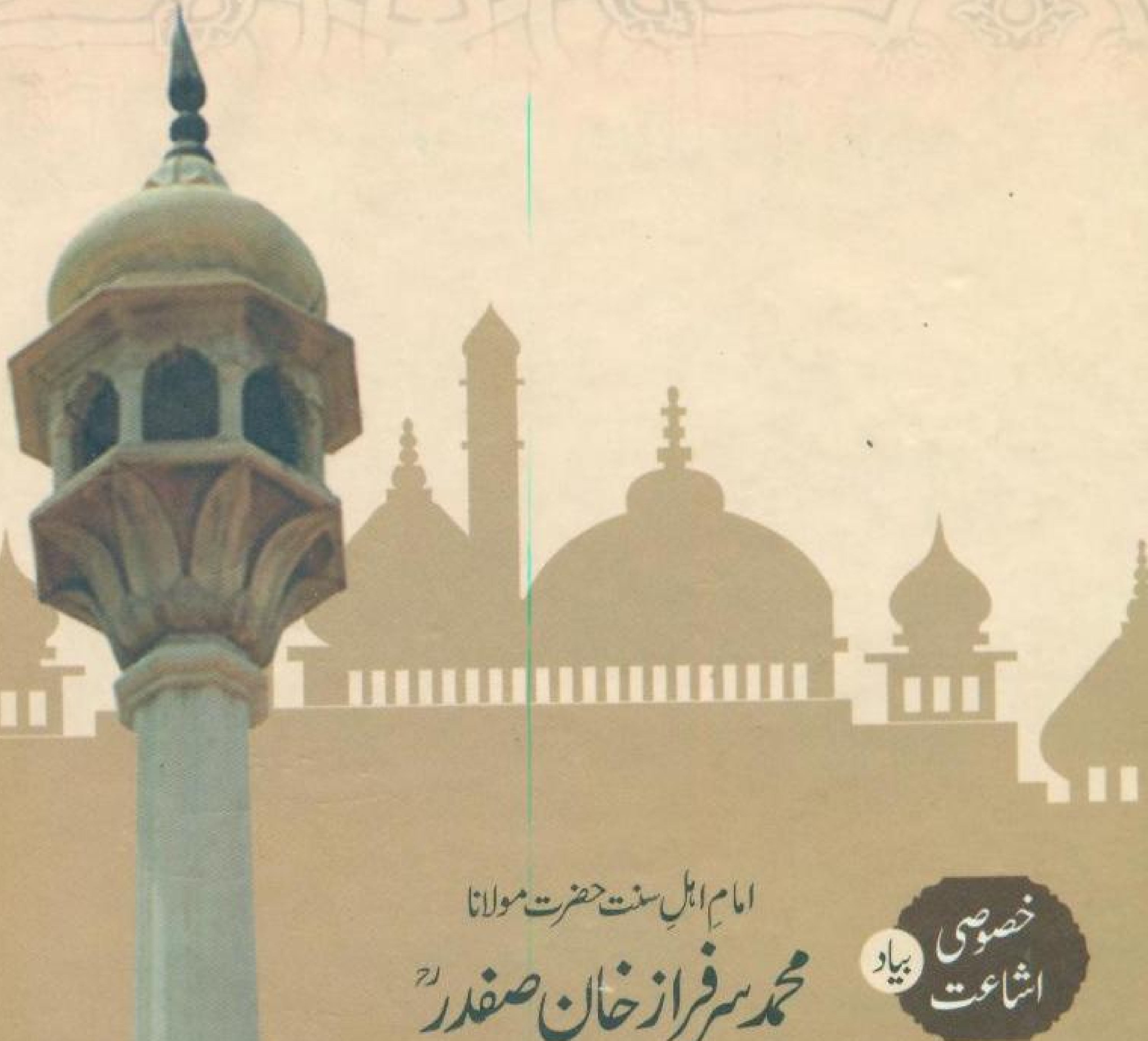
ماہنامہ

الشریعہ

جولائی - اکتوبر ۲۰۰۹ء

گوجرانوالہ



امامِ اہلِ سنت حضرت مولانا

محمد سرفراز خان صفدرؒ

خصوصی اشاعت بیاد

الشریعہ اکادمی

وحدت امت کا داعی اور غلبہ اسلام کا علم بردار

ماہنامہ **الشریعہ** گوجرانوالہ

جلد ۲۰ ٭ شمارہ نمبر ۷-۱۰ ٭ جولائی - اکتوبر ۲۰۰۹

خصوصی اشاعت

بیاد:

امام اہل سنت، شیخ الحدیث

حضرت مولانا محمد سرفراز خان صفدر

رحمۃ اللہ علیہ

زر تعاون	خط و کتابت کے لیے	زیر اہتمام	شعبہ ترسیل
سالانہ 150 روپے	ماہنامہ الشریعہ	الشریعہ اکادمی	حافظ محمد طاہر
خصوصی اشاعت:	پوسٹ بکس 331 گوجرانوالہ	ہاشمی کالونی کنگنی والا گوجرانوالہ	جامع مسجد شیرانوالہ باغ گوجرانوالہ
500 روپے	aknasir2003@yahoo.com	055-4000394	0334-4458256

ناشر: حافظ محمد عبدالمتین خان زاہد - طابع: مسعود اختر پرنٹرز، میکلوڈ روڈ، لاہور

فہرست مضامین

بسم اللہ الرحمن الرحیم

○ نقوش وتاثرات

ا. اہل خاندان کے رشحات قلم

ب. اہل علم، تلامذہ اور متوسلین کی نگارشات

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

کلمہ حق

محمد عمار خان ناصر

گر قبول افتد زہے عز وشرف

امام اہل سنت، شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد سرفراز خان صفدر رحمۃ اللہ علیہ کی یاد میں 'الشریعۃ' کی خصوصی اشاعت قارئین کے سامنے ہے۔ اس کے منظر عام پر آنے کے لیے ابتداءً اجولائی کا مہینہ مقرر کیا گیا تھا، لیکن بھرپور کوشش کے باوجود ایسا نہ ہو سکا۔ واقفان حال جانتے ہیں کہ ایک ضخیم اشاعت کی تیاری اور ترتیب وتدوین کی مشکلات کیا ہوتی ہیں اور کئی طرح کے اسباب تاخیر کا باعث بن ہی جایا کرتے ہیں۔ بہر حال قارئین کو دو ماہ تک انتظار کی جو زحمت اٹھانا پڑی، اس کے لیے ہم معذرت خواہ ہیں اور امید رکھتے ہیں کہ محدود وقت میں میسر حالات اور وسائل کے ساتھ اپنی بساط کی حد تک اس اشاعت کو بہتر سے بہتر بنانے کی جو کوشش کی گئی ہے، اسے اس تاخیر کے لیے مناسب وجہ جواز سمجھتے ہوئے عذر کو قبول کیا جائے گا۔

جہاں تک حضرت شیخ الحدیث رحمہ اللہ کی شخصیت کے کمالات واوصاف کے کما حقہ احاطہ کی بات ہے تو اس نوعیت کی کئی کاوشوں کے باوجود شاید وہ ممکن نہیں اور اس اشاعت کے لیے لکھنے والے چھوٹے بڑے تمام اصحاب قلم نے اول وآخر اسی اعتراف کے ساتھ قلم اٹھایا ہے کہ:

نہ حسنش غایتے دارد نہ سعدی را سخن پایاں

ان سب کوششوں کا مقصد ومحرک اصلاً حضرت کے کمالات کا کوئی جامع مرقع کھینچنا نہیں، بلکہ آپ کے مداحوں اور عقیدت مندوں کی بزم میں شریک ہونے کی سعادت حاصل کرنا ہے، البتہ آپ کی شخصیت سے تاثر قبول کرنے والے اہل قلم کے، مختلف زاویوں سے اپنے مشاہدات وتاثرات کو بیان کرنے سے قارئین ایک حد تک ان نمایاں اوصاف کا اندازہ کر سکتے ہیں جو حضرت رحمہ اللہ کی شخصیت کے وسیع وعمیم فیضان اور آپ کو حاصل ہونے والی غیر معمولی محبوبیت کے ظاہری اسباب کا درجہ رکھتی ہیں۔

یہ اشاعت حضرت رحمہ اللہ کے دامن فیض کے وابستگان کی طرف سے آپ کے تذکرہ اور آپ کی یادوں کو تازہ رکھنے کے سلسلے میں نقش اول کی حیثیت رکھتی ہے، نقش آخر کی نہیں۔ یہ سلسلہ ان شاء اللہ جاری رہے گا اور اس مناسبت سے یہاں ان علمی وتصنیفی منصوبوں کا مختصر ذکر مناسب معلوم ہوتا ہے جن کا مقصد حضرت رحمہ اللہ کی علمی تحقیقات اور

افادات کو عملی ضروریات اور تقاضوں کے لحاظ سے بہتر سے بہتر انداز میں مرتب اور محفوظ کرنا ہے اور جن پر مختلف اطراف سے کام ہو رہا ہے۔

الشریعہ اکادمی میں اس حوالے سے درج ذیل تصنیفی منصوبوں پر کسی نہ کسی درجے میں کام جاری ہے:

۱۔ مفصل سوانح حیات: حضرت رحمہ اللہ کی مفصل سوانح حیات لکھنے کا آغاز دو سال قبل اکادمی کے رفیق برادرم مولانا حافظ محمد یوسف نے کیا تھا۔ اس کے ابتدائی ابواب ماہنامہ 'الشریعہ' میں شائع ہو چکے ہیں، جبکہ زیر نظر اشاعت میں بھی اس کے دو باب شامل کیے جا رہے ہیں۔

۲۔ اصولی مباحث کے مجموعے: حضرت رحمہ اللہ کی تصانیف میں تفسیر وحدیث، فقہ، اصول فقہ اور علم کلام وغیرہ سے متعلق جو متنوع اصولی مباحث بکھرے ہوئے ہیں، راقم الحروف نے دو سال حضرت کی اجازت سے انھیں مستقل مجموعوں کی صورت میں یکجا کرنے کا سلسلہ شروع کیا تھا تاکہ اہل علم ان مباحث سے، جو مختلف فروعی وذیلی بحثوں کے تحت آنے کی وجہ سے ان تصانیف میں دب سے گئے ہیں، ان کی مستقل حیثیت میں فائدہ اٹھا سکیں۔ بحمد اللہ اس ضمن میں ''فن حدیث کے اصول ومبادی'' کے زیر عنوان اصول حدیث سے متعلقہ مباحث کو یکجا کیا جا چکا ہے اور یہ مجموعہ ان شاء اللہ جلد منظر عام پر آ جائے گا۔ اسی طرز پر تفسیر، فقہ اور عقائد وغیرہ سے متعلق اصولی مباحث بھی مستقل مجموعوں کی صورت میں الشریعہ اکادمی کے زیر اہتمام شائع کیے جائیں گے۔

۳۔ مفصل تصانیف کی تلخیصات: اصولی نوعیت کی علمی وتحقیقی بحثوں کے علاوہ حضرت رحمہ اللہ نے جن اعتقادی اور فقہی موضوعات پر قلم اٹھایا ہے، انھیں عوام الناس کے استفادے کے لیے مختصر اور عام فہم کتابچوں کی صورت میں پیش کرنا بھی ایک عرصے سے ہمارے پیش نظر ہے۔ کافی عرصہ پہلے والد گرامی حضرت مولانا زاہد الراشدی نے حضرت رحمہ اللہ کی ضخیم اور محققانہ تصنیف ''احسن الکلام'' کی تلخیص ''اطیب الکلام'' کے عنوان سے پیش کی تھی۔ اسی طرز پر ان شاء اللہ باقی موضوعات پر بھی حضرت رحمہ اللہ کی تحقیقات اور تحریروں پر مبنی مختصر کتابچے مرتب کروائے جائیں گے تاکہ ان کے افادہ کا دائرہ زیادہ سے زیادہ لوگوں تک وسیع ہو سکے۔

ان تصانیف میں متنوع نوعیت کا جو علمی اور معلوماتی مواد موجود ہے، استفادہ کی سہولت کے لیے اسے بھی متفرق عنوانات کے تحت یکجا مرتب کرنے کا کام پیش نظر ہے۔ اس ضمن میں چند ممکنہ اور متوقع دائرے حسب ذیل ہیں:

۱۔ سیرت النبی صلی اللہ علیہ وسلم

۲۔ منتخب احادیث اور ان کی تشریح

۳۔ ضعیف اور موضوع احادیث

۴۔ صرفی ونحوی اور لغوی تحقیقات

۵۔ فقہی مسائل

۶۔ اصلاح معاشرہ کے مختلف پہلو

۷۔ دلچسپ واقعات

۴۔ تصانیف کا اشاریہ: حضرت رحمہ اللہ کی مبسوط اور مختصر تصانیف کی تعداد ۴۵ کے قریب ہے اور علم وتحقیق سے شغف رکھنے والے حضرات کے لیے بھی یہ اندازہ کرنا بالعموم ممکن نہیں کہ ان تصانیف کے ہزاروں صفحات میں کس علمی بحث یا نکتے سے متعلق کہاں اور کس نوعیت کی تفصیل مل سکے گی۔ جدید دور میں اس طرح کی مبسوط اور مفصل تصانیف سے استفادے کو آسان بنانے کے لیے ان کے تفصیلی اشاریے مرتب کرنے کا طریقہ اختیار کیا جاتا ہے، لیکن حضرت رحمہ اللہ کی تصانیف کا کوئی اشاریہ ابھی تک میسر نہیں۔ الشریعہ اکادمی کے زیر اہتمام ان شاء اللہ ان تمام تصانیف کا ایک تفصیلی اشاریہ مرتب کیا جائے گا اور اہل علم کے استفادہ کے لیے اسے کتابی صورت میں پیش کیا جائے گا۔

۵۔ مکاتیب: حضرت رحمہ اللہ نے معاصر اہل علم یا اپنے تلامذہ اور معتقدین کے نام جو خطوط تحریر فرمائے، ان کا ایک اچھا خاصا ذخیرہ مختلف حضرات کے پاس محفوظ ہے۔ زیر نظر خصوصی اشاعت کے موقع پر ہماری درخواست پر بہت سے حضرات نے یہ خطوط ہمیں فراہم کیے ہیں جن کا ایک بڑا حصہ شامل اشاعت بھی کیا جا رہا ہے۔ اس کے علاوہ بھی بہت سے حضرات کے پاس بڑی تعداد میں حضرت کے قیمتی خطوط کی موجودگی کی اطلاعات ہیں۔ یہ تمام ذخیرہ جمع کیا جا رہا ہے اور ترتیب وتدوین کے بعد اسے ''مکاتیب صفدر'' کے عنوان سے شائع کیا جائے گا۔

۶۔ مقالات ومضامین: حضرت رحمہ اللہ نے مستقل تصانیف کے علاوہ مختلف مواقع پر بعض علمی واصلاحی موضوعات پر مضامین اور مقالات بھی سپرد قلم کیے ہیں جو ملک کے مختلف دینی جرائد میں شائع ہوتے رہے ہیں۔ ہمارے رفیق جناب شبیر احمد خان میواتی نے ان مضامین کا بیشتر حصہ جمع کر لیا ہے اور تکمیل کے بعد یہ مجموعہ بھی ''مقالات صفدر'' کے عنوان سے قارئین کی خدمت میں پیش کر دیا جائے گا۔ حضرت کے تحریر کردہ بعض فتاویٰ مدرسہ نصرۃ العلوم کے ریکارڈ میں محفوظ ہیں۔ انھیں بھی ان شاء اللہ اس مجموعے کا حصہ بنا دیا جائے گا۔

۷۔ اصلاحی خطبات: مختلف دینی وعلمی اجتماعات کے موقع پر حضرت رحمہ اللہ کے اصلاحی اور معلوماتی بیانات وخطابات کو جمع کرنے کا بیڑا بھی برادرم شبیر احمد خان میواتی نے اٹھایا ہے۔ یہ افادات بھی ایک مستقل مجموعے کی صورت میں شائع کیے جائیں گے۔

۸۔ ڈائری: حضرت رحمہ اللہ کا نصف صدی سے زائد عرصے تک یہ معمول رہا ہے کہ وہ رات کو سونے سے پہلے ڈائری لکھا کرتے تھے اور اس میں دن بھر کی اہم مصروفیات اور واقعات کا اندراج کر لیا کرتے تھے۔ عم مکرم مولانا منہاج الحق خان راشد ان ڈائریوں کے مندرجات کے انتخاب کے سلسلے میں کام کر رہے ہیں۔ خیال یہ تھا کہ اس سلسلے کو زیر نظر اشاعت کا حصہ بنایا جا سکے گا، تاہم کام کی طوالت اور عم مکرم کی علالت کے باعث ایسا ممکن نہیں ہو سکا۔ اب تکمیل کے بعد اسے ایک مستقل مجموعے کی صورت میں شائع کیا جائے گا۔

۹۔ انٹرنیٹ پر تصانیف کی فراہمی: حضرت رحمہ اللہ کی تصانیف سے استفادہ کے دائرے کو عالمی سطح تک وسیع کرنے کے لیے ان تصانیف کو انٹرنیٹ پر الشریعہ کی ویب سائٹ پر مہیا کرنے کا منصوبہ بھی ابتدائی مراحل میں ہے اور ان شاء اللہ اس ضمن میں ٹھوس پیش رفت جلد سامنے آ جائے گی۔

۱۰۔ علمی سیمینار: الشریعہ کی زیر نظر اشاعت کے دوران میں ہم مسلسل یہ محسوس کرتے رہے ہیں کہ حضرت رحمہ اللہ کی تحقیقات وتصانیف کے علمی وفنی معیار اور آپ کے علمی منہج کے مختلف پہلو اس طرح تفصیل اور گہرائی سے زیر بحث نہیں آ سکے جس کے وہ حق دار ہیں۔ ظاہر ہے کہ علمی وتحقیقی نوعیت کے مفصل اور معیاری مقالات ومضامین اس محدود وقت میں لکھے بھی نہیں جا سکتے، چنانچہ یہ فیصلہ کیا گیا ہے کہ حضرات شیخین رحمہما اللہ کے افکار وتحقیقات کے علمی وفنی پہلوؤں پر مختلف اہل علم سے مفصل مقالات لکھوائے جائیں گے اور انھیں ایک علمی سیمینار میں اہل ذوق کے سامنے پیش کیا جائے گا۔ ان شاء اللہ مطلوبہ مقالات کی تصنیف کے بعد مجوزہ سیمینار ۲۰۱۰ء کے دوران میں الشریعہ اکادمی میں منعقد کیا جائے گا اور بعد میں ان مقالات کو کتابی صورت میں بھی شائع کیا جائے گا۔

یہ تو وہ منصوبہ جات ہیں جن کی تکمیل حضرت رحمہ اللہ کی علمی ودینی خدمات کا تسلسل قائم رکھنے کے سلسلے میں الشریعہ اکادمی کے پلیٹ فارم سے ہمارے پیش نظر ہے۔ اس سے ہٹ کر آپ کے علمی افادات کی ترتیب وتدوین کا جو کام مختلف دائروں میں انجام دیا جا رہا ہے، اس کا مختصر تعارف حسب ذیل ہے:

۱۱۔ الخیرات فی تفسیر القرآن الکریم: مدرسہ نصرۃ العلوم میں منتہی طلبہ کے لیے حضرت رحمہ اللہ کے تفسیر قرآن کے دروس کو مرتب کرنے کی خدمت استاذ گرامی وعم مکرم مولانا عبد القدوس خان قارن زید مجدہ انجام دے رہے ہیں اور وہ اس ضمن کا دو تہائی کام بحمد اللہ مکمل کر چکے ہیں۔ ان دروس کا نام خود حضرت شیخ الحدیثؒ نے ''الخیرات فی تفسیر القرآن الکریم مع الربط بین السور والرکوعات'' تجویز فرمایا تھا اور اسی عنوان سے یہ ان شاء اللہ مستقبل قریب میں کتابی صورت میں منصۂ شہود پر آئیں گے۔

۱۲۔ ذخیرۃ الجنان: گکھڑ کی جامع مسجد میں نماز فجر کے بعد عوامی سطح پر دیے جانے والے درس قرآن کو پنجابی سے اردو میں منتقل کرنے کی خدمت مولانا محمد نواز بلوچ انجام دے رہے ہیں اور یہ دروس ''ذخیرۃ الجنان فی فہم القرآن'' کے عنوان سے حضرت رحمہ اللہ کے خادم خاص حاجی لقمان اللہ میر کے زیر اہتمام شائع ہو رہے ہیں۔ اب تک اس سلسلے کی آٹھ جلدیں شائع ہو چکی ہیں جن میں سورۂ توبہ کے آخر تک کے دروس محفوظ کیے جا چکے ہیں۔

۱۳۔ خطبات امام اہل سنتؒ: حضرت رحمہ اللہ کے خطبات جمعہ کو پنجابی سے اردو میں منتقل کر کے شائع کرنے کے سلسلے کا آغاز جامعہ قاسمیہ گوجرانوالہ کے مہتمم اور حضرت کے پرانے شاگرد مولانا قاری گلزار احمد قاسمی نے کیا ہے اور وہ ''خطبات امام اہل سنت'' کے زیر عنوان اب تک ان خطبات کی تین جلدیں پیش کر چکے ہیں۔

۱۴۔ خصوصی اشاعتیں: حضرت رحمہ اللہ کی وفات کے موقع پر آپ کی حیات وخدمات کے حوالے سے ملک بھر

کے جرائد ورسائل میں تعزیتی وتاثراتی مضامین اور اداریے تحریر کیے گئے، جبکہ بعض جرائد نے خصوصی اشاعتوں کا اہتمام بھی کیا۔ ان میں ماہنامہ ''مدینۃ العلم'' فیصل آباد، ماہنامہ 'ہدی للناس'' گوجرانوالہ اور ہفت روزہ ''وزارت'' لاہور قابل ذکر ہیں۔ بالخصوص ''وزارت'' نے مئی اور جون کی مسلسل چار اشاعتیں حضرت کی خدمات کے تذکرے کے لیے مخصوص کر دیں اور مختلف اصحاب قلم کی معلوماتی وتاثراتی تحریروں کے علاوہ حضرت رحمہ اللہ کی جوانی، بڑھاپے اور بعد از وفات کی چند یادگار تصاویر کو بھی اپنے صفحات میں محفوظ کر کے معتقدین کے ذوق دید کی تسکین کا سامان کیا۔

'الشریعہ' کی زیر نظر اشاعت کے علاوہ جامعہ مدنیہ بہاول پور سے شائع ہونے والے مجلّہ ''المصطفیٰ'' نے بھی امام اہل سنت رحمہ اللہ کی یاد میں ایک ضخیم اشاعت پیش کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔ اسے برادرم حافظ سرفراز حسن خان حمزہ (فرزند عم مکرم مولانا عبد الحق خان بشیر زید مجدہم) بڑی محنت اور لگن سے مرتب کر رہے ہیں اور امید ہے کہ رمضان المبارک کے دوران میں یہ ان شاء اللہ منظر عام پر آ جائے گی۔ 'الشریعہ' اور 'المصطفیٰ' کی خصوصی اشاعتوں کی ترتیب کے ضمن میں ہماری باہمی مشاورت بھی ہوتی رہی ہے اور اس بات کی کوشش کی گئی ہے کہ دونوں اشاعتوں کے مندرجات میں تکرار کم سے کم ہو، تاکہ قارئین یکساں دلچسپی کے ساتھ دونوں سے استفادہ کر سکیں۔

اس سے قبل گزشتہ سال ہمارے خاندان کے دوسرے بڑے بزرگ حضرت مولانا صوفی عبد الحمید سواتی رحمہ اللہ کے انتقال کے موقع پر ماہنامہ ''نصرۃ العلوم'' ان کی یاد میں ایک ضخیم اشاعت ''مفسر قرآن نمبر'' کے عنوان سے پیش کر چکا ہے جو حضرت صوفی صاحب علیہ الرحمۃ کی حیات وخدمات کے ساتھ ساتھ حضرت شیخ الحدیث علیہ الرحمۃ کی شخصیت اور خدمات کے حوالے سے بھی بڑی اہمیت کی حامل ہے۔

اس خصوصی اشاعت کی پیش کش کے سلسلے میں ان سب حضرات کا شکریہ ادا کرنا بھی لازم ہے جن کا تعاون کسی بھی حوالے سے ہمیں حاصل رہا۔ سب سے بڑھ کر تو وہ اصحاب قلم ہمارے شکریے کے مستحق ہیں جن کی تحریریں قارئین آئندہ صفحات میں ملاحظہ فرمائیں گے۔ بحمد اللہ تمام اہل قلم نے بھرپور عقیدت واحترام کے ساتھ اس سعادت میں شریک ہونے کے جذبے سے اپنے خیالات وتاثرات قلم بند کیے ہیں اور ہماری درخواست پر اپنی دیگر مصروفیات کو پس پشت ڈال کر اپنی تحریریں ارسال فرمائی ہیں جس کی بدولت چار ماہ کے مختصر عرصے میں یہ ضخیم اشاعت پیش کرنا ممکن ہوا ہے۔ خاص طور پر برادرم مولانا حافظ محمد یوسف نے حضرت رحمہ اللہ کے اسلوب تفسیر سے متعلق اپنا مفصل مقالہ دن رات کی محنت سے مکمل کر کے ہمیں عنایت کیا، جناب حافظ نثار احمد الحسینی نے بڑی محنت سے متعدد مضامین خصوصی اشاعت کے لیے ارسال فرمائے جن میں سے دو اس میں شامل کیے گئے ہیں، جبکہ عم مکرم مولانا عبد الحق خان بشیر زید مجدہ نے اپنی علالت اور پے در پے اسفار کے باوجود ایک خصوصی اور مفصل مقالہ رقم فرمایا ہے جس کی شمولیت یقیناً اس اشاعت کی علمی قدر وقیمت میں اضافے کا موجب بنی ہے۔

اس کے ساتھ ساتھ اس اشاعت کی تیاری اور ظاہری تزئین وترتیب میں الشریعہ اکادمی کے رفقا برادرم حافظ مولوی محمد سلیمان اور برادرم شبیر احمد خان میواتی کی خدمات کا ذکر بھی ضروری ہے۔ اول الذکر اپنی متنوع تعلیمی و تدریسی مصروفیات کے باوجود موصولہ مواد کی بروقت کمپوزنگ کرتے رہے جبکہ ثانی الذکر نے پوری دلچسپی کے ساتھ مضامین کی پروف خوانی کی خدمت انجام دینے کے علاوہ ترتیب وتدوین کے حوالے سے اپنے قیمتی مشوروں سے نوازا اور تیاری کے حتمی مراحل تک ہمارے ساتھ شریک کار رہے۔ حضرت رحمہ اللہ کے آثار وتبرکات کی تصاویر فراہم کرنے میں عم محترم جناب قاری حماد الزہراوی صاحب نے تعاون فرمایا جبکہ طباعت سے متعلق جملہ معاملات کی نگرانی حسب سابق ہمارے دوست جناب عبد الرزاق خان صاحب نے انجام دی ہے۔

میں ان سب حضرات کا اور ان کے علاوہ اس اشاعت کی تیاری کے ضمن میں کسی بھی حوالے سے اور کسی بھی درجے میں معاونت کرنے والے دوستوں کا 'الشریعہ' اور اس کے قارئین کی طرف سے تہہ دل سے شکریہ ادا کرتا ہوں اور دعا کرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ ہم سب کی طرف سے حضرت رحمہ اللہ کے ساتھ عقیدت ومحبت کے اس اظہار کو، جو کسی طرح بھی حضرت کی شخصیت اور رفعت مقام کے شایان شان نہیں ہے، قبولیت سے نوازے اور اسے ہمارے لیے ذریعہ سعادت ونجات بنا دے۔ آمین

گزشتہ چند مہینوں کے دوران میں حضرت شیخ الحدیث رحمہ اللہ اور ہمارے پھوپھا محترم حضرت مولانا قاری خبیب احمد عمر جہلمیؒ کے علاوہ بھی خدمت دین کے میدان میں متحرک اور فعال بہت سی شخصیات کی جدائی کا صدمہ اہل دین کو برداشت کرنا پڑا۔ ان میں سے چند نمایاں نام حسب ذیل ہیں:

- جامعہ اسلامیہ راولپنڈی کے مہتمم اور معروف عالم دین مولانا قاری سعید الرحمٰنؒ۔
- دار العلوم اسلامیہ شیر گڑھ کے مہتمم مولانا حاجی محمد احمدؒ۔
- ملت اسلامیہ کے مرکزی راہ نما اور جید عالم دین مولانا علی شیر حیدریؒ۔
- جمعیۃ علمائے اسلام کے مرکزی راہ نما مولانا سید امیر حسین شاہ گیلانیؒ۔
- تحریک خلافت کے راہنما اور فاضل صاحب علم مولانا خورشید احمد گنگوہیؒ۔
- ملت اسلامیہ پاکستان کے راہ نما اور ترجمان مولانا عطاء الرحمٰن شہبازؒ فاروقی۔

یہ تمام حضرات دین کی نشر واشاعت اور تعلیم وتبلیغ کے سلسلے میں گراں قدر خدمات انجام دے رہے تھے اور مختصر عرصے میں ان سب کے دنیا سے رخصت ہو جانے سے یقیناً ایک بڑا خلا پیدا ہوا ہے۔ اللہ تعالیٰ ان سب حضرات کی خدمات کو قبول فرمائے، ان کی سیئات سے درگزر فرما کر انھیں بلند سے بلند درجہ عطا فرمائے اور پس ماندگان کو ان کی جدائی کا صدمہ برداشت کرتے ہوئے ان کی خدمات کے تسلسل کو جاری رکھنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین

۱

سوانح

حضرت مولانا محمد سرفراز خان صفدرؒ

ہم نے تمام عمر گزاری ہے اس طرح

[خودنوشت سوانح حیات]

— ۱ —

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نحمدہ و نصلی علی رسولہ الکریم۔ اما بعد

''ہمارے مخلص اور مہربان بزرگ جناب خان محمد خواص خان صاحب دام مجدہم اعوان مقام ہیڑاں ڈاکخانہ اہل تحصیل مانسہرہ ضلع ہزارہ نے بار بار بزرگانہ خطوط تحریر فرمائے کہ میں علماے ہزارہ کے بارے کتاب لکھنا چاہتا ہوں، اس لیے تم اپنے اور برادرِ خورد صوفی عبد الحمید کے حالاتِ زندگی اور خصوصیت سے تحصیل علم سے متعلق معلومات ضبط تحریر میں لا کر بھیجو۔ موصوف سے وعدہ بھی تھا مگر ایک ضروری سفر اور بے حد مصروفیت اور اس پر مستزاد گوناگوں بیماریاں اور کچھ ایسے ہی دیگر متعدد عوارض دامن گیر ہوئے کہ محترم کو تقریباً چار پانچ سال تک خاطر خواہ جواب لکھ کر نہ بھیج سکا اور ان تمام عوارضات سے بڑھ کر یہ مانع پیش آیا کہ موصوف تو علماے ہزارہ کے حالات اپنی زندۂ جاوید کتاب میں درج فرمانا چاہتے ہیں، لیکن جب راقم نے اپنی حقیقت پر نگاہ ڈالی تو اپنے کو اس صف میں کھڑا ہونے کا اہل نہ پایا جس علماء کی صف میں موصوف غالباً محض اپنی حسن عقیدت یا بزرگانہ شفقت سے کھڑا کرنا چاہتے ہیں، کیونکہ اپنی حقیقت اس کے سوا کچھ نہیں کہ من آنم کہ من دانم۔ اس کے بعد موصوف نے شکوہ سے بھرے ہوئے خطوط ارسال فرمانا شروع کر دیے جس میں وہ حق بجانب تھے کہ تمہاری مصروفیات تو ختم نہیں ہوں گی اور میں انتظار کر کر کے تھک گیا ہوں (محصلہ)۔ اب مجبوراً اس بزرگانہ شکوہ اور وعدہ کو ملحوظ رکھ کر راہ فرار بھی نظر نہیں آ رہی اس لیے موصوف کے حکم کی تعمیل میں اختصاراً و اجمالاً کچھ لکھ کر ارسال کرنا ہی ضروری سمجھا گیا، تا کہ موصوف سے تو جان چھڑائی جا سکے اپنی جگہ پوزیشن اور حقیقت کچھ ہو یا نہ ہو، آخر گلوخلاصی بھی تو ضروری ہے۔ واللہ تعالیٰ الموفق للخیر''۔

خاندانی پس منظر اور ابتدائی حالات

راقم اثیم کا نام محمد سرفراز، والد کا نام نور احمد خان مرحوم، دادا کا نام گل احمد خان مرحوم، قوم سواتی (شاخ مندراوی)، جاے پیدائش ڈھکی چیڑاں داخلی، کڑمنگ بالا سابق ڈاکخانہ بٹل، علاقہ کونش تحصیل مانسہرہ، ضلع ہزارہ صوبہ سرحد (مغربی پاکستان) ہے۔ صحیح طور پر تو معلوم نہیں اور نہ کوئی تحریر موجود ہے، بزرگوں کے مختلف بیانات کی روشنی میں قدر مشترک یہ ہے کہ راقم کی

ان چھ سات سالوں میں ہم نے وطن میں اپنے بزرگوں اور رشتہ داروں کو کوئی اطلاع نہ دی کہ ہم ہیں یا نہیں؟ اور ہیں تو کہاں ہیں؟ اور کرتے کیا ہیں؟ جن حضرات کو ہمارے ساتھ قدرتی اور طبعی طور پر محبت تھی، مثلاً والدہ ماجدہ اور ہمشیرگان وغیرہا تو وہ ہمارے بارے میں متفکر اور پریشان تھے اور کچھ ایسے بھی تھے جو غالباً ''ولے بخیر گزشت'' کا ورد کرتے ہوں گے۔ بہرحال دنیا میں بہت کچھ ہوتا ہے اور یہ زمانہ ہم پر جیسے بھی گزرا، آخر گزر گیا۔ راقم کی موقوف علیہ تک سب کتابیں ختم ہو گئی تھیں، لیکن عزیزم عبد الحمید کی باقی تھیں اور راقم اس کے لیے رکا رہا اور دورۂ حدیث شریف کے لیے دار العلوم دیوبند نہ جا سکا اور بحکم استاذ محترم تقریباً ڈیڑھ سال پرائیویٹ طور پر ایک جگہ مولوی فاضل کا کورس پڑھاتا رہا۔ پچیس روپے ماہانہ تنخواہ ملتی تھی اور کھانا اور رہائش کا انتظام اس کے علاوہ تھا۔ اسی زمانہ میں ہماری برادری کے ایک بزرگ چچا گل خان صاحب ساکن اچھڑیاں راہوالی میں ریلوے کے محکمہ میں ملازم تھے، ان کی وجہ سے ہمارا علم ہمارے بزرگوں کو ہو گیا۔ چنانچہ ہمارے خالہ زاد بھائی حاجی گوہر آمان خان صاحب مرحوم ہماری ملاقات کے لیے گوجرانوالہ آئے۔ ملاقات ہوئی، خیر و عافیت کا علم ہوا۔ ہماری والدہ مرحومہ اور چھوٹی ہمشیرہ انہی کے ہاں رہتی تھیں۔ کچھ دنوں کے بعد راقم بھی وطن گیا اور خویش و اقارب سے ملاقات ہوئی۔ چند دن وہاں رہا اور بعض مقامات پر تقریریں بھی کیں۔ لوگوں کا زاویہ نگاہ قدرے بدل چکا تھا اور اب وہ وقعت کی نگاہ سے دیکھنے لگے۔

ولادت ۱۹۱۴ء کے لگ بھگ ہوئی ہے۔ (عزیزم عبدالحمید مجھ سے تقریباً تین سال چھوٹا ہے۔ اس لحاظ سے اس کی ولادت ۱۹۱۷ء کے لگ بھگ کی ہے) واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب۔ ہمارے والد مرحوم کی پہلی شادی اپنے حقیقی چچا محمد خان مرحوم کی لڑکی بی بی رحمت نور مرحومہ سے ہوئی۔ (یہ ہماری سوتیلی والدہ تھیں اور پاکستان بننے کے بعد ۱۹۴۹ء میں گکھڑ ضلع گوجرانوالہ میں ان کی وفات ہوئی اور یہیں وہ مدفون ہیں، اللھم اغفر لھا وارحمھا)۔ اس شادی کے بعد ایک لڑکا پیدا ہوا جس کا نام اپنے بزرگوں سے اور خصوصاً والدہ مرحومہ سے عبدالغفورؒ سنا ہے۔ جوانی میں ہی ان کا انتقال ہو گیا تھا۔ اس کے بعد تقریباً تیس سال تک ہمارے والد مرحوم کے ہاں باوجود والدہ مرحومہ کے علاج ومعالجہ کے کوئی اولاد نہ ہوئی۔ جب ہمارے والد مرحوم کی عمر تقریباً ساٹھ سال کی ہوگئی تو ہماری سوتیلی والدہ مرحومہ اور خاندان کے بعض دیگر بزرگوں نے ہمارے والد مرحوم کو اولاد کی غرض سے اور شادی کرنے پر مجبور کیا۔ پہلے تو وہ پہلوتہی کرتے رہے مگر بالآخر وہ بھی مجبور ہو گئے۔ ڈھنہ کے مقام کے چیچی خاندان کی پندرہ سولہ سال کی ایک خاتون سے جن کا نام بی بی بخت آور تھا، خاصی کش مکش کے بعد نکاح ہو گیا۔ دونوں کی عمروں کے نامناسب ہونے کی وجہ سے بعض رشتہ دار ابتدائی مرحلہ میں سخت مخالف تھے، بالآخر سب راضی ہو گئے۔ یہ ہماری حقیقی والدہ تھی۔

شادی کے بعد ۱۹۱۱ء کے لگ بھگ ایک لڑکی پیدا ہوئی جو ہماری بڑی ہمشیرہ ہے جس کا نام بی بی حکم جان ہے اور اپنے حقیقی پھوپھی زاد بھائی سید عبداللہ شاہ صاحبؒ ولد سید دین علی شاہ صاحب مرحوم ساکن لمبی کے نکاح میں ہے۔ صاحب اولاد ہے اور تاوقت تحریر بقید حیات ہے۔ اللہ تعالیٰ عمر دراز کرے۔ اس کے بعد تقریباً تین سال بعد راقم کی ولادت ہوئی، پھر تقریباً تین سال بعد عزیزم صوفی عبدالحمید کی ولادت ہوئی۔ اس کے بعد تقریباً ۱۹۲۰ء کے لگ بھگ ہماری چھوٹی ہمشیرہ بی بی خانم مرحومہ پیدا ہوئی (جس کی وفات ۱۹۴۴ء میں لاہور میں ہوئی اور وہ باغبانپورہ کے قبرستان میں مدفون ہے، جبکہ اس کا خاوند برادرم دولت خان ساکن اچھڑیاں وہاں ٹکسال میں ملازم تھا)۔ ہماری یہ چھوٹی ہمشیرہ تقریباً چالیس دن کی تھی کہ ہماری حقیقی والدہ بی بی بخت آور مرحومہ چیچک کی بیماری میں مبتلا ہو کر تقریباً پچیس سال کی عمر میں دنیا سے رخصت ہوگئی اور ہم چاروں بہن بھائی اپنی حقیقی ماں کی مامتا سے محروم ہو گئے اور وہ بھی بے بسی کی حالت میں اپنے معصوم بچوں کو چھوڑ کر اللہ تعالیٰ کے حکم قطعی کو لبیک کہتے ہوئی آخرت کو روانہ ہوگئی۔ اس کے دل میں کیا کیا حسرتیں ہوں گی، کون اندازہ کر سکتا ہے؟ ان تمام حسرتوں کے عوض اللہ تعالیٰ مرحومہ کو جنت الفردوس مرحمت فرمائے۔ ہم پہلے بھی اپنی سوتیلی والدہ کی گود میں رہتے تھے اور حقیقی والدہ کی وفات کے بعد تو گود ہی وہی تھی اور یہ بالکل ایک حقیقت ہے کہ ایسی نیک دل، خدمت گزار، ہمدرد اور مہربان وشفیق سوتیلی والدہ شاید ہی کسی کو میسر ہوئی ہو جو اللہ تعالیٰ نے ہمیں مرحمت فرمائی تھی۔ اللہ تعالیٰ ان تمام کو اپنی رحمت کے جوار میں جگہ مرحمت فرمائے، آمین ثم آمین۔

ہم نے جب ہوش سنبھالا تو والد مرحوم کو بالکل سفید ریش دیکھا۔ ایک بال بھی سر اور ڈاڑھی میں سیاہ نہ تھا۔ بخلاف اس کے ہمارے دادا جی مرحوم بھی اس وقت زندہ تھے۔ ان کی ڈاڑھی اور سر میں بال سیاہ بھی تھے اور ان کی عمر سو سال کے لگ بھگ تھی۔ جب دونوں باپ بیٹا اکٹھے ہوتے تو دیکھنے والوں کو الٹ شبہ پڑتا۔ ہمارے گھر کے قریب کوئی اور مکان نہ تھا۔ تقریباً دو فرلانگ کے فاصلہ پر ہمارے دادا صاحب مرحوم اور ان کے چھوٹے بھائی میر عالم خان مرحوم کے دو مکان تھے جو

بالکل آس پاس تھے اور انہوں نے اپنی سہولت کے لیے مسجد بھی تعمیر کر لی تھی۔ بحمد اللہ تعالیٰ سبھی بزرگ متشرع اور پختہ نمازی تھے۔ ہمارے والد مرحوم اکثر نمازیں گھر ہی پڑھتے تھے اور گھر سے باہر ایک چبوترہ نماز کے لیے بنا رکھا تھا اور جانوروں سے اس کی بڑی حفاظت کیا کرتے تھے۔ تہجد اور باقی نمازوں کی سختی سے پابندی کرتے تھے۔ یہی حال ہماری سوتیلی والدہ مرحومہ کا تھا۔ والد مرحوم کبھی کبھی اذان خود بھی کہتے تھے مگر زیادہ تر مقابل میں دوسرے پہاڑ پر جگوڑی کے موذن کی اذان پر نمازوں اور سحری اور افطار کا انحصار ہوتا تھا۔

والد مرحوم اور اس طرح دادا مرحوم بالکل ان پڑھ تھے۔ جوانی کے دور میں والد مرحوم نے قرآن کریم کا پہلا پارہ ناظرہ پڑھا تھا، اس کے بعض مقامات کبھی پڑھ لیا کرتے تھے۔ ہاں قرآن کریم کی بعض سورتیں خوب یاد تھیں۔ نماز اور تلاوت میں انہیں کو پڑھتے تھے۔ عمر گو خاصی تھی مگر بفضلہ تعالیٰ صحت قابل رشک تھی اور اپنا تمام کاروبار خود کرتے تھے۔ ایک معمر نوکر بھی رکھا تھا جو کوہ مری کے علاقہ کا تھا اور عباسی خاندان سے تعلق رکھتا تھا۔ وہ بڑا پرہیزگار، متشرع نمازی اور نہایت خدمت گزار تھا۔ ہمارے مال ومویشی اکثر وہی چرایا کرتا تھا اور ہم بھی کبھی کبھی اس کے ساتھ مال ومویشی کے چرانے میں شرکت کرتے تھے۔ پانی خاصا دور تھا اور وہ پانی بھی اکثر لاتا تھا۔ ہمارا گھر گو اکیلا تھا مگر مہمان بکثرت رہتے اور خصوصاً لمبی کے ہمارے پھوپھی زاد بھائی تو اکثر وہاں رہتے تھے۔ خوب چہل پہل رہتی۔ والد مرحوم بڑے مہمان نواز تھے۔ بٹ کس کی صاف وشفاف ندی سے خود مچھلیاں پکڑ کر لاتے اور مہمانوں کی مچھلیوں اور اس کے علاوہ مرغیوں اور گوشت سے خوب تواضع کیا کرتے تھے۔ جب کسی موقع پر کوئی مہمان نہ آتا تو خاصے پریشان دکھائی دیتے تھے، لیکن مہمانوں کے نہ آنے کا واقعہ سال میں کبھی کبھار پیش آتا تھا۔

تعلیم کا آغاز

راقم نے جب ہوش سنبھالا تو زمینداری طریقہ سے گھر کے سب کام کرتا تھا لیکن والد مرحوم کو ہماری تعلیم کی بے حد فکر تھی اور اس جنگل میں تعلیم کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ حسن اتفاق سے ہمارے پھوپھی زاد بھائی محترم مولانا مولوی سید فتح علی شاہ صاحب ولد سید دین علی شاہ صاحب مرحوم ساکن لمبی بٹل میں سکول پڑھتے تھے اور غالباً اس وقت وہ چھٹی جماعت میں پڑھتے تھے۔ والد مرحوم نے راقم کو جبکہ غالباً عمر تیرہ سال کی ہوگی، ۱۹۲۷ء کے قریب بٹل پہنچا دیا اور پھوپھی زاد بھائی کے حوالہ کر دیا۔ وہاں راقم کو سکول میں داخل کر دیا گیا اور پہلی جماعت میں راقم نے تعلیم شروع کر دی۔ رہائش ایک بڑھیا مائی کے ہاں تھی۔ راشن اپنا ہوتا تھا، پکا وہ دیتی تھی۔ نام تو اس کا یاد نہیں، ہاں اتنا یاد ہے کہ یعقوب خان صاحب مرحوم کے گھر کے قریب ہی اس مائی کا گھر تھا۔ مکئی کی روٹی اور کڑھی اس مائی کے ہاتھ کی پکی ہوئی اب تک یاد ہے۔ اللہ تعالیٰ اس کو جزائے خیر دے۔

نہ معلوم کن وجوہ اور اسباب کی بنا پر برادرم محترم اچانک بٹل سے ملک پور چلے گئے اور وہاں فقیرا خان صاحب مرحوم کی مسجد میں ڈیرہ ڈال دیا اور شیر پور کے مڈل سکول میں داخل ہو گئے۔ کچھ عرصہ کے بعد والد مرحوم نے مجھے بھی وہاں پہنچا دیا اور ملک پور کی مسجد میں چھوڑ آئے اور اس موقع پر لمبی کے اور بھی کئی احباب وہاں آ گئے جن میں ہمارے دو اور پھوپھی زاد بھائی سید عبداللہ شاہ جو ہمارے بہنوئی بھی ہیں اور پیر ولی شاہ صاحب بھی تھے اور ان کے علاوہ چنار کوٹ اور کولیاں وغیرہ کے اور بھی کئی دوست جمع ہو گئے۔ رہتے تو ہم ملک پور میں تھے لیکن سکول شیر پور میں پڑھتے تھے حتیٰ کہ راقم دوسری جماعت تک

شیر پور میں پڑھتا رہا اور اس اثنا میں مسجد میں قاعدہ، قرآن کریم ناظرہ اور نماز جنازہ کے ضروری مسائل سیکھ لیے۔ وظیفے مانگ مانگ کر اکتا گیا اور کئی مرتبہ چھپ کر گھر بھاگ جاتا رہا۔ ایک دفعہ تو تن تنہا گلی باغ کے راستہ سے ٹنگ لائی کا خطرناک پہاڑ طے کر کے گھر پہنچ گیا اور لطف یہ کہ طبیعت میں کوئی خوف و ہراس نہ تھا، لیکن برادرم محترم سید فتح علی شاہ صاحب پولیس کی طرح راقم کا تعاقب کرتے اور جب قابو آتا تو بے تحاشا پیٹتے اور ایک دفعہ تو رسی سے باندھ کر پیٹا اور پھر جکڑ کر الٹا لٹکا دیا۔ والد مرحوم یا والدہ مرحومہ جب چھڑانے کے لیے قریب آتے تو برادر محترم ان سے الجھ پڑتے اور یوں گویا ہوتے کہ اگر تم نے پڑھانا ہے تو میرے کام میں مداخلت مت کرو، ورنہ تم جانو اور تمہارا کام۔ وہ چپ ہو جاتے اور ان کی مار کے بعض نشانات ابھی تک راقم کے بدن پر موجود ہیں، لیکن بایں ہمہ کئی دفعہ راقم بھاگ کر گھر چلا جاتا لیکن وہ پھر جا کر لے آتے اور خوب پٹائی کرتے۔

برادر محترم نے شیر پور میں مڈل پاس کر لیا اور راقم دوسری جماعت سے تیسری میں ہو گیا۔ اسی موقع پر والد مرحوم نے عزیزم صوفی عبد الحمید کو ملک پور پہنچا دیا۔ یہ اس کا پہلا سفر تھا لیکن چونکہ اپنے ہی رشتہ دار چند ہم عصر ساتھی موجود تھے، اس لیے اس نے بھی کوئی زیادہ تکلیف محسوس نہیں کی۔ اس زمانہ میں اخبار زمیندار بہت عروج پر تھا اور افغانستان میں بچہ سقاء کی شورش کی شہ سرخیاں اخبارات میں نمایاں ہوتی تھیں۔ اسی زمانہ میں مانسہرہ میں محترم جناب غلام احمد صاحب عرضی نویس اور حضرت مولانا غلام غوث صاحب دامت برکاتہم کی کوشش سے ایک دینی آزاد مدرسہ اصلاح الرسوم کے نام سے قائم ہوا تھا اور برادر محترم سید فتح علی شاہ صاحب اس مدرسہ میں جا کر داخل ہو گئے اور رہائش مانسہرہ کے قریب گنڈا کی مسجد میں رکھی۔ ہم لوگ بھی ملک پور سے کوچ کر کے گنڈا چلے گئے اور مانسہرہ کے مدرسہ میں داخل ہو گئے۔ تیسری جماعت میں داخلہ لیا اور تعلیم الاسلام مصنفہ حضرت مفتی محمد کفایت اللہ صاحب رحمہ اللہ کو خوب یاد کیا اور وہاں تقریر کا ڈھنگ بھی بتایا جاتا تھا۔ ہم نے بھی چند باتیں یاد کر لیں اور تقریر شروع کر دی۔ اس درمیان پیدل ہی ہم گھر آتے جاتے تھے۔ اس وقت لاری وغیرہ کا کوئی انتظام نہ تھا اور والد مرحوم بھی اکثر ہماری خبر گیری کے لیے آتے اور دیکھ بھال کر تسلی دے کر اور کچھ رقم دے کر چلے جاتے۔ ایک مرتبہ ہمارے کپڑوں میں بے پناہ جوئیں دیکھ کر والد مرحوم رو پڑے۔ ہماری برادری اور خاندان کے بعض حضرات والد مرحوم کو خوب کوستے اور طعنہ دیتے کہ اس بڑھاپے میں تجھے اللہ تعالیٰ نے اولاد دی ہے، لیکن تو ان کو گھر نہیں ٹکنے دیتا۔ چونکہ ان کو ہماری تعلیم کا بے حد شوق تھا، اس لیے وہ ان تمام طعنوں کو سن کر صبر شکر کر کے خاموش ہو جاتے۔

دادا اور والد کی وفات

اس اثنا میں ہمارے دادا مرحوم غالباً ۱۹۳۰ء کو ہماری غیر موجودگی میں رمضان مبارک کے مہینہ میں بحالت روزہ وفات پا گئے، اللھم اغفر لہ وارحمہ۔ چونکہ اس وقت سواری کا انتظام نہ ہوتا تھا اور گنڈا اور ہمارے گھر میں تقریباً ۲۶ میل کی مسافت تھی، اس لیے ہمیں اطلاع نہ بھیجی جا سکی۔ ہم تین چار دن کے بعد گھر پہنچے۔ اس کے ایک سال بعد رمضان مبارک ہی کے مہینہ میں ۱۹۳۱ء کے قریب ہمارے والد مرحوم کا انتقال ہوا اور ہم دونوں بھائی اس موقع پر گھر میں ہی تھے۔ ہمارے پھوپھا سید دین علی شاہ صاحب مرحوم اور راقم وہاں سے چھ میل دور منڈی حال حاجی آباد کفن خریدنے چلے گئے اور کورے اور اچھڑیاں میں اپنے رشتہ داروں کو وفات کی اطلاع دینے کی غرض بھی تھی، لیکن ان دنوں جنگل میں کٹائی کا کام شروع تھا اور سوء اتفاق سے ان میں کوئی بھی جنازہ میں شریک نہ ہو سکا، بجز ہماری سوتیلی والدہ کے بھانجے محترم جناب حاجی گوہر آمان

خان صاحب مرحوم (جن کی ۷ جولائی ۱۹۷۰ء کو وفات ہوئی تھی)۔ وہ ہمارے ساتھ ہو لیے اور شام کے قریب ہم نے والد مرحوم کو پادرے کے قبرستان میں دادا مرحوم کی قبر کے پہلو میں (اسی قبرستان میں ہماری حقیقی والدہ مرحومہ بھی مدفون ہیں) دفن کیا۔ تجہیز و تکفین اور دفن کے موقع پر ہمارے والد مرحوم کے چچا سید عالم خان مرحوم، ان کے فرزند محمد زمان خان مرحوم، ان کے فرزند صحبت خان صاحب و سعادت خان صاحب اور سید دین علی شاہ صاحب مرحوم اور برادرم فتح علی شاہ صاحب وغیرہ حضرات موجود تھے اور علی الخصوص ہمارے حقیقی چچا خان زمان خان صاحب مرحوم بھی حاضر تھے۔ مدت العمر انہوں نے شادی نہیں کی۔ افریقہ، عراق اور دیگر ممالک میں زندگی کا بیشتر حصہ گزارا۔ بڑے نمازی اور متشرع تھے۔ مزاج میں قدرے تندی تھی۔ ۱۹۳۳ء کے قریب کورے میں وفات ہوئی اور وہاں ہی قبرستان میں مدفون ہیں جہاں ہمارے بہت سے بزرگ اور عزیز (جن میں راقم کا فرزند عزیزم محمد یونس خان راشد بھی ہے) مدفون ہیں۔

والد مرحوم کی فوتیدگی کے بعد ہمارا شیرازہ کچھ ایسا بکھرا کہ اس کے بعد ہم سب بہن بھائی اور سوتیلی والدہ مرحومہ کبھی اکٹھے نہیں ہو سکے۔ کہیں دو اکٹھے ہو جاتے اور کہیں تین۔ ہماری والدہ مرحومہ اور چھوٹی ہمشیرہ بی بی خانم مرحومہ کو محترم جناب اخوی حاجی گوہر آمان خان صاحب مرحوم اچھڑیاں لے گئے۔ بڑی ہمشیرہ کو پھوپھی درمرجان صاحبہ مرحومہ لمبی لے گئیں جن کے فرزند سے والد مرحوم زندگی میں ان کی منگنی کر چکے تھے اور ہم دونوں بھائی کبھی لمبی اور کبھی اچھڑیاں اور کبھی کورے میں اور زیادہ تر مسجدوں میں وقت گزارتے۔ گھر کا اثاثہ، سامان اور جانور کچھ اس انداز سے تقسیم کیے گئے کہ آج تک وثوق سے نہیں کہا جا سکتا کہ ان سے فائدہ کس نے اٹھایا اور جو کچھ ہمارے حصہ میں آیا، وہ کہاں گیا۔ بہر حال یتیموں کی داستان خاصی دردناک اور طویل ہوا کرتی ہے جس سے ہمیں بھی دوچار ہونا پڑا۔ اس دور میں برادر محترم سید فتح علی شاہ صاحب کی شادی ہو چکی تھی اور وہ باوجود شوق کے تعلیم جاری نہ رکھ سکے اور اکثر گھر ہی رہنے لگے۔ ہم لوگ بھی گنڈا سے نکل کر تتر بتر ہو گئے اور وہ ساتھی جو ملک پور اور اس کے بعد گنڈا میں جمع تھے، پھر سب کبھی یکجا نہ ہو سکے۔

علاقہ کونش میں تعلیم

والد مرحوم کی وفات کے بعد گھر کے اجڑنے اور گنڈا سے نکل چکنے کے بعد تھوڑے عرصہ میں خاصی جگہیں بدلنا پڑیں۔ چنانچہ راقم کچھ عرصہ بٹل میں پڑھتا رہا۔ اس کے بعد ہروڑی پائیں میں حضرت مولانا نخی شاہ صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ کے پاس رہا۔ وہاں نور الایضاح اور صرف کی ابتدائی کچھ گردانیں یاد کیں۔ اس کے بعد کھکھو میں حضرت مولانا محمد عیسیٰ صاحب کے پاس رہا اور پھر سنگل کوٹ میں مولانا احمد نبی صاحب کے پاس رہا اور نحو میر کا کچھ حصہ پڑھا۔ پھر بائی پائیں میں کچھ عرصہ رہا، لیکن ان تمام جگہوں میں تعلیم کا خاطر خواہ انتظام نہ ہونے نیز اپنی ناتجربہ کاری کی وجہ سے وقت زیادہ صرف ہوا اور تعلیمی کام نہ ہونے کے برابر رہا اور اس پر مستزاد یہ کہ ہمارے لمبی والے برادران کرام اس سلسلہ میں خاصے استاد ثابت ہوئے کہ جب کام کاج اور گھاس کاٹنے کے دن ہوتے تو وہ ہمیں جہاں کہیں بھی ہم ہوتے، تلاش کر کے لمبی لے جاتے اور کئی کئی دن تک کام کرواتے۔ جب کام سے فراغت ہو جاتی، وہ پھر کسی نہ کسی مسجد میں ہمیں لے جا کر چھوڑ آتے۔ اور عزیزم صوفی عبد الحمید اس درمیان اچھڑیاں اور کورے میں رہتا۔ کبھی ٹنگ لائی سے بالن لے آتا، کبھی گھاس اور شوتل کاٹ لاتا اور کبھی کوئی اور خدمت جو اس کے سپرد ہوتی، وہ سرانجام دیتا اور کبھی کبھار لمبی چلا جاتا۔ (اچھڑیاں اور لمبی کے درمیان تقریباً اٹھارہ میل کی

مسافت ہے اور یہ پہاڑی علاقہ ہے)

اس اثنا میں ایک نیک دل بزرگ نے مشورہ دیا کہ تمہارا وطن میں کیا دھرا ہے؟ کہیں جا کر علم حاصل کرو۔ چنانچہ راقم نے عزیزم عبد الحمید کو ساتھ لیا اور دونوں ۱۹۳۳ھ کے لگ بھگ بھاگ کھڑے ہوئے۔ کہیں پیدل چلتے اور کہیں ریل گاڑی پر سوار ہوتے حتیٰ کہ ہم کوئٹہ بلوچستان جا پہنچے۔ وہاں کے متصل ایک بستی تھی۔ وہاں ایک پرانے طرز کا (مسجد میں) مدرسہ تھا۔ ہم وہاں داخل ہو گئے اور وہاں کوئٹہ ابتدائی کتابیں پڑھنا شروع کر دیں۔ اس وقت بہترین قسم کا انگور وہاں ایک آنے کا دو سیر ملتا تھا اور یہ کوئٹہ کے (غالباً ۱۹۳۴ء میں) غرق ہونے سے پہلے کا واقعہ ہے۔ لیکن کچھ دنوں کے بعد وہاں سے ہم بھاگ کھڑے ہوئے اور کلکتہ جا پہنچے۔ وہاں کچھ دن رہ کر پھرتے پھراتے پھر وطن پہنچ گئے۔ راقم لمبی پہنچ گیا اور عزیزم اچھڑیاں اور دونوں کام کاج میں مصروف ہو گئے۔ جو کام بھی ہم سے لیا جاتا، بامر مجبوری ہمیں کرنا پڑتا، لیکن کام صدق نیت سے کرتے اور راقم تو بفضلہ تعالیٰ کسی کام میں کسی کو آگے نہ بڑھنے دیتا اور اس کا وہاں خاص شہرہ تھا۔ اس کے بعد راقم پھر دوبارہ بھاگا اور اپنے ایک رفیق سفر کے ساتھ جو چھٹہ بٹہ کا رہنے والا تھا، سیدھا اجمیر شریف جا پہنچا۔ وہاں سے پھر چکر لگاتا ہوا واپس لمبی جا پہنچا اور وہاں شیڑ کے مقام پر گوجروں کا امام بنا دیا گیا۔

مسجد کے آس پاس کوئی گھر نہ تھا۔ کبھی کوئی نمازی آ جاتا اور کبھی نہ آتا۔ راقم اکیلا ہی اذان کہہ کر نماز پڑھ لیتا اور رات کو وہاں ہی مسجد میں سو جاتا۔ کبھی تو اکیلا سو جاتا اور کبھی خلیل کا کا مرحوم گوجر راقم کا ساتھی ہوتا۔ جو کھانا وہ لوگ دے دیتے، وہ کھا لیتا۔ دن کو بندوق لے کر شکار کرتا۔ چکور وہاں بکثرت ہوتے تھے۔ مکی کی فصل پر راقم کو چھ پیمانے مکی امامت کے معاوضہ میں ملی۔ کچھ پیمانے دے کر شوق جہاد میں تلوار خریدی۔ بندوق پہلے سے ہی موجود تھی۔ ان دنوں آزاد قبائل انگریز کے خلاف لڑتے تھے جن کی قیادت مشہور مجاہد حضرت مولانا اللہ داد خان صاحب دامت برکاتہم کرتے تھے۔ (موصوف راقم کی کتابیں پڑھ کر اور ان سے بے حد متاثر ہو کر گکھڑ برائے ملاقات تشریف لائے تھے اور چند دن قیام فرما کر واپس تشریف لے گئے) لمبی سے تقریباً دو میل کی مسافت پر آزاد علاقہ شروع ہوتا تھا۔ جہازوں کی بمباری کے علاوہ توپوں مشین گنوں حتیٰ کہ رات کے وقت رائفلوں کی آواز ہم بخوبی سنتے تھے۔ مولانا موصوف بمع اپنے چند ساتھیوں کے انگریز نے گرفتار کر لیے جو کافی عرصہ کے بعد بے حد مصائب اٹھا کر رہا ہوئے۔ وہ تلوار اور بندوق لمبی میں ہی تھی، اب معلوم نہیں وہ کس صاحب کے تصرف میں ہیں، والعلم عند اللہ تعالیٰ۔

طلبِ علم کے لیے شدِ رحال

اللہ تعالیٰ جزائے خیر عطا فرمائے جناب سید محمود شاہ باجی مرحوم ساکن لمبی کو۔ انہوں نے ایک مرتبہ راقم کو پاس بٹھا کر بڑے نرم لہجہ اور معقول گفتگو کے ساتھ یہ نصیحت کی اور فرمایا سرفراز! تو خاصا ذہین اور محنتی آدمی ہے اور ابھی تمہاری عمر بھی کوئی زیادہ نہیں، جا کر علم حاصل کرو، تو ان گوجروں کی گرِٹ (روٹی) پر کیوں گرا ہوا ہے؟ ان کے اس پیارے اور مشفقانہ انداز سے نصیحت کا دل پر گہرا اثر ہوا اور دفعۃً وہاں سے دل اچاٹ ہو گیا۔ لمبی سے روانہ ہوا اور برادرم محمد ایوب خان صاحب کو (جو ہمارے پھوپھی زاد بھائی ہیں، ہم سے تقریباً عمر میں بڑے ہیں۔ اس وقت مدرسہ نصرۃ العلوم گوجرانوالہ میں چوکیدار ہیں) ساتھ لیا اور اچھڑیاں سے عزیزم عبد الحمید کو ساتھ لیا اور ہری پور جا پہنچے۔ وہاں سے کھلابٹ ہوتے ہوئے دوڑ کی ندی کے

کنارہ پر پہاروں نام ایک چھوٹی سے بستی میں مقیم ہو گئے اور پکا پیالہ میں دن کو جا کر سبق پڑھ آتے اور رات کو اپنے مستقر پر آ جاتے۔ وہاں محترم جناب سکندر خان صاحب ایک معمر بزرگ تھے، وہ ہمارے کھانے اور لسی وغیرہ کا خاص اہتمام کرتے، لیکن کچھ عرصہ کے بعد عزیزم عبد الحمید پھر اچھڑیاں چلا گیا۔ (کیونکہ سوتیلی والدہ مرحومہ اور چھوٹی حقیقی ہمشیرہ مرحومہ وہاں ہی ہوتی تھیں اور یہ ان کے بغیر صبر نہ کر سکتا) اور راقم خانپور (جو کہ ہری پور سے جنوب مشرق کی طرف روہی کی ندی کے کنارے سرسبز علاقہ ہے اور راجوں کا خانپور کہلاتا ہے) چلا گیا۔ وہاں لوہاروں کی مسجد میں ٹِک گیا اور حضرت مولانا عبد العزیز صاحب سے جو اس مسجد کے امام تھے، صرف کی ابتدائی بے سلیقہ اور بے ترتیب کتابیں شروع کر دیں۔ موصوف نے بکریاں رکھ رکھی تھیں۔ راقم کی صحت بڑی اچھی تھی اور استادوں اور بزرگوں کا کام بڑی محنت اور نیک دلی سے کیا کرتا تھا۔ موصوف اس جوہر کو تاڑ گئے۔ راقم دو تین میل باہر پہاڑوں میں چلا جاتا اور وہاں سے بکریوں کے لیے لانگی (وہاں کی اصطلاح میں چارہ) لاتا۔ راقم کے پاس ایک قیمتی شاہڑی تھی۔ وہ استاد محترم نے چھت کے ساتھ پنکھا بنا کر لٹکا دی۔ بہانہ تو یہ کیا کہ اس کو کیڑا نہیں لگے گا، لیکن اصل مقصد یہ تھا کہ راقم بھاگ نہ جائے۔ آں محترم کے عزیزوں میں سے کسی کا باغ تھا۔ راقم کو وہاں چند دن کے لیے بھیج دیا گیا۔ راقم خرمانیاں اتارتا، ان سے ٹوکریاں بھرتا اور پھر ان کو سیتا اور وہ براستہ ٹیکسلا راولپنڈی پہنچتیں اور وہاں فروخت ہوتیں۔ اس کام میں بھی راقم نے خوب محنت اور مہارت کا ثبوت دیا۔ اب وہ تو راقم کے اور زیادہ گرویدہ ہو گئے اور اپنی ہی برادری میں سے ایک لڑکی کا رشتہ راقم سے جوڑنے کی سعی شروع کر دی اور جب راقم کو اس کا پتہ چلا تو بلطائف الحیل شاہڑی ان سے لی، کیونکہ اس کا وہاں چھوڑنا بھی ایک غریب طالب علم کے لیے مشکل تھا اور ان سے لینا تو مشکل تر تھا، لیکن حکمت عملی کام آ گئی اور شاہڑی لے کر راتوں رات وہاں سے بھاگ نکلا۔ وہاں چند ماہ رہا، لیکن سبق صرف برائے نام تھا۔ اصل کام ان کا کام تھا۔

راقم پھر لمبی جا پہنچا۔ وہاں چند دن رہ کر پھر اچھڑیاں اور کورے گیا اور وہاں سے عزیزم عبد الحمید کو خاصی ترغیب و ترہیب کے ساتھ آمادہ کیا اور دلاسا کیا اور اس کو ساتھ لے کر لاہور چلا گیا۔ وہاں مصری شاہ میں ایک ڈاڑھی منڈھے مولوی صاحب رہتے تھے جن کا نام غالباً عبد الواحد تھا اور عرب استاد [کے نام] سے مشہور تھے۔ صرف اور نحو میں ان کو بڑی مہارت تھی۔ عربی روانی سے بولتے تھے اور پشتو بھی بڑی فصیح اور سلیس بولتے تھے۔ اپنا خیال یہ ہے کہ وہ قبائلی تھے۔ لباس خالص عربی پہنتے تھے، عربی لباس اور عربی زبان بولنے کی وجہ سے شاید عرب استاد کہلاتے تھے۔ تعویذات ان کے بہت چلتے تھے اور انہی کی آمدنی پر وہ وقت بسر کرتے تھے۔ انہوں نے بکری بھی رکھ رکھی تھی اور ہم اس کی خدمت بھی کرتے تھے۔ عرب استاد یک چشم تھے۔ سب کو ایک ہی آنکھ سے دیکھتے تھے اور اسی وجہ سے اکثر سیاہ رنگ کی عینک استعمال کرتے تھے۔ ان کی شہرت کی وجہ سے ان کے پاس حفیظ باندی تحصیل مانسہرہ ضلع ہزارہ کے ایک نوعمر مولوی صاحب جن کا نام فضل الٰہی تھا، برائے تحصیل علم حاضر ہوئے اور عرب استاد سے غالباً اس وقت وہ نحو کی دقیق اور مشکل کتاب عبد الغفور اور مغنی اللبیب پڑھتے تھے اور ہمارے اسباق بالکل ابتدائی تھے۔ جب انہوں نے یہ محسوس کیا کہ یہ پڑھنے کا بے حد شوق رکھتے ہیں لیکن ناتجربہ کاری کی وجہ سے کسی مدرسہ تک نہیں پہنچ سکتے تو انہوں نے ہمیں مرہانہ تحصیل ڈسکہ ضلع سیالکوٹ حضرت مولانا غلام محمد صاحب مرحوم کے پاس بھیج دیا۔ اس وقت ہم تین ساتھی تھے۔ راقم، عزیزم عبد الحمید اور مولوی عبد الحق صاحب ساکن کھکھو، مگر افسوس کہ ہماری کتابیں

بالکل ابتدائی تھیں اور ان کے پاس طلبہ زیادہ تھے، نیز داخلہ کے ایام بھی نہ تھے۔ اس لیے انہوں نے داخلہ سے تو معذوری ظاہر کردی لیکن بایں ہمہ انہوں نے ہماری صحیح رہنمائی کردی کہ تم وڈالہ سندھواں (یہ مرہانہ سے چندمیل کی مسافت پر ضلع سیالکوٹ میں خاصا مشہور قصبہ ہے) چلے جاؤ۔ چنانچہ ہم وہاں چلے گئے۔ وہاں بڑی مرکزی دومنزلہ وسیع مسجد کے ساتھ طلبہ کی رہائش کے لیے کمرے بنے ہوئے تھے اور کئی طلبہ وہاں رہتے تھے۔ وہاں حضرت مولانا محمد اسحاق صاحب رحمانی رحمہ اللہ تعالیٰ (۱۳۸۸ھ/ ۱۹۶۸ء میں حضرت کا، جبکہ آپ سرگودھا کی جامع مسجد اہل حدیث کے خطیب تھے، حرکت قلب بند ہونے سے انتقال ہوگیا) مدرس اور خطیب تھے۔ حضرت کا آبائی علاقہ چونیاں ضلع لاہور تھا اور دورہ حدیث شریف انہوں نے حضرت مولانا مفتی محمد کفایت اللہ صاحب رحمہ اللہ سے دہلی میں پڑھا تھا۔ غضب کے ذہین، بہترین مدرس اور چوٹی کے مقرر تھے۔ مسلکاً اہل حدیث تھے، مگر خاصے معتدل۔ فروعی مسائل میں نزاع اور اختلاف کو پسند نہ کرتے تھے۔ جب ہم ان کی خدمت میں حاضر ہوئے تو انہوں نے راقم سے داخلہ کا امتحان لیا اور نحو میر میں معرفہ اور نکرہ کی تعریف دریافت فرمائی جو راقم نے فی الفور صحیح تعریف مع مثال عرض کردی۔ اور بھی بعض سوالات کیے اور خوش ہو کر ہمیں مدرسہ میں داخل کرلیا۔ ہماری صحیح اور باقاعدہ تعلیم کا آغاز وڈالہ ہی سے ہوا۔ ہم وہاں تقریباً دو سال رہے۔ روٹیاں گھروں سے مانگ لاتے اور خوب سیر شکم ہو کر کھاتے اور محنت سے پڑھتے۔ سبعہ معلقہ، شرح جامی اور قطبی تک کتابیں راقم نے وہاں ہی پڑھیں۔ عزیز عبدالحمید کی کتابیں ابتدائی تھیں۔ ہمارے استاد محترم اس وقت مجلس احرار اسلام کے سرگرم رکن اور نڈر سپاہی اور بے باک مقرر تھے۔ ہم لوگ باقاعدہ وردی پہنتے اور تلواریں گلے میں لٹکا کر پریڈ کرتے۔ ڈسکہ، گوبند کے اور لاہوڑ کی تاریخی کانفرنسوں میں ہم نے رضا کارانہ وردیاں پہن کر شرکت کی۔ ان دنوں مسجد شہید گنج کا مسئلہ خوب زوروں پر تھا۔ کچھ عرصہ کے بعد مولوی عبدالحق صاحب وہاں سے فرار ہوگئے اور اس کے کچھ عرصہ بعد ہی عزیزم عبدالحمید اپنے ایک رفیق درس مولانا سید امیر حسن شاہ صاحب ساکن تھب تحصیل باغ ضلع پونچھ کے ساتھ وڈالہ سندھواں سے بھاگ گیا اور راقم اکیلا رہ گیا۔

پھر کچھ دنوں کے بعد راقم اس کی تلاش میں نکلا۔ غربت کا زمانہ تھا۔ رقم پاس نہ تھی۔ پیدل ہی وہاں سے گوجرانوالہ پھر قلعہ دیدار سنگھ پھر حافظ آباد اور پھر وہاں سے ونیکے تارڑ جا پہنچا۔ ان تمام جگہوں میں اس وقت دینی کتابوں کے درس ہوتے تھے اور بیرونی طلبہ پڑھتے تھے، مگر عزیزم کا ان جگہوں پر کوئی اتا پتا نہ چلا۔ بالآخر راقم کشتی کے ذریعہ دریائے چناب کو عبور کر کے قادر آباد پہنچا اور وہاں سے پھر انھی کے مشہور درس میں جا پہنچا جہاں پہلے ماہر معقول ومنقول حضرت مولانا غلام رسول صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ پڑھاتے تھے، اس کے بعد ہمارے استاد محترم ماہر علوم عقلیہ ونقلیہ یادگار سلف حضرت مولانا ولی اللہ صاحب دامت برکاتہم تعلیمی خدمات انجام دیتے تھے اور بحمد اللہ تعالیٰ تاہنوز پڑھا رہے ہیں۔ مختلف علاقوں سے ذہین اور پڑھنے والے طلبہ کا وہاں ہجوم رہتا تھا۔ راقم انھی سے چندمیل دور ککہ میں مقیم ہوگیا۔ وہاں مقام ہٹیاں کشمیر کے مولانا عبدالمجید صاحب بھی رہتے تھے۔ ہم دونوں صبح سویرے وہاں سے چل کر انھی آجاتے اور سبق پڑھ کر ظہر تک واپس چلے جاتے۔ میبذی وغیرہ کتابیں راقم نے وہاں ہی پڑھی ہیں۔ انھی میں طریقۂ تعلیم یہ تھا کہ طالب علم ہر فن کی کتاب کا خود مطالعہ کر کے اور خوب سمجھ کر کتاب کا مطلب استاد کے سامنے بیان کرتا اور غلطی پر استاد اس کی اصلاح کر دیتے۔ اس طریقہ سے بمشکل ایک دو سبق ہی حل کرسکتا۔ نہایت ہی ذہین آدمی تین اسباق پڑھ سکتا تھا۔ اس طرز سے طلبہ میں مطالعہ اور کتابوں کے

سمجھنے اور حل کرنے کا جذبہ بخوبی اجاگر ہوتا تھا۔ کچھ عرصہ وہاں رہنے کے بعد راقم وہاں سے پکھی، منڈی بہاؤالدین، ملکوال، پنڈ دادن خان، بھیرہ، خوشاب سے ہوتا ہوا شاہ پور اور پھر وہاں سے سرگودھا اور وہاں سے تقریباً بیس میل دور جہان آباد پیدل پہنچا۔ وہاں سے اتنا معلوم ہوا کہ عزیزم عبدالحمید بمع اپنے رفیق کے آئے تھے اور کچھ دن یہاں رہے ہیں اور پھر چلے گئے ہیں۔ وہاں رات رہ کر راقم خوشاب، واں بھچراں، کندیاں، کلورکوٹ سے ہوتا ہوا ضلع لائل پور (فیصل آباد) کے ایک قصبہ بازار والہ پہنچا۔ وہاں بریلوی مکتب فکر کا ایک درس تھا اور بیرونی طلبہ رہتے تھے۔ وہاں سے معلوم ہوا کہ دونوں مفرور ملتان میں ہیں اور مولانا عبدالعلیم صاحب کے مدرسہ میں پڑھتے ہیں۔ چنانچہ راقم وہاں سے روانہ ہو کر ملتان پہنچا اور عزیزم عبدالحمید بمع اپنے رفیق کے وہاں موجود تھا۔ ملاقات ہوئی، گلہ شکوہ اور سفر کی تکلیفوں کا تذکرہ بھی ہوا اور ملاقات کر کے خوشی بھی ہوئی۔ وہاں ہم تینوں کچھ عرصہ رہے اور علم میراث کا ایک رسالہ جس کے مصنف خود مولانا موصوف تھے، پڑھا۔ مولانا بہت معمر تھے۔ ان کے فرزند مولانا عبدالحلیم اور ان کے فرزند مولانا عبدالکریم اور ان کے فرزند مولوی عبدالشکور سب زندہ تھے۔ لانگے خان کے باغ کے قریب ان کی مسجد تھی اور اس میں درسِ کتب جاری تھا۔ یہ حضرات نہ پکے دیوبندی اور نہ پختہ بریلوی، بین بین تھے۔ علم اور علماء سے بڑی عقیدت رکھتے تھے، لیکن وہاں کھانے کا کوئی معقول انتظام نہ تھا۔ وہاں فی کس توے کی ایک روٹی سالم اور ایک آدھی ملتی تھی اور اس کی دلیل وہ یہ بیان کرتے تھے کہ ہمارے اوپر کے کسی بزرگ کا یہی معمول تھا۔ ہمارا اس کھانے پر بخوبی گزارہ تو نہیں ہو سکتا تھا، مگر چونکہ رمضان شریف بالکل قریب تھا، اس لیے اختتام سال کے پیش نظر ہم وہاں ہی پڑے رہے۔

جب سال ختم ہوا تو ہم تینوں وہاں سے روانہ ہو کر ملتان کے قریب ہی پیراں غائب کے مقام پر (جو مین لائن کا اسٹیشن بھی ہے) پہنچے۔ وہاں کچی کچی جھونپڑیاں تھیں اور ایک امام مسجد میاں عبداللہ صاحب سے اتفاقی ہماری ملاقات ہوگئی۔ چونکہ ہمارے ایک ساتھی امیر حسن شاہ صاحب سید تھے اور وہ لوگ سادات کی بڑی عزت کرتے تھے، اس لیے انہوں نے ہماری بڑی عزت کی اور باصرار انہوں نے اپنے پاس رکھا اور رمضان شریف ہم نے سید صاحب کی برکت سے بڑا ہی مزے سے گزارا۔ جب رمضان شریف ختم ہوا تو ہم ۱۹۳۷ء میں جہانیاں منڈی ضلع ملتان پہنچے۔ وہاں حضرت مولانا غلام محمد صاحب لدھیانوی دامت برکاتہم بڑی جامع مسجد میں (جس کے ساتھ طلبہ کی رہائش کے لیے خاصے کمرے تھے) خطیب اور مدرس تھے۔ موصوف حضرت مولانا سید انور شاہ صاحبؒ کے شاگرد اور فضلائے دیوبند میں سے ہیں۔ ہم نے ان سے اسباق شروع کیے۔ کچھ دنوں کے بعد حضرت مولانا عبدالخالق صاحب مظفر گڑھی دامت برکاتہم (جو آج سے تقریباً باون سال پہلے دیوبند سے فارغ ہوئے) مدرس ہو کر تشریف لائے۔ راقم نے وہاں عبدالغفور، حمد اللہ، مسلم الثبوت اور مختصر المعانی وغیرہ کتابیں پڑھیں۔ عزیزم عبدالحمید کے اسباق چھوٹے تھے۔ اس کے بعد اختتام سال کے قریب ہی رفیق سفر کے اکسانے اور باہمی مشورہ سے بلاوجہ ہی روانہ ہوگئے۔ چونکہ ان کے بھائی مولوی سید گل حسن شاہ صاحب گوجرانوالہ میں تھے، انہوں نے ان کے پاس آنا تھا، ہم بھی ساتھ ہی چلے آئے اور رمضان سے قبل ہی مدرسہ انوار العلوم گوجرانوالہ میں نئے سال کے داخلہ کی منظوری لے لی۔ اس وقت حضرت مولانا عبدالعزیز صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ المتوفی ۱۳۵۹ھ جو فضلائے دیوبند میں سے تھے اور وسیع النظر اور علم حدیث اور طبقات رواۃ پر بڑی گہری نگاہ رکھنے والے تھے، وہاں مہتمم اور خطیب تھے۔ داخلہ کی

منظوری کے بعد ہم دونوں بھائیوں نے رمضان مبارک میں ضلع گوجرانوالہ تحصیل حافظ آباد اور ضلع شیخوپورہ کے بہت سے دیہات کا تبلیغی اور اکتسابی دورہ کیا۔ رمضان شریف بھی ختم ہوا اور ہماری سیاحت بھی ختم ہوئی۔ ماہ شوال میں ہم انوار العلوم میں داخل ہو گئے۔ وہاں حضرت مولانا عبد القدیر صاحب دامت برکاتہم کیمل پوری صدر مدرس تھے۔ (موصوف حضرت مولانا سید انور شاہ صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ کے مایۂ ناز شاگردوں میں سے ہیں۔ حضرت مدرسہ انوار العلوم کے بعد ڈابھیل بھی مدرس رہے۔ اس کے بعد ملک تقسیم ہو گیا اور کئی سال فقیر والی ضلع بہاول نگر میں شیخ الحدیث رہے۔ اب اس سال اپنے آبائی علاقہ غور غشتی میں شیخ الحدیث ہیں) تقریباً تین سال ہم انوار العلوم میں رہے اور یہ وہ دور تھا جس میں ہٹلر کی اتحادیوں سے جنگ عظیم چھڑی ہوئی تھی اور سرکار برطانیہ کی قوت کی چولیں ڈھیلی دکھائی دیتی تھیں۔ اس اثنا میں ہم نے بڑی محنت اور دل جمعی سے تعلیم جاری رکھی اور محترم استاد کی خصوصی نوازشوں سے بہت استفادہ کیا۔ موقوف علیہ تک کی تمام اہم کتابیں مثلاً ہدایہ اولین، ہدایہ اخیرین، توضیح وتلویح، بیضاوی، تصریح، اقلیدس، صدرا، قاضی مبارک، شمس بازغہ، شرح نخبۃ الفکر اور مشکوٰۃ شریف وغیرہ کتابیں حضرت سے پڑھیں اور مطول وسراجی وغیرہ حضرت مولانا عبد الواحد صاحب دامت برکاتہم سے پڑھیں اور باوجود غربت اور عسرت کے تعلیمی مشغلہ میں خوب انہماک رہا۔ اساتذہ کرام بھی ہم سے بڑے خوش تھے۔

ان چھ سات سالوں میں ہم نے وطن میں اپنے بزرگوں اور رشتہ داروں کو کوئی اطلاع نہ دی کہ ہم ہیں یا نہیں؟ اور ہیں تو کہاں ہیں؟ اور کرتے کیا ہیں؟ جن حضرات کو ہمارے ساتھ قدرتی اور طبعی طور پر محبت تھی، مثلاً والدہ ماجدہ اور ہمشیرگان وغیرہا تو وہ ہمارے بارے میں متفکر اور پریشان تھے اور کچھ ایسے بھی تھے جو غالباً ''وَ لے بخیر گزشت'' کا ورد کرتے ہوں گے۔ بہر حال دنیا میں بہت کچھ ہوتا ہے اور یہ زمانہ ہم پر جیسے بھی گزرا، آخر گزر گیا۔ راقم کی موقوف علیہ تک سب کتابیں ختم ہو گئی تھیں، لیکن عزیزم عبد الحمید کی باقی تھیں اور راقم اس کے لیے رکا رہا اور دورۂ حدیث شریف کے لیے دار العلوم دیوبند نہ جا سکا اور بحکم استاد محترم تقریباً ڈیڑھ سال پرائیویٹ طور پر ایک جگہ مولوی فاضل کا کورس پڑھاتا رہا۔ پچیس روپے ماہانہ تنخواہ ملتی تھی اور کھانا اور رہائش کا انتظام اس کے علاوہ تھا۔ اسی زمانہ میں ہماری برادری کے ایک بزرگ چچا گل خان صاحب ساکن اچھڑیاں راہوالی میں ریلوے کے محکمہ میں ملازم تھے، ان کی وجہ سے ہمارا علم ہمارے بزرگوں کو ہو گیا۔ چنانچہ ہمارے خالہ زاد بھائی حاجی گوہر آمان خان صاحب مرحوم ہماری ملاقات کے لیے گوجرانوالہ آئے۔ ملاقات ہوئی، خیر وعافیت کا علم ہوا۔ ہماری والدہ مرحومہ اور چھوٹی ہمشیرہ انہی کے ہاں رہتی تھیں۔ کچھ دنوں کے بعد راقم بھی وطن گیا اور خویش واقارب سے ملاقات ہوئی۔ چند دن وہاں رہا اور بعض مقامات پر تقریریں بھی کیں۔ لوگوں کا زاویہ نگاہ قدرے بدل چکا تھا اور اب وہ وقعت کی نگاہ سے دیکھنے لگے۔

دار العلوم دیوبند میں داخلہ

رشتہ داروں کی ملاقات کر کے راقم پھر واپس گوجرانوالہ پہنچا اور ۱۹۴۱ء میں ہم دونوں بھائی بمع چند دیگر ساتھیوں کے دار العلوم دیوبند روانہ ہوئے۔ داخلہ کا امتحان دیا اور بفضلہ تعالیٰ ہم کامیاب رہے اور حدیث شریف کے دورہ میں شریک ہو گئے۔ بخاری شریف اور ترمذی شریف حضرت مولانا سید حسین احمد صاحب مدنیؒ کے پاس اور مسلم شریف حضرت مولانا محمد ابراہیم صاحب بلیاویؒ کے پاس اور ابوداؤد شریف حضرت مولانا محمد اعزاز علی صاحبؒ کے پاس تھا۔ اسی طرح دیگر اسباق

دوسرے اساتذہ کرام پر تقسیم تھے۔ دن رات تعلیم ہوتی اور اس سال دورۂ حدیث شریف میں ہم ۳۳۲ ساتھی تھے۔ کل تعداد اس سال ۱۹۹۵ تھی۔ ابتدائی مہینے تو بڑے آرام اور سکون سے گزرے اور طلبہ کی تقریریں بھی بڑے جوش وخروش سے ہوتی تھیں اور راقم کے بارے بلاوجہ ایک دو تقریروں کے بعد یہ تاثر قائم کر لیا گیا کہ یہ اچھا مقرر ہے بلکہ ایک موقع پر مشہور شاعر جناب علامہ مولانا محمد انور صاحب صابری نے راقم کی تقریر سن کر یہ فرمایا کہ سرحدیوں میں یہ ابو الکلام کہاں سے پیدا ہو گیا ہے؟ درمیان سال میں حضرت شیخ العرب والعجم مولانا سید حسین احمد صاحب مدنیؒ نے مراد آباد میں ایک تقریر فرمائی۔ اس سلسلہ میں ان پر مقدمہ چلا اور حضرت گرفتار ہو گئے۔ طلبہ نے حضرت کی گرفتاری کے خلاف زبردست احتجاج کیا حتیٰ کہ پولیس اور فوج کو مداخلت کرنا پڑی اور طلبہ نے اس موقع پر فرط عقیدت کی بنا پر کئی بار جلوس نکالے اور آخری جلوسوں کی قیادت اس ناچیز کے نازک کندھوں پر ڈال دی گئی (جس کی وجہ یہ تھی کہ متحدہ ہندوستان کے گیارہ صوبے تھے اور طلبہ نے اپنی سہولت کے لیے ہر صوبے کا ایک ایک نمائندہ مقرر کر دیا تھا۔ ایک زبان ہونے کی وجہ سے صوبہ سرحد اور افغانستان کا نمائندہ راقم کو چنا گیا اور پھر ان تمام نمائندوں کا صدر راقم منتخب ہوا۔ ع

قرعہ فال بنامِ منِ مسکین زدند

اس وجہ سے ارباب دار العلوم دیوبند، مجلس شوریٰ کے اراکین اور حکومت کے نمائندوں کا سلسلہ ہی راقم سے وابستہ ہو گیا۔ کبھی صدر مہتمم حضرت مولانا شبیر احمد صاحب عثمانیؒ سے گفتگو ہوتی اور کبھی مہتمم حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب دامت برکاتہم سے اور کسی موقع پر حضرت مولانا ابو الوفاء صاحب شاہجہانپوری سے صلاح ومشورہ ہوتا اور کبھی حضرت مولانا مفتی محمد کفایت اللہ صاحب دہلویؒ سے اور کبھی پولیس اور حکومت کا کوئی افسر اور کارندہ آ جاتا اور کبھی سی آئی ڈی کا کوئی خیر خواہ مولویانہ شکل وصورت میں حالات معلوم کرنے کے لیے راقم کے ذہن کو کریدتا۔ ادھر طلبہ کی بے چینی اپنے عروج پر تھی۔ جلسوں پر جلسے اور نعروں پر نعرے لگتے۔ کافی دن اس اضطراب میں گزر گئے اور راتوں کی نیند بھی کافور ہو گئی اور آہ وزاری میں وقت گزرتا رہا کہ اے پروردگار، کوئی ایسی صورت پیدا نہ ہو جائے کہ ظالم برطانیہ کو دار العلوم دیوبند کے بند کرنے کا بہانہ مل جائے یا اس کی تعلیم پر ہی کوئی زد پڑے۔ بالآخر ایک دن حضرت مولانا مفتی محمد کفایت اللہ صاحبؒ نے راقم کو تنہائی ڈ، ، طلب فرمایا۔ دار العلوم کے طلبہ میں سے اس وقت کوئی اور موجود نہ تھا۔ راقم تھا اور بزرگوں میں صرف حضرت مولانا مفتی محمد کفایت اللہ صاحبؒ اور حضرت مولانا ابو الوفاء صاحب شاہ جہان پوری اور حضرت مولانا محمد یوسف صاحب گنگوہی موجود تھے۔ بند کمرے میں گفتگو ہوئی اور حضرت مفتی صاحبؒ نے اپنے وقار، تحمل اور سنجیدگی کو ملحوظ رکھ کر بڑے سلجھے ہوئے انداز میں راقم کو مخاطب فرمایا کہ عزیز، تم اس وقت تمام طلبہ کے نمائندہ ہو اور جو بات بھی طے ہونی ہے، وہ تمہارے ساتھ ہونی ہے۔ اگر تو ہوش وحواس کو قابو میں رکھو اور ٹھنڈے دل سے ہماری بات سنو تو ہم عرض کر دیں اور اگر نعرہ بازی اور جوش وخروش کا اظہار کرو تو ہمارا کچھ عرض کرنا بالکل بے سود ہے۔ راقم نے عرض کیا کہ حضرت آپ ارشاد فرمائیں، میں آپ کا ارشاد سن کر ان شاء اللہ العزیز تمام طلبہ تک پہنچا دوں گا۔ حضرت مفتی صاحبؒ نے فرمایا کہ اس وقت بمبئی میں کانگرس کا حکومت برطانیہ کے خلاف راست اقدام کرنے کا فیصلہ ہوا ہے اور حکومت کے عزائم بہر کیف اچھے نہیں ہیں۔ اگر یہاں دار العلوم میں اس قسم کی ہنگامہ آرائی ہوئی تو لامحالہ حکومت اس ہنگامہ کی کڑی کانگرس کے اس راست اقدام سے جوڑے گی اور پھر ہو سکتا ہے کہ

حضرت مولانا مدنیؒ کے مقدمہ کی نوعیت بدل جائے یا غیر معین عرصہ تک دار العلوم بند ہو جائے یا حکومت برطانیہ کوئی اور ایسا فتنہ کھڑا کر دے جس کو سنبھالنا اراکین دار العلوم کے بس میں نہ ہو، حالانکہ یہ بات بالکل واضح ہے کہ طلبہ کے اس ہنگامے کا کانگرس کے اس راست اقدام سے قطعاً کوئی تعلق نہیں ہے۔ ان کا جوش وخروش جتنا کچھ اور جیسا کچھ بھی ہے، وہ صرف حضرت مدنیؒ کی گرفتاری کے خلاف ایک منظم احتجاج ہے اور اپنے شیخ اور استاد محترم کے ساتھ عقیدت کا اظہار ہے۔ اس لیے مفادِ دار العلوم اسی میں ہے کہ ہنگامہ ختم کیا جائے اور طلبہ جلسوں اور جلوسوں اور نعرہ بازی سے گریز کریں اور فوراً اپنی اپنی کلاسوں میں چلے جائیں اور ذوق وشوق سے تعلیم جاری رکھیں۔

حضرت مفتی صاحبؒ کی بات چونکہ نہایت معقول اور رائے بڑی وزنی تھی، راقم ان کا ہم نوا ہو گیا لیکن دو ہزار افراد کے قلبی جذبات کو یک لخت ٹھنڈا کر دینا کس کے بس میں تھا؟ اور ان میں ہر ملک کے حضرات شامل تھے۔ ہر ایک کا مزاج اور طبیعت الگ الگ تھی۔ سوچ اور سمجھ کا مادہ جدا جدا تھا اور ان میں فتنے اور فساد کو فرو کرنے والے بھی تھے اور ان میں ابھارنے والے بھی تھے۔ ان میں بیشتر حضرات خیر خواہ تھے، لیکن بدقسمتی سے حکومت کے ایما سے بدخواہ بھی ان ہنگاموں میں شامل ہو گئے تھے اور ان میں پیش پیش تھے اور انتہائی غلط قسم کی حرکات پر اکساتے تھے، لیکن بفضلہٖ تعالیٰ باوجود نوعمری کے راقم ان کے چکمہ میں نہ آیا اور جلوس کو پر امن رکھنے کی سعی میں منہمک رہا، جبکہ ایک نازک موقع پر شرارت پسند لوگوں کی وجہ سے قریب تھا کہ تشدد کا بہانہ بنا کر فوج گولی چلا دیتی۔ الغرض راقم نے پیش آنے والے بعض خطرات کا تذکرہ حضرت مفتی صاحبؒ سے کر دیا اور طلبہ کے جوش وخروش اور جذبات کو دفعۃً ٹھنڈا کرنے کی اہمیت ان کے پیش نظر بھی تھی۔ ہم نے اپنے تمام نمائندوں کو بلا کر سب کے سامنے حقیقت حال بیان کر دی۔ باقی حضرات تو ہمارے ہم خیال ہو گئے، لیکن صوبہ بہار کا نمائندہ اس پر آمادہ نہ ہوا اور انہوں نے خاصی تیزی کا اظہار کیا اور بلاوجہ ہم پر ساز باز کا الزام لگایا۔ ادھر ارباب شوریٰ کا ہنگامی اور مختصر اجلاس ہوا اور اس کے بعد فوراً دار الحدیث میں جلسہ عام ہوا جس میں اکابر نے دار العلوم کے مفاد کے بارے اپنے نیک اور بھرپور جذبات کا اظہار فرمایا۔ اس عمومی جلسہ کا اثر یہ ہوا کہ اکثر حضرات مطمئن ہو گئے، مگر کچھ ہنگامہ خیز طبیعتیں مطمئن نہ ہو سکیں اور انہوں نے ہنگامہ جاری رکھنے پر خاصا زور صرف کیا۔ ہو سکتا ہے کہ بعض مغلوب الحال لوگ فرط عقیدت کی وجہ سے ایسا کرتے ہوں اور غالباً کچھ لوگ حکومت کی شہ پر ایسا کرتے ہوں تاکہ تشدد کا بہانہ بنا کر حکومت کو دست اندازی کا موقع مل سکے۔ بہر حال تعلیم جاری ہو گئی اور بخاری شریف اور ترمذی شریف کا بقیہ حصہ حضرت مولانا محمد اعزاز علی صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ نے پورا کیا۔ جب سالانہ امتحان قریب آیا تو پھر ہنگامہ خیز طبیعتوں نے دفعۃً ہنگامہ برپا کر دیا اور مطالبہ یہ رکھا کہ امتحان کے بغیر ہی ہمیں پاس تصور کیا جائے اور مفت میں سندیں مل جائیں۔ اور ہنگامہ میں غبی، بے محنت اور نالائق پیش پیش تھے مگر چونکہ یہ مطالبہ سراسر غیر معقول تھا اس لیے اراکین مدرسہ اس پر آمادہ نہ ہوئے اور معمول سے چند دن پہلے ہی دار العلوم بند کر دیا گیا اور اہتمام کی طرف سے صاف اعلان کر دیا گیا کہ امتحان کسی مناسب موقع پر ان شاء اللہ تعالیٰ ہو جائے گا، اس وقت آپ حضرات چلے جائیں۔

وطن واپسی

ہم دونوں بھائی دار العلوم سے روانہ ہو کر سیدھے اچھڑیاں پہنچے جہاں ہماری سوتیلی والدہؒ اور حقیقی چھوٹی ہمشیرہ بی بی خانم

مرحومہ تھیں۔ سب سے پہلے ہم نے اس کی شادی کا انتظام کیا اور برادرم دولت خان صاحب ساکن اچھڑیاں سے اس کی شادی کر دی۔ مہر اور بعض دیگر غیر شرعی رسموں کے بارے بعض رشتہ داروں نے کچھ بے جا پابندیاں عائد کرنے کی کوشش کی مگر ہم دونوں بھائیوں نے سختی سے مزاحمت کی اور صرف دو سو روپیہ مہر مقرر ہوا۔ اس ضروری کام سے فارغ ہونے کے بعد ہم دونوں بھائی لمبی چلے گئے۔ عزیزم عبد الحمید تو وہیں رہا اور راقم وہاں سے روانہ ہو کر اچھڑیاں پہنچا اور وہاں سے رخصت ہو کر چٹہ بٹہ، متھال، ایبٹ آباد، دمتوڑ، حویلیاں پہنچا۔ ان مقامات پر اپنے دوستوں سے ملاقاتیں ہوتی رہیں۔ یہ سارا سفر رمضان مبارک میں اور لطف یہ کہ پیدل طے ہوا۔ حویلیاں سے بذریعہ ریل گاڑی راقم مدرسہ انوار العلوم جامع مسجد شیرانوالہ باغ گوجرانوالہ پہنچا۔ رمضان شریف کے بعد عزیزم عبد الحمید بھی گوجرانوالہ پہنچ گیا۔ راقم کو اسی مدرسہ میں صرف پندرہ روپے ماہانہ پر اساتذہ کرام کے حکم سے مدرس مقرر کر دیا گیا اور عزیزم عبد الحمید گوجرانوالہ کے قریب مقام کھیالی میں جامع مسجد میں خطیب مقرر ہو گیا۔ چونکہ راقم پہلے ہی مولوی فاضل کا مکمل کورس پڑھا چکا تھا، اساتذہ کرام کو بھی اعتماد تھا اور طلبہ بھی مطمئن تھے اس لیے راقم کے پاس درجہ وسطیٰ کے اسباق شروع ہو گئے اور بحمد اللہ تعالیٰ کام تسلی بخش طور پر جاری رہا۔ اسی اثنا میں دار العلوم دیوبند سے امتحان کے لیے طلب کیا گیا اور ہم دونوں بھائی گوجرانوالہ سے روانہ ہو کر دیوبند پہنچے اور امتحان دیا اور پھر واپس آ گئے۔ امتحان کے نتیجہ پر معلوم ہوا کہ بحمد اللہ تعالیٰ ہم دونوں کامیاب ہیں اور کچھ عرصہ کے بعد بذریعہ ڈاک ہماری سندیں بھی ہمیں موصول ہو گئیں۔ سوء اتفاق سے عزیزم عبد الحمید کھیالی میں بیمار ہو گیا اور کافی دن بیمار رہا۔ راقم پیدل ہی چل کر اس کی خبر گیری کرتا اور اختتام سال کے قریب راقم میعادی بخار میں مبتلا ہو گیا اور بوجہ ناداری کے خاطر خواہ علاج کی سہولت میسر نہ ہو سکی۔ اللہ تعالیٰ نے اپنا خصوصی فضل وکرم کیا اور تقریباً ایک ماہ کے بعد راقم تندرست ہوا، مگر کمزوری بے پناہ تھی۔ آخری ایک دو ماہ کی تنخواہ مدرسہ کی طرف سے بیس روپے ماہانہ کر دی گئی لیکن اس سے کوئی خاص فرق نہ پڑا اور امتحان کے بعد سالانہ تعطیل ہو گئی اور اساتذہ کرام اور طلبہ اپنے اپنے وطن روانہ ہو گئے۔

گکھڑ میں آمد

راقم ابھی دیوبند نہیں گیا تھا اور موقوف علیہ تک کی سب کتابیں ختم ہو چکی تھیں مگر عزیزم عبد الحمید کی کتابیں باقی تھیں۔ اس کے لیے میں بھی رکا رہا۔ اس اثنا میں دار العلوم دیوبند کے سفیر مولانا عبد الرحمٰن صاحب بہاری گوجرانوالہ تشریف لائے اور راقم سے کہنے لگے کہ میں پنجابی زبان نہیں جانتا، تم میرے ساتھ گکھڑ چلو۔ راقم ان کے ساتھ گکھڑ آیا۔ سفیر صاحب کا اصل مقصد تو دار العلوم کے لیے چندہ فراہم کرنا تھا، لیکن اہل گکھڑ نے تقریر کی فرمائش کر دی چنانچہ بٹ دری فیکٹری کے سامنے کھلے میدان میں عشا کے بعد موصوف نے بھی چند منٹ اردو میں تقریر کی اور اس کے بعد راقم نے تقریباً ایک گھنٹہ پنجابی میں تقریر کی۔ بحمد اللہ تعالیٰ تقریر خاصی موثر رہی اور دار العلوم دیوبند سے فراغت کے بعد عالم اسباب میں یہی تقریر میرے گکھڑ آنے کا سبب قرار پائی۔ مجھ سے پہلے حضرت مولانا علم الدین صاحب جالندھری فاضل دیوبند یہاں خطیب تھے۔ موصوف کی طبیعت بہت نرم ہے، اس لیے گکھڑ جیسے بدعت گڑھ میں شرک وبدعت کے طوفان کا مقابلہ پوری طرح ان سے نہ ہو سکا۔ ہاں ان سے پہلے حضرت مولانا محمود الحسن صاحب جالندھری نے خاصا کام کیا۔ راقم مدرسہ انوار العلوم میں مدرس تھا کہ درمیان سال میں اراکین انجمن اسلامیہ گکھڑ میں سے بعض حضرات کئی دفعہ راقم کو گکھڑ لانے کے لیے تشریف لے گئے، مگر

راقم مجبور تھا۔ جب مدرسہ انوار العلوم کا سالانہ امتحان ہو چکا اور تعلیمی سال پورا ہو گیا تو محترم جناب چودھری حاجی فخر الدین صاحب مرحوم اور محترم جناب ماسٹر کرم الدین صاحب مرحوم وغیرہ حضرات گئے اور راقم کو پینتالیس روپے ماہانہ کے مشاہرہ پر گکھڑ لے آئے اور راقم ۹ جولائی ۱۹۴۳ء کو گکھڑ پہنچا اور درس شروع کر دیا اور جمعہ پڑھانے کی ذمہ داری قبول کی، لیکن ابتدائی دور شدید مخالفت کی وجہ سے بہت صبر آزما گزرا مگر اللہ تعالیٰ کے فضل وکرم سے پائے استقامت میں لغزش نہیں آئی اور آہستہ آہستہ لوگ توحید وسنت سے شناسا ہونے لگے اور شرک وبدعت کی نفرت ان کے دل میں بیٹھنے لگی۔

راقم نے اراکین انجمن سے یہ شرط طے کی تھی کہ طلبہ ضرور ہوں گے، ورنہ میری تعلیم بھی ختم ہو جائے گی اور ٹھوس طریقہ سے نتیجہ خیز دینی خدمت بھی نہیں ہو سکے گی۔ میری دلجوئی کے لیے انہوں نے پانچ طلبہ منظور کیے۔ پہلے سال تو اتنے ہی طلبہ رہے، مگر پھر بحمد اللہ تعالیٰ طلبہ کی تعداد بڑھتی گئی حتیٰ کہ پھر بیس سے بھی زائد طلبہ یہاں رہنے لگے اور یہ سلسلہ تقریباً تیرہ چودہ سال رہا۔ اس کے بعد راقم کا بحیثیت مدرس مدرسہ نصرۃ العلوم گوجرانوالہ شوال ۱۳۷۴ھ کو تقرر ہوا۔ ابتداءً موقوف علیہ تک مختلف علوم وفنون کی کتابیں راقم پڑھاتا رہا۔ اب کئی سال سے دورہ حدیث شریف کی دو کتابیں بخاری شریف اور ترمذی شریف اور ترجمہ قرآن کریم تو ہر سال لازم ہوتا ہے۔ ان کے علاوہ بھی ایک دو سبق راقم کے سپرد ہوتے ہیں اور تقریباً پندرہ سولہ سال سے مدرسہ نصرۃ العلوم کا یہ سلسلہ جاری ہے۔ انجمن اسلامیہ گکھڑ کی طرف سے راقم کے ذمہ صرف جمعہ اور درس کی ڈیوٹی ہے، لیکن بحمد اللہ تعالیٰ چھبیس سال سے راقم باقاعدہ نماز بھی حسبۃً للہ تعالیٰ پڑھا رہا ہے۔ اس کے علاوہ گورنمنٹ ٹریننگ انسٹی ٹیوٹ گکھڑ میں ۱۹۴۳ء سے قرآن پاک کا درس دیتا ہے اور یہ سب کام بحمد اللہ تعالیٰ تادم تحریر جاری ہیں۔ اللہ تعالیٰ مزید توفیق بخشے، آمین ثم آمین۔

پہلی شادی

۲۴ رمئی ۱۹۴۵ء کو راقم کی پہلی شادی سکینہ بی بی بنت مولوی محمد اکبر صاحب مرحوم قوم راجپوت خطیب جامع مسجد اسلام بستی گوجرانوالہ سے ہوئی جس سے سات بچے پیدا ہوئے۔ پانچ لڑکے اور دو لڑکیاں۔ دو لڑکے فوت ہو گئے ہیں، عبد الرشید اور عبد الکریم۔ باقی پانچ زندہ ہیں۔ بڑا لڑکا محمد عبد المتین خان زاہد (جو زاہد الراشدی اپنا تخلص رکھتا ہے) حافظ قرآن اور مدرسہ نصرۃ العلوم کا فارغ ہے۔ اس وقت مدرسہ انوار العلوم گوجرانوالہ میں مدرس اور جامع مسجد کا نائب خطیب اور شادی شدہ ہے۔ بڑی لڑکی سلمیٰ اختر کی اچھڑیاں ضلع ہزارہ میں شادی ہوئی ہے۔ اور ان سے چھوٹا عبد القدوس خان قارن حافظ قرآن اور مستند اور اس وقت مدرسہ نصرۃ العلوم میں درجہ وسطیٰ میں پڑھ رہا ہے۔ اس سے چھوٹی لڑکی حافظہ سعیدہ اختر جو مستند قاریہ ہے اور اس وقت مشکوٰۃ شریف وغیرہ کتابیں اپنے چچا عزیزم عبد الحمید سے پڑھ رہی ہے اور مدرسہ نصرۃ العلوم میں شعبہ نسواں میں پڑھاتی بھی ہے۔ اس سے چھوٹا لڑکا عبد الحق خان بشیر چھٹی جماعت پاس ہے اور اس وقت قرآن کریم یاد کر رہا ہے۔ اللہ تعالیٰ سب کو دین پر قائم رکھے، آمین۔

دوسری شادی

بعض اشد مجبوریوں کی وجہ سے راقم نے ۳ ر رجب ۱۳۷۱ھ / ۳۰ مارچ ۱۹۵۲ء میں دوسری شادی اپنے والد محترم مرحوم

کے چچازاد بھائی محمد فیروز خان صاحب مرحوم ساکن کورے کی لڑکی زبیدہ بی بی (سابق نام مہر انگیز) سے کی جس سے سات بچے پیدا ہوئے۔ ایک لڑکی اور چھ لڑکے۔ ایک لڑکا محمد یونس خان راشد فوت ہو گیا ہے، باقی زندہ ہیں۔ بڑا لڑکا محمد اشرف خان ماجد قرآن کریم حفظ کر چکا ہے اور اب وہ اس کو دہرا رہا ہے۔ اس سے چھوٹی لڑکی طاہرہ آسیہ خاتون بھی قرآن کریم یاد کر چکی ہے۔ اس سے چھوٹے شرف الدین خان حامد اور رشید الحق خان عابد قرآن کریم یاد کر رہے ہیں اور سکول میں پانچویں جماعت میں داخل ہیں۔ دو ان سے چھوٹے ہیں، عزیز الرحمٰن شاہد اور عنایت الوہاب خان ساجد۔ دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کو علم دین سے مالا مال کرے اور اپنی رضا کی توفیق بخشے، آمین۔ اللہ تعالیٰ کے فضل وکرم سے راقم کی دونوں بیویاں زندہ ہیں اور ایک ساتھ رہتی ہیں۔ ایک ہی چولہے پر اکٹھا پکاتی کھاتی ہیں اور آج تک کوئی ایسی بدمزگی پیدا نہیں ہوئی جس کی وجہ سے علیحدگی کا سوال یا مطالبہ سامنے آیا ہو اور یہی حال بچوں کا ہے۔ بحمد اللہ تعالیٰ آپس میں شیر وشکر ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان سب کو اتفاق واتحاد سے رکھے اور اپنی مرضیات کی توفیق بخشے۔

تصنیف وتالیف

راقم کا اصل کام تو تعلیم وتدریس رہا ہے، لیکن فارغ اوقات میں محض اللہ تعالیٰ کی تائید اور توفیق سے متعدد اختلافی اور تحقیقی مسائل پر چھوٹی بڑی کئی کتابیں تالیف کی ہیں اور بحمد اللہ تعالیٰ کئی بار اکثر کتابیں طبع ہو چکی ہیں اور پاک وہند کے اکابر علمائے کرام نے ان کی تصدیق کی ہے اور بعض کتابوں پر ان کی زریں تصدیقات بھی طبع شدہ ہیں۔ فہرست کتب سے ان کے مضامین معلوم ہو سکتے ہیں اور یہ فہرست مطبوع مل سکتی ہے۔ اجمالی طور پر کتابوں کا نام یہاں درج کیا جا رہا ہے:

(۱) الکلام الحاوی فی تحقیق عبارۃ الطحاوی (۲) گلدستہ توحید (۳) دل کا سرور (۴) آنکھوں کی ٹھنڈک (۵) راہ سنت (۶) باب جنت (۷) ہدایۃ المرتاب (۸) ازالۃ الریب (۹) احسن الکلام (۱۰) طائفہ منصورہ (۱۱) مقام ابی حنیفہ (۱۲) صرف ایک اسلام (۱۳) چراغ کی روشنی (۱۴) علم غیب اور ملا علی قاری (۱۵) تسکین الصدور (۱۶) درود شریف پڑھنے کا شرعی طریقہ (۱۷) تبلیغ اسلام حصہ اول (۱۸) انکار حدیث کے نتائج (۱۹) عیسائیت کا پس منظر (۲۰) چالیس دعائیں (۲۱) آئینہ محمدی (۲۲) بانی دار العلوم دیوبند (۲۳) مسئلہ قربانی (۲۴) عمدۃ الاثاث (۲۵) تنقید متین بر تفسیر نعیم الدین (۲۶) شوق جہاد وغیرہ۔

اس کے علاوہ بعض کتابوں کے ترجمے اور بعض کے مقدمات بھی لکھے ہیں، مثلاً رسالہ تراویح مولانا غلام رسول صاحب مرحوم کا ترجمہ مع مقدمہ، اعفاء اللحیۃ کا ترجمہ مع مقدمہ، تحقیق الدعاء بعد الجنازہ کا مقدمہ، البیان الازہر ترجمہ فقہ اکبر (یہ ترجمہ عزیزم صوفی عبد الحمید نے کیا ہے) کا مقدمہ وغیرہ۔ اس کے علاوہ کچھ کتابیں ابھی طبع نہیں ہو سکیں۔ بعض کے مسودات لکھے جا چکے ہیں، لیکن کم فرصتی اور علالت کی وجہ سے ذمہ داری کے ساتھ نظر ثانی کا موقع میسر نہیں ہے اور بعض کے مضامین کو جمع کر لیے گئے ہیں مگر خاطر خواہ ترتیب ابھی تک نہیں دی جا سکی، مثلاً ختم نبوت، نزول مسیح علیہ السلام، سماع موتی، مسئلہ تراویح، رفع یدین و آمین بالجہر وغیرہ پر رسالہ، الکلام المفید، شوق حدیث، عبارات اکابر وغیرہ۔ ان میں بعض رسالے مرتب ہیں اور امید ہے کہ ان شاء اللہ العزیز جلدی ہی طبع ہو جائیں گے۔ دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ اس حقیر خدمت کو قبول فرما کر راقم کے گناہوں کا کفارہ بنائے اور ان کو اخروی نجات کا ذریعہ بنائے، آمین۔

عزیزم عبدالحمید

عزیزم کے دورہ حدیث شریف تک کا تعلیمی تذکرہ پہلے ہو چکا ہے۔ زائد بات جو قابل ذکر ہے، وہ یہ ہے کہ عزیزم نے دارالمبلغین لکھنؤ میں امام اہل السنّت حضرت مولانا عبدالشکور صاحبؒ کی سرپرستی میں باطل فرقوں کے ساتھ مناظرہ کے فن کی تکمیل کر کے سند حاصل کی۔ اس کے بعد راقم کی مرضی کے خلاف طبیہ کالج حیدرآباد دکن میں چار سال کا کورس مکمل کر کے طبیب مستند کی سند حاصل کی اور پھر گوجرانوالہ میں کچھ عرصہ حکمت کی دوکان بھی کرتا رہا، لیکن راقم جس چیز کو پسند کرتا تھا یعنی تعلیم وتدریس، اللہ تعالیٰ نے اس کی طرف اس کا رجحان ومیلان کر دیا اور مدرسہ نصرۃ العلوم کی بنیاد واجرا کے بعد وہ اس کا مہتمم مقرر ہوا اور جامع مسجد نور کا خطیب ہے اور بفضل اللہ تعالیٰ درس وجمعہ پر موثر تبلیغ کی برکت سے بہت لوگوں کی اصلاح ہوئی ہے اور مدرسہ کا کام بھی بحمد اللہ تعالیٰ بہت عمدہ پیرایہ سے ہو رہا ہے اور خصوصی وعمومی درس اور طلبہ کے اسباق کے علاوہ اس کی کوشش سے حضرت شاہ ولی اللہ صاحبؒ اور شاہ رفیع الدین صاحبؒ کی نادر کتابیں بڑی صحت کے ساتھ طبع ہوئی ہیں، مثلاً الطاف القدس، تکمیل الاذہان، مجموعہ رسائل، اسرار المحبۃ اور تفسیر آیۃ النور وغیرہ۔ اور فیوضات حسینیہ کا ترجمہ اور مقدمہ اس کے علاوہ ہے۔

بڑے اصرار کے ساتھ راقم نے گکھڑ میں عزیزہ غلام زہرہ بنت مہر کریم بخش صاحب کے ساتھ ۱۲رذوالحجہ ۱۳۸۲ھ /۷ر مئی ۱۹۶۳ء میں اس کی شادی کرائی جس سے چار بچے پیدا ہوئے ہیں۔ عزیزہ میمونہ (تقریباً آٹھ سال کی عمر ہے اور یہ بڑی ہے)، عزیزم محمد فیاض، محمد ریاض اور عزیزہ عاتکہ جو شیر خوار ہے۔ اللہ تعالیٰ ان کو صحت اور درازیٔ عمر کے ساتھ دین کا علم عطا فرمائے۔ آمین ثم آمین۔

۵۳ء کی تحریک ختم نبوت میں حصہ

جب ۱۹۵۳ء میں پاکستان میں تحریک ختم نبوت شروع ہوئی تو بحمد اللہ تعالیٰ ہم دونوں بھائیوں نے اس میں بھرپور حصہ لیا اور بالآخر گرفتار کر لیے گئے۔ راقم پہلے گرفتار ہوا اور چند دن گوجرانوالہ کی جیل میں رکھنے کے بعد اسی سلسلہ کے قیدیوں کو نیوسنٹرل جیل ملتان منتقل کر دیا گیا۔ تحریک ختم نبوت سے وابستہ حضرات چار اضلاع (گوجرانوالہ، سیالکوٹ، سرگودھا اور کیمل پور) کے وہاں جمع تھے اور جیل میں خوب تعلیم وتعلیم کا سلسلہ جاری رہا۔ تقریباً نو ماہ راقم جیل میں رہا اور سخت گرمی کے زمانہ میں جولائی کے مہینہ میں رمضان مبارک کے روزے ملتان جیل میں ہم نے رکھے اور ''صرف ایک اسلام'' کا مسودہ نیو سنٹرل جیل ملتان ہی میں تیار کیا گیا اور عزیزم عبدالحمید اور بعض دیگر دوست چونکہ دیر سے گرفتار کیے گئے تھے، اس لیے گوجرانوالہ کی جیل ہی میں رہے اور ہم سے کچھ عرصہ پہلے ہی رہا ہو گئے۔ اللہ تعالیٰ ہمارے اس عمل کو آخرت کی نجات کا ذریعہ بنائے اور سب مسلمانوں کو عقیدہ ختم نبوت پر قائم ودائم رکھے، آمین۔

حج کی سعادت

اللہ تعالیٰ نے محض اپنے فضل وکرم سے جہاں ہم پر اور بہت سی نوازشیں فرمائیں، وہاں یہ کرم بھی اس نے کیا کہ دونوں کو حج کی سعادت نصیب ہوئی۔ عزیزم عبدالحمید تو شادی سے پہلے ہی حج کر آیا تھا اور راقم کو ۱۳۸۸ھ میں حج کی توفیق نصیب

ہوئی۔ اللہ تعالیٰ اپنے خصوصی فضل وکرم سے اس حج کو حج مبرور کرے اور ہماری کوتاہیوں کے لیے اس کو ذریعہ کفارہ بنائے۔

بے شک ہمارے گناہ بھی بے حد ہیں، لیکن اس کی رحمت بے پایاں آخر بے حساب ہے۔ ؎

مرے گناہ زیادہ ہیں یا تری رحمت
کریم تو ہی بتادے حساب کر کے مجھے

نہایت ہی اختصار کے ساتھ اپنی فانی اور مستعار زندگی کے کچھ ضروری حالات لکھ دیے گئے۔ اللہ تعالیٰ بقیہ زندگی کو اپنی رضا اور حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی اتباع اور دین کی خدمت میں گزارنے کی توفیق اور اس پر استقامت مرحمت فرمائے، آمین۔

وصلی اللّٰہ تعالیٰ علیٰ خیر خلقه محمد وعلیٰ اٰله واصحابه وازواجه وجمیع امته امین یارب العالمین۔

احقر ابوالزاہد محمد سرفراز خطیب جامع گکھڑ
۵ر رجب ۱۳۹۱ھ /۲۷راگست ۱۹۷۱ء

— ۲ —

[حضرت شیخ الحدیث رحمہ اللہ کی خودنوشت کے تکملہ کے طور پر ذیل میں وہ متفرق واقعات درج کیے جا رہے ہیں جو حضرت نے دروس، خطبات، مضامین اور مکاتیب میں بیان فرمائے ہیں اور جو ان کی زندگی کے مختلف پہلوؤں پر مفید روشنی ڈالتے ہیں۔ (مدیر)]

زمانہ طالب علمی کے واقعات

○ الحمد للہ میں نے آج تک سینما نہیں دیکھا اور آئندہ بھی اللہ تعالیٰ حفاظت فرمائے، کیونکہ ہمارا یہ ذہن بنایا گیا تھا کہ تھیٹر نہیں دیکھنا، سینما نہیں دیکھنا۔ والد محترم کی ڈاڑھی سنت کے مطابق تھی، پکے نمازی اور بڑے مہمان نواز تھے، بالکل ان پڑھ۔ وہ ہمیں کہتے تھے بیٹے، تھیٹر نہیں دیکھنا، سینما نہیں دیکھنا۔ یہ ان کا دیا ہوا سبق مجھے آج تک یاد ہے، بھلایا نہیں ہے۔ (ذخیرۃ الجنان ۴/ ۲۹۴)

○ ہمارے علاقہ میں جہاں میری پیدائش ہوئی ہے، لوگ بڑے جاہل تھے۔ اب الحمد للہ بڑے سمجھدار ہو گئے ہیں، تعلیم آگئی ہے۔ جہالت کے زمانے میں لوگ بزرگوں کی قبروں پر چڑھاوے چڑھاتے، اور پہاڑی علاقہ ہے اور پہاڑوں پر چیڑھ، دیار اور بہار کے بلند درخت ہیں، ان درختوں پر جھنڈے لٹکاتے جو قبروں کے پاس ہوتے تھے۔ میں اس وقت نابالغ تھا اور میرا طالب علمی کا زمانہ تھا۔ حضرت مولانا غلام غوث ہزارویؒ کی تقریریں سنتا تھا اور ان سے بڑا متاثر تھا۔ وہ تقریروں میں ان جھنڈوں کی بڑی تردید کرتے تھے اور میں درختوں پر چڑھنے کا بڑا ماہر تھا۔ میں ان مشکل درختوں کی چوٹیوں پر چڑھ کر جھنڈے اتار کر طالب علموں کو دیتا تھا۔ کوئی ان کو سلوا لیتا تھا اور کوئی قرآن کریم پر غلاف چڑھا دیتا۔ ایک دفعہ میں درخت پر چڑھ کر جھنڈا اتار رہا تھا کہ لوگ آگئے۔ کہنے لگے کہ یہ قبر والا بابا تجھے تکلیف پہنچائے گا۔ چونکہ الحمد للہ ذہن پختہ تھا، میں نے

کہا کہ تم مجھے نہ چھیڑو، بابا جانے اور میں جانوں۔ تم نے مجھے کچھ نہیں کہنا۔ وہ انتظار میں تھے کہ یہ اب کرے گا اور بابا اس کی ٹانگ توڑ دے گا۔ میں جھنڈے اتار کر نیچے اتر آیا اور وہ دیکھتے رہ گئے کہ اسے کچھ نہیں ہوا۔ (ذخیرۃ الجنان، ۱۷۵/۶)

○ ۱۹۳۲ء یا ۱۹۳۳ء کا واقعہ ہے۔ جہانیاں منڈی میں ہم پڑھتے تھے۔ مسجد کے پاس کمرے تھے۔ ایک کمرے میں ایک پیر صاحب تھے۔ ڈاڑھی منڈوائی ہوئی تھی۔ چیلے ان کے خاصے تھے۔ گرمی کا زمانہ تھا۔ وہ مہتمم صاحب کے کمرے میں تھے۔ ظہر کی اذان ہوئی۔ میں گیا اور جا کر کہا کہ پیر صاحب! اذان ہو گئی ہے، نماز پڑھیں۔ پیر صاحب کہنے لگے کہ نماز دل کی ہوتی ہے۔ خیر میں واپس چلا گیا۔ جا کر وضو کیا اور نماز پڑھی۔ فارغ ہو کر جا رہا تھا کہ پیر صاحب نے مجھے بلایا۔ کہنے لگے کہ ادھر کوئی بیت الخلا ہے؟ میں نے کہا جی، دل میں کر لیں۔ انھوں نے میری شکایت میرے استاد سے کی اور کہا کہ آپ کا ایک شاگرد بڑا گستاخ ہے۔ استادوں نے مجھے بلایا اور کہا کہ تم نے پیر صاحب کی توہین کی ہے۔ میں نے کہا، حضرت! بات صرف اتنی ہے کہ اذان ہو چکی تھی۔ میں نے ان سے کہا کہ جا کر نماز پڑھو تو پیر صاحب نے کہا کہ ہم دل میں پڑھتے ہیں۔ میں نماز پڑھ کر اپنے کمرے کی طرف جانے لگا تو یہ کہنے لگے، ادھر آؤ۔ میں گیا تو کہنے لگے کہ ادھر کوئی بیت الخلا ہے؟ تو میں نے کہا کہ دل میں کر لو۔ اگر آپ نماز دل میں پڑھ سکتے ہو تو یہ کام بھی دل میں کرو، یہ کیوں ظاہر کرتے ہو؟ (خطبات امام اہل سنت ۱۷۶/۳)

○ استاد محترم مولانا غلام محمد لدھیانویؒ جہانیاں منڈی مسجد کے خطیب اور مدرس تھے۔ ہم ان کے پاس پڑھتے تھے۔ ۱۹۳۰ء کے قریب کا واقعہ ہے کہ ان کی برادری کا ایک آدمی پاگل ہو گیا جس کو انھوں نے لاہور پاگل خانے میں داخل کرا دیا۔ اس وقت ہندوستان میں صرف دو پاگل خانے تھے۔ ایک بریلی میں اور ایک اچھرہ لاہور میں۔ کچھ دنوں کے بعد اس کی خبر لینے کے لیے گئے اور کچھ تحفے تحائف بھی اس کے لیے لے گئے۔ وہ جب اپنے آدمی کے پاس پہنچے، ملے اور بیٹھے تو ایک اور آدمی بھی ان کے پاس آ کر بیٹھ گیا اور علمی گفتگو شروع کر دی۔ کبھی منطق کی، کبھی فلسفے کی، کبھی ریاضی کی، کبھی تفسیر کی، کبھی حدیث کی باتیں کرتا۔ مولانا بھی بڑے فاضل آدمی تھے اور ہر فن میں ماہر تھے۔ کچھ دیر کے بعد اس نے کہا کہ میں ٹھہر کے آتا ہوں۔ طبعی تقاضے کے لیے گیا یا پانی پینے کے لیے گیا۔ مولانا نے دریافت کیا کہ یہ کون آدمی ہے؟ کہنے لگے پاگل ہے۔ مولانا نے کہا یہ کس طرح پاگل ہے، اس نے میرے ساتھ کافی دیر علمی گفتگو کی ہے۔ اس میں تو کوئی پاگل والی بات نہیں ہے۔ حیران ہو گئے کہ یہ کیسا پاگل ہے۔ تھوڑی دیر کے بعد وہ پھر آ گیا اور مختلف مسائل پر گفتگو شروع کر دی۔ وہ جوں جوں باتیں کرتا، مولانا توں توں حیران ہوتے کہ اس کو پاگل کہنے والے تو خود پاگل ہیں۔ مولانا نے ٹائم دیکھا تو فرمایا کہ میں جاتا ہوں۔ اگر تاخیر کی تو گاڑی سے رہ جاؤں گا، کیونکہ اس زمانے میں آمد و رفت کے وسائل بہت کم ہوتے تھے۔ ریل گاڑیاں ہوتی تھیں، جو رہ گیا رہ گیا۔ پھر اگلی گاڑی کا انتظار کرنا ہوتا تھا۔ اس لیے مولانا نے کہا کہ میں اب جاتا ہوں۔ اس نے کہا اچھا، تم جا رہے ہو۔ مولانا نے کہا کہ ہاں میں جا رہا ہوں۔ مصافحہ کے لیے ہاتھ بڑھایا تو اس نے ہاتھ پر تھوک دیا۔ مولانا نے فرمایا کہ واقعی پاگل ہے۔ (ذخیرۃ الجنان ۲۸۴/۴، ۲۸۵)

○ ہم وڈالہ سندھواں میں پڑھتے تھے۔ ہمارا ایک ساتھی تھا بڑا مسخرہ۔ اس نے کوئی شرارت کی جس کی شکایت مہتمم صاحب کے پاس پہنچ گئی۔ اس کو طلب کیا اور اس سے پوچھا کہ تو نے یہ شرارت کی ہے؟ اس نے کہا، اللہ کی قسم ہے، مجھے تو علم بھی نہیں ہے، اور جان بچا لی۔ مگر جن ساتھیوں کو علم تھا کہ اس نے یہ کام کیا ہے، انھوں نے اس کو گھیر لیا کہ تو نے قسم کس حساب

سے کھائی ہے؟ کہنے لگا کہ تم نے سنا نہیں کہ میں نے کیا کہا ہے؟ میں نے تو کہا ہے: الاں کی قسم ہے۔ ایک سبزی ہے کدو کی جنس کی، اس کو الاں کہتے ہیں اور تربوز کی بیل کو الاں کہتے ہیں۔ (ذخیرۃ الجنان ۲۸۶/۴)

○ [ککہ سے انھی] ہم روزانہ سبق پڑھنے کے لیے پیدل سفر کر کے جاتے تھے۔ راستہ میں ایک بابا جی جو بزرگ زمیندار تھے، بیل کے ذریعے کنویں سے اپنی کھیتی کو پانی دیا کرتے تھے۔ انہوں نے بیل کی گردن میں ایک گھنٹی باندھی ہوئی تھی جس سے ''ٹن، ٹن'' کی آواز آتی رہتی تھی۔ ہم نے عرض کیا، بابا جی! بیل کی گردن میں یہ گھنٹی باندھنا درست نہیں ہے، کیونکہ اس سے ٹن ٹن کی آواز آتی رہتی ہے۔ وہ بزرگ زمیندار کہنے لگے کہ میں بیل کو کنویں پر جوت کر اپنے دیگر کام کاج میں لگ جاتا ہوں اور گھنٹی کی ٹن ٹن کی آواز اس بات کا پتہ دیتی رہتی ہے کہ بیل رکا نہیں بلکہ چل رہا ہے اور کھیتی سیراب ہو رہی ہے اور جب گھنٹی کی آواز نہ آئے تو میں سمجھ جاتا ہوں کہ بیل رک گیا ہے، چنانچہ میں دوبارہ آ کر اس کو چلا دیتا ہوں۔ ہم نے عرض کیا کہ بابا جی! اگر آپ کا یہ بیل کھڑے کھڑے ہی دائیں بائیں سر ہلاتا رہے تو آواز تو پھر بھی آتی رہے گی۔ اس پر وہ بزرگ مسکرا کر فرمانے لگے کہ ''میرے بیل نے منطق کا فن نہیں پڑھا، لہٰذا اس کو اس حیلے کی کیا خبر؟'' (روایت: مولانا حافظ محمد یوسف)

○ ۱۹۳۵ھ کی بات ہے۔ میں گوجرانوالہ میں پڑھتا تھا۔ انگریز حکومت کا زمانہ تھا۔ گوجرانوالہ میں ایک ہندو کا سینما تھا۔ انہوں نے اعلان کیا کہ ہم حج کی فلم دکھائیں گے۔ تمام مسالک کے علما اکٹھے ہوئے، دیوبندی، بریلوی، اہل حدیث۔ مشاورت کی اور جلسہ عام رکھا اور اس میں احتجاج کیا کہ حج ہماری عبادت ہے، اس کو کھیل تماشے کے طور پر پیش کرنے کی شریعت اجازت نہیں دیتی، لہٰذا اس فلم کو بند کیا جائے۔ جلسے کے بعد احتجاجی جلوس بھی نکالا، میں خود اس جلوس میں شریک تھا۔ انگریز نے احتجاج کو تسلیم کیا اور فلم بند کرا دی اور حج فلم پر پابندی لگا دی۔ اس کے بعد پاکستان بن گیا اور ''خانہ خدا'' کے نام سے فلم تیار کی گئی اور لوگوں کو دکھائی گئی۔ الحمد للہ! میں نے آج تک سینما نہیں دیکھی۔ لوگ بتاتے رہتے ہیں کہ وہاں یہ کچھ ہوتا ہے۔ انھی دنوں میں شیخوپورہ میں بہت بڑا جلسہ تھا۔ حضرت مولانا محمد علی جالندھریؒ جو چوٹی کے مقرر تھے، ان کا خصوصی خطاب تھا اور میری صدارت تھی۔ مجھے چونکہ ساتھیوں نے صدر بنایا تھا، میرے پاس رقعے آنے شروع ہو گئے۔ ان میں سے ایک رقعہ کے اوپر لکھا ہوا تھا کہ انگریزی دور میں علما حج فلم پر احتجاج کرتے تھے اور آج فلم دکھائی جا رہی ہے، علما خاموش کیوں ہیں؟

مولانا جالندھریؒ نے تقریر کے دوران ہی وہ رقعہ میرے ہاتھ سے لے لیا۔ مولانا بڑے ذہین اور حاضر جواب تھے۔ فرمایا کہ بھائی! کسی صاحب نے یہ رقعہ لکھا ہے کہ انگریز کے زمانہ میں علما نے حج فلم پر احتجاج کیا تھا اور انگریز نے پابندی لگا دی تھی، اب پاکستان میں ''خانہ خدا'' فلم چل رہی ہے تو علما احتجاج کیوں نہیں کرتے، خاموش کیوں ہیں؟ مولاناؒ نے فرمایا کہ ''علما خاموش نہیں ہیں، اب بھی اس کی تردید کرتے ہیں، لیکن بات یہ ہے کہ مائیں دو قسم کی ہوتی ہیں، حقیقی اور سوتیلی۔ حقیقی ماں اپنے بچے کو بے تحاشا مارتی ہے، اس کو کوئی پوچھنے والا نہیں ہوتا۔ اور سوتیلی ماں بچے کو مارتے ہوئے گھبراتی اور ڈرتی ہے کہ لوگ کہیں گے کہ سوتیلی ہے، اس لیے مار رہی ہے۔ پہلے ہماری سوتیلی بے بے حکومت برطانیہ تھی، وہ ڈرتی تھی۔ اور اب ہماری سگی بے بے ہے حکومت پاکستان، یہ جو چاہے کرے، ڈرتی نہیں ہے۔ اب جو کچھ ہمارے ساتھ ہو رہا ہے، سگی بے بے کا معاملہ ہو رہا ہے۔ سگی بے بے جو کچھ ہمارے ساتھ کر رہی ہے، ایسی خرافات کبھی نہیں ہوئی تھیں۔'' (ذخیرۃ الجنان، ۲۰۱/۵)

○ جب دار العلوم میں ہم پڑھتے تھے تو اس سال ہم تین سو تینتیس آدمی تھے۔ دورۂ حدیث میں ہمارے ساتھ ترکی کے

ایک جرنیل محبوب ختن تھے۔ ہماری عمر چھوٹی تھی، وہ بالکل بوڑھے تھے۔ ہم کسی وقت ان سے دل لگی بھی کرتے تھے کہ بابا جی، آپ کو کیا خیال آیا اس بڑھاپے میں۔ وہ اردو کچی پکی بولتے تھے۔ ترکوں کے جرنیل رہے تھے۔ پہلے کرنل تھے، پھر بریگیڈیئر بنے، پھر اللہ تعالیٰ نے توفیق دی تو اس طرف آئے۔ (خطبات امام اہل سنت ۱/۲۷)

○ آج سے تقریباً ساٹھ سال پہلے حدیث کی پہلی کتاب مشکوٰۃ شریف ہم نے پڑھی۔ جس وقت یہ حدیث ہمارے سامنے آئی: یقاتلونکم الیہود، یہود تمہارے ساتھ لڑیں گے، وتقاتلون الیہود، اور تم یہودیوں کے ساتھ لڑو گے تو ہم بڑے حیران ہوئے کہ یہودیوں کے ساتھ ہماری کیا لڑائی ہوگی اور ان کی ہمارے ساتھ کیا لڑائی ہوگی! ان کی کیا حیثیت ہے کہ اس وقت فلسطین میں چھ سات ہزار یہودی تھے۔ ہم نے استاد محترم حضرت مولانا عبد القدیرؒ سے سوال کیا کہ حضرت! ان لوگوں سے لڑنا تو ہماری توہین ہوگی کہ میدان میں ایک پہلوان ہو اور دوسری طرف سے بچہ ہو تو پہلوان کی توہین ہوتی ہے، تو یہودی تو ہمارے مقابلہ میں بچے ہیں۔ حضرت نے فرمایا: ''میاں (یہ حضرت کا تکیہ کلام تھا) اس وقت ان کو قوت حاصل ہو جائے گی۔ جب ان کی تباہی کا وقت آئے گا، ان کو پر لگ جائیں گے۔ چیونٹی کی جب موت آتی ہے تو اس کو پر لگ جاتے ہیں۔'' اس وقت ہماری سمجھ میں یہ بات نہیں آتی تھی کہ ان کو قوت کس طرح حاصل ہو جائے گی، لیکن دیکھتے دیکھتے ہی اب وہاں اسی لاکھ یہودی ہیں اور ان خبیث حکومتوں نے تجربہ کار افراد جو اکثر فوجی ہیں، وہاں جمع کر دیے ہیں۔ اس وقت دنیا میں اسلحہ کے اعتبار سے یہودی تیسرے نمبر پر ہیں، ایٹم بم تک انہوں نے تیار کر لیا ہے۔ (ذخیرۃ الجنان، ۷/۳۱۵)

○ ہم بخاری شریف کا سبق پڑھ رہے تھے۔ حضرت مدنی رحمہ اللہ کو کسی نے اخبار کا تراشہ دیا کہ ظاہر شاہ نے روس کی پیش کش کو قبول کر لیا ہے اور پیشکش یہ تھی کہ میں اپنے خرچے پر تمہارے کالجوں اور اسکولوں میں پروفیسر اور ماسٹر بھیجتا ہوں، یعنی ان کی تنخواہیں اور اخراجات میرے ذمہ ہیں، تم قبول کر لو۔ پیش کش کا دوسرا حصہ یہ تھا کہ تم اپنے لڑکے ہمارے کالجوں میں بھیجو، ان کے بھی تمام اخراجات ہم برداشت کریں گے۔ حضرت مدنی رحمہ اللہ سبق پڑھاتے ہوئے رو پڑے اور فرمایا، ظاہر شاہ! تو نے بڑی نادانی کی ہے۔ ظاہر شاہ! تو نے بڑی نادانی کی ہے۔ ظاہر شاہ! تو نے بڑی نادانی کی ہے۔ وہاں سے جو معلم اور اساتذہ آئیں گے، وہ کفر سکھائیں گے اور جو تمہارے بچے روس میں جا کر پڑھیں گے، وہ کافر بن کر وہاں سے نکلیں گے۔ (ذخیرۃ الجنان ۳/۵۵)

○ حضرت مولانا حسین احمد صاحب مدنی ایک واقعہ سنایا کرتے تھے کہ ہمارے گاؤں میں ایک ہندو دوکاندار تھا۔ محلے کی مسجد کا امام روزانہ اس سے تھوڑی سی نسوار مانگ کر لے جاتا اور پیسے نہیں دیتا تھا۔ ایک دن اس ہندو دکاندار نے کہا میاں جی، تم روزانہ مفت نسوار لے جاتے ہو۔ میں بھی کمزور آدمی ہوں اور میرے بال بچے بھی ہیں اور یہ نسوار میں خرید کر لاتا ہوں، مجھے کوئی پیسہ دھیلا دے دیا کرو۔ میاں جی کو یہ بات بڑی ناگوار گزری کہ مجھ سے پیسے مانگتا ہے۔ کہنے لگا کہ میں تیرا علاج کر لیتا ہوں۔ نماز کا وقت ہوا، مسجد میں پہنچے، نماز پڑھائی۔ نماز سے فارغ ہو کر مقتدی جانے لگے تو میاں جی نے آواز دی کہ ذرا ٹھہر جاؤ، میں نے تمہارے ساتھ ایک بات کرنی ہے۔ مقتدی بیٹھ گئے تو میاں جی نے کہا کہ فلاں ہندو دکاندار وہابی ہو گیا ہے، اس سے سودا نہ لینا۔ کئی دن گزر گئے، اس سے کسی نے سودا نہ خریدا۔ وہ بے چارہ ہاتھ پر ہاتھ دھر کر بیٹھ گیا۔ ایک دن مولوی صاحب وہاں سے گزرے تو کہنے لگے، تجھے پتہ چل گیا ہے نا؟ اس کو تو پتہ چل ہی گیا تھا کہ میاں جی نے مجھے وہابی بنا

دیا ہے۔ ہندو نے کہا، میاں جی میں توبہ کرتا ہوں۔ مجھے معاف کر دو اور نسوار جتنی چاہتے ہو، لے جایا کرو مگر مجھ سے یہ وہابیت کی دم اتار دو۔ (ذخیرۃ الجنان ۳/۱۱۲، ۱۱۳)

○ ہمارے استاد محترم حضرت مولانا ادریس کاندھلوی ہم جب دیوبند میں پڑھتے تھے تو وہ چھوٹے استادوں میں سے تھے، معین المدرسین۔ اسی طرح حضرت مولانا شفیع صاحب مفتی اعظم پاکستان، یہ بھی ہمارے چھوٹے مدرسین میں سے تھے۔ بڑے جو مدرسین تھے، ان میں حضرت مولانا سید حسین احمد مدنیؒ، مولانا اعزاز علی صاحبؒ، مولانا ابراہیم بلیاویؒ اور مفتی ریاض الدین صاحبؒ تھے۔ حضرت مولانا محمد ادریس کاندھلویؒ نے ایک موقع پر یہ فرمایا کہ مولوی صاحب، یہ لوگ جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی میلاد مناتے ہیں بارہویں تاریخ کو تو مولوی صاحب، شریعت میں تو یہ بدعت ہے ہی، میں کہتا ہوں کہ عشق ومحبت کے لحاظ سے بھی بدعت ہے۔ حضرت، وہ کیسے؟ فرمایا کہ کیا یہ بدعت نہیں کہ محبوب کا دن سال میں صرف ایک مرتبہ منایا جائے، آگے پیچھے یاد نہ کرے اور محبوب کا نام سال میں صرف ایک دفعہ منایا جائے۔ محبت یہ ہے کہ محبوب ہر وقت ذہن میں ہو تو یہ شریعت میں تو بدعت ہے ہی، عشق ومحبت کے طور پر بھی بدعت ہے۔ (خطبات امام اہل سنت ۳/۲۴۱، ۲۴۲)

○ دار العلوم دیوبند میں ہمارے ایک استاد تھے، مولانا عبد الحق مدنیؒ۔ وہ فرمایا کرتے تھے کہ ہمارے ملک میں ہر تیسرا آدمی مفتی ہے اور ہر چوتھا آدمی حکیم ہے۔ کوئی مسئلہ پیش کرو، وہاں موجود آدمیوں میں سے کوئی نہ کوئی ضرور بول پڑے گا، چاہے اسے الف با کا بھی علم نہ ہو۔ اسی طرح اگر تم کہو کہ میں بیمار ہوں تو تمہیں ضرور اس کا علاج بتائیں گے، چاہے حکمت کی ابجد سے بھی واقف نہ ہوں۔ یہ لوگوں کی عادت بن گئی ہے۔ (ذخیرۃ الجنان، ۶/۲۴۷)

گکھڑ میں آمد اور شرک وبدعات کا مقابلہ

○ راقم اثیم نے دار العلوم دیوبند میں ۱۳۶۰ھ/۱۹۴۰ء میں دورۂ حدیث شریف کے لیے مع برادر عزیز صوفی عبد الحمید سلمہ اللہ تعالیٰ داخلہ لیا۔ وہاں سے فراغت کے بعد اپنے قابل قدر اور مہربان استادوں (حضرت مولانا عبد القدیر صاحبؒ اور حضرت مفتی مولانا عبد الواحد صاحبؒ) کے اصرار اور حکم سے مدرسہ انوار العلوم جامع مسجد شیرانوالہ باغ گوجرانوالہ میں تدریس شروع کی۔ حسامی اور دیوان حماسہ وغیرہ کتابیں میرے پاس تھیں۔ پھر گکھڑ والے مجھے لے آئے اور حضرات اساتذہ کی اجازت سے ۹ر جولائی ۱۹۴۳ کو گکھڑ کی اس وقت کی واحد جامع مسجد کا مجھے خطیب مقرر کیا گیا اور ساتھ ہی انجمن اسلامیہ کے تحت درس نظامی کا سلسلہ بھی چلتا تھا اور راقم اکیلا ہی متعدد کتابیں پڑھاتا تھا۔ (مسودہ تحریر کردہ ۱۹ر ربیع الاول ۱۴۱۹ھ/۱۴ر جولائی ۱۹۹۸ء)

○ جس زمانے میں مشرقی پنجاب میں مسلمانوں پر بڑے ظلم ڈھائے جا رہے تھے، مسجدیں گرائی جا رہی تھیں، عورتوں کی بے حرمتی ہو رہی تھی، بچوں کو قتل کیا جا رہا تھا اور بہت کچھ ہو رہا تھا، اس وقت ایک مولوی صاحب نے بٹ دری فیکٹری [جی ٹی روڈ گکھڑ] کے سامنے تقریر کی اور کہا کہ اولیاء اللہ ہماری مدد کرتے ہیں، اور شرک کی خوب آبیاری کی۔ مسئلہ یہ ہے کہ باطل کی تردید فرض کفایہ ہے۔ اگر کسی جگہ باطل ظاہر ہوا اور اس کی کسی نے تردید نہ کی تو تمام کے تمام لوگ مجرم ہوں گے۔ اور اگر ایک ثقہ آدمی نے اس کی تردید کر دی تو تمام کی گردنیں آزاد ہو جائیں گی، گناہ سے بری الذمہ ہو جائیں گے۔ اس وقت میں گکھڑ میں نیا نیا آیا تھا۔ میں نے سوچا کہ اس نے غلط تقریر کی ہے، اگر تردید نہ ہوئی تو گکھڑ کے سارے لوگ گنہگار ہوں گے، لہٰذا

ایک دن کے وقفے کے بعد میں نے اس کی تردید کی اور کہا کہ مدد کرنا صرف اللہ تعالیٰ کا کام ہے، مخلوق کا کام نہیں ہے۔ بڑی سے بڑی ہستی بھی مافوق الاسباب کسی کی مدد نہیں کر سکتی۔ اور نماز میں ہم پڑھتے ہیں: ایاك نعبد و ایاك نستعین، پروردگار! ہم خاص تیری ہی عبادت کرتے ہیں اور خاص تجھ ہی سے مدد طلب کرتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے ہمیں یہ سبق دیا ہے کہ عبادت بھی اللہ تعالیٰ کی اور مدد بھی اللہ تعالیٰ سے مانگنی ہے۔ اللہ تعالیٰ کے سوا مافوق الاسباب کوئی کسی کی مدد نہیں کر سکتا۔ تقریر میں، میں نے یہ بھی کہا کہ اگر اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی اور مدد کر سکتا ہے تو مشرقی پنجاب میں مسلمانوں پر جو ظلم ہو رہا ہے، پیر فقیر ان کی مدد کیوں نہیں کرتے؟ حالانکہ بڑے بڑے ولی اس دھرتی پر ہیں، مثلاً شیخ احمد سرہندیؒ، حضرت مجدد الف ثانیؒ، شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ، شاہ عبدالعزیزؒ، حضرت اجمیریؒ، خواجہ نظام الدین اولیاءؒ۔ پچاس ساٹھ سال کی عمر کا ایک بابا کھڑا ہوا۔ ڈاڑھی اس کی کتری ہوئی تھی۔ کہنے لگا: اولیاء اللہ مدد کرتے ہیں، مگر آج کل سارے بزرگ حج کے لیے گئے ہوئے ہیں۔ حالانکہ وہ حج کا موسم بھی نہیں تھا، مگر وہ چپ نہیں رہا، شوشہ چھوڑ کر چلا گیا۔ (ذخیرۃ الجنان، ۶/۳۱۷)

○ میرے خیال میں حاجی فخر الدین صاحب مرحوم گکھڑ میں پہلے شخص تھے کہ جب ان کے پوتے کو دفنانے کے بعد دعا کی گئی تو انھوں نے اعلان کیا کہ ہم نے کوئی تیجا ساتا نہیں کرنا اور نہ ہی کوئی اس ارادے سے ہمارے گھر آئے۔ میں بھی وہاں موجود تھا۔ ان کی برادری کے کچھ آدمیوں نے کہا کہ پھر تو ہمارے سے کٹ گیا ہے نا، علیحدہ ہو گیا ہے! اللہ تعالیٰ حاجی صاحب کی مغفرت فرمائے، بڑے تیز مزاج تھے۔ کہنے لگے، اگر اس بات سے میں الگ ہو گیا ہوں تو مجھے الگ ہی رہنے دو۔ بڑے جہاد کی بات ہے۔ اور لوگ بڑے عجیب ہیں کہ جنازہ تو مجھ سے پڑھواتے ہیں اور گھر جا کر اعلان کرتے ہیں کہ کل قل شریف ہوں گے یا پرسوں ہوں گے۔ بھائی، یا تو مجھ سے جنازہ نہ پڑھاؤ یا قلوں کا اعلان نہ کرو۔ (ذخیرۃ الجنان ۴/۲۱)

○ حافظ اللہ داد صاحب مرحوم، گجرات میں ایک مقام ہے پٹیالہ، وہاں کے رہنے والے تھے۔ پنجابی میں بہت بہترین وعظ فرماتے تھے۔ کوٹ وارث میں ایک جلسہ تھا۔ جلسہ سے فارغ ہو کر وہ درمیان والے راستے سے گکھڑ آئے۔ وہ ضروری کتابوں کی گٹھڑی بھی ساتھ رکھتے تھے۔ راستے میں کمہار گدھے لے کر گکھڑ آ رہے تھے۔ حافظ صاحب مرحوم نے ان کو کہا کہ اگر تم اجازت دو تو میں تمہارے گدھے پر یہ کتابوں کی گٹھڑی بھی رکھ دوں؟ انھوں نے کہا کہ رکھ دو۔ انھوں نے حافظ صاحب سے پوچھا کہ تم نے کہاں جانا ہے؟ تو حافظ صاحب نے میرا نام لیا کہ اس کے پاس جانا ہے۔ وہ کمہار کہنے لگے کہ اس کے پاس نہ جاؤ، وہ تو کلمے کا منکر ہے۔ حافظ صاحب نے کہا کہ نہیں بھئی، وہ تو کلمہ پڑھتا ہے۔ پھر کہنے لگے کہ وہ معراج کا منکر ہے اور کہتا ہے کہ (معاذ اللہ تعالیٰ) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو معراج نہیں ہوئی۔ حافظ صاحب کی کتابوں میں میرا رسالہ تھا ''ضوء السراج فی تحقیق المعراج'' جو انھیں دنوں میں طبع ہوا تھا۔ حافظ صاحب نے گٹھڑی سے وہ نکال کر ان کو سنانا شروع کر دیا اور خاصا پڑھ کر سنایا اور کہا کہ معراج کو جتنا اس نے دلیلوں کے ساتھ ثابت کیا ہے، اتنا اور کسی نے نہیں کیا۔ جب گکھڑ کے قریب آئے تو کہنے لگے کہ ہمیں کسی شے کا علم نہیں ہے، ہمیں تو ہمارے مولوی صاحب کہتے ہیں کہ وہ معراج کا بھی منکر ہے اور کلمے کا بھی۔ (ذخیرۃ الجنان ۲/۱۷)

تعلیم قرآن کے فروغ کی مساعی

○ آج سے تقریباً پچپن سال پہلے سیٹھی محمد یوسف مرحوم میرے پاس آئے اور کہنے لگے مجھے وقت دیں، ملک کا دورہ

کریں۔ میں نے پوچھا، دورہ کس کام کے لیے کرنا ہے؟ تو کہنے لگے کہ جب رمضان شریف کا مہینہ آتا ہے، ہمیں قرآن سنانے کے لیے حافظ نہیں ملتے، کیونکہ حافظوں کی تعداد بہت کم ہے۔ کیمل پور (موجودہ اٹک) اور میانوالی کے علاقوں سے چند حافظ مل جاتے ہیں، مگر ضرورت زیادہ حفاظ کی ہوتی ہے۔ پھر جو ملتے ہیں، تجوید وقراءت کے بغیر سادہ قرآن پڑھے ہوتے ہیں، لہٰذا لوگوں کو ترغیب دیں کہ وہ بچوں کو حفظ کے لیے بھیجیں اور یہ بھی بتائیں کہ قرآن کریم صرف غریبوں کے لیے نہیں، امیروں کے لیے بھی ہے تاکہ مال دار لوگ بھی اپنے بچوں کو حفظ کرائیں اور صرف اندھوں کے لیے نہیں، بلکہ آنکھوں والوں کے لیے بھی ہے۔ چنانچہ میں ان کے ساتھ گیا اور ملک کے مختلف علاقوں کے دورے کیے۔ ایک جگہ میں نے دامن پھیلا دیا اور کہا، میں تم سے چندہ وصول کرنے آیا ہوں مگر روپے پیسے اور کپڑے وغیرہ کا چندہ نہیں، بلکہ چندہ بچوں کا لینا ہے۔ لوگ بڑے حیران ہوئے کہ یہ مولوی ہمارے بچوں کو جھولی میں ڈال کر کہاں لے جائے گا۔ میں نے کہا: پریشان نہ ہوں، تمہارے بچے یہیں رہیں گے۔ تم پڑھنے کے لیے بچے دو، ہم معلم دیں گے۔ سیٹھی صاحب کافی مخیّر آدمی تھے۔ اس سلسلے میں انہوں نے کافی کام کیا۔ اب تو اللہ تعالیٰ کا فضل ہے، ملک میں مدرسوں کا جال بچھا ہوا ہے۔ صرف ہمارے گکھڑ میں دس مدرسے ہیں اور ہماری انجمن کے تحت جو بچے حفظ کر رہے ہیں، تقریباً دو سو ہیں۔ (ذخیرۃ الجنان ۲/۳۵۰)

○ الحمد للہ آج سے کئی سال پہلے میں نے متعدد مقامات پر ترجمہ کلاس کی اپیلیں کی تھیں اور الحمد للہ ان تمام مقامات پر کراچی سے پشاور تک اور سیالکوٹ، شیخوپورہ فیصل آباد وغیرہ تمام علاقوں میں ساتھیوں نے بڑا اچھا کام کیا۔ ترجمہ کلاس کا مفہوم یہ ہے کہ جو بچے اسکولوں میں ہیں، کالجوں میں ہیں، ان کو زیادہ وقت نہیں ملتا، وہ روزانہ ایک یا دو آیت ترجمے کی پڑھیں۔ الحمد للہ اس کا خاصا اثر ہوا اور بہت سے مقامات پر بچوں نے اور لڑکیوں نے ترجمہ پڑھا۔ قاری عبید اللہ عامر صاحب گوجرانوالہ میں نمبر ایک ہیں۔ انھوں نے الحمد للہ کئی کلاسیں پڑھائیں۔ لڑکے بھی ہیں لڑکیاں بھی ہیں۔ میں نے کہا کہ تشریح کی زیادہ ضرورت نہیں، لفظی ترجمہ بڑی شے ہے۔ لفظی ترجمہ آئے تو ایک آیت بھی ہزار نفل سے بہتر ہے۔

(خطبات امام اہل سنت ۳/۲۲۴)

حکمرانوں کے سامنے احقاق حق

○ کافی پرانی بات ہے۔ پاکستان بنے ابھی تیرہ چودہ سال ہوئے تھے۔ ایک بڑا موٹا ڈی سی ہوتا تھا۔ اس نے ایک اسکول میں معززین شہر کو جمع کیا اور مولویوں کو بھی بلایا۔ مجھے بھی دعوت ملی، میں بھی گیا۔ اس نے تقریر کی اور معاشرے کی خرابی کی ذمہ داری ساری مولویوں پر ڈال دی کہ یہ لوگوں کی اصلاح نہیں کرتے۔ میں نے اٹھ کر کہا کہ ڈی سی صاحب! آپ ہمارے ضلع کے بڑے افسر ہو اور اس وقت ہمارے مہمان ہو، ہم آپ کی قدر کرتے ہیں، مگر سوال یہ ہے کہ یہ سینما گھر مولویوں نے بنوائے ہیں یا حکومت نے؟ یہ مینا بازار اور جمعہ بازار مولوی لگواتے ہیں یا تم؟ یہ مخلوط تعلیم مولویوں نے شروع کی ہے یا تم نے؟ یہ کلب مولویوں نے کھلوائے ہیں یا تم نے؟ مجھے ایک ساتھی نے کہا، ڈی سی ہے۔ میں نے کہا، جب اس نے بات کی ہے تو مجھے بھی کرنے دو۔ سارا نزلہ مولوی پر گرتا ہے۔ مولوی کے پاس زبان کے سوا اور ہے کیا؟ طاقت تمہارے پاس، حکومت تمہارے پاس، ڈنڈا تمہارے پاس، اختیارات تمہارے پاس، یہ سارے بدمعاشی کے اڈے تم نے قائم کیے ہیں۔ اخبارات میں غلط قسم کی خبریں چھپتی ہیں جن کو پڑھ کر نوجوان طبقہ ڈاکو بنتا ہے، وہ اخبارات تمہارے کنٹرول میں ہیں۔

آج اکثریت ڈاکوؤں کی کالجیٹ ہے۔ حکومت ان کو ملازمت نہیں دیتی، ان کی مدد نہیں کرتی، وہ یہی کام کرتے ہیں۔ جاہل اوران پڑھ ڈاکو بہت کم ہیں۔ تم مولویوں کو کوستے ہو، اس میں مولویوں کا کیا گناہ ہے؟ (ذخیرۃ الجنان، ۴۹/۵)

o صدر ایوب خان کے زمانے میں عائلی قوانین کے ذریعے کچھ چیزیں خلاف شرع نافذ ہوئیں، جو ابھی تک نافذ ہیں۔ ان میں ایک شق یہ بھی تھی کہ مطلقہ غیر حاملہ کی عدت نوے دن ہے۔ ہم نے ملاقات کی کوشش کی۔ علما کا ایک وفد تیار ہوا کہ اس کو بتائیں کہ یہ جو تمہارا حکم ہے، اس کی ایک شق قرآن کے خلاف ہے اور ایک شق اجماع کے خلاف ہے تو اسلامی ملک میں ایسا کام کرنا جو قرآن اور اجماع امت کے خلاف ہو، صحیح نہیں ہے۔ لیکن اقتدار اقتدار ہوتا ہے، اس کا نشہ بہت برا ہوتا ہے۔ ایوب نے کہا میرے پاس وقت نہیں ہے۔ دو دن کے بعد جاپان سے ناچنے والوں کا ایک طائفہ آیا جس میں کچھ عورتیں اور کچھ مرد تھے۔ ان کو ایوب نے وقت دے دیا۔ مولانا غلام غوث ہزاروی رحمہ اللہ تعالیٰ بڑے جرات مند آدمی تھے۔ انھوں نے ایوب کو کھڑکا دیا کہ علما کے لیے تو تیرے پاس وقت نہیں ہے اور ان ناچنے والوں کے لیے تیرے پاس وقت ہے۔ اس وقت ایوب نے حقارت سے ”ملا“ کا لفظ استعمال کیا تھا تو مولانا ہزاروی رحمہ اللہ تعالیٰ نے مسٹر کرنٹا کا لفظ استعمال کیا جو کافی دیر تک چلتا رہا، لیکن وقت نہ ملا۔ پھر ہم نے دوسرا طریقہ اختیار کیا۔ اللہ تعالیٰ غریق رحمت فرمائے حاجی اللہ دتہ صاحب مرحوم، حاجی ملک اقبال صاحب مرحوم اور صوفی نذیر احمد صاحب مرحوم اور میر محمد شفیع صاحب اور ہم نے ایک وفد تیار کیا۔ اس وقت چودھری صلاح الدین صاحب، حامد ناصر چٹھہ کے والد، یہ قومی اسمبلی کے ممبر تھے۔ ہم وفد کی شکل میں ان کے پاس گئے اور ملاقات کی اور ان کو کہا کہ دیکھو، ہماری براہ راست ایوب خان تک رسائی نہیں ہوئی اور ایک غلط کام ہوا اور اس کی تردید کوئی نہ کرے تو ساری قوم گناہ گار ہوتی ہے۔ آپ ہمارے حلقے کے قومی اسمبلی کے ممبر ہیں۔ یہ ہماری بات وہاں تک پہنچا دیں، تاکہ ہم بھی گنہگار نہ ہوں اور ہماری پبلک بھی گنہگار نہ ہو، کیونکہ غلط چیز کی تردید فرض کفایہ ہے جس طرح تبلیغ فرض کفایہ ہے۔ اگر کچھ لوگ تبلیغ کریں تو باقی لوگ گناہ سے بچ جاتے ہیں اور اگر کوئی بھی نہ کرے تو سارے گنہگار ہوں گے۔ اسی طرح اگر باطل چیز کی تردید نہ کی جائے تو سب گنہگار ہوں گے۔ ہم نے ان کو سمجھایا کہ دیکھو، عائلی قوانین کی ایک شق یہ ہے کہ مطلقہ غیر حاملہ کی عدت نوے دن ہے اور قرآن پاک میں ایسی مطلقہ کا ذکر بھی ہے کہ جس کی عدت سرے سے ہی نہیں۔ مثلاً ایک بچی کا نکاح ہوا اور رخصتی سے پہلے طلاق ہو گئی تو اس پر عدت نہیں ہے۔ پھر ہم نے اس مسئلے سے بھی آگاہ کیا کہ فقہی مسئلہ ہے کہ بعض عورتوں کے حالات مختلف ہوئے تو شرعی طور پر اس عورت کی عدت اٹھارہ ماہ کے بعد مکمل ہوگی، جبکہ تمہارا قانون یہ کہتا ہے کہ اس کی عدت بھی نوے دن ہے۔ پھر میں نے یہ سمجھایا کہ وہ عورتیں جن کو ہر ماہ حیض آتا ہے اور امکان کے درجے میں ان کی عدت نوے دن بن سکتی ہے، یہ بھی ممکن نہیں کیونکہ تین مہینے مسلسل تیس تیس دن کے ہوتے ہی نہیں، لہٰذا یہ قانون قرآن اور فقہ کے بالکل خلاف ہے۔ چودھری صلاح الدین مرحوم نے ہماری بات سمجھی۔ سمجھ دار وکیل تھے۔ ہماری گفتگو کو انھوں نے نوٹ کیا۔ پھر معلوم نہیں کہ انھوں نے ہماری بات ایوب تک پہنچائی نہ پہنچائی۔ (ذخیرۃ الجنان ۲/ ۲۱۳، ۲۱۴)

o ضیاء الحق مرحوم کے دور میں لاہور ہائی کورٹ کے ایک جج نے ایک کیس میں کہا کہ یہ کوڑے مارنا اور سنگسار کرنا جابرانہ، ظالمانہ اور وحشیانہ فیصلہ ہے اور یہ یہودیوں کی ایجاد ہے، اسلامی احکامات نہیں ہیں۔ لاحول ولا قوۃ الا باللہ العلی العظیم۔ اس کا یہ بیان اخبارات میں شائع ہوا۔ اس پر تمام طبقوں کے علما اکٹھے ہوئے اور کہا کہ یہ بکواس اگر کوئی سیاسی لیڈر بکتا تو اس کا جواب ہم جلسوں اور جلوسوں کی صورت میں دیتے، مگر یہ الفاظ تو ایک جج نے عدالت میں بیٹھ کر کہے ہیں اور عدالت کے اندر جج کا بیان قانون ہوتا ہے اور یہ ریمارکس ہائی کورٹ کے جج نے دیے ہیں، لہٰذا اس پر خاموش نہیں رہنا چاہیے۔

چنانچہ پچاس علما پر مشتمل ایک وفد تشکیل دیا گیا۔ اس وفد میں، میں بھی شامل تھا کہ یہ وفد صدر مملکت سے ملاقات کرے اور احتجاج کرے۔ چنانچہ ہم براہ راست ضیاء الحق کو ملے اور اس کو کہا کہ ایک طرف تو آپ اسلام اسلام کہتے تھکتے نہیں اور دوسری طرف حالت یہ ہے کہ آپ کا ایک جج عدالت میں بیٹھ کر شرعی حدود کے متعلق یہ ریمارکس دے رہا ہے۔ اس نے کہا کہ وہ اخبار مجھے دو۔ ہم نے تین چار اخبار اس کے سامنے رکھ دیے۔ اس نے پڑھنے کے بعد کہا کہ تمہاری شکایت بجا اور صحیح ہے، میں اس کا انصاف کروں گا۔ یہ بھی بڑی بات تھی کہ اس نے مان لیا، ورنہ آج کے حکمران تو ماننے کے لیے بھی تیار نہیں ہیں۔ پھر اس نے شریعت کورٹ بنائی جس کے لیے تین جج مقرر ہوئے۔ ایک مولانا تقی عثمانی صاحب، دوسرے پیر کرم شاہ صاحب، تیسرے کا نام میں بھول گیا ہوں۔ اگر کوئی جج اسلام کے خلاف بات کرے گا تو یہ شریعت کورٹ کے جج اس کا فیصلہ کریں گے۔ پھر ججوں کے دماغ درست ہو گئے کہ ہم نے اگر خلاف شریعت کوئی فیصلہ دیا تو اوپر والی عدالت ہمارے اس فیصلے کو رد کر دے گی۔ (ذخیرۃ الجنان ۴/ ۴۰)

o جنرل ضیاء الحق نے بہت سی غلطیاں کی تھیں۔ ان میں سے ایک غلطی یہ بھی تھی کہ اس نے حکومتی سطح پر زکوٰۃ وصول کرنے کا حکم دیا تھا۔ ہم نے اس وقت بھی گرفت کی تھی کہ حکومت اس کی مجاز نہیں ہے۔ حکومت صرف جانوروں کی زکوٰۃ اور زمین کی پیداوار سے عشر وصول کرنے کا اختیار رکھتی ہے۔ نقد، پیسے اور سامان تجارت کی زکوٰۃ خود مالک اپنی مرضی سے دے گا اور ہم نے یہ بھی کہا تھا کہ حکومتی سطح پر وصول کی جانے والی زکوٰۃ اپنے مصرف میں خرچ نہیں ہوگی۔ کوئی اس رقم سے گلیاں بنوائے گا، کوئی الیکشن لڑے گا، کوئی کچھ کرے گا، اور کوئی کچھ کرے گا۔ ہمارے خدشات درست ثابت ہوئے اور اب، حکومت بھی اس بات کو تسلیم کرتی ہے۔ اصل بات یہ تھی کہ ضیاء الحق مشیروں کی اندرونی بات کو نہیں سمجھے۔ ان کا مقصد یہ تھا کہ زکوٰۃ حکومت وصول کرے گی تو یہ دینی مدارس جو زکوٰۃ پر چل رہے ہیں، بند ہو جائیں گے، لیکن الحمد للہ کوئی بھی بند نہیں ہوا، بلکہ مزید بڑھے ہیں۔ ان شریروں کی پالیسی کامیاب نہ ہوئی۔ اس طرح ضیاء سے یہ مطالبہ کیا گیا کہ وفاق المدارس سے فارغ ہونے والے طلبہ کرام کو ایم اے کی ڈگری دیں، لیکن اس کے مشیر نہ مانے۔ علما کو آگے نہیں آنے دیتے بلکہ کوشش کرتے ہیں کہ علما کو اپنے تابع کر لیں۔ اس کے لیے بڑی کوشش کرتے اور منصوبے بناتے رہتے تھے۔ نصرۃ العلوم میں الحمد للہ اس وقت اٹھارہ سو طلبہ وطالبات زیر تعلیم ہیں اور ستر افراد پر مشتمل عملہ ہے اور ان کا صدر مدرس اور نگران تعلیم میں ہوں۔ ہمیں حکومت نے پیش کش کی کہ آپ کے مدرسہ میں دورۂ حدیث بھی ہوتا ہے، لہٰذا تمہیں چار لاکھ روپیہ سالانہ ملے گا۔ صوبے سے بھی اور مرکز سے بھی پیغام آیا۔ ہم نے انکار کر دیا کہ ہم حکومتی امداد نہیں لیں گے۔ انہوں نے دھمکی دی کہ حکومت تمہیں گرفتار کرے گی۔ ہم نے کہا، کرے گرفتار، یہ کون سی بات ہے! ہم نے پہلے بھی قیدیں بھگتی ہیں۔ یہاں ہمارے صدر چوہدری اعجاز صاحب نے پہلے سال غلطی کی اور میری لاعلمی میں ایک سال کی زکوٰۃ وصول کر لی۔ میں ناراض ہوا کہ تم نے کیوں وصول کی؟ کہنے لگا، مجھے علم نہیں تھا۔ اس کے بعد آج تک حکومت سے ایک پیسہ بھی وصول نہیں کیا۔ (ذخیرۃ الجنان ۸/ ۲۴)

o پاکستان بننے کے بعد امریکہ نے پاکستان کے ساتھ دفاعی معاہدہ کیا تھا۔ دفاعی معاہدے کا مفہوم یہ ہے کہ اگر دشمن نے

تم پر حملہ کیا تو ہم تمہارا ساتھ دیں گے اور اگر ہم پر حملہ ہوا تو تم ہمارا ساتھ دو گے۔ ان دنوں میں اخبارات نے بھی بڑے زور وشور سے اس پر سرخیاں لگائیں اور مضمون نگاروں نے مضمون لگے، مگر میں نے جمعہ کے خطبہ میں یہ بات کہی تھی کہ کافروں پر اعتماد کرنا بالکل غلط ہے اور دفاعی معاہدہ کر کے یہ نہ سمجھو کہ وہ ہمارا ساتھ دیں گے۔ یہ اسلام کی روح کے خلاف ہے اور تجربہ اس پر شاہد ہے۔ ہاں، اگر کچھ فائدہ اٹھا سکتے ہو تو اٹھا لو۔ مجمع میں سے ایک نوجوان اٹھ کھڑا ہوا اور کہا کہ تم مولویوں والا ذہن رکھتے ہو، یہ حکومتوں کے آپس کے معاہدے ہیں، مولویوں کے نہیں ہیں۔ میں نے کہا برخوردار، اللہ کرے تیرا یہ کہنا اور ارادہ پورا ہو جائے، مگر ایمان کی اور قرآن اور حدیث کی رو سے اور تاریخ اسلام کی رو سے ہمارا تجربہ یہ ہے کہ کافر نے مومن کا بھی ساتھ نہیں دیا، لیکن وہ نوجوان بڑا جذباتی تھا، اٹھ کر چلا گیا اور جمعہ بھی نہ پڑھا اور کہا کہ میں تمہارے ساتھ نمٹ لوں گا۔ اللہ تعالیٰ رحمت کرے حاجی محمد اقبال صاحب پر، کئی دنوں تک بطور محافظ کے یہاں سے میرے گھر تک ساتھ جاتے اور جب میں نے آنا ہوتا تھا تو مجھے ساتھ لے کر آتے تھے، اس خیال کے پیش نظر کہ نوجوان ہے، دھمکی دے کر گیا ہے۔ کوئی غلط قدم نہ اٹھا بیٹھے۔ کچھ عرصے کے بعد ۱۹۶۵ء کی جنگ لگ گئی۔ باوجود حلیف ہونے کے امریکہ نے ہماری کوئی مدد نہ کی، قطعاً کوئی مدد نہ کی۔ اس کو مدد کا کہتے رہے مگر اس نے کچھ نہ سنی۔ بعد میں پتہ چلا کہ اس نوجوان نے کئی سالوں کے بعد کہا کہ میں نے غلطی کی۔ مولوی صاحب جو کہتے تھے، ٹھیک کہتے تھے۔ (ذخیرۃ الجنان ۴/۲۹۱۔ خطبات امام اہل سنت ۱/۷۸، ۷۹)

مختلف اسفار کے مشاہدات اور تجربات

o ہم بحمد اللہ تعالیٰ ۲۲ر دسمبر بروز جمعہ المسجد الحرام پہنچ چکے ہیں۔ خلاف معمول سرد ہوائیں چل رہی ہیں۔ لوگوں نے اپنے گرم کپڑے سوئٹر اور کوٹ وغیرہ پہن رکھے ہیں، اوپر کمبل اوڑھ رہے ہیں، لیکن ایک میں ہوں اور ایک دو بنگالی نظر آئے ہیں کہ وہ بھی میری طرح احرام میں ہیں۔ احرام کی وجہ سے ہم سر بھی نہیں ڈھانپ سکتے اور مچھر بھی بے پناہ ہیں۔ کل ہی دس ریال کی ایک مچھر دانی خریدی ہے اور کئی راتوں کے بعد گزشتہ رات کچھ نیند پڑی ہے۔ گھر سے آنے کے بعد آج تک اطمینان سے نیند نہیں آ سکی۔ تین دن کی مسلسل محنت سے اور دوستوں کی بے [حد] کوشش سے شعب ابی طالب میں بہت ہی کم قیمت کا مکان ساڑھے چھ سو ریال پر ملا ہے، یعنی پاکستانی تقریباً دو ہزار روپیہ، مگر پانی دیگر کئی مکانوں کی طرح اس میں بھی نہیں ہے۔

اس سال اشیا کی اتنی گرانی ہے کہ بیان سے باہر ہے اور مکانوں کی اس قدر دقت ہے کہ الحفیظ والامان۔ راقم جب پہلی دفعہ آیا تھا تو ہمیں فی کس ۸۹۲ ریال، ایک من گندم اور دس سیر چاول ملے تھے مگر اب فی کس صرف ۶۳۵ ریال ملے ہیں۔ لوگ اپنے ساتھ خوب راشن لائے ہیں۔ جو راشن نہیں لا سکے تو وہ دیگر سامان اور کم از کم گھی فروخت کے لیے لائے ہیں۔ ہمارے محترم حاجی محمد صادق صاحب تقریباً ایک من گھی لائے ہیں، لیکن راقم صرف دس سیر چاول اور تقریباً ۵ سیر گھی اور تقریباً اڑھائی سیر کھانڈ لایا ہے اور بس۔ مکان کے کرایہ کے علاوہ مدینہ طیبہ کا کرایہ ۱۰۲ ریال، وہاں مکان کا کرایہ اور دیگر خرچہ، پھر عرفات اور منیٰ کا کرایہ ستر ریال، پھر جدہ کا کرایہ، پھر قربانی، یہی چیزیں اس رقم میں پوری نہیں ہو سکتیں۔ اس لیے راقم نے ایک وقت کی چائے بالکل چھوڑ دی ہے اور ایک وقت صرف قہوہ ہم پیتے ہیں اور کبھی کھانا بھی صرف ایک ہی وقت کھاتے ہیں۔ یہاں آٹا پاکستانی سکہ کے لحاظ سے ۸۵ روپے من ہے، آلو چار روپے سیر ہیں، پالک پانچ روپے سیر ہے، بھنڈی توری نو روپے سیر ہے۔ وعلیٰ ہذا القیاس یہی سلسلہ دیگر اشیا کا ہے۔ ہم کوشش کر رہے ہیں کہ ۷ر فروری کے جہاز سے واپسی ہو

جائے۔ دعا کرنا اور اس وقت تک بھی ہمارا خرچہ پورا ہونا مشکل ہے۔ پچانوے فیصدی لوگوں نے ۳۳ سو روپیہ فی کس جمع کرایا تھا، ہمارا صرف ۲۹۸۲ ہے اور باقی وہ لوگ دیگر اشیا بھی ساتھ لائے ہیں۔ فروخت کر کے اپنا گزارا کر رہے ہیں اور ہر ایک کے پاس بڑا راشن ہے۔ آنے کے بعد یہ حقیقت کھلی ہے۔ (مکتوب بنام مولانا زاہد الراشدی، تاریخ ندارد)

o دوپہر کے وقت ہم مدینہ طیبہ سے چلے اور ذوالحلیفہ پہنچے جس کو آج کل بئر علی کہا جاتا ہے۔ ذوالحلیفہ کے نام سے لوگ آج کل واقف نہیں ہیں۔ مغربی علاقے کے ایک آدمی نے بالکل ننگا ہو کر غسل کرنا شروع کر دیا۔ وہاں کثیر تعداد میں مرد اور عورتیں موجود تھیں۔ غسل کرنے کے بعد جب اس نے احرام کے کپڑے پہن لیے اور اس سے پوچھا گیا کہ تو نے یہ کیا حرکت کی ہے تو کہنے لگا کہ میں نے حدیث پر عمل کیا ہے۔ ترمذی شریف میں حدیث آتی ہے: تجرد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم للغسل قبل الاحرام کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے احرام باندھنے سے پہلے غسل کے لیے کپڑے اترے۔ اس نے سمجھا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ننگے ہو کر غسل کیا، معاذ اللہ تعالیٰ۔ یہ واقعہ میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے اور اس کا جواب کانوں سے سنا ہے۔ (ذخیرۃ الجنان ۳/۱۸۰، ۱۸۱)

o عرفات کے میدان میں جتنا ہو سکے، رب تعالیٰ کا ذکر کرے اور کھڑے ہو کر ذکر کرنا مستحب ہے۔ الحمد للہ میں نے وہاں دس پارے کھڑے ہو کر پڑھے۔ ہاں، اگر کوئی ضعیف ہے، بوڑھا ہے تو بیٹھ کر بھی ذکر کر سکتا ہے۔ (ذخیرۃ الجنان ۲/۱۴۳)

o بعض ڈرائیور اس طرح بھی کرتے ہیں کہ عرفات کے آخری کونے میں اتار دیتے ہیں۔ ایک دفعہ میرے ساتھ صوفی نذیر احمد صاحب تھے، اللہ تعالیٰ انھیں غریق رحمت کرے اور حاجی اللہ دتہ مرحوم بھی تھے۔ ان کے علاوہ اور بھی چند ساتھی تھے۔ رش چونکہ زیادہ تھا تو ڈرائیور نے ہمیں عرفات کے آخری کونے میں عرفات کے اندر ہی اتار دیا۔ ہم نے اس کو کہا کہ ہمیں جبل قزح بتا۔ کہنے لگا، ھنا، یہیں ہے۔ بڑا ضدی تھا۔ ہم نے اس کی خاصی منت کی کہ ہمارے ساتھ اس طرح نہ کر، حج پر زد پڑتی ہے اور یہ تو عرفات ہے، تو ہمیں مزدلفہ جا کر اتار۔ وہ نہ مانا اور چل پڑا کہ اب میں سحری کے وقت آؤں گا۔ تو ہم نے وہاں نعرہ لگایا کہ لیمت سواق ھذہ السیارۃ، اس گاڑی کا ڈرائیور مردہ باد۔ تو وہ گھبرایا اور پھر ہمیں جا کر مزدلفہ اتارا۔ (ذخیرۃ الجنان ۲/۱۴۴، ۱۴۵)

o تیرھویں تاریخ کو [جمرات پر رمی کے لیے] کوئی شاذ و نادر ہی ٹھہرتا ہے۔ ایک دفعہ میں نے کوشش کی تھی۔ میرے ساتھ کچھ ساتھی بھی تھے۔ بس ہم ہی وہاں تھے، اور کوئی نہیں تھا۔ (ذخیرۃ الجنان ۲/۱۵۱)

o میں جس وقت عمرے کے لیے جدہ گیا تو ایک بوڑھا، بے چارہ اس کی بڑی ڈاڑھی تھی، وہ سپاہی جو اس جگہ کا شرطی تھا، وہ آ کر اس کی ڈاڑھی کریدتا تھا، ڈاڑھی میں کچھ تلاش کرتا تھا۔ ہم ہنسنے لگے کہ اس بوڑھے کی ڈاڑھی میں کیا تلاش کرتا ہے۔ اس شرطی نے کہا کہ چند دن ہوئے، ایک بوڑھا اپنی ڈاڑھی میں ہیروئن چھپا کر لایا تھا، اس لیے ہم مجبور ہیں۔ لوگ اپنے عزیزوں کو رشتہ داروں کو باتوں کی کیسٹیں بھیجتے ہیں، اس نے کیسٹ میں ہیروئن بھر کر دے دی کہ جی ہمارے فلاں کو دے دینا اور کیسٹ کے اندر ہیروئن تھی۔ اتنے ہم بے ایمان ہو چکے ہیں کہ ڈاڑھیاں بھی ہماری بے ایمانی سے نہیں بچیں۔ اور وہ جو سلام کلام کیسٹوں میں ہم بھیجتے ہیں، وہ بھی بچیں اور لوگ جوتوں میں بھی بے ایمانی کرتے ہیں۔ وہ بھی بے چارے مجبور ہیں۔ (خطبات امام اہل سنت ۳/۲۷۰)

○ حج بدل خاصا مشکل ہے۔ مجھے یاد ہے کہ ایک دفعہ میرا حج بدل تھا اور مجھے مسلسل چالیس دن تک احرام میں رہنا پڑا۔ اور سردی بھی تھی، سر کو ٹھنڈ لگتی تھی۔ وہاں مجھے سوائے مولانا غلام غوث ہزاروی کے کسی واقف نے نہ پہچانا۔ بہر حال اللہ تعالیٰ نے مہربانی فرمائی اور حج مکمل ہو گیا۔ (ذخیرۃ الجنان ۴۶/۲)

○ ایک دفعہ میں جہاز پر سوار ہوا اور وہ اس طرح ہوا کہ حج سے واپسی پر مجھے پاکستان کا ٹکٹ نہ مل سکا، مجبوراً شام کا ٹکٹ لینا پڑا اور ہم جدہ سے دمشق چلے گئے۔ راستے میں بادل بہت گھرے تھے تو میں پوچھتا رہا کہ یہ پہاڑ کون سے ہیں؟ کہنے لگے یہ پہاڑ نہیں، یہ تو بادل ہیں اور جہاد جب بادل سے اوپر جاتا تھا تو بادل پہاڑ لگتے تھے۔ (ذخیرۃ الجنان ۵۷/۲)

○ شام اور کنعان بھی ارض مقدس میں ہے، اس لیے کہ بے شمار پیغمبر وہاں تشریف لائے اور ان کی قبریں بھی وہیں ہیں۔ یہ بڑا زرخیز اور ٹھنڈا علاقہ ہے، ہر طرح کے پھل وہاں ہوتے ہیں۔ صاف ستھرا پانی ہے۔ ہم نے دمشق کی نہر میں دیکھا کہ پانی کی دو نالیاں آ رہی ہیں۔ ایک میں صاف شفاف پانی ہے، اس کا پانی لوگ استعمال کرتے ہیں اور تھوڑے سے فاصلے پر دوسری نالی ہے جس میں استعمال شدہ پانی جا رہا ہے۔ ہر جگہ پانی کی فراوانی ہے، گھروں میں بھی اور مسجدوں میں بھی۔ وہاں کے لوگ بھی بڑے منیب الطبع تھے۔ ہم ایک بازار سے گزر رہے تھے کہ ایک آدمی جس کی چھوٹی سی کریانہ کی دوکان تھی، دوڑتا ہوا آیا اور میری ڈاڑھی کو اس نے چومنا شروع کر دیا اور مسلسل چومتا رہا۔ میں نے کہا بھائی! کیا بات ہے۔ میرا تیرا کوئی تعارف نہیں ہے۔ میں تجھے جانتا نہیں ہوں۔ میری ڈاڑھی کو کیوں چوم رہے ہو؟ کہنے لگا: ڈاڑھی نظر آئی ہے، محبت سے چوم رہا ہوں۔ میں نے کہا تجھے بھی رکھنے کا حق ہے، رکھ لے، کیوں نہیں رکھتا؟ اس نے بڑی گالی دے کر کہا: ہم تو ڈاڑھی رکھنا چاہتے ہیں مگر جب رکھتے ہیں تو یہ جو ہمارے بڑے ہیں، ہمارا مذاق اڑاتے ہیں، اس لیے ہم نہیں رکھتے، یعنی معاشرہ رکاوٹ بنا ہوا ہے۔ (ذخیرۃ الجنان، ۱۰۸/۶)

○ اس زمانے میں، میں نے حج کا سفر کیا۔ واپسی پر مجھے براہ راست پاکستان کا جہاز نہ ملا، شام کے راستے واپس آنا پڑا۔ ہمیں دو دن دمشق رہنا پڑا۔ وہاں ایک بڑی وسیع مسجد تھی اور بڑے بڑے مینار تھے اور بہت خوب صورت تھی جس طرح شاہی مسجد ہے۔ سلیمان خان قانونی ترکی بادشاہ گزرا ہے، اس نے بنوائی تھی اور اس کے ساتھ کمرے بنے ہوئے تھے۔ پانی کا بڑا انتظام تھا۔ موذن نے لاؤڈ اسپیکر پر اذان دی۔ جماعت کے وقت ایک امام اور دو آدمی مقامی تھے اور میرے علاوہ تین چار اور پاکستانی تھے۔ نماز پڑھنے کے بعد ہم نے امام سے دریافت کیا کہ کیا وجہ ہے، اتنی بڑی مسجد اور نمازی نہیں ہیں؟ اس نے کہا کہ یہ مسجد شہر سے الگ ہے، آبادی ذرا دور ہے۔ میں نے کہا کہ مسجد کے ساتھ جو کمرے ہیں، ان میں لوگ رہتے ہیں یا نہیں؟ کہنے لگا اس میں فوجی رہتے ہیں۔ میں نے کہا، وہ مسلمان ہیں؟ اس نے کہا، ہاں مسلمان ہیں۔ میں نے کہا، انھوں نے اذان سنی ہے؟ مسجد کے کمروں میں رہتے ہیں اور نماز نہیں پڑھی۔ اس نے بہت بڑی گالی دے کر کہا کہ اگر یہ نمازی ہوتے تو ہمیں یہودیوں سے ذلیل کراتے؟ (ذخیرۃ الجنان ۲۲۶/۳، ۲۲۷)

○ ایک دفعہ میں لندن سے واپس آ رہا تھا۔ میرے ساتھیوں نے ٹکٹ پر لکھوا دیا کہ جہاز میں کھانا نہیں کھائیں گے اور مجھے بھی بتا دیا کہ ہم نے آپ کے ٹکٹ پر یہ لکھوا دیا ہے، کیونکہ یہ جہاز برطانیہ کا ہے۔ اس باورچی خانے میں اگرچہ پکانے والے سلمانوں کے لیے گائے، بکری اور مرغی کا گوشت پکائیں گے، مگر ہانڈی میں چلانے والا چمچہ مشترک ہوتا ہے کہ خنزیر کی ہانڈی میں بھی وہی چلاتے ہیں۔ بارہ تیرہ گھنٹوں کا سفر تھا۔ جب کھانے کا وقت ہوا تو میں نے کہا کہ میں نے نہیں کھانا۔ وہ میری بات نہ سمجھ سکی، چونکہ وہ اردو نہیں جانتی تھی۔ وہ اردو سمجھنے والی کو لے آئی۔ اس نے پوچھا، بابا جی! آپ کھانا کیوں نہیں کھاتے؟ میں نے کہا، بس میں نے کہا کہ نہیں کھانا۔ کہنے لگی: آپ کے ذہن میں جو خدشہ ہے، وہ ہم نہیں لائیں گی۔ ہم آپ کے لیے مرغی یا بکری کا گوشت لے آتے ہیں۔ میں نے اس کا بھی انکار کر دیا۔ ان کے لیے مصیبت بن گئی۔ ایک جاتی ہے اور دوسری آتی ہے۔ جس طرح گھروں میں بڑوں کو راضی کیا جاتا ہے، مجھے راضی کرنے کے لیے لائن لگ گئی۔ میں نے کہا: بارہ تیرہ گھنٹے بھوکا رہنے سے میں نہیں مرتا، آپ لوگ پریشان نہ ہوں۔ کہنے لگیں: کوئی سبزی لے آئیں؟ تو میں نے کہا ٹھیک ہے، سبزی لے آؤ مگر سور والا چمچہ نہ استعمال کرنا۔ تب جا کر کہیں ان کو سکون آیا۔ اس سے ان کے اخلاق کا اندازہ لگائیں۔

یہ تو انگریز تھے۔ اب مسلمانوں کا حال بھی سن لو۔ جب میں ابوظہبی اترا، نماز میں نے پڑھنی تھی اور تھا میں باوضو۔ رومال میں نے کندھے پر رکھا ہوا تھا۔ ایک افسر کو بلا کر میں نے کہا: ارنی جهة القبلة ارید الصلوة، مجھے قبلہ کا رخ بتا دیں، میں نے نماز پڑھنی ہے۔ اس نے کوئی پروا نہ کی۔ دوسرے سے پوچھا، وہ بھی بڑبڑ کرتا ہوا چلا گیا اور بتایا نہیں۔ پھر ایک اور افسر آیا۔ اس نے بڑی پیٹی اور کندھے پر پھول لگائے ہوئے تھے۔ میں نے اس کو سلام کیا اور اس کا بازو پکڑا اور کہا کہ میں مسافر ہوں، میں نے نماز پڑھنی ہے، مجھے قبلہ کا رخ بتا دو۔ اس نے بڑے ترش لہجہ میں کہا: "ھـنـا"، ادھر ہے۔ میں نے کہا، ان کا اخلاق دیکھو اور ان کا اخلاق دیکھو، کتنا فرق ہے۔ (ذخیرۃ الجنان، ۳۱۰/۶)

○ گزشتہ سال علاج وغیرہ کے سلسلہ میں مجبوری کے تحت برطانیہ جانا ہوا، مگر ناکام ہو کر لوٹ آیا کیونکہ مصارف کی بھاری چٹان اٹھانے کے قابل نہیں تھا۔ بس یوں سمجھیے کہ کرایہ کے تاوان کے نیچے دب کے آ گیا۔ (مکتوب بنام مولانا عبد الدیان کلیم، ۲۶ر صفر ۱۴۰۸ھ / ۲۰ر اکتوبر ۱۹۸۷ء)

○ اللہ تعالیٰ کے خصوصی فضل و کرم سے راقم اثیم خیر و عافیت کے ساتھ افریقہ اور عمرہ کے سفر سے واپس آ گیا ہے۔ ربیع الاول سے قبل عمرہ کی اجازت خاصا مسئلہ تھا، مگر اللہ تعالیٰ کی خصوصی مدد سے اور ظاہری طور پر افریقہ کے ساتھیوں کی کوشش سے کامیابی ہوئی اور عمرہ ہو گیا۔ الحمد للہ علیٰ ذالک۔ آنے کے بعد طبیعت نزلہ زکام وغیرہ کی وجہ سے خاصی بگڑ گئی تھی۔ اب بفضلہٖ تعالیٰ قدرے آرام ہے۔ سفر میں میرے ساتھ حضرت مولانا محمد جمیل خان صاحب تھے۔ انھوں نے سارا سفر نامہ لکھا ہے، بلکہ جہاں جہاں بیانات ہوتے رہے، اکثر وہ بھی لکھے ہیں اور کہتے تھے کہ یہ 'الشریعہ' میں شائع کرانا ہے۔ (مکتوب بنام مولانا زاہد الراشدی، تاریخ ندارد)

○ کوئٹہ پہلے بڑا اہم شہر ہوتا تھا۔ ۳۱ر مئی ۱۹۳۵ء میں جب وہاں زلزلہ آیا تو کوئٹہ تباہ ہو گیا۔ ہزاروں کی تعداد میں لوگ تباہ و برباد ہو گئے۔ مجھے باسٹھ سال کے بعد پھر کوئٹہ جانا پڑا۔ میں نے غرق ہونے سے پہلے کوئٹہ دیکھا تھا۔ اب جب کہ دیکھا تو وہ پہلے سے بھی زیادہ بارونق تھا۔ (ذخیرۃ الجنان ۳۱۵/۲)

○ اجلاس صد سالہ دار العلوم دیوبند (انڈیا) ۳، ۴، ۵ جمادی الاولیٰ ۱۴۰۰ھ / ۲۱، ۲۲، ۲۳ مارچ ۱۹۸۰ء کو منعقد ہوا۔ راقم اثیم کو بھی شرکت کا موقع اور شرف حاصل ہوا۔ راقم اثیم اپنے برادر عزیز صوفی عبد الحمید سلمہ اللہ تعالیٰ کی معیت میں دیوبند میں حضرت مولانا سید محمد انظر شاہ صاحب دام مجدہم (جو حضرت مولانا سید محمد انور شاہ صاحب کشمیری رحمہ اللہ تعالیٰ کے فرزند ہیں) کے

دولت کدہ پر ملاقات کے لیے حاضر ہوا تو دیکھا کہ وہاں پاک و ہند کے مقتدر علماء کرام اور پروفیسر حضرات خاصی تعداد میں جمع ہیں۔ راقم اثیم نے جب اپنا نام بتایا تو حضرت شاہ صاحب دام مجدہم بڑی محبت اور عقیدت سے اٹھ کر ملے اور بھری مجلس میں یہ فرمایا کہ یہ امیر الموحدین ہیں جنھوں نے توحید و سنت پر ٹھوس اور مدلل علمی کتابیں لکھی ہیں اور یہ ''عمدۃ الاثاث'' کے مصنف ہیں جس کے ذریعے بعض علماء کرام کے شکوک وشبہات دور ہو گئے ہیں۔ کثرت ہجوم کی وجہ سے زیادہ وقت حضرت شاہ صاحب موصوف سے گفتگو کا نہیں مل سکا، لیکن حضرت شاہ صاحب موصوف کے ان جملوں سے یہ بات بالکل آشکارا ہو جاتی ہے کہ حضرت نے، جو خود بھی بہترین مدرس اور محقق عالم ہیں، اس کتاب کو بہت پسند فرمایا ہے۔ (عمدۃ الاثاث ص ۷، ۸)

○ [دار العلوم دیوبند کے صد سالہ اجلاس کے موقع پر] مجمع لاکھوں کا تھا اور پگڑیاں ہزاروں کو ملنا تھیں۔ اس کارروائی کا افتتاح محترم قاری محمد طیب صاحبؒ اور مولانا محمد منت اللہ صاحب کی دستار بندی سے ہوا اور پھر مولانا عبد الحق صاحبؒ اور بعد میں آپ [مولانا قاضی شمس الدینؒ] کا نمبر آیا۔ چونکہ ہزاروں لوگوں کو دستار بندی کرانا بہت ہی مشکل تھا، کچھ حضرات کو اسٹیج پر اور باقی حضرات کو اسٹیج سے نیچے پگڑیاں ہاتھوں میں دی گئیں۔ اور بحمد اللہ تعالیٰ سواتی برادران اسٹیج پر ہی تھے اور براہ راست اسٹیج پر پگڑیاں ملیں۔ ہم سے یہ نہیں کہا گیا کہ جاؤ، دار الاہتمام سے پگڑیاں لے لو۔ (الشہاب المبین، ص ۴۵)

۵۳ء کی تحریک ختم نبوت میں جیل کے واقعات

○ راقم اثیم تحریک ختم نبوت کے دور میں پہلے گوجرانوالہ جیل میں، پھر نیو سنٹرل جیل ملتان میں کمرہ نمبر ۱۴ میں مقید رہا۔ ہماری بارک نمبر ۶ دو منزلہ تھی اور اس میں چار اضلاع کے قیدی تھے اور سبھی علما، طلبا، تاجر اور پڑھے لکھے لوگ تھے جو دین دار تھے۔ اضلاع یہ ہیں: ضلع گوجرانوالہ، ضلع سیالکوٹ، ضلع سرگودھا اور ضلع کیمبل پور (فی الحال ضلع اٹک)۔ بحمد اللہ تعالیٰ جیل میں بھی پڑھنے پڑھانے کا سلسلہ جاری تھا۔ راقم اثیم قرآن کریم کا ترجمہ، موطا امام مالک، شرح نخبۃ الفکر اور حجۃ اللہ البالغہ وغیرہ کتابیں پڑھاتا رہا۔ دیگر حضرات علمائے کرام بھی اپنے اپنے ذوق کے اسباق پڑھتے پڑھاتے رہے۔ آخر میں راقم اثیم کمرہ میں اکیلا رہتا تھا، کیونکہ باقی ساتھی رہا ہو چکے تھے اور میں قدرے بڑا مجرم تھا۔ تقریباً دس ماہ جیل میں رہا اور ڈاکٹر غلام جیلانی برق صاحب کی تردید میں بجواب دو اسلام ''صرف ایک اسلام'' وہاں ملتان جیل ہی میں راقم اثیم نے لکھی تھی۔ (توضیح المرام فی نزول المسیح علیہ السلام، ص ۱۲، ۱۳)

○ تحریک ختم نبوت میں، میں سنٹرل جیل ملتان میں تھا کیوں کہ وہ کئی ضلعوں کی جیل تھی۔ میرے ساتھ میرے استاد مولانا عبد القدیر صاحب بھی تھے۔ جیل میں تقریباً دو ہزار اخلاقی قیدی تھے اور دو سو سے زائد ہم تحریکی قیدی تھے جن میں علما، طلبہ، وکلا، تاجر اور عوام تھے۔ جیل کا سپرنٹنڈنٹ اسلم خان چھچھ کے علاقے کا رہنے والا اور ہمارے استاد مولانا عبد القدیر کے دیہات کا قریبی تھا۔ ایک دوسرے کو جانتے تھے۔ سیٹی بجی، دروازے بند ہو گئے۔ سپاہیوں نے کہا کہ دورہ ہے، اس لیے دروازے بند ہو گئے ہیں۔ سپرنٹنڈنٹ آ رہا ہے، وہ قیدیوں سے حالات پوچھے گا کہ کسی کو کوئی تکلیف تو نہیں ہے۔ چنانچہ اسلم خان نے آ کر سلام کیا اور پوچھا کہ مولانا! کوئی تکلیف تو نہیں ہے؟ مولانا نے فرمایا، الحمد للہ ہم آرام سے ہیں، ہمیں کوئی تکلیف نہیں ہے۔ سپرنٹنڈنٹ نے کہا کہ تمہارے ساتھیوں کی طرف سے میرے پاس ایک درخواست آئی ہے جس میں لکھا ہے کہ ہم وعدہ کرتے ہیں کہ ختم نبوت کا عقیدہ رکھیں گے، لیکن درس، جمعہ اور تقریر میں بیان نہیں کریں گے لہٰذا ہمیں جیل سے

نکال دو۔ یہ بات کر کے اسلم خان مسکرایا اور کہنے لگا: مولانا! یہ لوگ کتنے سادہ ہیں، ان کو یہ معلوم نہیں ہے کہ یہ مرکزی حکومت کے قیدی ہیں۔ میں کون ہوتا ہوں ان کو نکالنے والا۔ ان کو تو گورنر بھی نہیں نکال سکتا۔ میں تو قیدیوں کا چوکیدار ہوں کہ کتنے قیدی میرے پاس ہیں اور ان کا حال کیا ہے۔ پھر کہنے لگا: مولانا! میرے پاس دو ہزار سے زیادہ اخلاقی قیدی ہیں، کسی نے اتنی کمزوری نہیں دکھائی جتنی تمہارے مولویوں نے دکھائی ہے۔ ہم نے مولانا عبد القدیرؒ سے کہا کہ حضرت! آپ ان سے مولویوں کے نام مہیا کریں تاکہ پتہ چلے کہ کون کون سے مولوی صاحبان ہیں۔ دو چار دن کے بعد مولانا سپرنٹنڈنٹ سے ملے اور کہا کہ وہ جو میرے دوست مولوی حضرات ہیں جنہوں نے درخواست دی ہے، ان کے نام مطلوب ہیں۔ وہ کہنے لگا، میں امین ہوں، بتلا نہیں سکتا۔ مولانا نے فرمایا کہ میں نے ضرور لینے ہیں۔ چونکہ اس سے سابقہ تعارف تھا، اس نے نام بتلا دیے۔ مولانا نام نوٹ کر کے لائے۔ یقین جانیں سارے حلوہ خور ہی تھے، اہل حق میں سے ایک بھی نہیں تھا، حالانکہ ہم بی کلاس میں تھے، کوئی مشقت نہیں تھی۔ دوسروں کی نسبت کھانا بھی اچھا ملتا تھا اور وہاں ہم پڑھتے پڑھاتے بھی تھے۔ چار سبق میں پڑھاتا تھا۔ ترجمہ، موطا امام مالک، حجۃ اللہ البالغہ، نخبۃ الفکر، ہدایہ وغیرہ کتابوں کے اسباق ہوتے تھے۔ سوائے اس کے کہ ہم گھر کے افراد سے جدا تھے، اور کوئی تکلیف نہیں تھی، مگر پھر بھی حلوہ خوروں کا یہ حال تھا کہ درخواست لکھ ڈالی۔ چونکہ میں بڑے مجرموں میں تھا، اس لیے دس ماہ بعد رہا ہوا۔ باقی ساتھی کوئی پانچ ماہ بعد، کوئی چھ ماہ بعد اور کوئی سات ماہ بعد رہا ہو گئے۔

(ذخیرۃ الجنان، ۷/۲۰۱)

○ جیل میں میرے استاد محترم حضرت مولانا عبد القدیر بھی تھے۔ عید کا دن تھا۔ افسر ہمارے پاس آئے اور کہنے لگے کہ عید کی نماز پڑھائیں۔ ہم نے کہا کہ جی، جیل کے اندر نہ جمعے کی نماز ہے اور نہ عید کی نماز۔ جمعے کے لیے شرط ہے اذن عام، لوگ آ جا سکیں۔ جیل میں ہم بی کلاس میں تھے اور دوسرے سی کلاس میں تھے۔ ہم ایک دوسرے سے مل نہیں سکتے تھے۔ ادھر اذن عام کا یہ عالم تھا کہ ہم سب کا ایک ہی جرم تھا، وہ بھی ختم نبوت کی تحریک میں آئے تھے، ہم بھی ختم نبوت کی تحریک میں آئے تھے، لیکن ہمیں ان سے ملنے کی اجازت نہیں تھی اور انھیں ہم سے ملنے کی اجازت نہیں تھی۔ ہم نے جمعہ نہیں پڑھا، عید بھی نہیں پڑھی۔ جہاں جمعہ نہیں، وہاں عید نہیں۔ مولانا عبد القدیر اوپر چڑھے تھے اور میں نیچے تھا۔ مولانا نے فرمایا، میاں! جلدی آؤ۔ یہ ان کا تکیہ کلام تھا۔ بڑی لمبی چوڑی جیل تھی۔ میں دوڑا بھاگا سیڑھیوں سے چڑھ کر اوپر گیا۔ سامنے منظر نظر آتا تھا۔ فرمایا، میاں! دیکھو کیا کر رہے ہیں۔ عید کا دن تھا۔ افسر بھی خاصے تھے۔ سنٹرل جیل تھی۔ کئی علاقوں کے قیدی اور افسر بھی تھے۔ تو ادھر عید کے لیے اذان ہو رہی تھی۔ مولانا صاحب نے کہا کہ میاں دیکھو۔ فرمانے لگے کہ قیدیوں پر ہمارا کوئی شکوہ نہیں۔ کوئی چور ہے، کوئی ڈاکو ہے، کوئی قاتل ہے، کوئی کچھ ہے، کوئی کچھ ہے۔ افسوس ان افسروں پر ہے جو دو سو سے زیادہ ہیں، جیل کے سنٹرل آئی جی بھی موجود تھے۔ افسوس ان پڑھے لکھے افسروں پر ہے جن کو یہ بھی معلوم نہیں کہ عید کی نماز کے لیے اذان نہیں ہوتی۔ (خطبات امام اہل سنت ۲/۲۴۹، ۲۵۰)

○ تحریک ختم نبوت کے زمانے میں تحریک ختم نبوت کی پیروی کرنے والے لاہور ہائی کورٹ میں وکیل محمد انور صاحب ہوتے تھے۔ بعد میں جج بنے۔ اب فوت ہو گئے ہیں۔ ہمیں حکم ہوا تھا کہ ان کو مسائل کی تیاری کراؤ۔ ایک مولانا لال حسین اختر صاحب مرحوم تھے۔ ایک مولانا عبد الرحمن میانوی مرحوم تھے۔ عربی باتیں جتنی تھیں، وہ میرے سپرد تھیں کہ اس کا

مطلب آپ نے وکیل کو بتانا ہے۔ اس وقت تین جج تھے۔ محمد خیر صاحب، ایم آر کیانی صاحب اور ایک محمود صاحب۔ اس وقت ہم عدالت میں بیٹھے ہوئے تھے۔ [جج کے کمرۂ عدالت میں آنے پر] وہ مجھے پکڑ پکڑ کر اٹھاتے تھے، میں اپنی جگہ سے نہ ہلتا۔ ہائی کورٹ میں کیانی بڑے زیرک آدمی تھے، وہ دیکھ کر مسکرائے۔ کارندے آتے اور آ کر مجھے کہیں اٹھ۔ میں نہ اٹھتا تھا۔ بہرحال ایسی افراط وتفریط کی بات ہو تو پھر بات ہے۔ افراط وتفریط نہ ہو تو پھر بڑے کے لیے اٹھ کھڑے ہونا کوئی جرم کی بات نہیں۔ (خطبات امام اہل سنت ۲/۲۷۲)

خواب میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی زیارت

○ ۱۳۷۳ھ/۱۹۵۳ء میں [ملتان جیل میں اسارت کے دوران] تقریباً سحری کا وقت تھا کہ خواب میں مجھ سے کسی نے کہا کہ حضرت عیسیٰ علیہ الصلوۃ والسلام آ رہے ہیں۔ میں نے پوچھا کہ کہاں آ رہے ہیں؟ تو جواب ملا کہ یہاں تمہارے پاس تشریف لائیں گے۔ میں خوش بھی ہوا کہ حضرت کی ملاقات کا شرف حاصل ہوگا اور کچھ پریشانی بھی ہوئی کہ میں تو قیدی ہوں، حضرت کو بٹھاؤں گا کہاں اور کھلاؤں پلاؤں گا کیا؟ پھر خواب ہی میں یہ خیال آیا کہ راقم کے نیچے جو دری، نمدہ اور چادر ہے، یہ پاک ہیں، ان پر بٹھاؤں گا۔ خواب میں یہ سوچ ہی رہا تھا کہ اتنے میں حضرت عیسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام اور ان کے ساتھ ان کا ایک خادم تشریف لائے۔ حضرت عیسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام کا سر مبارک ننگا تھا، چہرہ اقدس سرخ اور ڈاڑھی مبارک سیاہ تھی۔ لمبا سفید عربی طرز کا کرتا زیب تن تھا اور نظر نہیں آتا تھا، مگر محسوس یہ ہوتا تھا کہ نیچے حضرت نے جانگیہ اور نیکر پہنی ہوئی ہے۔ اور آپ کے خادم کا لباس سفید تھا، فٹ کرتا اور قدرے تنگ شلوار اور سر پر سفید اور اوپر کو ابھری ہوئی نوک دار ٹوپی پہنے ہوئے تھے۔ راقم اثیم نے اپنے بستر پر، جو زمین پر بچھا ہوا تھا، دونوں بزرگوں کو بٹھلایا۔ نہایت ہی عقیدت مندانہ طریقہ سے علیک سلیک کے بعد راقم اثیم نے حضرت عیسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام سے مودبانہ طور پر کہا کہ حضرت! میں قیدی ہوں، اور کوئی خدمت نہیں کر سکتا، صرف قہوہ پلا سکتا ہوں۔ حضرت نے فرمایا، لاؤ۔ میں خواب ہی میں فوراً تنور پر پہنچا جہاں روٹیاں پکتی تھیں۔ میں نے اس تنور پر گھڑا رکھا اور اس میں پانی، چائے کی پتی اور کھانڈ ڈالی۔ اور تنور خوب گرم تھا، جلدی ہی میں قہوہ تیار ہو گیا۔ راقم اثیم خوشی خوشی لے کر کمرہ میں پہنچا اور قہوہ دو پیالیوں میں ڈالا اور یوں محسوس ہوا کہ اس میں دودھ بھی پڑا ہوا ہے۔ بڑی خوشی ہوئی۔ ان دونوں بزرگوں نے چائے پی۔ پھر جلدی سے حضرت عیسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام اٹھ کھڑے ہوئے اور خادم بھی ساتھ اٹھ گیا۔ میں نے التجا کی کہ حضرت، ذرا آرام کریں اور ٹھہریں تو حضرت علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا: ہمیں جلدی جانا ہے، پھر ان شاء اللہ العزیز جلدی آ جائیں گے۔ یہ فرما کر رخصت ہو گئے۔

راقم اثیم اس خواب سے بہت ہی خوش ہوا۔ فجر ہوئی اور ہمارے کمرے کھلے تو راقم اثیم استاد محترم حضرت مولانا عبد القدیر صاحب کی خدمت میں حاضر ہوا اور حضرت بھی تحریک ختم نبوت کے سلسلہ میں ہمارے ساتھ جیل میں مقید تھے اور ان کے سامنے خواب بیان کیا۔ حضرت نے فرمایا، میاں! تمہیں معلوم ہے کہ حضرات انبیاء کرام اور فرشتوں علیہم الصلوٰۃ والسلام کی (جو تمام معصوم ہیں) شکل وصورت میں شیطان نہیں آ سکتا۔ واقعی تم نے حضرت عیسیٰ علیہ الصلوۃ والسلام ہی کو دیکھا ہے اور میاں! ہو سکتا ہے کہ تمہاری زندگی ہی میں تشریف لے آئیں۔

راقم اثیم نے دوسری مرتبہ حضرت عیسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام کو خواب میں دیکھا کہ حضرت شلوار پہنے ہوئے تھے اور گھٹنوں

سے ذرا نیچے تک قمیص زیب تن تھی اور سر مبارک پر سادہ سا کلہ، اوپر پگڑی باندھے ہوئے تھے اور کوٹ میں جو گھٹنوں سے نیچے تھا، ملبوس تھے اور بڑی تیزی سے چل رہے تھے۔ راقم اثیم کو پتہ چلا کہ حضرت عیسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام جا رہے ہیں تو راقم اثیم بھی پیچھے پیچھے چل پڑا اور سلام عرض کیا۔ یوں محسوس ہوا کہ بہت آہستہ سے جواب دیا اور رفتار برقرار رکھی۔ راقم بھی ساتھ ساتھ چلتا رہا۔ کافی دور جانے کے بعد زور زور کی بارش شروع ہو گئی۔ حضرت اس بارش میں بیٹھ گئے اور اوپر ایک سفید رنگ کی چادر تان لی۔ کافی دیر تک مغموم اور پریشان حالت میں بیٹھے رہے۔ پھر بارش میں ہی اٹھ کر کہیں تشریف لے گئے اور پھر نظر نہ آئے۔

اس خواب کے چند دنوں بعد مہاجرین فلسطین کے دو کیمپوں صابرہ اور شتیلہ کا واقعہ پیش آیا کہ یہودیوں نے تقریباً بتیس ہزار مظلوم مسلمان مردوں، عورتوں، بوڑھوں، بچوں اور مریضوں کو گولیوں سے بھون ڈالا۔ اس واقعہ کے پیش آنے کے بعد راقم اثیم خواب کی تعبیر سمجھا کہ حضرت عیسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام کا شدید بارش میں چادر اوڑھ کر بیٹھنا اور پریشان ہونا اس کی طرف اشارہ تھا کہ تقریباً ستر لاکھ ظالم یہودیوں کے ہاتھوں تقریباً تیرہ کروڑ کی، آس پاس کی مسلمان حکومتوں کی موجودگی میں، جنھوں نے بے غیرتی کا مظاہرہ کیا اور مصلحت کی چادر اوڑھ رکھی ہے، مظلوم مسلمانوں پر بارش کی طرح گولیوں کی بوچھاڑ ہو رہی ہے، مگر یہ بے غیرت خاموش ہیں اور ان کی بے غیرتی اور بے حسی وامریکہ پرستی کی لعنت تا ہنوز ان پر چھائی ہوئی ہے۔ اللہ تعالیٰ ان کو شرم وغیرت کی دولت عطا فرمائے۔ آمین

ان دو خوابوں میں راقم اثیم نے حضرت عیسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام کی ملاقات کا شرف حاصل کیا۔ اور بحمد اللہ تعالیٰ کارگل کی لڑائی سے چند دن پہلے تیسری مرتبہ بھی حضرت عیسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام کو خواب میں دیکھا ہے۔ آپ سفید لباس میں ملبوس تھے۔ اوپر واسکٹ تھا۔ سر مبارک ننگا تھا اور عینک لگائے ہوئے تھے۔ ملاقات ہوتے ہوئے آپ فوراً کہیں چلے گئے اور آپ کے اردگرد کچھ مستعد نوجوان تھے اور خاصی تعداد میں میلے اور ڈھیلے لباس والے طالبان قسم کی مخلوق تھی جو آپ کے حکم کی منتظر تھی۔ (توضیح المرام فی نزول المسیح علیہ السلام، ص ۱۲ تا ۱۵)

بعض تصانیف کا پس منظر

○ ۲۴ رجولائی ۱۹۴۴ء کو مقام گکھڑ سے ایک ماہ کی چھٹی لے کر بعض مخلص احبہ (جناب حکیم فضل داد خاں عباسی وجناب مولانا محمد عسکری فاضل دیوبند) کے اصرار پر کوہ مری گیا۔ وہاں میرا پہنچنا ہی تھا کہ بعض مقامی مشہور مسائل میرے سامنے پیش ہوئے جن میں سے بعض تو ایسے لچر پوچ تھے کہ جن کی نسبت کسی ذی علم کی طرف عیب قبیح ہے۔..... من جملہ ان مسائل کے ایک مسئلہ یہ بھی تھا.... کہ بنی ہاشم (سادات) کو زکوۃ لینی جائز ہے۔ وہاں کے ایک بہت بڑے امام مسجد نے (جو وہاں کے علاقہ میں مانے ہوئے ہیں اور سب ائمہ مساجد کے سردار ہیں) اپنے ایک حواری کو ایک رقعہ دیا کہ جا کر راقم الحروف کو بتلاؤ کہ ہم عباسی ہیں اور ہمارے لیے زکوۃ لینا جائز ہے۔ دیکھو نہر الفائق اور جامع الرموز اور انواع مولوی عبد اللہ وغیرہ میں لکھا ہے۔ احقر نے وہاں جو کتب حدیث وفقہ دست یاب ہو سکیں، ان کی طرف مراجعت کی، چنانچہ مشکوۃ شریف اور فتاوی قاضی خان اور عالمگیری وغیرہ کا مطالعہ کیا تو ان میں لکھا تھا کہ بنو ہاشم کے لیے زکوۃ وصدقات جائز نہیں، البتہ نور الایضاح میں لکھا تھا کہ امام طحاوی رحمہ اللہ تعالیٰ جواز کے قائل ہیں۔ احقر کو کچھ شبہ سا پڑ گیا۔ جب میں واپس اپنی جائے رہائش مقام گکھڑ ضلع گوجرانوالہ آیا تو بعض علما سے پوچھا کہ کیا امام طحاویؒ اس کے قائل ہیں تو انھوں نے بھی کہہ دیا کہ ہاں،

امام طحاویؒ اس کے قائل ہیں۔ میں نے جب امام طحاوی کی مشہور تصنیف شرح معانی الآثار دیکھی تو مجھے وہ مطلب جو علماے کرام بیان فرما رہے تھے، سمجھ نہ آیا بلکہ یہی سمجھ آیا کہ امام طحاویؒ بھی عدم جواز کے قائل ہیں۔ چنانچہ میں نے جب اپنے دلائل پیش کیے تو بعض علما نے وہ باب جو امام طحاوی نے صدقات علیٰ بنی ہاشم پر قائم کیا ہے، دوبارہ اور سہ بارہ دیکھا۔ بعض نے تو سکوت اختیار کیا اور بعض نے کہا کہ جیسی یہ عبارت ہے، اس سے تو وہی مطلب سمجھا جاتا ہے جس کو تم (یعنی احقر راقم الحروف) سمجھے ہو، مگر چونکہ ہم نے اپنے اساتذہ سے اور فلاں فلاں عالم سے سنا ہے کہ امام طحاویؒ جواز کے قائل ہیں، اس لیے ممکن ہے کہ کتاب کا کوئی دوسرا نسخہ صحیح ہو اور اس میں یہ عبارت صحیح لکھی گئی ہو۔ پھر احقر کو شبہ پڑا اور متعدد مطابع کے چھپے ہوئے نسخے جو میسر ہو سکے، دیکھے مگر وہی عبارت ملی۔ مطلب حل نہ ہوا اور اس کے لیے ایک لمبا سفر دار العلوم دیو بند کا احقر نے اختیار کیا۔ وہاں بعض علما نے مراجعت کی اور بعض کتب جو میسر ہو سکیں، ان سے ضروری اقتباسات .... لکھ کر لایا۔ کچھ کتب گوجرانوالہ حضرت مولانا عبد العزیز صاحبؒ (المتوفی ۱۳۵۹ھ) کے کتب خانہ سے میسر ہوئیں۔ وہ علماء کرام جن سے مجھے اس مسئلہ میں مدد ملی، بعض یہ ہیں:

۱۔ حضرت مولانا مفتی عبد الواحد صاحب خطیب جامع مسجد گوجرانوالہ، ۲۔ جناب استاذی وسابق مفتی دار العلوم دیو بند حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب دیو بندیؒ، ۳۔ اور جناب استاذی مولانا الحافظ الحاج محمد ادریس صاحب سابق مدرس دار العلوم دیو بند۔ اللہ تعالیٰ ان سب کو جزائے خیر عطا فرمائے۔ آمین (الکلام الحاوی فی تحقیق عبارۃ الطحاوی ص ۱۳ تا ۱۶)

○ عالم اسلام کی دنیا میں سب سے بڑی خالص اسلامی یونیورسٹی اور مرکز علوم دینیہ دار العلوم دیو بند (بھارت) کے حضرت مہتمم صاحب دام مجدہم کے یکے بعد دیگرے تین عدد دعوت نامے راقم اثیم کے نام بذریعہ ڈاک آئے کہ دار العلوم دیو بند کے معزز ارکان شوریٰ کے فیصلہ کے مطابق ۲۹، ۳۰، ۳۱؍ اکتوبر ۱۹۸۶ء کو دار العلوم کے زیر اہتمام تحفظ ختم نبوت کے موضوع پر ایک عالمی اجلاس طے ہوا ہے جس میں تمہاری شمولیت بھی ضروری ہے اور ذیل کے عنوانات میں سے کسی ایک پر ایک مقالہ تحریر کر کے ۲۰؍ اکتوبر تک دار العلوم دیو بند بھیج دیں۔ اور مقالہ فل اسکیپ سائز کے سات صفحات پر مشتمل ہونا چاہیے، یا اگر مقالہ مفصل ہو تو چار پانچ صفحات میں اس کی تلخیص فرما دی جائے تا کہ اس کو ۱۲ منٹ میں پیش کیا جا سکے۔ چونکہ راقم اثیم ۳؍ ستمبر ۱۹۸۶ء سے ۲۵ ستمبر تک برطانیہ کے دورے پر تھا اور مدرسہ نصرۃ العلوم گوجرانوالہ میں اسباق کے خلاف معمول کافی ناغے ہو چکے تھے، اس لیے خود دار العلوم دیو بند جانے کے سلسلے میں خاصا متردد تھا، مگر بفضل اللہ تعالیٰ مقالہ ان کے انتخاب کردہ عنوانات کے تحت نمبر ۱۰ ''ختم نبوت کتاب وسنت کی روشنی میں'' پر لکھنا شروع کر دیا۔ اور معلوم ہوا کہ عزیزم زاہد الراشدی اور عزیزم محمد عبد القدوس خاں قارن سلمہما اللہ تعالیٰ اپنے چند دیگر رفقا کے ساتھ اس اجتماع پر دار العلوم جانے کا عزم بالجزم کر چکے ہیں اور ویزے حاصل کرنے کے لیے درخواستیں بھی دے چکے ہیں۔ بے حد مصروفیت کی وجہ سے مقالہ ۲۰؍ اکتوبر تک تیار نہ ہو سکا تا کہ بذریعہ ڈاک دار العلوم دیو بند ارسال کر دیا جاتا۔ دل مطمئن تھا کہ ان شاء اللہ العزیز تکمیل کے بعد یہ مقالہ دار العلوم دیو بند بھیج دیا جائے گا جو وہاں اجلاس میں پڑھ کر سنا دیا جائے گا، مگر عزیزوں کے طے شدہ پروگرام کے مطابق روانگی سے ایک دن پہلے معلوم ہوا کہ انڈیا نے سرحدوں کی کشیدگی کا بہانہ بنا کر ان کے ویزوں کی درخواستیں مسترد کر دی ہیں اور مرکزی حضرات میں سے جن دو چار خوش نصیبوں کو جانے کی اجازت ملی تو وہ چلے گئے اور ہمیں ان کے جانے کا

علم نہ ہو سکا۔ (ختم نبوت کتاب وسنت کی روشنی میں، ص ۷، ۸)

○ ہمارے ایک محترم بزرگ اور مکرم استاد مولانا مفتی محمد شفیع رحمۃ اللہ علیہ نے، جن کی علمی شہرت اور فقہی کمال پاک وہند کے علاوہ ایک بین الاقوامی حیثیت رکھتا ہے، راقم اثیم کو یہ تلقین فرمائی اور اس امر کی طرف خصوصی توجہ دلائی کہ مولوی احمد رضا خان صاحب بریلی (المتوفی ۱۳۴۰ھ) نے قرآن پاک کا جو ترجمہ لکھا ہے، اس کی طرف توجہ کرنا ضروری ہے۔ بہت سے اہل علم سے سنا ہے کہ انھوں نے ترجمہ میں بعض مقامات پر خالص سینہ زوری اور تحریف کی ہے اور علاوہ ازیں ان کے مایہ ناز شاگرد مولوی نعیم الدین صاحب مراد آبادی (المتوفی ۱۳۶۷ھ) نے اس کا جو مفصل حاشیہ لکھا ہے،.... اس حاشیہ اور تفسیر کا بھی علمی اور تحقیقی طور پر جائزہ لینا چاہیے کہ اگر ان میں کوئی چیز دینی طور پر قابل گرفت ہو جس سے عوام الناس کے عقائد پر اثر پڑتا ہے اور ان کے اعمال وعبادات بگڑنے کا خطرہ ہو تو بروقت یہ فریضہ ادا کیا جائے تا کہ کتمان حق اور نہی عن المنکر کی کوتاہی کے وبال میں ہم نہ آ جائیں۔ باوجود بے حد مصروفیت اور علالت وکاہلی کے اپنی بے بضاعتی اور بے مائیگی کے ساتھ سردست صرف سرسری طور پر ہی طائرانہ نگاہ ڈالی جا سکی ہے۔..... اس میں استاد محترم کے حکم کی تعمیل کے علاوہ مقدم طور پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث بھی پیش نظر ہے۔ (تنقید متین بر تفسیر نعیم الدین ص ۱۱، ۱۲)

بعض دلچسپ مکالمے

○ ایک مرتبہ سردی کے موسم میں مدرسہ نصرۃ العلوم سے سبق پڑھا کر گکھڑ میں اپنی رہائش گاہ پر واپس پہنچا تو کسی نے دروازے پر دستک دی۔ میں نے دروازہ کھولا تو دروازہ کھٹکھٹانے والے صاحب نے مجھے بتلایا کہ ایک پادری نے مجمع لگایا ہوا ہے اور لوگوں کو عیسائیت کی دعوت دے رہا ہے اور لوگ اس کے دلائل کے سامنے لاجواب ہیں۔ میں نے بائبل اٹھائی اور اس آدمی کے ساتھ چل پڑا۔ جب میں پہنچا تو لوگوں کا ایک جم غفیر اس پادری صاحب کے ارد گرد جمع تھا اور وہ بڑی زوردار آواز میں لوگوں کو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی تعلیمات پر ایمان لانے کی دعوت دے رہا تھا۔ میں نے آگے بڑھ کر عرض کی کہ پادری صاحب! آپ لوگوں کو کس چیز کی دعوت دے رہے ہیں؟ پادری بولا: میں لوگوں کو یسوع مسیح کی تعلیمات پر ایمان لانے کی دعوت دے رہا ہوں۔ میں نے کہا کہ پادری صاحب، یہ بائبل جو میرے ہاتھ میں ہے، اس پر آپ کا ایمان ہے؟ پادری بولا: کیوں نہیں۔ میں نے کہا کہ اگر آپ کا اس کتاب پر ایمان ہے تو اس کتاب کی تعلیم کے مطابق آپ ان لوگوں کو یسوع مسیح کی تعلیمات پر ایمان لانے کی دعوت نہیں دے سکتے۔ پادری بولا: کیوں؟ میں نے متعلقہ صفحہ نکال کر کہا کہ جناب! آپ کی کتاب میں حضرت عیسیٰ کا یہ فرمان لکھا ہوا ہے کہ ''میں تو صرف بنی اسرائیل کی گمشدہ بھیڑوں کی طرف بھیجا گیا ہوں۔'' (متی باب ۱۵:۲۵) آپ دیانت داری سے بتائیں کہ اس پورے مجمع میں قوم بنی اسرائیل سے تعلق رکھنے والا کوئی فرد ہے؟ جب یہ بنی اسرائیل کی قوم ہی نہیں تو آپ ان کو حضرت یسوع مسیح کی تعلیمات پر ایمان لانے کی دعوت کیوں دے رہے ہیں؟ میری اس دلیل پر وہ پادری بالکل خاموش ہو گیا اور اس نے فرار ہونے میں ہی عافیت سمجھی۔ یوں اللہ تعالیٰ نے اسلام کی صداقت وحقانیت کو پورے مجمع پر واضح فرما دیا۔ (روایت: مولانا حافظ محمد یوسف)

○ سردیوں کا موسم تھا۔ کسی نے دستک دی۔ میں نے بچے کو کہا کہ معلوم کرو، کون ہے۔ بچے نے آ کر بتایا کہ پینٹ کوٹ والے دو آدمی کھڑے ہیں۔ میں چونکہ مصروف تھا، بچے کو کہا کہ ان کو بیٹھک میں بٹھاؤ اور اہلیہ کو کہا کہ چائے تیار کرو۔ چائے

تیار ہو گئی تو میں نے ان سے ملاقات کی اور پوچھا کہ تمہارا کیا تعارف ہے؟ کہاں سے تشریف لائے ہو؟ اور کیسے آئے ہو؟ ایک نے اپنا تعارف کرایا کہ میرا نام پطرس گل ہے اور انار کلی لاہور کے گرجا گھر کا انچارج ہوں۔ دوسرا بھی پادری تھا، مگر میں اس کا نام بھول گیا ہوں۔ کہنے لگے کہ ہم نے تمہاری کتاب ''عیسائیت کا پس منظر'' پڑھی ہے۔ اس میں آپ نے انجیل یوحنا کا حوالہ دیا ہے کہ حضرت عیسیٰ نے فرمایا کہ ''میں جانا چاہتا ہوں کیونکہ دنیا کا سردار آتا ہے اور مجھ میں اس کا کچھ نہیں''۔ اس حوالے کا مصداق تم نے اپنے پیغمبر کو قرار دیا ہے، حالانکہ پیغمبر اس کا مصداق نہیں بنتا۔ میں نے کہا کہ یہ حوالہ ہمارے پیغمبر پر کیوں صادق نہیں آتا؟ کہنے لگے، اس سے مراد شیطان ہے۔ میں نے کہا: پادری صاحب! بڑی عجیب بات ہے جو تم نے کہی ہے۔ اچھا یہ بتاؤ کہ شیطان کس نعمت کا نام ہے کہ حضرت عیسیٰ اپنے ساتھیوں کو اس کی خوشخبری دے رہے ہیں؟ اور کیا تم شیطان کو دنیا کا سردار مانتے ہو؟ اور کیا حضرت عیسیٰ سے پہلے شیطان نہیں تھا کہ وہ اب اس کے آنے کی خوشخبری سنا رہے ہیں؟ آدم کے جنت سے نکلنے کا سبب کون بنا تھا؟ پھر انجیل متی میں ہے کہ میں اس کی جوتیاں اٹھانے کے قابل نہیں ہوں۔ تو کیا حضرت عیسیٰ شیطان کی جوتیاں اٹھانے کے قابل نہیں ہیں؟ لاحول ولاقوۃ الا باللہ العلی العظیم۔ حضرت عیسیٰ تو شیطان کو جوتیاں مارنے والے ہیں۔ پھر وہ چلے گئے۔ (ذخیرۃ الجنان، ۱۷۵/۵)

o میں بچیوں کو اسباق پڑھا رہا تھا تو ایک بی بی آ گئی جو پروفیسر تھی۔ مجھ سے کہنے لگی کہ مولانا، میں آپ سے کچھ پوچھنا چاہتی ہوں۔ میں نے کہا کہ بی بی اس وقت یہ بچیاں پڑھ رہی ہیں۔ اس نے کہا کہ مجھے ذرا جلدی ہے، میں پوچھنا چاہتی ہوں۔ میں نے کہا، پوچھو کیا پوچھتی ہو۔ کہنے لگی کہ دیکھیے کہ امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ تعالیٰ نے یہ کہا ہے کہ مردوں اور عورتوں میں اعضا کے قصاص کے سلسلے میں مساوات نہیں، تو کیا امام صاحب عورتوں کو انسان نہیں سمجھتے؟ میں نے کہا کہ بیٹی، تم نے خود مسئلہ چھیڑا ہے، اب مجھے بھی کچھ بیان کرنا پڑے گا۔ میں نے کہا، دیکھو مسئلہ یہ ہے کہ اگر کوئی شخص کسی کی ڈاڑھی مونڈ ڈالے تو اس کی پوری دیت یعنی سو اونٹ لازم آتی ہے۔ اب اگر ایک عورت کسی مرد کی ڈاڑھی مونڈتی ہے تو مرد اس کی ڈاڑھی کہاں سے مونڈے گا، وہ کہاں ہے؟ میں نے کہا کہ اچھا، تم نے مسئلہ چھیڑا ہے تو بتاؤ کہ ایک عورت مرد کے آلہ تناسل کو خصیتین سمیت کاٹ دیتی ہے تو مرد اس کی کون سی جگہ کاٹے گا؟ مرد اگر عورت کے سر کو مونڈ ڈالے اور ہو میرے جیسا ہو جو سر منڈوائے رکھتا ہو تو تم اس کی کون سی جگہ مونڈو گی؟ میں نے کہا کہ مرد کسی عورت کے پستان کاٹ دیتا ہے تو اب مرد کے پستان کہاں ہیں جو کاٹے جائیں گے؟ تو امام صاحب نے کوئی غلط بات نہیں کہی، بالکل صحیح کہا ہے۔ سب بچیاں جو پڑھتی تھیں، سر نیچے کر کے ہنستی تھیں۔ میں نے کہا کہ مسئلہ بیان کرنا ہے۔ اس نے پوچھا ہے تو اب مجھے بتانا تو پڑے گا۔ (دورۂ تفسیر قرآن، سورۂ بقرہ، آیت نمبر ۲۸۲)

o بہت عرصہ ہوا کہ جھنگ شہر میں میری تقریر ہوئی جو معجزات اور کرامات کے بارے میں تھی۔ [اس کے بعد گکھڑ میں میرے گھر پر] دو گاڑیاں آئیں۔ ان میں ایک عورت تھی اور باقی سب مرد تھے۔ دروازہ کھٹکھٹایا۔ میں نے بچوں سے کہا کہ باہر دیکھو کہ کون آیا ہے۔ کہنے لگے، باہر ایک عورت پردے والی ہے اور باقی سب اس کے ساتھ مرد ہیں۔ میں نے کہا کہ ان کو بیٹھک میں بٹھا دو اور ان کو پانی وغیرہ پلاؤ۔ گرمی کا زمانہ تھا۔ ان کو بیٹھک میں بٹھایا اور پانی وغیرہ پلایا۔ میں نے ان سے پوچھا کہ آپ سب کہاں سے آئے ہیں۔ کہنے لگے کہ جھنگ شہر سے۔ وہ عورت اس وقت ہیڈ آفیسر تھی یعنی ہسپتالوں کی انچارج تھی۔ ان میں سے ایک نے کہا کہ میں ایم بی بی ایس ڈاکٹر ہوں، ایک نے کہا کہ میں وکیل ہوں، ایک نے کہا کہ میں

انجینئر ہوں۔ وہ سب بھائی بہن تھے۔ میں بہت حیران ہوا کہ یہ لوگ میرے رشتہ دار نہیں ہیں۔ ان سب کا میرے ساتھ کیا تعلق ہے! وہ عورت کہنے لگی کہ ہم آپ کے پاس اس لیے آئے ہیں کہ ہمارے ایک بھائی نے خودکشی کی ہے اور ہم نے اس کو زندہ کرنا ہے۔ میں نے کہا کہ آپ کو مذاق کرنے کے لیے اور کوئی ضلع نہیں ملا؟ آپ نے ضلع جھنگ طے کیا، پھر ضلع لائل پور طے کیا، پھر آگے شیخوپورہ طے کیا اور گوجرانوالہ آئے ہو مذاق کرنے کے لیے! کہنے لگی کہ خدا کی قسم، ہم مذاق نہیں کر رہے۔ ہم سچ کہہ رہے ہیں کہ آپ ہمارے بھائی کو زندہ کر دیں۔ میں نے کہا کہ میرے والدین میرے سامنے فوت ہو چکے ہیں، اتنے عزیز وفات پا چکے ہیں، اگر میرے پاس کوئی ایسی طاقت ہوتی تو میں ان کو کیوں مرنے دیتا؟ اگر مر بھی گئے تھے تو میں ان کو زندہ کر دیتا۔ عورت بہت تیز تھی۔ کہنے لگی کہ دیکھو، مردوں کو زندہ کرنے کا حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے پاس معجزہ تھا۔ اور بھی بہت سے ولیوں سے ثابت ہے۔ کہنے لگی کہ آپ نے ایک تقریر کی تھی، اس میں معجزت اور کرامات بیان کیے تھے۔ آپ دعا کریں، ہمارا بھائی زندہ ہو جائے۔ میں نے کہا کہ دیکھو، اللہ تعالیٰ قادر مطلق ہے، چاہے تو سارے مردوں کو زندہ کر دے، لیکن میرے پاس ایسا کوئی کام نہیں ہے۔ پھر میں نے کہا کہ اتنے پڑھے لکھے لوگ ہیں، لیکن عقیدہ نہیں ہے۔ عقیدے کچے ہیں۔ (خطبات امام اہل سنت ۲۴۹/۳، ۲۵۰)

o ایک دفعہ ایسا ہوا کہ مولانا خیر محمد جالندھریؒ جو حضرت تھانویؒ کے بڑے خلفا میں سے تھے اور چوٹی کے علما میں سے تھے، مجھے اپنے جلسہ پر ضرور بلاتے تھے، میں مولانا کے پاس کمرے میں بیٹھا تھا اور ان کے بیٹے مولانا محمد شریف بھی بیٹھے تھے اور ایک چائے پلانے والا خادم تھا۔ ایک مولوی صاحب نے اندر آ کر مسئلہ چھیڑ دیا کہ حضرت! آپ نے ''نماز حنفی'' میں لکھا ہے کہ جب قبر پر دعا کرو، ہاتھ نہ اٹھاؤ۔ مولانا خیر محمدؒ نے فرمایا، ہاں ایسا ہی ہے۔ اس مولوی صاحب نے میری طرف اشارہ کر کے کہا کہ انہوں نے ''راہ سنت'' میں لکھا ہے کہ ہاتھ اٹھا کر دعا کر سکتے ہیں۔ اب بتلاؤ، ہم کس بزرگ کی بات مانیں؟ مولانا خیر محمد صاحبؒ نے فرمایا، انہوں نے لکھا ہے تو اس کی دلیل ان سے مانگیں۔ میں نے کہا جی، میں نے اپنی دلیلیں بھی نقل کی ہیں۔ مسلم شریف میں روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جنت البقیع کے قبرستان میں تشریف لے گئے، 'رفع یدیہ ودعا ثلاثا'، آپ نے ہاتھ اٹھائے اور تین مرتبہ دعا کی: ''اللھم اغفر لھم اللھم اغفر لھم اللھم اغفر لھم'' تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے قبروں کے درمیان ہاتھ اٹھا کر دعا مانگی ہے۔ اور آپ کے صحابی طلحہ بن براءؓ فوت ہو گئے، آپ اس کے جنازے میں شریک نہیں ہو سکے تھے۔ روایات میں موجود ہے کہ آپ اس کی قبر پر تشریف لے گئے، فرفع پس آپ نے ہاتھ اٹھائے اور دعا مانگی۔ اس کے بعد مولانا خیر محمدؒ خاموش ہو گئے، نہ میری تائید کی اور نہ تردید۔ (ذخیرۃ الجنان ۱۹۷/۸)

چند دلچسپ واقعات

o اللہ تعالیٰ غریق رحمت فرمائے مولانا عبد المہیمن صاحبؒ کو، فوت ہو گئے ہیں۔ جب پاکستان بن رہا تھا، اس زمانے میں انہوں نے میرے پاس مشکوٰۃ شریف پڑھی تھی۔ نصرۃ العلوم سے فارغ ہو کر نصرۃ العلوم میں ہی کئی سال تک تدریس کی خدمت کی، پھر جامعہ اسلامیہ [راول پنڈی] میں شیخ الحدیث رہے۔ اب دو سال ہو گئے ہیں، فوت ہو گئے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت فرمائے۔ مشکوٰۃ شریف میں جب یہ روایت آئی: من تبدی فقد جفا، جس نے دیہاتی زندگی اختیار کی، اس نے اپنے اوپر ظلم کیا۔ مولوی صاحب مرحوم کہنے لگے، استاد جی! حدیث کا مفہوم سمجھ نہیں آ رہا، کیوں کہ دیہات کی آب و

ہوا بڑی عمدہ ہوتی ہے، دیہاتی لوگ مخلص ہوتے ہیں، محبت کرتے ہیں، چیزیں مفت دے دیتے ہیں۔ شہری لوگ ہوشیار ہوتے ہیں، جی حضور جی حضور کر کے ٹرخا دیتے ہیں۔ پھر حدیث کا کیا معنی ہے؟ میں نے سمجھانے کی کوشش کی کہ دیکھو، شہروں میں دنیا کے واقعات، حالات، حادثات کا علم اور دیگر علوم حاصل ہونے کے مواقع اور اسباب ہوتے ہیں جو دیہاتوں میں نہیں ہوتے اور انسانی ضروریات شہر میں حاصل ہوتی ہیں۔ دیہات میں بعض چیزیں نہیں ملتیں۔ آدمی تنگ ہوتے ہیں۔ پھر شہر میں اگر کوئی اچانک بیمار ہو جائے تو فوراً ڈاکٹر حکیم کا انتظام ہو جاتا ہے، دیہات میں فوراً انتظام نہیں ہوتا۔ مرحوم نے کہا، استاد جی! ساری باتیں صحیح ہیں، مگر تسلی نہیں ہوئی۔ میں نے کہا پھر تسلی اور کس طرح ہو؟ جو بڑی عمر کے لوگ ہیں، ان کو معلوم ہوگا کہ جنرل یحییٰ کے زمانہ میں نوٹ تبدیل ہوئے تھے اور انہوں نے دو دن کی مہلت دی تھی نوٹ تبدیل کرانے کی۔ یہ بے چارے دیہات کے قبائلی علاقے میں رہتے ہیں۔ انہوں نے حج اور مکان بنانے کے لیے اسی نوے ہزار روپیہ جمع کیا ہوا تھا اور یہ جہاں رہتے تھے، وہاں نہ ریڈیو اور نہ اور کوئی ایسا ذریعہ تھا کہ جس سے ان کو پتہ چل جاتا۔ دو دن گزر گئے اور یہ تبدیل نہ کرا سکے۔ پھر وہ نوٹ لے کر پھرتے رہے، کوئی لیتا نہیں تھا۔ کہتے تھے، اب ان سے چائے پکا لو۔ کہنے لگے، استاد جی! اب حدیث سمجھ میں آگئی ہے کہ جس نے دیہاتی زندگی اختیار کی، اس نے اپنے اوپر ظلم کیا۔ اگر میں شہر کے اندر ہوتا تو اسی نوے ہزار روپیہ تو برباد نہ ہوتا۔ (ذخیرۃ الجنان ۸/۲۲۳)

o ۱۹۷۰ء میں جمعیت علمائے اسلام نے قومی اور صوبائی اسمبلی کے الیکشن لڑنے کا فیصلہ کیا اور دو حلقوں، گکھڑ، وزیر آباد کے حلقے اور شہر گوجرانوالہ کے حلقے میں استاد محترم مفتی عبد الواحد صاحبؒ کو کھڑا کیا گیا۔ ایک پر صوبائی کے لیے اور ایک پر قومی کے لیے۔ دیہاتی علاقوں میں ہمیں بھی جانا پڑتا تھا کیوں کہ میں اس وقت جمعیت علماء اسلام ضلع گوجرانوالہ کا امیر تھا۔ جمعیت کے ساتھ تعلق تھا۔ ۱۹۹۰ء کے بعد بڑھاپے اور بیماریوں کی وجہ سے اور کچھ پالیسیوں کی وجہ سے جمعیت کے ساتھ نہیں ہوں اور نہ ہی کسی اور جماعت کے ساتھ ہوں۔ حضرت درخواستیؒ زندہ تھے، میں نے ان کو اطلاع دے دی تھی کہ اب میرا کسی جماعت کے ساتھ تعلق نہیں ہے۔ تو خیر، الیکشن کے سلسلے میں علی پور کے قریب ایک قصبہ میں پہنچے۔ سورج طلوع ہوئے ایک گھنٹہ ہو چکا تھا۔ چودھری صاحب کے بارے میں معلوم کیا۔ نام ان کا ڈائری میں درج ہے، زبانی مجھے یاد نہیں ہے۔ چودھری صاحب آئے اور بڑے خوش ہوئے، کیوں کہ مجھے جانتے تھے، میری تقاریر بھی سنتے تھے اور مفتی عبد الواحد صاحبؒ کو بھی جانتے تھے۔ کہنے لگے، آج میرے لیے عید کا چاند ہے اور دو عیدیں ہیں، دو بزرگ ہمارے قصبے میں تشریف لائے ہیں، بڑی خوشی کی بات ہے۔ ہمارے ساتھ دس بارہ رضا کار بھی تھے کہ ویگن بھری ہوئی تھی۔ چودھری صاحب نے پر تکلف ناشتہ کرانے کے بعد پوچھا کہ تم کس لیے آئے ہو؟ ہم نے بتایا کہ الیکشن لڑ رہے ہیں اور مولانا کو اس حلقہ میں کھڑا کیا ہے۔ آپ لوگوں کو اکٹھا کریں تاکہ ہم ان سے بات کریں۔ چودھری صاحب نے لوگوں کو اکٹھا کیا۔ جب لوگ اکٹھے ہوئے تو ہم نے تقریریں کیں۔ بعد میں چودھری صاحب نے کہا: علماء کرام جی! اگر ناشتے میں کوئی کمی ہوئی ہے تو میں معذرت خواہ ہوں۔ دوپہر کا کھانا تم نے یہیں کھانا ہے۔ ان شاء اللہ کھانے پینے کی کمی کو پورا کریں گے، مگر ووٹ ہم میں سے کوئی ایک بھی تمہیں نہیں دے گا۔ ہم بڑے حیران ہوئے کہ چودھری صاحب تو بڑے خوش تھے اور کہہ رہے تھے کہ ہمارے لیے عید کا چاند چڑھ گیا ہے اور اب کہتے ہیں کہ ایک ووٹ بھی نہیں دینا۔ بڑا کھرا آدمی تھا۔ کہنے لگا سنو! ہماری آپس میں لڑائیاں ہوتی ہیں۔

بنے پر، زمین پر، نالے پر، درخت پر، جانوروں پر، رشتوں پر۔ ہم سچے بھی ہوتے ہیں، جھوٹے بھی ہوتے ہیں، تم سارے کاموں میں ہمارا ساتھ دو گے؟ ہم نے کہا نہیں۔ تو کہنے لگا، پھر ہم نے ووٹ ان کو دینے ہیں کہ اگر ہم جھوٹے بھی ہوں تو ہمارا ساتھ دیں۔ ہم نے قتل بھی کیا ہو تو ہمارے ساتھ جائے اور کہے یہ قاتل نہیں ہیں۔ چوری کی ہو تو یہ کہے کہ یہ تو بڑے پارسا ہیں۔ ڈاکہ ڈالا ہو تو کہے یہ تو ڈاکو نہیں ہیں۔ ہم نے ووٹ ایسے لوگوں کو دینے ہیں، اس لیے ہم معذرت خواہ ہیں۔ تمہیں مغالطے میں نہیں رکھنا چاہتے۔ اور شہری لوگوں کا حال یہ ہے کہ ایک آیا تو اس کو قسم اٹھا کر تسلی دے دی، دوسرا آیا تو اس کو قسم اٹھا کر تسلی دے دی۔ ایک کے سامنے قرآن اٹھا لیتے ہیں اور دوسرے کے لیے بھی قرآن سر پر رکھ لیتے ہیں۔ اندر کچھ اور ظاہر میں کچھ ہوتے ہیں۔ (ذخیرۃ الجنان ۸/۲۲۷)

o کافی عرصے کی بات ہے۔ مجھے ساتھیوں نے کہا کہ علامہ خالد محمود صاحب کی تقریر کرانی ہے۔ علامہ خالد محمود ہماری جماعت کے محقق عالم ہیں۔ بہت کام کر رہے ہیں۔ مجھ سے کافی چھوٹے ہیں۔ اس وقت انگلستان میں ہیں۔ میں نے کہا، بڑے شوق سے تقریر کراؤ مگر لاؤڈ اسپیکر کی اجازت لے لو، کیوں کہ لاؤڈ اسپیکر پر پابندی ہے۔ نوجوان تھے، تجربہ نہیں تھا، درخواست دے دی لیکن منظوری نہ ہوئی۔ ان نادانوں نے سمجھا کہ درخواست دینے سے ہی منظوری ہو جاتی ہے۔ اسی مسجد میں تقریر ہوئی۔ میں اس مسجد کا تقریباً ساٹھ سال سے خطیب ہوں۔ مجھ پر مقدمہ ہو گیا۔ پہلے وزیر آباد پھر سیشن کورٹ گوجرانوالہ منتقل ہو گیا۔ ابرار احمد ہمارا وکیل تھا۔ جج نے پوچھا، مولانا! جب لاؤڈ اسپیکر پر پابندی تھی تو تم نے کیوں چلایا؟ وکیل نے وکیلانہ شوشہ چھوڑا کہ بوڑھے آدمی ہیں، بزرگ ہیں، ان کو معلوم نہیں تھا کہ قانون کیا ہے۔ جج نے بڑی معقول بات کہی کہ وکیل صاحب! ملک میں رہ کر ملکی قانون سے بے خبر رہنا یہ کوئی وجہ جواز نہیں ہے۔ بہر حال اس نے ہمیں رہا کر دیا۔ (ذخیرۃ الجنان ۸/۲۹۵)

اساتذہ و اکابر اور معاصرین کے ساتھ تعلق

حضرت مولانا عبد القدیر صاحب کیمل پوریؒ: راقم الحروف کو جو تھوڑی سی علمی شد بد ہے، وہ استاذنا المکرم حضرت مولانا عبد القدیر صاحب دامت برکاتہم اور ان جیسی دیگر گراں قدر و بزرگ شخصیتوں کی برکت سے حاصل ہے، ورنہ ع نغمہ کجا و من کجا ساز سخن بہانہ ایست۔ (مکتوب بنام حافظ نثار احمد الحسینی، ۶ رجب ۱۴۰۸ھ/ ۲۵ فروری ۱۹۸۸ء)

استاد محترم کا راقم اثیم سے بہت گہرا تعلق تھا اور ان کے حکم سے ان کی علمی کتاب ''تدقیق الکلام'' کی ترتیب میں راقم اثیم نے خاصا کام کیا ہے۔ حضرت کی قبل از وفات اپنی خواہش اور ان کے جملہ لواحقین اور متعلقین کی قلبی آرزو کے مطابق ۱۶ جمادی الاولیٰ ۱۴۱۱ھ / ۴ دسمبر ۱۹۹۰ء کو مومن پور علاقہ چھچھ ضلع اٹک میں راقم اثیم نے ان کا جنازہ پڑھایا اور دفن کرنے کے بعد ان کی قبر پر سنت کے موافق دعا مانگی۔ اللہ تعالیٰ مرحوم کے درجات بلند فرمائے۔ آمین ثم آمین۔ (مقدمہ ''توضیح المرام فی نزول المسیح علیہ السلام'')

مفتی اعظم حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحبؒ: ہمارے استاد محترم مفتی اعظم اور سابق مفتی دار العلوم دیوبند حضرت مولانا مفتی محمد شفیعؒ (المتوفی ۱۳۹۶ھ) دور حاضر کی ان بلند شخصیتوں میں سے ایک تھے جن کی ساری زندگی علم دین اور فقہ اسلامی کی نشر و اشاعت میں گزری ہے، جنھوں نے تدریس و تالیف اور تقریر و تزکیہ نفوس کے ذریعہ اس صحیح دین کو عوام الناس

کیا، بلکہ خواص تک پہنچایا جو امانت کے طور پر حضرات سلف صالحینؒ نے آنے والی نسلوں تک پہنچانے کی ان تھک سعی فرمائی اور بحمد اللہ تعالیٰ ان کی نیک سعی بار آور بھی ہوئی۔

اللہ تعالیٰ نے حضرت مفتی صاحب کو نہایت ٹھنڈی، سلجھی ہوئی اور سنجیدہ طبیعت عطا فرمائی تھی کہ اپنے ہم عصروں میں وہ بالکل نمایاں تھے۔ ہم نے ۱۳۶۰ھ میں جب دار العلوم دیو بند میں دورۂ حدیث شریف کے لیے داخلہ لیا تو حضرت مفتی صاحب مرحوم کے پاس ہمارے اسباق میں سے طحاوی شریف تھی۔ علماء کرام بخوبی جانتے ہیں کہ امام طحاوی رحمہ اللہ تعالیٰ (المتوفی ۳۲۱ھ) کی شرح معانی الآثار مختلف احادیث کی جمع وتطبیق کے سلسلے میں کتنی دقیق کتاب ہے اور اس میں 'النظر' فرما کر عقلی اور فقہی وقیاسی دلیل سے جس طرح وہ راجح حدیث کو عیاں کرتے ہیں، وہ کتنی ادق ہے۔ حضرت مفتی صاحب مرحوم ٹھہر ٹھہر کر دھیرے دھیرے انداز سے کتاب کو اس انداز سے پڑھاتے کہ بحمد اللہ تعالیٰ ہمیں آج تک ان کی بعض تقریریں اور پیارے کلمات یاد ہیں۔

تقریباً نصف صدی تک حضرت نے پاک وہند اور دیگر اسلامی اور غیر اسلامی ممالک میں رہنے والے مسلمانوں کی جس طرح دینی رہنمائی فرمائی ہے اور ہزار ہا ٹھوس باحوالہ اور مدلل فتوے صادر فرما کر اسلام کا صحیح پہلو ان کے سامنے اجاگر کیا ہے، وہ ایک ناقابل فراموش ذخیرہ ہے اور سب سے بڑی خوبی حضرت کی یہ ہے کہ بالکل جدید اور مادی دور کی پیداوار وہ سنگین الجھنیں جن کو حل کرنے کے لیے صریح جزئیات کی شکل میں مدون کتب فقہ وفتاویٰ بالکل عاری ہیں، ایسے ہی صنائع جدیدہ کے سلسلے میں قرآن وسنت اور کتب فقہ کی روشنی میں اپنی دینی بصیرت سے ایسے معلومات افزا اور تسلی بخش بدائع مفیدہ مرتب فرما کر امت مرحومہ پر احسان عظیم فرمایا ہے۔ اور اسی طرح اسلام وکفر کی جامع تعریف جس سے کوئی مسلمان فرقہ خارج نہ ہو اور باطل فرقہ داخل نہ ہو، ٹھوس حوالوں سے مدون فرما کر علما کے ہاتھ میں ایک ایسا عروۂ وثقیٰ پکڑایا ہے، جس کے پڑھنے سے وہ تمام علمی اشکالات بفضل اللہ تعالیٰ بالکل کافور ہو جاتے ہیں جو کسی وسیع النظر اور ذہین سے ذہین آدمی کو اپنی علمی خامی کی وجہ سے پیش آتے اور آسکتے ہیں۔ اسی طرح بے شمار اختلافی مسائل پر چھوٹی بڑی کتابیں اور ان کے تراجم کر کے اور بعض کو عربی کا جامہ پہنا کر اس انداز سے مرتب کیا ہے کہ عوام الناس بھی بڑی آسانی سے ان سے استفادہ کر سکتے ہیں اور عربی دان ان کی عربی عبارات سے لطف اندوز ہو سکتے ہیں۔

اور تفسیر معارف القرآن تو ان کا ایسا صدقہ جاریہ ہے جس نے دور جدید میں اردو زبان میں تفسیریں لکھنے والوں کے طلسم کو توڑ کر رکھ دیا ہے جن کو اپنی تفاسیر پر بڑا ہی ناز ہے۔ اس تفسیر میں فن تفسیر کی ضروری اور صحیح باحوالہ تشریحات کے علاوہ جس طرح فقہی مسائل بیان کیے گئے ہیں، وہ صرف اردو زبان میں اسی تفسیر کا طرۂ امتیاز ہے جس سے عموماً ہر مکتب فکر کے حضرات اور خصوصاً جدید تعلیم یافتہ حضرات صرف استفادہ ہی نہیں کرتے، بلکہ ان کی ہر طرح سے تسلی بھی ہو جاتی ہے۔ اور ہم نے بہت اونچے طبقے کے لوگوں سے اس تفسیر کے بارے میں بڑے ذوق وشوق کے جذبات سنے اور ملاحظہ کیے ہیں۔ اور دار العلوم کا دینی مدرسہ جس سے دور دراز کے لوگ علمی پیاس بجھاتے ہیں، ان کا ایک مستقل صدقہ جاریہ ہے اور حضرت مرحوم کے سب فرزند جو اپنی جگہ جید علماء کرام میں شمار ہوتے ہیں، علی الخصوص حضرت مولانا محمد تقی صاحب عثمانی دام مجدہم ان کی باقیات صالحات میں ہیں۔ اللہ تعالیٰ حضرت مرحوم کے جنت الفردوس میں درجے بلند کرے اور ان کی دینی خدمات کو قبول

فرمائے اور ہمیں ان کے نقش قدم پر چلنے کی توفیق بخشے۔ آمین ثم آمین۔''

(''فقیہ دوراں''، ماہنامہ البلاغ کراچی، مفتی اعظم نمبر، ص ۷۰۴، ۷۰۵)

حضرت مولانا غلام غوث ہزارویؒ: راقم اثیم کی قریباً ۱۹۲۷ء میں حضرت سے پہلی ملاقات ہوئی جب مانسہرہ میں انجمن اصلاح الرسوم کے نام سے ان کا مدرسہ بڑے عروج پر تھا اور مولانا غلام محمد صاحب بالاکوٹی (عرضی نویس) اس کے مہتمم تھے۔ راقم اثیم بھی اسی مدرسہ کا ابتدائی طالب علم ہے جبکہ راقم اثیم کے پھوپھی زاد بھائی حضرت مولانا فتح علی شاہ صاحب دام مجدہم ساکن لبی ڈاک خانہ چنار کوٹ حال ضلع مانسہرہ اور ان کے چھوٹے بھائی محمد عبد اللہ شاہ صاحب مرحوم جو راقم اثیم کے بہنوئی بھی تھے، وہاں پڑھتے تھے۔ راقم اس زمانہ میں دوسری جماعت میں داخل تھا۔ راقم اثیم نے حضرت مولانا ہزارویؒ سے مانسہرہ میں تعلیم الاسلام کے چند اسباق پڑھے ہیں اور بفہ میں جب کہ حضرت مولاناؒ کی حکمت کی دکان تھی، راقم اس میں دکان کا نگران بھی تھا اور ادویہ ساز بھی اور حضرت مولانا سے نحو بھی پڑھتا تھا۔ اس لحاظ سے حضرت مولانا مرحوم راقم اثیم کے استاد اور ابتدائی مربی تھے۔......

اس دور میں اس علاقہ میں دو شخصیتیں تقریر کرتی تھیں۔ ایک حضرت مولانا غلام غوث صاحبؒ اور دوسرے حضرت مولانا عبد الحنان صاحب جریدی بالاکوٹی، اور دونوں بزرگ فضلاے دیو بند میں سے تھے۔ اور اس دور میں علما میں یہ مقولہ مشہور تھا کہ کھڑے ہو کر تقریر کرنے کے سلسلے میں 'کل علماء هزاره بكم الا غلام غوث وعبد الحنان'، حالانکہ اس دور میں اس علاقہ میں دیو بند کے بغیر کسی بھی دوسرے مکتب فکر کے علما سے عوام کے کان بالکل نا آشنا تھے اور دیو بند ہی کے مدرسہ کا نام عوام کی زبان پر تھا اور راقم الحروف بھی حضرت مولانا مرحوم کی ایسی ہی تقاریر اور اس قسم کے مجاہدانہ کارناموں سے متاثر ہوا اور دیو بندیت کے پروانوں کی حقیقت کھل کر سامنے آگئی کہ ان کا طریق ہی حب توحید وسنت اور بغض شرک وبدعت کا دوسرا نام اور خلاصہ ہے۔

یہ پروانہ ہے جس نے دیدہ بازی کا ہنر جانا
اسی کا کام ہے ذوق نظر میں جل کے مرجانا

جنازہ کے بعد لوگ ایک حلقہ بنا لیتے اور کافی مقدار میں رقم کی گٹھڑی (جو بسا اوقات قرض لے کر بلکہ ہندوؤں سے سودی رقم لے کر حاصل کی جاتی) اور ساتھ گڑ رکھا جاتا اور اوپر قرآن کریم جو اکثر کسی مسجد سے اٹھا کر لایا جاتا اور میت کے وارثوں میں دو تین وہ گٹھڑی اس حلقہ میں گھماتے اور اس طریقہ سے حیلہ اسقاط کرتے اور دور ان قرآن کیا جاتا۔ راقم اثیم کے علم میں حضرت مولانا غلام غوث صاحب ہی وہ پہلے بزرگ ہیں جنھوں نے یہ بری رسم ختم کرائی اور کتب فقہ کے حوالے نکال نکال کر علما کو بتائے اور عبارات کے تراجم ان سے کراتے جاتے۔ چنانچہ ۱۹۳۲ء کے لگ بھگ بفہ کی جامع مسجد میں جمعہ کے دن علاقہ کونش میں بائی زیریں کے مولانا صاحب سے عالمگیری کی عبارت پڑھوا کر اس کا ترجمہ کروایا اور راقم اثیم وہاں موجود تھا اور بائی زیریں سے مولانا کے ساتھ ہی آیا تھا۔ چونکہ علماء کرام مسلک دیو بند سے وابستہ تھے، اس لیے وہ مولانا مرحوم کی تائید ہی کرتے اور اس مسئلہ میں بھی اس علاقہ میں اس بدعتی رسم کے ختم کرنے میں مولانا غلام غوث صاحب بڑی حد تک کامیاب ہوئے اور اکثریت نے یہ رسم ترک کر دی۔......

مولانا ہزاروی کے ساتھ ان کی آخری عمر میں سیاسی نقطہ نظر سے اختلاف کرنے کی خاصی گنجایش ہے اور ہم بھی ان کی بعض آرا کی تائید اور تصدیق کرتے ہوئے اور ان کی بعض آرا کو مفید سمجھتے ہوئے بھی مجموعی حیثیت سے ان سے متفق نہ ہو سکے، لیکن اس بات میں ذرہ بھر بھی شک نہیں کہ حضرت مولانا نے جمعیت سے علیحدگی کے لیے جو کچھ بھی کیا، محض اپنی صواب دید اور اجتہادی رائے سے کیا۔ اپنی ذات کے لیے مولانا مرحوم نے ایک پیسے کا فائدہ نہیں لیا۔ اگرچہ ان کی علیحدگی کے وقت بعض جذباتی لوگوں نے یہ کہا تھا کہ ان کا جماعت سے الگ ہونا خلوص پر مبنی نہیں، بلکہ برائے فلوس ہے، لیکن ان لوگوں کی یہ رائے بالکل غلط اور بے بنیاد تھی۔......

لباس اور کھانے پینے میں اتنی سادگی تھی کہ ناواقف آدمی ان کی سادگی کو دیکھ کر حیران رہ جاتا۔ ایک موقع پر راقم اثیم اور عزیزم صوفی عبد الحمید سلمہ اللہ تعالیٰ مہتمم مدرسہ نصرۃ العلوم گوجرانوالہ چند رفقا کے ساتھ لاہور میں جمعیت کے پرانے دفتر حضرت شاہ محمد غوثؒ کے پاس بوقت شام مولانا مرحوم کی ملاقات کے لیے حاضر ہوئے۔ ہم کھانے کے سلسلے سے فارغ تھے۔ مولانا نے ہم سے کھانے کا پوچھا تو ہم نے واضح کر دیا کہ ہم طلب گار نہیں ہیں۔ مولانا نے اپنے لیے خادم کو بھیجا جو ایک روٹی اور آدھ پاؤ دہی کی لسی بنا کر لایا۔ مولانا نے ہمارے سامنے روٹی لسی کے ساتھ کھائی اور آخر میں الحمد للہ کی مسنون دعا پڑھ کر اپنا بستہ کھول کر کام میں مصروف ہو گئے۔......

مولانا میں بہت سی خوبیاں تھیں۔ اللہ تعالیٰ ان کو ان کے رفع درجات کا ذریعہ بنائے۔ بالآخر مولانا ہزارویؒ نے ۲۸ ربیع الاول ۱۴۰۱ھ کو مانسہرہ میں وفات پائی اور اپنے آبائی گاؤں بفہ کے قبرستان میں مدفون ہوئے اور باوجود سخت سردی اور بارش کے ہزاروں آدمی ان کے جنازہ میں شریک ہوئے جو ان کی مقبولیت کی واضح دلیل ہے۔

اکیلا کون کہتا ہے لحد میں نعش حاتم کو
ہزاروں حسرتیں لپٹی ہیں اس دریا کے پہلو سے

(ہفت روزہ ''تبصرہ'' لاہور، مولانا غلام غوث ہزاروی نمبر ۱۹۸۱ء)

حضرت مولانا سید عطاء اللہ شاہ بخاریؒ: امیر شریعت حضرت مولانا سید عطاء اللہ شاہ بخاری رحمہ اللہ تعالیٰ کو اللہ تعالیٰ نے تقریر کا بہت بڑا ملکہ عطا فرمایا تھا۔ پانچ پانچ، چھ چھ، سات سات، آٹھ آٹھ گھنٹے تقریر فرماتے تھے۔ ہم نے ان کی تقریروں میں ہندوؤں اور سکھوں کو بھی روتے ہوئے دیکھا ہے۔ گوجرانوالہ میں ان کی تقریر تھی۔ بہت بڑا مجمع تھا۔ کسی نے رقعہ دیا کہ تم لوگوں کو ایمان کی دعوت دیتے ہو، حالانکہ تم خود کافر ہو۔ (ان دنوں بریلویت کا زور تھا اور دیوبندیوں کو کھلے طور پر کافر کہتے تھے۔ اپنی مسجدوں میں داخل نہیں ہونے دیتے تھے۔ اگر کسی مسجد میں دیوبندی داخل ہوتا تو اسے دھو دیتے اور کہتے تھے کہ ایک دیوبندی مسجد میں داخل ہو جائے تو وہ پلید ہو جاتی ہے اور اگر سو خنزیر داخل ہوں تو کچھ نہیں ہوتا۔ اب الحمد للہ ملک میں وہ حالات نہیں ہیں۔ پہلے وہ اپنے جلسوں میں ان مسائل کا یعنی حاظر ناظر وغیرہ کا باقاعدہ عنوان رکھتے تھے، عالم الغیب کا عنوان رکھتے تھے، مختار کل کا عنوان رکھتے تھے۔ اب الحمد للہ وہ قصے نہیں رہے۔ ہماری کتابوں نے خاصا اثر کیا ہے۔ اب یہ عنوان نہیں رکھتے۔ ہاں ضمنی طور پر اپنا عقیدہ بیان کرتے ہیں۔) حضرت نے رقعہ پڑھ کر سنایا اور فرمایا کہ میں کافر ہوں، کافر ہوں اور مجھے اپنے کفر پر فخر ہے۔ ہمارا اس وقت طالب علمی کا زمانہ تھا۔ ہمیں بہت غصہ آیا کہ رقعے والے بھی کہا ہے کہ تم کافر

ہو اور حضرت شاہ صاحب بھی فرماتے ہیں کہ ہاں میں کافر ہوں اور مجھے اپنے کفر پر فخر ہے۔ پھر حضرت نے اعوذ باللہ پڑھا اور بسم اللہ پڑھی اور قرآن شریف پڑھنا شروع کیا۔ قرآن شریف پڑھنے کا حضرت کا انداز نرالا ہوتا تھا۔ جی چاہتا کہ شاہ صاحبؒ پڑھتے رہیں اور آدمی سنتا رہے۔ تو حضرت نے یہ آیت پڑھی: فمن یکفر بالطاغوت ویومن باللہ۔ فرمایا، میں کافر ہوں مگر طاغوت کا کافر ہوں، اللہ کا کافر نہیں ہوں اور میرے ہاتھ میں مضبوط دستہ ہے۔ پھر انگریز پر چڑھ گئے بے تکلے اور چھ سات گھنٹے تقریر کی۔

حضرت امیر شریعت بڑے ذہین اور حاضر جواب تھے۔ یہاں جین والی کھوہی میں جلسہ تھا۔ بہت بڑا مجمع تھا۔ اس مجمع میں حضرت نے جنت کی خوبیاں بیان فرمائیں کہ جنت میں یہ ملے گا، یہ ملے گا۔ ایک بابا جی کھڑے ہو کر کہنے لگے کہ حضرت شاہ جی! یہ بتائیں کہ جنت میں حقہ بھی ملے گا؟ حضرت شاہ صاحبؒ نے فرمایا، ہاں حقہ ملے گا لیکن آگ لینے کے لیے دوزخ میں جانا پڑے گا۔ (ذخیرۃ الجنان ۲/۳۰۶، ۳۰۷)

حضرت مولانا محمد عبد اللہ درخواستیؒ: راقم آثم ۱۹۳۰ء سے ۱۹۴۰ء تک مجلس احرار اسلام کا سرگرم رکن رہا۔ پھر جمعیت علماے ہند میں رہا۔ پاکستان بننے کے بعد جب لاہور میں برکت علی ہال میں ۱۹۶۰ء میں جمعیت علماء اسلام کا انتخاب ہوا او رحضرت مولانا احمد علی صاحب لاہوریؒ کو جمعیت کا امیر چنا گیا تو راقم اس میں شریک تھا۔ سال ہا سال تک جمعیت علماء اسلام کی مجلس شوریٰ اور مجلس عاملہ کا رکن رہا۔ حضرت لاہوری کی وفات کے بعد جب حضرت مولانا درخواستی کو امیر منتخب کیا گیا تو اس موقع پر بھی راقم موجود تھا اور کئی سال ضلع گوجرانوالہ کا امیر رہا اور کم وبیش چالیس سال سے زیادہ عرصہ تک حضرت درخواستی کے ساتھ مختلف اوقات اور متعدد مقامات پر جلسوں اور میٹنگوں میں شریک رہا۔ ۱۹۹۰ء میں پورے ساٹھ سال سیاست میں رہ کر جمعیت سے الگ ہوا۔ اس میں ایک سبب اپنی پیرانہ سالی، دوسرا گوناگوں علالتوں کا ہجوم، تیسرا اپنی بے حد مصروفیت اور چوتھا اور سب سے بڑا سبب جمعیت کی غلط پالیسی ہے جو اکابر کی پالیسی سے ہٹ اور کٹ کر اختیار کی گئی ہے۔ اس میں حضرت درخواستی اپنے بے حد ضعف اور شدید علالت کی وجہ سے یک گونہ بے بس اور معذور رہے اور مہربانوں نے اپنی پسند اور مرضی کی پالیسیاں بنائیں اور اپنائیں۔

حضرت درخواستی کو ہر وقت قوم کی دینی اصلاح کی فکر رہتی تھی۔ ان کی کوئی مجلس ایسی نہ ہوتی تھی جس میں وہ قرآن وحدیث، ورع اور تقویٰ کی دعوت نہ دیتے ہوں۔ حضر میں، سفر میں، بیماری اور تندرستی میں، غرض کہ ہر حال میں وہ اپنی صحت کی پروا کیے بغیر دینی اور روحانی طور پر ہر آدمی کی اصلاح کے فکر مند ہوتے تھے اور کچھ نہ کچھ فرماتے ہی رہتے تھے، خاموش نہیں رہتے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت کو بڑا قوی حافظہ عطا فرمایا تھا۔ موقع ومحل کی مناسبت سے فوراً قرآن کریم کی آیات اور الفاظ حدیث یوں فر فر پڑھتے جاتے جیسے سامنے کتاب رکھی ہو اور لمبی لمبی حدیثیں اور غرائب الحدیث اس روانی سے پڑھتے جیسے پختہ کار حافظ قرآن کریم پڑھتا ہے اور بزرگان دین کے مقولے ایسے انداز میں نقل فرماتے کہ سمجھ دار لوگ متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکتے۔ ان کی تقریر میں عرفی ربط سے بے نیاز رہ کر اخلاص اور للّٰہیت زیادہ ہوتی تھی اور تواضع کا یہ عالم تھا کہ ہر کہ ومہ سے خندہ پیشانی کے ساتھ پیش آتے تھے اور وضع دار علما کی ان میں بو بھی نہ تھی۔

سالہا سال تک وہ بخاری شریف وغیرہ کتابیں پڑھاتے رہے اور رمضان المبارک میں دورۂ تفسیر شریف پڑھاتے

تھے۔ قرآن کریم سمجھانے میں ان کا اپنا اور انوکھا رنگ ہوتا تھا۔ ہزار ہا جید علماء کرام نے ان سے قرآن کریم پڑھا اور آگے پڑھنے پڑھانے کا خاص اہتمام کیا اور یہ ان کا صدقہ جاریہ ان شاء اللہ العزیز قیامت تک جاری رہے گا۔ حضرت سلوک اور تصوف میں بڑی اونچی شان کے مالک تھے اور ہزاروں کی تعداد میں علما، خواص وعوام ان کے مرید تھے۔ شرک وبدعت اور رسومات بد سے سخت بے زار تھے اور حقیقت یہ ہے کہ حدیث شریف 'و خیار عباد اللہ الذین اذا راوا ذکر اللہ تعالی' کا عملی نمونہ تھے۔ فطرت میں سجاوٹ کوٹ کوٹ کر بھری گئی تھی۔ راقم اثیم، عزیزم صوفی عبد الحمید سلمہ اللہ تعالیٰ اور عزیزم زاہد الراشدی سلمہ اللہ تعالیٰ سے بے پناہ محبت کرتے تھے۔ حضرت نے بارہا ہماری ختم بخاری شریف کی دعوت پر لبیک کہا اور تشریف لائے۔ (''حافظ الحدیث حضرت درخواستی''، ماہنامہ انوار القرآن، اگست ۹۷ء، ص ۴۱، ۴۲)

حضرت مولانا قاضی شمس الدینؒ: آپ [مولانا قاضی شمس الدینؒ] عرصہ تک ہمارے ساتھ رہے۔ مزاج سے بھی بخوبی واقف ہیں کہ ہم شرارت پسند نہیں ہیں اور بفضلہٖ تعالیٰ بزرگوں کے ادب واحترام کو بھی بخوبی جانتے ہیں اور آپ کی ہر غمی اور خوشی میں شریک ہوتے رہے ہیں، جیسے آپ نے اپنے فرزند مولانا عبید اللہ صاحب مرحوم کی تجہیز وتکفین اور جنازہ میں ہماری شرکت کا خود ہی ذکر فرمایا ہے۔ اسی طرح آپ کو اپنے عزیز اور عزیزہ کی شادی میں شرکت کا بھی ذکر کرنا چاہیے تھا۔ آپ کے دعوت نامہ پر ہم حسب توفیق شامل ہوئے۔ اور نیز آپ کے حکم سے اور محترم جناب قاضی محمد عصمت اللہ صاحب دام مجدہم کے ارشاد سے راقم اثیم نے ان کی والدہ ماجدہ مرحومہ کا قلعہ دیدار سنگھ میں جنازہ پڑھایا تھا، حالانکہ آپ دونوں بزرگ عالم بھی تھے اور ولی بھی تھے، لیکن جنازہ پڑھانے کا اعزاز آپ نے راقم اثیم کو دیا۔ اور آپ کو یاد ہوگا کہ جب میں آگے کھڑا ہوا تو پیچھے سے آوازیں بلند ہوئیں کہ شاہ صاحب گجراتی تشریف لے آئے ہیں، لیکن آپ دونوں بزرگوں نے فرمایا کہ جنازہ تم ہی پڑھاؤ گے تو جنازہ میں نے ہی پڑھایا تھا۔ اس سے صاف عیاں ہے کہ ہم اور آپ میں گہرے روابط ہیں۔ (الشہاب المبین ص ۴۶، ۴۷)

حضرت مولانا عبد اللطیف جہلمیؒ: غالباً ۱۹۴۵ء میں حضرت مولانا عبد اللطیف صاحبؒ جہلم میں تشریف لائے اور بڑے ہی نامساعد حالات میں وہاں انھوں نے پہلے خطابت کا پھر مدرسہ کا سلسلہ شروع کیا اور الحمد للہ تعالیٰ تھوڑے ہی عرصے میں خاطر خواہ کامیابی حاصل کی۔ ان کے ابتدائی سالانہ جلسوں میں راقم اثیم حاضر ہوتا تھا جبکہ حضرت مولانا سید سلیمان ندویؒ اور حکیم الامت مولانا قاری محمد طیب صاحبؒ وغیرہ حضرات بھی وہاں ابتدائی دور میں شرکت فرماتے رہے اور دیگر جید اکابر بھی وقتاً فوقتاً تشریف لاتے رہے۔ حضرت مولانا عبد اللطیف صاحبؒ کے ساتھ ہم پہلے مجلس احرار اسلام میں اور پھر جمعیۃ علمائے اسلام کے تحت عرصہ تک اکٹھے کام کرتے رہے۔ پھر ان کے بیٹے الحافظ المولوی خبیب احمد عمر فاضل نصرۃ العلوم سے راقم اثیم کی لڑکی حافظہ مجودہ فاضلہ وفاق المدارس سعیدہ اختر کا نکاح ہوگیا جو اس وقت شعبۃ البنات کے حصہ کی انچارج ہے اور کئی سو لڑکیاں مختلف علاقوں کی وہاں زیر تعلیم ہیں اور اس کی وجہ سے علاقہ پر مزید اچھا اثر پڑا ہے۔ اور مدرسہ تعلیم الاسلام حنفیہ پہلے ہی سے قائم تھا۔ اللہ تعالیٰ قائم رکھے۔

حضرت مولانا عبد اللطیف صاحبؒ کو اللہ تعالیٰ نے بہت سی خوبیوں سے نوازا تھا۔ جرات اور ہمت سے حق بات پر ڈٹ جانا اور بلاخوف اس کی اشاعت کرنا ان کا بہترین کارنامہ تھا۔ بارہا قید وبند کی صعوبتیں بھی برداشت کیں، مگر حق کا اور اکابر کا

دامن نہیں چھوڑا۔ ضلع جہلم، چکوال بلکہ آزاد کشمیر تک میں انھوں نے دینی مدارس کے جال بچھا دیے جس میں سینکڑوں بچے اور بچیاں تعلیم حاصل کرتی ہیں اور جو لوگ توحید وسنت سے ناواقف تھے اور مسئلہ ختم نبوت سے بے خبر تھے اور حضرات صحابہ کرام کی شان سے بے بہرہ تھے، حضرت مولانا مرحوم نے ان بنیادی مسائل سے عوام کو اپنی ولولہ انگیز تقریروں کے ذریعہ خوب خوب آگاہ کیا اور بحمد اللہ تعالیٰ ملک کے اندر اور انگلستان میں بھی لوگ حق سے آگاہ ہوئے۔

مولانا مرحوم حضرت مولانا قاضی مظہر حسین صاحب دام مجدہم کے وفادار جرنیل تھے۔ اور حضرت مولانا مرحوم کے مریدوں کی تعداد بھی خاصی ہے جو آگے بھی حق کی نشر واشاعت میں مصروف ہیں اور مولانا مرحوم کا یہ صدقہ جاریہ ان شاء اللہ العزیز دیر تک اور دور تک جاری رہے گا۔ دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ مولانا مرحوم کو ان کی ایمانی جرات اور حق گوئی کا پورا پورا صلہ عطا فرمائے اور ان کے پس ماندگان کو صبر اور حوصلہ کی ہمت بخشے اور جو جو مدارس انھوں نے قائم کیے ہیں، اللہ ان کو تا قیامت جاری رکھے۔ آمین ثم آمین۔ (مسودہ تحریر کردہ ۱۹ ربیع الاول ۱۴۱۹ھ / ۱۴ جولائی ۱۹۹۸ء)

متفرقات

o پاکستان بننے سے پہلے ایک دفعہ مجھے ٹی بی کی تکلیف ہوگئی تھی۔ ڈاکٹر صاحب نے ایک دوا تجویز کی جس کے اندر الکوحل تھا۔ میں نے اس کو استعمال نہ کیا۔ میری نوعمری تھی۔ میں نے مفتی اعظم مفتی کفایت اللہ دہلویؒ سے پوچھا کہ حضرت! ڈاکٹر صاحب نے میرے لیے ایک دوا تجویز کی ہے اور اس میں بارہ فیصد الکوحل ہے۔ میں نے استعمال نہیں کی، اس کا کیا حکم ہے؟ حضرت نے فتویٰ دیا کہ جائز ہے، اس کے استعمال کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے۔ پھر شامی اور بہت ساری کتابوں کے حوالے بتائے۔ الکوحل دوائیوں کو محفوظ رکھنے کے لیے استعمال کرتے ہیں۔ جس طرح حکیم لوگ اپنی ادویہ شہد میں محفوظ رکھتے ہیں، اس طرح ڈاکٹر الکوحل استعمال کرتے ہیں جس سے ادویہ کافی دیر تک محفوظ رہتی ہیں۔ ان کے فتوے کے بعد میں نے استعمال کی۔ (ذخیرۃ الجنان ۸/ ۲۱۳)

o راقم علیل تھا۔ کسی ظالم نے کوئی..... چیز کھلا دی تھی اور بظاہر کچھ مایوسی تھی۔ ایک ماہ زیر علاج رہا اور تین جمعے نہیں پڑھا سکا، نہ درس دے سکا اور نہ نارمل اور مدرسہ نصرۃ العلوم میں حاضری دے سکا۔ اب اللہ تعالیٰ کے فضل اور پھر آپ جیسے مخلص ساتھیوں اور بزرگوں کی دعا کی برکت سے بالکل آرام ہے اور ہر جگہ کی ڈیوٹی دیتا ہے۔ (مکتوب بنام مولانا مفتی محمد عیسیٰ خان گورمانی، ۲۲ صفر ۱۳۹۰ھ / ۲۹ اپریل ۱۹۷۰ء)

o ہمارے خالہ زاد بھائی جو بڑے متشرع بزرگ تھے اور اپنے علاقہ میں جمعیۃ علماء اسلام کے سرگرم رکن اور خان ہونے کی وجہ سے علاقہ میں ان کا اثر بھی خاصا تھا، اچانک دل کا دورہ پڑا اور وفات پا گئے۔ انا للہ الخ۔ تار موصول ہوا اور راقم وطن روانہ ہوگیا۔ سفر طویل ہونے کی وجہ سے جنازہ پر نہ پہنچ سکا اور جنازہ حضرت مولانا غلام غوث صاحب دام مجدہم نے پڑھایا۔ کافی دنوں کے بعد گزشتہ جمعہ وہاں سے واپس آیا۔ (مکتوب بنام مولانا مفتی محمد عیسیٰ خان گورمانی، ۲۰ جمادی الاولیٰ ۱۳۹۰ھ / ۲۵ جولائی ۱۹۷۰ء)

o عموماً جمعرات کو بعد از ظہر خطوط کا جواب لکھا جاتا ہے۔ ایک جمعرات کو ایک جنازہ میں شرکت کی وجہ سے جوابات نہ لکھے جا سکے اور دوسری جمعرات کو عزیزم صوفی عبد الحمید سلمہ اللہ تعالیٰ کو ہسپتال میں برائے آپریشن غدود داخل کرایا گیا۔ کل

آپریشن ہوگیا ہے۔ (مکتوب بنام مولانا مفتی محمد عیسیٰ خان گورمانی، ۱۳؍ذوالقعدہ ۱۴۰۴ھ/۱۱؍اگست ۱۹۸۴ء)

○ سیٹھی محمد یوسف صاحب راہوالی، انہوں نے حفظ قرآن وتجوید کے بارے میں بڑا کام کیا ہے۔ میرے ساتھ ان کی بے تکلفی تھی اور میرے پاس آتے جاتے رہتے تھے۔ ایک دن میں نے ان سے پوچھا، سیٹھی صاحب! یہ جو تمہارا گتے کا کارخانہ ہے، اس میں سے حکومت بھی تم سے کچھ لیتی ہے،؟ تو مسکرا پڑے اور کہنے لگے، سو میں سے ترانوے روپے لیتی ہے۔ میں نے حیران ہو کر پوچھا کہ پھر تمہارے پاس کیا باقی رہا؟ کہنے لگے، باقی جو سات روپے ہیں، ان میں فلاں فلاں ٹیکس علیحدہ ہے۔ (ذخیرۃ الجنان ۸/۷۳)

ایک دن حضرت اپنے صاحبزادے مولانا عزیز الرحمٰن شاہد کو فرمانے لگے، بیٹا محنت کرو اور پڑھو۔ فرمایا ہم نے تو انتہائی کس مپرسی کے حالات میں پڑھا ہے۔ پھر یتیمی کے دوران پڑھا ہے۔ وسائل نہیں تھے، والد کا سایہ بھی نہ تھا۔ بیٹا دین سے دنیا بھی سنورتی ہے اور آخرت بھی۔ آج تمہارے پاس وسائل بھی ہیں اور کسی چیز کی کمی نہیں ہے۔ پھر اپنا ایک واقعہ سنایا کہ میں گوجرانوالہ میں رہتا تھا۔ اطلاع ملی کہ ہمارے علاقہ مانسہرہ میں کوئی عزیز فوت ہو گیا ہے۔ میں وہاں اپنے علاقہ میں گیا۔ واپس گوجرانوالہ آنا تھا۔ اس وقت وہاں سے گوجرانوالہ کا کرایہ دو روپے تھا اور میرے پاس صرف ایک روپیہ تھا۔ میں نے سوچا کہ چلو پنڈی تک پیدل چلا جاتا ہوں، وہاں سے گاڑی پر بیٹھ کر ایک روپیہ کرایہ دوں گا اور گوجرانوالہ چلا جاؤں گا، یا پھر پنڈی تک گاڑی میں چلا جاتا ہوں، پنڈی سے گوجرانوالہ پیدل چلا جاؤں گا۔ پھر اچانک دل میں خیال آیا کہ چلو قریب ہی رشتہ داروں کا گھر ہے، ان سے ایک روپیہ قرض لے لیتا ہوں۔ جب ان کے پاس گیا تو انہوں نے ایک روپیہ قرض دینے سے انکار کر دیا کہ یہ بے چارہ ایک روپیہ کیسے واپس دے گا، ضائع کرنے والی بات ہے۔ چنانچہ میں نے اس کے بعد سے آج تک کبھی کسی سے کوئی سوال نہیں کیا۔ اپنے علاقہ سے واپس پیدل سفر شروع کر دیا۔ رات ایبٹ آباد پہنچا۔ وہاں پر الیاسی مسجد میں نماز پڑھی۔ میرے پاس صرف لٹھے کی ایک چادر تھی۔ نماز کے بعد مسجد والوں نے پوچھا، آپ کیوں بیٹھے ہیں؟ میں نے کہا کہ مسافر ہوں، رات مسجد میں گزارنا چاہتا ہوں۔ انہوں نے مسجد میں رہنے کی اجازت نہ دی۔ سردیوں کی رات لٹھے کی چادر میں، میں نے باہر ہی گزاری۔ صبح ہوئی تو پھر پیدل سفر شروع کیا اور پنڈی پہنچ گیا۔ وہاں سے گاڑی پر بیٹھ کر گوجرانوالہ آ گیا۔

حضرت نے مولانا شاہد سے فرمایا، بیٹا! اس وقت جن رشتہ داروں نے ایک روپیہ قرض دینے سے انکار کیا تھا، آج وہی رشتہ دار مجھ سے رشتہ داری پر فخر اور ناز کرتے ہیں، اور وہی مسجد والے جنہوں نے رات گزارنے کی اجازت نہ دی، مجھے متعدد بار جلسہ میں شرکت کی دعوت دے چکے ہیں۔ یہ ساری عزت اس علم دین کی وجہ سے ہے، اس لیے اسے توجہ سے پڑھو، اللہ تعالیٰ ضرور نوازے گا۔

(ماہنامہ ہدی للناس گوجرانوالہ، امام اہل سنت نمبر، جون ۲۰۰۹ء)

مولانا حافظ محمد یوسف*

حضرت شیخ الحدیثؒ کے اساتذہ کا اجمالی تعارف

شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد سرفراز خان صفدرؒ پر منعم حقیقی کا یہ خصوصی فضل وانعام تھا کہ ان کو اپنے وقت کی بلند پایہ اور گرانمایہ علمی شخصیتوں کے خرمن علم سے خوشہ چینی کی سعادت نصیب ہوئی۔ آپ کو جن اصحاب فضل وکمال کے دامن فضل سے وابستگی اور سرچشمہ علم وفن سے کسب فیض اور اکتساب علم کا شرف حاصل ہوا، ان میں سے اکثر اس زمانہ کے عبقری اور علم وفن کی آبرو تھے۔ چونکہ صاحب سوانح کی سوانح حیات اس وقت تک مکمل نہیں ہو سکتی جب تک ان نفوس قدسیہ کا تذکرہ نہ ہو جن کے فیوض تعلیم وتربیت نے صاحب سوانح کی صلاحیتوں کو جلا بخشی، اس لیے ہم ذیل کی سطور میں آپ کے اساتذہ گرامی کا اجمالاً ذکر کر رہے ہیں۔

شیخ العرب والعجم حضرت مولانا سید حسین احمد مدنیؒ

حضرت مولانا سید حسین احمد مدنیؒ ۱۹؍شوال المکرم ۱۲۹۶ھ کو موضع الہداد پور قصبہ ٹانڈہ ضلع فیض آباد میں حضرت مولانا سید حبیب اللہ صاحب (خلیفہ خاص حضرت مولانا فضل الرحمٰن گنج مراد آبادیؒ) کے ہاں پیدا ہوئے۔ آپ حسینی سید ہیں۔ آپ نے ابتدائی تعلیم مڈل تک اپنے والد گرامی کے پاس ہی حاصل کی۔ قرآن کریم اور ابتدائی فارسی کی تعلیم اپنے والدین سے حاصل کی۔ مالٹا کی اسارت میں قرآن کریم حفظ کرنے کی سعادت حاصل کی۔ جب آپ تیرہ برس کی عمر کو پہنچے تو ۱۳۰۹ھ میں دارالعلوم دیوبند میں داخلہ لیا اور درس نظامی کی مکمل تعلیم اپنے بڑے بھائی مولانا صدیق احمد صاحب اور شفیق استاذ حضرت مولانا محمود حسن صاحبؒ کی زیر نگرانی دارالعلوم دیوبند میں ہی حاصل کی۔ باوجود اس کے کہ حضرت شیخ الہندؒ دورۂ حدیث کی بڑی کتابیں پڑھاتے تھے، لیکن آپ کو ہونہار پا کر ابتدائی کتابیں بھی خود پڑھائیں۔ آپ نے سترہ فنون پر مشتمل درس نظامی کی ۶۷ کتابیں ساڑھے چھ سال میں مکمل فرمائیں۔ ۱۳۱۴ھ میں دارالعلوم دیوبند سے سند فراغت حاصل کی جبکہ ابھی چند خارج از درس کتب، طب، ادب، ہیئت میں باقی رہ گئیں تھیں کہ آپ کے والد محترم نے مدینہ منورہ کی طرف عزم ہجرت کیا تو آپ بھی مدینہ منورہ کے لیے روانہ ہو گئے اور باقی کتابیں مدینہ منورہ کے معمر اور مشہور ادیب حضرت مولانا شیخ آفندی عبدالجلیل برادہ سے پڑھیں۔ جس وقت آپ کے استاذ مکرم حضرت شیخ الہندؒ آپ کو مدینہ منورہ رخصت کر رہے تھے تو یہ نصیحت فرمائی کہ پڑھانا ہرگز نہ چھوڑنا، چاہے ایک دو ہی طالب علم ہوں۔ حضرت زندگی بھر اس نصیحت پر عمل پیرا رہے۔ ۱۳۱۶ سے ۱۳۳۱ھ تک جب آپ کا زیادہ وقت مدینہ طیبہ میں بسر ہوا تھا، اس دوران آپ کی زبان فیض ترجمان سے قال اللہ وقال الرسول کا دل نشیں نغمہ مسلسل گونجتا رہا۔ ۱۹۲۷ سے ۱۹۵۷ء تک دارالعلوم دیوبند میں شیخ الحدیث و

*رفیق شعبہ تصنیف وتالیف، الشریعہ اکادمی گوجرانوالہ

صدرالمدرسین کے منصب جلیل پر فائز رہے۔ اس کے علاوہ امروہہ، کلکتہ میں مولانا ابوالکلام آزاد کے مدرسہ عالیہ اور سلہٹ کے جامعہ اسلامیہ میں بھی علم وعرفان کے موتی بکھیرتے رہے۔

سلوک وتصوف میں بھی آپ شیخ کامل تھے۔ ۱۳۱۶ھ میں آپ آستانہ عالیہ رشیدیہ میں قطب الارشاد مولانا رشید احمد گنگوہیؒ سے بیعت ہوئے۔ مکہ مکرمہ میں حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکیؒ کی بابرکت مجالس میں بھی روحانی تربیت حاصل کرتے رہے۔ حضرت گنگوہیؒ نے آپ کو خلافت کی خلعت سے نوازا اور اپنے دست مبارک سے دستار خلافت آپ کے سر پر باندھی۔ حضرت مولانا احمد علیؒ لاہوری آپؒ کے متعلق فرمایا کرتے تھے کہ ''حضرت مدنیؒ اس زمانہ میں اولیاء اللہ کے امام ہیں''۔

آپؒ تدریسی، روحانی، ملی اور سیاسی خدمات کے ساتھ ساتھ تصنیف وتالیف کے میدان میں بھی نمایاں خدمات سرانجام دیتے رہے۔ آپؒ کی مشہور تصانیف درج ذیل ہیں: (۱) نقش حیات، دو جلدیں (۲) مکتوبات شیخ الاسلامؒ، چار جلدیں (۳) الشہاب الثاقب (۴) تعلیمی ہند (۵) اسیر مالٹا (۶) متحدہ قومیت اور اسلام (۷) ایمان وعمل (۸) مودودی دستور وعقائد کی حقیقت (۹) سلاسل طیبہ (۱۰) کشف حقیقت (۱۱) خطبات صدارت۔

اگر یہ کہا جائے کہ حضرت مولانا انور شاہ صاحبؒ کے بعد دارالعلوم دیوبند کی علمی وعملی فضا حضرت مدنیؒ کے ہی دم قدم سے قائم رہی تو مبالغہ نہ ہوگا۔ آپؒ نے جس ہمت واستقلال، ایثار وقربانی اور جرأت وشجاعت سے دین اور ملک وملت کی خدمت کی، حضرت شیخ الہندؒ کے بعد اس کی نظیر آخری دور میں نظر نہیں آتی۔ آپؒ نے زندگی بھر تعلیم وتدریس، تصنیف وتالیف، وعظ وتبلیغ اور جہاد فی سبیل اللہ کا مبارک سلسلہ جاری رکھا۔ یہاں تک کہ آپؒ نے ۲۸ محرم الحرام ۱۳۷۷ھ بمطابق ۲۵ راگست ۱۹۵۷ء کو آخری سبق بخاری شریف جلد اول پڑھایا اور ۱۳ جمادی الاولیٰ ۱۳۷۷ھ بمطابق ۵ دسمبر ۱۹۵۷ء کو علم وعمل، زہد وتقویٰ اور رشد وہدایت کا یہ آفتاب عالم تاب غروب ہوگیا۔

حضرت مدنی، حضرت شیخ الحدیث کے ممتاز اساتذہ میں سے تھے۔ جب آپ اپنے برادر عزیز شیخ الحدیث والتفسیر حضرت مولانا صوفی عبدالحمید سواتیؒ کے ہمراہ ۱۹۴۰ء میں دارالعلوم دیوبند تشریف لے گئے، اس وقت شیخ العرب والعجم مرکز علم دارالعلوم دیوبند میں شیخ الحدیث وصدرالمدرسین کے منصب پر فائز تھے۔ اس منصب عظیم پر متمکن ہونے سے قبل آپ مدینۃ الرسول صلی اللہ علیہ وسلم میں اور مشرقی پاکستان میں علم وفن کی تمام دینی کتب پڑھا چکے تھے۔ حضرت شیخ الحدیثؒ نے ۱۳۶۰ھ اور ۱۳۶۱ھ کا اکثر حصہ آپ کی زیر نگرانی دارالعلوم کی روح پرور فضا میں گزارا اور حضرت مدنی سے بخاری شریف اور ترمذی شریف جلد اول پڑھنے کی سعادت حاصل کی۔ حضرت مدنیؒ صبح کے وقت دو گھنٹے ترمذی شریف (اول) اور ایک گھنٹہ بخاری شریف (اول) پڑھاتے اور رات کے وقت بخاری شریف جلد ثانی پڑھاتے تھے۔

دوران سبق شرکا کو کیسا عجیب روحانی ماحول نصیب ہوتا تھا، اس کی ایک جھلک آپ کے ہونہار شاگرد حضرت مولانا صوفی عبدالحمید سواتیؒ کی تحریر میں ملاحظہ فرمائیں: ''دوران سبق شرکا کو ایسا عجیب روحانی ماحول نصیب ہوتا تھا کہ ہر شریک درس کی یہ دلی خواہش ہوتی تھی کہ کاش یہ مجلس دراز سے دراز ہوتی جائے ہم کو یوں محسوس ہوتا تھا کہ جیسے ہمارے قلوب زنجیروں کے ساتھ عالم بالا میں جکڑے ہوئے ہیں''۔ دوران سبق حضرت مدنی کا طلبہ کے ساتھ رویہ کیسا ہوتا تھا، اس کی ایک جھلک بھی حضرت صوفی صاحبؒ کے الفاظ میں ملاحظہ ہو: ''جو طلبا شریک درس ہوتے، اپنے سوالات اور شکوک وشبہات لکھ کر حضرت

مدنیؒ کی خدمت میں بھیجتے، آپؒ ایک ایک پرچی پڑھ کر انتہائی تحمل، بردباری اور مشفقانہ انداز میں جواب مرحمت فرماتے کسی کے سوال سے تو کیا بلکہ کسی معترض کی تلخ کلامی یا غلط تحریر پڑھ کر بھی ناراض نہ ہوتے تھے''۔

حضرت شیخ، حضرت مدنیؒ کے ذوق تدریس کا یہ واقعہ اکثر طلبا کے سامنے بیان فرماتے تھے:

''ہمارے استاذ محترم مولانا سید حسین احمد مدنی انگریز کے دور میں قید وبند کی صعوبتیں برداشت کرتے رہے، چنانچہ ایک مرتبہ دوران اسارت مراد آباد جیل میں حضرت قاری محمد طیب مہتمم دارالعلوم دیوبند ان سے ملاقات کے لیے تشریف لے گئے۔ حضرت قاری صاحب کیا دیکھتے ہیں کہ حضرت مدنی جیل میں قیدیوں کو تعلیم الاسلام پڑھا رہے ہیں۔ حضرت قاری صاحب نے دل لگی اور از راہ مزاح کہا، حضرت آپ نے تو خوب ترقی کی ہے کہ بخاری شریف پڑھاتے پڑھاتے تعلیم الاسلام پڑھانی شروع کر دی ہے۔ حضرت مدنیؒ نے جواب دیا، بھائی! کام جو پڑھانا ہوا، دارالعلوم دیوبند میں بخاری وترمذی پڑھنے والے تھے، ان کو بخاری وترمذی پڑھاتا تھا اور یہاں مراد آباد جیل میں تعلیم الاسلام پڑھنے والے ہیں، چنانچہ ان کو تعلیم الاسلام پڑھاتا ہوں''۔

اگر کسی طالب علم کو حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد سرفراز خان صاحب صفدر مدظلہ کی کلاس میں اونگھ یا نیند آجاتی تو آپ حضرت مدنیؒ کے ان الفاظ کے ساتھ طالب علم کو بیدار کرتے: ''ہمارے استاد محترم حضرت مدنیؒ فرمایا کرتے تھے، نیند کی دو قسمیں ہیں۔ ایک نیند اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہوتی ہے اور ایک نیند شیطان کی طرف سے ہوتی ہے۔ اگر دوران جنگ مسلمان مجاہد کو نیند آجائے تو یہ نیند اللہ تعالیٰ کی طرف سے رحمت اور مجاہد کے لیے سکون وآرام کا قدرتی ذریعہ ہوتی ہے، لیکن اگر دوران سبق طالب علم کو نیند آجائے تو یہ شیطان کی طرف سے ہوتی ہے جس کا مقصد طالب علم کو غفلت میں ڈالنا ہوتا ہے''۔

حضرت مدنیؒ نے حضرت شیخ الحدیثؒ اور حضرت صوفی صاحبؒ کی علمی لیاقت پر اعتماد فرماتے ہوئے دارالعلوم دیوبند کی سند کے علاوہ اپنی طرف سے اپنے دونوں مایہ ناز تلامذہ کو خصوصی سند بھی عطا فرمائی۔

حضرت مولانا محمد ابراہیم بلیاویؒ

حضرت بلیاویؒ ۱۳۰۴ھ میں مشرقی یوپی کے شہر بلیا کے ایک علمی گھرانے میں پیدا ہوئے۔ آپؒ نے فارسی اور عربی کی ابتدائی تعلیم جونپور میں مشہور طبیب مولانا حکیم جمیل الدین نگینویؒ سے حاصل کی اور معقولات کی کتابیں مولانا فاروق احمد چڑیاکوٹی اور مولانا ہدایت اللہ خان (تلمیذ حضرت گنگوہیؒ) سے پڑھیں۔ دینیات کی تعلیم کے لیے مولانا عبدالغفار کے سامنے زانوئے تلمذ کیا۔ ۱۳۲۵ھ میں دارالعلوم دیوبند میں داخل ہوئے اور ہدایہ اور جلالین اور مختلف کتب پڑھتے رہے۔ پھر حضرت بلیاویؒ کی حیات مبارکہ میں وہ دن بھی آیا جب ۱۳۲۷ھ میں آپ نے دارالعلوم دیوبند سے سند فراغت حاصل کی۔ دینی علوم وفنون کی تحصیل کے بعد آپ زندگی بھر درس وتدریس کے پیشہ سے وابستہ رہے۔ آپ کے درس وتدریس کی مدت ۱۳۲۷ھ سے ۱۳۸۷ھ تک ساٹھ سال بنتی ہے۔ آپ نے مختلف مقامات مدرسہ عالیہ (فتح پور) عمری ضلع مراد آباد، مدرسہ دارالعلوم (اعظم گڑھ)، مدرسہ امدادیہ (بہار)، جامعہ اسلامیہ (ڈابھیل)، کوہاٹ ہزاری ضلع چاٹگام میں طلبہ علوم اسلامیہ کے قلوب کو زندگی بھر دینی علوم سے منور کرتے رہے۔ بالآخر آپ اپنی مادر علمی دارالعلوم دیوبند میں تشریف لے آئے۔ ۱۳۷۷ھ میں حضرت مولانا سید حسین احمد مدنیؒ کے بعد آپ دارالعلوم کی سند صدارت پر فائز ہوئے اور تادم واپسی اس پر

متمکن رہے۔ آپ کے تلامذہ کی تعداد ہزاروں سے متجاوز ہے جو برصغیر کے علاوہ ایشیا اور افریقہ کے بہت سے ملکوں میں اپنے استاذ گرامی کے دینی علوم و معارف پھیلا رہے ہیں۔

حضرت بلیاویؒ نے شیخ الہندؒ مولانا محمود حسنؒ کے دست حق پرست پر بیعت کی تھی۔ آپ حضرت شیخ الہندؒ کے تلمیذ خاص بھی تھے۔ آپ کے اوصاف و کمالات کے متعلق محدث العصر حضرت مولانا محمد یوسف صاحب بنوریؒ فرماتے ہیں:

''حضرت مولانا بلیاویؒ دارالعلوم دیوبند کے مایہ ناز محقق عالم اور شیخ الہند مولانا محمود الحسنؒ کے مخصوص تلامذہ میں سے تھے۔ درسیات کی مشکل ترین کتابوں کے اعلیٰ ترین مدرس اور استاذ تھے۔ اپنی حیات طیبہ کا بہت حصہ علوم نقلیہ وعقلیہ کی تدریس و تعلیم میں ہی صرف کیا اور پورے ساٹھ برس تک تدریس علوم دینیہ کی خدمت انجام دی۔ ذکاوت، قوت حافظہ اور حسن تعبیر میں خصوصاً معقول و منقول کی مشکلات کے حل کرنے میں یکتائے روزگار تھے اور ہندو پاک کے تقریباً تمام علما کے بلاواسطہ یا بالواسطہ استاذ تھے اور اپنے علمی کمالات اور جامعیت کے اعتبار سے قدمائے سلف کی یادگار تھے''۔

مولانا محمد ابراہیم بلیاویؒ حضرت شیخ الحدیثؒ اور حضرت صوفیؒ صاحب کے ممتاز اساتذہ میں ہیں۔ دونوں بھائیوں نے دارالعلوم دیوبند میں حضرت بلیاویؒ سے مسلم شریف (مکمل) پڑھنے کی سعادت حاصل کی۔ حضرت شیخ الحدیثؒ دوران تدریس اپنے اسباق میں اکثر ان کا ذکر خیر کیا کرتے تھے۔ (حضرت بلیاویؒ کے علاوہ حضرات شیخین نے صحاح ستہ میں شامل مشہور کتاب ''نسائی شریف'' حضرت مولانا عبدالحق نافع گلؒ سے پڑھنے کی سعادت حاصل کی جب کہ ابن ماجہ تین ممتاز اصحاب علم حضرت مولانا مفتی ریاض الدینؒ، حضرت مولانا عبدالشکور فرنگی محلیؒ اور مولانا ابوالوفاء شاہجہانپوریؒ سے پڑھی۔ اسی طرح علامہ ظہور احمد دیوبندیؒ سے موطا امام محمد اور مولانا قاری اعزاز احمدؒ (ابن مولانا اعزاز علیؒ) سے فن تجوید میں 'الفوائد المکیۃ' پڑھنے کی سعادت حاصل کی۔)

حضرت بلیاویؒ کی ساری عمر درس و تدریس اور تبلیغ و اصلاح میں گزری۔ آخری عمر میں جامع ترمذی پر حاشیہ لکھ رہے تھے جس کے پورے ہونے کی نوبت نہ آسکی اور صحت خراب ہوتی چلی گئی۔ آخر کار ۲۴ رمضان ۱۳۸۷ھ مطابق ۲۷ دسمبر ۱۹۶۷ء بروز چہارشنبہ عالم آخرت کو تشریف لے گئے۔ قبرستان قاسمی دیوبند میں محو آرام ہیں۔ حق تعالیٰ درجات عالیہ نصیب فرمائے۔

شیخ الادب حضرت مولانا اعزاز علی امروہیؒ

آپ کا آبائی وطن مراد آباد کے مضافات میں مشہور قصبہ امروہہ ہے۔ آپ یکم محرم الحرام ۱۳۰۱ھ بمطابق ۱۸۸۲ء بروز جمعۃ المبارک صبح صادق کے قریب ہندوستان کے مشہور شہر بدایوں میں پیدا ہوئے جہاں آپ کے والد ماجد بسلسلہ ملازمت رہائش پذیر تھے۔ کچھ عرصہ بعد آپ کے والد محترم بدایوں سے شاہ جہاں پور آگئے جہاں آپ نے میاں جی قطب الدینؒ سے بیس پارے ناظرہ قرآن حکیم پڑھا۔ بعد میں حضرت قاری شرف الدینؒ سے قرآن پاک حفظ کیا۔ آپ نے اردو اور فارسی کی ابتدائی تعلیم اپنے والد محترم سے حاصل کی، پھر مولانا مقصود علی خانؒ سے بعض کتب فارسیہ اور میزان الصرف سے شرح جامی تک کتابیں پڑھیں۔ پھر شاہجہانپور کے مدرسہ عین العلم میں داخل ہو کر مولانا شبیر احمد مراد آبادی، مولانا عبدالحق کابلی اور مولانا مفتی کفایت اللہ دہلوی کے پاس تعلیم حاصل کی۔ اس کے بعد مولانا کفایت اللہ دہلویؒ کے مشورہ سے دارالعلوم

دیوبند میں داخل ہوئے۔ ہدایہ اولین و میر قطبی اور دیگر کتب پڑھ کر دوسرے سال اپنی ہمشیرہ سے ملاقات کے لیے میرٹھ تشریف لے گئے۔ مولانا عاشق الٰہی میرٹھی کے اصرار پر میرٹھ ہی میں چار سال تعلیم حاصل کرتے رہے۔ اس کے بعد دارالعلوم دیوبند میں داخل ہوئے اور ہدایہ اخیرین، بیضاوی، بخاری، مسلم، ابوداؤد، ترمذی وغیرہ کتابیں حضرت شیخ الہندؒ کے پاس پڑھیں۔ فنون کی بعض کتابیں مولانا رسول خان ہزارویؒ سے جبکہ ادب کی کتابیں حضرت مولانا سید معز الدینؒ سے پڑھیں۔ فتویٰ نویسی کا فن حضرت مولانا عزیز الرحمٰن عثمانیؒ سے سیکھا۔

۱۳۲۰ھ میں دارالعلوم دیوبند سے سند فراغت حاصل کی۔ فراغت تعلیم کے آپ کم و بیش ۵۴ سال مسند تدریس پر متمکن رہے۔ آپ مدرسہ نعمانیہ بھاگل پور میں سات سال، مدرسہ افضل المدارس شاہجہان پور میں تین سال تدریس کرتے رہے۔ ۱۳۳۰ھ پچیس روپے مشاہرہ پر دارالعلوم دیوبند میں مدرس مقرر ہوئے۔ درمیان میں ایک سال کے لئے حیدر آباد گئے، پھر دارالعلوم ہی میں تشریف آوری ہوئی اور ۱۳۷۴ھ تک دارالعلوم ہی میں تدریسی خدمات انجام دیتے رہے۔ آپ کے روحانی تزکیہ و تربیت کے لیے حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ کے دست مبارک پر بیعت کی اور اجازت و خلافت حضرت مدنیؒ کی طرف عطا ہوئی۔ ہزاروں تشنگان علم نے آپ سے اپنی پیاس بجھائی۔ آپ کے مشہور تلامذہ میں حضرت مولانا مفتی شفیعؒ، مولانا حفظ الرحمٰن سیوہارویؒ، مولانا قاری محمد طیب قاسمیؒ، مولانا محمد منظور نعمانی، مولانا سعید احمد اکبر آبادیؒ، شیخ الحدیث مولانا سرفراز خان صفدر اور حضرت مولانا صوفی عبدالحمید سواتیؒ شامل ہیں۔ تدریسی خدمات کے علاوہ آپ نے کئی درسی کتابوں کے حواشی تحریر فرمائے جن میں حاشیہ نورالایضاح (فارسی) حاشیہ کنز الدقائق، حاشیہ مفید الطالبین، حاشیہ دیوان متنبی، حاشیہ دیوان حماسہ اور حاشیہ تلخیص المفتاح شامل ہیں۔

شیخ الادبؒ ممتاز مدرس عالم دین، علوم و فنون میں یکتائے روزگار اور باخدا شخصیت تھے۔ آپ بے شمار خداداد امتیازی صفات کے ساتھ تشنگان علم و عرفان میں زندگی بھر وراثت نبوی تقسیم فرماتے رہے۔ حضرات شیخین کی یہ خوش نصیبی تھی کہ دونوں قابل فخر بھائیوں کو شیخ الادب کے علم و عرفاں سے خوشہ چینی کی سعادت نصیب ہوئی۔ حضرات شیخین نے آپؒ سے ابوداؤد شریف مکمل، ترمذی شریف جلد ثانی اور شمائل ترمذی پڑھنے کی سعادت حاصل کی، جب کہ حضرت مدنی کی گرفتاری کے بعد بخاری شریف اور ترمذی شریف کا بقیہ حصہ بھی حضرت شیخ الادبؒ سے پڑھا۔ حضرت مولانا صوفی عبدالحمید سواتیؒ اپنے عظیم استاذ کی نمایاں صفات کے بارے میں فرماتے ہیں:

''آپ کی یہ ایک نمایاں خوبی تھی کہ ہمیشہ سلام میں پہل کرتے تھے اور سلام کرنے میں کسی دوسرے کو پہل نہیں کرنے دیتے تھے۔ آپ کی یہ صفت بھی نمایاں تھی کہ نہ تو آپ پان کھاتے تھے اور نہ کبھی کِھل کِھلا کے ہنستے تھے۔ وقت کے سخت پابند تھے۔ جونہی ان کے پیریڈ کی گھنٹی بجتی، کھٹ سے کلاس میں داخل ہو جاتے۔ ادھر جب وقت ختم ہونے کی گھنٹی سنتے، جو لفظ منہ میں ہوتا اسے بھی چھوڑ کر جماعت سے باہر چلے جاتے۔ وقت کی قدر و قیمت سے آپ بخوبی آشنا تھے۔ وقت کی اہمیت کے متعلق آپ کا یہ فرمان با مقصد زندگی گزارنے والوں کے لیے باعث تقلید ہے: ''جو زمانہ گزر چکا، وہ ختم ہو چکا، اس کو یاد کرنا عبث ہے اور آئندہ زمانہ کی طرف امید کرنا بس امید ہی ہے۔ تمہارے اختیار میں تو وہی تھوڑا وقت ہے جو اس وقت تم پر گزر رہا ہے۔''

امام المفسرین حضرت مولانا حسین علیؒ واں بھچرانویؒ

حضرت مولانا حسین علی بن محمد بن عبداللہ ۱۲۸۳ھ میں واں بھچراں ضلع میانوالی کے ایک زمیندار گھرانے میں پیدا ہوئے۔ آپ نے ابتدائی تعلیم واں بھچراں کے قریب ایک موضع ''شادیا'' میں حاصل کی۔ ابتدائی صرف ونحو اور فارسی نظم کی کتابیں اپنے والد حافظ میاں محمدؒ سے پڑھیں۔ اس کے بعد موضع ''سیلوہال'' میں دیگر کتب پڑھیں اور فنون کی تمام اونچی کتابیں مولانا احمد حسن کانپوریؒ سے پڑھیں۔ ۱۳۵۲ھ میں حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ کی خدمت میں گنگوہ حاضر ہو کر حدیث پڑھی اور سند حاصل کی۔ ۱۳۵۳ھ میں عارف ربانی حضرت مولانا مظہر نانوتویؒ کی خدمت میں حاضر ہو کر تفسیر پڑھی۔ ۱۳۵۴ھ میں کانپور میں مولانا احمد حسن صاحبؒ سے منطق، فلسفہ وغیرہ فنون کی تکمیل کی۔

مولانا حسین علی صاحبؒ کو اللہ تعالیٰ نے بڑا وسیع علم عطا فرمایا تھا۔ خصوصاً تفسیر اور علم حدیث وفقہ، علم کلام اور تصوف و سلوک میں بڑی وسیع دستگاہ رکھتے تھے اور بڑی ٹھوس علمیت اور استعداد کے مالک تھے۔ علم اسماء الرجال میں آپ کی نظر بڑی وسیع تھی۔ مختلف احادیث کی تطبیق میں مہارت تامہ رکھتے تھے۔ قرآن کریم کے ترجمہ اور مطالب بیان کرنے میں اور مضامین کے استحضار اور آیات اور سورتوں کا ربط بیان کرنے میں تو اپنی نظیر آپ تھے۔ آپ کا علاقہ ناخواندگی اور اسلامی تعلیمات سے عدم واقفیت کے سبب شرک وبدعت کے اندھیروں میں ڈوبا ہوا تھا۔ آپ نے اس بدعت زدہ ماحول میں برس ہا برس کی محنت شاقہ سے توحید کی شمع روشن کی۔ آپ کی توحید باری تعالیٰ بیان کرتے ہوئے ایک بڑی علمی اور مؤثر بات یہ ارشاد فرمایا کرتے تھے: ''توحید اپنے بیان کے لیے کسی تمہید کی محتاج نہیں''۔ طلبہ دور دور سے استفادہ کے لیے آپ کی خدمت میں حاضر ہوتے۔ آپ خود کھیتی باڑی کرتے تھے اور طلبہ کے جملہ اخراجات اپنی جیب سے ادا کرتے تھے۔ آپ تقریباً ساٹھ برس مسند تدریس پر رونق افروز رہے اور شمع ہدایت کو فروزاں کیے رکھا۔ آپ روحانی تربیت کے لیے حضرت خواجہ محمد عثمان دامانیؒ سے سلسلہ نقشبندیہ میں بیعت ہوئے۔ ان کی وفات کے بعد خواجہ سراج الدینؒ کی طرف رجوع کیا اور ان سے ہی خلافت حاصل کی۔ وقت کے یہ عظیم مصلح، مایہ ناز مفسر اور ممتاز محدث رجب ۱۳۶۳ھ میں اپنے رب رحیم اور مولائے رؤف سے جا ملے۔

حضرت شیخ الحدیث شریعت وطریقت دونوں کو لازم وملزوم سمجھتے تھے۔ آپ نے اپنی ذات سے کبھی بھی ان کو جدا نہیں ہونے دیا۔ آپ اپنی علمی مجالس میں اپنے اکابر زاد اللہ فیوضہم کے متعلق اکثر فرمایا کرتے تھے کہ ''ہمارے اکابر رحمہم اللہ میں سے ہر ایک کسی نہ کسی روحانی سلسلہ سے ضرور وابستہ تھے''۔ یہی وجہ ہے کہ جہاں وہ ایک طرف علوم شرعیہ میں یکتائے روزگار تھے، وہاں راہ سلوک وتصوف میں بینارہ نور بھی تھے۔ چنانچہ حضرت شیخ الحدیث نے سلسلہ نقشبندیہ میں حضرت مولانا حسین علیؒ کے دست حق پرست پر بیعت کی۔ آپ کے شیخ نے آپ کی علمی وروحانی ترقی کو دیکھتے ہوئے آپ کو خلافت کی خلعت فاخرہ سے نوازا۔ آپ زندگی بھر اپنے شیخ کے روحانی فیض کو تقسیم کرتے رہے اور شرک وبدعت اور رسوم ورواج کے اندھیروں میں حق وصداقت کی شمع جلاتے رہے۔ حضرت مولانا حسین علی صاحبؒ آپ کے روحانی ومربی ہونے کے ساتھ ساتھ تفسیر قرآن حکیم میں آپ کے استاد بھی تھے۔ آپ نے قرآن حکیم کے علوم ومعارف اسی رجل مومن سے حاصل کیے۔ آپ قرآن حکیم کی تفسیر پڑھاتے ہوئے جابجا اپنے شیخ کے تفسیری نکات پیش فرماتے، خاص طور پر ''ربط'' کے حوالے سے اپنے شیخ کی تصنیف ''بلغۃ الحیران فی ربط آیات الفرقان'' کا حوالہ ان الفاظ سے دیا کرتے تھے: ''ہمارے حضرت مرحوم حضرت مولانا حسین علی صاحبؒ اس کا ربط یوں بیان فرماتے تھے''۔ حضرت فرماتے ہیں کہ میں جب بیعت کے لیے حضرت کی خدمت میں حاضر ہوا تو اس وقت حضرت نے اپنے دست مبارک سے ''تحفہ ابراہیمیہ'' کا ایک نسخہ مجھے عطا فرمایا اور ساتھ ہی فرمایا کہ اس کا مطالعہ کرو اور اگر کوئی بات پوچھنی ہے تو پوچھ لو۔ چنانچہ میں نے ڈیڑھ گھنٹے میں اس کا مطالعہ کیا اور بعض مقامات سے کچھ باتیں حضرت سے دریافت کیں، آپ نے ان کا جواب عنایت فرمایا۔ حضرت مولانا حسین علی صاحبؒ نے ''تحفہ ابراہیمیہ'' میں سلوک و تصوف اور حقائق ومعارف کے اکثر مسائل نہایت ہی اختصار سے بیان کیے ہیں اور ان مسائل کو اس رسالہ میں درج کیا ہے جن پر باطنی تربیت کا مدار ہے۔

بطل حریت حضرت مولانا غلام غوث ہزارویؒ

حضرت مولانا غلام غوث ہزاروی جون ۱۸۹۶ھ کو موضع بفہ ضلع مانسہرہ حضرت مولانا گل احمد کے ہاں پیدا ہوئے۔ آپ نے ابتدائی تعلیم گھر کے ماحول ہی میں مکمل کی۔ ۱۹۱۰ھ میں مڈل کا امتحان پاس کیا اور ضلع بھر میں اول پوزیشن حاصل کی۔ دینی تعلیم کے حصول کے لیے آپ نے پہلے مظاہر علوم سہارنپور میں داخلہ لیا، اس کے بعد صوبہ سرحد کے مشہور عالم مولانا رسول خان صاحب کی زیرنگرانی ۱۹۱۵ء میں مرکز حق دار العلوم دیوبند میں داخلہ لیا۔ ان دنوں حضرت علامہ محمد انور شاہ کشمیری دار العلوم دیوبند کے شیخ الحدیث تھے۔ ۱۳۳۷ھ مطابق ۱۹۱۹ء میں حضرت کشمیریؒ، حضرت مولانا غلام رسولؒ، علامہ شبیر احمد عثمانیؒ اور حضرت مولانا محمد ابراہیم بلیاوی سے دورہ حدیث پڑھ کر سند حاصل کی۔ حضرت مولانا محمد اسحاق کانپوری امتحان میں اول اور آپ دوم آئے۔ حضرت مولانا قاری محمد طیبؒ، حضرت مولانا مفتی محمد شفیعؒ اور مولانا محمد ادریس کاندھلویؒ جیسے عظیم اصحاب فضل وکمال آپ کے ہم سبق تھے۔ فراغت کے بعد حضرت مولانا حبیب الرحمٰن عثمانی (مہتمم دار العلوم دیوبند) کے ارشاد پر معین مدرس دار العلوم میں تدریس کی، پھر جمعیۃ علمائے ہند کی تنظیم کے لیے مولانا یوسف جونپوریؒ کے ہمراہ پورے ہندوستان کا دورہ کیا اور حیدر آباد دکن کی ایک ہندو ریاست میں دو سال تک بطور مبلغ اسلام تبلیغی خدمات انجام دیں۔ آپ نے ۱۹۳۱ء میں ہزارہ میں سیاسی کام کا آغاز کیا اور انگریز کے خلاف نبرد آزما ہوئے اور اس کے نتیجہ میں ۱۹۳۲ء کا پورا سال ایبٹ آباد اور بنوں کی جیلوں میں گزارا۔ جیل سے رہائی کے بعد ۱۹۳۳ء میں انگریز کے خود کاشتہ پودے مرزائیت سے نبرد آزما رہے۔ ۱۹۳۴ء میں مجلس احرار اسلام سے وابستہ ہوگئے اور مرزائیت کے خلاف تحریک میں زبردست حصہ لیا۔ پھر ۱۹۴۲ء میں انگریز بھرتی کے خلاف سول نافرمانی کی تحریک میں شریک ہو کر پورا سال قید وبند کی صعوبتیں برداشت کرتے رہے۔ ۱۹۵۳ء کی تحریک ختم نبوت میں نمایاں کردار ادا کیا۔ ۱۹۵۶ء میں جمعیت علمائے اسلام کے ناظم اعلیٰ مقرر ہوئے۔ ۱۹۵۸ء میں ایوب خان کے مارشل لا اور ۱۹۶۲ء میں عائلی قوانین کی غیر شرعی دفعات کے خلاف ڈٹ گئے۔ ۱۹۷۱ء کے الیکشن میں قومی اسمبلی کے ممبر منتخب ہوئے۔ ۱۹۷۱ء میں عرب ممالک کا دورہ کیا اور ۱۹۷۲ء میں سرکاری حج وفد کے رکن کی حیثیت سے حج وزیارت کی سعادت حاصل کی۔

بہرحال اس پیکر جرات وعزیمت نے ساری زندگی دینی خدمت کرتے ہوئے بار ہا قید وبند، مقدمات، فاقہ کشی اور تکالیف کی صعوبتوں کو برداشت کیا۔ آپ نے زندگی کی جدوجہد کے تقریباً پچاس سال گزارے۔ آخری ایام میں گوشہ نشینی اختیار کر لی اور ۴ر فروری ۱۹۸۱ء کی درمیانی رات ۲۸ ربیع الاول ۱۴۰۱ھ کو بفہ میں عارضہ دل میں مبتلا ہو کر شب کو ساڑھے چار

بجے خالق حقیقی سے جاملے۔ زندگی کے آخری لمحات میں 'رب یسر و لاتعسر' کے الفاظ بار بار دہراتے رہے۔ اس کے بعد کلمہ طیبہ آہستہ آواز سے پڑھتے ہوئے جھٹکے سے اپنا منہ قبلہ کی طرف کرتے ہوئے محمد رسول اللہ ذرا بلند آواز سے پڑھا اور اسی لمحے آپ کی روح مبارک جسم سے جدا ہوگی۔

حضرت مولانا غلام غوث ہزارویؒ حضرات شیخین کے ابتدائی اساتذہ میں سے ہیں۔ دونوں بھائیوں نے درس نظامی کی کتب کی ابتدا حضرت ہزارویؒ سے ہی کی۔ ۱۹۲۰ء میں حضرات شیخین کی والدہ محترمہ کے بعد آپ کے پھوپھی زاد بھائی سید فتح علی شاہ صاحبؒ آپ کو اور آپ کے برادر عزیز کو پڑھانے کے لیے اپنے ساتھ اپنے گاؤں ''لمی'' لے آئے۔ شاہ صاحبؒ فرماتے تھے کہ میرے ماموں محترم نور احمد خان مرحومؒ مجھے فرمایا کرتے تھے کہ میرے ان دونوں بیٹوں کو دینی تعلیم پڑھائیں اور یہ بات تاکیداً فرماتے تھے کہ ان دونوں بچوں کو حدیث رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور فقہ اسلامی کی تعلیم سے ضرور آراستہ کریں۔ شاہ صاحب چونکہ خود باضابطہ مکمل عالم دین نہ تھے، اس لیے انہوں نے دونوں بھائیوں کو تحصیل علم کے لیے ملک پور (مانسہرہ) کے ایک دینی مدرسہ میں داخل کروا دیا جس کے مہتمم نگران حضرت مولانا غلام غوث ہزارویؒ تھے۔ حضرات شیخین نے ملک پور اور بفہ (مانسہرہ) میں آپ کے زیر سایہ درس نظامی کی ابتدائی تعلیم حاصل کی۔ حضرت شیخ الحدیث نے علم نحو کی ابتدائی کتاب نحو میر اور مسائل دینیہ پر مشتمل مختصر ابتدائی کتاب تعلیم الاسلام حضرت ہزاروی سے ہی پڑھی۔

آپ اپنے استاد محترم کی جرات وشجاعت، حق گوئی و بے باکی اور تواضع وانکساری سے بے حد متاثر تھے۔ اکثر ان کی جرات اور حق گوئی و بے باکی کے واقعات طلبہ کو سناتے تاکہ ان کے اذہان وقلوب میں عظیم شخصیات کی صفات نقش ہوں اور وہ ان کے روشن کردار کو اپنے لیے قابل تقلید سمجھیں۔ حضرت ہزارویؒ اپنے دونوں قابل فخر تلامذہ پر بہت شفقت فرمایا کرتے تھے۔ آپ اکثر مدرسہ نصرۃ العلوم تشریف لاتے اور ادارہ کی تعلیمی وتدریسی اصلاحی ترقی کو دیکھ کر انتہائی خوشی کا اظہار فرماتے۔ حضرت ہزارویؒ نے مدرسہ نصرۃ العلوم کے قیام کا ابتدائی زمانہ دیکھا تھا۔ جہاں آج کل مدرسہ کی عظیم عمارت ہے، وہاں اس دور میں ایک بڑا تالاب ہوتا تھا۔ ابتدا میں اس تالاب کے کنارے مٹی وغیرہ ڈال کر مدرسہ کی بنیاد رکھی گئی۔ مسجد اور مدرسہ کے کمرے کچے ہوتے تھے، لیکن جب اللہ تعالیٰ نے مرکز حق کو تعلیمی عروج عطا فرمایا تو مسجد اور مدرسہ کی عمارت پختہ تعمیر کی گئی۔ حضرت ہزارویؒ نے جب اس ترقی کو دیکھا اور مسجد اور مدرسہ میں وسعت دیکھی اور تعلیمی سرگرمیاں ملاحظہ کیں تو ایک موقع پر اپنی تقریر میں خوشی کا اظہار کرتے فرمایا: ''مولوی کو تو بس پاؤں رکھنے کی جگہ چاہیے، آگے سب کچھ بن جاتا ہے۔''

مفتی اعظم حضرت مولانا مفتی محمد شفیع دیوبندیؒ

آپ ۱۳۱۴ھ بمطابق ۱۸۹۷ء میں قصبہ دیوبند ضلع سہارنپور میں جید عالم دین صاحب نسبت بزرگ مولانا محمد یٰسین دیوبندیؒ کے گھر میں پیدا ہوئے۔ پانچ سال کی عمر میں حافظ محمد عظیم صاحبؒ کے پاس دارالعلوم دیوبند میں قرآن کریم کی تعلیم شروع کی۔ فارسی کی تمام مروجہ کتب اپنے والد محترم سے دارالعلوم میں پڑھیں۔ حساب وفنون کی تعلیم اپنے چچا مولانا منظور احمد سے حاصل کی۔ سولہ سال کی عمر میں دارالعلوم کے درجہ عربی میں داخل ہوئے اور ۱۳۳۵ھ میں فارغ التحصیل ہوئے۔ پھر دارالعلوم میں بحیثیت استاد ہر علم وفن کی جماعتوں کو پڑھایا۔ دارالعلوم میں تدریس کا یہ سلسلہ ۱۳۶۲ھ تک جاری رہا۔ ۱۳۴۹ھ میں دارالافتا کا کام بھی مستقل طور پر آپ کے سپرد کر دیا گیا۔ اللہ تعالیٰ کے فضل وکرم سے آپ صدر فقہی کے

عظیم منصب کا حق پوری طرح ادا کرتے رہے اور قیام پاکستان تک اس عظیم منصب فائز رہے۔

حضرت مفتی اعظمؒ نے سلوک وتصوف میں بھی بلند مقام پایا تھا۔ ابتدا میں آپ شیخ الہند حضرت مولانا محمود حسن دیوبندیؒ سے ۱۹۲۰ء میں بیعت ہوئے۔ پھر ان کی وفات کے بعد ۱۳۴۶ھ میں حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ سے بیعت ہوئے جنھوں نے آپ کی علمی اور روحانی صلاحیتوں کو دیکھ کر ۱۳۴۹ھ میں آپ کو اپنا خلیفہ اور مجاز بیعت قرار دیا۔ ایک مرتبہ حضرت حکیم الامت اشرف علی تھانویؒ نے آپ کے متعلق فرمایا: ''اللہ تعالیٰ مفتی محمد شفیع کی عمر دراز کرے۔ مجھے ان سے دو خوشیاں ہیں۔ ایک تو یہ کہ ان کے ذریعہ علم حاصل ہوتا رہتا ہے اور دوسری یہ کہ اللہ تعالیٰ کا شکر ہے کہ میرے بعد بھی کام کرنے والے موجود ہیں۔'' حضرت مولانا قاری محمد طیب قاسمیؒ آپ کی جامع صفات کو مختصراً کیا خوب بیان فرمایا ہے کہ ''حضرت مفتی اعظمؒ، ہمارے شیخ حضرت حکیم الامت کے علمی اور روحانی ترجمان اور صحیح جانشین تھے۔ ہمارے قدیم اسلاف کی یادگار تھے، فقہ وتفسیر میں امامت کا مرتبہ حاصل تھا، ایک مایہ ناز مصنف، ادیب اور شاعر تھے، ایک شیخ کامل اور عارف کامل تھے۔ الغرض آپ کی شخصیت ایک جامع شخصیت تھی اور اکابرین امت کو آپ کی ذات پر مکمل اعتماد تھا۔ امام العصر علامہ انور شاہ کشمیریؒ، علامہ شبیر احمد عثمانیؒ، مولانا حسین احمد مدنیؒ، مولانا ظفر احمد عثمانی اور مولانا اصغر حسین دیوبندیؒ جیسے مشاہیر بھی آپ سے رائے لیتے تھے اور آپ کو وقت کا محقق، مفسر، مدبر اور فقیہ تسلیم کرتے تھے۔ درس وتدریس اور تبلیغ واصلاح کے ساتھ تصنیف وتالیف بھی آپ کا محبوب مشغلہ رہا اور آپ کے قلم فیض رقم سے تین سو سے زائد تالیفات منصۂ شہود پر آئیں۔''

حضرت مفتی اعظمؒ ساری زندگی خدمت اسلام اور خدمت مسلمین میں مصروف رہے اور آخر دم تک درس وتدریس، فقہ و افتا اور تبلیغ وارشاد میں مصروف رہے۔ آپ ۹ اور ۱۰ شوال المکرم کی درمیانی شب ۱۳۹۶ھ بمطابق ۱۹۷۶ء کو خالق حقیقی سے جاملے۔ ایک لاکھ سے زائد مسلمانوں نے آپ کے جنازہ میں شرکت کی اور حضرت ڈاکٹر عبدالحی عارفیؒ نے نماز جنازہ پڑھائی۔ آپ کی وفات پر آپؒ کے متعلق محدث عصر حضرت مولانا محمد یوسف بنوریؒ نے فرمایا کہ ''آپ سے دارالعلوم دیوبند کی پوری تاریخ وابستہ تھی اور ہمارے اسلاف کی آپ آخری یادگار تھے۔''(۱)

مفتی اعظم مولانا محمد شفیعؒ کا شمار ایسے علمائے حق میں ہوتا ہے جنھوں نے پوری زندگی علوم دینیہ کی خدمت اور امت مسلمہ کی اصلاح کے لیے صرف فرمائی۔ آپ نہ صرف مفسر عہد، مدبر عصر، عالم باعمل، فاضل اجل، فقیہ دوراں اور محقق اعظم تھے، بلکہ سلوک وتصوف کے بے مثل امام اور شیخ کامل تھے۔ جب ۱۹۴۰ء میں حضرت شیخ الحدیث اپنے برادر عزیز حضرت مولانا صوفی عبدالحمید سواتیؒ کے ہمراہ دارالعلوم دیوبند پہنچے تو حضرت مفتی صاحبؒ دارالعلوم میں ہی معین المدرس کی حیثیت سے مسند تدریس پر رونق افروز تھے۔ چنانچہ دونوں بھائیوں نے حدیث کی کتاب طحاوی شریف حضرت مفتی صاحبؒ سے سبقاً سبقاً پڑھی۔ قیام پاکستان کے بعد جب حضرت مفتی صاحبؒ ہجرت فرما کر پاکستان تشریف لے آئے تو حضرت شیخ اپنے استاذ محترم سے برابر رابطہ میں رہے۔ اپنی علمی، تصنیفی وتدریسی سرگرمیوں کے متعلق حضرت مفتی صاحبؒ سے مشورہ کرتے رہتے، بلکہ حضرت نے اپنی کتاب ''تنقید متین بر تفسیر نعیم الدین'' حضرت مفتی صاحبؒ کے حکم پر ہی تالیف فرمائی اور اس کتاب میں مولانا احمد رضا خان بریلوی اور مفتی نعیم الدین مرادی آبادی کے ترجمہ وتفسیر کا علمی اور تحقیقی جائزہ لے کر اس میں موجود اغلاط کو قرآن کریم اور احادیث رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات کی روشنی میں واضح کیا۔ حضرت مفتی صاحبؒ بھی

آپ کی مساعی جمیلہ اور خاص طور پر آپ کی تصنیفات کی بے حد تحسین فرماتے تھے۔ جب حضرت شیخ نے اپنی تصنیف ''مقام ابی حنیفہ'' حضرت مفتی صاحبؒ کی خدمت میں بھیجی تو حضرتؒ بے حد مسرور ہوئے اور جوابی مکتوب میں تحریر فرمایا:

''میں نے اس کتاب کو مختلف مقامات سے خود بھی پڑھا۔ بار بار دل سے دعا نکلتی ہے۔ بحمد اللہ میری آرزو پوری ہوگئی۔ بلا مبالغہ عرض ہے کہ میں خود لکھتا تو ایسی جامع کتاب نہ لکھ سکتا۔ اس موضوع پر یہ کتاب بالکل کافی شافی ہے۔''

حضرت مفتی صاحبؒ اس موضوع پر خود ایک کتاب تحریر کرنا چاہتے تھے لیکن آپ کے قابل فخر شاگرد نے آپؒ کی اس خواہش کو پورا کر دیا۔ استاد اور شاگرد کے درمیان کیسا مثالی رشتہ اور تعلق تھا کہ حضرت مفتی صاحبؒ نے اپنی شہرہ آفاق تفسیر معارف القرآن میں بھی قارئین کو اپنے لائق شاگرد کی تحریرات سے استفادہ کی تلقین کی ہے۔ سورۃ البقرۃ کی آیت نمبر ۱۳۵، ۱۲۹ کی تفسیر میں طلاق ثلاثہ کے مسئلہ پر حضرت شیخ کی کتاب ''عمدۃ الاثاث'' کا حوالہ دیتے ہوئے فرماتے ہیں:

''حال میں مولانا ابو الزاہد محمد سرفراز صاحب کی کتاب عمدۃ الاثاث بھی اس مسئلہ پر بھی شائع ہوگئی ہے جو بالکل کافی ہے۔''

شیخ الحدیث والتفسیر حضرت مولانا محمد ادریس کاندھلویؒ

شیخ الحدیث والتفسیر حضرت مولانا محمد ادریس صاحب کاندھلویؒ ان علمائے حق میں سے تھے جن کا علم وفضل، زہد وتقویٰ اور خلوص وللّٰہیت ایک مسلمہ حیثیت رکھتے ہیں۔ آپ اپنے دور کے عظیم محدث، جلیل القدر مفسر، بہترین محقق اور بلند پایہ عالم دین تھے۔ آپ کا اسم گرامی بھی حضرات شیخین کے اساتذہ کی فہرست میں شامل ہیں۔ حضرت شیخ صاحب اور حضرت صوفی صاحبؒ کے آپؒ سے حدیث کی مشہور کتابیں مشکوٰۃ المصابیح اور موطا امام مالک پڑھیں۔

حضرت مولانا محمد ادریس کاندھلویؒ ۱۲ ربیع الثانی ۱۳۱۷ھ مطابق ۱۹۰۰ء میں ایک ممتاز عالم دین اور صاحب نسبت بزرگ حافظ محمد اسماعیل کاندھلویؒ کے ہاں پیدا ہوئے۔ نو سال کی عمر میں آپ نے اپنے والد ماجد سے قرآن کریم حفظ کیا۔ صرف ونحو کی ابتدائی کتابیں حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ سے پڑھیں۔ اس کے بعد ثانوی اور اعلیٰ تعلیم مولانا خلیل احمد سہارنپوریؒ، حضرت مولانا حافظ عبد اللطیفؒ، حضرت مولانا ثابت علیؒ، حضرت مولانا ظفر احمد عثمانیؒ جیسے اکابر اہل علم سے حاصل کی اور ۱۹ برس کی عمر میں تمام علوم وفنون کی تعلیم سے فراغت حاصل کی۔ پھر مرکز علوم اسلامیہ دیوبند تشریف لے گئے جہاں حضرت مولانا محمد انور شاہ کشمیریؒ، حضرت مولانا علامہ شبیر احمد عثمانیؒ، مولانا مفتی عزیز الرحمٰنؒ، مولانا حبیب الرحمٰن عثمانیؒ اور مولانا اصغر حسین دیوبندیؒ جیسے مایہ ناز اساتذہ کے سامنے زانوئے ادب تہہ کیا اور دوبارہ دورۂ حدیث سے فراغت حاصل کی۔ تعلیم سے فراغت کے بعد ۱۹۲۱ء سے آپ کی تدریسی زندگی کا آغاز ہوا اور تادم واپسیں درس وتدریس کے مقدس پیشہ سے وابستہ رہے۔ آپ مدرسہ امینیہ دہلی میں ایک سال، دار العلوم دیوبند میں نو سال، جامعہ عباسیہ بہاول پور میں شیخ الجامعہ کی حیثیت سے دو سال اور جامعہ اشرفیہ لاہور میں شیخ الحدیث والتفسیر کے منصب جلیل پر آخر دم تک درس وتدریس کا فریضہ انجام دیتے رہے۔

آپ بڑے سادہ اور علمی انداز میں وعظ فرماتے تھے۔ جب تقریر فرماتے تو معلوم ہوتا کہ علم وعرفاں کا سمندر ٹھاٹھیں مار

رہا ہے۔ ایک مرتبہ خیر المدارس ملتان کے سالانہ جلسہ کے موقع پر آپ خطاب فرما رہے تھے۔ بڑے بڑے علما اور خطبا تشریف فرما تھے۔ سامعین بڑے ذوق وشوق سے تقریر سن رہے تھے۔ دوران تقریر علمی نکات پر ایسی عالمانہ اور محققانہ گفتگو فرمائی کہ آپ کی علمی قابلیت اور دینی بصیرت سے متاثر ہو کر امیر شریعت سید عطاء اللہ شاہ بخاریؒ دوران تقریر مجمع کے سامنے کھڑے ہو گئے اور شدت جذبات میں فرمانے لگے: ''لوگو دیکھ لو، یہ ہیں ہمارے اکابر جن کا علم وتقویٰ بے مثل ہے۔ لوگو! خوب دیکھ لو اور سن لو، یہ دار العلوم دیوبند کے قابل فخر فرزند اور اس دور کے محدث اعظم ہیں۔''

حضرت کاندھلویؒ شیخ المفسر والمحدثین تو تھے ہی، اپنے زمانہ کے مایہ ناز مصنف بھی تھے اور آپ کے قلم فیض رقم سے درجنوں تالیفات منصۂ شہود پر آئیں۔ آپ کی تالیف ''سیرت المصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم'' کے متعلق حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ کا ارشاد گرامی ہے کہ ''مولانا حافظ محمد ادریس صاحب جو علمی وعملی کمالات کے جامع ہیں، ان کی ''سیرت مصطفیٰ'' قلب پر بے حد اثر کرتی ہے اور قلب کو سکون بخشتی ہے۔''

آخری دم تک آپ پاکستان میں نظام اسلام کے نفاذ کے لیے کوشاں رہے۔ تحریک ختم نبوت میں بھرپور حصہ لیا اور تحریر و تقریر کے ذریعے قادیانیت کی تردید کرتے رہے۔ غرض یہ کہ آپ کی ساری حیات طیبہ اسلام کی خدمت میں گزری۔ آپؒ ایک سچے عاشق رسول اور ولی کامل تھے۔ کئی بار حج بیت اللہ کی سعادت نصیب ہوئی۔ بالآخر پیغام اجل آپہنچا اور آپ ۷ رجب المرجب ۱۳۹۴ھ بمطابق ۲۸ جولائی ۱۹۷۴ء کو اپنے خالق حقیقی سے جا ملے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ حق تعالیٰ ہمیں ان کے قدم پر چلنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین ثم آمین

استاذ العلماء مولانا عبد القدیر کیمل پوریؒ

حضرت مولانا عبد القدیر ۱۹۰۱ء میں بمقام مومن پورہ علاقہ چھچھ ضلع اٹک میں مولانا عبد الرحیمؒ کے گھر میں پیدا ہوئے۔ پرائمری تک تعلیم اپنے گاؤں کے اسکول میں حاصل کی۔ اس کے بعد دینی تعلیم کی تحصیل میں مصروف ہو گئے۔ اپنے علاقہ چھچھ میں مختلف علما سے دینی تعلیم حاصل کرتے رہے اور خاص طور پر مومن پورہ کے قریب ہی جلالیہ میں مولانا سعد الدین صاحبؒ سے پڑھتے رہے جو حضرت مولانا عبد الحی فرنگی محلی کے شاگرد تھے۔ پھر مظاہر العلوم سہارنپور میں اور اس کے بعد دار العلوم دیوبند میں پڑھتے رہے۔ آخر میں ڈابھیل پہنچ کر حضرت مولانا انور شاہ کشمیریؒ سے حدیث کی تکمیل کی۔ آپ تدریسی مزاج اور ذوق کے متبحر عالم دین تھے۔ زندگی بھر تدریس آپ کا اوڑھنا بچھونا رہا۔ تقریباً ۵۲ سال مسند تدریس پر رونق افروز رہے۔ ۱۷ سال قیام پاکستان سے پہلے اور ۳۵ پینتیس سال قیام پاکستان کے بعد تدریس کی۔ آخر میں آپ مدرسہ تعلیم القرآن راولپنڈی میں شیخ الحدیث کی حیثیت سے تشریف لے گئے اور سات سال اسی مدرسہ میں آخر دم تک اس منصب جلیل پر خدمات سرانجام دیتے رہے۔ بالآخر علم عرفان کا یہ آفتاب علمی روشنی بکھیرتے ہوئے طلبہ کے قلوب کو علوم دینیہ سے منور کرتے ہوئے بروز منگل ۱۰ جمادی الاولیٰ ۱۴۱۱ھ بمطابق دسمبر ۱۹۹۰ء کو اپنے خالق حقیقی سے جا ملا۔ اللہ تعالیٰ آپ کی مساعی جمیلہ کو اپنی بارگاہ عالیہ میں اپنی شان کے مطابق قبول فرمائے، آپ کو اعلیٰ علیین میں جگہ نصیب فرمائے، آمین۔ آپ کا جنازہ آپ کے تلمیذ رشید شیخ الحدیث حضرت مولانا سرفراز خان صفدرؒ نے پڑھایا اور آپ کو آپ کے آبائی گاؤں مومن پورہ میں سپرد خاک کر دیا گیا۔

استاذ العلماء مولانا عبدالقدیر کیمل پوریؒ عوامی حلقوں میں تو زیادہ معروف نہ تھے، لیکن تدریسی حلقوں میں آپ کو ایک مایہ ناز استاذ، محقق دوراں، شیخ المنقول والمعقول کے نام سے شہرت دوام حاصل ہوئی۔ اگر آپ کو برصغیر کی سطح کے چوٹی کے مدرّسین کی فہرست میں شمار کیا جائے تو تدریسی میدان کے وابستگان جانتے ہیں کہ یہ مبالغہ نہ ہوگا۔ آپؒ حضرت شیخ الحدیثؒ اور حضرت صوفی صاحبؒ کے ممتاز اساتذہ میں سے ہیں، بلکہ حضرات شیخین نے درس نظامی کی اکثر کتب آپؒ ہی سے پڑھیں۔ حضرت شیخ الحدیث اپنے اسباق میں اکثر اپنے استاد گرامی کا تذکرہ کرتے ہوئے فرمایا کرتے تھے: ''میرا تعلیمی ذوق شوق اور علمی استعداد استاذ محترم حضرت مولانا عبدالقدیر صاحبؒ کی خصوصی شفقت اور توجہ کی مرہون منت ہے۔''

جب حضرت شیخ الحدیثؒ نے تقلید کے موضوع پر اپنی معروف ومقبول کتاب ''الکلام المفید فی اثبات التقلید'' تحریر فرمائی تو مولانا عبدالقدیر اپنے تلمیذ رشید کی اس علمی وتحقیقی کاوش پر بہت خوش ہوئے۔ اپنی خوشی کا اظہار ان الفاظ میں کرتے ہیں:

''آپ کی تالیف کردہ کتاب دیکھ کر نہایت خوشی ہوئی۔ کتاب اپنی ظاہری زیبائش کے ساتھ باطنی موتیوں کا خزانہ نظر آیا۔ کتاب صحیح معنوں میں حجۃ اللہ علی الاعداء وشفاء المرضیٰ ہے۔ الحمد للہ والمنۃ۔ صحیح المزاج، سلیم الدماغ لوگوں کے لیے سرچشمہ ہدایت اور مفید بصیرت وبصارت ہے۔ واللہ یھدی من یّشآء الی صراط مُستقیم، جزاکم اللہ تعالیٰ خیر الجزاء فی الدارین۔''

آپ کے استاذ محترم کو آپ کی علمی لیاقت واستعداد پر اس قدر اعتماد تھا کہ جو کتب آپ کو پڑھائیں، زمانہ طالب علمی ہی میں وہی کتب اپنی نگرانی میں آپ کو پڑھانے کا موقع عطا فرمایا۔ حضرت شیخ الحدیث تقریباً دواڑھائی سال درس نظامی کی فراغت سے پہلے مدرسہ انوار العلوم گوجرانوالہ میں آپ کی زیر نگرانی پڑھاتے رہے۔ راقم نے ایک دفعہ حضرت شیخ رحمہ اللہ سے پوچھا کی آپ نے کون کون سی کتابیں حضرت مولانا عبدالقدیر صاحبؒ سے پڑھی ہیں؟ فرمایا کہ میں نے درس نظامی کی اکثر کتب حضرت مولانا عبدالقدیر صاحب سے پڑھیں۔ پھر بطور نمونہ چند کتب کے نام لیے، مثلاً تفسیر میں جلالین اور بیضاوی، حدیث میں مشکوۃ، فقہ میں ہدایہ (چار جلدیں) اصول فقہ میں حسامی وتوضیح تلویح، منقولات میں ملاحسن، قاضی مبارک، صدرا اور حمد اللہ، فلسفہ میں بدور، اس کے علاوہ خیالی، متن متین، حماسہ وغیرہ۔ حضرت مولانا صوفی عبدالحمید صاحب سواتیؒ آپ کی شفقتوں کا تذکرہ کرتے تحریر فرماتے ہیں:

''احقر نے تقریباً تین سال دوران تعلیم آپ کی خدمت میں گزارے۔ شیخ الحدیث حضرت مولانا سرفراز خان صفدر تو آپ کے اجل تلامذہ میں سے تھے۔ ان کی ذہانت وفطانت کی وجہ سے مولانا ان کا بہت خیال فرماتے تھے، لیکن احقر کی طبعی خاموشی اور مسکینی اور اس لیے کہ صبح کی نماز باجماعت ادا کرتا تھا، احقر کا بہت لحاظ فرماتے تھے۔''

مفکر اسلام حضرت مولانا مفتی عبدالواحدؒ

آپ ۱۹۰۸ء میں اٹک کے علاقہ میں قاضی ضیاء الدین کے ہاں پیدا ہوئے۔ مڈل تک تعلیم اپنے آبائی گاؤں سہال میں حاصل کی جبکہ دینی تعلیم اپنے چچا اور سسر حضرت مولانا عبدالعزیز سہالویؒ محدث گوجرانوالہ (المتوفی ۱۳۵۹ھ) سے حاصل کی اور کچھ کتابیں حضرت مولانا محمد چراغ صاحبؒ سے حاصل پڑھیں۔ آخر میں ۱۹۳۰ء کے لگ بھگ جامعہ اسلامیہ ڈابھیل سے سند فراغت حاصل کی۔ آپ کا شمار حضرت مولانا سید محمد انور شاہؒ (المتوفی ۱۳۵۲ھ) کے مایہ ناز شاگردوں میں ہوتا تھا۔ آپ

نے امام المفسرین حضرت مولانا حسین علی صاحب (المتوفی ۱۳۶۳ھ) کے دست حق پرست پر بیعت کی۔ شادی زمانہ طالب علمی ہی میں اپنے چچا حضرت مولانا عبدالعزیز صاحبؒ کی صاحبزادی سے ہوگئی تھی، لیکن کوئی اولاد نہیں ہوئی۔ زندگی بھر تعلیم و تدریس، اور افتا کے شعبہ سے وابستہ رہے۔ جامع مسجد شیرانوالہ باغ گوجرانوالہ کے عرصہ دراز تک خطیب رہے اور مدرسہ انوار العلوم کے مدرس اور مہتمم کی حیثیت سے بھی تدریس اور اہتمام کی ذمہ داریاں سرانجام دیتے رہے۔

سیاسی میدان میں متحدہ جمعیۃ علماے ہند اور بعد از تقسیم ہند جمعیۃ علماے اسلام کے پلیٹ فارم پر سرگرم عمل رہے۔ علما کے طبقہ میں آپ کو بڑی قدر ومنزلت کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا۔ تبلیغی جماعت کے ساتھ بھی آپ کا گہرا ربط اور تعلق تھا بلکہ گوجرانوالہ کے تبلیغی جماعت کے امیر وسرپرست بھی تھے۔ اللہ تعالیٰ ملک وملت کے لیے آپ کی تمام کاوشوں کو قبول فرمائے، آمین۔ آخری عمر میں فالج کا حملہ ہوا اور اسی بیماری میں ۱۱ر دسمبر ۱۹۸۲ء بروز ہفتہ صبح دس بجے جناح ہسپتال گوجرانوالہ میں دار فانی سے دار بقا کی طرف رحلت فرما گئے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ آپ کی نماز جنازہ آپ کی خواہش کے مطابق حضرت مولانا محمد عبداللہ درخواستیؒ نے شیرانوالہ باغ گوجرانوالہ کے وسیع گراؤنڈ میں پڑھائی اور گوجرانوالہ کے قدیم قبرستان کلاں میں آپ کو دفن کیا گیا۔

حضرت مولانا مفتی عبدالواحد گوجرانوالہ شہر کے ایک بزرگ عالم دین، متقی وپرہیزگار، ذہین وذکی اور زیرک سیاستدان ہونے کے علاوہ بے شمار خداداد صلاحیتوں اور خوبیوں سے مالا مال تھے۔ حضرت شیخ الحدیثؒ نے مدرسہ انوار العلوم گوجرانوالہ میں آپ سے درس نظامی کی مختلف کتابیں مثلاً شرح وقایہ، سراجی اور مطول وغیرہ پڑھیں۔ حضرت شیخ اکثر حضرت مفتی صاحبؒ کا ذکر خیر ایک مشفق مربی کی حیثیت سے کیا کرتے تھے۔ مفتی صاحب اگرچہ مدرسہ انوار العلوم کے مہتمم تھے، تاہم آپ کی نظر پورے شہر کے معاملات پر ہوتی تھی اور تمام دینی وملی کاموں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کو یہ اعزاز بھی عطا فرمایا کہ آپ کی سرپرستی اور مشورہ ہی سے ۱۹۵۲ء میں عظیم دینی درس گاہ مدرسہ نصرۃ العلوم کی بنیاد رکھی گئی اور حضرت مولانا صوفی عبدالحمید سواتی کو اس کا مہتمم مقرر کیا گیا۔ اللہ تعالیٰ اس دینی درس گاہ کو تا قیامت آباد وشاد رکھے اور اس کے علمی وروحانی فیض کو عام اور تام فرمائے۔ آمین ثم آمین۔

استاذ العلماء حضرت مولانا ولی اللہؒ (انہی والے)

''انہی''، ضلع منڈی بہاؤالدین میں واقع قصبہ میانوالی رانجھا کے قریب ہی ایک چھوٹا سا گاؤں ہے۔ یہی گاؤں حضرت مولانا غلام رسول صاحبؒ المعروف ''بابا انہی والا'' کا وطن مالوف تھا۔ آپ علوم نقلیہ اور عقلیہ کے ماہر عالم دین تھے۔ اس چھوٹے سے گاؤں میں آپ کے ہاں بڑے بڑے اصحاب علم زیر تعلیم رہے۔ حضرت مولانا محمد انور شاہ کشمیریؒ آپ کے متعلق فرمایا کرتے تھے کہ ''مولوی صاحب علمائے آخرت میں سے ہیں''۔ آپ بڑے زاہد وعابد، صاحب کشف وکرامت اور متوکل بزرگ تھے اور حضرت مولانا غلام رسول صاحبؒ کے تلمیذ رشید اور علمی جانشین تھے۔

حضرت شیخ ''انہی'' میں رائج طریقہ تدریس کے متعلق خود تحریر فرماتے ہیں: ''انہی میں طریقہ تعلیم یہ تھا کہ طالب علم ہر فن کی کتاب کا مطالعہ کرتا اور خوب سمجھ کر حل شدہ سبق استاد کے سامنے بیان کرتا اور غلطی پر استاد اس کی اصلاح کر دیتے۔ اس طریقہ سے طالب علم بمشکل ایک دو سبق ہی حل کر سکتا۔ نہایت ہی ذہین طالب علم تین اسباق پڑھ سکتا تھا۔ اس طرز سے طلباء

میں مطالعہ اور کتابوں کو سمجھنے اور حل کرنے کا جذبہ بخوبی اجاگر ہوتا ہے۔'' حضرت شیخ نے اسی طریقہ تعلیم کے مطابق اس مشہور درسگاہ میں درس نظامی کی دقیق اور مشکل کتب خیالی، میبذی اور ملاحسن وغیرہ پڑھیں۔ فرمایا کرتے تھے کہ اس دور میں یہ دستور تھا کہ جس گاؤں میں ''خیالی'' پڑھانے والے کوئی ماہر استاذ موجود ہوتا، اس گاؤں کے باہر درخت پر سفید جھنڈا لگا ہوتا تھا جو اس بات کی علامت ہوتا تھا کہ یہاں خیالی پڑھانے والے کوئی ماہر استاذ موجود ہیں۔

آپ بعض اوقات اس دور کے واقعات اور حصول علم میں پیش آنے والی مشکلات کا تذکرہ طلبہ کو سنایا کرتے تھے، تاکہ وہ بھی حصول علم میں پیش آنے والی مشکلات کو خندہ پیشانی سے برداشت کرتے ہوئے اپنے علمی سفر کو جاری رکھیں۔ آپ جب مولانا ولی اللہ صاحبؒ کے ہاں زیر تعلیم تھے تو روزانہ صبح سویرے طویل پیدل سفر کر کے پڑھنے کے لیے تشریف لے جاتے تھے، کیونکہ مدرسہ طلبہ کی رہائش گاہ سے کافی دور واقع تھا۔ وہاں علوم عقلیہ منطق وغیرہ کا فن اتنی پختگی سے پڑھایا جاتا تھا کہ علاقہ کے ان پڑھ زمینداروں میں بھی اس فن کا بہت چرچا تھا۔

حضرت مولانا ولی اللہؒ ابھی بقید حیات ہی تھے کہ حضرت شیخ دارالعلوم دیوبند سے تعلیمی فراغت کے بعد واپس گوجرانوالہ تشریف لے آئے اور ۱۹۴۳ء میں گکھڑ میں تعلیمی وتدریسی اور تصنیفی وتالیفی سلسلہ کا آغاز کر دیا۔ جلد ہی آپ کی علمی شہرت ارد گرد کے اضلاع میں پھیل گئی۔ حضرت شیخ الحدیث کے دل میں حضرت مولانا ولی اللہ صاحبؒ کی اتنی قدر ومنزلت تھی کہ ان کی موجودگی میں کسی مسئلہ کے جواب دینے میں کتنی احتیاط اور تامل فرماتے تھے۔ ایک مرتبہ میانوالی رانجھا کے کچھ احباب کسی دینی مسئلہ کے متعلق حضرت مولانا ولی اللہ صاحبؒ کے جواب سے مطمئن نہ ہوئے اور انہوں نے اسی مسئلہ کے متعلق حضرت شیخ سے بذریعہ خط آپ کی رائے معلوم کرنی چاہی۔ آپ نے جوابی خط میں اپنی رائے دینے سے قبل تحریر فرمایا کہ ''استاذ محترم حضرت مولانا ولی اللہ صاحبؒ کی موجودگی میں مجھ ناکارہ سے مسئلہ پوچھنے کی کیا ضرورت پیش آئی ہے؟ لیکن اگر آپ نے پوچھا ہے تو اپنی رائے عرض کر دیتا ہوں تاہم میں اس کی تصویب کے لیے آپ کا خط اور اپنی تحریر کردہ رائے حضرت استاذ محترم کو بھیج رہا ہوں۔'' چنانچہ حضرت شیخ نے اپنی تحریر کردہ رائے اپنے استاذ محترم کے ذریعے ہی متعلقہ احباب تک پہنچائی۔

حضرت مولانا ولی اللہ صاحبؒ کا روحانی تعلق امام المفسرین مولانا حسین علی صاحبؒ کے ساتھ تھا۔ آپ زندگی بھر شہرت وناموری سے دور رہتے ہوئے مسند تدریس پر رونق افروز علم وعرفان کی شمعیں روشن کرتے۔ اللہ تعالیٰ آپ کی بشری تقصیرات سے درگزر کرتے ہوئے حسنات کو قبول فرمائے اور آپ کو اعلیٰ علیین میں جگہ نصیب فرمائے۔ آمین

حضرت مولانا اسحاق رحمانیؒ (ساکن چونیاں)

حضرت شیخ الحدیث اپنے برادر عزیز کے ہمراہ ضلع سیالکوٹ کے مشہور قصبہ وڈالہ سندھواں میں تقریباً دو سال حضرت مولانا اسحاق رحمانیؒ کے پاس زیر تعلیم رہے۔ آپ حضرت مولانا مفتی محمد کفایت اللہ دہلویؒ کے مایہ ناز شاگردوں میں سے تھے۔ غضب کے ذہین، بہترین مدرس اور چوٹی کے مقرر تھے۔ مسلکاً اہل حدیث تھے، مگر خاصے معتدل تھے اور فروعی مسائل میں نزاع اور اختلاف پسند نہ کرتے تھے۔ جب حضرت شیخ اپنے برادر خورد کے ہمراہ ان کی خدمت میں حاضر ہوئے تو انہوں نے آپ سے داخلہ کا امتحان لیا اور معرفہ ونکرہ کی تعریف دریافت فرمائی اور پھر بعض سوالات کیے۔ جب آپ نے فی الفور صحیح جوابات دے دیے تو بہت خوش ہوئے اور آپ کو اور آپ کے برادر عزیز کو داخلہ دے دیا۔ وڈالہ سندھواں کی مرکزی دومنزلہ

مسجد میں تقریباً دو سال آپ مولانا محمد اسحاقؒ کے پاس زیر تعلیم رہے اور سبعہ معلقہ، شرح جامی اور قطبی تک کتابیں پڑھیں، جبکہ حضرت صوفی صاحبؒ نے ابتدائی کتابیں پڑھیں۔

حضرت مولانا اسحاق صاحب کا سوانحی خاکہ اور تفصیلی حالات راقم کو تلاش بسیار کے باوجود نہ مل سکے۔ اس مقصد کے لیے راقم حضرت شیخ کی خدمت میں بھی حاضر ہوا، لیکن گوناگوں عوارض کی وجہ سے آپ ان کے متعلق کچھ تفصیل نہ بتا سکے۔ ان کے متعلق حضرت نے جو کچھ بتایا، وہ درج بالا سطور میں درج کر دیا گیا ہے۔

حضرت مولانا عبدالعلیمؒ

مولانا عبدالعلیم صاحب ملتانی کا اسم گرامی بھی آپ کے اساتذہ گرامی کی فہرست میں شامل ہے۔ آپ نے ملتان میں واقع ''لانگے خان باغ'' کے قریب مسجد میں موصوف سے علم میراث کا ایک رسالہ پڑھا جس کے مصنف مولانا موصوف خود ہی تھے۔ حضرت شیخ موصوف کی مسلکی وابستگی کے بارے میں تحریر فرماتے ہیں کہ ''مولانا بہت معمر تھے۔ ان کے فرزند مولانا عبدالحلیم اور ان کے فرزند مولانا عبدالکریم اور ان کے فرزند مولانا عبدالشکور سب زندہ تھے۔ لانگے خان کے باغ کے قریب ان کی مسجد تھی اور اس میں درس کتب جاری تھا۔ یہ حضرات نہ پکے دیوبندی اور نہ پختہ بریلوی تھے بلکہ بین بین تھے۔ علم اور علماء سے بڑی عقیدت رکھتے تھے''۔

حضرت مولانا غلام محمد لدھیانویؒ

حضرت مولانا غلام محمد لدھیانویؒ حضرت مولانا انور شاہ کشمیریؒ کے قابل فخر شاگرد اور ممتاز فضلاے دیوبند میں سے تھے۔ آپ جہانیاں منڈی کی مرکزی مسجد کے خطیب اور مدرس تھے۔ مسجد سے متصل طلبا کی رہائش کے لیے کمرے تھے۔ ۱۹۳۷ء میں حضرت شیخ اپنے برادر عزیز اور اپنے ایک ساتھی سید امیر حسین شاہ صاحب کے ہمراہ جہانیاں منڈی میں حضرت مولانا غلام محمد لدھیانوی صاحبؒ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ اسباق شروع ہونے کے چند دن بعد دارالعلوم دیوبند کے قدیم فضلا میں سے مولانا عبدالخالق مظفر گڑھی بھی بحیثیت مدرس وہاں تشریف لے آئے۔ یہاں مدرسہ رحمانیہ میں نورالانوار، تلخیص، مختصر المعانی، مسلم الثبوت، حمد اللہ اور عبدالغفور وغیرہ کتابیں ان دونوں بزرگوں سے پڑھیں۔

مولانا سید فتح علی شاہؒ

قدرت نے یہ سعادت حضرت سید فتح علی شاہ صاحبؒ کے مقدر میں لکھی تھی کہ حضرات شیخین کے اساتذہ گرامی کی فہرست میں ان کا نام بھی درج ہو۔ حضرت شیخ نے ایک مرتبہ خود راقم کو یہ بتلایا کہ انہوں نے مکمل ناظرہ قرآن مجید حضرت شاہ صاحبؒ سے ہی سبقاً سبقاً پڑھا، بلکہ یہ بھی فرمایا کہ ہم دونوں بھائیوں کو سب سے پہلے بفل حریت حضرت مولانا غلام غوث ہزارویؒ کے مدرسہ میں حضرت شاہ صاحبؒ نے ہی داخل کروایا تھا۔ حضرت شاہ صاحبؒ حضرت شیخ الحدیث صاحب کے پھوپھی زاد بھائی تھے۔ آپ کی پھوپھی ہزارہ میں واقع ایک قصبہ ''بفل'' کے ایک سادات خاندان میں بیاہی گئی تھیں۔ بفل کے مغربی جانب گاؤں ''لمی'' میں سید فتح علی شاہ صاحبؒ ایک مسجد میں امام تھے۔ جب ۱۹۲۰ء میں حضرت شیخ کی والدہ محترمہ کا انتقال ہو گیا تو آپ کی پھوپھی صاحبہ آپ کو اور آپ کے برادر عزیز کو اپنے ساتھ ہی بفل لے آئیں۔ وہاں سے شاہ

صاحبؒ دونوں بھائیوں کو اپنے ساتھ ''لمی'' گاؤں میں لے گئے۔ شاہ صاحبؒ حضرات شیخین کے والد محترم نوراحمد خان صاحبؒ کی اپنے بچوں کے متعلق خواہش اور وصیت ان الفاظ میں بیان فرمایا کرتے تھے: ''میرے ماموں جان اکثر مجھے یہ بات تاکیداً فرمایا کرتے تھے کہ میرے ان بچوں کو حدیث رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور فقہ اسلامی کی ضرور تعلیم دینی ہے''۔ اللہ نے اس نیک آرزو اور خواہش کو شرف قبولیت عطا فرماتے ہوئے دونوں بھائیوں کے قلوب میں حدیث رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور فقہ اسلامی کی وہ روشنی پیدا فرمائی جس سے ہزاروں لاکھوں انسانوں کے قلوب منور ہوئے۔

سید فتح علی شاہ صاحب بن سید دین علی شاہ مرحوم ساکن لمی بٹل میں واقع ایک سکول میں چھٹی جماعت میں پڑھتے تھے۔ پھر نامعلوم وجوہ اور اسباب کی بناء پر بٹل سے ملک پور چلے گئے اور وہاں فقیرا خان مرحوم کی مسجد میں بحیثیت امام اپنے فرائض سرانجام دینے لگے اور شیر پور کے مڈل سکول میں داخل ہو گئے۔ دوران تعلیم ہی سید فتح علی شاہ مرحوم کی شادی ہوگئی اور وہ باوجود شوق کے تعلیم جاری نہ کر سکے اور اکثر گھر ہی میں رہنے لگے۔ ۱۹۸۴ء میں دنیائے فانی سے رخصت ہوئے۔

۱۹۹۳ء میں حضرت شیخ الحدیث عمرہ کے لیے تشریف لے گئے۔ حضرت کے صاحبزادے مولانا عزیز الرحمٰن شاہد بھی اس وقت سعودی عرب میں ہی مقیم تھے۔..... حضرت امام اہل سنت نے واقعہ سنایا کہ کافی سال پہلے میں حج کے لیے آیا تھا۔ اس وقت سفر بحری جہازوں کا ہوتا تھا اور دو تین ماہ بھی لگ جایا کرتے تھے، اس لیے میں اپنی کتابیں بھی ساتھ ہی لایا تھا۔ اس وقت حرم میں مختلف جگہوں پر حلقۂ درس بھی ہوا کرتے تھے۔ ایک دن میں نے اپنے حلقہ میں تین مسائل بیان کیے:

۱۔ دوران طواف حجر اسود کے علاوہ سینہ پھیرنا مکروہ ہے۔

۲۔ بیت اللہ شریف کی طرف دیکھنا بھی باعث ثواب ہے

۳۔ میدان عرفات میں اگر آپ مسافر ہیں تو قصر پڑھیں، ورنہ پوری نماز پڑھیں۔

حضرت شیخ الحدیث فرماتے ہیں کہ گوجرانوالہ کے ایک غیر مقلد عالم دین نے شیون الحرم کو شکایت کر دی۔ وہ مجھے ایک تہہ خانہ میں لے گئے۔ وہاں شیخ طٰہٰ ابوالواسع البرکاتی تھے۔ انہوں نے مجھ سے پوچھا کہ آپ نے یہ مسائل بیان کیے ہیں؟ میں نے کہا، میں نے مسائل بیان کیے ہیں۔ انہوں نے دلیل پوچھی تو میں نے تینوں مسائل کے احادیث سے دلائل دیے اور شیخ طٰہٰ ابوالواسع البرکاتی کو احادیث مبارکہ بھی سنائیں۔ اس کے بعد حضرت شیخ الحدیث نے شیخ طٰہٰ کو کہا کہ مسنون تو پگڑی باندھنا ہے، مگر آپ لوگ پگڑی کیوں نہیں باندھتے، رومال رکھ کر سانپ سا لپیٹ لیتے ہیں، اس کی آپ کے پاس کیا دلیل ہے؟ اس پر شیخ طٰہٰ مسکرائے اور مجھے کہا کہ آپ جائیں اور حرم میں درس دیتے رہیں۔ حضرت شیخ نے فرمایا کہ اس کے بعد جب کبھی آنا ہوتا تو شیخ طٰہٰ ابوالواسع البرکاتی سے ملاقات ہو جاتی۔ آج انہوں نے مجھے افطاری اپنے پاس کرنے کی دعوت دی ہوئی تھی، اس لیے افطاری آج ان کے پاس کر کے آیا ہوں۔

(ماہنامہ ہدی للناس گوجرانوالہ، امام اہل سنت نمبر، جون ۲۰۰۹ء)

حافظ نثار احمد الحسینی*

امام اہل سنتؒ کے چند اساتذہ کا تذکرہ

شیخ الحدیث حضرت مولانا عبدالقدیر مومن پوری رحمہ اللہ

حضرت امام اہل سنت مولانا محمد سرفراز خان صفدر رحمہ اللہ کے اساتذہ میں شیخ الاسلام حضرت مولانا سیّد حسین احمد مدنی رحمہ اللہ، امام الموحدین حضرت مولانا حسین علی رحمہ اللہ اور شیخ الحدیث حضرت مولانا عبدالقدیر مومن پوری رحمہ اللہ اپنے فیوضات کی وجہ سے نمایاں ہیں۔ حضرت امام اہل سنت رحمہ اللہ نے حضرت مدنی رحمہ اللہ سے حدیث رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا فیض لیا، حضرت مولانا حسین علی رحمہ اللہ سے تفسیر اور تصوّف کا فیض لیا اور مولانا عبدالقدیر رحمہ اللہ سے فقہ اور فنون کی پختگی حاصل کرنے کے ساتھ ان کی شفقتوں سے نوازے گئے۔ حضرت مولانا عبدالقدیر رحمہ اللہ سے آپ نے مدرسہ انوار العلوم گوجرانوالہ میں پڑھا۔ مولانا عبدالقدیر رحمہ اللہ نے آپ کی خداداد صلاحیتوں کو دیکھتے ہوئے نہ صرف آپ کو توجہ سے پڑھایا بلکہ اپنے سامنے آپ سے تدریس کروائی اور آپ کو طلبہ کی ایک مستقل جماعت دی۔ اس طرح زمانہ طالب علمی میں حضرت امام اہل سنت رحمہ اللہ کی تدریسی صلاحیتوں کے جوہر کھلے۔ حضرت امامِ اہل سنت رحمہ اللہ احقر کے نام اپنے ایک مکتوب گرامی میں لکھتے ہیں:

''آپ کا محبت نامہ موصول ہوا۔ یاد آوری، کرم فرمائی، حسن ظنی اور ذرہ نوازی کا صمیم قلب سے ہزار شکریہ، ورنہ من آنم کہ من دانم۔ کیا پدّی اور کیا پدّی کا شوربا۔

محترم! راقم الحروف کو جو تھوڑی سی علمی شُد بُد ہے، وہ استاذنا المکرّم حضرت مولانا عبدالقدیر صاحب دامت برکاتہم اور ان جیسی دیگر گراں قدر و بزرگ شخصیتوں کی برکت سے حاصل ہے، ورنہ نغمہ کجا و من کجا ساز سخن بہانہ ایست۔'' (مکتوبہ ۶ رجب ۱۴۰۸ھ/ ۲۵ فروری ۱۹۸۸ء)

حضرت مولانا عبدالقدیرؒ کی یہ شفقتیں حضرت امام اہل سنت پر آخر تک رہیں۔ حضرت مولانا عبدالقدیرؒ کی مستقل تصانیف دو ہی ہیں جو حضرت امام اہل سنت کے دفاع میں لکھی گئیں۔ ''تدقیق الکلام'' آپ نے ''احسن الکلام'' کے دفاع میں اور ''ارشاد العلماء'' آپ نے ''تسکین الصدور'' کے دفاع میں لکھی۔ اس طرح حضرت امام اہل سنت کے رحمہ اللہ کے اساتذہ میں حضرت مولانا عبدالقدیر رحمہ اللہ کی شخصیت نمایاں ہے۔ ''الشریعہ'' کی اشاعت خاص کی مناسبت سے حضرت مولانا عبدالقدیر رحمہ اللہ کے مختصر حالاتِ زندگی نذر قارئین ہیں۔

مہتمم مدرسہ عربیہ حنفیہ تعلیم الاسلام، حضرو، ضلع اٹک

حضرت مولانا عبدالقدیر رحمہ اللہ مومن پور علاقہ چھچھ ضلع اٹک میں ۱۳۱۸،۱۹ھ/ ۱۹۰۱ء میں پیدا ہوئے۔ آپ کے والد مولانا عبدالرحیم رحمہ اللہ مومن پور میں تدریس کرتے تھے اور گزر اوقات کے لیے خود اپنی ذاتی زمینوں میں کھیتی باڑی کرتے تھے۔ آپ کے دادا محمد حسن رحمہ اللہ بھی نیک سیرت اور علاقہ کے متمول حضرات سے تھے۔ آپ قریشی النسل ہیں۔ آپ کے آباو اجداد سلطان محمود غزنوی رحمہ اللہ کے ساتھ عرب سے ہند میں جہاد کے لیے آئے اور ہند سے کشمیر، ہزارہ کے راستہ صدیوں کا سفر طے کرتے ہوئے علاقہ ''چھچھ'' میں آباد ہو گئے۔ اس علاقہ کی علمی فضا کا شہرہ دور دور تک تھا۔ تشنگان علم اس علاقہ کو ''چھچھ ہزارہ کا بخارا'' کہتے تھے۔ رب تعالیٰ نے یہاں کے علمی ماحول میں آپ کے آباو اجداد کی فطرتی صلاحیتوں اور خاندانی خصوصیات کو علمِ دین کی خدمت کی سعادت بخشی۔

حضرت مولانا عبدالقدیر رحمہ اللہ نے قرآن مجید اور ابتدائی تعلیم گھر پر حاصل کی۔ پرائمری تک اپنے گاؤں مومن پور کے اسکول میں میں پڑھا۔ عربی، صرف ونحو کے لیے آپ مومن پور گاؤں کے قریب قصبہ ''جلالیہ'' میں حضرت مولانا سعد الدین رحمہ اللہ کی خدمت میں رہے۔ حضرت مولانا سعد الدین رحمہ اللہ نے حدیث حضرت مولانا احمد علی سہارنپوری رحمہ اللہ سے، فقہ حضرت مولانا عبدالحی لکھنوی رحمہ اللہ سے اور فنون حضرت مولانا لطف اللہ علی گڑھی رحمہ اللہ سے پڑھے تھے۔ آپ کا علمی شہرہ دور دور تک تھا۔ مولانا سعد الدین رحمہ اللہ سے شرح جامی تک کتب پڑھنے کے بعد آپ نے ۱۳۴۱ھ/ ۱۹۲۲ء میں جامعہ مظاہر علوم سہارنپور میں داخلہ لیا اور مختصر المعانی اور میر قطبی وغیرہ کتب مظاہر علوم میں پڑھیں۔ ۱۳۴۲ھ/ ۱۹۲۳ء تا ۱۳۴۵ھ/ ۱۹۲۶ء چار سال دار العلوم دیوبند میں مولانا اعزاز علی رحمہ اللہ، مولانا رسول خان رحمہ اللہ، مولانا محمد ابراہیم بلیاوی رحمہ اللہ اور مولانا عبدالسمیع رحمہ اللہ سے درجہ موقوف علیہ کی کتب جلالین، ہدایہ اولین، توضیح تلویح، رسالہ قطبیہ اور مشکوٰۃ شریف پڑھنے کے بعد آپ پنجاب میں فنون کی مشہور درس گاہ موضع ''انھی'' پھالیہ ضلع گجرات آ گئے۔ یہاں آپ نے مولانا غلام رسول رحمہ اللہ (م ۱۳۵۱ھ/ ۱۹۳۳ء) اور مولانا ولی اللہ رحمہ اللہ (م ۱۳۹۳ھ/ ۱۹۷۳ء) سے فنون آلیہ کی کتب میں ملکہ حاصل کیا۔ موضع ''انھی'' میں آپ نے مولانا غلام رسول رحمہ اللہ سے ''تفسیر''، ''ہدایہ آخرین''، ''بیضاوی''، ''جلالین''، ''میر زاہد''، ''امور عامہ''، ''قاضی مبارک''، ''مسلم الثبوت''، ''عبدالغفور''، ''متن متین'' وغیرہ کتب اور فلسفہ منطق کی دوسری انتہائی کتب مولانا ولی اللہ رحمہ اللہ سے پڑھیں۔

اس زمانہ میں علمِ حدیث کا طوطی ڈابھیل میں بول رہا تھا۔ طالبانِ علمِ حدیث کشاں کشاں حضرت امام المحدثین مولانا علامہ محمد انور شاہ کشمیری رحمہ اللہ کی خدمت میں حاضر ہوتے اور اس بحرِ بےکراں سے مستفیض ہوتے۔ آپ بھی عازمِ ڈابھیل ہوئے۔ ۱۳۴۸،۴۹ھ/ ۱۹۲۹،۳۰ء کا تعلیمی سال آپ نے جامعہ اسلامیہ ڈابھیل میں گزارا۔ حضرت علامہ محمد انور شاہ کشمیری رحمہ اللہ سے صحیح بخاری شریف، علامہ شبیر احمد عثمانی رحمہ اللہ سے جامع ترمذی شریف اور حدیث کی دوسری کتب صحیح مسلم، سنن ابی داؤد، سنن ابن ماجہ وغیرہ مولانا سراج احمد رشیدی رحمہ اللہ سے پڑھیں۔ جامعہ اسلامیہ ڈابھیل میں آپ کا سلسلہ نمبر فضلاء ۱۳۴۹ھ/ ۱۹۳۰ء میں ۱۰۳ ہے۔

جامعہ اسلامیہ ڈابھیل سے فراغت کے بعد دو سال آپ اپنے گاؤں موضع ''مومن پور'' رہے اور فنون کی انتہائی کتب کی تدریس فرمائی۔ جامعہ اسلامیہ ڈابھیل کی انتظامیہ نے آپ کی علمی پختگی اور تدریسی صلاحیتوں کا شہرہ سن رکھا تھا۔ ذوالحجہ

۱۳۵۱ھ/ مارچ ۱۹۳۳ء میں آپ کو جامعہ اسلامیہ ڈابھیل میں تدریس کی دعوت دی گئی۔ آپ نے تدریس کے لیے اپنے مادرِ علمی کو ترجیح دی اور ڈابھیل تشریف لے گئے۔ ذوالحجہ ۱۳۵۱ھ/ مارچ ۱۹۳۳ء تا شوال ۱۳۵۵ھ/ دسمبر ۱۹۳۶ء تین تعلیمی سال آپ نے جامعہ اسلامیہ ڈابھیل میں مختلف درسی علوم وفنون کی انتہائی کتب کا درس دیا۔ روئیداد جامعہ اسلامیہ ڈابھیل میں آپ کو عربی مدرس لکھا گیا ہے۔ جامعہ اسلامیہ میں مدرس حدیث کے بعد یہ دوسرا اعزاز سمجھا جاتا ہے۔ آپ شوال ۱۳۵۵ھ/ دسمبر ۱۹۳۶ء میں ڈابھیل سے واپس تشریف لے آئے۔ گوجرانوالہ میں مولانا عبدالعزیز سیہالوی رحمہ اللہ (م ۱۳۵۹ھ/ ۱۹۴۰ء) نے جامع مسجد شیرانوالہ باغ سے متصل مدرسہ انوار العلوم کے نام سے ایک دینی مدرسہ جاری کیا تھا۔ آپ کو بھی یہاں تدریس کی دعوت دی گئی، چنانچہ شوال ۱۳۵۵ء/ دسمبر ۱۹۳۶ء میں آپ گوجرانوالہ تشریف لے آئے۔ یہاں آپ نے ۱۳۵۵ھ/ ۱۹۳۶ء تا ۱۳۶۵ھ/ ۱۹۴۵ء دس سال تدریس فرمائی۔ یہیں آپ سے حضرت مولانا صوفی عبدالحمید سواتیؒ اور حضرت مولانا محمد سرفراز خان صفدرؒ (۱۳۵۹، ۱۳۶۰، ۱۳۶۱ھ/ ۱۹۴۰، ۴۱، ۴۲ء) نے تین سال پڑھا۔ ۱۳۶۵ھ/ ۱۹۴۵ء میں جامعہ اسلامیہ ڈابھیل کی انتظامیہ نے آپ کو دوبارہ ڈابھیل آنے کی دعوت دی، چنانچہ ذوالحجہ ۱۳۶۵ھ/ اکتوبر ۱۹۴۶ء تا شوال ۱۳۶۶ھ/ اگست ۱۹۴۷ء آپ نے دو سال جامعہ اسلامیہ ڈابھیل میں تدریس فرمائی۔ شوال ۱۳۶۶ھ/ اگست ۱۹۴۷ء میں تقسیم ہند پر قیام پاکستان کا اعلان ہو گیا اور ہندوستان پاکستان اور بھارت دو ملکوں میں تقسیم ہو گیا جس کی وجہ سے آپ کا ڈابھیل میں رہنا ممکن نہ رہا اور آپ وطن واپس آ گئے۔

۱۳۶۶ھ/ ۱۹۴۷ء تا ۱۳۷۰ھ/ ۱۹۵۱ء پانچ سال آپ نے ''مدرسہ عربیہ فضل العلوم''، چاہ میاں صاحب حضرو میں تدریس فرمائی۔ ۱۳۷۰ھ/ ۱۹۵۱ء میں حضرت مولانا محمد انور شاہ کشمیری رحمہ اللہ کے شاگرد رشید حضرت مولانا عبدالحنان تاجکی رحمہ اللہ نے آپ کو اوکاڑہ میں تدریس کی دعوت دی، چنانچہ ۱۳۷۰ھ/ ۱۹۵۱ء تا ۱۳۷۵ھ/ ۱۹۵۶ء پانچ سال آپ نے اوکاڑہ میں تدریس فرمائی۔ ان پانچ سالوں میں دو سال عیدگاہ اور تین سال جامع مسجد گول چوک میں گزرے۔ حضرت مولانا محمد امین صفدر اوکاڑوی رحمہ اللہ (م ۳ شعبان ۱۴۲۱ھ/ ۳۱ اکتوبر ۲۰۰۰ء) اسی زمانہ میں غیر مقلدین کی طرف سے آپ سے بحث مباحثہ کے لیے آئے اور پہلے ہی دن غیر مقلدین کی دھوکہ دہی اور احناف کی حقانیت کے قائل اور آپ کی علمیت کے اسیر ہو گئے اور چند ہی ملاقاتوں کے بعد غیر مقلدیت سے توبہ کر کے باقاعدہ حضرت مولانا عبدالحنان تاجکی رحمہ اللہ اور آپ سے علمِ دین پڑھا۔ آپ نے مولانا امین صفدر اوکاڑوی رحمہ اللہ سے فرمایا: سطحی علم فتنہ ہے، پختہ علم پڑھو۔ چنانچہ صرف کی گردانوں سے آپ نے ابتدا کروائی۔ ۱۳۷۵ھ/ ۱۹۵۶ء تا ۱۳۸۷ھ/ ۱۹۶۷ء بارہ سال آپ نے قاسم العلوم فقیر والی میں تدریس فرمائی۔

۱۳۸۷ھ/ ۱۹۶۷ء میں آپ کو شیخ الحدیث حضرت مولانا نصیر الدین غورغشتویؒ (۱۳۸۸ھ/ ۱۹۶۹ء) نے اپنے ہاں غورغشتی بلا لیا۔ حضرت شیخ الحدیثؒ نے اس وقت ضعف کی وجہ سے تدریس چھوڑ دی تھی چنانچہ ۱۳۸۷ھ/ ۱۹۶۷ء تا ۱۳۹۰ھ/ ۱۹۷۰ء تیرہ سال آپ نے غورغشتی میں تدریس فرمائی۔ ۱۳۹۰ھ/ ۱۹۷۰ء میں آپ لائل پور (موجودہ فیصل آباد) تشریف لے گئے اور ۱۳۹۳ھ/ ۱۹۷۳ء تک یہاں تدریس فرمائی۔ شیخ القرآن حضرت مولانا غلام اللہ خانؒ (م ۱۹۸۰ء) آپ کے زمانہ جامعہ اسلامیہ ڈابھیل کے ساتھی تھے۔ ڈابھیل میں آپ نے ہی شیخ القرآن کو دورہ حدیث کے لیے بلایا تھا جو اس وقت دار العلوم دیوبند میں دورۂ حدیث میں داخلہ لے چکے تھے۔ آپ نے انہیں لکھا کہ فنِ حدیث کے امام علامہ محمد انور شاہ

کشمیری چراغِ سحری ہیں، آپ ڈابھیل آجائیں۔ شیخ القرآنؒ اس پر دارالعلوم دیوبند سے جامعہ اسلامیہ ڈابھیل آگئے۔

شیخ القرآن رحمہ اللہ نے آپ کو اپنے مدرسہ تعلیم القرآن راولپنڈی آنے کی دعوت دی، چنانچہ ۱۳۹۳ھ/۱۹۷۳ء میں آپ تعلیم القرآن راولپنڈی تشریف لے آئے اور تاوفات (۱۴۱۱ھ/۱۹۹۰ء) آپ نے تقریباً ۱۸ سال کا طویل عرصہ تعلیم القرآن میں درس نظامی کے علوم وفنون کی انتہائی کتابوں اور حدیث شریف میں صحیح بخاری اور جامع ترمذی وغیرہ کی تدریس فرمائی۔ تعلیم القرآن کی اٹھارہ سالہ تدریس سمیت آپ نے کل تریسٹھ سال کا طویل عرصہ علوم دینیہ کی تدریس میں گزارا اور ہزار ہا طلبہ نے آپ سے فیض پایا۔ آپ کا درس سادہ اور بے تکلف ہوتا تھا۔ آپ کی زیادہ توجہ متن پر ہوتی۔ درسی گپ شپ اور لچھے دار تقریر نہ آپ کو آتی تھی اور نہ اسے کبھی اختیار کرنے کی کوشش کی۔ وقت پر سبق شروع کرتے، وقت پر ختم کرتے۔ کتاب کا درسی حصہ تعلیمی سال میں ختم کر دیتے تھے۔ ''قاسم العلوم'' فقیروالی کے زمانہ تدریس میں چند طلبہ جو گپ شپ اور لچھے دار تقریر کے شوقین تھے، مولانا فضل محمد رحمہ اللہ (مہتمم مدرسہ) کے پاس گئے اور سبق کی شکایت کی۔ یہ ''مختصر المعانی'' کا سبق تھا۔ دوسرے روز مولانا فضل محمد رحمہ اللہ نے ستون کے پیچھے سے خود سبق سنا تو ان طلبہ کو بلا کر فرمایا، میں نے ''مولانا عبدالقدیر رحمہ اللہ کا سبق سنا ہے۔ میرا جی چاہتا ہے میں خود ان سے ''مختصر المعانی'' پڑھوں۔ تم کس بنیاد پر شکایت کرتے ہو؟'' آخر زمانہ میں آپ کی ایک آنکھ کی نظر ختم ہو گئی تھی۔ دوسری آنکھ سے معمولی نظر آتا تھا۔ مطالعہ اور کتاب دیکھ کر پڑھانا ممکن نہ رہا تھا، مگر بفضل اللہ درسیات آپ کو یاد تھیں۔ طالب علم فقط عنوان الباب سناتا تھا تو آپ متعلقہ عنوان کی پوری تقریر بیان فرما دیتے۔ احقر کو ''تعلیم القرآن'' میں آپ کے درس بخاری کے سماع کی سعادت نصیب ہوئی تو یہ منظر خود دیکھا کہ ''صحیح بخاری'' آپ کے سامنے نہیں تھی، طلبہ باب کا عنوان سناتے، آپ حدیث کے جملہ مباحث، ادلہ، ترجیحات، تقابل، متن، سند تمام مباحث یوں بیان فرماتے جیسے ابھی آپ یاد کر کے آئے ہیں۔

تریسٹھ سالہ دور تدریس میں ہزار ہا علما نے آپ سے شرف تلمذ حاصل کیا۔ جن مدارس میں آپ نے پڑھایا ہے، اگر ان مدارس کے ریکارڈ میں دیکھا جائے تو آپ سے مستفیض ہونے والے علما و مشاہیر کی اچھی خاصی فہرست جمع ہو سکتی ہے۔ آپ کے مرشد حضرت مولانا عبدالدیان رحمہ اللہ نے آپ سے آپ کے مشہور تلامذہ کا پوچھا تھا تو آپ نے جواب میں لکھا:

''بخدمت حضرت عالی جاہ پیر طریقت دام ظلہ وعز مجدہ

بعد السلام علیکم عرض یہ ہے کہ آپ نے شاگردوں کے متعلق دریافت فرمایا تھا۔ اس وقت استحضار نہ تھا، اب خیال آیا کہ عرض کر دوں۔ مولانا سرفراز صاحب اور صوفی عبدالحمید صاحب کے علاوہ مولانا احسان الحق صاحب مہتمم و مدرس مدرسہ تعلیم القرآن راولپنڈی، مولانا محمد خلیل احمد صاحب خطیب جامع مسجد سکھر، مولانا محمد صابر صاحب صدر مدرس مدرسہ اشاعت القرآن حضرو، مولانا عبدالسلام صاحب مدرس مدرسہ اشاعت القرآن اور مولانا رشید احمد صاحب مہتمم مدرسہ کامل پور موسیٰ چھچھ ضلع اٹک، مولانا عبدالسلام صاحب خطیب فیکٹری واہ۔ یہ سب حضرات دینی خدمات سرانجام دے رہے ہیں، جزاہم اللہ خیر الجزاء واللہ الموفق۔

طالب دعا بندہ عبدالقدیر عفی اللہ عنہ از راولپنڈی''

(ماہنامہ ''نصرۃ العلوم'' جلد نمبر ۵ شمارہ نمبر ۴ فروری ۲۰۰۰ء ص ۴۱)

مزاج و اخلاق

اللہ تعالیٰ نے آپ کو فطرت سلیمہ اور اخلاقِ عالی سے نوازا تھا۔ نہایت سادہ طبیعت اور منکسر المزاج تھے۔ گپ شپ، ہنسی مزاح اور فضولیات میں وقت لگانا آپ سے کوسوں دور تھا۔ نہ زیادہ تعلقات بنانے کا ذوق تھا، نہ سیر و تفریح کا شوق تھا۔ تدریس مطالعہ اور عبادت و ریاضت، یہ آپ کا تمام عمر مشغلہ رہا۔ نماز نہایت خشوع و خضوع سے پڑھتے اور تلاوت بلند آواز سے ترتیل کے ساتھ کرتے تھے۔ احقر ایک مرتبہ ''مومن پور'' آپ کے گھر مرشدی مولانا قاضی محمد زاہد الحسینی رحمہ اللہ کا ایک پیغام لے کر حاضر ہوا تو آپ گھر کے صحن میں چارپائی پر قبلہ رو تھے، سرہانہ پر قرآن مجید رکھے تلاوت فرما رہے تھے اور آپ کی تلاوت کی آواز باہر دروازہ پر سنی جا رہی تھی۔ جب گھر تشریف لاتے تو اپنی ذاتی زمینوں میں خود کھیتی باڑی کرتے تھے۔ کھیتی باڑی میں اس دور میں دو بیلوں سے ہل جوت کر خود بیلوں کے ساتھ لکڑی کے ہل پر کھڑے ہو کر بیلوں کے ساتھ بھاگنا پڑتا تھا۔ آپ یہ مشکل کام ایک مشاق زمیندار کی طرح کرتے تھے۔ ایک مرتبہ حضرت مولانا عبدالدیان کلیمؒ آپ کے ہاں ''مومن پور'' تشریف لائے تو آپ اس دن ہل چلا کر اپنا کام ختم کر چکے تھے۔ مرشد نے مرید سے فرمائش کی کہ آپ ذرا مجھے بھی دکھائیں کہ آپ نے ہل کس طرح چلایا ہے۔ بخاری پڑھاتے ہوئے تو میں نے آپ کو دیکھا ہے، ہل چلاتے ہوئے بھی دیکھ لوں۔ آپ نے مرشد کی فرمائش پر دوبارہ بیل جوتے اور لکڑی کے ہل پر کھڑے ہو کر مخصوص زمینداری آواز جو زبان کو کروٹ دے کر دائیں طرف سے نکالی جاتی ہے، نکالی اور بیلوں کے ساتھ کھیت میں دوڑ لگا کر دکھایا۔

آپ کے شاگرد رشید مفسر قرآن حضرت مولانا صوفی عبدالحمید سواتی رحمہ اللہ آپ کے اخلاق اور سادگی پر اپنے مشاہدات نقل کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''احقر عبدالحمید سواتی نے مولانا عبدالقدیر مرحوم کو قریب سے دیکھا ہے۔ نماز باجماعت کے بہت پابند تھے اور طلبہ سے بھی شدید پابندی کراتے تھے۔ کبھی تادیباً مارتے بھی تھے۔ رات کے آخری حصہ میں تہجد کی نماز بھی مختصری پڑھتے۔ اگر امام کسی وقت نہیں ہوتا تھا تو نماز بھی خود پڑھاتے تھے۔ مغرب کی نماز کے بعد چھ نوافل بھی پابندی سے ادا فرماتے تھے۔ اگر کبھی درس قرآن دینے والے بزرگ نہ ہوتے تو درس قرآن بھی دیتے تھے۔ حضرت شیخ الاسلام مولانا مدنی رحمہ اللہ اور امیر شریعت سید عطاء اللہ شاہ بخاری رحمہ اللہ کے ساتھ ان کے انگریز مخالف کارناموں اور نظریات کی وجہ سے والہانہ عقیدت و محبت رکھتے تھے۔ امیر شریعت کی تقریر اگر قریب ہوتی تو ضرور سننے کے لیے جاتے تھے۔ سبق کا ناغہ کبھی نہیں کرتے تھے سفر کے سوا۔ عام علما کی طرح کسی سے رشک و رقابت یا حسد و بغض نہیں رکھتے تھے۔ علما اکثر احساس کمتری میں مبتلا ہوتے ہیں۔ مولانا اس قسم کی تمام آفات سے خالی تھے۔ صاف دھلے ہوئے کپڑے بغیر استری کے ہی زیب تن فرماتے تھے۔ احقر نے تقریباً تین سال دوران تعلیم آپ کی خدمت میں گزارے تھے۔ شیخ الحدیث حضرت مولانا سرفراز صفدر تو آپ کے اجل تلامذہ میں سے تھے، ان کی ذہانت اور فطانت کی وجہ سے مولانا ان کا بہت خیال فرماتے تھے، لیکن احقر اپنی طبعی خاموشی اور مسکینی اور اس لیے کہ صبح کی نماز باجماعت ادا کرتا تھا، اس لیے احقر کا بہت لحاظ فرماتے تھے۔''

(ماہنامہ ''نصرۃ العلوم'' گوجرانوالہ، فروری ۲۰۰۰ء ص ۳۵)

’’احقر عبدالحمید سواتی نے حضرت مرحوم سے تین سال تک ۱۹۳۹، ۴۰، ۴۱ء میں پڑھا تھا۔ چنانچہ معقولات میں ملاحسن، حمداللہ، قاضی مبارک، میر زاہد، ملا جلال، میر زاہد، رسالہ قطبیہ، میر زاہد امور عامہ، فقہ میں ہدایہ آخرین، تفسیر میں جلالین شریف مکمل، تفسیر بیضاوی سورۃ بقرہ تک پڑھی تھیں۔ فلسفہ میں میبذی اور شمس بازغہ کتابیں پڑھی تھیں۔ مولانا نہایت سادہ لباس پہنتے تھے۔ طبیعت میں انکسار تھا۔ مشین کا بنا ہوا دیسی کھدر کا لباس ہوتا تھا اور معمولی سے کلے پر دیسی بناوٹ کی لنگی سر پر باندھتے تھے۔ عام حالات میں کھدر کی معمولی چادر اوڑھتے تھے۔ سردی کے موسم میں گرم چادر اوڑھ لیتے تھے۔ سادہ جوتا دیسی بناوٹ کا پہنتے تھے۔ طبیعت میں قدرتی طور پر کسی قدر رعب تھا۔ بے تکلفی بہت کم کرتے تھے اور ہنستے بھی بہت کم تھے۔ آپ کا زیادہ وقت دقیق کتابوں کے مطالعہ میں صرف ہوتا تھا، بعض شروح بخاری اور فتح القدیر، بحرالرائق وغیرہ۔ اسٹوپ کا رواج عام تھا۔ اکثر اپنے ہاتھ سے چائے تیار کر لیتے تھے۔ کبھی کوئی ساتھی فارغ ہوتا تھا تو وہ تیار کر دیتا۔ سالن بھی اسٹوپ پر تیار کر لیتے تھے اور روٹیاں تنور سے منگوا لیتے تھے۔ اپنے لیے اور کوئی مہمان اگر ہوتا تھا، اس کے لیے بھی۔‘‘

(ماہنامہ ’’نصرۃ العلوم‘‘، گوجرانوالہ، فروری ۲۰۰۰ء ص ۳۶، ۳۷)

تصانیف

حضرت مولانا عبدالقدیر رحمہ اللہ نے تمام عمر درس وتدریس میں گزاری۔ آپ کی تدریسی محنت سے ہزار ہا مدرس، محقق اور مصنف تیار ہوئے۔ برس ہا برس رات دِن کی تدریسی محنت میں آپ کو تصنیف کا وقت نہ ملا۔ آخر عمر میں آپ نے دو محققانہ تصانیف یادگار چھوڑیں۔ یہ دونوں تصانیف اپنے شاگرد رشید امام اہل سنت رحمہ اللہ کے دفاع میں ہیں۔ علاوہ ازیں آپ کے فتاویٰ اور مطبوعہ وغیر مطبوعہ مضامین آپ کے علمی یادگار ہیں۔ آپ کے تصنیفی کام کی تفصیل درج ذیل ہے۔

۱: ’’ارشاد العلماء الیٰ تحقیق مسئلہ سماع الموتی وحیات الانبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام‘‘

یہ کتاب آپ نے اکتوبر ۱۹۸۷ء میں تصنیف فرمائی۔ اس وقت آپ تعلیم القرآن راولپنڈی میں مسند حدیث پر جلوہ افروز تھے۔ ’’ارشاد العلماء‘‘ آپ نے عقیدہ حیات الانبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام پر امام اہل سنت حضرت مولانا محمد سرفراز خان صفدر رحمہ اللہ کی مشہور تصنیف ’’تسکین الصدور‘‘ کے دفاع میں لکھی، چنانچہ آپ نے کتاب کی ابتدا کرتے ہوئے لکھا:

’’عرصہ ہوا کہ محترم شیخ الحدیث محمد سرفراز صاحب مداللہ ظلّہ نے رسالہ طیبہ تسکین الصدور خزینۃ المعقول والمنقول دیا کہ اس کے متعلق اپنا تأثر لکھیں! لیکن مجھے تعلیمی شغل کی وجہ سے اور بالخصوص نگاہ کی کمزوری کی وجہ سے موقع نہ ملا۔ علاوہ ازیں یہ دیکھا کہ اس گلدستہ علم کے متعلق گرامی قدر افاضل علماء کرام اور بعض اساتذہ عظام کی تصدیقات ثبت ہو چکی ہیں! ان حضرات گرامی قدر وفضلا کی توثیق کے بعد اور لکھنے کی کیا ضرورت ہے؟

مشک آں باشد کہ خود ببوید نہ کہ عطار بگوید

کتاب تسکین الصدور کو دیکھنے والا واقعی اس کتاب کو اسم بامُسمّٰی اور صحیح سمجھ کر انشراح صدر پائے گا۔ جزاھم اللہ خیر الجزاء ووفقہ اللہ لمایحب ویرضی! کتاب نہایت سنجیدگی سے لکھی گئی ہے! مقصد کے لیے وافی اور کافی ہے۔‘‘ (’’ارشاد العلماء‘‘ ص ۳)

امام اہل سنت حضرت مولانا محمد سرفراز خان صفدر رحمہ اللہ نے ’’ارشاد العلماء‘‘ کے پیش لفظ میں لکھا:

’’راقم اثیم نے کتاب تسکین الصدور حضرت الشیخ استاذنا المحترم مولانا عبدالقدیر صاحب دامت برکاتہم سابق مدرس حدیث جامعہ اسلامیہ ڈابھیل (انڈیا) وحال شیخ الحدیث مدرسہ تعلیم القرآن راجہ بازار راولپنڈی کی خدمتِ اقدس میں پیش کی کہ اس کے بارے اپنی زرّیں رائے مبارک سے آگاہ فرمائیں.... بحمداللہ تعالیٰ حضرت الاستاذ المحترم دامت برکاتہم نے باوجود تعلیمی مشاغل، نگاہ کی کمزوری اور پیرانہ سالی کے شفقت کرتے ہوئے نہ صرف یہ کہ ’’تسکین الصدور‘‘ میں درج شدہ مسائل اور دلائل کی تائید وتصویب ہی فرمائی بلکہ مزید ٹھوس حقائق اور علمی نکات پیش کیے۔‘‘ (’’ارشاد العلماء‘‘ ص ۲، ۳)

۲: ’’تدقیق الکلام‘‘

یہ کتاب آپ نے فاتحہ خلف الامام کے موضوع پر حضرات احناف رحمہم اللہ کا مؤقف بیان کرتے ہوئے مشہور غیر مقلد عالم مولانا حافظ محمد صاحب گوندلوی کی تصنیف ’’خیر الکلام‘‘ کے جواب میں لکھی۔ ’’خیر الکلام‘‘ کے جواب میں اس سے پہلے آپ کے مایہ ناز شاگرد امام اہل سنت حضرت مولانا محمد سرفراز خان صفدر رحمہ اللہ کی مشہور زمانہ تصنیف ’’احسن الکلام‘‘ خواص وعوام سے خراج تحسین وصول کر چکی تھی۔ آپ نے ’’احسن الکلام‘‘ کے مؤقف کو اپنے خاص علمی انداز سے مدلل بیان فرمایا۔

حضرت امام اہل سنت رحمہ اللہ ’’تدقیق الکلام‘‘ کا تعارف کراتے ہوئے لکھتے ہیں:

’’استاذِ محترم شیخ الحدیث حضرت مولانا عبدالقدیر صاحب دامت برکاتہم نے (جو تقریباً ساٹھ سال تک علومِ نقلیہ اور عقلیہ کے کامیاب مدرس رہے ہیں، ڈابھیل میں بھی استاد حدیث رہ چکے ہیں اور اب بھی مدرسہ تعلیم القرآن راولپنڈی میں شیخ الحدیث ہیں) انوکھے اور علمی انداز میں ترک القرأت خلف الامام کے دلائل پیشِ نظر کتاب ’’تدقیق الکلام‘‘ میں بیان فرمائے ہیں۔ علمائے کرام کے لیے یہ انمول موتی ہیں اور ایسے انداز سے پیش کیے ہیں جو حقیقت کی خوب خوب گرہ کشائی کرتے ہیں اور ’’خیر الکلام‘‘ میں نقل کردہ دلائل کا باحوالہ تانا بانا بھی روشن کیا گیا ہے اور بعض مقامات پر نام لے کر ’’توضیح الکلام‘‘ میں نقل کردہ دلائل کا بھی خوب تعاقب کیا ہے، مگر زیادہ تر تردید خیر الکلام کے شبہات کی کی گئی ہے، کیونکہ ’’توضیح الکلام‘‘، ’’خیر الکلام‘‘ کا علمی سرقہ اور اسی کا چربہ ہے۔ جب اصل کا رد ہو گیا تو فرع کا خود بخود ہو جاتا ہے۔‘‘ (’’تدقیق الکلام‘‘ ج ۱ ص ۱۳)

’’تدقیق الکلام‘‘ میں آپ کا طرز تحریر مدرّسانہ ہے۔ یوں معلوم ہوتا ہے کہ علم کا ایک بحرِ بے کراں موج زن ہے اور دلائل وبراہین سے اپنی بات ایسے سلجھے ہوئے انداز میں بیان کر رہا ہے کہ اس کے تسلیم کیے بغیر چارہ کار نہیں۔

حضرت مولانا عبدالقدیر رحمہ اللہ نے مختلف عنوانات پر مضامین بھی لکھے جو ملکی دینی جرائد میں مطبوعہ ہوئے۔ علاوہ ازیں غیر مطبوعہ مضامین بھی ہیں۔ ان مضامین کا انداز بیان بھی عالمانہ، محققانہ ہے۔ اگر یہ مضامین چھپ جائیں تو ایک بڑا علمی سرمایہ ہے، جس سے خواص وعام مستفید ہو سکتے ہیں۔

آپ کا عام معمول فتاویٰ لکھنے کا نہیں رہا، البتہ اگر کسی نے آپ سے فتویٰ پوچھا تو آپ نے کبھی انکار نہیں فرمایا یا یہ نہیں کہا کہ فلاں دار الافتاء سے رجوع کریں۔ آپ نے استفتا کا مدلل جواب دیا۔ آپ کے یہ فتاویٰ مختلف حضرات کے ہاں

موجود ہیں۔ اگر جمع ہو سکیں تو نہایت قیمتی ذخیرہ ہے۔

خط کا جواب آپ باقاعدگی سے اور جلد لکھتے تھے۔ اکثر آپ سے دینی مسائل پوچھے جاتے اور آپ تفصیلی جواب دیتے۔ ہر عنوان کی مختلف جہات خود نکالتے اور ہر جہت کی وضاحت فرماتے۔ آپ کی کوشش ہوتی کہ آپ کا مخاطب پوری طرح مطمئن ہو جائے۔ آپ کے خطوط بھی جمع ہو سکیں تو یہ قیمتی سرمایہ نہ صرف اپنے عنوانات پر ایک راہنما ہے بلکہ اپنے وقت کی مشاہداتی تاریخ بھی ہے۔

حضرت مولانا عبد القدیرؒ نے تمام عمر سادگی سے بسر کی۔ سادہ خوراک، سادہ لباس اور عام رہن سہن میں آپ کی صحت آخر تک قابلِ رشک رہی۔ اپنا کام خود کرنا، گاؤں مومن پور سے راولپنڈی وغیرہ کا سفر عام بسوں میں کرنا آپ کا معمول تھا۔ آپ تعلیم القرآن راولپنڈی میں حدیث رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی تدریس کر رہے تھے کہ معمولی بخار ہوا۔ گھر تشریف لائے۔ چند دِن ہسپتال داخل رہے۔ وفات سے چند دِن پہلے خواب دیکھا کہ سفید لباس میں ملبوس کچھ لوگ مجھے ملنے آئے ہیں۔ آپ نے خود ہی تعبیر کرتے ہوئے ارشاد فرمایا کہ شاید میرا وقت قریب ہے۔ ۱۰ جمادی الاولیٰ ۱۴۱۱ھ/ ۲۹ نومبر ۱۹۹۰ء بروز منگل آپ نے جان جانِ آفریں کے سپرد کر دی، انا للہ وانا الیہ راجعون۔ دوسرے دِن عصر کے بعد آپ کی نماز جنازہ آپ کے شاگرد رشید اور معتمد خاص امام اہل سنت حضرت مولانا محمد سرفراز خان رحمہ اللہ صفدر نے پڑھائی۔ آپ کو اپنے آبائی گاؤں مومن پور میں اپنے آبائی قبرستان میں سپرد خاک کیا گیا۔ حضرت امام اہل سنت رحمہ اللہ نے تدفین کے بعد قبر پر مختصر بیان فرماتے ہوئے عجیب بات ارشاد فرمائی جس سے حضرت امام اہل سنت رحمہ اللہ کے ہاں اپنے استاذ کی قدر و منزلت کا اندازہ ہوتا ہے۔ ارشاد فرمایا:

''حضرت میرے محبوب استاذ تھے۔ مجھے اپنے باپ کے مرنے پر اتنا صدمہ نہیں ہوا جتنا آج ان کی وفات سے صدمہ ہوا ہے۔''

حضرت مولانا سید سخی شاہ رحمہ اللہ شیرازی

حضرت امام اہل سنت رحمہ اللہ کے ابتدائی اساتذہ میں حضرت مولانا سید سخی شاہ رحمہ اللہ بھی ہیں۔ حضرت امام اہل سنت رحمہ اللہ اپنی خود نوشت میں فرماتے ہیں کہ ہروڑی پائین میں حضرت مولانا سخی شاہ صاحب رحمہ اللہ کے پاس رہا اور وہاں ''نور الایضاح'' اور صرف کی ابتدائی کچھ گردانیں یاد کیں۔

حضرت مولانا سید سخی شاہ رحمہ اللہ ۱۸۸۴ء میں ہروڑی گاؤں، بٹل مانسہرہ، ہزارہ میں پیدا ہوئے۔ آپ کے والد سید قاسم نیک آدمی تھے۔ آپ نے ابتدائی تعلیم اپنے علاقہ میں مولانا خلیل الرحمٰن عرف خان مُلّا رحمہ اللہ (ترہا) اور مولانا حاجی محمد حسین رحمہ اللہ (فاضل دار العلوم دیوبند) سے حاصل کی۔ فنون کی تعلیم حضرت مولانا محمد اسماعیل رحمہ اللہ (کوٹل برشین) تلمیذ حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن دیوبندی رحمہ اللہ سے حاصل کی۔ فقہ اور موقوف کی کتابیں حضرت مولانا حمید الدین مانسہروی رحمہ اللہ تلمیذ حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن دیوبندی رحمہ اللہ سے پڑھیں۔

دورہ حدیث شریف کے لیے آپ نے ۱۳۲۹ھ/ ۱۹۱۱ء میں دار العلوم دیوبند میں داخلہ لیا۔ حضرت علامہ محمد انور شاہ کشمیری

رحمہ اللہ، حضرت مولانا غلام رسول بنوری رحمہ اللہ، حضرت مولانا مرتضیٰ حسن چاندپوری رحمہ اللہ، حضرت علامہ شبیر احمد عثمانی رحمہ اللہ، حضرت مولانا محمد ابراہیم بلیاوی رحمہ اللہ، حضرت مولانا عبد السمیع رحمہ اللہ، حضرت مولانا مفتی عزیز الرحمٰن رحمہ اللہ، حضرت مولانا محمد سہول بھاگلپوری رحمہ اللہ، حضرت مولانا اعزاز علی رحمہ اللہ، حضرت مولانا میاں اصغر حسین رحمہ اللہ، حضرت مولانا گل محمد خان رحمہ اللہ، حضرت مولانا رسول خان ہزاروی رحمہ اللہ اور حضرت مولانا حبیب الرحمٰن عثمانی رحمہ اللہ سے حدیث رسول صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم پڑھ کر سند فراغت حاصل کی۔ دار العلوم دیوبند سے فراغت کے بعد آپ نے اپنے گاؤں ''ہروڑی پائین'' کی مسجد میں امامت کے ساتھ علومِ دینیہ کی تدریس بھی شروع کی۔ تیس، پچیس طلبہ آپ کے پاس موجود رہتے۔ آپ کھیتی باڑی کرتے اور طلبہ کو پڑھاتے۔ آپ کے پاس کوہستان، آلاچی، گلگت، سوات، مردان اور افغانستان تک کے طلبہ آتے تھے۔ علاقہ کے عوام و خواص آپ ہی کے فتویٰ پر اعتماد کرتے۔ تقریباً پینتالیس سال آپ نے تدریس کی۔

۱۳۷۹ھ/ ۱۹۵۸ء میں آپ نے وصال فرمایا اور آبائی گاؤں موضع ''ہروڑی پائین'' میں مدفون ہوئے۔ آپ کی اولاد بھی ماشاء اللہ عالم فاضل ہے۔ آپ کے چار صاحبزادے اور دو صاحبزادیاں تھیں۔ صاحبزادوں کی تفصیل درج ذیل ہے:

(۱) مولانا سید فیض علی شاہ صاحب: فاضل دیوبند ۱۳۶۸ھ و سابق استاذ دار العلوم دیوبند۔

(۲) مولانا سید معروف شاہ شیرازی: پیدائش ۱۳۵۰ھ/ ۱۹۳۲ء فاضل جامعہ اشرفیہ، لاہور۔ سابق مدیر ماہنامہ ''تعلیم القرآن'' راولپنڈی۔ مترجم ''تفسیر فی ظلال القرآن''۔ جماعت اسلامی کے ساتھ وابستہ ہیں۔

(۳) مولانا سید الاذکیا صاحب: فاضل ''تعلیم القرآن'' راولپنڈی۔

(۴) مولانا سید عبد البر، فاضل جامعہ اشرفیہ، لاہور۔

حضرت مولانا احمد نبی رحمہ اللہ تعالیٰ

حضرت امام اہل سنت رحمہ اللہ نے اپنے آبائی گاؤں موضع ڈھکی چیڑاں کے قریب ''سنگل کوٹ'' میں حضرت مولانا احمد نبی رحمہ اللہ سے ''نحو میر'' کا کچھ حصہ پڑھا۔ حضرت مولانا احمد نبی رحمہ اللہ سنگل کوٹ علاقہ کونش کے علمی خاندان کے فرد تھے۔ آپ نے علوم و فنون اپنے علاقہ ہی میں پڑھے اور پھر موضع ''سنگل کوٹ'' میں اپنی آبائی مسجد میں امامت و خطابت کے ساتھ تدریس کرتے رہے۔ آپ کے ساتھ ہمیشہ طلبہ کی ایک جماعت رہتی۔ آپ ''سنگل کوٹ'' میں تدریس میں مشغول تھے کہ علمائے دیوبند کا علمی شہرہ سنا۔ شوق ہوا اور رخت سفر باندھا۔ دار العلوم دیوبند میں دورہ حدیث شریف میں داخلہ لیا۔ اس وقت مسند حدیث پر شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی رحمہ اللہ جلوہ افروز تھے۔ آپ نے دورہ حدیث شریف دار العلوم دیوبند میں پڑھ کر امتحان دیا اور دار العلوم دیوبند کی سند سے نوازے گئے۔ آپ لائق اور طلبہ میں معتبر تھے۔ حضرت مدنی رحمہ اللہ کے اخلاص تقویٰ اور علمیت سے متاثر ہوئے اور دامن مدنی سے وابستہ ہو کر شرف بیعت بھی حاصل کیا۔ حضرت مدنی رحمہ اللہ نے آپ کو اپنی خصوصی سند حدیث سے بھی نوازا۔ آخر عمر تک حضرت مدنی رحمہ اللہ کے تلقین فرمودہ اذکار یازدہ تسبیحات سلسلہ عالیہ چشتیہ صابریہ مواظبت سے کرتے رہے۔

آپ کی ترغیب پر آپ کے چھوٹے بھائی مولانا عبد القادر رحمہ اللہ بھی دار العلوم دیوبند گئے اور دورہ حدیث حضرت مدنی رحمہ اللہ سے پڑھ کر ۱۳۵۳ھ/ ۱۹۳۴ء میں فاضل دیوبند ہوئے۔ مولانا عبد القادر رحمہ اللہ کوئٹہ میں امام و خطیب تھے۔ تدریس

کا شغل آخر عمر تک رہا۔ آپ کا درس حدیث طلبہ میں مشہور تھا۔ اپنے استاذِ حدیث حضرت مدنی رحمہ اللہ کے درسی افادات کا ابتدائی حصہ ''تحقیق الایمان'' کے عنوان سے لکھا جسے آپ کے صاحبزادہ مولانا مفتاح الحق حقانی مدظلہ نے حافظ کتب خانہ، مسجد روڈ کوئٹہ سے چھپوایا ہے۔

مولانا احمد نبی رحمہ اللہ دار العلوم دیوبند سے تحصیلِ علم کے بعد اپنے گاؤں ''سنگل کوٹ'' تشریف لے آئے اور تمام عمر تدریس کرتے رہے۔ آپ درس کی طرز پر درس نظامی کی تمام کتب پڑھاتے تھے۔ فقہ اور حدیث میں آپ کی تدریس مشہور تھی۔ آپ کے دو بیٹے تھے جو حصول علم کے لیے حضرو علاقہ چھچھ میں آئے۔ (۱) مولانا ہدایت الحق مرحوم فاضل مدرسہ ''مفتاح العلوم''، بھنگی، حضرو اٹک (۲) مولانا مظہر الحق مرحوم فاضل مدرسہ حقانیہ، حضرو، اٹک۔ مولانا ہدایت الحق مرحوم نے ''مفتاح العلوم'' حضرو سے فراغت حاصل کی۔ اس مدرسہ کے بانی مولانا عبد الحق مرحوم تلمیذ مولانا عبد الرحمٰن امروہی رحمہ اللہ آخر عمر میں اہل بدعت کی طرف مائل ہو گئے تھے، مگر تکفیری بریلوی جماعت سے برأت کرتے تھے۔ مولانا ہدایت الحق بھی اسی ماحول میں اہل بدعت سے متعلق رہے۔ حضرو میں ''حقائق العلوم'' کے نام سے ایک مدرسہ بنایا جس میں پہلے سال دورۂ حدیث شریف مولانا فضل حق ممتاز رحمہ اللہ تلمیذ حضرت شیخ الحدیث مولانا نصیر الدین غورغشتوی رحمہ اللہ سے پڑھوایا۔ اس پر ''تنظیم المدارس'' نے سخت تنبیہ کی اور اپنا الحاق منقطع کر دینے کا نوٹس دیا۔ مولانا احمد نبی رحمہ اللہ کے دوسرے بیٹے مولانا مظہر الحق مرحوم کا آخر عمر تک علمائے دیوبند سے عقیدت مندانہ تعلق رہا اور اسی بنیاد پر علاقہ چھچھ ضلع اٹک کے بریلوی علما کا نشانہ بھی رہے۔ مولانا مظہر الحق مرحوم نے دورۂ حدیث حضرت مولانا فضل حق ممتاز رحمہ اللہ تلمیذ شیخ الحدیث مولانا نصیر الدین غورغشتوی رحمہ اللہ سے پڑھا۔ مولانا احمد نبی مولانا ہدایت الحق مرحوم کے اہل بدعت سے تعلق اور ان کے ہاں بدعات عرس، میلاد وغیرہ پر ہمیشہ نکیر فرماتے تھے۔ آپ نے خود کو کبھی نہ ان بدعات سے وابستہ رکھا اور نہ کبھی تائید فرمائی۔

مولانا احمد نبی رحمہ اللہ آخر عمر میں علاج کے لیے حضرو تشریف لے آئے۔ یہیں ان کا وصال ہوا۔ تدفین اپنے آبائی گاؤں موضع ''سنگل کوٹ'' میں ہوئی۔

> اہل سنت والجماعت کا یہ نظریہ ہے کہ بسا اوقات جنات انسان کے وجود میں داخل ہو کر اس کو تکلیف پہنچا سکتے ہیں لیکن جنات کی بیماری اتنی عام نہیں ہے جتنا ان فراڈیوں نے، فالوں اور تعویذ گنڈے والوں نے لوگوں کا ذہن بگاڑا ہوا ہے۔ ہر ایک کو کہتے ہیں کہ تجھ پر سایہ ہے اور جادو ہے۔ ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ مسلمان کو اتنا وہمی نہیں ہونا چاہیے۔ سو مریضوں میں سے ایک دو ایسے ہوں گے جن پر جنات کا اثر ہو، باقی سب طبعی بیماریاں ہیں۔ کوئی شے ہمیں خالص ملتی نہیں، خوراک ہماری کھاد والی ہے۔ دودھ مرچ اور نمک تک میں ملاوٹ کرتے ہیں۔ پھر صحت کس طرح قائم رہے گی؟ بالکل غلط فہمی کا شکار نہ ہونا۔ اچھے خاصے پڑھے لکھے سمجھ دار اس بیماری میں مبتلا ہیں۔ کچھ ویسے ذہن بگڑے ہوئے ہیں اور کچھ ان ٹھگی باز تعویذ والوں نے بے ایمان بنا دیا ہے۔ اللہ تعالیٰ محفوظ فرمائے۔ (ذخیرۃ الجنان، ۶/۱۶۲)

قاری حماد الزہراوی*

گکھڑ میں امام اہل سنت کے معمولات و مصروفیات

گوجرانوالہ اور وزیر آباد کے درمیان جی ٹی روڈ پر واقع گکھڑ ایک قدیم تاریخی مقام ہے۔ اسے ایک جنگ جو اور مہم جو قبیلے گکھڑ کی نسبت سے یہ نام دیا گیا۔ اس کی وجہ تسمیہ کی بابت مختلف روایات بیان کی جاتی ہیں جن میں سے ایک یہ ہے کہ برصغیر کے معروف عدل گستر، اعلیٰ پایے کے منتظم اور عظیم بادشاہ شیر شاہ سوری سے شکست کے بعد مغل خاندان کے چشم و چراغ نصیر الدین ہمایوں نے جب ایران کا رخ کیا تو اس دور میں گکھڑ قوم نے شیر شاہ سوری کے خلاف باغیانہ روش اختیار کر رکھی تھی۔ چنانچہ گکھڑوں کی سرکوبی کے لیے ہی شیر شاہ سوری نے دینہ کے قریب روہتاس کا قلعہ تعمیر کرایا۔ شیر شاہ کی وفات کے بعد جب ان کے جانشین نا اہل ثابت ہوئے تو ہمایوں نے شاہ ایران طہماسپ کے تعاون سے ہندوستان پر حملہ کر دیا۔ اس دوران اس نے گکھڑ قوم کے سرداروں سے رابطہ کر کے ان سے تعاون طلب کیا۔ گکھڑوں نے اس تعاون کے عوض کامیابی کی صورت میں اپنے علاقے میں خود مختاری طلب کی جسے ہمایوں نے اضطراراً منظور کر لیا، چنانچہ ہمایوں کی فتح کے بعد پوٹھوار کے علاقہ سے دریائے چناب سے دس فرسنگ لاہور کی جانب تک گکھڑ سلطنت کی سرحد قرار پائی۔

شیر شاہ سوری کی تعمیر کردہ چوکی اور سرائے پہلے سے وہاں موجود تھی، اسے گکھڑ سرحد چوکی کے نام سے موسوم کر دیا گیا جس کا کچھ حصہ جی ٹی روڈ گکھڑ کے قریب واپڈا گرڈ اسٹیشن کے شمال مشرقی کنارے پر ٹیلی فون ایکسچینج کے ساتھ آج بھی موجود ہے۔ اس چوکی سے کچھ فاصلے پر رفتہ رفتہ ایک بستی قائم ہو گئی جسے پہلے گکھڑ چوکی اور پھر گکھڑ کے نام سے یاد کیا جانے لگا۔ جلال الدین اکبر کے دور میں جب تمام خود مختار ریاستیں ختم کر دی گئیں تو گکھڑوں کی اس ریاست کا بھی خاتمہ ہو گیا۔

گکھڑ قوم کے حوالے سے یہ روایت بھی منقول ہے کہ پرتھوی راج کو شکست دینے کے بعد فاتح ہند سلطان شہاب الدین غوری کی افغانستان واپسی کے دوران گکھڑوں نے ان پر دھوکہ سے حملہ کر دیا اور وہ اپنے تین وفادار محافظوں کے ساتھ شہید ہو گئے۔ تاریخی ریکارڈ کی روشنی میں محسن پاکستان ڈاکٹر عبد القدیر خان نے ۱۹۹۵ء میں جی ٹی روڈ پر واقع سوہاوہ کی سرزمین پر ان کی قبر دریافت کی۔ سلطان غوری کی شہادت کے قریباً آٹھ سو سال بعد جب قبر کشائی کی گئی تو ان کا جسد خاکی ان کے محافظوں سمیت صحیح سالم نکلا، چنانچہ ڈاکٹر عبد القدیر خان کی خواہش و کاوش سے سلطان غوری کا مزار تعمیر کیا گیا۔ چونکہ ڈاکٹر عبد القدیر کا تعلق گکھڑ قوم سے ہے، اس لیے انہوں نے اپنی قوم کے دامن پر لگے ہوئے اس داغ ندامت کو دھونے کی سعی کی ہے اور غوری میزائل بنا کر اپنی قوم کی شدید زیادتی کا مداوا کیا ہے۔

---

*مدیر معارف اسلامیہ اکادمی، گکھڑ

امام اہل سنتؒ کی گکھڑ میں آمد

قیام پاکستان سے چار سال قبل گکھڑ میں علوم ومعارف اور حریت واستقلال کے عظیم مرکز، برصغیر کے نامور تعلیمی ادارے دارالعلوم دیوبند کے فیض یافتہ مولانا محمد سرفراز خان صفدرؒ نامی ایک عالم ربانی کا ورود ہوتا ہے۔ایک خدا پرست اور حق گو عالم دین کی آمد یوں تو اہل گکھڑ کے لیے ایک اعزاز تھا، مگر شاید سخت مزاج، جھگڑالو اور محسن کش گکھڑ کے نام کا اہل گکھڑ کے مزاج پر اثر ہے کہ جو ہر شناسی اور قدر دانی کے وصف سے عموماً عاری دکھائی دیتے ہیں۔ چنانچہ اس عالم ربانی کا گکھڑ میں ابتدائی طویل عرصہ انتہائی مصائب ومشکلات سے دوچار رہا۔ جہالت اور ذہنی پستی نے شدید مخالفت کا ایک طوفان کھڑا کر دیا۔معدودے چند گوہر شناس افراد کے سوا لوگوں کا عمومی طرز عمل انتہائی معاندانہ رہا۔

ایک عالم ربانی کے لیے لوگوں کا یہ انداز نہایت لائق تاسف اور تعجب انگیز تھا۔اہل حق کی زندگی کے مصائب ومشکلات کے یہ اوقات صبر آزما ضرور ہوتے ہیں، مگر ثابت قدمی کے جوہر سے متصف افراد کے لیے یہ رفعت ومنزلت کے زینے شمار ہوتے ہیں۔جس فرد کی علمی زندگی عزم وہمت سے عبارت ہو، اسے علمی زندگی میں ایسی رکاوٹیں کب منزل کی طرف بڑھنے سے روک سکتی ہیں۔ چنانچہ عزم کے اس کوہ گراں نے مخالفین کی ہر روش کو برداشت کیا، مگر اپنا سفر عزم مصمم کے ساتھ جاری وساری رکھا۔منزل کی طرف رواں دواں راہی کلاب راہ سے الجھ کر منزل سے دست کشی اختیار نہیں کیا کرتا اور نہ ہی دریا بے دم ہو کر راستے سے واپس پلٹا کرتا ہے۔ چنانچہ راہ حق کا یہ مسافر راستے کی ہر رکاوٹ کو دور کرتا چلا جاتا ہے۔آوازے کسنے والے آوازے کستے رہے، طعن باز اپنے دل کی بھڑاس نکالتے رہے، عزت وآبرو کو تاراج کرنے کے درپے اور تن بدن کو آزار پہنچانے کے خواہاں اپنی تدابیر آزماتے رہے، مگر اخلاق کی پستی اخلاق کی بلندی کو نہ کبھی نیچا دکھا سکی اور نہ اسے کبھی شکست سے دوچار کر سکی۔

گکھڑ کی منفرد اور تاریخی جامع مسجد

حضرت مولانا محمد سرفراز خان صفدر نے ۹ر جولائی ۱۹۴۳ء کو بحیثیت خطیب اور مدرس گکھڑ کی جس جامع مسجد میں اپنی دینی ذمہ داریوں کا آغاز کیا، اس کے سامنے بوہڑ کا ایک تناور درخت تھا جس کی وجہ سے اسے بوہڑ والی مسجد کے نام سے پکارا جاتا ہے۔ یہ درخت نصف صدی قبل تعمیر کی وجہ سے کاٹا جا چکا ہے۔ مسجد ہذا کے لیے رقبہ زمین وقف کرنے والے ایک بزرگ مولوی غلام حیدر چیمہ مرحوم کے ذریعہ سے اس مسجد کی تعمیر ہوئی جو کئی سال تک اس مسجد کے پیش امام رہنے کے بعد ۱۵ر ستمبر ۱۸۸۷ء کو اس دار فانی سے رخصت ہو گئے۔ ملک کی معروف اور عظیم دینی شخصیت حضرت مولانا مفتی رشید احمد لدھیانویؒ اپنے چچا حضرت مولانا محمود لدھیانویؒ کی اس مسجد میں خطابت اور تدریس کے دور میں ان کے پاس ایک عرصہ تک زیر تعلیم رہے۔ مسجد ہذا میں مولانا علم الدین جالندھری فاضل دارالعلوم دیوبند بھی ایک مدت تک امامت وخطابت کے فرائض سرانجام دیتے رہے۔ اس مسجد کا ایک منفرد اور امتیازی مقام یہ بھی ہے کہ یہاں امام اہل سنت مولانا سرفراز خان صفدرؒ نے تقریباً ساٹھ سال تک فریضہ خطابت انجام دینے کے ساتھ ساتھ نماز فجر کے بعد قرآن وحدیث کا فیض عام کیا۔ ہفتہ کے ابتدائی تین دن درس قرآن اور آخری تین دن درس حدیث کا اہتمام رہا۔ حضرت موصوفؒ نے اس دوران درس قرآن کے

کئی دور مکمل کیے۔ آخری دور سورۃ الفرقان تک ہوا تھا کہ حضرت امام اہل سنتؒ کے فالج کے عارضہ میں مبتلا ہونے کی وجہ سے یہ دور مکمل نہ ہو سکا۔

درس قرآن کا یہ سلسلہ بڑا عام فہم، سلیس اور کم تعلیم یافتہ افراد کے لیے پنجابی زبان میں ہوتا تھا۔ عام افراد کی ذہنی سطح کو ملحوظ رکھتے ہوئے بڑے سادہ انداز میں یہ درس ہوتا تھا۔ سامعین قرآنی مکاتب کے انداز میں بیٹھتے اور ان کے سامنے قرآن حکیم ہوتا تھا۔ پہلے چند آیات کی قراءت ہوتی، پھر ان کا ترجمہ بتایا جاتا اور اس کے بعد ہر آیت کی تشریح بیان ہوتی۔ گکھڑ کے ایک صاحب فکر عقیدت مند جناب محمد سرور منہاس نے درس قرآن کی یہ ترتیب بڑی حاضر باشی اور فکر مندی کے ساتھ کیسٹوں میں ریکارڈ کرنے کی سعادت حاصل کی۔ حضرت شیخؒ کے خادم خاص جناب میر محمد لقمان گوجرانوالہ اور تلمیذ رشید مولانا محمد نواز بلوچ کی مساعی جمیلہ سے یہ دروس پنجابی سے اردو میں منتقل ہو کر ''ذخیرۃ الجنان فی دروس القرآن'' کے نام سے شائع ہو رہے ہیں۔ اس صدی کی یہ ایک عظیم مسجد ہے جسے فیضان حدیث عام کرنے میں ایک منفرد اور تاریخی اعزاز حاصل ہے۔ تقریباً ساٹھ سال تک اس مسجد میں بحمد اللہ امام اہل سنتؒ کتب صحاح ستہ یعنی بخاری، مسلم، ترمذی، ابوداؤد، نسائی اور سنن ابن ماجہ کے علاوہ مستدرک حاکم، ابوداؤد طیالسی، مسند احمد، الجامع الصغیر، صحیح ابن حبان، الترغیب والترہیب، مشکوٰۃ المصابیح اور الادب المفرد وغیرہ ذخیرہ حدیث کا درس دیتے رہے، مگر مقامی حضرات کی عدم دلچسپی اور بے توجہی کے باعث یہ عظیم علمی ذخیرہ بدقسمتی سے ریکارڈ نہ ہو سکا۔ البتہ مشکوٰۃ شریف کے دروس کا یہ سلسلہ جناب محمد سرور منہاس کی مخلصانہ کاوش سے کیسٹوں میں محفوظ ہے۔

حضرت ممدوح مسجد ہذا میں تن تنہا تیرہ چودہ سال تک درس نظامی کے اسباق کی تدریس بھی کرتے رہے۔ روزانہ بیس سے زائد کتب کا تدریسی عمل حضرت موصوف کے علمی انہماک اور نصابی کتب پر عبور کا بین ثبوت فراہم کرتا ہے۔ مدرسہ نصرۃ العلوم گوجرانوالہ کے قیام سے پہلے یہ تدریسی سلسلہ تسلسل کے ساتھ گکھڑ میں جاری رہا، اور بعد میں مستقل طور پر نصرۃ العلوم میں منتقل ہو گیا۔

حضرت امام اہل سنتؒ کی زیر سرپرستی مسجد ہذا میں تقریباً بیس سال تک تجوید وقراءت کی تعلیم کا سلسلہ بھی جاری رہا۔ اس عرصے میں حضرت مولانا قاری عبد الحلیم سواتیؒ اور مولانا غلام علی اعوان قرآنی فیض عام کرتے رہے۔ پھر جگہ کی تنگی کی وجہ سے یہ شعبہ دوسری جگہ منتقل کر دیا گیا۔ اس شعبہ سے فیض یافتہ بے شمار قراء کرام ملک کے طول وعرض بلکہ بیرون ممالک میں قرآنی تعلیمات کی شمع فروزاں کیے ہوئے ہیں اور خدمت واشاعت دین کی سعادت سے بہرہ ور ہو رہے ہیں۔ مسجد ہذا میں شعبہ حفظ وناظرہ بھی نصف صدی سے زائد عرصہ سے قرآن کریم کی خدمت میں مصروف ہے۔ شیخ القاعدہ قاری علی احمد فیصل آبادی اور برادرم قاری محمد اشرف خان ماجد مرحوم شعبہ ناظرہ میں کئی سال تک تدریس کرتے رہے۔ اس شعبہ میں زیر تعلیم رہ کر نہ صرف سینکڑوں طلبہ وطالبات قرآن مجید کی ناظرہ تعلیم سے فیض یاب ہو چکے ہیں، بلکہ بے شمار شائقین قرآن کو حفظ قرآن مجید کا تاج اپنے سروں پر سجانے کی سعادت عظمیٰ حاصل ہو چکی ہے اور بیسیوں طلبہ وطالبات اب بھی اپنے سینوں کو نور قرآن سے منور کر رہے ہیں۔ معروف مدرس قرآن محترم قاری محمد انور مدظلہ فیصل آبادی (جو ہم بہن بھائیوں میں سے بیشتر کے مشترکہ استاد ہیں) ایک طویل عرصہ تک یہاں تدریس قرآن کے عمل سے منسلک رہے۔ اب آپ مدینہ طیبہ کی

پاکیزہ فضاؤں میں عرصہ دراز سے قرآن کے فیضان کو عام کررہے ہیں۔ قاری فضل کریم، قاری محمد فاضل، قاری محمد اشرف کشمیری، قاری محمد اختر، قاری محمد سلیم، قاری محمد ہاشم، قاری ضیاء اللہ، قاری محمد انور انصر، قاری محمد رفیق، قاری ممتاز احمد، قاری اسلام الدین، قاری محمد افضل چیمہ، قاری نسیم اختر، قاری حیدر علی طاہر اور قاری عمر فاروق الحسینی کے اسمائے گرامی اس مسجد کے مدرسین کی فہرست میں شامل ہیں۔

مسجد ہذا کی حالیہ جاری تعمیر نو کے دوران حضرت امام اہل سنتؒ کی تصنیفی اور تحقیقی خدمات کا فیض عام کرنے کے لیے ایک مستقل لائبریری بھی تعمیر کی گئی ہے۔ اس مسجد کو بحمد اللہ ایک مرکزی حیثیت حاصل ہے۔ یہ مسجد علاقائی سطح پر مختلف مساجد و مدارس کے قیام وانتظام کے علاوہ ان کے تعلیمی وتدریسی نظام کو باہم مربوط ومنظم کرنے اور مسلکی وحدت پیدا کرنے کی گراں قدر خدمات انجام دے رہی ہے۔ یہ معارف اسلامیہ اکادمی کے نام سے مصروف عمل مختلف دینی وعصری اداروں کا مرکز اور ہیڈ آفس بھی ہے۔ معارف اسلامیہ اکادمی کے مدیر اور مسجد ہذا کے خطیب کی حیثیت سے راقم الحروف کئی سال سے ذمہ داری انجام دے رہا ہے۔ برادر کبیر اور معروف مذہبی اسکالر علامہ زاہد الراشدی مدظلہ بروز جمعہ المبارک بعد نماز مغرب یہاں ایمان افروز اور معلومات افزا لیکچر سے عوام کو فیض یاب کرتے ہیں۔

مسجد ہذا میں امام اہل سنتؒ پچاس سال سے زائد مدت تک حسبۃً للہ نماز پنجگانہ کی امامت کرواتے رہے۔ غیر حافظ ہونے کے باوجود کثرت تلاوت اور ترجمہ قرآن کے ساتھ غیر معمولی مناسبت کی وجہ سے نماز تراویح میں دیگر حفاظ قرآن کے ساتھ حضرت شیخؒ خود سامع ہوتے تھے۔ کیا مجال کہ کوئی غلطی کا ارتکاب کرکے قراءت جاری رکھ سکے۔ حفاظ کرام سے زیادہ امام پر حضرت شیخؒ کی سماعت کا رعب ہوتا تھا۔ برادران کرام علامہ زاہد الراشدی، مولانا عبد القدوس خان قارن، مولانا عبد الحق خان بشیر، مولانا رشید الحق خان عابد، مولانا عزیز الرحمٰن خان شاہد اور راقم الحروف کو حضرت شیخؒ کی موجودگی میں نماز تراویح کی امامت کا اعزاز حاصل ہوتا رہا۔ عزیزم محمد عمار خان ناصر بھی مسجد ہذا میں نماز تراویح کے اندر قرآن کریم سنانے کی سعادت حاصل کرتے رہے۔

گکھڑ کالج میں درس قرآن

گورنمنٹ ٹیچرز ٹریننگ کالج گکھڑ برصغیر کا ایک قدیم تعلیمی ادارہ ہے جو یکم جنوری ۱۹۲۱ء کو معرض وجود میں آیا۔ یہاں پنجاب بھر کے مختلف قریب وبعید کے اضلاع کے طلبہ سیکڑوں کی تعداد میں تعلیم حاصل کرتے رہے۔ ادارے میں طلبہ کے لیے ہاسٹل کا مستقل سسٹم موجود تھا۔ اساتذہ کی تعلیم وتربیت کے حوالے سے اس ادارے کا تاریخ میں نہایت روشن نام ہے۔ نظم وضبط، تعلیم وتربیت اور سہولیات کے حوالے سے یہ ایک مثالی اور معیاری ادارہ شمار ہوتا ہے۔ یہاں عرصہ دراز تک پی ٹی سی، سی ٹی، آرٹ اینڈ کرافٹس اور او ٹی کلاسز کا سلسلہ جاری رہا۔ اب یہاں طلبہ وطالبات کے لیے بی ایڈ اور ایم ایڈ کی کلاسز ہوتی ہیں۔

امام اہل سنتؒ نے ۱۹۴۳ء سے کالج کی مسجد میں درس قرآن کا مبارک عمل شروع کیا۔ قیام پاکستان سے پہلے تو ادارے میں زیر تعلیم کئی غیر مسلم طلبہ بھی مسلم طلبہ کے ساتھ درس میں شریک ہوکر اسلامی تعلیمات سے آگاہی حاصل کرتے رہے۔ درس قرآن کی اس کلاس میں ادارے کی طرف سے تمام طلبہ کے لیے حاضری لازمی تھی۔ حضرتؒ کا تعلیم وتربیت کا عمل، علمی

اور مدلل مگر نہایت سہل انداز میں ہوتا تھا۔ آپ سوالات اور اشکالات کا جواب نرم لہجے اور مشفقانہ انداز میں دیتے تھے۔ مختلف مذاہب اور مکاتب فکر سے تعلق رکھنے والے طلبہ کرام بڑے انہماک اور طلب کے ساتھ درس قرآن کے اس حلقہ میں شریک ہوتے تھے۔ چنانچہ سیکڑوں کی تعداد میں ہر سال طلبہ قرآنی تعلیمات سے اپنے قلوب واذہان کو منور کرتے رہے۔ اس دوران صوبہ کے دور دراز شہروں اور دیہی علاقوں سے تعلق رکھنے والے سینکڑوں طلبہ کی اعتقادی اور عملی زندگی میں کافی تبدیلی رونما ہوئی۔ گرمیوں کے ایام میں درس قرآن کا یہ سلسلہ عصر کے بعد اور سردیوں میں عشا کے بعد ہوا کرتا تھا۔ عصری تعلیم یافتہ افراد کے لیے فہم قرآن کا یہ ایک بہترین اسلوب تھا، مگر بدقسمتی سے یہ علمی ذخیرہ محفوظ نہ کیا جاسکا۔ چونکہ درس قرآن کے لیے حضرت کی آمد ورفت پیدل ہوتی تھی، اس لیے کبرسنی، نقاہت اور عوارض بدنی کے پیش نظر جب پیدل جانا مشکل ہوگیا تو سواری کا بندوبست نہ ہونے کی وجہ سے درس قرآن کا یہ مبارک عمل موقوف ہوگیا۔

امام اہل سنت کے معمولات

حضرت شیخؒ نہایت مستعد، ذمہ دار اور اوقات کے پابند انسان تھے۔ عمومی طور پر آپ کے شخصی اور منصبی معمولات کا ایک مستقل نظام الاوقات تھا۔ بعض ذہنی، ہنگامی اور ناگزیر تقاضوں کے پیش نظر ان اوقات کار میں اگر کبھی تبدیلی کی ضرورت پیش آئی تو حضرت اپنی منصبی ذمہ داریوں کے حوالہ سے ہر ممکن حد تک عہدہ برآ ہونے کا معمول برقرار رکھتے اور اپنے شخصی معمولات کے اوقات میں ان ناگزیر تقاضوں کو نبھانے کی کوشش کرتے تھے۔ حضرت شیخؒ کے روزمرہ کی ترتیب کچھ یوں تھی کہ رات کے آرام کے بعد گھڑی کے الارم کے ساتھ ہی بیدار ہوجاتے۔ شب بیداری اور سحر خیزی کا معمول تو مستقل تھا ہی، روزانہ بیدار ہوتے ہی غسل کا معمول بھی حضرت شیخؒ نے مستقل اپنا رکھا تھا۔ شدید سردی کے ایام میں بھی اس معمول کو ٹوٹنے نہیں دیتے تھے۔ ہینڈ پمپ اور نلکے کے تازہ پانی سے غسل کرتے، البتہ بڑھاپے کے عالم میں گیزر کے گرم پانی سے غسل کرنے لگے۔ جسمانی معذوری سے قبل ایام علالت کے سوا زندگی بھر سحری کے وقت غسل کے پابند رہے۔ نماز تہجد سے فارغ ہوکر نماز فجر کے بعد کے درس کا مطالعہ کرتے اور نماز فجر سے پہلے ہی ناشتہ کرلیتے تھے۔ ناشتہ کے بعد نماز فجر کے لیے مسجد میں تشریف لے جاتے اور مسجد روانگی کے وقت آپ با آواز بلند "نماز نماز نماز" کی صدا لگاتے جو ہر نماز کے وقت آپ کا مستقل معمول مبارک تھا تاکہ اہل خانہ نماز کے لیے فکر مند ہوجائیں اور گھر میں موجود مرد حضرات یا قریب البلوغ افراد مسجد میں باجماعت نماز ادا کریں۔

مسجد میں درس سے فارغ ہوکر شروع میں بذریعہ ریل گاڑی، پھر بذریعہ بس اور آخر میں کار پر مدرسہ نصرۃ العلوم تشریف لے جاتے رہے۔ گوجرانوالہ سے واپس تشریف لاتے تو اخبار اور ڈاک کا مطالعہ کرتے۔ پھر دوپہر کا کھانا کھا کر قیلولہ کرتے۔ ظہر کی نماز کے وقت بیدار ہوتے۔ سردیوں میں ظہر اور عصر کے وقت وضو کرکے اور گرمیوں میں غسل کرکے مسجد میں تشریف لے جاتے۔ نماز ظہر کی امامت کے بعد نماز مکمل کرکے گھر تشریف لاتے۔ ظہر کی نماز کے بعد چائے کا معمول تھا۔ پھر خطوط کے جواب، تصنیفی کام اور کتب کے مطالعہ کی ترتیب ہوتی جو عصر کی نماز سے مغرب کی نماز تک جاری رہتی۔ البتہ عصر کے بعد قرآن کریم کی باقاعدہ تلاوت فرماتے۔ کالج میں درس قرآن کے لیے گرمیوں میں عصر کے وقت اور سردیوں میں عشا کے وقت تشریف لے جاتے۔ جب کالج میں درس قرآن کا سلسلہ موقوف ہوا تو اس دوران حضرت شیخؒ نے

گھر میں طالبات کے لیے صرف ونحو، فقہ وحدیث، ترجمہ وتفسیر کی تعلیم وتدریس کا مبارک عمل شروع کر دیا۔ کتنی ہی طالبات دین نے نہ صرف خود کو زیور تعلیم سے آراستہ کیا بلکہ کئی ایک ان میں سے دینی فیضان کو عام کرنے کے لیے تعلیم وتدریس سے مستقل وابستگی اختیار کیے ہوئے ہیں۔ آخر میں علالت ونقاہت کی معذوری ومجبوری کی وجہ سے یہ تعلیمی سلسلہ موقوف ہو گیا۔

معذوری سے قبل نماز پنجگانہ مسجد میں باجماعت ادا کرنے کے معمول پر حضرت مستقل کار بند رہے۔ رات کا کھانا مغرب کی نماز کے فوراً بعد تیار ہو جاتا۔ حضرت کھانا تناول کرتے اور پھر مطالعہ وغیرہ کسی علمی سرگرمی میں مصروف ہو جاتے۔ عشا کی نماز ادا کرنے کے بعد حضرت شیخؒ روزانہ ڈائری تحریر کرتے اور ہنگامی حالات میں ریڈیو پر خبریں سنتے اور پھر جلدی سو جاتے۔ سوتے وقت عموماً اہل خانہ میں سے ایک دو فرد حضرت کی مٹھی چاپی کرنے یعنی بدن دبانے کی سعادت حاصل کرتے۔

دینی مسائل معلوم کرنے، دم وغیرہ کروانے یا ملاقات کے لیے تشریف لانے والے حضرات کی وجہ سے حضرت شیخؒ کے شخصی معمولات کی ترتیب میں ردوبدل واقع ہو جاتا۔ حضرت شیخؒ اپنی شدید مصروفیات کی وجہ سے دینی اجتماعات میں بہت کم تشریف لے جاتے تھے، خصوصاً رات کے وقت منعقدہ پروگراموں میں اور وہ بھی تدریسی ایام میں شاذ ونادر ہی شریک ہوتے۔ غیر تدریسی ایام میں گاہے گاہے ایسی تقریبات کو رونق بخشتے اور رات کے اول حصہ میں پروگرام سے واپس تشریف لے آتے۔ ایسے ہی تعطیلات کے ایام میں دن کے وقت کسی پروگرام میں مدعو کیا جاتا تو حضرت ضرور تشریف لے جاتے۔ حضرت شیخؒ اپنی مسجد میں انعقاد پانے والے پروگراموں میں بھی بہت کم تشریف لے جاتے۔ اگر قدم رنجہ فرماتے تو قلیل سی مدت کے لیے۔ ویسے بھی حضرت شیخؒ کی موجودگی میں مقررین کرام خطاب کا حوصلہ نہیں پاتے تھے۔ البتہ صحت کے زمانے میں جامعہ نصرۃ العلوم گوجرانوالہ کے فضلائے کرام کی دستار فضیلت کی تقریب میں خطیب اسلام حضرت مولانا محمد اجمل خانؒ اور حیات مبارکہ کے آخری سالوں میں اپنی جامع مسجد میں دورۂ تفسیر کے فضلا کی دستار بندی کے موقع پر علامہ عبد القیوم حقانی کے خطابات کو انتہائی انہماک اور محویت سے سماعت فرماتے۔ اسی طرح اکابر علما حضرت مولانا محمد عبد اللہ درخواستیؒ، حضرت مولانا غلام غوث ہزارویؒ، مولانا مفتی محمودؒ اور مولانا عبید اللہ انورؒ جیسی عظیم شخصیات کی مرکزی جامع مسجد گکھڑ اور مدرسہ نصرۃ العلوم گوجرانوالہ میں تشریف آوری کے موقع پر تقریبات میں حضرت شیخؒ کی شرکت یقینی ہوتی تھی۔

امام اہل سنتؒ اور تعلقات عامہ

حضرت شیخؒ کی بھاری ذمہ داریاں اور شدید مصروفیات تعلقات عامہ کے لیے وقت نکالنے کی گنجایش نہ رکھتی تھیں، مگر کئی ایک معاملات تعلقات عامہ کے لیے از خود ذریعہ بنتے رہے، جن میں نماز باجماعت کی ادائیگی، نماز جمعہ کے بعد مسجد میں حاضرین سے ملاقات، تفکرات اور مختلف عوارض کے شکار لوگوں کی دم اور وظائف وغیرہ کے لیے حاضری۔ اس طرح گکھڑ کے کسی بھی محلہ نیز مضافات میں مسلک سے وابستہ افراد کی وفات پر نماز جنازہ کی امامت کے لیے حضرت شیخؒ ہی سے درخواست کی جاتی اور حضرت بلا امتیاز امیر وغریب متعلقین کی نماز جنازہ میں شریک ہوتے۔ غم زدہ خاندان سے اظہار تعزیت کے علاوہ یہ عمل عوام سے ربط وتعلق کا ذریعہ بھی بن جاتا۔ حضرت جوانی اور فرصت کے عالم میں بیمار حضرات کی تیمار داری کے لیے تشریف لے جاتے رہے۔ بصورت دیگر افراد خانہ میں سے کسی نہ کسی کو بھیج دیتے۔ حضرت شیخؒ کا حافظہ غضب کا تھا جس کی وجہ سے لوگوں کے نام ومقام خوب یاد رہتے۔ کسی بھی خاندان کے کسی فرد سے ملاقات کے وقت ان کے

گھرانے کے دیگر افراد کا نام لے کر ان کے حالات دریافت کرتے۔ ملاقات کا یہ انداز زیارت کرنے والے پر ایک خوشگوار اثر چھوڑتا۔ وہ اپنے خاندان کے افراد سے شناسائی کو حضرت کی نظر میں اپنے گھرانے کی وقعت اور اپنے خاندان سے گہری تعلق داری محسوس کرتا۔

حضرت شیخؒ کی دینی ذمہ داریاں شادی وغیرہ جیسی تقریبات میں شرکت کی متحمل نہ تھی، البتہ قریبی اعزہ کی عروسی تقریبات میں مختصر وقت کے لیے حضرت شیخؒ کی شرکت ہو جاتی۔ اس طرح بعض عقیدت مند حضرات کی شدید خواہش پر ان کے عقد نکاح کی تقریب میں خطبہ نکاح کے لیے تشریف لے جاتے۔ اعزہ واقارب، اسی طرح مقامی معتقدین اور متعلقین حضرات کی شادی کی تقریبات پر حضرت شیخؒ بصورت رقم، کپڑے اور دینی کتب ہدیہ کا اہتمام ضرور کرتے اور ہدیہ کی ترسیل کے لیے یہ سلسلہ عموماً دونوں والدہ صاحبہ کے ذریعے سے ہوتا۔ مقامی آبادی کی خوشی اور غمی کے مواقع پر دونوں والدہ محترمہ کی حاضری مقامی خاندانوں سے تعلقات کے فروغ اور حقوق معاشرہ کی ادائیگی کا مستقل ذریعہ بنتی اور یوں لوگوں میں غمی اور خوشی کے موقع پر حضرت کے خاندان کی شرکت کا احساس قائم رہتا۔ جب دونوں والدہ صاحبہ وفات پا گئیں تو ہدیہ وتحفہ بھیجنے کا یہ عمل دیگر افراد خانہ کے ذریعے سے پورا ہوتا رہا۔ شادی کی تقریبات میں تمام اہل وعیال کے مدعو ہونے کے باوصف حضرت شیخؒ عموماً اپنے گھرانے میں سے ایک اور کبھی دو افراد کو پروگرام میں شمولیت کے لیے بھیجتے تھے، البتہ چند ایک ایسے گھرانے جن سے گھریلو مراسم گہرے اور بڑی قربت کے تھے، ان کے اصرار پر تمام گھرانے کو تقریب میں شمولیت کی جازت دے دیتے اور خود نکاح مسنون کی تقریب میں شرکت پر اکتفا کرتے۔

قناعت پسندی، خودداری اور لوگوں پر بوجھ نہ بننے کا وصف حضرت شیخؒ کے مزاج کا مستقل حصہ رہا۔ مفلس اور نادار لوگوں کا حضرت خوب خیال رکھتے۔ عیدین کے موقع پر بطور خاص اور اس کے علاوہ اوقات میں ان کی دل جوئی کرتے رہتے تھے۔ محلہ داروں کے حقوق کا خاص لحاظ رکھتے۔ اپنے پڑوس کے یتیم گھرانے سے عمر بھر حسن سلوک کا مثالی مظاہرہ کرتے رہے۔ گکھڑ کے جن خاندانوں کے حضرت شیخؒ کے گھرانے سے قریبی اور گھریلو نوعیت کے تعلقات رہے، ان میں حاجی اللہ دتہ بٹ (بٹ دری فیکٹری والے)، میر فیملی، حاجی خوشی محمد درزی فیملی، حاجی فخر الدین چیمہ فیملی، ماسٹر کرم الدین آرائیں فیملی، حاجی عبد اللہ چیمہ فیملی، ملک نور دین فیملی، ظفر یاسین بٹ فیملی، نصیر الدین حلوائی فیملی، ملک نور دین فیملی، حافظ احمد حسن فیملی، لالہ غلام نبی بٹ فیملی، تارڑ فیملی، سید منیر علی شاہ فیملی، برکت علی حلوائی فیملی، محمد شفیع بٹ فیملی، میر محمد شریف فیملی، حکیم محمد صفدر فیملی، حاجی محمد صادق بٹ فیملی، مستری ابراہیم فیملی، رانا فیملی، باجوہ فیملی، نمبر دار فیملی، محمد بشیر چیمہ دو کھوہ والے، جوئیہ فیملی، حاجی عبد العزیز درزی فیملی، سراج دین بٹ فیملی، حاجی خوشی محمد کھوکھر فیملی اور ماسٹر اللہ دین فیملی قابل ذکر ہیں۔

خانگی نظم اور مہمان داری

حضرت شیخؒ کا مسکن کثیر العیال اور کثیر الضیوف ہونے کی وجہ سے بارونق اور سدا آباد رہا۔ اس گھر کو شاید ہی کبھی قفل اور تالا لگانے کی نوبت آئی ہو۔ مہمانوں کی کثرت آمد کی وجہ سے افراد خانہ یا متعلقین میں سے کسی نہ کسی فرد کی گھر میں موجودگی ضرور ہوتی تھی۔ حضرت شیخؒ گھریلو ضروریات کے حوالہ سے انتہائی منتظم اور فکر مند انسان تھے۔ گھر کے معاملات پر گہری نظر رکھتے تھے۔ صحت کے زمانہ تک گھر کا سارا نظم حضرت شیخؒ کے دست مبارک میں رہا۔ مرچ تک کی ضروریات کا خیال اور حساب رکھتے

اور گھریلو حوائج کی بابت استفسار کرتے رہتے۔ چونکہ مہمانوں کی آمد ورفت بکثرت رہتی تھی، اس لیے خور ونوش اور دیگر ضروریات اور لوازمات کے حوالے سے پیشگی بندوبست کو ترجیح دیتے۔ گندم اور چاول وغیرہ خشک اناج اکٹھا منگوا لیتے۔ اسی طرح باقی راشن مہینہ بھر کی ضروریات کے مطابق اکٹھا خریدا جاتا۔ سبزی، گوشت، دودھ، دہی وغیرہ اشیا کی مقدار تقاضے کے مطابق روزانہ منگواتے۔ اسی طرح افراد خانہ کے لباس وغیرہ کے معاملات کو ضرورت کے مطابق کفایت شعاری سے پورا کرتے۔ قرض سے حتی الامکان احتراز کرتے۔ حضرت شیخ معاملات میں انتہائی درجے کے محتاط تھے، یہاں تک کہ اگر اولاد میں سے کسی سے ڈاک کا لفافہ یا ٹکٹ ضرورت کے لیے لیتے تو اس کا حساب بھی بے باق کرنا لازم سمجھتے تھے۔

حضرت شیخ میں شیخ العرب والعجم حضرت مدنیؒ کی دین پر استقامت، عاجزی، سادگی اور مہمان نوازی کے اوصاف کی جھلک نمایاں نظر آتی تھی۔ ہر صغیر وکبیر کے لیے آپ کا دروازہ کھلا رہتا۔ علالت اور معذوری کے آخری سالوں کے علاوہ اوقات اور ملاقات کی کوئی تحدید نہ تھی۔ ملاقات کے لیے پیشگی وقت لینے کی کوئی ضرورت نہ پڑتی۔ جب بھی کسی کی ملاقات کے لیے آمد ہوتی، نیند وآرام کے اوقات کے علاوہ فوراً ملاقات ہو جاتی۔ مہمانوں کی خاطر مدارات میں بنفس نفیس خود بھی شامل ہو جاتے۔ افراد خانہ کو مہمان نوازی کی تلقین وتاکید کرتے رہتے۔ مہمانوں کی آمد ویسے بھی بکثرت رہتی تھی، مگر عمر کے ساتھ ساتھ اس میں روز افزوں اضافہ ہوتا چلا گیا۔ مختلف ہموم وعوارض میں مبتلا افراد کی دم اور اوراد وغیرہ کی حاضری اس پر مستزاد تھی اور یہ سلسلہ اتنا وسیع تھا کہ اس سے نہ صرف حضرت شیخ کے معمولات شدید متاثر ہوتے بلکہ تمام افراد خانہ اس کی لپیٹ میں آتے اور اس کی وجہ سے عبادات، خانگی معاملات، نیند وآرام اور دیگر امور کی ادائیگی کا سارا نظام متاثر ہو کر رہ جاتا۔ قرابت داروں سے صلہ رحمی اور حسن سلوک حضرت شیخ کا امتیازی وصف رہا ہے۔ رشتہ داروں کی آمد پر ان کی خوب ضیافت اور خدمت ہوتی اور واپسی پر انہیں ہدیہ اور تحفہ سے عمر بھر نوازتے رہے۔

حضرت شیخ کے گھر کے دینی اور خانہ داری کے امور کی بھی ایک مستقل ترتیب تھی۔ ہماری بڑی والدہ محترمہ جو اوراد و اذکار اور قیام وصیام کا اہتمام رکھتی تھیں، والد محترم کے لیے ناشتہ اکثر وہ تیار کرتی تھیں۔ والد محترم نماز فجر سے پہلے ہی ناشتہ سے فارغ ہو جاتے۔ نماز فجر کے فوراً بعد دیگر افراد خانہ کے لیے ناشتہ عموماً ہماری چھوٹی والدہ محترمہ تیار کرتیں۔ حضرت والد محترم کی فجر کے بعد درس قرآن سے فراغت تک ہم مسجد میں زیر تعلیم بہن بھائی ناشتہ کر کے مسجد چلے جاتے، پھر دیگر افراد خانہ نیز مہمان ناشتہ کرتے۔ اس دوران بڑی والدہ محترمہ محلے کے بچوں اور بچیوں کو قرآن کریم پڑھانے میں مصروف ہو جاتیں۔ خانہ داری کے امور سے اکثر چھوٹی والدہ محترمہ جبکہ گھر میں اور گلی میں طالبات کے مدرسہ کی تعلیمی ذمہ داری سے بڑی والدہ صاحبہ عہدہ برآ ہوتیں، البتہ برادر کبیر علامہ زاہد الراشدی مدظلہ کی شادی کے بعد ان کی اہلیہ محترمہ خانہ داری کے امور میں چھوٹی والدہ محترمہ کی مستقل اور تعلیمی امور میں بڑی والدہ محترمہ کی بوقت ضرورت خوب معاونت کرتی رہیں۔ باوجود اس کے کہ وہ عمر میں بہت چھوٹی تھیں، مگر بڑی مستعدی اور فراخ دلی اور قرینے سے گھریلو امور کی انجام دہی میں حصہ لیتیں۔ چونکہ گھر میں مہمان داری زیادہ تھی، اس لیے ان کی آمد سے گھر کے نظام میں کافی سہولت، بہتری اور خوشگوار تبدیلی محسوس ہونے لگی۔

پھر دیگر بھائیوں کی شادی کے بعد عیال داری، مہمان داری اور گھریلو ذمہ داری کا پہلو جب مزید وسعت اختیار کر گیا تو خانہ داری کے امور باہم منقسم ہو گئے۔ کچھ عرصہ بعد حضرت والد محترم کی تلقین وتاکید سے برادران کرام دیگر شہروں میں

تدریس اور خطابت وامامت وغیرہ کی مستقل ذمہ داریوں کی وجہ سے اپنے اپنے اہل وعیال کو اپنے ساتھ لے گئے اور گھر کے خانہ داری کے معاملات دوبارہ پہلی ترتیب پر لوٹ آئے۔ اس دوران برادرم قاری محمد اشرف ماجدؒ کی فیملی بھی اسی گھر میں مقیم رہی۔ کئی سال تک یہ ترتیب چلتی رہی تا آنکہ دونوں والدہ محترمہ کی یکے بعد دیگرے قریباً ایک سال کے وقفہ کے ساتھ وفات ہو گئی اور یوں ہنستا بستا اور باغ وبہار کا منظر پیش کرتا یہ گھر ویرانے اور خزاں کا منظر پیش کرنے لگا۔ دونوں والدہ مرحومہ کی وفات کے بعد راقم الحروف کی شادی ہوئی اور گھر کے نظم کو سابقہ روایات پہ لانے کی مقدور بھر سعی ہوتی رہی۔ پھر چھوٹے بھائیوں (بھائی شاہد، بھائی ساجد اور بھائی راشد) کی شادی پر گھر کا نظم ان کے سپرد ہوا اور کئی سال تک وہ سب بالعموم اور بالخصوص بھائی راشد حضرت والد محترم کی خدمت سے بہرہ مند ہوتے رہے، یہاں تک کہ وہ غم انگیز اور غم فزا ساعتیں آ پہنچیں کہ اس گھر کے عظیم اور نادر روزگار مکین اس یادگار مسکن کو داغ مفارقت دے کر اس کی باقی ماندہ رونقیں بھی اپنے ساتھ لے گئے اور یوں اس گھر کی روشن تاریخ کا تابناک باب ہمیشہ کے لیے بند ہو گیا۔

چاروں طرف فضا میں اداسی بکھر گئی
وہ کیا گئے کہ رونق شام و سحر گئی

مسکن شیخ کو علمی دنیا میں ایک منفرد، امتیازی اور تاریخی حیثیت حاصل ہے۔ نصف صدی سے زائد عرصہ تک یہ مسکن مرجع خلائق رہا۔ عوام کا تانتا تو یہاں بندھا ہی رہتا تھا، خواص بھی اپنی حاضری کو ایک اعزاز سمجھتے تھے۔ وہ یہاں حاضر ہو کر علمی گتھیوں کو سلجھاتے اور چشمہ علوم ومعارف سے سیراب ہوتے تھے۔ مسکن شیخ بیک وقت راہ نوردوں کے لیے ایک سرائے اور مہمان خانہ، روحانی وجسمانی عوارض دونوں کے لیے ایک شفا خانہ، تشنگان علوم دینیہ کے لیے ایک منبع اور منفرد چشمہ معارف، متلاشیان حقیقت کے لیے ایک معتمد تحقیقی ادارہ، بھٹکے ہوئے افراد کے لیے ایک مرکز حق وہدایت، مضطرب اور پریشان حال لوگوں کے لیے ایک مقام تسکین اور اصلاح طلب افراد کے لیے ایک بزم اصلاح وتلقین کا منظر پیش کرتا رہا۔ حضرت کے دولت کدہ کو نہ صرف سینکڑوں مرتبہ تکمیل تلاوت قرآن پاک کی برکات حاصل ہوتی رہیں بلکہ تفسیر، حدیث اور فقہ کے علاوہ دیگر علوم اسلامی کے مطالعہ کی کثرت کے حوالہ سے بھی اسے ایک امتیاز اور اعزاز حاصل رہا۔ نصف صدی کے طویل عرصہ تک ایک قابل فخر اور منفرد تاریخ رکھنے والے اس مسکن کے در و دیوار پر اب ایک عجیب سی اداسی چھائی ہوئی ہے۔ باغ وبہار کا منظر پیش کرنے والا یہ مسکن اب سونا سونا دکھائی دیتا ہے۔ اس کی ہر اینٹ اپنے عظیم مکین کو ڈھونڈتی ہے، مگر اس کے دیدار کا ہر طالب تو اب سدا تڑپتا ہی رہے گا۔

سوچ میں ڈوبی بھیگی، سہمی سہمی آنکھوں سے
دیکھ رہے ہیں سپنا ان کا، اب نہ لوٹ کے آنے کا

— ۲ —

تعلیم و تدریس

مومن مرد ہو یا عورت، ان کے لیے شرعاً حکم ہے کہ جہاد کی حالت کے علاوہ بھی اپنی جان کی حفاظت کرے۔ یہ جان کسی کی ذاتی نہیں ہے بلکہ اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی ہے اور ہمارے پاس اللہ تعالیٰ کی امانت ہے اور امانت کی حفاظت ضروری ہے۔ یہی وجہ ہے کہ خودکشی حرام ہے اور خودکشی کرنے والا یہ نہیں کہہ سکتا کہ میں نے اپنی جان ضائع کی ہے، کسی کا میں نے کوئی نقصان نہیں کیا۔ بھئی، یہ جان تیری نہیں ہے، اللہ تعالیٰ کی امانت ہے۔ جب میدان جہاد میں اللہ تعالیٰ کے دشمن کے مقابلے میں ہو، لڑائی جاری ہو تو پیٹھ پھیرنا حرام اور اپنا تحفظ کرتے ہوئے لڑنا ضروری ہے۔ عام حالات میں بلاوجہ جان ضائع کرنا حرام ہے۔ اس سلسلے میں فقہی طور پر چند مسائل سمجھ لیں۔ سخت سردی کا موسم ہے اور آدمی کو سردی سے بچاؤ کرنے مثلاً گرم لباس پہننے کی، گرم جگہ میں رہنے کی طاقت بھی حاصل ہے، مگر وہ سستی کرتا ہے اور سردی سے بچتا نہیں ہے اور اس کو بخار ہو جاتا ہے، نمونیہ ہو جاتا ہے یا کوئی تکلیف ہو جاتی ہے تو یہ بیمار بھی ہوگا اور گنہگار بھی ہوگا، اس لیے کہ اس نے رب تعالیٰ کی امانت کی حفاظت نہیں کی۔ اسی طرح سخت گرمی ہے اور یہ گرمی سے بچنے کی طاقت رکھتا ہے، مگر کوشش نہیں کرتا۔ تکلیف ہو گئی ہے تو گنہگار ہوگا، اس لیے کہ اس نے رب تعالیٰ کی امانت کی حفاظت نہیں کی۔ اسی طرح اگر کوئی مرد یا عورت، بوڑھا یا جوان سڑک کراس کرنا چاہتا ہے تو اسے اچھی طرح دیکھ کر گزرنا چاہیے تاکہ وہ بس وغیرہ کے نیچے نہ آ جائے۔ اگر بے احتیاطی سے گزرا اور کسی شے کے نیچے آ کر مر گیا تو یہ گنہگار ہوگا۔ اسی طرح اگر کوئی مرد یا عورت ضرورت سے زیادہ جان بوجھ کر کھا لیں جس کو ہضم نہ کر سکیں اور بدہضمی ہو جائے، تکلیف ہو جائے تو یہ گنہگار ہیں کہ انھوں نے رب تعالیٰ کی امانت میں خیانت کی ہے۔ اسی طرح اگر کوئی شخص اتنا تھوڑا کھاتا ہے کہ اٹھ بیٹھ نہیں سکتا، نماز نہیں پڑھ سکتا، روزہ نہیں رکھ سکتا تو یہ گنہگار ہے۔ اس کو اتنا کھانا چاہیے کہ جس سے جسم کی قوت برقرار رہے اور یہ نماز پڑھ سکے اور روزہ رکھ سکے۔

(ذخیرۃ الجنان ۴/۱۴۸ تا ۱۵۱)

آپ کی حقیقت شناس نگاہ میں درس قرآن کی اتنی عظمت ومحبت تھی کہ شرکاے دورۂ تفسیر وشرکاے دورۂ حدیث اور اہل علم کی دیگر خصوصی مجالس میں اکثر یہ نصیحت ارشاد فرمایا کرتے تھے کہ

''میری آپ سے درخواست ہے کہ اپنی اپنی وسعت وطاقت کے مطابق درس قرآن کا مبارک سلسلہ ضرور شروع کر دیں۔ جس مسلمان کا قرآن سے شعوری تعلق ہو جاتا ہے، دنیا کی کوئی باطل طاقت اس کو گمراہ نہیں کر سکتی۔ یقین جانیے، قرآن کی درس وتدریس بہت بڑی سعادت ہے۔ آپ کو ایک آدمی مل جائے، دو مل جائیں، تین مل جائیں، درس کا سلسلہ شروع کر دیجیے۔''

یہ نصیحت ارشاد فرما کر اپنے استاد محترم مولانا سید حسین احمد مدنیؒ کا یہ واقعہ سنایا کرتے تھے کہ ایک مرتبہ مراد آباد جیل میں اسارت کے دوران حضرت قاری محمد طیب صاحب مہتمم دارلعلوم دیو بند ان سے ملاقات کے لیے تشریف لے گئے اور دیکھا کہ حضرت مدنی جیل میں قیدیوں کو تعلیم الاسلام پڑھا رہے ہیں۔ حضرت قاری صاحب نے دل لگی اور از راہ مزاح کہا، حضرت آپ نے تو خوب ترقی کی ہے کہ بخاری شریف پڑھاتے پڑھاتے تعلیم الاسلام پڑھانی شروع کر دی ہے۔ حضرت مدنیؒ نے جواب دیا، ''بھائی! کام جو پڑھانا ہوا۔ دار العلوم دیو بند میں بخاری وترمذی پڑھنے والے تھے، ان کو بخاری وترمذی پڑھاتا تھا اور یہاں مراد آباد جیل میں تعلیم الاسلام پڑھنے والے ہیں، چنانچہ ان کو تعلیم الاسلام پڑھاتا ہوں۔''

مولانا محمد فیاض خان سواتی*

مدرسہ نصرۃ العلوم میں حضرت شیخ الحدیث رحمہ اللہ کی خدمات

بندہ نے شعور وآگہی کی عمر میں قدم رکھتے ہی دیکھا کہ پچاس سال سے زائد عمر کے ایک بزرگ صبح ہی صبح آکر ہمارے گھر کے دروازے پر دستک دیتے ہیں اور پھر اندر آ کر زوردار طریقے سے سب کو السلام علیکم کہتے ہیں۔ پھر والد صاحبؒ کے کمرے میں چلے جاتے ہیں، تھوڑی دیر دونوں آمنے سامنے بیٹھ کر گفتگو کرتے ہیں اور پھر وہ آنے والے بزرگ ایک کاپی اُٹھا کر سلام کرتے ہوئے گھر سے باہر چلے جاتے ہیں۔ گرمی ہو یا سردی، ان کا یہی معمول ہے، ہاں اتنا فرق ضرور ہے کہ گرمی کے موسم میں وہ سفید لباس اور سفید رنگ کی گول ٹوپی اور سیاہ بوٹ زیب تن کرتے ہیں، اور سردی کے موسم میں سر پر سیاہ دھاری دار یا سفید پگڑی، پاؤں میں جرابیں اور بوٹ، سفید کپڑوں کے اوپر جرسی یا واسکٹ اور اکثر کالی شیروانی، اوپر سواتی شال اوڑھے، ہاتھ میں چھتری، آنکھوں پہ چشمہ، شلوار نصف پنڈلیوں تک اُٹھائی ہوئی، سفید وسیاہ ملی جلی گھنی اور مختصر ڈاڑھی، نہایت تنومند، متوسط قد، موٹی سفید اور بھاری پنڈلیاں، چلتے ہوئے دونوں ہاتھوں کو ہلاتے تو کسی پہلوان کا نمونہ پیش کرتے۔ ہر موسم میں سر پہ حلق، مونچھوں پہ استرا اور کندھے پر رومال ان کا جز ولاینفک ہوتا۔ سامنے کی جیب میں قلم، زنجیر والی گھڑی، بٹوا اور دیگر کئی اشیاء جیب کے بھاری بھر کم ہونے کا عندیہ دیتیں۔ ہنستے تو سامنے کے دانت چمکتے، غصہ میں آتے تو رنگ سرخ ہو جاتا۔ کسی کو کچھ بھی نہ کہتے، لیکن قدرتی طور پر دبدبہ اور رعب نمایاں ہوتا۔

ان کی آمد سے پہلے ہی سارے گھر میں سناٹا چھا جاتا اور آواز بلند ہوتی کہ ''مولوی صاحب آ رہے ہیں'' کیونکہ گھر میں آتے ہی ان کا سب سے پہلا ہدف ہم بچے ہوتے۔ خصوصاً موسم سرما میں اگر کسی بچے نے موٹے کپڑے، جرسی، کوٹ اور جرابیں وغیرہ نہ پہنی ہوتیں تو بچوں کو کم اور بڑوں کو زیادہ ڈانٹ ڈپٹ کا سامنا کرنا پڑتا، کیونکہ وہ اکثر کہتے تھے کہ ''مجھے صوفی کے بچوں سے بہت محبت ہے''۔ آہستہ آہستہ پتہ چلا کہ یہ ہمارے تایا جان ہیں، ہمارے ابو کے بڑے بھائی ہیں۔ ہم انہیں بڑے ابو کہنے لگے۔ روزانہ گکھڑ سے آتے ہیں اور مدرسہ میں سبق پڑھا کر پھر واپس چلے جاتے ہیں، جاتے وقت بھی ہمارے گھر میں آتے ہیں، اپنی کاپی رکھ کر خواتین کو تعویذ، دم درود کرتے ہیں، پیشاب وضو سے فارغ ہو کر نکل جاتے ہیں۔

جمعہ کے دن کے علاوہ ان کی مذکورہ روٹین میں کوئی فرق نہیں آتا۔ وہ صبح تہجد کے وقت اٹھتے۔ گرمی ہو یا سردی، ٹھنڈے پانی سے نہاتے۔ خدا تعالیٰ کے سامنے عاجزی وانکساری کا اظہار کرتے، مصلیٰ پر قبلہ رو ہو کر نوافل ادا کرتے، دعا ومناجات کرتے۔ تہجد کے وقت ہی وہ ناشتہ کر لیتے۔ پھر بوہڑ والی مسجد میں جا کر نماز پڑھاتے اور درس قرآن وحدیث دیتے۔ وہاں سے فارغ ہو کر گکھڑ ریلوے اسٹیشن جاتے اور گاڑی پر سوار ہو کر گوجرانوالہ آتے۔ ریلوے اسٹیشن سے مدرسہ پیدل چل کر

* مہتمم مدرسہ نصرۃ العلوم گوجرانوالہ

آتے۔ کبھی بس، ویگن یا دیگر سواری کے ذریعے بھی آتے اور لاری اڈہ سے مدرسہ پیدل ہی آتے۔ یہی معمول واپسی کا بھی تھا کہ اسباق سے فراغت کے بعد لاری اڈہ یا ریلوے اسٹیشن پیدل جاتے۔ ۱۹۵۵ء کے اواخر سے اوائل ۱۹۷۶ء تک تقریباً بیس سال مسلسل یہی معمول رہا۔ میرے ناقص خیال کے مطابق ان کی یہ آمد و رفت جس عزم و استقلال سے بدستور جاری رہی کہ اس میں چھٹی کا کوئی تصور نہیں ہے، اسے مدرسہ نصرۃ العلوم کے لیے ان کی بنیادی اور اہم ترین خدمات میں شمار کیا جا سکتا ہے، کیونکہ باقی ساری کی ساری خدمات اس جہد پیہم ہی کی مرہون منت ہیں۔

ان کا یہ معمول دنیا بھر کے اساتذہ کے لیے ایک نمونہ کی حیثیت بھی رکھتا ہے کہ گرمی ہو یا سردی، خزاں ہو یا بہار، خشکی ہو یا برسات، وہ اپنے مقررہ وقت پر اپنی مسند پر موجود ہوتے۔ اس حوالے سے ایک عجیب واقعہ ہے جسے لطیفہ سے بھی تعبیر کیا جا سکتا ہے۔ ایک بار ملک میں پہیہ جام ہڑتال ہوئی۔ صبح کی نماز پڑھ کر سارے طالب علم اس نظریہ کے ساتھ چادریں تان کر سو گئے کہ آج حضرت شیخ صاحب تشریف نہیں لائیں گے اور بظاہر اس کا کوئی امکان بھی نہ تھا، لیکن جب ان کے پیریڈ کا ٹائم ہوا تو اچانک گھنٹی کی آواز نے پورے مدرسہ میں ایک ارتعاش پیدا کر دیا۔ ہر طالب علم سوالیہ انداز میں ایک دوسرے کی طرف دیکھ رہا تھا جیسے کوئی انہونی ہو گئی ہو۔ بعض نے کہا کہ کسی نے شرارت کی ہے۔ بعض نے کہا کہ چاول وغیرہ آئے ہوں گے، انہیں تقسیم کرنے کے لیے گھنٹی لگائی گئی ہے۔ طرح طرح کے تخمینے اور تجزیے ہوئے، لیکن سب کی امیدوں پر اس وقت اوس پڑ گئی جب ایک طالب علم بھاگتا ہوا آیا اور اس نے طلبہ کو آگاہ کیا کہ حضرت شیخ صاحب تشریف لے آئے ہیں اور گھنٹی بھی انہوں نے خود ماری ہے اور سبق کے لیے تمہارا انتظار کر رہے ہیں۔ بھاگم بھاگ وضو کے بعد سب ترجمہ کے سبق میں حاضر ہوئے کہ جنرل حاضری اس کے بعد حضرت شیخ صاحبؒ خود ہی لگاتے تھے۔ ترجمہ کی کلاس کے بعد حاضری لگانے سے پہلے انہوں نے مسکراتے ہوئے بتایا کہ میں حسب معمول گکھڑ ریلوے اسٹیشن پر گیا۔ پہیہ جام کی وجہ سے امکان تو نہیں تھا کہ سواری مل سکے، لیکن اپنی ڈیوٹی کے لیے حاضری دینے میں انسانی کوشش کی حد تک میں نے سوچا کہ قسمت آزمائی کر لی جائے تاکہ عند اللہ و عند الناس مواخذہ نہ ہو۔ اسٹیشن پر کھڑا تھا کہ اچانک وزیر آباد سے گوجرانوالہ کی طرف جاتا ہوا ریل گاڑی کا ایک خالی انجن گکھڑ ریلوے اسٹیشن پر رکا تو میں نے ڈرائیور سے کہا کہ بھائی مجھے گوجرانوالہ میں ایک انتہائی ضروری کام ہے۔ مجھے بھی اپنے ساتھ انجن پر کھڑا کر لو۔ کچھ پس و پیش کے بعد اس نے کہا، آؤ مولوی صاحب میرے ساتھ کھڑے ہو جاؤ۔ اس طرح حضرت اس کے ساتھ سوار ہو کر گوجرانوالہ آ گئے اور مدرسہ پہنچ کر سب کو ورطۂ حیرت میں ڈال دیا اور ساتھ ہی آنے والی نسلوں کو یہ سبق بھی دے گئے کہ اپنی ڈیوٹی میں کوتاہی ہرگز روا نہیں، انسان کو اپنی طرف سے پوری کوشش کرنی چاہیے۔ اخلاص کے ساتھ سعی کرنے والوں کے ساتھ اللہ کی تائید بھی شامل حال ہو جاتی ہے جس کا عملی نمونہ خود حضرت شیخ کا یہ واقعہ ہے۔

اہل بدعت کا حملہ

۱۹۷۶ء میں اڈہ سے مدرسہ پیدل آتے ہوئے محلّہ اسلام آباد کے قریب اہل بدعت میں سے کچھ شرپسندوں نے آپ پر حملہ کیا اور دھکے دیے جس سے آپ گر گئے۔ اس حادثہ نامرضیہ پر اہل حق کو بے حد تشویش ہوئی، خصوصاً مدرسہ نصرۃ العلوم کی مجلس منتظمہ کو اس واقعہ سے بڑا ہی صدمہ ہوا جس پر مہتمم صاحب نے انتظامیہ کو حکم دیا کہ فوراً موٹر کار کا بندوبست کریں، چنانچہ اس وقت سے ۲۰۰۱ء تک پھر وہ موٹر کار پر ہی گکھڑ سے مدرسہ آتے جاتے رہے۔ وہ منظر ابھی میری نظر میں گردش کر رہا ہے کہ

مدرسہ کے خزانچی نے تین گاڑیاں لا کر مدرسہ کے صحن میں کھڑی کیں اور حضرت صوفی صاحبؒ سے کہا کہ جس پر آپ ہاتھ رکھیں گے، وہی گاڑی ہم مدرسہ کے لیے خرید لیں گے تو حضرت نے ان میں سے سب سے بڑی گاڑی گہرے آسمانی رنگ والی ٹیوٹا پر ہاتھ رکھا اور وہ مدرسہ کے لیے خرید لی گئی، لیکن گوجرانوالہ کے بازار اور سڑکیں تنگ ہونے کی وجہ سے آمد و رفت میں مشکل پیدا ہونے لگی تو تیسرے ہی دن اس گاڑی کو فروخت کر کے اس کی جگہ دوسری چھوٹے سائز کی کلیجی کلر کی ٹیوٹا خرید لی گئی۔

مدرسہ نصرۃ العلوم کے لیے حضرت شیخ کی خدمات اس قدر وسیع ہیں کہ انہیں کسی مضمون میں سمیٹنا جوئے شیر لانے کے مترادف ہے اور ہمارے کوتاہ قلم سے ان کا حق ادا بھی نہیں ہو سکتا، تاہم چند اہم ترین باتوں پر قلم اٹھانے کی جسارت کر رہا ہوں۔ یہ چونکہ ایک خاص موضوع ہے، اس لیے یہ تحریر اسی کے دائرہ میں لکھی گئی ہے، باقی موضوعات پر دیگر احباب خامہ فرسائی کریں گے۔

مدرسہ نصرۃ العلوم کے ابتدائی حالات

۱۹۵۲ء میں جب مفسر قرآن حضرت مولانا صوفی عبد الحمید خان سواتیؒ نے مدرسہ نصرۃ العلوم اور جامع مسجد نور کی بنیاد رکھی تو پہلے سال صرف چند بیرونی طلبہ تھے اور درس نظامی میں پڑھنے والے طلبہ کے لیے وہ اکیلے ہی استاد تھے۔ آہستہ آہستہ طلبہ کی تعداد میں اضافہ ہوتا رہا اور اساتذہ کی مزید ضرورت محسوس ہوتی گئی۔ تو اساتذہ کی تعداد میں بھی اضافہ ہوتا چلا گیا، ۱۹۵۵ء تک بیرونی طلبہ کی تعداد چودہ تک ہو گئی اور مقامی بچے بچیاں ناظرہ قرآن کریم کی تعلیم کے لیے کافی آنے لگے تو قرآن کریم ناظرہ کی تعلیم مولانا صوفی حسن محمد صاحب مرحوم اعزازی طور پر دینے لگے۔ درس نظامی کے طلبہ کو انگریزی، حساب اور اردو وغیرہ کی تعلیم دینے کے لیے پچپن روپے ماہانہ پر ڈاکٹر عبد الکریم مرحوم (ایف اے) کی خدمات حاصل کر لی گئیں۔ ۱۹۵۴ء کے اوائل میں درس نظامی کے شعبہ میں حضرت مولانا عبد القیوم ہزاروی زید مجدہ کا ستر روپے مشاہرہ پر تقرر ہوا۔ ۱۹۵۵ء کے اواخر میں حضرت مولانا محمد سرفراز خان صفدرؒ کا اور پھر ۱۹۵۶ء میں مولانا قاضی شمس الدین مرحوم کا تقرر ہوا۔ اس طرح یہ کاروانِ علم بڑھتا چلا گیا اور مدرسہ ترقی کی منازل کی طرف رواں دواں ہو گیا۔

امتحانات کا سلسلہ شروع ہوا تو ۱۹۵۲ء سے ۱۹۵۵ء تک ابتدائی چار سال دو شخصیات سالانہ امتحان کے لیے بطور ممتحن تشریف لاتی رہیں، ایک مولانا قاضی شمس الدین مرحوم اور دوسرے مولانا محمد سرفراز خان صفدرؒ۔ ان حضرات نے طلبہ کرام کی تعلیمی کارکردگی کے بارے میں جو رپورٹ لکھی، وہ مدرسہ نصرۃ العلوم کی سب سے پہلی روئیداد میں مطبوعہ ہے۔ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اسے یہاں نقل کر کے تاریخ کے اوراق میں محفوظ کر دیا جائے۔

''حضرت مولانا سرفراز خان صفدر خطیب جامع مسجد گکھڑ کی رائے''

''طلبہ کے مختلف اسباق کے نتائج کافی اچھے اور حوصلہ افزا رہے ہیں اور خلاف توقع (جب کہ اس دور میں دین کی طرف بالکل ہی رغبت نہیں رہی) طلبہ نے محنت و مشقت کا ثبوت بہم پہنچایا ہے۔ ارباب بست و کشاد طلبہ اور ان کے اساتذہ کی رعایت ملحوظ رکھیں اور ان کی حتی المقدور ہمت افزائی کریں''۔

(روئیداد سالانہ مدرسہ نصرۃ العلوم، ج ۱، ص ۸، مطبوعہ ۲/۹/۵۲ء تا ۱۳/۳/۵۵ء)

حضرت شیخؒ کی متنوع خدمات

مدرسہ نصرۃ العلوم کے لیے حضرت شیخؒ کی خدمات کو کئی دائروں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے، مثلاً مدرس، صدر مدرس و ناظم تعلیمات، شیخ الحدیث، شیخ التفسیر، صدر مفتی، مصنف، معاون اور سرپرست وغیرہ۔ ذیل میں ان پہلوؤں کا تاریخی و واقعاتی جائزہ لیا جاتا ہے۔

مدرس: دار العلوم دیوبند سے فراغت کے بعد آپؒ ۱۹۴۲ء میں مدرسہ انوار العلوم گوجرانوالہ میں پندرہ روپے مشاہرہ پر مدرس مقرر ہوئے۔ پھر ۱۹۴۳ء میں جامع مسجد بوہڑ والی گکھڑ کے امام و خطیب مقرر ہوئے اور وہیں مدرسہ میں تدریس بھی فرمانے لگے۔ پھر ۱۹۵۵ء میں مدرسہ نصرۃ العلوم میں حدیث کے لیے ایک مدرس کی ضرورت محسوس ہوئی تو انجمن نصرۃ الاسلام مدرسہ نصرۃ العلوم نے انجمن اسلامیہ گکھڑ کے توسط سے آپ کے ساتھ تدریس کے لیے بات کی جس کے لیے آپ نے بخوشی آمادگی کا اظہار فرمایا، چنانچہ انجمن نصرۃ الاسلام کے رجسٹر کارروائی میں اس کو نقل کیا گیا ہے۔ اس کی عبارت ذیل میں درج کی جاری ہے جس سے کئی اور باتوں پر بھی روشنی پڑے گی:

"۲۴/۶/۵۵ء۔ آج اجلاس عام زیر صدارت جمعدار فضل کریم صدر منعقد ہو کر مندرجہ ذیل کارروائی عمل میں آئی:

"(۱)............

(۲) تقرر اساتذہ و دیگر امور (ا) حدیث شریف کے معلم کے لیے معاملہ تعلیمی کمیٹی کے زیر غور رہا جنہوں نے حضرت قاضی شمس الدین صاحب کی (جو جامع مسجد شیرانوالہ باغ سے مستعفی ہو گئے تھے) خدمات حاصل کرنے کی کوشش کی مگر گفتگو ناکام رہی۔ اس کے بعد مولانا عبد الرؤف صاحب محدث آف سیریاں ہری پور کے بارہ میں سوچ بچار کیا گیا جن کے لیے مکان رہائش، خوراک اور وظیفہ کا مدرسہ حامل نہ ہو سکتا تھا۔ اس لیے کمیٹی مذکور نے طے کیا کہ مولانا سرفراز خان صاحب خطیب جامع مسجد گکھڑ منڈی کو یہاں لایا جاوے، مگر اس میں انجمن اسلامیہ گکھڑ کی، جس کے تحت مولانا مذکور کام کر رہے ہیں، رضامندی ضروری تھی، چنانچہ انجمن ہذا نے کمیٹی مذکور کی درخواست پر کہا کہ اگر ہمارے معمولات میں فرق نہ آئے تو ہمیں کوئی اعتراض نہ ہوگا۔ اس پر مولانا مذکور کی خدمات ۲/شوال سے باقاعدہ حاصل کر لی گئیں، جن سے طے پایا کہ وہ باقاعدہ صبح ۸ بجے سے ۲ بجے تک مدرسہ میں حدیث شریف کی تعلیم دیا کریں گے اور ان کے عوض مدرسہ نصرۃ العلوم کی طرف سے مبلغ ایک صد روپیہ ماہانہ بطور وظیفہ دیا جائے گا۔ اجلاس نے متفقہ طور پر اس حسن انتظام کو منظور کیا۔

....

دستخط غلام محمد۔ محمد عبد اللہ بقلم خود۔ علم الدین بقلم خود۔ محمد صدیق۔ محمد صدیق بقلم خود۔ شفیق الرحمٰن بقلم خود۔ عبد الحمید سواتی۔ نور محمد۔ بقلم خود عزیز الدین۔ جمعدار فضل کریم۔"

یوں ۱۹۵۵ء بمطابق شوال ۱۳۷۴ھ میں آپؒ مدرسہ نصرۃ العلوم کے لیے مدرس حدیث مقرر ہوئے اور ۱۹۶۰ء تک موقوف علیہ تک کی اہم کتابیں پڑھانے لگے جن میں تفسیر، حدیث، فقہ، اصول فقہ، اصول حدیث، اصول تفسیر، عقائد اور دیگر

کئی فنون بطور خاص آپ پڑھاتے رہے۔ آپ کا انداز تدریس کیا تھا، یہ ایک علیحدہ مستقل موضوع ہے۔ یہاں اتنا لکھنا بے جا نہ ہوگا کہ آپ ہی کے مخصوص انداز تدریس نے مدرسہ نصرۃ العلوم کو علمی دنیا میں بام عروج تک پہنچایا، تفہیم، اختصار، معلومات کی فراوانی، کتاب اور فن کو بیک وقت حل کرنے میں آپؒ کی تدریس جادوئی تاثیر رکھتی تھی۔ یہ خاصہ اللہ رب العزت کسی کسی کو عطا فرماتا ہے جس سے حظ وافر آپؒ کو عطا ہوا تھا۔

صدر مدرس و ناظم تعلیمات: ۱۹۵۶ء کے وسط میں مولانا قاضی شمس الدین مرحوم مدرسہ نصرۃ العلوم میں بحیثیت صدر مدرس اور شیخ الحدیث منتخب ہوئے اور مدرسہ میں دورۂ حدیث کا آغاز ہو گیا۔ دورۂ حدیث کے سارے اسباق قاضی صاحب مرحوم ہی پڑھاتے تھے۔ دو سال انہوں نے اس منصب پر کام کیا اور پھر مدرسہ سے علیحدگی اختیار کر لی۔ ان کے جانے کے بعد دو سال تک مدرسہ میں دورۂ حدیث منقطع رہا۔ تاہم ان کے جانے کے بعد حضرت شیخؒ ۱۹۵۸ء کے اواخر میں صدر مدرس اور ناظم تعلیمات کے منصب پر فائز ہوئے اور ۱۹۶۰ء میں دوبارہ دورۂ حدیث شریف کا آغاز ہو گیا اور آپؒ شیخ الحدیث والتفسیر کے منصب پر بھی فائز ہو گئے۔ یہاں مناسب معلوم ہوتا ہے کہ مدرسہ نصرۃ العلوم کے رجسٹرڈ مطبوعہ قواعد و ضوابط میں سے اس منصب کا تعارف اور ان کی ذمہ داریوں کو من و عن نقل کر دیا جائے جس سے یہ بات بخوبی نمایاں ہو جائے گی کہ حضرت شیخؒ اس حوالہ سے کیا کیا خدمات انجام دیتے رہے ہیں۔

"صدر المدرسین (و ناظم تعلیمات):

ناظم تعلیمات کا عہدہ اگرچہ الگ بھی ہو سکتا ہے، لیکن بہتر یہ ہے کہ یہ عہدہ صدر المدرسین و شیخ الحدیث کے پاس ہو جس کے فرائض و اختیارات حسب ذیل ہوں گے۔

(۱) طلبہ و مدرسین کی حاضری کے رجسٹر ہر ماہ کی آخری تاریخوں میں یا جب بھی مناسب خیال کرے، جانچ پڑتال کرنا، اور مناسب ہدایات دینا۔

(۲) مقدار نصاب و خواندگی کی پڑتال کرنا۔

(۳) کسی مضمون یا کتاب و سبق میں ردوبدل (ترمیم نصاب) کرنے کا اختیار ہوگا۔

(۴) طلبہ کی غیر حاضری کی صورت میں جرمانہ یا مناسب کارروائی کرنے کا اختیار ہوگا۔

(۵) طلبہ کی عمومی اصلاح کے لیے مناسب ہدایات جاری کرنا، وعظ و نصیحت اور زجر و توبیخ کے ذریعہ۔

(۶) مسلک کے لیے ضروری مسائل کے سلسلہ میں مدرسین و طلبہ کی راہنمائی کرنا۔

(۷) ابتداء سال میں اسباق و کتب (مضامین) کی تقسیم کا انتظام کرنا۔

(۸) مدرسین کو ادائے فرائض میں کوتاہی پر تنبیہ کرنا اور ان کی نگرانی کرنا۔

(۹) تعلیمی معاملات میں مہتمم، ناظم اور مدرسین سے صلاح و مشورہ کرنا۔

(قواعد و ضوابط مدرسہ نصرۃ العلوم ص ۱۰، ۱۱)

ان کے علاوہ بعض دیگر باتوں کا بھی قواعد و ضوابط میں ذکر ہے، مثلاً:

(۱) کوئی کتاب یا سبق ناظم تعلیمات یا مہتمم کی اجازت کے بغیر شروع نہیں کرایا جا سکتا اور نہ کسی طالب علم کا

شروع کیا ہوا سبق چھڑایا جاسکتا ہے۔ (ص،۱۱،۱۲)

(۲) جو طالب علم بلا عذر کسی سبق میں شریک نہ ہو تو اس کو ایک دو دفعہ تنبیہ کرنے کے بعد ناظم تعلیمات کے سامنے پیش کرنا ہوگا۔ (ص،۱۲)

(۳) مدرسہ کا وقت برائے مدرسین حضرات اور ناظم اور مفتی چھ گھنٹے ہوگا، بجز صدر مدرس کے کہ ان کے لیے چار گھنٹے ہوگا۔ (ص ۱۲)

(۴) اہم فتاوٰی میں (مفتی کے لیے) صدر مدرس، مہتمم یا کسی اور عالم سے اگر ضرور ہو تو مشورہ ضروری ہوگا۔

(۵) نصاب تعلیم کے بارہ میں مناسب ہوگا کہ اس پر غور کرنے کے لیے ایک کمیٹی مقرر ہو جس کے رکن مدرسہ کے ناظم تعلیمات صدر المدرسین، مہتمم، ناظم اور مدرسین حضرات ہوں اور ان کے علاوہ بھی اگر کوئی شخص مناسب و موزوں ہو تو وہ بھی اس کا رکن ہو سکے گا۔ (ص،۳۲)

بحمد اللہ تعالیٰ یہ تمام فرائض حضرت شیخؒ ۲۰۰۱ء تک انجام دیتے رہے۔ اتنے مصروف ترین انسان کا مدرسہ نصرۃ العلوم کے لیے مسلسل چھیالیس سال تک ان امور کو انجام دینا یقیناً ان کی کرامت ہی ہے۔ آپ کی صدارت تدریس کے زمانہ میں مدرسہ نصرۃ العلوم نے ترقی کی وہ گھاٹیاں عبور کی ہیں جنہیں آنے والا مؤرخ سنہری حروف سے لکھتے ہوئے انہیں خراج عقیدت پیش کرنے پر اپنے آپ کو مجبور پائے گا۔

حضرت کا یہ خاصا تھا کہ وہ اپنی ذمہ داری کو اپنے ذاتی امور سے بھی زیادہ اہمیت دیتے تھے اور بڑی مستعدی سے اسے انجام تک پہنچاتے تھے۔ اس بات کا اندازہ ان تحریرات سے بخوبی لگایا جا سکتا ہے جو احقر کے پاس ابھی تک محفوظ ہیں۔ احقر کو حضرت شیخؒ کے ساتھ دس سال سے زیادہ عرصہ مدرسہ کے اہتمام کی ذمہ داری انجام دینے کی سعادت عظمیٰ حاصل ہوئی ہے۔ وہ میرے تایا، استاد، شیخ اور مربی بھی تھے۔ میں ان کے اکثر بچوں سے بھی عمر میں چھوٹا ہوں۔ میرے سر پر ۱۹۹۱ء میں اہتمام کی دستار بھی انہوں نے ہی جامع مسجد نور میں خطبہ جمعہ کے موقع پر رکھی تھی، لیکن ان کی ذمہ داری کے بارے میں عرض کرتا ہوں کہ ایک مرتبہ مدرسہ کے طلبہ نے انہیں بحیثیت صدر مدرس و ناظم تعلیمات ایک درخواست دی کہ:

"بخدمت جناب شیخ الحدیث صاحب دامت برکاتہم العالیہ

السلام علیکم

مؤدبانہ گزارش ہے کہ جملہ کلاس درجہ موقوف علیہ کی مشکوٰۃ شریف جلد ثانی حضرت .... صاحب کے پاس ہے۔ حضرت استاد محترم صحیح نہیں پڑھاتے جو کہ بالکل سمجھ نہیں آتی، لہٰذا بذریعہ درخواست اپیل ہے کہ مشکوٰۃ ثانی کے بارے میں کچھ حل نکالا جائے۔ جناب کی عین نوازش ہوگی۔"

منجانب جملہ طلبہ درجہ موقوف علیہ

حضرت شیخؒ نے اس درخواست کے نیچے یہ تحریر لکھ کر دفتر اہتمام میں جمع کرائی، آپؒ نے لکھا:

"یہ درخواست مجھے ملی اور میں نے طرفین کو واضح تنبیہ کر دی ہے۔"

ابو الزاہد محمد سرفراز، ۹ ربیع الثانی ۱۴۱۷ھ / ۲۵ راگست ۱۹۹۶ء

حضرت مدنیؒ کے بارے میں سنا تھا کہ قاری محمد طیبؒ کو انہوں نے اپنی گود میں کھلایا تھا، لیکن جب وہ دارالعلوم دیوبند کے مہتمم بنے تو حضرت مدنیؒ ان کی اتنی تعظیم فرماتے تھے کہ جب قاری صاحبؒ آتے تو حضرت مدنیؒ اٹھ کر کھڑے ہو جاتے۔ اس کا عملی نمونہ میں نے حضرات شیخین کریمینؒ کے سلوک میں پایا۔ بسا اوقات وہ اتنی عزت دیتے کہ میرے ماتھے پر پسینہ آجاتا۔ مجھے وہ وقت کبھی نہیں بھول سکتا جب دفتر اہتمام میں مدرسہ کے اساتذہ کرام کی میٹنگ تھی اور ان میں سے سب سے کم عمر میں تھا۔ بعض طلبہ کے امتحانات میں عدم شرکت اور غیر حاضری کی بناء پر انہیں سالانہ امتحان میں شریک کرنے اور اجرائے اسناد کا مسئلہ زیر بحث تھا۔ تمام اساتذہ نے اپنی اپنی رائے کا اظہار فرمایا۔ آخر میں احقر نے بھی اپنی رائے کا اظہار کیا تو حضرت شیخؒ فوراً متوجہ ہوئے اور فرمایا، فیاض ٹھیک کہہ رہا ہے۔ اس کی بات قابل لحاظ اور قابل غور ہے، چنانچہ اسی کے مطابق پالیسی طے ہوئی۔

حضرت شیخؒ میرے ساتھ دل لگی بھی فرمایا کرتے تھے اور اسی ضمن میں وہ مدرسہ کے حالات بھی معلوم کر لیتے تھے۔ خصوصاً جب عید کی چھٹیوں کے بعد تعلیم شروع ہوتی تو سبق پڑھانے کے بعد دفتر اہتمام کے سامنے کھڑے ہو کر پنجابی میں مجھے مخاطب فرماتے، "کنیاں چماں کھچیاں نیں، ایس صندوکڑی وچ کنے پیسے اکٹھے کیتے نیں" (قربانی کی کتنی کھالیں جمع کی ہیں، اس ڈیسک میں کتنے پیسے اکٹھے کیے ہیں؟) احقر انہیں تفصیل بتاتا کہ اتنی کھالیں جمع ہوئی ہیں، اتنی رقم ہوئی ہے اور ساتھ یہ بھی کہتا کہ آپ دعا فرماتے رہیں، اللہ فضل فرمائے گا تو آپؒ مسکراتے ہوئے چلے جاتے۔

بحیثیت صدر مدرس اساتذہ کی میٹنگ میں وہ اکثر اساتذہ کرام کو اس طرح سمجھایا کرتے تھے کہ "بھائی! طالب علم کو خود کچھ آتا ہے یا نہیں، لیکن اسے اتنا ضرور پتہ چلتا ہے کہ استاد کو آتا ہے یا نہیں آتا، اس لئے مطالعہ کے بغیر کبھی سبق نہیں پڑھانا چاہیے، میں نے زندگی میں کبھی بغیر مطالعہ کے سبق نہیں پڑھایا۔" بحیثیت صدر مدرس تمام طلبہ مدرسہ کی جنرل حاضری صبح ترجمہ کی کلاس کے بعد خود ہی لگاتے تھے۔ اس ضمن میں بسا اوقات بڑے بڑے لطائف بھی رونما ہوتے۔ تین دن بغیر اہتمام کی منظوری کے اگر کوئی طالب علم چھٹی کرتا تو آپ باضابطہ اس کا نام کاٹ دیتے، چنانچہ طلبہ کو حاضری کی بے حد فکر ہوتی تھی۔ ایک مرتبہ ایک طالب علم کا نام بولا گیا، وہ لیٹ تھا، اس نے مدرسہ کے گیٹ کے پاس سے ہی لبیک کی صدا بلند کی تو حضرت مسکرانے لگے۔ ایک طالب علم اپنے نام کے ساتھ ہر سال اضافہ کرتا جا رہا تھا۔ پہلے سال محمد عرفان، دوسرے سال حافظ محمد عرفان، تیسرے سال حافظ قاری سید محمد عرفان شاہ۔ آپ نے فرمایا، کچھ عرصہ کے بعد رجسٹر کا ایک صفحہ صرف تیرے نام کے لیے مخصوص کرنا پڑے گا۔ ایک طالب علم کی آپؒ نے حاضری لگائی، نعم العبد۔ وہ متوجہ نہیں تھا، اچانک اس نے لبیک کے بجائے زندہ باد کا نعرہ لگا دیا اور ساری مجلس کشت زعفران بن گئی۔ حضرت نے اس کا نام تبدیل کر کے عبید اللہ رکھ دیا۔ آپؒ کی عادت تھی کہ اگر کسی کا نام صحیح نہ ہوتا تو اس کا نام تبدیل فرما دیتے تھے، اس کی بیسیوں مثالیں موجود ہیں، خود ہماری دورہ حدیث کی کلاس میں ایک طالب علم کا نام غفور الرحمٰن تھا جو آپؒ نے تبدیل کر کے مغفور الرحمٰن رکھ دیا، مدرسہ کے فاضل و استاد مولانا نیامت علی کا نام نعمت اللہ رکھا، ایک مرتبہ آپؒ تیزی سے حاضری لگا رہے تھے۔ علی پور ضلع گوجرانوالہ کے ایک طالب علم اسلام الدین کا نام آیا تو آپؒ کے منہ سے یوں ادا ہوا: "اسلام آباد گوجرانوالہ"۔ اس پر کافی دیر آپؒ اور طلبہ ہنستے رہے۔

آپ طلبہ کی چھٹیوں کے بارے میں بڑے حساس تھے۔ان کی کوشش ہوتی تھی کہ جیسے میں چھٹی نہیں کرتا، اسی طرح طلبہ بھی چھٹی کم سے کم کریں۔ایک بار بڑا عجیب لطیفہ ہوا۔عیدالاضحیٰ کی تعطیلات کے سلسلے میں طلبہ کا نظریہ تھا کہ سوموار کے دن سبق پڑھا کر شیخ صاحبؒ چھٹیوں کا اعلان فرمادیں، چنانچہ انہوں نے درخواست دی کہ آج آپ چھٹیوں کا مژدہ سنائیں، لیکن شیخؒ چاہتے تھے کہ جمعرات کو اسباق کے بعد چھٹیاں ہوں۔طلبہ کو مایوسی ہوئی اور انہوں نے مہتمم صاحب کو درخواست دی تو حضرت صوفی صاحبؒ نے چھٹی کا اعلان فرمادیا۔اگلے دن جب شیخؒ تشریف لائے اور انہیں اس بات کا پتہ چلا تو ترجمہ وتفسیر کا سبق پڑھانے کے بعد جو چند طلبہ موجود تھے، ان میں احقر بھی موجود تھا، آپؒ نے مسکراتے ہوئے یہ اعلان فرمایا کہ ''بھائی میں بوڑھا ہوں، صوفی جوان ہے، اس نے مجھے ڈھالیا ہے، چلو موج کرو''۔ چنانچہ چھٹیوں کا اعلان فرمادیا۔

آپؒ طلبہ کرام کو اپنی ذاتی جیب سے انعام بھی عنایت فرماتے تھے۔کئی مرتبہ امتحانات کے بعد انہوں نے طلبہ کو اپنی کتب اور نقد رقم بھی انعام میں دی جن میں بندہ فقیر بھی شامل ہے۔کئی امتحانات میں پوزیشن حاصل کرنے پر انہوں نے مجھے خصوصی انعام سے نوازا۔میرے لیے سب سے اہم ان کا وہ انعام ہے جو انہوں نے وفاق المدارس العربیہ پاکستان کے سالانہ امتحان میں دورہ حدیث شریف کی پوری کلاس میں اول آنے پر مجھے دیا تھا۔ایک جوڑا، جرسی، رومال، ٹوپی، خوشبو اور نقدی۔وکفٰی بذالك فخراً۔

شیخ الحدیث: ۱۹۶۰ء میں آپؒ شیخ الحدیث کے منصب پر فائز ہوئے۔مدرسہ کے اجرائے اسناد کے رجسٹر کے ریکارڈ کے مطابق جن طلبہ نے آپؒ سے پہلے سال دورہ حدیث شریف کی تکمیل کی، انہیں ۱۹۶۱ میں اسناد جاری ہوئیں۔یوں آپؒ نے ۲۰۰۱ء تک مسلسل چالیس سال دورہ حدیث کے طلبہ کرام کو پڑھایا۔آپ کا معمول یہ تھا کہ سب سے پہلے ترجمہ وتفسیر قرآن کریم پندرہ پندرہ پارے ہر سال پڑھاتے۔یوں دو سال میں ترجمہ وتفسیر مکمل ہوتی۔یہ سلسلہ ۲۰۰۱ء تک مسلسل جاری رہا۔شروع میں آپ بخاری شریف کی دونوں جلدیں خود ہی پڑھاتے تھے، پھر ۱۹۸۰ء کے بعد ایک جلد چھوڑ دی اور صرف پہلی جلد پڑھانے لگے۔یہ سلسلہ بھی ۲۰۰۱ء تک جاری رہا۔آخری بار آپ نے بخاری شریف جلد ثانی پڑھائی اور دوران تدریس ہی علیل ہو گئے۔ترمذی شریف جلد اول ابواب البیوع تک پڑھانے کا معمول تھا۔۱۹۹۰ء کے بعد آپؒ نے علالت کے باعث ترمذی شریف چھوڑ دی تھی۔ابتدائی دور میں آپؒ ان کے ساتھ دورہ حدیث کی دیگر کتابیں بھی پڑھاتے رہے، بلکہ نچلے درجوں کی کتابیں بھی زیر تدریس رہیں، مثلاً نور الایضاح، ہدایۃ النحو، شرح العقائد، شرح نخبۃ الفکر، ہدایہ، سراجی وغیرہ۔احقر کو بھی آپؒ سے نور الایضاح، ترمذی شریف، بخاری شریف اور ترجمہ وتفسیر قرآن مکمل پڑھنے کی سعادت حاصل ہوئی ہے۔

آپؒ سہ ماہی اور ششماہی تحریری وتقریری امتحان بھی لیتے تھے۔آپؒ کا امتحان تحریری طور پر اتنا دشوار نہ ہوتا تھا جتنا کہ تقریری۔آپؒ کے رعب ودبدبہ سے بعض طلبہ امتحان دیتے ہوئے کانپتے اور پسینے سے شرابور ہو جاتے۔اہل علم کے ہاں آپؒ کے امتحان کے بارے میں یہ شہرت تھی کہ آپؒ سے کوئی سو نمبر حاصل نہیں کر سکتا۔احقر بطور تحدیث نعمت عرض کرتا ہے کہ علم نحو جیسے مشکل اور دقیق فن میں حضرت شیخؒ سے امتحان میں مکمل سو نمبر حاصل کرنے کی بندہ حقیر کو سعادت عظمیٰ حاصل ہوئی ہے جسے میں نے بطور فخر کے اس وقت اپنی نحو کی کاپی پر درج کیا تھا اور مدرسہ کے امتحانی ریکارڈ میں بھی موجود ہے۔

جب ہم ان سے نور الایضاح پڑھا کرتے تھے تو ہمارا سبق دورہ حدیث والوں کے سبق کے بعد ہوا کرتا تھا۔آپؒ روزانہ

ہم سے سبق سنا کرتے تھے اور ہر جمعرات کو ایک ہفتہ میں جو پڑھا ہوتا، وہ سنتے۔انہوں نے ہمیں ''زلۃ القاری'' کا باب بھی پڑھا دیا تھا جو اس دور میں عموماً اساتذہ کرام مشکل ہونے کی وجہ سے ترک کر دیتے تھے۔ہمارے ننھے منے ذہنوں میں انہوں نے اسی دور میں ایسی باتیں ڈال دی تھیں جو آج تک اسی طرح یاد ہیں۔ مثلاً حیلہ کے مسئلہ میں انہوں نے اس وقت یہ حوالہ دیا تھا کہ امام ابو یوسفؒ نے کتاب الخراج ص ۸۰ میں اس کی تردید کی ہے۔اور اذان مغرب کے بعد درود شریف، دعائے وسیلہ اور یہ دعا انہوں نے ہمیں اسی وقت یاد کرادی تھی: ''اللّٰھم ھذا اقبال لیلك وادبار نھارك واصوات دعاتك فاغفرلی''۔ یہ دعا اسی وقت سے بندہ کے معمولات میں ہے اور گزشتہ تیس سال میں اسے کبھی ترک نہیں کیا جو یقیناً حضرت شیخؒ کے لیے صدقہ جاریہ ہے۔

حدیث پڑھاتے ہوئے آپؒ بہت سے مقامات پر بخاری شریف کا حاشیہ بھی حل کرا دیتے تھے۔آپ کا سبق شروع سے آخر سال تک بالکل متوازن رہتا تھا۔صفحات میں کمی بیشی نہ ہوتی تھی۔ترمذی شریف آپؒ کاپی کے ساتھ پڑھاتے تھے جو اب ''خزائن السنن'' کے نام سے طبع ہو گئی ہے۔تدریس میں آپ کو بے حد کمال حاصل تھا۔ایک بار انہوں نے بخاری شریف کے سبق میں یہ واقعہ سنایا کہ مجھ سے ایک غیر مقلد ہدایہ پڑھا کرتا تھا۔وہ ایک دن مجھے کہنے لگا، استاد جی جیسے آپ کو ہدایہ آتا ہے، اگر مجھے ایسا آتا ہوتو میں مجتہد ہونے کا دعویٰ کر دوں۔میں نے اسے کہا، اللہ گنجے کو ناخن نہ دے کہ وہ خارش کر کر کے اپنا ہی سر زخمی کر لے گا''۔

آپ بخاری شریف کے سبق میں اکثر فرمایا کرتے تھے کہ بسا اوقات کسی مسئلہ میں میرے ذہن کے اندر ایسے ایسے دلائل آتے ہیں جن کو ذہن بھی قبول کرتا ہے، لیکن جب میں دیکھتا ہوں کہ ہمارے اکابر کی تحریرات میں وہ نہیں ہیں تو میں بھی ان کو ترک کر دیتا ہوں۔آپؒ کی یہ نصیحت تو ہر خاص وعام ہی جانتا ہے کہ ''اکابر کا دامن کبھی نہ چھوڑنا''۔وہ یہ بھی فرمایا کرتے تھے کہ ہمارے اکابر نے کوئی ایسا موضوع نہیں چھوڑا جس پر انہوں نے کچھ نہ کچھ لکھا نہ ہو۔فرمایا کہ ایک مسئلہ میں، میں بڑا متردد تھا، کہیں سے مل نہیں رہا تھا۔اچانک حضرت تھانویؒ کے ملفوظات دیکھتے ہوئے مل گیا۔اسی لیے فرمایا کرتے تھے کہ ہمیں کسی اور طرف دیکھنے کی ضرورت ہی نہیں، ہمارے لیے ہمارے اکابر ہی کافی ہیں۔

آپؒ طلبہ کے ساتھ اسباق میں دل لگی بھی فرماتے تھے جو بظاہر مزاح ہوتا، لیکن حقیقت میں اس کے اندر کوئی نہ کوئی نصیحت ہوتی۔ایک بار بخاری شریف کی عبارت پڑھتے ہوئے ایک طالب علم بار بار غلطی کر رہا تھا۔آپؒ کی عادت مبارکہ تھی کہ عبارت کی کوئی غلطی جانے نہیں دیتے تھے۔غلطیوں کی جب کثرت ہوئی تو آپؒ نے تنگ آ کر اسے مزاح کے انداز میں نصیحت فرمادی کہ ''مولانا معلوم ہوتا ہے آج حلوہ نہیں کھایا'' یعنی آج عبارت کی تیاری نہیں کی۔ساری کلاس ہنسنے لگی اور وہ طالب علم خجالت سے سر جھکا کر بیٹھ گیا۔

آپؒ طلبہ کو علم میں پختگی اور مطالعہ کا شوق دلاتے ہوئے عموماً فرمایا کرتے تھے کہ ''علم ایک سیال چیز ہے، جامد نہیں ہے۔اس میں جتنا انہماک رکھو گے، وسعت پیدا ہوتی چلی جائے گی'' اور پھر اس پر ایک عربی پنجابی مکس جملہ ارشاد فرماتے جو مزاح بھی ہوتا اور نصیحت بھی، کہ 'العلم چھچھڑۃ فکھچوھا' علم ایک چھچھڑے کی طرح ہے۔اسے کھینچتے چلے جاؤ، جتنا اسے کھینچو گے، اتنا ہی علم بھی بڑھتا چلا جائے گا۔

صدر مفتی: مدرسہ نصرۃ العلوم کے دارالافتاء میں ابتداءً آپؒ فتاویٰ بھی لکھتے رہے اور دیگر فتاویٰ کی تصدیق ''الجواب صحیح'' کے ساتھ بھی فرماتے رہے۔ ان فتاویٰ کی تعداد بے شمار ہے، البتہ ابتدائی دور میں فتاویٰ لکھ کر بھیج دیے جاتے تھے اور نقل محفوظ رکھنے کا خاص انتظام نہ تھا، تاہم پھر بھی کچھ فتاویٰ جات آپؒ کے ہاتھ سے لکھے ہوئے ریکارڈ میں محفوظ ہیں۔ بطور تبرک کے آپؒ کے ہاتھ کے لکھے ہوئے دو تائیدی فتاویٰ یہاں نقل کیے جاتے ہیں جن سے آپؒ کے فتاویٰ نویسی کا اسلوب بھی نمایاں ہوگا۔

(۱) بنک کی طرف سے زکوٰۃ کی کٹوتی اور اس کے مصارف کے متعلق ایک استفتاء کا جواب لکھتے ہیں۔

''مبسملاً ومحمداً ومصلیاً۔ امابعد! زکوٰۃ اسلام کے ارکان میں سے ایک رکن اور عبادت ہے، اس کے لیے شریعت میں وجوب، اداء اور مالک کی نیت اور مرضی اور مصارف وغیرہا کی کئی شرطیں ہیں، جب تک وہ پوری نہ ہوں، مکلّف کا ذمہ فارغ نہیں ہوسکتا۔ مثلاً حولان حول کی شرط اور مالک کی رضا وغیرہ کو نظر انداز کر دیا جائے یا زکوٰۃ کی رقم سے نالیاں، سڑکیں اور ہسپتال کی عمارتیں تعمیر ہونے لگیں وغیرہ وغیرہ تو زکوٰۃ کیسے ادا ہوگی؟ اس سلسلہ میں ہم نے اپنی قدرے تفصیلی رائے علماء کراچی وعلماء کلاچی کو باحوالہ عرض کر دی ہے۔ اموال ظاہرہ وباطنہ کی جو فقہی تعریف، تفسیر اور حکم حضرت مولانا مفتی محمد عبدالستار خان صاحب دام مجدہم نے باحوالہ نقل کیا ہے، راقم اثیم اس سے کلی اتفاق کرتا ہے اور موضوع سے غیر متعلق حوالوں کی بھرمار سے فضول بھرتی کرنے والوں کے دلائل بلکہ شبہات سے مطمئن نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ حضرت مفتی صاحب دام مجدہم کو جزائے خیر مرحمت فرمائے کہ انہوں نے فرض کفایہ ادا کر دیا ہے۔ واللہ الہادی والموفق۔ واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب۔

احقر ابوالزاہد محمد سرفراز خطیب جامع مسجد گکھڑ

وصدر مدرس مدرسہ نصرۃ العلوم گوجرانوالہ

۱۹ ربیع الثانی ۱۴۰۴ھ / ۲۴ جنوری ۱۹۸۴ء''

(۲) عذاب وثواب قبر کے بارے میں ایک استفتاء کا جواب تحریر فرماتے ہیں:

''مبسملاً و محمدلاً و مسلما ، امابعد! ثواب وعذاب قبر احادیث متواترہ اور اتفاق امت سے ثابت ہے۔ تواتر کے انکار سے کفر لازم آتا ہے اور جمہور سلفؒ وخلفؒ کی تحقیق سے ثواب وعذاب جسم عنصری اور روح دونوں کی مشارکت سے ہوتا ہے، گو جسم ریزہ ریزہ ہی کیوں نہ ہو جائے۔ جو لوگ ثواب وعذاب قبر صرف روح سے متعلق مانتے ہیں یا جسم مثالی سے تسلیم کرتے ہیں، وہ نصوص قطعیہ، احادیث صحیحہ اور اتفاق امت کی تصریحات کے منکر ہیں۔ کسی صحیح حدیث، کتاب فقہ وعقائد سے ثواب وعذاب کے سلسلہ میں جسم مثالی کا ثبوت نہیں ہے۔ ویسے اجسام مثالیہ کا کوئی منکر نہیں اور جو بعض صوفیاء کرامؒ جسم مثالی کا تذکرہ کرتے ہیں تو وہ جسم عنصری کا ذکر بھی کرتے ہیں، جیسا کہ ''تسکین الصدور'' میں اس پر بحث موجود ہے۔ حضرت مولانا مفتی محمد عبدالشکور صاحب دام مجدہم، نائب مفتی دارالافتاء مدرسہ نصرۃ العلوم گوجرانوالہ کا فتویٰ بجا ہے جو انہوں نے حضرت مولانا مفتی سید عبدالشکور صاحب ترمذی دام مجدہم کی تائید میں لکھا ہے۔ واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب۔

احقر ابوالزاہد محمد سرفراز

صدر مدرس مدرسہ نصرۃ العلوم گوجرانوالہ

۶ رجب ۱۴۰۷ھ / ۷ مارچ ۱۹۸۷ء''

ان کے علاوہ رؤیت ہلال کے بارے میں آپؒ کا تفصیلی فتویٰ، عورت کی سربراہی کے متعلق تفصیلی فتویٰ، حیاۃ النبی صلی اللہ علیہ وسلم، عقائد ورسومات اور دیگر مسائل کے بارے میں بھی آپؒ کے اپنے ہاتھ سے لکھے ہوئے چند فتاویٰ دارالافتاء مدرسہ نصرۃ العلوم کے ریکارڈ میں محفوظ ہیں۔

شیخ التفسیر: شیخ التفسیر کے حوالہ سے مدرسہ نصرۃ العلوم میں آپؒ نے دو طرح کی خدمات انجام دیں۔

(۱) ۱۹۵۸ء سے آپؒ نے ترجمہ وتفسیر قرآن کریم کا آغاز فرمایا۔ گکھڑ سے آتے ہی پہلے ترجمہ وتفسیر کا سبق ہوتا جس میں کافیہ سے اوپر کے تمام درجوں کے لیے مدرسہ کی طرف سے شرکت ضروری تھی اور باقی درجوں کے لیے اعزازی تھی، تاہم تمام طلبہ کرام ہی اس ترجمہ وتفسیر میں شریک ہوتے تھے کیونکہ اس کے متصل بعد شیخؒ مدرسہ کے تمام طلبہ کی جنرل حاضری لیتے تھے اور پھر اسباق کا آغاز ہوتا تھا۔ یہ سلسلہ بحمد اللہ اب بھی اسی طرح چل رہا ہے۔ اس ترجمہ وتفسیر کا طریقہ کار یہ تھا کہ پینتالیس منٹ کا پیریڈ ہوتا جسمیں پندرہ پندرہ پارے ایک ایک سال میں پڑھائے جاتے اور دو سال میں یہ ترجمہ وتفسیر مکمل ہوتا۔ یوں اگر کوئی طالب علم مدرسہ نصرۃ العلوم میں آٹھ سال مکمل تعلیم حاصل کرتا تو اسے چار بار ترجمہ وتفسیر قرآن کریم مکمل پڑھنے کی سعادت حاصل ہو جاتی۔ اس درس میں چونکہ روزانہ ایک آدھ رکوع ہی پڑھایا جاتا اس لیے حضرت شیخؒ بڑی تفصیل سے بیان فرماتے۔ اس نوعیت کا ترجمہ وتفسیر یہ صرف مدرسہ نصرۃ العلوم ہی کا طرۂ امتیاز ہے کہ اسے باقاعدہ نصاب تعلیم میں داخل کر کے اتنی اہمیت کے ساتھ علیحدہ طور پر پڑھایا جاتا ہے وگرنہ دیگر مدارس میں صرف وفاق المدارس العربیہ پاکستان کے نصاب تعلیم میں جو ترجمہ وتفسیر شامل ہے اسی پر اکتفا کیا جاتا ہے۔ حضرت شیخؒ نے باوجود علالت وضعف کے ۲۰۰۱ء تک مسلسل بیالیس سال یہ خدمت انجام دی۔

(۲) تفسیر قرآن کے حوالے سے آپؒ کی دوسری بڑی خدمت مدرسہ نصرۃ العلوم میں دورۂ تفسیر قرآن کریم کی ہے۔ ۱۹۷۵ء میں مدرسہ نصرۃ العلوم جامع مسجد نور میں کل پاکستان نظام شریعت کانفرنس تین دن منعقد ہوئی جس میں تمام اکابرین نے شرکت کی اور پاکستان کے مختلف اطراف سے ہزاروں کارکنوں نے بھی اس میں شرکت کی۔ اس وقت پیپلز پارٹی کی حکومت تھی، جسے یہ برداشت نہ ہوا اور محکمہ اوقاف کی طرف سے مدرسہ ومسجد کو سرکاری تحویل میں لینے کا نوٹیفیکیشن جاری ہوگیا، جس کے بعد ایک تحریک جامع مسجد نور کے نام سے چلی۔ جس کی تفصیلات احقر کی کتاب ''تحریک جامع مسجد نور'' میں دیکھی جا سکتی ہیں، جب سرکاری قبضہ کے لیے نوٹس جاری ہوا تو اس کے بعد مدرسہ کی سالانہ تعطیلات آگئیں اور مدرسہ طلبہ سے خالی ہو گیا، تو بزرگوں کی مشاورت سے یہ بات طے ہوئی کہ چھٹیوں میں مدرسہ کو خالی نہیں چھوڑنا چاہیے۔ چنانچہ ۱۹۷۶ء میں ہنگامی طور پر دورۂ تفسیر قرآن کا اعلان کر دیا گیا۔ اس کے لیے وقت یکم شعبان سے ۲۵ رمضان المبارک طے ہوا اور تفسیر قرآن پڑھانے کی ذمہ داری بھی حضرت شیخؒ کے لیے طے ہوئی اور یوں تعطیلات میں دورۂ تفسیر قرآن کریم عبوری دور کے لیے شروع ہوگیا، جو بعد ازاں ۱۹۹۶ء تک مسلسل بیس سال جاری رہا۔ اس میں حضرت شیخؒ صبح گکھڑ سے تشریف لاتے اور مسلسل ایک ہی

نشست میں پانچ سے چھ گھنٹے قرآن کریم کی تفسیر پڑھاتے ۔یوں روزانہ پون پارہ ایک پارہ سواپارہ سبق ہوتا۔ یہ دورۂ تفسیر چونکہ محدود وقت میں ہوتا تھا، اس لیے اس میں وہ تفصیلات بیان نہ ہوسکتیں جو دوران سال حضرت شیخؒ بیان فرماتے تھے۔ تاہم اس دورۂ تفسیر سے بھی ہزاروں علماء وطلبہ نے استفادہ کیا۔ یہ سلسلہ ابتداء تو ہنگامی حالات سے نمٹنے کے لیے شروع ہوا تھا،لیکن بعدازاں اس کو جاری رکھنے کی وجہ یہ تھی کہ تفسیر قرآن کریم اور حدیث کے حوالے سے حضرت شیخؒ جیسی عالی سند کا کوئی مفسر و محدث پاکستان میں موجود نہ تھا۔ چنانچہ اس تبرک کے لئے بعدازاں بھی یہ سلسلہ جاری رہااور پھر جب انہوں نے ضعف کی وجہ سے ۱۹۹۷ء کی تعطیلات میں دورۂ تفسیر پڑھانے سے معذوری کا اظہار فرمایا تو یہ سلسلہ منقطع ہوگیا۔

حضرت شیخؒ نے جولائی ۱۹۹۵ء میں جنوبی افریقہ کا دورہ کیا وہاں ایک جگہ خطاب فرماتے ہوئے انہوں نے اپنی عالی سند کا اظہار یوں فرمایا:

’’میری حدیث شریف کی دو سندیں ہیں۔ایک تو دارالعلوم دیوبند کے اساتذہ کرام کے واسطے سے .... دوسری سند حضرت مولانا حسین علیؒ کے واسطے سے ہے جو کہ بہت اونچی سند ہے۔ حضرت مولانا حسین علیؒ نے حدیث شریف کی تعلیم فقیہ ملت حضرت مولانا مفتی رشید احمد گنگوہیؒ سے حاصل کی اور تفسیر قرآن کریم کی تعلیم بانی مدرسہ مظاہر علوم سہارنپور حضرت مولانا محمد مظہر نانوتویؒ سے حاصل کی۔ اس طرح دارالعلوم دیوبند اور مدرسہ مظاہر علوم سہارنپور دونوں کے بانی سے فیض یافتہ تھے۔اس سند کے اعتبار سے میرے اور حضرت گنگوہیؒ کے درمیان صرف ایک واسطہ ہے۔اور غالباً اس وقت برصغیر پاک و ہند اور اساتذہ دیوبند میں شاید ہی کوئی شخص ایسا ہو جس کی سند میں حضرت گنگوہیؒ اور اس کے درمیان صرف ایک واسطہ ہو۔ (ماہنامہ نصرۃ العلوم، اپریل ۱۹۹۶ء ص ۵،۶)

مصنف: آپؒ کے اشہب قلم سے تقریباً پچاس سے زائد ہر موضوع پر کتب منصۂ شہود پر آئی ہیں۔جن میں سے چند کتب آپؒ نے مدرسہ نصرۃ العلوم کے شعبہ تدریس سے منسلک ہونے سے قبل تحریر فرمائی تھیں اور اکثر کتب آپؒ نے اسی دورانیہ میں لکھی ہیں اور پھر آپؒ کی اکثر کتب ادارہ نشرواشاعت مدرسہ نصرۃ العلوم کو ابتدائی ایڈیشن شائع کرنے کی سعادت عظمیٰ حاصل ہوئی۔ چند کتب انجمن اسلامیہ گکھڑ نے بھی شائع کی ہیں۔۱۹۹۲ء تک آپؒ کی اکثر کتب ادارہ نشرواشاعت مدرسہ نصرۃ العلوم سے ہی شائع ہوتی رہیں، پھر آپؒ نے اپنا ذاتی مکتبہ صفدریہ قائم فرمایا بعدازاں اس سے ساری کتابیں طبع ہوتی رہیں۔اس لیے جیسے یہ لکھنا غلط نہیں کہ آپؒ کی اکثر کتب کو ابتداءً ادارہ نشرواشاعت مدرسہ نصرۃ العلوم کو متعارف کرایا تو یہ لکھنا بھی بجا ہے کہ آپؒ کی تصنیفات ہی کی وجہ سے ’’ادارہ نشرواشاعت مدرسہ نصرۃ العلوم‘‘ نے طبع کرا کے پورے عالم میں شہرت حاصل ہوئی ہے۔

آپؒ کس پائے کے مصنف ہیں، مناسب معلوم ہوتا ہے کہ یہاں دارالعلوم دیوبند کے صدر مفتی حضرت مولانا سید مہدی حسنؒ کی تحریر کا ایک اقتباس نقل کیا جائے جو انہوں نے آپؒ کی کتاب راہ سنت پر بطور تقریظ کے تحریر فرمایا:

’’میں نے المنہاج الواضح یعنی راہ سنت، مؤلفہ محترم مولانا ابوالزاہد محمد سرفراز خان صاحب صفدر، اطال اللہ بقاءہ کو پڑھا، زبان شستہ وصاف، لہجہ دل آویز، جدال ورنگ مناظرانہ سے دور اور مضامین کی جامع کتاب ہے، بدعات کے سلسلہ کی اپنے رنگ کی یہ پہلی کتاب ہے، جس میں بدعات کا رد نئے اسلوب سے کیا گیا ہے اور اتباع

سنت کو بطریق احسن ثابت کیا گیا ہے۔‘‘ (تقریظ راہ سنت، ص ۱)

مہتمم دارالعلوم دیوبند حضرت مولانا قاری محمد طیبؒ آپؒ کے انداز تحریر کے متعلق لکھتے ہیں:

’’مصنف کی اور دوسری لطیف تصانیف بھی جہاں تک نظر سے گزریں، محققانہ، منصفانہ، اور متین اندازِ بیان کی حامل ہیں جو سنت و بدعت اور دین وغیر دین کی تفریق کے سلسلہ میں مجادلہ وجدال کی دعوت نہیں دیتیں بلکہ شرح صدر، قوت یقین اور عمل میں طمانیت وقناعت کی طرف لے آتی ہیں۔ یہ اسم بامسمّٰی کتاب ’’راہ سنت‘‘ بھی حقیقتاً راہ سنت کی داعی ہے۔‘‘ (تقریظ راہ سنت ص ز)

آپؒ ایک ایسے مصنف تھے کہ معاصر تو کجا اکابر بلکہ آپؒ کے اساتذہ کرامؒ کی تائید واعتماد بھی آپ کی تحریر کو حاصل تھا۔ آپؒ کے اساتذہ میں سے شیخ العرب والعجم حضرت مولانا سید حسین احمد مدنیؒ اور مفتی اعظم پاکستان حضرت مولانا مفتی محمد شفیع دیوبندیؒ کی تقریظات وتصدیقات بھی آپؒ کی کتب پر موجود ہیں۔اگر آپؒ کی کتب پر لکھی ہوئی تقریظات کو علیحدہ کیا جائے تو ایک مستقل رسالہ منصۂ شہود پر آسکتا ہے۔

نومبر ۱۹۹۵ء میں جب ماہنامہ نصرۃ العلوم کا آغاز ہوا تو احقر کی فرمائش پر آپؒ نے اس کا سب سے پہلا مضمون لکھا، جو ’’دعوت الی اللہ کی ضرورت واہمیت اور چند اصول‘‘ کے عنوان سے اس کے پہلے شمارے میں طبع ہوا۔ یہ اس قدر اہم مضمون ہے کہ ہر مسلمان کو عموماً اور اہل علم کو خصوصاً اس کا مطالعہ کرنا چاہیے۔ پھر ۱۹۹۶ء میں احقر نے دوبارہ حضرتؒ سے کسی بھی موضوع پر مضمون لکھنے کی فرمائش کی تو آپؒ نے باوجود علالت وضعف کے ایک شاندار اور مفصل مضمون بعنوان ’’بعض اشراط الساعۃ‘‘ (قیامت کی کچھ نشانیاں) تحریر فرمایا، جو ماہنامہ نصرۃ العلوم جلد اول شمارہ ۱۰ میں شائع ہوا۔ اس مضمون کے متعلق حضرتؒ نے میرے نام ایک خط بھی لکھا جو درج ذیل ہے:

باسمہ سبحانہ

من ابی الزاہد

الیٰ عزیز القدر! عزیزم محمد فیاض سلمہ اللہ تعالیٰ

ہدیہ مسنونہ کے بعد دماغ کے منتشر ہونے ہاتھوں کی لغزش اور آمد ورفت والوں کی بہتات سے مضمون لیٹ بھی ہوگیا ہے، اور شاید پورا مربوط بھی نہ ہو، تاہم اس کو غور سے دیکھ کر مناسب ہو تو رسالہ میں طبع کرا دو۔ ص ۹، میں علامہ محمد طاہرؒ کی سن وفات درج کر دینا، میری ہی کتابوں سے مل جائے گا، اب یاد نہیں۔ والسلام

ابوالزاہد محمد سرفراز

۲۹ رمحرم ۱۴۱۷ھ / ۱۵ رجون ۱۹۹۶ء بعد از مغرب

ان کے علاوہ آپؒ نے کئی اہم ترین مضامین ماہنامہ نصرۃ العلوم میں وقتاً فوقتاً تحریر فرمائے جو ماہنامہ نصرۃ العلوم کی فائل میں موجود ہیں۔

مدرسہ نصرۃ العلوم کی کارکردگی، ادارہ نشرواشاعت اور اپنے چھوٹے بھائی کی خدمات کے متعلق ۱۹۷۱ء میں آپؒ نے اپنے ایک مضمون میں لکھا:

''عزیزم (عبد الحمید) نے دار المبلغین لکھنؤ میں امام اہل سنت حضرت مولانا عبد الشکور صاحبؒ کی سرپرستی میں باطل فرقوں کے ساتھ مناظرہ کے فن کی تکمیل کر کے سند حاصل کی۔ اس کے بعد راقم کی مرضی کے خلاف طبیہ کالج حیدر آباد دکن میں چار سال کا کورس مکمل کر کے طبیب مستند کی سند حاصل کی اور پھر گوجرانوالہ میں کچھ عرصہ حکمت کی دوکان بھی کرتا رہا، لیکن راقم جس چیز کو پسند کرتا تھا یعنی تعلیم وتدریس، اللہ تعالیٰ نے اس کی طرف اس کا رجحان ومیلان کر دیا اور مدرسہ نصرۃ العلوم کی بنیاد واجراء کے بعد وہ اس کا مہتمم مقرر ہوا اور جامع مسجد نور کا خطیب اور بفضل اللہ تعالیٰ درس وجمعہ پر مؤثر تبلیغ کی برکت سے بہت لوگوں کی اصلاح ہوئی ہے اور مدرسہ کا کام بھی بحمد اللہ تعالیٰ بہت عمدہ پیرایہ سے ہو رہا ہے اور خصوصی وعمومی درس اور طلبہ کے اسباق کے علاوہ اس کی کوشش سے حضرت شاہ ولی اللہ صاحبؒ اور شاہ رفیع الدین صاحبؒ کی نادر کتابیں بڑی صحت کے ساتھ طبع ہوئی ہیں، مثلاً الطاف القدس، تکمیل الاذہان، مجموعہ رسائل، اسرار المحبۃ اور تفسیر آیۃ النور وغیرہ اور فیوضات حسینیہ کا ترجمہ اور مقدمہ اس کے علاوہ ہے۔'' (ماہنامہ نصرۃ العلوم گوجرانوالہ، مفسر قرآن نمبر ص ۴۳)

مدرسہ نصرۃ العلوم کے لیے آپؒ نے بحیثیت مصنف کتابیں لکھیں، مضامین تحریر کیے، فتاویٰ نویسی کی اور اس کے تعارف اور کارکردگی کے بارے میں خطوط کے جوابات دیے۔ مدرسہ کی خیر خواہی ہر وقت آپؒ کے پیش نظر ہوتی تھی۔ ایک دفعہ ایسے ہوا کہ والد محترم حضرت صوفی صاحبؒ کے ''دروس الحدیث'' جو چار جلدوں میں شائع ہوئے ہیں۔ جب اس کی چوتھی جلد طبع ہوئی تو حضرت شیخؒ نے سمجھا کہ یہ ''ادارہ نشر واشاعت مدرسہ نصرۃ العلوم'' نے شائع کی ہے، حالانکہ وہ مکتبہ دروس القرآن فاروق گنج سے طبع ہوئی تھی اور اس وقت اہل مکتبہ کتاب پر اصل لاگت سے زیادہ قیمت نہ رکھتے تھے، لیکن چونکہ کاتب نے اس میں مضمون کو خواہ مخواہ پھیلا دیا تھا، اس لیے آپؒ نے بڑے خیر خواہانہ اور ناصحانہ انداز میں بحیثیت مہتمم مدرسہ میرے نام مندرجہ ذیل خط لکھا:

باسمہ سبحانہ

من ابی الزاہد

الی عزیز القدر! حاجی محمد فیاض سلمہ اللہ تعالیٰ

ہدیہ مسنونہ کے بعد عرض ہے کہ راقم اثیم نے دروس الحدیث جلد چہارم کو مختلف جگہوں سے دیکھا مگر صد افسوس ہوا کہ کتابت، کاغذ اور طباعت وتجلید وغیرہ کی بے حد گرانی کے دور میں کاتب صاحب نے محض اپنے فائدے اور سہولت کی خاطر صرف تقریباً ۱۴۸ صفحات کے مضمون کو پھیلا پھیلا کر ۳۹۲ صفحات کر دیے جس کی قیمت بھی بڑھ گئی۔ اس بات کو ضرور پیش نظر رکھنا کہ آئندہ ایسا نہ ہو اور اس کو بھی کم صفحات میں کتابت کراؤ، یہ خرچہ بہ نسبت کاغذ اور طباعت کے خرچہ کے مقابلہ میں بہت کم ہوگا۔

والسلام

ابو الزاہد محمد سرفراز

۱۱ ربیع الثانی ۱۴۱۶ھ / ۸ ستمبر ۱۹۹۵ء

معاون: حضرت شیخؒ مدرسہ نصرۃ العلوم کے ذاتی معاون بھی تھے اور دیگر حضرات کو بھی انفرادی طور پر یا تحریری طور پر اس طرف توجہ دلاتے رہتے تھے۔ آپؒ کا معمول تھا کہ اپنے وظیفہ میں سے مدرسہ کو ماہانہ چندہ دیتے تھے۔ آپؒ نے اپنا آخری ماہانہ چندہ جو مدرسہ میں جمع کرایا، وہ دو سو روپے تھا۔ ایک مرتبہ گکھڑ سے کسی زمیندار نے ان کے ہاتھ اپنی زکوٰۃ وعشر کی رقم مدرسہ کے لیے بھیجی تو احقر نے بیس ہزار روپے کی رسید بنا کر انہیں دی۔ اسی مضمون کی ابتدا میں ذکر کیا جا چکا ہے کہ حضرتؒ جب ابتدائی دور میں مدرسہ نصرۃ العلوم کا سالانہ امتحان لینے کے لیے تشریف لائے تھے تو امتحانی رپورٹ کے آخر میں بھی انہوں نے اس طرف توجہ دلائی تھی کہ ''ارباب بست وکشاد طلبہ اور ان کے اساتذہ کی رعایت ملحوظ رکھیں اور ان کی حتی المقدور ہمت افزائی کریں''۔ (مطبوعہ روئیداد مدرسہ نصرۃ العلوم ج ۱، ص ۸)

۱۹۸۶ء میں جب برطانیہ کے بائیس روزہ دورہ پر تشریف لے گئے تو وہاں بعض واقف حال لوگوں نے آپؒ کے ہاتھ مدرسہ کے لیے کچھ رقم بھجوانا چاہی تو آپؒ نے ان سے فرمایا کہ ''براہ راست مدرسہ بھیجیں''۔ گویا آپ نے یہ چاہا کہ ان کا تعلق مدرسہ سے براہ راست قائم ہو جائے اور ایسا ہی ہوا۔ ویسے بھی آپؒ مالی معاملات میں انتہائی محتاط تھے۔ آپؒ کی کوشش ہوتی تھی کہ مدرسہ کی رقم کو ہاتھ نہ لگائیں۔ اس کا اندازہ میرے نام ایک خط سے بخوبی کیا جا سکتا ہے۔ جب ۱۹۹۵ء میں آپؒ جنوبی افریقہ کے دورہ پر تشریف لے گئے تو ایک صاحب نے انہیں مدرسہ کے لیے کچھ رقم دی اور ذاتی طور پر ہدیہ بھی دیا۔ درمیان میں ایجنٹ نے کچھ گڑبڑ کر دی تو آپؒ نے لکھا:

باسمہ سبحانہ

من ابی الزاہد

الی عزیز القدر! محمد فیاض سلمہ اللہ تعالیٰ

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ   مزاج؟

الحاج محمود موسیٰ میاں صاحب نے دس ہزار رینڈ تو بمد زکوٰۃ دیے تھے اور یہ کہا تھا کہ یہ اسی ہزار روپیہ پاکستانی ہیں۔ ایجنٹ نے رقم ڈالروں میں بدل دی۔ مجھے ہدیہ تین ہزار رینڈ حاجی صاحب نے اور دو ہزار ان کے بھائی حاجی نذیر صاحب نے، کل پانچ ہزار رینڈ بواسطہ ایجنٹ دینے کیے جن کی مالیت چالیس ہزار ہوتی ہے، مگر مجھے جو رقم ملی، 23970/- ہے، باقی نہیں ملی۔ اپنا حساب چیک کر لو تا کہ میں ان سے رابطہ قائم کروں۔

والسلام

ابو الزاہد محمد سرفراز

۲۶ ربیع الاول ۱۴۱۶ھ

حضرت شیخؒ نے مدرسہ کے اسی ہزار روپے زکوٰۃ کے تو جمع کرا دیے۔ بندہ فقیر نے ہی اس کی رسید بنا کر انہیں دی، لیکن ان کا ذاتی ہدیہ کا نصف غالباً ایجنٹ ہی ہڑپ کر گیا۔ اس موقع پر بھی انہوں نے ذاتی نقصان تو برداشت کر لیا لیکن مدرسہ کو نقصان نہیں پہنچنے دیا۔

سرپرست: آپؒ مدرسہ نصرۃ العلوم اور ہمارے سواتی خاندان کے سرپرست اور سربراہ تھے۔ مدرسہ نصرۃ العلوم کے

تمام شعبہ جات پر آپؒ کی بڑی گہری نظر ہوتی تھی۔ خصوصاً تعلیمی وتحریری معاملات میں باریک بینی سے سرپرستی فرماتے تھے۔ وقتاً فوقتاً ان معاملات میں ہدایات بھی جاری فرماتے رہتے تھے۔ اساتذہ وطلبا کو وعظ ونصیحت بھی فرماتے۔ بندہ سے مدرسہ کے انتظامی معاملات میں بھی پوچھ گچھ کر کے باخبر رہتے تھے۔ ۲۰۰۱ء تک تو وہ پڑھانے کے لیے مدرسہ تشریف لاتے رہے اور ہر روز ہی ان کی زیارت وملاقات کا شرف حاصل ہوتا، لیکن بعد ازاں بھی وہ گاہے بگاہے مدرسہ تشریف لاتے رہے۔ ہم بھی ان کی ملاقات کے لیے گکھڑ حاضر ہوتے۔ جب بھی میں ان سے ملاقات کے لیے حاضر ہوتا تو دروازہ سے داخل ہوتے ہی پہچان لیتے اور خود ہی فرماتے کہ ''فیاض'' ہے؟ سلام ودعا کے بعد سب سے پہلا سوال ان کا یہ ہوتا کہ ''صوفی ٹھیک ہے''۔ حضرت والد ماجدؒ کی حیات تک ان کا سب سے پہلا سوال یہ ہی ہوتا۔ پھر دیگر گھر والوں کا حال احوال پوچھتے۔ مجھے نہیں یاد کہ انہوں نے کسی بھی ملاقات میں اس ترتیب کو بدلا ہو۔ اس کے بعد ان کا جو سوال ہوتا، وہ مدرسہ کے حالات کے بارے میں ہوتا۔ کتنے طالب علم ہیں؟ دورۂ حدیث میں کتنے طلبہ ہیں؟ فلاں شعبہ میں کتنی تعداد ہے؟ فنڈ کا کیا حال ہے؟ تم کون کون سے سبق پڑھاتے ہو؟ یہ سلسلہ آخر تک بدستور قائم رہا۔

حضرت صوفی صاحبؒ کی وفات کے تیسرے دن جب میں انہیں ملنے کے لیے گیا تو واپسی پر میرا دایاں ہاتھ پکڑ کر غمگین انداز میں اس پر بوسہ دیا اور آبدیدہ ہو گئے۔ آپؒ کا آخری ایک ہفتے میں بول چال اور کھانا پینا تقریباً بند ہو گیا تھا۔ اس دوران میں ان سے ملنے کے لیے گیا تو خاموش تھے۔ میں نے اپنا منہ ان کے بالکل قریب کیا تو انہوں نے اپنے ہونٹوں کو ہلایا، لیکن بات سمجھ میں نہ آئی۔ مجھے ایسا ہی محسوس ہوا کہ وہ اپنی روٹین کے مطابق فرما رہے ہیں: ''فیاض ہے؟'' یہ میری ان سے آخری ملاقات تھی۔ آپؒ کا حافظہ اور نظر آخر تک صحیح کام کرتے رہے ہیں۔ ان کی وفات سے تقریباً ایک ماہ قبل میں اپنے بیوی بچوں سمیت ان سے ملنے گیا تو اس دن طبیعت میں بے حد بشاشت تھی۔ اس دن بڑی ظرافت فرمائی اور ہمیں واپس نہیں آنے دیتے تھے۔ ان کا اصرار تھا کہ رات یہیں ٹھہرو، لیکن بچوں نے سکول ومدرسہ پڑھنے کے لیے جانا تھا اور رات وہاں قیام ممکن نہ تھا، لہٰذا انہوں نے اجازت دے دی۔

میری اہلیہ جوان کی سب سے بڑی پوتی ہیں۔ انہوں نے اسی مجلس میں ان سے پوچھا: ابو جی، یہ سامنے دیوار پر جو کلاک لگا ہوا ہے، آپ کو نظر آتا ہے؟ فرمایا، ہاں۔ پھر پوچھا، اچھا بتائیں اس وقت ٹائم کیا ہوا ہے؟ اس وقت رات کے پونے نو بجے تھے۔ لیٹے لیٹے غور سے کلاک کی طرف دیکھ کر مزاح سے فرمانے لگے ''نونے پوں''۔ محفل میں بیٹھے سب بچے خوب ہنسے۔ یہ ہمارے ساتھ ان کی آخری خوش طبعی تھی۔ میرے بچوں کو ایک ایک کر کے بوسہ دیا۔ ان کے لیے وہ اکثر ملاقات کے وقت یہ دعا فرماتے تھے جو اس محفل میں بھی فرمائی کہ ''اللہ حافظ، عالم باعمل بنائے، اپنے بڑوں کے نقش قدم پر چلائے''۔ اللہ تعالیٰ ان کی دعا قبول فرمائے، آمین۔ ان کی سرپرستی اور حوصلہ افزائی کے کئی واقعات ذہن میں گردش کر رہے ہیں اور مضمون طویل ہوتا جا رہا ہے۔ جب انہوں نے مدرسہ آنا چھوڑ دیا تو ایک بار حضرت والد ماجدؒ عزیزم محمد ریاض خان سواتی کو ساتھ لے کر گکھڑ ان سے ملنے گئے تو دوران گفتگو حضرت صوفی صاحبؒ نے ان سے مزاحاً کہا، اب تو آپ مدرسہ آتے نہیں، اس لیے ''چٹا حرف لکھن دی ہوں اینوں اجازت دے دیو'' تو شیخ ہنسنے لگے اور ریاض کو تین نفلی روزے رکھوا کر دم، تعویذات اور عملیات کی اجازت دے دی۔

۱۹۹۱ء میں احقر نے جب اپنی سب سے پہلی کتاب لکھی جو حضرت والد ماجدؒ کی ''نماز مسنون کلاں'' پر غیر مقلدین کے اعتراضات کے دفاع میں لکھی گئی تھی۔ اس کا نام ''حی علی الفلاح'' ہے۔ اسے مطالعہ کرنے کے بعد ہمارے گھر کے صحن میں کھڑے کھڑے سب گھر والوں کے سامنے بڑی حوصلہ افزائی فرمائی اور پسندیدگی کا اظہار فرمایا اور فرمایا، کچھ الفاظ پروف ریڈنگ میں درست ہونے والے ہیں۔ پھر جب احقر نے ماہنامہ نصرۃ العلوم میں حضرت امام ابوحنیفہؒ کے متعلق یکے بعد دیگرے تین مضامین لکھے جو ان کے عزم واستقلال، تابعیت اور صحابہ کرامؓ سے ان کی روایات کے موضوع پر تھے تو ان مضامین پر بھی بڑی تشجیع فرمائی۔ پھر اولین مدونین حدیث میں سے بلند پایہ محدث امام زہریؒ پر شیعیت کے الزام کے دفاع میں احقر نے ۳۸ صفحات پر مشتمل ایک مضمون لکھا جس پر شیخؒ نے صرف تصویب فرمائی بلکہ احقر کو پانچ صد روپیہ نقد انعام بھی مرحمت فرمایا۔ احقر کی مرتب کردہ کتاب ''احکام عمرہ'' اور ''احکام حج'' حضرت شیخؒ نے متعدد مرتبہ اپنی جیب سے خرید کر کئی احباب کو، جو حج وعمرہ کے سفر میں جا رہے تھے، ہدیہ دیں۔ یہ احقر کے لیے بہت بڑا اعزاز ہے۔ ایک مرتبہ فرمانے لگے کہ ماہنامہ نصرۃ العلوم کی کتابت اچھی ہے۔ حروف موٹے ہوتے ہیں، میں اسے پڑھ لیتا ہوں، لیکن ماہنامہ 'الشریعۃ' کے حروف بہت باریک ہوتے ہیں، وہ مجھ سے نہیں پڑھے جاتے۔ آپؒ ماہنامہ نصرۃ العلوم کو بڑی گہری نظر سے ملاحظہ فرماتے تھے اور بعض مضامین پر پسندیدگی کا اظہار بھی فرماتے تھے۔ حضرت صوفی صاحبؒ کی کتاب ''نماز مسنون کلاں'' کے بارے میں اکثر لوگوں کو فرمایا کرتے تھے کہ اس کا مطالعہ کریں اور بچوں کو نماز مسنون خود یاد کرائیں، اور علما سے کئی بار فرمایا کہ درس کے لیے ''معالم العرفان فی دروس القرآن'' کا مطالعہ کیا کرو۔ یہ سب باتیں ان کے بڑے پن کی تھیں کہ وہ چھوٹوں پر دست شفقت رکھتے تھے۔

اساتذہ کی میٹنگ میں کبھی کوئی سبق زائد بچ جاتا اور تقسیم میں نہ آتا تو کسی نوجوان استاد سے فرماتے کہ یہ تم لے لو اور ساتھ حوصلہ افزائی فرماتے اور اپنا واقعہ بھی سناتے کہ جب میں جوان تھا تو ایک ایک دن میں تیس تیس اسباق پڑھاتا تھا جن میں سب سے چھوٹا سبق شرح تہذیب کا ہوتا تھا۔ اس سے نوجوان اساتذہ کو ہمت ہو جاتی اور آپؒ اپنی سرپرستی کا حق ادا فرما دیتے۔

آپؒ اکثر نصیحت فرماتے تھے کہ اپنی ڈیوٹی پر دوسرے کاموں کو ترجیح نہیں دینی چاہیے۔ اپنی امامت، خطابت، درس و تدریس کو چھوڑ کر دوسری جگہوں میں جا کر کام کرنا درست نہیں ہے۔ ہاں فارغ اوقات میں درست ہے۔ حضرت گنگوہیؒ کے حوالے سے فرمایا کرتے تھے کہ انہوں نے فتاویٰ رشیدیہ میں لکھا ہے کہ کسی بھی ادارہ سے متعلق آدمی کو اس ادارہ کے قواعد و ضوابط کی پابندی کرنا واجب ہے۔

وقت کی قدر ومنزلت کے بارے میں ایک انگریز کا واقعہ سنایا کرتے تھے کہ بحری جہاز کے کپتان نے طوفان کی وجہ سے خطرے کی آخری سیٹی بجا دی۔ موت کے خوف سے سارے جہاز میں چیخ وپکار اور افراتفری کی کیفیت پیدا ہو گئی لیکن ایک انگریز بے فکر ہو کر اپنے مطالعہ میں مستغرق تھا۔ کسی نے اس سے پوچھا کہ اس وقت مطالعہ کر رہے ہو جب کہ موت سر پر سوار ہے؟ تو اس نے نہایت حیرت انگیز جواب دیا کہ موت تو اپنے وقت پر ہی آنی ہے، تمہارے شور وغل سے یا بے صبری سے ٹل نہیں سکتی تو میں اپنا وقت کیوں ضائع کروں؟ میں اتنی دیر میں اپنا مطالعہ کیوں نہ کر لوں؟ آپؒ کی یہ سرپرستانہ باتیں آج تک ذہن کو جھنجھوڑتی رہتی ہیں۔

احقر جب ۱۹۸۴ء میں حج بیت اللہ کی سعادت حاصل کرنے کے لیے روانہ ہوا تو اپنی دونوں اہلیہ محترمہ کو تبرع دے کر

مجھے رخصت کرنے کے لیے بھیجا۔ پھر جب میں واپس آیا تو گکھڑ اپنے گھر بلا کر میری پُر تکلف دعوت کی۔

مدرسہ نصرۃ العلوم کے فیض کے متعلق آپؒ عموماً اپنے درس و بیان میں فرمایا کرتے تھے کہ ''بحمد اللہ تعالیٰ گوجرانوالہ اور اس کے اطراف میں جو دیوبندیت کا نام ہے تو یہ سارا نصرۃ العلوم کی کوششیں ہیں جو اللہ تعالیٰ نے ہم جیسے فقیروں کے ہاتھ سے لیا ہے۔ اس پر اس کا جتنا شکر ادا کیا جائے، کم ہے۔''

ایک مرتبہ میں آپؒ کی علالت کے زمانہ میں گکھڑ ملاقات کے لیے گیا تو مغرب کی نماز کا وقت ہو گیا۔ مجھے فرمانے لگے کہ نماز پڑھاؤ، چنانچہ احقر نے انہیں مغرب کی نماز کی امامت کرائی، وگرنہ ان کا معمول یہ تھا کہ وہ وہاں موجود حضرات کو مسجد میں جا کر نماز پڑھنے کے لیے حکم فرماتے تھے۔

۲۰۰۴ء میں آپؒ اپنے چھوٹے بھائی سے ملاقات کے لیے ہمارے گھر تشریف لائے تو دونوں بھائی آمنے سامنے بیٹھ کر ایک دوسرے کو کافی دیر دیکھتے رہے، لیکن کوئی بات نہیں کی۔ یہ منظر دیکھ کر قریب موجود سارے ہنسنے لگے تو حضرت شیخؒ نے حضرت صوفی صاحبؒ سے پوچھا، تجھے یاد ہے کہ ہم نے دار العلوم دیوبند میں ابن ماجہ کس بزرگ سے پڑھی تھی؟ مجھے ان کا نام یاد نہیں رہا۔ تو حضرت صوفی صاحبؒ نے میری طرف اشارہ کر کے فرمایا کہ انہیں ان کا نام بتاؤ تو احقر نے عرض کیا کہ دو اساتذہ سے آپؒ نے پڑھا ہے، کچھ حصہ حضرت مولانا مفتی ریاض الدین صاحبؒ سے اور کچھ حصہ حضرت مولانا ابو الوفاؒ شاہ جہان پوریؒ سے، تو ہاتھ اٹھا کر انگلی سے اشارہ کرتے ہوئے اور سر ہلاتے ہوئے اس کی تصویب فرمائی۔

پھر مجھے فرمانے لگے کہ '' فیاض! حضرت شیخ الہندؒ اور ان کے شاگردوں کے متعلق تعارفی مضمون لکھو''۔ حضرت صوفی صاحبؒ نے فرمایا کہ ''یہ ماہنامہ نصرۃ العلوم میں لکھتا رہتا ہے، اس میں لکھے گا''۔ احقر نے عرض کیا کہ حضرت شیخ الہندؒ کے مشہور تلامذہ تو حضرت مدنیؒ، حضرت تھانویؒ، حضرت مولانا انور شاہ کشمیریؒ اور حضرت مولانا محمد الیاس کاندھلویؒ وغیرہ ہیں تو شیخؒ فرمانے لگے کہ ان کے علاوہ بھی جو ہیں مثلاً مولانا غلام غوث ہزارویؒ وغیرہ، سب کے متعلق ہونا چاہیے۔ میں نے پوچھا کہ آپؒ نے حضرت ہزارویؒ سے کیا کیا پڑھا ہے؟ تو فرمایا نحو میر کا کچھ حصہ اور تعلیم الاسلام۔ آپؒ کی سرپرستانہ باتیں بہت زیادہ ہیں جس کا یہ مضمون متحمل نہیں ہے۔

> انسان اگر کوئی عمل کرتا ہے تو اس کا اثر پڑتا ہے۔ نیکی کا اثر الگ اور برائی کا اثر الگ، اور لوگ اچھی طرح اچھائی اور برائی کو محسوس کرتے ہیں۔ انسان خواہ خود عمل نہ کرے مگر دوسرے کی نیکی بدی کو دیکھتے ہیں، غور کرتے ہیں۔ اس واسطے ہر آدمی کو اپنے گریبان میں دیکھنا چاہیے اور اپنی کوتاہیاں دور کرنی چاہئیں۔ اور یاد رکھو! جب آدمی دوسروں کو حق کی بات بتائے اور خود عمل نہ کرے تو ایک تو روحانی طور پر اس کا اثر کم ہوتا ہے، دوسرا لوگ بھی متنفر ہوتے ہیں۔ داعی الی اللہ کے لیے ضروری ہے کہ وہ پہلے اپنی اصلاح کرے۔ ایک مقام پر کسی نے سوال کیا کہ ہمارے امام صاحب ٹی وی دیکھتے ہیں تو میں نے کہا کہ بھائی مسئلہ تو واضح ہے کہ ایسے امام کے پیچھے نماز مکروہ ہے۔ ایک نے کہا کہ ہمارے امام صاحب گفتگو میں فحش گوئی کرتے ہیں۔ میں نے کہا کہ نماز اس کے پیچھے بھی مکروہ ہے۔ آدمی کو عموماً اور درس دینے والوں کو خصوصاً اس بات کا خیال کرنا چاہیے۔'' (ذخیرۃ الجنان جلد اول، ص ۱۶۱)

مولانا عبد القدوس خان قارن*

امام اہل سنت رحمۃ اللہ علیہ کا تدریسی ذوق اور خدمات

اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں میں مختلف نوعیت کی صلاحتیں ودیعت کی ہوتی ہیں جن کا اظہار ان کی زندگی میں ہوتا ہے، مگر ان کی کچھ صلاحیتیں ایسے انداز سے ظاہر ہوتی ہیں کہ لوگوں کی نظر ان ہی پر منحصر ہو جاتی ہے اور دیگر صلاحیتوں کی جانب توجہ نہیں رہتی۔ امام اعظم ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کو پروردگار نے بے شمار صلاحیتوں سے نوازا تھا۔ وہ رات بھر میں نماز میں پورا قرآن کریم ختم کر لیا کرتے تھے۔ (الخیرات الحسان لابن حجر مکی ص ۸۵۔ تاریخ بغداد ج ۱۳ ص ۳۵۶ وغیرہ) ان کو فن حدیث میں بہت بلند مقام حاصل تھا، چنانچہ امام ابن عبد البر المالکیؒ لکھتے ہیں کہ مشہور محدث حماد بن زید نے فرمایا: روی عن ابی حنیفۃ احادیث کثیرۃ (الانتقاء ص ۱۳۰) امام ابو حنیفہ سے بہت سی احادیث مروی ہیں۔ علامہ عبد الوہاب شعرانی نے لکھا ہے کہ حضرت امام ابو حنیفہؒ نے ایک نوجوان کو غسل کرتے دیکھا تو اس کو غسل کے بعد بلا کر نصیحت فرمائی کہ آئندہ زنا نہ کرنا۔ اس نے کہا کہ آپ کو کیسے معلوم ہوا تو امام صاحب نے فرمایا کہ جس پانی سے تو نے غسل کیا ہے، اس پانی میں مجھے زنا کے آثار نظر آئے ہیں۔ اس نوجوان نے اقرار کیا اور امام صاحب کے ہاتھ پر توبہ کی۔ (بحوالہ فتح الملہم ج ۱ ص ۴۰۹) ان عبارات سے واضح ہوتا ہے کہ امام اعظم ابو حنیفہ اپنے دور کے عظیم المرتبت حافظ قرآن، بلند پایہ محدث اور صاحب کشف بزرگ بھی تھے، مگر ان کو زیادہ تر لوگ فقہ و اجتہاد کے دائرے ہی میں دیکھتے ہیں، اس لیے کہ عوام الناس کے سامنے ان کی صلاحیتیں فقہ و اجتہاد میں ہی زیادہ نمایاں ہوئی ہیں۔

حضرت امام اہل سنت رحمۃ اللہ علیہ کو بھی اللہ تعالیٰ نے بے شمار صلاحیتوں سے نوازا تھا۔ اردو ادب میں وہ مقام حاصل تھا کہ بڑے بڑے ادیب ان کی تحریر سے دم بخود رہ جاتے۔ اپنے نظریہ کو ثابت کرنے اور مخالف کے نظریہ کی تردید میں باحوالہ دلائل کا ایسا مجموعہ پیش فرماتے کہ بڑی بڑی وسیع المطالعہ شخصیات کی عقلیں دنگ رہ جاتیں۔ اہل علم حضرات کے لیے ایسے علمی نکات ذکر فرماتے کہ وہ عش عش کر اٹھتے۔ بات سمجھانے کا ان کو ایسا ملکہ حاصل تھا کہ معمولی ذہن کا آدمی بھی بآسانی سمجھ جاتا۔ وہ اپنے دور کے صرف کہنہ مشق، تجربہ کار اور تمام فنون میں مہارت رکھنے والے مدرس ہی نہیں، بلکہ مدرس گر بھی تھے اور ان کو تصوف و ولایت میں بھی بلند مقام حاصل تھا۔ ایک مجلس میں پیر طریقت حضرت سید نفیس الحسینی شاہ رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ حضرت کو لوگ ایک عالم اور مصنف کی حیثیت سے جانتے ہیں، حالانکہ ان کو ولایت میں بھی بہت بلند مرتبہ حاصل ہے۔

جب راقم الحروف نے مدرسہ نصرۃ العلوم گوجرانوالہ سے درس نظامی کا کورس مکمل کیا اور عم مکرم حضرت مولانا صوفی عبد الحمید سواتی رحمۃ اللہ علیہ نے استاد محترم حضرت مولانا عبد القیوم ہزاروی دام مجدہم کے مشورے سے اپنے اسی مادر علمی میں مدرس کی

---

*استاذ الحدیث مدرسہ نصرۃ العلوم، گوجرانوالہ

حیثیت سے میرا تقرر فرمایا تو حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے مجھے جن باتوں کی تلقین فرمائی اور ان کی پابندی کا حکم فرمایا اور وقتاً فوقتاً ان کی یاددہانی بھی کراتے رہے، ان سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ وہ ایک عظیم مدرس ہی نہیں، ایک اعلیٰ درجہ کے مدرس گر بھی تھے۔ یقیناً میرے علاوہ اپنے دیگر متعلقین کو بھی وہ انھی باتوں کی تلقین فرماتے ہوں گے اور جن حضرات نے حضرت سے پڑھا ہے، وہ اس بات کی گواہی دیں گے کہ انھوں نے خود بھی ان باتوں کی پابندی فرمائی۔

○ فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرو کہ اس نے تمھیں ایسے ادارے میں تدریس کا موقع دیا ہے جہاں مکمل درس نظامی پڑھایا جاتا ہے۔ لازمی بات ہے کہ تمھیں ہر فن کے اسباق پڑھانے پڑیں گے، اس لیے تمام فنون میں پہلے خود مہارت حاصل کرو۔ جن فنون میں کمزوری محسوس کرتے ہو، وہ کتابیں کسی استاد سے دوبارہ پڑھو۔

حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے مدرسہ نصرۃ العلوم گوجرانوالہ میں ۱۹۵۵ء میں تدریس شروع کی۔ اس سے پہلے وہ گکھڑ میں اپنی مسجد میں ہی پڑھاتے تھے۔ مشکوۃ شریف تک اسباق ہوتے تھے اور حضرت اکیلے پڑھاتے تھے اور فرمایا کرتے تھے کہ ایک ایک دن میں تیس تیس اسباق بھی پڑھائے ہیں جن میں سب سے چھوٹا سبق شرح تہذیب ہوا کرتا تھا۔ استاد محترم حضرت مولانا عبد القیوم ہزاروی دام مجدہم (سابق استاذ الحدیث مدرسہ نصرۃ العلوم گوجرانوالہ وحالاً شیخ الحدیث جامعہ محمدیہ اسلام آباد) اور حضرت مولانا صوفی محمد سرور دام مجدہم (شیخ الحدیث جامعہ اشرفیہ لاہور) جیسی شخصیات نے گکھڑ میں ہی تعلیم حاصل کی۔ جب حضرت کا تقرر مدرسہ نصرۃ العلوم میں ہوا تو اس کے بعد بھی کچھ عرصہ گکھڑ میں تعلیمی سلسلہ جاری رکھا۔ پھر جو طلبہ گکھڑ پڑھنے کے لیے آتے، ان کو مدرسہ نصرۃ العلوم گوجرانوالہ میں داخل ہونے کی تلقین فرما دیتے اور گکھڑ میں طلبہ کا تعلیمی سلسلہ جو حضرت رحمۃ اللہ علیہ نے قائم کر رکھا تھا، وہ ختم کر دیا گیا۔ البتہ مقامی طالبات کی تعلیم کا سلسلہ حضرت کی شدید بیماری سے پہلے تک جاری رہا۔ بہت دفعہ حضرت کو یہ کہتے سنا کہ اللہ تعالیٰ کا شکر ہے کہ اس نے علمی ترقی اور زیادہ افادہ واستفادہ کے لیے نصرۃ العلوم جیسے ادارے میں موقع عطا فرمایا۔

حضرت رحمۃ اللہ علیہ نے طالب علمی کے دور میں ہی پڑھانا شروع کر دیا تھا اور فراغت سے قبل ہی عربی فاضل کے اسباق بڑی کامیابی اور اطمینان سے پڑھاتے تھے۔ گکھڑ میں تمام فنون کے اسباق پڑھاتے رہے۔ حضرت مولانا عبد القیوم ہزاروی دام مجدہم فرماتے ہیں کہ ہم نے حضرت سے ہدایہ چند ماہ میں مکمل کیا۔ نیز فرماتے تھے کہ حضرت طالب علم کے وقت کا بہت لحاظ رکھتے تھے۔ اگر کوئی طالب علم یہ کہتا کہ میرے پاس وقت کم ہے، میں ایک ہی سال میں اسباق پڑھنا چاہتا ہوں تو اس کو کئی کئی سال کے اسباق ایک ہی سال میں مکمل کرا دیتے تھے۔ اس سے اندازہ کیا جا سکتا کہ حضرت کو تمام فنون میں کس قدر مہارت تامہ حاصل تھی۔

حضرت کی وفات کے بعد مدرسہ نصرۃ العلوم گوجرانوالہ میں خدمات شیخین کانفرنس سے خطاب کرتے ہوئے حضرت مولانا ڈاکٹر شیر علی شاہ دام مجدہم نے، جن کی ساری زندگی درس وتدریس میں گزری ہے، فرمایا کہ حضرت رحمۃ اللہ علیہ جب بخاری شریف کا درس دیتے تو لغوی، کلامی، حدیثی اور فن بلاغت وبدیع سے متعلق ابحاث ایسے بیان فرماتے کہ پتہ چلتا کہ اندر خزانہ ہے اور زبان کے تالے کھل گئے ہیں اور وہ خزانہ بکھرتا جا رہا ہے۔ ۱۹۹۲ء میں حضرت رحمۃ اللہ علیہ کے ساتھ جامعہ علوم اسلامیہ بنوری ٹاؤن کراچی میں جانے کا اتفاق ہوا۔ وہاں بخاری شریف کا آخری سبق حضرت نے پڑھایا۔ اس تقریب

میں بہت سے ایسے بڑے بڑے علما موجود تھے جنھوں نے بیس بیس سال سے زائد عرصہ بخاری شریف اور ترمذی شریف پڑھائی۔ حضرتؒ نے ڈیڑھ گھنٹہ کے قریب بیان فرمایا۔ بعد میں علما کی مجلس میں حضرت مولانا نظام الدین شامزئی رحمۃ اللہ علیہ فرمانے لگے کہ استاد استاد ہی ہوتا ہے۔ حضرت نے اپنے بیان مین وہ علمی نکات بیان فرما دیے ہی کہ ہم کئی کئی مہینوں کے مطالعہ سے بھی وہ حاصل نہیں کر سکتے تھے۔ اسی طرح کا ایک واقعہ حضرت مولانا مفتی محمد اویس صاحب دام مجدہم نے بھی بیان فرمایا کہ ایک بہت بڑے عالم نے حضرت کا بیان سننے کے بعد فرمایا کہ استاد استاد ہی ہوتا ہے۔ بعد والے جتنی بھی ترقی کر لیں، استاد تک نہیں پہنچ سکتے۔

جب فارغ التحصیل علما حضرت سے ملاقات کرتے تو حضرت ان سے پوچھتے کہ کیا کرتے ہو؟ جب کوئی بتاتا کہ میں پڑھاتا ہوں اور کسی ایسے مدرسے کا نام لیتا جہاں بڑی بڑی کتابیں پڑھائی جاتی ہوں تو فرماتے کہ اللہ تعالیٰ کا شکر کرو۔ برادر مکرم حضرت مولانا علامہ زاہد الراشدی دام مجدہم مدرسہ نصرۃ العلوم گوجرانوالہ سے فراغت کے بعد مدرسہ انوار العلوم میں پڑھاتے رہے، پھر کسی وجہ سے تدریس چھوڑ دی تو حضرت کو اس کا بہت ملال رہا۔ پھر جب ان کا مدرسہ نصرۃ العلوم میں پہلے اعزازی اور پھر مستقل مدرس کی حیثیت سے تقرر ہوا تو حضرتؒ اتنے خوش تھے کہ گویا ان کو گم شدہ خزانہ حاصل ہو گیا ہو۔ اس سے بخوبی اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ حضرت کو تدریس کے شعبہ سے کس قدر لگاؤ تھا اور اس شعبہ کی ان کے ہاں کس قدر اہمیت تھی۔ اسی لگاؤ اور اہمیت کی بدولت ان کو تمام فنون میں مہارت تامہ حاصل تھی جس کی اوروں کو بھی تلقین فرماتے تھے۔

○ فرمایا کہ ہر سبق کا مطالعہ خوب کرنا اور سبق پڑھانے سے پہلے پوری تیاری کرنا تاکہ سبق پڑھانے میں خود اعتمادی ہو۔ پہلے کتاب کی عبارت کا مطلب خود سمجھو اور پھر طلبہ کو سمجھاؤ۔ اپنے بارے میں فرماتے تھے کہ میں نے کبھی مطالعہ کیے بغیر سبق نہیں پڑھایا۔ کئی کئی سال مسلسل جو کتابیں پڑھائی ہیں، ان کا بھی مطالعہ ضرور کرتا ہوں۔ ایک موقع پر فرمایا کہ مجھے چالیس سے زائد سال ترجمہ قرآن کریم پڑھاتے ہو گئے ہیں، اس کے باوجود میں درس اور سبق کے لیے مطالعہ ضرور کرتا ہوں اور بالخصوص حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کا قرآن کریم کا ترجمہ ضرور دیکھتا ہوں۔ راقم الحروف کو اچھی طرح یاد ہے کہ حضرت کے رات کے مطالعہ کے لیے ہر روز عصر کے بعد ہی لالٹین اور لیمپ کا انتظام کیا جاتا، ان کے فیتے درست کیے جاتے، ان میں تیل ڈالا جاتا اور ان کے شیشے صاف کیے جاتے، کیونکہ اس دور میں ہمارے کرایے کے مکان میں بجلی کا انتظام نہیں تھا۔ مغرب کی نماز سے فارغ ہونے کے بعد گھر تشریف لانے پر لیمپ یا لالٹین حضرت کی میز پر رکھ دی جاتی تھی اور حضرت آتے ہی پہلے کھانا کھاتے اور پھر مطالعہ میں مصروف ہو جاتے تھے۔ ہم ماسٹر خوشی محمد صاحب کے مکان کے ساتھ ان ہی کے ایک مکان میں کرایہ پر رہتے تھے جو قبرستان کے قریب تھا۔ جب گھر میں مہمان آ جاتے جن میں عورتیں اور بچے بھی ہوتے اور لالٹین ان کے لیے رکھ دی جاتیں تو حضرت کتابیں لے کر مسجد میں چلے جاتے اور کبھی کبھی اسٹیشن پر چلے جاتے اور وہاں جلنے والی ٹیوب کی روشنی میں بیٹھ کر مطالعہ کرتے اور پھر گھر واپس آ جاتے۔

حضرت اپنے مطالعہ کے شوق کا خود ذکر فرمایا کرتے تھے کہ جب ہم مدرسہ انوار العلوم میں پڑھتے تھے تو عصر کی نماز کے بعد باقی ساتھی چہل قدمی کے لیے باہر چلے جاتے اور میں مسجد میں مطالعہ کرتا رہتا تو ہمارے استاد مولانا عبد القدیر رحمہ اللہ مجھ سے کتاب چھین لیتے اور فرماتے، کتابی کیڑے! اس وقت تو مطالعہ چھوڑ دے، اور زبردستی مجھے بھی چہل قدمی کے لیے

باہر بھیج دیتے۔ مدرسہ نصرۃ العلوم گوجرانوالہ کی وسیع لائبریری، گکھڑ میں انجمن اسلامیہ کے کتب خانہ اور آپ کی ذاتی کتب کو دیکھا جائے تو ہر کتاب پر حضرت کے نوٹس لکھے ہوئے ہیں جو ان کے وسیع المطالعہ ہونے کی گواہی دیتے ہیں۔ بالخصوص درسی کتابوں مثلاً التوضیح والتلویح وغیرہ پر حضرت کے عربی میں بہترین حواشی ان کے قلم سے لکھے ہوئے ہیں۔ اسباق کے لیے تیاری بھی خوب ہوتی تھی۔ اگر کوئی طالب علم دوران سبق کوئی سوال کرتا اور اس کا جواب حاشیہ میں مذکور ہوتا تو ازراہ تفنن فرماتے کہ مولوی صاحب، ذرا مطالعہ کی عادت بھی ڈالو اور پھر حاشیہ کا حوالہ دے کر جواب دیتے۔ اگر حاشیہ میں جواب نہ ہوتا تو پھر بھی اس کا بہترین انداز میں جواب دیتے۔

○ فرمایا کہ سبق میں طلبہ کا لحاظ رکھنا، ایک تو اس لحاظ سے کہ آواز ان تک پہنچے اور دوسرا یہ کہ تقریر طلبہ کے معیار کے مطابق ہو اور سمجھانے میں ادنیٰ ذہن کے طلبہ کا لحاظ رکھنا۔ حضرت فرمایا کرتے تھے کہ جس طرح طلبہ پر لازم ہے کہ وہ سبق کے دوران اپنے استاد کی تقریر کی جانب ہمہ تن متوجہ ہوں، اسی طرح استاد کا فرض ہے کہ آواز تمام طلبہ تک پہنچائے۔ اگر اپنی آواز پہنچ جائے تو بہتر، ورنہ اسپیکر کا انتظام کیا جائے۔ ایک دفعہ کسی مدرسہ کے مدرس سے پوچھا کہ تمہاری کلاس میں کتنے طلبہ ہیں؟ انھوں نے خاصی تعداد بتائی تو فرمایا کہ تمہاری آواز ان تک پہنچ جاتی ہے؟ وہ کہنے لگے کہ پیچھے بیٹھنے والوں کو دقت ہوتی ہے تو فرمایا کہ یا تو تمام طلبہ تک آواز پہنچانے کا انتظام کرو یا پھر داخلہ محدود کر دو۔

راقم الحروف نے جب تدریس کا آغاز کیا تو حضرت رحمۃ اللہ علیہ کی جانب سے مجھ پر پابندی تھی کہ آواز اتنی نکالو کہ مجھے اپنی درس گاہ میں تمہاری آواز آئے اور پھر حضرتؒ نے استاد محترم حضرت مولانا عبدالقیوم ہزاروی دام مجدہم سے فرمایا تھا کہ اس کا سبق وقتاً فوقتاً سنا کرو اور جہاں اصلاح کی ضرورت ہو، اس کی اصلاح کر دیا کرو۔ حضرت کے ارشاد کی وجہ سے حضرت استاد محترم دام مجدہم بھی میرے سبق کا جائزہ لیتے۔ اس وقت سے اونچی آواز میں سبق پڑھانے کی ایسی عادت پڑ گئی ہے کہ اب اس عادت کو ترک کرنا بھی چاہتا ہوں تو نہیں کر پاتا۔ اب اونچی بولنے سے کچھ تکلیف بھی ہو جاتی ہے اور پھر یہ احساس بھی ہوتا ہے کہ میری اونچی آواز کی وجہ سے میرے اردگرد قریب کوئی مدرس سبق نہیں پڑھا سکتا جس سے مجھے کوفت ہوتی ہے، مگر کوشش کے باوجود میں اپنی اس عادت کو چھوڑ نہیں سکا۔

جب تک حضرت رحمۃ اللہ علیہ کی صحت ٹھیک رہی، بغیر اسپیکر کے بھی حضرت کی آواز پورے مدرسے میں گونجتی تھی اور یہی حال عم مکرم حضرت صوفی صاحب رحمۃ اللہ علیہ اور حضرت مولانا عبدالقیوم ہزاروی دام مجدہم کا تھا، اس لیے ابتدائی دور میں اسپیکر کی ضرورت ہی محسوس نہیں کی جاتی تھی۔ جب بیماریوں نے گھیر لیا تو اسپیکر کی ضرورت محسوس کی گئی۔ اسپیکر کا انتظام جس کے ذمے ہوتا، اس کو سختی سے اسپیکر کا نظام درست رکھنے کی تلقین فرماتے۔ دورۂ تفسیر قرآن کریم شروع کرنے سے پہلے اسپیکر کے نظام کا جائزہ لیتے اور طلبہ سے پوچھتے کہ کیا آواز سب تک پہنچ رہی ہے یا نہیں؟ اگر کچھ خلل ہوتا تو اسپیکر کے نظام کو وسیع کرنے کی تلقین فرماتے اور سبق شروع کرنے سے پہلے اسپیکر میں تین دفعہ پھونک مار کر اطمینان کر لیتے کہ اسپیکر درست کام کر رہا ہے یا نہیں۔

حضرت رحمۃ اللہ علیہ کو قدرت نے یہ کمال بھی عطا فرمایا تھا کہ ایک ہی موضوع پر تقریر سامعین کے لحاظ سے مختلف ہوتی تھی۔ قرآن کریم کے ایک ہی رکوع پر عوام الناس کے سامنے تقریر اور کافیہ تک پڑھے ہوئے طلبہ کے سامنے اور انداز میں،

اور دورۂ تفسیر میں فارغ التحصیل علما کے سامنے تقریر اور انداز میں ہوتی تھی۔ اسی طرح دیگر اسباق میں بھی ہوتا تھا اور تقریر میں ادنیٰ ذہن کے طلبہ کا لحاظ رکھتے تھے۔ بعض جملوں کو کئی کئی بار دہراتے اور پھر طلبہ سے ان کو دہرانے کا فرماتے تاکہ تسلی ہو جائے کہ طلبہ بات کو سمجھ گئے ہیں۔ ہمارے ساتھ شرح عقائد اور خیالی میں پیر طریقت حضرت مولانا خواجہ خان محمد دام مجدہم کے صاحب زادے مولانا عزیز احمد مدظلہ بھی تھے۔ صاحبزادہ صاحب کم گو تھے۔ ایک دفعہ سبق میں حنفی محدث اور فقیہ قاسم بن قطلوبغا کا قول نقل فرمایا تو صاحب زادہ صاحب سے دو دو دفعہ اس کا تلفظ ادا کروایا۔

○ فرمایا کہ سبق میں تقریر بہت لمبی نہ ہو بلکہ ضرورت کے مطابق بحث ہو جس سے نفس کتاب حل ہو جائے اور طالب علم کو کتاب میں مذکور عبارت کا مفہوم سمجھ آ جائے۔ جن حضرات نے حضرت رحمۃ اللہ علیہ سے پڑھا ہے، وہ اس بات کی گواہی دیں گے کہ خود حضرت کا اپنا معمول بھی یہی تھا۔ تقریر سادہ کتاب کے مطابق اور دل نشیں ہوتی تھی اور فرمایا کرتے تھے کہ ہمارے بزرگوں حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ اور حضرت مولانا اعزاز علی رحمۃ اللہ علیہ وغیرہم کا بھی یہی انداز تھا۔ لمبی تقریر سے گریز کرتے تھے۔ اگر محسوس فرماتے کہ کوئی طالب اس میں زیادہ معلومات چاہتا ہے تو اس کو کتاب کا حوالہ دے دیتے کہ فلاں کتاب اس بحث کو دیکھ لیا جائے، وہاں تفصیل موجود ہے۔ جو کتابیں حضرت سے پڑھی ہیں، ان کو پڑھانے کے دوران حضرت رحمۃ اللہ علیہ کی تقریر کانوں میں گونجتی ہے اور جہاں حضرت نے کسی کے ساتھ مزاح کیا یا کسی کو ڈانٹا یا کوئی قصہ بیان فرمایا، وہ نظارہ سامنے آ جاتا ہے۔

پیر فیض علی فیضی صاحب جو کہ راول پنڈی محکمہ اوقاف کے ڈسٹرکٹ خطیب اور بریلوی مسلک کے تھے اور گکھڑ اور وزیر آباد کے درمیان داد والی خانقاہ کے گدی نشین کی حیثیت سے فوت ہوئے اور ہمارے تعلق دار حکیم محمد صادق صاحب مرحوم کے داماد تھے، ان کے پاس ایک دفعہ حضرتؒ نے مجھے ایک کام کی غرض سے بھیجا۔ میں عشا کے بعد ان کے ہاں پہنچا۔ ہلکی ہلکی بارش ہو رہی تھی۔ ان کی مسجد میں پہنچ کر خادم سے پوچھا تو اس نے کہا کہ فیضی صاحب اپنے گھر چلے گئے ہیں۔ ان کا گھر مسجد کے ساتھ بالائی منزل پر تھا۔ خادم نے کہا کہ اب ان سے ملاقات نہیں ہو سکتی، ان سے ملاقات صبح ہی ہوگی۔ میں نے خادم سے کہا کہ آپ یہ کاغذات فیضی صاحب کو ابھی پہنچا دیں اور مجھے آ کر بتا دیں کہ کاغذ ان تک پہنچ گئے ہیں تو میں چلا جاؤں گا۔ خادم نے کانپتے کانپتے کاغذات لیے، کیونکہ ڈسٹرکٹ خطیب ہونے کی وجہ سے فیضی صاحب خاصے بارعب تھے۔ اس نے جا کر کاغذات فیضی صاحب کو دیے تو میں نے دیکھا کہ خادم کے ساتھ ساتھ فیضی صاحب خود بھی سیڑھیوں سے نیچے اترتے ہوئے آ رہے ہیں اور سامنے آتے ہی کہنے لگے ''اوئے میرا ویر آیا، میرے استاد دا پتر ایا'' (میرا بھائی اور میرے استاد کا بیٹا آیا ہے)۔ فیضی صاحب کے اس انداز سے میں بھی حیران ہوا اور خادم بھی۔ پھر میرا ہاتھ پکڑا اور مجھے اوپر مکان میں لے گئے۔ اجنبی ماحول میں مجھے پریشانی تھی، لیکن میرے کمرے میں بیٹھتے ہی محترم جناب حکیم صادق صاحب مرحوم تشریف لے آئے۔ ان کو دیکھ کر میری پریشانی جاتی رہی، کیونکہ حکیم صاحب سے تو اکثر ملاقات ہوتی تھی۔ گکھڑ میں ان کا مطب تھا اور ہم انھی سے دوائی لایا کرتے تھے۔ وہ پیر کوٹ سے روزانہ آتے اور نمازیں بھی اکثر ہماری مسجد میں ادا فرماتے تھے۔ میرے لیے کھانا لایا گیا، پھر گرم دودھ لایا گیا۔ فارغ ہو کر حکیم صاحب مرحوم اور فیضی صاحب میرے پاس کافی دیر بیٹھے رہے۔ گفتگو کے دوران کہنے لگے کہ میں نے حضرت صاحب سے چند کتابیں پڑھی ہیں۔ جو کتابیں پڑھی ہیں، وہ آج بھی کھولتا ہوں تو حضرت صاحب کی

تقریر کانوں میں گونجتی ہے۔ ان کے پڑھانے کا انداز ہی نرالا تھا۔ میں رات وہیں رہا اور صبح ناشتے کے بعد واپس آیا۔

○ فرمایا کہ صرف سبق کا خیال نہ رکھا جائے بلکہ طالب علم کا بھی خیال رکھا جائے۔ دوران سبق طلبہ کو دیکھا جائے کہ کہیں وہ کسی اور شغل میں تو مصروف نہیں۔ وقتاً فوقتاً کسی طالب علم سے اپنی بات دہرانے کا کہا جائے تاکہ طلبہ سبق کی جانب ہی متوجہ رہیں اور طالب علم سے پوچھا جائے کہ بات سمجھ میں آ گئی ہے یا نہیں۔ اگر اس کی سمجھ میں بات نہ آئی ہو تو دوبارہ سمجھانے کی کوشش کی جائے۔ اگر طالب علم کوئی اشکال پیش کرے یا کوئی اعتراض کرے تو اس کے اعتراض کو غور سے سنا جائے اور جواب دیا جائے۔ اگر جواب ذہن میں نہ ہو تو پھر بتانے کا کہہ دیا جائے یا اس کو کہہ دیا جائے کہ کسی اور استاد سے پوچھ لو یا کسی کتاب کا حوالہ دے دیا جائے کہ اس کتاب میں دیکھ لو۔

حضرت رحمۃ اللہ علیہ کے سبق میں کسی طالب علم کو مجال نہ ہوتی تھی کہ وہ کسی اور کام میں مشغول ہو۔ حضرت کی نظر ہر طرف گھومتی تھی۔ کوتاہی کے مرتکب کو مناسب تنبیہ فرماتے۔ دورۂ حدیث کے علاوہ باقی اسباق میں طلبہ کو اپنی بات دہرانے کا حکم فرماتے اور غلطی پر اصلاح فرماتے اور جب محسوس فرماتے کہ طلبہ کو بات سمجھ میں نہیں آئی تو دوبارہ سمجھاتے۔ بعض دفعہ سمجھانے کا انداز بھی بدل دیتے۔ طالب علم کا اعتراض انتہائی توجہ سے سنتے اور عادت یہ تھی کہ جب کوئی طالب علم اعتراض کرتا تو حضرت اپنا سر نیچے جھکا لیتے اور پورے غور سے اس کی بات سنتے۔ جب وہ بات کر رہا ہوتا تو اس کی جانب نہیں دیکھتے تھے تاکہ وہ جھجک محسوس نہ کرے۔ جب طالب علم اپنا اعتراض مکمل کر لیتا تو پھر مسکراتے ہوئے اس کا جواب دیتے۔

مولوی محمد عقیل قریشی صاحب اور مولوی نور حسین صاحب حضرت سے شرح عقائد پڑھتے تھے اور مولوی محمد عقیل صاحب نے صبح جو عبارت پڑھنی ہوتی تھی، وہ رات کو راقم الحروف کے پاس درست کر لیتے۔ جب جزء لایتجزی کی بحث آئی تو میں نے مولوی محمد عقیل صاحب سے کہا کہ حضرت سے پوچھنا کہ آج کی سائنس نے ایٹم کو توڑ کر جزء لایتجزی کا نظریہ باطل کر دیا ہے۔ پھر مجھے بتایا کہ حضرت نے کیا جواب دیا ہے۔ مولوی صاحب موصوف بڑے خوش ہوئے کہ میں صبح حضرت سے اعتراض کر کے اس کا جواب پوچھوں گا۔ جب سبق میں عبارت پڑھ لی گئی اور حضرت نے اس کے مطابق تقریر فرمالی تو مولوی محمد عقیل صاحب کہتے ہیں کہ میں نے بڑے پرجوش انداز میں کہا کہ حضرت! یہاں اعتراض واقع ہوتا ہے۔ تو حضرات نے اپنی عادت کے مطابق سر نیچے جھکا لیا اور اعتراض سننے کے لیے کان لگا دیے۔ کافی دیر گزر گئی مگر مولوی صاحب کچھ نہ بولے تو حضرت نے سر اٹھایا اور فرمایا ’’سنگیا، کیہہ اعتراض ای، بولدا کیوں نئیں؟‘‘ (دوست، کیا اعتراض ہے، بولتے کیوں نہیں؟) تو مولوی صاحب نے اپنی ہندکو زبان میں کہا کہ ’’مکو بسر گیا اے‘‘ (مجھے بھول گیا ہے)۔ یہ سن کر حضرتؒ بھی اور سارے طلبہ بھی ہنس پڑے۔

دورۂ حدیث کے طلبہ اکثر تحریر کے ذریعے سے سوالات کرتے تو حضرت رحمۃ اللہ علیہ جو اعتراض و سوال سبق سے متعلق ہوتا، اس کا جواب دے دیتے اور جو کسی دوسری بحث سے متعلق ہوتا تو فرما دیتے کہ یہ بات اپنے مقام پر آ جائے گی۔ اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ حضرت اپنے سبق میں طالب علم کو کس طرح سوال کا حق دیتے تھے۔

حضرت رحمۃ اللہ علیہ کا حافظہ غضب کا تھا۔ طلبہ کے تعلیمی دور کے بعض واقعات بھی ان کو یاد دلایا کرتے تھے۔ ایک مولوی صاحب نے بتایا کہ ہم مدرسہ نصرۃ العلوم میں پڑھتے تھے تو ہمارا ہدایہ اول کا سہ ماہی امتحان حضرت کے پاس رکھا گیا۔

میں نے عبارت پڑھی، ترجمہ کیا۔ اس میں یہ عبارت بھی تھی کہ ’اتی سباطة قوم‘ کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ایک قوم کی کوڑی (کوڑا کرکٹ کے ڈھیر) کے پاس گئے۔ میں نے اس کا ترجمہ کیا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم سباطہ قوم کے پاس آئے۔ حضرت نے پوچھا کہ سباطہ کیا ہے؟ تو میں نے کہا کہ یہ قوم کا نام ہے تو حضرت نے مسکراتے ہوئے فرمایا کہ وہ قوم کہاں آباد ہے؟ حضرت کے انداز سے اور ساتھ والے ساتھی کے کہنی مارنے سے مجھے احساس ہوا کہ میں نے غلطی کی ہے۔ اس واقعہ کو بارہ سال سے زائد کا عرصہ گزر گیا۔ گکھڑ میں حضرت سے ملاقات کے لیے آیا تو حضرت نے پوچھا کہ کون سے اسباق پڑھاتے ہو؟ میں نے کہا کہ آج کل میرے پاس مختصر المعانی، مقامات حریری اور ہدایہ اول وغیرہ کتابیں ہیں۔ تو فرمانے لگے کہ اب تو آپ کو معلوم ہو گیا کہ سباطہ قوم کہاں آباد ہے۔ میں شرمندہ بھی ہوا اور مجھے حضرت کے حافظہ پر تعجب بھی ہوا۔

حضرت مولانا عبد المہیمن رحمۃ اللہ علیہ جو حضرت سے گکھڑ میں بھی پڑھتے رہے اور نصرۃ العلوم میں بھی پڑھا اور پھر کچھ عرصہ مدرسہ نصرۃ العلوم میں مدرس بھی رہے (چند سال قبل ہری پور میں وفات پائی) انھوں نے اپنا واقعہ بیان فرمایا کہ جب ہم حضرت سے پڑھتے تھے تو ایک حدیث ’من سکن البادیة فقد جفا‘ سبق میں آئی، جس کا مطلب یہ ہے کہ جس نے دیہاتی زندگی اختیار کی، اس نے زیادتی کی۔ حضرت نے اس کا مفہوم بیان فرمایا مگر میں نے سوال کیا کہ شہری زندگی کی بہ نسبت تو دیہاتی زندگی بہتر ہوتی ہے۔ ہوا خوش گوار، تازہ سبزی اور ہر جانب سبزہ، تو اس کے باوجود دیہاتی زندگی کو جفا کیوں کہا گیا ہے؟ حضرت نے فرمایا کہ دیہاتوں میں تعلیم کے مواقع، علاج معالجہ کی سہولتیں اور ضروریات زندگی کے اسباب کم پائے جاتے ہیں، اس لیے اس کو جفا فرمایا گیا ہے۔ وقتی طور پر میں خاموش تو ہو گیا مگر تسلی نہ ہوئی۔ اس کو حضرت نے بھی محسوس کر لیا۔ تقریباً بائیس سال کے عرصہ کے بعد یہ واقعہ پیش آیا کہ حکومت نے کرنسی نوٹ تبدیل کر دیے۔ میں اس وقت اپنے علاقہ تربیلہ کے ایک دیہات میں ایک مسجد کا امام تھا اور وہیں بعض طلبہ کو پڑھاتا تھا۔ مجھے اس سلسلے میں کچھ خبر نہ ہوئی اور حکومت کی مقرر کردہ میعاد ختم ہو گئی۔ میں نے اپنی ہنگامی ضروریات اور اپنی رہائش کی تعمیر کے لیے کچھ رقم جمع کر رکھی تھی۔ اچانک میں انھی دنوں ہری پور آیا تو معلوم ہوا کہ نوٹ تبدیل ہو چکے ہیں اور پرانے نوٹوں کی حیثیت اب کاغذ سے زیادہ نہیں رہی۔ مجھے اس پر بڑا افسوس ہوا مگر تقدیر سمجھ کر صبر کیا۔ اس واقعہ کے بعد گکھڑ حضرت کی ملاقات کے لیے حاضر ہوا تو حضرت نے حالات معلوم کیے اور میں نے اس دوران نوٹ ضائع ہو جانے کا واقعہ بھی بیان کیا۔ حضرت فرمانے لگے کہ نوٹ ضائع ہونے پر افسوس تو ہے مگر آپ کو ’من سکن البادیة فقد جفا‘ کا مفہوم تو خوب سمجھ آ گیا ہوگا۔ مولانا عبد المہیمن صاحب فرماتے تھے کہ میں اتنا زور سے ہنسا کہ حضرت کی موجودگی کا بھی احساس نہ رہا۔ حضرت کے اس ایک جملہ نے میری ساری پریشانی دور کر دی اور میں سوچنے لگا کہ شاید اللہ تعالیٰ نے حدیث کا مفہوم سمجھانے کے لیے ہی مجھے اس آزمائش میں ڈالا۔

○ فرمایا کہ ہر روز نہیں تو ہفتہ میں ایک دفعہ طلبہ سے پچھلا پڑھا ہوا سبق ضرور سننا۔ دورۂ حدیث کے علاوہ حضرت کے پاس جو اسباق ہوتے تھے، ان میں حضرت کا معمول یہ تھا کہ روزانہ پچھلے سبق کی کوئی نہ کوئی بات ضرور کسی طالب علم سے پوچھتے اور جمعرات کو ہفتہ بھر کے پڑھے ہوئے اسباق کو سنا کرتے تھے۔ ایک دفعہ ایک طالب علم سے فرمانے لگے کہ یہ سمجھو کہ تم مدرس ہو اور طلبہ کو پڑھا رہے ہو تو بتاؤ یہ سبق کیسے پڑھاؤ گے۔ یہ کہہ کر عبارت اس کے سامنے رکھ دی اور خود سر جھکا کر کان اس کی طرف لگا دیے۔ اس نے اس عبارت کی بہترین انداز میں وضاحت کی تو حضرت نے اس کو انعام بھی دیا اور اس

کے حق میں دعا بھی فرمائی۔ حضرت اچھی کارکردگی دکھانے والے طلبہ کو اپنے پاس سے انعام بھی دیا کرتے تھے۔

○ فرمایا کہ اسباق کا تسلسل قائم رکھنا، ناغوں سے تسلسل قائم نہیں رہتا جس سے طلبہ کا نقصان ہوتا ہے۔ حضرت بلا وجہ ناغہ کو بالکل پسند نہیں کرتے تھے اور خود معمول یہ تھا کہ جب تک صحت تھی، سال بھر میں ایک ناغہ بھی نہیں ہوتا تھا۔ بعض قریبی علاقے کے اہم رشتہ داروں کی وفات پر جنازہ کا ایسا وقت مقرر کرنے کا فرماتے جس کی وجہ سے سبق کا ناغہ نہ ہو۔ خود فرماتے تھے کہ عموماً میں گکھڑ اپنی مسجد میں درس دے کر صبح کے وقت ریل گاڑی پر گوجرانوالہ پہنچتا۔ اگر ریل گاڑی نکل گئی ہوتی تو بس پر پہنچتا۔ بعض دفعہ یوں بھی ہوتا کہ اندر جگہ نہ ہونے کی وجہ سے بس کے پیچھے سیڑھی پر کھڑے کھڑے سفر کرنا پڑتا اور اڈے سے کبھی پیدل اور کبھی تانگے پر مدرسہ پہنچتا۔ سخت بارش میں بھی ناغہ نہ ہوتا۔ شلوار اٹھائے ایک ہاتھ میں بوٹ اور ایک ہاتھ میں چھتری پکڑے مدرسہ میں داخل ہوتا تو طلبہ حیران رہ جاتے۔

○ فرمایا کہ بوقت ضرورت اگر اردو شرح دیکھ لی جائے تو کوئی حرج نہیں مگر اردو شروحات پر مکمل بھروسہ نہیں کرنا چاہیے بلکہ بزرگوں نے عربی وفارسی میں کتابوں پر جو حواشی لکھے ہیں، ان سے اور ان کتابوں کی شروحات سے استفادہ کرنا چاہیے۔ آئندہ سال جو اسباق لینے کا ارادہ ہو، ان کتابوں کا سالانہ چھٹیوں میں ضرور مطالعہ کر لینا چاہیے تاکہ آسانی ہو جائے۔ جس دور میں حضرت فنون کی کتابیں پڑھاتے تھے، اس دور میں تو اردو شروحات کا رواج ہی نہ تھا۔ یہ تو قریب زمانے میں شروع ہوا ہے۔ حضرت کتابوں کے حواشی کے ساتھ ساتھ زیادہ تر اپنے اساتذہ کی تقریر کو ملحوظ رکھتے تھے جو انھوں نے دوران تعلیم سنی ہوتی تھیں۔ اپنے تمام اساتذہ کے قدر دان تھے مگر فنون میں حضرت مولانا محمد اسحاق رحمانی رحمۃ اللہ علیہ، جن سے وڈالہ سندھواں میں پڑھا، مولانا غلام محمد لدھیانوی رحمۃ اللہ علیہ جن سے جہانیاں منڈی میں پڑھا اور حضرت مولانا عبد القدیر کیمبل پوری رحمۃ اللہ علیہ جن سے مدرسہ انوار العلوم گوجرانوالہ میں پڑھا، ان حضرات کے تدریسی انداز سے بہت متاثر تھے اور اکثر تعریف کیا کرتے تھے۔

○ جب راقم الحروف نے اپنے تدریسی دور کا آغاز کیا تو پہلے ہی سال میرے پاس پڑھنے والی کلاس میں میرے برادر عزیز عبد الحق خان بشیر سلمہ اور اس سے اگلے سال برادران عزیز قاری حماد الزہراوی سلمہ اور مولوی رشید الحق خان عابد سلمہ شامل تھے۔ مجھے حضرت رحمۃ اللہ علیہ نے خصوصیت سے تلقین فرمائی کہ باقی طلبہ کی بہ نسبت اپنے عزیزوں پر کنٹرول زیادہ رکھنا اور ان سے نرمی کا مظاہرہ نہ کرنا تاکہ ان کا مزاج بھی نہ بگڑے اور دوسرے طلبہ کو شکایت کا موقع نہ ملے۔ جو بات حضرت نے مجھے فرمائی، میں نے اپنی عملی زندگی میں مشاہدہ کیا کہ حضرتؒ خود بھی اس پر سختی سے کاربند تھے۔ ہم تمام بھائیوں نے مدرسہ نصرۃ العلوم گوجرانوالہ میں تعلیم حاصل کی۔ باقی طلبہ سے درگزر کا معاملہ ہو جاتا تھا، مگر ہمارے لیے درگزر حضرت کی ڈکشنری میں نہیں تھا۔

میں ۱۹۶۸ء میں مدرسہ نصرۃ العلوم میں داخل ہوا۔ میرے ہدایۃ النحو کی کلاس کے اسباق تھے جبکہ برادر محترم حضرت مولانا زاہد الراشدی دام مجدہم کے آخری سال تھے۔ برادر محترم دوران تعلیم بھی خاصے متحرک اور جمعیۃ علماے اسلام کے فعال کارکن تھے۔ دور دراز کے سفر بھی کرتے مگر صبح جنرل حاضری میں ضرور حاضر ہو جاتے تھے جو حضرت رحمۃ اللہ علیہ خود لیا کرتے تھے۔ اگر ہم میں سے کوئی کسی وجہ سے کسی دن حاضر نہ ہو سکتا تو اگلے دن تمام طلبہ کے سامنے ہمیں کھڑا کر کے پوچھا

جاتا کہ کل کہاں تھے؟ اس رسوائی سے بچنے کے لیے جرات ہی نہیں ہوتی تھی کہ غیر حاضری کی جائے۔ اسی طرح ہمارے جو اسباق حضرت کے پاس ہوتے تھے، ان میں اسباق سننے یا امتحان کے طور پر کوئی بات پوچھنے میں ہمیں ہرگز نظر انداز نہیں کیا جاتا تھا، بلکہ بعض اوقات یہ سلسلہ ہم سے ہی شروع کیا جاتا تھا اور کوتاہی پر ساری جماعت کے سامنے ہماری صاحب زادگی کو یوں نچوڑ دیا جاتا کہ ایک بوند بھی ہمارے اندر نہ رہی۔

ایک بزرگ جنھوں نے اپنی زندگی میں تقریباً پچاس سال تدریس کے فرائض سر انجام دیے، انھوں نے ایک موقع پر گفتگو کے دوران فرمایا کہ آج کل طلبہ میں تعلیمی کمزوری کے مختلف اسباب میں سے ایک سبب صاحبزادگی بھی ہے کہ صاحب کی جانب سے مدرس کو آرڈر آ جاتا ہے کہ صاحب زادہ صاحب کے ساتھ نرمی کا برتاؤ کرنا جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ صاحب زادہ صاحب کلاس کے آداب وشرائط سے مستثنیٰ قرار پاتے ہیں جس کا اثر دیگر طلبہ پر بھی پڑتا ہے اور مدرس بھی بددل ہو جاتا ہے اور بددلی کے ساتھ پڑھائے گئے اسباق کا نتیجہ وہ نہیں نکلتا جو نشاط قلب کے ساتھ پڑھانے کا ہوتا ہے۔ ہمارے بزرگوں کا یہ طریق کار رہا ہے کہ وہ جب اپنے بچوں کو کسی مدرس کے سپرد کرتے تو اس کو ذمہ داری کا احساس دلاتے تھے کہ اب اس کی تعلیم اور اس کے اخلاق سنوارنے کی ذمہ داری تم پر ہے۔ سختی اور نرمی کا اختیار مدرس کو ہی ہوتا تھا۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ جب گکھڑ میں استاد محترم قاری محمد انور صاحب دام مجدہم کا شعبہ حفظ میں تقرر ہوا اور ہم پہلی دفعہ حضرت قاری صاحب سے پڑھنے کے لیے گئے تو اتفاق سے حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ صبح کے درس سے فارغ ہو کر مسجد سے نکل رہے تھے تو مجھے دیکھ لیا۔ پھر مجھے بازو سے پکڑ کر قاری صاحب کے پاس لے گئے اور فرمایا کہ مجھے اس کے چمڑے کی ضرورت نہیں ہے بلکہ پڑھائی کی ضرورت ہے۔ حضرت قاری صاحب میری طرف دیکھ کر مسکرائے۔ وہ منظر مجھے آج بھی یاد ہے اور کئی دفعہ حضرت قاری محمد انور صاحب دام مجدہم نے بعد میں بھی اس کا ذکر فرمایا۔ پھر حضرت قاری صاحب دام مجدہم نے ہمارے چمڑے کی نہیں بلکہ ہماری پڑھائی کی ایسی فکر کی کہ اب وہ ہم جیسے نالائق شاگردوں پر مسجد نبوی میں چھتری کے سایے میں بیٹھ کر اپنے دوستوں کے سامنے فخر کا اظہار فرماتے رہتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ حضرت قاری صاحب دام مجدہم کا سایہ صحت وعافیت کے ساتھ تادیر ہمارے سروں پر قائم رکھے۔ آمین

گھر میں تعلیمی سلسلہ

حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے گھر کو بھی شروع ہی سے مدرسہ بنا رکھا تھا جو محض رضاے الٰہی کے لیے تھا۔ گکھڑ کے چھوٹے بچے اور بچیاں قاعدہ، ناظرہ اور حفظ قرآن کریم کے لیے آتے تو ان کی تعلیم کی ذمہ داری محترمہ والدہ مرحومہ سر انجام دیتی تھیں۔ گکھڑ کے سیکڑوں حضرات وخواتین نے انھی سے قرآن کریم پڑھا ہے۔ ان میں سے بہت سے اعلیٰ عہدوں پر فائز ہوئے اور بڑے فخر سے کہا کرتے ہیں کہ ہم نے بڑے خالہ جی سے پڑھا ہے۔ جو بچیاں ترجمہ قرآن کریم یا کتابیں پڑھنا چاہتیں تو ان کو حضرت رحمۃ اللہ علیہ خود پڑھاتے تھے۔ مدرسہ نصرۃ العلوم گوجرانوالہ سے اسباق پڑھا کر گھر تشریف لے جاتے تو ظہر سے مغرب تک یہ تعلیمی سلسلہ جاری رہتا۔ اس دوران حضرت مطالعہ بھی فرماتے اور تحریری سلسلہ بھی جاری رہتا اور طالبات کو بھی پوری توجہ سے تعلیم دیتے۔ اتنی ذمہ داریوں کو نبھانا حضرتؒ ہی کی ہمت تھی جو اللہ تعالیٰ نے ان کو مرحمت فرمائی تھی۔

ہماری بڑی ہمشیرہ محترمہ نے میزان الصرف سے بخاری شریف تک تمام کتابیں حضرت سے پڑھی ہیں۔ان کے ساتھ دیگر طالبات میں وہ خاتون بھی تھی جو آج مولوی خان محمد صاحب کی اہلیہ اور مفتی محمد طیب صاحب کی والدہ محترمہ ہیں۔ ہماری چھوٹی بہنوں نے بھی کئی کئی سال حضرت سے پڑھا اور گکھڑ کی بے شمار لڑکیوں نے حضرت سے پڑھا جن میں خصوصیت کے ساتھ محترم جناب منیر احمد شاہ صاحب مرحوم کی بیٹی اور اس کی ہم سبق طالبات اور محترم جناب صابر شاہ صاحب کی بیٹی اور اس کی ہم سبق طالبات نمایاں ہیں جنھوں نے اول سے آخر تک مکمل کتابیں حضرت رحمۃ اللہ علیہ سے پڑھیں اور اب وہ پڑھا رہی ہیں۔ جن طالبات نے حضرتؒ سے پڑھا، وہ بڑے وثوق واعتماد سے آج فقہ، ادب، لغت اور حدیث کی کتابیں پڑھا رہی ہیں۔ حضرتؒ سے پڑھنے والی ایک خاتون محترمہ اقبال بیگم صاحبہ جو محترم جناب صوفی تاج دین صاحب مرحوم کی بیٹی ہیں، انھوں نے حضرت سے ترجمہ قرآن کریم اور حدیث کی چند کتابیں پڑھیں اور پھر محکمہ تعلیم سے اعلیٰ ڈگری حاصل کر کے کالج میں پڑھاتی رہیں۔ انھوں نے کئی دفعہ اس کا اظہار کیا کہ مجھ سے زیادہ ڈگریاں حاصل کرنے والی اور سینئر معلمات بھی جب مجھے قرآن کریم کا ترجمہ اور حدیث پڑھاتے سنتی ہیں تو تعجب سے پوچھتی ہیں کہ تم نے کس سے پڑھا ہے؟ تو میں بڑے فخر سے کہا کرتی ہوں کہ میں نے اپنے استاذ محترم مولانا محمد سرفراز خان صاحب صفدر سے پڑھا ہے۔ یہ وہی خاتون ہیں جن کے شوہر رانا محمد اقبال نے اپنی وزارت کے دنوں میں جامع مسجد نور کو محکمہ اوقاف کی تحویل میں لینے کی کوشش کی تھی۔

مجھ پر خصوصی نوازش

حضرت رحمۃ اللہ علیہ کو اللہ تعالیٰ نے ایسی طبیعت عطا فرمائی تھی کہ ہر قرابت دار یہ سمجھتا کہ حضرت کو مجھ سے ہی زیادہ تعلق اور لگاؤ ہے اور ہر طالب علم اور طالبہ یہ سمجھتے کہ ہم نے ہی حضرت سے زیادہ استفادہ کیا ہے۔ اسی خوش فہمی میں، میں بھی مبتلا ہوں۔ میں نے جب حفظ مکمل کر لیا تو چند ماہ بعد رمضان المبارک آ گیا اور حضرت استاذ محترم قاری محمد انور دام مجدہم کے حکم سے میں نے مسجد شاہ سلیمان گکھڑ میں نماز تراویح میں ایک حافظ صاحب کا قرآن کریم سننا شروع کیا تو وہ بے چارہ چوتھے پارے میں ہی بے بس ہو گیا اور آگے سنانے سے انکار کر دیا۔ مسجد کی انتظامیہ نے مجھے آگے کھڑا کر دیا تو میں نے اس رات چھ رکعتیں پڑھائیں۔ اب مسجد کے نمازیوں نے اصرار کیا کہ باقی دنوں کی تراویح بھی تم ہی پڑھاؤ۔ میں نے کہا کہ ابا جی سے پوچھ لیں۔ اگر انھوں نے اجازت دی تو مجھے کوئی اعتراض نہیں۔ صبح حاجی محمد صادق صاحب مرحوم سمیت نمازیوں کا ایک وفد حضرت کے پاس گیا تو حضرت نے ڈائری نکالی اور میری تاریخ پیدائش دیکھی تو فرمایا کہ یہ چاند کے حساب سے تو بارہ سال کا ہو چکا ہے مگر شمسی حساب سے تین ماہ کم ہے۔ مجھ سے پوچھا کہ کیا تم بالغ ہو؟ تو میں بالکل چپ رہا اور کوئی جواب نہ دیا۔ پھر حضرت نے ایک دو کتابیں دیکھ کر ان حضرات سے فرمایا کہ اگر تمہارا اصرار ہے تو یہ تراویح پڑھا دیا کرے لیکن فرض نماز اور وتر پڑھانے میں احتیاط کرے۔ جب میں نے تراویح میں قرآن کریم مکمل سنا دیا تو حضرت کو میری منزل کے بارے میں اطمینان ہو گیا اور حضرت قاری محمد انور صاحب دام مجدہم نے بھی اطمینان دلایا تو رمضان المبارک کے بعد مجھے گکھڑ میں ہی قاری کلاس میں داخل کرا دیا گیا۔

قاری کلاس میں دو انتہائی محنتی اساتذہ کا تقرر کیا گیا تھا۔ تجوید کے اسباق حضرت مولانا قاری عبد الحلیم سواتی دام مجدہم اور درس نظامی کے اسباق حضرت مولانا غلام علی اعوان رحمۃ اللہ علیہ فاضل مدرسہ نصرۃ العلوم گوجرانوالہ پڑھاتے تھے۔ حضرت والد صاحب نے مجھ پر پابندی لگا دی کہ ہر روز مغرب کی نماز کے بعد تم میری بیٹھک میں بیٹھ کر سبق یاد کیا کرو گے اور ایک دو زائد سبق مجھ سے پڑھا کرو گے۔ ابتدا میں حضرت نے مجھے میزان الصرف شروع کرائی اور گردانیں یاد کرانے کا یہ طریقہ اختیار فرمایا کہ مجھے سلیٹ لے کر دی اور فرماتے کہ جو گردان پڑھی ہے، اس کو یاد کر کے کتاب بند کر کے زبانی سلیٹ پر لکھ کر مجھے دکھاؤ اور خود اپنے مطالعہ میں مصروف ہو جاتے۔ کبھی کبھی مخفی نظر سے دیکھتے کہ کہیں یہ کتاب سے دیکھ کر تو نہیں لکھ رہا۔ جب میں گردان لکھ کر لے جاتا تو دیکھ کر فرماتے کہ اس کو مٹا کر دوبارہ لکھ کر لاؤ، حتیٰ کہ بعض دفعہ بیس سے بھی زائد دفعہ لکھنا پڑتا۔ جوں جوں سبق آگے بڑھتا، سلیٹ پر لکھائی بھی زیادہ ہوتی جاتی۔ جب میزان الصرف کی تمام گردانیں یاد ہو گئیں اور حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے مجھ سے سن لیں تو پھر صیغوں کی باری آئی کہ فلاں گردان کا فلاں صیغہ اور فلاں گردان کا فلاں صیغہ لکھ کر لاؤ۔ بیک وقت چھ سات صیغے لکھا دیتے اور میں سامنے کرسی پر بیٹھ کر سوچ سوچ کر وہ صیغے لکھ کر لاتا۔ درست ہوتا تو خوش ہوتے اور غلطی ہوتی تو اصلاح فرما دیتے۔ پھر اسی طریقے سے دستور المبتدی پڑھائی اور پھر نحو میر پڑھائی۔

اجرا کا یہ انداز اختیار فرماتے کہ سامنے پڑی کسی کتاب کا صفحہ نکال کر فرماتے کہ اس صفحہ میں مرکب اضافی، غیر منصرف اور جمع سالم وغیرہ دیکھ کر بتاؤ۔ اسی طرح باقی مسائل سے متعلق ہوتا۔ ہر روز کوئی نہ کوئی کتاب میرے ہاتھ میں ہوتی اور میں جملوں کا تعین کر کے اور دیگر باتوں کا تعین کر کے بتاتا۔ اس طرح ابتدائی صرف ونحو میں مجھے ایک قسم کا اعتماد پیدا ہو گیا۔ جب میں مدرسہ نصرۃ العلوم میں داخل ہو گیا تو ابتدائی دو سال روزانہ گکھڑ چلا جاتا تھا اور رات کو حضرت کی بیٹھک میں ہی مجھے پڑھنا ہوتا تھا۔ بعض دفعہ کوئی کتاب دے کر فرماتے کہ اس صفحہ میں جو جملے شرطیہ ہیں، ان میں شرط اور جزا کا تعین کرو اور کبھی یوں ہوتا کہ فرماتے کہ بتاؤ، اس عبارت میں پہلا جملہ کہاں ختم ہوا ہے اور دوسرا جملہ کہاں سے شروع ہوا ہے۔ میں اس کا اتنا عادی ہو گیا کہ مجھے اس انداز سے دلچسپی پیدا ہو گئی اور جی چاہتا تھا کہ مجھ سے اس جیسے مزید سوال کیے جائیں۔ میں نے فقہ میں مالابد منہ قاری کلاس میں پڑھی تھی۔ جب حضرت رحمۃ اللہ علیہ سے نور الایضاح پڑھی تو ہر پانچ سات صفحات کے بعد حضرت میرا امتحان یوں لیتے کہ جو مسئلہ نور الایضاح میں بیان کیا گیا ہے، اگر وہ مسئلہ مالابد منہ میں بھی ہے تو نور الایضاح کی عربی عبارت اور مالابد منہ کی فارسی عبارت لکھ کر لاؤ۔ اس کے لیے مجھے ایک دن کا وقفہ بھی دیا جاتا تھا۔ میں دونوں کتابوں کو سامنے رکھ کر عبارتیں لکھ کر پیش کرتا جو اکثر ٹھیک ہی ہوتی تھیں تو بڑے خوش ہوتے تھے۔ غلطی پر اصلاح فرما دیتے۔ اس سے مسائل کی جانب توجہ کے ساتھ ساتھ میری لکھائی بھی کافی حد تک درست ہو گئی۔

میں نے حضرت والد صاحبؒ سے ترجمہ وتفسیر قرآن کریم تقریباً پانچ دفعہ پڑھا۔ بخاری شریف مکمل، ترمذی شریف از اول تا کتاب البیوع، شرح نخبۃ الفکر، شرح عقائد، خیالی، سراجی، ہدایۃ النحو، شرح تہذیب، اصول الشاشی، نفحۃ العرب، نور الایضاح، علم الصیغہ، میزان الصرف، دستور المبتدی، تعریف الاشیاء اور نورانی قاعدہ ویسرنا القرآن کا کچھ حصہ پڑھا ہے۔ سراجی پڑھنے کے دوران اس کی شرح شریفیہ کا مطالعہ مجھ پر لازم قرار دیا۔ میں نے کئی دفعہ سراجی اسی انداز میں پڑھائی۔ اب جی چاہتا ہے کہ طلبہ کے فائدہ کی خاطر اس انداز میں سراجی کی شرح کر دی جائے، مگر وقت اور صحت اجازت نہیں دے رہے۔ شرح تہذیب میں نے مدرسہ نصرۃ العلوم گوجرانوالہ میں اپنی جماعت کے ساتھ مل کر حضرت مولانا مفتی جمال احمد رحمۃ اللہ علیہ سے پڑھی تھی مگر تسلی نہ تھی۔ سالانہ چھٹیوں میں حضرت سے دوبارہ پڑھی۔ حضرت نے فن منطق سے

مناسبت پیدا کرنے کے لیے مجھے پہلے تعریف الاشیاء یاد کرائی جس میں علم منطق کی تمام اصطلاحات اور ان کی تعریفات ذکر کی گئی ہیں۔ پھر اس کے بعد مجھے تقریباً ڈیڑھ ماہ میں شرح تہذیب مکمل کرادی اور پھر مجھ سے مکمل سنی۔

بخاری شریف اور ترمذی شریف میں انداز

جو حدیث پہلی مرتبہ آتی تو اس کا ترجمہ فرمادیتے اور جب وہی حدیث دوبارہ آتی تو فرمادیتے کہ یہ فلاں باب میں گزر چکی ہے۔ اگر کوئی جملہ یا کوئی لفظ نیا آتا تو اس کا ترجمہ فرمادیتے۔ امام بخاریؒ کے تراجم ابواب میں ان کے فقہی نظریہ کی وضاحت فرماتے اور اس کے تحت ذکر کی گئی حدیث کی باب سے مطابقت ذکر فرماتے اور حدیث کے متعلق فقہی، اصول حدیث اور ادب کے اعتبار سے مناسب بحث فرماتے۔ ابتدا سے اختتام تک ایک ہی انداز ہوتا تھا۔ بخاری شریف کی ابتدا میں ہی فرمادیتے کہ بھائی، وقت تھوڑا ہونے کی وجہ سے ہر باب کی مکمل بحث تو نہیں کی جاسکتی اور میں یہ بھی مناسب نہیں سمجھتا کہ چند ابحاث پر تفصیلی بحث کردی جائے اور باقی ابحاث کو بالکل ہی نظر انداز کر دیا جائے، اس لیے طلبہ کی ضرورت کے مطابق ہر باب کی مناسب بحث کی جائے گی۔

بخاری شریف پڑھاتے وقت اس کا حاشیہ جو ابتدائی پچیس پاروں کا حضرت مولانا احمد علی سہارنپوری رحمۃ اللہ علیہ نے اور آخری پانچ پاروں کا قاسم العلوم والخیرات حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا ہے، اس کو حضرت خصوصیت کے ساتھ پیش نظر رکھتے اور طلبہ کو بھی اس کے مطالعہ کی تلقین فرماتے۔ اس کے ساتھ بخاری کی شروحات میں سے علامہ کرمانی، علامہ قسطلانی، علامہ ابن حجر اور علامہ عینی رحمہم اللہ کی شروحات کے حوالہ جات اکثر دیتے اور بعض دفعہ حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ اور حضرت مولانا محمد زکریا سہارنپوریؒ کی عبارات کا بھی حوالہ دیتے۔ بخاری شریف میں فن حدیث اور ترمذی شریف میں فقہی ابحاث کا پہلو نمایاں ہوتا تھا۔ اپنے نظریہ کی مدلل بحث اور مخالف نظریہ کے جوابات فریق مخالف کے مسلمات کی روشنی میں بیان فرماتے۔ برصغیر میں چونکہ احناف کے فریق مخالف غیر مقلد حضرات ہیں، اس لیے علامہ امیر یمانیؒ، قاضی شوکانیؒ، نواب صدیق حسن خانؒ، مولانا نذیر حسین دہلویؒ اور محدث مبارک پوریؒ کی عبارت پیش فرماتے تاکہ فریق مخالف پر حجت تام ہو جائے کہ ان کی مسلمہ شخصیات نے یہ فرمایا ہے۔ حضرتؒ کی تقریر ترمذی جو "خزائن السنن" کے نام سے مطبوعہ ہے، اس کا مطالعہ کرنے والے پر یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ حضرت نے انھی حضرات کے حوالہ جات بکثرت دیے ہیں۔

حضرت اپنی انفرادی رائے قائم نہیں کرتے تھے بلکہ سلف صالحین میں سے جس کی رائے کو دلیل کے لحاظ سے راجح سمجھتے، اسی کو اپناتے اور جمہور کی رائے کو ترجیح دیتے تھے۔ اگر اہل علم میں سے کسی کی انفرادی رائے کسی مسئلے کے متعلق ہوتی تو اس کو تفرد قرار دیتے اور فرماتے کہ تفردات کی اتباع درست نہیں ہے۔ کئی دفعہ حضرت سے سنا، فرماتے تھے کہ ہر عالم کی انفرادی رائے کو تفرد نہیں کہا جاسکتا، بلکہ ایسا عالم جو اپنے دور میں علمی لحاظ سے اس مقام پر ہو کہ اصول مسلمہ کی روشنی میں جدید مسائل میں اجتہاد اور فتویٰ کی اہلیت رکھتا ہو، اس کی انفرادی رائے کو تفرد کہا جاسکتا ہے۔ علامہ ابن تیمیہؒ، شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ اور علامہ انور شاہ کشمیریؒ جیسے حضرات اس کے اہل تھے۔ ہر مولوی کی انفرادی رائے کو تفرد کا نام نہیں دیا جاسکتا، ورنہ تو کسی مولوی کی مخالفت کی کوئی وجہ ہی نہیں رہتی۔

حضرت رحمۃ اللہ علیہ کی خواہش

حضرت کے خصوصی خدمت گاروں میں سے محترم جناب میر لقمان صاحب نے ایک دفعہ راقم الحروف کی موجودگی میں حضرت سے پوچھا کہ حضرت! آپ کی خواہش کیا ہے؟ تو فرمایا کہ میری ایسی حالت ہو جائے کہ میں دوبارہ پڑھانے کے قابل ہو جاؤں۔ علما کے ایک وفد سے باتیں کرتے ہوئے، جن میں مولانا محمد اسلم شیخوپوری مدظلہ بھی تھے، اپنی خواہش کا اظہار فرمایا کہ میرا جی چاہتا ہے کہ میں میزان الصرف اور نحو میر وغیرہ ابتدائی کتابیں طلبہ کو پڑھاؤں۔ شدید بیماری کی حالت میں حضرت رحمۃ اللہ علیہ کی اس خواہش سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ حضرت کو تدریس کے شعبہ سے کس قدر لگاؤ اور محبت تھی۔ یقیناً اس کی وجہ حضور علیہ السلام کا یہ فرمان مبارک ہے کہ علم کا فائدہ مرنے کے بعد بھی آدمی کو پہنچتا رہتا ہے اور جتنے لوگ اس علم کو پھیلائیں گے اور اس پر عمل کریں گے، مرنے والے کے نامہ اعمال میں اس کی نیکی لکھی جاتی رہے گی۔ حضرت کے چالیس ہزار کے لگ بھگ مرد اور سیکڑوں کی تعداد میں خواتین شاگرد ہیں۔ اس دور میں کسی عالم دین کے شاگردوں کی اتنی تعداد ملنا مشکل ہے۔ ان شاگردوں کے ذریعے سے پھیلنے والے علم کی وجہ سے ان شاء اللہ العزیز تاقیامت حضرت کا نامہ اعمال نیکیوں میں بڑھتا رہے گا اور ہر دم درجہ بدرجہ بلند ہوتا رہے گا۔

آخری سبق

علالت کے باعث کئی سال سے حضرت نے پڑھانا چھوڑ دیا تھا۔ فروری ۲۰۰۹ء کے آخری عشرے میں حضرت راقم الحروف کے ہاں تشریف لائے اور پانچ دن قیام فرمایا۔ اس دوران مدرسہ نصرۃ العلوم گوجرانوالہ میں دورۂ حدیث شریف میں شریک طلبہ جن کی تعداد ایک سو کے قریب ہے اور ان میں راقم الحروف کے دو بیٹے عزیزم حبیب القدوس خان معاویہ اور عزیزم عبد الوکیل خان مغیرہ بھی شامل ہیں، ان کو گھر بلا کر بخاری شریف کا سبق پڑھایا۔ چند منٹ بیان فرمایا اور حدیث کی اجازت دی اور دعا بھی فرمائی۔ یہ حضرت نے طلبہ کی کلاس کو آخری سبق پڑھایا۔

اللہ تعالیٰ حضرت کے درجات بلند فرمائے اور حضرت کے پس ماندگان کو ان کے مشن پر قائم رہتے ہوئے اس مشن کو آگے بڑھانے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین یا الٰہ العالمین۔

قاضی عبد الرحمن فرماتے ہیں: حضرت امام اہل سنت طلبہ کو کبھی تحکمانہ انداز میں یا نام لے کر نہ بلاتے تھے بلکہ ہمیشہ "مولانا" کہہ کر پکارتے تھے۔ ایک مرتبہ جمعہ کے دن حضرت کے پاس گکھڑ ملاقات کے لیے گئے تو حضرت نے ہمیں بٹھایا، اکرام کیا اور پرتکلف کھانا کھلایا۔ اس وقت حضرت کے صاحبزادے مولانا عبد القدوس قارن چھوٹے بچے تھے۔ کچھ ساتھیوں نے مولانا عبد القدوس قارن کو کچھ رقم دے دی۔ حضرت نے پوچھا، عبد القدوس کو پیسے کس نے دیے ہیں؟ ہم نے عرض کی حضرت ہم نے، تو اس پر فرمایا کہ تمہارا اپنے استاد کے بچے سے محبت کرنا اور اکرام کرنا اپنی جگہ، مگر اس طرح بچے کی عادت خراب ہو جاتی ہے۔ یہ اوروں کے سامنے ہاتھ پھیلائے گا۔ آئندہ ایسے نہ کرنا۔ (ماہنامہ ہدی للناس گوجرانوالہ، امام اہل سنت نمبر، جون ۲۰۰۹ء)

مولانا حافظ محمد یوسف *

امام اہل سنت رحمہ اللہ کی قرآنی خدمات اور تفسیری ذوق

قرآن حکیم کی درس وتدریس سے وابستہ ہو جانے والے خوش قسمت افراد کے مقام ومرتبہ کا صحیح صحیح عملی اظہار تو دار الجزاء ہی میں ہوگا جب وہ الحمدلله الذی اذهب عنا الحزن (شکر ہے اس خدائے پاک کا جس نے ہر قسم کا غم ہم سے دور کر دیا) کی تلاوت کرتے ہوئے۔ رحمت خداوندی کے سایہ میں، خراماں خراماں جنت کے درجات عالیہ کی طرف محو پرواز ہوں گے۔ وہ کیسا دلنشین منظر ہوگا جب خدائے رحمٰن کی زبان سے "سلام قولا من رب رحیم" کے رسیلے الفاظ ان کے کانوں میں رس گھول رہے ہوں گے اور فرشتے قطار در قطار کھڑے ہو کر ان کو "سلام علیکم طبتم فادخلوها خالدین" کے الفاظ سے سلام پیش کر رہے ہوں گے۔ یہ وہی خوش قسمت لوگ ہیں جن کی زبان تلاوت کلام پاک سے تر رہتی ہے، جن کی سوچ قرآن حکیم کے بحر ذخار میں غوطہ زن ہو کر حکمت ودانش کے موتی چن کر امت میں تقسیم کرتی ہے اور گم کردہ راہ انسانیت کے لیے روشن راہوں کا تعین کرتی ہے، جن کے شب وروز کے اعمال قرآنی تعلیمات کے سانچے میں ڈھل کر آسمان ہدایت پر مہر تاباں بن کر چمکتے ہیں، جو زندہ جاوید لوگوں کی جماعت میں شامل ہو کر تادم واپسیں اپنے نقوش کا پتہ ان الفاظ میں بتا رہے ہوتے ہیں: ''لوگو! ہمارے انتقال کے بعد ہمیں قبروں میں مت تلاش کرنا، ہم علم کے دلوں میں بسیرا کریں گے''۔

موت کو سمجھے ہے غافل اختتام زندگی
ہے یہ شام زندگی صبح دوام زندگی

اسی باکمال قافلہ کے ایک راہ رو، سیدی واستاذی، امام اہل سنت حضرت مولانا محمد سرفراز خان صفدرؒ بھی تھے جو لاکھوں قلوب میں قرآنی علوم ومعارف کی شمع روشن کرتے ہوئے اسی قافلہ حق کے ساتھ جا ملے۔ ذیل میں ہم اجمالاً حضرت شیخؒ کی ان خدمات جلیلہ کا ذکر کرنا چاہتے ہیں جو آپ زندگی بھر قرآن حکیم کی تعلیم اور نشر واشاعت کے سلسلہ میں انجام دیتے رہے۔

۱۔ حفظ قرآن کے مکاتیب کے قیام کا ایک عظیم سلسلہ

حضرت شیخ جولائی ۱۹۴۳ء میں گکھڑ تشریف لائے تو اس وقت یہاں کے لوگوں میں حفظ قرآن کا ذوق بالکل نہ تھا، بلکہ معروف لہجے میں ناظرہ قرآن تلاوت کرنے والے بھی شاذ ونادر ہی تھے۔ اس وقت کی صورت حال حضرت شیخؒ کے الفاظ میں ملاحظہ فرمائیں۔ فرماتے ہیں:

''جب میں ۱۹۴۳ء میں جامع مسجد اہل سنت والجماعت گکھڑ میں بحیثیت امام وخطیب آیا تو اس وقت ہمیں

* رفیق شعبہ تصنیف وتالیف، الشریعہ اکادمی گوجرانوالہ

رمضان میں نماز تراویح میں قرآن سنانے کے لیے اس علاقہ سے کوئی حافظ صاحب نہ مل سکے، بلکہ میانوالی سے ایک حافظ صاحب تشریف لائے اور انہوں نے ہمیں قرآن کریم سنایا جبکہ آئندہ سال تو کافی کوشش اور تگ ودو کے بعد بھی قرآن سنانے کے لیے کوئی صاحب نہ مل سکے۔ جب ماہ مبارک کا چاند نظر آیا اور نماز تراویح کا وقت ہوا، میں نے مصلی امامت پر کھڑے ہو کر انتہائی دکھ کے ساتھ یہ الفاظ کہے: لوگو! آج رمضان المبارک کا مہینہ شروع ہو چکا ہے، لیکن افسوس آج ہمارے درمیان نماز تراویح میں مکمل قرآن سنانے والا کوئی حافظ موجود نہیں ہے۔''

یہ بات یاد رہے کہ حضرت شیخؒ خود قرآن کے حافظ نہ تھے۔ یہ قرآن کریم کے ساتھ آپ کے والہانہ تعلق اور شفقت کا نتیجہ تھا کہ آپ رمضان میں سامع کی حیثیت سے خود قرآن سنتے تھے اور تلاوت کے دوران جو غلطی آتی، بتلا دیتے۔ کیا مجال کہ تلاوت قرآن میں کوئی غلطی گزر جائے اور آپ کو پتہ نہ چل سکے۔

حفظ قرآن سے بے پروائی اور بے اعتنائی کی اس افسوس ناک صورت حال نے آپؒ کو انتہائی پریشان کر دیا، چنانچہ قرآن کے اس عاشق صادق نے جہالت کے اس گھٹاٹوپ اندھیرے میں حفظ قرآن کے لیے قرآنی مکاتیب قائم کرنے کا عزم مصمم کیا۔ مسبب الاسباب نے سبب پیدا فرمایا اور اپنی کتاب مبین کی خدمت کے لیے ایک نومسلم باپ کے بیٹے، راہوالی گتہ فیکٹری کے مالک محترم محمد یوسف سیٹھی کو آپ کا دست وبازو بنا کر مال واسباب کی دنیا میں پرورش پانے والوں پر اس حقیقت کو واضح فرما دیا کہ جب مالک حقیقی کس خوش قسمت سے، خواہ وہ تہی دامن ہی کیوں نہ ہو، خدمت دین لینے کا فیصلہ فرمائیں تو وہ اسباب خود ہی مہیا فرما دیتا ہے۔

ان المقادير اذا ساعدت الحقت العاجز بالقادر

مختصر یہ کہ حضرت شیخؒ اور سیٹھی صاحب کی کوششوں سے ملک بھر میں ہزاروں دینی مکاتب ومدارس قائم ہوئے اور آج بحمد اللہ گکھڑ، گوجرانوالہ اور گردونواح کے علاقوں میں ہزاروں کی تعداد میں حفاظ موجود ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان دونوں بزرگ ہستیوں کی خدمات جلیلہ کو شرف قبولیت عطا فرمائے۔ ان عشاق کے اسمائے گرامی ان شاء اللہ تا قیامت خادمین قرآن کی فہرست میں مہر تاباں بن کر چمکتے رہیں گے۔ حضرت شیخؒ ضعف وپیرانہ سالی میں بھی اس عظیم جدوجہد کا تذکرہ فرماتے تو بے ساختہ آپ کی زبان فیض ترجمان سے یہ شعر جاری ہو جاتا۔

ہمارا خون بھی شامل ہے تزئین گلستان میں
ہمیں بھی یاد کر لینا چمن بھی جب بہار آئے

اس ضمن میں حفظ قرآن کے حوالے سے حضرت شیخؒ کی چار اہم نصائح کا ذکر کرنا بھی مناسب دکھائی دیتا ہے۔ ان میں تین نصائح تو منتظمین مدرسہ اور اصحاب اہتمام سے متعلق ہیں جب کہ ایک نصیحت کا تعلق حفظ قرآن کی سعادت حاصل کرنے والے طلبہ کرام سے متعلق ہے۔ یہ نصائح درج ذیل ہیں:

۱۔ پچاس سالہ تجربہ سے ہم اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ ہر بچے (غبی وغیرہ) کو حفظ نہیں کروانا چاہیے۔ (اصحاب اہتمام اور اساتذہ کو اس نصیحت کی طرف توجہ دینی چاہیے، کیونکہ بعض بچے حفظ قرآن کے لیے سالہا سال لگاتے ہیں لیکن حفظ کیا ہوا حصہ جلدی بھول جاتے ہیں۔ ایسے بچوں کو مکمل حفظ کروانے کی بجائے قرآن کا کچھ منتخب حصہ حفظ کروا دینا بہتر ہے۔)

۲۔ اساتذہ سے میری درخواست ہے کہ ناگزیر صورت میں بھی بچے کو معمولی سے معمولی سزا دیں۔ بچے کو کبھی بھی بے تحاشا نہ ماریں۔ ایسا نہ ہو کہ بچے کو مار مار کر لہولہان کر دیں اور ماں بھی دوڑتی ہوئی آئے، باپ بھی دوڑتا ہوا آئے کہ ہم نے آپ کو کوئی بکرا تو ذبح کرنے کے لیے نہیں دیا تھا، بلکہ بچہ پڑھنے کے لیے دیا تھا۔

۳۔ حفظ قرآن کی تعلیم کے ساتھ ساتھ بچوں کی فکری تربیت اور اخلاقی و عملی تربیت کی طرف بھرپور توجہ دیں۔ بہتر ہے کہ بچوں کو تعلیم الاسلام زبانی یاد کروا دیں۔

۴۔ حفاظ بچوں سے میری درخواست ہے کہ بیٹو! اگر قرآن کو حفظ کرنا مشکل ہے تو حفظ کر کے یاد رکھنا مشکل تر ہے۔ قرآن کریم کو بھول نہ جانا۔ ابوداؤد اور مسند احمد کی روایت ہے کہ جس نے قرآن کو یاد کیا اور پھر بھول گیا تو قیامت کے دن اس کو کوڑھی کر کے اٹھایا جائے گا۔ اللہ تعالیٰ اس انجام بد سے ہر مسلمان کو محفوظ فرمائے۔ آمین۔

جامع مسجد بوہڑ والی گکھڑ میں درس قرآن و حدیث

برصغیر میں حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی اور ان کے قابل فخر صاحبزادگان حضرت شاہ عبد العزیز، شاہ عبد القادر اور شاہ رفیع الدینؒ اور ان کے جانشین اکابر علمائے دیوبند ہمیشہ اس بات کی کوشش فرماتے رہے کہ اس خطہ میں مسلمانوں کا قرآن کے ساتھ فہم و شعور کا تعلق قائم ہو جائے، کیوں کہ اس کے بغیر وہ کفر و ضلالت کے حملوں اور گمراہ کن افکار و نظریات کی یلغار سے خود کو محفوظ نہیں رکھ سکتے۔ اللہ تعالیٰ نے علمائے ہند کو قرآن فہمی میں جو ذوق اور مقام عطا فرمایا تھا، وہ محتاج بیان نہیں۔ اس ضمن میں حضرت شیخ، حضرت حکیم الامت مولانا اشرف علی کا یہ مقولہ اکثر سنایا کرتے تھے: نزل القرآن فی العرب وقرئ فی مصر و کتب فی استنبول وفهم فی الهند۔ قرآن عرب میں نازل ہوا، مصر میں نہایت خوبصورت آواز میں پڑھا گیا اور استنبول میں عمدہ کتابت اور جلد کے ساتھ شائع ہوا اور ہندوستان میں سمجھا گیا۔

حضرت شیخ بھی علمائے ہند کے اسی قافلہ حق کے مسافر تھے۔ آپ نے عامۃ المسلمین کا قرآن کے ساتھ شعوری تعلق قائم کرنے کے لیے جوان تھک اور مثالی جدوجہد سرانجام دی، وہ ہمیشہ راہ حق مسافروں کے جذبات کو جلا بخشتی رہے گی۔ آپؒ ۹ رجولائی ۱۹۴۳ء کو جامع مسجد اہل سنت والجماعت بوہڑ والی میں، جو اب مرکزی جامع مسجد حضرت مولانا سرفراز خان صفدرؒ کے نام سے موسوم ہے، بحیثیت خطیب تشریف لائے تو اپنی آمد کے دوسرے روز ہی ۱۰ رجولائی ۱۹۴۳ کو نماز فجر کے بعد درس قرآن کا مبارک سلسلہ شروع فرما دیا جو ۲۰۰۱ تک تقریباً ۵۸ سال جاری رہا۔ اس مبارک سلسلہ سے ہزاروں عامۃ المسلمین کے قلوب علوم قرآنیہ سے روشن ہوئے۔ ابتدا میں آپ کو انتہائی کٹھن مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ علاقہ میں بدعات و رسومات عام تھیں۔ بقول آپؒ کے گکھڑ بدعت گڑھ تھا۔ لوگوں میں درس قرآن کی مبارک مجلس میں شرکت کا کوئی ذوق و شوق نہ تھا، لیکن آپ نے لوگوں کی بے رغبتی اور شرکا کی قلت و کثرت کی پروا کیے بغیر درس قرآن کے اس مبارک سلسلہ کو جاری رکھا۔

اس دور میں فہم قرآن سے عامۃ المسلمین کی بے توجہی کا یہ واقعہ راقم الحروف نے آپ سے کئی مرتبہ سنا۔ ارشاد فرمایا کرتے تھے کہ میں نے جب گکھڑ بوہڑ والی مسجد میں درس قرآن کا آغاز کیا تو میرے درس میں صرف ایک آدمی حکیم اللہ رکھا بیٹھتے تھے، لیکن میرے عزیزو! میں ہمیشہ درس قرآن کے لیے بھرپور تیاری کرتا، تقریباً درجن کے لگ بھگ عربی تفاسیر کا مطالعہ کرتا اور ان عربی تفاسیر کے علمی نکات کو آسان پیرایے میں بیان کرتا۔ ایک مرتبہ ایک بے تکلف دوست نے کہا،

حضرت! جب کوئی سنتا ہی نہیں تو آپ اتنی مشقت و تکلیف کیوں برداشت کرتے ہیں؟ میں نے عرض کی بھائی، میں اپنا فرض نبھا رہا ہوں۔ یہ جملہ ارشاد فرما کر آپ اکثر اوقات طلبہ اور شرکائے مجلس کو یہ شعر بھی سنایا کرتے تھے:

حق نے کر ڈالی ہیں دوہری خدمتیں تیرے سپرد
خود تڑپنا ہی نہیں اوروں کو تڑپانا بھی ہے

پھر آہستہ آہستہ حضرات و خواتین میں درس قرآن میں شرکت کا وہ جذبہ پیدا ہوا کہ شرکا کی تعداد تین سو کے لگ بھگ ہو گئی۔ آپؒ کی حقیقت شناس نگاہ میں درس قرآن کی اتنی عظمت و محبت تھی کہ شرکائے دورۂ تفسیر و شرکائے دورۂ حدیث اور اہل علم کی دیگر خصوصی مجالس میں اکثر یہ نصیحت ارشاد فرمایا کرتے تھے کہ

"میری آپ سے درخواست ہے کہ اپنی اپنی وسعت و طاقت کے مطابق درس قرآن کا مبارک سلسلہ ضرور شروع کر دیں۔ جس مسلمان کا قرآن سے شعوری تعلق ہو جاتا ہے، دنیا کی کوئی باطل طاقت اس کو گمراہ نہیں کر سکتی۔ یقین جانیے، قرآن کی درس و تدریس بہت بڑی سعادت ہے۔ آپ کو ایک آدمی مل جائے، دو مل جائیں، تین مل جائیں، درس کا سلسلہ شروع کر دیجیے۔"

یہ نصیحت ارشاد فرما کر اپنے استاد محترم مولانا سید حسین احمد مدنیؒ کا یہ واقعہ سنایا کرتے تھے کہ ایک مرتبہ مراد آباد جیل میں اسارت کے دوران حضرت قاری محمد طیب صاحب مہتمم دار العلوم دیوبند ان سے ملاقات کے لیے تشریف لے گئے اور دیکھا کہ حضرت مدنی جیل میں قیدیوں کو تعلیم الاسلام پڑھا رہے ہیں۔ حضرت قاری صاحب نے دل لگی اور از راہ مزاح کہا، حضرت آپ نے تو خوب ترقی کی ہے کہ بخاری شریف پڑھاتے پڑھاتے تعلیم الاسلام پڑھانی شروع کر دی ہے۔ حضرت مدنیؒ نے جواب دیا، "بھائی! کام جو پڑھانا ہوا۔ دار العلوم دیوبند میں بخاری و ترمذی پڑھنے والے تھے، ان کو بخاری و ترمذی پڑھاتا تھا اور یہاں مراد آباد جیل میں تعلیم الاسلام پڑھنے والے ہیں، چنانچہ ان کو تعلیم الاسلام پڑھاتا ہوں۔"

اہل علم کو اس مبارک سلسلہ کی طرف متوجہ کرنے کے ساتھ ساتھ آپ عامۃ المسلمین کو ان مبارک مجالس میں شرکت کی بھرپور تلقین فرماتے۔ اس ضمن میں حضرت شیخ کے الفاظ ملاحظہ فرمائیں:

"محترم سامعین! ابن ماجہ کے حوالہ سے یہ حدیث مبارکہ آپ کئی مرتبہ سن چکے ہیں کہ بغیر ترجمہ کے قرآن کریم کی ایک آیت مبارکہ سیکھنے کا ثواب سو رکعت نماز نفل سے بڑھ کر ہے اور ایک آیت کریمہ و ترجمہ و تفسیر کے ساتھ سیکھنا، اس کا ثواب ہزار رکعت نماز نفل سے زیادہ ہے۔ یہ بات بھی ذہن نشین کر لیں کہ ترجمہ سیکھنا صرف علما ہی کی ذمہ داری نہیں ہے بلکہ تمام مسلمانوں پر فرض ہے، چاہے مرد ہوں چاہے عورتیں۔ اب تو بحمد اللہ گکھڑ میں بھی ۷/۸ ادارے خواتین کی دینی تعلیم کے قائم ہو چکے ہیں۔ ان میں پڑھنے پڑھانے والی معلمات سالہا سال میرے پاس پڑھتی رہی ہیں۔"

حضرت شیخ نے صبح کے عمومی درس میں تقریباً دس گیارہ مرتبہ قرآن مکمل فرمایا۔ آپ نے درس کا آغاز تو قرآن سے کیا، لیکن بعد میں ہفتہ کے تین دن حدیث مبارکہ کے لیے مخصوص فرما دیے۔ اس سلسلہ میں درس قرآن کی تکمیل کے ایک مبارک موقع پر حضرت کے ارشاد فرمائے ہوئے الفاظ ملاحظہ فرمائیں:

"میں پاکستان بننے سے پانچ سال قبل ۹؍جولائی ۱۹۴۳ میں گکھڑ آیا اور ۱۰؍جولائی کو میں نے قرآن کا درس شروع کیا۔ ہفتہ میں تین دن قرآن کا درس ہوتا رہا اور تین دن حدیث کا درس ہوتا رہا۔ الحمدللہ درس سننے والوں نے صحاح ستہ کے علاوہ مستدرک حاکم کی چار جلدیں، ابوداؤد طیالسی، الادب المفرد، الترغیب والترہیب، موارد الظمآن اور الجامع الصغیر دروس میں مرحلہ وار سنی ہیں۔ میں ان کتب کے الفاظ بھی باقاعدہ پڑھتا رہا ہوں تاکہ آپ کے کان آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات کے ساتھ مانوس ہو جائیں۔ میرے خیال میں آج دسویں مرتبہ قرآن مکمل ہوا ہے۔ اگر قرآن کے درس کے ساتھ حدیث کا درس نہ ہوتا تو غالباً بہت زیادہ مرتبہ قرآن مکمل ہو چکا ہوتا۔"

غالباً ۲۰۰۱ء میں موسم سرما کی ایک شام کو راقم الحروف کے دل میں یہ جذبہ پیدا ہوا کہ صبح حضرت استاذ محترم کے درس میں شرکت کی سعادت حاصل کی جائے۔ میں یہ جذبہ لیے اپنے گاؤں سے روانہ ہوا اور نماز فجر باجماعت حضرت استاذ محترم کے ساتھ ادا کی۔ لوگ تپائیاں لے کر آپ کے سامنے بیٹھ گئے۔ آپ نے نماز فجر کے بعد حدیث کا درس شروع کیا۔ آپ عام فہم انداز میں حدیث کی دل نشین تشریح فرما رہے تھے کہ دوران درس اچانک ہی آپ نے عوامی انداز بیان بدلا اور محققانہ وعالمانہ انداز میں علم وعرفان کے موتی بکھیرنے لگے۔ ہر بات باحوالہ، کتاب کے نام، جلد نمبر اور صفحہ نمبر کے ساتھ بیان فرماتے۔ راقم یوں محسوس کر رہا تھا جیسے کتب حدیث کے ایک عظیم ذخیرہ سے مزین لائبریری میں بیٹھا ہو۔ حضرت الاستاذ اس حدیث کا عملی نمونہ نظر آ رہے تھے: نضر الله امرا سمع منا حديثا فحفظه واداه كما سمع ۔درس حدیث کے اختتام پر حضرت کے ارشاد فرمودہ الفاظ آج تک مجھے یاد ہیں۔ فرمایا:

"محترم سامعین! آپ سوچ رہے ہوں گے کہ آج میں نے یہ محققانہ انداز بیان کیوں اختیار کیا ہے۔ اصل میں کبھی کبھار درس میں کئی علما شریک ہو جاتے ہیں۔ میں یہ انداز بیان ان کے علمی ذوق وجستجو کو بڑھانے کے لیے اختیار کرتا ہوں۔"

اللہ اکبر! یہ حضرت شیخ کی شفقت تھی کہ مجھ جیسے علم وعمل سے تہی دامن طالب علم کے لیے یہ محققانہ عالمانہ انداز بیان اختیار فرمایا۔ اللہ تعالیٰ ہمیں بھی آپ کی علمی جستجو، تحقیق وتالیف، درس وتدریس اور پاکیزہ صفات میں سے اپنی شان کے مطابق حصہ عطا فرمائیں، آمین۔

حضرت امام اہل سنت صبح کے درس قرآن میں جن امور کا بطور خاص خیال فرماتے تھے، راقم مناسب خیال کرتا ہے کہ ان میں سے چند امور کا یہاں ذکر کر دیا جائے۔

۱۔ حاضرین کی ذہنی وعلمی سطح کے مطابق انداز بیان

آپ کے درس میں شریک ہونے والے حضرات وخواتین کی تعداد سینکڑوں سے متجاوز تھی۔ خواتین کے لیے علیحدہ باپردہ انتظام تھا۔ آپ ہمیشہ سامعین کی ذہنی علمی وسطح کو سامنے رکھتے ہوئے اتنا آسان اور سہل انداز اختیار فرماتے کہ قرآن کی مجمل ومتشابہ آیات کی تفسیر اور مشکل مقامات بآسانی سمجھ آ جاتے۔ آپ کے دروس حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے اس مشہور جملہ کی عملی تصویر نظر آئیں گے کہ کلموا الناس على قدر عقولهم، لوگوں سے ان کی عقل کے مطابق گفتگو کرو۔ یہی وجہ ہے کہ حضرت شیخ کے گکھڑ کے عمومی ماحول کو سامنے رکھتے ہوئے صبح کا درس اور خطبہ جمعہ پنجابی زبان میں ارشاد فرمایا کرتے

تھے۔ آپ پٹھان ہونے کے باوجود پنجابی روانی اور مسلسل سے بولتے تھے۔ خود ارشاد فرمایا کرتے تھے کہ "میں نے پنجابی کتب کا مطالعہ اور مشق سے پنجابی زبان میں اتنی مہارت حاصل کر لی ہے کہ ناواقف شخص پہچان نہیں سکتا کہ میں پنجابی ہوں یا پٹھان۔ میں نے پنجابی ادب کی ایسی مشکل ترین کتابوں کا مطالعہ کیا ہے جو اکثر پنجابیوں کی بھی سمجھ میں نہیں آتیں۔"

بحمداللہ آپ کے پنجابی زبان میں ارشاد فرمائے ہوئے دروس اردو زبان میں "ذخیرۃ الجنان فی فہم القرآن" کے نام سے مرحلہ وار زیور طبع سے آراستہ ہو رہے ہیں اور اس کی آٹھ جلدیں منظر عام پر آ چکی ہیں، گو دروس میں بطور حوالہ ارشاد فرمائی ہوئی اکثر آیات مبارکہ، احادیث مبارکہ، فقہی وتاریخی کتب کے حوالہ جات کی تخریج اور پروف کی اغلاط کی تصحیح کا کام باقی ہے جو امید ہے کہ ان شاء اللہ آئندہ مراحل میں مکمل کر لیا جائے گا۔ اسی طرح آپ کے جمعۃ المبارک کے خطبات تین جلدوں میں شائع ہو چکے ہیں، لیکن اس میں بھی پروف ریڈنگ کی فاش غلطیاں ہیں۔ خاص طور پر قرآن کی آیات اور احادیث کے نقل کرنے میں جو غلطیاں ہوئی ہیں، ان کی تصحیح بہت ضروری ہے۔

۲۔ عقائد واعمال کی اصلاح

یہ بات اظہر من الشمس ہے کہ فوز وفلاح کا مدار عقائد واعمال کی اصلاح پر موقوف ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آپؒ کے درس میں شرکت فرمانے والے اکثر حضرات وخواتین کی گفتار وکردار میں اسلامی عقائد واعمال کی وہ مثالی اور قابل رشک پختگی اور صلابت جھلکتی ہے، جس سے بخوبی معلوم ہو سکتا ہے کہ آپ نے اس پیغام کو ان کے دل ودماغ میں راسخ کرنے کے لیے کتنی کوششیں صرف فرمائی ہوں گی۔ اللہ تعالیٰ آپ کو اپنی شایان شان اجر جزیل عطا فرمائے۔ آپ توحید باری تعالیٰ کو قرآن وسنت کے ٹھوس دلائل کی روشنی میں اس خوبصورت انداز سے بیان فرماتے کہ شرک وبدعت کے تمام اندھیرے دل ودماغ سے چھٹ جاتے اور سامعین خود کو توحید کی روشنی میں 'باب جنت' کی طرف محو پرواز دیکھتے۔ عقیدۂ توحید باری کی مٹھاس کے متعلق آپ کا یہ ملفوظ ہمیشہ اہل ایمان کے قلوب کو جلا بخشتا رہے گا کہ "عقیدۂ توحید کڑوا ضرور ہے، مگر سمجھ میں آ جائے تو اس سے میٹھی چیز کوئی نہیں۔" اس مقدس موضوع کے مختلف پہلوؤں پر آپ نے گلدستہ توحید، تبرید النواظر فی تحقیق الحاضر والناظر، تحقیق مسئلہ مختار کل اور دل کا سرور جیسی کتب تصنیف فرما کر آئندہ نسلوں پر احسان عظیم فرمایا ہے۔

آپ عقائد اسلام کے تعارف کے ضمن میں عقیدہ ختم نبوت کی اہمیت اس انداز میں بیان فرماتے ہیں کہ عقیدہ حاضرین کے قلوب میں رچ بس جاتا۔ یہی وجہ ہے کہ "ذخیرۃ الجنان فی فہم القرآن" کی ہر جلد میں تقریباً کئی کئی مقامات پر اس عقیدہ کا تعارف کروایا گیا ہے اور اس عقیدہ پر ڈاکہ ڈالنے والے مرزا غلام احمد قادیانی اور اس کے پیروکاروں کے کفریہ عقائد ونظریات پر کاری ضرب لگائی گئی ہے۔ اس عقیدہ کے تحفظ کے لیے آپ نے زندانوں کو بھی آباد کیا اور کردار یوسفی کو زندہ کرتے ہوئے اپنے عمل سے استقامت کا یہ پاکیزہ درس دیا۔

آپ عقائد کی تصحیح کے ساتھ ساتھ اعمال صالحہ کی بھی بھرپور ترغیب ارشاد فرماتے۔ یہ ترغیب صرف زبانی نہیں ہوتی تھی بلکہ عملی طور پر حاضرین وسامعین کے قلوب واذہان پر نقش کرنے کی کوشش فرماتے۔ آپ کا روشن کردار اعمال صالحہ کی عملی تصویر بن کر اکابر واسلاف کی تابندہ روایات کی یاد دلاتا ہے اور تشنگان رشد وہدایت کے قلوب کو جلا بخشتا ہے۔ آپ کی پاکیزہ گفتار وکردار سے ہزاروں بندگان خدا کے کردار اعمال صالحہ کے عملی نمونہ بن گئے۔

آپ کے درس قرآن میں تیس سال تک شرکت فرمانے والے ایک ضعیف العمر بزرگ محترم جاوید اقبال بٹ (جو کئی ماہ سے راقم الحروف کے پیچھے جامع مسجد سید ابوایوب انصاریؓ سرفراز کالونی گوجرانوالہ میں نماز جمعہ ادا فرماتے ہیں) سے راقم الحروف نے آپ کے درس کی نمایاں خصوصیت کے بارے میں جاننا چاہا تو موصوف میرا سوال سن کر کوئی جواب ارشاد فرمانا چاہتے تھے، لیکن جواب سے پہلے ان کی آنکھوں سے آنسو رواں ہوگئے اور وہ یوں مسلسل روئے جا رہے تھے جیسے ایک بچہ اپنے ماں باپ کے شفقت بھرے لمحات یاد کر کے روتا ہے۔ راقم مسجد میں کھڑا ان کو تسلی بھی دے رہا تھا اور سوچ رہا تھا کہ یہ آنسو حضرت استاد محترمؒ کے اہم پیغام کی طرف اشارہ کر رہے ہیں: ''میرے عزیزو! الحمدللہ ہم نے اپنے اکابر و اسلاف کا قرض چکا دیا۔ اب یہ تمہاری ذمہ داری ہے کہ اس امانت کا تحفظ کرو۔'' جب یہ بزرگ خاموش ہوئے تو مختصر جملہ میں درج ذیل جواب ارشاد فرمایا کہ ''میں الحمدللہ تقریباً ۳۰ برس صبح کے درس میں حضرت اور حاضرین کے سامنے لکڑی کی تپائیاں اور قرآن کریم کے نسخے رکھنے والوں میں شریک رہا۔ مجھے اور میرے خاندان کو اللہ تعالیٰ نے حضرت شیخؒ کے قدموں سے وابستہ فرما کر ہدایت کی دولت سے مالا مال فرمایا۔''

۳۔ بدعات اور رسم و رواج پر کاری ضرب

حضرت شیخؒ اپنے دروس میں شرک و بدعت اور رسم و رواج پر ضرب کاری لگاتے تھے۔ جب حضرت جولائی ۱۹۴۳ء میں گکھڑ تشریف لائے تو گکھڑ اور گرد و نواح میں شرک و بدعات اور جاہلانہ رسوم و رواج عام تھیں۔ آپ اپنی خود نوشت میں خود فرماتے ہیں:

''مجھ سے پہلے گکھڑ میں حضرت مولانا علیم الدین جالندھریؒ فاضل دیوبند خطیب تھے۔ موصوف کی طبیعت بہت نرم تھی، اس لیے گکھڑ جیسے بدعات گڑھ میں ان سے شرک و بدعت کے طوفان کا مقابلہ پوری طرح نہ ہو سکا۔ البتہ ان سے پہلے حضرت مولانا محمود الحسن جالندھری نے خاصا کام کیا۔''

حضرت شیخؒ قرآن و سنت کے دلائل کی روشنی میں شرک و بدعت کی بھرپور تردید فرماتے تھے۔ شرک و بدعت اور رسوم و رواج کے ایوانوں میں ہمیشہ آپ کے نام سے زلزلہ برپا رہا۔ آپ لوگوں کو توحید و سنت کا جام بھر بھر کر پلاتے رہے۔ یہی وجہ ہے کہ گکھڑ جو بدعت گڑھ تھا، توحید و سنت کے نور سے جگمگا اٹھا۔ حضرت شیخؒ اپنے الفاظ میں اس کا نقشہ یوں بیان فرماتے ہیں:

''راقم الحروف ۹ جولائی ۱۹۴۳ء کو گکھڑ پہنچا اور اگلے ہی دن درس قرآن شروع کر دیا اور جمعہ پڑھانے کی ذمہ داری بھی قبول کر لی، لیکن ابتدائی دور شدید مخالفت کے باوجود صبر آزما گزرا۔ اللہ تعالیٰ کے کرم و فضل سے پائے استقامت میں ذرہ بھر بھی فرق نہ آیا۔''

۴۔ داعیانہ اور ناصحانہ انداز بیان

حضرت شیخؒ کے دروس کا ایک نمایاں اور ممتاز وصف جس نے ہزاروں لوگوں کے دل موہ لیے، داعیانہ اور ناصحانہ انداز بیان اور انی لکم ناصح امین کی عملی تصویر تھا۔ آپ اپنے تمام متعلقین کو یہ نصیحت فرمایا کرتے تھے کہ آپ کے موقف میں لچک اور نرمی نہیں ہونی چاہیے، لیکن انداز گفتگو میں ہمیشہ نرمی ہونی چاہیے۔ اس ضمن میں آپ کسی مخالف کی تلخ کلامی اور دل آزار گفتگو پر ناراض ہونے کی بجائے ہمیشہ تحمل، بردباری اور خیر خواہی کا رویہ اختیار فرماتے۔ حضرت شیخؒ کے طرز سے یہ حقیقت اظہر من الشمس ہوتی ہے کہ تلخ و ترش انداز تکلم سے متاثر ہو کر جذبات کی رو میں بہہ جانا انبیائے کرام علیہم السلام اور وارثان انبیا کا شیوہ نہیں ہے۔ آج ہم اپنے دروس اور تقاریر میں یہی داعیانہ اور ناصحانہ انداز گفتگو اختیار کریں تو یقیناً ہماری گفتگو میں انبیا کے انداز تکلم کا نور چمکے گا جو ان شاء اللہ ہماری اور سامعین کی رشد و ہدایت کا سبب بنے گا۔ شیخ الاسلام علامہ شبیر احمد عثمانیؒ نے کیا خوب فرمایا کہ حق بات حق طریقے پر اور حق کی نیت سے کہی جائے تو یقیناً اثر انداز ہوتی ہے۔ حضرت شیخؒ اسی داعیانہ اور ناصحانہ انداز بیان کی ضرورت و اہمیت کے متعلق بیان فرماتے ہوئے قرآن کی اس آیت سے عموماً استشہاد فرماتے: فقولا له قولا لينا لعله يتذكر او يخشى ۔ (اسے نرم بات کہنا، شاید وہ نصیحت قبول کر لے یا ڈر جائے۔) اس آیت کی تلاوت کے بعد ارشاد فرماتے:

''غور فرمائیے، اللہ تعالیٰ نے جب حضرت موسیٰ اور حضرت ہارونؑ کو فرعون جیسے متکبر اور خدائی کا دعویٰ کرنے والے سرکش آدمی کے پاس پیغام ہدایت پہنچانے کے لیے بھیجا تو یہی نصیحت فرمائی کہ اس کے ساتھ نرم لہجہ میں گفتگو کرنا۔ کہیں تمہارا سخت اور ترش لہجہ اس کے لیے قبول حق میں رکاوٹ نہ بنے۔ آپ خود سوچیں کہ کیا ہم میں سے کوئی حضرت موسیٰ اور حضرت ہارون کے مقام تک پہنچنے کا تصور بھی کر سکتا ہے؟ ہرگز نہیں۔ اور ہمارا مخاطب خاص طور پر مسلمان خواہ وہ کیسا ہی کیوں نہ ہو، ضلالت و گمراہی میں فرعون کے درجے کو نہیں پہنچ سکتا تو ہمارے لیے کیسے روا اور جائز ہے کہ ہم پیغام رشد و ہدایت پہنچانے کے لیے تند و تیز اور ترش و تلخ لہجہ اختیار کریں؟''

داعیانہ اور ناصحانہ انداز بیان سے گفتگو کی اہمیت و افادیت کئی گنا بڑھ جاتی ہے اس انداز کی جھلک آپؒ کے دروس میں جا بجا نظر آتی ہے۔

۵۔ فرق باطلہ کا تعارف

آج کے پرفتن دور میں جب باطل فرقے برسات کے مینڈکوں کی طرح عام ہیں اور وہ مختلف آوازیں نکال کر سادہ لوح مسلمانوں کے ایمان و اعمال پر ڈاکہ ڈالنے کے لیے کوشاں ہیں تو اہل علم کے لیے ضروری ہے کہ وہ عامۃ المسلمین کے عقائد و ایمان کی حفاظت کے لیے ان کو فرق باطلہ کے فکری پس منظر، عقائد و نظریات کے تعارف، ان کے اہداف اور اس سلسلہ میں ان کی ذمہ داریوں سے آگاہ کریں۔ حضرت شیخؒ اس ذمہ داری سے بخوبی آگاہ تھے اور موقع محل کے مطابق وہ شرکائے درس کو باطل فرقوں کی ضلالت و گمراہی سے آگاہ کرتے اور راہ ہدایت کو دلائل و براہین کی روشنی میں واضح فرماتے۔ اس سلسلہ میں حضرت کے الفاظ ملاحظہ فرمائیں:

''پاکستان میں بہت سے باطل فرقے ہیں۔ ہندو، سکھ، عیسائی، یہودی، پارسی، رافضی، آغا خانی، قادیانی، بہائی، ذکری وغیرہ۔ آپ کسی سے پوچھ کر دیکھ لیں، وہ یہی کہے گا کہ ہم راہ حق پر ہیں اور جو کچھ کر رہے ہیں، صحیح کر رہے ہیں۔ آپ ضابطہ یاد رکھیں۔ جو شخص یا جماعت قرآن و سنت سے ہٹ گئی، اجماع امت سے ہٹ گئی، وہ گمراہی کی وادیوں میں داخل ہو چکی۔ ہدایت قرآن کریم، حدیث مبارکہ اور اجماع امت میں ہے۔ ائمہ دین، فقہائے کرام، محدثین عظام کی تعلیمات سے الگ ہو کر کوئی دین سمجھنا چاہے تو میں یہی عرض کروں گا: ایں خیال است و محال است و جنون۔ ان بزرگوں نے دین کو سمجھا اور اس پر عمل کیا۔ ان کو چھوڑ کر کوئی دین کو نہیں سمجھ سکتا۔''

۷۔ سلوک وتصوف

سلوک وتصوف کا مقصد حقیقی تزکیہ نفس اور باطن کہ اصلاح ہے۔ امام غزالی سے لے کر مولانا عبدالماجد دریابادی تک جب بھی کسی پر عقل وخرد کا غلبہ ہوا تو اسے خود کو سنبھالنے، تہافت سے بچانے اور تکمیل ذات کے لیے معرفت وسلوک کا سہارا لینا پڑا۔

فلسفی سر حقیقت نتوانست کشود
گشت رازے دگر آں راز کہ افشائی کرد

لیکن بعض نادان لوگوں نے اس سلسلہ میں افراط وتفریط سے کام لیا ہے۔ بعض نے تو اسے غیر ضروری بلکہ دینی اعتبار سے نقصان دہ خیال کرتے ہوئے کلیتاً رد کر دیا جب کہ بعض نے سلوک وتصوف کا سہارا لیتے ہوئے جاہلانہ من گھڑت قصص وواقعات اور بدعات ورسومات کو دین کا درجہ دے دیا۔ حضرت شیخ شریعت وطریقت دونوں کو لازم وملزوم سمجھتے ہوئے اپنے دروس میں سلوک وتصوف کا مقام اور تزکیہ نفس کی اہمیت پر بڑی تفصیل سے روشنی ڈالتے تھے اور فرمایا کرتے تھے:

''آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے فرائض منصبی میں سے دوسرا فرض منصبی ویزکیھم (اور تمہیں پاک کرتے ہیں) ہے۔ تزکیہ حقیقتاً تو رب تعالیٰ کا کام ہے، لیکن آپ صلی اللہ علیہ وسلم اس کا ذریعہ ہیں۔ آپ کی پاکیزہ تعلیمات، آپ کے اخلاق حسنہ، آپ کا اعلیٰ کردار لوگوں کے دلوں میں صفائی کا ذریعہ بنا۔''

دلوں کی پاکیزگی بہت ضروری ہے۔ بزرگان دین میں بیعت اور پیری مریدی کا یہی مقصد ہے کہ دل صاف ہو جائیں۔ دل صاف ہو جائیں تو بہت کچھ حاصل ہو جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ حضرتؒ اپنے اکابر کے تصوف وسلوک سے وابستگی کو ان الفاظ میں بیان فرمایا کرتے تھے:

''ہم نے اپنے اکابر کو اس حال میں دیکھا کہ ان میں ہر ایک باطنی اصلاح اور تزکیہ نفس کے فکر میں لگا رہتا، جبکہ ان میں بعض تو شیخ طریقت کے منصب پر فائز تھے جبکہ بعض دوسروں کے دست حق پرست پر بیعت تھے۔ بہرحال اس سلسلہ سے ہر ایک وابستہ تھا۔''

۸۔ معاملات ومعاشرت

معاملات ومعاشرت کی درستی اور اصلاح آپؒ کے دروس کا ایک نمایاں اور ممتاز وصف تھا۔ آپؒ معاملات کی درستی اور اصلاح کی بڑی تاکید فرماتے تھے۔ اس سلسلہ میں حضرتؒ کے الفاظ ملاحظہ ہوں:

''یاد رکھیے، دین اسلام میں حقوق العباد کی ادائیگی کی بڑی اہمیت ہے۔ جب تک صاحب حق معاف نہیں کرے گا، رب تعالیٰ بھی معاف نہیں کریں گے۔ حق باپ کا ہو، بھائی کا ہو، چچا کا ہو، پھوپھی کا ہو، بہن کا ہو یا کسی اور کا، خوب یاد رکھیے حق کی معافی نہیں ہے۔ قرضہ بھی حق ہے۔ ایک سوئی بھی کسی کے ذمہ ہے تو وہ بھی بڑی بھاری ہے۔ میں معاملات ومعاشرت کی اصلاح کے ضمن میں شیخ عبدالقادر جیلانیؒ کی غنیۃ الطالبین کے حوالہ سے یہ واقعہ کئی مرتبہ عرض کر چکا ہوں کہ ایک نیک پرہیزگار آدمی کا انتقال ہو گیا۔ وفات کے بعد کسی نے ان کو خواب میں دیکھا اور پوچھا کہ آپ کے ساتھ کیا معاملہ ہوا ہے۔ فرمایا، مجھے سزا تو نہیں ہوئی، لیکن جنت کے دروازے کے اندر

داخلہ ممنوع ہے۔ مجھے ممانعت کی یہ وجہ بتلائی گئی ہے کہ تو نے ہمسایے سے کپڑا سینے کے لیے سوئی مانگی تھی، وہ واپس نہیں کی۔ جب تک وہ سوئی نہیں تیرے ورثا واپس نہیں کریں گے، تو جنت میں نہیں جا سکتا۔ اندازہ لگاؤ کسی کے حق کا، سوئی کتنی بھاری ہے اور یہاں تو لوگ دوسروں کی مشینیں، کارخانے، دوکانیں اور مکان غائب کر دیتے ہیں اور کوئی پروا نہیں کرتے۔''

درج بالا صفحات میں آپ نے ان اہم نکات کا مطالعہ کیا جن کا حضرت شیخ اپنے دروس میں بطور خاص خیال کرتے تھے۔ آپ کے ۵۸ سال پر محیط درس قرآن نے سیکڑوں، ہزاروں دلوں میں شمع قرآنی کو فروزاں کیا اور آج بحمد اللہ آپ کے ہزاروں تلامذہ روزانہ اپنے اپنے دائرۂ کار میں درس قرآن ارشاد فرما کر آپ کے اس فیض کو جاری رکھے ہوئے ہیں۔

گورنمنٹ ایلمنٹری کالج آف ٹیچرز میں درس قرآن

گکھڑ منڈی میں زیر تربیت اساتذہ کے لیے عرصہ دراز سے ایک ٹیچرز ٹریننگ کالج قائم ہے جس کا نام پہلے گورنمنٹ ٹریننگ انسٹی ٹیوٹ تھا جب کہ بعد میں اس کا نام تبدیل کر کے گورنمنٹ ایلمنٹری کالج آف دی ٹیچرز رکھا گیا جس میں ایس وی، او ٹی، سی ٹی، پی ٹی سی اور بی ایڈ وغیرہ کلاسز ہوتی ہیں۔ ان کلاسز میں شریک زیر تربیت اساتذہ کے لیے کالج کے پرنسپل ملک عبدالحمید صاحبؒ نے اپنے دینی ذوق اور قرآن کی تعلیم سے محبت اور لگاؤ کی وجہ سے مستقل درس قرآن کا فیصلہ کیا اور اس مقصد کے لیے ان کی نظر انتخاب حضرت شیخ پر پڑی۔ چنانچہ ان کی دعوت اور پرخلوص تحریک پر آپ نے زیر تربیت اساتذہ کے لیے کالج میں درس قرآن کا مبارک سلسلہ شروع کیا۔ اگرچہ اس عظیم نیک عمل کا آغاز اللہ تعالیٰ نے ملک صاحب کی قسمت میں لکھا تھا، تاہم آپ کے عالمانہ طرز بیان اور محققانہ طرز استدلال کی وجہ سے اس درس قرآن نے خوب شہرت پائی اور اس شہرت کی وجہ سے ملک صاحب کے بعد بھی درس کا یہ سلسلہ مستقل چالیس سال جاری رہا۔ اگرچہ بعض متعصب پرنسپل صاحبان نے محض مسلکی اختلاف کی بنیاد پر اپنے انتظامی دور میں اس سلسلہ درس کو روکنے کی کوشش بھی کی، لیکن وہ اپنے مقصد میں کامیاب نہ ہو سکے۔ اس درس قرآن کے سلسلہ میں جن پرنسپل صاحبان نے پوری کوشش کی، ان میں ملک عبدالحمید، میاں عمران الدین اور میاں منیر احمد کے نام نمایاں ہیں۔

اس کالج میں زیر تربیت اساتذہ فراغت کے بعد ملازمت کے سلسلہ میں ملک بھر کے تعلیمی اداروں میں پھیل جاتے ہیں، اس لیے ملک بھر کے جن تعلیمی اداروں میں بھی اس درس قرآن میں شریک ہونے والے اساتذہ پہنچے، وہیں ان کے ذریعے ہزاروں لاکھوں طلبہ تک قرآن حکیم کا پیغام بھی پہنچا۔ جدید علمی حلقوں میں اس درس قرآن کو بے حد پذیرائی حاصل ہوئی۔ اس علمی شہرت کی بنا پر کالج کے ایک پرنسپل مرزا نثار صاحب نے محض مسلکی اختلاف کی بنا پر اس سلسلہ کو ختم کرنے کی بھرپور کوشش کی، لیکن کامیاب نہ ہو سکے۔ حالانکہ حضرت درس میں اختلافی مسائل پر معاندانہ رویہ ہرگز اختیار نہ فرماتے تھے، بلکہ قرآن کا حقیقی پیغام، پیغام رشد وہدایت، سامعین تک پہنچانے کی کوشش فرماتے تھے۔ چالیس سال کے عرصہ کو محیط یہ مبارک سلسلہ قرآن حکیم کی تعلیمات سے آپ کے والہانہ شغف اور لگاؤ کا نتیجہ ہی تھا۔ کوئی دنیاوی مفاد آپ کے پیش نظر ہرگز نہ تھا۔ درس قرآن کے ابتدائی دور میں آپ کو کالج کی طرف سے پندرہ روپے وظیفہ ملتا تھا اور ۱۹۹۳ء تک یہ وظیفہ پچاس روپے سے زیادہ نہ ہوا اور آخری سالوں میں یہ بھی بند کر دیا گیا، لیکن آپ کے پیش نظر تو صرف اور صرف قرآن کا پیغام نسل نو

تک پہنچانا تھا۔آپ اس حقیقت سے بخوبی آشنا تھے کہ اس ادارہ میں زیر تربیت اساتذہ کے ذریعے وہ اپنا پیغام نسل نو تک پہنچا سکتے ہیں۔کالج آپ کی رہائش سے تقریباً ایک میل دور ہے۔آپ چالیس سال تک روزانہ پیدل موسم گرما میں عصر کے بعد اور موسم سرما میں عشا کے بعد درس قرآن کے لیے تشریف لے جاتے۔درس کے لیے ایک میل پیدل جانا اور ایک میل پیدل واپس آنا آپ کے اخلاص وللّٰہیت کا منہ بولتا ثبوت ہے۔بارگاہ ایزدی سے اس عظیم خداوندی کی سرفرازی پر آپ ہمیشہ اظہار تشکر کرتے اور اہل علم کے جذبہ کو مہمیز کرنے کے لیے اس نعمت کا اظہار ان الفاظ میں فرماتے:

”میں نے بحمد اللہ تعالیٰ گورنمنٹ ٹریننگ انسٹی ٹیوٹ گکھڑ میں زیر تربیت اساتذہ کو پورے چالیس سال قرآن کریم کا درس دیا ہے۔مختلف اضلاع سے تعلق رکھنے والے ہزاروں اساتذہ نے اس درس سے استفادہ کیا۔درس میں شریک ہونے والوں کی تعداد چار سے پانچ سو کے لگ بھگ ہوتی تھی۔زیر تربیت اساتذہ کے علاوہ پرنسپل اور پروفیسر حضرات بھی درس میں موجود ہوتے تھے۔درس قرآن کی یہ عظیم نعمت محض اللہ تبارک کا فضل واحسان ہے۔“

آپ درس قرآن کے شرکا کی علمی وذہنی سطح کے مطابق قرآن کا آفاقی پیغام ان تک پہنچانے کی کوشش فرماتے۔درس کے شرکا کے علمی سوالات کے جوابات ارشاد فرماتے، عقائد واعمال کی اصلاح کی بھرپور کوشش فرماتے، اور ذہنوں میں ابھرنے والے شکوک وشبہات رفع فرما کر ان کو ایمان ویقین کی دولت سے مالا مال کرنے کی کوشش کرتے۔اس ضمن میں قرآن کی ایک آیت کے حوالہ سے ذہن میں ابھرنے والا ایک شبہ اور اس کا جواب حضرت شیخؒ کے الفاظ میں ملاحظہ فرمائیں:

”ایک روز گورنمنٹ کالج گکھڑ میں درس قرآن میں میں نے سورۃ آل عمران کی یہ آیت تلاوت کی۔ولا تھنوا ولا تحزنوا وانتم الاعلون ان کنتم مومنین۔(نہ تم سستی دکھانا اور نہ ہی غمزدہ ہونا اور اگر فی الواقع تم ایمان والے ہوئے تو تم ہی غالب رہو گے۔تلاوت وترجمہ کے بعد مختصر تفسیر بھی بیان کی۔درس کے بعد ایک پروفیسر صاحب مجھ سے پوچھنے لگے حضرت! کیا ہم ایمان والے نہیں ہیں؟ اگر ہم ایمان والے ہیں تو پھر آیت کریمہ میں مذکورہ سربلندی وکامیابی ہم سے کوسوں دور کیوں ہے؟ میں نے پروفیسر صاحب کی خدمت میں عرض کیا: اللہ تعالیٰ نے سربلندی اور کامیابی کے لیے ایمان کے اقرار کے ساتھ جن چیزوں کو لازم قرار دیا ہے، ان کو ملحوظ رکھنا ضروری ہے۔ان کا ذکر قرآن کے مختلف مقامات پر ہے۔ان میں پہلی چیز اتفاق واتحاد ہے۔اللہ تعالیٰ قرآن میں اس کا حکم ان الفاظ میں ارشاد فرماتے ہیں: واعتصموا بحبل اللہ جمیعا ولا تفرقوا (اللہ تعالیٰ کی رسی کو مضبوطی سے تھام لو اور فرقہ بندی نہ کرو)۔اتفاق واتحاد کے بغیر کامیابی وسربلندی کا تصور بھی ممکن نہیں، چنانچہ اتفاق واتحاد بھی ہمارے ایمان کا حصہ ہے۔دوسری چیز زمانہ کی ضرورت کے مطابق اسلحہ اور ہتھیار مہیا کرنا ہے۔اللہ تعالیٰ اس کا حکم بھی قرآن میں ارشاد فرماتے ہیں: واعدوا لھم ما استطعتم من قوۃ ومن رباط الخیل ترھبون بہ عدو اللہ وعدوکم۔(جہاں تک ممکن ہو سکے، اپنے دشمنوں کے مقابلہ کے لیے قوت اور جنگی گھوڑے تیار رکھو۔) کامیابی کے لیے تیسری چیز میدان جنگ میں بہادری اور مردانہ وار دشمن سے لڑنا ہے جس کا حکم اللہ تعالیٰ نے سورۃ الانفال میں ارشاد فرمایا ہے۔حدیث مبارکہ میں میدان جنگ سے بھاگ جانے اور پیٹھ دکھانے کو کبیرہ گناہ شمار کیا گیا ہے۔کامیابی کے لیے چوتھی چیز اہم امور میں مشاورت ہے۔اللہ تعالیٰ اس کا حکم ان الفاظ کے

ساتھ ارشاد فرماتے ہیں: وامرھم شوری بینھم (مسلمانوں کے معاملات باہمی مشاورت سے طے پاتے ہیں) پانچویں چیز اولی الامر کی اطاعت ہے جس کا ذکر ان الفاظ کے ساتھ مذکور ہے: یایھا الذین آمنوا اطیعوا اللہ واطیعوا الرسول واولی الامر منکم (اے ایمان والو! اللہ کی اور اس کے رسول کی اطاعت کرو اور ان حاکموں کی بھی جو تم میں سے ہوں)۔عالم اسباب میں ہم ان چیزوں پر عمل کریں گے تو کامیابی ہوگی۔آپ خود فیصلہ فرمائیں کہ کیا یہ چیزیں ہمارے ایمان میں شامل ہیں؟ پروفیسر صاحب میری گفتگو سن کر بولے، حضرت! آپ کو قرآن فہمی مبارک ہو۔اللہ تعالیٰ آپ کو جزائے خیر دے۔اب یہ حقیقت مجھ پر واضح ہوگئی ہے کہ کامیابی کے لیے دعوائے ایمان کے ساتھ اس کے تقاضوں پر عمل کرنا بھی ضروری ہے۔“

درج بالا واقعہ سے یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ پروردگار نے آپ کو قرآن فہمی کی دولت کے ساتھ ساتھ مخاطب کی نفسیات اور ذہنی سطح کے مطابق قرآن کی دعوت کے ابلاغ کا سلیقہ بھی عطا فرمایا تھا۔اسی نوع کا ایک اور واقعہ حضرت شیخؒ کے الفاظ میں ملاحظہ فرمائیں:

”گورنمنٹ کالج گکھڑ میں سورۃ عنکبوت کی درج ذیل آیت کے متعلق درس ہو رہا تھا: فاقم وجھک للدین حنیفا، فطرت اللہ التی فطر الناس علیھا، لا تبدیل لکلمات اللہ، ذلک الدین القیم، ولکن اکثر الناس لا یعلمون (اے نبی کریم! یکسو ہو کر دین کی طرف متوجہ ہو جاؤ۔یہی فطرت الٰہی ہے جس پر اس نے لوگوں کو پیدا کیا ہے۔اللہ تعالیٰ کی اس خلقت میں کوئی ردوبدل نہیں ہو سکتا۔دین قیم یہی ہے لیکن اکثر لوگ نہیں جانتے)۔جن دنوں اس آیت کے متعلق درس ہو رہا تھا، ان دنوں اخبارات میں جنس کی تبدیلی کے متعلق مختلف مضامین شائع ہو رہے تھے کہ فلاں جگہ لڑکی کی جنس بدل گئی اور وہ لڑکا بن گئی۔درس کے بعد ایک پروفیسر صاحب نے کہا کہ حضرت مولانا! آپ فرما رہے ہیں: لا تبدیل لخلق اللہ، اللہ تعالیٰ کی خلقت میں کوئی ردوبدل نہیں ہو سکتا، حالانکہ فلاں جگہ لڑکی کی خلقت اور جنس بدل گئی ہے۔میں نے عرض کیا کہ آپ آیت کے سمجھنے میں غلط فہمی کا شکار ہیں۔اس قرآنی جملہ میں خلقت سے مراد فطرت ہے جس کا ذکر ماقبل جملہ میں ہے: فطرت اللہ التی فطر الناس علیھا، اور پھر فطرت سے مراد دین ہے جس کا ذکر مابعد جملہ میں ہے: ذلک الدین القیم (دین قیم یہی ہے)۔اسی بات کا ذکر بخاری ومسلم کی اس روایت میں ہے: قال النبی صلی اللہ علیہ وسلم: کل مولود یولد علی الفطرۃ فابواہ یھودانہ او ینصرانہ او یمجسانہ۔(ہر بچہ فطرت اسلام پر پیدا ہوتا ہے۔پھر اس کے والدین اس کو یہودی یا عیسائی یا پارسی بنا لیتے ہیں)۔چنانچہ آیت اور حدیث میں فطرت سے مراد دین اسلام ہے، توحید باری تعالیٰ ہے اور یہ نہیں ہو سکتا کہ کبھی توحید کا حکم ہو اور کبھی شرک کا، کبھی دین اسلام کے قبول کرنے کا حکم ہو اور کبھی انکار ہو۔چنانچہ آیت میں خلقت وفطرت سے مراد جنس نہیں ہے بلکہ اس سے مراد دین اسلام ہے۔اس وضاحت کے بعد پروفیسر صاحب مطمئن ہو گئے۔“

گورنمنٹ کالج گکھڑ میں ۴۰ سال تک درس قرآن کے عظیم اور مبارک سلسلہ سے یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ آپ جدید تعلیم یافتہ طبقہ میں قرآن فہمی کا شعور اجاگر کرنے میں کتنی گہری دلچسپی رکھتے تھے۔آپ اپنے تمام متعلقین کو اکثر یہ نصیحت

فرماتے تھے کہ:

”جدید تعلیم یافتہ حضرات تک قرآن کا پیغام پہنچانے کے لیے آپ ترجمہ قرآن کی کلاسز شروع کر دیں۔ اس ضمن میں تین باتیں بطور خاص یاد رکھیں:

۱۔ ہمیشہ بھرپور مطالعہ کریں، متعلقہ آیات کی تفسیر وتشریح کے لیے اکابر مفسرین کی آرا کو ہمیشہ سامنے رکھیں، خود رائی سے حتی الامکان خود کو بچاتے رہیں، اپنے پاکیزہ کردار وعمل سے اپنی دعوت کا عملی ثبوت مہیا کریں۔

۲۔ ان کلاسز کے شرکا کی نفسیات اور ذہنی وعلمی سطح کو سامنے رکھتے ہوئے انتہائی باوقار اور شستہ انداز سے قرآن کا پیغام، پیغام رشد وہدایت ان تک پہنچائیں۔ اس سلسلے میں کبھی قلت وکثرت کی پروا نہ کریں، اپنا فرض باقاعدگی سے نبھاتے رہیں۔ نیز مدارس میں زیر تعلیم طلبہ کی کلاسز کے ماحول اور ان کلاسز کے ماحول میں فرق کو ہمیشہ ملحوظ رکھیں۔

۳۔ شرکا کو سوالات کا موقع بھی دیں، ان کے اذہان میں پیدا ہونے والے شکوک وشبہات اور اعتراضات پر کبھی خفگی اور ناراضگی کا اظہار نہ کریں، بلکہ احسن طریقہ سے ان کو رفع کرنے کی کوشش کریں۔ اگر خود کوئی دقت محسوس کریں تو دیگر اکابر اہل علم سے رجوع کرنے میں کبھی شرم محسوس نہ کریں۔ قرآن کریم کا یہ ارشاد ہمیشہ پیش نظر رکھیں: وفوق کل ذی علم علیم (اللہ تعالیٰ نے ہر علم والے کے اوپر ایک علم والا پیدا فرمایا ہے۔) اگر آپ ان باتوں کو ملحوظ رکھتے ہوئے یہ مبارک سلسلہ جاری رکھیں گے تو اس کے فوائد وثمرات ان شاء اللہ بہت جلد ظاہر ہوں گے۔“

بحمد اللہ آج ملک بھر میں کئی مقامات پر یہ مبارک سلسلہ جاری وساری ہے۔ راقم الحروف اس ضمن میں تمام اہل علم کی خدمت میں ملتمس ہے کہ اپنے اپنے دائرے میں اس مبارک سلسلہ کو شروع کر دیں، کیونکہ یہ ہم پر اکابر اصحاب علم کا قرض بھی ہے اور ہماری ذمہ داری بھی۔ یہ مبارک سلسلہ اللہ تعالیٰ کی رضا کے حصول کے ساتھ ساتھ بندگان خدا کی رشد وہدایت کا ذریعہ بھی ہے۔

مدرسہ نصرۃ العلوم گوجرانوالہ میں درس تفسیر

ذیل کی سطور میں ہم قرآن کریم کی تدریس کے حوالہ سے حضرت شیخؒ کے دو اہم علمی حلقوں کا تعارف پیش کرنے کی سعادت حاصل کر رہے ہیں۔

۱۔ حضرت شیخؒ ۱۹۵۴ء سے ۲۰۰۱ء تک مدرسہ نصرۃ العلوم گوجرانوالہ میں تدریس کے فرائض انجام دیتے رہے۔ آپ مدرسہ میں سالہا سال تک درس نظامی کے طلبہ کو پہلے پیریڈ میں قرآن کی تفسیر پڑھاتے رہے۔ اس پیریڈ میں درجہ ثالثہ سے دورۂ حدیث تک زیر تعلیم طلبہ کی شرکت تو لازمی ہوتی تھی، تاہم تفسیر کے پرچہ میں صرف درجہ موقوف علیہ اور درجہ دورۂ حدیث کے طلبہ ہی شریک ہوتے تھے۔ یہ سلسلہ اتنا منظم اور باقاعدہ تھا کہ مدرسہ کی طرف سے کامیاب طلبہ کو دی جانے والی اسناد میں اس کا باقاعدہ ذکر ہوتا تھا۔

۲۔ حضرت شیخؒ شعبان اور رمضان کی سالانہ تعطیلات میں مدرسہ نصرۃ العلوم میں ۲۵ سال تک درس نظامی کے منتہی طلبہ،

فضلائے درس نظامی، دینی مدارس کے مدرسین اور جدید تعلیم یافتہ حضرات کو دورۂ تفسیر قرآن پڑھاتے رہے۔ اس دورہ کے آغاز کا پس منظر یہ تھا کہ ۱۹۷۶ء میں ذوالفقار علی بھٹو مرحوم کی حکومت نے مدرسہ نصرۃ العلوم اور اس سے متصل جامع مسجد نور کو محکمہ اوقاف کی تحویل میں لینے کا فیصلہ کیا تو ارباب مدرسہ نے اس کے خلاف باقاعدہ احتجاجی تحریک کا اعلان کر دیا۔ چھ ماہ کی مسلسل تحریک میں تین سو کے قریب افراد گرفتار ہوئے جن میں آپ کے تین صاحبزادے، مولانا زاہد الراشدی، مولانا عبد القدوس خان قارن اور مولانا عبد الحق خان بشیر بھی شامل تھے۔ اسی تحریک کے دوران مدرسہ نصرۃ العلوم میں سالانہ تعطیلات ہو گئیں۔ کسی بھی مدرسہ کی حفاظت کے لیے مدرسہ کے طلبہ ایک مستحکم اور مضبوط قوت ہوتے ہیں۔ سالانہ تعطیلات کی وجہ سے جب خالی مدرسہ پر جبری قبضہ کا اندیشہ پیدا ہوا تو مدرسہ کے ذمہ داران نے سالانہ تعطیلات کے دوران دورۂ تفسیر قرآن کا اعلان کر دیا تاکہ ان سالانہ تعطیلات کے دوران بھی مدرسہ طلبہ سے خالی نہ رہے۔ تفسیر قرآن کی تدریس کے لیے بھی مشیت خداوندی کے مطابق قرعہ فال حضرت شیخ ہی کے نام نکلا۔ قدرت خداوندی آزمائش میں بھی دینی خدمت کے مواقع پیدا فرما دیتی ہے۔ بظاہر تو مجبوری کے تحت آپؒ نے دورہ تفسیر قرآن کا آغاز فرمایا، لیکن بعد میں اس کی اہمیت وافادیت کی بنا پر اس کو مستقل طور پر جاری رکھنے کا فیصلہ کیا گیا اور یہ کم وبیش ۲۵ سال تک جاری رہا۔ پاکستان کے علاوہ ہندوستان، افغانستان، بنگلہ دیش، برما، تھائی لینڈ کے طلبہ شریک ہو کر اپنی علمی پیاس بجھاتے رہے۔ آج ان ممالک کے علاوہ آپ کے تلامذہ عرب ممالک بالخصوص سعودی عرب، روس، آذربائیجان، امریکہ اور برطانیہ میں دینی خدمات سرانجام دے رہے ہیں۔ ہر سال دورۂ تفسیر کے شرکا کی تعداد ۳۰۰ سے ۵۰۰ تک ہوتی تھی۔ ان میں اکثر وبیشتر فارغ التحصیل علما اور کئی ایک درس نظامی کے کہنہ مشق مدرس ہوتے۔ دورہ تفسیر کا دورانیہ تقریباً دو ماہ ہوتا تھا، اس لیے اس میں جدید تعلیم یافتہ حضرات بھی بکثرت شامل ہوتے تھے۔ آپ کا انداز تفسیر بعینہ اپنے شیخ مولانا حسین علیؒ جیسا تھا۔ ربط آیات اور رد شرک وبدعت کی جو اہمیت وانفرادیت آپ کے شیخ کا خاصہ تھا، وہی طرز اور انداز یہاں بھی بدرجہ اتم موجود تھا۔ دورہ تفسیر کے بلند پایہ علمی وتحقیقی نکات کی تدوین وترتیب پر آپ کے قابل فخر فرزند حضرت مولانا عبد القدوس خان قارن زید مجدہم کام کر رہے ہیں۔ اللہ تعالیٰ اس عظیم علمی کام میں ان کی خصوصی مدد ونصرت فرمائے، آمین۔

دورۂ تفسیر کی خصوصیات

دورۂ تفسیر کا مقصد حضرت شیخؒ کے الفاظ میں ملاحظہ فرمائیں:

”قرآن کریم کی تفسیر میں ہم ان مسائل کو نہیں چھیڑیں گے جو فرعی مسائل کہلاتے ہیں، کیونکہ اتنا وقت نہیں ہوتا۔ اگر ہم یہ بحث شروع کر دیں کہ امام کے پیچھے سورۂ فاتحہ پڑھنی ہے یا نہیں پڑھنی، آمین جہر کے ساتھ ہے یا سر کے ساتھ ہے تو مہینہ اسی میں گزر جائے گا۔ الحمد للہ قرآن پاک میں کوئی مشکل ترکیب، کوئی صیغہ، کوئی ربط، اہم شان نزول، کوئی ایسا اہم مسئلہ ان شاء اللہ العزیز نہ چھوٹے گا۔“

”بحمد اللہ تعالیٰ ہم سب اس بات کی بھرپور کوشش کرتے ہیں کہ دورۂ تفسیر میں مکمل قرآن شرکا کی سمجھ میں آجائے۔ ہم دورۂ تفسیر میں ترجمہ، تفسیر، ربط آیات، شان نزول، ترکیب، صرفی ونحوی اشکالات کے جوابات کا بطور خاص خیال رکھتے ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ اس بات کی بھی بھرپور کوشش کی جاتی ہے کہ قرآن کا پیغام رشد

وہدایت بلاکم وکاست سب سامعین وحاضرین تک پہنچ جائے۔"

حضرت شیخؒ درج بالا دونوں تفسیری حلقوں میں تفسیر قرآن کی تدریس کے دوران ایسا عالمانہ، محققانہ اور مدلل انداز بیان اختیار فرماتے تھے کہ شرکا خود کو ایک عظیم لائبریری میں بیٹھا ہوا محسوس کرتے تھے۔ حوالہ جات کا علمی مقام اور تجزیہ، مختلف طبقات کتب حدیث کا تعارف، متعلقہ احادیث کے درجہ ومقام کی وضاحت کے التزام کے ساتھ ان کی روشنی میں قرآن کی تفسیر، لغات القرآن کے حل اور مشکل الفاظ کی وضاحت وتبیین کے لیے قاموس، تاج العروس، مختار الصحاح اور منتہی الارب جیسی کتب لغت سے استشہاد، نحوی مشکلات کے حل کے لیے شرح جامی، عبدالغفور، مغنی اللبیب، متن متین اور رضی کے بار بار حوالہ جات، علم معانی سے متعلق مشکلات کے حل کے لیے دلائل الاعجاز، مختصر المعانی اور مطول جیسی کتب سے حوالہ جات، فقہی مسائل کے لیے کبیری، البحر الرائق، فتح القدیر، شامی، درمختار، ہدایہ اور عالم گیری جیسی کتب کے حوالہ جات، مختصر یہ کہ اصول تفسیر، اصول فقہ، تاریخ وسیر، منطق وفلسفہ، جغرافیہ اور سلوک وتصوف کے فنون سے متعلقہ سینکڑوں کتب کا تعارف اور موقع محل کے مطابق ان استشہاد اور بعض اوقات بعض قرآنی آیات کی تفسیر میں شاذ آرا کا علمی وتحقیقی جائزہ اور صحیح تفسیر کی با حوالہ وضاحت، ایسا عالمانہ اور محققانہ انداز سن کر طلبہ ورطہ حیرت میں پڑ جاتے اور بے ساختہ پکار اٹھتے کہ آپ کی شخصیت قرآن کا زندہ وجاوید معجزہ ہے اور قرآنی علوم وفنون آپؒ کے رگ وپے میں رچ بس چکے ہیں۔

یہ راز کسی کو نہیں معلوم کہ مومن
قاری نظر آتا ہے حقیقت میں ہے قرآن

قارئین! یہ مبالغہ نہیں۔ اس کے عادل گواہ آج بھی ہزاروں کی تعداد میں موجود ہیں اور دنیا کے مختلف گوشوں میں مسند تدریس کو رونق بخشے ہوئے ہیں۔ دراصل یہ تو چراغ سے چراغ جلے ہیں، ان کی روشنی میں قیامت تک تشنگان رشد وہدایت راہ پاتے رہیں گے اور حضرت شیخؒ کی روح مبارک کو اس کا ثواب پہنچتا رہے گا۔ ان شاء اللہ تعالیٰ۔

آپؒ درج بالا دونوں تفسیری حلقہ جات میں جن امور کا بطور خاص خیال رکھتے تھے، ان میں سے چند اہم امور کا ہم ذیل کی سطور میں ذکر کریں گے۔

۱۔ ربط: قرآن مجید میں ربط سے متعلق آغاز ہی میں مفسرین کے دو مسلکوں کا ذکر یوں فرماتے تھے:

"اس میں اختلاف ہے کہ قرآن کریم میں ربط ہے یا نہیں۔ مفسرین کرام کا ایک طبقہ کہتا ہے کہ قرآن کریم میں کوئی ربط نہیں۔ یہ شاہی حکم ہے اور بادشاہ لوگوں کے حالات کے مناسب ان کو حکم دے گا۔ ان میں کسی ربط کی ضرورت نہیں۔ اسی طرح قرآن میں کہیں حکم ہوگا کہ نماز قائم کرو، کہیں یہ ہوگا کہ جہاد کرو، کہیں یہ کہا جائے گا کہ والدین کی اطاعت کرو۔ یہ بھی شاہی حکم ہے۔

دوسرا طبقہ کہتا ہے کہ بے شک شاہی حکم ہے، لیکن اس کے ساتھ ربط بھی ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ قرآن کریم کے تمام علوم میں ربط سب سے زیادہ مشکل ہے۔ اس ربط کے متعلق جن حضرات نے کوشش کی ہے، ان میں امام فخر الدین رازی، علامہ ابو السعود محمد بن محمد ابن عمادی، متاخرین میں سے حضرت حقانی، مولانا تھانوی اور ہمارے مرشد حضرت مولانا حسین علی، یہ حضرات قرآن پاک کے ربط کو بڑی اہمیت دیتے تھے۔"

حضرت شیخؒ قرآنی سورتوں، قرآنی مضامین اور رکوعات کے مابین ربط واضح کرنے کے لیے اکثر حضرت مولانا حسین علیؒ کی کتاب "بلغۃ الحیران فی ربط آیات الفرقان" یا امام رازی کی تفسیر کبیر یا حضرت تھانویؒ کی تفسیر بیان القرآن سے حوالہ نقل فرماتے تھے، جبکہ کبھی کبھار اپنے ذوق کے مطابق بھی ربط بیان فرما دیتے تھے۔ اس ضمن میں سورۃ بقرۃ کی آیت نمبر ۱۸۵ کے متعلق حضرت شیخؒ کے الفاظ ملاحظہ ہوں:

"ارشاد باری تعالیٰ ہے: واذا سالك عبادی عنی فانی قریب، اجیب دعوۃ الداع اذا دعان فلیستجیبوا لی ولیومنوا بی لعلھم یرشدون (اور جب تجھ سے پوچھیں میرے بندے میرے بارے میں سو میں قریب ہوں۔ قبول کرتا ہوں دعا مانگنے والے کی جب مجھ سے مانگے، تو چاہیے کہ وہ حکم مانیں میرا اور یقین لائیں مجھ پر تا کہ نیک راہ پائیں)۔ اس آیت کے ماقبل اور مابعد روزوں کے مسائل ہیں۔ ذہن میں ایک سوال پیدا ہوتا ہے کہ روزوں کے مسائل میں دعا اور پکار کا مسئلہ درمیان میں کیوں مذکور ہے؟ اس کا روزوں سے کیا ربط ہے؟ میں نے اس کا ربط کسی تفسیر میں تو نہیں پڑھا، اپنی طرف سے عرض کرتا ہوں۔ ان یکن صوابا فمن اللہ والا فمنی ومن الشیطان۔ بعض علاقوں میں ماہ رمضان میں بعض لوگ چلا چلا کر ذکر اور دعا کرتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے روزوں کے مسائل میں آہستہ آواز سے ذکر اور دعا کے متعلق اشارہ فرما کر اس حقیقت کی طرف اشارہ فرمایا ہے کہ خیر الذکر الخفی، بہترین ذکر وہی ہے جو آہستہ آواز سے ہو۔"

درج بالا آیت کا ربط حضرت شیخؒ کے الفاظ میں نقل کرتے ہوئے ربط ہی کے حوالے سے ایک بات راقم کے ذہن میں آئی۔ راقم مناسب خیال کرتا ہے کہ اس کو بھی اہل علم کی خدمت میں عرض کر دیا جائے۔ اللہ تعالیٰ نے روزوں کے مسائل میں دعا اور پکار کا مسئلہ ذکر فرما کر اس حقیقت کی طرف اشارہ فرمایا ہے کہ دعا کی قبولیت کا رمضان المبارک کے روزوں کے ساتھ ایک خصوصی تعلق ہے اور سحری وافطاری کے اوقات میں روزہ داروں کی دعا بارگاہ خداوندی میں بطور خاص قبول ہوتی ہے۔

۲۔ شان نزول: آپ مختلف قرآنی آیات اور واقعات کا شان نزول بھی بیان فرماتے تھے۔ اس ضمن میں آپ مختلف تفاسیر سے استشہاد فرماتے تھے۔

۳۔ تفسیری ماخذ کی روشنی میں قرآن کی تفسیر: آپؒ قرآن کی تفسیر میں تفسیری مآخذ کا بطور خاص خیال فرماتے تھے۔ تفسیری مآخذ کی روشنی میں تفسیر کا خصوصی ذوق اور ملکہ پروردگار نے آپ کو عطا فرمایا تھا۔

الف۔ تفسیر القرآن بالقرآن: قرآن کی تفسیر میں ایک بنیادی اصول تفسیر القرآن بالقرآن ہے۔ آپؒ کو اس بنیادی اصول تفسیر میں رب العالمین نے خصوصی ملکہ اور صلاحیت عطا فرمائی تھی۔ جو بات بعض اکابر مفسرین نے قرآن کے بعض مقامات کی تشریح وتفسیر میں کئی صفحات میں واضح فرمائی ہے، آپؒ وہی بات نہایت اختصار اور اجمال کے ساتھ چند جملوں میں بیان فرما دیتے تھے۔ اس ضمن میں بطور نمونہ صرف دو مثالیں ملاحظہ فرمائیں۔

۱۔ خَتَمَ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ وَعَلٰى سَمْعِهِمْ وَعَلٰٓى اَبْصَارِهِمْ غِشَاوَةٌ وَّلَهُمْ عَذَابٌ عَظِيْمٌ (البقرہ ۷) (مہر لگا دی اللہ تعالیٰ نے ان کے دلوں پر اور ان کے کانوں پر اور ان کی آنکھوں پر پردہ ہے اور ان کے لیے بڑا عذاب ہے۔) اس آیت کی تفسیر میں بعض لوگوں نے بلاوجہ جبر وقدر کی بحث چھیڑی ہے۔ کہتے ہیں کہ ان بے چاروں کا کیا قصور جو

مجبور محض ہیں۔ جب اللہ تعالیٰ نے فرمادیا کہ وہ ایمان نہیں لائیں گے تو وہ ایمان کیوں کر لا سکتے ہیں؟ اس ضمن میں کئی لوگ فکری گمراہی کی وادیوں میں بھی جا گرے۔ اکابر اہل علم اور مفسرین نے ان کے شبہات وفکری گمراہی کے جوابات تفصیل سے دیے۔ اس آیت سے پیدا ہونے والا شبہ کا کافی اور شافی جواب خود اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم کے ۲۴ پارہ، سورۃ حٰم السجدہ میں دیا ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے: وَقَالُوا قُلُوبُنَا فِي أَكِنَّةٍ مِّمَّا تَدْعُونَا إِلَيْهِ وَفِي آذَانِنَا وَقْرٌ وَمِن بَيْنِنَا وَبَيْنِكَ حِجَابٌ فَاعْمَلْ إِنَّنَا عَامِلُونَ (حم السجدہ ۵) (اور انہوں نے کہا کہ جس چیز کی طرف تو ہمیں بلاتا ہے، اس سے ہمارے دل پردوں میں ہیں اور ہمارے کان بہرے ہیں اور ہمارے اور تیرے درمیان ایک پردہ حائل ہے، لہٰذا تم اپنا کام کیے جاؤ، ہم اپنا کام کیے جائیں)۔ اب جن لوگوں نے اپنی چاہت وارادے سے اپنے عمل سے اپنے دلوں پر پردے تسلیم اور پسند کیے ہیں، کانوں میں ڈاٹیں دی ہیں، آنکھوں کے آگے پردے لٹکائے ہیں تو اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: نولہ ما تولی، جدھر کوئی جانا چاہتا ہے، ہم ادھر ہی بھیج دیتے ہیں۔ جب وہ اس حالت پر راضی ہوئے تو رب تعالیٰ نے بھی فرمایا کہ اگر تم اسی حالت پر راضی وخوش ہو تو پھر ہمارا فیصلہ بھی تمہاری چاہت کے مطابق یہی ہے۔ خَتَمَ اللَّهُ عَلَى قُلُوبِهِمْ وَعَلَى سَمْعِهِمْ وَعَلَى أَبْصَارِهِمْ غِشَاوَةٌ وَلَهُمْ عَذَابٌ عَظِيمٌ ۔ (مہر لگادی اللہ تعالیٰ نے ان کے دلوں پر اور ان کے کانوں پر اور ان کی آنکھوں پر پردہ ہے اور ان کے لیے بڑا عذاب ہے۔)

۲۔ سورہ نوح میں ارشاد ہے: وَقَالَ نُوحٌ رَّبِّ لَا تَذَرْ عَلَى الْأَرْضِ مِنَ الْكَافِرِينَ دَيَّاراً ۔ إِنَّكَ إِن تَذَرْهُمْ يُضِلُّوا عِبَادَكَ وَلَا يَلِدُوا إِلَّا فَاجِراً كَفَّاراً (نوح ۲۶،۲۷)۔ (حضرت نوح نے عرض کی اے میرے رب! کافروں میں سے کوئی بھی اس زمین پر گھرانہ نہ چھوڑ۔ اگر تو نے انہیں چھوڑ دیا تو وہ تیرے بندوں کو گمراہ کریں گے اور ان سے جو اولاد ہوگی، وہ بھی بدکردار اور سخت کافر ہوگی۔) ان آیات سے بظاہر معلوم ہو رہا ہے کہ حضرت نوح ''عالم ماکان ومایکون'' تھے۔ اسی لیے تو بعض اہل بدعت نے اس آیت سے حضرت کے عالم ماکان ومایکون ہونے پر استدلال کیا ہے۔ اس ضمن میں مولوی محمد عمر اچھروی لکھتے ہیں: ''دیکھیے حمل کا حال تو ایک طرف رہا، یہاں ابھی تخم بھی نہیں پڑا۔ تسلاً بعد نسل آپؑ نے معلوم کر کے عرض کر دیا کہ ان میں سے کوئی مسلمان نہ ہوگا۔'' (مقیاس حنفیت) حضرت شیخ ان کے باطل استدلال کا جواب ان الفاظ میں ارشاد فرمایا کرتے تھے:

''اصل میں تفسیر القرآن بالقرآن کا اصول چھوڑنے کی وجہ سے بعض لوگوں نے اس آیت کے سمجھنے میں سخت غلطی کی ہے۔ سورۃ ہود کی آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت نوح نے جو قوم کے لیے بددعا فرمائی تھی، وہ اس فرمان الٰہی کے بعد تھی کہ تیری قوم میں سے کوئی بھی ایمان نہیں لائے گا۔ وَأُوحِيَ إِلَى نُوحٍ أَنَّهُ لَن يُؤْمِنَ مِن قَوْمِكَ إِلَّا مَن قَدْ آمَنَ فَلَا تَبْتَئِسْ بِمَا كَانُوا يَفْعَلُونَ (ہود ۳۶)۔ (اور البتہ حضرت نوح کی طرف سے یہ حکم بھیجا گیا کہ اب ہرگز ایمان نہ لائے گا تیری قوم سے کوئی مگر جو ایمان لا چکا۔ سو غمگین نہ ہو ان کاموں پر جو وہ کر رہے ہیں) اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت نوح نے قوم کی تباہی اور ہلاکت کی دعا اس وقت مانگی تھی جب اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان کو یہ پیغام مل چکا تھا کہ اب آئندہ تیری قوم سے کوئی ایمان نہ لائے گا۔''

ب۔ تفسیر القرآن بالحدیث: تفسیر القرآن بالقرآن کے ساتھ ساتھ اللہ تعالیٰ نے آپ کو تفسیر القرآن بالحدیث میں بھی

خصوصی ملکہ اور ذوق عطا فرمایا تھا۔ یہ ذوق اتنا اعلیٰ اور بلند پایہ تھا کہ ایک مرتبہ دوران سبق سورہ آل عمران کی آیت ۱۰۳ کی تفسیر کے متعلق حافظ ابن کثیرؒ کا یہ قول نقل فرمایا کہ وہ ارشاد فرماتے ہیں کہ میں نے اس آیت کی تفسیر سے متعلقہ احادیث کی تلاش شروع کی تو پانچ احادیث ڈھونڈنے میں کامیاب ہوا۔ پھر فرمایا کہ تفسیر القرآن بالحدیث کے متعلق حافظ صاحبؒ کا یہ ذوق پڑھ کر میرے دل میں بھی یہ دلچسپی پیدا ہوئی چنانچہ میں نے اس آیت کی تفسیر سے متعلقہ احادیث تلاش شروع کیں تو الحمدللہ میں سات احادیث ڈھونڈنے میں کامیاب ہوا۔ گویا میں نے اللہ تعالیٰ کے فضل وکرم سے حافظ ابن کثیرؒ سے دو احادیث زیادہ ڈھونڈی ہیں۔ اللہ تعالیٰ قبولیت سے بہرہ ور فرمائیں۔

آپ کے اس فرمان سے بخوبی اندازہ ہو سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو تفسیر القرآن بالحدیث کے اصول میں کس قدر مہارت عطا فرمائی تھی۔ اسی اصول کے تحت سورۃ توبہ کی آیت ۲۴ کی تفسیر بھی ملاحظہ فرمائیں۔

اس آیت کے ایک جملہ ''حتی یاتی اللہ بامرہ'' کی تفسیر حدیث مبارکہ کے ذخیرہ سے ڈھونڈنے کے لیے بقول آپ کے آپ کی نظر تیس سال سرگرداں رہی۔ حضرت شیخ کے الفاظ ملاحظہ فرمائیں:

''اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: قُلْ إِن كَانَ آبَاؤُكُمْ وَأَبْنَاؤُكُمْ وَإِخْوَانُكُمْ وَأَزْوَاجُكُمْ وَعَشِيرَتُكُمْ وَأَمْوَالٌ اقْتَرَفْتُمُوهَا وَتِجَارَةٌ تَخْشَوْنَ كَسَادَهَا وَمَسَاكِنُ تَرْضَوْنَهَا أَحَبَّ إِلَيْكُم مِّنَ اللَّهِ وَرَسُولِهِ وَجِهَادٍ فِي سَبِيلِهِ فَتَرَبَّصُوا حَتَّى يَأْتِيَ اللَّهُ بِأَمْرِهِ وَاللَّهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْفَاسِقِينَ'' (اے نبی! کہہ دیجیے اگر تمہیں اپنے باپ، اپنے بیٹے، اپنے بھائی، اپنی بیویاں، اپنے کنبے والے اور اپنے اموال جو تم نے کمائے ہیں اور وہ تجارت جس کے مندا پڑنے سے تم ڈرتے ہو اور تمہارے وہ مکان جو تمہیں پسند ہیں، اگر اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول اور اس کی راہ میں جہاد کرنے سے زیادہ محبوب ہیں تو انتظار کرو یہاں تک اللہ تعالیٰ اپنا حکم لے آئے اور اللہ تعالیٰ نافرمان لوگوں کو ہدایت نہیں دیتا۔)

درج بالا آیت میں حتی یاتی اللہ بامرہ (یہاں تک اللہ اپنا حکم لے آئے) سے کیا مراد ہے؟ اس کے مفہوم کو سمجھنے کے لیے ابوداؤد، نسائی، مسند احمد، الجامع الصغیر للسیوطی اور موارد الظمآن میں مذکور ایک حدیث ہمیشہ پیش نظر رہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: اذا تبایعتم بالعینۃ واخذتم باذناب البقر ورضیتم بالزرع وترکتم الجہاد سلط اللہ علیکم ذلا لا ینزعہ حتی ترجعوا الی دینکم (ابوداؤد ۲/۱۳۴) ''جب تم خرید وفروخت کے کام میں مصروف ہو جاؤ گے، جانوروں ہی کی دیکھ بھال میں لگ جاؤ گے اور تم کھیتی باڑی میں مصروف ہو جاؤ گے اور اللہ تعالیٰ کی راہ میں جہاد چھوڑ دو گے تو اللہ تعالیٰ تم ذلت مسلط کر دے گا، اس ذلت کو تم سے نہیں ہٹائے گا جب تک کہ تم اس اپنے دین کی طرف واپس نہ لوٹ آؤ۔'' اس حدیث مبارکہ نے حتی یاتی اللہ بامرہ کے مفہوم کو واضح فرمادیا ہے کہ اس سے مراد ذلت کا مسلط ہونا ہے اور اس ذلت کو اس وقت تک نہیں ٹالا جا سکتا جب تک دین کی طرف رجوع نہ کیا جائے۔''

مجھے بخوبی یاد ہے کہ سورۃ توبہ کی درج بالا آیت کی تفسیر کے لیے حضرتؒ نے ہمیں حکم فرمایا تھا کہ ابوداؤد لاؤ۔ پھر آپ نے ابوداؤد کی مذکورہ حدیث پڑھ کر سنائی اور اس کا جلد اور صفحہ نمبر بھی بتایا۔ مرور زمانہ کے ساتھ ساتھ میں جلد اور صفحہ نمبر بھول

گیا۔آپ کی وفات سے چند ماہ قبل آپ کی خدمت میں حاضر ہوا تو میرے استفسار پر حضرتؒ نے ابوداؤد کا ذاتی نسخہ منگوایا اور مجھے ارشاد فرمایا کہ جلد ۲ صفحہ ۱۳۴ کھول کر متعلقہ حدیث مجھے پڑھ کر سناؤ۔ چنانچہ میں نے آپ کے حکم کے مطابق حدیث مبارکہ پڑھ کر سنائی۔ حدیث مبارکہ سے اس خصوصی تعلق اور دلی لگاؤ کی وجہ سے آپ قرآنی آیات کی تفسیر کے لیے ایک ہی وقت میں چھ چھ، سات سات کتب حدیث کے حوالے ارشاد فرماتے تھے۔ آپ کا دل مبارک حدیث مبارکہ کی عظمت ورفعت سے معمور رہتا تھا۔ کبھی کبھی آپؒ بڑے ذوق وشوق سے طلبہ کو یہ شعر پڑھ کر سناتے تھے:

پڑھتا ہے بخاری جو بلا عشق محمد
آتا ہے بخار اس کو بخاری نہیں آتی

ج۔ تفسیر القرآن باقوال الصحابہ: تفسیر القرآن باقوال الصحابہ کے تحت آپ اکثر حضرت عبداللہ بن مسعود اور حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کے تفسیری اقوال نقل فرماتے تھے۔ آپؒ دورہ تفسیر کے آغاز میں حضرت عبداللہ بن مسعود کا یہ فرمان باحوالہ بخاری شریف نقل فرماتے تھے کہ ایک مرتبہ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ نے صحابہ کے مجمع میں ارشاد فرمایا، ''تم سب لوگ ہی جانتے ہو کہ قرآن کی کوئی ایسی آیت نہیں جس کے بارے میں مجھے معلوم نہ ہو کہ یہ آیت کب اور کس کے بارے میں نازل ہوئی اور رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی کیا تفسیر بیان فرمائی ہے''۔ تفسیر القرآن باقوال الصحابہ کے ساتھ ساتھ آپؒ تابعین، تبع تابعین، اتباع تبع تابعین، مفسرین، فقہا، محدثین اور متکلمین کے اقوال وارشادات موقع محل کے مطابق نقل فرماتے تھے۔ جب آپ ان بلند پایہ اہل علم کے اقوال نقل فرماتے تو مختلف موضوعات پر سینکڑوں کتب کا تعارف بھی سامنے آجاتا۔ آپ فقہا کے مقام ومرتبہ کے متعلق اکثر فرمایا کرتے تھے کہ ''یادرکھیں فقہا سے زیادہ محتاط طبقہ امت میں اور کوئی نہیں ہے۔''

تفسیر قرآن کے دوران جب آپ کا روئے سخن مختلف آیات سے اخذ شدہ فقہی مسائل کی طرف ہوتا تو بے ساختہ اس حدیث مبارکہ کی آپ عملی تصویر نظر آتے: من یرد اللہ بہ خیرا یفقھہ فی الدین (اللہ تعالیٰ جس سے بھلائی کا ارادہ چاہتے ہیں، اس کو دین میں فقاہت عطا فرماتے ہیں) آپ فقہی مسائل کے لیے البحر الرائق، فتح القدیر، شامی درمختار، ہدایہ اور عالمگیری جیسی اہم کتب کے حوالہ جات نقل فرماتے۔ سورۃ بقرہ آیت ۲۵۶ اور سورۃ نساء کی آیت ۶۰ میں مذکور لفظ طاغوت کی تفسیر میں امام مالکؒ کے اس جامع قول کی روشنی میں فرمایا کرتے تھے کہ کل ما عبد من دون اللہ فھو طاغوت (اللہ تعالیٰ کے علاوہ جس کی بھی عبادت کی جائے، وہ طاغوت ہے)۔

د۔ ائمہ لغت کے اقوال وارشادات سے استدلال: قرآن کریم کے مشکل الفاظ کے معانی کو نہایت آسان پیرایے میں بیان فرماتے تھے۔ جس آیت کریمہ میں جو مشکل لفظ ہوتا، آپؒ ائمہ کرام کے اقوال وارشادات کی روشنی میں اس کی وضاحت فرماتے۔ اس ضمن میں آپ تاج العروس، قاموس اللغات، مختار الصحاح اور منتہی الارب سے استشہاد فرماتے۔ تاہم شرکا دورہ تفسیر کو مشکل الفاظ قرآنی کے حل کے لیے لغات القرآن لمولانا عبدالرشید نعمانی سے استفادہ کی بطور خاص تلقین فرمایا کرتے تھے۔ یہ کتاب چھ جلدوں پر مشتمل ہے۔ آپ اس کتاب کی بہت تحسین فرماتے۔ ائمہ لغت کے اقوال وارشادات کی روشنی میں چند مشکل قرآنی الفاظ کی تشریح بطور نمونہ حضرت شیخ کے الفاظ میں ملاحظہ فرمائیں:

سورۃ بقرہ کی آیت ۴۶ میں مذکور لفظ یظنون کے معنی ومطلب کی وضاحت میں فرماتے کہ مختار الصحاح، منتہی الارب اور تاج العروس میں یہ صراحت مذکور ہے کہ ظن کا لفظ اضداد میں سے ہے۔ یقین کے لیے بھی آتا ہے اور گمان کے لیے بھی، چنانچہ موقع ومحل کے مطابق یہاں یظنون کا ترجمہ یستیقنون کریں گے، یعنی وہ لوگ جو یقین رکھتے ہیں، کیونکہ بات خاشعین کی ہو رہی ہے اور خاشعین اللہ تعالیٰ سے ملنے کا گمان نہیں رکھتے بلکہ یقین رکھتے ہیں۔

سورۃ ہود آیت ۲۲ میں مذکور لفظ لاجرم کے معنی کی وضاحت ان الفاظ میں ارشاد فرماتے: امام خلیل بن احمد اور سیبویہ فرماتے ہیں کہ لاجرم اصل میں مرکب بنائی ہے، جیسے خمسۃ عشر۔ اس کا معنی ہے حقا۔ آگے کا جملہ اس کا فاعل ہے، لاجرم ای حقا۔ امام فراء فرماتے ہیں کہ لاجرم محلا مبتدا ہے، اور آگے اس کی خبر ہے۔

سورۃ البقرۃ کی آیت ۲۶ میں ان اللہ لا یستحی (بے شک اللہ تعالیٰ نہیں شرماتا) میں لا یستحی کا کیا معنی ہے؟ حضرت شیخ کے الفاظ میں ملاحظہ فرمائیں: امام قرطبی فرماتے ہیں: لا یستحی ای لا یخشی وقیل لا یترك وقیل لا یمتنع۔ اسی طرح سورۃ النساء میں واللہ ارکسھم کا معنی ہے: واللہ ردھم اور اسی سورت میں مذکور جملہ مذبذبین بین ذلك کا معنی ہے مترددین بین ذلك۔

یہاں بطور نمونہ چند مثالیں ذکر کی گئی ہیں، ورنہ حضرتؒ آیت میں آنے والے ہر مشکل لفظ کی لغوی تشریح کا بطور خاص خیال فرماتے تھے۔

۴۔ صرفی ونحوی ابحاث: حضرت شیخ دورہ تفسیر میں اکثر فرمایا کرتے تھے کہ تین علوم تفسیر قرآن میں بنیادی حیثیت رکھتے ہیں۔ علم صرف، علم نحو اور عربی ادب۔ جس شخص کو یہ تین علوم نہیں آتے، وہ قرآن نہیں سمجھ سکتا۔ لہٰذا ان علوم میں خوب مہارت پیدا کریں۔ آپؒ قرآن کریم میں ہر صرفی ونحوی مشکل کو نہایت آسان پیرایے میں بیان فرماتے تھے اور نحوی مشکلات کے حل کے لیے بالعموم متن متین، رضی، مغنی اللبیب جیسی اہم کتب سے حوالہ جات نقل فرماتے۔ اس ضمن میں چند مثالیں ملاحظہ ہوں۔

''سورۃ البقرۃ آیت ۶۷ کے ایک جملہ اتتخذنا ھزوا میں ایک نحوی اشکال کی وضاحت میں ارشاد فرماتے ہیں: اتتخذنا میں جمع متکلم کی ضمیر کا پر ھزوا مصدر کو محمول کیا گیا ہے۔ سوال پیدا ہوتا ہے کہ ضمائر تو ذوات ہوتی ہیں اور ھزوا مصدر ہے، جو وصف ہوتا ہے تو وصف کا حمل ذات پر کیسے درست ہو سکتا ہے؟ اس نحوی اشکال کا جواب یہ ہے کہ ھزوا اگرچہ مصدر ہے، لیکن مھزو کے معنی میں اسم مفعول ہے اور مفعول کا صیغہ ذات پر دلالت کرتا ہے۔ یوں اتتخذنا میں ضمیر بھی ذات پر دلالت کرتی ہے اور ھزو مصدر (مھزو کے معنی میں) بھی ذات پر دال ہے، چنانچہ ذات کا حمل ذات پر ہوا۔

آپ تفسیر کے سمجھنے اور سمجھانے کے لیے اور کئی نحوی مشکلات کے حل کے لیے نحاۃ کوفیین کا یہ قاعدہ اکثر بیان فرماتے تھے کہ حروف جارہ مطلقاً ایک دوسرے کی جگہ پر استعمال ہوتے رہتے ہیں۔

اسی طرح سورۃ البقرۃ آیت ۱۷۷ میں ہے: ولکن البر من آمن باللہ والیوم الآخر والملئکۃ والکتاب والنبیین (نیکی کرنے والا وہ شخص ہے جو ایمان لائے اللہ پر، آخرت کے دن پر، فرشتوں پر، کتابوں پر اور انبیا پر) اس آیت میں ایک نحوی اشکال کا جواب ان الفاظ میں ارشاد فرماتے ہیں: ''آیت کریمہ میں لکن حروف مشبہ بالفعل میں سے

ہے اور البر اسم ہے اور خبر اسم پر محمول ہوتی ہے لیکن اس آیت میں ایسا نہیں ہے، کیوں کہ البر تو مصدر ہے اور مصدر وصف ہوتا ہے جب کہ من ذات ہے اور ذات کا حمل وصف پر درست نہیں ہو سکتا۔ اگر ذات کا حمل وصف پر کریں تو پھر معنی یہ ہوگا ''نیکی وہ شخص ہے'' حالانکہ یہ معنی درست نہیں ہے۔ چنانچہ صاحب کشاف اس نحوی مشکل کو یوں حل فرماتے ہیں کہ اس مقام پر اسم کی طرف مضاف محذوف ہے، یعنی ولکن صاحب البر من آمن ۔ یوں ذات کا حمل ذات پر ہی ہوگا نہ کہ وصف پر۔ مضاف محذوف ماننے کی صورت میں اشکال رفع ہو جاتا ہے۔ اس صورت میں معنی یہ ہوگا کہ نیکی کرنے والا تو وہ شخص ہے جو ایمان لائے اللہ تعالیٰ پر، آخرت کے دن پر، فرشتوں پر، کتابوں پر اور انبیاء پر۔ یہ معنی اور ترجمہ درست ہے۔

قرآن کی تفسیر میں آپ یہ اہم نحوی قاعدہ اکثر بیان کرتے تھے کہ جب اب ، اخ، ابــن کی نسبت غیر ذوی العقول کی طرف ہو تو پھر ابن کا معنی بیٹا اور اخ کا معنی بھائی اور اب کا معنی باپ نہیں ہوتا، بلکہ ان میں ہر ایک کا معنی ہوتا ہے ''والا''، جیسے ابو الحرب (لڑائی والا)، ابو التراب (مٹی والا)، ابو هريره (بلی والا)، ابو الخير (بھلائی والا)، ابن السبيل (راستے والا، یعنی مسافر)۔

قرآنی تفسیر میں علم صرف سے متعلق مشکلات کو بھی حل فرماتے تھے۔ اس ضمن میں چند مثالیں ملاحظہ فرمائیں:

سورۃ نساء کی آیت ۱۲۲ میں ارشاد باری تعالیٰ ہے: و من اصدق من الله قيلا ۔ (بات میں اللہ تعالیٰ سے بڑھ کر اور کون سچا ہو سکتا ہے؟) درج بالا ارشاد ربانی میں قیــلا کے صیغہ کے متعلق حضرت شیخ فرماتے کہ یاد رکھیے، اس آیت میں لفظ قيــلا، قال يقول کا مصدر ہے۔ عام طور پر قال يقول کا مصدر قولاً ہی معروف ہے۔ یہ بھی درست ہے، لیکن اس کے علاوہ بھی مصادر آتے ہیں۔ تاج العروس جو قاموس کی شرح ہے، اس میں قــال يقول کے درج ذیل مصادر مذکور ہیں: قال يـقـول قولا وقيلا ومقالا ومقالة ومقولة وقالا ۔ چنانچہ قال بطور مصدر بھی آتا ہے، اسی لیے بعض مدرسین اس جملہ کی ترکیب پوچھتے ہیں کہ مولانا، قال زيد کی ترکیب کیا ہے۔ اس مثال میں قال کا لفظ بطور مصدر کے استعمال ہوا ہے اور مضاف ہے زید کی طرف۔

آپ دوران سبق اکثر یہ صرفی قاعدہ بھی بیان فرماتے کہ مصدر کے بدلنے سے معنی بدل جاتا ہے۔ مثلاً وعــد يعـد وعدا کا معنی وعدہ کرنا اور وعد يعد وعيدا کا معنی ڈرانا اور خوفزدہ کرنا۔ اسی صرفی قاعدہ کو ملحوظ رکھتے ہوئے سورہ البقرۃ کی آیت ۱۲۸ کا ترجمہ کیا جاتا ہے: ''الشيطـان يـعدكم الفقر ويامركم بالفحشاء والله يعدكم مغفرة منه و فـضلاً و الـلـه واسع عليم۔ (شیطان تمہیں مفلسی اور تنگ دستی سے ڈراتا ہے اور تمہیں فحش کام کرنے کا حکم دیتا ہے جب کہ اللہ تعالیٰ تم سے اپنے فضل اور مغفرت کا وعدہ فرماتا ہے۔ اللہ تعالیٰ بڑا وسعت والا اور جاننے والا ہے۔) اس آیت میں يعدكم کا فعل دو مرتبہ آیا ہے۔ پہلی مرتبہ اس کا ترجمہ ڈرانا اور خوف زدہ کرنا کیا گیا ہے، جب کہ دوسری مرتبہ وعدہ کرنا۔ ایک ہی فعل کے دو الگ الگ ترجمے اسی صرفی قاعدہ کو ملحوظ رکھتے ہوئے کیے گئے ہیں۔ اسی طرح تـلا يتـلـو تلاوة کا معنی پڑھنا اور تلا يتلو تِلوا کا معنی پیچھے آنا۔ ذكر يذكر ذِكرا کا معنی ہے زبان سے یاد کرنا اور ذكر يذكر ذُكرا کا معنی دل میں یاد کرنا۔

اسی صرفی قاعدہ کی ایک اور مثال یہ ہے کہ هـجر يهجر هِجرا کے معنی ہیں چھوڑنا اور هـجر يهجر هُجرا کا معنی ہے ہذیان بکنا اور بکواس کرنا۔ اسی صرفی قاعدہ کو دانستہ یا نادانستہ نظر انداز کرنے کی وجہ سے شیعہ راہنما مسٹر خمینی نے بخاری شریف کے ایک جملہ کا ترجمہ کرتے ہوئے حضرت عمر فاروق پر وہ جارحانہ حملہ کیا ہے جس کی تکلیف اور درد ہر مسلمان محسوس کرتا ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے مرض الوفات میں حضرت عمر فاروقؓ نے ایک جملہ کہا تھا کہ ''اهـجر''؟ کیا آپ ہمیں چھوڑ کر جا رہے ہیں؟ یہاں یہ لفظ هِجرا مصدر سے آیا ہے، جب کہ مسٹر خمینی نے اس کا ترجمہ یوں کیا ہے کہ اهجر یعنی حضرت عمر نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی گستاخی کرتے ہوئے کہا کہ ''کیا آپ ہذیان بک رہے ہیں، بکواس کر رہے ہیں؟'' العیاذ باللہ۔ مسٹر خمینی نے اس صرفی قاعدہ کو نظر انداز کرتے ہوئے اهـجر کے ترجمہ میں ایسی فاش غلطی کی ہے جس کے بعد آدمی ایمان سے ہاتھ دھو بیٹھتا ہے۔ تفصیل کے لیے حضرت شیخ کی تقریر بخاری ''احسان الباری لفہم البخاری'' کا مطالعہ فرمائیں۔

سورۃ بقرۃ آیت ۱۸۴ میں مذکور ایک جملہ اور اس کا ترجمہ ملاحظہ فرمائیں۔ وعـلـى الـذيـن يطيقونه فدية طعام مسكين (اور ان لوگوں پر جو روزہ رکھنے کی طاقت نہیں رکھتے، اس کا فدیہ ایک مسکین کا کھانا ہے)۔ يطيقونه تو فعل مثبت ہے، لیکن اس کا ترجمہ ''طاقت نہیں رکھتے'' نفی میں کیا گیا ہے۔ اس کی وجہ حضرت شیخ یوں بیان فرماتے کہ ''میں نے ایک اہم صرفی قاعدہ کو ملحوظ رکھتے ہوئے فعل مثبت کا ترجمہ فعل نفی میں کیا ہے۔ يطيقونه باب افعال سے فعل مضارع کا صیغہ ہے اور باب افعال کی ایک خاصیت سلب ماخذ ہے، یعنی بعض اوقات باب افعال کا ہمزہ سلب کے لیے آتا ہے اور میں نے اسی خاصیت کو ملحوظ رکھتے ہوئے نفی میں ترجمہ کیا ہے۔ جیسے بعض مدرسین بطور امتحان طلبہ سے اس جملہ کا ترجمہ پوچھ لیتے ہیں کہ من اكـرم مـحمدا صلى الله عليه وسلم فهو كافر ومن ابغضه فهو مومن ۔ اس جملہ کو سن کر عموماً طلبہ پریشان ہو جاتے ہیں، حالانکہ اگر غور کیا جائے تو اس جملہ میں اكـرم اور ابـغض دونوں باب افعال سے فعل ماضی کے صیغے ہیں۔ اگر باب افعال کی خاصیت سلب ماخذ کو نظر انداز کرتے ہوئے اس جملے کا ترجمہ کیا جائے تو انسان کفر تک پہنچ جاتا ہے۔ وہ ترجمہ یہ ہے کہ جس نے عزت کی محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی، وہ کافر ہے اور جس نے بغض رکھا محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے وہ مومن ہے۔ (العیاذ باللہ) لیکن باب افعال کی خاصیت سلب ماخذ کو ملحوظ رکھتے ہوئے ترجمہ کیا جائے تو ترجمہ یہ ہوگا کہ ''جس نے اکرام نہ کیا حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا، وہ کافر ہے اور جس نے بغض نہ رکھا محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے، وہ مومن ہے۔''

طلبہ میں تحقیقی ذوق بیدار کرنے کے لیے آپ ہر سال دورہ تفسیر میں علم وصرف کے اہم قاعدہ کے متعلق شرکا سے سوال کرتے تھے۔ حضرت شیخ کے الفاظ میں ملاحظہ فرمائیں: ''علم صرف کا اصول یہ ہے کہ صیغہ جمع مذکر غائب کی علامت واؤ ساکنہ کے بعد الف لکھا جاتا ہے، جیسے فـعلوا ضربوا وغیرہ۔ لیکن قرآن میں جمع مذکر غائب کے چھ صیغے ایسے ہیں جن کے آخر میں الف نہیں لکھا ہوا، جیسے جاء و ، بائو ، فاء و ، تبوء و وغیرہ۔ ان صیغہ جات کے آخر میں الف نہ آنے کی وجہ بھی ایک صرفی قاعدہ ہے۔ وہ صرفی قاعدہ کون سا ہے؟ یہ میرا آپ حضرات کے ذمہ قرض ہے۔ اس کے لیے آپ دوسرے حضرات سے تعاون لے سکتے ہیں، لیکن یہ بات بھی یاد رکھیں کہ رسم الخط یا تجوید کا حوالہ قبول نہیں کیا جائے گا، بلکہ صرفی قاعدہ ہی قابل قبول ہوگا۔''

راقم الحروف نے ایک مرتبہ امام الصرف والنحو استاد محترم مولانا محمد اشرف شادؒ سے اس قاعدہ کے متعلق استفسار کیا تو

انہوں نے صرفی قاعدہ تو بیان نہیں کیا لیکن الخط العثمانی للقاری رحیم بخش پانی پتیؒ کے حوالہ سے یہ ارشاد فرمایا کہ قرآن حکیم کے رسم الخط اور عام رسم الخط میں فرق ہے۔ چونکہ قرآنی رسم الخط اللہ تعالیٰ کی طرف نازل کردہ توقیفی ہے، اسی وجہ سے ان صیغہ جات کے آخر میں واوٗ جمع کے بعد الف نہیں ہے۔ جیسے صرفی قاعدہ کے مطابق مفرد کے صیغہ جات کے آخر میں الف نہیں لکھا جاتا، لیکن قرآن میں کئی ایسے مفرد صیغہ جات ہیں جن کے آخر میں الف لکھا ہوا ہے جیسے لیربوا، لتتلوا، تتلوا الشیاطین، حالانکہ یہ صرفی اصول کے مطابق درست نہیں ہے۔ وجہ یہی ہے جو اوپر ذکر کی گئی ہے کہ قرآن کا رسم الخط اجتہادی نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل کردہ (توقیفی) ہے۔ تاہم امام الصرف والنحو کا جواب حضرت الشیخ کے سوال کے مطابق نہ تھا۔ چونکہ آپؒ فرمایا کرتے تھے کہ رسم الخط یا تجوید کا حوالہ قابل قبول نہیں ہے بلکہ صرفی قاعدہ ہی قابل قبول ہوگا۔ اس لیے راقم الحروف نے اس جواب کو آپ کی خدمت میں پیش نہیں کیا۔ البتہ راقم الحروف اپنی طرف سے ایک توجیہ اہل علم کی خدمت میں پیش کرتا ہے کہ اگر ان صیغہ جات پر غور کیا جائے تو یہ صیغہ جات جاءو، باءو، تبوءو مہموز اللام ہیں۔ ممکن ہے ان کے آخر میں الف نہ آنے کی وجہ یہ ہو کہ قرآن حکیم میں جہاں بھی مہموز اللام کے باب سے جمع مذکر غائب کے صیغے ہیں، ان کے آخر میں الف نہیں لکھا جاتا۔ البتہ جمع مذکر غائب کا ایک اور صیغہ عتوا ایسا ہے جس کے آخر میں الف نہیں ہے اور وہ مہموز اللام بھی نہیں۔ اس کی وجہ قرآن کریم کا مخصوص رسم الخط معلوم ہوتی ہے، کیونکہ یہ صیغہ قرآن میں چار جگہ مذکور ہے۔ تین جگہ اس کے آخر میں الف لکھا ہوا ہے اور ایک جگہ الف نہیں لکھا ہوا۔ ایک جگہ الف کا لکھا ہوا نہ ہونا رسم الخط کے توفیقی ہونے کی طرف اشارہ کر رہا ہے۔ بخلاف درج بالا مہموز اللام صیغہ جات کے کہ وہ قرآن میں جہاں بھی مذکور ہیں، ان کے آخر میں الف نہیں ہے۔ واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب۔

بہرحال حضرت شیخؒ طلبہ میں تحقیقی ذوق وشوق پیدا کرنے کے لیے اس نوعیت کے سوالات کیا کرتے تھے تاکہ طلبہ میں مختلف سوالات کے حل کے لیے مختلف کتب اور مختلف شخصیات سے مراجعت کی عادت پختہ ہو جائے۔

۵۔ الفاظ کے صحیح تلفظ پر تنبیہ: آپ کے درس تفسیر کا ایک امتیازی وصف جس کو عام طور پر نظر انداز کر دیا جاتا ہے، الفاظ کی ادائیگی میں صحت تلفظ کا خیال تھا۔ آپ بعض اوقات مشکل الفاظ کے درست تلفظ کے لیے الفاظ کے ہجے بھی کیا کرتے تھے۔ اس ضمن میں چند مثالیں ملاحظہ فرمائیں۔

۱۔ یونان ۔ درست تلفظ یونان بفتح الیاء ہے، لیکن بعض لوگ اس کو یونان بضم الیاء پڑھتے ہیں جو غلط ہے۔ الفاظ کی ادائیگی میں تلفظ صحت کا خیال ضرور رکھیں۔ یونان کو ہمیشہ بفتح الیاء ہی پڑھیں نہ کہ بضم الیاء۔ تفصیل کے لیے مفتاح السعادۃ ومصباح السیادۃ لطاش کبریٰ ازادہ ملاحظہ فرمائیں۔

۲۔ بیت المقدس کا صحیح تلفظ البیت المقدس بصیغہ اسم مفعول ہے۔ اس کے علاوہ اس کو بیت المقدِس بھی پڑھ سکتے ہیں، جیسا کہ امام نووی نے تہذیب الاسماء واللغات میں تصریح فرمائی ہے۔ یہ شہر جبل صہیون پر آباد ہے۔ صِہیَون بروزن برزون ہے، کما قال مجد الدین فیروز آبادی فی القاموس۔ آج کل بعض صحافی اور جدید تعلیم یافتہ حضرات جو عربی لغت سے ناواقف ہیں، وہ صِہیَون کو صَیہون لکھ دیتے ہیں جو غلط ہے۔

۳۔ حضرت ابراہیم کی دعوت توحید کی راہ میں روڑے اٹکانے والا بادشاہ وقت کون تھا؟ عام طور پر اس کا نام نمرود بن

کنعان لیا جاتا ہے، لیکن نکتہ رس مفسر شیخ سلام الدین دہلویؒ صاحب کمالین فرماتے ہیں، نمرود درست نہیں ہے بلکہ اس کا نام نُمرُوذ بن کنعان تھا۔

۶۔ جغرافیائی مقامات کی وضاحت: آپؒ دوران تدریس قرآن میں مذکور ہر مقام اور علاقہ کی جغرافیائی وضاحت کی طرف بھرپور توجہ فرماتے تھے۔ اس ضمن میں آپؒ تاریخ ارض القرآن از علامہ سید سلیمان ندوی اور قصص القرآن از مولانا حفظ الرحمٰن سیوہارویؒ سے استفادہ کی تلقین فرماتے تھے۔ بطور نمونہ ایک مثال ملاحظہ فرمائیں:

> ''بنی اسرائیل بحر قلزم کو عبور کر کے وادی تیہ میں پہنچے جس کو آج کے جغرافیہ میں وادی سینائی کہتے ہیں۔ علامہ جار اللہ زمخشری تفسیر کشاف میں اس کی پیمائش کے بارے میں لکھتے ہیں کہ یہ وادی ۳۶ میل لمبی اور ۲۴ میل چوڑی ہے اور یہ سطح سمندر سے تقریباً ۵ ہزار فٹ کی بلندی پر واقع ہے'' ۱۹۶۷ء کی جنگ میں یہودیوں نے اس پر قبضہ کر لیا تھا۔ پھر مصر نے لڑائی کے بعد اس حاصل کیا، لیکن جس حصہ میں تیل ہے اور جو رقبہ فوجی اہمیت کا حامل ہے، وہ ابھی تک یہود کے پاس ہے۔''

سورۃ المائدہ میں حضرت موسیٰؑ کے اپنی قوم سے خطاب یاقوم ادخلوا لارض المقدسة التی کتب الله لکم (اے میری قوم داخل ہو جاؤ اس پاک سرزمین میں جو اللہ تعالیٰ نے تمہارے لیے مقدر کر رکھی ہے) میں الارض المقدسہ سے کون سی پاک سرزمین مراد ہے؟ حضرت شیخؒ کے الفاظ ملاحظہ فرمائیں:

> ''شام، لبنان، اردن، کنعان، اس وقت جو علاقہ یہود کے پاس ہے، یہ بھی اور ایشیا کا کچھ حصہ بھی۔ یہ وسیع تر علاقہ ارض مقدس کہلاتا ہے۔ اس علاقہ کو ارض مقدس اس لیے کہتے ہیں کہ یہاں بے شمار پیغمبر تشریف لائے اور ان کی قبریں بھی اسی علاقہ میں ہیں۔ یہ بڑا زرخیز اور ٹھنڈا علاقہ ہے۔ ہر طرح کے پھل اس علاقہ میں وافر ہوتے ہیں۔ اس کا پانی صاف ستھرا ہے۔''

۷۔ شاذ اور مردود تفسیری اقوال کی نشان دہی: آپ قرآنی آیات کی تفسیر میں جہاں تعامل سنت، تعامل صحابہ اور تعامل امت سے استشہاد فرماتے تھے، وہیں شاذ اور مردود تفسیری اقوال کا بھرپور علمی تعاقب کرتے ہوئے احقاق حق اور ابطال باطل کا فریضہ بھی انجام دیتے تھے۔ اس ضمن میں آپ نے مفتی نعیم الدین صاحب مراد آبادیؒ کے تفسیری حواشی پر ''تنقید متین بر نعیم الدین'' کے نام سے ایک کتاب تحریر فرمائی جس میں ان کے تحریر کردہ بعض غلط تفسیری حواشی کا قرآن وسنت کی تعلیمات کی روشنی میں جائزہ لیتے ہوئے درست موقف کو واضح فرمایا۔ آپؒ احمد رضا خان صاحب بریلوی کی تفسیر کنز الایمان پر ان الفاظ میں تبصرہ فرمایا کرتے تھے کہ ''خدا گواہ ہے کہ لفظی ترجمہ میں جتنی غلطیاں احمد رضا خان صاحب نے کی ہیں، کسی اور نے نہیں کیں۔'' جن فرق باطلہ نے اپنے بعض من گھڑت عقائد ونظریات کو قرآن کے دلائل کی روشنی میں درست ثابت کرنے کی کوشش کی، حضرتؒ دوران تدریس ان کے استدلال کی حقیقت کو واضح فرماتے اور ان کے غلط عقائد ونظریات کو رد فرماتے۔ قارئین ذیل میں چند مثالیں ملاحظہ فرمائیں۔

۱۔ سورۃ الاعراف کی آیت ۳۵ میں ارشاد باری ہے: يَا بَنِيْ آدَمَ إِمَّا يَأْتِيَنَّكُمْ رُسُلٌ مِّنكُمْ يَقُصُّونَ عَلَيْكُمْ آيَاتِيْ فَمَنِ اتَّقَى وَأَصْلَحَ فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ'' (اے اولاد آدم اگر آئیں تمہار

رسول تم میں سے جو بیان کریں تم پر میری آیات کو جو لوگ میرے احکامات کی نافرمانی سے بچے اور انہوں نے اپنی اصلاح کر لی تو اس کے لیے نہ کوئی خوف ہوگا اور نہ وہ غمزدہ ہوں گے۔)

قادیانیوں نے درج بالا آیت کریمہ سے اپنا کفریہ عقیدہ اجرائے نبوت ثابت کرنے کی کوشش کی ہے۔ ان کا طرز استدلال یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں: یَا بَنِیْ آدَمَ إِمَّا یَأْتِیَنَّکُمْ رُسُلٌ مِّنکُمْ۔ (اے اولاد آدم اگر آئیں تمہارے پاس رسول تم میں سے)۔ اس پر ارشاد ربانی معلوم ہوتا ہے کہ بنی آدم کے پاس پیغمبر آتے رہیں گے اور حکم ہے کہ جب پیغمبر آئے تو اس پر ایمان لاؤ، چنانچہ ہم بھی بنی آدم ہیں۔ جب ہمارے پاس پیغمبر یعنی مرزا غلام احمد قادیانی آچکا ہے، تو ہم اس پر اس حکم خداوندی کے مطابق ایمان کیوں نہ لائیں؟ اس باطل استدلال کا جواب حضرت شیخ کے الفاظ میں ملاحظہ فرمائیں:

''اللہ تعالیٰ نے عالم ارواح میں فرمایا تھا کہ اے بنی آدم تمہارے پاس پیغمبر آتے رہیں گے، چنانچہ اس ارشاد کے مطابق پیغمبر تشریف لاتے رہے یہاں تک کہ حضرت عیسیٰ تشریف لائے اور انہوں نے اللہ تعالیٰ کی طرف سے '' ومبشرا برسول یاتی من بعدی اسمہ احمد '' کی بشارت سنائی۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میرا نام احمد بھی ہے اور محمد بھی ہے۔ جب آپ دنیا میں تشریف لے آئے تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا ''ما کان محمد ابا احد من رجالکم ولکن رسول اللہ و خاتم النبیین'' (محمد تمہارے مردوں میں کسی کے باپ نہیں ہیں بلکہ وہ اللہ تعالیٰ کے رسول اور خاتم النبیین ہیں)۔ قرآن کی اس نص قطعی سے معلوم ہوتا ہے کہ سلسلہ نبوت جاری نہیں ہے بلکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر ختم ہو چکا ہے۔ خاتم النبیین کی تشریح وتوضیح آنحضرت کے اس فرمان مبارکہ سے بھی ہوتی ہے کہ انا خاتم النبیین لا نبی بعدی۔ چنانچہ قادیانیوں کا یہ استدلال کہ نبوت جاری ہے بالکل باطل اور بے بنیاد ہے کیوں کہ اما یاتینکم رسل منکم کا خطاب تو اللہ تعالیٰ نے عالم ارواح میں فرمایا تھا۔ اس فرمان کے مطابق سلسلہ نبوت چلتا رہا اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر ختم ہو گیا۔''

۲۔ سورۃ آل عمران آیت ۱۴۴ میں ارشاد باری ہے: وما محمد الا رسول قد خلت من قبلہ الرسل، (محمد صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے رسول ہیں، تحقیق آپ سے پہلے بھی رسول گزر چکے ہیں۔) قادیانیوں نے درج بالا آیت سے ایک نحوی قاعدہ کا سہارا لیتے ہوئے یہ استدلال کیا ہے کہ درج بالا آیت قد خلت من قبلہ الرسل میں الرسل جمع کا صیغہ ہے اور نحو کی مشہور کتب عبدالغفور، رضی اور مغنی اللبیب میں یہ قاعدہ ہے کہ الف لام جب جمع کے صیغے پر داخل ہو تو یفید الاستغراق بالاتفاق ، اس میں جمعیت کا معنی نہیں رہتا۔ اسی قاعدہ کے مطابق جمع کے صیغے رسل پر الف لام داخل ہو چکا ہے، لہٰذا نحوی قاعدہ کے مطابق اس ارشاد کا درست ترجمہ یہ ہو سکتا ہے کہ آپ سے پہلے تمام رسول وفات ہو چکے ہیں اور حضرت عیسیٰ بھی رسل میں شامل ہیں، چنانچہ وہ بھی وفات ہو چکے ہیں۔

اس باطل استدلال کا جواب حضرت شیخ کے الفاظ میں ملاحظہ فرمائیں:

''قادیانیوں نے جس نحوی قاعدہ کا سہارا لیا ہے، بے شک وہ نحوی قاعدہ بالکل درست ہے، لیکن ایک اصول ہمیشہ یاد رکھیں کہ کوئی بھی قاعدہ خواہ صرفی ہو یا نحوی، کلی نہیں ہوتا بلکہ اکثری ہوتا ہے۔ قاعدہ کلیہ تو صرف ایک ہی ہے ان لا کلیۃ، کہ کوئی بھی قاعدہ کلی نہیں ہوتا۔ سورۃ بقرہ کی آیت ۸۷ سے بھی قادیانیوں کے اس استدلال کا

باطل ہونا معلوم ہوتا ہے۔ ارشاد باری ہے: ولقد آتینا موسی الکتاب وقفینا من بعدہ بالرسل، (بلاشبہ ہم نے موسیٰ کو کتاب دی، پھر اس کے بعد پے در پے ہم نے رسول بھیجے)۔ اس قرآنی ارشاد میں بھی جمع کے صیغہ رسل پر الف لام آیا ہے۔ اگر الرسل کا صیغہ استغراق ہی کا فائدہ دیتا ہے تو پھر لامحالہ ماننا پڑے گا کہ تمام رسول حضرت موسیٰ کے بعد تشریف لائے اور حضرت موسیٰ پہلے پیغمبر ہیں۔ حالانکہ یہ بات مسلم ہے کہ بہت سے پیغمبر حضرت موسیٰ سے پہلے بھی تشریف لائے ہیں اور اس بات کو قادیانی بھی تسلیم کرتے ہیں۔ چنانچہ الرسل کے صیغہ سے ایک نحوی قاعدہ کے سہارا لیتے ہوئے حضرت عیسیٰ کی وفات پر استدلال بالکل باطل ہے کیوں کہ یہ استدلال نص قرآنی کے بالکل خلاف ہے۔ دوسری قابل غور بات یہ ہے کہ خلا کا حقیقی معنی وفات نہیں ہے، بلکہ یہ تو مجازی معنی ہے۔ خلا کا حقیقی معنی ہے جگہ خالی کرنا۔ اس لیے علامہ آلوسی، امام رازی نے ترجمہ یوں کیا ہے کہ پیغمبروں نے جگہ خالی کر دی ہے یعنی یا تو وفات پا گئے یا آسمانوں پر اٹھا لیے گئے۔

اس ضمن میں آپ روافض، منکرین حدیث، قادیانی، آغا خانی، ذکری، بہائی بلکہ اس سے آگے بڑھ کر تحریک آریہ سماج کے لیڈر دیانند سرسوتی کے قرآن عظیم پر اعتراضات اور قرآنی آیات سے غلط استدلالات کا بھرپور علمی تعاقب فرماتے۔ شیعیت، جو یہودیت کی ردیف ہے، کے باطل عقائد ونظریات کی تردید کے لیے علامہ ابن تیمیہ کی کتاب منہاج السنۃ کے مطالعہ کی تلقین فرمایا کرتے تھے۔ اس کتاب کی تالیف کا پس منظر یہ بتاتے تھے کہ ایک رافضی نے اپنے نظریات کی تائید کے لیے منہاج الکرامۃ نامی کتاب لکھی جس میں باطل عقائد کو خوب واضح کیا، چنانچہ اس کتاب کے جواب میں امام ابن تیمیہ نے منہاج السنۃ تالیف فرمائی جس کی اہمیت کے متعلق مولانا عبدالحئی لکھنوی نے اپنی کتاب التعلیقات السنیۃ میں لکھا ہے کہ لم یصنف فی الباب مثلہ، اس مسئلہ پر اس جیسی کوئی کتاب نہیں لکھی گئی۔ آپؒ نے اپنی کتاب ''ارشاد الشیعہ'' میں شیعہ کے کفر کی وجوہات کو بالتفصیل بیان فرمایا اور اس سلسلہ میں ان کے عقائد ونظریات کو ان کی بنیادی کتب سے نقل فرمایا۔

آپ دوران تفسیر کمیونسٹ حضرات کے ''مساوی حقوق کے عادلانہ معاشی نظریہ'' کی بھی بھرپور تردید فرماتے تھے اور مختلف قرآنی آیات سے ان کے غلط استدلات کی وضاحت فرماتے ہوئے درست موقف کی نشاندہی فرماتے تھے۔ مختصر یہ کہ جس باطل فرقہ یا جس باطل جماعت نے اپنے باطل نظریات کو قرآنی آیات سے سچا ثابت کرنے کی کوشش کی، آپؒ قرآن وسنت کی تعلیمات کی روشنی میں اس کا بھرپور علمی تعاقب فرماتے ہوئے اس کا رد فرماتے۔ اس ضمن میں اگر متقدمین میں سے بھی کسی شخصیت نے قرآن وسنت کی تعلیمات اور جمہور کی راہ سے ہٹ کر کوئی موقف اختیار کیا ہوتا تو آپؒ اس شخصیت کے مقام ومرتبہ کو ملحوظ رکھتے ہوئے اس موقف اور اس میں موجود سقم اور کمزوری کی وضاحت کرتے ہوئے درست موقف کی نشاندہی فرماتے۔ اسی لیے آپ اکثر یہ نصیحت فرمایا کرتے تھے کہ ''میرے عزیزو! اکابر کے دامن کو مضبوطی سے تھامے رکھنا، اکابر کی رائے پر اعتماد کرنا۔ جتنے فرقے پہلے گمراہ ہوئے ہیں، ان کی گمراہی کا نقطہ آغاز اسی سے ہوا کہ انہوں نے قرآن وحدیث کے فہم میں اکابر واسلاف کی راہ کو چھوڑ دیا۔ چنانچہ آپ نے تاریخ اٹھا کر دیکھ لیں، خوارج اور معتزلہ نے جب اکابر واسلاف کو چھوڑا ہے تو ٹھوکر پہ ٹھوکر کھائی ہے۔'' اس ضمن میں حضرت شیخ علامہ جاراللہ زمخشریؒ، صاحب کشاف کے تمام تر علمی مقام ومرتبہ کو ملحوظ خاطر رکھتے ہوئے رؤیت باری تعالیٰ کے متعلق ان کے موقف کی کمزوری کو واضح فرماتے اور

درست موقف کی نشاندہی فرماتے ۔حضرت شیخ کے الفاظ ملاحظہ فرمائیں:

''ہم جاراللہ زمخشری کی علمی طور پر قدر کرتے ہیں ۔صرفی ،نحوی ،معانی اور بدیع کے اصول وقواعد کے لحاظ سے جو مقام ومرتبہ کشاف کا ہے، کسی اور تفسیر کا نہیں ۔تاہم رؤیت باری کے اجماعی مسئلہ میں انہوں نے جو موقف اختیار کیا ہے، وہ ہرگز قابل قبول نہیں ہے ۔قرآن وسنت کے ٹھوس دلائل کی روشنی میں اہل حق کا موقف تو یہ ہے کہ رؤیت باری تعالیٰ برحق ہے ۔اللہ تعالیٰ اہل ایمان کو قیامت کے دن اپنی رویت کی نعمت سے سرفراز فرمائیں گے ۔قرآن کی ایک سے زیادہ آیات اس موقف کی صداقت پر دلالت کرتی ہیں اور احادیث مبارکہ میں صحابہ کرام کے استفسار پر ''هل نرى ربنا يوم القيامة'' (کیا ہم قیامت کے دن اللہ کو دیکھیں گے) کے جواب میں بھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ تم قیامت کے دن اللہ تعالیٰ کا دیدار کرو گے ۔لیکن علامہ جاراللہ زمخشری نے اس اجماعی مسئلہ میں نہ صرف اہل حق کے موقف سے انحراف کیا، بلکہ انہوں نے سورۃ الانعام کی آیت ۱۰۳'' لاتدركه الابصار وهو يدرك الابصار وهو اللطيف الخبير ''میں رویت باری تعالیٰ کا انکار کرتے ہوئے اس موقف کے قائلین اہل حق کے بارے میں لکھا ہے کہ وہ گدھوں کی طرح ہیں ۔علامہ جاراللہ زمخشری متعصب معتزلی تھے ۔رؤیت باری تعالیٰ کے اس مسئلہ پر ان کا یہ موقف پڑھ کر مجھے سخت صدمہ پہنچا ۔اب بھی میں احترام سے ان کا نام لیتا ہوں، لیکن ان کے بعض عقائد ونظریات کی وجہ سے قصداً ان کے نام کے ساتھ رحمہ اللہ تعالیٰ کے الفاظ نہیں بولتا۔''

علامہ جاراللہ زمخشری تو معتزلہ سے تعلق رکھتے تھے، اگر اہل سنت والجماعت کی کسی عالی قدر علمی شخصیت سے بھی کوئی تسامح ہوا تو آپ اس کی بھی نشان دہی کرتے ہوئے درست موقف کی نشاندہی فرماتے ۔حضرت شیخ اکثر فرمایا کرتے تھے کہ یاد رکھیں، علما کی غلطیوں کا نام دین نہیں ہے ۔بڑی سے بڑی شخصیت سے بھی غلطی ہو سکتی ہے ۔الحمد للہ ہمارے اکابر کا طریقہ یہ ہے کہ وہ غلط موقف کی تائید نہیں کرتے ۔اگر کسی صاحب علم بزرگ شخصیت سے کوئی غلطی ہو جائے تو بزرگ شخصیت کو برا بھلا نہیں کہتے ، بلکہ ان کا احترام ملحوظ رکھتے ہوئے ان کی غلطی کی نشان دہی کر دیتے ہیں ۔

سورۃ بنی اسرائیل کی آیت ۴۷ کا آخری جملہ ہے: ان تتبعون الا رجلا مسحورا (تم ایک سحر زدہ آدمی کی اتباع کر رہے ہو) یہ جملہ قرآن کی فصاحت وبلاغت سے عاجز آ کر کہا کرتے تھے جس کا حقیقت سے کوئی تعلق نہیں ہے ۔تاہم آپ کی زندگی میں آپ پر جادو ہوا یا نہیں؟ اس کے متعلق بخاری شریف کی ایک روایت کے پیش نظر جمہور اہل علم کا موقف یہ ہے کہ آپ پر لبید بن اعصم یہودی نے جادو کیا، لیکن دین کے معاملہ میں اس جادو کا قطعاً کوئی اثر نہیں ہوا ۔ہاں دنیاوی معاملات میں اس کا اثر ہوا ہے ۔مثلاً آپ نے کبھی کھانا کھایا ہوتا تو آپ کو یاد نہ رہتا کہ کھانا کھایا ہے یا نہیں، کبھی پانی پیا ہوتا تو یاد نہ رہتا کہ پانی پیا ہے یا نہیں ۔یہ تو جمہور اہل علم کا موقف ہے لیکن اس سلسلہ میں امام ابوبکر جصاصؒ بھی مغالطے کا شکار ہو گئے ۔وہ فرماتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر جادو نہیں ہوا، کیونکہ بالفرض اگر مان لیا جائے کہ آپ پر جادو ہوا تھا تو پھر کفار کے اس قول ''ان تتبعون الا رجلا مسحورا'' کی تائید ہوتی ہے ۔ہم اس سلسلہ میں یہی عرض کرتے ہیں کہ بخاری شریف کی اس روایت سے کفار کے درج بالا قول کی بالکل تائید نہیں ہوتی لہٰذا کفار کے اس بے بنیاد قول کی تائید سے

ڈرتے ہوئے حدیث مبارکہ کو نظر انداز کرنا درست نہیں ہے، کیونکہ یہ جملہ تو کفار قرآن کی فصاحت وبلاغت سے عاجز آ کر کہتے تھے، لہٰذا ان کے اس جملے کا بخاری شریف کی روایت سے قطعاً کوئی تعلق نہیں ہے ۔

قرآن کی تفسیر فرماتے ہوئے ہر شاذ اور کمزور تفسیری قول کا بھرپور علمی جائزہ لیتے ہوئے درست موقف کی نشان دہی یوں فرماتے کہ تشکیک وارتیاب کے تمام بادل چھٹ جاتے اور سامعین وحاضرین کے قلوب ایمان ویقین کے نور سے معمور ہو جاتے ۔

۸۔ بدعات ورسومات کی تردید: آپ زندگی بھر توحید وسنت کا جام بھر بھر کر پلاتے رہے، چنانچہ قرآن کی تدریس کے دوران بھی آپ عقائد باطلہ اور بدعات ورسومات کی بھرپور تردید فرماتے تھے ۔بدعت کتنا بڑا جرم ہے، اس کے متعلق آپؒ اکثر فرمایا کرتے تھے کہ خدانخواستہ اگر ایک آدمی مسجد کی محراب میں بیٹھ کر سو بوتلیں شراب پی لے تو خود سوچیے کتنا بڑا گناہ ہے، لیکن یاد رکھیے کہ ایک بدعت کا گناہ اس سے بھی بڑھ کر ہے، کیونکہ شراب پینے سے دین کا نقشہ بدل نہیں جاتا جب کہ بدعت سے دین کا نقشہ بدل جاتا ہے اور لوگ غیر دین کو دین سمجھ کر اس پر عمل پیرا ہونے لگتے ہیں ۔ایک مرتبہ یہ واقعہ سنایا کہ ایک کرنل صاحب بڑی غالی اور متعصب بدعتی تھے ۔انہوں نے میری کتاب ''راہ سنت'' پڑھی ۔اللہ تعالیٰ نے ان کے دل کو روشن فرما دیا ۔انہوں نے تمام بدعات ورسومات سے توبہ کی اور پھر شکریہ ادا کرنے کے لیے میرے پاس بھی تشریف لائے ۔آپ کی تشریف آوری سے قبل، بقول آپ کے گکھڑ بدعت گڑھ تھا ۔پھر اس مرد حق کی شبانہ روز جدوجہد سے نہ صرف گکھڑ بلکہ گردونواح کے علاقے بھی توحید وسنت کے نور سے جگمگا اٹھے ۔آج ہر شخص خود اس حقیقت کا مشاہدہ کر سکتا ہے ۔یہاں یہ بات پیش نظر رہے کہ آپ بدعات کی تردید میں ہمیشہ نرم لب ولہجہ اختیار فرماتے ۔آپ اکثر فرمایا کرتے تھے کہ موقف اور نظریہ میں لچک نہیں ہونی چاہیے لیکن انداز گفتگو میں ہمیشہ نرمی ہونی چاہیے ۔

چند سال سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے یوم ولادت کے موقع پر جلوس نکالنے کا جو سلسلہ شروع ہوا ہے، اس کی حقیقت اور اس کے آغاز پر روشنی ڈالتے ہوئے فرماتے تھے کہ عید میلاد کا جلوس ہمارے سامنے نکلنا شروع ہوا ہے ۔اس کا بانی شیخ عنایت اللہ قادری ہے جو پہلے ہندو تھا اور رام لیلا کا جلوس نکالا کرتا تھا ۔پھر اللہ تعالیٰ نے اس کو اسلام کی توفیق دی تو اس نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا جلوس نکالنا شروع کر دیا ۔آج بھی کشمیری بازار لاہور میں اس کے مکان کے دروازے پر لکھا ہوا ہے ''شیخ عنایت اللہ قادری، بانی جلوس عید میلاد النبی صلی اللہ علیہ وسلم'' ۔جن بدعات کو آج لوگ دین بنائے پھرتے ہیں، ان سے تو صحابہ کرام کے کان بھی واقف نہ تھے ۔یاد رکھیں، غنیۃ الطالبین میں حضرت شیخ عبدالقادر جیلانیؒ فرماتے ہیں: ''اہل سنت وہ ہیں جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے طریقے اور صحابہ کرام کے نقش قدم پر چلنے والے ہوں ۔'' آپؒ اس ضمن میں شرکاے دورہ تفسیر کو مولانا عبید اللہ مرحوم کی کتاب ''تحفۃ الہند'' کے مطالعہ کی تلقین فرمایا کرتے تھے جو بدعات کے پس منظر سے آگاہی اور تردید کے لیے بہت عمدہ کتاب ہے ۔

۹۔ تقابل ادیان: آپ قرآنی علوم ومعارف کو شرکاے درس کے قلوب میں منتقل فرماتے ہوئے مذاہب عالم پر اسلام کی فوقیت کو اس انداز سے بیان فرماتے کہ دین اسلام کی صداقت وحقانیت، دلائل وبراہین کے ساتھ واضح ہو جاتی ۔یہود ونصاریٰ یا مستشرقین ومتجددین میں سے جس نے بھی دین اسلام پر کسی نوع کا حملہ کیا ہے، آپ دورہ تفسیر میں ان اعتراضات

وشبہات کے بھرپور انداز میں جوابات ارشاد فرماتے اور سب سے بڑھ کر خود معترضین کی کتب سے اسلام کی صداقت وحقانیت پر دلائل پیش فرماتے۔ آپؒ اکثر فرمایا کرتے تھے ”عزیزو! میں نے چومکھی لڑائی لڑی ہے۔“ یعنی جس جہت سے دین اسلام پر کسی جارح نے حملہ کیا ہے، میں نے اپنی وسعت کے مطابق اس کا جواب دینے کی کوشش کی ہے۔ آپ تفسیر قرآن کی تدریس کے دوران اسلام کی صداقت وحقانیت پر دلائل کے وہ انبار لگا دیتے کہ شرکا بزبان حال یہ بھی پکار اٹھتے کہ آپ کا علم وعمل اور آپ کا پاکیزہ کردار بھی اسلام کی صداقت وحقانیت کی کھلی دلیل ہے۔

۱۰۔ کتب تاریخ وکتب سیر کے حوالہ جات: آپؒ شرکا میں محبت رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا پاکیزہ جذبہ بیدار کرنے کے لیے سیرت طیبہ سے متعلق مختلف واقعات کو مختلف کتب سیر کے حوالہ سے بیان فرماتے۔ کبھی تو سیرت ابن ہشام کا حوالہ دیتے، کبھی زاد المعاد کا اور کبھی وفاء الوفاء فی اخبار دار المصطفیٰ کا حوالہ ارشاد فرماتے۔ ایک ایک حوالہ تلاش کرنے کے لیے تاریخ وسیرت کی کن کن کتابوں کی ورق گردانی کرتے اور آپ کی عقابی نگاہ کہاں کہاں تک پہنچتی، اس ضمن میں حضرت شیخ کے تحقیقی ذوق کا اندازہ ایک بات سے کیا جا سکتا ہے۔ فرماتے تھے کہ میدان احد میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا کون سا دانت مبارک شہید ہوا؟ میں سالہا سال تک اس سوال کے جواب میں مختلف کتب کی ورق گردانی کرتا رہا اور بالآخر وفاء الوفاء فی اخبار دار المصطفیٰ میں مجھے یہ ملا کہ آپ کے نیچے والے سامنے کے دو دانتوں میں سے دایاں دانت مبارک شہید ہوا۔ علما مدرسین اور طلبہ جب اس نوع کے واقعات سنتے تو ان میں تحقیقی ذوق بیدار ہوتا۔ آپ اس نوع کے تحقیقی واقعات بیان فرما کر بطور مزاح ارشاد فرماتے تھے، ”میرے عزیزو! اب تو ذوق بھی فوت ہو چکا ہے اور شوق بھی، رحمہما اللہ۔“

آپ علمائے ہند کے پاکیزہ کردار اور عظمت کو حاضرین کے قلب ودماغ میں راسخ کرنے کے لیے ایک تاریخی کتاب ”علماء ہند کی شاندار ماضی“ کے مطالعہ کی تلقین فرمایا کرتے تھے۔ ارشاد فرماتے تھے: ”انگریز کے مظالم سے آگاہی کے لیے اس کتاب کا مطالعہ ضرور کریں۔ روس کے مظالم سے آگاہی کے لیے المسئلۃ الشرقیۃ لمصطفیٰ کمال مصری کا مطالعہ کریں۔ المسئلہ الشرقیہ عربی میں ہے، اس کا ترجمہ نیاز فتح پوری نے کیا ہے۔ نیاز فتح پوری ملحد تھا، ایک مولوی کا بیٹا تھا، عربی ادب میں ماہر تھا اور حساب میں بھی ماہر تھا، لیکن گمراہ ہو گیا۔ اس لیے میں کہا کرتا ہوں کہ دعا کرو کسی مولوی کا دماغ خراب نہ ہو۔ اگر مولوی کا دماغ خراب ہو جائے تو فرعون سے بڑھ جاتا ہے۔ اس کی ایک کتاب ہے ”من ویزداں“۔ کالجوں کے نصاب میں شامل تھی، شور وغل سے اس کتاب کو نصاب سے خارج کر دیا گیا ہے۔ طلبہ میں مطالعہ کا ذوق وشوق پیدا کرنے کے لیے کبھی کبھی فرمایا کرتے تھے کہ بحمد اللہ میں نے اپنی زندگی درس ومطالعہ اور تصنیف وتالیف میں گزاری ہے۔ تحدیث بالنعمۃ کے طور پر عرض کرتا ہوں کہ پاکستان، افغانستان، بنگلہ دیش اور ہندوستان میں آج کے دور میں کسی عالم نے مجھ سے زیادہ مطالعہ نہیں کیا۔

اللہ تعالیٰ نے آپ کو قرآن کی تفسیر کا ایسا فہم اور پاکیزہ ذوق وشوق عطا فرمایا تھا جس کی وجہ سے کہنہ مشق اور مدرس علما اور منتہی طلبہ آپ کے دورۂ تفسیر میں چہار طرف سے کھنچے چلے آتے تھے، حتیٰ کہ آپ کے مادر علمی دار العلوم دیوبند سے بھی علما وطلبہ آپ کے حلقہ درس میں شریک ہو کر اپنی علمی پیاس بجھاتے تھے۔ آپ کے بالواسطہ یا بلاواسطہ تلامذہ دنیا کے اکثر ممالک میں دینی خدمات سرانجام دے رہے ہیں۔ آپؒ متقدمین ومتاخرین اصحاب علم کی بلند پایہ علمی تفاسیر کی روشنی میں قرآنی

آیات کی تشریح وتوضیح فرمایا کرتے تھے۔ احکام القرآن، تفسیر ابن جریر طبری، تفسیر کبیر، البحر المحیط، ابن کثیر، روح المعانی، بیضاوی، مظہری، تفسیر عزیزی، جلالین، جمل، خازن، معالم التنزیل، مدارک، کشاف، ابو سعود اور بیان القرآن سے جب بار بار حوالہ جات نقل فرماتے تو شرکائے درس خود کو قرآنی علوم کے بحر زخار میں غوطہ زن محسوس کرتے۔ آپ جب خود قرآنی علوم ومعارف کے بحر زخار میں غوطہ زن ہوتے تو اس سفر میں بہت سے متقدمین آپ سے پیچھے رہ جاتے۔ آپ کو قرآنی علوم ومعارف سے کس قدر شغف تھا، اس کا اندازہ حضرت شیخ کے بیان کردہ ایک واقعہ سے بخوبی ہوتا ہے۔

سورۃ الاعراف آیت ۸۵ میں ارشاد باری ہے: والی مدین اخاھم شعیباً قال یقوم اعبدوا اللہ ما لکم من الہ غیرہ قد جاء کم بینۃ من ربکم (اور اہل مدین کی طرف ہم نے ان کے بھائی شعیبؑ کو بھیجا۔ انہوں نے فرمایا، اے میری قوم! اللہ تعالیٰ کی عبادت کرو، جس کے سوا تمہارا کوئی الٰہ نہیں ہے۔ تحقیق تمہارے پاس تمہارے رب کی طرف سے واضح دلیل آ چکی ہے) بینۃ کا معنی معجزہ ہے اور اکثر پیغمبروں کے معجزات قرآن میں مذکور ہیں، لیکن حضرت شعیبؑ کا معجزہ صراحت کے ساتھ قرآن میں مذکور نہیں ہے۔ اب اس فرمان میں بینۃ سے مراد تو معجزہ ہی ہے، لیکن کون سا معجزہ؟ میں تقریباً ۳۰ سال تلاش کرتا رہا اور پھر طویل جد وجہد کے بعد مجھے بدائع الظہور فی وقائع الدہور نامی کتاب میں اس سوال کا جواب ملا کہ حضرت شعیب کو اللہ تعالیٰ نے کون سا معجزہ عطا فرمایا تھا۔ بدائع الظہور میں ہے کہ قوم شعیب نے کہا، اے شعیب! اگر یہ ہمارے بت تمہاری دعوت کی تصدیق کر دیں تو ہم ایمان لے آئیں گے۔ حضرت شعیبؑ نے فرمایا، اگر اللہ تعالیٰ تمہارے منہ سے نکلا ہوا مطالبہ پورا کر دیں تو کیا تم واقعی ایمان لے آؤ گے؟ وہ بولے، کیوں نہیں۔ چنانچہ لوگوں کے بھرے مجمع میں حضرت شعیب بتوں کے پاس تشریف لے گئے اور بتوں سے مخاطب ہو کر فرمایا کہ تم کیا کہتے ہو اس دعوت کے متعلق جو میں انہیں پہنچاتا ہوں؟ (یعنی اللہ کی عبادت کرو، اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہراؤ، اور میں اللہ کا رسول ہوں) اللہ تعالیٰ نے ان بتوں کو قوت گویائی عطا فرمائی اور بتوں نے بلند آواز سے کہا، لا الہ الا اللہ وانت رسول ربنا۔ کسی قرآنی لفظ کے صحیح مفہوم اور مصداق کی تلاش میں تیس تیس سال تک جستجو کرتے رہنا قرآنی علوم ومعارف سے آپ کے خصوصی شغف کا نتیجہ ہی تھا۔

قرآن کے ۱۹ ویں پارہ میں ایک سورۃ کا نام چیونٹی کے نام پر سورہ نمل رکھا گیا ہے۔ اس چیونٹی کا نام کیا تھا، آپ کی تحقیقی نگاہ یہاں تک بھی پہنچی۔ فرماتے تھے کہ یہ مادہ چیونٹی تھی اور لنگڑی تھی۔ اس کے دو نام منذرہ اور طاعۃ تفاسیر میں مذکور ہیں۔

قرآن مجید کی تفہیم کے لیے آپ لغات القرآن از مولانا عبد الرشید نعمانیؒ، تاریخ ارض القرآن از مولانا سید سلیمان ندویؒ اور قصص القرآن از مولانا حفظ الرحمٰن سیوہارویؒ کے مطالعہ کی بطور خاص تلقین فرماتے تھے۔

۱۱۔ اصلاح وہدایت: آپ شرکائے دورہ تفسیر کی اصلاح اور کردار سازی کی طرف بھی بھرپور توجہ فرماتے تھے۔ کبھی تو نیک اور پاکباز لوگوں کے زہد وتقویٰ کے واقعات سناتے اور کبھی ارشاد فرماتے کہ یقین کیجیے، جب تک آپ خود نماز باجماعت کی پابندی نہیں کریں گے، آپ کے تلامذہ پر آپ کا کوئی اثر نہیں ہوگا۔ کبھی ارشاد فرماتے، میرے ساتھ اللہ تعالیٰ کے گھر میں بیٹھ کر وعدہ کریں کہ مدرسہ کے معاملات میں ایک پیسہ کی بھی خیانت نہیں کریں گے۔ شرکائے درس کو تلقین فرماتے کہ اصلاح باطنی کے لیے کسی اللہ والے کے دست حق پرست پر بیعت ضرور کریں۔ میں نے اپنے اکابر کو دیکھا ہے

کہ ان میں سے ہرایک اسی سلسلہ رشد و ہدایت سے وابستہ تھا۔ اکثر اپنے شیخ حضرت مولانا حسین علی صاحبؒ اور اپنے ممتاز اساتذہ حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی، مولانا اعزاز علی، مولانا ابراہیم بلیاوی رحمہم اللہ کے واقعات سنایا کرتے تھے تاکہ شرکا کے قلوب میں ان پاکیزہ لوگوں کا پاکیزہ کردار ثبت ہو جائے۔

۱۲۔ علمی لطائف اور مزاح: حضرت پانچ پانچ گھنٹے مسند تدریس پر متمکن قرآنی علوم و معارف کے موتی بکھیرتے رہتے۔ جب طلبہ تھکاوٹ محسوس کرتے تو آپ مختلف تفاسیر کے حوالہ سے کوئی نہ کوئی علمی لطیفہ سنا دیتے، لیکن لطیفہ میں بھی معلومات، وقار اور سنجیدگی کو ہمیشہ پیش نظر رکھتے۔ مثلاً واذ قال موسی لقومہ ان اللہ یامرکم ان تذبحوا بقرۃ کی تفسیر بیان فرماتے ہوئے تفسیر عزیزی کے حوالہ سے ایک ہندو اور مسلمان کا مناظرہ سنایا کرتے تھے۔ مناظرہ کا موضوع یہ تھا کہ رب ہندو ہے یا مسلمان؟ دونوں نے اپنے اپنے دلائل پیش کیے۔ مسلمان نے کہا کہ اللہ نے تو گائے ذبح کرنے کا حکم دیا ہے، تم خود سوچو اگر اللہ ہندو ہوتا تو کیا گائے ذبح کرنے کا حکم دیتا؟ اس سے معلوم ہوا کہ اللہ ہندو نہیں ہے۔ مسلمان کی یہ دلیل سن کر ہندو خاموش ہو گیا۔

گیارہویں پارہ کے پہلے رکوع میں اعراب کے مزاج اور طبیعت کے اعتبار سے اللہ تعالیٰ نے ان کی دو قسمیں بیان فرمائی ہیں۔ حضرت شیخ دیہاتیوں کی دونوں قسمیں بیان فرماتے ہوئے امام غزالیؒ کے حوالے سے ایک دلچسپ لطیفہ سنایا کرتے تھے۔ امام غزالی فرماتے ہیں کہ ایک امام صاحب لوگوں کو نماز پڑھا رہے تھے۔ انہوں نے سورۃ توبہ کی آیات تلاوت کیں۔ جب وہ اس آیت پر پہنچے "الاعراب اشد کفرا و نفاقا واجدر الا یعلموا حدود ما انزل اللہ علی رسولہ واللہ علیم حکیم" (دیہاتی عرب کفر اور نفاق میں زیادہ سخت ہیں اور ان میں یہ امکان زیادہ ہے کہ ان حدود کو نہ سمجھ سکیں جو اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول پر نازل کی ہیں اور اللہ تعالیٰ سب کچھ جاننے والا اور حکمت والا ہے)۔ ایک دیہاتی بھی نماز با جماعت پڑھ رہا تھا۔ اس کو یہ آیت سن کر بڑا غصہ آیا۔ اس نے ایک ڈنڈا اٹھایا اور امام صاحب کے سر پر دے مارا۔ امام صاحب قراءت کرتے رہے اور جب اس سے اگلی آیت پڑھی: ومن الاعراب من یؤمن باللہ والیوم الآخر ویتخذ ما ینفق قربات عند اللہ وصلوات الرسول (کچھ اعرابی ایسے بھی ہیں جو اللہ تعالیٰ اور آخرت کے دن پر ایمان رکھتے ہیں اور جو کچھ خرچ کریں، اسے قرب الٰہی اور دعائے رسول کا ذریعہ سمجھتے ہیں) تو دیہاتی یہ الفاظ سن کر بہت خوش ہوا اور فوراً بولا، الان نفعک العصا، ابھی ابھی ڈنڈے کا اثر ہو گیا ہے۔

ان الصلوۃ تنھی عن الفحشاء والمنکر (بے شک نماز بے حیائی اور برے کاموں سے روکتی ہے) کی تفسیر بیان فرماتے ہوئے حضرت ملا علی قاری کے حوالہ سے، جو گیارھویں صدی کے مجدد ہیں، یہ لطیفہ سنایا کرتے تھے کہ ایک مرتبہ وہ چند ساتھیوں کے ہمراہ ایک سفر میں تھے۔ جب نماز کا وقت ہوتا، سب ساتھی با جماعت نماز ادا کرتے لیکن ایک صوفی قسم کا آدمی تنہا نماز ادا کرتا تھا۔ ملا علی قاریؒ نے اس سے تنہا نماز ادا کرنے کی وجہ دریافت کی تو اس نے کہا کہ آپ نے قرآن نہیں پڑھا؟ اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں: ان الصلوۃ تنھی (نماز تنہا پڑھنی چاہیے)

آپ ازراہ مزاح فرمایا کرتے تھے کہ:

"علامہ تاج الدین سبکیؒ کی کتاب طبقات الشافعیہ الکبریٰ میں اولیاء اللہ کی نشانیاں درج ہیں۔ ولایت کی نشانیوں میں سے ایک نشانی ہم سب میں پائی جاتی ہے۔ علامہ تاج الدین سبکیؒ ولی کی نشانیاں تحریر فرماتے ہوئے سترھویں نشانی تحریر فرماتے ہیں کہ وھو یقدر علی تناول طعام کثیر۔ اللہ تعالیٰ کا ولی زیادہ کھانے پر قادر ہوتا ہے۔ آپ بتائیں، یہ نشانی ہم سب میں پائی جاتی ہے یا نہیں؟ لیکن یہ بھی یاد رکھنا کہ ولی زیادہ کھانا کھانے پر قادر تو ہوتا ہے لیکن کھاتا نہیں۔"

جب اس نوع کے دلچسپ علمی لطائف شرکائے دورہ تفسیر کو سناتے تو سب ہشاش بشاش ہو جاتے، تاہم اس طرح کے علمی لطائف ایک نوع کا وقفہ اور تازہ دم ہونے کا ایک ذریعہ ہوتے تھے، چنانچہ جلد ہی آپ شرکا کو لے کر دوبارہ علمی تحقیق کی روشن شاہراہ پر گامزن ہو جاتے اور شرکا اپنی اپنی ذہنی سطح اور استعداد کے مطابق اس چشمہ صافی سے اپنی علمی پیاس بجھاتے۔

قارئین! گزشتہ صفحات میں آپ نے قرآن کے ایک محب صادق کی قرآنی علوم و معارف سے دلی وابستگی، ذوق و شوق، جدوجہد اور تدریسی دائرہ کار کا مطالعہ فرمایا۔ یہ تو ان کی جامع شخصیت کا ایک پہلو تھا، اس کے علاوہ انہوں نے تصنیف و تالیف کے میدان میں بھی نمایاں خدمات سرانجام دیتے ہوئے مختلف موضوعات پر ۴۷ کتب تالیف فرمائیں۔ نصف صدی میں فرد واحد نے گوناگوں مصروفیات کے باوجود ۴۷ کتب تالیف فرما کر تنہا ایک ادارہ کا فریضہ انجام دیا۔ اس کے علاوہ آپؒ شباب سے شیب تک تقریباً نصف صدی مسند تدریس پر رونق افروز رہے۔ ہزاروں تشنگان علم نے اس چشمہ علم و عمل سے اپنی علمی پیاس بجھائی۔ عامۃ الناس کی رشد و ہدایت کے لیے بھی آپ کی جدوجہد ہمیشہ داعیان حق کے پاکیزہ جذبات کو جلا بخشتی رہے گی۔ آپ گکھڑ کے گرد و نواح کے مختلف دیہاتوں میں خاص طور پر جمعرات کی شام کو کئی کئی میل پیدل سفر طے کر کے پہنچتے اور ان لوگوں تک توحید و سنت کا پیغام پہنچاتے۔ آپؒ عجز و انکساری کا ایسا عملی نمونہ تھے کہ کبھی مجلس میں نمایاں جگہ بیٹھنا پسند نہیں فرماتے تھے۔ آپ شہرت و ناموری سے کوسوں دور تھے۔ اگرچہ آپ نے طائر شہرت کے سارے پر کتر دیے تھے، لیکن پروردگار نے آپ کو علمی و عوامی حلقوں میں وہ شہرت عطا فرمائی کہ آج ان کی درس و تدریس کے فیض سے اسلامی علوم کے مراکز آباد ہیں۔ آپ کی جامع شخصیت ایک نمایاں پہلو کہ آپ جرات و استقامت، حق گوئی و بے باکی میں اکابر و اسلاف کی تابندہ روایات کے امین و مظہر تھے، عقیدہ ختم نبوت کے تحفظ اور غلبہ اسلام کی جدوجہد میں آپ زندانوں کو آباد فرما کر اپنے کردار و عمل سے سنت یوسفی کو زندہ فرمایا۔ راقم الحروف کے نزدیک آپ کی شخصیت کی سب سے نمایاں اور ممتاز خوبی یہ ہے کہ آپؒ نے اپنی شخصیت کی تعمیر خود کی ہے۔ مادی وسائل سے خالی و عاری حالات میں آنکھ کھولنے والا بچہ علم و عمل اور جہد مسلسل کی راہ پر چلتے ہوئے بعون اللہ تعالیٰ اس مقام تک پہنچا، جس مقام پر پہنچ کر انسان رشک ملائکہ بن جاتا ہے۔

انھیں ڈھونڈتی ہیں نگاہیں ہماری
جو خود چھپ گئے ساری محفل سجا کے

اللہ تعالیٰ آپ پر کروڑوں رحمتیں نازل فرمائے اور ہم سب کو آپؒ کے تابندہ نقوش پر چلتے رہنے کی توفیق نصیب فرمائے۔ آمین یارب العالمین۔ اللھم لاتحرمنا اجرہ ولاتفتنا بعدہ۔

جنرل ضیاء الحق مرحوم کی صدارت کا آخری دور تھا۔ ۱۹۸۸ء میں انھوں نے ایک مشائخ کانفرنس منعقد کرائی اور اس کانفرنس کی صدارت کے لیے حضرت شیخ الحدیثؒ کو دعوت دی گئی۔ آپ نے انکار کر دیا۔ ایک دن صبح کے وقت حضرت مولانا عبد القدوس خان قارن ہمیں مشکوٰۃ شریف کا سبق پڑھا رہے تھے کہ کمشنر گوجرانوالہ کا فون آیا اور اس نے کہا کہ ہوائی جہاز کے ذریعے حضرت کے سفر کے تمام انتظامات مکمل ہو چکے ہیں اور ان کے ساتھ اور بھی جتنے آدمی جانا چاہیں، جا سکتے ہیں۔ حضرت شیخ اس وقت اسباق پڑھا رہے تھے۔ جب اسباق سے فارغ ہوئے تو مولانا عبد القدوس خان قارن مدظلہ نے کمشنر صاحب کا پیغام آپ تک پہنچایا۔ آپ نے جواب میں فرمایا: میں حضرت مدنیؒ کا شاگرد ہوں۔ تمہاری مشائخ کانفرنس میں نہیں جاؤں گا۔

(روایت: حافظ محمد مشتاق، ہرنولی، میانوالی۔ فاضل جامعہ نصرۃ العلوم گوجرانوالہ)

....

حضرت امام اہل سنت دوران سفر کھانے کے وقت اپنے تمام ساتھیوں کو یاد رکھتے۔ دیگر مہمان تو حضرت کے ساتھ ہی کھانے پر آ جاتے تھے۔ اگر ڈرائیور کو گاڑی کھڑی کرتے یا کسی اور مصروفیت کی وجہ سے کچھ دیر ہو جاتی تو حضرت میزبان کو حکم دیتے تھے کہ بھئی ڈرائیور کو بلاؤ اور جب تک ڈرائیور دسترخوان پر آ نہ جاتا، حضرت کھانا شروع نہ فرماتے تھے۔ مولانا محمد نواز بلوچ فرماتے ہیں کہ حضرت امام اہل سنت دوران سفر تمام ساتھیوں کا خیال کرتے تھے، بالخصوص ڈرائیور کو ساتھ بٹھاتے اور فرماتے بھئی اچھی طرح سیر ہو کر کھاؤ، شرمانا نہیں۔

اپنے اکابر اور اساتذہ کا بے حد احترام کرتے اور ان کے خلاف کبھی کوئی بات سننا گوارا نہ کرتے تھے۔ مولانا محمد نواز بلوچ فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ مولانا محمد ریاض انور گجراتی نے حضرت قاضی شمس الدین صاحب کے متعلق کوئی بات کی تو حضرت امام اہل سنت سخت ناراض ہوئے اور مولانا گجراتی کو فوراً جھڑکتے ہوئے بات جاری رکھنے سے منع فرما دیا۔

(ماہنامہ ہدی للناس گوجرانوالہ، امام اہل سنت نمبر، جون ۲۰۰۹ء)

—— ۳ ——

تصنیف وتالیف

ایک دن میں نے کتابیں الٹتے پلٹتے دیکھا تو ایک کتاب کے اوپر نام جو پہلی بار میں نے دیکھا اور پڑھا، ابوالزاہد محمد سرفراز خان صفدر لکھا ہوا تھا اور وہ کتاب قراءۃ الفاتحہ خلف الامام کے موضوع پر تھی اور دو جلدوں میں تھی۔ تو میں اس قدر حیران ہوا کہ قراءۃ الفاتحہ خلف الامام 'ایک' مسئلہ ہے اور اس مسئلہ پر دو جلدوں میں ''احسن الکلام فی ترک القراءۃ خلف الامام''! تو حیرانی مجھے اس درجہ ہوئی کہ یہ مسئلہ ایک جزوی مسئلہ ہے، اس کے اوپر دو جلدوں میں کتاب! اور جب اس کو الٹنا پلٹنا شروع کیا تو سطر سطر حوالوں سے بھری ہوئی۔ ہر سطر میں حوالے ان کتابوں کے جن کا کبھی اس وقت نام بھی نہیں سنا تھا۔ اور اس نے اپنی جانب کھینچا اور یہ نام مبارک بھی پہلی بار ہی سنا تھا۔ اس کو پڑھنا شروع کیا اور پڑھنے کے بعد اندازہ ہوا کہ قراءۃ فاتحہ خلف الامام تو ایک عنوان ہے، علوم کے دریا بہانے کا ایک عنوان تھا۔ چھوٹا سا مسئلہ لیکن اس مسئلہ کی تحقیق اور تنقید میں کتنے اصولی مسائل، کتنے اصولی افادات اس کے اندر موجود تھے۔ تو اس روز پہلی بار میں نے یہ نام مبارک دیکھا اور سنا۔ پھر میں نے اپنے والد ماجد حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب قدس اللہ تعالیٰ سرہ سے پوچھا کہ یہ کون بزرگ ہیں تو حضرت والد صاحب نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو خاص توفیق عطا فرمائی ہے۔

مولانا عبدالحق خان بشیر*

امام اہل سنت رحمہ اللہ کی تصانیف: ایک اجمالی تعارف

امام اہل سنت حضرت مولانا محمد سرفراز خان صفدر رحمہ اللہ نے نصف صدی سے زائد عرصے پر محیط اپنی علمی و تحقیقی زندگی میں چوالیس محققانہ تصانیف سپرد قلم فرمائیں، جبکہ بعض مفید علمی رسائل کا اردو میں ترجمہ کیا۔ ذیل میں تاریخی ترتیب سے ان تصانیف و تراجم کا ایک مختصر اور اجمالی تعارف پیش کیا جا رہا ہے۔

۱) الکلام الحاوی فی تحقیق عبارۃ الطحاوی [مطبوعہ: ۱۳۶۴ھ/۱۹۴۴ء]

یہ حضرت نور اللہ مرقدہ کی پہلی تالیف ہے جو ایک خالص علمی مسئلہ پر لکھی گئی۔ امام طحاوی (المتوفی ۳۲۱ھ) کی معروف کتاب ''شرح معانی الآثار'' کی ایک عبارت سے بعض اکابر علما کو یہ شبہ گزرا کہ امام طحاویؒ دیگر ائمہ اہل سنت کے برعکس سادات و بنی ہاشم کے لیے زکوٰۃ و صدقات وصول کرنے کو جائز خیال کرتے ہیں۔ حضرت شیخؒ نے اس کتاب میں امام طحاویؒ کی عبارت سے پیدا ہونے والے شبہ کا ازالہ فرمایا اور دلائل سے ثابت کیا ہے کہ امام طحاوی دیگر محدثین و مفسرین اہل سنت سے اس مسئلہ میں ہرگز اختلاف نہیں رکھتے، بلکہ ان کے نزدیک بھی سادات کے لیے زکوٰۃ و صدقات لینا شرعاً ناجائز ہے۔ کتاب کے آخر میں ''تشیع کا اجمالی نقشہ'' کے عنوان سے شیعہ عقائد و نظریات پر مشتمل ۲۱ صفحات کا ضمیمہ بھی شامل ہے۔ اس کتاب کو اکابر علماے دیوبند کی تائید و تصدیق حاصل ہے۔

۲) آئینہ محمدی [مطبوعہ: ۱۳۶۵ھ/۱۹۴۵ء]

۴۸ صفحات پر مشتمل یہ کتابچہ حضرت نور اللہ مرقدہ کی دوسری تالیف ہے جو حفظ و ناظرہ اور ابتدائی مدارس کے طلبہ و طالبات اور عام مسلمانوں کے لیے سیرت النبی صلی اللہ علیہ وسلم کے موضوع پر تحریر کیا گیا ہے اور اس میں عقائد و عبادات اور اخلاق و معاملات جیسے موضوعات پر قرآن و حدیث کی روشنی میں مختصر مگر ضروری بحث کی گئی ہے۔

۳) ضوء السراج فی تحقیق المعراج [مطبوعہ: ۱۳۶۸ھ/۱۹۴۸ء]

مرزا غلام احمد قادیانی پہلے دور میں معراج جسمانی کے قائل تھے لیکن دوسرے دور میں انہیں یہ نظریہ اپنی شریعت کے خلاف نظر آیا تو انھوں نے اس کا انکار کر دیا۔ حضرت شیخ نور اللہ مرقدہ نے ۴۸ صفحات کے اس رسالہ میں قرآن و سنت، اقوال سلف اور خود مرزا صاحب کی اپنی عبارات سے ثابت کیا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا معراج جسمانی تھا، محض روحانی نہ تھا۔ اس رسالہ کے دوسرے ایڈیشن میں (جو ۱۳۷۹ھ/۱۹۵۹ء میں طبع ہوا) معروف منکر حدیث نیاز فتح پوری کے نظریہ انکار

*ڈائریکٹر حق چار یار اکیڈمی، گجرات

معراج جسمانی کا بھی رد کیا گیا ہے۔

۴) تبرید النواظر فی تحقیق الحاضر والناظر یعنی آنکھوں کی ٹھنڈک [مطبوعہ: ۱۳۶۸ھ/۱۹۴۹ء]

حاضر وناظر ہونا خدائے تعالیٰ کی صفت ہے اور اس پر ایمان عقیدہ توحید کا جز ہے۔ ہمارے ہاں ایک طبقہ نے یہ عقیدہ اپنا لیا ہے کہ انبیائے کرام علیہم السلام اور اولیائے عظام رحمہم اللہ تعالیٰ بھی حاضر وناظر ہوتے ہیں۔ اس پر حضرت نور اللہ مرقدہ نے یہ کتاب تالیف فرمائی اور قرآن وحدیث کے ٹھوس دلائل سے ثابت کیا کہ انبیائے کرام اور اولیائے عظامؒ ہر وقت جگہ موجود نہیں ہوتے۔ اس کتاب کا پہلا ایڈیشن ۱۱۲ صفحات پر مشتمل تھا جو بعد میں متعدد اضافوں کے مراحل سے گزرتا رہا۔ اب موجودہ ایڈیشن ۲۰۰ صفحات پر مشتمل ہے۔

۵) گلدستہ توحید [مطبوعہ: ۱۳۷۰ھ/۱۹۵۰ء]

تقریباً تمام انبیائے کرام علیہم الصلوٰۃ والتسلیمات کو ایسی اقوام سے واسطہ رہا ہے جو کسی نہ کسی انداز میں عقیدہ توحید سے انکاری اور شرک کی نحوست ونجاست میں مبتلا تھیں، البتہ ان کے مشرکانہ تصورِ الوہیت ومعبودیت میں فرق تھا۔ بعض نے یہ تصور شمس وقمر، نجوم وفلک اور آب وآتش سے باندھ رکھا تھا اور بعض نے انبیائے کرام واولیائے عظامؒ سے۔ پھر ان میں سے بھی بعض نے انبیاء واولیاءؒ کے مجسموں کو اپنی عبادت واستعانت کا مرکز بنا رکھا تھا اور بعض نے ان کی قبروں کو۔ حضرت نور اللہ مرقدہ نے اس کتاب میں آیاتِ قرآنیہ اور احادیث صحیحہ سے ثابت کیا ہے کہ اللہ رب العزت کے علاوہ غیر کی عبادت کرنا اور غیر سے مافوق الاسباب امور میں استعانت طلب کرنا شرک ہے اور اللہ کی ذات کے علاوہ ہر چیز اس ''غیر'' میں شامل ہے، خواہ وہ جاندار ہو یا بے جان، انسان ہوں یا ملائکہ، انبیاءؑ ہوں یا اولیاءؒ۔

۶) دل کا سرور یعنی تحقیق مسئلہ مختار کل [مطبوعہ: ۱۳۷۰ھ/۱۹۵۱ء]

حضرت نور اللہ مرقدہ نے اس کتاب میں قرآن وحدیث، عقائد صحابہ کرامؓ اور جمہور ائمہ اہل سنت کے اقوال سے یہ ثابت کیا ہے کہ تمام تکوینی اور تشریعی امور میں حاکم حقیقی اور مختار کل صرف اللہ تعالیٰ کی ذات ہے۔ کسی غیر کو نہ ذاتی طور پر یہ اختیار حاصل ہے اور نہ عطائی طور پر۔

۷) حلیۃ المسلمین ترجمہ اللحیۃ فی نظر الدین [مطبوعہ: ۱۳۷۱ھ/۱۹۵۱ء]

ڈاڑھی مرد کی فطرت بھی ہے، انبیائے کرام کی سنت بھی اور مومن کے چہرے کی زینت بھی اور ایک قبضہ (مشت) ڈاڑھی مسنون ہے جسے منڈوانا یا کٹوا کر ایک قبضہ سے کم کر لینا شرعاً حرام ہے اور ایسے شخص کے پیچھے نماز درست نہیں۔ بہت عرصہ قبل بغداد (عراق) کے ایک ادارہ الشرکۃ الاسلامیہ للطباعۃ والنشر المحدودہ نے ایک مختصر رسالہ ''اللحیۃ فی نظر الدین'' کے نام سے شائع کیا جو اس وقت کے چار ممتاز عرب علماء (۱) الشیخ استاذ علی الطنطاویؒ (۲) الشیخ محمد ناصر الدین البانیؒ (۳) الشیخ عبد العزیز بن بازؒ (۴) الشیخ سید محمد سابقؒ کے مضامین پر مشتمل تھا۔ حضرت نور اللہ مرقدہ نے ''حلیۃ المسلمین'' کے نام سے اس کا ترجمہ کیا جسے پہلی بار ۱۳۷۱ھ/۱۹۵۱ء میں جماعت المسلمین حنفیہ گوجرانوالہ نے شائع کیا۔ ۱۹۶۶ء میں شائع ہونے والے

تیسرے ایڈیشن میں شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی کا رسالہ ''اعفاء اللحیۃ''، حضرت مولانا عاشق الٰہی میرٹھیؒ کا ایک مضمون اور ڈاڑھی کے متعلق حکمائے یورپ کے افکار بھی شامل کر دیے گئے ہیں۔ نیز دیباچے میں حضرت مولانا اشرف علی تھانوی، حضرت مولانا مفتی کفایت اللہ دہلوی، حضرت مولانا مفتی عزیز الرحمٰن دیوبندی اور حضرت مولانا احمد علی لاہوری رحمہم اللہ وغیرہ اکابر علمائے دیوبند کے فتاویٰ جمع کر دیے گئے ہیں کہ ڈاڑھی کٹوا کر ایک قبضہ سے کم کر لینا حرام ہے۔

۸) مسئلہ قربانی [مطبوعہ: ۱۳۷۴ھ/۱۹۵۴ء]

حضرت نور اللہ مرقدہ نے اس رسالہ میں منکرین حدیث کے اس طبقے کا رد کرتے ہوئے جو خود کو اہل قرآن کہلاتا ہے اور قربانی کو خلاف اسلام اور جانوروں کا ضیاع قرار دیتا ہے، ٹھوس دلائل سے یہ ثابت کیا ہے کہ قربانی ایک مسنون عمل ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ اہل حدیث حضرات کے موقف کے جواب میں، جو تین دن کی بجائے چار دن تک قربانی کا قائل ہے، یہ واضح کیا ہے کہ جمہور ائمہ اہل سنت کے نزدیک قربانی کے تین ہی ایام ہیں۔ اس رسالہ کے جواب میں حافظ محمد ابراہیم (غیر مقلد) نے ''ایام قربانی'' کے نام سے ایک رسالہ لکھا تو شیخ الحدیث حضرت مولانا عبد القیوم ہزاروی زید مجدہم نے اس کا جواب ''سیف یزدانی'' کے نام سے تحریر فرمایا جو ''مسئلہ قربانی'' کی طبع دوم میں اس کے ساتھ ہی شائع ہوا ہے۔

۹) چالیس دعائیں [مطبوعہ: ۱۳۷۴ھ/۱۹۵۴ء]

منکرین حدیث دعا کی ضرورت اور اس کے عبادت ہونے سے بھی انکاری ہیں۔ حضرتؒ نے اس مختصر رسالہ میں دعا کی اہمیت اور اس کا عبادت ہونا ثابت کیا ہے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی چالیس مسنون دعائیں مع ترجمہ نقل کی ہیں۔

۱۰) احسن الکلام فی ترک القراءۃ خلف الامام [مطبوعہ: ۱۳۷۵ھ/۱۳۵۵ء]

فاتحہ خلف الامام قرن اول سے ایک اختلافی واجتہادی مسئلہ رہا ہے، لیکن بدقسمتی سے ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے بعد فرنگی عہد اقتدار میں غیر مقلدین کے بعض ناعاقبت اندیش راہنماؤں نے صدیوں کے فروعی اختلافی مسائل کی اجتہادی حیثیت کا انکار کرتے ہوئے مقلدین احناف کی نمازوں کو باطل وخلاف سنت قرار دینے کے تحریری وتقریری فتوے جاری کر دیے، برصغیر میں اسلام کی اشاعت وحفاظت کا فریضہ سرانجام دینے والے تمام علما واولیا کو نمازیں پڑھنے کے باوجود بے نماز قرار دے دیا اور احناف کے موقف کو بے دلیل ثابت کرنے کے لیے بڑے بڑے اشتہار اور موٹی موٹی کتابیں چھاپی گئیں۔ متعدد علمائے احناف نے اس موضوع پر بیسیوں کتب تالیف فرمائیں۔ حضرتؒ نے بھی ''احسن الکلام'' کے نام سے یہ کتاب دو ضخیم جلدوں میں تالیف فرمائی جس میں قرآنی وحدیثی ٹھوس دلائل سے ثابت کیا کہ احناف کا اس بارہ میں موقف نہ صرف ٹھوس دلائل سے مزین ہے بلکہ دوسرے مسلک کے مقابلہ میں دلائل کی فوقیت کے اعتبار سے راجح بھی ہے۔ پہلی جلد میں احناف کے دلائل پیش کیے گئے ہیں اور دوسری جلد میں فریق مخالف کے دلائل کا جواب دیا گیا ہے۔

۱۱) صرف ایک اسلام بجواب دو اسلام [مطبوعہ: ۱۳۷۵ھ/۱۹۵۵ء]

ڈاکٹر غلام جیلانی برق مرحوم کسی دور میں تحریک انکار حدیث سے متاثر ہو کر منکر حدیث ہو گئے اور اس دور میں انہوں

نے دو قرآن اور دو اسلام کے نام سے دو کتابیں لکھیں۔ ان میں سے ''دو اسلام'' نامی کتاب حضرت نور اللہ مرقدہ کو تحریک ختم نبوت کے دوران اس وقت ملی جب وہ ملتان سنٹرل جیل میں نظر بند تھے۔ حضرت نے اسی دوران جیل میں ہی اس کا جواب لکھ لیا اور رہائی کے بعد اسے شائع کیا جسے پڑھ کر ڈاکٹر برق مرحوم نے اپنے ناقص فہم کا اعتراف کیا اور بہت سے بے بنیاد اعتراضات سے رجوع کر لیا۔ بعد میں ڈاکٹر برق مرحوم انکار حدیث کے باطل نظریے سے تائب ہو گئے اور حجیت حدیث پر باقاعدہ ایک کتاب لکھی۔

۱۲) المنہاج الواضح یعنی راہ سنت [مطبوعہ: ۱۳۷۷ھ/ ۱۹۵۷ء]

شرک کے بعد سب سے بڑا شرعی جرم بدعت ہے۔ بدعت ہر ایسے کام کو کہتے ہیں جو دلائل شرعیہ (قرآن، سنت، اجماع اور قیاس مجتہد) سے ثابت نہ ہو اور اسے دین سمجھ کر اختیار کیا جائے۔ فرامین پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی روشنی میں بدعت مذموم اور بدعتی مردود ہے۔ حضرت نور اللہ مرقدہ اس ضخیم کتاب میں بدعت کی تعریف اور قرآن و سنت کی روشنی میں اس کا مردود و مذموم ہونا بھی ثابت کیا ہے اور برصغیر پاک و ہند میں معرض وجود میں آنے والی بدعات (مجالس میلاد کا مروجہ طریقہ، عرس، ذکر بالجہر، مذارات کو پختہ کرنا، قبروں پر چراغاں کرنا، قبروں پر چادریں اور پھول چڑھانا، اذان میں انگوٹھے چومنا وغیرہ) کا رد بھی کیا ہے اور فریق مخالف کے دلائل کا جواب بھی دیا ہے۔

۱۳) ہدایۃ المرتاب فی طریق الصواب یعنی راہ ہدایت [مطبوعہ: ۱۳۷۸ھ/ ۱۹۵۷ء]

مختار کل کے مسئلہ پر حضرت نور اللہ مرقدہ کی تالیف ''دل کا سرور'' کے جواب میں بریلوی عالم مولانا سید حسین الدین شاہ نے ''ہدیۃ الاحباب فی التصرف مافوق الاسباب معروف بہ نور ہدایت'' کے نام سے ایک کتاب شائع کی۔ حضرت شیخؒ کی یہ کتاب اسی کا جواب ہے جس میں ٹھوس دلائل و براہین کے ساتھ ثابت کیا گیا ہے کہ معجزہ اور کرامت میں فعل و قدرت خدا کی ہوتی ہے جبکہ ہاتھ نبی اور ولی کا ہوتا ہے۔

۱۴) ازالۃ الریب عن عقیدۃ علم الغیب [مطبوعہ: ۱۳۷۹ھ/ ۱۹۵۹ء]

حاضر و ناظر کی طرح عالم الغیب ہونا بھی خدا تعالیٰ کی صفت ہے اور علم غیب خاصہ خداوندی ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو قدرت نے انباءِ غیب سے بہت وافر حصہ عطا فرمایا ہے، لیکن وہ عالم الغیب نہیں ہیں۔ حضرت نور اللہ مرقدہ نے یہ کتاب اسی موضوع پر لکھی ہے اور قرآن و سنت سے بدلائل قاہرہ اس عقیدہ کو ثابت کیا ہے اور فریق مخالف آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو عالم الغیب ثابت کرنے کے لیے جو دلائل دیتا ہے، ان کا مدلل جواب بھی دیا ہے۔

۱۵) انکار حدیث کے نتائج [مطبوعہ: ۱۳۷۹ھ/ ۱۹۶۰ء]

عصر حاضر میں انکار حدیث کا فتنہ اپنے عروج پر ہے۔ جس نے اردو ادبیت کے فن اور نفسیاتی طرز بیان کے سہارے ان گنت لوگوں کو مسحور کر رکھا ہے اور دینی علوم اور دینی ماحول سے محروم تعلیم یافتہ طبقہ ان کے دام فریب میں گرفتار ہو جاتا ہے۔ حضرت شیخ نور اللہ مرقدہ نے اس کتاب میں معروف منکرین حدیث عبد اللہ چکڑالوی، حافظ محمد اسلم جیراج پوری، نیاز فتح

پوری، ڈاکٹر غلام جیلانی برق، ڈاکٹر احمد دین، علامہ عنایت اللہ المشرقی، چوہدری غلام احمد پرویز، تمنا عمادی پھلواروی اور ان کے مشہور دعوتی و نشریاتی ادارہ طلوع اسلام کی پیدا کردہ گمراہیوں کا تذکرہ فرمایا ہے۔

۱۶) مر ئی کا جنازہ اور مسلمان [مطبوعہ: ۱۹۶۶ء]

کافی عرصہ قبل گوجرانوالہ کے اندر مرزائی کی نماز جنازہ پڑھنے کے حکم شرعی پر بحث چل نکلی تو مختلف اکابر علما کی طرف رجوع کیا گیا۔ حضرت نور اللہ مرقدہ نے اس بارہ میں جو فتوئی دیا، اسے جمعیۃ علمائے اسلام گوجرانوالہ نے شائع کر دیا۔ یہ وہی رسالہ ہے اور اس پر دیگر علمائے کرام کی تصدیقات بھی موجود ہیں۔

۱۷) مقام ابی حنیفہؒ [مطبوعہ: ۱۳۸۱ھ/ ۱۹۶۲ء]

قرون ثلاثہ سے عصر حاضر تک امت مسلمہ کے تقریباً دو تہائی مسلمانوں کے فقہی امام و پیشوا حضرت امام ابو حنیفہؒ کے بارہ میں ان کے حاسدین تقریباً ہر دور میں کچھ نہ کچھ کہتے رہے ہیں، لیکن اس دور کے غیر مقلدین نے تو بغض و حسد کے تمام ریکارڈ توڑ دیے اور تاریخ کے موضوع و من گھڑت اقوال کی بنیاد پر حضرت امام اعظمؒ کی شخصیت و کردار کو تختہ مشق بنا ڈالا۔ حضرت شیخ نور اللہ مرقدہ نے اس کتاب میں تاریخ کے ٹھوس حوالوں سے حضرت امام اعظم کی حدیثی و فقہی خدمات اور ان کے بے داغ کردار و عمل پر مفصل و مدلل بحث کی ہے اور غیر مقلدین کے تمام اعتراضات و الزامات کا مدلل رد پیش کیا ہے۔

۱۸) تبلیغ اسلام [مطبوعہ: ۱۳۸۲ھ/ ۱۹۶۲ء]

امر بالمعروف اور نہی عن المنکر اسلام کے بنیادی فرائض میں سے ایک فریضہ ہے۔ لیکن اسلام نے اس فریضہ کے ساتھ اس کے اصول و ضوابط بھی دیے ہیں۔ حضرت شیخؒ نے اس کتاب کے اندر قرآن و سنت کی روشنی میں امر بالمعروف و نہی عن المنکر کی اہمیت، اسلام کی صداقت و حقانیت، دعوت و تبلیغ کے شرعی اصول، مبلغین اسلام کی حق گوئی اور داعیان اسلام کے مرتبہ و مقام پر مدلل بحث کی ہے۔ اس کتاب کا صرف پہلا حصہ طبع ہو سکا۔ دوسرے حصہ کی اشاعت کی نوبت نہیں آئی۔

۱۹) طائفہ منصورہ [مطبوعہ: ۱۳۸۲ھ/ ۱۹۶۲ء]

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمان کے مطابق ایک جماعت فکری وحدت کے ساتھ قرن در قرن قیامت تک ہر دور میں موجود رہے گی اور اسی جماعت و اس کی فکری وحدت کے ساتھ قائم رہنا ہی ہدایت و نجات کے لیے ضروری ہوگا۔ حضرت نور اللہ مرقدہ نے اس کتاب میں بدلائل قاہرہ ثابت کیا ہے کہ دینی تعلیمات و خدمات کے حوالہ سے یہ موعودہ جماعت مقلدین ائمہ اربعہ کی جماعت ہے جو ہر دور میں نہ صرف موجود رہی ہے بلکہ تعلیم و تبلیغ و جہاد جیسے فرائض کی خدمات بھی سرانجام دیتی رہی ہے۔ غیر مقلدین کا شمار اس موعودہ جماعت میں نہیں ہوتا اور اس میں مصنفین صحاح ستہ کا مقلد ہونا بھی ٹھوس دلائل سے ثابت کیا گیا ہے۔

۲۰) عیسائیت کا پس منظر [مطبوعہ: ۱۳۸۴ھ/ ۱۹۶۲ء]

عیسائیت ایک مسخ و محرف شدہ آسمانی مذہب ہے۔ جو اصلی و حقیقی آسمانی تعلیمات سے محروم ہو چکا ہے۔ اس کی تحریف

اور تغیر وتبدل کی داستان خاصی طویل ہے۔ حضرتؒ نے اس کتاب میں توہین انبیاء، نظریہ تثلیث، ابنیت مسیح اور مسئلہ کفارہ جیسے مسیحی عقائد ونظریات کے باطل ومردود ہونے پر مدلل بحث فرمائی ہے اور تحریف بائیبل پر ٹھوس شہادتیں بیان فرمائی ہیں۔

۲۱) بانی دار العلوم دیوبند [مطبوعہ: ۱۳۸۲ھ/۱۹۶۲ء]

حجۃ الاسلام حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی نور اللہ مرقدہ کا شمار بلاشک وشبہ برصغیر کی ان شخصیات میں ہوتا ہے جنہیں بجا طور پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا معجزہ قرار دیا جا سکتا ہے۔ حضرت شیخ نور اللہ مرقدہ نے اس مختصر رسالہ میں حضرت نانوتویؒ کی دینی وعلمی اور مجاہدانہ ومناظرانہ خدمات کا تذکرہ کیا ہے اور بریلویت وقادیانیت کی طرف سے ان پر انکار ختم نبوت کے جو الزامات عائد کیے گئے ہیں، ان کا ٹھوس جواب دیا گیا ہے۔

۲۲) باب جنت بجواب راہ جنت [مطبوعہ: ۱۳۸۳ھ/۱۹۶۲ء]

حضرت نور اللہ مرقدہ کی کتاب لاجواب ''راہ سنت'' کا جناب مفتی احمد یار خان گجراتی نے جواب دینے کی ناکام کوشش کی، اور اپنی کتاب کا نام انہوں نے ''راہ جنت'' رکھا۔ ''باب جنت'' اسی کا جواب ہے۔ مفتی صاحب نے اپنی کتاب کے پیش لفظ میں لکھا ہے کہ ہماری اس کتاب کا اصل نام ''لطمہ شیر ببر بر نجدی زادہ گکھڑ'' تھا لیکن بعد میں اس کا نام ''راہ جنت'' رکھ دیا گیا۔ اس کے جواب میں حضرت شیخؒ نے اپنی کتاب کے عرض حال میں لکھا کہ اگر مفتی صاحب اپنی کتاب کا یہ نام رکھتے تو پھر ہماری کتاب کا نام ''لطمات شیر سوات بر رخ مبتدع زادہ گجرات'' ہوتا۔

۲۳) شوق جہاد [مطبوعہ: ۱۳۸۵ھ/۱۹۶۵ء]

یہ مختصر سا رسالہ فضائل جہاد کے موضوع پر لکھا گیا جس کے پیچھے جنرل محمد ضیاء الحق شہید مرحوم کی خواہش وتحریک تھی جو اس وقت فوج میں کرنل تھے۔ حضرت نور اللہ مرقدہ نے اس رسالہ کے اندر جہاد کے فضائل واصول تحریر فرمائے اور پاک فوج کے جذبات وخدمات کا تذکرہ فرمایا۔ اس رسالہ کا پہلا ایڈیشن ہزاروں کی تعداد میں بٹ دری فیکٹری گکھڑ کے مالک حاجی اللہ دتہ بٹ مرحوم نے اپنی جیب سے چھپوا کر فوج میں تقسیم کیا۔

۲۴) تنقید متین بر تفسیر نعیم الدین [مطبوعہ: ۱۳۸۷ھ/۱۹۶۷ء]

مولانا احمد رضا خان بریلوی نے غلط ترجمہ کی ایسی طرح ڈالی جو ان گنت لوگوں کی گمراہی وبے دینی کا ذریعہ بن سکتی تھی۔ اس سے قبل تفسیر وحواشی سے صرف نظر کرتے ہوئے کوئی بھی آدمی کسی بھی مترجم کے ترجمہ قرآن کو اس اطمینان کے ساتھ پڑھ سکتا تھا کہ کم ازکم ترجمہ میں کوئی دجل موجود نہیں ہوگا، جو خرابیاں ہوں گی، وہ تفسیری حواشی میں ہوں گی، لیکن خان صاحب بریلوی نے اپنے تمام باطل وگمراہ کن نظریات ترجمہ میں گھسیڑ دیے اور پھر اسی ترجمہ کو مذہبی تعصب کی بنا پر مفتی نعیم الدین صاحب مراد آبادی نے اپنے تفسیری حواشی کے ذریعے بھرپور تحفظ فراہم کیا۔ خان صاحب بریلوی کے ترجمہ ''کنز الایمان'' اور مفتی نعیم الدین صاحب کے تفسیری حواشی ''خزائن العرفان'' کی علمی واعتقادی اغلاط پر حضرت نور اللہ مرقدہ نے اپنی اس کتاب میں بہت ہی محققانہ گرفت فرمائی ہے۔

۲۵) عمدۃ الاثاث فی حکم الطلقات الثلاث [مطبوعہ: ۱۳۸۷ھ/۱۹۶۸ء]

اس رسالہ میں حضرت نور اللہ مرقدہ نے قرآن وسنت اور جمہور ائمہ اہل سنت کے اقوال سے یہ ثابت کیا ہے کہ ایک جملہ اور ایک مجلس میں دی گئی تین طلاقیں تین ہی شمار ہوتی ہیں۔ غیر مقلدین حضرات ان تین طلاقوں کو ایک قرار دینے کے لیے جو دلائل دیتے ہیں، ان کا مدلل جواب دیا گیا ہے اور ثابت کیا گیا ہے کہ جمہور ائمہ اہل سنت کا مسلک وموقف یہی ہے کہ تین طلاقیں تین ہی شمار ہوں گی۔

۲۶) تسکین الصدور فی تحقیق احوال الموتی فی البرزخ والقبور [مطبوعہ: ۱۳۸۸ھ/۱۹۶۸ء]

۱۹۵۸ء میں سید عنایت اللہ شاہ صاحب بخاریؒ کی طرف سے حیات الانبیاء علیہم السلام فی القبور کے انکار کی تحریک منظم کی گئی اور اس ضمن میں متعدد مصالحانہ کوششیں ان کے تشدد پسند رویہ اور موقف میں کوئی تبدیلی نہ لا سکیں تو ۲ ربیع الاول ۱۳۸۲ھ مطابق ۴ راگست ۱۹۶۲ء کو جمعیۃ علماے اسلام کی مرکزی مجلس شوریٰ کے اجلاس میں مذہب اہل سنت اور مسلک علماے دیوبند کی روشنی میں ایک کتاب لکھنے کا فیصلہ کیا گیا جس کے لیے بنیادی ذمہ داری حضرت نور اللہ مرقدہ کو سونپ گئی۔ حضرت نے پانچ سال کی مسلسل کوشش ومحنت سے ایک مسودہ تیار کیا جسے جامعہ خیر المدارس ملتان میں علماے کرام کے اجلاس کے اندر پڑھ کر سنایا گیا اور اشاعت کی منظوری ہوئی۔ اس کتاب میں قرآن وحدیث اور جمہور ائمہ اہل سنت کے اقوال سے ثابت کیا گیا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اپنی قبر مبارک (روضہ اقدس) میں بہ تعلق روح زندہ ہیں اور عند القبر پڑھا جانے والا الصلوٰۃ والسلام خود سنتے ہیں اور جواب دیتے ہیں۔ یہی جمہور ائمہ اہل سنت کا عقیدہ ہے اور یہی تمام علماے دیوبند کا مسلک ہے۔

۲۷) ینابیع ترجمہ رسالہ تراویح [مطبوعہ: ۱۳۸۸ھ/۱۹۶۹ء]

بیس رکعت نماز تراویح عہد فاروقیؓ سے عصر حاضر تک بالاجماع پڑھی جا رہی ہیں۔ حرمین شریفین سمیت پوری دنیا کے اندر چاروں مذاہب (حنفی، شافعی، حنبلی، مالکی) کے مقلدین بیس رکعت تراویح ہی ادا کر رہے ہیں۔ برصغیر پاک وہند کے غیر مقلدین نے جہاں بعض دیگر مسائل کو فتنہ وفساد کا ذریعہ بنایا، وہاں بیس تراویح کا اجماعی عمل بھی ان کی زد سے محفوظ نہ رہ سکا۔ چنانچہ تیرہویں صدی ہجری کے آخری عشرہ میں غیر مقلدین کے محسن اعظم مولانا محمد حسین بٹالویؒ نے بیس رکعت تراویح کے بدعت ہونے کا فتویٰ جاری کر دیا تو انہی کے ایک ہم مسلک بزرگ مولانا سید میاں نذیر حسین دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کے شاگرد مولانا غلام رسول صاحب رحمۃ اللہ علیہ (قلعہ میاں سنگھ گوجرانوالہ) نے بٹالوی صاحب کے جواب میں ایک رسالہ فارسی زبان میں تالیف کیا جس میں ثابت کیا کہ بیس رکعت نماز تراویح سنت خلفاے راشدینؓ ہے۔ حضرت شیخ نور اللہ مرقدہ نے اس رسالہ کا اردو ترجمہ کیا اور اس پر ۱۶ صفحات کا مفید مقدمہ لکھا۔

۲۸) درود شریف پڑھنے کا شرعی طریقہ [مطبوعہ: طبع دوم ۱۳۸۸ھ/۱۹۶۸ء]

درود شریف پڑھنا ایک عبادت ہے اور ہر عبادت کی طرح شریعت نے اس کے لیے بھی کچھ حدود وقیود متعین کیے ہیں۔ ہمارے زمانہ میں ایک طبقہ نے اذان کے ساتھ صلوٰۃ وسلام تقریباً لازمی قرار دے رکھا ہے اور اس کے لیے باقاعدہ

دلائل دیے جاتے ہیں، حالانکہ یہ طریقہ نہ عہد خیرالقرون میں موجود تھا اور نہ دلائل شرعیہ (قرآن، سنت، اجماع، قیاس) سے ثابت ہے۔ کافی عرصہ قبل ایک بریلوی بزرگ نے مذہبی تعصب میں مبتلا ہو کر اذان کے ساتھ صلوٰۃ وسلام کے جواز پر ایک اشتہار شائع کیا تھا۔ حضرت نوراللہ مرقدہ نے یہ رسالہ اسی کے جواب میں تالیف فرمایا۔ اس رسالہ کے پہلے ایڈیشن کی طباعت کا سال معلوم نہیں ہو سکا۔

۲۹) مودودی صاحب کا ایک غلط فتویٰ [مطبوعہ: ۱۳۹۰ھ/۱۹۷۰ء]

مودودی صاحب کا شمار عصر حاضر کے ان مفکرین میں ہوتا ہے جو مغربی تہذیب وفکر سے مرعوب رہے اور اس کے لیے نہ صرف انہوں نے چودہ سو سالہ اسلامی ذخیرہ کو ناقابل عمل قرار دے دیا بلکہ انبیائے کرام، صحابہ کرامؓ اور مجددین امت تک کو تنقید کا نشانہ بنا ڈالا۔ ان کے دیگر گمراہ کن نظریات کے علاوہ ایک نظریہ لاہوری مرزائیوں کو کافر تسلیم نہ کرنے کا بھی ہے۔ انہوں نے ایک فتویٰ جاری کیا کہ لاہوری مرزائی نہ کافر ہیں نہ مسلمان، بلکہ اسلام اور کفر کے درمیان معلق ہیں۔ حضرت نور اللہ مرقدہ نے اس رسالہ میں مودودی صاحب کے اسی فتویٰ پر گرفت کی ہے اور اس کے علاوہ ان کے چند دیگر گمراہ کن نظریات بھی بیان کیے ہیں۔

۳۰) ملا علی قاریؒ اور مسئلہ علم غیب وحاضر وناظر [طبع دوم: ۱۳۹۵ھ/۱۹۷۵ء]

مرقاۃ شرح مشکوٰۃ اور شرح فقہ اکبر کے مصنف اور دسویں صدی ہجری کے مجدد حضرت شیخ ملا علی قاری الحنفیؒ کی بعض عبارات سے اہل بدعت نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی کہ وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو العیاذ باللہ تعالیٰ عالم الغیب اور حاضر وناظر مانتے تھے۔ حضرت نور اللہ مرقدہ نے اس رسالہ میں اسی دعوے کا جواب دیا ہے اور حضرت ملا علی قاریؒ کی عبارات سے ثابت کیا ہے کہ وہ خدا تعالیٰ کے علاوہ کسی کو عالم الغیب اور حاضر ناظر نہیں مانتے تھے۔

۳۱) عبارات اکابر [مطبوعہ: ۱۳۹۲ھ/۱۹۷۲ء]

مولانا احمد رضا خان بریلوی نے حضرت مولانا شاہ محمد اسماعیل شہید، حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی، حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی، حضرت مولانا خلیل احمد سہارنپوری اور حضرت مولانا محمد اشرف علی تھانوی رحمۃ اللہ علیہم کی بعض عبارات میں تغیر وتبدل کر کے اور بعض عبارات کو اپنا خانہ ساز اختراعی مفہوم دے کر علمائے حرمین شریفین سے ان کے خلاف کفر کا فتویٰ حاصل کر لیا۔ جب علمائے حرمین کو اس دجل وتلبیس کا علم ہوا تو انہوں نے ۲۶ سوالات تحریر کر کے علمائے دیوبند کے پاس بھیجے۔ حضرت مولانا خلیل احمد سہارنپوریؒ نے ان کا جواب لکھا جس پر اس وقت کے تمام اکابر علمائے دیوبند نے تائیدی وتصدیقی دستخط ثبت فرمائے اور علمائے حرمین شریفین نے بھی اس پر تائیدی دستخط کیے جو التصدیقات لدفع التلبیسات، المہند علی المفند اور عقائد علماء دیوبند کے ناموں سے طبع ہو چکا ہے، لیکن مخالفین نے نئے نئے ناموں سے انھی الزامات کو دہراتے ہوئے کتابیں اور کتابچے لکھنے شروع کر دیے۔ علمائے دیوبند کی طرف سے ان اعتراضات کے جواب میں بیسیوں تحریریں سامنے آ چکی ہیں۔ حضرت نور اللہ مرقدہ نے بھی اس کتاب میں انھی الزامات واعتراضات کا مدلل ومسکت جواب دیا ہے۔ اس کا پہلا حصہ شائع ہوا، جبکہ دوسرے حصہ کی نوبت نہ آ سکی۔

۳۲) حکم الذکر بالجہر [مطبوعہ: ۱۳۹۴ھ/۱۹۷۴ء]

حضرت نور اللہ مرقدہ نے ''راہ سنت'' میں دیگر بدعات کے علاوہ ذکر بالجہر کے بدعت ہونے پر بھی بحث کی تھی جس پر بریلوی مکتب فکر کے ممتاز عالم مولانا رسول سعیدی نے ''ذکر بالجہر'' کے نام سے ایک رسالہ لکھا اور اس میں ذکر بالجہر کا جواز ثابت کرنے کی کوشش کی گئی۔ حضرت شیخ کی یہ کتاب اسی کا جواب ہے۔

۳۳) سماع الموتی [مطبوعہ: ۱۳۹۶ھ/۱۹۷۶ء]

حیات النبی اور سماع موتی دو الگ الگ مسئلے ہیں۔ پہلے مسئلے پر امت کا اجماع ہے اور دوسرے مسئلہ میں عہد صحابہؓ سے اختلاف چلا آ رہا ہے، لیکن بدقسمتی سے دوسرے اختلافی مسئلہ کی آڑ میں پہلے اجماعی مسئلہ سے بھی انکار کر دیا گیا اور پھر بعض تشدد پسند حضرات نے دوسرے مسئلہ کے اختلافی ہونے سے بھی انکار کر دیا۔ حضرت شیخ نور اللہ مرقدہ نے اس کتاب کے اندر مدلل بحث کی ہے کہ یہ مسئلہ عہد صحابہؓ سے اختلافی ہے۔ جمہور ائمہ اہل سنت سماع موتی کے قائل ہیں، لیکن دونوں طرف دلائل موجود ہیں، اس لیے اس مسئلہ میں اختلاف کی بنا پر کسی فریق کو بدعتی وگمراہ قرار دینا سراسر غلط ہے۔

۳۴) تفریح الخواطر فی ردتنویر الخواطر [مطبوعہ: ۱۳۹۷ھ/۱۹۷۷ء]

حضرت شیخ نور اللہ مرقدہ نے تبرید النواظر (آنکھوں کی ٹھنڈک) لکھی تھی جس کے جواب میں ایک بریلوی عالم صوفی اللہ دتہ صاحب نے ''تنویر الخواطر'' کے نام سے طبع آزمائی کی۔ یہ کتاب اسی کا مدلل جواب ہے۔

۳۵) اخفاء الذکر [مطبوعہ: ۱۴۰۱ھ/۱۹۸۱ء]

بریلوی عالم مولانا غلام رسول سعیدی نے اپنی کتاب ذکر بالجہر کے دوسرے حصہ میں حضرت شیخ نور اللہ مرقدہ کی تالیف ''حکم الذکر بالجہر'' پر کچھ اعتراضات کیے تھے۔ اس کتاب میں اسی کا جواب دیا گیا ہے۔

۳۶) اتمام البرہان فی ردتوضیح البیان

حضرت شیخ نور اللہ مرقدہ کی کتاب ''تنقید متین بر تفسیر نعیم الدین'' کے جواب میں مولانا غلام رسول سعیدی نے ''توضیح البیان علیٰ خزائن العرفان'' لکھی جس کے جواب میں یہ کتاب لکھی گئی جو چار حصوں پر مشتمل ہے۔ حصہ اول ۱۴۰۱ھ/۱۹۸۱ء میں، حصہ دوم وسوم ۱۴۰۳ھ/۱۹۸۳ء میں جبکہ حصہ چہارم ۱۴۰۴ھ/۱۹۸۴ء میں طبع ہوا۔

۳۷) شوق حدیث [مطبوعہ: ۱۴۰۴ھ/۱۹۸۴ء]

علم حدیث کے حصول اور اس کے حفظ کے سلسلہ میں ائمہ محدثین رحمہم اللہ تعالیٰ کی خدمات اور ان کے شوق وجذبہ پر حضرت شیخ نور اللہ مرقدہ نے یہ کتاب تالیف فرمائی۔ اس کا بھی صرف ایک حصہ شائع ہوا، جبکہ دوسرا شائع نہیں ہو سکا۔

۳۸) الشہاب المبین علیٰ من انکر الحق الثابت بالادلۃ والبراہین [مطبوعہ: ۱۴۰۳ھ/۱۹۸۳ء]

حضرت مولانا قاضی شمس الدین رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے بعض حواریوں کے شدید مجبور کرنے پر سواتی برادران کے خلاف

''الشہاب الثاقب علیٰ من حرف الاقوال والمذاہب'' تالیف فرمائی۔ حضرت نور اللہ مرقدہ نے اس کتاب میں اسی کا جواب دیا ہے۔اس کے بعد حضرت قاضی صاحب نے تحریری طور پر اس بات کا اعتراف فرمایا کہ روضہ اقدس میں روح مع الجسد حیات اور عند القبر سماع کو حیات دنیوی یا حیات برزخی قرار دینے والوں کے مابین صرف نزاع لفظی ہے۔

۳۹) اظہار العیب فی کتاب اثبات علم الغیب [مطبوعہ: ۱۴۰۶ھ/۱۹۸۶ء]

حضرت نور اللہ مرقدہ نے ''ازالۃ الریب'' تالیف فرمائی تھی جس کے جواب میں بریلوی عالم مولانا غلام فرید ہزاروی نے ''اثبات علم الغیب'' لکھی۔ یہ کتاب اسی کا جواب ہے۔مولانا غلام فرید صاحب نے اپنے مسلکی مزاج و تربیت کے عین مطابق اصل موضوع سے ہٹ کر بہت سی خارجی بحثیں کر کے اپنی کتاب کا حجم بڑھا لیا تھا۔ان میں سے ایک بحث تاریخ برصغیر پر بھی تھی جس میں انہوں نے علماے دیوبند کو انگریز کا ایجنٹ ثابت کرنے کی ناکام کوشش کی۔ حضرت نور اللہ مرقدہ نے ان کے پیش کردہ حوالہ جات کی تحقیق اور ان کے جواب کے لیے احقر کی ڈیوٹی لگائی۔ میں نے حکم کی تعمیل میں اس کا مفصل جواب لکھا جسے حضرت شیخؒ نے اپنی اسی کتاب میں ''البیان الحق لحافظ عبدالحق'' کے عنوان سے تیسرے باب کی صورت میں شامل کر فرمالیا۔

۴۰) الکلام المفید فی اثبات التقلید [مطبوعہ: ۱۴۰۶ھ/۱۹۸۵ء]

غیر منصوص مسائل میں مجتہد کی تقلید عہد صحابہؓ و خلفاے راشدینؓ سے ایک اجتماعی و اتفاقی مسئلہ رہا ہے اور قرون ثلاثہ میں ہر علاقہ کے لوگ اپنے علاقہ کے فقیہ و مجتہد کی تقلید کرتے رہے ہیں۔ حضرت امام شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ کے بیان کے مطابق چوتھی صدی ہجری میں چونکہ دیگر تمام مذاہب تقریباً ختم ہو چکے تھے اور صرف مذاہب اربعہ (حنفی، شافعی، حنبلی اور مالکی) باقی تھے، اس لیے امت نے انہی چار مذاہب پر اجماع کر لیا اور باقی مذاہب متروک ہو گئے۔اس مرحلے پر یہ پابندی عائد کی گئی کہ اب اپنے لیے نئے اجتہادی اصول وضع کرنے کی کسی کو اجازت نہیں، البتہ مکمل شرائط کے ساتھ ائمہ اربعہ رحمہم اللہ تعالیٰ میں سے کسی مجتہد مطلق کے اجتہادی اصولوں کے دائرہ میں رہ کر نئے پیش آمدہ مسائل میں اجتہاد کیا جا سکتا ہے۔ حضرت نور اللہ مرقدہ نے اپنی اس کتاب میں انہی مسائل پر مدلل و مفصل بحث فرمائی ہے۔

۴۱) المسلک المنصور فی رد الکتاب المسطور [مطبوعہ: ۱۴۰۶ھ/۱۹۸۶ء]

مولانا محمد حسین نیلوی مرحوم نے اپنے حلقہ کے بعض حضرات کے شدید اصرار پر حضرت شیخؒ کی کتاب ''تسکین الصدور'' اور ''سماع الموتی'' کا جواب ''الکتاب المسطور فی جواب سماع الموتی و تسکین الصدور'' کے نام سے تالیف فرمایا جو ''ندائے حق'' کے نام سے معروف ہے۔ پہلے یہ ایک جلد میں شائع ہوا تھا، بعد میں اسے خاصا پھیلا کر تین جلدوں میں شائع کیا گیا۔اس کتاب کا مواد کسی حد تک قابل توجہ یا قابل جواب تھا۔حضرت شیخؒ نے اس کتاب میں اسی کی حقیقت واضح کی ہے۔

۴۲) ارشاد الشیعہ [مطبوعہ: ۱۴۰۷ھ/۱۹۸۷ء]

یہ کتاب ایک خط کا جواب ہے جو روافض کے بارہ میں حضرت شیخ نور اللہ مرقدہ کا نقطہ نظر معلوم کرنے کے لیے لکھا گیا تھا۔حضرت شیخؒ نے اس کتاب میں واضح کیا ہے کہ ان کا موقف وہی ہے جو ان کے اکابر کا تھا اور اکابر رحمہم اللہ تعالیٰ تین

بڑے اسباب (سب صحابہ، نظریہ امامت اور تحریف قرآن) کی بنیاد پر روافض کی تکفیر کرتے تھے اور ان اسباب کی وجہ سے روافض آج بھی کافر ہیں۔اس کتاب میں ایران کے شیعہ راہنما آیت اللہ خمینی کے عقائد و نظریات اور ان کے فقہی مسائل پر بھی مدلل بحث کی گئی ہے۔

۴۳) ختم نبوت کتاب وسنت کی روشنی میں [مطبوعہ: ۱۴۰۷ھ/۱۹۸۷ء]

دار العلوم دیوبند کی مجلس شوریٰ کے فیصلہ کے مطابق ۲۹، ۳۰، ۳۱ اکتوبر ۱۹۸۶ء کو دار العلوم دیوبند میں ختم نبوت کے موضوع پر ایک عالمی سیمینار منعقد کیا گیا جس میں حضرت نور اللہ مرقدہ کو بھی شرکت اور مقالہ پڑھنے کی دعوت دی گئی۔ حضرتؒ نے مقالہ تحریر فرمایا، لیکن حکومت انڈیا کی طرف سے ویزا نہ ملنے کی وجہ سے نہ تو خود تشریف لے جا سکے اور نہ مقالہ ہی بروقت ارسال کیا جا سکا۔بعد میں اس مقالہ کو افادہ عام کے لیے شائع کر دیا گیا۔اس میں عقیدہ ختم نبوت، عقیدہ نزول مسیح اور قادیانی دجل و تلبیس پر بحث کی گئی ہے۔

۴۴) احسان الباری لفہم البخاری [مطبوعہ: ۱۴۰۸ھ/۱۹۸۸ء]

حضرت نور اللہ مرقدہ بخاری شریف کی تدریس کے دوران مختلف علمی بحثیں لکھواتے رہے جنہیں ابتداءً حضرت مولانا عزیز الرحمٰن صاحبؒ (فاضل و مدرس مدرسہ نصرۃ العلوم گوجرانوالہ) اور حضرت مولانا سعید الرحمٰن علویؒ (فاضل مدرسہ نصرۃ العلوم گوجرانوالہ) نے تحریر کیا اور بعد میں برادر عزیز حضرت مولانا رشید الحق خان عابد مدظلہ نے حضرت شیخؒ کے حکم سے متعدد اضافوں کے ساتھ مرتب کیا۔یہ کتاب انہی تقاریر کا مجموعہ ہے۔

۴۵) خزائن السنن [مطبوعہ: ۱۴۱۲ھ/۱۹۹۲ء]

حضرت نور اللہ مرقدہ نے ترمذی شریف پڑھاتے ہوئے طلبہ کو جو بحثیں لکھوائیں، انہیں ''خزائن السنن'' کے نام سے شائع کیا گیا ہے۔اس کی پہلی جلد برادر عزیز حضرت مولانا قاری رشید الحق خان عابد مدظلہ نے مرتب کی ہے جو ابواب الطہارت، ابواب الصلوٰۃ اور ابواب الزکوٰۃ و ابواب الاضاحی پر مشتمل ہے۔دوسری جلد برادر مکرم حضرت مولانا عبد القدوس خان قارن مدظلہ نے تصنیف کی ہے جو ابواب البیوع پر مشتمل ہے۔یہ جلد ۱۴۲۰ھ/ ۲۰۰۰ء میں طبع ہوئی۔

۴۶) توضیح المرام فی نزول المسیح علیہ السلام [مطبوعہ: ۱۴۱۷ھ/۱۹۹۶ء]

یہ حضرت شیخ نور اللہ مرقدہ کی آخری تالیف ہے جس میں احادیث صحیحہ سے ثابت کیا گیا ہے کہ حضرت سیدنا عیسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام زندہ آسمانوں پر اٹھائے گئے، قرب قیامت میں نازل ہوں گے، دجال کو قتل کریں گے اور شریعت محمدیہ علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والتحیۃ کے مطابق چالیس سال خلافت کریں گے۔یہی اہل سنت والجماعت کا اجماعی عقیدہ ہے۔اس کتاب میں حیات و نزول مسیح علیہ السلام کا انکار کرنے والے ملحد و بے دین فرقوں کا مدلل رد کیا گیا ہے۔

حافظ عبد الرشید*

امام اہل سنت کی تصانیف اکابر علما کی نظر میں

شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد سرفراز خان صفدرؒ کی طالب علمانہ مسافرت اور بے سروسامانی میں گزری زندگی کی ابتدائی گھڑیوں کو جب قرار ملا تو کئی بے قراریاں ان کی راہ تک رہی تھیں۔ دین کی ترویج واشاعت کی بے قراری، علوم نبوت کی وراثت باہمت واہل ہاتھوں کو منتقل کرنے کی بے قراری، تحریفِ دین کے حریصوں کا سدِ باب کرنے کی بے چینی، جہالت و بے علمی سے پیدا ہونے والے شکوک وشبہات دور کرنے کا اضطراب و بے اطمینانی اور سب سے بڑھ کر نفاذِ اسلام کی جدوجہد میں اپنا سرگرم کردار ادا کرنے کی فکر۔ غرض کسی بھی راستے سے دین پر آنے والے حرف کو مٹانا ان کی زندگی کا واحد مقصد بن گیا تھا اور وہ اسی مقصد کے حصول میں زندگی کی ہر سانس، ہر لحہ اور ہر پل گزار گئے اور مستفیضین کو عملاً دکھا گئے کہ اس راہِ عاشقی میں اہل دل اس طرح اپنا تن من دھن نثار کرتے ہیں۔

نفس نفس کو رہِ عاشقی میں کر کے نثار
تم اہل دل کا سا جینا ہمیں سکھا کے چلے

حضرت نے دیوبند میں شیخ العرب والعجم مولانا سید حسین احمد مدنیؒ اور شیخ الادب مولانا اعزاز علیؒ سے بخاری شریف پڑھ کر اپنے روایتی علمی سفر کا اختتام کیا، دارالعلوم دیوبند سے حدیثِ نبوی کی امانت وصول کی اور پھر اس امانت و وراثت کی آئندہ نسلوں کو منتقل کرنے کے لیے اس سرگرمی وتن دہی سے کام کیا کہ اکابر علماے دیوبند سے سند تعریف وتوثیق حاصل کی۔

ان سُطور میں ہم اکابر ومعاصر علما کے ہاں حضرت شیخ کے علمی مقام ومرتبہ پر ان کی کتابوں پر لکھی جانے والی تقریظات، خطوط اور دیگر چیدہ چیدہ واقعات کی روشنی میں کچھ معروضات پیش کرنے کی سعادت حاصل کریں گے۔ عربی کا مقولہ ہے: ”المعاصرة أصل المنافرة“ کہ ہم عصری آپس میں نفرت کی جڑ ہے، لیکن حضرت شیخ کے علمی کام اور اخلاص وللّٰہیت کے سبب ان کے اکابرین ومعاصرین نے جس طرح ان کے کام پر اعتماد کیا ہے اور جن زبردست الفاظ میں ان کی علمی کاوشوں کو سراہا اور خراج عقیدت پیش کیا ہے، وہ بہت کم لوگوں کے حصے میں آئے ہیں۔

اکابر علما کی تحریرات میں جن باتوں کو بطورِ خاص سراہا گیا ہے، وہ حسبِ ذیل ہیں:

۱۔ مسائل کی تحقیق اور مختلف پہلوؤں سے ان کا جائزہ لینے میں حضرت شیخ کی عرق ریزی، غایتِ جستجو اور ژرف نگاہی۔

۲۔ جمہور امت اور اپنے اکابرین کے مزاج ومذاق کی مکمل پاسداری اور ان کے موقف سے زبردست موافقت۔

۳۔ مدمقابل کی مخاصمانہ روِش اور بدگوئی سے بھرپور لہجے کے جواب میں متین اور سنجیدہ اندازِ تحریر۔

*رفیق شعبہ تصنیف وتالیف الشریعہ اکادمی، گوجرانوالہ

۴۔ مخالفت کے باوجود فریق مخالف کی خیر خواہی اور بھلائی کی تمنا۔

۵۔ تحریر میں ادب کی چاشنی۔

۶۔ لغو اور بچگانہ اعتراضات سے اعراض اور قابل اعتنا اشکالات کا مسکت ومدلل جواب۔

حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیبؒ: ۱۹۷۵ء میں قاری صاحبؒ نے پاکستان کا سفر فرمایا اور حضرت شیخ کے ہاں گکھڑ میں بھی ایک شب قیام فرمایا۔ حضرتؒ نے اپنی تالیف لطیف ”احسن الکلام“ پیش خدمت کی۔ حضرت قاری صاحبؒ نے واپس دیوبند پہنچنے پر ایک خط کے ذریعے مہمان نوازی کا شکریہ ادا کرتے ہوئے ”احسن الکلام“ پر اپنے تاثرات کا اظہار بھی فرمایا اور لکھا کہ:

”احسن الکلام کا مطالعہ یاد اور شوق طبعی دامن گیر تھا۔ ماشاء اللہ مسئلہ فاتحہ میں ایک بحر زخار پایا۔“

(احسن الکلام، ص ۱۰)

حضرت حکیم الاسلام نے احسن الکلام پر تقریظ لکھنی تھی، مگر کتاب کے مطالعہ کے بعد تحریر اتنی طویل ہوئی کہ اس کو بطورِ مقدمہ کتاب میں شامل کرنے کی فرمائش کی۔ لکھتے ہیں:

”میں نے حسب وعدہ تقریظ لکھنے کا ارادہ کیا۔ لکھنے بیٹھا تو غیر متوقع طریق پر تحریر طویل ہوگئی جو ”احسن الکلام“ سے متاثر ہونے کا نتیجہ تھا۔“ (ایضاً)

مقدمہ کی ابتدائی سطور میں حضرت شیخ کے اندازِ تحریر سے متعلق اپنے تاثرات یوں بیان فرماتے ہیں:

”محترم الفاضل مولانا محمد سرفراز خان صفدر دام بالمجد والفواضل کی لطیف ترین تالیف ”احسن الکلام فی ترک قراءة الفاتحہ خلف الامام“ سے استفادہ کا شرف میسر ہوا۔ مطالعہ کے وقت ہر اگلی سطر پر آنکھوں میں نور، دل میں سرور اور روح میں ثلجِ یقین بڑھتا جاتا تھا۔ اثباتِ مسئلہ کے سلسلہ میں مصنف نے سلاستِ بیان، زورِ استدلال، منصفانہ تنقید اور عادلانہ مدافعت سے مسئلہ کے تحقیقی اور الزامی دونوں پہلوؤں کو مضبوط دلائل اور موکد شواہد سے مسئلہ کے کسی پہلو کو تشنہ نہیں چھوڑا، اور ساتھ ہی مسئلہ کے دفاعی پہلو سے بھی صرف نظر نہیں کیا کیونکہ مثبت پہلو کے ساتھ جب تک اس کا منفی پہلو صاف نہ ہو، مسئلہ من کل الوجوہ مستحکم نہیں ہوتا۔ مصنف نے جہاں مثبت پہلو سے ماننے والوں کے لیے سینہ کی ٹھنڈک کا سامان بہم پہنچایا ہے، وہیں منفی پہلو کے دفاع سے نہ ماننے والوں اور ان طعنہ زنوں کا منہ بند کر کے ان پر حجت تمام کر دی ہے“۔ (احسن الکلام، ص ۱۱)

اس کے بعد قاری صاحبؒ نے فروعی مسائل میں طعن وتشنیع کا رویہ اپنانے اور فریق مخالف پر گمراہی وباطل پرستی کا حکم لگانے والوں پر بڑی متین تنقید کی ہے اور ان کا شکریہ بھی ادا کیا ہے کہ اگر وہ یہ رویہ نہ اپناتے تو حضرتؒ کے علوم سے استفادے کی سبیل بھی پیدا نہ ہوتی۔ گویا فریق مخالف پر ان کی یہ تنقید حضرت شیخ کے لیے تعریف بن گئی۔ فرماتے ہیں:

”اگر وہ طعن وتشنیع کی راہ سے اس مسئلہ کو اپنے جذبات اور شکوک کی آماجگاہ نہ بناتے اور فریق کی حیثیت سے سامنے نہ آتے تو مصنف محترم مولانا سرفراز خان صاحب کے ان دقیق علوم اور اسالیب بیان سے ہم مستفید بھی نہ ہو سکتے جو اس حیلے سے انہوں نے اپنی کتاب احسن الکلام میں رقم فرمائے ہیں“۔ (احسن الکلام ص ۱۶)

''احسن الکلام'' کو موافق ومخالف دونوں کے لیے مفید قرار دیتے ہوئے لکھا ہے کہ ان دلائل سے دو میں سے ایک مفید کام ضرور ہوگا۔ فریق مخالف کی شدت ختم ہو جائے گی یا پھر کتاب کے کسی کمزور مقدمہ پر تنقید کی وجہ سے ہمارے لیے علم کا ایک اور در وا ہو جائے گا۔ لکھتے ہیں:

''ہم مصنف ''احسن الکلام' کے ممنون ہیں کہ انہوں نے اس حیلہ سے مسئلہ فاتحہ کے تحقیقی اور دفاعی دونوں پہلوؤں کو بہت حد تک صاف کر دیا ہے جو موافق ومخالف دونوں طبقوں کے لیے علمی حیثیت سے کار آمد ہوں گے۔ اگر خلاف رائے رکھنے والے حضرات کے لیے ان دلائل سے شفا ہو گئی تو ان کے خلاف میں شدت باقی نہ رہے گی، خواہ وہ اپنے ہی مسلک پر عمل پیرا رہیں۔ سو یہ کون سا کم نفع ہے! اور اگر ان دلائل کے کسی مقدمہ کو کمزور پا کر انہوں نے جواب کے طور پر اسے واضح کیا تو ہم سب کے لیے ایک مزید علم کا اضافہ ہوگا اور یہ کون سا قلیل نفع ہے، جو زدنی علما کا مصداق ہو''۔ (احسن الکلام، ص ۱۷)

حضرت شیخ کی کتاب ''تبرید النواظر'' کی وصولی پر خط لکھ کر ان الفاظ میں اپنی عقیدت کا اظہار فرمایا:

''جناب کی تالیفات بحمد اللہ محققانہ ہوتی ہیں، نہ ہم جیسوں کی تقریظ کی محتاج ہیں اور ترمیم کی تو کیا ہوتیں؟ یہ تو جناب کا علوِ ظرف ہے کہ اس کمال پر بھی ہم جیسوں کی حوصلہ افزائی فرماتے رہتے ہیں''۔ (تبرید النواظر ص ۹)

حضرت شیخ کی کتاب ''المنہاج الواضح'' یعنی ''راہِ سنت'' پر اپنی تقریظ میں قاری صاحبؒ نے ان کو زبردست الفاظ میں خراج تحسین پیش کیا۔ بدعات ورسومات کے حاملین کا ذوق بیان کرتے ہوئے جدل وخصومت کو ان کا خاصہ قرار دیا اور سنت وعلم کے حاملین کو متانت، سنجیدگی، راست گوئی اور حلم واناءۃ سے متصف کیا اور اس معیار پر اکابرین دیوبند کے مزاج و مذاق کی تشریح کرتے ہوئے حضرت شیخ کی تصنیف واندازِ تالیف کو پرکھا۔ لکھتے ہیں:

''حضرت مولانا نانوتوی بانی دار العلوم دیوبند قدس سرہ (المتوفی ۱۲۹۷ھ) نے اسی سنت وبدعت کے فرق کو عقائد اور کلیات دین میں نمایاں کیا۔ حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی قدس سرہ (المتوفی ۱۳۲۳ھ) نے اسی فرق کو فقہی جزئیات میں کھولا۔ حضرت تھانوی قدس سرہ (المتوفی ۱۳۶۲ھ) نے اسی فرق کو معاشرت ومعاملات میں نمایاں کیا۔ ابن شیر خدا حضرت مولانا مرتضٰی حسن صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ (المتوفی ۱۳۷۱ھ) نے اسی فرق کو مروجہ رسوم میں واضح کیا اور آج انہیں اسلاف صالحین کے ایک خلف رشید مولانا سرفراز خان صاحب صفدر نے اسی فرق کو اس دور کے ان تمام مخترعات ومحدثات میں مثبت ومنفی پہلو سے محققانہ دلائل کی روشنی میں نہایت واضح اور پاکیزہ انداز میں واشگاف کیا ہے جس کی شاہد عدل ان کی حالیہ تصنیف ''راہِ سنت'' ہے۔'' (راہِ سنت)

مزید لکھتے ہیں:

''مصنف کی اور دوسری لطیف تصانیف بھی جہاں تک نظر سے گزریں، محققانہ، منصفانہ اور متین اندازِ بیان کی حامل ہیں جو سنت وبدعت اور دین وغیر دین کی تفریق کے سلسلہ میں مجادلہ وجدال کی دعوت نہیں دیتیں بلکہ شرح صدر، قوت یقین اور عمل میں طمانیت وقناعت کی طرف لے آتی ہیں۔ یہ اسم بامسمیٰ کتاب ''راہِ سنت'' بھی حقیقتاً راہِ سنت کی داعی ہے جس سے جدل کا ذوق پیدا نہیں ہوتا کہ جدل بدعت وگمراہی کا خاصہ ہے، نہ کہ سنت اور

ہدایت کا۔'' (ایضاً)

اس کے بعد قاری صاحبؒ نے ترمذی شریف کی حدیث کا حوالہ دیتے ہوئے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی پیش گوئی کی وضاحت یوں کی کہ

''اہل بدعت واہل سنت کے رویے اور طرز کلام میں نمایاں فرق یہ ہے کہ اہل بدعت کا خاصہ بدگوئی، درشت کلامی، تفریق بین المسلمین، گالم گلوچ، قتل وغارت گری اور اشتعال انگیزی کے دبے ہوئے پنہانی غیظ وغضب کے ساتھ ہر وقت آمادۂ فساد رہنا، گویا ان کی حجت وبرہان ہی زبان کی گالی اور ہاتھوں کی درازدستی ہے جبکہ اہل سنت کی زبانیں متین، کلام مہذب، لب ولہجہ صادق اور انداز حلم واناءۃ کا ہے۔ کسی بھی موقع پر ''نہ تصنیف میں نہ تقریر میں'' وہ جذباتی رنگ میں اشتعال انگیزی کر کے تفریقیں ڈلواتے نہیں پھرتے بلکہ کتاب وسنت کے حجت وبرہان کی روشنی میں اللہ ورسول کے مدعا کو نقل کر کے دلائل سے پردہ اٹھا دیتے ہیں۔''

اس تبصرہ کے بعد ''راہِ سنت'' کے متعلق فرماتے ہیں:

''رسالہ زیر نظر ''راہِ سنت'' کا اندازِ بیان ولب ولہجہ اور طریقِ استدلال بھی انہی محققانہ اوصاف کا حامل ہے، کیونکہ وہ سنتوں کی دعوت دے رہا ہے جن کے لیے علم وتہذیب کفایت کرتے ہیں، نہ بدعات وخرافات کی جن کے لیے جہالت وجاہلانہ انداز ناگزیر ہے''۔ (ایضاً)

حضرت شیخ کی کتاب ''تسکین الصدور'' پر ان الفاظ میں اپنے تاثرات کا اظہار فرمایا:

''رسالہ نافعہ ''تسکین الصدور'' مولفہ حضرت مولانا سرفراز خان صفدرؒ سے استفادہ نصیب ہوا۔ رسالہ کی وقعت و عظمت کے لیے یہ کافی ہے کہ وہ مولانا سرفراز خان صاحب کی تالیف ہے جو اپنی محققانہ اور معتدلانہ طرز تصنیف میں معروف ہیں۔'' (تسکین الصدور ص ۲۰)

کتاب ''تسکین الصدور'' اور مسلک اہل سنت میں مطابقت کی اس طرح تعریف فرمائی:

''تسکین الصدور'' حقیقت یہ ہے کہ اس موضوع کے مسائل میں تسکین الصدور ہی ہے جس سے روحی وقلبی تسکین ہو جاتی ہے۔ جن جن مسائل پر کلام کیا گیا ہے، وہ اپنی جگہ نہ صرف یہ کہ اہل سنت والجماعت کے مسلک اور مذہب منصور کے مطابق ہے بلکہ فی نفسہٖ اپنے تحقیقی رنگ کی وجہ سے پوری جامعیت کے ساتھ منضبط ہو گئے ہیں اور ان سے دلوں میں سرور اور آنکھوں میں نور پیدا ہوتا ہے۔'' (ایضاً)

حضرت مولانا مفتی محمد مہدی حسنؒ: حضرت امام اہل سنت کی کتاب ''احسن الکلام'' حضرت مولانا مفتی مہدی حسن صاحب کے پاس پہنچی تو انہوں نے جزو اول مکمل اور جزو ثانی کو مختلف مقامات سے ملاحظہ فرمانے کے بعد اپنی تقریظ میں کتاب پر بڑے عمدہ الفاظ میں تبصرہ فرمایا۔ حضرت شیخ صاحبؒ کے متعلق اپنی رائے سے پہلے انہوں نے موجودہ دور کے فتنوں میں امت کے مختلف گروہوں کے درمیان اتحاد ویگانگت کی ضرورت پر زور دیا اور مسائل میں شدت پسندی کی وجہ سے عوام میں بے چینی واضطراب پھیلا کر تشتت وافتراق میں سعی کرنے والوں کی پرزور مذمت کی، ایسا اسلوب اختیار کرنے کی تلقین فرمائی جس سے شدت میں کمی آئے اور ہر مسئلہ کو اس کے مقام پر رکھنے کا سلیقہ وطریقہ رواج پکڑے۔ حضرت مفتی

صاحبؒ کی تقریظ سے شیخ العرب والعجم مولانا سید حسین احمد مدنیؒ نے مندرجہ ذیل الفاظ میں مکمل اتفاق کا اظہار فرمایا:

''حضرت مفتی سید مہدی حسن صاحب کی تحریر سے میں حرف بحرف موافقت کرتا ہوں اور دعا کرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ مولانا محمد سرفراز خان صفدر صاحبؒ موصوف کو جزائے خیر عطا فرمائے۔ (آمین)'' (احسن الکلام ص ۲۰)

یہ اس شخصیت کے الفاظ ہیں جس سے اپنا تعلق حضرت شیخؒ تمام عمر بڑے فخر سے بیان فرماتے رہے اور جن کے ساتھ نسبت کو اپنے لیے باعث نجات سمجھتے رہے۔ حضرت مفتی مہدی حسن صاحبؒ کے الفاظ یہ ہیں:

''میں نے احسن الکلام کے جزو اول سے آخر تک لفظ بہ لفظ اور جزو ثانی کا مختلف مقامات سے مطالعہ کیا ہے۔ خوبی اسلوب و اندازِ بیان، زبان کی صفائی کے ساتھ دلائل و براہین پر منصفانہ نظر ڈالی ہے۔ فاضل موصوف نے کسی پہلو کو تشنہ نہیں چھوڑا، معترضین کے شبہات کا جواب عالمانہ دیا ہے اور تحقیق کے ساتھ مجادلانہ طریق اختیار نہیں کیا کہ کتاب کی افادیت میں کمی واقع ہو۔ اپنے ہر دعویٰ کو براہین سے مدلل کیا ہے کہ مخالفین حضرات کو بھی، اگر ان کے یہاں علم و انصاف کی قدر و قیمت ہے تو تسلیم کر لینے اور سکوت اختیار کرنے کے سوا چارہ کار نہیں ہے۔ اس محنت و عرق ریزی اور تحقیق و تنقید کی جملہ احناف کی طرف سے فاضل موصوف کو اللہ تعالیٰ جزائے خیر عطا فرمائے اور بے انصاف مخالفین کی ہدایت کا ذریعہ بنائے۔ ان کے علم و عمل میں برکت عطا فرمائے اور مخلوق کے طریق رشد و ہدایت کا رہبر بنائے۔'' (احسن الکلام ص ۱۹)

حضرت شیخ کی کتاب ''تسکین الصدور'' جب حضرت مفتی صاحب کے پاس پہنچی تو آپ کی عمر اس وقت ۸۸ سال تھی اور کمزوری و ضعف کے سبب صاحب فراش تھے۔ نشست و برخاست تک میں دشواری محسوس کرتے تھے۔ اس کے باوجود کتاب کا مطالعہ فرمایا اور ان الفاظ میں کتاب پر اظہارِ اعتماد کیا:

''جناب والا نے کتاب کے کسی مبحث کو تشنہ نہیں چھوڑا۔ مسائل کو دلائل صحیحہ اور نقول معتبرہ سے باحسن وجوہ ثابت کر دیا ہے اور اہل سنت والجماعت کے عقیدہ کو بطریقِ صحیح ثابت کرنے میں کسی قسم کا فتور واقع نہ ہوا۔''
(تسکین الصدور ص ۱۹)

اس کے بعد فرماتے ہیں:

''عوام و خاص کے لیے بہت مفید ہے۔ پڑھنے کے بعد مجھ جیسے نااہل کے صدر کو تسکین اور دل میں سرور اور آنکھوں میں نور پیدا کر دیا۔'' (ایضاً)

حضرت شیخ کی کتاب ''راہِ سنت'' کے متعلق رقمطراز ہیں:

''بدعات کے سلسلہ کی اپنے رنگ کی یہ پہلی کتاب ہے جس میں بدعات کا رد نئے اسلوب سے کیا گیا ہے اور اتباعِ سنت کو بطریق احسن ثابت کیا گیا ہے۔.... ''زبان شستہ و صاف، لہجہ دل آویز، جدال و رنگِ مناظرہ سے دور اور مضامین کی جامع'' (راہ سنت)

حضرت مولانا شمس الحق افغانیؒ: حضرت مولانا شمس الحق افغانی رحمہ اللہ تعالیٰ نے حضرت شیخ کی کتاب ''راہِ سنت'' پر اظہار خیال کرتے ہوئے بدعات کے رد میں انتظامی و تعلیمی امور، صوفیا کے اشغال و مصروفیات اور جدید مباح معاملات

اور نئی پیدا ہونے والی خواہشات اور مردوں سے متعلقہ امور کے درمیان فرق کو نہایت مشکل قرار دیا اور اسے ایک علمی اور دقیق مبحث بتایا، لیکن حضرت شیخ کے متعلق فرماتے ہیں:

''میں یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ مصنف موصوف نے اس اہم مورچہ کو بہت بڑی حد تک سر کر دیا ہے اور اس عظیم مبحث کو نہایت خوبی اور خوش اسلوبی کے ساتھ حل کر دیا ہے۔'' (ایضاً)

دیگر کتب اور اس کتاب کے بطور خاص نافع ہونے کے متعلق فرمایا:

''میرے خیال میں مصنف دام فضلہ کی تمام تصانیف اگرچہ بجائے خود بہت مفید ہیں، لیکن یہ کتاب دیگر تصانیف کی نسبت عوام و خواص دونوں کے لیے بے حد نافع ہے۔ احقر اپنے حلقہ کے علمائے کرام و طلبہ کو مشورہ دیتا ہے کہ اس کتاب کی طرف توجہ فرمائیں''۔ (ایضاً)

''احسن الکلام'' کے متعلق اپنے تاثرات میں مسئلہ مبحوث فیہا میں وسعتِ مطالعہ کی بنیاد پر یہ بات تحریر فرمائی:

''اس مسئلہ پر قبل ازیں نفیاً و اثباتاً کافی رسائل و اجزا لکھے گئے ہیں، لیکن ان سب میں زیر تبصرہ کتاب کی شان نرالی ہے۔ مصنف علام کو حفاظتِ اصول و فروع دین و ردِ غلو غالین و تحریفات مبتدعین میں ایک ممتاز ملکہ حاصل ہے۔..... یہ کتاب بلحاظِ مواد، سلاستِ بیان و ضبط دلائل و ردِ اشکالاتِ مخالفین اور جامعیتِ جمیع ابحاثِ متعلقہ بالموضوع کے لحاظ سے اپنی شان میں بے نظیر ہے۔'' (احسن الکلام ص ۳۲، ۳۳)

''تسکین الصدور'' پر اپنے ایک خط میں ان الفاظ میں اظہار اعتماد فرمایا:

''آپ کی کتاب کا لب لباب اہل سنت والجماعت کے مسلک کے مطابق ہے اور منہج سلفِ صالحین کا آئینہ دار ہے۔'' (تسکین الصدور ص ۲۲)

''تبرید النواظر'' کے متعلق رائے گرامی یہ ہے:

''میری بے لاگ رائے یہ ہے کہ یہ کتاب اپنے موضوع میں بے مثال ہے۔.... اس موضوع پر ایسی عمدہ، جامع و پُر از معلومات کتاب اب تک میری نظر سے نہیں گزری۔'' (تبرید النواظر ص ۸، ۹)

حضرت مولانا حبیب الرحمٰن اعظمیؒ: حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحب اعظمیؒ نے حضرت شیخ کی چند کتابوں کا مطالعہ فرمایا اور شیخ کی متانت و سنجیدگی سے بھرپور اندازِ تحریر و تحقیق کے متعلق فرمایا:

''ماشاء اللہ آپ حضرات علم اور مذہب کی خدمت کا فرض نہایت خوش اسلوبی سے انجام دے رہے ہیں۔ سبھی رسالے قابل قدر ہیں، مگر مقامِ حضرت امام ابوحنیفہؒ شاہکار کی حیثیت رکھتا ہے۔ .... بڑی بات یہ ہے کہ اس سخت مرحلہ پر بھی سنجیدگی و متانت کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوٹا ہے۔'' (مقامِ ابی حنیفہؒ ص ۲۰)

حضرت مولانا مفتی فخر الدین احمدؒ: حضرت مولانا مفتی فخر الدین احمدؒ نے حضرت شیخ کی کتاب ''تسکین الصدور'' وصول ہونے پر دو مرتبہ مطالعہ کیا اور حسب ذیل رائے کا اظہار کیا:

''کتاب اپنے موضوع کے لحاظ سے بے مثل ہے اور واقعی اسم بامسمیٰ ''تسکین الصدور'' ہی ہے۔ یہ مسئلہ نہایت واضح طریق پر دلائل سے آراستہ پیراستہ اور مخالفین کے دلائل کا صحیح رد، جس سے دیکھنے والے کو حق معلوم کرنے

میں زبردست امداد حاصل ہو سکے اور بشرطِ انصاف انکار کی گنجایش باقی نہ رہے۔ پھر اس کے ساتھ مسلک کی پوری رعایت، یہ جملہ امور ایسے ہیں کہ بے اختیار داد دینے کو جی چاہتا ہے کہ دل سے دعا نکلتی ہے کہ خدایا! اس کتاب کو اہل حق کے لیے مقبول بنا اور اس کے جامع کو دنیوی عزت کے ساتھ آخرت میں خادمانِ دین متین میں محشور فرما۔"
(تسکین الصدور، ص ۱۸)

حضرت مولانا مفتی محمد شفیعؒ: صاحبِ تفسیر معارف القرآن حضرت مولانا مفتی محمد شفیع رحمہ اللہ تعالیٰ سے حضرت شیخ نے کچھ اسباق پڑھے تھے۔ حضرت شیخ نے اپنی کچھ کتابیں ان کی خدمت میں بھیجتے ہوئے اس رشتہ تلمذ کا تذکرہ کیا تو حضرت مفتی صاحبؒ نے ان الفاظ میں اپنے جذبات کا اظہار کیا:

"آپ نے رشتہ تلمذ کا ذکر کیا۔ ماشاء اللہ آپ کے علمی کمالات کے سامنے اس کا تصور بھی مجھے نہیں ہو سکتا"۔
(تسکین الصدور ص ۳۲)

اس کے بعد حضرت شیخ کی کتابوں پر درج ذیل تبصرہ فرمایا:

"کچھ کتب کو اجمالاً دیکھا اور "تنقید متین" اور "تسکین الصدور" کو کسی قدر تفصیلاً دیکھنے کی نوبت آئی۔ جوں جوں دیکھتا جاتا تھا، دل سے دعائیں نکلتی جاتی تھیں کہ ماشاء اللہ تحقیق کا حق بھی پورا ادا کر دیا اور دوسروں پر تنقید کا طرز بھی بہت اچھا اور متین ہے۔ آج کل کے انشا پردازوں یا واعظوں کی زبان اختیار نہیں کی جس میں الزام تراشی اور فقرے کسنے کا جذبہ اصلاح کے جذبے کو دبا دیتا اور بے اثر بنا دیتا ہے۔ اللہ تعالیٰ آپ کے علم، حسن عمل اور اخلاص میں ترقیاتِ لامتناہی عطا فرمائیں۔" (ایضاً)

حضرت مفتی صاحبؒ نے مسائل جدیدہ کی تحقیق اور ان پر متفقہ رائے کے اظہار کے لیے علما کی ایک مجلس بنائی جس میں کراچی کی سطح کے سرکردہ علما شریک تھے۔ اُنھوں نے حضرت شیخ کی کتابیں دیکھنے کے بعد اس بات کی خواہش ظاہر فرمائی کہ وہ بھی اس مجلس میں شریک ہوں اور اپنے ذوق تحقیق اور وسعت نظر سے عوام وخواص کو مستفید فرمائیں۔ لکھتے ہیں:

"ماشاء اللہ آپ کی وسعتِ نظر اور ذوقِ تحقیق کے پیشِ نظر دل تو یہ چاہتا ہے کہ اس مجلس میں بھی آپ کی شرکت ہوتی تو بہتر تھا مگر بُعدِ بعید کی وجہ سے یہ نہ ہو سکا"۔ (ایضاً)

حضرت شیخ کی کتاب "مقام ابی حنیفہ" جب حضرت مفتی صاحبؒ کی نظر سے گزری تو انہوں نے اپنے خط میں فرمایا کہ وہ خود عرصہ دراز سے امام عالی مقام پر کوئی تحقیقی تصنیف کے خواہاں تھے اور کچھ علمی مواد بھی جمع کیا تھا، لیکن شیخ کی کتاب دیکھ کر یہ فیصلہ کیا کہ اس کا تفصیلی مطالعہ کریں گے اور کافی وشافی پانے پر اپنے قلب ودماغ کو اس ارادہ سے فارغ کر لیں گے۔ اس مقصد کے لیے انہوں نے جامعہ کے استاد مولانا سلیم اللہ خان مدظلہ العالی (حال مہتمم وشیخ الحدیث جامعہ فاروقیہ کراچی) کو مطالعہ پر مامور کیا۔ ان کی انتہائی اطمینان بخش رائے معلوم ہونے اور خود بھی چیدہ چیدہ مقامات کو بغور دیکھنے کے بعد لکھا:

"آج انہوں نے (مولانا سلیم اللہ خان مدظلہ العالی) پورے مطالعہ کے بعد جس اطمینان کا اظہار کیا، اس سے بے حد مسرت ہوئی۔ اب خود بھی کتاب کو مختلف مقامات سے پڑھا۔ بار بار دل سے دعا نکلی، بحمد اللہ میری آرزو پوری ہو گئی۔ بلا مبالغہ عرض کرتا ہوں کہ میں خود لکھتا تو ایسی جامع کتاب نہ لکھ سکتا۔ اس موضوع پر یہ کتاب بالکل

کافی وشافی ہے۔" (مقامِ ابی حنیفہ، ص ۲۱)

حضرت مولانا سلیم اللہ خان صاحب مدظلہ العالی نے کتاب دیکھنے کے بعد اپنی رائے کا بھی تحریراً اظہار فرمایا جس میں حضرت شیخ کی علمی پختگی، وسعتِ مطالعہ اور اعتراضات کے شافی جوابات کی تعریف کے بعد فرمایا:

"ان کا یہ علمی شاہکار قابل صد آفریں ہے۔" (ایضاً)

حضرت مولانا خیر محمد جالندھریؒ: حضرت مولانا خیر محمد جالندھری "تسکین الصدور" پر اپنی تقریظ میں کتاب کے علمی مرتبہ وثقاہت کے متعلق یوں رقم طراز ہیں:

"اتباعِ سلف صالحین میں ہر مسئلہ میں مذہب جمہور کو قرآن وحدیث شریف، صحیح وحسن، وفقہ حنفی کے ذخیرہ کی روشنی میں مسائل کو ادلہ کثیرہ سے ایسا مبرہن کیا ہے کہ اس سے زائد کی گنجایش نہیں۔ ہر مسئلہ سے دلائل صحیحہ کا اس قدر انبار لگا دیا ہے کہ ہر منصف اس پر اعتبار واعتماد کرتے ہوئے یہ کہنے پر مجبور ہے: ایں کار از تو آید ومردان چنین کنند۔"

حضرت مولانا محمد یوسف بنوریؒ: حضرت مولانا سید محمد یوسف بنوریؒ نے حضرت شیخ کی کتاب "مقام ابی حنیفہ" پر اپنی تقریظ میں موجودہ دور کے داخلی وخارجی فتنوں کا ذکر کیا اور ان حالات میں بعض ناعاقبت اندیش افراد کے اس رویہ کی زبردست مذمت کی ہے جو متفقہ مسائل وشخصیات کو متنازع بنانے کی سعی میں مصروف ہیں اور غیر واقعی افسانوں کو علمی تحقیقات کا رنگ دے کر اس کی اشاعت کر رہے ہیں۔ اس کے بعد حضرت شیخ کے متعلق فرمایا:

"جناب محترم مولانا محمد سرفراز صاحب بارک اللہ فی حیاتہ ہمارے شکریہ کے مستحق ہیں کہ موصوف نے ان خرافات کا عالمانہ ومحققانہ جواب دیا اور "مقام حضرت امام ابو حنیفہ" تالیف فرما کر امت محمدیہ کی طرف سے فرض کفایہ کا حق نہایت خوش اسلوبی سے ادا کیا۔ مولانا کا اسم گرامی تو عرصے سے کانوں میں پڑتا رہا، لیکن ان کو سمجھنے کا موقع اس کتاب سے ملا۔..... تقریباً اکثر ابحاث پر استیفا کے ساتھ سیر حاصل تبصرہ، بصیرت افروز محققانہ انداز سے ہو گیا اور معترضین وناقدین کے شکوک وشبہات ووساوس واوہام کا نہایت خوش اسلوبی سے استیصال کیا گیا۔ اندازِ تحریر عالمانہ، اردو شگفتہ ہے، اسلوبِ بیان مؤثر ہے، کہیں کہیں ادیبانہ ہے۔" (مقامِ ابی حنیفہ ص ۲۴)

علامہ بنوریؒ نے "تسکین الصدور" پر تقریظ میں مسئلہ حیاتِ انبیا پر پیدا ہونے والے خلفشار کا ذکر کیا اور اس خلفشار کو ختم کرنے کے لیے ارباب فکر واخلاص کی طرف سے اس تجویز کا ذکر کیا کہ اس مسئلہ پر ایک محققانہ کتاب مؤثر انداز میں لکھی جائے جس سے مسئلے کے تمام گوشوں پر سیر حاصل تبصرہ کیا جائے۔ اس اہم ونازک کام کے لیے تمام احباب کی نظر انتخاب حضرت شیخ پر ٹھہری اور یہ کام ان کو سونپ دیا گیا۔ علامہ بنوریؒ اس ضمن میں فرماتے ہیں:

"باتفاق رائے اس کام کی انجام دہی کے لیے جناب برادر گرامی؟؟ مآثر مولانا ابو الزاہد محمد سرفراز خان صاحب منتخب ہو گئے جن کے دماغ میں بحث وتمحیص کی صلاحیت بھی ہے، قلم میں پختگی بھی، علومِ دینیہ اور حدیث ورِجال سے اچھی قابل قدر مناسبت بلکہ عمدہ بصیرت بھی ہے۔ مختلف مکان سے غرر نقول جمع کرنے کی پوری قدرت بھی ہے اور حسن ترتیب کی پوری اہلیت بھی۔ الحمد للہ برادر موصوف نے توقع سے زیادہ مواد جمع کر کے تمام گوشوں کو خوب واضح کر دیا اور تحقیق کا حق ادا کر دیا ہے۔ میرے ناقص خیال میں اب یہ تالیف اس مسئلہ میں جامع ترین

تصنیف ہے اور اس دور میں جتنی تصانیف اس مسئلہ پر لکھی گئی ہیں، ان سب میں جامع و واضح و عالمانہ بلکہ محققانہ ہے۔ اللہ تعالیٰ موصوف کی اس خدمت کو خلعت قبول سے نوازے اور مزید اس قسم کی خدمات کی توفیق عطا فرمائے''۔ (تسکین الصدور ص ۲۴)

حضرت مولانا مفتی رشید احمد لدھیانویؒ: حضرت مولانا مفتی رشید احمدؒ نے ''احسن الکلام'' پر اپنی مسرت کا یوں اظہار فرمایا:

''احسن الکلام کی تحقیق عمیق اور جامعیت دیکھ کر بہت مسرت ہوئی۔ اللہ تعالیٰ اس محنت کو قبول فرمائیں''۔ (احسن الکلام ص ۳۴)

حضرت مولانا محمد عبداللہ درخواستیؒ: ''احسن الکلام'' پر اپنی تقریظ میں حضرت مولانا عبداللہ درخواستی فرماتے ہیں:

''فقد رأیت احسن الکلام من تألیف المولوی محمد سرفراز خان صفدر فرأیتہ موشحاً بدلائل و خالیا عن الجدل، فجزی اللہ تعالیٰ المؤلف احسن الجزاءً وارجوا من اللہ ان ینتفع بہ العوام والخواص وان یترك اهل الجدل الجدل'' (احسن الکلام ص ۲۶)

حضرت مولانا عبدالحقؒ: حضرت مولانا عبدالحق (مہتمم دار العلوم حقانیہ، اکوڑہ خٹک) 'احسن الکلام'' کے بارے میں اپنے گرامی نامہ میں لکھتے ہیں:

''بزرگوارم! ایسی جامع اور مسئلہ کے ہر پہلو پر حاوی کتاب پر تقریظی جملے لکھنا میرے خیال میں سورج کے سامنے چراغ دکھانا ہے''۔ (احسن الکلام ص ۲۹)

حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی: حضرت شیخؒ نے اپنی کتابیں بطورِ ہدیہ حضرت مفتی محمد تقی عثمانی دامت برکاتہم کو بھیجیں۔ حضرت مفتی صاحب نے اپنے جوابی خط میں کچھ اس طرح اپنی عقیدت کا اظہار فرمایا:

''آنجناب نے جس شفقتِ کریمانہ سے اس ناچیز کو اس ہدیہ سامیہ سے سرفراز فرمایا، اس پر حق شکر ادا نہیں کر سکتا۔ اسے بغرض استفادہ اپنے سامنے کی الماری میں رکھ لیا تھا۔ ..... ''آنجناب کی ہر تالیف ہم جیسے طالب علموں کے لیے علمی مواد کا گراں قدر ذخیرہ ہوتی ہے، اس لیے احقر نے بڑے اہتمام سے آنجناب کی تقریباً تمام تالیفات جمع کی ہوئی ہیں اور وقتاً فوقتاً درس وغیرہ میں ان سے استفادہ کرتا رہتا ہوں۔ الحمدللہ یہ کتاب بھی حسب سابق ہم جیسے طالب علموں کے لیے نعمتِ بیش بہا ہے۔ اللہ تعالیٰ اس کو قبول فرما کر اس کا نفع عام اور تام فرمائیں۔'' (الکلام المفید فی اثبات التقلید)

کتاب اور صاحبِ کتاب کے بارے میں حضرت مفتی صاحب مدظلہ العالی نے اپنے تاثرات ماہنامہ ''البلاغ'' میں تحریر فرمائے۔ فرماتے ہیں:

''حضرت مولانا محمد سرفراز خان صفدر مدظلہم العالی اپنے علم و فضل اور تحقیقی ذوق کے لحاظ سے ہمارے ملک کی قیمتی متاع ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان کو تادیر بایں فیوض سلامت رکھیں۔ انہوں نے اپنے قلم سے دین کی جو خدمات انجام دی ہیں اور مسلکِ حق کے اثبات اور عہدِ حاضر کے مختلف مکاتیبِ فکر پر جو عالمانہ تنقیدیں فرمائی ہیں، وہ ہمارے

علمی اور دینی لٹریچر کا بہت بڑا سرمایہ ہیں۔'' (الکلام المفید فی اثبات التقلید)

حضرت شیخؒ کے اسلوب کے متعلق لکھتے ہیں:

''مولانا کا اسلوب یہ ہے کہ وہ جو بات کہتے ہیں، اس کی پُشت پر مستند حوالوں کا ایک بڑا ذخیرہ ہوتا ہے اور ان کی کتاب کا ہر صفحہ ان حوالوں سے سجا ہوا ہوتا ہے۔ یہی اسلوب اس کتاب میں بھی پوری قوت کے ساتھ جلوہ گر ہے۔'' (ایضاً)

۲۸ رمئی ۲۰۰۹ کو مدرسہ نصرۃ العلوم گوجرانوالہ میں حضرات شیخین کی یاد میں منعقد ہونے والے ایک تعزیتی سیمینار سے خطاب میں مولانا تقی عثمانی نے ''احسن الکلام'' کے حوالے سے اپنے تاثرات بیان کرتے ہوئے فرمایا کہ:

''ایک دن میں نے کتابیں الٹتے پلٹتے دیکھا تو ایک کے اوپر نام جو پہلی بار میں نے دیکھا اور پڑھا، اس میں ابو الزاہد محمد سرفراز خان صفدر لکھا ہوا تھا اور وہ کتاب قراءۃ الفاتحہ خلف الامام کے موضوع پر تھی اور دو جلدوں میں تھی۔ تو میں اس قدر حیران ہوا کہ قراءۃ الفاتحہ خلف الامام ایک مسئلہ ہے اور اس مسئلہ پر دو جلدوں میں احسن الکلام فی ترک القراءۃ خلف الامام! تو حیرانی مجھے اس درجہ ہوئی کہ یہ مسئلہ ایک جزوی مسئلہ ہے، اس کے اوپر دو جلدوں میں کتاب! اور جب اس کو الٹنا پلٹنا شروع کیا تو سطر سطر حوالوں سے بھری ہوئی۔ ہر سطر میں حوالے ان کتابوں کے جن کا کبھی اس وقت نام بھی نہیں سنا تھا۔ اور اس نے اپنی جانب کھینچا اور یہ نام مبارک بھی پہلی بار ہی سنا تھا۔ اس کو جب پڑھنا شروع کیا اور پڑھنے کے بعد اس کے نتیجے میں اندازہ ہوا کہ قراءۃ فاتحہ خلف الامام تو ایک عنوان ہے، علوم کے دریا بہانے کا ایک عنوان تھا۔ چھوٹا سا مسئلہ لیکن اس مسئلہ کی تحقیق اور تنقید میں کتنے اصولی مسائل، کتنے اصولی افادات اس کے اندر موجود تھے۔ تو اس روز پہلی بار میں نے یہ نام مبارک دیکھا اور سنا۔ پھر میں نے اپنے والد ماجد حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب قدس اللہ تعالیٰ سرہ سے پوچھا کہ یہ کون بزرگ ہیں تو حضرت والد صاحب نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو خاص توفیق عطا فرمائی ہے۔''

اس مختصر تذکرہ سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ حضرت شیخؒ ان نابغہ روزگار اور عبقری شخصیات کے پرعزم و پرنور قافلے کا ہی ایک فرد تھے جنہوں نے ہر زمانے میں وقت کے گیسو سنوارنے، دین متین کو ہر قسم کی ملاوٹ سے خالص کرنے اور بھٹکتی انسانیت کو شاہراہِ ہدایت پر گامزن کرنے کے لیے انبیا کے جذبے اور اسپرٹ سے ہی کام کیا۔ بلاشبہ اس قافلہ حق کا ہر فرد منتخب اور چنا ہوا تھا۔ اگر حضرت شیخؒ کے ابتدائی حالات اور ان کے سفرِ آخرت کا منظر سامنے رکھیں، جس میں لاکھوں نفوس عقیدت واحترام کے پھول نچھاور کرنے جمع ہوئے تھے، تو دل میں یہ یقین جاگزیں ہوتا ہے کہ یہ بھی بڑی سرکار کی طرف سے چناؤ ہی تھا۔

ڈاکٹر محمد اکرم ورک*

حضرت شیخ الحدیث رحمہ اللہ اور دفاعِ حدیث

امت مسلمہ کا ہمیشہ سے اس بات پر اتفاق رہا ہے کہ قرآن مجید کے بعد حدیثِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم دین اسلام کا دوسرا بنیادی مأخذ ہے۔ اگرچہ قرآن مجید ایک جامع کتاب ہے، تاہم قرآن کی جامعیت کا مفہوم صرف یہ ہے کہ قرآن میں جہاں بعض مسائل واحکام پر تفصیلی روشنی ڈالی گئی ہے، وہاں زندگی کے اکثر معاملات کے بارے میں بنیادی اصولوں کے بیان پر ہی اکتفا کیا گیا ہے اور یہ منصب جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کو خود اللہ تعالیٰ نے تفویض کیا ہے کہ وہ ان اصولوں کی وضاحت اس ''حکمت'' کی روشنی میں فرمائیں جو اللہ تعالیٰ نے آپ پر نازل کی ہے۔ حدیث وسنت دراصل اللہ تعالیٰ کے حکم ''لتبین للناس مانزل الیھم'' ہی کا مظہر ہے۔ اس نقطۂ نظر سے دیکھا جائے تو قرآن مجید اپنی درست تعبیر وتشریح کے لیے واضح طور پر حدیث وسنت کا محتاج ہے۔ حدیث وسنت کی اسی اہمیت کے پیش نظر جمہور اہل علم کے نزدیک محدثانہ اصولوں کے مطابق جب کسی روایت کے بارے میں یہ ثابت ہو جاتا ہے کہ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہی کا قول وفعل ہے تو پھر حجت ہونے کے اعتبار سے قرآن اور حدیث میں کوئی بنیادی فرق نہیں رہتا۔ امتِ مسلمہ کی ذہنی تشکیل میں چونکہ یہی فکر ہمیشہ کارفرما رہی ہے، اس لیے مسلمانوں نے قرآن مجید کی صرف اسی تعبیر وتشریح کو قبول کیا ہے جو حدیث وسنت کی روشنی میں کی گئی ہو۔

خوارج اور بعد ازاں معتزلہ نے جب محض عقل کی بنیاد پر قرآن مجید کی من مانی تشریح کرنے کی کوشش کی اور اپنی عقلی موشگافیوں کی راہ میں حدیث وسنت کو رکاوٹ سمجھتے ہوئے تنقید کا نشانہ بنایا تو اللہ تعالیٰ نے اپنے خاص تکوینی نظام کے تحت محدثین عظام سے خدمتِ حدیث کا وہ کام لیا جس کی کوئی دوسری مثال ہمیں پوری انسانی تاریخ میں نظر نہیں آتی۔ جمہور اہل علم نے فتنہ اعتزال کا بھرپور علمی تعاقب کیا جس کے نتیجے میں یہ فتنہ موت کی وادی میں داخل ہو گیا اور پھر صدیوں تک ہمیں اس فتنے کا کوئی نام ونشان نظر نہیں آتا، یہاں تک کہ چودھویں صدی ہجری میں اس فتنے نے ہندوستان کی سرزمین پر ''فتنہ انکارِ حدیث'' کے نام سے نیا جنم لیا۔ مغربی فکر وفلسفہ سے ذہنی مرعوبیت کا شکار بعض اہل علم نے اس فتنے کی سرپرستی کی، جن میں سرسید احمد خان (م ۱۸۹۸ء) اور ان کے رفقاے کار خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ بعد کے دور میں حدیث وسنت سے انحراف کی اس روش نے ایک منظم تحریک کی شکل اختیار کر لی اور پھر بہت جلد اسلم جیراج پوری (م ۱۹۵۵ء)، تمنا عمادی (م ۱۹۷۲ء)، غلام احمد پرویز (م ۱۹۸۵ء) اور ڈاکٹر غلام جیلانی برق (م ۱۹۸۵ء) جیسے صاحبِ طرز ادیبوں کی سرپرستی میں اس تحریک نے ایک خطرناک فتنے کی صورت اختیار کر لی۔ اللہ تعالیٰ نے ہندوستان کے اہل علم کو اس فتنے کی سرکوبی کی خصوصی توفیق ارزانی فرمائی اور ان کے قلم سے حدیث وسنت کی خدمت کا چشمہ فیض پھوٹ نکلا۔ فتنہ انکارِ سنت کا ایک مثبت

* شعبہ اسلامیات، گورنمنٹ ڈگری کالج پیپلز کالونی، گوجرانوالا

پہلو یہ بھی ہے کہ اس کے ردِ عمل میں حدیث وسنت کی حجیت اور تشریعی حیثیت پر وقیع اور ہمہ جہت لٹریچر تیار ہوا اور حدیث وسنت کے وہ محاسن امت پر نئے سرے سے منکشف ہوئے جن سے امت تقریباً غافل ہو چکی تھی۔ برصغیر کے علما کی علمی تگ وتاز نے منکرین حدیث کے حقیقی عزائم کو طشت از بام کر دیا۔

برصغیر کے وہ اہل علم جنہوں نے منکرین حدیث کے دلائل کے تار وپود بکھیر کر رکھ دیے اور ان کو دفاعی پوزیشن پر لا کھڑا کیا، ان میں ایک بڑا نام ہمارے ممدوح شیخ الحدیث مولانا سرفراز خان صفدرؒ (۱۹۱۴ء-۲۰۰۹ء) کا بھی ہے۔ اگرچہ حضرت شیخ نے متنوع موضوعات پر ہزاروں صفحات سپرد قلم کیے ہیں اور درجنوں کتابیں یادگار چھوڑی ہیں، تاہم فن حدیث پر ان کی رقم کردہ کتب کو اگر پیش نظر رکھا جائے تو شاید یہ کہنا مبالغہ نہ ہوگا کہ حدیث وسنت سے ان کی دلچسپی دیگر علوم وفنون کی نسبت زیادہ تھی۔ حضرت شیخ الحدیثؒ کی علم حدیث میں خصوصی دلچسپی اور رسوخ کی ایک وجہ تو شاید یہ ہے کہ آپؒ نے شیخ الاسلام مولانا سید حسین احمد مدنیؒ جیسے ماہر فن استاد سے حدیث کی تعلیم حاصل کی اور دوسری طرف اپنی عمر عزیز کا بڑا حصہ (تقریباً چھیاسٹھ سال) حدیث کی تدریس میں صرف کیا۔ فتنہ انکارِ سنت کا علمی تعاقب کرتے ہوئے حضرت مولانا محمد سرفراز خان صفدرؒ کے قلم سے جو یادگار کتب منصۂ شہود پر آئیں، ان میں ''شوقِ حدیث''، ''صرف ایک اسلام'' اور ''انکارِ حدیث کے نتائج'' خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ ان قابل قدر تصانیف کے مطالعہ سے واضح ہوتا ہے کہ حضرت شیخؒ نے منکرین حدیث کے تمام اعتراضات کا نہ صرف محکم دلائل کے ساتھ تجزیہ کیا ہے بلکہ منکرین حدیث کے حقیقی عزائم کو بھی بے نقاب کر کے رکھ دیا ہے۔

منکرین حدیث کی کتابوں پر نظر ڈالنے سے معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے حدیث وسنت پر دو طرح کے اعتراضات کیے ہیں۔ پہلی قسم کے اعتراضات وہ ہیں جن میں حدیث کی حجیت، اس کی قانونی اور تشریعی حیثیت پر تنقید کی گئی ہے، نیز جمع وتدوین حدیث کی کوششوں پر بھی شکوک وشبہات کا اظہار کیا گیا ہے۔ دوسری قسم کے اعتراضات کا تعلق حدیث کے متون کے ساتھ ہے، جس میں کتبِ احادیث سے مختلف روایات کے متون کو بطور مثال اس دعویٰ کے ساتھ پیش کیا گیا ہے کہ یہ روایات نہ صرف قرآن مجید سے متعارض ہیں بلکہ باہم متناقض ہونے کے ساتھ ساتھ عقل انسانی اور علم جدید سے بھی متصادم ہیں، لہٰذا احادیث کے بارے یہ دعویٰ کرنا کہ یہ مبنی بر وحی اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات ہیں، درست نہیں ہے۔ اس نوعیت کی مثالوں کا زیادہ تر انتخاب صحاح ستہ اور موطأ امام مالکؒ سے کیا گیا ہے، تاکہ قارئین کو یہ دھوکہ دیا جائے کہ جب مستند ترین کتب احادیث میں مرویات کا یہ حال ہے تو حدیث کی دوسری کتابیں بھلا کیونکر قابل بھروسہ ہو سکتی ہیں؟ ہمارے ممدوح کا اختصاص یہ ہے کہ انھوں نے حدیث کے تشریعی مقام ومرتبہ اور جمع وتدوین پر اعتراضات کا تجزیہ اپنی کتاب ''شوقِ حدیث'' میں کیا ہے اور متون حدیث پر اعتراضات کا جائزہ ''صرف ایک اسلام'' میں لیا ہے، جبکہ انکارِ سنت کی صورت میں مرتب ہونے والے لازمی نتائج کو اپنی تصنیف لطیف ''انکارِ حدیث کے نتائج'' میں اس اسلوب میں بیان کر دیا ہے کہ کوئی بھی سلیم الفطرت انسان، جس کے کوئی مخفی عزائم نہ ہوں اس کتاب کے مطالعہ کے بعد حدیث وسنت کے انکار کا تصور بھی نہیں کر سکتا۔

منکرین حدیث میں سے جن لوگوں نے ''متون حدیث'' کو خاص طور پر تنقید کا نشانہ بنایا ہے، ان میں حافظ محمد اسلم جیراج پوری اور ڈاکٹر غلام جیلانی برق قابل ذکر ہیں۔ اس نوعیت کی تنقیدات جیراج پوری صاحب کی کتاب ''ہمارے دینی علوم'' میں دیکھی جا سکتی ہیں جس کا ایک حصہ جناب غلام احمد پرویز نے اپنی کتاب ''مقام حدیث'' میں بھی شامل کیا ہے، جبکہ

متون حدیث پر تنقیدات ڈاکٹر غلام جیلانی برق کی ''دو اسلام'' میں ملاحظہ کی جا سکتی ہیں۔

مولانا سرفراز خان صفدرؒ نے ڈاکٹر غلام جیلانی برق کی کتاب ''دو اسلام'' کا تنقیدی جائزہ جس عالمانہ شان اور ادیبانہ اسلوب میں اپنی کتاب ''صرف ایک اسلام'' میں لیا ہے، اس کا اعتراف خود برق صاحب نے بھی کیا ہے، چنانچہ موصوف حضرت شیخ الحدیثؒ کے نام اپنے مکتوب میں رقم طراز ہیں:

''دو اسلام کے جواب میں نصف درجن کے قریب کتابیں نکل چکی ہیں جن میں سے مجھے آپ کی کتاب ''صرف ایک اسلام'' بوجوہ پسند آئی۔ اول، اس لیے کہ اس میں گالیاں کم تھیں۔ دوم، انداز تحریر ادیبانہ تھا۔ سوم، اور میری اغلاط کی وضاحت عالمانہ تھی۔ میں طبع نو کے ''حرف ثانی'' میں آپ کا شکریہ خاص طور سے ادا کر رہا ہوں۔ طبع نو سے اغلاط نکال دی ہیں اور انداز بیان کو بہت نرم کر دیا گیا ہے۔ مجھ سے جو غلطیاں ہوئیں، ان میں بدنیتی کو دخل نہیں تھا بلکہ ایک جگہ میں ایک دعا کو آیت سمجھ گیا اور ۱۰۔۱۲ مقامات پر الفاظ حدیث کا ترجمہ نافہمی سے غلط کر دیا تھا۔'' (صرف ایک اسلام، ص: ۶، ۷)

حضرت شیخؒ کی کتاب ''صرف ایک اسلام'' کی علمی قدر و قیمت کیا ہے، اس کا اندازہ تو محترم برق صاحب کے خط ہی سے ہو جاتا ہے، اس لیے ہم اس کتاب پر برق صاحب کے الفاظ ہی کو بہترین تبصرہ سمجھتے ہوئے اپنے قارئین کی توجہ اس کتاب کی ایک ایسی خصوصیت کی طرف مبذول کروانا چاہیں گے جو خاص طور پر حدیث کے طلبہ کے خصوصی توجہ کی متقاضی ہے۔ اس کتاب میں مولانا صاحبؒ نے برق صاحب کی درجنوں اغلاط کی نشاندہی کرنے کے ساتھ ساتھ متون حدیث پر ان کے چھتیس (۳۶) اہم اعتراضات کا تنقیدی جائزہ لیا ہے۔ کتاب کا امتیاز یہ ہے کہ مولاناؒ کی تنقیدی آرا کے مطالعے سے ہمارے لیے ان اسباب اور وجوہات کا تعین کرنا ممکن ہو جاتا ہے جو متون حدیث کے فہم میں برق صاحب کے لیے رکاوٹ کا باعث بنے ہیں۔ علم حدیث کے طالب علم کے لیے ان اسباب و وجوہات پر غور و فکر ضروری ہے، تا کہ وہ اس کج فہمی سے محفوظ رہ سکے جس کا شکار برق صاحب ہوئے ہیں۔ ذیل کی سطور میں ہم مولاناؒ کی تنقیدی آرا کی روشنی میں علم حدیث کے طلبہ کے لیے مطالعہ حدیث کے چند اصولوں کا ذکر کرنا چاہیں گے، جن کی مختصر تفصیل حسب ذیل ہے۔

۱۔ روایات میں بہت سی باتیں مخاطب کی ذہنی سطح کے مطابق تمثیل کے انداز میں بیان ہوئی ہیں مگر کم فہم لوگ اس کو لفظی طور پر لے لیتے ہیں جس کی وجہ سے وہ اشکال کا شکار ہو جاتے ہیں۔ مثلاً برق صاحب بخاری کی ایک روایت کا ترجمہ ان الفاظ میں کرتے ہیں: ''ابن عمر حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں کہ سورج نکلتے اور ڈھوبتے وقت نماز نہ پڑھا کرو، اس لیے کہ سورج بوقت طلوع شیطان کے دو سینگوں میں پھنسا ہوا ہوتا ہے۔'' پھر موصوف نے اس حدیث کو لفظی مفہوم میں سمجھتے ہوئے شدید تنقید کا نشانہ بنایا ہے۔ حضرت شیخؒ نے پہلے تو برق صاحب کے اعتراضات کا تحقیقی اور الزامی جواب دیا ہے اور پھر فہم کلام کے ایک اہم اصول کی طرف توجہ دلاتے ہوئے لکھا ہے:

''عرف عام میں بھی کہا جاتا ہے کہ گرمی کے موسم میں سورج فلاں اور فلاں پہاڑ یا فلاں اور فلاں درخت یا فلاں اور فلاں مکان کے درمیان سے طلوع کرتا ہے اور سردیوں میں فلاں اور فلاں کے درمیان سے۔ اس سے کوئی عقل مند یہ نہیں سمجھتا کہ سورج پہاڑوں اور درختوں، ٹیلوں اور مکانوں میں الجھ کر رہ جاتا ہے اور نہ اس سے عوام ''پھنسا

ہوا ہوتا ہے'' سمجھتے ہیں۔ اور بول چال اور گفتگو کا یہ طریقہ صحیح اور رائج سمجھا جاتا ہے اور کوئی منصف مزاج اس قسم کا کلام کرنے والوں کے مبلغ علم کا رونا نہیں روتا مگر برق صاحب ہیں کہ بلا دلیل ملا بیچارے کو کوستے ہیں۔''

(صرف ایک اسلام، ص: ۱۶۹)

گویا اس روایت میں بات سمجھانے کے لیے تمثیلی اسلوب اختیار کیا گیا ہے۔ اب اگر کوئی شخص اس طرح کی روایات کو لفظی مفہوم میں ہی لے اور ''عرف عام'' کو نظر انداز کر دے تو برق صاحب کی طرح اس کا غلط فہمیوں میں مبتلا ہونا یقینی ہے۔

۲۔ متن حدیث کی تفہیم میں اس وقت بھی غلطی کا ارتکاب ہو سکتا ہے جب اسلوب بیان اور محاورے کو پوری طرح نہ سمجھا جائے۔ مثلاً برق صاحب نے بخاری کی اس روایت کو تاریخی طور پر غلط قرار دیا ہے جس میں معاہدہ صلح حدیبیہ کے بعض الفاظ لکھنے کی نسبت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف کی گئی ہے۔ برق صاحب کہتے ہیں کہ قرآن اور تاریخ ہر دو شاہد ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نہ لکھ سکتے تھے اور نہ پڑھ سکتے تھے، لہٰذا بخاری کی روایت غلط ہے۔ (دو اسلام، ص: ۱۹۵) مولانا سرفراز خانؒ نے قرآنی آیات اور دیگر دلائل سے برق صاحب کے اعتراض کا تجزیہ کرنے کے بعد ثابت کیا ہے کہ بعض الفاظ لکھنے کی جو نسبت حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف کی گئی ہے، یہ ''اسناد مجازی'' ہے اور اس کی مثالیں نہ صرف قرآن میں موجود ہیں بلکہ دنیا کی ہر زبان میں اس کی مثالیں ملاحظہ کی جا سکتی ہیں۔ روزمرہ کی زبان، عرف اور محاورے کی پہچان فہم کلام کے لیے کس قدر ضروری ہے، اس کی وضاحت کرتے ہوئے حضرت شیخؒ لکھتے ہیں:

''عرف عام میں بھی کہا جاتا ہے کہ فلاں مسجد فلاں بادشاہ نے بنائی ہے اور فلاں قلعہ اور فلاں عمارت فلاں بادشاہ کی تعمیر کردہ ہے۔ کیا اس کا یہ مطلب لیا جایا ہے کہ بادشاہ نے خود اینٹ اور پتھر سیمنٹ اور کیچڑ سر پر اٹھا کر اس کو تعمیر کیا ہے؟ سب لوگ بادنیٰ غور سمجھ جاتے ہیں کہ بادشاہ کے حکم سے کاریگروں اور مزدوروں نے مسجد اور قلعہ وغیرہ تعمیر کیے ہیں۔ یا مثلاً کہا جاتا ہے کہ فلاں جرنیل نے فوج کو پسپا کر دیا ہے۔ سب لوگ جانتے ہیں کہ یہ اسناد مجازی ہے۔ درحقیقت فوج کو شکست دینے والے اس کے سپاہی اور ماتحت فوجی ہوتے ہیں اور کوئی بھی ان مثالوں میں بادشاہ اور جرنیل وغیرہ کی طرف اسناد کو غلط اور باطل نہیں قرار دیتا، لیکن برق صاحب کی منطق نرالی اور تحقیق ہی عجیب ہوتی ہے کہ ان کے نزدیک قرآن وحدیث اور عرف عام کوئی چیز قابل قبول نہیں۔ ہاں البتہ ان کے دماغ میں کوئی چیز آ جائے تو وہ محکم اور اٹل ہو جاتی ہے، خواہ اس کے خلاف براہین اور دلائل کا ایک انبار بھی کیوں نہ موجود ہو۔'' (صرف ایک اسلام، ص: ۶۸)

۳۔ کسی موضوع کی ایک روایت کو لے کر رائے قائم کرنا بھی درست نہیں ہے، بلکہ اس موضوع کی مختلف روایات کا مجموعی مطالعہ کرنے کے بعد رائے قائم کی جائے تو امید ہے کہ بہت سی غلط فہمیاں اور اشکالات پیدا ہی نہیں ہوں گے۔ مثلاً برق صاحب نے وضو کے فضائل کی ان روایات پر تنقید کی ہے جن میں ذکر ہے کہ جب کوئی انسان وضو کرتا ہے تو اس کے سب گناہ دھل جاتے ہیں۔ موصوف کہتے ہیں کہ یہ بات میری سمجھ سے بالاتر ہے کہ جب سب گناہ وضو ہی سے معاف ہو جاتے ہیں تو پھر حضور صلی اللہ علیہ وسلم اور خلفائے راشدین مسلمانوں پر زنا، سرقہ اور شراب نوشی وغیرہ کی حد کیوں جاری کرتے رہے؟ (دو اسلام، ص: ۲۸۷، ۲۸۸) برق صاحب کی نافہمی کی بڑی وجہ یہ ہے کہ انھوں نے اس موضوع کی دیگر

روایات کو قابل اعتنا نہیں سمجھا۔ اگر وہ اس موضوع کی دیگر روایات کا بھی مطالعہ کرتے اور مجموعی تأثر کی بنیاد پر نتائج اخذ کرتے تو اس کج فہمی کا شکار نہ ہوتے۔ مولانا صاحبؒ نے ڈاکٹر صاحب کے اعتراض کا تنقیدی جائزہ لیتے ہوئے اسی اصول کی طرف اِن الفاظ میں اشارہ کیا ہے:

''برق صاحب اگر ذرا سی تکلیف گوارا فرما کر صحیح مسلم وغیرہ کی روایت کا یہ ٹکڑا بھی ملاحظہ فرما لیتے تو ان کو بلاضرورت حاشیہ آرائی کی ہرگز ضرورت نہ پڑتی اور بیک نگاہ حقیقت ان کے سامنے آجاتی: ''کفارۃ لما قبلھا من الذنوب مالم یأت کبیرۃ'' (مسلم ۱/۱۲۱) کہ وضو وغیرہ سے ماقبل کی زندگی کے تمام گناہ معاف ہو جاتے ہیں بشرطیکہ کوئی گناہِ کبیرہ سرزد نہ ہوا ہو۔'' (صرف ایک اسلام، ص: ۷۸)

۴۔ محدثین کا اصول یہ ہے کہ وہ حدیث کی صحت کا التزام کرنے کے بعد بسا اوقات ناسخ ومنسوخ اور اسی نوع کی دیگر روایات کسی واضح تعین کے بغیر ذکر کر دیتے ہیں۔ ناسخ ومنسوخ کی پہچان سے عاری سطح بین قاری ایسی روایات سے غلط فہمی میں مبتلا ہو سکتا ہے۔ مثلاً بخاری کی روایت ہے کہ زید بن خالدؓ نے حضرت عثمانؓ سے دریافت کیا کہ اگر کوئی شخص مجامعت کرے، لیکن انزال سے پہلے علیحدہ ہو جائے تو اس کے متعلق کیا حکم ہے؟ فرمایا کہ شرمگاہ کو دھو ڈالے اور وضو کر لے۔ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ایسا ہی سنا تھا۔ علیؓ، زبیرؓ، طلحہؓ اور ابیؓ کی رائے بھی یہی ہے۔ جبکہ موطأ اور مسلم کی روایات میں ہے کہ فقط دخول سے غسل لازم ہو جاتا ہے۔ برق صاحب نے ان متضاد روایات پر طنزیہ انداز میں شدید تنقید کی ہے۔ (ملاحظہ ہو، دو اسلام، ص: ۲۳۱) ظاہر ہے کہ برق صاحب کو جو اشکال ہوا ہے، اس کی بنیادی وجہ ناسخ ومنسوخ روایات کی عدم پہچان ہے۔ مولانا صاحبؒ نے اصول نسخ کی روشنی میں برق صاحب کے اعتراض کا جائزہ لے کر واضح کیا ہے کہ ابتدائے اسلام میں بلاشک یہ حکم تھا کہ جماع میں انزال کے بغیر غسل واجب نہیں، لیکن بعد میں یہ حکم بالکل منسوخ ہو گیا تھا اور جو صحابہ نسخ کے حکم سے واقف نہ تھے، وہ سابق حکم پر فتویٰ دیتے رہے، لیکن بالآخر تمام صحابہ کا اس پر اجماع ہو گیا کہ مجامعت سے غسل لازم ہو جاتا ہے، چاہے انزال نہ بھی ہو۔ (ملاحظہ ہو: صرف ایک اسلام، ص: ۱۰۴۔۱۰۷)

برق صاحب کو یہی اشکال صحیح مسلم کی ان روایات میں بھی ہوا ہے جن میں سے ایک روایت میں تو آگ کی پکی ہوئی چیز کے کھانے سے نئے وضو کا حکم مروی ہے جبکہ دوسری روایت میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا عمل اس کے برعکس ثابت ہے۔ (دو اسلام، ص: ۲۴۳) مولانا نے برق صاحب کے اشکال کا جائزہ اصول نسخ کی روشنی میں لیا ہے اور بجا طور پر لکھا ہے:

''برق صاحب کو اگر ناسخ اور منسوخ کا علم نہیں تو یہ ان کی لاعلمی ہے۔ ان کو مناسب تھا کہ پہلے کسی محدث اور عالم دین سے دریافت کر لیتے، اور اگر دیدہ ودانستہ انہوں نے ناسخ اور منسوخ میں تعارض پیدا کر کے لوگوں کو دھوکا دیا ہے تو یہ ان کی کھلی خیانت ہے۔ ممکن ہے کہ ان کے نزدیک یہ ہنر اور قابلیت تصور ہوتی ہو، ورنہ وہ بار بار اس کا ارتکاب ہرگز نہ کرتے۔'' (صرف ایک اسلام، ص: ۱۰۹)

۵۔ جس طرح بعض آیات کا صحیح مفہوم اس وقت تک سمجھنا ممکن نہیں ہوتا جب تک ان آیات کے سببِ نزول اور پس منظر سے مکمل واقفیت نہ ہو، بالکل اسی طرح بسا اوقات روایت میں کسی ایسے حکم کا بیان ہوتا ہے جس کا کوئی خاص سبب اور حکمت ہوتی ہے۔ اگر اس سبب اور حکمت کی کھوج نہ لگائی جائے تو کئی غلط فہمیاں پیدا ہو جاتی ہیں۔ مثلاً مسلم کی روایت ہے

کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ: ''مجھ سے مت لکھو اور جس نے قرآن کے سوا اور چیز لکھی ہو، وہ مٹا دے۔'' برق صاحب نے اس روایت سے عجیب وغریب قسم کے نتائج اخذ کیے اور یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں ہی آپ کے اقوال محرف ہو چکے تھے، اس لیے آپ نے انھیں لکھنے کی ممانعت کر دی۔ (ملاحظہ ہو، دو اسلام، ص ۵۵) اب جو شخص بھی برق صاحب کی طرح اس حکم کے سبب اور علت کو نظر انداز کرے گا، اس کا پریشان ہونا یقینی ہے اور لامحالہ اس کے ذہن میں وہ تمام اشکالات پیدا ہوں گے جن کا شکار موصوف ہوئے ہیں۔ حضرت شیخؒ نے اس حکم کی علت اور اس روایت کا پس منظر بیان کرنے کے بعد اس روایت کا مفہوم بیان کیا ہے اور اپنی تنقید سے واضح کیا ہے کہ روایات کے پس منظر سے لاعلمی اسی طرح کے خطرناک نتائج پیدا کرتی ہے۔ (ملاحظہ ہو: صرف ایک اسلام، ص: ۱۸۶۔۱۹۱)

خلاصہ کلام یہ کہ فہم حدیث کے لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے فرامین کے پس منظر اور اسباب ووجوہات سے مکمل واقفیت بھی ضروری ہے، ورنہ اسلام کے بہت سارے احکامات جن کا تعلق خاص حالات، مخصوص افراد، ناسخ ومنسوخ یا اصول تدریج کے ساتھ ہے، ان کی تفہیم میں غلطی کا امکان موجود ہے۔

۶۔ عام بول چال کی زبان اور خالص علمی زبان میں جو فرق ہے، اہل علم اس سے اچھی طرح آگاہ ہیں، اس لیے کسی بھی زبان میں مہارت حاصل کرنے کے لیے زبان دانی کے بنیادی اصولوں سے واقفیت ضروری ہے۔ قرآن وحدیث اور عربی زبان کی دیگر بنیادی کتابوں سے اخذ واستفادہ کے لیے علم صرف ونحو میں مہارت بنیادی پتھر کی حیثیت رکھتی ہے اور جو شخص بھی ان علوم میں کمال حاصل کیے بغیر عربی زبان میں مہارت کا دعویٰ کرے، اس کا یہ دعویٰ مشکوک ہے۔

برق صاحب کے بعض اعتراضات ایسے ہیں جن سے واضح ہوتا ہے کہ ان کو علم صرف کے بعض بنیادی قواعد تک کا بھی علم نہیں ہے اور موصوف چونکہ مختلف ابواب کی خاصیات سے ناواقف ہیں، اس لیے عربی عبارات کا درست ترجمہ کرنے کی صلاحیت سے بھی عاری ہیں۔ مثلاً برق صاحب بخاری میں درج ختنۂ ابراہیم والی روایت کے فہم میں ابواب کی خاصیات سے عدم واقفیت کی وجہ سے غلطی کے مرتکب ہوئے ہیں۔ موصوف کہتے ہیں کہ:

''ابوہریرہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے راوی ہیں کہ حضرت ابراہیمؑ کا ختنہ اسی (۸۰) برس کی عمر میں ہوا تھا۔ راوی نے یہ نہ بتایا کہ پورے اسی سال تک اس مبارک کام میں کون سی رکاوٹ حائل رہی جو وفات سے عین پہلے دور ہوئی اور آپ باآں ضعف وپیری حجام کے سامنے جا بیٹھے۔'' (دو اسلام، ص: ۳۳۸)

شیخ الحدیث مولانا سرفراز خان صفدرؒ برق صاحب کی عربی دانی کا پردہ چاک کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''عربی کا ادنیٰ طالب علم بھی اس بات کو بخوبی جانتا ہے کہ ''اختتن'' باب افتعال سے فعل ماضی ہے جو لازمی اور متعدی دونوں طرح مستعمل ہے اور جس کے معنی خود اپنا ختنہ کرنے کے بھی ہیں، نہ کہ حجام کے سامنے جا بیٹھنے اور اس سے ختنہ کروانے کے، جیسا کہ برق صاحب نے سمجھا ہے۔'' (صرف ایک اسلام، ص: ۶۹۔۷۰)

برق صاحب اپنی افتادِ طبع کے عین مطابق ایک دوسرے مقام پر حدیث سنت پر طعن وتشنیع کے تیروں کی بوچھاڑ کرتے ہوئے رقم طراز ہیں:

''سوال یہ ہے کہ آیا وضو میں ہاتھ منہ اور پاؤں کو ایک مرتبہ دھونا چاہیے یا زیادہ۔ حدیث کا فیصلہ ملاحظہ ہو:

۱۔ حضور ایک مرتبہ دھوتے تھے: عن ابن عباسؓ قال توضأ النبی صلی اللہ علیہ وسلم مرۃ مرۃ۔ ابن عباسؓ کہتے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم وضو میں اعضا کو ایک ایک مرتبہ دھوتے تھے۔

۲۔ دو دو مرتبہ دھوتے تھے: عن عبد اللہ بن زیدؓ ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم توضأ مرتین مرتین۔ عبد اللہؓ بن زید کہتے ہیں کہ حضور وضو میں اعضا کو دو دو مرتبہ دھوتے تھے۔

۳۔ تین تین مرتبہ دھوتے تھے: حضرت عثمانؓ بن عفان فرماتے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم تین مرتبہ اعضا کو دھوتے تھے۔'' (دو اسلام، ص: ۲۳۴۔۲۳۵)

مولانا سرفراز صاحبؒ عربی گریمر کی رو سے برق صاحب کی غلطی کو واضح کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''برق صاحب کو مناسب تھا کہ اس تحقیق انیق سے قبل عربی کے کسی مبتدی طالب علم سے یہ پوچھ لیتے کہ ''توضأ'' ماضی مطلق ہے یا ماضی استمراری؟ اگر وہ یہ بتلا دیتا کہ یہ ماضی استمراری کا صیغہ ہے تو اس کا معنی ''دھوتے تھے'' بجا تھا اور اگر وہ یہ بتاتا کہ ''توضأ'' باب تفعل کی ماضی مطلق ہے اور صرف ایک مرتبہ فعل کرنے سے ماضی مطلق کا مفہوم متحقق ہو جاتا ہے اور اس میں بار بار کرنے کا مفہوم شامل نہیں ہے تو برق صاحب کو چاہیے کہ وہ ''توضأ'' کا معنی یوں کرتے: آپ نے وضو کیا۔ (توضأ) نہ کہ یہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم وضو کرتے تھے یا دھوتے تھے، کیونکہ اس سے بار بار کرنے کا مفہوم ادا ہوتا ہے جو ماضی استمراری کا مفاد ہے۔ مثلاً ''أکل'' ماضی مطلق ہے۔ اس کا معنی ہے اس نے کھایا۔ اس کا یہ معنی کرنا کہ کھایا کرتا تھا یا کھاتا تھا، باطل ہے کیونکہ یہ ''کان یأکل'' کا معنی ہے جو ماضی استمراری ہے۔'' (ملاحظہ ہو: صرف ایک اسلام، ص: ۶۹۔۸۷)

پھر حضرت شیخ الحدیثؒ نے عمل رسول صلی اللہ علیہ وسلم میں تفاوت کی جو خوبصورت توجیہ کی ہے، وہ بھی ملاحظہ فرمائیں:

''اصل بات یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بحیثیت رسالت امت دیگر امور کی طرح وضو کرنے کا عملی سبق بھی مختلف اوقات میں دیا ہے۔ کسی موقع پر آپ نے صرف ایک ایک مرتبہ اعضا دھو کر وضو کا طریقہ بتلایا تا کہ اگر کہیں زیادہ پانی میسر نہ ہو سکے یا بیماری وغیرہ کسی اور شرعی عذر کی وجہ سے ایک سے زیادہ مرتبہ اعضا کا دھونا مشکل ہو تو ایسی صورت میں ایک ہی مرتبہ اعضا دھونے سے وضو مکمل ہو جائے گا اور یہ قدر وضو میں فرض ہے جو نفس جواز کا درجہ ہے۔ اور کسی موقع پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے دو دو مرتبہ وضو کر کے فرمایا کہ یہ نور علیٰ نور اور بین بین و متوسط درجہ ہے جس سے طہارت اور نظافت بخوبی حاصل ہو سکتی ہے۔ اور اکثر مواقع پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے تین تین مرتبہ وضو کر کے سب سے اعلیٰ اور اکمل طریقہ بتلا دیا تا کہ اس میں فرض سنت اور مستحب وغیرہ سبھی امور آ جائیں اور یہ تکمیل اور محبوبیت کا انتہائی درجہ ہے۔ اس کے بعد مزید پانی استعمال کرنا اسراف اور تعدی میں شامل ہے جیسا کہ ایک حدیث میں اس کی تصریح موجود ہے۔ اتنی سی بات تھی جو برق صاحب پر معما بن گئی اور الٹا حدیث پر اعتراض شروع کر دیا۔'' (صرف ایک اسلام، ص: ۸۸)

مندرجہ بالا گفتگو کا حاصل یہ ہے کہ عربی زبان کے بنیادی قواعد اور علم صرف ونحو سے مکمل واقفیت کے بغیر قرآن وحدیث کے فہم میں غلطی کا امکان بہرحال رہتا ہے، اس لیے علوم اسلامیہ کے طالب علم کے لیے عربی زبان میں رسوخ ضروری ہے

ورنہ اس کو بیسیوں مقامات پر اشکال پیش آ سکتا ہے۔

۷۔ عربی زبان کے مختلف الفاظ کے معانی میں جو تنوع اور وسعت ہے، مترجم کے لیے ان کا جاننا ضروری ہے اور اس میں یہ صلاحیت بھی ہونی چاہیے کہ وہ ان میں سے سیاق وسباق کے اعتبار سے موزوں معنی کا انتخاب کر سکے۔ حضرت شیخ الحدیثؒ نے برق صاحب کی اس طرح کی غلطیوں پر بھی گرفت کی ہے۔ مثلاً بخاری کی ایک حدیث میں حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں:

"کنت بین یدی رسول اللہ ورجل فی قبلتہ فاذا سجد غمزنی قبضت رجلی فاذا قام بسطہا والبیوت لیس فیہا مصابیح"۔ میں نماز میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے پاؤں ان کی طرف پھیلا کر لیٹ جاتی تھی۔ جب وہ سجدہ کرنے لگتے تو مجھے آنکھ سے اشارہ کر دیتے، چنانچہ میں پاؤں سمیٹ لیتی اور جب وہ اٹھتے تو پھر پھیلا دیتی اور گھر میں چراغ موجود نہیں تھا (یعنی بالکل اندھیرا تھا)۔ برق صاحب اس پر اعتراض کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ ''یہ اندھیرے میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اشارہ ابرو کو دیکھ لینا حضرت عائشہ ہی کا کمال ہو سکتا ہے۔'' (دو اسلام ص: ۲۴۷)

حضرت شیخ الحدیثؒ نے برق صاحب کی حدیث فہمی کی صلاحیت اور ان کے علمی قد کاٹھ کا جو بھانڈا بیچ چوراہے پھوڑا ہے، وہ ملاحظہ فرمائیں:

''حضرت عائشہؓ کا کمال تھا یا نہ تھا، یہ بات تو اپنی جگہ پر رہے گی مگر برق صاحب نے تو کمال کر ہی دکھایا ہے۔ ہم مقدمہ میں عرض کر چکے کہ وہ تمام الفاظ کو ایک ہی لاٹھی سے ہانکنے کے عادی ہیں۔ جہاں ''غمز'' آنکھ سے اشارہ کرنے کے لیے آتا ہے، وہاں یہ بھی لکھا ہے: ''واصل الغمز العصر غمز'' کے اصلی معنی ہاتھ سے دبانے اور نچوڑنے کے ہیں۔ اور مجمع البحار ج ۳ ص: ۳۸ میں ہے: ''الغمز العصر والکبس بالید'' اور منجد ص: ۵۸۸ میں لکھا ہے: ''غمزہ غمزا جسّہ و کبسہ بالید'' یعنی غمز کے معنی ہاتھ سے کسی چیز کو ٹٹولنے اور دبانے کے آتے ہیں۔ اور صراح ص: ۲۲۶ میں لکھا ہے کہ ''دست نہادن بر دنبہ و پہلوئے گوسپند تا فربہی ولاغری معلوم شود۔'' برق صاحب ہی فرمائیں کہ ہاتھ کے ساتھ ٹٹولنے اور دبانے سے باخبر اور بیدار ہونے کی خوبی اور کمال کیا صرف حضرت عائشہؓ کے ساتھ مخصوص ہے یا کسی اور میں بھی اس کا تحقق ہو سکتا ہے۔''

(صرف ایک اسلام، ص: ۸۱)

ایک دوسرے مقام پر برق صاحب نے ''مباشرۃ فی الحیض'' کی سرخی جما کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نجی زندگی سے متعلق روایات کا خوب مذاق اڑایا ہے۔ (ملاحظہ ہو، دو اسلام، ص: ۲۲۲) حالانکہ یہاں بھی موصوف کے فہم حدیث کا مشاہدہ کرنے کے بعد سلیم الفطرت انسان انگشت بدنداں رہ جاتا ہے کہ وہ روایات جو بجا طور پر شواہدِ نبوت میں شمار کرنے کے قابل ہیں، ڈاکٹر صاحب ان پر تنقید کر رہے ہیں اور پھر تنقید بھی ایسی جو سادہ ترین الفاظ میں سراسر جہالت پر مبنی ہے۔ حضرت شیخؒ نے لغت کی معروف کتب کی روشنی میں واضح کیا ہے کہ اگرچہ مباشرت کا معنی مجامعت بھی ہے، تاہم ان روایات میں مباشرت سے مراد مرد وزن کے جسم کا باہم چھو جانا ہے اور روزے اور حیض کی حالت میں بھی اس طرح کی مباشرت جائز ہے، اور برق صاحب کی کج فہمی کی بڑی وجہ یہ ہے کہ انھوں نے مباشرت کو مجامعت کے معنی میں لیا ہے۔ (تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو، صرف ایک اسلام، ص: ۱۷۷۔۱۸۱)

حضرت شیخؒ کی تنقید کا حاصل یہ ہے کہ مندرجہ بالا دونوں مقامات پر برق صاحب کی نافہمی کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ ایک طرف تو وہ عربی زبان کے الفاظ میں معانی کی جو وسعت اور تنوع ہے، اس کا درست ادراک نہیں کر سکے اور دوسری طرف وہ سیاق وسباق کے اعتبار سے موزوں معنی کا انتخاب کرنے میں بھی ناکام رہے ہیں، حالانکہ کسی بھی کلام کے درست فہم کے لیے اور خاص طور پر کسی اجنبی زبان کے مترجم کے لیے اس صلاحیت کا ہونا از حد ضروری ہے۔

مولانا سرفراز خان صفدرؒ نے ڈاکٹر غلام جیلانی برق کی کتاب ''دو اسلام'' کا جو تنقیدی جائزہ لیا ہے، اس سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ اگر یہ تسلیم بھی کر لیا جائے کہ موصوف کے اعتراضات بد نیتی پر مبنی نہیں ہیں، تب بھی ان تمام اشکالات کا سبب جہالت ہے اور برق صاحب کی کج فہمی کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ موصوف نہ صرف مطالعہ حدیث کے بنیادی اصولوں سے نابلد ہیں بلکہ وہ زبان دانی کے لیے عرفِ عام، محاوراتِ عرب، صرف ونحو کی اہمیت سے بھی پوری طرح واقف نہیں ہیں۔

منکرین حدیث نے حدیث وسنت کے جس پہلو پر سب سے زیادہ تنقید کی ہے، وہ حدیث کی جمع وتدوین اور تشریعی مقام ومرتبہ ہے۔ شیخ الحدیث مولانا سرفراز خان صفدرؒ نے اپنی کتاب ''شوق حدیث'' میں منکرین حدیث کے اس نوعیت کے تمام اعتراضات کا تنقیدی جائزہ لیا ہے۔ حجیت حدیث کے موضوع پر برصغیر کے اہل علم نے بلا مبالغہ سینکڑوں کتب تصنیف کی ہیں، ان میں زیر نظر کتاب دو حوالوں سے منفرد مقام کی حامل ہے۔ ایک تو اس وجہ سے کہ یہ ان اولین کتابوں میں سے ہے جو فتنہ انکار حدیث کے رد میں لکھی گئیں۔ حضرت شیخؒ نے اس کتاب کی تصنیف کا آغاز ۱۹۵۰ء میں فرمایا تاہم دیگر تصنیفی مصروفیات کی وجہ سے اس کی تکمیل ۱۹۷۰ء میں ہوئی۔ اس کتاب کی ایک دوسری خصوصیت جو اسے دیگر کتب سے ممتاز کرتی ہے، یہ ہے کہ اس کتاب میں منکرین حدیث کے تقریباً تمام اہم اعتراضات کا محققانہ تجزیہ کیا گیا ہے اور تمام متعلقہ موضوعات پر مستند حوالہ جات کی صورت میں اس قدر مواد جمع کر دیا گیا ہے کہ تنہا اس کتاب کا مطالعہ قاری کو کئی کتابوں سے بے نیاز کر دیتا ہے۔ مصنف نے بجا طور پر کتاب کے پیش لفظ میں لکھا ہے:

''یہ بات تو ناممکن ہے کہ یہ دعویٰ کیا جا سکے کہ یہ کتاب اس موضوع پر حرف آخر ہے کیونکہ انسان کے کام اور خصوصاً اس حقیر پر تقصیر کے کام کے متعلق ایسا خیال کسی طرح بھی زیب نہیں دیتا اور نہ درست ہو سکتا ہے، مگر بفضلہ تعالیٰ بلا خوف لومۃ لائم یہ کہنا بجا ہوگا کہ اتنی مختصر کتاب میں ایسے ایک جا اور باحوالہ معلومات قارئین کرام کو کہیں میسر نہیں ہو سکیں گی۔'' (شوق حدیث، ص:۱۰)

منکرین حدیث کا طریقہ واردات یہ ہے کہ وہ عام لوگوں کو یہ دھوکہ دینے کی کوشش کرتے ہیں کہ صحابہ کرامؓ اور قرن اول کے مسلمانوں کو حدیث وسنت سے کوئی خاص مناسبت نہ تھی، یہی وجہ ہے کہ صحابہ کرامؓ اور اکابرین امت نے حدیث وسنت کی حفاظت کا کوئی اہتمام نہیں کیا اور اکابرین امت کی نظر میں حدیث وسنت محض زبانی یادداشتوں کا ایک ریکارڈ ہے جس کی کوئی دینی حیثیت نہیں ہے۔ غور کیا جائے تو صاف معلوم ہوتا ہے کہ منکرین حدیث کا فکری سرچشمہ مستشرقین کی کتابیں ہیں۔ منکرین حدیث کے اکثر اعتراضات مستشرق گولڈ زیہر کی کتاب "Muslim Studies" اور جوزف شاخت کی کتاب "The origins of Muhammadan Jurisprudence" سے ماخوذ ہیں۔ مولانا صفدرؒ کی محولہ بالا کتاب اگرچہ منکرین حدیث کے نقطہ نظر کا جواب ہے، تاہم اس میں فن حدیث پر مستشرقین کے اعتراضات کا جواب بھی آ گیا ہے۔

فاضل مصنف نے ''شوق حدیث'' کے پہلے باب میں حدیث کی حجیت پر دلائل دیے ہیں، جبکہ اگلے آٹھ ابواب میں حفاظت حدیث کی ان کوششوں کا تفصیلی ذکر کیا ہے جس کا اہتمام نہ صرف صحابہ کرامؓ نے کیا بلکہ بعد کے دور میں محدثین نے بھی حفظ حدیث کو اپنی زندگیوں کے سب سے پسندیدہ مشغلے کے طور پر اپنائے رکھا۔ اس موضوع پر جس قدر مواد مکمل حوالہ جات کے ساتھ اس کتاب میں جمع کر دیا گیا ہے، اس کی کوئی دوسری مثال اردو ادب میں کم از کم راقم الحروف کی نظر سے نہیں گزری۔ (تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو: ۱۱۔۶۵) مولانا صاحبؒ نے کتاب کے باب نمبر ۱۰ تا ۱۲ میں طلب حدیث کے لیے محدثین کے محیر العقول اسفار کا ذکر کیا ہے۔ نیز تفصیلی دلائل سے واضح کیا ہے کہ محدثین صرف ان حدیثوں کی روایات پر اکتفا نہیں کرتے تھے بلکہ وہ ان پر پوری طرح عمل پیرا بھی تھے۔ (ملاحظہ ہو: ص: ۴۷-۱۰۹)

کتاب کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ مصنف کی نظر میں قرن اول میں بجا طور حفظِ حدیث ہی حدیث وسنت کی حفاظت کا سب سے محفوظ طریقہ تھا، اور یہ طریقہ عربوں کی اس فطرت کے عین مطابق تھا جس کے لیے قدرت نے صدیوں تک اس قوم کو تیار کیا تھا۔ تاہم اس کا یہ مطلب نہیں کہ قرن اول میں حدیث وسنت کو تحریری شکل میں محفوظ نہیں کیا گیا۔ مصنف علیہ الرحمہ نے کتاب کے باب نمبر ۱۳ میں کتابتِ حدیث کے تفصیلی دلائل فراہم کیے ہیں (ملاحظہ ہو ص: ۱۱۱-۱۳۳) اور پھر چودھویں باب میں ان پینسٹھ علوم میں سے بعض کا تعارف کروایا ہے جو محدثین نے سند اور متن کی حفاظت کے لیے ایجاد کیے ہیں۔ (ملاحظہ ہو ص: ۱۳۳-۱۴۳)

کتاب کے پہلے چودہ ابواب میں اگرچہ منکرین حدیث کے تمام بنیادی اعتراضات کا جواب موجود ہے، تاہم مصنف نے کتاب کے پندرہویں باب میں منکرین حدیث کے سولہ اعتراضات ذکر کیے ہیں اور پھر پوری جامعیت کے ساتھ ان اعتراضات کا جائزہ لیا ہے۔ ہماری نظر میں کتاب کا آخری باب خاص طور پر قابل مطالعہ ہے۔ (ملاحظہ ہو ص: ۱۴۵-۱۸۴)

مولانا صفدرؒ نے اپنی گرانقدر تصانیف ''صرف ایک اسلام'' اور ''شوق حدیث'' میں جہاں منکرین حدیث کے گمراہ کن نظریات کا جائزہ لے کر نئی نسل کو فکری ارتداد سے بچانے کی سعی مشکور فرمائی ہے، وہاں اللہ تعالیٰ نے آپؒ سے ایک بڑی اہم خدمت یہ لی ہے کہ آپ نے اپنی تصنیف لطیف ''انکار حدیث کے نتائج'' میں انکارِ سنت کی تحریک کے تمام سرکردہ حضرات، جن میں عبد اللہ چکڑالوی، حافظ اسلم جیراج پوری، نیاز فتح پوری، ڈاکٹر احمد دین، ڈاکٹر غلام جیلانی برق، علامہ عنایت اللہ مشرقی اور غلام احمد پرویز شامل ہیں، کے افکار کو اس اسلوب میں اربابِ دانش کی عدالت میں پیش کیا ہے جن سے کسی بھی سلیم الفطرت انسان کے لیے یہ سمجھنا مشکل نہیں رہتا کہ ان نظریات کو قبول کرنے کا صاف مطلب اسلام سے دست برداری ہے۔

الحاصل حضرت شیخ الحدیثؒ نے حدیث وسنت کے دفاع میں اپنی مایہ ناز تصانیف میں جس عرق ریزی اور محنتِ شاقہ کے بعد اپنے نتائج فکر امت کے سامنے رکھے ہیں، اس پر امت ہمیشہ ان کی احسان مند رہے گی اور حقیقت یہ ہے کہ آپ کے نتائج فکر علم وحکمت کے ایسے انمول موتی اور جواہرات پارے ہیں جن سے آنے والی نسلیں فیض یاب ہوتی رہیں گی۔

ڈاکٹر محمد عبداللہ *

منکرینِ حدیث کے شبہات کے جواب میں مولانا صفدر رحمہ اللہ کا اسلوبِ استدلال

مولانا محمد سرفراز خان صفدرؒ (۱۹۱۴ء-۲۰۰۹ء) بلاشبہ اس دور میں اللہ تعالیٰ کی نشانیوں میں سے تھے۔(۱) زہد وتقویٰ، رسوخ فی العلم، اصابتِ فکر اور طرز استدلال میں ان کی مثال ملنا مشکل تھی۔ بالخصوص علم حدیث کے فنی پہلوؤں جیسے اسماء الرجال، جرح وتعدیل، اصولِ حدیث حجیت حدیث پر جس طرح ان کی گہری نظر اور فقیہانہ بصیرت تھی، اس سے قرونِ اولیٰ کے محدثین کی یاد تازہ ہو جاتی ہے۔ تدریس حدیث میں جو ملکہ اور استحضار اللہ تعالیٰ نے انہیں عطا فرمایا تھا، وہ بہت کم علما کے حصے میں آیا ہے۔ عام طور پر یہ دیکھنے میں یہ آیا ہے کہ مدارس دینیہ میں تدریسی فرائض سرانجام دینے والے علما تصنیف وتالیف کی طرف بہت ہی کم توجہ دیتے ہیں، لیکن مولانا سرفراز خان صفدرؒ نے بھرپور تدریسی فرائض اور دیگر علمی وخانگی مشاغل کے ساتھ جس طرح تصنیف وتالیف کی طرف توجہ دی ہے، وہ اپنی مثال آپ ہے۔ آپ کی چھوٹی بڑی تصانیف کی تعداد پچاس کے قریب ہے۔ نیز تصنیف میں انہوں نے جو انداز واسلوب اپنایا ہے، وہ تحقیقی اور عقلی بھی ہے اور ادبی چاشنی کا حامل بھی۔(۲)

اگر اس پس منظر پر نظر ڈالی جائے جس میں مولانا سرفراز خان صفدرؒ نے تحصیل علم کی اور جن اساتذہ کرام سے فیض پایا اور بالخصوص جس زمانہ اور علاقہ میں آپ نے عمر بسر کی، اس کو دیکھا جائے تو آپ کی خدمات دوچند نظر آتی ہیں۔ اس لحاظ سے خدمات کے کئی پہلو ہیں جن میں سے ایک پہلو بطور متکلم کا بھی ہے۔ ایک متکلم کا کام یہ ہے کہ اسلام کے جن پہلوؤں پر مخالفین، منکرین اور متشککین کی طرف سے اعتراضات اٹھتے ہیں، وہ ان کا جواب دیتا ہے، جیسا کہ شیخ الاسلام امام ابن تیمیہ نے کیا۔ انہوں نے فلاسفہ، ملاحدہ، مناطقہ، خوارج، معتزلہ، یہود ونصاریٰ کے علاوہ اہل تشیع کی طرف سے اسلام کے مسلمہ عقائد وتعلیمات پر اعتراضات کے جواب میں اسلام کا دفاع کیا۔(۳)

مولانا سرفراز خان صفدرؒ نے جن حالات میں آنکھ کھولی، ان میں من جملہ دیگر خرافات وبدعات کے حدیث کے مقام وحجیت کے بارے میں شکوک وشبہات زبان زدِ عام تھے۔ ایک منظم گروہ تعلیم یافتہ افراد اور سادہ لوح مسلمانوں کو خوش کن الفاظ کے ساتھ گمراہ کر رہا تھا اور دلیل یہ دے رہا تھا کہ دراصل قرآن ہی ہدایت کا سرچشمہ ہے اور مسلمانوں کو ایک لڑی میں پرونے کا واحد ذریعہ ہے۔ حدیث میں شکوک وشبہات پیدا کرنے کا سلسلہ نیا نہیں ہے بلکہ اولین طور پر معتزلہ اور خوارج نے ان بحثوں کو چھیڑا، تاہم صدرِ اوّل میں محدثین کرام نے اپنی مساعی جمیلہ سے ان سازشوں کا بھرپور مقابلہ کیا اور امت مسلمہ

---

* ایسوسی ایٹ پروفیسر، شیخ زاید اسلامک سنٹر، پنجاب یونی ورسٹی لاہور۔

میں حدیث کی مسلمہ حیثیت ہر دور میں موجود رہی۔ برصغیر پاک وہند میں جن لوگوں نے حدیث کی اجماعی حیثیت سے انکار کیا اور ان میں شکوک وشبہات پیدا کیے، ان میں علامہ تمنا عمادی، مولانا محمد اسلم جیراج پوری، عبداللہ چکڑالوی، ڈاکٹر احمد الدین امرتسری، غلام احمد پرویز اور غلام جیلانی برق شامل ہیں۔ آخر الذکر نے ''دو اسلام'' کے نام سے ایک کتاب بھی لکھی جس کا جواب مولانا سرفراز احمد صفدرؒ نے ''صرف ایک اسلام'' کے نام سے لکھا۔ تاہم اللہ تعالیٰ نے آخری عمر میں ہدایت دی اور منکرینِ حدیث کے اس گروہ سے نکل گئے اور اپنے سابقہ افکار وخیالات سے کھلے عام برأت کا اعلان کر دیا۔

بیسویں صدی کے نصف میں حدیثِ نبویؐ کے حوالے سے مذکورہ افراد کی بحثیں زبان زدِ عام تھیں۔ وہ اپنی تحریروں میں اپنے افکار وخیالات کا اظہار کر رہے تھے۔ اہل علم بالخصوص علما آستین کا سانپ بنے اس گروہ سے غافل نہ تھے۔ انہوں نے اپنے اپنے انداز سے ان کے استدلال کا پوری طرح جواب دیا۔ ان میں مولانا مناظر احسن گیلانی (تاریخ تدوینِ حدیث)، سید منت اللہ رحمانی (کتابتِ حدیث)، سید ابو الاعلیٰ مودودیؒ (سنت کی آئینی حیثیت)، ڈاکٹر خالد علویؒ (حفاظتِ حدیث)، پیر محمد کرم شاہ الازہریؒ (سنت خیر الانام) قابل ذکر ہیں۔ مولانا سرفراز خان صفدرؒ نے اس باب میں ''انکارِ حدیث کے نتائج''، ''شوقِ حدیث''، ''مقامِ ابی حنیفہ'' تالیف فرمائیں۔ ان کتب میں اپنے انداز اور اسلوب میں حدیث میں شکوک وشبہات پیدا کرنے والوں کا تعاقب کیا گیا ہے۔

ذیل کی سطور میں ہم مولانا سرفراز خان صفدرؒ کے اس استدلال کا جائزہ پیش کرتے ہیں جو آپ نے منکرینِ حدیث کے اعتراضات کے ضمن میں اختیار کیا ہے، اور شکوک وشبہات کے ازالہ میں اپنی کتب میں تحریر فرمایا۔ یہاں آپ کے استدلال کو ہم اختصاراً ہی نقل کریں گے۔

اعتراض نمبر۱: چونکہ احادیث یقینی نہیں ظنی ہیں اس لیے یہ دین نہیں قرار پا سکتیں ان کی حیثیت تاریخ کی ہے اور تاریخ تنقید کی حد سے بالا نہیں ہوتی۔(۴)

الجواب: بلا کسی تفصیل کے مطلقاً تمام ذخیرہ احادیث کو ظنی قرار دینا خالص ابلیسانہ نظریہ ہے۔ اصولی طور پر حدیث کی دو قسمیں ہیں: ایک خبر متواتر اور دوسری خبر واحد۔ خبر واحد اگرچہ ظن کا فائدہ دیتی ہے اور یہی وجہ ہے کہ عقائد میں اس پر اعتبار نہیں کیا جا سکتا، کیونکہ عقیدہ کی بنیاد قطعی ادلہ پر ہے جو قرآن کریم اور خبر متواتر اور اجماع ہیں۔ چنانچہ علامہ مسعود تفتازانیؒ (م ۷۹۲ھ) لکھتے ہیں کہ خبر واحد ان تمام شرائط پر مشتمل ہونے کے باوجود بھی جو اصول فقہ میں بیان کی گئی ہیں، ظن کا فائدہ دیتی ہے اور اعتقادات کے باب میں ظن کا کوئی اعتبار نہیں ہے۔ (شرح عقائد، ص ۱۰۱) لیکن خبر متواتر کے متعلق یہ کہنا کہ وہ ظنی ہے، قطعی باطل اور سراسر جھوٹ ہے۔ حافظ ابن حجر وغیرہ تصریح فرماتے ہیں کہ خبر متواتر علم یقینی کا فائدہ دیتی ہے۔ (شرح نخبۃ الفکر، ص ۱۰) اور خبر متواتر کا منکر کافر ہوتا ہے۔ (توجیہ النظر، ص ۶) یہ یاد رہے کہ تواتر کی چار قسمیں ہیں۔ تواتر الاسناد، تواتر الطبقہ، تواتر العمل وتوارث اور تواتر القدر المشترک (مقدمہ فتح الملہم ص ۶) الغرض مطلقاً حدیث کو ظنی کہہ کر اس سے گلوخلاصی چاہنا دجل اور تبلیس کے سوا کچھ نہیں ہے۔

مولانا سرفراز خان صفدرؒ نے اس باب میں عقلی استدلال کرتے ہوئے لکھا ہے کہ ہر آدمی اس بات کو بخوبی جانتا ہے کہ دنیا میں بیشتر کام ظن کے ماتحت کیے جاتے ہیں، مگر کوئی ظنی کہہ کر ان کو ترک نہیں کرتا۔ مثلاً شادی کرتے ہیں تو اس کا قطعی طور

پر کیا ثبوت ہوتا ہے کہ زوجین تادم حیات زندہ رہیں گے یا ان میں اختلاف کی وجہ سے طلاق کی نوبت نہیں آئے گی؟ یا مقدمہ میں وکیل کرتے ہیں تو اس کا یقینی طور کیا ثبوت ہوتا ہے کہ وکیل مقدمہ جیت جائے گا؟ یا کسی بیمار کا ڈاکٹر اور حکیم سے علاج کراتے ہیں تو اس کا کیا وثوق ہوتا ہے کہ بیمار تندرست ہو جائے گا اور موت کے چنگل سے بچ جائے گا؟ غرض یہ کہ اصولِ دین اور عقائد کے علاوہ ظنی احکام میں خبر واحد اور ظنی دلیل ہی کافی ہوتی ہے اور اسی پر آج تک امت کا عمل چلا آرہا ہے۔ باقی دینی و دنیوی امور کے فرق کی آڑ لے کر یہ کہنا کہ دنیوی امور میں ظن قابل عمل ہے اور دینی امور میں نہیں تو یہ ایک خالص طفلانہ خیال ہے۔ (۵)

اعتراض نمبر۲: احادیث کی جس قدر کتابیں ہمارے پاس موجود ہیں، بخاری اور مسلم سمیت ان میں ایک بھی حدیث ایسی نہیں ہے جس کے متعلق یہ دعویٰ کیا جاتا ہو کہ اس کے الفاظ وہی ہیں جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمائے تھے۔ کوئی حدیث ایسی نہیں ہے جس کے الفاظ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے الفاظ ہوں، تمام احادیث روایات بالمعنی ہیں۔ (۶)

الجواب: یہ دعویٰ کرنا کہ تمام احادیث روایت بالمعنی ہیں، خالص افترا اور سفید جھوٹ ہے۔ بلاشبہ بعض احادیث روایت بالمعنی کے طور پر ہیں جہاں کوئی راوی أو کماقال یا صرف حرف أو سے، مثلہ یا نحوہ یا بالمعنی یا او المعنی واحد وغیرہ کے الفاظ استعمال کرتا ہو۔ باقی ان کے علاوہ تمام احادیث کے الفاظ بھی وہی ہیں جو آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمائے ہیں۔ خبر متواتر میں قطعیت کے ساتھ اور خبر واحد میں ظنیت کے ساتھ یہ کہنا بجا ہے کہ یہ آپ ہی کے الفاظ ہیں اور بلا کسی قوی عقلی اور نقلی دلیل کے ہر حدیث کے مروی بالمعنی ہونے کا دعویٰ مطلقاً مردود ہے۔ (۷)

اعتراض نمبر۳: ان مجموعوں [صحاح ستہ] میں ایسی باتیں موجود ہیں جو قرآن کے خلاف ہیں جن سے اللہ تعالیٰ کی ذات پر اور انبیاء کرام کی شان میں طعن پایا جاتا ہے جن سے بصیرت ابا اور عقل بغاوت کرتی ہے۔ (۸)

الجواب: کوئی صحیح حدیث قرآن وحدیث کے خلاف نہیں ہے اگر کسی کو کوئی صحیح حدیث قرآن کریم کی کسی آیت سے متصادم نظر آتی ہے تو یہ اس کی اپنی فہم کا قصور ہے اس کو اعتراض سے پہلے اپنے دماغ کا کسی ماہر امراض دماغ ڈاکٹر سے علاج کرالینا چاہیے۔ ہاں موضوع اور باطل قسم کی روایتوں سے ضرور تصادم ہے مگر اس کا کیا کیجیے کہ ایسی حدیثوں کو حضرات محدثین کرامؒ نے چھان بین کے بعد ڈھیر پر پھینک دیا اور یہ ان کو اٹھا کر لے آئے ہیں اور انہوں نے اپنے عقائد واعمال کی ان پر بنیاد رکھی ہے لیکن اس سے صحیح احادیث اور حضرات محدثین کرامؒ پر کیا زد پڑتی ہے؟ (۹)

اعتراض نمبر۴: مشہور منکر حدیث تمنا عمادی نے حدیث کے مدون اوّل ابن شہاب الزہریؒ کے بارے میں ایک طویل مضمون لکھا ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ امام موصوف عربی نہ تھے بلکہ عجمی تھے اور عجمیوں کا کام اسلام مٹانا تھا۔ لکھتے ہیں:

”اور منافقین عجم نے اپنے مقاصد کے ماتحت جمع احادیث کا کام شروع کرنا چاہا تو انہیں منافقین عجم کے آمادہ کرنے سے اس وقت خود ابن شہابؒ کو خیال ہوا کہ ہم حدیثیں جمع کرنا شروع کر دیں تو یہ مدینہ بھی پہنچے اور کوفہ بھی اور مختلف مقامات سے حدیثیں حاصل کیں تو پھر بیسویں راویوں کے ساتھ رہے۔ انہیں منافقین عجم کی ایک جماعت نے اپنا رسوخ فی الدین اور ظاہری زہد وتقویٰ دکھا کر ابن شہاب زہریؒ کو جمع احادیث پر آمادہ کیا۔“ (۱۰)

الجواب: چونکہ حضرت امام زہریؒ حدیث کے پہلے مدون ہیں اس لیے منکر حدیث تمنا عمادی صاحب نے ایڑی چوٹی کا

زور اس پر صرف کیا ہے کہ امام زہریؒ عربی النسل ثابت نہ ہوں اور عرب کے باشندہ قرار نہ پائیں اور ان کو عجمی عجمی کہہ کر ان کی کڑی منافقین عجم کے ساتھ جوڑ دی جائے تاکہ حدیث کا سرے سے اعتبار نہ رہے کہ نہ رہے بانس نہ رہے بانسری۔ (۱۱)

جیسا کہ منکرین حدیث کا سرغنہ نیاز فتح پوری یہ لکھتا ہے کہ مسجد وکلیسا اور ناقوس واذان میں کوئی فرق نہیں۔ (معاذ اللہ)

مولانا سرفراز خان صفدرؒ نے رجال کی مستند کتابوں سے ان کا نسب نامہ بیان کیا ہے، لیکن تمنا عمادی کی ستم ظریفی دیکھیے کہ وہ ان تمام حضرات کو منافقین عجم سے تعبیر کرتے ہیں اور امام زہری کے اساتذہ کو وضاعین اور کذابین کہتے ہیں اور ان کی اس اہم دینی خدمات کو اور ان کی بلامدافعت مسلمہ ثقاہت وعدالت کو اپنے خبثِ باطن کی وجہ سے خاک میں ملا رہے ہیں اور یہ کہتے ہیں کہ ان کی تحصیل علم کی کاوش ۱۰۱ھ سے بعد کی ہے۔ عمادی صاحب حضرت امام زہریؒ، ان کے اساتذہ اور تلامذہ اور حضرت عمر بن عبد العزیزؒ وغیرہم جیسی پاکیزہ شخصیتوں کے بارے میں بار بار منافقین عجم کا جملہ بول کر اپنے ماؤف دل کی بھڑاس نکالتے ہیں جو ان کے خبث باطن پر دال ہے۔ غرضیکہ عمادی وغیرہ کی ان دجالانہ دسیسہ کاریوں سے نہ حضرت امام زہریؒ کی مسلمہ شخصیت پر کوئی زد پڑتی ہے اور نہ صحت احادیث پر۔ (ملخص) (۱۲)

اعتراض نمبر۵: ڈاکٹر احمد الدین لکھتے ہیں:

”صحاح ستہ قطعی طور پر قرآن مجید کے خلاف ہیں۔ نیز صحاح ستہ کی باطل روایات نہ حدیث رسول ہیں نہ حکمت، نہ تواتر نہ وحی خفی، نہ تفسیر نہ سوانح حیات، نہ بیان نہ اسوۂ حسنہ، یہ سب بناوٹی کہانی ہے۔ ان روایات کے مصنفین کی مثال یہ ہے کہ جس طرح سامری نے من اثر الرسول کہہ کر بنی سرائیل کی قوم سے بچھڑے کی پرستش کروائی تھی، اس طرح ان مذکورہ مصنفین نے قال قال رسول اللہ کہہ کر مصنوعی حدیث کی پرستش کروائی ہے۔“ (۱۳)

الجواب: صحیح بخاری اور صحیح مسلم کی متصل اور مرفوع حدیثیں حضرات محدثین کرامؒ کے اتفاق واجماع سے صحیح ہیں:

اما الصحیحان فقد اتفق المحدثون علی ان جمیع مافیھما من المتصل المرفوع صحیح بالقطع (حجۃ اللہ البالغہ، ص ۱۳۴)

صحاح ستہ کی باقی چار کتابوں (نسائی، ابوداؤد، ترمذی اور ابن ماجہ) میں بعض روایات ضعیف بھی ہیں بلکہ بعض موضوع بھی جن کی حضرات محدثین کرام نے نشاندہی کر دی ہے، لیکن صحاح ستہ کی صحیح احادیث میں سے کوئی حدیث قرآن کریم کی کسی بھی آیت کریمہ کے ہرگز خلاف نہیں۔ اگر کسی کوتاہ فہم کو کسی حدیث کا قرآن کریم کی کسی آیت کریمہ سے تضاد نظر آتا ہے تو وہ اس کا اپنا سوء فہم کا نتیجہ ہے۔ ایسا سطحی قسم کا تعارض تو قرآن کریم کی بعض آیات کریمات کا آپس میں معلوم ہوتا ہے۔

ڈاکٹر احمد الدین صاحب کا یہ دعویٰ کہ کتب صحاح ستہ قطعی طور پر قرآن مجید کے خلاف ہیں، خالص ہرزہ سرائی اور قطعاً جھوٹ اور صریح بہتان ہے اور اسی طرح ان کا صحاح ستہ کی تمام روایات کے بارے میں یہ دعویٰ کہ وہ حدیث رسول نہیں اور باطل روایات ہیں، خالص زندیقانہ اور کافرانہ نظریہ ہے۔ صحیحین کی تمام اور بقیہ کتب اربعہ کی بجز چند روایات کے باقی سب روایات حدیثِ رسول بھی ہیں اور حکمت وموعظت بھی، وحی بھی ہیں اور قرآن کریم کی تفسیر بھی، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا اسوۂ حسنہ بھی ہیں اور آپ کی سوانح حیات بھی۔ یہ بناوٹی کہانی نہیں بلکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اقوال وافعال کا بہترین اور قابل اعتماد سرمایہ اور ذخیرہ ہے اور اس کا انکار بغیر کسی پاگل یا ملحد کے اور کوئی نہیں کر سکتا۔ (ملخص) (۱۴)

اعتراض نمبر ۶: آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حدیث لکھنے سے منع فرمایا ہے اور لکھی ہوئی احادیث کو مٹا دینے کا کلمہ ارشاد فرمایا جیسا کہ ابوسعید الخدریؓ کی روایت میں ہے:

ولا تکتبوا عنی ومن کتب عنی غیر القرآن فلیمحه وحدثوا عنی ولا حرج ومن کذب علی متعمدا فلیتبوأ مقعده من النار (مسلم، ابوداؤد)

الجواب: اگر کتابت حدیث کی نہی سے یہ ثابت کرنا مقصود ہے کہ حدیث حجت نہیں تو یہ استدلال قطعاً باطل ہے کیونکہ خود اس حدیث میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سنہرے موتیوں کی طرح چمکتے ہوئے یہ الفاظ بھی موجود ہیں: حدثوا عنی ولا حرج ، میری حدیثیں بیان کرو اور اس میں قطعاً کوئی حرج نہیں ہے بالکل واضح امر ہے کہ اگر حدیث حجت نہ ہوتی تو آپ حدیث بیان کرنے کا ہرگز حکم نہ دیتے معلوم ہوا کہ آپ کی حدیث بیان کرنا امرِ مطلوب ہے جواب کے لیے اتنی بات کافی ہے کہ اگر حدیث حجیت نہ ہوتی تو آپ حدیث بیان کرنے کا حکم نہ دیتے۔

اب غور طلب امر یہ ہے کہ اگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت اور حدیث دین اور حجت نہیں تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے تارکِ سنت کو اپنی امت کی فہرست سے کیوں خارج کر دیا ہے؟ اور آپ نے تارک سنت کو ملعون کیوں قرار دیا ہے اور سنت پر عمل کرنے کی اور اس اس کو مضبوطی سے پکڑنے کی تاکید کیوں فرمائی ہے؟ اور خلافِ سنت کاموں سے پرہیز کرنے کا حکم کیوں دیا ہے؟ کیا معاذ اللہ اللہ تعالیٰ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم حضرات صحابہ کرامؓ کو اور پوری امت کو ایک غیر دینی یا نری تاریخی بات پر قائم رہنے کی پرزور الفاظ میں تاکید در تاکید فرماتے رہے؟ ہر عقل مند آدمی اسی سے حدیث اور سنت کی اہمیت اور اس کی دینی حیثیت اور اس کی حجت کو بخوبی آسانی سے سمجھ سکتا ہے باقی جس نے میں نہ مانوں کی شرط لگائی ہے تو اس کے لیے اس جہاں میں سرے سے کوئی علاج ہی نہیں ہے حدیث کو وہی تسلیم کرے گا جس میں اللہ تعالیٰ کی محبت ہوگی اور اس محبت کے نتیجے میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے محبت ہوگی اس لیے کہ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول برحق کی محبت لازم وملزوم ہیں۔ جب حدیث کی محبت نہیں تو یقین جانیے کہ خدا تعالیٰ کی محبت بھی نہیں۔ (۱۵)

اعتراض نمبر ۷: حضرت امام ابوحنیفہؒ بھی 'منکرین حدیث' میں شامل تھے۔ مولانا سرفراز خان صفدرؒ لکھتے ہیں:

''منکرینِ حدیث نے مطلب برآری کے لیے محض اپنے بائیں ہاتھ کے کرتب اور شعبدہ بازی سے جن حضرات کو منکرینِ حدیث کی مد میں لا کھڑا کیا ہے ان میں ایک حضرت امام ابوحنیفہؒ کی ذات گرامی ہے۔ چنانچہ مقام حدیث میں غلام احمد پرویز کی یہ عبارت ملتی ہے: ''تین بڑے بڑے 'منکرینِ حدیث - امام ابوحنیفہؒ، شاہ ولی اللہ دہلویؒ اور علامہ اقبالؒ''۔ علاوہ ازیں طلوعِ اسلام میں ایک ذمہ دار شخص کا مضمون شائع ہوا جس میں امام ابوحنیفہؒ کو بیس سے کم حدیثوں کا عالم گردانا گیا۔''

الجواب: جن حضرات نے امام ابوحنیفہؒ کی حدیث دانی پر اعتراض کیا ہے یا حدیث میں ان کے مقام ومرتبہ کو کم تر ثابت کرنے کی کوشش کی ہے، مولانا صفدرؒ نے ان کے رد میں ایک مفصل کتاب ''مقام ابی حنیفہؒ'' کے نام سے تالیف فرمائی۔ اس کے سبب تالیف میں لکھتے ہیں: ''اشد ضرورت تھی کہ تاریخی طور پر امام صاحب کا علم حدیث میں مقام اور مرتبہ عرض کیا جائے اور منکرین کے دجل وفریب کو آشکار کیا جائے تاکہ کسی کو مغالطہ نہ رہے اور صحیح بات ذہن نشین ہو سکے۔'' (۱۶)

امام ابوحنیفہؒ کی کتاب الآثار کے بارے میں مختلف ائمہ کی آرا نقل کرنے کے بعد رقم طراز ہیں:

''حدیث کی بات ہے کہ امام ابوحنیفہؒ ستر ہزار سے زیادہ حدیثیں اپنی تصانیف میں بیان فرماتے ہیں اور چالیس ہزار حدیثوں سے کتاب الآثار کا انتخاب کرتے ہیں مگر بایں ہمہ متعصب لوگ یہ کہتے ہیں کہ امام ابوحنیفہؒ فن حدیث میں یتیم تھے ان کو حدیث سے کوئی مس نہ تھا۔ ان سے صرف ستر حدیثیں مروی ہیں، یہ کس قدر ظلم عظیم اور ناانصافی کی بات ہے۔'' (۱۷)

حجیت حدیث اور مقام سنت کو واضح کرنے کے لیے مولانا نے تین اہم نکات بیان کیے ہیں:

۱۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ حدیث سے صرف نظر کرتے ہوئے قرآن حکیم کے احکام پر عمل نہیں کیا جا سکتا۔ اس کی وضاحت کرتے ہوئے ایک اثر نقل کیا ہے:

''حضرت عمران بن حصینؓ سے ایسے ہی کسی سر پھرے نے سوال کیا کہ یہ مسئلہ صرف قرآن حکیم سے بتائیے۔ اس پر برہم ہو کر انہوں نے ارشاد فرمایا اگر تیرا اور تیرے ساتھیوں کا احتجاج صرف قرآن کریم ہی میں منحصر ہے تو بتاؤ کہ قرآن کریم میں تم پاتے ہو کہ بیت اللہ اور صفا ومروہ کا طواف سات سات دفعہ ہے اور کیا عرفات میں ٹھہرنے اور رمی جمار کی تفصیل اس میں ہے؟ پھر فرمایا کہ قرآن کریم میں چور کے ہاتھ کاٹنے کے حکم کا اسلامی حکمرانوں کو ذمہ دار قرار دیا گیا ہے، بتاؤ کہ ہاتھ کلائی سے کاٹا جائے یا کہنی سے یا کندھے کے قریب سے؟'' (الکفایہ للخطیب)

۲۔ اس دنیا کا سلسلہ ہی یوں جاری ہے کہ یہاں تقابل ہی کے ذریعے کسی چیز کی حقیقت اور اصلیت تک رسائی ہوتی ہے اگر رات نہ ہو تو دن کی کیا قدر ہو سکتی ہے اگر سیاہی نہ ہوتی تو سفیدی کی کیا قیمت پڑ سکتی ہے اگر باطل نہ ہو تو حق کی شناخت کیسے ممکن ہے۔ اگر شرک نہ ہو تو توحید کیسے عیاں ہو سکتی ہے۔ اگر بدعت نہ ہو تو سنت کی روشنی کیسے چمک سکتی ہے۔ غرض یہ کہ تقابل ہی سے حقیقت واضح ہوتی ہے۔ اگر منکرین حدیث اس جہاں میں نہ آتے تو ہماری طرح بے شمار مسلمانوں کے ایمان میں پختگی اور یقین کامل اور تازگی پیدا نہ ہوتی۔ یہ لوگ آئے تو ہمارا ایمان مضبوط ہو گیا۔ حضرت مقدام بن معدی کربؓ روایت کرتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ قریب ہے کہ ایک شخص تم میں سے اپنے پلنگ پر بیٹھا ہوگا اس کو میری حدیث سنائی جائے گی تو وہ کہے گا کہ میرے سامنے صرف کتاب اللہ پیش کرو اس میں جو ہمیں حلال ملے گا اس کو حلال سمجھے گئے اور اس میں جو حرام ہے اس کو حرام سمجھیں گے آپ نے فرمایا اللہ کے رسولؐ نے بہت سی اشیاء کا حرام ہونا بیان کیا ہے سو وہ بھی ویسا ہی حرام ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے حرام قرار دیا ہے۔ (ترمذی)

ایک اور روایت میں آپ نے ارشاد فرمایا خبردار بے شک مجھے کتاب اللہ دی گئی اور اس کی مثل بھی اس کے ساتھ دی گئی جیسا کہ ارشاد الٰہی ہے: وَمَآ اَنْزَلَ عَلَيْكُمْ مِّنَ الْكِتٰبِ وَ الْحِكْمَةِ ۔ اس سے معلوم ہوا کہ جیسے کتاب منزل من اللہ ہے اسی طرح حکمت بھی منزل من اللہ ہے اور حکمت سے مراد سنت ہے (تفسیر ابن کثیر، ص ج ۱۸۴۶)

۳۔ حضرت جابر بن عمرؓ نے ایک موقع پر فرمایا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ عورتیں جب تم سے اجازت طلب کر کے مسجد جائیں اور (وعظ ونصیحت) کے طور پر اپنا حصہ لینا چاہتی ہوں تو تم ان کو نہ روکو۔ اس پر ابن عمرؓ کے فرزند حضرت بلال نے کہا کہ بخدا ہم تو ضرور ان کو روکیں گے۔ حضرت ابن عمرؓ نے فرمایا کہ میں نے تجھ سے حدیث بیان کی ہے اور تو کہتا ہے

کہ ہم انہیں روکیں گے! حضرت ابن عمرؓ نے اتنا برا کہا کہ اتنا برا کبھی نہیں کہا تھا۔ (مختصر مسلم ج۱ ص۱۸۳)

.......آج منکرین حدیث ایک دو تین ہی نہیں بلکہ حدیث کے مجموعہ ذخیرہ سے صراحتاً انکار بلکہ استہزا کرتے ہیں اور نہ تو خود ان کو اس پر کوئی ندامت کو ہوتی ہے اور نہ ان کے دوست واحباب ہی ان سے قطع تعلق کرتے ہیں۔ (۱۸)

حوالہ جات

۱۔ مولانا سرفراز خان صفدرؒ کے حالات کے لیے دیکھیے:
نوید الحسن: مولانا سرفراز خان صفدرؒ کی علمی ودینی خدمات، غیر مطبوعہ مقالہ برائے ایم فل (علوم اسلامیہ) شیخ زاید اسلامک سنٹر، پنجاب یونیورسٹی لاہور، ۲۰۰۳ء

۲۔ ایضاً ص۱۹، ۲۰

۳۔ شیخ الاسلام امام ابن تیمیہ کے حالات اور خدمات کے لیے دیکھیے: سید ابوالحسن علی ندوی، تاریخ دعوت وعزیمت، (حصہ دوم) مجلس نشریاتِ اسلام، کراچی

۴۔ مولانا سرفراز خان صفدرؒ، شوقِ حدیث (حصہ اول) انجمن اسلامیہ، گکھڑ ضلع گوجرانوالہ، ۱۹، ص ۱۴۵

۵۔ ایضاً ص۱۵۰، ۱۵۱

۶۔ ایضاً ص۱۴۵۔ غلام احمد پرویز نے یہ اعتراضات اپنے مجلّہ طلوع اسلام بابت ماہ اکتوبر ۱۹۴۹ء میں شخصیت پرستی، کے عنوان سے لکھے گئے مضمون میں کیے ہیں۔

۷۔ ایضاً ص۱۵۲

۸۔ ایضاً ۱۴۶

۹۔ ایضاً ص ۱۵۳

۱۰۔ تمنا عمادی، محمد بن شہاب زہری کی تاریخ، طلوعِ اسلام، ستمبر ۱۹۹۰ء، ص ۴۸

۱۱۔ شوقِ حدیث، ص۱۵۲

۱۲۔ ایضاً ص۱۵۳، ۱۵۲

۱۳۔ ڈاکٹر احمد الدین، پیغام توحید، اکال گڑھ، گوجرانوالہ، ص۵

۱۴۔ شوقِ حدیث، ص۱۵۹، ۱۶۰

۱۵۔ ایضاً ص۱۶۲

۱۶۔ مولانا سرفراز خان صفدرؒ، مقام ابی حنیفہؒ، مکتبہ صفدریہ، گوجرانوالہ، سخن ہائے گفتنی، ص ۳۴

۱۷۔ ایضاً ص ۱۱۲

۱۸۔ شوقِ حدیث، ص ۱۸۴

ڈاکٹر انوار احمد اعجاز*

''مقام ابی حنیفہ'' - ایک علمی وتاریخی دستاویز

امام اہل سنت شیخ الحدیث مولانا سرفراز خان صفدرؒ کا نام نامی ملت اسلامیہ میں اپنے تحقیقی وعلمی کام کی بدولت ہمیشہ زندہ رہے گا۔ آپ نے ۵۰ کے قریب کتب یادگار چھوڑی ہیں جن کا علمی وتحقیقی معیار نہایت بلند ہے۔ ۱۹۴۴ء میں آپ کی پہلی تصنیف ''الکلام الحاوی'' منظر عام پر آئی اور ۱۹۹۶ء تک، جب آپ کی آخری تصنیف ''توضیح المرام فی نزول المسیح علیہ السلام'' منظر عام پر آئی، آپ پوری تن دہی کے ساتھ دین متین کے علمی وفکری زاویوں سے مرصع تصنیفات وتالیفات پیش کرتے رہے۔ یوں تو آپ کی ہر تالیف کا علمی شکوہ چار دانگ عالم میں شہرہ رکھتا ہے، لیکن ''احسن الکلام''، ''تسکین الصدور''، ''اظہار العیب''، ''الکلام المفید''، ''راہ سنت''، ''شوق حدیث''، ''طائفہ منصورہ'' اور ''مقام ابی حنیفہ'' میں جس انداز سے علمی وتحقیقی اور فنی کمالات کا مظاہرہ کیا گیا ہے، اس کی بدولت ان تصنیفات نے برصغیر کے سبھی دینی مفکرین سے بے پناہ داد پائی، خاص طور پر ''مقام ابی حنیفہ'' تو ایک ایسا شاہکار ہے کہ اس کی نظیر شاید ہی پیش کی جا سکے۔

سراج الائمہ حضرت امام اعظم امام ابوحنیفہؒ کا اسم گرامی تاریخ امت میں اپنی گراں قدر خدمات کے لیے جگمگاتا رہے گا۔ آپ کی شان محدثیت وحدیث فہمی لاریب، ایک ناقابل انکار حقیقت ہے۔ آپ کے حالات، ذاتی اوصاف اور تدوین فقہ کے لیے خدمات ملت اسلامیہ کی تاریخ کا نہایت درخشندہ باب ہے جس سے آنے والے سارے زمانے روشنی اور رہنمائی پاتے رہیں گے۔ آپ کے عہد کے دینی، فکری اور سیاسی رویوں کا بھرپور مطالعہ بہت سے سوانح نگاروں نے اپنی تصنیفات میں عمدہ طریق سے کیا ہے۔ مختلف دینی اور مذہبی دانشوروں نے امام اعظمؒ کے علوم حدیث اور سیاسی زندگی کے تناظر میں اتنا وقیع علمی کام سرانجام دیا ہے کہ اس کی بدولت امام اعظمؒ کی فقہی اور سیاسی بصیرت سے تا قیامت استفادہ کیا جاتا رہے گا۔

جہاں امام اعظمؒ کی زندگی پر محققانہ شان سے نہایت علمی انداز میں تصنیف وتالیف کرنے والے مصنفین موجود ہیں، بدقسمتی سے وہاں ایک خاص جماعت کی دریدہ ذہنی، فقہائے امت کی شان میں گستاخی اور ان پر بے بنیاد الزامات کے تند وتیز حملے روزمرہ کی بات ہوگئی ہے اور بالخصوص ان کا زور طعن وتشنیع زیادہ تر امام اعظمؒ پر صرف ہوتا ہے۔ یہ لوگ تمام ائمہ کو چھوڑ کر امام اعظمؒ پر طرح طرح کے ایسے الزامات تراشتے رہتے ہیں جن کا بے بنیاد ہونا صدیوں سے واضح کیا جا رہا ہے۔ ان کی گمراہ کن تالیفات میں حوالہ جات کی قطع وبرید کر کے اور متعصبین کے حوالے چن چن کر ہر ناجائز طریق سے امام اعظمؒ کو مطعون ٹھہرانے کی کوششیں کی جاتی ہیں۔ ساٹھ کی دہائی میں ''حقیقۃ الفقہ''، ''شمع محمدی'' اور ''نتائج التقلید'' وغیرہ اسی نوعیت کی کتابیں تھیں۔ ان گمراہ کن تالیفات میں مصنفین نے تعصب، جہالت اور دروغ گوئی کا بھرپور مظاہرہ کرتے ہوئے اپنی کم

* سینئر اسپیشل ایجوکیشن ٹیچر، گورنمنٹ Deaf اسکول سیالکوٹ۔

مانگی اور دریدہ وہنی کے نادر نمونے پیش کیے ہیں۔ بالخصوص ''نتائج التقلید'' میں عرصہ دراز سے چلے آنے والے ان خلاف واقعہ اکاذیب کو جدید سانچے میں ڈھالنے کی سعی کی گئی ہے جن کی حقیقت علماے امت صدیوں قبل واضح کر چکے ہیں۔

''مقام ابی حنیفہ'' میں معترضین کے تعصب اور عناد کے انھی مظاہر کی نشان دہی کی گئی ہے اور امام اعظمؒ کے مقام حدیث وفقہ اور علم کلام کے بارے میں سیر حاصل علمی مواد پیش کیا گیا ہے۔ ''مقام ابی حنیفہ'' کی پوری تسوید ۱۰ر رجب تا ۲ر رمضان ۱۳۸۱ھ بمطابق ۸ر فروری ۱۹۶۲ء کو ہوئی اور طباعتی مراحل سے گزر کر یہ ۲۹ر مئی ۱۹۶۲ء کو اشاعت پذیر ہوئی۔ یہ تصنیف ''نتائج التقلید'' (مولفہ حکیم محمد اشرف سندھو، بلو کے قصور) میں اٹھائے گئے تمام اعتراضات، شبہات اور مناقشات کا نہایت متانت بھرا عالمانہ جواب تھا جس میں نہ صرف فریب کاریوں، دجل وتلبیس اور قطع وبرید کے ذریعے پیش کی جانے والی نام نہاد وجعلی تحقیق کا پول کھولا گیا ہے بلکہ امام اعظمؒ کی شان تقویٰ وورع اور علمی مقام، ان کی مجتہدانہ خصوصیات اور علم فقہ وحدیث میں ان کی امامت کو نہایت مستند اور ناقابل انکار شواہد اور حوالہ جات سے ثابت کیا گیا ہے۔

یہ گراں قدر علمی وتحقیقی تالیف آٹھ ابواب پر مشتمل ہے۔ اس میں مولانا سرفراز خان صفدرؒ کا تحقیقی انداز بہت سلجھا ہوا اور نہایت تحقیقی ہے۔ انہوں نے صفحہ بہ صفحہ نہایت سلیقے اور خوب صورتی کے ساتھ اہل حق کی تائید میں قرآن وسنت، اقوال صحابہ وائمہ تابعین وفقہا سے جابجا دلائل پیش کیے ہیں۔ کتاب میں متعدد اصولی وفروعی دقیق مباحث کا سیر حاصل تعارف کرایا گیا ہے، مثلاً فقہ واجتہاد کی اہمیت، فقہاے کوفہ اور محدثین کا تفصیلی تعارف، رائے کا صحیح مفہوم، اس کی شرعی وعرفی حیثیت، رائے مذموم، امام اعظمؒ کے ہاں رائے اور قیاس کے اعتبار کا صحیح معیار اور حدیث (خواہ وہ ضعیف ہو) کی رائے پر ترجیح جیسے مسائل بڑی علمی شان سے زیر بحث آئے ہیں۔

''سخن ہائے گفتنی'' کے ذیل میں شیخ الحدیثؒ نے ان مختلف علمی اشکالات کی وضاحت کی ہے جن کے باعث یہ کتاب لکھی گئی۔ ان کے مطابق اس بات کی اشد ضرورت تھی کہ تاریخی طور پر امام اعظمؒ کا علم حدیث میں مقام اور مرتبہ بیان کیا جائے اور منکرین کے دجل وتلبیس کو آشکارا کیا جائے تاکہ کسی کو کوئی مغالطہ نہ رہے اور صحیح بات ذہن نشین ہو سکے۔ امام اعظمؒ کے حوالے سے یہ الزام کہ وہ حدیث میں ضعیف اور کمزور تھے اور ان کا سرمایہ حدیث فقط سترہ احادیث تھی، ان سب بے بنیاد دعاوی کے ٹھوس اور مسکت حوالہ جات نقل کیے جائیں اور ان سے علمی مناقشہ کیا جائے اور اس کا مسکت جواب دیا جائے۔

مقام ابی حنیفہ کے مآخذ کے حوالہ سے مصنف رقم طراز ہیں کہ ''اس کتاب میں جتنے حوالہ جات درج ہیں، اکثر براہ راست راقم السطور نے خود کتابوں سے دیکھے ہیں اور جو علمی کتابیں دستیاب نہیں تھیں، ان کے حوالہ جات ''ابن ماجہ اور علم حدیث'' از مولانا عبد الرشید نعمانی اور ''مذہب اہل سنت والجماعت'' از مولانا محمد علی صدیقی کاندھلوی سے لیے گئے ہیں اور بقیہ حوالہ جات اکابر ہی کی کتابوں کی رہنمائی میں ہم نے اصل کتابوں سے نقل کیے ہیں۔'' (ص ۳۵)

یہ پیراگراف اس کتاب کی علمی وتحقیقی حیثیت کو واضح کرنے کے لیے خشت اول کی حیثیت رکھتا ہے اور بلا مبالغہ یہ بات کہی جا سکتی ہے کہ مصنف نے کتاب کے ہر ہر صفحے پر اس تحقیقی صورت گری کو پوری ثقاہت اور علمی شکوہ سے مد نظر رکھا ہے۔

مقام ابی حنیفہ کے باب اول میں تفقہ فی الدین، قرآن کریم میں تفقہ کی فضیلت، حدیث میں فقہ کا درجہ جیسے موضوعات پر سیر حاصل کلام کیا گیا ہے اور یہ واضح کیا گیا ہے کہ عقل وخرد اور فہم وفقہ سے مراد عام سمجھ نہیں بلکہ وہ فہم وفراست مراد ہے جو

دین سے متعلق ہے، عام اس سے اس کا تعلق روایت سے ہو یا درایت سے۔ قرآن وحدیث اور اقوال علما میں جہاں بھی فقہ وعقل کا لفظ آتا ہے، اس سے یہی مراد ہوتی ہے۔ (ص ۳۹) از روے حدیث فقہ کا درجہ واضح کرتے ہوئے بخاری، مسلم اور مشکوۃ سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد کی تشریح علماے سلف کی عبارات کی روشنی میں کی گئی ہے جس میں بارش اور زمینوں پر اس کے اثرات اور مابعد نتائج کو واضح کیا گیا ہے۔ محدث اور فقیہ کے علمی منصب کو واضح کرتے ہوئے بتایا گیا ہے کہ حدیث کو جمع کر کے اس کو آگے پہنچانا، اس پر عمل کرتے ہوئے اپنا تزکیہ کرنا اور اس کے ذریعہ ہزاروں مسائل کا حل نکال کر امت کو عظیم فائدہ پہنچانا اسی حدیث کا مصداق ہے۔ تفقہ فی الدین کا درجہ بیان کیا گیا ہے اور یہ واضح کیا گیا ہے کہ احادیث کی تبلیغ کا اصل مقصد ان سے فقہ حاصل کرنا ہے۔ (ص ۴۳)

کتاب ہذا کے باب دوم میں فقہ ودرایت کو موضوع بنایا گیا ہے اور یہ بات واضح کی گئی ہے کہ حدیث کے سلسلہ میں دو اہم اور بنیادی چیزوں کی سخت ضرورت ہے جن کے بغیر حدیث سے استفادہ کرنا ایک مشکل کام ہے۔ ایک چیز سند اور روایت ہے اور دوسری معنی ودرایت۔ اول کی حفاظت محدثین کرام نے کی ہے اور دوسری کی فقہاے کرام نے۔ اگر ایک طبقہ اور گروہ نے راستہ کی حفاظت کی ہے تو دوسرا گروہ منزل کا نگہبان رہا ہے۔ اگر ایک جماعت نے چھلکے اور پوست کی نگرانی کی تو دوسرا حزب میوہ اور مغز کا پاسبان رہا ہے۔ (ص ۴۵) نہایت واضح انداز میں یہ بات بھی پیش کی گئی ہے کہ فقہ حاصل کرنے کو ان لوگوں نے معیوب قرار دیا ہے جو عقل سے محروم ہیں اور ایسے لوگوں کے علم فقہ پر عیب لگانے سے کوئی ضرر نہیں ہے۔

تیسرے باب میں امت کی تاریخ سے فقہ واجتہاد کی چند نہایت روشن جھلکیاں دکھائی گئی ہیں۔ شیخ الحدیثؒ نے فقہاے صحابہ کرام کے بارے میں امام مسروقؒ، امام حاکمؒ، امام شعبیؒ اور ابن قیمؒ کے حوالے پیش کر کے مختلف فقہاے صحابہ کرام کے اسماے مبارکہ رقم کیے ہیں اور ان کی علمی فضیلت کا احوال بیان کیا ہے۔ ''کوفہ میں حضرات صحابہ کرام کا ورود'' اور ''اہل کوفہ اور علم حدیث'' کے زیر عنوان ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ ستر بدری صحابہ، تین سو بیعت رضوان میں شریک صحابہ کے ساتھ ساتھ ایک ہزار پچاس صحابہ کرام کوفہ میں علمی وفکری روایت کا نقش اول تھے، جبکہ تذکرۃ الحفاظ جلد اول سے کوفی یا نزیل کوفہ محدثین میں سے ایسے ۱۹۷ اکابر کے نام مع سن وفات دیے گئے ہیں جن کا نام تاریخ حدیث میں مستقل سند کا درجہ رکھتا ہے۔ مولانا شمس الحق افغانی فرماتے ہیں کہ مقام ابی حنیفہ کے پہلے تین ابواب میں تفقہ کا شرعاً محمود اور مطلوب ہونا ثابت کیا گیا ہے جس کے لیے قرآنی آیات، احادیث اور تعامل صحابہ سے استدلال کیا گیا اور نقول کا پورا ذخیرہ پیش کیا گیا ہے۔ (ص ۱۶)

باب چہارم میں امام اعظمؒ کے علمی مقام کو مختلف حوالوں سے واضح کیا گیا ہے۔ یہی باب فقہ حنفی کی مقبولیت اور آپ کے اراکین شوریٰ کے تعارف وخدمات کو بھی اپنے اندر سموئے ہوئے ہے۔ واضح کیا گیا ہے کہ جب آپ کی ولادت ہوئی تو کوفہ میں حضرات صحابہ کرام کی بعض شخصیات موجود تھیں۔ انہوں نے اکابر سے علمی استفادہ کیا اور فقہ میں اعلیٰ مقام حاصل کیا۔ بڑے بڑے علما آپ کے کمال اور خوبی کی تعریف وتوصیف میں رطب اللسان ہیں۔ اس سلسلے میں تاریخ بغداد، تہذیب التہذیب، مناقب موفق اور مناقب کردی وغیرہ کے حوالوں سے آپ کی فقہی شان باحوالہ بیان کی گئی ہے۔ ایک ایک رائے اتنی جامع اور وافی ہے کہ امام اعظمؒ کی عظمت پر مہر ثبت کر دیتی ہے۔ امام اعظمؒ کی ولادت کی بشارت بزبان حدیث مبارکہ، آپ کے فارسی الاصل ہونے کا تحقیقی ثبوت اور اس بارے میں امت کے مقتدر بزرگان کا ایمان وایقان بشارت کی فصل

میں موجود ہے۔ آپ کی کاروباری دیانت اور امانت کی پاسداری کو تاریخی حقائق کی روشنی میں ثابت کیا گیا ہے۔ بنو امیہ کے آخری بادشاہ مروان کی طرف سے مقرر کردہ جابر گورنر یزید بن عمرو نے اپنے سیاسی اقتدار کے استحکام کے لیے آپ کو عہدۂ قضا کی پیش کش کی اور آپ کے انکار کی پاداش میں آپ کو مسلسل بارہ دن تک ۱۲۰ کوڑوں کی سزا دی گئی۔ اس کے بعد عباسی دور میں ابوجعفر منصور کے ظلم واستبداد کی خونیں اور دلخراش داستان بیان کی گئی ہے جب آپ کو تیس کوڑے مارے گئے اور آپ کا جسم خون آلود ہو گیا۔

فقہ حنفی کی مقبولیت کے ذیل میں شیخ الحدیثؒ نے ان سب عوامل کا گہرا تجزیہ پیش کیا ہے جن کی بدولت امت مسلمہ میں فقہ حنفی کو مقبولیت عامہ حاصل ہوئی۔ اسی طرح فقہ حنفی کے متعلق دروغ گوئی کرنے والے حضرات کی تنقیدات کا جائزہ پیش کیا ہے کہ ان کی مدار محض جہالت ہے اور فرضی واقعات سے امت کو گمراہ کرنے کی مذموم کوشش کی گئی ہے۔ شیخ الحدیثؒ نے اپنے مطالعہ کا ماحصل یوں بیان کیا ہے کہ امام صاحب کی فقہ اس لیے مقبول رہی ہے کہ اس کے اصول وضوابط شوریٰ کے ذریعے طے ہوتے رہے ہیں، چنانچہ کوفہ کے اندر کتاب وسنت کی روشنی میں وضع قوانین اور حل حوادث کے لیے ایک مجلس شوریٰ قائم کی تھی جس کے امام اعظم سربراہ تھے اور ان کی سربراہی میں اہل علم غور وخوض کرتے تھے۔ بحث وتمحیص کے بعد اگر کسی رائے پر متفق ہو جاتے تو اسے قید تحریر میں لاتے تھے۔ اس ضمن میں حضرت شیخ الحدیثؒ نے آپ کی مجلس شوریٰ کے اراکین کے نام اور ان کی فقہی صلاحیت کے متعلق تاریخی حوالے پیش کیے ہیں۔ ملا علی قاریؒ کے حوالے سے تاریخی کام کا مکمل حوالہ پیش کرتے ہوئے آپ نے لکھا ہے کہ ’’امام صاحب نے تراسی ہزار مسئلے طے کیے، ان میں اڑتیس ہزار عبادات سے متعلق اور باقی معاملات سے متعلق تھے۔‘‘ (ص ۱۰۵)

کتاب کے پانچواں باب میں حضرت امام اعظمؒ اور علم حدیث کے ذیل میں فن روایت اور علم حدیث میں آپ کے رتبے کو بیان کیا گیا ہے۔ حضرت شیخ الحدیثؒ ملا علی قاریؒ کا تاریخی حوالہ دیتے ہوئے رقم طراز ہیں: ’’امام ابوحنیفہؒ نے اپنی تصانیف میں ستر ہزار سے کچھ اوپر حدیثیں بیان کی ہیں اور چالیس ہزار احادیث سے کتاب الآثار کا انتخاب کیا ہے۔‘‘ (ص ۱۱۴) حضرت شیخ الحدیث نے اسی باب میں شبلی نعمانیؒ کے اس اعتراض کے جواب میں کہ امام صاحب کی اپنی کوئی تصنیف نہیں تھی اور حتیٰ کہ ’’الفقہ الاکبر‘‘ بھی ان کی اپنی تالیف نہیں تھی، تاریخ اہل حدیث ص ۶۶ سے حوالہ دیا ہے کہ امام ابن تیمیہ ’’منہاج السنۃ‘‘ میں فقہ اکبر کو حضرت امام اعظمؒ کی تصنیف قرار دیتے ہیں۔ پس مولانا شبلیؒ کے انکار کی بنا پر اسے معرض بحث میں لانے کی ضرورت نہیں۔ مزید وضاحت کرتے ہوئے رقم طراز ہیں کہ ’’امام صاحب کی تصانیف سے وہ املائی تصانیف ہیں جن کو ان کے لائق اور قابل قدر تلامذہ مثلاً امام ابویوسف وغیرہ امام صاحبؒ کی تعلیم وتدریس کے وقت قید تحریر میں لاتے تھے، کیونکہ ان کی مجلس شوریٰ کے اجلاس میں ایک ایک مسئلہ پر کئی کئی دن غور وخوض ہوتا تھا۔ پھر آپ فرماتے تھے کہ اب مسئلہ کو لکھ لو اور بجائے سینہ کے سفینہ میں محفوظ کر لو۔ اور امام صاحب کی ان املائی کتابوں میں ستر ہزار سے زیادہ حدیثیں موتیوں کی طرح بکھری ہوئی ہیں۔‘‘ (ص ۱۱۷)

اس سلسلے میں شیخ الحدیث ’’الخیرات الحسان‘‘ لابن حجر مکی کا حوالہ نقل کرتے ہیں کہ ’’اس بات سے پرہیز کرنا کہ تم یہ وہم کرنے لگو کہ امام اعظم کو فقہ کے بغیر اور کسی علم کی خبر تام نہ تھی۔ حاشا للہ۔ امام ابوحنیفہؒ علوم شرعیہ تفسیر، حدیث اور علوم ادبیہ

وقیاس فنون میں بحرِ بیکراں اور امام تھے جن کا مقابلہ نہیں کیا جا سکتا۔ ان کے بعض دشمنوں کا ان کے بارے میں اس کے خلاف کچھ کہنے کا سبب محض حسد اور معاصرانہ چشمک، جھوٹ وبہتان کی الزام تراشی ہے۔ (ص ۱۲۶)

باب پنجم ہی کی ایک فصل میں حضرت امام ابوحنیفہ کی ثقاہت کے ذیل میں امام یحییٰ بن معین کا حوالہ دیتے ہوئے شیخ الحدیث لکھتے ہیں کہ امام ابوحنیفہ ثقہ تھے اور وہ اسی حدیث کا حوالہ دیتے تھے جو ان کو متن اور پوری سند کے ساتھ ازبریاد ہوتی تھی۔ جو حدیث ان کو یاد نہ ہوتی تھی، وہ اس کو بیان نہیں کرتے تھے۔ اس پر تفصیلی بحث کرتے ہوئے آپ مولف نتائج التقلید کی کج فہمی، کج بحثی اور یاوہ گوئی کی بڑے بھرپور انداز میں قلعی کھولتے ہیں۔

احترام حدیث وحب محدثین اور حدیث میں احتیاط کے حوالہ سے امام اعظمؒ کے عمل کی تفہیم وتعبیر وتشریح بھی اسی باب میں پورے تفصیلی مواد کے ساتھ موجود ہے اور اس موضوع پر تحقیق کرنے والوں کے لیے کشادگی فکر ونظر کا بڑا سامان رکھتی ہے۔ قلت حدیث کے الزام کی وضاحت کرتے ہوئے شیخ الحدیث لکھتے ہیں: ’’آپ کو قلیل الحدیث بلکہ یتیم الحدیث کے تیر سے زخمی کیا گیا ہے۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ آپ کو تو صرف سترہ حدیثیں معلوم تھیں اور اس کے اثبات کے لیے ممتاز مورخ ابن خلدون کے نامکمل حوالے کے دامن میں پناہ ڈھونڈی گئی۔‘‘ آپ نے اس باب میں تاریخ ابن خلدون سے مکمل حوالہ بغیر قطع وبرید کے نقل کر کے مبغضین اور متعصبین کے جھوٹ کا پول کھول دیا ہے۔

غیر مقلدین کی طرف سے امام اعظمؒ کو اہل رائے کہا جاتا ہے۔ حضرت شیخ الحدیث نے اس موضوع پر تفصیلی کلام کرتے ہوئے رائے کے لغوی اور اصطلاحی معنوں کی بحث کرتے ہوئے امت کے کئی اصحاب رائے کے تاریخی وتحقیقی حوالے نقد ونظر کے لیے فراہم کیے ہیں۔ اس ضمن میں حضرت مجدد الف ثانیؒ کے مکتوبات اور حضرت شاہ ولی اللہ کی حجۃ اللہ البالغہ سے حوالہ جات دیے ہیں اور سوال اٹھایا ہے کہ کیا رائے کے بغیر حدیث سمجھی جا سکتی ہے؟ پھر خود ہی اس کی وضاحت کرتے ہوئے فرمایا ہے کہ حدیث سے استغنا برت کر محض رائے پر بھروسہ کرنا انسان کو ورطہ حیرت میں ڈال دیتا ہے۔ اس طویل بحث کو سمیٹتے ہوئے یہ واضح کیا ہے کہ امام اعظم کس وقت رائے قائم کرتے تھے؟ اس بات کی تائید آپ کے بیان کے حوالہ سے لکھتے ہیں کہ ’’میں کتاب اللہ کو لیتا ہوں، اگر اس میں حکم نہیں پایا جاتا تو سنت رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو لیتا ہوں، اگر کتاب وسنت میں حکم نہیں پاتا تو حضرات صحابہ کرام کے قول کو لیتا ہوں۔ ان میں سے جس کا قول (امر واقعہ کے قریب پاتا ہوں) چاہتا ہوں، لے لیتا ہوں اور جس کا قول (امر واقعہ سے دور پاتا ہوں) چاہتا ہوں چھوڑ دیتا ہوں، لیکن سب حضرات صحابہ کرام کے قول کو چھوڑ کر اور کسی کے قول کو نہیں لیتا۔ جب معاملہ ابراہیم، شعبی، ابن سیرین، حسن، عطاء، سعید بن مسیب تک پہنچتا ہے تو جیسے انہوں نے اجتہاد کیا، میں بھی عقل وفکر کے مطابق اجتہاد کرتا ہوں۔‘‘ (ص ۱۸۳)

باب ششم میں غیر مقلدین کی طرف سے مذموم رائے کے من گھڑت معیارات کے تنقیدی مطالعہ پر توجہ مرکوز کی گئی ہے۔ اس باب میں آپ نے رائے مذموم اور اکابرین کی فکر کی توضیحات پیش کی ہیں۔ رائے کی حقیقت، ضرورت، اہمیت اور اس کی قدر ومنزلت پر بحث کرتے ہوئے مذموم رائے کا جانب دارانہ انداز فکر واقع کیا ہے اور اکابرین کی رائے کو بلاوجہ مذموم قرار دینے کی روش کا تحقیقی جواب دیا ہے۔ پھر باب کے آخر میں ابن تیمیہؒ کی ایک طویل عبارت پیش کر کے فرماتے ہیں: ’’شیخ الاسلام کی اس صریح عبارت سے ثابت ہوا کہ صحابہ کرام اور جمہور امت رائے، اجتہاد اور قیاس کے قائل تھے اور

جس قیاس کی مذمت کرنے کا ذکر آیا ہے، وہ ایسا قیاس اور رائے ہے جو نص کے مقابلہ اور معارضہ میں ہو اور اس کے مردود ہونے میں کہاں شک وشبہ ہوسکتا ہے اور امت محمدیہ میں ایسے مردود قیاس کا قائل کون ہے؟'' (ص ۱۰۲)

اسی باب میں حضرت امام ابوحنیفہؒ پر مخالفت حدیث کے الزام کی حقیقت کھولتے ہوئے مسکت جواب دیا گیا ہے۔ مختلف مواقع پر رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے احکامات کے حوالہ سے حضرات صحابہ کرام کے اعمال کی روشنی میں ایسی علمی وتحقیقی بحث پیش کی ہے جس کا مطالعہ غبی انسان پر بھی اس الزام کی حقیقت کھول دے۔ بحث کے آخر میں الزامی جواب کے طور پر حدیث حسن کو قبول نہ کرنے کے ضمن میں امام بخاریؒ کے مسلک کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا: ''علم حدیث کے ساتھ شغف رکھنے والے اور اصول حدیث وطبقات رواۃ سے آگاہ افراد جانتے ہیں کہ سینکڑوں ہی نہیں بلکہ ہزاروں حدیثیں سند کے لحاظ سے حسن ہیں اور صرف ایک ہزار حسن حدیث تو امام حماد بن سلمہ سے مروی ہیں۔ تو کیا ایسی تمام حسن قسم کی روایات کتب حدیث سے چن چن کر ان کی فہرست مرتب کر دینی چاہیے اور معتبر محدثین سے باحوالہ ان کا حسن ہونا نقل کر دینا چاہیے اور کتابوں، رسالوں، اخباروں اور تقریروں میں جماعتی شکل میں یہ مکروہ پراپیگنڈا شروع کر دیا جائے کہ امام بخاریؒ تو اتنی حدیثوں کے منکر تھے؟ حاشا وکلا کہ اس سے کوئی منصف مزاج اہل علم متاثر ہو کر حضرت امام بخاریؒ کے خلاف کچھ کہنے پر آمادہ ہو۔ بس یہی کہے گا کہ چونکہ امام بخاری مجتہد تھے، انہوں نے اپنی دیانت اور صوابدید سے ایسا کیا ہے۔ اسی طرح اگر امام اعظمؒ نے روایات کے بارے میں کوئی سخت اور کڑی شرط لگائی ہو جس کے فقدان کی صورت میں وہ حدیث کو قابل احتجاج واستدلال نہیں سمجھتے تھے تو وہ کیونکر منکر حدیث اور مخالف حدیث قرار دیے جا سکتے ہیں؟'' (ص ۲۱۷)

کتاب کے باب ہفتم میں مخالفت حدیث پر ایک نفیس بحث کی گئی ہے اور اس اصولی بحث کے ذریعے مخالفت حدیث کے ضمن میں الفاظ کی مخالفت اور معانی کا لحاظ رکھنے، نہی کو حرمت یا کراہت پر اور امر کو وجوب یا ارشاد ومشورہ پر محمول کرنے کے مختلف نکات زیر بحث آئے ہیں اور فہم حدیث کے حوالے سے فقہا کے تحقیقی طرز عمل کو مثالوں کے ساتھ واضح کیا گیا ہے۔ عہد رسالت میں احکامات نبوی پر عمل کے حوالے سے صحابہ کرام کے فقہ واجتہاد کی مثالیں بیان کرنے کے بعد یہ سوال اٹھایا گیا ہے کہ کیا یہ بھی مخالفت حدیث ہے؟ اور اگر یہ مخالفت حدیث نہیں تو امام اعظمؒ کس طرح مخالفت حدیث سے متہم ہو سکتے ہیں؟

باب ہشتم، جو کہ آخری باب ہے، کا آغاز اس پیراگراف سے ہوتا ہے ''غیر مقلدین حضرات نے فقہ حنفی اور کتب فقہ حنفی اور مسائل فقہ حنفی کو ناقابل اعتبار ٹھیرانے اور عوام کو ان سے بدظن کرنے کے لیے کئی حربے اختیار کر رکھے ہیں، مگر از روئے انصاف اس پر غور نہیں کیا کہ فقہ کہ ہر جزئی اور ہر مسئلہ امام اعظمؒ کا فرمودہ نہیں ہے، بلکہ بیشتر مسائل بعد کے فقہاے کرام اور خصوصیت سے متاخرین کی تخریجات ہیں۔ ظاہر بات ہے کہ غیر معصوم کی بات میں خطا اور غلطی کا امکان موجود ہے۔'' یہ بات بھی یاد رہے کہ غیر مقلدین نے کتب فقہ سے متعلق جو حوالے سے پیش کیے ہیں، ان میں قطع وبرید سے کام لیا ہے۔ اس پورے باب میں حضرتؒ نے بڑے علمی انداز میں ایسے سوالات کے مسکت جوابات دیے ہیں اور مولف ''نتائج التقلید'' کی ہٹ دھرمی، بددیانتی اور فقہاے امت کے حوالے سے ان کی دریدہ ذہنی کا بھرپور نوٹس لیا ہے۔

دیکھا جائے تو ''مقام ابی حنیفہ'' حضرت شیخ الحدیثؒ کی تحقیقی تالیفات میں نہایت رفیع الشان تالیف کا درجہ رکھتی ہے۔ آپ نے اصل مآخذ تک رسائی اختیار کی اور موضوع کی مناسبت سے ابواب کی تقسیم بندی اور ان کے مواد کی جامعیت کو

پورے التزام کے ساتھ مدنظر رکھا ہے۔ گو کہ کتاب میں روے سخن غیر مقلدین کے اعتراضات کی طرف ہے، لیکن آپ نے دیگر کئی کتب میں موجود امام اعظمؒ کے حوالے سے کیے گئے اعتراضات کو بھی مدنظر رکھا ہے۔ حضرت امام اعظمؒ کے مقام اور شخصیت کے علمی وعملی اور دینی وفکری رویوں کی تمام تر اساسات اور آپ کی رائے کے محکم ہونے کے بارے میں امت کی نابغہ روزگار شخصیات کے اقوال کو بڑی بصیرت افروزی کے ساتھ جمع کیا گیا ہے۔ حضرت شیخ الحدیثؒ نے بڑی دقت نظری کے ساتھ اس عہد میں دستیاب علمی مواد سے اتنی عظیم الشان تحقیقی تالیف علمی دنیا کو پیش کی جو آج پچاس سال گزرنے کے بعد بھی امام اعظمؒ کے حوالے سے تحقیق کی دنیا میں صف اول کی حوالے کی کتاب ہے۔ کتاب میں شیخ الحدیث کا مخصوص اسلوب نگارش بھی نہایت شان کے ساتھ جلوہ گر ہے۔ جابجا اردو کا حسین تر شعری ذوق پوری طرح موجود ہے۔ تحقیقی کتابیں اپنے اندر حوالوں کا بھرپور سرمایہ رکھنے کے باوجود عام طور پر لطافت سے خالی ہوتی ہیں، جب کہ شیخ الحدیثؒ کے ہاں جابجا نرم روی، سلاست اور رعنائی خیال کے بھی رنگ اپنی بہار جانفزا دکھلا رہے ہیں۔ حضرت امام اعظمؒ کے مقام ومرتبہ کے تعین میں یہ کتاب فکری حوالوے سے ایک ایسی یادگار ہے جو اپنے علمی شکوہ کی بدولت ہمارے عہد کے یادگار سرمایے کی حیثیت سے یاد کی جاتی رہے گی اور امت میں حضرت امام اعظمؒ کے علمی سرمایہ کے حقیقی خدوخال سے آشنائی پیدا کرنے میں اپنے حصے کا کردار کرتی رہے گی۔

کتاب اپنے صوری اور معنوی محاسن کے لحاظ سے اہل علم کے لیے جس بصیرت افروزی کا مرقع ہے، اس پر ناز کیا جائے گا۔ اللہ تعالیٰ اس کتاب کے نور سے پوری امت مسلمہ کے قلوب کو روشنی اور تابنا کی عطا کرے اور حضرت شیخ الحدیثؒ کے درجات کی بلندی کے لیے سبب اور ذریعہ بنائے۔ آمین۔

ائمہ کرام کی تقلید ان مسائل میں ہے جو منصوص نہیں ہیں۔ کم علم اور ناسمجھ کو چاہیے کہ عالم اور سمجھ دار سے پوچھے اور اس پر عمل کرے، لہٰذا اس تقلید کو شرک کہنا سوء فہم کا نتیجہ ہے۔ ہاں! خدا اور رسول کے مقابلہ میں باپ دادا کی اتباع کی جائے جیسا کہ آیت کریمہ میں ذکر ہے کہ ''جب ان کو کہا جاتا ہے کہ آؤ اس چیز کی طرف جو اللہ تعالیٰ نے نازل فرمائی ہے اور رسول کی طرف تو کہتے ہیں کافی ہے ہمیں وہ چیز جس پر پایا ہم نے اپنے باپ دادا کو'' تو اس تقلید کے شرک اور حرام ہونے میں کیا شک ہے! کم فہم لوگ ایک بات اور بھی کہتے ہیں کہ مقلدوں نے اپنے اماموں کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی گدی پر بٹھایا ہوا ہے۔ یہ بات بالکل غلط ہے اور یہ لوگ غلط فہمی کا شکار ہیں، اس لیے کہ پیغمبر معصوم عن الخطا ہوتا ہے اور مجتہد اور امام کو کوئی بھی معصوم نہیں کہتا۔ مجتہد کی بات صحیح بھی ہوتی ہے اور اس سے غلطی بھی ہو جاتی ہے، جبکہ پیغمبر سے غلطی نہیں ہوتی۔ تو امام، پیغمبر کی گدی پر کس طرح بیٹھ سکتا ہے یا ان کو پیغمبر کی گدی پر کون بٹھا سکتا ہے؟ کتنی غلط بات ہے جو وہ ہمارے ذمہ لگاتے ہیں۔ پھر ہمارا نظریہ ہے کہ امام کی بات اگر خدا اور رسول کے خلاف ہو تو اس کو چھوڑ دو، اس پر عمل نہ کرو۔ تو یہ ہم پر محض الزام لگاتے ہیں۔

(ذخیرۃ الجنان ۵/۳۱۲)

ڈاکٹر خواجہ حامد بن جمیل*

’’عیسائیت کا پس منظر‘‘ ۔۔۔ ایک مطالعہ

قیام پاکستان کے بعد گوجرانوالہ میں پادری و مسیحی مبلغین تبشیری و اسلام مخالف سرگرمیوں میں بہت فعال رہے ہیں۔ ان میں پادری عبدالقیوم، اے۔ ڈیوڈ، خورشید عالم، نذیر یوسف، عنایت اللہ، آر اار جیان، اسلم برکت، الیگزینڈر دیور، کینتھ سپارٹن، انور صدیق، ڈاکٹر کندن لعل ناصر اور اب میجر (ر) ٹی ناصر بہت نمایاں ہیں۔ چرچ آف سینٹ پال، ڈسکہ روڈ، گوجرانوالہ؛ چرچ آف سینٹ فرانسیس زیونیر، حافظ آباد روڈ، گوجرانوالہ، کامیاب کتابیں، معرفت سوسائٹی، بنیادی تعلیم بالغاں گوجرانوالہ: نرالی کتابیں، سول لائینز گوجرانوالہ اور تھیولاجیکل سیمنری گوجرانوالہ کے علاقہ میں فلاحی اور بشارتی سرگرمیوں میں اہم کردار کر رہی ہیں۔ (۱) ’’مسیحی خادم‘‘، ’’مزدور‘‘، ’’جستم‘‘ اور ’’کلام حق‘‘ جیسے کئی جرائد اپنا اپنا کام خاموشی سے جاری رکھے ہوئے ہیں۔ (۲) ان میں ’’کلام حق‘‘ متشددانہ اور جارحانہ رویہ اختیار کیے ہوئے ہے۔ یہ مجلہ گوجرانوالہ سے ۱۹۶۵ء سے مسلسل شائع ہو رہا ہے۔ پہلے یہ آنجہانی ڈاکٹر کندن لعل ناصر (۳) کی ادارت میں اور پھر ان کے بیٹے میجر (ر) ٹی۔ ناصر کی نگرانی میں شائع ہوتا رہا۔

گوجرانوالہ میں مسیحی و تبشیری سرگرمیوں کی روک تھام اور ’’کلام حق‘‘ ایسے جرائد میں شائع ہونے والے مضامین کا جائزہ لینے کی جتنی ضرورت تھی، بدقسمتی سے اس علاقہ کے بڑے علما اتنے ہی غافل نظر آتے ہیں۔ البتہ غفلت و تساہل کے اس ماحول میں دو کتب ایسی ہیں جن کا مطالعہ مسیحیت کے حوالہ سے ذکر ہوتا ہے اور انہیں علمی وقعت و مقام بھی حاصل ہے:

۱۔ حافظ محمد گوندلوی (۴) کی کتاب ’’اثبات التوحید بابطال التثلیث‘‘۔ یہ کتاب پادری عبدالحق صاحب کی کتاب ’’اثبات التثلیث فی التوحید‘‘ (پنجاب ریلجس بک سوسائٹی، لاہور، بار اول ۱۹۶۹ء) کے جواب میں تحریر کی گئی ہے۔ پادری عبدالحق مسیحیوں کے مشہور مبلغ و مناظر تھے۔ وہ گوجرانوالہ کے قریب گاؤں جواتیاں کے ایک مسلم گھرانے میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد کا نام مولوی محمد عظیم تھا۔ عبدالحق عین شباب میں مرتد ہو گئے۔ منطق و فلسفہ ان کا پسندیدہ موضوع تھا اور اس کی چھوٹی بڑی تمام اصطلاحیں انہیں از بر تھیں جنہیں وہ بے تکلفی سے مناظرے میں استعمال کرتے تھے۔ تقسیم ہند کے بعد وہ آگرہ چلے گئے اور ۱۹۸۰ء میں چندنی گڑھ (پنجاب، بھارت) میں فوت ہوئے۔

ایک مرتبہ توحید و تثلیث کے مسئلہ پر حافظ محمد گوندلویؒ سے ان کی بحث ہوئی۔ اس سے کچھ عرصہ بعد حافظ صاحب کی ملاقات علامہ سید سلیمان ندویؒ (ولادت: ۲۲/نومبر ۱۸۸۴ء/۱۳۰۲ھ، وفات: ۲۲/نومبر ۱۹۵۳ء/۱۵/ربیع الاول ۱۳۷۳ھ) سے ہوئی۔ دوران ملاقات حافظ صاحب نے اس بحث کا تذکرہ کیا اور چند پہلوؤں کی وضاحت کی۔ سید صاحب نے ان کو

* اسسٹنٹ پروفیسر، شعبہ علوم اسلامیہ، جی سی یونیورسٹی، فیصل آباد

مشورہ دیا کہ اس بحث کو آسان زبان میں منتقل کر کے رسالہ کی صورت میں شائع کر دینا چاہیے۔ چنانچہ انہوں نے اسے لکھ کر کاتب کو دے دیا۔ چار پانچ روز بعد معلوم ہوا کہ کاتب سے یہ مسودہ گم ہو چکا ہے۔ حافظ صاحب حسب عادت خاموش ہو گئے اور کسی قسم کے ملال کا اظہار نہیں کیا۔ اب انسے دوبارہ لکھا اور کاتب کو دے دیا۔ اتفاقاً پہلا مسودہ بھی کاتب کو مل گیا۔ دونوں مسودوں کا مقابلہ کیا گیا تو بالکل ایک تھے، کہیں کوئی فرق نہیں تھا۔ (۵)

دوسری اہم کتاب مولانا محمد سرفراز خان صفدر کی ’’عیسائیت کا پس منظر‘‘ ہے۔ (۶) مولانا صفدرؒ نے اس کتاب کو ۱۹۶۲ء میں تحریر کیا تھا جس کی اشاعت کے بعد انارکلی، لاہور کے چرچ کے انچارج پادری پطرس گل اپنے ایک ساتھی پادری کے ساتھ گکھڑ آئے اور اس کتاب کے موضوعات پر گفتگو کے بعد لاجواب ہو کر گئے تھے۔ (۷) ’’عیسائیت کے پس منظر‘‘ کے اندر بڑے مباحث: دنیا میں مسیحیت کی ترقی کے اسباب، صداقت اسلام پر مسیحیوں کی شہادت، حضرت عیسی علیہ السلام صرف بنی اسرائیل کے نبی تھے، بائبل میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق پیشین گوئیاں، حواریوں اور صحابہ کرام کے مابین موازنہ، توہین انبیا، تحریف بائبل اور تثلیث و ابنیت مسیح ہیں۔ ان سب پر مولانا سرفراز خان صفدرؒ نے مسیحی ماخذ کی روشنی میں سیر حاصل، مدلل و منطقی گفتگو بڑے سلیقے اور جامعیت سے کی ہے۔

قیام پاکستان کے بعد ۱۹۶۰ء کی دہائی تک مسیحیوں کی تعداد بہت زیادہ بڑھی، جس پر صرف علماے حق اور اخباری طبقہ ہی پریشان نہیں ہوا بلکہ خود حکومت پاکستان نے اس پر تشویش کا اظہار کیا۔ مولانا نے اس کے اسباب کی نشاندہی کی اور کہا کہ:

> ’’بعض لوگوں کے اسلام سے متنفر ہونے کا سبب خود مسلمانوں کا غیر اسلامی کردار اور شعائر اسلام سے بے پروائی اور غفلت ہے۔ تاریخ بتاتی ہے کہ ایک وہ دور تھا، جس میں مسلمانوں کے اجتماعی ماحول اور ان کی شکلوں اور ان کے کردار اور گفتار سے متاثر ہو کر لوگ مسلمان ہوتے تھے‘‘۔ (۸)

مسیحی، مخالفین اسلام اور بالخصوص مستشرقین نے یہ شوشہ چھوڑ رکھا ہے کہ اسلام چونکہ بزور شمشیر پھیلا ہے اور مسیحیت محبت کا مذہب ہے، اس لیے عالم اسلام اور خاص کر پاکستان کے مسلمان اسلام چھوڑ کر بڑی رغبت سے مسیحیت قبول کر رہے ہیں۔ اگر مسلم مآخذ سے یہ ثابت کیا جائے کہ اسلام اپنی حقانیت اور صداقت کی وجہ سے دنیا میں چمکا اور پھیلا ہے تو مسیحی اقوام کے لیے اس میں کوئی وزن نہ ہوتا، کیوں کہ جب اسلام کو وہ سچا نہیں سمجھتے تو اس کی کتب اور مآخذ کی ان کی ہاں کیا قدر و منزلت ہوگی۔ اس لیے ضروری تھا کہ اس باب میں انہی کے اقوال پیش کیے جاتے جس سے یہ ثابت ہو کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اخلاق حسنہ کی تابانی نے تھوڑے ہی عرصے میں کرہ ارض کو روشن اور منور کیا اور بالآخر عرب و عجم کو حق کی آواز کے سامنے سرنگوں ہونا پڑا۔ اس سلسلہ میں مولانا صفدرؒ نے معروف مستشرقین کی کتاب سے گیارہ اہم اقتباسات مع حوالہ جات نقل کیے ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ اسلام کی ذاتی کشش اور جاذبیت نے ہی لوگوں کے دلوں میں اس کی قبولیت کے لیے قلوب اور اذہان کو متاثر کیا نہ کہ زور و جبر نے، جب کہ مسیحیت کے فروغ کا واحد ذریعہ دولت و عورت اور صنفی حربے ہیں، جس کی وجہ سے وہ دین سے بے بہرہ مگر دنیا کے حریص اور لالچی اشخاص و افراد کو اپنا بنا لیتے ہیں۔ (۹)

یہاں مولانا نے حیرت اور افسوس کا اظہار کیا ہے کہ پادری جو دنیا بھر میں مسیحیت کی تبلیغ کرتے پھرتے ہیں، ان کا یہ عمل حضرت مسیح علیہ السلام کی تعلیمات سے مطابقت نہیں رکھتا کیونکہ حضرت مسیح صرف بنی اسرائیل کی طرف مبعوث ہوئے تھے

اور انہوں نے کبھی غیر اسرائیلیوں کو تبلیغ نہیں کی بلکہ ایک کنعانی عورت ان کی خدمت میں استفادہ کرنے کے لیے آئی تو وہ خاموش ہو گئے اور بہت اصرار کے بعد گویا ہوئے:

''میں اسرائیل کے گھرانے کی کھوئی ہوئی بھیڑیوں کے سوا کسی اور کے لیے نہیں بھیجا گیا'' (متی ۱۵:۲۴۔۲۶)

مزید یہ کہ حضرت مسیح نے جب اپنے حواریوں کو تبلیغ کے لیے بھیجا تو انہیں اس بات کا پابند کیا کہ ''غیر قوموں کی طرف نہ جانا''۔ (متی ۱۰:۶) اس کے بعد مولانا مسیحیوں کے تمام فرقوں میں تبلیغ کے جواز کو تفصیلی دلائل سے باطل قرار دیتے ہیں۔ (۱۰) حضرت مسیح علیہ السلام کی نبوت چونکہ صرف بنی اسرائیل تک محدود تھی، اس لیے انہوں نے اپنے حواریوں اور شاگردوں کے توسط سے تمام دنیا کو یہ خوشخبری سنائی کہ میرے بعد ایک ایسے عظیم الشان ہادی تشریف لائیں گے جو تمام اقوام عالم اور ساری دنیا کو تبلیغ کریں گے۔ اس سلسلہ میں حضرت مولانا نے یوحنا ۱۵:۳۰، یوحنا ۱۶:۱۳،۱۔ کرنتھیوں ۱۳:۹۔۱۰ اور یوحنا ۱۴:۱۵ کی بشارتوں کا حوالہ دے کر مسیحیوں کے اس موقف کا سختی سے رد کیا ہے کہ یہ بشارات حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے متعلق نہیں ہیں۔

''عیسائیت کا پس منظر'' کا بڑا حصہ حضرت مسیح کے حواریوں کے کردار اور حضرات صحابہ کرامؓ کے خصائص کے موازنہ پر مشتمل ہے۔ بائبل حضرت مسیح کے ساتھیوں اور حواریوں کی جو تصویر دکھاتی ہے۔ اس کے مطابق:

۱) حواری ایمان وعمل دونوں میں کمزور تھے اور روزے تک نہیں رکھتے تھے۔

۲) حضرت مسیح علیہ السلام کی والدہ اور بھائی (مسیحی نقطہ نظر کے مطابق) خداوند کی مرضی پر چلنے والے نہیں تھے۔

۳) پطرس حواری کو انہوں نے اپنے لیے ٹھوکر کا باعث قرار دیا کیوں کہ وہ خدا کی باتوں کا نہیں بلکہ آدمیوں کی باتوں کا دھیان رکھتا تھا۔ (متی ۱۷:۲۳؛ مرقس ۸:۳۳)

۴) مسیح علیہ السلام کے ایک شاگرد یہوداہ اسکریوتی نے انہیں پکڑوانے سے بھی گریز نہیں کیا۔ (متی ۲۶:۱۴۔۵۰؛ مرقس ۱۴:۴۴۔۴۵؛ لوقا ۲۲:۴۷۔۴۸)

اس کے برعکس صحابہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی جاں نثاری کا جو فقید المثال جذبہ موجود تھا، اس کی مثال میں مولانا نے تاریخ اسلام کے اس درخشندہ دور سے سولہ واقعات (۱۱) پیش کر کے یہ ثابت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اصحاب نے رضائے الٰہی کے لیے استقامت علی الدین اور آپ کی ذات گرامی کے لیے وہ قربانی اور ایسا ایثار کیا ہے جس کی نظیر دیگر انبیا اور بالخصوص حضرت مسیح علیہ السلام کے شاگردوں حتیٰ کہ بارہ قریبی حواریوں میں بھی نہیں پائی جاتی۔

اللہ تعالیٰ نے جن برگزیدہ شخصیات کو لوگوں کے رشد وہدایت اور اصلاح وتزکیہ کے لیے انتخاب فرمایا، انھیں رذائل اور آلائشوں سے بھی محفوظ رکھا، لیکن جب بائبل کا مطالعہ کرتے ہوئے انبیاے کرام کے بارے میں گندی اور فحش باتیں اور مکروہ ودل آزار افعال اور ایسے برے اور قبیح اعمال نظر آتے ہیں تو ان کو پڑھ کر حیا کے مارے آنکھیں زمین میں گڑ جاتی ہیں۔ مولانا محمد سرفراز خان صفدرؒ نے اپنی کتاب میں بجا طور پر ان واقعات کو رنگین مزاج مصنفین بائبل کی رنگ رلیوں اور عیش کوشیوں کا ثمرہ قرار دیا ہے۔ ان کا یہ موقف جدید تحقیقات کی روشنی میں حق پر مبنی ہے کہ ان خواہش کے اندھوں نے انبیاے کرام علیہم السلام اور ان کی نیک اولاد کی طرف بہت سی بے سروپا باتیں تحریر کر کے اپنے لیے تکمیل خواہش کا چور دروازہ

تیار کر لیا ہے تا کہ ان پر کسی کو اعتراض کرنے کی جرات اور ہمت نہ ہو اور وہ دنیا کی ہر عورت سے جائز ونا جائز مباشرت کر کے آتش خواہش بجھاتے رہیں۔ (۱۲)

بائبل کو جو شخص اس قسم کے مضمون سے پر دیکھتا ہے، تو وہ اس نتیجے پر پہنچتا ہے کہ یہ ہرگز ہرگز خدا کا کلام نہیں ہے۔ پھر اندرونی اور بیرونی قرائن وشواہد اس بات کو اہم ثبوت فراہم کرتے ہیں۔ اس ضمن میں مولانا صفدرؒ نے درج ذیل دلائل وبراہین پر مفصل گفتگو کی ہے:

۱) قرآن کی طرح تورات کی باقاعدہ تلاوت وحفظ کا کوئی حکم یا رواج نہیں تھا۔

۲) حضرت موسیٰ علیہ السلام نے تورات کا صرف ایک ہی نسخہ تیار کرایا تھا۔ (استثناء ۳۱:۲۴۔۲۶)

۳) تورات صرف ساتویں سال کے بعد پڑھ کر سنائی جاتی تھی۔ (استثناء ۳۱:۹۔۱۲)

۴) جو نگران اور محافظ تورات کی حفاظت پر مامور تھے، خود بائبل ان کی اخلاقی پستی کا رونا روتی ہے۔ (یرمیاہ ۲۳:۱۰۔۱۱)

۵) بنی اسرائیل اپنی دینی غفلت، بدکاری اور بت پرستی کی وجہ سے تورات کی عبارت سمجھنے سے قاصر تھے۔ (عزرا ۷:۱۱)

۶) حضرت یرمیاہ نے صرف صاف الفاظ میں بنی اسرائیل سے اس بات کا شکوہ کیا ہے کہ

''تم نے زندہ خدا رب الافواج ہمارے خدا کے کلام کو بگاڑ ڈالا ہے۔'' (یرمیاہ ۲۳:۳۶)

۷) تغافل شعاری کی وجہ سے معدوم ہو جانے والے قدیم صحف وکتب کو سینکڑوں سالوں بعد تنہا عزرا نے از سر نو محض حافظہ کی بنیاد پر تحریر کیا۔

۸) تورات پر فاتح حکمرانوں کی جانب سے پابندی رہی۔

۹) یہود نے بعض کتب کو کھو دیا اور بعض کو پھاڑ ڈالا۔

عہد نامہ جدید کی تاریخ اور تحریف کے متعلق بھی انہوں نے ٹھوس اور صریح حوالہ جات کے ذریعہ اہم باتیں لکھی ہیں:

۱) ابتدائی ڈیڑھ سو سال میں اناجیل کو کوئی مستند حیثیت حاصل نہ تھی۔

۲) اناجیل کے قدیم نسخوں میں اختلاف عبارت میں زیادہ ہے۔

۳) ڈاکٹر مل نے عہد جدید کے نسخوں کا تقابل کرنے کے بعد تیس ہزار اختلاف نکالے۔ اسی طرح گریسباخ نے ڈیڑھ لاکھ اختلاف عبارات کی نشاندہی کی ہے۔

۴) مصنفوں کے اصل نوشتے موجود نہیں ہیں۔

۵) محققین بائبل کے لیے اصلی یا خالص عبارت کو دروغ آمیز عبارت سے تمیز کرنا مشکل ہے۔

۶) مسیحیوں نے اپنی مقدس کتب میں دیدہ دانستہ فریب کارانہ انداز سے ردوبدل کیا ہے۔

۷) یہیں پر بس نہیں، بہت سارے فریب کاروں نے انجیل کے نام پر خود کتابیں لکھ ماریں۔

ان نکات پر تفصیلی گفتگو کے بعد مولانا محمد سرفراز خان صاحب صفدرؒ استفہامیہ صورت میں جو نتیجہ پیش کر رہے ہیں، وہ مسیحیت پر سخت چوٹ اور کاری ضرب سے کم نہیں ہے۔ آپ لکھتے ہیں:

''اس انجیل مقدس اور کتاب مقدس پر جن مسائل کی بنیاد رکھی جائے گی وہ کہاں تک صحیح ہو سکتے ہیں؟ اور ان کی

صحت کو کس طرح تسلیم کیا جا سکتا ہے؟ اور ان کو مدارِ نجات کیوں کر قرار دیا جا سکتا ہے؟ عام اس سے کہ وہ مسئلہ تثلیث ہو یا مسئلہ ابنیت مسیح علیہ السلام یا کفارہ ہو؟ کسی مسئلہ کو بھی ہرگز صحیح نہیں کہا اور یقین کیا جا سکتا ہے، کیوں کہ جن کتابوں میں یہ مسائل مندرج ہیں، وہ خدائی اور الہامی ہیں ہی نہیں بلکہ جعلسازوں اور فریب کاروں کی مکاری کا پلندہ ہیں۔''(۱۳)

غرض اس کتاب میں مختصر طور پر اسلام اور نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی خصوصیات، حواریوں اور صحابہ کے ایمان وکردار کا تقابل، توہین انبیا، عہد نامہ قدیم وجدید میں تحریف، تثلیث، ابنیت مسیح اور مسئلہ کفارہ پر شاندار اور مدلل انداز سے بحث موجود ہے اور مولانا صفدرؒ نے مسیحیت کے بنیادی عقائد کا نقلی وعقلی دلائل سے خوب جائزہ لیا ہے۔ ان کے علاوہ بھی درجنوں مسائل کھل کر سامنے آ گئے ہیں اور پادریوں کی بعض فرسودہ اور بے جا تاویلات کی حقیقت طشت از بام کر کے رکھ دی گئی ہے۔

حوالہ جات

۱۔ ڈاکٹر محمد نادر رضا صدیقی: پاکستان میں مسیحیت، (مسلم اکادمی، لاہور، ۱۳۹۹ھ/۱۹۷۹ء)، متعدد مقامات

۲۔ Emmanual Zafar : A Concise History of Pakistan Christianr,(Humpookhan Publication, Lahore, [2007]) p267-268)

۳۔ ولادت: ۸/جنوری ۱۹۱۸ء/۲۳/ربیع الاول ۱۳۲۶، وفات: ۷/مئی وفات ۱۹۹۶ء/۱۷/ذوالحجہ ۱۴۱۶

۴۔ ولادت: ۱۸۹۷ء/۱۳۱۵ھ؛ وفات: ۴/جون ۱۹۸۵ء/۱۴/رمضان المبارک ۱۴۰۵ھ (محمد اسحاق بھٹی: نقوش عظمت رفتہ، مکتبہ قدوسیہ، لاہور، بدون تاریخ) گوندلوی صاحبؒ کی یہ کتاب اسلامیہ سٹیم پریس، لاہور (بدون تاریخ) سے شائع ہوئی۔

۵۔ محمد اسحاق بھٹی: نقوش عظمت رفتہ، ص ۱۴۵۔۱۴۶

۶۔ عیسائیت کا پس منظر، مکتبہ صفدریہ، گوجرانوالہ، طبع پنجم ۲۰۰۵ء کے کل صفحات ۱۲۸ ہیں۔

۷۔ محمد فیاض خان سواتی: حضرت مولانا محمد سرفراز خان صفدر کا مختصر سوانحی خاکہ، (ادارہ نشرواشاعت، نصرۃ العلوم، گوجرانوالہ، [۲۰۰۹ء])، ص ۱۲۔

۸۔ محمد سرفراز خان صفدر: عیسائیت کا پس منظر، ص ۱۲

۹۔ المرجع السابق، ص ۱۵۔۲۱

۱۰۔ المرجع السابق، ص ۲۶۔۳۲

۱۱۔ المرجع السابق، ص ۴۵۔۵۹

۱۲۔ المرجع السابق، ص ۸۵

۱۳۔ المرجع السابق، ص ۱۰۵

حافظ محمد سلیمان*

حضرت شیخ الحدیث رحمہ اللہ کی تصانیف میں
تصوف وسلوک کے بعض مباحث

شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد سرفراز خان صفدر قدس سرہ کی زندگی نسل نو کی تعمیر کے لیے مثالی زندگی تھی۔ حضرت کی حیات پر طائرانہ نظر ڈالنے سے ہی دینی وفکری اعتبار سے معاشرہ کی اصلاح کے لیے جدوجہد کے مختلف گوشے واضح طور پر سامنے آجاتے ہیں۔ قرآن وحدیث کی تدریس اور مختلف موضوعات پر تحریر کی جانے والی کتب کے علاوہ سلوک وتصوف پر بھی آپ کی نظر عمیق تھی۔ حضرتؒ نے اگرچہ اس موضوع پر کوئی مستقل تصنیف نہیں چھوڑی، تاہم آپ کی تالیفات میں مختلف مناسبتوں سے سلوک وتصوف کے اہم مباحث بیان ہوئے ہیں جن کے مطالعہ سے سلوک وتصوف کے متعلق آپ کے نظریات پر خاصی روشنی پڑتی ہے۔ ذیل میں ہم سلوک وتصوف کے بعض پہلوؤں سے متعلق حضرت شیخ الحدیث رحمہ اللہ کا نقطہ نظر واضح کرنے کی کوشش کریں گے۔

روحانی تعلق

حضرت شیخ الحدیثؒ سلسلہ نقشبندیہ کے معروف بزرگ حضرت مولانا حسین علیؒ (م ۱۳۶۳ھ) کی زندگی کے آخری ایام میں ان سے بیعت ہوئے اور ان سے روحانی فیض حاصل کیا۔ حضرت فرماتے ہیں کہ میں جب بیعت کے لیے حضرت کی خدمت میں حاضر ہوا تو حضرت نے اپنے دست مبارک سے اپنی تصنیف ''تحفہ ابراہیمیہ'' کا ایک نسخہ مجھے عطا کیا اور فرمایا کہ اس کا مطالعہ کرو اور اگر کوئی بات پوچھنی ہے تو پوچھ لو۔ چنانچہ حضرت نے ڈیڑھ گھنٹے میں اس کا مطالعہ کیا اور بعض مقامات سے کچھ باتیں حضرت سے دریافت کیں اور آپ نے ان کا جواب عنایت فرمایا۔ مرشد کامل نے جوہر قابل کو پہچانتے ہوئے خلعت خلافت سے بھی سرفراز فرمادیا۔(۱) حضرت مولانا حسین علی اگرچہ مختلف سلاسل میں مجاز تھے، مگر نقشبندی طریقہ سلوک کو زیادہ اہمیت دیتے تھے اور زیادہ تر اسی میں بیعت فرماتے تھے۔ اس سلسلہ مبارکہ کی نمایاں خصوصیات میں ذکر الٰہی کی کثرت، سنت نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کی اتباع اور توحید کی تبلیغ کو بنیادی اہمیت حاصل ہے۔(۲)

حضرت شریعت وطریقت دونوں کو لازم وملزوم سمجھتے تھے۔ آپ اپنے اکابر کے متعلق اکثر فرمایا کرتے تھے کہ ''ہمارے اکابر رحمہم اللہ میں سے ہر ایک کسی نہ کسی روحانی سلسلہ سے ضرور وابستہ تھا۔'' تاہم حضرت نے مرشد کاملؒ کی طرف خلعت

*رفیق شعبہ تصنیف وتالیف، الشریعہ اکادمی، گوجرانوالہ

خلافت سے نوازے جانے کے باوجود بیعت کا سلسلہ بہت محدود رکھا۔ اکثر و بیشتر بیعت کرنے سے انکار فرما دیتے اور اگر کسی کی طرف سے بہت زیادہ اصرار ہوتا تو بیعت فرما لیتے۔ آپ کا بیعت کا طریقہ انتہائی مختصر اور سادہ تھا اور عموماً ان الفاظ سے بیعت فرماتے تھے:

''میں شرک وبدعت سے توبہ کرتا ہوں، اوامر کے بجالانے اور نواہی سے اجتناب کی پوری کوشش کا وعدہ کرتا ہوں، بالخصوص نماز کی پابندی کا وعدہ کرتا ہوں۔''

ان مختصر الفاظ کے بعد وظائف اور اوراد بتائے جاتے اور ان کی تلقین فرماتے تھے۔ (۳)

حضرت شیخ اس بات پر زور دیتے ہیں کہ کفر، شرک، نفاق، غلط رسومات اور دیگر باطنی رذائل سے تزکیہ کیا جائے۔ چنانچہ فرماتے ہیں:

''دلوں کا تزکیہ شرعاً مطلوب ہے۔ اور جو صحیح پیری مریدی ہے، ٹھگوں کی بات نہیں کرتا، ان کی بات کرتا ہوں جو صحیح معنی میں اللہ والے ہیں، ان کی پیروی مریدی اس آیت کریمہ ''ویزکیھم'' کی تشریح ہے۔ جو مرشد کامل ہیں، وہ اپنے مرید کی اخلاقی تربیت کریں گے۔ ان کو سبق دیں گے کہ تم یہ کام کرو اور فلاں کام چھوڑ دو۔ یہ وظیفہ پڑھو اور فلاں وظیفہ نہ پڑھو۔ تو اللہ تعالیٰ کے صالح لوگوں کی تعلیم وتربیت سے انسان کفر وشرک سے، رسم ورواج سے، تکبر، بغض، کینہ اور حب دنیا جیسی بیماریوں سے بچ جاتا ہے اور اصلاح ہو جاتی ہے۔''(۴)

حضرت کا تعلق اگرچہ سلسلہ نقشبندیہ سے تھا، مگر آپ کو تمام سلاسل تصوف وسلوک سے عقیدت تھی۔ فرماتے ہیں:

''ہمارے دلوں میں تمام سلاسل کے اکابر کی بے پناہ محبت وعقیدت ہے، وہ نقشبندی ہوں یا چشتی قادری ہوں یا سہروردی یا کسی اور سلسلہ سے وابستہ ہوں۔ تمام ہمارے لیے قابل ہزار احترام ہیں اور ہمارا پختہ یقین ہے کہ ان حضرات کی محبت نجات کا بہترین ذریعہ ہے۔''(۵)

عام طور پر صوفیانہ حلقوں میں یہ دیکھنے میں آتا ہے کہ اپنے ارادت مندوں کا حلقہ بڑھانے کی کوشش کی جاتی ہے، لیکن حضرت اپنے حلقہ ارادت کی توسیع اور نمود ونمایش سے گریز کرتے تھے اور مریدوں وغیرہ کے اجتماع کو پسند نہ کرتے تھے۔ عمومی حالات میں بھی ان چیزوں سے سختی سے منع اور گریز کیا کرتے تھے جو مریدین کے لیے تکلیف کا باعث ہوتے ہیں، بلکہ بسا اوقات اپنی استطاعت کے مطابق مریدین کو اپنی جیب سے کرایہ اور زاد راہ بھی عنایت فرماتے تھے۔

حضرت شیخ الحدیث تعویذ دینے اور دم کرنے میں کوئی حرج نہیں سمجھتے تھے، لیکن اس کے ساتھ بعض امور کی سختی کے ساتھ پابندی فرماتے تھے۔ فرماتے ہیں:

''جادو کرنا اور کرانا قطعاً جائز نہیں ہے۔ جائز طریقہ سے دم اور تعویذات میں کوئی حرج نہیں ہے، مگر اس کو دھندہ بنانا درست نہیں ہے۔ دم اور تعویذ ہم بھی کرتے ہیں۔ عورتیں آتی ہیں، تعویذ لیتی ہیں، پھر کہتی ہیں کہ اس کی فیس آپ کیا لیتے ہیں؟ میں کہتا ہوں کہ میں نے کبھی کسی سے کچھ مانگا ہی نہیں۔ وہ بڑی حیران ہوتی ہیں کہ فلاں مولوی

صاحب نے تو ہم سے پانچ سو مانگا ہے، فلاں نے تین سو۔ میں کہتا ہوں کہ ہمارے بزرگوں کا یہی طریقہ ہے۔ کوئی اگر خوشی سے دے جائے تو رد نہیں کرتے، لیکن مانگی کبھی نہیں۔''(۶)

صوفیانہ ذواق کو فقہا کی تحقیقات پر پرکھنا

حضرت شیخ الحدیثؒ کی تالیفات کا بنظر غائر مطالعہ کرنے سے سلوک وتصوف میں آپ کا ذوق اور رجحان واضح ہوتا ہے۔ آپ نے اسی ذوق کے مطابق زندگی گزاری اور اپنے عقیدت مندوں کو بھی اس کی تلقین فرمائی۔ چنانچہ ایسے اعمال ورسوم، جن کا جواز حضرت کی تحقیق کے مطابق قرآن وسنت سے ثابت نہیں، آپ اپنے متوسلین ومعتقدین کو ان سے گریز کی تلقین کرتے تھے۔ مثلاً نقشبندی سلسلہ کے علاوہ باقی تمام سلاسل ذکر بالجہر کو روا گردانتے ہیں، جبکہ حضرت شیخ کی تحقیق کے مطابق ایسا کرنا شرعاً روا نہیں ہے۔ اس موضوع پر آپ نے ''حکم الذکر بالجہر'' اور ''اخفاء الذکر'' کے عنوان سے دو مستقل تصانیف لکھی ہیں۔ فرماتے ہیں:

''یاد رکھنا، ذکر واذکار بھی آہستہ کرنا چاہیے۔ حدیث پاک میں آتا ہے: ''خیر الذکر الخفی''۔ بہترین ذکر وہ ہے جو مخفی ہو۔ ایک اور حدیث میں آتا ہے کہ بلند آواز سے ذکر کرنے کی بجائے آہستہ ذکر کرنے کا اجر ستر گنا زیادہ ہے، لہٰذا ذکر ایسے انداز سے کرو کہ اپنے کان سنیں، دوسروں کے کان نہ کھاؤ۔ خدا اور رسول کی بات پر عمل کرو اور دوزخ کی رسوائی سے بچو۔''(۷)

ایک دوسری جگہ ذکر بالجہر کی تردید میں حضرت مجدد الف ثانیؒ کا فرمان پیش کرنے کے بعد تبصرہ کرتے ہیں:

''لہٰذا ہم تو بحمد اللہ تعالیٰ حضرت مجدد الف ثانیؒ کے اس بہترین اور سنہری مشورے اور نصیحت پر عمل کرنے کو اپنی نجات کا ذریعہ سمجھتے ہیں۔''(۸)

نفل نماز کو جماعت کے اہتمام کے ساتھ ادا کرنے سے متعلق حضرت کا ارشاد ملاحظہ ہو:

''یاد رکھنا! نفل نماز کے لیے جماعت کا اہتمام کرنا بڑا گناہ ہے۔ تمام فقہائے کرامؒ نے لکھا ہے۔ حضرت مجدد الف ثانیؒ فرماتے ہیں کہ نفل نماز میں اگر ایک یا دو آدمی ساتھ مل جائیں تو کراہت نہیں ہے، تیسرا مل گیا تو مکروہ تنزیہی ہے اور اگر چار مل گئے تو مکروہ تحریمی ہے، حرام ہے۔ یہ تو مردوں کے لیے حکم ہے اور اب عورتوں نے بھی یہ بدعت شروع کر دی ہے کہ وہ صلوٰۃ التسبیح کے واسطے اہتمام کرتی ہیں اور ان کے لیے مسجدوں میں اعلان ہوتے ہیں۔ یہ تمام چیزیں بدعت ہیں۔ بدعت کا گناہ ہے، ثواب بالکل نہیں ہے۔ اس لیے کہ بدعت سے دین کا نقشہ بگڑ جاتا ہے۔ اپنی جگہ تہجد پڑھو، اشراق پڑھو، صلوٰۃ التسبیح پڑھو، بڑی سعادت کی بات ہے، مگر ان کی جماعت کا اہتمام کرنا بدعت ہے۔''(۹)

صوفیائے کرام کے کشف والہام اور اقوال کی حیثیت

حضرت امام اہل سنت صوفیائے کرام کے اقوال پر عمل کرنے کو روا سمجھتے تھے، لیکن جہاں صوفیا کے اقوال وافعال نصوص

قطعیہ کے معارض ہوں تو ان کو ترک کرنے میں کوئی تردد محسوس نہیں کرتے۔ فرماتے ہیں:

''حضرات صوفیائے کرامؒ کی ایسی باتیں خود قابل تاویل ہوں گی۔ مثلاً اس جہر سے ادنیٰ جہر مراد لی جائے یا تعلیم کی خاطر ہو۔ اور اگر تاویل نہ ہو سکے تو ان کو معذور سمجھتے ہوئے ان کا قول ترک کر دیا جائے گا، نہ یہ کہ ان پر مذہب کی بنیاد رکھی جا سکتی ہے۔ مذہب کی بنیاد تو قرآن کریم و حدیث شریف اور حضرات ائمہ فقہا اور خصوصاً حضرت امام ابوحنیفہ کی بات اور فقہ حنفی کی مستند ترین کتابوں پر رکھی جا سکتی ہے''۔ (۱۰)

ایک جگہ فرماتے ہیں:

''حضرت مولانا رشید احمد صاحب گنگوہیؒ سے یہ سوال ہوا کہ آپ کی فلاں مسئلہ میں یہ رائے ہے حالانکہ آپ کے پیر و مرشد اس کے خلاف کہتے ہیں تو آپ ان کی مخالفت کیوں فرماتے ہیں؟ (محصلہ) تو اس کے جواب میں آپ فرماتے ہیں:

''اور حجت قول و فعل مشائخ سے نہیں ہوتی بلکہ قول و فعل شارع علیہ الصلوٰۃ والسلام سے اور اقوال مجتہدین رحمہم اللہ تعالیٰ سے ہوتی ہے۔ حضرت خواجہ نصیر الدین چراغ دہلوی قدس سرہ فرماتے ہیں جب ان کے پیر سلطان نظام الدین قدس سرہ کے فعل کی حجت کوئی لاتا کہ وہ ایسا کرتے ہیں، تم کیوں نہیں کرتے؟ کہ فعل مشائخ حجت نہ باشد او اس جواب کو حضرت سلطان الاولیاءؒ بھی پسند فرماتے، لہٰذا جناب حاجی (امداد اللہ صاحبؒ) سلمہ اللہ کا ذکر کرنا سوالات شرعیہ میں بے جا ہے۔ فقط واللہ تعالیٰ اعلم۔'' رشید احمد گنگوہی عفی عنہ (فتاویٰ رشیدیہ ج ا ص ۹۸ طبع دہلی)''(۱۱)

امام اہل سنت عمل بالقرآن و عمل بالسنۃ کو عزیز تر سمجھتے تھے اور ایسے حضرات صوفیائے کرام جو شرکت و بدعات جیسے رذائل سے نفرت کرتے ہیں، خصوصاً حضرت شیخ احمد سرہندی مجدد الف ثانیؒ (م ۱۰۳۴ھ)، آپ انہیں آئیڈیل قرار دیتے تھے اور ایسے سلسلہ طریقت کو اختیار کرنے کی تلقین و تاکید فرماتے جو واہی و ناجائز امور سے مبرا ہو، چنانچہ حضرت مجدد الف ثانی کے مکتوبات سے نقل فرماتے ہیں کہ:

''و درمیان طرق صوفیہ اختیار کردن طریقہ علیہ نقشبندیہ اولیٰ و انسب است چہ ایں بزرگواراں التزام متابعت سنت نمودہ اند و اجتناب از بدعت فرمودہ لہٰذا اگر دولت متابعت دارند و از احوال ہیچ ندارند خرسند ند و اگر احوال رانہ مے پسندند ازیں جا سماع و رقص را تجویز نہ کردہ اند۔''

''حضرات صوفیائے کرام کے طریقوں میں سے اونچے طریقہ نقشبندیہ کو اختیار کرنا زیادہ بہتر اور مناسب تر ہے کیوں کہ ان بزرگوں نے سنت کی متابعت کا التزام کیا ہے اور بدعت سے اجتناب کیا ہے۔ اسی لیے اگر اتباع سنت کی دولت رکھتے ہوں اور احوال صوفیہؒ سے کچھ بھی نہ رکھتے ہوں تو وہ خوش ہوں اور اگر احوال کے باوجود اتباع سنت میں فتور دیکھتے ہیں تو ان احوال کو وہ پسند نہیں کرتے۔ یہی وجہ ہے کہ انہوں نے احوال سماع و رقص کو تجویز نہیں

کیا اور جو احوال سماع اور رقص پر مرتب ہوتے ہیں، ان کو وہ معتبر نہیں سمجھتے بلکہ ذکر بالجہر کو بدعت سمجھتے ہیں اور اس سے منع کرتے ہیں۔''(۱۲)

اس عبارت میں جہاں حضرتؒ سلوک و تصوف میں سلسلہ نقشبندیہ کے اولیٰ و انسب ہونے کا مدعا پیش کرتے ہیں، وہاں حضرت مجدد الف ثانیؒ کے مکتوب کے حوالے سے ان صوفیائے کرام کو بے حد توصیف و تعریف کے لائق سمجھتے ہیں جو سنت اور علوم شرعیہ کو اپنی وجدانی کیفیات اور اذواق پر مقدم سمجھتے ہیں اور سنت کے خلاف کسی بات کو قبول نہیں کرتے، رقص و سماع کو در خور اعتنا نہیں سمجھتے اور ذکر بالجہر کی طرف سرے سے توجہ اور التفات نہیں کرتے۔

اسی طرح ایک جگہ حضرت مجدد الف ثانیؒ کا یہ اقتباس نقل کرتے ہیں:

''اے نیک بخت! جو چیز ہم پر اور تم پر لازم ہے، وہ کتاب و سنت کے مطابق عقیدوں کو درست کرنا ہے، اس طریقہ پر جس پر علمائے اہل حق نے کتاب و سنت سے ان عقائد کو سمجھا ہے اور ان سے اخذ کیا ہے، کیوں کہ ہمارا اور تمہارا سمجھنا جب کہ ان کی سمجھ کے موافق نہ ہو، درجہ اعتبار سے ساقط ہے کیوں کہ ہر مبتدع اور گمراہ اپنے احکام کو کتاب و سنت سے سمجھتا ہے اور انہی سے لیتا ہے، حالانکہ اس کا سمجھنا حق کی کسی چیز سے کفایت نہیں کر سکتا۔''(۱۳)

استشفاع و توسل

استشفاع و توسل کا مسئلہ کئی اعتبار سے اپنے اندر ابہام رکھتا ہے۔ اس میں بظاہر شرک کا شائبہ پایا جاتا ہے، کیونکہ انسان آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم، صحابہ کرامؓ، شہدا و صالحین کی قبور کے پاس حاضر ہو کر اپنی مغفرت اور حوائج و ضروریات کے لیے اللہ تعالیٰ سے سفارش کراتا ہے۔ انسان کا قبر کے پاس جا کر فوت شدگان کو واسطہ بنانا بظاہر ایک نامانوس سی چیز دکھائی دیتی ہے جب کہ اللہ تعالیٰ خود انسان کی شہ رگ سے بھی زیادہ قریب ہے۔

بعض حضرات صوفیا اپنے متوسلین و معتقدین کو توسل اور استشفاع جیسے امور کی طرف خاص اہمیت سے توجہ دلاتے ہیں۔ بعض دفعہ قبور پر جا کر ایسے امور بھی انجام دیے جاتے ہیں جو ایک شرک کی طرف لے جاتے ہیں، کیونکہ لوگ ان اشخاص و افراد کے بارے میں یہ سمجھنے لگتے ہیں کہ وہ بذات خود امور میں متصرف اور مختار ہیں۔ حضرت شیخ الحدیثؒ نے اس مسئلہ کے تمام ضروری پہلوؤں کو سامنے رکھتے ہوئے اس کی حقیقت کو واضح کرنے کی کوشش کی ہے تاکہ ایک عامی اور صاحب نسبت کو اس کی حقیقت سمجھنے میں دشواری نہ ہو۔ یہاں دو سوال ہیں:

۱) کون سا توسل اور استشفاع شرک اور حرام ہے؟

۲) توسل اور استشفاع کی دینی و شرعی حیثیت کیا ہے؟

پہلے سوال کے جواب میں حضرت شیخ الحدیثؒ یہ واضح کرتے ہیں کہ اگر تو حضرات انبیائے کرام، صحابہ کرامؓ، شہدا و صالحینؒ کی قبور پر جا کر بذات خود انہی سے استمداد کی جا رہی ہو اور انہیں جمیع امور میں قاضی سمجھا جا رہا ہو، پھر تو شرع میں

قبیح ہے اور شرک ہے اور عنداللہ اس پر مواخذہ ہوگا۔ بصورت دیگر اگر محض وساطت کے طور پر انہیں پیش کرتا ہے اور تمام امور کا قاضی، قادر مطلق اللہ تعالیٰ ہی کو جانتا ہے، تو یہ صورت شرک کی نہیں ہے۔ حضرت شیخ الحدیثؒ فرماتے ہیں:

’’الغرض اللہ تعالیٰ کے سوا کسی سے مراد مانگنا اور اس کو حاجت روا سمجھ کر پکارنا شرک ہے۔ اگر کوئی شخص زندہ بزرگ سے بھی اولاد مانگے یا صحت وتندرستی مانگے یا ایسی چیز طلب کرے جو عالم اسباب میں اس کے بس واختیار میں نہیں ہے تو یہ بھی شرک ہے۔ اسی طرح دفن ہونے سے پہلے مردہ کی چارپائی کے پاس حاضر ہو کر مراد مانگے، تب بھی شرک ہے۔ غرضیکہ جو چیز شرک ہے، وہ زندگی میں بھی شرک ہے اور مرنے کے بعد دفن سے پہلے بھی شرک ہے جب کہ میت کی چارپائی سامنے ہے اور مردہ نظر بھی آتا ہے، اور دفن کے بعد بھی شرک ہے اور وہ اسی صورت میں ہے کہ اس سے اپنی حاجت اور مراد طلب کرے اور مانگے۔ رہی بات استمداد کی وہ صورت جو توسل اور شفاعت کی مد میں ہے، وہ نہ تو زندگی میں شرک ہے، نہ دفن سے قبل اور نہ دفن کے بعد۔ اس صورت میں مراد اور حاجت صرف پروردگار سے طلب کی جاتی ہے۔ ہاں درمیان میں اللہ تعالیٰ کے کسی مقبول اور برگزیدہ بندہ کا واسطہ اور سفارش ہوتی ہے اور سفارش کرانے والا یہ سمجھتا ہے کہ مشکل کشا، حاجت روا اور قاضی الحاجات صرف اللہ تعالیٰ ہے۔ بندہ کے بس میں یہ امور نہیں ہیں۔‘‘(۱۴)

اصل میں دو اس مسئلے میں دو نقطہ نظر پائے جاتے ہیں۔ ایک طرف جمہور امت کا نقطہ نگاہ ہے اور دوسری طرف امام ابن تیمیہؒ اور ان کے شاگردوں اور متوسلین کا۔ امام اہل سنتؒ، جمہور حضرات کی رائے کو ترجیح دیتے ہیں کہ حقیقت میں تو قادر اللہ تعالیٰ کی ذات گرامی ہے اور اس صورت میں شرک کا شائبہ تک نہیں پایا جاتا۔ یہ ایسے ہی ہے جیسے اللہ تعالیٰ کے مقرب اور نیک بندوں سے ان کی زندگی میں کوئی توسل اور دعا کی درخواست کرے اور یہ صورت بالاتفاق جائز ہے، پس ایسا توسل بعد از وفات کیوں جائز نہ ہوگا؟ اور کامل لوگوں کی ارواح کا زندگی اور موت کے بعد کوئی فرق نہیں، بجز اس کے کہ مرنے کے بعد کمال میں مزید ترقی ہو جاتی ہے۔ باقی دور دراز سے بزرگوں کی روحوں کو حاضر سمجھنا اور ان کے لیے لوگوں کے حالات کا علم ثابت کرنا حضرات فقہائے کرام کے ہاں صریح کفر ہے۔ اسی طرح حضرت فرماتے ہیں کہ امام ابن تیمیہؒ اور حضرت مولانا حسین علیؒ نے جس پکارنے کو شرک لکھا ہے، وہ بالکل بجا اور درست ہے کہ صاحب قبر سے اپنی حاجت اور مراد طلب کرے۔ صاحب قبر سے مراد مانگنے کا اور اس کی دعا اور توسل کے ساتھ اللہ سے مراد مانگنے کا اصولی طور پر فرق ہے۔(۱۵)

غائبانہ طور پر کسی کو سفارشی بنانا تو ’’شفعاء نا عنداللہ‘‘ کی مد میں آتا ہے، لیکن زندگی میں کسی کو دعا کے لیے سفارشی بنانا یا بعد از وفات قبر کے پاس جا کر کسی سے دعا کی درخواست کرنا اور علی الخصوص حضرت انبیاے کرام علیہم الصلوٰۃ والسلام سے طلب شفاعت کرنا اس مد میں نہیں آتا۔ اگر یہ اس آیت کا مصداق ہوتا تو یہ آیت کریمہ حضرات فقہائے کرامؒ کے سامنے بھی تھی جنہوں نے ایمان وتقویٰ کی دولت کے ساتھ دین کی گہرائیوں تک رسائی حاصل کی ہے۔ وہ ہرگز عند القبر شفاعت اور توسل کی اجازت نہ دیتے اور بڑے بڑے ائمہ کرامؒ اور علماے امت جو سماع موتی کے قائل ہیں، بزرگان دین کی قبور کے

پاس دعا کی اجازت نہ دیتے۔ یہ اس بات کی واضح دلیل ہے کہ نزدیک سے طلب سفارش اور دعا کرانا اس آیت کے مفہوم میں ہرگز شامل نہیں ہے اور نہ شرک ہے۔ شرک اسی صورت میں ہے کہ دور سے یہ کارروائی کی جائے جس سے علم غیب اور حاضر وناظر کا عقیدہ پیدا ہوتا ہے جو شرک کی جڑ اور بنیاد ہے۔(۱۶)

جہاں تک دوسرے سوال کا تعلق ہے کہ استشفاع وتوسل کی شرع میں کیا حیثیت ہے؟ تو حضرت شیخ الحدیثؒ نے اس مسئلہ کو بھی اپنی تصانیف میں اہمیت سے بیان کیا ہے، کیونکہ زیر بحث مسئلہ کے جواز اور عدم جواز کے بارے میں مختلف آرا افراط وتفریط کا شکار دکھائی دیتی ہیں، چنانچہ بعض حضرات تو ہر حال اور ہر صورت میں اس کو ترجیح دینے لگے جب کہ ان کے مد مقابل دوسرا گروہ بالکل عدم جواز کے قول پر مصر ہونے لگا۔ حضرت شیخ الحدیثؒ نے نصوص سے یہ بات ثابت کی ہے کہ فی نفسہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی قبر مبارک کے پاس حاضر ہو کر طلب دعا اور استشفاع نہ فرض ہے اور نہ واجب اور نہ سنت موکدہ بلکہ حضرات فقہائے کرامؒ کے فتوی کے رو سے صرف جائز ہے اور اس میں بھی بعض فقہا کا اختلاف منقول ہے۔ درحقیقت یہ ایک فروعی مسئلہ ہے، اور اس پر حضرت عمرؓ کی مہر ثبت ہے کہ آپؓ کے زمانہ خلافت میں ایک مرتبہ سخت قحط پڑا اور اس کی وجہ سے بے حد تکلیف پیش آئی تو گاؤں کا رہنے والا ایک شخص (اعرابی) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی قبر مبارک پر حاضر ہوا اور آپ سے درخواست کی کہ حضرت! آپ کی امت نہایت تکلیف میں ہے اور اس کی ہلاکت اور بربادی کا خطرہ ہے۔ آپ اللہ تعالیٰ سے دعا کریں کہ اللہ تعالیٰ بارش برسائے۔ آپ کی قبر مبارک کے پاس دعا کر کے یہ شخص چلا گیا۔ رات کو خواب میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اس شخص سے ملے اور فرمایا کہ عمرؓ کے پاس جاؤ اور اس سے میرا سلام کہو اور یہ خبر دے دو کہ ان شاء اللہ تعالیٰ بارش ہوگی، اور عمرؓ سے کہہ دو کہ وہ عقل مندی کو لازم پکڑے۔ صبح ہوئی تو وہ شخص حضرت عمرؓ کی خدمت میں حاضر ہوا اور خواب کا یہ سارا ماجرا ان کو سنایا۔ یہ خبر سن کر حضرت عمرؓ رو پڑے اور فرمایا کہ میرے رب! جو چیز میرے بس میں ہے، اس کے بارے میں تو کبھی میں نے کوتاہی نہیں کی۔(۱۷)

یہ واقعہ ۱۷/۱۸ھ کا ہے۔ سند کے لحاظ سے صحیح ہونے کے ساتھ ساتھ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کی تصویب اور دیگر صحابہ کرامؓ کی بھی بلا نکیر تائید حاصل ہے۔ ان وجوہ کی بنیاد پر حضرت شیخ الحدیثؒ جمہور فقہائے کرام کی رائے کو جواز کی حد تک ترجیح دیتے ہیں۔

حوالہ جات

۱۔ محمد سرفراز خان صفدرؒ، مولانا: ذخیرۃ الجنان (ناشر، میر محمد لقمان گوجرانوالہ، ۲۰۰۲ء)، ۴/۱،

۲۔ المرجع السابق، ص ۱۵

۳۔ ذخیرۃ الجنان، ۶/۱،

۴۔ المرجع السابق ۳۴۶/۳

۵۔ سرفراز خان صفدرؒ، مولانا: حکم الذکر بالجہر، (ناشر مکتبہ صفدریہ، گھنٹہ گھر گوجرانوالہ، ۲۰۰۳ء) ص ۹۸/۱۹۷

۶۔ ذخیرۃ الجنان ۱/ ۲۴۴

۷۔ المرجع السابق ۳/ ۴۲۰

۸۔ حکم الذکر بالجہر، ص ۲۰۷

۹۔ المرجع السابق، ۱/ ۳۱۶

۱۰۔ المرجع السابق، ص ۹۸، ۱۹۷

۱۱۔ محمد سرفراز خان صفدر، مولانا: سماع الموتی، (مکتبہ صفدریہ، گھنٹہ گھر، گوجرانوالہ، ۲۰۰۲ء) ص ۳۱۳، ۳۱۴

۱۲۔ المرجع السابق، ص ۱۹۸

۱۳۔ محمد سرفراز خان صفدرؒ، مولانا: تنقید متین بر تفسیر نعیم الدین، (ناشر مکتبہ صفدریہ، گھنٹہ گھر، گوجرانوالہ، ۲۰۰۳ء) ص ۸۱، ۸۲

۱۴۔ سماع الموتی، ص ۱۰۳

۱۵۔ المرجع السابق، ص ۱۱۱

۱۶۔ المرجع السابق، ص ۱۱۵

۱۷۔ المرجع السابق، ص ۱۱۶

آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی مجلس اقدس میں تھوڑی دیر بیٹھنے والے کی اتنی صفائی ہو جاتی تھی کہ ساٹھ ساٹھ سال مجاہدہ اور ریاضتیں کرنے والوں کی اتنی صفائی نہیں ہوتی۔ بزرگان دین نے شرعی دائرہ میں رہ کر جو چلہ کشی کی ہے اور ریاضتیں کی ہیں، بعض سطحی قسم کے لوگ ان پر اعتراض کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ انھوں نے غلط کیا ہے، کیونکہ صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین نے چلہ کشی نہیں کی تھی۔ بھائی! ٹھیک ہے، صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے چلہ کشی نہیں کی، مگر ان کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی موجودگی میں ضرورت ہی کیا تھی؟ شیشہ صاف ہو تو اس کو صاف کرنے کی کیا ضرورت ہے؟ صاف تو اس وقت کیا جاتا ہے جب اس پر میل کچیل ہو۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے شیشے ویسے ہی صاف تھے۔ پھر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی مجلس میں بیٹھنے سے اتنے صیقل ہو جاتے تھے کہ ساٹھ سالہ مجاہدے سے بھی وہ کیفیت حاصل نہیں ہو سکتی، تو ان کو مجاہدے کی کیا ضرورت تھی کہ وہ چلہ کشی کرتے؟ مگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد وہ کیفیت باقی نہیں رہی، اس لیے دلوں کی صفائی کے لیے مجاہدہ کرنا پڑتا ہے۔ یاد رکھنا، کثرت کے ساتھ ذکر کرنے سے دلوں کی صفائی ہوتی ہے، لہٰذا کلمے کا ورد کرو، تیسرا کلمہ پڑھتے رہو، استغفار کرو، درود شریف پڑھو، قرآن پاک کی تلاوت کرو، قبر کو یاد کرو، آخرت کا خیال رکھو، اپنی نظر کو محفوظ رکھو۔ اس سے دلوں کی صفائی ہوتی ہے اور تزکیہ نفس شریعت میں مطلوب ہے۔'' (ذخیرۃ الجنان ۳/۳۴۶-۳۴۸)

پروفیسر عبد الواحد سجاد*

سنت اور بدعت ''راہ سنت'' کی روشنی میں

اللہ تعالیٰ نے ہر دور میں ایسے بطل جلیل پیدا فرمائے جنہوں نے نہ صرف سنت و بدعت میں امتیاز کو نمایاں کیا بلکہ سنت کے نور کو بدعت کی ظلمت پر غالب کرنے کے لیے نامساعد حالات کے باوجود سرگرم کردار ادا کیا تا کہ دین کا نورانی چہرہ شرک و بدعت کی آلائشوں سے داغ دار نہ ہونے پائے۔ حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ کے خانوادے کا یہ اعزاز ہے کہ اس نے ہندوستان میں سنت کے دائرے سے خرافات کے اخراج میں قائدانہ کردار ادا کیا جسے دار العلوم دیوبند کے بیٹوں اور اس کے فضلا نے آگے بڑھایا۔ شیخ الحدیث والتفسیر حضرت مولانا محمد سرفراز خان صفدرؒ کو اللہ تعالیٰ نے اپنے بزرگوں مولانا قاسم نانوتویؒ، مولانا رشید احمد گنگوہیؒ اور مولانا اشرف علی تھانویؒ کے کام کو نئے اسلوب سے آگے بڑھانے اور بدعت کے تار و پود بکھیرنے کا جو کام سونپا، اسے حجت و برہان کی کمک اور محققانہ انداز بیان نے منفرد بنا دیا۔

آپ نے ''راہ سنت'' میں سنت اور بدعت کی تفریق واضح کرنے کے لیے متانت، سلاست اور لطافت سے حجت قائم کی۔ جذباتیت، اشتعال اور درشت کلامی کا عنصر ڈھونڈے نہیں ملتا۔ قرآنی آیات، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی روایات اور اسلاف کی عبارات سے ایسے نکات سامنے لائے جو آپ جیسے محقق کے علاوہ کسی کے لیے ممکن نہ تھا۔ تحریر میں سب سے اہم بات یہ ہے کہ محققانہ [illegible] ہونے کے باوجود جس طرح خواص اس سے فائدہ اٹھاتے ہیں، اسی طرح عوام بھی فیض یاب ہوتے ہیں۔

حضرت شیخ کی تصنیف لطیف ''راہ سنت'' اس وقت میرے سامنے ہے۔ ''عرض حال'' سے خاتمہ تک جو چیز بھی لکھی گئی، وہ دلائل اور مکمل حوالہ جات کے ساتھ ہے۔ نہ اس میں قطع و برید کی گئی ہے اور نہ دوسروں کی عبارات سے مطلب کے الفاظ لے کر دشنام طرازی کی گئی ہے۔

باب اول میں کتاب اللہ کی ہمہ گیر صداقت، سنت کی جمیت، اجماع امت اور تعامل خیر القرون کے حجت ہونے کا ثبوت دیا اور اس پر ہونے والے ایک ایک اعتراض کو نقل کرنے کے بعد اس کا مسکت جواب دیا ہے۔

باب دوم میں بدعت کی لغوی و شرعی اقسام و احکام، احادیث سے بدعت کی تردید اور بدعت حسنہ اور سیۂ کی تحقیق جیسے مباحث پر مشتمل ہے۔

باب سوم میں ''بدعت کے جواز کے دلائل پر ایک نظر'' کے عنوان کے تحت فریق مخالف کی بنیادی دلیل ''اصل اشیا میں اباحت'' کے جواب میں دلائل کے انبار لگا کر یہ ثابت کیا گیا ہے کہ کسی مباح کی اباحت جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے

* اسلام آباد

قول وفعل کے بغیر ثابت نہیں ہوسکتی۔ اگرچہ بعض نے اصل اشیا میں اباحت تسلیم کی ہے، لیکن جمہور کا مسلک اس کے خلاف ہے۔ حضرت علی، ائمہ اربعہ، اہل بیت، کوفہ کے فقہا ومحدثین اور خاص طور پر حضرت امام ابوحنیفہؒ اور امام شافعیؒ اصل اشیا میں حرمت کے قائل ہیں اور باقی جمہور اصل اشیا میں توقف کے قائل ہیں بلکہ صاحب درمختار نے صاف لکھا ہے کہ ''اہل سنت والجماعت کا صحیح مذہب یہ ہے کہ اصل اشیا میں توقف ہے اور اباحت کا قول معتزلہ کا خیال اور رائے ہے''۔

باب چہارم میں ''عبادات میں اپنی طرف سے اوقات اور کیفیات کا تعین کرنا بدعت ہے'' کے عنوان کے تحت فرمایا کہ ضروری نہیں کہ کوئی چیز اصل ہی میں بری ہو تو وہ بدعت ہوگی بلکہ وہ اہم طاعات اور عبادات بھی جن کو شریعت نے مطلق چھوڑا ہے، ان میں اپنی طرف سے قیود لگا دینا یا ان کی کیفیت بدل دینا یا اپنی طرف سے اوقات کے ساتھ متعین کر دینا، یہ بھی شریعت کی اصطلاح میں بدعت ہوگی۔ پھر حضرت ابوہریرہؓ کی اس روایت کو اپنے موقف کے حق میں پیش فرمایا کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ ''جمعہ کی رات کو دوسری راتوں سے نماز اور قیام کے لیے خاص نہ کرو اور جمعہ کے دن کو دوسرے دنوں سے روزہ کے لیے خاص نہ کرو، مگر ہاں اگر کوئی شخص روزے رکھتا ہے اور جمعہ کا دن بھی اس میں آجائے تو الگ بات ہے۔''

پھر علامہ ابواسحاق شاطبی کی الاعتصام، حافظ ابن دقیق العید کی احکام الاحکام، حضرت شاہ ولی اللہؒ کی حجۃ اللہ البالغہ، علامہ زین العابدین کی البحر الرائق اور حضرت مجدد الف ثانیؒ کے مکتوبات سے اپنے دعوے کا اثبات فرماتے ہوئے حضرات صحابہ کرامؓ کا ایسی کیفیات اور ہیئات کی تعیین کے متعلق جو فیصلہ ہے، اس کو تفصیل سے بیان فرمایا ہے۔ پھر بدعت کی تردید کے عقلی دلائل دے کر سنت اور بدعت کے مقام کو واضح کرتے ہوئے ارشاد فرمایا کہ سنت کو اگر اصلی شکل میں محفوظ رکھا جائے تو وہ قیمتی موتی ہے اور اس کی قیمت دنیا ومافیہا کے خزانے بھی ادا نہیں کر سکتے۔

باب پنجم میں ''کیا بدعات میں بھی کوئی خوبی بھی ہوتی ہے اور ان پر دلائل بھی پیش کیے جا سکتے ہیں؟'' کے عنوان کے تحت واضح کیا کہ بدعات کی ایجاد میں محاسن اور خوبیوں کا دعویٰ کیا جاتا ہے اور اس کی ترویج کے لیے دلائل بھی تراشے گئے، جیسے مشرکین مکہ نے شرک جیسے قبیح فعل کو مستحسن ثابت کرنے کے لیے تقرب الٰہی کے خوش کن الفاظ کا سہارا لیا اور مرد وزن کے برہنہ ہو کر طواف کعبہ کرنے کی یہ دلیل دی کہ ہم کپڑوں میں گناہ کرتے ہیں تو ان میں اللہ کے پاک گھر کا طواف کیسے کریں؟ لیکن فتح مکہ کے بعد صدیوں کی اس بدعت کا حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے خاتمہ کر دیا۔ اسی طرح ہر مبتدع اپنی بدعت پر کسی شرعی دلیل سے استشہاد کرتا ہے اور اس طریقے سے وہ اسے اپنی عقل اور خواہش کے مطابق بنا لیتا ہے۔ اس غلط استشہاد کی بنا پر کسی بدعت کو جائز قرار نہیں دیا جا سکتا کیونکہ قرآن وحدیث کا صحیح مفہوم وہی ہوگا جو حضرات صحابہ کرامؓ اور تابعینؒ نے سمجھا۔

باب ششم میں ''سنت اور بدعت میں اشتباہ ہو تو کیا کرنا چاہیے'' کی بحث میں آپ نے براہین قاطعہ سے ثابت کیا کہ جس کام کے بدعت اور سنت ہونے میں شبہ ہو، اس کو چھوڑ دیا جانا چاہیے۔

باب ہفتم میں فرداً فرداً تمام بدعات پر بحث کرتے ہوئے محفل میلاد کی تاریخ، میلاد میں قیام، ایصال ثواب کے لیے ربیع الاول کی تعیین، عرس، ذکر بالجہر، مزارات کی پختگی اور ان پر گنبد کی تعمیر، قبروں پر چراغاں کرنا، چادریں ڈالنا اور پھول چڑھانا، قبروں کی مجاوری، نماز جنازہ کے بعد دعا، قبر پر اذان دینا، انگوٹھے چومنا، کفنی یا الفی لکھنے، تلاوت قرآن پر اجرت،

ایصال ثواب کے لیے دنوں کی تعیین، میت کے گھر اجتماع اور کھانا پکانا، تیجہ دسواں اور چالیسواں، کھانے پر ختم، چٹائی اور پھوڑی بچھانا، حیلۂ اسقاط، دوران قرآن، عبدالنبی اور عبدالرسول نام رکھنا وغیرہ پر بحث کی گئی ہے۔ یہ باب ۱۳۸ صفحات پر مشتمل ہے۔ ایک ایک چیز کو کھول کر بیان کیا گیا اور فریق مخالف کے اعتراضات نقل کر کے ان کا جواب دیا گیا ہے۔ آخری چودہ صفحات کے خاتمے میں فریق مخالف کے گیارہ الزامی جوابات واعتراضات اور ان کا جواب دے کر سنت اور بدعت کے حوالہ سے کی جانے والی بحث کو مکمل فرمایا۔

امام اہل سنت نے اپنی پوری زندگی سنت کی ترویج واشاعت کے لیے وقف کیے رکھی۔ ہر چھوٹے بڑے فتنے کے خلاف قلم اٹھایا اور جس موضوع پر بحث کی، اس کے تمام پہلوؤں کو مدنظر رکھا۔ دلائل وبراہین قاطعہ کے ہتھیار کو استعمال کیا۔ دشنام یا جذباتیت سے کام لینے کے بجائے اپنے اکابر کی اعلیٰ اقدار اور روایات کے مطابق اعتدال واستدلال کا ایسا رنگ اپنایا کہ مخالف کو بھی قائل کر لیا۔ حضرت شیخ نے اسلوب تحریر میں اپنے عہد کی نزاکتوں کو بھی ملحوظ رکھا اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اس قول کے مصداق کہ لوگوں سے ان کی سمجھ کے مطابق بات کرو، اپنا فرض بخوبی نبھایا۔

''آج کل کے مشرک اور بدعتی اپنے آپ کو حنفی کہتے ہیں۔ وجہ اس کی یہ ہے کہ فقہ حنفی چونکہ مشہور ہے، اس لیے یہ اپنی کڑی فقہ حنفی کے ساتھ ملاتے ہیں، ورنہ حقیقت میں مشرکوں اور بدعتیوں کا فقہ حنفی کے ساتھ کوئی تعلق نہیں ہے۔ الحمد للہ میں نے فقہ حنفی، شافعی، مالکی، حنبلی سب کا مطالعہ کیا ہے۔ میں پورے دعوے سے یہ بات کہتا ہوں کہ شرک اور بدعت کی جتنی تردید فقہ حنفی میں ہے، اتنی اور کسی فقہ میں نہیں ہے۔ فقہ حنفی کی کوئی مستند کتاب دیکھ لیں۔ مثلاً فتاویٰ عالمگیری ہی دیکھ لیں جو اورنگ زیب عالمگیر کے حکم سے پانچ سو علمائے کرام نے مرتب کیا تھا اور اسے ہندوستان کے لیے قانون بنایا تھا۔ میں بلا مبالغہ کہتا ہوں کہ وہ پانچ سو علمائے کرام ایسے تھے کہ اس وقت ساری دنیا میں علم وعمل کے اعتبار سے ان میں سے ایک عالم کی بھی نظیر نہیں۔ تو عالمگیری میں دیکھ لیں، شرک اور بدعت کی کتنی تردید ہے، مگر اس کے باوجود یہ مشرک اور بدعتی اپنے آپ کو حنفی کہتے ہیں۔'' (ذخیرۃ الجنان ۳/۱۳۴)

''اکثر لوگ جو شرک میں مبتلا ہیں اور بدعات کا ارتکاب کرتے ہیں، یہ لاعلمی کی وجہ سے کرتے ہیں، ورنہ ان کو رب تعالیٰ اور اس کے رسول کے ساتھ عداوت نہیں ہے۔ ان کو علم ہو جائے کہ شرک کتنا بڑا گناہ ہے اور ہم جو کچھ کر رہے ہیں، یہ شرک ہی ہے تو کبھی قریب نہ جائیں۔ اس طرح بدعت کے متعلق علم ہو جائے کہ کتنا بڑا گناہ ہے تو لوگ اس کے قریب نہ جائیں۔ ..... عوام بے چارے جہالت کا شکار ہیں، ورنہ ان کو رب تعالیٰ اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے عداوت نہیں ہے نہ دین سے عداوت ہے۔ البتہ کچھ لوگ شرک اور بدعات کا ارتکاب ضد کی وجہ سے کرتے ہیں تو ان کا کوئی علاج نہیں ہے۔'' (ذخیرۃ الجنان ۴/۲۰۴، ۲۰۵)

ڈاکٹر محفوظ احمد*

مولانا محمد سرفراز خان صفدر رحمہ اللہ کا انداز تحقیق

امام اہل سنت حضرت مولانا محمد سرفراز خان صفدرؒ ان علمائے دین میں سے ہیں جنھوں نے اپنی ساری زندگی تعلیم وتعلم اور تصنیف وتالیف میں بسر کی۔ آپ نے ۹۵ سال کی عمر پائی اور تقریباً چوالیس کتب تصنیف فرمائیں۔ ان تصانیف میں آپ ایک محقق کی حیثیت سے سامنے آتے ہیں۔ تحقیق کو بطور طرز زندگی اپنانا، سچی لگن، مختلف علوم سے واقفیت، اہم اور بنیادی مصادر ومراجع تک رسائی، حصول مواد کے ذرائع سے واقفیت، حقائق کی تلاش اور چھان پھٹک، مواد کی ترتیب وتنظیم اور کتاب کی بہتر تسوید اور پیش کش کو تحقیق کے بنیادی لوازم اور حق گوئی، غیر متعصبانہ وغیر جانبدارانہ تحقیق کو دنیاوی مقاصد کے حصول کا ذریعہ نہ بنانا، دلچسپی اور محنت، وسعت مطالعہ، نقد کی صلاحیت کو ایک محقق کے بنیادی اوصاف شمار کیا جاتا ہے۔ اصول تحقیق کے ان اصولوں اور قواعد کی روشنی میں جب حضرت شیخ الحدیثؒ کی تصنیفات کو دیکھا جاتا ہے تو قاری بلاتردد یہ تسلیم کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے کہ آپ کی تمام تالیفات وتصنیفات تحقیق کے اعلیٰ معیار پر پوری اترتی ہیں۔

حضرت امام اہل سنت کی اکثر تصانیف ان عقائد ومسائل سے متعلق ہیں جو اہل سنت اور دوسرے مکاتب فکر کے مابین مختلف فیہ ہیں۔ مختلف فیہ موضوعات پر لکھنا عام موضوع پر لکھنے سے مشکل ہوتا ہے، تاہم آپ کی ہر تحریر سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ آپ نے متعلقہ موضوع پر قلم اٹھانے کا حق ادا کر دیا ہے۔ مثال کے طور پر آپ کی کتاب ''تسکین الصدور فی تحقیق احوال الموتی فی البرزخ والقبور'' احوال برزخ سے متعلق ہے۔ جمہور اہل سنت کے نزدیک عالم برزخ میں اعادۂ روح ہوتا ہے، سماع موتی کی حقیقت کو تسلیم کیا گیا ہے، قبر میں جسم وروح دونوں کو عذاب ہوتا ہے اور دعا میں انبیاے کرام اور صالحین امت کا توسل درست ہے جب کہ بعض مکاتب فکر کے نزدیک یہ تمام عقائد درست نہیں۔ حضرت شیخ الحدیثؒ نے سب سے پہلے ان عقائد کے بارے میں یہ ثابت کیا ہے قدیم وجدید اکابر علما نے انھیں اپنی اپنی کتب میں تحریر کیا ہے اور انہیں اہل سنت کے عقائد میں شمار کیا ہے۔ اس دعویٰ کو ثابت کرنے کے لیے علامہ طاہر بن احمد البخاریؒ (م ۵۴۲ھ) کی ''خلاصۃ الفتاویٰ'' سے لے کر مولانا اشرف علی تھانویؒ (م ۱۹۴۳ء) کی تصانیف ''نشر الطیب'' اور ''التکشف'' تک عربی، فارسی اور اردو زبان کے درجنوں مآخذ سے حوالہ جات پیش کیے گئے ہیں۔ اس کے بعد ان عقائد کو اسلام کے بنیادی مصادر قرآن وحدیث سے ثابت کیا گیا ہے۔ مثلاً توسل کے بارے میں علمائے اسلام کے نظریات پیش کرنے کے بعد آیت ''استفتاح'' اور آیت وسیلہ کو توسل کے جواز میں بطور دلیل پیش کیا گیا اور متعدد احادیث اور آثار صحابہ سے اپنے دعویٰ کو مبرہن کیا گیا ہے۔ (تسکین الصدور، ص ۴۲۲)

---

* چیئرمین شعبہ علوم اسلامیہ، جی سی یونیورسٹی فیصل آباد

تحقیق میں اقتباس کو بہت اہمیت حاصل ہے، کیونکہ اقتباس پیش کرنے سے کسی جماعت، گروہ یا مصنف کے نقطہ نظر کا تجزیہ کر کے اس کی تردید کرنے، دو متضاد خیالات کا جزوی موازنہ کرنے اور اپنے دعویٰ کی توضیح واثبات کے فوائد حاصل ہوتے ہیں۔ کسی بھی کتاب کا حوالہ اصل عبارت نقل کرنے کے علاوہ مفہومی عبارت کی صورت میں بھی دیا جا سکتا ہے۔ حضرت شیخ الحدیثؒ نے اس کتاب میں مفہومی اقتباس کی بجائے اصل اقتباسات نقل کرنے کو ترجیح دی ہے۔ جب عقائد ونظریات کا موازنہ یا تردید مقصود ہو تو اصل اقتباس ہی تحقیق کی ضرورت ہوتا ہے، لہٰذا آپ نے بھی اسی طریقہ کو اختیار کیا۔

جس طرح اقتباسات تحقیق کے معیار کو بلند کرتے ہیں، اسی طرح متعلقہ مآخذ کا حوالہ دینے سے بنیادی مقصد یہ ہوتا ہے کہ قاری اصل مآخذ تک آسانی سے رسائی حاصل کر لے۔ قدیم علما اقتباس کے لیے کبھی محض کتاب کا نام ذکر کرتے اور کبھی مصنف کے نام پر اکتفا کرتے ہیں، جبکہ جدید علما کتاب کا نام اور متعلقہ جلد وصفحہ بھی نقل کرتے ہیں۔ حضرت شیخ الحدیثؒ نے تسکین الصدور میں موخر الذکر طریقہ اختیار کیا ہے۔ آپ ہر اقتباس کے شروع میں مصنف کا نام مع سال وفات اور اقتباس کے آخر میں کتاب کا نام اور جلد وصفحہ نمبر تحریر کرتے ہیں۔ بعض مقامات پر کتاب کے نام کے ساتھ باب کا نام بھی تحریر کرتے ہیں، جیسے عذاب وراحت قبر کے اثبات کے لیے حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی (م ۱۱۷۶ھ) کی کتاب حجۃ اللہ البالغہ کے ''باب اختلاف احوال الناس فی البرزخ'' کی بابت بھی تحریر کیا ہے۔ (تسکین الصدور، ص ۱۴۵)

جدید محققین اپنی تصنیف کے آخر میں مصادر ومراجع کا ذکر ضرور کرتے ہیں۔ اس کی ضرورت اس لیے محسوس کی جاتی ہے کہ مصادر ومراجع کے دیکھنے سے ہی کتاب کی تحقیقی نوعیت کا اظہار ہو جاتا ہے۔ حضرت محدث اعظمؒ نے اس کتاب میں سینکڑوں کتب کے حوالہ جات دیے ہیں، لیکن مصادر ومراجع کی صورت میں فہرست تیار نہیں کی۔ مصادر ومراجع کا کسی کتاب میں نہ ہونا محقق کے تحقیقی مقام پر کوئی منفی اثر نہیں ڈالتا، تاہم یہ قارئین کی سہولت کے لیے ہوتا ہے۔ بہر حال جدید طرز تحقیق میں تصنیف وتحقیق کے لیے اسے لازمی تصور کیا جاتا ہے۔ حضرتؒ کے علمی ورثا اگر اس کتاب کی طبع جدید کے وقت مصادر ومراجع کی فہرست درج کرنے کا اہتمام کر لیں تو کتاب جدید تحقیق کے ظاہری معیارات کے لحاظ سے بھی مکمل ہو جائے گی۔

جدید تحقیق میں ایک محقق دوسرے محقق کے نظریات کا رد مثبت انداز میں ہی کرتا ہے اور کوئی ایسا لفظ استعمال کرنا جس میں مخالف کی تضحیک ہو، درست نہیں سمجھا جاتا۔ البتہ علما کے ہاں ایسے الفاظ کے استعمال کی روایت رہی ہے۔ حضرت شیخ الحدیثؒ بھی اس روایت پر عمل پیرا نظر آتے ہیں، چنانچہ حیات انبیا کے بارے میں فریق مخالف کا نظریہ پیش کرنے کے بعد فرماتے ہیں: ''کیا پدی اور کیا پدی کا شوربہ''۔ (تسکین الصدور، ص ۲۸۷) محقق کی طرف سے ایسے جملوں کا استعمال اس وقت کیا جاتا ہے جب فریق مخالف یا فریق ثانی کے دلائل انتہائی کمزور ہوں اور وہ اپنے کمزور دلائل کے باوجود دعویٰ کو بدستور قائم رکھے ہوئے ہو۔

بہر حال حضرت امام اہل سنتؒ کی شخصیت علمی اور تحقیقی میدان میں مسلمہ حیثیت کی حامل ہے۔ مسائل میں آپ کا تحقیقی انداز بے مثل تھا۔ یہ انداز تحقیق صرف اسی کتاب میں نہیں بلکہ آپ کی تمام تصنیفات میں دکھائی دیتا ہے، اس لیے آپ کی تمام تصنیفات نہ صرف علمی لحاظ سے اہمیت کی حامل ہیں بلکہ محققین کے لیے تحقیق میں روشنی کا مینار ہیں۔

نوید الحسن*

مولانا محمد سرفراز خان صفدر کا اسلوب تحریر

مولانا سرفراز خان صفدر کا شمار صاحب تصنیف و تحقیق علما میں ہوتا ہے۔ انہوں نے مختلف عنوانات پر بہت سی کتب تحریر فرمائیں اور اپنے دور کے مسائل کو پیش نظر رکھ کر اہل السنۃ والجماعۃ کے عقائد و نظریات کو قرآن وسنت کی روشنی میں پیش کرنے کے ساتھ ساتھ فریق ثانی کے باطل نظریات کو بے نقاب کرتے ہوئے ان کا رد کیا۔ یہاں ہم مولانا کے اسلوب تحریر کی نمایاں خصوصیات کا اختصاراً تذکرہ کریں گے۔

۱۔ مولانا سرفراز خان صفدر کا انداز تحریر آسان، عام فہم، دلچسپ اور مؤثر ہے۔ آپ کی تحریر میں عالم کو علمیت کی چاشنی، ادیب کو ادبی تسکین اور مسائل کے حل کے متلاشی کو ان کا حل ملتا ہے۔ مولانا نے اپنی تحقیق کو تحریر کا پیرہن پہناتے وقت اپنے قارئین کی ذہنی و علمی سطح کو ملحوظ رکھتے ہوئے عام فہم انداز اختیار کیا تاکہ ان کی تحریروں سے زیادہ سے زیادہ لوگ استفادہ کر سکیں۔ تحریر کی بڑی خوبی یہ ہے کہ آپ مشکل مسائل کو اس قدر وضاحت وصراحت سے پیش کرتے ہیں کہ قاری کو سمجھنے میں بالکل دشواری محسوس نہیں ہوتی بلکہ معمولی پڑھا لکھا آدمی بھی آپ کی بات کو آسانی سے سمجھ لیتا ہے۔ عالم اور مبتدی دونوں کے قلب و ذہن میں حقائق ابھرتے چلے جاتے اور غلط نظریات کے بادل چھٹتے چلے جاتے ہیں۔ آپ کے انداز تحریر کی اس خوبی کے بارے میں پشاور یونیورسٹی کے پروفیسر عبدالدیان کلیم فرماتے ہیں کہ ''آپ پر اللہ تعالیٰ کا خاص فضل و کرم ہے کہ ایک مشکل مضمون کو بھی عالمانہ انداز میں ایک منطقی ربط و تسلسل کے ساتھ شستہ زبان میں تحریر فرما دیتے ہیں''۔ (۱) اسی طرح مولانا محمد سلطان محمود ''احسن الکلام'' کے مطالعہ کے بعد جن تین نکات کی نشاندہی کرتے ہیں، ان میں سے ایک یہ ہے ''اس کتاب کا طرز بیان نہایت ہی سلیس اور عام فہم ہے۔ صرف اردو خواں بھی اس سے فائدہ اٹھا سکتے ہیں''۔ (۲)

۲۔ مولانا سرفراز خان صفدر کی تحریر کی خاص بات ان کا تحقیقی، مدلل و مبرہن انداز ہے۔ کسی بھی تحریر کا معیاری و اعلیٰ ہونا اس بات کا مقتضی ہے کہ اس کا انداز محققانہ ہو۔ بالخصوص مولانا نے جن جہات پر کام کیا ہے، وہ اس بات کی مقتضی تھیں کہ تحریر تحقیقی انداز میں لکھی جائے تاکہ فریق مخالف کے پاس کوئی حجت باقی نہ رہے۔ مولانا کے اس انداز تحریر پر مختلف علما نے اپنے اپنے انداز میں تبصرہ فرمایا ہے۔ مثلاً حضرت مولانا قاری محمد طیبؒ (مہتمم دار العلوم دیو بند) ''تسکین الصدور'' کے متعلق فرماتے ہیں کہ ''رسالہ کی وقعت و عظمت کے لیے یہ کافی ہے کہ وہ حضرت مولانا سرفراز خان صفدر کی تالیف ہے جو اپنی محققانہ اور معتدلانہ طرز تالیف میں معروف ہیں۔'' (۳) اسی کتاب کے بارے میں مولانا عبدالحق صاحب فرماتے ہیں کہ ''جس محنت اور عرق ریزی سے آپ نے ان مسائل کو تحقیقی دلائل اور اکابر ملت اور معتمد علما کے اقوال سے مبرہن کیا ہے، وہ آپ کی

---

*ایم فل شیخ زاید اسلامک سنٹر، پنجاب یونیورسٹی لاہور

حصہ ہے۔'' (۴) مولانا عبدالرشید نعمانی آپ کے تحقیقی انداز تحریر کے بارے میں فرماتے ہیں: ''الکلام المفید ماشاء اللہ حوالوں سے بھرپور ہے اور بڑی محنت و تحقیق سے لکھی گئی ہے۔'' (۵)

مولانا اپنے تحقیقی انداز تالیف میں نقلی دلائل بھی پیش کرتے ہیں اور عقلی بھی۔ چونکہ مولانا کی تحریروں کا مقصد دین کی صحیح تعبیر و تشریح کر کے صراط مستقیم کو واضح کرنا ہے، لہٰذا یہاں جن نقلی دلائل و براہین کو اہمیت حاصل ہے، وہ قرآن وسنت کے ساتھ ساتھ راسخ فی العلم علما کی تصانیف ہیں اور مولانا کی تحریروں میں ان مستند مصادر سے بیان کردہ نقلی دلائل کثرت سے موجود ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ مولانا نے اپنی تحریر میں استدلال کے جو مختلف طریقے اختیار کیے ہیں، ان میں عقلی اسلوب بھی شامل ہے جس سے مراد یہ ہے کہ عقلی دلائل پیش کر کے اپنے موقف کی خوبی اور مخالف نقطہ نظر کی خامی کو آشکارا کیا جائے۔ اس طرز کو بھی اختیار کیا ہے اور نقلی دلائل کے ساتھ ساتھ بہت سے مقامات پر حسب ضرورت عقلی دلائل بھی پیش کیے ہیں۔ مثلاً نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے اپنے بعض ازواج کی خوشنودی کے لیے شہد کو اپنے آپ پر حرام کر دینے اور اس پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے تنبیہ نازل ہونے کے واقعہ کا ذکر کر کے اس سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں اس نظریے کی نفی پر استدلال کرتے ہیں کہ آپ حاظر و ناظر ہیں اور جمیع ما کان وما یکون کا علم رکھتے ہیں۔ مولانا لکھتے ہیں:

''ہمارا استدلال اس مضمون سے اس طرح ہے کہ اگر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو علم غیب یا جمیع ما کان وما یکون کا علم ہوتا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو نزول آیات سے قبل ہی معلوم ہوتا کہ میرا یہ فعل اللہ کو پسند نہیں ہوگا، لہٰذا میں ایسا نہ کروں۔ کیا فریق مخالف کے نزدیک جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے عمداً ایسا کیا تھا؟ اس سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے حاضر و ناظر اور مختار کل نہ ہونے کی بھی صاف وضاحت ہوگئی ہے۔ اگر آپ حاضر و ناظر ہوتے اور حضرات ازواج مطہرات نے جہاں خفیہ مشورہ کیا تھا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم وہاں تشریف فرما ہوتے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو تمام قصہ معلوم ہوتا۔ اور اگر مختار کل ہوتے تو جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی مرضی سے صرف اپنی ذات بابرکات کے لیے (لونڈی) یا شہد حرام کر دیا تھا تو وہ حرام ہی رہتا۔ اللہ تعالیٰ کی طرف سے تنبیہ نازل نہ ہوتی۔'' (۶)

تحریر کے اسلوب میں ایک طریقہ الزامی جواب دینے کا ہے جو کسی نظریہ یا قول کی تردید میں بعض اوقات بہت موثر ثابت ہوتا ہے۔ اس سے مراد یہ ہے کہ کسی شخص یا گروہ کے نظریے کے کسی ایسے پہلو کو اجاگر کر دیا جائے جو خود اس کے نظریے کی تردید کر رہا ہو۔ یہ اس لحاظ سے بڑی اہمیت رکھتا ہے کہ اس کے بعد فریق مخالف کے پاس فرار کا کوئی راستہ نہیں ہوتا۔ مولانا سرفراز خان صفدر نے اس اسلوب کو بھی موقع کی مناسبت سے خوب استعمال کیا ہے۔

۳۔ قرآن وسنت کے ٹھوس اور صریح دلائل سے آپ نے مخالفین کے جواب دیتے وقت نرمی و شائستگی، عدل و انصاف اور خلق و تہذیب جیسے اعلیٰ اوصاف کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوٹنے دیا اور درشتی و سختی، سب و شتم اور گالم گلوچ کی بجائے اعلیٰ اوصاف حمیدہ اختیار کیے اور عالمانہ انداز میں غلط اور باطل نظریات کا رد کیا۔ چنانچہ وہ لوگ بھی جن کے نظریات کے رد میں آپ نے کام کیا ہے، آپ کی تعریف و توصیف پر مجبور نظر آتے ہیں۔ چنانچہ ڈاکٹر غلام جیلانی برق مرحوم مولانا کی تصنیف ''صرف ایک اسلام بجواب دو اسلام'' کے مطالعہ کے بعد مولانا کے نام اپنے خط میں یوں رقم طراز ہیں:

''دو اسلام کے جواب میں نصف درجن کے قریب کتابیں نکل چکی ہیں جن میں سے مجھے آپ کی کتاب

''صرف ایک اسلام'' بوجوہ پسند آئی۔ اول، اس لیے کہ اس میں گالیاں کم تھیں۔ دوم، انداز تحریر ادیبانہ تھا۔ سوم، اور میری اغلاط کی وضاحت عالمانہ تھی۔''(۷)

ڈاکٹر برق مرحوم ''دو اسلام'' کی طبع ششم میں اپنے ناقدین کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

''ان میں سے چار حضرات کی کتابیں قابل توجہ ہیں۔ ان میں ایک ''صرف ایک اسلام'' از مولانا سرفراز خان (خطیب گکھڑ) ہے۔ ایک لحاظ سے میں ان حضرات کا مشکور ہوں اور خصوصاً مولانا محمد سرفراز خان صفدر کا کہ انہوں نے میری بعض اغلاط واضح کیں۔ موجودہ ایڈیشن کو ان اغلاط سے پاک کر دیا گیا ہے اور تحریر کی تلخی کو بھی بڑی حد تک کم کر دیا گیا ہے...... مولانا سرفراز خان صاحب کے سوا، جنہوں نے کتاب میں کافی حد تک سنجیدگی سے کام لیا ہے، باقی حضرات نے سب وشتم کا وہ مظاہرہ کیا ہے کہ شاید کوئی شستہ مذاق انسان ان کا ایک صفحہ بھی پڑھ سکے۔''(۸)

آپ کی تحریر کے اعلیٰ اوصاف کی نشان دہی حضرت مولانا سید مفتی مہدی حسن (سابق مفتی دار العلوم دیو بند) نے آپ کی کتاب ''راہ سنت'' پر تبصرہ کرتے ہوئے ان الفاظ میں کی ہے کہ ''زبان شستہ وصاف، لہجہ دل آویز، جدال ورنگ مناظرانہ سے دور اور مضامین کی جامع کتاب ہے''۔(۹)

۴۔ تحریر میں اشعار کا برمحل استعمال اس کی خوبصورتی، حلاوت اور تاثیر میں اضافے کا باعث ہوتا ہے۔ بعض اوقات شعر کا ایک مصرعہ ایک پورے پیراگراف کی ضرورت کو پورا کر دیتا ہے۔ اگرچہ عام طور پر مذہبی مصنفین کے ہاں نثر میں اشعار کا استعمال بہت کم ملتا ہے، لیکن مولانا سرفراز خان صفدر نے اپنی تحریروں میں اشعار کا بھرپور استعمال کیا ہے۔

حوالہ جات

۱۔ محمد سرفراز خان صفدر، اظہار الغیب فی کتاب اثبات علم الغیب، ص ا
۲۔ محمد سرفراز خان صفدر، احسن الکلام فی ترک القراءت خلف الامام، ص ۲۶
۳۔ محمد سرفراز خان صفدر، تسکین الصدور، ص ۲۰
۴۔ محمد سرفراز خان صفدر، تسکین الصدور، ص ۲۸
۵۔ محمد سرفراز خان صفدر، الکلام المفید فی اثبات التقلید، ص (د)
۶۔ محمد سرفراز خان صفدر، ازالۃ الریب عن عقیدۃ علم الغیب، ص ۲۹۸
۷۔ محمد سرفراز خان صفدر: صرف ایک اسلام، ص ۷
۸۔ غلام جیلانی برق: دو اسلام، ص ۵۰
۹۔ محمد سرفراز خان صفدر، راہ سنت، ص ا

مولانا مومن خان عثمانی*

امام اہل سنت رحمہ اللہ کا شعری ذوق

امام اہل سنت حضرت مولانا محمد سرفراز خان صفدر کو اللہ تعالیٰ نے علوم ومعارف کا بہت بڑا ذخیرہ عطا فرمایا تھا۔ قرآن وحدیث، فقہ وتفسیر، جرح وتعدیل اور دیگر علوم وفنون پر آپ کو مکمل عبور حاصل تھا اور ہر فن میں آپ ید طولیٰ رکھتے تھے۔ قوت حافظہ، دقت فہم، سیلان ذہن اور اعلیٰ فقاہت نے آپ کو زمانہ کے تمام اہل علم سے ممتاز بنا دیا تھا۔ رسوخ فی العلم، تصلب فی الدین اور قوت استدلال آپ کا خاصہ تھا۔ دوران تدریس مشکل مقامات اور دقیق نکات ایسے دل نشیں انداز میں بیان فرماتے کہ غبی سے غبی طالب علم بھی بآسانی مستفید ہو جاتا۔ اسی طرح آپ کو اردو ادب میں بھی کمال حاصل تھا۔ آپ کی تصانیف میں جہاں دلائل کے انبار ہیں، وہیں اردو ادب کی چاشنی بھی وافر مقدار میں پائی جاتی ہے۔ ایک کامیاب مصنف کی تمام خصوصیات اور خوبیاں آپ کی ذات میں جمع تھیں۔ حضرت نے اپنی تصانیف کی ہر بحث میں جہاں مخالفین کے دعووں کو دلائل سے رد کیا ہے، وہاں مزید دلچسپی کے لیے حسب حال شعر لکھ کر عبارت کے حسن اور مدعا کی تاثیر کو دوبالا کر دیا ہے۔ زیر نظر مضمون میں حضرت امام اہل سنت کا شعری ذوق قارئین کے سامنے لانے کے لیے آپ کی مختلف کتب سے چند اقتباسات جمع کیے گئے ہیں جن میں موقع ومحل کی مناسبت سے اشعار کے برمحل اور بلیغ استعمال کی خوب صورت اور دلچسپ مثالیں پائی جاتی ہیں۔

''افسوس ہے کہ فریق ثانی نے تعصب اور کم فہمی کی وجہ سے ایسا ایٹم بم ایجاد کر لیا ہے کہ اس کی زد سے نہ بڑے بڑے ائمہ بچ سکتے ہیں اور نہ حضرات تابعین، بلکہ حضرات صحابہ کرام اور حتیٰ کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات گرامی بھی ان کے لایعنی فتووں سے محفوظ نہیں رہ سکتی۔ (العیاذ باللہ ثم العیاذ باللہ) دیکھیے، اس ناروا فتوے کی زد سے کون بچ سکتا ہے۔

متاع دین ودانش لٹ گئی اللہ والوں کی   یہ کس کافر ادا کا غمزۂ خوں ریز ہے ساقی''

''اگر فریق ثانی گستاخی نہ سمجھے تو ایک جائز قسم کا ورد عرض کرتا ہوں۔ وہ اس کو پڑھا کریں (اور وہ یا شیخ عبد القادر جیلانی شیئاً للہ کے خالص مشرکانہ ورد سے کوئی تعلق نہیں رکھتا)۔ وہ ورد شریف یہ ہے:

اے میرے باغ آرزو کیسا ہے باغ ہائے تو   کلیاں تو گو ہیں چار سو کوئی کلی کھلی نہیں''

(احسن الکلام)

''اس عبارت سے یہ بھی معلوم ہو گیا کہ روح کا اصل ٹھکانہ جہاں بھی ہو، مگر قبر میں بدن بھی اس کے لیے ایک مکان کی حیثیت رکھتا ہے۔ گویا روح اپنے اس تعلق کی وجہ سے مکین ہے اور بدن اس کے لیے مکان ہے اور مردہ کو جلانے کی صورت

*امیر جمعیت علمائے اسلام تحصیل اوگی، ضلع مانسہرہ

میں گویا روح کو بے مکان کرنا ہے اور چونکہ انبیاء علیہم السلام کے ابدان مبارکہ کا اصل صورت میں موجود ہونا نص حدیث سے ثابت ہے، بعض شہدا اور اولیاء کرام رحمہم اللہ تعالیٰ کے اجسام کا موجود ہونا مشاہدہ سے ثابت ہے، لہٰذا کوئی وجہ نہیں کہ ان کی ارواح مبارکہ کا تعلق ان کے اجسام عنصریہ سے نہ ہو، کیونکہ

دل ہو اور اس میں درد محبت کہیں نہ ہو — عبرت کا ہے محل کہ مکاں ہو مکیں نہ ہو''

''آپ عند القبر سلام کہنے والے کا سلام بنفس نفیس خود سنتے اور اس کا جواب دیتے ہیں اور انصاف کی دنیا میں نہ تو اس اتصال اور تعلق کا انکار ہوسکتا ہے اور نہ اس سے بڑھ کر اس کا کوئی ثبوت پیش کیا جاسکتا ہے۔ ثلج صدر کے لیے یہ دلائل کافی ہیں۔

حریم دل کا کیا کہنا یہاں جلوے ہی جلوے ہیں — بحمد اللہ یہیں وہ ہیں یہیں خلوت نشیں میں ہوں''

(تسکین الصدور)

''یہ ایک واضح حقیقت ہے کہ امت کی اکثریت نے جس طرح حضرت امام ابوحنیفہؒ کے علم و دیانت پر اعتماد کر کے ان کی خوشہ چینی کی ہے، وہ حضرات صحابہ کرام اور کبار تابعین کے بعد اور کسی کو نصیب نہیں ہوسکا اور علم و عرفان اور حدیث وفقہ کی ہزاروں شمعوں کے ہوتے ہوئے جس طرح آتش علم بجھانے کے لیے پروانے ان کے گرد جمع ہوئے ہیں، وہ کسی اور پر جمع نہیں ہوئے۔ کیا خوب کہا گیا ہے کہ

سر بزمِ فلک شب بھر ہزاروں شمعیں جلتی ہیں — مگر اس محفلِ گردوں میں پروانے نہیں دیکھے''

''جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے موزوں کے اعلیٰ حصے پر ہی مسح کیا ہے تو کسی دانش ور کی دانش اور کسی عقل مند کی عقل اور کسی فہیم کی فہم ورائے کی اس پیارے عمل کے مقابلے میں بھلا حیثیت ہی کیا ہے؟ اس موقع پر اگر تسلی اور چین ہوسکتا ہے تو صرف آپ کی پیاری ادا اور آپ کے پسندیدہ عمل اور بہترین اسوۂ حسنہ سے، اس لیے کہ

برسوں فلاسفہ کی چناں اور چنیں رہی — لیکن خدا کی بات جہاں تھیں، وہیں رہی''

''اگر انھوں نے وقت کی اس ضرورت کو اپنے ناخن تدبیر وتفقہ سے حل کر کے امت مرحومہ پر احسان کیا ہے تو اس کی وجہ سے کیا وہ داد وتحسین کے مستحق ہیں یا باعث نفرین ہیں؟

وہ ایک عالم جسے جہاں نے خراج تحسیں ادا کیا ہے — وہ ایک مومن جو لطف خالق کی برکتوں سے قمر بنا ہے''

''یہ الگ بات ہے کہ غیر مقلدین حضرات کو تعصب کی عینک استعمال کر کے رافضی کی طرح کچھ کا کچھ نظر آئے اور اہل الرائے والا اجتہاد اور ان کے متبعین کو ہی ملزم گردانا جائے، مگر اس سے اہل حق کا کیا نقصان؟

تجھے کیوں فکر ہے اے گل دلِ صد چاکِ بلبل کی — تو اپنے پیرہن کے چاک تو پہلے رفو کر لے''

(مقام ابی حنیفہ)

''اگر ان کو [یعنی حضرت شاہ ولی اللہؒ کی جماعت کو] اہل حدیث تسلیم نہیں کرتے تو بتائیں ان سے بڑھ کر اہل حدیث کون ہوا ہے؟ اور اگر یہ اہل حدیث ہیں تو صاف طور پر یہ بتلائیں کہ تقلید اختیار کر کے اور شخصی رائے کی پابندی اختیار کر کے یہ حضرات اہل حدیث کیسے ہوگئے اور کیونکر ہوگئے؟ مگر صد افسوس کہ

اہل گلشن کے لیے بھی باب گلشن بند ہے — اس قدر کم ظرف کوئی باغباں دیکھا نہیں''

(طائفہ منصورہ)

''اس نکتہ پر خان صاحب بریلوی اور مولانا رشید احمد گنگوہی صاحب دونوں متفق ہیں کہ ایصال ثواب کے لیے جو قرآن کریم پڑھا جاتا ہے، اس پر اجرت لینا دینا دونوں حرام ہیں اور ثواب کچھ نہیں ہوتا، بلکہ اس پر استحقاق عذاب ہے۔ اب جو لوگ اس مسئلہ میں علماء دیوبند کو کوستے ہیں تو ان کو بغور سوچ لینا چاہیے کہ طعن کس پر ہوگا؟

یوں نظر دوڑے نہ برچھی تان کر — اپنا بے گانہ ذرا پہچان کر''

(راہ سنت)

''کیا رنجیت سنگھ اور کیول کسی مسلمان کا نام تھا؟ اور کیا سکھوں اور انگریزوں کے ان ایجنٹوں سے جہاد کرنا کسی مسلمان سے جہاد کرنا ہے؟ یہ ہے مولف مذکور کے ہاں مسلمان جو مجاہدین اسلام سے لڑتا ہے اور سکھوں اور انگریزوں سے اس کی دوستی اور محبت ہے۔

فیض تم کو ہے تقاضاے وفا ان سے جنھیں — آشنا کے نام سے پیارا ہے بے گانے کا نام''

''عبد الرحمٰن بن عبد القاری مسلمان تھے، مگر خان صاحب ان کو کافر اور شیطان سے تعبیر کرتے ہیں۔ جب خان صاحب صحابی یا ثقہ تابعی کو کافر کہنے سے نہیں چوکے تو اگر وہ اس دور کے اہل حق علما اور مجاہدین کو کافر کہہ دیں تو کون سی انوکھی بات ہے۔ کافروں کو مسلمان بنانا تو ان کے بس کا روگ نہیں، تکفیر مسلم ہی کے ذوق وشوق سے وہ فرحاں ہیں۔

پھولوں کے تو قابل نہیں قطعاً تیرا دامن — اے صاحب گلشن اسے کانٹوں سے ہی بھر دے''

''مولف مذکور اور ان کے ہوشیار اکابر نے یہ باور کرا رکھا ہے اور عوام کو اسی کا درس دیتے ہیں اور ان کے خلاف ایسے بے اصل شوشے چھوڑتے اور تاریخی حقائق کو مسخ کرنے کے درپے ہیں کہ تحریک آزادی اور پاکستان بنانے میں علماء دیوبند کا کوئی حصہ نہیں اور حقیقت اس کے برعکس ہے۔

ہمیں سے رنگ گلستاں ہمیں سے رنگ بہار — ہمیں کو نظم گلستاں پہ اختیار نہیں''

''تکفیر رضا خانی فرقہ کا آبائی ورثہ ہے اور باب سوم کے روشن حوالوں سے اس پر خاصی بحث ہوچکی ہے کہ انگریز کا ہر مخالف اور تحریک آزادئ ہند کا کوئی عالم، پیر اور سیاسی لیڈر ایسا نہیں جو ان کے تکفیری گولے سے بچ سکا ہے۔

گھائل تری نظر کا بنوع دگر ہر ایک — زخمی کچھ ایک بندۂ درگاہ ہی نہیں''

(اظہار العیب)

''ہم تو مدینہ طیبہ سے عقیدت اور محبت کو ایمان کی جز سمجھتے ہیں۔ سنیے کیا خوب کہا گیا ہے:

الٰہی کیسی پر انوار گلیاں ہیں مدینے کی — خداوندا! انھیں دیکھا نہیں ہے نام سنتے ہیں
در محبوب پر پہنچیں یہی ارمان ہے دل میں — مریض عشق پاتا ہے وہاں آرام سنتے ہیں
وہ یاد آتے ہیں تو اک ہوک سی اٹھتی ہے سینے میں — کلیجہ تھام لیتے ہیں جب ان کا نام سنتے ہیں''

اعلیٰ حضرت خان صاحب بریلوی حدائق بخشش حصہ دوم ص ۵۰ میں لکھتے ہیں:

سر سوے روضہ جھکا پھر تجھ کو کیا — دل تھا ساجد نجدیا پھر تجھ کو کیا
بیٹھتے اٹھتے مدد کے واسطے — یا رسول اللہ کہا پھر تجھ کو کیا
یا عبادی کہہ کے ہم کو شاہ نے — بندہ اپنا کر لیا پھر تجھ کو کیا
دیو کے بندوں سے کب ہے یہ خطاب — نہ تو ان کا ہے نہ تھا پھر تجھ کو کیا
نجدی مرتا ہے کہ کیوں تعظیم کی — یہ ہمارا دین ہے پھر تجھ کو کیا
دیو کے بندوں سے ہم کو کیا غرض! — ہم ہیں عبد المصطفیٰ پھر تجھ کو کیا

امام اہل سنت نے اس کا جواب اسی وزن پر درج ذیل اشعار میں دیا ہے:

تو اگر مشرک ہوا پھر ہم کو کیا — پیٹ کا بندہ بنا پھر ہم کو کیا
تو نے کی تحریف قرآن وحدیث — راندۂ درگاہ ہوا پھر ہم کو کیا
خالق کون ومکاں کو چھوڑ کر — غیر کے در پر جھکا پھر ہم کو کیا
شرک وبدعت کو کیا تو نے پسند — توحید وسنت سے پھرا پھر ہم کو کیا
آیہ ایاک نستعین کو — کر دیا تو نے بھلا پھر ہم کو کیا
ہم تو اللہ کے بندے سبھی — تو ہے عبد المصطفیٰ پھر ہم کو کیا

(آنکھوں کی ٹھنڈک)

''برطانیہ نے شریف مکہ کے توسط سے ترکوں کے خلاف جنگ کرنے کے جواز پر کس سے فتویٰ حاصل کرنا چاہا تھا اور کس نے اس کا انکار کر کے سالہا سال تک مالٹا میں اسیری کی زندگی بسر کی تھی؟ اور کس کو مالٹا کے زنداں میں گھر کی سی لذت محسوس ہوتی تھی؟ جنھوں نے شاید بزبان حال یہ بھی کہا ہو کہ

نئی دنیا بنا دی لذتِ ذوق اسیری نے — قفس میں رہنے والوں کو خیالِ آشیاں کیوں ہو''

''فریق مخالف کی بلا سے! وہ تو اپنی ساکھ اور حلوے مانڈے کے لیے بدعات کو سنگینوں کے پہرے سے محفوظ رکھنے کے درپے ہے۔ اس کے مقابلے میں توحید وسنت کا گلستاں اجڑتا ہے تو ان کو اس کی کوئی پروا نہیں۔ ہاں گیارھویں شریف، ختم، میلاد اور عرس وغیرہ پر کوئی زد نہ پڑے۔ آہ!

کس نے اپنے آشیاں کے چار تنکوں کے لیے — برق کی زد میں گلستاں کا گلستاں رکھ دیا''

(ازالۃ الریب)

''برق صاحب ہی فرمائیں کہ کیا جن کی نبوت تمام انسانوں اور جنوں بلکہ تمام مخلوق کے لیے ہو اور زمانہ بھی محدود نہ ہو (کہ ان کے بعد کوئی اور نبی مبعوث ہو کر اگرچہ بعض ہی احکام کیوں نہ ہوں، منسوخ کر سکے) وہ افضل ہوں گے یا وہ جن کی نبوت باعتبار قوم اور زمانہ کے محدود اور مخصوص ہو؟ دیکھیے کیا ارشاد ہوتا ہے!

الٹی سمجھ کسی کو بھی ایسی خدا نہ دے — دے موت آدمی کو پر ایسی ادا نہ دے''

''برق صاحب کو مناسب تھا کہ وہ ملا کے مبلغ علم کا ماتم کرنے سے پہلے ٹھنڈے دل سے اس حقیقت کو سوچ لیتے اور اس

کے بعد قلم تحقیق کو جنبش دیتے، مگر ان کی بلا سے! وہ تو میدان اوہام اور ظنون میں بے سروپا باتیں کرنے اور خیالی گھوڑے دوڑانے کے عادی ہیں۔ نہ دماغ پر کنٹرول ہے اور نہ قلم قابو میں ہے۔

شوریدگی کے ہاتھ سے سر ہے وبالِ دوش — صحرا میں اے خدا کوئی دیوار بھی نہیں''

(صرف ایک اسلام)

''اکابرین علمائے دیوبند کثر اللہ جماعتہم جو اس زمانہ میں صحیح معنی میں اہل السنت والجماعت ہیں، ائمہ دین کے قدم بقدم ہیں اور ان کے عقیدہ اور عمل سے سر مو انھوں نے تجاوز نہیں کیا۔ اگرچہ کئی لوگ افراط وتفریط کی حدود کو پھاند کر دور نکل گئے، مگر یہ اکابر جہاں تھے، وہاں ہی ہیں:

وہ تری گلی کی قیامتیں کہ لحد کے مردے اکھڑ گئے — یہ مری جبین نیاز ہے کہ جہاں دھری تھی دھری رہی''

''قارئین کرام سے التجا کرتے ہیں کہ وہ تمام اہل توحید کے لیے دعا کریں اور خصوصیت سے اس ناچیز کے لیے جس کی تھوڑی سی فانی زندگی میں خدا جانے کیسے کیسے اور کتنے بڑے بڑے گناہ صادر ہو چکے ہیں، مگر جب اللہ تعالیٰ کی ستار اور غفار ہونے کی صفت پر دھیان پڑتا ہے تو بے اختیار زبان سے نکلتا ہے کہ:

مرے گناہ زیادہ ہیں یا تری رحمت — کریم تو ہی بتا دے حساب کر کے مجھے''

(راہ ہدایت)

''اکابر علما کا طریقہ یہ تھا اور ہے کہ وہ ان احادیث کو تسلیم کرتے ہوئے حسب فہم اس کی مناسب تاویل کرتے ہیں، لیکن فریق ثانی کو ملحد وزندیق اور مبتدع کسی نے نہیں کہا۔ تکفیر سازی کا یہ عہدہ جناب نیلوی صاحب اور ان کے سید سند کو ہی حاصل ہے۔

قسمت کیا ہر ایک کو قسام ازل نے — جو شخص کہ جس چیز کے قابل نظر آیا''

''جناب نیلوی صاحب! ایسا صریح دھوکہ تو نہ دیں۔ آپ نہ تو حنفی ہیں نہ دیوبندی۔ صرف اپنی نارسا عقل کے پیروکار ہیں۔ آپ کو حنفیت اور دیوبندیت سے کیا واسطہ اور تعلق؟

ہو چکا قطع تعلق تو جفائیں کیوں ہوں؟ — جن کو مطلب نہیں رہتا، وہ ستاتے بھی نہیں''

(المسلک المنصور)

''جناب خمینی صاحب! یہ روایت تو حضرت علی سے مروی ہے اور وہ فرماتے ہیں کہ متعۃ النساء سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے منع فرمایا ہے۔ کیا آپ کے نزدیک متعہ جیسے لذیذ فعل کی نہی نقل کر کے حضرت علی بھی حضرت عمر کے ساتھ قرآنی حکم کے مخالف نہیں ہو گئے؟ لب کشائی تو کیجیے، بات کیا ہے!

میرے رونے سے مرا دامن ہی تر ہوتا تو خیر — شرم سے ظالم جبیں تیری بھی تر ہو جائے گی''

''تقیہ شیعہ کے نزدیک روئے زمین کی تمام اشیا سے محبوب ترین چیز ہے کہ دین کے نو حصے اسی میں شامل ہیں اور اسی میں عزت، رفعت اور درجات کی بلندی منحصر ہے۔ یعنی جھوٹ میں ثواب ہے۔

کیا جو جھوٹ کا شکوہ تو یہ جواب ملا — تقیہ ہم نے کیا تھا ہمیں ثواب ملا''

''اور کون کم بخت دنیا کی لذت اور آخرت کے ثواب کی تحصیل سے جان چھڑائے گا؟ ہم خرما و ہم ثواب۔ ممکن ہے کہ دنیا کی لذت کا دل دادہ کوئی متعہ باز یہ کہہ دے:

اک حقیقت سہی فردوس میں حوروں کا وجود حسن انساں سے نمٹ لوں تو وہاں تک دیکھوں''

''اندازہ کیجیے کہ شیعہ اور امامیہ کے مذہب میں جنسی خواہشات کی تکمیل کے لیے کس قدر وسعت اور فراوانی ہے کہ آزاد عورت ہو یا لونڈی ہو، منکوحہ ہو یا غیر منکوحہ، اس کی شرم گاہ کسی دوسرے کو لطف اندوز ہونے کے لیے عاریتاً دینے میں قطعاً کوئی حرج اور مضائقہ نہیں ہے۔ شاید شیعہ امامیہ کا ورد یہ ہو:

شب وصل تھی چاندنی کا سماں تھا بغل میں صنم تھا خدا مہرباں تھا''

(ارشاد الشیعہ)

''المہند کو اول سے آخر تک پڑھ لیں اور انصاف کریں کہ کیا اس میں حضرت تھانوی کی تکفیر کی گئی ہے یا تکفیر سے ان کی براءت بیان کی گئی ہے؟ اور کیا اس کتاب میں ان کی تردید کی گئی ہے یا تصدیق اور تقریظ حاصل کی گئی ہے؟ مگر

یہ ملا کافروں کو دولت اسلام کیا دے گا اسے کافر بنانا بس مسلمانوں کو آتا ہے''

(عبارات اکابر)

''تعجب ہے کہ اس پر اپنے بے بنیاد مذہب اور مسلک کی بنیاد رکھی جا سکتی ہے اور ان کی تکفیر کے لیے نعرۂ تکبیر و رسالت وغوثیہ کی گونج میں عوام سے داد تحسین حاصل کی جاتی ہے اور اس پر بھی وہ یہ چاہتے ہیں کہ ہم لب کشائی نہ کریں۔ آہ!

صدائے نالہ دل پر خموشی کس کا شیوہ ہے تو ہی کہہ دے کہ پتھر کا جگر تیرا ہے یا میرا؟''

(بانی دار العلوم دیوبند)

میں نوجوانوں کو کہا کرتا ہوں کہ بھئی، بات سنو۔ اس موقع پر ہر طبقہ ذرا جوش میں ہوتا ہے۔ بعض ایسے ہوتے ہیں جو جوش میں غلط نعرے بھی لگاتے ہیں۔ اگر کوئی ایسا غلط نعرہ سنو تو خاموشی اختیار کرو۔ لڑائی نہ کرو۔ لڑائی بری چیز ہے۔ پھر ایسا بھی ہوتا ہے کہ باطل فرقوں کو کم عقل لوگوں کی طرف سے شرارتی بندے بھی مل جاتے ہیں۔ وہ ایجنٹ ہوتے ہیں۔ کسی پر پتھر پھینکا، کسی سے تو تو میں میں ہوتی ہے تاکہ جھگڑا پیدا ہو۔ اس وقت ملک کے اندر اندرونی تخریب کاریاں بھی ہیں، بیرونی تخریب کاریاں بھی ہیں۔ میں نوجوانوں کے سامنے عرض کرتا ہوں، اگر اشتعال انگیز نعرہ سنو تو خاموش ہو جاؤ۔ جھگڑا، فتنہ فساد شروع نہ کرو۔ ایسے جلوسوں کو بدعت سمجھو، گناہ ہے۔ شرکت نہ کرو، تعاون نہ کرو، لیکن کسی سے جھگڑو بھی نہیں۔ لڑائی بھی نہ کرو۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں یہودی بھی ہوتے تھے، عیسائی بھی ہوتے تھے، بت پرست اور مجوسی بھی ہوتے تھے، آتش پرست بھی ہوتے تھے، اپنا اپنا ساز بجاتے تھے، لیکن کسی سے لڑائی جھگڑا نہیں ہوا۔ (خطبات امام اہل سنت ۲/۲۷۰، ۲۷۱)

—— ٤ ——

نقوش وتاثرات

مولانا ابوعمار زاہد الراشدی*

حضرت والد محترمؒ سے وابستہ چند یادیں

حضرت مولانا محمد سرفراز خان صفدرؒ میرے والد گرامی تھے‘ استاد محترم تھے‘ شیخ و مربی تھے اور ہمارے درمیان دوستی اور بے تکلفی کا وہ رشتہ بھی موجود تھا جو ہر باپ اور اس کے بڑے بیٹے کے مابین ہوتا ہے۔ ۵ مئی کو رات ایک سوا ایک بجے کے لگ بھگ وہ کم وبیش ایک صدی اس دنیا میں گزار کر دار القضاء کی طرف کوچ کر گئے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ میں خود ہجری اعتبار سے ۶۲ سال کا ہو چکا ہوں۔ میرے جذبات وتاثرات کا وہی عالم ہے جو حضرت مولانا سید محمد یوسف بنوریؒ کا اپنے والد گرامی حضرت مولانا سید محمد زکریا بنوریؒ کی وفات پر تھا۔ وہ مولانا سید یوسف بنوریؒ کی وفات سے کچھ ہی عرصہ قبل اس جہانِ فانی سے رخصت ہوئے تھے۔ اپنے بزرگ باپ کی وفات پر مولانا بنوریؒ رو رہے تھے تو کسی نے دریافت کیا کہ حضرت! آپ کے والد بزرگوار نے ماشاء اللہ خاصی عمر پائی ہے اور بہت اچھی زندگی گزاری ہے‘ آپ روتے کیوں ہیں؟ فرمایا کہ روتا اس لیے ہوں کہ اب مجھے ”اے یوسف“ کہہ کر بلانے والا نہیں رہا۔ میری کیفیت بھی کچھ اسی طرح کی ہے اور سوچتا ہوں کہ اب ”زاہد کو بلاؤ“ کون کہے گا اور ”زاہد ادھر آؤ“ کہہ کر بلانے والا کون ہوگا؟

وفات کے وقت ان کی عمر ہجری حساب سے اٹھانوے برس تھی کہ وہ اپنا سن ولادت ۱۳۳۲ھ بتایا کرتے تھے۔ ان کے والد محترم جناب نور احمد خان مرحوم شاہراہ ابریشم پر واقع شنکیاری سے چند میل کے فاصلے پر کڑمنگ کے قریب ایک پہاڑی چوٹی ”چیرآں ڈھکی“ میں رہتے تھے۔ چھوٹے موٹے زمیندار تھے۔ سوات کے معروف روحانی پیشوا حضرت اخوند زادہ عبد الغفور سواتیؒ سے بیعت وعقیدت کا تعلق تھا۔ ضلع مانسہرہ کے طول وعرض میں آباد سواتی قوم میں سے تھے۔ انہوں نے دینی تعلیم اپنے چھوٹے بھائی مولانا صوفی عبد الحمید خان سواتیؒ کے ہمراہ‘ جن کا گزشتہ سال اپریل (۲۰۰۸ء) میں انتقال ہوا ہے‘ مانسہرہ‘ گوجرانوالہ‘ جہانیاں منڈی‘ وڈالہ سندھواں اور دوسرے علاقوں کے دینی مدارس میں حاصل کی۔ ۱۹۴۱ء میں دار العلوم دیوبند پہنچے جہاں دونوں بھائیوں نے دورہ حدیث کیا اور حضرت مولانا سید حسین احمد مدنیؒ سے شرف تلمذ کے ساتھ سند فراغت وفضیلت حاصل کی۔ ۱۹۴۳ء میں وہ گکھڑ آ گئے اور جی ٹی روڈ پر ایک مسجد میں امامت وخطابت کا سلسلہ شروع کیا جو ۲۰۰۰ء تک مسلسل جاری رہا۔ پانچ وقت نمازوں کی امامت‘ نماز فجر کے بعد بلا ناغہ درس قرآن وحدیث اور جمعہ وعیدین کے خطبوں کے علاوہ درس نظامی کے مختلف درجات کی تدریس کم وبیش ساٹھ برس تک ان کا روزمرہ کا معمول رہی۔

ان کی دو بیویاں تھیں جن سے ہم بارہ بھائی اور تین بہنیں پیدا ہوئے۔ تین بھائی بچپن میں ہی فوت ہو گئے۔ نو بھائی جوان ہوئے جو سب کے سب دینی تعلیم سے آراستہ ہیں‘ عالم ہیں‘ حافظ ہیں۔ تینوں بیٹیوں کو دینی تعلیم سے بہرہ ور کیا‘ تینوں

*فرزند اکبر وجانشین امام اہل سنتؒ۔ شیخ الحدیث مدرسہ نصرۃ العلوم گوجرانوالہ۔

ہم سب اسی ادب واحترام کی فضا میں پروان چڑھتے رہے تا آنکہ والد صاحبؒ سے رشتہ تلمذ بھی قائم ہوا اور بعض بھائیوں کو سلسلہ ارادت بھی نصیب ہوا۔ تلمذ وارادت کے رشتوں کے لیے مزید ادب واحترام کی پختگی اور ناگزیری ظاہر وباہر ہے۔ رشتہ ابوۃ وبنوۃ کے لیے حسب روایات دنیا کسی قدر بے تکلفی، بے حجابی لازم ہے جس کی وجہ سے بعض اوقات ادب واحترام کو کما حقہ ملحوظ رکھنا مشکل بھی ہوتا ہے، لیکن اس کو والد صاحبؒ کی کرامت جانیے کہ ہم سب بھائیوں نے تقریباً ساری زندگی صلبی رشتہ کو اول الذکر رشتوں کے پہلو میں مغلوب بلکہ کالمعدوم رکھ کر ادب واحترام کو حتی الوسع پوری طرح برقرار رکھنے کی کوشش کی اور روئے ارض پر شاید ہی ایسے گھرانے ہوں جن کو یہ سعادت بایں طرز نصیب ہوئی ہو۔ ع

کم ہیں وہ طائر جو ہیں دام وقفس سے بہرہ مند

قرآن کریم کی حافظہ ہیں اور درس نظامی کی تعلیم سے بھی فیض یافتہ ہیں اور تینوں دینی علوم کی تدریس میں مصروف ہیں۔ والد محترم خود حافظ قرآن نہیں تھے، مگر سب بیٹوں اور بیٹیوں کو قرآن کریم حفظ کرایا۔ ان سے کوئی پوچھتا کہ حضرت! آپ حافظ ہیں؟ تو جواب میں کہتے کہ ''میں حافظوں کا باپ ہوں''۔

میں نے جب ہوش کے ناخن لینا شروع کیے تو ہم گکھڑ میں جی ٹی روڈ پر بٹ دری فیکٹریوں کے چوبارے میں رہتے تھے۔ ہماری والدہ مرحومہ گوجرانوالہ سے تھیں۔ شیرانوالہ باغ کے سامنے ریلوے پھاٹک سے دوسری طرف واقع پولیس تھانے کے عقب میں رام بستی نامی محلہ کی مسجد میں ہمارے نانا مرحوم مولوی محمد اکبر صاحب امام مسجد تھے جو راجپوت جنجوعہ برادری سے تعلق رکھتے تھے۔ بڑے باذوق بزرگ تھے، قرآن کریم معروف لہجے میں اور اچھے انداز میں پڑھا کرتے تھے جو اس زمانہ میں بہت کمیاب تھا۔ زیادہ پڑھے لکھے نہیں تھے، لیکن میں نے بہت سے معیاری علمی جرائد ان کے ہاں ڈاک سے باقاعدہ آتے دیکھے جن میں الفرقان، النجم، برہان، خدام الدین اور درس قرآن جیسے رسالے بھی شامل تھے۔ وہ ان کا مطالعہ کرتے اور اہتمام سے ان کی جلدیں بنواتے تھے۔ یہ منظر اب بھی میری آنکھوں کے سامنے ہے کہ وہ مسجد کے صحن میں ٹہلتے ہوئے قرآن کریم کی بلند آواز سے تلاوت کیا کرتے تھے یا عربی، فارسی کی کوئی مناجات ترنم سے پڑھتے تھے۔ حضرت صدیق اکبرؓ سے منسوب مناجات ”خذ بلطفك يا الهیٰ من له زادٌ قليل“ سب سے پہلے میں ان سے سنی اور ان کے لہجے کا سوز ابھی تک کانوں میں رس گھول رہا ہے۔

بٹ دری فیکٹری کی وہ پرانی عمارت تھی۔ نیچے کھڈیاں تھیں اور اوپر چوبارہ تھا جس میں ہماری رہائش تھی۔ حاجی اللہ دتہ بٹ مرحوم گکھڑ کے ان تین چار بزرگوں میں سے ہیں جو والد محترم حضرت مولانا سرفراز خان صفدر رحمہ اللہ تعالیٰ کو ۱۹۴۳ء میں گکھڑ لانے کا باعث بنے اور ان کے اولین ساتھی اور پشت پناہ ثابت ہوئے۔ دوسرے بزرگوں میں حاجی فخر الدین صاحب مرحوم، ماسٹر کرم دین مرحوم، چودھری غلام حسین چیمہ مرحوم، ملک محمد اقبال مرحوم اور چودھری محمد عبداللہ چیمہ مرحوم کے نام لیے جاتے ہیں۔ حضرت والد محترمؒ جب دارالعلوم دیوبند سے فارغ التحصیل ہو کر گوجرانوالہ آئے اور مدرسہ انوار العلوم میں تدریسی خدمات میں مصروف تھے کہ حاجی اللہ دتہ بٹ صاحب مرحوم اور ان کے رفقا کی فرمائش پر وہ گکھڑ آ گئے جہاں جی ٹی روڈ پر بوہڑ والی مسجد میں انہیں امامت وخطابت کے فرائض سپرد کیے گئے جبکہ چچا محترم حضرت مولانا صوفی عبدالحمید خان سواتی قدس اللہ سرہ العزیز دارالعلوم دیوبند سے فراغت کے بعد لکھنؤ اور پھر حیدرآباد دکن چلے گئے جہاں انہوں نے امام اہل سنت حضرت مولانا عبدالشکور لکھنویؒ سے مناظرہ کا دورہ کیا اور عثمانیہ طبیہ کالج حیدرآباد دکن میں حکیم حاذق کا باقاعدہ کورس کیا۔

حاجی اللہ دتہ بٹ صاحب مرحوم کو ہمارے خاندان کے بزرگ کی حیثیت حاصل ہو گئی تھی اور وہ بھی ہمارے ساتھ بہت شفقت فرماتے تھے۔ شادی غمی میں خاندانی بزرگ کی طرح شریک ہوتے۔ ان کی اہلیہ مرحومہ کو ہم دادی سمجھا کرتے تھے اور وہ بے جی بٹنی کے نام سے ہمارے ہاں معروف تھی۔ بٹ صاحب مرحوم کے خاندان کے ساتھ ہمارا گھریلو میل جول اس حد تک رہا ہے کہ ہم ان کے بیٹوں کو چچا اور بیٹیوں کو پھوپھی کہا کرتے تھے اور اب بھی انھیں ہمارے خاندانی ماحول میں وہی مقام حاصل ہے۔ اسی طرح ماسٹر بشیر احمد صاحب کشمیری مرحوم کے خاندان کے ساتھ ہمارے تعلقات کی نوعیت کچھ اسی طرح کی تھی۔ ان کے بڑے بھائی صوفی نذیر احمد صاحب ہمارے گھر میں تایا جی کہلاتے تھے، ان کی والدہ محترمہ کو بے جی کا

مقام حاصل تھا جبکہ ان کی بہنیں ہماری پھوپھیاں کہلاتی ہیں اور انھی میں سے ایک پھوپھی میرے چھوٹے بھائی مولانا عبدالقدوس قارن کی خوش دامن ہیں۔

گکھڑ کی یہ مسجد جس میں والد صاحب تشریف لائے، چیمہ برادری کے ایک پرانے بزرگ مولوی غلام حیدر چیمہ مرحوم نے بنوائی تھی۔ ان کی قبر مسجد کے ایک کونے میں نیچے کمرے میں موجود ہے جہاں مسجد کی شب وروز کی دینی اور تعلیمی سرگرمیوں کی برکات اور اجر وثواب کا فیضان جاری رہتا ہے۔ حضرت والد صاحبؒ گکھڑ آئے تو مسجد میں امامت وخطابت کے ساتھ درس وتدریس کا سلسلہ بھی شروع کر دیا جو گوجرانوالہ میں مدرسہ نصرۃ العلوم کے قیام اور اس میں ان کی تدریس کے سلسلہ کے آغاز تک جاری رہا۔ پرانے رواج اور طرز کے مطابق مختلف علاقوں سے طلبہ جمع ہو جاتے تھے، ان کا قیام مسجد میں ہوتا تھا، گاؤں کے لوگ کھانا دے دیا کرتے تھے، اس طرح کے طلبہ خود مختلف گھروں سے جا کر کھانا لے آتے تھے اور مسجد میں شب وروز تعلیم کا سلسلہ جاری رہتا تھا۔ اسباق کی درجہ بندی نہیں ہوتی تھی اور طلبہ اپنی اپنی استعداد اور ذوق کے مطابق اسباق پڑھتے تھے۔ اس دوران صبح سے شام تک اسباق چلتے رہتے تھے۔ حضرت والد صاحبؒ سے ایک بار سنا کہ بسا اوقات دن میں تیس تیس اسباق بھی پڑھانے میں آ جاتے تھے۔ سیکڑوں علمائے کرام نے اس دور میں استفادہ کیا۔ ان کے بہت سے پرانے شاگرد جب ملتے ہیں تو اس زمانے کے واقعات سناتے رہتے ہیں۔

میری ولادت ۲۸ راکتوبر ۱۹۴۸ء کو ہوئی۔ جب بٹ دری فیکٹری کا چوبارہ ہمارا مسکن تھا، وہاں کی کچھ کچھ باتیں ذہن کی سکرین پر جھلملاتی رہتی ہیں۔ والد محترم اور والدہ محترمہ کے علاوہ ایک بزرگ خاتون کا ہیولیٰ سا ذہن میں موجود ہے۔ شکل یاد نہیں، لگتا ہے کہ وہ ہماری دادی مرحومہ تھیں، یعنی حضرت والد محترمؒ کی سوتیلی والدہ جنہیں گکھڑ میں مقیم ہونے کے بعد وہ ہزارہ سے جا کر لے آئے تھے۔ ان کا انتقال گکھڑ میں ہوا اور بٹ دری فیکٹری کے عقب کے قبرستان میں ان کی قبر موجود ہے۔ جب تک میں عید کی نماز گکھڑ میں حضرت والد صاحبؒ کے ساتھ پڑھتا رہا، ان کا معمول تھا کہ عید کی نماز کے بعد دادی مرحومہ کی قبر پر جاتے، ان کے لیے دعا کرتے،، ہمیں بتاتے کہ یہ تمہاری دادی کی قبر ہے اور میں بھی دعا میں شریک ہو جاتا۔ پھر اسی قبرستان میں ہمارے خاندان کے وہ سب افراد مدفون ہوئے جن کا گکھڑ میں انتقال ہوا۔ ان میں ہماری دونوں مرحومہ مائیں، ہمارے چھوٹے بھائی قاری محمد اشرف خان ماجد مرحوم، ہمارے دو چھوٹے بھائی عبدالرشید اور عبدالکریم جن کا بچپن میں انتقال ہو گیا تھا اور قاری ماجد مرحوم کے دو بیٹے محمد اکرم اور محمد اکمل شامل ہیں اور اب خاندان کے سربراہ حضرت والد محترمؒ کو بھی اسی قبرستان میں سپرد خاک کیا گیا۔

بٹ دری فیکٹری والے مکان سے مجھے حضرت والد محترمؒ کا جیل جانا یاد ہے۔ یہ ۱۹۵۳ء کی تحریک ختم نبوت کی بات ہے۔ اس کی دو باتیں ذہن میں ہیں۔ ایک یہ کہ ہم چھوٹے چھوٹے بچے گلیوں میں ٹولیوں کی صورت میں مرزا غلام احمد قادیانی کے خلاف ٹھیٹھ پنجابی میں مخصوص نعرے لگایا کرتے تھے۔ دوسری بات یہ کہ حضرت والد محترمؒ نے پولیس چوکی خود جا کر گرفتاری پیش کی۔ اس دن صبح والدہ مرحومہ نے حلوہ پکایا تھا اور ایک طالب علم جس کا نام غالباً عزیز الرحمٰن تھا، والد کا بستر اُٹھا کر ساتھ لے گئے۔ حضرت والد صاحبؒ کا سیڑھیوں سے اترنے کا منظر میرے ذہن میں اب تک محفوظ چلا آ رہا ہے۔

وہ تقریباً دس ماہ تک ملتان جیل میں رہے اور اس دوران ہم نے مکان تبدیل کیا۔ بٹ دری فیکٹری کے چوبارے سے

ہم مسجد ٹھیکداراں والی گلی میں ایک مکان میں منتقل ہو گئے جو کرایے کا تھا اور اس میں کئی سال بسر کیے۔ اس سے قبل ہماری چھوٹی والدہ مرحومہ بھی آ چکی تھیں اور ہم سب نے نئے مکان میں بسیرا کیا۔ ٹھیکیداروں والی مسجد کی گلی والے مکان سے چند سالوں کے بعد ہم جی ٹی روڈ پر ماسٹر خوشی محمد مرحوم کے مکان میں منتقل ہو گئے جس کا دروازہ عقبی گلی میں تھا اور نیچے اوپر دو منزلیں تھیں۔ ہم رہتے اوپر تھے مگر سامان وغیرہ نیچے ہوتا تھا۔ یہ بھی کرایے کا مکان تھا۔ ایک دفعہ سیلاب آیا تو نچلی منزل میں پڑا سامان جس میں کتابیں بھی تھیں، بھیگ گئے اور انہیں خشک کرنے میں خاصے دن لگ گئے۔

چھوٹی والدہ مرحومہ حضرت والد محترمؒ کے چچا جناب محمد فیروز خان مرحوم کی بیٹی تھیں جن کی رہائش شنکیاری سے آگے حاجی آباد اڈے سے مغرب کی جانب بستی کورے میں تھی اور اب وہاں ان کے ایک فرزند اور ہمارے ماموں قاری یحییٰ سلطان صاحب رہتے ہیں۔ ہماری دونوں ماؤں نے ایک ہی گھر میں اکٹھے زندگی گزاری، دونوں کے مزاج میں نیکی اور خیر کا غلبہ تھا۔ حضرت والد محترمؒ کے مزاج میں اصول پرستی اور سخت ڈسپلن کا رجحان غالب تھا، اس لیے کبھی کبھار چھوٹے موٹے اختلافات اور ان کے اظہار کے باوجود مجموعی طور پر گھر کا ماحول اتحاد و اتفاق ہی کا تھا۔ گھر کے کاموں میں تقسیم تھی اور نظام بخوبی چلتا رہا۔ کھانا ایک ہی جگہ پکتا تھا اور سب مل کر کھاتے تھے۔ ہم بہن بھائیوں میں بھی سوتیلے پن کا احساس واضح نہ تھا۔ ایک دوسرے کے ساتھ محبت پیار اور اعتماد و سلوک کی فضا میں ہم سب جوان ہوئے اور یہ فضا بحمد اللہ تعالیٰ اب بھی قائم ہے۔ لوگوں کے پوچھنے پر ہمیں بتانا پڑتا ہے کہ دونوں ماؤں سے اولاد کی تقسیم کیا ہے، ورنہ ہمارے ہاں عام طور پر اس کا تذکرہ نہیں ہوتا۔

ہم سب کی تعلیم کا آغاز گھر سے ہوا۔ مسجد میں بچوں کی دینی تعلیم یعنی قرآن کریم حفظ و ناظرہ کا مدرسہ بعد میں قائم ہوا، مگر ہمارے گھر میں اس سے بہت عرصہ پہلے سے درسگاہ قائم تھی جس کے دو حصے تھے۔ ایک حصے کے استاذ حضرت والد محترمؒ تھے۔ ان سے گکھڑ کے مختلف گھرانوں کی بچیاں قرآن کریم کا ترجمہ، عربی گریمر اور درس نظامی کی کتابیں کسی باقاعدہ درجہ بندی کے بغیر پڑھتی تھیں۔ ہماری بہنوں نے درس نظامی کا کم و بیش پورا نصاب ان سے پڑھا ہے۔ ان کے ساتھ بیسیوں دیگر لڑکیوں نے بھی تعلیم حاصل کی ہے۔ ہماری دونوں ماؤں نے قرآن کریم کا ترجمہ ان سے پڑھا ہے۔ میں نے حفظ قرآن کریم کے بعد صرف و نحو کی ابتدائی کتابیں یعنی میزان الصرف، نحو میر، علم الصیغہ وغیرہ انھی سے گھر میں پڑھی ہیں، بلکہ مدرسہ نصرۃ العلوم میں ۶۲ء سے ۶۹ء تک تعلیم کے دوران سالانہ چھٹیوں میں وہ گزشتہ سال پڑھی ہوئی کتابوں میں سے ایک دو کا انتخاب کر کے مجھ سے سنتے بھی تھے۔ کم و بیش ہم سب بہن بھائیوں کے ساتھ ان کا اسی طرح کا معاملہ تھا۔ گھر میں ان کا یہ تدریسی سلسلہ اگرچہ دن کے مختلف اوقات میں متفرق ہوتا تھا، مگر یہ پوری ایک درسگاہ کا کام تھا جو وہ خاموشی کے ساتھ کرتے جاتے تھے۔

ہماری گھریلو درس گاہ کا دوسرا حصہ وہ تھا جس کی صدر معلمہ ہماری بڑی والدہ مرحومہ تھیں اور ہماری چھوٹی امی مرحومہ بھی اس میں ان کے ساتھ شریک کار رہتی تھیں۔ مختلف گھرانوں کے بچے اور بچیاں ان سے قرآن کریم ناظرہ و حفظ اور قرآن کریم کا ترجمہ پڑھتے تھے۔ والدہ مرحومہ خود حافظہ نہیں تھیں، لیکن بہت سی بچیوں نے ان سے قرآن کریم حفظ کیا۔ ایک بار میں نے ان سے حفظ قرآن کریم کرنے والی طالبات کی مجموعی تعداد پوچھی تو اندازے سے بائیس تئیس کے لگ بھگ بتائی۔ خود میری اہلیہ ام عمار نے، جو چودہ برس کی عمر میں میرے نکاح میں آئیں، قرآن کریم والدہ مرحومہ سے ہی حفظ کیا۔ وقتاً فوقتاً ہم بہن بھائیوں کی منزلیں سننا بھی ہماری دونوں ماؤں کی ڈیوٹی میں شامل تھا، جب کہ بیسیوں بچیوں نے والدہ مرحومہ سے

قرآن کریم کا لفظی ترجمہ پڑھا۔ اس درس گاہ سے گکھڑ کے سیکڑوں بچوں اور بچیوں نے والدہ مرحومہ سے فیض حاصل کیا جن میں سابق صدر پاکستان جناب محمد رفیق تارڑ، سابق آئی جی پنجاب پولیس جناب احمد نسیم چودھری، پاک آرمی ایجوکیشن کور کے سابق بریگیڈیئر جناب محمد علی چغتائی اور وزارت خارجہ کے ایک سابق آفیسر محمد شعبان اپل جیسے نامور حضرات بھی شامل ہیں۔

گکھڑ کی مسجد میں حفظ قرآن کریم کا باقاعدہ مدرسہ محترم الحاج سیٹھی محمد یوسفؒ کی توجہ سے قائم ہوا۔ وہ گکھڑ سے تین چار میل کے فاصلہ پر گتہ فیکٹری کے مالک تھے اور ایک نومسلم خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ انہیں اللہ تعالیٰ نے یہ ذوق عطا فرمایا تھا کہ قرآن کریم حفظ و ناظرہ اور تجوید و قراءت کے باقاعدہ مدارس قائم ہوں اور حفظ کے ساتھ ساتھ تجوید کا ذوق بھی عام ہو۔ انہوں نے اس کے لیے ایک باقاعدہ ٹرسٹ قائم کر رکھا تھا اور اپنی آمدنی کا بڑا حصہ اس پر خرچ کرتے تھے۔ وہ مختلف مقامات پر جا کر خود ترغیب دیتے تھے کہ مسجد میں قرآن کریم کی درس گاہ قائم کر کے استاد رکھا جائے اور استاد کی تنخواہ کا ایک حصہ، کہیں نصف اور کہیں تیسرا حصہ، جیسے طے ہو جائے، اپنی طرف سے دیا کرتے تھے جب تک کہ وہ مدرسہ خود کفیل نہ ہو جاتا۔ میں ایک زمانہ میں گتہ فیکٹری کی کالونی کی مسجد میں جمعہ پڑھایا کرتا تھا۔ اس دور میں اس شعبہ کے انچارج سے میں نے ایسے مدرسوں کی تعداد دریافت کی تو جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے، انہوں نے بتایا کہ ملک بھر میں گیارہ سو کے لگ بھگ مدارس ایسے ہیں جنہیں اس طرح امداد دی جاتی ہے، بلکہ یہ اعزاز بھی گکھڑ کے علاقہ کے ایک نومسلم خاندان کے اس فرزند کو حاصل ہوا کہ حجاز مقدس اور سعودی عرب کے بہت سے دیگر علاقوں میں بھی تحفیظ القرآن کے مدارس کا آغاز انہی کی کوشش سے ہوا۔ انہوں نے ایک عرصہ تک وہاں ایسے مدارس چلائے۔ بعد میں سعودی حکومت نے ان مدارس کا نظم سنبھال لیا اور اب وہ پوری دنیا میں ایک مثال ہیں۔

مجھے وہ منظر یاد ہے کہ سیٹھی محمد یوسف مرحوم نے حضرت والد محترمؒ کی مسجد میں جمعہ کے اجتماع کے موقع پر مختصر خطاب میں حفظ قرآن کریم کا مدرسہ قائم کرنے کی ترغیب دی اور اس میں اپنا حصہ شامل کرنے کی پیش کش کی جس پر مدرسہ تجوید القرآن قائم کرنے کا فیصلہ ہوا اور ہمارے پہلے استاد محترم قاری اعزاز الحق امروہویؒ گکھڑ تشریف لائے جنہوں نے اس مسجد میں قرآن کریم کی باقاعدہ کلاس کا آغاز کیا۔ میں اس پہلی کلاس کا طالب علم تھا۔ اس وقت میں پرائمری اسکول میں چوتھی کلاس میں زیر تعلیم تھا اور گھر میں تھوڑی بہت دینی تعلیم کا سلسلہ جاری تھا۔ مدرسہ قائم ہونے کے بعد میری اسکول کی تعلیم چھڑوا دی گئی اور میں حفظ قرآن کریم کے باقاعدہ طلبہ میں شامل ہو گیا۔ اس مدرسہ میں بعد میں فیصل آباد کے محترم قاری محمد اشرف صاحب، جھنگ کے محترم قاری عبد الرزاق صاحب، گکھڑ کے محترم حافظ احمد حسن مرحوم اور دیگر بہت سے اساتذہ نے تحفیظ القرآن کی خدمات سر انجام دیں اور ان سب کے بعد ہمارے استاذ محترم قاری محمد انور صاحب تشریف لائے جنہوں نے ایک عرصہ تک اس درس گاہ کو آباد رکھا اور گکھڑ کے سیکڑوں خاندانوں کے طلبہ اور طالبات کو حفظ قرآن کریم کے زیور سے آراستہ کیا۔ خود میں نے اکتوبر ۱۹۶۰ء میں ان سے قرآن کریم پڑھا۔ اب ربع صدی سے وہ مدینہ منورہ میں مقیم ہیں اور تحفیظ القرآن کی خدمات سر انجام دے رہے ہیں۔

ایک دور وہ تھا جب گکھڑ کی مسجد میں رمضان المبارک کے دوران تراویح میں قرآن کریم سنانے کے لیے حافظ باہر کے علاقوں سے درآمد کیے جاتے تھے۔ مجھے یاد ہے کہ ایک بار رمضان المبارک کا آغاز ہونے پر پہلی رات تراویح سے پہلے

حضرت والد محترمؒ نے نمازیوں سے خطاب کرتے ہوئے بتایا کہ انہوں نے بہت کوشش کی ہے، مگر کہیں سے قرآن کریم سنانے کے لیے حافظ صاحب دستیاب نہیں ہوئے، اس لیے مجبوراً اس سال تراویح آخری دس سورتوں سے پڑھنی پڑے گی۔ یہ کہتے ہوئے ان کی آواز بھرا گئی اور انہوں نے خود ہی آخری سورتوں کے ساتھ پورا رمضان المبارک تراویح پڑھائیں، اس لیے کہ وہ حافظ نہیں تھے۔ پھر ایک وقت وہ بھی آیا کہ ایک دفعہ ہم چند بھائیوں نے اپنے خاندان کے حافظوں کا شمار کیا تو حضرت والد محترمؒ کے بیٹوں، بیٹیوں، نواسوں، نواسیوں، پوتوں اور پوتیوں میں حفاظ کی تعداد چالیس سے متجاوز نکلی جو اسی مذکورہ مدرسہ کا فیضان ہے۔ بعد میں اس کے ساتھ تجوید وقراءت کا مدرسہ بھی ''قاری کلاس'' کے نام سے قائم ہوا جس کے اولین استاد حضرت مولانا قاری عبدالحلیم سواتی مدظلہ اور حضرت مولانا غلام علیؒ تھے۔ یہ دونوں بزرگ میرے اساتذہ میں شامل ہیں اور مولانا قاری عبدالحلیم سواتی اب خلیجی ریاست بحرین میں تدریسی خدمات سرانجام دے رہے ہیں۔

حضرت والد محترمؒ خود حافظ نہیں تھے، مگر ان کے آگے کھڑے ہو کر قرآن کریم سنانا سب سے مشکل کام ہوتا تھا۔ وہ حافظ نہ ہونے کے باوجود چھوٹی سی چھوٹی غلطی کو بھی چھوٹنے نہیں دیتے تھے اور نہ صرف یہ کہ فوری گرفت کرتے تھے بلکہ بعد میں ڈانٹا بھی کرتے تھے۔ مجھے کئی بار بحمداللہ تعالیٰ انہیں تراویح میں اور تہجد کے نوافل میں قرآن پاک سنانے کا شرف حاصل ہوا ہے۔ اس وقت رعب وخوف کی جو کیفیت مجھ پر طاری ہوتی تھی، اس کی یاد اب تک تازہ ہے۔ دوسرے بھائیوں کو بھی یہ موقع کئی بار ملا ہے، کیوں کہ حضرت والد محترمؒ، جب تک صحت نے اجازت دی، رمضان المبارک میں سحری کے وقت نوافل میں بھی قرآن کریم سنا کرتے تھے۔

ان کی صحت کے زمانہ میں شب وروز کا نظام کچھ اس طرح کا ہوتا تھا کہ سحری کے وقت اٹھ کر بلاناغہ غسل کرتے تھے اور تہجد کی نماز ادا کرتے تھے۔ اس وقت ہماری والدہ مرحومہ بھی بیدار ہو کر تہجد پڑھتی تھیں اور ناشتہ تیار کرتی تھیں۔ اذان فجر کے بعد حضرت والد محترمؒ ناشتہ کرتے تھے جو پراٹھے اور چائے پر مشتمل ہوتا تھا۔ اس کے بعد مسجد میں چلے جاتے اور ساتھ ہی ساتھ والدہ مرحومہ بھی مسجد میں چلی جاتی تھیں، اس لیے کی فجر کی نماز اور درس میں خواتین بھی باقاعدہ شریک ہوا کرتی تھیں اور خواتین کے لیے مسجد میں الگ انتظام موجود تھا، چنانچہ خواتین فجر کی نماز اور درس کے علاوہ جمعہ کے اجتماع اور تراویح میں بھی کثیر تعداد میں شریک ہوا کرتی تھیں۔ نماز فجر پڑھانے کے بعد حضرت والد محترمؒ درس دیتے تھے جو تین دن قرآن کریم اور تین دن حدیث کا ہوتا تھا۔ درس عام طور پر نصف سے پون گھنٹے پر مشتمل ہوتا تھا۔ اس کے بعد وہ گوجرانوالہ میں مدرسہ نصرۃ العلوم میں پڑھانے کے لیے چلے جاتے تھے جہاں سے دوپہر سے کچھ پہلے واپسی ہوتی تھی۔ کھانا کھا کر اور اخبار پڑھ کر سو جاتے تھے۔ ظہر تک آرام ہوتا تھا۔ ظہر سے عصر تک اپنی چارپائی پر بیٹھے لکھنے پڑھنے کا کام کرتے رہتے تھے اور اسی دوران بچیاں مختلف اسباق کی تعلیم حاصل کرتی تھیں۔ عصر کی نماز کے بعد قرآن کریم کی منزل پڑھتے تھے جو عام طور پر روزانہ ایک پارہ ہوتا تھا۔ اس کے بعد گھر کے چھوٹے موٹے کام اپنے ہاتھ سے کیا کرتے تھے۔ جس زمانے میں ابھی بجلی نہیں آئی تھی، لیمپ اور لالٹین کے شیشے صاف کرنا، چارپائی کی ڈھیلی ادوائن کو کسنا، پیڑھی وغیرہ اگر قابل مرمت ہے تو اسے ٹھیک کرنا اور اس طرح کے دیگر چھوٹے موٹے کام کرنا ان کے معمولات میں شامل تھا۔

نماز مغرب کے بعد کھانا کھاتے اور مطالعہ کرتے تھے اور عشا کے بعد سردیوں میں مطالعہ کرتے اور گرمیوں میں جلد

سونے کی کوشش کرتے تھے۔ نیند سے پہلے انہیں جسم دبوانے کی عادت تھی۔ عام طور پر ہماری والدہ محترمہ دونوں انھیں دبایا کرتی تھیں۔ کبھی کبھی ہم کو بھی بلا لیا کرتے تھے اور ہم سب بھائیوں اور بہنوں کو بھی خدمت کا موقع مل جایا کرتا تھا۔ ہم سے اس دوران قرآن کریم کا کوئی رکوع سن کر اس کے صیغے اور نحوی ترکیبیں پوچھا کرتے تھے۔ سونے سے پہلے چار معمولات مجھے اچھی طرح یاد ہیں جو ایک عرصہ تک جاری رہے۔ ڈائری میں اس دن کی کوئی نہ کوئی یادداشت تحریر کرتے تھے، پین میں سیاہی بھرتے تھے، ٹائم پیس کا الارم سیٹ کرتے تھے اور جیب کی گھڑی کو چابی دیا کرتے تھے۔ اس دوران کا ایک اور مستقل معمول بھی تھا کہ گورنمنٹ ٹریننگ انسٹی ٹیوٹ یعنی نارمل اسکول میں اساتذہ کی جے وی، ایس وی وغیرہ کی کلاس کے شرکا کو گرمیوں میں عصر اور سردیوں میں عشا کے بعد قرآن کریم کا ترجمہ پڑھاتے تھے۔ یہ اسکول ہمارے گھر سے تقریباً ایک کلو میٹر کے فاصلے پر ہے جہاں روزانہ پیدل آنے جانے کا ان کا معمول تھا۔ ان کورسز کے شرکا کو روزانہ درس کی صورت میں قرآن کریم کے ترجمہ وتفسیر سے بہرہ ور کرنے کا سلسلہ بھی کم وبیش ربع صدی تک جاری رہا۔ ایک بار ہم نے ان اداروں سے تعلیم پانے والے حضرات کے اعداد وشمار کا محتاط اندازے سے حساب لگانا چاہا تو خاصی احتیاط کے ساتھ کیے گئے اندازے میں یہ نتیجہ سامنے آیا کہ حضرت مرحوم کے براہ راست شاگردوں کی تعداد تیس ہزار سے کسی طرح کم نہیں ہوگی جو دنیا کے مختلف ممالک میں پھیلے ہوئے ہیں اور کسی نہ کسی شعبے میں دینی اور تعلیمی خدمات سرانجام دے رہے ہیں۔ مجھے دنیا کے مختلف حصوں میں وقتاً فوقتاً جانے کا موقع ملتا رہتا ہے، امریکہ، یورپ، افریقہ، مشرق بعید، مشرق وسطیٰ اور وسط ایشیا کا کوئی علاقہ ایسا نہیں دیکھا جہاں ان کا کوئی نہ کوئی شاگرد موجود نہ ہو اور دینی خدمات سرانجام نہ دے رہا ہو۔

مجھے یاد پڑتا ہے کہ اسی زمانے میں ملک کے بعض حصوں سے کچھ دینی اداروں سے فرمائشیں آنا شروع ہو گئیں کہ حضرت والد محترمؒ گکھڑ چھوڑ کر کسی بڑے شہر کے تعلیمی ادارے میں منتقل ہو جائیں۔ بڑی تنخواہ اور سہولت کی پیش کش بھی تھی اور ترقی کے ظاہری مواقع بھی موجود تھے مگر حضرت والد محترمؒ اس کے لیے تیار نہیں ہوئے۔ وہ دنیوی ترقی اور مفاد کے لیے جگہ تبدیل کرنے کو پسند نہیں کرتے تھے اور گکھڑ سے انہیں کچھ ایسا انس ہو گیا تھا کہ آخر دم تک وہ وہاں سے منتقل ہونے پر کبھی آمادہ نہیں ہوئے۔ شاید اس بات کو محسوس کرتے ہوئے بعض دوستوں میں اس بات کی تحریک ہوئی کہ ان کا گکھڑ میں ذاتی مکان ہونا چاہیے اور ۱۹۶۰ء میں یہ مکان تعمیر ہوا جہاں حضرت والد محترمؒ آخر وقت تک مقیم رہے۔ اس مکان کے دو حصے تھے اور دونوں کے دروازے الگ الگ رکھے گئے۔ ایک حصہ والد صاحبؒ نے اپنے لیے بنوایا اور دوسرا حصہ چچا محترم حضرت صوفی صاحبؒ کے لیے مختص کر دیا۔ اس حصے میں صرف ایک بیٹھک اور ڈیوڑھی تعمیر ہوئی اور باقی حصہ چھوڑ دیا گیا کہ جب حضرت صوفی صاحبؒ کی شادی ہو گی تو اس موقع پر ان کے لیے تعمیر کیا جائے گا۔

صوفی صاحب پر تصوف کا رنگ غالب تھا اور والد صاحب پر ابن تیمیہ کا۔ میں کہا کرتا ہوں کہ ہمارے ہاں ابن تیمیہ بھی ہیں اور ابن عربی بھی۔ حضرت صوفی صاحب کے وحدت الوجود پر مستقل مقالے بھی ہیں۔ ایک مرتبہ میں نے ان سے پوچھا کہ حضرت مجدد صاحب کے بارے میں سنا ہے کہ وہ وحدت الوجود کے بارے میں مختلف نظریہ رکھتے ہیں۔ صوفی صاحب نے کہا کہ جس کی سمجھ میں نہیں آئے گا، وہ یہی کہے گا۔ تصوف کا عملی رنگ بھی صوفی صاحب پر غالب تھا جس کی ایک جھلک میں نے یہ دیکھی کہ لاہور کے ایک سفر میں، جس میں وہ مجھے بھی اپنے ساتھ لے گئے تھے، وہ حضرت سید علی ہجویریؒ المعروف

حضرت گنج بخشؒ کی قبر پر مراقب ہوئے اور کافی دیر مراقبہ کی کیفیت میں رہے۔ اس کے بعد وہ حضرت شاہ محمد غوثؒ کے مزار پر گئے اور وہاں بھی ان کی قبر پر مراقبہ کیا۔ پھر ایک بار گجرات گئے۔ میں بھی ساتھ تھا۔ وہاں انہوں نے حضرت شاہ دولہؒ کی قبر پر مراقبہ کیا، مگر سب سے دلچسپ صورت حال دیوبند کے سفر میں پیش آئی۔

دار العلوم دیوبند کے صد سالہ اجلاس میں حضرت والد محترم مدظلہ اور حضرت صوفی صاحبؒ دونوں بزرگ گئے۔ میں کسی وجہ سے بروقت نہیں پہنچ سکا اور جب اجلاس کے آخری روز دیوبند پہنچا تو قاری محمد طیب صاحبؒ اختتامی خطاب فرما رہے تھے۔ والد صاحب اور صوفی صاحب مولانا محمد سالم قاسمیؒ کے گھر میں ٹھہرے ہوئے تھے۔ گوجرانوالہ کے قافلے میں قاری محمد یوسف عثمانی، حاجی عبد المتین چوہان مرحوم، مولانا حکیم محمود سلفیؒ اور مولانا مفتی نعیم اللہ صاحب بھی تھے۔ یہ حضرات باہر برآمدے میں قیام پذیر تھے اور اندر کمرے میں دونوں بزرگوں یعنی والد صاحب اور صوفی صاحب کے بستر لگائے گئے تھے۔ جب میں پہنچا تو میرا بستر دونوں بزرگوں کے درمیان لگا دیا گیا۔ میں نے حال احوال پوچھا تو والد صاحب نے کہا کہ کوئی حال نہیں، صوفی رات کو خراٹے لیتا ہے اور سونے نہیں دیتا۔ صوفی صاحب کہنے لگے کہ خراٹے خود لیتے ہیں اور ذمے دوسروں کے لگا دیتے ہیں۔ اب جب رات ہوئی اور ہم بستر پر لیٹے تو میں نے دیکھا کہ دونوں بزرگ زور زور سے خراٹے لے رہے ہیں۔ میں نے منہ پر ہاتھ رکھا اور بھاگتا ہوا باہر آ گیا اور پھر میری ہنسی چھوٹ گئی۔

صد سالہ اجلاس سے فارغ ہو کر ایک روز دونوں بزرگوں نے میرے بارے میں مشورہ کیا کہ اسے دیوبند کی سیر کرانی چاہیے، چنانچہ مجھے لے کر دونوں حضرات نے دیوبند کا چکر لگایا۔ میں نے ان کے ہمراہ حضرت مدنیؒ کا مکان اور مسجد دیکھی، حضرت علامہ انور شاہ کشمیریؒ کے گھر حاضری دی جہاں ان کے فرزند مولانا محمد ازہر شاہ قیصرؒ اور داماد حضرت مولانا احمد رضا بجنوریؒ سے ملاقات ہوئی، مسجد چھتہ میں انار کا وہ درخت دیکھا جس کے نیچے بیٹھ کر حضرت ملا محمودؒ نے مولانا محمود حسنؒ کو پہلا سبق پڑھایا تھا اور دار العلوم دیوبند کا آغاز ہوا تھا اور دیگر بہت سے مقامات مجھے دکھائے۔ چلتے چلتے والد صاحب نے پوچھا کہ ''مڑھیاں'' بھی دیکھنی ہیں (یعنی قبرستان جانا ہے)؟ میں نے کہا کہ جی۔ ہم قبرستان گئے تو بالکل دل کی بات کرتا ہوں کہ واقعتاً حضرت شیخ الہند اور حضرت مدنی کی قبروں پر، جو ساتھ ساتھ بنی ہوئی ہیں، عجیب سا سکون محسوس ہو رہا تھا۔ میں تاریخ کا طالب علم ہوں۔ اس عظیم المرتبت استاذ اور جلیل القدر شاگرد کو اکٹھے آرام فرما دیکھ کر تاریخ کے کئی مناظر ایک تیز رفتار فلم کی طرح ذہن کی اسکرین پر گھوم گئے۔ حضرت صوفی صاحبؒ کا شیخ الاسلام حضرت مدنیؒ کے ساتھ شاگردی کے ساتھ ساتھ بیعت کا تعلق بھی تھا، وہ تو قبر کو دیکھ کر سیدھے وہاں پہنچے اور مراقبہ میں بیٹھ گئے۔ اب منظر یہ تھا کہ حضرت صوفی صاحبؒ مراقبہ میں بیٹھے ہیں، حضرت والد صاحب مدظلہ تھوڑے فاصلے پر کھڑے کچھ پڑھ رہے ہیں اور میں درمیان میں کھڑا ہوں۔ میرا جی چاہ رہا ہے کہ میں بھی چچا جان کے ساتھ مراقبہ میں بیٹھ جاؤں، مگر پیچھے کھڑے والد صاحب سے ڈر بھی رہا ہوں۔ تھوڑی دیر گزری تو حضرت والد صاحب نے اپنے مخصوص انداز میں کہا کہ ''اٹھا ایس بدعتی نو، جھنڈ مار کے بہہ گیا اے۔'' (اس بدعتی کو اٹھاؤ، یہ کیا چادر میں سر دے کر بیٹھ گیا ہے)۔ اب میں انہیں کیا اٹھاتا کہ میرا تو خود جی ان کے ساتھ بیٹھنے کو چاہ رہا تھا۔ حضرت صوفی صاحبؒ کم وبیش دس بارہ منٹ تسلی سے مراقبہ میں بیٹھے رہے۔ پھر اٹھے اور کہا کہ ''چلیں، آپ کو ہر کام بدعت نظر آتا ہے۔'' اور پھر ہم تینوں کوئی اور بات کیے بغیر اگلی منزل کی طرف چل پڑے۔

دار العلوم دیوبند کے مہتمم حضرت مولانا قاری محمد طیبؒ نے ایک جگہ لکھا ہے کہ دیوبندیت شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ اور شیخ اکبر محی الدین ابن عربیؒ کے الگ الگ ذوقوں کے اجتماع اور امتزاج کا نام ہے دونوں الگ الگ بلکہ بظاہر متضاد ذوق نظر آتے ہیں مگر حضرت قاری صاحبؒ کا ارشاد ہے کہ ان دونوں ذوقوں کو جمع کیا جائے تو دیوبندیت تشکیل پا جاتی ہے، میں اس پر کہا کرتا تھا کہ ہمارے گھر میں دونوں ذوق موجود ہیں والد محترم شیخ الاسلام حضرت ابن تیمیہؒ کے ذوق کی نمائندگی کرتے ہیں اور حضرت صوفی صاحبؒ شیخ اکبر محی الدین ابن عربیؒ کے ذوق کے نمائندہ ہیں اس لیے ہمارا گھرانہ دیوبندیت کی مکمل نمائندگی کرتا ہے، خود میرا حال یہ ہے کہ میں نے کئی بار اپنے دل ودماغ کو ٹٹولا ہے اور یہ دیکھنے کی کوشش کی ہے کہ میرا دل و دماغ ابن تیمیہؒ اور ابن عربیؒ میں سے کس کو ترجیح دیتا ہے؟ مگر آج تک فیصلہ نہیں کر پایا، مجھے دونوں سے یکساں دلی محبت ہے اور دونوں کے الگ الگ ذوق کو دین کا اہم اور ضروری حصہ سمجھتا ہوں۔

حضرت والد صاحبؒ اور حضرت صوفی صاحبؒ دونوں میرے بزرگ تھے، استاد تھے، مربی تھے، مشفق تھے اور دعا گو تھے۔ حضرت والد صاحبؒ کے مزاج میں سختی تھی، رعب تھا، اور دبدبہ تھا۔ حضرت صوفی صاحبؒ کے انداز میں نرمی، بے پروائی اور چشم پوشی کا عنصر غالب ہوتا تھا۔ ان دونوں رویوں کی ضرورت ہوتی ہے اور اپنے اپنے موقع پر دونوں کام دکھاتے ہیں۔ میں اپنے دور طالب علمی کے چند واقعات یاد کرتا ہوں تو سختی اور نرمی کے یہ دونوں رویے میری شخصیت کی تشکیل میں کار فرما دکھائی دیتے ہیں۔

مجھے لکھنے پڑھنے کی عادت طالب علمی کے زمانہ میں ہی تھی۔ مضامین لکھنا، خبریں بنانا اور اخبارات میں پہنچانا، اور پھر ان کی اشاعت پر خوش ہونا اسی دور سے مزاج کا حصہ بن گیا تھا۔ اس زمانہ میں پاکستان کے قومی اخبارات میں نسیم حجازی مرحوم کا روزنامہ ''کوہستان'' خاصی اہمیت کا حامل ہوتا تھا۔ ایک بار میرا ایک مضمون روزنامہ کوہستان میں ادارتی صفحہ پر شائع ہوا جس نے میرا دماغ خراب کر دیا اور میں نے دماغ کی اس خرابی میں ایک تعلیمی سال ضائع کیا۔ یہ ۱۹۶۵ء کی بات ہے۔ میرے مضامین ہفت روزہ ترجمان اسلام میں شائع ہوتے تھے اور میں روزنامہ وفاق لاہور کا باقاعدہ نامہ نگار بن گیا تھا۔ ''کوہستان'' کے ادارتی صفحے پر مضمون کی اشاعت نے میرے ذہن میں یہ بات پیدا کر دی کہ میرا اصل میدان صحافت ہے، اس لیے تعلیم وتعلم میں میری توجہ کم ہوتی چلی گئی۔ حضرت والد صاحب یہ دیکھ کر مجھے مدرسہ سے اٹھا کر گکھڑ میں گھر لے آئے اور وہاں اپنی نگرانی میں تعلیم کا سلسلہ شروع کیا۔ اسی زمانے میں گکھڑ کے مدرسہ میں استاذ حضرت مولانا غلام علی صاحبؒ سے میں نے فصول اکبری اور گلستان کا کچھ حصہ پڑھا اور حضرت مولانا قاری عبد الحلیم سواتی مدظلہ سے قرآن کریم کے کچھ حصے کی مشق کی۔ حضرت والد صاحب کا انداز سختی کا ہوتا تھا اور سختی کے سارے حربے وہ اختیار کیا کرتے تھے جس سے میں بے بسی کے عالم میں ایک روبوٹ کی طرح تعمیل حکم تو کر لیا کرتا تھا مگر سوچ سمجھ کے دروازے اکثر بند ہی رہتے تھے، اس لیے یہ سختی مجھ پر کچھ زیادہ اثر انداز نہ ہو سکی۔

اس دوران ایک روز گوجرانوالہ میں مدرسہ نصرۃ العلوم میں آیا تو حضرت صوفی صاحبؒ نے پاس بٹھا کر مجھے بڑی شفقت سے سمجھایا اور ان کی یہ بات میرے دل ودماغ میں نقش ہو گئی کہ بیٹا! صحافت اور خطابت لوگوں تک کوئی بات پہنچانے کا ذریعہ ہے۔ یہ ضرور آدمی کے پاس ہونا چاہیے، لیکن پہنچانے کے لیے کوئی چیز بھی پاس موجود ہونا چاہیے۔ اگر اپنے پاس کچھ

ہوگا تو دوسروں تک پہنچاؤ گے اور اگر اپنا سینہ علم سے خالی ہوگا تو دوسروں کو کیا دو گے؟ ٹونٹی کتنی خوبصورت کیوں نہ ہو، وہی چیز باہر نکالے گی جو ٹینکی میں ہوگی اور اگر ٹینکی میں کچھ نہیں ہوگا تو ''شاں شاں'' کرے گی۔ حضرت صوفی صاحبؒ کے اس محبت بھرے لہجہ اور ''شاں شاں'' کی مثال نے ایک لمحے میں دل ودماغ کا کانٹا بدل دیا اور یہ جملے اب بھی میرے کانوں میں ''شاں شاں'' کرتے رہتے ہیں۔

دوسری طرف سختی کی کارفرمائی بھی دیکھ لیجیے کہ غالباً ہمارا کافیہ کا سال تھا، میرے ایک ہم سبق ذہین ساتھی نے میٹرک کا امتحان دیا اور فرسٹ ڈویژن میں کامیابی حاصل کر لی۔ یہ دیکھ کر مجھے بھی میٹرک کا امتحان دینے کا شوق ہوا۔ میں نے سوچا کر امتحان دے کر باقی مضامین تو نکال ہی لوں گا، انگریزی اور حساب میں کمپارٹ آجائے گی تو ان کے لیے تیاری کر کے اگلے سال امتحان دے دوں گا۔ میں نے ذہنی طور پر تیار ہو کر امتحان کے فارم حاصل کیے۔ حضرت والد صاحبؒ کو کسی ذریعے سے پتہ چل گیا اور انہوں نے مجھے بلا کر سختی سے ڈانٹ دیا، بلکہ امتحان دینے کی صورت میں لاتعلقی کی دھمکی دے دی۔ میں نے امتحان کا ارادہ ترک کر دیا مگر دل میں غصہ ضرور باقی رہا۔ میرے اس ساتھی نے میٹرک کے امتحان میں فرسٹ ڈویژن میں کامیابی حاصل کرنے کے بعد مدرسہ کی لائن چھوڑ دی اور عصری تعلیم کی طرف منتقل ہو گیا اور ایک عرصہ بعد ایک ہائی اسکول کے ہیڈ ماسٹر کے طور پر ملے تو حسرت اور پشیمانی کے ساتھ کہنے لگے کہ کاش! میں نے میٹرک کا امتحان نہ دیا ہوتا تو آج آپ کی طرح دینی خدمات سرانجام دے رہا ہوتا۔ ان کی اس حسرت نے میرے اس احساس اور سوچ کو پختگی دی جو میرے ذہن میں پہلے سے آچکی تھی کہ حضرت والد صاحبؒ کی سختی میرے کام آگئی کہ اگر وہ مجھے میٹرک کے امتحان سے سختی کے ساتھ نہ روکتے تو میں عصری تعلیم میں ضرور آگے نکل چکا ہوتا، مگر دینی تعلیم کی لائن سے نکل جاتا اور دینی علوم کی کچھ نہ کچھ خدمت کرنے کا جو موقع مل رہا ہے، عالم اسباب میں اس سے محروم ہو جاتا۔ میں دینی علم کے ساتھ میٹرک، ایف اے وغیرہ کا مخالف نہیں ہوں بلکہ اس بات کا داعی ہوں۔ دینی علوم کے ساتھ عصری علوم بھی ضروری ہیں، کیونکہ ان کے بغیر آج کے دور میں دین کی صحیح خدمت ممکن نہیں ہے، لیکن اگر عصری تعلیم دینی تعلیم چھوڑنے کا باعث بن جائے اور ذہانت وصلاحیت کے دوسری طرف منتقل ہو جانے کا ذریعہ بنیں تو اس کے حق میں بہر حال نہیں ہوں۔ اسی وجہ سے حضرت والد صاحبؒ کی یہ سختی مجھے اچھی لگی اور اس پر ان کے لیے ہمیشہ دعا گو رہوں گا۔

حضرت والد صاحبؒ کی سختی کا ایک اور واقعہ بھی ذکر کرنا چاہتا ہوں کہ میں نے ۱۹۷۰ء میں مدرسہ نصرۃ العلوم سے فراغت حاصل کی۔ اس سے قبل ہی میں مرکزی جامع مسجد میں حضرت مولانا مفتی عبدالواحدؒ کی نیابت کے لیے منتقل ہو چکا تھا اور اس وقت میرا شمار جمعیت علمائے اسلام کے سرگرم حضرات میں ہوتا تھا۔ ضلعی بلکہ ڈویژنل سطح پر میری سرگرمیاں جاری تھیں۔ حضرت والد صاحبؒ نے اس کے بعد کچھ عرصہ (کم وبیش دس سال) تک مجھ پر دو باتوں کی سختی قائم رکھی۔ ایک یہ کہ میں رمضان المبارک میں تراویح میں قرآن پاک سنا رہا ہوں یا نہیں۔ ایک دو ماہ قبل ہی پوچھنا شروع کر دیتے کہ کہاں سنا رہے ہو، منزل دہرا رہے ہو یا نہیں؟ کتنے پارے دہرائے ہیں؟ پھر رمضان المبارک کے دوران متعدد بار پوچھتے کہ کتنے پارے ہوئے ہیں؟ کب ختم کر رہے ہو؟ کتنی غلطیاں آتی ہیں؟ یہ اسی سختی کی برکت ہے کہ بحمد اللہ تعالیٰ میں نے تیس سال تراویح میں قرآن پاک سنایا ہے اور کم وبیش سات یا آٹھ دفعہ سحری میں حضرت والد صاحبؒ کو نوافل میں سنانے کی سعادت

حاصل کی ہے۔ میں سوچتا ہوں کہ اگر یہ سختی نہ ہوتی تو یہ سعادت بھی حاصل نہ ہوتی۔ اس طرح مدرسہ نصرۃ العلوم سے فراغت کے بعد حضرت والد صاحبؒ کی کوشش تھی کہ میں مدرسہ انوار العلوم میں، جو ۱۹۲۶ء سے قائم ہے اور حضرت والد صاحبؒ اور حضرت صوفی صاحبؒ نے ۱۹۳۷ء سے ۱۹۴۰ء تک اسی میں تعلیم حاصل کی ہے، کچھ نہ کچھ ضرور پڑھاتا رہوں، چنانچہ ان کی اس خواہش بلکہ اصرار پر میں نے مدرسہ انوار العلوم میں تقریباً بیس سال اس طرح تدریس کی ہے کہ میری یہ ڈیوٹی اعزازی ہوتی تھی اور اپنی مرضی کے دو تین سبق پڑھاتا تھا، مگر حضرت والد صاحبؒ کی طرف سے یہ لازمی ہوتی تھی اور اس کے بارے میں وقتاً فوقتاً دریافت کرتے رہتے تھے۔ ابتداءً مجھے یہ سختی اچھی نہیں لگتی تھی اور بہت غصہ آتا تھا، مگر آہستہ آہستہ مزاج بنتا گیا اور طبیعت عادی ہو گئی تو یہ بات سمجھ میں آنے لگی کہ سختی ضروری تھی اور آج سوچتا ہوں کہ اگر یہ سختی نہ ہوتی اور میں اپنی آزادی پر قائم رہتا تو آج جو کچھ تھوڑا بہت تدریسی ذوق ومزاج ہے، یہ یقیناً نہ ہوتا۔

اس زمانے میں میرا معمول یہ تھا کہ جامع مسجد میں فجر کی نماز پڑھنے کے بعد مختصر درس دیتا اور اسی مصلے پر بیٹھا دو تین سبق پڑھا دیتا جو عام طور پر فقہ، اصول فقہ اور ادب کے ہوتے تھے۔ گھر سے چائے یا قہوہ کا ایک تھرموس آجاتا، میں اسے پیتا رہتا اور پڑھاتا رہتا۔ اس کے بعد میں اپنی جماعتی اور تحریکی سرگرمیوں کے لیے سارا دن فارغ ہوتا تھا۔ اس دور میں الحمد للہ یہ ہمت بھی تھی کہ رات کو کسی دور دراز شہر میں جلسہ میں شریک ہوتا، اس کے بعد سفر کر کے فجر سے قبل گوجرانوالہ پہنچتا، نماز سے قبل مطالعہ کرتا اور نماز کے بعد پڑھانے بیٹھ جاتا۔ ایسا سالہا سال تک ہوتا رہا ہے، مگر اب ہمت نہیں رہی اور رات کو چار پانچ گھنٹے نیند نہ ملے تو صبح پڑھانا مشکل ہو جاتا ہے۔

ہماری تعلیم وتربیت کے حوالہ سے حضرت والد صاحبؒ کے ذوق کے ایک اور پہلو کا ذکر بھی کر دوں تو مناسب رہے گا۔

۷۵۔۱۹۷۶ء کی بات ہے۔ میرے ایک شاگرد اور ساتھی نے مجھے ورغلایا کہ مسجد کی تنخواہ پر کب تک گزارہ ہوگا، کوئی کاروبار ساتھ ہونا چاہیے۔ اس کی ترغیب پر میں نے کچھ دوستوں سے قرض لیا اور ہم نے مل کر جی ٹی روڈ پر دین پلازہ کے عقب میں ایک کرایے کی دوکان میں سلور کی تار بنانے کا اڈہ بنا لیا۔ سلور کی موٹی تار لیتے، اس کو باریک کرتے اور دوکانداروں کو فروخت کرتے۔ اس کو ہم نے مدنی اسٹیل ورکس کا نام دیا۔ خیال تھا کہ آگے چل کر اسے ترقی دیں گے، مگر ۱۹۷۵ء کے اواخر میں میری گرفتاری ہو گئی، اس لیے کہ اکتوبر ۱۹۷۵ء میں جامع مسجد نور مدرسہ نصرۃ العلوم میں جمعیت علمائے اسلام پاکستان کے ملک گیر کنونشن کے موقع پر تقاریر کی بنیاد پر جمعیت کے اکثر رہنماؤں کے خلاف ۱۶ ایم پی او کے تحت مقدمات درج ہو گئے جن میں مقامی صرف میں تھا۔ اس وقت میں جمعیت کا مرکزی سیکرٹری اطلاعات تھا۔ جمعیت کی مرکزی مجلس شوریٰ نے اس مقدمہ میں قبل از گرفتاری ضمانت نہ کرانے کا فیصلہ کر لیا۔ باقی سب حضرات دور دراز کے تھے اور گرفتار نہ ہو سکے، مگر میں مقامی تھا اس لیے مجھے سب کی طرف سے فرض کفایہ ادا کرنا پڑا اور کم وبیش ڈیڑھ ہفتہ گوجرانوالہ جیل میں رہنے کے بعد ضمانت پر رہا ہوا۔ اسی کنونشن کی پاداش میں مدرسہ نصرۃ العلوم کو محکمہ اوقاف کی تحویل میں لینے کا سرکاری اعلان ہوا تو اس کے خلاف ہم نے مزاحمتی تحریک شروع کی اور میں سیکڑوں دیگر علما اور کارکنوں کے ہمراہ دوبارہ گرفتار ہو کر کم وبیش ساڑھے تین ماہ تک جیل میں رہا۔ بالآخر حکومت کو اپنا نوٹیفکیشن واپس لینا پڑا۔

اس کے بعد ملکی سطح پر پاکستان قومی اتحاد بنا اور انتخابات کی مہم چل پڑی۔ میں قومی اتحاد کی صوبائی قیادت میں تھا۔ الیکشن

ہوا۔ اس کے بعد حکومت کے خلاف تحریک چلی۔ اس میں بھی میری گرفتاری ہوگئی۔ پھر جنرل ضیاء الحق مرحوم نے جب مارشل لاء نافذ کیا تو ہمیں کچھ سانس لینے کا موقع ملا۔ میرا سال ڈیڑھ سال اسی مصروفیت میں گزر گیا۔ فراغت ہوئی تو کاروبار کی طرف دیکھا تو وہ میرے ساتھی سمیت غائب ہو چکا تھا اور قرض میرے سر پر تھا۔ مجھے بہت پریشانی ہوئی۔ گھر جا کر حضرت والد صاحبؒ سے بات کی اور صورت حال سے آگاہ کیا اور ساتھ ہی قدرے شکوہ کے انداز میں عرض کیا کہ کاروبار کے آغاز میں، میں نے آپ کو وہاں تشریف آوری کی زحمت دی تھی اور دعا کی درخواست کی تھی۔ آپ تشریف بھی لائے تھے، مگر میرا خیال ہے کہ آپ نے دعا نہیں کی تھی۔ اگر آپ دعا کرتے تو میرا یہ حشر نہ ہوتا۔ میری یہ بات سن کر فرمانے لگے، ''تم ٹھیک سمجھے ہو۔ میں تمہارے کہنے پر آیا تھا اور مٹھائی بھی کھائی تھی، دعا کے لیے ہاتھ بھی اٹھائے تھے، مگر دعا نہیں کی تھی، اس لیے کہ میں نے تمہیں سالہا سال تک تعلیم سلور کی تار بنانے کے لیے نہیں دلائی تھی، بلکہ اس لیے پڑھایا تھا کہ کہیں آرام سے بیٹھ کر روکھی سوکھی کھاؤ اور اللہ کا دین پڑھاؤ۔'' ان کی یہ بات سن کر میرے دل کا سارا بوجھ اتر گیا اور ذہن کو یکسوئی حاصل ہوگئی جو بحمد اللہ آج تک کام آ رہی ہے اور آخر دم تک ان شاء اللہ تعالیٰ مشعل راہ رہے گی۔

حضرت والد محترم کی سرگرمیوں کا ایک بڑا دائرہ تصنیف وتالیف کا تھا۔ ان کی پچاس کے لگ بھگ علمی وتحقیقی تصانیف ہیں جو ملک بھر سے نہیں بلکہ عالمی سطح پر خراج تحسین وصول کر چکی ہیں۔ باقی سارے کاموں سے الگ کر کے صرف ان کے تصنیفی کام کو دیکھا جائے تو یہ ایک پورے ادارے اور اکادمی کا کام ہے جو تن تنہا انہوں نے سرانجام دیا ہے۔ ان کی تحقیق کا معیار یہ تھا کہ ایک ایک حوالے کے لیے کئی کئی لائبریریوں کا رخ کرتے اور جب تک خود دیکھ کر تسلی نہ کر لیتے، اس کا اندراج نہیں کرتے تھے۔ ایک ایک بات پر درجنوں حوالے دیتے جو بقید صفحات ہوتے۔ ان کا ذوق یہ تھا کہ اہل سنت، شیعہ، دیوبندی، بریلوی، اہل حدیث، قادیانی، منکرین حدیث اور دیگر مذہبی گروہوں کے درمیان اختلافی مسائل پر انھوں نے پچاس کے لگ بھگ کتابیں لکھی ہیں جن میں سے بعض خاصی ضخیم بھی ہیں، لیکن انداز تحریر علمی، تحقیقی اور شستہ ہے۔ وہ دیوبندی مسلک کے علمی ترجمان تھے، اس لیے مسلکی حوالے سے جو بھی اختلافی مسئلہ انہوں نے دیکھا، اس پر لکھا اور خوب لکھا۔ موقف میں پختگی ہوتی تھی اور اس کا بے لچک اظہار کرتے تھے، لیکن لہجہ اور اسلوب بیان لچک دار اور نرم ہوتا تھا اور اس کی اپنے شاگردوں کو اکثر تلقین کیا کرتے تھے کہ موقف مضبوط رکھو اور اسلوب بیان، الفاظ اور انداز انتہائی نرم ہو۔ اپنے مخالفین کا ذکر احترام کے ساتھ کرتے تھے۔ بات کا جواب دلیل سے دیتے تھے اور اس میں ذاتی مخالفت کا انداز پیدا نہیں ہونے دیتے تھے۔ ادیبانہ چھیڑ چھاڑ اور طنز ومزاح ضرور کرتے تھے جو ان کی تحریروں میں جا بجا جھلکتا ہے، لیکن طعن وتشنیع اور تمسخر، استہزا کے عادی نہیں تھے۔ وہ طنز ومزاح اور تمسخر واستہزا کے درمیان فرق کو اچھی طرح سمجھتے تھے اور اس کا لحاظ بھی رکھتے تھے۔

اس پر ایک تاریخی شہادت کا حوالہ دینا ضروری سمجھتا ہوں کہ ہمارے ملک کے معروف محقق اور دانش ور ڈاکٹر غلام جیلانی برق مرحوم ایک دور میں منکرین حدیث میں شمار ہوتے تھے اور انھوں نے حدیث رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے حجت ہونے کے خلاف ''دو اسلام'' کے نام سے ایک کتاب بھی لکھی تھی جس میں احادیث نبویہ پر اعتراضات کیے گئے ہیں۔ اس کے جواب میں برصغیر کے بہت سے سرکردہ علما نے کتابیں لکھیں اور والد محترم مولانا محمد سرفراز خان صفدر نے بھی ۵۳ء کی تحریک ختم نبوت میں گرفتاری کے بعد ملتان سنٹرل جیل میں اسارت کے دوران ''صرف ایک اسلام'' کے نام سے اس کا جواب تحریر کیا۔ ڈاکٹر

برق مرحوم نے حضرت والد صاحبؒ کے نام اپنے خط میں اعتراف کیا کہ ان کی کتاب ''صرف ایک اسلام'' نے اپنے تحقیقی انداز اور شستگی کے باعث انھیں یعنی ڈاکٹر برق کو اپنی بہت سی باتوں پر از سر نو غور کرنے پر آمادہ کیا ہے۔ خیر اس کے بعد تو کایا ہی پلٹ گئی اور ڈاکٹر غلام جیلانی برق مرحوم بالآخر اپنے سابقہ موقف سے رجوع کرتے ہوئے حدیث کی تاریخ اور حجیت پر ایک مستقل کتاب ''تاریخ حدیث'' لکھ کر دنیا سے رخصت ہوئے۔ اللہ تعالیٰ انھیں جوار رحمت میں اعلیٰ مقام سے نوازیں، آمین۔

اس سلسلے میں میرا اپنا واقعہ یوں ہے کہ صدر محمد ایوب خان مرحوم کے دور میں ایک بار رویت ہلال میں شہادت کے مسئلہ پر علمائے کرام میں اختلاف پیدا ہو گیا اور اخبارات ورسائل میں مضامین وبیانات شائع ہونے لگے۔ مولانا حافظ عبد القادر روپڑیؒ اہل حدیث مکتب فکر کے بڑے علما میں سے تھے۔ بڑے مناظر تھے اور خالص مناظرانہ مزاج رکھتے تھے۔ بعد میں میری ان سے خاصا عرصہ نیاز مندی رہی ہے اور ان کی شفقت اور دعاؤں سے مستفید ہوتا رہا ہوں۔ اس زمانے میں ان کا ایک مضمون غالباً ''نوائے وقت'' میں شائع ہوا جو ہمارے موقف کے برعکس تھا۔ میں نے اپنے طور پر اس کا جواب لکھا اور تصحیح کے لیے والد صاحب کو دکھایا جس پر مجھے ان کی سخت ڈانٹ کا سامنا کرنا پڑا اور یوں یاد پڑتا ہے کہ انھوں نے تھپڑ مارنے کے لیے ہاتھ بھی اٹھایا مگر بات صرف ہاتھ اٹھانے تک رہ گئی۔ میں نے اس جوابی مضمون میں مولانا حافظ عبد القادر روپڑیؒ کے مضمون کا ایک جملہ اس انداز میں لکھا تھا کہ ''حافظ عبد القادر لکھتا ہے۔'' والد صاحب نے اس پر سخت ناراضگی کا اظہار کیا اور کہا کہ:

''وہ تمہارا چھوٹا بھائی ہے؟ ہو سکتا ہے عمر میں تمہارے باپ سے بھی بڑا ہو۔ اس لیے اس طرح لکھو کہ مولانا حافظ عبد القادر روپڑی یوں لکھتے ہیں مگر مجھے ان کی اس بات سے اختلاف ہے۔''

اسی طرح یہاں اس بات کی وضاحت بھی ضروری سمجھتا ہوں کہ مسلکی اختلافات زندگی بھر حضرت والد محترم کا موضوع گفتگو رہے ہیں۔ انھوں نے مسلک کے ہر پہلو پر لکھا ہے اور بیان بھی کیا ہے۔ دیوبندی بریلوی اختلافات ہوں، سنی شیعہ کشمکش ہو، حنفی اہل حدیث تنازعات ہوں، حجیت حدیث کا مسئلہ ہو یا حیات وممات اور سماع اموات کا عنوان ہو، ان میں سے شاید ہی کوئی موضوع ایسا باقی رہا ہو جس پر انھوں نے نہ لکھا ہو اور بیان نہ کیا ہو۔ انھوں نے ہر موضوع پر لکھا اور خوب لکھا بلکہ حق ادا کر دیا، لیکن پبلک اجتماعات میں وہ ان موضوعات پر خطاب نہیں کرتے تھے۔ کسی بیان میں ضمناً کوئی بات آ گئی ہو تو مسئلہ کی وضاحت کی حد تک ان کا بیان دوٹوک ہوتا تھا، لیکن کسی اشد مجبوری کے بغیر کسی اختلافی مسئلہ کے موضوع پر عام اجتماعات میں وہ بیان نہیں کیا کرتے تھے۔ اختلافی مسائل پر وہ کتابوں کی صورت میں اظہار خیال کرتے تھے، سبق میں تفصیل سے بحث کرتے تھے اور درس میں بھی مسائل کی وضاحت دلائل کے ساتھ کیا کرتے تھے، لیکن عام اجتماعات میں، پبلک جلسوں میں حتیٰ کہ جمعۃ المبارک کے خطبات میں بھی ان کے گفتگو کے عنوانات اصلاحی ہوتے تھے۔ عقائد کی اصلاح، سنت کی اہمیت، دین کی اہمیت، حلال وحرام کا فرق اور عادات واخلاق کی اصلاح ان کی پبلک تقریروں کے موضوعات ہوتے تھے اور اس دوران ضمناً کوئی اختلافی مسئلہ آ جاتا تو اس کی وضاحت بھی کر دیا کرتے تھے۔

حضرت والد صاحبؒ کے خلیفہ مجاز اور ہمارے محترم دوست حضرت مولانا سعید احمد جلال پوری نے حضرت والد صاحبؒ کی وفات پر ماہنامہ ''بینات'' کراچی میں اپنے تعزیتی مضمون میں لکھا ہے کہ انہوں نے ایک موقع پر حضرت مولانا محمد سرفراز خان صفدرؒ سے عرض کیا کہ اپنے مسلک کے لیے آدمی کو متعصب ہونا چاہیے۔ انہوں نے جواب میں فرمایا، متعصب

نہیں بلکہ متصلب ہونا چاہیے۔ پھر دونوں میں فرق یہ بیان کیا کہ متعصب کے نزدیک دوسری کوئی بات قبول کرنے کی گنجائش نہیں ہوتی جبکہ متصلب اگرچہ اپنے اکابر کے موقف پر مضبوطی سے قائم رہتا ہے، لیکن اگر کوئی دوسری بات دلیل سے سمجھ میں آجائے تو اسے قبول کرنے میں اسے ہچکچاہٹ نہیں ہوتی۔

میرے لکھنے پڑھنے کے ذوق کو دونوں بزرگوں یعنی والد محترم حضرت مولانا محمد سرفراز خان صفدرؒ اور عم مکرم حضرت مولانا صوفی عبدالحمید سواتیؒ کی عملی سرپرستی حاصل رہی ہے۔ طالب علمی کے زمانے میں حضرت والد صاحبؒ نے فاتحہ خلف الامام پر اپنی ضخیم کتاب ''احسن الکلام'' کی مجھ سے اپنی نگرانی میں تلخیص کرائی جو ''اطیب الکلام'' کے نام سے شائع ہو چکی ہے۔ اس پر دو تین صفحات کا پیش لفظ میں نے خود تحریر کیا جو کتابچہ میں موجود ہے اور مجھے یاد ہے کہ میرے لکھے ہوئے پیش لفظ میں حضرت والد صاحب نے صرف ایک جملہ کی اصلاح کی تھی۔ میں نے ایک جگہ ''بیک بندش چشم'' کی اصطلاح استعمال کی تھی جسے انہوں نے ''چشم زدن'' کے محاورہ سے بدل دیا۔ اس کے علاوہ انہوں نے کوئی تبدیلی نہیں کی جس پر مجھے بے حد خوشی ہوئی اور میری خود اعتمادی میں اضافہ ہوا۔ حضرت صوفی صاحبؒ نے اپنی تصنیف ''فیوضات حسینی'' کی تسوید وترتیب کے کام میں مجھے شریک کیا اور اس کا بیشتر حصہ حضرت صوفی صاحبؒ کی نگرانی میں ان کی ہدایات کے مطابق میں نے مرتب کیا جس پر مجھے انہوں نے ''پارکر'' کا ایک خوبصورت قلم انعام میں دیا۔ دونوں بزرگوں کی یہ خواہش اور کوشش رہی کہ میں ان کے تصنیف وتحقیق کے کام میں ان کا معاون اور دست راست بنوں مگر کسی شخص کے لیے اپنے ''خون کا گروپ'' خود اختیار کرنے کی سہولت اللہ تعالیٰ نے نہیں رکھی، اور میرے خون کے جراثیم قدرے مختلف تھے، اس لیے اس فطری تنوع نے میری تحریر وتقریر کا میدان کسی حد تک ان سے مختلف کر دیا۔ جمعیۃ طلباء اسلام اور جمعیۃ علماء اسلام کے پلیٹ فارم پر سیاسی سرگرمیوں میں متحرک ہو جانے کے بعد میرے فکر ونظر کا زاویہ قدرے مختلف ہو چکا تھا اور میرے لکھنے پڑھنے کے موضوعات میں اسلامی نظام کی اہمیت وضرورت، مغربی فلسفہ وثقافت کی یلغار، اسلام پر مغرب کی طرف سے کیے جانے والے اعتراضات وشبہات، آج کے عالمی تناظر میں اسلامی احکام وقوانین کی تشریح، اسلامائزیشن کے علمی وفکری تقاضے، نفاذ اسلام کے حوالے سے دینی حلقوں کی ضروریات اور ذمہ داریاں، اسلام دشمن لابیوں کی نشان دہی اور تعاقب اور ان حوالوں سے طلبہ، دینی کارکنوں اور باشعور نوجوانوں کی راہ نمائی اور تیاری کو اولین ترجیح کا درجہ حاصل ہو گیا، چنانچہ گزشتہ پینتالیس برس سے انھی موضوعات پر مسلسل لکھتا چلا آ رہا ہوں۔

میں بحمد اللہ تعالیٰ راسخ العقیدہ سنی، شعوری حنفی اور متصلب دیوبندی ہوں اور اپنے دائرۂ کار کو کراس کیے بغیر ان مسائل پر سنجیدہ کام کرنے والوں سے حتی الوسع تعاون اور ان کی حوصلہ افزائی بھی کرتا رہتا ہوں، مگر میرا اپنا دائرۂ کار وہی ہے جس کا اوپر ذکر کر چکا ہوں اور اسی دائرے میں آخر وقت تک محنت کرتے رہنے کو اپنے لیے باعث سعادت ونجات سمجھتا ہوں۔

میرے لیے یہ بات خوشی کا باعث ہے کہ میرے چھوٹے بھائی اور مدرسہ نصرۃ العلوم گوجرانوالہ کے استاذ حدیث مولانا عبد القدوس خان قارن سلمہ نے حضرت والد محترم کی معاونت کا میدان سنبھال رکھا ہے اور وہ مسلسل اس خدمت کو پوری محنت اور ذوق کے ساتھ سرانجام دیتے چلے آ رہے ہیں، مگر اس کے باوجود اس بات کی خود مجھے شدت سے ضرورت محسوس ہو رہی تھی کہ حضرت والد محترم کی تحقیقات وتصنیفات میں مختلف حوالوں سے علمی ابحاث اور معلومات کا جو ذخیرہ بکھرا ہوا ہے، اسے اختلافی مسائل کے تناظر سے ہٹ کر مثبت انداز میں بھی سامنے لایا جائے تاکہ وہ لوگ جو کسی بھی وجہ سے اختلافی مسائل کے حوالے سے مطالعہ کا ذوق نہیں رکھتے، وہ بھی اس سے استفادہ کر سکیں، بلکہ میرے سامنے اس کی افادیت کا ایک اور پہلو بھی ہے جو اس سے کہیں زیادہ اہم ہے۔ وہ یہ کہ یہ مباحث اگر مثبت انداز میں از سر نو مرتب ہو جائیں تو نہ صرف دینی مدارس کے مدرسین بلکہ کالجوں میں اسلامیات کے اساتذہ کے لیے بھی بہت مفید ہوں گے بلکہ آج کے عمومی حالات کے تناظر میں دینی مدارس اور عصری کالجوں کے دینیات کے نصاب میں تبدیلی، اصلاح اور ترمیم واضافہ کے لیے جو آواز اٹھائی جا رہی ہے اور اس پر کسی درجے میں کام بھی ہو رہا ہے، اس میں یہ علمی ذخیرہ نئی نصاب سازی کے لیے ایک بہتر بنیاد بن سکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ کچھ عرصہ پہلے جب میرے بڑے بیٹے حافظ محمد عمار خان ناصر سلمہ (فاضل مدرسہ نصرۃ العلوم گوجرانوالہ وایم اے انگلش پنجاب یونیورسٹی) نے بتایا کہ وہ اپنے دادا محترم کی تصنیفات پر اس حوالے سے کام کر رہا ہے اور اس نے اس سلسلے میں چند مجموعے مرتب بھی کر لیے ہیں تو میری خوشی کی انتہا نہ رہی، چنانچہ ''فن حدیث کے اصول ومبادی'' کے عنوان پر ان مباحث کا مسودہ میں خود لے کر حضرت والد محترمؒ کی خدمت میں حاضر ہوا اور انھیں اس بات کی اطلاع دیتے ہوئے دعا کی درخواست کی تو انھوں نے بہت خوشی کا اظہار کیا اور اس کام کی تکمیل اور کامیابی کے لیے دعا فرمائی۔ بعد میں عزیز عمار خان سلمہ بھی ان کی خدمت میں اس کی باقاعدہ اجازت کی درخواست کے لیے حاضر ہوا تو انھوں نے اجازت کے ساتھ دعاؤں سے نوازا۔

میرے دل میں ایک کسک شروع سے رہی ہے کہ میں اپنی علمی وفکری تگ وتاز کا میدان مختلف ہو جانے کے باعث حضرت والد محترم کا ان کی جدوجہد کے میدان میں معاون نہیں بن سکا۔ اس کسک کے ایک پہلو کی کسی حد تک تسکین برادرم مولانا عبد القدوس قارن سلمہ، عزیزم مولانا حاجی محمد فیاض خان سواتی سلمہ، برادرم مولانا عبد الحق خان بشیر سلمہ اور برادرم مولانا قاری حماد الزہراوی سلمہ کی مسلکی سرگرمیاں دیکھ کر ہوتی رہتی ہے، جبکہ دوسرے پہلو کی تسکین کا سامان عزیز عمار خان سلمہ نے فراہم کر دیا ہے اور میں پورے اطمینان اور خوشی کے ساتھ دعا گو ہوں کہ اللہ تعالیٰ اسے نظر بد سے محفوظ رکھیں، اس کار خیر کی جلد از جلد تکمیل کی توفیق دیں اور اپنی صلاحیتوں کو دین حق کی خدمت کے لیے صرف کرتے رہنے کے مواقع، توفیق، اسباب اور پھر قبولیت ورضا سے بہرہ ور فرمائیں۔ آمین یا رب العالمین۔

حضرت والد محترم فروعی معاملات میں اختلاف کا حق خود بھی استعمال کرتے تھے اور دوسروں کو بھی اس کا حق دیتے تھے۔ اس پر ایک پورا مضمون لکھا جا سکتا ہے، مگر اس کی چند جھلکیاں ضرور پیش کرنا چاہوں گا۔

ان کا بیعت کا تعلق حضرت مولانا حسین علیؒ سے تھا جو تشہد میں رفع سبابہ کے قائل نہیں تھے، مگر حضرت والد صاحبؒ نے فرمایا کہ ہم ان کے سامنے رفع سبابہ ''ٹکا کے'' کرتے تھے اور ایک دفعہ انہوں نے اپنے شیخ سے اس پر بحث بھی کی۔

وہ نماز عید سے قبل تقریر کو بدعت کہتے تھے اور زندگی میں کبھی نہیں کی۔ ان کا معمول تھا کہ عید گاہ میں جاتے ہی نماز پڑھاتے، پھر خطبہ پڑھتے اور اس کے بعد ٹھیٹھ پنجابی میں گھنٹہ پون گھنٹہ خطاب کرتے تھے۔ نصف صدی سے زیادہ عرصہ تک ان کا معمول یہی رہا ہے، جب کہ حضرت صوفی صاحبؒ سمیت ہم سب کا معمول عید سے پہلے تقریر کرنے کا ہے جو حضرت والد صاحبؒ کے علم میں تھا اور وہ کبھی کبھی ہمیں کہتے بھی تھے کہ یہ بدعت ہے، لیکن بات کبھی اس سے آگے نہیں بڑھی۔ ابھی اسی سال عید الاضحیٰ کی بات ہے۔ میں ان کی خدمت میں حاضر ہوا تو نماز عید کے وقت کا تذکرہ چھڑ گیا۔ میں نے بتایا کہ میں نے

اتنے وقت پر عید پڑھائی ہے۔ فرمایا، بہت دیر سے پڑھائی ہے۔ میں نے عرض کیا کہ ہم نے پہلے تقریر بھی کرنا ہوتی ہے۔ فرمانے لگے، یہ بدعت ہے۔ میں نے عرض کیا کہ نماز کے بعد تقریر سنتا کوئی نہیں ہے۔ فرمایا کہ مروان بن الحکمؒ نے بھی یہی عذر پیش کیا تھا۔ میں نے گزارش کی، اس نے عربی خطبہ کے بارے میں کہا تھا اور ہم عربی خطبہ نماز کے بعد ہی پڑھتے ہیں۔ فرمانے لگے، لوگ تقریر کو بھی خطبہ کا حصہ سمجھنے لگتے ہیں۔ بس ہمارا اتنی ہی مکالمہ ہوا۔ اس کے بعد گفتگو کا رخ کسی اور طرف ہو گیا۔

حضرت والد صاحبؒ نماز تراویح کے بعد، وتر کے بعد یا نفلوں کے بعد کسی موقع پر بھی اجتماعی دعا کے قائل نہیں تھے اور اسے بدعت کہتے تھے۔ میں بھی جب تک گکھڑ میں رہا، یہی معمول رہا، مگر جب گوجرانوالہ کی جامع مسجد میں قرآن کریم سنانا شروع کیا تو وہاں دعا کا معمول تھا۔ حضرت مولانا مفتی عبد الواحدؒ حضرت والد صاحبؒ کے استاد تھے۔ ان سے پوچھا تو فرمایا کہ آخر میں ایک دعا ضرور ہو جانی چاہیے، تراویح کے بعد یا وتروں کے بعد یا نفلوں کے بعد۔ میں نے تینوں سے فراغت کے بعد یعنی نفلوں کے بعد ایک اجتماعی دعا کا معمول بنا لیا جو حضرت والد صاحبؒ کے نزدیک صریح بدعت تھی۔ حضرت والد صاحبؒ کو پتہ چلا تو پوچھا۔ میں نے عرض کیا کہ میں نے آپ کے استاد محترمؒ سے اجازت لے لی ہے۔ اس سلسلے میں لطیفہ یہ ہوا کہ کچھ عرصہ بعد جب میری جگہ عزیزم حافظ محمد عمار خان ناصر سلمہ نے قرآن کریم سنانا شروع کیا تو اس نے دادا محترمؒ کے فتویٰ پر عمل شروع کر دیا اور نوافل کے بعد دعا مانگنا ترک کر دی۔ میں ان دنوں عمرے پر گیا ہوا تھا۔ نمازیوں میں خلفشار پیدا ہو گیا اور میری واپسی تک اچھی خاصی گہما گہمی ہو گئی۔ میں نے واپس آ کر صورت حال دیکھی تو اس مسئلہ پر نمازیوں سے مستقل خطاب کیا کہ عمار خان ناصر اگر تراویح یا نوافل کے بعد دعا نہیں مانگتا تو یہ اس کے دادا محترمؒ کے فتویٰ کے مطابق ہے، اور میں مانگتا ہوں تو اپنے دادا استاد کے فتویٰ کے مطابق مانگتا ہوں، یہ بھی درست ہے۔ اس لیے وہ نماز پڑھائے گا تو دعا نہیں مانگے گا اور میں پڑھاؤں گا تو دعا مانگوں گا۔ اس میں کسی کو اشکال نہیں ہونا چاہیے۔ بعض دوستوں نے کہا آپ عمار خان ناصر کو حکماً کہیں کہ وہ دعا ضرور مانگا کرے۔ میں نے عرض کیا کہ میں ایسے معاملات میں حکم اور جبر کو درست نہیں سمجھتا اور وہ بھی مولانا سرفراز خان کا خون ہے، بات صرف دلیل کی سنے گا۔ حکم کی بات شاید اس پر اثر انداز نہ ہو۔

مجھے بریلوی حضرات کی عمومی تکفیر میں تردد رہا ہے جواب بھی ہے۔ میرا موقف یہ ہے کہ علم غیب، حاضر و ناظر، نور و بشر وغیرہ مسائل میں جو حضرات ایسی تاویل کر لیتے ہیں جو کفر کے دائرہ سے نکال سکتی ہو تو ان کے عقیدہ کو کفر کے دائرے میں شامل کرنے کی بجائے زیادہ سے زیادہ تعبیر کی گمراہی قرار دیا جا سکتا ہے، البتہ جو شخص کسی تاویل کے بغیر صراحتاً شرکیہ عقیدہ کا اظہار کرتا ہے، اس کا معاملہ مختلف ہے۔ حضرت والد محترم رحمۃ اللہ علیہ کو اس کا ایک بار علم ہوا تو انھوں نے مجھ سے اس مسئلہ پر باقاعدہ گفتگو کی، مگر کوئی دباؤ ڈالنے کی بجائے دلیل کے ساتھ سمجھانے کی کوشش کی اور علم غیب کے مسئلہ پر حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ اور حضرت مولانا حسین علیؒ کے فتاویٰ مجھے پڑھائے، مگر وہ پڑھنے کے بعد بھی میں نے حضرت والد محترمؒ سے عرض کیا کہ اگر کوئی شخص ایسی تعبیر اختیار کرتا ہے جو اس کو کفر کے دائرہ سے نکالتی ہو تو اس کو کفر کے فتوے سے بچانا ہی زیادہ مناسب ہے۔ ہماری یہ گفتگو اس سے آگے نہیں بڑھی اور اس کے بعد حضرت والد محترمؒ نے اس مسئلہ پر کبھی مجھ سے بات نہیں کی۔

ایک اور پر لطف مکالمہ کا ذکر بھی شاید نامناسب نہ ہو۔ حضرت والد محترمؒ نقشبندی سلسلہ میں حضرت مولانا حسین علیؒ سے بیعت اور مجاز تھے اور میرا بیعت کا تعلق حضرت مولانا عبید اللہ انورؒ سے تھا جو قادری راشدی سلسلہ کے شیخ تھے۔ ان کے ہاں

مجلس ذکر ہوتی تھی اور اس میں ذکر بالجہر بھی ہوتا تھا۔ حضرت والد محترمؒ کے نزدیک اجتماعی طور پر ذکر بالجہر بدعت شمار ہوتا ہے اور اس مسئلہ پر ان کی مستقل کتاب بھی ہے۔ وہ ذکر میں جہر کو بعض شرائط کے ساتھ تعلیماً تو جائز کہتے تھے، مگر اس کے مستقل معمول کو وہ درست نہیں سمجھتے تھے۔ میرا معمول یہ تھا کہ جب تک حضرت مولانا عبید اللہ انورؒ حیات رہے، ان کی مجلس ذکر میں شرکت کے لیے شیرانوالہ لاہور بھی جاتا رہا اور وہ گوجرانوالہ میں کبھی تشریف لاتے تو یہاں بھی ان کی مجلس ذکر میں شریک ہوتا تھا۔ ایک بار اتفاق سے گکھڑ کی کسی مسجد میں حضرت مولانا عبید اللہ انورؒ تشریف لائے اور مجلس ذکر ہوئی تو میں بھی شریک ہوا۔ اس سے ایک روز بعد اس مسئلہ پر حضرت والد محترمؒ سے میرا درج ذیل مکالمہ ہو گیا:

انھوں نے مجھ سے پوچھا کہ ”تم بھی ہو ہو کرنے گئے تھے؟“

میں نے ہاں میں جواب دیا تو فرمایا کہ ”سر بھی ہلاتے رہے ہو؟“

میں نے اس کا جواب بھی اثبات میں دیا تو فرمایا کہ ”تم نے میری کتاب نہیں پڑھی؟“

میں نے عرض کیا کہ ”پڑھی ہے“ تو فرمایا کہ پھر تمہارا کیا خیال ہے؟

ظاہر بات ہے کہ میں ان سے کسی مباحثہ یا مناظرہ کی گستاخی نہیں کر سکتا تھا، اس لیے میں نے بات ٹالنے کے لیے یہ عرض کر دیا کہ ”آپ نقشبندی ہیں، ہم قادری ہیں۔ نقشبندیوں کے ہاں ذکر میں جہر نہیں ہے اور قادری جہر کے ساتھ ذکر کرتے ہیں۔“

فرمایا: ”بڑے بے وقوف ہو۔ کیا میں نے کتاب اس لیے لکھی ہے؟“

میں نے اس بحث کو آگے نہیں بڑھانا تھا، اس لیے پہلی بات کو ہی دوبارہ عرض کر کے خاموش ہو گیا اور حضرت والد محترم نے بھی خاموشی اختیار فرما لی اور پھر کبھی اس موضوع پر مجھ سے کچھ نہیں فرمایا۔

عرض کرنے کا مقصد یہ ہے کہ وہ جزوی اور فروعی مسائل میں بھی اپنے موقف کا بے لچک اور دوٹوک اظہار ضرور کرتے تھے، مگر اختلاف کو سنتے تھے، برداشت کرتے تھے، اس کا حق دیتے تھے اور اپنے موقف کو منوانے میں جبر یا دباؤ کو استعمال کرنے کی بجائے دلیل اور افہام و تفہیم کا لہجہ اختیار کرتے تھے جو ہمیشہ سے اہل علم کا ذوق اور رویہ رہا ہے۔

حضرت والد محترمؒ کی تحریکی زندگی کا آغاز طالب علمی کے دور میں ہی ہو گیا تھا۔ طالب علمی کے زمانے میں جب وہ ۱۹۳۱ء سے ۱۹۴۱ء تک مختلف مدارس میں پڑھتے رہے ہیں، انہوں نے خود اپنی یادداشتوں میں لکھا ہے کہ وہ مجلس احرار اسلام کے باقاعدہ رضا کار تھے اور اس کے جلسوں میں بطور رضا کار کے شریک ہوتے اور تحریک آزادی میں اس پلیٹ فارم سے حصہ لیتے رہے ہیں۔ ان کی اس دور کی دو یادگاریں ہمارے گھر میں ایک عرصہ تک موجود رہی ہیں۔ ایک لوہے کا سرخ ٹوپ جو وہ پریڈ کے وقت پہنا کرتے تھے اور دوسری کلہاڑی۔ لوہے کا سرخ ٹوپ تو اب موجود نہیں ہے، لیکن ان کی کلہاڑی اب بھی موجود ہے اور ان کے احراری ہونے کی یاد دلاتی رہتی ہے۔ اسی دوران وہ جمعیۃ علماء ہند کے کارکن بھی رہے اور جمعیۃ کے متعدد اجلاسوں میں انھوں نے شرکت اور نمائندگی کی۔ وہ ۱۹۴۳ء میں گکھڑ آ گئے تھے اور یہاں مجلس احرار انھوں نے ہی بنائی ہے۔ اس میں ان کے ساتھ حاجی اللہ دتہ بٹ مرحوم اور ملک محمد اقبال مرحوم شامل تھے۔ تحریک پاکستان کے حوالے سے ان کا یہ تذکرہ ان کے ریکارڈ میں ملتا ہے کہ قیام پاکستان کے موقع پر مقامی مسلم لیگی قیادت کی درخواست پر گکھڑ میں

پاکستان کا پرچم سب سے پہلے انھوں نے لہرایا تھا۔

ان کے دور طالب علمی کا ایک اہم تحریکی واقعہ یہ ہے کہ ۱۹۴۱ء میں جب وہ دار العلوم دیوبند میں دورۂ حدیث کے طالب علم تھے، دار العلوم کے شیخ الحدیث حضرت مولانا سید حسین احمد مدنیؒ انگریزی اقتدار کے خلاف آزادی کی تحریک میں گرفتار ہو گئے جس پر دار العلوم کے طلبہ نے شدید احتجاج کیا، مظاہرے ہوئے، کلاسوں کا بائیکاٹ کیا گیا اور ہنگاموں کی صورت حال پیدا ہوگئی۔ اس موقع پر مختلف علاقوں سے تعلق رکھنے والے طلبہ کے نمائندوں پر مشتمل ایکشن کمیٹی قائم کی گئی جس میں سرحد اور افغانستان کے طلبہ نے اپنا نمائندہ حضرت والد محترم کو چنا اور پھر تمام نمائندوں نے مل کر ایکشن کمیٹی کا سربراہ بھی انھی کو منتخب کر لیا۔ اس طرح حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی کی گرفتاری کے خلاف دار العلوم دیوبند کے طلبہ کی پر جوش احتجاجی تحریک کی قیادت مولانا محمد سرفراز خان صفدرؒ نے کی۔ مظاہروں نے اس قدر شدت اختیار کی کہ دار العلوم دیوبند کے معاملات میں حکومت کی مداخلت کے امکانات نظر آنے لگے۔ اس پر جمعیۃ علماے ہند کے قائدین حضرت مولانا مفتی کفایت اللہ دہلویؒ کی راہ نمائی میں دیوبند تشریف لائے اور طلبہ کے نمائندوں کے ساتھ مذاکرات کیے تاکہ دار العلوم کے معاملات اور تعلیمی ماحول کو نقصان سے بچایا جا سکے۔ ان مذاکرات میں بھی طلبہ کے نمائندوں نے مولانا محمد سرفراز خان صفدرؒ کی قیادت میں اپنے بزرگوں سے بات چیت کی۔ اس طرح پر جوش احتجاجی تحریک ختم کر کے دار العلوم کے طلبہ کلاسوں میں واپس گئے اور دار العلوم دیوبند کا تعلیمی ماحول بحال ہوا، مگر اس کے اثرات اس قدر وسیع تھے کہ اس سال دار العلوم دیوبند کے سالانہ امتحانات نہ ہو سکے۔ یہ پوری تاریخ میں پہلا واقعہ ہے۔ طلبہ درمیان سال میں ہنگاموں میں رہے اور امتحان سے پہلے طلبہ نے مطالبہ کر دیا کہ چونکہ ہم ہنگاموں میں رہے ہیں اس لیے ہمیں بغیر امتحان کے پاس کیا جائے۔ دار العلوم دیوبند کے داخلہ کے امتحان اور سالانہ امتحان کا بہت سخت معیار تھا۔ دار العلوم دیوبند نے انکار کر دیا اور کہا کہ ہم یہ تو کر سکتے ہیں کہ دار العلوم دیوبند کو بند کر دیں لیکن یہ نہیں کر سکتے کہ بغیر امتحان کے کسی کو پاس کر دیں۔ چنانچہ اس سال امتحان نہیں ہوئے اور دورۂ حدیث کے شرکا نے اگلے سال ۱۹۴۲ء میں دوبارہ وہاں جا کر امتحان دیا جن میں حضرت والد محترم اور مولانا صوفی عبد الحمید خان سواتیؒ بھی شامل تھے۔

قیام پاکستان کے بعد ان کی تحریکی زندگی کا اہم واقعہ ۱۹۵۳ء کی تحریک ختم نبوت میں ان کی گرفتاری ہے۔ وہ تحریک میں سرگرم حصہ لینے کے جرم میں گرفتار ہوئے اور کم وبیش ساڑھے نو ماہ تک ملتان کی جیل میں رہے۔ حضرت مولانا صوفی عبد الحمید خان سواتیؒ بھی اس تحریک میں گرفتار ہوئے اور کئی ماہ تک جیل کاٹی۔ جیل میں والد محترم کا تدریسی سلسلہ جاری رہا اور حجیت حدیث پر ایک کتاب انھوں نے اسی دوران ''صرف ایک اسلام'' کے نام سے لکھی جو ڈاکٹر غلام جیلانی برق مرحوم کی کتاب ''دو اسلام'' کے جواب میں ہے اور اسی قید کے دوران انھیں خواب میں سیدنا حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی زیارت ہوئی جس کی تعبیر میں ان کے استاذ محترم حضرت مولانا عبد القدیر صاحبؒ نے فرمایا کہ ہو سکتا ہے، حضرت عیسیٰ علیہ السلام آپ کی زندگی میں آ جائیں۔

تحریکی زندگی میں حضرت والد محترم کا تیسرا دور جمعیۃ علماے اسلام میں ان کی شمولیت کا ہے۔ ۱۹۵۶ء میں حضرت مولانا احمد علی لاہوریؒ، حضرت مولانا محمد عبد اللہ درخواستیؒ، حضرت مولانا غلام غوث ہزارویؒ اور حضرت مولانا مفتی محمودؒ کی قیادت میں

جمعیۃ علماے اسلام کی تشکیل نو ہوئی تو مولانا محمد سرفراز خان صفدرؒ بھی اس میں شامل ہو گئے اور کم وبیش پچیس برس تک جمعیۃ کے ضلعی امیر کی حیثیت سے خدمات سرانجام دیں۔ ان کی ابتدائی جماعتی سرگرمیوں میں سے مجھے دو واقعات یاد ہیں۔ ایک یہ کہ صدر ایوب خان مرحوم کے دور میں جب ملک میں عائلی قوانین نافذ ہوئے اور اس کی خلاف شریعت دفعات پر علماے کرام نے اعتراض کیا تو قومی اسمبلی کے ارکان کو علماے کرام کے موقف سے آگاہ کرنے کے لیے ان کے پاس وفود بھیجنے کا پروگرام بنایا گیا۔ تحصیل وزیر آباد سے اس وقت قومی اسمبلی کے رکن چودھری صلاح الدین چٹھہ مرحوم ہوا کرتے تھے جو چودھری حامد ناصر چٹھہ صاحب کے والد تھے۔ ان سے ملاقات کے لیے حضرت مولانا مفتی عبد الواحدؒ، حضرت والد محترم اور مولانا احمد سعید ہزاروی زید مجدہم پر مشتمل وفد گکھڑ سے چودھری صلاح الدین مرحوم سے ملاقات کے لیے ان کے قصبہ احمد نگر گیا۔ یہ حضرات گکھڑ میں اکٹھے ہوئے، جامع مسجد میں باہمی مشاورت کی اور پھر تانگے پر احمد نگر روانہ ہوئے۔ مجھے مسجد میں ان کے مل بیٹھنے اور تانگے پر احمد نگر روانہ ہونے کا منظر یاد ہے۔

اس دور کی دوسری بات جو میری یادداشت میں محفوظ ہے، یہ ہے کہ صدر محمد ایوب خان مرحوم نے دستور کی تشکیل کے لیے عوام سے سفارشات طلب کیں تو اس وقت جمعیۃ علماے اسلام نے، جو مارشل لا کی وجہ سے نظام العلماء پاکستان کے نام سے کام کر رہی تھی، عوامی سطح پر اسلامی دستور کے لیے محضر نامے بھجوانے کی مہم چلائی۔ یہ محضر نامے گکھڑ سے بھی بھجوائے گئے۔ حضرت والد محترم کی ترغیب پر جن حضرات نے محضر نامے پر کروانے اور بھجوانے کے لیے محنت کی، ان میں ہمارے ایک محترم بزرگ ماسٹر بشیر احمد کشمیریؒ پیش پیش تھے اور ایک کارکن کے طور پر مجھے بھی ان کے ساتھ کام کرنے کا موقع ملا تھا۔ اس کے بعد حضرت والد محترم کو ایک مرحلہ میں جمعیۃ علماے اسلام ضلع گوجرانوالہ کا امیر منتخب کیا گیا اور وہ کم وبیش ربع صدی تک اس حیثیت سے خدمات سرانجام دیتے رہے۔ جمعیۃ کے اجلاسوں کی صدارت، جماعتی دورے، تحریکات میں سرپرستی اور جمعیۃ کے زیر اہتمام عام جلسوں سے خطاب کے لیے وہ اپنی بے پناہ مصروفیت کے باوجود وقت نکالتے تھے اور جماعتی سرگرمیوں میں حصہ لیتے تھے۔ ۷۰ء کے انتخابات میں وزیر آباد کی نشست کے لیے قومی اسمبلی کے امیدوار حضرت مولانا مفتی عبد الواحدؒ کے لیے انتخابی مہم چلائی جو ان کے استاذ محترم بھی تھے، اور ۷۴ء کی تحریک ختم نبوت میں سرگرم حصہ لیا۔

۷۵ء میں جمعیۃ علماے اسلام کا ملک گیر قومی نظام شریعت کنونشن مدرسہ نصرۃ العلوم گوجرانوالہ میں منعقد ہوا جس میں جمعیۃ کی مجلس شوریٰ کے فیصلے کے مطابق حضرت مولانا مفتی محمودؒ نے پرائیویٹ سطح پر جمعیۃ علماے اسلام کے تحت شرعی عدالتوں کے قیام کا اعلان کیا۔ اس کے لیے وفاقی سطح پر شرعی عدالت مولانا مفتی محمودؒ کی سربراہی میں قائم کی گئی جس میں حضرت والد محترم اور حضرت مولانا عبد الکریم قریشیؒ آپ بیر شریف شامل تھے۔ اس کے بعد صوبائی اور ضلعی سطح پر شرعی عدالتیں قائم کی گئیں۔ ہمارے حضرت مولانا قاضی حمید اللہ خان صاحب بھی اسی دور میں قاضی بنے۔ وہ گوجرانوالہ کے ضلعی قاضی مقرر ہوئے جبکہ حضرت مولانا مفتی محمد عیسیٰ خان گورمانی نائب قاضی تھے۔ انھوں نے بعض مقدمات کی سماعت بھی کی اور اس وجہ سے مولانا حمید اللہ خان کے نام کے ساتھ قاضی کے لقب کا اضافہ ہوا۔ ان شرعی عدالتوں کے نظام اور طریق کار کے تعین کے لیے جامعہ مدینہ لاہور اور مدرسہ قاسم العلوم شیرانوالہ گیٹ لاہور میں کنونشن منعقد ہوئے جن میں شرعی عدالتوں کا طریق کار اور نظام العمل وضع کیا گیا۔ ان میں سے ایک کنونشن کی صدارت حضرت والد محترم نے کی اور ان کے ساتھ حضرت

مولانا مفتی محمودؒ، حضرت مولانا محمد یوسف خان آف پلندری، حضرت مولانا سید حامد میاںؒ، حضرت مولانا ایوب جان بنوریؒ، حضرت مولانا عبد الکریم قریشیؒ، حضرت مولانا مفتی عبد الواحدؒ اور حضرت مولانا مفتی احمد الرحمٰنؒ جیسے بزرگ اس کار خیر میں شریک ہوئے۔ اس موقع پر وفاقی اور صوبائی سطح پر عدالتوں کی تشکیل کے ساتھ ساتھ مقدمات کی سماعت اور فیصلوں کے طریق کار کا بھی تعین کیا گیا، مگر یہ سارا ہوم ورک ۱۹۷۷ء کی سیاسی گہما گہمی کی نذر ہو گیا اور عملاً کوئی پیش رفت نہ ہو سکی۔

۱۹۷۶ء میں پنجاب کی پیپلز پارٹی کی حکومت نے مدرسہ نصرۃ العلوم گوجرانوالہ اور اس کے ساتھ ملحقہ جامع مسجد نور کو محکمہ اوقاف کی تحویل میں لینے کا نوٹیفکیشن جاری کر دیا تھا جس کے خلاف احتجاج کے لیے گوجرانوالہ کے معروف وکیل جناب نوید انور نوید ایڈووکیٹ مرحوم کی قیادت میں احتجاجی تحریک چلی جس میں سیکڑوں علما اور کارکنوں نے گرفتاری دی اور ہم تین بھائی یعنی راقم الحروف، مولانا عبد القدوس قارن اور مولانا عبد الحق خان بشیر بھی کئی ماہ تک جیل میں رہے۔ اس تحریک کے اصل سرپرست مولانا مفتی عبد الواحدؒ، حضرت والد محترم اور حضرت صوفی صاحبؒ تھے اور والد محترم نے اپنے استاذ محترم حضرت مولانا مفتی عبد الواحدؒ کے ساتھ مل کر مسجد نور کی واگزاری کی تحریک کی سرپرستی کی اور ضلع بھر کا دورہ کر کے دینی کارکنوں کو اس تحریک میں حصہ لینے کے لیے تیار کیا۔

اس کے بعد انھوں نے جمعیۃ علماے اسلام کے ضلعی امیر کی حیثیت سے ۱۹۷۷ء کی تحریک نظام مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم میں سرگرم کردار ادا کیا۔ مختلف جلوسوں کی قیادت کی، جلسوں سے خطاب کیا اور احتجاجی جلوس کی قیادت کرتے ہوئے گرفتار ہو کر کم وبیش ایک ماہ ڈسٹرکٹ جیل گوجرانوالہ میں رہے۔ اسی دوران وہ مشہور واقعہ بھی پیش آیا کہ گکھڑ کی جامع مسجد سے جمعہ کے بعد پاکستان قومی اتحاد کا احتجاجی جلوس نکلنا تھا جس کی قیادت حضرت والد محترم نے کرنا تھی۔ فیڈرل سیکورٹی فورس کے کمانڈر نے جلوس پر پابندی لگا دی اور ایک لکیر سڑک پر کھینچ کر وارننگ دی کہ جس نے یہ لکیر عبور کی، اسے گولی مار دی جائے گی۔ اس کے ساتھ ہی ایف ایس ایف کے جوانوں نے فائرنگ کے لیے پوزیشنیں سنبھال لیں، مگر حضرت والد محترم اپنے رفقا سمیت، جن میں ہمارے حفظ قرآن کریم کے استاذ محترم قاری محمد انور صاحب اور جے یو پی کے راہ نما حاجی سید ڈار مرحوم بھی شامل تھے، یہ کہتے ہوئے وہ لکیر عبور کر گئے کہ ۶۳ سال کی مسنون عمر پوری کر چکا ہوں اور اب شہادت کی آرزو رکھتا ہوں۔ ان کا یہ عزم دیکھتے ہوئے فیڈرل سیکورٹی فورسز کے جوانوں کی تنی ہوئی رائفلیں زمین کی طرف جھک گئیں اور احتجاج جلوس پوری آب وتاب کے ساتھ آگے روانہ ہو گیا۔

جمعیۃ علماے اسلام کے ساتھ حضرت والد محترم کے تعلق کے حوالے سے اس بات کا تذکرہ بھی ضروری ہے کہ وہ اگرچہ جمعیۃ کی مرکزی مجلس شوریٰ کے باضابطہ رکن نہیں تھے، لیکن اہم اجلاسوں میں خصوصی دعوت پر کبھی کبھار شریک ہوا کرتے تھے۔ دراصل ضلع گوجرانوالہ سے حضرت مولانا مفتی عبد الواحدؒ مرکزی مجلس شوریٰ کے رکن تھے جو جمعیۃ کے سینئر راہ نماؤں میں تھے اور حضرت والد محترمؒ کے اساتذہ میں سے تھے۔ پھر جمعیۃ کا مرکزی سیکرٹری اطلاعات منتخب ہونے کے بعد میں بھی بلحاظ عہدہ مرکزی مجلس شوریٰ کا رکن بن گیا تو گوجرانوالہ سے مرکزی مجلس شوریٰ میں دو رکن ہو گئے۔ ایک موقع پر قائد جمعیۃ حضرت مولانا مفتی محمودؒ نے مجھ سے فرمایا کہ حضرت مولانا محمد سرفراز خان صفدرؒ کو بھی مرکزی شوریٰ کا ممبر ہونا چاہیے۔ میں نے عرض کیا کہ گوجرانوالہ سے ہم دو پہلے سے ممبر ہیں، تیسرا ممبر بنانے پر شاید کچھ علاقوں کو اعتراض ہو۔ حضرت مفتی صاحبؒ نے

فرمایا کہ تمہاری بات درست ہے، مگر مولانا جیسی شخصیت کو مرکزی شوریٰ میں کبھی کبھی ضرور آنا چاہیے۔ میں نے عرض کیا کہ یہ بات آپ ان سے خود فرما دیں۔ اس مقصد کے لیے حضرت مولانا مفتی محمودؒ نے گکھڑ کا سفر کیا۔ میں بھی ہمراہ تھا۔ انھوں نے جب حضرت والد صاحب سے یہ بات کہی تو والد محترمؒ کا جواب بھی وہی تھا جو میں عرض کر چکا تھا کہ حضرت مولانا عبد الواحد صاحبؒ اور زاہد الراشدی پہلے سے رکن ہیں تو وہ میری نمائندگی ہی کرتے ہیں۔ الگ طور پر مجھے رکن بنانے میں مصلحت نہیں ہے۔ حضرت مولانا مفتی محمودؒ نے فرمایا کہ یہ ساری باتیں درست ہیں، لیکن آپ جیسے بزرگوں کا مجلس شوریٰ میں آنا جہاں عوام میں ہمارے اعتماد میں اضافے کا باعث بنے گا، وہاں ہمیں بھی حوصلہ ہوگا کہ ہم صحیح کام کر رہے ہیں اور صحیح رخ پر جا رہے ہیں، اس لیے باضابطہ رکنیت کے بغیر بھی اہم اجلاسوں میں آپ کو اگر دعوت دی جائے تو تشریف لے آیا کریں۔ اس پر حضرت والد محترم نے وعدہ کر لیا اور حضرت مفتی صاحبؒ نے بہت سے اہم اجلاسوں کے موقع پر مجھے ہدایت کی کہ مولانا محمد سرفراز خان صفدر کو بھی دعوت دینی ہے اور کئی اجلاسوں میں وہ تشریف بھی لائے۔ اس سے قبل متحدہ پاکستان کے دور میں بھی مجھے یاد ہے کہ جمعیۃ علماے اسلام کی مرکزی مجلس شوریٰ کا ایک اہم اجلاس ڈھاکہ میں ہو رہا تھا جس کے لیے حضرت مولانا مفتی محمودؒ اور حضرت مولانا غلام غوث ہزارویؒ نے حضرت والد محترمؒ کو خصوصی دعوت دی اور وہ ان بزرگوں کے ساتھ جمعیۃ علماے اسلام کے مرکزی اجلاس میں شرکت کے لیے ڈھاکہ تشریف لے گئے۔

حضرت والد محترم جس عرصہ میں جمعیۃ علماے اسلام کے ضلعی امیر رہے، اس دوران جمعیۃ علماے اسلام دو بار تقسیم ہوئی۔ ایک بار حضرت مولانا غلام غوث ہزارویؒ نے اپنے رفقا سمیت الگ ہو کر ”ہزاروی گروپ“ کے نام سے الگ جمعیۃ بنا لی اور دوسری بار حضرت مولانا مفتی محمودؒ کی وفات کے بعد جمعیۃ علماء اسلام درخواستی گروپ اور فضل الرحمٰن گروپ میں تقسیم ہو گئی۔ دونوں بار حضرت والد محترمؒ جمعیۃ کے امیر حضرت مولانا محمد عبد اللہ درخواستیؒ کے ساتھ رہے اور ان کی امارت میں مسلسل جماعتی خدمات سرانجام دیتے رہے، البتہ جب ان دونوں گروپوں کے اتحاد کے بعد ایک نئی تقسیم فضل الرحمٰن گروپ اور سمیع الحق گروپ کی صورت میں عمل میں آئی تو حضرت والد محترمؒ نے جماعتی زندگی سے کنارہ کشی کر لی اور دونوں گروپوں میں مصالحت کے لیے کئی بار کوشاں ہوئے۔ ایک بار پشاور بھی تشریف لے گئے اور حکیم الامت حضرت تھانویؒ کے خلیفہ مجاز حضرت مولانا فقیر محمدؒ کے ہاں بعض دیگر اکابر علماے کرام کے ہمراہ چند روز قیام کر کے مولانا فضل الرحمٰن اور مولانا سمیع الحق کے درمیان مصالحت کی کوشش کرتے رہے جبکہ اس کے بعد ایک اور موقع پر شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد یوسف خان دامت برکاتہم آف پلندری کے ساتھ مل کر جمعیۃ کے دونوں دھڑوں میں مصالحت کی سعی کی، مگر انھیں اس میں کامیابی نہیں ہوئی۔ ان کی شدید خواہش تھی کہ جمعیۃ علماے اسلام کے سب دھڑے متحد ہو کر کام کریں۔

اسی طرح ان کی یہ خواہش اور کوشش بھی رہی کہ علماے دیوبند سے تعلق رکھنے والی تمام جماعتوں کا بھی کوئی متحدہ فورم تشکیل پائے اور ایک موقع پر ابن امیر شریعت حضرت مولانا سید عطاء المومن شاہ بخاری کی مساعی سے ”کل جماعتی مجلس عمل علماے اسلام“ کے نام سے ایک متحدہ محاذ قائم بھی ہوا جس کے لیے جامع مسجد نیلا گنبد لاہور میں ایک ملک گیر نمائندہ کنونشن منعقد ہوا جس میں حضرت والد محترمؒ کو اس متحدہ محاذ کا امیر منتخب کیا گیا اور ملک میں امریکی مداخلت سے آزادی اور نفاذ اسلام کے لیے عوامی تحریک منظم کرنے کا فیصلہ کیا گیا، لیکن ابن امیر شریعت کی تمام تر مساعی اور خلوص کے باوجود یہ مہم اس لیے آگے نہ بڑھ سکی

کہ اس وقت دیوبندی مکتب فکر کی تین بڑی جماعتوں یعنی جمعیۃ علماے اسلام کے دونوں گروپوں اور اس کے ساتھ کالعدم سپاہ صحابہ کی قیادت کو عملاً ساتھ چلنے کے لیے تیار نہ کیا جا سکا اور دو تین اجلاسوں کے بعد معاملہ آگے بڑھنے سے رک گیا۔

زندگی کے آخری ایام میں حضرت والد محترمؒ نے مولانا سمیع الحق کو بطور خاص گکھڑ بلا کر دیوبندی مکتب فکر کی تمام جماعتوں کا مشترکہ اجلاس بلانے اور متفقہ موقف اختیار کرنے کی خواہش کا اظہار کیا، مگر یہ خواہش بھی تشنہ تکمیل رہی۔

حضرت والد محترمؒ کی سرگرمیوں کا ایک دائرہ دینی جماعتوں اور مدارس کے اجتماعات کا بھی تھا۔ وہ ان جلسوں میں جاتے اور خطاب کرتے تھے مگر عام طور پر ان کے پبلک خطابات کے موضوعات اختلافی مسائل سے ہٹ کر ہوتے تھے اور کسی اشد ضرورت کے بغیر اختلافی مسائل پر گفتگو نہیں کرتے تھے۔ ان کے عوامی اجتماعات حدیث وسنت کی اہمیت، اصلاح عوام اور عام لوگوں سے متعلقہ جائز وناجائز، حلال وحرام کے مسائل ہوتے تھے۔ زبان سادہ استعمال کرتے تھے۔ لہجہ ناصحانہ اور اسلوب افہام وتفہیم کا ہوتا تھا۔ گکھڑ میں خطبہ جمعہ اور درس ٹھیٹھ پنجابی زبان میں ہوتا تھا اور کوئی شخص ان کا بیان سن کر یہ تصور بھی نہیں کر سکتا تھا کہ یہ بزرگ پنجابی نہیں پٹھان ہیں۔ پنجابی محاورے، ضرب الامثال اور کہاوتیں انہیں از بر یاد تھیں اور موقع ومحل کے مطابق ان کا استعمال اس خوبی سے کرتے تھے کہ سننے والا محسوس کرتا تھا کہ یہ کہاوت یا محاورہ شاید اسی موقع کے لیے کہا گیا ہے۔

جلسوں میں شرکت کے حوالے سے ایک واقعہ خاص طور پر قابل ذکر ہے کہ وہ جامعہ رشیدیہ ساہیوال کے جلسے سے خطاب کے لیے تشریف لے گئے۔ یہ میرے طالب علمی کے دور کی بات ہے۔ اس وقت جامعہ رشیدیہ کے ناظم حضرت مولانا حافظ مقبول احمدؒ تھے جو بعد میں گلاسکو (برطانیہ) کی مرکزی جامع مسجد کے بانی اور خطیب بنے۔ واپسی پر انہوں نے حضرت والد محترمؒ کو حسب معمول کرایہ وغیرہ کے لیے کچھ رقم دی وہ غالباً تیس یا چالیس روپے دینا چاہتے تھے۔ جو اس زمانے میں کرایہ وغیرہ کے لیے کافی تھی لیکن رات رات اندھیرے کی وجہ سے دس دس کی بجائے سو سو کے نوٹ پکڑا دیے، واپسی پر حضرت والد محترمؒ نے دیکھا تو سمجھ گئے کہ یہ غلطی سے ہوا ہے چنانچہ دس دس کے نوٹوں کے حساب سے رقم رکھ کر باقی رقم بذریعہ منی آرڈر واپس بھجوادی۔ بعد میں گلاسکو میں ایک ملاقات کے موقع پر حضرت مولانا مقبول احمدؒ نے اس کا تذکرہ کیا اور فرمایا حضرت مولانا سرفراز خان صفدر نے ٹھیک سمجھا تھا، کہ ہم سے یہ غلطی ہوگئی تھی، لیکن صبح اس کا علم ہونے پر ہم نے ذمہ دار حضرات کے مشورہ سے یہ ساری رقم حضرت والا کو ہدیہ کرنے کی نیت کر لی تھی مگر انہوں نے واپس بھجوادی۔

انہی جلسوں کے حوالے سے ایک اور واقعہ کا تذکرہ بھی شاید نامناسب نہ ہو کہ ایک دفعہ ضلع گوجرانوالہ کے قصبہ نوشہرہ ورکاں میں سیرت کا جلسہ تھا۔ حضرت والد محترمؒ کی تقریر تھی، میں ساتھ تھا تو مجھے بھی تقریر کے لیے کہا گیا اور میں نے بھی مختصر تقریر کی۔ تقریر کے دوران میں نے کوئی واقعہ بیان کیا۔ جواب یاد نہیں ہے۔ دوسرے دن شام کو میری طلبی ہوگئی۔ پوچھا وہ واقعہ جو تم نے بیان کیا تھا کہاں پڑھا ہے؟ میں نے کہا یاد نہیں ہے۔ فرمانے لگے کہ ویسے ہی بول دیا تھا؟ میں نے عرض کی شاید کہ کسی سے سنا تھا۔ پوچھا کس سے سنا تھا؟ میں نے کہا یہ بھی یاد نہیں ہے۔ اس پر مجھے ڈانٹا اور فرمایا کہ جب تک خود کسی مستند کتاب میں نہ پڑھو یا کسی ثقہ بزرگ سے نہ سنو۔ کوئی واقعہ اس طرح بیان نہ کرنا۔ ثقہ بزرگ کے حوالے سے تین چار نام بھی لیے، جن میں حضرت مولانا مفتی محمد شفیعؒ، حضرت مولانا محمد یوسف بنوریؒ، حضرت مولانا شمس الحق افغانیؒ، اور حضرت

مولانا مفتی محمودؒ کے نام مجھے یاد ہیں۔ اس کے بعد سے بحمد اللہ میرا معمول ہے کہ کوئی روایت یا واقعہ اپنے کسی بیان میں ذکر نہیں کرتا۔ جب تک اس حوالہ ذہن میں نہ ہو اور کسی درجہ میں اس کا قابل بیان ہونے کی تسلی نہ ہو۔

حضرت والد محترمؒ کی دینی سرگرمیوں کا ایک دائرہ اصلاح وارشاد کا بھی تھا۔ وہ امام الموحدین حضرت مولانا حسین علیؒ سے بیعت تھے اور نقشبندی سلسلہ میں انہیں حضرت مرحومؒ سے خلافت* حاصل تھی۔ پہلے وہ عام طور پر بیعت سے گریز کیا کرتے تھے لیکن اگر کوئی اصرار کرتا تو نقشبندی سلسلہ میں اسے بیعت کر کے کچھ ذکر واذکار کی تلقین کرتے تھے۔ مگر آخری سالوں میں انہوں نے عام طور پر بیعت لینا شروع کر دی تھی۔ انکی زیادہ تلقین سنت کی پیروی اور بدعات سے اجتناب تھا۔ اس کے ساتھ قرآن کریم کی باقاعدہ تلاوت کا کہتے تھے اور روزمرہ کچھ اذکار کی تلقین کیا کرتے تھے۔ بس اس سے زیادہ اس سلسلہ میں ان کا کوئی باقاعدہ معمول نہیں تھا۔ اس سلسلہ میں انکے متعلقین کی تعداد سیکڑوں میں ہوگی جن میں علماے کرام بھی ہیں اور عام مسلمان بھی ہیں اور انہوں نے چند حضرات کو اپنی طرف سے خلافت بھی عطا کی ہے جس میں انہوں نے مجھے بھی شامل کر رکھا ہے۔

حضرت والد محترمؒ بیعت کے ساتھ جن اعمال واذکار کی تلقین کرتے تھے وہ کچھ اس طرح ہیں کہ ''توحید وسنت پر قائم رہتے ہوئے اور شرک وبدعت سے سختی کے ساتھ نفرت کرتے ہوئے اپنی ہمت کے مطابق نیکی کے دیگر اعمال کے ساتھ ۲۴ گھنٹے میں جب وقت ملے (وضو ہو تو نور علی نور) اور بہتر ہوگا کہ ایک جگہ بیٹھ کر پڑھے ورنہ چلتے پھرتے بھی پڑھ سکتا ہے''

۱۔ سبحان الله ۲۰۰ بار

۲۔ الحمدلله ۲۰۰ بار

۳۔ لا اله الا الله ۲۰۰ بار

۴۔ الله اکبر ۲۰۰ بار

۵۔ لاحول ولاقوة الابالله العلی العظیم ۲۰۰ بار

۶۔ نماز والا درود شریف ۲۰۰ بار

۷۔ استغفرالله الذی لا اله الا هو
الحی القیوم واتوب الیه ۲۰۰ بار

۸۔ ناظرہ خواں کے لیے قرآن پاک کی تلاوت روزانہ ایک پاؤ اور حافظ کے لیے کم از کم ایک پارہ

میرا بیعت کا تعلق سلسلہ قادریہ میں حضرت مولانا عبید اللہ انورؒ سے تھا۔ ان کے بعد میں نے حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ سے بیعت کا تعلق قائم کیا۔ لیکن یہ بیعت محض نسبت اور تعلق ہی کے درجہ میں تھی۔ اس سلسلہ میں سلوک کے منازل طے کرنے کی نوبت نہیں آئی۔ حضرت مولانا عبید اللہ انورؒ سے ایک بار سلوک کے اسباق کا تذکرہ کیا تو انہوں نے سرسری انداز میں فرمایا کہ تم جو دینی جدوجہد کر رہے ہو۔ یہی تمہارے اسباق ہیں۔ میں نے اسے غنیمت سمجھا اور اس کے بعد کبھی دریافت ہی نہیں کیا۔ اب حضرت والد محترمؒ نے مجھے اپنے خلفاء کی فہرست میں شامل کیا ہے تو مجھے حجاب سا محسوس ہو رہا ہے کہ نہ میں اس لائن کا آدمی ہوں اور نہ ہی اس کی اہلیت رکھتا ہوں۔ حضرت والد محترمؒ کی وفات کے بعد بہت سے دوستوں

نے تجدید بیعت کے لیے مجھ سے رجوع کیا ہے مگر میں مسلسل ٹالنے کی کوشش کر رہا ہوں۔

حضرت والد محترمؒ نے بیماری کے دنوں ایک بار مجھے بطور خاص فرمایا کہ میں تصوف وسلوک کے موضوع پر کوئی کتاب نہیں لکھ سکا۔ اب اس پر تم نے لکھنا ہے اور اس سلسلہ میں حکیم الامت حضرت تھانویؒ اور حضرت مولانا محمد منظور نعمانیؒ کی کتابیں ضرور پڑھ لینا۔ میں نے ان سے وعدہ تو کر لیا مگر وہی حجاب آڑے آ رہا ہے کہ میں اس دنیا کا شخص نہیں ہوں۔ میری سرگرمیوں کا میدان اور ہے۔ ایک رکاوٹ اور بھی ہے کہ کسی موضوع پر باقاعدہ کتاب لکھنے کا میرا ذوق نہیں ہے۔ گزشتہ چالیس برس سے مضامین ہی لکھ رہا ہوں اور مزاج یہ پختہ ہو گیا ہے کہ کوئی بھی موضوع ہو، اختصار کے ساتھ زیادہ سے زیادہ دو تین قسطوں میں اسے نمٹا دیتا ہوں۔ اس سے زیادہ کسی موضوع پر میں لکھ ہی نہیں سکتا۔ ادھر حضرت والد محترمؒ کے ساتھ وعدہ بھی یاد ہے۔ اس لیے سوچ رہا ہوں کہ تصوف وسلوک کے بارے میں کسی بہانے آٹھ دس محاضرات کا سلسلہ کسی جگہ ہو جائے اور انہیں پھر کتابی شکل دے دی جائے۔ قارئین سے درخواست ہے کہ وہ میرے لیے خصوصی طور پر اس بات کی دعا فرمائیں کہ میں اس وعدہ کی جلد از جلد تکمیل کر سکوں۔ آمین یا رب العالمین۔

حضرت والد محترمؒ کا دم اور تعویذ کا سلسلہ بھی تھا۔ گکھڑ اور گوجرانوالہ میں دم کرانے اور تعویذ لینے والوں کے لیے لوگ ان سے رجوع کیا کرتے تھے۔ وہ اس کا معاوضہ نہیں لیتے تھے، البتہ کوئی اپنی خوشی سے تنگی محسوس کیے بغیر کچھ دے دیتا تو انکار پر اصرار نہیں کرتے تھے۔ بہت سے لوگ ان سے دم اور تعویذات کی اجازت مانگتے تھے جس پر انہوں نے وہ تین روزے رکھنے کی شرط پر اجازت دے دیتے تھے اور اپنے تجربات بھی لکھ کر دیتے تھے۔

والد محترم مولانا محمد سرفراز خان صفدرؒ گزشتہ آٹھ نو برس سے صاحب فراش تھے، مگر اللہ تعالیٰ کے فضل وکرم سے ان کی یادداشت آخر وقت تک قائم رہی اور علمی دلچسپی کا سلسلہ بھی جاری رہا۔ نظر کمزور ہو گئی تھی اور کسی کو ویسے نہیں پہچانتے تھے، لیکن تعارف کرا دیا جاتا تو پھر ساری باتیں ان کو یاد آ جاتیں اور وہ جزئیات تک دریافت کرتے تھے۔

مجھے جمعہ کے دن شام کو تھوڑی دیر کے لیے حاضری کا موقع ملتا، جب بھی طبیعت کچھ بحال ہوتی تو کسی نہ کسی کتاب سے کچھ سنانے کی فرمائش کرتے اور احادیث کی کسی کتاب میں سے چند احادیث سنا دیتا، ان کے سامنے پڑھتے ہوئے ڈر بھی رہتا تھا کہ چھوٹی سے چھوٹی غلطی بھی ان کی گرفت سے نہیں بچ پاتی تھی۔ ایک بار ایک حدیث سناتے ہوئے ایک لفظ پر میں اٹک گیا بعد میں حیرت بھی ہوئی کہ کئی دفعہ یہ حدیث پڑھنے پڑھانے میں آئی ہے یہ اٹک درمیان میں کیسے آ گئی؟ بہر حال میں جب اٹک گیا تو لفظ بھی بتایا اور اس کا مفہوم بھی بتایا۔ متعدد بار ایسا ہوا کہ کسی حدیث کی تلاش میں ذہن کام نہیں کر رہا اور تلاش کے باوجود نہیں مل رہی تو وہ بتاتے کہ فلاں کتاب کے فلاں باب میں دیکھو اور وہ حدیث وہیں مل جاتی۔ یہ باتیں ان کی صحت کے دور کی نہیں بلکہ اس بیماری کے دور کی ہیں جبکہ وہ اپنی مرضی سے کروٹ بھی نہیں بدل سکتے تھے۔ لیکن ذہنی استحضار کا یہ عالم تھا کہ ہمیں رشک آتا تھا۔

ایک موقع پر ہم تین چار بھائی حسب معمول جمعہ کی شام کو ان کے پاس موجود تھے تو طبیعت میں بشاشت تھی۔ مجھ سے قرآن کریم کی ایک آیت کریمہ کے بارے میں پوچھا کہ وہ کون سی سورت میں ہے، میں نے بتا دیا۔ خیال تھا کہ کسی مسئلہ کے حوالہ سے پوچھ رہے ہیں، لیکن جب اسی آیت کے بارے میں دوسرا سوال کیا تو اندازہ ہوا کہ ویسے نہیں پوچھ رہے،

امتحان لے رہے ہیں۔ چھوٹے بھائی قاری عزیز الرحمٰن شاہد بھی موجود تھے جو جدہ میں رہتے ہیں اور ان دنوں گکھڑ آئے ہوئے ہیں۔ میں انہیں آگے کر کے ان کی اوٹ میں ہو گیا اور پھر ان کا امتحان شروع ہو گیا۔ ان سے متعدد آیات کے بارے میں پوچھا اور جو آیت پوچھتے، اس کے ساتھ یہ کہتے کہ اس سے پہلے والی آیت بھی سناؤ۔ ہمیں اس بات پر خوشی تھی کہ آج طبیعت ہشاش بشاش ہے اور بابا جی موڈ میں ہیں۔

میری حاضری پر وہ زیادہ تر ملکی حالات کے بارے میں دریافت کرتے۔ ان دنوں سوات کی صورت حال کے بارے میں سخت پریشان تھے۔ اخبارات سننے کا معمول تھا، حالات سے واقف رہتے تھے اور سوال وجواب بھی کرتے تھے۔ میرے کالم بھی اہتمام سے سنتے تھے اور ان کے بعض مندرجات کے بارے میں بات بھی کرتے تھے۔ میں نے ایک کالم میں لکھا تھا کہ جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اپنے امتیوں کے لیے ''آئیڈیل'' ہیں۔ اس کے بعد حاضری ہوئی تو پوچھنے لگے کہ یہ آئیڈیل کیا ہوتا ہے؟ میں نے عرض کیا کہ یہ اسوہ حسنہ کا آزاد ترجمہ ہے۔

چند ماہ قبل فرمانے لگے کہ لغت کی کوئی مستند کتاب تمہارے پاس ہو تو مجھے لا دو۔ میں نے عرض کیا کہ آپ اسے اس حالت میں کیا کریں گے؟ فرمایا کہ کسی وقت ضرورت پڑ جاتی ہے۔ میں نے بازار سے ایک کتاب خرید کر پیش خدمت کر دی، بہت خوش ہوئے۔ پھر ایک دن فرمایا کہ اللؤلؤ والمرجان مل جائے گی؟ میں نے عرض کیا کہ مل جائے گی۔ وہ بھی میں نے بازار سے لا کر پیش کر دی۔ گزشتہ ماہ میں برطانیہ کے سفر پر جانے لگا اور عرض کیا کہ واپسی پر عمرہ کا ارادہ بھی ہے تو خوش ہوئے، دعا دی اور فرمایا کہ سنا ہے کہ ''مسند ابی یعلیٰ'' چھپ گئی ہے۔ اگر مل جائے تو میرے لیے لیتے آنا۔ میں نے اسے مدینہ منورہ اور مکہ مکرمہ کے متعدد کتب خانوں میں تلاش کیا، مگر نہ ملی۔ واپسی پر جدہ میں اپنے میزبان قاری محمد اسلم شہزاد صاحب سے، جو میرے ہم زلف ہیں، عرض کیا کہ کتاب لیے بغیر واپس جانے کو جی نہیں چاہتا۔ حضرت والد صاحب نے فرمائش کی ہے اور وہ مل نہیں رہی۔ ہم نے ایک راؤنڈ جدہ کے کتب خانوں کا لگایا تو دو تین کتاب خانوں کی چھان بین کے بعد ایک مکتبہ میں وہ مل گئی اور مجھے بے حد خوشی ہوئی۔ مجھ سے زیادہ قاری صاحب خوش ہوئے، قیمت بھی مجھے ادا نہیں کرنے دی اور کہا کہ یہ ہدیہ میری طرف سے پیش کر دیں۔

۱۴ر اپریل سے ۲۶ر اپریل تک میں برطانیہ میں تھا اور اس کے بعد حرمین شریفین حاضری دے کر وطن واپس آنے کا ارادہ تھا۔ جاتے ہوئے حضرت والد محترمؒ سے مل کر اور ان کی دعا لے کر گیا تھا، مگر برطانیہ میں قیام کے دوران اس اطلاع نے پریشان کر دیا کہ ان کی طبیعت زیادہ خراب ہو گئی ہے اور خون کی قے آئی ہے۔ اضطراب کی وجہ واضح تھی اور میں اس سے قبل یہ صدمہ دیکھ چکا تھا کہ ہماری چھوٹی والدہ مرحومہ کا جب انتقال ہوا تو میں شکاگو میں تھا اور آخری زیارت اور جنازے سے محرومی نے زندگی میں پہلی بار شدت کے ساتھ اس بات کا احساس دلایا تھا کہ بے بسی کسے کہتے ہیں۔ پریشانی اور بے چینی کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ حضرت والد صاحبؒ نے مجھے کہہ رکھا تھا کہ میرا جنازہ تم نے خود پڑھانا ہے۔ گھر فون کر کے معلوم کیا تو بتایا گیا کہ طبیعت کچھ سنبھل گئی ہے۔ قدرے اطمینان ہوا مگر سفر کے اختتام تک پریشانی دل و دماغ پر سوار رہی۔ یکم مئی بروز جمعرات گھر واپس پہنچا تو حسب معمول اگلے روز جمعہ کی شام کو حضرت والد صاحب کی خدمت میں حاضری دی۔ طبیعت زیادہ خراب تھی۔ حضرت کے معالج ڈاکٹر فضل الرحمٰن صاحب اور خادم خصوصی حاجی محمد لقمان میر اور مولانا محمد نواز بلوچ

موجود تھے۔ میں نے کتاب دکھائی تو دیکھ کر اشارہ کیا کہ وہاں رکھ دو۔

کچھ دنوں سے مسلسل خاموشی تھی۔ کچھ کھا پی بھی نہیں رہے تھے۔ ڈاکٹر صاحب کہنے لگے کہ کوشش کریں، کچھ کھا پی لیں اور باتیں بھی کریں۔ میں نے گزارش کی تو ایک آدھ گھونٹ پانی پیا اور پھر انکار کر دیا۔ میں نے سفر کے حالات کا تذکرہ شروع کر دیا تو ہلکا ہلکا اشارہ کرتے رہے۔ ہماری کوشش تھی کہ کچھ بولیں مگر کامیابی نہیں ہو رہی تھی۔ میں نے ان کی نواسیوں کا ذکر کیا جو برطانیہ میں رہتی ہیں۔ میں نے ان کا نام لیا اور بتایا کہ میں ان کے پاس بھی گیا تھا تو ہلکی سی توجہ کی اور اشارے سے ان کا حال پوچھا۔ بس میری یہ آخری ملاقات ہوئی۔ اس کے بعد ہم تین چار بھائی تھوڑی دیر کے لیے پھر ان کے پاس بیٹھے اور کچھ آپس کا حساب کتاب ان کے سامنے کیا۔ اس موقع پر ہم سب گھر والے یعنی میری اہلیہ، محمد عمار خان ناصر، اس کی اہلیہ اور دونوں بچے صحت کا حال معلوم کرنے کے لیے گکھڑ گئے تھے اور یہ آخری ملاقات ہم سب کی اکٹھی ہوئی۔

۴ رمئی کو رات ڈیڑھ بجے کے لگ بھگ فون کی گھنٹی بجی۔ فون اٹھایا تو دوسری طرف برادر عزیز قاری حماد الزہراوی صاحب تھے۔ دل دھڑکا کہ خدا خیر کرے۔ انہوں نے گلوگیر لہجے میں بتایا کہ حضرت والد صاحب کی طبیعت بہت زیادہ خراب ہے اور اب بظاہر کوئی امید دکھائی نہیں دے رہی۔ زبان پر بے ساختہ دعا جاری ہوئی۔ ابھی اسی شش و پنج میں تھا کہ برادرم قاری راشد خان کا فون آیا اور انہوں نے روتے ہوئے انا للہ وانا الیہ راجعون کہا تو امید کی آخری کرن بھی گل ہو گئی اور انا للہ وانا الیہ راجعون کہتے ہوئے اہلیہ کو جگایا۔ وہ یہ اچانک خبر سن کر رونے لگ گئیں۔ تھوڑی دیر میں حاجی محمد فیاض خان سواتی صاحب کا فون آیا۔ ہم نے ایک دوسرے سے تعزیت کی اور پھر گکھڑ جانے کی تیاری میں لگ گئے۔ اس سے چند گھنٹے پہلے میں نے عشا کی نماز تلونڈی موسیٰ خان کے قریب گاؤں پیرو چک میں پڑھائی اور اس کے بعد درس دیا تھا۔ درس کے دوران گفتگو اس مسئلہ پر آ گئی کہ اخبارات میں ''آپ کا ہفتہ کیسے گزرے گا؟'' کے عنوان سے کہانت کا جو کاروبار چل رہا ہے، یہ وہی کہانت ہے جو جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے دور میں موجود تھی اور آپ نے جاہلیت کی دیگر بہت سی اقدار و روایات کے ساتھ اس کا بھی خاتمہ کر دیا تھا۔ میں نے عرض کیا کہ قرآن کریم کہتا ہے کہ تمہیں آنے والے کل کی خبر نہیں کہ تم کیا کرو گے اور آنے والا کل تو بہت دور ہے، آج رات کے بارے میں ہم نہیں جانتے کہ ہم کیا کریں گے یا ہمارے ساتھ کیا ہوگا؟ اس کے صرف چند گھنٹے کے بعد ہمارے ساتھ یہ کچھ ہو گیا جس کا صدمہ رہتی زندگی تک ہمارے ساتھ رہے گا۔

سچی بات ہے کہ ہم سب ایک دوسرے کی تعزیت کے مستحق ہیں۔ ان کا کوئی عقیدت مند تعزیت کے لیے آتا ہے تو میری کوشش ہوتی ہے کہ اس سے تعزیت کروں، اس لیے کہ یہ اجتماعی صدمہ ہے، ملی صدمہ ہے اور عظیم دینی صدمہ ہے۔ مگر میں اس موقع پر حضرت رحمہ اللہ تعالیٰ کے ان خدام کو سب سے زیادہ تعزیت کا مستحق سمجھتا ہوں جنہوں نے ان کے صاحب فراش ہونے کے دوران سالہا سال تک ان کی خدمت کی۔ بالخصوص برادر عزیز قاری راشد صاحب جو ہمارے سب سے چھوٹے بھائی ہیں اور ان کے ساتھ ڈاکٹر فضل الرحمٰن، حاجی محمد لقمان میر، مولانا محمد نواز بلوچ، نعیم بٹ، ہمارے بھانجے مولانا داؤد خان نوید اور گھر کی وہ بچیاں جو مسلسل خدمت میں مصروف رہیں۔ اللہ تعالیٰ سب کو جزائے خیر سے نوازیں۔

اللہ تعالیٰ کی خاص مہربانیوں میں سے ایک یہ بھی ہوئی کہ ان کی وفات پر ہم سب بھائی خلاف معمول یہاں موجود تھے۔ میں سفر سے واپس پہنچ گیا تھا۔ ہمارے چھوٹے بھائی قاری عزیز الرحمٰن خان شاہد کئی سالوں سے جدہ میں مقیم ہیں اور تحفیظ

القرآن کی خدمات سرانجام دے رہے ہیں، وہ گزشتہ ماہ بچوں سمیت آ گئے تھے۔ ہمارے ایک بھائی مولانا رشید الحق عابد سلمہ جنہیں ہم پیر عابد صاحب کے نام سے یاد کرتے ہیں، وہ بھی دو روز پہلے گکھڑ آ چکے تھے۔ بقیہ برادران مولانا عبد القدوس قارن، مولانا عبد الحق خان بشیر، مولانا قاری حماد الزہراوی، قاری عنایت الوہاب خان ساجد، قاری منہاج الحق خان راشد اور ہمارے مرحوم بھائی قاری محمد اشرف خان ماجدؒ کے فرزند حافظ انصر خان اپنے اپنے گھروں میں موجود تھے۔ اس طرح ہم سب بھائی حضرت والد محترمؒ کے سفر آخرت کے وقت حاضر تھے۔ ہمشیرگان میں سے ایک مجھ سے بڑی ہیں جو آبائی علاقے اچھڑیاں شنکیاری میں ہیں، وہ اور ہمارے بڑے بہنوئی حاجی سلطان محمود خان بھی وقت پر پہنچ گئے۔ چھوٹی ہمشیرہ گوجرانوالہ میں ہیں۔ وہ بھی اپنے خاوند حافظ محمد شفیق صاحب، فرزند مولانا محمد داؤد خان نوید اور بچیوں کے ہمراہ موجود تھیں۔ ہماری منجھلی ہمشیرہ جو جہلم میں ہیں اور ان کے خاوند مولانا قاری خبیب احمد عمرؒ کا گزشتہ ماہ انتقال ہوا ہے، ان کے لیے یہ صدمہ دہرا ہو گیا کہ خاوند کی وفات کے بعد والد محترم کی وفات کے صدمہ سے دوچار ہونا پڑا۔ وہ بھی جنازے کے دن پہنچ گئیں۔

حضرت والد صاحبؒ کی وفات کے روز ہم سب بھائی گکھڑ میں جمع ہوئے تو جنازے کے لیے موزوں جگہ اور تدفین کے مقام کے بارے میں باہمی مشورہ ہوا۔ گکھڑ میں سب سے بڑی گراؤنڈ ڈی سی ہائی سکول کی ہے۔ ہم نے صبح اسے ایک بار دیکھا۔ اندازہ تھا کہ اس میں ایک لاکھ سے زیادہ افراد نماز جنازہ ادا کر سکیں گے۔ ہمارا خیال اسی کے لگ بھگ تھا، مگر شام کو جنازے کے وقت دیکھا کہ ہمارا اندازہ درست نہیں تھا۔ گراؤنڈ اس قدر بھری ہوئی تھی کہ اندر مزید لوگوں کے آنے کی گنجائش نہیں تھی، جبکہ باہر جی ٹی روڈ اور اس کے ساتھ ملحقہ دو روڈوں پر عوام کا بے پناہ ہجوم تھا اور جی ٹی روڈ، ٹریفک کے رش کی وجہ سے خاصی دیر تک جام رہی۔ ایک دوست نے بتایا کہ وہ ایک کلومیٹر کا فاصلہ تین گھنٹے میں طے کر پائے۔ عوام کا ہجوم ہماری توقعات سے کئی گنا زیادہ تھا اور ہم اس کے مطابق انتظام نہیں کر پائے تھے۔ اس لیے ہوا یہ کہ جتنے حضرات نے نماز جنازہ پڑھی، کم و بیش اتنے ہی لوگ نماز جنازہ نہ پڑھ سکے اور ٹریفک کے ہجوم میں پھنسے رہے۔ رحیم یار خان سے پشاور تک کے شہروں سے قافلے آئے جن میں سے بہت سے راستہ میں ہی رہ گئے اور جنازہ تک نہ پہنچ سکے۔

حضرت والد محترمؒ کی زندگی بھر یہ روایت رہی ہے کہ وقت کی پابندی میں ضرب المثل تھے۔ ان کے بارے میں اور مولانا ظفر علی خان مرحومؒ کے بارے میں واقف حال لوگوں کا کہنا ہے کہ لوگ ان کے معمولات دیکھ کر اپنی گھڑیاں ٹھیک کیا کرتے تھے۔ ہم نے جنازے کا اعلان یہ کر رکھا تھا کہ سوا پانچ بجے عصر کی نمازیں ارد گرد کی مساجد میں ہو جاتی ہیں، اس لیے نماز پڑھتے ہی ساڑھے پانچ بجے نماز جنازہ ادا کی جائے گی۔ برادرم قاری حماد الزہراوی صاحب نے، جو حضرت والد محترمؒ کی جگہ گکھڑ میں مسجد و مدرسہ کے معاملات ان کی علالت کے بعد سے بحسن و خوبی چلا رہے ہیں، یہ کہا کہ نماز جنازہ میں تھوڑی تاخیر کر لی جائے۔ میں نے عرض کیا کہ ہم کم از کم ان کی ایک روایت کو تو قائم رکھیں کہ وہ جس وقت کا اعلان کرتے تھے، اس سے ایک منٹ بھی آگے پیچھے نہیں ہوتے تھے۔ چنانچہ جنازے سے پہلے تشریف لانے والے ممتاز راہنماؤں کے خطاب کا سلسلہ جاری تھا۔ علامہ ڈاکٹر خالد محمود، حافظ حسین احمد، مولانا سمیع الحق، مولانا محمد احمد لدھیانوی، مولانا قاری محمد حنیف جالندھری، مولانا قاضی محمد رویس خان ایوبی، مولانا پیر عبد الرحیم نقشبندی اور دیگر بہت سے علما خطاب کر چکے تھے اور بہت سے راہنما باقی تھے کہ عین وقت پر میں نے مائیک سنبھال لیا اور ٹھیک ساڑھے پانچ بجے اعلان کے مطابق اور حضرت والد

محترمؒ کی روایت کے مطابق نماز جنازہ کے لیے اللہ اکبر کی صدا بلند کر دی۔ بہت سے دوستوں نے بعد میں شکوہ کیا کہ اگر بیس تیس منٹ نماز جنازہ میں تاخیر کر دی جاتی تو بے شمار مزید حضرات بھی جنازے میں شریک ہو سکتے تھے، مگر میں مطمئن ہوں کہ ہم نے حضرت والد محترمؒ کی کسی ایک روایت پر تو عمل کر لیا، فالحمد للہ علیٰ ذلک۔

تدفین کے بارے میں بات چلی تو میں نے عرض کیا کہ حضرت والد محترم اس بارے میں کسی تخصیص کو پسند نہیں کرتے تھے، اس لیے عام قبرستان ہی بہتر ہے۔ گکھڑ میں آپ جی ٹی روڈ پر آ جا رہے ہوں تو شہر کے وسط میں مشرق کی جانب بٹ دری فیکٹری کے عقب میں ایک قبرستان ہے جو جی ٹی روڈ سے صرف چند گز کے فاصلے پر ہے۔ اس قبرستان میں ہماری دادی مرحومہ، پھوپھی مرحومہ، ہماری دونوں مرحومہ مائیں، ہمارے بھائی قاری محمد اشرف خان ماجد مرحوم اور ان کے دو فرزند محمد اکرم اور محمد اکمل مدفون ہیں۔ طے ہوا کہ اسی میں تدفین ہوگی۔ کوشش کی گئی کہ دادی مرحومہ کے قریب جگہ مل جائے تو بیٹے کو ماں کی گود میں ہی سلا دیا جائے، مگر اس کے اردگرد کوئی جگہ نہ ملی تو قبرستان کی عام گزرگاہ کے ساتھ پہلی لائن میں موجود ایک خالی جگہ کو غنیمت سمجھا گیا اور وہیں قبر کی کھدائی کا فیصلہ کر لیا گیا۔

میں نے کچھ عرصہ قبل ایک خواب دیکھا تھا کہ گکھڑ میں حضرت والد محترمؒ کی مسجد کے دروازے سے باہر نکلتے ہوئے بائیں جانب جی ٹی روڈ کے ساتھ جو کھلی جگہ ہے، وہاں صاف ستھرے پانی کا ایک بڑا تالاب ہے۔ اس تالاب میں سے ایک بہت بڑی مچھلی اچھلی ہے اور فضا میں تھوڑی دیر نظر آ کر دوبارہ اسی تالاب میں ڈبکی لگا کر غائب ہو گئی ہے۔ اس پر خواب میں، میں نے یا میرے ساتھ کھڑے ایک صاحب نے تعجب کا اظہار کیا کہ سمندر کی مچھلی تالاب میں کیسے آ گئی ہے؟ اس خواب کے بعد میرے دل میں یہ دھڑکا مسلسل لگا رہتا تھا کہ علم کے سمندر کی یہ بڑی مچھلی گکھڑ کے تالاب میں کسی بھی وقت ڈبکی لگا کر نظروں سے اوجھل ہو سکتی ہے۔ چنانچہ ۵ رمئی بروز منگل عین اس وقت جب ادھر سورج غروب ہو رہا تھا، آسمان علم ومعرفت کے اس سورج کو بھی لحد میں اتارا جا رہا تھا۔ میں نے اس موقع پر ساتھیوں سے عرض کیا کہ ہم ایک پوری لائبریری کو زمین میں دفن کر رہے ہیں۔

حضرت والد محترم سے وابستہ یادوں کا یہ سلسلہ نصف صدی سے زیادہ عرصہ پر پھیلا ہوا ہے۔ ان کے پرت یکے بعد دیگرے کھلتے ہی چلے جائیں گے اور ہر موقع پر کوئی نہ کوئی یاد تازہ ہوتی رہے گی۔ شیخ الہند مولانا محمود حسن دیوبندیؒ کی وفات پر لوگوں کو روتے ہوئے دیکھ کر مولانا سید حسین احمد مدنیؒ نے کہا تھا کہ تم کیوں روتے ہو؟ تمہارے لیے تو ہم ہیں۔ رونے کا حق تو ہمارا ہے کہ ہمارے لیے کوئی نہیں رہا۔ آج اہل علم یتیم ہو گئے ہیں کہ مشکل وقت میں راہنمائی کے لیے جن سے رجوع کیا کرتے تھے، وہ ہم سے رخصت ہو گئے ہیں۔ اب ان کا یہ حق ہے کہ ان کی زندگی سے سبق حاصل کیا جائے، ان کی جدوجہد سے استفادہ کیا جائے، ان کے مشن کو زندہ رکھا جائے، ان کی حسنات کے تسلسل کو قائم رکھا جائے، ان کے لیے دعائے مغفرت کی جائے اور ان کے صدقات جاریہ کو آگے بڑھانے کی کوشش کی جائے۔ اللہ تعالیٰ جنت الفردوس میں ان کے درجات کو بلند سے بلند تر فرمائیں اور ہم سب کو ان کے نقش قدم پر چلنے کی توفیق سے نوازیں۔ آمین یا رب العالمین۔

مولانا قاضی محمد رویس خان ایوبی*

شمع روشن بجھ گئی بزم سخن ماتم میں ہے

امام اہل سنت تقویٰ کے پیکر مجسم، حلیم ومتواضع، علم وعمل کے بحر بیکراں تھے۔ ان کی اہلیہ آپا سکینہ اور میری اہلیہ، سہیل کی امی سگی بہنیں تھیں۔ یوں ایک کندۂ ناتراش مقدر کے قلم سے امام اہل سنت کا ہم زلف بن گیا۔ مولانا محمد فیروز خان (مہتمم دار العلوم مدنیہ ڈسکہ) نے میرے رشتہ کی بات چلائی۔ امام اہل سنت نے ان سے فرمایا کہ میری سب سے چھوٹی سالی ہے۔ نہایت شریف النفس، عاجز، منکسر المزاج لڑکی ہے۔ اس کے والد مولوی محمد اکبر مولانا محمد چراغ کے ہم وطن تھے۔ نہایت شریف النفس بزرگ تھے۔ فوت ہو گئے ہیں۔ میری سالی میری حقیقی بیٹیوں کی طرح ہے۔ میرا خیال ہے مولانا، یہ رشتہ آپ کے عزیز کے لیے مناسب رہے گا۔ آپ کا عزیز پڑھا لکھا ہے؟ مولانا فیروز خان نے فرمایا، ہاں وہ ادیب عربی، فاضل عربی کے علاوہ میٹرک اور جامعہ اشرفیہ سے فارغ التحصیل ہے اور اچھا خطیب ہے۔ حضرت نے کہا کہ اچھا پھر آپ ایسا کریں کہ اپنے گھر والوں کو بھیج دیں، وہ آ کر لڑکی کو دیکھ لیں۔ پھر آپ برخوردار کو میرے پاس بھیج دیں، میں اس سے ملاقات کر لوں گا۔ مولانا فیروز خان نے فرمایا کہ حضرت! یہ وہی برخوردار ہے جو ڈسکہ میں ہمارے مدرسے میں پڑھتا رہا ہے اور آپ نے اس کو امتحان بھی لیا تھا۔ امام اہل سنت نے فرمایا کہ ٹھیک ہے، آپ اسے بھیج دیں۔ پھر ساری کارروائی کے بعد ۲۲ نومبر ۱۹۶۶ء کو مجھے گکھڑ بھیج دیا گیا۔ امام اہل سنت نے میرا انٹرویو لیا:

"بیٹا، تم نے کیا کچھ پڑھا ہے؟"

میں نے عرض کیا کہ ادیب عربی اور فاضل عربی کے علاوہ دورۂ حدیث جامعہ اشرفیہ سے کیا ہے۔

"کتاب الطہارۃ پڑھی ہے؟"

میں نے جواب دیا، ہاں۔

"یہ کتاب کس نے لکھی ہے؟"

عرض کیا کہ یہ تو فقہ اور حدیث کی تمام کتابوں میں بشکل ابواب وفصول ہوتی ہے، مستقل الگ تو کوئی کتاب نہیں۔

"اچھا یہ بتاؤ کہ نجاست کو دور کرنے کے کتنے طریقے ہیں؟"

میں نے عرض کیا کہ تغسیل، تشمیس، تدلیک اور تفریک۔

"تشمیس کی کوئی مثال ہے؟"

عرض کیا کہ جی ہاں، جیسے زمین سورج کی تپش سے خشک ہو کر پاک ہو جاتی ہے۔

*صدر مجلس افتا آزاد جموں وکشمیر۔

''اور تدلیک؟''

عرض کیا کہ جس طرح چھری رگڑ کر صاف کر دی جائے تو پاک ہو جاتی ہے۔

''فلسفہ بھی پڑھا ہے؟''

میں نے جواب دیا، ہاں۔

''ہیولیٰ کس کو کہتے ہیں؟''

میں نے کہا کہ حضرت، ہیولیٰ آج تک میری سمجھ میں نہیں آیا۔ یہ تو بہت مشکل انٹرویو ہے۔

''ادب بھی پڑھا ہے؟''

عرض کیا جی ہاں۔

''کیا پڑھا ہے؟''

الطریقۃ الجدیدۃ سے لے کر متنبی، حماسہ، مقامات اور جدید عربی کی کتب سحر لبنان، العبرات، النظرات۔

'اچھا یہ بتاؤ کہ ''لما اقتعدت غارب الاغتراب'' کس کتاب کی عبارت ہے؟''

میں نے عرض کیا کہ مقامات حریری کی۔

''اس کا کیا مطلب ہے؟''

میں کہا کہ ''جب میں نے سفر کا آغاز کیا''۔

''چلو، اللہ خیر کرے گا۔''

اس کے بعد ۱۸ر دسمبر ۱۹۶۶ء کو میں حضرت کی خواہر نسبتی کے ساتھ رشتہ ازدواج میں منسلک ہو گیا۔

حضرت کے گھر میں دن بھر مہمانوں کا تانتا بندھا رہتا۔ ۱۱ بجے سے قبل اگر مہمان آتا تو پرتکلف چائے، اور اگر اس کے بعد آتا تو کھانے کے بغیر ہرگز نہ جانے دیتے۔ میرے بچے، اہلیہ اور میری ہمشیرہ کے بچے، مولانا فیروز خان کی اولاد، اپنی بیٹیوں کی اولاد، کسی مرید کا کوئی بچہ کمرے میں آ جاتا یا لایا جاتا، دم بھی فرماتے اور جیب سے ۵۰، ۱۰۰ اور ۵۰۰ تک کی رقم بھی حسب قرابت عنایت فرماتے۔ ہم کہتے کہ حضرت یہ تکلف نہ کیجیے تو فرماتے مولوی جی، یہ تکلف اسلامی تہذیب کا حصہ ہے۔ آپ اگر جیب بھی ڈھیلی نہ کریں اور کسی کے لیے وقت بھی نہ نکالیں تو لوگ آپ کے نزدیک نہیں آئیں گے۔ بچوں کے ساتھ شفقت، رشتہ داروں کے ساتھ صلہ رحمی اور مہمانوں کا اکرام ہمارے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت ہے۔

ایک موقع پر میری اہلیہ حضرت کی زیارت اور اپنی بہن سے ملاقات کے لیے میری رفاقت میں گکھڑ گئیں۔ دوسرے دن صبح سویرے ہم واپس ڈسکہ جانے کے لیے تیار ہوئے۔ سڑک پر پہنچے تو سفید رنگ کی ایک کار امام اہل سنت کی منتظر تھی۔ حضرت والا آگے آگے سنت نبویہ کے مطابق چل رہے تھے۔ دھیمی، پروقار رفتار، وہی نقشہ جو احادیث میں سرکار کی رفتار کا کھینچا گیا ہے۔ شلوار ٹخنوں سے اونچی، مخصوص قسم کی گورگابی، کرتا، پگڑی، بغل میں کتب، دوہرا جسم، گندم گوں کتابی چہرہ، خندہ زیر لب۔ گاڑی کا دروازہ کھلا۔ حضرت تشریف فرما ہوئے۔ میں نے عرض کیا کہ حضرت! گوجرانوالہ تک ہم دونوں بھی پچھلی نشست پر بیٹھ جائیں؟ فرمایا کہ مولوی صاحب! یہ مدرسہ کی گاڑی ہے، رشتہ داروں اور اولاد کے لیے میں اس گاڑی کو

استعمال نہیں کرتا۔ پھر جیب میں ہاتھ ڈالا، بیس روپے نکال کر دیے کہ آپ بس میں بیٹھ کر یہاں سے گوجرانوالہ اور وہاں سے ڈسکہ چلے جائیں۔ مجھے عمر بن عبدالعزیزؒ یاد آ گئے جنھوں نے مہمان کی آمد پر چراغ بجھا دیا تھا کہ سرکاری چراغ پرائیویٹ گفتگو اور مجلس کے لیے استعمال کرنا حرام ہے۔ صدیق اکبر رضی اللہ عنہ یاد آ گئے کہ یہ حلوہ آج کیسے تیار ہو گیا؟ اس کا مطلب ہے کہ ہم بیت المال سے اپنی اصل ضرورت سے زائد رقم وصول کرتے ہیں۔ لہٰذا میری تنخواہ سے آئندہ کٹوتی کی جائے اور اتنی رقم واپس بیت المال میں جمع کی جائے۔

ضلع سیالکوٹ کی عظیم دینی درس گاہ دار العلوم مدنیہ ڈسکہ کے سالانہ جلسے میں، جس کے مہتمم و بانی مولانا فیروز خان حضرت مولانا حسین احمد مدنی کے شاگرد رشید ہیں اور انھی سے بیعت بھی ہیں، ہمیشہ شرکت فرماتے۔ کیا خوب صورت منظر ہوتا! حضرت مولانا محمد ضیاء القاسمی خطیب پاکستان، حافظ اللہ داد مرحوم گجرات، مولانا سید عنایت اللہ شاہ بخاری مرحوم، شیخ القرآن حضرت مولانا غلام اللہ خان مرحوم، خطیب اسلام حضرت قاضی احسان احمد شجاع آبادی مرحوم۔ یوں محسوس ہوتا تھا کہ علم وعمل کی ایک کہکشاں ہے جو دار العلوم کے اسٹیج پر سج گئی ہے۔ جب امام اہل سنت کی تشریف آوری ہوتی اور اسٹیج سے نعرہ بلند ہوتا تو حضرت شیخ القرآن فرماتے، وہ مسلک دیوبند کا کتب خانہ آ گیا۔ حافظ اللہ داد مرحوم فرماتے: ''لوگو، تمہیں کیا معلوم کہ گکھڑ کا یہ مولوی حدیث کے راویوں کا کتب خانہ اور اسلام کا لائبریری ہے۔ جس جس نے ان کی تقریر غور سے سن لی، وہ جلسے سے اسماء الرجال کا فن سیکھ کر جائے گا۔'' معلوم نہیں، کس عالم دین کا گکھڑ کی مرکزی جامع مسجد میں خطاب تھا۔ انھوں نے کوئی حدیث بیان کی تو خواتین کی گیلری سے ایک چٹ آئی جس پر لکھا تھا کہ اس حدیث میں فلاں راوی ضعیف ہے۔ گویا امام اہل سنت کا درس تسلسل سے سننے والے بھی عالم بن گئے۔

گکھڑ کے نارمل اسکول میں عرصہ دراز تک درس قرآن کا سلسلہ جاری رہا۔ آپ اپنے گھر سے نارمل اسکول تک ہمیشہ پیدل جاتے۔ تمکنت، وقار کی اس چال سے دور سے دیکھنے والے یوں سمجھتے تھے جیسے زمین لپٹتی جا رہی ہے۔ نارمل اسکول میں اردو پڑھانے والے ایک استاد راتھر صاحب تھے۔ ایک دفعہ راقم بھی محض شوقیہ اوٹی کلاس میں شریک ہو گیا۔ ہمارے ایک ساتھی مولانا مطیع الرحمٰن وہاں اوٹی کلاس میں پڑھ رہے تھے۔ راتھر صاحب نے اردو پڑھاتے ہوئے بال جبریل کی ایک نظم کی شرح فرمانا شروع کی تو اٹک گئے۔ فرمانے لگے، کل پڑھاؤں گا۔ نظم کا بند یہ تھا:

رگ تاک منتظر ہے تری بارش کرم کی
کہ عجم کے مے کدوں میں نہ رہی مے مغانہ

یہ تاک کی رگ کیا ہے؟ دوسرے دن حضرت شیخ سے میں نے خود پوچھا کہ حضرت، یہ تاک تو تانکنے جھانکنے کو کہتے ہیں، رگ کہاں سے آ گئی؟ فرمایا، مولوی صاحب! تاک انگور کی بیل کو کہتے ہیں اور اس کا مطلب ہے کہ اللہ کے کرم کی بارش ہو تا کہ انگور پھلے پھولے اور مے پیدا ہو، یعنی امت پر اللہ کی رحمت نازل ہو جو کہ انگور کی بیل کی مانند ہے، تا کہ عجم میں حجازی نشہ پیدا ہو کر دین کی سمجھ پیدا ہو۔ ہم نے موقع غنیمت جانا اور ایک اور نظم اسکول کے گیٹ تک آتے آتے پوچھ لی:

قلب ونظر کی زندگی دشت میں صبح کا سماں
چشمہ آفتاب سے نور کی ندیاں رواں

فرمایا، بھئی صحرا میں چلے جاؤ اور جا کر طلوع آفتاب کا منظر دیکھو۔ اتنا سہانا اور خوب صورت منظر دل کو جو سکون اور نظر کو جو طراوت بخشتا ہے، بس تو زندگی کا لطف ہے اور یوں محسوس ہوتا ہے جیسے آفتاب کے چشمے سے نور کے دریا بہہ رہے ہوں۔

تب ہمیں احساس ہوا کہ راہ سنت، تبرید النواظر، ازالۃ الریب، صرف ایک اسلام، تسکین الصدور، شوق حدیث، احسن الکلام اور حضرت کی دیگر تصانیف میں برمحل اشعار کا استعمال اسی ادبی ذوق کا آئینہ دار ہے۔

ایک دن میں نے سوال کیا کہ حضرت، پرویزی اعتراض کرتے ہیں کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے حضرت عروہ کے سوال پر انھیں غسل کر کے دکھایا تو آخر اس کی کیا ضرورت تھی، ویسے ہی بتا دیتیں کہ اتنا پانی کافی ہے۔ فرمایا کہ مولوی جی، انھوں نے صرف اپنے بھانجے عروہ کو مسئلہ نہیں بتانا تھا۔ وہ تو پوری امت کی ماں اور معلمہ تھیں۔ صحابہ کو جب بھی کوئی علمی مشکل پیش آتی تھی، وہ اس کے حل کے لیے حضرت عائشہ کی طرف رجوع کرتے تھے۔ صدیقہ کائنات سے بڑا فقیہ اور پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے علم کا وارث شاید ہی کوئی اور ہو۔

۱۳؍ مارچ ۱۹۷۷ء کو میں حکومت آزاد کشمیر کی طرف سے کنگ عبد العزیز یونیورسٹی جدہ کے شریعہ کالج مکہ مکرمہ میں قانون کی اعلیٰ تعلیم کے لیے روانگی کے لیے تیار ہوا۔ گکھڑ حاضر ہوا اور حضرت سے عرض کیا کہ کوئی نصیحت فرمائیے۔ فرمایا کہ مولوی صاحب، وہاں ریالوں اور علم کا مقابلہ ہوگا۔ مجھے تب خوشی ہوگی کہ علم جیت جائے اور ریال ہار جائیں۔ مطلب یہ تھا کہ دولت کے پیچھے نہ بھاگنا، علم حاصل کرنا۔ فرمانے لگے کہ وہاں جا کر بہت سے لوگ حنفیت چھوڑ بیٹھتے ہیں۔ اگر آپ نے لائبریریوں کو کھنگال لیا تو حنفیت کہیں نہیں جائے گی، اور اگر رٹا ہی لگاتے رہے تو پھر جو کچھ پاس ہے، وہ بھی گنوا کر آئیں گے اور تقلید چھوڑ کر ''گواچی گاں'' (آوارہ گائے) بن جائیں گے۔ میں نے عرض کیا کہ کیا لائبریریوں کا سارا مواد حنفیت پر ہے؟ تو فرمایا کہ نہیں، سارا مواد حنفیت پر نہیں۔ لائبریریوں میں علم کا ذخیرہ ہے اور ہر وہ شخص جو علم کے سمندر میں غوطہ زن ہوگا، اسے اس میں امام ابوحنیفہ کے موتیوں کی لڑیاں ملیں گی۔ علم اور حنفیت کا تعلق ابوت اور بنوت کا ہے۔ جیسے کوئی شخص اولاد کے بغیر باپ نہیں کہلا سکتا اور کوئی شخص باپ کے بغیر بیٹا نہیں کہلا سکتا۔ علم دین کا جو ذخیرہ آپ کو حنفی فقہ میں ملے گا، دوسرے ائمہ کے ہاں اس کا عشر عشیر بھی نہیں ملے گا۔

بالکل یہی بات مجھ سے مولانا مودودی مرحوم نے فرمائی۔ میں ان سے بھی ملا اور ان سے بھی نصیحت کی درخواست کی تو انھوں نے فرمایا کہ محترم، وہاں اکثر لوگ جا کر ریال کمانے لگ جاتے ہیں۔ آپ جس غرض کے لیے بھیجے جا رہے ہیں، اگر آپ نے اس مقصد کو پورا نہ کیا تو یہ اپنے آپ کے ساتھ بھی اور حکومت آزاد کشمیر کے ساتھ بھی بد دیانتی ہوگی۔ آپ سرکاری ملازم ہیں، قاضی کے منصب پر فائز ہیں۔ اگر آپ نے ریال کمانے شروع کر دیے اور علم سے کنارہ کش ہو گئے تو یہ اپنے منصب سے خیانت ہوگی اور پھر شرعاً آپ قضا کے اہل نہیں رہیں گے۔

مولانا مودودی کے ذکر سے بہت سے احباب چیں بہ جبیں ہوں گے، لیکن میرا موقف یہ ہے کہ خذ ما صفا ودع ما کدر، جہاں سے اچھی بات ملے، لے لو اور جو اختلاف ہے، اسے اپنی جگہ برقرار رکھو۔ مولانا مودودی کی نہ تمام تحریرات غلط ہیں نہ تمام تحریرات سے ہمیں اتفاق ہے۔ نسل نو میں دینی حمیت اور غیرت اور نظام اسلام کو ایک دستوری حیثیت میں متعارف کرانے میں ان کے کردار کا انکار کرنا بھی قرین انصاف نہیں۔ ہم تو حضرت علی رضی اللہ عنہ کے اس قول پر عمل پیرا ہیں: لا تنظر الی من قال وانظر الی ما قال۔

مکہ مکرمہ سے ہر سال آتا تو گکھڑ ضرور حاضری ہوتی اور جب روانگی ہوتی تو حضرت فرماتے کہ مولوی جی، میری طرف سے روضہ پاک پر درود شریف پیش کر دینا۔

تاریخ، ادب، ثقافت، نفسیات، فقہ، شاید ہی کوئی ایسا فن ہوگا جس پر آپ کی علمی گرفت نہ ہو۔ ہر فن کی بڑی سے بڑی اور چھوٹی سے چھوٹی کتاب کے مصنف، تاریخ پیدائش، تاریخ وفات، کتاب کے موضوعات، امتیازات اور خصوصیات پر اتنی گہری نظر میں نے دور حاضر میں کسی عالم دین میں نہیں دیکھی۔ ابن حجر عسقلانی، قسطلانی، امام ذہبی، خطیب بغدادی، ملا علی قاری، امام جلال الدین سیوطی کی تصانیف اور دور حاضر میں مولانا حسین علی مرحوم کی تفسیر بلغۃ الحیران، مولانا مدنی کی نقش حیات، علماء ہند کا شاندار ماضی، ملفوظات احمد رضا خان بریلوی، فتاویٰ رضویہ، امداد الفتاویٰ اور حجۃ اللہ البالغہ کے حوالے انھیں از بر تھے۔

آخری ایام میں پیر طریقت حضرت مولانا سیف اللہ خالد صاحب مہتمم جامعہ منظور الاسلامیہ جن سے میری رفاقت ۴۰ سال پر محیط ہے، مولانا عبد الرؤف فاروقی خطیب مسجد خضریٰ سمن آباد، مولانا منور صاحب خطیب صدر بازار لاہور، ان تینوں حضرات نے فقیر سے رابطہ کیا اور فرمایا کہ آئیے، ہم سب مل کر حضرت کے پاس چلتے ہیں اور ان سے استفسار کرتے ہیں کہ کیا مسئلہ حیات وممات اصولی مسائل میں سے ہے یا افتراق علماے دیو بند کا سبب ہے اور کیا موجودہ حالات میں اس مسئلہ پر رسہ کشی مسلک علماے دیو بند کے لیے سود مند ہے یا ضرر رساں؟ چنانچہ ہم ۲۱؍ اپریل کی ایک تپتی دوپہر کو مولانا کے دولت کدہ پر حاضر ہوئے۔ لاہور سے آئے ہوئے تینوں حضرات پہلے سے موجود تھے۔ انھوں نے فقیر سے فرمایا، آپ پوچھیں۔ امام اہل سنت کے فرزند قاری شاہد صاحب موجود تھے۔ میں نے عرض کیا کہ حضرت! مسئلہ حیات وممات اصولی مسائل میں سے ہے یا فروعی مسائل میں سے؟ آپ نے فرمایا، فروعی مسائل میں سے ہے۔ پوچھا کہ جو شخص حیات کا قائل نہیں، اس کے پیچھے نماز پڑھ لینا درست ہے؟ جواب دیا کہ مکروہ ہے۔ میرا وہی مسلک ہے جو مفتی مہدی حسن مفتی دار العلوم دیو بند کا ہے۔ قاری شاہد سے فرمایا کہ جاؤ، فتاویٰ دار العلوم نکال کر لاؤ، اس میں دیکھ لو۔ میں نے پوچھا کہ ایسا شخص جو حیات النبی کا قائل نہیں، مسلک دیو بند سے تعلق رکھتا ہے؟ فرمایا، نہیں۔ وہ اہل سنت سے نہیں، مگر مسلمان ہے۔ جیسے اور بہت سے مسائل میں اختلاف کے باوجود ہم کسی کو دائرۂ اسلام سے خارج نہیں سمجھتے، اسی طرح اس مسئلہ میں بھی۔ بہر حال اب اس دور میں ایک بجھی ہوئی آگ کو دوبارہ چنگاریاں کرید کر جلانا اچھی بات نہیں۔ میں نے آپ کی یہ گفتگو ریکارڈ کر رکھی ہے۔ ہم سب حیران ہو گئے کہ اس شدید تکلیف میں سوال سنا، کتاب کا نام ایاد، مفتی مہدی حسن کا نام یاد۔ اللہ اللہ کس قدر حافظہ تھا۔

۴؍ مئی کی شب کو فقیر دینہ میں ایک عزیز کے ہاں قیام پذیر تھا۔ صبح سویرے راولپنڈی کے لیے روانہ ہوا۔ ابھی روات پہنچا تھا کہ فرزندم محمد اویس خان (تحصیل قاضی پلندری) کا ایس ایم ایس ملا جس میں تحریر تھا کہ عالم اسلام کی عظیم شخصیت، امام اہل سنت گزشتہ شب ڈیڑھ بجے انتقال فرما گئے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ چار بج کر پچپن منٹ پر ہم گکھڑ پہنچے تو گکھڑ کا جی ٹی روڈ میدان عرفات کا منظر پیش کر رہا تھا۔ وزیر آباد سے کامونکی تک ٹریفک جام تھی۔ گکھڑ میں امام اہل سنت کے گھر کو جانے والی گلی کے قریب بریلوی حضرات کی مسجد میں لوگوں کا جم غفیر وضو کر رہا تھا۔ مجھے خوشی ہوئی کہ بریلوی حضرات نے مسجد کے دروازے وضو کرنے والوں کے لیے وا کر دیے تھے، اگرچہ بعد میں معلوم ہوا کہ کچھ لوگ ہمارے چلے جانے کے بعد مسجد کو دھو رہے تھے۔ یہ معلوم نہ ہو سکا کہ دیو بندیوں کے داخلے کی وجہ سے دھو رہے تھے یا ویسے ہی صفائی کر رہے تھے۔ واللہ اعلم

گورنمنٹ ڈی سی اسکول کا گراؤنڈ بھرا ہوا تھا۔ جی ٹی روڈ مکمل طور پر جام تھی۔ تا حد نگاہ انسانوں کا سیل رواں تھا۔ اس عظیم

اجتماع کی نظیر گوجرانوالہ کی تاریخ میں نہیں ملتی۔ پاکستان بھر سے مدارس کے طلبہ، علما، پیران طریقت، محدثین وفقہا، خطبا و وعاظ، سیاست دان، غرضیکہ معاشرے کے صالح اور نیکوکار افراد کا گویا گلستاں سج گیا۔ مشتاقان دید کے جم غفیر کے سامنے سرکاری انتظامی مشینری بے بس ہوگئی۔ اسٹیج سے بار بار کی جانے والی درخواست کے باوجود لوگ دیوانہ وار دیدار کے لیے چارپائی کی طرف لپکتے تھے۔ بالآخر آپ کے فرزند اکبر شیخ الحدیث مولانا زاہد الراشدی نے اللہ اکبر کہہ کر نماز جنازہ کا آغاز کر دیا۔ اسلام کے نظام صلوٰۃ کا معجزہ ہے کہ تکبیر کے بعد ایسا سکوت طاری ہوا کہ سوئی تک گرنے کی آواز سنائی دے۔ سلام کے بعد فوری طور پر جنازہ وین میں رکھا گیا اور تقریباً ۶ بجے آسمان علم کا یہ آفتاب عالم برزخ میں ضوفشانی کے لیے لحد میں اتار دیا گیا۔

کچھ ایسے بھی اٹھ جائیں گے اس بزم سے جن کو
تم ڈھونڈنے نکلو گے مگر پا نہ سکو گے

پون صدی پہلے دو بھائی، محمد سرفراز خان اور عبد الحمید ولد نور احمد خان مانسہرہ سے اپنے تعلیمی سفر کا آغاز کر کے لاہور، مرہانہ تحصیل ڈسکہ، وڈالہ سندھواں، فیصل آباد، ملتان، گوجرانوالہ اور دیوبند سے ہوتے ہوئے جب گکھڑ اور گوجرانوالہ پہنچے تو تنہا تھے، لیکن عروج وسربلندی، سرفرازی ودل نوازی دونوں بھائیوں کے ماتھے کا جھومر بنی اور پھر ۶ر اپریل ۲۰۰۸ء اور ۵ر مئی ۲۰۰۹ء کو چشم فلک نے دیکھا کہ ان کے سفر آخرت کے موقع پر عقیدت مندوں کا ٹھاٹھیں مارتا ہوا سمندر اس بات کی گواہی دے رہا تھا کہ دلوں پر حکمرانی کرنے والوں کے اقتدار کو بندوقوں، ہتھکڑیوں، جیل کی سلاخوں کے زور پر کوئی آمر نہیں چھین سکتا۔ دل کی دنیا اور ہے، من کی دنیا کا رنگ ڈھنگ الگ ہے۔ وہ مر کر بھی امر ہیں۔ احمد علی لاہوری سے لے کر حق نواز شہید، ضیاء الرحمن فاروقی شہید، اعظم طارق شہید، محمد یوسف لدھیانوی شہید، حضرت بنوری، شیخ القرآن غلام اللہ خان، پیر نصیر الدین نصیر مرحوم، اللہ ان سب کو اپنے جوار رحمت میں جگہ دے۔

مدرسہ نصرۃ العلوم میں حفظ کے استاد اور قاری محمد عبد اللہ صاحب کے صاحبزادے قاری محمد عبید اللہ عامر فرماتے ہیں۔ میں نے ۱۹۸۴ء میں مدرسہ نصرۃ العلوم سے دورہ حدیث کیا۔ حدیث کے سبق میں کسی نے حضرت شیخ الحدیث کو طلباء کی شکایت لگائی کہ طلباء نماز میں سستی کرتے ہیں۔ اس پر حضرت نے فرمایا، میرا یہاں گھر نہیں ہے۔ اگر میں یہاں رہتا ہوتا تو پھر دیکھتا کہ طلباء نماز میں کیسے سستی اور کوتاہی کرتے ہیں۔ اس کے بعد حضرت شیخ الحدیث نے فرمایا: الحمد للہ ۵۳ برس سے میری تکبیر اولیٰ فوت نہیں ہوئی۔

یہ بات حضرت شیخ الحدیث نے ۱۹۸۴ء میں بیان کی۔ اس کے بعد جب تک صحت ٹھیک رہی اور حضرت مسجد میں باجماعت نماز ادا کرنے کے لیے آتے رہے، اس وقت تک نماز کا باجماعت تکبیر اولیٰ کے ساتھ اہتمام فرماتے رہے۔ ۱۹۸۴ء کے بعد اگر حضرت کی صحت کا باقی زمانہ بھی شامل کر لیا جائے تو کل ۷۰ برس بنتے ہیں۔ ۷۰ برس تک تکبیر اولیٰ کا اہتمام' یہ اسی کی برکت تھی کہ حضرت کی تقریر اور تحریر میں اتنا اثر تھا کہ ہزاروں لوگوں کی زندگیوں میں آپ کی کتب کے مطالعہ سے انقلاب آیا اور شرک وبدعت اور باطل نظریات سے توبہ کی۔

(ماہنامہ ہدی للناس گوجرانوالہ، امام اہل سنت نمبر، جون ۲۰۰۹ء)

مولانا عبد الحق خان بشیر *

والد محترم کے ساتھ ایک ماہ جیل میں

حضرت والد محترم نور اللہ مرقدہ کے زیر سایہ وزیر تربیت ہم سب بہن بھائیوں نے اپنے اپنے ذوق وظرف کے مطابق جو کچھ بھی حاصل کیا' وہی ہمارا اصل سرمایہ حیات ہے۔ اگر ہم اس سرمایہ کی حفاظت کر سکیں تو یقیناً ہمارے لیے ہدایت ونجات کی منزلیں طے کرنا آسان ہوگا۔ انہوں نے اہل السنت والجماعت کے جن متواتر واجماعی اصول وضوابط کی روشنی میں ہمارے افکار ونظریات کو پروان چڑھایا، ہم پر ان کی حفاظت ایک شرعی اور موروثی ذمہ داری ہے۔ خدا تعالیٰ ہمیں ان کی حفاظت کی توفیق بخشے۔ آمین

ہم سب بھائیوں کو اللہ تعالیٰ نے اپنے خصوصی فضل وکرم کے ساتھ کسی نہ کسی انداز میں حضرت والد محترمؒ کی رفاقت ومعیت میں رہ کر ان کی خدمت کا موقع عطا کیا۔ کسی کو اندرون ملک تبلیغی وذاتی اسفار میں ان کی رفاقت حاصل رہی۔ کسی نے دار العلوم دیوبند' بنگلہ دیش' افغانستان' جنوبی افریقہ اور برطانیہ وغیرہ بیرونی ممالک کے اسفار میں ان کی رفاقت کا شرف حاصل کیا۔ کسی نے حج وعمرہ کے اسفار میں ان کی رفاقت کے مزے لوٹے۔ کسی نے ان کی بیماری وعلالت کے ایام میں مختلف اوقات کے اندر ہسپتال میں ان کی خدمت ورفاقت کی سعادت حاصل کی اور کسی نے ضعف وبڑھاپے کے دوران ان کی خدمت ومعیت کا ثواب کمایا۔ خدمت ورفاقت کے ان تمام مراحل میں کم وبیش سارے بھائی ایک دوسرے کے ساتھ باہم معاون وشریک رہے، لیکن خدمت ورفاقت کا ایک مرحلہ ایسا بھی آیا کہ اس کے اندر بھائیوں میں سے میں وحدہ لاشریک تھا۔ یعنی یہ خدمت ومعیت میرے علاوہ بھائیوں میں سے کسی دوسرے کو میسر نہیں آئی اور وہ ہے جیل کی خدمت ورفاقت۔

۱۹۷۷ء کی تحریک نظام مصطفیؐ اپنے عروج پر تھی۔ پورے ملک کی جیلیں سیاسی قیدیوں سے بھری پڑی تھیں۔ حضرت والد محترم نور اللہ مرقدہ بھی ایف ایس ایف (فیڈرل سیکورٹی فورس) کی وارننگ ریڈ لائن کراس کر کے ظلم وآمریت کے سفاک چہرہ پر بھرپور طمانچہ رسید کر چکے تھے۔ دن کی روشنی میں تو ان پر ہاتھ اٹھانے کی جسارت کوئی نہ کر سکا۔ البتہ رات کی تاریکی میں مکان کا محاصرہ کر کے انہیں گرفتار کر لیا گیا۔ اور رات ہی کے اندھیرے میں انہیں گوجرانوالہ جیل منتقل کر دیا گیا۔ ان کی گرفتاری کے بعد برادر محترم حضرت مولانا علامہ زاہد الراشدی مدظلہ (جو اس وقت پاکستان قومی اتحاد پنجاب کے صوبائی جنرل سیکرٹری تھے) کے حکم پر میں نے والد محترمؒ کی جگہ تحریک کی ذمہ داری سنبھال لی اور اپنے رفقا حافظ ظفر یاسین بٹ مرحوم' حافظ بشیر احمد چیمہ' ملک عبد الشکور' رانا محمد عمران اور محمد عرفان کے ساتھ مل کر تحریک کو اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ ان حوصلہ مند نوجوانوں کے شوق وجذبہ نے تحریک میں ایک نئی روح پھونک دی۔

* فرزند امام اہل سنتؒ۔ ڈائریکٹر حق چاریار اکیڈمی گجرات۔

والد محترمؒ کی گرفتاری کے ایک ہفتہ بعد میری گرفتاری بھی عمل میں آ گئی۔ مجھے جی ٹی ایس اڈہ گوجرانوالہ سے گرفتار کر کے سٹی تھانہ کی حوالات میں بند کر دیا گیا جہاں سے دوسرے دن تھانے کے اندر ہی مجھے مجسٹریٹ کے سامنے پیش کرنے کے بعد جیل منتقل کر دیا گیا۔ والد محترمؒ کو میری گرفتاری کی اطلاع ہو چکی تھی۔ مجھے بیرک نمبر ۴ میں رکھا گیا جبکہ والد محترمؒ چکی نمبر ۸ میں محبوس تھے۔ اس چکی میں چند ماہ قبل تحریک جامع مسجد نور کے دوران ہم بھی چند دن گزار چکے تھے۔ اگرچہ ہم دونوں کے لیے جیل جانے کا یہ پہلا تجربہ نہ تھا، کیونکہ والد محترمؒ ۱۹۵۳ء کی تحریک ختم نبوت میں ۹ ماہ اور میں ۱۹۷۶ء کی تحریک جامع مسجد نور میں ۶ ماہ جیل میں گزار چکے تھے، لیکن اس کے باوجود انہیں میرے بچپن (اس وقت میری عمر تقریباً ۱۹ برس تھی) اور مجھے ان کی علالت و بڑھاپے کا احساس ستا رہا تھا۔ ہماری باہمی ملاقات ممکن نہ تھی۔ جیل قوانین اور حکومت کی سختیوں کے مطابق ہم ادھر کا رخ نہ کر سکتے تھے اور وہ جمعہ کے دن جمعہ کے وقت کے علاوہ چکی کی حدود سے باہر نہ آ سکتے تھے۔ میرے جیل جانے کے دوسرے دن حضرت والد محترمؒ کے قریبی ساتھی اور ان کے انتہائی عقیدت مند اور سفر حج کے ساتھی جناب حاجی محمد صادق بٹ مرحوم کی خصوصی سفارش سے مجھے والد محترمؒ کے پاس چکی میں منتقل ہونے کی اجازت مل گئی۔ ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ جیل حاجی صاحب مرحوم کا قریبی عزیز تھا، لہٰذا اس کی اجازت سے میں بیرک سے والد محترمؒ کے پاس چکی پہنچ گیا جہاں اس وقت استاد محترم جناب قاری محمد انور صاحب مدظلہ (جو چھوٹے دو بھائیوں کے علاوہ ہم سب بہن بھائیوں کے حفظ کے استاد ہیں اور گزشتہ ۳۰ برس سے مدینہ منورہ کے اندر بن لادن خاندان کے مدرسہ تحفیظ القرآن میں حفظ قرآن کی کلاس لے رہے ہیں۔ آج کل شدید بیمار ہیں۔ اللہ تعالیٰ صحت و سلامتی کے ساتھ ان کا سایہ ہمارے سروں پر قائم رکھے۔ آمین) مجلس تحفظ ختم نبوت کے مبلغ حضرت مولانا ضیاء الدین آزاد مدظلہ، اہل حدیث راہنما جناب محمد یوسف احرار مرحوم، بریلوی مکتب فکر کے مولانا غلام نبی جماعتی، سیاسی راہنما چوہدری محمود بشیر ورک اور میر محمد بشیر وغیرہ حضرات موجود تھے۔ مختلف مذہبی طبقات اور مختلف سیاسی جماعتوں کے راہنماؤں اور کارکنوں کا یہ ایک دلچسپ اجتماع تھا۔

میری تمام تر دلچسپی اس بات میں تھی کہ مجھے والد محترمؒ کی اس مقام پر خدمت کا موقع میسر آ گیا جہاں واقعتاً ان کو خدمت کی شدید ضرورت تھی۔ اس دلچسپی کے پیش نظر میں خود کو ذہنی طور پر ہر قسم کے باقی افکار و خیالات سے آزاد کر چکا تھا کہ دوسرے دن والد محترمؒ نے سنسنی خیز دھما کہ کر دیا اور فرمایا آج سامان کی جو چٹ گھر بھجوانی ہے، اس کے ذریعہ اپنی کتابیں بھی منگوا لو تاکہ کل سے تمہارے اسباق شروع ہو جائیں۔ میرے لیے یہ حکم سراسر خلاف توقع تھا کیونکہ میں جیل میں سبق پڑھنے کے لیے تھوڑا آ گیا تھا، لیکن شیخ مکرمؒ جیل کو مدرسہ بنانے کی سلفی روایات سے روگردانی کرنے کے لیے شاید بالکل تیار نہ تھے اور میں بھی شاید اپنا بویا ہوا پھل کاٹ رہا تھا۔ کیونکہ چند ماہ قبل ہی تحریک جامع مسجد نور میں ہم اڑھائی سو کے قریب جو افراد گرفتار ہو کر جیل پہنچے تھے، ان میں ایک کثیر تعداد علمائے کرام اور مدارس میں دینیہ کے طلبہ کی تھی۔ برادر محترم حضرت مولانا علامہ زاہد الراشدی مدظلہ اور اخی المکرم حضرت مولانا عبد القدوس خان قارن مدظلہ بھی ان میں شامل تھے۔ ان دونوں بزرگوں کے حکم نے درس و تدریس کی رونقیں جما دیں اور اچھی بھلی جیل کو انہوں نے اچھا خاصا مدرسہ بنا ڈالا۔ تمام بیرکوں میں دروس قرآن کا سلسلہ اور ترجمہ و ناظرہ قرآن کی کلاسیں جاری ہو گئیں۔ حضرت شیخؒ کو بھی شاید خبر ہو چکی تھی کہ جیل میں مدرسہ بنانا قانوناً کوئی جرم نہیں ہے۔ لہٰذا انہوں نے اپنی ہر وقت پڑھنے پڑھانے کی عادت مجھ پر پوری کرنے کا فیصلہ کر لیا اور ویسے بھی

درمیان میں کافی دن ان کی اس عادت مبارکہ کے پورا کرنے کا ناغہ ہو چکا تھا اور اس کی تلافی وہ مجھ پر ہی کرنا چاہتے تھے۔ بہر حال میرے لیے جیل مدرسہ بن گئی۔ نور الایضاح مکمل، شرح مائۃ عامل کی ترکیب زنجیری مکمل اور نحو میر کا بیشتر حصہ میں نے جیل ہی میں حضرت شیخؒ سے پڑھا۔

یہ سلسلہ شروع ہوئے ابھی چند ہی گزرے تھے کہ ایک دن صبح کے وقت چکی کے صحن کی صفائی کے لیے آنے والے شخص کو دیکھ کر میں چونک اٹھا۔ وہ ایک پاگل شخص تھا جس کے دماغ کا شعور و ادراک والا خانہ کام چھوڑ چکا تھا، البتہ دماغ کے حفظ و یادداشت والے خانہ میں تاریخ کا بہت بڑا ذخیرہ فیڈ تھا۔ جیل کے چند ماہ پہلے کے زمانہ میں اس سے واقفیت ہوئی تھی۔ وہ ایک گریجویٹ آدمی تھا جسے گھریلو اور خاندانی حالات کی ستم ظریفیوں نے پاگل و دیوانہ کر کے رکھ دیا۔ میں نے حضرت شیخؒ کو اس کے بارے میں بتایا کہ یہ شخص ذہنی توازن کھو چکا ہے۔ لیکن اسی کی یادداشت کے خانہ میں انقلاب فرانس سے لے کر انقلاب ترکی تک، انقلاب روس سے لے کر انقلاب چین تک، جنگ عظیم اول سے لے کر جنگ عظیم دوم تک، چنگیز و ہلاکو کی سفاکیت سے لے کر ہٹلر کی بربریت تک، ایسٹ انڈیا کمپنی کی آمد سے لے کر ہندوستان کی تقسیم تک پوری تاریخ محفوظ ہے اور اس طرح سناتا ہے جیسے ٹیپ ریکارڈ کا بٹن آن کر دیا گیا ہو۔ تاریخ کے کئی اسکالر تو پاگل دیکھے سنے تھے، لیکن تاریخ کے پاگل اسکالر سے پہلی دفعہ واسطہ پڑا تھا۔

حضرت شیخؒ نے اس کی ضروریات کے بارہ میں پوچھا تو میں نے بتایا کہ سگریٹ بہت پیتا ہے اور چائے کا بھی شوقین ہے۔ حضرت شیخؒ نے اس کے لیے سگریٹ کا پورا ڈبہ اور بسکٹ وافر مقدار میں منگوا لیے اور ہیڈ وارڈن سے کہہ کر اس کی مستقل ڈیوٹی اپنے پاس لگوا لی۔ صبح نماز کے بعد حضرت شیخؒ درس دیتے اور ہم ناشتہ سے فارغ ہوتے تو وہ بھی آ جاتا۔ جب تک وہ صفائی سے فارغ ہوتا تب تک میں اس کے لیے چائے تیار کر لیتا۔ گویا حضرت شیخؒ کی خدمت اور اپنے اسباق کی ڈیوٹی کے علاوہ اس پاگل اسکالر کے لیے ناشتہ تیار کرنے کی اضافی ڈیوٹی بھی مجھے سونپ دی گئی۔ وہ چائے پیتا جاتا، سگریٹ پھونکتا رہتا اور تاریخ کے کسی ایک پہلو پر گفتگو کرتا رہتا۔ وہاں پر موجود تمام حضرات بڑی توجہ سے اس کی گفتگو سنتے۔ گفتگو کے دوران یہ اندازہ کرنا قطعاً ناممکن ہوتا کہ یہ پاگل و مجنون ہے۔ اس کا پتہ اس وقت چلتا جب سگریٹ اس کے ہاتھ تک پہنچنے میں دیر ہو جاتی یا چائے کی خالی پیالی میں چائے ڈالنے کے اندر تاخیر ہو جاتی یا اسے کسی جگہ ٹوک دیا جاتا۔ پھر اس کے دماغ کی دوسری کیسٹ شروع ہو جاتی جو بسا اوقات حساس نوعیت کے مغلظات پر مشتمل ہوتی اور اس وقت حضرت شیخؒ کے کان لپیٹ کر تیزی کے ساتھ باہر نکلنے کا منظر بڑا دیدنی ہوتا۔ بہر حال ہماری اس تفریحی مصروفیت نے جہاں وقت کی رفتار تیز کر دی، وہاں ہمیں تاریخی معلومات کا ایک وافر حصہ بھی دستیاب ہوا۔ اس کے علاوہ مصروفیت اور وقت کاٹنے کا ایک اور سہارا بھی تلاش کر لیا گیا اور وہ یہ کہ شیخ محمد یوسف احرار مرحوم داستان امیر حمزہ کا ایک لیکچر دیتے تھے۔ (اس واہیات اور توہین صحابہؓ پر مشتمل قصہ کی خبر مجھے پہلی بار وہیں ہوئی اور بعد میں پتہ چلا کہ اس قصہ کی بڑی بڑی کتب مارکیٹ میں فروخت ہوتی ہیں) تمام لوگ وہ لیکچر بڑے شوق سے سنتے اور یہ لیکچر حضرت شیخؒ سے چوری ہوتا تھا۔ میں بھی اس میں بڑے شوق سے بیٹھتا تھا لیکن ایک دن حضرت شیخؒ نے صحن میں ٹہلتے ہوئے اس کے کچھ جملے سن لیے تو بڑے غیر محسوس طریقہ سے مجھ پر اس مجلس میں بیٹھنے کی پابندی عائد کر دی گئی اور اس وقت میرے سبق کا ایک اضافی پیریڈ رکھ دیا گیا۔

اس دوران دو بڑے دلچسپ واقعات رونما ہوئے۔

پہلا یہ کہ جمعہ کے دن آمدورفت اور سیاسی قیدیوں کی باہمی ملاقات میں کچھ نرمی رکھی گئی تھی۔ حضرت شیخؒ کی علمی و روحانی شہرت سن کر بہت سے ناواقف لوگ بھی ملاقات کے لیے آجاتے، کوئی مسائل پوچھنے اور کوئی دعا لینے۔ ایک دن ایمن آباد (موڑیا شہر) کا ایک میراثی شیخ کی شہرت سن کر آ گیا اور دعا کی درخواست کی۔ اس کے اندازِ گفتگو سے مجھے کھٹکا کہ یہ میراثی ہے۔ میں نے پوچھا کہ آپ کیا کام کرتے ہیں۔ اس نے بتایا کہ شادی بیاہ کے موقع پر جوک کرنا ہمارا پیشہ ہے۔ شیخ نے پوچھا کس سلسلہ میں جیل آئے ہو۔ اس نے کہا اسی تحریک کے سلسلہ میں۔ ہمیں حیرت ہوئی کہ اس کا تحریک کے ساتھ کیا کام؟ شیخ نے پوچھا کہ خود گرفتاری دی ہے؟ اس نے کہا نہیں پیر جی۔ میں تو اپنے ساتھیوں کے ساتھ ایک شادی میں گیا تھا۔ وہاں ہم جوک کر رہے تھے۔ میں خدا بن کے ایک کرسی پر بیٹھا تھا اور سربراہان مملکت کی حاضری ہو رہی تھی۔ میں ہر سربراہ مملکت کا اٹھ کر استقبال کرتا۔ جب بھٹو (جو اس وقت وزیر اعظم پاکستان تھے) کی باری آئی تو میں نے کرسی پر بیٹھے بیٹھے اس کے ساتھ مصافحہ کیا۔ اس نے شکایت کی کہ آپ سب سے اٹھ کر ملے، مجھ سے کھڑے ہو کر کیوں نہیں ملے۔ میں نے کہا مجھے تم سے خطرہ تھا۔ اگر میں کھڑا ہوتا تو تم میری کرسی پر قبضہ کر لیتے۔ جن کے ہاں شادی تھی، وہ پیپلز پارٹی کے تھے۔ انہوں نے رپورٹ کر دی اور پولیس نے مجھے گرفتار کر لیا۔ حضرت شیخ کئی دن تک اس کی بات یاد کر کے مسکراتے رہتے اور مجھے فرمایا کہ ان لوگوں کو خدا نے جتنی ذہانت دی ہے اگر اسے اچھے مقصد کے لیے اور اچھے کام پر صرف کریں تو ملک وملت کی بڑی خدمت کر سکتے ہیں۔

دوسرا دلچسپ واقعہ یہ رونما ہوا کہ تحریک کے دوران وکلا اور دیگر گریجویٹ حضرات بھی بکثرت گرفتار تھے اور قانونی طور پر وہ جیل کی بی کلاس کے حقدار تھے۔ گورنمنٹ کے پاس اتنی بی کلاسز کا انتظام نہیں تھا۔ ایک وکیل نے اپنا سیاسی یا خاندانی اثر رسوخ استعمال کر کے اپنے لیے بی کلاس منظور کرا لی۔ اب جیل انتظامیہ نے عدالتی حکم کی تعمیل میں ہمارے والی چکی کے چو کمروں میں سے ایک کمرہ خالی کرا کے اس میں ایک چارپائی رکھوا دی اور اس چارپائی کو سنگل کے ساتھ دروازے سے باندھ دیا۔ یہ بی کلاس تیار تھی۔ ہمارے استاد محترم جناب قاری محمد انور صاحب مدظلہ کی رگ ظرافت پھڑکی۔ فرمانے لگے، میں بھی گھر جا کر اپنے گھر والوں سے کہوں گا کہ مجھے بی کلاس دیں۔ ساتھیوں نے پوچھا، وہ کیسے؟ تو فرمانے لگے ان سے کہوں گا کہ چارپائی کو سنگلی کے ساتھ دروازے سے باندھ دیں۔ یہ لطیفہ وکیل صاحب کی طبیعت پر کچھ ایسا گراں گزرا کہ دو دن کے بعد انہوں نے وہاں سے اپنا تبادلہ کسی اور جگہ کرا لیا۔

انہی حالات و مصروفیات میں ایک ماہ بیت گیا۔ قومی اتحاد اور حکومت کے درمیان مذاکرات کا عمل شروع ہوا۔ گرفتاریوں میں کچھ نرمیاں پیدا ہوئیں۔ رہائیوں کا سلسلہ بھی شروع ہوا۔ حضرت شیخ کی گرفتاری چونکہ پہلے عمل میں آئی تھی، ان کی رہائی بھی ایک ہفتہ پہلے ہو گئی اور یہ ایک ماہ کا عرصہ میری زندگی کے قیمتی ترین لمحات میں شامل ہو گیا۔

مولانا شیخ رشید الحق خان عابد نقشبندی مجددی معصومی بنوری*

پیکر علم وتقویٰ

داستانِ عہد گل را از نظیری می شنو
عندلیب آشفتہ تر میگوید ایں افسانہ را

آنحضرت جل سلطانہ نے امت مرحومہ کی جن چیدہ چیدہ شخصیات کو تبحر فی العلم، وسیع المطالعہ، متنوع الجہات دینی خدمات کی بنا پر نابغہ روزگار اور عبقری شخصیت بنایا، حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا شمار بھی ایسی ہی شخصیات میں تھا۔ انہی کمالات کے ساتھ ساتھ مستزاد بریں خصوصی عنایت خداوندی 'ثم یوضع لہ القبول فی الارض' سے بھی بہرہ ور فرمایا، چنانچہ جب ہم نے ہوش سنبھالی تو والد صاحبؒ کو انہی اخلاق فاضلہ کی بنا پر ہر کہ ومہ کی نظر میں صاحب احترام واحتشام پایا۔ ماحول سے متاثر ہونے کی بنا پر ہمارے دل ودماغ میں بھی والد محترمؒ کے ادب واحترام کا یہی نقش منقش ہوا جو کہ مرور زمانہ کے ساتھ ساتھ مزید راسخ ہوتا چلا گیا۔ واقعی ماحول اور معروضی حالات بچوں کو ایسا بہت کچھ بڑی بے تکلفی اور آسانی سے سکھا دیتے ہیں جو بڑوں کو بڑے بڑے مربی اور معلم بھی بمشکل سکھا سکتے ہیں۔ راقم الحروف صرف دو خاندانی واقعے ذکر کرے گا جن سے بچپن میں والد محترمؒ کے ادب واحترام کے راسخ فی الذہن ہونے کی پوری پوری عکاسی ہو سکے گی۔

ہمارے بھانجے حافظ حبیب الرحمٰن عرف پپو سلمہ اللہ تعالیٰ بچپن میں اپنے علاقہ ہزارہ میں اپنے ہم عمر بچوں کے ساتھ کھیل رہے تھے کہ حسب معمول کھیل کے دوران بچوں نے لڑائی اور گالی گلوچ شروع کی۔ دوسرے بچوں نے جانتے ہوئے کہ یہ والد صاحبؒ کا نواسہ ہے، والد صاحب کو گالی دی جس کے جواب میں پپو نے کہا، ''داتہ کنزے مکوہ، ہغہ خو پیغمبر دے'' کہ ان کو گالی مت دو، وہ تو پیغمبر ہیں۔ پیغمبر کے مقام سے اگرچہ بڑے بھی پوری طرح باخبر نہیں ہوتے چہ جائیکہ صغار، لیکن ہر ادنیٰ واعلیٰ مسلمان کی نظر میں کسی بنی آدم کی بزرگی، جلالت شان اور تعریف کے لیے حرف آخر یہی لفظ پیغمبر ہے جس کے بعد تعریف کا کوئی لفظ فضول ہے۔ اگرچہ پپو کا یہ لفظ خلاف واقعہ تھا، لیکن چھوٹی عمر میں اس کے ذہن میں والد صاحبؒ کے ادب واحترام کے بخوبی موجود ہونے کی مکمل آئینہ داری کرتا ہے۔

اسی طرح برادر محترم قاری عزیز الرحمٰن شاہد زید مجدہ کے بڑے بیٹے ارسلان خان اس وقت بمشکل چار پانچ سال کے تھے اور گھر میں واحد بچے تھے جو کہ دوسروں کی تعلیمی مصروفیات کی بنا پر باہر سے آنے والے ملاقاتیوں کی والد صاحبؒ کے ساتھ ملاقات کرانے کی ڈیوٹی پر تھے۔ کسی نے دروازہ کھٹکھٹایا۔ ارسلان حسب معمول پہنچا۔ آنے والوں نے پوچھا کہ سرفراز صاحب ہیں؟ تو ارسلان نے ان کے الفاظ کو خلاف معمول وخلاف ادب واحترام پاتے ہوئے فوراً غصے میں کہا ''آپ کو شرم

---

*فرزند امام اہل سنت۔ مرتب ''خزائن السنن'' (تقریر ترمذی)۔

آنی چاہیے، اتنے بڑے عالم ہیں اور آپ سرفراز صاحب کہہ رہے ہیں، جبکہ حضرت مولانا سرفراز خان صاحب کہا کرتے ہیں‘‘۔ مہمان بے چارے بچے کا جواب سن کر خفیف تو ہوئے لیکن اندر پہنچ کر والد صاحبؒ سے پوچھا کہ یہ بچہ کون ہے؟ والد صاحبؒ نے فرمایا، میرا پوتا ہے تو انھوں نے یہی مندرجہ بالا مکالمہ دہرایا جس پر والد صاحبؒ مسکرا دیے۔

غرضیکہ ہم سب اسی ادب واحترام کی فضا میں پروان چڑھتے رہے تا آنکہ والد صاحبؒ سے رشتہ تلمذ بھی قائم ہوا اور بعض بھائیوں کو سلسلہ ارادت بھی نصیب ہوا۔ تلمذ وارادت کے رشتوں کے لیے مزید ادب واحترام کی پختگی اور ناگزیری ظاہر وباہر ہے۔ رشتہ ابوۃ وبنوۃ کے لیے حسب روایات دنیا کسی قدر بے تکلفی، بے حجابی لازم ہے جس کی وجہ سے بعض اوقات ادب واحترام کو کما حقہ ملحوظ رکھنا مشکل بھی ہوتا ہے، لیکن اس کو والد صاحبؒ کی کرامت جانیے کہ ہم سب بھائیوں نے تقریباً ساری زندگی صلبی رشتہ کو اول الذکر رشتوں کے پہلو میں مغلوب بلکہ کالمعدوم رکھ کر ادب واحترام کو حتی الوسع پوری طرح برقرار رکھنے کی کوشش کی اور روئے ارض پر شاید ہی ایسے گھرانے ہوں جن کو یہ سعادت بایں طرز نصیب ہوئی ہو۔ ع

کم ہیں وہ طائر جو ہیں دام وقفس سے بہرہ مند

راقم الحروف کی تقریباً پچاس سالہ زندگی میں والد صاحبؒ کی حیات مبارکہ کے داخلی وخارجی تمام پہلو تقریباً بندہ کی نظر میں ہیں، لیکن 'قدر گوہر شاہ داند یا بداند جوہری' کے تحت کم از کم مجھ کم نصیب سے تو ان کمالات کی عکاسی ناممکن ہے، بلکہ میرے ناقص خیال میں اہل علم وفضل میں سے یا تقریر وتحریر کے جغادریوں میں سے جو کوئی بھی اس موضوع پر قلم اٹھائے گا، 'صورت نادیدہ تشبیہے بتخمیں کردہ اند' کا مصداق ہی ہوگا۔ ع

سفینہ چاہیے اس بحر بے کراں کے لیے

تاہم 'ما لا یدرک کلہ لا یترک کلہ' کے تحت چند خصوصی امتیازی صفات کی نشان دہی کرنے کی بندہ کوشش کرے گا جن میں تکمیل اور تزیینی نقش نگاری قارئین کے ذمے ہے۔

والد صاحبؒ کی جسمانی صحت ماشاء اللہ اپنے آبا واجداد کی طرح قابل رشک تھی۔ راقم الحروف نے والد صاحبؒ کی پچھتر سالہ زندگی تک کسی بھی قابل ذکر بیماری میں والد صاحبؒ کو نہیں دیکھا۔ غالباً ۱۹۸۵ء میں چار پانچ سال کے لیے کمر کے مہروں میں سخت تکلیف ہوئی جو کہ ایک ہفتہ کے اندر اندر بفضلہ تعالیٰ رفع ہو گئی۔ چنانچہ نوے سالہ زندگی تک روزانہ مدرسہ نصرۃ العلوم تعلیم کے لیے تشریف لے جاتے رہے۔ عالم اسباب میں جن چند چھوٹی چھوٹی باتوں کا والد صاحبؒ اہتمام فرماتے رہے، ہم اس وقت اپنی نادانی اور لاعلمی کی بنا پر ان کو اتنی اہمیت نہیں دیتے تھے، لیکن اب معلوم ہوا کہ عالم اسباب میں ان چھوٹی چھوٹی باتوں پر بڑے بڑے نتائج مرتب ہوتے ہیں۔ مثلاً ہمیشہ صبح اٹھ کر غسل کرنا، کھانا ہمیشہ سادہ اور بے تکلف کھانا، کھانا ہمیشہ اپنے اوقات مقررہ پر کھانا، دو کھانوں کے درمیانی اوقات میں سوائے پانی اور ظہر کی چائے کے کبھی بھی کوئی چیز نوش نہ فرمانا، کھانے کو ہمیشہ اچھی طرح چبا کر کھانا، پانی ہمیشہ ہینڈ پمپ کا تازہ استعمال فرمانا، فریزر کے ٹھنڈے پانی سے اجتناب کرنا، تازہ ہوا کے لیے کمرے کی کھڑکی کا ضرور کھلا رکھنا اور دوسروں کو بھی اس کی تلقین کرتے رہنا، اپنے آپ کو ہمیشہ مصروف رکھنا اور فارغ نہ بیٹھنا، ہر روز تھوڑا بہت پیدل چلنا جو کہ اوقات خمسہ میں مسجد میں جانے کی صورت میں اور گورنمنٹ ایلیمنٹری کالج میں درس کے لیے جانے کی شکل میں ہوتا تھا، اور مدرسہ نصرۃ العلوم میں گاڑی کے بندوبست سے

قبل گوندلانوالہ اڈہ سے مدرسہ تک پیدل آنے جانے کی شکل میں ہوتا تھا، انگریزی ادویہ سے بالکلیہ اجتناب کرنا۔

فرنگی طب سراسر غیر فطری ہونے کے باوجود اپنی تمام تر خرافات اور فتنہ سامانیوں سمیت حکومتی سرپرستی اور پشت پناہی کی بنا پر اگرچہ کافی ترقی پذیر ہو چکی ہے، لیکن والد صاحبؒ طبعاً اس کے بالکل خلاف تھے اور پسند نہ فرماتے تھے۔ ہمیشہ اپنی چھوٹی موٹی تکالیف میں کسی نہ کسی یونانی مسہل سے اپنا علاج خود فرما لیا کرتے تھے۔ آخر عمر میں اگرچہ خلاف طبع مجبوراً کافی سال ڈاکٹروں کے زیر تسلط رہے، لیکن تقریباً ہر بار بندہ کی حاضری پر بندہ کے یونانی یا ہومیو علاج کے مشورہ پر ہمیشہ بدیں الفاظ جواب مرحمت فرماتے کہ ڈاکٹر جان چھوڑیں تو میں کوئی دوسرا علاج کروں۔ وفات سے دو دن قبل بندہ کے اصرار پر کراچی کے ایک یونانی حکیم کے تجویز کردہ نسخہ کے استعمال پر آمادگی ظاہر فرما دی، چنانچہ بندہ نے دوائی بیٹھک میں پہنچا کر طریقہ بتا دیا تو ایک ماہ کے استعمال پر وعدہ فرما لیا، لیکن اے بسا آرزو کہ خاک شدہ۔ ہم سنا کرتے تھے کہ آدمی جب بڑھاپے میں بھی کافی وقت گزار لے تو سفید بال دوبارہ کالے ہونا شروع ہو جاتے ہیں۔ والد صاحبؒ کے ڈاڑھی مبارک کے بال بھی کافی سارے دوبارہ سیاہ ہو چکے تھے۔ وفات سے ایک دن قبل بندہ نے والد صاحبؒ سے اس کا تذکرہ کیا تو انھی بالوں پر ہاتھ رکھ کر فرمایا کہ ہاں یہ بال سیاہ ہو چکے ہیں۔ بندہ کے استفسار پر کہ آپ نے کبھی ایسا آدمی دیکھا جس کے بال دوبارہ سیاہ ہو چکے ہوں تو سر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے نفی میں ہاتھ کو حرکت دی کہ اس وقت ایسا آدمی ذہن میں نہیں ہے۔

اپنے معاصر علما ومشائخ میں عمدہ حافظے کی بنا پر خاص طور پر ممتاز تھے۔ عالم اسباب میں آخری مرض تک بلا ناغہ روزانہ خمیرہ گاؤزبان عنبری استعمال فرمانے کا دائمی معمول تھا جو کہ اپنی نگرانی میں سالہا سال تک گھر پر ہی تیار کرواتے تھے اور باطنی اور روحانی اسباب میں سے، جیسا کہ اہل علم امام شافعیؒ کے شعر 'فاوصانی الی ترک المعاصی' کے تحت جانتے ہی ہیں، ہمیشہ مصروفیات کی بنا پر معاصی اور فضولیات کی تو فرصت ہی نہ تھی اور نہ ہی ان کی ڈکشنری میں اس کا تصور تھا۔ باوجودیکہ والد صاحبؒ حافظ قرآن نہ تھے، لیکن اسی حافظے کی بدولت کالحافظ تھے۔ رمضان شریف میں کیا مجال ہے کہ کوئی حافظ یا قاری تراویح میں معمولی سی زیر زبر کی غلطی کر کے بچ نکلے۔ بلا تاخیر اس کو ٹوکتے یا سامع کو تنبیہ کرتے اور درستگی کے بعد آگے جانے دیتے۔ وفات سے چند ماہ قبل بندہ موجود تھا۔ برادرم قاری راشد صاحب سلمہ ربہ (جنھوں نے سالہا سال بڑی جفاکشی اور تن دہی سے والد صاحبؒ کی خدمت کی۔ مولا پاک ان کو دین دنیا آخرت میں ہم سب کی طرف سے خدمت کی بہترین جزائے خیر نصیب فرمائے) کو فرمایا کہ سامنے والی الماری کے درمیان والے خانے کی ساتویں نمبر کی کتاب لاؤ اور ص ۶۰ کھولو اور میری طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا کہ اس کو دو۔ انھوں نے ص ۶۰ نکال کر کتاب بندہ کو تھما دی۔ والد صاحبؒ نے ایک روایت کے الفاظ سارے پڑھے اور فرمایا کہ الفاظ اسی طرح ہیں؟ بندہ نے عرض کی کہ اس صفحے پر ایسے کوئی الفاظ نہیں۔ بڑے تعجب سے فرمایا کہ یہ کسی اور خانے سے کتاب اٹھا لایا ہے، چنانچہ یہ بات درست ثابت ہوئی۔ وہ مطلوبہ کتاب نہیں لائے تھے۔ مطلوبہ کتاب لانے پر اسی کے صفحہ ۶۰ پر بعینہ وہی الفاظ نکلے جس کے آخری الفاظ بندہ کو بھی کسی قدر یاد ہیں: 'کان کفارۃ لما مضی من ذنوبہ وموعظۃ لہ فی ما یستقبل'۔

حافظے کا یہ حال سالہا سال کے فالج کی بیماری کے باوجود تھا۔ اسی سے زمانہ صحت کا قیاس کیا جا سکتا ہے۔ ع

قیاس کن زگلستان من بہار مرا

کوئی صاحب علم بندہ مجلس میں جب موجود ہوتا تو پے در پے علمی باتیں کرنے کے لیے بہانے تلاش فرماتے رہتے اور ضرور کسی نہ کسی رنگ میں علمی تذکرہ رہتا۔ شیخ الاسلام قاری محمد طیب صاحبؒ کی تقریر ٹیپ ریکارڈ پر چل رہی تھی۔ کسی حدیث کا ذکر ہوا۔ فرمایا کہ یہ حدیث کہیں نظر سے گزری ہے؟ بندہ نے عرض کی کہ ہاں، کنوز الحقائق میں بندہ نے دیکھی ہے۔ غلطی سے بندہ نے علامہ سخاویؒ کا نام لے لیا، برجستگی سے فرمایا کہ وہ علامہ مناویؒ کی ہے، نہ کہ علامہ سخاویؒ کی۔ حاصل کلام یہ کہ آخر عمر تک قوت حافظہ قابل رشک حد تک برقرار رہی۔

دقیق سے دقیق علمی مسائل پوچھنے پر بھی فوراً تسلی بخش جواب عنایت فرماتے یا حسب شخصیت کسی نہ کسی قدر روشنی ضرور ڈالتے۔ اگر جواب تفصیلی ہوتا یا سائل کی علمیت پر اعتماد ہوتا یا فرصت نہ ہوتی تو مسئلہ کے مظان ومراجع کی طرف رجوع کر کے خود دیکھ لینے کا فرماتے جس پر مسئلہ پوری تفصیل سے مع مالہا وما علیہا انھی مظان میں مل جاتا۔ یہ سب صورتیں بندہ کے مشاہدہ کی ہیں۔ راقم الحروف علمی مسائل میں والد صاحبؒ کی تحقیق کی بجائے گزشتہ شخصیات کے بارے میں والد صاحبؒ کے تاثر جاننے کی ضرور کوشش کرتا رہتا۔ ایک بار حضرت شاہ ولی اللہؒ اور امام ربانی حضرت مجدد الف ثانیؒ کے بارے میں ان کا تاثر لینا چاہا تو فرمایا کہ تصوف میں امام ربانی کا مقام اونچا ہے اور علم میں شاہ صاحبؒ بہت آگے ہیں۔ ساتھ ہی فرمایا، امام ربانی علم میں اتنے محقق نہیں تھے۔ بندہ نے عرض کی کہ کون سی بات غیر تحقیقی انھوں نے فرمائی؟ فرمایا کہ حدیث غرانیق کا ذکر مکتوبات میں ایسے انداز سے کیا ہے۔ یہ مکالمہ اس وقت دلچسپ مباحثے کی شکل اختیار کر گیا جب بندہ نے کہا کہ اس کو تو حافظ الدنیا حافظ ابن ابی حجرؒ نے بھی صحیح کہا ہے۔ حسب تکیہ کلام فرمایا کہ ایسے ہی مار رہے ہو، کہاں لکھا ہے؟ میں نے عرض کی کہ حافظ نے فتح الباری میں اس کی دو تین اسناد کو صحیح قرار دیا ہے۔ فرمایا کہ لا کر دکھاؤ کہاں ہے۔ بندہ دوسرے کمرے میں جا کر فتح الباری اٹھا لایا اور کھول کر سامنے رکھ دی۔ والد صاحب اٹھ کر بیٹھ گئے (یہ واقعہ وفات سے بارہ تیرہ سال قبل کا ہے)۔ اس صفحے کا مطالعہ شروع فرمایا۔ بندہ نے روحانی طور پر دیکھا کہ والد صاحبؒ کا عالم امر کاب سے بالا لطیفہ اخفی دوران مطالعہ متاثر ہونا شروع ہوا اور انوار حدیث کی بارش اس پر ہونے لگی، چنانچہ والد صاحب کی آنکھوں سے پانی تک بہہ نکلا۔ بعد ز مطالعہ مسکراتے ہوئے فرمایا کہ ہاں، اس محمل کی گنجائش ہے۔ یاد رہے کہ لطیفہ اخفی بالطبع صفت علم سے مناسبت رکھتا ہے، اگرچہ اس وقت وارد ہونے والا فیض دو آتشہ تھا۔ الغرض مجلس شریفہ 'اے لقاے تو جواب ہر سوال' کا پورا پورا نمونہ تھی۔

اتباع شریعت وسنت نیز توقیر شریعت میں نہایت راسخ القدم تھے۔ قارئین فتویٰ اور تقویٰ کے فرق کو بخوبی جانتے ہوں گے۔ اپنی صحت کے زمانے میں تقریباً ہمیشہ شرع شریف کے اتقائی پہلو پر عامل رہے۔ مجھے بخوبی یاد ہے، میری عمر اس وقت بمشکل پندرہ سولہ سال ہوگی۔ برادر محترم شیخ الحدیث مولانا زاہد الراشدی مدظلہ جمعیت کی سیاسی سرگرمیوں سے وابستگی کی بنا پر ان دنوں گھر سے اکثر غیر حاضر ہوتے تھے۔ عام گھرانوں میں، جیسا کہ معمول ہے، گھر کے افراد ایک دوسرے کی اشیا آپس کے انبساط ومودۃ کی بنا پر استعمال کرتے رہتے ہیں اور کسی کو کوئی اعتراض نہیں ہوتا۔ میں نے بھی مولانا راشدی مدظلہ کی غیر حاضری میں ان کے پلاسٹک کے بوٹ برسات کے موسم کی وجہ سے پہن رکھے تھے۔ والد صاحبؒ نے دیکھ لیا اور پوچھا کہ بوٹ کس کے ہیں؟ عرض کیا کہ بھائی جان کے ہیں۔ ایک زناٹے دار تھپڑ رسید کرتے ہوئے فرمایا کہ کیا تو نے ان

سے پوچھا ہے؟ فوراً اتار کر اس کے کمرے میں رکھ اور اس کی آمد پر اس کو اطلاع کر۔ بصد شرمندگی بندہ نے اتار دیے۔ بھابھی صاحبہ نے بڑا اصرار کیا کہ پہن لو، کوئی بات نہیں، لیکن والد صاحبؒ کے خوف سے جرات نہ ہوئی اور بھائی جان کی آمد پر بتایا۔ بھائی جان مسکرا دیے۔

بظاہر چھوٹی سی بات ہے، لیکن چونکہ تقویٰ کی عکاس ہے، اس لیے بڑی ہے۔ گویا کہ عملاً مراسیل ابی داؤد میں موجود حدیث کی طرف راہ نمائی فرمادی: 'اذا تناول احدکم عن اخیه شیئاً' الحدیث۔

مدرسہ نصرۃ العلوم میں تدریس کے دوران والد صاحب اسباق سے فراغت کے فوراً بعد واپسی فرماتے تھے۔ ایک دفعہ کسی تقریب کے سلسلے میں ٹھہرنا ہوا اور ظہر کی نماز مدرسہ میں ہی ادا فرمائی۔ نماز سے قبل انتظار صلوٰۃ کے لیے تشریف فرما تھے۔ ابوداؤد اور مسند احمد کی روایت کے مطابق منتظر الصلوٰۃ کو تشبیک (ہاتھوں کی انگلیوں کو آپس میں پیوست کرنے) کی ممانعت ہے۔ بندہ والد صاحبؒ سے کچھ ہی فاصلے پر پہلی صف میں موجود تھا۔ اچانک والد صاحبؒ نے بے توجہی سے تشبیک کر لی۔ بندہ نے جونہی دیکھا، چند سیکنڈ کے بعد فوراً تشبیک ختم فرمائی اور جلد ہی دائیں بائیں اس غرض سے دیکھا کہ کسی نے مجھے دیکھا تو نہیں، لیکن بندہ 'ولد الفقیہ نصف الفقیہ' کے تحت دیکھ چکا تھا۔ بدیں حالت تشبیک اگرچہ زیادہ سے زیادہ خلاف اولیٰ اور مکروہ تنزیہی ہے، لیکن والد صاحبؒ نے متنبہ پر فوراً چند لمحوں میں ختم فرمادی۔ مستزاد بریں متلاشی نظروں سے ادھر ادھر دیکھنا احساس عظمت شریعت کا پورا پورا غماز تھا۔ جس شخص کی نظر میں اتنی معمولی باتیں اتنی بڑی ہوں، اس سے بڑی خامیوں کی توقع سراسر فضولیات میں داخل ہوگی۔ واقعی آنحضرت جل سلطانہ کی عطا فرمودہ سند 'انما یخشی اللہ من عبادہ العلماء' کسی کسی کو نصیب ہوتی ہے۔ کاش کہ ہمیں بھی نصیب ہو جائے۔

دور حاضر میں امت مرحومہ کی شاید سب سے بڑی خامی نماز میں خشوع وخضوع وتوجہ کا فقدان ہے اور شاید ہی کوئی عالم یا جاہل اس سے مستثنیٰ ہو۔ گویا کہ ہم سب

چلاسی قلب شاں بس سوے غیر است
اگرچہ رخ سوے محراب کردند

کا مکمل مصداق ہیں۔ مشائخ صوفیاء رحمہم اللہ تعالیٰ کے ہاں کسی بھی شخص کی عظمت وبلندئ مرتبت کا مدار اس کی نماز کے خشوع وخضوع پر ہے۔ والد صاحبؒ کو حضرت حق جل مجدہ نے اس سے بھی بہرۂ وافر نصیب فرمایا تھا۔ اگرچہ لمبے چوڑے نوافل کی عادت شریفہ نہیں تھی، لیکن باقی نماز پوری دل جمعی اور حسن آداب سے ادا فرماتے اور اس معاملے میں معمولی فروگزاشت بھی برداشت نہ فرماتے تھے۔ خاص طور پر امامت کے بارے میں انتہائی احتیاط فرماتے تھے۔ غالباً ۱۹۷۳ء کا واقعہ ہے۔ ابھی تک مدرسہ نصرۃ العلوم کی طرف سے گاڑی کا بندوبست نہیں ہوا تھا۔ والد صاحبؒ عوام الناس کی طرح بذریعہ عام ٹرانسپورٹ اور پھر پیادہ مدرسہ تک تشریف لے جاتے تھے۔ اتفاقاً ایک دن گکھڑ کی مسجد میں ظہر کی نماز کے بعد اعلان فرمایا کہ پرسوں ظہر سے آج فجر سمیت جس نے میرے پیچھے جتنی نمازیں بھی پڑھی ہوں، براے مہربانی ان کی قضا کر لیں۔ فرمایا کہ آج ظہر کا وضو کرتے ہوئے میرے بازو پر روغن کارائی برابر نشان تھا جس کو میں نے دور کر دیا ہے۔ بہت سوچ بچار کے بعد میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ پرسوں بارش اور سڑکوں پر پانی زیادہ ہونے کی وجہ سے بندہ پیدل واپس آنے کی بجائے تانگے پر بیٹھ گیا تھا

جس پر تازہ تازہ روغن ہوا تھا۔ اغلب ہے کہ اس پر بیٹھنے کے دوران معمولی روغن میرے بازو پر بھی لگ چکا تھا، اس لیے سارے حضرات میرا وضو نہ ہو سکنے کی بنا پر اپنی نمازیں ضرور دہرالیں اور پھر کئی نمازوں کے بعد یہی اعلان فرماتے تھے۔

اس قحط التقویٰ کے دور میں ایسی مثال سعی بسیار کے بعد بھی شاید بمشکل مل سکے۔ شاید نماز کی اسی حسن ادائیگی اور احتیاط کی بنا پر ایک متشرع سید صاحب کو حضور علیہ الصلوۃ والسلام نے خواب میں نمازیں آپ کی اقتدا میں ادا کرنے کا فرمایا، چنانچہ وہ مستقل عرصہ دراز تک گکھڑ میں ہی رہائش پذیر ہو گئے تھے اور نمازیں حتی الوسع والد صاحبؒ کی اقتدا میں ادا کرتے تھے۔

اکابر علمائے کرام خصوصاً علمائے دیوبند رحمہم اللہ کے مسلک ومشرب میں انتہائی متصلب تھے۔ کسی معمولی لچک کے بھی روادار نہ تھے۔ اسلاف پر اعتماد اور حسن عقیدت مثالی تھی۔ فرمایا کرتے تھے کہ ساری زندگی کے تجربات ومشاہدات کا حاصل اور نچوڑ یہ ہے کہ ہمارے اکابر نے دین کے سمجھنے سمجھانے میں جو موقف اپنایا، وہ حرف آخر ہے۔ خود بھی اسی موقف پر کاربند رہے اور ہر سال خاص طور پر دورۂ حدیث کے فضلا کو یہی نصیحت فرماتے رہے کہ ہر لحاظ سے اکابر سے وابستہ رہنا اور تفرد سے دور رہنا۔ خود بھی ساری عمر دین کے مختلف محاذوں پر اکابر کی مکمل ترجمانی فرماتے رہے۔ دنیاوی تعلیم اگرچہ بمشکل پرائمری سطح کی تھی، لیکن تحریر کافی اعلیٰ تھی۔ اردو ادب میں پایہ کافی بلند تھا۔ تحریر اگرچہ عام طور پر شستہ، سہل اور شگفتگی لیے ہوتی تھی، لیکن کبھی سہل ممتنع کی نوبت بھی آتی اور بعض اوقات مسئلہ کی نزاکت اور مخاطب کے انداز وتیور کے بموجب جارحانہ بھی ہوتی تھی، اگرچہ اس میں بھی مزاحی پہلو نمایاں رہتا تھا۔ بحث کے تمام پہلوؤں پر قوت استدلال کی وجہ سے مکمل حاوی رہتے تھے اور بعض اوقات استنباط تخریج بعید کی بنا پر 'ہزار نکتہ باریک تر زمو ایں جا است' کا نمونہ پیش کرتا تھا۔

قارئین کرام نے مشائخ رحمہم اللہ تعالیٰ کا قول سنا ہوگا: طرق الوصول الی اللہ تعالیٰ بعدد الانفاس، کہ آنحضرت جل سلطانہ تک پہنچنے کے راستے بے شمار ہیں، لیکن بڑے بڑے راستے تین ہیں:

(۱) راہ اجتباء یعنی براہ راست کمالات نبوت تک پہنچانے والا راستہ جس میں توسط کی ضرورت ہوتی۔ تمام انبیاء کرام علیہم الصلوات والتسلیمات اسی راستہ سے واصل بحق ہوتے ہیں۔

(۲) راہ جذب جس میں کمالات ولایت تک وصول براستہ جذب ہوتا ہے۔ تمام محبوب ومراد اولیائے کرام رحمہم اللہ تعالیٰ اسی راستہ سے حسب استعداد واصل بحق ہوتے ہیں۔

۳۔ راہ سلوک جس میں کمالات ولایت تک وصول براستہ سلوک ہوتا ہے۔ تمام عاشق ومرید اولیائے کرام رحمہم اللہ تعالیٰ اسی راستہ سے حسب استعداد واصل بحق ہوتے ہیں۔

لیکن بہت کم قارئین کو معلوم ہوگا کہ ایک چوتھا راستہ سلوک براہ علم بھی ہوتا ہے۔ وہ اگرچہ متقدمین اکابر میں شائع وذائع تھا، لیکن عرصہ سے غیر متعارف ہو چکا ہے، اگرچہ یہ راستہ بھی کھلا ہے۔ چنانچہ ہمارے والد صاحبؒ بھی اسی راستے سے واصل تھے۔ اس راستے کی شرائط میں سے فنافی العلم ہونا، علوم شرعیہ کو اوڑھنا بچھونا بنالینا اور ہر وقت اسی میں منہمک رہنا، شرع شریف کی مکمل تعظیم کرنا، سلیم الفطرت ہونا، کامل العقل ہونا اور خاص طور پر کبائر اور فضولیات سے مکمل اجتناب رکھنا۔ چنانچہ ایسا شخص جس میں مندرجہ بالا شرائط پائی جاتی ہوں، اس پر ان علوم شرعیہ کی تعلیم وتعلیم ومطالعہ کے دوران علوم شرعیہ کے انوار

اسی طرح موسلا دھار بارش کی طرح برستے ہیں جیسے ذاکرین پر ذکر کے انوار۔ 'ونور اللہ لا یعطی لعاص' سب نے سنا ہوگا۔ انوار خواہ علم کے ہوں یا ذکر کے، سالک کو ترقی بخشتے ہیں، البتہ ایسے اہل علم جو اگرچہ علوم شرعیہ میں مشغول ہوں لیکن مندرجہ بالا شرائط کے حامل نہ ہوں، ان کو اس اعزاز سے ہاتھ دھولینا چاہیے۔

بر سر طورِ ہوئی طنبور شہوت می زنی
عشق مردِ لن ترانی را بدیں خواری مجو

چنانچہ اسی سلوک براستہ علم کی طرف راہنمائی کرتے ہوئے خواجہ نقشبندؒ کا قول اپنے دور کے عالم حقانی کے بارے میں ہے: ''(غالباً) مولانا زین الدین تائبادیؒ کا سلوک براستہ علم واقع ہوا ہے۔'' راقم الحروف کہتا ہے کہ اگرچہ انوار علم اور انوار ذکر کے نتائج وثمرات میں بڑا بھاری فرق ہے، لیکن محض انوار علم بھی بشرائط سلوک واجبی کے قطع کے لیے کافی ووافی ہیں۔ اس دور میں سلوک براستہ علم کے لحاظ سے ہمارے والد صاحبؒ اس لائن کی منفرد شخصیت تھے۔ یقیناً اور حضرات بھی ہوں گے، لیکن مجھ کم نصیب کی نظر سے نہیں گزرے۔ بندہ نے اگر والد صاحبؒ کا سلوب براستہ علم نہ دیکھا ہوتا تو اس راستہ کا عملی نمونہ بندہ کے علم میں نہ ہوتا۔ محض متقدمین اکابر کے بارے میں ایک سنی سنائی بات ہوتی۔ 'شنیدہ کے بود مانند دیدہ'۔ ایسے اہل علم جو باوجود علوم شرعیہ کی تعلیم وتعلم کے اور وسعت مطالعہ کے علوم سے تاثر پزیر نہ ہوں اور قطع سلوک کی دولت سے بہرہ ور نہ ہوں، شیخ سعدی شیرازیؒ کے صرف ایک ہی مصرعہ نے ان کی حقیقت بخوبی آشکارا کی ہے: 'علمے کہ راہ حق ننماید جہالت است'۔ یہ راستہ اگرچہ ہر طرح سے بے غبار ہے، لیکن افسوس کہ فی زمانہ غیر مسلوک ہے جس کی بنا پر کالمتروک ہے۔

آنحضرت جل سلطانہ کی خلاقی اور کمال قدرت کا کرشمہ سمجھیے کہ ایک ہی والدین کی اولاد، ایک ہی گھر اور ماحول میں پلنے بڑھنے والے دو بھائی، ایک ہی مدارس اور استادوں سے تعلیم پانے والے دو طالب علم جب کامل ہو جاتے ہیں تو طبعاً ایک دوسرے کے بالکل متضاد بلکہ بعد المشرقین کی صفات کے حامل ہوتے ہیں۔ فسبحان من جمع بین المشرق والمغرب۔ حضرت صوفی صاحبؒ باوجود انتہائی محقق عالم ہونے کے اپنی وضع قطع اور بود وباش میں ٹھیٹھ صوفی تھے۔ عرصہ دراز تک مدرسہ کے گیٹ سے بھی باہر تشریف نہ لے جاتے تھے۔ طبع شریف عضلاتی ہونے کی بنا پر نیز مراقباتی اور مشاہداتی کیفیات میں مستغرق ہونے کی وجہ سے گرد وپیش سے صرف نظر رکھتے تھے۔ حتیٰ کہ آرام فرما بھی ہوتے تو گرد وپیش میں بچے جتنا شور وشغف بھی کرتے، مطلقاً متاثر نہ ہوتے بلکہ اپنی کیفیات میں مستغرق رہتے۔ ۱۹۸۴ء کا واقعہ ہے، گرمی کے موسم کی ابتدا تھی۔ حضرت صوفی صاحبؒ حسب معمول بعد از عشا گھر کے دروازے کے سامنے چارپائی پر بظاہر آرام فرما تھے جبکہ حقیقتاً مشاہداتی کیفیات میں مستغرق۔ بندہ صوفی صاحب کے گھر والوں سمیت تیسری منزل پر خوش گپیوں میں اچھی خاصی آوازوں میں مصروف تھے۔ چھوٹے بچے بھاگ دوڑ میں مشغول، لیکن صوفی صاحب باوجود ہر طرح کے شور کے اپنے مراقبے میں مستغرق تھے۔ دفعتاً کسی قوی وارد یا تجلی کی بنا پر تحمل نہ کر سکنے کی وجہ سے صوفی صاحبؒ نے بڑی خوفناک آواز سے باآواز بلند بلکہ بہت بلند تین چار بار اللہ اللہ کہا۔ بندہ نے اور صاحبزادہ حاجی فیاض صاحب مہتمم مدرسہ نے پہلے اوپر سے جھانک کر دیکھا تو دوبارہ ویسی ہی آواز نکالی۔ دفعتاً ہم دونوں نے نیچے کی طرف دوڑ لگائی تو صوفی صاحبؒ کو پسینے میں شرابور پایا۔ اٹھ کر بیٹھنے کی کوشش میں تھے۔ بندہ نے دایاں ہاتھ اور صاحبزادہ صاحب نے بایاں ہاتھ پکڑ کر بٹھایا اور پوچھا کہ کوئی تکلیف ہے؟ بندہ کو

اگرچہ تصوف میں داخل ہوئے چند سال ہو چکے تھے اور کسی قدر ان واردات سے واقفیت بھی تھی، دک وفک چونکہ تجلیات کے لوازمات میں سے ہے، خواہ کوئی بڑا ہو یا نسبتاً چھوٹا، سیدنا موسیٰ علیٰ نبینا وعلیہ الصلوٰۃ والسلام کا کوہ زبیر پر پڑنے والی معمولی تجلی سے بے ہوش ہو جانا نص قطعی سے ثابت ہے۔ 'موسیٰ زہوش رفت بہ یک پرتو صفات' تو سب نے سنا ہی ہوگا۔ صوفی صاحب نے جواب میں بڑی صفائی سے معاملے کو راز رکھتے ہوئے فرمایا کہ پانی لاؤ۔ پانی لایا گیا۔ آدھا گلاس پانی پی کر فرمایا کہ چلے جاؤ، میں ٹھیک ہوں۔ بندہ اگرچہ کسی قدر سمجھ تو گیا لیکن صوفی صاحب نے بزبان حال فرماتے ہوئے ہمیں بھیج دیا:

تانگردی آشنا زیں پردہ بوئے نشنوی
گوش نامحرم نباشد جائے پیغام سروش

جبکہ والد صاحبؒ وضع قطع عالمانہ اور رندانہ رکھنے کی بناپر صوفیانہ نزاکتوں اور اداؤں سے کوسوں دور تھے۔ خوردبینی عینک سے کوئی صوفیانہ ادنیٰ جھلک بھی تلاش کرنے کی کوشش کرتا تو یکسر ناکام رہتا۔ طبع شریف اعصابی رکھنے کی وجہ سے بیدار مغز اور گردوپیش سے پوری طرح باخبر رہتے تھے۔ جب آرام فرما ہوتے تو گردوپیش میں قریب تو کسی شور وشغب کا ذکر تو بڑی دور کی بات ہے، دور کے کمروں میں باوجود دروازوں کے بند ہونے کے معمولی آواز سے بات کرنا بڑا مشکل ہوتا تھا۔ چنانچہ دونوں بھائی اپنی انھی صفات کی بنا پر اکابر علما ومشائخ میں رجحان بھی اپنی ہی جیسی شخصیات کی طرف رکھتے تھے، اگرچہ قدر وادب سب کا ہی کرتے تھے۔ سچ ہے:

ہر گلے را رنگ وبوے دیگر است

والد صاحب کے طرز بیعت کو سمجھنے سے قبل قارئین کرام کو بیعت کی اقسام بتاتا چلوں تاکہ علیٰ وجہ البصیرۃ اس پر روشنی پڑ سکے۔ امت کے علما ومشائخ کے ہاں نیز شرع شریف میں اگرچہ بیعت کی کافی اقسام کا ذکر ملتا ہے، لیکن بیعت کی اقسام پانچ مشہور ہیں۔

(۱) بیعت تبرک: عام طور پر ایسے مسلمان جو ضعیف الاستعداد ہوں، مادیت کی طرف رجحان رکھتے ہوں، ریاضت وروحانیت کے چنداں خواہاں نہ ہوں، لیکن مشائخ سے اعتقاد رکھتے ہوں اور ان کی اور ان کے سلسلے کی برکات سے مستفید ہونا چاہتے ہوں تو ایسے حضرات کو مشائخ بیعت تبرک سے بہرہ ور فرماتے ہیں، چنانچہ وہ مشائخ کی دعاؤں اور توجہات کی برکت سے دین اور اہل دین سے کسی نہ کسی قدر منسلک رہتے ہیں اور اس ضمن میں دعاؤں کی برکت سے بہت سے مادی فوائد بھی حاصل کرتے ہیں۔ اسی طرح مشائخ اپنے خاص معتقدین کے چھوٹے بچوں کو بھی بیعت تبرک سے نوازتے ہیں تاکہ اطفال مشائخ کے زیر سایہ پروان چڑھیں۔

(۲) بیعت شریعت وارشاد: اس کو بیعت علما بھی کہتے ہیں۔ ایسے علماء کرام جو صاحب علم وتقویٰ ہوں، سمجھ دار عوام کو عموماً اور اپنے اہل علم شاگردوں کو خصوصاً بیعت ارشاد میں داخل فرماتے ہیں جس میں شریعت وسنت کی اتباع اور توحید پر استقامت کا سبق دیا جاتا ہے۔ موقع بموقع اور زندگی کے مختلف موڑوں پر ایسے مریدین کی امر بالمعروف ونہی عن المنکر سے راہنمائی کی جاتی ہے۔ ایسے مریدین جو سلیم الفطرت اور کامل العقل ہوں، فطرتاً گناہوں سے مجتنب ہوں یا بتقاضائے عقل نفس کی خواہشات کو پامال کر کے شرع شریف کو مدنظر رکھتے ہوں، اس بیعت سے مستفیض ہو سکتے ہیں، ورنہ دوسرے لوگوں

کے لیے یہ بیعت بھی عملاً تبرک میں داخل ہے۔

(۳) بیعت طریقت واصلاح: یہی بیعت پیران طریقت کے ہاں عرصہ سے معمول بہا ہے جس میں لطائف عشرہ پر بکثرت ذکر اسم ذات یا نفی اثبات کے مختلف طریقوں اور ضربوں کے ساتھ تصفیہ وتزکیہ کرا کے سالک کی اصلاح کی جاتی ہے اور خصوصاً سالک کی باطنی خامیوں کا ازالہ کرایا جاتا ہے، ان خامیوں کی بجائے خوبیوں کو اجاگر کیا جاتا ہے۔ تصفیہ وتزکیہ یا تخلیہ وتحلیہ یا فنائے رزائل وبقائے خصائل یا ظاہراً وباطناً شرع شریف کے مطابق سالک کی پوری پوری اصلاح کر کے اس کو مومن کامل بنانا اس کے لوازمات میں سے ہے۔ دعاؤں کا بکثرت قبول ہونا، نیک لوگوں کی نظروں میں باوقعت ہونا اور حضرت حق جل مجدہ کا ایسے کی ضروریات اور رزق کا متکفل ہو جانا اس کے آثار میں سے ہے۔ اس کو سیر ملکوت، سیر عالم امر، ولایت ایمانی یا ولایت عامہ بھی کہتے ہیں۔ بیعت کی ان دونوں قسموں کے لوازمات کسبی ہیں اور شرعاً ان کا مکلف ہے۔ ایسا آدمی اگرچہ ظاہری وباطنی پوری پوری اصلاح رکھتا ہے، لیکن مقام فنا فی اللہ سے محروم ہے، اس لیے مشائخ صوفیاؒ کے ہاں ولی نہیں ہے بلکہ مومن کامل ہے۔

فرشتہ گرچہ دارد قرب درگاہ
نگنجد در مقام لی مع اللہ

(۴) بیعت معرفت وبیعت صوفیا: اگر سالک کی روحانی استعداد بہت اونچی ہو تو ایسا سالک بیعت معرفت سے ممتاز ہوتا ہے جس میں سالک کی سیر اگر دائرۂ امکان سے بالا ظلال اسماء وصفات میں شروع ہو جائے اور آنحضرت جل سلطانہ کی تجلیات افعالیہ کا مورد ومہبط بن جائے اور اس تجلی میں سالک کے قلب کو فنا وبقا حاصل ہو جائے اور تمام مخلوقات کو ریموٹ کنٹرول پائے تو سالک صوفیت اور ولایت خاصہ کے ادنیٰ مقام سے مشرف ہو جاتا ہے اور سالک کا علم حصولی بالکل زائل ہو جاتا ہے۔ اسی کو ولایت صغریٰ، ولایت خاصہ، ولایت ظلی، ولایت عرفانی اور سیر برزخی کہا جاتا ہے۔ مقام محاضرۃ سے بھی موسوم کیا جاتا ہے۔۔ سالک کی نظر سے افعال مخلوقات کا ساقط ہو کر مخلوقات کا ریموٹ کنٹرول ہو جانا، رضا بالقضا سے مشرف ہونا، علم حصولی کا زائل ہونا، اور قلب میں باوجود ہزار کوششوں کے ایک سیکنڈ کے لیے بھی غیر اللہ کا گزر نہ ہونا اور قلب کا دنیا کی کسی بڑی سے بڑی خوشی سے خوش نہ ہونا اور بڑے سے بڑے غم سے غمگیں نہ ہونا اس مقام کے لوازمات سے اور کشف قبور، کشف صدور، کشف ارواح، کشف وقائع آئندہ اور کسی قدر کرامات کا ظہور اس کے آثار میں سے ہے۔

محو ہیں اپنی جگہ آسودگان کوے دوست
آرزوئیں دل میں دل آنکھوں میں آنکھیں سوے دوست

اور اگر سالک اس سے بھی اونچی استعداد رکھتا ہو اور مقام صفات تک عروج کر جائے، حضرت حق جل مجدہ کی تجلیات صفاتیہ کا مورد ہو جائے، اس تجلی میں سالک کے نفس کو فنا وبقا حاصل ہو جائے، اس کا علم حضوری بھی زائل ہو جائے، اپنے آپ کو اور مخلوقات کو مظاہر صفات حق پائے اور بروایت بخاری شریف مقام 'بی یسمع وبی یبصر' سے مشرف ہو جائے تو صوفیت کے مقام سے مشرف ہو جاتا ہے۔ اسی کو ولایت کبریٰ، ولایت انبیا، ولایت احسانی، ولایت اصلی، سیر جبروت، مقام مکاشفہ اور قرب نوافل کہا جاتا ہے۔ ع

من برنگ یار گشتم یار رنگ من گرفت

ابتداءً توحید وجودی اور بالآخر توحید شہودی سے متصف ہونا، نفس کا فنا فی اللہ ہو کر مطمئنہ ہونا نیز علم حضوری کا گم کر دینا اس کے لوازمات سے اور کرامات وتصرفات کا پے در پے صدور اس کے آثار سے ہے۔ اکابر اولیاے امت کا مقام ہے۔

نہ من تنہا دریں مے خانہ مستم
غزالی، رومی وعطار ہم مست

لگے ہاتھوں یہ غلط فہمی بھی دور کرتا چلوں کہ اچھے اچھے پڑھے لکھے لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ معرفت دقیق علمی باتوں اور موشگافیوں کا نام ہے۔ حاشا وکلا ثم حاشا وکلا۔ معرفت مشائخ صوفیا کے ہاں فنا فی اللہ سے عبارت ہے اور بس۔ اگرچہ اس فنا کے بعد بہت سے اسرار پر مطلع ہو کر اظہار دقائق واسرار لوازمات سے ہے۔ اسی کو بیعت صوفیاء بھی کہا جاتا ہے اور مشائخ صوفیاء کے ہاں بیعت کا مقصد کم از کم انھی دونوں ولایتوں کا حاصل کرنا ہوتا تھا، کیونکہ شریعت کی روح اخلاص کا حصول عالم اسباب میں اسی معرفت پر وابستہ ہے۔ ولایت ظلی سے مشرف ہونے کے بعد سالک مخلِص (بکسر اللام) اور ولایت اصلی سے مشرف ہونے پر مخلَص (بفتح اللام) ہو جاتا ہے اور مناصب صوفیاء ابدال، نجباء، نقباء، غوث، قطب وفرد وغیرہ کا مدار بھی اسی معرفت پر ہے، نہ کہ عوام الناس کی طرح ہر راہ گیر کو ان مناصب پر فائز کر دیا جاتا ہے۔

خدا زاں خرقہ بیزار است صد بار
کہ صد بت باشدش در آستینے

(۵) بیعت حقیقت: اسی کو بیعت انبیاء علیہم السلام بھی کہا جاتا ہے۔ اگر سالک مقامات قرب کی پوری پوری استعداد رکھتا ہو جیسے انبیاء کرام علیہم الصلوات والتسلیمات میں ہوتی ہے یا ان کے اکابر اصحاب میں ہوتی ہے یا امت کے چند گنے چنے اکابر میں ہوتی ہے، وہ اس مقام سے ممتاز ہوتے ہیں جس میں تجلی ذاتی دائمی سے سالک بہرہ ور ہو جاتا ہے، لطائف ستہ کی فنا وبقا کے ساتھ ساتھ عناصر اربعہ کے تزکیہ واعتدال سے بھی حظ وافر حاصل کر لیتا ہے اور آنحضرت جل سلطانہ کا پورا پورا معتمد ہو جاتا ہے اور انتہائی آخری قرب حق حاصل کر لیتا ہے۔ کمالات ثلاثہ، حقائق انبیا وحقائق الٰہیہ سے متحقق ہو جانا، حقائق شرع سے تحقق ہونے کی بنا پر شرع کے بدیہی الیقین ہونے کا شرح صدر ہو جانا، براہ راست حضرت حق جل مجدہ سے مستفیض ہونا، مقام عبدیت سے مشرف ہونے کی بنا پر ہمہ تن بندہ بن کر رہنا اس کے لوازمات میں سے ہے۔ مقام مشاہدہ ومعاینہ وقرب فرائض وسیر لاہوت اسی کو کہتے ہیں۔ شرع شریف کے تمام پہلوؤں شریعت، طریقت، معرفت، حقیقت، سیاست کا علمی وعملی طور پر جامع ہونا، ترویج شریعت میں علماً واصلاحاً وجہاداً ہمہ تن کوشاں رہنا، رائج الوقت باطل سیاسی نظام کا اس کی کوشش سے مکمل درہم برہم ہو جانا، شرعی سیاسی نظام کا رائج ہو جانا، اس کے ہشت پہلو اصلاحی آثار کا دیرپا اور ہمہ گیر ہونا، وجود کا نفس الامری جنتی ہو جانا اور کاتب شمال کو نہ پانا، غرضیکہ 'آنچہ خوباں ہمہ دارند تو تنہا داری' کا مکمل مصداق ہو جانا اس کے آثار میں سے ہے۔ معرفت وحقیقت کے تمام مقام وہبی ہیں۔

لبت شکر بمستاں داد وچشمت مے بے خواراں
منم کز غایت حرماں نہ با آنم نہ با اینم

بیعت کی ان تمہیدی اقسام کے بعد عرض ہے کہ والد محترمؒ امام الموحدین، راس المفسرین، شیخ المشائخ حضرت مولانا حسین علیؒ سے بیعت ومستفیض تھے جو کہ براہ راست خواجہ عثمان دامانیؒ کے خلیفہ اجل تھے۔ خواجہ عثمانی دامانیؒ کے دست مبارک سے تحریر فرمودہ خلافت نامہ جو مولانا حسین علیؒ کو بوقت خلافت عنایت فرمایا، راقم الحروف کو خود دیکھنے کی سعادت حاصل ہے جو کہ سوا سو سال پہلے کا تحریر فرمودہ ہے۔ جیسا کہ بندہ نے قبل ازیں عرض کی، والد صاب کا سلوک براستہ علم طے شدہ تھا۔ سلوک متعارف سے بالکل طبعی مناسبت نہ تھی۔ فنا فی العلم ہونے کی بنا پر شریعت وارشاد پر اکتفا فرماتے تھے۔ استقامت علی التوحید، اتباع شریعت وسنت کے سبق کے ساتھ تبلیغی اوراد ثلاثہ کی اجازت مرحمت فرماتے تھے۔ اصلاح لطائف بطریقہ معروفہ، ذکر اسم ذات، نفی اثبات مروج یا اسباق سلوک متعارف کی طرف قطعاً رجحان نہ تھا۔ بیعت شریعت اور باقی تینوں بیعتوں کے لوازم وآثار میں فرق ذکر ہو چکا ہے جن کو یہاں دہرانا فضولیات میں داخل ہوگا۔ ع

ذوق ایں مے نشناسی بخدا تا نہ چشی

من نیز حاضر بودم
چوں رفت او سوے بقا

راقم الحروف پر حضرت حق جل مجدہ کی خصوصی عنایت یہ ہوئی کہ حضرات شیخین رحمہما اللہ تعالیٰ کی وفات کے وقت بندہ گھر میں تھا۔ حضرت صوفی صاحبؒ کی وفات سے دو روز قبل بندہ والد صاحبؒ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ چنانچہ عین وفات کے دن بندہ اکیلا ہی والد صاحبؒ کے پاس بیٹھا ہوا تھا کہ والد صاحبؒ کی خاص خادمہ ہماری بھانجی باہر سے آئی اور میرے کان میں آہستہ سے کہا کہ صوفی صاحبؒ وفات پا گئے ہیں، ابا جی کو بتانا ہے یا نہیں؟ والد صاحبؒ نے اس کو میرے کان میں بات کرتے ہوئے دیکھ لیا تھا، لیکن خاموش رہے۔ بھانجی جلدی سے واپس چلی گئی۔ برادرم قاری راشد صاحب سلمہ ربہ آ پہنچے اور میری طرف دیکھتے ہوئے اشارہ سے لائحہ عمل پوچھا تو ہم نے حسب روایت دنیا تمہیدی طور پر صوفی صاحبؒ کی حالت کی نزاکت کا ذکر کیا۔ والد صاحبؒ نے دعا کے انداز میں دونوں ہاتھ اٹھاتے ہوئے فرمایا، اللہ خیر کرے۔ چند منٹ کے توقف سے وفات کی خبر ناگزیر ہونے کی بنا پر بتانا پڑا کہ صوفی صاحب وفات پا گئے ہیں تو خاص لہجے میں حسب عادت فرمایا کہ صوفی؟ عرض کی جی ہاں تو تین بار آواز بلند ترجیع فرمائی۔ والد صاحب کو جنازے پر لے جانے کے لیے بندہ نے اپنی گاڑی پیش کی اور خود بندہ کسی اور ذریعے سے حاضر ہوا۔ آنحضرت جل سلطانہ غریق رحمت فرمائیں، حضرت صوفی صاحبؒ ایک جامع الصفات شخصیت تھے اور کافی وجوہ سے اپنے اقران میں ممتاز تھے، خاص کر تصوف کو علمی طور پر سمجھنے اور تصوف کی تصنیفی خدمات کے حوالے سے از بس منفرد تھے۔

لائی حیات آئے، قضا لے چلی چلے
اپنی خوشی نہ آئے نہ اپنی خوشی چلے

اسی طرح والد صاحبؒ کی وفات سے دو تین روز قبل حضرت حق جل مجدہ نے مجھ کم نصیب کو پہنچایا۔ حیات مبارکہ کے آخری تین سالوں میں بندہ جب حاضر ہوتا، والد صاحبؒ کا ہاتھ سلام لیتے وقت پکڑ کر ضرور چومتے اور بوقت رخصت ہاتھ دیر تک تھامے رکھتے اور ٹکٹکی باندھ کر چہرہ کو دیکھتے رہتے جس سے آخری ملاقات کا خدشہ ذہن پر چھا جاتا۔ والد صاحبؒ نے

بایں علم وفضل آخر عمر میں ایک لمبا عرصہ بیماری کی وجہ سے چارپائی پر گزارا۔ اس کے پیچھے کیا تشریعی وتکوینی راز تھے، آنحضرت جل سلطانہ ہی بہتر جانتے ہیں۔ کاش کہ حضرت حق مجھے اپنے معاملات کے اسباب اور رازوں کا علم بخشیں۔

ہر کس نشناسندۂ راز ست وگرنہ
این ہا ہمہ راز ست کہ معلوم عوام است!

ان آخری دو دنوں میں بندہ نے دو حوالوں سے والد صاحبؒ سے تفصیلی گفتگو بار بار کی۔ ڈاکٹر ملوی کے فلسفہ صحت کے مطابق بندہ نے عرض کی کہ جسمانی صحت کے لیے ذہنی صحت اور دماغ کا فریش ہونا ضروری ہے۔ اچھا بھلا صحت مند آدمی بھی ایک کمرے یں چند دن پڑا رہنے سے بیمار ہو جاتا ہے، چہ جائیکہ پہلے سے بیمار ہو۔ اس لیے آپ برائے مہربانی صبح شام کرسی پر کم از کم تھوڑی دیر کے لیے گھر کے صحن میں اور موسم خاطر خواہ ہونے پر گلی اور قریبی ہمسایوں کے پارک میں تشریف لے جایا کریں اور مہینہ میں ایک بار کسی دوسرے شہر بھی سیر وتفریح کے لیے تشریف لے جایا کریں۔ آپ کے ساتھ ساتھ خدام کا ذہن بھی فریش رہے گا۔ بندہ کے اصرار پر رضامندی ظاہر فرمائی کہ ٹھیک ہے، ایسا ہی کروں گا۔ ساتھ ہی بندہ نے عرض کی کہ عرصہ دراز سے آپ انگریزی علاج کرا رہے ہیں، نتائج آپ کے سامنے ہیں۔ صرف چند دن کے لیے یونانی علاج کرا کے دیکھیں۔ چنانچہ رضامندی ظاہر فرمانے پر کراچی والے حکیم صاحب کی دوائی کمرے میں پہنچانے کا ذکر بندہ کر چکا ہے، اور ساتھ ہی اعصابی اشیا سے پرہیز کا بندہ نے عندیہ دیا۔ اس کے برعکس عضلاتی وغدی انڈا شہد وغیرہ استعمال کرنے کی عرض کی، چنانچہ پرہیز شروع فرما دی۔ دوسرے دن بندہ ابھی آرام کر رہا تھا کہ بھانجی آئی اور کہا کہ ابا جان کہہ رہے ہیں، تمہارے کہنے پر انڈا استعمال کرنے لگا ہوں، لیکن اس سے قبض ہو جاتی ہے، کھاؤں یا نہ کھاؤں؟ بندہ نے عرض کی کہ ایک وقت انڈا اور دوسرے وقت شہد کا استعمال فرمائیں۔ شہد قبض کشا ہے، ان شاء اللہ دونوں ٹھیک رہیں گے۔

بوقت حاضری اپنی صحت کے بارے میں مجھ کم نصیب سے ضرور رائے لیتے۔ اس دفعہ صاف الفاظ میں دونوں دن فرمایا کہ تمہارا کیا خیال ہے کہ میں دوبارہ کبھی اٹھ کر چل پھر سکوں گا؟ یہ سن کر بندہ کا دل بھر آیا۔ عرض کی کہ مولا پاک آپ کو صحت دیں، حکیم صاحب کی دوائی صرف ایک ماہ پابندی سے استعمال فرما لیں، ان شاء اللہ ضرور چلنا پھرنا ہوگا۔ دوسرے دن بھانجی کو بھیج کر بلایا اور فرمایا کہ تمہارا کیا پروگرام ہے؟ بندہ نے عرض کی کہ فی الحال ادھر ہی ہوں۔ ہاتھ سے اشارہ فرمایا کہ بہتر ہے۔

آخری رات پورے بارہ بجے کے قریب بندہ بستر پر لیٹا ہی تھا، غالباً ابھی آنکھ بھی نہیں لگی تھی کہ کسی نے دروازے پر دستک دی۔ بندہ نے پوچھا کہ کون ہے، کیا بات ہے؟ بھانجی بولی کہ ابا جی کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے، جبکہ دو دن سے بندہ کی موجودگی میں کوئی تشویش ناک بات نہیں تھی۔ چنانچہ بندہ فوراً کمرے میں پہنچا۔ ہمشیرہ اپنی بچی سمیت، عزیزم شاہد وراشد اپنی اپنی اہلیہ سمیت موجود تھے۔ والد صاحبؒ خون کی قے کسی قدر کر چکے تھے اور متلی جاری تھی۔ بندہ نے نبض دیکھی، جسم مبارک کافی زیادہ ٹھنڈا ہو رہا تھا، چنانچہ سب نے ہاتھ پاؤں کی مالش شروع کی۔ دایاں دست مبارک مجھ کم نصیب کے ہاتھ میں تھا اور مکمل خاموش تھے۔ خیال ہوا کہ شاید بلڈ لو ہونے کی وجہ سے جسم ٹھنڈا ہو رہا ہے۔ نیم گرم پانی میں شہد حل کر کے پلانے کی کوشش کی لیکن ذہن مبارک نے قبول نہ کیا۔ بلڈ چیک کیا، وہ بھی تقریباً درست تھا۔ گکھڑ کے چند ڈاکٹروں سے فون پر اور گھر کے دروازوں پر دستک دے کر رابطہ کی کوشش کی، لیکن ہر طرف سے سعی لا حاصل ثابت ہوئی۔

اسی اثنا میں چند لمحوں کے لیے محسوس ہوا کہ صحت بحال ہونی شروع ہوئی ہے، چنانچہ دوبارہ لٹا دیا گیا۔ مکمل خاموش رہنے کے باوجود آنکھیں وقفوں سے کھولتے اور بند فرماتے رہے۔ لٹا دینے پر آنکھیں دو تین بار چھت کی طرف لگائے رکھیں، پھر بند فرما لیں۔ عزیزم راشد خادم خاص ڈاکٹر فضل الرحمٰن صاحب کے فون پر بار بار رابطہ کرنے کی کوشش کرتا رہا، لیکن بے سود۔ پھر خادم خاص حاجی لقمان صاحب کا فون ملا اور چند منٹ تک ڈاکٹر صاحب کو لے کر پہنچنے کی اطلاع دی۔ اسی دوران مکمل بے حسی کے عالم میں والد صاحب نے دایاں ہاتھ کافی تیزی اور پھرتی سے للکارنے کے انداز میں اٹھایا اور تین چار بار آواز بلند کوئی لفظ بولا جو کہ فالج کی وجہ سے بخوبی سمجھ نہ آ سکا۔ حاضرین نے سمجھا کہ شاید ہمشیرہ کو یا بھانجی کو آواز دی ہے، لیکن ظن غالب ہے کہ بازو کے اٹھانے کے ساتھ لفظ اللہ چند بار کہا۔ اسی آواز کی وجہ سے ہم نے سمجھا کہ صحت کسی قدر ہوش کی طرف آ رہی ہے۔ دوبارہ تکیہ لگا کر بٹھا دیا اور نبض ہاتھوں میں رہی۔ ایک دو بار اسی دوران آنکھیں عجیب انداز میں کھولیں اور پھر بند فرما لیں۔ تکلیف کے بارے میں پوچھا۔ اس کے جواب میں بھی معمولی الفاظ سے بولے۔ آنحضرت جل سلطانہ نے اپنی ارحم الراحمینی کا مظاہرہ فرمایا کہ اس تمام عمل میں کسی قسم کی جزع فزع، بے چینی، تکلیف کا اظہار والد صاحبؒ نے نہیں فرمایا۔ مکمل خاموشی اور چند بار قے کے بعد متلی کا احساس ہوا۔ چنانچہ اسی تکیے کی ٹیک کے دوران سانس چند منٹ آہستہ آہستہ آتے رہے، پھر ایک آدھ منٹ سانس کسی قدر معمولی تیز ہوئے اور پھر ہچکی کے ساتھ آخری سانس لیا اور جان شہنشاہ مطلق کے حوالے فرما دی۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

بھائیوں میں سے بڑا اس وقت یہ کم نصیب ہی پاس تھا۔ اس آخری سانس کے انداز سے سب حرکت میں آ گئے اور دوبارہ لٹا دیا گیا۔ بندہ نے نبض دیکھی تو بالکل ساقط ہو چکی تھی۔ عزیزم شاہد وراشد نے اسٹیتھو اسکوپ سے باری باری چیک کیا، لیکن بے سود۔ اتنی دیر تک مقامی ڈاکٹر صاحب پہنچے۔ انھوں نے بھی حرکت قلب اور نبض چیک کی اور پھر مصنوعی تنفس جاری کرنے کی کوشش کی، پھر سعی بے سود کے بعد غم کے عالم میں ایک طرف ہو گئے، لیکن زبان کچھ کہنے کے لیے ساتھ نہیں دے رہی تھی۔ مجبوراً سر سے سہارا لیتے ہوئے نفی میں سر ہلا دیا۔ اسی دوران خدام خاص ڈاکٹر فضل الرحمٰن صاحب مع حاجی لقمان صاحب تشریف لے آئے۔ دروازے سے داخل ہوتے ہی اترے ہوئے چہروں سے صورت حال کی نزاکت کو بھانپ گئے۔ آتے ہی نبض چیک کی۔ اسٹیتھو اسکوپ سے حرکت قلب معلوم کرنے کی کوشش کی، لیکن 'حیف در چشم زدن صحبت یار آخر شد' کی بنا پر تقریباً لڑکھڑاتے ہوئے ایک طرف ہو گئے۔ جو ڈاکٹر صاحب روزانہ معالج خاص ہونے کی بنا پر والد صاحبؒ کی ڈھارس بندھانے کی خاطر تشریف لایا کرتے تھے، آج بڑی بے بسی کے ساتھ حزن وغم کی تصویر بنے خود کھڑا ہونے کے لیے کسی سہارے کی تلاش میں تھے۔ بصد کوشش زبان سے کچھ نہ کہہ سکے، بلکہ بچشم تر بزبان حال

دریں آشوب غم عذرم بنہ گر نالہ زن گریم
جہانے را جگر خوں شد ہمیں تنہا نہ من گریم

کہتے ہوئے وفات کی تصدیق کر دی۔ سب پر سکتہ طاری تھا۔ بشدت غم کسی کی زبان سے کوئی لفظ نہ نکل رہا تھا، جبکہ والد صاحب بظاہر خاموش، بباطن بہزار اکرام واعزاز حظیرۃ القدس کی حدیں چھو رہے تھے۔ مستورات جو ڈاکٹرز کی آمد کی بنا پر کمرے سے نکال دی گئی تھیں، اگرچہ بصورت ہچکی آخری سانس دیکھ چکی تھیں، لیکن حتمی رپورٹ کی تہہ تک پہنچنے کے لیے اندر

آنے کے لیے رسے تڑا رہی تھیں۔ بصد کوشش روکی گئیں۔ چند منٹ اسی سکتے اور خاموشی کے عالم میں سب ہی بحالت غم کھڑے رہے۔ بندہ نے خاموشی توڑتے ہوئے ڈاکٹر صاحب کو دوبارہ چیک کرنے کی عرض کی۔ دوبارہ چیک کرنے پر ڈاکٹر صاحب نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے پاؤں مبارک کو بوسہ دیا اور جسم مبارک کو سیدھا کرتے ہوئے دہن مبارک اور آنکھیں بند کر کے وفات پر مہر تصدیق ثبت کر دی۔ باندھنے کی اشیاے ضرورت لینے باہر تشریف لے گئے۔ تمام اہل خانہ فوراً واپس پہنچ آئے اور ماحول یک دم 'از نالہ بر گلستاں آشوب محشر آور' کا نمونہ بننا ناگزیر تھا۔

آناً فاناً خبر اطراف واکناف میں پھیل گئی۔ ابھی ہم بھائی جسد مبارک پر چادر ڈال ہی رہے تھے کہ خلق خدا تانتا باندھے پہنچنا شروع ہو گئی۔ دیکھتے ہی دیکھتے سینکڑوں سے ہزاروں اور ہزاروں سے لاکھوں تک نوبت جا پہنچی اور ازدحام کثیر گکھڑ کی تنگ دامنی کا گلہ کرنے لگی۔ زمین تو زمین، آسمان نے بھی یہ منظر عرصے بعد دیکھا ہوگا۔ پھر بوقت جنازہ کثرت خلق کی بنا پر میلوں تک ٹریفک کا جام ہو جانا اور کثیر خلق کا جنازہ گاہ تک نہ پہنچ سکنا تقریباً سب قارئین کے سامنے ہے، جس کے کہنے کی ضرورت نہیں ہے۔

آخر کو گل صرفِ درمے کدہ ہوئی
پہنچی وہیں پہ خاک جہاں کا خمیر تھا

زندگی میں بارہا خصوصاً بچپن میں مقام لحد سے بارہا گزرنا ہوا، لیکن کبھی وہم وگمان میں بھی نہ گزرا تھا کہ یہ خطہ ارض اتنا عظیم الشان بابرکت ہوگا کہ کسی وقت خزانہ علم وفضل کو اپنی آغوش میں لیے رشک جناں ہوگا۔ واقعی گکھڑ کی زمین کو عموماً اور شرقی قبرستان کو خصوصاً اور خاص مقام لحد کو انصاً بہت بڑی بھاری فضیلت وفخر حاصل ہے کہ خصوصی عنایات خداوندی وانوار وبرکات کا مہبط ومورد بننے کا شرف دائمی حاصل کر سکی۔ وکفی بہ فخرا

فيه السماحة والفصاحة والتقى
والعلم اجمع والحجى والخير

اللهم لا تحرمنا اجره ولا تفتنا بعده۔ آنحضرت جل سلطانہ والد صاحبؒ کے ساتھ ان کے شایان شان سلوک فرمائیں اور ہم پس ماندوں کو ان کے نقش قدم پر چلاتے ہوئے ان کی برکات سے پوری طرح مستفیض ہونے کی توفیق بخشیں۔ بر کریماں کارہا دشوار نیست۔ آخر میں خدام وخواص عزیزم راشد سلمہ ربہ، ان کی اہلیہ، ہمشیرہ اور بھانجی اور دیگر خدام بھائی اور اہل خانہ، نیز ڈاکٹر فضل الرحمٰن صاحب، حاجی لقمان صاحب، مولانا نواز بلوچ صاحب کو انصاً اور تمام اہل خدمت جنھوں نے دامے درمے قدمے سخنے یا کسی بھی رنگ میں والد صاحب کی خدمت فرمائی، حضرت حق جل مجدہ دنیا وآخرت کی ہر طرح کی خوش حالیوں سے نوازیں، اپنی عنایات وبرکات کے دروازے ان پر ہمیشہ کے لیے کھلے رکھیں اور ہر طرح کی آفات سے ہمیشہ بچائے رکھیں۔ آمین یارب العالمین والحمد للہ رب العالمین۔

مولانا محمد فیاض خان سواتی*

دو مثالی بھائی

جزیمہ عراق کے بادشاہوں میں سے تھا۔ اس کے دو ندیم ومصاحب تھے، ایک کا نام مالک اور دوسرے کا نام عقیل تھا۔ وہ دونوں کبھی ایک دوسرے سے جدا نہیں ہوتے تھے، حتیٰ کہ اس کی مصاحبت میں چالیس سال اکٹھے رہے، لیکن واقعہ ردّت میں حضرت خالد بن ولیدؓ کے ایک لشکری حضرت ضرار بن الازورؓ کے ہاتھوں مالک بن نویرہ قتل ہو گیا تو اس کے بھائی متمم بن نویرہ یربوعی نے اپنے بھائی مالک کے بارے میں ایک مرثیہ پڑھا۔ عربی ادب میں متمم کے مراثی کو ایک خاص مقام حاصل ہے جس کا اندازہ اس بات سے بخوبی لگایا جا سکتا ہے کہ اس کے اشعار ومراثی کو حضرت عمرؓ بھی پسند فرماتے تھے۔ اس نے مالک اور عقیل کی جدائی پر بڑا دل دوز مرثیہ کہا تھا۔ یہی مرثیہ ام المؤمنین حضرت عائشہ صدیقہؓ نے بھی مکہ مکرمہ آمد کے موقع پر مقام حُبشی میں اپنے بھائی حضرت عبد الرحمٰن بن ابی بکرؓ کی قبر پر پڑھا تھا۔ میں بھی آج شیخین کریمینؒ کی پہلے آپس کی جدائی اور پھر ہم سے جدائی پر اسی مرثیہ کو کہنا چاہتا ہوں جو ان دونوں بھائیوں کے حالات کی مکمل عکاسی کرتا ہے۔ اس مرثیہ کو امام ترمذیؒ نے اپنی کتاب ترمذی شریف ج ۱ ص ۲۰۳ میں نقل کیا ہے:

و(كنا) كندماني جزيمة حقبة من الدهر حتى قيل لن يتصدعا
فلما تفرقنا كاني ومالكا لطول اجتماع لم نبت ليلة معاً

''ہم ایک عرصہ تک جزیمہ کے دو مصاحبوں (مالک وعقیل) کی طرح (جدا نہیں ہوتے) تھے، یہاں تک کہ کہا جانے لگا کہ یہ دونوں ہرگز جدا نہ ہوں گے۔ پھر جب ایک طویل عرصہ ساتھ رہنے کے بعد (موت کی وجہ سے) ہم جدا ہوئے تو ایسے ہو گئے گویا میں نے اور مالک نے ایک رات بھی کبھی ساتھ نہیں گزاری۔''

نور احمد خان سواتیؒ کو پہلی بیوی رحمت نورؒ سے اللہ رب العزت نے ایک بیٹا عبد الغفور نامی عطا فرمایا تھا جو نو عمری میں ہی وفات پا گیا۔ پھر تیس سال تک یہ جوڑا بے اولاد رہا۔ نیک شعار بیوی نے کوشش کی کہ ان کا خاوند دوسرا نکاح کر لے، چنانچہ ان کا دوسرا نکاح بختاور بی بیؒ سے ہوا، اللہ رب العزت نے اس سے دو بیٹے اور دو بیٹیاں عنایت فرمائیں۔ یہ بڑھاپے کی اولاد تھی کیونکہ نور احمد خانؒ کا انتقال تقریباً سو سال کی عمر میں ۱۹۳۱ء میں ہوا تھا جبکہ ان کی بڑی بیٹی حکم جان المعروفہ دڈےؒ کی ولادت ۱۹۱۲ء میں، بڑے بیٹے محمد سرفرازؒ کی ولادت ۱۹۱۴ء میں، دوسرے بیٹے عبد الحمیدؒ کی ولادت ۱۹۱۷ء میں اور دوسری بیٹی بی بی خانم کی ولادت ۱۹۲۰ء میں ہوئی۔ گویا نور احمد خانؒ کو اللہ رب العزت نے یہ اولاد تقریباً ۸۰ سال کی عمر میں عطا فرمائی تھی۔ وہ اپنے بچوں کے لیے تہجد کے وقت اٹھ کر یہ دعا کیا کرتے تھے کہ ''اے اللہ ان کو قرآن، حدیث اور فقہ کا علم عطا فرما''۔

* مہتمم مدرسہ نصرۃ العلوم، گوجرانوالہ

اللہ رب العزت کی بارگاہ میں ان کی مناجات ایسی مقبول ہوئی کہ ان کے دونوں بیٹے قرآن وحدیث اور فقہ میں دنیا کے امام ہوئے۔ آج اگر نور احمد خانؒ موجود ہوتے اور اپنی آنکھوں کے ساتھ مشاہدہ کرتے کہ ان کی دعا کے کیا ثمرات ہیں تو ان کا دل باغ باغ ہو جاتا اور وہ اپنی قسمت پر پھولے نہ سماتے کہ ان کے بیٹوں کا فیض دنیا کے تمام براعظموں میں پھیلا ہوا ہے۔ لیکن قضا وقدر کے فیصلے بڑے عجیب ہوتے ہیں۔ وہ اپنی ساری اولاد چھوڑ کر عالم آخرت کو سدھار گئے۔ چھوٹی بچی ابھی صرف چالیس دن کی تھی کہ ان کی والدہ بھی ۱۹۲۰ء میں عالم جاودانی کی طرف رحلت فرما گئی۔ ان بچوں کو ان کی بڑی والدہ نے ہی سنبھالا جو ۱۹۴۹ء میں فوت ہوئیں اور گکھڑ کے قبرستان میں دفن ہیں۔ حقیقی والدہ کی وفات کے بعد زمانے کے حوادثات نے انہیں گھیر لیا۔ گھربار، زمین و جائیداد چھوٹ گئے اور در در کی ٹھوکریں مقدر ہو گئیں۔ دینی تعلیم کا آغاز تو نور احمد خانؒ اپنی زندگی ہی میں انہیں کرا چکے تھے، ملک بھر کے دینی مدارس کی خاک چھانی، بھوک اور افلاس برداشت کیے اور وقت کی گاڑی کو آگے دھکیلتے رہے۔ جنگل میں بکریاں بھی اکٹھے چراتے رہے۔ دو بھائی اب سفر وحضر میں دوساتھی اور دوست بھی بن گئے۔ بڑا باپ کی جگہ تھا اور چھوٹا اولاد کی جگہ ان کی قدر ومنزلت بجالاتا تھا۔ ایک دوسرے سے جدا ہونے کا تصور بھی انہیں پریشان کر دیتا تھا۔ چھوٹے بھائی کے ذہن پر یتیمی کے اثرات زیادہ تھے، تعلیم میں ان کا دل نہ لگتا تھا، اسی لیے وہ کبھی ادھر ادھر بھاگ بھی جاتے تھے، لیکن بڑے بھائی کٹھن حالات میں بھی ان کا تعاقب جاری رکھتے۔ یوں تعلیمی دور بھی اپنی منزل کی طرف رواں دواں رہا۔ عمر میں معمولی تفاوت کی وجہ سے فطری طور پر کبھی آپس میں نوک جھونک بھی ہو جاتی۔ بڑا چھوٹے کو مار بھی لیتا۔ ایک بار چھوٹے نے بھی پتھر مار کر بڑے کا سر زخمی کر دیا، لیکن پھر بھی ساتھ جاری رہا۔ بڑا چھوٹے کے لیے قربانیاں دیتا، چھوٹا بڑے کی خدمت بجالاتا، ان کے کپڑے دھوتا، کھانا لاتا، ان کی دیگر ضروریات کا خیال رکھتا، حتیٰ کہ دارالعلوم دیوبند میں تعلیم کے دوران ۱۹۴۱ء میں جمعیۃ علماے ہند کی کانفرنس لاہور میں منعقد ہوئی تو اس میں دارالعلوم دیوبند کے کثیر طلبہ نے شرکت کی، لیکن ان دو بھائیوں کا حال یہ تھا کہ کرایہ نہ تھا۔ صرف اتنے پیسے تھے کہ دونوں میں سے ایک ٹکٹ خرید سکتا تھا تو چھوٹے نے بڑے سے کہا کہ آپ اس میں شریک ہو جائیں، میں یہیں رہتا ہوں۔ تعلیمی دور میں اسباق اور درجوں کا بھی تفاوت رہا، لیکن دورۂ حدیث شریف کے لیے بڑے نے چھوٹے کے لیے قربانی دی کہ اس کے اسباق مکمل ہو جائیں تو اکٹھے دارالعلوم دیوبند جا کر دورۂ حدیث کریں گے، چنانچہ ایسا ہی ہوا۔

دیوبند سے فراغت کے بعد بڑا ۱۹۴۳ء میں گکھڑ میں امام وخطیب متعین ہو جاتا ہے، لیکن پہلے ہی جمعے کو علیل ہو جانے کی وجہ سے اس کی جگہ پہلا جمعہ چھوٹا بھائی پڑھاتا ہے۔ بعد ازاں چھوٹا بھائی مزید تعلیم کے لیے دارالمبلغین لکھنؤ اور پھر نظامیہ طبیہ کالج حیدر آباد دکن چلا جاتا ہے۔ اس دوران برابر خط وکتابت جاری رہتی ہے اور ایک دوسرے کے حالات سے آگاہی رکھی جاتی ہے۔ بڑا چھوٹے کے لیے رقم بھی بھیجتا رہتا ہے۔ بڑے کی گوجرانوالہ میں ۱۹۴۵ء میں پہلی اور پھر بعض مجبوریوں کی وجہ سے ۱۹۵۲ء میں دوسری شادی ہو جاتی ہے۔ چھوٹے کے لیے وہ بڑی کوشش کرتا ہے کہ یہ بھی شادی کر لے لیکن وہ شادی کے لیے تیار نہیں ہوتا۔ چھوٹا دکن سے واپس آ کر گوجرانوالہ میں مطب کھولتا ہے۔ ایک سال مطب چلاتا ہے لیکن قدرت اس سے کوئی بڑا کام لینا چاہتی ہے۔ وہ مطب کو چھوڑ کر ایک جوہڑ کے کنارے بیٹھ جاتا ہے اور مدرسہ نصرۃ العلوم کے نام سے ۱۹۵۲ء میں ایک مکتب کی داغ بیل ڈالتا ہے جو دیکھتے ہی دیکھتے پاکستان کے قابل قدر مدارس میں شمار

ہونے لگتا ہے۔ وہ بڑے بھائی کو بھی نہیں چھوڑ سکتا، سو ۱۹۵۵ء میں اسے بھی یہاں لے آتا ہے۔ اب ۲۰۰۱ء تک دونوں بھائیوں کا ہر روز ملاپ ہونے لگتا ہے، روزانہ دکھ سکھ ہوتا ہے، تبادلہ خیالات ہوتا ہے، ایک دوسرے کی ضروریات و احساسات کو دیکھا اور پرکھا جاتا ہے، باہمی میل جول اور تعاون کے مواقع میسر آتے ہیں۔

بڑے بھائی کو اللہ رب العزت اپنے فضل وکرم کے ساتھ دونوں ہی بیویوں سے اولاد نوازتا ہے، لیکن اسے چھوٹے بھائی کی شادی کی فکر بھی ہر وقت دامن گیر ہے، حتیٰ کہ ایک دن وہ چھوٹے سے یہ بھی کہہ دیتا ہے کہ "اب تو لوگ بھی مجھے طعنہ دینے لگے ہیں کہ اپنی تو دو شادیاں اور بھائی کی ایک بھی نہیں" لیکن چھوٹا پھر بھی نہیں مانتا، کیونکہ اس کے پاس مکان نہیں ہے، بیوی کو سنبھالنے کے لیے مال ومتاع نہیں ہے، لیکن بڑا پوری تگ ودو میں ہے کہ اس کی شادی کرادوں۔ بھلا انکار کب تک ہو سکتا تھا، ہمیشہ سے ہی بڑے بھائی کی بات مانتا چلا آیا تھا۔ ایک دن ہتھیار ڈال دیے اور غصے میں یہ بھی کہہ دیا کہ "شادی تو کرادو گے، سنبھالے گا کون؟" چنانچہ بڑا ۱۹۶۳ء میں گکھڑ میں چھوٹے کی شادی کرا دیتا ہے۔ چھوٹے کی عمر اس وقت چھیالیس سال سے زائد ہو چکی ہوتی ہے، یہی وجہ ہے دونوں بھائیوں کی اولاد میں عمروں کے تفاوت کی۔ شادی کے بعد بڑا بھائی چھوٹے کی بیوی کو اپنے گھر میں رکھتا ہے۔ کچھ عرصے کے بعد چھوٹے کے لیے مسجد ومدرسہ کی طرف سے گوجرانوالہ میں رہائش گاہ تیار ہو جاتی ہے اور وہ وہاں منتقل ہو جاتے ہیں۔ بڑے بھائی کے بچے اپنے چچا اور چچی کے پاس اکثر رہتے ہیں، وہیں قیام کرتے ہیں اور تعلیم حاصل کرتے ہیں۔ پھر چھوٹے بھائی کو بھی اللہ تعالیٰ اولاد سے نوازتا ہے۔ بچے جب شعور کی مدت کو پہنچتے ہیں تو انہیں پتہ چلتا ہے کہ ان کے تایا جان جنہیں وہ بڑے ابو کہتے ہیں، ان سے بے پناہ محبت کرتے ہیں۔ جمعرات کے دن اپنے بچوں کے ساتھ انہیں بھی اکثر ساتھ گکھڑ لے جاتے ہیں اور پھر ہفتے کے دن ساتھ ہی واپس لے آتے ہیں۔ اس ایک آدھ دن کے دوران ان بچوں کے ناخن خود تراشتے ہیں، حجام سے ان کے سر کا حلق بھی کرا دیتے ہیں اور اپنے دیرینہ معمول کے ساتھ ساتھ کبھی بچوں کو بھی جلاب دے دیتے ہیں، زندگی کے نشیب وفراز طے کرتی ہوئی گاڑی تیزی سے آگے بڑھتی چلی جاتی ہے۔

ایک وقت ایسا بھی آتا ہے کہ دونوں بھائی، دونوں ساتھی، دونوں آپس میں سمدھی بھی بنتے ہیں۔ بڑے بھائی کا بیٹا اور چھوٹے بھائی کی بیٹی ہے۔ شادی ہوتی ہے، ایک بچی بھی اللہ تعالیٰ عطا فرماتا ہے، لیکن قدرت کو نباہ منظور نہیں ہے، طلاق کی صورت میں علیحدگی ہو جاتی ہے۔ یہ وقت دونوں کے لیے انتہائی کٹھن اور صبر آزما ہے۔ بڑے بھائی کی پوتی چھوٹے بھائی کی بہو بھی ہے، خاندان کے دولخت ہونے کا شدید خطرہ ہے، دینی اور مسلکی طور پر نقصان کا اندیشہ الگ ہے۔ مخالف قوتیں حرکت میں آجاتی ہیں، دونوں بھائیوں کو اکسا کر خاندان، مسلک اور ادارہ کو تباہ کرنے کے منصوبے گردش کرنے لگتے ہیں۔ ایسی صورت میں چونکہ بچی والے زیادہ متاثر ہوتے ہیں، لوگوں کی ہمدردیاں بھی بظاہر ان کا ساتھ دیتی ہیں، لیکن چھوٹا بھائی اس موقع پر قربانی دیتا ہے اور تمام منصوبوں اور ریشہ دوانیوں کو یہ کہہ کر ہمیشہ کے لیے تاراج کر دیتا ہے کہ "بچے بچی کا نبھاہ نہیں ہوا بس قدرت کو یہی منظور تھا، میرا بڑا بھائی میرے باپ کی جگہ ہے اور اس وقت وہ ہمارے خاندان کا سربراہ بھی ہے، میں ان کے ساتھ لڑائی جھگڑے کے لیے قطعاً تیار نہیں ہوں اور آئندہ اس موضوع پر کوئی بھی میرے ساتھ بات کرنے کی کوشش نہ کرے۔" اس کے ساتھ ہی ہر طرف سے چہ میگوئیوں کے دروازے بند ہو جاتے ہیں۔ خاندان جڑا رہتا ہے۔ زندگی پھر معمول کے مطابق رواں دواں ہو جاتی ہے۔ دونوں بھائی اور ان کی اولاد ایک ہی ادارہ میں پڑھاتے ہیں۔ بڑے

بھائی کی نواسی کو چھوٹا بھائی اس کے بعد بھی اپنی بہو بنا کر لے آتا ہے۔

دونوں بھائی صد سالہ اجلاس میں دار العلوم دیو بند اکٹھے جاتے ہیں۔ رائے ونڈ کے اجتماع میں اکٹھے آنا جانا رہتا ہے۔ آپس میں شادیوں اور غمیوں کے مواقع میں آتے جاتے ہیں۔ دونوں بھائی ایک ادارہ میں آخر تک پڑھاتے رہتے ہیں۔ بڑا صدر مدرس ہے تو چھوٹا مدرس ہے۔ بڑا شیخ الحدیث ہے تو چھوٹا مہتمم ہے۔ بڑا ناظم تعلیمات ہے تو چھوٹا خطیب ہے۔ ایک بخاری کی ایک جلد پڑھاتا ہے تو دوسرا دوسری جلد پڑھاتا ہے۔ ایک ترمذی کی پہلی جلد پڑھاتا ہے تو دوسرا دوسری جلد پڑھاتا ہے۔ دونوں ہی ادارہ کے روح رواں ہیں۔ یک قالب، دو جان ہیں۔ بڑا ہر روز چھوٹے کے گھر میں دو دفعہ آتا ہے، چھوٹا بھی بڑے کے ہاں گکھڑ آتا جاتا ہے۔ ایک دوسرے کے ساتھ ہنسی مزاح بھی ہوتا ہے، علمی تبادلہ بھی جاری رہتا ہے۔ بڑا چھوٹے کے متعلق لکھتا ہے تو چھوٹا بھی بڑے کے متعلق رطب اللسان ہے۔ بڑا چھوٹے کے ساتھ شفیق ہے تو چھوٹا بڑے پر فخر کرتا ہے۔ بڑا اگر کسی معاملہ میں پریشان ہوتا ہے تو سب سے پہلے چھوٹے کو بتاتا ہے۔ چھوٹا اگر پریشان ہوتا ہے تو بڑے سے مشورہ کرتا ہے۔ بڑے کو مکہ مکرمہ میں اگر پتہ چلتا ہے کہ چھوٹے پر مقدمہ بن گیا ہے تو وہ وہاں سے ہی خط لکھ کر تسلی دیتا ہے۔ تقریر میں جارحانہ انداز اپنانے سے منع کرتا ہے تو چھوٹا بات مانتا ہے۔ بڑا اپنی پریشانی کا اظہار اگر خط میں کرتا ہے تو چھوٹا خط میں انہیں تسلی اور دعا دیتا ہے۔ بڑا ختم نبوت کے لیے جیل جاتا ہے تو چھوٹا بھی جیل جاتا ہے۔ بڑا تحریک نظام مصطفی صلی اللہ علیہ وسلم میں جیل جاتا ہے تو چھوٹا بھی ان کے پاس جانے کے لیے کوشش کرتا ہے، لیکن اسے گرفتار نہیں کیا جاتا۔ دونوں کی شکل بھی یکساں ہے۔ ایک نظر دیکھنے والا پہچان نہیں پاتا۔ بہت سے لوگ مغالطہ کھا جاتے ہیں۔ زندگی بھر ساتھ جاری رہتا ہے حتیٰ کہ پورا خاندان کیا، پورا عالم اس جوڑی پہ رشک بھری نظروں سے فخر کرتا ہے۔

پھر دونوں اکٹھے ہی بیمار ہو جاتے ہیں۔ دونوں اکٹھے ہی تدریس چھوڑ دیتے ہیں۔ دونوں اکٹھے ہی صاحب فراش ہو جاتے ہیں، لیکن ایک دوسرے کی خبر گیری پھر بھی جاری رہتی ہے۔ کبھی بڑا چھوٹے کو ملنے کے لیے گوجرانوالہ آجاتا ہے تو کبھی چھوٹا بڑے کو ملنے کے لیے گکھڑ چلا جاتا ہے۔ بڑا بھائی جب چھوٹے کے ساتھ آخری ملاقات کے لیے آتا ہے تو اسے بے ہوش دیکھ کر بے چین ہو جاتا ہے۔ اس کی کیفیت دیکھ کر ٹانگ میں ایک دم کھنچاؤ پیدا ہو جاتا ہے اور تھوڑی دیر ٹکٹکی باندھ کر اسے دیکھے جاتا ہے اور پھر صبر نہیں کر سکتا اور کہہ اٹھتا ہے کہ ”مجھ سے اس کی کیفیت دیکھی نہیں جا رہی، مجھے فوراً گکھڑ واپس لے چلو“۔ یہ دونوں بھائیوں کا زندگی میں آخری ملاپ تھا۔ پھر جب بڑا چھوٹے کی میت کے پاس وہیل چیئر پر بیٹھ کر آتا ہے، اس کے چہرے پر اپنا ہاتھ پھیر کر آسمان کی طرف منہ اٹھا کر آنسو بہاتا ہے تو سارے اردگرد کے ماحول میں کہرام مچ جاتا ہے۔ ایک آواز بلند ہوتی ہے کہ ”آج آپ کی جوڑی ٹوٹ گئی ہے“۔ سارا ماحول سوگوار ہو جاتا ہے، ہر آنکھ اشک بار ہو جاتی ہے۔ ۶؍اپریل ۲۰۰۸ء میں ایک صدی کے لگ بھگ کی رفاقت آج ٹوٹ رہی ہے، ماوشما کا دل کیا جانے، پوچھ ان سے جن کی دنیا اُجڑ گئی۔ ساحل کے قریب سفینہ ڈوب گیا۔ ایک لٹے ہوئے مسافر کی طرح گکھڑ واپس جانے والا، اب اندر ہی اندر سے گھلنے لگا تھا، اپنی عادت سے مجبور کیف دل کسی پر افشا نہیں کر سکتا تھا۔ جس کے ساتھ دکھ سکھ تھا، وہ تو رہا ہی نہیں، اب زندگی کی گاڑی دن بدن رفتار کم کرنا شروع ہو جاتی ہے، دوائی دارو بھی کام کرنا چھوڑ دیتے ہیں۔ پھر وہ وقت بھی آجاتا ہے کہ کھانا پینا چھوٹ جاتا ہے، گفتگو بند ہو جاتی ہے، غنودگی کی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے۔ بڑے اور چھوٹے کی کیفیت آخری مراحل میں یکساں ہو جاتی ہے اور

وہ ایک سال ۲۹ دن کے صبر آزما انتظار کے بعد چھوٹے کا تعاقب کرتے ہوئے اس کو پا لیتا ہے۔ اس کی روح کو مکتی مل جاتی ہے۔ خاندان کی ایک خاتون کی آواز بلند ہوتی ہے، ”ساری زندگی تعاقب میں رہا، موت کے بعد بھی تعاقب جاری رکھا اور اس کے پاس پہنچ کے چھوڑا۔“ یہ دو بھائی، دو ساتھی، کیا ان کی مثال پیش کی جا سکتی ہے؟

۳ رمئی ۲۰۰۹ء کی رات میں خواب میں دیکھتا ہوں کہ حضرت صوفی صاحبؒ ایک قطار میں کھڑے ہیں اور ساری قطار والوں سے اونچا قد ہے۔ بالکل سفید لباس اور سفید ٹوپی پہنے ہوئے ہیں، لہری فریم والی بڑی خوبصورت عینک آنکھوں پر لگا رکھی ہے۔ خوشی سے چہرہ سرخ و سفید ہے اور یوں جیسے انتظار میں کھڑے ہیں۔ میں نے ان عرض کیا کہ میں نے آپ سے ایک بات پوچھنی ہے، لیکن نہ تو میں نے ان سے بات پوچھی اور نہ ہی انہوں نے کوئی بات کی۔ آنکھ کھلنے پر خواب پر بڑا تعجب ہوا۔ کوئی تعبیر سمجھ میں نہ آ رہی تھی۔ صبح کو گھر والوں کے سامنے بھی یہ خواب بیان کیا، لیکن کسی کا ذہن اس طرف گیا ہی نہیں کہ وہ کس کے انتظار میں ہیں اور کیوں خوش ہیں۔ ۵ رمئی ۲۰۰۹ء کو رات ایک بجے ابھی مطالعہ سے فارغ ہو کر لیٹا ہی تھا اور آنکھ لگی ہی تھی کہ موبائل فون پر گھنٹی ہوئی۔ دل دھک دھک کرنے لگا کہ اس وقت خیر ہو۔ فون آن کیا تو دوسری طرف عزیزم محمد ریاض نے یہ دل فگار خبر سنائی کہ حضرت شیخ الحدیثؒ کا انتقال ہو گیا ہے۔ فوراً انا للہ وانا الیہ راجعون کا ورد زبان پر جاری ہوا۔ افراتفری میں اُٹھتے ہوئے دماغ چکرا گیا اور چارپائی پر گر گیا۔ اہلیہ کو بیدار کیا، گھر والوں کو خبر دی تو ایک کہرام بپا ہو گیا۔ فوراً اُٹھ کر گکھڑ روانہ ہو گئے۔ بعض خوابیں اپنی تعبیر کس قدر جلدی ظاہر کرتی ہیں۔ اللھم اغفر لھما ۔ آمین

حضرت شیخ الحدیث رحمہ اللہ اپنے برادر خورد کی نظر میں

امام اہل سنت حضرت مولانا محمد سرفراز خان صفدرؒ، حضرت مولانا صوفی عبد الحمید خان سواتیؒ کے بڑے بھائی ہیں۔ حضرت صوفی صاحبؒ نے اپنے بھائی کا تذکرہ اپنی کتابوں، خطبات، دروس اور خطوط میں متعدد مقامات پر فرمایا ہے۔ یہاں ان کی تقریر و تحریر کے چند اقتباسات درج کیے جاتے ہیں:

☆ حضرت صوفی صاحبؒ نے امام الموحدین حضرت مولانا حسین علی واں بھچراںؒ کی فارسی کتاب ”تحفہ ابراہیمیہ“ پر بسیط مقدمہ میں حضرت مولانا حسین علی اور ان کے مرشد اور تلامذہ ومجازین کا ایسا تعارف کرایا ہے کہ اس کتاب کو ایک تاریخی دستاویز کی حیثیت حاصل ہے۔ تلامذہ اور خلفا کے ضمن میں اپنے بڑے بھائی کا تذکرہ یوں فرماتے ہیں:

”آپ حضرت مولانا حسین علیؒ کے آخری ایام میں ان سے بیعت ہوئے اور روحانی فیض حاصل کیا۔ آپ پاکستان کے چند گنے چنے علما میں سے ایک ہیں۔ دار العلوم دیو بند کے فاضل ہیں۔ نہایت ذہین اور طباع ہیں۔ ربع صدی سے زیادہ عرصہ ہو چکا ہے کہ آپ دین کی بڑے وسیع پیمانہ پر خدمت کر رہے ہیں۔ آپ تقریباً تیس سے زیادہ کتابوں کے مصنف ہیں۔ فرق باطلہ کے مقابلہ میں آپ کا قلم خدائی تلوار کا کام کرتا ہے اور آپ کی زبان علمائے دیو بند کی ترجمان ہے۔ آپ بڑے محقق ہیں، آپ کی کتابوں سے پاکستان و ہندوستان میں لاکھوں انسانوں نے فائدہ اٹھایا ہے اور بہت سے گمراہ لوگ ان کتابوں کو پڑھ کر راہِ راست پر آئے ہیں۔ آپ ۱۲ سال سے مدرسہ نصرۃ العلوم میں پڑھا رہے ہیں اور اب شیخ الحدیث کے منصب پر فائز ہیں۔ آپ تقریباً ربع صدی سے زائد عرصہ ہو چکا ہے کہ گورنمنٹ ٹریننگ انسٹی ٹیوٹ گکھڑ میں قرآن کریم کا درس دیتے ہیں جس سے اب تک کئی

ہزار ٹریننگ حاصل کرنے والے ٹیچر حضرات مستفید ہو چکے ہیں۔ جامع مسجد گکھڑ میں خطابت کی ذمہ داری بھی آپ کے سر ہے اور قرآن کریم کا درس بھی پابندی سے دیتے ہیں۔ پورے علاقہ میں اصلاحی کام ہوا ہے۔ آپ علم حدیث، تفسیر، فقہ، اسماء الرجال اور نقد حدیث میں مہارت تامہ رکھتے ہیں۔ فتویٰ نویسی کا کام بھی کرتے ہیں۔ پاک و ہند کے اکابر علما اور اساتذہ نے آپ کے علمی اور تحقیقاتی کاموں کی بے حد توصیف و تعریف کی ہے اور داد تحسین و آفرین دی ہے اور آپ کی تصانیف پر تقریظات لکھی ہیں۔ و کفی بذلک فخراً۔

تدریس کے سلسلہ میں بھی آپ کے شاگردوں اور تلامذہ، بلاواسطہ اور بالواسطہ کی تعداد ہزاروں سے متجاوز ہے۔ مزاج میں اعتدال ہے، وعظ و تقریر بھی کرتے ہیں اور لوگوں کے اصرار پر باوجود بیمار ہونے کے دور کا سفر کرتے ہیں اور کسی کی دل شکنی گوارا نہیں کرتے۔" (مقدمہ: فیوضات حسینیؒ ص ۴۶ والاکابر ص ۳۴۳)

یہ تحریر کافی عرصہ پہلے کی ہے، اس لیے اسے اسی تناظر میں دیکھا جائے۔

☆ ۱۹۶۶ میں حضرت صوفی صاحبؒ کی دعوت پر بخاری شریف کے اختتامی سبق کے لیے حضرت مولانا علامہ شمس الحق افغانی (سابق شیخ التفسیر دار العلوم دیوبند) مدرسہ نصرۃ العلوم میں تشریف لائے۔ اس موقع پر ان کی حضرت صوفی صاحبؒ سے جو گفتگو ہوئی، وہ حضرت مولانا محمد سرفراز خان صفدرؒ کے علمی مقام کے حوالہ سے بڑی اہمیت کی حامل ہے۔ حضرت صوفی صاحبؒ دار العلوم الاسلامیہ چارسدہ کے مہتمم صاحب کے نام اپنے ایک خط میں اس کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"احقر کی حضرت مولانا شمس الحق افغانیؒ کے ساتھ صرف ایک مرتبہ ہی ملاقات ہوئی ہے، جب وہ یہاں گوجرانوالہ احقر کی درخواست پر مدرسہ نصرۃ العلوم کے سالانہ تقریب اختتام بخاری شریف میں تشریف لائے تھے اور دو دن یہاں رہے تھے ..... مجھے فرمانے لگے کہ آپ نے مولانا سرفراز خان صفدر کی موجودگی میں مجھے کیوں دعوت دی ہے، اختتام بخاری کے لیے وہ تو مجھ سے زیادہ علم رکھتے ہیں۔ میں نے عرض کیا کہ حضرت! ہم سب لوگ آپ کے خادم ہیں اور آپ ہمارے بزرگ ہیں۔"

علامہ افغانیؒ جیسے علم کے پہاڑ بھی ان کے علمی مقام و مرتبہ کی وجہ سے انہیں اپنے سے زیادہ عالم و محقق سمجھتے تھے۔

☆ حضرت شیخؒ، امام الاولیا، شیخ التفسیر حضرت مولانا احمد علی لاہوریؒ سے قرآن کریم کی تفسیر پڑھنا چاہتے تھے۔ حضرت صوفی صاحبؒ لکھتے ہیں:

"یوں تو حضرت مولانا احمد علیؒ (المتوفی ۱۳۸۱ھ) کا نام مبارک اپنے ابتدائی طالب علمی کے دور میں سنتے رہتے تھے، لیکن جب ۱۹۴۱ء کے دور میں دار العلوم دیوبند میں دورۂ حدیث کی تکمیل کے لیے داخل ہوئے تو حضرت لاہوریؒ کا چرچا قرآن کی تحصیل کے لیے طلبا میں بہت زیادہ تھا۔ ہم نے بھی دیوبند سے حضرت کی خدمت میں خط لکھا کہ ہم دونوں بھائی (حضرت مولانا سرفراز خان صفدر اور کاتب الحروف عبد الحمید سواتی) جناب والا کی خدمت بابرکت میں دورۂ حدیث سے فراغت کے بعد قرآن کریم کی تفسیر پڑھنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ حضرت نے جواب میں تحریر فرمایا کہ آپ دونوں وقت پر آ جائیں مگر افسوس کہ یہ کام نہ ہو سکا۔ جب دار العلوم دیوبند سے فارغ ہوئے، اپنے ذاتی حالات اور گوناگوں دیگر پریشانیوں کی وجہ سے حضرت کی خدمت میں دورۂ تفسیر کے لیے حاضر

نہ ہو سکے۔" (الاکابر ص ۲۷۶)

☆ حضرت شیخؒ نے امام انقلاب حضرت مولانا عبید اللہ سندھیؒ کی زیارت کی۔ حضرت صوفی صاحبؒ لکھتے ہیں:

"ایک دفعہ ہم دار العلوم دیوبند کے دار الحدیث میں تھے کہ شیخ الاسلام حضرت مدنیؒ سبق پڑھانے کے لیے اپنے گھر سے تشریف لائے۔ آپ دار الحدیث میں داخل ہونے سے پہلے اہتمام کے دفتر میں حاضری لگا کر سبق پڑھاتے تھے۔ دیکھا، آگے آگے حضرت مدنیؒ ہیں اور ان کے پیچھے پیچھے حضرت سندھیؒ آ رہے ہیں۔ ۱۹۴۳ء، موسم سرما تھا۔ ہم لاہور گئے تو دفتر مجلس احرار سے ہو کر جب ہم دونوں جب نیچے اترے تو امیر شریعت سید عطاء اللہ شاہ بخاریؒ مختلف کارکن اور رضا کاروں سے مل رہے تھے۔ آپ کی نظر ایک طرف پڑی۔ آگے سے حضرت مولانا عبید اللہ سندھیؒ غازی خدا بخش کے ساتھ آ رہے تھے۔ امیر شریعت نے رضا کاروں کو ادھر ادھر ہٹایا۔ حضرت سندھیؒ سے مصافحہ کیا اور نہایت باادب طریقہ سے ان کی خیر و عافیت دریافت کی۔ حضرت سندھیؒ نے بھی آپ کی خیر و عافیت دریافت کی۔ حضرت سندھیؒ نے فرمایا کہ فلاں جگہ جانا ہے اور یہ غازی خدا بخش میرے ساتھ ہے اور چلے گئے۔" (الاکابر ص ۲۲۴، ۲۲۵)

☆ حضرت شیخؒ کی کتاب تسکین الصدور کے بارے میں حضرت صوفی صاحبؒ لکھتے ہیں:

"حیات النبی صلی اللہ علیہ وسلم کا مسئلہ تمام امت کے علما کا اور بالخصوص علماء دیوبند کا متفقہ مسئلہ ہے۔ المہند پڑھ کر دیکھو۔ اگر اس مسئلہ کی تفصیل اور وضاحت دیکھنی ہو تو حضرت شیخ الحدیث نے موجودہ دور میں کتاب لکھی ہے، تسکین الصدور، اس کا مطالعہ کریں۔ اس پر موجودہ دور کے علما کے دستخط موجود ہیں کہ مسئلہ یہی صحیح ہے کہ نبیوں کو قبروں میں حیات حاصل ہے اور جسم کے ساتھ روح کا تعلق ہے، اور قریب سے وہ سنتے ہیں۔ اب حیات النبی صلی اللہ علیہ وسلم کے قائلین کو مشرک کہنے والا خود گمراہ ہے اور وہ خود اہل بدعت میں سے ہے۔" (خطبات سواتی ۴/۲۲۴)

☆ حضرت شیخؒ کی تعبیر الرؤیا میں مہارت کے حوالے سے فرماتے ہیں:

"خواب کی تعبیر بتانا ہر شخص کے بس کی بات نہیں۔ بعض آدمیوں میں فطرتاً بڑی صلاحیت ہوتی ہے۔ حضرت ابوبکر صدیقؓ میں اللہ نے یہ خصوصیت رکھی تھی۔ اس کے بعد امام ابن سیرینؒ کا نام آتا ہے۔ برصغیر میں شاہ عبد العزیز محدث دہلویؒ خواب کی تعبیر بتاتے تھے۔ ہمارے بزرگوں میں حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ کا نام آتا ہے۔ شیخ الحدیث مولانا محمد سرفراز خان صفدر کو بھی اس سلسلہ میں کمال حاصل ہے۔" (معالم العرفان فی دروس القرآن ۱۰/۵۹۵، ۵۹۶)

☆ حضرت شیخؒ کی، دمشق میں اصحاب کہف کے غار کی زیارت سے متعلق لکھتے ہیں:

"دمشق سے بیس پچیس میل کی مسافت پر ایک غار ہے جس کے متعلق مشہور ہے کہ یہی اصحاب کہف کا غار کا مقام ہے۔ لوگ اس غار کی زیارت کے لیے جاتے ہیں۔ حضرت شیخ الحدیث بھی جب حج کر کے واپس آ رہے تھے تو دمشق پہنچ کر آپ نے بھی اس غار کی زیارت کی تھی۔ وہاں پر کچھ قبریں ہیں، کتبے بھی لگے ہوئے ہیں، مسجد بھی ہے۔ کہتے ہیں کہ یہ اصحاب کہف کی غار ہے، واللہ اعلم۔" (معالم العرفان ۱۲/۳۴۰)

☆ حضرت شیخؒ اپنے استاذ کی نظر میں کیسے تھے؟ حضرت صوفی صاحبؒ لکھتے ہیں:

''احقر نے تقریباً تین سال دوران تعلیم آپ* (حضرت مولانا عبدالقدیر محدث کیمل پوریؒ) کی خدمت میں گزارے تھے۔ شیخ الحدیث حضرت مولانا سرفراز خان صفدر تو آپ کے اجل تلامذہ میں سے تھے۔ ان کی ذہانت اور فطانت کی وجہ سے مولانا ان کا بہت خیال فرماتے تھے، لیکن احقر اپنی طبعی خاموشی اور مسکینی اور اس لیے کہ صبح کی نماز باجماعت ادا کرتا تھا، اس لیے احقر کا بہت لحاظ فرماتے تھے...... (ان کا) جنازہ آپ کے تلمیذ شیخ الحدیث حضرت مولانا سرفراز خان صفدر نے پڑھایا۔'' (الاکابر ص ۳۰۷)

☆ حضرت درخواستیؒ حضرت شیخؒ کے غائبانہ بھی بے حد قدر دان تھے۔ حضرت صوفی صاحبؒ لکھتے ہیں:

''مولانا درخواستی ..... کے کمرے تک احقر کو پہنچا دیا گیا۔ حضرت سے یہ پہلی ملاقات ہوئی۔ احقر نے اپنا تعارف کرایا۔ حضرت مولانا مدرسہ نصرۃ العلوم کو بھی غائبانہ جانتے تھے، اور شیخ الحدیث مولانا سرفراز خان صفدر صاحب کو بھی غائبانہ جانتے تھے۔ میں نے ملاقات کی، مصافحہ کیا، اپنا نام عرض کیا اور شیخ الحدیث کا سلام بھی حضرت کی خدمت میں عرض کیا اور مقصد بھی ظاہر کیا کہ میں قرآن کریم کے ترجمہ اور تفسیر میں شرکت کے خیال سے حاضر ہوا ہوں۔ حضرت نے خوشی کا اظہار فرمایا۔'' (الاکابر ص ۳۲۶، ۳۲۷)

☆ حضرت شیخؒ کی سالانہ تعطیلات میں خدمت قرآن کے بارے میں حضرت صوفی صاحبؒ لکھتے ہیں:

''ہمارے ہاں (مدرسہ نصرۃ العلوم) مین جو تین سو نئے ساتھی آئے ہیں، ان میں کون سے دہشت گرد ہیں؟ یہ پاکستان اور بیرون ممالک سے بھی آئے ہیں اور تدریس قرآن کا یہ سلسلہ نصف رمضان تک جاری رہتا ہے۔ شیخ صاحب ہر روز چار پانچ گھنٹے تک اپنے ضعف کے باوجود شائقین کو قرآن پڑھاتے ہیں۔ کیا یہ دہشت گرد تیار کر رہے ہیں؟'' (خطبات سواتی ۲۵۰/۳، ۲۵۱)

☆ حضرت شیخؒ کی اپنے مرشد حضرت مولانا حسین علی صاحبؒ کی خدمت میں حاضری کا منظر یوں بیان کرتے ہیں:

''حضرت کی خدمت میں جو علما حضرات بیعت کے لیے حاضر ہوتے تھے، حضرتؒ ان کو تحفہ ابراہیمیہ کا نسخہ بھی عطا فرماتے تھے، چنانچہ جب حضرتؒ کی خدمت میں شیخ الحدیث مولانا محمد سرفراز خان صاحب حاضر ہوئے تو حضرتؒ نے بیعت کے وقت تحفہ ابراہیمیہ کا نسخہ اپنے ہاتھ مبارک سے عنایت کیا اور ساتھ یہ بھی فرمایا کہ اس کا مطالعہ کرو، اگر کوئی بات پوچھنی ہو تو وہ پوچھ لو۔ شیخ الحدیث نے مسجد میں بیٹھ کر تقریباً ایک گھنٹہ میں اس سب کا مطالعہ کر لیا اور حضرت کو آگاہ کر دیا کہ میں نے اس کا مطالعہ کر لیا ہے۔ تحفہ ابراہیمیہ تصوف اور سلوک کا رسالہ ہے، فارسی زبان میں حضرت نے اسے تحریر فرمایا ہے۔ اس میں سلاسل سب درج ہیں۔'' (مقدمہ فیوضات حسینی، صفحہ ''ص'')

''تقریباً ڈیڑھ گھنٹہ میں اس کا مطالعہ کیا اور بعض مقامات سے کچھ باتیں حضرتؒ سے دریافت کیں۔ آپ نے ان کا جواب عنایت فرمایا۔'' (مقدمہ فیوضات حسینی، ص ۵۲)

☆ حضرت شیخؒ کا دفاع کرتے ہوئے ایک مقام میں لکھتے ہیں:

''مقدمہ میں حضرت مولانا قاضی شمس الدین مرحوم نے بجز شخصی تعلقات اور اپنی علمی برتری اور تفوق کے نمایاں

کرنے کی کوشش کے کچھ نہیں کیا، یا پھر احقر عبدالحمید سواتی اور شیخ الحدیث مولانا محمد سرفراز خان صاحب صفدر کے ساتھ تضحیک واستہزا اور طعن وتشنیع میں کافی وقت صرف کیا۔'' (مقدمہ فیوضات حسینی صفحہ ''ز'')

☆ حضرت شیخؒ کی کتاب ''بانی دارالعلوم دیوبند'' کے متعلق حضرت صوفی صاحبؒ لکھتے ہیں:

''حضرت مولانا سرفراز خان صفدر صاحب .... نے بھی ایک عمدہ رسالہ ''بانی دار العلوم دیوبند'' مرتب کیا ہے، جو اپنی زبان اور استناد کے اعتبار سے معیاری ہے۔ اسی رسالہ کا ایک حصہ مکمل طور پر ''بیس بڑے مسلمان'' کے مصنف نے اپنی کتاب میں نقل کر لیا ہے۔'' (الاکابر ص ۲۰۴)

☆ حضرت شیخؒ کے انداز تدریس کا ذکر کرتے ہوئے بخاری شریف کی تقریر میں فرمایا:

''یہ مختلف محدثین کرام کا طریقۂ تدریس رہا ہے۔ یہاں پر (مدرسہ نصرۃ العلوم میں) آپ حضرات جو اسباق شیخ الحدیث مولانا محمد سرفراز خان صفدر سے پڑھیں گے، ان میں تفصیل سے کلام ہوگا، تاہم ہمارے ہاں اختصار پر اکتفا کرنا ہوگا۔'' (ماہنامہ نصرۃ العلوم ۱۲/۱، ص ۱۳)

☆ حضرت شیخ کی کتابوں کے علمی وتحقیقی مرتبہ کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''میں آپ کو واضح کر دینا چاہتا ہوں کہ علمائے دیوبند کے نرم طرز عمل کو ان کی کمزوری پر محمول نہ کریں، وگرنہ ان کے علمی اور تحقیقی کام کی مثال تو پوری دنیا میں موجود نہیں۔ دور جانے کی ضرورت نہیں، ہمارے شیخ الحدیث مولانا محمد سرفراز صفدر نے گزشتہ پینتالیس سال کے عرصہ میں اہل بدعت کے خلاف جو مدلل کتابیں لکھی ہیں، یہ لوگ قیامت تک ان کا جواب نہیں دے سکتے۔ جب کوئی فریق دلیل کا جواب دلیل سے نہیں دے پاتا تو گالیوں پر اتر آتا ہے۔ احسن الکلام کا جواب تو آج تک حافظ محمد صاحب بھی نہیں دے سکے۔

اہل سنت والجماعت کی کتابوں میں بدزبانی نہیں ہے۔ خدا کے فضل سے ہم اخلاق کی حدود پر قائم ہیں۔ دلائل کا جواب دلائل سے ہی دیا جا سکتا ہے۔ اہل حدیث حضرات طلاق ثلاثہ کے مسئلہ کو عموماً اچھالتے رہتے ہیں، حالانکہ شیخ الحدیث نے اس مسئلہ پر اتنی مدلل کتاب لکھی ہے کہ اس کا ایک حصہ مولانا مفتی محمد شفیع صاحبؒ نے اپنی تفسیر میں نقل کر دیا ہے۔ مولوی محمد علی کاندھلویؒ نے تو ساری کتاب اپنی تفسیر میں نقل کر دی ہے۔'' (خطبات سواتی ۳۹/۴، ۴۰)

☆ ۱۹۹۲ء میں حضرت شیخؒ کے ایک نجی خط کے جواب میں حضرت صوفی صاحبؒ نے لکھا:

''بخدمت گرامی برادر محترم شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد سرفراز خان صفدر دام ظلکم واطال اللّٰہ حیاتکم وعافاکم فی الدنیا والآخرۃ۔

سلام مسنون اسلام کے بعد، آپ کا عطا کردہ رقعہ پڑھا۔ آپ کی پریشانیوں پر تشویش ہوئی۔ اللہ تعالیٰ آپ کو اس عمر میں ہر طرح سے سکون وطمانیت عطا فرمائے اور ہر قسم کی ذہنی اور جسمانی تشویشات سے بچائے، آمین۔

.... آپ کے احسانات بالعموم ہم سب پر اور بالخصوص اس احقر پر بہت زیادہ ہیں۔ ان کا اجر اللہ تعالیٰ آپ کو عطا فرمائے گا۔ آپ کی شفقت، رأفت، تربیت اور رہنمائی پر احقر تادم واپسیں آپ کے لیے اور جملہ اہل خاندان کے لیے دعا گو ہے اور دعا گو رہے گا۔''

مولانا عزیز الرحمٰن خان شاہد*

حضرت والد محترمؒ کے آخری ایام

والد محترم امام اہل سنت شیخ الحدیث والتفسیر حضرت مولانا محمد سرفراز خان صفدرؒ ۵؍مئی ۲۰۰۹ء بروز منگل رات ایک بج کر دس منٹ پر دار الفناء سے دار البقاء کی طرف کوچ فرما گئے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ اور آج ان کو بچھڑے ہوئے کئی روز گزر گئے ہیں۔ یوں تو جدائی کے یہ لمحات ان کے لاکھوں شاگردوں اور عقیدت مندوں پر بھاری گزرے اور گزر رہے ہیں مگر ان کے سایۂ پدری میں ایام زیست گزرانے والوں خصوصاً ہمہ دم حاضر باش رہنے والوں پر ایک ایک لمحہ بار ہمالہ سے کم نہیں۔ گھر کے وہ در و دیوار جو پچاس برس تک اپنی خوش نصیبی پر شاداں تھے، جنہوں نے ایک عرصہ تک ابو حنیفہؒ کی فقاہت، امام مالکؒ کی جرأت، احمد بن حنبلؒ کی استقامت، بخاریؒ کی روایت، ابن تیمیہؒ کی عزیمت، شاہ ولی اللہؒ کی بصیرت، نانوتویؒ کی حکمت، محمود الحسنؒ کی غیرت، حسین علیؒ کی خلافت اور مدنیؒ کی عظمت کو بہت قریب سے دیکھا، وہ حرماں نصیب در و دیوار آج اداس اور سوگوار ہیں۔

ویراں ہے میکدہ خم و ساغر اداس ہیں
تم کیا گئے کہ روٹھ گئے دن بہار کے

احقر نے اپنی تینتالیس سالہ زندگی میں سے چالیس سالہ شعوری زندگی کے اندر قبلہ والد محترم کو ایسی ہمہ گیر صفات کا حامل اور مظہر پایا کہ وہ اپنی مثال آپ ہی تھے۔ ایک طرف عمومی زندگی میں جہاں ان کی فقاہت، روایت، درایت، خطابت اور خلافت کے چرچے تھے تو دوسری طرف عائلی زندگی میں وہ ایک انتہائی مشفق والد اور منتظم مربی بھی تھے۔ امانت، دیانت، شرافت، اور صداقت کے ایسے خوگر تھے کہ اولاد اور متعلقین میں سے ہر ایک کو اس کا مقام اور حق پوری دیانت داری اور انصاف کے ساتھ ادا فرماتے۔ جلال و جمال کے ایسے پیکر تھے کہ ایک طرف جگر گوشوں کی ہلکی سی تکلیف پر بے چین ہو جاتے، تو دوسری طرف احکام شرع میں تہاون و تکاسل کی بنا پر یہی جگر گوشے مہبط جلال بھی بن جاتے۔ دنیاوی معاملات میں اپنے بڑے سے بڑے حق سے بھی دستبردار ہو جاتے مگر دینی معاملات میں ذرہ بھر بھی مداہنت سے کام نہ لیتے۔

کثرتِ ہجوم اور شدت ہموم کی وجہ سے اس مختصر کاوش میں شیخ کی حیاتِ مستعار کے تمام پہلوؤں پر روشنی ڈالنا تو ممکن نہیں، زندگی رہی تو ان شاء اللہ العزیز یہ سعادت آئندہ کبھی حاصل کروں گا۔ قبلہ والد محترم کے انتقال کے بعد تعزیت کے لیے آنے والے تقریباً ہر عقیدت مند کا چونکہ ایک ہی سوال تھا کہ حضرت کے آخری ایام اور آخری وقت کیسے گزرا؟ اس لیے بعض دوستوں نے اصرار کیا کہ ان قیمتی اور تاریخی اوقات کو قلم بند کر دو، شاید کہ شیخ کے متعلقین و متوسلین کے مضطرب اور محزون

* فرزند امام اہل سنتؒ ۔ مدرس شعبہ تحفیظ القرآن، جدہ (سعودی عرب)

قلوب کے حزن و اضطراب کا کچھ مداوا ہو جائے۔ سو اسی سلسلے میں یہ چند سطور حاضر خدمت ہیں۔

راقم عزیز الرحمٰن خان شاہد اپنے بھائیوں میں ساتویں نمبر پر ہے۔ (اب چھٹے نمبر پر ہے، اس لیے کہ ایک بڑے بھائی قاری محمد اشرف خان ماجد ۲۰۰۰ء میں انتقال کر چکے ہیں)۔ احقر اپنی پیدائش ۱۹۶۶ء سے لے کر ۱۹۸۶ء کے اوائل تک گکھڑ میں رہ کر تعلیم حاصل کرتا رہا۔ اس عرصہ میں تقریباً مڈل تک اسکول، حفظ قرآن کریم اور معارف اسلامیہ اکیڈمی گکھڑ میں دو سالہ تجوید کا کورس مکمل کیا۔ پھر ۱۹۸۶ء سے ۱۹۹۱ء کے اوائل تک مدرسہ نصرۃ العلوم گوجرانوالہ میں درس نظامی کا کورس مکمل کر کے مدرسہ نصرۃ العلوم اور وفاق المدارس العربیۃ سے شہادۃ العالمیہ حاصل کی۔ تحدیث نعمت کے طور پر عرض ہے کہ بحمد اللہ احقر تجوید کے دونوں سالوں میں اول پوزیشن حاصل کرتا رہا، پھر مدرسہ نصرۃ العلوم میں نو سال کے عرصہ میں مدرسہ اور وفاق کے اکتیس امتحانات دیے جن میں سے تقریباً سولہ ۱۶ امتحانات کے اندر ناچیز نے پہلی پوزیشن، آٹھ یا نو امتحانات میں دوسری یا تیسری پوزیشن حاصل کی اور بقیہ امتحانات میں بھی اچھے نمبروں کے ساتھ کامیاب ہوا۔

۱۹۸۳ء سے ۱۹۸۸ء تک (ماسوا ۱۹۸۶ء کے) پانچ سالوں میں رمضان المبارک کے اندر قبلہ والد محترم کے سامنے انہی کی مسجد میں کھڑے ہو کر قرآن کریم سنانے کا شرف بھی حاصل ہوا۔ ۱۹۹۱ء کے اوائل میں درس نظامی سے فراغت کے بعد چند دنوں میں تیاری کر کے میٹرک کا امتحان بحمد اللہ فرسٹ ڈویژن میں پاس کیا اور ساتھ ساتھ برادر مکرم حضرت مولانا زاہد الراشدی حفظہ اللہ تعالیٰ کے زیر سایہ مدرسہ انوار العلوم میں درس نظامی کے شعبہ میں اور شاہ ولی اللہ یونیورسٹی میں درس و تدریس کے ساتھ ساتھ مختلف انتظامی امور میں خدمت انجام دیتا رہا۔ بد قسمتی سے ۱۹۹۲ء میں نامساعد حالات کی بنا پر جب "ضاقت علیھم الارض" کی کیفیت پیدا ہوئی تو اللہ رب العزت کا خصوصی کرم شامل حال ہوا اور برادر مکرم مولانا زاہد الراشدی صاحب کے ہم زلف قاری محمد اسلم شہزاد صاحب نے سعودی عرب سے ویزہ بھیج دیا۔ فجزاہ اللہ احسن الجزاء۔ بھائی جان کی اجازت اور مشورہ سے احقر ارض مقدسہ کا عازم ہوا۔ ۱۰؍اکتوبر ۱۹۹۴ء تک وہیں رہا۔ بحمد اللہ دونوں سال حج بیت اللہ کی سعادت حاصل ہوئی۔ پھر ۱۰؍اکتوبر ۱۹۹۴ء سے ۱۱؍اپریل ۲۰۰۳ء تک تقریباً ساڑھے آٹھ سال کا دور عملی زندگی کا وہ سنہری دور ہے جو احقر نے والد محترم کی معیت میں بھرپور انداز میں گزارا۔ مرکزی جامع مسجد واپڈا ٹاؤن میں خطابت تھی اور معارف اسلامیہ اکیڈمی گکھڑ میں شعبہ درس نظامی کا مدرس تھا۔ ابتدائی سالوں میں جب والد صاحب کبھی کبھی بیمار ہوتے تھے اور بعد والے سالوں میں جب والد صاحب بیماری کی وجہ سے مستقلاً گھر میں نماز پڑھتے تھے، احقر کو ان کی امامت کا شرف بھی حاصل ہوتا رہا۔ احقر صبح سات آٹھ بجے سے الیٰ مابین الظہر والعصر اسباق میں مشغول رہتا، گھر آ کر کھانا کھاتا، مہمان نہ ہوتے تو عصر تک آرام کا موقع مل جاتا، ورنہ متواتر رات گئے تک قبلہ والد محترم کے مہمانوں کی مہمان نوازی میں مشغولیت رہتی۔ پھر اسباق کے مطالعے کے لیے بیٹھ جاتا۔ کبھی ایسا بھی ہوتا کہ والد محترم تہجد کے لیے بیدار ہوتے تو ناچیز مطالعہ ختم کر کے سونے کی کوشش کرتا۔

ایک سال جب احقر کے پاس تقریباً چودہ اسباق تھے، رات دیر تک مطالعہ کی وجہ سے صبح فجر کی نماز کے لیے ذرا تاخیر ہو گئی تو والد محترم سے ڈانٹ پڑ گئی۔ عذر پیش کیا کہ رات شرح تہذیب کا مطالعہ ذرا دشوار تھا، اس لیے بے ترتیبی ہو گئی۔ فرمانے لگے کہ جب میں صحت مند تھا تو تیس تک اسباق پڑھاتا تھا اور سب سے چھوٹا سبق شرح تہذیب ہوتا۔ بہرکیف

۱۹۹۸ء میں جب برادر عزیز مولانا منہاج الحق خان راشد حفظہ اللہ تعالیٰ درس نظامی سے فراغت کے بعد گھر آ گئے تو احقر کا بوجھ کم ہوگیا بلکہ رفتہ رفتہ عزیزم راشد نے اس سعادت کا ''حظ وافر'' اپنے دامن میں سمیٹنا شروع کر دیا۔

۲۰۰۱ء میں والد محترم پر فالج کا پہلا حملہ ہوا، لیکن اللہ تعالیٰ کے فضل وکرم سے بروقت علاج معالج کی وجہ سے زیادہ متاثر نہ ہوئے۔ ۱۱/اپریل ۲۰۰۳ء میں احقر بعض مالی مشکلات کی بنا پر دوبارہ سعودی عرب چلا گیا۔ بد قسمتی سے احقر کے جانے کے تقریباً ڈیڑھ ماہ بعد والد محترم پر دوبارہ فالج کا حملہ ہوا جو پہلے کی بہ نسبت سخت تھا جس کی وجہ سے والد محترم کے لیے چلنا پھرنا مشکل ہوگیا بلکہ آہستہ آہستہ معذوری نے مکمل طور پر ان کو بے بس کر دیا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ قبلہ والد محترم کی اولاد اور متعلقین میں سے ہر ایک نے اپنے اپنے وقت اور انداز میں ان کی خدمت کی، اللہ تعالیٰ ہر ایک کو اس کا بدلہ عطا فرمائے آمین، مگر خدمت کے باب میں چند شخصیات ایسی ہیں کہ والد محترم کی زندگی کے آخری اور معذوری کے دور میں ان حضرات نے خدمت کا ایسا حق ادا کیا کہ ان کی خدمات تاریخ کا ایک حصہ بن گئی ہیں۔ ان حضرات میں مفتی جمیل خان صاحب شہید، حاجی میر لقمان اللہ صاحب، ڈاکٹر فضل الرحمٰن صاحب، ڈاکٹر سہیل صاحب، مولانا محمد نواز بلوچ صاحب اور قاری اسماعیل صاحب کا نام سر فہرست ہے اور گھر والوں میں سے عزیزم مولانا منہاج الحق خان راشد اور ان کی اہلیہ جو کہ ہماری خالہ زاد بہن بھی ہیں، چھوٹی باجی ام داؤد خان نوید، ان کی بچیاں، خاص طور پر ان کی چھوٹی بیٹی اخت داؤد خان نوید تو انتہائی قابل ستائش ہیں کہ انہوں نے قبلہ والد محترم کی طویل بیماری کے ایام میں دن رات ان کی خدمت کر کے ایسی سعادتیں سمیٹی ہیں جو دونوں جہانوں میں ان کی سرخروئی کے لیے کافی ہیں۔

عزیزم مولانا راشد بچپن سے ہی طبعاً تیز، کام میں پھرتیلے اور ماشاء اللہ مضبوط جسم کے مالک تھے۔ اسی طرح اخت نوید بہ نسبت دوسری بچیوں کے صحت میں قوی اور مضبوط تھیں۔ پہلے تو یہ دونوں چیزیں سمجھ سے بالاتر تھیں مگر جب قبلہ والد محترم کی بیماری میں خدمت کا وقت آیا تو خدا تعالیٰ کی حکمت پھر سمجھ میں آئی کہ اللہ رب العزت نے اپنے برگزیدہ بندے کی خدمت کا انتظام پہلے سے ہی فرما رکھا تھا، فجز اہما اللہ احسن الجزاء۔ اسی طرح گکھڑ میں مقیم برادر محترم جناب مولانا قاری حماد الزہراوی صاحب والد محترم کی بیماری کے بعد مرکزی جامع مسجد اہل سنت گکھڑ، معارف اسلامیہ اکیڈمی گکھڑ، شعبہ درس نظامی طلبہ و طالبات اور اسکول کی ذمہ داریوں کے ساتھ ساتھ، برادر عزیز قاری عنایت الوہاب خان ساجد اور برادر مکرم جناب قاری محمد اشرف خان ماجد مرحوم کے فرزند حافظ انصر خان بھی وقتاً فوقتاً اس سعادت کے پھول چنتے رہے۔ اسی طرح برادر مکرم جناب مولانا عبد الحق خان بشیر کے بڑے صاحبزادے عزیزم احسن خدامی معارف اسلامیہ اکیڈمی گکھڑ میں اپنے تعلیمی قیام ۲۰۰۱ء سے ۲۰۰۳ء تک کے عرصہ میں اور بعد ازاں چھٹیوں کے ایام میں اپنے چھوٹے بھائی عزیزم حمزہ کے ساتھ مل کر حضرت شیخ کی بھرپور خدمت کرتے رہے۔ اسی طرح برادر مکرم واستاد محترم جناب مولانا عبد القدوس خان قارن صاحب کے صاحبزادگان عزیزم مولانا عمر خان، مولانا معاویہ خان اور قاری سالم خان اور چھوٹی باجی کے بیٹے مولانا داؤد خان نوید جب بھی گکھڑ تشریف لاتے، حضرت والد محترم کی خدمت کے لیے ان کا جذبہ دیدنی ہوتا۔ اللہ تعالیٰ ان سب حضرات کو جزائے خیر عطا فرمائے، آمین۔

بہر حال ۲۰۰۳ء میں سعودیہ جانے کے بعد احقر کے دل میں ایک افسوس اور ایک خوف مسلسل رہا۔ افسوس اس بات کا کہ

کاش والد محترم کی بیماری کا پہلے کچھ اندازہ ہو جاتا تو ان کو چھوڑ کر کبھی عازم سفر نہ ہوتا اور خوف اس بات کا کہ موت تو برحق ہے، کہیں آخری دیدار اور زیارت سے ہی محروم نہ ہو جاؤں۔ جب بھی حرم جاتے، صحت کی دعا کے ساتھ ساتھ اس بارے میں بھی دعا کرتے رہتے۔ یہی وجہ ہے کہ جب بھی سال سوا سال کے بعد والد محترم یاد فرماتے، ہم بحمد اللہ ہر ترتیب کو نظر انداز کر کے قدم بوسی کے لیے حاضر ہو جاتے اور تا حکم ثانی خدمت میں ہی رہتے۔ اس سال بچوں نے مطالبہ کیا کہ ہم نے کئی برس سے عید پاکستان میں نہیں کی، اس سال عید دادا ابو کے پاس گزارنی ہے، سو ہمارا پکا پروگرام بن گیا کہ ۲۵ رمضان المبارک کے بعد جائیں گے اور اس سال دونوں عیدیں ان شاء اللہ گھر میں والد محترم کے ساتھ گزاریں گے۔ مگر محرم کے آخر میں والد محترم کا جدہ میں فون آیا۔ پہلے احقر سے بات کی، پھر ام ارسلان سے، پھر ارسلان، امیمہ اور فائز، ہر ایک سے بات کی اور فرمایا کہ میں اداس ہوں۔ ہم نے اپنا پروگرام بتلایا تو خاموش اور اداس ہو گئے۔ پھر دو چار دن کے بعد دوبارہ فون آیا۔ اب کی بار ہماری ہمت جواب دے گئی۔ حسب معمول اپنی ترتیب الٹ پلٹ کر کے ۱۸/مارچ ۲۰۰۹ء کے دن حاضر خدمت ہوگئے۔ ہمیں دیکھ کر خلاف عادت چار یا پانچ منٹ تک ''اللہ اکبر کبیرا والحمد للہ کثیرا'' کی صدا بلند فرماتے رہے۔ پھر قریب کر کے پوچھا کہ شاہد ہی ہو؟ عرض کیا جی۔ پھر ایک ایک بچے کو قریب کیا اور چومتے رہے۔ پھر فرمایا کہ مجھے امید نہیں تھی کہ زندگی میں تم مجھے دیکھ سکو گے یا میں تمہیں۔ ہم تو ان کلمات کو فرط جذبات کی ایک ادا سمجھتے رہے، مگر معلوم نہ تھا کہ ٹھیک اڑتالیس دن اور بارہ گھنٹے کے بعد ان جملوں کی حقیقت آشکارا ہو جائے گی۔ خلاف معمول اس دفعہ چھٹیوں میں کہیں بھی جانے کو جی نہیں چاہتا تھا۔ بعض دوستوں نے حسب معمول دعوتوں کے پروگرام بنائے، بعض نے بزم آرائیوں کے عندیے دیے مگر دل گھر کی چوکھٹ بھی پار کرنے پر آمادہ نہ تھا۔ ایسے لگتا تھا کہ کچھ ہو جائے گا۔ آخر ۵ مئی کو کچھ ہو ہی گیا۔

۱۸ مارچ سے ۵ مئی کے دوران بہت سے لوگ اور بہت سی شخصیات قبلہ والد محترم کی ملاقات اور زیارت کے لیے تشریف لائیں۔ ان سب کا احاطہ اور ذکر تو ممکن نہیں، البتہ چند مجالس ایسی تھیں جو کسی نہ کسی وجہ سے منفرد اور نمایاں تھیں۔ ایک مجلس تو تقریباً ہر روز عصر کے لگ بھگ بجتی جس میں حاجی میر لقمان اللہ صاحب، ڈاکٹر فضل الرحمٰن صاحب، ڈاکٹر سہیل صاحب، مولانا نواز بلوچ صاحب، جناب قاسم بن حافظ بشیر احمد چیمہ صاحب، مولانا مدثر صاحب اور اکثر و بیشتر چوہدری احسن جاوید صاحب ایس ایس پی بھی تشریف لایا کرتے تھے۔ ڈاکٹر حضرات قبلہ والد محترم کا چیک اپ کرتے اور حاضرین مجلس مختلف موضوعات پر سوال کرتے۔ یہ مجلس بڑی دلچسپ ہوا کرتی تھی۔ ۳/اپریل ۲۰۰۹ء کی وہ مجلس جس میں برادر مکرم مولانا زاہد الراشدی صاحب سمیت استاد محترم و برادر مکرم مولانا عبد القدوس خان قارن صاحب، برادر مکرم مولانا عبد الحق خان بشیر صاحب، برادر مکرم قاری حماد الزہراوی صاحب، راقم عزیز الرحمٰن خان شاہد، عزیزم قاری عنایت الوہاب خان ساجد اور عزیزم مولانا منہاج الحق خان راشد سب بھائی شامل تھے، ماسوائے استاد محترم و برادر مکرم مولانا رشید الحق خان عابد صاحب، والد محترم کے ساتھ جملہ برادران مکرم کی ایک ایسی مجلس تھی جو کہ آخری مجلس ثابت ہوئی۔ اس مجلس کے بعد جملہ برادران کرام والد محترم کی خدمت میں اکٹھے نہ ہو سکے۔ اسی طرح ایک مجلس جس کو میں یادگار سمجھتا ہوں، حضرت مولانا الیاس گھمن صاحب کی مع رفقا وہ حاضری ہے جس میں انہوں نے قبلہ والد محترم کے سامنے اپنی جماعتی کارگزاری پیش کی اور شیخ نے اس کی تائید فرمائی۔ اسی طرح ۱۱/اپریل کے دن ایک مجلس ہوئی جس میں قائد جمعیت مولانا سمیع الحق صاحب، میاں محمد عارف صاحب،

شاہ عبدالعزیز صاحب و دیگر رفقا تشریف لائے۔ یہ مجلس اس لحاظ سے ناقابل فراموش ہے کہ اس مجلس میں برادر مکرم مولانا زاہد الراشدی صاحب اور برادر مکرم قاری حماد الزہراوی صاحب کی مشاورت سے سوات کے پرخطر حالات کے متعلق گفت و شنید کے بعد ایک جامع لائحہ عمل تیار ہوا۔ اسی طرح ایک دن حضرت مولانا عبدالرؤف فاروقی صاحب ہمارے خالو محترم جناب حضرت مفتی رویس خان صاحب اور مولانا پیر سیف اللہ خالد صاحب تشریف لائے۔ یہ مجلس اس لحاظ سے اہم مجلس تھی کہ جناب خالو محترم نے منکرین حیاۃ الانبیاء کے متعلق جب متعدد سوالات کیے تو جواباً فرمایا کہ ہمارا نظریہ اور موقف وہ ہے جو مولانا مفتی مہدی حسنؒ کا فتویٰ ہے۔ اس کے علاوہ اس عرصہ میں اور بے شمار علمائے کرام تشریف لائے جن میں مولانا فضل الرحیم صاحب از جامعہ اشرفیہ مولانا ظفر احمد قاسم از جامعہ خالد بن ولید وہاڑی، مولانا محب النبی صاحب از لاہور، مولانا معاویہ اعظم طارق از جھنگ، مولانا محمد الیاس صاحب از چناری، مولانا عبدالمالک از مظفر آباد، مولانا عبدالظاہر فاروقی اور مولانا سعید اعوان از بحریہ ٹاؤن راولپنڈی وغیرہم کے اسماء نمایاں ہیں۔

میں نے اپنی زندگی میں والد محترم سے زیادہ اوقات کا پابند علمائے کرام میں سے کسی کو نہیں پایا۔ ان کی اوقات کی پابندی اتنی مشہور تھی کہ لوگ ان کو دیکھ کر گھڑیوں کے ٹائم درست کیا کرتے تھے، مگر معذوری اور لاچاری انسان کو کس قدر بے بس بنا دیتی ہے۔ مسلسل بیماری کی وجہ سے پوری پوری رات والد محترم کو نیند نہیں آتی تھی۔ عزیزم راشد، ان کی اہلیہ یا باجی ام داؤد خان نوید اپنی بیٹی سمیت پوری پوری رات جاگ کر تیمارداری میں مصروف رہتے۔ بسا اوقات طبیعت میں اس قدر اضطراب ہوتا کہ نہ لیٹ کر آرام آتا نہ بیٹھ کر۔ کبھی فرماتے بٹھا دو، کبھی فرماتے لٹا دو۔ دو تین راتیں عزیزم راشد اور باجی کی عدم موجودگی میں احقر کو کچھ دیر یہ خدمت انجام دینے کا شرف ملا تو پتہ چلا کہ کس قدر مشکل اور بھاری ذمہ داری ہے۔ بیس منٹ میں تقریباً تیس دفعہ فرمایا، بٹھا دو، لٹا دو۔ دل سے دعا نکلی کہ اے اللہ، ان عزیزوں کو جزائے خیر عطا فرما جنہوں نے یہ حساس ذمہ داری قبول کر کے ہمیں سبک دوش کیا ہوا ہے۔ خصوصاً باجی کی حالت پر تو بہت رحم آتا کہ بے چاری خود بھی گھٹنوں کے درد کے باعث چلنے پھرنے سے معذور ہیں، لاٹھی کے سہارے بڑی مشکل سے دو چار قدم اٹھاتی ہیں۔ اللہ پاک سب کی خدمت کو قبول فرمائے اور ہماری طرف سے ان سب کو جزائے خیر عطا فرمائے، آمین۔

۲۴ اور ۲۵ راپریل کی درمیانی رات دو بجے کے لگ بھگ عزیزم راشد نے، جو رات کو خدمت کی ڈیوٹی پر تھے، آکر میرے کمرے کا دروازہ کھٹکھٹایا۔ میں جلدی سے اٹھا تو انہوں نے کہا کہ والد محترم کی طبیعت خراب ہے۔ احقر جب والد محترم کے پاس حاضر ہوا تو دیکھا کہ والد صاحب خون کی الٹیاں کر رہے ہیں۔ طبیعت میں بے چینی ہے۔ کچھ دیر کے بعد جب افاقہ ہوا تو آرام کی غرض سے آنکھیں بند کر لیں۔ پوچھا کہ ڈاکٹر کو بلائیں تو فرمایا، آرام ہے، ضرورت نہیں۔ تھوڑی دیر کے بعد نیند کی آغوش میں چلے گئے۔ دل میں کھٹکا پیدا ہوا، تھوڑا سا کھانس کر اطمینان کرنا چاہا۔ آواز سن کر دوبارہ آنکھیں کھول کر دیکھا تو قدرے اطمینان ہوا۔ عزیزم راشد کہنے لگے، آپ آرام کر لیں۔ اگر خدانخواستہ ضرورت محسوس ہوئی تو آپ کو دوبارہ اٹھا لوں گا۔ بادل نخواستہ واپس ہوا، مگر نیند آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔ صبح کا انتظار کرنے لگا۔ صبح اٹھ کر دیکھا کہ آرام فرما رہے ہیں تو دل کو تسلی ہوئی۔ اس قے کے بعد طبیعت اور مزاج میں دو تبدیلیاں آئیں۔ ایک تو مسلسل خاموشی طاری ہوگئی۔ پہلے آنے والوں سے حال احوال پوچھتے تھے، مگر اب خاموش رہتے۔ کوئی سوال کرتا تو کبھی جواب دے دیتے، کبھی خاموش

رہتے، کبھی ہاتھ سے اشارہ فرما دیتے۔ دوسرے نمبر پر کھانا تو پہلے ہی تناول نہ فرماتے تھے، تھوڑا سا دودھ یا جوس وغیرہ پی لیا کرتے تھے، مگر اب بالکل انکار فرما دیتے۔ فرماتے دل نہیں چاہتا۔ ڈاکٹر حضرات نے چیک اپ کیا تو رپورٹ دی کہ خون کی مقدار کم ہے، اس لیے کھانے کی اشتہا نہیں ہوتی۔ چار دن مسلسل خون لگتا رہا، مگر فرق نہ پڑا۔ ڈاکٹر فضل الرحمن صاحب فرمانے لگے کہ اگر غذا کے بارے میں یہی صورت حال رہی تو مصنوعی طریقے سے غذا کا انتظام کرنا پڑے گا۔ اس دوران ہسپتال لے جانے کا بھی مشورہ ہوا۔ عزیزم راشد نے سروسز ہسپتال لاہور اور اتفاق ہسپتال لاہور میں تقریباً بات بھی مکمل کر لی، مگر والد محترم آمادہ نہ ہوئے۔ بالآخر یہ حربہ اختیار کیا گیا کہ حضرت کی خدمت میں عرض کیا جائے کہ اگر غذا نہیں لیں گے تو مصنوعی طریقہ سے غذا دینا پڑے گی، یا تو ڈرپوں کے ذریعے یا ناک کے ذریعے اور پھر ہسپتال بھی جانا پڑے گا۔ یہ حربہ کامیاب ثابت ہوا۔ اب قبلہ والد محترم نہ چاہتے ہوئے بھی کچھ نہ کچھ غذا لینے لگے جس پر سب نے اطمینان کا اظہار کیا۔

یکم مئی بروز جمعۃ المبارک برادر مکرم مولانا زاہد الراشدی صاحب، جو کہ برطانیہ اور سعودیہ کے تین ہفتے کے دورے پر تشریف لے گئے ہوئے تھے، بعد نماز عصر مع اہل وعیال تشریف لائے۔ ان سے مل کر قبلہ والد محترم کی طبیعت کچھ بحال ہوئی۔ بھائی جان نے مسند ابی یعلیٰ موصلی پیش کی جس کا ذکر قبلہ والد محترم نے بھائی جان کے سامنے سفر پر جانے سے پہلے کیا تھا۔ والد محترم کتاب دیکھ کر بہت خوش ہوئے۔ میں قریب ہی کھڑا تھا، مجھے فرمایا کتاب الماری میں رکھ دو۔ افسوس کہ والد صاحب کو یہ کتاب بالتفصیل دیکھنے کا موقع نہ مل سکا۔ رات گئے بھائی جان بمع اہل وعیال واپس تشریف لے گئے۔ یہ ان کی والد صاحب سے آخری ملاقات تھی۔

یکم اور ۲ رمئی کی درمیانی رات میں احقر نے خواب دیکھا کہ عم مکرم حضرت مولانا صوفی عبدالحمید سواتی تشریف لاتے ہیں اور احقر کے سر پر پیار بھرا ہاتھ پھیر کر دائیں ہاتھ کے بالمقابل کھڑے ہو جاتے ہیں۔ اسی اثنا میں ہماری دونوں والدہ تشریف لاتی ہیں۔ چھوٹی والدہ محترمہ ذرا آگے ہیں اور بڑی والدہ محترمہ ذرا ایک قدم پیچھے ہیں۔ چھوٹی والدہ محترمہ نے احقر کے سر پر شفقت بھرا ہاتھ پھیرا اور فرمایا، تمہاری طبیعت ٹھیک نہیں، لیٹ جاؤ، آرام کرو۔ ایک سفید رنگ کی چادر اوڑھنے کے لیے دیتی ہیں اور پھر فرماتی ہیں کہ دوائی بھی پی لو، چنانچہ پانی میں دوائی ڈال کر دیتی ہیں۔ ابھی پی نہیں سکا کہ اہلیہ نے فجر کی نماز کے لیے بیدار کر دیا۔ صبح سب گھر والوں کے سامنے اس خواب کا تذکرہ کیا مگر تعبیر کوئی سمجھ نہ سکا۔ اسی دن شام کو استاد مکرم و برادر محترم مولانا رشید الحق خان عابد بھی تشریف لے آئے۔ ان کے سامنے بھی خواب کا تذکرہ ہوا تو فرمایا کہ فوراً کچھ صدقہ کر دو۔

ظہر کی نماز کے بعد عزیزم راشد صاحب نے والد محترم سے عرض کیا کہ برادر مکرم مولانا رشید الحق خان عابد آج تشریف لا رہے ہیں تو والد صاحب بہت خوش ہوئے۔ اس دن بھی طبیعت میں کچھ اضطراب تھا، مگر بحمد للہ دودھ، جوس اور پانی کی شکل میں کچھ نہ کچھ غذا لیتے رہے۔ عصر کے بعد حاجی میر لقمان اللہ صاحب، ڈاکٹر فضل الرحمن صاحب اور مولانا نواز بلوچ صاحب تشریف لائے۔ تھوڑی دیر کے بعد مولانا ریاض انور گجراتی بھی تشریف لے آئے اور حضرت والد محترم سے ملاقات کر کے تشریف لے گئے جو ان کی آخری ملاقات ثابت ہوئی۔ شام کے وقت برادر مکرم مولانا رشید الحق خان عابد تشریف لائے تو ان سے مل کر قبلہ والد محترم کی طبیعت کچھ کھلی اور پھر کافی دیر تک ان سے گفتگو کرتے رہے۔ اگلے دن ۳ مئی ۲۰۰۹ء کو بھی برادر مکرم مولانا رشید الحق خان عابد یہیں تھے۔ گاہے بگاہے والد محترم کی خدمت میں حاضری دیتے رہے جس سے والد

صاحب کی طبیعت کافی ہشاش بشاش رہی۔ دن بھر والد صاحب سے ملاقات کے لیے لوگ تشریف لاتے رہے۔ عصر کے بعد حسب معمول حاجی لقمان اللہ صاحب اور ڈاکٹر فضل الرحمٰن تشریف لائے۔ حضرت کو تھوڑا سا جوس پلایا، چیک اپ کیا اور فرمایا کہ تھوڑی تھوڑی دیر کے بعد کچھ نہ کچھ پلاتے رہیں۔

اگلے دن ۴؍مئی کو برادر مکرم مولانا رشید الحق خان عابد صاحب سے پروگرام پوچھا تو فرمایا کہ آج شام واپسی ہے۔ عصر کے وقت برادر مکرم قاری محمد اشرف خان ماجد مرحوم کے گھر تشریف لے گئے۔ احقر بھی کچھ دیر کے بعد ان کے پیچھے گیا، پھر خیال آیا کہ حاجی صاحب اور ڈاکٹر صاحب کے آنے کا وقت ہے، واپس گھر چلتا ہوں مگر باتوں میں مشغولیت کی وجہ سے کچھ دیر ہوگئی۔ واپسی سے پہلے جب برادر مکرم سے دوبارہ پروگرام پوچھا تو فرمانے لگے کہ آج رہوں گا۔ پھر احقر جب واپس گھر آیا تو پتہ چلا کہ حاجی صاحب اور ڈاکٹر صاحب تشریف لائے تھے، مگر خلاف معمول آج جلد واپس چلے گئے ہیں۔ بعد میں جب حاجی صاحب اور ڈاکٹر صاحب سے ملاقات ہوئی تو انہوں نے فرمایا کہ ہمارا ارادہ تو بیٹھنے کا تھا، مگر جب حضرت کو جوس پلانے لگے تو حضرت نے باجی کو بلا بھیجا اور ہم اس لالچ میں اٹھ آئے کہ چلو ہم سے نہیں تو ان کے ہاتھ سے کچھ نہ کچھ پی لیں گے۔

بہر کیف جب گھر پہنچا تو ڈاکٹر صاحب تو جا چکے تھے، البتہ برادر محترم قاری حماد الزہراوی صاحب تشریف لائے ہوئے تھے جو کہ ۲۴؍اپریل کے بعد تقریباً ہر روز عصر کے بعد والد محترم کا حال احوال معلوم کرنے آتے تھے۔ وہ والد محترم سے ہم کلام تھے اور عرض کر رہے تھے کہ اگر بادل نخواستہ تھوڑا بہت دودھ نوش فرمالیا کریں تو بہت بہتر رہے گا کیونکہ دودھ دوا کی دوا اور غذا کی غذا ہے، مگر والد محترم نے کوئی جواب نہیں دیا۔ اس کے بعد ان کی آنکھ لگ گئی اور نیند کی آغوش میں چلے گئے۔ اسی اثنا میں معارف اسلامیہ اکیڈمی گکھڑ کے دو طالب علم ناصر گجراتی صاحب اور ان کا ایک ساتھی قبلہ والد محترم کی عیادت کے لیے تشریف لائے، مگر برادر مکرم قاری حماد صاحب نے ان سے کہا کہ حضرت آرام فرما رہے ہیں، آپ پھر آ جائیں۔ چنانچہ وہ چلے گئے۔ شام کے بعد برادر مکرم مولانا رشید الحق صاحب گھر تشریف لائے۔ باجی اور ان کی صاحبزادی قبلہ والد محترم کے پاس تھیں۔ احقر اور برادر مکرم جب کھانا کھانے لگے تو باجی کو بھی دعوت دی۔ فرمانے لگیں کہ آپ لوگ کھالیں، ہم ابھی ابا جان کے پاس ہیں، بعد میں کھالیں گی۔ کھانے کے بعد برادر مکرم مولانا رشید الحق صاحب والد محترم کی خدمت میں چلے گئے۔ تھوڑی ہی دیر گزری تھی کہ اخت نوید نے آکر مجھ سے کہا کہ نانا ابو آپ کو بھی بلا رہے ہیں۔ احقر جب والد محترم کے پاس پہنچا تو برادر مکرم کرسی پر تشریف فرما تھے۔ ناچیز نے والد محترم کے قدموں میں بیٹھتے ہوئے عرض کیا، جی ابا جان۔ فرمانے لگے، ام نوید اور اخت نوید گوجرانوالہ اپنے گھر جانا چاہتی ہیں، ان کو روک لو، میری طبیعت ٹھیک نہیں۔ احقر نے عرض کیا کہ ان کو رکنے کی درخواست کر دیتے ہیں، چنانچہ والد صاحب کچھ خوش ہو گئے۔ میں کمرے سے باہر نکلا اور باجی سے بات کی تو انہوں نے کہا صرف ایک دو دن کے لیے جانا چاہتے ہیں تاکہ گھر کے کچھ ضروری معاملات سمیٹ سکیں۔ احقر نے عرض کیا کہ والد صاحب کی طبیعت ٹھیک نہیں، خلاف طبیعت کوئی کام اور بات نہ کریں، اگر کوئی ضروری کام ہے تو میں چلا جاتا ہوں۔ باجی مسکرائیں اور کہنے لگیں کہ ٹھیک ہے، نہیں جاتے۔

پھر برادر مکرم مولانا رشید الحق خان عابد صاحب احقر کے بیٹے ارسلان کو لے کر برادر مکرم قاری حماد الزہراوی صاحب کے گھر تشریف لے گئے اور ناچیز عشا کی نماز کے لیے وضو کرنے لگا۔ تھوڑی تاخیر ہوگئی اور مسجد میں جماعت ہوگئی۔ احقر نے باجی سے عرض کیا کہ والد محترم کی آنکھ لگی ہوئی ہے۔ آپ لوگ کھانا کھالیں، میں والد محترم کے کمرے میں نماز پڑھ لیتا ہوں۔ اسی اثنا میں کراچی سے دو مہمان آئے۔ احقر نے ان کو دوسرے کمرے میں بٹھا دیا۔ باجی اور اخت نوید کھانے میں مشغول ہو گئیں اور احقر قبلہ والد محترم کے کمرے میں نماز میں مشغول ہو گیا۔ چوتھی رکعت میں تھا کہ والد محترم نے اخت نوید کو آواز دی، جواب نہ ملا تو ادھر دیکھا اور پھر مجھے آواز دی۔ میں نے جلدی سے آخری رکعت مکمل کی اور حاضر خدمت ہوا۔ فرمایا مجھے بٹھا دو۔ میں نے بٹھا دیا اور عرض کیا کہ دو مہمان ہیں۔ فرمایا بلالو۔ میں نے دونوں مہمانوں کو بلایا۔ ایک کا نام مولانا امداد اللہ صاحب تھا، دوسرے کا نام معلوم نہیں۔ دونوں حضرات کراچی سے جماعت میں وقت لگانے کے لیے رائے ونڈ تشریف لائے ہوئے تھے اور وہاں سے شیخ کی زیارت کے لیے آئے تھے۔ یہ حضرات والد صاحب سے ملے اور حدیث کی اجازت چاہی۔ حضرت نے اجازت دے دی۔ یہ قبلہ والد محترم کی زندگی کے آخری مہمان اور اجازت حدیث لینے والے آخری خوش نصیب تھے۔

جب وہ لوگ چلے گئے تو والد محترم نے فرمایا، اخت نوید کو بلاؤ۔ اسے بلایا تو فرمایا مجھے لٹا دو۔ چنانچہ عزیزہ نے والد محترم کو پھر لٹا دیا۔ اس کے بعد عزیزم راشد نے والد محترم کا لباس اور بستر بدلا جو کہ خدمت کے باب میں ایک انتہائی دشوار مرحلہ ہوتا تھا۔ گھر والوں میں صرف عزیزم راشد ہی ایسے تھے جو مضبوط اور صحت مند ہونے کی وجہ سے اس خدمت کو بخوبی انجام دے سکتے تھے۔ اللہ تعالیٰ ان کو جزائے خیر عطا فرمائے کہ آٹھ دس سال تک قبلہ والد محترم کو نہلانا، ان کے کپڑے اور بستر بدلنا اور بیت الخلاء سے فراغت جیسی ذمہ داری کو نبھانا انہی کا خاصہ تھا۔ بہر کیف اس کے بعد باجی اور اخت نوید والد محترم کے کمرے میں چلی گئیں۔ تقریباً گیارہ بج کر تیس منٹ پر برادر مکرم مولانا رشید الحق خان عابد صاحب واپس تشریف لے آئے اور آرام کی غرض سے اوپر کمرے میں تشریف لے گئے۔ باقی گھر والے بھی اپنے کمروں میں سونے کے لیے چلے گئے اور احقر قبلہ والد محترم کے کمرے کے سامنے برآمدے میں ایک چارپائی پر لیٹ کر اس دن کے اخبار پڑھنے لگا۔ تقریباً بارہ بج کر سات منٹ پر عزیزہ اخت نوید دوڑتی ہوئی باہر آئی اور کہا، ماموں جلدی آئیں، نانا جان کی طبیعت خراب ہوگئی ہے۔ احقر دوڑتا ہوا اندر گیا تو دیکھا کہ والد محترم پھر خون کی قے کر رہے تھے، مگر مقدار بہت تھوڑی تھی۔ ہم نے پیچھے تکیے رکھ کر بٹھایا۔ والد صاحب کی سانسیں اکھڑ رہی تھیں۔ میں نے کہا کہ جلدی سے عزیزم راشد اور بھائی جان رشید الحق صاحب کو اٹھا دو۔ وہ دوڑتے ہوئے آئے۔ میری اہلیہ اور عزیزم راشد کی اہلیہ اور ان کی ہمشیرہ، جو مہمان آئی ہوئی تھیں، سب آناً فاناً جمع ہو گئے۔ ڈاکٹر حضرات کو فون کیے۔ ڈاکٹر فضل الرحمٰن صاحب اور حاجی میر لقمان اللہ صاحب نے، جو کہ گوجرانوالہ شہر میں رہتے ہیں، فرمایا ہم ابھی پہنچ رہے ہیں۔ تھوڑی دیر کے بعد جب ہاتھ اور پاؤں کی مالش کی گئی تو طبیعت قدرے بحال ہوگئی۔ سب نے اطمینان کا اظہار کیا کہ بحمد اللہ طبیعت بہتر ہوگئی، چنانچہ والد صاحب کو سیدھا لٹا دیا گیا۔ سب نے دیکھا کہ والد صاحب ٹکٹکی باندھے چھت کی طرف دیکھ رہے تھے اور منہ سے کچھ بول یا پڑھ رہے تھے۔ ہلکی ہلکی آواز تو آرہی تھی، مگر ہم لوگ سمجھ نہیں سکے۔ تھوڑی دیر کے بعد قے کے لیے ابکائی آئی، اٹھا کر بٹھایا مگر قے نہ آسکی۔ احقر نے پوچھا، ابا جان تکلیف ہے؟ فرمایا ہاں۔ پوچھا کس جگہ؟ کوئی جواب نہیں دیا۔ احقر نے باری باری سر، سینہ اور بازوؤں کی طرف اشارہ کیا تو فرمایا نہیں، جب پیٹ کی طرف اشارہ کیا تو فرمایا ہاں۔ برادر محترم مولانا رشید الحق صاحب فرمانے لگے، نیم گرم پانی میں شہد ملا کر لاؤ۔ چمچ کے ذریعے پلانے کی کوشش کی، مگر نہ پیا۔ احقر

اور برادر مکرم رشید الحق صاحب سامنے تھے، دائیں جانب اخت نوید اور بائیں جانب ام نوید تھیں، عزیزم راشد بے چارے شٹل کاک کی طرح کبھی اندر کبھی باہر ڈاکٹروں کے انتظام میں بھاگ دوڑ کر رہے تھے۔ اس اثنا میں عزیزم مولانا مدثر صاحب بھی، جو کہ والد محترم کے پرانے خدمت گزار تھے، تشریف لے آئے۔ انہوں نے سر توڑ کوشش کی کہ کوئی ڈاکٹر مل جائے، مگر بدقسمتی سے رات کی وجہ سے کوئی ڈاکٹر نہیں مل رہا تھا۔ اس اثنا میں والد محترم نے باجی کو آواز دی جو بائیں جانب تھیں۔ انہوں نے کہا، جی ابا جان۔ پھر اخت نوید کو آواز دی۔ پھر اس حال میں کہ دایاں ہاتھ عزیزم راشد کے ہاتھ میں تھا، ایک نظر سب کی طرف دیکھتے ہوئے اپنے دائیں کندھے کے بالکل سامنے دیکھا اور دیکھتے ہی دیکھتے جان جاں آفریں کے سپرد کر دی اور آسمان علم کا وہ آفتاب جو برسوں جہالت کی ظلمتیں مٹاتا رہا، افق میں غروب ہو گیا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

میں نے اسٹیتھو سکوپ کے ذریعے دل کی دھڑکن جانچنے کی بڑی کوشش کی مگر ناتجربہ کاری کی وجہ سے کچھ سمجھ نہیں آ رہا تھا۔ اس اثنا میں گکھڑ کے ڈاکٹر عصمت اللہ علوی صاحب تشریف لائے، انہوں نے چیک کیا۔ عزیزم راشد نے ان کے کہنے پر مصنوعی تنفس کی بھی کوشش کی، مگر بے سود۔ پھر ڈاکٹر صاحب ایک طرف ہو کر کھڑے ہو گئے، زبان سے کچھ نہ کہہ سکے، مگر ان کا چہرہ وہ سب کچھ کہہ گیا جو زبان نہ کہہ سکی۔ اسی اثنا میں ڈاکٹر فضل الرحمن اور حاجی لقمان صاحب بھی تشریف لے آئے، چیک کیا، ''انا للہ'' پڑھا اور آنسوؤں کی برسات میں ہمیں وہ سندیسہ دے دیا جو رہتی دنیا تک ہمیں تڑپاتا رہے گا۔

رات دن محنت سے جس کو اس جہاں میں کام تھا
ہر گھڑی جہد و مشقت جس کا شغلِ عام تھا
زندگی میں اپنی جو وقفِ غم و آلام تھا
چین سے سوتا نہ تھا بے گانۂ آرام تھا
وہ گیا ہے عالم برزخ میں سونے کے لیے
رہ گئے ہم اس جہاں میں آج رونے کے لیے

حق کے مٹنے کی دو صورتیں ہوتی ہیں۔ ایک تو یہ کہ حق کو بیان ہی نہ کیا جائے۔ جب بیان نہیں کیا جائے گا تو آنے والی نسلوں کو کیا پتہ چلے گا کہ کیا حق ہے اور کیا حق نہیں ہے۔ دوسرا یہ کہ حق اور باطل کا ملغوبہ بنا دیا جائے، اس طرح خلط ملط کر دیا جائے کہ پتہ ہی نہ چلے کہ حق کیا ہے اور باطل کیا ہے۔ اسی واسطے بدعت کا بہت سخت گناہ ہے۔ اگر کوئی شخص مسجد میں بیٹھ کر سو بوتل شراب پی لے تو اندازہ لگاؤ کہ کس قدر گناہ ہے، مگر ایک بدعت کا گناہ اس سے بھی زیادہ ہے۔ کیونکہ گناہ کے ساتھ دین کا نقشہ نہیں بدلتا اور بدعت کے ساتھ دین کا نقشہ بدل جاتا ہے۔ جو چیز دین نہیں ہے، بدعت سے وہ دین سمجھ لی جاتی ہے۔ جن لوگوں نے بدعات کو سنبھالا ہوا ہے، یہ ان کا دین ہے۔ اگر اس کی مخالفت کریں تو کہتے ہیں کہ ہمارے دین کی مخالفت کی گئی ہے۔ اس لیے سو گناہ کبیرہ ایک طرف اور ایک بدعت ایک طرف ہو تو اس کا گناہ زیادہ ہے۔ گناہ کرنے والا یہ سمجھتا ہے کہ میں گناہ گار ہوں، کبھی تو توبہ کر سکتا ہے، جبکہ بدعت کرنے والا اس کو کار ثواب سمجھتا ہے تو ثواب کے کام سے توبہ کیوں کرے گا؟ (ذخیرۃ الجنان ۱/۱۱۵)

ام عمران شہید*

میرے بابا جان

۵ مئی کی رات میرے لیے بہت ہی دکھوں بھری داستان چھوڑ گئی۔ تین چار دن پہلے چھوٹی بھابھی کا فون آیا کہ ابا جان کی طبیعت خراب ہے اور وہ بہت کمزور ہو گئے ہیں۔ لیکن ذہن نے یہ قبول نہیں کیا کہ میرے بابا جان ہم سب کو ایسے چھوڑ کر چلے جائیں گے۔ میں ملاقات کے لیے جانے کے پروگرام ہی بناتی رہی، لیکن مجبوریاں آڑے آ گئیں اور اصل تو یہ ہے کہ مقدر میں ملاقات تھی ہی نہیں۔ روزانہ فون کر کے پوچھتی تو جواب ملتا کہ خطرے کی کوئی بات نہیں، صرف کمزوری ہے۔ اس شام کو جہلم میں چھوٹی ہمشیرہ سے بات ہوئی تو اس نے بھی یہی کہا کہ بچے گئے تھے اور ابا جان بہت کمزور ہو گئے ہیں۔ اس سے پہلے بھی کافی کمزور ہو جاتے تھے، لیکن خون وغیرہ لگانے سے افاقہ ہو جاتا۔ پس یہی امید تھی کہ اللہ تعالیٰ میرے بابا جان کو صحت عطا کر دیں گے۔

اس رات بھی بے چینی سے لیٹی یہ منصوبہ بنا رہی تھی کہ صبح ہر حال میں بابا جان سے ملنے جاؤں گی۔ آنکھ لگے ابھی تھوڑی دیر ہوئی تھی کہ کسی نے میرا دایاں پاؤں بڑے زور سے پکڑ کر ہلایا۔ میں ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھی۔ ادھر ادھر دیکھا۔ لائٹ جل رہی تھی، لیکن اہل خانہ سب سوئے ہوئے تھے۔ میں بہت پریشان ہوئی اور ایسا محسوس ہوا کہ میرا دم گھٹنے لگا ہے۔ اٹھ کر ٹیک لگا کر بیٹھ گئی۔ وقت دیکھا تو بارہ بج کر بیس منٹ ہو رہے تھے۔ پریشانی میں اٹھا بھی نہیں جا رہا تھا کہ اٹھ کر کوئی دوا وغیرہ لے لوں۔ اسی طرح بیٹھے بیٹھے تقریباً دو بج گئے۔ دو بجے کے لگ بھگ فون کی گھنٹی ہوئی۔ میں نے گھبرا کر فون اٹھایا۔ دل بہت زور سے دھڑک رہا تھا اور ایسا لگتا تھا کہ سخت طوفان آنے والا ہے۔ ہمت کر کے فون اٹھایا۔ موبائل پر چھوٹی بہن نے یہ روح فرسا خبر سنائی تو بے اختیار اتنی زور زور سے میری چیخیں نکلیں کہ دوسرے کمروں سے گھر کے سارے افراد جمع ہو گئے اور پوچھنے لگے کہ کیا ہوا ہے، لیکن میں اپنی چیخوں پر قابو نہیں پا رہی تھی۔ جب ان کو پتہ چلا تو سارے گھر میں کہرام مچ گیا۔ میرا بلڈ پریشر اس قدر ہائی ہو گیا کہ لگتا تھا کہ دماغ کی شریانیں پھٹ جائیں گی۔ مجھے بابا جان کے کہے ہوئے الفاظ ایک دم یاد آ گئے: کل نفس ذائقة الموت۔ اپنی اپنی باری پر سب کو جانا ہے، صبر کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑنا چاہیے۔ یہ الفاظ بابا جان نے کچھ عرصہ پہلے کسی کی موت پر کہے تھے۔ میں پریشان تھی کہ ان کا باپ فوت ہو گیا ہے اور بچے پریشان تھے۔ اس وقت مجھے یہ بات یاد آئی تو فوراً مجھے جھٹکا لگا اور میں نے جلدی سے چارپائی سے اٹھ کر پہلے دو گولیاں بلڈ پریشر کی لیں، پھر وضو کیا اور کچھ نوافل پڑھے۔ سحری کا وقت تھا۔ پتہ نہیں کیا پڑھا اور کیا نہیں، لیکن اللہ سے اپنی بے صبری کی معافی مانگی، توبہ کی کہ اے اللہ! یہ میرے بس میں نہیں تھا۔ اللہ پاک مجھے معاف کر دیں اور مجھے صبر اور استقامت دیں تاکہ میں اپنے بابا جان کا آخری

*دختر امام اہل سنتؒ۔ خادمہ مدرسہ عمران شہید للبنات۔ اچھڑیاں

دیدار استقامت سے کرسکوں۔ صبح اذان ہوتے ہی نماز پڑھی اور سفر پر روانہ ہوگئی۔

اللہ تعالیٰ نے میری دعاؤں کو شرف قبولیت بخشا اور مجھے پتہ ہی نہیں چلا کہ میں نے سفر کیسے طے کیا۔ تقریباً ساڑھے بارہ بجے ہم گکھڑ پہنچ گئے۔ ہمارے پہنچنے کے تقریباً ایک گھنٹہ بعد بابا جان کو غسل کے لیے لے جایا گیا۔ جب نہلا کر لایا گیا تو دیدار کرنے والا ہجوم اور ان کی تڑپ قابل دید تھی۔ میں بابا جان کو بوسہ دینے کے لیے جھکی تو بابا جان کی آنکھیں تھوڑی تھوڑی کھلی ہوئی لگ رہی تھیں، جیسا کہ زندگی میں نیند کی حالت میں ہوتی تھیں۔ مجھے اس وقت یہ محسوس ہوا کہ بابا جان میرا انتظار کرتے رہے ہیں، لیکن میں بدنصیب تھی کہ آخری وقت میں ملاقات نہ کرسکی۔ اس سے کچھ عرصہ پہلے میں اور چھوٹی بھابھی اور بھتیجی تقریباً ڈیڑھ ہفتہ گکھڑ رہے تو بابا جان ہمیں اپنے کمرے سے ایک منٹ کے لیے بھی نکلنے نہیں دیتے تھے۔ تھوڑی دیر کے لیے باہر آجاتی تو اسی وقت بابا جان بلوا لیتے، یہاں تک کہ کہتے کہ نماز بھی یہیں پڑھو۔ ان دنوں میں بابا جان نے ہم سے ہر قسم کے موضوع پر بہت سی باتیں کیں۔ کچھ کتابوں کے بارے میں سوالات پوچھے اور مدرسہ، گھر اور بچوں سے متعلق دریافت کرتے رہے۔ کچھ پرانے واقعات بھی سنائے۔ یوں یہ ڈیڑھ ہفتہ میری زندگی کا حاصل بن گیا۔ جب رات کو بابا جان تھوڑا سو جاتے تو چھوٹا بھائی عزیزم راشد اور بھابھی جو کہ ہماری خالہ زاد بہن بھی ہیں، ہم سب بہن بھائی بیٹھ کر گپیں لگاتے۔ بھائی بھی کھانے پینے کے لیے کچھ نہ کچھ لے آتے اور ہمارے ساتھ بیٹھے رہتے۔ بھابھی بھی ہمارا بہت خیال رکھتی۔

جس دن میں نے واپس آنا تھا، میں خود بہت پریشان تھی اور بابا جان بھی پریشان تھے۔ اکثر جب میں واپس آتی تو انھیں روتے ہوئے چھوڑ کر آتی تھی، کیونکہ واپس تو آنا ہی ہوتا تھا۔ اس دن بھی شام کو میں گوجرانوالہ چلی گئی اور وہاں دو دن گزار کر واپس آگئی۔ اس کے بعد یکم مارچ کو ہمارے چھوٹے بہنوئی قاری خبیب احمد عمر اچانک ہمیں چھوڑ کر اس دنیا فانی سے رخصت ہوگئے۔ میں ان کی وفات پر جہلم آئی تو میں اور میری بیٹی گکھڑ بھی گئے۔ یہ میری بابا جان سے آخری ملاقات تھی۔ رات کو عشا سے پہلے ہی بابا جان نے میری بیٹی سے کہا کہ بستر لا کر یہاں بچھا دو۔ آپ کی امی آج میرے پاس سوئے گی۔ تھوڑی دیر کے بعد وہ دوبارہ کمرے میں آئی، لیکن بستر ساتھ نہیں تھا۔ بابا جان نے اسے بہت ڈانٹا کہ میں کہہ رہا ہوں کہ بستر لا کر بچھاؤ اور تم نہیں لائیں۔ خیر چھوٹی بھابھی نے بستر بچھا دیا۔ بابا جان کے پاس بیٹھے بیٹھے تقریباً ڈیڑھ بج گئے۔ پھر بھائی راشد آگئے۔ بابا جان ان کو دیکھ کر بہت پریشان ہوگئے۔ کبھی اس کو دیکھتے اور کبھی مجھے۔ میں نے بابا جان سے کہا کہ آج میں یہاں سو جاتی ہوں، لیکن بھائی نے کہا کہ بابا جان بار بار کبھی اٹھتے ہیں اور کبھی لیٹتے ہیں اور کپڑے وغیرہ بھی تبدیل کرنے ہوتے ہیں۔ ان کا کہنا صحیح تھا، کیونکہ میں یہ کام نہیں کرسکتی تھی۔ جب میں کمرے سے باہر آئی تو بابا جان بار بار مجھے دیکھ رہے تھے۔ میں اس رات بالکل سو نہیں سکی۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا وجہ ہے، کیونکہ اس سے پہلے آ کر کہتی کہ میں یہاں آپ کے پاس سو جاتی ہوں تو بابا جان کہتے کہ تم بیمار ہو جاؤ گی، آرام کرلو۔

چھوٹے بھائی راشد اور بھابھی اور چھوٹی ہمشیرہ اور ان کی بیٹیاں اور خصوصاً چھوٹی بیٹی جو بابا جان کو بہت عزیز تھی اور جسے وہ بار بار اپنے پاس بلاتے تھے، سب بہت خوش نصیب ہیں۔ چھوٹے بھائی نے اباجی کی خدمت کے لیے ہر کام ہر شغلہ چھوڑ رکھا تھا جو کہ ایک بہت بڑی قربانی ہے۔ وہ ایک دن بھی کہیں باہر نہیں جاسکتے تھے۔ انہوں نے یہ ذمہ داری بڑی خوش اسلوبی سے انجام دی۔ اللہ تعالیٰ ان کی قربانیوں کا آخرت میں اجر جزیل دے کہ ان کی وجہ سے ہم سب بے فکر تھے۔

اگر میں یہ کہوں کہ بابا جان کو مجھ سے بہت پیار تھا تو بے جا نہ ہوگا۔ آپ کی تمام اولاد میں ہر کوئی یہ کہتا ہے کہ بابا کو مجھ سے زیادہ پیار تھا۔ حقیقت میں بابا کو اپنی تمام اولاد سے بہت پیار تھا۔ آخری ملاقات میں بھی بابا جان نے یہ ذکر کیا کہ جب میں حج پر گیا تو بہت بیمار ہوگیا۔ دل میں خواہش تو تھی کہ یہاں قبر نصیب ہو، لیکن میں نے دعا کی کہ اللہ مجھے اپنے بچوں کے پاس پہنچادے۔ آپ کی محبت کا یہ عالم تھا کہ کچھ ماہ پہلے میری چھوٹی بیٹی کا چھ سالہ بیٹا بچہ عکرمہ گکھڑ میں بابا جان سے ملاقات کے بعد واپس جاتے ہوئے لالہ موسیٰ کے قریب کار کے حادثے میں شہید ہوگیا تو اس وقت بھی بابا جان فون پر تعزیت کرتے ہوئے بہت روئے اور بار بار فون کرتے رہے۔ جب میں گکھڑ آئی تو بابا جان نے کہا کہ مجھے عکرمہ کی والدہ بہت یاد آتی ہے، لیکن میں اس کے پاس جا نہیں سکتا تھا۔ کہتے کہ عکرمہ نے میری کمر توڑ دی ہے۔ میں جب واپس آئی تو میں نے بیٹی سے کہا کہ بابا جان بہت روتے اور آپ کو یاد کرتے تھے۔ بھلا ہو میرے داماد مولانا عبد الحق صاحب کا، وہ انہی دنوں بچوں کو لے کر بابا جان کی ملاقات کے لیے چلے گئے۔ واپس آئے تو روتے ہوئے بتایا کہ مجھے بہت شرمندگی ہوئی ہے کہ بابا جان کہہ رہے تھے کہ تمہارا بہت بہت شکریہ کہ تم مجھے ملنے آئے ہو۔ یہ آپ کی محبت تھی۔

ہماری والدہ صاحبہ کی وفات کو تقریباً بیس سال ہو چکے ہیں، لیکن بابا جان نے ہمیں کوئی کمی محسوس نہیں ہونے دی۔ بڑی والدہ کے انتقال پر جب میں رات کافی دیر سے گکھڑ پہنچی اور دروازہ کھٹکھٹایا تو بابا جان نے دروازہ کھولا۔ میں پریشان ہوگئی کہ بابا جان ابھی تک جاگ رہے ہیں۔ اندر گئی تو بابا جان نے مجھے اپنے زور سے سینے کے ساتھ لگا کر پیار دیا۔ میں حیران ہوگئی اور مجھے سب کچھ بھول گیا کہ میں کیا سوچ رہی تھی۔ اللہ گواہ ہے کہ آج بھی جب یاد کرتی ہوں تو بابا جان کے سینے کی ٹھنڈک مجھے اپنے سینے میں محسوس ہوتی ہے۔

میرے بھتیجے عمار خان ناصر کا اصرار تھا کہ میں کچھ لکھوں حالانکہ میں ابھی لکھنے کے قابل نہیں ہوں۔ کئی دن سے جب بھی قلم کاغذ لے کر بیٹھتی ہوں تو بلڈ پریشر ہائی ہو جاتا ہے۔ بہر حال یہ چند ٹوٹے پھوٹے الفاظ لکھ دیے ہیں۔ اللہ تعالیٰ میرے بابا جان، میرے چچا جان اور میرے بہنوئی اور خاندان کے سب فوت شدگان کو جنت الفردوس میں جگہ عطا کرے اور ہمیں صبر جمیل عطا کرے۔ آمین

حدود و تعزیرات کے جتنے بھی احکام ہیں، یہ افراد کے لیے نہیں ہیں۔ قرآن پاک میں آتا ہے: السارق والسارقة فاقطعوا ایدیهما (المائدۃ ۳۸/۶) چور مرد اور چور عورت، پس تم ہاتھ کاٹ دو ان کے۔ عام آدمی میں کسی کو یہ حق حاصل نہیں ہے کہ چور کو پکڑ کر اس کے ہاتھ کاٹ دے۔ غیر شادی شدہ مرد و عورت زنا کریں تو ان کو کوڑے مارنے کا حکم قرآن میں مذکور ہے، مگر حکومت کے بغیر کسی کو حق نہیں ہے کہ وہ کوڑے مارے۔ یہ حکومت کا کام ہے۔ اگر ہم ایسا کریں گے تو گنہگار ہوں گے۔ اسی طرح یہود و نصاریٰ اور دیگر کافروں سے لڑنا انفرادی کام نہیں ہے۔ یہ اجتماعی طور پر حکومت کا کام ہے۔ مسلمانوں کے پاس اتنا اقتدار ہونا چاہیے کہ جس کے ذریعے کافروں کی سرکوبی کریں۔ اس لیے غلط فہمی کا شکار نہ ہونا۔ یہ حکومت کا کام ہے۔ تمہیں زبان سے سمجھانے کا حق ہے۔ (ذخیرۃ الجنان ۲۳۴/۱، و ۷۷/۸)

اہلیہ قاری خبیب احمد عمرؒ*

ذَهَبَ الَّذِيْنَ يُعَاشُ فِيْ اَكْنَافِهِمْ

[جن کے دامن میں جینے کا لطف تھا، وہ اب رخصت ہوئے]

انسان کی زندگی میں یہ کیسا عجیب امتزاج ہے کہ کبھی اس کا دل خوشیوں سے معمور ومسرور ہوتا ہے تو کبھی غموں کی آماج گاہ اور صدمات سے چور۔ تمام عمر انسان انہی کیفیات میں بسر کر دیتا ہے، کبھی خوش تو کبھی رنجیدہ۔ دیکھا جائے تو انسان کی زندگی کی سب سے بڑی خوشی ماں اور باپ کی محبت اور شفقت اور سب سے بڑا غم ان شفیق ہستیوں کی جدائی ہے۔ میں اور میرے بچے ان دنوں زندگی کے سب سے بڑے غم اور عظیم صدمہ کی حالت میں ہیں کہ یکم مارچ ۲۰۰۹ء کو میرے بچوں کے والد محترم اور داس کے دوماہ بعد میرے والد مکرم اس فانی دنیا کو چھوڑ کر عازم راہ جنت ہوئے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ اس سے قبل بھی زندگی میں بڑے بڑے صدمات سے دوچار ہونا پڑا، مثلاً ایک سال کے وقفے سے دونوں امی جان کی ابدی جدائی، نوجوان بھانجے حافظ عدیل عمران کی شہادت، چچازاد بھائی محمد عیاض کی حادثاتی موت، ماموں اور خالہ کی یکے بعد دیگرے وفات، جواں سال بھائی قاری ماجد کا انتقال، انھی کے دو نوجوان بیٹوں محمد اکرم اور محمد اکمل کی حادثاتی موت، میرے سسر حضرت مولانا قاضی عبداللطیف جہلمیؒ کی اچانک وفات جو جید وعالم دین اور میرے مہربان استاد ومربی تھے، پھر گزشتہ سال میرے بہت ہی پیارے چاچا جی حضرت مولانا صوفی عبدالحمید سواتیؒ کی جدائی جو میرے مشفق استاد تھے، پھر بھانجی کے نوعمر بیٹے عکرمہ کی حادثاتی موت، گزشتہ دوعشروں کے دوران یہ وہ المناک صدمات ہیں جو دل کا ایسا ناسور بن چکے ہیں جس کی ٹیسیں کسی پل قرار نہیں لینے دیتیں۔ یوں تو ان کے علاوہ بھی بہت سے صدمات کے زخم دل پر ہیں، لیکن خونی رشتوں کے حوالے سے ان عزیز ترین ہستیوں کی جدائی ایسا زخم ہے جو ہر وقت ڈستا رہتا ہے۔ اب جو گزشتہ تین چار ماہ کے عرصے میں اتنے بڑے دو صدمات سہنا پڑے ہیں، لگتا ہے غم کا کوہ گراں ہے جس کے بوجھ تلے ہم پس رہے ہیں اور لگتا ہے کہ ہم یکے بعد دیگرے دو مرتبہ قیامت صغریٰ سے گزرے ہیں، ایسی قیامت جو دل کو ہر لمحہ خون کے آنسو رلاتی رہتی ہے۔

بہر حال بحیثیت مسلمان اللہ رب العزت کے حکم اور اس کی رضا کے آگے سر تسلیم خم ہے۔ ہم لاکھ صدموں سے چور سہی، ہمارا دل بے شک غموں سے رنجور سہی، پر اپنے خالق ومالک کے فیصلوں پر راضی ہیں اور اپنے آقا پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت طیبہ پر عمل کرتے ہوئے آپ کی اتباع میں حدیث پاک کے وہ مبارک الفاظ دہراتے ہیں جو آپ نے اپنے پیارے صاحب زادہ حضرت ابراہیم کی وفات پر فرمائے تھے، تدمع العین ویحزن القلب ولا نقول الا ما یرضی ربنا۔ واللہ یا ابراهیم! انا بك لمحزونون۔ (مسلم شریف) ہم ان قابل قدر عزیز ترین ہستیوں کی یادوں سے

*دختر امام اہل سنتؒ۔ مہتممہ جامعہ حنفیہ للبنات جہلم۔

دل وجان کو آباد رکھے ہوئے ہیں، اور مرتے دم تک آباد رکھیں گے، ان شاء اللہ۔

یہ یادیں بھی انسان کے لیے کتنا قیمتی سرمایہ ہیں! سوچتی ہوں اگر ہمارے پاس یادوں کا گراں مایہ سرمایہ نہ ہوتا تو ہماری زندگی کتنی بے کیف اور ہمارے دل کتنے ویران ہوتے۔ یہ تو میرے رب کریم کا احسان عظیم ہے کہ اس خالق کائنات نے ہمارے خانہ ذہن میں یادیں محفوظ کرنے کا سامان کر دیا کہ ہم جب چاہیں، اس خانہ ذہن میں محفوظ خوشگوار یادوں سے دل کو بہلا لیتے ہیں، خوش ہو لیتے ہیں، اور غم زدہ یادوں سے آنسو بہا کر دل کی بھڑاس نکال لیتے ہیں۔ آج جب میں اباجی اور چاچا جی کی یادوں کو صفحہ قرطاس پر بکھیرنے بیٹھی ہوں تو دل کی یہ کیفیت ہے کہ

یادوں کے اوراق پلٹتی ہوں جب میں ماضی میں
کیسے خوش کن دل کش روشن منظر سامنے آتے ہیں
اور انہی کی اوٹ سے جھانکتے کچھ دل سوز مناظر بھی
اپنی جھلک دکھلا کر دل میں سوئے درد جگاتے ہیں۔

والد محترم شیخ الحدیث حضرت مولانا سرفراز خان صفدرؒ اور عم محترم شیخ التفسیر حضرت مولانا صوفی عبدالحمید خان اختر ہماری قابل احترام ولائق تحسین دو ایسی عزیز ترین ہستیاں ہیں جو ہماری پوری زندگی کا محور ہیں۔ ہم سب بہن بھائیوں اور ہمارے عم زاد بہن بھائیوں کی ساری زندگی انہی دو شفیق ہستیوں کی محبتوں اور شفقتوں کے زیر سایہ گزری ہے۔ دادا دادی کی محبت ہماری قسمت میں نہ تھی۔ نانا نانی ہمارے بچپن میں ہی اللہ کو پیارے ہو گئے۔ چھوٹی امی جان کی طرف سے نانی جان حیات تو تھیں لیکن مانسہرہ سے بھی آگے کافی دور سکونت پذیر ہونے کی وجہ سے ان کی شفقت ہمیں سالوں بعد ہی کبھی حاصل ہوتی۔ سو خاندانی بزرگ کی حیثیت سے، استاد کی حیثیت سے، مشفق ومربی کی حیثیت سے شعور کی آنکھ کھولنے سے آخر دم تک یہی دو ہستیاں ہمیں اپنی زندگی میں ہر طرف چھائی محسوس ہوتی ہیں۔

آج فراغت پاتے ہی ماضی کا دفتر کھولا ہے، تنہائی میں بیٹھ کر اپنا ایک ایک زخم ٹٹولا ہے، آج جب میں ماضی کے مناظر میں جھانکنے بیٹھی ہوں تو تقریباً نصف صدی پہلے کے کچھ مناظر بہت واضح دکھائی دے رہے ہیں۔ جب ہم بہت چھوٹے تھے، اتنے چھوٹے کہ کھانے پینے اور سونے جاگنے کے علاوہ ہمیں کسی بات کا شعور نہیں تھا، تب ہمارے شفیق اباجی تھے جنہوں نے ہماری تعلیم وتربیت کی ذمہ داری اٹھائی اور خود ہمیں کلمہ طیبہ، نماز، دعائے قنوت، آیت الکرسی، ایمان کی صفات اور چھوٹی چھوٹی دعائیں یاد کروائیں۔ میری برستی آنکھوں کے سامنے آج بھی وہ منظر آ رہا ہے کہ اباجی مغرب کی نماز پڑھا کر واپس آتے، گرمی کے موسم میں باہر صحن میں چارپائی بچھی ہوتی، اباجی کھانا کھا کر لیٹ جاتے اور ہم بہن بھائی، جو چھوٹی عمر کے ہیں، اباجی کے اردگرد بیٹھے اپنے چھوٹے چھوٹے ہاتھوں سے اباجی کی ٹانگیں دبا رہے ہیں اور اباجی ہمیں ایک ایک لفظ کر کے یہ سب کچھ یاد کروا رہے ہیں۔ سردی کے موسم میں یہ منظر اباجی کی بیٹھک میں منتقل ہو جاتا ہے۔ اباجی کے جسم کا لمس آج بھی اپنے ہاتھوں میں محسوس ہوتا ہے اور اباجی کی آواز آج بھی اپنے کانوں میں گونجتی سنائی دے رہی ہے۔ کبھی کلمہ یاد کرواتے ہوئے تو کبھی نماز اور دعائیں اور ساتھ ساتھ حوصلہ افزائی ہوتی کہ جو سب سے اچھا یاد کرے گا اور سنائے گا، اسے ایک آنہ ملے گا۔ اس زمانہ میں ایک آنہ کی قدر آج کے دس روپے سے بھی زیادہ تھی۔

پھر ہم باشعور ہوئے تو ہماری باقاعدہ تعلیمی زندگی کا آغاز ہوا اور مجھے یاد ہے کہ ہم میں سے ہر بہن بھائی کی تعلیم پر اباجی کی خاص توجہ ہوتی تھی۔ تعلیمی مدارج میں ترقی وکامیابی پر بے پایاں خوشی اور غفلت وبے پروائی پر مرحلہ وار نصیحت، ڈانٹ ڈپٹ بلکہ پٹائی تک بھی ہو جاتی جو یقیناً ہمارے مفاد میں تھی اور میں سمجھتی ہوں کہ ابھی تک اس کا فائدہ اور اثر ہماری زندگیوں پر ہے۔ ہم اسکول جاتے تو اباجی وقتاً فوقتاً ہماری تختیاں چیک کرتے، لکھائی میں کوشش کی تلقین فرماتے بلکہ ہمارے لیے قلم تک اپنے ہاتھوں سے تراشتے۔ اس وقت کلک کا قلم ہوتا تھا۔ اباجی ڈھیر سارے کلک منگوا کر اپنے پاس رکھ لیتے۔ جس بہن بھائی کو قلم کی ضرورت ہوتی یا جس کا قلم ٹوٹ جاتا، وہ اباجی کے پاس پہنچ جاتا۔ اباجی جیب سے چھوٹا سا چاقو نکالتے جس کا ہاتھی دانت سے بنا ہوا تھا۔ اتنی خوبصورتی سے قلم تراشتے کہ پوری کلاس میں کسی کے پاس ایسا قلم نہ ہوتا۔ اباجی کی اپنی لکھائی اتنی خوبصورت تھی کہ لگتا تھا ورق پر موتی بکھرے ہوئے ہیں۔ افسوس! ہم میں سے کسی بہن بھائی کی لکھائی اباجی جیسی نہیں ہے۔ لکھائی کے معاملے میں سب سے زیادہ ڈانٹ ڈپٹ مجھے ہوتی تھی، کیوں کہ بچپن میں سب سے زیادہ گندی لکھائی میری ہی تھی۔ لکھائی کی طرف میری توجہ ہی نہیں تھی اور نہ ہی شوق تھا۔ بس پڑھائی اور مطالعہ میرا جنون تھا۔ اسکول کی ہیڈ مسٹرس صاحبہ نے، جو بہت نیک خاتون ہیں اور اباجی کی بہت معتقد بھی ہیں، میری لکھائی پر انفرادی توجہ دی تو کچھ گزارے لائق ہوگئی، لیکن اباجی کے معیار کی پھر بھی نہ تھی۔

ایک مرتبہ اباجی نے گکھڑ کے ایک مدرسہ میں بچیوں کے حفظ وناظرہ کا امتحان لینے بھیجا۔ پہلے امتحان کے بارے میں ہدایات دیں کہ امتحان سختی سے نہ لینا اور خواہ مخواہ بچیوں پر رعب مت ڈالنا اور نمبر بھی کم نہ دینا، وغیرہ۔ آخر میں فرمایا کہ امتحان ختم ہونے کے بعد اپنی رائے ضرور لکھنا اور صاف صاف لکھنا، کیڑے مکوڑے مت ڈال آنا۔ اسکول کی تعلیم کے ساتھ ساتھ دینی تعلیم کا سلسلہ گھر میں بھی جاری تھا۔ بھائی لوگ تو مسجد جاتے تھے، کیونکہ وہ قرآن پاک حفظ کر رہے تھے اور ہم بہنیں امی کے پاس ہی پڑھتی تھیں۔ اور بھی بہت سی بچیاں بلکہ بڑی عمر کی خواتین امی کے پاس قرآن پاک، بہشتی زیور اور ترجمہ قرآن پاک پڑھنے آیا کرتی تھیں۔ پڑھائی کی ذمہ داری بڑی امی کے سپرد تھی، لیکن ان کی عدم موجودگی میں چھوٹی امی پڑھایا کرتی تھیں۔ تعلیم کے ساتھ ساتھ ہماری عملی تربیت پر بھی اباجی کی گہری نظر تھی، مثلاً نماز، روزہ کی بہت چھوٹی عمر میں عادت ڈال دی گئی بلکہ جب وہ مسجد میں نماز پڑھنے کے لیے جانے لگتے تو جانے سے پہلے صحن میں اونچی آواز میں کہا کرتے، ''نماز، نماز، نماز''۔ ایسا پانچوں وقت کی نمازوں سے پہلے ہوتا۔ نیز ہم سے روزانہ پوچھتے کہ نماز پڑھی ہے یا نہیں۔ اگر کسی وقت ہم نے نہ پڑھی ہوتی تو فرماتے کہ چلو ابھی پڑھو۔ ایک دن غالباً یوم آزادی کی تیاری کے سلسلہ میں مجھے اسکول سے گھر آنے میں دیر ہوگئی تو جیسے ہی گھر واپس آئی، فوراً اباجی نے پوچھا کہ نماز پڑھی ہے یا نہیں؟ ڈرتے ڈرتے بتایا کہ نہیں پڑھی۔ گھڑی پر ٹائم دیکھا تو غصہ سے فرمایا، آج تم نے نماز قضا کر دی۔ جاؤ وضو کرو اور نماز قضا ادا کرو اور ساتھ ہی قضا نماز کا طریقہ اور نیت بھی بتلائی۔ اس دن مجھے پہلی مرتبہ پتہ چلا کہ قضا نماز میں سنتیں اور نوافل نہیں پڑھے جاتے۔

میں امی کے پاس ناظرہ قرآن پڑھ رہی تھی۔ تقریباً سوا پارہ پڑھ چکی تھی کہ بھائیوں کی دیکھا دیکھی میرے دل میں بھی یہ خواہش جڑ پکڑ گئی کہ میں نے بھی قرآن پاک حفظ کرنا ہے۔ امی اس کے حق میں نہیں تھیں کہ لڑکیوں کو حفظ کرایا جائے، بلکہ اس وقت معاشرہ میں لڑکیوں کے قرآن پاک حفظ کرنے کا کوئی خاص تصور نہ تھا۔ ایک دن امی نے مجھے سبق پڑھنے کو کہا تو

میں نے رونا شروع کر دیا کہ مسجد میں پڑھنے جاؤں گی اور قرآن پاک حفظ کروں گی۔ عمر کوئی سات سال ہوگی۔ اس پر امی سے پٹائی بھی ہوئی۔ خیر اباجی ظہر کی نماز پڑھا کر واپس آئے تو میرا رونا دھونا اور امی کی ڈانٹ ڈپٹ جاری تھی۔ اباجی نے پوچھا کہ کیا مسئلہ ہے۔ امی نے بتایا کہ یہ سبق نہیں سنا رہی اور کہتی ہے کہ بھائیوں کے ساتھ مسجد میں جاؤں گی اور قرآن پاک حفظ کروں گی۔ اباجی فرمانے لگے، اس میں کیا حرج ہے۔ اگر یہ اپنی خوشی کے ساتھ حفظ کرنا چاہتی ہے تو یہ بہت اچھی بات ہے۔ امی کو توقع تھی کہ اباجی مجھے سمجھا بجھا کر اس ضد سے روک دیں گے۔ اباجی کی بات سن کر بولیں کہ بھلا لڑکیاں بھی حفظ کرتی ہیں! تو اباجی نے ازواج مطہراتؓ، صحابیات کی مثال دے کر امی کو سمجھایا کہ یہ انوکھی بات نہیں ہے۔ امت مسلمہ میں بے شمار خواتین حافظ قرآن گزری ہیں۔ یوں میری تحفیظ القرآن کی تعلیم شروع ہوئی۔ اباجی نے مجھے بھائی زاہد کے ہمراہ مسجد بھیجا اور قاری محمد انور صاحب کی شاگردی میں بٹھا دیا گیا جو حفظ کے کامیاب مدرس ہیں اور الحمد للہ حضرت قاری صاحب کی بے بہا شفقت، خصوصی توجہ اور ''ڈنڈے پیر'' کی برکت سے ناچیز کی یہ دلی خواہش میرے مولا نے پایہ تکمیل تک پہنچائی۔

دوران حفظ کے ایسے بہت سے مناظر میری آنکھوں کے سامنے گھوم رہے ہیں جو اباجی کی شفقتوں اور خصوصی توجہ کا مظہر ہیں۔ ان میں سے مغرب کے بعد کا وقت تو بہت قابل قدر اور مثالی ہے، جب اباجی مغرب کی نماز پڑھا کر واپس تشریف لاتے اور کھانے سے فارغ ہو کر اپنی بیٹھک میں چارپائی پر بیٹھ کر آئندہ روز کے اسباق کا مطالعہ فرماتے۔ اس وقت ہم بہن بھائی آپ کے اردگرد، کوئی کرسیوں پر تو کوئی چارپائی پر بیٹھ کر صبح کے اسباق یاد کر رہے ہوتے۔ اباجی ساتھ ساتھ اپنا مطالعہ بھی جاری رکھتے اور ہم پر بھی گہری نظر رکھتے کہ توجہ سے پڑھ رہے ہیں یا نہیں۔ یوں ہم روزانہ رات کو اباجی کی زیر نگرانی سبق یاد کیا کرتے، بلکہ خوب پکا کرتے۔ اس کی وجہ سے صبح کو ڈنڈے پیر سے بچ جاتے۔ جس دن اباجی گھر پر نہ ہوتے اور کسی جلسے وغیرہ پر مدعو ہوتے تو ہماری نگرانی دونوں امی جان میں سے کسی ایک کے ذمے ہوتی اور جس دن مہمان داری کی وجہ سے ہماری نگرانی میں کسی وجہ سے کوئی کمی رہ جاتی تو صبح ڈنڈا پیر ہم پر ایسے برستا کہ الامان والحفیظ۔ جب ہم رات کو اباجی کی نگرانی میں پڑھ رہے ہوتے تو عمر کے تقاضے سے کبھی کبھی کوئی شرارت بھی ہو جاتی۔ ہم بہن بھائیوں میں سے بھائی جان زاہد شروع سے ہی سنجیدہ مزاج رہے ہیں، البتہ بھائی جان قارن کے مزاج میں بچپن سے ہی ظرافت کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی جس کا نشانہ اکثر ہم چھوٹے بہن بھائی ہی بنتے۔ کبھی کبھار گلی محلہ میں سے بھی کوئی اس کی زد میں آ جاتا۔ بھائی جان قارن آج الحمد للہ مسند حدیث پر رونق افروز ہیں اور مدرسہ نصرۃ العلوم میں دورۂ حدیث کے استاد ہیں۔ دونوں بھائی زاہد وقارن اور عم زاد حاجی محمد فیاض تینوں، اباجی اور چاچا جی کی نیابت کا خوب حق ادا کر رہے ہیں، اللہم زد فزد۔ جب ہم سبق یاد کر رہے ہوتے تو بھائی قارن صاحب اپنی ظرافت طبع سے کوئی نہ کوئی چٹکلہ چھوڑ دیا کرتے۔ ایک مرتبہ جب بھائی جان سورۃ نور کی آیت ''لُجِّيٍّ يَغْشَاهُ'' یاد کرتے ہوئے بار بار اس آیت کو پڑھتے اور لُجِّيٍّ پڑھتے ہوئے ہمارا منہ چڑا دیتے۔ ہم بہن بھائی جو ان سے چھوٹے تھے، اباجان سے شکایت کرتے کہ بھائی قارن ہمارا منہ چڑاتے ہیں۔ اباجی جب سر اٹھا کر دیکھتے تو بھائی پڑھ رہے ہوتے اور ہمیں ڈانٹ پڑ جاتی کہ وہ تو پڑھ رہا ہے، تم خواہ مخواہ شور کر رہے ہو۔ دھیان سے سبق یاد کرو۔ جب تین چار دن تک مسلسل ایسا ہوتا رہا، نہ بھائی جان منہ چڑانے سے باز آئے اور نہ ہی ہم شکایت کرنے سے تو اباجی کو کچھ شک ہوا۔ اب اباجی چہرہ جھکائے مطالعہ میں مصروف تھے اور ساتھ چپکے چپکے کن انکھیوں سے بھائی جان کو بھی دیکھتے رہے، اور

بھائی جان کو معلوم نہ ہوا۔ حسب معمول بھائی نے آیت پڑھی اور ہمارا منہ چڑایا تو اباجی نے فوراً چوری پکڑ لی اور پھر ڈانٹ ڈپٹ کا رخ بھائی جان کی طرف ہو گیا اور خوب ہوا۔

ہماری تعلیم کی طرف ہر لحاظ سے اباجی کی پوری توجہ ہوتی حتیٰ کہ جب امتحانات کا نتیجہ اباجی کے سامنے پیش ہوتا تو ہر ایک کے نمبر ملاحظہ فرماتے۔ نتیجہ اچھا ہونے پر اباجی کی خوشی دیدنی ہوتی، کامیابی پر شاباش بھی ملتی اور جیب سے کچھ نہ کچھ انعام بھی ملتا اور ناکامی کی صورت میں ڈانٹ ڈپٹ بھی ہوتی اور کان کھنچائی بھی۔ گاہے بگاہے اباجی خود بھی مسجد میں درجہ حفظ کے بچوں کا امتحان لیتے۔ مجھے یاد ہے کہ ایک مرتبہ اباجی نے امتحان لیا۔ میرے اس وقت ڈیڑھ یا دو پارے حفظ ہوئے تھے۔ جب میری باری آئی اور میں امتحان دینے گئی تو اباجی نے پوچھا کہاں سے سنوں؟ میں خاموش رہی تو مجھ سے تیسویں پارے کی تین یا چار بڑی سورتیں سنیں اور سن کر بہت خوش ہوئے اور بولے کتنے نمبر لوگی؟ میرے تصور کی انتہا اس وقت دس کا عدد ہی تھا، سو کہہ دیا کہ دس نمبر۔ سن کر مسکرائے اور فرمایا چلو ٹھیک ہے، تمہیں دس ہی نمبر ملیں گے ایک اضافی زیرو کے ساتھ اور یوں مجھے پورے سو نمبر ملے۔

صرف تعلیم وتربیت نہیں، ہم سب بہن بھائیوں کی صحت اور دیگر ضروریات کی طرف بھی اباجی کی پوری توجہ ہوتی۔ ہم میں سے کوئی بیمار ہو جاتا تو اپنی نگرانی میں علاج معالجہ کراتے، دوائی خود کھلاتے، پرہیز پر نظر ہوتی بلکہ بخار تک خود چیک کرتے۔ اس مقصد کے لیے اباجی کی الماری میں تھرمامیٹر ہر وقت موجود ہوتا۔ میری شادی کے کچھ عرصہ بعد میری صحت کافی خراب ہو گئی۔ تقریباً ایک سال تک مسلسل مجھے بخار ہوتا رہا۔ جہلم میں کافی علاج معالجہ کرایا، لیکن کوئی خاص افاقہ نہ ہوا۔ اباجی کو علم ہوا تو باقاعدہ خط لکھ کر صحت کا حال دریافت فرماتے اور اپنی پریشانی اور تشویش کا اظہار فرماتے۔ ۵/ اکتوبر ۱۹۷۵ء کا لکھا ہوا اباجی کا خط آج بھی میرے پاس بحفاظت موجود ہے جس میں اباجی نے تحریر فرمایا، ''عزیزہ کی بیماری کی طوالت کی وجہ سے ہم سب بہت پریشان اور نہایت غمگین ہیں اور رو رو کر اس کی صحت کے لیے دعائیں کرتے ہیں۔'' جب بخار نہیں اترا تو مجھے گکھڑ بلوا لیا اور گوجرانوالہ کے مشہور ومعروف ڈاکٹر معراج الدین مرحوم سے میرا علاج کروایا۔ روزانہ صبح شام پابندی سے خود بخار چیک کرتے، علاج کے ساتھ پرہیز اور خوراک کا بھی خیال رکھتے اور جب اللہ پاک کے فضل وکرم اور اباجی کی خصوصی دعاؤں سے میرا بخار اترا تو اباجی کی خوشی دیکھنے کے لائق تھی۔ پوری طرح بخار اترنے کے بعد ہی مجھے جہلم جانے دیا۔ ان دنوں جب میں گکھڑ تھی تو کچھ خواتین میری عیادت کے لیے آئیں اور انہوں نے مجھے بتایا کہ مولوی صاحب تمہاری بیماری کی وجہ سے بہت پریشان ہیں۔ جمعہ کی نماز کے بعد تمہارے لیے دعا کرواتے ہوئے رو پڑے تھے۔ اباجی کی یہ شفقت ومحبت صرف میرے لیے نہیں تھی، بلکہ بہن بھائیوں میں سے ہر ایک کے لیے یوں ہی محبتوں اور شفقتوں کا سائبان تھے۔

دوران حفظ ہم بہن بھائی صبح صبح پڑھنے کے لیے مسجد جایا کرتے تھے۔ گھر اور مسجد کے درمیان جرنیلی سڑک ہے اور ساتھ ہی بس کا اڈہ۔ ہم اس اڈہ سے سڑک پار کیا کرتے تھے۔ اباجی کا معمول تھا کہ صبح نماز تہجد سے فارغ ہو کر ناشتہ تناول فرماتے، پھر مسجد میں جا کر نماز کی جماعت کرواتے۔ اس کے بعد مسجد میں روزانہ پابندی سے درس دیا کرتے اور درس سے فارغ ہوتے ہی بس کے اڈہ پر پہنچ جاتے جہاں چند منٹ کے انتظار کے بعد بس آجاتی تو بس میں سوار ہو کر گوجرانوالہ چلے جاتے جہاں مدرسہ نصرۃ العلوم میں دورۂ حدیث کے طلبہ کو پڑھاتے۔ ادھر ہم گھر سے نکلتے اور ادھر اباجی بس کے اڈہ پر کھڑے ہوتے۔ دور سے ہمیں آتا دیکھ کر چہرے پر مسکراہٹ آجاتی۔ اگر سردی کا موسم ہوتا تو ہمیں اپنے پاس کھڑا کر لیتے اور باری باری ہم سب کے سویٹر جرابیں وغیرہ چیک کرتے، بلکہ قمیص اٹھا کر چیک کرتے کہ نیچے بھی سویٹر پہنا ہے یا نہیں۔ اس وقت ہم بچے تھے، احساس وشعور سے محروم۔ بسا اوقات یہ اچھا نہ لگتا تو گھر آکر امی سے شکایت بھی کرتے کہ اباجی سڑک پر کھڑا کر کے سویٹر چیک کرتے ہیں۔ جب بڑے ہوئے اور احساس وشعور جاگا تو اندازہ ہوا کہ یہ اباجی کی ہم سے شفقت اور محبت کی انتہا تھی۔ آج جب ان کی جدائی کا گھاؤ دل کے مستقل درد کی صورت اختیار کر گیا ہے تو سوچتی ہوں دنیا میں کون سا ایسا باپ ہوگا جو اولاد کی محبت میں اس گہرائی میں جا کر سوچے!

ان کی فرقت میں ہماری گریہ زاری کیوں نہ ہو
ضرب ہے دل پر لگی تو ضرب کاری کیوں نہ ہو
ان کے جانے سے ہوا غارت اگر دل کا سکوں
دل کی اس ویرانی سے اب بے قراری کیوں نہ ہو
اجڑا اجڑا سا چمن ہے ہر کلی کملائی ہے
غنچہ وگل مرجھا گئے ہیں اشک باری کیوں نہ ہو

الحمدللہ ہم بارہ بہن بھائی تھے جن کی پرورش وتربیت اباجی نے کی اور ہم تھے بھی دو ماؤں کی اولاد، اس کے باوجود اباجی کی توجہ، اباجی کی محبت، ہماری ضروریات کا احساس سب کے ساتھ یکساں تھا۔ کثیر العیال ہونے اور مالی طور پر مستحکم نہ ہونے کے باوجود کبھی ہمیں احساس محرومی نہیں ہونے دیا۔ جب بھی فروٹ لاتے، سب سے پہلے ہمسایوں کے بچوں کا حصہ ان کے گھر بھیج دیتے جن کے والد کم سنی میں انھیں یتیمی کا دکھ دے گئے تھے۔ اباجی ان کا بہت خیال کرتے تھے بلکہ دونوں امی جان کو بھی اور ہم بہن بھائیوں کو بھی تلقین کرتے کہ ان کے ساتھ حسن سلوک کریں۔ ان کا حصہ بھیجنے کے بعد باقی فروٹ سب میں برابر تقسیم کرتے۔ دونوں امی جان کا حصہ الگ نکالتے اور کوئی بھی چیز چاہے تھوڑی سی ہوتی، سب میں تقسیم کرتے۔ ہمارے گھر میں یہ تصور ہی نہ تھا کہ کوئی چیز گھر میں آئے اور کسی ایک یا دو فرد کے ہتھے چڑھ جائے۔ تھوڑی تھوڑی کر کے سب میں تقسیم ہوتی۔ اس معاملہ میں دونوں امی جان کا طریق کار بھی یہی تھا۔ ایک مرتبہ ایسا ہوا کہ شادی والے گھر سے کچھ مٹھائی آئی تو چھوٹی امی جان اباجی کے پاس لے گئیں کہ سب میں پوری تو ہوگی نہیں، اس لیے آپ کھا لیں۔ اباجی نے مٹھائی کی پلیٹ پکڑ کر اپنے پاس رکھ لی اور آوازیں دے کر سب بچوں کو اپنے پاس اکٹھا کر لیا اور پھر اپنے ہاتھوں سے وہ مٹھائی تھوڑی تھوڑی کر کے سب میں تقسیم کی۔ دونوں امی جان کو دی اور جو تھوڑی سی باقی بچی، خود کو مخاطب کر کے فرمایا ''لے بھئی سرفراز، ایہہ تیرا حصہ اے، چل تو کھا لے۔'' ہم بہن بھائی اباجی کی بات سن کر کھل کھلا کر ہنس دیے۔ یقین جانیں آج مٹھائی کے بڑے بڑے ڈبے گھر میں اکٹھے ہو جاتے ہیں، لیکن اس مٹھائی میں وہ لذت اور چاشنی نہیں ہوتی جو اس وقت ہتھیلی پر اباجی کے ہاتھوں سے رکھی جانے والی ذرا سی مٹھائی میں تھی۔

عموماً جس گھر میں دو بیویاں ہوں اور دو ماؤں کی اولاد ہو، وہاں لڑائی جھگڑا لگا رہتا ہے کہ کسی نہ کسی فرد کو ناانصافی یا زیادتی کی شکایت ہو جاتی ہے، لیکن ہمارے اباجی میں یہ خوبی تھی کہ انہوں نے گھر کا مکمل انتظام اور کنٹرول اپنے ہاتھ میں رکھا اور گھر

کے ہر معاملے میں اور ہر مسئلے پر اباجی کی گہری نظر ہوتی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ ہم بہن بھائی ایک جگہ کھاتے پیتے بلکہ مزے کی بات یہ کہ چھوٹی عمر کے بہن بھائی ایک ہی برتن میں کھاتے تھے۔ ایک ہی پرات میں امی چاول اور سالن ڈال دیتے اور ہم مل جل کر خوب مزے سے کھاتے۔ بسا اوقات اس میں ہمسایوں کے بچے بھی ہمارے ساتھ شریک ہو جاتے۔ ہم ان کے گھر کھا پی لیتے اور وہ ہمارے گھر کھا پی لیتے۔ کوئی تیرے میرے والی بات نہ ہوتی اور ایک ہی پرات میں کھانا کھانے کی روایت ہمارے بچوں تک چلی۔ جب ہم بہن بھائیوں کے اور چاچا جی کے بچے گکھڑ میں جمع ہوتے تو سب مل کر ایک ہی پرات میں کھاتے۔ اب تو روایات ہی بدل گئی ہیں۔ بچوں میں ہلکا پھلکا لڑائی جھگڑا بھی ہوتا، شکوے شکایات بھی ہوتے، لیکن ویسے ہی جیسے کہ بچوں کا معمول ہوتا ہے کہ ادھر لڑائی ادھر صلح صفائی۔ بچوں کی وجہ سے ہمارے گھر میں بڑوں کے درمیان کبھی لڑائی جھگڑا نہیں ہوا۔ الحمد للہ۔

اور بات صرف کھانے پینے تک محدود نہیں، کپڑے جوتے تک ہم سب کے اکٹھے آتے۔ کپڑے گھر آتے اور گھر میں ہی پسند کیے جاتے تھے۔ جوتے بھی گھر لا کر پسند کیے جاتے تھے اور یہ سب اباجی کی نگرانی میں ہوتا۔ اباجی کی پوری کوشش ہوتی کہ کسی کے ساتھ زیادتی یا ناانصافی نہ ہو۔ پھر جب کپڑے سل کر آتے تو سب سے پہلے اباجی کے پاس جاتے۔ اباجی پوری طرح کپڑے ملاحظہ فرماتے۔ گلا چیک کرتے کہ کھلا تو نہیں، بازو اور پائنچے چیک کرتے، غرض ہر چیز پر نظر ہوتی۔ زنانہ کپڑے درزن سے سلائے جاتے تھے۔ جو خاتون ہمارے کپڑے سیا کرتی تھی، بہت نیک خاتون تھیں۔ چند دن پہلے ان کا انتقال ہو گیا ہے۔ اللہ ان کی مغفرت فرمائے اور ان کے درجات بلند فرمائے۔ ایک مرتبہ درزن نے میری قمیص کے بازو لمبائی میں چھوٹے کر دیے۔ بہت چھوٹے بھی نہ تھے، لیکن کلائیوں سے کم تھے جو شرعی لحاظ سے اس لیے ناجائز ہے کہ نماز میں عورت کی کلائیاں ستر میں داخل ہیں۔ اباجی نے وہ قمیص مجھے پہننے نہیں دی، بلکہ چھوٹی بہن کو دلوا دی۔ اباجی کی تربیت کا اثر ہے کہ کلائیوں سے بھی لمبے بازو پہننا میری ایسی عادت بن چکی ہے کہ بازو تھوڑے سے بھی چھوٹے ہوں تو مجھے الجھن ہوتی ہے۔ اسی طرح ایک مرتبہ بھائیوں میں کسی نے شلوار کے پائنچے ڈوری والے بنوا لیے جو اس وقت کا فیشن تھا۔ اتفاق سے کپڑے عید کی صبح کو سل کر آئے۔ اباجی نے یہ کپڑے پہننے پر پابندی لگا دی۔ بھائی کی پریشانی دیکھ کر بڑی باجی نے فوراً مشین رکھی اور ٹخنے کاٹ کر نئے پائنچے بنائے، اوپر نیفا ڈالا اور بھائی نے کپڑے پہنے۔ تو اباجی کا معمول تھا کہ لباس میں کوئی بات خلاف شرع دیکھتے یا فیشن کے مطابق دیکھتے تو فوراً اصلاح فرماتے اور ایسے کپڑے قطعاً نہ پہننے دیتے۔

اس وقت گھر میں سلوک و اتفاق مثالی تھا اور واقعتاً گکھڑ کے لوگ ہمارے گھر کی مثال دیا کرتے تھے۔ دونوں امی جان نے مل جل کر گھر کا انتظام بہت اچھے طریقے سے چلا رکھا تھا۔ باہر سے آنے والا کوئی بھی دونوں امی جان کا باہمی رویہ اور سلوک و اتفاق دیکھ کر یہ یقین کرنے کو تیار نہ ہوتا کہ دونوں آپس میں سوکنیں ہیں۔ ہر کام باہم مل جل کر کرتیں۔ کہیں جانا ہوتا، کوئی تقریب ہوتی تو عموماً ایک ہی جیسے کپڑے پہن کر اکٹھے شرکت کرتی تھیں۔ ایک مرتبہ دونوں امی جان کے لیے کپڑے لینے تھے۔ اباجی نے کپڑے پسند کروانے کے لیے گھر منگوائے تو ان میں ایک کپڑا کافی شوخ تھا، بروکیڈ کا کپڑا ان دنوں نیا نیا آیا تھا۔ بڑی امی جان کی عمر بھی چھوٹی امی جان سے کچھ زیادہ تھی اور کچھ مزاجاً بھی سادگی پسند تھیں تو بڑی امی جان کی مرضی تھی کہ سادہ سوٹ لیے جائیں اور چھوٹی امی کی خواہش تھی کہ بروکیڈ کے سوٹ لیے جائیں۔ اباجی کا فرمان تھا کہ

ایک ہی جیسے کپڑے لے کر دینے ہیں، تم لوگ آپس میں طے کر لو۔ چھوٹی امی جان نے پہلے تو بڑی امی جان کو خود قائل کرنے کی کوشش کی، لیکن وہ نہ مانیں تو ہم بہنوں کو آگے کیا کہ تم لوگ امی کو مناؤ۔ غالباً کہیں شادی میں شرکت کا مسئلہ تھا۔ خیر دونوں بہنوں نے امی جان کو بڑی مشکل سے قائل کر کے چھوڑا اور جب بھائی جان دونوں کے بروکیڈ کے سوٹ لے کر آئے تو اباجی نے مسکراتے ہوئے فرمایا، ''شہزادیاں دے سوٹ آئے نیں۔''

چھوٹی امی کا دل بہت کمزور تھا۔ جب ۶۵ کی جنگ ہوئی تو گکھڑ بھی فضائی حملے کی زد میں آیا۔ سو جنگ کے ایام میں سڑک پر ٹرک یا گاڑی گزرتی تو اس کی آواز سے خوفزدہ ہو جاتیں جس کی وجہ سے ہم بہن بھائی اکثر انہیں مذاق کا نشانہ بنایا کرتے۔ جب جنگ ختم ہو گئی تو اس کے بعد کافی عرصہ تک ہم چھوٹی امی کو بہت تنگ کیا کرتے۔ صبح جب اخبار آتی تو اگر پہلے میرے یا بھائی زاہد کے ہاتھ لگ جاتی تو زور زور سے اخبار کی سرخیاں پڑھا کرتے تھے جن میں سب سے نمایاں سرخی تھوڑے ردوبدل کے ساتھ یہ ہوتی کہ انڈیا نے پاکستان پر حملہ کر دیا، اور چھوٹی امی جان دل پر ہاتھ رکھ کر بیٹھ جاتیں اور چہرے کا رنگ زرد ہو جاتا۔ بڑی امی جان سے ہمیں تو ڈانٹ پڑتی ہی تھی، ساتھ چھوٹی امی کو بھی سرزنش کیا کرتیں کہ تمہیں پتہ ہے کہ یہ تمہیں تنگ کرتے ہیں، پھر تم ان کی باتوں میں آجاتی ہو۔ اور چھوٹی امی لرزتے لہجے میں کہتیں، ''آپاں جی، میرے کولوں برداشت نہیں ہوندا۔'' اسی طرح چھوٹی امی اگر کمرے میں اکیلے بیٹھے ہوتیں اور کوئی باہر سے دروازے کی کنڈی لگا دیتا تو چھوٹی امی کی حالت دیکھنے والی ہوتی۔ یہ شرارت ہم لوگ اکثر کیا کرتے تھے جس پر اباجی سے بھی ڈانٹ کھاتے اور بڑی امی سے بھی، بلکہ چھوٹے بھائی تو اس مسئلہ میں باقاعدہ چھوٹی امی کو بلیک میل کیا کرتے۔ کوئی بات منوانی ہوتی، زیادہ پیسے لینے ہوتے تو یہی حربہ استعمال کرتے اور چھوٹی امی کو مجبوراً ان کی ماننا پڑتی۔

ہم بہن بھائی کافی بڑے ہو گئے، لیکن ہمیں یہ پتہ نہ تھا کہ دونوں میں سے ہماری سگی ماں کون سی ہے۔ یقین جانیں، ہمیں یہ بات باہر کے لوگوں سے معلوم ہوئی۔ جب کوئی خاتون ہم سے پوچھتیں کہ بڑی امی سے یا ہو چھوٹی امی سے تو ہم حیرت سے دیکھتے رہ جاتے اور ہمیں اس سوال کی سمجھ ہی نہ آتی۔ ہم گھر میں دونوں کو بڑی امی اور چھوٹی امی کہا کرتے تھے اور حقیقت کا علم ہمیں بہت بعد میں ہوا۔ یہ اباجی اور دونوں امی جان کی بہترین تربیت اور خصوصی توجہ کا نتیجہ ہے کہ آج کے اس بے حسی اور نفسانفسی کے دور میں جب کہ سگے خونی رشتے بھی ایک دوسرے سے نالاں اور بے زار ہیں اور ایک ماں باپ کی اولاد بھی باہمی محبت، رواداری اور اتفاق سے محروم ہے، ہم بہن بھائی الحمد للہ ایک دوسرے کی محبت سے سرشار ہیں۔ چھوٹے موٹے مسائل اور اختلاف رائے سے قطع نظر اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے کبھی ہم بہن بھائیوں میں قطع تعلقی نہیں ہوئی، اور دلی دعا ہے کہ اللہ رب العزت ہماری زندگی میں ایسا وقت کبھی نہ لائیں کہ ہمارے والدین کی تربیت پر حرف آئے یا روز محشر ان کے سامنے شرمندہ ہونا پڑے، آمین۔

الحمد للہ ہمارے بچپن کا زمانہ بہت خوشگوار رہا ہے۔ ان ایام میں جہاں اللہ رب العزت نے ہمارے والدین کے توسط سے ہمیں بے شمار خوشیوں سے نوازا، وہاں ایک بہت بڑی خوشی جو ہمیں حاصل تھی، وہ ہمارے گھر میں ہمارے پیارے چاچا جی کی آمد تھی۔ ہم سے بہت ہی محبت کرنے والے شفیق چاچا جی، جنھیں گھر کے سب بڑے صوفی صاحب کہتے تھے، کبھی کبھار ہی گکھڑ تشریف لاتے تھے، لیکن جب تشریف لاتے تو عجیب سی رونق، خوشی اور چہل پہل ہوا کرتی، بلکہ ہمارے لیے وہ دن

عید سے بھی زیادہ خوشی کے ہوتے۔ گھر کے بڑے تو چاچا جی کی آمد پر خوشی سے سرشار ہوتے ہی تھے، ہم بچے بھی اس خوشی کو پوری طرح محسوس کیا کرتے۔ چاچا جی کا مزاج بہت ہی حلیم وشفیق تھا، بلکہ اگر میں یہ کہوں کہ ابا جی کے مزاج میں جلال غالب تھا اور چاچا جی کے مزاج میں جمال تو شاید یہ غلط نہ ہو۔ دونوں بھائیوں میں انتہا کی محبت تھی۔ کم از کم میں نے اپنی زندگی میں ایسی مثالی محبت کسی بہن بھائی میں نہیں دیکھی۔ مجھے بہت چھوٹی عمر سے ہی اپنے چاچا جی بہت ہی اچھے لگتے تھے، بلکہ بڑے بہن بھائی اکثر مجھے تنگ کرتے کہ تم ہماری بہن نہیں ہو، بلکہ چاچا جی کی بیٹی ہو۔ تمہاری ماں فوت ہو گئی تھی، اس لیے ہم تمہیں اپنے گھر لے آئے تھے۔ اس وقت چاچا جی کی شادی نہیں ہوئی تھی، کیونکہ چاچا جی نے شادی کافی تاخیر سے کی۔ یہی وجہ ہے کہ چاچا جی کے بچے ہم بہن بھائیوں سے بہت چھوٹے ہیں، حالانکہ دونوں بھائیوں کی عمر میں صرف تین سال کا فرق ہے۔ خیر انہی دنوں چاچا جی کی شادی کا سلسلہ شروع ہوا تو ساتھ ہی بھائی لوگوں نے مجھے خوفزدہ کرنا شروع کر دیا کہ اب تمہاری سوتیلی ماں آئے گی تو پتہ چلے گا۔ اتفاقاً چاچا جی کا رشتہ گکھڑ میں ہی طے ہوا۔ اپنی ہونے والی چچی جان سے ہمارے سفارتی تعلقات بہت چھوٹی عمر سے ہی کافی خوشگوار تھے اور الحمد للہ ابھی تک ویسے ہی خوشگوار بلکہ اس سے بھی بڑھ کر ہیں۔ اللہ رب العزت ہمارے تعلقات اور ہماری محبت کو ہر قسم کی نظر بد سے محفوظ فرمائے۔ آمین۔

چاچا جی کے سسرال والے مسجد کے قریب ہی رہائش پذیر تھے۔ ہم لوگ جب مسجد پڑھنے جاتے تو اکثر چھٹی کے بعد وہیں سے چچی جان کے گھر چلے جاتے۔ رشتہ طے ہونے سے پہلے ہی اس خاندان سے ہمارے خاندانی مراسم بہت گہرے تھے جس کا فائدہ ہم بچے خوب اٹھاتے۔ چچی جان کی والدہ محترمہ جن کو سب چھوٹے بڑے حتیٰ کہ ان کے اپنے بچے بھی ماسی کہا کرتے تھے، بڑی خوش مزاج، زندہ دل اور محبت کرنے والی خاتون تھیں۔ ہم بہن بھائیوں سے بہت محبت وشفقت سے پیش آتیں۔ چند سال قبل ان کا انتقال ہوا ہے۔ اللہ پاک ان کی مغفرت فرمائیں اور درجات بلند فرمائیں، آمین۔ اسی طرح چچی جان کے چھوٹے بھائی ماموں ارشد بھی بہت نیک انسان تھے۔ ہمارے پورے خاندان سے بہت عقیدت رکھتے تھے۔ ہم جب ان کے گھر جاتے تو بہت ہی خوش ہوتے۔ کبھی جھولا ڈال کر دیتے تو کبھی ٹافیاں وغیرہ لا کر دیتے۔ افسوس جوانی میں کینسر جیسے موذی مرض میں مبتلا ہو کر اس فانی دنیا سے لاولد ہی رخصت ہوئے۔ اللھم اغفر لہ وارحمہ وارفع درجاتہ، آمین۔ تو ہم اکثر چچی جان کے گھر چلے جایا کرتے تھے اور رشتہ طے ہو جانے کے بعد تو دن میں دو تین بار حاضری لازم ہو گئی کہ چچی جان کو چاچا جی کے نام سے چھیڑنا جو ہوتا تھا۔

بہر حال چاچا جی کی شادی بڑی سادگی سے لیکن دلی خوشیوں کے ساتھ بہت اچھے طریقے سے ہوئی اور ہمارے گھر کی رونق دوبالا ہو گئی۔ شادی کے بعد چچی جان کچھ عرصہ تک گکھڑ میں ہی رہیں اور چاچا جی ہفتہ عشرہ کے بعد گکھڑ تشریف لاتے تو ہم بچوں کی تو موجیں ہی ہو جاتیں۔ باقی دنوں میں تو ابا جی اور دونوں امی جان کی طرف سے ہم پر پڑھائی کے معاملہ میں اور تربیت کے مسئلہ کافی سختی ہوتی تھی کہ ابا جی "کھلاؤ سونے کا نوالہ اور دیکھو شیر کی آنکھ سے" والے مقولے پر سختی سے کاربند تھے، لیکن چاچا جی کی آمد کے دنوں میں اس آرڈیننس میں نرمی ہو جاتی اور کافی چھوٹ مل جاتی بلکہ چاچا جی کی شہ پر ہم مسجد سے چھٹی کرنے کی عیاشی بھی کر لیتے تھے۔ ادھر چاچا جی کی شادی کے بعد بھائی لوگوں کی مجھے تنگ کرنے والی تحریک زور پکڑ گئی اور اب چچی جان بھی اس تحریک میں شامل ہو گئیں اور مجھ ناچیز کو خوب دھمکایا جانے لگا کہ اب تمہاری سوتیلی ماں آ گئی ہے، ہو

اب اپنا حشر دیکھنا۔ چچی جان دھمکاتیں کہ ادھر تو باقی سب لوگوں کی وجہ سے میں کچھ کہہ نہیں سکتی، جب میرے ساتھ گوجرانوالہ جاؤ گی تو پھر پتہ چلے گا۔ سچ پوچھیں تو مجھے بھی اس بات کا یقین ہو گیا کہ میں واقعی چاچا جی کی بیٹی ہوں اور مجھے حقیقتاً سوتیلی ماں کے ظلم وستم کا شکار ہونا پڑے گا۔ چونکہ مطالعہ کی عادت تو تقریباً چھ سات سال کی عمر سے ہی پڑ گئی تھی، روزانہ گھر آنے والا اخبار اور سنڈے ایڈیشن باقاعدگی سے پڑھا کرتی تھی، بلکہ ایک چھوٹی امی جان کی اور میری اکثر اخبار پڑھنے پر چھینا جھپٹی بھی ہوتی تھی۔ تو مطالعہ کی عادت کی وجہ سے بچوں کی چھوٹی چھوٹی کہانیوں کی کتابیں بھی کافی پڑھ رکھی تھیں جن میں اکثر سوتیلی ماں کے ظلم وستم کا ذکر ہوتا۔ جب یہ تحریک زیادہ ہی بڑھ گئی اور بھائی لوگوں نے دیکھا کہ اس پر کچھ خاص اثر نہیں ہو رہا تو ایک دن نیا شوشا چھوڑا کہ تم ہمارے گھر ہمارا کھانا کھاتی ہو، ہمارے کپڑے پہنتی ہو، جاؤ اپنے گھر۔ یہ سن کر ناچیز کی پٹھانی غیرت بھی جوش میں آ گئی، کھانا پینا سب چھوڑ چھاڑ کر کمرے میں دروازے کے پیچھے ڈیرا ڈال کر بیٹھ گئی اور خوب رونا دھونا مچایا، اتنا کہ امی بھی پریشان ہو گئیں۔ ہر چند انہوں نے مجھے یقین دلانے کی بھرپور کوشش کی کہ تم میری اپنی بیٹی ہو اور یہ لوگ خواہ مخواہ تمہیں تنگ کر رہے ہیں، لیکن مجھے بالکل یقین نہ آیا بلکہ میں نے یہ ضد پکڑ لی کہ میرے اپنے ابا جی آئیں گے تو ان کا لایا ہوا کھانا کھاؤں گی اور ان کے لائے ہوئے کپڑے پہنوں گی۔ آخر بات ابا جی تک پہنچی۔ ابا جی کمرے میں آئے، پہلے سب کو بلا کر خوب ڈانٹ ڈپٹ کی، پھر میرے سامنے قسم کھا کر مجھے یقین دلایا کہ تم میری اپنی بیٹی ہو اور میں تمہارا باپ ہوں۔ یہ سب تمہیں تنگ کرنے کے لیے جھوٹ بول رہے ہیں۔ اس وقت تو ابا جی کی بات کا یقین آ گیا، لیکن سچی بات ہے کہ اس کے بعد بھی کبھی کبھار یہ شک دل میں سر اٹھاتا رہا کہ میں چاچا جی کی بیٹی ہوں، حالانکہ ابا جی کی ڈانٹ ڈپٹ کے بعد یہ سلسلہ بالکل ختم ہو گیا کہ ابا جی کی بات گھر میں حرف آخر ہوتی تھی۔

ہماری چچی جان بہت مشفق اور محبت کرنے والی خاتون ہیں۔ ہم سب بہن بھائیوں کے ساتھ ہمیشہ بہت اچھا اور بہت پرشفقت رویہ رکھا۔ جب تک گکھڑ میں رہیں، دونوں امی جان اور چچی جان مل جل کر گھر کا کام نمٹا لیتیں۔ کبھی کاموں کی وجہ سے کوئی مسئلہ کھڑا نہیں ہوا۔ الحمد للہ، اللہ پاک کا بڑا احسان ہے کہ ہمارا بچپن گھریلو مسائل سے آزاد گزرا۔ کھیل کود اور مذاق اور پررونق زندگی ہمیں میسر تھی اور یہ سب ہمارے بڑوں کی باہمی محبت اور سلوک واتفاق کی برکت سے تھا۔ جب کچھ عرصہ کے بعد چچی جان گوجرانوالہ چلی گئیں تو پھر وقتاً فوقتاً آنا جانا رہتا۔ ہم اسی انتظار میں رہتے کہ کب ہم لوگ گوجرانوالہ جائیں گی یا چچی جان گکھڑ آئیں گی۔ جب چاچا جی گکھڑ تشریف لاتے تو ابا جی اور چاچا جی کی محفل خوب جمتی اور نوک جھوک چلتی۔ عموماً بیٹھک میں کھانا یا چائے لے جانے کی سعادت ناچیز کو ہی حاصل ہوتی۔ سو اکثر اس محفل میں اور اس نوک جھوک میں شرکت بھی مجھے نصیب ہوتی۔ بہت یادگار وقت تھا اور بہت خوبصورت محفلیں!

وہ دن کہاں کہ اب کوئی محفل سجائیے — اک دل ہے سو اسی سے محبت نبھائیے
منظر جو آنکھ میں ہے گنوا دیجیے اسے — پتھر جو دل پہ ہے اسے کیسے گنوائیے
اب کون ہے جو دے ہمیں جینے کا حوصلہ — اتنے دکھوں میں کس کے لیے مسکرائیے

ایک مرتبہ دونوں بھائی بیٹھک میں رونق لگائے ہوئے تھے۔ میں کھانا لے کر اندر گئی تو دونوں بھائیوں میں کچھ بحث ہو رہی تھی اور ایک طرف سے "نہیں، تم" اور دوسری طرف سے "نہیں، آپ" کی تکرار جاری تھی۔ میں ابھی معاملے کو سمجھنے کی

کوشش ہی کر رہی تھی کہ ابا جی کہنے لگے کہ چلو یہ آ گئی ہے، اس سے فیصلہ کروا لیتے ہیں۔ چاچا جی بولے، پتر سچ سچ بتا، میں زیادہ موٹا ہوں یا تمہارے ابا جی؟ میں حقیقتاً پریشان ہوگئی کہ اب فیصلہ کس کے حق میں کروں۔ ان دنوں ہمارے گھر کے ساتھ متصل ایک لکڑی کا ٹال ہوتا تھا اور ٹال والے نے لکڑیاں تولنے کے لیے ایک بڑا ترازو لگا رکھا تھا۔ میرے ذہن میں فوراً وہ آ گیا اور میں نے کہا کہ دونوں ٹال والے کے ترازو کے ایک ایک پلڑے میں بیٹھ جائیں، فیصلہ خود بخود ہو جائے گا۔ میرے بچپن کے اس معصومانہ فیصلہ پر دونوں بھائی بہت دیر تک ہنستے رہے۔

اسی طرح ایک مرتبہ میں چائے لے کر گئی۔ چائے رکھ کر کچھ اور چیزیں لینے واپس باورچی خانہ کی طرف گئی۔ دوبارہ بیٹھک میں داخل ہوئی تو چاچا جی کچھ کہنے ہی لگے تھے کہ ابا جی فوراً بول پڑے، ''جا اپنے چاچے لئی چھاننی لے کے آ۔'' میں تیزی سے واپس آ گئی اور آٹا چھاننے والی چھلنی اٹھا لائی۔ چھلنی دیکھ کر ابا جی کے چہرے پر مسکراہٹ تھی اور چاچا جی کے چہرے پر الجھن۔ مجھے کچھ سمجھ نہ آئی کہ کیا معاملہ ہے۔ ابا جی مسکراتے ہوئے کہنے لگے ''چھاننی اپنے چاچے دی پیالی اتے رکھ دے''۔ اور چاچا جی بولے، پتر چھوڑ وان کو، جاؤ چائے والی چھلنی لے کر آؤ۔ جوں ہی معاملہ میری سمجھ میں آیا، میری بھی ہنسی چھوٹ گئی۔ دراصل چاچا جی شروع سے اردو بولتے تھے اور ہم سب ابا جی سمیت پنجابی بولتے۔ پنجابی میں چائے والی چھلنی کو پونی کہا جاتا ہے اور آٹے والی چھلنی کو چھاننی۔ چاچا جی کو چائے والی چھلنی درکار تھی، ابا جی نے ازراہ مزاح مجھے چھاننی لانے کو کہا اور میں آٹے والی چھلنی اٹھا لائی۔ سوچتی ہوں اب ایسی محفلیں، ایسی رونقیں اور ایسی پیاری نوک جھوک کہاں!

ویراں ہے مے کدہ خم و ساغر اداس ہیں
تم کیا گئے کہ روٹھ گئے دن بہار کے

جب بھی چاچا جی اور چچی جان گکھڑ آتے، ہمارا گھر خوشیوں اور رونقوں کی آماجگاہ بنا رہتا۔ اس طرح جب ہمیں گوجرانوالہ جانے کی اجازت ملتی تو ہم دونوں بہنوں کی خوشی کی کوئی انتہا نہ ہوتی۔ ہم تین بہنیں ہیں۔ بڑی باجی سب بہن بھائیوں سے بڑی ہیں، اس لیے ان کی شادی اس وقت تک ہو چکی تھی اور گھر میں ہم دونوں بہنیں ہی تھیں۔ چھوٹی بہن مجھ سے تقریباً تین سال چھوٹی ہے۔ ہم دونوں کی آپس میں بہت زیادہ محبت تھی اور ہر کام میں ساتھ ہوتی تھیں۔ مجھے یاد نہیں کہ ہم دونوں بہنوں میں لڑائی تو دور کی بات، کبھی اختلاف رائے بھی ہوا ہو۔ الحمد للہ اب بھی یہ محبت قائم دائم ہے۔ ہم دونوں ابا جی کے ساتھ گوجرانوالہ جاتیں اور کافی دن چچی جان کے پاس گزار کر آتیں۔ چچی جان ہمارا بہت خیال رکھتی تھیں اور ہم بھی وہاں بہت خوش رہتیں، بلکہ جب ہم نے واپس آنا ہوتا تو چچی جان ہمیں محلہ میں ہی کپڑے فروخت کرنے والوں کے گھر بھیجتیں اور ہم دونوں اپنی پسند کے کپڑے خرید کر لاتیں۔ اس وقت ہم بہت چھوٹی ہوا کرتی تھیں۔ چاچا جی کا گھر مدرسہ نصرۃ العلوم سے متصل ہی ہے۔ چاچا جی ہمیں مسجد میں قاری صاحب کے پاس پڑھنے کے لیے بھیجتے کہ پڑھا ہوا بھول نہ جائیں۔ اس دور میں حفظ کے اساتذہ کرام طالب علموں کی خوب پٹائی کرتے تھے، بلکہ بغیر مار پٹائی کے حفظ کا تصور ہی نہ تھا۔ نہ تو گھر والے اعتراض کرتے، نہ بچے گلے شکوے کرتے، بلکہ ہونہار شاگرد تو استادوں کی مار کو اپنے لیے باعث سعادت سمجھا کرتے تھے۔ قاری یاسین صاحب نے بچوں کی پٹائی کے لیے ایک چھوٹا سا چابک رکھا ہوا تھا۔ ایک دن ہم دونوں نے جو ایک بچے کو چابک پڑتے دیکھا تو درس گاہ سے اٹھ کر یوں بھاگیں کہ گھر آ کر سانس لیا۔ چچی جان نے پوچھا کہ واپس کیوں آ گئی ہو تو ہم نے کہا کہ قاری صاحب تو چھاننے سے بچوں کو ایسے مارتے ہیں جیسے گھوڑے کو مارا جاتا ہے، لہٰذا ہم نے ان سے نہیں پڑھنا۔ چچی جان نے یہ بات چاچا جی کو بتائی تو چاچا جی بہت زیادہ ہنسے۔

ہماری دو پھوپھیاں تھیں۔ چھوٹی پھوپھی صاحبہ تو عالم جوانی میں ہماری پیدائش سے بہت پہلے ایک بچی کو چھوڑ کر دنیائے فانی سے رخصت ہوگئیں۔ اس بچی کی پرورش ہمارے ساتھ ہی ہماری بہن کے طور پر ہوئی اور بعد میں یہ ہماری ممانی بنیں۔ ابا جی اور چاچا جی اکثر اپنی اس چھوٹی بہن کو بہت یاد کیا کرتے تھے۔ بڑی پھوپھی صاحبہ جو برادر مرحوم سید عالم شاہ کی والدہ تھیں، بہت نیک دل، صاف دل، سادہ مزاج اور محبت کرنے والی خاتون تھیں۔ دونوں بھائی اپنی اس بڑی بہن کو ''ددے'' کہتے تھے اور ان کی دیکھا دیکھی ہم سب بھی ددے کہتے تھے۔ دونوں ان سے بہت پیار کرتے تھے۔ پھوپھی صاحبہ مانسہرہ سے آگے پہاڑی علاقے میں رہتی تھیں۔ دونوں بھائی اکثر اصرار کر کے ان کو پنجاب بلاتے اور کافی عرصہ اپنے ساتھ رکھتے۔ ہر طرح سے ان کی خدمت خاطر کرتے۔ دونوں امی جان اور چچی جان کی محبت بھی پھوپھی جان کے ساتھ مثالی تھی۔ ہمیں نہیں یاد کہ کبھی ان کے درمیان نند بھاوج والی روایتی چپقلش کبھی معمولی سی بھی ہوئی ہو۔ پھوپھی صاحبہ تینوں بھاوجوں اور ان کے بچوں سے دلی محبت رکھتی تھیں اور تینوں بھاوجیں بھی دل سے ان کا احترام اور ان کی خدمت کرتیں۔ تقریباً دس سال قبل پھوپھی صاحبہ کا انتقال ہوگیا۔ اللہ رب العزت ہماری دونوں پھوپھیوں کی مغفرت فرمائے۔ آمین۔

ان دنوں مدرسہ نصرۃ العلوم میں ہمارے پھوپھی زاد بھائی سید عالم شاہ صاحب مرحوم پڑھا کرتے تھے۔ ہم بہن بھائیوں کے ساتھ بہت محبت و شفقت کا برتاؤ کیا کرتے۔ بہت نیک انسان تھے۔ چند سال قبل لاہور میں ان کی وفات ہوئی۔ اللہ پاک ان کی مغفرت فرمائے اور ان کے درجات کو بلند فرمائے، آمین۔ ایک مرتبہ ہم گوجرانوالہ گئیں تو بھائی عالم شاہ ہم دونوں بہنوں کو بڑی محبت سے اپنے کمرے میں لے گئے۔ گرمی کا موسم تھا اور اس وقت ریفریجریٹر تو ہوتے نہیں تھے، پانی ٹھنڈا کرنے کے لیے مٹی کے گھڑے استعمال ہوتے تھے۔ مدرسہ میں طلبہ اس مقصد کے لیے مٹی کے لوٹا نما کوزے استعمال کرتے تھے، جب کہ ہمارے خیال کے مطابق لوٹوں کا استعمال صرف بیت الخلا میں ہی ہوتا تھا، اگرچہ اب جدید دور میں لوٹوں کے استعمال میں بھی کافی جدت اور روشن خیالی آ گئی ہے۔ خیر بھائی صاحب نے ہمارے لیے بطور خاص لوٹے میں شربت بنایا۔ ہم دونوں بہنیں پہلے تو ایک دوسرے کے کانوں میں کھسر پھسر کرتی رہیں کہ لوٹے والے شربت پینا پڑے گا اور پھر جو اٹھ کر دوڑ لگائی تو پیچھے مڑ کر نہ دیکھا اور سیدھے گھر پہنچ کر دم لیا۔ چچی جان نے پوچھا کہ کیا ہوا تو ہم نے بڑی معصومیت سے بھاگنے کی وجہ بتلائی جسے سن کر چاچا جی اور چچی جی کا ہنس ہنس کر برا حال ہوگیا۔ اتنے میں دیکھا تو بھائی صاحب بھی شربت کا لوٹا اٹھائے پہنچ گئے اور چاچا جی نے ہمیں سمجھایا کہ پتر، یہ بیت الخلا والے لوٹے نہیں ہیں، یہ تو پاک صاف لوٹے ہیں جو طالب علم گھڑے کی جگہ استعمال کرتے ہیں۔ کاش آج کے اس پرآشوب دور میں بھی دو چار ایسے پاک صاف لوٹے پیدا ہو جائیں تو شاید ملک و قوم کی تقدیر سنور جائے۔

انہی ایام کا ایک اور واقعہ یاد آ رہا ہے۔ جب ہم دونوں بہنیں گوجرانوالہ جاتیں تو واپسی پر ہماری خواہش ہوتی کہ ٹرین کا سفر کریں جو اکثر ابا جی کی شفقت سے پوری ہو جاتی۔ ایک مرتبہ ہم ابا جی کے ساتھ واپسی کے سفر کے لیے گوجرانوالہ ریلوے اسٹیشن پہنچیں۔ گاڑی لیٹ تھی، اس لیے ابا جی ہم دونوں کو ساتھ لے کر ایک بنچ پر بیٹھ گئے۔ چھوٹی بہن مزاج کی بہت

سادہ ہے۔ بنچ پر بیٹھے بیٹھے اسے نیند آ گئی۔ جیسے ہی گاڑی آئی، اباجی نے اس کو جگایا اور وہ اٹھ کر آنکھیں ملتے ہوئے بولی، گکھڑ آ گیا ہے؟ اباجی اور میں ہنس پڑے۔ اباجی بولے، بنچ پر بیٹھے بیٹھے تو گکھڑ نہیں آئے گا، گاڑی میں بیٹھو گی تو آئے گا۔

اباجی کو قرآن پاک کی تلاوت کے ساتھ گہرا شغف اور روزانہ عصر کی نماز کے بعد قرآن پاک کی تلاوت کا معمول تھا۔ قرآن پاک کا بڑا ذوق رکھتے تھے۔ رمضان المبارک میں مسجد میں نماز تراویح میں پورا قرآن پاک سنتے اور پھر سحری کے وقت نفلوں میں بھائی زاہد الراشدی مدظلہ سے پورا قرآن سنتے۔ مجھے بطور سامعہ ان کے پیچھے کھڑا ہونا ہوتا جو دس سال کی عمر میں ایک کار دشوار تھا۔ نیند سے آنکھیں نہ کھلتیں اور اس وقت کڑکے کی سردی میں لحاف سے نکلنے کو جی نہ چاہتا، لیکن بھائی جان کا جگانے کا انداز بڑا عجیب تھا۔ کمرے میں آ کر آرام سے لحاف ہٹاتے اور مجھے دونوں بازوؤں میں اٹھا کر غسل خانہ میں لے جا کر کھڑا کر دیتے اور طوعاً وکرہاً وضو کرنا ہی پڑتا۔ اباجی کی بیٹھک میں جماعت ہوتی۔ اگلی صف میں اباجی اور بھائی جان کھڑے ہوتے تھے اور پچھلی صف میں بڑی امی جان اور میں۔ کبھی کبھار ہمسایوں کی بچی جسے قرآن پاک کی تلاوت اور عبادت سے بفضل خدا بہت لگاؤ تھا، وہ بھی ہمارے ساتھ کھڑی ہو جاتی۔ کچھ عرصہ قبل جوانی میں ہی اللہ کو پیاری ہو گئی۔ اللہ مرحومہ کی مغفرت فرمائے۔ آمین۔ ہر چند کہ اباجی حافظ قرآن نہ تھے، لیکن تلاوت میں اتنی روانی تھی کہ زیر زبر کی غلطی بھی فوراً پکڑ لیتے اور مجھے نیند کے جھونکوں کے باوجود پوری توجہ سے سننا پڑتا، ورنہ سلام پھیرتے ہی ڈانٹ پڑ جاتی۔ بھائی جان کی پڑھنے کی رفتار پر بھی اباجی کا مکمل کنٹرول ہوتا۔ رفتار تیز ہوتی تو ''کی ڈاک گڈی چلائی ہوئی اے'' اور رفتار آہستہ ہوتی تو ''مال گڈی نہ بن'' جیسے جملے بھائی جان کو رفتار اعتدال پر رکھنے پر مجبور کر دیتے۔ بھائی جان کو ان دنوں عادت پڑی ہوئی تھی کہ شاید ناک بند ہو جانے کی وجہ سے تھوڑی دیر بعد منہ سے ''کھوں'' کی آواز نکالتے۔ اگر کبھی بھولے سے نماز میں آواز نکال بیٹھتے تو سلام پھیرتے ہی سرزنش ہو جاتی۔ اباجی فرماتے ''کی کھوں کھوں لائی اے!'' جتنا پارہ بھائی جان نے رات کو سنانا ہوتا، دن کو ہم دونوں بہن بھائی اس کا دور کرتے اور اگر کسی وقت میری منزل یاد نہ ہوتی تو مغرب کے بعد بھائی جان مجھ سے دوبارہ سنتے۔ بھائی جان کو منزل ماشاء اللہ بہت اچھی طرح یاد تھی۔ تقریباً آٹھ نو سال میں نے بھائی جان کے ساتھ دور کیا۔

قرآن پاک کی تلاوت کا ذوق دونوں امی جان کا بھی الحمد للہ بہت اچھا تھا۔ دونوں نے سادہ قرآن پاک پڑھا ہوا تھا۔ جب ہم مسجد سے پڑھ کر گھر آتے تو امی جان ہم سے تلفظ ٹھیک کیا کرتیں۔ یہی وجہ تھی کہ الحمد للہ قرآن پاک بہت اچھا پڑھنے لگی تھیں۔ ہم بہن بھائیوں میں سے جس کا بھی قرآن پاک ختم ہوتا، اباجی اور دونوں امی جان کی خوشی دیکھنے کے لائق ہوتی۔ مجھے یاد ہے کہ جب میرا قرآن پاک ختم ہوا تو میری عمر دس سال تھی۔ آخری سبق مسجد میں نماز جمعہ کے بعد سنانا ہوتا۔ یہ سب بچوں کے لیے معمول تھا۔ جب میں سبق سنانے کے لیے مسجد کے ہال میں گئی تو اباجی نے اعلان کیا، ''ایہہ فقیر دی دھی اے۔ الحمد للہ اج ایہدا قرآن پاک حفظ مکمل ہو گیا اے۔ ایہہ آخری سبق سنائے گی۔'' جب مجھے مائیک کے آگے کھڑا کیا گیا تو مائیک میرے لحاظ سے اونچا تھا۔ میرے مہربان ومشفق استاد محترم جناب قاری محمد انور صاحب نے مجھے اٹھا کر منبر پر کھڑا کر دیا اور اسپیکر لا کر میرے آگے رکھ دیا۔ جب میں نے آخری سبق سنایا تو سب لوگ میرے استاد محترم کو اور میرے اباجی کو مبارک باد دینے لگے۔ اس وقت دونوں کی خوشی قابل دید تھی۔ حفظ کی تکمیل کے ساتھ ہی اباجی نے مجھے کتب کے اسباق شروع کروا دیے جن میں میزان الصرف، القراءۃ الراشدہ، روضۃ الادب اور ترجمہ قرآن پاک سرفہرست تھے۔ صبح کا وقت منزل یاد کرنے اور سنانے کے لیے مختص تھا اور ظہر کے بعد اباجی سے مذکورہ اسباق پڑھتی۔ میرے ساتھ ماسٹر منیر شاہ صاحب کی بچی بھی پڑھا کرتی تھی۔ وہ بھی قرآن پاک کی حافظہ تھی۔ اباجی نے سب بہن بھائیوں کی تعلیم پر بہت توجہ اور بہت محنت کی، لیکن میں سمجھتی ہوں کہ میری تعلیم پر اباجی کی سب سے زیادہ اور خاص توجہ تھی۔

جب میں نے پرائمری پاس کر لی تو گھر والوں کی خواہش تھی کہ میں اسکول کی تعلیم آگے بھی جاری رکھوں۔ چاچا جی کا مشورہ بھی یہی تھا۔ چونکہ منزل یاد کر کے آخری امتحان سے فارغ ہو چکی تھی، اس لیے صبح کا وقت فارغ ہوتا تھا۔ اباجی نے مجھ سے پوچھا کہ تمہاری کیا مرضی ہے؟ میں خاموش رہی اور سچ پوچھیں تو میرا اپنا دل بھی اسکول کی تعلیم کے لیے نہیں مانتا تھا۔ اباجی فرمانے لگے، ''پتر میری مرضی ایہہ اے کہ توں قاری کلاس شروع کر لے'' اور یوں میری تجوید کی تعلیم کا آغاز ہوا جو میں نے اور ماسٹر منیر شاہ کی بیٹی نے بفضل خدا تین سال کے عرصہ میں مکمل کر لی۔ مدرسہ میں قاری کلاس میں صرف لڑکے ہی پڑھتے تھے، اس لیے اباجی نے یہ انتظام فرمادیا کہ صبح تقریباً ساڑھے نو بجے استاذ القراء جناب قاری عبد الحلیم صاحب گھر تشریف لے آتے اور اباجی کی بیٹھک میں ہم پڑھا کرتیں۔ ہمارے ساتھ بھائی ماجد، جو ان دنوں حفظ کر رہے تھے، اباجی نے ان کی ڈیوٹی لگائی۔ وہ بھی ہمارے ساتھ بیٹھا کرتے اور سبقی پارہ یاد کرتے اور قاری صاحب کو سناتے۔ الحمد للہ، ہم نے قاری صاحب سے مشق بھی کی، پورا قرآن پاک حدر میں سنایا اور تجوید کی کتب بھی پڑھیں۔ ہمارا تجوید کا امتحان استاذ القراء جناب قاری حسن شاہ صاحبؒ نے لیا۔

میری تعلیم کے دوران اباجی کے پاس جب بھی کوئی بزرگ ہستی تشریف لاتیں تو مجھے بطور خاص ان سے ملواتے، میرے لیے ان سے خصوصی دعا کرواتے اور ان سے میرا امتحان دلواتے۔ ان بزرگوں میں حضرت مولانا غلام غوث ہزارویؒ، حضرت مولانا عبد اللہ درخواستیؒ، حضرت مولانا عبید اللہ انورؒ اور انڈیا سے آئے ہوئے بعض علمائے کرام جن کے نام مجھے یاد نہیں، نمایاں ہیں۔ مجھے ان بزرگوں کو ترجمہ قرآن پاک، ریاض الصالحین وغیرہ سنانے اور ان کی دعاؤں سے فیض یاب ہونے کی سعادت حاصل ہے۔ پھر تیرہ سال سے میرا پردہ کرایا گیا۔ اللہ تعالیٰ اس پر قائم ودائم رکھے، آمین۔ میرا قاری کلاس کا کورس تو مکمل ہو گیا لیکن اباجی کے پاس کچھ کتب کے اسباق جاری تھے۔ انہی دنوں چاچا جی نے مدرسہ نصرۃ العلوم کے ایک شعبے کے طور پر عصری اور دینی تعلیم کے لیے تعلیم نسواں کے نام سے اسکول شروع کیا تو چاچا جی کی خواہش پر اباجی نے مجھے گوجرانوالہ بھیج دیا جہاں میں نے عرصہ دو سال تک تعلیم نسواں اسکول میں پڑھایا بھی اور چاچا جی کے پاس پڑھا بھی۔ یہ دو سال کا عرصہ میری زندگی کا یادگار زمانہ ہے۔ چاچا جی، چچی جان اور بچوں کے ساتھ الحمد للہ بہت اچھا وقت گزرا۔ ان دنوں حاجی صاحب یعنی برادر عزیز محمد فیاض تقریباً چار سال کے تھے۔ ان سے بڑی بہن جنہیں ہم پیار سے ''منی'' کہتے تھے، چھ سال کی اور برادر عزیز حافظ محمد ریاض دو سال کے تھے۔ ان سے چھوٹی بہن ان دنوں پیدا ہوئی تھی اور میری وہاں رہائش کے دوران مجھ سے بہت مانوس ہو گئی تھی اور زیادہ تر میرے پاس ہی رہتی تھی۔ بڑے تینوں بہن بھائی بھی میرے ساتھ بہت مانوس تھے، بلکہ ہم مل جل کر شرارتیں کرتے اور چچی جان کو خوب تنگ کیا کرتے۔ کھانے پینے کی چیزیں ہمارے حملے سے کسی صورت میں نہ بچ پاتیں، بلکہ مہمان داری کے لیے رکھے ہوئے بسکٹ وغیرہ بھی ہم نہ چھوڑتے۔ چچی جان جہاں بھی چھپا کر رکھتیں، ہم تینوں ماہر جاسوسوں کی طرح کسی نہ کسی طرح ڈھونڈ نکالتے اور اوپر والے کمرے میں، جسے چوبارہ کہتے تھے اور جو

ہمارا مخصوص ٹھکانہ ہوتا تھا، پہنچ جاتے۔ پھر ہم ہوتے اور بسکٹ جو بہت مزے سے اڑائے جاتے۔

چچی جان سالن بنا رہی ہوتیں تو ہم بہانے بہانے سے جھانک کر دیکھتے۔ اگر گوشت ہوتا تو پھر تاک میں رہتے۔ جیسے ہی ہنڈیا بھونتے ہوئے چچی جان کسی کام سے ادھر ادھر ہوتیں، ہم فوراً پلیٹ میں بوٹیاں ڈالتے اور چوبارے میں غائب ہو جاتے۔ چچی جان آ کر سالن کی صورت حال دیکھتی تو پکارتیں، ''اج فیر بلیاں پے گئیاں نیں''، اور چاچا جی اندر بیٹھک میں ہماری شرارتیں سن کر مسکراتے رہتے۔ کبھی چاچا جی نے یا چچی جان نے ڈانٹ ڈپٹ نہ کی، نہ کبھی بے جا روک ٹوک کی اور نہ کبھی ناراض ہوئے یا غصہ کیا۔ ہم کچھ زیادہ ہ تنگ کرتے تو چچی جان ہمیں ڈراتیں کہ ''میں جا کے بیٹھک وچ تہاڈی شکایت لانی آں'' اور شکایت بھی نہ کرتیں۔ ہم نے بالکل سہیلیوں کی طرح وقت گزارا۔ وہ عمر ایسی تھی کہ مزاج میں لاابالی پن تھا۔ کبھی موڈ ہوا تو کام کر لیا اور نہ ہوا تو اللہ اللہ خیر صلا۔ لیکن چچی جان نے مجھے کبھی نہیں جتایا، بلکہ ناشتہ، کھانا ہر چیز اپنے بچوں کی طرح سب کو اکٹھے بٹھا کر کھلاتیں۔ دو سال کے عرصہ میں کبھی مجھے یہ محسوس ہی نہیں ہوا کہ میں چچی جان کے گھر ہوں۔ میں گھر کے باقی کام تو مرضی اور موڈ سے کرتی تھی، لیکن چاچا جی کے کپڑے بہت شوق اور لگن سے استری کیا کرتی تھی اور چاچا جی کو میرے استری کیے ہوئے کپڑے بہت پسند آتے تھے۔ الحمد للہ دو سال تک مجھے ان کے کپڑے استری کرنے کی سعادت حاصل رہی جسے میں اپنے لیے بڑے اعزاز کی بات سمجھتی ہوں۔

دو سال کے اس عرصے میں، میں نے چاچا جی سے مختلف کتابیں بھی پڑھی ہیں جن میں کافیہ، نور الایضاح اور مشکوٰۃ شریف نمایاں ہیں۔ ابا جی کی طرح چاچا جی کا پڑھانے کا انداز بھی بڑا دلنشین تھا۔ چاچا جی اپنے بیڈ پر سرہانے کی طرف تشریف فرما ہوتے، میں پائنتی کی طرف ہوتی، درمیان میں تپائی رکھی ہوتی جس پر کتاب کھلی ہوئی رکھی ہوتی۔ میں عبارت پڑھتی، ترجمہ سناتی، جہاں غلطی ہوتی، چاچا جی اصلاح فرماتے اور پھر آنکھیں بند کر کے تشریح فرمانا شروع کر دیتے اور میں چاچا جی کے چہرے کی طرف دیکھتی رہتی اور چاچا جی جو کچھ سمجھا رہے ہوتے، اسے ذہن میں محفوظ کرتی رہتی۔

دونوں شفیق ہستیوں، ابا جی اور چاچا جی کی نوک جھوک سے بھی محظوظ ہوا کرتی جو یہاں بھی جاری رہتی۔ ابا جی کا معمول تھا کہ روزانہ صبح جب نصرۃ العلوم پہنچتے تو پہلے سیدھے چاچا جی کے گھر تشریف لے جاتے، وضو کرتے اور پھر چند منٹ چاچا جی کے ساتھ گزار کر درس گاہ میں تشریف لے جاتے۔ اسی طرح اسباق سے فارغ ہوتے تو بھی پہلے گھر جاتے، معمولات سے فارغ ہونے کے بعد اگر چاچا جی اندر ہوتے تو کچھ دیر ان کے پاس بیٹھتے۔ کچھ باہمی مشورے وغیرہ کرنے ہوتے تو وہ کرتے، پھر واپس گکھڑ تشریف لے جاتے۔ اس اثنا میں ہنسی، مذاق اور نوک جھوک بھی چلتی رہتی۔ مجھے چاچا جی کی ایک بات بہت مزہ دیتی تھی۔ جب ابا جی کوئی بات کرتے تو چاچا جی جواب میں کوئی مزاحیہ سی بات کہہ دیتے، لیکن ساتھ ہی فوراً کتاب بغل میں دبا کر مدرسہ کی راہ لیتے اور یقیناً ایسا از راہ احترام ہوتا کہ چاچا جی، ابا جی کا بہت زیادہ احترام کیا کرتے تھے۔ چاچا جی کا یہ انداز بالکل ایسا ہوتا جیسے بچہ اپنے کسی بڑے کے سامنے بات کرتا ہے۔ انہی دنوں کی بات ہے کہ ایک طالبہ نے مجھے پلاسٹک کا بنا ہوا ایک سانپ دیا جو دیکھنے میں بالکل اصلی لگتا تھا۔ برادر عزیز حاجی فیاض اور منی اکثر اس سے کھیلتے رہتے۔ چاچا جی مسجد میں نماز پڑھنے کے لیے گئے تو ان کی عدم موجودگی میں بچوں نے شرارت سے وہ سانپ ان کے بستر پر رکھ دیا۔ چاچا جی مسجد سے واپس آئے اور جوں ہی بستر پر بیٹھنے لگے، اچانک سانپ پر نظر پڑی۔ اچھل کر کھڑے

ہو گئے اور آواز دی ''منیے! سوٹا لے کے آ، سپ مارنا ایں''۔ ہم تینوں جو صورت حال معلوم کرنے کے لیے باہر ہی کھڑے تھے، ہنسنے لگے تو چاچا جی سمجھ گئے کہ یہ ان کی شرارت ہے۔ سو تھوڑی ڈانٹ ڈپٹ ہمیں ہوئی کہ ''اے شیطانی شے تساں کتھوں لے آندی اے۔'' اگلی صبح جب ابا جی گکھڑ سے تشریف لائے اور حسب معمول بیٹھک میں آ کر اپنے بوٹ اتارے اور وضو والے چپل پہن کر وضو کے لیے غسل خانہ میں گئے تو چاچا جی نے چپکے سے وہ سانپ ابا جی کے بوٹ میں رکھ دیا اور سر جھکا کر کتاب کے مطالعہ میں مصروف ہو گئے۔ جیسے ہی ابا جی وضو کر کے واپس آئے اور پاؤں خشک کر کے بوٹ پہننے لگے تو سانپ دیکھتے ہی پیچھے کی طرف چھلانگ لگائی اور ساتھ ہی آواز دی ''کڑیو، جلدی ڈنڈا پھڑ اؤ۔ بڑا موذی سپ اے۔'' چاچا جی جلدی جلدی اپنی چیزیں سمیٹ کر مدرسہ جانے کے لیے تیار ہونے لگے اور ساتھ ہی اپنی مسکراہٹ چھپانے کی کوشش بھی کر رہے تھے۔ ادھر باہر سے ہمارے ہنسنے کی دبی دبی آوازیں سنیں تو ابا جی فوراً معاملہ کی تہہ تک پہنچ گئے اور بولے، ''ایہہ صوفی دی شرارت اے''، اور چاچا جی اتنی دیر میں مدرسے کا دروازہ پار کر چکے تھے۔ ابا جی اور ساتھ ہم لوگ بھی بہت دیر تک ہنستے رہے۔

الغرض وہ وقت جو میں نے چاچا جی اور چچی جان اور بچوں کے ساتھ گزارا، میرے لیے ہر لحاظ سے قیمتی اور یادگار ہے۔ شادی کے بعد بھی سب سے محبت اور بے تکلفی کا رشتہ اس طرح قائم ہے۔ رب کریم تا حیات یوں قائم رکھیں۔ آمین۔

دونوں بھائیوں میں انتہا درجہ کی محبت تھی۔ جب دونوں بھائی بیمار ہوئے تو بیماری کے ہاتھوں اس قدر لاچار ہو گئے کہ ایک دوسرے کے لیے ترس جاتے۔ اس عالم میں دونوں کی تڑپ قابل دید تھی۔ گکھڑ سے کوئی بھی آتا تو چاچا جی کے لبوں پر سوال ہوتا، ''بھائی صاحب دا حال کیہ اے؟''۔ اگر گوجرانوالہ سے کوئی بھی جاتا تو ابا جی بے قراری سے دریافت فرماتے، ''صوفی دا کیہ حال اے؟''۔ وقتاً فوقتاً ایک دوسرے سے فون پر خیریت معلوم کرتے۔ آخری ایام میں مسلسل بیماری اور ضعف کی وجہ سے چاچا جی نے کھانا پینا چھوڑ دیا۔ بہت اصرار سے اور تقریباً زبردستی کھلانا پڑتا تو چچی جان کہتیں کہ گکھڑ فون کر کے بھائی صاحب کو بتاتے ہیں کہ یہ کچھ کھا پی نہیں رہے، تو چاچا جی فوراً بول پڑتے، ''ناں، ناں، بھائی صاحب نوں فون ناں کریں، اوہ پریشان ہو جان گے۔'' دونوں میں سے جس کی بھی طبیعت زیادہ خراب ہوتی تو یہی کوشش ہوتی کہ دوسرے بھائی کو علم نہ ہو کہ انہیں پریشانی ہو گی۔

جب چاچا جی کا انتقال ہوا تو ابا جی کی حالت دیکھی نہیں جاتی تھی۔ بھتیجوں کو گلے لگا کر اس طرح روئے کہ سب کو رلا دیا۔ میں گوجرانوالہ سے تیسرے دن گکھڑ آ گئی اور رات کو ابا جی کے پاس بیٹھی چاچا جی کی باتیں کرتی رہی۔ میں نے ابا جی سے پوچھا کہ ابا جی! کبھی زندگی میں آپ دونوں بھائیوں کی لڑائی یا کوئی ناراضگی بھی ہوئی؟ فرمانے لگے، نہیں، کبھی نہیں ہوئی۔ پھر کافی دیر روتے رہے۔ پھر فرمانے لگے، صوفی میری بڑی عزت کردا سی۔ میری ہر گل من لیندا سی۔ ساڈے درمیان کدی کوئی لڑائی جھگڑا نہیں ہویا۔ بیماری کے عالم میں بھی دونوں بھائیوں کی خوش طبعی عروج پر رہی۔ گکھڑ جاتی تو وہاں ابا جی کی بیٹھک میں خوب رونق لگی ہوتی۔ محفل آباد ہوتی۔ کسی سے نعت سن رہے ہیں، کسی سے کتاب اور کسی سے قرآن پاک کی آیات، اور گوجرانوالہ جاتی تو چاچا جی کی بیٹھک کشت زعفران کا منظر پیش کر رہی ہوتی۔

ہم نے چونکہ اپنے دادا دادی کو نہیں دیکھا، اس لیے میرے دل میں ہمیشہ یہ حسرت رہی ہے کہ کم از کم اتنا علم تو ہو جائے کہ وہ ہستیاں کیسی تھیں۔ میں اکثر ابا جی اور چاچا جی سے ان کے بارے میں پوچھتی رہتی تھی۔ اب افسوس ہوتا ہے کہ کاش وہ

قیمتی گفتگو ریکارڈ کر لیتی تو کتنا اچھا ہوتا۔ میں نے ایک دن ابا جی سے پوچھا کہ آپ کو اپنی حقیقی والدہ کی صورت یاد ہے؟ تو چھوٹی بہن کی دوسرے نمبر کی بیٹی کی طرف دیکھ کر فرمانے لگے کہ اس کی مشابہت کسی حد تک ان کے ساتھ ہے۔ وہ ابا جی کے لیے چائے اور بسکٹ لائی اور کھلانے لگی تو ابا جی ہنس کر فرمانے لگے، یہ میری اماں ہے، مجھے بچوں کی طرح کھلاتی ہے۔ ہم دونوں بھی ہنسنے لگیں۔

گزشتہ سال گکھڑ گئی۔ ابا جی کے پاس بیٹھی ہوئی تھی کہ کچھ لوگ ملاقات کے لیے آ گئے۔ سو مجھے اٹھ کر اندر جانا پڑا۔ سب سے چھوٹا بھائی حافظ راشد سلمہ مہمانوں کے ساتھ تھا۔ تھوڑی دیر بعد باہر آیا تو ہنس رہا تھا۔ میں نے پوچھا، کیا بات ہے؟ کہنے لگا کہ اندر جو مہمان آئے ہیں، وہ حکومت میں اونچے عہدے پر فائز ہیں۔ ابا جی سے کہنے لگے کہ حضرت، میرا ایک ساتھی ہے جو عیسائی ہے۔ وہ کہتا ہے کہ شیطان کے بارے میں تقریباً ہر مذہب والے مانتے ہیں کہ وہ انسانوں کو بدی پر مائل کرتا ہے اور گمراہ کرتا ہے، تو ہمارے پاس تو شیطان سے بچاؤ کے لیے خدا کا بیٹا ہے (نعوذ باللہ من ذالک)، تمہارے پاس کیا ہے؟ ابا جی نے فوراً جواب دیا: ''اونہوں آکھو تہاڈے کول پتر اے تے ساڈے کول پیو اے۔'' (اسے کہیں کہ تمہارے پاس بیٹا ہے تو ہمارے پاس باپ ہے)۔

یہی حال چاچا جی کا بھی تھا۔ جب میں گوجرانوالہ جاتی، چاچا جی کے کمرے میں رونق لگی ہوتی۔ بالخصوص رات کو سب ان کے کمرے میں جمع ہو جاتے اور چاچا جی سے باتیں ہوتیں۔ ہنسی مزاح بھی چلتا رہتا۔ خصوصاً چاچا جی اور چچی جان کی نوک جھوک بڑی دلچسپ ہوتی۔ چچی جان کو مذاق میں ''میری بے غم'' کہا کرتے تھے۔ میں چاچا جی کے پاس بیٹھی ہوئی تھی اور میرے ساتھ ہی چچی جان بھی تھیں۔ مجھے کہنے لگے ''ایہہ تیرے کول کون بیٹھا اے؟'' میں نے کہا، ''ایہہ تہاڈی بے غم صاحبہ نیں۔'' تھوڑا سا مسکراتے ہوئے کہنے لگے، ''اچھا، ایہہ ساڈی بے غم اے، پر سانوں تے نہیں پچھدے بھالدے۔'' چچی جان کہنے لگیں، ''میں ناراض ہو گئی آں، میں تہاڈے کمرے وچ نہیں آنا۔'' میں نے کہا، ''چاچا جی! تہاڈی بے غم تے ناراض ہو گئے نیں۔ ہن کیہ کرو گے؟'' پہلے تو کھل کے ہنسے، پھر بولے ''کوئی گل نیں، کچھ خوشامد وشامد کر کے راضی کر لاں گے۔''

غرض ہم رات دو بجے تک بیٹھے رہے اور کسی کا بھی اٹھ کر جانے کو جی نہیں چاہتا تھا۔ آخری ایام میں چاچا جی کچھ عرصہ کے لیے بالکل خاموش ہو گئے تھے۔ نہ کسی کو پہچانتے تھے اور نہ بات کرتے تھے۔ ان دنوں میں گوجرانوالہ آئی تو چاچا جی کو اس حالت میں دیکھ کر لگا کہ میرا دل پھٹ جائے گا۔ میں چند منٹ بھی ان کے پاس نہ ٹھہر سکی۔ ہر نماز کے بعد، ہر درس میں ابا جی اور چاچا جی کے لیے دعا کرتی رہی، لیکن جو اللہ کا حکم ہو وہی ہوتا ہے۔ علم وحکمت کے یہ دونوں آفتاب تقریباً نصف صدی سے زیادہ عرصے تک مسند حدیث کو رونق بخش کر، ایک عالم میں اپنے علم وفکر کی کرنیں بکھیر کر، اپنی حقیقی اور روحانی اولاد کو یتیم کر کے اس جہان فانی سے رخصت ہو کر عازم خلد مکانی ہو گئے، انا للہ وانا الیہ راجعون۔

ہمارے بعد کہاں یہ وفا کے ہنگامے کوئی کہاں سے ہماری مثال لائے گا

ابا جی اور چاچا جی اس لحاظ سے بہت خوش قسمت تھے کہ اللہ رب العزت نے ان کو رفیقہ حیات بہت ہی اچھی عطا کیں۔ دونوں امی جان نے ابا جی کی خدمت کی خاطر میں کوئی کسر نہیں چھوڑی۔ ہم چھوٹے تھے تو یہی دیکھتے آئے کہ دونوں کے پیش نظر ہمہ وقت ابا جی کی ذات ہی ہوتی۔ ان کے آرام کا خیال، ان کے کھانے پینے کے اوقات کا دھیان، ان کی صحت کی فکر۔

ہم نے بہت کم ایسا دیکھا ہے کہ کسی بیوی نے اپنے شوہر کا بھی اتنا خیال رکھا ہو جتنا ہماری دونوں امی جان رکھا کرتی تھیں۔ ابا جی کی نیند کچی تھی۔ ہلکی سی آہٹ پر بھی آنکھ کھل جاتی اور پھر نیند نہ آتی تو دونوں امی جان نہ صرف یہ کہ ہم بہن بھائیوں پر کڑی نظر رکھتیں کہ ابا جی جب تک سوئے ہوئے ہیں، اونچی آواز میں بات کرنے کی بھی اجازت نہ ہوتی بلکہ ہمارے گھر کے صحن میں درخت لگے ہوئے تھے اور چڑیاں کوے وغیرہ بہت ہوتے اور شور کرتے، لیکن جس وقت ابا جی سو رہے ہوتے تو دونوں امی جان باری باری پرندوں کو اڑانے کی ڈیوٹی انجام دیتیں اور مجال ہے کہ کوئی پرندہ پر بھی مار جاتا۔

ابا جی کی زندگی بڑی منظم تھی۔ ناشتہ، کھانا، چائے، اور سونا جاگنا مقررہ وقت پر ہوتا تھا اور الحمد للہ دونوں امی جان نے ابا جی کے ہر معمول اور اس کے وقت کا پورا پورا خیال رکھا۔ مہمان داری اتنی تھی کہ ہر وقت ناشتے اور کھانے میں چار پانچ مہمان تو معمول کی بات تھی اور کبھی یہ تعداد دگنی چگنی بھی ہو جاتی، لیکن انتہائی خندہ پیشانی سے ابا جی کے مہمانوں کی خدمت خاطر کرتیں۔ ابا جی کے لیے ہمیشہ الگ پرہیزی سالن بنتا۔ چونکہ ابا جی دل کے مریض تھے تو اس تکلیف کے لیے خمیرہ گاؤزبان استعمال کیا کرتے تھے اور یہ خمیرہ ابا جی کے لیے دونوں امی جان گھر میں تیار کرتی تھیں۔ تانبے کے بڑے سے قلعی شدہ دیگچے میں دوائیاں پکاتیں، پھر ان میں شہد ملا کر ان کو گھوٹا جاتا جو کافی مشقت طلب کام تھا اور ہم بچے بھی اس کار خیر میں بخوشی حصہ لیتے تھے۔ خمیرہ تیار ہونے کے بعد مرتبان میں ڈالا جاتا اور پھر دیگچہ چاٹنے کا جو مزہ آتا، اس کا ذائقہ زبان آج تک نہیں بھول پائی۔ مغرب کی اذان سے پہلے جب ابا جی خمیرہ کھاتے تو ہم بہن بھائیوں میں سے جو بھی پاس ہوتا، تھوڑا سا اسے بھی چکھایا کرتے، اس ڈر سے کہ یہ زیادہ کھانے سے نقصان دیتا ہے۔

چچی جان نے بھی چاچا جی کی خدمت میں الحمد للہ کوئی کمی نہیں چھوڑی۔ ان کے آرام، ان کی خوراک، ان کی صحت، پرہیزی کھانا، غرض ہر بات کا بھرپور خیال رکھا۔ خصوصاً چاچا جی کی زندگی کے آخری چند سال جو شدید بیماری میں گزرے، حقیقتاً چچی جان کے لیے بہت بڑی آزمائش تھی اور الحمد للہ چچی جان نے یہ کڑی آزمائش کا وقت بڑے حوصلے اور صبر سے گزارا۔ بچوں نے بھی ان کے ساتھ بھرپور تعاون کیا اور صحیح معنوں میں چاچا جی کی خدمت میں رات دن ایک کر دیا۔

دونوں امی جان کی وفات کے بعد چھوٹے بھائیوں اور بھابھیوں نے وقتاً فوقتاً حسب استطاعت ابا جی کی بڑی خدمت کی۔ اسی طرح بھتیجوں نے خصوصاً عزیزان حافظ احسن خدامی، حافظ حمزہ احسانی نے اس خدمت میں خوب دل سے حصہ لیا، لیکن چھوٹی بہن اور اس کی بچیوں نے اور چھوٹے بھائی حافظ راشد اور اس کی بیوی نے تو ماشاء اللہ خدمت کا حق ادا کر دیا، بلکہ میں اگر یہ کہوں کہ ان سب نے ہم سب بہن بھائیوں کی طرف سے فرض کفایہ ادا کر دیا تو یہ بے جا نہ ہوگا۔ ہم سب ان کے لیے تہہ دل سے دعا گو ہیں کہ اللہ رب العزت ان کی شبانہ روز محنت اور خدمت کو قبول فرمائیں اور دو جہاں کی عزت، کامیابی عطا فرمائیں۔ آمین۔

اگرچہ باقی سب اپنی تدریسی مصروفیات کی وجہ سے باضابطہ خدمت کا حق تو ادا نہ کر سکے لیکن ابا جی اور چاچا جی کے مشن کے لحاظ سے خدمت میں کوئی بھی پیچھے نہیں رہا۔ جب ابا جی شدید بیماری کی وجہ سے نصرت العلوم میں تدریسی خدمات انجام دینے سے قاصر ہو گئے تو اللہ کے فضل وکرم سے بھائی جان زاہد الراشدی نے آگے بڑھ کر بحیثیت شیخ الحدیث اور بھائی جان قارن نے بحیثیت استاد الحدیث ان خدمات کی ذمہ داری بخوبی اٹھالی۔ اسی طرح جب ابا جی مرکزی جامع مسجد گکھڑ میں

بوجہ ضعف اور بیماری خطابت کی ذمہ داری انجام نہ دے سکے تو برادر عزیز قاری حماد الزہراوی نے یہ ذمہ داری سنبھال لی۔ برادر عزیز قاری عزیز الرحمٰن خان شاہد جب تک پاکستان میں رہے، اباجی کی خدمت کا فریضہ سرانجام دیتے رہے اور تدریسی خدمات بھی الحمدللہ بہت اچھے طریقے سے ادا کرتے رہے۔ پھر جب بحکم خداوندی اہل وعیال سمیت سعودیہ چلے گئے تو وہاں بھی بفضل خدا اباجی کے مشن کی تکمیل میں مصروف ہیں۔ جدہ میں ایک مسجد میں امامت کے فرائض سرانجام دے رہے ہیں اور ایک مدرسہ میں حفظ قرآن پاک کی تدریس بھی کرتے ہیں۔ ماشاء اللہ بڑی خوبصورت قراءت کرتے ہیں۔ اللھم زد فزد۔ باقی بھائی اور بہنیں بھی حسب استطاعت واستعداد اباجی کے مشن کی تکمیل میں مصروف ہیں۔ اسی طرح چاچاجی کی ذمہ داریاں بھی الحمدللہ ان کے بچوں نے ان کی حیات ہی میں بہت احسن طریقے سے سنبھال لیں۔ برادر عزیز حاجی محمد فیاض سواتی بحیثیت مہتمم مدرسہ نصرۃ العلوم کی تمام ذمہ داریاں اور ساتھ تدریسی فرائض سرانجام دے رہے ہیں۔ ان کی اہلیہ جو ہماری بھتیجی ہیں، شعبہ طالبات کی صدر معلّمہ کی حیثیت سے اپنے فرائض انجام دے رہی ہیں۔ گزشتہ سال میں نصرۃ العلوم سے متصل ہی طالبات کی دینی تعلیم کے لیے بھی ایک خوب صورت عمارت تعمیر کی گئی ہے جس میں مختلف شعبوں میں بچیوں کی دینی تعلیم کا سلسلہ جاری ہے اور محدود رہایشی داخلے کا انتظام بھی ہے، فالحمدللہ علیٰ ذلک۔ برادر عزیز حافظ محمد ریاض خان سواتی بحیثیت ناظم انتظامی امور میں حاجی صاحب کے معاون کی ذمہ داریاں سنبھالے ہوئے ہیں اور ان کی اہلیہ جو محترمہ چچی جان کی بھانجی ہیں، شعبہ طالبات میں بطور معلّمہ خدمت انجام دے رہی ہے۔ برادر عزیز حافظ محمد عرباض خان سواتی جو ناچیز کے داماد بھی ہیں، تدریس کے ساتھ ساتھ ناظم امتحانات کی ذمہ داری سنبھالے ہوئے ہیں اور ان کی اہلیہ، جو ناچیز کی بیٹی ہے، شعبہ طالبات میں بطور معلّمہ خدمت انجام دے رہی ہے۔

الحمدللہ جامعہ نصرۃ العلوم اللہ پاک کے خصوصی فضل وکرم سے اور دونوں بھائیوں کے لائق، باصلاحیت اور محنتی بیٹوں کے باہمی تعاون سے دن دگنی رات چگنی ترقی کر رہا ہے اور ان شاء اللہ تا قیامت ترقی وکامرانی کی راہوں پر یوں ہی گامزن اور رواں دواں رہے گا، کیوں کہ اس کی بنیادوں میں اسلاف واکابر اور بزرگوں کا خون جگر شامل ہے، اس کی کامیابی میں صاحب استعداد اور مخلص اساتذہ کرام کی شبانہ روز محنت شامل ہے اور اس کی ترقی میں لاکھوں صاحب ایمان واخلاص ہمدرد ومہربان ساتھیوں کی دعائیں اور ان کا مخلصانہ تعاون شامل ہے جنہوں نے اس جامعہ سے کسی نہ کسی نسبت سے فیض حاصل کیا اور جو صدق دل سے جامعہ اور منتظمین کے خیر خواہ ہیں۔ سچ تو یہ ہے کہ ہر لائق شاگرد اور مخلص معتقد کا فریضہ ہے کہ اپنے مادر علمی، اپنے اساتذہ کرام اور اپنے مرشدین کے ساتھ قلبی اور روحانی تعلق قائم رکھے، اپنا مخلصانہ تعاون جاری رکھے اور اپنی دعاؤں میں یاد رکھے، کہ ہم تو بحمد اللہ بزرگوں کے جاری کردہ فیض سے تا حیات مستفیض ہوتے رہیں گے، لیکن ہماری طرف سے ان کی شبانہ روز محنتوں کا حق ادا کرنے کا طریقہ یہی ہے کہ ان کے بعد ان کے لگائے ہوئے چمن کی حسب توفیق وحسب استطاعت آبیاری کرتے رہیں۔

اباجی تقریباً آٹھ نو سال بیمار رہے اور میں وقتاً فوقتاً، چاہے گھنٹے ڈیڑھ گھنٹے کے لیے سہی، زیارت کے لیے چلی جاتی۔ ۲۰۰۳ء میں جب رضائے الٰہی سے مختلف بیماریاں مجھ پر حملہ آور ہوئیں جن میں میجر آپریشن اور ہیپاٹائٹس سی سرفہرست ہیں تو کچھ عرصہ میرا جانا موقوف رہا۔ میری کوشش تھی کہ اباجی کو میری بیماری کے بارے میں نہ بتایا جائے، لیکن ان کو خبر ہوگئی۔ ان

دنوں اباجی کی یادداشت بھی فالج کے حملہ سے کچھ متاثر تھی۔ ایک دن چھوٹے بھائی حافظ راشد کا فون آیا۔ مجھے کہنے لگا کہ باجی، آپ کسی طرح ہمت کر کے تھوڑی دیر کے لیے ہی آجائیں۔ اباجی کو آپ کی بیماری کا علم ہو گیا ہے اور اب وہ عیادت کے لیے ہر شخص سے، چاہے وہ پشاور سے آیا ہو یا پنڈی سے یا کہیں سے بھی، یہی پوچھتے ہیں کہ جہلم گئے تھے؟ بیٹی کا کیا حال ہے؟ میں دوسرے دن ہی بیٹے کے ساتھ گکھڑ چلی گئی۔ اباجی سے ملی تو اباجی نے فوراً پہچان لیا۔ آنکھوں سے آنسو جاری ہوگئے۔ پہلی بات تو یہ پوچھی کہ اب ٹھیک ہو؟ دوائی کھاتی ہو، کھانا کھالیتی ہو، ہضم ہو جاتا ہے؟ ایسے ہی سوال میرے چھوٹے بیٹے سے ہوتے تھے جو اپنے اندر محبتوں کا ایک جہان لیے ہوئے ہوتے۔ آج ان سوالوں اور ان محبتوں کو سوچتی ہوں تو دل درد کی شدت سے پارہ پارہ ہوتا محسوس ہوتا ہے۔

اللہ رب العزت نے مجھے گزشتہ سال حج بیت اللہ کی سعادت بخشی۔ بڑا بیٹا اور دوسرے نمبر والی بیٹی بھی میرے ہمراہ تھی۔ روانگی سے قبل میں اباجی سے ملنے گئی۔ بہت ہی زیادہ خوش ہوئے۔ میں نے ان سے کچھ مسائل پوچھے اور کچھ اباجی نے از خود بتائے۔ پھر حج کا فریضہ انجام دینے کے بعد جب میں واپس آئی تو مہمانوں کی آمد ورفت کی وجہ سے اور کچھ بیٹی کے ہاں بچے کی ولادت کی وجہ سے میں جلدی جا نہ سکی تو بار بار دریافت فرماتے کہ کب آئے گی؟ تیسرے نمبر والی بیٹی نے جو بھائی زاہد کی بہو ہے، مجھے فون کر کے کہا کہ امی جان! نانا ابو سے مل جائیں، وہ آپ کو بڑا یاد کرتے ہیں۔ ہم گکھڑ گئے اور رات کافی دیر تک اباجی کے پاس بیٹھے رہے۔ اباجی مکہ مکرمہ اور مدینہ منورہ کی رہایش اور معمولات کے بارے میں پوچھتے رہے۔ میں نے اباجی سے حالت احرام میں چہرے کے پردے کے بارے میں پوچھا تو فرمانے لگے کہ لازمی ہے۔ میں نے عرض کیا کہ اباجی! آج کل عورتیں وہاں برائے نام پردہ کرتی ہیں اور بڑے بڑے علمائے کرام بھی یہی فتویٰ دے رہے ہیں کہ حالت احرام میں پردہ ضروری نہیں ہے۔ فرمانے لگے، ''نہیں پتر، پردہ حالت احرام وچ وی ضروری اے۔'' پھر حضرت عائشہؓ کے بارہ میں فرمایا کہ پردہ کے ثبوت میں ان کی حدیث ہے اور ازواج مطہرات بھی پردہ کرتی تھیں۔ پھر مجھ سے دریافت کرنے لگے کہ بڑا عمرہ کیا تھا؟ میں نے عرض کی، جی ہاں، کیا تھا۔ عمرہ کا احرام عام طور پر مکہ میں رہتے ہوئے تنعیم سے یعنی مسجد عائشہؓ سے باندھا جاتا ہے، لیکن اگر احرام جعرانہ سے باندھ کر عمرہ کیا جائے تو اسے بڑا عمرہ کہتے ہیں اور اس کی بڑی فضیلت ہے۔

دوسرے دن ہماری واپسی تھی۔ میرے شوہر قاری خبیب احمد صاحبؒ ہمیں لینے کے لیے آئے۔ میں اور میری بیٹی بھی اباجی کے پاس گئیں تو اباجی اپنی چارپائی پر ٹانگیں لٹکا کر بیٹھے ہوئے تھے، دائیں بائیں اور پیچھے تکیے رکھے ہوئے تھے اور قاری صاحبؒ ان کے قدموں میں بیٹھ کر ان کی ٹانگیں دبا رہے تھے۔ سردی کا موسم تھا اور قاری صاحب نے گرم چادر خوب اچھی طرح لپیٹی ہوئی تھی۔ بیٹی نے از راہ مذاق کہا کہ ''ابوجی، تسیں تے ماسیاں دی تراں بیٹھے ہوئے او'' (آپ تو ماسیوں کی طرح بیٹھے ہوئے ہیں)۔ ہنس کر بولے کہ کام بھی تو ماسیوں والا کر رہا ہوں۔ ہمیں کیا معلوم تھا کہ ہم دونوں کو آخری بار اکٹھا بیٹھے دیکھ رہے ہیں۔ مغرب کی نماز کے بعد ہم الوداعی ملاقات کے لیے اباجی کے پاس گئے تو اباجی لیٹے ہوئے تھے۔ میں نے عرض کیا کہ ''اباجی اسیں جا رہے آں۔'' میرا ہاتھ مضبوطی سے پکڑ لیا اور فرمانے لگے کہ ''فیر کدوں آئیں گی؟'' میں نے کہا اباجی کوشش کروں گی کہ جلدی چکر لگاؤں، بس سبقوں کا مسئلہ ہے۔ حسب معمول آنکھوں سے آنسو جاری ہوگئے۔ میں نے اباجی کے ماتھے پر بوسہ دیا، ہاتھ پر پیار کیا اور دکھے دل کے ساتھ الٹے قدموں بیٹھک سے باہر نکل آئی۔

میرے وہم وگمان میں نہ تھا کہ آج میں اپنے اباجی، بہت پیارے اباجی سے ہمیشہ کے لیے جدا ہو رہی ہوں۔ اگر حکم ربی نہ ہوتا تو میں موت سے کم ازکم اتنا ضرور کہتی کہ:

مجھ سے کیوں میرے پیاروں کو جدا تو نے کیا
ہائے ری موت تجھے موت ہی آئی ہوتی

میری بدنصیبی کی انتہا جو میری زندگی کی شاید سب سے کڑی آزمایش تھی کہ آخری ایام میں اباجی کو ایک نظر دیکھ بھی نہ سکی کہ عدت کی وجہ سے شرعی مجبوری تھی۔ فون آتے رہے، میں سنتی رہی۔ اباجی بیمار ہیں۔ اباجی کی طبیعت خراب ہے۔ اباجی کی حالت بگڑتی جا رہی ہے۔ میں نے اللہ سے بہت دعائیں کی، بہت التجائیں کیں، طالبات سے بھی کروائیں، درس میں آنے والی خواتین سے بھی کروائیں، لیکن ہوا وہی جو میرے مولا کو منظور تھا۔ میرا اضطراب اور میری تڑپ دیکھ کر میرے بڑے بیٹے حافظ محمد ابوبکر سلمہ نے کہا کہ امی، میں آپ کو لے چلتا ہوں۔، ہم صرف آدھ گھنٹہ وہاں ٹھہر کر واپس آجائیں گے۔ میں نے کہا، پہلے مفتی صاحب سے پوچھ لو۔ مفتی صاحب نے فرمایا کہ گنجایش نہیں اور میرے ضمیر نے گوارا نہیں کیا کہ میں صرف اپنے دل کی اور اپنے نفس کی خوشی کے لیے اللہ کی مقرر کی ہوئی حدود کو توڑ دوں۔ بچے باری باری سارے زیارت کر آئے اور میں آزمایش کی بھٹی سے گزرتی رہی اور پھر جدائی کا لمحہ آہی گیا جو ننگی تلوار بن کر سروں پر معلق تھا۔

جس رات اباجی کا انتقال ہوا، مجھے نیند نہیں آرہی تھی اور میں بیٹی کے ساتھ باتیں کر رہی تھی کہ ساتھ والے کمرے میں فون کی گھنٹی ہوئی۔ میں نے وقت دیکھا تو تقریباً پونے دو بجے تھے۔ چھوٹی بیٹی اٹھ کر آئی اور میرے پاس چپ چاپ کھڑی ہوگئی۔ دل کسی انہونی کے خوف سے لرز رہا تھا، لیکن اتنا حوصلہ بھی نہ تھا کہ اس سے پوچھوں۔ بڑی بیٹی نے ہمت کی اور پوچھا تو رونے لگی اور صرف یہ الفاظ اس کے منہ سے نکلے، ''امی! نانا ابو۔'' اور اس لمحے مجھے لگا کہ میرے لیے آج سب کچھ ختم ہو چکا ہے۔ اب کچھ نہیں بچا۔ صرف دو ماہ گزرے تھے جب سر سے چھت اڑی تھی، اس وقت جب قاری صاحب ہمیں چھوڑ کر اچانک چپ چاپ چل دیے۔ اس وقت اباجی کا فون آیا تھا۔ ان کی بھی چیخیں نکل رہی تھیں اور میری بھی۔ نہ وہ کچھ کہہ سکے نہ میں۔ پھر دو دن کے بعد میں نے فون کیا، تب بھی یہی حالت تھی۔ پھر اس کے بعد مجھے بات کرنے کا حوصلہ ہی نہ ہوا، لیکن یہ تسلی رہی کہ اباجی کی دعاؤں کا حصار میرے اور بچوں کے اردگرد ہے۔ جب اباجی بھی رخصت ہوگئے تو محسوس ہوا کہ آج چھت کے ساتھ درودیوار بھی زمیں بوس ہوگئے ہیں۔ یہ کیفیت اور یہ حالت عالم اسباب کے لحاظ سے ہے، ورنہ اللہ تعالیٰ جو سب سے بڑا آسرا اور سہارا ہے، ان کی ذات پر کامل ایمان بھی ہے، یقین بھی ہے۔ اللہ تعالیٰ میرے اباجی، میرے چاچاجی اور میرے بچوں کے ابوجی کو اعلیٰ درجات سے نوازیں، ان کی مرقد کو اپنی رحمتوں سے اور جنت کی خوشبوؤں سے معمور فرمائیں اور ہم سب کو ان کے لیے صدقہ جاریہ بنائیں۔ آمین۔

ام عمار راشدی*

اب جن کے دیکھنے کو اکھیاں ترستیاں ہیں

یہ ۱۹۷۰ء کی بات ہے۔ ہمارے اباجی ڈاکٹر محمد دین سرکاری ملازم تھے۔ اباجی کی ٹرانسفر برنالی گاؤں میں ہوئی جو ایک نہایت پس ماندہ علاقہ تھا۔ وہاں حکومت کی طرف سے اباجی کو جو ملازم ملا تھا، وہ پینے کے لیے پانی دوسرے گاؤں سے لایا کرتا تھا۔ یہ ایک بزرگ ملازم تھا جو ہماری فیملی کی خدمت پر مامور تھا۔ پانی ایک گدھی پر لاد کر لایا جاتا تھا۔ پانی لا کر وہ باباجی گدھی کو باندھ کر اپنے کوارٹر میں جا کر سو جایا کرتے تھے۔ ایک دن ہم بہن بھائی کھیل رہے تھے کہ میری نظر گدھی پر پڑی۔ میں نے اس کی رسی کھولی اور ایسے ہی اس کے اوپر بیٹھ گئے۔ گدھی نے سمجھا کہ شاید اب ریس لگانی ہے۔ وہ اتنی تیزی سے بھاگی کہ پکی سڑک کے درمیان میں مجھے پٹخ کر گرا دیا۔ اس دوران میں میرے چھوٹے بھائی نے گھر والوں کو آگاہ کیا۔ امی اور اباجی گھر پر نہیں تھے۔ دادی محترمہ کو، جنھیں ہم بے جی کہا کرتے تھے، بتایا گیا کہ آپ کی لاڈلی گدھی سے گر کر سڑک پر پڑی رو رہی ہے۔ بے جی جلدی سے کوارٹر سے باہر نکلیں اور مجھے اٹھا کر کوارٹر کے اندر لے جایا گیا۔ پکی سڑک پر گرنے کی وجہ سے چوٹیں خوب لگی تھیں۔ مرہم پٹی کر کے مجھے چارپائی پر لٹا دیا گیا۔

شام کو جب امی اور اباجی آئے تو بے جی ان کے سامنے رونے لگیں اور اپنے مخصوص انداز میں پنجابی میں کہنے لگیں ''محمد دینا! ایہدا کج کرلے۔ ایہہ اج اپنی لنگ تروڑ لین لگی سی آ'' (محمد دین! اس کا کچھ کرلو۔ یہ آج اپنی ٹانگ توڑ بیٹھنے لگی تھی)۔ اباجی بہت پریشان ہوئے اور سوچنے لگے کہ کیا کیا جائے۔ یہ لڑکی بھائیوں کے ساتھ رہ کر لڑکوں والے کام کرنے لگی ہے، اس کا کچھ حل ہونا چاہیے۔ دوسرے دن وہ گجرات کے مدرسہ حیات النبی میں مولانا نذیر اللہ خان صاحب کی خدمت میں حاضر ہوئے تاکہ ان سے مشورہ کر سکیں۔ مولانا نذیر اللہ خان اباجی کے پیر بھائی تھے اور دونوں حضرت مولانا احمد علی لاہوریؒ سے بیعت تھے۔ گزشتہ تیس پینتیس برس سے اباجی کا معمول تھا کہ ان کا جہاں کہیں بھی تبادلہ ہوتا، وہ جمعہ گجرات میں مولانا نذیر اللہ خان کے پیچھے ہی پڑھتے تھے۔ اباجی نے ان سے کہا کہ کیا میری بچی آپ کے زیر سایہ آپ کی بچیوں کے ساتھ قرآن کی تعلیم حاصل کر سکتی ہے؟ انھوں نے فرمایا کہ میرے پاس تو اس کا انتظام نہیں ہے کیونکہ طالبات کا مدرسہ نہیں ہے، البتہ گکھڑ میں مولانا سرفراز خان صفدر کے گھر طالبات کی تعلیم ہوتی ہے اور مولانا کی اہلیہ محترمہ بچیوں کو قرآن پاک کی تعلیم دیتی ہیں۔ اباجی نے ایڈریس لیا اور گکھڑ میں مولانا سرفراز خان صفدر کی خدمت میں حاضر ہو کر اپنا مدعا بیان کیا۔ مولانا صاحب نے فرمایا کہ ہمارے گھر میں تعلیم تو ہوتی ہے مگر شہری طالبات ہوتی ہیں جو پڑھ کر شام کو گھر چلی جاتی ہیں۔ ہم بچی کو گھر میں رکھنے سے معذور ہیں، کیونکہ ہمارا گھر لڑکوں والا ہے۔ البتہ اگر آپ ہمارے بڑے بیٹے زاہد کے لیے رشتہ دے

*اہلیہ شیخ الحدیث حضرت مولانا زاہد الراشدی۔

دیں تو آپ کا تعلیم کا مسئلہ بھی حل ہو جائے گا۔

ابا جی یہ بات سن کر خاموش ہو گئے۔ گھر واپس آ کر انھوں نے والدہ صاحبہ سے بات کی جو پہلے پہل تو نہیں مانیں لیکن پھر ابا جی نے انھیں قائل کر لیا۔ اُدھر مولانا سرفراز صاحب نے اپنے اہل خانہ کو بتایا کہ گجرات کے ایک ڈاکٹر صاحب اپنی بیٹی کی تعلیم کے لیے آئے تھے اور میں نے انھیں رشتے کے لیے کہا ہے۔ گھر والوں نے کہا کہ ٹھیک ہے، دیکھ لیتے ہیں۔ اگر اچھے شریف لوگ ہیں تو رشتہ طے کرنے میں کوئی حرج نہیں۔ مولانا سرفراز صاحب نے کہا کہ پھر آپ ان کے گھر کا ایک چکر لگا لیں۔ اس پر مولانا سرفراز صاحب کی دونوں بیگمات، بٹ دری فیکٹری کے مالک اللہ دتہ صاحب اور ان کی اہلیہ محترمہ شادی وال گئے جہاں ان دنوں ابا جی کا تبادلہ ہو چکا تھا۔ وہاں سے ابا جی ان مہمانوں کو ساتھ کر براستہ لالہ موسیٰ ہمارے آبائی گاؤں گلیانہ پہنچے، جو لالہ موسیٰ سے پانچ سات کلومیٹر کے فاصلے پر ہے۔ یہاں ہمارے گھر والوں سے مہمانوں کی ملاقات ہوئی اور انھوں نے ہمارے گھر والوں کو اپنے ہاں آنے کی دعوت دی۔ واپس جا کر انھوں نے مولانا صاحب کو بتایا کہ باقی سب تو ٹھیک ہے، لیکن لڑکی بہت چھوٹی ہے۔ اس پر مولانا نے جواب دیا کہ کوئی بات نہیں، کھائے پیے گی تو بڑی ہو جائے گی۔

اس کے بعد مولانا صاحب اور ان کے گھر والوں کی دعوت پر ہمارے گھر سے دس بارہ خواتین گکھڑ گئیں۔ ان میں خالہ، پھوپھیاں، ممانی اور چچی شامل تھیں۔ یہ خواتین واپس آئیں تو انھوں نے ابا جی کو بہت سمجھانے کی کوشش کی کہ فیملی بہت بڑی ہے اور برادری بھی دوسری ہے۔ پھر بچی کم عمر ہے، اس لیے یہ رشتہ مناسب نہیں۔ خصوصاً بے جی نے کہا کہ ”محمد دینا! اک سس ای نئیں، اوتھے دو سساں نیں“ (دیکھ لو، وہاں ایک نہیں، دو ساسیں ہیں)۔ ابا جی نے کہا کہ کوئی بات نہیں۔ چاہے چار ساسیں ہوں، ہماری خوش بختی کے لیے یہ کافی ہے کہ اتنے اچھے، شریف، سلجھے ہوئے اور علم سے وابستہ خاندان کے ساتھ رشتہ قائم ہو جائے گا۔ چنانچہ دونوں طرف کی رضامندی سے چھوٹی موٹی تیاری کے بعد ٹھیک ایک ماہ بعد یہ شادی ہو گئی۔ والدین نے مجھے نصیحت کی کہ ہمیں شکایت نہیں ملنی چاہیے۔ دونوں ساسیں تمہاری مائیں ہیں اور اب تمہارا جینا مرنا وہیں ہے۔ الحمد للہ، اللہ تعالیٰ نے اتنی ہمت دی کہ میں نے کبھی پیچھے مڑ کر نہیں دیکھا اور اپنی ہمت سے بڑھ کر خدمت کرنے کی کوشش کی۔ گکھڑ آ کر میں ماؤں اور مولانا صاحب کی شفقت اور بہن بھائیوں کا پیار پا کر اپنے ماں باپ، بہن بھائی کو بالکل بھول گئی۔ اپنے گھر چھ بھائی، تین بہنیں اور والدین چھوڑ کر آئی تھی، اللہ نے یہاں تین بہنیں، آٹھ بھائی، دو مائیں اور ایک ابا جی عطا فرمائے۔ ان میں سے چھ بھائی اور ایک بہن مجھ سے چھوٹے اور باقی بڑے تھے۔

شادی کے بعد میں نے بڑی امی کے پاس قرآن مجید حفظ کیا۔ ۱۹۷۳ء میں میرے ہاں بیٹی کی پیدائش ہوئی جبکہ ۱۹۷۴ء میں قرآن مجید حفظ مکمل ہوا۔ پھر کچھ عرصے کے بعد چھوٹے دیوروں عابد اور حماد کے ساتھ میں نے ابا جی کے پاس صرف ونحو پڑھی۔ کچھ عرصہ میں نے اور چھوٹی امی نے مل کر ابا جی کے پاس پڑھا۔ ہم جب سبق پڑھنے جاتے تو جیسے ہی ابا جی کے کمرے میں داخل ہوتے، ابا جی ہنسنے لگ جاتے۔ امی ذرا ٹھہر ٹھہر کے پڑھتیں یا کبھی اٹک کر پڑھتیں تو ابا جی پنجابی میں کہتے ”چناچا ناتے آٹا خراب“، جس کی وجہ سے امی کو سبق کے لیے جانے سے پہلے فکر ہوتی کہ سبق اچھی طرح یاد ہو، ورنہ ابا جی پھر مذاق اڑائیں گے۔ ابا جی امی کو کہتے کہ پہلے تم صرف بیوی تھیں، اب شاگرد بھی ہو تو امی کہتیں، اف ماری گئی۔ جب ابا جی سبق پڑھاتے تو میں فوراً دہرا لیتی اور مجھے جلدی یاد ہو جاتا، لیکن امی کو فوراً یاد نہ ہوتا اور یاد کرنے میں وقت لگتا تھا، لیکن بعد

میں، میں جلدی بھول جاتی جبکہ انھیں آموختہ، یاد رہتا تھا۔

حساب کتاب میں بڑے سخت تھے۔ نہ کسی کی ایک پائی خود رکھتے تھے اور نہ کسی کو لینے دیتے تھے۔ ان کا وقت طے تھا کہ سال میں کب گھر والوں کو کپڑے لے کر دینے ہیں۔ گندم، چاول، مہینے کا راشن، جوتے وغیرہ وہ خود حساب سے منگوا کر دیتے تھے، جبکہ روزانہ کا خرچ بڑی امی کے سپرد کر دیتے تھے۔ ماشاء اللہ دونوں بیویوں کا اتفاق تھا اور کسی کو اعتراض نہ تھا کہ خرچہ بڑی امی کے پاس کیوں ہے یا کچن میں زیادہ وقت چھوٹی امی کیوں گزارتی ہیں۔ گھر کے معاملات میں انصاف اور آپس میں پیار تھا جس کی بڑی وجہ ابا جی کے اصول تھے۔ دونوں امیوں کا آپس میں بہت اتفاق تھا اور بہوؤں کے ساتھ اس قدر پیار اور شفقت کا رویہ تھا کہ باہر سے آنے والا یہ جان نہیں پاتا تھا کہ بہو کون سی ہے اور بیٹی کون سی۔ گھر کے کام میرے اور چھوٹی امی کے ذمے ہوتے تھے۔ امی کھانا بناتی تھیں اور ابا جی ان کے ہاتھ کا کھانا پسند کرتے تھے۔ میں صفائی کے علاوہ برتن اور کپڑے دھونے کا کام کرتی تھی۔ بڑی امی پڑھنے پڑھانے کا کام کرتی تھیں اور گھر کا برآمدہ اور کمرے ان کے شاگردوں سے بھرے ہوتے تھے، اس لیے ہم نے انھیں گھر کے کاموں کے جھنجھٹ سے فارغ کیا ہوا تھا۔ بڑی امی دنیاوی کاموں میں کوئی دلچسپی نہیں رکھتی تھیں۔ اندرون ملک اور بیرون ملک بے شمار لوگ ایسے ہیں جنھوں نے قرآن پاک کی تعلیم بڑی امی سے حاصل کی ہے۔

آپس میں ہنسی مذاق اور مل بیٹھنے کو ابا جی بہت پسند کرتے تھے اور بعض اوقات میری طرف اشارہ کر کے امیوں سے کہتے تھے کہ پہلا تکا تو ٹھیک لگ گیا ہے، آگے پتہ نہیں کیا ہوگا۔ اس پر اللہ دتہ بٹ صاحب کی اہلیہ، بے جی کہتیں کہ مولوی صاحب! آپ خود اور آپ کی بیویاں بہت اچھی ہیں، اس لیے آگے بھی ان شاء اللہ اچھا ہی معاملہ ہوگا۔ اور ایسا ہی ہوا۔ ابا جی کی سب بہوویں ایک سے بڑھ کر ایک اچھی ہیں، خدمت گزار اور ملنسار ہیں۔ یہ اس گھرانے کی بڑی خوش قسمتی تھی۔ ہم سب بہوؤں کا آپس میں بہت اتفاق اور پیار ہے۔ جب بھی کسی موقع پر ملنا ہوتا ہے تو اچھی طرح ملتی ہیں، ایک دوسرے سے ہنسی مذاق اور گپ شپ خوب ہوتی ہے۔ اس پر ابا جی بہت خوش ہوتے تھے اور ماشاء اللہ ماشاء اللہ کہتے تھے۔

باہمی اتفاق اور پیار ومحبت میں ابا جی کا گھرانہ مثالی تھا اور لوگ مثال دیا کرتے تھے کہ دو مائیں ہیں اور ان کے بچے بھی ایک ہی گھر میں اکٹھے پلے بڑھے ہیں۔ ایسا ابا جی کے انصاف اور پیار وشفقت ہی کی وجہ سے ممکن ہوا۔ جس طرح اپنی اولاد کے ساتھ ان کی محبت مثالی تھی، اسی طرح بلکہ اس سے بھی زیادہ ان کی اپنے بھائی سے محبت مثالی تھی۔ بچپن سے بڑھاپے تک ان کا پیار اور ایک دوسرے کے احترام حیران کن حد تک مثالی تھا۔ دونوں بھائیوں کے والد کم عمری میں ہی ان کا ساتھ چھوڑ گئے تھے۔ اس کے بعد صوفی صاحب کی ہر قسم کی ذمہ داری ابا جی نے خود اپنے سر لے لی اور ہمیشہ اس کو نبھایا۔ صوفی صاحب، ان کی اولاد اور ان کی اہلیہ بھی ابا جی کی بہت عزت کرتے تھے۔ صوفی صاحب اپنے اہل خانہ سے کہتے تھے کہ گھر کے معاملات میں بھائی صاحب نے جیسے کہہ دیا ہے، ویسے ہی کریں۔ ساری زندگی صوفی صاحب کے اہل خانہ نے ان کی اس بات کو سر آنکھوں پر رکھا اور ابا جی کے ہر حکم کی اطاعت کی۔

صوفی صاحب بہت کم گکھڑ جاتے تھے۔ میں ۹ سال گکھڑ رہی۔ اس دوران وہ دو یا تین مرتبہ گکھڑ آئے۔ جب کبھی صوفی صاحب آتے تو ان کے آنے سے پہلے ہی ابا جی ہدایات دیتے کہ صوفی نے آنا ہے، اس کا پورا خیال رکھنا۔ دونوں امی کہتیں کہ ٹھیک ہے، پہلے بھی خدمت کرتے تھے، اب بھی کریں گے۔ اگر کسی سے بھی کسی قسم کی کمی بیشی ہو جاتی تو ابا جی ڈانٹ پلاتے

تھے۔ایک مرتبہ صوفی صاحب نے آنا تھا۔حسب عادت اباجی نے ہدایات دیں تو میں نے کہا، ٹھیک ہے، ہم سب ان کی خدمت کریں گے، بلکہ جہاں آپ کے اور صوفی صاحب کے جوتے پڑے ہوئے ہیں، وہیں بیٹھ جائیں گے،لیکن آپ کو بھی ایک وعدہ کرنا ہوگا۔ بولے، پتر وہ کیا؟ میں نے کہا کہ اگر کوئی کوتاہی ہوگئی تو صوفی صاحب کے سامنے مت ڈانٹیے گا۔اباجی نے کہا کہ تم لوگ کوئی کوتاہی کرنا ہی نہ۔ میں نے کہا کہ اس کا مطلب ہے کہ ڈانٹ تو پڑے گی ہی پڑے گی،تو اباجی ہنسنے لگے۔

دونوں بھائیوں کے مزاج میں زمین آسمان کا فرق تھا۔اباجی کے رعب اور دبدبے کی وجہ سے ان کے اپنے بچے، بیٹے اور بیٹیاں صوفی صاحب کے ساتھ زیادہ بے تکلف تھیں۔صوفی صاحب اباجی کی بیٹیوں سے بڑی تفصیل سے بات چیت کیا کرتے تھے۔ جب کبھی اباجی کی بیٹیاں آتیں تو وہ ان سے ان کے اور ان کے سسرال کے متعلق بہت تفصیل سے دریافت کرتے اور مناسب مشورے بھی دیتے تھے۔اسی طرح اباجی کی بہوؤں سے ہمارے میکے کے متعلق بات چیت کرتے تھے۔ہم سب بے تکلفی سے ہر موضوع پر ان کے ساتھ بات کر لیتے تھے اور اسی وجہ سے ان کے ساتھ زیادہ قرب محسوس کرتے تھے۔

اباجی کی اولاد کی پیدائش تو گکھڑ میں ہوئی لیکن سب نے تعلیم صوفی صاحب کے زیر سایہ گوجرانوالہ میں حاصل کی اور انھوں نے سب بچوں کے سر پر اپنا دست شفقت رکھا۔نہ صرف صوفی صاحب ہمیشہ ان کا بہت خیال رکھتے اور ہمیشہ مشفقانہ برتاؤ کرتے تھے، بلکہ چچی صاحبہ نے بھی سب کا بہت خیال رکھا۔اباجی کی سب اولاد کو صوفی صاحب کے گھر میں ہر طرح کی آزادی اور سہولت میسر تھی اور کھانے پینے یا کسی بھی معاملے میں کسی قسم کی کوئی رکاوٹ نہیں تھی۔ چچی صاحبہ کی شفقت صوفی صاحب کے دنیا سے رخصت ہو جانے کے بعد بھی قائم ہے۔

اباجی اور صوفی صاحب کی طرح چچی صاحبہ اور اباجی کی دونوں بیگمات میں بھی پیار محبت کا مثالی تعلق تھا اور وہ گھر الگ الگ ہونے کے باوجود ہر کام باہمی مشورے سے کرتی تھیں۔صوفی صاحب اپنی بھاوجوں کا بہت احترام کرتے تھے اور اباجی بھی اپنی بھاوج کی بہت عزت کرتے تھے۔ان کو پیار سے ''جوہری'' (زہرہ) کہتے تھے۔جب تک اباجی نصرۃ العلوم آتے رہے، چچی ہمیشہ اچھے انداز سے ان کا استقبال کرتی تھیں۔صوفی صاحب نے اپنی اولاد کی تربیت بھی کی تھی کہ وہ بھی اباجی کا بہت احترام کرتے تھے۔صوفی صاحب کے بچے جب بھی گکھڑ جاتے تو اباجی انھیں بہت پروٹوکول دیتے تھے۔بار بار پوچھتے کہ بچوں نے کچھ کھایا ہے؟ اور بچوں سے بھی معلوم کرتے۔

جب میری شادی ہوئی تو کچھ دن کے بعد صوفی صاحب گکھڑ آئے اور مجھے بلوایا۔ میں گئی تو میرے سر پر ہاتھ پھیرا، مجھ سے میری تعلیم اور بہن بھائیوں کے بارے میں پوچھا۔ میرے والد ڈاکٹر محمد دین صاحب کی سروس کے بارے میں بھی دریافت کیا، حتیٰ کہ دادا دادی کے بارے میں بھی پوچھا کہ کیا وہ زندہ ہیں؟ میں اپنی معلومات کے مطابق انھیں جواب دیتی رہی۔صوفی صاحب نے مجھ سے میرے دادا کا نام پوچھا تو میں نے نظام دین بتایا۔صوفی صاحب کہنے لگے کہ اچھا وہ جو ریڈیو پر کام کرتے ہیں؟ میں نے کہا، نہیں وہ تو میرے والد صاحب کے بچپن میں وفات پا گئے تھے۔ بعد میں، میں نے اپنے والد صاحب سے پوچھا تو انھوں نے کہا کہ دادا کا نام نظام دین نہیں بلکہ امام دین تھا۔جتنی دیر تک صوفی صاحب میرا انٹرویو کرتے رہے، اباجی پاس بیٹھے ہلکے ہلکے مسکراتے رہے۔ پھر صوفی صاحب نے میرے سر پر ہاتھ پھیرا اور مجھے پچاس روپے سلامی دی۔اس وقت ڈیڑھ سو روپے کا ایک تولہ سونا آجاتا تھا۔عام رواج دو یا تین روپے کی سلامی کا تھا اور اس لحاظ سے

پچاس روپے کی سلامی بہت زیادہ تھی۔ میں نے امی کو بتایا کہ صوفی صاحب نے اتنے زیادہ پیسے مجھے دیے ہیں تو میں ان کا کیا کروں؟ انھوں نے کہا کہ اللہ دتہ بٹ صاحب کی اہلیہ آئیں گی تو ان کے ذریعے سے تمھیں سونے کی انگوٹھی بنوا دیں گے، کیونکہ میرے پاس صرف ایک انگوٹھی تھی۔ایسا ہی ہوا اور پورے پچاس روپے کی ایک سونے کی انگوٹھی بن گئی۔

اباجی کی طرح صوفی صاحب بھی خوب ہنسی مزاح کیا کرتے تھے، بلکہ اباجی کی بہ نسبت زیادہ کھل کر ہنستے اور قہقہہ لگا کر ہنستے تھے۔وفات سے پانچ چھ ماہ پہلے میں ان کے گھر گئی اور چچی صاحبہ کے گھر سے مشروب وغیرہ پی کر اوپر حاجی فیاض صاحب کی رہائش گاہ پر چلی گئی تو صوفی صاحب نے چچی سے کہا کہ اس کو کوئی دانہ پانی ڈالا ہے یا نہیں؟ چچی نے ہنستے ہوئے کہا کہ یہ کوئی مرغی ہے جو اسے دانہ پانی ڈالوں؟ صوفی صاحب کی محبت اور شفقت کا انداز آخری وقت تک قائم رہا۔ جب بھی ہم ملنے جاتے، وہ ایک ایک فرد کا پوچھتے۔زندگی کے آخری ایام میں ان کی یادداشت بہت متاثر ہو چکی تھی، لیکن پھر بھی جب میں ملنے جاتی تو پوچھتے کہ زاہد کہاں ہے؟ ملک میں ہے یا ملک سے باہر؟ راشدی صاحب سے انھیں خاص لگاؤ تھا۔ کہتے تھے کہ یہ میرا بڑا بیٹا ہے۔انھوں نے اپنے بڑے بیٹے حاجی فیاض صاحب کی شادی اپنے بھائی کی پوتی یعنی میری بیٹی کے ساتھ کی جبکہ سب سے چھوٹے بیٹے عرباض سواتی کی شادی اباجی کی نواسی یعنی جہلم والی بھتیجی کی بیٹی سے کی۔ جب صوفی صاحب نے حاجی فیاض صاحب کے لیے رشتے کی بات کی تو راشدی صاحب بہت خوش ہوئے۔ وہ اس بات پر بہت فخر محسوس کرتے تھے کہ چچا جی نے مجھے اس قابل سمجھا اور مجھ پر اعتماد کیا۔ چچا بھتیجے کا فیصلہ ماشاء اللہ بہت کامیاب رہا۔اللہ تعالیٰ سب کی بیٹیوں کا تعلق ایسے ہی گھرانوں کے ساتھ جوڑے۔ چچی اکثر صوفی صاحب کی یہ بات دہراتی ہیں کہ اتنے سال گزرنے کے باوجود ہم نے کبھی ایک دوسرے کو سمدھی نہیں سمجھا۔جس طرح حاجی فیاض صاحب کی شادی سے پہلے تعلقات تھے، اسی طرح اب بھی ہیں۔ ہمارا ماں بیٹی کا تعلق ہے اور میں اکثر چچی صاحب سے ایسا مذاق بھی کر لیتی ہوں جو بے تکلف سہیلیاں ہی آپس میں کر سکتی ہیں۔اب ہمارے بزرگوں میں سے چچی صاحبہ ہی بچی ہیں۔اللہ ان کا سایہ صحت اور عافیت کے ساتھ ہمارے سروں پر قائم رکھے۔آمین

اباجی نے اپنی زندگی بہت نظم وضبط کے ساتھ گزاری ہے۔ان کا چوبیس گھنٹے کا ٹائم ٹیبل مقرر تھا اور وہ اس کی سختی کے ساتھ پابندی کرتے تھے۔ایک منٹ بھی آگے پیچھے نہیں ہونے دیتے تھے۔ سحری کے وقت وہ بیدار ہوتے اور گھر میں گیزر اور موٹر ہونے کے باوجود ساری زندگی نلکے سے تازہ پانی خود نکال کر صبح غسل کرتے تھے۔غسل کے بعد نفل پڑھتے۔اس کے بعد بڑی امی ناشتہ بناتی اور اباجی فجر کی اذان کے وقت ناشتہ کرتے تھے۔ وہ ناشتے میں ایک پراٹھا اور دو کپ چائے پیتے تھے۔ناشتے سے فارغ ہو کر وہ مسجد میں جا کر نماز پڑھاتے اور درس قرآن دیتے تھے۔جب واپس آتے تو اتنے میں گوجرانوالہ سے مدرسہ نصرۃ العلوم سے ڈرائیور گاڑی لے کر پہنچ جاتا تھا۔ڈرائیور ناشتہ کر کے اباجی کو ساتھ لے جاتا جہاں سے دس، گیارہ بجے کے قریب ان کی واپسی ہوتی۔اس وقت تک ان کا کھانا تیار ہو چکا ہوتا تھا۔عام حالات میں گھر داخل ہو کر السلام علیکم کہتے تھے، لیکن کبھی کسی کام سے دیر ہو جاتی اور ان کی بھوک شدید تر ہو چکی ہوتی تو گھر میں داخل ہوتے ہی آواز لگاتے ''کھانا لاؤ، السلام علیکم''۔کھانے سے فارغ ہو کر دوپہر کو پابندی کے ساتھ آرام کرتے تھے۔ان کی نیند بہت ہلکی تھی۔ جتنی دیر وہ آرام کرتے، ہم صحن سے چڑیوں اور کوؤں کو اڑاتے رہتے تھے کیونکہ ان کی آواز سے اباجی کی نیند خراب ہو جاتی تھی۔

ظہر کی نماز پڑھا کر ابا جی آتے تو قرآن پاک کی تلاوت کرتے۔ ظہر اور عصر کے بعد دم کرانے والے حضرات اور خواتین کا سلسلہ بھی ساتھ ساتھ چلتا رہتا تھا۔ عصر کی نماز جبکہ سردیوں میں مغرب کی نماز نارمل اسکول جا کر پڑھاتے تھے اور اس کے بعد درس قرآن دیتے تھے۔ نارمل اسکول ان کے گھر سے ایک یا سوا میل کے فاصلے پر تھا۔ ابا جی روزانہ پیدل وہاں جاتے تھے اور سردی ہو یا گرمی، کبھی ناغہ نہیں کرتے تھے۔

مغرب کی نماز پڑھا کر آتے تو گرمیوں میں باہر صحن میں جبکہ سردیوں میں اپنے کمرے میں بیٹھتے تھے۔ صحن آدھا کچا اور آدھا پختہ فرش والا تھا۔ (یہ آج سے پچیس تیس سال پہلے کی بات ہے) کچے صحن میں پودے لگے ہوتے تھے اور ایک ترتیب سے چارپائیاں بچھادی جاتی تھیں۔ رات کا کھانا سب وہیں کھاتے تھے۔ روزانہ رات کو ابلے ہوئے چاول پکتے تھے۔ ساتھ دودھ، دہی اور دال ہوتی تھی تاکہ اپنی اپنی پسند کے مطابق جو فرد جو کھانا چاہے، کھالے۔ ابا جی کے لیے الگ شوربہ بنتا تھا، کیونکہ وہ ہلکی نمک مرچ کھاتے تھے۔ دال چاول انھیں بہت مرغوب تھے۔ ابا جی کو کبھی مزید چاول لینے ہوتے تو کہتے کہ بڈھی سے کہو ایک ٹکے کے چاول دو۔ شروع میں مجھے سمجھ نہیں آتی تو میں دوبارہ پوچھتی کہ کتنے چاول لاؤں؟ وہ کہتے کہ بڈھی سے کہو۔ کبھی کہتے دو ٹکے کے چاول لاؤ۔ امیوں کو اندازہ ہوتا تھا کہ ایک ٹکے کتنی مقدار ہے اور دو ٹکے کتنی۔ کھانے کے بعد پھل ضرور کھاتے تھے۔ تبخیر کے مریض تھے، اس لیے موسمی بہت پسند کرتے تھے اور زیادہ پابندی کے ساتھ کھاتے تھے۔

ابا جی اپنے استعمال میں صرف دو تین جوڑے رکھتے تھے۔ اس سے زائد کپڑے ان کے استعمال میں نہیں ہوتے تھے۔ وہ کہتے تھے کہ بس ٹھیک ہے، ان سے گزارا ہو جاتا ہے۔ امی ان سے پوچھے بغیر ایک آدھ سوٹ سلوا کر رکھ لیتی تھیں کہ اگر اچانک کہیں جانا پڑ جائے تو آسانی ہوگی۔ ابا جی عید یا کسی شادی وغیرہ کے موقع پر بھی نئے کپڑے نہیں بنواتے تھے۔ ایسے موقع پر امی کا بن پوچھے بنوایا ہوا جوڑا کام آ جاتا۔ ابا جی کا معمول تھا کہ سردیوں میں سوموار اور جمعے کو جبکہ گرمیوں میں روزانہ یا ایک دن چھوڑ کر کپڑے تبدیل کرتے تھے۔ ان کے کپڑوں سے کبھی پسینے کی بو نہیں آتی تھی، بلکہ تین یا چار دن کے پہنے ہوئے کپڑے بھی جب دھوئے جاتے تو سونگھنے سے ان سے ہلکی ہلکی خوشبو آتی تھی۔ ان کے کمرے سے بھی ہمیشہ مدھم مدھم خوشبو آتی تھی۔ وضو وہ اپنے کمرے کے ساتھ ملحقہ ڈیوڑھی میں ہی کرتے تھے۔ ان کا ایک بڑا سا لوٹا تھا جس میں عام سائز کے تین چار لوٹوں جتنا پانی سما جاتا تھا۔ یہ جہازی سائز کا لوٹا سلور کا بنا ہوتا تھا جسے راشدی صاحب گوجرانوالہ سے لے کر جاتے تھے۔

سونے کا ان کا اپنا انداز تھا۔ دایاں ہاتھ رخسار کے نیچے رکھ کر سوتے تھے۔ گرمیوں میں باہر صحن میں تہبند اور کرتی پہن کر اور سر پر رومال باندھ کر سوتے تھے اور ہمیشہ دائیں کروٹ پر سوتے تھے۔ سردیوں میں رضائی سارے سر پر لپیٹ کر اور تھوڑا سا چہرہ باہر نکال کر سوتے تھے۔ اپنے کمرے اور اپنی چارپائی سے انھیں بہت انس تھا۔ موقع کوئی بھی ہو، وہ اپنے کمرے میں اپنی چارپائی پر ہی سوتے تھے۔ جب وہ بیمار ہوئے تو ڈاکٹروں نے کہا کہ ان کی آب وہوا تبدیل کی جائے۔ ان کے کہنے پر راشدی صاحب نے بھی بہت کوشش کی کہ وہ گوجرانوالہ آ جائیں اور بھائی عبدالحق صاحب نے بھی ایڑی چوٹی کا زور لگایا کہ ابا جی کچھ دنوں کے لیے ہی سہی، گجرات آ جائیں لیکن وہ نہیں مانے۔ البتہ شاید مدرسہ نصرۃ العلوم کے ساتھ پرانی یادیں وابستہ ہونے کی وجہ سے وہ بیماری کے دوران دو مرتبہ تقریباً دس دس دن کے لیے قارن صاحب کے گھر رہنے کے لیے آئے۔ ہم سب نے کوشش کی کہ وہ ہمارے ہاں رہیں، لیکن ان کا ایک ہی جواب ہوتا تھا کہ میرا کمرہ اور میری چارپائی، بس مجھے وہیں پہنچاؤ۔ وہ اپنے کمرے میں واپس جانے کے بہانے تلاش کرتے تھے، کیونکہ انھیں وہیں جا کر سکون ملتا تھا۔ ان کا کمرہ بہت یادگار کمرہ ہے۔ انھوں نے اپنی تمام کتابیں وہیں بیٹھ کر لکھیں، بہت سی اہم شخصیات کے ساتھ ملاقات بھی اسی کمرے میں ہوئی اور بہت سے اہم فیصلے بھی وہیں ہوئے۔

اپنے کمرے میں مخصوص چارپائی کے علاوہ کوئی دوسری چارپائی استعمال نہیں کرتے تھے۔ ان کی چارپائی سیبے کی رسی سے بنی ہوتی تھی اور وہ اپنی چارپائی خود اس طرح کستے تھے کہ ابا جی کے بیٹھنے سے بھی وہ ڈھیلی نہیں ہوتی تھی۔ ان کی عادت تھی کہ گرمیوں میں چارپائی پر بستر نہیں بچھاتے تھے، بس پائنتی پر ایک دری ڈال لیتے تھے۔ البتہ سردیوں میں نیچے گدا اور چادر بچھاتے تھے۔ ان کے کمرے میں گنی چنی چند چیزیں پڑی ہوتی تھیں۔ دو چارپائیاں، دو کرسیاں اور ایک میز۔ ایک قالین نماز جائے نماز، دو یا تین گاؤ تکیے، ایک لکڑی کی پھٹی جس پر وہ قرآن مجید رکھ کر پڑھتے اور تصنیف کا کام کرتے تھے۔ دو یا تین لاٹھیاں اور دروازے کے پیچھے ایک بڑا ڈنڈا اور ایک کلہاڑی رکھی ہوتی تھی۔ یہ آج سے تیس سال پہلے کی بات ہے جب میں گکھڑ میں ہی رہتی تھی۔ ابا جی کھانا جائے نماز پر بیٹھ کر کھاتے تھے۔ ان کے کھانے کے بھی مخصوص برتن تھے۔ سٹیل کا ٹرے، ایک گلاس اور ایک پلیٹ۔ سادہ برتن پسند کرتے تھے۔ کھانا کھانے سے پہلے اور کھانا کھانے کے بعد ہمیشہ ہم ان کے ہاتھ دھلاتے تھے۔ جگ یا گلاس میں پانی لے کر ساتھ ایک بڑا برتن لے جاتے جس میں وہ ہاتھ دھوتے تھے۔ ان کے پاس دستی رومال موجود ہوتا تھا جس سے وہ اپنے ہاتھ خشک کرتے تھے۔

سردیوں میں سردی سے بچاؤ کا بہت اہتمام کرتے تھے کہ اگر میں بیمار ہو گیا تو پڑھنے پڑھانے میں خلل آئے گا۔ سردیوں میں ان کا لباس یہ ہوتا تھا کہ صدری یا کرتی، پھر قمیص اور اس کے اوپر پورے بازو کی جرسی، اوپر واسکٹ اور اس کے اوپر موٹا کوٹ پہنتے تھے۔ یہ اچکن کی طرز کا ایک لمبا سا کوٹ ہوتا تھا۔ اگر بارش ہوتی تو گرم چادر یعنی دھسا بھی لے لیتے تھے۔ پہلے کبھی کبھی کالی پگڑی باندھتے تھے، جبکہ گرمیوں میں لون کی سفید رنگ کی پگڑی باندھتے تھے۔ موٹی جرابیں پہنتے تھے۔ زنجیر والی گھڑی ہمیشہ جیب میں رکھتے تھے، کلائی والی گھڑی استعمال نہیں کرتے تھے۔ موٹے شیشوں کی عینک پہنتے تھے۔

ابا جی سب بچوں کے ناخن خود کاٹتے تھے۔ ایک دفعہ سب کے ناخن کاٹ رہے تھے تو میرے بھی کاٹے۔ مجھے بہت جھجک محسوس ہو رہی تھی۔ امیوں نے سمجھایا کہ سب کے ناخن وہی کاٹتے ہیں، کچھ نہیں ہوتا تو میں نے بھی کٹوا لیے، لیکن ابا جی نے اس قدر رگڑ کر ناخن کاٹے کہ ایک مہینے تک ناخن نہیں بڑھے اور کئی دن تک میرے انگلیوں کے پور درد کرتے رہے۔ کچھ عرصہ کے بعد ایک مرتبہ پھر ابا جی سب کے ناخن کاٹ رہے تھے تو مجھے بھی ناخن کٹوانے کے لیے بلایا۔ میں نے خوف زدہ ہو کر ہاتھ بغلوں میں دبا لیے کہ ہائے ابا جی نہیں، پہلے بھی میری انگلیوں میں ورم ہو گیا تھا۔ اس پر امی نے بھی میری حمایت کی کہ آپ چھوڑیں، یہ خود کاٹ لے گی۔ تب میری جان بخشی ہوئی۔

ہم تقریباً نو سال تک گکھڑ رہے۔ جب تک میں گکھڑ میں رہی، ابا جی کو کسی بڑی بیماری میں مبتلا نہیں دیکھا۔ البتہ انھیں دل کی تکلیف رہتی تھی۔ دن یا رات کو جب بھی تکلیف زیادہ ہوتی تو اونچی اونچی آواز نکالتے تھے۔ سب گھر والے بھاگے ہوئے آتے۔ کوئی ہاتھ ملتا تو کوئی سر۔ کبھی آدھے گھنٹے کے بعد آرام آ جاتا اور کبھی دو دو گھنٹے تک تکلیف رہتی۔ یہ تکلیف کبھی دو تین ماہ کے وقفے سے ہوتی تھی اور کبھی مہینے میں ایک دو بار بھی ہو جاتی تھی۔ اس تکلیف کے لیے خمیرہ گاؤ زبان سادہ کا نسخہ

گوجرانوالہ سے لے کر جاتے اور چھوٹی امی اسے تیار کرتیں۔ دو دن اس کی تیاری میں لگ جاتے تھے۔ پکانے کے بعد چنگل کے ایک بڑے برتن میں چھان کر اسے سارا دن گھوٹنا پڑتا تھا۔ پھر اس کی رنگت سیاہ سے سفید ہو جاتی۔ ابا جی کو دکھایا جاتا تو وہ انگلی سے چیک کر کے کہتے کہ ابھی اسے مزید گھوٹا جائے۔ چھوٹی امی کہتیں، ہائے مولوی صاحب، اب تو ہمارے بازو بھی رہ گئے ہیں۔ ابا جی کہتے کہ جب رہ جائیں تو پھر بس کر دینا، لیکن ابھی اس کو مزید گھوٹو۔ کبھی کبھی گرمی کے موسم میں باہر صحن میں بیٹھ جاتے اور کہتے کہ میرے سامنے گھوٹو۔ جب خمیرہ تیار ہو جاتا تو چینی کے مرتبان میں ڈال کر اپنے کمرے میں الماری میں رکھ لیتے تھے۔ ایک مرتبہ تیار کیا ہوا خمیرہ مہینے یا ڈیڑھ مہینے کے لیے کافی ہوتا تھا۔ روزانہ عصر کی نماز سے فارغ ہو کر ایک چمچ کھایا کیا کرتے تھے۔ چونکہ ہمیں معلوم ہوتا تھا، اس لیے جیسے ہی وہ عصر کی نماز پڑھا کر گھر آتے، ہم پانی اور چمچ ان کے کمرے میں لے جاتے۔ عشا کی نماز کے بعد ابا جی اپنے اسباق کا مطالعہ کرتے تھے اور دونوں امیاں تقریباً ایک گھنٹے تک ان کا جسم دباتی تھیں۔ اس کے بعد وہ سو جاتے تھے۔ رمضان میں تراویح سے فارغ ہو کر جلدی سو جاتے تھے۔

ابا جی ایک ہی درزی سے کپڑے سلواتے، ایک ہی موچی سے جوتا بنواتے اور ایک ہی حجام سے بال کٹواتے تھے۔ ہر جمعہ کو چھت پر ایک چارپائی رکھ دی جاتی تھی۔ حجام کے آنے سے گھنٹہ آدھ گھنٹہ پہلے ابا جی چھت پر چلے جاتے اور اپنے اور بچوں کے ناخن کاٹتے تھے اور ٹیوزر کے ساتھ چہرے کے فالتو بال بھی صاف کرتے تھے۔ پھر حجام آتا اور وہ استرے سے اپنا سر منڈواتے تھے۔ کبھی کسی نے ابا جی کے سر پر بال نہیں دیکھے۔ نہ اولاد نے اور نہ کسی اور نے، البتہ امیوں نے ممکن ہے کبھی دیکھے ہوں۔ ایک دفعہ حجام کی آمد پر لطیفہ سا بن گیا۔ عید کے موقع پر ابا جی کی سب بہوویں اور بیٹیاں گکھڑ میں جمع ہوتی تھیں۔ ایک دفعہ عید کے دوسرے یا تیسرے دن جمعہ تھا اور ہم سب وہاں جمع تھے۔ حجام آیا تو ہمیں معلوم تھا کہ اب ابا جی بچوں کو بھی اوپر بلائیں گے اور جن کے سر پر بال ہوئے، ان کی خیر نہیں۔ مجھے ٹنڈ اچھی نہیں لگتی تھی، اس لیے میں نے سب بچوں کو بہلا پھسلا کر گھر سے باہر بھیج دیا اور کہا کہ جب تک حجام گھر میں ہے، تم نے اندر نہیں آنا۔ سب کو بھیج کر میں مطمئن ہو گئی۔ اتنے میں چھوٹی امی نے آواز دی کہ ارے ادھر تو دیکھو۔ ادھر جو دیکھا تو میرا اپنا بیٹا عمار خان ناصر مزے سے اپنی چمکتی ہوئی ٹنڈ پر ہاتھ پھیرتا ہوا سیڑھیوں سے اتر رہا تھا۔ سب خواتین جن کے بچوں کو میں نے گھر سے باہر بھیجا تھا، ہنسنے لگیں اور میں اپنا سر پکڑ کر رہ گئی۔

ابا جی اپنی جوتی گوجرانوالہ کے ایک موچی سے خصوصی طور پر بنواتے تھے۔ ہماری شادی پر بھی اسی موچی سے اسپیشل جوتا تیار کرایا تھا جو وہ بارات پر پہن کر آئے تھے۔ مجھے اس موچی کے بنائے ہوئے جوتے بالکل پسند نہیں تھے۔ ایک مرتبہ ابا جی اپنا نیا جوتا تیار کرا کر لے گئے تو کہا کہ پتر، یہ جوتے سنبھال دو۔ میں نے بے ساختہ کہا کہ افوہ، ابھی یہ موچی مرا نہیں! ابا جی نے کہا: لاحول ولا قوۃ الا باللہ، تم کیوں اس بے چارے کو مارنا چاہتی ہو۔ میں نے کہا کہ آپ کے صاحبزادہ صاحب بھی اسی سے بے سرے بوٹ بنوا لیتے ہیں۔ اس پر ابا جی بہت ہنسے اور کہا کہ کبھی جوتے بھی سر کے یا بے سرے ہوتے ہیں؟ میں نے کہا کہ ہاں بازار میں ہر سر کے جوتے ہوتے ہیں، لیکن جب تک یہ موچی زندہ ہے، آپ باپ بیٹا نے سر کے جوتے نہیں پہننے۔ کافی عرصے کے بعد یہ موچی فوت ہو گیا تو ابا جی ایک دن گوجرانوالہ سے گئے اور کہا کہ پتر، اب زاہد سر کے جوتے پہنے گا۔ میں نے کہا کہ وہ کیسے؟ تو کہا کہ بابا موچی بے چارہ فوت ہو گیا ہے۔ میں نے پوچھا کہ اس کا کوئی بیٹا تو یہ کام نہیں کرتا؟ ابا جی نے کہا کہ ہاں، کرتا ہے۔ میں نے کہا کہ پھر اپنے بیٹے کو اس کے متعلق نہ بتائیے گا۔

ابا جی کا مزاج اپنے چھوٹے بھائی صوفی صاحب کی بہ نسبت گھریلو معاملات میں سخت تھا۔ وہ چاہتے تھے کہ جیسے میں ہر کام کو وقت پر مکمل کرتا ہوں، ایسے ہی سب کریں۔ لیکن سخت مزاجی کے باوجود ہنسی مزاح چلتا رہتا تھا۔ ابا جی اپنی دونوں بیویوں کو "بڈھی" کہتے تھے۔ کبھی مجھے کہتے کہ بڑی بڈھی کو بلاؤ تو میں شرارت سے چھوٹی امی کو بھیج دیتی، اور کبھی کہتے کہ چھوٹی بڈھی کو بلاؤ تو میں بڑی امی کو بھیج دیتی۔ اس طرح کے چھوٹے چھوٹے مذاق ابا جی کے ساتھ چلتے رہتے تھے۔ بعض دفعہ ابا جی اتنی سنجیدگی سے مذاق کرتے تھے کہ بالکل اندازہ نہیں ہوتا تھا۔ میرے آنے سے پہلے گھر میں رنگ روغن مرد کرتے تھے اور سامان کو ادھر ادھر کرنے اور پھر پردے کی وجہ سے کافی مسئلہ ہوتا تھا۔ ایک بار میں نے ابا جی سے کہا کہ آپ سامان منگوا دیں، ہم خود روغن کر لیں گے۔ ابا جی نے کہا کہ یہ بہت مشکل کام ہے، تم لوگوں کے بس کا نہیں، لیکن میرے اور چھوٹی امی کے اصرار پر ابا جی نے سامان منگوا دیا اور ہم نے خود ہی روغن کیا۔ اس کے بعد میں اور چھوٹی امی خود ہی یہ کام کرتے تھے۔ لیکن پہلی مرتبہ جب روغن کیا تو اناڑی پن کی وجہ سے ہاتھوں کی انگلیوں میں سوراخ ہو گئے، لیکن کام جیسے تیسے مکمل کر لیا۔ ابا جی کو پتہ چلا تو کہنے لگے کہ پتر، بگدا یعنی ٹوکا لاؤ۔ میں ٹوکا لے کر آئی تو ابا جی ٹوکا اٹھا کر میرے ہاتھ کاٹنے لگے۔ میں نے چیخ مار کر امی کو آواز دی تو چھوٹی امی بھاگتی ہوئی آئیں۔ ان کے ہاتھوں میں بھی سوراخ تھے۔ میں نے ان کو آگے کر دیا کہ ان کے ہاتھوں میں بھی سوراخ ہیں، پہلے ان کے کاٹیں۔

گھر میں ایک ہی بیت الخلا تھا اور وہ بھی دوسری منزل پر۔ اس پر چھت بھی نہیں تھی۔ ایک دفعہ بارش ہوئی تو ابا جی نے کہا کہ چھتری لاؤ۔ اتفاق سے چھتری کوئی لے کر گیا ہوا تھا۔ اب امی پریشان ہوئیں کہ کیا کریں، مولوی صاحب چھتری مانگ رہے ہیں اور چھتری موجود نہیں۔ میں بھاگ کر اسٹور سے گندم صاف کرنے والا چھاج لے گئی۔ ابا جی نے کہا کہ یہ کیا ہے؟ میں تو ویسے ہی مذاق میں لے کر گئی تھی، لیکن ابا جی وہی چھاج لے کر اوپر بیت الخلا میں چلے گئے۔ بعد میں کبھی بارش ہوتی اور ابا جی کہتے کہ لاؤ، مجھے چھاج دو تو ہمیں پتہ چل جاتا کہ انھوں نے بیت الخلا میں جانا ہے۔

ایک بار ابا جی غسل کر کے آئے تو تہبند باندھا ہوا تھا۔ ان کا وجود بھاری تھا اور تہبند پیٹ سے اوپر کر کے باندھتے تھے۔ سر پر تولیہ لٹکایا ہوا تھا۔ ہم ابا جی کو دیکھ کر ہلکا سے مسکرا پڑیں اور پھر اپنے دھیان میں لگ گئیں۔ اچانک ابا جی نے اتنے زور سے "حق" کہا کہ ہم بے اختیار ایک دوسرے پر گر پڑیں۔ چھوٹی امی نے کہا کہ آئے ہائے مولوی صاحب، کبھی کبھی تو آپ حد ہی کر دیتے ہیں۔ ہنس کر کہنے لگے، یہ شیر کی للکار ہے۔

جب کبھی عید کا یا خوشی کا موقع ہوتا اور میں سب گھر والوں کے جوتے اکٹھے کر کے پالش کر رہی ہوتی تو ابا جی دیکھ لیتے اور کہتے، اچھا موچن اپنے کام پر لگی ہوئی ہے۔ اسی طرح جب کپڑے دھونے بیٹھتی تو کہتے کہ دھوبن لگی ہوئی ہے۔ گھر کے باہر کی نالی بھی رات کے وقت، جب گلی خالی ہوتی، میں ہی صاف کیا کرتی تھی۔ جب میں میکے جاتی تو ابا جی کہتے کہ "کڑی گئی اے تے نالی بھری اے"۔ جب میں واپس آتی اور نالی کی صفائی کرتی تو کہتے، لگتا ہے ویرو آ گئی ہے۔ ویرو ہمارے گھر کا کوڑا اٹھانے والی مسیحی خاتون کا نام تھا۔

ابا جی کے پاس ہر طرح کی خواتین اور مرد ملنے کے لیے آتے تھے اور خواتین اپنے مسائل بتا کر تعویذ لے کر جاتی تھیں۔ کبھی کبھی جب ابا جی کا موڈ خوشگوار ہوتا تو صحن میں بیٹھ کر لوگوں کے لطیفہ نما واقعات سنایا کرتے تھے۔ ایک دفعہ یہ واقعہ سنایا

کہ کسی گاؤں سے ایک عورت کسی مولوی صاحب کے پاس گئی اور کہنے لگی کہ میرا شوہر میرے حقوق پورے نہیں کرتا۔ مولوی صاحب نے پوچھا کہ کیا خرچہ نہیں دیتا؟ اس نے کہا کہ دیتا ہے۔ پھر پوچھا کہ کہیں جانے نہیں دیتا؟ اس نے کہا کہ نہیں، ہر جگہ لے کر جاتا ہے۔ مولوی صاحب نے پوچھا کہ کیا مارتا ہے؟ اس نے کہا کہ نہیں۔ پھر پوچھا کہ کیا تمہارے بچے ہیں؟ اس نے کہا کہ ہاں۔ مولوی صاحب نے کہا کہ بی بی، پھر وہ کون سے حقوق ہیں جو وہ پورے نہیں کرتا؟ کہنے لگی کہ وہ یہ سب کام تو کرتا ہے، لیکن میرے حقوق پورے نہیں کرتا۔ وہ اپنی ماں کو ''بے بے'' کہتا ہے اور مجھے بے بے نہیں کہتا۔ ابا جی نے یہ واقعہ سنا کر کہا کہ لاحول ولا قوۃ، اس نے اسے اپنے بچوں کی بے بے بنایا اور اب یہ اس کی بھی بے بے بننا چاہتی ہے۔

راشدی صاحب جب بھی گھر آتے تو وہی موچی والے بوٹ ڈیوڑھی میں زور سے زمین پر مارتے جس سے ان کے آنے کا پتہ چل جاتا۔ ایک دفعہ وہ اسی طرح آئے اور اپنے بوٹ زور سے زمین پر مارے تو سب بہن بھائی خوشی سے پکارنے گے کہ بھائی جان آ گئے، بھائی جان آ گئے۔ میں بھی بھاگتی ہوئی چھوٹی امی کے پاس گئی اور کہا کہ بھائی جان آ گئے۔ امی نے کہا کہ کون سے بھائی جان؟ میں نے کہا کہ بھائی جان زاہد تو امی نے کہا تیرا بیڑا اتر جائے، تم تو اسے بھائی جان نہ کہو۔ میں نے کہا کہ کیوں! سعیدہ اور طاہرہ بھی تو کہتی ہیں۔ امی نے مجھے سمجھایا کہ جس کے ساتھ شادی ہوئی ہو، اسے بھائی جان نہیں کہتے۔ بعد میں یہ واقعہ میری چھیڑ بن گیا اور اب بھی جب میں دادی اور نانی بن چکی ہوں، سب مجھے یہ بات یاد دلا کر چھیڑتے ہیں۔ امی نے یہ لطیفہ سب کو بتایا، حتیٰ کہ ابا جی اور راشدی صاحب کو بھی۔ ایک دن ابا جی صحن میں بیٹھے ہوئے تھے اور ہنسی مزاح ہو رہا تھا تو چھوٹی امی نے کہا کہ آپ کی بہو کا ایک لطیفہ بھی ہے۔ امی نے جیسے ہی بات شروع کی، میں شرم سے بھاگ کر اندر چلی گئی۔ ابا جی نے پیچھے سے آواز دے کر بلایا۔ میں شرم سے باہر نہیں نکل رہی تھی تو امی مجھے پکڑ کر باہر لائیں۔ ابا جی بہت زیادہ ہنس رہے تھے۔ وہ ہنستے ہوئے آواز نہیں نکالتے تھے، لیکن جسم بھاری ہونے کی وجہ سے ہنستے ہوئے ہلتا تھا اور وہ ہنستے ہوئے بہت اچھے لگتے تھے۔ ان کے سامنے کے دو دانتوں میں خلا تھا جو بہت خوب صورت لگتا تھا۔ جب میں باہر آئی تو کہا کہ کوئی بات نہیں، ایسا ہو جاتا ہے۔

جب ہم گوجرانوالہ منتقل ہو گئے تو ایک دفعہ ابا جی شیرانوالہ باغ کی جامع مسجد میں آئے۔ وہ پروگراموں کے سلسلے میں اکثر آیا کرتے تھے۔ ہماری رہائش اوپر تیسری منزل پر تھی۔ ابا جی جب بھی آتے تو اوپر ہمارے گھر بھی آتے تھے۔ ایک مرتبہ جلدی کی وجہ سے مسجد میں آئے لیکن اوپر ہمارے گھر نہ آئے، حالانکہ میں نے کھانے کا اہتمام کر رکھا تھا۔ کچھ عرصے کے بعد چھوٹی امی آئیں تو میں نے ان سے گلہ کیا کہ ابا جی آئے تھے، لیکن مسجد سے ہو کر چلے گئے، گھر نہیں آئے اور کھانا بھی نہیں کھایا، اس لیے میں ان سے ناراض ہوں۔ وہ گکھڑ واپس گئیں تو جا کر ابا جی کو بتایا کہ آپ کی بہو ناراض ہے۔ ابا جی نے پوچھا کہ کس بات پر؟ تو امی نے بتایا کہ آپ مسجد سے ہی واپس آ گئے جبکہ اس نے کھانا تیار کیا ہوا تھا۔ ابا جی نے کہا، اچھا اور خاموش ہو گئے۔ کچھ دن گزرے تھے کہ ایک دن ابا جی اچانک ہمارے گھر آ گئے۔ اس دن راشدی صاحب بھی گھر پر تھے۔ وہ سیڑھیاں چڑھ کر جلدی جلدی آئے اور کہنے لگے کہ ابا جی آئے ہیں۔ میں بہت حیران ہوئی۔ ابا جی نے اپنے مخصوص انداز میں ''السلام علیکم'' کہا۔ میں نے بھی اٹھ کر سلام کا جواب دیا تو ابا جی نے میرے سر پر ہاتھ پھیرا اور کہا کہ سنا ہے، تم ناراض ہوئی بیٹھی ہو۔ میں نے کہا کہ ہاں، اس دن ہم آپ کا انتظار کرتے رہے اور آپ نہیں آئے۔ تو کہنے لگے کہ پتر، یہ کون سی

بات ہے ناراض ہونے کی۔ لو میں آ گیا ہوں، لاؤ مجھے جو کچھ کھلانا ہے، کھلاؤ۔ میں نے کہا کہ ابا جی، اہتمام تو میں نے اس دن کیا تھا، آج تو گھر میں صرف کڑھی پکی ہے۔ کہنے لگے کہ واہ واہ، ماشاء اللہ، پھر میں تو بالکل ٹھیک دن آیا ہوں۔ تمہیں معلوم ہے کہ مجھے کڑھی بہت پسند ہے۔ ایک دفعہ گکھڑ میں مجھ سے پوچھا کہ کڑھی کھاتی ہو؟ میں نے کہا کہ نہیں۔ کہنے لگے کہ کیوں؟ میں نے بتایا کہ ہمارے گھر میں نہیں بنتی۔ بہت حیران ہو کر کہنے لگے کہ تمہارے گھر میں تو گائیں بھینسیں بھی ہیں، پھر بھی کڑھی نہیں بناتے؟ اگر ہمارے بڑے کڑھی نہ کھاتے تو پھٹ کر مر جاتے۔ کڑھی ابا جی کو واقعی بہت پسند تھی۔ جب گھر میں کالے چنے یا کڑھی پکتی تو ابا جی کہتے کہ ثرید بنا دو۔ ہم روٹی کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے شوربے یا کڑھی میں بھگو دیتے۔

ابا جی کی عادت تھی کہ بہو یا بیٹی یا کوئی پوتا پوتی، نواسہ نواسی ان سے ملنے جاتے تو عام حالات میں بھی وہ اپنی گنجایش کے مطابق کچھ نہ کچھ پیسے ضرور دیتے تھے۔ جب تک وہ تندرست رہے، بہت پابندی سے اپنی ساری اولاد کو عیدی بھی دیتے رہے۔ وہ الگ الگ لفافوں میں رقم ڈال کر عیدی بھیجا کرتے تھے۔ ساتھ پرچی ہوتی تھی جس پر لکھا ہوتا تھا کہ اتنی بچوں کی عیدی ہے اور اتنی بچوں کی ماں کی۔ جب وہ بیمار ہوئے تو یہ سلسلہ موقوف ہو گیا۔ ہمارے گھر عیدی ہمیشہ قاری اشرف خان ماجد مرحوم کے ہاتھ بھیجتے تھے۔ ایک بار وہ عیدی لے کر آئے تو لفافے میں صرف بچوں کی عیدی تھی، میری نہیں تھی۔ اگلی عید پر جب ماجد بھائی آئے تو لفافے میں بچوں کے ساتھ ساتھ میری عیدی بھی تھی۔ میں نے بچوں کی رکھ لی اور اپنی واپس کر دی اور کہا کہ جب میں عید کے موقع پر ملنے آؤں گی تو لے لوں گی۔ ماجد بھائی نے جا کر اسی طرح ابا جی کو بتا دیا۔ جب میں گکھڑ گئی تو ابا جی کے کمرے میں داخل ہو کر جونہی سلام کیا، انھوں نے پوچھا کہ ماجد عیدی لے کر گیا تھا تو واپس کیوں کی تھی؟ میں نے کہا کہ میری پچھلی عیدی بھی رہتی ہے، وہ بھی دیں گے تو لوں گی۔ ابا جی نے کہا کہ میں نے تو بھیجی تھی۔ میں نے کہا کہ مجھے نہیں ملی، صرف بچوں کی ملی تھی۔ ابا جی نے ماجد بھائی کو بلوا کر ان سے پوچھا تو انھوں نے کہا کہ آپ نے جو جو لفافے جس جس کے نام دیے تھے، میں نے اسی طرح پہنچا دیے تھے۔ ابا جی نے کہا کہ اچھا، میں ڈائری دیکھتا ہوں۔ ان کا معمول تھا کہ وہ رات کو ڈائری پر دن بھر کی اہم باتیں نوٹ کیا کرتے تھے۔ جب انھوں نے ڈائری دیکھی تو اس میں واقعتا سب کے نام تھے لیکن میرا نام نہیں تھا۔ ابا جی نے مجھے بلایا اور کہا کہ تم نے ٹھیک کہا، میں بھول گیا تھا، کیونکہ ڈائری پر بھی تمہارا نام درج نہیں ہے۔ میں نے کہا کہ میں آپ کی پہلی بہو تھی اور آپ مجھے ہی بھول گئے۔ یہ تو زیادتی ہے۔ اب مجھے ڈبل عیدی دیں۔ تب ابا جی نے مجھے دگنی عیدی یعنی ایک ہزار روپے دیے۔

ابا جی کو اپنی چوتھی نسل دیکھنے کا موقع بھی ملا، لیکن بڑی امی اور چھوٹی امی بہت جلد دنیا سے رخصت ہو گئیں۔ وہ اپنے بچوں اور پوتوں کی خوشیوں کو دیکھ کر بہت خوشی ہوتی تھیں اور جتنے بچے تھے، وہ دونوں انھیں دیکھ دیکھ کر جیتی اور خوش ہوتی تھیں۔ اگر وہ زندہ ہوتیں تو اپنی چوتھی نسل دیکھ کر یقیناً ان کی خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہ ہوتا۔ ابا جی اس لحاظ سے بھی بہت خوش قسمت تھے کہ دونوں بیویاں انتہائی خدمت گزار ملیں اور ان کے بعد بیٹوں، بیٹیوں اور بہوؤں نے بھی بہت خدمت کی۔ ایک دن ابا جی گوجرانوالہ سے پڑھا کر واپس گئے تو سلام دعا کے بعد کہنے لگے کہ بڈھیو! دونوں تیاری کر لو۔ چھوٹی امی سمجھیں کہ شاید کہیں جانا ہے۔ انھوں نے پوچھا کہ کہاں کی تیاری؟ ابا جی نے کہا کہ اگلے گھر کی، اللہ کے پاس جانے کی۔ دونوں امیاں خاموشی سے ابا جی کا چہرہ دیکھنے لگیں۔ ابا جی نے بتایا کہ میں نے گزشتہ رات خواب میں دیکھا ہے کہ چلتے ہوئے میری

ایک جوتی اتر گئی ہے اور چند قدم چلنے کے بعد دوسری جوتی بھی اتر گئی ہے۔ یہ خواب تم دونوں کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ بڑی امی نے کہا کہ سو بسم اللہ، تیاری ہی تیاری ہے۔ وہ جب چاہے بلا لے۔ بڑی امی زیادہ وقت ذکر اذکار میں صرف کرتی تھیں، لیکن چھوٹی امی پریشان ہو کر کہنے لگیں کہ مولوی صاحب، میرے تو چھوٹے چھوٹے بچے ہیں۔ بڑی امی کہنے لگیں کہ پھر کیا ہوا؟ وہ مائیں بھی تو ہوتی ہیں جو دودھ پیتے بچوں کو چھوڑ جاتی ہیں۔ جب بھی اللہ کا بلاوا آئے، ہم حاضر ہیں۔ ابا جی کا یہ خواب اور اس کی تعبیر اتنی درست تھی کہ کچھ ہی عرصے کے بعد بڑی امی بیمار ہو گئیں اور دو تین ماہ کے بعد ان کا انتقال ہو گیا۔ ان کے انتقال کے کچھ ہی عرصے کے بعد چھوٹی امی بھی بیمار ہو گئیں۔ وہ شوگر کی مریضہ تھیں۔ بڑی امی کی وفات کے ایک سال بارہ یا تیرہ دن کے بعد ان کا بھی انتقال ہو گیا۔ جب دونوں امیوں کا انتقال ہوا اور ہم سب رو رہے تھے تو ابا جی کہتے تھے کہ مت رو، وہ تمہارا کچھ نہیں لے کر گئیں، سب کچھ چھوڑ کر گئی ہیں، صرف اپنے اعمال ساتھ لے کر گئی ہیں۔ دونوں امیوں کی وفات کے درمیان تقریباً اتنا ہی وقفہ تھا جتنا ابا جی اور صوفی صاحب کی وفات کے درمیان تھا۔

انھیں اپنی ساری اولاد سے پیار تھا، لیکن پہلا بیٹا اور پہلی بہو ہونے کی وجہ سے ہمارے گھرانے سے بہت زیادہ محبت تھی۔ بڑی اولاد ہونے کی وجہ سے ابا جی کی تیسری اور چوتھی پشت بھی ہمارے گھر سے شروع ہوئی۔ جب عمار کی شادی ہوئی تو ابا جی اپنی طبیعت کی ناسازی کی وجہ سے شرکت نہ کر سکے، لیکن میں نے نیت کی تھی کہ عمار کے ہاں جو بھی اولاد ہوگی، اسے گھٹی ابا جی کے ہاتھ سے ہی دلانی ہے، کیونکہ عمار کو بھی گھٹی ابا جی نے ہی دی تھی۔ اللہ تعالیٰ نے میری یہ خواہش پوری کی۔ جب ہمارا پہلا پوتا طلال پیدا ہوا تو راشدی صاحب اس وقت برطانیہ میں تھے۔ میں لیڈی ڈاکٹر سے اجازت لے کر نومولود کو لے کر سیدھی گکھڑ گئی۔ ابا جی کے کمرے میں داخل ہوئی تو وہ لیٹے ہوئے تھے۔ انھوں نے پوچھا کہ یہ کیا ہے؟ میں نے کہا کہ آپ کی چوتھی نسل ہے۔ کہنے لگے، چوتھی نسل؟ میں نے کہا، ہاں۔ یہ آپ کا پڑپوتا اور عمار کا بیٹا ہے۔ ابا جی جلدی سے اٹھے اور ماشاء اللہ ماشاء اللہ کہتے ہوئے بچے کو اپنی گود میں لیا، پیار کیا اور کچھ پڑھ کر پھونکا۔ میں گھٹی ساتھ لے کر گئی تھی جو حاجی فیاض صاحب سے کہہ کر صوفی صاحب سے تیار کرائی گئی تھی۔ صوفی صاحب زم زم اور کھجور یا زم زم اور شہد میں تھوڑا سا اپنا لعاب شامل کر کے خاص گھٹی تیار کرتے تھے۔ میں نے کہا کہ یہ گھٹی صوفی صاحب سے بنوائی ہے، آپ اپنے مبارک ہاتھوں سے اس بچے کو دیں۔ ابا جی نے طلال کو گھٹی دی اور یہ طلال کی خوش قسمتی ہے کہ دو اتنے بڑے بزرگوں کے ہاتھوں اسے گھٹی ملی۔ میرا چھوٹا بیٹا عامر چھ سال سے امریکہ میں مقیم ہے۔ ابا جی اس کے بارے میں ہمیشہ سوال کرتے تھے کہ عامر نے کب آنا ہے؟ راشدی صاحب ہر جمعہ کو گکھڑ جاتے تو ان سے بھی یہی سوال کرتے کہ عامر نے کب آنا ہے؟ ایک دو دفعہ راشدی صاحب نے فون پر ابا جی کی عامر سے بات بھی کروائی۔ (عامر کو ابا جی کی وفات کی اطلاع اس سے اگلے دن ہوئی تو وہ بہت رنجیدہ تھا۔ کہنے لگا کہ میں بہت بدقسمت ہوں، میری عدم موجودگی میں دونوں دادا، نانا ابو اور پھوپھا جان (قاری خبیب احمد صاحبؒ) وفات پا گئے اور میں ان میں سے کسی کا بھی آخری دیدار نہ کر سکا۔)

ابا جی کو صحت کے زمانے میں بھی بچوں سے بہت پیار تھا، لیکن بیمار ہونے کے بعد تو بہت زیادہ پیار کرتے تھے۔ جو بھی پوتا یا نواسہ یا خاندان کا کوئی بھی بچہ ان کے پاس جاتا تو وہ اس کا ہاتھ منہ چومتے اور دعائیں دیتے تھے کہ اللہ تمہیں عالم بنائے، دین کی خدمت کرنے اور اکابر کے نقش قدم پر چلنے کی توفیق بخشے۔ بچوں سے پیار بھی بہت کرتے تھے اور ان کا خیال بھی

بہت رکھتے تھے۔ خصوصاً سردی کے موسم میں کوئی بچہ ان کے پاس جاتا تو وہ چیک کرتے کہ اس نے گرم ٹوپی اور جرابیں پہن رکھی ہیں یا نہیں۔ سب مائیں اس ڈر سے بہت خیال رکھتی تھیں کہ ابا جی ناراض ہوں گے۔ جب بچے ان کے پاس جاتے تو بڑی دلچسپی سے ان سے پوچھتے کہ کون سی کلاس میں پڑھتے ہو، کون سے اسکول میں پڑھتے ہو یا کتنے پارے یاد ہو گئے ہیں؟ بڑے شوق اور پیار سے ان سے چھوٹی چھوٹی باتیں اور سوالات پوچھتے تھے۔ ایک دفعہ ہم ان سے ملنے گئے تو ابا جی نے بڑے پوتے طلال سے پوچھا کہ تمہارا نام کیا ہے؟ اس نے کہا، طلال خان آفریدی تو ابا جی نے انگلی کے اشارے سے منع کیا کہ یہ غلط بات ہے، اپنی خاندانی نسبت تبدیل نہیں کرتے۔ ہم سواتی ہیں، آپ لوگ بچے کو بتائیں کہ ہم آفریدی نہیں ہیں۔ یہ گناہ کی بات ہے۔ میں نے کہا کہ ابا جی، کرکٹ کا ایک کھلاڑی ہے شاہد آفریدی، وہ طلال کو بہت پسند ہے، اس لیے یہ بھی اپنے نام کے ساتھ آفریدی لگا لیتا ہے۔ ابا جی نے کہا کہ یہ غلط بات ہے۔ پھر انھوں نے طلال سے کہلوایا کہ کہو طلال خان سواتی۔

دونوں بھائیوں کی بڑی خوش قسمتی تھی کہ اولاد اچھی، تعلیم یافتہ، فرماں بردار اور خدمت گزار ملی۔ ابا جی عام حالات میں وہ بہت مضبوط دل کے تھے، البتہ بیمار ہونے کے بعد پہلے تین چار سال تک تو کچھ حوصلے سے وقت گزارا، لیکن جب بیماری طویل ہو گئی تو بہت روتے تھے۔ جب بھی کوئی ملتا تو رو پڑتے تھے۔ ہم تسلی دیتے تو کہتے کہ میں اولاد کے لیے آزمائش بن گیا ہوں۔ ان کے بیمار ہونے کے تین یا چار سال بعد کی بات ہے، ایک بار ہم ان سے ملنے کے لیے گئے تو کہنے لگے کہ جب میں بیمار ہوا اور میری بیماری طویل ہو گئی تو مجھے دل میں یقین تھا کہ اب میری اولاد مجھے اٹھا کر کسی ہسپتال میں چھوڑ آئے گی۔ میں نے کہا کہ ابا جی، استغفر اللہ، آپ کی اولاد کوئی نافرمان اولاد ہے؟ یہ بات آپ نے سوچی بھی کیوں؟ آپ کا خون اور حق حلال کی کمائی سے پرورش پانے والی اولاد ایسا کیسے کر سکتی ہے؟ آپ نے اولاد کی اتنی اچھی تربیت کی ہے۔ ابا جی خاموش ہو گئے۔ پھر کہنے لگے کہ الحمد للہ، راشد نے میری بہت خدمت کی ہے۔ اولاد میں سب سے چھوٹا ہونے کی وجہ سے راشد سے بہت انس رکھتے تھے اور اسی کے پاس رہنا پسند کرتے تھے۔ فی الواقع بیماری کے آٹھ نو سال راشد اور اس کی فیملی نے ابا جی کی بہت خدمت کی ہے اور دن رات ابا جی کا خیال رکھا ہے۔ تمام بھائیوں میں سب سے زیادہ خدمت کا اعزاز راشد کو ہی حاصل ہے۔ پہلے وہ اکیلا ہی ان کی دیکھ بھال کی ذمہ داری انجام دیتا تھا، پھر جب بیماری طویل ہو گئی تو راشدی صاحب کی چھوٹی ہمشیرہ اور اس کی بچیاں بھی خدمت میں شریک ہو گئیں۔ وہ اکثر وہیں رہتی تھیں بلکہ چھوٹی ہمشیرہ نے اپنی ایک بچی کو مستقل طور پر ابا جی کی خدمت کے لیے مامور کر دیا تھا۔ خود بھی وہ دو چار دن کے بعد چکر لگا لیتی تھیں اور پھر کئی کئی دن کے لیے وہاں رہنا بھی پڑ جاتا، کیونکہ ابا جی کی طبیعت ایسی ہو چکی تھی کہ وہ چاہتے تھے کہ ہر وقت کوئی نہ کوئی ان کے پاس موجود رہے۔ تنہائی سے گھبراتے تھے، اس لیے کوئی کتاب یا اخبار سنتے رہتے تھے۔ ان کا جی چاہتا تھا کہ کوئی نہ کوئی میرے پاس موجود ہو، چاہے کوئی بچہ ہی کیوں نہ ہو۔

ادھر چچی صاحبہ نے بھی صوفی صاحب کی بے حد خدمت کی ہے۔ آخری عمر میں وہ تقریباً پندرہ سولہ سال بیمار رہے اور اس عرصے میں چچی نے ان کی اتنی خدمت کی ہے کہ خود بیمار ہو گئیں۔ ہر آدھ پون گھنٹے کے بعد ان کے کھانے کے لیے کچھ بنانا، وضو کرانا، نماز کی تیاری اور کپڑے تبدیل کرنا بہت صبر آزما کام ہے اور بہت کم بیویاں اپنے شوہر کی اتنی خدمت کر سکتی ہیں۔ اللہ تعالیٰ انھیں اس خدمت کا اجر دنیا اور آخرت میں عطا فرمائیں۔ ابا جی کی طرح صوفی صاحب کی اولاد نے بھی ان کی خدمت میں کوئی کمی نہیں کی، بلکہ جیسے ابا جی کی اولاد میں سب سے چھوٹے بیٹے اور سب سے چھوٹی بیٹی نے بہت خدمت کی،

اسی طرح صوفی صاحب کے چھوٹے بیٹے عرباض اور بیٹی نے بہت خدمت کی۔ انھیں نہلانا، کپڑے تبدیل کرنا، آخری ایام میں لیٹ لیٹ کر کمر پر بن جانے والے زخموں کی پٹی کی تبدیل کرنا، اور بالکل بچوں کی طرح بہلا کر انھیں جوس پلانا۔ وہ ضد کرتے تو عرباض کہتا کہ بس یہ آخری گھونٹ ہے۔ اسی طرح بہلاتے ہوئے انھیں کھلانا پلانا پڑتا۔ وہ اپنے مخصوص انداز میں "نہ کر" کہتے رہتے اور عرباض "اچھا جی" اور کبھی "بس" جیسے الفاظ کہہ کر اپنا کام کرتا رہتا۔ اسی طرح پوتے ان کے پاس بیٹھتے اور ان سے باتیں کرتے تو وہ خوش ہوتے تھے اور پوتے بھی ان کی دل لگی کے لیے ہنسنے ہنسانے کی باتیں کرتے رہتے تھے۔ صوفی صاحب بچوں کو روکنے ٹوکنے کے خلاف تھے اور پوتے پوتیاں جتنا چاہے شور کرتے، وہ برا نہیں مناتے تھے۔

دونوں بھائیوں کی اولاد کا آپس میں بھی بہت اچھا تعلق ہے اور ایک دوسرے کا ادب اور احترام کرتے ہیں، اور ایک دوسرے کی خوشی اور غم کو اپنی خوشی اور غم سمجھتے ہیں۔ اباجی کی طرح صوفی صاحب کے بچے بھی بڑے بھائی کو باپ کی جگہ دیتے ہیں اور ویسی ہی عزت سے پیش آتے ہیں۔

تین چار سال پہلے کا واقعہ ہے۔ میں اور راشدی صاحب گھر اباجی کی زیارت کے لیے گئے تو میری نظر اباجی کی لاٹھی پر پڑی جو ان کے کمرے میں لٹکی ہوئی تھی۔ میں نے اباجی سے تقاضا کیا کہ اپنی لاٹھی مجھے دے دیں۔ اباجی مجھے ایک پرانی سی لاٹھی دینے لگے تو میں نے کہا کہ نہیں، جو آپ کے استعمال میں رہی ہے، وہ لاٹھی لینی ہے۔ اباجی ہنس کر راشدی صاحب سے کہنے لگے کہ "ایہہ بڑی شے ای" (یہ بڑی چیز ہے)۔ پھر انھوں نے اپنے زیر استعمال لاٹھی مجھے دے دی جو میرے پاس بطور یادگار موجود ہے۔ اباجی کے آدھ درجن رومال، تہبند، ٹوپیاں اور دستی رومال ان کے کمرے میں پڑے ہوئے تھے اور کمرے سے ملحق ڈیوڑھی میں گھر والوں نے دھو کر اور استری کر کے رکھے ہوئے تھے۔ اباجی کے کرتے، صدریاں اور دوسرے بہت سے استعمال کے کپڑے وہاں تہہ لگا کر رکھے ہوئے تھے جو خواتین عقیدت مند اٹھا کر لے گئیں۔ اب بہت سے لوگ تقاضا کرتے ہیں کہ ہمیں یادگار کے طور پر اور برکت کے لیے کوئی ٹوپی یا رومال دے دیں، لیکن گھر میں کچھ بھی نہیں ہے۔

راشدی صاحب کے معمولات میں ہر جمعہ کے روز گکھڑ حاضری دینا بھی تھا۔ وہ بتاتے ہیں کہ تین یا چار ماہ پہلے وہ اباجی سے ملنے گکھڑ گئے تو اباجی نے میرا ہاتھ تھام لیا اور کہا کہ میرا جنازہ تم نے خود پڑھانا ہے اور ساتھ ہی یہ بھی کہا کہ چھوٹے بہن بھائیوں کا خیال رکھنا اور ان کے سر پر ہاتھ رکھنا۔ میرا دل اندیشوں میں الجھ گیا کہ اباجی نے اس سے پہلے ایسی بات کبھی نہیں کہی تھی۔ راشدی صاحب نے یہ بات گھر آ کر مجھے بتائی تو مجھے کھٹکا سا لگ گیا کہ معلوم نہیں وہ اباجی کی اس وصیت کو پورا کر سکیں گے یا نہیں، کیونکہ وہ سال میں ایک آدھ سفر بیرون ملک کا بھی کرتے ہیں۔ لیکن اللہ تعالیٰ کا شکر ہے کہ اباجی کی وفات سے چار دن پہلے وہ برطانیہ اور سعودی عرب کے دورے سے واپس پہنچ گئے اور اگلے روز ہم جمعہ کے بعد سب گھر والے اباجی سے ملنے گکھڑ گئے۔ پہلے جب ہم ملنے جاتے تو اباجی نہ صرف سلام کا جواب دیتے بلکہ یہ بھی پوچھتے تھے کہ کون ہو؟ اور پھر فرداً فرداً سب کی خیریت معلوم کرتے، لیکن اس دفعہ ایسا نہیں ہوا۔ اباجی خاموش تھے اور کسی بات کا جواب نہیں دے رہے تھے۔ بس خاموشی سے ایک ایک کا چہرہ دیکھ رہے تھے۔ بچوں کو ان کے قریب کیا گیا تو پہلی سی گرم جوشی نہیں تھی۔ میں نے کھجوریں ان کی خدمت میں پیش کیں کہ راشدی صاحب عمرے کے لیے گئے تھے تو یہ لائے ہیں۔ انھوں نے دایاں ہاتھ اٹھا کر اشارہ کیا کہ میرے بائیں طرف سرہانے کے قریب رکھ دو۔ میں اباجی سے ملنے جاتی تو عام طور پر ان سے ان کی عمر کے

بارے میں ضرور پوچھتی۔ وہ ہمیشہ بڑی تفصیل سے جواب دیتے کہ میں عیسوی سنہ کے اعتبار سے اتنے سال کا اور ہجری سنہ کے لحاظ سے اتنے سال کا ہوں۔ لیکن آخری ملاقات میں، میں نے متعدد بار ان سے یہ سوال کیا تو انھوں نے جواب نہیں دیا، بس غور سے میرے چہرے کی طرف دیکھتے رہے۔ چھوٹی ہمشیرہ کہنے لگیں کہ کچھ دن سے اباجی بہت خاموش ہو گئے ہیں او ربات کا جواب نہیں دیتے اور کھانا بھی بہت کم کھاتے ہیں۔ بیماری کی وجہ سے ان کی خوراک ویسے بھی بہت کم ہو گئی تھی، لیکن آخری ایام میں تو خوراک بالکل مختصر ہو گئی تھی۔ میرا اندازہ یہ تھا کہ کھانا بالکل نہ ہونے کے برابر کھاتے ہیں جس کی وجہ سے کمزوری ہو گئی ہے اور انھیں بات کرنے میں دشواری محسوس ہوتی ہے، چنانچہ میں نے چھوٹی ہمشیرہ سے کہا کہ اگر یہ کھانا نہیں کھاتے تو انھیں جوس یا دودھ یا کوئی لیکوڈ چیز دے دیا کریں تا کہ ان کو نقاہت تو نہ ہو۔ ہمشیرہ نے کہا کہ لیکوڈ بھی موڈ ہو تو پیتے ہیں، ورنہ انکار کر دیتے ہیں۔ اس دن رخصت ہوتے وقت ہم سب اباجی کی زیارت کر کے اور ان کے ہاتھ پر بوسہ دے کر واپس آئے۔ ہم میں سے کسی کو یہ اندازہ نہیں تھا کہ ہمارے لیے دعاؤں کا یہ دروازہ اب بند ہونے والا ہے۔

پیر اور منگل کی درمیانی شب کو رات ایک بجے کے قریب راشدی صاحب کو گکھڑ سے فون آیا۔ میں نیند میں تھی۔ راشدی صاحب کی ہیلو کی آواز سے میں ہڑبڑا کر اٹھ گئی۔ راشدی صاحب نے فون کانوں کے ساتھ لگایا ہوا تھا اور انا للہ وانا الیہ راجعون کا ورد کر رہے تھے۔ فون بند کر کے انھوں نے مجھے بتایا کہ اباجی فوت ہو گئے ہیں۔ شدت غم سے ان کی آواز بھرائی ہوئی تھی اور ہاتھ کانپ رہے تھے۔ یہ اتنا شدید جھٹکا تھا کہ لگتا تھا آسمان زمین پر گر پڑا ہے۔ سال بھر پہلے میرے والد صاحب کا انتقال ہوا تو اس وقت بھی اتنا شدید صدمہ نہیں ہوا تھا۔ شاید دل کو یہ تسلی تھی کہ اباجی کا سایہ تو ہمارے سروں پر قائم ہے۔ نہ چاہنے کے باوجود میری چیخیں نکل گئیں۔ راشدی صاحب نے کہا کہ حوصلے، صبر اور ہمت سے کام لینا ہے۔ ہم نے عمار اور اس کی اہلیہ کو اٹھا کر یہ روح فرسا خبر سنائی۔ پھر طے پایا کہ ہم دونوں اسی وقت گکھڑ جائیں گے جبکہ عمار اور اس کے بچے صبح آ جائیں گے۔ گکھڑ پہنچے تو قاری حماد صاحب، پیر عابد صاحب اور شاہد صاحب صحن میں ہی موجود تھے۔ انھیں دیکھ کر مجھے لگا کہ شدت غم سے دل پھٹ جائے گا۔ یہ خیال ہی سوہان روح تھا کہ اب ہم یتیم ہو گئے ہیں۔ میرے پاس انھیں تسلی دینے کے لیے الفاظ نہیں تھے۔ سب گھر والے گھر میں موجود تھے، لیکن اس شدت کا سناٹا تھا کہ گھر بالکل ویران لگتا تھا۔ گرتے پڑتے اباجی کے کمرے میں پہنچے۔ اباجی وہاں موجود تھے، لیکن ان کی مخصوص "کون ہے" کی آواز نہیں تھی۔ کمرے میں گھر کی خواتین کے علاوہ ہمسایوں کی خواتین بھی موجود تھیں۔ وہ ہمیں دیکھ کر رونے لگیں۔ اباجی کے گھر کے بالکل ساتھ والے گھر کے ساتھ ہمارا بے حد قریبی تعلق ہے۔ وہ کم عمری میں ہی باپ کے سایہ شفقت سے محروم ہو گئے تھے اباجی نے ان کا بہت خیال رکھا۔ وہ سب بھی ہماری طرح اباجی کو اباجی ہی کہتے تھے۔ روتے ہوئے اباجی کی میت کے پاس پہنچے اور ان کے ماتھے کا بوسہ لیا تو یقین کیجیے، یوں لگتا تھا جیسے چارپائی پر کوئی فرشتہ یا معصوم بچہ لیٹا ہوا ہے۔ لگتا تھا کہ اباجی ہر طرح کی پریشانیوں سے بے نیاز سو رہے ہیں، ابھی اٹھ جائیں گے اور پوچھیں گے کہ یہ کون رو رہا ہے۔ پھر کہیں گے کہ اونچی آواز نہ نکالیں، آواز کے ساتھ رونا منع ہے۔

اباجی کے پاس ان کی چھوٹی بیٹی بیٹھی ہوئی تھی۔ میں نے اس سے پوچھا کہ کیا اباجی کی طبیعت زیادہ خراب ہو گئی تھی؟ اس نے بتایا کہ ہمیں تو بالکل اندازہ ہی نہیں ہوا۔ آخر وقت تک اباجی ہمارے ساتھ باتیں کرتے رہے۔ گیارہ بجے تک سب بیٹے اور بہوویں اباجی کے پاس بیٹھے باتیں کر رہے تھے۔ پھر باری باری سب اٹھ کر سونے کے لیے اپنے اپنے کمروں میں چلے گئے

تو میں بھی ابا جی کی چارپائی کے ساتھ نیچے لیٹ گئی۔ ابھی میں جاگ رہی تھی کہ ابا جی نے مجھے نام لے کر پکارا۔ میں نے جی ابا جی کہا تو کہا کہ پتر، مجھے لٹا دو۔ میں نے کہا کہ ابا جی، آپ لیٹے ہوئے ہیں۔ کہنے لگے کہ نہیں، مجھے لٹا دو۔ میں نے ابا جی کے کندھوں پر ہاتھ پھیرا، ان کی ٹانگیں درست کیں اور کہا کہ میں نے آپ کو لٹا دیا ہے۔ ابا جی خاموش ہو گئے۔ اس کے بعد پھر مجھے آواز دی اور میں نے جی ابا جی کہا تو کہا کہ مجھے لٹا دو۔ میں نے سرہانے کو ٹھیک کیا اور ابا جی کے جسم کو تھوڑا سا ہلایا اور پوچھا کہ اب ٹھیک ہے؟ ابا جی نے کہا ہاں۔ میں دوبارہ لیٹ گئی۔ پھر ابا جی نے تیسری دفعہ آواز دی تو میں نے کہا جی ابا جی۔ کہا کہ میری ٹانگیں سیدھی کرو۔ میں نے ٹانگیں درست کیں تو تھوڑی دیر کے بعد کہنے لگے کہ مجھے اٹھا کر بٹھا دو۔ میں نے جا کر بھائیوں کو بلایا اور انھوں نے آ کر ابا جی کو اٹھا کر بٹھا دیا اور دودھ یا جوس کا ایک گھونٹ ان کو پلایا۔ کچھ دیر کے بعد ابا جی نے قے کر دی جس میں خون کی آمیزش تھی۔ اس وقت بھی ہوش وحواس میں تھے۔ ہم نے ان کو دوبارہ لٹا دیا۔ تھوڑی دیر کے بعد ابا جی نے میری بیٹی اور اپنی نواسی اقرا کو پکارا اور آنکھیں کھول کر غور سے کمرے کی چھت کو دیکھا۔ اس کے بعد ہماری طرف دیکھا اور آنکھیں بند کر لیں۔ اس وقت تک بھی ہمیں بالکل اندازہ نہ تھا کہ یہ ابا جی کا آخری وقت ہے۔ چھوٹی ہمشیرہ نے بتایا کہ ابا جی کا سر میری گود میں تھا اور پھر ایک طرف ڈھلک گیا۔ بالکل یقین نہیں آتا تھا کہ یہ کیا ہو گیا ہے اور ابا جی ہمارا ساتھ چھوڑ گئے ہیں۔

صبح فجر کے وقت وفات کا اعلان ہوا تو سب خواتین کی چیخیں نکل گئیں۔ اعلان کے کچھ دیر بعد لوگوں کی آمد شروع ہو گئی۔ دن چڑھا تو خواتین کا بہت زیادہ ہجوم ہو گیا۔ ایک بجے کے قریب ابا جی کو غسل کے لیے لے جایا گیا۔ ابا جی کے کمرے کے ساتھ متصل ایک ڈیوڑھی تھی جو عام آمد ورفت کے لیے استعمال نہیں ہوتی تھی۔ وہاں ایک ٹونٹی بھی لگی ہوئی تھی۔ ساری زندگی ابا جی نماز اور تلاوت کے لیے وہیں وضو کیا کرتے تھے۔ ابا جی کو غسل دیا جا چکا تو ان کی چارپائی زیارت کے لیے ان کے کمرے میں ہی رکھ دی گئی۔ خواتین کا بے پناہ ہجوم تھا اور سب ہی چہرہ دیکھنے کے لیے بہت بے تاب تھیں۔ ہر کسی کو فکر تھی کہ کہیں میں محروم نہ رہ جاؤں۔ دھکم پیل میں خاصی بدنظمی بھی پیدا ہو گئی۔ ایک معمر خاتون نے میری ٹھوڑی کو ہاتھ لگا کر کہا کہ پتر، تم نے تو جی بھر کر چہرہ دیکھ لیا ہے، میری تو ٹانگیں قبر میں ہیں، مجھے ایک دفعہ قریب جا کر چارپائی کو ہاتھ لگا لینے دو، شاید اسی سے میری بخشش ہو جائے۔ مجھے اس خاتون پر ترس آ گیا اور میں نے انھیں چارپائی کے قریب جانے دیا۔ انھوں نے کفن کو ہاتھ لگا کر اپنے منہ پر اور اپنے جسم پر پھیرا اور کہا، ربا مجھے بخش دے۔ میں اس قدر عقیدت دیکھ کر حیران رہ گئی۔

غسل دینے سے ابا جی پر اس قدر روپ آ گیا تھا کہ مثال دینا مشکل ہے۔ ابا جی کی رنگت ویسے گندمی تھی، لیکن وفات کے بعد اتنے سفید اور صحت مند لگ رہے تھے کہ بالکل تازہ گلاب کا گمان ہوتا تھا۔ ابا جی بہت خوب صورت لگ رہے تھے اور سب ان کا چہرہ دیکھ کر ماشاء اللہ ماشاء اللہ کہہ رہے تھے۔ میں نے ابا جی کو الوداعی کلمات کہے اور کہا کہ ابا جی، ہمارا دل تو آپ کو رخصت کرنے پر آمادہ نہیں، لیکن آگے بھی اشدت سے آپ کا انتظار ہو رہا ہے۔ صوفی صاحب، دونوں امیاں، بھائی ماجد اور ان کے دونوں بیٹے اکرم اور اکمل آپ کے لیے پھولوں کی چادر لیے استقبال کو بے تاب ہوں گے۔ ہماری طرف سے امیوں کو اور سب عزیزوں کو سلام کہہ دیجیے گا۔ اس وقت ہر طرف سے یہی آوازیں آ رہی تھیں کہ ابا جی، ہم یتیم ہو گئے، مولوی صاحب ہم یتیم ہو گئے، اب گکھڑ ویران ہو گیا، اب ہمارا گکھڑ میں کیا کام! چچی صاحبہ بھی رو رہی تھیں اور کہہ رہی تھیں کہ مولوی صاحب! صوفی صاحب کے بعد ہمیں آپ کا سہارا تھا، اب آپ بھی اپنے بھائی کے پاس جا رہے ہیں۔ انھیں ہماری طرف سے سلام

کہیے گا۔ چچی بہت مضبوط دل کی ہیں اور ہر مشکل کا حوصلے سے سامنا کرتی ہیں۔ میں نے زندگی میں پہلی بار ان کو اتنا روتے ہوئے دیکھا۔ تین ساڑھے تین بجے ابا جی کی چارپائی اٹھا لی گئی اور ہم آہ وزاری کرتے ہوئے ابا جی کی چارپائی کو رخصت کر کے خالی دامن رہ گئے۔

یہ تمام یادیں میری زندگی کا سرمایہ ہیں۔ اب بھی جب گکھڑ جاتی ہوں تو امی مرحومہ کے ساتھ مل کر کام کرنے، برتن دھونے، صفائیاں کرنے، صحن میں کھانا لگانے اور گھر کے دوسرے سارے کاموں کا منظر آنکھوں کے سامنے آ جاتا ہے، بلکہ خواب میں بھی اکثر وہ جگہیں دکھائی دیتی ہیں جہاں بڑی امی سب کو کھانا ڈال کر دیتی تھیں اور جہاں چھوٹی امی کے ساتھ مل کر میں گھر کے کام انجام دیا کرتی تھی۔ اللہ کا شکر ہے کہ سب دیور دیورانیاں بہت عزت کرتے ہیں اور اس پر بھی اللہ کا جتنا شکر کروں کم ہے کہ اللہ نے اتنی عزت بخشی اور اس خاندان میں اتنا احترام اور چاہت ملی۔ یہ سب بزرگوں کی خدمت کرنے اور ان کی دعائیں حاصل کرنے سے ہوا۔ میرے والد صاحب ڈاکٹر محمد دین سب کے سامنے اس بات پر ہمیشہ فخر کرتے تھے کہ میری بچی راشدی صاحب کے گھر میں ہے اور اسے اتنے بڑے علمی گھرانے کے ساتھ نسبت ہے۔ کبھی کبھی ہنس کر کہتے کہ یہ سب اس کھوتی کا کمال ہے جس سے تم گری تھیں اور جو تمہارے وہاں جانے کا ذریعہ بنی۔ ایک بار چھوٹی امی نے راشدی صاحب سے کہا کہ زاہد! اللہ تعالیٰ نے تمہیں اتنی عزت اور اتنی شہرت دے گا جس کا تم تصور بھی نہیں کر سکتے تھے۔ یہ انھی دعاؤں کا ثمرہ ہے کہ آج راشدی صاحب ابا جی کی مسند پر بیٹھ کر، جہاں ابا جی نے نصف صدی تک درس دیا، بخاری شریف پڑھاتے ہیں۔ ابا جی نے وصیت فرمائی تھی کہ میرا جنازہ زاہد پڑھائے گا، یعنی انھوں نے اپنی دستار اپنے بڑے بیٹے کے سر پر رکھ دی اور انھیں اپنے بعد خاندان کا سرپرست مقرر کیا کہ یہ اپنے چھوٹے بہن بھائیوں کا خیال رکھیں گے۔ ہمارے لیے یہ بڑی خوش بختی اور فخر واعزاز کی بات ہے۔

ابا جی کے ساتھ گزرے ہوئے وقت کی چند جھلکیاں صفحہ قرطاس پر منتقل کرنے کی یہ ایک حقیر سی کوشش تھی۔ اللہ تعالیٰ ان کو کروٹ کروٹ جنت نصیب فرمائے اور ان کی اولاد نے ان کی جو خدمت کی ہے، اس کے طفیل اللہ سب کی بخشش فرمائیں۔

بدلا نہ میرے بعد بھی موضوعِ گفتگو
میں جا چکا ہوں پھر بھی تری محفلوں میں ہوں

میرے والد صاحب، ڈاکٹر محمد دینؒ

ہمارے خاندان کے تین بزرگ، ابا جی، صوفی صاحب اور میرے والد صاحب، تیرہ ماہ کے مختصر عرصے میں ہم سے رخصت ہوئے۔ گزشتہ سال ۹ر اپریل کو صوفی صاحب کی وفات کے تین دن بعد بیاسی برس کی عمر میں میرے والد صاحب کا بھی انتقال ہو گیا۔ ابا جی پہلے سمدھی ہونے کے ناتے سے والد صاحب کی بہت عزت کرتے تھے۔ ان کی وفات کے بعد جب میں گکھڑ گئی تو ابا جی نے تعزیت کرتے ہوئے کہا کہ ڈاکٹر صاحب بہت نیک اور تہجد گزار تھے اور ہمارا آپس میں بہت اچھا وقت گزرا۔ ابا جی نے کہا کہ کل کی بات لگتی ہے جب ہم زاہد کی بارات لے کر گئے تھے۔ بڈھیاں (ابا جی کی بیویاں) بہت پریشان تھیں کہ غیر لوگ ہیں، گاؤں میں ہے، نجانے کیسا رویہ ہو گا، لیکن جب بارات واپس آئی تو سب نے بہت مبارک دی کہ مہمانوں کے لیے بہت اچھا انتظام تھا۔ کھانا دیسی گھی میں تیار کیا گیا تھا اور ساتھ پھل اور دہی بھی تھا۔ سب

باراتی بہت خوش تھے۔ مجھے حیرت ہوئی کہ اتنی پرانی بات بھی اباجی کو یاد ہے۔

جب سے میں نے ہوش سنبھالا، والد صاحب کی کالی ڈاڑھی نہیں دیکھی۔ سفید، گھنی اور لمبی ڈاڑھی تھی۔ کم سے کم ایک فٹ لمبی ہوگی۔ آخر میں کچھ کم ہو گئی تھی، لیکن پھر بھی آٹھ نو انچ ضرور ہوگی۔ دوسرے ان کو ہمیشہ دھان پان سا دیکھا۔ وہ کہتے تھے کہ میرا وزن کبھی چالیس کلو سے نہیں بڑھا، لیکن وہ بے حد چست اور پھرتیلے تھے۔ گھر کے بہت سے کام پیدل ہی چل کر انجام دیتے۔ گلیانہ میں اڈہ گھر سے خاصا دور تھا۔ سودا سلف وہاں سے لانا پڑتا تھا۔ پچھتر سال کی عمر تک سائیکل پر جاتے تھے، اس کے بعد پیدل جانا شروع کر دیا۔

اباجی اپنے بچپن اور یتیمی کے بہت سے واقعات سناتے تھے۔ بتاتے تھے کہ مولانا سرفراز صاحب اور صوفی صاحب کی طرح میرا بچپن بھی یتیمی میں گزرا، البتہ میرے حالات یوں مختلف تھے کہ میری والدہ اور سوتیلی پھوپھی کا وٹہ سٹہ تھا۔ میری پھوپھی کی، ماموں کے ساتھ نہ بنی تو میری والدہ کو بھی گھر والوں نے روک لیا۔ کہتے تھے کہ میں اپنی والدہ کے ساتھ تھا اور مجھے اپنے والد کا چہرہ بھی یاد نہیں تھا۔ والد صاحب نے بہت کوشش کی کہ میری والدہ واپس آ جائیں لیکن میرے ننھیال والے نہ مانے۔ ایک آدھ مرتبہ والد نے چوری چوری ملنے کی کوشش کی تو ماموؤں نے مار کٹائی کر کے نکال دیا۔ جب میں آٹھ نو سال کا ہوا تو ننھیال والوں کو خطرہ محسوس ہوا کہ کہیں یہ اپنے والد سے ملنے نہ چلا جائے یا ان کے پاس ہی نہ چلا جائے۔ اس ڈر سے وہ مجھے لاہور میں یتیم خانہ میں چھوڑ آئے۔ میری والدہ ایسا نہیں چاہتی تھیں، مگر ان کی بات نہیں چلتی تھی۔ (البتہ میری والدہ نے مجھے تمام حالات سے آگاہ کر رکھا تھا)۔ میں نے یتیم خانہ میں ہی قرآن پاک بھی پڑھا اور اسکول کی تعلیم بھی وہیں حاصل کی۔ وہاں لڑکوں کا ایک گروپ ایسا تھا جسے موسیقی سے بہت دلچسپی بھی تھی۔ میں بھی ان میں شامل تھا۔ ہم مختلف گانے گاتے اور مختلف گلوکاروں کی نقلیں اتارتے تھے۔ میری آواز زیادہ اچھی تھی۔ وہیں ایک صاحب تھے جو ہمیں کہتے کہ تمہاری آواز اچھی ہے، تم نعتیں پڑھا کرو۔ وہ ہمیں نماز کی تلقین بھی کیا کرتے تھے۔ باقی لڑکوں نے تو نہیں، لیکن میں نے نعتیں بھی پڑھنا شروع کر دیں اور انھی صاحب سے نماز بھی یاد کی اور نماز کی ادائیگی پابندی سے شروع کر دی۔ بتاتے تھے کہ پہلی نعت جو میں نے پڑھی، وہ یہ تھی:

میں سو جاؤں یا مصطفیٰ کہتے کہتے
کھلے آنکھ صل علیٰ کہتے کہتے

اباجی نے مجھے یہ نعت پوری سنائی اور کہا کہ یہ نعت میں نے چودہ پندرہ سال کی عمر میں پڑھی تھی، اب اکیاسی سال کی عمر میں بھی مجھے یاد ہے۔

اباجی نے بتایا کہ جب میں سولہ سترہ سال کا تھا تو میرے والد بیمار ہو گئے۔ پہلے پہل تو ان کو معلوم نہ تھا کہ میں یتیم خانے میں ہوں۔ پھر جب معلوم ہوا تو میرے ننھیال والوں کو علم ہوئے بغیر کسی کو بھیج کر مجھے بلوا لیا۔ اسی طرح میں دو تین بار اپنے والد صاحب سے ملنے گیا اور وہ کسی کے ہاتھ مجھے کچھ خرچہ وغیرہ بھی بھجوانے لگے۔ ننھیال والوں کو ان سب باتوں کا علم نہیں تھا۔ پھر ایک مرتبہ والد صاحب نے آدمی بھیجا اور اس نے کہا کہ چلو، تمہارے والد صاحب بہت بیمار ہیں۔ میں گیا تو واقعی والد صاحب بیمار اور کافی کمزور تھے۔ انھوں نے کہا کہ بیٹا، میں نے تمہیں اس لیے بلوایا ہے کہ تمہاری ایک امانت میرے پاس ہے، وہ میں

تمہارے سپرد کرنا چاہتا ہوں۔ میری کافی جائیداد زمینوں کی صورت میں ہے، اس کے تم اکیلے حق دار ہو۔ آج تک میں نے دوسری شادی بھی نہیں کی، کیونکہ میں نہیں چاہتا تھا کہ اس جائیداد کا کوئی اور وارث بنے۔ یہ تمہارا اور تمہاری ماں کا حق ہے او رتمہاری ماں کے بعد میں نے اپنے لیے دوسری عورت کو حرام سمجھا ہے۔ والد صاحب نے پٹواری اور اشتمال وغیرہ کا تمام انتظام کر رکھا تھا۔ اس طرح ساری جائیداد میرے نام منتقل ہو گئی اور کچھ عرصہ کے بعد والد صاحب وفات پا گئے۔ اباجی نے مجھے بتایا تھا کہ یہ کتنی جائیداد تھی، لیکن اب مجھے یاد نہیں۔

اباجی کہتے ہیں کہ والد صاحب نے مجھے نصیحت کرتے ہوئے یہ بھی کہا کہ بیٹا، اب تم نے حوصلے کے ساتھ مرد بن کر رشتہ داروں کا سامنا کرنا ہے۔ اب یہ تمہارا کچھ نہیں بگاڑ سکتے۔ تم اس دادا کے پوتے ہو کہ سکھوں کے دور میں ان کا ایک گھوڑا ہماری فصلوں میں گھس کر انھیں خراب کیا کرتا تھا۔ تمہارے دادا نے کئی مرتبہ سکھوں کو شکایت لیکن شنوائی نہ ہوئی۔ ایک دن تمہارے دادا اکیلے جا کر فصلوں میں کھڑے ہو گئے اور سکھوں کے گھوڑے کے کلے دونوں ہاتھوں کے انگوٹھوں کے ساتھ گلے تک چیر دیے۔ دادا کا قد آٹھ نو فٹ تھا۔

اباجی جن دنوں لاہور میں ہی تھے، رشتہ داروں نے والدہ کی دوسری شادی کر دی۔ ایک بھائی پیدا ہوا جو ماشاء اللہ حیات ہیں۔ کچھ عرصے کے بعد میرے سوتیلے والد کا انتقال ہو گیا۔ اباجی اور ان کے سوتیلے بھائی کی آپس میں بالکل سگے بھائیوں جیسی محبت تھی۔ بتاتے تھے کہ جب میں تعلیم مکمل کر کے واپس آیا تو اس دوران میں میرے سوتیلے والد کی بھابھی بھی وفات پا گئی تھیں، چنانچہ گھر والوں نے میری والدہ کی شادی دیور کے ساتھ کر دی تاکہ وہ سسرال میں ہی رہے۔ میری والدہ کی چار بیٹیاں پیدا ہوئیں جن کی سرپرستی زیادہ تر میں نے ہی کی اور ان کی شادیاں بھی میں نے کیں۔ زمینوں کی دیکھ بھال میری والدہ اور سوتیلے دادا کیا کرتے تھے۔ میں جہاں تعیناتی ہوتی، وہاں چلا جاتا۔ میری عدم موجودگی میں والدہ صاحبہ، جن کو سب بے جی کہتے تھے، گلیانہ میں رہتی تھیں۔ سوتیلے والد اور بے جی مل کر زمین کی دیکھ بھال کرتے تھے اور کاشت کاری کرتے تھے۔ دادا جی کھیتی باڑی خود کرتے تھے۔ زمین سے گھاس خود کاٹ کر لاتے تھے۔ گھر میں بھی مشین پر خود ہی گھاس کاٹتے۔ ہمارے گھر کا صحن گائے، بھینس، بکری، گھوڑا، بیل وغیرہ مختلف جانوروں سے بھرا ہوتا تھا۔ ہماری مویشیوں والی حویلی تقریباً ۲۳ مرلے کی تھی جو بھری ہوئی ہوتی تھی۔

اسی عرصہ میں والد صاحب کی شادی میری خالہ کے خاندان میں ہو گئی۔ خالہ اباجی کی ممانی بھی لگتی تھیں۔ انھوں نے اپنی نند کے بیٹے یعنی اباجی کی شادی اپنی ہمشیرہ کے ساتھ کرائی۔ والد صاحب کئی پشتوں سے اکلوتے چلے آ رہے تھے، لیکن اللہ کے فضل سے ہم دس بھائی بہن ہوئے۔ چھ بھائی اور چار بہنیں۔ دادا اور دادی نے تقریباً سو سال کی عمر پائی۔ دادی کی وفات کو نو سال جبکہ دادا جی کی وفات کو چار سال ہو چکے ہیں۔ دادی تقریباً پانچ سال تک بستر علالت پر رہیں اور آخر عمر میں ان کی بینائی بھی جاتی رہی تھی۔ اباجی نے اپنی والدہ کی بہت زیادہ خدمت کی۔ بچوں کی طرح ان کا خیال رکھتے تھے، حتیٰ کہ جب وہ چارپائی سے اترنے لگتیں تو انھیں جوتے خود پہناتے تھے۔ بے جی کا وجود بہت ہلکا پھلکا تھا اور اباجی اپنے ہاتھوں پر اٹھا کر انھیں ایک چارپائی سے دوسری چارپائی پر منتقل کرتے تھے۔ سردیوں میں دھوپ میں بٹھاتے، خود چمچ سے دوا پلاتے اور وہ ضد کرتیں تو انھیں بچوں کی طرح بہلاتے تھے۔ کھانا بھی خود کھلاتے تھے کیونکہ بے جی کسی اور سے کھانا نہیں کھاتی تھیں۔ کہتی

تھیں، محمد دینا آئے گا تو کھاؤں گا۔ وہ اباجی کو محمد دینا ہی کہتی تھیں۔ اللہ تعالیٰ نے اسی خدمت کا صلہ اباجی کو یہ دیا کہ خود ان کے آخری وقت میں جب انھیں بہت زیادہ تکلیف تھی، بیٹوں اور بہوؤں نے ان کی بہت خدمت کی۔ کمزوری کی وجہ سے ابا جی جسم بہت دبواتے تھے اور میرے بھائی، اللہ ان کو جزائے خیر دے، گھنٹوں تک والد صاحب کو دباتے رہتے تھے۔

وہ باقاعدہ عالم تو نہیں تھے، لیکن مطالعہ بہت کرتے تھے۔ حدیث کی کتابیں بہت شوق سے پڑھتے تھے اور فقہ میں بھی بہت دلچسپی رکھتے تھے۔ مسائل پر بات چیت اور بحث ومباحثہ گھنٹوں تک کر سکتے تھے اور مخاطب کو لاجواب کر دیتے تھے۔ مولانا احمد علی لاہوریؒ سے بیعت تھے۔ میں ذکر کر چکی ہوں کہ مولانا نذیر اللہ خان اباجی کے پیر بھائی تھے اور تیس پینتیس برس تک اباجی کا یہ معمول رہا کہ وہ ڈیوٹی کے سلسلے میں پاکستان کے جس کونے میں بھی ہوتے، وہ جمعہ گجرات میں مولانا نذیر اللہ خان کے پیچھے ہی پڑھتے تھے۔ ان کے انتقال کے بعد کئی سال تک راشدی صاحب کے چھوٹے بھائی مولانا عبد الحق خان بشیر کے پیچھے گجرات میں ہی جمعہ پڑھتے رہے۔ مولانا لاہوری کی وفات کے بعد انھوں نے شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد زکریا صاحب سے بیعت کر لی۔ آخری عمر میں تقریباً ساڑھے برس بیمار رہے۔ اس سے پہلے تک وہ تقریباً پینتیس سال تک روزانہ معمولاً ذکر بالجہر کرتے رہے۔ ان کا معمول تھا کہ سحری کے وقت اٹھتے تو اشراق کے وقت تک جائے نماز پر ہی رہتے تھے۔ اس کے علاوہ مغرب سے عشا تک مختلف وظائف پڑھتے تھے۔ اپنے لیے انھوں نے روزانہ کئی ہزار تسبیحات مقرر کر رکھی تھیں جن کی وہ بے حد پابندی کرتے تھے۔ قرآن مجید کا تیسواں پارہ، انتیسویں پارے سے سورہ مزمل، سورہ قیامہ اور سورہ جن، اس کے علاوہ سورہ یٰس مکمل اور سورۂ بقرہ کے کچھ حصے انھیں زبانی یاد تھے اور قرآن کی تلاوت بہت سریلی آواز سے کرتے تھے۔

والدین کا آپس میں بہت پیار تھا اور خاندان میں اس کی مثال دی جاتی تھی۔ ان کی رفاقت کا عرصہ تقریباً تینتالیس سال بنتا ہے۔ تیرہ برس پہلے والدہ صاحبہ کا انتقال ہو گیا تو قدرتی طور پر والد صاحب بہت تنہائی محسوس کرتے تھے۔ بہن بھائی بھی سب شادی شدہ اور اپنے اپنے بکھیڑوں میں مصروف تھے، اس لیے انھوں نے اپنے آپ کو پڑھنے پڑھانے اور وظائف میں بہت زیادہ مصروف کر لیا۔ سات آٹھ سال پہلے تک کیفیت یہ تھی کہ سال میں شاید دو یا تین ماہ بغیر روزے کے گزرتے تھے، ورنہ ہر ماہ کے لیے انھوں نے اپنے لیے روزوں کی ایک مخصوص گنتی مقرر کر رکھی تھی، حتیٰ کہ جون اور جولائی میں بھی روزے رکھتے تھے۔ دین کی برکت اور ذکر اذکار کے ثمرات تھے کہ اللہ نے ان کو ہمت اور استقامت عطا فرمائی تھی اور وہ بہت کمزور جسم کے مالک ہونے کے باوجود اتنی کثرت سے روزے بھی رکھتے تھے اور ذکر اذکار اور عبادت کے معمولات بھی انجام دیتے تھے۔

ان کی خوراک بہت کم تھی۔ سبزی یا شوربے کے ساتھ ایک چپاتی صبح اور ایک شام کو لیتے تھے، البتہ دودھ پتی بہت پسند تھی۔ پھلوں میں آم پسند تھے۔ معمولات کی کثرت اور خوراک کی قلت کی وجہ سے ان کے پھیپھڑے اور جگر متاثر ہو گئے جس کی وجہ سے سانس بہت پھولتی تھی۔ خود ڈاکٹر ہونے کی وجہ سے پہلے پہل خود ہی اپنے لیے دوا تجویز کرتے رہے، لیکن افاقہ نہ ہوا تو ہومیو پیتھک اور چائنیز طریقہ علاج سے فائدہ اٹھایا۔ میرا ایک چھوٹا بھائی طبیب ہے، اس نے بھی علاج کیا لیکن جو بھی علاج شروع کیا جاتا، شروع میں کچھ دن اس سے افاقہ محسوس ہوتا لیکن پھر تکلیف بڑھ جاتی۔

ان کی وفات سے تقریباً ایک سال پہلے میں اور راشدی صاحب ان کی عیادت کے لیے گئے تو ہم نے اصرار کیا کہ آپ اتنے علاج کرا چکے ہیں، ایک دفعہ گوجرانوالہ آئیں۔ وہاں ایک بہت قابل ہومیو پیتھک معالج، ڈاکٹر جعفر امام ہوتے ہیں۔

ان سے علاج کرا کے دیکھیں۔ پہلے نہیں مانتے تھے، پھر بڑی مشکل سے آمادہ ہو گئے، لیکن ساتھ ہی یہ شرط لگا دی کہ میں آپ کے ہاں نہیں ٹھہروں گا، بلکہ سیدھا ڈاکٹر کے پاس جاؤں گا اور دوا لے کر واپس آ جاؤں گا۔ ہم نے کہا، ٹھیک ہے۔ جب وہ گوجرانوالہ آئے اور ڈاکٹر جعفر امام کے پاس گئے تو انھوں نے کہا کہ میرا علاج کرانے کے لیے ضروری ہے کہ آپ کچھ دن یہاں رکیں۔ مجبوراً انھوں نے رہنے کی ہامی بھر لی اور علاج کے لیے تقریباً دو ماہ ہمارے پاس رہے۔ علاج سے کافی افاقہ ہوا۔ بھوک پیاس جو پہلے بالکل ختم ہو گئی تھی، اب کچھ بہتر ہو گئی۔ سانس پھولنا کم ہو گیا بلکہ لاٹھی کے بغیر چلنے لگے۔ پھر جس دن ان کی واپسی تھی، اس دن خود نیچے مسجد میں جا کر جمعہ پڑھا اور خود سیڑھیاں اتر کر گاڑی میں بیٹھے۔ لیکن گلیانہ جانے کے بعد کچھ دن تک تو طبیعت بحال رہی، لیکن پھر دن بدن بیماری بگڑتی گئی اور وفات سے تین چار ماہ پہلے وہ بالکل چارپائی کے ہو کر رہ گئے۔ بیت الخلا بھی خود نہ جا سکتے تھے۔ وفات سے آٹھ دس دن پہلے تک اشاروں سے نماز ادا کرتے رہے۔

والد صاحب ہمیشہ اس بات پر بہت حیران ہوتے تھے کہ ہمارے گھر میں مہمان داری اور اخراجات کا جو سلسلہ ہے، وہ محدود تنخواہ میں کیسے چلتا ہے۔ پھر خود ہی راشدی صاحب کی طرف اشارہ کر کے کہتے کہ یہ ان کی برکت کی وجہ سے ہی ممکن ہے، کیونکہ یہ دین کی اتنی مخلصانہ خدمت کر رہے ہیں۔ کسی لالچ کے بغیر پبلک ٹرانسپورٹ میں دھکے کھاتے سفر کرتے ہیں اور ہر چھوٹی بڑی بستی میں پہنچتے ہیں۔ کہتے تھے کہ یہی دین کی اصل خدمت ہے کہ اپنے آرام کا خیال نہیں کرتے، گرمی سردی کے موسم کی پروا نہیں کرتے۔ ایک دفعہ راشدی صاحب گھر آئے تو گھٹنے سے شلوار پھٹی ہوئی تھی۔ گھٹنا بھی کچھ زخمی تھا اور لنگڑا کر چل رہے تھے۔ پوچھا تو بتایا کہ بس پر چڑھتے ہوئے ڈرائیور نے تیزی سے گاڑی چلا جس کی وجہ سے وہ گر گئے تھے۔ اباجی یہ سن کر بہت پریشان ہوئے تو میں نے کہا کہ اس سے پہلے بھی دو تین مرتبہ ایسا ہوا ہے اور ہم گھر والے ان کو بہت کہتے ہیں کہ اب شوگر کا عارضہ بھی ہے اور بلڈ پریشر بھی زیادہ رہتا ہے، اس لیے سفر کم کر دیں۔ یہ کہتے ہیں کہ مجبوری ہے۔ میں نے پہلے کی نسبت سفر بہت کم کر دیا ہے، لیکن بعض جگہوں پر نا نہیں کی جا سکتی اور جانا پڑتا ہے۔

اباجی بعد میں بھی روزانہ تقریباً دو تین بار اس بات کا ذکر کرتے تھے کہ یہ سفر والی صورت حال بہت پریشان کن ہے۔ راشدی صاحب سے بھی کہتے کہ اس کا کوئی بہتر انتظام ہونا چاہیے۔ راشدی صاحب کہتے کہ کوئی بات نہیں، میرے والد صاحب نے بھی دین کی خدمت اسی طرح کی ہے۔ وہ سائیکل اور تانگے اور بس پر بیٹھ کر دیہات میں دین کی تبلیغ کے لیے جاتے تھے اور ساری زندگی انھوں نے دین کی خدمت سہولتوں کے بغیر ہی کی ہے۔ اباجی کہتے تھے کہ اچھی گاڑیوں میں سفر کرنے والے علما بھی دین کی خدمت کرتے ہیں، لیکن اصل خدمت تو یہ لوگ کرتے ہیں جو اپنی ذات کی نفی کرتے ہوئے اپنے آپ کو فی سبیل اللہ وقف کیے ہوئے ہیں۔ اباجی کہتے تھے کہ اگر مجھے زندگی نے مہلت دی اور صحت ملی تو میں ان شاء اللہ ان کے لیے گاڑی کا انتظام کروں گا۔ مجھے ہمیشہ تلقین کرتے تھے کہ راشدی صاحب کی خوراک کا خصوصی خیال رکھا کرو، ان کی جسمانی اور دماغی مشقت بہت زیادہ ہے اور خوراک اس کے حساب سے کم ہے۔ میں کہتی کہ پہلے خوراک پھر بھی ٹھیک تھی، جب سے شوگر اور ہائی بلڈ پریشر ہوا ہے، بالکل سادہ غذا ہو گئی ہے اور گوشت تو بالکل چکھتے بھی نہیں۔ اباجی کہتے کہ زیادہ سفر اور بے آرامی کی وجہ سے یہ دونوں تکلیفیں انھیں لاحق ہوئی ہیں۔

والد صاحب راشدی صاحب کے ساتھ بیٹوں سے بھی زیادہ انس رکھتے تھے۔ کبھی انھیں تم کہہ کر نہیں بلاتے تھے اور

ہمیشہ احترام کرتے تھے۔ ان پر بہت فخر کرتے تھے اور لوگوں کو ان کے کالم پڑھ کر سناتے تھے کہ یہ بڑے عالم دین ہیں، عالم دین باپ کی نیک صالح اولاد ہیں اور میرے داماد ہیں۔ یہ بھی ذکر کرتے تھے کہ میری اپنے بیٹوں سے متعلق جو خواہش تھی، وہ اللہ تعالیٰ نے بیٹی کی طرف سے پوری کر دی۔ جب بھی ہمارا گلیانہ جانا ہوتا تو اباجی اپنے دوست احباب کو بلا لیتے کہ راشدی صاحب آ رہے ہیں۔ سب مل کر ان کے پاس بیٹھتے اور دیر تک ملکی حالات کے بارے میں آگاہی حاصل کرتے۔ جب تک صحت مند تھے، خود ان کے لیے اڈے سے جا کر ضرورت کی چیزیں لے کر آتے۔ اس قدر چاہت کرتے تھے کہ ان کو وضو کے لیے جوتے بھی خود لا کر دیتے۔ اگر لائٹ نہ ہوتی تو پمپ سے پانی بھی خود نکال کر دیتے۔ اگر کوئی اور ان کا کام کرنے لگتا تو روک دیتے اور کہتے کہ میں خود کروں گا۔

اباجی کو بہت شوق تھا کہ ان کی اولاد عالم بنے۔ چھ بھائیوں میں سے تین حافظ قرآن تو بنے لیکن عالم کوئی نہ بن سکا۔ اس لیے وہ راشدی صاحب سے بہت پیار کرتے تھے۔ مجھے کہتے تھے کہ تم بہت خوش قسمت ہو کہ تم خود بھی حافظ ہو، تمہارے سسر بہت بڑے عالم اور تمہارا میاں بھی حافظ عالم، تمہارے دونوں بیٹے حافظ، بڑا بیٹا عالم بھی ہے، تمہارا داماد بھی حافظ عالم ہے اور دونواسے اور بیٹی بھی دین کی خدمت کر رہے ہیں۔ اس وجہ سے میرے بچوں کو ددھیال کی طرح ننھیال سے بھی بہت پیار ملا۔ ددھیال میں پہلی اولاد ہونے کی وجہ سے اور ننھیال میں بھی یہ پہلی اولاد تھے، کیونکہ میرے بڑے بھائی کی شادی میری شادی کے بعد ہوئی جبکہ بڑی ہمشیرہ کی شادی تو مجھ سے پہلے ہو گئی تھی، لیکن بچے ان کی شادی کے سات سال بعد پیدا ہوئے۔ اس طرح ننھیال میں بھی میرے بچے ہی تیسری پشت کے پہلے بچے ہیں۔

والد صاحب کو گکھڑ والے اباجی اور صوفی صاحب کے ساتھ بہت عقیدت تھی۔ اکثر دعا مانگتے تھے کہ یا اللہ، میری زندگی میں ان دونوں بزرگوں کو کچھ نہ ہو اور میں اپنی زندگی میں ان کی وفات کی خبر نہ سنوں۔ ان کی دعا آدھی قبول ہوئی اور آدھی نہیں ہوئی۔ صوفی صاحب کی وفات ان سے تین دن قبل ہوئی اور جب انھیں بتایا گیا تو وہ غنودگی کی کیفیت میں تھے، صدمے کا اظہار بھی ٹھیک طرح سے نہ کر سکے۔ پھر ۹/ اپریل کو تقریباً ڈیڑھ بجے دوپہر گلیانہ سے فون آیا کہ اباجی کا انتقال ہو گیا ہے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ میری بھابھی نے بتایا کہ آخر وقت تک وہ ہوش میں رہے اور باتیں کرتے رہے۔ گھر کے ساتھ ہی ہسپتال ہے۔ کہنے لگے کہ مجھے ڈرپ لگواؤ جس پر گھر میں ہی ڈرپ لگوانے کا انتظام کیا گیا۔ کچھ دیر کے بعد ان کے کہنے پر ڈرپ اتار دی گئی اور میرے بھائی نے انھیں اٹھا کر بٹھا دیا۔ بھابھی ٹانگیں دبانے لگی تو اسے منع کر دیا۔ اسی وقت انھوں نے منہ میں کچھ پڑھا تو بھابھی نے اپنے میاں سے کہا کہ اباجی کو لٹا دو۔ ان کا سر ڈھلک گیا تھا اور بھابھی کو پتہ چل گیا تھا، لیکن بھائی یقین نہیں کر رہا تھا کہ اباجی کا انتقال ہو گیا ہے۔ پھر ڈاکٹر کو بلایا گیا تو اس نے موت کی تصدیق کر دی۔

والد صاحب دو باتوں کی ہمیشہ تلقین کرتے تھے۔ ایک یہ کہ مجھے غسل جلدی دے دینا اور دوسرا یہ کہ جب بھی مجھے موت آئے، مجھے رات نہ رکھنا اور تدفین جلدی کر دینا، چنانچہ ان کی وصیت کے مطابق ان کی تدفین رات کو ہی کر دی گئی۔

وفات سے کافی عرصہ پہلے انھوں نے اپنی جائیداد میں سے چار کنال زمین مسجد اور مدرسے کے لیے وقف کر دی۔ مسجد ابھی زیر تعمیر ہے جہاں پنج وقتہ نمازوں اور جمعہ کے علاوہ صبح کا درس اور بچوں کے لیے قرآن پاک کی تعلیم کا سلسلہ جاری ہے۔ یہ سب انتظام اباجی کی زندگی میں ہی ہو گیا تھا۔ اللہ تعالیٰ ان کے اس صدقہ جاریہ کو قبول فرمائے۔

محمد عمار خان ناصر*

اباجیؒ اور صوفی صاحبؒ

شخصیت اور فکر و مزاج کے چند نمایاں نقوش

میں چار سال کا تھا جب ہم گکھڑ سے گوجرانوالہ منتقل ہو گئے۔ اس کے بعد گکھڑ جانے کا موقع عام طور پر عید کے دنوں میں یا کسی دوسری خاص مناسبت سے پیدا ہوتا تھا۔ ابتدائی سالوں کی زیادہ باتیں یادداشت میں محفوظ نہیں ہیں، البتہ ایک آدھ واقعہ اب بھی ذہن کی اسکرین پر جھلملاتا ہے۔

دادا محترم، شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد سرفراز خان صفدرؒ کو گھر میں عام طور پر ''اباجی'' کہہ کر پکارا جاتا تھا اور ہم بچے بھی انھیں اسی نام سے یاد کرتے تھے۔ اباجی ہر جمعہ کے دن گھر کی چھت پر بیٹھ کر حجام سے سر منڈواتے اور اپنے اور گھر کے بچوں کے ناخن تراشتے تھے۔ انھوں نے اپنے پاس حاضر ہو کر ناخن ترشوانے والے بچوں کے لیے انعام کا بھی اعلان کر رکھا تھا اور مجھے کم سے کم ایک مرتبہ ان سے ناخن ترشوا کر ایک روپے کا بالکل نیا نوٹ انعام میں لینا یاد ہے۔ اسی عمر میں اباجی سے زندگی کا پہلا اور آخری تھپڑ کھانا بھی ذہن میں محفوظ ہے۔ اباجی کے کمرے کی کھڑکی جس گلی کی طرف کھلتی ہے، اس کے آگے ایک خاصا وسیع خالی پلاٹ ہے جو محلے کے بچوں کے لیے کھیل کے میدان کا کام دیتا ہے۔ پلاٹ کی دوسری طرف شیشم کے گھنے درخت کے نیچے ایک قبر تھی جہاں ''رحما ماچھی'' نام کا ایک ملنگ صبح صبح آ کر جھاڑو دیا کرتا اور اللہ ہو اللہ ہو کے نعرے بلند کیا کرتا تھا۔ اس کے بارے میں مشہور تھا کہ اس کے پاس جن ہیں، چنانچہ ہم بچے تجسس سے اس کے مخصوص وقت پر گلی میں جا کر کھڑے ہو جاتے تھے اور اس کی آوازیں سنا کرتے تھے۔ ایک دفعہ کچھ شرارتی بچوں نے ذرا قریب جا کر اس کو چھیڑا اور شاید کچھ بدتمیزی کی جس پر وہ ناراض ہو کر بچوں کے پیچھے ہو لیا۔ باقی بچے تو بھاگ کر ادھر ادھر چلے گئے، لیکن میں گھر میں داخل ہو کر اباجی کے کمرے میں چلا گیا تاکہ کھڑکی سے دیکھ سکوں کہ رحما ماچھی کیا کرتا ہے۔ وہ سیدھا اباجی کے کمرے کی کھڑکی کے پاس آیا اور آ کر اباجی کو شکایت کی کہ ان بچوں نے مجھے گالیاں دی ہیں۔ اباجی کو اس پر غصہ آیا اور چونکہ اس سے ذرا پہلے میں ہی بھاگتا ہوا آ کر کھڑکی کے پاس کھڑا ہوا تھا، اس لیے انھوں نے مجھے شریک جرم سمجھتے ہوئے ایک خاصا وزنی تھپڑ میرے منہ پر جڑ دیا۔

جب وہ اپنے کمرے میں بستر پر لیٹے ہوتے تو بچے اور نوجوان مختلف اوقات میں ان کے پاس جا کر ان کا جسم اور ٹانگیں دبانے کو سعادت سمجھتے تھے۔ ان کا جسم مضبوط اور گٹھا ہوا تھا اور وہ عام طور پر بچوں سے مزاح کے انداز میں کہتے تھے کہ ذرا زور لگاؤ۔ چچا زاد اور پھوپھی زاد بہن بھائی ان کے پاس اکٹھے جاتے تو وہ عام طور پر دل لگی کرتے ہوئے یہ ضرور پوچھتے تھے کہ تم میں سے 'لالہ' (بڑا بھائی) کون ہے؟ اگر لڑکا اور لڑکی ہوتے تو پوچھتے کہ تم 'لالہ' ہو یا یہ 'ددے' (بڑی بہن) ہے؟

* فرزند شیخ الحدیث مولانا زاہد الراشدی۔ ڈپٹی ڈائریکٹر الشریعہ اکادمی گوجرانوالہ

ان کے دبدبے اور احترام کی کیفیت بھی بچپن سے ہی ذہن پر نقش ہے۔ والدہ بتاتی ہیں کہ گکھڑ میں جب وہ دوپہر کے وقت آرام کر رہے ہوتے تھے تو گھر کی خواتین ساری دوپہر باہر صحن سے پرندوں کو اڑانے میں مصروف رہتی تھیں کہ کہیں ان کی آوازوں سے اباجی کی نیند خراب نہ ہو۔ مجھے یاد ہے کہ بچپن میں جب ہم بچے کھیلتے ہوئے کسی وقت دوسری منزل پر اباجی کے کمرے کے اوپر بنے ہوئے کمرے میں چلے جاتے تو دادی محترمہ یا گھر کا کوئی نہ کوئی فرد فوراً پیچھے پہنچ جاتا کہ چھت پر اچھلنے کودنے کی آوازیں نیچے اباجی کے آرام میں خلل پیدا نہ کریں۔ گھر کے افراد کبھی ان کے سامنے ننگے سر نہیں جاتے تھے، بلکہ والدہ بیان کرتی ہیں کہ ایک دن والد گرامی عشا کے بعد سونے کے کپڑوں میں بستر پر لیٹے ہوئے تھے کہ اتنے میں سرہانے رکھے ہوئے ٹیلی فون کی گھنٹی بجی۔ والد گرامی نے فون اٹھایا اور السلام علیکم کہتے ہی ایک دم اٹھ کر بیٹھ گئے اور بے اختیار پاس رکھی ہوئی ٹوپی اٹھا کر سر پر رکھ لی۔ پتہ چلا کہ اباجی کا فون تھا۔ خاندان کے بزرگ بتاتے ہیں کہ ڈاڑھی کے معاملے میں وہ اپنی اولاد پر سخت نظر رکھتے تھے اور انھوں نے تنکے کے ساتھ ہر فرد کی ڈاڑھی کی باقاعدہ پیمائش اپنے پاس رکھی ہوئی تھی جس کی مدد سے وہ وقتاً فوقتاً یہ چیک کرتے رہتے تھے کہ کسی نے ڈاڑھی چھوٹی تو نہیں کی۔ تیسری پشت کے نوجوانوں کے ساتھ ان کا رویہ سخت گیر نہیں رہا، لیکن ڈاڑھی کترنے والے نوجوان، ان سے چھپتے پھرتے تھے یا ان کے سامنے جاتے ہوئے ٹھوڑی کو اچھی طرح لپیٹ کر جانے کا اہتمام کرتے تھے۔

اباجی کی مہمان نوازی ضرب المثل تھی۔ باہر کے مہمانوں کا کیا ذکر، بچپن میں ہم خوردوں میں سے بھی اگر کوئی جاتا اور ان کے پاس سلام کے لیے حاضر ہوتا تو وہ بتاکید پوچھتے کہ کچھ کھایا پیا ہے؟ نہیں تو گھر والوں کو بلا کر انھیں مہمانی اور تواضع کا حکم دیتے۔ عام طور پر رخصت ہوتے وقت پچاس یا سو روپے کا تبرک ضرور دیا کرتے تھے۔ بعض دفعہ ٹھہرنے کا موقع نہ ہوتا تو مشروب کے لیے الگ پیسے دیتے اور کہتے، یہ تمہاری بوتل کے پیسے ہیں۔ اس ضمن میں اکرام نفس کا اتنا خیال ہوتا تھا کہ ایک دفعہ رخصت ہوتے وقت انھوں نے مجھے صرف دس روپے دیے تو ساتھ یہ وضاحت کی کہ ان دنوں مہمانوں کی کثرت کی وجہ سے خرچہ بہت ہوا ہے، اس لیے صرف دس روپے دے رہا ہوں، بلکہ عم مکرم مولانا عزیز الرحمن خان شاہد کا روایت کردہ ایک واقعہ، جو بظاہر ایک لطیفہ لگتا ہے، اباجی کے محسوسات کی نہایت درست عکاسی کرتا ہے۔ اباجی کے گھر میں مہمان داری کا سلسلہ بہت زیادہ تھا اور مہمان نوازی کے لیے عام طور پر دوکان سے ٹھنڈے مشروب لائے جاتے تھے۔ ذمہ داری چونکہ کسی ایک فرد کی نہیں تھی، اس لیے بعض اوقات دکان دار کے ساتھ حساب کتاب میں کچھ الجھن پیش آ جاتی تھی۔ پھر بعض اوقات بازار جانے کے لیے کوئی فرد بھی میسر نہیں ہوتا تھا۔ جب ڈبے کے جوس نئے نئے متعارف ہوئے تو کسی نے اباجی کو یہ مشورہ دیا کہ مہمانوں کے لیے جوس کے ڈبے اکٹھے منگوا کر رکھ لیے جائیں تاکہ آسانی رہے۔ اباجی کو تجویز اچھی لگی اور ایسا ہی کیا گیا، لیکن پھر انھیں خیال ہوا کہ کہیں مہمان یہ نہ سمجھیں کہ ہمیں ہلکے معیار اور کم قیمت کا مشروب پلایا جا رہا ہے۔ چنانچہ جب مہمان آتے اور انھیں مشروب پیش کیا جاتا تو اباجی ان کے سامنے باقاعدہ وضاحت کرتے کہ آپ مشروب لیجیے، اس کی قیمت بھی اتنی ہی ہے جتنی بوتل کی۔

اباجی کو اپنی اولاد اور اولاد کی اولاد کی تعلیم وتعلم کے سلسلے سے بھی بے حد دلچسپی رہتی تھی اور وہ اس کی پوری پوری خبر رکھا کرتے تھے۔ اس ضمن میں کسی بھی اہم پیش رفت پر ان کی خوشی اور جذبہ تشکر دیدنی ہوتا تھا۔ فروری ۱۹۸۵ء میں میرا حفظ

قرآن مکمل ہوا تو جامع مسجد شیرانوالہ باغ گوجرانوالہ میں ایک بڑی تقریب کا اہتمام کیا گیا جس میں اباجی کے علاوہ حضرت مولانا عبید اللہ انور اور حضرت مولانا محمد اجمل خان رحمہما اللہ بھی تشریف لائے۔ مجھے یاد ہے کہ اباجی نے اس موقع پر تفصیلی تقریر فرمائی اور اپنی اولاد میں حفظ قرآن کا سلسلہ آگے بڑھنے کا ذکر کرتے ہوئے رو پڑے تھے۔ اسی طرح طالب علمی کے ابتدائی زمانے میں، میں ایک دفعہ ان کے پاس حاضر ہوا اور کہا کہ آپ کے پاس ابن الندیم کی فہرست ہے؟ کیونکہ مجھے اس سے ایک حوالہ دیکھنا ہے۔ یہ حوالہ سیدنا عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کے مصحف کے کسی نسخے سے متعلق تھا جس کے بارے میں ابن الندیم نے بیان کیا ہے کہ اس میں معوذتین بھی موجود تھیں۔ اباجی نے کہا کہ کتاب تو میرے پاس ہے، لیکن کیا تم حوالہ تلاش کر لوگے؟ میں نے کہا کہ جی ہاں۔ اس پر انھوں نے کتاب نکال کر مجھے دی۔ میں نے فہرست دیکھ کر صفحات الٹے پلٹے اور مطلوبہ حوالہ نکال کر ان کو دکھایا جس پر وہ بہت خوش ہوئے۔

اباجی سے باقاعدہ شرف تلمذ حاصل کرنے کا موقع غالباً ۱۹۸۸ء میں ملا جب میں مدرسہ نصرۃ العلوم میں دورۂ تفسیر میں شریک ہوا۔ اس کے بعد ۹۱ء سے ۹۴ء تک درس نظامی کے آخری تین سالوں کی تعلیم میں نے نصرۃ العلوم ہی میں مکمل کی اور اباجی نے تفسیر قرآن کے علاوہ دورۂ حدیث کے سال صحیح بخاری اور جامع ترمذی کا ایک ایک حصہ پڑھا۔

ان کے سامنے بخاری شریف کی عبارت پڑھنے کی ذمہ داری میری تھی۔ عبارت پہلے سے اچھی طرح تیار کر کے لانا پڑتی تھی۔ ایک آدھ دفعہ ایسا ہوا کہ جتنی عبارت کا مطالعہ کیا گیا تھا، اس سے زیادہ پڑھنا پڑی اور بحمد اللہ کوئی غلطی بھی نہیں ہوئی، لیکن ان کی تیز نگاہ فوراً بھانپ گئی اور سبق کے بعد انھوں نے کہا کہ عبارت زیادہ دیکھ کر آیا کرو۔ ایک دفعہ دوران سبق میں فرمایا کہ عبارت پڑھنے والے میں تین خوبیاں ہونی چاہییں: ایک یہ کہ صحیح پڑھے، دوسری یہ کہ تیز پڑھے اور تیسری یہ کہ بلند آواز سے پڑھے۔ یہ صحیح بھی پڑھتا ہے، تیز بھی پڑھتا ہے لیکن اس کی آواز اونچی نہیں ہے۔ ایک دن غالباً میرا گلا خراب تھا۔ سبق سے فارغ ہونے کے بعد انھوں نے فرمایا کہ میرے ساتھ گکھڑ چلو۔ گھر پہنچ کر انھوں نے اپنی الماری سے شہتوت کے شربت کی ایک بوتل نکال کر مجھے دی اور کہا کہ اسے استعمال کرو تاکہ گلا جلدی ٹھیک ہو جائے۔

صحیح بخاری کے سبق میں وہ وقتاً فوقتاً اس بات کا امتحان لیتے رہتے تھے کہ جو روایت پڑھی جا رہی ہے، وہ اس سے پہلے امام بخاریؒ نے کہاں نقل کی ہے۔ بعض اوقات حوالہ بتانے پر انعام بھی دیا کرتے تھے۔ اہم باتوں سے متعلق حوالے وہ باقاعدہ نوٹ کرا دیا کرتے تھے۔ اسی طرح وہ اہم مقامات پر مولانا احمد علی سہارنپوریؒ کے حاشیہ بخاری کی طرف بھی متوجہ کیا کرتے تھے اور بعض اوقات اس کی عبارت بھی باقاعدہ پڑھی جاتی تھی۔ اس ضمن میں انھوں نے ایسے مقامات خوب ذہن میں رکھے ہوئے تھے جو تنبہ کے بغیر فوراً پڑھنے پر مزلہ اقدام ثابت ہو سکتے ہیں۔ یاد ہے کہ ایک دفعہ انھوں نے حاشیے سے ایک عبارت پڑھی اور پڑھتے پڑھتے اچانک رک گئے اور کہا کہ آگے پڑھو، کیا لکھا ہے؟ آگے 'قلّت او کثرت' کے الفاظ تھے، لیکن میں نے یہ سمجھتے ہوئے کہ محشی اپنی طرف سے کوئی نکتہ بیان کرنا چاہتا ہے، فوراً 'قلت' (بصیغہ مونث غائب از قل یقل) کو 'قلت' (بصیغہ متکلم از قال یقول) پڑھ دیا۔ اباجی نے فوراً ٹوکا اور کہا کہ یہ 'قلت نہیں، 'قلت' ہے۔

دوران سبق میں، کم سے کم دو مواقع یاد ہیں جب انھوں نے بعض ماثور دعاؤں میں عام طور پر پڑھے جانے والے ایسے الفاظ پر تنبیہ کی جو روایات میں ثابت نہیں ہیں۔ ایک مرتبہ اذان کے بعد کی دعا کے بارے میں فرمایا کہ دعاؤں کی عام کتابوں

میں 'آت محمدان الوسیلة والفضیلة والدرجة الرفیعة وابعثه مقاما محمودا الذی وعدته وارزقنا شفاعته یوم القیامة' کے جو الفاظ نقل کیے گئے ہیں، ان میں سے 'والدرجة الرفیعة' اور 'وارزقنا شفاعته یوم القیامة' کے الفاظ حدیث سے ثابت نہیں ہیں۔ (ابن حجر نے تلخیص الحبیر ۱/۲۱۰ میں 'والدرجة الرفیعة' کے بارے میں اس کی تصریح کی ہے)۔ اسی طرح ایک موقع پر نماز کے بعد پڑھی جانے والی دعا 'اللھم انت السلام ومنک السلام تبارکت یا ذا الجلال والکرام' کا ذکر آیا تو اباجی نے پوچھا کہ کسی کو یہ دعا یاد ہے؟ میں نے عرض کیا کہ جی ہاں۔ ہم اپنے ننھیال (موضع گلیانہ، ضلع گجرات) میں گھر کے قریب جس مسجد میں نماز کے لیے جاتے تھے، وہ بریلوی مکتب فکر کی تھی اور میں نے ہر نماز کے بعد امام صاحب سے سن سن کر یہ دعا جیسے یاد کی ہوئی تھی، اسی طرح پڑھ کر سنا دی: 'اللھم انت السلام ومنک السلام والیک یرجع السلام حینا ربنا بالسلام وادخلنا دار السلام تبارکت یا ذا الجلال والاکرام'۔ جیسے ہی میں نے دعا پوری کی، اباجی نے فوراً کہا: سب ''خرافات'' یاد کی ہوئی ہے۔ پھر بتایا کہ 'والیک یرجع السلام حینا ربنا بالسلام وادخلنا دار السلام' کے الفاظ حدیث میں نہیں آئے۔ (ملا علی القاری نے 'المصنوع' رقم ۴۷۲ میں اس کی تصریح کی ہے۔ البتہ ان میں سے 'حینا ربنا بالسلام' کے الفاظ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے نماز کے بعد کے ذکر میں تو منقول نہیں، لیکن بعض روایات میں ہے کہ بیت اللہ کی زیارت کے موقع پر نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور سیدنا عمر 'اللھم انت السلام ومنک السلام فحینا ربنا بالسلام' کے کلمات پڑھا کرتے تھے۔ (بیہقی، السنن الکبریٰ، رقم ۸۹۹۵، ۸۹۹۸) اسی طرح بزار نے ایک ضعیف روایت میں نقل کیا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے سورج نکلنے کے بعد جو دعا پڑھنے کی تلقین کی، اس میں 'اللھم انت السلام ومنک السلام والیک یعود السلام' کے الفاظ بھی ہیں۔ (مجمع الزوائد ۱۰/۱۱۵) ابو حاتم نے اس روایت کو منکر قرار دیا ہے۔ (علل ابن ابی حاتم، ۲۰۶۶)

مدارس کے طلبہ کے مزاج، نفسیات اور عادات کے بارے میں پر مزاح جملے بھی ان کے سبق کا حصہ ہوتے تھے۔ دوران سبق میں سونے والے طالب علموں کے لیے فرماتے کہ نیند اگر میدان جنگ میں آئے تو وہ سکینہ ہوتی ہے اور اللہ کی طرف سے نازل ہوتی ہے، لیکن اگر سبق کے دوران میں آئے تو شیطان کی طرف سے ہوتی ہے۔ امام سبکی کی 'طبقات الشافعیة الکبریٰ' کے حوالے سے فرماتے کہ اس میں ولی کی بے شمار نشانیاں بیان کی گئی ہیں جن میں سے ایک زیادہ کھانا، کھانا بھی ہے۔ پھر طلبہ سے کہتے کہ آپ خوش ہو جائیں کہ کم از کم ولایت کی یہ نشانی تو آپ میں بھی پائی جاتی ہے۔ بتاتے تھے کہ ایک دفعہ میں امتحان لینے کسی جگہ گیا۔ ترجمہ قرآن کے امتحان میں، میں نے سورۂ فاطر کی پہلی آیت 'الحمد لله فاطر السموات والارض' طالب علم کے سامنے رکھی تو اس نے ترجمہ کیا: ''سب تعریف اللہ کے لیے ہے جس نے فتور مچا رکھا ہے آسمانوں اور زمین میں۔'' عم مکرم مولانا عزیز الرحمٰن شاہد کی روایت ہے کہ ایک دفعہ رجسٹر پر طلبہ کی حاضری درج کرتے ہوئے ان کے قلم کی سیاہی خشک ہو گئی۔ ایک طالب علم نے اپنا قلم دیا تو جیسے ہی انھوں نے اس کی نوک کاغذ پر رکھی، اس کی سیاہی پھیل گئی۔ اباجی نے مزے سے یہ کہہ کر قلم واپس کر دیا کہ بھئی! یہ لے لو، اسے طالب علموں والی بیماری ہے۔ طلبہ کو کسی بات کی تحقیق کی ترغیب دیتے ہوئے یہ خاص جملہ اکثر دہراتے تھے کہ ''ذوق اور شوق دو بھائی تھے۔ عرصہ ہوا کہ فوت ہو گئے، رحمہما اللہ''۔ یہ بھی فرماتے کہ آپ حضرات ''طلباء'' نہیں بلکہ ''طلبہ'' بنیں، اور پھر وضاحت کرتے کہ ''طلباء'' اسم فاعل کا، جبکہ ''طلبہ'' صفت مشبہ کا صیغہ

ہے جس میں دوام اور استمرار کا مفہوم پایا جاتا ہے۔ ایک دفعہ دوران سبق میں سینما کا ذکر آیا تو فرمایا کہ میں نے آج تک زندگی میں کبھی سینما نہیں دیکھا، البتہ ''آپ جیسے ثقہ بزرگوں'' سے سنا ہے کہ اس میں یہ اور یہ ہوتا ہے۔

بعض دفعہ دلچسپ علمی لطائف بھی سناتے تھے۔ 'ولا الضالین' میں ضاد کے تلفظ پر یہ لطیفہ سناتے کہ گکھڑ میں ایک شخص میرے پاس آیا اور کہا کہ اس کا صحیح تلفظ 'ولا الدالین' ہے۔ میں نے کہا کہ بھائی، یہ بتاؤ کہ آپ جب نماز کے لیے اپنے اعضا دھوتے ہیں تو کیا کہتے ہیں: میں نے ''وضو'' کیا یا میں نے ''ودو'' کیا؟ اس نے کہا کہ ''وضو'' کہتے ہیں۔ میں نے کہا کہ خدانخواستہ آپ کی اہلیہ کو کوئی خطرناک بیماری لگ جائے تو آپ کیا کہیں گے: میری بیوی کو ایک موذی مرض لگ گیا ہے یا ایک موذی ''مرد'' لگ گیا ہے؟ جب باقی ہر جگہ ضاد ہی بولتے ہو تو لا الضالین میں بھی یونہی پڑھو۔ اسی طرح بتاتے کہ ایک دفعہ سفر کے دوران میں گاڑی میں کوئی شیعہ ان کے ساتھ بیٹھ گیا اور سیدنا علی رضی الہ عنہ کی فضیلت پر گفتگو شروع کر دی۔ دوران گفتگو میں اس نے کہا کہ علی کی تو قرآن میں بڑی فضیلت بیان ہوئی ہے۔ دلیل کے طور پر اس نے 'انه لعلی حکیم' یا 'وھو العلی العظیم' جیسی کچھ آیات سنائیں۔ اباجی کہتے ہیں کہ میں نے اس سے کہا: قرآن میں تو یزید کا بھی بڑا رتبہ بیان ہوا ہے۔ اس نے کہا، وہ کہاں؟ میں نے کہا، قرآن میں ہے: ویزیدھم من فضله۔ اس نے کہا کہ یہ 'یزید' کے بعد 'ھم' ضمیر کا کیا مطلب ہے؟ میں نے کہا کہ اس سے مراد بنو امیہ ہیں، یعنی بنو امیہ کا یزید اللہ کے فضل میں سے ہے۔ بتاتے تھے کہ گورنمنٹ نارمل اسکول گکھڑ میں درس قرآن کے دوران ایک صاحب نے کہا کہ مولانا! یہ ڈاڑھی تو ایک غیر فطری چیز ہے، اسے کیوں ضروری قرار دیا جاتا ہے؟ پوچھا گیا کہ یہ کیسے غیر فطری ہے تو انھوں نے کہا کہ جب انسان پیدا ہوتا ہے تو اس کی ڈاڑھی نہیں ہوتی۔ اباجی کہتے ہیں کہ میں نے ان سے کہا کہ جب آپ پیدا ہوئے تھے تو آپ کا ایک بھی دانت نہیں تھا، اس لیے آپ اپنے سارے دانت نکلوا دیں۔ پھر پیدائش کے وقت آپ بالکل ننگے تھے، اس لیے اگر فطری یا غیر فطری کا معیار یہی ہے تو اب بھی آپ اپنے کپڑے اتار دیجیے۔

وہ تفسیر میں حضرت مولانا حسین علی رحمہ اللہ کے تلمیذ تھے اور ان کا ذکر ''ہمارے حضرت مرحوم'' کے الفاظ سے کیا کرتے تھے۔ بعض مقامات پر میانوالی کی بولی میں ان کا ترجمہ خاص طور پر سنایا کرتے تھے۔ مثلاً فبھت الذی کفر (البقرة ۲۵۸) کے تحت ان کا یہ ترجمہ سناتے تھے کہ ''کافر بھڑوی دا پچی تھی گیا'' (نامراد کافر لاجواب ہو گیا)۔ اسی طرح 'قال اخسئوا فیھا ولا تکلمون' (المومنون ۱۰۸) کا ترجمہ یہ سناتے کہ ''چپ تھیوو، نہ باں باں کرو۔'' اپنے درس تفسیر میں قرآنی مضامین کے باہمی ربط کو واضح کرنے کا بھی خاص اہتمام کرتے تھے، البتہ ان کے ہاں اس حوالے سے مولانا حسین علی صاحب کے مخصوص تفسیری ذوق کے بجائے عمومی رنگ غالب دکھائی دیتا تھا۔ ربط مضامین کو واضح کرنے کے لیے وہ دوسری تفسیروں کے علاوہ مولانا اشرف علی تھانویؒ کی ''سبق الغایات فی نسق الآیات'' اور ''بیان القرآن'' کا حوالہ بکثرت دیا کرتے تھے۔

کمزور اور پر تکلف تاویل پر مبنی تفسیری آرا کی تردید بھی ان کے درس کا خاص حصہ ہوتی تھی۔ مثلاً 'ورفعنا فوقکم الطور' (البقرہ ۶۳) ضمن میں مولانا مودودیؒ کی اس رائے کا ذکر کرتے کہ یہ پہاڑ حقیقتاً اپنی جگہ سے بلند نہیں کیا گیا تھا، بلکہ بنی اسرائیل کو صرف ڈرایا گیا تھا کہ دیکھو، اگر نہیں مانو گے تو یہ پہاڑ تم پر گرا دیا جائے گا۔ پھر فرماتے کہ اگر یہ مراد ہے تو 'واذ نتقنا الجبل فوقھم کانه ظلة' (الاعراف ۱۷۱) کا کیا مطلب ہے جہاں صاف طور پر پہاڑ کو اپنی جگہ سے اکھاڑنے اور

اسے سائبان کی طرح ان کے سروں پر معلق کر دینے کا ذکر ہوا ہے۔ اسی طرح سورۂ بقرہ کی آیت 'فخذ اربعة من الطير فصرهن اليك' (البقرہ ۲۶۰) کی تفسیر میں مولانا ابوالکلام آزادؒ کی یہ راے بیان کرتے کہ ابراہیم علیہ السلام کو ان چار پرندوں کو ذبح کرنے کا حکم نہیں دیا گیا تھا، بلکہ یہ کہا گیا تھا کہ وہ ان پرندوں کو اپنے ساتھ مانوس کریں اور اس کے بعد ان میں سے ہر پرندے کو ایک ایک پہاڑ پر چھوڑ کر انھیں پکاریں تو یہ تیزی سے ان کے پاس پہنچ جائیں گے۔ پھر فرماتے کہ مولانا نے یہاں ٹھوکر کھائی ہے اور ان کی یہ تاویل باطل ہے، کیونکہ یہاں سیاق میں زیر بحث سوال یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ مردوں کو کیسے زندہ کرتے ہیں، جبکہ مولانا کی تاویل کی صورت میں اس واقعے کا احیاے موتی کے ساتھ کوئی تعلق ہی نہیں بنتا۔

قرآن مجید کے مختلف نصوص سے گمراہ فرقوں کے استدلالات کا جواب بھی وہ اہتمام سے ذکر کرتے تھے۔ مثال کے طور پر 'جاهد الكفار والمنافقين' (التوبہ ۷۳) کے تحت اہل تشیع کے اس استدلال کی تردید کرتے ہوئے کہ 'والمنافقين' میں واؤ مع کے معنی میں ہے اور مطلب یہ ہے کہ اے نبی، آپ ان منافقین (یعنی نعوذ باللہ صحابہ) کے ساتھ مل کر کفار کے ساتھ جہاد کریں، وہ صاحب 'متن متین' علامہ عبد الرسولؒ اور کافیہ کے شارح رضی استرابادی کا حوالہ دیا کرتے تھے کہ یہ دونوں صراحت کرتے ہیں کہ قرآن مجید میں نصاً وصراحتاً مفعول معہ کی کوئی مثال موجود نہیں۔ فرماتے تھے کہ یہ دونوں غالی شیعہ ہیں، لیکن نحو کے امام ہیں۔ متن متین کا حوالہ وہ 'وارجلكم الى الكعبين' (المائدہ ۶) کے تحت پاؤں پر مسح کرنے کے شیعی موقف کے جواب میں بھی دیا کرتے تھے کہ قرآن مجید میں جر جوار کا اسلوب کہیں نہیں پایا جاتا۔ متن متین شاید ان کی پسندیدہ کتاب تھی۔ فرماتے تھے کہ یہ نحو کی ادق ترین کتاب ہے۔ (یہ کافیہ کی طرز پر چھوٹے چھوٹے اور مغلق جملوں میں تصنیف کردہ کتاب ہے اور کسی دور میں تکمیل فنون کے اسباق میں پڑھائی جاتی رہی ہے۔ بالعموم دست یاب نہیں، البتہ اباجی کے پاس ایک موقع پر اس کا نسخہ دیکھنا مجھے یاد ہے۔) اسی طرح 'ليذهب عنكم الرجس اهل البيت' (الاحزاب ۳۳) کے ضمن میں اہل تشیع کا یہ استدلال بیان کرتے کہ یہاں جمع مذکر کی ضمیر استعمال ہوئی ہے جو اس بات کی دلیل ہے کہ اہل بیت میں ازواج مطہرات شامل نہیں ہیں۔ پھر بتاتے کہ عربیت کے لحاظ سے جمع مذکر کی ضمیر واحد مونث کے لیے بھی استعمال ہو سکتی ہے۔ اس پر قرآن مجید کی آیت: 'رحمت الله وبركته عليكم اهل البيت' (ہود ۷۳) کے علاوہ 'وان شئت حرمت النساء سواكم' اور 'فلا تحسبي اني تخشعت بعدكم' جیسے اشعار بطور نظیر پیش کرتے۔

بے انتہا وسعت مطالعہ کے باوجود علمی نکات کی تحقیق اور معلومات میں اضافے کے ضمن میں وہ 'حيث وجدها فهو احق بها' کے اصول پر عمل پیرا تھے۔ عم مکرم مولانا عبد الحق خان بشیر نے ۱۹۷۷ء میں گوجرانوالہ جیل میں قید کی یادداشتوں میں بیان کیا ہے کہ جیل میں ان کی بیرک کی صفائی پر ایک پاگل مامور تھا جو اپنا ذہنی توازن کھو چکا تھا، لیکن تاریخ کا وسیع مطالعہ رکھتا تھا اور اس کی یادداشت قائم تھی۔ اباجی اس سے استفادے کے لیے اس کی پسند کے مطابق سگریٹ اور بسکٹ کے ڈبے منگوا لیتے، چائے بنوا کر اس کے سامنے رکھ دی جاتی، اور وہ تاریخی معلومات اگلنا شروع کر دیتا۔ اس طرح کئی نشستوں میں اباجی نے اس سے انقلاب فرانس، انقلاب ترکی، جنگ عظیم اول ودوم اور تاریخ کے دوسرے بہت سے اہم مراحل کے بارے میں معلومات حاصل کیں۔ اس سلسلے میں وہ نہایت منصف مزاج بھی تھے اور مسلکی یا دینی اختلاف ان کے لیے کسی کے علم وفضل کا اعتراف کرنے میں مانع نہیں بنتا تھا، چنانچہ ایک مرتبہ مولانا احمد رضا خان صاحب بریلوی کے بارے میں

گفتگو ہوئی تو فرمایا کہ وہ علم حدیث میں کمزور تھے، لیکن باقی علوم کے ماہر تھے۔ ان کے متواضع مزاج کا اظہار علم کے معاملے میں بھی ہوتا تھا اور وہ اپنے خوردوں سے بھی کوئی مفید بات لینے میں حجاب محسوس نہیں کرتے تھے۔ مدرسہ نصرۃ العلوم کے زمانہ طالب علمی میں، ایک مرتبہ مجھے اس نکتے کی تحقیق کی ضرورت پیش آئی کہ اہل نحو جملے کے اعراب میں حرف 'لما' کا کیا عمل بیان کرتے ہیں۔ میں نے اباجی سے دریافت کیا تو غالباً انھوں نے کہا کہ مجھے مستحضر نہیں، تم خود دیکھو۔ میں نے مختلف کتابوں کی مراجعت کی تو 'تاج العروس' میں یہ وضاحت مل گئی کہ 'لما' جملے میں واقع فعل کا ظرف ہوتا ہے، البتہ اس کا عامل کبھی جواب شرط کی صورت میں اس سے موخر ہوتا ہے (جیسے لما ورد ماء مدين وجد عليه امة) اور کبھی اس سے مقدم (جیسے استعد القوم لقتال العدو لما احسوا بهم)۔ اگلے دن اباجی اپنے اسباق سے فارغ ہوئے تو میں نے یہ بات ان کے سامنے پیش کی۔ وہ کھڑے تھے، فوراً بیٹھ گئے اور جیب سے اپنا قلم اور کاغذ کی ایک چٹ نکال کر کہا کہ ذرا دوبارہ بتاؤ، تاج العروس میں کیا لکھا ہے؟ میں نے بتایا تو انھوں نے اسے باقاعدہ نوٹ کر کے اپنے پاس جیب میں رکھ لیا۔

اباجی کے روزمرہ معمولات میں دم کرنا اور تعویذ لکھنا بھی شامل تھا۔ دوران سبق میں ایک مرتبہ تعویذات کے جواز یا عدم جواز کا مسئلہ زیر بحث آیا تو انھوں نے مشکوۃ المصابیح منگوائی اور اس میں سے عبد اللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ کی حدیث باقاعدہ پڑھ کر سنائی جس میں ذکر ہے کہ وہ 'اعوذ بكلمات الله التامات من غضبه وعقابه وشر عباده ومن همزات الشياطين وان يحضرون' کے کلمات اپنے بڑے بچوں کو یاد کرا دیتے تھے جبکہ چھوٹے بچوں کے گلے میں لکھ کر لٹکا دیا کرتے تھے۔ (ترمذی، رقم ۳۴۵۱ ومسند احمد، رقم ۶۴۰۹) ایک زمانے میں جب میرے ذہن میں تعویذات کے جواز کے سلسلے میں تردد پیدا ہوا تو میں نے اباجی نے دریافت کیا تھا کہ اس روایت کی سند میں تو محمد بن اسحاق ہے جس پر آپ نے احسن الکلام میں شدید ترین جرح نقل کی ہے۔ اباجی نے فرمایا کہ اس کی روایت احکام میں قبول نہیں لیکن تاریخ کے دائرے میں قابل استدلال ہے۔ یاد نہیں کہ میں نے اس پر مزید یہ اشکال پیش کیا تھا یا نہیں کہ اس روایت سے تو ایک شرعی حکم ہی کے ضمن میں استدلال کیا جا رہا ہے، اس لیے اس پر تاریخ کا اصول کیونکر لاگو ہو سکتا ہے؟ بہرحال مجھے بے شمار دفعہ انھیں تعویذ لکھتے ہوئے دیکھنے کا اور ایک آدھ دفعہ ان کے کہنے پر تعویذ کو تہہ کرنے کا موقع ملا۔ عام طور پر وہ تعویذ میں ۷۸۶ کے بعد 'رب الناس اذهب الباس' کے کلمات لکھا کرتے تھے، جبکہ دم کرتے ہوئے بالعموم ان کی زبان سے 'بسم الله الذى لا يضر مع اسمه شئ' کے الفاظ سننے میں آتے تھے۔ گکھڑ میں عصر کے بعد کا وقت عام طور پر اسی مقصد کے لیے حاضر ہونے والے حضرات وخواتین کے لیے مخصوص تھا، لیکن تعویذات کا کاروبار کرنے والے عاملین کے برعکس ان کی ساری کوشش تعویذ پر لوگوں کا یقین بنانے کے لیے نہیں بلکہ اس سے ہٹانے کے لیے ہوتی تھی۔ وہ کم وبیش ہر آنے والے سے کہتے تھے کہ شفا اللہ کے ہاتھ میں ہے، وہ چاہے گا تو دم یا تعویذ میں اثر پیدا کر دے گا۔ وہ خود گھٹنوں کے درد میں مبتلا تھے اور کئی دفعہ دم کی تاثیر کے اللہ کی مشیت پر منحصر ہونے کو واضح کرنے کے لیے کہتے تھے کہ میں خود ایک طویل عرصے سے گنٹھیا کا شکار ہوں، اگر میرے پاس کوئی شرطیہ دم ہوتا تو پہلے اپنا علاج نہ کر لیتا؟ میرے سامنے کی بات ہے کہ ایک مولوی صاحب ان کے پاس حاضر ہوئے اور کہا کہ میرے پاس ایک ایسا دم ہے جس سے بیمار کو یقینی طور پر آرام آ جاتا ہے۔ اباجی نے مسکراتے ہوئے کہا کہ میرے گھٹنوں میں پرانا درد ہے، آپ ذرا اپنا دم آزمائیں۔ انھوں نے ایک دفعہ دم کیا

اور پوچھا کہ کچھ افاقہ ہے؟ اباجی نے کہا، نہیں۔ انھوں نے دوسری دفعہ دم کیا تو اباجی نے کہا، کوئی فرق نہیں۔ تیسری دفعہ دم کے بعد زور سے کہا کہ ذرہ برابر بھی آرام نہیں ہے۔ وہ صاحب اپنا سا منہ لے کر رہ گئے۔

ہر مسئلے کا حل تعویذ میں تلاش کرنے والوں کے لیے بعض دفعہ وہ دلچسپ تبصرے بھی کیا کرتے تھے۔ بچپن میں ایک دفعہ والدہ نے مجھے ان کے پاس بھیجا کہ اپنے لیے پڑھائی کا تعویذ لے کر آؤ۔ یاد نہیں کہ اباجی نے تعویذ دیا یا نہیں، لیکن یہ اچھی طرح یاد ہے کہ انھوں نے فرمایا: ''پتر، پڑھائی پڑھن نال ہوندی اے'' (بیٹا، پڑھائی پڑھنے سے ہوتی ہے)۔ ایک صاحب آئے اور انھوں نے اپنے گھٹنوں کے درد کا ذکر کیا۔ اباجی نے کہا کہ عمر کتنی ہے؟ اگر چالیس سال سے زیادہ ہے تو پھر یہ درد ہونا چاہیے۔ اس ضمن میں توہم پرستی اور ضعیف الاعتقادی ان کے طنز و مزاح کا خاص طور پر ہدف بنے رہتے تھے اور وہ بعض توہم پرست لوگوں کے دلچسپ واقعات بھی سنایا کرتے تھے۔ بتاتے تھے کہ ایک دفعہ ایک میجر صاحب میرے پاس آئے اور کہا کہ مجھ پر کسی نے جادو کر دیا ہے، اس کے لیے تعویذ دے دیں۔ میں نے کہا کہ میں تعویذ دے دیتا ہوں، لیکن عام طور پر لوگ خواہ مخواہ جادو کے وہم میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ انھوں نے کہا کہ نہیں، مجھے یقین ہے کہ مجھ پر جادو کیا گیا ہے۔ میں نے پوچھا کہ آپ کو کیا تکلیف ہے؟ انھوں نے کہا، میرے پاخانے سے بدبو آتی ہے۔ اباجی نے کہا کہ اس پر میں نے لاحول ولا قوۃ پڑھی اور کہا کہ بھائی، وہ پاخانہ ہے، کوئی کستوری تو نہیں۔ ایک دفعہ سبق میں فرمایا کہ ''میں نے آج تک نہ کوئی جن دیکھا ہے اور نہ جنوں کا عامل دیکھا ہے، البتہ ٹھگ بڑے سنے ہیں کہ فلاں ہے اور فلاں ہے۔'' ایک دلچسپ واقعہ یہ بھی سناتے کہ جھنگ میں کسی شخص نے خودکشی کر لی تو اس کے بہن بھائی باقاعدہ سفر کر کے ان کے پاس گکھڑ آئے اور کہا کہ ہم نے آپ کی ایک تقریر سنی تھی جس میں آپ نے معجزات اور کرامات کا برحق ہونا بیان کیا تھا، اس لیے ہم آپ کے پاس آئے ہیں کہ آپ ''کرامت'' دکھا کر ہمارے مردہ بھائی کو زندہ کر دیں۔

دوران سبق میں کوئی خاتون دم یا تعویذ کے لیے آ جاتی تو انھیں ناگوار گزرتا تھا۔ ایک دفعہ ایک خاتون سبق کے دوران میں آ گئی تو اباجی نے بادل نخواستہ اسے پاس بلا لیا۔ اس نے اپنی کوئی تکلیف بتائی اور اباجی نے اس کی بات سن کر اسے تعویذ دے دیا۔ اب وہ پوچھنے لگی کہ میں پرہیز کیا کروں؟ اباجی نے کہا کہ کوئی پرہیز نہیں، ساری حلال چیزیں کھاؤ۔ اس نے دو تین بار یہی سوال کیا تو اباجی نے کہا کہ بی بی! میرا دماغ نہ کھاؤ، باقی سب کچھ کھاؤ۔ اسی طرح اسباق سے فارغ ہونے کے بعد صوفی صاحب کے گھر میں خواتین ان کے انتظار میں بیٹھی ہوتی تھیں۔ جمعرات کو انھیں خاص طور پر واپسی کی جلدی ہوتی تھی، کیونکہ ان کا معمول تھا کہ وہ ہر جمعرات کو پیٹ کی صفائی کے لیے جلاب لیا کرتے تھے۔ ایک دن کسی خاتون نے غالباً تعویذ کے لیے اپنی لمبی چوڑی کتھا سنانا شروع کر دی تو اباجی نے جھلا کر کہا کہ بی بی، مختصر بات کرو، میں نے جا کر جلاب بھی لینا ہے۔ بتاتے تھے کہ ایک دفعہ مجھے اسی طرح جانے کی جلدی تھی کہ نکلتے نکلتے ایک خاتون آ گئی۔ میں نے غصے میں اسے خالی کاغذ تہہ کر کے تعویذ کے طور پر دے دیا۔ کچھ دنوں کے بعد وہ خوش خوش آئی اور کہنے لگی کہ مولوی صاحب، آپ کے تعویذ کی برکت سے میرا مسئلہ حل ہو گیا ہے۔

یہاں یہ بات بیان کرنے میں بھی کوئی حرج نہیں کہ دم اور تعویذ کے لیے آنے والی خواتین کے معاملے میں ان کے طرز عمل سے پتہ چلتا تھا کہ وہ چہرے کے پردے کے بارے میں متقدمین احناف کے موقف کے قائل ہیں، کیونکہ انھوں نے

کبھی مدرسے میں یا گھر میں آنے والی کسی خاتون کو، خواہ وہ جوان ہو یا بوڑھی، چہرہ چھپانے کے لیے نہیں کہا۔ کئی مرتبہ ہم گھر کے نوجوان ان کے پاس ہوتے اور ہماری موجودگی میں خواتین دم کے لیے آ جاتیں تو وہ کبھی ہم سے باہر جانے کے لیے نہیں کہتے تھے۔ ان کی اپنی اولاد میں چچازاد، ماموں زاد اور پھوپھی زاد لڑکے لڑکیاں بعض دفعہ ان کے پاس جا کر اکٹھے بیٹھ جاتے تو وہ اس پر بھی کوئی نکیر نہیں فرماتے تھے۔ اباجی کے گھر میں دیور بھابھی، چچی بھتیجا اور ممانی بھانجا وغیرہ کے مابین پردے کا بھی کوئی تصور نہیں تھا، البتہ بہت بعد میں بعض خواتین نے اپنے ذاتی ذوق سے ایسا کرنا چاہا تو اباجی نے اس پر کوئی اعتراض بھی نہیں فرمایا۔ اباجی کے مذکورہ طرز عمل کے علاوہ 'الا ما ظهر منها' (النور ۳۱) کے تحت انھوں نے اس مسئلے کی وضاحت میں جو کچھ فرمایا، اسے بھی یہاں لفظاً نقل کر دینا مناسب معلوم ہوتا ہے۔ فرمایا:

''اس میں خاصا اختلاف ہے کہ عورتوں کا چہرہ، ان کے ہاتھ اور ان کے قدمین، یہ عورت ہیں یا نہیں۔ پھر یہ کہ فی الصلوٰۃ و فی غیر الصلوٰۃ کوئی فرق ہے یا نہیں۔ تیسرا کہ اجنبی یا غیر اجنبی کا بھی کوئی فرق ہے یا نہیں۔ کبیری میں ہے کہ عورت کا چہرہ، یدین اور قدمین عورت نہیں ہیں، لا فی الصلوة ولا فی غیر الصلوة، لا فی حق الاجنبی ولا فی حق غیر الاجنبی ۔ وعلیہ الاتفاق۔ فقہاے احناف کا اس پر اتفاق ہے۔ ہاں پردہ کرنا مستحب ہے، واجب نہیں۔ [لیکن] عوام کے سامنے یہ بات بیان نہ کرنا۔''

یقین سے یاد نہیں کہ بات کا پس منظر کیا تھا، لیکن ایک دفعہ دوران سبق میں انھوں نے مفتی رشید احمد صاحب لدھیانویؒ کے حوالے سے فرمایا کہ وہ ہمارے ساتھی ہیں، لیکن بعض امور میں تشدد سے کام لیتے ہیں۔

اباجی کی تصنیف وتالیف کا موضوع زیادہ تر اختلافی مسلکی مسائل رہے اور انھوں نے مختلف مباحث کے ضمن میں پچاس کے لگ بھگ تصانیف میں اکابر دیوبند کے نقطہ نظر کی بھرپور اور مدلل علمی ترجمانی کی خدمت انجام دی۔ مجھے چونکہ ان بحثوں سے کوئی خاص دلچسپی نہیں تھی، اس لیے زمانہ طالب علمی میں اباجی کی کتابوں سے بھی کچھ زیادہ اعتنا نہیں رہا، بلکہ ایک لطیفے کی بات یہ ہوئی کہ ۸۹ء میں ہم نے ماہنامہ 'الشریعہ' کا آغاز کیا تو اباجی کی تصانیف میں سے بھی کوئی نہ کوئی انتخاب ہر ماہ شامل کیا جاتا تھا اور چونکہ 'الشریعہ' کے موضوعات اور دائرۂ کار سے مسلکی اختلافات کو خارج رکھنے کی باقاعدہ پالیسی طے کی گئی تھی، اس لیے اباجی کی تصانیف سے انتخاب کرتے ہوئے بھی اس کا لحاظ کیا جاتا تھا کہ تحریر عمومی نوعیت کے کسی موضوع سے متعلق ہو۔ اس ضمن میں ایک موقع پر میں نے تفنن کے انداز میں والد گرامی سے یہ کہا کہ ہم اباجی کی کتابوں میں سے اپنی ترجیحات کے مطابق انتخاب واقتباس آخر کب تک کر سکیں گے؟ والد گرامی نے یہ بات اباجی کے گوش گزار کر دی۔ پھر ایک موقع پر خود میں نے بھی اباجی کے سامنے یہی بات دہرانے کی حماقت کی تو انھوں نے فرمایا کہ میری کتابوں میں اتنا مواد ہے کہ تم ساری زندگی بھی اس میں سے انتخاب کرتے رہو تو مواد ختم نہیں ہوگا۔ ان کی یہ بات درست تھی، البتہ مجھ پر اس کی اہمیت بہت بعد میں اس وقت واضح ہوئی جب اصول فقہ اور اصول حدیث وغیرہ کے ساتھ باقاعدہ علمی اشتغال کا موقع ملا اور میں نے دیکھا کہ اباجی کی تصانیف میں جگہ جگہ بہت سی اہم علمی واصولی بحثوں کا ایک گراں قدر ذخیرہ موجود ہے، چنانچہ میں نے ان مباحث کو اس خیال سے نشان زد کرنا شروع کر دیا کہ اگر انھیں مربوط طریقے سے الگ یکجا کر دیا جائے تو اصول فقہ، اصول حدیث، اصول تفسیر اور اصول عقائد سے متعلق مستقل مجموعے تیار ہو سکتے ہیں۔ ان میں سے ایک مجموعہ ''فن

حدیث کے اصول ومبادی'' کے عنوان سے باقاعدہ مرتب بھی ہو چکا ہے اور ان شاء اللہ جلد زیور طبع سے آراستہ ہو جائے گا۔

جہاں تک ابا جی کے طرز بحث کا تعلق ہے تو اس کی خصوصیات پر کئی پہلوؤں سے مفصل گفتگو کی جا سکتی ہے، لیکن مجھے اپنے ذوق کے لحاظ سے اس میں دو باتیں بے حد نمایاں دکھائی دیتی ہیں۔ ایک تو یہ کہ وہ دوسرے فریق کا موقف نہایت دیانت داری سے اور پوری تفصیل کے ساتھ خود اس کے اپنے الفاظ میں نقل کرتے ہیں، بلکہ ان کی بعض تصانیف میں اگر فریق مخالف کی نقل کی جانے والی تحریروں کا تناسب کتاب کی کل ضخامت سے دیکھا جائے تو وہ ایک چوتھائی سے کم نہیں ہوگا۔ دوسری بنیادی خصوصیت یہ ہے کہ وہ بحث کے دوران میں کہیں بھی اصل نکتے کو چھوڑ کر کسی غیر متعلق بات کے درپے ہونے، کسی بحث طلب نکتے کو نظر انداز کرنے، دوسرے فریق پر اس کی غلطی واضح کرنے کے بجائے قارئین کو الفاظ کے ہیر پھیر میں ڈالنے یا اس نوعیت کے دوسرے مناظرانہ ہتھکنڈے اختیار نہیں کرتے۔ غالباً عم مکرم مولانا عبد الحق خان بشیر زید مجدہم کو ایک موقع پر نصیحت کرتے ہوئے فرمایا کہ کبھی یہ سمجھ کر گفتگو نہ کرو کہ تمہاری بات کو صرف تمہارے موافقین سنیں اور پڑھیں گے، بلکہ یہ ذہن میں رکھو کہ تمہارے مخالفین بھی گفتگو کے مخاطب ہیں اور تمہاری بات سے ان کے اندر اپنے نقطہ نظر پر نظر ثانی کے لیے آمادگی پیدا ہونی چاہیے۔

یہ اسی جذبے اور داعیے کا نتیجہ ہے کہ انھوں نے کہیں بھی کسی نقطہ نظر پر تنقید کرتے ہوئے محض موافقین کی ذہنی واعتقادی وابستگی کو اپیل کرنے جبکہ مخالف کے علمی استدلالات سے صرف نظر کرنے کا طریقہ اختیار نہیں کیا۔ مثال کے طور پر اگر وہ ''صرف ایک اسلام'' میں حدیث کے بارے میں ڈاکٹر برق مرحوم کے نظریات بیان کر کے ان کے سارے اعتراضات اور استدلالات کو یہ کہہ کر جھٹک دیتے کہ ''دیکھو، یہ شخص تو منکر حدیث ہے، اس لیے اس کی کسی بات یا استدلال کی کیا وقعت ہو سکتی ہے!'' یا ''چراغ کی روشنی میں'' مرزا غلام احمد قادیانی کے دعوائے نبوت اور دیگر کفریہ نظریات درج کر کے فرماتے کہ ''کیا ایسے شخص کی پیش کردہ کوئی بات یا دلیل مذہبی لحاظ سے قابل توجہ ہو سکتی ہے؟'' تو عوام الناس کو گمراہی سے بچانے کی حد تک یہ طریقہ کافی اور موثر ہوتا، لیکن انھوں نے ایسا نہیں کیا، بلکہ ان دونوں کتابوں میں اور اس کے علاوہ اپنی ہر تصنیف اس بات کی کوشش کی ہے کہ فریق مخالف کے استدلال میں جو جو نکتہ بھی علمی طور پر وضاحت کا تقاضا کرتا ہے، اسے زیر بحث لایا جائے اور محض مذہبی قارئین کے ذہنی تعصبات کو اپیل کرنے کے بجائے علمی طور پر مخالف نقطہ نظر کی غلطی واضح کی جائے۔

کسی بیہودہ سے بیہودہ بات پر بھی ابا جی کا قلم غصے کے چھینٹے اڑاتا دکھائی نہیں دیتا۔ وہ تحمل اور سنجیدگی کا خود التزام کرنے کے ساتھ ساتھ دوسرے لکھنے والوں کو بھی اسی کی تلقین کرتے تھے۔ ۱۹۹۶ء میں میری اولین تصنیف ''امام اعظم ابو حنیفہؒ اور عمل بالحدیث'' کے زیر عنوان مدرسہ نصرۃ العلوم کے ادارۂ نشر واشاعت کے زیر اہتمام شائع ہوئی جس میں، میں نے امام ابو حنیفہؒ کی آرا پر جلیل القدر محدث امام ابن ابی شیبہؒ کے ایک سو پچیس اعتراضات کا ایک طالب علمانہ تجزیہ پیش کیا ہے۔ ابا جی نے اس پر مجھے تفصیلی خط لکھا اور کتاب میں موجود بہت سی اغلاط کی نشان دہی کرتے ہوئے ان الفاظ میں حوصلہ افزائی فرمائی کہ ''اگر اس کتاب کی صحیح معنی میں تصحیح اور خدمت ہو جائے تو ایک بہت بڑا علمی کارنامہ ہوگا''، جبکہ بعد میں زبانی شاباش دیتے ہوئے خاص طور پر اس بات کی تحسین کی کہ کسی بھی بات کا جواب دیتے ہوئے تمہیں غصہ نہیں آیا، ورنہ بعض جگہ غصے کا آ جانا ناگزیر ہے۔

نامعقول باتوں کی نامعقولیت واضح کرنے کے لیے وہ غصے اور جذباتی پن کے اظہار کے بجائے ظرافت کا سہارا لیتے

تھے، چنانچہ ڈاکٹر غلام جیلانی برق مرحوم نے اپنی کتاب ''دو اسلام'' میں مذہبی لباس اور وضع قطع کے بارے میں بعض استہزائیہ جملے لکھے تو ابا جی نے اس کے جواب میں لکھا:

''ہم برق صاحب سے عرض کرتے ہیں کہ آپ از راہ انصاف یہ فرمائیں کہ بجائے اسلامی صورت اور سیرت کے اگر ایک شخص ڈاڑھی منڈوا کر جیسے چھیلی ہوئی گنڈیری ہوتی ہے، کہ زن فیشن کی مونچھیں رکھ کر (جو دور سے ایسے معلوم ہوتی ہیں کہ گویا ناک کے سامنے مکھی بیٹھی ہوئی ہے)، گلے میں سانپ (نکٹائی) لٹکا کر، منہ میں سگریٹ لے کر، سر پر ہیٹ رکھ کر اور ٹخنوں سے نیچے پتلون لٹکا کر (جیسے سارنگی پر غلاف چڑھا ہوا ہوتا ہے اور جس میں پیچھے سے چلتے وقت یوں محسوس ہوتا ہے کہ چوتڑ باتیں کر رہے ہیں) اور پاکٹ میں مسواک کی جگہ خنزیر کے بالوں کی برش ڈال کر..... حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دربار میں حاضر ہو تو کیا آپ ایسے شخص کو مسلمان اور اپنا امتی تصور فرمائیں گے؟'' (صرف ایک اسلام، ص ۲۷، ۲۸)

مزاح اور ظرافت ویسے بھی ان کی طبیعت کا حصہ تھا اور وہ ایسے برجستہ اور فی البدیہہ جملے کہا کرتے تھے کہ دیر تک ان کا لطف باقی رہتا تھا۔ بچپن میں میرے چھوٹے بھائی عزیزم ناصر الدین خان عامر سلمہ کا نام اس کے گول مٹول جسم کی وجہ سے انھوں نے ''ڈڈو'' رکھا ہوا تھا اور وہ عام طور پر پیار سے اسے اسی نام سے پکارتے تھے۔ والد گرامی کے شب وروز کے اسفار کی وجہ سے ابا جی نے ان کے لیے ''دابۃ الارض'' کا لقب تجویز کیا ہوا تھا۔ میری کتاب ''امام ابو حنیفہ اور عمل بالحدیث'' چھپی تو ابا جی نے مجھے پانچ سو روپے بطور انعام دیے اور خط میں لکھا کہ ''تمہاری قیمت تو بہت زیادہ ہے، لیکن میں یتیم ہوں، اس لیے صرف پانچ سو روپے انعام دے رہا ہوں۔'' گکھڑ میں انھیں اپنی مسجد کے لیے حفظ کے استاذ کی ضرورت تھی۔ ابا جی نے کسی سے قاری کی تلاش کے لیے کہا تو ساتھ ہی حلق کی طرف اشارہ کر کے کہا کہ ''یہ دیکھ لینا کہ وہ یہاں سے اوپر اوپر قاری ہو۔'' سفر حج میں ابا جی کو اطلاع ملی کہ ان کی پھوپھی زاد بہن کے ہاں بیٹے کی ولادت ہوئی ہے اور اس کا نام بلال رکھا گیا ہے تو انھوں نے اپنے خط میں اس کی مبارک باد دی اور لکھا کہ ''دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کو صحیح معنی میں بلال بنائے، بغیر اس کے کہ وہ کالا ہو۔'' برادرم عبد القیوم طاہر بتاتے ہیں کہ شادی کے بعد کافی دیر تک ان کے ہاں اولاد نہیں ہوئی تو وہ ابا جی کے پاس تعویذ کے لیے حاضر ہوئے۔ ابا جی نے تعویذ دیا اور کہا کہ بھئی، تعویذ تو یہ لو، لیکن خود بھی محنت کرنی ہے۔ خود محنت کرتے نہیں اور تعویذ لینے آ گئے ہو! دوران سبق میں بعض دفعہ فرماتے کہ ہر زبان میں کسی آنے والے کے استقبال کے لیے کوئی نہ کوئی خاص کلمہ بولا جاتا ہے، مثلاً عربی میں 'مرحبا' کہا جاتا ہے، فارسی میں کہتے ہیں: ''خوش آمدید''، پنجابی میں ''جی آیاں نوں'' رائج ہے، جبکہ انگریزی میں کہتے ہیں: 'وَیلکُمْ' (Welcome)۔ ایک موقع پر جنات کا ذکر ہوا تو فرمایا کہ ہم جنات کو دیکھ نہیں سکتے، لیکن جہاں ہم بیٹھے ہیں، وہاں انسانوں سے زیادہ جنات موجود ہیں، اور ایسا بھی ہو سکتا ہے کہ وہ انسانوں کی شکل میں آ کر ہمارے ساتھ بیٹھ جائیں۔ اب یہ آپ دیکھ لیں کہ وہ آپ میں سے کون کون ہیں! ان کے سامنے کسی عیسائی کا یہ اعتراض ذکر کیا گیا کہ شیطان کے حملوں سے بچاؤ کے لیے ہمارے پاس تو خدا کے بیٹے کا سہارا ہے، تمہارے پاس کیا ہے؟ ابا جی نے کہا کہ اس سے کہو: ''تہاڈے کول پترا اے تے ساڈے کول پیو اے۔''

ابا جی کے نزدیک دین کی خدمت کا اہم ترین ذریعہ تعلیم وتعلم اور درس وتدریس تھا اور وہ اسی کو بنیادی اہمیت دیتے

تھے۔ والد گرامی بیان کرتے ہیں کہ ایک موقع پر انھوں نے اپنے ذرائع آمدن بڑھانے کے لیے کچھ دوستوں سے قرض لے کر کاروبار کرنے کا فیصلہ کیا اور اس کے افتتاح کے موقع پر دعا کے لیے ابا جی کو دعوت دی۔ ابا جی آئے، افتتاحی تقریب میں شریک ہوئے اور دعا بھی کی، لیکن متعدد وجوہ سے یہ کاروبار چل نہ سکا اور خاصا نقصان اٹھانا پڑا۔ والد گرامی نے اس صورت حال سے ابا جی کو آگاہ کیا اور عرض کیا کہ میں نے آپ سے کاروبار کی کامیابی کے لیے دعا کی درخواست کی تھی، لیکن لگتا ہے کہ آپ نے دعا نہیں کی۔ ابا جی نے فرمایا کہ تم بالکل درست سمجھے ہو۔ میں تمہارے کہنے پر آیا تھا اور دعا کے لیے ہاتھ بھی اٹھائے تھے، مگر دعا نہیں کی تھی، اس لیے کہ میں نے تمھیں سالہا سال تک دینی تعلیم کاروبار کرنے کے لیے نہیں دلوائی تھی، بلکہ اس لیے پڑھایا تھا کہ قناعت سے کام لیتے ہوئے دین کی خدمت کرو۔

عم مکرم قاری محمد اشرف خان ماجد مرحوم نے ایک موقع پر یہ ارادہ ظاہر کیا کہ وہ کراچی جا کر ٹرک ڈرائیور بننا چاہتے ہیں اور اس سے انھیں ایک ہزار روپے ماہانہ آمدن ہوگی۔ ابا جی نے انھیں سختی سے ڈانٹ دیا اور انھیں پابند کیا کہ وہ یہیں کسی مسجد میں بیٹھ کر قرآن مجید کی تعلیم دیں۔ عم مکرم مولانا رشید الحق خان عابد کے تعلیم وتدریس کے سلسلے سے الگ ہو جانے کا انھیں شدید قلق تھا اور وہ کئی دفعہ اس تاثر کا اظہار کیا کرتے تھے کہ تعلیم وتدریس میں ان بھائیوں میں سب سے زیادہ لائق وہی تھا، لیکن افسوس کہ وہ اس لائن کو ہی چھوڑ گیا ہے۔ والد گرامی کو 'الشریعہ' کا ڈیکلریشن ملا تو اکتوبر ۱۹۸۹ء سے اس کی باقاعدہ اشاعت کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ میں ان دنوں بائبل اور مسیحی لٹریچر کے مطالعے سے دلچسپی رکھتا تھا۔ والد گرامی کی تحریک پر میں نے عیسائیت کے حوالے سے بعض مضامین لکھے جو الشریعہ میں شائع ہوئے۔ یہ میرا درجہ خامسہ کا سال تھا۔ ابا جی نے یہ مضامین پڑھے تو ایک چٹ لکھ کر مجھے بھیجی (جو افسوس ہے کہ مجھے اپنے کاغذات میں نہیں ملی)۔ مضمون کم وبیش یہ تھا کہ ”میں نے تمہارے مضامین دیکھے ہیں۔ دیکھو، ملک چیخنے چلانے والوں سے بھرا پڑا ہے جبکہ مدرس علما کی کمی ہے۔ تم ماشاء اللہ ذہین بھی ہو اور محنتی بھی، اس لیے فی الحال لکھنے لکھانے کا سلسلہ ترک کر کے پوری توجہ اپنی تعلیم پر مرکوز کرو۔“ یاد نہیں کہ اس نصیحت کا مجھ پر کیا اثر ہوا تھا، لیکن عملاً یہی ہوا کہ میرا لکھنے لکھانے کا سلسلہ منقطع ہو گیا اور اس کے بعد تقریباً پانچ سال تک میں نے کسی موضوع پر کچھ نہیں لکھا۔

دوران تعلیم میں وہ کسی بھی قسم کی ایسی سرگرمیوں کے سخت خلاف تھے جو تعلیم میں حارج ہوں۔ طلبہ کو سختی کے ساتھ تاکید کیا کرتے تھے کہ تعلیم کا کام تبلیغ سے زیادہ اہم ہے، اس لیے دوران سال میں تعلیم چھوڑ کر تبلیغ کے لیے جانا ہرگز درست نہیں، البتہ چھٹیوں میں ضرور تبلیغی جماعت کے ساتھ وقت لگانا چاہیے۔ ایک موقع پر جماعت کے بزرگ راہ نما حضرت مولانا سعید احمد خانؒ گکھڑ تشریف لائے۔ اتفاق سے میں بھی وہیں موجود تھا۔ مجھ سے دریافت کیا گیا کہ میں کیا کرتا ہوں اور آیا میں نے اللہ کے راستے میں وقت لگایا ہے یا نہیں؟ میں اس وقت مدرسہ نصرۃ العلوم میں پڑھاتا تھا اور جماعت کے طریقے اور مزاج کے ساتھ طبعی عدم مناسبت کی وجہ اس میں زیادہ دلچسپی نہیں رکھتا تھا۔ (اب بارہ تیرہ سال کے بعد اس کے ساتھ دل تو رکھتا ہوں، لیکن چسپی اب بھی نہیں ہے)۔ میں نے نفی میں جواب دیا تو غالباً خود مولانا سعید احمد خان یا شاید ان کے کسی ساتھی کی طرف سے مجھے ”وصول“ کرنے کی فرمائش کی گئی۔ اس فرمائش پر صاف انکار کرنا میرے لیے مشکل تھا، تاہم ابا جی نے فوراً مداخلت کی اور فرمایا کہ یہ مدرسے میں پڑھاتا ہے اور دوران تدریس میں اس کے یوں چلے جانے سے طلبہ کا نقصان ہوگا، اس لیے یہ اس وقت نہیں جا سکتا، البتہ چھٹیاں ہوں گی تو دیکھا جائے گا۔

کسی بھی معاملے میں دوٹوک بات کہنا اور بالخصوص اگر مسئلہ فقہ اور شریعت کا ہو تو اس میں کسی کی کوئی رعایت نہ کرنا ویسے بھی ان کے طرز فکر اور طرز عمل کا ایک نہایت نمایاں پہلو تھا۔ والد گرامی بتاتے ہیں کہ ۱۹۸۰ء میں دار العلوم دیوبند کے صد سالہ اجلاس کے موقع پر ابا جی اور صوفی صاحب دیوبند گئے تو اس موقع پر دونوں بزرگ دیوبند کے قبرستان میں اکابر دیوبند کی قبروں پر بھی حاضری دی۔ ابا جی نے تو دعا اور فاتحہ پر اکتفا کی، جبکہ صوفی صاحب آگے بڑھ کر حضرت مدنی کی قبر پر مراقب ہو کر بیٹھ گئے۔ تھوڑی دیر گزری تو ابا جی نے کہا کہ ”اٹھا ایس بدعتی نوں، جھول مار کے بیہہ گیا اے۔“ (اٹھاؤ اس بدعتی کو، یہ کیا سر نگوں میں دے کر بیٹھ گیا ہے)۔ ان کے سامنے اس بات کا ذکر ہوا کہ ایک صوفی سلسلے میں ایک خاص طرح کے روحانی عمل کے ذریعے سے، جس میں حبس دم کرنا پڑتا ہے، حالت بیداری میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت کرائی جاتی ہے۔ ابا جی نے کہا کہ جتنی دیر وہ سانس روکتے ہیں، اتنی دیر میں ویسے بھی کچھ نہ کچھ دکھائی دینے لگتا ہے۔ عم مکرم مولانا عزیز الرحمٰن شاہد کی روایت ہے کہ ایک موقع پر نماز فجر کے درس میں انھوں نے ذکر کی اجتماعی مجالس کے ”بدعت“ ہونے کا مسئلہ واضح کیا۔ اس پر حاضرین میں سے کسی نے سوال کیا کہ حضرت مولانا عبید اللہ انور تو اہتمام کے ساتھ اجتماعی مجالس ذکر منعقد کرتے ہیں۔ ابا جی نے کہا کہ ہم نے کلمہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا پڑھا ہے، مولانا عبید اللہ انور کا نہیں۔

قاضی محمد رویس خان ایوبی صاحب، جو ابا جی کے ہم زلف بھی ہیں، بیان کرتے ہیں کہ ایک موقع پر ابا جی گکھڑ سے مدرسہ نصرۃ العلوم کی گاڑی پر گوجرانوالہ آ رہے تھے تو وہ بھی اپنی اہلیہ محترمہ کے ہمراہ ساتھ بیٹھنے کے لیے آگے بڑھے، لیکن ابا جی نے یہ کہہ کر انھیں روک دیا کہ یہ گاڑی مدرسے والوں نے مجھے لینے کے لیے بھیجی ہے اور میں نے کسی اور کو اپنے ساتھ سوار کرانے کی اجازت مدرسے والوں سے نہیں لی۔ پھر ابا جی نے انھیں اپنی جیب سے کرایہ نکال کر دیا اور کہا کہ آپ بس میں بیٹھ کر آ جائیں۔ ابا جی کے ایک قریبی عزیز، جو کسی سرکاری مسجد میں خطیب مقرر تھے، ان سے ملنے آئے تو ابا جی نے پوچھا کہ آج کل کیا کرتے ہو؟ انھوں نے بتایا کہ کوئی خاص ذمہ داری تو نہیں ہے، بس جا کر تنخواہ لیتا رہتا ہوں۔ ابا جی نے کہا، پھر تو تم بہت حرام خور ہو۔ ایک دفعہ گکھڑ کے ایک قریبی تعلق رکھنے والے گھرانے کی شادی کے موقع پر نکاح کے لیے ابا جی بارات کے ساتھ گئے۔ دولہا ان کے ساتھ ہی بیٹھا ہوا تھا۔ اس نے بوتل پی کر عام عادت کے مطابق اس کا کچھ حصہ چھوڑ دیا اور بوتل نیچے رکھ دی۔ ابا جی نے کہا کہ یہ بوتل اٹھاؤ اور اسے ختم کرو، اور پھر ہچکچاہٹ اور شرمندگی کے باوجود دولہا کو ساری بوتل ختم کرتے ہی بنی۔

ابا جی اپنی آرا اور نظریات میں جمہور اہل علم کے موقف کی سختی کے ساتھ پابندی کرتے تھے۔ ان کا نقطہ نظر یہ تھا کہ کسی بھی علمی یا فقہی مسئلے میں جمہور امت جس رائے کی تائید کریں، وہی اقرب الی الحق اور قرین صواب ہوتی ہے۔ انھوں نے اپنی تصانیف میں زیر بحث آنے والے کم وبیش تمام مسائل کی تحقیق میں اسی زاویہ نگاہ کو ملحوظ رکھا ہے اور اپنے تلامذہ اور متعلقین کو بھی یہی ہدایت کرتے تھے کہ مختلف گمراہ کن نظریات کے اثرات سے بچنے کے لیے جمہور علمائے امت کی تحقیقات کا دامن تھامے رکھنا ہی محفوظ ترین اور محتاط ترین راستہ ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ وہ دین کے معاملے میں بزرگوں پر اعتماد کرنے اور عوام الناس میں اس اعتماد کو قائم رکھنے کو بے حد ضروری قرار دیتے تھے اور اس ضمن میں انھیں اگر کسی بات سے علمی نوعیت کا اختلاف ہوتا تو اس کے اظہار میں بھی اس کا لحاظ رکھتے تھے۔ ۲۰۰۱ء میں ماہنامہ 'الشریعہ' میں میرا ایک مضمون شائع ہوا جس میں، میں نے اس معروف تفسیری واقعے پر سند اور متن کے اعتبار سے نقد کیا تھا جس میں بیان کیا گیا ہے کہ ایک موقع پر سیدنا

عمر رضی اللہ عنہ نے ایک منافق کو اس بنیاد پر قتل کر دیا تھا کہ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے فیصلے پر مطمئن نہیں تھا اور آپ کی عدالت سے فیصلہ سننے کے بعد اپنا مقدمہ سیدنا عمر کے پاس لے کر گیا تھا۔ ابا جی نے یہ مضمون پڑھا اور چند دنوں کے بعد جب میں حاضر ہوا تو فرمایا کہ تمہاری تنقید درست ہے، لیکن بات یہ ہے کہ یہ واقعہ بہت سی معروف اور متداول تفسیروں میں بیان کیا گیا ہے، جبکہ تمہاری تنقید سے عوام کا اعتماد ان بزرگوں اور کتابوں کے بارے میں مجروح ہوگا۔ پھر انھوں نے مجھ سے کہا کہ میری المماری سے تفسیر جلالین کا نسخہ نکالو۔ میں نے کتاب نکالی تو کہا کہ فلاں صفحہ کھولو۔ وہاں انھوں نے کتب تفسیر میں عام طور پر بیان کی جانے والی ایک روایت پر، جس میں ایک معروف صحابی کے اخلاق و کردار منفی رنگ میں سامنے آتا ہے، اپنی تنقید ایک الگ صفحے پر تحریر کر کے رکھی ہوئی تھی۔ ابا جی نے لکھا تھا کہ یہ واقعہ دراصل اس معروف اور مخلص صاحب ایمان صحابی کا نہیں بلکہ ایک منافق کا تھا۔ انھوں نے یہ بھی لکھا تھا کہ معروف روایت کی سند میں ایک شیعہ راوی ہے جس نے غالباً صحابی کو بدنام کرنے کے لیے اس واقعے میں ان کا نام ذکر کر دیا ہے۔ ابا جی نے مجھ سے کہا کہ میری تحقیق یہ ہے، حالانکہ تمام مفسرین اس واقعے کو اسی طرح بیان کرتے ہیں، لیکن میں نے کبھی اپنی اس تنقید کو شائع نہیں کیا کہ اس سے اکابر کی تحقیق کے بارے میں لوگوں کا اعتماد مجروح ہو سکتا ہے۔ البتہ میرے سوال پر انھوں نے کہا کہ اس نوعیت کا اختلاف یا تنقید سبق کے دوران میں طلبہ کے سامنے بیان کر دینے میں کوئی حرج نہیں۔

تاہم ابا جی کا یہ طرز عمل علمی نوعیت کی باتوں میں ہوتا تھا، جبکہ ایسے امور میں جو کسی اعتقادی یا شرعی مسئلے سے متعلق ہوں اور ان سے عوام الناس کے ایمان واعتقاد پر منفی اثر پڑنے کا خدشہ ہو، وہ مذکورہ مصلحت کو درخور اعتنا نہیں سمجھتے تھے۔ اسی طرح اگر مسئلہ شرعی نوعیت کا ہوتا تو وہ بڑے بڑے علما کے ہاں طبقاً عن طبق چلی آنے والی کسی غلط فہمی کی تردید میں بھی کوئی ہچکچاہٹ محسوس نہیں کرتے تھے۔ مثال کے طور پر امام طحاویؒ کی ایک عبارت سے حنفی فقہا کی ایک بہت بڑی تعداد یہ سمجھتی چلی آ رہی ہے کہ امام صاحب بنو ہاشم کو زکوٰۃ دینے کے جواز کے قائل ہیں۔ ابا جی نے تحقیق کی تو واضح ہوا کہ امام صاحب کا مدعا یہ نہیں ہے، چنانچہ انھوں نے ''الکلام الحاوی فی تحقیق عبارۃ الطحاوی'' کے عنوان سے ایک مفصل کتاب تصنیف فرمائی۔ اس میں لکھتے ہیں:

''اب ہم ان بعض حضرات کے حوالے بتلاتے ہیں جن کی عبارات ہماری نظر سے گزری ہیں اور یہ کہتے ہیں کہ امام طحاوی جواز کے قائل ہیں: ۱۔ علامہ عبد الحیؒ اور چند وہ بزرگ جن کے نام مجموعۂ فتاویٰ میں درج ہیں، ۲۔ شارح ملتقی الابحر، ۳۔ مصنف النہر الفائق، ۴۔ علامہ برجندی عبد العلیؒ، ۵۔ علامہ شرنبلالیؒ، ۶۔ الیاس زادہؒ، ۷۔ قہستانیؒ، ۸۔ صاحب العرف الشذی، ۹۔ سید جلال الدین الخوارزمی کرمانی، صاحب الکفایہ شرح ہدایہ، ۱۰۔ اور صاحب فتاویٰ برہنہ وغیرہ''۔ (ص ۹۹)

''طحاوی کے سب باب کو اول سے آخر تک بغور مطالعہ کریں۔ کہیں صراحۃً یا کنایۃً ایک بھی ایسی جزئی نظر نہ آئے گی جس سے یہ سمجھا جائے کہ امام طحاویؒ جواز کے قائل یا مائل الی الجواز ہیں۔ یہ ان بعض حضرات کی بھیڑ چال تھی۔ سامحہم اللہ تعالیٰ بعموم فضلہ کہ ایک کو غلطی ہوئی تو پھر دوسرے بزرگوں نے اس کو نقل کرنا شروع کر دیا اور امام طحاوی کے قول 'فبہذا نأخذ' کو محرف کر کے بالجواز نأخذ کر دیا جس سے مطلب کیا سے کیا ہو گیا۔'' (ص ۱۰۶)

علمی وفقہی معاملات میں وہ اکابر دیوبند کی تحقیقات کی پابندی کو خاص طور پر ضروری سمجھتے اور اس دائرے سے باہر جانے کو کسی حال میں گوارا نہیں کرتے تھے۔ ۲۰۰۱ء میں 'الشریعہ' میں میرے بعض مضامین شائع ہوئے جن میں، میں نے عبادات اور معاملات سے متعلق بعض فقہی مسائل کے ضمن میں حلقہ دیوبند کے معروف مفتیان کرام کے موقف کے برعکس نقطہ نظر کو علمی طور پر ترجیح دی تھی۔ مجھے اپنی افتاد طبع کے لحاظ سے مطالعہ وتحقیق اور علمی استفادے کو اہل علم کے کسی مخصوص دائرے تک محدود کر دینے کا فلسفہ بدو شعور سے ہی اپیل نہیں کرتا تھا اور اس کے بجائے ''تمتع زہر گوشۂ یافتم'' کا رجحان میرے مزاج کے ساتھ زیادہ ہم آہنگ تھا۔ زمانہ طالب علمی میں ایک موقع پر مدرسہ نصرۃ العلوم کی انجمن طلبہ کے زیر اہتمام ایک تربیتی مناظرے کا اہتمام کیا گیا جس کا موضوع تقلید کا جواز یا عدم جواز تھا۔ مجھے عدم جواز کے نقطہ نظر کی ترجمانی کی ذمہ داری سونپی گئی تھی۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ اس موقع پر دلائل کی ترتیب اور تنقیح کے مرحلے میں جو چیز میرے ذہنی رجحان کی حتمی تعیین میں فیصلہ کن ثابت ہوئی، وہ یہ تھی کہ خود احناف کے ہاں صرف امام ابو حنیفہؒ کے اقوال کی پابندی نہیں کی جاتی، بلکہ دلیل کے وزن اور عملی ضرورت کے لحاظ سے ان کے تلامذہ کا قول اختیار کرنے کی بھی گنجایش موجود ہے۔ یہ بات میری سمجھ میں نہیں آ سکی کہ جب ائمہ احناف کی آرا میں اخذ وانتخاب اور ترجیح کی گنجایش موجود ہے تو اس حوالے سے امت کے دوسرے فقہا کو ''اچھوت'' قرار دینے کا کیا جواز ہے؟ بعد میں ایک موقع پر حضرت مولانا صوفی عبد الحمید سواتی رحمہ اللہ کے اس ارشاد نے میرے اس رجحان کو تقویت دی کہ اگر کوئی شخص علمی دلائل کی روشنی میں دوسرے فقہا کے موقف پر اطمینان محسوس کرتا اور اسے اختیار کرتا ہے تو ایسا کرنے سے وہ حنفیت سے خارج نہیں ہوتا۔ مطالعہ وتحقیق کا دائرہ وسیع ہونے سے ماضی اور حال کے مختلف ومتنوع فکری دھاروں سے زیادہ قریبی واقفیت پیدا ہوئی اور بالخصوص استاذ گرامی جناب جاوید احمد غامدی کی صحبت میں آیت من آیات اللہ، ترجمان القرآن حضرت امام حمید الدین فراہیؒ (جن کی قرآنی بصیرت کے اعتراف میں سید سلیمان ندویؒ، مناظر احسن گیلانیؒ، عبد الماجد دریابادیؒ اور سید ابو الحسن علی ندویؒ جیسے بلند پایہ اہل علم رطب اللسان ہیں) کے مدرسہ فکر اور قرآنی علوم ومعارف میں اس کی تحقیقات وخدمات سے متعارف ہونے کا موقع ملا تو اس رجحان میں مزید پختگی پیدا ہوتی چلی گئی۔

خیر، ابا جی نے 'الشریعہ' میں میرے مضامین پڑھے تو مجھے طلب فرمایا۔ میں حاضر ہوا تو انھوں نے تنہائی میں محبت اور شفقت سے بھرپور لہجے میں گفتگو کی۔ فرمایا کہ دیکھو! جب زاہد نے سیاسی میدان میں قدم رکھا اور مختلف نظریات کے لوگوں اور جماعتوں سے ملنا جلنا شروع کیا تو ہمیں اس بات کا شدید اندیشہ تھا کہ وہ کہیں اپنے بزرگوں (یعنی اکابر دیوبند) کے مسلک سے ہٹ نہ جائے، لیکن الحمد للہ زاہد نے ہمیں اس معاملے میں شکایت کا موقع نہیں دیا۔ اب تمہارے جو مضامین شائع ہوئے ہیں، ان میں تم نے بعض ایسی باتیں لکھی ہیں جو ہمارے بزرگوں کی تحقیق کے خلاف ہیں، جبکہ ان کی تحقیقات حد درجہ غور وفکر اور احتیاط پر مبنی ہوتی ہیں اور ان کے علم وفہم کے مقابلے میں میرے اور تمہارے علم یا رائے اور قیاس کی کوئی حیثیت نہیں۔ ابا جی نے اسی نوعیت کی چند مزید باتیں بھی ارشاد فرمائیں۔ ان کی باتیں دماغ کو تو جتنا اپیل کر سکتی تھیں، اتنا ہی کیا، لیکن ان کے محبت وشفقت میں ڈوبے ہوئے لہجے نے، سچی بات یہ ہے کہ دل کو جیسے اپنی گرفت میں لے لیا تھا۔ میرا ان سے بحث کرنے کا پہلے بھی ہرگز کوئی ارادہ نہیں تھا اور زیر بحث مسائل بھی بالکل جزوی اور فروعی نوعیت کے تھے، چنانچہ میں نے عرض کیا کہ آپ جن باتوں کو غلط سمجھتے ہیں، ان کی نشان دہی کر دیں، میں ان شاء اللہ آئندہ شمارے میں وضاحت کر دوں گا۔ ابا جی اس پر بے حد خوش ہوئے اور دعا دے کر مجھے رخصت کر دیا۔ بعد میں انھوں نے متعدد بار میرے رویے پر بڑی

خوشی کا اظہار کیا اور فرمایا کہ میرا خیال تھا کہ وہ اپنی بات پر اڑ جائے گا اور بحث کرے گا، لیکن اس نے بڑے برخوردارانہ طرز عمل کا اظہار کیا ہے۔ چند دنوں کے بعد انھوں نے میری تحریروں میں سے بعض مسائل کی نشان دہی کر کے ان کے حوالے سے اپنا موقف بتایا اور فرمایا کہ ان کی وضاحت تم اپنے قلم سے خود لکھو، کیونکہ تم ادیب ہو۔ میری یہ وضاحت 'الشریعہ' کے اگلے شمارے میں ''چند علمی مسائل کی وضاحت'' کے زیر عنوان شائع ہوئی۔

فقہی معاملات میں اباجی کے اس زاویہ نظر کا دائرہ روزمرہ کے عام مسائل تک محدود نہیں تھا، بلکہ وہ اجتماعی سطح پر قانون سازی کے ضمن میں بھی قدیم فقہی ذخیرے کی من وعن پابندی کو ضروری سمجھتے تھے اور اس ضمن میں حالات کے تغیر اور عملی ضروریات کی روشنی میں بھی کسی قسم کی کوئی لچک پیدا کرنے کو درست نہیں سمجھتے تھے۔ الیکٹرانک میڈیا کو دینی مقاصد کے لیے ذریعہ ابلاغ کے طور پر استعمال کرنے کے حوالے سے ان کا موقف معروف ہے۔ اسی طرح ایک موقع پر والد گرامی نے انھیں جمعیۃ علماے اسلام کے منشور کا مسودہ تصدیق وتائید کے لیے بھجوایا تو اباجی نے جوابی خط میں لکھا:

''جمعیۃ علماے اسلام کا جو منشور ہے، وہ اپنی کوشش اور اخروی نجات کے لیے ضرور ہونا چاہیے، مگر اس میں بعض چیزیں تو محض شیخ چلی کے پلاؤ کا مصداق ہیں۔ عملاً ان کا پتہ چلے گا، کاغذی کاروائی سے کیا معلوم ہو سکتا ہے؟ اقلیتی فرقوں میں بعض مرتد اور زندیق ہیں، ان کے لیے شرعاً ہم مسلک لوگوں کے لیے تعلیمی ادارے قائم کرنے کی گنجایش کہاں ہے؟ اور پاکستان میں آزاد ومنصفانہ انتخابات کا تصور بھی نہیں ہو سکتا۔ اور اس میں اور بہت سی چیزیں ایسی ہیں جو قابل فہم اور قابل عمل نہیں ہیں اور ''۲۲ نکات کی روشنی میں ترامیم کی جائے گی'' کے جملہ کی بھی سمجھ نہیں آتی۔ گویا یہ اس کے رد کے مترادف ہے۔ بینکوں میں مضاربت، سرکاری اداروں کا تعلیمی نصاب اور زکوٰۃ وعشر کے نظام پر نظر ثانی ایک چیستان ہے۔''

افغانستان کے طالبان کے طرز حکومت کی تائید میں انھوں نے جو تحریر لکھی، اس میں یہ بات خاص طور پر نمایاں کی کہ:

''طالبان کو قانون سازی کی ضرورت نہیں ہے۔ صدیوں سے ہدایہ وغیرہا کی صورت میں ان کے قانون پہلے ہی سے بنے ہوئے ہیں اور قانون سازی کی چپقلش سے وہ فارغ ہیں۔ کتاب نکالی اور فوراً اس کا نفاذ کر دیا۔ جب کہیں کسی نئی چیز میں ان کو ضرورت پیش آئے گی تو بحمد اللہ تعالیٰ جید علماے کرام ان کے ساتھ ہیں جو شوریٰ کی شکل میں اس مشکل کو بھی حل کرنے کی استطاعت رکھتے ہیں۔''

مجھ جیسے ''تجدد پسند'' اس پر کتنی ہی بے اطمینانی کیوں نہ محسوس کرتے ہوں، لیکن اباجی کا موقف بہر حال یہی تھا۔

اس کے ساتھ ساتھ اس معاملے کا ایک دوسرا پہلو بھی ہے جسے وہ پورے اعتدال اور توازن کے ساتھ ملحوظ رکھتے تھے۔ وہ اس نکتے کو خوب اچھی طرح سمجھتے تھے کہ بلند فکری اور ذہنی معیار رکھنے والے اہل علم اور محققین بسا اوقات کسی مسئلے میں عام رائے پر اطمینان محسوس نہیں کرتے اور ان کا غور وفکر انھیں معروف اور مانوس نقطہ نظر سے مختلف رجحان اختیار کرنے پر آمادہ کر سکتا ہے، چنانچہ وہ ایسے اہل علم کے لیے جن کی علمی حیثیت مسلم ہو، عام آرا سے اختلاف یا تفرد کا حق بھی پوری طرح تسلیم کرتے تھے، بشرطیکہ اس اختلاف کو علمی حدود میں رکھا جائے اور اس کی وجہ سے جمہور اہل علم پر طعن وتشنیع کا طریقہ اختیار نہ کیا جائے۔ اپنی کتاب ''سماع الموتی'' میں انھوں نے اپنے اس موقف کی تفصیلاً وضاحت کی ہے۔ لکھتے ہیں:

''ہم نے نہ تو یہ کہا ہے اور نہ ہمارا یہ موقف ہے کہ جمہور شرع کی پانچویں دلیل ہے۔ ادلۃ الشرع صرف چار ہیں، لیکن ان ادلہ اربعہ میں سے جس دلیل کو جمہور بیان کرتے اور اس پر عمل کرتے چلے آئے ہوں، اس کو کوئی بھی دیانت دار اور منصف مزاج عالم کبھی بھی جمہور زنبور کہہ کر ٹرخا تا بھی نہیں رہا اور نہ حضرات جمہور کے خلاف ایسے گندے الفاظ کسی نے زبان وقلم سے نکالے ہیں۔ یہی ہوا ہے کہ جمہور کے ادب واحترام کو ملحوظ رکھ کر علمی طور پر دوسرے پہلو کو ترجیح دی ہے۔'' (ص ۵۵) ''حضرت شیخ الہند کا ارشاد بھی صحیح ہے۔ وہ جمہور اور اکثریت کے قول کو تسلیم کر کے راجح اور مرجوح کا فرق اور لفظ ہمیشہ تحریر فرما کر اسے بیان فرماتے ہیں جو ایک خالص علمی اور تحقیقی بات ہے۔'' (ص ۶۱) ''الغرض اختلافی مسائل میں اکثریت اور جمہور کے قول کو اگر معمول بہ نہ بھی بنایا جائے اور کسی معقول اور قوی وجہ سے اس کے مد مقابل قول کو لیا جائے، تب بھی جمہور کو زنبور کہہ کر ان کو ہدف ملامت بنانا بھی تو کسی عالم کا کام نہیں ہے۔'' (ص ۶۳) ''بلاشبہ ہمارے پیرومرشد قدس اللہ تعالیٰ سرہ اور حضرت شاہ صاحبؒ اور شیخ الہندؒ اور حضرت نانوتویؒ وغیرہ حضرات نے اپنے علم وتحقیق کی بنا پر اپنے تفردات کو بھی لیا ہے، مگر یقین جانیے کہ نہ تو انھوں نے جمہور کو زنبور کہا ہے اور نہ ان کا مذاق اڑایا ہے اور نہ انھوں نے یہ فرمایا ہے کہ علماء حق کے ہاں جمہور کی حیثیت کیا ہے؟'' (ص ۶۴)

ایسی انفرادی اور اچھوتی آرا کی بنا پر وہ نہ تو ان شخصیات کے مرتبہ ومقام اور احترام میں تقصیر کو گوارا کرتے تھے اور نہ ان کی علمی حیثیت کو کلیتاً مجروح کرنے یا یا ان کی دینی خدمات کی نفی کرنے کو درست سمجھتے تھے۔ وفات سے چند ماہ قبل کی بات ہے کہ میں ان کی خدمت میں حاضر ہوا۔ گفتگو کے دوران میں، میں نے کہا کہ آپ علمی مسائل میں جمہور کی رائے کی پابندی پر بہت اصرار کرتے ہیں، لیکن بہت سے اکابر اہل علم، مثلاً امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ کے ہاں متعدد مسائل میں عام موقف سے ہٹ کر رائے پیش کرنے کی مثالیں بھی ملتی ہیں۔ (امام ابن تیمیہ کی ایسی آرا کی تعداد تین درجن کے قریب شمار کی گئی ہے) کیا یہ حضرات جمہور کی رائے کی اہمیت سے واقف نہیں تھے اور کیا ان کو یہ حق حاصل تھا کہ وہ اپنی منفرد رائے قائم کریں؟ انھوں نے فرمایا، ہاں۔ میں نے پوچھا کہ کیا ایسا کرنے سے وہ گمراہی کا ارتکاب کرتے ہیں؟ انھوں نے کہا، نہیں۔ میں نے کہا کہ کیا ایسا کرنے کے باوجود وہ اہل سنت کے دائرے میں ہی رہتے ہیں؟ انھوں نے کہا، ہاں۔ اباجی نے اپنی تصانیف میں بھی ہر جگہ امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ کا ذکر ہر جگہ نہایت ادب واحترام سے ''امام'' اور ''شیخ الاسلام'' وغیرہ کے القاب کے ساتھ کیا ہے۔ ''راہ ہدایت'' میں لکھتے ہیں:

''اکثر اہل بدعت مشہور محدث حافظ ابن تیمیہؒ المتوفی ۷۲۸ھ اور حافظ ابن القیمؒ کی رفیع شان میں بہت ہی گستاخی کرتے ہیں، مگر ملا علی القاری الحنفیؒ ان دونوں بزرگوں کی تعریف ان الفاظ سے کرتے ہیں کہ .... یہ دونوں اہل السنۃ والجماعۃ کے اکابر میں اور اس امت کے اولیا میں تھے۔'' (ص ۱۲۰، ۱۲۱)

جمہور سے ہٹ کر منفرد آرا قائم کرنے والے سبھی اہل علم کے بارے میں ان کے ہاں یہی رویہ دیکھنے کو ملتا ہے۔ مثال کے طور پر مشہور مورخ ابن خلدونؒ نے تاریخی زاویے سے بعض ایسی روایات پر بھی تنقید کی ہے جو محدثین کے ہاں مستند سمجھی جاتی ہیں، مثلاً حضرت آدم کا قد ساٹھ ہاتھ ہونے کی روایت اور امام مہدی کے ظہور سے متعلق روایات۔ اس کے باوجود امام

اہل سنت نے ہر جگہ ان کا ذکر ''علامہ'' اور ''مورخ اسلام'' کے القاب سے کیا ہے۔ تسکین الصدور میں ابن حزمؒ کی جمہور سے بالکل ہٹی ہوئی ایک رائے بیان کرتے ہوئے اور اسے ''غلط نظریہ'' قرار دیتے ہوئے بھی انھوں نے ان کے لیے ''علامہ'' کا لقب استعمال کیا ہے۔ نواب صدیق حسن خانؒ کے ہاں مشرک کے ذبیحہ کے حلال ہونے، چار سے زائد عورتوں سے نکاح کے جواز اور نکاح متعہ کی حلت جیسے بہت سے تفردات پائے جاتے ہیں، لیکن اباجی نے اپنی تصانیف میں بے شمار جگہ پر ان کی آرا کا حوالہ دیا ہے اور صرف الزامی بحثوں میں نہیں، بلکہ خالص تحقیقی امور میں بھی ان کی رائے سے استناد کیا ہے۔ مولانا عبید اللہ سندھیؒ کے بعض تفردات اور شاذ آرا کے تناظر میں ان کی شخصیت حلقہ دیوبند میں خاصے بحث ونزاع کا موضوع ہے اور خود ان کے دفاع میں قلم اٹھانے والے بزرگ، مثال کے طور پر استاذ گرامی حضرت مولانا صوفی عبد الحمید صاحب سواتی نور اللہ مرقدہ تسلیم کرتے ہیں کہ ان کے ہاں ''مرجوح اور شاذ'' آرا موجود ہیں۔ برادرم مولانا مشتاق احمد چنیوٹی نے ایک مکتوب میں اس ضمن میں استفسار کیا تو اباجی نے انھیں لکھا کہ ''مولانا سندھیؒ کے بعض نظریات سے اختلاف تو کیا جا سکتا ہے، لیکن ان پر کوئی فتویٰ نہیں لگتا۔'' مولانا شبلی نعمانیؒ کے بارے میں مولانا علی میاںؒ کی کتاب ''نزہۃ الخواطر'' میں یہ تبصرہ ایک مرتبہ انھوں نے خود مجھے دکھایا کہ وہ کلامی مسائل میں معتزلی تھے، لیکن اپنی کتابوں میں شبلی کا ذکر کرتے ہوئے انھوں نے ہر جگہ ''علامہ'' کا لقب استعمال کیا ہے، بلکہ ایک جگہ ''دور حاضر کے مشہور اور معتبر مورخ حضرت مولانا شبلی نعمانی'' کے الفاظ بھی لکھے ہیں۔ مولانا ابو الکلام آزاد کی بہت سی تفسیری آرا کو اہل علم نے نقد وجرح کا موضوع بنایا ہے اور خاص طور پر مولانا محمد یوسف بنوریؒ نے ان کے اسلوب تفسیر پر شدید تنقید کرتے ہوئے ان کا ذکر سر سید احمد خان اور علامہ عنایت اللہ مشرقی کے ساتھ کیا ہے، لیکن استاذ گرامی مولانا مفتی محمد عیسیٰ خان صاحب گورمانی نے اباجی سے کہا کہ بعض اہل علم مولانا ابو الکلام آزادؒ کے بارے میں اچھی رائے نہیں رکھتے تو فرمایا: مولانا حسین احمد مدنیؒ کے درس میں ایک طالب علم نے رقعہ لکھا جس میں مولانا ابو الکلام آزاد کو برا بھلا کہا گیا تھا۔ حضرت مدنی نے رقعہ پڑھ کر کہا کہ یہ کس گدھے نے لکھا ہے؟ ہمارے استاد شیخ الہند مولانا محمود حسنؒ تحریک آزادی میں مولانا آزاد کی خدمات کو سراہتے اور ان کی تعریف کیا کرتے تھے۔ مولانا امین احسن اصلاحیؒ کی منفرد تفسیری آرا اور رجحانات بھی کسی سے مخفی نہیں، لیکن اباجی نے ان کا ذکر بھی ''حضرت مولانا امین احسن اصلاحی'' کے الفاظ سے کیا ہے۔ البتہ اختلاف کی بنیاد پر طعن وتشنیع کرنے والے حضرات کے معاملے میں ان کی روش مختلف تھی، چنانچہ مشہور معتزلی نحوی اور لغوی زمخشری کے بارے میں فرماتے تھے کہ وہ لغت اور نحو کا امام ہے، لیکن اہل سنت کے بارے میں سخت تعصب رکھتا ہے۔ پھر بتاتے تھے کہ ایک جگہ اس نے اپنے مسلک کی وکالت کرتے ہوئے اہل سنت کے بارے میں 'کالحمیر الموکفة' کے الفاظ لکھے ہیں۔ فرماتے تھے کہ جب سے میں نے یہ الفاظ پڑھے ہیں، اس کے بعد سے میں زمخشری کے لیے رحمہ اللہ کا جملہ مستقلاً استعمال نہیں کرتا۔

اسی طرح بہت سے اکابر کے ہاں بعض ایسی آرا اور تعبیرات ملتی ہیں جو بظاہر شرعی نقطہ نظر سے قابل اعتراض اور قابل گرفت ہیں۔ حضرت انھیں قابل اعتراض ہی سمجھتے تھے اور ان کے بے جا دفاع کی روش اختیار نہیں کرتے تھے۔ اپنی تصنیفات میں انھوں نے متعدد جگہ اس ضمن میں اپنے موقف کی وضاحت کی ہے۔ ''دل کا سرور'' میں لکھتے ہیں: ''علماء دین کی غلطیاں اور لغزشیں عین ایمان ہرگز نہیں ہوا کرتیں۔'' (ص ۱۸۱) مزید فرماتے ہیں: ''اگر کسی بزرگ کا کوئی قول کسی جگہ مجمل ہے تو ان ہی کی عبارت میں دوسری جگہ اس کی تفصیل بھی عموماً موجود ہے۔ اگر بالفرض اس کی کوئی مناسب تاویل آپ کو نہیں مل سکتی تو قرآن کریم اور احادیث اور اجماع امت کے مقابلے میں ان کی وہ بات مردود ہوگی، نہ یہ کہ اس پر دین کی اور خصوصاً عقیدہ کی عمارت استوار ہو سکتی ہے۔'' (ص ۲۱۹) میں نے ایک مرتبہ ان سے پوچھا کہ کیا صوفیا کا تصور وحدت الوجود قرآن وسنت کے مطابق ہے؟ انھوں نے کہا: ''کھینچ تان کر ہی مطابق بنایا جاتا ہے''، لیکن اس تصور کے سب سے بڑے ترجمان امام محی الدین ابن العربی کا ذکر انھوں نے اپنی تصانیف میں بے حد احترام کے ساتھ کیا ہے۔ ایک دوسرے موقع پر اس نوعیت کی بعض تعبیرات کے تناظر میں میرے استفسار کے جواب میں انھوں نے فرمایا کہ ہمارا طریقہ بحمد اللہ اعتدال کا طریقہ ہے۔ ہم نہ اہل بدعت کی طرح اکابر کی غلطیوں کو مذہب اور مسلک بناتے ہیں اور نہ غیر مقلدین کی طرح انھیں طعن وتشنیع کا ہدف بناتے ہیں۔

مذکورہ امور کی روشنی میں، میرے نزدیک اباجی کے موقف اور نقطہ نظر کی درست تعبیر یہ بنتی ہے کہ وہ اصولی طور پر جمہور اہل علم کی آرا اور تعبیرات ہی کو درست سمجھتے اور اپنے لیے اس کی پابندی کو بالعموم ضروری تصور کرتے تھے، تاہم اہل علم کے لیے دلائل کی روشنی میں انفرادی رجحانات کا حق بھی تسلیم کرتے تھے اور جمہور سے محض علمی اختلاف کو اہل سنت کے منہج سے انحراف یا گمراہی قرار نہیں دیتے تھے، حتیٰ کہ اگر کسی صاحب علم یا کسی طبقے کی کوئی بات فی الواقع جادۂ صواب سے ہٹی ہوئی اور علمی وشرعی معیارات کی روشنی میں قابل تنقید ہوتی تو اس رائے پر تنقید کے باوجود صاحب رائے کی دینی وعلمی خدمات کی نفی کرنے یا اس کی شخصیت کے مقام اور احترام کو نظر انداز کرتے ہوئے فتویٰ بازی اور طعن وتشنیع کو جائز نہیں سمجھتے تھے۔ میرے نزدیک جمہور سے اختلاف کرنے والے اصحاب علم کے معاملے میں یہی مسلک، مسلک اعتدال ہے، اور میں سمجھتا ہوں کہ مذکورہ اصولی رویے کو صرف روایتی مذہبی حلقوں میں معروف اور مانوس اہل علم تک محدود رکھنے کے بجائے کسی بھی علمی مکتب فکر سے تعلق رکھنے والے اصحاب علم کے حوالے سے اس کی پابندی کو ملحوظ رکھنا چاہیے۔

اباجی دیوبندی مکتب فکر سے تعلق رکھنے والی تمام جماعتوں اور تنظیموں کے ساتھ مشفقانہ تعلق رکھتے تھے اور اپنے اپنے دائرے میں ان کی جدوجہد کی کامیابی کے لیے دعا گو بھی رہتے تھے، تاہم اس کے ساتھ ساتھ وہ ان کی بے اعتدالیوں پر بھی پوری طرح نظر رکھتے اور موقع ومحل کی مناسبت سے ان کی طرف توجہ بھی دلاتے رہتے تھے۔

تبلیغی جماعت کے کام کی وہ بڑی قدر کرتے اور اس کے اثرات ونتائج پر خوشی کا اظہار فرماتے تھے، لیکن اس سے وابستہ بہت سے حضرات کے فکری غلو کی بھی واضح طور پر تردید کرتے تھے۔ ایک مضمون میں تحریر فرماتے ہیں:

''بعض کم فہم لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ مجموعی طور پر ساری امت پر دعوت الی اللہ لازم ہے، مگر ایسا نہیں ہے بلکہ امر بالمعروف والنہی عن المنکر یعنی نیکی کا حکم دینا اور برائی سے روکنا، یہ تو امت کے ہر فرد کا فریضہ ہے اور یہ کام انفرادی طور پر بھی باحسن وجوہ ہو سکتا ہے۔ مثلاً ہر گھر کے سربراہ، ذمہ دار، کفیل، استاد اور صاحب اثر کا کام ہے کہ وہ اپنے اہل خانہ کو، بیوی بچوں کو، چھوٹے بہن بھائی اور شاگرد اور زیر اثر لوگوں کو نیکی کرنے کا حکم اور ترغیب دے اور برائی سے منع کرے۔ ...... اس کے لیے اجتماع، اشتہار، منادی اور باہر نکلنا، گشت کرنا اور اکٹھ کرنا ضروری نہیں۔ ایک آدمی بھی یہ کر سکتا ہے اور ایک ایک کو بھی امر ونہی کر سکتا ہے۔ اور دعوت الی اللہ ساری امت پر لازم

نہیں ہے۔ (''دعوت الی اللہ کی ضرورت، اہمیت اور چند اصول''، ماہنامہ نصرۃ العلوم، نومبر ۹۵ء، ص ۱۳، ۱۴)

اسی مضمون میں آگے چل کر فرماتے ہیں:

''حضرت تھانویؒ فرماتے ہیں:...... ''مجھے اندیشہ ہے کہ کبھی ایسا نہ ہو کہ مدرسین وطلبہ پڑھنا پڑھانا چھوڑ دیں بلکہ اس کو اپنے بزرگوں سے پوچھو کہ ہم کو کیا کرنا چاہیے۔'' .... جو حضرات نئے نئے تبلیغی بنتے ہیں، ان کو بھی حضرت تھانویؒ کے یہ ارشادات پیش نظر رکھنے چاہییں کہ جو علما یا طلبا درس وتدریس کے اوقات میں باہر نہیں نکلتے تو ان کو حقارت کی نگاہ سے ہرگز نہ دیکھیں، اس لیے کہ وہ بھی مبلغ بلکہ اصل مبلغ ہیں۔ اسلام میں افراط وتفریط اور غلو بری چیز ہے۔'' (ص ۱۵، ۱۷)

افغانستان کی تحریک طالبان کے ساتھ انھیں بہت زیادہ قلبی لگاؤ تھا۔ ملا محمد عمر کی قیادت میں امارت اسلامیہ کے قیام کے بعد وہ باقاعدہ افغانستان کے دورے پر گئے اور ملا محمد عمر سے ملاقات کی۔ انھوں نے طالبان کی تائید اور حمایت کے لیے ایک باقاعدہ تحریر بھی لکھی جو مختلف رسائل وجرائد میں شائع ہوئی۔ تاہم وہ جہادی تنظیموں کی طرف سے شرعی وفقہی اصول وضوابط سے ہٹ کر کیے جانے والے اعلانات، فتووں اور نعروں کی تائید نہیں کرتے تھے۔ جنرل ضیاء الحق مرحوم کے دور میں کشمیر میں شروع کی جانے والی جہادی سرگرمیوں کی شرعی وفقہی حیثیت کے بارے میں وہ تحفظات رکھتے تھے اور ایک دفعہ دوران سبق میں انھوں نے اس کا اظہار بھی کیا، لیکن ساتھ یہ فرمایا کہ جو نوجوان مخلصانہ جذبے سے جا کر شہید ہو رہے ہیں، انھیں ان کی نیت کے مطابق اللہ تعالیٰ سے اجر ملے گا۔ محمد اسلم معاویہ صاحب بیان کرتے ہیں کہ ایک ملاقات میں انھوں نے اباجی سے پوچھا گیا کہ مولانا مفتی نظام الدین شامزیؒ صاحبؒ نے فتویٰ دیا ہے کہ ہندوستان کے مسلمانوں پر جہاد فرض ہو چکا ہے، آپ کی اس کے بارے میں کیا رائے ہے؟ انھوں نے فرمایا کہ مفتی صاحب کو اس فتوے سے رجوع کرنا چاہیے، کیونکہ ہندوستان میں بھی بڑے بڑے علما موجود ہیں جو وہاں کی صورت حال کو بہتر سمجھتے ہیں۔

سپاہ صحابہ کے متشددانہ طرز عمل کی بھی انھوں نے کبھی تائید یا حمایت نہیں کی، بلکہ اس کی قیادت کے نام ایک باقاعدہ خط لکھ کر انھیں اصلاح طلب امور کی طرف توجہ دلائی۔ ۲۳/ جنوری ۱۹۹۱ء کو لکھے گئے اس خط میں وہ فرماتے ہیں:

''نوجوان جذباتی ہوتے ہیں اور جذبات میں بہت کچھ کر اور کہہ جاتے ہیں۔ شدت اور سختی سے کبھی مسائل حل نہیں ہوتے اور نہ قوت اور طاقت سے کسی فرد یا نظریہ کو ختم کیا جا سکتا ہے۔... اس لیے گزارش ہے کہ نوجوانوں کو قولاً اور فعلاً شدت اختیار کرنے سے سختی کے ساتھ روکیں۔ رافضیوں کے کفر میں تو شک نہیں، مگر در ودیوار پر کافر کافر لکھنے اور نعرہ بازی سے بجائے فائدہ کے نقصان ہوگا۔''

مذہبی جماعتوں میں انھیں سب سے زیادہ شکایت مذہبی سیاسی جماعتوں کے قائدین سے تھی اور وہ جمعیۃ علماے اسلام کے راہ نماؤں کے شخصی اختلافات، گروہ بندی کی سیاست اور مفاد پرستی کے طرز عمل سے سخت نالاں تھے۔ ۲۳ر نومبر ۱۹۹۴ء کو والد گرامی کے نام لکھے گئے ایک خط میں لکھتے ہیں:

''جمعیۃ کے دو دھڑے پہلے ہی موجود ہیں اور دونوں کسی نہ کسی بہانہ اور عذر سے حکومت وقت کے ساتھ تعاون کر رہے ہیں اور یہ کہا جائے کہ اس کے خصیہ بردار ہیں تو غلط نہ ہوگا اور تم نے یہ فارمولا تیار کیا ہے کہ ''میں نے

جمعیۃ علماء اسلام پاکستان کا فارورڈ بلاک قائم کرنے کا فیصلہ کیا ہے''۔ یہی تفریق کی شکل میں تیسرا دھڑا بنے گا اور اس کو کندھا دینے کے لیے ضرور چند مجنوں مل جائیں گے۔.... دونوں صاحبزادوں کی عداوت انتہا کو پہنچ چکی ہے۔ ان کا آپس میں ملنے کا امکان بھی نہیں ہے اور ان دونوں کو پہلے تو عہدوں سے الگ کرنا ہی مشکل ہے۔ اگر بالفرض الگ کر بھی دیے گئے تو ہر ایک کے مفاد پرست احباب انھیں سے چمٹے رہیں گے اور ان میں سے ہر ایک اس کا مدعی ہوگا کہ اصلی جمعیۃ تو میری ہے، دوسرا دھڑا غاصب ہے۔''

غالباً ۲۰۰۲ کے اواخر میں ان پر فالج کا حملہ ہوا اور وہ ایک حد تک معذور ہو گئے۔ اس کے بعد انھوں نے کم وبیش سات سال اسی کیفیت میں بستر علالت پر گزارے۔ اس دوران میں ان کے روز مرہ کے معمولات کا نقشہ بالکل بدل گیا، تعلیم وتدریس کا سلسلہ منقطع ہوا، مطالعہ اور تصنیف وتحقیق کو جاری رکھنا ناممکن ٹھہرا، اور عوارض کے ہجوم نے انھیں مسلسل ایک صبر آزما صورت حال سے دوچار کیے رکھا، لیکن اگر کسی چیز میں کوئی فرق واقع نہیں ہوا تو وہ ان کی علمی جستجو اور گرد وپیش کے حالات سے باخبر رہنے کا اشتیاق تھا۔ گو ان کے لیے علم وتحقیق کے میدان میں بذات خود گرم دم جستجو ہونے کا موقع باقی نہیں رہا تھا، لیکن ان کے پاس تھوڑی دیر بیٹھنے اور ان کی گفتگو سننے والا ہر شخص اندازہ کر سکتا تھا کہ علم کے لیے ان کے تجسس اور اشتیاق کا کیا عالم ہے۔ یہ محرومی ان کے لیے جسمانی صحت کی محرومی سے کہیں بڑھ کر تھی۔ وہ اپنی صحت یابی کی خواہش رکھتے تھے اور بارہا یہ سوال کرتے تھے کہ کیا میں دوبارہ چل پھر سکوں گا، لیکن ان کی اس خواہش کے پیچھے بھی یہی آرزو کارفرما دکھائی دیتی تھی کہ وہ ایک بار پھر مطالعہ اور تحقیق کا سلسلہ شروع کر سکیں اور کتابوں سے استفادے کے لیے دوسروں کے محتاج نہ رہیں۔ میں جب بھی کبھی حاضر ہوتا اور عیادت کرنے والوں کی آمد ورفت مانع نہ ہوتی تو ان کی خواہش یہی ہوتی تھی کہ میں انھیں نئی طبع ہونے والی کتابوں کے بارے میں بتاؤں یا الماری سے کوئی عربی کتاب لے کر اس کے اقتباسات انھیں سناؤں۔ فرماتے تھے کہ عربی کی کتابیں سننے کو جی چاہتا ہے، لیکن میرے پاس موجود جو بچیاں مجھے کتاب پڑھ کر سناتی ہیں، وہ عربی نہیں پڑھ سکتیں۔ کسی نئی کتاب کے بارے میں بتایا جاتا تو تین باتیں اہتمام سے دریافت کرتے تھے: ایک یہ کہ کتاب کتنی جلدوں میں ہے، دوسری یہ کہ کہاں سے طبع ہوئی ہے، اور تیسری یہ کہ کیا یہ تمہارے کتب خانے میں موجود ہے؟ بعض اوقات بڑی حسرت سے فرماتے کہ جب صحت تھی تو بہت سی کتابیں دستیاب نہیں تھیں، اور اب کتابیں ملتی ہیں تو صحت ساتھ چھوڑ گئی ہے۔ ایک دفعہ میں اپنا لیپ ٹاپ لے کر گیا اور انھیں بتایا کہ اس میں حدیث، تفسیر، فقہ، رجال اور تاریخ کے تمام معروف مآخذ موجود ہیں۔ وہ حیرانی سے مختلف کتابوں کے بارے میں پوچھتے رہے اور بعض چیزوں کے بارے میں فرمایا کہ رجال کی کتابوں میں دیکھ کر مجھے بتاؤ کہ ان کے بارے میں کیا لکھا ہے۔

اباجی مدرسہ نصرۃ العلوم گوجرانوالہ میں نصف صدی تک صحاح ستہ اور بالخصوص صحیح بخاری کا درس دیتے رہے، چنانچہ صحیح بخاری کی محدثانہ خصوصیات ان کی دلچسپی کا خاص موضوع تھیں اور امام بخاری کے استنباطات، احادیث کے اطراف اور دیگر معلومات کے حوالے سے ان کا حافظہ بڑھاپے اور علالت کی اس کیفیت میں بھی قابل رشک تھا۔ اپنے پاس حاضر ہونے والے طلبہ اور علماسے وہ جو مختلف علمی سوال کرتے تھے، ان کا مرکز بھی عام طور پر صحیح بخاری ہوتی تھی۔ ایک دن میری موجودگی میں چند طلبہ حدیث کی سند حاصل کرنے کے لیے آئے تو اباجی نے ان میں سے ایک دوست سے پوچھا کہ صحیح بخاری میں

ثلاثیات کتنی ہیں؟ وہ اس کا جواب نہ دے سکے جس پر اباجی نے بہت افسوس کا اظہار کیا اور مجھ سے مخاطب ہو کر فرمایا کہ میں نے ''احسان الباری'' میں صحیح بخاری کی ثلاثیات کے مواقع جلد اور صفحہ کے حوالے کے ساتھ درج کر دیے ہیں، لیکن اگر ان روایات کا متن بھی الگ کر کے شائع کر دیا جائے تو طلبہ کو اس سے فائدہ ہوگا۔ ان کی اس فرمایش کی تعمیل میں، میں نے برادرم مولانا وقار احمد (فاضل مدرسہ نصرۃ العلوم گوجرانوالہ) سے گزارش کی اور انھوں نے صحیح بخاری کی ثلاثی روایات کے متن اور ترجمہ کے ساتھ ساتھ ان روایات کے راویوں کے مختصر تعارف پر مشتمل ایک مختصر رسالہ مرتب کر دیا جسے الشریعہ اکادمی کی طرف سے شائع کر کے دورۂ حدیث کے طلبہ میں تقسیم کیا گیا۔

اباجی کی وفات سے چند ماہ پہلے ایک ملاقات میں، میں نے ان سے کہا کہ آپ نے ایک مرتبہ دوران سبق میں صالحین کے ساتھ توسل کے جواز کے لیے جو یہ تاویل ذکر کی تھی کہ ''بزرگوں کے ساتھ عقیدت ومحبت بھی ایک نیک عمل ہے اور نیک عمل کا بطور وسیلہ ذکر کر کے اللہ تعالیٰ سے دعا کی جا سکتی ہے''، اس کی کیا ضرورت ہے اور براہ راست نیک لوگوں کی ذات کا حوالہ دے کر دعا کرنا کیوں جائز نہیں؟ اباجی نے فرمایا کہ ہاں، وہ بھی ٹھیک ہے اور ایک حدیث سے اس کی تائید ہوتی ہے۔ اباجی نے اس ضمن میں 'کان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یستفتح بصعالیك المہاجرین' کی روایت کا حوالہ دیا، یعنی نبی صلی اللہ علیہ وسلم فقراے مہاجرین کے وسیلے سے فتح ونصرت کی دعا مانگا کرتے تھے۔ (یہ روایت حافظ مقدسی کی الاحادیث المختارۃ، رقم ۱۵۰۷ اور طبرانی کی المعجم الکبیر، رقم ۵۸۷ میں امیہ بن خالد بن اسید سے مرسلاً مروی ہے، البتہ عام طور پر علما نے اسے فقراے مہاجرین سے دعا کرانے کے مفہوم میں لیا ہے (قرطبی، الجامع لاحکام القرآن ۲/۲۶۔ سیوطی، الجامع الصغیر، رقم ۵۷۸) جو توسل بالذات سے مختلف صورت ہے۔)

ایک دن میں نے ان کی بیماری کے پیش نظر ان کا دل بڑھانے کے لیے عرض کیا کہ سنا ہے کہ نیک لوگوں کو آخری عمر میں علالت اور معذوری کی جس کیفیت کا سامنا کرنا پڑتا ہے، وہ ان کے لیے رفع درجات کا ذریعہ بن جاتی ہے، کیا یہ بات درست ہے؟ انھوں نے فرمایا کہ یہ سامنے کی الماری کے فلاں شیلف میں فلاں کتاب رکھی ہے، اس کی دوسری جلد کا صفحہ نمبر ۸ کھولو۔ میں نے وہ صفحہ کھولا تو وہاں اسی مضمون کی حدیث موجود تھی۔ (اپنا حال یہ ہے کہ اب کتاب کا نام بھی ذہن میں نہیں رہا) پھر انھوں نے پوچھا کہ یہ روایت کس صحابی سے مروی ہے اور کس کتاب کے حوالے سے نقل کی گئی ہے؟ میں نے بتایا کہ عبد اللہ بن مغفل رضی اللہ عنہ راوی ہیں اور مسند احمد میں روایت ہوئی ہے۔ انھوں نے مجھے مسند احمد کی متعلقہ جلد بتائی اور کہا کہ اس میں عبد اللہ بن مغفل کے مسند میں یہ روایت تلاش کرو۔ میں نے تلاش کر کے بتائی تو اس کا صفحہ نمبر پوچھا۔ میرے بتانے پر انھوں نے صفحہ نمبر دہرایا اور اسے گویا اپنے ذہن میں محفوظ کر لیا۔ ایام علالت میں ہی چند دنوں کے لیے گوجرانوالہ، عم مکرم مولانا عبد القدوس خان قارن کی رہایش گاہ پر تشریف لائے تو یہاں بھی مدرسہ نصرۃ العلوم کی لائبریری سے مختلف کتابیں منگوا کر دیکھتے رہے۔ مولانا سید ابو الحسن علی ندویؒ کی کتاب ''نزہۃ الخواطر'' کی آٹھویں جلد انھوں نے اسی موقع پر منگوائی اور مجھ سے کہا کہ اس کے فلاں صفحہ پر دیکھو، مولانا شبلی نعمانی کے بارے میں کیا لکھا ہے۔ میں نے وہ صفحہ کھولا تو وہاں علی میاں کا یہ تبصرہ درج تھا کہ شبلی، کلامیات میں معتزلہ کی طرف رجحان رکھتے تھے۔ غرض یہ کہ علم، مطالعہ اور تحقیق کے ساتھ ان کا اشتغال آخر وقت تک قائم رہا اور اس معاملے میں بحمد اللہ ان کی یادداشت بھی پوری طرح قائم رہی۔ یہ سلسلہ غالباً وفات سے چند ہی دن قبل منقطع ہوا۔

والد گرامی سعودی عرب کے حالیہ سفر سے ان کی فرمایش پر مسند ابی یعلیٰ کا نسخہ لائے تھے۔ انھوں نے کتاب پیش کی تو اباجی نے اشارے سے فرمایا کہ اسے الماری میں رکھ دیا جائے، لیکن غالباً انھیں اس سے استفادہ کا موقع نہیں مل سکا۔

مارچ کے آخر یا اپریل ۲۰۰۹ کے شروع کی بات ہے۔ میں نے خواب میں دیکھا کہ اباجی اپنی صحت کے زمانے کی طرف واپس لوٹ چلے ہیں اور اسی طرح ہشاش بشاش اور متحرک ہیں جیسے وہ اپنی علالت سے پہلے ہوا کرتے تھے۔ پھر اسی خواب میں دیکھتا ہوں کہ میں نے اباجی کے سامنے اپنا یہ خواب بیان کیا ہے اور اباجی مجھے اس کی تعبیر یہ بتاتے ہیں کہ اس کا مطلب یہ ہے کہ اب میں جلد دنیا سے چلا جاؤں گا۔ اباجی کو خواب کی تعبیر کے فن میں جو غیر معمولی درک حاصل تھا، یہ شاید اسی کا ایک نمونہ تھا کہ خواب میں بتائی ہوئی ان کی تعبیر بھی بالکل درست ثابت ہوئی اور اس کے لگ بھگ ایک ماہ کے بعد ۴ اور ۵ مئی کی درمیانی شب کو سوا بجے کے قریب وہ اس دار فانی سے رخصت ہو گئے۔ میری ان سے آخری ملاقات والد گرامی، والدہ محترمہ اور اپنی فیملی کے ساتھ اس سے تین روز قبل جمعۃ المبارک کے دن ہوئی۔ اس وقت وہ کھانا پینا اور گفتگو کرنا کم وبیش بند کر چکے تھے، البتہ یادداشت قائم تھی اور بہت اصرار پر ایک آدھ لفظ میں بات کا جواب دیتے تھے۔

علالت کے ان سات آٹھ سالوں میں گھر کے لوگوں میں سے بطور خاص عم مکرم مولانا منہاج الحق خان راشد اور ان کے اہل خانہ، ہماری چھوٹی پھوپھی اور ان کی بیٹیوں اور وقتاً فوقتاً برادرم ممتاز الحسن احسن اور برادرم سرفراز حسن حمزہ نے جبکہ اباجی کے مخلص معتقدین میں سے حاجی لقمان میر صاحب، ڈاکٹر فضل الرحمٰن صاحب اور مولانا محمد نواز بلوچ نے اپنی اپنی بساط اور توفیق کے مطابق ان کی پرخلوص خدمت کی اور ان کی دعاؤں سے وافر حصہ پایا۔ جنازے کے موقع پر ڈاکٹر فضل الرحمٰن صاحب بلک بلک کر روتے رہے۔ یوں لگتا تھا جیسے ان کے حقیقی والد فوت ہو گئے ہوں۔ ان سب حضرات کے لیے بابایاں اجر، ان شاء اللہ، اللہ تعالیٰ کے ہاں محفوظ ہے۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو اخلاص، محبت اور عقیدت کے ساتھ صحیح معنوں میں اباجی کے لیے صدقہ جاریہ بننے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین

حضرت صوفی صاحبؒ

گزشتہ سال ۶ / اپریل کو ہمارے خاندان کے دوسرے بڑے بزرگ حضرت مولانا صوفی عبد الحمید سواتی رحمہ اللہ کی وفات پر ماہنامہ نصرۃ العلوم کے ''مفسر قرآن نمبر'' کے لیے چند سطور تحریر کی گئی تھیں۔ چند اضافوں کے ساتھ، مناسب معلوم ہوتا ہے کہ انھیں یہاں بھی درج کر دیا جائے:

استاذ گرامی حضرت مولانا صوفی عبد الحمید سواتی رحمۃ اللہ علیہ کا تعارف خاندان کے ایک بڑے بزرگ اور سرپرست کی حیثیت سے تو بچپن ہی سے تھا اور مجھے یاد ہے کہ بہت چھوٹی عمر میں والد محترم نے مجھے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی بعض مختصر احادیث کا متن اور ترجمہ یاد کرایا تو ایک موقع پر مجھے لے کر صوفی صاحب کی خدمت میں حاضر ہوئے اور میں نے ایک آدھ حدیث اور اس کا ترجمہ سنا کر ان سے برکت کی دعا حاصل کی، تاہم مجھے انھیں نسبتاً قریب سے دیکھنے اور ان سے باقاعدہ شرف تلمذ حاصل کرنے کے ساتھ ساتھ ان کی ذاتی شفقت اور عنایت سے بہرہ ور ہونے کا موقع ان کی آخری عمر میں ہی ملا۔ ان کی حیات کا بڑا حصہ جو تعلیمی، تدریسی، تصنیفی اور سیاسی سرگرمیوں سے بھرپور رہا ہے، میرے براہ راست مشاہدے میں نہیں رہا، چنانچہ ان کے کمالات واوصاف کا کوئی جامع مرقع کھینچنا میرے لیے اپنے محدود اور جزوی مشاہدے کی بنا پر ممکن

نہیں، البتہ ان کی غیر معمولی شخصیت کے بعض نہایت نمایاں نقوش یقیناً میرے محسوسات وتاثرات میں مرتسم ہیں اور انھیں قارئین تک منتقل کرنا بھی شاید کسی حد تک ممکن ہے۔

صوفی صاحب چھوٹوں اور بڑوں، سب کے بزرگ تھے۔ ان کی بزرگانہ شفقت سے ہر شخص اپنا حصہ پاتا تھا اور میری طرح غالباً ہر شخص یہ محسوس کرتا تھا کہ اسے ان کی خاص توجہ اور عنایت حاصل ہے۔ ۱۹۹۱ء میں، میں نے مدرسہ نصرۃ العلوم کے درس نظامی کے شعبے میں درجہ سادسہ میں داخلہ لیا تو صوفی صاحب پیرانہ سالی کے تقاضے سے تدریسی مصروفیات کو دورۂ حدیث اور موقوف علیہ کے دو تین اسباق تک محدود کر چکے تھے۔ والد گرامی سے سن رکھا تھا کہ صوفی صاحب عربی ادب کے ساتھ خاص شغف رکھتے ہیں اور ایک عرصے تک درسی وغیر درسی کتب ادب کی تدریس خاص ذوق کے ساتھ فرماتے رہے ہیں۔ میں نے اسی مناسبت سے فرمائش کی کہ میں آپ سے 'السبع المعلقات' پڑھنا چاہتا ہوں۔ طبعی طور پر تدریس ان کے لیے اب کوئی خاص دلچسپی کی چیز نہیں رہ گئی تھی، لیکن انھوں نے کمال شفقت کا مظاہرہ کیا اور مدرسے کی تعطیلات کے دنوں میں صرف ایک طالب علم کو ادب جاہلی کے سات طویل قصیدے پڑھانے کی زحمت گوارا فرمائی۔ استاذ گرامی کی شفقت کا یہ سلسلہ اس کے بعد آخر دم تک قائم رہا۔ دورۂ حدیث کے سال وہ اپنی جیب خاص سے ہر ماہ مجھے تبرک عنایت فرماتے تھے۔ ایک موقع پر میں نے اس پر تردد ظاہر کیا تو فرمایا کہ ''جب تک پڑھ رہے ہو، تب تک ہی ملیں گے۔ پھر کون دے گا؟''

صوفی صاحب اپنے مزاج کے لحاظ سے تواضع اور انکسار کا پیکر تھے۔ وہ علمی وعملی مسائل کے حوالے سے سوچی سمجھی اور دوٹوک رائے رکھتے تھے اور اس کے اظہار میں بھی کسی رورعایت سے کام نہیں لیتے تھے، لیکن انھوں نے کبھی اپنی علمی حیثیت اور اپنا بزرگانہ استحقاق جتلانے یا اپنی رائے دوسروں پر ٹھونسنے کی کوشش نہیں کی۔ مدرسہ نصرۃ العلوم صوفی صاحب کی یادگار ہے۔ مدرسے کے قیام کے بعد جلد ہی اس کا انتظام وانصرام ان کے سپرد کر دیا گیا تھا اور ملک بھر بلکہ دنیا بھر میں اسے جو تعارف حاصل ہے، وہ بلاشبہ صوفی صاحب کے علم، استقلال، خلوص اور للّٰہیت کا ثمر ہے، لیکن انھوں نے اسے اپنی ذات کو نمایاں کرنے کا ذریعہ نہیں بنایا، حتیٰ کہ اپنے علمی ذوق ورجحان اور تعلیمی تصورات کی تجربہ گاہ بنانے کی کوشش بھی نہیں کی جو ان کا ایک بالکل جائز حق تھا۔ دینی مدارس کے نصاب اور طرز تعلیم کے بارے میں ان کے خیالات ونظریات عام روش سے ہٹ کر تھے اور ''ہمارا تعلیمی وتبلیغی لائحہ عمل'' کے عنوان سے انھوں نے مدرسہ نصرۃ العلوم کا جو بالکل ابتدائی تعارف لکھا، اس میں ان کی بھرپور عکاسی ہوئی ہے، لیکن مدرسہ کے عملی نظام کی تشکیل انھوں نے اپنے تصورات کے مطابق نہیں کی جس کی وجہ غالباً یہ تھی کہ اپنے وژن کو عملی صورت میں متشکل کرنے کے لیے ہم خیال اور ہم ذوق رفقا کی جو ٹیم درکار تھی، وہ غالباً انھیں میسر نہیں آ سکی، جبکہ مختلف ذوق اور رجحانات کے حامل رفقا پر اپنے تصورات مسلط کرنا ان کے مزاج کے خلاف تھا۔ واقعہ یہ ہے کہ اپنی علمی دلچسپیوں، تحقیقی ذوق، شخصی مزاج اور افکار ونظریات کے حوالے سے صوفی صاحب نے ایک تنہا فرد کی زندگی بسر کی ہے۔ مدرسے کے مزاج اور ماحول کو اپنے رنگ میں رنگنا تو کجا، جب نصف صدی تک مدرسے کی خدمت کرنے اور اپنی جوانی اور بڑھاپا اس کی ترقی میں صرف کر دینے کے بعد عمر کے آخری دور میں بعض مسائل کے حوالے سے مدرسے کی قدیمی انتظامیہ کے ساتھ اختلاف پیدا ہو گیا تو صوفی صاحب نے محاذ آرائی یا تنازع کی کوئی صورت پیدا کیے بغیر خاموشی کے ساتھ اپنے خاندان سمیت مدرسے کے انتظامی اور تعلیمی معاملات سے الگ ہو جانے کا فیصلہ کر لیا اور واقعہ یہ ہے کہ اگر شہر کے علما مدرسے کی بہی خواہی کے جذبے سے

اس معاملے میں مداخلت نہ کر کے معاملات کا رخ نہ موڑتے تو صوفی صاحب اپنے اس فیصلے پر عمل کر گزرتے۔

انھیں اکابر دیوبند کے ساتھ بے پناہ محبت تھی اور وہ موقع بہ موقع ان بزرگوں بالخصوص شیخ الہند مولانا محمود حسنؒ اور مولانا سید حسین احمد مدنی کے تقویٰ، للّٰہیت، خلوص اور کردار کا حوالہ دیتے نہیں تھکتے تھے۔ ایک موقع پر حدیث کے درس میں کسی مناسبت سے ان حضرات کا ذکر آ گیا تو گویا ان کے دل کے تار کسی نے چھیڑ دیے۔ اس دن کا سبق ان بزرگوں کی جدوجہد اور قربانیوں کے تذکرے کے لیے وقف رہا۔ گفتگو کرتے کرتے ان پر رقت طاری ہو گئی اور انھوں نے اپنی محبت اور جذبات کے اظہار کے لیے کسی عرب باندی کے اس شعر کا سہارا لیا کہ:

سادتی ان شرقوا او غربوا ویلی
وان عاشروا غیرنا ویل علیٰ ویل

''میرے آقا (مجھے چھوڑ کر) مشرق کی طرف جائیں یا مغرب کی طرف، میرے لیے بربادی ہے۔ اور اگر وہ ہمارے علاوہ کسی اور کو اپنی رفاقت کے لیے منتخب کر لیں تو بربادی پر بربادی ہے۔''

دورۂ حدیث کے سال ہمیں ان سے صحیح مسلم اور جامع ترمذی کے ایک حصے کے علاوہ حجۃ اللہ البالغہ پڑھنے کا موقع ملا۔ وہ طول طویل مباحث سے گریز کرتے تھے اور حوالہ جات اور دلائل کا انبار لگانے کے بجائے زیر بحث مسئلے سے متعلق اصل نکتے کی مختصر اور جامع وضاحت پر اکتفا کرتے تھے۔ طول بیانی انھیں ویسے بھی پسند نہیں تھی اور وہ مختصر اور متعین طرز گفتگو کو پسند کرتے تھے۔ میں نے ایک مرتبہ عرض کیا کہ یونانی فلاسفہ کے طریق استدلال پر امام غزالیؒ نے بھی نقد کیا ہے اور امام ابن تیمیہؒ نے بھی، ان میں سے کس کا نقد زیادہ وزنی ہے؟ فرمایا کہ ابن تیمیہ کا غزالی کے ساتھ کوئی تقابل نہیں۔ میں نے عقل ونقل کے مابین تعارض کے موضوع پر ابن تیمیہ کی طویل تصنیف پڑھی ہے۔ وہ تقریر لمبی چوڑی کرتے ہیں لیکن اس میں مغز تھوڑا ہوتا ہے۔ مولانا حمید الدین فراہیؒ کا ذکر ہوا تو فرمایا کہ وہ بڑے عالم تھے، لیکن مولانا امین احسن اصلاحیؒ کی ''تدبر قرآن' میں بے جا طوالت پائی جاتی ہے۔ بیرون ملک سے ایک بزرگ عالم پاکستان تشریف لائے اور صوفی صاحب کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ خاصی دیر نشست رہی جس میں وہ عالم بے تکان بولتے اور صوفی صاحب خاموش سنتے رہے۔ بعد میں یہ بے تکلف تبصرہ کیا کہ ان کے بارے میں سنتے آ رہے تھے کہ بڑے فاضل شخص ہیں، لیکن یہ تو نری باتوں کی پٹاری ہیں۔

وہ اپنے اختلاف رائے کا اظہار بالکل دوٹوک کرتے تھے اور اپنے احساس اور تاثر کا ابلاغ بھی کوئی لگی لپٹی رکھے بغیر پوری وضاحت سے کر دیتے تھے۔ والد محترم کی روایت ہے کہ انھوں نے ایک مرتبہ وحدت الوجود کے حوالے سے شیخ ابن عربیؒ کے موقف سے شیخ احمد سرہندیؒ کے اختلاف کا ذکر کیا اور صوفی صاحب سے ان کی رائے معلوم کرنا چاہی۔ صوفی صاحب نے بے تکلف فرمایا کہ ''بھئی! جس کی سمجھ میں بات نہیں آئے گی، وہ یہی کہے گا۔'' اپنی کتاب ''مولانا عبید اللہ سندھی کے علوم وافکار'' میں انھوں نے مولانا سندھی کے حوالے سے پائی جانے والی شدید مخالفانہ فضا میں ان کی ذات اور افکار وخیالات پر کیے جانے والے اعتراضات کا پورے اعتماد کے ساتھ سامنا کیا ہے اور مولانا سندھی کے موقف کی درست تفہیم کی کوشش کی ہے۔ اسی کتاب میں انھوں نے قیام پاکستان کے حوالے سے مسلم لیگ کے موقف کی تائید کرنے والے علما کے علم وتقویٰ کا پورا اعتراف کرتے ہوئے ان کے سیاسی موقف پر بے باک تبصرہ کیا ہے جس اس پر انھیں مخالف حلقے کی

طرف سے سخت ردعمل کا سامنا کرنا پڑا۔

وہ نہ صرف خود علمی اختلاف کا حق پورے اعتماد سے استعمال کرتے تھے، بلکہ اس کی حوصلہ افزائی بھی فرماتے تھے۔ ۱۹۹۶ء میں، مدرسہ نصرۃ العلوم کے شعبہ نشرواشاعت نے ''امام ابوحنیفہؒ اور عمل بالحدیث'' کے عنوان سے میری اولین تصنیف شائع کی جس کا موضوع امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کی آرا پر دوسری صدی ہجری کے مشہور محدث امام ابوبکر ابن ابی شیبہؒ کے وہ اعتراضات تھے جو انھوں نے اپنی کتاب ''المصنف'' کے ایک مستقل باب میں درج کیے ہیں۔ اس کتاب کا نام بھی حضرت صوفی صاحب ہی کے مشورے سے تجویز ہوا تھا۔ میں نے ابن ابی شیبہ کے اعتراضات کے جواب میں اپنے فہم کی حد تک امام ابوحنیفہ کا نقطہ نظر اور استدلال واضح کرنے کی کوشش کی، تاہم بعض مقامات پر مجھے احناف کے استدلال پر اطمینان نہیں ہو سکا۔ اس ضمن میں حضرت صوفی صاحب سے بھی گفتگو ہوئی اور انھوں نے میرے اشکالات کے حوالے سے احناف کے استدلال کو واضح کیا، تاہم اس کے ساتھ یہ بھی فرمایا کہ اگر کسی مسئلے میں تمہارا احناف کے موقف پر اطمینان نہیں ہوتا اور تم علمی طور پر کسی دوسری رائے کو ترجیح دیتے ہو تو ایسا کرنے سے تم حنفیت سے خارج نہیں ہو گے۔

استاذ گرامی اور جد مکرم شیخ الحدیث مولانا محمد سرفراز خان صفدر نے اپنی تدریسی و تصنیفی زندگی کے بالکل آخری دور میں حیات ونزول مسیح علیہ السلام کے موضوع پر ''توضیح المرام'' تصنیف فرمائی۔ میں ان دنوں مدرسہ نصرۃ العلوم میں تدریس کے فرائض انجام دیا کرتا تھا۔ ایک دن مدرسے پہنچا تو صوفی صاحب اپنے معمول کے مطابق دفتر انتظام کے باہر چارپائی پر تشریف فرما تھے اور مدرسے کے سینئر استاذ مولانا عزیز الرحمٰن مرحوم ومغفور (آف ٹیکسلا) کے ساتھ تبادلہ خیال کر رہے تھے۔ میں نے سلام کیا تو مجھے بھی پاس بٹھا لیا اور فرمایا کہ بھئی! ہم شیخ الحدیث صاحب کی کتاب ''توضیح المرام'' کے بارے میں بات کر رہے ہیں۔ تم بتاؤ، تمہاری اس کے بارے میں کیا رائے ہے؟ میں نے اپنے تاثر کے اظہار میں ذرا جھجک محسوس کی تو وہ سمجھ گئے اور فرمایا کہ کھل کر اپنی رائے بتاؤ، اس سے تمہارے دادا کی شان میں کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ میں نے عرض کیا کہ ان کی سابقہ تصنیفات سے جو علمی وتحقیقی معیار سامنے آتا ہے، اس کتاب میں وہ ملحوظ نہیں رکھا جا سکا۔ صوفی صاحب نے اس سے اتفاق کیا اور فرمایا کہ ہم بھی یہی بات کر رہے تھے۔

اعتقادی تعبیرات اور ان کے ضمن میں تکفیر وتفسیق کے حوالے سے بھی ان کا اپنا ایک مخصوص نقطہ نظر تھا۔ ۸۰ء کی دہائی کے آخر میں ہمارے ہاں سپاہ صحابہ نے تکفیر شیعہ کی مہم شروع کی تو اس کی تائید میں ایک فتوے پر ملک کے بہت سے علما کے دستخط کرائے گئے۔ شیخ الحدیث مولانا محمد سرفراز خان صاحب صفدرؒ نے بھی اس پر تائیدی دستخط کیے۔ والد گرامی بتاتے ہیں کہ انھی دنوں میں وہ صوفی صاحب سے ملنے گئے تو انھوں نے پوچھا کہ بھئی، وہ شیعہ کے بارے میں ایک فتویٰ چل رہا ہے، تم نے کیا کیا ہے؟ والد گرامی نے عرض کیا کہ میں نے مشروط دستخط کیے ہیں کہ جو شیعہ تحریف قرآن کا قائل ہے، تکفیر شیخینؓ کرتا ہے اور قذف عائشہ کا مرتکب ہوتا ہے، وہ مسلمان نہیں ہے۔ صوفی صاحب نے فرمایا کہ میں نے تو دستخط کیے ہی نہیں ہیں۔ میں نے ان سے کہا ہے کہ مولوی صاحب (حضرت شیخ الحدیث) نے دستخط کر دیے ہیں، بس وہی کافی ہیں۔ صوفی صاحب نے اپنی بعض تصانیف اور خطبات میں بھی علی الاطلاق تکفیر شیعہ سے اختلاف کیا ہے اور ایک مرتبہ خود مجھ سے گفتگو کرتے ہوئے فرمایا کہ اہل تشیع ''ملت کے دائرے میں داخل ہیں۔''

ہمارے ہاں سیدنا مسیح علیہ السلام کی آمد ثانی کے مسئلے کو عام طور پر ایک اعتقادی مسئلہ سمجھا جاتا اور اس سے اختلاف کرنے والوں کی تکفیر تک کر دی جاتی ہے۔ حضرت شیخ الحدیث رحمہ اللہ سمیت بہت سے اکابر علما کا موقف یہی ہے، لیکن صوفی صاحب اس معاملے میں مولانا ابوالکلام آزادؒ اور مولانا سندھیؒ کے نقطہ نظر سے اتفاق رکھتے تھے جو اسے اعتقادی امور کا حصہ قرار دینے کے بجائے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی پیش گوئیوں کے زمرے میں شمار کرتے ہیں۔ صوفی صاحب نے اپنی کتاب ''مولانا عبید اللہ سندھیؒ کے علوم وافکار'' میں بھی ان حضرات کے نقطہ نظر کی وضاحت کی ہے، جبکہ برادرم افتخار تبسم صاحب بیان کرتے ہیں کہ ۱۹۹۴ء میں ان کی مدرسہ نصرۃ العلوم میں حضرت صوفی صاحب سے ملاقات ہوئی تو اس مسئلے پر بھی گفتگو ہوئی۔ انھوں نے صوفی صاحب سے پوچھا کہ مولانا ابوالکلام آزادؒ اور مولانا سندھیؒ نزول مسیح کے قائل نہیں تو کیا اس پر ان کی تکفیر کی جائے گی؟ صوفی صاحب نے کہا کہ نہیں، وہ اپنے پاس دلائل رکھتے ہیں اور دلائل کی بنیاد پر یہ بات کہتے ہیں۔ پوچھا گیا کہ لیکن اس مسئلے پر تو علما کا اجماع ہے تو صوفی صاحب نے کہا کہ یہ اجماع اس نوعیت کا نہیں ہے کہ اس سے اختلاف پر تکفیر وتضلیل کی جائے۔ (برادرم افتخار تبسم نے یہ واقعہ اسی طرح بیان کیا ہے، تاہم صوفی صاحب نے اپنی کتاب ''مولانا عبید اللہ سندھیؒ کے علوم وافکار'' میں مولانا سندھیؒ کی طرف نزول مسیح کے انکار کی نسبت کو درست تسلیم نہیں کیا۔ ان کی مذکورہ گفتگو غالباً اس مفروضے پر مبنی ہوگی کہ اگر یہ نسبت درست ہو تو بھی اس کی بنیاد پر تکفیر نہیں کی جا سکتی)۔

بریلوی علما کی اعتقادی تعبیرات کے ضمن میں بھی ان کا رجحان شاید یہی تھا اور وہ ان سے اختلاف کے باوجود انھیں زیادہ بحث ومباحثہ کا موضوع بنانے کو مناسب نہیں سمجھتے تھے۔ والد گرامی یہ واقعہ بیان کرتے ہیں کہ ایک مرتبہ حضرت شیخ الحدیثؒ اپنی کسی نئی کتاب کا مسودہ لے کر صوفی صاحب کے دفتر میں تشریف لائے اور بتایا کہ فلاں بریلوی عالم نے جو کتاب لکھی ہے، یہ اس کا جواب ہے۔ صوفی صاحب نے برادرانہ بے تکلفی سے فرمایا: ''کیا قوم کو لڑانے پر کمر باندھ رکھی ہے! کبھی کسی کام کے موضوع پر بھی لکھ لیا کریں۔'' حضرت شیخ الحدیث نے فرمایا کہ لکھ لکھ کر میری انگلیاں گھس جاتی ہیں اور تم کہتے ہو کہ قوم کو لڑانے پر کمر باندھ رکھی ہے۔ ڈاکٹر وفا راشدی ایک مرتبہ صوفی صاحب سے ملنے کے لیے حاضر ہوئے تو فرقہ وارانہ اختلافات پر گفتگو چھڑ گئی۔ صوفی صاحب نے کہا کہ ہمارے بھائی صاحب اس طرح کے اختلافات کے بارے میں لکھتے رہتے ہیں، اب ہم نے ان کی کتابیں چھاپنا بند کر دی ہیں۔ (یہ بات غالباً از راہ تفنن کہی گئی تھی، کیونکہ حضرت شیخ الحدیث کی تصانیف کافی عرصہ تک شعبہ نشرواشاعت مدرسہ نصرۃ العلوم کے زیر اہتمام شائع ہوتی رہیں، پھر بعد میں انھوں نے ''مکتبہ صفدریہ'' کے نام سے اپنا ذاتی مکتبہ الگ قائم کر لیا تھا۔)

فروعی فقہی اختلافات کو نمایاں کرنے یا انھیں دعوت وتبلیغ کا موضوع بنانے سے بھی وہ سخت نفور تھے۔ محترم ملک عبد الواحد صاحب بیان کرتے ہیں کہ ایک مرتبہ کسی شخص نے خطبہ جمعہ کے موقع پر ان کو رقعہ دیا جس میں رفع یدین کے بارے میں دریافت کیا گیا تھا تو صوفی صاحب نے غصے سے فرمایا کہ مجھے ایسے رقعے نہ دیا کرو۔ جیسے تمہارے استاذ نے نماز پڑھنے کا طریقہ بتایا ہے، اسی طرح پڑھ لیا کرو۔ اپنی کتاب ''نماز مسنون'' میں بھی انھوں نے احناف اور اہل حدیث کے اختلافی مسائل کے ضمن میں یہی متوازن موقف اپنایا اور احادیث کی روشنی میں دونوں نقطہ ہائے نظر کی گنجایش کو تسلیم کیا ہے۔ روایت ہے کہ ایک مرتبہ معروف حنفی مناظر مولانا محمد امین صفدر مرحوم نے شکایت کی کہ ہم محنت کر کے عوام کے ذہن کو حنفیت

پر پختہ کرنے کی کوشش کرتے ہیں، لیکن صوفی صاحب کی کتاب ہماری ساری محنت پر پانی پھیر دیتی ہے۔

فقہی مسائل اور جزئیات کو دیکھنے کا بھی ان کا ایک اپنا زاویہ نگاہ تھا اور وہ فقہی کتابوں میں درج جزئیات کی لفظی پابندی کے بجائے فقہی اصولوں کی رعایت کا زیادہ اہتمام کرتے تھے۔ مثلاً ان کی رائے یہ تھی کہ روزے کی حالت میں انجکشن لگوایا جائے تو روزہ ٹوٹ جاتا ہے۔ اس پر انھوں نے مفصل مقالہ لکھا جس میں فقہی اصولوں اور طبی معلومات کی روشنی میں اپنے نقطہ نظر کو استدلال سے واضح کیا ہے۔ اسی طرح فقہی کتابوں میں نقد اور ادھار کی قیمت میں فرق کو اس شرط کے ساتھ جائز بتایا گیا ہے کہ اگر معاملہ طے کرتے وقت فریقین کے مابین ایک متعین قیمت طے پا جائے جس میں کمی بیشی کا امکان نہ رہے تو نقد کے مقابلے میں ادھار قیمت میں اضافہ کرنا درست ہے۔ معاصر اسلامی بینکنگ میں اسی بنیاد پر ''مرابحہ'' کے عنوان سے چیزوں کو ادھار فروخت کر کے نقد کے مقابلے میں زیادہ قیمت لینے کا طریقہ اختیار کیا گیا ہے۔ صوفی صاحب کی رائے یہ تھی کہ فقہا نے جس تناظر میں اس معاملے کو جائز قرار دیا ہے، وہ مختلف ہے جبکہ معاصر تناظر میں یہ طریقہ سودی کاروبار کو جواز فراہم کرنے کے لیے ایک حیلے کے طور پر استعمال ہو رہا ہے، اس لیے محض فقہی کتابوں میں مذکور جواز کو بنیاد بنانے کے بجائے موجودہ معاشی عرف کو بھی ملحوظ رکھنا ضروری ہے۔ برادرم مولانا محمد یوسف کی روایت ہے کہ انھوں نے ایک موقع پر جبراً لی جانے والی طلاق کے واقع ہو جانے سے متعلق احناف کے موقف پر اپنا اشکال صوفی صاحب کی خدمت میں پیش کیا اور کہا کہ جب قرآن مجید نے جبر واکراہ کے تحت کہے گئے کلمہ کفر کو بھی موثر تسلیم نہیں کیا تو دل کے ارادے اور مرضی کے خلاف دی جانے والی طلاق کیونکر موثر قرار دی جا سکتی ہے؟ صوفی صاحب نے فرمایا کہ اس جزیئے کا صحیح محل یہ ہے کہ قاضی یا حاکم کسی شرعی مصلحت کے تحت اپنا اختیار استعمال کرتے ہوئے کسی شخص کو اپنی بیوی کو طلاق دینے پر مجبور کرے تو ایسی طلاق نافذ مانی جائے گی۔

مطالعہ ان کا بے حد محبوب ذوق تھا اور جب تک ان کے لیے ممکن رہا، انھوں نے اپنی دلچسپی کے موضوعات پر مطالعہ کا سلسلہ جاری رکھا۔ آخری دنوں کی شدید علالت سے پہلے تک میں جب بھی ان کے پاس حاضر ہوا، بالعموم انھیں اپنے پلنگ پر تکیہ لگائے ہوئے مطالعہ میں مصروف پایا، البتہ ان کی وسعت مطالعہ سے مستفید ہونے کے لیے ان کے خاص مزاج کا لحاظ رکھنا ضروری تھا۔ گفتگو میں بے تکلف بات سے بات پیدا ہوتی چلی جاتی تو وہ بھی سلسلہ گفتگو کو جاری رکھتے، لیکن اگر اندازہ ہو جاتا کہ ان سے ''مستفید'' ہونے کی کوشش کی جا رہی ہے تو وہ گریز کا طریقہ اختیار کر لیتے تھے۔ میرا تجربہ یہی ہے کہ میں نے اگر کبھی کسی مسئلے سے متعلق براہ راست ان کی رائے دریافت کر لی تو انھوں نے مختصر جواب دے کر فرمایا کہ تم اصل مآخذ سے مراجعت کر کے خود تحقیق کرو۔ ذاتی یا خاندانی حالات پر گفتگو کرتے ہوئے یا کسی علمی مسئلے پر تبادلہ خیال کرتے ہوئے انھوں نے کبھی مجھے اپنے بزرگ اور میرے طالب علم ہونے کا احساس نہیں ہونے دیا۔ وہ بات منوانے کی کوشش نہیں کرتے تھے اور نہ ان کا مطمح نظر اپنی رائے یا تبصرہ سے آگاہ کرنا ہوتا تھا۔ وہ ہمیشہ یہ کہتے تھے کہ ''آپ اس کے بارے میں کیا کہتے ہیں؟'' یا ''آپ کی اس معاملے میں کیا رائے ہے؟'' اگر ان کی رائے وہی ہوتی جو میں عرض کرتا تو ''ہاں'' کہہ کر اطمینان ظاہر کر دیتے، ورنہ تردید کرنے کے بجائے اس کے حوالے سے اپنا سوال یا اشکال بیان فرما دیتے۔ وہ پوری توجہ سے بات سنتے تھے اور ان سے مکالمہ کرتے ہوئے اپنی ناچیز آرا کے بہت اہم اور قابل احترام ہونے کا احساس پیدا ہونے لگتا ہوتا تھا۔

صوفی صاحب کے ساتھ خاندانی، فکری اور روحانی رشتہ وتعلق کی جہتیں متنوع ہیں اور ان میں سے ہر جہت افتخار واعتزاز

کا ایک الگ احساس پیدا کرتی ہے، لیکن ان کے ایک مشفق اور مہربان بزرگ ہونے کی جہت سب پر غالب ہے۔ میں جب بھی اپنے ذہن میں ان کی شخصیت کا کوئی تاثر قائم کرنے کی کوشش کرتا ہوں تو اس سے مختلف کوئی تاثر نہیں بن پاتا۔ ان کے الطاف وعنایات کی یاد اس دنیا میں بھی سرمایہ حیات ہے اور یقین ہے کہ جب وہ فردوس کے بلند وبالا مقامات میں اپنے رب کی نعمتوں کے حق دار قرار دیے جائیں گے تو ہم جیسے کوتاہ عمل بھی ان شاء اللہ اس نسبت کی برکات سے محروم نہیں رہیں گے:

وَالَّذِیْنَ آمَنُوا وَاتَّبَعَتْهُمْ ذُرِّیَّتُهُم بِإِیْمَانٍ أَلْحَقْنَا بِهِمْ ذُرِّیَّتَهُمْ وَمَا أَلَتْنَاهُم مِّنْ عَمَلِهِم مِّن شَیْءٍ (الطور ۲۱)

دعا یہ کر کہ خداوند آسمان وزمیں
کرے پھر اس کی زیارت سے شادماں مجھ کو

لوگ وراثت کے مسائل میں بہت کوتاہی کرتے ہیں۔ بیٹیوں کا حق نہیں دیتے، بہنوں کا حق نہیں دیتے، پھوپھیوں کا حق نہیں دیتے اور بڑے عجیب قسم کے حیلے بہانے کرتے ہیں۔ لڑکیوں کے بارے میں کہتے ہیں کہ ان کی تعلیم پر روپیہ خرچ کیا ہے، شادی پر بڑی رقم خرچ کی ہے۔ بھائی سوال یہ ہے کہ کیا لڑکے کی تعلیم مفت میں ہو گئی ہے اور کیا اس کی شادی پر رقم خرچ نہیں کی جاتی؟ کبھی یہ بہانہ کرتے ہیں کہ بچیاں عیدیں اور شب قدر لے جاتی ہیں۔ یہ ٹھیک ہے مگر لڑکے بھی تو تمہاری جیب کاٹتے ہیں، وہ کب معاف کرتے ہیں؟ اور کبھی کہتے ہیں کہ لڑکیوں نے اپنا حق معاف کر دیا ہے۔ بھائی، معاف کس طرح کیا ہے! اس کے نام مکان کی رجسٹری، نہ زمین کی رجسٹری، نہ انتقال نہ ان کا قبضہ۔ معافی کس چیز کی ہوئی ہے؟ پہلے قانونی طور پر ان کے نام رجسٹری کراؤ، انتقال کراؤ، ان کو قبضہ دو، سال دو سال وہ استعمال کریں، زمین کی پیداوار کھائیں، ان کو ان کے منافع معلوم ہوں، پھر معاف کریں تو ٹھیک ہے۔ خالی معافی کا کوئی معنی نہیں ہے۔ کچھ لوگ کہتے ہیں کہ انگریز دور سے جس طرح زمین منتقل ہوتی چلی آ رہی ہے، اسی طرح ہم تو ان پر قابض ہیں۔ اگر لڑکیوں کا حصہ نہیں دیا تو بڑوں نے نہیں دیا۔ اس میں ہمارا کیا قصور ہے؟ یہ ٹھیک ہے کہ انگریز دور میں وراثت شرعی قاعدے کے مطابق تقسیم نہیں ہوتی تھی، لیکن سوال یہ ہے کہ اگر انگریز دور میں لڑکیوں کو حق نہیں دیا گیا تو کیا ان کا حق ختم ہو گیا ہے، ضائع ہو گیا؟ زمینیں تمہارے پاس موجود ہیں اور ان میں ان کا حق بھی موجود ہے، وہ ان کے حوالے کرو۔ اگر بڑوں نے اپنی قبریں خراب کی ہیں تو تم اپنی قبریں خراب نہ کرو۔ (ذخیرۃ الجنان ۱۴/۳۵۷، ۳۵۸)

مولانا محمد عرباض خان سواتی*

قبولیت کا مقام

سترھویں صدی کے آغاز میں کچھ خاندان ریاست سوات کو چھوڑ کر ضلع ہزارہ میں آباد ہوئے تھے۔ یہ وہ دور تھا جب ضلع ہزارہ پر ترکوں کا تسلط تھا۔ ترک وہاں پر ہر لحاظ سے مضبوط تھے۔ ان خاندانوں نے آہستہ آہستہ وہاں سے ترکوں کی عملداری کو ختم کر دیا اور اپنا تسلط قائم کر لیا۔ انہی خاندانوں میں ایک خاندان ہمارے جد امجد حضرت گل داد خان سواتیؒ کا تھا جو شنکیاری سے چند کلومیٹر کے فاصلے پر شاہراہ ریشم کے کنارے ایک حسین وجمیل، سرسبز وشاداب، درختوں سے ڈھکے، بلند وبالا پہاڑ کی چھوٹی پر ایک گاؤں ''چیڑاں ڈھکی'' میں قیام پذیر ہوا۔ ہمارے جد امجد حضرت گل داد خان سواتیؒ اور ان کی اہلیہ کسی حد تک دینی تعلیم سے آراستہ تھے۔ دیگر مصروفیات کے ساتھ ساتھ بچوں اور بچیوں کو پڑھاتے بھی تھے۔ علاقہ میں ان کی شہرت پیر اور پیرنی کے نام سے آج بھی لوگوں کو یاد ہے۔

اللہ نے اولاد کی دولت سے بھی خوب مالا مال فرمایا تھا۔ آپؒ کے پانچ بیٹے تھے جن میں سے سب سے بڑے گل احمد خان سواتیؒ ہمارے پردادا ہیں جو پڑھے لکھے تو نہ تھے مگر صاحب فہم وفراست ہونے کی وجہ سے علاقے کے معززین سے اچھے تعلقات رکھتے تھے اور پنچایتوں میں بیٹھنے والے تھے۔ اونچے لمبے، بہادر، باہمت اور نڈر تھے۔ یکے بعد دیگرے سات شادیاں کیں اور ایک سو بیس سال کی لمبی عمر پائی۔ بڑھاپے کی وجہ سے بازوؤں کا گوشت لٹک گیا تھا، مگر ہمت کا عالم یہ تھا کہ آخری عمر میں بھی کھیتوں میں کام کرتے تھے۔ علاقے میں مشہور تھا کہ ایک دفعہ ان کی بکری کو شیر نے جھپٹ لیا تو وہ اس کے منہ سے اپنی بکری کو چھین لائے تھے۔ اللہ نے اولاد کی دولت سے بھی نوازا تھا۔ آپ کے دو بیٹے نور احمد خان سواتیؒ اور خان زمان خان سواتیؒ اور ایک بیٹی تھی۔ یہی نور احمد خان سواتیؒ حضرات شیخین کریمینؒ کے والد محترم اور ہمارے دادا محترم ہیں۔

نور احمد خان سواتی حصول علم کی بہت خواہش رکھتے تھے۔ کئی مرتبہ کوشش کی مگر تعلیم کا سلسلہ جاری نہ رکھ سکے، تاہم قرآن کریم کا کچھ حصہ ناظرہ پڑھا تھا اور کچھ سورتیں زبانی یاد کی تھیں۔ دادا محترم کو اپنے بچوں کی تعلیم کا بھی بہت شوق تھا، مگر اس جنگل نما گاؤں میں تعلیم کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ اسی بنا پر آپ نے بچوں کو تعلیم کے لیے دور دراز درسگاہوں میں داخل کرا دیا۔ حضرات شیخین کریمینؒ فرماتے ہیں کہ بسا اوقات ہمارے میلے کچیلے کپڑوں اور حالت زار کو دیکھ کر بہت روتے تھے اور اس پر خاندان اور برادری کی طرف سے طعن وتشنیع کا بھی سامنا کرنا پڑتا تھا کہ اس بڑھاپے میں اللہ نے اولاد سے نوازا، ان کو پاس رکھنا بھی نصیب نہیں ہے، مگر وہ بچوں کو تعلیم دلانے کی خاطر ہر قسم کے طعن وتشنیع کو برداشت کرتے تھے اور ان کے لیے کثرت سے دعا کرتے تھے۔ یہاں تک وفات کے وقت بھی ان کی وصیت یہی تھی کہ میرے بچوں کو قرآن وسنت وفقہ کی

* فرزند حضرت مولانا صوفی عبدالحمید سواتی۔ ناظم امتحانات مدرسہ نصرۃ العلوم گوجرانوالہ۔

تعلیم ضرور دلانا۔ یہ قبولیت کی کوئی گھڑی تھی جس میں مانگی ہوئی دعا کو اللہ تعالیٰ نے قبول فرما لیا۔

یہی وہ دور تھا جب قضا وقدر نے حضرات شیخین کریمین والدین کے سایہ رحمت سے محروم ہو گئے۔ اپنوں کی بے رخی میں گھر، سامان، زمین، مال ومویشی سب ایسے تقسیم ہوا کہ کچھ ہاتھ نہ آیا۔ دردر کی ٹھوکریں، لمحے لمحے کی محتاجی، کئی کئی دنوں کی فاقہ کشی، ننگے بدن کے ساتھ برفانی علاقے کی سرد ترین راتیں مقدر میں آئیں اور خوشیوں کے لمحات قصہ پارینہ ہو گئے۔ خاندان کا شیرازہ کچھ ایسا بکھرا کہ چاروں بھائی بہن ایک ساتھ پھر کبھی اکٹھے نہ ہو سکے۔ تاہم گردش ایام اور دردر کی یہ ٹھوکریں دراصل ان پر حصول علم کے دروازے کھولنے کا ذریعہ بن رہی تھیں۔ حصول علم کا یہ سفر زندگی کی تلخیوں میں کئی مراحل میں طے پاتا ہے۔ پرخوف وخطر اور دشوار گزار راہوں کے راہی جان جوکھوں میں ڈالتے ہوئے بستی بستی، قریہ قریہ، نگر نگر جاتے ہیں اور علم دین کی تلاش میں برصغیر پاک وہند کے اطراف واکناف میں کئی علمی چشموں سے سیراب ہوتے ہیں۔ آخر علوم ومعارف ولٰہیت کے عظیم سرچشمے دار العلوم دیوبند تک رسائی حاصل کرتے ہیں، وہاں سے خوب سیراب ہوتے ہیں، علمی تشنگی کو بجھاتے ہیں اور فیض واعزاز پاتے ہیں۔

پھر قسمت ان کو گوجرانوالہ شہر میں گھنٹہ گھر چوک کے قریب ایک جوہڑ پر لا کھڑا کرتی ہے اور وہ علم وعمل کی دنیا میں ایسے مصروف ہوتے ہیں کہ جامعہ نصرۃ العلوم کے نام سے ایک عظیم الشان ادارہ معرض وجود میں آتا ہے جو نہ صرف ان کی پہچان بنتا ہے اور براعظم ایشیا سمیت دوسرے براعظموں کے تشنگان علوم کی سیرابی کا ذریعہ بنتا ہے۔ دونوں بھائی بیک وقت بلند پایہ کے مدرس، عظیم المرتبت مصنف، بے مثال خطیب، بے لوث راہنما، حق گو مبلغ، کثیر المطالعہ عالم، اعلیٰ درجہ کے منتظم، اکابر علمائے دیوبند کے علوم معارف کے امین، فکر شاہ ولی اللہؒ کے داعی، رئیس المحققین، عظیم فلاسفر، مفسر اعظم، محدث اکبر، فقیہ امت، امام وقت، ولی زماں، غزالی دوراں، زاہد ومتقی، متوکل ومجاہد، مشفق وہمدرد وخیر خواہ جیسی بے شمار صفات کے حامل تھے اور ان کی زندگی کے ایک ایک پہلو پر کئی کئی ضخیم کتابیں لکھی جا سکتی ہے۔

انہوں نے ساری زندگی راحت وسکون، آسایش وآرام، اور شان وشوکت کو چھوڑ کر اپنی تمام تر قوتیں اور اپنی تمام تر ہمتیں دین اسلام کے لیے صرف کر دیں۔ یہ تھے میرے چچا اور میرے والد جو اب ہم سے رخصت ہو گئے۔ مگر یہ تو تقدیر کے فیصلے ہیں جن کے سامنے کسی کی نہیں چلتی۔ یہ تو اسی رب العالمین کی شان ہے کہ وہ دو یتیموں کو کس انداز سے کہاں سے اٹھا کر لایا اور کس شان سے انھیں دنیا سے رخصت کیا۔ ان کی تمام تر علمی خدمات اور ان کے علم وعمل سے جاری ہونے والے فیض کے چشموں سے صدیوں تک امت سیراب ہوتی رہے گی۔ اللہ تعالیٰ ان کے جاری کردہ چشمہ ہائے فیض کی حفاظت فرمائے اور ان کے تمام متعلقین کو ان کے نقش قدم پر چلنے کی توفیق عطا فرمائے، آمین۔

''اگر کوئی مرد یا عورت قرآن پاک کا لفظی ترجمہ ہی پڑھ لے تو اسے اللہ تعالیٰ کے فضل وکرم سے ایمان کی حقیقت اور کفر وشرک کی برائی سمجھ میں آ جائے گی۔ آج ہمارے اندر جتنی کمزوریاں ہیں، ان کی وجہ صرف قرآن پاک سے دوری ہے۔ قرآن پاک کو سمجھا نہیں ہے۔ قرآن پاک کو سمجھنا صرف مولویوں اور طالب علموں کا کام نہیں ہے۔ قرآن پاک کا پڑھنا سمجھنا ہر مسلمان مرد عورت پر لازم ہے۔'' (ذخیرۃ الجنان ۱۷۴/۴)

مولانا قاری محمد ابوبکر صدیق*

جامع الصفات شخصیت

یوں تو ہر دور میں علماے امت نے دین کی تعلیم وتعلم کے شعبے میں مثالی خدمات سرانجام دی ہیں، لیکن عالم اسلام اور بالخصوص برصغیر پاک وہند میں اللہ تعالیٰ نے دار العلوم دیوبند سے جو کام لیا، اس کی شان ہی نرالی ہے۔ بانی دار العلوم حضرت مولانا قاسم نانوتویؒ سے لے کر دور حاضر کے اکابر علماے دیوبند تک ایسے علما کی ایک طویل فہرست ہے جو صحیح معنی میں حضرات انبیا کے وارث کہلانے کے مستحق ہیں۔ دار العلوم دیوبند کی کہکشاں کے انھی ستاروں میں درخشاں ستارہ امام اہل سنت، محدث العصر حضرت مولانا محمد سرفراز خان صفدر کی ذات گرامی بھی ہے جن کی شخصیت عالم اسلام اور بالخصوص دینی حلقوں میں کسی تعارف کی محتاج نہیں۔ حضرت نے ستر سال تک دینی علوم کی تدریس کی اور چالیس سال مسند حدیث پر بیٹھ کر طلبہ دین کے سینوں کو علم حدیث سے منور کیا۔ آپ نے اہم دینی، علمی اور نظریاتی عنوانات پر پینتالیس کے لگ بھگ کتب تصنیف فرمائیں۔ اپنے تو اپنے، غیر بھی حضرت کی دینی، علمی، تدریسی اور تصنیفی خدمات کا برملا اعتراف کرتے ہیں۔

جہلم کے حوالے سے حضرت شیخ کا تذکرہ یوں کرنا چاہوں گا کہ جہلم، گوجرانوالہ اور چکوال کا آپس میں ایک مثالی دینی تعلق رہا۔ چند سال پہلے تک گوجرانوالہ میں حضرت امام اہل سنتؒ، چکوال میں حضرت مولانا قاضی مظہر حسین صاحبؒ اور جہلم میں بندہ کے جد امجد حضرت مولانا عبد اللطیف صاحب جہلمیؒ کی صورت میں علماے حق کی عظیم نشانیاں موجود تھیں۔ کیا سنہری دور تھا جب یہ تینوں جامع الصفات شخصیات آپس میں مل بیٹھتی تھیں۔ تینوں کا دار العلوم دیوبند سے سند فراغت حاصل کرنے کا زمانہ بھی تقریباً ایک اور اساتذہ وشیوخ بھی ایک ہی تھے۔ یہی وجہ ہے کہ ان حضرات کی دینی، مسلکی ونظریاتی فکر میں وحدت پائی جاتی تھی۔ پھر ان حضرات کا یہ مبنی بر اخلاص تعلق ان کی اولاد کے باہمی ازدواجی رشتوں کی صورت میں باقاعدہ ایک خاندان کی شکل اختیار کر گیا۔ ان حضرات نے اپنے اپنے حلقہ اثر میں دین حق کی دعوت وتبلیغ، قرآن وسنت کی روشنی میں صحیح عقائد ونظریات کی ترجمانی وتحفظ اور امر بالمعروف ونہی عن المنکر کے فریضے کی ادائیگی میں جو عظیم خدمات سرانجام دیں اور راہ حق میں بڑے بڑے فتنوں اور آزمایشوں کے سامنے جس صبر واستقامت کا مظاہرہ کیا اور اپنے اس عظیم مشن کو جاری رکھا، اس کی نظیر بہت کم ملتی ہے۔

حضرت شیخ دیگر اکابر علما کی طرح ہر سال باقاعدگی کے ساتھ جامعہ کے سالانہ جلسے میں تشریف لاتے رہے۔ جامعہ کے شعبہ کتب کے سالانہ امتحانات کے لیے بھی بطور ممتحن آپ کی تشریف آوری ہوتی رہی۔ ۲۰۰۰ء کے سالانہ جلسے میں دورۂ حدیث شریف سے فراغت کے موقع پر میری دستار بندی تھی۔ ان دنوں حضرت شیخ ضعف اور علالت کے باعث بہت کم کسی

*فرزند مولانا قاری خبیب احمد عمرؒ۔ مہتمم جامعہ حنفیہ تعلیم الاسلام جہلم۔

پروگرام میں تشریف لے جاتے تھے، جبکہ اس سے دو سال قبل جد امجد حضرت مولانا عبد اللطیف صاحب جہلمیؒ کا وصال ہو چکا تھا۔ ان کی جدائی کے احساس نے اس اشتیاق میں مزید شدت پیدا کر دی کہ کم از کم اس سال حضرت شیخ الحدیثؒ سالانہ جلسے میں ضرور تشریف لائیں، لیکن حضرت نے بیماری کا عذر کر دیا۔ اتفاقاً اسی سال بندہ کے ماموں زاد بھائی حافظ ممتاز الحسن خان احسن کی بھی حفظ قرآن مجید کی دستار بندی تھی اور ہم دونوں اپنی اپنی جگہ پریشان تھے۔ اس دوران میں، میں نے اپنے ماموں مولانا عبد الحق خان بشیر سے مشورہ کیا اور یہ طے پایا کہ اگر ہم دوران جلسہ حضرت شیخ کو لانے کے لیے ان کی خدمت میں حاضر ہو جائیں تو شاید بات بن جائے۔ گکھڑ منڈی پہنچ کر معلوم ہوا کہ حضرت ایک دینی پروگرام کے سلسلے میں گوجرانوالہ شہر تشریف لے گئے ہیں۔ یہ سن کر کچھ امید پیدا ہوئی کہ آج حضرت کی طبیعت کچھ بہتر ہے۔ تھوڑی دیر کے بعد حضرت واپس تشریف لائے تو چہرے سے شدید تھکاوٹ اور تکلیف کے آثار نمایاں تھے۔ کچھ دیر آرام کیا۔ پھر ماموں نے مدعا عرض کیا تو حضرت نے انکار فرما دیا۔ ہم نے کہا کہ آپ دوسروں کے ہاں تو چلے جاتے ہیں، کیا گھر والوں کا کوئی حق نہیں؟ حضرت نے فرمایا کہ دوسروں کو میری تکلیف کا احساس نہیں، اس لیے ان کے اصرار پر چلا گیا، لیکن تمہیں تو احساس ہونا چاہیے۔ یہ جواب سن کر مزید کچھ کہنے کی ہمت نہیں ہوئی، البتہ یہ سبق ضرور ملا کہ بزرگوں سے عقیدت اور ملاقات کی خواہش تو اپنی جگہ درست ہے، لیکن ان کی تکلیف کا احساس اور آرام کا خیال بھی رکھنا چاہیے۔

بندہ کے والد گرامی مولانا قاری خبیب احمد عمرؒ کا حضرت سے چند ماہ قبل انتقال ہوا جس پر حضرت شدید غمگین تھے۔ والد صاحب مرحوم کے اچانک انتقال کی خبر سننے کے بعد دو روز تک گھر والوں سے گفتگو نہ فرمائی اور اکثر آنکھیں اشکبار رہتی تھیں۔ ہم پہلے ہی عظیم صدمے سے دوچار تھے، حضرت کی یہ کیفیت سن کر شدید پریشانی لاحق ہوئی اور والد صاحب کی تعزیت کے لیے آنے والے والوں کا ہجوم کم ہوتے ہی بندہ اپنی بڑی ہمشیرہ کے ہمراہ حضرت کی خدمت میں حاضر ہوا۔ والدہ صاحبہ چونکہ عدت میں تھیں، اس لیے ساتھ نہ جا سکیں لیکن وہ بھی اپنے والد ماجد سے ملنے کے لیے مضطرب تھیں۔ اگرچہ ایسی کیفیت میں رات گھر سے باہر نہ گزارنے کی شرط پر بعض علما کے نزدیک سفر کرنے کی گنجایش نکلتی ہے، لیکن طے ہوا کہ حضرت سے پوچھ لیا جائے۔ ہم نے حضرت سے پوچھا تو انگلی کے ساتھ نفی کا اشارہ فرمایا کہ شرعاً گنجایش نہیں ہے۔ اندازہ کیجیے کہ ایک طرف بیٹی کا عظیم صدمہ ہے لیکن حضرت شرعی حکم کو ترجیح دیتے ہوئے اپنی ہی ملاقات کے لیے آنے سے منع فرما رہے ہیں۔

بہرحال حضرت صوفی صاحب علیہ الرحمۃ سمیت ہمارے خاندان کے یہ تینوں بزرگ ایک سال کے قلیل عرصے میں یکے بعد دیگرے ہم سے رخصت ہو گئے اور میں سمجھتا ہوں کہ ان حالات میں سب سے زیادہ جامعہ حنفیہ متاثر ہوا کہ حضرت جہلمیؒ، پھر حضرت قاضی صاحب اور پھر حضرت والد صاحب کے بعد حضرت امام اہل سنتؒ کا سایہ شفقت بھی ہمارے سروں سے اٹھ گیا۔ اللہ تعالیٰ ان تمام اکابرین کی دینی وعلمی خدمات کو شرف قبولیت عطا فرمائے، ان کے درجات کو بلند فرمائے اور ان کے علمی وروحانی فیض کو تا قیامت جاری وساری فرمائے۔ ہمیں یہ بھی عہد کرنا ہوگا کہ ہم ان کے مقدس مشن کو ان شاء اللہ بتوفیقہ تعالیٰ زندہ رکھیں گے اور ان کے نقش قدم پر چلتے ہوئے اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی پاکیزہ تعلیمات کو پورے عالم میں پھیلائیں گے۔ ان شاء اللہ

حافظ ممتاز الحسن خان احسن*

ایک استاد کے دو شاگرد

شیخ العرب والعجم حضرت مولانا سید حسین احمد مدنیؒ کی ذات علم وحکمت کا ایسا آفتاب تھی جس سے روشنی پانے والا ہر خوش نصیب دعوت وعزیمت کے افق پر ماہ تاباں بن کر چمکا۔ جسے آپ کے جام معرفت کا ایک گھونٹ بھی نصیب ہوگیا، اس کی باقی عمر قال اللہ وقال الرسول کی صدائیں دیتے، زندانوں کے سناٹوں میں شور سلاسل برپا کرتے اور گلی گلی، کوچے کوچے میں حق کی آواز لگاتے گزری۔ انہی خوش نصیبوں میں سے دو خوش نصیب میرے دادا جان مولانا محمد سرفراز خان صفدرؒ اور میرے نانا جان مولانا قاضی مظہر حسینؒ تھے۔ دونوں حضرات علم ومعرفت کے اس دھواں دھار بادل سے سیراب ہوئے اور خوب ہوئے۔ پھر اس شراب طہور کے نشے سے کچھ ایسے مخمور ہوئے کہ دنیا لاکھ رنگ بدل کر انہیں بلاتی رہی، دور حاضر کی جدت طرازیاں بارہا انہیں رنگ بدلنے پر آمادہ کرتی رہیں، مگر یہ اپنے محبوب استاد کی روش چھوڑنے پر تیار نہ ہوئے۔ اسی کھدر پوشی میں زندگی بتادی اور اسی قلندرانہ رنگ میں اس دنیائے فانی کو الوداع کہہ کر دار آخرت کو چل دیے۔

چمن کا رنگ گو تو نے سراسر اے خزاں بدلا
نہ ہم نے شاخ گل چھوڑی نہ ہم نے آشیاں بدلا

مے خانہ مدنیؒ کے ان مے خواروں نے ساقی کے جلووں اور اس کی دنیائے جنون کو اپنی آنکھوں سے انتہائی قریب سے دیکھا اور ان کے دل نے فیصلہ کیا کہ دنیا وآخرت کی کامرانی اور اتباع سنت کا نور اگر کہیں ہے تو اسی پاکباز استاد کے نقش قدم پر چلنے میں ہے۔ انہوں نے انہی نقوش پاکورہ گزار حیات بنانے کا فیصلہ کیا اور اپنے فیصلہ میں اس قدر مستقیم ثابت ہوئے کہ روئے مدنیؒ کی دید کے مشتاقان آ آ کر ان کے چہروں کے جمال کی زیارت سے نظروں کی پیاس بجھانے لگے۔ انہوں نے دار العلوم دیوبند کے دار الحدیث سے جو سبق سیکھا، آخری سانس تک بڑی استقامت سے اس پر قائم رہے۔ استاد نے مالٹا اور نینی تال جیل سے جو سبق دیا، شاگردوں نے اس پر چلتے ہوئے سنٹرل جیل ملتان، سنٹرل جیل لاہور اور اڈیالہ جیل راولپنڈی کو آباد کیا۔ زنجیروں کی قید میں کلمہ حق کہنے کی جو روایت استاد نے زندہ کی تھی، وفادار شاگردوں نے بھی دار ورسن کو چوم کر استاد کی اس روایت کو برقرار رکھا۔

مدت ہوئی اک دیوانے نے جب ساز سلاسل چھوڑا تھا
اب جب دیکھو زندانوں میں اک شور سلاسل ملتا ہے

اگرچہ وقت کے تمام عقل مندوں اور شہر خرد کے سبھی مفتیوں کا فتویٰ یہی تھا کہ یہ دور رواداری اور امن پسندی کا دور ہے، اس

* فرزند مولانا عبد الحق خان بشیر۔ متعلم جامعہ مدنیہ جدید لاہور۔

دور میں اگر کوئی ''محقق'' صحابہ کرام کو برا بھلا کہے، اسلاف امت کی پگڑیاں اچھالے، اپنے زور قلم سے کوے کو سفید اور سورج کو بیاہ ثابت کرنے کی کوشش کرے اور ''دلائل قاہرہ'' کے زور پر حق وباطل کو خلط ملط کرنے کی سعی کرے تو ہونٹوں پر تالے لگا کر زبان کو سی لو، امن وامان اور بھائی چارے کی فضا قائم رکھو، گالی گلوچ اور بدزبانی تو ناروا ہے، لیکن اگر کوئی علمی حدود میں رہتے ہوئے مہذب انداز میں صحابہ کرام پر تحقیقی اعتراضات کرے اور ان کے معیار حق ہونے پر سوالیہ نشان کھڑا کرے یا اسلاف امت پر بداعتمادی کا راستہ کھولے تو عالی ظرفی اور بلند حوصلگی کا مظاہرہ کرو، اگر غصہ یا اشتعال پیدا ہو تو اسے دبا دو اور ایک منافقانہ مسکراہٹ چہرے پر سجا کر اپنی روشن خیالی کا ثبوت دو۔ کار پردازان شہر تحقیق نقارے بجا بجا کر چہار سو یہ اعلان پھرتے کر رہے ہیں کہ اگر کوئی حق یا اہل حق کا دفاع کر کے اشتعال انگیزی کا مرتکب ہوا تو اس پر امت میں توڑ پیدا کرنے کی دفعہ لگا کر شہر تحقیق سے جلاوطن کر دیا جائے گا اور باز نہ آنے کی صورت میں وہ تعزیر مزید کا مستوجب قرار پائے گا۔

روشن خیالی کے بلند مناروں اور تحقیق کے اسپیکروں سے یہ واویلا کچھ اس زور سے برپا گیا کہ بہت سے قلم اپنی چال بھول گئے۔ بہت سی شعلہ نواز بانوں کو اپنا انداز ہی یاد نہ رہا۔ حق کو حق کہنا یا اسے دلائل سے ثابت کرنا معیوب اور گھٹیا سمجھا جانے لگا۔ بلند علمی تحقیقات کے حامل افراد مناظرانہ لہجے اور مناظرے کو بے وقعتی کی نظر سے دیکھنے لگے اور اکابر کے مسلک کا نام لینا تنگ نظری کی علامت سمجھا جانے لگا۔ ان سب حالات میں جب ان دونوں صاحبانؒ نے نظر اٹھا کر اپنے پاکباز استاد کی طرف دیکھا تو انہیں یہی منظر نظر آیا کہ ان کا استاد عین حالت جنگ میں ہے۔ ایک طرف وہ انگریز کے ساتھ نبرد آزما تھا، دوسری طرف ''الشہاب الثاقب'' اور ''مودودی دستور اور عقائد کی حقیقت'' لکھ کر مبتدعین کی بیخ کنی میں مصروف تھا اور تیسری طرف تحریک مداح صحابہؓ میں جانبازانہ حصہ لے کر روافض کی چیرہ دستیوں کے سامنے بند باندھ رہا تھا۔ انہوں نے اپنے استاد کے اس طرز عمل سے یہی انمول سبق حاصل کیا کہ کفار اور مشرکین سے دفاعی طرز کا معاہدہ تو کیا جا سکتا ہے، مگر اسلام کا نام لینے والے مبتدعین اور ضالین کو قطعاً کسی صورت بھی مسلمانوں میں اپنے ملحدانہ نظریات پھیلانے کی اجازت نہیں دی جائے گی۔ چنانچہ ان دونوں نے اپنے قلم سے ''راہ سنت''، ''خارجی فتنہ''، ''تسکین الصدور''، ''سنی مذہب حق ہے''، ''ارشاد الشیعہ''، اور ''مودودی مذہب'' جیسی بے شمار کتابیں تصنیف فرما کر احقاق حق کا فریضہ سرانجام دیا۔

وہ دیوبند گئے تو وہاں سے رنگا رنگ سوغاتوں سے جھولیاں بھر کر لائے۔ جہاں ایک طرف دیوبند کے دار الحدیث کا علم مدنی مسجد چکوال کے منبر اور نصرۃ العلوم کی مسند حدیث پر جھلکتا تھا، وہاں مدنی منزل دیوبند کی مہمان نوازی اور سادگی بھی چکوال اور گکھڑ کے مہمان خانوں میں نمایاں تھی۔ منبر رسول پر آہستہ آہستہ ٹھہر ٹھہر کر بولنے کا انداز بھی وہی تھا اور پابجولاں ہو کر حاکم وقت کے سامنے سینہ تان کر چلنے کا انداز بھی وہی تھا۔ شب کی خلوتوں میں آہ وزاریاں اور محبوبانہ راز ونیاز بھی وہی تھا اور دن کی محفلوں میں ہنستا مسکراتا شگفتہ چہرہ بھی وہی۔ غرض یہ کہ انہوں نے شیخ مدنیؒ کی اداؤں کو کچھ اس طرح اپنی ذات میں سمو لیا کہ خود شیخ مدنیؒ کی تصویر بن گئے۔

میں نے شعور کی آنکھ کھولتے ہی اپنے گھر میں ان دونوں بزرگوں کا تذکرہ انتہائی عقیدت سے سنا اور ہوش سنبھالتے ہی دونوں کی عقیدت سے دل کو معمور پایا۔ مجھے یاد ہے کہ بچپن کے ان انمول دنوں میں جب ہمارا چکوال یا گکھڑ کا چکر لگتا تو گویا ہمیں عید کی نوید سنائی جاتی اور ہم بے شمار معصوم خواب آنکھوں میں سجائے دادا جانؒ یا نانا جانؒ سے ملاقات کو روانہ ہوتے۔

جب مزید سمجھ بوجھ پیدا ہوئی اور دونوں بزرگوں کو قریب سے دیکھنے کا موقع ملا تو ان کے بہت سے کمالات آشکارا ہوتے چلے گئے اور ہر بات پر ان کی محبت وعقیدت میں اضافہ ہوتا گیا۔ جب میں تعلیم کی غرض سے گکھڑ رہائش پزیر ہوا تو ان کی آپس کی محبتوں کے نظارے بھی سامنے آئے، اگرچہ دونوں بزرگ اس وقت ملک شباب کی سرحدوں کو بہت پیچھے چھوڑ کر پیری کی منزل کا بہت سا فاصلہ طے کر چکے تھے۔ چنانچہ ان کی ملاقات کے ایک واقعہ کے سوا اور کوئی واقعہ میری یادداشت میں محفوظ نہیں۔

امی جان کے ماموں، جو اب وفات پا چکے ہیں، گوجرانوالہ میں رہائش پذیر تھے۔ ان کی اہلیہ محترمہ کی وفات ہوئی تو نانا جیؒ تعزیت کے لیے گوجرانوالہ تشریف لے گئے اور رات کو ان کے گھر پر قیام فرمایا۔ اگلے دن صبح سویرے عم مکرم مولانا ریاض خان سواتی تشریف لائے اور نانا جیؒ سے نصرۃ العلوم میں درس دینے کی درخواست کی جسے نانا جیؒ نے قبول فرمالیا۔ گاڑی میں نصرۃ العلوم کی جانب روانہ ہوئے۔ ہم بچے بچونگڑے بھی ساتھ تھے۔ نصرۃ العلوم پہنچ کر آپؒ نے طلبہ میں طویل بیان فرمایا۔ تھوڑی دیر کے بعد دادا جان بھی تشریف لے آئے اور طلبہ کے ہجوم میں دونوں کی ملاقات ہوئی۔ مجھے ان دونوں بزرگوں کی ملاقات کو دیکھنے اور ان کی باتیں سننے کا بہت شوق تھا، مگر جرم طفولیت کی بنا پر آگے جگہ نہ پا سکا اور منبر پر چڑھ کر پنجوں کے بل کھڑا ہونے کے باوجود ان کی ملاقات کی ایک جھلک ہی دیکھ سکا۔ دونوں بزرگ کھڑے ہو کر معانقہ فرما رہے تھے اور خوشی ومسرت سے دونوں کے چہرے تمتما رہے تھے۔ طلبہ کرام بھی اچک اچک کر اس حسین ودل آویز کو نظروں میں سمونے کی کوشش کر رہے تھے۔ بڑے لطف کا منظر تھا جو میری زندگی کی یادگاروں میں سے ایک یادگار ہے۔

دادا جانؒ، مولانا عبد اللطیف جہلمیؒ اور نانا جانؒ، تینوں بزرگوں کا آپس کا تعلق بڑا گہرا تھا۔ تینوں ایک مدرسہ کے فیض یافتہ تھے، نظریات اور خیالات بھی ایک جیسے تھے اور عقائد اہل سنت کا تحفظ اور فرق باطلہ کی سرکوبی تینوں کا محبوب مشن تھا۔ اس ہم مزاجی کی بنا پر ان کے تعلقات دلی محبتوں، جلسوں میں اکٹھے شرکت اور گھریلو میل ملاپ سے بڑھتے ہوئے خاندانی رشتہ داریوں تک جا پہنچے، چنانچہ پہلے میری منجھلی پھپھو کا نکاح مولانا عبد اللطیف کے فرزند مولانا قاری خبیب احمد عمرؒ سے ہوا جو چند ماہ قبل اس دار فانی کو الوداع کہہ کر دار اصلی کی طرف روانہ ہو چکے ہیں۔ پھر پھپھو جان کی تحریک پر میرے والدین کا رشتہ وجود پذیر ہوا۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو بھی ان محبتوں اور رشتوں کو بخوبی نبھانے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین۔

یوں تو نانا جانؒ اور دادا جانؒ کی محبتوں کے گواہ بہت سے واقعات ہیں جو حافظے کی اسکرین پر جھلملا رہے ہیں، مگر یہ مختصر صفحات ان سب کا تحمل نہیں کر سکتے، اس لیے صرف چند ایک کا تذکرہ کرتا ہوں۔

امی جان نے بتایا کہ ان کی شادی کے کچھ ہی عرصہ کے بعد دادا جانؒ بیمار ہو گئے۔ بیماری معمولی نوعیت کی تھی، کوئی شدید یا مہلک بیماری نہیں تھی، لیکن جب نانا جانؒ کو خبر ملی تو انہوں نے عیادت کے لیے تمام اہل خانہ سمیت گکھڑ کا سفر فرمایا اور دادا جان کی عیادت کی۔ جب نماز کا وقت ہوا تو دونوں بزرگوں نے ایک دوسرے سے امامت کروانے کے لیے اصرار فرمایا۔ کافی دیر تک دونوں طرف سے یہ اصرار ہوتا رہا۔ آخر نانا جیؒ نے فرمایا کہ میں معذوری کی وجہ سے پڑھا نہیں سکتا، چنانچہ دادا جانؒ نے نماز پڑھائی۔ اگرچہ یہ دونوں حضرات ہم عصر اور ہم عمر تھے مگر مزے کی بات یہ ہے کہ ہر ایک کا برتاؤ دوسرے کے لیے ایسا تھا جیسا مرید کا مرشد کے لیے ہوتا ہے۔ نانا جانؒ، دادا جانؒ کو حضرت شیخ الحدیث صاحب کے نام سے یاد فرماتے تھے اور دادا جانؒ انہیں حضرت قاضی صاحب کے نام سے یاد فرماتے تھے۔ دونوں کا ایک دوسرے کے بارے میں گفتگو کا لہجہ انتہائی مودبانہ ہوتا تھا اور گفتگو ''وہ فرماتے ہیں''، ''انہوں نے ارشاد فرمایا''، ''ان سے عرض کریں'' جیسے الفاظ کے گرد گھومتی تھی۔

جب دادا جانؒ مفتی محمد جمیل خان شہیدؒ کے ساتھ سفر حرمین کے لیے تشریف لے گئے تو واپسی پر ایک روز فرمایا کہ ''میں او تھے قاضی صاحب تے صوفی صاحب واسطے رو رو کے دعاواں منگدا رہیاں۔'' صوفی صاحب سے مراد ہمارے چھوٹے دادا جانؒ حضرت مولانا عبد الحمید خان سواتی تھے، جن سے دادا جانؒ کو بہت پیار تھا۔ ان کے ساتھ حرم شریف کی خاص الخواص دعاؤں اور آہ وزاریوں میں جنہیں شریک فرمایا، وہ مولانا قاضی مظہر حسینؒ تھے۔ نانا جیؒ کی وفات کے بعد امی جی نے، جنھوں نے پہلے نانا جیؒ کے ہاتھ پر بیعت کی تھی، دادا جان سے عرض کیا کہ میں پہلے ابا جی سے بیعت تھی، اب آپ سے بیعت کی درخواست کرنا چاہتی ہوں، مگر دادا جانؒ نے ان کی بات کاٹ کر بڑے زوردار سے فرمایا کہ وہی کافی ہے اور امی جی کو بیعت نہیں فرمایا۔ اور سنا ہے کہ حضرت لاہوریؒ بھی حضرت مدنیؒ کی وفات کے بعد آپ کے مریدوں کو از روئے تواضع بیعت نہیں فرماتے تھے۔

آخری عمر میں جب نانا جانؒ کی کمر کمان کی طرح جھک چکی تھی اور آپ کو کرسی پر بٹھا کر ادھر ادھر لے جایا جاتا تھا، دو شخصیات ایسی تھیں جن کے استقبال کے لیے نانا جانؒ جھکی ہوئی کمر کے ساتھ گلی سے باہر خود چل کر تشریف لائے۔ نانا جی کے انتقال کے بعد دادا جی نے شدید بیماری اور معذوری کے باوجود بھیں کی پہلی سنی کانفرنس میں، جو نانا جی کے آبائی گاؤں ضلع چکوال میں منعقد ہوتی ہے، شرکت فرمائی۔ گزشتہ سال شعبان میں جب میں دادا جان کی خدمت میں گکھڑ قیام پذیر تھا، ایک روز حضرت مولانا حبیب الرحمٰن سومرو مدظلہ، جو نانا جیؒ کے واحد خلیفہ مجاز ہیں، تشریف لائے۔ دادا جانؒ نے فرمایا کہ ان کو بڑی کرسی پر بٹھاؤ۔ دادا جانؒ کے کمرے میں عام مہمان تو نیچے زمین پر بچھے ہوئے قالین پر بیٹھتے تھے، خواص کو فولڈنگ کرسی دی جاتی تھی جو دادا جان کی چارپائی کے ساتھ رکھی رہتی تھی، جبکہ اخص الخواص مہمانوں کو بڑی کرسی پر بٹھایا جاتا تھا۔ چنانچہ انہیں بھی بڑی کرسی پر بٹھایا گیا اور دادا جانؒ ان سے اس طرح گفتگو فرما رہے تھے جیسے بڑے بزرگوں سے کرتے ہیں، حالانکہ وہ عمر میں شاید میرے والد محترم سے بھی چھوٹے ہوں۔ دادا جان نے مجھے فرمایا کہ پانی لاؤ۔ میں پانی لایا تو حضرت کو فرمایا کہ مجھے پانی دم کر دیں۔ انھوں نے تعمیل حکم میں دم کیا تو فرمایا کہ آپ تھوڑا سا پانی پی کر مجھے دے دیں۔ پھر ان کا بچا ہوا پانی دادا جان نے نوش فرمایا۔ پھر شاید فرمایا کہ میرے لیے دعا فرمائیں کہ میرا خاتمہ ایمان پر ہو۔ اتنا ادب چھوٹوں میں سے دادا جان کو کسی کسی کا کرتے دیکھا، مثلاً حضرت مولانا منظور احمد چنیوٹیؒ، حضرت مولانا اسعد مدنیؒ اور چند دیگر چیدہ چیدہ حضرات۔ اسی طرح جب نانا جیؒ کے جانشین اور میرے ماموں جان مولانا قاضی ظہور حسین صاحب تشریف لائے تو ان کا بھی بہت اکرام فرمایا اور فرمایا کہ قاضی مظہر حسین کے طریقے پر چلتے رہنا، اور اکابر کا یہی طریقہ تھا۔ جب دادا جان ہماری کسی خدمت پر خوش ہوتے تو رقت آمیز لہجے میں ہاتھ اٹھا کر فرماتے، یا اللہ! یہ میرے پاس قاضی صاحب کی نشانی ہے، انھیں ان کا جانشین بنا۔

باری تعالیٰ! آپ خوب جانتے ہیں کہ ہم کتنے ناکارہ اور نالائق ہیں۔ اے ہمارے مولا! ہماری نالائقیوں اور گناہوں سے درگزر فرما اور اپنی رحمت سے اپنے اس بندے کی زبان سے نکلے ہوئے بول کی لاج رکھ۔ ہمیں اپنے بڑوں کے نقش قدم پر چلا اور پھر ہمیں وہ ایمانی حرارت دے جو تو نے اپنے حبیب صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد حضرت ابوبکر صدیق اور دیگر صحابہ کرام کو عطا فرمائی۔ آمین

حافظ سرفراز حسن خان حمزہ*

دادا جان رحمہ اللہ ـــــ چند یادیں، چند باتیں

حضرت دادا جان رحمہ اللہ ایک مایہ ناز مدرس اور قابل فخر معلم تھے۔ ہزاروں تشنگانِ علم نے دور دور سے آکر آپ سے کسب فیض کیا۔ بالخصوص آپ کا شعبان رمضان کی سالانہ چھٹیوں میں منعقد ہونے والا چالیس روزہ دورۂ تفسیر تو ایسا مشہور ومقبول ہوا کہ اس کی مثال دیکھنے میں نہیں آتی۔ دار العلوم دیوبند (ہندوستان)، بنگلہ دیش، ایران، سعودی عرب، انڈونیشیا، جنوبی افریقہ، افغانستان اور برما سمیت دنیا بھر سے طلبہ جوق در جوق آپ کے دورۂ تفسیر میں شریک ہوتے اور اپنی علمی پیاس بجھاتے تھے۔ آپ کے سینکڑوں شاگرد دنیا بھر میں حدیث پاک کی خدمت میں مصروف ومشغول ہیں۔ کتب احادیث پر آپ کی گہری نظر تھی۔ حافظہ اس قدر غضب کا تھا کہ دورانِ درس پورے اعتماد کے ساتھ ایسی کتب کے حوالے دیتے تھے جن کا مطالعہ آپ رحمہ اللہ نے کئی کئی سال قبل کیا ہوتا تھا۔ اکثر صفحہ نمبر بھی بتا دیتے اور بعض اوقات تو عبارات بھی پڑھ کر سنا دیتے۔ خاص طور پر کتب حدیث اور جلالین شریف کی عبارات تو اکثر زبانی پڑھ دیتے اور پھر بعض اوقات طلبہ کے اطمینان کی خاطر کتاب کھول کر طلبہ کی تسلی بھی کرا دیتے تھے۔ اس کے علاوہ کتب تفاسیر مثلاً قرطبی، روح المعانی، کشاف، مظہری اور دیگر کتب کے حوالے بمع صفحہ نمبر بتاتے تھے۔ خود فرماتے تھے کہ ''اب تو بوڑھا ہو گیا ہوں، زیادہ مطالعہ نہیں کر سکتا۔ جس زمانہ میں تندرست تھا، الحمد للہ بہت تفسیریں دیکھی ہیں، سب کی باتیں ابھی تک صفحہ نمبر سمیت یاد ہیں''۔ مطالعہ اس قدر وسیع تھا کہ دنیا بھر میں مثال ملنا مشکل ہے۔ بعض اوقات آپ رحمہ اللہ تحدیث نعمت کے طور پر خود فرمایا کرتے تھے کہ ''برصغیر میں شاید ہی کسی نے اتنا مطالعہ کیا ہو جتنا مطالعہ کرنے کی بفضلہٖ تعالیٰ مجھے توفیق ملی ہے''۔

بات سمجھانے اور اسے اچھی طرح ذہن نشین کرانے کا ملکہ خداوند قدوس نے آپ کو کامل واکمل طور پر عطا کیا تھا۔ الفاظ کو ایسا واضح اور صاف بولتے کہ ایک ایک لفظ دل میں اترتا چلا جاتا اور ہر ہر بات کا مفہوم ذہن نشین ہوتا چلا جاتا تھا۔ خاص طور پر مشکل الفاظ اور عبارات تو ایسے واضح فرماتے کہ سامع کے ذہن میں کئی کئی سال تک وہ لفظ صحیح تلفظ اور درست اعراب کے ساتھ گونجتا رہتا تھا۔ خود احقر نے ان کے دورہ تفسیر کی سی ڈیز سنیں۔ کئی ماہ گزرنے کے باوجود ابھی تک اُن کے الفاظ اور انداز، مشکل الفاظ کو زور دے کر واضح کرنا، نہایت ہی پیارا اور دلنشین آسان ترجمہ کرنا، کتب تفسیر وحدیث کے حوالوں پہ حوالے دینا، جن آیات سے اہل باطل استدلال کرتے ہیں، اُن کی نشان دہی کرنا اور ان کے استدلال کا طریقہ اور اس کا رد بتانا، اور جن آیات سے اہل باطل کے خلاف استدلال کیا جاتا ہے، اُن سب کی بھی نشان دہی کرنا اور طریق استدلال خوب ذہن نشین کرانا، صرفی نحوی اشکالات اور قابل قدر اعتراضات کا تسلی بخش، باحوالہ، مدلل جواب دینا، طلبہ کرام کو بے حد

* فرزند مولانا عبد الحق خان بشیر۔ متعلم جامعہ مدنیہ بہاولپور

شفقانہ انداز سے مخاطب کرنا، سبق میں توجہ رکھنے کی خاطر کوئی کوئی مقام کسی سے سن لینا، دوران سبق دلچسپی کا پورا سامان مہیا کرنا، یہ سب کچھ ذہن میں گھوم رہا ہے اور ان کی دل کش آواز کانوں میں گونجتی محسوس ہو رہی ہے۔ خاص طور پر اُن کا جملہ 'اے مخاطب'' تو احقر کو بہت ہی بھاتا تھا۔ ابھی تک لہجہ کی حلاوت اور مٹھاس محسوس ہو رہی ہے۔ یہ تو سی ڈیز سننے والے کا حال ہے، ان خوش نصیبوں نے آپ کے سامنے بیٹھ کر آپ کے درس کے مزے لوٹے ہوں گے، ان کی کیا کیفیت ہوگی!

کریما سے لے کر بخاری شریف تک تمام کتب کئی کئی سال آپ کے زیر درس رہیں۔ خاص طور پر بخاری شریف تو تقریباً مسلسل پچاس سال آپ کے زیرِ درس رہی۔ ۲۰۰۱ میں فالج کی بنا پر جب تدریس چھوڑی تو ایک دن مجھے فرمایا کہ ''بیٹا! سب سے لمبی سروس اس وقت میری ہے۔ میں نے کل ستر سال تدریس کی ہے، لیکن اب کمزور ہو گیا ہوں، ہمت نہیں رہی، اس لیے میں نے نصرۃ العلوم سے استعفا دے دیا ہے۔ وہ بھی پریشان ہیں کہ اُن کو کوئی پرانا آدمی نہیں مل رہا۔ دعا کرنا اللہ خیر کرے''۔ اُس وقت میری عمر تقریباً تیرہ سال تھی۔ میں اس قدر حیران ہوا اور سوچنے لگا کہ دادا جان نے مجھے بلا کر یہ بات کیوں بتائی؟ یہ عقدہ تا حال حل نہیں ہو سکا۔

سنا تھا کہ اللہ درس حدیث کے دوران جب امام بخاری رحمہ اللہ کے استاد زادہ بچوں کے ساتھ کھیلتے ہوئے آپ کے سامنے آتے تو آپ احتراماً کھڑے ہو جاتے تھے۔ اس کی عملی صورت بندہ نے یا تو اپنے نانا جی قائد اہل السنۃ وکیل صحابہ حضرت مولانا قاضی مظہر حسین صاحب نور اللہ مرقدہ کے ہاں دیکھی یا پھر حضرت دادا جان رحمہ اللہ کے ہاں نظر آئی۔ استاد زادہ جو ہر لحاظ سے آپ سے چھوٹے شمار ہوتے تھے، ان کا اس قدر ادب کرتے کہ عقل دنگ رہ جاتی۔ ''شیخ الاسلام سیمینار'' بہاولپور میں، میں نے یہ منظر دیکھا کہ جب فرزند شیخ مدنی رحمہ اللہ حضرت مولانا سید محمد ارشد مدنی دامت برکاتہم آپ کو ملنے کے لیے تشریف لائے تو آپ کی خوشی اور مسرت کا کوئی ٹھکانہ نہ تھا۔ باوجود بڑھاپے، کمزوری اور فالج کے آپ گویا احتراماً بچھے جاتے تھے۔ ملتے ہی پہلے سنت کے مطابق مصافحہ کیا، پھر اپنے استاد زادہ کے ہاتھ چومے، آنکھوں سے لگائے، بڑی ہی عقیدت اور محبت سے بٹھایا اور حال احوال دریافت کیے۔ اس قدر ادب دیکھ کر ناظرین حیران وششدر رہ گئے، کیونکہ مولانا ارشد مدنی مدظلہ آپ سے ہر لحاظ سے چھوٹے تھے۔ پھر یہی منظر جامعہ مفتاح العلوم سرگودھا کے سالانہ جلسے پر نظر آیا کہ آپ بستر پر لیٹے ہوئے تھے جب حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی مدظلہ آپ سے ملاقات کے لیے تشریف لائے۔ باوجودیکہ آپ خود اٹھنے سے بالکل قاصر تھے، بار بار اٹھنے کی کوشش کرتے۔ یہاں بھی پہلے مصافحہ کیا، پھر استاد زادہ کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے کر ہونٹوں کے قریب لے جانا چاہا تو حضرت مفتی صاحب نے شرمندگی سے پیچھے کھینچا اور عرض کیا کہ حضرت میں اس قابل نہیں، مگر آپ باوجود انتہائی ضعف کے برابر ہاتھ ہونٹوں کے قریب لے جانے کی کوشش کرتے رہے۔ بالآخر مفتی صاحب نے آپ کی تکلیف کا خیال کرتے ہوئے ہاتھ ڈھیلا کر دیا اور آپ نے اس پر بوسہ دیا۔

شیخ الاسلام سیمینار (بہاولپور) میں شرکت کے لیے جب آپ اسٹیج پر پہنچے تو انتظامیہ کی طرف سے آپ کو ایک بیج لگایا گیا جس پر آپ کا نام درج تھا تاکہ سامنے بیٹھنے والے سامعین کو بزرگوں کی پہچان میں سہولت اور آسانی ہو۔ آپ نے جب بیج لگتے دیکھا تو بڑے ہی دلفریب اور مزاحیانہ انداز سے مسکراتے ہوئے مجھ سے سوال کیا ''یہ بیج اس لیے لگایا ہے کہ کہیں ''بابا''

گم نہ ہو جائے؟'' میں نے جواباً عرض کیا کہ نہیں، یہ اس لیے لگایا ہے کہ ''باباجی'' بھاگ نہ جائیں۔ یہ سن کر آپ خوب مسکرائے۔ دادا جان رحمہ اللہ فرمایا کرتے کہ ''خدمت تو کرو مگر صرف شوق اور جذبے کو ملحوظ نہ رکھا کرو بلکہ عقل اور سمجھ سے کام لے کر حسبِ ضرورت خدمت کیا کرو۔'' بعض حضرات جو فقط شوق اور جذبے سے سرشار ہو کر آپ کی خدمت کرتے تو آپ ان کو ''مخلص للّے'' کے لقب سے نوازتے اور فرماتے کہ یہ بے چارے ہیں تو مخلص، مگر ہیں للّے۔ کام کا ڈھنگ نہیں آتا۔

فالج کی وجہ سے آپ بالکل حرکت کرنے سے بالکل عاجز تھے، چنانچہ راہوالی (گوجرانوالہ کینٹ) سے ایک ڈاکٹر صاحب روزانہ آپ کی مالش کرنے اور ورزش کرانے کے لیے آتے تھے۔ آپ کو چونکہ جسمانی تکلیف شدید تھی، ورزش تو دور کی بات ہے، اعضا کو چھیڑنے سے ہی درد کی لہریں اٹھنے لگتیں، مگر ''دورانِ خون'' جاری رکھنے اور اعضا کو جام ہونے سے بچانے کے لیے یہ ورزش بہت ضروری تھی۔ آپ تکلیف کی وجہ سے ڈاکٹر صاحب کو ورزش سے منع کر دیتے مگر ڈاکٹر صاحب مختلف حیلوں بہانوں سے کچھ نہ کچھ ورزش کرا ہی جاتے۔ اس صورت حال کو دیکھتے ہوئے آپ نے ڈاکٹر صاحب کو ''ڈاکٹر جن'' کے لقب سے ملقب فرمایا اور آخر تک اسی نام سے یاد فرماتے۔

خادم کے چھوٹے بھائی عبدالرحمٰن خان انس نے بچپن میں کہیں دادا جان اور نانا جان رحمہما اللہ کے اسمائے گرامی کے ساتھ بڑے بڑے القابات دیکھے تو اسے بھی شوق ہوا کہ میں بھی اپنے نام کے ساتھ مختلف لقب لگاؤں۔ چنانچہ اس نے ازخود ایک اشتہار پر نانا جان رحمہ اللہ کے نام کے ساتھ موجود القاب یاد کر لیے اور ان کو اپنے نام کا حصہ بنا لیا۔ ایک روز ہم گکھڑ میں تھے کہ دادا جان نے انس کو بلایا اور اتفاقاً ہی نام پوچھا تو انس نے اپنا یاد کردہ نام مع القابات سنانا شروع کر دیا: ''پیرِ طریقت، رہبرِ شریعت، وکیلِ صحابہ حضرت مولانا عبدالرحمٰن خان انس نعمانی صاحب''۔ یہ سنتے ہی دادا جان مسکرائے اور والد صاحب کو بلا کر پوچھا کہ ''اس کو کیا یاد کرایا ہے؟'' والد صاحب اس سے قطعی بے خبر تھے، انہوں نے لاعلمی ظاہر کی۔ دادا جان نے دوبارہ نام پوچھا تو حضرت انس صاحب نے اول تا آخر ساری کیسٹ پھر سے چلا دی۔ دادا جان رحمہ اللہ نے پوچھا ''ابو کا کیا نام ہے؟'' تو جواب ملا: ''عبدالحق''۔ فوراً دادا جان رحمہ اللہ کا ہلکا سا قہقہہ بلند ہوا۔ اس کے بعد جب بھی انس کو دیکھتے تو بلاتے اور فرماتے ''نام تو سناؤ!'' اور حضرت صاحب شروع ہو جاتے۔ بعض اوقات جامعہ نصرۃ العلوم گوجرانوالہ میں جانا ہوتا۔ دادا جان رحمہ اللہ مسجد کے برآمدے میں بیٹھ کر سبق پڑھا رہے ہوتے۔ انس سامنے سے گزرتا تو اسے بلاتے اور اسپیکر میں تمام طلبہ کو نام سنواتے۔ چنانچہ انس ''پیرِ طریقت'' کے نام سے مشہور ہو گیا، حتیٰ کہ نانا جان رحمہ اللہ بھی اسے ''پیرِ طریقت'' کہہ کر ہی بلاتے۔

علم و فضل کے کوہ گراں ہونے کے ساتھ ساتھ آپ دیانت و تقویٰ کے بھی پیکر تھے۔ چنانچہ آپ ان طلبہ کو ''اجازتِ حدیث'' ہرگز نہ عنایت فرماتے جو ابھی دورۂ حدیث کر رہے ہوتے اور ''بخاری شریف'' مکمل نہ کی ہوتی۔ جدید فضلا میں سے عام طور پر آپ سند اُن کو دیتے جو کسی صحیح العقیدہ استاذ سے حدیث پڑھنے کے بعد وفاق کا امتحان دے چکے ہوتے، البتہ رائے ونڈ کے فضلا کے لیے ''وفاق'' کے امتحان کی شرط نہ تھی۔ بعض اوقات کسی موقع پر اُن حضرات کو بھی سند عنایت فرما دیتے جو بخاری مکمل کرنے کے بعد ''وفاق'' کے امتحان سے قبل اپنے اساتذہ سمیت جماعت کی شکل میں ''اجازتِ حدیث'' لینے آ پہنچتے۔ اسی طرح اگر کسی جگہ ''ختمِ بخاری شریف'' کی تقریب میں جاتے تو ایسے فضلا جنہوں نے ابھی ''وفاق'' کا امتحان نہ دیا ہوتا، اُن کی اور اُن کے اساتذہ کی خواہش پر سند عنایت فرما دیتے تھے۔ ایک مرتبہ احقر نے آپ سے پوچھا کہ آپ دورانِ

سال دورۂ حدیث والوں کو سند عنایت نہیں فرماتے، اس کی کیا وجہ ہے، جبکہ دیگر بعض اکابر تو ابتدائے سال میں ''افتتاحِ بخاری'' کی تقریب میں ہی طلبہ کو ''اجازتِ حدیث'' اور سند دے دیتے ہیں؟ تو فرمایا: ''بیٹا! یہ ایک امانت ہے، جسے حق دار تک پہنچانا ضروری ہے۔ غیر حق دار کو سند دینا دیانت کے خلاف ہے، اور نہ معلوم کون دورانِ سال بھاگ جائے، نہ پڑھے، تو اس صورت میں سند غیر حق دار کے پاس چلی جائے گی!'' پھر فرمایا: ''اگرچہ سب پڑھ بھی جائیں، لیکن ابھی ان میں سند کا استحقاق نہیں ہے، غیر مستحق کی گواہی میں کیوں دوں؟ یہ تو جھوٹی گواہی ہوگی! اس لیے میں انہی کو سند دیتا ہوں جو ظاہری لحاظ سے اہلیت اور استحقاق پیدا کر چکے ہوتے ہیں۔ (یعنی دورۂ حدیث مکمل کر چکے ہوتے ہیں)۔''

حضرت اقدس دادا جان رحمہ اللہ کی مسلک اہل السنۃ والجماعۃ کے ساتھ گہری اور پختہ وابستگی سب پر عیاں ہے۔ اس سلسلہ میں وہ معمولی لچک کے بھی روادار نہ تھے اور مسلک کے حوالے سے ''لا یخافون لومۃ لائم'' کے مظہر اتم تھے۔ مکہ مکرمہ کے رہنے والے ایک عرب گھرانے کے فرد محمد علوی مالکی صاحب (جو مذہباً بریلوی ہیں) نے 'الذخائر المحمدیہ' اور 'حول الاحتفال بذکری المولد النبوی شریف' کے نام سے دو کتابیں لکھیں۔ ان کتابوں کے بہت سے مندرجات پر سعودی عرب کے علما بورڈ کے ایک رکن اور مکہ مکرمہ کے قاضی شیخ عبداللہ بن سلیمان بن منیع نے اعتراض کیا اور ان کے رد میں ایک کتاب ۱۴۰۳ھ میں شائع کی جس کا نام 'حوار مع المالکی فی رد منکراتہ وضلالاتہ' رکھا۔ اس کتاب کی اشاعت کے بعد جب علوی صاحب کے حامیوں نے پاکستان میں 'مفاہیم یجب ان تصحح' کا اردو ترجمہ ''اصلاحِ مفاہیم'' کے نام سے شائع کیا تو اہل حق اسی وقت کھٹکے کہ شرک و بدعات کو اصل دین بتایا جا رہا ہے۔ چنانچہ اکابر اہل علم نے بروقت ان حضرات کی گرفت کی اور اپنے مضامین و فتاویٰ اور رسائل میں عوام الناس کو اس بات سے بخوبی آگاہ کیا کہ ''اصلاحِ مفاہیم'' شرک و بدعات پر مبنی عقائد و اعمال کا پلندہ ہے جس پر توحید و سنت کا لیبل لگایا گیا ہے۔ حضرت دادا جان رحمہ اللہ نے اپنے ذوق اور عادت کے مطابق اس مقام پر بھی ''حق'' اور ''اہلِ حق'' کی تائید و تصویب فرمائی اور انہی کا ساتھ دیتے ہوئے ''اصلاحِ مفاہیم'' اور علوی صاحب کی دیگر کتب میں موجود باطل نظریات سے برأت کا اظہار فرمایا۔ احقر نے حضرت دادا جان رحمہ اللہ کے پاس حاضر ہو کر علوی مالکی صاحب کی بابت سوال کیا تو فرمایا کہ ''میرا وہی نظریہ ہے جو حضرت قاضی صاحب رحمہ اللہ کا تھا''۔ پھر احقر نے مولانا ڈاکٹر مفتی عبدالواحد مدظلہ (مفتی جامعہ مدنیہ لاہور) کا ایک رسالہ ''محمد علوی مالکی کے عقائد ان کی تحریرات کے آئینہ میں'' سنایا تو چند عبارتیں سنتے ہی دادا جان رحمہ اللہ بول اٹھے کہ ''یہ تو احمد رضا سے بھی بڑا بدعتی ہے''۔ احقر نے فوراً سوال کیا کہ ''جو علما ان کی تائید کرتے ہیں، ان کا کیا حکم ہے؟'' فرمایا ''کون؟'' میں نے عرض کیا کہ ''مولانا عبدالحفیظ مکی صاحب وغیرہ'' تو فرمایا: ''اگر وہ اس کی تائید کرتے ہیں تو وہ اسی جیسے ہیں''۔ اللہ اکبر! یہ تھی مسلکی غیرت کہ مسلک کے معاملہ میں اپنے پرائے کی رعایت رکھے بغیر ''حق'' بیان کیا۔ رحمہ اللہ تعالیٰ رحمۃً واسعۃً۔

آپ کو اپنے اکابر سے والہانہ لگاؤ اور اُن کی تحقیقات پر کلی اعتماد تھا، اسی کی نصیحت اپنے متعلقین کو بھی فرماتے اور یہی نصیحت آپ کے بیعت والے کارڈ پر بھی درج ہوتی۔ ملاحظہ فرمائیں:

''عزیزانِ گرامی قدر!

میں کسی بھی مسئلہ میں اپنی کوئی رائے نہیں رکھتا، بلکہ قرآن و سنت اور فقہ و تاریخ کے تمام افکار و مسائل میں اکابرین

علمائے دیوبند کی اجماعی تحقیق پر اعتماد کرتا ہوں اور ان کی تمام اجماعی تعلیمات کو حق جانتے ہوئے ان پر عمل پیرا ہونے کو اپنے لیے ہدایت اور نجات کا ذریعہ سمجھتا ہوں۔ لہٰذا میں اپنے تمام تلامذہ، مریدین اور متعلقین کو نصیحت کرتا ہوں کہ وہ اکابر علمائے دیوبند کے مسلک پر سختی کے ساتھ عمل پیرا رہیں اور ان کا دامن کسی صورت چھوڑنے نہ پائیں۔ جو اکابر علمائے دیوبند کے اجماعی مسلک کو قرآن وسنت کے مطابق سمجھتے ہوئے اس پر پوری طرح قائم رہے، وہ میرے متعلقین میں شامل ہے، اور جس کا اکابر کی اجماعی تحقیق پر اعتماد نہ ہو، میرا اُس کے ساتھ کوئی تعلق نہیں۔“

مولانا محمد اعظم طارق شہیدؒ کی شہادت کے بعد جب مولانا محمد احمد لدھیانوی مدظلہ سپاہ صحابہ کے صدر منتخب ہوئے تو دادا جان کے پاس گکھڑ حاضری دی۔ اس موقع پر خادم بھی موجود تھا۔ مولانا لدھیانوی نے سلام دعا اور احوال دریافت کرنے کے بعد عرض کیا کہ حضرت! ہمیں اب سمجھ آ گئی ہے کہ ہماری سابقہ پالیسی نے جتنا ہمیں نقصان پہنچایا ہے، اتنا نفع نہیں ہوا، لہٰذا اب ہم نے سابقہ پالیسی تبدیل کرنے اور متشددانہ طرز عمل ترک کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔ یہ بات سنتے ہی دادا جان رحمہ اللہ کا چہرہ خوشی سے تمتمانے لگا۔ مسرت ان کے چہرہ سے ایسے عیاں تھی جیسے نصف النہار کا سورج۔ مولانا لدھیانوی سے مخاطب ہو کر فرمایا: ”مولانا! ہم تو پہلے ہی یہ سمجھاتے تھے مگر ہماری نہیں سنی گئی۔ اب آپ نے بہت اچھا اور حالات کے مطابق درست فیصلہ کیا ہے۔ آپ تشدد کی پالیسی ترک کر دیں، ہماری دعائیں آپ کے ساتھ ہیں۔ اللہ تعالیٰ آپ کو استقامت نصیب فرمائے“۔

فالج کے تیسرے حملے کے بعد جب آپ بالکل ہی معذور ہو چکے تھے، اس دوران خادم نے دو رمضان آپ رحمہ اللہ کی خدمت میں گزارے جو میری زندگی کا قیمتی سرمایہ اور متاع عزیز ہیں۔ ان دنوں آپ کے معمولات کچھ یوں تھے:

چونکہ انتہائی ضعف ونقاہت کی بنا پر آپ روزہ رکھنے سے قاصر تھے، لہٰذا فجر سے قبل بیدار ہوتے اور کچھ کھانے پینے کو طلب فرماتے۔ پھر بعد از نماز فجر خادم کو پاس بٹھا کر قرآن پاک پڑھنے کا حکم دیتے اور خود سنتے رہتے۔ اسی دوران آپ کی آنکھ لگ جاتی۔ پھر کچھ دیر آرام فرماتے۔ تقریباً ایک گھنٹہ بعد بیدار ہوتے اور اخبار کی موٹی موٹی سرخیاں اور اگر کوئی اہم اداریہ یا مضمون ہوتا تو وہ سنتے۔ پھر ناشتہ کرتے اور ناشتہ کے بعد کم وبیش آٹھ بجے سے گیارہ بجے تک ”فضائل اعمال“ سنتے۔ یہ دورانیہ اس سے کم ہو جاتا تھا، زیادہ نہیں۔ روزہ کی بنا پر خادم میں اتنی ہمت نہ ہوتی۔ گلا خشک ہو جاتا اور آواز بیٹھنے لگتی۔ انتہائی دقت کے ساتھ یہ تین گھنٹے پورے کرتا۔ اس دوران مہمانوں وغیرہ کی آمد کا سلسلہ جاری رہتا۔ کوئی صاحب زیارت یا تعویذ کے لیے تشریف لاتے اور آپ ان کی طرف متوجہ ہوتے تو خادم کچھ دیر سانس لے لیتا مگر آپ جلد ہی ان کو فارغ کر کے پھر حکم فرماتے، پڑھو! پھر تقریباً گیارہ بجے آپ بھی کچھ دیر آرام فرماتے، خادم بھی سو جاتا۔ ظہر سے کچھ پہلے بیدار ہو کر کوئی چیز کھانے کی (دلیہ وغیرہ) یا پینے کی (دودھ سوڈا، انشور، یا یخنی وغیرہ) طلب فرما کر نوش فرماتے اور ظہر بھی کرسی پر بیٹھ کر باجماعت ادا کرتے۔ بعد از ظہر خادم منزل یاد کرتا یا گھر کے کام کاج کرتا اور ڈاکٹر مقبول صاحب تشریف لے آتے۔ وہ دادا جان کو ورزش وغیرہ کراتے، کچھ جسمانی اعضا کو حرکت دیتے، کچھ مشینوں وغیرہ سے دوران خون برقرار رکھنے کے لیے جسم کو حرکت دیتے۔ اس دوران خادم کے چچا مولانا منہاج الحق خان راشد صاحب اور خادم کے بڑے بھائی مولانا ممتاز الحسن خان احسن صاحب میں سے ایک دادا جان کے پاس موجود رہتے اور ڈاکٹر صاحب کی ہدایت کے مطابق ان کو اٹھاتے، بٹھاتے اور لٹاتے۔ مہمانوں کی آمد ورفت کا سلسلہ اس وقت بھی جاری رہتا۔

عصر کی نماز باجماعت پڑھنے کے بعد ہم تینوں میں سے کوئی ایک آپ کو ویل چیئر پر بٹھا کر گھر کے صحن میں سیر کراتا۔ اسی اثنا میں خادم اپنی منزل بھی دہراتا رہتا۔ دم تعویذ اور ملاقات کے لیے آنے والوں کا سلسلہ اس وقت بھی جاری رہتا۔ مغرب سے کچھ دیر قبل آپ کو کمرے میں بٹھا دیتے۔ ایک بھائی گھر کا سامان وغیرہ لاتا اور دوسرا آپ کی خدمت میں موجود رہتا۔ عین افطاری کے وقت آپ بلاتے اور فرماتے، چلو نماز پڑھو۔ ابھی روزہ بھی نہ کھولا ہوتا۔ ہم عرض کرتے کہ ابھی تو ہم نے روزہ ہی نہیں کھولا! تو فرماتے، جلدی کرو۔ جب تک آپ مغرب کی نماز باجماعت ادا نہ کر لیتے، آپ کو تسلی نہ ہوتی۔ پھر عشا کی اذان کے منتظر رہتے۔ جوں ہی اذان ہوتی، ہم نماز شروع کر دیتے اور نماز کے بعد تراویح کا آغاز ہوتا۔ بحمد اللہ دو سال تراویح میں ۱۵ پارے خادم نے اور ۱۵ پارے برادر مکرم مولانا احسن صاحب نے سنانے کی سعادت حاصل کی۔ ہم میں سے ہر ایک کی خواہش تھی کہ دادا جان کو تراویح میں قرآن میں سناؤں۔ بالآخر ہم نے یہی فیصلہ کیا کہ نصف نصف تقسیم کر لیتے ہیں۔

تراویح کی بھی عجیب مگر دلچسپ ترتیب ہوتی تھی۔ آپ اپنی طبیعت وصحت کے مطابق بعد نماز مغرب بتا دیتے کہ آج اتنا پڑھنا ہے۔ اس وقت چونکہ خادم نے تازہ تازہ قرآن یاد کیا تھا بلکہ استاد مکرم مولانا قاری عبد الرحمن ضیاء دامت برکاتہم نے زبردستی یاد کرایا تھا۔ (اللہ تعالیٰ انہیں جزائے خیر دے اور دنیا وآخرت کی تمام بھلائیاں نصیب فرمائے اور ان کا سایہ تادیر ہمارے سروں پر قائم ودائم رکھے۔ آمین) اس لیے منزل یاد تھی، کوئی مسئلہ نہیں ہوتا تھا۔ خادم نے دادا جان کی طبیعت کے مطابق، ایک دن میں تین پارے بھی پڑھے اور ایک پاؤ بھی۔ پھر تمام تراویح اکٹھی نہ پڑھتے بلکہ تقریباً دس تراویح تک تو کوشش اور ہمت کر کے دادا جان بیٹھے رہتے مگر جب ہمت بالکل جواب دے جاتی تو فرماتے، مجھے لٹا دو! پھر رات کو جس وقت بھی آنکھ کھل جاتی، بقیہ تراویح شروع کرا دیتے، حتیٰ کہ بعض اوقات سحری کے وقت تراویح ختم ہوتیں۔ تراویح میں آپ سے کسی غلطی کا بچ جانا محال وناممکن تھا۔ معمولی سے معمولی غلطی پر بھی پکڑ کرتے۔ حالانکہ آپ حافظ نہ تھے، مگر ترجمہ ایسا ذہن نشین تھا کہ آپ کو متحضر ہوتا کہ یہاں ’اولئک ھم الفائزون‘ ہے اور یہاں ’ھم المفلحون‘ ہے۔ اس کے علاوہ بھی ”واؤ“ چھوٹ جاتی یا اس قسم کی کوئی ذرا سی بھی غلطی ہوتی، وہ آپ سے چھوٹ نہ پاتی تھی۔ اگر تراویح جلد مکمل ہو جاتیں تو رات بھر عم مکرم مولانا منہاج الحق راشد صاحب دادا جان کی خدمت میں رہتے اور ہم آرام سے سو جاتے اور پھر صبح سحری کے وقت چاچو کی آواز ”حمزہ میاں داؤ“، ”احسن میاں داؤ“ سے بیدار ہوتے۔

یہ معمولات اکثری تھے، کلی نہیں۔ آپ اپنی صحت وطبیعت کے مطابق ان میں ردوبدل بھی فرما لیا کرتے تھے، مثلاً ”فضائل اعمال“ کبھی صرف ایک گھنٹہ سماعت فرماتے، مگر ناغہ نہ کرتے تھے۔ کبھی کیسٹ کے ذریعے سید امین گیلانی مرحوم، سلمان گیلانی صاحب، رانا عثمان صاحب اور دیگر حضرات کی نظمیں بھی سنتے۔ کبھی دوسری کتابیں بھی سن لیتے، خاص طور پر جن کتابوں میں حوالوں کی بھرمار ہو یا ائمہ کرام کا تذکرہ ہو، وہ تو بہت شوق سے سنتے تھے۔

علالت کے سارے عرصے میں دادا جان رحمہ اللہ کی صحیح معنوں میں خدمت ہمارے سب سے چھوٹے چچا مولانا منہاج الحق راشد اور آپ کی بڑی ہمشیرہ (مولانا داؤد خان نوید کی والدہ) اور ان کے گھرانے کو نصیب ہوئی۔ ان دونوں گھرانوں نے واقعی دادا جان کی خدمت کا حق ادا کر دیا ہے۔ اللہ رب العزت انہیں دنیا وآخرت کی خوشیوں، کامیابیوں، کامرانیوں اور ہر طرح کی راحتوں سے مالا مال فرمائے اور ہم سب کو جنت میں بھی دادا جان کی رفاقت نصیب فرمائے۔ آمین

حافظ محمد علم الدین خان ابوہریرہ*

کچھ یادیں، کچھ باتیں

دنیا کے شب روز میں کچھ لمحات ایسے بھی آتے ہیں کہ انسان کے پاس کسی کی صرف یادیں رہ جاتی ہیں۔ جانے والے کی باتیں، لب ولہجہ اور انداز شفقت ومحبت ہمیشہ کے لیے دل میں نقش بن کر رہ جاتی ہیں۔ کچھ یادیں ایسی ہوتی ہیں جنہیں انسان بھول جانے کی کوشش کرتا ہے اور کچھ یادیں ایسی خوبصورت اور حسین ور پرکشش کہ انسان انھیں ہمیشہ اپنے ذہن میں محفوظ رکھنے کی خواہش کرتا ہے۔ ایسی ہی کچھ یادیں ہمارے داداجی حضرت مولانا سرفراز خان صفدرؒ کی ہیں جو اس دنیائے فانی کی فضاؤں کو توحید وسنت کی خوشبو سے معطر کر کے اپنے رب کریم کے دربار میں سرخرو ہو چکے ہیں۔

ہم سب گھر والے خوش نصیب ہیں کہ علالت کے ایام میں حضرت داداجیؒ کی خدمت کا دو بار موقع ملا۔ ویسے تو ہمارے گھر حضرت داداجیؒ کی تشریف آوری ان گنت دفعہ ہوئی، مگر بیمار ہونے کے بعد صرف دو دفعہ تشریف لائے۔ پہلی دفعہ آمد کے موقع پر ہمیں چند دن پہلے سے علم تھا کہ حضرت تشریف لانے والے ہیں، چنانچہ ہم نے مہمانوں کی حضرت سے ملاقات اور داداجیؒ کے بیٹھنے کے لیے چارپائی وغیرہ کے تمام انتظامات پہلے ہی مکمل کر رکھے تھے۔ حضرت داداجیؒ تشریف لائے تو

وہ آئے گھر میں ہمارے خدا کی قدرت ہے
کبھی ہم ان کو کبھی اپنے گھر کو دیکھتے ہیں

کی کیفیت تھی۔ مجھ نالائق کو بھی حضرت داداجیؒ کی خدمت کا پورا موقع ملا۔ ان دنوں حضرت داداجیؒ کے ہاتھوں میں سوجن تھی۔ ہم نے ہاتھوں کی ورزش کے لیے ایک گیند انھیں دی۔ حضرت گیند کو پکڑ کر اسے دبانے لگے۔ کچھ دیر گزرنے کے بعد مسکراتے ہوئے یہ شعر پڑھا۔

تمناؤں میں الجھایا گیا ہوں — کھلونا دے کر بہلایا گیا ہوں

ایک اور شعر حضرت داداجیؒ اپنی آل اولاد کے لیے کثرت سے پڑھا کرتے تھے۔

پھلا پھولا رہے یا رب چمن میری امیدوں کا
جگر کا خون دے دے کر یہ بوٹے میں نے پالے ہیں

جب کوئی حضرت داداجی کا جسم دباتا تو حضرت دعا دیتے، بلکہ ان کی کوئی بھی خدمت کی جاتی تو دعا ضرور دیتے تھے۔ بعض اوقات ویسے ہی لیٹے لیٹے ہاتھ اٹھاتے اور کہتے کہ یا اللہ ان بچوں کو عالم فاضل، باعمل اور دین کا خادم بنا۔ ایک دن میں نے داداجی سے کہا کہ میرے لیے دعا کریں۔ حضرت داداجیؒ فرمانے لگے کہ جب تک عمل نہ کیا جائے، اس وقت دعاؤں کا

*فرزند مولانا عبد القدوس خان قارن۔ معلم مدرسہ نصرۃ العلوم گوجرانوالہ۔

کوئی فائدہ نہیں۔

بیماری کے دوران دوسری دفعہ ۲۴ فروری ۲۰۰۹ء بروز منگل حضرت داداجیؒ ہمارے گھر آئے۔ اس مرتبہ حضرت کی طبیعت کچھ زیادہ خراب تھی۔ ہم گھر والوں نے یہ اہتمام کیا کہ حضرت داداجیؒ کے پاس گھر کا کوئی نہ کوئی فرد موجود رہتا اور باتوں سے ان کا جی بہلائے رکھتا۔ حضرت والد محترم عربی میں کوئی نہ کوئی کتاب حضرت کو سناتے اور مولانا نصر الدین عمر، جو میرے بڑے بھائی ہیں، ان کی اہلیہ کو پہلی دفعہ حضرت داداجیؒ کی خدمت کا موقع ملا۔ بھابی جی نے حضرت داداجیؒ کو ''۳۱۳ روشن ستارے'' اور ''فغان کلیم'' جو شاعری کی کتاب ہے، پڑھ کر سنائی۔ اس کے علاوہ روزانہ صبح حضرت داداجیؒ کی فرمائش پر اخبار سناتی رہیں۔

۲۷ تاریخ بروز جمعۃ المبارک فیصل آباد سے ایک شیخ الحدیث صاحب ملاقات تشریف لائے تو داداجی نے ان سے صحابی رسول مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ کا اصل نام پوچھا۔ وہ اس سوال کا جواب نہ دے سکے اور حضرت والد محترم نے اس کا جواب دیا۔ حضرت داداجی سے دینی معلومات پر جب کوئی بات ہوتی تو ان کا حافظہ پوری طرح کام کر رہا ہوتا، لیکن دنیاوی معلومات سے متعلق کوئی بات پوچھی جاتی تو وہ اپنا سر پکڑ لیتے اور کہتے کہ میری یادداشت کام نہیں کرتی۔

میرا بھتیجا حنظلہ اور بھتیجی عفیفہ خوش نصیب ہیں کہ حضرت نے انھیں اپنی گود میں بٹھا کر بوسے دیے۔ میری بھتیجی حضرت داداجیؒ کی پہلی پڑپوتی ہے۔ حضرت داداجیؒ کو پانی پلانے کے بعد جو پانی بچ جاتا تو پلانے والے کی کوشش ہوتی کہ وہ سارا بچا ہوا خود ہی پی جائے، کیونکہ ہر ایک کی خواہش یہ ہوتی تھی کہ حضرت کا تبرک اسے مل جائے۔ حضرت داداجیؒ کا سر اور پاؤں دبانے اور بار بار حضرت کو بوسہ دینے کا موقع ملتا رہتا تھا۔

اسی موقع پر حضرت داداجیؒ نے والد محترم کی فرمائش پر مدرسہ نصرۃ العلوم میں دورہ حدیث کے طلبہ کو گھر بلا کر اپنی زندگی میں بخاری شریف کا آخری سبق پڑھایا۔ اس آخری درس میں شریک ہونے والے خوش نصیبوں میں میرے بھائی عبد الوکیل مغیرہ اور حبیب القدوس معاویہ اور ان کے ساتھی نوید، شہباز، خالد اور سرفراز بھی شامل ہیں۔ جس دن حضرت داداجیؒ نے واپس گکھڑ جانا تھا، اس روز سب نے حضرت سے دوبارہ آنے کی درخواست کی تو حضرت فرمانے لگے کہ جب عفیفہ چلنے لگے گی، تب آؤں گا۔ میرا بھتیجا حنظلہ داداجی کے پاس جا کر کہنے لگا کہ میں دروازے کے آگے ڈبے کھڑے کر کے آپ کو جانے نہیں دوں گا۔ پھر دونوں ہاتھوں کو پھیلا کر کہنے لگا کہ میں ایسے کھڑا ہو جاؤں گا تو آپ کیسے جائیں گے؟ حضرت داداجیؒ حنظلہ کی یہ حرکات بڑے غور سے دیکھ کر مسکراتے رہے۔ میں نے حضرت داداجیؒ کا آخری بوسہ لیا اور وہ ہمارے گھر سے رخصت ہوئے۔ دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ حضرت داداجیؒ کی قبر پر کروڑوں رحمتیں نازل فرمائے۔ آمین۔

حافظ شمس الدین خان طلحہ *

اٹھا سائبان شفقت

امام اہل سنت حضرت مولانا محمد سرفراز خان صفدرؒ وفات سے دو ماہ پہلے ۲۴ فروری ۲۰۰۹ء بروز منگل آخری بار ہمارے گھر (متصل مدرسہ نصرۃ العلوم گوجرانوالہ) تشریف لائے اور پانچ دن ہمارے ہاں قیام کیا۔ ان ایام میں وقتاً فوقتاً مجھے ان سے سوال و جواب کرنے اور بعض اہم باتیں دریافت کرنے کا موقع ملا۔ ان سوالات و جوابات کو ایک انٹرویو کی شکل میں پیش کرنا مناسب دکھائی دیتا ہے۔

طلحہ: آپ نے کتنے حج وعمرے کیے ہیں؟

حضرتؒ: پانچ حج اور دس عمرے۔

طلحہ: آپ نے کون کون سے ملک کا سفر کیا ہے؟

حضرتؒ: سعودی عرب، شام، برطانیہ، جنوبی افریقہ، بھارت، افغانستان اور بنگلہ دیش۔

(ان میں سے بعض ممالک میں آپ کو ایک سے زیادہ دفعہ جانے کا موقع ملا۔ مثلاً سعودی عرب میں حضرت پندرہ بیس بار اور بنگلہ دیش تین بار گئے ہیں۔ اسی طرح بھارت کے بھی متعدد سفر کیے ہیں۔)

طلحہ: جب آپ افغانستان گئے تھے تو آپ کی ملاقات ملا محمد عمر سے ہوئی تھی یا اسامہ بن لادن سے بھی؟

حضرت: میری ملاقات ملا محمد عمر مجاہد سے ہوئی تھی، اسامہ بن لادن سے نہیں ہوئی تھی۔

طلحہ: اس وقت آپ کی عمر کتنی ہے؟

حضرت: ہجری اعتبار سے ۹۹ سال۔

طلحہ: کیا مولانا قاضی شمس الدین صاحبؒ آپ کے ساتھ پڑھتے رہے ہیں؟ اور کیا وہ حیات النبی صلی اللہ علیہ وسلم کے قائل تھے یا نہیں؟

حضرت: قاضی صاحبؒ مجھ سے پہلے دارالعلوم دیوبند میں پڑھے ہیں۔ حیات النبی صلی اللہ علیہ وسلم کے سلسلے میں ان کا موقف گول مول تھا۔

طلحہ: تصویر والا ٹی وی چینل جائز ہے یا نہیں اور تصویر کس نوعیت کی مجبوری کے تحت جائز ہے؟

حضرت: ٹی وی تصویر والا چینل حرام ہے اور شناختی کارڈ اور پاسپورٹ کے علاوہ اور کسی مجبوری سے تصویر بنوانا جائز نہیں۔

* فرزند مولانا عبدالقدوس خان قارن۔ متعلم اسلامیہ کالج گوجرانوالہ۔

طلحہ: آپ کتنی بار جیل میں گئے ہیں اور کون کون سی جیلوں میں رہے؟

حضرتؒ: میں تین بار جیل گیا ہوں: تحریک ختم نبوت ۵۳ء میں (۲) تحریک جامع مسجد نور ۱۹۷۶ء میں اور (۳) بھٹو دور حکومت کے مارشل لاء کے دوران۔

(حضرت دو بار گوجرانوالہ جیل میں اور ایک بار آپؒ ملتان سنٹرل جیل میں رہے ہیں۔ حضرتؒ نے مزید فرمایا کہ میرے ساتھ تمہارے نانا بشیر احمد بٹ مرحوم بھی تھے اور ہم اکٹھے ایک ہی جیل میں رہے ہیں۔)

یکم مارچ کو حضرتؒ واپس گکھڑ روانہ ہو گئے۔ اس سے اگلے دن حضرتؒ کے دوسرے نمبر کے داماد مولانا قاری خبیب احمد عمر رحمہ اللہ، جو کہ احقر کے پھوپھا جان تھے، وفات پا گئے۔ اسی دن احقر کی طبیعت خراب ہو گئی اور یکے بعد دیگرے تین چار ایسی تکلیفیں عارض ہو گئیں کہ باوجود دل چاہنے اور کوشش کے حضرت صاحبؒ سے آخری دنوں میں ملاقات نہ ہو سکی جس کا تا دم حیات ملال رہے گا۔

حضرت صاحبؒ جب تک بقید حیات رہے، علمائے دیوبند کی تمام جماعتوں مثلاً جمعیت علمائے اسلام، مجلس تحفظ ختم نبوت، سپاہ صحابہؓ، ملت اسلامیہ اور دیگر جماعتوں کی سرپرستی فرماتے رہے۔ تمام جماعتیں اس پر فخر کرتیں کہ ہمارے سر پر حضرت کا دست شفقت ہے۔ حضرت امام اہل سنت، مولانا اعظم طارق شہید کو آبروئے علمائے دیوبند کہتے تھے اور ان کی شہادت پر آپ زار و قطار روتے رہے۔ آپ سپاہ صحابہ کے موقف کی تائید کرتے ہوئے بعض معاملات میں سپاہ صحابہ کی قیادت کی اصلاح بھی کرتے رہے ہیں۔ جب لال مسجد کا واقعہ ہوا تو حضرتؒ بہت پریشان رہے۔ حضرتؒ نے اپنے چھوٹے بیٹے مولانا منہاج الحق خان راشد کو فرمایا کہ پاکستان اس لیے نہیں بنایا گیا تھا کہ سر عام مساجد گرائی جائیں اور مساجد پر فائرنگ کی جائے۔ اس سے تو اچھا تھا کہ پاکستان نہ بنتا اور ہمیں یہ دن نہ دیکھنا پڑتا کہ ہمارے سامنے مساجد گرائی جائیں اور ہم خاموش رہیں۔ لال مسجد کے واقعہ کے بعد احقر کو گکھڑ جانے کا اتفاق ہوا۔ اسی دن مولانا علامہ علی شیر حیدری مدظلہ بھی گکھڑ تشریف لائے تھے۔ حضرتؒ نے حیدری صاحب سے پوچھا کہ آپ لوگ (یعنی سپاہ صحابہ و ملت اسلامیہ) لال مسجد کے حضرات کے ساتھ مذاکرات کرنے والے علما کے وفد میں کیوں شامل نہیں ہوئے؟ حیدری صاحب نے فرمایا کہ حضرت! ہم تو علما کے وفد میں شامل ہونا چاہتے تھے، لیکن حکومت ہمیں پہلے ہی دہشت گرد قرار دیتی ہے، اس لیے مذاکرات میں ہماری شرکت مناسب نہیں تھی۔ مزید فرمایا کہ ہم مانتے ہیں کہ ہم سے کچھ کوتاہی ہوئی ہے، لیکن مذاکرات کرنے والے علما کے وفد کے ہوتے ہوئے اس طرح کا واقعہ نہیں پیش آنا چاہیے تھا۔ حضرتؒ نے فرمایا کہ آپ ٹھیک کہتے ہیں۔ ایسا نہیں ہونا چاہیے تھا۔ بہرحال اب آپ حالات کا جائزہ لے کر اس کے مطابق اپنی پالیسی بنائیں۔ اسی میں سب کی بہتری ہے۔

حضرت کی وفات سے کچھ دن پہلے احقر کی والدہ محترمہ ان کے پاس گکھڑ تین چار دن گزار کر آئیں اور واپسی پر مجھ سے فرمایا کہ حضرت کی طبیعت بہت خراب ہے، اس لیے تم ان سے ملاقات کرنے چلے جاؤ۔ مگر احقر کی طبیعت ناساز تھی، اس لیے آخری دنوں میں حاضر نہ ہو سکا، مگر میرے برادران مولانا نصر الدین خان عمر، مولوی حبیب القدوس خان معاویہ اور قاری عبدالرشید خان سالم وغیرہم وقتاً فوقتاً حاضر ہوتے رہے۔ ۴ مئی کو رات تقریباً ڈیڑھ بجے اطلاع ملی کہ حضرتؒ وفات پا گئے ہیں تو یوں لگا جیسے کسی نے ہمارے جسم سے روح کھینچ لی ہو۔ حضرتؒ کی وفات پر دل افسردہ اور آنکھیں اشکبار ہیں۔ رہ رہ کر

حضرت اقدس کی شفقت یاد آتی اور رلاتی ہے۔ اس موقع پر حضرت سید نفیس الحسینی شاہ صاحبؒ کی ایک نظم، جو حضرت شاہ صاحبؒ نے اپنے والد بزرگوار کی رحلت پر کہی تھی، اپنے احساسات کی ترجمانی کرتی ہوئی محسوس ہوتی ہے:

دل زخم زخم لوگو! کوئی ہے جسے دکھائیں — کوئی ہم نفس نہیں ہے، غم جاں کسے سنائیں

یکا یک جو چھا گئی ہیں غم و درد کی گھٹائیں — گیا کون اس جہاں سے کہ بدل گئیں فضائیں

اٹھا سائبان شفقت، بڑی تیز دھوپ دیکھی — نہیں دور دور چھاؤں، کہاں اپنا سر چھپائیں

اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ خاندان صفدر یہ کو اس صدمے کے تحمل کا حوصلہ دے، حضرت امام اہل سنت کو جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام عطا فرمائے اور ہمیں حضرت کے بتائے ہوئے راستے پر چلنے اور حضرت کے مشن کو زندہ رکھنے کی توفیق عطا فرمائے۔

جو حضرات اس موقع پر خاندان صفدر یہ کے دکھ میں شریک ہوئے، اللہ تعالیٰ انھیں بھی جزائے خیر عطا فرمائے۔ آمین

حضرت شیخ الحدیث کے ایک قریبی عزیز خالد صاحب ٹرک ڈرائیور ہیں۔ وہ رات دو بجے گکھڑ سے گزر رہے تھے۔ انہوں نے سوچا کہ چلو حضرت سے ملاقات کر کے جاتا ہوں۔ حال احوال بھی معلوم ہو جائے گا اور واپس جا کر عزیز رشتہ داروں کو حضرت کی طبیعت اور صحت کے بارے میں آگاہ کر دوں گا۔ انہوں نے دروازے پر دستک دی۔ حضرت نے دروازہ کھولا تو فرمایا: خالد بیٹا! اس وقت کیسے آنا ہوا۔ انہوں نے عرض کی کہ حضرت! ادھر سے گزر رہا تھا تو سوچا، آپ سے ملاقات کر کے جاتا ہوں۔ حضرت نے فرمایا، گاڑی کہاں ہے؟ عرض کی کہ سڑک پر کھڑی ہے۔ اس کے بعد وہ کچھ دیر حضرت کے پاس بیٹھے رہے۔ حضرت نے ان کا اکرام کیا، بوتل وغیرہ پلائی۔ خالد صاحب دیگر اہل خانہ کو ملنے کے لیے اندر چلے گئے۔ تھوڑی دیر بعد وہ حضرت کے کمرہ میں واپس آئے تو حضرت موجود نہیں تھے۔ باہر گاڑی کے پاس گئے تو دیکھا کہ حضرت کنڈیکٹر کو بوتل پلا رہے تھے۔ خالد صاحب کہتے ہیں، میں حضرت کو وہاں کھڑا دیکھ کر شرم سے پانی پانی ہو گیا اور عرض کی کہ حضرت، آپ نے اس بڑھاپے میں اتنی زحمت کیوں کی؟ فرمایا، میں اس لیے باہر آیا تھا کہ گاڑی کے پاس جا کر کھڑا ہوتا ہوں، کیونکہ رات کا وقت ہے۔ یہاں آیا تو دیکھا کہ کنڈیکٹر بھی موجود ہے۔ اس کو پانی پلانا میرا حق تھا۔ خالد صاحب کہتے ہیں کہ گکھڑ سے وزیر آباد تک تو میرا ہوش ہی ٹھکانے نہیں رہا کہ اتنا بڑا شخص اپنے چھوٹوں پر اس قدر شفقت کر سکتا ہے! جب وزیر آباد سے گزر گئے تو کنڈیکٹر نے مجھ سے سوال کیا کہ یہ بابا جی کون تھے جو بوتل لے کر آئے تھے؟ میں نے اس کو حضرت کے متعلق مختصراً بتایا تو وہ حضرت کا عقیدت مند بن گیا۔

(ماہنامہ ہدی للناس گوجرانوالہ، امام اہل سنت نمبر، جون ۲۰۰۹ء)

حافظ محمد عمیر عثمان*

شجر ہائے سایہ دار

زندگی کے سفر میں انسان تن تنہا مسافر کی طرح ہوتا ہے اور اسے سایہ دار درخت کی ضرورت ہوتی ہے جس کے سایے میں آ کر انسان اپنے سفر کی تھکان بھول جائے اور جس کے نیچے اسے نہ دھوپ کا غم ہو نہ بارش کا ڈر۔ ہمارے خاندان کے بزرگ ہمیں اچھے برے کا فرق بتاتے ہیں، صحیح اور غلط کی پہچان کرواتے ہیں اور اپنے تجربات کی روشنی میں ہمیں اچھا انسان بنانے کی کوشش کرتے ہیں جس کی وجہ سے ہم برے کاموں سے بچتے ہیں، کبھی ان کی مار کے ڈر سے تو کبھی ڈانٹ کے خوف سے۔ جب یہ درخت ہم سے چھن جائیں تو دنیا کی رونقیں بے معنی ہو جاتی ہیں۔ جنھوں نے انگلی پکڑ کر چلنا سکھایا ہو، جب ان کو کندھا دینا پڑ جائے تو زندگی کا کیف ختم ہو جاتا ہے اور ہر چیز کاٹتی ہوئی لگتی ہے۔ ان کے بے جان جسم کو خود سے دور کرنے پر دل آمادہ نہیں ہوتا۔ جی چاہتا ہے کہ ایک بار وہ اٹھ کر بیٹا کہہ کر اپنے سینے سے لگا لیں، پھر چاہے دکھوں کی برسات بھی آ جائے تو پروا نہیں۔ لیکن قدرت کا قانون اٹل ہے اور انسان مجبور خود اپنے کندھوں پر اٹھا کر اپنے ہاتھوں سے انھیں منوں مٹی کے نیچے دفن کر کے آ جاتا ہے۔

گزشتہ ایک سال میں ہم پر یہ قیامت تین مرتبہ ٹوٹی۔ پہلے نانا ابو کے چھوٹے بھائی حضرت مولانا صوفی عبد الحمید خان سواتی رخصت ہوئے جنھیں ہم بھی چاچا جی ہی کہا کرتے تھے، پھر میرے والد محترم حضرت مولانا قاری خبیب احمد عمرؒ اور پھر میرے نانا شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد سرفراز خان صفدر۔ ان سب بزرگوں کی وفات نے لاکھوں لوگوں کو تو سوگوار کر ہی دیا، ہمارے لیے یہ ایسے تھا جیسے ہمیں کڑی دھوپ میں ایک سایہ دار درخت کے سایے سے محروم کر دیا گیا ہو۔

جب بھی کوئی پریشانی ہوتی تھی، میں نانا جان کے پاس حاضر ہو جاتا تھا۔ ان کی پریشانی کے ڈر سے ان سے بات کہنے کی ہمت نہیں ہوتی تھی، اس لیے دعا کا ہی عرض کر دیتا اور اللہ کے فضل سے وہ پریشانی دور ہو جاتی۔ میں نے ہوش سنبھالنے کے بعد سے ان کو بستر علالت پر ہی دیکھا تھا، لیکن ابو اور امی سے ان کی کافی باتیں سنیں۔ وہ ابو اور امی دونوں کے استاد تھے اور دونوں ہی ان کے بارے میں بہت کچھ بتایا کرتے تھے، ان کے طرز تربیت کے بارے میں، ان کی سادگی کے بارے میں، ان کی ذہانت اور ان کی قابلیت کے بارے میں۔ وہ پڑھائی کے بارے میں بہت سختی کیا کرتے تھے۔ جب بھی ان کے پاس جانا ہوتا تو اسباق کے بارے میں اور جامعہ کے بارے میں تفصیلاً ضرور پوچھتے تھے اور اکثر امتحان بھی لیا کرتے تھے۔

ان کی سادہ مزاجی کے بارے میں والدہ بتاتی ہیں کہ اگر کبھی وہ نانا ابو کا سوٹ استری کر دیتیں تو وہ کپڑوں کی استری دوبارہ خراب کر کے پہنتے تھے۔ ہر جمعہ کو باقاعدگی سے سر منڈواتے تھے۔ ایک بار میں نے والدہ سے کہا کہ میں نے کبھی نانا

*فرزند مولانا خبیب احمد عمرؒ۔ متعلم جامعہ حنفیہ تعلیم الاسلام جہلم۔

ابو کے سر پر بال نہیں دیکھے تو انہوں نے جواب دیا کہ میں نے اپنی زندگی میں کبھی ان کے سر پر بال نہیں دیکھے۔

ان کی قوت حافظہ کا اندازہ اس سے ہوا کہ ایک بار میرے ایک استاد محترم نے مجھے ایک سوال نانا ابو سے پوچھنے پر مامور کیا۔ میں جب گکھڑ حاضر ہوا تو وہ سوال نانا ابو سے عرض کیا۔ نانا ابو نے کہا کہ میرے دائیں طرف کی جو الماری ہے، اس کی فلاں لائن میں فلاں نمبر پر فلاں کتاب ہے، وہ لاؤ۔ جب میں وہ کتاب لایا تو صفحہ نمبر بھی بتایا۔ میں نے کھولا تو کہا کہ نیچے کی طرف سے پانچویں سطر پڑھو۔ پھر ترجمہ کرنے کا کہا اور پھر جواب دیا۔ ہم سب حیران رہ گئے کہ اس عمر میں بھی حافظے کا یہ عالم ہے۔

ان کی وفات کا صدمہ بہت بڑا ہے، لیکن حکم الٰہی یہی ہے۔ آج وہ گئے، کل ہم نے جانا ہے۔ بارگاہ الٰہی میں یہی التجا ہے کہ ہمیں زندگی بھر نانا ابو کے نقش قدم پر چلتے ہوئے دین کی خدمت کرنے کی توفیق عطا فرمائے اور ہمارے حق میں ان کی تمام دعائیں قبول فرمائے اور ان کی قبر پر کروڑوں رحمتیں برسائے۔ آمین۔

حضرت شیخ الحدیث کے صاحبزادے مولانا عزیز الرحمٰن شاہد فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ حضرت نے مجھے حکم دیا کہ بخاری شریف لاؤ۔ میں بخاری شریف لے کر حضرت کی خدمت میں حاضر ہوا۔ حضرت نے فرمایا، فلاں صفحہ کھولو۔ میں نے مطلوبہ صفحہ نکال کھولا تو ایک حدیث سنائی کہ اسے تلاش کرو۔ میں نے اس حدیث کو ڈھونڈ کر عرض کیا کہ حضرت حدیث مل گئی ہے۔ حضرت نے فرمایا: دیکھو اس حدیث پر میرے ہاتھ سے حاشیہ لکھا ہوا ہوگا۔ میں نے دیکھا تو نہ ملا۔ عرض کیا کہ آپ کا لکھا ہوا حاشیہ نہیں ملا۔ فرمایا دھیان سے دیکھو۔ میں نے آنکھوں کو ہاتھوں سے ملا اور دوبارہ دیکھا لیکن پھر بھی نہ ملا تو عرض کیا کہ حضرت نہیں ملا۔ حضرت نے اصرار کے ساتھ فرمایا، غور سے دیکھو، ضرور مل جائے گا۔ میں نے دیکھا تو کتاب کی جلد بندی دوبارہ کی گئی تھی اور صفحے کا اندرونی حصہ سلائی میں آ گیا تھا۔ میں نے دونوں ہاتھوں سے کتاب کو اطراف سے دبایا تو حضرت کا لکھا ہوا حاشیہ مل گیا۔ میں خوش ہوا اور عرض کیا کہ حضرت آپ کا لکھا ہوا حاشیہ مل گیا ہے۔ اس پر حضرت نے فرمایا: میں نے یہ حاشیہ ۳۰ سال قبل لکھا تھا اور مجھے اچھی طرح یاد بھی تھا، اس لیے تمہارے انکار پر دوبارہ کہا تھا کہ دھیان سے دیکھو، ضرور مل جائے گا۔

یہ واقعہ حضرت کی بیماری کے ایام کا ہے جب درس و تدریس کا سلسلہ بھی رک گیا تھا اور اس سے کافی سال پہلے حضرت نے نصرۃ العلوم میں پڑھانا چھوڑ دیا تھا۔

(ماہنامہ ہدی للناس گوجرانوالہ، امام اہل سنت نمبر، جون ۲۰۰۹ء)

ام حذیفہ خان سواتی*

میرے دادا جی رحمۃ اللہ علیہ

ہمارے بعد اجالا نہ ہوگا محفل میں
بہت چراغ جلاؤ گے روشنی کے لیے

میری پیدائش ۱۹۷۳ء میں گکھڑ میں دادا جی کے گھر میں ہوئی تھی۔ ہم انہیں ابا جی کہتے تھے۔ آٹھ نو سال کی عمر تک انہیں بہت قریب سے دیکھنے کا موقع ملا۔ میرے ابو اس وقت جمعیت علمائے اسلام میں سرگرم تھے اور سیاسی دوروں میں مصروفیت کی وجہ سے ہفتہ دس دن بعد ہی گھر آتے تھے، اس لیے گھر میں ہمارا زیادہ تر معاملہ دادا جی ہی کے ساتھ ہوتا تھا۔ پھر ہم جامع مسجد شیرانوالہ باغ گوجرانوالہ منتقل ہو گئے تو اس کے بعد کبھی کبھار ملاقات ہوتی۔ ہم گکھڑ جاتے رہتے۔ وہ بھی ہمارے گھر کئی بار آئے۔ میں ان کی سب سے بڑی پوتی ہوں اور اس ناتے سے ان کا جو پیار مجھے ملا، اسے کبھی بھلا نہیں سکوں گی۔

میں نے اپنے دادا جی جیسا انسان زندگی میں نہیں دیکھا۔ انہوں نے اپنی ساری زندگی بڑے نظم و ضبط کے ساتھ گزاری ہے۔ ان کھانا پینا، سونا جاگنا، آنا جانا، پڑھنا پڑھانا، ملنا ملانا، لکھنا پڑھنا حتیٰ کہ نہانا اور رفع حاجت کے لیے جانا بھی متعین وقت پر ہوتا تھا۔ سارے معمولات ایسے منضبط تھے کہ ان میں کبھی فرق نہیں آتا تھا۔ اللہ تعالیٰ نے ان کے وقت میں بڑی برکت رکھی تھی۔ جتنے کام وہ دن رات میں کر لیتے تھے، عام آدمی ان کے کرنے میں سوچ بھی نہیں سکتا۔ صبح کی نماز کے بعد وہ گکھڑ میں اپنی مسجد میں درس دیتے تھے۔ کبھی کبھار میری دادی جان مجھے بھی اپنے ساتھ مسجد میں درس سننے کے لیے ساتھ لے جاتیں۔ دادا جی کا درس سننے کے لیے کافی تعداد میں مرد تو ہوتے ہی تھے، لیکن عورتیں بھی ڈیڑھ دو سو کے قریب درس سننے کے لیے آتی تھیں۔ پھر وہ درس کے بعد گوجرانوالہ چلے جاتے۔ مدرسہ میں پڑھانے کے بعد دوپہر کو گھر واپس آتے اور کھانا کھا کر آرام کرتے۔ تمام نمازیں وہ مسجد میں جا کر خود پڑھاتے تھے۔ گھر میں بچیوں کو ترجمہ قرآن و تفسیر اور کتابیں پڑھاتے۔ نارمل اسکول پیدل جا کر درس دیتے اور پیدل ہی واپس آتے۔ مطالعہ کرتے، کتابیں لکھتے، خطوں کے جواب دیتے، دم درود اور تعویذات کے لیے آنے والے مردوں اور عورتوں کے لیے وقت نکالتے، ملنے ملانے والوں سے ملاقات کرتے اور بعض اوقات جلسوں وغیرہ میں بھی جاتے۔ اپنے گھر والوں کی ضروریات کا دھیان رکھتے، ہر روز اپنی ڈائری لکھتے اور روزمرہ کا حساب کتاب پورا پورا درج کرتے۔ کیا اتنے کام پابندی سے اپنے وقت پر روزانہ انجام دینے کا کوئی شخص تصور کر سکتا ہے؟ یہ انہی کی ہمت تھی اور اسی لیے اللہ پاک نے ان سے دین کا بہت کام لیا۔ دنیا کی کوئی جگہ ایسی نہیں ہوگی جہاں ان کے شاگرد نہ ہوں یا ان کی لکھی ہوئی کتابیں نہ پہنچی ہوں۔ لوگ جب ان تذکرہ کرتے ہیں تو ہمارا سر فخر سے بلند ہو جاتا

* دختر شیخ الحدیث مولانا زاہد الراشدی۔ پرنسپل جامعہ نصرۃ العلوم للبنات گوجرانوالہ

ہے۔ اللہ نے ان کی وجہ سے ہمیں بھی بہت ہی عزت عطا فرمائی ہے۔

دادا جی ریڈیو پر خبریں بھی سنتے تھے۔ عین وقت پر ریڈیو الماری سے نکالتے اور خبریں سننے کے بعد فوراً الماری میں رکھ دیتے۔ عشا کی نماز مسجد میں پڑھا کر واپس آتے ہی سو جاتے تھے، کیونکہ انہوں نے تہجد کے وقت اٹھنا ہوتا تھا۔ گرمی سردی میں صبح اٹھ کر ٹھنڈے پانی سے نہاتے تھے۔ اپنے بچوں کی تعلیم اور دینی تربیت، نماز کی پابندی کرانے اور ان سے باز پرس کرنے میں سختی سے بھی کام لیتے تھے۔ سارے بچوں کے ناخن خود تراشتے تھے اور بسا اوقات ان سے ناخن ترشواتے ہوئے خون نکل آتا تھا۔ جب میں اسکول میں داخل ہوئی تو ابھی چھوٹی عمر ہی کی تھی کہ مجھے برقع پہننے کا حکم دے دیا۔ مجھے یاد ہے کہ علامہ محمد احمد لدھیانویؒ کے اسکول ''حبیب کالج'' میں ہر سال میں اپنی کلاس میں اول آتی رہی، لیکن برقع کی وجہ سے مجھے اسکول چھوڑنا پڑا، کیونکہ اتنی کم عمری میں برقع اسکول میں ایک مذاق بن جاتا۔ اسکول کی انتظامیہ نے بھی بہت کوشش کی کہ میں تعلیم جاری رکھوں، لیکن ایسا نہ ہو سکا۔ پھر جب ۱۹۹۰ء میں میری شادی ہوئی تو میرا نکاح بھی میرے دادا جی نے ہی پڑھایا۔ بڑے دادا جی ہماری طرف سے شریک تھے اور چھوٹے دادا جی (میرے سسر حضرت مولانا عبد الحمید سواتی) لڑکے والوں کی طرف سے شریک تھے۔ بڑے دادا جی نے مجھے جہیز میں بطور خاص قرآن کریم کی تفسیر عثمانی اور اپنی کتابیں دی تھیں۔

میں رخصت ہو کر جس گھر میں آئی، وہاں دادا جی روزانہ ہی تشریف لاتے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے مجھے بہت بڑی نعمت سے نوازا کہ دادا جی کے چھوٹے بھائی جو میرے سسر تھے، وہ میرے استاد بھی ہو گئے اور میں نے ان سے دینی تعلیم کا کافی نصاب پڑھا۔ اس طرح اللہ تعالیٰ نے مجھے دنیاوی تعلیم کی جگہ دینی تعلیم سے نوازا۔ کسی وقت یقین نہیں آتا کہ میں جامعہ نصرۃ العلوم للبنات کے شعبہ طالبات میں پڑھانے کی سعادت حاصل کر رہی ہوں۔ میں سمجھتی ہوں کہ اس میں میرے دادا جی کی دعاؤں کا بڑا حصہ ہے، البتہ مجھے اس بات کا بے حد افسوس رہے گا کہ میں دادا جی سے براہ راست کچھ پڑھ نہیں سکی جو میرے لیے بہت بڑا اشرف ہوتا۔

وہ میرے بچوں کو بھی بہت پیار کرتے تھے۔ جب بھی ملتے، ان کو چومتے اور ڈھیروں دعائیں دیتے۔ جب ہم گکھڑ ان سے ملنے جاتے تو ہمارے ساتھ خوب دل لگی کرتے۔ ہمیں واپس نہ آنے دیتے اور رات وہاں رہنے کے لیے اصرار کرتے۔ گھر والوں سے پر تکلف کھانا بنانے کو کہتے۔ کچھ عرصہ پہلے جب میں اپنے میاں اور بچوں کے ساتھ ان سے ملنے کے لیے گکھڑ گئی تو اس دن ان کی طبیعت بڑی ہشاش بشاش تھی۔ خوب ہنسی مزاح فرمایا۔ اس دن انہوں نے بہت اصرار کیا کہ ہم وہیں ٹھہر جائیں۔ ہمارا جی بھی چاہ رہا تھا کہ آج ان کی طبیعت بہت اچھی ہے، چلو ٹھہر جاتے ہیں، لیکن پھر بچوں کے اسکول اور مدرسہ کی تعلیم کا حرج ہونے کا عذر پیش کیا تو انہوں نے واپس جانے کی اجازت دے دی۔ اس وقت رات کے پونے نو بج رہے تھے۔ ہم نے ساری زندگی انہیں عینک پہنے ہی دیکھا تھا، لیکن دونوں آنکھوں کے آپریشن کے بعد انہوں نے لینز ڈلوا لیے تھے، اس لیے وہ آخری سالوں میں وہ عینک نہیں پہنتے تھے۔ چنانچہ میں نے ان سے پوچھا کہ ابا جی! آپ کو وہ سامنے دیوار پر گھڑی نظر آ رہی ہے؟ تو فرمانے لگے، ہاں۔ میں نے دوسرا سوال کیا کہ اس وقت کیا ٹائم ہوا ہے تو مزاح میں فرمانے لگے: ''نونے پوں'' (پونے نو)۔ یہ ان کی ہماری ساتھ خوش طبعی تھی۔ پھر میرے بچوں کو بوسہ دیا۔ ان کے لیے اکثر وہ یہ دعا فرماتے تھے کہ اللہ انھیں حافظ، عالم باعمل بنائے اور اپنے بڑوں کے نقش قدم پر چلائے۔ آمین ثم آمین۔

اپنی وفات سے تقریباً ایک ماہ پہلے وہ گوجرانوالہ آئے تو میرے چچا قارن صاحب کے گھر ایک ہفتہ رہے۔ جب میں انہیں ملنے کے لیے گئی تو سوئے ہوئے تھے۔ جب بیدار ہوئے تو میں نے ان سے پوچھا کہ آپ نے مجھے پہچانا ہے کہ میں کون ہوں؟ پہلے کہنے لگے کہ نہیں۔ میں سمجھی کہ طبیعت ٹھیک نہیں ہے یا شاید سو کر اٹھے ہیں، اس لیے پہچان نہیں رہے، لیکن وہ خوش طبعی فرما رہے تھے۔ میں نے دوبارہ پوچھا کہ آپ نے مجھے پہچانا نہیں کہ میں کون ہوں تو میرے منہ پر ہاتھ پھیر کر فرمانے لگے کہ ''میری سعدیہ ہے''۔ ان کی یہ ادا اب بھی یاد کرتی ہوں تو ان کا پیار اور محبت یاد آتی ہے۔ یہ میری ان سے آخری ملاقات تھی۔

افسوس کہ ہمارے دونوں بزرگ یکے بعد دیگرے بہت کم وقفے سے ہم سے جدا ہو گئے۔ اب صرف ان کی یادیں باقی رہ گئی ہیں۔ ان کی برکات، دعاؤں اور شفقتوں سے ہم محروم ہو گئے ہیں۔ دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کی خدمات کو قبول فرمائے، ان کو جنت الفردوس میں بلند مقام عطا فرمائے اور ہم سے بھی ان کی طرح دین کا کام لیتا رہے۔ ہمیں ان کے نقش قدم پر چلائے اور ہم سب کا ایمان پر خاتمہ فرمائے۔ آمین ثم آمین۔

ایک دفعہ حضرت کسی جلسے سے واپس تشریف لائے اور جلدی جلدی اپنے ٹیبل کی دراز کھولی اور وہاں سے کچھ رقم نکالی اور فوراً باہر چلے گئے۔ حضرت کی اہلیہ نے پوچھا آپ ابھی تو آئے ہیں، پھر اتنی جلدی کہاں تشریف لے جا رہے ہیں؟ حضرت نے فرمایا میں بس ابھی آتا ہوں۔ حضرت کی اہلیہ نے اپنے بیٹے مولانا عزیز الرحمٰن شاہد کو بھیجا کہ جاؤ دیکھو، آپ کے ابو کہاں جا رہے ہیں۔ حضرت باہر گئے اور ڈرائیور کو کچھ رقم دی۔ پھر گھر واپس تشریف لے آئے۔ اہلیہ محترمہ نے کہا: لوگ جلسوں میں جاتے ہیں تو پیسے لاتے ہیں اور آپ جلسے سے واپس تشریف لاتے ہیں تو گھر سے پیسے دے رہے ہیں۔ اس پر حضرت شیخ نے فرمایا کہ جس گاڑی پر آیا ہوں، اس کا ڈرائیور عیسائی ہے۔ راستہ میں اس کے ساتھ بات چیت ہوئی۔ اس کی تنخواہ کے متعلق بھی سوال کیا تو وہ بیچارہ رو پڑا تھا۔ اس کی تنخواہ کم ہے، صاحب اولاد ہے، اس کا گزارا مشکل ہوتا ہے، اس لیے میں نے کچھ رقم اس کو دی تا کہ اس کی پریشانی کچھ کم ہو سکے۔ حضرت کا دوران سفر ملنے والے اور ملاقات کے لیے آنے والے مہمانوں سے بات چیت کرنے اور ان کے مشاغل کے متعلق معلومات حاصل کرنے کا معمول تھا۔ اگر کوئی پریشان حال نظر آتا تو حضرت شیخ اس کے ساتھ تعاون فرماتے تھے۔

(ماہنامہ ہدی للناس گوجرانوالہ، امام اہل سنت نمبر، جون ۲۰۰۹ء)

اُم عدی خان سواتی *

میرے شفیق نانا جان

۲۰۰۸ء اور ۲۰۰۹ء ہمارے خاندان پر بہت بھاری گزرا ہے، اور ہمارا خاندان صحیح معنوں میں یتیم ہو گیا ہے۔ ۶؍اپریل ۲۰۰۸ء بروز اتوار میرے سُسر مفسر قرآن حضرت مولانا صوفی عبدالحمید خان سواتی کا انتقال ہوا، یکم مارچ ۲۰۰۹ء بروز اتوار والد محترم حضرت مولانا قاری خبیب احمد عمر جہلمی دنیا سے رخصت ہو گئے، اور ۵؍مئی ۲۰۰۹ء بروز منگل محترم نانا جان امام اہل سنت شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد سرفراز خان صفدر ہمیں داغ مفارقت دے گئے۔

آج محترم نانا جان کے بارے میں کچھ لکھنے کے لیے قلم اٹھایا تو ذہن میں بہت سی باتیں ابھر آئیں جو اب ہمارے لیے صرف یادیں بن کر رہ گئی ہیں۔ بچپن میں جب ہم چھٹیوں میں ننھیال آیا کرتے تھے تو ماموں اور خالائیں سب جمع ہوتے تھے اور گھر میں عید کا سماں ہوتا تھا۔ نانا جان کے گھر میں معمول تھا کہ شام کو دال چاول ہی پکتے تھے۔ دونوں نانی امی اور ممانیاں کھانا بناتی تھیں اور بچوں کو جو کہ ماشاء اللہ کافی تعداد میں ہوتے تھے، ایک پرات میں دال چاول ڈال کر دے دیتیں اور سب بچے اسی پرات میں کھانا کھاتے تھے۔ میں نے اپنے بچپن میں نانا جان کے گھر کھانا کھانے کا چمچ کبھی نہیں دیکھا۔ خود بھی سنت رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے مطابق ہاتھ سے چاول کھاتے اور گھر والوں کو بھی ہاتھ کے ساتھ کھانے کی تلقین کرتے تھے۔ بچپن میں ہم سب بچے نانا جان کے کمرے میں ان کی چارپائی کے اردگرد جمع ہوتے، ان کو دباتے اور نانا جان ہم سے باتیں کرتے اور ہنسی مذاق کیا کرتے تھے۔ میں اور میری خالہ زاد جو میری ہم عمر ہے، ہم دونوں اکٹھے جب بھی نانا جان کے پاس بیٹھتے تو نانا جان کا یہ سوال ہوتا کہ تم دونوں میں سے وڈے (بڑی) کون ہے اور مِنی کون ہے؟ جمعہ کے دن ان کا معمول تھا کہ ناخن تراشتے اور استرے سے سر منڈواتے تھے۔ اسی طرح گھر میں موجود سب لڑکوں کی ٹنڈ کرواتے اور لڑکیوں کے ناخن چیک کر کے جس کے ناخن ذرا سے بھی بڑھے ہوتے، اس کے ناخن خود کاٹتے۔

جب میں بہت چھوٹی تھی تو ایک دفعہ نانا ابو جہلم تشریف لائے۔ دونوں نانی امی بھی ان کے ہمراہ تھیں۔ میری امی نے مجھے قرآن پاک کی سورتیں زبانی یاد کروائی ہوئی تھی۔ چھوٹی نانی امی نانا ابو سے کہنے لگیں کہ اپنی نواسی سے سورتیں سنیں۔ نانا ابو نے مجھے سنانے کو کہا اور میں نے سورتیں سنانا شروع کیں تو نانا ابو مجھے گول گول گھما کر کچھ دیکھنے لگے۔ نانی امی نے پوچھا کہ کیا ڈھونڈ رہے ہیں؟ تو کہنے لگے کہ ڈھونڈ رہا ہوں اس ٹیپ کا بٹن کہاں ہے۔

ان کی گفتگو زیادہ تر علمی ہوتی تھی۔ پوچھتے تھے کہ کون سی کلاس میں پڑھتی ہو، کون کون سی کتاب پڑھتی ہو، اور فلاں کتاب کے مصنف کا کیا نام ہے وغیرہ۔ شادی کے بعد جب بھی میں جاتی تو نانا ابو یہ پوچھتے کہ پڑھانا شروع کیا ہے یا نہیں؟ میں کہتی

* بنت قاری خبیب احمد عمرؒ۔ معلمہ مدرسہ نصرۃ العلوم للبنات گوجرانوالہ۔

کہ ابھی شروع نہیں کیا تو کہتے کہ پڑھانا شروع کرو اور جو علم حاصل کیا ہے، اسے آگے پھیلاؤ۔ جب میں نے پڑھانا شروع کیا اور انھیں بتایا تو پوچھنے لگے کہ کون کون سی کتابیں پڑھاتی ہو؟ میں نے کتابوں کے نام بتائے تو پوچھا کہ قصص النبیین کے مصنف کا کیا نام ہے؟ نانا ابو کے غیر متوقع سوال سے میں بوکھلا گئی اور میرے ذہن سے مصنفؒ کا نام نکل گیا۔ میں کبھی حسینی کہتی اور کبھی ندوی، جبکہ مصنف کا اصل نام مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ تھا۔ نانا ابو کا یہ سوال بھی ضرور ہوتا تھا کہ اسکول کتنا پڑھی ہوئی ہو۔ میں گوجرانوالہ سے جاتی تو ان کا پہلا سوال یہ ہوتا تھا کہ صوفی کا کیا حال ہے؟ پھر گھر کے ایک ایک فرد کا نام لے کر حال پوچھتے۔ اسی طرح اگر جہلم سے آتی تو بھی ایک ایک فرد کا نام لے کر حال پوچھتے، حتیٰ کہ ان کو یہ بھی یاد ہوتا تھا کہ میرا چھوٹا بھائی ٹیبر پڑھنے کے لیے کراچی گیا ہوا ہے۔ پوچھتے کہ وہ کراچی میں ٹھیک ہے، اس کا فون آتا ہے، وہ کیا پڑھ رہا ہے؟ بڑی باجی جو برطانیہ میں ہوتی ہیں، ان کے بچوں کے نام بھی نانا ابو کو یاد تھے اور وہ ان سب کے نام لے کر ان کے بارے میں پوچھتے تھے۔ امام ترمذیؒ کے حالات میں ہم نے ان کے حافظے کے بارے میں عجیب وغریب واقعات پڑھے تو حیران رہ گئے کہ کسی انسان کا حافظہ اتنا مضبوط بھی ہو سکتا ہے! لیکن نانا ابو کے حافظے کو دیکھ کر امام ترمذیؒ کے حافظے کا گمان ہوتا تھا۔

نانا ابو اور میرے سُسر حضرت صوفی صاحبؒ دونوں بھائیوں کی محبت بھی مثالی تھی۔ شدید تکلیف کی وجہ سے حضرت صوفی صاحب نے زندگی کے آخری دنوں میں کھانا پینا چھوڑ دیا تھا۔ جب کچھ نہیں کھاتے تھے تو میری ساس صاحبہ ان سے کہتی تھی کہ ہم نے گکھڑ مولوی صاحب کو فون کیا ہے اور انھیں بتایا ہے کہ آپ کھانا نہیں کھا رہے۔ انھوں نے کہا ہے کہ صوفی سے کہو کہ کھانا کھائے۔ اس پر تکلیف کے باوجود صوفی صاحب کھانا کھا لیتے تھے۔ ان سے کوئی بھی بات منوانی ہوتی تو نانا ابو کا نام لے کر منوائی جاتی تھی۔ ایک دفعہ چند عورتیں ان کے پاس ان کی زیارت کے لیے آئیں تو میں پاس بیٹھی ہوئی تھی۔ ان عورتوں نے نانا ابو کے بارے میں پوچھا تو صوفی صاحب انھیں نانا ابو کے بارے میں بتانے لگے۔ ان کے الفاظ آج بھی میرے کانوں میں اسی طرح گونج رہے ہیں جیسے ابھی سنے ہوں: ”او جیہڑے گکھڑ والے استاد نے، او اساں دے بڑے استاد بھی نے اور بڑے بھائی بھی نے، تے اسی اوناں دی بہت عزت کردے آں، میں اوناں کول پڑھیا بھی ہے“۔ ان کی محبت اور عزت کا اندازہ اسی سے لگایا جا سکتا ہے کہ آخر وقت میں جب ان کا حافظہ شدید متاثر ہو گیا تھا اور بعض اوقات گھر والوں کو بھی نہیں پہچانتے تھے، اس کیفیت میں بھی گکھڑ والے بڑے استادوں کی کوئی بھی بات نہیں بھولے تھے اور ان سے متعلق ایک ایک بات ان کو یاد تھی۔

آخری ملاقات کے موقع پر جب میں نانا ابو سے ملنے ان کے کمرے میں گئی تو نانا ابو چھت کی طرف دیکھ رہے تھے۔ میں نے سلام کیا تو نانا ابو نے میری طرف دیکھا اور چونکہ میں ابو کی وفات کے بعد نانا ابو سے پہلی دفعہ ملی تھی تو نانا ابو کو دیکھ کر میری آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ اتنے میں شاہد ماموں آ گئے اور کہنے لگے کہ مرد حضرت آئے ہیں۔ جمعہ کے دن چونکہ مردوں کا بہت رش ہوتا تھا، اس لیے بس یہی مختصر سی ملاقات ہو سکی۔ پھر ۵؍مئی بروز منگل رات ڈیڑھ سے پونے دو بجے کے درمیان راشد ماموں کا فون آ گیا کہ نانا ابو انتقال فرما گئے۔ زبان سے بے ساختہ نکلا کہ یا اللہ ابھی تو ابو کو گئے ہوئے صرف دو ماہ ہوئے ہیں اور ایک اور اتنی بڑی آزمائش! لیکن خدائے رب ذوالجلال کے آگے کسی کا بس نہیں چلتا، وہ تو قادر مطلق ہے۔

”رَضِينَا بِاللّٰهِ رَبًّا وَبِالْإِسْلَامِ دِيناً وَبِمُحَمَّدٍ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ رَسُولاً وَنَبِيًّا“

بنت مولانا قاری خبیب احمد عمرؒ*

وہ سب ہیں چل بسے جنہیں عادت تھی مسکرانے کی

یوں تو دنیا فانی ہے۔ اس میں رہنے والا ہر آدمی چاہے وہ غریب ہو یا امیر، نیک ہو یا بد، طویل العمر ہو یا جوان، ہر کسی نے مقررہ وقت پر اپنے خالق کے پاس چلے جانا ہے۔ دوام وبقا صرف اس ذات کریمی کے ہی لائق ہے جو سب کو زندگی بخشتا ہے، مگر کچھ لوگ ایسے بھی ہوتے ہیں جو خود تو اس فانی دنیا سے چلے جاتے ہیں مگر ایسی باقیات صالحات چھوڑ جاتے ہیں جو انھیں ہمیشہ زندہ رکھتی ہیں اور ان کو ان کی دینی خدمات کی وجہ سے کبھی بھلایا نہیں جاسکتا۔

۵ رمئی ۲۰۰۹ء کو ہمارے مشفق ومحترم نانا ابا امام اہل سنت حضرت مولانا سرفراز خان صفدرؒ کا وصال بھی ایسا ہی ایک واقعہ تھا۔ بچپن میں ہمیں ان کے علمی مقام ومرتبہ اور عظمت کا اتنا شعور نہیں تھا اور وہ ہمارے لیے صرف ایک محبت کرنے اور ہمارا خیال رکھنے والے نانا ابو تھے۔ ایک مرتبہ بہت چھوٹی عمر میں ناچیز کا بازو ٹوٹ گیا تو انھوں نے بہت فکر مندی سے والدہ محترمہ کو خط لکھ کر میرا حال دریافت کیا۔ وہ خط آج بھی یادگار کے طور پر سنبھالا ہوا ہے۔ اس طرح بچپن میں ان کی شفقتوں اور محبتوں کے سایے میں بہت اچھا وقت گزرا۔ نانی امی تو ہوش سنبھالتے ہی اس دار فانی سے کوچ کر گئی تھیں، مگر نانا ابو کی محبت ہمارے لیے بہت قیمتی یادوں کا سرمایہ ہے۔ پھر جب اللہ تعالیٰ نے اپنے دین کا علم حاصل کرنے کے لیے ہمیں بھی منتخب کیا اور دینی تعلیم حاصل کرنے کے لیے ساتھ ساتھ علما وصلحا کی محبت اور عقیدت سے بھی دل منور ہوئے تو صحیح معنوں میں اللہ پاک کی اس عظیم الشان نعمت کی قدر دل میں آئی کہ علم کے جس سمندر کو دیکھنے کے لیے لوگ دور دراز سے آتے نہیں تھکتے، اللہ پاک نے ہماری اس کے ساتھ اتنی قریبی رشتہ داری رکھی ہے۔ ہمیشہ ننھیال جا کر لوگوں کا مجمع دیکھتے رہے کہ اب خواتین نانا ابو کے پاس سے اٹھ کر اندر چلی جائیں، کیونکہ ملاقات اور زیارت کے لیے حضرات آئے ہیں۔ ہر وقت آنے جانے والوں کا تانتا بندھا رہتا۔ اس کے بعد جب دورۂ حدیث کرتے ہوئے ترمذی شریف کے فقہی مباحث سمجھنے کے لیے میں نے والدہ محترمہ کے کہنے پر ''خزائن السنن'' مطالعہ میں رکھی۔ اس وقت بھی دل میں عجیب سی خوشی اور فخر کا احساس جاگا کہ میں اپنے نانا ابو کی لکھی ہوئی کتاب پڑھ رہی ہوں۔ اللہ تعالیٰ کے اس احسان کا جتنا بھی شکر ادا کیا جائے، کم ہے کہ اس نے ہماری نسبت علم کے اس سمندر کے ساتھ قائم کی جس سے ایک دنیا فیض یاب ہو رہی ہے۔

ان سے ملاقات کے ہر موقع پر علمی گفتگو ضروری ہوتی تھی۔ خصوصاً جب میں نے تدریس شروع کی تو وہ تفصیل سے پوچھتے تھے کہ کون سی کتاب پڑھاتی ہو؟ کس کلاس کو پڑھاتی ہو؟ کتنے بجے مدرسے جاتی ہو اور کب واپسی ہوتی ہے؟ طالبات کی تعداد، کلاس میں کتنی طالبات ہیں اور کتنی معلمات، جب تک ساری تفصیلات معلوم نہ کر لیتے، تب تک کوئی اور موضوع

* معلمہ جامعہ حنفیہ تعلیم الاسلام للبنات جہلم۔

زیر گفتگو نہ آتا۔ جب ۲۰۰۵ء میں نانا ابو جہلم آئے تو ہماری خوشی کا کوئی ٹھکانا نہیں تھا، کیوں کہ ہمارے نئے گھر میں پہلی بار ان کے بابرکت قدم پڑ رہے تھے۔ ابو جیؒ بھی بہت خوش تھے۔ جامعہ کی معلمات وطالبات نے ان کی زیارت کی خواہش کا اظہار کیا تو ابو جی سے پوچھ کر ہم نے طالبات ومعلمات کو ان سے ملوایا۔ نانا ابو جی نے سب کے لیے خصوصی دعا کی۔ اسی طرح ہر سال جب مدرسہ نصرۃ العلوم کے شعبہ تعلیم نسواں کے سالانہ امتحان کے لیے ہم گوجرانوالہ جاتے تو آتے ہوئے یا جاتے ہوئے نانا ابو کے پاس ضرور حاضری دیتے۔ جب بھی میں ملتی، ہمیشہ طالبات کی کامیابی کی دعا کرواتی۔ جب نانا ابو اپنے کانپتے ہاتھ اٹھا کر دعا مانگتے تو دل جیسے بالکل مطمئن ہو جاتا۔ آخر دم تک پھر یہی کامل اطمینان دل میں رہتا کہ اللہ تعالیٰ کے ولی کی دعا رائیگاں نہیں جائے گی۔ ان کی دعا کی تاثیر سے ہی الحمد للہ ہر سال جامعہ کی طالبات کا رزلٹ تقریباً ۱۰۰ فی صد آتا تھا۔ ان بزرگوں اور بڑوں کی محنتوں اور دعاؤں کے طفیل ہی اللہ پاک نے ہمیں اس قابل بنایا کہ ہم دین کے خادم بن سکیں۔ اب وہ پرخلوص دعائیں اور شفقتیں کہاں ملیں گی!

مجھے وہ دن یاد ہے جب ہم ۲۰۰۲ء میں اپنی ہمشیرہ سے ملنے گوجرانوالہ اپنے بڑے ماموں مولانا زاہد الراشدی کے گھر گئے تو واپسی پر گکھڑ بھی رکے۔ اسی دن ہم دونوں بہنوں یعنی میرا اور مجھ سے بڑی ہمشیرہ (اہلیہ مولانا عرباض خان سواتی) کا عالیہ کا رزلٹ آیا تھا اور ہمیں سفر میں ہی اپنے رزلٹ کی اطلاع ملی تھی۔ الحمد للہ بہت اچھا رزلٹ تھا تو نانا ابو یہ سن کر بہت خوش ہوئے اور انعام کے طور پر دو دو سو روپے دیے جو آج بھی میری ڈائری میں بطور یادگار محفوظ ہیں۔ اس سے پہلے جب ہم گئے تھے تو مجھے فرمایا کہ تم کوئی بڑی کتاب بھی پڑھاتی ہو یا صرف چھوٹی کتابیں پڑھاتی ہو؟ فرمایا کہ ہدایہ پڑھاتی ہو؟ میں نے کہا کہ جی، پانچ یا چھ مرتبہ پڑھائی ہے۔ فرمانے لگے، اس کے مصنف کا نام بتاؤ۔ میں نے بتایا تو بہت خوش ہوئے اور سر ہلا کر خوشی کا اظہار کرنے لگے۔ اسی طرح ایک مرتبہ پوچھا کہ آج کل کون کون سی کتابیں پڑھا رہی ہو؟ میں نے کہا کہ آج صحاح ستہ میں سے بھی بعض کتابیں پڑھا رہی ہوں۔ کہنے لگے کون سی؟ میں نے کہا کہ بخاری شریف اول، ترمذی شریف اول اور ابوداؤد شریف۔ فرمایا، ماشاء اللہ۔ جاؤ، بخاری شریف لے کر آؤ۔ میں احادیث شریف سننا چاہتا ہوں۔ میں نے کہا کہ مجھے زبانی بھی کچھ یاد ہیں، وہ سنا دوں؟ فرمایا کہ نہیں، میں نے پچپن سال تک پڑھائی ہے، اب میں کسی سے سننا چاہتا ہوں جو میری اولاد میں سے ہی ہو۔ میں نے بخاری شریف سے حدیث سنائی تو گھبراہٹ میں درمیان سے ایک راوی کا نام چھوٹ گیا۔ فرمایا، دوبارہ سناؤ۔ میں نے دوبارہ پڑھا اور راوی کا نام لیا تو فرمایا، ہاں اب ٹھیک ہے۔ پھر مجھ سے کافی احادیث سنیں اور آخر میں بہت دعائیں دیں اور کہا کہ میں بہت خوش قسمت ہوں کہ میری اولاد بھی احادیث کے پڑھنے پڑھانے میں مشغول ہے۔ اب اگلی نسل میں بھی یہ علم منتقل ہو رہا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے ہمارے لیے اس سال کو عام الحزن بنا دیا۔ ہم پر دوہرا صدمہ ہے کہ ابھی ہم اپنے والد محترم کی وفات سانحے سے نہ سنبھلے تھے کہ ۵ رمئی کو ہم سے نانا ابو کا مشفق سایہ بھی چھن گیا۔ دو ہفتے پہلے ہم ان سے ملنے گئے تو بہت علیل تھے، مگر آہستہ آواز میں امی کی صحت اور مدرسہ کے بارے میں پوچھتے رہے۔ اس مرتبہ والد محترم کی وفات کے بعد ہم پہلی بار گئے تھے۔ ہمیں دیکھ کر ان کی طبیعت اور خراب ہونے لگی، خصوصاً چھوٹے بھائی کو دیکھ کر تو ان پر کپکپی طاری ہو گئی اور آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے اور ہاتھ کے اشارے سے اس کو پاس بلا کر گلے لگا کر تھپکتے ہوئے آہستہ آہستہ کہہ رہے تھے، صبر صبر۔ اس

وقت ہمارا رونا بھی شدت سے شروع ہو گیا اور ہم کمرے سے صرف اس خیال سے باہر آ گئے کہ ان کی طبیعت اور نہ بگڑ جائے۔ جب آخری بار ہم ملے تو فرمایا کہ باری تو میرے جانے کی تھی، خبیب کیوں چلا گیا؟

بجھا چراغ اٹھی بزم کھل کے رو اے دل
وہ سب ہیں چل بسے جنہیں عادت تھی مسکرانے کی

ان کی یادیں کبھی تو ہمارے لیے مہکتا ہوا پھول ہیں جن کی خوشبو سے ہم اپنے آپ کو معطر کرتے ہیں اور ان کے اقوال اور گفتار کو سوچ کر اپنی اصلاح کر سکتے ہیں، اور کبھی ایسا زخم جو کریدنے سے اور بڑھتا ہے۔ ہمیشہ یہ کسک دل میں رہے گی۔ کاش! ان کی صحیح معنوں میں خدمت کرنے کا موقع ہمیں بھی ملتا۔ ایک مرتبہ میں نے کہا، نانا ابو! بہت جی چاہتا ہے کہ کچھ دن آپ کے پاس رہوں اور آپ کی خدمت کروں، مگر مدرسے کی وجہ سے آنا مشکل ہے اور چھٹیاں بہت کم ہوتی ہیں۔ کہنے لگے تم دین کی خدمت کر رہی ہو، یہ بہت بڑی خوشی کی بات ہے۔

اللہ پاک سے ہماری یہی دعا ہے کہ ہم علما کے صحیح معنوں میں وارث بنیں۔ دنیاوی وراثت تو فانی اور عارضی ہے۔ اس کا اندازہ ہمیں اپنے بزرگوں کو اور روحانی استاذوں کو دیکھ کر ہوتا ہے کہ اپنے ماں باپ کے سایے اور اپنے باپ دادا کی وراثت کے بغیر ساری زندگی گزار دی، مگر جو اپنے پیارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی وراثت تھی، اس کو حاصل کرنے میں کوئی کسر نہ چھوڑی۔ اس لیے اللہ پاک سے دعا ہے کہ ہمیں اپنے بزرگوں کی دینی وراثت کا صحیح معنوں میں حق دار بنائے اور ہمیں ہمارے اسلاف کے دامن کے ساتھ ہمیشہ ہمیشہ وابستہ رکھیں اور ان کے نقش قدم پر چلنے کی توفیق دیتے ہوئے ہمیں ان کے لیے صدقہ جاریہ بنائے۔ آمین ثم آمین

''یہ جو شریف اور رذیل کا فرق ہے، اسلام اس کو مٹانے کے لیے آیا ہے، مگر ہم نے اس کو مضبوطی کے ساتھ پکڑا ہوا ہے کہ یہ چودھری ہے اور یہ کمی ہے۔ آج بھی اگر کوئی بڑا آدمی چارپائی پر بیٹھا ہو تو اس کے ساتھ کسی نیچ قوم کے آدمی کو بیٹھنے کی ہمت نہیں ہے اور اگر کوئی بیٹھ جائے تو اس کو وہ برا سمجھتے ہیں۔ یہ افراط وتفریط اسلام میں نہیں ہے۔ اسلام میں گورا کالا، امیر غریب، بادشاہ گدا گر سب انسان ہیں۔ یہ فرق یہود و ہنود اور نصاریٰ وغیرہ قوموں نے تراشا ہوا ہے جن کے ہاں گورے اور کالے لوگوں کے عبادت خانے ماضی قریب تک الگ الگ رہے ہیں اور گوروں اور کالوں کے ہسپتال بھی الگ الگ رہے ہیں۔ گورے کالوں کو اپنے ساتھ بیٹھنے بھی نہیں دیتے تھے، الگ بیٹھتے تھے۔ جب ہمارے تبلیغی حضرات ان ملکوں میں تبلیغ کے لیے جاتے ہیں اور گورے کالے سب مل کر اکٹھے بیٹھ کر کھانا کھاتے ہیں اور اکٹھے نمازیں پڑھتے ہیں اور ایک دوسرے کا احترام کرتے ہیں تو وہ لوگ دیکھ کر حیران ہوتے ہیں۔'' (ذخیرۃ الجنان ۴/۸۹)

بنت حافظ محمد شفیق*

بھولے گا نہیں ہم کو کبھی ان کا بچھڑنا

مشہور ادیب ٹالسٹائی نے کیا خوب کہا ہے کہ میں انتہائی کوشش اور طویل جستجو کے باوجود زندگی کے معمے کا عشر عشیر بھی نہیں جان پایا۔ حقیقت کی جستجو فضول ہے۔ آخر کار مر جانا ہے۔ انسان کسی مسئلے پر کتنا ہی غور کیوں نہ کرے، وہ درحقیقت موت پر غور کر رہا ہوتا ہے۔ جہاں موت ہے، وہاں حقیقت کی کیا حیثیت۔ یہ تو ایک غیر مسلم نے موت کے بارے میں کہا ہے، جبکہ مسلمان ہونے کے ناتے ہمارا ایمان ہے کہ کل نفس ذائقة الموت۔ موت ایک ایسی چیز ہے کہ کوئی بھی بشر زندگی کے کتنے ہی سال گزار لے، آخر موت اسے ہم سے چھین لیتی ہے۔ وہ یہ نہیں دیکھتی یہ کسی کو کتنا پیارا ہے اور دنیا والوں کو اس کی کتنی ضرورت ہے۔ ایسی ہی ایک عزیز از جان، پیاری اور محترم شخصیت ہمارے نانا جان کی تھی۔ ان کے نام کے ساتھ رحمہ اللہ اور نور اللہ مرقدہ جیسے الفاظ لکھتے ہوئے دل خون کے آنسو روتا ہے۔ وہ ہم سے جدا ہو گئے۔ محبتوں کے پیکر اور وفاؤں کے راہی اپنی محبتوں اور وفاؤں سے ہمیشہ کے لیے محروم کر گئے۔ اپنے گھر اور خاص طور پر اپنے کمرے کے بغیر کہیں نہ رہنے والے اس کے در و دیوار کو تنہا چھوڑ کر کسی دور دیس جا بسے۔ ہماری پریشانی پر پریشان ہونے والے اور آنکھوں میں آنسو دیکھ کر بے چین ہو جانے والے ہمیں بے چینی اور آنسوؤں کی ایسی برسات دے کر چلے گئے جو ہماری زندگیوں کا حصہ بن گئی ہے۔ جگر پارہ پارہ اور دل زخمی زخمی ہے۔ لگتا ہے کسی نے دل مٹھی میں لے رکھا ہو اور اسے بھینچتا چلا جا رہا ہو۔ ہاتھ اب بھی دعا کے لیے اٹھتے ہیں تو عادت کے مطابق بے اختیار یہی زبان سے نکلتا ہے کہ یا اللہ، ابا جان کو صحت اور تندرستی عطا فرما۔ فون کی گھنٹی بجتی ہے تو یہی خیال ہوتا ہے کہ ابا جی کا ہوگا۔

بھولے گا نہیں ہم کو کبھی ان کا بچھڑنا بستے ہوئے اک شہر کا پل بھر میں اجڑنا

ماضی کی یادوں کو دہرایا تو اپنی زندگی کا بہت سا وقت جو ان کی محبتوں کے سایے تلے گزرا، آنکھوں کو نمناک اور دل کو مزید غمگین کر گیا۔ بچپن میں ہم چھٹیوں کے دوران اپنی امی جان کے ساتھ گکھڑ جایا کرتے تو سرخ وسفید چہرے، خندہ پیشانی، عدسے سے جھانکتی ہیروں جیسی چمکتی ذہین آنکھوں والے اور سفید اجلے کپڑے پہنے ایک باوقار و بارعب بزرگ سے پیار و محبت اور خلوص بھری ملاقات ہوتی۔ باشعور ہونے پر پتہ چلا کہ ہمارے ابا جی ہیں۔ ہمارے والدین کی طرف سے ہمیں یہ نصیحت تھی کہ ابا جی کا ادب واحترام ہم سے بھی بڑھ کر کرنا ہے اور ان کی دل وجان سے خدمت کرنی ہے۔ چنانچہ ابا جی کے کھانے کا وقت ہوتا تو ہم بھاگ کر ہاتھ دھلوانے کی کوشش کرتے، وضو کے لیے اٹھتے تو فوراً جوتے پیش کرتے، سونے کے لیے لیٹنا ہوتا تو ٹانگیں دباتے اور ایسے چھوٹے چھوٹے کام لگن سے کرنے کی وجہ سے وہ ہماری محبت کا پاس رکھتے ہوئے یہ کام ہمیں کرنے دیتے۔

* نواسی امام اہل سنتؒ۔

ایک مرتبہ ہماری والدہ محترمہ سخت بیمار ہوگئیں تو ہم چاروں بہنیں اور بڑے بھائی جان گکھڑ میں ہی رہے جبکہ امی جان بڑے ماموں جان زاہد کے ہاں گوجرانوالہ چلی گئیں۔ ہم لوگ کبھی امی کے بغیر نہیں رہے تھے۔ کچھ وقت اباجی کی محبتوں اور اپنی شرارتوں میں گزار دیا، لیکن پھر ہم نے شور مچانا شروع کر دیا کہ امی کے پاس جانا ہے۔ اباجی نے اپنی باتوں سے اور چیزیں وغیرہ دے کر ہمیں بہلایا۔ جب ہم بچوں کا پیمانہ صبر لبریز ہوگیا اور ضد شروع کر دی تو اباجی نے ہمیں کہا کہ چلو سب مل کر دعا کرتے ہیں کہ وہ جلدی صحت یاب ہو کر یہاں آ جائے۔ جب ہم نے دیکھا کہ نہ تو امی جان کے آنے کی کوئی اطلاع ہے اور نہ ہی ہمیں وہاں بھیجا جا رہا ہے تو ہم سب بہنوں اور بھائی نے فیصلہ کیا کہ ہم کھانا نہیں کھائیں گے، جب تک امی سے نہ مل لیں۔ اباجی تک یہ بات پہنچی تو فوراً ہمیں اپنی عدالت میں حاضر کیا اور بہت پیار سے منانے لگ گئے۔ ہماری کیفیت دیکھ کر کہنے لگے کہ اس وعدہ پر لے کر جاؤں گا کہ وہاں رہنا نہیں ہے اور نہ ہی امی کے سامنے رونا ہے۔ میری آنکھوں میں وہ منظر اب بھی روشن ہے کہ ہم سب بہن بھائی ان کے ارد گرد بیٹھے تھے اور درمیان میں کھانے کا طشت رکھا تھا۔ وہ ہمیں ایک ایک لقمہ بنا کر کھلا رہے تھے اور ساتھ کہہ رہے تھے کہ ان شاء اللہ صبح تمہاری امی کے پاس جائیں گے۔ صبح انھوں نے ہمیں ماموں جان ماجد مرحوم کے ساتھ روانہ کیا۔ ہم گھر سے نکل کر اڈے تک گئے تو پتہ چلا کہ آج پہیہ جام ہڑتال ہے، چنانچہ گھر واپس لوٹ آئے۔ ہمارے اداس چہرے دیکھ کر کہنے لگے ان شاء اللہ، آج ضرور جاؤ گے۔ باہر کے حالات خراب ہونے کے باوجود اس دن عصر کے بعد اباجی نے اپنے وعدے کے مطابق ہمیں گوجرانوالہ بھیجا۔ یہ ہے ان کی چھوٹے بچوں کے ساتھ ایفاے عہد کی روشن مثال۔

جب بھی ہم اباجی کے پاس جاتے تو وقتاً فوقتاً ہمیں نصیحت کرتے اور قرآن وحدیث کے متعلق باتیں بتاتے۔ سب سے زیادہ نماز کی تاکید کرتے اور اس کے مسائل بتلاتے تاکہ بچوں کے ذہن میں یہ باتیں پختہ ہو جائیں۔ ایک دن نماز کے مسائل بتاتے ہوئے کہنے لگے کہ اکثر خواتین وضو کرتے وقت ناک کے سوراخ میں پانی نہیں ڈالتیں۔ اس طرح وضو نہیں ہوتا۔ ان کی یہ بات ہم نے اپنے پلے باندھ لی۔ صبح سب سے پہلے ہمارے کانوں میں لاٹھی کی آواز کے ساتھ "نماز نماز" کی گونج دار آواز بھی پڑتی۔ بڑے تو بڑے، سب چھوٹے بچے بھی اپنے اپنے بستروں سے نکل کر نماز کی تیاری بڑے اہتمام سے کرتے۔ عشا کی نماز کے بعد سب بچے مل کر کمرے میں جا کر اباجی کا جسم دباتے تھے۔ ابھی تھوڑا سا دباتے تھے کہ شاباش شاباش کی آواز کے ساتھ اٹھتے اور الماری میں رکھی ہوئی اپنی زنبیل سے طرح طرح کے میوہ جات ہمیں عنایت فرماتے۔ جمعۃ المبارک کو ناشتہ کرنے کے بعد گھر کی چھت پر چلے جاتے اور حجامت بنواتے۔ ہم بچے حجام کے جانے کے انتظار میں ہوتے تاکہ اوپر جا کر اباجی سے ناخن کٹوائیں اور انعام میں ایک ایک روپیہ حاصل کریں جو ہم بچوں کے لیے ہفت اقلیم کی دولت ہوتی۔ کبھی کبھی مذاق سے قینچی ناک پر رکھتے اور کہتے ناک کٹوا لو تو پانچ روپے دوں گا۔ ہم بچے تھے، لیکن اتنی سمجھ ضرور تھی کہ ناخن تو دوبارہ آ سکتے ہیں، لیکن ناک نہیں، اس لیے فوراً بھاگ جاتے کہ کہیں ہمیں نک کٹا نہ کر دیں۔

ہمارے والد محترم نے خواب دیکھا کہ وہ مجھے اور بڑے بھائی مولانا داؤد خان نوید کو لے کر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت اقدس میں حاضر ہوئے تو آپ نے بھائی جان کو ٹافیاں دیں۔ میرے والد محترم نے میری طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا کہ یا رسول اللہ، میری بیٹی کو بھی دیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے بھی کچھ ٹافیاں عنایت فرمائیں۔ اسی اثنا میں والد محترم کی آنکھ کھل جاتی ہے۔ ان دنوں ہمارے گھر ماموں جان عابد آئے ہوئے تھے۔ ان سے تعبیر پوچھی تو کہنے لگے کہ بچوں کو کسی بڑے بزرگ کی صحبت نصیب ہوگی۔ اس کی تعبیر یوں سامنے آئی کہ میرے بھائی جان نے حفظ مکمل کیا تو اباجی نے انھیں اپنے پاس بلوا لیا اور وہ وہاں تجوید کی تعلیم حاصل کرنے کے ساتھ ساتھ اباجی کی خوب جی بھر کر خدمت کرتے رہے۔ اسی طرح کچھ عرصہ کے بعد میں نے میٹرک کا امتحان دیا تو ماموں جان شاہد مجھے گکھڑ لے گئے تاکہ چھٹیاں وہاں گزاروں۔ کچھ دن رہنے کے بعد اباجی سے اجازت لینے گئی تو اباجی نے مجھے واپس نہ آنے دیا اور وہاں ماموں جان حماد الزہراوی کے مدرسہ میں شعبہ حفظ میں داخل کرا دیا۔

میرا میٹرک کا رزلٹ آیا تو امی جان نے مجھے فرسٹ ڈویژن میں امتحان پاس کرنے پر سونے کی ایک انگوٹھی کا تحفہ دیا۔ میں کسی کام کے لیے اباجی کے پاس گئی تو ان کی نگاہ انگلی میں پڑی ہوئی انگوٹھی پر پڑ گئی اور وہ اس کے متعلق پوچھنے لگے۔ میں نے بتایا تو کہنے لگے پتر، تمہاری امی کی محبت ٹھیک ہے، لیکن یہ طالب علمی کا دور ہے۔ پھر بڑے پیار محبت سے اپنے طالب علمی کے دور کے تین چار واقعات رقت آمیز لہجے میں سنائے اور کہنے لگے کہ ہمیشہ سادگی سے رہو، یہی عورت کا اصل زیور اور حسن ہے۔ مجھے اس وقت اپنے آپ پر بہت زیادہ رشک آیا کہ اللہ پاک نے ہمیں ایسے اباجی عطا کیے ہیں جو ہماری چھوٹی چھوٹی باتوں پر بھی اتنے اچھے انداز سے رہنمائی کرتے ہیں اور ہمارا حد سے زیادہ خیال رکھتے ہیں۔ ہماری بھی کوشش ہوتی کہ ہم سے کوئی کوتاہی نہ ہو جائے، خصوصاً ہماری امی جان نے آخر وقت تک ان کا بہت زیادہ خیال رکھا۔

ہماری امی جان کے ہاتھ کا پکا ہوا کھانا بہت خوش ہو کر کھاتے۔ امی جان بھی ہفتے میں دو تین دن ضرور کھانا بنا کر بڑے بھائی کے ہاتھ اباجی کو بھیجتی تھیں۔ کریلے گوشت، چوہنگاں، کڑھی، سری پائے، ساگ، ایسی چیزیں بہت خوش ہو کر کھاتے تھے۔ ایک دفعہ اباجی کھانا لے کر گھر میں داخل ہوئے تو مجھے آواز دی۔ میں بھاگ کر آئی تو میرے ہاتھ میں کھانے کے برتن پکڑائے اور ہنس کر کہنے لگے، "اج تیریاں موجاں نیں۔ تیری امی نے تیرے لئی پکایا اے۔ میری امی زندہ ہوندی تے میرے واسطے پکاندی۔" میں نے کہا کہ "میری امی نے اپنے اباجی واسطے تیار کیتا اے" تو کہنے لگے کہ "چل دوناں لئی اے۔"

ایک دن میں جامعہ جانے کی تیاری کر رہی تھی کہ مجھے بلایا اور کہنے لگے کہ پتر، آج جنوبی افریقہ سے مہمان (غالباً حاجی ابراہیم صاحب تھے) نے آنا ہے، ان کے لیے اچھے کھانے کا انتظام کر لینا۔ مجھے ڈشز بھی بتائی گئیں کہ یہ تیار کر لینا۔ اباجی پریشان تھے کہ کیا میں اتنا کچھ تیار کر لوں گی یا نہیں اور کھانا اچھا بنے گا یا نہیں۔ اباجی سے اچھے کھانے کی سند حاصل کرنا بہت ہی مشکل کام تھا۔ بہر حال دوپہر کو خوب اللہ کو یاد کرتے ہوئے اور دل لگا کر کھانا بنایا۔ الحمد للہ حاجی صاحب کو میری محنت اتنی پسند آئی کہ ہر لقمہ پر انہوں نے کھانے کی تعریف کی۔ پہلے تو اباجی کو محسوس ہوا کہ بچی کا دل رکھنے کے لیے ایسا کہہ رہے ہیں، لیکن جب انہوں نے خوب جی بھر کر کھانا کھایا تو پھر یقین آیا۔ کھانے کے فوراً بعد اباجی کے ہاتھ پر پانچ سو روپے رکھے اور کہنے لگے کہ میری طرف سے بچی کا انعام ہے۔ اباجی نے بہت انکار کیا لیکن جب وہ کسی طریقے سے نہ مانے تو مجھے آواز دے کر اندر بلوایا۔ میں پردہ کے ساتھ اندر گئی تو حاجی صاحب نے میرے سر پر پیار دیا اور مجھے انعام دیا۔ میں نے تردد کا اظہار کیا تو اباجی نے اشارہ کر کے کہا کہ رکھ لو۔ حاجی صاحب کے جانے کے بعد اباجی نے مجھے کمرے میں بلا کر بہت زیادہ شاباش دی۔

طبیعت کے مطابق کام کرنے پر بہت زیادہ حوصلہ افزائی کرتے جبکہ طبیعت کے خلاف کام کرنے پر سخت غصہ اور ڈانٹ

ڈپٹ بھی کرتے۔ ایک دفعہ مجھے شوق ہوا کہ اباجی اور مہمانوں کے لیے جو کمرہ ہے، اس کی نئی چادریں اور پردے وغیرہ بناؤں۔ سب گھر والوں نے بہت ڈرایا کہ اباجی غصہ کریں گے، لیکن میں نہ مانی۔ ان دنوں ان کی بڑی بہن ''ددے'' بھی آئی ہوئی تھیں اور اباجی اپنے معمول سے ہٹ کر عشا کے بعد تقریباً دو گھنٹے تک ان کے پاس آ کر بیٹھتے اور پرانی یادیں دہرا کر اور نت نئے قصوں سے ہمیں لطف اندوز کرتے تھے۔ جب اباجی اپنے وقت پر ہمارے پاس آئے تو فوراً ان کی نگاہوں نے تبدیلی بھانپ لی اور وہ اردگرد کا بہت غور سے جائزہ لیتے رہے۔ کمرے میں واپس جانے کے بعد ماموں جان راشد کو بلایا اور کہنے لگے کہ اتنا تو مجھے پتہ ہے کہ بازار سے یہ سب لانے والے تمہی ہو، یہ بتاؤ کہ کس نے منگوایا ہے؟ انہوں نے پس و پیش سے کام لیا، لیکن اباجی کے سامنے مجبوراً میرا نام بتانا پڑا۔ نام اس لیے نہیں بتا رہے تھے کہ ان کو پتہ تھا کہ اب ڈانٹ لازماً پڑے گی۔ اُدھر میں سب کو اترا اترا کر بتا رہی تھی کہ اباجی نے مجھے کچھ بھی نہیں کہا۔ اس بات پر سب حیران بھی تھے۔ یہ رمضان المبارک کا مہینہ تھا۔ صبح سحری بنا کر اباجی کے پاس گئی اور ہاتھ دھلانے کے لیے برتن آگے کیا تو برتن ایک طرف رکھ کر مجھ سے پوچھنے لگے کہ پہلے مجھے بتاؤ، سارا خرچ کتنا آیا ہے۔ ان کا اصول تھا کہ ایک ایک روپے کا حساب لکھوا کر لیتے۔ میں نے ٹال مٹول سے کام لیا تو سختی سے کہنے لگے، مجھے بتاؤ۔ مجھے ان کی سختی سے پوچھی گئی بات پر رونا آ گیا اور آنسو میری آنکھوں سے ٹپ ٹپ گرنے لگے۔ میرے آنسو دیکھ کر میری طرف دیکھ کر تھوڑا مسکرائے اور کہا کہ میں نے تمہیں کچھ بھی نہیں کہا، صرف خرچ پوچھا ہے کہ کتنا ہوا ہے۔ مجبوراً میں نے آدھا خرچ بتایا تو کہنے لگے، یہ چیزیں اتنے کی تو نہیں ہیں۔ اتنا تجربہ تو مجھے ہے۔ سچ سچ بتاؤ اور آئندہ جس چیز کی بھی ضرورت ہو، مجھ سے پیسے لے لینا یا مجھے بتا دینا، میں منگوا دوں گا۔ غرض جب تک انہوں نے مجھے روپے نہیں دیے، سحری کے کھانے کو ہاتھ نہیں لگایا۔ ہو سکتا ہے پڑھنے والوں کے ذہن میں یہ بات آئے کہ گھریلو معاملات میں اباجی کس قدر سخت تھے۔ بالکل نہیں۔ دراصل وہ گھریلو معاملات میں بہت حساس تھے اور احساس ذمہ داری سے ہر کام کو انجام دینے والے تھے۔ ان کے کچھ اصول تھے جن پر وہ سختی سے کاربند رہتے تھے۔

ہمارے معاشرے میں عام طور پر مرد حضرات گھریلو ذمہ داریوں سے دست بردار ہو جاتے ہیں، لیکن اباجی نے جس طرح دین کی خدمت اپنا فریضہ سمجھتے ہوئے کی ہے، اسی طرح گھر کی ذمہ داریوں کو بھی نہایت خوش اسلوبی سے نبھایا ہے۔ گھر کا سودا سلف لانا ہے تو لسٹ اباجی خود بنا رہے ہوتے کہ کون سی چیز کتنی آنی ہے۔ بجلی، سوئی گیس یا جس قسم کے بل آتے، فوراً ادائیگی کرواتے۔ کسی کی شادی آتی ہے تو تحفے بھیجتے۔ کوئی فرد بیمار ہے تو اس کی عیادت کرتے۔ گھر کا کوئی فرد بیمار ہو جاتا تو جب تک خود دوائی منگوا کر اسے کھلا نہ دیتے، ان کو سکون نہ آتا۔ جب تک بیمار فرد کو چلتا پھرتا نہ دیکھ لیتے، بے چین اور بے سکون رہتے۔ یہ کیفیات صرف صحت کی حالت میں نہیں تھیں، صاحب فراش ہونے کے بعد تو گھر والوں کے معاملے میں بہت زیادہ حساس ہو گئے تھے۔

ہماری ایک ایک بات کی طرف ان کی خصوصی توجہ ہوتی۔ کوئی غلط کام یا بات کرتے تو فوراً ٹوک دیتے تھے۔ ہماری والدہ محترمہ اپنے بہن بھائیوں میں زیادہ خاموش طبع ہیں۔ ان کو یہ ڈر تھا کہ کہیں بچوں میں بھی یہ نہ عادت آ جائے، اس لیے اچھی گفتگو کرنے پر ہمہ وقت اکساتے۔ آج ہم بہن بھائی جس مقام پر ہیں، اللہ رب العزت کی خصوصی مدد اور اس کے فضل کے ساتھ اباجی اور والدین کی خصوصی دعائیں اور اباجی کی تربیت بہت زیادہ شامل ہے۔ الحمد للہ اباجی نے ہمیں بہت زیادہ اعتماد،

اظہار، محبتوں، شفقتوں، دعاؤں اور نصیحتوں سے نوازا جو ہماری باقی کی زندگیوں کے لیے مشعل راہ اور بہترین زاد راہ ہے۔

ہم چاروں بہنوں نے اباجی کی خواہش کے مطابق گھر کے قریب جامعہ ام سلمہ میں درجہ کتب میں داخلہ لیا تو بہت خوشی کا اظہار کیا اور استقامت کی دعائیں دیں۔ جامعہ میں کچھ ہی عرصہ گزرا تھا کہ اباجی کی بیماری کی اطلاع آ گئی۔ اس وقت ہمارے وہم وگمان میں بھی نہ تھا کہ طبیعت کی خرابی اتنے طویل عرصہ تک رہے گی۔ ہمیں جامعہ سے چھٹیاں نہ ہونے کی وجہ سے امی جان اکیلے ہی چلی گئیں جبکہ ہمیں اک پل بھی چین نہ تھا۔ ہونٹوں پر یہی دعائیہ کلمات تھے کہ مالک کائنات! اباجی کو صحت وتندرستی عطا فرما۔ ہم تین چار دن کے بعد گئے تو اپنے جان سے پیارے اباجی کو چارپائی پر لیٹے دیکھ کر دل دھک سے رہ گئے۔ چہرے پر بہت زیادہ کمزوری اور بیماری کے اثرات صاف دکھائی دے رہے تھے۔ ہمیں محسوس ہوا کہ ہر وقت دوسروں کو تسلی اور دلاسہ دینے والے اباجی کو اب ہماری اشد ضرورت ہے۔ بس پھر کیا تھا، ادھر جامعہ سے جمعرات کو چھٹی ہوتی، اُدھر ماموں جان راشد ہمیں گکھڑ لے جانے کے لیے گاڑی لے کر آ جاتے۔ انہوں نے اباجی کی خدمت کے ساتھ ہمیں لانے لے جانے کی ڈیوٹی بھی احسن طریقے سے نبھائی ہے۔ اللہ پاک ان کو بہترین جزائے خیر عطا فرمائے۔ آمین۔ ماموں جان کہتے تھے کہ ہفتہ کے دن جب تم لوگ چلی جاتی ہو تو اباجی پر انتظار کے لمحے بہت بھاری گزرتے ہیں۔ ایک ایک پل پوچھتے کہ آج کیا دن ہے۔ جب منگل آتا تو پرسکون ہونا شروع ہو جاتے کہ اب تمہارے آنے میں صرف ایک دن رہ گیا ہے۔ خود اباجی ہم بہنوں کو کہتے کہ تم میرے آنگن کی چڑیاں ہو، جب چلی جاتی ہو تو میں اداس ہو جاتا ہوں۔ میں نے مذاقاً کہا کہ چڑیا تو اُڑتی پھرتی ہے تو ہم بھی اُڑنے لگی ہیں تو فوراً کہتے، ''ناں ناں، ہالے نہ اُڑنا''۔

ہمارے جامعہ نے تقسیم اسناد کا پروگرام رکھا تو جامعہ کی انتظامیہ کا اصرار تھا کہ حضرت صاحب یہاں آئیں، لیکن اباجی نے معذرت کا اظہار کیا اور کہنے لگے کہ آپ کسی اور کو بلا لیں، میں کہیں نہیں جاتا۔ انتظامیہ والوں نے ہمیں کہا کہ آپ ان کو منائیں، آپ کی بات مان جائیں گے۔ ہم نے صرف اتنا ہی کہا کہ اباجان، ہمیں بہت خوشی ہوگی جب آپ اپنے ہاتھوں سے سند ہمیں دیں گے تو ماموں جان راشد کو بلا کر کہنے لگے کہ بچیوں کی خوشی اسی میں ہے، اس لیے تم مجھے وہاں لے جانا۔ اُس وقت ہماری خوشی کا کوئی ٹھکانا نہیں تھا جب اباجی ماموں جان ساجد، ماموں جان راشد اور بھائی داؤد کے ساتھ جامعہ میں داخل ہوئے۔ انہوں نے ہمیں کہا کہ تم لوگوں کی فرمائش پوری کر دی ہے، اب تم ان کو سنبھال لینا، ہم باہر جا رہے ہیں۔ اباجی نے جامعہ کے اساتذہ کرام وطالبات سے کچھ گفتگو فرمائی اور پھر ہمیں سندیں دیں۔ جب واپس جانے لگے تو اصرار کرنے لگے کہ میرے ساتھ چلو، کیونکہ جمعرات کا دن تھا۔ گاڑی میں جگہ نہ ہونے کی وجہ سے ماموں کہنے لگے، آپ کو چھوڑ کر میں ان کو آ کر لے جاؤں گا۔ اباجی کی محبتوں کو دیکھ کر اپنے اوپر بہت رشک آیا۔ تھوڑی دیر کے بعد ہم بھی گکھڑ پہنچ گئے۔ ان دنوں عصر کے بعد ہوا خوری کے لیے ویل چیئر پر باہر چکر لگواتے تھے۔ اس دن میں نے ویل چیئر پکڑی ہوئی تھی تو مجھ سے پوچھنے لگے کہ آج جو تمہیں سندیں ملی ہیں، یہ وفاق المدارس کی طرف سے ہیں؟ میں نے کہا، جی اباجی تو کہنے لگے الحمد للہ ثم الحمد للہ، اللہ پاک تم سب کو کامیاب وکامران کرے۔ اسی طرح عالمیہ والے سال ختم بخاری شریف کے موقع پر تشریف لائے تو ہمیں کہنے لگے، آج میں بہت زیادہ خوش ہوں کیونکہ تم لوگوں سے متعلق میری دیرینہ خواہش پوری ہوئی ہے۔ اس کے ساتھ سند حدیث کی اجازت دی اور عالمہ کے ساتھ عاملہ بننے کی خصوصی دعا کی۔

جب جمعرات کو ہم گکھڑ جاتے تو رات کافی دیر تک بزم ادب کی طرح محفل سجتی ۔ نعتیں، نظمیں، علمی باتیں اور لطائف رات گئے تک سنتے ۔ کچھ مزاحیہ باتوں پر اباجی کے قہقہوں کے ساتھ ہمارے قہقہے بھی رکنے پر نہ آتے ۔ نظمیں سننے پر بار بار یہ الفاظ دہراتے کہ یا اللہ تیرا شکر ہے کہ میرے بچے تیرے نام لیوا ہیں ۔ لوگوں کے بچے گانے سناتے ہیں تو ان کے والدین خوش ہوتے ہیں، جبکہ مجھے اپنے بچوں کی یہی ادائیں بہت پسند ہیں ۔

اباجی کے ساتھ زندگی کی بہت سی خوشگوار یادیں وابستہ ہیں ۔ ان خوشگوار دنوں میں سے ایک وہ دن بھی ہے جب ہمیں پتہ چلا کہ چھوٹے نانا جان حضرت صوفی صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ رہنے کے لیے اباجی کے پاس آ رہے ہیں ۔ ہماری خوشیوں کا کوئی ٹھکانا نہ رہا جب ہم نے ان دونوں بزرگوں کو ایک جگہ پر کافی دیر اکٹھے دیکھا ۔ دونوں بھائیوں کی پرانی یادیں اور پرانے قصے بڑے مزے سے سنے چھوٹے جو نانا جان نے اپنے دلچسپ انداز میں ہمیں سنائے اور ہمیں بہت زیادہ ہنسایا ۔ ان دنوں اباجی کی یہی خواہش تھی کہ مجھے چھوڑ کر صوفی کی خدمت زیادہ کرو ۔ اُدھر ان کے پاس جاتے تو وہ کہتے، مولوی صاحب کی زیادہ خدمت کرو ۔ دونوں بھائیوں کی محبت اور ایثار آخر تک مثالی رہا ۔

بیماری کی حالت میں اباجی مطالعہ خود تو نہیں کر سکتے تھے، لیکن کتابیں بہت خوش ہو کر سنتے ۔ اکثر و بیشتر کتابوں کے اوپر اپنا ہاتھ حسرت سے پھیرتے کہ میں ان کو اب پڑھ نہیں سکتا ۔ میں نے سب سے زیادہ جو کتابیں سنائیں، ان میں صحاح ستہ کے علاوہ الجامع الصغیر، جامع البیان، تذکرۃ المحدثین والمفسرین، دنیا میرے آگے اور تحریک مجلس احرار اور ختم نبوت کی تحریک کے متعلق کتابیں شامل ہیں ۔ مولانا مفتی تقی عثمانی صاحب کا سفر نامہ بہت زیادہ سنا ہے ۔ جب مجھے سنانے کے لیے کہتے تو میں پوچھتی کہ ''اباجی، اج کتھے دی سیر کریے؟'' جس ملک کے بارے میں سننا ہوتا تو کہتے ''اج اوتھے چلنا اے'' ۔ جب ذخیرۃ الجنان کی نئی جلد آتی تو وہ بھی سنتے ۔ ماموں راشد سے کہتے کہ ان سب کے لیے ایک ایک جلد ضرور رکھنا، چنانچہ جب ہم واپس آنے لگے تو ہم بہن بھائیوں کو اپنے ہاتھ سے دیتے ۔ ایکسپریس، ضرب مؤمن اور اسلام اخبار سننے کا معمول تھا ۔ ضرب مومن میں مولانا اسلم شیخوپوری اور سید عدنان کاکاخیل کے مضامین بعض اوقات موڈ نہ ہونے کے باوجود بہت دلچسپی سے سنتے ۔ اسلام اخبار میں سے ماموں جان زاہد کے کالم کے علاوہ مجھے جو کالم اچھا لگتا اور میں سنانے کے لیے کہتی تو بہت غور سے سنتے ۔ ایک دفعہ مولانا غلام اللہ خانؒ کے متعلق قسط وار مضمون آیا ۔ میں نے سنایا تو بہت زیادہ پسند آیا اور اپنے کمرے کی الماری میں وہ اخبار رکھوایا ۔ جب بھی جاتی، وہ ضرور سنتے ۔

کسی کتاب کی بھی عربی عبارت سننے پر بہت خوش ہوتے ۔ پیشانی اور ہاتھ پر بوسہ دیتے اور بے اختیار ہمارے استاد مکرم مولانا عبد المجید صاحب کو دعائیں دیتے ۔ میں اپنی عادت کے مطابق ایک ہاتھ میں کتاب پکڑتی اور دوسرا ہاتھ اباجی کے کندھے پر رکھ کر سناتی تھی ۔ پھر کچھ دنوں میں ایسی عادت ہو گئی کہ کمرے میں موجود چھوٹی کرسی پر بٹھا کر سنا کرتے ۔ ایک دن بڑے خوشگوار موڈ میں تھے ۔ مجھے کتاب سنانے کو کہا تو میں نے ایک طرف بیٹھ کر کتاب سنانی شروع کی تو مجھے کرسی لا کر وہاں بیٹھنے کو کہا ۔ میں نے ہنس کر کہا کہ اباجی، اس کرسی کے لیے تو بہت سے پاپڑ بیلنے پڑتے ہیں، جب کہ آپ آرام سے دوسروں کے حوالے کر دیتے ہیں ۔ آپ بھی مسکرائے اور کہنے لگے کہ ''اوہ وڈی کرسی ہوندی اے، ایہہ تے چھوٹی ساری اے ۔'' میں جب بھی پاس جا کر بیٹھتی تو میری کلائی تھوڑا سا زور لگا کر پکڑتے اور وہ جگہ سرخ ہو جاتی ۔ میں کہتی کہ آپ کہتے ہیں کہ میں بیمار

ہوں، جبکہ آپ میں ابھی بھی اتنی طاقت اور ہمت ہے کہ کسی پہلوان کو نیچے گرا سکتے ہیں ۔ اس پر مسکراتے اور ساتھ ساتھ ہاتھ سے ناں ناں کا اشارہ کرتے ۔ لیکن یہ طاقت و ہمت چھوٹے نانا جان کی وفات کے بعد ختم ہونا شروع ہو گئی اور آخری ضرب ہمارے محترم خالو جان مولانا قاری خبیب احمد عمر رحمہ اللہ کی وفات ثابت ہوئی جس نے اباجی کی ساری طاقت و ہمت نچوڑ لی ۔

۲۰ / اپریل ۲۰۰۹ء کو میں نے خواب دیکھا کہ میرا دانت ایک دم نیچے گر گیا ہے اور بہت زیادہ خون نکل رہا ہے ۔ میں اپنا دانت اٹھا کر دیکھتی ہوں تو وہ سب دانتوں سے زیادہ چمک دار اور روشن دکھائی دیتا ہے ۔ اسی طرح اباجی کی وفات سے تین چار دن پہلے خواب میں دیکھتی ہوں کہ مولانا عبد اللطیف جہلمیؒ اپنی اہلیہ کے ساتھ گکھڑ کے بازار میں آئے ہیں اور کہتے ہیں، ہم خریداری کرنے آئے ہیں ۔ میں پوچھتی ہوں، کس چیز کی؟ اتنے میں ایک دم اباجی آتے ہیں اور قاضی صاحب ان کا ہاتھ پکڑتے ہیں اور کہتے ہیں، مولانا سرفراز کی ۔ وہ اباجی کو جلدی سے لے جاتے ہیں جبکہ میں ان کے پیچھے بھاگتی ہوں اور کہتی ہوں کہ ہمارے اباجی کو نہ لے کر جائیں ۔ وہ مڑ کر جواب دیتے ہیں کہ میں نے لے کر جانا ہے ۔

میں نے جب آخری دفعہ ان کو دیکھا تو میری طرف چند سیکنڈ تک بہت غور سے دیکھتے رہے ۔ دل نے فوراً دہائی دی کہ یا اللہ، خیر کا معاملہ فرمانا ۔ اے اللہ، اباجی ہمارے لیے رحمتوں اور برکتوں کا سائبان ہیں، انہیں ہم سے جدا نہ کرنا ۔

اللہ تعالیٰ کے راضی ہونے کی دلیل بھی یہی ہے کہ اس کی رضا میں خوش رہا جائے ۔ یہی سوچ کر صبر کا دامن تھام لیا ہے، ورنہ کس کا دل چاہتا ہے کہ اس کا پیارا اس سے جدا ہو ۔ خود چاروں ماموں اور ہماری امی اور چھوٹی بہن کہتی ہیں کہ آخری لحات میں ہم سب اتنے بے بس ہو گئے تھے کہ کوئی کچھ نہیں کر سکتا تھا ۔ ہم میں سے کوئی ایک بھی باوجود ہزار کوششوں کے اپنے مشفق باپ کو دور جانے سے نہیں روک سکتا تھا، کیونکہ یہی قضا کا فیصلہ تھا ۔

اباجی کے بغیر ہم سب بڑے تو پریشان اور اداس ہیں ہی، لیکن گھر کے چھوٹے بچے ارسل، امیمہ، فائز، مبشرہ، رمشہ، مسفرہ، عبد الرزاق اور رشیقہ بھی سب بہت یاد کرتے ہیں اور پوچھتے ہیں کہ دادا ابو کہاں چلے گئے ہیں، ابھی تک واپس کیوں نہیں آئے؟ وہ تو اپنے گھر سے اتنے دن کبھی دور نہیں رہے ۔ اللہ تعالیٰ سے یہی دعا ہے کہ جس نے بھی اباجی کی خدمت دل و جان سے کی ہے، چاہے وہ گھر کا فرد ہے یا باہر کا، اس کو بہترین صلہ عطا فرمائے ۔ گھر میں سے خصوصاً ہماری امی جان، ماموں جان راشد، میری چھوٹی بہن ان سب نے اباجی کی خدمت کے لیے دن اور رات میں کوئی فرق نہیں رکھا تھا ۔ کسی نے جنت کمانے والے کو دیکھنا ہو تو بلا شک و شبہ ان کو دیکھ لے جنھوں نے اپنی جان سے بڑھ کر خدمت کی ہے ۔

یا اللہ! ہمارے اباجی کو جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام عطا فرما ۔ جس طرح ہمارا ان کا دنیا میں ساتھ رہا ہے، اسی طرح اُخروی زندگی میں بھی اپنے اس ولی کامل کا ساتھ نصیب فرمانا ۔ آمین ثم آمین ۔

کچھ سال پہلے جب احقر گکھڑ منڈی میں حضرت کی طبع پرسی اور حدیث کی اجازت کے لیے حاضر ہوا تو حضرت کے مبارک ہاتھوں میں رعشہ تھا ۔ میں نے عرض کیا کہ ان ہاتھوں نے دین کی خدمت میں بہت کچھ لکھا ہے ۔ اب ان پر رعشہ آیا ہے تو حق کی ادائیگی کے بعد آیا ہے ۔ جس پر حضرت مولانا مرحوم مسکرانے لگے ۔

(مفتی عبد الوہاب چاچڑ، ادارتی شذرہ، ماہنامہ ''شریعت'' (سندھی) سکھر، مئی ۲۰۰۹)

اخت مولانا داؤد خان نوید*

دل سے نزدیک آنکھوں سے اوجھل

وائے گل چین اجل کیا خوب تھی تیری پسند
پھول وہ توڑا کہ ویراں کر دیا سارا چمن

آج ہمیں جس ہستی کے ذکر نے قلم اُٹھانے پر مجبور کیا ہے، وہ ہماری محبوب، سب سے عظیم اور پیاری ہستی ہمارے پیارے نانا جانؒ کی ہے اور جنہیں آج رحمۃ اللہ علیہ لکھتے وقت ہاتھوں میں کپکپاہٹ جاری ہے اور دل خون کے آنسو رو رہا ہے اور جن کی وفات کا یقین آج تک نہیں ہوا۔

زمیں کے تاروں سے ایک تارا فلک کے تاروں کو جا چکا ہے
مگر تری مرگ ناگہانی کا مجھ کو اب تک یقیں نہیں ہے

نانا جانؒ حقیقتاً آسمان کا ایک تارا تھے جو ۹۵ برس تک اپنی روشنی پوری آب وتاب کے ساتھ اس دنیا میں بکھیرتے رہے اور بالآخر ۵ مئی ۲۰۰۹ء کو دار فانی سے دار بقا کی جانب روانہ ہوگئے اور ہم سب کو روتا بلکتا چھوڑ گئے۔

دل و جان اداس ہیں ہمارے
اُٹھ گیا کون پاس سے ہمارے

بہرحال تقدیر کے فیصلوں کو کون رد کر سکتا ہے۔ موت کا ذائقہ ہر نفس نے چکھنا ہے، چاہے وہ بادشاہ ہو یا فقیر، امیر ہو یا غریب، بیمار ہو یا تندرست، مفلس ہو یا غنی، عقل مند ہو یا بے وقوف۔ ہر کسی کو ایک نہ ایک دن خدائے بزرگ و برتر کے پاس حاضر ہونا اور اپنے اعمال کا حساب دینا ہے۔ اللہ پاک ہمارے اوپر رحم فرمائے اور درگزر والا معاملہ فرمائے، آمین ثم آمین۔

نانا جانؒ نے دو شادیاں کی تھیں۔ ہم نے ابھی عمر کی چند بہاریں ہی دیکھی تھیں کہ ہماری بڑی نانو اور چھوٹی نانو، دونوں وفات پا گئیں۔ اللہ تبارک وتعالیٰ ان دونوں کو اپنی جوار رحمت میں جگہ دے اور کروٹ کروٹ جنت نصیب فرمائیں، آمین۔ لہٰذا ان کے ساتھ گزرے ہوئے لمحات تو یاد نہیں، البتہ نانا جانؒ کے ساتھ ہم نے زندگی کا کافی حصہ گزارا ہے اور یہی لمحات ہماری زندگی کی کل متاع ہیں۔

نانا جانؒ کی زندگی کے چند پہلو بے حد نمایاں تھے۔

۱۔ قرآن سے محبت: نانا جانؒ چونکہ صاحب فراش تھے اور پڑھنے لکھنے اور چلنے پھرنے سے معذور تھے، ہم بہنیں اگر ان کے کمرے میں قرآن شریف پڑھ رہی ہوتیں تو ہمیں اپنے پاس بلاتے اور فرماتے کہ میرے پاس بیٹھ کر اونچی آواز سے

* نواسی امام اہل سنتؒ۔

پڑھو، صرف اتنی اونچی آواز جو نانا جانؒ کو سنائی دے سکے۔ ہم پڑھتیں تو نانا جانؒ کافی دیر تک تلاوت قرآن سے لطف اندوز ہوتے۔ اگرچہ نانا جانؒ خود حافظ نہیں تھے، لیکن اگر ہم جان بوجھ کر ایک آیت چھوڑ کر پڑھتے تو فوراً بول اُٹھتے کہ آگے یہ والی آیت ہے۔ ہم ایسا صرف یہ دیکھنے کے لیے کرتی تھیں کہ نانا جانؒ کو پتہ چلتا ہے یا نہیں۔

۲۔ احادیث سے محبت: دوران تعلیم جب ہم جمعرات کو نانا جانؒ کے پاس گکھڑ جاتے تو ہم تینوں بہنوں سے ضرور پوچھتے کہ آج حدیث کا کون سا سبق پڑھ کر آئی ہو؟ ہم بتاتیں کہ فلاں حدیث پڑھی ہے تو اس کے بعد ہم تینوں کو باری باری اپنے پاس بلاتے اور ہمارے ہاتھ چومتے تھے اور فرماتے کہ ان ہاتھوں سے تم احادیث کی کتابیں پکڑتی ہو۔ اس وقت نانا جانؒ کی آنکھوں سے آنسو رواں ہوتے تھے۔

۳۔ علم وعمل: علمی میدان میں بھی نانا جانؒ نے اپنا لوہا منوایا۔ حقیقتاً وہ بڑے بلند پایہ عالم تھے اور کیوں نہ ہوتے، آخر یہ سب ان کے اساتذہ کی محنت تھی۔ اساتذہ بھی حضرت مولانا سید حسین احمد مدنیؒ، مولانا ابراہیم بلیاویؒ، مولانا عبدالقدیر کیمبل پوریؒ اور مولانا اعزاز علیؒ جیسے ہوں اور ان کی محنت رنگ نہ لائے، یہ کیسے ہو سکتا تھا۔ نانا جانؒ نے بھی اپنے اساتذہ کی محنت کی لاج رکھی اور نہایت محنت، جستجو اور لگن سے علمی میدان میں ترقی کی منازل طے کرتے رہے۔ یہی وجہ ہے کہ آج دیوبند کو اپنے اس قابل فخر سپوت پر فخر ہے۔ پھر علم بھی اس وقت کامل ہوتا ہے جب عمل بھی ہو اور یہ باتیں نانا جانؒ میں بدرجہ اتم موجود تھیں۔ آج عالم اسلام بالخصوص اہل سنت والجماعت حنفی دیوبندیوں کو اپنے اس شیخ اور ولی کامل پر فخر ہے۔

۴۔ تقویٰ وپرہیزگاری: نانا جانؒ بڑے متقی اور پرہیزگار تھے۔ ساری زندگی اپنے آپ کو اور اپنی اولاد کو بدعات سے بچائے رکھا۔ اکثر عورتیں جب دَم وغیرہ کروانے آتیں تو عقیدت سے نانا جانؒ کے ہاتھ چومنے لگتیں اور بعض تو ایسی بھی ہوتیں جو درباروں اور پیروں فقیروں کے پاس جانے والی ہوتی تھیں۔ جب وہ ایسا کرتیں تو نانا جانؒ ایسا کرنے سے سختی سے منع فرماتے تھے۔ غرض آپؒ ہر معاملے میں اپنے اسلاف کی روایات کو زندہ رکھتے اور پرہیزگاری اختیار فرماتے تھے۔

۵۔ اساتذہ سے محبت: ایک دن میری چھوٹی بہن نانا جانؒ کو کوئی دینی رسالہ سنا رہی تھی۔ جب مولانا حسین احمد مدنیؒ کا تذکرہ آیا تو نانا جانؒ آبدیدہ ہوگئے۔ اپنے اساتذہ کی بڑی عزت کرتے تھے۔ نانا جانؒ کو صفدر کا لقب بھی انہی بزرگوں نے دیا تھا۔ نانا جانؒ جیسے شاگرد رشید سے بڑی شفقت فرماتے تھے اور جب شاگرد اپنے استاد کے مقام کو اچھی طرح جان اور سمجھ لے تو پھر استاد کو بھی وہ شاگرد پیارا ہو جاتا ہے اور ایسے شاگرد بھی استادوں کے دلوں میں جگہ پاتے ہیں اور ان کے دل جیت لیتے ہیں۔ نانا جانؒ اس کی زندہ مثال تھے۔

۶۔ کتابوں سے محبت: نانا جانؒ صرف احادیث کی کتابوں کا احترام نہیں کرتے تھے، بلکہ ہر کتاب کے بارے میں نانا جانؒ کی ایک جیسی ہی کیفیت ہوتی تھی۔ کسی کتاب کی بے ادبی گوارا نہ کرتے تھے اور اپنی کتابوں کی حفاظت اپنی جان سے بھی بڑھ کر کرتے تھے۔ نانا جانؒ اپنی بیماری کی وجہ سے رات کا زیادہ تر حصہ جاگ کر گزارتے تھے۔ معمول کے مطابق ایک رات والدہ محترمہ نانا جانؒ کو دبا رہی تھیں کہ نانا جانؒ کو اچانک اپنی کوئی کتاب یاد آگئی۔ فوراً والدہ محترمہ سے فرمانے لگے کہ اس الماری میں دیکھو، کتاب موجود ہے یا نہیں۔ والدہ محترمہ نے اٹھ کر دیکھا تو کتاب وہاں موجود نہ تھی۔ نانا جانؒ کو بڑی تشویش ہوئی۔ والدہ محترمہ نے نانا جانؒ کو پریشان دیکھا تو کہا کہ ابا جان، آپ پریشان نہ ہوں۔ کسی نے دوسرے کمرے میں رکھ

دی ہوگی۔ میں ان شاء اللہ صبح ہوتے ہی وہ کتاب آپ کو ڈھونڈ دوں گی۔ اس پر نانا جانؒ نے جو الفاظ کہے، وہ کتابوں کے ساتھ نانا جان کی محبت کی صحیح عکاسی کرتے ہیں۔ والدہ محترمہ سے فرمانے لگے کہ ''پتر مینوں اینا ں دکھ اپنے ماں باپ دے مرن دا نئیں سی ہویا جیناں دکھ مینوں کتاب گواچن دا ہویا اے''۔ (مجھے اتنا دکھ والدین کے مرنے کا نہیں ہوا تھا جتنا دکھ کتاب کے گم ہونے کا ہوا ہے۔) اللہ پاک ہمیں بھی کتابوں سے محبت اور ان ادب کرنے کی توفیق عطا فرمائیں۔ امین ثم امین۔

۷۔ مخلصانہ مشورے اور نصیحت آمیز باتیں: نانا جانؒ کی ہم پر بے پناہ شفقتوں میں سے ایک شفقت و مہربانی یہ بھی تھی کہ ہمیں اپنے مدبرانہ اور مخلصانہ مشوروں سے بھی نوازتے رہتے تھے اور اس انداز سے ہمیں نصیحت فرماتے تھے کہ ہماری تربیت بھی ہو جاتی تھی اور کسی کی دل آزاری بھی نہ ہوتی۔ حقیقتاً وہ ہمارے مربی تھے۔ ایک دفعہ میں اور میری چھوٹی بہن نانا جانؒ کے پاس بیٹھی ان کو دبا رہی تھیں تو فرمانے لگے، مجھے پتہ چلا ہے کہ تم دونوں قرآن حفظ کر رہی ہو۔ ہم نے بتایا کہ جی ہاں تو فرمایا کتنے پارے ہوگئے ہیں؟ ہم نے بتایا کہ دس ہوگئے ہیں۔ نانا جانؒ فرمانے لگے کہ تم درس نظامی کا کورس شروع کرو۔ نانا جانؒ کے حکم پر ہم نے باوجود حفظ کا شوق ہونے کے، درس نظامی میں داخلہ لے لیا اور نانا جانؒ کی دعاؤں سے آج ہم دین کا علم حاصل کر کے دین کی خدمت کی سعادت حاصل کر رہی ہیں۔ اللہ پاک ہمیں استقامت نصیب فرمائیں اور سب سے بڑی خوشی کی بات ہمارے لیے یہ ہے کہ نانا جانؒ سے ہم نے درس نظامی کی اسناد حاصل کیں، کیونکہ نانا جانؒ ہمارے مدرسہ میں تشریف لائے تھے۔ ہمیں نانا جانؒ سے اجازت حدیث بھی حاصل ہے۔ اللہ پاک عمل کی توفیق دے۔

۸۔ خوش مزاجی: اگر کسی کتاب کا تذکرہ ہوتا تو نانا جانؒ کا انداز منصفانہ اور مدبرانہ ہوتا۔ اگر اساتذہ کا تذکرہ ہوتا تو ادب واحترام ملحوظ خاطر رکھتے۔ اگر علما کی مجلس ہوتی تو انداز گفتگو عالمانہ ہوتا اور اگر بچوں سے مذاق کے موڈ میں ہوتے تو بچے بن جاتے۔ نانا جانؒ کا دل لگانے کے لیے ہم اکثر انہیں ''بچوں کا اسلام'' سے لطائف سناتیں۔ اگر کوئی لطیفہ ان کو زیادہ پسند آتا تو دو تین بار سنانے کی فرمائش کرتے اور پھر کافی دیر تک مسکراتے رہتے۔

نانا جانؒ اپنے ہاتھ کی انگلیوں کی طرف اشارہ کرتے اور پھر ہم پانچوں بہن بھائی کے نام ہر انگلی پر بولتے۔ شہادت کی انگلی کے ساتھ والی انگلی پر میرا نام بولتے۔ میں نانا جانؒ سے کہتی کہ میں بہن بھائی میں تیسرے نمبر ہوں اور آپ بڑی انگلی پر میرا نام بولتے ہیں تو نانا جانؒ کافی دیر مسکراتے اور پھر کہتے کہ ہاں تم میری امی بخت آور جو ہوئی۔ میری سب سے چھوٹی بہن کا نام انگوٹھے پر لیتے تھے۔ ہم پوچھتیں تو فرماتے کہ یہ انگوٹھے کی طرح جو ہوئی۔ (چھوٹی بہن جسامت میں ذرا صحت مند ہے۔) اس پر ہم مسکرا اٹھتیں۔ ہم بھی نانا جانؒ کے لیے فرحت کا سامان کرتی رہتیں اور نانا جانؒ بھی ہمارا دل لگائے رکھتے تھے۔ ہم جب نانا جانؒ کے پاس ان کے کمرے میں جاتیں تو فرماتے کہ میری چڑیاں آ گئی ہیں۔

نانا جان کو اگر ہم اپنا شیخ، استاد، مربی اور مشفق باپ لکھیں تو بے جا نہ ہوگا۔ وہ درحقیقت ہمارے لیے مشعل راہ تھے اور ان کی ساری زندگی ہمارے لیے نمونہ ہے۔ ہم نے کافی عرصہ ان کی صحبت میں گزارا ہے اور اس سارے عرصے میں وہ ہمیں بہت کچھ سکھا گئے۔ ان کی ہر بات میں ہمارے لیے تربیت کا کوئی نہ کوئی رنگ ضرور ہوتا تھا اور یہی وجہ ہے کہ ہماری والدہ محترمہ ہم سے جب بھی کسی کے گھر مثلاً ماموں، خالہ وغیرہ کے ہاں جانے کا پوچھتیں تو ہمارا جواب یہی ہوتا کہ ہم نے گکھڑ جانا ہے۔ دراصل نانا جانؒ کی محبتیں اور شفقتیں ہمہ وقت ہمارا احاطہ کیے رکھتی تھیں اور ہم بھی ہر وقت ان کے پاس جانے کو

بے چین رہتے تھے۔ نانا جانؒ ہمیں جب بھی دعا دیتے، فرماتے تھے کہ اللہ پاک تمہیں عالمہ، فاضلہ، اور دین کی خادمہ بنائے۔ اس وقت ہم ابھی اسکول کی تعلیم حاصل کرتی تھیں اور ہمارے وہم وگمان میں بھی نہ تھا کہ ہم مذہبی علوم کی تحصیل کریں گی، لیکن یہ نانا جانؒ کے منہ سے نکلی ہوئی دعا تھی جو اللہ پاک نے پوری کرنی تھی اور وہ صرف چند سالوں بعد پوری بھی ہوئی۔ سب سے زیادہ خوشی کی بات یہ ہے کہ ان کی زندگی میں ہی پوری ہوئی۔

جب چھٹیاں ہوتیں تو ہم سب گھر والے نانا جانؒ کے پاس حاضر خدمت ہوتے۔ ان کی یہی خواہش ہوتی تھی کہ ساری چھٹیاں میرے پاس ہی گزاریں اور ہم بھی ان کی خواہش کو پورا کرتے۔ خاصہ کے امتحان سے فراغت کے بعد ہم نانا جانؒ کے پاس حاضر خدمت ہوئے۔ چھٹیوں کے اختتام پر جب والدہ محترمہ نانا جانؒ سے واپسی کی اجازت لینے ان کے کمرے میں گئیں تو نانا جانؒ والدہ محترمہ سے فرمانے لگے، ''پتر اینوں ایتھے میرے کول رہن دے۔'' (اسے یہیں میرے پاس رہنے دو۔) نانا جانؒ کے منہ سے الفاظ ادا ہوں اور ہماری والدہ محترمہ انکار کریں، یہ ناممکن تھا، چنانچہ میں اور میری چھوٹی بہن نانا جانؒ کی خدمت میں مشغول ہوگئیں اور باقی گھر والے واپس گوجرانوالہ آ گئے۔

ہم دونوں بہنوں کو نانا جانؒ کے چھوٹے سے چھوٹے کام سے لے کر بڑے سے بڑا کام کر کے خوشی محسوس ہوتی تھی۔ اسے ہم اپنے لیے اعزاز سمجھتے تھے۔ ان سالوں کو میں اپنی زندگی کے سب سے قیمتی سال تصور کرتی ہوں اور انہی سالوں میں، میں نے نانا جان کی بے شمار قیمتی دعائیں سمیٹی ہیں۔ جب میں شروع شروع میں ان کے پاس رہنے لگی تو ایک دن مجھے فرمانے لگے ''پتر، تینوں چا بنانی آندی اے کہ نئیں؟'' (بیٹا تمہیں چائے بنانی آتی ہے یا نہیں؟) میں نے کہا جی، بنانی آتی ہے۔ فرمایا، بنا کر لاؤ۔ شاید ان کا مقصد میرا امتحان لینا تھا کہ اسے کھانا پکانا آتا ہے یا نہیں۔ میں نے چائے بنائی اور ان کے پاس حاضر خدمت ہوئی۔ وہ مجھے فرمانے لگے کہ کپ میرے منہ کے ساتھ لگاؤ اور تھوڑی تھوڑی کر کے مجھے پلاؤ۔ میں نے اسی طرح پلائی جیسے حکم فرمایا تھا۔ جب چائے پی چکے تو فوراً میرا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیا اور بوسہ دیا اور فرمانے لگے کہ بہت اچھی چائے بنائی ہے۔ وہ لمحہ میری زندگی کا یادگار ترین لمحہ تھا۔ پھر یکے بعد دیگرے ایسے لمحات آتے رہے کیونکہ اس کے بعد نانا جانؒ میرے ہاتھ کی بنی ہوئی چائے پینا پسند فرماتے تھے۔

نانا جانؒ جب بھی گھر والوں سے مسور کی دال پکواتے تو ایک واقعہ ضرور سناتے تھے اور میں نے یہ واقعہ اسی دن سنا تھا جب نانا جانؒ نے میرے ہاتھ کی بنی ہوئی دال کھائی تھی۔ نانا جانؒ واقعہ بتاتے ہیں کہ جب میں اور صوفیؒ (نانا جانؒ کے چھوٹے بھائی) کلکتہ کا سفر کر رہے تھے تو کرایہ بھی تھوڑا تھا اور سفر بھی لمبا تھا۔ ابھی ہم آدھے راستے میں ہی تھے کہ کرایہ ختم ہو گیا۔ اب ہم پیدل سفر کرنے لگے۔ چلتے چلتے ہمیں جھونپڑیاں نما گھر نظر آئے جہاں زیادہ تر غیر مسلم آباد تھے۔ فرماتے ہیں کہ ہمیں بھوک بھی بہت ستا رہی تھی، چنانچہ ہم نے ایک گھر سے کھانے کے لیے کچھ مانگا تو ایک غیر مسلم عورت نے کاپی کا گتا پھاڑ کر اس میں تھوڑے سے چاول اور اوپر دال ڈال کر دی اور غصے سے ہماری طرف پھینکے۔ نانا جانؒ فرماتے ہیں کہ میں نے دو چار لقمے کھائے اور باقی کے چاول صوفیؒ کو دے دیے۔

نانا جانؒ ہم سب بہنوں سے کتابیں سنتے تھے۔ جس کتاب کے سننے کو جی چاہتا، ہم وہ سنا دیتیں۔ مفتی محمد تقی عثمانی دامت برکاتہم کی کتاب ''دنیا میرے آگے'' بڑے شوق سے سنتے تھے۔ سب سے پہلے اندلس کا سفر سننے کی فرمائش کرتے اور طارق بن

زیادہ والا واقعہ بڑے ایمانی جذبے اور شوق سے سنتے تھے۔ جب ہم اشعار پر پہنچتی تو بڑے پُر جوش ہو کر یہ اشعار زبانی پڑھتے، اس حال میں کہ آنکھوں سے آنسو جاری ہوتے تھے۔ کتابیں سننے کا یہ عمل تقریباً چھے، سات گھنٹے تک مسلسل جاری رہتا۔ وفات سے آخری دو ماہ پہلے تک معمول اسی طرح تھا، کیونکہ میں خود سناتی تھی لیکن بعد میں اس میں کمی آتی گئی۔ کتاب سناتے سناتے گلا خشک ہو جاتا تو فرماتے، پانی پی آؤ اور باقی آ کر پورا کرو۔ کتاب سننے کے لیے تو ہر وقت بے چین رہتے تھے۔

نانا جانؒ کے پاس رہتے ہوئے جب کبھی مجھے بخار ہوتا تو اپنی بیماری کو بھول کر میری فکر میں لگ جاتے۔ بار بار گھڑی کی طرف دیکھتے اور پوچھتے کہ ڈاکٹر صاحب آئے ہیں یا نہیں؟ ڈاکٹر فضل الرحمٰن صاحب نانا جانؒ کے معالج تھے اور روحانی بیٹے بھی۔ اللہ تبارک وتعالیٰ ان کو بہترین بدلہ عطا فرمائے اور دنیا وآخرت کی نعمتوں سے سرفراز فرمائے، آمین۔ جس وقت ڈاکٹر صاحب تشریف لاتے تو فوراً کہتے کہ پہلے میری بچی کو چیک کریں۔ مجھے آواز دیتے اور اپنی موجودگی میں مجھے چیک کرواتے۔ اس کے بعد وقتاً فوقتاً مجھے کھانے پینے کی ہدایت فرماتے۔ جب میں نانا جانؒ کو چائے بسکٹ کھلاتی تو فرماتے، ایک چمچ میرے منہ میں ڈالتی جاؤ اور ایک اپنے منہ میں۔ میں اسی طرح کرتی اور مجھے کھاتے ہوئے دیکھ کر انہیں تسلی ہو جاتی۔

نانا جانؒ مجھے اکثر فرمایا کرتے تھے کہ تمہاری شکل وصورت میری چھوٹی امی پر ہے۔ نانا جانؒ کے والد محترم نے دو شادیاں کی تھیں اور نانا جانؒ اپنی چھوٹی امی میں سے تھے۔ جب بھی خاندان والے اکٹھا ہوتے تو خاص طور پر مجھے سب کے سامنے بلاتے اور فرماتے کہ اس کی شکل میری امی ''بخت آور'' پر ہے۔ ہم اگر بختاور کہتیں تو فرماتے، بختاور نہیں بلکہ بخت آور ہے اور کافی عرصہ تک مجھے اپنی امی کے نام سے بلاتے رہے۔ جب بھی عید کا تہوار یا شادی وغیرہ کی کوئی رسم ہوتی تو نانا جانؒ فرماتے تھے کہ مجھے اپنے والدین بہت یاد آتے ہیں، خصوصاً اپنی چھوٹی امی اور پھر رونے لگ جاتے۔

نانا جانؒ ہمارے مربی تھے۔ انھوں نے ہمیں گفتگو کے سلیقے سکھایا اور بتایا کہ بڑوں کے ساتھ کس طرح پیش آنا ہے اور چھوٹوں پر کس طرح شفقت کرنی ہے۔ نانا جانؒ ہمیں بتاتے تھے کہ آپ کی والدہ بہت خاموش طبع ہے اور میں چاہتا ہوں کہ آپ سب خوب بولا کرو۔ ہمیں اپنے آنگن کی چڑیاں کہتے تھے اور فرماتے کہ یہ ہر وقت چہچہاتی ہوئی اچھی لگتی ہیں۔ والد محترم کو بڑی قدر ومنزلت کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ والد محترم نانا جانؒ سے اکثر ملنے جاتے رہتے تھے اور ان سے بہت سے مسائل دریافت کرتے تو نانا جانؒ اچھے طریقے سے جواب دیتے اور والد محترم مطمئن ہو جاتے۔

ایک مرتبہ نانا جان کو کسی مدرسہ والوں نے اپنے پروگرام میں آنے کی دعوت دی۔ نانا جانؒ نے جانے کی ہامی بھر لی، لیکن جب پروگرام کا دن آیا تو فرمایا کہ طبیعت ٹھیک نہیں ہے، لہٰذا میں نہیں جاؤں گا، میری طرف سے معذرت کر دیں۔ پروگرام بھی کافی بڑا تھا اور انتظامات بھی کافی کیے گئے تھے اور سب سے بڑی بات یہ تھی کہ اشتہارات میں چھپ چکا تھا کہ اختتامی دعا حضرت صاحب فرمائیں گے، لہٰذا گھر والے بڑے پریشان ہوئے۔ ان کی پریشانی بھی بجا تھی۔ سب نانا جانؒ کو مناتے رہے، لیکن وہ نہ مانے۔ دفعتاً ہمارے والد محترم نانا جانؒ کے پاس گکھڑ حاضر ہوئے اور فرمایا کہ وہ لوگ بہت اصرار کر رہے ہیں، لہٰذا آپ انہیں انکار نہ فرمائیں اور چلے جائیں، چاہے تھوڑی دیر کے لیے ہی چلے جائیں، لیکن جائیں ضرور تاکہ وہ حضرات خوش ہو جائیں۔ والد محترم کے یہ الفاظ کہنے کی دیر تھی کہ نانا جانؒ فرمانے لگے، ٹھیک ہے میں تیار ہوں۔ اس پر سب حیران اور خوش ہوئے اور والد محترم کو دعائیں دینے لگے۔

نانا جانؒ بھی سے نظمیں بھی سنتے تھے اور ہر کوئی اپنی پسندیدہ نظم سناتا تھا۔ مجھ سے نانا جانؒ اکثر دو نظمیں سنتے تھے۔ ایک ''باطل سے کبھی حق نہ دبا ہے نہ دبے گا'' اور دوسری:

کس سے مانگیں کہاں جائیں کس سے کہیں اور دنیا میں حاجت روا کون ہے

آخری دنوں میں نانا جانؒ مجھ سے یہ اشعار سنانے کی فرمائش بار بار کرتے تھے:

مصائب سے الجھ کر مسکرانا میری فطرت ہے
مجھے ناکامیوں پر اشک برسانا نہیں آتا

عمر بھر جس نے جلائے علم وحکمت کے چراغ
آہ ! اب اس کی جدائی پر ہیں سینے داغ داغ

اے خدا آسودہ جنت میں رہے وہ پاک روح
جس نے سازِ زندگی میں سوز پیدا کر دیا

نانا جانؒ کو صوفیؒ صاحب سے بہت محبت تھی۔ نانا جانؒ اور صوفی صاحبؒ جن کو ہم چھوٹے نانا جانؒ کہا کرتے تھے، ان دونوں کی جوڑی بہت مشہور تھی۔ ہمیشہ اکٹھے رہتے۔ جب چھوٹے نانا جانؒ کی وفات ہوئی تو ہمارے نانا جانؒ کی ہمت جواب دے گئی۔ ان کی وفات کے بعد اکثر کہا کرتے تھے کہ ''ہن ایہہ بابا نئیں اے''۔ (اب یہ بابا نہیں ہے۔) فرماتے تھے کہ اب میں نے بھی جلدی صوفیؒ کے پاس چلے جانا ہے۔ شاید اللہ تبارک وتعالیٰ کو بھی ان دونوں کا الگ رہنا پسند نہیں تھا اور جو جوڑی دنیا میں بظاہر ٹوٹ گئی تھی، آخرت میں اس کو دوبارہ جوڑنا تھا۔ اور پھر ایسا ہی ہوا کہ نانا جانؒ تھوڑے عرصے کے بعد ہی اپنے چھوٹے بھائی سے جا ملے۔ یقیناً دونوں پھر خوش ہوں گے کہ ہماری جوڑی پھر جڑ گئی ہے اور تمام آسمانی مخلوق بھی ان دونوں بھائیوں کے ملاپ پر خوشیاں منا رہی ہوگی لیکن زمینی مخلوق ان دونوں کے چلے جانے سے اداس اور شدید ترین غم زدہ ہے۔ جو ہستیاں ہمیں دعائیں دیتے نہ تھکتی تھیں، آج ہمیں اپنی دعاؤں سے محروم کر گئی ہیں۔ اگرچہ ہمیں دعائیں دینے والی اور ہستیاں ابھی زندہ ہیں، لیکن ان کی بات ہی اور تھی۔ اللہ تبارک وتعالیٰ ان ہستیوں کا سایہ تادیر ہمارے سروں پر قائم رکھے۔ آمین۔

بے شک ہمارے نانا جانؒ جیسے انسان صدیوں بعد ہی پیدا ہوتے ہیں۔ نانا جانؒ کے چلے جانے سے جو خلا ہماری زندگیوں میں آیا ہے، وہ مرتے دم تک پورا نہیں ہوگا۔ یہ غم ہمارے ساتھ ساتھ پوری ملت اسلامیہ کا مشترکہ غم ہے کیونکہ وہ ابھی اپنے روحانی باپ سے محروم ہو گئی ہے۔ وہ تو اپنا فرض ادا کر چکے، اب ہمارا فرض ہے کہ ہم ان کے بتائے ہوئے راستے پر چلیں تاکہ پوری دیانت داری سے ہم بھی یہ فرض ادا کر سکیں۔ اللہ پاک ان کے لگائے ہوئے چمن کی آبیاری کریں اور اس چمن سے نکلنے والے پھول اپنی خوشبو چار دانگ عالم میں بکھیرتے رہیں۔ اللہ پاک ہمیں اپنے اسلاف کے نقش قدم پر چلائے اور جتنے بھی علمائے کرام اللہ کے راستے میں اپنی جانوں کا نذرانہ پیش کر چکے ہیں، انھیں اور بالخصوص ہمارے دونوں نانا جانؒ کو اللہ تبارک وتعالیٰ اعلیٰ علیین میں جگہ نصیب فرمائیں۔ آمین

اُٹھتے جاتے ہیں تیری بزم سے ارباب نظر
گھٹتے جاتے ہیں میرے دل کو بڑھانے والے

بنت حافظ محمد شفیق*

مرنے والے مرتے ہیں لیکن فنا ہوتے نہیں

میں نانا جان کو ابو جی کہا کرتی تھی، جبکہ باقی سب گھر والے ابا جی کہتے تھے۔ ہم سب گھر والوں کو اپنے اپنے انداز سے ابو جی کی خدمت کا موقع ملا جو اب ہماری زندگیوں کا کل اثاثہ ہے، البتہ میں خاصا عرصہ مسلسل ابو جی کی خدمت میں رہی۔ ہم سب امتحان سے فراغت کے بعد چھٹیاں گزارنے ابو جی کے پاس گئے تو تعطیلات کے اختتام پر انھوں نے مجھے خدمت کے لیے اپنے پاس رکھ لیا۔ امی جان نے بھی اس بات کو باعث سعادت سمجھا۔ میں چھوٹی تھی اور اتنی سمجھ نہیں تھی کہ خدمت کیسے کروں گی، لیکن ابو جی کی شفقتوں، محبتوں اور عنایتوں نے میرے لیے خدمت کے کام کو بہت سہل کر دیا۔

ابو جی کا پیار محبت سب کے ساتھ یکساں تھا۔ ہر فرد یہی خیال کرتا تھا کہ حضرت کو میرے ساتھ زیادہ پیار ہے۔ میرے ساتھ خصوصی پیار کی کچھ وجوہات بھی تھیں۔ میں سب سے چھوٹی اور لاڈلی نواسی تھی۔ پھر میری چھوٹی چھوٹی شرارتوں اور حرکتوں نے بھی ابو جی کو مجھ سے مانوس کر دیا تھا۔ ابو جی صاحب فراش تھے اور مجھے ان کے مزاج اور طبیعت کا بخوبی اندازہ ہو گیا تھا کہ انھیں اس وقت کس چیز کی طلب ہے۔ وہ بھی اپنے کام کے لیے مجھے ہی بلاتے تھے۔ میں اکثر انھیں ہنسانے کے لیے کوئی نہ کوئی شرارت کیا کرتی تھی۔ ایک دفعہ میں ابو جی جیسا لباس پہن کر اور نقلی ڈاڑھی مونچھیں لگا کر ہاتھ میں ان کا عصا پکڑے ان کے کمرے میں بڑی سنجیدگی کے ساتھ داخل ہوئی۔ بڑی بہن کو خاموش رہنے کا اشارہ کیا کیونکہ ایسے موقع پر وہ فوراً ہنس پڑتی تھی۔ آپی جان نے ابو جی کے قریب ہو کر کہا کہ ایک بابا جی آپ سے ملاقات کے لیے تشریف لائے ہیں۔ ''بابا جی'' نے قریب جا کر سلام کیا، ہاتھ مبارک پر بوسہ دیا اور چارپائی کے قریب بیٹھ گیا۔ دونوں جانب سے سوال وجواب کا سلسلہ شروع ہوا۔ بابا جی نے پوچھا کہ حضرت! آپ کی طبیعت کیسی ہے تو فرمایا کہ طبیعت ٹھیک نہیں رہتی۔ ابو جی نے پوچھا کہ آپ کہاں سے آئے ہیں اور کیسے آنا ہوا؟ بابا جی نے کہا کہ میں ادھر سے ہی آپ کی زیارت کے لیے حاضر ہوا ہوں۔ ابو جی نے اسی طرح دو تین اور سوال کیے اور بابا جی نے جواب دیے۔ اسی اثنا میں ابو جی نے آپی کو مشروب لانے کے لیے کہا تو ان کی ہنسی چھوٹ گئی اور سارا راز فاش ہو گیا۔ پھر آپی نے انھیں ساری بات بتائی۔ ابو جی فرمانے لگے کہ مجھے اٹھا کر بٹھاؤ۔ بابا جی نے ہی انھیں بٹھایا اور وہ بیٹھ کر ہر چیز کا معائنہ کرتے رہے اور ہنستے رہے۔ ہر چیز کے بارے میں سوال کرنے لگے کہ یہ کیا چیز ہے، کہاں سے لی ہے؟ میں نے ابو جی کو بتایا کہ یہ سب آپ کو ہنسانے کے لیے کیا ہے۔ آج بھی ابو جی کا ہنستا مسکراتا چہرہ یاد آتا ہے تو آنکھیں بھیگ جاتی ہیں، کیونکہ یہ اس حسین وجمیل چہرے کی زیارت کو ترستی ہیں اور اب ترستی ہی رہیں گی۔

ابو جی نے جب اٹھنا بیٹھنا یا لیٹنا ہوتا تو مجھے کہتے کہ پہلوان، ادھر آؤ۔ میرے نام ''اقرا'' کے بارے میں کہتے کہ یہ بڑا

* نواسی امام اہل سنتؒ۔

وزنی نام ہے، میں تمہیں اقلیمہ کہا کروں گا۔ اس کے بعد جب مجھے آواز دیتے تو اقلیمہ ہی کہتے۔ اب کان اس مبارک آواز کو سننے کے لیے ترستے ہیں۔ ابو جی کے پاس رہتے ہوئے مجھے کہیں جانے کا موقع نہیں ملتا تھا اور نہ ہی وہ مجھے کہیں جانے دیتے تھے۔ ایک منٹ کے لیے بھی اپنے پاس سے جدا نہیں ہونے دیتے تھے۔ ابو جی ہم دونوں بہنوں کو یہی کہتے کہ ہر وقت میری آنکھوں کے سامنے رہا کرو، حتیٰ کہ اگر ہم کسی کام سے باہر جاتے تو گھنٹی پر ہاتھ رکھ دیتے اور جب تک ہم اندر نہ پہنچ جاتیں، اپنا ہاتھ گھنٹی سے نہ ہٹاتے۔ پوچھتے کہ کہاں گئی تھیں؟ ہم بتاتیں کہ وضو کرنے گئی تھیں تو فرماتے کہ یہاں ڈیوڑھی میں میرے سامنے ہی کیا کرو۔ نماز بھی میرے کمرے میں ادا کیا کرو اور کھانا بھی میرے سامنے ہی کھایا کرو۔ میں نے ہنستے ہوئے کہا کہ ابو جی، پھر تو آپ ہمارے نوالے گنتے رہیں گے۔ فرمایا کہ ''نہیں پتر، مینوں اپنے آنگن دیاں چڑیاں ویکھ کے خوشی ہوندی اے'' (مجھے اپنے آنگن کی چڑیوں کو دیکھ کر خوشی ہوتی ہے)۔ اس طرح ہمارا زیادہ تر وقت ابو جی کے پاس ان کے کمرے میں ہی گزرتا۔ نماز، کھانا اور چھوٹے موٹے کام ہم ابو جی کے پاس ہی کر لیتے تاکہ وہ بھی خوش رہیں اور ہمیں بلاتے ہوئے انھیں کوئی دقت یا تنگی محسوس نہ ہو۔ باہر گلی میں کوئی چیز بیچنے والا گزرتا تو فرماتے کہ دیکھو، کیا چیز بیچ رہا ہے؟ ہم بتاتیں کہ فلاں چیز ہے تو فرماتے کہ میری جیب سے پیسے نکالو اور چیز لا کر میرے سامنے کھاؤ۔ چنانچہ ہم دونوں بہنیں بیٹھ کر کھاتیں اور وہ ہمیں دیکھ کر مسکراتے رہتے۔

چھوٹے نانا جان کی عیادت کے لیے گوجرانوالہ گئے تو ہم دونوں بہنیں بھی ساتھ تھیں۔ اپنے چھوٹے بھائی کو دیکھ کر ابو جی کی جو کیفیت ہوئی، میں اسے لفظوں میں بیان نہیں کر سکتی۔ جس بھائی کے لیے وہ کسی قسم کی تکلیف کو برداشت نہیں کر سکتے تھے، آج وہ بستر پر بے ہوشی کی حالت میں پڑے ہوئے تھے۔

میں ابو جی کو نظم ''شیخ صفدر کو رب نے جو رتبہ دیا'' سناتی۔ جب سنا چکتی تو ان سے پوچھتی کہ آپ شیخ صفدر کو جانتے ہیں؟ یہ کون ہیں؟ تو ہاتھ سے اشارہ کرتے کہ نہیں۔ پھر مسکراتے ہوئے جواب میں فرماتے کہ پتہ نہیں، یہ کون سے بابا جی ہیں، میں ان کو نہیں جانتا۔ میں کہتی کہ وہ تو اتنی عظیم ہستی ہیں کہ لوگ ان کی زیارت کے لیے دور دور سے سفر کر کے آتے ہیں اور اس وقت وہ میری آنکھوں کے سامنے چارپائی پر آرام فرما ہیں۔ فرماتے کہ نہیں، میں تو بابا جی ہوں۔ میں اٹھ کر پیشانی مبارک پر بوسہ دیتی اور کہتی کہ یہی تو وہ عظیم ہستی ہیں جو میرے ابو جی ہیں اور جن کو میں تنگ کرتی رہتی ہوں۔ فرماتے، ''نہیں پتر، مینوں تیریاں ایہہ شرارتاں تے ایناں نال مینوں ہنساندے رہنا بڑا چنگا لگدا اے'' (بیٹا، مجھے تمہاری یہ شرارتیں اور شرارتوں سے مجھے ہر وقت ہنساتے رہنا بہت اچھا لگتا ہے)۔

عصر کے بعد حاجی لقمان میر صاحب اور ڈاکٹر فضل الرحمٰن صاحب ابو جی کی خدمت اور زیارت کے لیے آتے اور کوئی نہ کوئی چیز مثلاً یخنی، مچھلی، جوس، ملک شیک وغیرہ ان کے لیے ضرور لے کر آتے۔ ابو جی خود نوش فرماتے اور باقی بچا کر میز پر رکھوا دیتے کہ یہ میں اپنی بچیوں کو دوں گا۔ وہ خود کوئی چیز کھا کر اتنے خوش نہیں ہوتے تھے جتنا ہمیں کھلا کر۔ جب حاجی صاحب اور ڈاکٹر صاحب چلے جاتے تو ہم بہنوں کو بلوا کر اپنے سامنے بٹھا کر کھانے پینے کو کہتے۔ اگر ہم کہتیں کہ یہ تو آپ کے لیے ہے تو فرماتے کہ اب یہ تمہارا حصہ ہے۔ میں نے جتنا کھانا پینا تھا، کھا پی لیا ہے۔ اگر ہم بہنیں ابو جی کے پاس ہوتیں اور کوئی چیز انھیں کھلا رہی ہوتیں تو ہر ایک کی کوشش یہی ہوتی تھی کہ بچی ہوئی چیز اسے ملے۔ پھر ہم چاروں بہنیں آپس میں

تقسیم کر کے کھالیتیں۔ ایک دن ہی ہم ایسے ہی کر رہی تھیں اور ہمیں پتہ نہیں تھا کہ نانا جان ہمیں دیکھ کر خوش ہو رہے ہیں۔ جب آپی جان برتن باہر لے جانے لگیں تو نانا جان نے انھیں آواز دی اور اپنے قریب بٹھا کر پوچھا کہ کیا تم لوگ میری ہوئی چیز پھینک دیتے ہو؟ آپی نے کہا کہ جی، پھینک دیتے ہیں۔ نانا جان حیران ہوئے اور پھر پوچھا کہ پھینک دیتی ہو؟ آپی نے کہا کہ جی، پھینک دیتی ہیں لیکن اپنے پیٹ میں۔ اس پر مسکرانے لگے۔

بیماری کے دنوں میں انھیں ہفتے میں ایک بار جمعرات یا جمعۃ المبارک کے دن ضرور نہلایا جاتا تھا اور میں اور میری والدہ محترمہ سر اور پاؤں وغیرہ پر تیل کی مالش کیا کرتی تھیں۔ میں ریش مبارک کو کنگھی کرتی، سرمہ لگاتی، عطر لگاتی اور پھر کہتی کہ دولہا تیار ہے۔ اس پر بہت خوش ہوتے اور کافی دیر تک مسکراتے رہتے۔ بستر تبدیل کرنے کا مرحلہ کافی مشکل ہوتا تھا۔ ابو جی کو اٹھا کر کرسی پر بٹھانا ہوتا تھا اور پھر بستر تبدیل کیا جاتا تھا۔ چھوٹے ماموں راشد اور میں دونوں مل کر بستر تبدیل کرتے تھے۔ میں کرسی لاتی اور وہ ابو جی کو اس پر بٹھاتے۔ اگر ماموں گھر پر نہ ہوتے تو بستر تبدیل کرنے کی ذمہ داری مجھ پر ہوتی اور میں الحمد للہ یہ کام بخوبی سرانجام دے لیتی۔ جب میں ابو جی کو اٹھاتی تو فرماتے، پہلوان واقعی میرا پہلوان ہے۔ ایک مرتبہ ابو جی بستر بدلوانے پر کسی طرح راضی نہیں ہو رہے تھے تو میں نے انھیں کھلا پلا کر فریش کیا اور باتوں باتوں میں ہی بستر تبدیل کر دیا۔ اس پر ابو جی نے ہم بہنوں کو ڈھیروں دعاؤں سے نوازا۔

ہر جمعہ کو نانا جان کے پاس بڑے ماموں مولانا زاہد الراشدی حاضر ہوتے اور ملکی حالات پر ان کے ساتھ تبادلہ خیال کرتے۔ ایک دفعہ ماموں آئے تو ابو جی نے مجھ سے کہا کہ ''پتر، اینوں جاندی ایں؟'' (بیٹا، اسے جانتی ہو؟) میں نے ابو جی کی طرف اشارہ کر کے کہا کہ یہ اس باباجی کے بیٹے ہیں۔ اس پر مسکرانے لگے۔

ابو جی کی وفات سے ایک رات پہلے تقریباً دو یا ڈھائی بجے بجلی گئی ہوئی تھی اور بالکل اندھیرا تھا۔ امی جان ابو جی کی چارپائی کے قریب جبکہ میں تھوڑے فاصلے پر لیٹی ہوئی تھی۔ اسی اثنا میں مجھے محسوس ہوا کہ سفید کپڑوں میں ملبوس ایک بزرگ کمرے کے دروازے سے داخل ہوئے۔ بجلی نہ ہونے کی وجہ سے ان کا چہرہ واضح طور پر نظر نہیں آیا۔ وہ کمرے کی کھڑکیوں کے آگے سے گزر کر ابو کی چارپائی پر پاؤں کی جانب بیٹھ گئے اور پھر غائب ہو گئے۔ مجھے خوف محسوس ہونے لگا تو میں نے امی جان کو آواز دے کر پوچھا کہ ابھی یہاں سے کون گزرا ہے؟ امی جان نے کہا کہ کوئی بھی نہیں گزرا۔ میں نے انھیں ساری بات بتائی تو انھوں نے کہا کہ تمھیں ایسے ہی وہم ہوا ہے۔ میں نے کہا کہ نہیں، وہم نہیں ہوا، میں نے خود اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے اور مجھے بہت ڈر لگ رہا ہے۔ امی جان نے مجھے اپنے قریب بلا کر لٹا لیا، لیکن ان کے پاس لیٹنے کے باوجود مجھ پر خوف طاری رہا۔ امی جان اپنا ہاتھ میرے سر پر پھیرنے لگیں تاکہ میں سو جاؤں، لیکن میری آنکھ کبھی لگ جاتی اور کبھی کھل جاتی۔ جیسے ہی آنکھ کھلتی، میری آنکھوں کے سامنے وہی سفید کپڑوں والے بزرگ آ جاتے۔ خیر رات تو جیسے تیسے گزر گئی، صبح میں نے ماموں جان شاہد کے سامنے اس بات کا ذکر کیا۔ اس کے بعد وہ سارا دن ابو جی کی خدمت میں ہی گزرا۔ کیا پتہ تھا کہ وہ آخری دن ہوگا۔

رات کو معمول کے مطابق سب اپنے اپنے کمروں میں چلے گئے۔ میں اور امی جان ابو جی کے کمرے میں ہی سوتے تھے۔ امی جان حسب معمول ابو جی کا جسم اور میں سر دبانے لگ گئی۔ تھوڑی دیر بعد ابو جی نے کہا کہ بیٹا، تم لیٹ جاؤ۔ اتنے میں سب بچے کمرے میں داخل ہوئے اور باری باری ابو جی کو سلام کر کے باہر چلے جاتے۔ پھر دوبارہ اندر آتے اور ابو جی سے ہاتھ ملا کر ہاتھ چومتے۔ ابو جی بھی بار بار بچوں سے سلام کرتے اور ان کے ہاتھ چومتے اور انھیں پیار کرتے رہے۔

ابو جی کو تو شاید پتہ چل گیا تھا کہ یہ بچوں سے آخری سلام اور پیار ہے، لیکن معصوم بچوں کے وہم و گمان میں بھی نہیں ہوگا کہ اب وہ اپنے پیارے دادا جان کو ڈھونڈتے ہی رہ جائیں گے۔ بچوں کے بار بار آنے سے ابو جی کی طبیعت میں ذرا بھی اکتاہٹ نہیں آئی۔ امی جان جو کافی دیر سے یہ منظر اور ابو جی کا چمکتا دمکتا اور مسکراتا چہرہ دیکھ کر خود بھی مسکرا رہی تھیں، آخر انھوں نے بچوں سے کہا کہ اب آپ جا کر سو جاؤ اور دادا جان کو تنگ نہ کرو تاکہ وہ کچھ دیر آرام کر لیں۔ انھیں کیا خبر تھی کہ آج ابو جی ایسی گہری اور پرسکون نیند سونے والے ہیں کہ پھر بیدار نہیں ہوں گے۔ بہرحال بچوں کو باہر بھیجنے کے بعد ہم دوبارہ ابو جی کو دبانے لگ گئے۔ اتنے میں ابو جی کو تھوڑی سے قے آئی اور میں بھاگتی ہوئی باہر گئی کہ ماموں میں سے جو بھی جاگ رہے ہوں، انھیں بتاؤں۔ باہر نکلی تو ماموں جان شاہد سامنے چارپائی پر لیٹے ہوئے اخبارات کا مطالعہ کر رہے تھے۔ میں نے انھیں بتایا کہ ابو جی کی طبیعت پھر خراب ہو گئی ہے اور وہ قے کر رہے ہیں تو وہ بھاگنے کے انداز میں اندر آئے اور ابو جی کے قریب پہنچے۔ امی جان نے نانا جان کو گود میں لیا ہوا تھا اور ایک ہاتھ سے قے صاف کر رہی تھیں۔ ماموں جان نے آگے بڑھ کر رومال پکڑ کر صاف کیا اور مجھ سے کہا کہ باقی سب کو بھی بلاؤ۔ میں جلدی سے گئی اور ماموں جان عابد کے کمرے پر دستک دی اور کہا کہ ابو جی کی طبیعت پھر خراب ہو گئی ہے۔

ماموں جان کے آنے تک گھر کے سبھی افراد پہنچ چکے تھے۔ ابو جی کی سانسیں اکھڑنے لگی تھیں۔ اسی اثنا میں انھوں نے مجھے آواز دی، حالانکہ میں ان کے قریب ہی کھڑی تھی۔ میں اور آگے ہوئی تو میری طرف عجیب انداز سے دیکھنے لگے۔ نہ جانے ان کے دیکھنے میں کیا تھا کہ ابھی تک دل میں اس نظر کی تاثیر محسوس ہوتی ہے۔ پھر انھوں نے امی جان کو آواز دی تو انھوں نے کہا، جی ابا جان۔ ابو جی کچھ پڑھ رہے تھے لیکن آواز صاف نہ ہونے کی وجہ سے سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا پڑھ رہے ہیں۔ پھر سب کی جانب دیکھ کر انھوں نے جان، جاں آفریں کے سپرد کر دی۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

اتنا پرنور، روشن، چمک دار اور مسکراتا ہوا چہرہ تھا کہ نگاہیں ہٹانے کو جی ہی نہیں چاہ رہا تھا۔ غسل کے بعد جب میں نے ان کا چہرہ دیکھا تو مجھے وہی ''دولہا تیار ہے'' والی بات یاد آ گئی، لیکن کس سے کہتی کہ میرے تیل اور عطر لگائے بغیر ہی آج دولہا تیار ہے۔ فی الواقع وہ دولہے سے بھی زیادہ خوب صورت لگ رہے تھے۔ ابو جی کے نورانی اور مسکراتے ہوئے چہرے کا آخری بوسہ لیتے ہوئے دل میں یہی خواہش ابھرتی رہی کہ اے کاش! ابو جی زندہ ہوتے، مجھ سے باتیں کرتے اور میرے سوالوں کا جواب دیتے۔

عزیزو، برخوردارو! کسی سے جھگڑا نہ کرنا۔ کافر کافر کہنا، یہ کوئی مسئلہ نہیں ہے۔ کافر تو کافر ہی ہوتا ہے، مگر چڑانے کے لیے، جس طرح جذباتی ساتھی کرتے ہیں، کافر کافر شیعہ کافر، یہ کوئی شرعی مسئلہ نہیں ہے۔ چڑانا بری بات ہے۔ ہندو کافر ہیں، سکھ کافر ہیں، عیسائی کافر ہیں، یہودی کافر ہیں، پارسی کافر ہیں، ذکری کافر ہیں اور یہ پاکستان میں موجود ہیں۔ (ذخیرۃ الجنان ۱۲۹/۸)

کوئی درخت اپنے پھل اور اس سے حاصل ہونے والے فوائد سے قیمتی بنتا اور پہچانا جاتا ہے۔ مولانا سرفراز خاں صفدرؒ کا ایک پھل ان کے ہزاروں شاگرد ہیں جو دنیا کے کونے کونے میں تبلیغ واشاعت اور دفاع دین کے کام میں مشغول ہیں۔ اس تناور درخت کا دوسرا ثمرہ آپ کی تصانیف ہیں جو دفاع دین کے حوالے سے اس قدر علوم ومعارف اور عقلی ونقلی دلائل سے بھری ہوئی ہیں کہ برصغیر کے علم الکلام پر لکھنے والا کوئی شخص ان سے بے نیاز نہیں ہوسکتا۔ اس قدآور درخت کا تیسرا ثمر آپ کی اولاد ہے۔ یہ بات مولانا کے لیے باعثِ بخشش بھی ہے اور قابلِ فخر بھی کہ آپ کی تمام اولاد حافظ قرآن اور عالمِ دین ہے۔ یہ حافظوں اور عالموں کا خانوادہ ہے۔ میرا اپنا نقطہ نگاہ یہ ہے کہ آپ کی تمام اولاد کا حافظ وعالم ہونا اس بات کی دلیل اور ثبوت ہے کہ آپ ایک باعمل انسان تھے۔ آپ کی اولاد نے آپ کی شخصیت میں علم وعمل کو یکجا دیکھا، تقویٰ اور پرہیزگاری کے صرف درس نہیں سنے بلکہ اپنے والدِ محترم کو تمام اسلامی تعلیمات کا عملی نمونہ اور تمام مکارمِ اخلاق کا مرقع پایا۔ اولاد کو آپ کے قول وفعل میں تضاد نظر نہیں آیا، اسی لیے ان کی اولاد کے لیے مولانا کی ہستی ایک عملی نمونہ ٹھہری اور انہوں نے اسی لائن کو اختیار کیا جس کا عملی نمونہ انہوں نے اپنے والدِ محترم میں دیکھا۔ ایسا بھی دیکھنے میں آیا ہے کہ عالموں کی اولاد حافظ اور عالم نہیں بنی، لیکن مولانا سرفراز خاں صفدرؒ اس اعتبار سے ایک منفرد حیثیت رکھتے ہیں کہ انہوں نے اپنی پوری اولاد کو دین کے لیے وقف کر دیا۔

مولانا عبد الستار تونسوی*

عصر حاضر کے مجدد

امام اہل سنت حضرت مولانا محمد سرفراز خان صفدرؒ عصر حاضر کے مفسر، محدث، فقیہ، مصنف اور علمی وروحانی حوالے سے مجدد کی حیثیت رکھتے تھے۔ عالم اسلام کی عظیم دینی یونیورسٹی دار العلوم دیوبند اور شیخ الاسلام حضرت مولانا حسین احمد مدنی قدس سرہ سے علمی روحانی فیوضات پانے والے امام اہل سنتؒ نے ہزاروں مفسرین، محدثین، مدرسین خطبا کو علمی انوارات سے نوازا۔ عرب وعجم میں جہاں بھی جائیں، آپ کے تلامذہ موجود ہیں۔ حضرت اقدس صفدر صاحب کو تصنیفات کی دنیا میں دیکھا جائے تو مولانا نے مسلک حق اہل سنت اور عقائد علمائے دیوبند کی ترجمانی وتشریحات اور فرق باطلہ کے رد میں دندان شکن کتب تحریر فرما کر جہاں علما وطلبہ کے لیے خزائن علمی کی سخاوت فرمائی، وہاں ہزاروں عقائد باطلہ اور اعمال سیۂ میں پھنسے افراد کی ہدایت کے اسباب مہیا فرمائے۔ آپ کے علمی وروحانی تصنیفی فیوضات سے رہتی دنیا تک مسلمانان عالم مستفیض ہوتے رہیں گے۔

مجھے اس بات پر فخر حاصل ہے کہ امام اہل سنتؒ میرے استاد بھائی ہونے کے علاوہ مسلکی اعتبار سے بے حد محبت کرتے تھے۔ علاوہ ازیں شیخ الاسلام حضرت مدنیؒ، مفتی اعظم مفتی محمد کفایت اللہ دہلویؒ، امام اہل سنت مولانا لکھنویؒ، شیخ التفسیر حضرت مولانا لاہوریؒ کی سرپرستی اور سردار احمد خان پتافیؒ، مولانا سید نور الحسن شاہ بخاریؒ کی قیادت میں قائم ہونے والی پہلی مذہبی وتبلیغی جماعت "تحریک تنظیم اہل سنت والجماعت" کے دستور، مشن اور طریق تبلیغ سے متفق بھی تھے اور مطمئن بھی۔ توحید وسنت کی اشاعت، اصحاب اہل بیت آل رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے ناموس کا تبلیغی وتحریری انداز سے تحفظ اور فرق باطلہ کا ہر لحاظ سے مدلل، محقق اور مستحسن رد اور موسسین اسلام کے دفاعی طریقے پر احقر اور میرے رفقا کو خصوصی دعائیں دیتے تھے۔ مولانا مرحوم نے ہمیشہ حق وباطل کے امتیاز اور اشاعت میں مثبت انداز اختیار فرمایا اور پسند بھی فرمایا۔

آپ کے تبحر علمی، تقدس روحانی نے جس طرح عالم اسلام کے علما، مفسرین، محدثین اور عامۃ المسلمین کو فیض یاب فرمایا، ان سے قیامت تک باقیات سے مسلمانان عالم مستفیض ہوتے رہیں گے۔ اللہ تعالیٰ حضرت اقدس کے درجات بلند فرمائے، آمین۔

---

*سرپرست اعلیٰ تحریک تنظیم اہل سنت پاکستان

مولانا مفتی محمد تقی عثمانی*

شیخ الکل حضرت مولانا سرفراز صاحب صفدرؒ

الحمد لله و كفى و سلام على عباده الذين اصطفىٰ۔

بعض شخصیات کو اللہ تبارک وتعالیٰ ایسی محبوبیت، قبول عام اور ہر دل عزیزی عطا فرماتے ہیں کہ ان کے تصور ہی سے دل کو سکون حاصل ہوتا ہے۔ ان سے ملاقات چاہے کم ہو، لیکن ان کا وجود ہی بذات خود تسلی اور ڈھارس کا ذریعہ ہوتا ہے۔ ہمارے مخدوم بزرگ، استاذ الکل حضرت مولانا محمد سرفراز خان صفدر صاحب قدس سرہ کی شخصیت بھی ایسی ہی تھی جس سے محروم ہو گئے۔ اناللہ وانا الیہ راجعون۔

وہ عرصہ دراز سے صاحب فراش تھے اور عملی زندگی سے تقریباً کنارہ کش۔ ان کی زیارت وصحبت کے مواقع بھی ہم جیسے دور افتادگان کے لیے بہت کم رہ گئے تھے، لیکن ان کے وجود سے اپنے سر پر ایک عظیم سایہ محسوس ہوتا تھا اور یوں لگتا تھا کہ جب کبھی حوادث روزگار سے کوئی مہلت ملی تو اس شجرۂ طیبہ کی ٹھنڈی چھاؤں اپنی آغوش پھیلانے کے لیے موجود ہے۔ اب یہ سایہ بھی سر سے اٹھ گیا۔ ان لله ما اخذ وله ما اعطى و كل شئ عنده باجل مسمى۔

اب دنیا میں وہ حضرات خال خال ہی رہ گئے ہیں جو اکابر علمائے دیوبند کی صحبت سے براہ راست سرفراز ہوئے اور پھر اپنے فیوض سے دنیا کو نہال کیا۔ حضرت مولانا محمد سرفراز خان صفدر قدس سرہ انھی خوش نصیب اہل علم میں سے تھے جنھوں نے براہ راست شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی، شیخ الادب حضرت مولانا اعزاز علی صاحب اور اس قرن کے دیگر اکابر سے فیض حاصل کیا تھا۔

انھوں نے اپنی خود نوشت سوانح میں تحریر فرمایا ہے کہ ابتدائی تعلیم حاصل کرنے میں ان کے والدین نے اور خود انھوں نے کیسی مشقتیں اٹھائیں اور پنجاب کے مختلف مقامات سے تحصیل علم کے بعد دارالعلوم دیوبند کا رخ کیا۔ وہاں دورۂ حدیث کی جماعت میں داخل ہوئے اور شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی قدس سرہ سے شرف تلمذ حاصل کیا، لیکن اس سال حضرت تحریک آزادیٔ ہند کے سلسلے میں گرفتار ہو کر جیل تشریف لے گئے اور آپ کی غیر موجودگی میں شیخ الادب حضرت مولانا اعزاز علی صاحب قدس سرہ سے صحیح بخاری شریف کی تکمیل فرمائی۔

درس نظامی سے فارغ التحصیل ہونے کے بعد آپ کی زیادہ تر مصروفیات درس وتدریس اور تصنیف وتالیف سے متعلق رہیں۔ آپ نے گوجرانوالہ کے قریب گکھڑ منڈی کے قصبے کو اپنا مستقر بنا لیا اور گوجرانوالہ میں نصرۃ العلوم کے نام سے ایک عظیم دینی درس گاہ قائم فرمائی جو بفضلہ تعالیٰ ہزار ہا تشنگان علم کو سیراب کر چکی ہے اور اب بھی اس کا چشمہ فیض جاری ہے۔

* نائب صدر دارالعلوم کراچی۔

میں نے حضرت کا نام سب سے پہلے اس وقت دیکھا جب میں دارالعلوم کراچی میں ہدایہ اخیرین وغیرہ پڑھتا تھا۔ دارالعلوم اس وقت نیا نیا شہر سے دور شرافی گوٹھ کے نام سے ایک گاؤں کے قریب صحرا میں منتقل ہوا تھا اور ہم پڑھنے کے لیے ہفتہ بھر دارالعلوم میں مقیم رہتے اور جمعرات کی شام کو شہر میں اپنے گھر جایا کرتے تھے۔ میرے والد ماجد حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب قدس سرہ کا ذاتی کتب خانہ بھی گھر ہی میں تھا اور جمعرات کی چھٹی میں میرا معمول یہ تھا کہ اس کتب خانے کی ایک ایک کتاب اٹھا کر دیکھتا اور کم از کم اس کے موضوع، مولف اور اس کے طرز تصنیف کا ایک تعارف حاصل کر لیتا تھا۔ اسی دوران ایک روز دو تین نئی کتابیں نظر سے گزریں جن پر مولف کا نام مولانا محمد سرفراز خان صفدر لکھا ہوا تھا۔ یہ کتابیں رد بدعات کے موضوع پر تھیں اور ان کو پڑھنا شروع کیا تو دیکھا کہ ان کی سطر سطر تفسیر، حدیث، فقہ اور عقائد کی کتابوں کے حوالوں سے بھری ہوئی ہے۔ ان میں بہت سے حوالے ایسے نظر آئے جن کا نام بھی پہلے نہیں سنا تھا۔ اسی وقت یہ اندازہ ہو گیا کہ یہ کوئی بڑے محقق عالم ہیں جن کا مطالعہ انتہائی وسیع ہے اور وہ کوئی بات حوالہ کے بغیر نہیں کہتے۔ یہ حضرت سے عقیدت ومحبت کی ابتدا تھی۔ اس کے بعد حضرت کی اور بھی بہت سی کتابیں آتی رہیں اور ان میں تحقیق ونظر کا وہی اسلوب ہر جگہ نظر آیا۔ جس موضوع پر قلم اٹھایا، اس پر سیر حاصل بحث فرمائی اور تحقیق کا حق ادا کر دیا۔ پھر یہ تالیفات ان موضوعات پر ہیں جن میں علمائے دیوبند اور علمائے بریلی کے درمیان یا علمائے دیوبند اور علمائے اہل حدیث کے درمیان بحث ومناظرہ کا بازار گرم رہا ہے اور اس میں رد وقدح کے دوران بہت سوں نے جارحانہ انداز واسلوب بھی اختیار فرمایا ہے، لیکن حضرت مولانا کی تالیفات بحیثیت مجموعی جارحیت سے خالی ہیں اور ان کا انداز خاص علمی اور محققانہ ہے۔ جزاہ اللہ تعالیٰ خیراً۔

ان تالیفات کی بنا پر حضرت سے تعارف اور محبت تو تھی، لیکن زیارت کا شرف پہلی بار اس وقت حاصل ہوا جب (۱۹۶۸ء میں) پہلی بار گوجرانوالہ حاضری ہوئی۔ اس وقت راولپنڈی میں ادارۂ تحقیقات اسلامی کی طرف سے ایک بین الاقوامی کانفرنس منعقد ہوئی تھی جس میں حضرت والد ماجدؒ کے ساتھ میں بھی حاضر ہوا تھا۔ کانفرنس کے اختتام پر غیر ملکی مندوبین کو سڑک سے لاہور لایا گیا۔ اس وقت بعض حضرات کی ترجمانی کے لیے میں بھی ان کے ساتھ ہو گیا۔ راستے میں یہ قافلہ گوجرانوالہ میں رکا۔ نصرۃ العلوم میں اس کی میزبانی اور خیر مقدمی جلسے کا اہتمام حضرت مولاناؒ نے کیا تھا۔ اس وقت پہلی بار ان کی زیارت کا شرف حاصل ہوا اور ان کی تالیفات پڑھ کر ذہن نے جو خاکہ بنائے ہوئے تھے، حضرت کو ان سے بالکل مختلف پایا۔ نہایت سادہ، متواضع اور کم گو۔ حضرت نے مہمانوں کو سپاس نامہ پیش کیا۔ میں اس وقت پچیس سالہ طالب علم تھا، لیکن حضرت والد صاحب قدس سرہ کی نسبت سے حضرت نے نہایت شفقت کا معاملہ فرمایا۔

اس کے بعد بفضلہ تعالیٰ حضرت سے متعدد بار نیاز حاصل ہوا۔ حضرت کی قیام گاہ پر بھی حاضری ہوئی۔ آپ دارالعلوم بھی تشریف لائے اور اساتذہ دارالعلوم کو اجازت حدیث سے بھی نوازا۔ حضرت کی علالت بڑھی تو مولانا مفتی محمد جمیل خان صاحب شہید رحمۃ اللہ علیہ انھیں علاج کے لیے کراچی لے آئے تھے اور انھیں حضرت کی خدمت کی بڑی سعادت حاصل ہوئی تھی۔ اس موقع پر بھی انھی کے گھر پر حضرت کی خدمت میں حاضری ہوئی اور حضرت نے اپنی شفقتوں سے نہال فرمایا۔

اللہ تعالیٰ نے انھیں اپنی اولاد کے بارے میں بھی قابل رشک بنایا۔ ان کے صاحبزادے ماشاءاللہ ان کی میراث علم کے وارث ہیں، خاص طور پر مولانا زاہد الراشدی صاحب (حفظہ اللہ تعالیٰ) کو اللہ تعالیٰ نے علم وفضل کے ساتھ خدمت دین کے

جذبہ بے تاب، متانت فکر اور سنجیدہ و باوقار طرز عمل کی خصوصیات عطا فرمائی ہیں۔ مغربی تہذیب کی فکری بنیادوں پر ان کی گہری نظر ہے اور اس پر ان کے جان دار تبصرے نئی نسل کے لیے مشعل راہ ہیں۔

حضرت مولانا محمد سرفراز خان صاحب قدس سرہ اصلاً علمی و تدریسی مزاج کے حامل تھے، لیکن جب کبھی ملک و ملت کو عملی جدوجہد کی ضرورت پیش آئی، انھوں نے اپنے اس مزاج کی قربانی دے کر اس جدوجہد میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ چنانچہ ۱۹۵۳ء کی تحریک ختم نبوت میں آپ نے سرگرمی سے حصہ لیا اور اس میں قید و بند کی صعوبتیں بھی برداشت کیں اور جیل میں رہتے ہوئے ان کی دعوت و تبلیغ کا سلسلہ بھی جاری رہا۔

عرصہ دراز سے حضرت صاحب فراش تھے اور بالآخر ۹ رجمادی الاولیٰ ۱۴۳۰ھ (۵ رمئی ۲۰۰۹ء) کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے بلاوا آ گیا اور وہ اپنے مالک حقیقی سے جا ملے۔

اللھم اکرم نزلہ ووسع مدخلہ وابدلہ دارا خیرا من دارہ واھلا خیرا من اھلہ ونقہ من الخطایا کما ینقی الثوب الابیض من الدنس۔

آج حضرت بذات خود ہمارے درمیان نہیں رہے، لیکن ان کی تالیفات اور ان کا قائم کیا ہوا جامعہ نصرۃ العلوم ان کے لیے عظیم صدقہ جاریہ ہے جس سے ان شاء اللہ یہ امت دیر تک فائدہ اٹھاتی رہے گی۔ اللہ تعالیٰ انھیں اپنے مقامات قرب سے نوازیں، ان کے اہل خانہ اور تمام متاثرین کو صبر جمیل عطا فرمائیں، ان کے ذی علم صاحب زادگان کو ان کے علم و فضل اور خدمات دینیہ کو آگے بڑھانے اور اہل سنت کی جس فکر کے وہ ترجمان تھے، اسے قائم رکھنے کی توفیق عطا فرما کر ظاہری اور باطنی فتنوں سے ان کی حفاظت فرمائیں۔ آمین ثم آمین۔

مدرسہ ریحان المدارس میں جلسہ تھا۔ جلسہ کے بعد ویگن میں حضرت شیخ الحدیث نے واپس جانا تھا۔ مولانا محمد نواز بلوچ نے قاری عبید اللہ عامر سے کہا کہ قاری صاحب، آپ ساتھ چلے جائیں۔ قاری صاحب ویگن میں پیچھے بیٹھ گئے اور حضرت امام اہل سنت ویگن میں اگلی سیٹ پر بیٹھ گئے۔ گکھڑ جا کر حضرت ویگن سے اتر کر گھر کی طرف چل پڑے اور قاری صاحب پیچھے پیچھے جاتے رہے۔ جب حضرت گھر کے دروازے پر پہنچے، تب ان کو قاری صاحب کے ہمراہ آنے کا پتہ چلا۔ فرمایا: تم کب آئے؟ قاری صاحب نے عرض کی، استاد جی میں تو گوجرانوالہ سے آپ کے ساتھ آیا ہوں۔ فرمایا، گاڑی والا واقف ہے؟ قاری صاحب نے عرض کیا، نہیں تو حضرت امام اہل سنت نے کھانا کھلایا، پھر خود چار پائی اٹھا کر لائے اور بچھائی۔ خود بستر لگایا اور کہا کہ آرام کرو۔ پانی کا ایک لوٹا بھر کر لا دیا اور کہا کہ اگر پیشاب کی حاجت ہو تو میں نے پانی رکھ دیا ہے، اسے استعمال میں لے آنا۔ یہ تھی حضرت امام اہل سنت کی اپنے تلامذہ سے محبت اور شفقت۔

(ماہنامہ ہدی للناس گوجرانوالہ، امام اہل سنت نمبر، جون ۲۰۰۹ء)

مولانا مفتی محمد عیسیٰ خان گورمانی*

نہ حسنش غایتے دارد نہ سعدی راسخن پایاں

حضرت مولانا زاہد الراشدی دام مجدہ نے حضرت شیخ الحدیث رحمہ اللہ کے متعلق کچھ لکھنے کی فرمائش کی اور کہا کہ حضرت سے آپ کا تعلق ہم سے بھی پہلے کا ہے، اس لیے کچھ نہ کچھ ضرور تحریر کریں۔ میں نے پچاس سال سے زائد طویل عرصہ پر نظر ڈالی اور جیسے جیسے کوئی چیز یاد آتی گئی، لکھتا گیا۔ عند ذکر الابرار تنزل الرحمۃ (نیک بندوں کے تذکرہ سے رحمت کا نزول ہوتا ہے)۔ نزول رحمت کا یہ فیضان بھی دیکھا ہے کہ جب ارادہ کیا، حیران تھا کہ کیا لکھوں، لیکن فضل الٰہی نے دستگیری کی اور یہ چند حروف معرض تحریر میں آ گئے۔ وباللہ التوفیق

علمی مقام اور علما کا آپ سے استفادہ

تفسیر، حدیث، فقہ، عقائد و کلام ہر فن میں آپ یگانہ روزگار تھے۔ معاصرین اور اکابر علما اہم مسائل میں آپ سے رجوع کرتے۔ آپ بڑی متانت اور تواضع سے ان کی حوصلہ افزائی فرماتے۔ راقم الحروف کے دورۂ حدیث کے سال حضرت الاستاذ مولانا قاضی شمس الدین صاحب نصرت العلوم کے صدر مدرس تھے۔ درس ترمذی میں ایک راوی کا ذکر آیا اور اس کا حال معلوم نہ ہو سکا۔ آپ نے فرمایا، اچھا مولانا سے دریافت کر لیں گے۔ پھر جب حضرت شیخ کے ہاں ابوداؤد کا درس ہو رہا تھا تو قاضی صاحب استاذ صاحب کی کلاس میں تشریف لے آئے۔ جب آپ کی نظر قاضی صاحب پر پڑی تو آپ نے ادباً اٹھنا چاہا۔ قاضی صاحب نے کہا کہ آپ بیٹھے رہیں۔ آپ نے کہا کہ یہ تو آپ زبردستی کرتے ہیں۔ قاضی صاحب نے راوی کا نام اور مقام پوچھا تو آپ نے برجستہ بتا دیا۔ قاضی صاحب نے کہا، مولوی محمد عیسیٰ! سن لیا؟ یہ کہہ کر چلے گئے۔

حضرت مولانا عبدالمالک صاحب (قلعہ دیدار سنگھ) نے ایک طویل ملاقات میں راقم الحروف سے گفتگو کرتے ہوئے بتلایا کہ جب جمعیۃ اشاعۃ التوحید کے علما اور شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد سرفراز خان صفدر کے مابین یک جہتی تھی، جلسوں میں سب حضرات تشریف لاتے تھے تو نوشہرہ ورکاں میں جلسہ ہوا۔ تقریر کے دوران حضرت شیخ القرآن نے کہا کہ مجھے حدیث تو یاد ہے لیکن حدیث کا درجہ معلوم نہیں تو مولانا سید عنایت اللہ شاہ بخاریؒ نے کہا کہ فکر کی کیا بات ہے، ہمارے پاس بہقی وقت تشریف رکھتے ہیں۔ چنانچہ حضرت الاستاذ نے تفصیلاً بتایا کہ محدثین کی اس حدیث کے بارے میں یہ رائے ہے۔

۱۹۷۶ء میں جامع مسجد شیرانوالہ گیٹ لاہور میں آئین شریعت کانفرنس کے موقع پر استاذ محترم مولانا مفتی محمودؒ نے علما کے ایک بڑے اجتماع سے خطاب کرتے ہوئے کہ حضرت علیؓ اپنے دور خلافت میں قاضی ابوشریح کی عدالت میں پیش ہوئے۔ حضرت شیخ کچھ فاصلے پر بیٹھے ہوئے تھے۔ آہستہ آواز میں کہا: قاضی شریح (تا کہ مفتی صاحب کے علاوہ اور کوئی نہ

* مہتمم جامعہ فتاح العلوم، نوشہرہ سانسی گوجرانوالہ

سنے)۔ مفتی صاحب نے بات دہراتے ہوئے پھر قاضی ابوشریح کہا۔ شیخ نے آہستہ آواز میں پھر کہا، لیکن مفتی صاحب متنبہ نہ ہوئے۔ پھر تیسری مرتبہ دہرایا تو شیخ نے اسی انداز میں کہا، قاضی شریح۔ مفتی صاحب نے سن لیا اور تصحیح کر لی۔ میں نے کہا کہ اس مجلس میں مفتی صاحب کو لقمہ دینے والے بھی موجود ہیں۔

حضرت الاستاذ مولانا قاضی شمس الدینؒ فرمایا کرتے تھے کہ مولانا سرفراز صاحب تین چیزوں میں مجھ سے فائق ہیں۔ ایک اسماء الرجال، دوسرے فقہی جزئیات اور تیسرے ادب (اردو)۔

راقم کہتا ہے کہ اسماء الرجال تو آپ کا ایک خاص فن تھا جس میں آپ کا کوئی شریک اور سہیم مشکل ہوگا، الا ماشاء اللہ۔ اسی طرح آپ کی تصانیف شاہد ہیں کہ آپ کے برابر علمی سطح پر لکھنے والا بھی شاید ہی کوئی ہوگا۔ بقول حضرت صوفی صاحبؒ آپ کی چھوٹی سی تصنیف ''بانی دار العلوم'' ملک کے اہل قلم اور صحافیوں نے دیکھی تو دنگ رہ گئے کہ اس دور میں اس طرح لکھنے والا بھی موجود ہے۔ حضرت قاضی صاحبؒ جیسے فقیہ بھی اس بات کا اعتراف کرتے ہیں کہ فقہی جزئیات میں مولانا کا پایہ ہم سے بڑھ کر ہے۔ ہم نے فقہ کے بعض مسائل جزئیہ اپنے بڑے اساتذہ سے دریافت کیے تو فنی تقریب سے یہ بتلا دیتے کہ فلاں فلاں ابواب میں انھیں تلاش کریں، لیکن حضرت شیخ کے کیا کہنے! اس قسم کے مسائل میں آپ برجستہ کتاب، باب اور صفحات تک کی نشان دہی کر دیتے۔ ایک دفعہ آپ نے فرمایا کہ اگر حجام غیر شرعی حجامت کرنے والا ہندو ہو اور وہ دعوت کرے تو اس کی ضیافت قبول کرنی چاہیے یا نہیں؟ یہ تلاش کرو۔ راقم الحروف نے حسب استطاعت فتاویٰ، مسائل اور احکام پر لکھی جانے والی کتب کا مطالعہ کیا لیکن نہ ملا۔ تین روز کے بعد فرمایا کہ یہ جزئیہ ''تذکرۃ الرشید'' میں مل گیا ہے۔

آخری عمر میں بڑی حسرت اور افسوس کا اظہار کرتے تھے کہ جب ہم جوان تھے، رجال کی کتابیں محدود تھیں تو ان کا بارہا مطالعہ کیا۔ اب اس فن کی نادر اور نایاب کتب منظر عام پر آ رہی ہیں اور ہم بوڑھے ہو گئے اور ان کا مطالعہ مشکل ہو گیا ہے۔ علم میں آپ کی جستجو، شوق اور حرص کا اس سے اندازہ لگا لیجیے کہ فرماتے تھے کہ میں نے مختلف کتابوں میں ایک مسئلہ دریافت کرنے کے لیے شب بھر مطالعہ کیا۔ عشا کی نماز پڑھ کر بیٹھا اور صبح کی اذانیں ہو گئیں۔ حضرت شیخ نے فرمایا کہ ایسا بھی ہوا کہ ایک مسئلہ کے پیش نظر میں نے کتاب کی تلاش میں کشمیر کی پہاڑیوں میں دو دن کا پیدل سفر کیا اور بالآخر منزل تک پہنچ گئے، لیکن مالک نے کتاب دکھانے سے انکار کر دیا۔

چنیں کردند یاراں زندگانی
زکار افتادہ بشنو تا بدانی

۱۹۵۸ء میں شیخ القرآن مولانا غلام اللہ خانؒ پشاور میں ایک تقریر کے اختتام پر مسجد کی محراب میں بیٹھے ہوئے تھے کہ عبدالروف نامی ایک شخص نے گردن کے پچھلے حصے پر خنجر سے قاتلانہ وار کیا۔ بڑا گہرا زخم آیا، لیکن اللہ تعالیٰ نے آپ کو صحت یاب کیا۔ حملہ آور راول پنڈی کی معروف گدی گولڑہ کے مریدین میں سے تھا۔ اس نے یہ موقف اختیار کیا کہ میں نے گستاخ رسول پر قتل کرنا چاہا۔ عدالت میں مقدمہ دائر ہو گیا۔ شیخ القرآن ایک جانب سے مدعی اور ایک جانب سے مدعا علیہ تھے۔ بقول استاذ محترم مولانا عبدالقیوم صاحب، ملک کے اطراف سے تین سو علما پشاور پہنچ گئے۔ شیخ القرآن نے سب کا شکریہ ادا کیا اور سب کو واپس بھیج دیا، سوائے شیخ مولانا محمد سرفراز خان صفدرؒ کے، کہ آپ سب پر بھاری ہیں اور ہماری مدد کے لیے کافی ہیں۔

طالب علمی کا دور ہو یا درس و تدریس وافتا کا یا تصنیف و تالیف اور تحقیق و جستجو اور بحث و مناظرہ کا، آپ کی محنت اور مشقت کو علمی مجاہدہ سے تعبیر کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے۔ جس موضوع پر قلم اٹھایا، سیر حاصل بحث کی۔ اللہ کی کتاب، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت اور اقوال، ائمہ شراح کی آرا، متقدمین سلف اور جمہور علماے خلف کا موقف ہمیشہ آپ کے پیش نظر رہا۔ خصوصاً اکابر علماے دیوبند کے عقائد کی توجیہ و توثیق ہمیشہ آپ کا مطمح نظر رہا۔ آپ کی تحقیقات و تدقیقات کا محور یہ رہا ہے کہ جمہور علماے امت کے دائرے میں رہنا چاہیے اور اکابر کا دامن نہیں چھوڑنا چاہیے۔ فرمایا کرتے تھے کہ ہم نے جس مسئلہ پر بھی تحقیق کے گھوڑے دوڑائے، اس نتیجے پر پہنچے کہ جو بات ہمارے بزرگوں نے کہی ہے، سچ ہے اور ہماری راہنمائی کے لیے کافی ہے۔

جب آپ کے تلامذہ اور اہل علم معاصرین آپ سے بعض مسائل دریافت کرتے تو فرماتے، بحمد اللہ بڑی بڑی کتب اس فن میں موجود ہیں، آپ ان کا مطالعہ کریں اور محنت کریں۔ یہ سب مسائل آپ کو نظر آ جائیں گے۔ افسوس تو یہ ہے کہ آپ محنت کے عادی نہیں ہیں بلکہ خوش ہوتے ہیں کہ کسی کا مارا ہوا شکار بسہولت مل جائے اور محنت نہ کرنی پڑے۔

بعض علمی مسائل میں حضرت کا موقف

مولانا محمد تقی عثمانی زید مجدہم و اساتذہ دار العلوم کراچی اور مولانا مفتی رشید احمد لدھیانوی نے یہ فتویٰ دیا کہ حکومت بینک میں جمع شدہ اموال کی زکوٰۃ ان کے مالکوں کی اجازت کے بغیر منہا کر سکتی ہے، جبکہ جمہور علما نے اس کے خلاف فتویٰ دیا۔ استاد محترم مولانا مفتی محمودؒ نے صدر ضیاء الحق کے اعلان سے پہلے ۲۳ جون ۱۹۸۰ء کو ملتان میں مفتیان کرام کی میٹنگ بلائی اور اس میں بالاتفاق طے پایا کہ حکومت کو اس طرح زکوٰۃ منہا کرنے کا حق حاصل نہیں ہے۔ مولانا مفتی جمیل احمد تھانویؒ (جامعہ اشرفیہ لاہور)، مولانا مفتی عبد الستارؒ (خیر المدارس ملتان)، مولانا قاضی شمس الدینؒ (جامعہ صدیقیہ گوجرانوالہ)، مولانا عبد القدیرؒ (تعلیم القرآن راول پنڈی) وغیرہم اور حضرت الشیخ کی رائے بھی یہی تھی کہ اس طرح زکوٰۃ ادا نہیں ہوتی۔ بقول حضرت شیخ مولانا تقی عثمانی نے آپ کو لکھا کہ آپ اپنی رائے سے مطلع کریں، ہم اسے ماہنامہ البلاغ میں شائع کریں گے۔ حضرت شیخ نے اپنی رائے مع دلائل تحریر کی اور دار الافتاء مدرسہ نصرۃ العلوم میں اس کا اندراج کرایا اور انھیں بھیج دی۔ انھوں نے آپ کا نام لکھے بغیر آپ کی طویل تحریر سے چند اقتباسات ''اہل علم کے چند شبہات اور ان کا جواب'' کے عنوان سے چھاپ دیے۔ حضرت شیخ نے پھر ان کی اس تحریر کا جواب لکھا اور شکوہ کیا کہ اس میں شامی کی بعض عبارات کو حذف کر دیا گیا ہے جو موضوع سے متعلق تھیں۔ جواب الجواب کے بعد فرمایا کہ یہ لکھاری قسم کے لوگ ہیں، چھوڑو۔ (والقصۃ بطولہا)۔

اسلامی بنکاری اور ٹی وی چینل کی حالیہ بحث سے متعلق بھی آپ جمہور علما کے ساتھ تھے اور آپ نے آخری ایام میں اس پر دستخط فرما دیے تھے۔

آپ کو اپنے سہو اور غلطی کا اعتراف کرنے میں ذرا بھی باک نہ تھا اور فخریہ اس بات کا اظہار کرتے کہ میں نے اپنی غلطی کے تسلیم کرنے میں اپنے جیسا کوئی نہیں دیکھا اور میں اس پر خوشی محسوس کرتا ہوں۔ ۱۹۵۷ء میں دورۂ حدیث کے سال راقم الحروف نے پوچھا کہ آپ کی کتاب ''احسن الکلام'' کے جواب میں مولانا محمد گوندلویؒ نے ''خیر الکلام'' تحریر کی، اس میں کچھ حقیقت ہے؟ آپ نے فرمایا کہ رجال کے مسئلے میں مجھ سے ایک جگہ غلطی ہوئی۔ مولانا حبیب الرحمٰن اعظمی نے اس کی نشان دہی کی اور مولانا محمد گوندلویؒ نے اسے نوٹ کر لیا۔ ایک ایسی غلطی جس کی دوست بھی نشان دہی کرے اور مخالف بھی، اسے

تسلیم کر لینا چاہیے۔ آئندہ ایڈیشن میں سب سے پہلے اعتراف اور معذرت کے ساتھ اسے شائع کروں گا۔

مسائل فقہیہ میں آپ اپنے استاذ مولانا مفتی عبد الواحد صاحب پر اعتماد کیا کرتے تھے۔ مفتی صاحب کے دو مسئلے معروف تھے۔ ایک یہ کہ اذان جمعہ کے بعد اور جمعہ کی نماز سے قبل نکاح پڑھایا جائے تو وہ منعقد نہیں ہوتا، اور دوسرا یہ کہ اگر نکاح خواں نکاح کے الفاظ میں صیغہ استفہام استعمال کرے تو اسے ایجاب نہیں کہتے۔ جب ایجاب نہ ہوا تو قبول بھی نہیں ہوگا۔ حضرت شیخ اپنے استاد کے ان دو مسئلوں پر مصر تھے اور پہلے مسئلہ کی دلیل میں احکام القرآن للتھانوی میں مذکورہ ابن العربی مالکیؒ کا حوالہ پیش کرتے تھے۔ حضرت صوفی صاحبؒ نے فرمایا کہ اس مسئلہ میں حضرت استاد متفرد ہیں، اس سلسلے میں ایک تحقیقی مجلس ہونی چاہیے۔ مجھ سے کہا کہ آپ استاد صاحب سے بحث کریں۔ میں نے کہا کہ میری کیا مجال ہے، آپ میری مدد کریں تو اور بات ہے۔ پھر ایک مجلس میں، میں نے حضرت صوفی صاحب کی معیت میں عرض کیا کہ نص میں جس چیز کی منع ہے یعنی بیع کی، علمائے حنفیہ نے لکھا ہے کہ اگر اذان جمعہ کے بعد بیع ہو تو اگرچہ اس میں حرمت لغیرہ پائی جاتی ہے لیکن اس کے باوجود بیع کا انعقاد ہو جاتا ہے تو نکاح کا انعقاد کیسے نہیں ہوگا؟ آپ نے فرمایا کہ زجر اور توبیخ کے طور پر ایسا کرتے ہیں، کیونکہ عموماً دیکھا گیا ہے کہ لوگ نکاح کے بعد چلے جاتے ہیں اور کھانے پینے میں مصروف ہو کر جمعہ کی نماز سے محروم رہ جاتے ہیں۔ دوسرے مسئلے کے متعلق میں نے عرض کیا کہ امام ابن ہمامؒ نے لکھا ہے کہ اگر نکاح کی مجلس ہو تو اس میں استفہام بھی ایجاب کا کام دیتا ہے اور قبول اس کو لاحق ہوتا ہے۔ آپ نے بغور عبارت کا مطالعہ فرمایا اور کہا کہ ٹھیک ہے۔

حسن اخلاق

آپ پر جمال غالب تھا، بلکہ آپ حسن اخلاق کا مجسمہ تھے۔ خواص تو خواص، عوام کی بعض بے جا باتوں پر بھی خوش اسلوبی سے پیش آتے تھے۔ راقم الحروف نے آپ کے ساتھ کئی سفر کیے ہیں۔ آپ سفر میں بھی اپنے رفیق سے خدمت لینے کے روادار نہیں تھے۔ ۱۹۶۷ء میں آپ مدرسہ قاسم العلوم ڈیرہ غازی خان کے جلسے میں تشریف لائے۔ اس کے بعد آپ نے راجن پور جانا تھا اور کتابوں کا ایک بھاری بیگ سفر میں اٹھائے ہوئے تھے۔ میں نے عرض کیا کہ میں سفر میں آپ کے ساتھ ہو جاتا ہوں۔ فرمایا کوئی مشکل نہیں، آپ مجھے اپنے گھر (لتڑی جنوبی) کا اسٹاپ بتلا دیں، میں پہنچ جاؤں گا۔ چنانچہ آپ دوسرے دن پہنچ گئے۔

بسا اوقات مستفتی حضرات استفتا کے فوری جواب کی فرمایش کرتے اور میں عذر کرتا تو بڑے پیار سے فرماتے کہ تھوڑی سی فرصت نکال کر جواب لکھ دیں۔ خود حضرت شیخ کا بھی یہی رویہ تھا۔ درس حدیث ہو رہا ہوتا اور درمیان میں کوئی دم کرانے یا تعویذ لکھوانے آ جاتا تو اسی وقت اس کی فرمایش پوری کر دیتے۔ حاضرین درس حیران ہوتے اور تعجب کرتے۔ اللہ کی مخلوق کے ساتھ شفقت کی وجہ سے حضرت شیخ ایسا کیا کرتے تھے۔

ایک دفعہ میں آپ کے ساتھ سفر کر رہا تھا۔ بس ایک اسٹاپ پر رکی تو زیادہ تر سواریاں اتر گئیں۔ ایک نوجوان ہمارے آگے سگریٹ کے کش لگا رہا تھا اور اس کے دھویں کا رخ سیدھا حضرت شیخ کی طرف تھا۔ میں اٹھا اور اس کے قریب جا کر آہستہ سے کہا کہ پیچھے بزرگ بیٹھے ہوئے ہیں، آپ احتیاط کریں۔ حضرت کو معلوم ہوا تو فرمایا، عزیز مجھے کوئی تکلیف نہیں ہو رہی، پریشان نہ ہوں۔

ڈیرہ غازی خان کے جلسہ میں تشریف لائے تو سالن میں مرچ بہت زیادہ تھی جو موافق طبع نہ تھی۔ میں نے عرض کیا میزبان کو اطلاع دوں تو فرمایا، نہیں۔ وہی چاول تناول فرمائے۔ جس جگہ رات کو آرام کرنا تھا، وہاں مولانا مولانا محمد شریف جہاول پوری مبلغ ختم نبوت سو رہے تھے اور بڑے خراٹے لے رہے تھے۔ آرام کرنا دشوار تھا۔ آپ رات دو بجے تک بے خوابی میں رہے، پھر ان کو اٹھایا اور کہا کہ مولانا، آپ تہجد پڑھیں اور مجھے ذرا سونے دیں۔ مولانا نے کہا کہ حضرت، آپ مجھے پہلے اٹھا دیتے، آپ نے میرے لیے اتنی تکلیف کیوں گوارا کی؟

جب حضرت میرے گھر (لتڑی جنوبی) تشریف لائے تو میں نے مرغ کے سالن میں سرخ مرچ کے بجائے سیاہ مرچ ڈالنے کو کہا، لیکن جب کھانا پیش کیا تو فرمایا کہ سیاہ مرچ عارضہ قلب کے لیے زیادہ مضر ہے۔ ایک لقمہ بھی نہ لیا۔ بخاری شریف میں آب زمزم کا ذکر آتا تو فرماتے کہ میں مفتی محمد عیسیٰ صاحب کے وطن گیا تو وہاں ایک ہی جگہ تین قسم کے پانی دیکھے۔ وضو کے لیے الگ، پینے کے لیے الگ اور چائے اور سالن کے لیے الگ۔

حضرت شیخ نے بتلایا کہ دار العلوم دیو بند کے صد سالہ جشن میں حضرت مولانا حبیب الرحمٰن اعظمی کی مجلس میں، میں دو زانو ہو کر بیٹھ گیا، کیونکہ وہ مجھ سے سولہ سال بڑے تھے۔ انھوں نے فرمایا کہ مجھے معلوم ہے کہ آپ بیمار ہیں، بے تکلف ہو کر بیٹھیں۔ یہ تھا بزرگوں کے ساتھ آپ کا تادب۔

احتیاط اور وقت کی پابندی

مدرسہ کے نظام الاوقات کی پابندی حضرت کا شیوہ تھا۔ ریلوے پاس بنوایا ہوا تھا۔ علی الصبح وقت سے پہلے تشریف لاتے۔ آپ کے آنے سے طلبہ جاگ اٹھتے۔ حضرت نے مجھ سے بات کرنی ہوتی اور دروازہ بند ہوتا تو کھٹکھٹاتے، کبھی دھکے سے دروازہ نہیں کھولا۔ جنرل حاضری ہوتی تو سب کا نام خود پکارتے اور حاضری لگاتے۔ احادیث کی عبارت میں سخت گرفت ہوتی۔ فرماتے کہ حافظ ابن حجر عسقلانیؒ نے کہا ہے کہ احادیث کی عبارت میں تساہل اور بے احتیاطی من کذب علی کی وعید کی مد میں آتی ہے۔ ابو داؤد شریف کی عبارت راقم الحروف کے ذمہ تھی۔ ایک صاحب نے کہا کہ کل میں عبارت پڑھوں گا۔ جب موقع آیا تو وہ صاحب سر جھکا کر بیٹھ گئے۔ حضرت شیخ نے فرمایا، پڑھو بھئی۔ میں نے پڑھنا شروع کیا۔ چونکہ مطالعہ نہیں کیا تھا تو حضرت نے ٹوکا کہ کیا بات ہے مولوی صاحب! آج آپ اندھیرے میں چل رہے ہیں! میں نے عرض کیا کہ مطالعہ نہیں تھا۔ فرمایا، عبارت ضرور پڑھنی تھی؟

ابو داؤد شریف کی تکمیل پر آپ نے ایک روپیہ عنایت فرمایا۔ طلبہ نے کہا کہ بخاری شریف کی تکمیل پر قاضی شمس الدین صاحب نے پانچ روپے دیے ہیں۔ حضرت نے فرمایا کہ قاضی صاحب آزاد سوپ فیکٹری کے مالک ہیں اور میں تو یتیم ہوں۔ آپ کے والد گرامی آپ کے بچپن میں فوت ہو گئے تھے، اس لیے آپ اس جملے کو اکثر دہرایا کرتے تھے۔

ایک دفعہ حضرت استاد مفتی محمود صاحبؒ دار الافتاء میں بیٹھے خیریت پوچھ رہے تھے کہ اتنے میں حضرت شیخ آ گئے اور میرے بارے میں کہا کہ یہ آپ کی طرح ناغے بہت کرتے ہیں۔ مفتی صاحب کو غصہ آ گیا اور فرمایا: ''آپ کی طرح'' کا کیا مطلب؟ حضرت شیخ نے فرمایا، آج ۱۷ جمادی الاولیٰ ہے۔ ۱۸ شوال سے اسباق شروع ہوتے ہیں۔ ریکارڈ موجود ہے۔ میرا ایک ناغہ بھی نہیں۔ میں نے آہستہ سے کہا، ادھر گھر ہے اور ادھر مدرسہ ہے۔ مفتی صاحب نے سن لیا تو کہا کہ کبھی آپ

نے گھر سے بھی ناغہ کیا ہے؟

اساتذہ اور طلبہ کے ناغہ کرنے پر بہت خفا ہوتے۔ فرماتے کہ مدرسہ کی تنخواہ بظاہر کسب معاش ہے، اسے حلال کرنا چاہیے۔ ایسا بھی ہوا کہ جب آپ حج سے فارغ ہو گئے تو جلد واپس آ کر مدرسہ میں حاضر ہونے کی کوشش کی۔ عام لوگ چونکہ اس بات کی اہمیت کو نہیں سمجھتے تو رفقائے سفر نے محسوس کیا کہ آپ ہمیں چھوڑ کر جا رہے ہیں۔

ہر سال بخاری شریف کے اختتام پر طلبہ تواضع اور ضیافت کا اہتمام کرتے تو حضرت شیخ بھی اس میں اچھا خاصا حصہ ڈالتے۔ جب حضرت کو معلوم ہوا کہ طلبہ مدرسہ میں کام کرنے والے مزدوروں اور شہریوں سے بھی پیسے لیتے ہیں تو سخت ناراض ہوئے اور ہمیشہ کے لیے ضیافت پر پابندی لگا دی اور فرمایا، آئندہ جو اس کا اہتمام کرے گا، میں اس کے لیے بددعا کروں گا۔

ایک دفعہ فرمایا کہ بینک کے ملازم ہمسایہ ہوں اور وہ طعام یا غیر طعام کی شکل میں کچھ ہدیہ کریں تو کیا کرنا چاہیے؟ میں نے عرض کی کہ ان سے لے کر کسی مضطر اور عام شخص کو دے دیتا ہوں۔ فرمایا کہ میں بھی ایسا ہی کرتا ہوں۔

فرمایا کرتے تھے کہ مجھے متضاد بیماریوں کا عارضہ لاحق ہے۔ ایک کے علاج سے دوسری بیماری متاثر ہوتی ہے۔ ان میں سے ایک ضیق النفس کی تکلیف ہے۔ میں نے کہا کہ مجھے بھی یہ تکلیف تھی، ذکر سلطان الاذکار سے یہ رفع ہو گئی۔ فرمایا کہ پاس انفاس بھی کیا اور تکلیف رفع نہ ہوئی۔

فرمایا کہ اسباب رزق میں سب سے اعلیٰ اور افضل مال غنیمت ہے جو جہاد فی سبیل اللہ اور اعلائے کلمۃ اللہ کے واسطے سے حاصل ہوتا ہے، پھر تجارت جسے اللہ کا فضل کہا گیا ہے، پھر صناعت وحرفت جو حضرت داؤد اور حضرت نوح علیہما السلام کو عطا کی گئی اور پھر محنت مزدوری اور کھیتی باڑی وغیرہ۔

۱۹۵۷ء میں ابوداؤد شریف کے درس میں، میں نے عرض کیا کہ اس وقت جہاد کہیں نہیں ہو رہا۔ فرمایا، آپ علم جہاد بلند کریں، میں آپ کا پہلا فوجی ہوں گا۔

آپ تمام بزرگوں سے حسن عقیدت رکھتے تھے اور ان کا بڑے ادب واحترام سے تذکرہ کرتے بلکہ اپنے معاصر اور کم عمر اہل علم کو بھی اچھے الفاظ میں یاد کرتے تھے۔ میں نے عرض کیا کہ اہل علم کا ایک طبقہ مولانا ابوالکلام آزاد کو اچھا نہیں سمجھتا اور انھیں برے القاب سے یاد کرتا ہے۔ آپ نے فرمایا کہ حضرت شیخ مدنی کے درس میں ایک طالب علم نے رقعہ لکھا اور اس میں مولانا ابوالکلام آزاد کو برا بھلا کہا۔ آپ نے رقعہ پڑھتے ہی عینک اتار دی اور متوجہ ہو کر فرمایا کہ یہ کس گدھے نے لکھا ہے؟ ہمارے استاد (شیخ الہند مولانا محمود حسنؒ) تحریک آزادی میں ان کی خدمات کو سراہتے اور تعریف کیا کرتے تھے۔

حضرت شیخ تعویذ گنڈے کے کاروبار کو اچھا نہیں سمجھتے تھے اور آپ نے کبھی طلب کر کے تعویذ کی اجرت نہیں لی۔

آخری عمر میں علاج کی غرض سے اور احباب کے اصرار پر برطانیہ کا سفر کیا۔ وہاں مختلف شہروں میں آپ کے بیانات ہوئے۔ ایک جگہ ایک صاحب نے یہ کہہ کر کہ آپ کا ایک بڑا مدرسہ ہے، لوگوں سے تعاون کی اپیل کی۔ آپ نے فرمایا، میں علاج کی غرض سے آیا ہوں، مدرسے کے لیے نہیں آیا۔ ان پروگراموں میں سے کسی کا کوئی معاوضہ قبول نہیں کیا۔ فرماتے ہیں کہ ایک دفعہ میں اپنی قیام گاہ پر پہنچا تو دیکھا کہ باہر والی جیب میں پندرہ بیس پاؤنڈ پڑے ہیں۔ سفر سے واپسی پر آپ نے اپنی جیب سے ٹکٹ خریدا اور احباب کو منع کر دیا۔

برطانیہ کے اسی سفر میں ایک ڈاکٹر صاحب نے آپ کے دل کا معاینہ کیا اور کہا کہ یہ لاعلاج ہے۔ آپ فرماتے ہیں کہ میں اس کی بات سن کر ہنس پڑا۔ وہ متعجب ہوئے تو میں نے کہا کہ اللہ تعالیٰ نے میرے لیے جو دن مقرر کیے ہیں، وہ پورے کر رہیں گے۔ آپ علاج معالجے میں طب یونانی کی دواؤں کو ترجیح دیتے تھے اور اپنے لیے مفید معجون تیار کر لیتے تھے۔ آخری چند سالوں میں آپ صاحب فراش ہو گئے اور ڈاکٹروں کے ہاتھ آ کر لاچار ہو گئے۔

حضرت شیخ فرماتے تھے کہ مدارس کی رسمی تعلیم سے فراغت کے بعد مجھے خیال آیا کہ میں مولوی فاضل کر لوں۔ ابھی ارادہ ہی تھا کہ ہمارے استاذ حضرت مولانا عبد القدیر صاحب کیمل پوری کو اس بات کا علم ہو گیا۔ انھوں نے فرمایا کہ ہم تو آپ سے بڑی توقعات وابستہ کیے ہوئے ہیں کہ اللہ تعالیٰ آپ سے بڑا کام لے گا۔ حضرت استاذ کے کہنے سے میرا ارادہ بدل گیا۔

تلامذہ کی حوصلہ افزائی اور اکرام

ہم استاد محترم مولانا مفتی محمود صاحبؒ کی وفات سے قبل سے سنتے آ رہے تھے کہ اب یہ بوجھ نوجوانوں کے سر پر آ پڑا ہے، اس لیے حضرت مفتی صاحب اور حضرت شیخ کو ہم نے دیکھا کہ چھوٹے سے لے کر بڑے تک شاگردوں کی حوصلہ افزائی فرماتے تھے اور اعزاز واکرام فرماتے۔ عموماً ان دونوں بزرگوں کی علمی مجالس میں یہ دیکھنے میں آیا کہ مسائل اور مباحث میں اپنے تلامذہ کو اتنی وسعت دیتے کہ استاد اور شاگرد کا مناظرہ شروع ہو جاتا اور گفتگو طوالت اختیار کر جاتی۔ مجال ہے کہ بحث میں استادی اور شاگردی کا تاثر پیدا ہو اور استاد اپنی استادی کو جتلاتے ہوئے کلام کا خاتمہ کرنے کی کوشش کرے۔

۱۹۶۷ء میں ہماری قوم میں ایک تنازع پیدا ہوا تو استاد محترم مولانا مفتی محمود صاحبؒ نے راقم الحروف اور میرے چچازاد محترم مولانا قادر داد صاحب کو فیصل بنایا۔ ہم نے کہا کہ ہم چھوٹے ہیں تو فرمایا کہ اللہ تعالیٰ آپ کو بڑا بنائے گا۔ اسی طرح حضرت شیخ ایک دفعہ صبح کے وقت دار الافتاء میں تشریف لائے اور فرمایا کہ آپ کے ہاں ایک مقدمہ میں میری گواہی ہے۔ جب فریقین حاضر ہوں تو مجھے بلا لینا۔ سماعت شروع ہوئی اور حضرت تشریف لائے تو میں اپنی جگہ سے اٹھنے لگا۔ فرمایا، آج آپ نے فیصلہ کرنا ہے، آپ قاضی ہیں، اپنی جگہ پر بیٹھیں۔ میں نے بیان سن کر کہا کہ حضرت، آپ گواہ نہیں بلکہ فریق ہیں۔ فرمایا کہ آپ مقدمہ کی شرعی کارروائی پوری کریں۔ مدعا علیہ نے قسم اٹھا لی اور مبلغ اٹھارہ سو روپے آپ کو ادا کرنا پڑے۔ مجلس برخاست ہوئی اور حضرت شیخ صوفی صاحب کے ہاں تشریف لے گئے۔ انھوں نے پوچھا کہ کیا ہوا؟ آپ نے فرمایا کہ باقی سب دبلے پتلے تھے، مفتی صاحب نے دیکھا کہ یہ موٹا ہے، اس لیے پھندا میرے گلے میں ڈال دیا۔ صوفی صاحب نے فرمایا کہ فیصلہ کیسا ہوا؟ آپ نے فرمایا کہ شرع کے مطابق صحیح فیصلہ ہوا ہے۔ ایک اور موقع پر ایک صاحب آئے اور کہا کہ میرا اپنے والد سے مالی تنازع ہے، آپ فیصلہ کریں۔ آپ نے فرمایا کہ مفتی صاحب کے پاس چلے جاؤ، وہ انصاف پر مبنی صحیح فیصلہ کرتے ہیں۔ میں ان کا استاد ہوں، لیکن وہ فیصلے میں کسی کی رعایت نہیں کرتے۔

ایک دفعہ رؤیت ہلال رمضان وعید کے مسئلے میں کراچی کے بعض علما نے انفرایت اختیار کی۔ بندہ نے حضرت شیخ کو ان علما کے عندیہ سے مطلع کیا تو حضرت نے ان سے اختلاف کرتے ہوئے مجھے ایک مفصل مکتوب لکھا اور فرمایا ”آپ بفضلہ تعالیٰ ذمہ دار، صاحب رائے اور افتا کے مجاز ہیں۔ اگر آپ کے نزدیک صحیح ہے تو راقم اثیم کو کوئی اعتراض نہیں ہے۔ آپ اپنے افتا میں نہ صرف معذور بلکہ ماجور ہوں گے، لیکن راقم اثیم اپنے آپ کو تائید کرنے پر آمادہ نہیں پاتا۔“ حضرت استاد

صوفی صاحبؒ نے حضرت شیخ کا مکتوب پڑھا تو مجھے کہا کہ شیخ نے تو آپ کو بڑا مقام دیا ہے۔ میں نے کہا کہ میں تو کچھ بھی نہیں ہوں، یہ تو اللہ تعالیٰ کا احسان اور حضرت کی دعا ہے۔

وقار اور بردباری

آپ وقار کے ایسے پیکر تھے جن کی ساری زندگی میں نہ کوئی قول عبث ہے اور نہ کوئی فعل عبث۔ خود بھی باوقار اور دوسروں کو بھی باوقار دیکھنا چاہتے تھے۔ نہایت خوش لباس اور سادہ طبیعت، لیکن باقرینہ اور قرینہ بھی ایسا کہ اس میں شریعت کا عنصر غالب ہو۔ گویا ہر ادا سے سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا درس دہرایا جا رہا ہے اور اذا راوا ذکر اللہ کی یاد تازہ ہو رہی ہے۔ بلا مبالغہ آپ بردباری اور تحمل کے پہاڑ تھے۔ کبھی ایسا ویسا طیش دیکھنے میں نہیں ایا۔ بتقاضاے بشریت طبیعت میں ناراضگی اور غصہ تھا، لیکن برداشت اتنی کہ مجال ہے کہ ایک لفظ بھی بے محل زبان سے صادر ہو یا خلاف طبع کوئی بات دیکھ کر کسی کی تنقیص یا توہین سرزد ہو۔ بفضلہ تعالیٰ راقم الحروف نے کبار اساتذہ سے پڑھا ہے، لیکن جو حکم اور برداشت حضرت شیخ میں دیکھنے میں آیا، وہ آپ ہی کی خصوصیت اور عطاے الٰہی ہے۔ عین شباب میں بھی ہم جیسے ناچیز شاگردوں پر کسی بات پر بہت سخت غصہ آتا تو اس کا اظہار یوں ہوتا کہ ''اچھا مولوی صاحب، جو آپ کا دل چاہے۔''

قاری شیر محمد سیانوالی مولانا عبد القدوس خان قارن کے ہم سبق تھے۔ ان کے پاؤں کی ٹھوکر سے قارن صاحب گر پڑے اور بے ہوش ہو گئے۔ اتنے میں حضرت شیخ تشریف لائے۔ طلبہ قارن صاحب کو پانی پلا رہے تھے۔ آپ نے انھیں دم کیا۔ قاری شیر محمد کو بلایا گیا۔ میں نے دیکھا کہ ان کے کندھے کانپ رہے تھے جس سے مجھے ترفص کتفاھما کی حدیث یاد آ گئی۔ آپ نے شیر محمد کی طرف رخ کیے بغیر نرم لہجے میں پوچھا کہ شیر محمد! کی اہوا؟ اس سے زیادہ آپ نے اسے کچھ نہیں کیا۔ متعلقین سے، نہ ملنے اور خط نہ لکھنے پر یاددہانی کی عادت نہیں تھی اور نہ ماضی کا شکوہ۔ احباب سے چھوٹی چھوٹی باتوں پر گرفت نہ فرماتے۔

سخاوت وضیافت

آپ کا دستر خوان وسیع تھا۔ بلا امتیاز خورد وکلاں سب اس سے فیض یاب ہوتے تھے۔ کوئی مہمان، خواہ اپنا ہو یا پرایا، واقف یا ناواقف، عالم یا ان پڑھ، آپ کی محبت بھری ضیافت سے محروم نہیں رہتا تھا۔ حسب حال مشروب اور کھانے کے وقت کھانا گھر میں تیار ملتا تھا۔ جب تک حضرت شیخ بصحت رہے اور آپ کی اہلیہ حیات رہیں، حضرت کے ہاں مہمانوں کے لیے بازار سے کھانا منگوانے کا رواج نہ تھا۔ آپ کا دستر خوان حضرت مدنی کے دستر خوان کی یاد دلاتا تھا۔ مجھے یاد نہیں کہ گوناگوں بیماریوں کے باوجود حضرت شیخ نے خاص احتیاط کرنے کا اہتمام کیا ہو۔ ایوبی دور میں گندم کی قلت کے پیش نظر مکئی کی روٹی اور چاول پکانے کا اہتمام ہوتا تھا۔ راقم الحروف آپ کا مہمان تھا تو آپ سے دریافت کیا گیا کہ کیا تیار کریں؟ فرمایا، چاول۔ میں نہ سمجھ سکا۔ میں نے کہا کہ میرے لیے روٹی ہونی چاہیے۔ آپ نے فرمایا کہ مولانا کے لیے روٹی پکالو۔ میں پھر سمجھا اور کہا کہ میں چاول ہی کھاؤں گا۔

۱۹۵۷ء میں دورۂ حدیث سے فراغت کے سال جب سالانہ امتحان اختتام کو پہنچا تو میں نے چاہا کہ حضرت کی زیارت سے مشرف ہو کر گھر چلا جاؤں۔ برسات کا موسم تھا۔ حضرت کسی کی حویلی میں عارضی طور پر رہائش پذیر تھے۔ میں نے دستک دی تو آپ تشریف لائے اور مجھے بڑی حویلی کے ایک کمرے میں بٹھایا۔ ایک گھنٹے بعد تشریف لائے۔ آنکھوں میں پانی تھا۔ فرمایا، خشک لکڑیاں نہیں تھیں، گیلی لکڑیوں کو پھونکتا رہا، اس لیے چائے بنانے میں دیر ہو گئی۔ مجھے بہت ندامت ہوئی کہ کاش، میں شیخ سے ملنے نہ جاتا۔

حضرت شیخ اپنے ہاں آنے والے مہمانوں کی ہر طرح تواضع اور مدارات فرماتے، لیکن کسی کا مہمان بن کر ساری باتیں بھول جاتے اور طرح طرح کی بیماریوں کے باوجود خوراک میں احتیاط اور پرہیز کی حد تک بھی اظہار کے روادار نہ ہوتے۔ البتہ احتیاط اور پرہیز ترک نہیں کرتے تھے اور متبادل کے طور پر اپنے آپ کو فاقہ اور برداشت کا عادی بنا لیا تھا۔ ایک دفعہ میں آپ کے ساتھ کار میں بیٹھا تھا تو کسی صاحب نے بتایا کہ سامنے کی بڑی کوٹھی ایک کمہار کی ہے۔ آپ نے ظرافتاً فرمایا کہ اگر مہمان اور بیماریاں نہ ہوتیں تو ہماری اس سے بھی بڑی کوٹھی ہوتی۔ ایک دفعہ بعض اہل علم طبقات کا ذکر کرتے ہوئے تعجب سے فرمایا کہ بزدلی، بخل، تکبر، ریاکاری جیسی خصلتیں سب ان میں پائی جاتی ہیں۔

حضرت کے بچوں کے نکاح کے موقع پر قارن صاحب مجھے دعوت دینا بھول گئے، جبکہ مدرسے کے طلبہ اور دیگر اساتذہ دعوت پر چلے گئے۔ حضرت شیخ ہر ایک سے پوچھتے کہ مفتی صاحب نہیں آئے؟ دوسرے دن مجھ سے حضرت صوفی صاحب نے کہا کہ آپ حضرت استاد کی دعوت پر نہیں آئے۔ میں نے عذر کیا کہ مجھے دعوت نہیں دی گئی تو فرمایا کہ حضرت استاذ صاحب نے آپ کو بہت یاد کیا۔ آخر میں فرمایا کہ استاد شاگرد کا تعلق تھا، آپ بغیر دعوت کے چلے آتے تو استاد صاحب بہت خوش ہوتے۔ جب حضرت استاد صاحب سے سامنا ہوا تو فرمایا کہ آپ کیوں نہیں آئے؟ (ادھر قارن صاحب ہاتھ جوڑ رہے تھے کہ میرے متعلق کچھ نہ کہنا)۔ میں نے جواباً عرض کیا کہ مجھے کسی نے دعوت نہیں دی۔ پیچھے متوجہ ہوئے اور کہا، اوئے بھوتنی دے آ! پھر فرمایا، مفتی صاحب کی مستقل دعوت کریں گے۔ اسی طرح شادی کے ایک اور موقع پر قارن صاحب نے مجھے کہا کہ آپ کی وجہ سے ہم نے فارمی مرغی کے بجائے بکرے خریدے ہیں، اس قدر اضافی رقم آپ کے ذمے ہے۔

تعبیر رؤیا

حضرت شیخ کی خصوصیات میں سے ایک تعبیر رؤیا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کو تعبیر میں خاص ملکہ عطا فرمایا تھا۔ وہ اپنے وقت کے گویا محمد بن سیرینؒ تھے۔ ادھر تعبیر بتلائی، ادھر پوری ہوئی۔ مولانا زاہد الراشدی دام مجدہ نے بتایا کہ میں نے بھٹو دور میں ایک خواب میں دیکھا کہ گوجرانوالہ کا گھنٹہ گھر گر گیا ہے۔ آپ نے فرمایا کہ خدا خیر کرے، ملک کے گھنٹہ گھر صدر بھٹو ہیں، جمعیت علماے اسلام کے گھنٹہ گھر مفتی محمود ہیں اور ہمارے شہر کے گھنٹہ گھر ہمارے استاد مفتی عبد الواحد صاحبؒ۔ (عام طور پر سیاست کے تذکرے میں حضرت شیخ کا یہ معروف جملہ تھا کہ مفتی محمود ہماری ناک ہے، یعنی اس وقت تمام علما کی عزت کی علامت اور نشان)۔ چنانچہ بالترتیب ان حضرات کی وفات کا سانحہ پیش آیا۔

استاد محترم مولانا عبد القیوم ہزاروی نے بتایا کہ میں نے خواب دیکھا کہ تحریک ختم نبوت کے دوران امیر شریعت مولانا سید عطاء اللہ شاہ بخاری کا جنازہ اٹھا رہا ہوں۔ حضرت شیخ نے فرمایا کہ جیل جانے کی تیاری کر لو۔ اسی دن مولانا جیل چلے گئے۔

جب آپ زیادہ مصروف ہوتے اور کوئی خواب کی تعبیر پوچھتا تو فرماتے، مفتی صاحب سے پوچھ لو۔ تعبیر کے ساتھ تدبیر

بھی تجویز فرماتے، مثلاً ورد یا علاج بتاتے جس سے تسلی ہو جاتی۔ اگر کوئی لکھ کر تعبیر پوچھتا تو اسی کاغذ پر جواب تحریر کر دیتے۔

ایک دفعہ راقم الحروف نے خواب میں دیکھا کہ بہت زیادہ بارش ہوئی ہے اور میں شیرانوالہ باغ سے مجاہد پورہ جانے کے لیے ریلوے کی پٹڑی پر جا رہا ہوں۔ استاذ قاضی شمس الدین صاحبؒ کے گھر کے قریب پہنچا تو دیکھا کہ عجیب سماں ہے۔ حضرت شیخ بطور مزدور تغاری میں اینٹ گارا لا رہے ہیں اور حضرت قاضی صاحب اونچی دیوار پر بطور معمار کمرہ تعمیر کر رہے ہیں۔ میں شیخ کے پاس گیا اور کہا کہ تغاری میں اٹھاؤں گا۔ آپ نے فرمایا کہ آپ کا کام نہیں۔ اتنے میں آنکھ کھل گئی۔ میں سوچتا رہا کہ مکان تعمیر کرنے کے لیے اور لوگ کم ہیں کہ یہ دو بزرگ یہ کام کر رہے ہیں۔ ذہن میں یہ آیا کہ اس سے مراد دین کی تعمیر اور آبیاری ہے اور اللہ نے اس کام کے لیے بالخصوص ان بزرگوں کو قبول کر لیا ہے۔ یہ خواب حضرت شیخ سے ذکر کیا تو آپ خاموش رہے۔

حضرت مولانا قاضی شمس الدینؒ اور حضرت شیخ کا ربط و تعلق

حضرت الاستاذ مولانا قاضی شمس الدینؒ اور حضرت شیخ کا گہرا ربط اور تعلق تھا۔ قاضی صاحب حضرت شیخ کے جامع العلوم ہونے کے قائل تھے اور حضرت شیخ بھی ان کے علمی مقام کو تسلیم کرتے تھے۔ میں نے اکثر دیکھا کہ حضرت شیخ قاضی صاحب کے سامنے متادب اور خاموش رہتے۔ ایک دفعہ مجاہد پورہ میں نکاح کی تقریب میں شیخ مدعو تھے اور حضرت قاضی صاحب بھی موجود تھے۔ قاضی صاحب نے کہا کہ مولانا، آپ نکاح پڑھائیں۔ حضرت شیخ نے فرمایا کہ سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کہ آپ کی موجودگی میں نکاح پڑھاؤں۔ آپس کی علمی نوک جھوک میں ہر ایک بزرگ نے دوسرے کے مقام و مرتبہ کو ملحوظ رکھا۔ جب میں حضرت قاضی صاحب کی خدمت میں حاضر ہوتا تو آپ حضرت شیخ اور حضرت صوفی صاحب کی خیریت دریافت کرتے اور فرماتے، میری طرف سے ان کو سلام پیش کرنا اور دعاؤں کی درخواست کرنا۔

حضرت قاضی صاحبؒ نے غالباً اپنے درس میں کچھ اختلافی باتیں بیان کیں اور انھیں ''الشہاب الثاقب'' کے نام سے چھاپ دیا۔ حضرت شیخ نے ''الشہاب المبین'' کے نام سے اس کا جواب تحریر کیا۔ حضرت صوفی صاحب نے مجھ سے پوچھا کہ آپ نے ان دونوں رسالوں کا مطالعہ کیا ہے؟ میں نے کہا کہ جی، مطالعہ کیا ہے۔ فرمایا کہ ان میں کیا پایا؟ میں نے کہا کہ میں کیا کہہ سکتا ہوں؟ دونوں میرے شیخ ہیں۔ لیکن صوفی صاحب نے اصرار کیا کہ بتائیں۔ میں نے کہا کہ دونوں شیوخ گرئ کلام کا شکار ہو گئے۔ قاضی صاحب نے کہا کہ مسئلہ تو فروعی ہے لیکن اگر مولوی صاحب چاہیں تو میں ان سے مباہلہ کرنے کو تیار ہوں، اور حضرت شیخ نے ایک بات پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا کہ یہ قاضی صاحب کا ''جہل مرکب'' ہے۔ میں نے کہا کہ تعجب ہے کہ مسئلہ تو فروعی ہے اور پھر مباہلہ! ادھر شیخ نے قاضی صاحب کے بارے میں اتنی بڑی بات کہی کہ کسی طرح آپ کے شایان شان نہیں ہے۔ اس پر صوفی صاحب نے فرمایا کہ آپ اپنے استاد قاضی صاحب کی رعایت کرتے ہیں۔ میں نے کہا کہ یہ تو خدا تعالیٰ جانتا ہے۔ آپ نے اصرار کیا ہے تو میں نے بتا دیا ہے۔

ایک ہفتے کے بعد میں حضرت استاد قاضی صاحب کی خدمت میں حاضر ہوا۔ آپ نے یہی سوال کیا تو میں نے کہا کہ میں آپ کو وہ جواب سناؤں جو میں نے صوفی صاحب کو دیا ہے؟ پھر میں نے من وعن وہی جواب سنا دیا۔ قاضی صاحب ہنس پڑے۔ میں نے مزید کہا کہ آپ کے رسالے کی نہ کوئی زبان ہے اور نہ بیان۔ ایسا لگتا ہے جیسے کسی نے آپ کی املائی تقریر کو

مرتب کیا ہے۔ قاضی صاحب نے اپنے سامنے رکھی ہوئی ایک فائل کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا کہ میں نے مولانا کے رسالے کا جواب لکھ دیا ہے۔ میں نے عرض کیا کہ ہم چاہتے ہیں کہ یہ مسئلہ آپ دونوں بزرگوں کی زندگی میں طے ہو جائے اور اگر آپ نے جواب لکھا ہے تو حضرت شیخ بھی آپ کے رسالے کا جواب تحریر کریں گے اور معاملہ بڑھ جائے گا۔ قاضی صاحب نے فرمایا کہ آپ کی کیا رائے ہے کہ یہ رسالہ طبع نہ ہو؟ میں نے کہا کہ جی ہاں۔ فرمایا، نہیں طبع ہوگا اور آج تک طبع نہیں ہوا۔

اس قسم کے مختلف فیہ مسائل میں حضرت شیخ اکثر راقم الحروف کو واسطہ بناتے۔ دونوں کو اعتماد تھا کہ پیغام میں کمی بیشی نہیں کرتا اور معاملہ سلجھانا چاہتا ہے۔ چنانچہ ۱۰؍شعبان المعظم ۱۴۰۵ھ کو مدرسہ نصرۃ العلوم میں ایک مولوی صاحب نے آ کر مجھ سے کہا کہ حضرت مولانا قاضی شمس الدین صاحب آپ کو بلا رہے ہیں۔ میں حاضر خدمت ہوا تو فرمانے لگے کہ مولانا سرفراز صاحب کو میرا پیغام دے دو کہ:

۱۔ میرا مولوی احمد سعید ملتانی سے کوئی تعلق نہیں۔ میں اس سے بے زار ہوں۔ میں اس سے تبری کا اعلان کرتا ہوں۔ حدیث پاک میں آتا ہے کہ ''اگر سنو کہ پہاڑ اپنی جگہ سے ٹل گیا ہے تو یہ تسلیم کر لو اور اگر یہ سنو کہ کسی کی عادت (طبیعت) بدل گئی ہے، یہ نہ مانو۔'' جتنی مجھے اس شخص سے تکلیف پہنچی ہے، وہ میں جانتا ہوں۔

۲۔ اللہ تعالیٰ کے ہاں پیش ہونا ہے۔ میں کسی کی ''سماع موتی'' پر تکفیر نہیں کرتا۔

ایک ہفتہ گزر گیا، مگر میں نے حضرت شیخ کو یہ پیغام نہ دیا تاکہ معاملہ آگے نہ بڑھے۔ ایک دن حضرت شیخ مولانا مفتی عبد الشکور صاحب سے اسی موضوع پر بات کر رہے تھے کہ مولوی احمد سعید کا ذکر آ گیا۔ میں نے مناسب سمجھا کہ حضرت استاد قاضی صاحب کا پیغام آپ کو پہنچا دوں۔ جب میں نے پیغام دیا تو اس پر حضرت شیخ نے کہا کہ حضرت قاضی صاحب سے کہیں کہ وہ لکھ کر دے دیں، کیونکہ ان کی وفات کے بعد کوئی اس بات کو تسلیم نہیں کرے گا۔ چنانچہ وسط شعبان المعظم میں (اس کے پندرہ بیس روز کے بعد ۱۰؍رمضان المبارک کو حضرت قاضی صاحب کا انتقال ہو گیا) راقم الحروف کراچی کے سفر سے واپس آیا تو حضرت قاضی صاحب کی زیارت کے لیے آپ کی رہائش گاہ پر صبح دس بجے حاضری دی۔ آپ آرام فرما رہے تھے۔ میں آپ کے پاؤں دباتا رہا اور ایک گھنٹے کے بعد نصرۃ العلوم حاضر ہوا۔ اتنے میں استاد زادہ مولانا عبد القدوس خان قارن صاحب تشریف لائے اور کہا کہ حضرت قاضی صاحب کی زیارت کے لیے جانا ہے، آپ بھی ہمارے ساتھ چلیں۔ میں نے کہا کہ رات بھر سفر کیا ہے اور ابھی حضرت سے مل کر آیا ہوں، آپ کے ساتھ نہیں جا سکتا، لیکن ان کے شدید اصرار پر ان کے ساتھ دوبارہ حضرت قاضی صاحب کی خدمت میں حاضر ہوا۔ مولانا عبد الغفور بٹ بھی ہمراہ تھے۔ بارہ بج چکے تھے اور آپ اس وقت بیدار ہو چکے تھے۔ بات چیت کے دوران آپ نے مجھ سے دریافت کیا کہ کیا میرا پیغام مولانا محمد سرفراز خان صفدر کو پہنچا دیا تھا؟ میں نے کہا کہ حضرت استاد فرماتے ہیں کہ قاضی صاحب یہ بات لکھ دیں۔ فرمایا، دس مہینے ہوئے میں نے لکھ دیا ہے جس کی نقل مولوی محمد صدیق کے پاس ہوگی اور ماہنامہ ''تعلیم القرآن'' میں اشاعت کے لیے مولوی احسان الحق کو بھیج دیا ہے۔ اس کے بعد قارن صاحب سے فرمایا کہ مکتوبات مجدد الف ثانی میرے سرہانے رکھے ہیں۔ اٹھا کر دیکھو، میرے ہاتھ سے ان صفحات کے نشان لگے ہوئے ہیں جن میں حضرت مجدد نے ''بحرمت'' کا لفظ استعمال کیا ہے۔ یہ اکیس حوالہ جات ہیں اور میں نے عنایت اللہ شاہ سے کہا ہے کہ اتنا غلو نہ کرو۔ جب ہمارے بزرگوں نے بحرمت

سید المرسلین لکھا ہے تو یہ صحیح ہے۔ قارن صاحب کے اعزاز میں حضرت نے چائے کا حکم دیا۔ چائے پی کر ہم سب دعا کی درخواست کرتے ہوئے آپ سے رخصت ہوئے۔ حضرت کے ایک نمایاں شاگرد نے شکایت کی کہ جب ہم آپ کے پاس آتے ہیں تو آپ نے ہمیں کبھی چائے پانی کا نہیں پوچھا اور مولانا محمد سرفراز صاحب کے بیٹے آتے ہیں تو آپ ان سے بہت محبت کرتے ہیں۔ فرمایا کہ مولانا سرفراز صاحب کے بیٹے ہیرے ہیں ہیرے، تم ان کی ریس کر سکتے ہو؟

حضرت قاضی صاحبؒ کی وفات کے بعد شیخ الحدیث مولانا سلیم اللہ خان صاحب تعزیت کے لیے مدرسہ نصرۃ العلوم تشریف لائے تو دار الافتاء میں ملاقات کے دوران حضرت صوفی صاحبؒ نے فرمایا کہ میں ہر نماز کے بعد نام لے کر حضرت قاضی شمس الدینؒ کے لیے دعا کرتا ہوں۔

حضرت شیخ عبقری العصر اور جامع کمالات شخصیت تھے۔ آپ کی صفات کا احاطہ مشکل ہے۔ ایک مستقل اکیڈمی آپ کی خدمات پر کام شروع کرے تو کامیابی آسان نہیں۔ شیخ کے اوصاف میں سے کسی ایک وصف تک رسائی کارے دارد۔ حضرت شیخ پر کچھ لکھنا محبین اور مخلصین کی سعادت ہے، ورنہ بحر بے کراں میں قدم رکھنے کی کون جرات کر سکتا ہے۔

نہ حسنش غایتے دارد نہ سعدی را سخن پایاں
بمیرد تشنہ مستسقی و دریا ہمچناں باقی

شیخ مولانا محمد سرفراز خان صفدر نے اپنی تصانیف میں فرق باطلہ کے عقائد فاسدہ کا پرزور رد کیا، ان کی دور از کار تحریفات اور تاویلات کا پردہ چاک کیا اور اہل سنت کے موقف کو کتاب وسنت کے دلائل و براہین سے واضح کیا۔ آپ کی تصانیف کا ایک گراں بہا ذخیرہ آپ کی خدمات پر شاہد ہے۔ مولانا عطاء المنعم شاہ بخاریؒ نے راقم الحروف سے شیخ کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا، دیوبند کے ایک سپوت نے وہ کام کیا ہے جو ساری اکیڈمی نہیں کر سکی۔ اتنی طویل تصانیف کے باوجود کسی حریف نے حرف گیری نہیں کی کہ فلاں جملہ اخلاقی حدود کو پامال کر رہا ہے۔

آپ کے علوم وفیوض اور آپ کے اصول وقواعد جن پر آپ کی تصانیف کا مدار ہے، ہر ایک تصنیف کا پس منظر اور اسباب، پھر دلائل کا توازن اور طرز استدلال، ان کی افادیت، زبان اور بیان کا اسلوب، ان پر اکابر علما کی تحسین وتقریظ، ان کی ترتیب اور تاریخ مستقل موضوعات ہیں۔ کوئی صاحب ذوق ان کو چھیڑے اور ان کو اپنائے تو یہ ان کی اہمیت اور بڑے حوصلے کا کام ہے۔

> ”میں کہا کرتا ہوں کہ ہر بچے کو حفظ نہ کراؤ۔ پہلے تم اس کا حافظہ دیکھ لو۔ اگر حافظہ قوی ہے، قرآن پاک کو یاد رکھ سکتا ہے تو ٹھیک ہے، ورنہ حفظ نہ کراؤ کیونکہ یاد کرنا فرض نہیں ہے، فضیلت کی بات ہے لیکن یاد کر کے بھول جانا بہت بڑا گناہ ہے۔ اور میں اساتذہ کو بھی سبق دیتا ہوں کہ تم بچے کا اندازہ کرو۔ وہ اس طرح کہ اس کو ایک پارہ یاد کراؤ اور دیکھو کہ کتنی دیر میں یاد کیا ہے، منزل کیسی ہے۔ اگر مضبوط حافظے والا ہے تو ٹھیک ہے، ورنہ قرآن پاک کا ترجمہ اور دوسرے دینی علوم اس کو پڑھاؤ، کیونکہ یہ بھی دین کا حصہ ہیں۔“ (ذخیرۃ الجنان ۳/۱۰۳)

مولانا محمد عیسیٰ منصوری*

امام اہل سنت کی رحلت

میرے شیخ طریقت مرشد کامل حضرت شاہ نفیس الرقمؒ کی وفات کے صدمہ کا زخم ابھی تازہ تھا کہ امام اہل سنت شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد سرفراز خان صفدرؒ کی وفات کی خبر نے دل ودماغ کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا۔ حضرت تقریباً ۸، ۹ سال سے صاحب فراش تھے۔ حضرت مولانا زاہد الراشدی صاحب دامت برکاتہم اور دیگر احباب کے ذریعے وقتاً فوقتاً حضرت کی صحت کے بارے میں معلوم ہوتا رہتا تھا۔ ایک ایسے دور میں جب علم، دین اور نسبتیں کاروبار اور نمود ونمایش بنتی جا رہی ہیں، حضرت امام اہل سنت جیسی ہستی کے وجود کا خیال واحساس ہی دل کی تقویت وحوصلہ کا باعث تھا۔ اس دور میں نگاہیں سلف صالحین کا طرز زندگی دیکھنے کے لیے بھٹک کر تھک جاتی ہیں۔

حضرت کے انتقال کی خبر سن کر مجھے بار بار حضرت مولانا محمد منظور نعمانی کا خیال آتا رہا۔ حضرات انبیاء کی بعثت کا بنیادی مقصد دنیا میں خدائے واحد کی عبادت قائم کرنا ہوتا تھا، اس لیے غیر اللہ کی عظمت و پرستش کے ادنیٰ سے ادنیٰ تصور کو مٹانے اور محو کرنے کی جدوجہد انبیا کا بنیادی مشن رہا ہے۔ عرصہ سے ہمارے اہل علم نے غیر اللہ کی پرستش وعظمت یعنی شرک وبدعات کے مٹانے کا کام پس پشت ڈال رکھا ہے۔ اس فرض منصبی اور دین کے ضروری بلکہ نہایت ضروری شعبہ کے لیے بھارت میں حضرت مولانا محمد منظور نعمانی اور پاکستان میں حضرت امام اہل سنت کے بعد کوئی ہستی نظر نہیں آتی۔ حضرت کی وفات کے بعد احساس ہوتا ہے کہ ہم نے کس قدر عظیم ہستی کھو دی۔ دین میں غلو وفساد یا افراط وتفریط کے دو بنیادی سبب ہوتے ہیں۔ ایک نفس کی انانیت وخود رائی جس کا عصری عنوان غالی سلفیت اور انکار حدیث ہے۔ یہ دونوں چیزیں بظاہر متضاد نظر آتی ہیں، مگر دونوں کی نفسیات، ذہنیت، اسلوب اور دلائل ایک جیسے ہوتے ہیں۔ دونوں مرض اسلاف پر عدم اعتماد سے پیدا ہوتے ہیں۔ عموماً انسان سلفیت سے ترقی کر کے انکار حدیث تک پہنچتا ہے۔ دوسرے غیر اللہ کی پرستش اور تعظیم، یعنی شرک وبدعات۔ اس کے اسباب عموماً تمدنی وتاریخی ہوتے ہیں۔ برصغیر کے تاریخ وتمدن ہی نہیں، علوم وفنون پر بھی اصنام پرستی کی گہری چھاپ رہی ہے۔ شرک وبدعات کی ہر ہر چیز کی بنیاد ہندو متھالوجی، دیومالائی اساطیر وتصورات اور یہاں کے تمدن وتاریخ میں تلاش کی جا سکتی ہے۔ صرف نام اور لیبل گئے ہیں۔

کچھ عرصہ سے برصغیر کے تینوں ممالک میں بدعات وخرافات اہل سنت کے لبادے میں جارحانہ انداز میں وارد ہو رہی ہیں اور ہمارے اہل علم اس محاذ پر غفلت کا شکار ہیں۔ آج سے تقریباً چالیس سال پہلے مفکر اسلام حضرت مولانا ابو الحسن علی ندویؒ نے دار العلوم دیوبند کے طلبہ کو خطاب کرتے ہوئے فرمایا تھا:

---

*چیئرمین ورلڈ اسلامک فورم، لندن

''آپ میں کتنے مولانا اسمٰعیل شہیدؒ کے حالات وکارناموں سے واقف ہیں؟ آپ میں سے کتنے بھائیوں نے صراط مستقیم اور تقویۃ الایمان پڑھی ہے؟ آپ میں کتنے بھائی توحید وسنت کی حقیقت سے واقف ہیں؟ وہ بتلا سکتے ہیں کہ اہل جاہلیت کے ایمان باللہ کی حقیقت کیا تھی اور قرآن نے کیوں ان کو مشرک کہا؟ توحید کے کیا مراتب ہیں اور شرک کے کیا مظاہر ہیں؟ بدعت کی جامع ومانع تعریف کیا ہے اور اس کے کیا نقصانات ہیں؟ آپ کو ان تمام مسائل پر تیار ہونا چاہیے تھا۔ آپ کا مطالعہ، آپ کی بصیرت عوام سے اس بارے میں بہت ممتاز ہونی چاہیے تھی، مگر مجھے خطرہ ہے کہ آپ میں بہت سے بھائی ان چیزوں سے بالکل خالی الذہن ہوں گے۔''

(پا جا سراغ زندگی ص ۱۲۱)

جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے، حضرت امام اہل سنت کا پہلا غائبانہ تعارف آپ کی مشہور اور معرکۃ الآرا کتاب ''راہ سنت'' کے ذریعے ہوا۔ بھارت میں بندہ کا واسطہ شرک وبدعات سے کم ہی پڑا۔ میرا وطن امراوتی (ضلع مہاراشٹر) دیوبندوندوی علما اور تبلیغی جماعت کی بدولت تمام تر اہل دیوبند سے وابستہ رہا ہے، مگر جب ۱۹۷۵ء میں برطانیہ آ کر لندن کے تبلیغی مرکز کا امام بنا تو یہاں پاکستانیوں کی غالب آبادی آزاد کشمیر کے لوگوں پر مشتمل نظر آئی۔ بھارتی کشمیریوں کی بہ نسبت پاکستانی کشمیریوں میں شرک وبدعات کا زیادہ زور نظر آیا۔ برطانیہ آ کر پاکستان کے جن علمائے کرام سے تعلق خاطر قائم ہوا، ان میں حضرت مولانا منظور الحق کیمل پوری آف برمنگھم بھی تھے جو بلند پایہ خطیب وواعظ تھے اور اکابر علمائے دیوبند سے عشق کے درجہ کا تعلق رکھتے تھے۔ اپنے مواعظ میں شرک وبدعت کا ردان کا خاص مشن تھا۔ مولانا نے سب سے پہلے مجھے ''راہ سنت'' پڑھنے کے لیے دی اور فرمایا کہ شرک وبدعت کو سمجھنے کے لیے یہ سب سے اچھی کتاب ہے۔ بندہ نے آج تک اس موضوع پر اس قدر مکمل ومدلل، جامع ومانع علمی انداز کی کوئی کتاب نہیں دیکھی تھی۔ اسے پڑھ کر حضرت شیخ الحدیث مولانا سرفراز صفدرؒ کی علمی عظمت کا نقش دل پر بیٹھ گیا۔ اس کے بعد حضرت کی بہت سی کتب نظر سے گزرتی رہیں۔ خالص علمی انداز، مسکت دلائل، پیرس کے ڈاکٹر محمد حمید اللہ صاحب کی کتب کی طرح مغز ہی مغز، حشو وزوائد سے پاک، اگر انسان میں طلب صادق ہو تو سمجھنے کے لیے کافی ووافی۔

بندہ کی حضرت امام اہل سنت سے پہلی ملاقات ۸۰ء کی دہائی کے اواخر میں لیسٹر اور شیفیلڈ میں ہوئی۔ حضرت پاکستان کے متعدد اہل علم واکابر کے جلو میں تشریف لائے ہوئے تھے۔ حضرت سے بندہ کا تعارف وملاقات شیفیلڈ کے الحاج بوستان صاحب نے کرائی جو میرپور آزاد کشمیر کے باشندے اور یہاں برطانیہ میں تبلیغی جماعت کے ذمہ داروں میں واحد شخص ہیں جو علمائے کرام سے خاص ربط وتعلق رکھتے ہیں۔ حضرت امام اہل سنت کی شخصیت میں وجاہت وسادگی، جلال وجمال کا امتزاج نظر آیا۔ ایک طرف علمی وقار ومتانت تو دوسری طرف چھوٹوں پر انتہائی شفیق ومہربان۔ بندہ نے یہ بات بھارت میں حضرت مولانا محمد منظور نعمانی میں دیکھی تھی۔ دوسری شخصیت حضرت امام اہل سنت کی نظر آئی۔ حضرت سے پہلی ملاقات آج تک دل پر نقش ہے۔ کسی نے سچ کہا ہے کہ کسی شخصیت سے محبت پیدا ہونے اور متاثر ہونے کے لیے ایک لمحہ بہت ہے۔

اس کے بعد غالباً ۱۹۹۲ء میں قضا وقدر کے فیصلے نے لندن میں میری رہایش کے قریب ہی سیرت النبی کے ایک جلسے میں حضرت مولانا زاہد الراشدی صاحب سے ملاقات کرا دی۔ بمصداق حدیث ''الارواح جنود مجندۃ'' دونوں نے ایک دوسرے کو فوراً پہچان لیا۔ وہ دن ہے اور آج کا دن، مولانا راشدی سے محبت وتعلق خاطر میں اضافہ ہی ہوتا رہا کہ ہم دونوں کا ذوق وفکر، درد وغم، کڑھن اور پریشانی ایک ہی ہے کہ مغرب کے دجالی فکر وفلسفہ، تمدن ومعاشرت اور مکارانہ سیاست سے انسانیت کو کیسے خلاصی ملے اور ملت کی سربلندی کی راہیں کیسے تلاش کریں؟ مولانا راشدی صاحب سے تعلق کی وجہ سے حضرت امام اہل سنتؒ اور آپ کے برادر خورد حضرت مولانا صوفی عبد الحمید سواتی صاحب سے ایسا رشتہ قائم ہوا کہ ایسا لگتا ہے کہ یہ دونوں اکابر گویا میرے اپنے گھرانے کے بزرگ ہوں، حالانکہ ان دونوں اکابر کی خدمت میں حاضری اور ان سے استفادہ کے مواقع بہت کم مل سکے، خاص طور پر حضرت امام اہل سنتؒ سے تو اور بھی کم۔ پاکستان کے آخری سفر ۲۰۰۶ء میں گوجرانوالہ سے اسلام آباد جاتے ہوئے حضرت کے دولت کدہ پر حاضری دی۔ نہایت سادہ سے مکان میں معمولی پلنگ پر جسے کھٹیا کہنا زیادہ مناسب ہوگا، تشریف فرما تھے۔ ایسی شفقت ومحبت اور اپنائیت کا معاملہ فرمایا کہ بندہ اور بندہ کے رفقاے سفر ابراہیم مولانا مشفق الدین (کالج لندن کے پرنسپل)، مولانا بلال، مولانا عبد اللہ اور لیسٹر کے مولانا فاروق ملا زندگی بھر کبھی فراموش نہیں کر سکتے۔

حضرت کی زندگی امیر شریعت حضرت سید عطاء اللہ شاہ بخاریؒ کے اس مقولے کی مصداق تھی جو آپ نے غالباً محدث شہیر علامہ انور شاہ کشمیریؒ کے متعلق فرمایا تھا کہ ''صحابہ کا قافلہ جا رہا تھا، ایک شخص پیچھے رہ گیا۔'' حضرت کی زندگی کے پچاس ساٹھ سال ایسے مشغول، ایسے منظم ومنضبط اوقات کے ساتھ گزرے کہ مجھ جیسوں کے لیے ہفتہ عشرہ کے لیے بھی ایسی پابندی دشوار ہے۔ شاید اسی کو کہا گیا ہے کہ الاستقامۃ فوق الکرامۃ۔ آپ نے نصف صدی سے زیادہ بخاری ومسلم جیسی کتب کی تدریس کے علاوہ مسجد اور کالج میں درس قرآن وحدیث سے عوام الناس اور نئی نسل کو مستفید فرمایا۔ نیز ہر سال علما کے لیے تفسیر قرآن کی خصوصی کلاس کو پڑھاتے رہے۔ کہا جاتا ہے کہ آپ کی تصانیف کی طرح درس میں بھی ہر بات مستند حوالوں کے ساتھ ہوتی تھی۔ حضرت کے براہ راست وبالواسطہ شاگردوں کی تعداد تیس ہزار کے قریب بتائی جاتی ہے۔ حضرت کی تصانیف دیکھ کر احساس ہوتا ہے کہ آپ برصغیر میں اس طرح مدلل انداز میں فتنوں پر علمی کام کرنے والے ایک فرد فرید تھے۔ حضرت حکیم الاسلام قاری محمد طیب صاحبؒ نے تقریباً چالیس سال پہلے ''راہ سنت'' پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا تھا کہ اس موضوع پر ہماری پوری جماعت نے جتنا کام کیا، حضرت شیخ الحدیثؒ نے تنہا اس سے کہیں زیادہ کام کیا ہے۔

ہم برصغیر کے مسلمانوں کا مزاج مردہ پرستی کا بن گیا ہے۔ ہم نے زندگی میں بہت کم کسی ہستی کی قدر کی ہے، البتہ وفات کے بعد عقیدتوں کی مالا ضرور چڑھائی۔ اس ذہنیت ومزاج (زندگی میں قدر نہ کرنا اور فائدہ نہ اٹھانا) کے خلاف جہاد مسلسل کی ضرورت ہے اور ابھی قابل قدر افراد جس کسی شعبہ میں رہ گئے ہیں، ان سے استفادہ کا ذوق پیدا کرنے کی ضرورت ہے۔ انھی قابل قدر افراد میں حضرت امام اہل سنتؒ کے جانشین حضرت مولانا زاہد الراشدی صاحب بھی ہیں۔ مولانا راشدی صاحب کی مسکنت، سادگی اور تواضع آپ کی قدر دانی اور استفادہ میں ایک حجاب ہے۔ مولانا نے اپنی ہستی کو اس طرح مٹی میں ملا رکھا ہے کہ لوگ قدر نہیں کر پاتے۔ پورے پاکستان کے علما میں مولانا راشدی منفرد شخصیت ہیں جو عصری فکر وفلسفہ کے مقابلے میں تن تنہا کام کر رہے ہیں۔ آپ برصغیر کے واحد عالم دین ہیں جن کے ہر ہفتہ عصری مسائل پر قومی اخبارات میں فکر انگیز کالم اور مضامین چھپتے ہیں۔ آپ کے کام اور جدوجہد کو اگر کسی سے تشبیہ دی جا سکتی ہے تو وہ ہیں مفکر اسلام حضرت

مولانا ابوالحسن علی ندویؒ۔ عصری تقاضوں پر گہری نظر، مغرب کے فکری چیلنجز کا سامنا، مغربی فکر و فلسفہ کے توڑ کی فکر۔ پاکستان کے تعلیم یافتہ طبقہ اور اخبار بین طبقہ پر جتنے اثرات مولانا راشدی نے ڈالے، پاکستان کا کوئی عالم نہیں ڈال سکا۔

مولانا کے صاحبزادے عزیزی مولوی عمار خان ناصر سلمہ میں جو صلاحیت، بلکہ میں عبقریت کہوں گا، وہ ان کے ہم عمر کسی عالم میں نظر نہیں آتی۔ بدقسمتی سے وہ کچھ عرصہ سے غامدی صاحب کے افکار سے متاثر ہو گئے ہیں۔ بندہ کے نزدیک اس میں کسی حد تک پاکستان کے علما کے جمود، فکری درماندگی اور اسلوب کا بھی قصور ہے جو ذہین و فطین نوجوانوں کو اپنے ساتھ نہیں رکھ پاتے۔ کاش وہ اپنے والد اور عظیم المرتبت دادا کا طرز اختیار کریں۔ ہمارے ہاں آج کل اکابر اکابر کا نام جپ کر جس طرح اپنے فرائض سے کوتاہی، بے حسی اور بے عملی کا جواز پیدا کیا جا رہا ہے، اس کی نمایاں مثال پاکستان کے دیوبندی مفتی صاحبان کا وہ ''متفقہ فتویٰ'' ہے جس میں اسلام کی تعلیم اور دعوت و اشاعت کے لیے جدید ذرائع ابلاغ کو مطلقاً حرام فرمایا گیا ہے۔ دوسری طرف غامدی صاحب اور ان کے متعدد شاگرد پاکستان کے ہر چینل پر براجمان ہیں اور نئی نسل میں اپنا ذہن و فکر عام کر رہے ہیں۔ کیا فتاویٰ بازی سے اس نقصان کا ازالہ ہو جائے گا؟

بندہ آج کل دیکھ رہا ہے کہ پاکستان کے بعض علمائے کرام جنھیں مولانا راشدی صاحب سے کسی طرح کی تکلیف، رشک یا پرخاش ہے، وہ عمار کا نام لے کر یا بہانہ بنا کر مولانا کی شخصیت کو مجروح کر رہے ہیں۔ انھیں مجروح کرنے کی کوشش کرنے والے شاید اپنا ہی نقصان کریں گے۔ خود غامدی صاحب کے فکر کی کجی و زیغ پر پورے پاکستان کے علمائے کرام کا کام ایک طرف اور مولانا راشدی کا ایک طرف۔ بندہ کو پوری توقع ہے کہ مولانا راشدی صاحب امام اہل سنت کے صحیح جانشین ثابت ہوں گے۔ عزیزی عمار سلمہ نے اپنے عظیم المرتبت دادا کے علوم کو موضوعات کے اعتبار سے جمع کرنا شروع کیا تھا۔ خدا کرے یہ کام جلد منصۂ شہود پر آ جائے۔ اس وقت میں عمار خان صاحب کو اس بات کی طرف توجہ دلانا چاہتا ہوں کہ آپ نے اپنے عظیم المرتبت دادا کی رحلت پر لوگوں کے دلوں میں ان کی مقبولیت، مرجعیت اور محبوبیت دیکھی۔ اہل سنت کے جلیل القدر امام حضرت امام احمد بن حنبلؒ کا قول مشہور ہے کہ ''ہمارا جنازہ ہمارے بارے میں شہادت پیش کر دے گا''۔ کیا یہ مقبولیت و محبوبیت کسی فراہی، کسی اصلاحی یا کسی غامدی کے حصے میں آ سکتی ہے؟ اگر صرف اس نکتے پر غور کر لیں تو کافی و وافی ہے۔

اللھم اھدنا الصراط المستقیم۔

حضرت امام اہل سنت کی سوانح حیات چھپ رہی ہے جس سے پتہ چلتا ہے کہ کیسی کیسی مشکلات، صعوبتوں، مجاہدوں، فقر و فاقہ سے گزر کر آپ نے علم حاصل کیا۔ حضرت کی سوانح کا یہ ابتدائی حصہ نہایت سبق آموز ہے اور خاص طور پر علمائے کرام کو بار بار پڑھنا چاہیے۔ آپ کی تصانیف ان شاء اللہ تا قیامت مشعل راہ رہیں گی۔ خاص طور پر سلفیت، انکار حدیث اور بدعات کے رد میں خالص علمی انداز میں آپ نے جو کچھ لکھا، وہ بے نظیر ہے۔ اس موضوع پر کام کرنے والے ان سے استفادہ کرتے رہیں گے۔

مولانا سعید احمد جلال پوری*

امام اہل سنتؒ کے غیر معمولی اوصاف و کمالات

دنیا میں جو بھی آیا ہے، اسے ایک نہ ایک دن جانا ہے اور ضابطہ الٰہی: ''کل نفس ذائقۃ الموت'' (آل عمران: ۱۸۵) (ہر جی نے موت کا ذائقہ چکھنا ہے) کے مصداق موت کا گھونٹ ہر ایک نے پینا ہے، اس لیے کہ: ''کل من علیھا فان ویبقیٰ وجہ ربک ذو الجلال والاکرام'' (رحمٰن: ۲۷) (ہر ایک کو فنا ہے، بقا تو صرف تیرے رب کی ذات کو ہے جو بزرگی اور عظمت والی ہے) کے تحت دنیا سے ہر نیک و بد، مسلم و کافر، محبوب و مبغوض، عالم و جاہل کو ایک دن ضرور کوچ کرنا ہے۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ دنیا کی اس گھاٹی سے کون کامیاب ہو کر پار ہوا اور کون ناکام ہو کر؟ کیونکہ دنیا کی راحت، عافیت، عزت اور وجاہت یا یہاں کی تکلیف، مشقت، فقر اور ذلت معیارِ کامرانی و ناکامی نہیں، بلکہ حقیقی کامیابی و ناکامی کا اندازہ مرنے کے بعد ہوگا۔

جن لوگوں کو حقیقی عقل و شعور یا فہم و ادراک کی دولت میسر ہے، وہ اس دھوکا کے گھر اور عارضی چکا چوند پر فریفتہ نہیں ہوتے اور نہ ہی دنیا کی عزت و ذلت کی پروا کرتے ہیں۔ ان کا اوڑھنا بچھونا رضائے الٰہی اور قبر و آخرت کی فکر ہوتی ہے۔ وہ دنیا کے پیچھے نہیں، دنیا ان کے پیچھے بھاگتی ہے۔ ایسے لوگ دنیا و مافیہا سے مستغنی اپنے حصہ کا کام کرتے ہیں اور خاموشی سے دنیا اور اس کے عیش و راحت کو لات مار کر راہی آخرت ہو جاتے ہیں، چنانچہ بہت سے مقربین بارگاہ الٰہی ایسے بھی ہوئے ہیں جن کو اہل دنیا ان کے جیتے جی پہچان تک نہ سکے، جبکہ بہت سے ایسے ہوئے جن کے خمول و گوشہ نشینی کی بنا پر اہلِ دنیا ان کے مرتبہ و مقام سے نا آشنا رہے۔ ہاں! کبھی کبھی ایسا ہوتا ہے کہ کسی بندہ خدا سے کچھ خدمت لینا مقصود ہو، تو اس کا تعارف کرا دیا جاتا ہے اور مخلوق خدا کو اس کے عند اللہ مرتبہ و مقام میں سے کسی قدر کوئی جھلک دکھا دی جاتی ہے۔ مقصود صرف اور صرف یہ ہوتا ہے کہ خلق خدا اس کے فیوض و برکات اور علوم و معارف سے مستفید ہو سکے، مگر یہ سب کچھ منجانب اللہ ہوتا ہے۔ اس میں ان مقربین بارگاہ الٰہی کی مرضی، چاہت اور اختیار کا کوئی دخل نہیں ہوتا، جیسا کہ بانی دار العلوم قاسم العلوم والخیرات حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی قدس سرہ کا یہ ملفوظ مشہور ہے کہ: اگر علم کے دو حروف کی تہمت نہ ہوتی تو کسی کو خبر بھی نہ ہوتی کہ محمد قاسم نام کا بھی کوئی ہے۔ چنانچہ ''بیس بڑے مسلمان'' میں ہے: ''ایک دن آپ فرماتے تھے کہ: ''اس علم نے خراب کیا ورنہ اپنی وضع کو ایسا خاک میں ملاتا کہ کوئی بھی نہ جانتا۔'' (ص: ۱۱۷)

بلا مبالغہ کچھ یہی شان امام اہل سنت شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد سرفراز خان صفدر قدس سرہ کی تھی جن کا ۵ رمئی ۲۰۰۹ء مطابق ۹ رجمادی الاولیٰ ۱۴۳۰ھ پیر اور منگل کی درمیانی شب سوا ایک بجے انتقال ہو گیا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ ان

---

* مدیر ماہنامہ بینات کراچی۔

للّٰہ ما اخذ ولہ ما اعطیٰ و کل شئی عندہ باجل مسمّٰی۔

حضرت امام اہل سنتؒ کو اللہ تعالیٰ نے جہاں دوسرے بے شمار انعامات سے نوازا تھا، وہاں اللہ تعالیٰ نے آپ کو اخفا اور استغنا سے بھی نوازا تھا۔ اللہ تعالیٰ نے جس طرح آپ کو علم و تحقیق اور قلم و قرطاس کی نعمت سے سرفراز فرمایا تھا، اسی طرح آپ کی نسبی اولاد میں سے مولانا زاہد الراشدی، مولانا عبد القدوس قارن اور مولانا عبد الحق خان بشیر زیدت الطافہم کو بھی درس و تدریس کے علاوہ لکھنے لکھانے کے ذوق اور سلیقے سے سرفراز فرمایا ہے۔ حضرت امام اہل سنتؒ کی نسبی اولاد کے علاوہ روحانی اور علمی اولاد کا حلقہ بھی خاصا وسیع ہے اور ان میں سے بہت سے اربابِ ذوق، اصحاب تحریر اور عمدہ انشا پرداز ہیں جن میں سے بہت سے حضرات نے آپؒ پر لکھا، لکھ رہے ہیں اور ان شاء اللہ آئندہ بھی ان کی زندگی کے مختلف گوشوں اور مخفی پہلوؤں کو اجاگر کرتے ہوئے انہیں خراج عقیدت پیش کرتے رہیں گے اور یہ سب کچھ وہ اپنے آپ کو خریدارانِ یوسف کی صف میں شامل کرنے کے لیے کریں گے، ورنہ حضرت امام اہل سنت قدس سرہ جس مرتبہ و مقام پر فائز تھے یا اب جہاں وہ پہنچ چکے ہیں، انہیں ایسی کسی مدح و توصیف کی نہ پہلے کبھی ضرورت تھی اور نہ اب ہے۔

اسی طرح اگر یہ کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا کہ کسی کا ان کی مدح و توصیف میں کچھ کہنا یا لکھنا نہ ان کے مرتبہ و مقام میں اضافہ کر سکتا ہے اور نہ انہیں اس سے کوئی فائدہ پہنچ سکتا ہے۔ ہاں ان کو اگر کچھ نفع ہوگا تو دعاے خیر، ایصالِ ثواب، ان کی جاری کردہ حسنات اور ان کے مشن پر چلنے سے ہی ہوگا، تاہم یہ ہماری ضرورت ہے کہ ہم اپنی زبان، بیان، تحریر، قلم اور قرطاس کو ان کے ذکر خیر سے وابستہ کر کے اپنے قد و قامت اور قدر و قیمت بڑھانے کی سعادت حاصل کر سکتے ہیں۔ تاہم جو لوگ اپنے قلم و قرطاس اور زبان و بیان کو ان کے ذکر خیر سے وابستہ کرنے کے باوجود بھی ان کی فکر و سوچ، علم و عمل، فہم و فراست، تحقیق و تدقیق اور زندگی بھر کے طرز عمل سے مخالفت کریں گے، نہ صرف یہ کہ ان کو اس سخن سازی سے کوئی فائدہ نہیں ہوگا، بلکہ عین ممکن ہے کہ ان کی اس روش سے بجائے نفع کے انہیں نقصان ہو اور حضرت امام اہلِ سنتؒ کی پاکیزہ روح کو بھی اس سے تکلیف ہو، اس لیے اس وقت حضرت امام اہل سنتؒ سے محبت و عقیدت کے اظہار کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ ان کی بیان فرمودہ راہ اور قدروں پر سو فیصد عمل کیا جائے اور ان کے مشن کو زندہ و تابندہ رکھا جائے۔

امام اہل سنت قدس سرہ کسی اعتبار سے بھی اونچا اور عالی پس منظر نہیں رکھتے تھے۔ ان کو جس قدر رفعت و عظمت ملی، وہ علم و عمل، دین و شریعت، زہد و تقویٰ، خلوص و اخلاص اور وراثت نبوی کی مرہون منت تھی، اور آپ: "العلماء ورثة الانبياء وان الانبياء لم يورثوا ديناراً ولا درهماً انما ورثوا العلم، فمن اخذه اخذ بحظ وافر۔" (مشکوٰۃ:۳۴) (علماء انبیاء کے وارث ہیں اور انبیاء اپنی وراثت میں دینار و دراہم نہیں چھوڑتے، ان کی وراثت علم ہوتی ہے، جس نے انبیاء کی وراثتِ علم حاصل کی، اس نے بہت کچھ حاصل کر لیا) کے کامل و مکمل مصداق تھے، آپ نے ساری زندگی میراث نبوی کو سینے سے لگائے رکھا اور اتباع نبوی میں اس میراث نبوی کی تقسیم کے لیے فکر مند رہے۔

آپ کو اللہ تعالیٰ نے موفق للخیر بنایا تھا اور آپ کے اوقات میں غیر معمولی برکات رکھی تھیں، یہ اسی کا کرشمہ تھا کہ روزانہ ۱۵، ۲۰ میل کا طویل سفر کر کے مدرسے آنا جانا، وہاں اسباق پڑھانا، ان تمام اسباق کا مطالعہ کرنا، بچیوں کو درس نظامی کی کتابیں پڑھانا، ٹیچر ٹریننگ کالج میں گھنٹہ بھر درس دینا اور وہاں بھی پیدل آنا جانا، مسجد کی پانچوں نمازوں کی امامت و خطابت، مسجد میں درسِ قرآن و درس حدیث دینا، اس کی مکمل تیاری کرنا، مسائل اور فتاویٰ لکھنا، اسی طرح اس مختصر وقت میں جامع مسجد گکھڑ میں تین چار بار قرآن کا درس مکمل کرنا، پھر وہاں صحاح ستہ، مستدرک حاکم اور دوسری حدیث کی کئی کتابوں کا درس دینا، وغیرہ سب خیر کی توفیق اور وقت میں برکت کی علامات ہیں۔

بحمد اللہ! راقم الحروف کو حضرت امام اہل سنتؒ کے ساتھ متعدد بار حرمین کے سفر کی سعادت میسر آئی۔ آپ ہر معاملہ میں نہایت حزم و احتیاط سے کام لیتے، حتیٰ کہ اگر کوئی فقہی مسئلہ پیش آ جاتا تو بجائے اس کے کہ اپنے علم و فہم اور تحقیق و افتا کی روشنی میں جواب دیتے، کسی اپنے شاگرد یا کسی دوسرے متعلقہ عالم دین سے مسئلہ معلوم کر کے اس پر عمل کرتے۔ چنانچہ ایسا کئی بار ہوا کہ کسی نے آپ سے مسئلہ پوچھا تو آپ نے راقم الحروف کو یاد فرمایا، حالانکہ راقم الحروف اکثر و بیشتر آپ سے ہی مسائل معلوم کرتا تھا۔

حضرت کا یہ معمول تھا کہ حتی الوسع آپ کسی سے جسمانی خدمت لینے سے احتراز فرماتے تھے، چنانچہ ہم نے حضرت کی زندگی کے آخری دور میں دیکھا، جبکہ اس وقت حضرت از خود اٹھ کر کھڑے بھی نہیں ہو سکتے تھے، کہ اگر کبھی رات کو حضرت کو باتھ روم جانے کی ضرورت ہوتی تو دیوار کو پکڑ کر خود چلے جانے کی کوشش کرتے مگر حتی الوسع کسی کو نیند سے بیدار کرنے سے احتراز فرماتے۔ اسی طرح حضرت کو یہ بھی گوارہ نہیں ہوتا تھا کہ کوئی نیا آدمی آپ کے جسم اور پاؤں دبائے، خصوصاً علما اور اکابر کی اولاد سے، بہت ہی احترام و عزت کا معاملہ فرماتے اور ان کو اپنے برابر میں بٹھاتے۔ اسی طرح آپ ہر آدمی سے ہدیہ لینے سے بھی احتیاط فرماتے، الا یہ کہ اس سے بے تکلفی ہو۔ اسی طرح جس آدمی کی کمائی کے بارے میں شک ہو، اس سے بھی ہدیہ لینے سے احتراز فرماتے۔ عام طور پر مال دار حضرات، علمائے کرام کو مستحق اور ضرورت مند سمجھتے ہیں، اس لیے اگر حضرت کے متعلقین میں سے کوئی صاحبِ حیثیت آپ کو کچھ پیش کرتا تو استفسار فرماتے یہ کس لیے ہے؟ اگر کہا جاتا کہ آپ کے لیے ہے تو آپ کا اگلا سوال ہوتا یہ زکوٰۃ تو نہیں ہے؟ پھر فرماتے: زکوٰۃ کے مستحق اور مصرف غربا، فقرا اور مساکین ہیں، زکوٰۃ ان کو دی جائے۔ اگر کسی سے بے تکلفی ہوتی اور وہ ہدیہ وغیرہ پیش کرتا تو یہ کہتے ہوئے کہ یہ آپ کا ہمارے لیے تبرک ہے، نہایت بشاشت سے وصول فرماتے اور اسے لے کر جیب میں رکھ لیتے تھے۔

اللہ تعالیٰ نے حضرت امام اہل سنتؒ کو حد درجہ کا استغنا، زہد، تقویٰ اور احتیاط عطا فرمائی تھی، آپ نے اتباع نبوی میں ساری زندگی قوت لایموت اور عسر و تنگی کے ساتھ گزاری مگر مال اور مال داروں سے ہمیشہ کنارہ کش رہے۔

سابق صدر پاکستان جناب محمد رفیق تارڑ آپ کے عقیدت مندوں میں سے تھے۔ جن دنوں وہ صدر پاکستان بنے تو انہوں نے خدمت میں حاضری کی اجازت چاہی تو حضرت امام اہل سنتؒ نے یہ کہہ کر ان کو آنے سے منع فرما دیا کہ جب آپ میرے پاس آئیں گے تو لوگ یہی سمجھیں گے کہ صدر صاحب میرے عقیدت مند ہیں۔ پھر لوگ مجھ سے جائز و ناجائز کاموں کی سفارش کی درخواست کریں گے جو میرے اور آپ دونوں کے لیے مشکلات کا سبب ہوگا، اس لیے آپ نہ ہی آئیں۔

آپ دین اور دینی کاموں میں بہت ہی خوش دلی اور بشاشت سے خرچ فرماتے بلکہ اس کو اپنے لیے سعادت سمجھتے تھے، چنانچہ شروع سے ہی حضرت کے نام پر ماہنامہ بینات اعزازی طور پر جاری تھا، مگر بایں ہمہ حضرتؒ کا اصرار رہتا کہ مجھ سے بینات کا زر سالانہ وصول کیا جائے اور میری وجہ سے ادارہ پر بوجھ نہیں پڑنا چاہیے، لیکن دوسری طرف حضرت بنوری قدس سرہ کا

فرمان تھا کہ نہیں آپ کے نام بینات اعزازی ہی رہے گا۔ سوء اتفاق کہ ایک بار ناظم بینات نے سہواً آپ کے نام جانے والے شمارے پر زر سالانہ کے ختم ہو جانے کی مہر لگا کر بھیج دیا۔ اس پر حضرتؒ نے فوراً زر سالانہ بھیج دیا۔ دفتر بینات میں جب وہ رقم پہنچی تو دفتر سے واپس یہ عریضہ ارسال کیا گیا کہ حضرت آپ کا رسالہ تو اعزازی ہے، مگر غلطی کی بنا پر آپ کے رسالہ پر ارسال چندہ کی مہر لگ گئی تھی، لہٰذا آپ کا زر سالانہ واپس کیا جاتا ہے۔ اس پر حضرت نے نہ صرف یہ کہ چندہ واپس نہیں لیا بلکہ درج ذیل خط لکھ کر ادائیگی چندہ پر خوشی کا اظہار فرمایا۔ لیجیے، حضرت کی اولوالعزمی اور مال و زر سے بے اعتنائی ملاحظہ فرمائیے:

باسمہ سبحانہ

منجانب: ابی الزاہد

الیٰ محترم المقام جناب حضرت مولانا..... صاحب دامت برکاتہم

وعلیکم السلام ورحمۃ اللہ وبرکاتہ، مزاج سامی!

آپ کا محبت نامہ، شفقت بھرے الفاظ سے ملا، آپ کی اس حسن ظنی، کرم فرمائی اور ذرہ نوازی کا صمیم قلب سے صد شکریہ، محترم المقام! راقم نے پہلے بھی دو تین مرتبہ پیشکش کی تھی اور جب کراچی آیا تھا تو خاصا اصرار بھی کیا تھا کہ ماہنامہ بینات کا چندہ راقم سے لیا جائے، لیکن اکابر کی بزرگانہ شفقت اور حکم کی تعمیل میں بالآخر خاموش رہا۔

اب جب چندہ کا حکم آیا تو خوشی بھی ہوئی کہ راقم کا بوجھ ادارہ پر نہ رہا اور ذہن میں یہ بات بھی آئی کہ ملکی حالات کے پیش نظر ادارہ کو مالی استحکام کی ضرورت درپیش ہوگی، بہر حال یہ رقم بڑی خوشی سے بھیجی ہے، ناگواری مطلقاً نہیں ہوئی۔ پاکستانی رسالوں میں صرف ''بینات'' ہی وہ رسالہ ہے، جس کو راقم ذوق وشوق سے پڑھتا ہے اور خصوصاً ''بصائر وعبر'' کو تو بے حد مزے لے لے کر پڑھتا ہے اور اس کا انداز تحریر عالمانہ اور ناصحانہ مواعظ اور حق گوئی کا بے نظیر جذبہ دیکھ کر دل سے دعائیں نکلتی ہیں اور حضرت العلام مولانا سیّد محمد یوسف بنوری دامت برکاتہم اور دیگر اصحاب مضامین کے علمی اور تحقیقی جواہر پاروں کو دیکھ کر دل باغ باغ ہو جاتا ہے اور بعض اوقات بڑی قیمتی معلومات حاصل ہوتی ہیں اور بعض ایسے مسائل کی طرف توجہ ہوتی ہے جو وقت کے اہم اور علمی طور پر بڑے دقیق مسائل ہوتے ہیں اور راقم تو حضرت مولانا بنوری صاحب دامت فیوضہم کی علمی اور تحقیقی ابحاث کا اور خصوصیت سے وسعت نظری کا ویسے بھی قائل ہی نہیں بلکہ مداح ہے اور ''بصائر وعبر'' کے مضمون سے تو خوشہ چینی کا اور ایک گونہ ملاقات کا شرف حاصل ہو جاتا ہے، راقم آپ کا اور تمام حضرات کا تہہ دل سے ممنون ہے تمام حضرات کو درجہ بدرجہ سلام مسنون ارشاد فرمائیں اور دعوات صالحہ میں یاد رکھیں۔

والسلام

احقر ابوالزاہد محمد سرفراز از گکھڑ

۲۳؍صفر ۱۳۹۲ھ، مطابق ۸؍اپریل ۱۹۷۲ء

آخری کچھ سالوں سے حضرت امام اہل سنتؒ قریب قریب صاحب فراش ہو گئے تھے اور گزشتہ کچھ عرصہ سے آپ نے تقریباً کھانا پینا ترک کر دیا تھا۔ حضرت فرماتے تھے کہ بھوک و پیاس نہیں لگتی۔ خدام، متعلقین اور معالجین نے جب بہت

اصرار کیا اور کہا کہ اس طرح تو کمزوری ہو جائے گی تو فرمایا ترمذی شریف لاؤ۔ ترمذی شریف لائی گئی تو آپ نے ابواب الطب کی درج ذیل حدیث کی طرف راہنمائی کرتے ہوئے فرمایا کہ: مریض کو کھانے پینے پر مجبور نہیں کرنا چاہیے، اس لیے کہ حدیث میں اس کی ممانعت وارد ہوئی ہے، اور یہ حدیث نکال کر دکھا دی:

"عن عقبة بن عامر الجهنى رضى الله عنه قال قال رسول الله صلى الله عليه وسلم لا تكرهوا مرضاكم على الطعام فان الله تبارك وتعالىٰ يطعمهم ويسقيهم، هذا حديث حسن غريب لا نعرفه الا من هذا الوجه۔" (ترمذی، ص:۲۵، ج:۲، ابواب الطب)

ترجمہ: ''حضرت عقبہ بن عامر جہنی رضی اللہ عنہ فرماتے تھے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اپنے مریضوں کو کھانے پر مجبور نہ کیا کرو، بے شک اللہ تعالیٰ انہیں کھلاتے اور پلاتے ہیں۔''

ایک بار راقم الحروف نے عرض کیا: حضرت! بھوک لگتی ہے؟ فرمایا: نہیں۔ دوبارہ عرض کیا: پیاس لگتی ہے؟ فرمایا: نہیں۔ تب راقم نے عرض کیا: اس کا معنی یہ ہے کہ آپ کو اپنے شیخ، شیخ الاسلام حضرت مولانا سیّد حسین احمد مدنی قدس سرہ سے اس اعتبار سے بھی مشابہت تامہ حاصل ہوگئی ہے کہ آپؒ نے بھی آخر میں کھانا پینا چھوڑ دیا تھا۔ اس پر صرف مسکرا کر خاموش ہو گئے۔ ایک اور مرحلہ پر جب آپ نے کھانے پینے سے صاف منع فرما دیا تو ازراہ بے تکلفی راقم نے عرض کیا: اس کا معنی یہ ہے کہ ملکوتی صفات کا غلبہ ہو رہا ہے؟ فرمایا: یہ تمہاری سوچ ہے۔ غرض اللہ تعالیٰ نے حضرتؒ کو غیر معمولی اوصاف وکمالات سے سرفراز فرمایا تھا۔ اللہ تعالیٰ ہمیں بھی ان کے نقش قدم پر چلنے اور ان کے مشن کو جاری رکھنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین۔

قاضی عبدالرحمٰن فرماتے ہیں کہ نصرۃ العلوم کے ساتھ گلی میں مسجد تھی، میں وہاں امام تھا۔ حضرت شیخ الحدیث گکھڑ سے گوندانوالہ اڈے تک گاڑی میں آتے، وہاں سے پیدل مسجد تک آتے۔ وہاں وضو فرماتے، پھر مجھے ساتھ لے کر مدرسہ میں پڑھانے تشریف لے جاتے تھے۔ حضرت سے کافی بے تکلفی تھی۔ حضرت کبھی کبھی مذاق بھی فرماتے تھے۔ ایک مرتبہ حضرت شیخ الحدیث نے مجھ سے سو روپے قرض لیا۔ میں نے پھر اس مسجد کی امامت چھوڑ دی اور پنجن کسانہ ضلع گجرات چلا گیا۔ حضرت کو اطلاع بھی نہ کی اور رابطہ بھی نہ رکھ سکا۔ تقریباً تین سال بعد مجھے ایک سو روپے کا منی آرڈر وصول ہوا۔ میں نے سوچا کہ مجھے منی آرڈر بھیجنے والا کون ہو سکتا ہے۔ دیکھا تو وہ منی آرڈر امام اہل سنت کی طرف سے تھا۔ ساتھ حضرت نے شکوہ بھی لکھا ہوا تھا کہ آپ بتا کر نہیں گئے اور رابطہ بھی نہ رکھا۔ میں نے آپ سے سو روپے بطور قرض لیے ہوئے تھے، اس کی ادائیگی کے لیے کافی پریشان تھا کہ کیسے ادائیگی کروں اور کہاں کروں۔ آپ کی پنجن کسانہ میں موجودگی کی اطلاع ملتے ہی سو روپیہ منی آرڈر کر رہا ہوں۔ ملتے ہی مجھے اطلاع ضرور کر دینا تاکہ میرا بوجھ ہلکا اور پریشانی ختم ہو سکے۔

(ماہنامہ ہدی للناس گوجرانوالہ، امام اہل سنت نمبر، جون ۲۰۰۹ء)

مولانا مفتی محمد زاہد*

حضرت مولانا محمد سرفراز خاں صفدرؒ کا سانحۂ ارتحال

حضرت مولانا محمد سرفراز خاں صفدر رحمہ اللہ اپنے وقت کے ان گنے چنے لوگوں میں سے تھے جن میں پرانے زمانے کے علما اور بزرگانِ دین کی جھلک واضح طور پر دیکھی جا سکتی تھی۔ ایسی کثیر الجہۃ شخصیات بہت کم وجود میں آتی ہیں۔ انہوں نے علمائے سلف کی طرح حصولِ علم کے لیے نہ معلوم کہاں کہاں کی خاک چھاننے کے بعد آخر میں دار العلوم دیوبند جیسے منبع صافی سے علمی پیاس بجھائی، بلکہ زیادہ صحیح لفظوں میں علم کی تشنگی بھڑکائی۔ درس وتدریس حضرت کی زندگی کا ایک اہم حوالہ ہے۔ حضرتؒ کے پاس کچھ عرصہ بیٹھنے ہی سے آپ کے راسخ فی التدریس ہونے کا اندازہ ہو جاتا اور پتا چل جاتا تھا کہ آپ دینی مدارس کے درس وتدریس کی زندگی کی ایک ایک رگ سے بخوبی واقف ہیں۔ وسعتِ مطالعہ آپ کی زندگی کا ایک دوسرا اہم حوالہ ہے۔ یہ چیز آپ کی تالیفات کی سطر سطر سے اور آپ کے شاگرد بتاتے ہیں کہ آپ کے درس کے لمحے لمحے سے واضح طور پر ٹپکتی تھی۔ تصنیف وتالیف آپ کے تعارف کا ایک اور حوالہ ہے۔ آپ نے درجنوں کتابیں اپنی یادگار چھوڑی ہیں جن میں سے بعض تو بہت مقبول ہوئی ہیں۔ ایسے نہ معلوم کتنے لوگ ہوں گے جن کی تحقیق کا منتہا یہ ہوگا کہ آپ کی کتابوں سے مستفید ہو کر ان میں دیے گئے حوالوں کی اصل کتب سے مراجعت کر لیں۔ اہلِ علم بالخصوص حدیث پڑھانے والوں کے لیے تو ان کی کتابیں مفید بلکہ تقریباً ناگزیر ہوتی ہی تھیں، بھاری بھرکم علمی مواد کے باوجود عام پڑھے لکھے مسلمان بھی ان سے مستفید ہوتے تھے۔ ہمارے ایک نانا (والدہ کے چچا) دینی مزاج رکھنے والے اور مطالعے کے شوقین ڈاکٹر تھے۔ اس زمانے میں ڈاکٹر بہت پڑھی لکھی ہستی سمجھا جاتا تھا۔ ان کے ترکے میں دینی اور تاریخی کتابوں کا بہت بڑا ذخیرہ تھا جن کا ایک حصہ بعض ورثہ نے ہمارے والد صاحب کو دے دیا تھا۔ ان میں حضرتؒ کی بھی متعدد کتب موجود تھیں۔ مجھے یاد پڑتا ہے کہ بچپن میں حضرت کے نام اور آپ کی کتابوں سے تعارف اسی ذخیرے کے ذریعے ہوا۔ کہنے کا مقصد یہ کہ آپ کی تصانیف اہلِ علم کے علاوہ عام صاحبِ مطالعہ مسلمانوں کے لیے بھی باعثِ افادہ تھیں۔

آپ کی تصانیف متعدد موضوعات پر ہیں، لیکن آپ کی تصانیف میں بیشتر حصہ ان کتابوں کا ہے جن کا تعلق مختلف بعض حلقوں کی طرف سے پیدا کیے جانے والے شکوک وشبہات کے ازالے اور اہل السنۃ والجماعۃ خصوصاً علمائے دیوبند کے نقطۂ نظر کو دلائل سے ثابت کرنے سے ہے۔ اس طرح کے ردّ وقدح اور بحث ومباحثے کے نتیجے میں عام طور پر گفتگو اور لہجے میں تلخی اور درشتی پیدا ہو جاتی ہے، لیکن حضرتؒ نے اپنے دامنِ قلم وزبان کو اس سے ہمیشہ محفوظ رکھا۔ ہمیشہ سادہ واضح انداز میں دلیل کے ساتھ بات کی۔ آپ کی بیشتر کتب کا تعلق اگرچہ بحث مباحثے اور بعض حلقوں کی تردید سے ہے، لیکن چونکہ آپ

* شیخ الحدیث جامعہ اسلامیہ امدادیہ فیصل آباد۔

نے ہمیشہ علم اور دلیل کی زبان میں بات کی ہے، اس لیے آپ کی تصانیف میں حدیث، فقہ اور اصول فقہ وغیرہ کے متعلق بیش بہا مباحث زیرِ قلم آ گئے ہیں جو ان اختلافی مسائل سے ہٹ کر بھی اپنی افادیت رکھتے ہیں۔ یہ مباحث بکھرے موتیوں کے طور پر آپ تصانیف میں جا بجا متفرق طور پر موجود ہیں۔ یہ بہت اچھی بات ہے کہ آپ کے پوتے جناب عمار خاں ناصر نے انہیں ایک لڑی میں پرونے اور مرتب کرنے کا بیڑا اٹھایا ہے۔

آپ کی زندگی اور جدّ وجہد کا بہت اہم پہلو عوامی دعوت اور تذکیر ونصیحت کا کام ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ درس وتدریس اور تصنیف وتالیف کا مشغلہ خاص طور پر جبکہ اس کے ساتھ دیگر حلقہ ہائے فکر کے ساتھ مباحثے کا کام بھی شامل ہو جائے تو اس کی وجہ سے آدمی عوام سے کٹ کر رہ جاتا ہے اور اس کی دعوتی اور واعظانہ سرگرمیاں بہت ہی سمٹ جاتی ہیں، بلکہ عموماً پبلک ڈیلنگ کا سلیقہ ہی ختم ہو جاتا ہے جس کی وجہ سے عام خلقِ خدا اس سے مستفید نہیں ہو پاتی، لیکن حضرتؒ کی زندگی اس سے بہت بڑا سبق آموز استثنا ہے۔ آپ کی تدریس، تصنیف اور مجادلہ حسنہ کی سرگرمیاں آپ کو عام خلقِ خدا سے کاٹ نہیں سکیں۔ عامۃ الناس کو آپ نے کس طرح مستفید اور سیراب کیا، حقیقت یہ ہے کہ آپ کی زندگی اور سیرت کا بہت بڑا عنوان ہے جس پر واقفانِ حال بہت تفصیل سے روشنی ڈال سکتے ہیں۔ حضرتؒ کے عوامی بیان کے بارے میں ایک عرصے تک احقر کا یہ تأثر رہا کہ اس میں خشک علمی زبان استعمال ہوتی ہوگی، بھاری بھرکم اصطلاحات کی کثرت ہوگی، فرقہ وارانہ مسائل کے علاوہ کوئی بات نہیں ہوتی ہوگی، لیکن جب پہلی دفعہ ایک عام مجمع میں حضرت کا بیان سننے کا اتفاق ہوا تو حیرت کی انتہا نہ رہی۔ آپ کے بیان میں علمی تثبت تو ہوتا، لیکن اصطلاحی یا مدرسانہ زبان کا دور دور تک کوئی نشان نہ ہوتا۔ وعظ ونصیحت کا سادہ دل فریب انداز جو از دل خیزد بر دل ریزد کا مصداق ہوتا۔ سنا ہے کہ گکھڑ کی مسجد میں اپنی مادری زبان پنجابی نہ ہونے کے باوجود پنجابی میں ہی درسِ قرآن اور درسِ حدیث دیتے۔ گوجرانوالہ ہی کے ہمارے ایک محترم ومکرّم دوست جناب قاری گلزار قاسمی صاحب ان بیانات اور دروس کو قلم بند کر کے اردو زبان میں منتقل کر رہے ہیں۔ اللہ تعالیٰ اسے نافع اور مقبول بنائیں۔ آمین۔

حضرت کی زندگی کا سب سے اہم پہلو تقویٰ، استقامت، قناعت، سادگی، جہدِ مسلسل، وقت کی قدر، تواضع، شفقت، تصنع سے پاک انداز وغیرہ وہ بے شمار خوبیاں تھیں جن میں اللہ تعالیٰ نے آپ کو بزرگانِ سلف کا نمونہ بنایا تھا۔ حضرت سے طویل عرصے تک مستفید ہونے والے اور آپ کی صحبتِ طویلہ اٹھانے والے تو ان اوصافِ حمیدہ کے گواہ ہیں ہی، کبھی کبھار آپ کی خدمت میں حاضر ہونے اور شفقت وبرکت حاصل کرنے والے بھی انہیں بے تکلف محسوس کیے بغیر اور ان سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہتے تھے۔ آپ نے وقت کی ایسی قدر کی کہ آپ کی خدمات کے شعبوں میں سے صرف کسی ایک کو دیکھا جائے تو محسوس ہوتا ہے کہ آپ کو زندگی بھر کسی اور کام کے لیے وقت ہی نہیں ملا ہوگا۔ اس کے باوجود ملنے جلنے کے انداز سے کہیں مصروفیات کا ہوایا ''لامساس'' والا انداز نظر نہیں آتا تھا۔ سب کام انجام پا رہے تھے لیکن انہیں احساس تک نہیں تھا کہ میں بہت کچھ کر رہا ہوں۔ یہ سب وقت میں برکت کے کرشمے تھے۔ جب وقت سے برکت اٹھ جاتی ہے تو وہ صورتِ حال ہوتی ہے جو ہمارے والد صاحبؒ فرمایا کرتے تھے کہ آج کے بڑے شہروں کی زندگی میں جسے کوئی کام نہ ہو، وہ بھی بہت 'مصروف' ہوتا ہے، اور کسی کام کے نہ ہونے کا سب سے بڑا عذر اس کے پاس یہی ہوتا ہے ''بس جی کیا کریں فرصت ہی نہیں ملی''۔ حضرتؒ ایک غیر معروف سے گھرانے میں پیدا ہوئے، اپنی لگن، دھیمی دھیمی مسلسل رفتار کی برکت سے علمی اور دینی دنیا

میں ایک حوالہ بن گئے۔ آج دنیا کا شاید ہی کوئی خطہ ایسا ہو جہاں قابلِ ذکر تعداد میں مسلمان آباد ہوں اور وہاں حضرتؒ کا بالواسطہ یا بلاواسطہ فیض نہ پہنچا ہو۔

حضرتؒ نے جہاں درجنوں تصانیف، لاتعداد شاگردوں، بے شمار مستفیدین جن کی زندگیاں آپ کی برکت سے بدلیں اور جامعہ نصرۃ العلوم جیسے اداروں کی شکل میں گوناگوں صدقاتِ جاریہ چھوڑے ہیں، وہیں اللہ تعالیٰ نے آپ کو ان خوش قسمت لوگوں میں سے بنایا ہے جنہیں ان کے مشن کو لے کر آگے چلنے والی صالح اولاد نصیب ہوئی۔ الحمد للہ حضرتؒ کے صاحبزادگان حضرت کی زندگی اور خدمات کے مختلف شعبوں کو باحسن طریق سنبھالے ہوئے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان کی خدمات میں مزید برکت، نافعیت اور مقبولیت عطا فرمائیں۔ حضرتؒ نے اپنے انتقال سے کچھ عرصہ قبل حضرت مولانا زاہد الراشدی صاحب مدظلہم کے بارے میں وصیت فرمائی تھی کہ ان کی نمازِ جنازہ وہ پڑھائیں۔ یہ یقیناً حضرت کی طرف سے مولانا راشدی پر اعتماد کا اظہار ہے جو ان کے لیے سند کی حیثیت بھی رکھتا ہے اور سعادت بھی۔

حضرت کی نماز جنازہ کے لیے آنے والا انسانوں کا ٹھاٹھیں مارتا سمندر جس کی نظریں بہت کم ملتی ہیں، ثم یوضع له القبول فی الأرض کا واضح مصداق نظر آ رہا تھا۔ ایک بہت بڑے میدان کا دامن جنازہ پڑھنے والوں کے لیے تنگ پڑ گیا تھا۔ ہمیں تو گراؤنڈ میں جنازہ ادا کرنے کی جگہ مل گئی تھی، لیکن بتانے والوں نے بتایا کہ جی ٹی روڈ پر بھی دور دور تک جنازہ پڑھنے والے کھڑے تھے۔ جو لوگ جنازے میں شرکت سے رہ گئے، ان کی تعداد بھی بہت زیادہ تھی۔ ذلك فضل الله یؤتیه من یشاء۔ حقیقت یہ ہے کہ حضرتؒ ان بزرگوں میں سے تھے جن کا وجود ہی بہت بڑا سہارا اور تسلی کا سامان ہوتا ہے۔ یہ تصور ہی بہت ہوتا ہے کہ وہ سر پر موجود ہیں۔ ان سے مل کر اور شفقتیں سمیٹ کر نئی زندگی کا احساس ہوتا تھا۔ ان بزرگوں کا وجود ہی نہ معلوم کتنے فتنوں کے آگے رکاوٹ ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ حضرت کی کامل مغفرت فرما کر انہیں درجات رفیعہ عطا فرمائیں۔ اللهم لا تحرمنا اجره ولا تفتنا بعده.

> حضرت کے صاحبزادے مولانا عزیز الرحمٰن شاہد جب گوجرانوالہ کے پوش ایریا واپڈا ٹاؤن کی مرکزی جامع مسجد میں خطیب مقرر ہوئے تو حضرت امام اہل سنت نے ان کو نصیحت کرتے ہوئے فرمایا: دیکھو بیٹا! نوکری اور ملازمت نہیں کرنی۔ واپڈا ٹاؤن پوش ایریا ہے، وہاں پر امیر اور دولت مند لوگ رہتے ہیں۔ وہاں حق گوئی سے کام کرنا، بات سچ کرنا۔ ہمارے اکابر کا یہی طریقہ کار رہا ہے۔ وہاں کی دولت کی وجہ سے، روپے پیسے کی وجہ سے کہیں زبان لڑکھڑا نہ جائے۔ اپنے اکابر کا دامن نہ چھوڑنا، تیری زبان سے حق سچ ہی ہمیشہ نکلنا چاہیے، البتہ زبان کا لب ولہجہ نرم رکھنا۔ حضرت امام اہل سنت کا اپنا طریقہ کار بھی یہی تھا۔ ہمیشہ حق گوئی ہی سے کام لیا۔ حضرت کی تحریر بھی ہمیشہ ایسی ہی ہوتی تھی کہ جب کسی باطل کے خلاف لکھنا شروع کرتے تو حضرت کے دلائل کے سامنے باطل کے دلائل کرچی کرچی ہوتے محسوس ہوتے، مگر اس کے باوجود زبان اور قلم کے استعمال میں اعتدال کا دامن نہ چھوڑتے۔
>
> (ماہنامہ ہدی للناس گوجرانوالہ، امام اہل سنت نمبر، جون ۲۰۰۹ء)

مولانا محمد جمال فیض آبادی*

اک شمع رہ گئی تھی سو وہ بھی خموش ہے

۷؍ جمادی الاولیٰ ۱۴۳۰ھ کو پاکستان کے مشہور عالم دین، شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی کے شاگرد رشید حضرت مولانا ابوالزاہد محمد سرفراز خان صفدر رحمۃ اللہ علیہ بھی اللہ کو پیارے ہو گئے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

شب و روز کے ہنگاموں میں نہ جانے کتنوں کے بارے میں یہ خبر ملتی ہے کہ وہ ہم سے رخصت ہو گئے، لیکن ایسے بہت کم ہوتے ہیں جن کی وفات کی خبر دلوں پر بجلی سی گرا دے، جن کا آفتاب زندگی مشرق میں غروب ہو تو مغرب والے اندھیرا محسوس کریں اور جن کی یاد ان لوگوں کے دل میں بھی ہوک پیدا کر دے جو ان سے رشتہ داری کا رسمی رابطہ بھی نہیں رکھتے۔ اللہ تعالیٰ حضرت مولانا سرفراز خان صفدرؒ پر اپنی رحمتوں کی بارش برسائے، وہ ایسے لوگوں میں سے تھے جو اپنے خلوص وللہیت، مجاہدانہ عزم وعمل، زہد وتقویٰ، دینی غیرت وحمیت، اشاعت دین اور پرخلوص دینی خدمات کی وجہ سے علمی اور دینی حلقوں میں ہر دل عزیز شخصیت کے مالک تھے۔ جو شخص بھی علم دین، مذہب اسلام کی صحیح ترجمانی اور تعلیمات اسلام کو خیر القرون کے نہج پر سمجھنے کی کچھ بھی قدر وقیمت اپنے دل میں رکھتا ہے، اس کے لیے مولانا مرحوم رحمۃ اللہ علیہ کی وفات ایک عظیم سانحہ ہے۔

فضلائے دار العلوم دیوبند میں جن اہل علم اور بااخلاص علمانے برصغیر خصوصاً خطہ ہندستان، پاکستان وافغانستان کو اپنے ایمان ویقین اور دین کی صحیح ترجمانی کر کے جگمگایا تھا، اب وہ ایک ایک کر کے کافی تعداد میں رخصت ہو چکے ہیں۔ ہم لوگوں سے رخصت ہو کر ہر جانے والا اپنے پیچھے ایسا مہیب خلا چھوڑ کر جا رہا ہے جس کے پر ہونے کی امید نظر نہیں آتی۔ جہاں تک علم، حروف، نقوش اور فنی مہارت کی بات ہے تو اس کے شناوروں کی آج بھی زیادہ کمی نہیں ہے اور امید ہے کہ بعد میں بھی اس کی زیادہ کمی محسوس نہ ہوگی، لیکن دین کا وہ ٹھیٹھ مذاق ومزاج، خلوص وللہیت، تقویٰ وطہارت، سادگی وقناعت اور تواضع وانکساری کا وہ البیلا انداز جو کتابوں سے نہیں بلکہ بزرگوں کی نظر کرم اور ان کی صحبت سے حاصل ہوتا ہے، اب مسلسل سمٹ رہا ہے اور اس خسارے کی تلافی کا کوئی راستہ بھی نظر نہیں آ رہا ہے۔

حضرت مولانا سرفراز خان صفدر کی پیدائش اپنے آبائی وطن میں ۱۹۱۴ء میں ہوئی۔ ابتدائی تعلیم اپنے قرب وجوار میں حاصل کی، علم حدیث کے لیے دار العلوم دیوبند کا سفر کیا اور دار العلوم دیوبند میں داخلہ لے کر حضرت شیخ الاسلام مولانا سید حسین احمد مدنیؒ اور شیخ الادب حضرت مولانا اعزاز علی صاحب امروہویؒ جیسی نابغہ روزگار ہستی کے سامنے زانوئے تلمذ تہہ کیا۔ دار العلوم دیوبند سے آپ نے غالباً ۱۹۴۱ء میں فراغت حاصل کی ہے۔ حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ دار العلوم دیوبند کے ایام طالب علمی کے بارے میں ایک جگہ تحریر فرماتے ہیں کہ ہم نے اپنے دور طالب علمی کا مختصر مگر بہترین حصہ حضرت شیخ الاسلام

*انجمن تقویۃ الاسلام، شعبہ مناظرہ (دار العلوم دیوبند، انڈیا)

اور اساتذۂ دار العلوم دیوبند کی خدمت میں گزارا، ان سے حدیث نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم حاصل کی اور ساتھ ساتھ ان اساتذہ کی مشفقانہ تربیت سے فیض یاب ہونے کی کوشش کی۔ (شیخ الاسلام نمبر، شائع کردہ مدرسہ اسعد بن زرارہ پاکستان)

حضرت مولانا مرحومؒ دار العلوم سے فراغت کے بعد اپنے علاقہ میں گئے اور وہیں خدمت دین میں لگ گئے۔ آپ کا مشغلہ درس وتدریس اور تصنیف وتالیف کا رہا۔ آپ ایک عرصہ تک مدرسہ نصرۃ العلوم گوجرانوالہ کے شیخ الحدیث رہے۔

حضرت مولانا مرحوم کو کبھی دیکھنے کا موقع نصیب نہ ہوا اور نہ براہ راست ان سے کبھی گفتگو ہوئی۔ ہاں، ان کی تصنیف کردہ کتابوں سے استفادہ کرنے کا خوب موقع ملا۔ خصوصاً دار العلوم دیوبند کی مایہ ناز انجمن ''انجمن تقویۃ الاسلام شعبہ مناظرہ'' سے منسلک ہونے کے بعد اکثر فرق باطلہ کے رد میں پروگرام کی تیاری کے لیے حضرت مولانا مرحومؒ کی کتابیں نظر سے گزریں۔ حضرت مولانا مرحوم فرق باطلہ اور اسلام کے خلاف اٹھنے والے ہر فتنہ کے خلاف ہمیشہ تیار رہتے تھے اور ان کے دنداں شکن جواب دینے کے لیے ہر وقت کمر بستہ رہتے تھے۔ حضرت مولانا کی تصانیف اس کی واضح دلیل ہیں۔ آپ نے اسلام مخالف عقائد رکھنے والوں اور اسلامی تعلیمات کو مسخ کر کے پیش کرنے والوں کے خلاف لکھا اور خوب لکھا۔ حدیث نبوی پر بھی آپ نے قلم اٹھایا ہے اور ترمذی شریف کی بہت ہی عمدہ اور جامع شرح لکھی ہے۔

کل تصانیف کی تعداد تقریباً تین درجن ہے۔ اخیر عمر کی تصانیف جو ابھی دیوبند نہیں پہنچی ہیں، بندہ کو ان کا علم نہیں۔ اسلامی تعلیمات، عقائد اسلام، شرک وبدعت کے خلاف، اندرون خانہ اسلامی تعلیمات کو مسخ کرنے والوں کے خلاف اور حدیث نبوی پر آپ نے کافی علمی ورثہ چھوڑا ہے۔ مرحوم کی ہر کتاب اپنے موضوع پر مکمل، جامع، واضح اور مدلل ہے۔ ان کی ہر کتاب لائق استفادہ ہے۔ اسلامی لبادے میں رہ کر اسلام کو نقصان پہنچانے والوں سے پردہ اٹھانے، اندرون خانہ سازش کرنے والوں کو سمجھنے اور اسلامی تعلیمات میں شرک وبدعت کی آمیزش کرنے والوں کے خلاف تحریک چلانے کے لیے مرحوم کی کتابیں کافی کارآمد ہیں۔ ان کتابوں میں تسکین الصدور، ازالۃ الریب، انکار حدیث کے نتائج، الکلام المفید، احسن الکلام، آنکھوں کی ٹھنڈک، راہ سنت وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ ابھی گزشتہ سال آپ کی تصنیف ''انکار حدیث کے نتائج'' پر کل ہند تحفظ ختم نبوت دار العلوم دیوبند کے نائب ناظم حضرت مولانا شاہ عالم گورکھپوری نے منکرین حدیث کے تعارف پر مشتمل ایک قیمتی مقدمہ شامل کر کے شاہی کتب خانہ دیوبند سے شائع کیا ہے جس سے کتاب کی افادیت دوبالا ہوگئی ہے۔ بندہ اسی کتاب کے مطالعہ میں مصروف تھا کہ حضرت مولانا شاہ عالم صاحب کے ذریعے ہی ہمارے ممدوح کے انتقال کی خبر ملی جس سے یہ امید ہمیشہ کے لیے منقطع ہوگئی کہ دنیا میں حضرت ممدوح سے کہیں ملاقات ہو سکے گی۔

علم وفضل کی دنیا میں کبھی کمی نہیں رہی، لیکن اخلاص اور دین کی سچی تڑپ وہ جنس گراں ہے جو کہیں خال خال ہی ملتی ہے۔ اس اعتبار سے مولانا مرحوم کی وفات ملت کا ایسا نقصان عظیم ہے جس کی تلافی ممکن نہیں۔ مولانا کے ساتھ موجودہ صدی کی ایک تاریخ رخصت ہوگئی۔ وہ ان مقدس ہستیوں میں سے تھے جن کا صرف وجود بھی نہ جانے کتنے فتنوں کے لیے آڑ بنا رہتا تھا۔ اللہ تعالیٰ مولانا پر اپنی رحمتیں نازل فرما کر دار آخرت کا سکون اور چین نصیب فرمائے اور مرحوم کو جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام عطا فرمائے اور پس ماندگان کو صبر جمیل عطا فرمائے۔ آمین

(بشکریہ ہفت روزہ الجمعیۃ، نئی دہلی)

مولانا محمد اسلم شیخوپوری*

چند منتشر یادیں

استاد محترم مولانا محمد سرفراز خان صفدر رحمہ اللہ نے تقریباً نصف صدی تک مسند درس کو رونق بخشی۔ درس نظامی کی کم وبیش ساری کتابیں خاص طور پر ترجمہ وتفسیر قرآن، بخاری شریف اور ترمذی شریف انہیں بار بار پڑھانے کی سعادت حاصل ہوئی۔ پھر بھی دل میں حسرت ہی رہی کہ بعض کتابیں پڑھانے کا موقع نہ مل سکا۔ گزشتہ سال زیارت اور عبادت کے لیے حاضری ہوئی تو میں نے سوال کیا: حضرت کوئی ایسی حسرت جس کے ناتمام رہ جانے کا احساس ہوتا ہو؟ فرمایا: ''بہت ساری ہیں''۔ عرض کیا: ''ان میں سے کسی ایک کی نشاندہی فرما دیجیے''۔ فرمایا: ''درس نظامی کی چھوٹی کتابیں نہیں پڑھا سکا۔ یہ حسرت آج بھی دل میں ہے''۔ ذرا رک کر سوچیے! اگر یہ سوال ہم میں سے کسی سے کیا جائے تو جواب میں نجانے کتنی مادی حسرتیں قطار اندر قطار اپنی اپانی جانب اشارے کرتے دکھائی دیں گی۔ پرتعیش مکان، نئے ماڈل کی گاڑی، وسیع کاروبار، بھاری بھرکم بینک بیلنس، میلوں پھیلی ہوئی جائیداد، شہرت کا بام عروج، اقتدار کی بلند سے بلند تر منزل، شہوت رانی کے غلیظ سے غلیظ تر امکانات اور پتہ نہیں کیا کیا۔ کائنات کی سب سے سچی زبان نے فرمایا تھا: ''انسان بوڑھا ہو جاتا ہے، مگر اس کے دل میں پرورش پانے والی دو چیزیں جوان ہو جاتی ہیں۔ مال کی محبت اور طویل سے طویل تر زندگی کی چاہت''، مگر اللہ والوں کی چاہتیں بھی ان کی شان کے مطابق ہوتی ہیں۔ زندگی بھر درس وتدریس فرماتے رہے۔ صبح سے شام تک اور ہر روز یہی شغل، یہی فکر، بلا ناغہ اور بلا تعطل، پھر جب بڑھاپے اور امراض نے چلنے پھرنے سے عاجز کر دیا تو یہ حسرت پریشان کرتی رہی کہ کاش! فلاں اور فلاں کتاب کی تدریس کا موقع مل جاتا۔

تعلیم وتعلم اور تبلیغ واصلاح میں مصروفیت کا یہ عالم تھا کہ چار تو صرف درس قرآن کے حلقے تھے جن میں سے تین کے لیے روزانہ وقت دیتے تھے۔ نماز فجر کے بعد گکھڑ کی جامع مسجد میں ترجمہ وتفسیر بیان فرماتے۔ پچپن سال تک یہ سلسلہ پابندی سے چلتا رہا۔ ابتدا درس قرآن سے ہوئی۔ بعد میں ہفتے کے تین دن درس حدیث کے لیے مخصوص فرمائے۔ چنانچہ اس عوامی درس میں بخاری، مسلم، ترمذی، ابوداؤد، نسائی، ابن ماجہ اور مستدرک حاکم کے علاوہ حدیث کی کئی کتابوں کا درس دیا۔ درس قرآن کا دوسرا حلقہ آپ نے گورنمنٹ ایلیمنٹری آف دی ٹیچرز نامی کالج میں قائم کیا۔ جہاں پی ٹی سی اور او ٹی اور ایس وی کی کلاسیں لگتی تھیں۔ یہاں آپ چالیس سال تک درس دیتے رہے، حالانکہ یہ کالج آپ کی رہائش گاہ سے ایک میل کے فاصلے پر تھا اور آپ کو روزانہ آمد ورفت میں دو میل کی مسافت پیدل طے کرنا پڑتی تھی۔ تیسرا حلقہ مدرسہ نصرۃ العلوم میں تھا جہاں آپ متوسط اور منتہی طلبہ کو دو سال میں پورے قرآن کا ترجمہ اور تفسیر پڑھاتے تھے۔ چوتھا حلقہ جسے ہمارے ہاں دورہ

---

* کالم نگار ہفت روزہ ضرب مومن کراچی۔

تفسیر کا نام دیا جاتا ہے‘ مدارس کی سالانہ تعطیلات میں ہوتا تھا جس میں سینکڑوں طلبہ شریک ہوتے تھے۔ یہ دورہ پچیس برس تک ہوتا رہا۔ ان میں سے ہر درس کا اسلوب اور علمی سطح شرکاء کے اعتبار سے مختلف ہوتی تھی۔ ایک اندازے کے مطابق جن علما‘ طلبا اور جدید تعلیم یافتہ حضرات اور عام مسلمانوں نے ان حلقہ ہائے درس میں شرکت کر کے آپ سے براہ راست استفادہ کیا، ان کی تعداد چالیس ہزار سے زائد بنتی ہے۔

اس ناچیز نے دینی علوم کی تحصیل سے رسمی فراغت کے بعد جب اپنے گاؤں میں تعلیم وتبلیغ کا آغاز کرنا چاہا اور مشورہ کے لیے حضرت کی خدمت میں گکھڑ حاضر ہوا تو آپ نے اپنے ذوق کے مطابق بلا تاخیر درس قرآن شروع کرنے کا حکم دیا اور خود اپنے بارے میں فرمایا کہ میں نے جب ۱۹۴۳ء میں گکھڑ کی بوہڑ والی مسجد میں درس قرآن کا آغاز کیا تو صرف ایک آدمی بیٹھتا تھا اور تھا بھی وہ عام مزدور‘ مگر میں بھرپور تیاری کے بعد پورا گھنٹہ درس دیتا تھا۔ بعض دوستوں نے کہا بھی کہ جب کوئی سنتا ہی نہیں تو آپ اتنی مشقت کیوں برداشت کرتے ہیں؟ مگر میں نے استقامت سے یہ سلسلہ جاری رکھا۔ اب صورت یہ ہے کہ شرکا کی تعداد سو سے بھی زائد ہوتی ہے مگر مصروفیات کی وجہ سے میں صرف آدھ گھنٹہ درس دیتا ہوں۔ امام اہل سنت سواتی پٹھان تھے۔ مادری زبان پشتو تھی۔ اس کے باجود آپ عوامی درس اور خطبہ جمعہ ٹھیٹھ پنجابی میں ارشاد فرمایا کرتے تھے۔ مطالعہ اور مشق سے آپ نے اس میں ایسی مہارت حاصل کر لی تھی کہ ناواقف شخص پہچان نہیں سکتا تھا کہ آپ پنجابی ہیں یا پٹھان؟

ایک موقع پر کثرت مطالعہ کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا: ’’ایک زمانے میں میرے اوپر مطالعہ کی ایسی دھن سوار تھی کہ پنجابی ادب کی مشکل ترین کتابیں جو خود پنجابیوں کی نئی نسل کی سمجھ میں نہیں آتیں‘ مَیں نے ان کا بھی مطالعہ کیا‘‘۔ اسی سلسلے میں آپ نے بعض کتابوں کا نام بھی لیا اور حضرت کی زبان سے ان کتابوں کا شکر سننے کے بعد ہم نے بھی وہ کتابیں حاصل کیں اور ان سے بقدر ظرف استفادہ کیا۔ حصول علم اور مطالعہ کی یہ دھن اس وقت تک ذہن پر چھائی رہی جب تک ہوش وحواس قائم رہے۔ اس سلسلے کے کئی واقعات حضرت کے خصوصی خدام اور فرزندان گرامی سے سنے جا سکتے ہیں۔ وفات سے چند ہفتے پہلے حضرت مولانا مفتی محمد رفیع عثمانی صاحب حاضر خدمت ہوئے تو سلام اور خیریت دریافت کرنے کے بعد جو پہلا سوال کیا، وہ یہ تھا: ’’جامعہ اشرفیہ کے شیخ الحدیث صوفی محمد سرور صاحب نے آپ کے والد گرامی کے حوالے سے فلاں حدیث بیان کی ہے۔ مجھے اس کے حوالے کی تلاش ہے۔ آپ متعلقہ کتاب کی نشاندہی کیجیے‘‘۔

اللہ اکبر! کوئی حد ہے طلب اور جستجو‘ تحقیق اور تحصیل کی! پتا نہیں کب یہ حدیث آپ کو کسی نے سنائی ہوگی اور کب سے آپ اس انتظار میں تھے کہ اگر مفتی اعظم مرحوم کے علمی جانشینوں میں سے کوئی آیا تو میں اس سے حوالہ پوچھوں گا جبکہ حالت یہ ہے کہ چلنا پھرنا تو در کنار اٹھنا بیٹھنا اور کروٹ بدلنا بھی محال ہے۔ پھر یہ کہ مسئلہ بھی ایسا نہیں جس کی جوابدی اور تحقیق فوری ضروری ہو۔ جن لوگوں کو حصول علم کا چسکا نہیں لگا‘ وہ نہیں جانتے کہ وہ کون سی چیز ہے جو حقیقی تشنگان علم کو بے تاب رکھتی ہے اور ان کی زندگی کو فضولیات سے دور کر کے نظم وضبط کی کن پابندیوں میں جکڑ دیتی ہے۔

امام اہل سنت رحمہ اللہ نے جوانی ہی سے اپنے آپ کو جن معمولات کا عادی بنا لیا تھا‘ ان کے ہوتے ہوئے لایعنی کاموں کے لیے وقت بچ ہی نہیں سکتا تھا۔ برسہا برس تک جن معمولات کی آپ نے پابندی فرمائی‘ وہ یہ تھے: عشا کے بعد آرام‘ آخر شب نماز تہجد‘ فجر سے قبل ناشتہ‘ نماز فجر کی ادائیگی‘ اپنی ہی مسجد میں عوامی درس قرآن وحدیث‘ گوجرانوالہ روانگی

تین اہم کتابوں کی تدریس‘ وہاں سے گکھڑ واپسی‘ کالج میں درس قرآن‘ دوپہر کا کھانا‘ قیلولہ‘ نماز ظہر‘ مقامی بچیوں کو درس نظامی کی مختلف کتابوں کی تعلیم‘ مہمانوں سے ملاقات‘ تصنیف وتالیف‘ نماز عصر‘ تلاوت قرآن‘ تصنیف وتالیف‘ دم اور تعویذ‘ نماز مغرب‘ کھانا اور مطالعہ‘ نماز عشا‘ سونے کی تیاری۔

دم اور تعویذ کا یہ حال تھا کہ ضرورت مند کسی بھی وقت آ جاتے تھے انکار کرنا اور ڈانٹ کر بھگا دینا حضرت کی فطرت میں نہ تھا۔ چھوٹی چھوٹی پرچیاں ہر وقت جیب میں رہتیں۔ کوئی چلتے پھرتے بھی تعویذ کیلئے درخواست کرتا تو وہ انگلیوں پر پرچی رکھ کر تعویذ لکھ دیتے اور اس کا کوئی ہدیہ اور نذرانہ قبول نہ فرماتے۔ کوئی اصرار کرتا تو لے کر کسی غریب طالب علم یا عام آدمی کو دے دیتے۔ دوران درس کئی لوگ اپنے اپنے مسائل کے لیے تحریری طور پر دعا کی درخواست کرتے۔ آپ ایک ایک پرچی کھولتے اور ہر ایک کے لیے الگ الگ دعا کرواتے۔ ایسا ہرگز نہ کرتے کہ تمام پرچیاں پڑھنے کے بعد اجتماعی دعا کروا دی جائے۔ حضرت کی کس کس ادا کا ذکر کیا جائے؟ حقیقت میں وہ جامع الصفت انسان تھے۔ صاحب خلق عظیم کے سچے غلام!

تواضع کا یہ عالم تھا کہ اپنے شاگردوں کے شاگردوں سے بھی بے تکلف ہو جاتے اور ان کا ایسا اکرام فرماتے کہ وہ پانی پانی ہو جاتے۔ ناچیز نے حاضری کے موقع پر حضرت کے ہاتھوں کو بوسہ دیا تو جواب میں حضرت نے بھی خطاکار ہاتھوں پر اپنے بابرکت ہونٹ ثبت فرما دیے۔ یہ معاملہ صرف میرے ساتھ نہ تھا بلکہ دوسروں کے ساتھ بھی یہی معاملہ فرماتے تھے۔ مہمان نوازی کا یہ حال تھا کہ کوئی طالب علم بھی ملاقات کے لیے آ جاتا تو کھلائے پلائے بغیر جانے نہ دیتے۔ کراچی میں آج سے تقریباً پندرہ سولہ سال پہلے احقر کی کوششوں سے آپ کے اعزاز میں ’’امام اہل سنت کانفرنس‘‘ کے عنوان سے عظیم الشان عوامی اجتماع کا انعقاد کیا گیا۔ میری ناقص معلومات کے مطابق اس عنوان سے منعقد ہونے والی یہ پہلی کانفرنس تھی۔ جب آپ کے بیان کی باری آئی تو فرمایا: ’’گکھڑ کی جس مسجد میں نماز پڑھاتا ہوں، اس کا نام مسجد اہل سنت والجماعت ہے۔ غالباً اسی مناسبت سے مجھے ’’امام اہل سنت‘‘ کا لقب دیا گیا ہے‘‘۔

وقت کی پابندی کا اتنا اہتمام فرماتے کہ آپ کے معمولات دیکھ کر گھڑی کا ٹائم درست کیا جا سکتا تھا۔ اسی کا نتیجہ تھا کہ صبح سے رات تک درسی اور عوامی مصروفیات کے باوجود تصنیف وتالیف کے لیے کچھ نہ کچھ وقت نکال لیتے تھے۔ بھاگم دوڑ میں نکالے گئے وقت ہی میں آپ نے ساٹھ کے قریب ایسی کتابیں تحریر فرمائیں جن کی ثقاہت واستناد کی حکیم الاسلام قاری محمد طیب اور علامہ شمس الحق افغانی رحمہما اللہ سمیت دسیوں اکابر نے تصدیق فرمائی۔ اپنے ہم عصر علما اور مصنفین میں آپ وہ مصنف تھے جن کی علمی وتحقیقی کتابوں کو عوام میں بے حد پذیرائی حاصل ہوئی اور یکے بعد دیگرے ان کے کئی ایڈیشن شائع ہوئے۔

اولاد کے اعتبار سے بھی آپ بڑے خوش نصیب تھے۔ آپ کی تمام بیٹیوں اور بیٹوں نے قرآن کریم حفظ کیا ہے۔ ان میں اکثر باضابطہ عالم دین ہیں اور دینی خدمت سرانجام دے رہے ہیں۔ آپ کی ایک بیٹی نے چالیس سال کی عمر میں قرآن کریم حفظ کیا۔ اسے قرآن کے اعجاز کے سوا کیا کہا جا سکتا ہے؟ قرآن کے اعجاز کی ہلکی سی جھلک ان شخصیات میں بھی دکھائی دیتی ہے جو اپنی زندگیاں قرآن کے لیے وقف کر دیتی ہیں۔ یقیناً امام اہل سنت بھی ان میں سے ایک تھے۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ حضرت کے درجات کو بلند فرمائے اور ان کی جسمانی اور روحانی اولاد کو ان کی اصلاح‘ تبلیغی‘ تدریسی اور قرآنی خدمات کا سلسلہ جاری رکھنے کی توفیق عطا فرمائے۔

پروفیسر غلام رسول عدیم*

اک چراغ اور بجھا اور بڑھی تاریکی

لماذا تبکی الاعین یا حبیبی لماذا صارت افئدۃ ھواء؟

جس چیز کا آغاز ہے، اس کا انجام بھی ہے۔ تین چیزوں کے بارے میں کسی دور میں کسی بھی جگہ کبھی دو رائیں نہیں رہیں: ایک یہ کہ موت ایک اٹل، حتمی اور یقینی امر ہے۔ نہ اس سے راہ فرار، نہ گریز کی کوئی سبیل۔ حتی یاتیك الیقین کے جاندار اور شاندار الفاظ اسی حقیقت کے یقینی ہونے پر دلالت کر رہے ہیں۔ دوسرے یہ کہ اس کا وقت متعین ہونے کے باوجود اسے پردۂ خفا میں رکھا گیا ہے۔ کوئی نہیں جانتا کہ وہ گھڑی کون سی ہے جب موت کا فرشتہ روح قبض کرے گا۔ تاہم یہ ضرور ہے کہ ایک لمحے کی نہ تقدیم ہوگی، نہ تاخیر۔ افراد کے لیے بھی یہی ضابطہ ہے اور اقوام کے لیے بھی یہی قانون عالمگیر ہے۔ اذا جاء اجلھم لایستاخرون ساعۃ ولایستقدمون۔

ایک ہی قانونِ عالمگیر کا ہے سب اثر
بوئے گل کا باغ سے گل چیں کا دنیا سے سفر

تیسری بات یہ کہ کوئی نہیں جانتا کہ وہ کس جگہ پر داعیٔ اجل کو لبیک کہے گا۔ بای ارض تموت کے الفاظ اسی ازلی اور ابدی صداقت کی گواہی دیتے ہیں۔ بات یہ بھی قابل ذکر ہے کہ موت کی ماہیت وکنہ قابل فہم ہے نہ قابل گرفت۔ موت کا لفظ لرزہ خیز تصور کا مظہر سہی، مگر جب وہ آ جاتی ہے تو Death is a leveller کے مصداق نہ کوئی منصب مانع ہے نہ جاہ، نہ پست نہ بلند، نہ نشیب نہ فراز، نہ طبیب نہ دوا۔ ہر طبیب بے بس اور ہر دوا ناکارہ وازکار رفتہ۔

چوں قضا آید طبیب ابلہ شود
آں دوا در نفع خود گمرہ شود

پھر نہ کوئی تعویذ گنڈا نہ جھاڑ پھونک نہ دوا نہ دارو نہ دم نہ درود۔ بیماریوں کے علاج تو ہیں، موت کا کوئی علاج نہیں۔

واذا المنیۃ انشبت اظفارھا
الفیت کل تمیمۃ لا تنفع

بڑے بڑے صاحبان شوکت وحشمت نہ رہے، آخر بلانے والے نے انہیں موت کا پیالہ پلا ہی دیا۔

این الملوك التی کانت مسلطۃ
حتی سقاھا بکاس الموت ساقیھا

* چیف سکریسی آفیسر، بورڈ آف سیکنڈری اینڈ انٹرمیڈیٹ ایجوکیشن گوجرانوالہ

یہی وجہ ہے کہ سرکار رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم نے موت کو کثرت سے یاد کرنے کی تلقین فرمائی کہ دلوں کے صیقل کرنے کا، بہترین ذریعہ ہے۔ فرمایا:

ان ھذہ القلوب لتصدا کما یصدا الماء الحدید، قیل: ماجلاء ھا یا رسول اللہ؟ قال: کثرۃ ذکرۃ الموت وتلاوۃ القرآن۔

تاہم وہ لوگ جن کی نگاہ اس جہان کی دلچسپیوں سے گزر کر آخرت کی راحتوں اور نعمتوں پر جاٹکتی ہے، ان کے لیے موت تمام تر حسرت سامانیوں کے باوجود زندگی کے رجائی طرز فکر کی ترجمان بن جاتی ہے۔ وہ خود چلے جاتے ہیں مگر ان کا نام اور کام دور تک اور دیر تک اپنے اثرات قائم رکھتا ہے۔

مرنے والے مرتے ہیں لیکن فنا ہوتے نہیں
یہ حقیقت میں کبھی ہم سے جدا ہوتے نہیں

موت کا بس صرف ظاہری جسم تک چلتا ہے، روح اس کی دسترس اور دست برد سے بالکل محفوظ رہتی ہے۔

فرشتہ موت کا چھوتا ہے گو بدن تیرا
ترے وجود کے مرکز سے دور رہتا ہے

یہی وجہ ہے کہ شہیدان راہ وفا کے فراق جان وتن کو 'بل احیاء ولکن لاتشعرون' کے حیات بخش اعلان سے تعبیر کیا گیا ہے۔ ایسے لوگوں کے پیش نظر حیات جاودانی کے حصول کے لیے زندگی ہی میں ان گنت مواقع موجود ہوتے ہیں جن سے وہ اپنے کارہائے نمایاں کے ذریعے فائز المرام ہوتے ہیں۔ بظاہر ایسا لگتا ہے کہ وہ اسی زندگی کے انہماکات میں کھوئے ہوئے ہیں، مگر دراصل وہ توشۂ آخرت کے لیے اپنی تمام تر خداداد توانائیوں کو بروئے کار لاتے ہوئے بھرپور زندگی گزارتے ہیں اور خود افروزی اور جگر سوزی سے ''آج'' سے اپنے ''کل'' کے لیے عیش دوام کا استحقاق پیدا کر لیتے ہیں۔

وہ کل کے غم وعیش پہ کچھ حق نہیں رکھتا
جو آج خود افروز وجگر سوز نہیں ہے

ایسوں ہی کے لیے حالی نے کہا تھا:

دنیائے دنی کو نقش فانی سمجھو روداد جہاں کو اک کہانی سمجھو
پر جب کرو آغاز کوئی کام بڑا ہر سانس کو عمر جاودانی سمجھو

حضرت شیخ الحدیث مولانا سرفراز خان صفدر مرحوم کی زندگی بھی کچھ ایسی ہی بھرپور زندگی تھی۔ بچپن میں مستقبل کے سنہرے سپنے دیکھے مگر حالات کی سنگینیوں سے شاہراہ حیات کے جھاڑ جھنکاڑ سے گزرتے ہوئے بے داغ شباب تک پہنچے، تحصیل علم وحکمت کی امنگوں اور ترنگوں کی اوگھٹ گھاٹیوں سے گزرتے گزرتے میدان عمل میں اترے۔ یہاں حالات کی گردشیں تیز تر ہو گئیں۔ اشاعت دین کے لیے تعلیم وتدریس کا منہاج واضح اختیار کیا اور پھر یہی میدان آپ کی تگ وتاز کا مرکز ومحور بن گیا۔ ان کی تقریری وتحریری خدمات کا جائزہ لیا جائے تو ہزاروں مواعظ اور کوئی پچاس کے قریب کتابوں کا تحریری سرمایہ ان کے تبلیغی کارناموں کا گواہ ہے۔ ان تحریروں کو ایک نظر دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کی قرآن وحدیث

میں ژرف نگاہی، استنباط واستخراج مسائل کی خداداد صلاحیت، تفقہ فی الدین سے مسائل کی تہہ تک پہنچنے کی استعداد، اپنی بات کو مستحکم استدلال سے باور کرانے کا ملکہ ان کا طرہ امتیاز رہا ہے۔ وہ کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اپنا نقطہ نظر قائم کرتے ہیں اور پھر اپنے موقف کے لیے جس طرح استشہاد کرتے ہیں، مخالف سے مخالف اور معاند سے معاند بھی استدلال کی اس آہنی دیوار کے مقابلے میں اپنی آرا و قیاسات کو ریگ رواں پاتا ہے۔

وہ اولاً قرآن مجید سے دلائل و براہین کے انبار لگا دیتے ہیں۔ ثانیاً حدیث رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم سے اپنے نقطہ نظر کو تقویت دیتے ہیں۔ پھر تعامل صحابہ کے سہارے آگے بڑھ کر اسلاف کے آثار و اقوال کو پیش نظر رکھتے ہیں۔ اس سارے سرمایے کی روشنی میں اپنے موقف کی سچائی کو ثابت کرتے اور پھر اس پر سیسہ پلائی ہوئی دیوار کی طرح ڈٹ جاتے ہیں۔ پھر مخالفت کا کوئی سا بھی جھکڑ ان کے پائے استقلال میں ڈگمگاہٹ پیدا نہیں کر پاتا۔ یہاں جن حقائق کو پیش کیا گیا ہے، وہ خالص اور ٹھوس دینی حقائق ہیں۔ جس موضوع پر قلم اٹھایا، اس میں ان کی تحریریں حرف آخر ثابت ہوئیں۔ اصل چیز دین کے محض تحریری افکار و تصورات نہیں، مقرون اعمال واشکال ہیں۔ شیخ مرحوم نے ان کے لیے جو اساسیات اسلام پیش کیں، وہ اسلام کی سچی تعبیر ہیں۔ بدعات کی بیخ کنی دین کے اساسیات میں سے ہے۔ جب دین میں غیر ضروری، مفاد پرستانہ، خود غرضانہ آمیزشیں در آئیں تو دین اپنی اصل شکل میں نہیں رہ سکتا۔ ہر دور کے مجددین و مجتہدین نے سب سے زیادہ زور اسی نکتے پر دیا ہے۔ ایمانیات ہوں یا عبادات، اخلاق و عادات ہوں یا صالحیت عمل کی راہیں، ان میں بدعات واختراعات کی پچریں لگا کر دین کو خالص رکھا نہیں جا سکتا، درآنحالیکہ ادھر فرمان الٰہی ہے: وما امروا الا لیعبدو اللہ مخلصین لہ الدین۔

حضرت کی مساعی جمیلہ اس سمت میں بے پناہ ہیں۔ دین خالص ہوگا تو تحقیقی عمل ثمر بار ہوگا۔ آپ نے اپنی علمی تحقیقات میں وہ اصول و مبادیات پیش کیے ہیں جن پر پورے دین کی اساس ہے۔ اگر بدعات کو شامل دین کر کے ملمع سازیوں سے ان پر ایمانی، فکری، عملی اور اخلاقی اعمال کے بلند بام پلازے بھی تعمیر کر لیے جائیں تو دین کی بنیادیں کھوکھلی ہی رہ جائیں گی۔ محاذ کوئی سا کیوں نہ ہو، نیچریوں، دہریوں، دین سے انحرافی راہیں اختیار کرنے والوں، جبہ و قبہ کی آڑ میں دین فروشوں اور نام نہاد پشمینہ پوش صوفیوں، غالی رافضیوں، سب کا تعاقب جس استقامت سے کیا، وہ قابل دید بھی تھی اور قابل داد بھی۔ حضرت دو دھاری تلوار بن کر چومکھی لڑتے رہے اور اللہ نے اس سرفراز کو سرفراز ہی فرمایا، شرک و بدعت کی صفوں کا صفدر ہی بنایا۔

گزشتہ صدی کے پانچویں دہاکے سے لے کر اختتام صدی کے کچھ عرصہ پہلے ۱۹۹۶ء تک الکلام الحاوی، ضوء السراج فی تحقیق المعراج، تبرید النواظر، گلدستہ توحید، احسن الکلام فی ترک القراءۃ خلف الامام، صرف ایک اسلام بجواب دو اسلام، راہ سنت، تفریح الخواطر، عیسائیت کا پس منظر، درود شریف پڑھنے کا شرعی طریقہ، تسکین الصدور، طائفہ منصورہ، شوق حدیث، الکلام المفید فی اثبات التقلید، ارشاد الشیعہ، خزائن السنن اور آخر میں توضیح المرام (مطبوعہ ۱۹۹۶ء) تک کم و بیش نصف صدی کو محیط ۴۷ گراں قدر تصانیف ان کے علم و عرفان، تحقیق و تدقیق، مختلف دینی موضوعات پر ان کی گرفت اور خالصۃً للٰہیت پر مبنی فکری منہاج کا پتہ دیتی ہیں۔ ایک سطح بیں شخص کہہ سکتا ہے کہ یہ تحقیقی کاوشیں بڑی قابل قدر سہی، مگر ان میں مسلکی رنگ نمایاں طور پر جھلکتا ہے اور مجموعی طور پر اسلامی فکر کی نمائندگی نہیں کرتیں۔ ان میں فروعی مسائل زیر بحث لائے گئے ہیں جس سے اس علمی مواد کی افادیت محدود ہو کر رہ گئی ہے۔ دیوبندیت اور بریلویت کی جنگ میں شمشیر برہنہ ہو کر معرکہ آرا بھی رہے

اور معرکۃ الآراء تصانیف بھی پیش کیں، مگر عالم اسلام کے اجتماعی مسائل اپنے وسیع تر تناظر میں مفقود ہیں۔ حق یہ ہے کہ یہ خیال بڑا ہی سطحی ہے۔ اس کے پیچھے جو منفی سوچ کارفرما ہے، اس سے معاندت کی بو آتی ہے۔ اگر وسعت نظر اور فکر کی گہرائی اسی چیز کا نام ہے کہ ہر رطب و یابس موضوع پر قلم فرسائی کی جائے تو واقعتاً وہ یہاں نہیں ہے۔

ان کے اخلاف میں ہمارے مکرم شیخ الحدیث حضرت مولانا زاہد الراشدی، حضرت مولانا عبد القدوس قارن، حافظ عبد الحق خان بشیر، مولانا محمد فیاض خان سواتی، (آپ کے بھتیجے) اور دیگر اولاد و احفاد شامل ہیں جن میں ایک چمکتا نام حافظ محمد عمار خان ناصر کا بھی ہے جو تحقیق کے میدان میں ان کے "طابق النعل بالنعل" ثابت ہو رہے ہیں اور ہونہار بروا کے چکنے چکنے پات کے مصداق اسلامی فکر کی ترویج واشاعت میں اس خوردسالی میں کئی سال خوردہ لوگوں کو پیچھے چھوڑ رہے ہیں۔ مکرمی حضرت مولانا زاہد الراشدی اور ان کے لخت جگر عزیزم حافظ محمد عمار خان ناصر اپنے فکر و نظر اور موقف کے اعتبار سے بعض حلقوں میں اس وجہ سے مورد مسئولیت ہیں کہ وہ اپنے اسلاف کے موقف سے کسی قدر ہٹ رہے ہیں۔ اس ضمن میں حضرت مولانا زاہد الراشدی کا مسکت جواب "الشریعہ" میں تفصیلاً آ بھی چکا ہے، تاہم یہ بات واضح کر دینا بھی ضروری ہے کہ یہ لوگ اصلاً و اصالۃً اسی منہاج کے وارث ہیں جن پر ان کے بزرگ عمر بھر چلتے رہے، البتہ شیخ مرحوم کا سفر ایک خاص سمت میں جاری رہا کہ بدعات و محدثات اور اختراعات فی الدین کا ازالہ ہوگا تو دین خالص ہوگا، اور دین خالص ہوگا تو اخلاص سے اس پر چلنا نصیب ہوگا۔ اخلاف میں شان اخلاص تو وہی ہے مگر یہاں عصری تقاضوں کے پیش نظر بزرگوں کے موقف میں تبدیلی کیے بغیر بعض دیگر پہلو بھی در آتے ہیں اور یہ کوئی بری بات نہیں، ورنہ تقلید کورانہ کا ٹھپہ لگ جاتا تو یہ بری بات ہوتی۔

تقلید کی روش سے تو بہتر ہے خودکشی
رستہ بھی ڈھونڈ خضر کا سودا بھی چھوڑ دے

عزیز مکرم اپنے جد امجد کے کارناموں کو تنظیم و ترتیب اور اشاریہ کے دائرے میں لا کر مراجعت عامہ کے لیے سہل الحصول بنانے کی فکر میں بہت پہلے سے تھے اور اب امید ہے کہ وہ بسرعت تمام یہ کام کر گزریں گے۔

آپ کی پاکبازانہ زندگی کے مختلف پہلو، علمی شغف، تدریسی مہارت، علمی وجاہت، تحقیقی کارنامے، سوانح حیات اور دیگر احوال و آثار کے بہت سے پہلوؤں پر بہت سی تحریریں سامنے آ چکی ہیں اور ابھی بہت زیادہ تحریریں صفحہ قرطاس پر جلد وجود پذیر ہوں گی۔ ان کے اخلاف، قریبی احباب، ہم عصر علما و فقہا، معتقد و مرید اور تلامذہ کا ایک جم غفیر ان کی زندگی کے کئی پہلوؤں کی شفاف سیرت کے کئی گوشے نمایاں کرے گا۔ کچھ قلم کار ان کے تحریری کارہائے نمایاں کو موضوع وار زیر بحث لائیں گے تو کئی ان کی تحقیقی کاوشوں کا استحسان یا انتقاد کریں گے۔ جہاں تک مرحوم کے ذاتی احوال کا تعلق ہے، ان کے اہل خاندان، اولاد و اخلاف اور احفاد و اسباط سے بہتر ان پر کوئی بھی قلم نہیں اٹھا سکتا۔ مجھ جیسے بے بضاعت ان کی صاف ستھری زندگی، ان کے کردار کے محاسن اور ان کی سیرت کے مکارم کے بارے میں ہی کچھ عرض کر سکتے ہیں۔ میرا سر فخر سے بلند ہو جاتا ہے جب میں یہ محسوس کرتا ہوں کہ بے شمار خوش نصیبوں کی طرح اپنے دور کے عظیم محدث کے سامنے زانوئے تلمذ تہ کیا۔ بقول اقبالؒ

نسیم و تشنہ ہی اقبال کچھ اس پر نہیں نازاں
مجھے بھی فخر ہے شاگردئ داغ سخن داں کا

میرے لیے یہ امر بے حد اعزاز وافتخار اور وقار واعتبار کا باعث ہے۔ وہ بخاری شریف پڑھاتے یوں گویا ہوتے گویا سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کے حضور میں باریاب ہوں، فرط محبت وعقیدت میں ادھر سے سن کر ادھر اپنے تلامذہ کو سرکار کے فرمودات سے نواز رہے ہوں (حالانکہ سلسلہ رواۃ کی کڑی سے کڑی ملنے سے بات وہاں تک مرفوع ہوتی ہے) اور توضیحات وتشریحات سے منشاے رسول تک پہنچنے کی کامیاب کوشش کر رہے ہوں۔ ان کے تدریسی اوقات میں ہم یوں محسوس کرتے گویا خیر القرون میں جی رہے ہوں، دنیا ومافیہا سے بے خبر۔ ایسے لگتا گویا ع

بلبل چہک رہا ہے ریاض رسول میں

ان کا طریقہ تدریس فکر انگیز بھی تھا اور دل نشیں بھی۔ الفاظ کی نشست وبرخاست ہر طرح کے حشو وزوائد سے پاک ہوتی۔ علمی وجاہت کی وجہ سے بات میں رس ہوتا۔ حدیث کے مفاہیم کی وضاحت، رواۃ کی جرح وتعدیل، اسماء الرجال کے فن میں نکتہ رسی بھی، جزئیات رسی بھی، ان پر انتقادی گفتگو، ان کے سوانح پر گہرائی اور گیرائی سے نگاہ ڈالنا، ان کے حالات کا احاطہ، حدیث کے الفاظ کے زینوں سے اتر کر معنویت کی گہرائی تک رسائی اور ان کی روح تک اترنا، ان کے طرز تدریس کا طرۂ امتیاز تھا۔ آواز کی شیرینی، صوتی اثرات میں محبت رسول کی دل گدازی، دلوں میں ایمان وایقان کی قندیلیں روشن کرتی چلی جاتی۔ وہ وحی کی روشنی میں چلتے اور توحید کے نغمات سے زمزمہ پرداز ہوتے۔ اس پر مستزاد یہ کہ استقامت علی الحق کے نتیجے میں ان کی زبان سے نکلا ہوا ایک ایک لفظ موتیوں کے تول تلتا اور جواہر ریزوں کے بھاؤ آنکا جاتا۔ ان کی جلوتیں اور خلوتیں اسلاف کا نمونہ اور سنت رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا عکس حسین تھیں۔ لاکھوں تشنگان علم وحکمت نے اس سرچشمہ دعوت وارشاد سے اپنی پیاس بجھائی اور کتنے ہی راہ گم کردہ راہی منزل شناس ہوئے۔ بعض مواقع پر تبلیغ دین کے سلسلہ میں بعض کوتاہیوں کا شدت سے احساس فرماتے اور ان کوتاہیوں کے ازالے کی کوششوں کو بھی دعوت وارشاد ہی کا حصہ سمجھتے۔

مجھے یاد ہے کہ ایک مرتبہ یورپ کا تبلیغی دورہ فرما کر واپس آئے تو اس ہیچ مدان نے آنجناب کے تاثرات جاننے کی آرزو کی۔ فرمایا، عدیم صاحب! مجھے اس بات کا شدید احساس ہوا ہے کہ علما کو انگریزی زبان پر دسترس ہونی چاہیے، بلکہ جس جس ملک میں دعوت وتبلیغ کا کام کریں، اس ملک اور خطے کی زبان کا جاننا ان کے لیے نہایت ضروری ہے۔ محض سرسری زبان دانی نہیں، ماہرانہ دسترس کے ساتھ۔ میں نے قبل ازیں اس امر کا اس شدت کے ساتھ احساس نہیں کیا تھا۔ یورپ میں جا کر مجھے معلوم ہوا کہ بات کے ابلاغ کے لیے مقامی زبان کس قدر موثر اور کارگر ہوتی ہے۔ ترجمان لاکھ اداے مطلب کریں، دل سے نکلی ہوئی بات دل میں نہیں اتر سکتی جب تک یک زبانی نہ ہو۔ ہم زبانی ہوگی تو ہم دلی کی راہ ہموار ہو سکے گی، ورنہ تو وہی بات ہوگی کہ ع

زبان یار من ترکی ومن ترکی نمی دانم

ایک بات جو میرے لیے اچنبھے کی رہی، وہ یہ کہ ان کی تقریر بالعموم ادبی چاشنی تو لیے ہوتی، بعض جملے تیر ونشتر کا کام دیتے، ان میں مخالف کے لیے بے پناہ کاٹ ہوتی، مگر ایسے لگتا جیسے آپ کو شعر وشاعری سے کوئی خاص دلچسپی نہیں۔ لیکن اس کے برعکس ان کی بعض تحریروں میں خشک سے خشک اور سنجیدہ سے سنجیدہ مضامین میں بھی وہ ایسے خوبصورت اور برمحل اشعار استعمال کرتے کہ یوں لگتا جیسے علمی، تفسیری، فقہی اور دوسرے دینی سرمایے کے ساتھ ساتھ مختلف اردو، فارسی اور عربی اشعار کے دواوین بھی ان کے زیر نظر رہتے۔ بعض شعر تو موقع ومحل کی نسبت سے پوری عبارت میں بجلی کا سا اثر بھر دیتے ہیں۔ یوں

ان کی تحریریں ادبی شکوہ کے ساتھ ساتھ دل آویز شعروں سے بھی مزین ہوگئی ہیں۔

اب میں حضرت کے شخصی مکارم کے بہت سے پہلوؤں میں سے چند ایک کی طرف اشارہ کرتا ہوں جن سے آپ کی بھرپور زندگی کے کئی رخ سامنے آ سکتے ہیں۔

محنت وجانفشانی اور فرض شناسی

قدرت نے انہیں جو بے پناہ صلاحیتیں عطا فرمائی تھیں، ان میں سے ایک محنت شاقہ اور جہد ناتمام بھی ہے۔ فرمایا کرتے تھے کہ بسا اوقات ایک لفظ یا ایک علمی نکتہ کی تہہ تک پہنچنے کے لیے مجھے گرمیوں کی شدید حبس انگیز راتوں میں اس قدر جانفشانی کرنا پڑی کہ شوق جستجو میں صبح ہو جاتی۔ میرے ذہن سے خلجان نہ جاتا تھا تا آنکہ مسئلہ حل نہ ہو جاتا۔

خیال آتا ہے کہ کیسے لوگ تھے جن کے دنوں کی تڑپ اور شبوں کا گداز مادی وسائل حیات کے حصول کے لیے نہیں، دین متین کے چھتنار درخت کی آبیاری کے لیے وقف تھا۔ آج امت کو ان کا ممنون احسان ہونا چاہیے کہ ان کی کوشش پیہم اور پرداخت مسلسل سے ظاہری وسائل کی عدم دستیابی کے باوجود مسائل کی وہ تنقیح ہوئی کہ حق کھل کر سامنے آ گیا اور باطل کو بھاگتے ہی بنی کہ اس کا مقدر ہی فرار ہے۔ جاء الحق وزهق الباطل ان الباطل كان زهوقا۔ ضلالتوں کے پردے چھٹ جانے کے بعد جو چیز باقی رہ جاتی ہے، وہ حق ہی تو ہوتا ہے۔

مجھے یاد ہے کہ ایک مرتبہ گکھڑ سے مدرسہ نصرۃ العلوم آتے ہوئے راستے میں آپ کی گاڑی کسی پل کی parapet سے ٹکرا گئی۔ ڈرائیور کا تساہل تھا یا کوئی اور سبب۔ یہ خبر طلبہ میں بالخصوص اور دوسرے لوگوں میں بالعموم پھیل گئی۔ راقم ان دنوں حضرت کے زیر سایہ دورۂ حدیث کے درس بخاری میں شریک تھا۔ ابھی راستہ ہی میں تھا کہ اطلاع ملی کہ حضرت کو حادثہ پیش آ گیا ہے اور وہ مدرسہ نہیں جا سکے۔ میں بھاگم بھاگ پریشانی کے عالم میں جاے حادثہ پر پہنچا۔ وہاں کوئی شخص موجود نہ تھا۔ ٹریفک معمول کے مطابق جاری تھی۔ ادھر ادھر سے معلوم کیا، پتہ نہ چلا۔ آخر ایک واقف حال نے بتایا کہ یہاں کچھ دیر پہلے ایک موٹر کار کے ساتھ حادثہ پیش آیا تھا۔ ان لوگوں کو ہسپتال لے گئے ہیں۔ سول ہسپتال سے معلوم ہوا کہ حادثہ ہوا تو تھا مگر سنگین نہ تھا۔ اس ادھیڑ بُن میں تھا کہ حضرت کی عیادت کے لیے گکھڑ جاؤں یا مدرسہ پہنچوں۔ آخر فیصلہ کیا کہ پہلے مدرسہ ہی سے حادثے کے پورے احوال سے باخبر ہو کر حضرت کی رہایش گاہ پر گکھڑ حاضری دوں گا۔ امید وبیم کے عالم میں مدرسہ نصرۃ العلوم پہنچا۔ حیرت ومسرت کے ملے جلے جذبات کے ساتھ کیا دیکھتا ہوں کہ کلاس باقاعدہ لگی ہوئی ہے، حضرت تشریف فرما ہیں اور اقوال وفرمودات پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے موتی رول رہے ہیں۔ ؂

وے صورتیں الٰہی کس دیس بستیاں ہیں

اب جن کے دیکھنے کو اکھیاں ترستیاں ہیں

سخت متعجب ہوا کہ کہاں حادثہ کی خبر بد سنی اور کوئی گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ سخت پریشانی میں ادھر ادھر بھاگا پھرا، مگر یہاں آ کر دیکھا تو ہر چیز معمول پر ہے۔ خاموشی سے ایک طرف گوشے میں بیٹھ گیا اور معمول کے مطابق شریک درس ہو گیا۔ حضرت کی آواز میں قدرے کمزوری کے آثار تھے۔ درس وقت مقررہ پر ختم ہوا تو قریب گیا۔ حسب معمول شفقت فرمائی۔ اس روز کے حادثہ کے بارے میں استفسار کیا اور شریک درس ہونے تک کی ساری کہانی سنائی۔ متبسم چہرے کے ساتھ فرمایا، اللہ تعالیٰ نے

خیر وعافیت سے رکھا، معاملہ کچھ زیادہ سنگین نہ تھا۔ عرض کیا، آپ کچھ روز کے لیے چھٹی کر لیں تا کہ آرام مل جائے اور آثار نقاہت زائل ہو جائیں اور پھر سے صحت یاب اور تازہ دم ہو کر تدریس کا آغاز کر سکیں۔ میری اس گزارش پر کچھ زیادہ توجہ نہ فرمائی۔ ہاں ہوں فرماتے رہے۔ چونکہ چوٹیں آئی تھیں، ایک دو دن تک ڈاکٹر کے مشورے پر عمل کرتے ہوئے آرام فرمایا۔ ابھی اچھی طرح صحت یاب بھی نہ ہوئے تھے کہ اچانک معلوم ہوا کہ کل سے کلاس شروع ہے۔ آپ حسب معمول کلاس لینے لگے۔ مزید آرام کا مشورہ دیا گیا تو فرمایا کہ مجھے گھر بیٹھنے سے الجھن محسوس ہوتی ہے۔ تعلیم وتعلم میں جی لگا رہتا ہے اور اس میں خوشی محسوس کرتا ہوں۔ میرا احساس ہے کہ آپ فطرتاً معلم ومبلغ پیدا کیے گئے تھے۔ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ فرمان واجب الاذعان پیش نظر رہتا کہ بعثت معلماً اور اس شغف میں آپ کا دل مسرت وانبساط کے جذبات سے لبریز رہتا۔

شگفتگیٔ طبع

’المزح فی الکلام کالملح فی الطعام‘ کے مصداق طبیعت میں شگفتگی اور خوش مزاجی کا عنصر موجود تھا۔ متانت وسنجیدگی کی یبوستوں میں ڈھلا ہوا مزاج نہ تھا۔ عام علمائے دین کی طرح ہمہ وقت سنجیدگی کا پیکر بنے ہوئے زعم علم میں عام لوگوں سے کٹے ہوئے نہیں رہتے تھے۔ ہر خاص وعام کو خندہ پیشانی سے ملتے۔ بایں ہمہ وجاہت علمی ہنستے بھی اور ہنسا بھی دیتے، اگرچہ شیخ کے ہنسنے میں تبسم غالب ہوتا اور ضحک وقہقہہ مغلوب۔ غالباً ۱۹۸۵ء کا واقعہ ہے، میں ان دنوں گورنمنٹ کالج شکر گڑھ سے گورنمنٹ کالج گوجرانوالہ آ چکا تھا۔ حضرت کے ساتھ بیٹھا ہوا تھا۔ از رہ تفنن طبع فرمایا، آپ ماہانہ کتنی تنخواہ لیتے ہیں؟ غالباً ان دنوں زیادہ سے زیادہ کوئی تین ہزار روپے تنخواہ ہوگی۔ دوسرا سوال کیا کہ آپ روزانہ کتنے پیریڈ پڑھاتے ہیں؟ عرض کیا، کبھی تین اور کبھی off session میں دو یا ایک پیریڈ روزانہ۔ دونوں کا جواب پا کر محض شگفتگی طبع کی خاطر فرمایا، مجھے بھی کسی کالج میں پروفیسر تعینات کروا دیں۔ یہ محض تفنن طبع تھا اور بس۔ وجہ یہ تھی کہ اپنے نظام الاوقات اور شب وروز کی محنت شاقہ کا موازنہ کالج کے اساتذہ کے کام کے ساتھ کر کے محض انبساط طبع مقصود تھا۔ میں نے عرض کیا، حضرت! کالجوں میں کیا دھرا ہے۔ بڑی بڑی عالی شان عمارتیں ہیں۔ اتنے بڑے بڑے مکانوں کے مکین علمی طور پر آپ جیسی قد آور شخصیتوں کے سامنے تو بالکل کوتہ قد بونے لگتے ہیں۔ آپ جس ڈگر پر چل کر شب وروز مصروف تعلیم وتبلیغ ہیں، کالجوں اور بے چارے کالجوں والوں کو کہاں نصیب! کچھ دیر کے بعد بات کا رخ کسی اور موضوع کی طرف پھر گیا۔

غمگساریوں سے لبریز دل

اللہ تعالیٰ نے آپ کو جہاں دل ودماغ کی خوبیوں سے نوازا تھا، ان میں ایک رقتوں اور غم گساریوں بھرا دل بھی تھا۔ ہر شخص آپ کے مشفقانہ رویے سے یہی سمجھتا تھا کہ آپ اسی کے لیے زیادہ شفیق ہیں اور حقیقت یہ ہے کہ راقم کو تو بے حد شفقتوں سے نوازتے۔ تدریسی اوقات میں ان کا نظام الاوقات بندھا ٹکا ہوتا۔ تاہم اس کے علاوہ جب کبھی بھی ملاقات کے لیے حاضری ہوتی، گھر بار کے حالات دریافت فرماتے، بچوں کے بارے میں ضرور استفسار فرماتے۔

ایک دفعہ میری ایک چار سالہ بچی گم ہوگئی۔ دو دن اور ایک رات تک پورا گھر، اعزہ، اقربا، درد وغم کی صلیب پر لٹکے رہے۔ وہ کسی نہ کسی طرح لاہور پہنچ گئی اور لاہور ریڈیو اسٹیشن سے ملی جہاں ایک نہایت ہی ہمدرد انسان بچی کے وارثوں کی

تلاش میں اعلان کروانے کے لیے اسے لے گیا۔ ادھر میں بھی روتا رلاتا در در کی خاک چھانتا لاہور ریڈیو اسٹیشن پہنچ گیا کہ بچی کی گمشدگی کا اعلان کرواؤں۔ ہم دونوں کی ملاقات ریڈیو اسٹیشن پر ڈرامائی طور پر ہوگئی۔ بچی کی گمشدگی کے واقعے سے مجھ پر قیامت گزر گئی۔ باپ بیٹی کا یوں ملنا معجزے سے کم نہ تھا۔ بچی مجھے دیکھ کر بے تابانہ مجھ سے لپٹ گئی اور میں ضبط گریہ نہ کر سکا۔ اللہ کا لاکھ لاکھ شکر کیا۔ اس واقعے کی حضرت کو اطلاع ملی تو ڈھیروں دعائیں فرمائیں۔ اس کے بعد کی اکثر ملاقاتوں میں مجھ سے اس واقعے کے بارے میں دریافت فرماتے رہتے، حتیٰ کہ بچی جوان ہوگئی اور اپنے گھر چلی گئی، وہ بحمد اللہ صاحب اولاد ہے مگر میرے حضرت پھر بھی میرے ساتھ ہمدردی فرماتے اور فرمایا کرتے، بچھڑ جانے کے ان دو دنوں اور ایک رات کو یاد کر کے آپ کے احساسات واضطراب کو محسوس کرتا ہوں کہ اللہ نے والدین کے دل میں اولاد کے لیے بے پناہ شفقتیں بھر دی ہیں۔ آپ میرے ساتھ شریک اضطراب ہوتے اور میرے بچوں کے لیے خصوصی دعا فرماتے۔ آج میں جو کچھ ہوں اور میرے بچے جس وقار واعتبار کی زندگی بسر کر رہے ہیں، میں سمجھتا ہوں کہ میرے والدین کے بعد حضرت کی دعاؤں کا نتیجہ ہے۔

عمومی کردار

طبیعت میں سادگی، مزاج میں انکسار، اخلاق میں ملنساری کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی ۔

فروتنی است دلیل رسیدگان کمال
کہ چوں سوار بمنزل رسد پیادہ شود

اسلاف کی پاکبازانہ زندگیوں کا نہایت حسین ودل آویز عکس تھے۔ تقویٰ وطہارت، زہد وورع اور فقر وقناعت کی خوب صورت تصویر تھے ۔

دارا و سکندر سے وہ مرد فقیر اولیٰ
ہو جس کی فقیری میں بوئے اسد اللٰہی

تقریر کرتے تو لچھے دار لفظوں اور گھن گرج سے کام نہیں لیتے تھے، ان خطیبوں کی طرح جن کی زبان پر فصاحت وبلاغت کے دریا بہہ رہے ہوں، مگر دل لذت شوق سے محروم ہوں ۔

لبھاتا ہے دل کو کلام خطیب
مگر لذت شوق سے بے نصیب

یہاں ٹھہراؤ تھا، رچاؤ تھا، دلائل وبراہین اور منطقی دروبست کی آراستگی تھی۔ لفظوں کی شعبدہ بازیوں اور جملوں کی قلابازیوں کے بجائے یہاں علمی حقائق سے لبریز وعظ ہوتے۔ نہ زبان وبیان کی مسجع ومرصع رنگینیاں، نہ حرف وصوت کی سنگینیاں۔ یہاں تو طبیعت سادہ، لفظ سادہ، بیان سادہ، طرز ادا سادہ، مگر یہ سادگی اپنے اندر بے پناہ رعنائیاں لیے ہوتی۔ بولتے تو موتی رولتے، قرآن وحدیث کے سمندروں سے چن چن کر ایسے بے شمار گہر ہائے آبدار اور ان گنت لولوے لالا پیش کرتے کہ عوام کے لیے بھی ان میں دلکشی اور پند پذیری کا سامان ہوتا اور اہل علم کے لیے بھی ان میں علم وحکمت اور عرفان وآگہی کے بے شمار پہلو ہوتے۔ تشنگان علم وآگہی دیار وامصار سے کھچے چلے آتے اور زبان حال سے تو کیا، زبان قال سے پکار اٹھتے:

لما سمعت الناس شدوا رحالهم   الی بحرك الطامی اتیت بحرة

کم وبیش پون صدی تک علم وعرفان کی تلاش کا یہ راہی بادیہ پیمائی کرتے ہوئے اس منزل تک آ پہنچا جہاں رہروان راہ محبت کے لیے گھنی چھاؤں والا شجر سایہ دار بن چکا تھا۔ کتنے ہی آبلہ پا مسافروں نے اس چھتنار درخت کے سایے میں اپنی دکھتی پیٹھ کو سہارا دیا۔

کتنے ہی راہیوں نے سکھ پایا
اے گھنے پیڑ تیری چھاؤں میں

آپ کے چھوڑے ہوئے قیمتی علمی ورثے کے اولاً تو ان کے صلبی ورثہ واقربا ہی وارث ہیں جو بحمد اللہ اس دشت کے سیاح ہیں۔ بعد ازاں جس طرح العلماء ورثة الانبیاء ہوتے ہیں، اس طرح اس خرمن علم وحکمت کے وہ تمام خوشہ چین جانے کب کب، کہاں کہاں، کون کون لوگ مستفید ومستفیض ہو کر اس میراث کے وارث بنیں گے اور اس روشنی کو آگے پھیلاتے رہیں گے۔

کبھی ایسا بھی ہوا ہے کہ اللہ نے ایک ہی شخص میں جہاں بھر کی خوبیاں بھر دی ہیں اور یہ اللہ کی قدرت سے کچھ بعید نہیں۔

لیس علی اللہ بمستنکر ان یجمع العالم فی واحد

ایک شخص میں گفتار واظہار کی اس شان کی خوبیاں ہوتی ہیں کہ وہ بولتا ہے تو ایک زمانہ اپنی تمام تر سماعتوں کو سمیٹے ہوئے اس کی جنبش لب کا منتظر رہتا ہے۔ انتظار رہتا ہے کہ وہ بولے اور ہمہ تن گوش ہو کر اس کی رسیلی گفتگو سے حظ اندوز ہوں اور اس سے بات کرنے کا موقع مل جائے تو زہے نصیب!

سنا ہے بولیں تو باتوں سے پھول جھڑتے ہیں
یہ بات ہے تو چلو بات کر کے دیکھتے ہیں

مگر جب اس شخص کو قریب سے دیکھا تو گفتار کا غازی تو پایا مگر اس کے کردار سے گھن آنے لگی۔ قال اور حال میں فرسنگوں کا فاصلہ محسوس ہوا۔ اس کے قال کی مزے داریاں اس کے حال کی بدمزگیوں میں ڈھل گئیں اور اس سے دلی نفرت اور طبعی کراہت محسوس ہونے لگی۔ تاریخ میں اس قبیل کے کئی شاعر، فلسفی، بے عمل عالم، بڑے بڑے موجد و دریافت کنندگان اور سائنس دان بآسانی تلاش کیے جا سکتے ہیں۔ مگر یہاں عالم ہی دوسرا ہے۔ قال، قال اللہ وقال الرسول کی حسن کاریوں کے سانچے میں ڈھلا ہوا اور حال میں شفاف سیرت کی جھلک۔ جھمک اور مضبوط کردار کی چمک دمک نمایاں نظر آتی ہے۔ بات سن کر آدمی گرویدہ ہو جاتا، مل کر حسن اخلاق اور حسن سیرت کا معترف ہو جاتا، جتنا جتنا تعلق خاطر بڑھتا جاتا، اتنا اتنا حسن عقیدت میں اضافہ ہوتا چلا جاتا۔ سراپا استعجاب بن کر دل پکار اٹھتا ہے۔

دیدہ ودل تمام آئینہ آدمی اور اس قدر شفاف!

پایان کار یہی کہوں گا کہ اللہ جل مجدہ مرحوم کو اپنے سایہ غفران میں ڈھانپ لے۔ جس منہاج پر انہوں نے بھرپور علمی، تبلیغی، اخلاقی، روحانی، تصنیفی، اصلاحی وفلاحی زندگی گزاری، ہر شخص کی زبان ان کی صالحیت فکر ونظر اور صلاحیت دل ودماغ کی مداح ہے۔ ہمیں یقین کامل ہے کہ وہ اپنے رب کے ہاں جزائے جزیل کے مستحق ہیں۔

بجا کہے جسے دنیا، اسے بجا سمجھو زبان خلق کو نقارۂ خدا سمجھو

پروفیسر ڈاکٹر علی اصغر چشتی*

چند یادگار ملاقاتیں

مورخہ ۵ مئی ۲۰۰۹ کو تقریباً ساڑھے گیارہ بجے حسب معمول جب میں دعوۃ اکیڈمی پہنچا تو کلاس میں داخل ہونے سے پہلے کلاس روم سے باہر طلبہ اور رفقاے دعوہ اکیڈمی کا ایک ہجوم نظر آیا۔ یہ یہ لوگ آپس میں گفتگو کر رہے تھے اور پریشان نظر آ رہے تھے۔ مجھے دیکھتے ہی میری طرف لپکے اور یہ افسوس ناک خبر سنائی کہ شیخ الحدیث مولانا سرفراز خان صفدر انتقال کر گئے۔ یہ اندوہناک خبر سنتے ہی طبیعت بوجھل ہو گئی اور مولانا کی صحبت میں بیتے ہوئے وہ سارے لمحات مستحضر ہو گئے جو اب ماضی کا حصہ بن چکے ہیں۔

مولانا سرفراز خان صفدر دار العلوم دیوبند کے اس قبیلہ سے تعلق رکھتے تھے جس کے ارکان اب برصغیر پاک وہند میں تقریباً نایاب ہو چکے ہیں۔ میری ذاتی ملاقات مولانا مرحوم کے ساتھ ۱۹۷۶ کے بعد ہوئی اور الحمد للہ بار بار ہوئی، لیکن ہمارے خاندان میں آپ کا چرچا پہلے سے تھا۔ میرے تایا مولانا محمد یونس مرحوم اور میرے چچا مولانا عبد الحق حفظہ اللہ دونوں نے دار العلوم دیوبند سے اس دور میں استفادہ کیا جب مولانا سرفراز خان صفدر وہاں موجود تھے۔ میرے چچا نے بارہا آپ کے بارے میں ہمیں بتایا اور آپ کی علمی وتالیفی خدمات پر رشک کا اظہار فرمایا۔ میرے والد مرحوم مولانا فیروزؒ سے جب کوئی طالب علم مشورہ لیتا تو آپ اسے مولانا سرفراز خان صفدر سے استفادہ کرنے کا مشورہ عنایت فرماتے تھے۔ میرے اساسی اساتذہ میں مفتی محمد اسرائیل مرحوم مولانا سرفراز خان صفدرؒ کے زملا میں تھے۔ آپ جب دار العلوم دیوبند میں اپنے بیتے ہوئے ایام کا تذکرہ چھیڑتے تھے تو مولانا کا ذکر خیر مختلف حوالوں سے ہوتا تھا۔ مولانا مرحوم کا تذکرہ ہمارے ہاں جمعیت طلبہ اسلام کے حلقوں میں بھی زور وشور سے رہتا تھا۔ طلبہ کی تربیت اور ذہن سازی کے ضمن میں جو کتابیں مطالعہ کے لیے تجویز کی جاتی تھی، ان میں مولانا سرفراز خان صفدر کی تالیفات بھی ہوتی تھی۔ ان دنوں میں جمعیت طلبہ اسلام بہت فعال تنظیم تھی۔ کراچی میں جمشید روڈ پر واقع جمعیت طلبہ اسلام کے دفتر میں ماہانہ تربیتی پروگرام منعقد ہوتے تھے اور اس کے ملحق لان میں سالانہ کنونشن کا انتظام ہوتا تھا۔ جمعیت علماے اسلام کے اکابران پروگراموں میں بڑے ذوق وشوق سے تشریف لاتے اور طلبہ کی سرپرستی فرماتے تھے۔

مجھے یاد ہے کہ ایک موقع پر جب مولانا سرفراز خان صفدر تشریف لائے تو پہلی منزل پر جانے کے لیے سیڑھیاں تنگ ہونے کی وجہ سے ہم نے آپ کو سہارا دینے کی کوشش کی۔ آپ نے فرمایا: نہیں۔ آپ میری وجہ سے تکلیف نہ کریں۔ میں آسانی کے ساتھ سیڑھیاں چڑھ سکتا ہوں۔'' پھر دفتر میں بیٹھ کر ہمارے ساتھ گھل مل گئے۔ اس موقع پر یاد ہے کہ آپ نے

---

*ڈین فیکلٹی آف اسلامک اسٹڈیز، علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی اسلام آباد۔

فرمایا: ''آپ لوگ مجھے جتنا بوڑھا سمجھ رہے ہیں، میں اتنا بوڑھا نہیں''۔ ہم نے کہا: حضرت! ''مفتی صاحب جب یہاں آتے ہیں تو انہیں اچھی خاصی وقت ہوتی ہے''۔ فرمایا: ''مفتی محمود بوڑھا ہے۔ میں بوڑھا نہیں ہوں''۔

۱۹۸۱ء میں جب میں نے عالمی مجلس تحفظ ختم نبوت کو بحیثیت مبلغ Join کیا تو اس کے بعد مولانا مرحوم کے ساتھ ملاقاتوں کا سلسلہ بڑھ گیا، وہاں عقیدت کا رشتہ بھی استوار ہوا۔ یہ رشتہ الحمدللہ تسلسل کے ساتھ برقرار رہا۔ ۱۹۸۵ء میں جب میرا تقرر دعوۃ اکیڈمی بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی میں بطور لیکچرر ہوا اور بعد ازاں تربیت ائمہ پروگرام کی مسئولیت مجھے دی گئی تو مولانا مرحوم کے ساتھ ملاقاتوں کے سلسلے نے ایک اور شکل اختیار کر لی۔ تربیت ائمہ پروگرام کے شرکا کے لیے جو کورس ڈیزائن کیا گیا تھا، اس کا ایک معتد بہ حصہ مختلف مکاتب فکر کے علما و مشائخ کے ساتھ ملاقاتوں پر مبنی تھا۔ ان دنوں میں شرکاے کورس کو لے کر جب ہم پشاور جاتے تھے تو راستہ میں دار العلوم حقانیہ اتر کر مولانا عبد الحقؒ کی زیارت کرتے تھے۔ ہم اس نزول کو سنت مفتی محمودؒ کہا کرتے تھے۔ مفتی محمودؒ جب پشاور جاتے تھے تو دار العلوم حقانیہ کی زیارت ضرور کرتے تھے۔ اور جب شرکاے کورس کو لے کر ہم سفر کرتے تھے تو راستہ میں نصرۃ العلوم اتر کر مولانا سرفراز خان صفدرؒ کی زیارت کرتے تھے۔ مولانا بہت خوش ہوتے تھے۔ فرداً فرداً شرکاے کورس کے ساتھ گفتگو فرماتے تھے۔ ملاقات کے موقع پر آپ شرکاے کورس کے ساتھ جو گفتگو فرماتے تھے تو پوری سند کے ساتھ حدیث پڑھ کر اس کی تشریح فرماتے تھے۔ فقہ کا لٹریچر پڑھنے کی ترغیب دیتے تھے اور فرماتے تھے کہ کتاب محض رسم کے طور پر نہیں پڑھنی چاہیے، بلکہ کتاب کی روح تک پہنچنے کی کوشش کرنی چاہیے۔

۱۹۹۰ء میں دعوۃ اکیڈمی کی طرف سے انٹرنیشنل تربیت ائمہ پروگرام کا آغاز ہوا۔ اس ضمن میں پہلا گروپ تاجکستان اور ازبکستان کے علما اور ائمہ مساجد سے منتخب کیا گیا۔ یہ گروپ ہمارے ہاں ان دنوں پہنچا جب روس کا تسلط ترکستان پر قائم تھا۔ اس گروپ کے شرکا جن کی تعداد سولہ تھی، عربی اور فارسی دونوں زبانوں میں گفتگو کر سکتے تھے۔ تاجکستان سے تعلق رکھنے والے کی فارسی بہت اچھی تھی، اس لیے کہ ان کی فارسی مادری زبان ہے، البتہ ازبکستان کے علما کی فارسی اس حد تک اچھی نہیں تھی۔ اس کورس کے شرکا کو ہمارے ہاں دینی مدارس میں قدرتی طور پر بڑا پروٹوکول ملا اور بہت سارے علما اور مشائخ کے ساتھ ان کی ملاقات کرائی گئی۔ جب ہمارا پروگرام لاہور کا جانے کا بن گیا تو حسب معمول حضرت مولانا سرفراز خان صفدرؒ کی زیارت کے لیے اتر گئے۔ شیخ نے اپنے معمول سے زیادہ گرمجوشی کے ساتھ استقبال کیا۔ مجھے یاد ہے، کافی دیر تک فرداً فرداً آپ نے معانقہ فرمایا اور انتہائی مسرت کا اظہار فرمایا۔ شیخ اپنی حیثیت کو بالائے طاق رکھتے ہوئے مہمانوں کے ساتھ گھل مل گئے۔ کسی کے ساتھ فارسی میں بول رہے تھے تو کسی کے ساتھ عربی میں بول رہے تھے۔ ترکستان کے اسلاف کبار کا نام لے لے کر فرماتے تھے کہ فلاں امام کے علاقہ سے ہیں، یہ فلاں امام کے شہر سے ہیں۔

ظہر کی نماز کے بعد ہم نے مولانا سرفراز خان صفدرؒ سے اجازت لی تو آپ نے فرمایا: ''آپ لوگوں کی خاطر تواضع نہیں ہوئی، میری خواہش ہے کہ لاہور سے واپسی پر آپ ہمارے ہاں کھانا کھائیں۔'' میں نے عرض کیا ''خاطر تواضع تو بہت ہوئی۔ آپ سے ملاقات ہوئی، آپ نے شفقت فرمائی اور پرتکلف چائے بھی پیش فرمائی۔'' میری بات سن کر آپ مسکرائے اور فرمایا: ''آپ کی بات ٹھیک ہے، لیکن ایسے مہمان پتہ نہیں کہ پھر ہمیں ملتے ہیں کہ نہیں۔''

غالباً آپ کا اشارہ ترکستان کی مقبوضہ صورت حال کی طرف تھا۔ آپ کے پرخلوص اصرار پر ہم نے واپسی پر ملاقات کا وعدہ کیا۔ جب میں نے شرکاے کورس کو یہ بات بتائی تو وہ از حد خوش ہوئے اور کہنے لگے کہ ہماری بھی یہی خواہش تھی کہ واپسی پر مولانا سرفراز خان صفدرؒ سے دوبارہ ملاقات کریں۔ لاہور سے واپسی پر جب شیخ سے ملاقات ہوئی تو آپ نے بہت عمدہ کھانے کا انتظام فرمایا تھا۔ دستر خوان پر ہمارے ساتھ بیٹھ کر اپنے دست مبارک سے روٹی توڑ توڑ کر مہمانوں کو دیتے رہے اور فرماتے تھے کہ یہ مہمانوں کی خاطر مدارات کے ضمن میں ترکستان کی روایت ہے۔ کھانا کھا لینے کے بعد ہم تھوڑی دیر آپؒ کی صحبت میں رہے۔ پھر شرکاے کورس نے دعا کے لیے درخواست پیش کی۔ آپؒ نے بہت رقت اور خلوص کے ساتھ دعا فرمائی۔ شیخ کے ساتھ یہ میری زندگی کی یادگار ملاقات ہے جو میرے لیے ایک انمول اور قیمتی سرمایہ ہے۔ عجیب اتفاق کی بات ہے کہ آپ کے انتقال کی خبر بھی اس وقت ملی جب میں انٹرنیشنل تربیت ائمہ کورس کو لیکچر دینے کے لیے کلاس روم کی دہلیز پر تھا۔

حضرت مولانا سرفراز خان صفدرؒ علوم عالیہ اور علوم آلیہ کے جامع تھے۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کو ہر علم وفن میں حظ وافر عطا فرمایا تھا۔ یہ خصوصیت آپ کی تدریس اور تحریر میں بہت نمایاں نظر آتی ہے۔ لیکن جو ملکہ آپ کو علم الرجال میں حاصل تھا، وہ اس دور کے کسی اور شخصیت کے حصہ میں نہیں آیا۔ رواۃ حدیث پر آپ کا مطالعہ اتنا وسیع تھا کہ معروف رواۃ حدیث کے حالات تقریباً آپ کو از بر تھے۔ اس لحاظ سے آپ اس دور میں امام ابن المبارک، امام ابن معین، امام علی بن المدینیؒ، حافظ مزی اور حافظ ذہبی کے علوم کے وارث تھے۔ اسناد کے ساتھ ساتھ متون حدیث پر آپ کی گرفت بہت مضبوط تھی۔ آپ نے جن جن موضوعات پر قلم اٹھایا اور احادیث کی روشنی میں ان پر بحث کی ہے، فنی طور پر ان مباحث کو دیکھ کر بڑی حیرت ہوتی ہے کہ آپ نے کس حد تک متون کو کھنگالا ہے اور کس طرح ان مخفی گوشوں کو کھول کر رکھ دیا ہے جو عام طور پر اچھے خاص قاری کی نظروں سے اوجھل رہتے ہیں۔

حضرت مولانا سرفراز خان صفدرؒ محض روکھے سوکھے عالم نہیں تھے۔ آپ کی شخصیت بہت دل آویز، رویہ بہت خوبصورت اور وجود بہت پرکشش تھا۔ آپ کو دیکھ کر یوں لگتا تھا کہ آپ کو حقیقتاً حجۃ الاسلام مولانا محمد قاسم نانوتویؒ، شیخ الہند مولانا محمود حسن اور شیخ الاسلام مولانا حسین احمد مدنیؒ کی نسبت کاملہ حاصل ہے۔ دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ مولانا سرفراز خان صفدرؒ کو کروٹ کروٹ جنت الفردوس عطا فرمائے، اور ہمیں آپ کے نقش قدم پر چلنے کی توفیق عطا فرمائے۔

> ''اگر تمہیں اللہ تعالیٰ نے ہاتھ سے روکنے کی طاقت عطا فرمائی ہے، تمہارے پاس کوئی منصب ہے تو روکو، کیونکہ ہاتھ سے تو حکمران ہی روک سکتے ہیں، عام آدمی تو ہاتھ سے نہیں روک سکتا۔ اگر طاقت ہے تو ہاتھ سے روکے اور اگر ہاتھ سے روکنے کی طاقت نہ ہو تو زبان سے روکے، مگر آج کا ماحول ایسا ہے کہ زبان سے روکنا اور بتانا کہ یہ برائی ہے، بڑا مشکل ہے۔ فقہاے کرامؒ نے یہ مسئلہ لکھا ہے اور بجا لکھا ہے کہ جس مقام پر حق بیان کرنے کے بدلے شر اور فتنے کا شدید خطرہ ہو، وہاں پر خاموشی بہتر ہے۔ آج تو ہماری مجالس ہی بری ہیں، الا ماشاء اللہ۔''
>
> (ذخیرۃ الجنان ۴/۲۹۳)

حافظ نثار احمد الحسینی*

امام اہل سنتؒ: چند یادیں، چند تأثرات

الحمدللّٰہِ وَ کَفٰی وَسَلَامٌ علیٰ عبادہ الذین اصطفٰی۔ أمّابعد:۔

کچھ شخصیات ان منٹ نشانات اور اپنے کردار کا ایسا تأثر چھوڑ جاتی ہیں کہ ان کی یاد کی خوشبو پھیلتی رہتی ہے۔ حضرت امامِ اہل سنت رحمہ اللہ کی شخصیت میں اللہ تعالیٰ نے ایسی صفات ودیعت کر رکھی تھیں کہ وہ اپنے کارناموں سے ہمیشہ یاد رہیں گے اور امت کی ہدایت کے لیے جو شمعیں انہوں نے جلا رکھی تھیں وہ ہمیشہ طالبان حق کی راہنما رہیں گی۔

حضرت امام اہل سنت رحمہ اللہ کی شخصیت اپنے وقت میں نیکی کے ہر نکتہ کا مَرجع تھی۔ ہر دینی محاذ پر وہ سینہ سپر رہے۔ وہ راہنمائے راہنمایاں بھی تھے اور خادمِ امت بھی، وہ طلبہ دین کے استاذ جی تھے اور اپنے حلقہ تلامذہ کے شیخ، سالکانِ طریقت کے مرشد عالی اور علمائے عصر کے راہنما۔ ہم عصر علما انہیں اپنے جیسا نہیں سمجھتے تھے بلکہ اپنا سرپرست قرار دیتے تھے اور اکابر نے انہیں اپنے اعتماد کی ہر سند سے نوازا تھا۔ ان کی شخصیت گلستانِ رنگا رنگ کی بہاروں کا مجموعہ تھی۔ جامع مسجد گکھڑ میں مضافات گوجرانوالہ سے آپ کا خطبہ جمعہ سننے کے لیے آنے والے انہیں وقت کا خطیب کہتے تھے اور پانچ وقت کے نمازیوں کے وہ امام صاحب تھے۔ ان کی تصانیف محققین کے لیے مأخذ کا درجہ رکھتی ہیں اور ان کا وعظ زندگی کی کایا پلٹ دینے والا ہوتا تھا۔ ان مجموعہ ہائے صفات کے حاملین کے متعلق حضرت خواجہ عزیز الحسن مجذوب رحمہ اللہ کا ایک مصرعہ مشہور ہے۔ ع

میخانے کا محروم بھی محروم نہیں ہے

مگر ہم نے اس مصرعہ کو امامِ اہل سنت رحمہ اللہ کی محفل میں غلط پایا کہ ان کی محفل میں کوئی محروم ہوتا ہی نہ تھا جسے محروم ہو جانے کے بعد کہا جائے کہ وہ محروم نہیں ہے۔ عین دوران درس آنے والوں کے لیے بھی کوئی روک ٹوک نہ تھی۔ تفسیر کا درس ہو رہا ہے کہ دم کروانے والے آگئے۔ چند سیکنڈ کی بات ہے، کلماتِ دعائیہ پڑھ کر پھونک مار دیتے اور سبق شروع ہو جاتا۔ جب صاحبِ فراش ہو گئے اور لوگوں کو اس خزانہ کی اہمیت کا احساس ہوا اور یہ دولت اپنے ہاتھوں سے جاتی نظر آئی تو وقت بے وقت کی قید نہ رہی۔ گکھڑ میں بٹ دری ہاؤس کے عقب میں آپ کے مکان والی گلی میں خواص وعام کا مجمع لگا رہتا۔ بیماری، ضعف، بڑھاپا کئی طرح کے عوارضات مگر ہونٹوں پر وہی مسکراہٹ، آنکھوں میں وہی چمک، ماتھے میں وہی شفقت۔ جاننے والوں سے اس کے گھر بار بیوی بچوں سب کا پوچھنا۔ نو وارد سے آپ کے چند سوالات تھے، وہ ضرور پوچھتے تھے۔ نوجوانوں سے پوچھتے شادی شدہ ہو؟ بچے کتنے ہیں؟ والدین زندہ ہیں؟ یہ سوال کبھی نہ ہوتا تھا کہ کام کیا کرتے ہو؟ آمدن کیا ہے؟ علما سے دینی مصروفیت پوچھتے۔ مدرسین سے پوچھتے کیا پڑھاتے ہو؟ علما سے ایک سوال یہ بھی ہوتا کہ مکان اپنا ہے یا

* مہتمم مدرسہ عربیہ حنفیہ تعلیم الاسلام، حضرو، ضلع اٹک

نہیں؟ اگر جواب نہ میں ہوتا تو دعا دیتے۔ فرماتے اگر ہو سکے تو مکان اپنا بناؤ۔ آخری چند سالوں میں جب بات چیت زیادہ نہ کر سکتے تھے تو دعا دیتے اور یہ دعا کبھی نہ بھولتے کہ اللہ تعالیٰ مدارس کی اور علما کی حفاظت فرمائے۔

احقر نے سب سے پہلے آپ کی زیارت ۱۹۸۰ء میں ''جامعہ حنفیہ تعلیم الاسلام'' جہلم کے سالانہ جلسہ میں کی۔ اس کے بعد جہلم کے سالانہ جلسوں میں بارہا آپ کا بیان سنا۔ ۱۹۹۴ء جہلم کے سالانہ جلسہ میں آپ کی آمد کی اطلاع بھی تھی اور یہ بھی کہ آپ بیمار ہیں، تشریف نہیں لا سکتے۔ احقر کو آپ کی زیارت کا اشتیاق تھا کہ معلوم ہوا آج آپ کا بیان ہے۔ حاضرین جلسہ میں خوشی کی لہر دوڑ گئی۔ آپ کے بیان میں مجمع اکٹھا ہو گیا۔ علماء، طلبہ، عوام اور آپ کے عقیدت مندوں کا جم غفیر تھا۔ آپ نے وضو کے مسائل پر بیان فرمایا اور بے پروائی سے پیدا ہونے والی عمومی غلطیوں کی نشان دہی فرمائی۔ علما، طلبہ کے اتنے بڑے مجمع میں آپ نے جو عنوان منتخب فرمایا، اس سے آپ کے ہاں عمومی فقہی مسائل کی اہمیت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

۱۴۱۱ھ/۱۹۹۰ء میں آپ ہمارے علاقہ چھچھ ضلع اٹک میں قصبہ ''مومن پور'' میں اپنے استاذِ گرامی حضرت مولانا عبدالقدیر رحمہ اللہ کے جنازہ پر تشریف لائے۔ نمازِ جنازہ آپ نے پڑھائی۔ قبر پر بیان میں اپنے تأثرات کا اظہار فرمایا جس سے حضرت مولانا عبدالقدیر رحمہ اللہ کی عظمت اور آپ کی ان سے محبت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ استاذ اور شاگرد کا رشتہ آپ کے ہاں کس مقام کا حامل ہے۔ آپ نے مولانا عبدالقدیر رحمہ اللہ کی تدفین کے بعد قبر کے سرہانے کھڑے ہو کر بیان میں فرمایا:

''حضرت میرے بڑے مشفق اور مہربان استاذ تھے مجھے اپنے باپ کے مرنے پر اتنا صدمہ نہیں ہوا جتنا آج ان کی وفات پر ہوا ہے۔''

دورۂ تفسیر کی خصوصیات

احقر شعبان، رمضان ۱۴۱۱ھ میں حضرت اقدس مرشدی مولانا قاضی محمد زاہد الحسینی قدس سرہٗ کی اجازت سے تفسیر قرآن مجید پڑھنے کے لیے ''نصرۃ العلوم'' حضرت امامِ اہل سنت رحمہ اللہ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ پہلا ہفتہ دورہ تفسیر کا سبق مشرقی درسگاہوں کی دوسری منزل پر ہوا، پھر مدرسہ کی مسجد ''مسجدِ نور'' کی گیلری میں ہوتا رہا۔ دورہ تفسیر کا آغاز آپ ہمیشہ یکم شعبان سے فرماتے تھے۔ ان دنوں وفاق المدارس کے امتحان بھی یکم شعبان سے شروع ہوتے تھے، اس لیے ابتدا میں طلبہ کی حاضری کم ہوتی، مگر آپ نے اپنا معمول نہ بدلا یا اور ہمیشہ یکم شعبان کو ہی دورہ تفسیر کا سبق شروع فرمایا۔

احقر کو بحیثیت شاگرد آپ کو قریب سے دیکھنے کا موقع ملا۔ پہلے دن جن باتوں سے متاثر ہوا، ایک تو آپ کی سادگی تھی سادگی کا معنی تکلف اور تصنّع سے پاک ہونا ہے سادہ لباس اور بلا تکلف آپ نے السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ کہا اور طلبہ میں مسند درس پر بیٹھ گئے۔ دوسرے وقت کی پابندی۔ سبق کے شروع ہونے کا وقت آٹھ بجے تھا۔ طلبہ کی حاضری کم ہو یا زیادہ، سردی ہو یا گرمی بارش ہو یا کوئی دوسرا عارضہ، آپ پورے آٹھ بجے مائیک پر پھونک مارتے اور طالب علم قرآن مجید سے تلاوت شروع کر دیتا۔ یہ تلاوت عبارت پڑھنے کی حیثیت میں ہوتی۔ لاؤڈ اسپیکر پر آپ کی پھونک کی آواز گھڑی کے الارم کی طرح ہوتی۔ طلبہ قرآن مجید اور کاپیاں لیے دوڑے آتے۔ ایسا کبھی نہیں ہوا کہ طلبہ انتظار میں بیٹھے ہیں اور آپ ابھی تشریف نہ لائے ہوں۔

تیسری چیز جس سے احقر متاثر ہوا، وہ آپ کا انداز بیان تھا۔ آپ سادگی سے، روانی سے بندھے بندھائے الفاظ کے

ساتھ بولتے چلے جاتے۔ آپ کی بات متنِ متین کی طرح ہوتی۔ نہ اس میں کوئی جھول نہ کجی، نہ پھیلاؤ کہ اکتاہٹ ہو جائے اور نہ اختصار کہ مطلب تک ہی رسائی نہ ہو۔ آواز کے زیر و بم میں بھی ایسی ہی یکسانیت تھی۔ نہ ایسا جوش وخروش کہ لاؤڈ اسپیکر پھٹنے لگے اور نہ ایسی پستی کہ کانوں تک بات نہ پہنچ سکے۔ آپ کے انداز بیان کو اگر کوئی پیمانہ لے کر ماپنا چاہے تو یہ ماپ آپ کی یکسانیت اور اعتدال میں شاید کوئی کمی نہ بتا سکے۔ پہلے دن آپ نے مبادی میں آدابِ قرآن مجید، آدابِ درس، طرزِ تفسیر، درجات تفسیر اور اپنے اندازِ بیان کا تعارف کرایا۔ سورۃ الفاتحہ کا ترجمہ اور تفسیر پڑھائی۔ دوسرے دِن سورۃ البقرہ سے ابتدا فرمائی۔ ابتدائی دو ہفتوں میں روزانہ آدھا پارہ اور پھر ایک پارہ پڑھاتے رہے۔ سبق بے تکلف ہوتا تھا۔ سورۃ البقرہ میں غم اور حزن میں فرق بیان فرمایا اور فرمایا، میں ہمیشہ حوالہ سناتا ہوں، اب اس فرق پر حوالہ یاد نہیں آرہا۔ ایک پرانے طالب علم نے عرض کیا، اجازت ہو تو عرض کروں؟ فرمایا: بالکل۔ اس نے بتایا کہ یہ فرق ابو ہلال حسن بن عبداللہ بن سہل العسکری نے ''الفروق اللغویۃ'' میں بیان کیا ہے۔ آپ نے فرمایا: جزاک اللہ، یہی حوالہ ہے۔

ایسا کمال احقر نے کہیں نہیں دیکھا۔ آپ روزانہ ایک پارہ پڑھاتے تھے۔ ایک پاؤ پر ایک گھنٹہ اور سپارے پر چار گھنٹے لگتے۔ یہ وقت نہ کبھی زیادہ ہوا نہ کم۔ آپ پورے آٹھ بجے مسندِ درس پر تشریف فرما ہوتے اور بارہ بجے اٹھتے۔ بڑھاپا بھی تھا اور ضعف بھی، مگر آپ کی کرامت تھی کہ درمیان میں اٹھنا تو کجا، جس کیفیت میں آپ بیٹھتے، اسی پر بیٹھے رہتے۔ پورے ڈیڑھ ماہ میں ہم نے آپ کو نشست بدلتے ہوئے بھی نہیں دیکھا۔ علومِ قرآنی کا ایک سمندر موجزن نظر آتا۔ آپ کا درس ایسا دلچسپ اور علمی نکات پر مشتمل ہوتا تھا کہ چار گھنٹے ہمیں بیس منٹ بھی نہ لگتے اور جی چاہتا کہ آپ بیان فرماتے رہیں اور ہم مستفید ہوتے رہیں۔

احقر نے آپ کے ابتدائی درجات کے طلبہ سے سنا ہے کہ دوسری کتب کی تدریس میں بھی آپ کا یہی اسلوب تھا۔ کتاب کی ایک مقدار متعین فرما دیتے، ورقہ یا آدھا ورقہ اور بڑی کتب میں حسبِ ضرورت، پھر پورا سال یہی ترتیب رہتی اور وقت پر کتاب ختم کر دیتے۔ متن کے سمجھانے پر زور دیتے، خارجی مباحث اور طولانی تقریروں کو مضر فرماتے تھے۔ دورہ تفسیر کی ابتدا میں آپ نے اپنا اسلوب بیان کرتے ہوئے فرمایا:

''کئی جگہ تفسیر کے نام پر محض چند مسائل پڑھائے جاتے ہیں، مگر میرا یہ طریقہ نہیں۔ میں تو پورا قرآن مجید پڑھاتا ہوں۔ مسائل پر حسبِ موقعہ ضمناً بات ہوگی۔''

مشہور مسائل پر آپ کی تفصیلی بات کے مقامات متعین تھے۔ انہی مقامات پر تفصیلی بات کرتے۔ اس کے بعد کسی آیت میں سوقع ہوتا تو پچھلی آیت کا حوالہ دے دیتے کہ فلاں مقام پر اس مسئلہ کی تفصیل بیان ہو چکی ہے۔ یہ تفصیل بھی چند منٹ سے زیادہ نہ ہوتی۔ آپ کے مطالعہ کا اجمال ہوتا اور تفصیل کے لیے اپنی مؤلفات یا اکابر کی تالیفات کی نشان دہی فرما دیتے۔ مثلاً: عقیدہ حیاۃ الانبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام اور حیات شہداء پر سورۃ البقرہ آیت نمبر ۱۵۴ وَلَا تَقُولُوا لِمَنْ يُقْتَلُ فِي سَبِيلِ اللَّهِ أَمْوَاتًا میں، مسئلہ سماع موتیٰ پر سورۃ الروم کی آیت نمبر ۵۲ فَإِنَّكَ لَا تُسْمِعُ الْمَوْتَىٰ میں، مسئلہ تقلید پر سورۃ الانبیاء آیت نمبر ۷ فَاسْأَلُوا أَهْلَ الذِّكْرِ إِنْ كُنْتُمْ لَا تَعْلَمُونَ میں بیان فرماتے تھے۔ مسئلہ وسیلہ سورۃ البقرۃ آیت نمبر ۸۹ يَسْتَفْتِحُونَ عَلَى الَّذِينَ كَفَرُوا میں جبکہ مسئلہ استشفاء، عقیدہ عذاب وثوابِ قبر للجسد بتعلق روح کو سورۃ الزمر

آیت نمبر ۴۲: اللَّهُ يَتَوَفَّى الْأَنْفُسَ حِينَ مَوْتِهَا وَالَّتِي لَمْ تَمُتْ فِي مَنَامِهَا میں بیان فرماتے۔

دورانِ درس آپ اکابر کے واقعات، اپنے مشاہدات اور لطائف بھی سناتے ان کے بھی مقامات متعین تھے۔

ربط آیات اہتمام سے بیان فرماتے۔ اس کے لیے باقاعدہ حوالہ دیتے ہوئے فرماتے: بیان القرآن، سبق الغایات میں یہ ربط ہے۔ کبھی ابن کثیر، درمنثور، بیضاوی، جلالین، قرطبی، السراج المنیر وغیرہ کے کسی استدلال کو بطور ربط بیان فرماتے۔ کبھی اپنے شیخ حضرت حسین علی رحمہ اللہ کے بیان کردہ ربط کو بیان فرماتے۔ اس وقت فرماتے: ہمارے حضرت مرحوم مولانا حسین علی صاحب رحمہ اللہ نے یہ ربط بیان فرمایا ہے۔ اور کبھی اپنا ذوق بھی بطور ربط بیان فرماتے۔ ایسے موقع پر یہ کبھی نہیں فرمایا کہ میرے نزدیک یہ ربط ہے۔ فرماتے: آسان ربط یہ ہے۔ اوپر یہ واقعہ ہے، اب اسی کی وضاحت ان کلمات سے ہے۔

تفسیر قرآن مجید کے بیان میں آپ اپنے خاص انداز سے قریب المعنیٰ الفاظ کے فرق کو بیان فرماتے۔ مثلاً تفسیر اور تاویل میں فرق کے ضمن میں فرماتے کہ امام ابو عبید رحمہ اللہ فرماتے ہیں كلاهما بمعنىً واحدٍ۔ امام ماتریدی فرماتے ہیں: تفسیر فسر سے ہے جس کا معنیٰ قطع قطعیت اور یقین کے ہیں اور تاویل ترجيحُ أحدُ المحتملاتِ ہے۔ اگر ترجیح وزنی دلیل سے ہے تو تفسیر صحیح ہے، ورنہ تفسیر بالرائے ہوگی۔ علم اور شعور میں فرق یہ بتاتے کہ علم عقل والوں کی صفت ہے اور شعور حواس خمسہ ظاہرہ سے کسی چیز کو دیکھنے یا معلوم کرنے کو کہتے ہیں۔ اِفك اور اَفَكُ میں فرق: اِفك بکسرہ ہمزہ بمعنیٰ جھوٹ اور اَفَكُ بفتح ہمزہ بمعنیٰ پھرنا۔ کبھی عام غلط تلفظ کی اصلاح فرماتے، مثلاً: يُونان بفتح یا ہے، بضمہ یا اغلاط العوام سے ہے۔ ''مفتاح السعادہ'' میں اس کی تصریح ہے۔

اسماء الرجال پر آپ کی گہری نظر رہی۔ بعض بڑے مغالطے اشاروں میں حل فرما دیتے۔ مثلاً فرمایا: فَلَمَّا آتَاهُمْ مِنْ فَضْلِهِ بَخِلُوا بِهِ کی تفسیر میں کئی حضرات ثعلبہ بن حاطب صحابی رضی اللہ عنہ کو لائے ہیں حالانکہ یہ بدری صحابی ہے اور بعض اس پر اعتراض کر کے اس واقعہ ہی کو غلط قرار دیتے ہیں۔ دونوں باتیں درست نہیں۔ ثعلبہ بن حاطب رضی اللہ عنہ بدری صحابی منافق نہیں۔ ایک اور ثعلبہ بن حاطب منافق تھا۔ یہ آیت اسی کے متعلق ہے اور زکوٰۃ پر إِنَّمَا هِيَ أُخْتُ الْجِزْيَةِ اسی ثعلبہ بن حاطب کا قول ہے۔ علامہ شبیر احمد عثمانی رحمہ اللہ کو بھی اس پر مغالطہ لگا ہے۔

ترجمہ قرآن مجید میں آپ کا مطالعہ وسیع تھا۔ تحقیق سے بات کرتے، مثلاً: ''إِنَّمَا'' کے متعلق فرمایا: علم معانی والوں نے نفی و اثبات سے مرکب بتایا ہے۔ اس پر ''إِنَّمَا'' کا معنیٰ ''نہیں ہے مگر یہ بات'' ہوتا ہے اور رضی شارح کافیہ نے ''إِنَّمَا'' کا معنیٰ ''پختہ بات'' سے کیا ہے۔ نحوی اشکالات کو آپ دلچسپ انداز میں بیان کرتے مثلاً: ''كُنْ'' امر ہے اور ''فَيَكُونُ'' جزا ہے تو جزا مجزوم کیوں نہیں؟ بیضاوی نے یہ جواب دیا ہے کہ فَيَكُونُ خبر ہے مبتدا محذوف کے لیے، أي فَهُوَ يَكُونُ۔ علمائے نحو کے اختلافات پر بھی آپ کی گہری نظر تھی اور اپنا مطالعہ بیان فرماتے۔ مثلاً: ''أَنْ تَمِيدَ بِكُمْ'' کی ترکیب کوفیوں کے ہاں لِأَنْ لَا تَمِيدَ بِكُمْ اور بصریوں کے ہاں كَرَاهِيَةَ أَنْ تَمِيدَ بِكُمْ ہے۔

آپ تفسیر میں کبھی دلچسپ معلومات بھی ارشاد فرماتے۔ ''وَمَا تَغِيضُ الْأَرْحَامُ وَمَا تَزْدَادُ'' کے تحت مدارک، ابو السعود، بیضاوی، السراج المنیر نے بیان کیا ہے کہ عادۃً تو بچہ نو مہینے کے بعد پیدا ہوتا ہے، لیکن کبھی اس سے کم، سات، آٹھ مہینے میں بھی ہو جاتا ہے۔ فرماتے ہیں۔ کہ ضحاک بن مزاحم پیدا ہوئے تو اس کے دانت بھی تھے اور پیدائش کے وقت

قہقہہ لگایا۔ احناف کے نزدیک حمل کی زیادہ مدّت دو سال، شوافع کے نزدیک چار سال اور مالکیہ کے ہاں پانچ سال ہے۔ ایک پادری کے حوالے سے لکھا ہے حکیم لاورے جو چین کا ایک مشہور آدمی ہے، وہ ۸۰ سال ماں کے پیٹ میں رہا۔ ایسی خرقِ عادت باتیں اگر آجائیں تو ان کے لیے کوئی ضابطہ نہیں۔ دوسری تفسیر یہ ہے کہ بچہ پہلے چھوٹا ہوتا ہے، پھر جب بڑا ہو جاتا ہے تو رحم بھی پھیلتا جاتا ہے۔ جب بڑا نہیں ہوتا ہے تو اس وقت رحم پھیلتا نہیں۔

آپ کے درس میں ایسی معلومات ہوتیں کہ یوں معلوم ہوتا تھا کہ آپ نے کتابوں سے کرید کرید کر یہ باتیں نکالی ہیں۔ مثلاً حضرت موسیٰ علیہ السلام جب فرعون کے دربار میں جادوگروں سے مقابلہ کے لیے گئے تو اون کا لباس پہنا ہوا تھا اور جوتے گدھے کے چمڑے کے تھے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی والدہ کا نام ''یوحانذ'' تھا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام پر تجلی کا جو واقعہ پیش آیا، اس پہاڑ کا نام طور نہیں ''زبیر'' ہے۔ حضرت سلیمان علیہ السلام کے واقعہ میں ہدہد کا نام ''یعفور'' ہے۔

آپ کا عام مزاج اشعار پڑھنے کا نہ تھا۔ کبھی کسی خاص موقع پر شعر بھی سناتے، مگر یہ شعر ایسا برمحل ہوتا گویا شاعر نے اسی موقع کے لیے کہا ہے۔ جب حضرت یوسف علیہ السلام کے بھائیوں نے انہیں کہا کہ و تصدّق عَلَیْنَا تو انہیں وہ وقت یاد نہ تھا جب انہوں نے یوسف علیہ السلام کو کنویں میں ڈالا۔

حقارت سے نہ دیکھ اے اہل ساحل اہل طوفاں کو
کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کنارے ڈوب جاتے ہیں

اَللّٰہُ نُوْرُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرض مثل نورہٖ کمشکوۃ فیہا مصباح پر اکبر الہ آبادی مرحوم کا قطعہ سنایا جو انہوں نے ہندوستان کے تین مشہور تعلیمی اداروں دیوبند، علی گڑھ اور ندوہ کے متعلق کہا ہے۔

ہے دلِ روشن مثالِ دیوبند اور ندوہ ہے زبانِ ہوش مند
گر علی گڑھ کی بھی تم تشبیہ دو اک معزز پیٹ بس اس کو کہو

وَلَا یَضْرِبْنَ بِاَرْجُلِهِنَّ پر شعر پڑھا:

مجھی سے سب یہ کہتے ہیں کہ رکھ نیچی نظر اپنی
کوئی ان سے نہیں کہتا نہ نکلو یوں عیاں ہو کر

قرآنیات میں مختلف آیات سے مذاہب متفرقہ کے استدلال کو بیان فرماتے، احناف کے دلائل بیان فرماتے، اہل بدعت اگر کسی آیت سے استدلال کرتے تو اس کا جواب بھی ارشاد فرماتے، اکابر کے واقعات سناتے، اپنے مشاہدات بیان فرماتے۔ آپ کے درس کی ایک خصوصیت مختلف مسائل پر اکابر کی تالیفات کا تعارف بھی تھا۔ قرآنیات پر ''مفردات القرآن'' از امام راغب اصفہانی رحمہ اللہ، ''لغات القرآن'' از مولانا عبد الرشید نعمانی رحمہ اللہ، ''قصص القرآن'' از مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی رحمہ اللہ اور ''ارض القرآن'' از علامہ سید سلیمان ندوی رحمہ اللہ کی تعریف فرماتے تھے۔ آپ جب کسی کتاب کا تذکرہ کرتے تو اس کا موضوع بھی بیان فرماتے، مثلاً: جہد المقل شیخ الہند مولانا محمود حسن رحمہ اللہ کا موضوع بیان فرمایا کہ جہد المقل میں تین عنوانات ہیں: (۱) امکانِ کذب (۲) امکانِ نظیر (۳) خلفِ وعید۔

آپ طلبہ کو دینی دعوت میں ہمیشہ اعتدال کی نصیحت فرماتے تھے۔ مشہور مسئلہ ''یا رسول اللہ'' کہنے کا حکم بیان کرتے

ہوئے فرمایا: ''یا رسول اللہ'' کہنا نہ مطلقاً جائز ہے نہ مطلقاً حرام ہے۔ اگر کوئی شوقیہ کہتا ہے اور رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کو حاضر ناظر نہیں مانتا تو درست ہے اور اگر حاضر ناظر سمجھتے ہوئے مدد کے لیے کہتا ہے تو شرک ہے۔

فرمایا: نصیحت کے طور پر کہتا ہوں کہ تعلیم میں سختی نہ کرو، اپنے دعویٰ میں نرمی نہ کرو، دلیل مضبوط بیان کرو اور تقریر نرمی سے کرو۔ اپنے استاذ حضرت مولانا غلام غوث ہزاروی رحمہ اللہ کا ایک واقعہ بیان فرمایا: ۱۹۲۵ء میں ہم ایک مرتبہ بے خبری میں اہل بدعت کے ہاں چلے گئے۔ تقریر مولانا غلام غوث ہزاروی صاحب کی تھی۔ ہم نے جب وہاں کے حالات دیکھے تو میں نے مولانا سے کہا یہ کیا ہوگا۔ فرمایا: میں کوئی راستہ نکالتا ہوں۔ مولانا غوث ہزاروی رحمہ اللہ نے تقریر کی۔ تقریر کے بعد ان لوگوں نے کہا، اب ہم نے سلام پڑھنا ہے۔ مولانا غلام غوث ہزاروی رحمہ اللہ نے دعا کرانا شروع کر دی یا اللہ ہم بہت گناہ گار ہیں، ہمیں معاف فرما، شرک و بدعت سے بچا، اپنے گھر کی زیارت نصیب فرما۔ جب تیرے گھر میں پہنچیں تو طواف نصیب فرما۔ اپنے حبیب صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے گھر کی زیارت نصیب فرما جب ہم روضہ رسول صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم پر جائیں تو وہاں یہ درود شریف پڑھنے کی توفیق نصیب فرما: ''الصّلوٰۃُ والسلامُ علیك یا رسول اللّٰہ''، ''الصّلوٰۃُ والسلامُ علیك یا حبیب اللّٰہ''۔ کچھ دیر پڑھتے رہے اور دعا ختم کر کے آگئے۔

آپ کے درس میں ایسی اہم باتیں ہوتیں جو ہر جگہ نہیں ملتیں۔ مثلاً فرمایا: ''تقویۃ الایمان'' حضرت شاہ محمد اسماعیل شہید رحمہ اللہ کی کتاب نہیں ہے۔ حضرت مدنی رحمہ اللہ اسے شاہ صاحب کی کتاب نہیں مانتے تھے۔ ہمیں حضرت مدنی رحمہ اللہ کی تحقیق پر اعتماد ہے۔ ملحوظ رہے کہ حضرت مدنی کی یہ بات مکتوبات شیخ السلام میں موجود ہے۔ ''بُلغۃ الحیران'' کے متعلق فرمایا: ''بلغۃ الحیران'' مولانا حسین علی رحمہ اللہ کی تفسیر نہیں بلکہ یہ حضرت مولانا غلام اللہ خان اور مولانا نذر شاہ صاحب نے لکھی ہے۔ ان حضرات نے مولانا حسین علی رحمہ اللہ کی طرح ربط بیان نہیں کیا بلکہ اس میں کمی کی ہے۔

بطور نصیحت کے فرمایا: ''یاد رکھو، اکابر کا دامن نہ چھوڑنا۔ حمد اللہ، مختصر المعانی، تصریح وغیرہ ہم نے سب پڑھی ہیں، سولہ سال کتابیں پڑھیں اور باون سال پڑھایا مگر اکابر سے ہٹ کر اِدھر اُدھر جانے کو دل نہیں چاہتا۔ جس مسئلہ میں تردد ہوتا ہے، میں اکابر کی کتابوں سے دیکھتا ہوں۔'' فرمایا: ''بحمد اللہ مجھے تفسیر، حدیث، فقہ اور دیگر علوم کی تدریس کرتے ہوئے نصف صدی سے زیادہ عرصہ ہو چکا لیکن کبھی اپنی رائے کو اجتہادی درجہ نہیں دیا بلکہ اکابر کی رائے کو ہی مقدم سمجھا ہے۔ عزیز القدر طلبہ! اجتہاد نہ کرنا، اکابر کی رائے پر اعتماد کرنا، اسلاف کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑنا۔''

''اشاعۃ التوحید والسنۃ'' سے اپنی قطع تعلقی کا واقعہ سناتے ہوئے فرمایا: سید عنایت اللہ شاہ بخاری صاحب کے ساتھ میں نے اٹھارہ سال تک کام کیا۔ ایک دفعہ گکھڑ آئے، صبح کا درس دیا، توسل کا مسئلہ بیان کیا اور کہا یہ شرک ہے۔ گکھڑ میں ماسٹر محمد حسین ہیں، وہ ''المہند'' اٹھا کر لے آئے جس پر ہمارے تمام اکابر کے دستخط ہیں۔ اس پر چھتیس علما کے دستخط ہیں۔ اس میں توسل کا ذکر ہے کہ کس طرح جائز ہے۔ شاہ صاحب نے ''المہند'' ماسٹر محمد حسین سے لے کر چٹائی پر پھینک دی۔ میں نے اس وقت سے فیصلہ کر لیا کہ ان کے ساتھ نہیں چل سکتے۔ اب انہوں نے ''المہند'' کے رد میں ''القول المسند'' چھپوائی ہے۔

احقر نے دیکھا کہ آپ کے دورہ تفسیر میں شریک علما میں تین باتیں ضرور پیدا ہوتیں: (۱) قرآن مجید سے تعلق پیدا ہوتا اور یہ داعیہ پیدا ہوتا کہ معاشرہ میں اصلاحی کام درس قرآن مجید کے بغیر مشکل ہے۔ (۲) بدعت سے نفرت اور تردید بدعت کا

جذبہ پیدا ہوتا۔ (۳) اکابر کی تحقیقات پر اعتماد پیدا ہوتا۔

حضرت امامِ اہل سنت رحمہ اللہ سے چند ملاقاتیں

دورہ تفسیر میں احقر کو اللہ تعالیٰ نے حضرت امامِ اہل سنت رحمہ اللہ کو قریب سے دیکھنے کا موقع ملا۔ آپ کی بلاتکلف زندگی، بلاتصنع نشست و برخاست اور پختہ علم، گہرا مطالعہ، مذاہب اور دلائل پر گہری نظر اور استحضار کے باوجود اکابر کے بلاچوں وچراں اتباع نے احقر پر گہرا اثر چھوڑا۔ جی چاہتا تھا کہ آپ سے استفادہ اور آپ کی زیارت سے دل کا سکون میسر رہے۔ اس غرض سے احقر اکثر آپ کی خدمت میں حاضر ہوتا رہا۔

۳رذوالحجہ ۱۴۲۲ھ کو گکھڑ حاضری ہوئی۔ اس وقت آپ معمولی نشست و برخاست خود کر سکتے تھے۔ پوچھا کیا کر رہے ہو؟ عرض کی، پڑھا رہا ہوں۔ احقر نے ''المہند علی المفند'' کی تلخیص لکھی تھی۔ ہر عقیدہ ایک سطر میں جامع آسان الفاظ سے لکھا۔ تصدیق کے لیے اسے اکابر کے مختلف علمی اداروں کو بھیجا۔ الحمد للہ سب نے سراہا۔ احقر دار العلوم دیوبند کی تصدیق اپنے ساتھ لے گیا تھا۔ حضرت کی خدمت میں پیش کی تو اپنا بڑا عدسہ نکالا اور استفتا، جواب استفتا اور خلاصہ کو بغور ملاحظہ فرمایا۔ مصدقین کے دستخط ایک ایک کر کے پڑھے۔ چند حضرات کا تعارف نہیں تھا، احقر سے پوچھا یہ کون ہیں؟ اس تفصیل کے بعد فرمایا، ماشاء اللہ بہت اچھا ہے۔ اسے چھپوا دیا جائے۔ احقر نے عرض کیا آپ بھی تصدیق فرما دیں۔ اپنا قلم نکالا اور دار العلوم دیوبند کے خط پر لکھا:

''الجواب صواب بلا ارتیاب''۔ احقر ابوالزاہد محمد سرفراز عفی عنہ۔ ۳رذوالحجہ ۱۴۲۲ھ

۱۹رشوال ۱۴۲۳ھ/ ۲۴دسمبر ۲۰۰۲ء بروز جمعہ عصر کے بعد حاضر ہوئے۔ الحاج محمد اکرام صاحب (گکھڑ) آفیسر محکمہ ٹیلی فون بھی ہمارے ہمراہ تھے۔ آپ چارپائی پر تشریف فرما تھے۔ چند طلبہ آپ کے پاؤں داب رہے تھے۔ احقر کو بھی سعادت نصیب ہوئی۔ احقر نے اجازت حدیث کے لیے عرض کیا تو خوشی سے فرمایا کہ اجازت ہے۔ برادرم حافظ ظہور احمد الحسینی مدظلہ کے لیے بھی عرض کیا تو پوچھا کہ انہوں نے دورہ حدیث پڑھا ہوا ہے؟ احقر نے عرض کیا: جامعہ اشرفیہ، لاہور سے پڑھا ہوا ہے۔ فرمایا: انہیں بھی اجازت ہے۔ سند حدیث کے متعلق فرمایا کہ ختم ہو چکی ہے۔ احقر نے عرض کیا کہ اگر اجازت ہو تو ہم چھپوا دیں۔ فرمایا: مولانا شیر علی شاہ صاحب لے گئے ہیں، آپ چھپوا دیں تو بھی بہتر ہے مگر اس میں کتابت کے اغلاط ہیں، درست ہونے چاہییں۔ احقر کے ساتھ ہمارے اٹک کے کمشنر صاحب بھی تھے جو اپنے دینی مزاج اور شوق سے احقر سے دینی علم پڑھ رہے تھے۔ ان کے نصاب سے متعلق مشورہ کیا کہ ان کی عمر اور مشغولیات کے مدنظر احقر نے ان کے لیے درج ذیل نصاب تجویز کیا ہے: علم صرف میں ابواب ثلاثی مجرد صحیح، مزید، ضروری قواعد اور تمرین الصرف، نحو میں مجموعہ قواعد نحو، تمرین النحو اور ہدایت النحو، منطق میں تیسیر المنطق اور مرقات، ادب میں نفحۃ العرب، فقہ میں نور الایضاح، قدوری، ہدایہ، اصولِ فقہ میں: تیسیر الاصول اور حسامی، حدیث میں زاد الطالبین، ریاض الصالحین، آثار السنن اور مشکوٰۃ، ترجمہ قرآن مجید اور تفسیر میں جلالین۔ اس نصاب کی تکمیل پر اگر مناسب ہو تو اصولِ حدیث پڑھا کر بخاری، ترمذی سبقاً اور مسلم، ابوداؤد، ابن ماجہ اور طحاوی تبعاً پڑھا دی جائیں۔ احقر کے اس مجوزہ نصاب پر آپ خوش ہوئے اور فرمایا: یہ مناسب ہے۔ ادب میں ''نفحۃ العرب'' کافی ہے، حماسہ نہ پڑھائیں اور مقامات تو بالکل نہیں۔ منطق میں اصطلاحات سے واقفیت کے لیے اتنا نصاب کافی ہے۔ ''تیسیر الوصول'' کا پوچھا کہ یہ کیا کتاب ہے؟ احقر نے عرض کیا: اصول الشاشی وغیرہ متون سے احقر نے اصطلاحات، احکام اور امثلہ کو جمع کر دیا ہے۔ فرمایا، چھپی ہوئی ہے؟ عرض کیا نہیں، تو فرمایا: چھپوا دیا جائے تو بہتر ہے۔ احقر نے کمشنر صاحب موصوف کے لیے اجازتِ حدیث کا عرض کیا تو فرمایا، انہوں نے دورۂ حدیث نہیں پڑھا۔ اس کے بعد اجازت دی جا سکتی ہے۔ آپ کے اس اصولی مؤقف پر احقر کو خوشی ہوئی۔ آپ انہی دنوں عمرہ کے سفر سے واپس آئے تھے۔ ہمیں کھجور اور ایک ایک تسبیح عنایت فرمائی۔ یہ تسبیح الحمد للہ احقر کے پاس آپ کے تبرک کے طور پر محفوظ ہے۔

۱۳رجنوری ۲۰۰۳ء کو عشاء کے بعد حاضر ہوا۔ وقت مناسب نہ تھا مگر زیارت کے بغیر جانے کو جی نہ چاہتا تھا۔ دروازے پر دستک دی تو حضرت کے پوتے مولوی احسن صاحب آئے۔ ہم نے عرض کیا کہ ہم اٹک سے حاضر ہوئے ہیں۔ اگر حضرت کی زیارت ہو سکے تو آپ کی مہربانی۔ انہوں نے بیٹھک کا دروازہ کھولا اور کہا: میں آپ کے لیے کھانا لاتا ہوں۔ احقر حضرت کی ترتیب پر خوش ہوا کہ یہ تکلفات میں نہیں پڑے کہ آپ نے کھانا کھایا ہے یا نہیں، کھائیں گے وغیرہ۔ ہم نے کھانا کھایا۔ پھر دوسرے کمرے میں حضرت امامِ اہل سنت رحمہ اللہ کی خدمت میں حاضری ہوئی۔ حضرت نے پہچان لیا۔ خوش ہوئے۔ فرمایا: آپ کی بے اکرامی ہوئی۔ گھر میں ساگ اور کڑھی پکی تھی۔ گوشت آج بازار میں نہیں ملا۔ احقر آپ کی مستعدی پر حیران ہوا کہ آپ نے تفصیل پوچھی ہوئی ہے کہ مہمان کہاں سے آئے ہیں اور کیا کھایا ہے۔ تعویذ لینے والے اور دعا کروانے والے لوگ بھی آ گئے۔ حضرت ہر ایک سے اس کی ضرورت پوچھتے۔ چھوٹے چھوٹے کاغذ کے ٹکڑے رکھے ہوتے تھے، مختصر تعویذ لکھ کر دے دیتے۔ ایک صاحب بھینس کے لیے آٹے کا پیڑ الفافہ میں دم کرانے لائے۔ آپ نے لفافہ لے کر دم پڑھا اور پیڑے کو خوب دائیں بائیں اوپر نیچے الٹ پلٹ کر دم کیا کہ اس کا کوئی حصہ پھونک مارنے سے رہ نہ گیا۔ جب یہ حضرات چلے گئے تو پوچھا: آپ نے عشا پڑھی ہے؟ ہم نے عرض کیا، ابھی نہیں پڑھی۔ فرمایا: وضو ہے؟ عرض کیا، جی وضو ہے۔ فرمایا: میں نے بھی نہیں پڑھی۔ آپ مصلے پر بیٹھے تھے۔ پیچھے ہو گئے اور احقر کو فرمایا کہ آپ نماز پڑھائیں۔ احقر نے عرض کیا کہ میں مسافر ہوں۔ فرمایا، آپ ہی پڑھائیں، ہم اپنی دو رکعت پوری کر لیں گے۔ احقر کو یہ سعادت نصیب ہوئی۔ ہم نے اجازت لی۔ کمشنر صاحب اٹک بھی ہمارے ساتھ تھے۔ اپنے پوتے مولوی احسن کو بلایا اور فرمایا تمہیں اس لیے بلایا ہے کہ بیٹا، دیکھو یہ اٹک کے کمشنر ہیں۔ گویا آپ نے اپنے پوتے کو ایک اعلیٰ افسر کی دینداری کا تعارف کرایا۔

آخری ملاقات اپریل ۲۰۰۷ء کو ہوئی۔ احقر اپنے چند عزیزوں کے ہمراہ حاضر خدمت ہوا۔ رات گیارہ بجے کا وقت تھا۔ دروازہ پر دستک دی۔ ایک صاحب آئے تو مدعا عرض کیا اور یہ عرض کی کہ وقت اگرچہ مناسب نہیں، راستہ میں ہمیں دیر ہو گئی ہے۔ اگر صرف حضرت کی زیارت ہو جائے تو آپ کی مہربانی۔ تھوڑی دیر بعد وہ صاحب ہمیں بیٹھک میں لے گئے۔ ماشاء اللہ حضرت جاگ رہے تھے۔ چارپائی پر تشریف فرما تھے۔ خوش ہوئے، مگر اب صحت کی حالت پہلے والی نہ تھی۔ بات کرنے میں دشواری تھی، مگر حافظہ، ذہنی بیداری اور استحضار پہلے کی طرح تھا۔ آپ کی آنکھوں میں وہی شفقت، محبت اور خوشی جھلک رہی تھی۔ احقر نے برخوردار محمد زاہد سلمہ کو آپ کی خدمت میں پیش کیا کہ یہ میرا بیٹا ہے۔ ہاتھ اٹھا کر اس کے سر پر رکھا اور فرمایا: اللہ عالم باعمل بنائے۔ کمزوری زیادہ تھی۔ ہاتھ محمد زاہد سلمہ کے سر پر سے ڈھلک گیا۔ ہم نے دعا کی درخواست پیش کی۔ دونوں ہاتھ اٹھا کر دعا فرمائی، خاص کر فرمایا: اللہ تعالیٰ علما کی اور مدارس کی حفاظت فرمائے۔

یہ آخری ملاقات تھی ۔اس کے بعد زیارت جنازہ پر ہوئی ۔عقیدت مندوں کا ٹھاٹھیں مارتا ہوا سمندر تھا۔ حضرت امام اہل سنت کو دیکھا۔ نورانیت وقار پہلے سے بڑھا ہوا تھا۔ چہرہ مبارک پر اطمینان وسکون کی تجلی خاتمہ بالخیر ہونے پر آپ کی خوشی کی گواہی دے رہی تھی اور یوں معلوم ہوتا تھا کہ آپ ابھی درس تفسیر ارشاد فرما رہے ہیں۔

ہزاروں منزلیں ہوں گی ہزاروں کارواں ہوں گے
بہاریں ہم کو ڈھونڈیں گی نہ جانے ہم کہاں ہوں گے

ایک خواب اور اس کی تعبیر

حضرت امامِ اہل سنت رحمہ اللہ کے وصال سے تقریباً ایک ماہ پہلے احقر نے خواب میں دیکھا کہ ”اشاعۃ التوحید والسنۃ“ سے تعلق رکھنے والے احقر کے شناسا ایک مولانا صاحب ایک جگہ کھڑے ہیں ۔احقر بھی ساتھ کھڑا ہے۔ ساتھ حضور نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم بھی کھڑے ہیں۔ احقر عقیدہ حیاۃ النبی صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم پر مولانا صاحب کو دلائل دے رہا ہے، وہ جواب دے رہے ہیں۔ حضور نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم فرما رہے ہیں: انہیں یہ دلائل بھی سمجھاؤ کہ منکرین حیات کس طرح دھوکہ دیتے ہیں اور اپنے اکابر کی تعبیراتی اصطلاحوں کو دھوکہ دے کر اختلاف پر محمول کرتے ہیں۔ اتنے میں دیکھا کہ ساتھ مولانا سید کفایت بخاری مدظلہ سابق مدیر ماہنامہ ”التوحید والسنۃ“ بیچ پیر کھڑے ہیں۔ حضور نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے بخاری صاحب کی طرف متوجہ ہو کر مجھے فرمایا: یہ انہیں کیوں نہیں سمجھاتے؟ اسی آن احقر نے دوسرا منظر دیکھا۔ حضور نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم تشریف فرما ہیں۔ احقر بھی خدمتِ اقدس میں حاضر ہے۔ احقر نے حضرت امامِ اہل سنت مولانا محمد سرفراز خان صفدر رحمہ اللہ کے متعلق پوچھا تو آپ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے فرمایا: انہیں ہم اپنے پاس بلانے والے ہیں۔ احقر نے عرض کیا، آپ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے پاس مجھے ایسا سکون محسوس ہو رہا ہے کہ میں نے کبھی ایسا سکون کہیں بھی نہیں دیکھا، مجھے بھی اپنے پاس بلا لیں۔ فرمایا: ابھی تمہارا وقت نہیں آیا اور اس کے بعد احقر کے متعلق کچھ ارشاد فرمایا۔ الحمد للہ علیٰ ذالک۔

اس خواب سے احقر کو یقین ہو گیا کہ اب حضرت امامِ اہل سنت استاذی المکرم دامت برکاتہم کا وقت قریب ہے اور اللہ تعالیٰ کے نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے دین کی خدمت میں آپ نے جو عمر گزاری، حدیث رسول صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی تعلیم وتدریس کو اپنا مشغلہ بنایا اور خصوصاً آپ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی شانِ اقدس کے تحفظ اور عقیدہ حیاۃ الانبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام کی جو خدمت کی، وہ رب تعالیٰ نے اپنے محبوب کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے دربار میں قبول فرمائی ہوئی ہے اور اس عظیم الشان خدمت کے صلہ میں آپ کو قرب دربارِ نبوی علیٰ صاحبہا الف الف تحیۃً وسلاماً حاصل ہے۔ اور وَالَّذِينَ اتَّبَعُوهُمْ بِإِحْسَانٍ کی بشارت پر جو آپ رحمہ اللہ کی تعلیمات اور عقائدِ حقہ کی خدمت گزاری کا شرف حاصل کرے اسے بھی ان شاء اللہ یہ سعادت نصیب ہوگی۔ رب تعالیٰ حضرت امام اہل سنت رحمہ اللہ تعالیٰ کے درجات بلند فرمائے، ان کی اولاد کو، عامۃ المسلمین کو، ہم سیاہ کاروں سمیت ان کا اتباعِ اخلاص سے نصیب فرمائے۔ آمین یا رب العالمین بجاہ النبی الکریم۔

یا رب تو کریم و رسولِ تو کریم
صد شکر کہ ہستیم میانِ دو کریم

ڈاکٹر حافظ محمود اختر*

ایک عہد ساز شخصیت

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ”دنیا سے علم یوں اٹھایا جائے گا کہ اہل علم دنیا سے اٹھا لیے جائیں گے۔“ حضرت مولانا سرفراز خاں صفدرؒ مرحوم کی وفات اسی حدیث کی عملی شکل دکھائی دیتی ہے۔ حضرت مرحوم میں علم اور عمل دونوں کا حسین امتزاج موجود تھا۔ یہی وجہ ہے کہ آپ کی گفتگو میں اللہ تعالیٰ نے اس قدر تاثیر رکھی ہوئی تھی کہ سننے والے کے دل میں اتر جاتی۔ آپ کے اندازِ تقریر میں سادگی اور برجستگی تھی۔ گفتگو مسجع مقفع خطیبانہ لفاظی اور غیر ضروری جوش خطابت سے بالکل مبرا ہوتی لیکن دل میں اتر جاتی۔ جب میں گورنمنٹ اسلامیہ کالج گوجرانوالہ میں بی اے کا طالب علم تھا، اس وقت کالج کی اسلامیات سوسائٹی کی ایک تقریب میں مولانا کو بطور مقرر دعوت دی گئی۔ ہمارا خیال تھا کہ حکم ہوگا کہ گاڑی بھیج دینا، لیکن کمالِ سادگی اور کمال شفقت سے فرمایا کہ میں خود تانگے پر آ جاؤں گا۔ میرے اصرار کے باوجود آپ خود ہی تانگے میں تشریف لائے۔ اپنے انداز کے مطابق بالکل سادہ تقریر فرمائی لیکن اس میں اس قدر تاثیر تھی کہ میں نے کالج کے کئی اساتذہ کو دیکھا کہ ان کی آنکھوں میں آنسو اور دل پر عجیب رقت طاری تھی اور کہہ رہے تھے کہ ”ہم تو ویسے ہی بہروپیے بن کر اپنے آپ میں خوش ہو رہے ہیں، اصل اللہ والے لوگ تو یہ ہیں۔“

اللہ تعالیٰ نے مولانا کو یہ صلاحیت بھی عطا کر رکھی تھی کہ آپ مخاطبین اور سامعین کی استعداد کے مطابق بات کرتے۔ آپ کو اعلیٰ فوجی افسروں، اساتذہ کرام اور عوام کے ہر طبقہ سے خطاب کے مواقع ملے۔ آپ زندگی بھر گکھڑ کی جامع مسجد میں عوام سے بھی خطاب کرتے رہے۔ مخاطبین کی ذہنی سطح کے مطابق ہر مجلس میں خطاب فرماتے۔ گورنمنٹ ٹریننگ انسٹی ٹیوٹ گکھڑ میں زیرِ تربیت اساتذہ کو بھی درس دیتے رہے۔ اس درس میں ہر مکتبِ فکر کے لوگ موجود ہوتے۔ او ٹی کے کورس میں شامل لوگوں میں علما بھی ہوتے تھے۔ بعض اوقات ان میں کچھ لوگ فرقہ وارانہ ماحول پیدا کرنے کی کوشش کرتے، لیکن آپ کا بیان اس قدر عالمانہ اور فرقہ وارانہ رجحان سے اس قدر مبرا ہوتا کہ پورا ماحول ہم آہنگی اور یک جہتی کی تصویر بنا رہتا۔ تمام مکاتبِ فکر کے لوگ آپ کا احترام کرتے۔

آپ ان ہستیوں میں سے تھے جنہیں دیکھ کر اللہ یاد آتا ہے۔ آپ کے دروس کے دوران اکثر مجھ پر ایسی کیفیت طاری ہو جاتی کہ گویا میں اپنے اندر جھانک کر اپنے گناہوں پر اپنے آپ کو ملامت کر رہا ہوں اور اپنی عملی کوتاہیوں پر نگاہ ڈال رہا ہوں اور اندر ہی اندر اللہ سے عہد کر رہا ہوں کہ میں اپنی اصلاح کروں گا۔ آپ کے درس سے اٹھنے کے بعد ایک روحانی لطافت محسوس ہوتی۔ یہ کیفیت میرے ساتھ خاص نہیں۔ بیسیوں لوگوں سے اس موضوع پر بات ہوئی اور ہر کوئی ایسی کیفیت کا

---

* سابق صدر شعبہ علوم اسلامیہ، پنجاب یونیورسٹی لاہور

تذکرہ کیا کرتا تھا۔ یہ کیفیت اللہ والوں کی مجلسوں میں ہی حاصل ہوتی ہے۔ میں یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ مجھے علم دین میں جتنی بھی شد بد ہے، اس کا ساٹھ ستر فی صد مولانا کی صحبت اور مجلس کا فیضان ہے۔ اس کے ساتھ جو تھوڑا بہت اللہ کا خوف یا نیکی سے محبت اور شر سے نفرت ہے، وہ بھی آپ ہی کی تربیت کا فیض ہے۔

مولانا کی زندگی نظم وضبط اور پابندیٔ وقت کا بہترین نمونہ تھی۔ روزانہ کے معمولات میں گکھڑ میں درس قرآن وحدیث، گوجرانوالہ میں تدریسی فرائض، آرام کے اوقات، مطالعہ کے اوقات، مسائل پوچھنے کے لیے آنے والوں کا وقت اور گورنمنٹ ٹریننگ انسٹی ٹیوٹ میں درس شامل تھے۔ ان میں کبھی تقدیم یا تاخیر نہیں ہوئی۔ ہر کام اپنے وقت پر سرانجام دیا جاتا۔ امامت اور درس میں وقت کی پابندی کا اس قدر اہتمام تھا کہ درس کے آغاز واختتام میں کبھی ایک منٹ کی بھی تاخیر نہیں ہوئی۔ نماز کے لیے مسجد میں داخل ہونے کا وقت سیکنڈوں کے اعتبار سے متعین تھا۔ کبھی ایسا نہیں ہوا کہ نمازیوں کو چند سیکنڈ بھی انتظار کرنا پڑا ہو۔ درس کے فوراً بعد گوجرانوالہ روانگی کا وقت بھی لمحات کے ساتھ متعین تھا۔

مولانا مرحوم مومنانہ فراست وبصیرت سے بھی مالا مال تھے۔ تعبیر رؤیا میں آپ کو خصوصی ملکہ حاصل تھا۔ تقویٰ وخدا خوفی، اخلاصِ نیت، اعلیٰ اقدار کا ہر قسم کی صورتِ حال میں خیال رکھنا، دوسروں کا احترام، جیو اور جینے دو کا اصول (رواداری) آپ کی زندگی کے بنیادی اصول تھے۔ گکھڑ میں ایک زمانے میں ایسے مواقع آئے جب بڑی اشتعال انگیز صورتِ حال پیدا ہو جاتی، لیکن مولانا مرحوم نے اپنے مقتدیوں کو تحمل اور بردباری کا پابند کیے رکھا اور آپ کی وجہ سے ماحول تکدر کا شکار ہونے سے بچا رہا۔

دفاع وابلاغ دین آپ کی زندگی کا مطمح نظر تھا۔ پوری زندگی اسی جد جہد میں گزاری۔ تقریر وتحریر کے ذریعے اسلامی عقائد کی وضاحت اور عقائد کے بارے میں پیدا کردہ ابہامات اور غلط فہمیوں کے ازالے کے لیے اپنی زندگی وقف کر دی۔ آپ نے بہت سے کلامی موضوعات پر قرآن وسنت اور امت کے اجماعی نقطہ نگاہ کی بنیاد پر بڑے مدلل اور موثر انداز سے لکھا۔ آپ کی کتب برصغیر کے علم الکلام میں ایک قیمتی اضافہ ہیں۔ مسلمانوں کی تاریخ میں کئی ایسے مرحلے آئے جب مختلف خارجی عوامل کے زیر اثر عقائد اسلام کے بارے میں کئی غلط فہمیاں در آئیں۔ ہر موقع پر اللہ تعالیٰ نے ایسے مصلحین پیدا کیے جنھوں نے عقائد اسلامی کی وضاحت اور غلط عقائد کی دلائل وبراہین کے ذریعے اصلاح کا کام کیا۔ اشاعرہ، ماتریدیہ، امام ابن تیمیہؒ اور ان کے شاگرد، مجدد الف ثانیؒ اور شاہ ولی اللہؒ کے نام مثال کے طور پر پیش کیے جا سکتے ہیں۔ اگر یہ تحریکیں پیدا نہ ہوتیں اور یہ حضرات اصلاحِ عقائد کا بیڑہ نہ اٹھاتے تو معلوم نہیں اسلامی عقائد میں کیا کیا بیرونی آلائشیں شامل ہو جاتیں۔ اصلاحِ عقائد میں مولانا سرفراز خاں صفدر کی کاوشیں بڑی قابلِ قدر ہیں۔ آپ نے اسلام کے تصورِ توحید کی قرآن وسنت کی روشنی میں جس طرح وضاحت کی، وہ وقت کی ایک اہم ضرورت تھی۔ گلدستۂ توحید میں آپ نے نہ صرف تصور توحید کی اہمیت وضاحت سے بیان کی بلکہ اس کے اثبات میں موثر عقلی ونقلی دلائل کے انبار لگا دیے۔ اُس زمانے میں مختلف تاویلات کے ذریعے توحید اور شرک کو خلط ملط کرنے کی کوششیں ہو رہی تھیں تو آپ نے دلائل وشواہد کی بنیاد پر واضح کیا کہ مشرکین اللہ کی مالکیت وخالقیت کے منکر نہ تھے بلکہ ان کا شرک یہ تھا کہ وہ خدائے واحد کے علاوہ اور قوتوں کو بھی اللہ کا شریک سمجھتے تھے۔ آپ کے دور میں شرک کو Dilute کر کے مختلف تاویلات کے ذریعے عقیدت ومحبت کے رنگ میں پیش کرنے کا رجحان پیدا ہو رہا تھا تو آپ نے بڑے موثر دلائل کے ساتھ ان سوراخوں کو بند کیا۔ اصلاحِ عقائد کے حوالے سے تسکین الصدور، ازالۃ الریب، راہِ سنت،

آنکھوں کی ٹھنڈک، دل کا سرور، مقالہ ختم نبوت وغیرہ خصوصاً قابلِ ذکر ہیں۔

انکارِ حدیث کے نتائج کے حوالے سے آپ کی کتابوں کو اولین تصانیف کی حیثیت حاصل ہے۔ ان کتب میں بنیادی اسلامی ماخذ اور امت کے اجماعی نقطہ نگاہ کی روشنی میں آپ نے منکرینِ حدیث کی تمام کوششوں سے پردہ اٹھایا اور اسلام میں حدیث کی اہمیت کو متعارف کروایا۔ اگرچہ بعد میں اس موضوع پر بہت سی کتابیں معرضِ وجود میں آئیں، لیکن آپ نے اس موضوع پر لکھنے کی راہیں کھولیں اور فتنہ انکارِ حدیث کے زہریلے اثرات سے لوگوں کو روشناس کرایا۔

تحقیق کے شعبے میں جدید دَور میں اصول وضوابط منضبط ہو گئے ہیں اور حوالہ وغیرہ دینے کا مخصوص انداز اختیار کیا جاتا ہے۔ اسی طرح تحقیق کی مختلف اقسام بھی ہیں۔ اگر اس معیار پر مولانا علیہ الرحمۃ کی کتابوں اور ان کے اسلوب کا جائزہ لیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ مولانا ایک محقق کے انداز سے لکھتے ہیں آپ کی تحریرات کے ماخذ بنیادی ہیں۔ سب سے پہلے قرآن حکیم، پھر احادیثِ نبویہ، اقوالِ صحابہ، تابعین کے اقوال، تبع تابعین کے آثار اور اس کے بعد ائمہ کا نقطہ نگاہ ان کی اصل کتابوں کے حوالے سے پیش کرتے ہیں اور ان کے مکمل حوالہ جات پیش کرتے ہیں۔ تحقیق کے بنیادی اصولوں میں یہ بات شامل ہے کہ کسی بھی بات کی تہہ تک پہنچے بغیر کوئی رائے نہ دی جائے۔ مولانا کا یہ اصول ہے کہ وہ کسی دوسرے شخص کی عبارت کا معنی ومفہوم خود اپنی طرف سے بیان نہیں کرتے بلکہ اس کا وہی مفہوم اختیار کرتے ہیں جو لکھنے والے نے خود بیان کیا ہو۔

تحقیق کی مختلف اقسام ہیں جن میں بنیادی تحقیق، تنقید، اطلاقی تحقیق وغیرہ شامل ہیں۔ آپ کی کتب میں تحقیق کی یہ تمام صورتیں موجود ہیں۔ جب مولانا دوسرے کے نقطہ نگاہ کا تجزیہ کرتے ہیں تو اس کے حق میں پیش کردہ روایت کے درجے اور اس کے راویوں کے بارے میں اسماء الرجال کے ماہرین کی آرا کا تجزیہ کرتے ہوئے روایت ودرایت کے اصولوں کے مطابق اس پر تنقید کرتے ہیں۔ فریقِ مخالف کے دلائل کا عقلی ونقلی بنیادوں پر تجزیہ بھی کرتے ہیں۔ اس طرح ہم کہہ سکتے ہیں کہ مولانا ایک ''محقق مصنف'' ہیں۔ اپنے نقطہ نگاہ کو حکایتوں اور روایتوں کے سہارے پیش نہیں کرتے بلکہ تحقیق کا اسلوب اپناتے ہیں۔

مولانا سرفراز خاں صفدر کی تحریرات میں سادگی، فکری تسلسل اور منطقی ترتیب موجود ہے۔ آپ اپنا نقطہ نگاہ بڑے اعتماد اور وضاحت سے بیان کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ نقطہ نگاہ منطقی ترتیب کے ساتھ پیش کرتے ہیں اور اس کی تائید میں دلائل کی لڑی پرو دیتے ہیں۔ بعض لوگوں کی عبارات میں جب دلائل کی کثرت آتی ہے تو تحریر میں بھاری پن پیدا ہو جاتا ہے اور پڑھنے والا بڑی کوشش کے بعد ہی ان دلائل کو سمجھ پاتا ہے، لیکن مولانا کی تحریرات میں ایسا بھاری پن نہیں ہوتا۔ قاری بڑی آسانی اور ذوق وشوق کے ساتھ تحریر میں منہمک رہتا اور دلائل حاصل کرتا ہے۔ آپ کی تحریرات میں تسلسل ہے۔ قاری کے ذہن میں بات ایک ترتیب کے ساتھ بیٹھتی چلی جاتی ہے۔

مولانا کی تمام کتابیں آپ کے تبحرِ علمی کا منہ بولتا ثبوت ہیں۔ آپ کا مطالعہ قرآن مجید، تفاسیر، احادیث کے بڑے بڑے مجموعوں، اسلاف کے علمی سرمایے اور کتب کو محیط ہے۔ وسعتِ نظر، بلند خیالی، نقطہ نگاہ میں گہرائی اور گیرائی مولانا صفدر کے بنیادی اوصاف میں شامل ہے۔ ان تمام اوصاف کا آپ کی کتابوں میں جا بجا مشاہدہ کیا جا سکتا ہے۔ یہ بات افسوس ناک ہے یا ہماری کوتاہی ہے کہ آپ کی تصانیف پاکستان کی یونیورسٹیوں اور ملک کی بڑی بڑی لائبریریوں میں مُوجود نہیں ہیں۔ ان کتابوں کو ایک طرح سے ایک مکتبِ فکر کی نمائندہ کتب سمجھ لیا گیا ہے اور انھیں ایک مکتبِ فکر میں محدود کر دیا گیا ہے، حالانکہ یہ

کتابیں محض ایک مکتب فکر کے نقطہ نگاہ کی نمائندہ نہیں بلکہ اسلامی عقائد کی توضیح واثبات اور علم الکلام کا عظیم سرمایہ ہیں۔ یہ ہماری ذمہ داری ہے کہ ان کتابوں کو ملک کی بڑی بڑی لائبریریوں تک پہنچایا جائے۔ مختلف جرائد میں کتابوں پر تبصرے شائع ہوتے ہیں۔ یہ تبصرے بھی کسی کتاب کے تعارف میں بڑا کردار ادا کرتے ہیں۔ ضرورت ہے کہ مولانا کی کتب پر مختلف جرائد میں تبصرے شائع کرائے جائیں تاکہ ان میں موجود علم الکلام کا عظیم ذخیرہ وسیع تر بنیاد پر منظرِ عام پر آئے۔

کوئی درخت اپنے پھل اور اس سے حاصل ہونے والے فوائد سے قیمتی بنتا اور پہچانا جاتا ہے۔ مولانا سرفراز خاں صفدرؒ کا ایک پھل ان کے ہزاروں شاگرد ہیں جو دنیا کے کونے کونے میں تبلیغ واشاعت اور دفاع دین کے کام میں مشغول ہیں۔ اس تناور درخت کا دوسرا ثمرہ آپ کی تصانیف ہیں جو دفاع دین کے حوالے سے اس قدر علوم ومعارف اور عقلی ونقلی دلائل سے بھری ہوئی ہیں کہ برصغیر کے علم الکلام پر لکھنے والا کوئی شخص ان سے بے نیاز نہیں ہو سکتا۔ اس قد آور درخت کا تیسرا ثمر آپ کی اولاد ہے۔ یہ بات مولانا کے لیے باعثِ بخشش بھی ہے اور قابلِ فخر بھی کہ آپ کی تمام اولاد حافظ قرآن اور عالمِ دین ہے۔ یہ حافظوں اور عالموں کا خانوادہ ہے۔ میرا اپنا نقطہ نگاہ یہ ہے کہ آپ کی تمام اولاد کا حافظ وعالم ہونا اس بات کی دلیل اور ثبوت ہے کہ آپ ایک باعمل انسان تھے۔ آپ کی اولاد نے آپ کی شخصیت میں علم وعمل کو یکجا دیکھا، تقویٰ اور پرہیزگاری کے صرف درس نہیں سنے بلکہ اپنے والدِ محترم کو تمام اسلامی تعلیمات کا عملی نمونہ اور تمام مکارمِ اخلاق کا مرقع پایا۔ اولاد کو آپ کے قول وفعل میں تضاد نظر نہیں آیا، اسی لیے ان کی اولاد کے لیے مولانا کی ہستی ایک عملی نمونہ ٹھہری اور انہوں نے اسی لائن کو اختیار کیا جس کا عملی نمونہ انہوں نے اپنے والدِ محترم میں دیکھا۔ ایسا بھی دیکھنے میں آیا ہے کہ عالموں کی اولاد حافظ اور عالم نہیں بنی، لیکن مولانا سرفراز خاں صفدرؒ اس اعتبار سے ایک منفرد حیثیت رکھتے ہیں کہ انہوں نے اپنی پوری اولاد کو دین کے لیے وقف کر دیا۔

اللہ تعالیٰ مرحوم کو کروٹ کروٹ راحت نصیب فرمائے، انہیں جنت میں اعلیٰ مقام عطا کرے اور ان کی تمام دینی خدمات کو ان کے لیے صدقۂ جاریہ بنائے۔ آمین

تبلیغ کرو اور نرمی کے ساتھ سمجھاؤ۔ یہ نہیں کہ دوسروں کے سر پر ڈنڈا مارو اور کہو او بے نماز، او روز خور، او شرابی! اس طرح تو لڑائی شروع ہو جائے گی۔ حدیث پاک میں آتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مسجد میں تشریف فرما تھے۔ ایک آدمی آیا اور مسجد میں پیشاب کرنا شروع کر دیا۔ لوگ اس کے پیچھے دوڑے تو آپ نے فرمایا اس کو نہ روکو۔ وجہ یہ ہے کہ جب اس نے پیشاب شروع کر دیا ہے تو روکنے سے اسے تکلیف ہوگی، اور دوسری وجہ یہ ہے کہ تم اس کے پیچھے دوڑو گے، وہ آگے دوڑے گا تو ساری مسجد کو گندا کرے گا۔ جب اس نے پیشاب کر لیا تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو بلایا اور فرمایا: ''دیکھو یہ مسجدیں اللہ تعالیٰ کے ذکر کے لیے ہیں، قرآن کریم کی تلاوت کے لیے ہیں، نیکیوں کے لیے ہیں، پیشاب پاخانے کے لیے نہیں ہیں۔'' نرمی کے ساتھ اس کو سمجھایا اور جو صحابہ کرام پیچھے دوڑے تھے، ان کو بھی تنبیہ فرمائی: ''انما بعثتم میسرین لا معسرین'' اللہ تعالیٰ نے تمہیں نرمی کے لیے بھیجا ہے، سختی کے لیے نہیں بھیجا۔ تو عزیزو! مسئلہ بتاؤ، سمجھاؤ نرمی کے ساتھ۔ ڈنڈا نہ مارو۔ سختی کرنے سے فتنہ فساد ہوگا۔ (ذخیرۃ الجنان، ۷/۳۰۸)

مولانا ظفر احمد قاسم*

پروانے جل رہے ہیں اور شمع بجھ گئی ہے

وہ کیا گئے کہ رونق بزم چمن گئی
رنگ بہار دید کے قابل نہیں رہا

امام اہل سنت حضرت مولانا سرفراز خان صفدر نور اللہ مرقدہ کی کمالات سے لبریز زندگی پر قلم اٹھانے کا اصل حق تو ان اصحاب علم وفضل معاصرین کا ہے یا پھر جلیل القدر تلامذہ کرام کا۔ ''انما یعرف ذا الفضل من الناس ذووہ'' کا قاعدہ مسلم ہے، تاہم کچھ مقبولان بارگاہ خداوندی ایسے بھی ہوتے ہیں کہ ہر شخص کی محبت ومودت کا مرکز ہوتے ہیں، اس لیے یہ عاجز بھی یادیاراں کی اس غم زدہ محفل میں شرکت کو اپنے لیے تحصیل سعادت کا ذریعہ سمجھتے ہوئے

ذکر حبیب کم نہیں وصل حبیب سے

کے نظارہ سے لطف اندوز ہو رہا ہے کیونکہ ''ھذا المجلس لا یشقی جلیسھم'' یا پھر بقول برکت العصر مولانا محمد زکریا کاندھلویؒ:

تیرے مے خانے کا محروم بھی محروم نہیں ہے

پوری طرح یاد نہیں کہ امام اہل سنت حضرت مولانا سرفراز خان صفدر قدس اللہ سرہ کی سب سے پہلی کون سی تصنیف نظر سے گزری، لیکن یہ اچھی طرح یاد ہے کہ ''راہ سنت'' کو پڑھ کر سب سے زیادہ متاثر ہوا۔ بلاشبہ حضرت اقدسؒ کی ہر تصنیف کی طرح یہ تصنیف بھی مسلک اہل سنت والجماعت کے مدلل اور واضح امتیازات پر نہایت جامع کتاب ہے بلکہ اہل سنت اور اہل بدعت کے درمیان اختلافی مسائل میں اس سے زیادہ دلکشا، بصیرت افروز، باحوالہ اور فیصلہ کن اور کوئی کتاب نظر سے نہیں گزری۔ یہ عاجز اپنے ناقص العلم، ناقص المطالعہ اور ناقص الفہم ہونے کا اعتراف کرتے ہوئے بھی اس اظہار حقیقت میں کوئی تردد محسوس نہیں کرتا کہ متقدمین واسلاف اہل سنت والجماعت کے عقائد واخلاق کا امین ووکیل اور ترجمان حضرت شیخ مولانا محمد سرفراز خان صفدر جیسا (چہ جائیکہ بڑھ کر) ہم عصر بزرگوں میں اور کوئی نہیں تھا۔ گو کہ مسلک اہل حق اور مشرب اعتدال کے معاملہ میں حضرت قاضی مظہر حسین صاحبؒ (مجاز شیخ الاسلام مدنیؒ) اور سرخیل صوفیا حضرت الشیخ سید نفیس الحسینیؒ (مجاز قطب الارشاد حضرت رائے پوری نور اللہ مرقدہ) بھی بڑے حساس تھے، لیکن یوں معلوم ہوتا ہے کہ اکابر واسلاف کے مجموعی مزاج کے ہر پہلو کی پورے اعتدال کے ساتھ علیٰ وجہ البصیرت مدلل ومفصل ترجمانی کا حق حضرت الشیخ مولانا محمد سرفراز خان صفدرؒ نے ہی ادا کیا۔ فجزاھم اللہ احسن ما یجزی بہ عبادہ المنعمین علیھم۔

*مدیر جامعہ خالد بن ولید، وہاڑی

غالباً حضرت الامام محمد بن حسن شیبانیؒ کی ''سیر صغیر'' یا ''سیر کبیر'' کے مطالعہ سے متاثر ہو کر کسی نصرانی نے یہ کہہ کر اسلام قبول کر لیا تھا کہ چھوٹے محمدؒ کے وفور علم اور کمال فضل کا یہ حال ہے تو بڑے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے اوصاف وکمالات کی بلندی کا کیا حال ہوگا۔ بلاشبہ حضرت اقدس نور اللہ مرقدہ کی ہر تصنیف کو پڑھنے کے بعد یہ تاثر ابھرتا ہے کہ حضرتؒ کے رسوخ علمی، عمیق مطالعہ اور اظہار حق علی الادیان کلہا کا یہ حال ہے تو قطب الارشاد حضرت گنگوہیؒ، قاسم العلوم حضرت نانوتویؒ، حضرت شیخ الہندؒ، حضرت مجدد تھانویؒ، حضرت علامہ انور شاہ کشمیریؒ، حضرت علامہ شبیر احمد عثمانیؒ اور شیخ الاسلام حضرت مدنیؒ قدس اللہ اسرارہم جیسے اکابر کے کمالات علمیہ وعملیہ کا کیا حال ہوگا۔

۱۷ رجب ۱۴۰۶ھ کی وہ مسرور کن صبح کبھی نہ بھولے گی جب مولانا غلام مصطفیٰ، بانی جامعہ مدنیہ بہاولپور نے فون پر مبارکباد دی کہ آپ بڑے خوش قسمت ہیں کہ ہمیں تو ۱۶ سال مسلسل درخواست کے بعد جامعہ مدنیہ کے لیے حضرت اقدسؒ کا وقت ملا ہے اور آپ کے جامعہ خالد بن ولید کے لیے (جہاں ابھی فقط زمین خرید کیے ہوئے چند ماہ ہوئے تھے اور کوئی عمارت بھی نہ بنی تھی) تشریف آوری منظور فرمائی ہے۔ بندہ انتہائی خوش بھی ہوا اور حیران بھی کہ اس عاجز نے تو کبھی حضرت اقدسؒ سے اشارتاً بھی درخواست نہیں کی تھی، لیکن اس طرح کی منجانب اللہ شفقت کریمانہ کو انتہائی نیک فال شمار کرتے ہوئے مولوی محمد رفیق صاحب بالاکوٹی (حال ٹیچر ومدرس ڈسکہ سیالکوٹ جوان دنوں اس عاجز کے ہاں جامعہ عثمانیہ شورکوٹ میں درجہ مشکوۃ شریف میں تھے) کو حضرت اقدس کے ہاں مختصر سا عریضہ لکھ کر پیشگی شکریہ ادا کرنے کے لیے بھیج دیا۔ حضرت اقدسؒ خود بھی حیران ہوئے کہ میں نے (یعنی حضرت اقدسؒ نے) تو جامعہ خالد بن ولید کے لیے کوئی وقت نہیں دیا۔ دراصل حضرت اقدسؒ کا تحیر بالکل صحیح تھا، کیوں کہ حضرت نے تو ایک تلمیذ قدیم کو ٹھینگ موڑ موجودہ الہ آباد ضلع قصور کے لیے وقت دیا تھا، لیکن حضرت مولانا غلام مصطفیٰ مرحوم نے ٹھینگی کالونی وہاڑی سمجھا اور بندہ کو مبارکباد دے دی۔ بہر حال اللہ تعالیٰ حضرت اقدسؒ کو اپنے شایان شان جزائے خیر عطا فرمائے کہ بہاولپور سے ٹھینگ موڑ میں راستے میں ہونے کی وجہ سے بالکل نومولود جامعہ خالد بن ولید میں تشریف آوری کی خوشخبری سے شادکام فرمایا اور ۲۳ رجب ۱۴۰۶ھ کو قبیل از عصر تشریف لائے۔ نماز عصر پڑھائی اور طویل دعا فرما کر عظیم خوشخبری بھی عنایت فرمائی ''کہ اس سرزمین سے علم کی نورانی شعاعیں پھوٹتی نظر آ رہی ہیں۔'' (قلندر ہرچہ گوید دیدہ گوید) اور فرمایا کہ اگر مجھے رات کے جلسے میں نہ پہنچنا ہوتا تو رات یہیں گزارتا۔ حوصلہ افزائی اور صغیر پروری کی انتہا فرمائی۔ رجسٹر پر سب سے پہلی وقیع رائے گرامی تحریر فرمائی اور اپنے اگلے نظم پر روانہ ہو گئے۔ (فجزاهم الله احسن الجزاء فی الاخرة والاولی) پھر تشریف آوری کے آثار قبولیت بفضلہ تعالیٰ یوں ظاہر ہوئے کہ بعد از نماز عشا شاداں وفرحاں سویا تو رات سوا ایک بجے کے قریب دیکھتا ہوں کہ مفسر قرآن حضرت مولانا عبد اللہ بہلویؒ جامعہ میں تشریف لائے ہیں اور فرماتے ہیں کہ ''لائیے وہ رجسٹر جس پر حضرت مولانا محمد سرفراز خان صفدرؒ نے رائے گرامی تحریر فرمائی ہے۔ میں بھی وہیں دستخط کروں گا''۔ چنانچہ دستخط فرمائے۔ بندہ کی آنکھ کھل گئی۔ پون گھنٹہ بعد پھر نیند میں دیکھا کہ جانشین امام لاہوریؒ ولی ابن ولی حضرت مولانا عبید اللہ انورؒ خوب صورت گاڑی پر جامعہ تشریف لائے ہیں۔ دو ڈبے مٹھائی کے ہاتھ میں ہیں اور فرمایا، ایک ڈبہ اپنی چھوٹی بیٹی سلمہا (جو اس وقت دورہ حدیث شریف میں تھی) کو دیں اور دوسرا ڈبہ طلبہ حفظ قرآن میں تقسیم کر دیں، اور وہ رجسٹر لائیں جس میں حضرت امام اہل سنتؒ کی رائے گرامی تحریر ہے۔

میں (مولانا عبید اللہ انور) بھی وہیں دستخط کروں گا۔ چنانچہ دستخط فرمائے۔ بندہ بیدار ہوا تو بالکل محسوس ہو رہا تھا کہ جیسے رجسٹر ہاتھ میں ہے اور حضرت انورؒ ابھی ابھی تشریف لے جا رہے ہیں۔ فالحمد لله علی ذلك حمدا کثیرا طیبا مبارکا فیه۔ اس کے بعد بفضلہ تعالیٰ اپنائیت کا یہ عالم تھا کہ بندہ بیسیوں مرتبہ حاضر خدمت ہوا اور حضرت اقدسؒ کی مشفقانہ توجہات کریمانہ کو سمیٹتا رہا۔ اللہ جزائے خیر عطا فرمائے مفتی محمد مظہر شاہ اسعدی کو کہ بہاولپور میں شیخ الاسلامؒ سیمینار منعقد کر کے جملہ اکابر دامت برکاتہم کے فیض برکات سے متمتع ہونے کا موقع مہیا فرمایا جس میں بطور خاص حضرت مولانا سید محمد ارشد مدنی مدظلہ کی صدارت میں کثیر تعداد میں بلند وبالا علمی شخصیات کی شرکت وزیارت اور ملاقات کا شرف حاصل ہوا۔

اس دوران معلوم ہوا کہ پیرانہ سالی اور حد درجہ ضعف کے باوجود حضرت امام اہل سنتؒ نے ریاست بہاولپور کے کافی مدارس قدیمہ میں تشریف لے جانا قبول فرمایا ہے تو داعیہ عشق ومحبت نے مہمیز لگائی اور جانشین شیخ حضرت مولانا زاہد الراشدی مدظلہ اور مولانا عبد الحق خان بشیر مدظلہ سے درخواست کی کہ واپسی میں مروراً ہی سہی، شرف آمدن باعث آبادی ما ہو جائے تو ''قليل منك يكفيني ولكن قليلك لا يقال له قليل'' کے ہدیہ وقیعہ پر تہہ دل سے شکرگزار رہیں گے۔ اللہ تعالیٰ دونوں بھائیوں کو جزائے خیر عطا فرمائے کہ محترم صاحبزادہ مولانا قاری عزیز الرحمن شاہد کے ذمہ لگایا کہ چونکہ تھکاوٹ اور ضعف بہت زیادہ ہے، لہٰذا تھوڑے وقت کے لیے مروراً دعا فرماتے جائیں گے۔ بس پھر کیا تھا ''سَنة الوصال سِنة وسِنة الفراق سَنة'' والے انتظار طویل کے لمحے گزرنے لگے یہاں تک قریب مغرب ۲۷ محرم ۱۴۲۶ھ حضرت مع رفقا تشریف لائے۔ طلبہ نے بھی بفضلہ تعالیٰ بھرپور والہانہ استقبال کیا۔ جب گاڑی مسجد کی دائیں طرف رکی اور حسب امید ووعدہ حضرت اقدسؒ سے دعا کی درخواست کی گئی تو پوچھا کون سی جگہ ہے؟ عرض کیا گیا ''جامعہ خالد بن ولید'' تو قربان جائیں ان کی مہر وشفقت پر، فرمایا مجھے اتارو، رات یہیں رہیں گے۔ اللہ اللہ! خادم نبوت سیدنا انس بن مالکؓ کا وہ سرور بخش جملہ متحضر ہوا ''كانى انظر الى وبيض خاتم النبى صلى الله عليه وسلم''۔ بندہ بھی اپنی اس مسرت او رخوشی کو لفظوں میں بیان کرنے سے قاصر ہے۔ عشا کی نماز کے بعد مختصراً خود اور پھر اپنے عزیز صالح کے ذریعے مسئلہ حیات النبی علیٰ صاحبہا الف الف تحیۃ وسلام کی اہمیت کا تذکرہ فرمایا اور تمام اساتذہ وطلبہ سے اس پر قائم رہنے کا عہد وپیمان لیا اور اسی شرط پر اپنی جملہ سندات علیاء سے اجازت حدیث بھی عطا فرمائی۔ (فجزاهم الله احسن الجزاء واحسنه)۔

صبح ناشتہ کے بعد روانگی سے قبل بندہ نے حقیر سا ہدیہ پیش خدمت کیا تو فرمایا ''تبرکاً لے رہا ہوں''۔ ڈھیروں شکریہ اور دعاؤں سے حضرت اقدسؒ کو جملہ اساتذہ اور طلبہ نے الوداعی سلام کہہ کر روانہ کیا۔ بعد ازاں حضرت اقدسؒ کی ہر مرتبہ زیارت ''يزيدك وجهه حسنا اذا ما زدته نظرا'' کا منظر پیش کرتی رہی۔ یہاں تک کہ محترم بھائی محمد نعیم بٹ صاحب کا پیغام ملا کہ حضرت مولانا مفتی محمد عیسیٰ صاحب مدظلہ کی، حضرت مولانا محمد طارق جمیل مدظلہ کے متعلق ایک تحریر کے سلسلے میں حضرت اقدسؒ سے ملاقات ضروری ہے۔ اس پیغام پر بندہ ۲۰ ربیع الاول ۱۴۲۹ھ بروز بدھ حضرت اقدسؒ کی خدمت میں پہنچا۔ زیارت ہوئی، سلام کیا اور جامعہ کا نام لیا تو فوراً پہچان کر فرمایا کہ ہاں آپ ہی کے ایک مدرس نے ''فضل الرحمٰن فی حل ترکیب القرآن'' کتاب لکھی ہے اور پھر دورۂ حدیث شریف میں طلبہ وطالبات کی تعداد پوچھی۔ بتلانے پر بہت خوش ہوئے اور ڈھیروں دعائیں دیں۔ بار بار فرماتے کہ ایمان کے بعد اللہ کی بڑی نعمت صحت ہے۔ پھر فرمایا کہ چار سال

سے بے کار پڑا ہوں، دعا کریں اللہ تعالیٰ ایمان پر خاتمہ فرمائے۔ جب بندہ نے عرض کیا کہ اللہ تعالیٰ اس دنیا کی زندگی کے بقیہ ایام بھی استقامت علی الدین، عزت وصحت کاملہ سے نصیب فرما کر ہم سب کا خاتمہ ایمان کامل پر فرما دیں تو بلند آواز سے تین مرتبہ آمین آمین آمین کہا۔ اسی دوران صاحبزادہ عزیز الرحمٰن شاہد صاحب کی موجودگی میں بندہ نے عرض کیا کہ مولانا مفتی محمد عیسیٰ صاحب کی بعض عنوانات پر گرفت گو اصولی ہے، لیکن طبع ہونے پر دین دشمن لوگوں کو باتیں بنانے کا موقع ملے گا، لہٰذا حضرت اقدسؒ مفتی صاحب کو حکماً طباعت سے روک دیں۔ صاحبزادہ صاحب کی موجودگی میں حضرت اقدسؒ نے تائید فرمائی۔ قریباً ایک گھنٹہ کی سعادتوں سے لبریز محفل سے اٹھتے وقت اجازت چاہی تو ڈھیروں دعائیں دیں۔

یہ علم نہ تھا کہ یہ آخری ملاقات ہوگی، لیکن احساس ہو رہا تھا کہ "من احب لقاء الله احب لقائه" کا مصداق یقیناً "یختار ما عندالله علی ما عند الناس" کے انتظار میں ہے۔ یہی ہوا۔ تقریباً ڈیڑھ ماہ بعد بندہ حرمین شریفین زادہما اللہ شرفاً کے لیے پابرکاب سفر تھا کہ صبح سوا دو بجے استاد مکرم حضرت مولانا عبد المجید لدھیانوی مدظلہ کی جانب سے فون موصول ہوا کہ حضرت اقدسؒ لاحق بالصالحین ہو چکے۔ فوراً حضرت مولانا زاہد الراشدی مدظلہ سے تصدیق کر کے فون پر تعزیت کی: "فان لله ما اخذ وله ما اعطى وكل شئ عنده باجل مسمى، فلتصبروا ولتحسنوا"۔ اس طرح کروڑوں مسلمانوں کے مرکز عقیدت، لاکھوں کے شیخ طریقت اور ہزاروں اہل علم کے شیخ واستاد نفس مطمئنہ کے حامل "رجوع الى ربه راضية مرضية" کے سفر عشق ومحبت پر روانہ ہو گئے۔

اللهم وسع مدخله وبرد مضجعه وادخله فی دار نعيمك المقيم الذی لايزول ولايحول۔ آمين يا اكرم الاكرمين۔

دل کی گہرائیوں سے بارگاہ کریمی میں دعا ہے کہ اللہ بلند وبالا حضرت اقدسؒ کے نسبی وروحانی جملہ پس ماندگان کو صبر جمیل واجر جزیل سے مالا مال فرما کر حضرت اقدسؒ کے ایمانی، علمی اور اخلاقی کمالات علیا وآثار حسنہ کو قیامت کی صبح تک زندہ وتابندہ رکھ کر امت کے لیے ہر نوع کی رہنمائی کا ذریعہ بنائے۔ آمین یا رب العالمین۔

> حضرت شیخ الحدیث کے صاحبزادے مولانا عزیز الرحمٰن شاہد فرماتے ہیں کہ حضرت کا اصلاح کا انداز عجیب تھا۔ جب ہم پڑھتے تھے تو کبھی کبھی اگر اچھی طرح استری کیے ہوئے، سفید اور خوبصورت کپڑے پہن لیتے، حضرت والد صاحب دیکھتے تو سمجھ جاتے کہ آج اکڑ کر چل رہے ہیں اور شان وشوکت والے کپڑے پہن کر کہیں یہ اترانے نہ لگ جائیں، چنانچہ ہمیں بلاتے اور گھر سے لے کر باہر گلی کے آخر تک نالی صاف کرواتے۔ اگر کبھی ہاتھ پر شاپر چڑھانے لگتے تو فوراً منع کر دیتے، شاپر نہ چڑھانے دیتے اور فرماتے: پہلے اچھی طرح سے نالی کی صفائی کرو، بعد میں ہاتھ دھو لینا۔
>
> (ماہنامہ ہدی للناس گوجرانوالہ، امام اہل سنت نمبر، جون ۲۰۰۹ء)

مولانا عبد القیوم حقانی*

وما کان قیس هلكه هلك واحد

۵ مئی ۲۰۰۹ء پیر اور منگل کی درمیانی شب رات کے تین بجے گوجرانوالہ سے بعض احباب نے موبائل فون پر اطلاع دی کہ امام اہل سنت حضرت مولانا سرفراز خان صفدر انتقال فرما گئے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

صبح جامعہ ابو ہریرہ کے ضروری اُمور نمٹانے کے بعد حضرت امام اہل سنت کے جنازے میں شرکت کے لیے روانہ ہوا۔ گکھڑ کے ڈی سی ہائی سکول میں آپ کا جسدِ خاکی لایا جا چکا تھا۔ گراؤنڈ کو اپنی وسعت کے باوجود تنگ دامنی کی شکایت تھی۔ ایک لاکھ سے زائد افراد پہنچ چکے تھے۔ باہر جی ٹی روڈ پر بھی عوام کا بے پناہ ہجوم تھا۔ وزیر آباد کے بعض بوڑھے "نوجوانوں" پروفیسر حافظ منیر احمد، حاجی بلال احمد ودیگر نے مجھے اپنے حصار میں لے کر کثیر ازدحام کے باوجود سٹیج پر پہنچا دیا۔ ہمارے کئی بزرگ علما خطاب کر چکے تھے، کئی باقی تھے۔ مجھے دعوتِ خطاب دی گئی۔ احقر نے مائیک سنبھالا، اور عرض کیا: امام اہل سنت چلے گئے لیکن ان کے اہداف، مشن اور دعوت وتبلیغ کے حوالے سے پروگرام جاری وساری ہیں۔ ہم نے ان کے کاز کو آگے بڑھانا ہے، یہی ان کی وصیت ہے اور یہی ساری زندگی کی مساعی کا نچوڑ۔

جنازہ حضرت مولانا سرفراز خان صفدر کے جانشین اور ان کے علوم ومعارف کے امین، محقق عالمِ دین حضرت مولانا زاہد الراشدی نے پڑھایا۔ جنازے سے واپسی پر اپنے رفقائے سفر مولانا عماد الدین محمود اور حافظ حسیب اللہ سے حضرتؒ کی حسین یادیں تازہ کرتے ہوئے لوحِ دماغ پر کچھ نقوش اُبھرے۔ میں نے اپنے احباب سے کہا:

گکھڑ جامع مسجد میں دورۂ تفسیر کے اختتام کے متعدد مواقع پر مخدوم زادہ حضرت مولانا حماد الزہراوی نے جلسہ ہائے عام منعقد کیے۔ مجھے بارہا شرکت کی دعوت دی گئی۔ حضرت کرسی صدارت پر تشریف فرما ہوتے، توجہ اور شفقت بھری نگاہِ التفات سے سرفراز تے اور میں اس توجہ والتفاتِ کامل کو غنیمت سمجھ کر کھل کر بولتا رہتا۔ ہر بار میں لوگوں سے یہی کہتا رہا: لوگو! آج امام اہل سنتؒ ہم میں موجود ہیں، ان نگاہوں کی قدر کرو، کل سب کچھ مل جائے گا لیکن یہ نگاہیں نہیں ملیں گی۔ یہ جامع مسجد ہوگی، جامعہ نصرۃ العلوم بھی ہوگا، رونقیں ہوں گی، چہل پہل ہوگی، لیکن اپنے وقت کا یہ شیخ التفسیر اور شیخ الحدیث نہیں ہوگا۔ یہ محبت اور شفقت بھری نگاہیں نہیں ملیں گی۔ موت ایک اٹل حقیقت ہے۔ وہی ہوا جو ہوتا آیا ہے۔ امام اہل سنت کا انتقال ایک شخصیت کی موت نہیں بلکہ علم ومعرفت، زہد وتقویٰ اور جرأت واستقامت کے ایک زریں عہد کا خاتمہ ہے۔

شیخ صفدر کو اللہ تعالیٰ نے علمی عظمتیں، تدریسی رفعتیں اور صوفیانہ شوکتیں عطا فرمائی تھیں، جنہیں ایک امام غزالی اگر دیکھ لیتے تو سو بار ان کے بوسے لیتے۔ مرحوم تبحر علم اور مزاجِ فقر کا حسین سنگم تھے، ان کی شستہ اور نستعلیقی شخصیت کا نقش بھلائے نہیں

* مہتمم جامعہ ابو ہریرہؓ، خالق آباد۔ نوشہرہ

بھولتا۔ جن کی سادگی پر شہزادگی نچھاور ہوتی تھی، جن کے علوم و معارف کی موجوں میں ایک دنیا بہہ جاتی تھی، جن کی آواز کی گونج سے طوفانوں کے دل دہل جاتے تھے، کسی تاجدار اور کج کلاہ میں وہ پھبن کہاں جو اس بے تاج بادشاہ میں بانکپن تھا۔

حضرت امام اہل سنت سے میری پہلی ملاقات کراچی میں ہوئی۔ برادرم مولانا محمد اسلم شیخوپوری داعی تھے۔ پہلا جلسہ جامعہ احسن العلوم میں ترتیب دیا گیا۔ میں احسن العلوم پہنچا تو امام اہل سنت کی تقریر جاری تھی اور فرما رہے تھے:

"میں پاکستان میں تین آدمیوں کے لیے خصوصیت سے دعا کرتا رہتا ہوں۔ کراچی کے مولانا محمد یوسف لدھیانوی، سرحد کے عبد القیوم حقانی اور لاہور کے قاری عبد الرشید میری دعاؤں کا مرکز ہیں"۔

میں اسٹیج پر حضرت کے قدموں میں بیٹھ گیا۔ یہ پہلی ملاقات تھی۔ اس کے بعد زیارت و ملاقات کا یہ شرف بارہا حاصل ہوتا رہا۔ پھر چار روز تک کراچی میں جلسے ہوتے رہے۔ حضرت کی سرپرستی میں میری تقاریر ہوتی رہیں۔ آخری روز کراچی کے برنس روڈ سوبھراج ہسپتال کے متصل چوک پر دفاع و عظمت صحابہؓ کے عنوان سے ایک بڑے جلسے کا اہتمام کیا گیا تھا۔ انتظام سپاہِ صحابہ کا تھا، حضرت کی صدارت تھی۔ حضرت کی موجوگی میں احقر نے بھی خطاب کیا۔ داعی سپاہِ صحابہؓ کے کارکن تھے۔ ظاہر ہے جلسہ میں وہی رنگ غالب تھا۔ میرا بھی آغازِ کار تھا۔ جوانی کا جوش اور ولولہ تھا، جذبات کا تلاطم تھا۔ میں نے تقریر شروع کی اور میری تقریر بھی سپاہِ صحابہؓ کے خطیبوں کے انداز میں ڈھل گئی۔ سپاہِ صحابہؓ کے جوشیلے نوجوانوں نے اپنے روایتی طرز پر نعرے لگائے۔ بعض نوجوان ساتھی حق نوازِ ثانی' عبد القیوم حقانی کے نعرے لگاتے رہے۔ جلسہ کے بعد امام اہل سنت نے میرا ہاتھ پکڑا اور فرمایا:

"آپ کا یہ اندازِ تقریر و بیان اور طرزِ فکر مجھے پسند نہیں۔ آپ نے مستقبل میں دینی کام کرنا ہے۔ اللہ نے آپ کو درس و تدریس، علم اور قلم کے لیے چُن لیا ہے۔ ہم تو درس و تدریس، تصنیف و تالیف کے میدان میں آپ کی صلاحیتوں کے منتظر ہیں۔ اس طریقہ کار کو اپناؤ گے تو علمی کام نہیں کر سکو گے۔ جوش میں ہوش کا دامن کھو بیٹھو گے"۔

امام اہل سنتؒ کا تیر ہدف پر لگا۔ میں نے یہ نصیحت پلے باندھ لی۔ رفتہ رفتہ میں نے پالیسی بدل لی اور درس و تدریس، تصنیف و تالیف میں اپنی صلاحیتیں کھپا دیں۔ یہ امام اہل سنتؒ کی دعاؤں اور نصیحتوں کا ثمرہ ہی تو ہے کہ آج مجھ گناہگار کے قلم سے ۸۰ سے زائد کتابیں منصۂ شہود پر آ چکی ہیں۔ والحمد للہ علیٰ ذلک۔

امام اہل سنت بہت بڑے محقق عالمِ دین تھے، عظیم مفسر قرآن تھے، محدثِ کبیر تھے، دینی و ملی رہنما تھے، ہزاروں لوگوں کے پیر و مرشد تھے، علما کی ایک بڑی جماعت کے استاد تھے، طبقہ علما کے سرخیل اور مقتدا تھے۔ ان ساری عظمتوں کے باوجود فروتنی اور انکساری کا یہ عالم تھا کہ فرمایا کرتے: لوگ مجھے امام اہل سنت کہتے ہیں۔ امام اہل سنت صرف اس معنی و مفہوم میں ہوں کہ میں گوجرانوالہ شہر میں واقع گکھڑ منڈی میں اہل سنت کی ایک مسجد کا امام ہوں اور بس۔

امام اہل سنت قافلۂ علم، عشق و شوق اور کاروانِ جذب و ذوق کے ہمراہی تھے۔ اہل دنیا سے روٹھ کر کیا گئے، قرارِ دل لوٹ کر لے گئے۔ اللہ نے انہیں بے پناہ خوبیاں دے رکھی تھیں، ایک ایک خوبی انہیں زندہ و جاوید رکھنے کے لیے کافی ہے۔ وہ شیخ التفسیر تھے، امام اہل سنت لقب پایا، وہ شیخ الحدیث تھے، پیکرِ عشق رسولؐ تھے، سنت رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے عاشقِ زار تھے، دبستانِ علمِ حدیث کے بلبلِ خوشنوا تھے۔ جن لوگوں نے ان سے دورۂ تفسیر اور دورۂ حدیث پڑھا، ان سے پوچھ لیجیے، وہ بول

اٹھیں گے کہ محض قرآن اور محض حدیث پڑھانا تو سب کو آتا ہے، مگر دل میں اُتارنا یہ امام اہل سنت شیخ صفدر کا خاصہ تھا۔

مجھے ان کی شخصیت کے دو پہلوؤں نے بے حد متاثر کیا۔ ایک تو مسلکِ اعتدال' جو ذہنی اور فکری توازن کی دلیل ہے اور دوسرے خوبصورت نثر نگاری' تحقیقی اندازِ تحریر اور ادبی چاشنی سے معمور۔ ایک اچھے ادیب اور کامیاب نثر نگار کی تحریر میں جو بھی اجزائے حسن ہوتے ہیں، وہ امام اہل سنت کے اسلوبِ نگارش میں بدرجۂ اتم موجود تھے اور قوتِ استدلال اس پر مستزاد۔

بہرحال امام اہل سنت چلے گئے، ان کی یادیں باقی ہیں۔ ان کا مشن، ہدف اور دعوتی پروگرام ہمارے لیے نقطۂ آغاز ہے۔ ہمیں چاہیے کہ ان کے مشن، ہدف اور دعوت کا علَم اُٹھا کر آگے بڑھیں۔ ان شاء اللہ دینی اور دنیوی کامیابی ہمارے قدم چومے گی۔

"منکرین حدیث نے محض اپنی خواہش کے مطابق قرآن کریم کو سمجھنے کی کوشش کی ہے اور حدیث کا انھوں نے بالکل انکار کر دیا ہے اور کہتے ہیں کہ ہم نے حدیث کا انکار اختلاف سے بچنے کے لیے کیا ہے، کیونکہ حدیث ماننے سے اختلاف پیدا ہوتا ہے۔ کوئی کہتا ہے رفع یدین کرو، کوئی کہتا ہے نہ کرو۔ کوئی کہتا ہے آمین بلند آواز سے کہو اور کوئی کہتا ہے آہستہ کہو۔ کوئی کہتا ہے امام کے پیچھے سورۂ فاتحہ پڑھو، کوئی کہتا ہے نہ پڑھو۔ سارے اختلاف حدیث کے ماننے کی وجہ سے ہیں، لہٰذا ہم کہتے ہیں کہ حدیث نہ مانو۔ بے شک اختلافات موجود ہیں، مگر فروعات میں ہیں، اصول میں تو کوئی اختلاف نہیں ہے۔ مثلاً اس میں اختلاف ہے کہ رکوع میں جاتے وقت اور رکوع سے سر اٹھاتے وقت رفع یدین کرنا ہے یا نہیں۔ ایک طبقہ کہتا ہے کہ کرنا مستحب ہے اور دوسرا طبقہ کہتا ہے کہ نہ کرنا مستحب ہے اور مستحب کا معنی ہے کہ کرو گے تو ثواب ملے گا، نہ کرو گے تو گناہ کوئی نہیں ہے۔ لیکن ان میں سے کوئی طبقہ اصل کا تو منکر نہیں ہے کہ نمازیں پانچ نہیں ہیں یا تعداد رکعات میں تو کوئی اختلاف نہیں ہے۔ جبکہ منکرین حدیث کا ایک گروہ کہتا ہے کہ نمازیں دو ہیں اور دوسرا گروہ کہتا ہے تین ہیں اور ایک گروہ کہتا ہے پانچ ہیں اور ایک گروہ کہتا ہے چھ نمازیں ہیں۔ رکعات کے متعلق بھی ان میں اختلاف ہے اور سجدوں میں بھی اختلاف ہے۔ کوئی کہتا ہے کہ ایک رکعت میں ایک سجدہ ہے اور کوئی کہتا ہے کہ دو سجدے ہیں تو حدیث کے انکار سے تو اصل میں اختلاف کر بیٹھے۔ عربی زبان کا محاورہ ہے: فر من المطر وقام تحت المیزاب، کہ بارش سے بچنے کے لیے بھاگا اور پرنالے کے نیچے کھڑا ہو گیا۔ بھائی، تم تو پرنالے کے نیچے کھڑے ہو گئے ہو۔ ہمارا اختلاف تو فروعات میں ہے، اصولوں میں تو نہیں ہے اور تمہارا تو اصولوں میں اختلاف ہے کہ رفع یدین کا مسئلہ فروعی ہے، اولیٰ غیر اولیٰ کا اختلاف ہے۔ البتہ بعض کم سمجھ لوگ اس پر زور لگاتے ہیں کہ جس نے رفع یدین نہیں کیا، اس کی نماز نہیں ہوتی اور لوگوں کو وہم میں ڈالتے ہیں کہ تمہاری نمازیں نہیں ہوئیں۔ یہ دین میں غلو ہے۔ سعودیہ میں تو کوئی جھگڑا نہیں ہوتا کہ وہاں رفع یدین کرنے والے بھی ہیں اور نہ کرنے والے بھی ہیں، اس لیے کہ سارے سمجھتے ہیں کہ اختلافی مسئلہ ہے مگر اصل میں کوئی اختلاف نہیں ہے، لہٰذا یاد رکھنا کہ حدیث بھی دین کی بنیاد ہے۔" (ذخیرۃ الجنان ۴/۲۴۶، ۲۴۷)

مولانا محمد احمد لدھیانوی*

ہم یتیم ہو گئے ہیں

اس دار فانی سے رحلت کا ایک نہ ختم ہونے والا سلسلہ روز اول سے جاری ہے اور ایک ایسا وقت آئے گا کہ کائنات میں کوئی بھی باقی نہ رہے گا۔ اس کے بعد جزا و سزا کا دن قائم ہوگا اور بارگاہ ایزدی میں تمام بنی نوع انسان اپنے کیے کے حساب کتاب کے لیے حاضر ہوں گے۔ اس دن کے قریب آ لگنے کی جو علامات خاتم المعصومین حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بیان فرمائی ہیں، ان میں سے ایک علم کا اس دنیا سے اٹھ جانا ہے اور یہ علامت اہل علم کے اس دار فانی سے رحلت کی صورت میں پوری ہوگی۔ حضرت عبداللہ بن عمرو العاص رضی اللہ عنہ کی روایت کردہ ایک حدیث میں مذکور ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ بیشک اللہ تعالیٰ لوگوں سے علم کو ایک ہی دفعہ نہیں چھین لے گا، بلکہ علم کو اہل علم کے اٹھا لینے سے سلب کرے گا اور ایک ایسا وقت آئے گا کہ زمین پر ایک بھی عالم بھی باقی نہیں رہے گا۔ تب لوگ جاہلوں کو اپنا سردار بنائیں گے جن سے مسائل کے بارے میں پوچھا جائے گا تو وہ بغیر علم کے فتویٰ دیں گے جن سے خود بھی گمراہ ہوں گے اور لوگوں کو بھی گمراہ کریں گے"۔

فداہ ابی وامی خاتم المعصومین صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ فرمان قحط الرجال کے اس دور میں پورا ہوتا ہوا نظر آ رہا ہے۔ گزشتہ چند ہی سالوں میں بڑے بڑے اصحاب علم و فضل، اہل معرفت اور تصوف کے میناروں کا اس دنیا سے اٹھ جانا، یہ صادق و مصدوق پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے اس فرمان کا پورا ہونا ہے۔ امام اہل سنت الشیخ حضرت مولانا محمد سرفراز خان صفدر رحمۃ اللہ علیہ کا سانحہ ارتحال کسی عام انسان کی موت یا وفات نہیں بلکہ ایک جبل علم و عمل اور وقت کے بہت بڑے عظیم محدث کی وفات ہے۔ ایسی شخصیات شاذ و نادر ہی پیدا ہوا کرتی ہیں۔ حضرت امام اہل سنتؒ، امام اہل سنت حضرت مولانا عبدالشکور فاروقی لکھنویؒ کے حقیقی جانشین تھے اور اس دور میں امام اہل سنت جیسا عظیم خطاب بھی حضرت شیخ کو ہی جچتا تھا۔ امام اہل سنت حضرت لکھنویؒ کی ایک امتیازی صفت یہ ہے کہ انہوں نے اپنی زندگی میں پھیلنے والے تمام فتنوں کا تعاقب کیا ہے اور ہر فتنہ کی بیخ کنی کے لیے سر توڑ کوششیں کی ہیں۔ اس راستہ میں ان پر مشکلات اور مصائب کے جو پہاڑ ٹوٹے ہیں، انہیں سن کر دور نبوت یاد آ جاتا ہے اور اہل مکہ کی وہ کارستانیاں اور امام الانبیاء حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف کی جانے والی سازشیں جو تاریخ کی کتب میں مرقوم ہیں، آنکھوں کے سامنے گھومنے لگتی ہیں۔

حضرت امام اہل سنت شیخ سرفراز صفدرؒ نے اپنے پیش رو امام اہل سنت حضرت لکھنویؒ کے نقش قدم پر چلتے ہوئے ہر فتنے کا تعاقب کیا ہے اور اس راستہ پر چلنے والوں اور کام کرنے والوں کی بھرپور حوصلہ افزائی اور سرپرستی فرمائی ہے۔ تردید فرق باطلہ کے عنوان پر حضرت کی کتب فرق باطلہ کے لیے چیلنج بنی ہوئی ہیں اور ان کا جواب دینے کے لیے اہل باطل بے بس نظر

* صدر ملت اسلامیہ پاکستان

آتے ہیں۔ حضرت الشیخ نے جب اپنی تصنیفی زندگی کا آغاز کیا تو اس وقت پاکستان میں رافضیت کے جڑیں قدرے کمزور تھیں، مگر وہ اپنی جڑیں مضبوط کرنے کے لیے ہاتھ پاؤں مار رہے تھے۔ ہندوستان میں شیعہ اپنے مذموم مقاصد کی تکمیل کے لیے مختلف حربے آزما چکا تھا اور وہاں حضرت لکھنویؒ کے ہاتھوں بری طرح پٹ چکا تھا۔ حضرت الشیخ اس ساری صورت حال سے بخوبی واقف تھے، اس لیے انہوں نے اپنی پہلی تصنیف "الکلام الحاوی" میں اس فرقے کا کھل کر تعاقب فرمایا۔ گمراہ کن عقائد و نظریات کی تردید میں حضرت الشیخ کی دیگر کتب موجود ہیں، مگر اپنی کتاب "ارشاد الشیعہ" کے آغاز ہی میں ایک خط نقل فرمایا ہے جس میں حضرت امام اہل سنت سے شکوہ کیا گیا ہے کہ "آپ نے تمام فرق ضالہ کی تردید میں کتب تحریر فرمائی ہیں، اب ایک کتاب شیعیت کی تردید میں تحریر فرمادیں"۔ حضرت امام اہل سنت اس کے جواب میں تحریر فرماتے ہیں کہ "میری کتاب "الکلام الحاوی" کا اگر آپ نے مطالعہ کیا ہوتا تو آپ کو یہ کہنے کی ضرورت محسوس نہ ہوتی۔ پھر بھی آپ کی خواہش کے احترام میں کتاب تحریر کرتا ہوں"۔ ارشاد الشیعہ کی اس عبارت کے پیش نظر اگر یوں کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا کہ حضرت امام اہل سنتؒ کی پہلی اور آخری تصنیف شیعیت کی تردید میں ہے۔

ملک میں رد رافضیت کے عنوان پر کام کرنے والی بہت سی تنظیمیں موجود ہیں، مگر سپاہ صحابہؓ نے بہت قلیل مدت میں اپنے مختلف انداز و اطوار کی وجہ سے جو مقبولیت حاصل کی، وہ کسی اور کو نصیب نہ ہو سکی۔ میں اس کی وجہ حضرات اکابرین کی شفقتوں، محبتوں اور دعاؤں کو سمجھتا ہوں۔ حضرت امام اہل سنتؒ کے سپاہ صحابہؓ کے ساتھ والہانہ تعلق اور سپاہ صحابہ کی قیادت پر بھرپور اعتماد اور پیار کو اس جماعت کی عند اللہ مقبولیت کی دلیل سمجھتا ہوں۔ میرا گکھڑ منڈی سے جب بھی گزر ہوا، ہمیشہ حضرت الشیخ کی زیارت کو اپنے لیے سعادت سمجھتے ہوئے ضرور حاضر ہوا۔ ہمیشہ ان کی صحبت میں بیٹھنے سے نیا سکون ملتا اور روحانی تسکین حاصل ہوتی۔ بوقت ملاقات ہمیشہ مجھ سے پہلا سوال یہی کرتے کہ حکومت نے سپاہ صحابہؓ کے لیے کوئی نرمی کی ہے؟ جواباً جب میں حالات و واقعات بیان کرتا تو حضرت امام اہل سنتؒ حکومتی زیادتیوں پر افسوس کا اظہار فرماتے اور جماعتی قربانیوں اور قائدین کی جرأت و استقامت پر خوشی کا اظہار فرماتے اور ڈھیروں دعاؤں سے نوازتے۔

وہ منظر آج بھی میری آنکھوں کے سامنے گھومتا ہے جب ملک کی مختلف تنظیموں کا مشترکہ اجلاس جامعہ منظور الاسلامیہ میں حضرت الشیخ کی صدارت میں ہو رہا تھا۔ دوران اجلاس ایک صاحب نے سپاہ صحابہؓ پر تنقید کرتے ہوئے کہا کہ سپاہ صحابہؓ کی غلط پالیسیوں کی وجہ سے علمائے کرام اور بزرگان دین نے انہیں چھوڑ دیا ہے اور آج کوئی بھی بزرگ ان کے ساتھ نہیں ہیں۔ میں نے اس تقریر کا جواب دیتے ہوئے کہا کہ ہم دوران سفر جب بھی کسی خانقاہ، مدرسہ یا جامعہ کے قریب سے گزرتے ہیں تو ہم وہاں چلے جاتے ہیں اور بزرگان دین کی خدمت میں عرض کرتے ہیں کہ اگر ہمارے اندر آپ کو کوئی غلط بات نظر آئے تو آپ ہماری اصلاح فرمادیں۔ اگر ہم غلط راستہ پر چل رہے ہیں تو آپ ہمیں سیدھا راستہ دکھا دیں، مگر ہمارے ان سوالوں کے جواب میں کوئی بھی بزرگ یہ نہیں کہتا کہ تم نے اکابر کا راستہ چھوڑ دیا ہے یا تمہاری پالیسیاں غلط ہیں، بلکہ یہ کہا جاتا ہے کہ آپ لوگ بڑے عظیم ہیں، آپ امت کی طرف سے فرض کفایہ ادا کر رہے ہیں اور بہت بڑے جہاد میں مصروف ہیں۔ ہماری دعائیں آپ کے ساتھ ہیں۔ یہ کہہ کر میں نے حضرت امام اہل سنتؒ کی طرف دیکھتے ہوئے سوال کیا کہ حضرت! آپ بتائیں کہ آپ کی ہمدردیاں، آپ کی محبت اور آپ کی دعائیں ہمارے ساتھ ہیں یا نہیں؟ حضرت امام اہل

سنتؒ نے کمال شفقت کا مظاہرہ فرماتے ہوئے اپنا ہاتھ بلند کیا اور بآواز بلند فرمایا کہ میری تمام محبتیں، میری تائید اور میری دعائیں سب آپ حضرات کے ساتھ ہیں۔ میں نے پھر مجمع کو مخاطب کر کے کہا کہ جب امام اہل سنت کی ہمدردیاں ہمیں حاصل ہیں اوران کی تائید ہمارے حق میں ہے تو پھر اہل سنت کے دیگر تمام علمائے کرام، بزرگان دین اور شیوخ کی تائید بھی ہمارے حق میں ہونی چاہیے اور جو لوگ ہمارے سامنے تو ہمارے فضائل بیان کرتے نہیں تھکتے اور ہمارے بعد ہمارے خلاف بولنے لگتے ہیں، ہمارے نزدیک وہ بزرگ نہیں ہیں۔ یہ باتیں کہہ کر میں حضرت امام اہل سنتؒ کے قریب بیٹھ گیا۔ حضرت امام اہل سنتؒ نے میرے کندھے پہ ہاتھ رکھتے ہوئے تھپکی دی اور دعاؤں سے نوازا۔ اب جب بھی حضرتؒ کی یہ باتیں، یہ محبتیں اور یہ شفقتیں یاد آتی ہیں تو سوائے آنسو بہانے کے کچھ نہیں سوجھتا۔

حضرت امام اہل سنت کی جدائی کے بعد ان کے متعلقین اور دیگر احباو پیروکار بھی کہتے ہوں گے مگر میں یہ بلا مبالغہ کہتا ہوں کہ حضرتؒ کے جانے سے ہم یتیم ہوگئے ہیں۔ میں نے ملک کے بڑے بڑے جنازوں میں شرکت کی ہے، مگر حضرت امام اہل سنتؒ کا جنازہ ایک تاریخی جنازہ تھا۔ حضرت امام اہل سنتؒ کے چہرہ مبارک کی زیارت کی تو محسوس ہوا کہ شیخ نے موت کو تحفہ سمجھ کر قبول کیا ہے۔ چہرے پر روحانیت اور اطمینان اتنا تھا کہ جیسے آنکھیں بند کر کے آرام فرما رہے ہیں اور کچھ دیر بعد جاگ جائیں گے۔ میں حضرت امام اہل سنتؒ کے تلامذہ، متعلقین اور بالخصوص حضرت کے صاحبزادگان سے اوران میں سے بھی بالخصوص معروف اسلامی اسکالر اور شیخ الحدیث حضرت مولانا زاہد الراشدی صاحب مدظلہ، مولانا عبدالقدوس قارن صاحب مدظلہ اور مولانا عبدالحق خان بشیر صاحب مدظلہ سے امید کرتا ہوں کہ وہ حضرت امام اہل سنتؒ کی طرح ہماری سرپرستی فرمائیں گے اور ہمیشہ اپنی دعاؤں میں ہمیں یاد رکھیں گے، کیونکہ حضرت امام اہل سنتؒ کے جانشین اوران کے ورثا کی حیثیت سے یہ ان حضرات کی ذمہ داری بھی ہے اور ہمارا حق بھی۔

دعا گو ہوں کہ رب ذوالجلال حضرت امام اہل سنتؒ کے تمام عقیدت مندوں، چاہنے والوں اور اہل وعیال کو صبر جمیل عطا فرمائیں اور حضرت امام اہل سنتؒ کے نقش قدم پر چلنے کی توفیق مرحمت فرمائیں۔ (آمین)

قاری محمد عبید اللہ عامر فرماتے ہیں کہ ۱۹۸۸ء میں ایک مرتبہ میں حضرت امام اہل سنت کے ساتھ سفر میں گیا۔ حضرت نے مجھے دو ہزار روپے بطور سفری اخراجات دیے اور کہا کہ سب خرچ ساتھ ساتھ لکھتے رہنا۔ جب سفر سے واپسی ہوئی تو میں نے سفری اخراجات کی تفصیل اور بقایا رقم حضرت کو پیش کر دی۔ حضرت نے خرچ کی تفصیل پڑھی تو فرمایا کہ قاری صاحب، حساب میں کچھ گڑبڑ ہے۔ میں کانپ گیا کہ میں نے تو ایک ایک پائی کا حساب لکھا ہے، پھر گڑبڑ کیسے ہوگئی۔ میں نے عرض کیا، حضرت! کہاں گڑبڑ ہے۔ میں نے تو پوری کوشش کی تھی کہ ہر خرچ لکھوں۔ حضرت نے فرمایا کہ پتوکی اسٹیشن پر ایک مانگنے والے فقیر کو میں نے کچھ دینے کے لیے کہا تھا، وہ اس میں درج نہیں ہے۔ میں نے کہا، حضرت اس کو ایک روپیہ میں نے دیا تھا۔ فرمایا، میں نے کہا تھا اور آپ نے میرے کہنے پر دیا تھا۔ وہ میرے خرچ میں درج ہونا چاہیے تھا۔ درج نہیں ہے، یہی تو گڑبڑ ہے۔
(ماہنامہ ہدی للناس گوجرانوالہ، امام اہل سنت نمبر، جون ۲۰۰۹ء)

ڈاکٹر حافظ محمد شریف*

میرے مہربان مولانا سرفراز خان صفدرؒ

بندہ گورنمنٹ پرائمری سکول منڈیالہ تیگہ میں تیسری کلاس کا طالب علم تھا۔ موسم گرما کی چھٹیاں گزارنے بلال پور سے اپنے ماموں کے ہاں گکھڑ منڈی کے قریب بھگت گڑھ آ گیا تھا جہاں حضرت کی مسجد میں حفظ کلاس کا مدرسہ تجوید القرآن درجہ حفظ کے نام سے شروع تھا جس کے ناظم ماسٹر اللہ دین تھے۔ بلال پور گاؤں میں ماسٹر صاحب کا اپنی بیٹی کے ہاں آنا جانا تھا۔ آپ انتہائی نیک اور دین دار انسان تھے۔ وہاں سے کچھ بچوں کو مدرسہ داخلہ لینے سے متعلق تیار کیا جن میں بندہ کا نام بھی شامل تھا۔ چنانچہ بھگت گڑھ سے سیدھا گکھڑ چلا آیا اور حضرت کے زیر سایہ مدرسہ میں داخل ہوگیا۔ ۱۹۶۱ء میں حفظ قرآن شروع کر دیا۔ خدا کے فضل وکرم سے نومبر ۱۹۶۳ء میں حفظ مکمل کر لیا۔ جونہی حفظ مکمل ہوا، آپ کے زیر سایہ قاری کلاس کا افتتاح ہوگیا۔ بندہ نے حضرتؒ کے فرمان پر تین سال کے لیے اس میں داخلہ لیا۔ یہ ہم طلبہ کی مدرسہ تجوید القرآن میں پہلی قاری کلاس تھی جس میں ابتدائی کتب اور قاری کلاس کا کورس تھا۔ ۱۹۶۸ء میں یہاں سے فراغت حاصل کر کے درس نظامی کے لیے حضرت بنوریؒ کے مدرسہ میں کراچی چلا گیا جہاں چار سال کے بعد مدرسہ نصرۃ العلوم میں آ گیا اور یہیں درس نظامی حضرتؒ کی زیر نگرانی مکمل کیا۔

سات سال گکھڑ میں رہا جہاں حضرتؒ کی سیرت وکردار کا خوب مطالعہ کرنے کا موقع ملا، اور بہت کچھ سیکھا۔ حفظ قرآن کے وقت عمر چھوٹی تھی۔ پختہ شعور نہیں تھا۔ اپنے کام سے کام رہا۔ بس اتنا شعور تھا کہ حضرتؒ واقعی ایک باوقار، بارعب عالم شخصیت ہیں۔ البتہ تجوید القرآن کے ایام شعور کے تھے۔ حضرتؒ کی اقتدا میں نمازیں پڑھیں گئیں۔ ہر جمعہ ادا کیا گیا۔ صبح کا درس سننے کا موقع ملا۔ حضرتؒ کے گھر آنا جانا رہتا کہ حضرتؒ کے صاحبزادے بالخصوص مولانا عبدالقدوس خان قارن مدظلہ جو اسکول میں چوتھی کلاس میں ہم کلاس رہے، حفظ اور درس نظامی میں بھی اکٹھے رہے، جبکہ حضرت شیخ الحدیث زاہد الراشدی مدظلہ پہلے حفظ مکمل کر چکے تھے اور درس نظامی سے بھی فارغ ہو چکے تھے۔ گھر کی زندگی حضرتؒ حضرتؒ کی برکت سے بڑی پرسکون اور خوشگوار تھی۔ آپ کی دونوں بیویوں میں کبھی تو تکار ہوتے نہیں دیکھی نہ سنی۔ دونوں آپس میں بڑی پرخلوص اور حضرت کی بھی بہت زیادہ خدمت گزار تھیں۔ اللہ جنت الفردوس میں جگہ عطا فرمائے۔

بندہ کو محنت کی عادت تھی جس سے بندہ پر حضرتؒ کی شفقت بہت ہوگئی۔ حضرتؒ قاری کلاس میں ترجمہ قرآن کا امتحان لیتے تو کسی وقت بندہ انعام کا حق دار ٹھہرتا۔ آپ انعام بھی دیتے اور دعائیں بھی اور فرماتے تھے، اللھم زد فزد۔ میں بھی حضرتؒ سے بالخصوص بڑا متاثر تھا کہ حضرتؒ کی ذات بڑی وقار، بارعب سنجیدہ اور خوش لباس ذات تھی۔ اللہ نے آپ کو بڑی

*شعبہ اسلامیات، گورنمنٹ کالج سیٹلائیٹ ٹاؤن گوجرانوالہ۔

خوبیوں سے نوازا تھا۔ دینی، تصنیفی، تعلیمی، روحانی، ملی، سماجی اور سیاسی غرضیکہ ہر انسانی خوبی آپ میں موجود تھی۔ درس قرآن بڑی پابندی سے سنتا تھا۔

نارمل اسکول میں بھی حضرت کے ساتھ جایا کرتا تھا۔ دل کی تکلیف میں مبتلا تھے۔ چلتے چلتے راستہ میں بھی تکلیف ہو جاتی۔ آپ بیٹھ جاتے اور ہم آپ کے ہاتھ پاؤں کپڑے سے ملتے اور آپ کو افاقہ ہو جاتا۔ ایک دن میں حضرت کے ساتھ جا رہا تھا تو آپ نے فرمایا کہ یار لوگوں نے درس بند کرانے کی بڑی کوشش کی تھی، حتیٰ کہ آپ کو پچاس روپے ماہوار جو وظیفہ دیا جاتا تھا، وہ بھی بند کر دیا۔ مقصد یہ تھا کہ آپ کی جگہ اپنی جماعت کے عالم کو درس کے لیے مقرر کیا جائے، مگر آپ نے وظیفے کی پروانہ کی اور درس جاری رکھا جو چالیس سال تک جاری رہا۔

حضرتؒ مسجد میں پنجابی میں درس دیتے تھے۔ سننے والوں کو یوں لگتا کہ حضرتؒ صرف پنجابی پر قدرت تامہ رکھتے تھے، لیکن نارمل اسکول میں اردو میں درس دیتے۔ وہاں ایسے لگتا کہ اردو حضرت کی مادی زبان ہے۔ درس ہوتا یا جمعہ، مکمل تیاری کے ساتھ ہوتا۔ مضمون پر مکمل عبور ہوتا۔ کلام میں تسلسل ہوتا۔ بات کا حوالہ دیتے۔ بوقت ضرورت بقدر ضرورت مسئلہ بیان فرماتے۔ حضرتؒ کی جمعہ کی اتنی افادیت اور مقبولیت عامہ تھی کہ دس دس میل سے عمر رسیدہ حضرات آ کر صبح سے مسجد میں بیٹھ جاتے تھے۔ پرچیوں پر لکھ کر لوگ سوال کرتے۔ آپ دلیل کے ساتھ تسلی بخش جواب دیتے۔ وقت پر درس یا جمعہ شروع کرتے اور ٹھیک ٹائم پر ختم کرتے۔ جتنے سال بھی گکھڑ رہا، ایک دن بھی ٹائم میں تقدیم تاخیر نہیں دیکھی۔ یہ حضرتؒ پر خاص اللہ تعالیٰ کی عنایت تھی۔ ایک مضمون جو درس میں، جمعہ میں یا پڑھاتے ہوئے بیان کرتے تو وہی مضمون جب دوبارہ کسی پر آ جاتا تو جو جو بات اس سے متعلق پہلے بیان فرمائی تھی، وہی بات اور وہی دلیل اسی طرح بیان فرماتے۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کو قوت حافظہ عطا فرمائی تھی۔

ان سالوں میں ایک بات میں نے خاص طور پر یہ نوٹ کی کہ اتباع سنت اور اس پر استقامت کا جواب نہیں تھا۔ حضرتؒ شلوار ٹخنوں سے اوپر رکھتے تھے۔ ایک مرتبہ ماسٹر اللہ دین نے بندہ سے بیان فرمائی تھی کہ میں نے مولانا سے پوچھا تھا کہ شلوار کتنی اوپر رکھی جائے تو آپ نے فرمایا، ایڑی سے ایک بالشت اوپر۔ چنانچہ حضرتؒ کی شلوار نہ کسی دن اس سے نیچے دیکھی نہ اوپر۔ جب آپ نماز کے لیے تشریف لاتے یا تو بالکل ٹائم پر مصلی پر قدم رکھتے۔ مسجد میں داخل ہوتے ہوئے بلند آواز سے سلام کہتے اور گھڑی کی طرف دیکھتے، ایک منٹ بھی ہوتا تو آپ فوراً دو رکعت کی نیت کرتے اور ٹھیک ٹائم پر ختم کرتے۔ ایسا محسوس ہوتا کہ وقت کی رفتار آپ کے سلام پھیرنے کے انتظار میں ٹھہر گئی ہے۔ یہ بھی آپ کی کرامت تھی۔

مہمان نوازی کے سلسلہ میں دو تین باتیں نمایاں تھیں۔ مہمان خواہ چھوٹا ہو یا بڑا، مہمانی بڑی خوشی سے کرتے۔ عموماً جو کچھ گھر میں تیار ہوتا، پیش فرما دیتے اور اپنے ہاتھ سے کھانا وغیرہ پیش کرتے۔ پھر مہمان کسی وقت بھی آتا، کبھی پیشانی پر شکن نہیں ڈالی۔ پھر کھانے کے لیے شوق دلاتے کہ اور کھاؤ۔ بندہ ایک مرتبہ کراچی سے آیا۔ آپ کے پاس ظہر کی نماز کے بعد محراب کے قریب کچھ حضرات بیٹھے تھے۔ میں نے اپنی کم عمری کی بنا پر مجمع میں ملاقات کرنا مناسب نہ سمجھا۔ جب وہ فارغ ہوئے تو حضرت اکیلے تھے۔ میں حاضر خدمت ہوا۔ حضرتؒ فرمانے لگے کہ صوفی! میں بڑی دیر سے تمہارا انتظار کر رہا ہوں اور دیکھ رہا ہوں کہ کبھی تم اوپر کی منزل پر جا رہے ہو اور کبھی نیچے۔ میں بڑا حیران ہوا کہ میرے جیسا چھوٹا انسان اور آپ جیسی

بڑی شخصیت۔ اس کے بعد حضرت گھر لے گئے اور کھانا کھلایا۔ چائے بھی پی۔ حضرت بنوریؒ سے متعلق اور میری پڑھائی سے متعلق پوچھتے رہے۔ ایک مرتبہ رات کو حضرتؒ کے ہاں ٹھہرا۔ کھانا بہت پر تکلف تھا۔ میں حیران تھا کہ حضرت بڑے اور چھوٹے کے ساتھ یکساں سلوک کرتے ہیں۔ ایک مرتبہ حضرت شیخ القرآن مولانا غلام اللہ خانؒ کی گاڑی گکھڑ میں خراب ہوگئی۔ آدھی رات کا وقت تھا۔ شیخ القرآن مسجد میں تشریف لائے۔ کچھ ساتھی ان کے ساتھ تھے۔ کسی ساتھی کو جگانا چاہتے تھے تاکہ حضرت کے مکان پر پہنچا جائے۔ خدا کی قدرت یہ قرعہ بندہ کے نام نکلا۔ اس وقت پہلی مرتبہ حضرت شیخ القرآن کی میں نے زیارت کی۔ ان حضرات کو حضرتؒ کے مکان پر لے گیا۔ حضرتؒ کو جگایا تو آپ شیخ القرآن کو دیکھ کر بڑے خوش ہوئے اور اس وقت بھی ان حضرات کی خوب مہمان نوازی کی۔

۱۹۷۲ء میں آپ حج پر تشریف لے گئے۔ حضرت کا قیام بنوری ٹاؤن مدرسہ میں تھا۔ بندہ کو الحمد للہ خوب خدمت کا موقع ملا۔ سیر کے لیے ایک واقف ساتھی اپنی گاڑی میں سمندر پر لے گیا۔ بندہ بھی حضرت کے ساتھ تھا۔ مغرب کی نماز کے لیے آپ نے مجھے مصلی پر کھڑا کیا اور آپ کے حکم پر مغرب کی نماز بندہ نے پڑھائی۔ بحری جہاز سے آپ نے سفر حج کیا۔ واپسی پر آپ مدرسہ تشریف لائے تو فرمایا، الحمد للہ مستحب تک نہیں چھوڑا جو ادا نہ کیا، ہو حتیٰ کہ دل کی تکلیف کے باوجود غار حرا پر بھی گیا تھا۔

حضرتؒ کو اللہ نے جتنا علم عطا فرمایا تھا، اتنی ہی عمل کی توفیق ارزاں فرمائی تھی۔ آپ کی امارت میں نماز کا ایک عجیب سکون ہوتا تھا۔ سنت کے مطابق ایک ایک آیت واضح، ایک ایک لفظ صاف صاف ادا فرماتے تھے۔ قرآن کریم پر اتنا عبور تھا کہ حافظ نہ ہونے کے باوجود قاری انور صاحب کی تراویح میں غلطی نکالتے تھے، جب کہ تراویح میں قاری صاحب کی رفتار بھی تیز ہوتی تھی۔ کسی نے پوچھا کہ حضرت آپ حافظ ہیں تو فرمایا، میں حافظوں کا باپ ہوں۔ اس وقت آپ کے بیٹے بیٹیاں، پوتے پوتیاں، نواسے اور نواسیاں حفاظ کی تعداد پچیس تھی جو اب ۴۴ تک پہنچ چکی ہے۔ ذلک فضل اللہ یوتیہ من یشا۔

آپ کا فرمان کس قدر صحیح تھا کہ میرے مذہب میں چھٹی جائز نہیں۔ آپ نے کبھی بلا عذر شرعی سبق سے چھٹی نہ کی۔ بارش ہو یا آندھی، جنگ ہو یا امن، آپ بروقت تشریف لاتے۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ ۶۵ کی جنگ زور پر تھی اور جہاز اٹیک کر رہے تھے، پھر بھی سبق کے لیے نصرۃ العلوم تشریف لاتے۔ آپ کو فرض کی ادائیگی میں جنگ کی بھی پروا نہ تھی۔ صبح کے وقت فجر کی نماز کے بعد درس ہو رہا تھا، قریب بیٹھے ایک بزرگ شخص نے جہاز سے فائرنگ کی آواز سن کر کہا، مولوی صاحب ''ایہہ کی اے''؟ فرمایا حملہ کہیں دور ہے۔ یہ فرما کر خاموش ہوئے تھے کہ دو جہاز مسجد کے اوپر سے گزرے جن کا پیچھا دو پاکستانی جہاز کر رہے تھے، حتیٰ کہ نت کلاں کے قریب ان کو جا گرایا۔ لوگوں کا جذبہ عجیب تھا، انڈیا کے گرے ہوئے جہازوں پر جوتے مار رہے تھے۔

آپ کی مہمان نوازی کا اثر آپ کے گھر والوں پر بھی بہت تھا۔ میں کبھی کبھار درس حدیث کے بعد کتاب چھوڑنے کے لیے آپ کے گھر جاتا تو گھر والے بغیر ناشتہ کے آنے نہیں دیتے تھے۔ جو طالب علم بھی جاتا، ہر ایک کے ساتھ یہی حسن سلوک کرتے۔ کراچی سے کچھ علوم وفنون پڑھنے کے لیے نصرۃ العلوم آنا چاہتا تھا۔ حضرت کو خط لکھا، آپ نے اپنے دست مبارک سے خط کا جواب دیا کہ آپ داخلہ کے لیے آ جائیں، چنانچہ یہاں شرح جامی، مختصر معانی، ہدایہ، قطبی، سلم، ملاحسن،

میر زاہد، ملا جلال، میبذی اور دیگر کتب پڑھیں۔ حضرت سے شرح عقائد، بخاری شریف، ترمذی اور حضرت صوفی صاحبؒ سے حماسہ، حجۃ اللہ البالغہ اور مسلم شریف پڑھی۔ حضرتؒ سے شرح عقائد پڑھتے ہوئے قاری خبیب احمد عمر صاحب مرحوم بھی شریک سبق تھے۔ آپ سبق اتنا آسان کر کے پڑھاتے کہ یوں لگتا جیسے یہ کتاب آپ کی اپنی لکھی ہوئی ہے۔ سننے والا محسوس کرتا کہ اس طرح تو میں بھی پڑھا سکتا ہوں۔ ایک قسم کا سہل ممتنع بھی ہے۔

۵ رمئی ۲۰۰۹ء کو یہ ہماری محبوب اور ممتاز شخصیت اس دنیائے فانی سے آخرت کی طرف منتقل ہوگئی۔ اسی نسبت سے علم وتحقیق، تفسیر، حدیث، فقہ رخصت ہوئے۔ عصر حاضر میں الحادی یلغار کو روکنے کے لیے حضرت جیسی شخصیات کی انتہائی ضرورت تھی، لیکن قضا وقدر کے سامنے کون دم مار سکتا ہے۔ آپ کی جدائی کا صدمہ پوری امت کا صدمہ ہے۔ بالکل صحیح فرمایا گیا ہے کہ ''موت العالم موت العالم''۔ حضرتؒ کی زبان سے سنی ہوئی یہ حدیث مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، ''علم دنیا سے اس طرح نہیں اٹھے گا کہ سینوں سے کھینچ لیا جائے بلکہ اس طرح اٹھے گا کہ رفتہ رفتہ علم کے حاملین دنیا سے رخصت ہوتے چلے جائیں گے۔ پھر لوگ جاہلوں کو اپنا سردار بنا لیں گے، جو بغیر علم کے فتویٰ دیں گے۔ خود بھی گمراہ ہوں گے، دوسروں کو بھی گمراہ کریں گے۔'' ہمیں اس کا خیال رکھنا چاہیے۔ واقعی اہل اللہ کا وجود مسعود بہت سے فتنوں سے بچنے کے لیے آڑ بنا رہتا ہے اور ان کا دنیا سے چلے جانا بذات خود فتنوں کو دعوت دیتا ہے۔ اللہ حفاظت فرمائے۔

حضرتؒ کی جدائی عرصہ دراز تک بھول نہیں سکے گی لیکن ہمیں چاہیے کہ آپ کے چھوڑے ہوئے مشن کو محنت اور جذبے کے ساتھ جاری رکھیں۔ اللہ کریم حضرتؒ کو جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام عطا فرمائے اور ہمیں اپنے اہل حق اکابر کے دامن سے وابستہ رکھے۔ آمین یا الہ العالمین۔

> حضرت انتہا درجہ کے مہمان نواز تھے۔ مہمانوں کا دل کی گہرائیوں سے اکرام کرتے تھے۔ ایک مرتبہ بیماری کے ایام میں اپنے بیٹے مولانا عزیز الرحمٰن شاہد کو مہمانوں کا اکرام کرتے اور حسن اخلاق سے پیش آتے دیکھ کر حضرت بہت خوش ہوئے اور فرمایا، مولانا! علم میں تم میرے برابر نہیں ہو، اخلاق میں تم میرے جیسے ہو کہ مہمانوں کا اکرام بھی کرتے ہو اور حسن اخلاق سے پیش آتے ہو۔ ایک دفعہ گکھڑ کے حاجی نذیر صاحب حضرت سے ملاقات کے لیے تشریف لائے۔ حضرت بیمار تھے، چار پائی پر بیٹھے تھے۔ حاجی نذیر صاحب نے حضرت سے مصافحہ کیا۔ حضرت کے کمرے میں چند اور مہمانوں کے ہمراہ مولانا عزیز الرحمٰن شاہد بھی موجود تھے۔ چونکہ حاجی نذیر صاحب گکھڑ سے ہی تشریف لائے تھے اور وقتاً فوقتاً تشریف لاتے رہتے تھے، اس لیے مولانا عزیز الرحمٰن مہمان کے اکرام میں کھڑے ہو کر نہیں ملے، بلکہ بیٹھے بیٹھے ہی مصافحہ کر لیا۔ اس پر حضرت نے مولانا عزیز الرحمٰن شاہد کو جھڑکا اور غصہ بھی ہوئے اور یہ حدیث مبارک پڑھی: من لم یرحم صغیرنا ولم یؤقر کبیرنا فلیس منا۔ جو چھوٹوں پر رحم نہیں کرتا اور بڑوں کی عزت نہیں کرتا، وہ ہم میں سے نہیں۔ پھر حضرت نے فرمایا مولانا، حاجی صاحب آپ سے بڑے ہیں، آپ کو اٹھ کر ملنا چاہیے تھا۔
>
> (ماہنامہ ہدی للناس گوجرانوالہ، امام اہل سنت نمبر، جون ۲۰۰۹ء)

مولانا ملک عبد الواحد*

مثالی انسان

بندہ مولانا محمد عمار خان ناصر صاحب مدظلہ کے حکم پر اپنی یادداشت میں محفوظ دو چار واقعات عرض کرتا ہے جن سے حضرت اقدسؒ کے اعلیٰ اخلاق کی ایک جھلک سامنے آتی ہے۔

اس حقیر کو سب سے پہلے حضرت امام اہل سنت کی زیارت کا شرف ۱۹۶۰ء میں حاصل ہوا جب میری عمر تقریباً گیارہ برس تھی اور میں مدرسہ نصرۃ العلوم میں شعبہ حفظ کا طالب علم تھا۔ مدرسہ نصرۃ العلوم کے موجودہ شیخ الحدیث حضرت مولانا زاہد الراشدی صاحب مدظلہ اس وقت ہمارے استاد محترم حضرت قاری محمد یٰسینؒ صاحب روہتکی کے پاس قرآن پاک کی گردان کر رہے تھے۔ ۱۹۶۱ء میں جب حضرت امیر شریعت سید عطاء اللہ شاہ بخاریؒ کا انتقال ہوا تو مدرسہ کی پرانی مسجد میں طلبہ کرام نے قرآن خوانی کی۔ اس موقع پر حضرت شیخ نور اللہ مرقدہ نے حضرت شاہ صاحبؒ کے حالات اور دین کے لیے ان کی محنت اور آزادی کی جنگ میں ان کی قائدانہ صلاحیتوں کا بیان فرمایا۔ یہ حضرت کا پہلا بیان تھا جو ہم نے سنا۔ اس کے بعد حضرتؒ سے شناسائی ہوگئی اور ان کی کتابیں پڑھنے کا شوق پیدا ہوا۔ نویں جماعت کے دوران میں نے حضرت کی کئی کتابیں مثلاً گلدستہ توحید، راہ سنت، آنکھوں کی ٹھنڈک اور شوق جہاد وغیرہ پڑھ لی تھیں۔ مجھے یاد ہے، اس وقت راہ سنت کی قیمت ڈیڑھ روپے تھی۔ اس سے بدعات سے تنفر پیدا ہوگیا۔ الحمد للہ علیٰ ذالک۔

اس وقت ہم گلی لانگریاں والی میں رہتے تھے اور ہماری فیکٹری محلہ کرشن نگر گلی نمبر ۱ میں تھی۔ بندہ روزانہ حضرت سے ملاقات کے لیے بازار خراداں کا راستہ اختیار کرتا تھا۔ کوئی مسئلہ پوچھنا ہوتا یا دم کرانا ہوتا اور کبھی خواب کی تعبیر دریافت کرنا ہوتی تو حضرت کے اسٹیشن یا لاری اڈہ سے پیدل مدرسہ تشریف لے جاتے ہوئے راستے میں پوچھ لیتا تھا۔ حضرت پوری توجہ اور تسلی سے جواب مرحمت فرماتے اور سڑک کے کنارے کھڑے ہو کر تشفی فرماتے۔

یہ عاجز اپنے استاد محترم قاری محمد یٰسین صاحبؒ کی برکت سے قرآن پاک اچھا پڑھ لیتا تھا۔ میرے مرشد حضرت اقدس جانشین شیخ التفسیر حضرت مولانا عبید اللہ خصوصی طور پر بندہ سے قرآن سنا کرتے تھے۔ اسکول میں حسن قراءت کے مقابلوں میں مجھ کو بھیجا جاتا تھا اور اللہ تعالیٰ کے فضل سے جہاں جاتا، اول آتا تھا۔ اسکول میں میری فیس بھی معاف تھی اور وظیفہ بھی ملتا تھا۔ یوں قرآن کے صدقے خوب کھایا پیا اور سیر وسیاحت بھی کی۔ ایک دفعہ گکھڑ کے نارمل اسکول کے ہال میں مقابلہ تھا۔ حضرت کے دوسرے صاحبزادے حضرت مولانا عبد القدوس خان قارن صاحب بھی ممتحنین میں شامل تھے، گو اس وقت واقفیت نہ تھی۔ بندہ یہاں بھی اللہ جل شانہ کے فضل سے اول آیا۔ فارغ ہو کر ہم تین ساتھی حضرت کی زیارت کے لیے آپ

* چھوٹی سوا ۱۱۹ئی۔ گوجرانوالہ

کی رہائش گاہ پر چلے گئے۔ پوچھنے پر آمد کا مقصد عرض کیا تو اسی وقت چائے اور مٹھائی آ گئی اور بعد میں کھانا کھلا کر ڈھیروں دعاؤں کے ساتھ ہمیں رخصت فرمایا۔

ایک دفعہ حضرت امام اہل سنت نے اپنے استاد مکرم حضرت مولانا غلام غوث ہزارویؒ کی خدمت میں کپڑوں کا ایک جوڑا اور پگڑی کا کپڑا پیش فرمایا۔ حضرت مولانا نے اپنے خاص انداز میں فرمایا، حضرت! ہماری سفید پوشی کا مذاق اڑا رہے ہیں؟ جواباً حضرت محدث اعظمؒ نے فرمایا کہ حضرت! یہ ہدیہ ہے، تو مولانا نے ہنستے ہوئے قبول فرما لیا اور ایک دوسرے ساتھی کو دے دیا۔ اس موقع پر مجھے حضرت زبدۃ العارفین حضرت مولانا عبد الہادی دین پور شریف والوں کا ایک ارشاد یاد آ رہا ہے۔ حضرتؒ فرماتے تھے کہ ہمارے اکابر کا فقر بھی اختیاری تھا، اضطراری ہرگز نہ تھا۔ جو شخص تین دفعہ اسمبلی کا ممبر بنا ہو، اس کا فقر کیونکر اضطراری ہو سکتا ہے۔ حضرت مفسر قرآن حضرت صوفیؒ نے ایک مرتبہ فرمایا کہ یہ سیٹلائٹ ٹاؤن میرے سامنے بنا۔ چار سو روپے میں پلاٹ ملتا تھا۔ ساتھی کہتے تھے کہ ہم جمع کرا دیتے ہیں، مگر میں نے انکار کیا کہ مسجد کے مکان میں ہی گزارا کریں گے۔ ماہنامہ نصرۃ العلوم کے مفسر قرآن نمبر میں ایک شکریہ کا خط حضرت شیخ الاسلامؒ نور اللہ مرقدہ کا ہے۔ حضرت صوفی صاحبؒ نے انھیں چار سو روپے ہدیہ بھیجا تھا۔ یہ اختیاری فقر نہیں تو اور کیا ہے؟

ایک دفعہ شیرانوالہ دروازہ لاہور میں علماے کرام کا ایک اجتماع تھا۔ کھانے کے لیے حضرت امام اہل سنت کو مدرسہ قاسم العلوم میں لے گئے۔ کھانا لایا گیا تو اس میں مچھلی چرغہ وغیرہ کئی قسم کے سالن تھے۔ حضرت شیخ نے فرمایا مجھے اختلاجِ قلب کی وجہ سے ان چیزوں سے پرہیز ہے۔ تب حضرت مولانا میاں محمد اجمل قادری صاحب مدظلہ نے اپنے چھوٹے بھائی حضرت ڈاکٹر محمد اکمل سے فرمایا کہ ابا جان کا سالن فریج میں رکھا ہے، وہ لے آئیں۔ وہ لایا گیا تو مونگ کی دال تھی۔ حضرت نے بڑے مزے سے کھائی اور فرمایا کہ بازار کے عمدہ کھانوں سے گھر کی دال بدرجہا بہتر ہے۔ ہم جیسے ظاہری ذائقوں پر مرنے والے کیا جانیں کہ باطنی حلاوت کسے کہتے ہیں۔

حضرت شیخ الحدیث مجلس ذکر کے قائل نہیں تھے، لیکن وہ دوسرے حضرات کی رائے کا احترام کرتے تھے۔ سیٹلائیٹ ٹاؤن میں مدینہ مسجد کا افتتاح ہوا تو اس موقع پر مولانا عبید اللہ انور صاحب نے مجلس ذکر کرائی اور حضرت شیخ الحدیث بھی ان کے ساتھ وہیں بیٹھے رہے، حالانکہ وہ چاہتے تو اٹھ کر الگ کسی جگہ جا کر بیٹھ سکتے تھے۔ اسی طرح ایک دفعہ حضرت مولانا انور ختم قرآن کی ایک تقریب میں شرکت کے لیے گکھڑ میں بوہڑ والی مسجد میں گئے تو اس موقع پر بھی مجلس ذکر ہوئی، بلکہ جب حضرت شیخ الحدیث کی تصنیف ''حکم الذکر بالجہر'' چھپ کر آئی اور مولانا عبید اللہ انور کو اس کے متعلق بتایا گیا تو انھوں نے یہ کتاب منگوا کر پڑھی۔ پھر جمعرات کی مجلس میں فرمایا کہ میں نے حضرت کی کتاب پڑھی ہے، اس میں ہمارے طریقے کے خلاف کوئی بات نہیں، کیونکہ اس میں انھوں نے لکھا ہے کہ سلسلہ قادریہ اویسیہ میں جو اذکار تلقین کیے جاتے ہیں، وہ میری مراد نہیں۔

۱۹۸۱ء میں حج کے مبارک موقع پر حضرت دو تین یوم ہمارے ساتھ تشریف فرما رہے۔ ۱۰ محرم کو بھی اکٹھے رہے، اور مدینہ منورہ میں بھی ملاقاتیں رہیں۔ مسائل میں رہنمائی کے ساتھ ساتھ حضرت ہماری اصلاح بھی فرماتے تھے۔ مکہ مکرمہ میں ایک موقع پر بندہ کے منہ سے ایک بریلوی مکتبہ فکر کے عالم کے بارے میں ایک سخت جملہ نکل گیا۔ حضرت نے فرمایا، حاجی صاحب! اختلافِ مسلک اور مسائل میں اختلاف اپنی جگہ، مگر کسی کی ذات کے بارے میں سخت الفاظ کہنے سے مکمل پرہیز کرنا چاہیے۔ تب بندہ نے توبہ واستغفار کی اور آئندہ اس سے محتاط ہو گیا۔ آج ہماری حالت یہ ہے کہ ذرا سے اختلاف پر خلاف کو جو جی میں آئے، کہنے کا حق رکھتے ہیں۔

ہم چونکہ احادیثِ صحیحہ، صحابہ کرام سمیت پوری امت کے اجماع اور اکابرین دیوبند کی تشریحات کے مطابق آقائے نامدار سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں وفات شریف کے بعد قبر میں جسم عنصری کے ساتھ برزخی حیات کا عقیدہ رکھتے ہیں اور روضہ اطہر پر صلوٰۃ وسلام کے سماع کے قائل ہیں، اس لیے میں نے اپنے ذوق کے مطابق حضرت سے مدینہ منورہ میں مسجد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم میں پوچھا تھا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کتنی دور سے صلوٰۃ وسلام سماعت فرماتے ہیں؟ اگر میں بھول نہیں رہا تو امام اہل سنتؒ نے فرمایا تھا کہ حضرت اقدس مولانا خلیل احمد سہارنپوریؒ نے لکھا ہے کہ مسجد نبوی کے اندر سے سماع فرماتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کی قدرت سے کچھ بعید نہیں۔ نہ ماننے والے حضرات خدا کو کتنا قادر مانتے ہیں، یہ ایک سوالیہ نشان ہے۔ ہمارے دادا پیرؒ حضرت شیخ التفسیر امام الاولیاء حضرت لاہوریؒ فرماتے ہیں کہ اہل نظر کے یہاں تو یہ مسئلہ بدیہیات میں سے ہے۔ اللہ تعالیٰ ہمیں اپنے اکابر کے ساتھ وابستہ رکھے۔ آمین یا الہ العالمین۔

حضرت والا جب واپس پاکستان آنے لگے فرمایا کہ حاجی صاحب! مجھ سے زیادہ وزن تو اٹھایا نہیں جاتا، ایک پانچ کلو کا گیلن آب زم زم کا اور دو رومال مجھے لا دیں۔ بندہ نے دونوں چیزیں حاضر کر دیں۔ دو چار کتابیں لے رکھی تھیں۔ یہ کل سامان تھا۔ فرمایا: ایک رومال سے تو صوفی کو خوش کروں گا، بلکہ پنجابی میں فرمایا ''اک نال تے صوفی نو ٹھگاں گا، اک کسی دا دا نو دیاں گے۔'' بعد میں، میں نے دیکھا کہ حضرت صوفی صاحبؒ کئی سال تک وہ رومال سر پر باندھتے رہے۔ حضرت کو اپنے چھوٹے بھائی حضرت مفسر قرآن استاد مکرم حضرت مولانا صوفی عبد الحمید سواتیؒ سے بڑی محبت تھی۔ بندہ جب بھی گکھڑ حاضر ہوتا تو فرماتے، صوفی سے ملے تھے؟ کیا حال تھا؟ احقر عرض کرتا کہ جمعہ میں حاضری ہوئی تھی، نقاہت ہے۔ احوال عرض کرتا۔ خدا کے فضل سے اس گناہگار نے دونوں بزرگوں کو بہت قریب سے دیکھا ہے۔ احقر اپنے علم کے مطابق عرض کرتا ہے کہ میں نے اپنی زندگی میں اتنی محبت کرنے والے دو بھائی نہیں دیکھے۔ یہ صرف دین اور علم وعمل کی برکت ہے۔

مدرسہ نصرۃ العلوم کی انتظامیہ کے پہلے صدر حافظ محمد عبد اللہ صاحب کی روایت ہے کہ جب حضرت صوفی صاحب کی شادی ہو گئی تو انتظامیہ کی طرف سے ان سے کہا گیا کہ پہلے تو آپ اکیلے تھے، اب اخراجات بڑھ گئے ہیں، اس لیے تنخواہ بڑھا لیں۔ صوفی صاحب نے فرمایا کہ نہیں، ابھی میرا گزارا ہوتا ہے۔ کچھ عرصے کے بعد یہی بات کہی گئی تو صوفی صاحب نے فرمایا کہ اگر ضرورت ہوئی تو بتا دوں گا اور آپ سے ہی کہوں گا، اور کس سے کہوں گا۔ بلا ضرورت مدرسے پر بوجھ ڈالنا مناسب نہیں۔ کچھ عرصے کے بعد پھر یہ بات کی گئی تو حضرت صوفی صاحب ناراض ہو گئے اور کہا کہ آپ کسی اور کو لے آئیں۔ جب میں کہہ چکا ہوں کہ ضرورت نہیں تو پھر کیوں اصرار کرتے ہیں۔

صوفی صاحب مستند طبیب بھی تھے اور طلبہ میں سے کسی کو کوئی تکلیف ہوتی تو وہ صوفی صاحب کے پاس جاتا اور انھیں نبض دکھا کر دوا لکھوا لیتا تھا۔ نزلے کے لیے وہ اطریفل اسطوخودوس اور پیٹ درد کے لیے کمونی کبیر لکھ کر دیتے تھے جو بازار سے لائی جاتی۔ حضرت کے عزیز احسان اللہ اور عبد الرحمٰن شاہ، جو میرے ہم سبق تھے، بتاتے تھے کہ رات کو صوفی صاب اٹھ اٹھ کر بیمار طالب علموں کے پاس جاتے تھے اور ان کی صحت کا حال معلوم کرتے تھے۔

حضرت صوفی صاحب فرماتے تھے کہ میں بیس سال تک حضرت لاہوری کے پاس مجلس ذکر میں جاتا رہا ہوں۔ ڈاکٹر شیر علی شاہ صاحب نے بھی بیان کیا کہ جب وہ شیرانوالہ میں طالب علم تھے تو صوفی صاحب ہر جمعرات کو وہاں جاتے تھے۔ اس ناتے سے حضرت صوفی صاحب کو حضرت مولانا عبید اللہ انورؒ کے ساتھ گہرا تعلق خاطر تھا۔ مولانا عبید اللہ انور فرماتے تھے کہ صوفی صاحب میرے ذوق کے آدمی اور میرے آئیڈیل ہیں۔ ہمیں تلقین کرتے تھے کہ ان کی خدمت میں جایا کرو، جمعہ وہیں پڑھا کرو اور ان کے پاس بیٹھا کرو۔ ایک دفعہ میں نے دیکھا کہ مولانا عبید اللہ انور اسٹیشن کے سامنے اڈے کی طرف سے رات تقریباً ایک بجے کے قریب تنہا آ رہے ہیں۔ میں ساتھ ہولیا۔ آگے پہنچتے تو دیکھا کہ صوفی صاحب گلی کے کنارے پر ان کے انتظار میں کھڑے تھے۔ میں ان کی تنہائی میں خلل انداز ہونے کے بجائے اجازت لے کر وہاں سے چلا گیا۔

تحریک مسجد نور کے دوران حضرت مولانا انور ہر ماہ یہاں تشریف لاتے تھے، حالانکہ بہت بیمار تھے اور فرماتے تھے کہ میں جان پر کھیل کر آیا ہوں۔ ڈاکٹروں نے ان سے کہہ رکھا تھا کہ اپنے کمرے سے بالکل باہر نہ جائیں۔ تحریک کے دوران انھوں نے ایک مرتبہ حکومت کے خلاف بہت سخت تقریر کی اور فرمایا کہ مدرسہ عمارت کا نام نہیں، ہم جہاں بھی بیٹھیں گے، وہیں مدرسہ آباد کرلیں گے۔ مولانا انورؒ کی وفات کی خبر سے صوفی صاحب کو بہت صدمہ ہوا اور شدت غم سے ان کے جسم پر لرزہ طاری ہوگیا۔ اس سے اگلا جمعہ وہ نہیں پڑھا سکے اور یہ جمعہ حضرت شیخ الحدیث نے مدرسہ نصرۃ العلوم میں پڑھایا اور کہا کہ نمبر تو میرا تھا، لیکن بازی مولانا عبید اللہ انور لے گئے، حالانکہ وہ مجھ سے خاصے چھوٹے تھے۔

مولانا عبد القیوم ہزاروی کی روایت ہے کہ عائلی قوانین کے موقع پر صوفی صاحب کی رائے یہ تھی کہ بغاوت کا اعلان کرنا چاہیے، کیونکہ یہ سراسر کفر ہے۔ وہ حضرت لاہوری کے پاس گئے تو انھوں نے کہا میں نے علما کی طرف فرض کفایہ ادا کر دیا ہے۔ حضرت لاہوری نے کہ میرا آخری وقت ہے، اور میرا آرام کا وقت ہے، لیکن مجھے اللہ کا خوف آیا کہ اللہ مجھ سے پوچھے گا کہ تمہارے سامنے اللہ کا دین بدلا گیا اور تم یہود و نصاریٰ کے مولویوں کی طرح چپ بیٹھ رہے۔ حضرت لاہوری نے مارشل لا توڑ کے جلسہ کیا اور عائلی قوانین کے خلاف تقریریں کیں۔ گوجرانوالہ میں بھی عائلی قوانین کے خلاف شیرانوالہ باغ میں جلسہ رکھا گیا جس میں حضرت درخواستی اور مولانا ہزاروی نے آنا تھا، لیکن وہ نہیں آ سکے، چنانچہ صوفی صاحب کو بلایا گیا اور انھوں نے عائلی قوانین کے خلاف بڑی زبردست اور پرجوش تقریر کی۔ اس طرح کی تقریر میں نے ان سے پہلے کبھی نہیں سنی تھی۔ ایک اور موقع پر جب مولانا عبید اللہ انور پر لاٹھی چارج کیا گیا تو بھی حضرت صوفی صاحب نے عید کے اجتماع پر بڑی پرجوش تقریر کی تھی۔

صوفی صاحب کا خطبہ جمعہ بڑا پرجوش ہوتا تھا اور حکومت کے غلط کاموں پر بالکل نڈر ہو کر تنقید کرتے تھے۔ عالم اسلام کے دفاع میں امریکہ کے خلاف بولتے تھے۔ حکومت کے خلاف سخت تقریروں کی پاداش میں ہی ایوب کے دور میں جب چند ماہ کے لیے ان پر پابندی لگا دی گئی تو وہ خان پور حضرت درخواستی کے پاس خان پور چلے گئے۔ حضرت درخواستی صوفی صاحب کے ساتھ بہت محبت رکھتے تھے۔ ۶۲ء میں درخواستی صاحب مولانا لاہوری کے بعد امیر بنے تو وہ گوجرانوالہ آئے۔ نصرۃ العلوم میں حیات النبی پر گفتگو کی۔ صوفی صاحب نے چائے کے لیے کہا تو فرمایا کہ تم تو میری طبیعت جانتے ہو۔ اگر بیٹھ گیا تو مغرب ادھر ہی ہو جائے گی، مجھے جہلم پہنچنا ہے۔ وہاں تقریر رکھی ہے۔ حضرت درخواستی سے حرم میں ایک آدمی ملا اور اس نے بتایا کہ میں

گوجرانوالہ سے ہوں تو کہا کہ وہاں میرا ایک ہی شاگرد ہے، صوفی عبد الحمید جو وفادار ہے۔ باقی سب بے وفا ہیں۔

حضرت صوفی صاحب جمعے کے خطاب میں فرقہ وارانہ اور اختلافی مسائل بیان کرنے کو پسند نہیں کرتے تھے۔ کسی نے جمعے میں ان کو رقعہ دیا رفع یدین کے بارے میں تو کہا کہ مجھے ایسے رقعے نہ دیا کرو۔ جیسے تمہارے استاذ نے نماز کا طریقہ بتایا ہے، اس طرح نماز پڑھو۔ پہلے ہی بہت انتشار ہے۔ حلال روزی کمانے پر بہت زور دیتے تھے۔ فرمایا کہ میں مشکوک پیسہ نہیں لیتا تھا۔ ایک آدمی نے مجھے کئی ہزار روپے دیے۔ میں نے پوچھا کہ کیا کام ہے تمہارا تو اس نے کہا کہ سیالکوٹ میں میرا ایک سینما ہے۔ میں نے کہا کہ میں ایسا پیسہ نہیں لیتا۔ اگر حلال کی کمائی سے سو روپے بھی دو تو بہت ہیں۔ پھر وہی آدمی دوبارہ آیا اور کہا کہ میں اپنی دکانوں کے کرایے سے بچا بچا کر لایا ہوں۔ میں نے بڑی خوشی سے وہ رقم قبول کر لی۔

صوفی صاحب جب حج پر گئے تو رات کو تہجد پڑھ کر روانہ ہوئے۔ صرف مستری منیر احمد صاحب لاہور تک ساتھ گئے تھے۔ جب واپس آئے تو میں اس وقت دوپہر کا کھانا کھا کر باہر نکل رہا تھا۔ سامنے دیکھا تو صوفی صاحب گلی میں داخل ہو رہے تھے۔ وہی کپڑے اور وہی قینچی جوتا۔ کوئی سامان پاس نہیں تھا۔ میں نے حسب معمول وضو کے لیے لوٹا بھر کر پیش کیا۔ صوفی صاحب نے استنجا اور وضو کیا اور مسجد میں جا کر نفل پڑھنے لگے۔ پھر سب لوگ اکٹھے ہوگئے اور صوفی صاحب نے دعا فرمائی۔

صوفی صاحب عام طور پر جنازے کے لیے نہیں جاتے تھے اور بعض دفعہ کئی کئی سال تک مدرسے کے حدود سے باہر نہیں نکلتے تھے، لیکن میرے والد اور والدہ دونوں کا جنازہ صوفی صاحب نے پڑھایا۔ والدہ کی وفات کے موقع پر میں نے حاضر ہو کر اطلاع دی اور جنازے کے لیے درخواست کی تو فرمایا کہ جنازہ کہاں ہوگا؟ میں نے بتایا کہ بڑے قبرستان میں، تو فرمایا کہ ضرور آؤں گا۔ میں نے عرض کیا کہ آپ کو لینے کوئی دوست آ جائیں گے۔ فرمایا کہ تم میرے بچوں کی طرح ہو۔ تمہیں یاد ہے کہ تم عصر کے بعد میرے لیے لوٹا بھر کر کھڑے ہوتے تھے؟ میں تو اس وقت سے تمہارے لیے دعائیں کرتا ہوں۔ تم درخواستی صاحب کا دل بھی بہلایا کرتے تھے اور وہ ہمارے استاذ ہیں۔ ہمارا جنازہ بعد میں پہنچا، صوفی صاحب ہم سے پہلے جنازہ گاہ میں پہنچے ہوئے تھے۔

میں عرض کرتا ہوں کہ اپنی سطح کے لوگوں سے ہر کوئی احسن طرز عمل کا مظاہرہ کر لیتا ہے، لیکن اپنے سے ہر اعتبار سے چھوٹوں کا دل رکھنا کسی کسی کا کام ہے۔ آج ہم اپنے اکابر سے اور ان کے طرز عمل سے کتنے دور ہوگئے ہیں۔ بندہ طوالت سے بچنے کے لیے صرف چند واقعات تحریر کیے ہیں، ورنہ ایسے بہت سے واقعات ذکر کیے جا سکتے ہیں۔ حضرت تھانوی رحمہ اللہ کی وفات پر مفتی محمد حسن صاحب نے فرمایا تھا کہ ہم خود تو انسان نہیں بن سکے، لیکن اتنی بات ہے کہ ہم نے انسان دیکھے ضرور ہیں۔ میں بھی حضرات شیخین کے حوالے سے یہی بات دہرا کر اللہ تعالیٰ جل ذکرہ سے دعا کرتا کہ بے ادبی کے اس دور میں اللہ تعالیٰ ہمیں اپنے اکابر کا ادب نصیب فرما دیں اور ان کے دامن سے وابستہ رکھیں، آمین یا الہ العالمین۔ تحریر کے خاتمہ کے طور پر اپنے جذبات کی ترجمانی کے لیے مولانا محمد عمار خان ناصر کا شعر پیش کرتا ہوں:

اے خدا تیرے فرشتے اور جتنے کام ہوں
ان کے پاؤں دابنے کو پر یہی خدام ہوں

مولانا داؤد احمد میواتی*

وہ جسے دیکھ کر خدا یاد آئے

حضرت عبد اللہ ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا گیا ہے کہ ہماری نشست و برخاست کیسے لوگوں کے ساتھ ہونی چاہیے؟ آپ نے فرمایا: من ذکرکم باللہ رؤیتہ وزاد فی علمکم منطقہ وذکرکم بالآخرۃ عملہ (رواہ البزار) ''وہ شخص جس کو دیکھ کر تمھیں خدا یاد آئے اور جس کی گفتگو سے تمہارا علم بڑھے اور جس کے عمل کو دیکھ کر آخرت کی یاد تازہ ہو۔'' ہمارے حضرت شیخ اس حدیث کا کامل مصداق تھے۔ انہیں جب بھی دیکھا، خدا یاد آیا اور ان کی مجلس میں بیٹھ کر علم میں اضافہ ہوا۔ آپ کی مجلس میں اکثر و بیشتر کسی علمی موضوع پر بات چیت ہوتی تھی یا کسی حدیث کا ذکر ہوتا۔ ایک مرتبہ ہم تین ساتھی حضرت کی بیمار پرسی کے لیے گکھڑ منڈی گئے۔ کچھ ڈاکٹر صاحبان تشریف لائے ہوئے تھے۔ ان میں سے کسی نے کہا، حضرت! ہم صرف بیمار پرسی کے لیے آتے ہیں۔ حضرت نے ہمارے فاضل دوست مولانا عبد الرحیم بلوچ سے فرمایا کہ مولانا! الماری سے فلاں کتاب پکڑیں، فلاں صفحہ نکالیں اور درمیان صفحہ میں فلاں صحابی سے منقول حدیث پڑھیں۔ وہ عیادت مریض سے متعلق دو حدیثیں ہیں:

۱۔ عن ثوبان رضی اللہ عنہ عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم قال: ان المسلم اذا عاد اخاہ المسلم لم یزل فی خرفۃ الجنۃ۔

''حضرت ثوبان کہتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جب کوئی مسلمان کسی مسلمان کی عیادت کرتا ہے تو جب تک وہ عیادت میں مشغول رہتا ہے، گویا وہ جنت کے باغ میں پھل چن رہا ہوتا ہے۔''

۲۔ ثویر اپنے والد سے نقل کرتے ہیں کہ انہوں نے فرمایا کہ حضرت علیؓ نے میرا ہاتھ پکڑا اور فرمایا چلو حسین کی عیادت کے لیے چلیں۔ حضرت ابو موسیٰ بھی وہیں تھے۔ حضرت علیؓ نے پوچھا کہ اعائدا جئت یا اباموسی ام زائرا؟۔ ابو موسیٰ! آپ صرف ملاقات کی نیت سے آئے ہیں یا عیادت کے لیے؟ حضرت ابو موسیٰ نے جواب دیا کہ عیادت کے لیے۔ حضرت علیؓ نے فرمایا:

سمعت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یقول: ما من مسلم یعود مسلما غدوۃ الا صلی علیہ سبعون الف ملک حتی یمسی وان عادہ عشیۃ الا صلی علیہ سبعون الف ملک حتی یصبح، وکان لہ خریف فی الجنۃ۔

''میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہے کہ جب کوئی مسلمان صبح کے وقت کسی مسلمان کی عیادت کرتا

---

* استاذ الحدیث مدرسہ انوار العلوم گوجرانوالہ

ہے تو ستر ہزار فرشتے شام تک اس کے لیے مغفرت کی دعا کرتے ہیں۔ اور اگر رات کو عیادت کرے تو صبح تک اس کے لیے دعائے مغفرت کرتے ہیں۔ نیز اس کے لیے جنت میں ایک باغ بھی لگایا جائے گا۔''

حضرت نے جب ان دو احادیث کی طرف توجہ دلائی تو تمام شرکا بہت خوش ہوئے اور عجب کیف محسوس ہوا۔

ایک مرتبہ بندہ حاضر خدمت ہوا تو فرمانے لگے، سورۃ الحج میں ومنکم من یرد الی ارذل العمر کی تفسیر میں حافظ ابن کثیر نے حضرت انس سے ایک حدیث نقل کی ہے جس میں یہ الفاظ ہیں: وکان اسیر اللہ فی ارضہ۔ تفسیر ابن کثیر میں یہ حدیث مجھے سنائیں۔ بندہ نے درج ذیل حدیث حضرت کو سنائی:

مسند احمد اور مسند ابی یعلی میں حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ بچہ جب تک بالغ نہیں ہوتا، اس کے نیک اعمال والد یا والدین کے حساب میں لکھے جاتے ہیں اور اگر کوئی برا عمل کرے تو وہ نہ اس کے حساب میں لکھا جاتا ہے اور نہ والدین کے۔ پھر جب وہ بالغ ہو جاتا ہے تو قلم حساب اس کے لیے جاری ہو جاتا ہے اور دو فرشتے جو اس کے ساتھ رہنے والے ہیں، ان کو حکم دیا جاتا ہے کہ اس کی حفاظت کریں اور اس کو قوت بہم پہنچائیں۔ اس کو تین قسم کی بیماریوں، جنون، جذام اور برص سے محفوظ فرما لیتے ہیں۔ جب پچاس سال کی عمر کو پہنچتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کو اپنی طرف رجوع کی خصوصی توفیق عطا فرماتے ہیں۔ جب ستر سال کی عمر کو پہنچتا ہے تو سب آسمان والے اس سے محبت کرنے لگتے ہیں۔ جب اسی سال کو پہنچتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کے حسنات لکھتے ہیں اور سیئات کو معاف فرما دیتے ہیں۔ پھر جب نوے سال کی عمر ہو جائے تو اللہ تعالیٰ اس کے سب اگلے پچھلے گناہ معاف فرما دیتے ہیں اور اس کو اپنے گھر والوں کے حق میں شفاعت کرنے کا حق دیتے ہیں اور اس کی شفاعت قبول ہوتی ہے اور اس کا لقب امین اللہ اور اسیر اللہ فی الارض ٹھہرتا ہے۔ اور جب ارذل عمر کو پہنچ جائے تو اس کے تمام وہ نیک اعمال نامہ اعمال میں برابر لکھے جاتے ہیں جو اپنی صحت و قوت کے زمانے میں کیا کرتا تھا۔ اور اگر اس سے کوئی گناہ ہو جاتا ہے تو وہ لکھا نہیں جاتا۔

اس حدیث پر حافظ ابن کثیرؒ نے سند کے حوالہ سے کلام بھی فرمایا ہے، لیکن اس کے باوجود امام احمد بن حنبل نے اپنی مسند میں اس حدیث کو موقوفاً و مرفوعاً نقل فرمایا ہے۔ جب حضرت نے حدیث کے الفاظ: وکان اسیر اللہ فی الارض سنے تو بہت خوش ہوئے۔ ایک دوسرے موقع پر بندہ نے جب اس حدیث کا تذکرہ کیا اور عرض کیا کہ حضرت آپ تو اس حدیث کا مصداق ہیں تو فرط مسرت سے آبدیدہ ہو گئے۔

قرآن و حدیث حضرت کا اوڑھنا بچھونا تھا۔ حضرت کی صحت کے زمانہ میں جب بھی عصر کے بعد حضرت کی زیارت کے لیے برادر محترم مولانا یوسف، استاد حدیث جامعہ الرشید کی معیت میں حاضری کا شرف حاصل ہوا تو تلاوت یا مطالعہ یا ذکر واذکار میں مشغول پایا۔

حضرت وعدے کے بہت پکے تھے۔ ایک مرتبہ بندہ نے عرض کیا کہ حضرت، میں یہ قلم خرید کر لایا ہوں، آپ لے لیں اور اپنا مبارک قلم مجھے عنایت فرما دیں۔ فرمانے لگے کہ جب کراچی گیا تھا تو ایک مولوی صاحب نے مجھے یہ قلم دیا تھا اور شرط یہ لگائی تھی کہ یہ کسی کو نہیں دینا۔ میرے پاس ایک نیا پین آیا ہے، اس سے ایک دو دن لکھ کر وہ آپ کو دے دوں گا۔ میں یہ سمجھا کہ حضرت نے ٹرخا دیا ہے۔ اتنی بڑی اور مصروف شخصیت کو کہاں یاد رہے گا، لیکن ٹھیک دو دن بعد بندہ اسباق پڑھا رہا تھا

کہ نصرۃ العلوم سے ایک طالب علم آیا اور مجھ سے کہا کہ حضرت شیخ نے بھیجا ہے اور آپ کے لے یہ پنسل دی ہے۔ بندہ کی حیرت کی انتہا نہ رہی۔ وعدہ پورا کرنے کا یہ احساس! اسی لیے اللہ تعالیٰ نے ان کی دعاؤں میں بڑا اثر رکھا تھا۔ بخاری شریف کے سبق کے بعد بندہ نے اپنی زمین کے مقدمہ کے حوالہ سے دعا کے لیے کہا تو حضرتؒ نے سب ساتھیوں کو متوجہ کر کے بڑی لجاجت کے ساتھ دعا فرمائی۔ شام کو برادر کبیر جناب شبیر احمد میواتی نے خوشخبری سنائی کہ اللہ تعالیٰ نے مقدمہ کا فیصلہ ہمارے حق میں کر دیا ہے۔

حضرت خوش طبع بھی بہت تھے۔ ایک مرتبہ بندہ حکیم محمد کوثر صاحب کے ساتھ حاضر ہوا تو فرمانے لگے حکیم صاحب کتنے مریض آ جاتے ہیں؟ انہوں نے کوئی تعداد بتلائی تو فرمانے لگے کہ ان میں سے کتنوں کو قبرستان بھیجتے ہیں؟ پھر فرمانے لگے کہ ماہانہ کتنے پیسے کما لیتے ہیں؟ حکیم صاحب نے آمدن بتائی تو فرمایا کہ یہ پیسے کہاں رکھتے ہو؟ پھر فوراً ہی فرمایا کہ ڈریں مت، اب میں چل پھر نہیں سکتا۔

میں دیکھے ہوئے خواب بھول جاتا ہوں، لیکن ایک خواب آج بھی حافظہ پر نقش ہے۔ ایک مرتبہ بندہ نے حضرت مدنیؒ کو خواب میں دیکھا کہ نصرۃ العلوم کی مسجد کے برآمدہ کھڑے ہیں اور ساتھ ہی استاد محترم مولانا عبد القیوم ہزاروی مدظلہ تشریف فرما ہیں۔ کسی نے حضرات شیخین کا ذکر کیا تو حضرت مدنی فرمانے لگے کہ ان کو تکلیف نہ دیں، وہ بہت قیمتی کام کر رہے ہیں۔ بعد میں کسی نے کہا کہ حضرت دار الحدیث میں سبق پڑھائیں گے۔ بندہ نے جا کر دیکھا تو ایک بچہ قرآن پاک کی تلاوت کر رہا تھا اور حضرت مدنیؒ خاموشی کے ساتھ تلاوت سن رہے تھے۔ اس خواب سے بشارت ملی کہ حضرت مدنیؒ حضرات شیخین کے کام اور خدمات سے بہت خوش ہیں۔ اللہ تعالیٰ ہمارے حضرت کو کروٹ کروٹ جنت نصیب فرمائے۔

جب امریکہ اور اتحادیوں نے افغانستان میں طالبان کی اسلامی ریاست پر ناجائز حملہ کیا تو حضرت بہت زیادہ افسردہ رہتے تھے۔ بندہ نے عرض کیا کہ طاغوتی اور شیطان قوتیں افغانیوں کی اسلام اور علما سے وابستگی کو کہاں برداشت کر سکتے ہیں! س پر بندہ نے علامہ اقبالؒ کے اشعار سنائے:

یہ فاقہ کش کہ موت سے ڈرتا نہیں ذرا
روح محمد اس کے بدن سے نکال دو
فکر عرب کو دے کے فرنگی تخیلات
اسلام کو حجاز ویمن سے نکال دو
افغانیوں کی غیرت دیں کا ہے یہ علاج
ملا کو ان کے کوہ ودمن سے نکال دو

کچھ دنوں کے بعد جب دوباری حاضری ہوئی تو فرمانے لگے، مولانا اقبالؒ کے وہ اشعار کیا تھے، دوبارہ سناؤ۔ بندہ نے دوبارہ سنائے تو بہت خوش ہوئے۔

حضرت کی اصل غذا علم تھا۔ کسی بھی دینی وعلمی بات پر بہت خوش ہوتے، لیکن مضبوط حوالے کے ساتھ۔ حوالے کے بغیر بات کو قبول نہیں فرماتے تھے۔

بندہ نے تین مرتبہ با قاعدہ دورۂ تفسیر میں شرکت کی ہے اور پندرہ پارے دورۂ حدیث والے بسال حضرت سے پڑھے ہیں۔ حضرت کا دورہ تفسیر منفرد خصوصیات کا حامل ہوتا تھا۔ ہر بات مستند حوالہ جات کے ساتھ ہوتی۔ تمام سبق میں مغز ہی مغز ہوتا تھا۔ کوئی رطب ویابس نہیں ہوتی تھی۔ حوالہ دیتے وقت تمام تفسیروں کا باقاعدہ نام لیتے اور آخر میں فرماتے، ''حتیٰ کہ جلالین شریف تک میں یہ بات موجود ہے۔'' پھر کسی طالب کو کھڑا کرتے جس کے پاس جلالین کا نسخہ موجود ہوتا اور اس سے نخے۔ اگر وہ عبارت پڑھنے میں غلطی کرتا تو فرماتے، مولانا آپ نے دال دلیہ کیا ہے، حلوہ نہیں بنایا۔

دورۂ حدیث میں الحمد للہ بخاری شریف جلد اول کی عبارت پڑھنے کی سعادت بندہ کو حاصل ہوئی۔ اگر کوئی بات پہلے گزر چکی ہوتی تو فرماتے کہ یہ بات پہلے گزر چکی ہے، اگر کوئی صاحب باحوالہ بتلا دیں تو پانچ روپے انعام ملے گا۔ ہمارے بہت سے ساتھیوں نے انعامات حاصل کیے۔ بندہ کو بھی کئی مرتبہ سعادت حاصل ہوئی۔ ہمارے ساتھی مولانا احمد سعید لکی مروت نے پانچ روپے اب تک محفوظ رکھے ہوئے ہیں اور وصیت کی ہے کہ میری وفات کے بعد اس کو میرے ساتھ میرے کفن میں رکھ دیا جائے، جبکہ بندہ کو جب بھی انعام ملا، میں نے ان بابرکت پیسوں سے ناشتہ کیا۔

قرآن پاک کے ترجمہ میں آیت وما اختلف الذین اوتوا الکتاب الا من بعد ما جاء ھم العلم بغیا بینھم میں ایک علمی سوال وجواب ہے۔ حضرتؒ اس کی بڑی عمدہ تشریح فرمایا کرتے تھے۔ اس آیت میں دو قسم کے اشکال ہیں، ایک نحوی اور ایک علم معانی کا۔ نحوی اشکال یہ ہے کہ الا کا ماقبل الا کے مابعد میں عمل نہیں کرتا۔ اس آیت میں بغیا، اختلف کا مفعول لہ ہے جو کہ الا کے بعد واقع ہے اور اختلف اس میں عامل ہے جو کہ اس سے پہلے واقع ہے۔ علم معانی کا اشکال یہ ہے کہ حکم چاہے اثبات کا ہو یا نفی کا، جب وہ کسی شے پر لگایا جاتا ہے تو اگر وہ شے مقید بالقید ہو تو حکم راجع الی القید ہوتا ہے۔ اس مقام پر اختلف مقید بقید البغی ہے تو معنی ہوگا کہ انہوں نے بغیا اختلاف نہیں کیا، بلکہ رشد وہدایت کی وجہ سے اختلاف کیا ہے، حالانکہ یہ بات صحیح نہیں۔ اس کا ایک جواب علامہ سیوطی نے دیا ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ اس میں تقدیم وتاخیر ہے۔ ای ما اختلف من بعد ماجاء تھم البینات بغیا بینھم الا الذین اوتوہ۔ کشاف، بیضاوی اور روح المعانی وغیرہ میں اس کا جواب یہ دیا گیا ہے کہ یہاں الا کے بعد اختلفو المحذوف ہے، ای اختلفوا بغیا بینھم۔

حضرت نے مذکورہ تقریر فرمائی۔ پھر دوسرے موقع پر جب یہ آیت آئی تو حضرت نے فرمایا کہ یہاں ایک سوال اور جواب ہے، اگر کوئی صاحب یہ سوال وجواب بتلا دیں تو ان کو پانچ روپے انعام ملے گا۔ احقر نے بتلایا تو دیر تک تحسین فرماتے رہے۔

دورۂ تفسیر کے دوران کبھی کبھی آیت کے مناسب یا حدیث کے مناسب واقعات ولطائف بھی سناتے تھے۔ کلموا الناس علی قدر عقولھم پر یہ لطیفہ سنایا کہ ایک مرتبہ حضرت مولانا محمد ابراہیم بلیاویؒ کی دار العلوم دیو بند کے گیٹ پر ایک مولی بیچنے والے نے پٹائی کر دی۔ مدرسہ میں یہ خبر پہنچی تو طوفان کھڑا ہو گیا۔ طلبہ دوڑتے ہوئے گیٹ پر پہنچے تو حضرت نے فرمایا اس کو کچھ نہ کہو، اس کا قصور نہیں ہے، بلکہ میری منطق کا قصور ہے۔ ہوا یہ کہ حضرت نے مولی کا بھاؤ معلوم کیا اور دیکھا کہ مولی کے پتے زیادہ ہیں اور مولی کم ہے تو فرمانے لگے، مقصود بالذات کم ہے اور مقصود بالعرض زیادہ ہے۔ اتفاق سے مولی فروش کا نام مقصود تھا۔ اس نے یہ سمجھا کہ مولانا مجھے گالی دے رہے ہیں کہ مقصود بدذات ہے۔ فرمانے لگے، اس منطق نے

میری پٹائی کروائی ہے۔ مدرسہ کے طلبہ وعلما خوب محظوظ ہوئے۔

من صمت نجا پر واقعہ سنایا کہ غالباً پاکستان بننے سے پہلے حضرت مولانا غلام محمد لدھیانوی کے علاقہ لدھیانہ میں ایک انگریز آیا۔ وہ ایک تالاب کے کنارے کھڑا ہو کر کسی پر فضا مقام کی تصویر لے رہا تھا کہ پاؤں پھسلا اور وہ تالاب میں جا گرا۔ تیرنا آتا نہیں تھا۔ چیخا چلایا تو ایک چرواہا جو قریب ہی اپنے جانور چرا رہا تھا، دوڑا ہوا آیا اور تالاب میں چھلانگ لگا کر انگریز کو باہر نکالا۔ انگریز نے شکریہ ادا کرتے ہوئے اسے کہا کہ تھینک یو۔ چرواہے نے سمجھا کہ یہ کہہ رہا ہے پھینکو تو اس نے انگریز کو دوبارہ دھکا دے دیا۔ انگریز پھر چیخا چلایا تو چرواہا کہنے لگا، انگریز بڑا الو کا پٹھا ہے۔ خود ہی کہتا ہے تھینک یو اور پھر شور بھی مچاتا ہے۔ چرواہے نے پھر چھلانگ لگائی اور اس کو نکال کر کنارے پر کھڑا کر دیا۔ اب انگریز نے خاموشی اختیار کرنے میں عافیت سمجھی۔ گویا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد من صمت نجا (جس نے خاموشی اختیار کی، اس نے نجات پائی) سے ایک کافر کو بھی فائدہ ہوا۔

گکھڑ منڈی میں جب ہمارے استاذ زادہ مولانا حماد الزاہراوی کی کوششوں سے دورہ تفسیر شروع ہوا تو استاد محترم حضرت مولانا زاہد الراشدی دامت برکاتہم کے ساتھ بندہ ناچیز کو بھی اس میں تدریس کی سعادت حاصل ہوئی۔ دورۂ تفسیر کے دوران تقریباً روزانہ حضرت کی زیارت کی سعادت حاصل ہوتی۔ کبھی کبھار بندہ کوئی ہدیہ لے کر جاتا تو فرماتے، مولانا آپ تکلف نہ کیا کریں، میں آپ سے بہت خوش ہوں۔ ایک مرتبہ ہم صبح صبح حضرت کا درس سننے کے لیے گکھڑ پہنچ گئے۔ درس کے بعد ہم حضرت کے ساتھ گھر گئے۔ حضرتؒ نے اپنے صاحبزادوں میں سے کسی صاحبزادے سے ناشتہ کے لیے فرمایا۔ ناشتہ بڑا پر تکلف تھا اور اکثر لوازمات باہر سے منگوائے گئے تھے۔ میں نے بعد میں ہدیہ دینا چاہا تو فرمانے لگے، مولانا یہ نہ کریں، میں اتنا حریص نہیں ہوں۔ چونکہ ناشتہ کے بعد ہدیہ پیش کیا گیا تھا، اس لیے حضرت نے یہ سمجھ لیا چونکہ ہم نے ناشتہ کروایا ہے، اس لیے یہ ہدیہ پیش کر رہے ہیں۔

حضرت کی سب سے بڑی خواہش مولانا محمد اسلم شیخوپوری کے مضمون سے معلوم ہوئی جو یہ تھی کہ مجھے شرح تہذیب سے نیچے درجہ کے اسباق پڑھانے کا موقع مل جائے، کیوں کہ میں نے شرح تہذیب اور اس کے اوپر کے اسباق پڑھائے ہیں۔

حضرت کو جب یہ بتلایا جاتا کہ فلاں مسجد میں درس قرآن یا ترجمہ شروع ہوا ہے تو حضرت بہت خوش ہوتے۔ بندہ کے زیر نگرانی تین مساجد میں ترجمہ قرآن کا سلسلہ چل رہا ہے اور تینوں مساجد میں حضرت نے قدم رنجہ فرمایا۔ حضرت کی کرامت دیکھی کہ حضرت کی تشریف آوری کے ساتھ ہی اللہ تعالیٰ نے مساجد کا ماحول بہت ہی پر سکون بنا دیا۔ جب بھی حاضری ہوتی، ترجمہ قرآن کریم کے بارے میں پوچھتے اور ڈھیروں دعاؤں سے نوازتے۔ ہمارے دوست مفتی ایاز صاحب نے جو عسکری کی مسجد میں ہیں، درس شروع کیا تو حضرت بڑے اہتمام کے ساتھ دریافت فرماتے، بڑی مسرت کا اظہار فرماتے اور بہت زیادہ دعائیں دیتے۔ گکھڑ میں حضرت کے صاحبزادے مولانا حماد الزہراوی کی کوششوں سے جب دورۂ تفسیر شروع ہوا تو اس پر بے حد مسرت کا اظہار فرماتے اور غیر ملکی طلبہ کے بارے میں خصوصاً پوچھتے۔ لہٰذا حضرت کے تلامذہ اور عقیدت مندوں سے گزارش ہے کہ زیادہ سے زیادہ ترجمہ قرآن کی کلاسز قائم کی جائیں اور حضرتؒ کی تصنیفات سے زیادہ سے زیادہ استفادہ کیا جائے۔ یہ حضرت کو خراج عقیدت پیش کرنے کا سب سے بہترین طریقہ ہے۔

مولانا حافظ گلزار احمد آزاد*

دو مثالی بھائی

مولانا محمد عمار خان ناصر نے ''الشریعہ'' کی اشاعت خاص کے لیے کچھ تحریر کرنے کا اشارہ فرمایا۔ ان کی حوصلہ افزائی سے بہار املا اور ہمت کر کے قلم اٹھا لیا، ورنہ اس حساس وادی کے نشیب وفراز سے سچی بات ہے کہ میں آشنا نہیں ہوں۔ مولانا عمار ناصر حضرت امام اہل سنتؒ کے پوتے ہیں۔ ان کی زبان سے یہ لفظ سن کر کہ ''حضرت امام اہل سنتؒ اور مفسر قرآن مولانا عبد الحمید خان سواتیؒ، دونوں بھائیوں کے بارے میں جو جو واقعات آپ کے ذہن میں محفوظ ہیں، وہ لکھ دیں''، ایک عجیب خوشی اور مسرت کا احساس ہوا کہ جیسے دونوں بھائیوں میں زندگی بھر باہمی تعلق اور محبت و پیار میں کبھی فرق نہ آیا، اسی طرح ان کی اولاد در اولاد اسی انس والفت اور خلوص سے سرشار نظر آتی ہے۔ خدا کرے، یہ تسلسل نسل در نسل سدا قائم رہے۔

امام اہل سنت اور مفسر قرآن دونوں بھائیوں کے حالات وواقعات بچپن سے لے کر جوانی تک اور جوانی سے لے کر بڑھاپے تک کچھ اس طرح جڑے ہوئے ہیں کہ اگر ان میں سے ایک کی سوانح حیات مرتب کی جائے تو یوں محسوس ہوتا ہے کہ دو شخصیات کے حالات زندگی لکھے گئے ہیں۔ حضرت شیخ سرفراز خان صفدرؒ بڑے تھے اور انہوں نے بڑے بھائی کا نہ صرف حق ادا کر دیا بلکہ ایک مثال قائم کر دی۔ حضرت سواتیؒ چھوٹے تھے اور انھوں نے پوری زندگی اپنے بڑے بھائی کے احسانات کو نہیں بھلایا۔ حضرت شیخ صفدرؒ کے نام اپنے ایک خط میں لکھتے ہیں:

> ''آپ کے احسانات بالعموم ہم سب پر اور بالخصوص اس احقر پر بہت زیادہ ہیں۔ ان کا اجر اللہ تعالیٰ آپ کو عطا فرمائے گا۔ آپ کی شفقت، رافت، تربیت اور رہنمائی پر احقر تا دم واپسیں آپ کے لیے اور جملہ خاندان کے لیے دعا گو ہے اور دعا گو رہے گا''۔

شیخین کریمینؒ سے اللہ تعالیٰ نے خوب دین کا کام لیا۔ جانے والا دنیا سے چلا جاتا ہے، اس کے آثار بطور یادگار باقی رہ جاتے ہیں۔ شیخین کی ایسی یادگاریں قائم ہو چکی ہیں جن کا سلسلہ خیر ان شاء اللہ قیامت کی صبح تک چلتا ہی رہے گا۔ دونوں بھائیوں سے اللہ تعالیٰ نے دینی خدمات کے علاوہ تمام علوم کی مخدوم کتاب قرآن مجید کی کمال خدمت لی ہے۔ دونوں نے اپنے منفرد انوکھے انداز میں فہم قرآن کی تحریک کو پروان چڑھایا جس سے اہل علم اور عوام اپنی اپنی بساط کے مطابق مستفیض ہو رہے ہیں۔

راقم الحروف ۱۹۷۱ء میں جامعہ نصرۃ العلوم میں داخل ہوا۔ اس سے پہلے شیخین سے تعارف نہیں تھا۔ جب مدرسہ قادریہ بدوکی سیکھوال میں درجہ حفظ کا طالب علم تھا تو قلعہ دیدار سنگھ کے سالانہ جلسہ میں شریک ہوئے۔ اتنا یاد ہے کہ ظہر کے بعد

---

* خطیب جامع مسجد ختم نبوت، ابوبکر ٹاؤن، سیالکوٹ روڈ، گوجرانوالہ

حضرت مولانا سرفراز خان صفدرؒ کا بیان سننے اور دور سے زیارت کا موقع نصیب ہوا تھا۔ اب جامعہ میں شیخین کو قریب سے دیکھنے کا موقع ملا۔ دونوں بھائی اخلاق میں اپنی مثال آپ ہی تھے۔ یہی وجہ ہے کہ اللہ کریم نے ان کا فیض پوری دنیا میں عام کر دیا۔ دیانت، امانت، تقویٰ، خلوص اور للّٰہیت میں دونوں بھائی اپنے اکابر کی یادگار تھے۔ مدرسہ پر اللہ کی خصوصی رحمت ہے۔

ایک دن صبح صبح تیز بارش ہوئی۔ راقم الحروف اور مولانا عبد الہادی شیخوپوریؒ (بہت اچھے خطیب تھے اور نوجوانی میں اللہ کو پیارے ہو گئے۔ اللہ ان کو جوار رحمت میں جگہ عطا فرمائے، آمین) ہم دونوں سیالکوٹ روڈ سے اکٹھے مدرسہ جایا کرتے تھے۔ جب بارش تھمی تو ہم مدرسہ پہنچے۔ خیال تھا کہ آج حضرت یقیناً نہ پہنچ سکیں گے، مگر پہنچنے سے قبل حضرت سبق پڑھا چکے تھے اور حاضری لگا رہے تھے۔ ہم بمشکل غیر حاضری سے بچے۔ جی ٹی روڈ سے بارش میں پیدل چل کر حضرت اپنے معمول کے وقت مدرسہ تشریف لائے۔

جمعرات کو مدرسہ میں تعطیل کا معمول تھا۔ شام کو گاؤں جانا ہوتا تھا اور جمعہ کی شام کو واپسی ہوتی تھی۔ گاؤں میں ایک رشتہ دار کی بیٹی تھی، اور اس کے علاوہ کوئی اولاد نہ تھی۔ وہ سخت بیمار ہو گئی اور مایوسی کی حد تک بات پہنچ گئی۔ اس نے مجھ سے بات کی تو میں نے کہا، صدقہ کرو، اللہ کرم کر دے گا۔ میں مدرسہ آنے لگا۔ وہ رقم لے کر آ گیا کہ تم خود ہی جہاں چاہو، دے دینا۔ میں نے مدرسہ آتے ہی دفتر میں حضرت صوفی صاحبؒ کو وہ رقم دی اور رسید حاصل کر لی۔ وہ ٹائم بھی نوٹ کر لیا۔ جب گاؤں گیا تو متعلقہ آدمی سے ملاقات ہوئی تو اس نے بتایا کہ اسی روز اللہ نے مہربانی فرمائی اور مریضہ کو افاقہ ہو گیا۔ میں نے کرید کر پوچھا کہ کب اس کو افاقہ ہوا تو انہوں نے وہی وقت بتایا جو میں نے نوٹ کیا تھا۔ جونہی حضرت صوفی صاحبؒ نے رسید کاٹی، اسی وقت اللہ نے شفا عطا فرما دی۔ یہ حضرت کے خلوص و للّٰہیت اور مدرسہ کے نظام میں دیانت و تقویٰ کی بدولت رحمت خداوندی اور بارگاہ میں قبولیت کی دلیل ہے۔

میں نے ۱۹۷۱ء ہی سے مسجد ختم نبوت ابوبکر ٹاؤن میں خطابت شروع کر دی تھی۔ مسجد کی توسیع کا فیصلہ ہوا تو سنگ بنیاد کے لیے حضرت نے نو بجے صبح کا وقت دیا۔ لوگوں کا خیال تھا کہ دس بجے تک حضرت تشریف لائیں گے، مگر حضرت نو بجے سے پانچ منٹ پہلے تشریف لے آئے۔ سب لوگ حیران ہوئے۔ کچھ صحافی دوست بھی تھے۔ کہنے لگے، یہ پابندیٔ وقت کی ایک مثال ہے۔ ہماری صحافیانہ زندگی میں یہ پہلا موقع ہے۔ بہت متاثر ہوئے۔

ایک دفعہ کسی پروگرام میں شرکت کے سلسلے میں گکھڑ جانا ہوا۔ تاخیر کی وجہ سے واپسی کی سواری نہ مل سکی۔ حضرت کے صاحبزادہ قاری ماجد صاحب مرحوم اصرار کر کے گھر لے گئے اور مہمان خانے میں بستر بچھا دیا۔ میں لیٹ تو گیا لیکن نیند نہیں آ رہی تھی۔ صبح کی اذان سے تھوڑا پہلے غنودگی طاری ہو گئی جو نیم بے ہوشی کی سی تھی۔ اتنا یاد ہے کہ کمرہ میں حضرت تشریف لائے اور کہا "سنگیا، نماز دی تیاری کرو"۔ اسی طرح غنودگی میں اٹھا۔ حضرت چلے گئے اور کچھ دیر بعد مسجد میں گیا اور نماز ادا کی۔ واپسی پر جب جیب میں ہاتھ ڈالا تو دو سو روپے ہاتھ آئے۔ ایک طالب علم کے لیے یہ اچھی خاصی رقم تھی۔ یہ حضرت امام اہل سنتؒ کی سخاوت اور طلبہ کے ساتھ محبت و شفقت تھی کہ مجھے اٹھاتے ہوئے جیب میں دو سو روپے ڈال دیے کہ یہ پروگرام میں آیا ہے، پتہ نہیں اس کے پاس کرایہ ہے یا نہیں۔

ذوالفقار علی بھٹو کے دور میں علما پر سولہ ایم پی او کی بارش تھی۔ جلسہ میں جس نے تلاوت بھی کی، اس پر کیس بن گیا۔ ایک جلسہ ہوا، حضرت امام اہل سنتؒ، مولانا زاہد الراشدی، مولانا حبیب اللہ فاضل رشیدی، مولانا عبد الرؤف چشتی اور دیگر علما اور راقم الحروف کے خلاف سولہ ایم پی او کے مقدمات درج ہوئے۔ قبل از گرفتاری ضمانت کے لیے درخواست دی گئی۔ مولانا زاہد الراشدی کے خلاف سرکاری وکیل نے کہا کہ ملزم نے پیپلز پارٹی پر سخت تنقید کی ہے۔ جج نے پوچھا، ملزم کا تعلق جس جماعت سے ہے، وہ حزب اقتدار میں ہے یا حزب اختلاف میں۔ اس نے کہا، حزب اختلاف میں ہے تو جج نے کہا کہ پھر تو تنقید کرنا ان کا حق ہے۔ اس طرح ضمانت ہو گئی۔ راقم الحروف سے جج نے کہا کہ تمہارے نام کے ساتھ حافظ لکھا ہے تو تم نے تو تلاوت کرنی تھی، جبکہ ادھر تمہاری تقریر لکھی ہے۔ میں نے کہا کہ تلاوت کے بعد ترجمہ اور پھر اس کی تشریح کی تھی۔ جج نے مسکرا کر ضمانت منظور کر لی۔ جب مولانا چشتی کی باری آئی تو جج نے انہیں مخاطب کر کے کہا، مولانا آپ کی تقریر میں ایک لفظ لکھا ہے "دیوث"، میں اس کی وضاحت پوچھ سکتا ہوں؟ مولانا کٹہرے میں کھڑے تھے۔ گرج کر بآواز بلند کہا: "سب سے بڑا بے غیرت"۔ جج نے کہا، مولانا! اب میں مجبور ہوں۔ اس نے ضمانت کینسل کر دی۔ حضرت امام اہل سنتؒ کی ضمانت ایک روز پہلے ہی ہو چکی تھی۔ میں مدرسہ میں حاضر ہوا اور پوری کارگزاری سنائی اور مولانا عبد الرؤف چشتی کے بارے میں اشارۃً کہہ دیا کہ اگر وہ بھی نرم الفاظ سے وضاحت کرتے تو ان کی بھی ضمانت ہو جاتی۔ حضرت نے فوراً فرمایا، انہوں نے جرات سے کام لیتے ہوئے قابل قدر کردار ادا کیا ہے۔ گویا حضرت کو جرات مندانہ انداز اور حق گوئی پسند تھے۔

مولانا عمر قریشی میرے پاس تشریف لائے۔ فرمانے لگے، حضرت شیخ کی خدمت میں حاضری دینی ہے، زیارت کو دل بے قرار ہے۔ ہم گکھڑ حضرت کے پاس حاضر ہوئے تو میں نے عرض کیا کہ طبیعت کیسی ہے؟ فرمانے لگے کہ میرا حافظہ ختم ہو گیا۔ حافظہ ختم ہو گیا۔ یہ جملہ مسلسل دہرانے لگے۔ چہرہ اقدس سے پریشانی صاف نظر آنے لگی۔ میں نے قریشی صاحب سے کہا کہ اگر کوئی حوالہ درکار ہے تو حضرت سے پوچھ لیں۔ انہوں نے فوراً کسی حوالہ کے متعلق سوال کر دیا۔ حضرتؒ نے اسی وقت کوئی سات آٹھ کتب کے نام لیے کہ ان میں دیکھیں، مل جائے گا۔ ان میں کئی کتابوں کے صفحات کی بھی نشان دہی فرما دی۔ میں نے عرض کیا کہ حضرت آپ کا حافظہ تو ماشاء اللہ تر و تازہ ہے۔ اس پر ہنسنے لگے اور پھر خوش گوار موڈ میں بہت دیر تک گفتگو فرماتے رہے اور دوران گفتگو اشعار بھی سناتے رہے۔

آپ کے عمومی دروس اور وعظوں میں شریک ہونے والے لوگ بھی اچھی خاصی دینی معلومات کے حامل ہو جاتے تھے۔ غالباً ۱۹۷۴ء کی تحریک ختم نبوت کے دوران حضرت شیخ گرفتار ہو گئے تو راقم الحروف کو پیغام ملا کہ گکھڑ منڈی میں حضرت کی جگہ جمعہ پڑھانا ہے۔ حکم کی تعمیل میں حاضر ہوا اور جمعہ کا خطبہ دیا۔ کچھ عرصہ کے بعد حضرت کی رہائی ہوئی۔ انہی دنوں جمعیت علمائے اسلام کی طرف سے مکی مسجد ڈیوڑھا پھاٹک میں پروگرام تھا۔ جمعیت علمائے اسلام کے ضلعی امیر آپ ہی تھے۔ بطور مہمان خصوصی آپ تشریف لائے۔ بہت سے کارکن استقبال کے لیے کھڑے تھے۔ میں بھی انہی میں شامل استقبالیہ ٹیم کا حصہ تھا۔ آپ کی تشریف آوری پر دوسروں کے ساتھ میں بھی آپ سے ملا۔ مصافحہ کیا، حال احوال پوچھا تو میرا ہاتھ پکڑ کر ایک طرف لے گئے اور فرمایا: "او سنگیا، جمعے وچ کی بیان کیتا ای؟ میں انہاں نوں صحاح ستہ توں علاوہ کنز العمال جہیاں حدیث دیاں کتاباں سنا دتیاں نیں"، کہ میں نے لوگوں کو اتنی احادیث مبارکہ سنا دی ہیں کہ اب ان کے سامنے سوچ سمجھ کر اور محتاط ہو کر بیان کرنا چاہیے۔ اصل میں ہوا یوں کہ کفار مکہ کی ایذا رسانیوں کو بیان کرتے ہوئے میں نے دو واقعے بیان کیے۔ ایک یہ

کہ محسن کائنات صلی اللہ علیہ وسلم حرم میں نماز پڑھ رہے تھے اور سر سجدہ میں تھا کہ کفار مکہ نے سر پر اوجھڑی لا کر رکھ دی اور دوسرا واقعہ یہ کہ آپ حرم میں نماز پڑھ رہے تھے کہ آپ کی گردن میں کپڑا ڈال کر کھینچا گیا۔ پہلے واقعہ میں حضرت فاطمہ نے آ کر اوجھڑی کو اٹھایا تھا، جبکہ دوسرے واقعہ میں حضرت ابوبکر صدیق نے آ کر چھڑوایا اور فرمایا کہ کیا تم اس آدمی کو قتل کرنا چاہتے ہو جو کہتا ہے کہ رب میرا اللہ ہے۔ میں نے جمعے کے خطاب میں اس کے برعکس بیان کر دیا تھا۔ حضرت الشیخ نے فرمایا: یہاں کے لوگ میرے مقتدی اتنے سے فرق کو بھی سمجھتے اور نوٹ کرتے ہیں۔

ہم اپنے اساتذہ سے سنتے آئے ہیں کہ حضرت مدنی نور اللہ مرقدہ کا دستر خوان بڑا وسیع تھا۔ ہمارے حضرت بھی اپنے استاذ محترم کی طرح بہت مہمان نواز تھے۔ آنے والوں سے بڑی خوشی اور خندہ پیشانی کے ساتھ مسکرا مسکرا کر ملتے، حال احوال پوچھتے، چائے پانی پیش کرتے، اور اگر کھانے کا وقت ہوتا تو کھانا کھائے بغیر نہ جانے دیتے۔ اس میں اپنے بیگانے کی کوئی تمیز نہ تھی، سب کے لیے آپ کی سخاوت یکساں تھی۔ جب تک صحت تھی، مہمان کے لیے خود چائے لاتے، پانی پلاتے، اور کھانا اٹھا کر لاتے۔ مہمانوں کی خدمت کرتے ہوئے پیشانی مبارک پر کبھی شکن نہ آتی۔ اپنے انداز اور اخلاق سے آنے والے کا دل موہ لیتے اور وہ سمجھتا کہ آپ مجھ سے سب سے زیادہ محبت کرتے ہیں۔

کسی کی غیبت نہ سنتے۔ طبیعت میں عاجزی وانکساری تھی۔ ہر ایک کی خیر خواہی اور بہتری چاہتے۔ ایک روز مدرسہ نصرۃ العلوم میں اسباق سے فراغت کے بعد دفتر کے سامنے چار پائی پر بیٹھے تھے کہ اچانک خاکروب پر نظر پڑی جو نیچے زمین پر بیٹھا ہوا تھا۔ فرمایا، اسے اٹھا کر اوپر بٹھاؤ۔ حاضرین نے عرض کی کہ خاکروب ہے اور عیسائی ہے۔ حضرت نے فرمایا، انسان تو ہے، چنانچہ اسے اٹھا کر چار پائی پر بٹھایا گیا۔ مولانا شفیق الرحمٰن بہاولپوری نے ڈبڈباتی آنکھوں سے یہ واقعہ مولانا عبید اللہ عامر کو سناتے ہوئے کہا کہ ہمارے اکابر سید عطاء اللہ شاہ بخاری اور سید حسین احمد مدنی کی یاد تازہ ہوگئی ہے۔

حضرت الشیخ خشک طبیعت اور سخت مزاج نہ تھے بلکہ باغ و بہار شخصیت تھے۔ مزاح اور دل لگی میں بے تکلفی کے ساتھ ایسی بات ارشاد فرماتے کہ پوری محفل کشت زعفران بن جاتی۔ علالت کے دنوں میں جب حضرت صاحب فراش تھے اور چلنا پھرنا ممکن نہ تھا، انہی دنوں میں آپ مولانا حافظ عبدالقدوس قارن کی رہائش گاہ واقع مدرسہ نصرۃ العلوم میں تشریف لائے۔ میں بھی اپنے بیٹوں حافظ عمر فاروق، حافظ محمد ابوبکر اور حافظ علی زبیر سمیت حاضر ہوا۔ اس وقت حضرت بڑے خوشگوار موڈ میں تھے۔ کچھ روز قبل فالج کا حملہ ہوا تھا، لیکن کنٹرول ہو گیا تھا۔ ہاتھ کو حرکت دینے کے لیے آلہ ورزش دیا گیا تھا تاکہ ہاتھ ہلتا رہے اور ورزش ہوتی رہے۔ یہ بھی علاج کا ایک حصہ تھا۔ حاضرین مجلس میں سے کسی نے پوچھا کہ حضرت یہ کیا ہے؟ تو فرمایا: ''کھلونا دے کے بہلایا گیا ہوں'' جس سے سب حاضرین بہت محظوظ ہوئے۔

صاحبزادہ مولانا حماد الزہراوی کے حکم پر ۲۲ مئی کا جمعہ مجھے گکھڑ میں حضرت شیخ کی مسجد میں پڑھانے کا موقع ملا۔ گکھڑ اور گردونواح میں اس مسجد کو بوہڑ والی مسجد کہا جاتا تھا، مگر اب اس کا تعارف ''مولانا محمد سرفراز خان صفدرؒ والی مسجد'' ہے۔ منبر کے بالکل سامنے دوسری صف میں ایک صحت مند بزرگ سفید گھنی لمبی ڈاڑھی چہرے پر سجائے بیٹھے تھے۔ پوچھنے پر پتہ چلا کہ نت کلاں کے رہنے والے ہیں۔ (نت کلاں روڈ کا نام اب حضرت کے نام مبارک پر ''مولانا محمد سرفراز خان صفدر روڈ'' رکھ دیا گیا ہے۔ اسی روڈ پر وہ قبرستان ہے جس میں حضرت مدفون ہیں۔ گیٹ کے سامنے آپ کی قبر مبارک ہے اور جس طرح زندگی میں

آپ کا گھر جی ٹی روڈ کے قریب ہونے کی وجہ سے ہر آنے والے کے لیے دروازہ کھلا رہتا تھا، اسی طرح اب آپ کی قبر کی زیارت کرنے میں بھی کوئی دقت نہیں ہوتی۔) جب بھی حضرت کا نام آتا، اس بوڑھے کی کیفیت دیدنی ہوتی۔ تقریر ختم ہوتے ہی خطبہ جمعہ سے قبل بھیگی آنکھوں سے کھڑا ہو کر مجھ سے ملا۔ اس کی نگاہیں اور اس کے آنسو الفاظ کے بغیر بہت کچھ کہہ گئے۔ نماز سے فراغت کے بعد اس نے ایک جملہ کہا جو سادہ سا جملہ تھا لیکن اس میں معانی کا سمندر تھا۔ اس نے کہا کہ ''جتھے وی گئے آں، جیدے کولوں وی حدیثاں قرآن دیاں گلاں سن دے ہاں، انج لگدا اے اساں سنیاں ہوئیاں نیں''، یعنی جب بھی کسی بزرگ شیخ سے ہم قرآن وحدیث کی باتیں سنتے ہیں تو یوں لگتا ہے کہ یہ تو ہم نے پہلے ہی سے سن رکھی ہیں، یعنی حضرت مرحوم نے ہمیں سبھی کچھ سنا دیا ہے۔ یہی کیفیت ہے آج آپ کے شاگردوں، فیض یافتگان اور آپ کے قریب رہنے والوں کی کہ جہاں بھی جا کر عقیدہ، دین، اسلام، حدیث اور قرآن کی باتیں سنتے ہیں، یوں لگتا ہے کہ یہ تو ہم کو حضرت نے بتایا تھا، سنایا تھا۔

سب سے اہم سبق جو ہم نے آپ سے سیکھا، وہ اپنے اکابر پر اعتماد ہے کیونکہ سب سے بڑا فتنہ آج کے دور میں اپنے آپ کو عقل کل سمجھنا اور اکابر، اپنے بزرگوں پر عدم اعتماد ہے۔ حضرت اس معاملہ میں بہت محتاط تھے۔ آخری دنوں میں ایک دفعہ ارشاد فرمایا کہ آج تک میں نے اپنی رائے سے کبھی فتویٰ نہیں دیا۔ جو کچھ بتایا، کہا یا لکھا، ہمیشہ اپنے اکابر کی رائے کو ہی اپنایا، اسی کو ترجیح دی۔ یہی وجہ ہے کہ دار العلوم دیوبند سے لے کر جامعہ خیر المدارس، جامعہ بنوریہ، دار العلوم حقانیہ کے اکابر بلکہ اہل السنت والجماعت علمائے دیوبند کے تمام حلقے آپ پر مکمل اعتماد کرتے ہیں۔ گویا آپ اہل حق کی معتمد علیہ شخصیت تھے۔ کراچی کے اہل علم علما واکابرین کا آپ کو ''امام اہل سنت'' کا لقب دینا آپ پر مکمل اعتماد کا بین ثبوت ہے۔ آپ کے ساتھ تعلق، نسبت اور آپ کی محبت اور آپ کا نہج اہل سنت ہونے کی دلیل اور علامت ہے۔

حضرت امام اہل سنتؒ ایک جامع شخصیت کے حامل تھے۔ ہمہ جہت خوبیوں کے مرقع اور غیر معمولی خصوصیات کا مجموعہ تھے۔ قدرت نے آپ کو ایک ایسا گلدستہ بنا دیا جس میں ہر قسم کے پھول کی خوشبو مہکتی تھی۔ تدریس، خطابت، وعظ، تصنیف، خوش اخلاق، ملنساری، جود وسخا، عاجزی، معاملات کی صفائی، دل جوئی، مہمان نوازی، حق گوئی، اکابر واسلاف سے سچی عقیدت، محبت رسول کی خوشبو اور سنت رسول کے رنگ میں ایسے رنگے ہوئے تھے کہ ہر ہر ادا اور قول وفعل سے سنت کی جھلک نمایاں تھی۔ جس نے اللہ اور رسول اور ان کے سچے دین سے اپنا رشتہ جوڑ لیا، اس کا نام ہمیشہ روشن رہتا ہے۔

آتی ہی رہے گی تیرے انفاس کی خوشبو
گلشن تیری یادوں کا مہکتا ہی رہے گا

• حضرت شیخ الحدیثؒ کسی بھی مسئلے میں علمی وفقہی حدود سے تجاوز کو پسند نہیں کرتے تھے۔ ایک مرتبہ مولانا حبیب اللہ ڈیروی مرحوم نے ایک مجلس میں حضرت مولانا مفتی مہدی حسنؒ کے فتوے کا حوالہ دیتے ہوئے کہا کہ جو شخص قبر میں حیات الانبیاء علیہم السلام کا قائل نہیں ہے، اس کے پیچھے نماز مکروہ تحریمی ہے۔ حضرت بھی مجلس میں موجود تھے۔ آپ نے فوراً انھیں ٹوکا اور فرمایا کہ یہ آپ نے ''تحریمی'' کا لفظ کہاں سے ساتھ لگا لیا ہے؟

(روایت: مولانا مفتی محمد عیسیٰ خان گورمانی)

مولانا محمد نواز بلوچ*

امام اہل سنت رحمۃ اللہ علیہ ـــــ چند یادیں

میں نے ۱۹۷۹ء میں مدرسہ نصرت العلوم میں درجہ موقوف علیہ میں داخلہ لیا۔ داخلے کے کچھ دنوں بعد میں نے امام اہل سنت سے بیعت کا تعلق قائم کرلیا اور پڑھائی کے اوقات کے علاوہ توجہ حاصل کرنے کے لیے میں گکھڑ جا کر بھی ان سے ملتا رہتا تھا۔ حضرت صوفی صاحبؒ جلالی مزاج کے بزرگ تھے۔ ان کو ملتے ہوئے ڈر لگتا تھا۔ ایک دفعہ میں مٹھائی کا ایک ڈبہ بطورِ ہدیہ لے کر گیا تو حضرت نے لینے سے انکار کردیا اور فرمایا کہ مجھے انقباض ہو جاتا ہے۔ کافی منت اور اصرار کے بعد حضرت نے وہ ہدیہ قبول کیا۔ لیکن حضرت شیخؒ جمالی مزاج کے مالک تھے۔ ملتے ہی آدمی کو ٹھنڈک محسوس ہوتی تھی۔ اس انداز سے ملتے تھے کہ اجنبی بھی یہ محسوس کرتا تھا کہ جیسے حضرت میرے پرانے واقف کار ہیں۔ میں تو شاگرد بھی تھا اور مرید بھی۔ میں نے بیعت بھی گکھڑ جا کر کی تھی۔ حضرت امام اہل سنتؒ نے بیعت لینے کے بعد فرمایا کہ تیرا وظیفہ یہ ہے کہ توحید وسنت کو بیان کرنا اور شرک وبدعت کی تردید کرنا، اور یہ بھی فرمایا کہ جب میں حضرت مولانا حسین علی صاحبؒ سے بیعت ہوا تھا تو انہوں نے مجھے یہی وظیفہ بتایا تھا اور یہ بھی فرمایا تھا کہ علم بڑھانا ہے تو کسی نہ کسی باطل فرقے کے خلاف کام جاری رکھنا۔ فرمایا کہ یہ بات مجھے قاضی نور احمد صاحبؒ نے فرمائی تھی۔ اس کے بعد میں وقتاً فوقتاً توجہ حاصل کرنے کے لیے گکھڑ جاتا رہتا تھا۔ جوں جوں وقت گزرتا گیا، محبت اور تعلق بڑھتا گیا۔ حج سے واپسی پر آپ نے مجھے سفید رنگ کا ایک دھاری دار رومال دیا اور فرمایا کہ صرف دو رومال لایا تھا، ایک صوفی کو دیا ہے اور ایک تجھے دے رہا ہوں۔

حضرت امام اہل سنتؒ پہلے سرکلر روڈ والے راستے سے مدرسہ نصرۃ العلوم آتے جاتے تھے، مگر جب جناح روڈ بن گیا تو واپسی اس راستے سے ہوتی تھی۔ کبھی کبھی میری مسجد کے دروازے پر گاڑی رکوا لیتے۔ مجھے پتہ چلتا تو میں ننگے پاؤں دوڑتا ہوا آتا۔ حضرتؒ حال احوال پوچھ کر دعائیں دیتے ہوئے تشریف لے جاتے۔ میرا بڑا بچہ جس کا نام میں حضرت امام اہل سنتؒ کے نام پر محمد سرفراز خان رکھا تھا، ڈیڑھ سال کی عمر میں وفات پا گیا۔ جب چوتھے دن میں گاؤں سے واپس آیا تو حسب سابق حضرت امام اہل سنتؒ کی گاڑی رکی۔ ہم سب دوڑتے ہوئے باہر آگئے، لیکن حضرت امام اہل سنتؒ مسجد کے اندر تشریف لائے۔ ہم نے مسجد کے ساتھ والے کمرے میں بٹھایا۔ سب سے پہلے انہوں نے مجھ سے تعزیت کی اور ہاتھ اٹھا کر دعا کی۔ اس سے پہلے میرا خیال یہ تھا کہ تعزیت کے موقع پر ہاتھ اٹھا کر دعا کرنا صحیح نہیں ہے۔ میں نے سوال کیا کہ حضرت! کیا ہاتھ اٹھا کر دعا کرنا صحیح ہے؟ تو فرمایا کہ حضرت شاہ محمد اسحٰق دہلویؒ نے چالیس مسائل میں لکھا ہے کہ ہاتھ اٹھا کر دعا کرنا جائز ہے۔

حضرت امام اہل سنتؒ مسائل میں اپنے بزرگوں پر کلی طور پر اعتماد کرتے تھے اور اپنے شاگردوں اور متعلقین کو بھی یہی سبق

* مہتمم مدرسہ ریحان المدارس گوجرانوالہ۔

دیتے تھے کہ اپنے بزرگوں کا دامن نہ چھوڑنا۔ ایک دن راقم اور حضرت کے طبیب خاص ڈاکٹر فضل الرحمٰن صاحب اور خادم خاص لقمان اللہ میر صاحب ان کے پاس بیٹھے ہوئے تھے کہ حضرت کا پوتا عمار خان ناصر آگیا جس کے متعلق حضرت امام اہل سنت کو پہلے کچھ شکایتیں پہنچ چکی تھیں کہ وہ بے راہ روی اختیار کرتا جا رہا ہے اور اپنے بزرگوں کے خلاف لب کشائی کرتا ہے۔ حضرت امام اہل سنتؒ نے اس کو سمجھایا اور فرمایا کہ اپنے اکابر کے خلاف کبھی بات نہ کرنا، اگرچہ ان میں غلطی بھی ہو۔ ان کی نیکیوں کی بوریاں بھری ہوئی ہیں، اگر ان میں ایک چٹکی مٹی کی پڑ بھی گئی تو کیا فرق پڑتا ہے۔ یہ ۱۹/اپریل ۲۰۰۲ء کی بات ہے۔

۱۹۹۵ء کی بات ہے۔ میں اپنی گاڑی کی مرامت کے لیے لاری اڈے پر ایک مکینک کے پاس گیا۔ مدرسہ ریحان المدارس کے جلسہ دستار فضیلت کے اشتہار بھی میرے پاس تھے۔ مکینک غیر مقلد تھا۔ اشتہار پڑھ کر کہنے لگا کہ دستارِ فضیلت باندھنے کا تمہارے پاس کیا ثبوت ہے؟ میں نے کہا کہ اس کی دلیل تو میرے علم میں نہیں ہے، لیکن میں اتنی بات یقین کے ساتھ کہتا ہوں کہ ہمارے بزرگ کوئی کام بغیر ثبوت کے نہیں کرتے۔ میں تجھے اس کی دلیل لا کر دوں گا۔ جب گاڑی کا کام ہو گیا تو میں نے گاڑی کا رخ سیدھا گکھڑ کی طرف کیا۔ اپنے شیخ ومرشد سے ملاقات کی اور دستارِ فضیلت کے متعلق ثبوت دریافت کیا۔ حضرت نے فرمایا کہ مستدرک حاکم جلد نمبر ۴ لاؤ۔ اس کے شروع میں میرا نوٹ ہوگا، وہ پڑھ کر صفحہ نکالو۔ میں نے صفحہ نمبر ۵۴۰ نکالا۔ فرمایا فلاں سطر والی حدیث جس پر میں نے نشان لگایا ہے، پڑھو۔ وہ حدیث میں نے پڑھ کر سنائی اور نوٹ بھی کی جس کا خلاصہ یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عبد الرحمٰن بن عوفؓ کو ایک مہم پر روانہ کرتے ہوئے ان کے سر پر پگڑی باندھی۔ میں گکھڑ سے شاداں وفرحاں واپس اسی مکینک کے پاس پہنچا اور باحوالہ اسے یہ روایت سنائی تو اس نے تسلیم کرلیا اور کہا کہ آئندہ میں یہ اعتراض نہیں کروں گا۔

حضرت شیخ تعبیر الرؤیا یعنی خوابوں کی تعبیر کے بھی شیخ تھے۔ ایک دفعہ چودھری محمد یعقوب صاحب (گلی لانگریاں والی) آئے اور کہا کہ میں نے خواب میں دیکھا ہے کہ میری والدہ کا کفن چھوٹا ہے، سر ڈھانپتے ہیں تو پاؤں ننگے ہو جاتے ہیں اور اگر پاؤں ڈھانپتے ہیں تو سر ننگا ہو جاتا ہے۔ حضرت نے فرمایا کہ تمہاری والدہ کی قبر کے ساتھ کوئی قبر کھودی گئی ہے جس سے تمہاری والدہ کی قبر چھوٹی ہو گئی ہے۔ بعد میں چودھری صاحب نے مجھے بتایا کہ حضرت نے جو تعبیر بتائی تھی، وہ بالکل درست تھی۔ میں نے قبرستان جا کر معلوم کیا تو واقعتاً پاؤں کی طرف ایک قبر کھودی گئی تھی اور میری والدہ کی قبر کا کچھ حصہ اس میں شامل ہو گیا تھا۔ ایک دفعہ ایک صاحب نے اپنا خواب سنایا کہ میں قبرستان میں گیا ہوں اور دیکھتا ہوں کہ میرے والد کا سر قبر سے باہر پڑا ہے اور منہ سے سورۂ الم نشرح کی آواز آرہی ہے۔ حضرت شیخ نے تعبیر بتائی کہ تیرے والد نے جائیداد صحیح تقسیم نہیں کی۔ تعبیر پوچھنے والے نے کہا کہ حضرت! باقی وراثت تو تقسیم کردی گئی ہے، البتہ میں نے والد صاحب سے پچاس ہزار روپے لیے تھے، وہ تقسیم نہیں کیے گئے۔ حضرت نے فرمایا کہ یہ بھی حصے کے مطابق سب میں تقسیم کرو۔

حضرت تقویٰ وطہارت کے پیکر تھے۔ ہم جب گکھڑ جاتے تھے تو ملک محمد یوسف صاحب حضرت کی رہائش والی گلی کے باہر اپنی دوکان پر بیٹھے ہوتے تھے۔ ہمیں دیکھ کر کھڑے ہو جاتے اور کہتے، ماشاء اللہ ماشاء اللہ، حضرت کے خادم آگئے ہیں۔ ایک دن مجھے کہنے لگے، میرے پاس بیٹھو، میں تمہیں حضرت کا ایک واقعہ سناؤں۔ ایک دن حضرت نے حقوق العباد کے موضوع پر درس دیا۔ میرے والد صاحب درس میں موجود تھے۔ حضرت جب اشراق سے فارغ ہو کر آئے تو میرے والد

صاحب نے انھیں روک لیا اور کہا کہ حضرت، میں نے آپ سے ایک بات کرنی ہے۔ حضرت نے فرمایا، کیجیے۔ والد صاحب نے کہا کہ حضرت آج آپ نے بہت اچھا درس دیا ہے، لیکن یہ بتایئے کہ صبح کے ناشتہ میں آپ تناول کرتے ہیں؟ حضرت نے فرمایا کہ پراٹھا، دو انڈے اور چائے۔ ملک صاحب نے کہا کہ حضرت، یہ بتایئے کہ کیا انڈے اپنی مرغیوں کے استعمال کرتے ہیں؟ حضرت نے فرمایا، ہاں۔ ملک صاحب کہنے لگے کہ آپ کی مرغیاں تو آ کر ہمارے دانے چگ جاتی ہیں (کیونکہ اس وقت غالباً ان کی گندم کی دوکان تھی)۔ حضرت نے فرمایا، اچھا! میں اس کا انتظام کرتا ہوں۔ آئندہ آپ کے دانے نہیں کھائیں گی۔ گھر جا کر حضرت نے اپنی ساری مرغیاں ذبح کر دیں۔ ملک صاحب نے کہا کہ یہ تھا حضرت کے تقویٰ کا عالم۔

ایک دفعہ ہم حضرت کو آب و ہوا کی تبدیلی کے لیے ایک ہفتے کے لیے مری لے گئے۔ قیام کے دوران حضرت نفلی عبادات معمول کے مطابق ادا کرتے تھے اور فرماتے تھے کہ ہمارے بزرگوں کا یہی معمول رہا ہے کہ سفر جاری ہوتا تو نفلی عبادات کو چھوڑ دیتے تھے اور اگر پڑاؤ ہوتا تو فرضوں میں رخصت پر عمل کرتے اور نفل اور سنتیں پوری پڑھتے۔ عصر کی نماز کے بعد تلاوت قرآن کا معمول تھا۔ فرمایا کہ حضرت آدم علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ نے عصر اور مغرب کے درمیان پیدا فرمایا تھا، لہٰذا یہ وقت اللہ تعالیٰ کے شکرانے کا ہے۔ مختلف مساجد میں کہیں ظہر کے بعد، کہیں مغرب کے بعد اور کہیں عشا کے بعد درس ہوئے۔ درس میں لوگوں کی کثیر تعداد شریک ہوتی اور لوگ بڑے شوق کے ساتھ سنتے۔ میں بھی سامنے بیٹھ کر سنتا تھا اور لوگوں کے تاثرات بھی معلوم کرتا۔ لوگ کہتے تھے کہ بابا بڑے سخت مسئلے بیان کرتا ہے۔ ان دنوں حضرت امام اہل سنتؒ ان مسائل پر بہت زور دیتے تھے کہ جس کے ناخن بڑھے ہوئے ہوں، اس کی نماز نہیں ہوتی کیونکہ ناخنوں کے نیچے میل جم جاتی ہے جس سے وضو نہیں ہوتا۔ عورتیں ناخن پالش نہ لگائیں کیونکہ ناخن پالش کے ہوتے ہوئے پانی ناخن تک نہیں پہنچتا جس سے وضو اور غسل نہیں ہوتا۔ پڑھی ہوئی نماز بھی ذمہ میں باقی رہتی ہیں۔ اگر کوئی خاتون ناخن پالش لگائے تو نماز کے وقت سے پہلے پہلے صاف کر لے۔ وضو کرتے وقت انگوٹھی اچھی طرح ہلائیں تاکہ نیچے پانی چلا جائے اور انگوٹھی والی جگہ خشک نہ رہے، ورنہ وضو نہیں ہوگا۔ عورتیں کوکے اور بالی کے سوراخ میں پانی پہنچائیں، ورنہ وضو اور غسل نہیں ہوگا۔ عورت اگر باریک دوپٹہ پہن کر نماز پڑھے جس سے سر کے بال نظر آتے ہوں تو نماز نہیں ہوگی، چاہے بند کمرے میں ہی کیوں نہ پڑھے، کیونکہ سر عورت کے ستر میں داخل ہے۔

حضرت امام اہل سنتؒ کی برکت سے میں بھی تہجد پڑھ لیتا تھا، ورنہ میں تہجد گزار نہیں ہوں۔ ایک دن میں نے تہجد کی نماز کے بعد دعا کی کہ اے پروردگار، مال وافر مقدار میں عطا فرما۔ حضرتؒ نے صبح کی نماز میں سورۂ بنی اسرائیل کے دوسرے رکوع کی تلاوت کی جس میں آتا ہے: ویدع الانسان بالشر دعاءہ بالخیر وکان الانسان عجولا۔ (اور مانگتا ہے انسان برائی کو جیسا کہ وہ مانگتا ہے بھلائی کو اور ہے انسان جلد باز) میں نے لقمان میر صاحب کو قصہ سنایا تو وہ بہت ہنسے۔ میں نے کہا کہ اللہ تعالیٰ نے میری اصلاح کے لیے حضرت کو یہ القا فرمایا ہے۔ واپسی سے دو دن پہلے میں نے اپنے جی میں فیصلہ کیا کہ پرسوں واپس جانا ہے، کل کو خوب خریداری کروں گا۔ صبح حضرت نے نماز پڑھائی تو سورہ بنی اسرائیل کا تیسرا رکوع تلاوت فرمایا جس میں ہے: ان المبذرین کانوا اخوان الشیاطین وکان الشیطن لربہ کفورا (بے شک بے جا خرچ کرنے والے شیطانوں کے بھائی ہیں اور شیطان اپنے رب کا ناشکرا ہے) میں نے اپنے ارادے سے فوراً توبہ کر لی۔

آزاد کشمیر کے سفر میں ایک جگہ ۱۴ اگست کو یوم آزادی کے سلسلے میں ایک تقریب تھی جس میں حضرت نے مختصر بیان فرمایا۔ ایک نوجوان نے کہا کہ حضرت! یہ بتائیں کہ علماے دیوبند نے پاکستان بننے کی مخالفت کیوں کی تھی؟ حضرت امام اہل سنتؒ نے خطبہ کے بعد فرمایا کہ جن علما نے حمایت کی تھی، وہ بھی ہمارے بزرگ تھے اور جنھوں نے مخالفت کی تھی، وہ بھی ہمارے بزرگ تھے۔ اصل بات یہ ہے کہ قائداعظم نے کہا تھا کہ پاکستان میں خلافت راشدہ کا قانون نافذ ہوگا۔ جن علما نے اس بات پر اعتماد کیا، انہوں نے ساتھ دیا اور جنھوں نے اعتماد نہیں کیا، انہوں نے مخالفت کی۔ میری اس بات کی تصدیق کے لیے آپ پاکستان بننے سے پہلے کے اخبارات کا مطالعہ کر سکتے ہیں اور یہ فیصلہ خود کر سکتے ہیں کہ جن علما نے اعتماد نہیں کیا تھا، ان کی سوچ صحیح تھی یا نہیں؟ اور آیا قائداعظم نے عہد کا ایفا کرتے ہوئے پاکستان میں خلافت راشدہ کا نظام نافذ کیا یا نہیں؟ اس کے بعد حضرتؒ نے خلافت راشدہ کے نظام پر مختصر روشنی ڈالی اور دعا فرمائی۔

ایک دفعہ سبق کے دوران حضرت شیخ رحمہ اللہ نے فرمایا کہ ایک دفعہ حج کے موقع پر مکہ مکرمہ کے علما کو میرے متعلق کسی نے بتایا تو وہ میرے پاس آ گئے۔ کافی دیر گفتگو ہوتی رہی۔ آخر میں ان حضرات نے مجھ سے تقاضا کیا کہ ہم یہ چاہتے ہیں کہ یہ منہ اور زبان جس سے اللہ تعالیٰ نے دین کا اتنا کام لیا ہے، اس کا لعاب ہمارے منہ میں ڈالیں، یعنی ہمارے منہ میں آپ تھوکیں۔ فرمایا، میں نے کہا کہ یہ بات تو ٹھیک نہیں ہے۔ آپ کو اللہ تعالیٰ نے عظمت عطا فرمائی ہے، لیکن انہوں نے مجھے تھوکنے پر مجبور کر دیا۔ چنانچہ حضرت شیخ رحمہ اللہ نے ہمیں مخاطب کرتے ہوئے فرمایا، مولوی صاحب! مجھے مجبوراً یہ کام بھی کرنا پڑا کہ میں نے اپنا لعاب ان کے منہ میں ڈالا جس طرح دوسرے کو دم کیا جاتا ہے۔

ایک دن بندہ راقم معمول کے مطابق حضرت کی تفسیر ''ذخیرۃ الجنان'' ترتیب دے رہا تھا کہ اچانک استاد زادہ مولانا احمد اللہ خان صاحب کا جدہ سے فون آیا کہ ابا جی (استاد محترم مولانا مفتی محمد عیسیٰ صاحب مدظلہ العالی) سے بات کرو۔ علیک سلیک کے بعد حضرت مفتی صاحب نے فرمایا کہ یہاں مقیم ہمارے ساتھیوں نے مقامی احباب کو میرا تعارف کرایا تو انہوں نے تقاضا کیا کہ ہمیں کچھ اسباق حدیث کے پڑھا دو۔ اس دوران میں نے حضرت شیخ رحمہ اللہ کا تعارف کرایا تو جدہ کے بڑے عالم شیخ احمد ہمدان اور ان کے ساتھیوں نے تقاضا کیا ہے کہ حضرت شیخ سے فون پر ہماری بات بھی کراؤ اور اجازت حدیث بھی دلواؤ! لہٰذا آپ گکھڑ جائیں اور حضرت سے ہماری بات کرائیں۔ میں اسی وقت میر صاحب اور ڈاکٹر صاحب کو لے کر گکھڑ پہنچ گیا اور حضرت شیخ کی استاد مفتی صاحب سے بات کرائی۔ پھر ان عرب علما نے بھی بات کی، حال احوال دریافت کیے تو حضرت رحمہ اللہ نے فرمایا کہ میں علیل ہوں۔ انہوں نے دعاؤں کی درخواست کے ساتھ اجازت حدیث طلب کی تو حضرت رحمہ اللہ نے مجھے فرمایا کہ آپ ان کو میری طرف سے کہہ دیں کہ ''اجازت ہے!''۔ میں نے ان کو بتایا کہ حضرت نے آپ کو اجازت دے دی ہے تو انہوں نے کہا کہ ہمیں حضرت خود اپنی آواز میں اجازت عنایت فرمائیں۔ میں نے حضرت رحمہ اللہ سے ان کا مطالبہ عرض کیا تو اشارہ سے فون قریب کرنے کا کہا۔ میں نے موبائل آپ کے کان سے لگا دیا تو آپ نے ان کو عربی میں فرمایا کہ ''میں آپ کو اجازت دیتا ہوں''۔

۲۰۰۱ میں حضرت پر فالج کا حملہ ہوا۔ میں نے لقمان اللہ میر صاحب سے کہا کہ میرے ایک بہت اچھے دوست ہیں، ڈاکٹر فضل الرحمن صاحب جو اپنے شعبے میں کافی مہارت رکھتے ہیں۔ حضرت کے علاج کے سلسلے میں ان کو ساتھ شامل کر لینا

بہتر ہوگا۔ چنانچہ ہم تینوں نے مل کر گکھڑ جانے کا معمول بنا لیا۔ اس کی صورت یہ ہوتی تھی کہ ہم عموماً شریف پورہ چوک، یا گوندلہ والا چوک یا لاری اڈا یا کسی اور جگہ اکٹھے ہو جاتے اور حضرت کے لیے کھانے پینے کی مختلف چیزیں ساتھ لے کر گکھڑ چلے جاتے۔ میرے ذمہ پرندوں کی یخنی ہوتی تھی۔ جس دن میں نہ جا سکتا، یخنی کسی ساتھی کے ذریعے پہنچا دیتا تھا۔ یخنی مختلف پرندوں مثلاً فاختہ، تیتر، بٹیر، تلیر، چڑے، پھاڑ، جل مرغی، جنگلی کبوتر، مرغابی وغیرہ کی بناتا تھا۔ حضرتؒ فاختہ کی یخنی شوق سے نوش فرماتے تھے، بلکہ کبھی خود فرما دیتے کہ گھوگھی کی یخنی لانی ہے۔ گرمیوں میں زیادہ تر مکس پھلوں کا تازہ جوس اور کبھی دودھ دیا جاتا، مگر خالی نہیں بلکہ اس میں ڈاکٹر صاحبان کے تجویز کردہ مختلف قسم کے طاقت کے پاؤڈر ملائے جاتے تھے۔ کبھی انڈا اور شہد مکس کر کے پلا دیتے تھے۔ مجھے زیادہ فکر یہی ہوتی تھی کہ یخنی والے پرندوں کی کمی نہ ہو۔ کبھی حضرت فرماتے کہ یخنی کی بجائے پرندے ہی گھر پہنچا دو، یہ خود تیار کر دیں گے، چنانچہ حکم کی تعمیل ہوتی تھی۔ خدمت کی ترتیب کچھ اس طرح ہوتی تھی کہ حضرت کے پاس پہنچ کر علیک سلیک کے بعد ڈاکٹر صاحب بلڈ پریشر چیک کرتے، میں یخنی ٹھنڈی کرتا یا دودھ اور انڈا مکس کرتا اور میر صاحب اپنے ہاتھ سے پلاتے اور جس دوائی کی ضرورت ہوتی، وہ استعمال کرا دی جاتی اور باقی دوائی کا استعمال اہل خانہ کو سمجھا کر ہم واپس آ جاتے۔ جب حضرت کی طبیعت معمول پر آ جاتی تو پھر میں ایک دن کا ناغہ کرتا تھا، لیکن میر صاحب ڈاکٹر صاحب کو لے کر روزانہ جاتے تھے۔ اگر ڈاکٹر صاحب مصروف ہوتے تو ڈاکٹر سہیل انجم بٹ صاحب کی خدمات حاصل کی جاتی تھیں۔

میر صاحب خدمت کے اس تسلسل کا توڑنا حرام سمجھتے تھے اور انھوں نے حضرت کے علاج کے سارے اخراجات اپنے ذمے لیے ہوئے تھے۔ میر صاحب نے فرمایا کہ دوائی کے لیے کسی سے کوئی پیسہ نہیں لینا، چاہے ایک روپے کی ہو یا ایک لاکھ کی۔ انہوں نے اس عہد کو آخر تک بڑی خندہ پیشانی کے ساتھ نبھایا۔ جب حضرت کو مثانے کے آپریشن کے لیے چوبرجی کے قریب ایک ہسپتال میں لے جایا گیا تو مولانا محمد حسن صاحب تشریف لائے جو حضرت کے بھی شاگرد ہیں اور میرے بھی شاگرد ہیں۔ مجھ سے کہنے لگے کہ استاد جی، اگر اجازت ہو تو آپریشن کا خرچہ میں دے دوں؟ میں نے کہا کہ یہ ذمہ داری چونکہ میر صاحب کی ہے، اس لیے ان سے پوچھ کر بتاتا ہوں۔ میر صاحب کے سامنے میں نے مولانا کی خواہش رکھی تو میر صاحب نے یہ کہہ کر انکار کر دیا کہ ساتھیوں کے علم میں ہے کہ یہ کام میں کر رہا ہوں، لہٰذا مولانا سے معذرت کر لیں۔ چنانچہ یہ سلسلہ اسی طرح چلتا رہا۔

۲۰۰۳ء میں حضرت پر فالج کا حملہ دوبارہ ہوا۔ طبیعت تو سنبھل گئی مگر حضرت نے کھانا بہت کم کر دیا۔ اس پر ساتھی کافی پریشان تھے۔ جب کبھی مفتی جمیل خان صاحب تشریف لاتے تو اصرار کر کے حضرت کو کھانا کھلا دیتے۔ ہم بھی کہتے رہتے کہ حضرت! کچھ نہ کچھ تو کھا لیا کریں۔ ایک دن استاذِ محترم مولانا مفتی محمد عیسیٰ خان صاحب تشریف لائے تو حضرت نے فرمایا کہ مفتی صاحب! یہ لوگ مجھے کھانے پر مجبور کرتے ہیں، حالانکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے: لا تکرھوا مرضاکم علی الطعام فان اللہ تبارك وتعالیٰ یطعمھم ویسقیھم (اپنے بیماروں کو کھانے پر مجبور مت کرو کیونکہ اللہ تبارک وتعالیٰ ان کو کھلاتا اور پلاتا ہے) اور فرمایا کہ مفتی صاحب، آپ نے یہ حدیث باحوالہ لکھ کر مجھے دینی ہے۔ چنانچہ حضرت مفتی صاحب نے یہ حدیث ترمذی شریف کے ابواب الطب کے حوالے سے لکھ کر مجھے دی اور میں نے وہ پرچی حضرت کو دے دی۔

فرمایا کہ اسے پڑھو۔ میں نے پڑھی تو فرمانے لگے کہ پھر تم مجھے زیادہ کھانے پر کیوں مجبور کرتے ہو؟ آخری پانچ چھ سال آپ زیادہ یخنی، مشروبات، چائے اور معمولی سا دلیہ کھا لیتے تھے۔

آنکھ کا آپریشن کرا کے جب آپ کو واپس لایا گیا اور نماز کا وقت ہوا تو فرمایا کہ صوفی صاحب کو فون کر کے پوچھو کہ میں تیمم کروں یا باقی اعضا کا غسل اور چہرے کا مسح؟ حضرت صوفی صاحبؒ نے فرمایا کہ تیمم کرنا ہے۔ پھر فرمایا کہ مفتی محمد عیسیٰ صاحب سے بھی پوچھو۔ ان سے پوچھا گیا تو انہوں نے بھی یہی جواب دیا۔ چنانچہ حضرت نے تیمم کیا اور نماز پڑھی۔ پھر فرمایا کہ مسئلے کا مجھے بھی علم تھا، لیکن میں چونکہ مبتلیٰ بہ تھا، اس لیے ان سے پوچھا تا کہ حجت تام ہو جائے۔ اللہ اللہ! کیا تقویٰ اور کیا احتیاط ہے، حالانکہ خود فقہ اور اصول فقہ کے امام ہیں۔

اجل کو لبیک کہنے سے آٹھ دن پہلے جو تھوڑا بہت ہنستے تھے، وہ بھی بند کر دیا جس سے بڑی پریشانی ہوئی۔ ڈاکٹر فضل الرحمن صاحب سفر پر تھے۔ ڈاکٹر سہیل انجم نے عرض کیا کہ حضرت، جسم میں خون بالکل نہیں ہے۔ یا تو کچھ کھائیں پئیں یا پھر خون کی بوتلیں لگانے کی اجازت دیں۔ بڑی منت سماجت کے بعد اجازت دی اور دو دن آپ کو خون کی بوتلیں لگائی گئیں۔ اس کے بعد تھوڑا بہت پینا شروع کر دیا، مگر نہ چاہتے ہوئے۔ تین دن پہلے ڈاکٹر صاحب نے پھر کہا کہ حضرت، بوتل لگانے کی اجازت دے دیں تو فرمایا کہ اب تم میرے ساتھ بکھیڑے کرنے چھوڑ دو، مجھے میرے حال پر چھوڑ دو۔ آخری دنوں میں حضرت پر کبھی کبھی استغراق کی کیفیت طاری ہو جاتی تھی اور وہ آسمان کی طرف رخ کر کے ٹکٹکی باندھ لیتے تھے۔ اس حالت میں کسی کے ساتھ گفتگو کرنا بھی پسند نہیں کرتے تھے، بلکہ اگر کوئی مخل ہونے کی کوشش کرتا تو اس کو تھپڑ بھی مار دیتے تھے۔ فرماتے تھے کہ مجھے نہ چھیڑو۔ جب اس کیفیت سے واپس آتے تو پھر خود ہمیں پکارتے اور باتیں کرتے۔ حضرت کی کیفیت سے میں سمجھ گیا تھا کہ اب آپ آخرت کی تیاری کر چکے ہیں۔ چنانچہ میں نے اپنے ساتھی مولانا ریاض انور گجراتی سے کہا کہ جاؤ اور حضرت کی زیارت کر لو، حضرت آخرت کی تیاری کر چکے ہیں۔

اس کے دو ہی دن بعد میرے شیخ نے اجل کو لبیک کہا اور ہمیں داغ مفارقت دے کر دار الفناء سے دار البقاء تشریف لے گئے۔ لیکن میرے شیخ کا فیض ایسا نہیں ہے کہ ان کے دنیا سے رخصت ہو جانے کے بعد ختم ہو جائے گا۔ ہرگز نہیں۔ میرے شیخ اہل حق کے عقائد ونظریات کے تحفظ اور فرق باطلہ کی سرکوبی کی شکل میں دین کی خدمت انجام دیتے رہے۔ حضرت کا یہ فیض قیامت تک جاری رہے گا، ان شاء اللہ تعالیٰ۔ دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ شیخ کے لواحقین، متعلقین، مریدین اور شاگردوں کو صبر عطا فرمائے اور حضرت کے مشن کو زندہ رکھنے کی توفیق مرحمت فرمائے۔

> میں نے آج تک نہ جن دیکھا ہے اور نہ جنوں کا عامل دیکھا ہے۔ ٹھگ بڑے سنے ہوئے ہیں کہ وہ ہے، وہ ہے، لیکن میں نے نہیں دیکھا۔ جنوں کا قائل ہوں اور یقین جانیں آپ سے زیادہ جنات یہاں موجود ہیں۔ وہ بھی پڑھتے سنتے ہیں، لیکن ہم سے براہ راست کبھی گفتگو نہیں کی۔ ہاں کبھی کبھار ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کپڑا کھینچ لیتے ہیں۔ دیکھتے ہیں تو پیچھے کچھ بھی نہیں ہوتا۔ بس اس کے علاوہ آج تک شکل نہیں دیکھی۔
>
> (دورۂ تفسیر، سورہ بقرہ، آیت ۲۷۵: یتخبطہ الشیطان من المس)

حاجی لقمان اللہ میر *

میرے مشفق اور مہربان مرشد

مخدوم العلماء، امام اہل سنت، قطب الاقطاب حضرت مولانا محمد سرفراز خان صفدر رحمہ اللہ ان یگانہ روزگار ہستیوں میں سے تھے جن کو اللہ تعالیٰ نے تمام اوصاف کے ساتھ متصف کیا ہوتا ہے اور جو ظاہر و باطن کی خوبیوں سے مالا مال ہوتے ہیں۔ حضرت بے مثال خطیب بھی تھے اور بے نظیر محدث بھی، بہترین ادیب اور مصنف بھی تھے اور تقویٰ وطہارت کے بادشاہ بھی، اعلیٰ پایے کے مدرس بھی تھے اور رہبر کامل بھی۔ انھوں نے ایک صدی کے لگ بھگ ایسی زندگی گزاری کہ اس کے کسی پہلو پر بدنمائی کا دھبہ نہیں ہے۔ تقریر فرماتے تو یوں لگتا تھا کہ علم کا سمندر موج زن ہے۔ تحقیق کے میدان میں ان کا کوئی ثانی نہیں تھا۔ ان کے انھی اوصاف کی وجہ سے میں ان کا معتقد تھا۔

میں کوئی عالم فاضل نہیں ہوں، بلکہ خالص کاروباری آدمی ہوں، اس لیے میں ان کے اوصاف کی صحیح معنی میں عکاسی بھی نہیں کرسکتا۔ میرے سسرال گکھڑ میں ہیں۔ میں وہاں جاتا تو حضرت کے درس میں بیٹھنے کا موقع ملتا۔ حضرت کے کردار کو دیکھ کر میں حضرت سے متاثر ہوا۔ جب کسی مسئلہ میں الجھن ہوتا تو دریافت کرنے کے لیے عام آدمی کی حیثیت سے حضرت کے پاس گکھڑ جاتا اور رہنمائی حاصل کرتا۔ پھر جس طرح فرماتے، اسی طرح کرتا۔

حضرت کے ساتھ قریبی تعلق کی ابتدا اس طرح ہوئی کہ حضرت کے بڑے صاحب زادے مولانا علامہ زاہد الراشدی کے ساتھ اسلام آباد جانے کا اتفاق ہوا تو میں نے مولانا نے کہا کہ میں حضرت سے بیعت ہونا چاہتا ہوں۔ چنانچہ واپسی پر علامہ صاحب مجھے گکھڑ حضرت کے گھر لے گئے اور مجھے بیٹھک میں بٹھا کر کہا کہ میں حضرت سے پوچھ کر آتا ہوں۔ پھر مجھے حضرت کے پاس لے گئے اور حضرت نے شفقت فرماتے ہوئے اسی وقت بیعت کرلیا۔ حضرت کی شفقت نے مجھے بہت زیادہ قریب کردیا۔ حضرت کے شاگرد اور مرید مولانا محمد نواز بلوچ صاحب سے بھی وہاں ملاقات ہوتی رہتی تھی۔

ایک دن حضرت نے فرمایا کہ مری میں اکابر کا اجتماع ہے، اس میں شرکت کے لیے جانا ہے۔ میں نے کہا کہ حضرت، اجازت ہو تو میں آپ کو اپنی گاڑی میں لے جاؤں۔ حضرت نے آمادگی کا اظہار فرمایا۔ میں نے کہا کہ حضرت، میں لمبے سفر پر گاڑی نہیں چلاسکتا۔ خصوصاً رات کو مجھے نیند آجاتی ہے، اس لیے بلوچ صاحب سے کہیں کہ وہ بھی ہمارے ساتھ چلیں اور گاڑی ڈرائیو کریں۔ حضرت کے کہنے پر وہ تیار ہوگئے اور ہم مشائخ کے اجتماع میں حاجی محمد شعیب صاحب کے گھر پہنچ گئے۔ یہ میرا حضرت کے ساتھ پہلا سفر تھا۔ پھر حضرت کے اتنا قریب ہوگیا کہ ایک آدھ سفر کے سوا تقریباً ہر سفر میں آپ کی خدمت کے لیے ساتھ ہوتا تھا۔ سفر کے دوران میں نے حضرت کو ہر وقت ذکر ہی کرتے دیکھا ہے۔ سفر کے دوران یا اقامت کی

* خادم خاص حضرت امام اہل سنتؒ۔

صورت میں بھی جب کوئی سوال کرتا تو حضرت بڑا مختصر اور جامع جواب دیتے تھے جس سے آدمی کی تشفی ہو جاتی تھی۔ صرف مقصد کی بات فرماتے۔ میں نے کبھی حضرت کی زبان سے فضول بات نہیں سنی۔ چترال اور گلگت کے سفر میں، میں کسی وجہ سے حضرت کے ساتھ نہ جاسکا، لیکن واپسی پر استقبال کے لیے گکھڑ پہنچ گیا۔ حضرت گاڑی سے اترے۔ میں نے سلام کیا تو فرمایا حاجی صاحب، اچھا کیا کہ تم سفر پر ساتھ نہیں گئے۔ یہ مفتی جمیل دیو ہے، اس نے ہمیں بہت مشکل راستوں پر پھرایا ہے۔ یہ جو کہتا ہے، کر گزرتا ہے۔

مجھے حضرت کے ساتھ تین عمرے اور ایک حج کرنے اور حضرت کی خدمت کرنے کی سعادت بھی نصیب ہوئی ہے۔ پہلا عمرہ اس طرح ہوا کہ جب حضرت پر فالج کا حملہ ہوا تو علاج کے دوران شہید ختم نبوت حضرت مولانا مفتی محمد جمیل خان صاحب تشریف لائے اور حضرت سے اصرار کیا کہ علاج کے لیے کراچی تشریف لے چلیں۔ حضرت نے آمادگی ظاہر فرمائی۔ حضرت کے ساتھ بندۂ گنہگار، مولانا محمد نواز بلوچ اور ڈاکٹر فضل الرحمٰن بھی کراچی گئے۔ ڈاکٹر صاحب تو حضرت کو پہنچا کر واپس آگئے، جبکہ میں اور بلوچ صاحب حضرت کی خدمت کے لیے وہیں رہے۔ ڈاکٹر حضرات حضرت کا علاج کرتے رہے اور علما وطلبہ اپنی علمی پیاس بجھاتے رہے۔ روزانہ عصر سے مغرب تک مفتی صاحب کے گھر پر علمی مجلس ہوتی جس میں علما اور طلبہ شریک ہوتے۔ اس دوران مفتی صاحب نے حضرت سے عمرہ کا وعدہ لے لیا۔ رمضان المبارک کا بابرکت مہینہ ہم نے حضرت کے ساتھ حرمین شریفین میں گزارا۔ اس سفر میں ہمارے ساتھ قاری سعید الرحمٰن صاحب (سابق صوبائی وزیر) بھی تھے۔ اس سفر میں ہم نے حضرت کی بہت سی کرامات کا مشاہدہ کیا جن کو احاطہ تحریر میں لانے کی میں طاقت نہیں رکھتا۔

عمرے کے ایک سفر میں جب ہم جدہ ایئرپورٹ پر پہنچے تو سامان کی چیکنگ پر اتنا وقت لگا کہ حضرت کے پاؤں سوج گئے کیونکہ حضرت وہیل چیئر پر پاؤں لٹکائے بیٹھے تھے۔ جب ہم وہاں سے فارغ ہونے کے بعد حضرت کے پاس پہنچے تو حضرت نے بہت عجیب انداز میں فرمایا، حاجی صاحب! دنیا کے حساب کتاب میں اتنی پریشانی اور دقت ہوتی ہے تو آخرت کے حساب کتاب کا کیا بنے گا۔ میں نے خوش طبعی کے طور پر کہا کہ حضرت، یہاں جو واقفیت رکھتا ہو، وہ جلدی فارغ ہو جاتا ہے۔ لہٰذا آخرت میں بھی آپ کی وجہ سے نہایت آسانی ہوگی۔ حضرت یہ بات سن کر خاموش ہوگئے۔

حضرت کی دیانت داری ضرب المثل ہے۔ ایک دفعہ میں نے حضرت سے گزارش کی کہ آپ مجھے اپنی کتابوں کا مکمل سیٹ عنایت فرمائیں اور ان پر کچھ تحریر بھی فرمادیں تاکہ یادگار رہے۔ حضرت نے مجھے کتابیں عنایت فرمائیں، مگر کچھ کتابیں کم تھیں۔ میں نے سیٹ مکمل کرنے کے لیے وہ کتابیں بازار سے خریدیں اور حضرت کے پاس لے گیا۔ عرض کیا کہ ان پر بھی کچھ لکھ دیں تو حضرت نے ان پر ہدیہ نہیں لکھا، بلکہ تحریر کیا کہ یہ کتابیں میر لقمان صاحب کی ملکیت ہیں اور لکھا میں نے ہے۔ اللہ اللہ! کتنی احتیاط ہے۔

میری اہلیہ گکھڑ کی رہنے والی ہے۔ اس نے خواب میں دیکھا کہ وہ حضرت کے گھر گئی ہے۔ جب دروازے پر پہنچی تو حضرت پھلوں کے چھلکے ہاتھ میں پکڑے انھیں پھینکنے کے لیے باہر تشریف لا رہے ہیں۔ میری اہلیہ نے کہا کہ مولوی صاحب، یہ چھلکے مجھے دے دیں۔ (حضرت کو گکھڑ والے مولوی صاحب کہتے تھے)۔ میں نے اہلیہ کا یہ خواب حضرت کو سنایا اور تعبیر پوچھی تو حضرت نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے جو علم ہمیں دیا ہے، اس میں سے آپ کو بھی حصہ ملے گا۔ اس کے کچھ عرصہ بعد

میرے دل میں خیال پیدا ہوا کہ حضرت کی کوئی تفسیر ہونی چاہیے۔ اس کا تذکرہ میں نے بلوچ صاحب سے کیا تو مولانا محمد نواز بلوچ نے اس خیال کو سراہتے ہوئے کہا کہ حضرت، جو درس جامع مسجد بوہڑ والی میں دیتے تھے، اس کا سراغ لگاتے ہیں کہ آیا کسی نے اس کی ریکارڈنگ کی ہے یا نہیں۔ اگر کی ہے تو اس کو نقل کر کے شائع کرنا چاہیے۔ اس طرح حضرت کی تفسیر معرض وجود میں آ سکتی ہے۔ معلوم کرنے پر پتہ چلا کہ اس کا پورا ریکارڈ محمد سرور منہاس صاحب کے پاس موجود ہے۔ ہم ان کے پاس گئے تو انھوں نے کہا کہ حضرت صاحب کی اجازت بغیر نہیں دے سکتا۔ منہاس صاحب کو ہم حضرت کے پاس لے گئے۔ حضرت نے فرمایا کہ کیسٹیں ان کے حوالے کر دیں، میں نے ان کو اجازت دی ہے۔

جب پہلی جلد چھپی تو کچھ لوگوں نے شکوک وشبہات پیدا کیے کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ حضرت کے بعد کوئی استحقاق کا دعویٰ کر دے، لہٰذا حضرت سے کچھ لکھوا لو۔ اس بات کا تذکرہ بلوچ صاحب نے حضرت شیخ صاحب سے کیا تو حضرت نے فرمایا کہ یہ کس طرح ہو سکتا ہے کہ روپے لقمان اللہ میر خرچ کرے اور مستحق کوئی اور بن جائے۔ میں نے کہا کہ حضرت، میں تو یہ کام اللہ کی رضا کے لیے کر رہا ہوں، لیکن حضرت نے ایک کاغذ منگوا کر تفسیر کے حقوق میرے نام لکھ دیے۔ تفسیر کا نام بھی حضرت نے خود تجویز فرمایا اور اس کی جلد کے لیے کپڑے کا رنگ بھی حضرت نے خود پسند فرمایا۔ وہ یوں کہ کراچی کے سفر کے دوران اقرا روضۃ الاطفال کی ایک لائبریری میں بیٹھے تھے کہ مختلف کتابیں حضرت کے سامنے پیش کی گئیں تو حضرت نے یہ رنگ پسند فرمایا۔ الحمد للہ اب تک سورۃ التوبہ تک آٹھ جلدیں چھپ چکی ہیں جبکہ نویں جلد، جس میں سورہ یونس اور سورہ ہود ہے، صفحہ قرطاس پر منتقل ہو چکی ہے۔

حضرت خواب کی تعبیر کے امام تھے۔ ایک دفعہ مری کے سفر میں، میں نے خواب میں حضرت کو پریشان بیٹھے دیکھا۔ فجر کی نماز کے بعد میں نے آپ کو خواب سنایا تو فرمایا کہ میرے گھر فون کر کے حالات معلوم کرو۔ معلوم کیا تو خیر خیریت تھی، لیکن دو دن کے بعد حضرت کے صاحب زادے قاری ماجد صاحب وفات پا گئے۔

حضرت کی مہمان نوازی مشہور ہے۔ کھانے کے وقت کوئی مہمان آیا ہو اور کھانا کھائے بغیر چلا گیا ہو، یہ ناممکن تھا۔ ایک دفعہ میں حضرت شیخ کے پاس گیا تو حضرت مکئی کی روٹی ساگ کے ساتھ کھا رہے تھے۔ مجھے بھی ساتھ بٹھا کر فرمایا کہ حاجی صاحب، آیئے، آپ بھی کھائیں۔ یہ مکئی گاؤں سے آئی ہے۔ یقین جانیے اس کا ایسا مزہ تھا کہ آج بھی محسوس ہوتا ہے۔ میں نے حضرت کے ساتھ جتنے بھی سفر کیے ہیں، ان سے واپسی پر حضرت بذریعہ فون کھانے کے لیے حاضر ہونے کا حکم دیتے۔ جب ہم پہنچتے تو کھانا تیار ہوتا۔ حضرت کھانا کھلاتے، پھر شکریہ ادا فرماتے اور رخصت کرتے۔

حضرت کے اصل معالج تو ڈاکٹر فضل الرحمٰن صاحب تھے جو روزانہ حضرت کی خبر گیری کے لیے گکھڑ جاتے تھے، لیکن کسی دن اگر مجبوری کی وجہ سے نہ جا سکتے تو ڈاکٹر سہیل انجم بٹ صاحب یہ خدمت سرانجام دیتے۔ بعض اوقات ڈاکٹر صاحب روانہ ہوتے وقت یہ خواہش ظاہر کرتے کہ آج حضرت ہمیں کھانا کھلا دیں۔ جب وہاں پہنچتے تو حضرت فرماتے کہ ڈاکٹر صاحب، کھانا کھائے بغیر نہیں جانا، حالانکہ ہم نے زبان سے کبھی اپنی خواہش کا اظہار نہیں کیا۔

حضرت چونکہ میرے ساتھ بہت محبت رکھتے تھے، اس لیے ادب کے ساتھ کبھی کبھی بے تکلفی کی بات بھی کر لیتا تھا۔ ایک دن میں نے کہا کہ حضرت، شعرا میں سے آپ کس شاعر کو پسند کرتے ہیں؟ فرمایا کہ اقبال اور غالب۔ میرا مقصد مذہبی شعرا

کے بارے میں معلوم کرنا تھا۔ میں نے کہا کہ حضرت مذہبی شعرا میں سے؟ تو فرمایا کہ امین گیلانی اچھا شاعر تھا۔ سرائیکی میں کتر صاحب کا کلام پسند فرماتے تھے۔ ایک دن میں نے کہا کہ حضرت، زندگی کے اچھے اور پیارے دن کون سے گزرے ہیں؟ تو فرمایا کہ حج اور عمرہ کے دن۔

حضرت میں مداہنت بالکل نہیں تھی اور حق گوئی میں کسی کی پروا نہیں کرتے تھے۔ ایک دن ہم حضرت کے پاس بیٹھے ہوئے تھے کہ کچھ تبلیغی ساتھی آ گئے۔ کچھ ساتھیوں نے کہا کہ یہ ہر طرح کے بدعقیدہ لوگوں کے پیچھے نماز پڑھ لیتے ہیں۔ انھوں نے کہا کہ ہم ایسا جوڑ کے لیے کرتے ہیں تاکہ وہ اس طریقے سے ہدایت پر آ جائیں۔ حضرت نے فرمایا کہ تمہارا کام تبلیغ کرنا ہے، ہدایت دینا نہیں۔ ہدایت دینا اللہ کے پاس ہے۔ یہ اختیار اللہ تعالیٰ نے کسی کو نہیں دیا کہ اس کے لیے آپ غلط کام کریں۔

حضرت کے علمی مقام کو تو دوست دشمن سب ہی تسلیم کرتے ہیں۔ بڑے بڑے علما حضرت کے سامنے دوزانو ہو کر بیٹھتے تھے۔ کراچی میں علاج کے دوران حضرت دار العلوم کراچی تشریف لے گئے تو مولانا محمد تقی عثمانی صاحب نے تمام علما وطلبہ کو ایک جگہ، غالباً مسجد میں جمع کیا اور حضرت سے کچھ وعظ اور اجازت حدیث کی درخواست کی۔ حضرت نے فرمایا کہ کوئی طالب علم حدیث شریف پڑھے تو مولانا تقی عثمانی صاحب نے خود حدیث کی کتاب لی اور حدیث پڑھنی شروع کر دی اور مجلس میں یہ بھی فرمایا کہ حضرت، آپ میرے دادا استاد ہیں۔ حضرت اکابر کا کتنا احترام فرماتے تھے، اس کا اندازہ اس سے لگائیں کہ دار العلوم کے دفتر میں بیٹھے تھے تو مولانا تقی عثمانی صاحب نے فرمایا کہ حضرت، یہ ڈیسک جو پڑا ہے، اس پر والد محترم حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب لکھا کرتے تھے اور یہ ڈیسک حکیم الامت حضرت تھانویؒ کا تھا۔ حضرت نے احتراماً اور برکت حاصل کرنے کے لیے ہاتھ بڑھا کر ڈیسک کو چھوا۔

حضرت کو میرے ساتھ کتنی محبت تھی، اس کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ ایک مرتبہ میری بیٹی کو تکلیف ہو گئی۔ حضرت سے دم کرایا تو وہ ٹھیک ہو گئی۔ اس کے بعد جب بھی ملتا، بچی کے بارے میں پوچھتے کہ اس کا کیا حال ہے؟ اپنے سب سے چھوٹے فرزند منہاج الحق راشد کی شادی کے موقع پر میرے گھر فون کیا اور فرمایا کہ حاجی صاحب کو بلاؤ، میں نے بات کرنی ہے۔ میں نے کہا کہ حضرت، میں خود بات کر رہا ہوں۔ مجھے حیرانی بھی ہوئی کہ اس سے پہلے حضرت نے کبھی فون نہیں کیا تھا۔ فرمایا کہ حاجی صاحب، راشد کی شادی ہے تو آپ جلدی اپنی گاڑی لے کر آ جائیں۔ میں تو خوشی سے کھل گیا کہ میری تمنا پوری ہو گئی۔ میں چاہتا تھا کہ حضرت شادی میں مجھے بلائیں۔ میں جلدی جلدی خوشی کے ساتھ گکھڑ روانہ ہوا۔ سوء اتفاق سے ابھی راہوالی پہنچا تھا کہ گاڑی کا کچھ اس انداز سے ایکسیڈنٹ ہو گیا کہ گاڑی کا بونٹ ہی اڑ گیا، لیکن بحمد اللہ مجھے خراش تک نہ آئی۔ پریشانی کی حالت میں حضرت کے پاس پہنچا۔ حضرت میری حالت دیکھ کر سمجھ گئے کہ کوئی پریشانی ہے۔ پوچھا تو میں نے حادثہ سے آگاہ کیا۔ چائے پلانے کے بعد فرمایا کہ آپ واپس چلے جائیں اور گاڑی کو ٹھیک کرائیں۔ شادی کے بعد ملاقات کے لیے حاضر ہوا اور شادی کا حال پوچھا تو حضرت نے فرمایا کہ بیٹے کی شادی کی خوشی تھی اور آپ کے نقصان کا غم بھی تھا۔ حضرت کی اس بات سے میرا سارا غم غلط ہو گیا۔

حضرت کا میرے ساتھ ایسا برتاؤ تھا کہ میں سمجھتا ہوں کہ مجھے اپنی اولاد سے بھی زیادہ عزیز سمجھتے تھے۔ میں نے بھی حضرت کی تکلیف اور دکھ کو اپنی تکلیف اور دکھ سمجھا اور حضرت نے جو فرمایا، اسی وقت کیا، کل پر نہیں ڈالا، چاہے گوجرانوالہ اور

گکھڑ کے کتنے ہی چکر لگانے پڑے۔ یہی وجہ ہے کہ باوجود معذوری کے، میرے بیٹوں حافظ عمر اور حافظ اسامہ کی دستار بندی کے لیے حضرت خود تشریف لائے۔ حضرت کو کئی مرتبہ برکت کے لیے اپنے کارخانہ بھی لے گیا۔ ایک دفعہ تانبا پگھلانے والی بھٹی کے پاس لے گیا تو حضرت جتنی دیر وہاں بیٹھے رہے، اللھم اجرنی من النار بار بار پڑھتے رہے۔ اور ہماری بدحالی کا یہ عالم ہے کہ ہم روزانہ بھٹی کے پاس بیٹھے ہوتے ہیں اور کبھی دوزخ یاد نہیں آئی۔ واقعی اللہ والے اللہ والے ہی ہوتے ہیں۔ ان کے ہر فعل میں آخرت نظر آتی ہے۔

حضرت مجھے اتنے پیارے انداز میں بلاتے تھے کہ میں دل میں شرمندہ ہو جاتا تھا۔ جب معذوری کی وجہ سے حضرت کھڑے ہو کر نماز نہیں پڑھا سکتے تھے تو جو بھی عالم اور حافظ موجود ہوتا، اس کو فرماتے کہ نماز پڑھاؤ۔ ایک دن اتفاقاً مجلس میں کوئی عالم اور حافظ نہیں تھا تو حضرت نے مجھے فرمایا کہ حاجی صاحب، نماز پڑھاؤ۔ میں تو پانی پانی ہو گیا کیونکہ اس سے پہلے میں نے کبھی نماز نہیں پڑھائی تھی۔ نماز کے بعد ڈاکٹر فضل الرحمٰن صاحب نے کہا کہ اب آپ مصلیٰ ہی سنبھال لیں کیونکہ حضرت نے آپ کو امام بنا دیا ہے۔ یہ سب حضرت کی محبت اور شفقت تھی، ورنہ میں اس قابل کہاں تھا کہ حضرت کو نماز پڑھاتا۔

ایک واقعہ جو میں خاص طور پر ذکر کرنا چاہتا ہوں، وہ بے حد قابل رشک اور سبق آموز ہے۔ حضرت شیخ نے جب مدرسہ نصرۃ العلوم میں تدریس سے معذرت کر لی تو مدرسہ کی انتظامیہ نے باہم مشورہ سے یہ طے کیا کہ حضرت کی خدمات کے پیش نظر حضرت کا وظیفہ جاری رہنا چاہیے اور حضرت سے گزارش کرنی چاہیے کہ وہ اس پیش کش کو قبول فرما لیں۔ چنانچہ ایک دن ڈاکٹر فضل الرحمٰن صاحب نے مجھ سے کہا کہ آج نصرۃ العلوم کی انتظامیہ کے صدر میاں محمد عارف ایڈووکیٹ صاحب نے بھی ہمارے ساتھ جانا ہے۔ ان کے حضرت کے پاس جانے کا مقصد میرے علم میں نہیں تھا۔ جب ہم پہنچے تو حضرت سے خیریت دریافت کرنے کے بعد میاں محمد عارف صاحب نے کہا کہ حضرت، آپ نے ایک عرصہ تک نصرۃ العلوم میں دین کی خدمت انجام دی ہے، لہٰذا ہم چاہتے ہیں کہ آپ کا وظیفہ برقرار رکھا جائے۔ حضرت نے اس بات کا کوئی جواب نہیں دیا۔ میاں صاحب نے دوبارہ بات کی تو حضرت نے فرمایا کہ میں اس بات کو پسند نہیں کرتا کہ لوگ کہیں کہ مولوی کام کے بغیر پیسے لیتے ہیں۔ میاں صاحب نے کہا کہ سرکاری ملازم بھی تو پنشن لیتے ہیں اور آپ نے تو دین کی خدمت کی ہے۔ حضرت نے غصے سے فرمایا کہ میں کوئی نئی مثال قائم نہیں کرنا چاہتا۔ میں نے ساری زندگی یہ سبق دیا ہے کہ رازق اللہ ہے اور اب تم سے پنشن لوں! ہرگز نہیں۔ میں کوئی ایسا کام نہیں کرنا چاہتا جسے لوگ اپنے لیے حجت بنا لیں۔ اکابر کی ایسی کوئی مثال میرے سامنے نہیں ہے۔

حضرت جیسے لوگ صدیوں بعد پیدا ہوتے ہیں۔ ان کا وجود مسعود ہمارے لیے ایک بڑی نعمت تھا جس سے ہم محروم ہو گئے ہیں۔ مجھے تیرہ چودہ سال حضرت کی خدمت میں رہنے کی سعادت حاصل رہی۔ بہت سی باتیں اور واقعات بھول چکا ہوں۔ جو تھوڑی بہت یاد تھیں، قارئین کی خدمت میں پیش کر دی ہیں۔ یہ بات بھی ذہن میں نہیں تھی کہ کسی وقت مجھے حضرت سے متعلق مضمون لکھنا پڑے گا، ورنہ موقع پر ہی ہر بات لکھ لیتا۔ حضرت کو دنیا سے رخصت ہوئے اتنے دن ہو گئے ہیں، مگر میری طبیعت ابھی تک سنبھل نہیں سکی۔ دماغ میں ایک قسم کی ہلچل سی ہے۔ حضرت کی یادیں تر و تازہ ہی ہیں اور جدائی کا صدمہ ہرا ہے۔ کوئی دن اور کوئی لمحہ ان کی یاد سے خالی نہیں ہے۔ حضرت کی محبت اور شفقت ہر وقت دل پر دستک دیتی رہتی ہے۔

ڈاکٹر فضل الرحمٰن*

مت سہل ہمیں جانو

حضرت اقدس کی ذات سے مجھے سب سے پہلے مجھے بھائی عبد الحمید صاحب نے متعارف کروایا۔ میں آٹھویں جماعت میں تھا جب بھائی عبد الحمید صاحب مجھے حضرت اقدس کی زیارت کے لیے ایک مسجد میں لے گئے جہاں حضرت کے لیے تشریف لائے تھے۔ حضرت منبر پر تشریف فرما تھے۔ خوبصورت، فرشتہ نما اور روحانیت سے مزین چہرہ، کالے فریم والی عینک، کالا عمامہ سر بکف کیے، سفید کپڑوں میں ملبوس ٹھیٹھ پنجابی میں درس دے رہے تھے۔ یہ میری زندگی میں حضرت کی پہلی زیارت تھی۔

احقر کے گھر کے ساتھ جامع مسجد گلی لانگریاں والی تھی جہاں فجر کے بعد ممتاز عالم دین مولانا مفتی خلیل احمد صاحب درس قرآن پاک دیتے تھے۔ نماز ظہر کے بعد دعوت و تبلیغ والے حضرات فضائل اعمال پڑھتے، مغرب کے بعد حضرت قاضی شمس الدین صاحبؒ درس قرآن و حدیث فرماتے۔ عشا کے بعد بھی علمی مجلس ہوتی جس کے روح رواں ڈاکٹر فضل الرحمٰن صاحب تھے جو کہ مسجد میں رہتے تھے اور تقسیم پاک و ہند سے پہلے تبلیغ وسے وابستہ تھے۔ وہ ہمیں سنت و اعمال، شان صحابہ اور عظمت اکابرین کے بارے اکثر واقعات سناتے۔ کم عمری کا زمانہ تھا۔ ہم اسکول میں جا کر یہی باتیں اپنے ہم جماعتوں کو سناتے، لیکن بعض کج ذہن ہمارے ساتھ ان واقعات کے حولے سے بحث شروع کر دیتے۔ میں اکثر اس بحث میں لاجواب ہو جاتا اور پھر رات کو بھائی عبد الحمید صاحب کو اسکول میں ہونے والی بحث کے بارے میں بتاتا۔ وہ مجھے نہایت احسن طریقہ سے مسئلہ سمجھاتے اور پھر فرماتے، گھبرانے کی ضرورت نہیں۔ بڑے حضرت نے اس کے بارے میں ایک پوری کتاب لکھی ہے۔ رفتہ رفتہ مجھے معلوم ہوا کہ بڑے حضرت نے رافضیت، فتنہ غیر مقلدیت، منکرین احادیث، عیسائیت اور بدعات کے قلع قمع کی ذمہ داری اٹھائی ہوئی ہے۔

حضرت کی زندگی کا ایک خاص پہلو وقت کی پابندی تھی۔ حضرت گھڑی سے وقت دیکھ کر کلاس میں جاتے اور طالب علموں کا ایک لمحہ بھی ضائع نہ فرماتے اور نہ ہی باتوں میں وقت صرف کرتے اور نہ ہی پانچ یا دس منٹ پہلے کلاس چھوڑتے یہی وجہ ہے کہ دوران تدریس سردی ہو یا گرمی حضرت کی طبیعت ٹھیک ہو یا بوجھل، کبھی چھٹی نہ فرماتے۔ اگر احقر دن کے وقت حضرت کی خدمت اقدس میں حاضر ہوتا تو فرماتے کہ چھٹی لے کر آئے ہیں؟

حضرت کی زندگی نہایت سادہ تھی۔ وہ زمانے کی چالاکیوں سے کوسوں دور بہت معصوم انسان تھے۔ جب گھر پر ٹیلیفون لگوایا تو شروع شروع میں کسی کا فون آنے پر السلام علیکم کا جواب دے کر پوچھتے کہ کون صاحب ہیں؟ اور زیادہ گفتگو سے

---

*معالج خصوصی امام اہل سنتؒ۔

گریز کرتے ہوئے جلدی فون بند کر دیتے۔ حضرت کا خیال تھا کہ شاید ٹیلی فون سننے والے کو بھی بل آتا ہے۔ پھر حضرت مولانا زاہد الراشدی نے عرض کیا کہ سننے کا نہیں، صرف فون کرنے کا بل آتا ہے تو پھر حضرت نے اطمینان سے فون سننا شروع کیا۔ علامہ زاہد الراشدی فرماتے ہیں کہ مولانا عبدالحق خان بشیر کی شادی سے واپسی پر نماز کے لیے ایک جگہ ہوٹل پر رکے تو وہاں ٹی وی پر کارٹون لگے ہوئے تھے۔ حضرت کچھ دیر ٹی وی کی طرف دیکھتے رہے، پھر مولانا زاہد صاحب کو بلایا اور پوچھا کہ یہ کیا ہے؟ انھوں نے کہا کہ حضرت، یہ ٹی وی ہے تو حضرت نے استغفار پڑھا اور فوراً رخ دوسری طرف کر لیا۔ آخری ایام میں ضعف کی وجہ دوسری کی وجہ سے ہم حضرت کو خون لگوانے کے لیے آمادہ کرتے مگر حضرت بار بار انکار فرما دیتے۔ میرے خیال میں اس کی وجہ بلڈ بینک تھی کیونکہ حضرت اقدس بلڈ بینک کو عام بینک کی طرح بینک سمجھتے تھے۔

دسترخوان پر بیٹھ کر حضرت پہلے پانی سے ہاتھ دھوتے اور تولیہ استعمال کیے بغیر کھانا شروع فرماتے، آرام سے چھوٹے چھوٹے نوالے چبا چبا کر کھاتے اپنی پلیٹ میں ضرورت کے مطابق ایک سالن ڈالتے اور پلیٹ کو اس طرح صاف کرتے جیسے دھوئی ہوئی ہو۔ کھانے کے بعد دو کپ چائے پرچ میں ڈال کر سیدھے ہاتھ سے پیتے۔ کھانے کے دوران اکثر حضرت کی ناک سے پانی شروع ہو جاتا۔ کھانے سے فراغت کے بعد حضرت اقدس کلی فرماتے اور اپنے دانت خود صاف کرتے اور قمیص کے ساتھ لگائے ہوئے بکسوے سے دانتوں میں خلال فرماتے۔

روزانہ صبح سے شام تک کراچی سے خیبر تک کے بہت لوگ حضرت کی خدمت میں سلام عرض کرنے کے لیے حاضر ہوتے رہتے اور دعا کی درخواست کرتے۔ حضرت آنے والوں سے ان کا نام پوچھتے اور پوچھتے کہ کہاں سے تشریف لائے ہیں؟ کیا کرتے ہیں؟ والدین زندہ ہیں؟ بچے کتنے ہیں؟ اگر کوئی عالم ہوتا تو فرماتے دورہ کس سن میں کیا؟ آنے والے اکثر حضرات حضرت اقدس سے دعا کی درخواست کرتے۔ ہمارے دوست احسن جاوید صاحب (ایس ایس پی پنجاب پولیس) اس بات کو بہت برا محسوس کرتے۔ وہ مجھے اکثر کہتے کہ جو لوگ حضرت کی زیارت کرنے اس لیے آتے ہیں کہ ان سے دعا کروائیں تو میرے نزدیک وہ اپنی غرض کے لیے آئے ہیں، اس لیے یہ سب خود غرض ہیں۔ حضرت کی مجلس میں کچھ دیر وقت گزارنا ہی بہت بڑی سعادت ہے اور حضرت کا ہمارے اوپر حق ہے کہ بغیر کسی لالچ و غرض کے حضرت کے پاس آئیں۔

بقول حضرت حرمین شریفین کے سفر میری زندگی کے یادگار لمحات تھے۔ ۲۰۰۲ء میں مفتی جمیل احمد خان شہیدؒ کی دعوت پر مجھے مولانا قاری سعید الرحمنؒ، مولانا سعید احمد جلال پوری اور دیگر اکابرین کے ہمراہ حضرت کے ساتھ رمضان المبارک میں حرمین شریفین کی حاضری کا موقع ملا۔ شارع ابراہیم خلیل پر واقع ایک ہوٹل میں قیام تھا۔ ایک کمرے میں قاری سعید الرحمن صاحب، مفتی جمیل احمد خاں شہیدؒ، احقر اور الحاج لقمان اللہ میر صاحب تھے۔ قاری صاحب کا بستر حضرت کے بالکل سامنے، احقر کا حضرت کے قدموں کی طرف اور سامنے حضرت مفتی صاحب شہید کا بستر تھا، مگر درمیان میں خالی جگہ پر الحاج لقمان اللہ میر صاحب بیٹھے تھے۔ حضرت کا مزاج تھا کہ ساتھیوں کو تکلیف نہیں دیتے تھے۔ احقر کے قدموں میں یا راستے میں لیٹنے کا مقصد یہ تھا کہ جیسے ہی حضرت کسی تقاضے کے لیے اٹھیں تو اکیلے نہ ہوں۔ اس سفر میں پہلے پندرہ دن مکہ معظمہ کا قیام تھا۔ اشراق کے بعد الحاج لقمان اللہؒ میر اور بھائی وسیم غزالی حضرت کو نہلا کر احرام بندھواتے، خود تیار ہوتے اور پھر مفتی صاحب شہیدؒ حضرت کو وہیل چیئر پر بٹھا کر لفٹ سے نیچے لاتے۔ اتنے میں ہم ٹیکسی کھڑی کرتے اور حضرت مسجد عائشہ تشریف لے جاتے،

نیت فرماتے اور ظہر سے قبل طواف سے فارغ ہو جاتے جبکہ سعی ظہر کی نماز کے بعد فرماتے۔ جمعرات جمعہ کے دن رش کی وجہ سے حضرت کو چھت پر طواف ادا کراتے جس کی وجہ سے حضرت مفتی صاحب شہیدؒ کے پاؤں میں چھالے پڑ جاتے۔ حضرت مفتی صاحب سعی کے دوران غزالی صاحب کو (جو قرآن پاک کھول کر سنتے) اپنی منزل سناتے تھے۔

عمرہ کے بعد کمرے میں پہنچ کر حضرت کو نہلاتے اور پھر حضرت عصر تک آرام فرماتے۔ مفتی صاحب شہید عصر کی نماز جماعت کے ساتھ کمرے ہی میں ادا فرماتے۔ اس دوران حضرت قرآن پاک کی تلاوت فرماتے۔ مغرب سے تیس چالیس منٹ قبل مفتی صاحب شہیدؒ، وسیم غزالی صاحب اور دوسرے احباب حضرت کو مطاف میں میزاب رحمت کے سامنے والے حصے میں لے جاتے جہاں سب احباب مل کر روزہ افطار کرتے۔ نماز مغرب کے بعد ہم سب لوگ حضرت کے ساتھ ہوٹل واپس آ کر دسترخوان پر کھانا کھاتے۔ غزالی بھائی، مفتی صاحب اور دو ساتھی وہاں رہ جاتے۔ باقی سب حضرات نماز عشا اور تراویح کے لیے حرم میں آ جاتے۔ حضرت مفتی صاحب شہیدؒ نے بتایا کہ حضرت تراویح کے دوران میری زبر زیر کی غلطی بھی پکڑ لیتے اور اگلے رکوع میں وہ آیت دوبارہ پڑھواتے۔

مجھے یاد ہے کہ ایک دفعہ ہم کراچی ائیر پورٹ پر تھے۔ فلائٹ کا وقت کم تھا تو حضرت مفتی صاحب شہیدؒ نے جلدی جلدی مغرب کی نماز پڑھائی۔ جیسے ہی مفتی صاحب سلام سے فارغ ہو کر اٹھے تو فوراً حضرت نے اپنا عصا مفتی صاحب کے ٹخنے میں ڈال کر اپنی طرف متوجہ کیا اور فرمایا: میاں! واجبات کا لحاظ بھی رکھنا چاہیے۔ اسی سفر میں جب ہم لوگ رات جدہ پہنچے تو سب لوگ نماز عشا قصر پڑھ کر جہاں جگہ ملی، وہاں سو گئے۔ مگر حضرات نے اپنی تراویح ادا کیں اور تہجد کے وقت اپنے معمول کے مطابق نوافل ادا کیے۔ حضرت کی عادت شریفہ بارہ رکعت پڑھنے کی تھی۔ ہر رکعت میں نہ بہت لمبی اور نہ بہت چھوٹی سورتیں پڑھتے تھے۔ پندرہ دن مکہ مکرمہ میں گزارنے کے بعد حضرت کی معیت میں یہ قافلہ مدینہ منورہ کی طرف روانہ ہوا۔ مدینہ منورہ میں حضرت کے ساتھ گزارے ہوئے دن میری زندگی کا سب سے بڑا اثاثہ ہیں۔ ہماری رہائش رباط مکی کے قریب تھی۔ حضرت مفتی صاحب شہیدؒ حضرت اقدس کو سنتیں رہائش گاہ پر ادا کروانے کے بعد مسجد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم میں جماعت کھڑی ہونے سے قبل لاتے اور فجر، ظہر اور عصر میں نماز کے فوراً بعد لے جاتے۔ مغرب میں پچھلی چھتریوں والے صحن میں پچھلی درمیان والی چھتری کے نیچے روزہ افطار فرمانے کا معمول تھا۔ تراویح سے فراغت کے ایک گھنٹہ بعد حضرت مفتی صاحب شہیدؒ حضرت اقدس کو وہیل چیئر پر لاتے۔ حضرت مسجد میں آ کر نوافل ادا کرتے۔ اس کے بعد ہم بھی پیچھے پیچھے چلے جاتے۔

باب جبرائیل سے داخل ہونے کے بعد سے لے کر امام صاحب کے کھڑے ہونے تک حضرت اقدسؒ وہیل چیئر پر رہتے۔ اس کے بعد حضرت وہیل چیئر سے اتر جاتے۔ ایک طرف سے مفتی صاحب شہیدؒ اور دوسری طرف سے الحاج لقمان اللہ میر صاحب حضرت کے ساتھ ہوتے اور حضرت نہایت عجز و نیاز کے ساتھ بارگاہ خاتم النبیین، شافع محشر امام الانبیا، وجہ تخلیق کائنات، رؤف رحیم حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم سرکار مدینہ کی بارگاہ میں سلام عرض کرتے۔ میں وہیل چیئر پکڑے بالکل پیچھے ہوتا۔ حضرت نہایت ہی پست آواز میں عربی میں سلام عرض کرتے اور اپنی طرف سے اور والدین و احباب کی طرف سے سلام عرض کرتے۔ یہ سارا عرصہ نظریں جھکائے اشک بار آنکھوں سے بارگاہ نبوت میں سر جھکائے کھڑے رہتے۔

اس سفر میں الحاج لقمان اللہ میر صاحب کا اصرار اور خواہش تھی کہ ستائیسویں شب کو حضرت کے ساتھ عمرہ ادا کریں۔

حضرت ساتھیوں کی تکلیف اور اس دن کے رش کو مدنظر رکھتے ہوئے خاموش تھے۔ بہر حال مفتی صاحب شہیدؒ کے اصرار پر عصر سے دو گھنٹے بعد روانگی کا پروگرام بنا، مگر گاڑی خراب ہونے وجہ سے روانگی میں تاخیر ہوگئی اور مغرب کے بعد مدینہ منورہ سے روانگی ہوئی۔ سارا راستہ مسلسل بارش رہی اور مکہ مکرمہ کے قریب پہنچے تو سڑکوں پر بارش کا پانی جمع تھا۔ گاڑیوں کا زبردست رش تھا اور پیدل چلنا محال تھا۔ حضرت مفتی صاحب شہیدؒ نے اپنے تجربے کی بنیاد پر مکہ مکرمہ میں داخل ہونے سے قبل دائیں ہاتھ پر ایک پیٹرول پمپ کی مسجد کے قریب ٹیکسی رکوائی اور حضرت کو تمام ضروریات سے فارغ کروا کر وضو کروا دیا۔ جب ہم ٹیکسی سے اتر کر حضرت کو حرم کی طرف لے جا رہے تھے تو بہت زیادہ رش تھا۔ قیام لیل شروع ہوئی ہی تھی۔ بہت مشکل سے کئی دفعہ تہہ خانوں کے راستوں سے مطاف میں داخل ہونے کی کوشش کی، مگر ہر سعی لاحاصل۔ پھر ہم حضرت کو لے کر پہلی منزل پر گئے تو وہاں زیادہ رش تھا۔ اوپر والی منزل میں بھی اندر مطاف تک پہنچنا ناممکن تھا۔ چھت پر پہنچے تو وہاں بھی کوئی صورت نظر نہیں آ رہی تھی۔ یہ صورت حال دیکھ کر حضرت پریشان ہو گئے اور فرمانے لگے مفتی صاحب، آپ نے اپنے اوپر بھی ظلم کیا اور میرے ساتھ بھی زیادتی کی۔ بہتر یہی ہے کہ واپس چلیں اور دم ادا کر دیں۔ حضرت کی یہ بات سن کر حضرت مفتی صاحب شہیدؒ کی کیفیت عجیب سی ہوگئی۔ (میں نے ایسے مواقع پر حضرت مفتی صاحب شہید کو ایک خاص وظیفہ پڑھتے سنا جس کی وجہ سے اللہ رب العزت مطلوبہ کام فوراً آسان فرما دیتے تھے) حضرت کی یہ بات سن کر ہم حضرت کو نیچے لے آئے۔ حضرت مفتی صاحب شہیدؒ کے دل میں جانے کیا آیا کہ حضرت کو لے کر سخت رش میں باب صفا سے اندر داخل ہو گئے۔ دو تین شرطوں نے حضرت مفتی صاحب کو سختی سے روکنے کوشش کی، مگر وہ ان کی ڈاڑھی کو ہاتھ لگاتے ہوئے عربی میں شیبہ شیبہ (بوڑھا آدمی) کہتے ہوئے مطاف میں داخل ہو گئے۔

حضرت مفتی صاحب شہیدؒ کی عجیب کیفیت تھی۔ وہ حضرت کو طواف کروا رہے تھے، مگر ان کی آنکھوں سے مسلسل آنسو جاری تھے۔ حضرت بھی بڑے اطمینان سے وہیل چیئر پر تشریف فرما تھے اور اس بات کا بہت لحاظ کر رہے تھے کہ کسی کو وہیل چیئر نہ لگ جائے۔ یہ دونوں بزرگوں کی کرامت تھی کہ اللہ رب العزت نے ایک ناممکن کام کو ممکن کر دیا۔ طواف سے فراغت کے بعد ہم حضرت کو درمیان والی صفا مروہ میں لے گئے۔ اس رات مولانا شریم صاحب قیام لیل پڑھا رہے تھے۔ ابھی ہم صفا مروہ کے تیسرے چکر میں تھے کہ دعا شروع ہوگئی۔ اللہ رب العزت کی حمد وثنا کے بعد مولانا نے یہ دعا شروع کی: 'اللہم انك تسمع كلامي وترى مكاني وتعلم سري وعلانيتي لا يخفى عليك شيء' اور تھوڑی ہی دیر میں ان کی ہچکی بندھ گئی۔ صفا مروہ کی باقی سعی ہم نے دعا ہی کے دوران پوری کی۔ اس کے بعد حضرت مفتی صاحب شہیدؒ حضرت کو لے کر ہوٹل تشریف لے گئے۔ مجھے یاد ہے کہ ہم نے اپنے نوافل نیچے مطاف میں ادا کیے۔ اس وقت خدام مطاف کو دھو رہے تھے۔ الغرض اس رات کی کیفیت بیان سے باہر ہے۔ اس کے بعد ہم دونوں قضائے حاجت کے لیے الحاج لقمان اللہ میر صاحب کی سابقہ حج والی رہائش جبل کعبہ کے نزدیک چلے گئے۔ اتنے میں غزالی صاحب اور حضرت مفتی صاحب شہیدؒ حضرت کو گاڑی میں بٹھا کر وہاں پہنچ گئے اور ہم مدینہ منورہ کے لیے روانہ ہوئے۔ ہم دونوں احرام ہی میں تھے اور ہم نے حلق بھی نہیں کروایا تھا، تب مفتی صاحب شہیدؒ نے فرمایا کہ حدود حرم سے باہر جانے سے پہلے حلق ضروری ہے، ورنہ دم لازم آ جاتا ہے، چنانچہ ہم نے فوراً حلق کروایا۔ میں نے پہلی دفعہ مفتی صاحب شہیدؒ کو گھبرائے ہوئے دیکھا۔ شاید اس کی وجہ حضرت کی فکر تھی۔

اسی سفر میں اللہ رب العزت نے مجھ پر جاگتی ہوئی حالت میں حضرت کے درجات منکشف کیے۔ وہ کیفیت اور وہ حالت میں بیان نہیں کر سکتا۔ حضرت اللہ رب العزت کے ہاں مقربین کے درجہ پر تھے۔ حضرت کی علالت کے دوران حضرت کو کسی بھی دوا یا انجکشن یا خوراک کی ضرورت پیش آتی تو میں حضرت سے عرض کرتا۔ حضرت بہ نفس نفیس اس کی اجازت مرحمت فرماتے تو وہ کام کرتا، ورنہ جیسے حضرت کی منشا ہوتی، ویسے ہی ہوتا۔ اس بات پر حضرت کے سب سے چھوٹے صاحب زادے مولانا منہاج الحق خان راشد مجھ سے اکثر نالاں رہتے۔ وہ اکثر مجھے کہتے کہ آپ ڈاکٹر بنیں، مرید نہ بنیں۔ لیکن اصل بات کا علم تو انھیں بھی نہیں تھا۔

حج کے ایک سفر میں ہم مولانا مدنیؒ کے ساتھ میدان عرفات میں تھے۔ اس مرتبہ حضرت کو علی الصباح گاڑی پر میدان عرفات لے گئے۔ حضرت مفتی صاحب شہیدؒ نے کافی گدے ایک دوسرے پر رکھ کر حضرت کو اوپر بیٹھنے کے لیے کہا، مگر حضرت وہیل چیئر پر ہی تشریف فرما رہے۔ مفتی صاحب نے حضرت کی وہیل چیئر کو پکڑا، مولانا حسن مدنیؒ کو کرسی پر بٹھایا اور کھلے آسمان کے نیچے سب لوگوں کے ساتھ آنسوؤں اور سسکیوں کے ساتھ اللہ رب العزت کی بارگاہ میں مناجات شروع کر دی۔ دعا کے ختم ہونے کے بعد عجیب اطمینان قلب کی کیفیت تھی اور سو فیصد یقین تھا کہ جیسے اللہ رب العزت نے سب کو معاف فرما دیا اور سب کی حاضری قبول فرمالی۔ اس مرتبہ مزدلفہ میں رات گزارنے کے بعد جب یہ حضرات حضرتؒ کو لے کر منیٰ آ رہے تھے تو راستہ میں شدید ازدحام میں پھنس گئے۔ ایسے موقع پر حضرت مفتی شہیدؒ نے حضرت کو فوراً اٹھا لیا اور باقی تمام حضرات بھی ارد گرد ہو لیے اور اللہ کے فضل وکرم سے حضرت کو منیٰ میں لے آئے۔ ہم منیٰ میں حضرت کے پاس بیٹھے تھے کہ مولانا اعظم طارق صاحب تشریف لائے اور بار بار حضرت سے اصرار فرماتے رہے کہ حضرت میری دیرینہ خواہش ہے کہ میں آپ کو اپنے کندھوں پر بٹھا کر طواف زیارت کراؤں۔ حضرت مسکرائے اور فرمایا کہ میں رمی بھی خود کروں گا اور طواف زیارت بھی۔

طواف زیارت کے لیے جب حضرت تشریف لے گئے تو رات ایک ڈیڑھ بجے فارغ ہوئے۔ حضرت مفتی صاحب شہیدؒ کی منشا یہ تھی کہ حضرت رات ہوٹل میں آرام فرمالیں، مگر حضرت نے مفتی صاحب سے حکماً فرمایا کہ منیٰ میں رات کا قیام واجب ہے، چنانچہ ڈرائیور حسن کے ساتھ ہم سب لوگ منیٰ کے لیے روانہ ہوئے۔ کسی طرف سے بھی منیٰ کے راستے کھلے نہ تھے۔ بے انتہا رش تھا۔ بہر حال ہم ایک طرف ہو کر اترے اور تقریباً اڑھائی گھنٹے کی پیدل مسافت کے بعد منیٰ میں پہنچے۔ مجھے یاد ہے کہ ایک جگہ پر مسلسل دو کلومیٹر چڑھائی تھی اور وہیل چیئر بھائی شاہ نواز صاحب چلا رہے تھے۔ فجر سے کچھ پہلے تہجد کے قریب ہم منیٰ میں پہنچے تو حضرت نے اللہ رب العزت کا شکریہ ادا کیا اور تمام ساتھیوں کو بہت دعائیں دیں۔

اس سفر میں بے شمار علمائے کرام جو کہ مختلف ممالک سے حجاز مقدس میں رہائش پذیر ہیں، حضرت کی خدمت میں حاضر ہوتے اور کوئی نہ کوئی کتاب ہدیہ کی صورت میں حضرت کو ہدیتاً عنایت فرماتے۔ بعض کتب جو کہ ہندو پاک میں میسر نہ تھیں، ان کی ایک لسٹ حضرت مفتی صاحب شہیدؒ کے پاس تھی۔ وہ بھی ساری کتب اکٹھی کی گئیں۔ مجھے یاد ہے کہ ہم چار لوگ تھے، لیکن کتابوں کی وجہ سے واپسی پر وزن کافی زیادہ تھا جس کے لیے الحاج لقمان اللہ میر نے کئی ہزار ریال جمع کروائے۔

مولانا منہاج الحق خان راشد نے حضرت کی بہت خدمت کی اور تمام بھائیوں کی طرف سے فرض کفایہ ادا کیا۔ تمام دنیا کے علمائے کرام کی طرف سے فرض کفایہ حضرت مفتی صاحب شہیدؒ نے اور مولانا بلوچ صاحب نے ادا کیا۔ ڈاکٹر حضرات

میں ڈاکٹر امین ملک صاحب، ڈاکٹر سہیل انجم، ڈاکٹر آصف جاوید قابل ذکر ہیں۔ عمومی افراد کی طرف سے یہ سعادت الحاج لقمان اللہ میر صاحب کو نصیب ہوئی۔ حضرت انہیں حاجی صاحب کہہ کر پکارتے تھے۔ سفر وحضر میں یہ حضرت کے امام تھے۔ حضرت کے ساتھ ان کی والہانہ عقیدت اور محبت تھی۔ مجھے یاد ہے کہ حضرت کے پاس جب ہم گوجرانوالہ سے آتے تو صبح سے لے کر عصر تک وہ مجھے کئی مرتبہ فون کرتے اور بسا اوقات ہسپتال میں پہنچ کر آدھ پون گھنٹہ نیچے کھڑے میرے منتظر رہتے۔ بعض اوقات ایمرجنسی میں مجھے دیر ہو جاتی لیکن کبھی میرے ساتھ تلخی سے پیش نہ آتے۔ حاجی صاحب میرے بھی بڑے محسن ہیں اور حضرت کی برکت سے میرے اوپر بھی ان کے بے شمار احسانات ہیں۔ مجھے فون کرنے کے علاوہ مولانا بلوچ صاحب کو بھی فون کرتے۔ مجھے لینے کے بعد پھر مولانا بلوچ صاحب کو لیتے۔ اسی ترتیب سے واپسی پر جہاں جہاں ہم نے جانا ہوتا، وہاں ہمیں پہنچاتے۔ حضرت کی کیفیت بھی یہ ہوتی کہ وہ بھی ہم سب کے منتظر رہتے۔ کبھی تھوڑی بہت دیر ہو جاتی تو مولانا منہاج الحق خان راشد صاحب سے ہمیں فون کرواتے۔ اکثر ایسا ہوتا کہ جیسے ہی فون آتا، میں عرض کرتا کہ ہم قریب ہی ہیں۔ حضرت کی مجلس میں پہنچ کر ہم دونوں حضرت سے مصافحہ کرتے اور حضرت کا ہاتھ چومتے، مگر مولانا بلوچ صاحب صرف حضرت سے مصافحہ فرماتے۔ میں تو خاموشی سے حضرت کے سامنے بیٹھ جاتا، مگر لقمان اللہ میر صاحب حضرت سے باتیں کرتے۔ تھوڑی دیر کے بعد ہم حضرت سے اجازت لیتے، مگر جب چودھری احسن جاوید صاحب (SSP) نے ہمارے ساتھ حضرت کی خدمت میں جانا شروع کیا تو انہوں نے ہمیں اس چیز کا احساس دلایا کہ آپ حضرات کو حضرت کو وقت دینا چاہیے۔

میں نے بڑے بڑے علما کو مشکل مسائل کے حل کے لیے حضرت کی طرف رجوع کرتے پایا اور یہ دیکھا کہ حضرتؒ کی طرف سے ایسا شافی وکافی اور محققانہ جواب ملتا تھا کہ سننے والا کہہ اٹھتا کہ اس مسئلے کی آخری تحقیق بس یہی ہے جو حضرتؒ نے پیش کی ہے۔ یہ واقعہ اکثر ہمارے ساتھ پیش آتا کہ مولانا نواز بلوچ صاحب جو کہ حضرتؒ کے دروس کے مترجم ہیں، کسی مسئلہ میں پھنس جاتے تو تمام کتب دیکھتے۔ کراچی مولانا سعید احمد جلال پوری صاحب کو فون کرتے، مولانا زاہد راشدی سے بات کرتے، لیکن جب یہ علمی اشکال لے کر حضرتؒ کی خدمت میں حاضر ہوتے تو حضرتؒ فوراً جواب میں فرماتے کہ مولانا! فلاں فلاں کتاب لاؤ جو کہ حضرتؒ کے کمرے میں موجود ہوتی، صفحہ نمبر فلاں نکالو اور حاشیہ میں اس کی تفصیل موجود ہے۔

حضرت اقدسؒ یہ فرماتے تھے کہ قرآن پاک اول سے آخر تک پڑھیں۔ خواہ آدھا رکوع روزانہ پڑھیں، لیکن ترجمہ کے ساتھ پڑھیں۔ وہ حضرات جو مخصوص سورتیں روزانہ تلاوت کرتے ہیں، ان کی بہ نسبت اللہ کے نزدیک الحمد للہ سے والناس تک پڑھنے والے زیادہ قابل قدر ہیں۔

حضرت کی زندگی کا ایک اور پہلو نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی مبارک حدیث پر عمل تھا۔ حضرت جہاں بھی جاتے، سلام میں پہل فرماتے۔ اگر ہم حضرت کے ساتھ کسی ہسپتال، مجلس، ائیر پورٹ، لیبارٹری میں جاتے تو حضرت اقدسؒ ہر کسی کو پہلے السلام علیکم کہتے۔

سفر میں جانے سے پہلے میں نے یہ بات خود دیکھی کہ جس شہر میں جتنے دنوں کے لیے جانا ہوتا حضرت اپنی نماز والی ڈائری سے اس شہر سے تہجد اور اشراق کا ٹائم خود اپنے ہاتھ سے تحریر فرماتے۔

۲۰۰۱ء میں جب حضرت نے مدرسہ سے استعفا دے دیا تو حضرت صوفی عبد الحمید صاحب کے حکم کی تعمیل میں میاں عارف صدر انجمن نصرت العلوم، احقر اور الحاج لقمان اللہ میر صاحب حضرت کی خدمت میں حاضر ہوئے اور استعفا واپس لینے کی درخواست کی۔ حضرت نے فرمایا میری صحت اجازت نہیں دیتی کہ میں اپنے کام کے ساتھ انصاف کر سکوں۔ ہم نے عرض کی کہ طالب علم آپ کے ہاں آجایا کریں گے۔ حضرت نے اس کی اجازت بھی نہ دی کہ ان کا آنے جانے میں وقت ضائع ہوگا اور ان کو مشکل ہوگی۔ پھر ہم نے عرض کی کہ ہم آپ کو پندرہ لاکھ روپیہ بطور پنشن پیش کرنا چاہتے ہیں۔ حضرت نے انکار فرمایا اور فرمایا کہ یہ ہمارے اکابرین کا شیوہ نہیں۔ پھر ہمیں شربت چائے پلا کر رخصت کر دیا۔

حضرت وقتاً فوقتاً اپنے متعلقین اور ہم مسلک احباب کی اصلاح بھی فرماتے تھے۔ ہمارے ایک بزرگ مولانا سعید احمد صاحب چکوری تھے جو قرآن پاک کی آیت 'رحماء بینھم' کو نص قطعی قرار دے کر صحابہ کے مشاجرات سے انکار فرماتے تھے۔ چنانچہ حضرت اقدسؒ ان کے پاس تشریف لے گئے اور انھیں ساری بات سمجھائی۔

۵ رمئی ۲۰۰۹ء بمطابق ۹ رجمادی الاولیٰ ۱۴۳۰ھ کو رات تقریباً ایک بج کر دس منٹ پر موت نے اس عظیم انسان کے لیے اپنا دامن وا کر دیا اور اس دور کا سب سے بڑا انسان اور عظیم مسلمان رحمتِ خداوندی کی آغوش میں چلا گیا۔

اگلے دن جب حضرت کا جنازہ گلی سے باہر نکلا تو ہزاروں انسان پُرنم آنکھوں اور سسکیوں کے ساتھ عقیدت اور محبت کے موتی نچھاور کرتے ہوئے اس میں شامل ہو گئے۔ سڑک کے دونوں کناروں اور فٹ پاتھ پر لوگ ہی لوگ تھے۔ ڈی سی اسکول گکھڑ منڈی کی بالائی چھت، تمام گیٹ، سڑک پر بنے ہوئے پل اور مکانوں کی منڈیریں انسانی سروں سے بھرے ہوئے تھے۔ گراؤنڈ میں محتاط اندازے کے مطابق ایک لاکھ سے زیادہ افراد جمع تھے۔ حضرت شیخؒ کی میت کو آخری دیدار کے لیے اسکول کے برآمدے میں رکھا گیا۔ ہر شخص کی آنکھ پُرنم تھی اور لوگ بلک بلک کر رو رہے تھے۔ تھوڑی دیر کے بعد لوگوں کا ہجوم تقریباً بے قابو ہو گیا تو حضرتؒ کی میت کو اُٹھا کر ہم سیدھا گراؤنڈ میں لے آئے۔ ملک بھر کے جید علمائے کرام موجود تھے جو تھوڑے تھوڑے وقت کے لیے مائیک پر تشریف لاتے رہے اور حضرت کی خدمت میں عقیدت کے پھول نچھاور کرتے رہے۔ قومی اور صوبائی اسمبلی کے ممبران بھی موجود تھے۔ ٹھیک وقت پر علامہ زاہد الراشدی صاحب نے نماز جنازہ پڑھائی۔ اس کے بعد حضرت کی میت کو لاکھوں اشکبار آنکھوں کے ساتھ قبرستان کی طرف لایا گیا۔ الحاج لقمان اللہ میر صاحب نے دوسرے احباب سے ساتھ حضرت کے جسد اطہر کو لحد میں اتارا۔ کوئی تابوت تیار نہ کیا گیا تھا۔ سفید کفن میں لپٹا ہوا ایک یادگار جسم خاک کے حوالے کر دیا گیا۔ بے شمار ہاتھ دعا کے لیے اٹھے اور ہر چہرہ روتا ہوا نظر آیا۔ حضرت ہمیں اس دنیا میں اکیلا چھوڑ گئے اور خود اللہ رب العزت کی جنتوں میں مقیم ہو گئے۔ اللھم اغفر لہ وارحمہ۔

مت سہل ہمیں جانو، پھرتا ہے فلک برسوں
تب خاک کے پردے سے انسان نکلتا ہے

مفتی خالد محمود*

حضرت مولانا سرفراز صفدرؒ اور مفتی محمد جمیل خان شہیدؒ

مفتی محمد جمیل خان شہیدؒ کا امام اہل سنت حضرت مولانا سرفراز خان صفدر سے تعلق تو شروع ہی سے ہوگا کہ حضرت ہمارے ملک ہی کی نہیں، بلکہ عالم اسلام کی عظیم شخصیت تھے اور تبلیغ دین، اشاعت علوم دینیہ، باطل فتنوں کے مقابلہ، علمائے حق علمائے دیوبند کے دفاع، مسلک احناف کی تائید اور امام ابوحنیفہ کی طرف سے معاندین کے رد میں آپ کی خدمات بہت نمایاں اور آب زر سے لکھنے کے قابل ہیں۔ حضرت کی انہی خدمات کے اعتراف کے لیے مفتی احمد الرحمٰنؒ کی خواہش تھی کہ ایک علمی سیمینار منعقد کیا جائے جس میں حضرت کی خدمات کا اعتراف اور تصانیف کا تعارف کراتے ہوئے حضرت کو خراج تحسین پیش کیا جائے، جس میں حضرت کی خدمات میں اپنے مقالات پیش کریں اور علما و مشائخ کی موجودگی میں حضرت کی خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے حضرت کو اعزازات سے نوازا جائے۔ مفتی احمد الرحمٰنؒ نے یہ کام مفتی جمیلؒ کے سپرد کیا کہ اس پر کام کرو اور اس کی ترتیب بناؤ۔ مفتی صاحبؒ نے حضرت کی تصانیف کا تعارف مرتب کرنے پر کچھ حضرات کو متوجہ بھی کیا تھا، مگر مفتی احمد الرحمٰن کی زندگی نے وفا نہ کی اور یہ کام ابتدائی مراحل سے آگے نہ بڑھ سکا۔

مفتی صاحبؒ کی وفات کے کئی سال بعد مولانا محمد اسلم شیخوپوری نے حضرت سے وقت لیا اور حضرت کے اعزاز میں کراچی میں ایک مجلس کا اہتمام کیا اور مفتی احمد الرحمٰن کی خواہش کی تکمیل کی ایک صورت نکالی۔ حضرت مولانا سرفراز خان صفدر اگرچہ مولانا اسلم صاحب کی دعوت پر تشریف لائے اور آپ کا قیام جامعہ بنوریہ میں تھا، اس اعتبار سے مولانا اسلم صاحب حضرت کے میزبان تھے، مگر اس موقع پر مفتی جمیلؒ نے اپنے آپ کو خدمت کے لیے وقف کر دیا۔ اپنی اور اپنے احباب کی گاڑیوں سمیت صبح جامعہ بنوریہ حاضر ہوتے اور رات گئے تک حضرت کے ساتھ رہتے۔ حضرت کو تمام پروگراموں میں لے جاتے۔ ایک ایک دن میں کئی کئی پروگرام ہوتے۔ اس طرح مفتی جمیلؒ صاحب کی دلچسپی اور ان کے ذوق وشوق کی وجہ سے پورے کراچی میں علمی مجالس منعقد ہوئیں اور تمام قابل ذکر مدارس میں حضرت کے پروگرام ہوئے۔ ہر صبح ناشتہ ایک جگہ ہوتا، ناشتہ کے بعد ایک جگہ اور گیارہ بجے دوسری جگہ پروگرام ہوتا۔ ظہر، عصر، مغرب، عشا ہر نماز کے بعد پروگرام ہوتے۔ درمیان میں ایک جگہ سے دوسری جگہ جاتے ہوئے تھوڑا وقت ملتا۔ اس تھوڑے سے وقت سے بھی فائدہ اٹھا کر کسی مدرسے میں حضرت کو لے جا کر دعا کراتے۔ ایک دن ظہر کے بعد کوئی پروگرام نہیں تھا۔ مفتی صاحبؒ نے حضرت کو اگلے پروگرام سے آگاہ کرتے ہوئے عرض کیا کہ حضرت کچھ دیر آرام فرمالیں، عصر سے کچھ دیر قبل جانا ہے۔ حضرت مسکرائے اور فرمانے لگے: اچھا تمہاری لغت میں بھی آرام کا لفظ ہے؟ میں تو سمجھا تھا کہ تم آرام کے لفظ سے واقف ہی نہیں۔

---

* مدیر اقرا روضۃ الاطفال ٹرسٹ کراچی

جامعہ بنوریہ کی انتظامیہ نے حضرت کو بخاری شریف کی آخری حدیث کے درس کے لیے زحمت دی۔ اس وقت بھی مفتی صاحبؒ نے حضرت کے متعدد پروگرام مختلف مدارس ومساجد میں رکھے۔ اسی اثنا میں مفتی صاحبؒ نے حضرت پر زور دیا کہ آپ رمضان المبارک حرمین میں گزاریں۔ حضرت نے فرمایا کہ میں کئی سال سے چھٹیوں کے ایام میں دورہ تفسیر پڑھاتا ہوں اور کبھی ناغہ نہیں کیا۔ دور دراز سے طلبہ پڑھنے کے لیے آتے ہیں، ان کا حرج ہوگا۔ مفتی صاحبؒ نے اس پر آمادہ کر لیا کہ بیس رمضان المبارک سے قبل دورۂ تفسیر مکمل کرا دیں اور اس کے بعد عمرہ کے لیے تشریف لے جائیں۔ میں اس کے مطابق آپ کی ترتیب بنا لیتا ہوں۔ اس پر حضرت راضی ہو گئے۔ مفتی صاحبؒ خود تو رمضان المبارک کے آغاز میں حرمین تشریف لے گئے اور حضرت کے ساتھ سفر کے لیے ایک ساتھی کو تیار کیا۔ حضرت کو جس تاریخ کو جدہ پہنچنا تھا، مفتی صاحبؒ اس وقت مدینہ منورہ میں تھے۔ مدینہ منورہ سے جدہ گئے، حضرت کو ائیر پورٹ سے لیا، عمرہ کرایا اور مدینہ منورہ حاضر ہو گئے۔ غالباً چار پانچ دن مدینہ منورہ میں رہے، اس کے بعد حضرت کی واپسی ہوئی۔

اسی طرح مفتی صاحبؒ کا حضرت سے تعلق مضبوط اور قوی ہوتا چلا گیا۔ جب لاہور میں اقرا کی شاخ قائم ہوئی تو لاہور حاضری کے موقع پر اکثر و بیشتر حضرت کی خدمت میں بھی حاضری دیتے۔ کئی مرتبہ شہید اسلام حضرت مولانا محمد یوسف لدھیانوی رحمہ اللہ کے ساتھ بھی حضرت کی خدمت میں حاضر ہوئے، لیکن جب گوجرانوالہ میں اقرا کی شاخ کا آغاز ہوا تو گوجرانوالہ کثرت سے جانا ہوا۔ مفتی صاحبؒ جب بھی گوجرانوالہ جاتے تو حضرت کی خدمت میں لازماً حاضری دیتے اور حضرت سے دعائیں لیتے۔ انہی دنوں میں حضرت نے ضعف اور بیماری کی وجہ سے مدرسہ نصرۃ العلوم جانا چھوڑ دیا تھا بلکہ کسی جگہ نہیں جاتے تھے حتیٰ کہ اپنی مسجد میں بھی صرف جمعہ کی نماز کے لیے تشریف لے جاتے۔ مفتی صاحبؒ جب بھی حضرت کی خدمت میں حاضری دیتے تو حضرت سے درخواست کرتے کہ حضرت دوبارہ سبق پڑھانا شروع کر دیں۔ حضرت معذرت کرتے ہوئے کہتے کہ حافظہ کمزور ہو گیا ہے، بات یاد نہیں رہتی، بینائی کمزور ہو چکی ہے، صحیح طرح مطالعہ نہیں کر سکتا، اس حالت میں سبق کا حق ادا نہیں ہوتا، بغیر مطالعہ کے سبق پڑھانا طلبہ کی حق تلفی ہے۔ نصرۃ العلوم کے ذمہ داران نے بہت کوشش کی کہ حضرت کسی طرح مدرسہ تشریف لائیں، گھر سے باہر نکلیں، مگر حضرت آمادہ نہ ہوئے۔ بہت سے حضرات نے کوشش کی مگر حضرت گھر سے باہر نکلنے کے لیے تیار نہ ہوئے۔ گوجرانوالہ میں اقرا کی سالانہ تقریب تھی۔ مفتی جمیل صاحب نے فرمایا کہ اس تقریب کے مہمان خصوصی مولانا محمد سرفراز خان صفدر صاحب ہوں گے۔ میں نے عرض کیا کہ حضرت تو کہیں جاتے ہی نہیں، ہماری تقریب میں کیسے آئیں گے؟ مفتی صاحبؒ نے فرمایا کہ ان شاء اللہ حضرت تقریب میں تشریف لائیں گے۔ مفتی صاحبؒ حضرت کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ نہ جانے کس ادا سے حضرت کی خدمت عالیہ میں درخواست پیش کی کہ حضرت کو آمادہ کر لیا۔ نہ صرف یہ کہ تقریب میں آنے کے لیے حضرت تیار ہوئے بلکہ بغرض علاج کراچی آنے کے لیے بھی حضرت کو راضی کر لیا۔

دعوت نامہ پر مہمان خصوصی کی حیثیت سے حضرت کا نام تحریر کیا۔ جس نے بھی دعوت نامہ میں حضرت کا نام دیکھا، دیکھتے ہی کہا کہ یہ اقرا والوں نے یوں ہی لکھ دیا ہے، حضرت نہ کہیں جاتے ہیں اور نہ حضرت کی صحت اس کی اجازت دیتی ہے۔ اقرا کے ایک مخلص رفیق داؤد ڈار صاحب تقریب میں شرکت کے لیے لاہور سے گوجرانوالہ آ رہے تھے۔ گوجرانوالہ

میں داخل ہوتے ہی ایک ہوٹل پر چائے پینے کے لیے رکے۔ اس کے کاؤنٹر پر دعوت نامہ رکھا ہوا تھا۔ جب اس ہوٹل والے کو یہ معلوم ہوا کہ وہ اقرا کی تقریب میں جا رہے ہیں تو اس نے خفگی کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ ممکن ہی نہیں کہ حضرت اس تقریب میں تشریف لائیں۔ یہ جانتے ہوئے بھی اقرا والوں نے حضرت کا نام کیوں لکھا؟ مگر مفتی صاحبؒ کا اخلاص تھا کہ حضرت تقریب میں تشریف لائے، مختصر بیان فرمایا اور دعا فرمائی۔ لوگوں کو یقین نہیں آ رہا تھا کہ حضرت تشریف لائے ہیں۔ لوگوں کا حال یہ تھا کہ حضرت کو دیکھ کر بے تاب ہو گئے۔ قریب تھا کہ تقریب کا نظم درہم برہم ہو جاتا، مجمع کو قابو کیا۔ جوں ہی تقریب ختم ہوئی، لوگ دیوانہ وار حضرت پر ٹوٹ پڑے۔ ہر شخص کی خواہش تھی کسی طرح حضرت سے مصافحہ ہو جائے۔ یہیں سے مولانا محمد نواز بلوچ، لقمان اللہ میر اور ڈاکٹر فضل الرحمٰن سے مفتی صاحبؒ کا تعارف ہوا۔ ان حضرات کو جب مفتی صاحبؒ کے پروگرام کا پتہ چلا تو یہ حضرات بہت خوش ہوئے اور ڈاکٹر فضل الرحمٰن نے مفتی صاحبؒ سے کہا: ہم تو چاہتے ہیں کہ حضرت گھر سے باہر نکلیں اور دوبارہ درس و تدریس کا سلسلہ شروع فرمائیں۔

مفتی صاحبؒ نے حضرت اور مذکورہ بالا تینوں حضرات کی کراچی آمد کا انتظام کیا، حضرت کے لیے اپنے گھر میں ایک کمرہ خاص طور پر تیار کروایا، بیت الخلا میں دونوں طرف دو لکڑیاں نصب کروائیں تا کہ حضرت اٹھنے بیٹھنے میں اس کا سہارا لے سکیں۔ سیڑھیوں پر ڈھلان بنوائی تا کہ وہیل چیئر لانا لے جانا آسان ہو۔ حضرت جب اپنے خدام کے ساتھ کراچی ایئر پورٹ پہنچے تو مفتی صاحبؒ اپنے رفقا کے ساتھ استقبال کے لیے موجود تھے۔ ایئر پورٹ سے سیدھا ہسپتال لے گئے۔ دماغ اور فالج کے اسپیشلسٹ ڈاکٹر عبداللہ سے تفصیلی معائنہ کرایا۔ ڈاکٹر کی ہدایت کے مطابق صبح دس بجے کے قریب فزیوتھراپی کے لیے روزانہ ہسپتال لے جاتے۔ صبح سیر کرانے کے لیے سمندر کے کنارے جاتے۔ اس موقع پر مفتی صاحبؒ نے حضرت کی جو خدمت کی، وہ صرف اور صرف مفتی صاحبؒ ہی کا حصہ ہے۔ اس موقع پر مفتی صاحبؒ نے تمام اسفار ترک کر دیے اور اپنے آپ کو حضرت اقدس کے لیے وقف کر دیا۔

جب ایئر پورٹ سے گھر جا رہے تھے تو مولانا محمد نواز بلوچ گاڑی میں میرے ساتھ بیٹھے تھے۔ وہ خود کلامی کے انداز میں بار بار یہ کہہ رہے تھے: ''حضرت کا اس حالت میں اتنی دور سفر کر کے آنا بڑی بات ہے''۔ ساتھ ساتھ وہ نفی کے انداز میں سر بھی ہلا رہے تھے۔ ان کی بات سن کر میں دل میں کہنے لگا: ابھی آگے دیکھیے، مفتی صاحبؒ حضرت اقدس کے ساتھ کیا معاملہ کرتے ہیں اور یہی ہوا۔ مفتی صاحبؒ نے حضرت اقدس کو تمام مدارس میں گھمایا اور حضرت سے بیان بھی کروائے۔ خود مفتی صاحبؒ کا گھر ایک مدرسہ اور خانقاہ میں تبدیل ہو چکا تھا۔ عصر کے بعد علما و طلبہ کا ایک جم غفیر ہوتا جس سے حضرت خطاب فرماتے۔ روانگی سے ایک دن قبل مفتی صاحبؒ کے گھر میں خواتین کا خاصا مجمع ہو گیا تھا۔ ان سے بھی حضرت نے خطاب فرمایا۔ مفتی صاحبؒ کا بس نہیں چلتا تھا کہ کس طرح حضرت کو دوبارہ اپنے پاؤں پر کھڑا کر دیں اور حضرت صرف چلنے ہی نہیں دوڑنے لگیں۔ اس کے بعد کئی مرتبہ حضرت اقدس کو کبھی علاج کی غرض سے کبھی ختم بخاری کی نیت سے کراچی لائے۔

مفتی صاحبؒ نے حضرت کی بے مثال خدمت کر کے اپنی عاقبت سنواری اور حضرت کی خوب دعائیں لیں۔ مفتی صاحبؒ کی اس خدمت سے متاثر ہو کر ہی تو حضرت نے فرمایا تھا: ''ایسی خدمت میری اولاد نے نہیں کی جو خدمت مفتی صاحبؒ نے کی۔ مفتی صاحبؒ مجھے اولاد سے زیادہ عزیز ہیں۔''

مفتی صاحبؒ نے اسی بیماری کی حالت میں حضرت اقدس کو عمرہ کے لیے راضی کر لیا جو بظاہر ناممکن سی بات تھی۔ نہ صرف یہ کہ حضرت عمرے کے لیے گئے بلکہ رمضان کا پورا مہینہ حرمین میں گزارا۔ جب تک مکہ مکرمہ میں رہے، حضرت روزانہ ایک عمرہ کرتے رہے۔ ایک دن حضرت نے فرمایا کہ میرا خیال تھا کہ میں ایک عمرہ بھی شاید مشکل سے کر سکوں، مگر مفتی صاحبؒ تو روز عمرہ کرا رہے ہیں۔ یہ مفتی صاحبؒ کی برکت اور ہمت ہے۔ ایک دن عمرہ سے فارغ ہو کر حضرت اپنے کمرہ میں تشریف فرما تھے۔ موڈ اچھا تھا۔ مفتی صاحبؒ فرمانے لگے، حضرت! ان شاء اللہ حج بھی کرنا ہے۔ ابھی سے نیت کر لیں۔ حضرت فرمانے لگے: مفتی صاحبؒ! حج بہت مشکل ہے۔ میں کیسے حج کروں گا؟ مفتی صاحبؒ نے عرض کیا: حضرت! اگر صحت ایسی ہی رہی تو حج کریں گے؟ حضرت نے فوراً ہاں کر دی تو حج پر بھی حضرت کو لے گئے اور الحمد للہ حج کے تمام ارکان احسن طریقے سے پورے کیے۔ عرفات میں حضرت سے بیان بھی کروایا۔

اگلے سال پھر حضرت کو ان کے صاحبزادے کے ساتھ حج کے لیے روانہ کیا۔ حضرت قافلہ کے ساتھ پہلے چلے گئے تھے، مفتی صاحبؒ بعد میں پہنچے۔ رفقا بتاتے ہیں کہ اس حج کے موقع پر حضرت کو ضعف بہت زیادہ تھا۔ بستر سے اٹھانا، بٹھانا بھی بہت مشکل ہو رہا تھا۔ کھانا بھی بڑی مشکل سے حضرت کو بستر پر ہی کھلایا جاتا تھا۔ حضرت کو مفتی صاحب کا انتظار تھا۔ جوں ہی مفتی صاحبؒ مکہ مکرمہ پہنچے، حضرت کی خدمت میں حاضری دی۔ مفتی صاحب کو دیکھتے ہی حضرت خوش ہو گئے اور اپنی ساری بیماری بھول گئے۔ لقمان اللہ میر صاحب کہتے ہیں: ہم حضرت کی وجہ سے پریشان تھے کہ اس حالت میں حج کیسے کرائیں گے؟ اب جو حضرت کو دیکھا تو احرام باندھے مفتی صاحبؒ کے ساتھ عمرہ کے لیے تیار ہیں۔ ہم حیران رہ گئے کہ یا اللہ یہ کیا ماجرا ہے؟ یا تو حضرت خود سے کروٹ بھی نہیں لیتے تھے اور اب مفتی صاحب کو دیکھتے ہی ایسے ہشاش بشاش کہ عمرہ کے لیے احرام باندھے تیار بیٹھے ہیں۔ یہ مفتی صاحبؒ کے اخلاص، ان کی محنت اور خدمت کا نتیجہ ہے۔

حضرت اقدس سے مفتی صاحبؒ کا تعلق اتنا بڑھا کہ تقریباً ہر ہفتہ عشرہ میں ایک مرتبہ ضرور حضرت کی خدمت میں حاضری دیتے۔ حضرت کی خیریت دریافت کرتے، دواؤں اور کھانے وغیرہ کے بارے میں پوچھتے۔ حضرت نے کھانا بہت کم کر دیا تھا۔ مفتی صاحبؒ حضرت کو کھانے پر راضی کرتے۔ حضرت کے صاحبزادے جب کھانے پینے کے بارے میں پریشان ہوتے تو مفتی صاحبؒ کو فون کرتے کہ آپ حضرت اقدس سے بات کریں اور حضرت کو راضی کریں کہ حضرت کھانا تناول فرما لیں۔ حضرت، مفتی صاحبؒ کی بات کو نہیں ٹالتے تھے۔ شہادت سے تین دن پہلے مفتی صاحبؒ حضرت کی خدمت میں حاضر ہوئے اور خیریت دریافت کی۔ ڈاکٹر فضل الرحمٰن نے کہا: حضرت کھانا نہیں کھاتے، ضعف دن بدن بڑھتا جا رہا ہے، حضرت طاقت کا انجکشن ہی لگوا لیں تا کہ ضعف میں کمی آئے۔ مفتی صاحبؒ نے انجکشن لگوانے کے لیے کہا تو حضرت آمادہ ہو گئے۔ ڈاکٹر فضل الرحمٰن کہتے ہیں کہ ہم کئی دن سے کوشش کر رہے تھے، لیکن حضرت راضی نہیں ہوئے۔ مفتی صاحبؒ نے ایک مرتبہ کہا تو حضرت فوراً مان گئے۔ یہ بزرگوں کا حضرت پر اعتماد اور ناز تھا۔

مفتی صاحبؒ کی شہادت سے حضرت کو بہت زیادہ صدمہ اور رنج ہوا۔ مفتی صاحبؒ کی شہادت پر حضرت بچوں کی طرح پھوٹ پھوٹ کر روئے۔ مفتی صاحبؒ حضرت کو ہر وقت خوش دیکھنا چاہتے تھے۔ مفتی صاحبؒ کی خواہش تھی کہ حضرت ہر وقت بستر پر نہ رہیں بلکہ متحرک رہیں، اس لیے مفتی صاحبؒ حضرت کو مختلف پروگراموں میں لے جاتے۔ اس طرح کا ایک

طویل سفر مفتی صاحب نے کیا اور حضرت کو گوجرانوالہ سے پنڈی لے گئے۔ وہاں سے کلر سیداں، کہوٹہ میں اقرا کی شاخوں کا افتتاح کروایا۔ وہاں سے باغ آزاد کشمیر میں دیوبند کانفرنس میں پہنچے۔ وہاں سے پشاور، دیر میں اقرا کی شاخوں کا معائنہ کرتے ہوئے چترال پہنچے۔ وہاں شاخوں کا افتتاح کیا۔ چترال سے شندور ٹاپ سے ہوتے ہوئے گلگت کے علاقے یاسین پہنچے۔ گلگت کی مختلف شاخوں کا معائنہ کیا، اسکردو گئے اور وہاں سے چلاس، کوہستان سے ہوتے ہوئے حضرت کے گاؤں پہنچے۔ یہ طویل ترین سفر مکمل طور پر گاڑیوں میں کیا۔ حیرت ہوتی کہ حضرت نے اتنا طویل سفر کیسے کیا؟ مگر مفتی صاحب کی ہمت اور عزم اور حضرت کی روحانی برکت کی بدولت ہی یہ سفر ممکن ہو سکا۔ اس سفر سے واپسی پر حضرت نے فرمایا: جمیل جن نہیں، ''دیو'' ہے۔ اس سے پہلے حضرت ازراہ تفنن مفتی صاحب کو ''جن'' کہا کرتے تھے۔

(بشکریہ ماہنامہ ''بینات'' اشاعت خاص بیاد مفتی محمد جمیل خان شہید)

''جوان عورت اگر بیوہ ہو جائے تو اس کو شریعت بڑی تاکید کرتی ہے کہ وہ نکاح ضرور کرے، ورنہ خرابیاں پیدا ہوں گی اور یہ باتیں عام تجربے میں بھی آ چکی ہیں، البتہ بچوں کے سلسلے میں پریشانی ہوتی ہے کہ ان کی پرورش کا کیا ہوگا تو بعض نیک دل بھی ہوتے ہیں جو بچوں کی کفالت اپنے ذمہ لے لیتے ہیں۔ اگرچہ ایسے لوگ تھوڑے ہیں، مگر ہیں ضرور۔ اگر ایسی صورت نہ ہو کہ بننے والا خاوند بچوں کی کفالت کا ذمہ نہ لے تو پھر مسئلہ یہ ہے کہ جب تک بچی بالغ نہ ہو، وہ ماں کی تربیت میں رہے گی اور لڑکا سات سال تک ماں کی تربیت میں رہے گا اور اس کا خرچہ پہلے وارثوں کے ذمہ ہے۔ وہ دیں گے۔ اگر وہ خود نہ دیں تو قاضی وارثوں سے خرچہ دلوائے گا۔ اگر وارث اس پوزیشن میں نہیں ہیں تو بیت المال سے باقاعدہ وظیفہ مقرر کیا جائے گا۔ ایسا نہیں ہے کہ ان بچوں کا کوئی انتظام نہ ہو اور ان کو یتیم خانے میں داخل کرا دیا جائے یا وہ بچے لاوارث ہو کر بداخلاقیوں کا شکار ہو جائیں۔ نہیں، بلکہ علاقے کے قاضی کی ذمہ داری ہے۔ اگر اسلامی قانون نافذ ہو جائے تو جس جگہ جمعہ کی نماز ہوگی، وہاں پر ایک بااختیار جج قاضی اور عامل ہوگا جس کا یہ فریضہ ہوگا کہ وہ محلے میں بیوہ عورتوں اور بچوں کا خیال رکھے اور ایسے آدمیوں کو تلاش کرے کہ جن کو روزگار میسر نہیں ہے اور وہ بھوکے ہیں اور یہ تلاش کرنا اس کی ذمہ داری میں شامل ہوگا۔ اگر وہ اس میں کوتاہی کرے گا تو حکومت کی طرف سے سزا ہوگی کہ تمہارے حلقے میں فلاں بیوہ عورت کیوں بھوکی رہی ہے، وہ یتیم بچہ کیوں بھوکا رہا ہے، فلاں بے روزگار کیوں بھوکا رہا ہے۔ لوگوں کو اسلامی قانون کی خوبیاں معلوم نہیں ہیں۔''

(ذخیرۃ الجنان ۴/ ۴۴، ۴۵)

مولانا محمد ایوب صفدر*

شیخ کاملؒ

میرے جیسے ناکارہ کے بس کی بات نہیں کہ شیخین کریمین کی شخصیات پر قلم اٹھاؤں، لیکن استاذِ محترم مولانا زاہد الراشدی مدظلہ کے ارشاد پر چند الفاظ تحریر کرنے کی ہمت کر رہا ہوں اور یہ خواہش بھی ہے کہ حضرت شیخ کے مداحوں میں میرا نام بھی آ جائے، چاہے سوت کی انٹی اور یوسفؑ کی مثال ہی کیوں نہ ہو۔

شیخ بحیثیت طالب علم

آپ کی قابلیت کا اندازہ اس بات سے بخوبی لگایا جا سکتا ہے کہ آپ کے استاد محترم شیخ العرب والعجم حضرت مولانا سید حسین احمد مدنیؒ نے آپ کو صفدر کا لقب مرحمت فرمایا۔ یہ استاد کے اپنے شاگرد رشید پر کمال اعتماد کا اظہار ہے۔ پھر جب حضرت مدنیؒ گرفتار ہوئے تو دار العلوم دیوبند کے تمام طلبہ کرام کے متفقہ صدر حضرت شیخ ہی تھے، اور یہ سب لوگ ہی جانتے ہیں کہ طلبہ کرام اور خاص طور پر دینی مدارس کے طلبہ ہر کسی کو اپنا سربراہ منتخب نہیں کر لیتے، جب تک اس میں تمام اوصافِ حسنہ کے ساتھ ساتھ علمی لیاقت وقابلیت اور اساتذہ کا اعتماد نہ ہو۔

شیخ بحیثیت استاد ومدرس

آپؒ کی تدریس کا شہرہ دنیا بھر میں تھا اور مشکل سے مشکل مسئلہ چٹکیوں میں حل فرما دیا کرتے تھے۔ اس کے ساتھ ساتھ انتہائی شفیق، مربی ومہربان بھی تھے۔ آپ کے اسباق کی یہ خوبی تھی کہ باطل مذاہب کے خلاف طلبہ کے اذہان کو دوران اسباق ہی تیار کر دیتے۔ ایک مرتبہ نارمل ہائی سکول گکھڑ میں درس قرآن کریم کے دوران ریاضی کے کسی پروفیسر صاحب نے سوال کیا کہ حضرت! آپ فرما رہے ہیں کہ کسی کافر کا کوئی عمل اور عبادت قبول نہیں ہوتی، جبکہ غیر مسلم قومیں بہت محنت کرتی ہیں اور مخلوقات کی خدمت کرتی ہیں۔ اگر وہ سب ضائع ہے تو یہ تو ناانصافی ہے۔ شیخ نے فرمایا کہ پروفیسر صاحب، آپ کیا پڑھاتے ہیں؟ انہوں نے بتایا کہ ریاضی پڑھاتا ہوں۔ شیخ نے فرمایا کہ پروفیسر صاحب، اگر کوئی طالب علم صفر صفر ڈالتا جائے تو کیا اس سے کوئی رقم بنے گی؟ اس نے کہا کہ حضرت جب تک اس کے بائیں طرف کوئی ہندسہ نہیں لگے گا، رقم نہیں بنے گی۔ شیخ نے فرمایا، بس یونہی سمجھ لیں کہ جب تک ہندسہ ساتھ لگائے بغیر صفر، صفر ہی رہتا ہے، اسی طرح جب تک کلمہ توحید کا ہندسہ نہیں لگے گا، تمام اعمال زیرو ہی رہیں گے۔ اس پر سائل اور تمام شرکا بہت متاثر ومطمئن ہوئے۔ نارمل اسکول کے سینئر استاد اور ماہنامہ چناب کے ایڈیٹر جناب محمد رمضان راتھر نے ایک مرتبہ کہا کہ ہمارا علم جہاں ختم ہوتا ہے،

---

* مہتمم مدرسہ فیضان سرفراز گوجرانوالہ

حضرت کا علم وہاں سے شروع ہوتا ہے۔

ایک بار بندہ ناچیز اور بعض دوسرے حضرات، حضرت شیخ کی خدمت میں بیٹھے تھے کہ مولانا محمد نواز بلوچ نے سوال کیا کہ استاد جی، جو طبقہ شہدا کے جسم مثالی کے ساتھ زندہ ہونے کا دعوے دار ہے، اس کو مختصر اور جامع جواب ہم کیا دیں؟ شیخ نے فرمایا، مولانا! خدا ان کو ہدایت دے۔ ان سے پوچھو کہ اللہ تعالیٰ کے راستہ میں قتل کیا ہوتا ہے؟ جسم مثالی، روح یا جسد عنصری یا کچھ اور؟ قرآن کریم نے ہمیں صاف صاف بتا دیا ہے کہ لمن یقتل، جو قتل کیے جائیں۔ جو چیز قتل ہوتی ہے، وہ زندہ ہے۔ اس کو اللہ تعالیٰ نے مردہ کہنے سے منع فرمایا ہے۔

شیخ بحیثیت مرشد کامل

جس طرح حضرت شیخ درس و تدریس، تحریر و تصنیف اور عبادت و ریاضت میں کامل تھے اور اسلاف کا نمونہ تھے، اسی طرح تصوف و سلوک کے بھی بے تاج بادشاہ تھے۔ شیخ میں وہ تمام خوبیاں موجود تھیں جو ایک متبع سنت اور کامل پیر میں ہوا کرتی ہیں۔ مجھے یاد ہے کہ بندہ مدرسہ ریحان المدارس میں زیر تعلیم تھا۔ چھوٹا بھائی مولانا محمد ادریس نقشبندیؒ قلعہ دیدار سنگھ میں پڑھتا تھا اور شیخ کے بارے میں اور میرے اساتذہ کے بارے میں انتہائی گستاخانہ الفاظ استعمال کرتا تھا جس سے بندہ کو بہت تکلیف ہوتی اور بعض اوقات میں اپنے عمر میں بڑا ہونے کا فائدہ اٹھاتے ہوئے اسے دو چار لگا بھی دیتا، مگر وہ پھر بھی باز نہ آتا۔ یہ سلسلہ ڈیڑھ دو سال چلتا رہا۔ بالآخر بڑی تگ و دو، کوشش و جستجو اور دعاؤں التجاؤں کے بعد اسے گوجرانوالہ میں اپنے پاس لے آیا۔ ایک دن پتہ چلا کہ حضرت شیخ گوبند گڑھ گلی نمبر ۶ میں مکی مسجد میں بعد نماز مغرب درس ارشاد فرمائیں گے۔ یہ غالباً ۸۴ کی بات ہے۔ میں نے ادریس صاحب سے کہا کہ شیخ تشریف لا رہے ہیں، آپ بھی چلیں مگر اس نے صاف انکار کر دیا اور سخت الفاظ کہے۔ خیر وہ دن آ گیا تو میں نے پھر منت کی کہ تم صرف بیان ہی سننا، بیعت نہ کرنا۔ عمل کرنا نہ کرنا، آپ کی مرضی۔ اسی ذہن اور اسی مزاج کا ایک اور ساتھی مولوی امجد علی شاکر بھی تھا۔ بالآخر یہ لوگ بھی اور طلبہ کے ساتھ تیار ہو گئے۔ شیخ کا بیان ہوا جس نے دلوں کو موہ لیا۔ دعا کے بعد میں نے کھڑے ہو کر لوگوں کی توجہ بیعت کی طرف لائی۔ بندہ خود بھی بیعت ہوا اور دوسرے لوگ بھی بیعت ہوئے۔ نہ جانے کیا ہوا کہ یکایک قاری محمد ادریس صاحب اور مولانا امجد علی شاکر بھی آگے بڑھے اور بیعت ہو گئے۔ بس بیعت ہونے کی دیر تھی کہ تمام غلط عقائد اور نظریات کے بادل چھٹ گئے، حالانکہ اس موضوع پر نہ شیخ کا درس ہوا تھا اور نہ ہی کسی نے گفتگو کی تھی۔ پھر یہ دونوں حضرات اتنے مضبوط ہوئے کہ اسے حضرت شیخ کی کرامت اور توجہ ہی کہا جا سکتا ہے جس نے محض اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے لمحہ بھر میں کایا پلٹ دی۔

محمد یونس خان مرحوم گلی لانگریانوالی کے ساتھی تھے۔ جب میں نے ان کو بیعت کروایا تو قسم کھا کر کہنے لگے کہ شیخ کے ہاتھوں سے ٹھنڈک جسم میں داخل ہوئی اور میرا سارا بوجھ اتر گیا۔ میں نے بہت سے غیر مقلدین، جماعت اسلامی سے وابستہ حضرات، بریلویوں اور حتیٰ کہ مرزائیوں اور شیعہ کو بھی شیخ کا بیعت کروایا۔ صرف بیعت ہی کی برکت سے ان لوگوں کو ہدایت کاملہ نصیب ہوئی اور آج وہ لوگ توحید و سنت کے مطابق زندگی بسر کر رہے ہیں۔ ہمارے بہت اچھے دوست اور دینی تحریکات مدارس و علما کے معاون رانا غلام اکبر خان (اللہ تعالیٰ ان کو صحت کاملہ عطا فرمائے) کے خاندان میں ایک دو افراد غیر مقلدیت کی طرف اور باقی بریلویت کی طرف مائل تھے۔ مجموعی طور پر دنیا داری کا غلبہ تھا۔ میں نے پہلے رانا صاحب کو بیعت کروایا۔ اس کے بعد ان کے والد صاحب حاجی غلام رسول مرحوم، پھر باقی بھائی حتیٰ کہ رانا صاحب کے سسرال، چچے اور رفتہ رفتہ خاندان کے بیسیوں افراد شیخ کے عقیدت مند بن گئے اور اس خاندان کا بچہ بچہ آج بحمد اللہ دیندار بھی ہے اور مسلک حق پر جان نچھاور کرنا اپنے لیے سعادت دارین سمجھتا ہے۔ ماسٹر شفقت جاوید جماعت اسلامی کے ساتھ وابستہ تھے۔ حضرت شیخ سے بیعت کروانے کے بعد آج تک الحمد للہ دسیوں مسجدیں اور مدرسے بنا کر اہل حق کے حوالے کر چکے ہیں۔

شیخ حق پر ہیں

بندہ کا سارا خاندان اور پورا گاؤں منڈیالہ تیگہ انکار حیات الانبیاء علیہم السلام کی لپیٹ میں آ چکا تھا۔ بندہ کی منگنی اپنے خاندان میں ہوئی تھی جو تقریباً ۱۰ ماہ قائم رہی۔ بندہ مدرسہ نصرۃ العلوم میں داخل ہوا تو پیغام ملا کہ یا تو نصرۃ العلوم اور مولانا سرفراز خان صاحب کو چھوڑ دو، ورنہ رشتے سے جواب ہے۔ خیر میں نے اس دھمکی کی کوئی پروا نہ کی اور رشتہ ٹوٹ گیا۔ اس کے بعد منڈیالہ تیگہ و گرد و نواح میں تقریباً دس مرتبہ رشتہ کی بات چلی، لیکن خفیہ ہاتھ حرکت میں آ جاتے اور جواب ہو جاتا۔ پھر کہیں سے یہ دھمکی ملی کہ یا تو مولوی سرفراز والا عقیدہ چھوڑ دے، ورنہ محمد ایوب اور عبید اللہ کنوارے ہی رہ جائیں گے، ہم ان کا کہیں رشتہ نہیں ہونے دیں گے۔ مزید برآں بندہ پر قاتلانہ حملے ہوئے اور دھمکیاں بھی دی گئیں۔ ان حالات کی وجہ سے ایک دن سر سجدہ میں رکھ کر بندہ خوب رویا اور اللہ تعالیٰ سے یوں التجا کی کہ اے اللہ! اگر مولانا محمد سرفراز خان صفدرؒ اور اکابر علمائے دیوبند کے تمام عقائد درست ہیں تو بندہ کی شادی اپنی برادری اور اپنے ہی گاؤں یا گرد و نواح میں ہو، ورنہ مجھے کوئی ضد نہیں۔ اے اللہ! مجھے ہدایت عطا فرما دے اور جو اہل حق ہیں، ان سے وابستہ فرما دے۔ واللہ اس دعا کو ابھی ایک ہفتہ بھی نہیں گزرا تھا کہ گاؤں میں، برادری میں بلکہ قریبی رشتہ داروں میں سے پیغام نکاح آ گیا۔ مولانا زاہد الراشدی مدظلہ نے اپنے بیٹوں مولانا عمار خان ناصر اور ناصر الدین خان عامر کے ہمراہ منڈیالہ تیگہ جا کر نکاح پڑھایا۔ اللہ تعالیٰ نے انتہائی نیک اور باوفا بیوی (جو میرے دینی کاموں میں ہمیشہ شریک رہتی ہے اور شیخ سے بیعت بھی ہے) عطا فرمائی۔ وللہ الحمد۔ یہ غیبی اشارہ تھا کہ شیخ امام اہل سنت اور اکابر علمائے دیوبند کے تمام عقائد درست ہیں۔ دوسری طرف جہاں سے مجھے رشتہ سے جواب ہوا، ایک آدھ کے سوا ان تمام بچوں اور بچیوں کے رشتے کٹر دیوبندی اور حیاتی گھرانوں میں ہوئے۔

کشف

بندہ نے شیخ کو ۱۹۹۰ء میں مسجد خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم فیروز والا روڈ میں درس قرآن کریم کے لیے دعوت دی۔ اہل محلہ میں سے بعض کا اصرار ہوا کہ کھانے کے انتظام کا موقع انھیں دیا جائے۔ اس ناچیز نے مشروط اجازت دی کہ کھانے پر جو خرچ ہو، وہ خالص محنت کی کمائی اور حلال مال سے ہو، کوئی چیز مشکوک شامل نہ ہو۔ حضرت کا بیان ہوا اور بہت سے لوگوں نے بیعت کی۔ دعا کے بعد کھانے کے لیے قریبی گھر میں شیخ تشریف لے گئے اور کھانا تناول فرمایا۔ بندہ ناچیز سیب اور کیلا وغیرہ چھیل کر دینے لگا تو شیخ نے ایک ٹکڑا بھی نہ لیا۔ میں سمجھ گیا کہ کچھ گڑبڑ ہے۔ بعد میں اہل خانہ سے میں نے کہا کہ کیا پھل تمہارا لایا ہوا نہیں تھا؟ انہوں نے کہا کہ بات تو یہی ہے، لیکن آپ کو کس نے بتایا؟ پھل ہمارا دوسرا بھائی لے کر آیا تھا۔ میں نے ان سے کہا کہ باوجودیکہ شیخ پھل پسند کرتے ہیں، مگر انھوں نے ہاتھ تک نہیں لگایا۔ گویا اللہ تعالیٰ نے اس سے روک دیا۔

عاجزی وانکساری

آدمی جتنا بڑا ہوگا، اس میں عاجزی اتنی ہی زیادہ ہوگی۔ کہتے ہیں کہ پھل دار درخت ہی جھکا ہوتا ہے۔ عاجزی وانکساری علمائے کرام کو بلند سے بلند کرتی چلی جاتی ہے۔ یہ وصف میرے شیخ میں بدرجہ اتم پایا جاتا تھا۔

۱۹۹۰ء میں اس ناچیز نے اپنے دیرینہ دوست حکیم ڈاکٹر طاہر پرویز بھٹی صاحب سے ۱۰ مرلہ قطعہ زمین شاہ دین کالونی (عقب لاہوری چونگی) میں حاصل کیا اور جامع مسجد ریاض الجنۃ صفدریہ کے سنگ بنیاد کے لیے شیخ سے عرض کیا۔ یہ بندہ پر شیخ کی شفقت تامہ تھی کہ زندگی میں جب بھی اور جس جگہ کے لیے بھی بندہ نے وقت مانگا، الحمد للہ کبھی مایوس نہ لوٹا۔ چاہے اور کسی کو وقت ملے نہ ملے، اس حقیر پر تقصیر کو کبھی خالی نہ لوٹایا گیا۔ دھوپ کا وقت تھا اور اتفاق سے راستہ کوئی بھی صاف نہ تھا۔ حضرت شیخ جی ٹی روڈ تک کار پر تشریف لائے۔ اس سے آگے فقیر کے ساتھ موٹر سائیکل پر ردیف بنے۔ پھر آگے جا کر موٹر سائیکل کا راستہ بھی نہ تھا تو باوجود ضعف وبیماری کے پیدل چل دیے اور ماتھے پر نہ شکن نہ ڈانٹ ڈپٹ، بلکہ شفقتیں بڑھتی ہی گئیں۔ آپ نے سنگ بنیاد رکھا، پھر بے مثال خطاب فرمایا اور اسی طرح واپسی ہوئی۔

ایک بار بندہ نے حضرت کو مدرسہ فیضان سرفراز میں خطاب کے لیے زحمت دی۔ شیخوپورہ کے مشہور عالم دین مولانا فاروقی بھی حضرت کی زیارت واستفادہ کی غرض سے تشریف لائے تھے۔ کھانے کے بعد قیلولہ کے لیے ہمارے پاس زمین پر گدے کے ایک ہی بستر کا انتظام تھا۔ شیخ سے عرض کی کہ آرام فرمالیں۔ وہ منظر آج بھی میری آنکھوں کے سامنے گردش کر رہا ہے کہ شیخ نے مہمان سے فرمایا کہ مولانا آپ بستر پر لیٹ جائیں اور خود چٹائی (صف) پر لیٹنے لگے، مگر مہمان نے بہت منت سماجت کر کے اس بات پر راضی کیا کہ چلیں آدھے بستر پر شیخ اور آدھے پر وہ لیٹ جاتے ہیں۔ شیخ نے اس درخواست کو قبول فرمالیا۔ بندہ پاؤں دبا رہا تھا۔ شیخ نے جب جان لیا کہ مہمان سو گئے ہیں تو آہستہ آہستہ چٹائی کی طرف کھسک گئے تاکہ مہمان کو آرام کا پورا موقع مل جائے۔ اللہ اکبر! کہاں سے تلاش کروں اس بے مثال شخصیت کو!

بندہ شیخ کو لے کر یادگار شہیداں لاہور جامعہ حنفیہ قادریہ کے سالانہ جلسہ پر حاضر ہوا۔ ابھی جلسہ جاری تھا۔ ہم لوگ کھانے وغیرہ سے فارغ ہوئے تو شیخ نے فرمایا کہ وضو کرلو، ہم نماز پڑھ کر چلتے ہیں۔ شیخ نے وضو فرمایا۔ پھر بندہ وضو کے لیے بیت الخلا میں گیا۔ جونہی باہر نکلا تو شیخ نے آگے مصلیٰ بچھا رکھا تھا اور خود رومال بچھا کر اس پر کھڑے ہوگئے اور اقامت کہنا شروع کردی۔ مولانا عبد الرؤف فاروقی اور بعض دیگر چند علما صف میں شیخ کے دائیں بائیں کھڑے ہوگئے اور مجھ ناچیز کو حکم فرمایا کہ نماز دوگانہ پڑھاؤ۔ ساری زندگی نمازیں پڑھتے پڑھاتے رہے ہیں، مگر اس نماز میں ٹانگیں کانپ رہی تھیں۔ آنکھوں سے آنسو جاری تھے، آواز نکالنا بھی دشوار ہو رہا تھا اور یہ ڈر تھا کہ یا اللہ ایسا نہ ہو کہ ساری زندگی کی نمازوں میں سے آج کی نماز کہیں ناقص نہ رہ جائے۔ اے اللہ! قبول فرمالینا۔ میری یہ حالت اپنی جگہ، مگر شیخ کی شفقت، سادگی، عاجزی کی مثال کہاں ملے گی۔

شیخ کا ادب

بندہ نے کئی بار مشاہدہ کیا کہ حضرت صوفی صاحب کبھی اپنے برادر مکرم کے آگے نہیں چلے۔ شیخ کے سامنے بلند آواز سے نہیں بولے اور جب بھی بندہ خدمت عالیہ میں حاضر ہوا، یہ سوال ضرور فرماتے کہ شیخ صاحبؒ سے ملاقات کب ہوئی؟ اگر جواب نفی میں ہوتا تو فرماتے، شیخ صاحب سے ملتے رہا کرو۔ ۸۸، ۸۹ میں بندہ دورۂ حدیث شریف میں شریک تھا۔ چونکہ

حضرات شیخینؒ کی بندہ پر (باوجود نالائقی کے) بے شمار عنایات اور شفقتیں تھیں تو شاید اس بنا پر کوئی نہ کوئی شرارت سوجھتی رہتی۔ ایک مرتبہ ہم چند ساتھیوں نے مشورہ کیا کہ استاد حضرت مولانا عبد القیوم ہزاروی مدظلہ اس گدے پر نہیں بیٹھتے جس پر شیخین کریمین جلوہ افروز ہوتے ہیں۔ تو حضرت ہزاروی مدظلہ بھی تو استاد ہیں، کیوں نہ ان کے لیے گدا بچھایا جائے۔ حسب مشورہ گدا بچھا کر ہم لوگ تاک میں رہے۔ استاد عبد القیوم مدظلہ تشریف لائے تو کتاب ایک طرف رکھی، میز اٹھا کر گدے سے آگے کھسکا دی اور خود چٹائی پر بیٹھ گئے۔ دوسرے دن ہم نے یہ کیا کہ پھٹیاں قریب قریب رکھ کر ان پر حدیث شریف کی کتابیں رکھ دیں اور چند ساتھی خود پہلے سے کلاس میں پہنچ کر بیٹھ گئے۔ استاد عبد القیوم ہزاروی مدظلہ تشریف لائے، کتاب بڑے ہی ادب سے ایک طرف رکھی اور گدا اٹھا کر دیوار کے ساتھ کھڑے کر دیا اور پھر چٹائی پر بیٹھ کر پڑھانے لگے۔ اللہ اکبر! قدر گوہر کی گوہری ہی جانتا ہے، جہلا کو کیا پتا کہ اہل علم کی قدر ومنزلت کیا ہے اور ان کا ادب واحترام کیسے کیا جاتا ہے۔

اتباع سنت

آپ کسی موقع پر بھی سنت کو ہاتھ سے نہ جانے دیتے۔ لباس ہو کلام ہو یا آمد مہمان ہو، نماز روزہ، اعمال، دوست احباب اور مقتدیوں اور تلامذہ کے ساتھ برتاؤ، ہر موقع پر سنت کا لحاظ رکھتے۔ مسکرا کر بولتے، محبت سے ملتے اور ہر عام وخاص کی خدمت ومہمان نوازی کرتے۔ بیماری وضعف کی وجہ سے مسجد کی سیڑھیاں نہ چڑھ سکتے تھے تو گھر میں بھی نماز باجماعت کا اہتمام کرتے۔ تہجد کبھی قضا نہ ہونے دیتے۔ فارغ وقت تلاوت کلام پاک میں بسر ہوتا اور اکثر نماز عصر یا مغرب کے بعد تلاوت میں ہی مشغول رہتے۔ باقی اوقات مطالعہ وتحریر تصنیف کے لیے مقرر تھے۔ ایک روز شیخ کے گھر میں بندہ نے اقامت کہی، اللہ اکبر اللہ اکبر، را کو لام سے ملا کر پڑھا، یعنی ہمزہ کو وصلی بنا دیا۔ سلام پھیرتے ہی شیخ نے فرمایا کہ سامنے الماری سے فلاں کتاب لاؤ اور پھر فرمایا، یہ دیکھو یہ ہمزہ وصلی نہیں قطعی ہے، اس لیے اللہ اکبر اللہ اکبر الگ الگ پڑھا کرو۔ خود بھی تلاوت میں تلفظ کو بڑی احتیاط سے ادا فرمایا کرتے تھے اور فرماتے تھے قرآن پاک عربوں کے لہجے میں پڑھا کرو۔ آپ سفر وحضر میں اپنے ہمراہی اور ساتھی کا بہت خیال فرماتے اور خاص طور پر ڈرائیور کے کھانے پینے اور آرام کا بہت خیال فرماتے اور میزبان سے حکماً فرماتے کہ ڈرائیور کے کھانے پینے کا خیال رکھا جائے۔ استنجا کے وقت پانی کے استعمال سے پہلے مٹی لازماً استعمال فرماتے، حتیٰ کہ سفر میں بھی اس بات کا پورا پورا لحاظ رکھتے۔ آپ عام طور پر عمامہ باندھتے۔ سیاہ اور سفید رنگ کا عمامہ ہوتا اور صرف کبھی کپڑے کی ٹوپی بھی پہن لیا کرتے تھے۔

بہت سے مواقع پر دیکھا اور بہتوں سے سنا کہ شیخ نے دعا فرمائی اور وہ من وعن قبول ہوگئی۔ مدرسہ فیضان سرفراز اور اس کی کامیابی حضرات شیخین کریمینؒ کی دعاؤں اور توجہات کا فیضان اور نتیجہ ہے۔ میرے شاگرد اور ملک کے معروف قاری محمد ارشد محمود صفدر نے بتایا کہ میرا گلا اکثر خراب رہتا تھا، بلکہ ٹھیک بھی ہوتا تو بوقت تلاوت خراب ہو جاتا۔ میں نے ایک روز شیخ سے دعا کروائی، الحمد للہ اب خراب گلہ بھی بوقت تلاوت ٹھیک ہو جاتا ہے۔

مزاح اور ظرافت

بندہ شیخ کی زیارت کے لیے حاضر ہوا۔ اس وقت محمد جمیل خان (لاہوری دروازہ والے) اور محمد احسان حوالدار اور کچھ دیگر لوگ بھی موجود تھے جو میرے بے تکلف دوست اور شیخ کے پروانے دیوانے، مسلک حق پر مر مٹنے والے ہیں۔ جمیل خان

نے بے تکلفی سے میرے بارے میں کہا کہ استاد جی، یہ اچھا خاصا آدمی ہے، لیکن نام ''طوفانی'' پتہ نہیں کسی نے اور کیوں رکھ دیا۔ شیخ نے مسکرا کر فرمایا، چلو بھئی تم اس کا نام نورانی رکھ لو۔ محفل کشت زعفران بن گئی۔ احسان صاحب نے کہا کہ استاد جی، وہ تو دوسرے ذہن کے لوگ ہیں، ان سے نہ ملائیں۔ شیخ نے مسکرا کر فرمایا، چلو یزدانی رکھ لو۔ جمیل صاحب نے عرض کیا کہ استاد جی، یہ بھی مناسب نہیں۔ پھر مسکرا کر فرمایا کہ اچھا بھائی، رحمانی رکھ لو۔ کہا کہ استاد جی، رحمانی تو کمہار کہلاتے ہیں، جبکہ یہ تو کمبوہ ہیں۔ استاد جی بہتر ہوگا کہ انھیں اپنی طرف سے منسوب فرمالیں۔ چلو بھئی ٹھیک ہے، محمد ایوب صفدر۔ مبارک ہو، مبارک ہو۔ ساتھیوں کی آوازیں آئیں اور یوں میرا نام محمد ایوب طوفانی سے محمد ایوب صفدر میں تبدیل ہوگیا۔

شجاعت و بہادری

۲۰۰۰ء کے لگ بھگ قاری شمس الدین احمد اور بندہ نے کوشش کر کے ایک قطعہ زمین دس مرلہ مسجد و مدرسہ کے لیے حاصل کیا۔ شیخ سنگ بنیاد اور بیان کے لیے تشریف لائے۔ آپ بیان فرما رہے تھے کہ بعض ناہنجار غیر مقلدین نے فائرنگ شروع کر دی اور شدید فائرنگ کی۔ بندہ اور بعض احباب شیخ پر جھک گئے کہ خوانخواستہ شیخ کو کوئی نقصان نہ پہنچے، مگر یہ علم وحلم کا پہاڑ نہایت استقلال سے بیان فرماتے رہے۔ بعد میں سنگ بنیاد رکھا اور دعا فرمائی اور بندہ کے ساتھ موٹر سائیکل پر قریب ایک گھر میں کھانے کے لیے تشریف لے گئے۔ ایسے بہت سے واقعات سننے میں آئے تھے کہ گکھڑ منڈی میں اور دیگر دینی اسفار میں کئی دفعہ شیخ کا راستہ روکا گیا، حملہ آور تیار ہو کر بیٹھتے مگر اللہ تعالیٰ شریروں کو اندھا کر دیتے اور شیخ بحفاظت اپنی منزل پر پہنچ جاتے۔ ان حملہ آوروں کے بارے میں شیخ کو پتہ ہی نہ ہوتا مگر گھبرا کر نہ راستہ بدلتے، نہ ان سے کوئی انتقام لیتے اور نہ ہی زبان پر کوئی حرف شکایت لاتے بلکہ دشمن حملہ آوروں اور مخالفوں کو بھی دعائیں ہی دیا کرتے۔

شیخ اور اتباع اکابرؒ

اکثر شیخ فرمایا کرتے کہ الحمد للہ میں نے ۶۵ سال تک خوب مطالعہ کیا ہے، ہر موضوع پر، ہر مسئلہ پر خوب تحقیق کی ہے، مگر اپنے علم اور اپنی رائے کو کبھی اکابر کی رائے سے مقدم نہیں کیا۔ کسی مسئلہ میں میری تحقیق کچھ اور ہے اور اکابر کی رائے کچھ اور ہے تو میں نے اکابر کی رائے ہی پر اعتماد کیا ہے۔ عزیز القدر طلبہ! تم بھی اپنے اکابر ہی پر اعتماد کرنا، اپنی رائے کو اکابر کی رائے پر کبھی مقدم نہ سمجھنا۔ ۱۹۹۴ء میں بندہ نے مدرسہ فیضان سرفراز میں محفل حمد ونعت کا اہتمام کیا۔ غالباً یہ سب سے پہلی محفل تھی۔ کسی نے شیخ کو شکایت کر دی اور بندہ کی طلبی ہوئی۔ شیخ نے فرمایا کہ مولانا، یہ کیا اہل بدعت کی طرح آپ لوگوں نے بھی قوالیاں شروع کر دیں؟ یہ طریقہ اہل بدعت کا ہے۔ اس میں بہت سے اعمال قوالوں سے ملتے جلتے ہیں۔ ناچیز نے عرض کیا کہ استاد جی، کیا حمد ونعت سے منع فرما رہے ہیں؟ فرمایا، ہرگز نہیں۔ حمد ونعت، مدح صحابہ واولیا ضرور ہو مگر جو طریقہ اکابر کا تھا، اس کے مطابق ہو۔ دو چار بیانات ہوں، ضمناً حمد بھی ہو، نعت بھی ہو۔ مگر یہ ساری رات گاتے رہنا اور قوالوں اور بھانڈ مراثیوں کی طرح نوٹ نچھاور کرنا، سننے اور سنانے والوں کا عجیب وغریب حرکتیں کرنا، یہ اسلام کا طرز نہیں۔ اکابر کی اتباع میں ہی خیر ہے۔

شیخ محبوب الخلائق

شیخ کو اللہ تعالیٰ نے غیر معمولی مقبولیت ومحبوبیت سے نوازا تھا۔ زندگی بھر ہر سلیم الفطرت کی خواہش رہی کہ شیخ کی

زیارت اور ملاقات کا شرف حاصل ہو۔ سعودی عرب، بنگلہ دیش، جنوبی افریقہ کے اسفار اور عوام وخواص کی محبت وہاں کے حالات واسفار میں دیکھی جا سکتی ہے کہ ایک وقت میں لاکھوں عوام وخواص شرف زیارت سے باریاب ہو رہے تھے۔ پاکستان میں بھی یہ محبت بام عروج کو پہنچی ہوئی تھی۔ گکھڑ رہائش گاہ پر یا جامع مسجد گکھڑ اور مدرسہ نصرۃ العلوم میں ملاقاتیوں کا تانتا بندھا رہتا۔ آخری عمر میں شیخینؒ بیان کے قابل نہ رہے، کمزوری اور بیماری بڑھاپا کا غلبہ تھا، لوگ صرف زیارت کو تڑپا کرتے تھے۔ بندہ بھی وقتاً فوقتاً خدمت اقدس میں حاضر ہوتا رہتا۔ آج سے چند سال قبل مدرسہ سے فارغ حفاظ کرام کا اصرار تھا کہ ابتدائی طلبہ وحفاظ کی دستار بندی اور دعا حضرت شیخ کے ہاتھوں ہونی چاہیے۔ شیخ سے عرض کیا تو الحمد للہ حضرت شیخ اور حضرت صوفی صاحب دونوں حضرات تشریف لائے۔ دونوں بزرگ کرسی پر تشریف فرما تھے اور ایسا روح پرور منظر تھا جیسے مقتدر ملائکہ تشریف فرما ہوں۔ لوگ بڑی تعداد میں شیخینؒ کی زیارت سے مشرف ہو رہے تھے۔ یقین جانیے حضرات شیخینؒ کی زیارت سے جی نہیں بھرتا تھا اور یہ حال میرا حال نہ تھا بلکہ ہر عقیدت مند کی یہی کیفیت تھی۔

آخری دفعہ حضرت شیخ کی زیارت اور ملاقات کے لیے اہل خانہ کے ہمراہ شیخ کے انتقال سے صرف دو روز قبل حاضری ہوئی۔ مولانا زاہد الراشدی، مولانا عمار خان ناصر، مولانا عزیز الرحمٰن شاہد، مولانا منہاج الحق خان راشد، رانا کفیل، میر لقمان اللہ، ڈاکٹر فضل الرحمٰن اور دیگر حضرات بھی موجود تھے۔ مولانا زاہد الراشدی غیر ملکی سفر سے واپس پہنچے تھے اور ایک کتاب شیخ کی خدمت میں پیش کی جو حضرت نے ان سے منگوائی تھی۔ شیخ نے قبول کرتے ہوئے الماری میں رکھنے کا اشارہ فرمایا۔ اللہ اکبر! اس عمر اور حالت میں بھی علوم سے محبت کا یہ عالم!

شیخ کامل کی محنت کے کامل ثمرات کا مظہر حضرت کا بے مثال جنازہ تھا۔ سچ فرمایا امام احمد حنبلؒ نے کہ ہمارے اور اہل بدعت کے مابین فیصلہ ہمارے جنازے کریں گے۔ شیخ کاملؒ اللہ تعالیٰ کو پیارے ہوتے ہیں تو تہجد کا وقت ہے کہ اس وقت عبادت وریاضت کا تقریباً ۷۵ برس سے شیخ نے انتخاب فرمایا ہوا تھا۔ گرمی سردی بیماری وصحت سفر وحضر میں بھی یہ وقت کبھی قضا نہ ہوا تھا۔ یہ خبر جنگل کی آگ کی طرح پھیل گئی اور لوگ ہر طرف سے گکھڑ کی طرف امڈ آئے۔ دیکھتے ہی دیکھتے گراؤنڈ، پیٹرول پمپ، سڑکیں، گلیاں بھرنے لگیں۔ لاکھوں کا مجمع تھا اور ہر چہرہ اداس، آنکھیں نم، رخسار آنسوؤں سے تر، لرزتے بدن، ہمت ہارے ہوئے وجود مجسمہ سوال بنے ہوئے کھڑے تھے کہ اب مشکل اوقات میں تشنہ لب اپنی علمی پیاس کیوں کر اور کیسے اور کہاں سے بجھائیں گے۔ جنازے میں نہ پہنچ سکنے والے لاکھوں لوگ بے قرار اور ٹوٹے دل سے تمنا کر رہے تھے کہ اے کاش اس مردِ قلندر ولی کامل کے جنازے میں ہم بھی شرکت کر لیتے اور جو پہنچ گئے، ان میں سے ہر ایک کی تمنا تھی کہ اسے شیخ کا دیدار نصیب ہو جائے۔ ہزاروں نے دیدار کیا اور ہزاروں وقت کی قلت کے باعث رہ گئے۔ جو رہ گئے، ان کی تمنا تھی کہ چلو دیدار نہیں ہو سکا تو چارپائی کو کندھا ہی دے لوں۔ اگر یہ بھی نہ ہو سکا تو چلو چارپائی یا اس کے بانسوں کو ہاتھ ہی لگ جائے۔ یہ بھی نہ ہو سکا تو ہم نے دیکھا کہ بہت سے لوگ اپنا رومال اور پگڑی شیخ کی چارپائی سے لگا کر بے چین دل کو چین بخشنے کی کوشش کر رہے تھے اور وہ کپڑا آنکھوں اور سینوں سے لگا رہے تھے۔ غرض ہر کوئی پروانہ وار قربان ہوا چاہتا تھا۔ ملکی تاریخ کا تو کچھ علم نہیں مگر گوجرانوالہ ڈویژن کی تاریخ میں اتنا بڑا اور منظم جنازے کا اجتماع نہ کبھی دیکھا نہ کبھی سنا اور نہ کبھی تصور کیا۔

مولانا عبد القیوم طاہر *

اولئک آبائی فجئنی بمثلهم

میرے والد (اللہ ان کی مغفرت فرمائے اور درجات بلند فرمائے' کبھی زندگی میں ان کی کسی نماز کی تکبیر اولیٰ فوت نہیں ہوئی تھی) صابن سازی کے شعبہ سے وابستہ تھے۔ بڑے زاہد و متقی اور حضرت امام اہل سنتؒ و حضرت صوفی صاحبؒ کے قدموں میں بیٹھنے والے تھے۔ اسی صحبت صالح کا اثر تھا کہ ہم سبھی بہن بھائیوں کو انہوں نے دینی تعلیم کے زیور سے آراستہ کیا۔

۱۹۸۴ء میں راقم الحروف جامعہ نصرۃ العلوم سے سند و دستار لے کر فارغ ہوا۔ ختم بخاری کے موقع پر ہمیں بخاری شریف کی آخری حدیث شیخ العقول والمنقول حضرت مولانا محمد موسیٰ خانؒ شیخ الحدیث جامعہ اشرفیہ لاہور نے پڑھائی۔ ۱۹۸۴ء میں ہی والد مرحوم اور ہمارے محسن شیخ محمد یوسف صاحب زید مجدہم (اللہ ان کی زندگی میں خیر و برکت و آسانیاں پیدا فرمائے) کے مشورہ سے میں نے طاہر سوپ کے نام سے صابن سازی کی ایک فیکٹری لگائی جس کے افتتاح کے لیے اپنے شیخ و مربی حضرت امام اہل سنتؒ کی خدمت میں وقت لینے کے لیے حاضر ہوا۔ فرمایا ''سنگیاں توں دوسرا بندہ ایں جیہڑا فارغ التحصیل ہو کے صابن بنان لگا اے''۔ عرض کی پہلا آدمی کون تھا؟ فرمایا، ''حضرت مولانا قاضی شمس الدینؒ دا صاحبزادہ تے دوجا توں۔'' بات سمجھانے کا انداز بھی کیسا نرالا ہے کہ دین پڑھ کر اس کو آگے پڑھاؤ اور اس کی خدمت کرو نہ کہ دنیا کمانے میں لگ جاؤ۔

بہر حال فرمایا کہ کل اسباق سے فارغ ہو کر بجے چلیں گے، مگر ڈرائیور اکرم سے پوچھ لینا کہ مدرسہ سے لے کر تمہارے گھر تک اور پھر وہاں سے جی ٹی روڈ گوندلانوالہ چوک تک گاڑی کا کتنا پٹرول خرچ ہوگا، وہ تم گاڑی میں ڈلوا دینا کیونکہ گاڑی اور اس میں جلنے والا پٹرول مدرسہ کے کھاتہ کا ہے جبکہ یہ کام تمہارا ہے۔ گھر جاتے ہوئے شیخوپورہ موڑ پر شیخ یونس کے پٹرول پمپ سے میں نے دس لیٹر تیل ڈلوانے کی کوشش کی مگر حضرت نہیں مانے۔ فرمایا صرف اتنا ڈلواؤ جتنا خرچ ہوگا اور اگر زیادہ خرچ کا شوق ہے تو مدرسہ کے فنڈ میں پیسے جمع کرواؤ۔ ہم گھر پہنچے تو ان دنوں عرفات کالونی حیدری روڈ پر سڑکوں اور گلیوں کی حالت اچھی نہیں تھی۔ چنانچہ راستہ خراب ہونے کی بنا پر گاڑی گھر سے دور چھوڑنی پڑی۔ حضرت شیخؒ پیدل گھر تک تشریف لائے اور صابن کے کڑاہے میں تیل ڈال کر آپؒ نے افتتاح کیا۔ دعائے خیر کے بعد فیکٹری سے متصل گھر کے اندر تشریف لے گئے جہاں تواضع احباب کا سادہ سا اہتمام تھا۔ میرے کمرے میں میں الماریوں میں خاصی تعداد میں کتابیں بھی موجود تھیں۔ حضرت شیخؒ کافی دیر تک کتابوں کو دیکھتے رہے، پھر فرمایا کہ ان کو کبھی پڑھتے بھی ہو یا صرف الماریوں کی زینت اور ڈیکوریشن ہی بنا کر رکھا ہوا ہے؟ اس کے بعد واپسی سے قبل حضرت شیخ المکرمؒ نے حضرت مولانا قاضی شمس الدینؒ کے بارے میں پوچھا جو کہ ان دنوں علیل تھے۔ حضرت ان کی عیادت کے لیے جانا چاہتے تھے۔ میں نے عرض کیا کہ حضرت ان کا گھر

---

* چیف ایڈیٹر ہفت روزہ وزارت لاہور

یہاں سے کچھ دور ہے اور گاڑی بھی اس وقت ان کے دروازے تک نہیں پہنچ سکتی تھی۔ حضرتؒ نے فرمایا کہ چلو پیدل ہی چلتے ہیں، ان کی عیادت ضرور کرنی ہے۔ حضرتؒ نے مجھے اپنی جیب سے پیسے دے کر تین کلو مٹھائی منگوائی اور پھر حضرت قاضی صاحبؒ کے گھر ان کی عیادت کے لیے تشریف لے گئے۔ اس موقع پر دونوں بزرگوں کی آپس میں کچھ علمی گفتگو بھی ہوئی۔

اگست ۱۹۸۶ء میں میری منگنی کلر سیداں ضلع راولپنڈی میں ہوئی۔ شروع سے خواہش تھی کہ نکاح حضرت امام اہل سنتؒ سے ہی پڑھواؤں گا۔ رخصتی سے قبل نکاح کا پروگرام بن گیا۔ جب حضرت شیخؒ سے ناچیز نے بات کی اور حضرت سے راولپنڈی جانے اور نکاح پڑھوانے کے لیے وقت مانگا تو آپ نے انکار فرما دیا کہ سنگیا، بہت دور کا سفر ہے اور میں بیمار آدمی ہوں اور ویسے بھی میرے معمولات متاثر ہوتے ہیں۔ فرمایا کہ ''توں زاہد (مولانا زاہد الراشدی صاحب مدظلہ) نوں لے جا''۔ میں نے کہا کہ نہیں، نکاح تو آپ سے پڑھوانا ہے۔ یہ میری دلی خواہش ہے' نہیں تو میں شادی ہی نہیں کرواتا۔ بہر حال حضرتؒ نے کمال شفقت سے مسکراتے ہوئے پھر معذوری ظاہر کی۔ میں تیسرے روز پھر نصرۃ العلوم پہنچ گیا۔ حضرت اسباق سے فارغ ہوئے تو میں نے آپ کا جوتا اٹھا کر باہر رکھ دیا۔ آپ مسجد کے ستون کے ساتھ ہاتھ رکھ کر جوتا پہنتے تھے یا پھر جوتا رکھ کر پاس کھڑے ہوئے ساتھی کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر جوتا پہنتے اور ساتھ ہی جوتا رکھنے والے سے پوچھتے کہ ''ہاں وائی سنگیا خیر ای؟'' یعنی کوئی کام وغیرہ ہے تو بتاؤ۔ اس روز بھی آپ حسب معمول مسجد سے نکلے، اور جوتا پہننے سے قبل مجھے ہمیشہ کی طرح مسکرا کر شفقت و ہمدردی سے ایسے دیکھا کہ ساری تھکان ایسے دور ہوئی کہ روح تک کھل اٹھی۔ آپ اسی طرح پرخلوص میٹھی اور پیار بھری مسکراہٹ و شفقت سے ہر کسی سے ملتے کہ ملنے والا یہی سمجھتا کہ حضرتؒ کو سب سے زیادہ مجھ سے ہی پیار ہے اور آج یہی بات زبان زد عام ہے۔ مجھ سے فرمایا ''سنگیا اج فیر آ گیا ایں'' (آج پھر آ گئے ہو، خیر ہے؟) میں نے عرض کی کہ حضرت نکاح کی تاریخ طے ہو چکی ہے۔ آپ کی شفقت کے لیے حاضر ہوا ہوں اور آپ کے انکار سے قبل ہی میں نے جلدی سے اپنا مدعا یوں بیان کر دیا کہ استاد جی، تین ماہ قبل مولانا عبد الحق صاحب (حضرت شیخؒ کے صاحبزادے اور میرے ہم مکتب) کی شادی پر آپ ان کی بارات کے ساتھ چکوال تشریف لے گئے تھے، حالانکہ آپ ان دنوں کچھ بیمار بھی تھے اور اب تو ماشاء اللہ آپ کی صحت ٹھیک ہے۔ فرق صرف یہ ہے کہ مولانا عبد الحق صاحب آپ کی حقیقی اولاد ہیں اور ہم آپ کی روحانی اولاد ہیں۔ حضرت نے فوراً اپنی آنکھ کے چھوٹے چشمے سے مجھے بڑے غور سے مگر لاڈ و پیار سے دیکھا اور مسکرا دیے اور پھر خوب مسکرا کر فرمایا، ''اچھا بھائی سنگیا! جس طرح تیری مرضی۔ جاؤ تیاری کرو، ان شاء اللہ میں نکاح پڑھانے کے لیے چلوں گا۔'' چنانچہ یہ میری خوش قسمتی اور اعزاز ہے کہ میرا نکاح پڑھانے کے لیے آپ ۹ راگست ۱۹۸۶ء کو ہمارے ہمراہ کلر سیداں ضلع راولپنڈی تشریف لے گئے۔ ہمارے ساتھ برادرم قاری عبید اللہ عامر اور میرے والد مرحوم بھی شریک سفر تھے۔ صبح آٹھ بجے گکھڑ سے روانگی ہوئی، راستہ میں حضرت نے ایک جگہ طہارت اور وضو فرمایا، ایک دو جگہ پانی چائے وغیرہ بھی پی۔ بارہ بجے کلر سیداں پہنچے۔ نکاح سے فارغ ہو کر آپ نے وہاں کی جامع مسجد شیخاں والی میں ظہر کے بعد درس بھی دیا۔ پھر واپسی پر عصر کی نماز قاری اختر صاحب مرحوم کے ہاں پنجن کسانہ میں پڑھی اور مغرب سے قبل گکھڑ پہنچ گئے۔ میرے والد مرحوم نے حضرت کی خدمت میں کچھ ہدیہ پیش کرنا چاہا تو فرمایا کہ میں نکاح اور تقریر کے پیسے نہیں لیا کرتا، بلکہ الٹا اپنی جیب سے مجھے ایک سو روپے دیے۔

حضرت بڑی ہی نفیس طبیعت کے مالک تھے۔ ہمیشہ سفید شلوار قمیص زیب تن کیا کرتے۔ قمیص کی سامنے کی جیب اور بین پر مشینی دھاگے سے سلائی سی ہوئی ہوتی تھی۔ سامنے والی جیب میں ایک قلم اور تعویزات کے لیے کاغذات ہوتے۔ ایک اندر کی جیب ہوتی جس میں زنجیر والی گھڑی ہوتی تھی۔ سر پر پگڑی یا پھر کپڑے کی سادہ سفید ٹوپی پہنتے جو آپ کے نورانی و روحانی چہرے کو چار چاند لگا دیتی۔ نظر قریب اور دور کی دونوں کمزور تھیں، اس لیے ہمیشہ صاف ستھری عینک پہنتے۔ میں نے اپنی پوری زندگی میں ایسی صاف ستھری اور نفیس شخصیت نہیں دیکھی۔

آپ انتہائی ملنسار، خوش اخلاق اور مہمان نواز تھے۔ زمانہ طالب علمی میں راقم الحروف اور برادرم مولانا ظہور احمد رانجھا حضرت شیخ سے ملنے گکھڑ چلے گئے۔ آپ ہم سے بغلگیر ہو کر ایسے ملے جیسے مہینوں کے بچھڑے باپ بیٹے ملتے ہیں۔ آپ نے ہمیں بیٹھک میں بٹھایا اور خود باہر تشریف لے گئے۔ جب دس پندرہ منٹ تک آپ تشریف نہ لائے تو ہم سمجھے کہ شاید حضرت ہمیں بٹھا کر بھول گئے یا کسی اور کام میں مصروف ہو گئے ہیں۔ ہم واپسی کے لیے گھر سے باہر نکلے تو دیکھا کہ حضرت شیخ ہمارے لیے دکان سے مشروب لے کر آ رہے تھے۔ فرمایا سنگیو، کتھے چلے او؟ میں تو تمہارے لیے پانی لے کر آیا ہوں، کیونکہ کوئی بچہ گھر پر نہیں تھا تو میں نے کہا کہ مہمان کو اکرام کے بغیر نہیں جانا چاہیے۔

آپ بڑی باغ و بہار طبیعت کے مالک تھے۔ ہمارا صابن سازی کا کاروبار تھا۔ میں نے ایک دفعہ حضرت سے پوچھا کہ صابن میں مردار جانور کی چربی استعمال ہوتی ہے، کیا یہ درست ہے اور کیا اس صابن سے کپڑے پاک ہو جاتے ہیں؟ آپ نے فرمایا، میرے نزدیک تو درست نہیں، لیکن فتویٰ مفتی صاحب سے لو۔ میں نے عرض کی کہ مفتی صاحب سے پوچھا ہے، وہ کہتے ہیں کہ درست ہے اور ایسے صابن سے کپڑے پاک ہو جاتے ہیں۔ آپ مسکرانے لگ گئے اور فرمایا "سنگیا سچ سچ دسیں، مفتی صاحب نوں کناں صابن دتا ای؟" (سچ سچ بتانا، مفتی صاحب کو کتنا صابن دیا ہے؟) یہ حقیقت ہے کہ وہ ہمارے دور کے انسان ہی نہیں تھے۔ وہ کسی اور دور کے انسان تھے جو ہمارے دور میں پیدا ہو گئے اور یہ ہم پر اللہ کی بہت بڑی نعمت اور احسان عظیم تھا۔ مگر بدقسمتی ہم نے نہ تو ان کی قدر کی، نہ ان سے فیض حاصل کر سکے اور نہ ہی ان کی خدمت کر سکے۔

> "بعض جذباتی قسم کے لوگ ہوتے ہیں اور جذبات میں آ کر غلط قدم اٹھاتے ہیں۔ ضلع گجرات سے ایک صاحب آئے۔ بظاہر بڑے دیندار معلوم ہوتے تھے۔ ان کی بیوی فوت ہو گئی تھی اور اولاد نافرمان تھی اور ان کے پاس زمین تھی۔ کہنے لگے میں ساری زمین مدارس اور مساجد کے لیے وقف کرنا چاہتا ہوں۔ میں نے ان کو سمجھایا کہ دیکھو بھائی، تمہاری اولاد ہے۔ فرماں بردار ہے یا نافرمان، جب تک وہ مسلمان ہیں، تم ان کو وراثت سے محروم نہیں کر سکتے۔ کہنے لگے کہ میں تو دین کے لیے وقف کرنا چاہتا ہوں۔ میں نے کہا کہ یہ تو تمہاری گفتگو سے معلوم ہو رہا ہے کہ تم دین کے لیے وقف کرنا چاہتے ہو اور اولاد کو محروم کرنا چاہتے ہو، یہ شرعی طور پر صحیح نہیں ہے۔ شریعت تمہیں تیسرے حصے تک اجازت دیتی ہے، چاہے مسجد کے لیے وقف کر دو یا مدرسے کے لیے وقف کرو، چاہے یتیم خانے کے لیے وقف کر دو یا کسی غریب کو دے دو، مگر ساری جائیداد نہیں دے سکتے۔" (ذخیرۃ الجنان ۴/ ۳۴، ۳۵)

مولانا مشتاق احمد چنیوٹی*

چند یادیں اور تاثرات

احقر نے ۱۹۸۶ء یا ۱۹۸۷ء میں مدرسہ نصرۃ العلوم میں دورہ تفسیر کے لیے داخلہ لیا۔ اس وقت حضرت مولانا عبد القدوس قارن ناظم مدرسہ تھے۔ امام مسجد بھی وہی تھے۔ سب سے پہلے دار الاقامہ کی مشرقی جانب دوسری منزل پر ایک کمرہ کلاس روم کے طور پر تجویز ہوا۔ تعداد زیادہ ہونے پر مسجد کے برآمدہ میں کلاس ہونے لگی۔ طلبہ کی بکثرت آمد کی وجہ سے کلاس مسجد کی دوسری منزل پر منتقل ہو گئی اور دورہ تفسیر کے اختتام تک وہیں تعلیمی سلسلہ جاری رہا۔ ایک دن دار الاقامہ کی دوسری منزل پر واقع درسگاہ میں جاری تھا کہ کوئی خاتون بچے کو اٹھائے ہوئے وہاں پہنچ گئی کہ بچہ کو دم کرانا ہے۔ حضرت نے معذرت کی، لیکن اس نے ٹلنے کا نام نہ لیا تو اسے اندر بلا کر بچے کو دم کر دیا۔ فرمایا کہ حرف علت کو اندر بلاؤ۔ بعد ازاں فرمانے لگے جس نے سبق میں خلل ڈال دیا ہے، میں اسے حرف علت نہ کہوں تو کیا کہوں!

ہم طلبہ سے حضرت شیخ کبھی کبھی دل لگی فرما لیتے تھے۔ مسجد کے برآمدہ میں جب کلاس لگتی تھی تو احقر آپ کے بالکل سامنے پہلی صف میں بیٹھتا تھا۔ ایک دن آپ جنات کا تذکرہ فرما رہے تھے کہ وہ انسانی شکل میں آ کر پڑھتے بھی ہیں۔ پھر اچانک میری طرف ہاتھ کا اشارہ کر کے فرمانے لگے، مولانا آپ کہیں جنات میں سے تو نہیں ہیں؟ اس پر طلبہ نے ایک قہقہہ لگایا اور سبق کی تھکاوٹ دور ہو گئی۔ بعض ساتھی کئی دن تک احقر کو جن کہہ کر پکارتے رہے۔ ڈیڑھ پونے دو ماہ کے اس عرصے میں مجھے متعدد بار حضرت کے جوتے اٹھانے اور بدن دبانے کی سعادت بھی نصیب ہوئی۔

ایک بار کوئی صاحب حضرت شیخ سے تاریخ لینے کے لیے آئے اور سفارش کے طور پر مولانا زاہد الراشدی صاحب کو ساتھ لائے۔ سبق ختم ہوا تو انہوں نے مدعا عرض کیا۔ حضرت نے فرمایا: سوچ بھی نہیں سکتا۔ شعبان رمضان میں اتنی مصروفیت ہوتی ہے کہ کھانسی بھی آئے تو روک لیتا ہوں کہ شوال میں کھانسوں گا۔

احقر سمیت متعدد طلبہ ایسے تھے جنھوں نے حضرت شیخ الحدیثؒ اور حضرت صوفی عبد الحمید خان سواتی کی پہلی مرتبہ زیارت کی تھی۔ دونوں حضرات جب اکٹھے کھڑے محو گفتگو ہوتے تھے تو وہ عجب پر بہار نظارہ ہوتا تھا۔ ہمارے لیے دور سے تمیز کرنا مشکل ہوتا تھا کہ شیخ صاحب کون سے ہیں اور صوفی صاحب کون سے!

کم از کم چار بار گکھڑ منڈی حضرت کی زیارت کے لیے حاضری کا موقع ملا۔ ایک بار آپ کے پیچھے نماز جمعہ بھی ادا کی۔ آپ پٹھان ہونے کے باوجود پنجابی زبان میں تقریر کرتے ہوئے بہت بھلے لگتے تھے۔ اس تقریر میں آپ نے ایک واقعہ سنایا کہ میرے پاس ایک صاحب آئے اور علیحدگی میں بات کرنا چاہی، لیکن خاموش ہو کر رہ گئے۔ میں نے کہا کہ میری

*استاذ جامعہ عربیہ چنیوٹ۔

مصروفیت کا خیال کرو اور اپنی بات کہو تو اس نے کہا کہ میری کنواری لڑکی امید سے ہے۔ میں نے کہا کہ کتے کا جھوٹا کتا ہی کھاتا ہے۔ جس کا حمل ہے، اسی کے ساتھ بیاہ کر دو۔ وہ زار و قطار رونے لگا کہ بیاہ کیسے کر دوں، اس کے سگے بھائی نے اس کے ساتھ زیادتی کی ہے۔

ایک بار اپنے ایک ہم سبق کے ساتھ حاضر خدمت ہوا تو نماز عصر کا وقت قریب تھا۔ ہم نے اجازت چاہی۔ خیال تھا کہ نماز گوجرانوالہ جا کر پڑھ لیں گے۔ حضرت نے نماز باجماعت پڑھے بغیر جانے کی اجازت نہ دی۔ نماز کے بعد مسجد ہی میں الوداعی مصافحہ کی کوشش کی تو فرمایا کہ مسجد سے باہر نکل کر ملیں گے۔ باہر نکل کر دو تین منٹ بات چیت کی، پھر معانقہ کیا اور جانے کی اجازت دی۔ احقر کو یاد پڑتا ہے کہ فاتحہ خلف الامام کے موضوع پر ایک ضخیم قلمی مسودہ بھی میں نے حضرت کو ہدیہ کیا تھا۔ اس کے مصنف کا نام یاد نہیں رہا۔ آپ خوش ہوئے اور فرمایا کہ یہ اب طبع ہو چکا ہے اور اس بزرگ کے پوتے پرسوں آ کر مجھے ایک نسخہ دے گئے ہیں۔

آپ نے دورہ تفسیر کے اختتام پر کئی نصیحتیں فرمائی تھیں جن میں سے ایک نصیحت یاد ہے۔ فرمایا کہ یہ مت سمجھنا کہ باہر نکلو گے تو تمہیں بنا بنایا ماحول مل جائے گا۔ ہرگز نہیں، تمہیں اپنا ماحول خود بنانا پڑے گا۔ ایک بار گکھڑ منڈی حاضری کے موقع پر نصیحت کی درخواست کی تو فرمایا کہ جو پڑھو، مطالعہ کر کے پڑھو اور جو پڑھاؤ، مطالعہ کر کے پڑھاؤ۔

ایک بار محترم قاری حماد الزہراوی کی وساطت سے حضرت امام اہل سنت کی زیارت کا موقع ملا۔ قاری صاحب نے دورہ تفسیر کی کلاس سے گفتگو کے لیے حاضری کا حکم دیا تھا۔ حضرت شیخ کی معذوری کا عالم دیکھ کر دل کو شدید دھچکا لگا۔ رنجیدہ دلی کے ساتھ واپس لوٹا۔

اس میں شک نہیں کہ حضرت شیخ الحدیثؒ ایک ہمہ جہت اور نابغہ عصر شخصیت تھے۔ آپ نے مختلف علمی ودعوتی کاموں کو اپنایا اور ہر شعبہ میں اپنے ان مٹ نقوش چھوڑے۔ کئی لوگ آکاس بیل کی مانند ہوتے ہیں کہ ان کے زیر سایہ کوئی ترقی نہیں کر سکتا۔ حضرت شیخ الحدیث کے متعلق بلاخوف تردید یہ کہا جا سکتا ہے کہ وہ ایک شجر سایہ دار تھے۔ آپ کے زیر سایہ ہزاروں علما وطلبہ نے دینی تعلیمات سیکھیں، اپنائیں اور لوگوں تک موثر طریقہ سے پہنچائیں۔ آپ نے عقائد باطلہ کی تردید میں بڑی حکمت عملی سے کام کیا۔ تحریر وتقریر اور بحث مباحثہ کے ذریعہ لوگوں کے شکوک وشبہات دور کیے اور دین اسلام اور مسلک دیوبند کی حقانیت آشکارا کی۔ حضرت شیخ الحدیث کی شخصیت کے موثر اور مقبول عام ہونے کی وجوہ احقر کے خیال کے مطابق یہ ہیں:

(۱) آپ نے ساٹھ سال سے زائد عرصہ قرآن وحدیث کی بے لوث خدمت کی۔ آپ نے علمائے سو کی طرح دین کی آڑ میں دنیا اکٹھی نہیں کی۔ بقول حفیظ جالندھری:

یہ نصف صدی کا قصہ ہے دو چار برس کی بات نہیں

(۲) آپ نے مسلک حق کی تعبیر وتشریح موثر انداز میں کی۔ آپ کو اپنے دور کا سب سے بڑا مسلکی ترجمان کہا جائے تو غلط نہ ہوگا۔

(۳) آپ علم وعمل کی جامعیت رکھتے تھے۔ علم وعمل کی جامعیت ایک ایسا سدا بہار پھول ہے جو لوگوں کو بے ساختہ اپنی

طرف متوجہ کرتا ہے۔ اگرچہ جہالت عام ہے، لیکن اس کے باوجود علم وعمل کی جامعیت لوگوں کو اپنی طرف متوجہ کرتی ہے۔ ایسے حضرات کے ارد گرد لوگ اس طرح جمع ہوتے ہیں جیسے شمع کے گرد پروانے۔

(۴) آپ نے کبھی دوسرے مسلک کے رہنماؤں کی طرف غلط باتیں منسوب نہیں کیں اور ان پر کیچڑ نہیں اچھالا۔ تحریر وتقریر میں مکمل ذمہ دارانہ طرز عمل اختیار کرتے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ مخالفین بھی حضرت کی شخصیت کا احترام کرتے تھے۔

حضرت امام اہل سنت کے نام لیواؤں، عقیدت مندوں اور شاگردوں کے لیے یہ ضروری ہے کہ وہ صرف اس پر نازاں نہ رہیں کہ حضرت شیخ الحدیث نے کافی کام کر دیا ہے اور یہ سمجھیں کہ اب ہمیں بدعات ورسومات کے خلاف کام کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ اگر خدانخواستہ یہ سمجھا گیا تو محض پدرم سلطان بود والی بات ہوگی۔ خطابت ومباحثات اور تحریروں میں ذمہ دارانہ اور عالمانہ طرز عمل اختیار کیا جائے۔ بدقسمتی سے سریلی اور جوشیلی تقریروں کا ایسا رواج پڑ گیا ہے کہ خطبا بھی عوام کا صرف چسکا پورا کرنے کی کوشش کرتے ہیں اور عوام بھی سریلے پن یا جوشیلے پن کے معیار پر ہی علما کو پرکھتے ہیں۔ حضرت امام اہل سنت کی زندگی ہمارے لیے مشعل راہ ہونی چاہیے اور ہماری خطابت کا مرکز ومحور قرآن وسنت، سیرت طیبہ، سیرت صحابہ، سیرت اولیا اور شرک وبدعت کا رد ہونا چاہیے۔ حضرت شیخ کی تعلیمات سے یہ سبق ملتا ہے کہ ہم عقائد واعمال میں ما انا علیہ واصحابی کا طرز اختیار کریں، جمہور کی پیروی کریں اور تفردات کے پیچھے نہ دوڑیں۔ قرآن مجید اور احادیث مبارکہ کے دروس کے حلقے زیادہ سے زیادہ قائم کرنے کی ضرورت ہے جہاں ادع الیٰ سبیل بالحکمۃ والموعظۃ الحسنۃ وجادلھم بالتی ھی احسن کے مطابق عمل کرتے ہوئے اصلاح عقائد اور اصلاح اعمال کی مسلسل کوشش کی جائے۔ حضرت شیخ الحدیث کی عقیدت مندی کا تقاضا یہی ہے۔

حضرت شیخ الحدیث اس فانی دنیا سے رخصت ہو گئے۔ باری باری سب نے چلے جانا ہے۔ خوش نصیب ہیں وہ لوگ جو آفتاب وماہتاب بن کر چلتے ہیں، دین اسلام کی سربلندی کا جھنڈا لے کر نکلتے ہیں، قرآن وحدیث کی تعلیمات کو عام کرتے ہیں، تمام دنیا میں اپنا فیض پہنچاتے ہیں۔ حضرت شیخ الحدیثؒ بھی اسی گروہ باصفا کے اہم رکن تھے۔ ان کی یادوں کے چراغ جلتے رہے ہیں اور جلتے رہیں گے۔ آپ اس لحاظ سے بھی خوش قسمت تھے کہ بے شمار روحانی اولاد (تلامذہ) کے علاوہ آپ کی حقیقی اولاد بھی دین اسلام کی خدمت میں مصروف ہے۔ خصوصاً مولانا زاہد الراشدی، مولانا عبد القدوس خان قارن اور مولانا عبد الحق خان بشیر کسی تعارف کے محتاج نہیں ہیں۔ مولانا عمار خان ناصر بھی اپنی الگ علمی پہچان رکھتے ہیں۔ یہ سب حضرات الباقیات الصالحات کا بہترین مصداق ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان سب حضرات کی خدمات کو قبول فرمائیں اور ہم سب کو حضرت شیخ الحدیث قدس سرہ کے نقش قدم پر چلنے کی توفیق دیں، آمین۔

صوفی محمد عالم*

باتیں ان کی یاد رہیں گی

حضرت شیخ الحدیثؒ کی ہستی ایک مایہ ناز ہستی تھی۔ ان کے علمی کمالات سے دنیا خوب واقف ہے۔ میرے جیسا بے علم شخص ان کے علمی مقام کو کیا بیان کر سکتا ہے، لیکن اللہ رب العزت کا مجھ پر احسان عظیم ہے کہ دونوں بزرگ بھائیوں کے سایہ شفقت میں رہتے ہوئے اللہ تعالیٰ نے مجھے دین کی سمجھ عطا فرمائی۔ ایک دن میں اور میرا دوست حاجی محمد شریف مسجد نور سے حضرت صوفی صاحبؒ کا درس سن کر باہر نکل رہے تھے اور آپس میں حضرات شیخینؒ کے علمی کمالات کی بات ہو رہی تھی تو حاجی شریف صاحب کہنے لگے کہ یہ بہت بڑے لوگ ہیں۔ میں نے جواباً کہا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: ثم لتسئلن یومئذ عن النعیم۔ یہ دونوں بھائی بھی ہمارے لیے نعمت عظمیٰ ہیں۔

حضرت صوفی صاحبؒ فرمایا کرتے تھے کہ ایک بزرگ حاجی امداد اللہ مہاجر مکیؒ کے پاس گئے اور دار العلوم دیوبند کے لیے دعا کی درخواست کی۔ عرض کیا کہ حضرت ہمارے مدرسہ کے لیے دعا کریں۔ حاجی امداد اللہ مہاجر مکیؒ فرمانے لگے، واہ بھائی واہ! پیشانی رات کو ہم رگڑتے رہے اور مدرسہ آپ کا ہو گیا۔ اللہ تعالیٰ نے دیوبند کو بہت مستجاب الدعوات شخصیات عطا فرمائیں۔ ان میں سے امام اہل سنت حضرت شیخ الحدیثؒ کی شخصیت کی ہستی بھی ہے۔ جب مدرسہ نصرۃ العلوم للبنات کا مستقل طور پر علیحدہ تعلیم کا آغاز ہوا تو حضرت نے فرمایا کہ ایک شخص لندن سے میرے پاس آیا اور مجھ سے اس بات پر اصرار کرنے لگا کہ مجھ سے ایک وعدہ کریں کہ جو بات میں کہوں گا، آپ اس کو ضرور مانیں گے۔ حضرت نے فرمایا کہ میں نے اس شخص سے کہا کہ پہلے آپ بات کریں، پھر میں اس کے مطابق فیصلہ کروں گا۔ وہ شخص اصرار کرتا رہا اور میں انکار کرتا رہا۔ کافی بحث و مباحثہ کے بعد وہ کہنے لگا کہ میری دو بچیاں ہیں۔ میں چاہتا ہوں کہ آپ ان کو اپنے گھر میں رکھ کر تعلیم پیغمبر سے آراستہ کریں اور ساتھ ساتھ ان کی تربیت بھی کرتے رہیں۔ حضرت اس شخص کی بات کو سن کر فرمانے لگے کہ نہ بابا نہ، میں ایسا نہیں کر سکتا۔ ایک تو میرے بچے جوان ہیں اور دوسرا میرے گھر میں اتنی جگہ نہیں ہے۔

حضرت فرماتے ہیں کہ وہ شخص میرا یہ جواب سن کر بڑی مایوسی کے ساتھ واپس چلا گیا۔ اس بات کو بیان کرنے کے بعد اسی موقع پر حضرتؒ نے انتہائی خلوص سے دعا مانگی کہ اے اللہ مدرسہ نصرۃ العلوم کے معاونین و منتظمین اور اس کے متعلقین کو یہ توفیق عطا فرما کہ وہ ایک رہائشی مدرسہ قائم کریں جس میں طلبہ کی طرح طالبات کے لیے بھی تمام شعبہ جات قائم کیے جائیں۔ ایک عرصہ تک تو اس جامعہ میں مقامی طالبات کے لیے تعلیم کا سلسلہ جاری رہا، لیکن اب الحمد للہ حضرات شیخینؒ کی پرخلوص دعاؤں کے ساتھ اب رہائشی طالبات کا بھی انتظام ہو چکا ہے۔ جب اس جامعہ کی تعمیر نو کا آغاز کرنا تھا تو مہتمم جامعہ

** خادم مدرسہ نصرۃ العلوم گوجرانوالہ

نصرۃ العلوم مولانا حاجی محمد فیاض خان مدظلہ نے اعلان کیا کہ جامعہ للبنات کی تعمیر کے لیے ایک کروڑ کا خرچہ ہے۔ میں نے یہ اعلان سنا تو اس بات کو بالکل بعید نہ جانا کیونکہ حضرت کی پرخلوص دعاؤں کے الفاظ میرے کانوں میں گونج رہے تھے۔ مجھے اس بات کا یقین تھا کہ اللہ تعالیٰ حضرتؒ کی مخلصانہ دعاؤں کے صدقے ایک کروڑ کا جلد ہی انتظام فرما دیں گے۔

جامع مسجد نور میں ایک بابا جی ہوتے تھے جن کا نام محمد ایوب تھا۔ وہ مسجد نور کے خادم تھے اور حضرات شیخینؒ کے پھوپھی زاد بھائی تھے۔ جب بابا جی فوت ہو گئے تو ان کی تجہیز و تکفین کے بعد ان کی نماز جنازہ ادا کی گئی۔ پھر ہم تدفین کے بعد ان کے لیے دعائے مغفرت کر کے سب لوگ واپس آ گئے، لیکن امام اہل سنتؒ بابا جی کی قبر پر کھڑے ہو کر دعا مانگتے رہے۔ میں نے دیکھا کہ دعا کے دوران آپ کی عاجزی و انکساری میں اضافہ ہوتا گیا۔ آپ کی عاجزی دیکھ کر یوں معلوم ہوتا تھا کہ آپ دعا قبول کروانے کے لیے زور دے رہے ہیں۔ آپ کی یہ حالت دیکھ کر میں نے یہ محسوس کیا کہ آپ کا شمار بھی مستجاب الدعوات ہستیوں میں ہے۔ آپ کے بابا جی کی قبر پر کھڑے ہو کر دیر تک دعا مانگنے سے مجھے صحابی رسول کا وہ قول یاد آ گیا جس میں انہوں نے فرمایا تھا کہ مجھے دفنانے کے بعد میری قبر پر اتنی دیر کھڑے رہنا جتنی دیر اونٹ ذبح کرنے کو لگتی ہے۔

ایک دفعہ ہم نصرۃ العلوم کے پرانے مہمان خانہ میں بیٹھے ہوئے تھے۔ حضرت مولانا غلام غوث ہزارویؒ بھی وہاں تشریف فرما تھے اور حضرت شیخ الحدیثؒ بھی موجود تھے۔ مولانا غلام غوث ہزارویؒ نے ایک حدیث پڑھی اور حضرت شیخ سے فرمانے لگے کہ حضرت یہ کس درجہ کی حدیث ہے۔ آپ نے بلا تاخیر جواب ارشاد فرمایا کہ یہ حسن درجہ کی حدیث ہے۔ مولانا غلام غوث ہزارویؒ فرمانے لگے کہ میں نے ایک مضمون لکھا تھا تو جماعت اسلامی کے کسی آدمی نے اس حدیث پر اعتراض کیا کہ یہ حدیث صحیح نہیں ہے تو میں نے یہ حدیث لکھ کر اعظم گڑھ میں مولانا حبیب الرحمٰن اعظمیؒ کے پاس بھیجی۔ انہوں نے بھی یہی فرمایا تھا کہ یہ حدیث حسن درجہ کی ہے۔ اب اس بات کی تصدیق آپ سے بھی ہو گئی ہے تو میں مطمئن ہو چکا ہوں۔

چودھری بشیر احمد پبلک میڈیکل سٹور والے ہندوستان کی سرحد کے قریب ایک قصبہ ہے، غالباً وہ وہاں کے رہائشی تھے۔ وہ مولانا خیر محمد جالندھری کو سالانہ جلسہ پر بلاتے تھے۔ ایک دن بشیر احمد صاحب حضرت صوفی صاحبؒ کے پاس تشریف لائے اور کہنے لگے کہ پاکستان بننے کے بعد میں مولانا خیر محمد جالندھریؒ کے پاس ملتان گیا تو میں نے ان سے پوچھا کہ آپ جو کتاب فاتحہ خلف الامام کے عنوان سے تحریر فرما رہے تھے، وہ کس مرحلے میں ہے؟ مولانا خیر محمدؒ نے فوراً جواب میں فرمایا کہ آپ گوجرانوالہ سے آئے ہیں تو وہاں مولانا سرفراز خان صفدرؒ نے ''احسن الکلام'' لکھ دی ہے۔ اس عنوان پر اب کسی دوسری کتاب کی ضرورت نہیں۔ وہ فرماتے ہیں کہ میں نے واپس آ کر حضرت مولانا سرفراز خان صفدرؒ کے ساتھ رابطہ قائم کیا اور ان کی تصنیف حاصل کی اور ان کی کتاب کا بغور مطالعہ کیا۔ مطالعہ کے بعد مجھے یقین ہو گیا کہ واقعی اب اس کے بعد کسی اور کتاب کی ضرورت نہیں ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ حضرت شیخ الحدیثؒ کے ساتھ پہلے میرا کوئی تعارف نہیں تھا۔ جب میں نے ان سے کتاب لی اور کتاب پڑھی تو اس کے بعد میرے ان سے تعلقات بڑھتے چلے گئے۔

اللہ تعالیٰ نے آپ کو خوابوں کی تعبیر کا بھی بہت زیادہ ملکہ عطا فرمایا تھا۔ یہ اللہ تعالیٰ کا آپ پر احسان عظیم تھا۔ میرے ایک دوست کو اکثر خواب میں سانپ نظر آتے تھے اور خواب میں وہ سانپ کے ساتھ لڑتا تھا۔ اس کی وجہ سے وہ بہت زیادہ پریشان تھا۔ ایک دن اس نے میرے سامنے اس کا تذکرہ کیا تو میں اسے حضرتؒ کے پاس لے گیا۔ حضرت نے اس شخص کو

تسلی دی اور فرمایا کہ بھائی فکر کی کوئی بات نہیں۔ تعبیر اس کی یہ ہے کہ آپ کو دولت ملے گی، لیکن مشقت کے ساتھ ملے گی۔ حضرتؒ کا یہ جواب سن کر وہ شخص مطمئن ہو کر چلا گیا۔ چودھری میڈیکل سٹور (کالج روڈ) کے مالک طاہر صاحب نے مجھ سے اپنی والدہ کا خواب بیان کیا کہ انھوں نے خواب میں دیکھا کہ وہ دودھ گرم کر رہی ہے اور اوپر سے دودھ میں سانپ گر گیا۔ طاہر صاحب کی والدہ اس وجہ سے بہت پریشان بلکہ بیمار ہو گئیں۔ میں نے اس بات کا تذکرہ حضرتؒ سے کیا تو حضرت فرمانے لگے کہ بھائی پریشانی والی بات کوئی نہیں۔ اس خواب کی تعبیر یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ دولت دیں گے اور اس کے ساتھ ایمان بھی سلامت رہے گا۔ اسی طرح ایک خواب میری بیوی نے دیکھا کہ ہمارے گھر کی چھت پر ہوائی جہاز رک گیا ہے۔ میں حضرت کی خدمت میں حاضر ہوا اور حضرت سے یہ خواب بیان کیا تو حضرت بہت پریشان ہوئے اور فرمانے لگے کہ بھائی رزق میں تنگی ہو گی اور جو اللہ تعالیٰ کی رحمتیں اوپر سے نازل ہوتی ہیں، وہ رک گئی ہیں۔

حضرات شیخینؒ دونوں میرے مشفق و مربی بزرگ تھے۔ حضرت شیخ الحدیثؒ سے جب بھی میں نے کوئی بات کی تو حضرت نے حوصلہ افزائی فرمائی۔ ۱۹۷۷ء کا واقعہ ہے کہ مرکزی جامع مسجد شیرانوالہ باغ میں اجلاس ہوا۔ حضرت کے ساتھ میں تھا اور دس پندرہ ساتھی اور بھی تھے۔ ہم سب حضرتؒ کے ساتھ اجلاس میں شرکت کے لیے جا رہے تھے۔ میں سب سے پیچھے تھا تو حضرت نے پیچھے کی طرف مڑ کر دیکھا اور میرے پاس تشریف لائے۔ مجھ سے فرمانے لگے کہ صوفی صاحب، کیا ہم تحریک شروع کر دیں تو لوگ ہمارا ساتھ دیں گے؟ میں نے حضرت کی خدمت میں عرض کیا کہ حضرت لوگوں میں بہت جوش ہے۔ لوگوں کے جوش وجذبہ کو دیکھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ ضرور ساتھ دیں گے۔ حضرتؒ کی یہ بات سن کر مجھے حیرانی اس بات پر ہوئی کہ میں حضرتؒ کا ادنیٰ سا خادم ہوں اور مجھ سے اتنی اہم بات کا مشورہ کر رہے ہیں۔ حضرات شیخینؒ کا عمر بھر یہ مزاج رہا کہ ہر موڑ پر حوصلہ افزائی فرمائی اور کبھی حوصلہ شکنی نہیں کی۔

مدرسہ انوار القرآن للبنات میں طالبات کے ختم قرآن کے موقع پر اکثر حضرتؒ کو دعوت دیتا۔ اگر آپ کی کوئی مصروفیت نہ ہوتی تو آپ ضرور تشریف لاتے۔ اگر کوئی عذر ہوتا تو معذرت فرما لیتے۔ ایک مرتبہ میں نے حضرتؒ کو دعا کے لیے دعوت دی تو اس وقت حضرتؒ کے ساتھ دو گن مین بھی ہوتے تھے۔ آپ مجھ سے فرمانے لگے، صوفی جی میرے ساتھ دو آدمی ہوتے ہیں جنھوں نے جا کر اپنا کام کرنا ہوتا ہے، اس لیے میں معذرت چاہتا ہوں۔ فرمانے لگے کہ کیا پہلے میں نے کبھی آپ کے حکم کی نافرمانی کی ہے؟ جب انہوں نے میرے لیے حکم کا لفظ بولا تو میں پانی پانی ہو گیا اور اس کے بعد کچھ بھی نہ بول سکا۔

جب مدرسہ انوار القرآن للبنات کی پہلی کلاس کی طالبات نے حفظ قرآن کریم مکمل کیا تو حضرت شیخ الحدیثؒ تشریف لائے۔ حضرت نے طالبات کا آخری سبق سنا تو طالبات کے تلفظ کی ادائیگی اور منزل کی پختگی کو خوب سراہا اور حاضرین مجلس اور طالبات کو وعظ و نصیحت فرمائی۔ اس کے بعد مدرسہ کی تعمیر و ترقی کے لیے خصوصی دعا فرمائی۔ جب حضرت واپس جانے لگے تو میری بچیوں نے حضرتؒ کو سلام کیا۔ حضرتؒ نے سر پر دست شفقت رکھا اور پھر مزید دعاؤں سے نوازا۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہ حضرتؒ کی دعاؤں کا ہی نتیجہ ہے کہ آج مدرسہ انوار القرآن ترقی کی طرف گامزن ہے۔ اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے میری چاروں بچیوں کو حضرتؒ کی طرف سے حدیث شریف میں اجازت ملی ہے۔

مولانا قاضی شمس الحق مشتاق*

یادوں کے گہرے نقوش

ہزارہ کی مردم خیز زمین نے ہر دور میں ایسے نامور اہل علم کو جنم دیا ہے جنہوں نے علمِ دین کی نشر و اشاعت، درس و تدریس اور تصنیف و تالیف کے لیے اپنی زندگیاں وقف کر دیں۔ اُن شخصیات میں سے امام اہل سنت محدث عصر استاذ العلماء شیخ الحدیث والتفسیر حضرت علامہ مولانا سرفراز خان صفدر رحمۃ اللہ علیہ بھی ایک تھے جنہوں نے نصف صدی سے زیادہ عرصہ درس و تدریس اور تصنیف و تالیف کے ذریعے علم دین کی خدمت کر کے ۹۵ سال کی عمر میں اپنی جان جانِ آفرین کے سپرد کر دی۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

چُنا ہے پھول عزرائیل نے ایسا گلستاں سے
کہ جس سے ہو گیا سارا چمن ہی دشت و ویرانہ

حضرت کے انتقال پُر ملال سے تحقیق و تصنیف، درس و تدریس، وعظ و تبلیغ کے میخانے ویران ہو گئے۔ یوں تو موت کا سلسلہ ہر لحہ جاری و ساری ہے، لیکن بعض شخصیات کے اُٹھ جانے سے سارا ماحول سوگوار نظر آتا ہے، بالخصوص جب کہ جانے والا گوناگوں اوصافِ حمیدہ کا مالک ہو۔ ایسا وجود جو سراپا خیر اور فیض رساں تھا، اس سے ہمیشہ کے لیے محروم ہو جانا جس قدر صدمے اور افسوس کا باعث ہو سکتا ہے، اس کا بیان و اظہار لفظوں میں کس طرح ہو سکتا ہے۔ وہ ساری عمر فیض رسانی میں مصروف رہے۔ دنیا سے بے نیازی، قناعت، سادگی، خودداری و استغنا، انابت الی اللہ، مجاہدہ و ریاضت، مہمان نوازی، خوش اخلاقی، انکسار و تواضع ان کی شخصیت کے نمایاں جوہر تھے۔ حق تعالیٰ کی توفیق و عنایت سے اپنے علم و قلم سے جو پاکیزہ اور یادگار نقوش و آثار آپ چھوڑ گئے ہیں، وہ رہتی دنیا تک حاملین قرآن و سنت کی راہنمائی کرتے رہیں گے۔

امامِ اہل سنتؒ کی رحلت صرف مسلمانانِ پاکستان ہی کا نہیں بلکہ پوری اسلامی دنیا کا عظیم نقصان ہے۔ ان کا شمار برصغیر (پاک و ہند، بنگلہ دیش) کے چوٹی کے علماے حدیث میں ہوتا تھا، لیکن اس کے باوجود تواضع میں کسی قسم کی کمی کبھی دیکھنے میں نہیں آئی۔ تصنع و تکلفات سے کوسوں دور رہتے تھے۔ ۱۹۷۸ء میں احقر کے نکاح کی تقریب کے لیے شوال کی سات تاریخ مقرر کی گئی تھی۔ حسن اتفاق سے حضرت بھی تشریف لائے۔ جب حضرت کو تقریب نکاح میں شرکت کی دعوت دی گئی تو آپؒ نے نہایت بے تکلفی سے فرمایا کہ ہم ضرور اس تقریب سعید میں شرکت کریں گے اور ایک دن نہیں، دو دن آپ کے گھر پر ٹھہریں گے۔ چنانچہ حضرتؒ مقررہ تاریخ پر تشریف لائے۔ اس موقع پر ضلع مانسہرہ کے تقریباً تمام علماے کرام موجود تھے۔ نکاح سے قبل علماے کرام کے اصرار پر حضرتؒ نے نکاح کی مناسبت سے اپنی شان کے مطابق نہایت عالمانہ اور فاضلانہ

---

* امیر جمعیت علماے برطانیہ۔ خطیب جامع مسجد عبد اللہ بن مسعود برمنگھم انگلینڈ

خطاب فرمایا اور اس کے بعد نکاح بھی پڑھایا اور دعا بھی فرمائی۔ بعد ازاں اپنے ہاتھوں سے چھوہارے اُچھالتے ہوئے فرمایا کہ نکاح کے بعد یوں چھوہارے اُچھالنا سنت ہے۔ اس منظر سے علما اور حاضرین بڑے محظوظ ہوئے۔

۱۹۷۵ء میں احقر جامعہ نصرۃ العلوم میں زیر تعلیم تھا۔ محرم میں میرے والد صاحبؒ تشریف لائے تو دوسرے دن صبح درس کے بعد حضرت صوفی صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے ناشتہ پر بلایا۔ ناشتے کے بعد جب حضرت رحمۃ اللہ علیہ تشریف لائے اور کلاس کے قریب پہنچنے والے تھے کہ احقر نے اطلاع دی کہ میرے والد صاحب آپ سے ملنے آرہے ہیں۔ حضرت نے تعجب سے اپنی پشتو زبان میں پوچھا کہ کہاں ہیں؟ میں نے مہمان خانے کی طرف اشارہ کیا۔ اُدھر سے والد صاحب مہمان خانہ سے باہر آرہے تھے۔ جونہی نظر پڑی، فوراً دوڑ کر مہمان خانہ کی طرف بڑھتے ہوئے ہاتھ کے اشارہ اور زبان سے بھی فرمایا کہ وہیں ٹھہریں، میں خود آرہا ہوں۔ حضرتؒ کے اس طرح دوڑ لگانے سے تمام طلبہ اس طرف متوجہ ہوئے۔ یہ منظر آج بھی میری آنکھوں کے سامنے گھوم رہا ہے۔ ملاقات کے بعد جب والد صاحبؒ نے لاہور جانے کی اجازت مانگی تو حضرتؒ نے اپنے مخصوص انداز میں فرمایا، ”کوئی اجازت نہیں، بڑے طویل عرصے کے بعد آئے ہیں۔ اسباق کے بعد میرے ساتھ گکھڑ جانا ہے اور رات وہیں میرے پاس ٹھہریں گے۔“

بظاہر یہ چھوٹے چھوٹے معمولی واقعات ہیں، لیکن جب ہم ایک طرف حضرتؒ کے بلند مقام و مرتبہ اور مصروفیات و معمولات کو دیکھتے ہیں اور دوسری طرف اپنے چھوٹوں کے ساتھ اس قسم کی بے تکلفی، مروّت، حسن سلوک، تواضع اور مہمان نوازی کو دیکھتے ہیں تو یہ بات بآسانی سمجھ میں آتی ہے کہ حضرتؒ کی زندگی ہم سب کے لیے قابل تقلید اور مشعل راہ ہے، خاص طور پر علما، طلبا، مدارس اسلامیہ کے منتظمین، معلمین اور متعلمین کے لیے۔ مندرجہ بالا واقعات کو ایک طویل عرصہ گزر چکا ہے، لیکن حضرت کی طرف سے ہمارے والد گرامیؒ سے کیا گیا حسن سلوک اور اعزاز و اکرام آج بھی دل میں تر و تازہ ہے اور ایک بیٹے کے دل و دماغ پر اس حسن سلوک کا جو اثر ہو سکتا ہے، وہ محتاج بیان نہیں۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے کہ جب آدمی مر جاتا ہے تو اس کا سلسلہ عمل منقطع ہو جاتا ہے، لیکن تین طریقے ایسے ہیں جو مرنے والے کے نامہ اعمال کو بند نہیں ہونے دیتے۔ ایک صدقہ جاریہ جو انسانوں کی فلاح و بہبود کے کام آئے، دوسرا علم نافع جس سے لوگ بلا واسطہ یا بالواسطہ فیض یاب ہوں اور تیسرے نیک اولاد جو دعا گو ہو۔ یقیناً حضرت شیخ الحدیث رحمۃ اللہ علیہ کے لیے ایصال ثواب کے تینوں ذرائع مہیا ہیں جو ان کے سلسلہ اعمال کو تا قیام قیامت منقطع ہونے نہیں دیں گے۔ ان شاء اللہ۔

آپ سے علم دین حاصل کرنے والے شاگرد اندرون ملک بھی اور بیرون ملک بھی خدمت دین میں شب و روز مشغول ہیں۔ ہمارے یہاں برطانیہ میں بھی آپؒ کے شاگردوں کی اور ان کے شاگردوں کی ایک بہت بڑی تعداد موجود ہے۔ ہماری جماعت جمعیت علمائے برطانیہ کے سیکرٹری جنرل مولانا محمد لقمان میرپوری کا شمار بھی حضرتؒ کے لائق و فائق شاگردوں میں ہوتا ہے۔ انہوں نے جامعہ نصرۃ العلوم سے دورۂ حدیث کے بعد یہاں برمنگھم کے قریب والسال میں ایک ادارہ جامعہ ابوبکر کی بنیاد رکھی ہے جس میں بفضلہ تعالیٰ اس وقت چودہ سو بچے بچیاں دینی اور دنیاوی علوم حاصل کر رہے ہیں۔ گزشتہ سال اسی جامعہ کے شعبہ بنات میں بارہ طالبات نے دورہ حدیث کر کے سند فراغت حاصل کی جن کو حضرت شیخ الاسلام مفتی تقی عثمانی

مدظلہ نے آخری حدیث پڑھائی۔ دیار غیر میں حضرت رحمۃ اللہ علیہ کے علم نافع سے لوگ اس وقت بھی اور ان شاء اللہ تعالیٰ قیام قیامت تک فیض حاصل کرتے رہیں گے۔ اسی طرح برطانیہ کی ایک اور معروف درسگاہ جامعہ الہدیٰ میں بھی آپ کے شاگرد مولانا مسعود صاحب شب و روز پڑھنے پڑھانے میں مصروف ہیں۔ حضرتؒ سے دورہ تفسیر اور دورہ حدیث پڑھنے والے شاگردوں کی کثیر تعداد برطانیہ کے مدارس و مساجد میں پڑھنے پڑھانے میں مصروف ہیں۔ میرے چھوٹے بھائی مولانا عزیز الحق بھی حضرتؒ کے شاگرد بھی ہیں اور حضرتؒ کی بڑی صاحبزادی کے داماد بھی ہیں۔ انہوں نے مانچسٹر کے قریب برنلے میں ایک بہت بڑا چرچ خرید کر مدرسہ مصعبؓ بن عمیر کی بنیاد رکھی ہے، جس میں بحمد اللہ اس وقت چھ کلاسیں درجہ حفظ و ناظرہ کی چل رہی ہیں اور اس وقت تک اٹھارہ طلبا قرآن مجید حفظ کر چکے ہیں۔ یہ سب حضرتؒ کے علم کا فیض ہے جو دیارِ غیر میں بھی جاری و ساری ہے۔

حضرت شیخ الحدیث رحمۃ اللہ علیہ سے جید علمائے کرام نے بھی فیض حاصل کیا، منتہی طلبا نے بھی پڑھا اور آپ نے مختلف موضوعات پر قابل قدر تصنیفات یادگار چھوڑیں جن سے آنے والے رہنمائی حاصل کرتے رہیں گے اور عوام و خواص کے دلوں میں ان کی یاد تازہ رہے گی۔ حضرت رحمۃ اللہ علیہ کے بیٹے سب بفضلہ تعالیٰ عالم دین ہیں اور اپنے والد گرامی کے مشن کے امین اور علم دین کی نشر و اشاعت اور درس و تدریس میں مشغول ہیں۔ عوام الناس میں حضرت رحمۃ اللہ علیہ کے مقبول و محبوب ہونے کی شہادت ان کی نماز جنازہ میں بلا مبالغہ لاکھوں کی تعداد میں عوام و خواص کا وہ ٹھاٹھیں مارتا ہوا سمندر تھا جو شاذ و نادر ہی کہیں نظر آتا ہے۔ اللہ تعالیٰ جس سے محبت کرتا ہے، لوگوں کی نظروں میں اس کو محبوب و مقبول بنا دیتا ہے۔ اللہ تعالیٰ حضرت رحمۃ اللہ علیہ کو اپنے جوار رحمت میں جگہ عطا فرمائے اور ان کی نسبی اور روحانی اولاد اور لواحقین و متعلقین کو صبر جمیل اور ان کے نقش قدم پر چلنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین

بعض سادہ قسم کے لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ تبلیغ صرف وہ ہے جو تبلیغی جماعت والے کرتے ہیں، اور کوئی تبلیغ نہیں کرتا۔ نصرۃ العلوم میں ایک بزرگ باباجی نیک آدمی تھے۔ میرے پاس بیٹھ کر قرآن کا درس سنتے تھے۔ طلبا کی کافی تعداد ہوتی تھی۔ کافی عرصہ کے بعد مجھے کہنے لگے، مولانا! آپ بہت بڑا کام کر رہے ہیں، مگر دین کا کام نہیں کرتے۔ میں نے کہا، باباجی! دین کا کام کیا کروں؟ کہنے لگے، آپ نے کوئی چلہ تو دیا نہیں۔ میں نے کہا، اگر میں چلہ دے دوں تو ان کو کون پڑھائے گا؟ کہنے لگا، ان کو خدا پڑھائے گا۔ بھائی اتنی سادگی بھی نہیں ہونی چاہیے۔ خدا ہر ایک کو خود نہیں پڑھاتا، اس نے پڑھانے کے اسباب بنائے ہیں۔ جو وقت نکال کر باہر جاتے ہیں، وہ بھی مبلغ ہیں، جو اپنی جگہ رہ کر اصلاح کرتے ہیں، وہ بھی مبلغ ہیں، اور اصل جہاد اور تبلیغ قرآن پاک کی تعلیم ہے، اور اس کے مدرسے قائم کرنا۔ باقی ان کے شعبے ہیں۔ (ذخیرۃ الجنان ۸/۴۵)

مولانا سید کفایت بخاری*

علمائے حق کے ترجمان

امام اہل سنت حضرت مولانا محمد سرفراز خان صفدر رحمہ اللہ تعالیٰ سے میرا ابتدائی تعارف حضرت الاستاذ مولانا سید لعل شاہ بخاری رحمہ اللہ الباری کے واسطہ سے ہوا جو پہلے محبت اور بعد میں عقیدت کی شکل اختیار کر گیا۔ حضرت الاستاذ مولانا سید لعل شاہ بخاری رحمہ اللہ الباری ۱۳۳۹ھ/ ۱۹۲۱ء میں اٹک کے نواحی قصبہ حاجی شاہ میں پیدا ہوئے۔ آپ شیخ المشائخ حضرت مخدوم جہانیاں رحمہ اللہ کی اولاد میں سے تھے اور آپ کے آبا واجداد میں کئی پشتوں سے علم وفضل اور تدریس وتصنیف کی پختہ روایت چلی آ رہی تھی۔

آپ رحمہ اللہ ۱۳۶۰ھ/ ۱۹۴۱ء میں دورہ حدیث کے لیے دار العلوم دیو بند تشریف لے گئے جہاں شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی رحمہ اللہ کے حضور میں زانوے تلمذ تہہ کرنے کی سعادت سے بہرہ یاب ہوئے۔ فراغت کے بعد مختلف مقامات پر تدریس فرماتے رہے۔ ۱۳۸۱ھ/ ۱۹۶۱ء سے لے کر تادمِ آخر واہ کینٹ میں خطابت وتدریس فرماتے رہے۔ وہیں ۲۳ر ذوالحجہ ۱۴۱۰ھ/ ۱۷ر جولائی ۱۹۹۰ء کو وصال ہوا اور وصیّت کے مطابق وہاں کے مقامی قبرستان میں سپرد خاک کیے گئے۔ اللھم اغفرلہ وارحمہ وادخلہ فی الجنۃ بغیر حساب۔

حضرت امام اہل سنت رحمہ اللہ کے متعلق حضرت الاستاذ رحمہ اللہ فرماتے تھے کہ دار العلوم دیو بند میں ہم اکٹھے پڑھتے رہے۔ امتحان داخلہ پچاس نمبروں کا تھا۔ ایک ہندوستانی طالب علم نے، جو ابتدائی درجہ سے ہی وہیں دار العلوم میں پڑھ رہے تھے، امتحان میں اکاون نمبر لیے جبکہ حضرت الاستاذ اور امام اہل سنت رحمہما اللہ تعالیٰ دونوں نے اڑتالیس اڑتالیس یکساں نمبر لیے۔ فرماتے تھے کہ ہم تینوں کو جماعت میں شیخ الاسلام حضرت مولانا سیّد حسین احمد مدنی رحمہ اللہ کے بالکل سامنے پہلی صف میں اکٹھے نشست ملی۔ دونوں حضرات کے یہ تعلقات دور طالب علمی کے بعد بھی نہ صرف باقی رہے بلکہ بڑھتے رہے۔ چنانچہ حضرت الاستاذ رحمہ اللہ کی دعوت پر اُن کے ہاں ''مدنی مسجد واہ کینٹ'' میں کئی مرتبہ حضرت امام اہل سنت رحمہ اللہ نے خطاب فرمایا۔

حضرت استاذ رحمہ اللہ نے تردید باطل میں میدان تقریر ومناظرہ میں خاصا کام کیا اور حضرت امام اہل سنت رحمہ اللہ کی طرح باطل کے خلاف اپنا قلم بھی استعمال فرمایا۔ چنانچہ آپ رحمہ اللہ نے اہل بدعت اور نواصب کی تردید میں متعدد علمی وتحقیقی کتب لکھیں جن میں سے سترہ کتب شائع ہو چکی ہیں۔ ان تصانیف میں بھی آپ رحمہ اللہ نے کئی مقامات پر حضرت امام اہل سنت رحمہ اللہ اور ان کی تصانیف کا تذکرہ فرمایا ہے۔ مثلاً:

* کامرہ، کلاں، اٹک۔

۱: آپ رحمہ اللہ حیلہ اسقاط کے رد میں ایک مفصل تحقیق پیش فرما کر لکھتے ہیں:

''مذکورہ بالا کتابیں، جن کے حوالہ جات درج کیے گئے، وہ سب تیرھویں صدی کے اندر لکھی گئی تھیں۔ اب بطور مشتے نمونہ از خروارے چودھویں صدی کے علمائے حق کے فتاویٰ درج کیے جاتے ہیں۔''

(الکلام الموزوں: ۷۴۔۷۵، طبع دوم)

پھر دلیل الخیرات، فتاویٰ دار العلوم دیو بند اور احسن الفتاویٰ کے حوالہ جات نقل فرما کر لکھتے ہیں:

''۴۔ راہ سنت: ۔ محترم برادر حضرت مولانا سرفراز خان صاحب صفدر، جو راقم اسطور کے ہم سبق وہم عصر ہیں، ''المنہاج الواضح'' یا راہ سنت اُن کی گرانقدر تصنیف ہے، انہوں نے بھی ''دعاء بعد جنازہ'' کا ایک عنوان قائم کیا ہے اور نہایت واضح اور قاطع دلائل سے ثابت کیا ہے کہ دعا بعد جنازہ مکروہ اور بدعت ہے''۔

یہاں آپ رحمہ اللہ نے حضرت امام اہل سنت رحمہ اللہ کے ساتھ اپنے تعلقات کے ساتھ ساتھ ان کی محققانہ تصنیف ''راہ سنت'' کے بارے میں بھی اپنی گرانقدر رائے کا اظہار فرما دیا۔

۲: اسی کتاب میں ایک جگہ ''راہ سنت'' کا تذکرہ فرماتے ہوئے لکھتے ہیں:

''اس مسئلہ کی تحقیق کے لیے میں نے کتب فقہ کے علاوہ مندرجہ ذیل مستقل رسالے بھی دیکھے ہیں:

وجیز الصراط، نور الصراط، الاصابہ، غایۃ الاحتیاط، اراءۃ الصراط، النشاط، الانبساط، حکم الاقساط، توثیق الکلام، ''راہ سنت'' وغیرہ''

۳: حضرت الاستاذ رحمہ اللہ کا انداز تصنیف نہایت محققانہ تھا اور مختلف علوم وفنون پر نہایت گہری نظر رکھتے تھے۔ چنانچہ زیر تحریر مسئلہ کے متعلق نہایت تحقیق وتدقیق کے بعد قلم اٹھاتے اور جب لکھنا شروع فرماتے تو بکثرت حوالہ جات سپرد قرطاس فرماتے۔ آپ رحمہ اللہ کی تصانیف میں مختلف علوم وفنون کی کتابوں کے بلا مبالغہ ہزار ہا حوالے ملتے ہیں۔ عادت مبارکہ یہ تھی کہ اصل کتاب دیکھے بغیر حوالہ قطعاً نہیں دیتے تھے۔ ذاتی کتب خانہ بھی بہت وسیع تھا اور حوالہ جات کی تحقیق وتلاش کے لیے سفر بھی فرماتے رہتے تھے۔ آپ رحمہ اللہ کے پورے ذخیرہ تصانیف میں ان دیکھے حوالہ کی صرف ایک مثال ہے اور وہ حضرت امامِ اہل سنت رحمہ اللہ پر آپ رحمہ اللہ کے اعتماد کی بہترین مثال بھی ہے۔ آپ رحمہ اللہ اپنی کتاب ''تسکین السائل عن خمس مسائل'' میں علامہ جلال الدین سیوطی رحمہ اللہ کی کتاب ''تیسیر المقال'' کا ایک حوالہ دینے کے بعد یوں ارقام فرماتے ہیں:

'تنبیہ: ''تیسیر المقال'' چونکہ بندہ کے کتب خانہ میں نہیں ہے مگر بندہ کو یقین ہے کہ یہ حوالہ درست ہے۔ اس لیے کہ برادر محترم مولانا صفدر صاحب نے بھی ''راہ سنت'' میں یہ حوالہ پیش کیا ہے۔''

(تسکین السائل: ۶۵، طبع اوّل مطبوعہ ۱۴۰۴ھ/۱۹۸۴ء)

حضرت الاستاذ رحمہ اللہ اپنے اساتذہ کرام علیہم الرحمہ میں سے سب سے زیادہ شیخ الاسلام حضرت مدنی رحمہ اللہ سے متاثر تھے بلکہ وہ اُن کے عاشق زار تھے اور ہمیشہ اُن کا تذکرہ کرتے ہوئے رو دیتے تھے۔ اسی طرح آپ رحمہ اللہ تفسیر کے سبق میں اور ترجمہ قرآن کریم پڑھاتے ہوئے رئیس الموحدین حضرت مولانا حسین علی رحمہ اللہ کے افادات سناتے رہتے

تھے۔ چنانچہ طالب علمی کے دور سے ہی ان اکابر علیہم الرحمہ سے ایک خصوصی قلبی تعلق پیدا ہو گیا تھا۔ حضرت امام اہل سنت رحمہ اللہ بھی انہی اکابر کی نسبتوں کے امین اور ان کی عظمتوں کے وارث تھے، پھر حضرت الاستاذ رحمہ اللہ سے ان کی تعریف بھی بے شمار مرتبہ سننے میں آچکی تھی، اس لیے اُن سے بھی محبت وعقیدت کا تعلق پیدا ہو جانا بالکل فطری بات تھی۔

آپ رحمہ اللہ نے زیادہ تر دفاع مذہب ومسلک اور تردید باطل کے عنوان پر لکھا۔ خود فرماتے تھے کہ میں نے چوکھی لڑائی لڑی ہے۔ جہاں سے کوئی فتنہ اٹھا، میں نے اُس کا مقابلہ کیا۔ یوں آپ رحمہ اللہ اہل حق کے لیے دفاع وتردید کے موضوع پر بہت بڑا اور وقیع ذخیرہ چھوڑ گئے۔ عام طور پر دیکھنے میں آیا ہے کہ بسیار نویسی معیار کو متاثر کرتی ہے اور جن اہل قلم نے بکثرت لکھا، وہ اپنا معیار برقرار نہیں رکھ سکے۔ مگر یہاں بھی حضرت امام اہل سنت رحمہ اللہ منفرد شان کے ساتھ نظر آتے ہیں۔

آپ رحمہ اللہ نے بکثرت لکھا، مختلف عنوانات پر لکھا مگر ہمیشہ معیاری اور تحقیقی انداز میں لکھا۔ ممکن ہے آپ رحمہ اللہ کے موقف سے کہیں اختلاف کیا جا سکے، آپ کی اختیار کردہ کسی تعبیر سے اتفاق کرنا مشکل نظر آئے یا آپ رحمہ اللہ کے پیش کردہ دلائل پر کہیں بات کی جا سکے، مگر یہ کہنا مشکل بلکہ ناممکن ہوگا کہ آپ رحمہ اللہ نے کوئی بات بے تحقیق لکھ دی یا سہل انگاری اور رواروی میں کوئی موقف اختیار فرما لیا۔ آپ رحمہ اللہ کا قلم اہل حق کا قلم تھا اور آپ رحمہ اللہ نے ہمیشہ اہل حق کے قلم کی پاسداری کی۔

آپ رحمہ اللہ نے زیادہ تر تردید ومناظرہ کے عنوان پر لکھا اور یہ وہ میدان ہے جس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ:

یہاں پگڑی اُچھلتی ہے، اسے میخانہ کہتے ہیں

مگر نہ آپ رحمہ اللہ نے کسی کی پگڑی اُچھالی، نہ میخانہ کے رقصِ مستانہ کا حصہ بنے۔ آپ رحمہ اللہ نے اہل حق کی شان کے مطابق سنجیدگی ومتانت سے اور اپنے مخاطب کے مقام کو ملحوظ رکھتے ہوئے پورے عالمانہ وقار کے ساتھ لکھا اور ناملائم پہلو سے ہمیشہ دامن بچا کے رہے۔

آپ رحمہ اللہ کا تعلق پٹھان قبیلے (یوسف زئی، سواتی) سے تھا اور پٹھانوں کو کبھی درست اردو بولتے نہیں دیکھا گیا، مگر آپ رحمہ اللہ کوثر وتسنیم میں ڈھلی ہوئی ایسی بہترین، شستہ اور رواں مگر ادبی اردو لکھتے ہیں کہ اہل زبان کو بھی کم نصیب ہوئی ہوگی۔ چلتے چلتے کہیں کوئی شعر استعمال فرماتے تو یوں محسوس ہوتا جیسے موتی ٹانک رہے ہوں۔ کہیں اپنے مخاطب کے ہلکی سی چٹکی لیتے ہیں تو ادیبانہ انداز بھی قربان ہوتے نظر آتے ہیں۔ اگر خود مخاطب بھی اسے پڑھے تو یقیناً لطف اندوز ہو۔

۱۴۱۱ھ/۱۹۹۰ء میں آپ رحمہ اللہ کے استاذ شیخ الحدیث حضرت مولانا عبد القدیر رحمہ اللہ کا وصال ہوا تو آپ رحمہ اللہ اُن کی نماز جنازہ پڑھانے کے لیے اُن کے آبائی گاؤں مومن پور (نزد حضرو، ضلع اٹک) میں تشریف لائے۔ وہاں نماز جنازہ سے پہلے اور بعد میں قبر پر بھی حقیقی معنوں میں آپ رحمہ اللہ کے قدموں میں بیٹھنے اور پاؤں دابنے کی سعادت نصیب ہوئی اور آپ رحمہ اللہ نے بہت ہی زیادہ دعاؤں سے نوازا، الحمد للہ علیٰ ذالک۔

ایک مرتبہ برادرم حضرت مولانا حافظ نثار احمد الحسینی مدظلہ کی معیت میں آپ رحمہ اللہ کے دولت کدہ پر عیادت کے لیے حاضری کا موقع نصیب ہوا تو ڈرتے ڈرتے اجازتِ حدیث شریف کے لیے عرض کیا۔ آپ رحمہ اللہ نے اساتذہ حدیث مبارکہ کے متعلق پوچھا، پھر بکمالِ شفقت ومحبت اجازت حدیث شریف سے نوازا اور اپنے مبارک ہاتھوں سے مطبوعہ سند اجازتِ حدیث مبارکہ بھی عنایت فرمائی۔ فجزاہ اللّٰہ تعالیٰ خیرا و أدام اللّٰہ تعالیٰ فیوضہ الی یوم الجزاء۔

اس بدنصیب وکوتاہ دست کو صرف دو بار کی زیارت ہی نصیب ہوئی۔ آپ رحمہ اللہ کی مجلس میں ایک خاص جاذبیت اور کشش تھی کہ اٹھنے کو جی نہیں چاہتا تھا اور آپ رحمہ اللہ کے چہرہ انور پہ وہ نورانیت تھی کہ نظریں ہٹانے کو جی نہ کرے۔ یقیناً یہ تقویٰ وطہارت اور خدمت دین مبین سے لبریز زندگی کا ثمرہ ہے۔

آج جب آپ رحمہ اللہ ہمارے درمیان میں نہیں رہے تو محسوس ہوتا ہے کہ یہ ساری خوبیاں بھی خوشبو کی طرح اپنے جلو میں لے گئے۔ امت پہ ایسا عجب دور آیا ہے کہ جانے والا اپنی جگہ خالی کر کے جاتا ہے اور جانے والی کی جگہ ہمیشہ کے لیے خالی ہی رہتی ہے۔ آپ جیسے باخدا عالم کے لیے صدیوں قرطاس وقلم راہ دیکھا کریں گے اور منبر ومحراب رویا کریں گے مگر کوئی انہیں چپ کرانے والا نہیں ہوگا! ؎

عمرہا در کعبہ وبت خانہ می نالد حیات
تا ز بزم ناز یک دانائے راز آید بروں

آپ رحمہ اللہ کے نماز جنازہ میں شمولیت کی سعادت بھی بفضلہ تعالیٰ سمیٹنے کا موقع ملا۔ یقیناً امام اہل سنت رحمہ اللہ اُن "رجال اللہ" میں سے تھے جن کے جنازہ میں شامل ہونے والے کی اپنی مغفرت کی توقع کی جا سکتی ہے۔ حضرت امام اہل سنت رحمہ اللہ کے بعد ان کی اولادِ صالحہ، جن کی اکثریت علما وحفاظ پر مشتمل ہے، بے شمار تلامذہ ومریدین اور دینی تصانیف کا عظیم ذخیرہ آپ رحمہ اللہ کے لیے بہترین صدقہ جاریہ ہے۔ اللہ تعالیٰ آپ رحمہ اللہ کی ان خدمات کو انتہائی طور پر قبول فرما کر آپ رحمہ اللہ کو درجات عظیمہ سے نوازے اور امت مرحومہ میں آپ رحمہ اللہ کے فیض کو جاری وساری رکھے، آمین۔

ایمان والوں کو ایمان والی عورتیں بھی ملیں گی اور حوریں بھی ملیں گی اور دنیا کی عورتیں بھی ملیں گی اور ان دنیا کی عورتوں کا درجہ حوروں سے زیادہ ہوگا۔ حدیث میں آتا ہے کہ حوریں کہیں گی کہ دیکھو! ہم جنت کی مخلوق ہیں، کوئی کستوری سے پیدا ہوئی ہوگی، کوئی کافور سے، کوئی عنبر سے اور کوئی زعفران سے، تو تم خاکی مخلوق ہو، تمہارا درجہ ہم سے زیادہ ہے اور تمہارا حسن ہم سے بھی زیادہ ہے، اس کی کیا وجہ ہے؟ وہ عورتیں کہیں گی: "بصلوٰتنا وصیامنا" اس لیے کہ ہم روزے رکھتی تھیں، نمازیں پڑھتی تھیں۔ تمہیں کیا تکلیف ہوتی ہے؟ تم تو یہاں مفت کی کھاتی ہو۔ ان نمازوں اور روزوں کی برکت سے اور دین کے سلسلے میں مشکلوں میں پڑنے کی برکت سے ان عورتوں کی حوروں کے اوپر سرداری ہوگی۔ ان کا حسن وجمال حوروں کے حسن وجمال کو مات کرے گا، لیکن شرط یہ ہے کہ یہ عورتیں مومن ہوں، نماز اور روزے کی پابند ہوں۔ کتنی بڑی سہولت ہے عورتوں کے لیے کہ وہ گھر میں ہی نماز پڑھیں۔ جس عورت کا خاوند نمازی ہے، روزہ رکھتا ہے، وہ مسجد میں جا کر باجماعت نماز پڑھتا ہے اور بیوی گھر میں نماز پڑھتی ہے، اس کی بیوی کو وہی ثواب ملتا ہے جو خاوند کو ملا ہے۔ اس عورت نے مسجد میں قدم بھی نہیں رکھا مگر ثواب برابر۔ بیوی اپنے خاوند کو روٹی پکا کر دیتی ہے، کپڑے دھوتی ہے اور خاوند کے گھر کی نگرانی کرتی ہے تو خاوند کے ثواب میں بیوی کا حصہ بھی ہوتا ہے۔ بیبیو، بیٹیو! مسئلہ یاد رکھنا کہ نفلی نمازوں اور نفلی روزوں سے گھر کے کاموں کا ثواب بہت زیادہ ہے۔ (ذخیرۃ الجنان ۱/۷۳)

قاری محمد اظہر عثمان*

دینی تعلق کی ابتدا تو ہے مگر انتہا نہیں

راقم کے جدِ امجد حکیم حافظ احمد حسن مرحوم علیہ الرحمۃ المعروف حافظ جی عرق شربت والے گکھڑ منڈی کے محلہ نئی آبادی میں بریلوی مکتبِ فکر کی جامع مسجد حنفیہ غوثیہ المعروف دارے والی مسجد کے امام و مدرس تھے۔ راقم کے چچا جان عبداللطیف صاحب جو آج کل لاہور میں مقیم ہیں، راوی ہیں کہ میں پورے محلہ سے روٹیاں اور سالن اکٹھا کیا کرتا تھا جو اس دور میں معیوب نہ سمجھا جاتا تھا۔ گیارھویں کا ختم اور اہلِ محلّہ کی فوتگی وغیرہ پر تو مزے ہوا کرتے تھے۔ اسی دوران راقم کے والدِ ماجد حضرت مولوی بشیر احمد لدھیانوی علیہ الرحمۃ کو اللہ تعالیٰ نے امام اہل سنت شیخ الحدیث والتفسیر حضرت مولانا محمد سرفراز خان صفدر نوّر اللہ مرقدہ کا درس قرآن سننے کا موقع عطا فرمایا۔ بس درس قرآن سننا تھا کہ اندر ایک آگ سی لگ گئی۔ یہی آگ آگے بڑھ کر ہمارے پورے ددھیالی خاندان کے عقیدہ کی درستگی کا باعث بنی، وللہ الحمد۔

حضرت والد رحمۃ اللہ علیہ نے باقاعدگی کے ساتھ امام اہل سنت رحمہ اللہ کا درس قرآن و حدیث سننا شروع کر دیا اور اپنے والدِ ماجد حکیم حافظ احمد حسنؒ کے سامنے امامِ اہل سنتؒ کے علم و حکمت کا تذکرہ بھی شروع کر دیا۔ راقم کے جدِ امجدؒ اپنے لختِ جگر کو سمجھاتے اور دھمکاتے کہ تو وہابی مولوی کے پاس مت جایا کر، مگر سختی سے منع کرنے کے لیے کوئی ٹھوس وجہ بھی موجود نہ تھی۔ راقم کے والد ماجدؒ اپنے بقیہ بھائیوں میں سے متمول بھی تھے اور والدین کے لیے متمول بیٹے کی جائز بات کو رد کرنا آسان نہیں ہوتا۔ راقم کے والد ماجدؒ کے بارہا اصرار پر حضرت جدِ امجدؒ بھی ایک دفعہ امام اہل سنتؒ کے حلقہ درس میں پہنچ گئے۔ امام اہل سنتؒ کا درس سننا تھا کہ اللہ ربّ العزت نے کایا ہی پلٹ دی اور فرمانے لگے کہ آہ! ہم نے وقت ضائع کر دیا۔ علم اور اس کا نور تو یہاں موجود ہے۔

پھر حضرت والد ماجدؒ کے ہمراہ جدِ امجد نے بھی حضرت امام اہل سنتؒ کے حلقۂ درس میں باقاعدگی سے جانا شروع کر دیا۔ اس دور میں قبلہ والد صاحب، چچا جان عبداللطیف، تایا جان محمود الحسن حضرت جدِ امجد اور اُن کے والد حافظ عبدالعزیزؒ یہ سب حضرات نمازِ جمعہ کی ادائیگی کے لیے گکھڑ میں ہی ایک اور بریلوی مکتبِ فکر کی جامع مسجد عالیہ صدیقیہ میں جایا کرتے تھے۔ وہاں مولوی بشیر صاحب سیالکوٹی بریلوی جمعہ پڑھایا کرتے تھے۔ ان مولوی صاحب کے علم کا یہ حال تھا کہ ایک جمعہ میں وہ اپنے نمازیوں سے کہنے لگے کہ بھئی پتہ ہے، آئندہ کل شبِ برات ہے اور آپ لوگوں نے خوب چراغاں کرنا ہے اور یہ چراغاں زیادہ سے زیادہ اس لیے کرنا ہے کہ وہابی جلیں۔ (یعنی علم اُسے بھی تھا کہ یہ چراغاں کوئی نیکی کا کام نہیں ہے)۔ حدیثِ قدسی ہے: من عادی لی ولیا فقد آذنته بالحرب ۔ اس پر راقم کے جدِ امجدؒ کے والد حافظ عبدالعزیزؒ نے

*دار القرآن عثمانیہ، گکھڑ۔ گوجرانوالہ

فرمایا کہ بھئی، یہ مولوی تو بس ایسا ہی ہے، لہٰذا آئندہ سے جمعہ بھی برخوردار بشیر کے مولوی یعنی امام اہل سنتؒ کے پیچھے پڑھا کریں گے۔ ادھر دارے والی مسجد والوں کے صبر کا پیمانہ بھی لبریز ہو رہا تھا کہ حافظ جی امام تو ہمارے ہیں مگر درس اور جمعہ کے لیے وہابی مولوی کے پاس جاتے ہیں۔ بارہا منع کرنے کے باوجود بھی حافظ جی منع نہیں ہوئے۔ بالآخر ایک دن انہوں نے یہ کہہ دیا کہ حافظ جی یا تو وہابی مولوی کا وعظ سننا چھوڑ دیں یا پھر ہماری امامت چھوڑ دیں۔

اب چونکہ عقیدۂ توحید کی حلاوت ان کے اندر امام اہل سنتؒ کے علم و عرفان سے رچ بس چکی تھی، اس عقیدہ سے ہاتھ دھونا تو ان کے لیے اتنا ہی مشکل تھا جتنا کہ انگارہ ہاتھ پر رکھنا مشکل ہوتا ہے، لہٰذا حضرت جدِ امجدؒ اللہ ربّ العزت کی ذاتِ اقدس پر کامل بھروسہ رکھتے ہوئے وَاُفَوِّضُ اَمْرِیْ اِلَی اللّٰهِ کہہ کر بریلویوں کی امامت سے مستعفی ہو گئے۔ (ذٰلِكَ فَضْلُ اللّٰهِ يُؤْتِيْهِ مَنْ يَّشَاءُ) اک در بند سو در کھلے۔ اللہ ربّ العزت نے راقم کے والد ماجد کے کاروبار بشیر اینڈ عبداللطیف ٹیکسٹائل ملز گکھڑ میں خوب برکت عطا فرما دی تھی اور جدِ امجدؒ چونکہ حکیم بھی تھے، انہوں نے گکھڑ کی مسجد شاہ جمال کے ساتھ حکمت اور عرق شربت کا کاروبار بھی شروع کر دیا۔ ابتداءً مسجد میں امامت اور پھر رمضان المبارک میں تراویح کا سلسلہ شروع ہوا۔ یوں حضرت جدِ امجدؒ نے پینتیس سال شاہ جمال مسجد میں قرآن سنانے کی سعادت حاصل کی۔ آخری عمر میں اسی مسجد میں بیٹھ کر اپنے پوتے یعنی راقم کے بڑے بھائی جناب حافظ قاری شبیر احمد عثمانی حفظہ اللہ تعالیٰ سے تراویح میں قرآن سنتے رہے۔ حضرت قاری صاحب مدظلہ نے تقریباً بارہ سال مسلسل قرآن سنانے کی سعادت حاصل کی۔ یوں جامع مسجد شاہ جمال میں ہمیں اللہ ربّ العزت نے تین سال کم نصف صدی تک مسلسل تراویح میں قرآن سنانے کی سعادت سے نوازا۔ (هذا من فضل ربی)

۱۹۹۲ء میں حضرت جدِ امجدؒ داعیٔ اجل کو لبیک کہہ کر ہمیں داغِ مفارقت دے گئے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ حضرت جدِ امجدؒ کی نمازِ جنازہ بھی حضرت امامِ اہل سنتؒ نے پڑھائی اور فرمایا کہ ایک وہ وقت تھا جب ہمارے اس پورے علاقہ میں کوئی حافظ نہ ہوتا تھا مگر صرف حکیم حافظ احمد حسن مرحومؒ ہی ہوا کرتے تھے۔ ایک دفعہ حاجی محمد یوسف سیٹھیؒ مرکزی جامع مسجد امام اہل سنتؒ المعروف بوہڑ والی مسجد میں جمعہ کے وقت کھڑے ہو گئے۔ اعلان کیا کہ سارے مجمع میں جو کوئی مجھے تجوید کے ساتھ صرف ایک رکوع قرآن پاک کا سنائے گا تو اُسے پچاس روپے نقد انعام دیا جائے گا۔ یہ ۱۹۵۶ء کی بات ہے۔ اُس دور میں پچاس روپے بہت بڑی رقم ہوا کرتے تھے۔ یہ سعادت بحمد اللہ راقم کے جدِ امجد کو نصیب ہوئی۔ اس پر حاجی سیٹھیؒ کہنے لگے کہ حافظ جی آپ تو لدھیانہ کے ہیں، میں نے اس علاقہ کی بات کی ہے۔ قصہ مختصر حضرت جدِ امجد نے پچاس روپے جمعہ کے مجمع میں بطورِ انعام وصول کیے۔

حضرت امام اہل سنتؒ جمعہ کی نماز سے فراغت کے بعد کچھ دیر مسجد میں تشریف فرما ہوتے۔ لوگ مسائل وغیرہ پوچھتے۔ حضرتؒ اصل پنجابی زبان میں جواب ارشاد فرماتے تاکہ سائلین کو مسئلہ سمجھنے میں کوئی دقت نہ ہو۔ کبھی کبھار مجلس کے اختتام پر حضرتؒ ہمارے غریب خانہ میں دوپہر کے کھانے کے لیے تشریف لاتے۔ اس دوران بھی مجلس ہمیشہ علمی ہی ہوا کرتی تھی۔

حضرت امام اہل سنتؒ خوش طبع بھی بہت تھے۔ علامہ زاہد الراشدی حفظہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ میں ایک دفعہ گھر میں ہاتھوں کو آپس میں باندھ کر گھگھو بجا رہا تھا تو میرے چھوٹے بھائی مولانا منہاج الحق خان [illegible] بڑی خوش ہو رہی تھی۔

اس پر حضرت امام اہل سنتؒ فرمانے لگے کہ زاہد! یہ بھلا کیوں خوش ہو رہی ہے؟ فرماتے ہیں، میں نے پوچھا کہ کیوں خوش ہو رہی ہے؟ حضرت فرمانے لگے کہ یہ اس لیے خوش ہو رہی ہے کہ اتنا بڑا گھگھو ہے۔ سبحان اللہ! مزاح میں بھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی اتباع ہی ہوا کرتی تھی۔

راقم نے بچپن میں ایک خواب دیکھا کہ ہمارے گھر میں ایک لڑکا پیدا ہوا ہے جس کے پیدائشی طور پر دانت بھی موجود ہیں اور ڈاڑھی بھی موجود ہے۔ اس خواب کی تعبیر کے لیے راقم کے والد ماجدؒ حضرت امام اہل سنتؒ کے پاس پہنچے اور خواب ذکر کیا۔ حضرت امام اہل سنتؒ نے تعبیر فرماتے ہوئے ارشاد فرمایا کہ یا تو واقعی آپ کے ہاں ایسا بچہ پیدا ہوگا یا پھر جس نے یہ خواب دیکھا ہے، وہ بچہ آپ کا دین دار بنے گا۔ اب راقم کے ماشاء اللہ دس بہن بھائی ہیں۔ اکثریت کا نام بھی حضرت امام اہل سنتؒ ہی نے رکھا ہے۔ بڑی ہمشیرہ جمیلہ بی بی تھیں جو کہ اللہ رب العزت کو پیاری ہو چکی ہیں جو حضرت امام اہل سنتؒ کے قائم کردہ مدرسہ معارف اسلامیہ میں معلمہ تھیں اور ایک عرصہ تک قرآن وسنت کی خدمت میں مصروف رہی ہیں۔ اللہ رب العزت مرحومہ کی مغفرت فرمائے اور جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام نصیب فرمائے، آمین۔ بقیہ نو بہن بھائیوں میں سے راقم کو اللہ رب العزت نے نام کا عالم بنا دیا ہے، کام کا عالم بننے کی توفیق مرحمت فرمائے۔ آمین۔

میں مشکوۃ شریف اور دورۂ حدیث شریف کے لیے جامعہ اسلامیہ امدادیہ فیصل آباد چلا گیا۔ جامعہ امدادیہ میں کچھ حالات خراب ہوئے تو حضرت امام اہل سنتؒ نے فرمایا کہ العین حق، العین حق، کہ نظر برحق ہے۔ پھر حضرت امام اہل سنتؒ نے فرمایا کہ ہمارے اس جامعہ نے بہت کم عرصہ میں بہت زیادہ ترقی حاصل کی ہے اور حاسدین کی نظر اس کو لگی ہے۔ اس پر حضرت امام اہل سنتؒ نے کافی دیر دعا بھی فرمائی۔ راقم جامعہ اسلامیہ امدادیہ سے فراغت کے بعد اپنے ہم کلاس جناب مولانا مفتی عبدالباسط صاحب حفظہ اللہ تعالیٰ کے ہمراہ، جو آج کل جامعہ اشرفیہ لاہور میں انٹرنیٹ پر افتا کا کام کر رہے ہیں، حضرت امام اہل سنتؒ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور بتایا کہ ہم دورہ حدیث شریف پڑھ چکے ہیں۔ اس پر حضرت امام اہل سنتؒ نے ہمیں سندِ حدیث سے نوازا۔ حضرت امام اہل سنتؒ فرمایا کرتے تھے کہ ہم نے اپنے اکابر کا قرض بحمد اللہ چکا دیا ہے۔ اب تمہارے کندھوں پر یہ قرض ہے۔

تحدیث بالنعمت کے طور پر یہ لکھ رہا ہوں کہ ہمارے خاندان پر زندگی میں تو حضرت امام اہل سنتؒ کا شفقت بھرا ہاتھ تھا ہی، جاتے جاتے بھی آپ ایک نیکی ایسی میرے ہاتھ میں تھما گئے جو ان شاء اللہ میری نجات کا سبب بنے گی۔ وہ یہ کہ حضرت امام اہل سنتؒ کی قبر مبارک میں نے اول تا آخر خود ہی اپنے ہاتھوں سے تیار کی ہے۔ قبر مبارک کا اوپر والا حصہ تقریباً ساڑھے تین فٹ چوڑا، تین فٹ گہرا، آٹھ فٹ لمبا رکھا اور لحد مبارک کا دہانہ تقریباً سولہ انچ کھلا اور ساڑھے سات فٹ لمبا رکھا۔ لحد مبارک کی کل پیمائش زمینی حصہ پر بتیس انچ چوڑائی، ساڑھے سات فٹ لمبائی اور چالیس انچ اونچائی رکھی۔ ظہر کے وقت جب قبر مکمل تیار ہو گئی تو سب لوگ نماز جنازہ کے لیے ڈی سی ہائی سکول کی گراؤنڈ کی طرف جا رہے تھے۔ راقم نے ابھی کپڑے بھی بدلنے تھے، غسل وغیرہ بھی کرنا تھا۔ اسی اثنا میں راقم کے بھائی قاری شبیر احمد عثمانی سلمہ مرقد مبارک پر تشریف لائے تو میں نے کہا کہ آپ یہاں ٹھہریں اور خود غسل وغیرہ کے لیے گھر چلا گیا۔ کپڑے وغیرہ بدل کر جب گھر سے نکلا تو ہجوم دیکھ کر یہ محسوس ہو رہا تھا کہ میں حضرت امام اہل سنتؒ کی زیارت بھی نہ کر سکوں گا، لیکن اللہ رب العزت نے قبر مبارک کی کھدائی کی برکت

سے جنازہ کی تیسری صف میں شامل ہونے کی سعادت سے نوازا اور پھر کچھ پتہ نہ چلا کہ کیسے اسٹیج پر پہنچ گیا۔

وہاں حضرت امام اہل سنتؒ کی جو زندہ کرامت دیکھی، وہ یہ تھی کہ کثرتِ ہجوم کی وجہ سے جس ٹرالہ پر حضرت امام اہل سنتؒ کا جسد مبارک تھا، وہ ٹرالہ سر کی طرف سے چھوٹے سے پائپ کے سہارے کھڑا ہچکولے لے رہا تھا اور میرا کلیجہ منہ کو آ رہا تھا کہ یہ کہیں گر نہ جائے، لیکن اللہ رب العزت نے حضرت امام اہل سنتؒ کی آخری کرامت بھی دکھائی اور وہ ٹرالہ صحیح و سالم اپنی جگہ کھڑا رہا اور حضرت امام اہل سنتؒ کا جسد مبارک معارفِ اسلامیہ کی گاڑی میں رکھ دیا گیا۔ مجھے کسی نے اٹھا کر گاڑی میں داخل کر دیا۔ اب مجھے اللہ رب العزت نے قبرستان تک حضرت امام اہل سنتؒ کی زیارت سے سرفراز فرمایا۔ چہرہ انور دیکھ کر یہ یقین ہو رہا تھا کہ یہ چہرہ روزانہ نماز فجر کے بعد سو دفعہ کلمہ طیبہ کا ورد کرنے والا تھا، کیونکہ چہرۂ انور قسم بخدا چودھویں کے چاند کی طرح چمک رہا تھا۔ قبرستان پہنچے تو اب بھی اللہ رب العزت نے قبر مبارک تک ساتھ نصیب فرمایا۔ قبر مبارک میں حضرت امام اہل سنتؒ کا جسدِ خاکی اتارنے والے خوش نصیبوں میں مولانا زاہد الراشدی، مولانا عبدالقدوس قارن، مولانا عبدالحق بشیر، مولانا عزیز الرحمن شاہد اور حضرتؒ کے خادم خاص میر لقمان اللہ صاحب تھے۔ انہوں نے سنتِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم پر عمل کرتے ہوئے بسم اللہ وعلیٰ ملتِ رسول اللہ پڑھتے ہوئے علم وعرفان کے سورج کو قبر مبارک میں اتار دیا تو ادھر اللہ رب الشمس نے دنیا کے سورج کو مغرب میں غروب فرما دیا۔ لحد مبارک کے دہانے پر کچی اینٹیں لگانے کی سعادت اللہ رب العزت نے راقم کو بھی نصیب فرمائی اور پھر اُن کے اوپر گارا مٹی لگانے کی توفیق سے بھی نوازا۔

حضرت کی وفات کے بعد مرکزی جامع مسجد امام اہل سنتؒ میں حضرت کی یاد میں منعقد ہونے والے ایک اجتماع میں استاذ العلماء حضرت مولانا قاضی حمید اللہ خان صاحب دامت برکاتہم نے پشاور کے کسی عالم دین کا خواب سنایا جس سے سامعین کو ایمان میں خوب ترقی نصیب ہوئی۔ قاضی صاحب نے فرمایا اس عالم دین کا خواب یہ ہے کہ دیکھتا ہوں گکھڑ کا قبرستان، جس میں حضرت امام اہل سنتؒ آرام فرما ہیں، اس میں سے بڑے بڑے سانپ اور بچھو نکل کر باہر آ رہے ہیں۔ اس پر حضرت قاضی صاحب نے فرمایا کہ جس قبرستان میں حضرت امام اہل سنتؒ آرام فرما ہیں، ان میں بقیہ تمام مردوں سے اللہ رب العزت نے یقیناً عذاب ہٹا دیا ہوگا، کیونکہ ایسی شخصیت سینکڑوں سال میں ایک آدھ ہی پیدا ہوتی ہے۔

طوالتِ مضمون سے بچتے ہوئے میری دعا ہے کہ اللہ رب العزت ہمیں حضرت امام اہل سنتؒ کے مسلک ومشرب پر کاربند رہتے ہوئے دین حق کی خدمت کے لیے قبول فرمائے اور حضرت امام اہل سنتؒ کی جملہ خدمات کو شرفِ قبولیت سے نوازتے ہوئے بخشش کا ذریعہ بناتے ہوئے درجات کی بلندیوں کا ذریعہ بنائے اور پس ماندگان کو صبر جمیل نصیب فرمائے اور حضرت امام اہل سنتؒ کی وجہ سے جو خلا واقع ہوا ہے اس کو اپنی قدرتِ کاملہ سے پُر فرمائے اور حضرت امام اہل سنتؒ کے وجود کی وجہ سے جتنے شرور اور فتن دبے ہوئے تھے، وہ اب بھی دبے ہی رہیں اور جس طرح امت کا ایک کثیر حلقہ حضرتؒ کی موجودگی میں حضرتؒ سے فیض یاب ہو رہا تھا، اسی طرح اس حلقہ کو حضرتؒ کے توسل سے ہمیشہ کے لیے فیض یاب ہونے کی توفیق مرحمت فرمائے۔ آمین یا رب العالمین۔

اَللّٰهُمَّ لَا تَحْرِمْنَا اَجْرَهٗ وَلَا تَفْتِنَّا بَعْدَهٗ

مولانا الطاف الرحمٰن*

امام اہل سنت مولانا سرفراز خان صفدر

اللہ تعالیٰ اپنے بعض خاص بندوں سے تھوڑے وقت میں دین کا بہت کام لے لیتے ہیں۔ ہمارے حضرت بھی ان خاص بندوں میں سے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت سے حق کی اشاعت کا بے حد کام لیا۔ حق سے ہر باطل کو جدا کر کے حضرت نے امت مسلمہ کی کتاب وسنت کی روشنی میں بہت عمدہ انداز میں رہنمائی فرمائی۔ حضرت نے ایک بار فرمایا، بحمد اللہ کوئی ایسا باطل اور گمراہ فرقہ نہیں جس نے سر اٹھایا ہو اور ہم نے اس کا تعاقب نہ کیا ہو۔ فرمایا کہ ہمارے اکابر نے ہمیشہ حق کی اشاعت کی اور توحید وسنت پر کاربند رہے۔ فرمایا کہ اکابر کے دامن کو کبھی نہ چھوڑنا، ہم نے اپنے اکابر کے دامن کو تھامے رکھا۔ فرمایا کہ اگر میں بھی اپنے اکابر کو چھوڑ کر الگ راستہ اختیار کرتا تو میرے ساتھ بھی بہت بڑا طبقہ جمع ہو جاتا، مگر میں راہ ہدایت سے دور ہو جاتا۔

بندہ نے حضرت سے دورہ تفسیر القرآن رابعہ کے سال پڑھا اور آخری سال دورۂ حدیث شریف اور پندرہ پارے مکمل تفسیر حضرت سے پڑھنے کی سعادت ۱۴۱۸ھ بمطابق ۱۹۹۷ء میں نصیب ہوئی۔ حضرت کے سب سے چھوٹے صاحبزادے مولانا منہاج الحق راشد ہمارے ہم سبق تھے۔ حضرت کی تصانیف کا مطالعہ کرنے کے بعد شوق پیدا ہوا کہ اپنے وقت کے عظیم محدث، عظیم مفسر، عظیم محقق سے فیض روحانی وفیض علمی حاصل کیا جائے، چنانچہ اللہ تعالیٰ نے کافی موقع عطا فرمایا۔ بطور تحدیث بالنعمت ذکر کر رہا ہوں کہ اس سال حضرت کے دست مبارک سے سب ساتھیوں کی نسبت مجھے زیادہ مرتبہ انعام ملا۔ الحمد للہ بعض دوسرے ساتھیوں کو بھی انعام ملے۔ حضرت کا مزاج مبارک تھا کہ دوران درس خصوصی اور اہم مقامات کو دو یا تین مرتبہ بیان فرماتے تاکہ اچھی طرح ذہن نشین ہو جائے۔ پھر دوسرے مقام پر جب وہ مسئلہ یا بحث آتی تو حضرت فرماتے کہ فلاں مقام پر یہ بحث گزر چکی ہے۔ ھل منکم رجل، کیا تم میں سے کوئی مرد ہے جو بیان کر دے؟

ایک مرتبہ حضرت نے دوران سبق ایک سوال پوچھا اور فرمایا، جو ساتھی جواب دے، اس کو ایک روپیہ انعام دیا جائے گا۔ بحمد اللہ بندہ نے وہ جواب دے دیا۔ حضرت نے جیب میں ہاتھ ڈالا، لیکن ہاتھ خالی لوٹاتے ہوئے فرمایا، بھائی آج فقیر کی جیب خالی ہے، کل دیں گے۔ میں سمجھا کہ حضرت بھول جائیں گے، کیوں کہ ضعیف ہیں، دوسری مصروفیات ہیں، مگر دوسرے دن درس ہونے سے پہلے حضرت نے جیب میں ہاتھ ڈالا اور دو روپے کا نوٹ نکالا۔ ان دنوں دو روپے کا کاغذ کا نوٹ ہوتا تھا۔ حضرت نے فرمایا، یہ لو میاں، ایک روپیہ تمہارے انعام کا اور ایک روپیہ سود کا۔ میں نے ہاتھ کھینچ لیا کہ شاید حضرت امتحان لے رہے ہیں، مگر سبحان اللہ حضرت کی عام گفتگو میں بھی کئی فقہی مسائل سمجھ میں آجاتے۔ فرمایا کہ یہ لو گھبراؤ مت۔ فرمایا، اگر کسی [illegible] ن کا کوئی قرض یا حق دینا ہو اور معاملہ شروع میں سودی طے نہ ہوا ہو، مثلاً کوئی آدمی کسی کو ایک روپیہ دے کر زیادہ لینے

*مدرسہ عربیہ فاروق اعظم، کچا بھٹہ، تحصیل صادق آباد، ضلع رحیم یار خان۔

کی شرط نہ رکھے اور قرض یا حق واپس کرنے والا اپنی خوشی سے زیادہ دینا چاہے تو لینے والے کے لیے حلال ہے۔ حضرت کی اس وضاحت کے بعد بندہ نے ہاتھ بڑھا کر حضرت کے دست مبارک سے دو روپے وصول کر لیے۔

بخاری شریف کے اختتامی پروگرام میں حضرت نے فرمایا کہ آپ سمجھ رہے ہوں گے کہ آج ہم فارغ ہو رہے ہیں، ایسا نہیں بلکہ آپ صرف مفت کھانے سے فارغ ہو رہے ہیں۔ کام کا وقت آپ کا اب شروع ہو رہا ہے۔ خبردار کبھی کسی بدعت میں شریک نہ ہونا۔ اگر آپ نے ایک مرتبہ بھی بدعت کر لی تو ساری زندگی اس کی تردید نہ کر سکو گے۔ اپنے اکابر کے دامن کو تھامے رکھنا۔ بحمد اللہ جس باطل نے سر اٹھایا، ہم نے اس کا تعاقب کیا۔ اب یہ تمہاری ذمہ داری ہے کہ دین حق کی حفاظت اور اشاعت کو اپنا مقصد بناؤ، کیونکہ دیوبندیت کے نام پر روٹی صرف میں نہیں کھاتا، آپ بھی کھاتے ہیں۔

حضرت کی مجالس یاد آتی ہیں تو عجیب لذت محسوس ہوتی ہے۔ حضرت کے ابتدائی دو گھنٹے ہوتے تھے۔ ایسی لذت اسباق میں محسوس ہوتی کہ پتہ ہی نہ چلتا اور وقت گزر جاتا۔ حضرت کے ہاں بخاری شریف کے سبق میں بخاری شریف کی عبارت پڑھنا بھی اہم مسئلہ تھا۔ حضرت نے فرمایا کہ عبارت وہ ساتھی پڑھے جس میں تین خوبیاں ہوں: عبارت صحیح پڑھے، روانی سے پڑھے اور آواز بلند ہو۔ جن تین چار ساتھیوں کو عبارت پڑھنے کا موقع ملتا، ان میں بندہ کو بھی یہ سعادت نصیب ہوتی۔ اکثر ایبٹ آباد کے ایک ساتھی عبارت پڑھتے جو عبارت میں بڑے ماہر تھے۔

جس سال ہم دورۂ حدیث میں تھے، اس سال تبلیغی جماعت کے بزرگ مولانا محمد عمر پالن پوریؒ کا انتقال ہوا۔ حضرت ان کے انتقال پر غم زدہ تھے اور فرمایا، مولانا پالن پوریؒ میرے ساتھ بہت محبت کرتے تھے۔ جب بھی رائے ونڈ آتے تو مجھ سے ملنے آتے اور پچاس روپے بطور تحفہ دیتے اور فرماتے، آپ کی تصانیف کی وجہ سے مجھے آپ سے محبت ہے۔ حضرت امام اہل سنتؒ نے ایک دفعہ فرمایا کہ تبلیغی جماعت والے عمومی طور پر بہت اچھے لوگ ہیں، اگر غلو نہ کریں۔ (یعنی تبلیغ ودعوت کو ہی صرف دین کا کام سمجھ لیں) حضرت نے تبلیغی جماعت کے ایک عمر رسیدہ حاجی صاحب کا واقعہ سنایا کہ میرے ساتھ عقیدت ومحبت رکھتے تھے۔ ایک دن دوران ملاقات فرمانے لگے، مولانا سرفراز! آپ نے اور تو بہت کام کیے، لیکن دین کا کام نہیں کیا۔ میں نے پوچھا، بھائی دین کا کام کیا ہے؟ کہنے لگے کہ آپ نے چلہ نہیں لگایا۔ واقعہ بیان کرتے وقت حضرت مسکرانے لگے اور سب ساتھی ہنسنے لگے۔ باقی دعوت وتبلیغ کے کام کی افادیت سے کون واقف نہیں۔ بگڑے ہوئے لاکھوں لوگوں کو اس محنت کے ذریعے ہدایت مل رہی ہے۔ خود بندہ کالج میں ایف ایس سی کا اسٹوڈنٹ تھا۔ الحمد للہ دعوت وتبلیغ ہی ظاہری طور پر علوم الٰہیہ کی طرف آنے کا سبب بنی اور امام اہل سنتؒ سے شرف تلمذ نصیب ہوا۔

حضرت شیخ الحدیثؒ نے ایک مرتبہ تفسیر کے سبق میں سورۃ العنکبوت آیت نمبر ۱۰ ’ومن الناس من یقول آمنا باللہ فاذا اوذی فی اللہ جعل فتنۃ الناس کعذاب اللہ‘ کا خلاصہ بیان فرمایا۔ کچھ لوگ کچے ایمان کے ایسے بھی ہوتے ہیں کہ زبان سے ایمان کا دعویٰ کرتے ہیں، لیکن جب ایمان کی آزمائش کا وقت آتا ہے، یعنی اللہ تعالیٰ کے دین کے راستہ میں ان کو لوگوں کی طرف سے معمولی تکلیف پہنچتی ہے تو اس تکلیف کو اتنا بڑا محسوس کرتے ہیں جیسے اللہ کا عذاب۔ جیسے اللہ کے عذاب سے ڈر کر کوئی آدمی کسی نامناسب کام سے رک جاتا ہے تو ایسے ہی یہ زبانی ایمان کا دعویٰ کرنے والے لوگوں پر جب بھی اللہ کے راستہ میں دوسرے لوگوں کی طرف سے معمولی سی تکلیف پہنچتی ہے تو اس کو اللہ کے عذاب کی طرح بڑا سمجھ

کر اپنے حق مشن و مقصد کو خیر باد کہہ دیتے ہیں۔

ایک دفعہ حضرت نے فرمایا کہ ہمارے ہم عصر ساتھیوں میں شاید ہی کسی نے ہم جتنا مطالعہ کیا ہو۔ ہم نے چوبیس گھنٹوں میں اٹھارہ اٹھارہ گھنٹے بھی مطالعہ کیا ہے اور نایاب سے نایاب کتب جہاں سے ملیں، جس قیمت پر ملیں، ہم نے حاصل کیں۔ صداقت و دیانت سے کام لیا، حتیٰ کہ مجھے بعض مخالفین کے خطوط بھی ملے جس میں انہوں نے اعتراف کیا کہ آپ سے اختلاف اپنی جگہ، مگر جو حوالہ جات آپ ہماری کتب سے یا دوسری مستند کتابوں سے نقل کرتے ہیں، وہ بغیر کسی قطع و برید کے من و عن درست ہوتے ہیں۔ الفضل ما شهدت به الاعداء۔

اللہ تعالیٰ نے حضرت کو حاضر جوابی اور ذہانت سے وافر حصہ عطا فرمایا تھا۔ فرمایا کہ ایک دن کالج میں درس قرآن کے دوران کسی صاحب نے مجھ سے سوال کیا کہ مولانا یہ ڈاڑھی تو غیر فطری چیز معلوم ہوتی ہے، کیوں کہ انسان کی پیدائش کے وقت نہ تھی۔ میں نے کہا، بھائی اس معیار کے مطابق تمہارے بتیس دانت بھی غیر فطری ہیں، ان کو بھی نکال دو۔ یہ آپ کا لباس بھی غیر فطری ہے، کیونکہ یہ بھی پیدائش کے وقت نہ تھا۔ پھر اس کی کیا ضرورت؟ سب سامعین ہنسنے لگے اور سوال کرنے والے صاحب کی بھی تسلی ہوگئی اور خاموش ہو گئے۔

آخری مرتبہ حضرت کی زیارت کا شرف اس وقت نصیب ہوا جب کچھ عرصہ قبل حضرت کا سفر ضلع رحیم یار خان میں ہوا۔ کئی مدارس کی طرف سے بڑے بڑے اشتہار شائع کیے گئے جن کا عنوان بھی بڑا پیارا تھا، ''رحیم یار خان میں امام اہل سنت کی آمد''، ''رحیم یار خان میں علم و عرفان کی بارش'' وغیرہ وغیرہ۔ حضرت کی زیارت کے لیے ہر طرف سے عوام کا جذبہ زیارت قابل دید تھا۔ تقریباً تمام اہل مدارس کا جذبہ تھا کہ حضرت ہمارے مدرسہ میں بھی کچھ وقت بطور برکت و دعا کے لیے تشریف لائیں۔ چنانچہ بہت زیادہ ضعف و کمزوری کے باوجود کافی اہل مدارس کو حضرت کی آمد کی برکت ملی۔ بندہ بھی کچھ وقت حضرت کے ساتھ رہا۔ حضرت پر کمزوری و ضعف بہت غالب تھا۔ حضرت کے اندر کتاب و سنت کا نور اور امت مسلمہ کی ہمدردی کوٹ کوٹ کر بھری تھی۔ آخری الفاظ جو بندہ نے حضرت سے سنے، وہ یہ تھے کہ خطبہ مسنونہ کے بعد حضرت نے فرمایا کہ یہود و نصاریٰ کبھی مسلمانوں کے دوست نہیں ہو سکتے۔ یہ مسلمانوں کے دشمن ہیں، ان کو دشمن سمجھو۔ یہ مسلمانوں کو مٹانا چاہتے ہیں۔ اس کے بعد حضرتؒ نے دعا فرمائی۔

اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ ہمارے شیخ کو اعلیٰ علیین میں جگہ نصیب فرمائے، حضرت کی تمام جسمانی و روحانی اولاد کو صبر جمیل عطا فرمائے اور اپنے اکابر کے مشن کو جاری رکھنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین۔

> دار الحرب اسے کہتے ہیں کہ جہاں مسلمان اپنے اسلامی فرائض ادا نہ کر سکیں۔ اس تعریف کے مطابق صرف چین اور روس اس زمرے میں آتے ہیں جو مسلمانوں کو کوئی عبادت ادا نہیں کر دیتے تھے، مگر اب وہاں بھی کرنے دیتے ہیں۔ اس کے علاوہ کوئی ایسا ملک نہیں ہے جہاں مسلمانوں کو نماز روزہ اور حج اور زکوٰۃ کی ادائیگی سے روکا جاتا ہو۔ تو اس وقت صحیح معنی میں دار الحرب بھی کوئی نہیں ہے۔'' (ذخیرۃ الجنان ۴/ ۲۴، ۲۵)

حافظ محمد عامر جاوید*

امام اہل سنتؒ اور ان کا پیغام

کسی بھی بڑی شخصیت کی زندگی کا تجزیہ کیا جائے تو چند صفات ایسی ملیں گی جن پر اس کی شخصیت کی تعمیر ہوئی ہوتی ہے۔ حضرت امام اہل سنت رحمہ اللہ کی پوری زندگی اور ان کے مختلف اور متنوع پہلوؤں میں دو چیزیں دو باتیں بنیادی حیثیت رکھتی ہیں۔ ایک رسوخ فی العلم اور دوسرے تقویٰ کا مزاج۔

حضرت اپنی یادداشت اور رسوخ فی العلم کے اعتبار سے علامہ انور شاہ کشمیریؒ کے مقام پر فائز تھے۔ ان کے ہم عصروں میں کوئی عالم یا محدث ایسا نظر نہیں آتا جو حافظہ کے اعتبار سے ان کے برابر ہو۔ استاد محترم مولانا زاہد الراشدی نے حضرت کی میت کو قبر میں اتارتے وقت بجا طور پر فرمایا کہ: ''ہم ایک عالم، فقیہ یا محدث کو نہیں بلکہ برصغیر کی ایک عظیم لائبریری کو قبر میں اتار رہے ہیں۔''

حضرت امام محمدؒ ساری رات مطالعہ کرتے رہتے تھے۔ ایک دفعہ کسی نے پوچھا کہ حضرت آپ رات کو کیوں مطالعہ کرتے ہیں، کیا دن کو وقت کم ہوتا ہے؟ حضرتؒ نے فرمایا کہ ساری دنیا اس اطمینان پر سوئی رہتی ہے کہ اگر صبح کو کوئی مسئلہ پیش آئے گا تو محمدؒ سے پوچھ لیں گے۔ اگر میں بھی سو گیا تو ان کے مسائل کو کون حل کرے گا؟ حضرت امام اہل سنت بھی ذوق مطالعہ کے اعتبار سے امام محمدؒ کے پرتو تھے۔ میں نے استاد محترم مولانا زاہد الراشدی سے حضرت کے ذوق مطالعہ اور اوقات کے متعلق سوال کیا تو انھوں نے فرمایا کہ ویسے تو اوقات متعین ہی تھے، لیکن جب کسی مسئلے میں الجھن ہوتی تو پوری پوری رات مطالعہ میں گزار دیتے، حتیٰ کہ سوتے وقت خواب میں یا پھر ویسے ہی کوئی خیال آ جاتا تو فوراً اٹھتے ہی تحقیق شروع کر دیتے تھے۔

حضرت کی یادداشت آخری وقت تک قائم رہی۔ جہاں سے کوئی کتاب دیکھتے، اس کتاب کا نام، صفحہ اور متعلقہ عربی یا اردو الفاظ یاد رکھتے۔ ایک مجلس میں فرمایا کہ ''اب تو میرا حافظہ کمزور ہو گیا ہے، لیکن میں نے اس موضوع پر دار العلوم دیوبند کی لائبریری کے قبلہ رخ شیلف نمبر ۲ میں رکھی ہوئی تیسری کتاب ''الدر النثیر'' میں فلاں صفحے پر فلاں بحث کے حاشیہ میں یہ شعر پڑھا تھا''۔

طلبہ میں مطالعہ کا ذوق پیدا کرنے کے لیے اور اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرتے ہوئے فرمایا کرتے تھے کہ ''تحدیث نعمت کے طور پر کہتا ہوں کہ افغانستان، پاکستان، ہندوستان اور بنگلہ دیش میں مجھ فقیر سے زیادہ کسی عالم کا مطالعہ نہیں ہوگا''۔ موجودہ دور کے طلبہ کے عدم ذوق کو یوں تعبیر فرماتے تھے کہ طلبہ میں ''ذوق بھی فوت ہو گیا، شوق بھی فوت ہو گیا اور وہ دونوں شاعر تھے۔''

---

* الشریعہ اکادمی، گوجرانوالہ۔

حضرت کو جہاں علم میں رسوخ حاصل تھا، وہیں حاضر جوابی میں بھی کمال درجہ حاصل تھا۔ پروفیسر اشفاق حسین منیر لکھتے ہیں کہ دوران سبق ایک دفعہ حضرت نے فرمایا: جب میں مدرسہ میں ہدایہ شریف پڑھایا کرتا تھا تو ایک غیر مقلد ساتھی آ کر قریب بیٹھ جاتا اور میرا سبق سنتا۔ ایک دفعہ بڑا متاثر ہو کر کہنے لگا کہ مولوی صاحب آپ اتنے بڑے عالم ہو کر بھی مقلد ہیں؟ حضرت نے جواباً فرمایا: مجھے بھی یہی حیرت ہے کہ تم جاہل ہو کر بھی غیر مقلد ہو۔

غالباً ۱۹۹۹ء کی بات ہے۔ الشریعہ اکادمی میں دینی مدارس کے طلبہ کے لیے عصری تعلیم کے سلسلے کے آغاز کے موقع پر استاد محترم مولانا زاہد الراشدی نے حضرات شیخین کو دعوت دی۔ حضرت امام اہل سنتؒ نے اپنے خطاب میں عصری تعلیم بالخصوص انگریزی زبان سیکھنے کی ترغیب دیتے ہوئے یوں فرمایا کہ ”میں برطانیہ گیا تو ایک انگریز نے اسلام کے متعلق اپنے شبہات کا ذکر کیا۔ میں نے اسے جواب دیا، لیکن چونکہ میں انگلش نہیں جانتا تھا، اس لیے ترجمان مقرر کیا گیا۔ اس وقت مجھے احساس ہوا کہ اگر مجھے انگریزی آتی ہوتی تو میں اسے اپنے الفاظ میں اچھی طرح سمجھا سکتا۔ میرے بیٹے عزیزم محمد زاہد نے دینی تعلیم کے ساتھ عصری تعلیم کا آغاز کیا ہے۔ اللہ تعالیٰ قبول فرمائیں۔“

حضرت نے طلبہ کو ختم بخاری شریف کے موقع پر نصیحت کرتے ہوئے فرمایا کہ آج کا کام کل پر نہ چھوڑو۔ جو کام آج کرنا ہے، وہ آج ہی کرو۔ مزید فرمایا کہ اتنے زیادہ کام اپنے ذمے نہ لو جنھیں نباہ نہ سکو۔ اتنا ہی کام اپنے ذمے لو جسے بآسانی نباہ سکو۔ یہ بھی نصیحت فرمائی کہ کام کرتے وقت آپ کے دل میں یہ جذبہ ہونا چاہیے کہ جو امانت میں نے اپنے اساتذہ سے حاصل کی ہے، اس امانت کو ان شاء اللہ العزیز اگلی نسلوں تک پہنچاؤں گا۔

میترانوالی ضلع سیالکوٹ کے ہمارے استاد محترم ماسٹر صفدر صاحب، جو کہ برسوں تبلیغ سے وابستہ رہے، فرماتے ہیں کہ ”میں نائیجیریا میں تبلیغ کے سلسلہ میں گیا اور ایک سال کے بعد واپسی پر رائیونڈ سے سیدھا حضرت شیخ الحدیثؒ کی مسجد میں پہنچا۔ عشا کا وقت تھا اور حضرت گھر تشریف لے جا چکے تھے، لہٰذا میں مسجد میں ہی ٹھہرا اور صبح نماز سے پہلے حضرت سے ملا۔ حضرت نے بڑی شفقت فرمائی اور بڑی محبت سے معانقہ کیا۔ نماز کے بعد فرمایا کہ آج درس کے بجائے ماسٹر صاحب کا بیان ہوگا۔ ماسٹر صاحب نائیجیریا میں ایک سال تبلیغ کا کام کر کے آئے ہیں۔ میں کچھ ہچکچایا تو فرمایا! بھائی جماعت کی کارگزاری سنا دو۔ چنانچہ اس دن میں نے نائیجیریا کے حالات سنائے“۔

اتنی بڑی شخصیت، محدث و مفسر کا ایک غیر عالم آدمی کی گفتگو کے لیے اپنے درس کو ترک کر دینا حضرت کی شفقت، دینی تڑپ اور انتہا درجے کی عاجزی کے سوا کیا ہو سکتا ہے۔

حضرت کی ایک خاص صفت تقریباً تمام بڑے بڑے حضرات سے سنی جو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت اور آپ کی چھوٹی سے چھوٹی ادا کو اپنانے کا نتیجہ تھی۔ وہ ترمذی شریف کی حدیث "افشوا السلام" پر عمل تھا کہ حضرت کے پاس جو بھی ملنے آتا، حضرت دور ہی سے سلام کہہ دیتے۔ کئی حضرات نے ذکر کیا کہ ہم نے چاہا کہ آج تو میں حضرت کو پہلے سلام کروں گا، لیکن حضرت نے موقع ہی نہ دیا اور دور ہی سے السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ کہہ دیتے۔ اللہ تعالیٰ ہمیں اس پاکیزہ صفت پر عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔

حضرت مدرسہ کی گاڑی کو گھر سے مدرسہ اور مدرسہ سے گھر جانے کے علاوہ استعمال نہ کرتے تھے، حتیٰ کہ اگر بازار کی

طرف جانا ہوتا تو بھی پیدل جاتے۔ ڈرائیور کہتا کہ میں نے بھی ادھر ہی جانا ہے، تب بھی سوار نہ ہوتے۔ گویا یہ فرماتے کہ یہ گاڑی صرف علم حدیث کے اسباق پڑھانے کے لیے مجھے دی گئی ہے، نہ کہ کسی دوسرے کام کے لیے اور اگر میں کسی دوسرے مصرف میں استعمال کروں گا تو امانت میں خیانت ہوگی۔ مدرسہ میں سبق پڑھانے کے دوران اگر کوئی دوست آ جاتا تو اس کے پاس بیٹھنے کا وقت نوٹ کر لیا کرتے اور سال کے آخر میں یا کسی موقع پر کل وقت کو جمع کر کے اس کے مطابق تنخواہ میں سے کٹوتی کرا دیتے۔ جو طالب علم صبح مدرسہ میں اجتماعی حاضری لگاتا، حضرت اس کو اپنی تنخواہ میں سے کچھ نہ کچھ ضرور دیتے۔ استاد محترم مولانا محمد یوسف صاحب فرماتے ہیں کہ جس سال میں حاضری لگاتا، حضرت مجھے ۱۰۰ روپے دیتے تھے۔ حضرت کے ذہن میں یہ تصور تھا کہ چونکہ یہ میرا کام ہے اور میں نے نہیں کیا، لہٰذا جو اس کو سر انجام دے رہا ہے، اس کو معاوضہ دینا چاہیے۔

حضرت شیخ صاحبؒ طلبہ کو نماز کی پابندی کرنے کی تلقین کرتے ہوئے فرماتے کہ یہ تقریباً ۱۹۴۰ء سے قبل کا زمانہ تھا جب میں مدرسہ انوار العلوم میں زیر تعلیم تھا۔ ایک رات بہت دیر تک مطالعہ کرتا رہا۔ صبح کچھ دیر ہو گئی اور نماز فجر کی ایک رکعت چھوٹ گئی۔ نماز کے بعد استاد محترم مولانا عبد القدیر صاحبؒ نے بلایا اور فرمایا کہ ”تم طالب علم ہو اور تمہاری تکبیر اولیٰ فوت ہو گئی بلکہ ایک رکعت بھی چھوٹ گئی!“ اس کے بعد اب تک الحمد للہ کبھی عمداً تکبیر اولیٰ فوت نہیں ہوئی۔

حضرت امام اہل سنت کا موقف جہاں بے لچک ہوتا، وہاں زبان میں اتنی ہی نرمی اور لچک تھی۔ حضرت کے مواعظ، خطبات، دروس اور درس حدیث، سب میں یہ خصوصیت ہر شخص محسوس کرتا ہے۔ استاد محترم مولانا زاہد الراشدی بیان فرماتے ہیں کہ ایک دفعہ مولانا عبد القادر روپڑی صاحب سے کچھ اختلاف ہوا تو میں نے جواب دیتے ہوئے یوں تحریر کیا ”عبد القادر روپڑی لکھتا ہے“۔ مضمون مکمل کر کے حضرت والد محترم کے پاس لے گیا تو انھوں نے سخت غصے میں تھپڑ مارنے کے لیے ہاتھ اُٹھایا اور ڈانٹ پلاتے ہوئے فرمایا کہ عبد القادر تمہارا چھوٹا بھائی ہے؟ استاد محترم فرماتے ہیں کہ وہ دن اور آج کا دن، ہزار اختلاف ہونے کے باوجود میں کبھی اعتدال سے باہر نہیں جاتا اور نہ کبھی کسی کی بے ادبی اور تنقیص کا خیال دل میں آتا ہے۔ یہ سب والد محترم ہی کی تربیت کا نتیجہ ہے۔

بعض حضرات، حضرت کے تصنیف و تالیف کے مخصوص ذوق سے نامناسب نتائج اخذ کرتے ہیں۔ یہ صرف حضرت کے ساتھ خاص نہیں بلکہ ہر بزرگ کے جذباتی اور فہم و فراست سے متبعین ایسا ہی کرتے ہیں۔ ان کا طرز بیان یہ ہوتا ہے کہ حضرت نے ہر فتنے کا مقابلہ کیا، غیر مقلدین کو لاجواب کر دیا، حیات و ممات کے مسئلے پر مخالفین کی بولتی بند کر دی، فلاں گروہ کے رد میں دلائل کے انبار لگا دیے، لہٰذا حضرت کے اس مشن کو جاری رکھتے ہوئے ہمارا فرض ہے کہ ہم اپنی تقریروں، دروس اور خطبات جمعہ میں ان مسائل کو ڈنکے کی چوٹ پر بیان کریں گے۔ حضرت کی یاد میں منعقد کی جانے والی مجالس اور پروگراموں میں ایسی باتیں کثرت سے سننے کو ملیں، لیکن ہم سمجھتے ہیں کہ یہ حضرات، صحیح استدلال نہیں کر رہے، بلکہ حضرت کے طرز عمل کا صرف ایک پہلو کو لے کر جو ان کو بھاتا ہے، باقی تمام پہلوؤں کو نظر انداز کر رہے ہیں۔ حضرت نے یقیناً ان تمام مسالک کے رد پر کتابیں لکھیں اور شرح و بسط سے لکھیں، لیکن حضرتؒ کے پیش نظر مخالفین کی اصلاح تھی نہ کہ جنگ و جدال، لہٰذا ہمیں بھی یہ مسائل بیان کرتے وقت اصلاح، ہمدردی اور خیر خواہی کے جذبے کو مد نظر رکھنا ہوگا۔ دوسرے یہ کہ حضرت کی تمام کتابیں دفاع میں لکھی گئی تھیں۔ غیر مقلدین نے بے جا اعتراضات کیے تو حضرت نے ان کے رد میں لکھا، حیات و

ممات کے مسئلے پر تشدد کا رویہ سامنے آیا اور عوام کے عقائد کی خرابی کا اندیشہ ہوا تو حضرت نے کتابیں تصنیف کیں، بریلویوں نے رسوم ورواج کو دین بنانا چاہا تو حضرت نے بدعت وسنت میں فرق کو واضح کیا۔ گویا تردید ومجادلہ کے انداز کو ضرورت کے حد تک محدود رکھا، جبکہ حضرت کی عمومی تقاریر، دروس اور خطبات میں ایسے مسائل شاذ ونادر ہی کہیں زیر بحث آتے تھے۔

حضرت شیخ رحمہ اللہ گکھڑ کی مرکزی جامع مسجد میں فجر کی نماز کے بعد جو درس دیا کرتے تھے، اسے پنجابی زبان سے اردو میں مولانا محمد نواز بلوچ منتقل کر رہے ہیں۔ اب تک اس کی آٹھ جلدیں شائع ہو چکی ہیں۔ ان دروس کی فہرست کا تجزیہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ آٹھ جلدوں کے ۲۹۲۷ صفحات میں ۳۲۷ دروس ہیں جن کے ذیلی عنوانات ۲۰۲۶ ہیں۔ ان عوامی دروس میں زیر بحث آنے والے دو ہزار سے زائد ذیلی نکات اور موضوعات میں سے صرف پچاس عنوانات ایسے ہیں جو اختلافی مسائل سے متعلق ہیں۔ اسی طرح حضرت کے چالیس سے زائد خطبات جمعہ کو جامعہ قاسمیہ گوجرانوالہ کے زیر اہتمام ''خطبات امام اہل سنت'' کے عنوان سے تین جلدوں میں شائع کیا گیا ہے۔ ان تین جلدوں کے مجموعی صفحات ۸۳۹ ہیں اور ان میں کوئی خطبہ بھی باقاعدہ کسی اختلافی عنوان پر نہیں دیا گیا، جبکہ ۴۶۸ ذیلی عنوانات میں سے صرف دس عنوانات اختلافی مسائل کے دائرے میں آتے ہیں۔

چنانچہ حضرت کے طرز عمل کی اتباع کا تقاضا یہ ہے کہ ہم بھی عوام الناس کی حقیقی دینی ضروریات کو سمجھیں اور اپنے دروس اور خطبات میں انھی کو موضوع بنائیں۔ اگر ہم اردگرد کے ماحول اور عوام کی ذہنی سطح کو نظر انداز کرتے ہوئے منبر ومحراب کو ہر موقع پر اپنے مخصوص مسلکی ذوق اور رجحان کی تسکین کا ذریعہ بنانا شروع کر دیں تو یہ حضرت کے طرز عمل کی اتباع نہیں، بلکہ اس کی مخالفت کہلائے گا۔ ہمیں ذمہ دارانہ رویہ اختیار کرتے ہوئے ہر اس بات سے پرہیز کرنا چاہیے جس سے عوام میں بلا ضرورت انتشار، بے چینی اور بے اطمینانی پیدا ہو اور ایسا انداز اپنانا چاہیے جو عوام میں حقیقی دینداری کے فروغ اور ان کی رشد وہدایت کا ذریعہ بنے۔

> اس پر فتن اور پر آشوب دور میں، جس میں مادی قوتوں نے لوگوں کے اذہان وافکار کی کایا ہی پلٹ کر رکھ دی ہے اور ہر آدمی مادی ترقی ہی کا خواہاں اور دلدادہ ہے، ایک مسلمان کے لیے اتنا ہی کافی ہے کہ وہ بنیادی عقائد اور اصول دین پر سختی سے کاربند ہو اور ان پر عمل پیرا ہو کر اپنی قبر اور آخرت کو سنوار سکے۔ اس نازک دور میں باریک اور دقیق علمی وتحقیقی موشگافیوں اور فروعی مسائل کو چھیڑنا کسی طرح بھی مستحسن نہیں ہے، مگر بعض مجبوریاں ایسی بھی ہوتی ہیں کہ اگر فروعی مسائل میں راجح اور حق پہلو کو عوام کے سامنے نہ پیش کیا جائے تو وہ غلط ڈگر پر چل نکلتے ہیں اور راجح وحق پہلو پر عمل کرنے والوں، کیا حضرات سلفؒ اور کیا خلفؒ، سب کو بنظر حقارت دیکھنے لگتے ہیں اور ایسے غلط کار لوگ اپنی غیر معصوم رائے کو حرف آخر سمجھ لیتے ہیں اور اس کی نشر واشاعت کچھ ایسے انداز سے کرتے ہیں کہ عوام حضرات سلفؒ وخلفؒ سے بدظن اور بے زار ہو جاتے ہیں...... ناچار حضرات سلف وخلفؒ اور اکابر کا دامن تھامنے والوں کو بھی کچھ کہنا ہی پڑتا ہے اور دفاع کے بغیر عالم اسباب میں اور چارہ ہی کیا ہے؟
>
> (سماع الموتی، ص ۱۳، ۱۴)

مولانا عبد اللطیف قاسم چلاسی*

ایک شخص جو لاکھوں کو یتیم کر گیا

امام اہل سنت حضرت مولانا محمد سرفراز خان صفدرؒ کی پہلی دفعہ زیارت اس وقت ہوئی تھی جب میں دار العلوم کبیر والا میں غالباً درجہ حفظ میں زیر تعلیم تھا۔ حضرت شیخ تقریب ختم بخاری کے موقع پر تشریف لائے تھے۔ اس وقت چونکہ حضرت کا نام بھی پہلی دفعہ سنا تھا اور زیارت بھی پہلی دفعہ ہوئی تھی اور ساتھ ذہن بھی کچا تھا، اس لیے نہ تو حضرت کے چہرے کے نقوش ذہن میں رہے اور نہ باتیں یاد رہیں۔

۲۰۰۰ء میں جب میں نے مدرسہ نصرت العلوم گوجرانوالہ میں تجوید میں داخلہ لیا تو اس وقت حضرت سے استفادہ کا موقع ملا اور قرآن مجید کے ابتدائی بیس پارے سماع کرنے کا بھی شرف حاصل ہوا۔ اس وقت واضح ہوا کہ حضرت کتنی بڑی شخصیت کے مالک ہیں۔ پھر جوں جوں حضرت کی خدمت میں رہنے اور استفادہ کرنے کا موقع ملتا رہا، توں توں عقیدت ومحبت بھی بڑھتی گئی۔ تقریباً ڈیڑھ سال تک روزانہ زیارت اور درس میں بیٹھنے کی سعادت اور کبھی کبھار جسم دبانے کا موقع بھی ملتا رہا۔ پھر زیادہ علیل ہونے کی وجہ سے آپ نے مدرسہ نصرت العلوم کو خیرباد کہہ دیا۔

امام اہل سنت جتنی بڑی شخصیت کے مالک تھے، اس سے کہیں زیادہ ان کے اندر عاجزی وانکساری پائی جاتی تھی۔ سبق کے دوران جب کسی مسئلہ کی تحقیق کرتے تو ضروری وضاحت کے بعد فرماتے کہ تفصیل کے لیے میری فلاں کتاب کا مطالعہ کریں جس میں برصغیر پاک وہند کے جید علمائے کرام کی تقریظات موجود ہیں۔ پھر فرماتے کہ اس میں میرا کیا کمال ہے، یہ سب میرے اکابرین کی برکات وثمرات ہیں۔ اور فرماتے ''کیا پدی کیا پدی کا شوربہ''۔ اللہ اکبر! اتنی بڑی شخصیت اپنے لیے ایسے الفاظ ومحاورات استعمال کرتی ہے۔

امام اہل سنت صرف ایک مدرس اور محقق نہیں بلکہ اپنے وقت کے بہت بڑے ولی اللہ بھی تھے۔ غالباً ۲۰۰۵ء میں روزنامہ ''اسلام'' کے ہفتہ وار میگزین ''بچوں کا اسلام'' میں حضرت کے ایک شاگرد نے اپنے مضمون میں یہ واقعہ لکھا کہ ایک موقع پر وہ پندرہ شعبان کو ملاقات کی غرض سے حضرت کے ہاں حاضر ہوئے۔ جوں ہی کمرے میں داخل ہوئے تو کیا دیکھتے ہیں کہ حضرت زار وقطار رو رہے ہیں۔ انھوں نے سبب پوچھا تو فرمایا کہ روؤں نہ تو کیا کروں۔ جب سے ہوش سنبھالا ہے، آج تک میرا پندرہ شعبان کا [illegible] چھوٹ گیا ہے۔ اس وقت تک حضرت پر فالج کے تین حملے ہو چکے تھے اور معالجین نے روزہ رکھنے سے منع کیا تھا۔ ویسے بھی [illegible] تین گھنٹے سے زیادہ بھوک برداشت نہیں کر سکتے تھے۔

غالباً ۹۸۔۱۹۹۷ کی بات ہے۔ ایک دفعہ گرمیوں کے موسم میں مدرسہ کے ناظم صاحب نے صبح جنرل حاضری کے وقت

* تلونڈی کھجوروالی گوجرانوالہ

حضرت کو پرچی دی کہ اکثر طلبہ کی فجر کی جماعت چھوٹ جاتی ہے اور کچھ طلبہ کی نماز بالکل رہ جاتی ہے۔ حضرت نے فرمایا: لاحول ولاقوۃ الا باللہ۔ مسجد کے اندر رہ کر اور دین کے طالب علم ہو کر پھر بھی تمہاری جماعت چھوٹ جاتی ہے۔ پھر اپنا واقعہ سنایا کہ ۱۹۳۴ء میں جب میں مدرسہ انوار العلوم شیرانوالہ باغ گوجرانوالہ میں زیر تعلیم تھا تو ایک دفعہ میری فجر کی ایک رکعت چھوٹ گئی۔ میرے استاد محترم مولانا عبد القدیر صاحبؒ نے پوچھا کہ سرفراز، تیری ایک رکعت کیوں چھوٹ گئی ہے؟ میں نے عرض کیا کہ رات دیر تک مطالعہ کرتا رہا، اس وجہ سے صبح آنکھ دیر سے کھلی اور رکعت چھوٹ گئی۔ اس پر استادِ محترم نے فرمایا کہ اس مطالعہ کا کیا فائدہ جس کی وجہ سے تمہاری رکعت چھوٹ جائے! فرماتے تھے اس دن سے لے کر آج تک کبھی میری تکبیر اولیٰ فوت نہیں ہوئی۔ اللہ اکبر! اس سے بڑا ولی اور کون ہو سکتا ہے جس کی ساٹھ سال تک کبھی تکبیر اولیٰ فوت نہیں ہوئی اور اپنے استاد کی نصیحت کو ایسا پلے باندھا کہ زندگی بھر رات کو عشا کے بعد جلدی سونے اور صبح تہجد کے وقت اٹھ جانے کا معمول رہا۔

وقت کی پابندی کے حوالے سے ایک لطیفہ بھی سنایا کرتے تھے۔ فرماتے تھے کہ استاد محترم حضرت مولانا مفتی عبد الواحد صاحبؒ نے ایک دفعہ مجھے جامع مسجد شیرانوالہ باغ میں درس دینے کا حکم فرمایا۔ درس آدھ گھنٹے کا ہوتا تھا۔ میں نے جو مضمون شروع کیا تھا، وہ وقت سے دو منٹ پہلے ختم ہو گیا تو میں نے درس ختم کر دیا۔ ایک آدمی فوراً بولا کہ ابھی وقت ختم ہونے میں دو منٹ باقی ہیں۔ میں نے ان کے دینی ذوق کو دیکھ کر دوسرا موضوع شروع کر دیا۔ جب وقت سے دو منٹ اوپر ہوئے تو وہ آدمی پھر بولا کہ دو منٹ اوپر ہو گئے ہیں۔

حضرت شیخ اپنے وقت کے صاحب کرامت ولی تھے اور ولیوں کی کرامات ہمارے نزدیک مسلم ہیں۔ میرے ایک قریبی دوست مولانا محمد عیسیٰ صاحب، جو حضرت کے شاگردِ خاص بھی ہیں، انہوں نے بارہا یہ واقعہ مجھے سنایا کہ میرے ہاں بچہ پیدا ہوا تو استادِ محترم نے ہی بچے کا نام محمد داؤد تجویز فرمایا۔ بچہ بہت روتا تھا تو ایک دن اہلیہ نے کہا کہ یا تو خود کوئی تعویذ بنا دو یا گکھڑ حضرت شیخ سے کوئی تعویذ بنوا کر لے آؤ۔ لیکن مصروفیت کی وجہ سے چھ ماہ کا عرصہ گزر گیا اور حضرت کے پاس جانا نہ ہوا۔ اسی دوران میری مسجد کے ایک نمازی حضرت شیخ کی ملاقات کے لیے گئے تو حضرت نے ان کو ایک تعویذ لکھ دیا اور فرمایا کہ یہ مولوی عیسیٰ کو دے دو کہ بچے کے گلے میں ڈال دیں۔ اس صاحب نے تعویذ لا کر مجھے دے دیا کہ یہ حضرت شیخ نے دیا ہے۔ شاید آپ نے کہا ہوگا۔ میں نے کہا کہ چھ ماہ سے میں حضرت کے پاس گیا ہی نہیں۔ ہاں، ہمارے گھر میں اس کا تذکرہ ضرور ہوتا تھا۔ مجھے بہت خوشی ہوئی اور اگلے دن میں حضرت شیخ کی خدمت میں حاضر ہوا اور تعویذ کا ذکر کیا تو فرمایا ہاں بھیجا تھا۔ یہ حضرت شیخ کی واضح کرامت تھی۔

امام اہل سنت اپنے وقت کے بہت بڑے معبر بھی تھے۔ یہ بات ہمیں سبق کے دوران آپ کے بھتیجے مولانا حاجی محمد فیاض خان سواتی مہتمم مدرسہ نصرۃ العلوم گوجرانوالہ نے بتلائی تھی، جبکہ بندہ اس سے پہلے خود اس کا مشاہدہ کر چکا تھا۔ غالباً ۲۰۰۰ء میں، میں نے خواب میں ایک بہت بڑا اور خوفناک سانپ دیکھا۔ وہ اتنا خوفناک اور جسیم تھا کہ اس کی دہشت کی وجہ سے میری زبان بند ہو گئی۔ صبح سارا خواب تحریر کر کے حضرت کی خدمت میں پیش کیا تو آپ نے تعبیر فرمائی کہ ''سانپ کی تعبیر مال ہوتا ہے جس میں حقوق پورے ادا نہ کیے گئے ہوں۔ وقتاً فوقتاً آپ کو مال ملتا رہے گا۔'' حضرت کی یہ تعبیر ہو بہو پوری ہوئی اور بندہ آہستہ آہستہ مالی لحاظ سے خود اپنے پاؤں پر کھڑا ہونے کے قابل ہو گیا۔

اللہ تعالیٰ نے آپ کو غضب کا حافظہ عطا فرمایا تھا۔ تدریس کے آخری سالوں میں فرمایا کرتے تھے کہ اب میرا حافظہ کمزور ہو چکا ہے، جوانی میں میرے حافظے پر لوگ رشک کیا کرتے تھے۔ تقریباً آٹھ نو برس صاحبِ فراش رہے۔ اتنی طویل علالت اور ضعف کے باوجود آپ کی یادداشت بالکل برقرار تھی۔ نظر کمزور ہونے کی وجہ سے پہچانتے نہیں تھے۔ جب تعارف کروایا جاتا تو فوراً پہچان لیتے، بلکہ جزئیات تک دریافت کرتے تھے۔ تقریباً دو سال قبل بندہ جماعت کے ساتھ گکھڑ گیا تو موقع کو غنیمت جانتے ہوئے امیر صاحب سے عرض کیا کہ سب ساتھیوں کی حضرت سے ملاقات کروائی جائے۔ امیر صاحب نے اجازت دی تو کچھ ساتھیوں کو لے کر میں حاضر خدمت ہوا۔ آپ نے اپنی عادت کے مطابق پوچھا، کہاں سے آئے ہو، کیا نام ہے، کیا کرتے ہو؟ میں نے عرض کیا تلونڈی کھجور والی سے آیا ہوں، جامع مسجد عثمانیہ (اونچا دارا) میں امامت خطابت کے فرائض سر انجام دیتا ہوں۔ حضرت نے فوراً پوچھا کہ وہاں ایک ماسٹر صادق صاحب ہوتے ہیں۔ میں نے کہا وہ بھی یہاں جماعت کے ساتھ (بحیثیت امیر) آئے ہوئے ہیں، تھوڑی دیر تک آپ کے پاس ملاقات کے لیے آ رہے ہیں۔ حضرت کی اس بات سے مجھے بہت حیرت ہوئی کہ آپ اس وقت تک اپنے تمام متعلقین سے کس قدر باخبر ہیں۔

ویسے تو حضرت شیخ کی طبیعت میں جمال کی صفت غالب تھی، مگر کبھی کبھی جلال بھی طاری ہوتا تھا۔ اس وجہ سے کبھی کبھار طلبہ کو ناپسندیدہ حرکات پر ڈانٹ بھی پلاتے تھے اور خصوصاً غیر حاضری پر سخت ناراض ہوتے تھے۔ ایک دفعہ ایک عورت دوران سبق تعویذ لینے کے لیے آئی تو حضرت نے تعویذ لکھ کر دے دیا۔ عورت نے پرہیز پوچھا تو آپ نے فرمایا کہ جو چیزیں اللہ تعالیٰ نے حلال بنائی ہیں، وہ سب کھاؤ اور حرام کے قریب نہ جاؤ۔ مگر عورت نے دوبارہ سہ بارہ یہی سوال دہرایا تو آپ نے جلال میں آ کر فرمایا کہ بی بی میرا دماغ نہ کھاؤ، باقی سب کچھ کھاؤ۔

موت ایک ایسی حقیقت ہے کہ اس سے کسی ذی روح کو مفر نہیں۔ جو بھی اس دنیا میں آیا، جانے کے لیے آیا، مگر کچھ جانے والے ایسے ہوتے ہیں کہ ان کو بھلایا نہیں جا سکتا۔ ان کی یادیں ہمیشہ تازہ رہتی ہیں۔ کچھ جانے والے اپنے پیچھے چند افراد کو سوگوار اور یتیم چھوڑ جاتے ہیں مگر کچھ ایسے ہوتے ہیں کہ ان کے پیچھے ایک پورا عالم سوگوار اور یتیم ہو جاتا ہے۔ امام اہل سنت کی شخصیت بھی انہی میں سے ایک تھی۔ حضرت کے جنازے میں لاکھوں لوگوں کی شرکت اور ہزاروں کو پھوٹ پھوٹ کر روتے دیکھ کر بجا طور پر کہا جا سکتا ہے کہ وہ ایک شخص لاکھوں کو یتیم کر گیا۔

- قاضی عبد الرحمٰن صاحب فرماتے ہیں کہ بیماری کے ایام میں جب حضرت صاحب فراش ہو چکے تھے، حضرت کا حافظہ اس وقت بھی غضب کا تھا۔ ایک دن میں ملاقات کے لیے حاضر ہوا تو حضرت مجھ سے فرمانے لگے، امام صاحب! آپ کا ایک بھائی عبد الحلیم رشیدی ہوتا تھا، وہ کہاں ہے اور کیا کرتا ہے؟ میں نے عرض کی، حضرت وہ فوج میں آفیسر بن گیا تھا اور اب تو کب کا ریٹائر ہو چکا ہے۔ حضرت کے حافظہ کے متعلق میں سوچتا چلا گیا کہ کیا بلا کا حافظہ ہے کہ پچاس سال سے زائد عرصہ گزر جانے کے باوجود حضرت کو آج بھی میرے بھائی کا نام یاد ہے۔

(ماہنامہ ہدی للناس گوجرانوالہ، امام اہل سنت نمبر، جون ۲۰۰۹ء)

ڈاکٹر محمد حبیب اللہ قاضی *

تفسیر میں امام اہل سنتؒ کی بصیرت: ایک دلچسپ خواب

مولانا قاری عبدالباری جامعہ اسلامیہ دارالعلوم سرحد پشاور سے فارغ التحصیل ہیں۔ راقم کے ہم سبق رہ چکے ہیں۔ ۱۹۸۷ء میں مدرسہ سے فراغت کے بعد علم کے ساتھ عمل کے میدان کو منور کرنے کے لیے حضرت مولانا قاری شیر محمد بونیری کی معیت میں سال کی جماعت کے ساتھ تبلیغ پر چلے گئے۔ اس کے بعد ان کا زیادہ تر وقت درس وتدریس اور تبلیغ میں گزرتا ہے۔ انتہائی ملنسار، پرہیزگار اور سیدھے سادے آدمی ہیں۔ آج کل پشاور یونیورسٹی میں فارسٹ کالج کی مسجد میں امامت وخطابت کے فرائض انجام دے رہے ہیں۔ ساتھ ساتھ نماز عشا کے وقت قرآن پاک کا درس بھی دیتے ہیں۔ خوش آواز بھی ہیں، اس لیے لوگ ان کے درس میں شوق وذوق سے بیٹھتے ہیں۔ گزشتہ دنوں راقم الحروف یونیورسٹی جاتے ہوئے چند منٹ کے لیے ان کی ملاقات کے لیے ان کے دولت کدہ پر گیا تو انھوں نے امام اہل سنت حضرت مولانا محمد سرفراز خان صفدرؒ سے متعلق اپنا خوب صورت خواب سنایا جسے قلم بند کر کے میں قارئین کی خدمت میں پیش کر رہا ہوں۔

قاری صاحب نے کہا کہ ۲۰۰۶ء کی بات ہے کہ میں درس قرآن دے رہا تھا۔ پہلے دن میں نے سورۃ مائدۃ کی آیت نمبر ۵ "الْيَوْمَ أُحِلَّ لَكُمُ الطَّيِّبَاتُ وَطَعَامُ الَّذِينَ أُوتُوا الْكِتَابَ حِلٌّ لَّكُمْ" کا درس دیا۔ دوسرے دن جب آیت نمبر ۶ "يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِذَا قُمْتُمْ إِلَى الصَّلَاةِ فَاغْسِلُوا وُجُوهَكُمْ وَأَيْدِيَكُمْ إِلَى الْمَرَافِقِ" کا درس دیا تو ایک صاحب نے سوال کیا کہ اس آیت مبارکہ کا ماقبل آیت سے کیا تعلق ہے؟ وہاں نکاح سے متعلق احکام ہیں اور یہاں وضو کے مسائل کی تفصیل ہے۔ میں نے اپنی کم علمی اور طالبانہ سطح کے مطابق جواب تو دے دیا، لیکن گھر آ کر سوچ میں پڑ گیا کہ معلوم نہیں، میرا جواب صحیح تھا یا غلط؟ اگر جواب غلط دیا ہے تو اللہ تعالیٰ کے ہاں پکڑ ہوگی۔ ابھی تو جان چھڑا لی ہے، لیکن کل قیامت کے دن کیا جواب دوں گا؟

عشا کا وقت تھا۔ اسی فکر میں جواب کی تلاش کے لیے گھر میں موجود تفاسیر دیکھنے لگا۔ جلالین اٹھائی، ربط نظر نہیں آیا۔ معارف القرآن میں دیکھا، جواب نہ ملا۔ مواہب الرحمٰن اٹھائی، تسلی نہیں ہوئی۔ ڈھونڈتے ڈھونڈتے اور اوراق پلٹتے پلٹتے تکیے کا سہارا لیا تو آنکھ لگ گئی۔ نیند کی وادی میں چلا گیا تو دیکھتا ہوں کہ اپنی ہی مسجد میں اسی جگہ درس دے رہا ہوں۔ یہی آیات ہیں اور لوگ بیٹھے ہوئے ہیں۔ اتنے میں ایک آدمی دوڑتا ہوا اندر داخل ہوا اور مجھے مخاطب کر کے کہا کہ باہر دروازے پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے ہیں۔ آپ کے ساتھ سیدنا صدیق اکبر رضی اللہ عنہ بھی ہیں اور اندر آنا چاہتے ہیں۔ میں درس چھوڑ کر دروازے کی طرف لپکا تو رحمت عالم صلی اللہ علیہ وسلم حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو ساتھ لے کر صحن مسجد میں پہنچ چکے تھے۔

---

* شعبہ اسلامیات، پشاور یونیورسٹی، پشاور۔

رحمت عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس فقیر وحقیر کو اپنے سینہ مبارک کے ساتھ لگایا۔ اسی طرح حضرت ابوبکر صدیق نے بھی معانقہ کیا۔ پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس آیت سے متعلق مجھے سمجھانے لگے اور ساتھ ساتھ فرمایا کہ تم پریشان کیوں ہوتے ہو؟ اتنی آسان بات ہے اور تم حد سے زیادہ پریشان ہو گئے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مجھے سمجھا رہے تھے اور تسلی دے رہے تھے جبکہ حضرت ابوبکر صدیق مسکرا رہے تھے۔ انہوں نے بھی کہا کہ آسان بات تھی، تمہاری پریشانی کی وجہ سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یہاں تشریف لائے۔ میں یہ سوچ ہی رہا تھا کہ رحمت عالم صلی اللہ علیہ وسلم کو درس کے لیے اپنی نشست پر بٹھاؤں تو آپ نے فرمایا کہ اگر ترجمہ وتفسیر میں کوئی مشکل پیش آجائے تو پریشان نہ ہونا، بلکہ مولانا سرفراز خان صفدر سے پوچھ لینا، وہ پیچیدگی حل کر دیں گے۔ یہ کہہ کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وضو بنانے کے لیے تشریف لے گئے۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ بھی ان کے ساتھ تھے اور میں بھی ان کی معیت میں وضو کرنے کے لیے وضو خانہ کی طرف چل پڑا۔

(یہ یاد رہے کہ قاری صاحب کہتے ہیں کہ اس وقت ان کے ذہن میں دور دور تک حضرت مولانا سرفراز خان صفدرؒ کا خیال نہیں تھا۔ زندگی میں صرف ایک مرتبہ ۱۹۸۷ء میں انھیں مولانا کی زیارت ہوئی تھی۔ وہ یوں کہ دورہ حدیث کے بعد وہ سال کی جماعت کے ساتھ گئے ہوئے تھے اور رائے ونڈ میں عربوں کی جماعت کے ساتھ ان کی تشکیل ہوئی تھی۔ اس سفر میں تین دن انھوں نے حضرت کی مسجد میں گزارے۔ حضرت کا صبح کا درس سنا، زیارت کا شرف حاصل ہوا، خیریت دریافت کی اور حضرت نے دعاؤں سے نوازا۔ زندگی میں یہ ان کی پہلی ملاقات تھی۔)

میرا دل چاہ رہا تھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے بہت سے سوالات پوچھوں اور مسائل دریافت کروں۔ میں وضو بنا کر جونہی درس گاہ کی طرف آیا تو کیا دیکھتا ہوں کہ حضرت مولانا محمد سرفراز خان صفدرؒ میری جگہ پر بیٹھ کر انہی آیات کا درس دے رہے ہیں۔ میں نے مولانا صفدر کو دیکھتے ہی پہچان لیا کہ یہ تو وہی شیخ صفدر ہیں جن کو میں نے ۱۷ سال قبل گکھڑ کی مسجد میں دیکھا تھا اور ملاقات کا شرف حاصل کیا تھا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ابھی وضو بنا کر واپس نہیں آئے تھے۔ میں حضرت شیخ کے قریب ہو کر بیٹھ گیا تو حضرت نے مجھے سمجھاتے ہوئے فرمایا کہ تم پریشان ہو گئے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے۔ آئندہ ایسی فکر میں مبتلا نہ ہونا۔ دیکھو میں تمہیں ان آیات میں ربط سمجھاتا ہوں۔ فرمایا کہ طہارت دو قسم کی ہے۔ ایک طہارت باطنی اور دوسرے طہارت ظاہری۔ آیت نمبر ۵ میں طہارت باطنی کا بیان تھا اور آیت نمبر ۶ میں طہارت ظاہری کا ذکر ہے۔ پھر مجھ سے فرمایا کہ اب بتاؤ، میں نے کیا کہا؟ میں نے ان کے بتائے ہوئے الفاظ کو دہرایا تو پھر مجھے مزید سمجھایا۔ اس کے بعد ہم دونوں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف جانے لگے جہاں آپ وضو بنا رہے تھے۔ ابھی راستے ہی میں تھے کہ میری بچی نے مجھے جگا دیا۔

جب میں اٹھا تو ایک طرف خوشی ومسرت کی انتہا نہ تھی، اور دوسری طرف خفا بھی تھا کہ اگر بچی مجھے نہ جگاتی تو میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت ابوبکر صدیقؓ کی مزید ملاقات وزیارت کا شرف حاصل کرتا اور حضرت شیخ صفدرؒ کی رفاقت میں کچھ مزید استفادہ کرتا۔ انھی خیالات میں تھا کہ تھوڑی دیر کے بعد دوبارہ آنکھ لگ گئی۔ اب خواب میں دیکھتا ہوں کہ میں انھی آیات کا درس دے رہا ہوں اور خواب کی حالت میں اپنا خواب بیان کرتے ہوئے یہ پورا واقعہ درس میں موجود لوگوں کو سنا رہا ہوں۔ میں نے کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت ابوبکر صدیقؓ یہاں تشریف لائے تھے اور انہوں نے

مجھے فرمایا کہ اگر ترجمہ وتفسیر میں کوئی مشکل پیش آئے تو مولانا سرفراز صفدرؒ سے دریافت کر لینا۔ یہاں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ مولانا سرفراز صفدرؒ بھی تشریف لائے تھے اور انہوں نے ان آیات کے باہمی ربط سے متعلق یہ فرمایا ہے۔

خواب سے بیداری کے بعد نیند تو چلی گئی اور اب آنکھوں میں نیند کے بجائے خوشی اور مسرت کے آنسو رواں تھے۔ مچھلی جس طرح بغیر پانی کے تڑپتی ہے، میرا حال بھی وہی تھا کہ اب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت ابوبکر صدیقؓ سے زندگی میں دوبارہ ملاقات کیونکر ہوگی۔ یہ خیال بھی آیا کہ شیخ صفدرؒ سے، جن کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بھی پسند کرتے ہیں اور جو آپ کی علمی وراثت کے صحیح جانشین اور امین ہیں، ان سے ملاقات کیسے کی جائے، کیونکہ اگر ان کی طرف نکلتا ہوں تو سال کی جماعت کے ساتھ جانے سے رہ جاؤں گا جس کا مجھے دو تین دنوں میں انتظام کرنا ہے۔ اسی دوران ذہن میں یہ بات آئی کہ قصہ خوانی جا کر حضرت شیخ کی تفسیر کہیں سے تلاش کرتا ہوں تاکہ اس تفسیر میں ربط دیکھوں جو آپ نے خواب میں سمجھایا ہے۔ قصہ خوانی میں تلاش بسیار کے باوجود آپ کی تفسیر تو نہیں ملی، البتہ سورۃ مائدہ کا درس کیسٹ میں دستیاب ہوگیا۔ میں نے وہ لے لیا۔ پھر ٹیپ ریکارڈر کی ضرورت تھی، وہ بھی خرید کر گھر آیا اور ان دونوں آیات کا ربط سنا۔ ہو بہو وہی تفسیر تھی جو آپؒ نے خواب میں مجھے سمجھائی تھی۔

> جس طرح جان کی حفاظت ضروری ہے، اسی طرح مال کی بھی حفاظت ضروری ہے۔ شریعت نے ہر طرح کی ہدایات دی ہیں۔ عورتیں گھروں میں اپنا سامان رکھتی ہیں، مثلاً زیور ہے، رقم ہے یا اور کوئی قیمتی چیز ہے تو اس کو حفاظت کے ساتھ سنبھال کر رکھیں اور بچوں کو بھی نہ دکھائیں، کیونکہ بچوں کی بھی طبائع مختلف ہوتی ہیں۔ اگر بے احتیاطی کی وجہ سے نقصان ہو گیا تو نقصان الگ اور گناہ الگ، اس لیے کہ اس نے اپنی چیز کی حفاظت نہیں کی۔ کھلے طور پر زیور رکھنا، گھڑی رکھنا یا کوئی قیمتی چیز رکھنا جس کو آنے جانے والی عورتیں دیکھیں یا بچے دیکھیں، یہ سخت گناہ ہے۔ عورتیں پروا نہیں کرتیں، پھر جب چیز ضائع ہو جاتی ہے تو ہر ایک پر شک کرتی ہیں اور الزام لگاتی ہیں کہ فلاں آیا تھا اور فلاں آئی تھی۔ اس طرح شک کرنا اور الزام لگانا بھی گناہ ہے۔..... اپنی چیز کی حفاظت کرو جس طرح دوسرے سامان کی حفاظت کرنی ہے۔ اسی طرح جب مسجد میں آؤ تو اپنے جوتوں کی بھی حفاظت کرو۔ اگر حفاظت نہ کی اور چوری ہو گئی تو جوتی بھی گئی اور گناہ بھی لکھا گیا۔ دیکھو میرا جوتا کافی پرانا ہے، بنوائے ہوئے کئی سال ہو گئے ہیں۔ اس کو جو لے جائے گا، بڑا بے وقوف ہوگا، لیکن میں اس کی بھی حفاظت کرتا ہوں محض اس لیے کہ حکم ہے، چنانچہ حدیث پاک میں آتا ہے: اجعل نعليك تحت عينيك، اپنی جوتیاں آنکھوں کے سامنے رکھنا یعنی ان کی حفاظت کرنا۔ اسی طرح کمبل چادر وغیرہ کوئی بھی قیمتی شے ہے، اس کی حفاظت کرو۔ بعض غافل قسم کے نمازی وضو کرتے وقت گھڑی اور عینک اتار کر رکھ دیتے ہیں، پھر جب کوئی اٹھا کر لے جاتا ہے تو تلاش کرتے پھرتے ہیں۔... حدیث پاک میں آتا ہے کہ جس وقت تم گھر میں داخل ہو تو دروازہ بند کر دو۔ کھلا ہوگا تو کتا بلا اندر آئے گا۔ شریعت نے تمام چیزیں تفصیلاً بیان فرمائی ہیں تاکہ تمہیں کسی بھی مرحلے میں تکلیف نہ پہنچے۔"
>
> (ذخیرۃ الجنان ۱۴۸/۴ تا ۱۵۱)

حافظ تنویر احمد شریفی*

امام اہل سنتؒ ۔ چند ملاقاتیں

۱۷ ستمبر ۱۹۹۲ء بمطابق ۱۹ ربیع الاول ۱۴۱۳ھ میری زندگی کا وہ مبارک دن تھا جب شیخ الحدیث حضرت العلام مولانا سرفراز خان صفدر کی پہلی زیارت ہوئی۔ حضرت شیخ الحدیثؒ دوپہر کے وقت کراچی کے ہوائی میدان پر اترے۔ آپ کے استقبال کے لیے علمائے کرام کا ایک جم غفیر جمع تھا۔ استاد محترم حضرت مولانا حسن الرحمن یوسفی مدظلہ شفقت فرماتے ہوئے مجھے بھی اپنے ساتھ ہوائی میدان لے گئے۔ یہ وہ دور تھا کہ جب ہمارے اکابر تشریف لاتے تھے تو نظم وضبط کا مظاہرہ ہوتا تھا۔ آج کل کی طرح جذبات میں بہہ کر استقبال کو ہنگامہ نہیں بنایا جاتا تھا۔ اسی نظم وضبط کی وجہ سے حضرت شیخ الحدیثؒ سے مصافحہ کی سعادت بھی اللہ تعالیٰ نے نصیب فرمائی تھی۔

حضرتؒ کی وجیہ شخصیت کو دیکھ کر اکابر علمائے دیوبند یاد آ گئے۔ جس نے اپنے اکابر سے شمہ برابر تعلق رکھا ہے اور انہیں پڑھا ہے، وہ یہ محسوس کر سکتا ہے۔ ہمارے مدارس میں اس وقت حالات یہ ہیں کہ طلبہ کرام اپنے اکابر کے حالات وخدمات سے یکسر ناواقف ہیں۔ یہ ایک بہت بڑی کمزوری ہے جسے دور کرنا چاہیے۔

حضرت شیخ الحدیثؒ کا قیام جامعہ بنوریہ سائٹ میں تھا۔ اسی دن حضرتؒ نے جامعہ احسن العلوم گلشن اقبال میں عصر کے بعد طلبہ کرام اور مغرب کے علماء کرام کی مجلس کو خطاب فرمایا۔ کراچی کے اردو بازار اور جامع کلاتھ مارکیٹ کے درمیان والسن روڈ پر عظیم الشان "امام اہل سنت" کانفرنس منعقد ہوئی۔ اس موقع پر حضرت شیخ الحدیث کے صاحب زادے محترم مولانا عبدالحق خان بشیر اور مولانا عبدالقیوم حقانی کے بھی بیانات ہوئے۔ مولانا شیخوپوری اسٹیج سیکرٹری کے فرائض سرانجام دے رہے تھے۔ مولانا حقانی کی تقریر جاری تھی کہ بندر روڈ کی طرف سے سنی تحریک کے لوگوں نے ہنگامہ آرائی کر کے جلسہ کو درہم برہم کرنا چاہا۔ ہوائی فائرنگ بھی ہوئی، لیکن وارے عشاقان مصطفیٰ! ایسے جمے اور ثابت قدم رہے کہ مخالفین کو منہ کی کھانی پڑی اور پولیس نے انہیں منتشر کر دیا۔ علمائے کرام اور خصوصاً مولانا حقانی نے عوام کو نظم وضبط اور صبر کی تلقین کی اور اپنے خطاب کا رخ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کے دشمن کی طرف موڑ دیا۔

جب اس محفل کے روح رواں حضرت صفدرؒ کو "امام اہل سنت" کا خطاب دے کر دعوت خطاب دی گئی تو خطبہ مسنونہ کے بعد حضرت نے جو ارشاد فرمایا، وہ اس طرح تھا:

"آپ نے مجھے امام اہل سنت کا خطاب دیا ہے۔ آپ کی اطلاع کے لیے عرض کر دوں کہ میں زمانہ طالب علمی سے امام اہل سنت ہوں۔ دار العلوم دیوبند میں پڑھنے کے زمانہ میں امامت کراتا تھا۔ قیام پاکستان کے بعد سے گکھڑ

* ناظم مجلس یادگار شیخ الاسلام پاکستان کراچی

کی جامع مسجد میں مسلمانوں کو نماز پڑھاتا ہوں۔ میں تو پہلے ہی سے امام اہل سنت ہوں، آپ کو آج معلوم ہوا؟‘‘

یہ جملے یادداشت سے لکھے ہیں، ہوسکتا ہے، بالکل وہی الفاظ نہ ہوں، لیکن قریب قریب مفہوم یہی تھا۔ اس کے بعد حضرت صفدرؒ نے ایک گھنٹہ تقریر فرمائی۔ علم کا ایک بہتا ہوا سمندر تھا جو روایتی خطابت کے جوہر سے خالی تھا۔ آج کل تو خطیب اسے سمجھا جاتا ہے جو بغیر کسی سیڑھی کے آسمان پر ہو اور تھوڑی دیر میں زمین پر بلکہ اس سے نیچے جا اترے۔ میں نے خطابت کا کمال دیکھا حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیب قاسمیؒ، خطیب الامت حضرت مولانا احتشام الحق تھانویؒ، شیخ طریقت حضرت مولانا سید حامد میاںؒ، استاد محترم حضرت مولانا سرفراز خان صفدرؒ اور مخدومی و مرشدی حضرت مولانا سید ارشد مدنی مدظلہ العالی میں کہ جس بات کو بیان کرتے، بڑی خوش اسلوبی سے دل میں اتر جاتی۔

حضرت مولانا صفدرؒ کی دوسری زیارت ۱۳؍جنوری ۱۹۹۳ء کو اس وقت ہوئی جب حضرت کراچی کے دورے پر استاد محترم حضرت انور حسین شاہ (نفیس الحسینیؒ) کے ہمراہ تشریف لائے۔ ہر دو بزرگوں سے مصافحہ کی سعادت نصیب ہوئی۔ اسی دن جامعہ بنوریہ میں حضرت نے ختم بخاری کرایا۔ اس درس میں حضرتؒ نے اپنے بیان میں فرمایا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا مبارک ارشاد ہے:

’’امت محمدیہ علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والتحیہ کے ستر ہزار لوگ بلا حساب وکتاب جنت میں جائیں گے اور پھر ہر ہزار کے ساتھ ستر ہزار جائیں گے اور پھر ہر ایک کے ساتھ ستر ہزار جائیں گے‘‘۔

اللہ اکبر! یہ صرف کثرت سے تعبیر ہے۔

تیسری مرتبہ حضرت کی زیارت ۱۸؍رجب المرجب ۱۴۱۴ھ بمطابق یکم جنوری ۱۹۹۴ء بروز ہفتہ کو اس وقت ہوئی جب مجھ گناہگار کو حضرت صفدرؒ کی شاگردی کی سعادت اللہ تعالیٰ نے نصیب فرمائی۔ جامعہ یوسفیہ بنوریہ شرف آباد میں حضرت الاستاد مولانا حسن الرحمٰن یوسفی مدظلہ کی دعوت پر حضرت مولانا مفتی جمیل خان شہیدؒ کی کوششوں سے حضرت ختم مشکوٰۃ شریف کے لیے تشریف لائے۔ مشکوٰۃ کی آخری حدیث حضرتؒ نے پڑھائی اور تقریر فرمائی۔ اس تقریر سے میں نے حضرتؒ کی ایک ادا اپنے دامن میں باندھ لی۔ حضرتؒ نے تقریر کی ابتدا میں ارشاد فرمایا:

’’میرے درس میں زیادہ تر خطاب طلبہ سے ہوگا، اس لیے علمی باتیں ہوں گی۔ یہ باتیں عام آدمی کو شاید سمجھ نہ آئیں، اس لیے ان کے لیے عامیانہ باتیں بھی ہوں گی۔ عام آدمی کی رعایت سے طلبہ عزیز ناگواری محسوس نہ کریں۔ اس تقریب میں تیسرے وہ لوگ ہیں جو علمائے کرام ہیں، ان سے میرا کوئی خطاب نہیں ہوگا۔‘‘

سبق یہ ملا کہ اپنے جیسے طالب علم سے خطاب ہو، علمائے کرام سے نہیں۔

دوسرے ایک نصیحت حضرت نے فرمائی۔ وہ یہ کہ تدریس کا عمل جاری رکھنا، چاہے بغدادی قاعدہ پڑھاؤ، اس لیے کہ ایک سال کے بعد تم لوگ مدرسہ سے فارغ ہو جاؤ گے اور چاہو گے کہ سب کو مدرسہ میں اعلیٰ کتابیں پڑھانے کو ملیں اور یہ نہیں ہوسکتا کہ سب مدرسہ میں اعلیٰ درجے کی کتابیں پڑھائیں۔ اس پر ایک واقعہ حضرت نے سنایا:

’’شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد مدنیؒ کو دیکھا گیا کہ تعلیم الاسلام پڑھا رہے ہیں۔ کسی نے کہا کہ حضرت! آپ بخاری شریف پڑھانے والے تعلیم الاسلام پڑھا رہے ہیں؟ حضرت مدنیؒ نے فرمایا کہ اس میں

کون سی شرم کی بات ہے۔ جس طرح کے طلبہ مل گئے، پڑھا رہا ہوں۔ ان کو بخاری پڑھانے سے تو رہا‘‘۔

سبق ملا کہ چھوٹی کتابیں پڑھانے میں شرم محسوس نہ کرو۔ اس دوران حضرت نے حدیث شریف کی اجازت بھی عطا فرمائی۔ حضرت صفدرؒ کی حدیث شریف کی سند اس لحاظ سے عالی ہے کہ ان کے اور حضرت امام ربانی مولانا رشید احمد گنگوہی قدس سرہ کے درمیان صرف ایک واسطہ ہے۔

میں نے حضرتؒ کو یہ بھی فرماتے ہوئے سنا:

’’مجھے اپنے مرنے کا غم نہیں ہے۔ تمہارے یہاں مولانا محمد یوسف لدھیانویؒ کو اللہ تعالیٰ نے یہ صلاحیت دی ہے کہ فرق باطلہ کا مقابلہ علمی انداز سے کر سکتے ہیں۔ مجھے ان پر پورا اعتماد ہے۔ میرے بعد یہ شخص ہمارے اکابر کی میراث کو تر وتازہ رکھے گا‘‘۔

لیکن اللہ کی شان کہ حضرت الاستاذ لدھیانوی شہید ہو کر حضرت الاستاد صفدرؒ سے پہلے اللہ کے حضور چلے گئے۔

حضرتؒ کی آخری زیارت ۶؍مارچ ۲۰۰۵ء کو جامعہ اسعد بن زرارہؓ، بہاولپور میں اس وقت ہوئی جب حضرت مفتی سید مظہر اسعدی نے شیخ الاسلام سیمینار منعقد کیا اور اس میں حضرت مدنیؒ کے تلامذہ کو جمع کیا اور ان کی آوازیں سامعین کو سنائیں۔ حضرت صفدرؒ اور حضرت مولانا صوفی عبدالحمید خان سواتیؒ کو ضعیفی کی حالت میں وہیل چیئر پر لایا گیا۔

۵؍ربیع الثانی ۱۴۲۹ھ بمطابق ۱۲؍اپریل ۲۰۰۸ء کو حضرت صفدرؒ کی طرف سے تحریری اجازت حدیث ملی جو میرے لیے بہت بڑی بابرکت سعادت ہے۔ یہ اجازت حدیث حضرت مولانا نعیم الدین مدظلہ (جامعہ مدنیہ لاہور) اور مولانا محمد عابد حامدی زادہ مجدہ کی مساعی سے مجھ تک پہنچی۔ فجزاہم اللہ خیراً۔

اب تو تسبیح ٹوٹ چکی ہے۔ ہمارے اکابر کو جن پر اعتماد تھا، وہ یکے بعد دیگرے جا رہے ہیں۔ حضرت صفدرؒ بھی تشریف لے گئے۔ اللہ تعالیٰ ہمیں اور خصوصاً حضرت کی اولاد (حفظہم اللہ) کو حضرتؒ کے نقش قدم پر چلائے۔ آمین۔

’’بعض جنات شرارتی ہوتے ہیں، وہ انسانوں کو تکلیف بھی پہنچاتے ہیں۔ لیکن یاد رکھنا! مسلمان کو اتنا ضعیف الاعتقاد نہیں ہونا چاہیے کہ تھوڑی سی تکلیف آئے تو کہے مجھے جنات چمٹ گئے ہیں۔ خصوصاً عورتیں بڑی وہمی ہوتی ہیں کہ تھوڑی سی تکلیف لمبی ہو جائے تو کہتی ہیں کہ کسی نے میرے اوپر جادو کر دیا ہے اور گھر میں کوئی عورت آ کر چلی جائے اور اس کے بعد کوئی تکلیف ہو جائے تو فوراً اس سے کڑی ملائیں گی کہ فلاں پھیرا مار گئی ہے جس کی وجہ سے یہ تکلیف آئی ہے۔ یہ بات بالکل غلط ہے کہ کسی کے آنے سے تکلیف آئے۔ یہ مشرکانہ عقیدہ ہے۔ جنات کے چمٹنے اور جادو سے انکار نہیں ہے، مگر سو میں سے ایک آدھ واقعہ جنات کا اور ایک آدھ واقعہ جادو کا ہوتا ہے۔ اتنا نہیں جتنا لوگوں نے ذہن بنا لیا ہے اور ہر معاملے کو اس کے ساتھ جوڑنا شروع کر دیا ہے۔ حاشا وکلا۔ یہ شرک کی ایک قسم ہے۔ ان توہمات سے بچو۔ مسلمان کا عقیدہ بڑا پختہ ہونا چاہیے۔ تکلیف سے کون بچا ہوا ہے؟ تکلیفیں بڑوں کو بھی ہوتی ہیں، بچوں کو بھی ہوتی ہیں۔ ہماری خوراک کیا ہے اور کیسی ہے! کوئی چیز کھری ملتی نہیں، پھر صحت بھی ایسی ہی ہوگی۔ طبعی طور پر تکلیفیں انھی چیزوں کا نتیجہ ہیں۔‘‘ (ذخیرۃ الجنان ۴/۱۷۰، ۱۷۱)

مجھے بھی فخر ہے شاگردئ داغ سخن داں کا

[مختصر تاثراتی تحریریں]

﴿ ۱ ﴾

حضرت کا نام نامی اسم گرامی بچپن ہی سے سن رکھا تھا۔ دیوبند سے فارغ التحصیل ہونے والے آزاد کشمیر کے بہت سے علما آپ کے رفیق درس تھے۔ ان میں ہمارے علاقہ کے ممتاز عالم دین مولانا مفتی عبدالمتین (مرحوم)، مجاہد ختم نبوت حضرت مولانا امیر الزمان خان کشمیری، حضرت مولانا عبدالحمید قاسمی، حضرت مولانا محمد اکبر صاحب، مولانا نور حسین صاحب، مولانا حاجی عبدالہادی صاحب، مولانا سرفراز صاحب آف ملوٹ شامل ہیں۔ یہ حضرات، حضرت شیخ الحدیث کا نام نامی اور اسم گرامی ہر عوامی اجتماع میں ضرور لیتے اور ان کے علمی مقام کا تذکرہ فرماتے۔ آپ کے تلامذہ میں حضرت مولانا محمد الیاس صاحب چناری، مولانا فضل کریم صاحب مظفر آباد، مولانا حکیم فضل الرحمٰن صاحب جگلوی، مولانا امین الحق صاحب باغ، مولانا نذیر فاروقی جگلوی، شیخ الحدیث مولانا سلیم اعجاز صاحب، مولانا عبدالرؤف صاحب تھب، مولانا محمد الیاس صاحب تھب، مولانا محمد طیب کشمیری، مولانا محمد الطاف صاحب پرنسپل کالج ملوٹ، مولانا عبدالخالق جگلوی، مفتی محمد طیب خان کفل گڑھ باغ اور دوسرے سیکڑوں علما کے ساتھ راقم کو بھی اللہ تعالیٰ نے شرف تلمذ کی توفیق بخشی۔

پرانے اکابر کی وجہ سے آپ کے ساتھ بچپن ہی سے عقیدت وتعلق تو تھا ہی، اسی عقیدت کی بنیاد پر اللہ تعالیٰ نے شرف تلمذ کا اعزاز بخشا کہ دو سال تک آپ کی خدمت میں رہ کر دورۂ حدیث مکمل کیا اور پھر دارالعلوم کراچی سے تخصص کے بعد مفسر قرآن حضرت مولانا صوفی عبدالحمید سواتی نور اللہ مرقدہ کے حکم پر بطور نائب مفتی جامعہ نصرت العلوم میں تقرر ہوا۔ اس وقت حضرت شیخ الحدیثؒ دارالافتاء کے نگران تھے۔ تقریباً ساڑھے دس سال تک آپ کے زیر نگرانی دارالافتاء میں خدمت کی سعادت ملی اور بارہا حضرت سے استفادہ اور راہنمائی کا موقع ملتا رہا۔

آپ ۱۹۴۵ء میں اپنے شاگرد خاص حضرت مولانا عبدالہادی (مرحوم) کے ساتھ گجر کوہالہ سے پیدل سفر کر کے تھب تشریف لائے۔ تھب اور قرب وجوار میں آپ کے درجنوں خطاب ہوئے اور پیدل نکر فتوٹ، ڈنہ کچیلی سے ہوتے ہوئے تشریف لے گئے۔ اس وجہ سے بھی عوام وخواص آپ کی علمی شخصیت سے نہ صرف واقف تھے بلکہ متاثر بھی تھے۔ اس بنا پر ۱۹۸۵ء میں احقر کی دعوت پر آپ علالت وضعف کے باوجود علمی مشاغل سے وقت نکال کر ایک ہفتہ کے دورہ پر باغ تشریف لائے جس پر تعجب کرتے ہوئے استاذ العلما حضرت مولانا زاہد الراشدی صاحب نے راقم کو کہا کہ مولوی عبدالشکور! حضرت ہمارے والد ہیں، ہمیں تو بعض اوقات ایک گھنٹہ بھی وقت نہیں دیتے، تیرے پاس کیا گیدڑ سنگھی ہے کہ اس بڑھاپے اور علالت میں پہاڑی علاقے میں پیدل سفر کر کے ایک ہفتے کا وقت دے دیا؟ پھر ۱۹۹۲ء، ۱۹۹۳ء آپ کچھ دنوں کے لیے مری تشریف لائے تو انتہائی ضعف وعلالت کے باوجود راقم کی درخواست پر تین دن کے لیے باغ کے دورہ پر تشریف لائے اور تقریباً سارے مدارس میں علما اور طلبہ سے خطاب فرمایا۔ انتہائی ڈر اور خوف سے احقر نے عرض کیا کہ حضرت آپ کو میری وجہ سے بہت تکلیف ہوئی تو آپ نے حوصلہ افزائی فرمائی اور فرمایا کہ تکلیف تو یقیناً ہوئی، لیکن پرانے دوستوں سے ملاقات کر کے مسرت اور خوشی بھی ہوئی ہے۔

امام اہل سنت شیخ الحدیث والقرآن محقق دوراں حضرت مولانا سرفراز خان صفدر نور اللہ مرقدہ دارالعلوم دیوبند کے ممتاز فضلا میں سے تھے جو قوی الاستعداد اور استحضار علم کے ساتھ ساتھ علم حدیث اور علم اسماء الرجال میں خاص امتیاز رکھتے تھے۔ عوام وخواص میں شیخ الحدیث کے نام سے مشہور ومعروف تھے۔ آپ بیک وقت علوم ظاہری اور علوم باطنی کے امام تھے۔ علوم ظاہری میں آپ دارالعلوم دیوبند کے ترجمان تھے اور علوم باطنی میں حضرت مولانا حسین علیؒ کے خلیفہ مجاز تھے۔ بیک وقت قرآن اصول قرآن حدیث اور اصول حدیث فقہ نحو صرف منطق فلسفہ اور دوسرے علوم کے کامیاب مدرس تھے۔ فقہ اور افتا میں اونچا مقام رکھتے تھے اور جامعہ نصرت العلوم شیخ الحدیث کے ساتھ صدر مفتی کے منصب پر فائز تھے۔ ملک اور بیرون ملک سے آنے والے سوالات کے جوابات خود ہی دیتے تھے۔ حضرت شیخ الحدیث ہمہ جہت صفات کے مالک تھے۔ کامیاب درس وتدریس کے ساتھ ساتھ وعظ وتبلیغ اور اصلاحی علمی گفتگو سے عوام وخواص کی راہنمائی کرتے تھے۔ عوام کے تزکیہ نفس کے لیے بیعت وارشاد کا سلسلہ بھی مسلسل قائم رکھا ہزاروں علما وطلبہ اور عوام نے آپ سے طریقت کا سلسلہ رائج کر کے اپنے نفس کی اصلاح کی۔

تصنیف وتالیف میں حضرت شیخ الحدیث ایک کامیاب مصنف بھی تھے۔ آپ نے فرق باطلہ کی تردید میں مدلل اور علمی کتب کے ذریعہ مسلک حقہ کی ترجمانی کی جس موضوع پر آپ نے لکھا اس پر دوبارہ قلم اٹھانے کی چنداں کسی کو ضرورت نہ رہی جس کے لیے اکابر علمائے دیوبند کی تقاریر شاہد ہیں۔ مفتی اعظم پاکستان حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب نور اللہ مرقدہ ”مقام ابی حنیفہ“ پر تقریظ لکھتے ہوئے رقمطراز ہیں کہ میں نے اس موضوع پر لکھنے کے لیے خاصا مواد جمع کر لیا تھا لیکن مولانا سرفراز صفدر کی کتاب دیکھنے کے بعد اس موضوع پر مزید کچھ لکھنے کی ضرورت محسوس نہیں کی۔ اس طرح آپ کی دوسری تصنیفات پر اکابر علمائے دیوبند کی تقریظات بھی آپ کے کامیاب مصنف ہونے کی شاہد ہیں۔

آپ کی زندگی تقویٰ اور طہارت سے لبریز تھی۔ حضرت جب عمر کے آخری حصہ میں درس وتدریس سے معذور ہو گئے تو مدرسہ کی کمیٹی نے طے کیا کہ حضرت کی سابقہ تدریسی خدمات کی بنیاد پر تاحیات ادارہ کی جانب سے کچھ اعزازیہ دیا جائے۔ حضرت نے احقر کو طلب کر کے فرمایا کہ آپ خود بھی مفتی ہیں، لیکن دارالعلوم کراچی والوں سے بھی رابطہ کر کے اس بارہ میں فتویٰ لے لیں کہ کیا ایسا کرنا جائز ہے یا نہیں۔ ساتھ یہ بھی فرمایا کہ میری رائے میں یہ درست نہیں۔ چنانچہ دارالعلوم کراچی کے فتویٰ میں بھی اس کی اجازت نہ تھی تو آپ نے ادارہ کی کمیٹی والوں سے کہا کہ میرے لیے یہ جائز نہیں کہ تدریسی عمل سے سبکدوش ہونے کے بعد بھی ادارہ سے اعزازیہ لوں۔ یہ حضرت شیخ کے تقویٰ کی ایک مثال ہے۔ آپ معاملات میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات اور اپنے اکابر کے عمل پر سو فیصد عمل پیرا تھے جس کی مثال کم از کم اس دور میں انتہائی مشکل ہے۔

حضرت کی بلند علمی شخصیت پر کچھ لکھنا انتہائی مشکل ہے۔ آج کانپتے ہوئے قلم پکڑا ہے اور انتہائی خوف میں حضرت کی نسبت سے کچھ سطور پیش خدمت ہیں۔ اللہ تعالیٰ حضرت کو کروٹ کروٹ جنت نصیب فرمائے اور ہم سب کو ان کے نقش قدم پر چلنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین

مولانا مفتی عبد الشکور کشمیری

[ضلع مفتی باغ]

﴿ ۲ ﴾

زمانہ طالب علمی سے ہی ان سے عقیدت و محبت اور علم و تحقیق سے متاثر ہونے کی وجہ سے بندہ اس وقت مدرسہ نصرۃ العلوم کے ناظم مولانا لالہ عبد العزیز صاحب کے ذریعے سے حضرت کی تصانیف منگواتا اور جمعرات کے دن اکوڑہ خٹک اور اس کے اردگرد کے علاقوں میں جا کر لوگوں کو ان سے متعارف کرانے کی کوشش کرتا۔

۱۹۷۰ء میں بندہ نے حضرت سے شرح عقائد جبکہ حضرت صوفی صاحبؒ سے حماسہ پڑھی۔ اس کے بعد ۱۹۷۲ء میں حضرت سے ترجمہ قرآن، بخاری شریف اور ترمذی شریف پڑھنے کا موقع ملا اور آپ نے اجازت حدیث بھی عنایت فرمائی۔ حضرت اسباق میں لطائف سنا کر طلبہ کو خوش بھی کرتے تھے۔ ناغہ نام کی کوئی چیز ان کی لغت میں نہیں تھی۔

حضرت نہایت شفیق تھے۔ کبھی غصہ نہیں فرمایا، بلکہ غصے کے موقع پر بھی انداز محبت بھرا اور خیر خواہانہ ہوتا تھا۔ ملاقات کے لیے حاضری ہوتی تو سیاست کے متعلق بھی گفتگو فرماتے اور اسباق کے بارے میں بھی پوچھتے۔ کبھی تعارف کرانے کی ضرورت نہیں پڑھی۔ خود ہی فرماتے کہ ''شاہ صاحب ہیں!'' اور بچوں کے بارے میں بھی دریافت فرماتے۔ ایک دفعہ حاجی مراد ہسپتال (جہاں میں خطابت کے فرائض انجام دیتا ہوں) میں تشریف لائے تو ہسپتال کی مسجد میں نماز ادا فرمائی اور فرمایا کہ اس مسجد کا سنگ بنیاد میں نے رکھا ہے۔

حضرت بے حد مہمان نواز تھے اور آپ کے اہل خانہ اس معاملے میں پورا پورا تعاون کرتے تھے۔ کسی بھی وقت مہمان آجاتا تو کوئی دقت محسوس نہیں کرتا تھا۔ ایک دوست نے حضرت کا یہ ارشاد سنایا کہ جب تک گھر والی زندہ تھی، کبھی یہ احساس نہیں ہوا کہ یہ کتنی محنت کرتی ہے، لیکن جب وہ رخصت ہوگئی تو تنور سے روٹی لا لا کر بھی پوری نہیں ہوتی۔

آخری دنوں میں حضرت سے درخواست کی کہ میں پہلے سے بیعت ہوں، لیکن چاہتا ہوں کہ آپ کے دست مبارک پر بھی تبرکاً بیعت کرلوں۔ اگر یہ جائز ہے تو مہربانی فرمادیں اور اگر جائز نہیں تو کوئی اصرار نہیں۔ حضرت نے میرا ہاتھ پکڑ کر ہلایا اور پھر ہم رخصت ہوگئے۔ رات کو خواب میں عجیب پر لطف کیفیات محسوس ہوئیں۔

بدعات سے سخت نفرت فرماتے تھے اور اکابر سے تعلق کے سخت پابند اور اس کی تلقین فرماتے تھے۔ قرآن و سنت کا چلتا پھرتا کتب خانہ اور استقامت کا عملی نمونہ تھے۔ بحمد اللہ حضرت نے اپنے خاندان کو علم کا گہوارہ بنایا ہے اور یہ صدقہ جاریہ ان شاء اللہ قیامت تک رہے گا۔ اللہ تعالیٰ ان کی اولاد اور اہل خاندان پر رحمت فرمائے اور انھیں حضرت کا صحیح جانشین بنائے۔ آمین

مولانا سید عبد المالک شاہ

[استاذ ... نصرۃ العلوم گوجرانوالہ]

﴿ ۳ ﴾

مورخہ ۵ رمئی بروز منگل ۲۰۰۹ء صبح تین بجے مدرسہ نصرۃ العلوم کے فون سے یہ دل گداز اطلاع ملی کہ حضرت شیخ محترم انتقال فرما گئے ہیں۔ زبان سے بے ساختہ انا للہ وانا الیہ راجعون کے الفاظ جاری ہوگئے۔ یہ دن میری زندگی میں دوہرا غم اور دوہرا صدمہ لے کر آیا۔ میرے بڑے بھائی محترم محمد سلیم عارضہ قلب میں مبتلا تھے اور کچھ دنوں سے صدیق صادق ہسپتال میں زیر علاج تھے۔ ہر وقت دل کو ان کے بارہ میں کھٹکا لگا رہتا تھا۔ نماز فجر کے بعد مسجد میں حضرت شیخ کی وفات کا اعلان کیا اور سوچا کہ ایک دفعہ ہسپتال بھائی کی عیادت کر کے گکھڑ حاضری دیتا ہوں، لیکن بھائی کی حالت تشویشناک تھی، اس لیے ظہر تک ہسپتال رہا۔ میرے لیے بڑے امتحان کا مرحلہ تھا۔ ایک طرف اپنے شیخ، مرشد اور مشفق استاد کی نماز جنازہ میں شرکت کرنی ہے اور دوسری طرف بھائی کی حالت ایسی تھی کہ ایک لمحہ بھی ان سے جدا ہونے کا حوصلہ نہیں پڑتا۔ شام پانچ بجے نماز جنازہ کا اعلان تھا۔ بالآخر تین بجے دن بھائی کے چہرے پر ایک حسرت بھری نگاہ ڈالی اور کہا کہ بھائی جان میں نماز جنازہ کے لیے گکھڑ جا رہا ہوں اور شام کو دوبارہ حاضری دوں گا۔ بھائی نے ایک لمحہ کے لیے آنکھ کھولی اور اداس نگاہوں سے میری طرف دیکھا اور آنکھ بند کر لی۔

میں تقریباً پونے چار بجے گکھڑ پہنچا تو جی ٹی روڈ پر چاروں طرف انسانی سر نظر آئے۔ خلق خدا ہر طرف سے اس مرد درویش کے جنازہ میں شرکت کے لیے پہنچ رہی تھی۔ کالج کی گراؤنڈ اپنی وسعت کے باوجود تنگ دامنی کا شکوہ کر رہی تھی۔ ملک بھر سے جید علماء کرام جنازہ میں شرکت کے لیے پہنچ چکے تھے۔ استاد محترم مولانا زاہد الراشدی مدظلہ نے نماز جنازہ کی امامت کرائی۔ جنازہ کے بعد میری شدید خواہش تھی کہ میں تدفین کے مرحلہ میں بھی شرکت کروں، لیکن چھوٹے بھائی حافظ محمد شاہد نے فون پر اطلاع دی کہ بھائی محمد سلیم بھی قافلہ شیخ میں شامل ہو چکے ہیں اور ان کی میت ہسپتال سے وصول کر کے رسول نگر لے جانے کی تیاری کر رہے ہیں۔ جس وقت حضرت استاد محترم کی نماز جنازہ ادا کی جا رہی تھی، اسی لمحے بھائی نے جان، جان آفرین کے سپرد کی۔ بروز بدھ ۶ رمئی کو رسول نگر میں حضرت مولانا مفتی محمد نعیم اللہ مدظلہ مہتمم مدرسہ اشرف العلوم گوجرانوالہ نے بھائی کی نماز جنازہ پڑھائی۔ رب تعالیٰ غریق رحمت فرمائے۔

غم اور صدمہ کی کیفیت کا دارومدار تعلق کی نوعیت پر ہوتا ہے۔ حضرت شیخ کے ساتھ سب سے مضبوط تعلق تو آپ کے خاندان کے ان افراد کا ہے جو بیک وقت نسبی، مذہبی اور تعلیمی رشتہ رکھتے ہیں، پھر وہ حضرات جن کا آپ سے مذہبی اور تعلیمی رشتہ تھا اور پھر صرف مذہبی رشتہ والے افراد۔ بلاشبہ تعزیت کے اولین حقدار تو آپ کا خاندان ہے جو ماشاء اللہ علم و عمل کی دولت سے مالا مال ہے۔ دوسرے درجہ میں اس گناہگار کا تعلق بھی موجود ہے۔ مذہبی اور تعلیمی دونوں رشتے الحمد للہ تاحال قائم ہیں۔

حضرت شیخ کے دورۂ تفسیر کی علمی حلقوں میں بہت شہرت تھی۔ ۱۹۹۴ء میں، میں نے دورہ تفسیر میں شرکت کی اور بعد ازاں ۱۹۹۷ء میں دورۂ حدیث شریف کے لیے مدرسہ نصرۃ العلوم میں داخلہ لیا اور بخاری شریف جلد اول استاد محترم سے پڑھنے کی سعادت حاصل کی۔ دوران تعلیم اور اس کے بعد استاد محترم کی چند صفات کا بہت مشاہدہ کیا۔

شاگردوں اور چھوٹوں پر شفقت اور علمی کاموں پر حوصلہ افزائی آپ کا وصف خاص تھا۔ مولانا مفتی محمد نعیم اللہ فرماتے ہیں کہ جب بھی حضرت کی خدمت میں حاضری ہوتی تو مجھے ''مفتی صاحب'' کہہ کر مخاطب فرمایا کرتے تھے۔ مولانا محمد یعقوب

(حال امام واپڈا ٹاؤن گوجرانوالہ) کہتے ہیں کہ ایک مرتبہ میں اپنی اہلیہ کو لے کر حاضر خدمت ہوا تو حضرت نے ڈھیروں دعاؤں کے ساتھ ایک سو روپیہ میری اہلیہ کو ہدیہ دیا اور میں نے وہ سو روپیہ تا حال بطور برکت محفوظ رکھا ہوا ہے۔ یہ اصاغر نوازی اور چھوٹوں پر شفقت کی اعلیٰ مثال ہے۔ میرے لیے اس سے زیادہ کیا شفقت ہوگی کہ دو مرتبہ حضرت کی موجودگی میں گکھڑ کی جامع مسجد میں رمضان المبارک کے جمعہ میں بیان کا موقع ملا اور آپ نے بعد میں خوب حوصلہ افزائی فرمائی۔

جس قدر کوئی شخصیت بلند مرتبہ ہوتی ہے، اس سے استفادہ کرنا اسی قدر مشکل ہو جاتا ہے کیوں کہ شخصیت کا رعب ودبدبہ دل ودماغ پر ایسا چھا جاتا ہے کہ وہ سوال وجواب میں حجاب بن جاتا ہے۔ ہاں اگر خوش طبعی اور ظرافت مزاج میں ہو تو پھر یہ حجاب اٹھ جاتے ہیں۔ حضور کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے مزاج عالیہ میں اگرچہ یہ وصف نہ ہوتا تو صحابہ کرام کے لیے استفادہ کرنے میں بہت مشکل پیش آتی۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے مزاج پر مشتمل کئی واقعات کتب احادیث میں منقول ہیں۔ ایسے ہی رب تعالیٰ نے خوش مزاجی سے استاد محترم کو وافر حصہ عطا فرمایا تھا۔ آپ اسباق میں بڑے بڑے علمی مسائل کو لطائف کی شکل میں سمجھا دیا کرتے تھے۔ اگر مخالفین پر رد کرنا ہوتا تو بسا اوقات اس کے لیے بھی بڑے دلچسپ جملے استعمال فرماتے۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ ۱۹۹۶ء میں دورہ تفسیر کے دوران کسی بات کے ضمن میں یہود ونصاریٰ کا تذکرہ کرتے ہوئے فرمایا کہ یہ دونوں طبقے ایک دوسرے پر غلط ہونے کا الزام لگاتے ہیں۔ ہم کہتے ہیں کہ اس معاملہ میں یہ دونوں سچے ہیں۔ جس طرح نواز شریف، بے نظیر حکومت پر خائن ہونے کا الزام لگاتا ہے اور بے نظیر، نواز شریف پر خائن اور غلط ہونے کا الزام لگاتی ہے، ہم ان دونوں کی لڑائی میں نہیں آتے، بلکہ ہم کہتے ہیں کہ اس بات میں یہ دونوں سچے ہیں، کوئی بھی جھوٹا نہیں ہے۔

مدرسہ نصرۃ العلوم میں طلبہ کی جنرل حاضری صبح آپ خود لگایا کرتے تھے اور اسلامی مہینوں کے لحاظ سے حاضری ہوتی تھی۔ کلاس میں جو طالب علم نابینا یا کمزور نگاہ والا ہوتا، اسے کھڑا کر کے فرماتے، ہر مہینہ چاند نظر آنے کی خبر دینا تمہاری ذمہ داری ہے۔ تم چیئرمین رویت ہلال کمیٹی ہو۔

غالباً ۱۹۹۱ء میں مدرسہ اشرف العلوم کے مہتمم مولانا نعیم اللہ مدظلہ کی دعوت پر آپ ان کے دو بیٹوں مولوی محمد عمر اور مولوی محمد عثمان کے حفظ قرآن کی تقریب میں مدرسہ اشرف العلوم تشریف لائے اور نماز عصر کے بعد طلبہ، علما اور عوام الناس سے خطاب فرمایا۔ مفتی صاحب کا بیان ہے کہ ایسا روحانی ونورانی کیف محسوس ہوا کہ بہت کم مجالس میں نصیب ہوتا ہے۔

حضرت شیخ کی شخصیت کے مختلف پہلوؤں پر اہل علم ضرور قلم اٹھائیں گے۔ میں نے چند تاثرات سپرد قلم کر دیے ہیں لیکن اس اقرار کے ساتھ کہ میری عقل نے جو لفظ بھی سوچے ہیں، آپ کے مقام ومرتبہ سے بہر حال چھوٹے ہیں۔

مولانا عبد الواحد رسول نگری

[مدرس مدرسہ اشرف العلوم گوجرانوالہ]

﴿ ۴ ﴾

حضرت امام اہل سنت کی خوبیوں اور محاسن کو ہر شخص اپنے ذوق اور زاویہ خیال سے بیان کرے گا، لیکن چند چیزیں ایسی تھیں کہ ہر شخص بغیر کسی طویل مشاہدہ کے فوراً انھیں جان لیتا تھا۔ ان میں سر فہرست حضرت کا اخلاق کریمانہ تھا۔ حضرت کا اخلاق وخوش خلقی وخوش مزاج ایسی تھی کہ ہر کوئی یہ سمجھتا تھا کہ حضرتؒ کو مجھ سے تعلق دوسروں کی نسبت زیادہ ہے۔

۲۰۰۰ء کے لگ بھگ ہفت روزہ ضرب مومن نے ملک بھر کے بڑے مدارس کا سروے اور مشائخ کی زیارت وملاقات کا سلسلہ شروع کیا تھا جس کی رپورٹ ضرب مومن میں شائع کی جاتی تھی۔ جب اس سلسلہ میں مدرسہ نصرۃ العلوم گوجرانوالہ اور گکھڑ منڈی میں حضرت کے دولت کدہ پر حاضر ہوئے تو دو باتیں خصوصیت سے نوٹ کیں۔ ایک یہ کہ حضرت کے تصنیفی کام یعنی کتب کا جواب تو شاید دیا جا سکتا ہو لیکن حضرت کے اخلاق کریمانہ کا کوئی جواب نہیں۔ اس میں حضرت کی تصنیفی خدمات کا انکار نہ تھا، بلکہ اخلاق کریمانہ کا اظہار تھا۔ اپنی جگہ یہ بات بھی ایک حقیقت ہے کہ حضرت کی کتب کا معقول جواب آج تک کسی سے نہ بن پایا۔ دوسری بات یہ کہ حضرت امام اہل سنتؒ کے مقتدی حضرات جو کہ نماز فجر کے بعد درس قرآن وحدیث وخطبہ جمعہ المبارک ایک تسلسل سے سنتے آ رہے ہیں، ان کی دینی معلومات اور عملی زندگی آج کل کے عام علما سے زیادہ قابل رشک ولائق تقلید ہے۔ یہ بات واقعی ثابت شدہ حقیقت ہے اور اس کا مشاہدہ بھی کئی دفعہ ہو چکا ہے۔

ہمیں حضرت امام اہل سنتؒ کی شاگردی اور پھر حضرت کے زیر سایہ دس سال تک تدریسی خدمات کی سعادت بھی حاصل ہے۔ حضرت کے صاحبزادہ مولانا قاری عزیز الرحمن مدظلہ کی معیت میں معارف اسلامیہ گکھڑ میں عرصہ دس سال تک درس نظامی کی کتب کی تدریس اور پھر حضرت کا اس پر اعتماد ہمارے لیے بہت بڑا اعزاز ہے۔ وفاق المدارس العربیہ کے امتحانات میں معارف اسلامیہ اکادمی گکھڑ کی کامیابی بڑی شاندار تھی۔ مدرسہ کے آغاز ہی میں سیکڑوں طلبہ کی آمد ایک بڑی کامیابی تھی۔ پھر وہ وقت آیا کہ طلبہ کی کثرت سے مدرسہ میں جگہ کم پڑ گئی۔ حضرت نے فرمایا کہ زائد طلبہ کو دیگر مساجد میں سکونت وقیام کی اجازت دے دیں اور تعلیمی سلسلہ جاری رکھیں۔ تقریباً دس سال میں ہمیں اجنبیت کا احساس تک نہ ہوا۔

پابندی وقت اور تعلیمی نظم وضبط کا ایک واقعہ یہ ہے کہ ایک دفعہ چند احباب کے ساتھ صبح کا ناشتہ حضرت کے گھر پر تھا۔ جب ہمارے سبق کا وقت ہوا تو حضرت نے فرمایا مولانا! آپ کے سبق کا وقت ہو چکا ہے۔ آپ جا سکتے ہیں۔

اخیر عمر میں حضرت نے اپنے محبوب استاد شیخ الاسلام مولانا حسین احمد مدنیؒ کی یاد میں منعقد ہونے والے سیمینار میں شرکت کی غرض سے بہاولپور کا سفر فرمایا۔ ہم بھی شریک سفر تھے۔ حضرت نے اس سفر میں امیر سفر اس عاجز ہیچ مدان کو مقرر کیا۔ یہ بھی حضرت کی اصاغر نوازی کی اعلیٰ مثال ہے۔ اسی طرح ایک دفعہ نماز عصر کے بعد میں حافظ محمد عمار خان ناصر کے ساتھ حضرت کے کمرہ میں موجود تھا۔ نماز مغرب کا وقت ہوا تو حضرت نے نماز کی امامت کے لیے بھی اس عاجز کو حکماً آگے کھڑا کر دیا اور تعمیل ارشاد میں مجھے اس نماز کی امامت کرنا پڑی۔

اتباع سنت امام اہل سنتؒ کا خصوصی وصف تھا۔ سنت کی اتباع ہر لحاظ سے رکھتے تھے۔ اگر حضرت کو فنافی الرسول کہہ دیں تو شاید ذرا بھی مبالغہ نہ ہوگا۔ اتباع سنت کے اسی بلند درجہ خصوصی امتیاز کی وجہ سے حضرت ''امام اہل سنتؒ'' کے موزوں ترین لقب سے ملقب ہوئے۔ تحدیث نعمت کے طور پر فرمایا کرتے تھے کہ روزانہ تین چار ہزار مرتبہ درود شریف پڑھتا ہوں۔ یہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ خاص عقیدت ومحبت اور تعلق بالرسول کی نایاب مثال ہے۔

ایک دفعہ میں نے عرض کیا کہ حضرت طبیعت کچھ ناساز ہے، دعا فرمائیں۔ حضرت نے دعا فرمائی اور میرے ہاتھ کو بھی چوما۔ یہ بھی بہت اعزاز ہے۔

مرض کے دنوں میں بھی علمی شغف تمام تر کمزوریوں وناتوانیوں کے باوجود جاری رہا۔ کمرے میں بچے مینڈک مار رہے

تھے تو فرمایا کہ میں نے انہیں منع کیا ہے کہ اس کو نہ مارو۔ پھر ابوداؤد شریف منگوائی اور متعلقہ مسئلہ کے تحت حدیث دیکھ کر اطمینان ومسرت کا اظہار فرمایا۔

حافظ عبدالرحیم بلوچ

[سابق صدر مدرس معارف اسلامیہ اکادمی گکھڑ]

﴿ ۵ ﴾

جب سے شعور اور ہوش آیا، حضرات شیخین، حضرت مولانا عبدالحمید خان سواتیؒ اور حضرت مولانا محمد سرفراز خان صفدرؒ کی عقیدت اساتذہ اور اکابر کی برکت سے ورثہ میں ملی تھی۔ جب میری عمر سولہ سال تھی اور میں نے مدرسہ نصرۃ العلوم میں پڑھانا شروع کیا تو حضرات شیخین کو والدین جیسی شفقت کرتے ہوئے پایا۔ میری بھی یہی کوشش ہوتی تھی کہ میں ہر کام حضرات شیخین کی اجازت اور نگرانی میں کروں۔ مجھے اس بات پر فخر ہے کہ الحمدللہ عرصہ گیارہ سال حضرات شیخینؒ کی نگرانی میں تدریس کی اور کبھی ایسا موقع نہیں آیا کہ میری طرف سے ان حضرات کو کوئی رنج وتکلیف پہنچی ہو۔ حضرت صوفی صاحبؒ کی کرامت تھی کہ عرصہ گیارہ سال میں مجھے کبھی چھٹی کرنا یاد نہیں۔ میرا نکاح جمعۃ المبارک کے دن ہوا اور دعوت ولیمہ پر حضرت شیخ تشریف لائے تو انہوں نے آتے ہی میرے ساتھی حافظ ارشد صاحب سے پوچھا کہ نکاح کتنے بجے ہوا تھا؟ انہوں نے کہا کہ گیارہ بجے تو حضرتؒ نے فرمایا کہ اگر جمعہ کی پہلی اذان کے بعد نکاح ہوا ہوتا تو میں دوبارہ پڑھاتا۔ استاد محترم فرمایا کرتے تھے کہ جس محلّہ کی مسجد میں جمعہ کی پہلی اذان ہو جائے، اس کے بعد اگر کوئی نکاح پڑھائے تو نکاح نہیں ہوگا۔

راقم الحروف نے ۱۹۷۸ء کو حضرت صوفی صاحبؒ سے اجازت چاہی کہ میں مدرسہ قائم کرنا چاہتا ہوں تو حضرت نے بخوشی اجازت مرحمت فرمائی اور ۱۹۷۹ء میں جامعہ قاسمیہ کا تعلیمی سلسلہ کا آغاز ہوا جس میں حضرت شیخ نے شرکت فرمائی اور دعا فرمائی۔ الحمدللہ جامعہ قاسمیہ کو یہ اعزاز حاصل ہے کہ اکابر علمائے دیوبند کی زیر سرپرستی چل رہا ہے، خصوصاً حضرات شیخین کی سرپرستی اور نگرانی تو ہمارے لیے بڑے فخر کی بات ہے۔ حضرت شیخ تو جامعہ کے ہر پروگرام میں تشریف لاتے تھے اور رمضان المبارک کی ۲۹ ویں شب کو ہر سال افطاری جامعہ میں کرتے تھے۔ آپ نماز تراویح جامعہ میں پڑھتے اور نماز عشا اور نماز وتر خود پڑھاتے اور ختم قرآن کے بابرکت موقع پر اصلاحی بیان اور دعا فرماتے تھے۔ حضرت کا بیان عام فہم اور اتنا سادہ ہوتا تھا کہ بہت مشکل بات اور مسئلہ اس طرح سمجھاتے تھے کہ جاہل بھی سمجھ جاتا تھا۔ الحمدللہ جامعہ کی تمام شاخوں کا سنگ بنیاد حضرت نے اپنے دست اقدس سے رکھا۔

حضرت کی بے شمار کرامات میں سے ایک کرامت یہ تھی کہ حضرت جس چیز کے لیے دعا فرما دیتے تھے، مشکل سے مشکل کام بھی آسان ہو جاتا تھا۔ راقم نے جب بھی جامعہ قاسمیہ کی شاخ بنانے کے لیے کسی جگہ کا انتخاب کیا، ظاہری طور پر تو کوئی اسباب نظر نہیں آتے تھے، لیکن جب حضرت سے دعا کروائی یا اس جگہ سنگ بنیاد رکھوایا تو اللہ نے ایسے راستے کھولے کہ جن کا وہم وگمان بھی نہیں تھا۔ مجھے آج بھی لوگ پوچھتے ہیں کہ یہ تمام کام کیسے چل رہے ہیں تو احقر جواب دیتا ہے کہ یہ اللہ کے فضل اور استاد محترم کی دعاؤں اور نگرانی کا نتیجہ ہے۔ تحدیث نعمت کے طور پر یہ کہتا ہوں کہ صرف پاکستان بلکہ اکثر ممالک میں میرے شاگرد قرآن کریم کی خدمت کر رہے ہیں۔

راقم الحروف کافی مدت سے اس کوشش میں تھا کہ حضرت کے بیانات ریکارڈ کروں۔ بالآخر اللہ تعالیٰ نے دستگیری فرمائی، بچوں نے ساتھ دیا اور میرے اس فکر میں میرے دست وبازو بنے۔ مدرسین حضرات میرے نیک عزائم میں معاون مددگار ہوئے اور اللہ تعالیٰ کے خاص لطف وکرم سے ''خطبات امام اہل سنت'' تحریری شکل میں شائع ہونے شروع ہوئے۔ اب یہ خطبات تین جلدوں میں منظر عام پر آ چکے ہیں جن میں توحید، سیرت، نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ اور قربانی کے موضوع پر انتہائی اہم بیان موجود ہیں۔ اس کے علاوہ مختلف موضوعات پر اٹھارہ خطبات موجود ہیں۔

حضرت کا جنازہ ملک کے تاریخی جنازوں میں سے ایک تھا۔ جنازہ ان کے علمی جانشین شیخ الحدیث حضرت مولانا زاہد الراشدی دامت برکاتہم نے پڑھایا جو حضرتؒ کے ہم شکل ہونے کے ساتھ ساتھ انھی کی صفات کے حامل بھی ہیں۔ راقم نے اتنا مخلص اور بے لوث شخص نہیں دیکھا۔ خدا کا شکر ہے کہ وہی مسند جس پر حضرت استاد محترم نے حدیث کا درس دیا، اسی پر حضرت علامہ صاحب جلوہ افروز ہیں اور جانشینی کا حق کر رہے ہیں۔ خداوند ذوالجلال ہم سب کو حضرات شیخین کے نقش قدم پر چلنے کی توفیق عطا فرمائے۔

قاری گلزار احمد قاسمی

[جامعہ قاسمیہ، گوجرانوالہ]

﴿ ۶ ﴾

۱۹۷۸ء میں، میں جامعہ نصرۃ العلوم میں داخل ہوا۔ اس وقت وفاق کی درجہ بندی نہیں تھی جس کی وجہ سے اسباق دو کلاسز میں بٹے ہوئے تھے۔ ایک کلاس میں شیخ کے صاحبزادگان مولانا عبدالحق خان بشیر اور مولانا شرف الدین حامد اور مولانا پیر رشید الحق خان عابد میرے شریک اسباق تھے، جبکہ دوسری کلاس میں مولانا بشیر سیالکوٹی لیکچرر اسلامی یونیورسٹی اسلام آباد اور مولانا اعظم رحمانی لیکچرر گورنمنٹ کالج گوجرانوالہ اور مفتی محمد اقبال' مولانا قاری محمد انور سیالکوٹی' مولوی سعید طیب' مولوی پروفیسر محمد اختر رحمانی' مولانا عبدالقیوم طاہر تھے۔ غالباً عمر میں، میں سب سے چھوٹا تھا۔ کام کاج کے حوالے سے مجھے ہی کہا جاتا تھا۔ زیادہ تر وقت حضرت شیخ کے صاحبزادے مولانا عبدالحق خان بشیر کے ساتھ گزرتا۔ شاید یہی وجہ ہے کہ جہاں حضرت کی شفقتیں مولانا عبدالحق خان بشیر کے ساتھ تھیں، وہاں میرے ساتھ بھی تھیں۔ خصوصاً درس وتدریس کے حوالے سے میں نے اپنے آپ کو تنہا نہیں سمجھا۔

غالباً ۱۹۸۳ء لانگریاں والی مسجد میں درس مشکوٰۃ شریف شروع کیا۔ ایک حصہ مکمل ہوا تھا تو مجھے یہاں سے جامع مسجد صدیقیہ سیٹلائٹ ٹاؤن منتقل کر دیا گیا۔ دوسرا حصہ وہاں مکمل ہوا۔ آخری درس پر حضرت شیخ کو مدعو کیا گیا۔ اختتام درس پر میں نے حضرتؒ سے مزید درس جاری رکھنے کے لیے پوچھا کہ اب کون سی کتاب کا درس شروع کروں تو فرمانے لگے کہ اب بخاری شریف کا درس شروع کرو۔ میں نے کہا حضرت استعداد نہیں ہے۔ فرمانے لگے کہ میں کہہ رہا ہوں۔ بہرحال جہاں ذہنی دباؤ تھا، وہاں مسرت بھی تھی اور پھر الحمدللہ گوجرانوالہ شہر میں ترجمہ قرآن پاک کے حوالے سے کام کرنے کا موقع ملا۔ محض شیخ کی دعا اور سرپرستی سے ۱۹۸۷ء سے اب تک کم وبیش بیس کلاسز مکمل ہو چکی ہیں اور تین دفعہ عمومی درس بعد از فجر میں قرآن کریم مکمل ہو چکا ہے۔ یہ سب شیخین کی سرپرستی اور دعا کی برکت ہے۔ کم وبیش پندرہ دفعہ شیخ اختتام درس کے موقع پر

مسجد صدیقیہ میں تشریف لائے۔ میں نے اب تک جو عزت، وقار اور جو احترام پایا ہے اساتذہ کے احترام اور خصوصاً حضرت شیخؒ اور حضرت صوفی صاحبؒ کی وجہ سے ہی ہے۔ مجھے یاد نہیں کہ میں نے کبھی کسی استاذ کی چغلی کی ہو یا تہمت لگائی ہو یا ننگے سر کسی استاذ کے سامنے گیا ہوں۔ اللہ تعالیٰ سب کو یہ ادب نصیب فرمائے۔

سفر و حضر میں شیخؒ کی خدمت میں رہا ہوں۔ کبھی خلاف سنت کوئی عمل میں نے نہیں دیکھا۔ ہر نماز باجماعت، کھانے میں سادگی، سفر میں دعاؤں اور تلاوت کا اہتمام۔ جب کسی مجلس میں بیٹھتے تو سب کی توجہ کا مرکز ہوتے۔ ہر کوئی اپنے آپ کو ان کے قریب سمجھتا تھا۔ ۱۹/اگست ۱۹۸۶ء کو برادرم طاہر قیوم چودھری کے نکاح کے لیے کلرسیداں ضلع راولپنڈی کا سفر حضرت شیخؒ کے ساتھ کرنے کا موقع ملا۔ اس سفر میں میرے ماموں مولوی حبیب اللہ صاحب بھی شریک سفر تھے۔ یہ سفر بھی میری زندگی کا یادگار ترین سفر ہے۔ نکاح کی تقریب کے بعد حضرتؒ نے وہاں کی جامع مسجد میں بعد نماز ظہر درس دیا اور واپسی پر نماز عصر پنجن کسانہ قاری اختر صاحب کے مدرسہ میں ادا کی۔ سفر کے دوران آتے جاتے حضرت شیخؒ ہمارے ساتھ اس طرح گھل مل گئے جیسے ہمارے بچپن کے دوست ہوں۔ ان کی محبتیں ہمیشہ ہمارے ساتھ رہیں گی۔

قاری سعید الرحمٰن (مرید کے ضلع شیخوپورہ) فرماتے ہیں کہ ۱۹۷۶ء میں ایک روز گوجرانوالہ آنے کے لیے راہوالی جی ٹی روڈ پر گاڑی کے انتظار میں کھڑا تھا کہ اچانک امام اہل سنتؒ کی گاڑی آ کر رکی۔ امام اہل سنتؒ نے مجھ سے پوچھا، کہاں جانے کا پروگرام ہے؟ میں نے کہا حضرت! گوجرانوالہ شہر۔ امام اہل سنتؒ نے جواب میں فرمایا کہ مدرسہ والوں کی طرف سے میں نے اجازت نہیں لی، ورنہ آپ کو ساتھ سوار کر لیتا۔ آئندہ میں مدرسہ والوں سے اجازت لے لوں گا۔

مفتی محمد اقبال صاحب زید مجدہ فرماتے ہیں کہ ایک فتویٰ کی تصدیق کے لیے گکھڑ جانا ہوا۔ امام اہل سنت رحمۃ اللہ علیہ نے پڑھا اور تصدیق کے لیے مجھ سے قلم مانگا۔ ساتھ ہی مجھ سے پوچھا کہ قلم میں سیاہی دار الافتاء کی ہے یا ذاتی جیب سے ہے؟ میں نے کہا کہ دار الافتاء کی ہے تو امام اہل سنتؒ نے قلم استعمال کرنے سے انکار کر دیا۔

ایک دفعہ گرمیوں کے دنوں میں دوران سفر ڈرائیور نے گاڑی کا اے سی چلا دیا۔ حضرت نے ڈرائیور سے پوچھا کہ کیا اے سی چلانے سے تیل زیادہ خرچ ہوتا ہے تو ڈرائیور نے کہا کہ جی ہاں۔ اس پر حضرت نے فرمایا کہ اس کو بند کر دو۔ گاڑی میں پٹرول مدرسہ کا جلتا ہے، ہمارا نہیں لہٰذا اس کی قطعی ضرورت نہیں۔

اس طرح کے سیکڑوں واقعات ہیں جنھیں ان شاء اللہ کسی وقت قلم بند کروں گا تا کہ اس پرفتن دور میں اسلاف کی یاد تازہ ہو جائے۔ حقیقت یہ ہے کہ چراغ لے کر اگر ڈھونڈنا چاہیں تو ایسے متقی اور زاہد کی تلاش مشکل ہے۔

قاری عبید اللہ عامر

[مدرس شعبہ حفظ، مدرسہ نصرۃ العلوم گوجرانوالہ]

﴿ ۷ ﴾

امام اہل سنت حضرت مولانا محمد سرفراز خان صفدر کسی تعارف کے محتاج نہیں۔ میرا تعلق حضرت شیخؒ کے ساتھ اس وقت ہوا جب ۱۹۷۶ء میں، میں مرکزی جامع مسجد شیرانوالہ باغ گوجرانوالہ میں بطور امام و مدرس تحفیظ القرآن کام کر رہا تھا۔ خط کتابت کا سلسلہ ۱۴۰۵ھ میں شروع ہوا جب احقر گوجرانوالہ سے سعودی عرب ریاض میں جماعت تحفیظ القرآن میں بطور

مدرس منتقل ہوا۔ میری یہ عادت تھی کہ کوئی چھوٹا سا کام بھی پیش آتا تو خط کتابت کر کے حضرت شیخؒ سے مشورہ لیتا۔ حضرت شیخؒ کی کرم نوازی تھی کہ مجھ جیسے کو بھی فوراً جواب سے نواز دیتے۔ کبھی کبھی میں خود سوچتا کہ کہاں میں اور کہاں علمی دنیا کے بادشاہ۔ فرماتے کہ آپ کو علم ہے کہ میرے پاس ایک منٹ فرصت بھی نہیں، لیکن حسن عقیدت کی وجہ سے جواب دے دیتا ہوں۔

بلاشک حضرت امام اہل سنتؒ علمی دنیا کے بادشاہ تھے۔ تقویٰ میں تو ان کا ثانی کوئی نہیں تھا، عاجزی اور انکساری میں اپنا ثانی نہیں چھوڑا۔

علمی دنیا میں تحقیق کے امام تھے۔ ایک مرتبہ درس میں فرمایا کہ جتنے بھی اکابر حیات ہیں، سب ہی بزرگ ہیں، لیکن میں تحدیث نعمت کے طور پر کہتا ہوں کہ جتنا مطالعہ احقر نے کیا ہے، شاید ہی کسی نے کیا ہو۔ اس کی ایک دلیل یہ ہے کہ سابق شیخ التفسیر دار العلوم دیوبند و سابق شیخ الحدیث ڈابھیل مولانا شمس الحق افغانیؒ نے فرمایا تھا کہ میں علماے کرام کو مشورہ دیتا ہوں کہ امام اہل سنتؒ کی کتابوں کا مطالعہ کریں، کیوں کہ حضرت نے بڑے دقیق مسائل پر قلم اٹھایا ہے جو ہر عالم کے بس کی بات نہیں۔ یہ حضرت کی رائے تھی۔ پھر ایک اور بزرگ عالم استفسار کرتے رہے کہ حضرت جن کتابوں کا آپ حوالہ دے رہے ہیں، کیا یہ کتابیں آپ کے پاس موجود ہیں؟ ہم نے ان کتابوں کا نام ہی سنا ہے، دیکھی نہیں ہیں۔ اگر آپ کے پاس یہ کتابیں موجود ہیں تو یوں سمجھیں کہ آپ دیوبند کے جھنڈے کے سایے تلے کتاب لکھ رہے ہیں۔

احقر آپ کا مرید بھی ہے۔ پہلے احقر نے جانشین شیخ التفسیر حضرت مولانا عبید اللہ انورؒ کے ہاتھ پر بیعت کی تھی۔ آپ کی وفات کے بعد حضرت کے بیعت ہوا۔ حضرت کے کم وبیش ۳۵/۳۰ خطوط میرے پاس موجود ہیں۔ احقر کے بچوں کے نام بھی حضرت نے رکھے ہیں۔ احقر کے سسر حضرت مولانا عبد الحمیدؒ چونکہ آپ کے ساتھی تھے اور دیوبند میں اکٹھے رہے، ان سے امام اہل سنتؒ کے متعلق سنا کرتا تھا کہ حضرت کو طالب علمی کے زمانہ سے ہی مطالعہ کتب کا بہت شوق تھا اور حافظہ تو بلا کا تھا۔ ہمارے علاقے میں جتنے بھی علماے کرام حیات ہیں، اکثر حضرت امام اہل سنتؒ کے شاگرد ہیں۔ ضلع باغ میں کوئی ایسا عالم نہیں جس نے حضرتؒ سے نہ پڑھا ہو۔ مثال کے طور پر ضلع مفتی باغ مولانا مفتی عبد الشکور، مولانا عبد الرؤف، مولانا محمد صادق پنیالی، مولانا عبد القدوس ناظم مدرسہ انوار العلوم گوجرانوالہ، مولانا عبد القدیر عربی معلم پنیالی، چوہدری ضیاء الرحمٰن تھب، مولانا عبد الحئی تھب، مولانا قاری نذیر فاروقی، مولانا عبد الجلیل خان تھب، مولانا محمد الیاس عربی معلم تھب۔ یہ چند نام نمونے کے طور پر احقر نے لکھے ہیں۔ آزاد کشمیر ضلع باغ کے کم وبیش دو صد کے قریب علماے کرام نے امام اہل سنتؒ سے دورۂ حدیث شریف پڑھا ہے۔ احقر کی ناقص رائے یہ ہے کہ حضرت مدنیؒ کے تمام شاگردوں میں سے جتنا کام اللہ نے حضرت شیخؒ سے لیا ہے، شاید ہی کسی دوسرے کا اتنا فیض ہو۔

این سعادت بزور بازو نیست   تانہ بخشد خدائے بخشندہ

اللہ تعالیٰ حضرت کے درجات کو بلند فرمائے اور آپ کے جانشین حضرت مولانا زاہد الراشدی شیخ الحدیث مدرسہ نصرۃ العلوم کو توفیق بخشے کہ وہ حضرت کے مشن کو جاری رکھ سکیں۔

قاری جمیل الرحمن کشمیری

[حال مدرس جماعت تحفیظ القرآن ریاض سعودی عرب]

﴿ ۸ ﴾

۱۹۵۸ء کی بات ہے۔ میں نے ایک خواب دیکھا کہ میں وضو کر رہا ہوں۔ جب اس کی تعبیر کے سلسلے میں حضرت شیخ سے رابطہ کیا تو آپ نے فرمایا کہ آپ کو روحانیت عطا ہوگی۔ خواب کی تعبیر کے علم کے بارے میں یوں کہوں گا کہ اس دور میں خواب کی تعبیر کا علم حضرت شیخ سے زیادہ کسی کے پاس نہیں تھا۔ ۱۹۷۱ء میں، میں نے خواب دیکھا کہ میں نے بیگ پکڑا ہوا ہے اور حج پر جا رہا ہوں۔ جب اس کی تعبیر پوچھی تو حضرت نے فرمایا کہ آپ نے نہیں، بلکہ میں نے حج پر جانا ہے۔ چند دنوں کے بعد حضرت حج بدل ادا کرنے کے لیے مکہ معظمہ تشریف لے گئے۔ پھر ایک دفعہ خواب میں حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی تشریف لائے۔ ان کے پاس میرے نام کچھ کاغذات تھے۔ اس کی تعبیر حضرت نے یوں فرمائی کہ بھائی آپ کا چونکہ حضرت شاہ ولی اللہ صاحبؒ کے ساتھ روحانی تعلق ہے، یہ اس وجہ سے ہے۔

۱۹۶۱ء کی بات ہے۔ میں لاہور میں حضرت مولانا احمد علی لاہوریؒ کی مجلس ذکر میں شریک ہوا۔ مجلس کے بعد اجازت لے کر اپنے گاؤں گکھڑ منڈی واپس آگیا۔ دل میں شدید بے چینی اور بے قراری کی سی کیفیت پیدا ہوگئی جس کو سکون صرف قبرستان کے علاوہ کسی جگہ نہیں آ رہا تھا۔ ان حالات میں احقر کے دل میں بیعت کا شوق پیدا ہوا اور اس شوق اور بے چینی کی کیفیت کو دور کرنے کے لیے میں نے اپنے ایک پرانے ساتھی حاجی صادق صاحب سے مشورہ کیا کہ ہم حضرت شیخ کے ہاتھ پر بیعت کر لیتے ہیں۔ ان دنوں حضرت عام بیعت نہیں فرمایا کرتے تھے۔ بہرکیف کسی کی سفارش پر حضرت نے فرمایا کہ آج یا کل مغرب کے بعد آجائیں۔ بے چینی و بے قراری عروج پر تھی۔ سوچا کہ کل نہیں، آج ہی جانا ہے۔ چنانچہ مغرب کی نماز سے فارغ ہو کر ہم دونوں ساتھی حضرت کی خدمت اقدس میں پہنچے۔ دروازے پر دستک دی تو حضرتؒ کے صاحبزادے مولانا عبدالقدوس خان قارن مدظلہ العالی نے دروازہ کھولا۔ ہمیں حضرت نے اپنے کمرے میں بٹھایا اور فرمایا کہ آپ لوگ بیٹھیں، میں ذرا وضو تازہ کر لوں۔ پھر حضرت نے بیعت فرمایا اور کچھ تسبیحات پڑھنے کے لیے حکم فرمایا جس کو احقر نے بحمد اللہ تعالیٰ ساری زندگی میں ایک مرتبہ بھی قضا نہیں کیا۔

آپ کی توجہ کی برکت سے احقر نے ۱۹۵۲ء سے ۱۹۸۲ء تک حضرت کے پیچھے نمازیں اور جمعے پڑھے ہیں۔ جو مسئلہ آپ بیان فرماتے تھے، اس پر حضرت کو باعمل پایا۔ ۱۹۸۲ء میں ملازمت کے سلسلے میں اپنے خاندان کے ساتھ حضرت کی اجازت سے گوجرانوالہ آگیا، لیکن ۱۹۸۲ء سے ۱۹۹۹ء تک جمعہ کی ادائیگی کے لیے اپنے شیخ کی خدمت عالیہ میں حاضر ہوتا رہا ہوں۔

۱۹۸۲ء میں، میں نے ایک خواب دیکھا کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا جنازہ جا رہا ہے اور اس کا ایک پایہ میرے کندھے پر ہے۔ جب اس کی تعبیر حضرت سے پوچھی تو آپؒ نے فرمایا کہ جس شخص نے یہ خواب دیکھا ہے، وہ سنت اور شریعت کو زندہ کرنے والا ہوگا۔ پھر ۱۹۸۳ء میں مجھے بذریعہ خواب حضرت کے مقام کے بارے میں آگاہ کیا گیا۔ خواب میں حضرت قاضی نور محمد صاحب قلعہ دیدار سنگھ والے، جو حضرت کے پیر بھائی تھے، تشریف لائے۔ فرمانے لگے کہ آپ کے شیخ مکرم مقام عبدیت پر فائز ہیں اور مقام عبدیت ولایت کا سب سے بڑا درجہ ہے، اور حضرت سید علاؤ الدین جیلانیؒ دار السلام والے مقام محبوبیت پر فائز ہیں اور آپ کو ان بزرگان کے مقامات تمہاری والدہ کی دعا کی وجہ سے بتائے گئے ہیں۔ جب میں نے یہ خواب حضرت کو بوہڑ والی مسجد میں بتایا تو آپؒ نے اپنا سر مبارک جھکایا اور فرمایا کہ بھائی، اللہ تعالیٰ ہمیں اپنا بندہ بنائے۔

میں نے اپنی زندگی میں جتنی احادیث کا مطالعہ کیا ہے، ہر حدیث پر اپنے شیخ کو عمل کرتا ہوا پایا ہے۔ میں نے ہمیشہ زندگی اور دین کے شعبہ میں حضرت کو بلند مرتبہ اور استقامت پر دیکھا ہے۔ دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہمارے شیخ کو علیین میں اعلیٰ مقام عطا فرمائے، ان کے درجات کو بلند فرمائے اور ہمیں ان کی تعلیمات پر عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے تاکہ شیخ مکرم کی برکت سے ہمارا خاتمہ بھی ایمان پر ہو۔ (آمین یارب العالمین)

صوفی عطاء اللہ

[مرید خاص حضرت شیخ الحدیثؒ۔ گوجرانوالہ]

﴿ ۹ ﴾

غالباً ۱۹۸۸ کی بات ہے۔ میں آٹھویں کلاس میں زیر تعلیم تھا۔ میرے ایک دوست حافظ احسان اللہ الحسینی نے مجھے کہا کہ جامعہ عثمانیہ مریالی میں سالانہ جلسہ ہے، ہم بھی جائیں گے۔ جلسہ میں پہنچے اور مختلف علمائے کرام کی تقریریں سنیں۔ اختتام جلسہ پر باہر کتابوں کا ایک اسٹال لگا ہوا تھا۔ ہم مختلف کتابیں دیکھنے لگے۔ اس زمانہ میں اکثر جلسوں میں قادیانیت کی شیطنت اور گمراہی کے پردے چاک ہوتے تھے اور ختم نبوت کے موضوع پر تقاریر ہوا کرتی تھیں۔ مسیلمہ کذاب اور اس کی ذریت کے خلاف نفرت کا اظہار ایمان کی علامت تھا۔ کتابوں کے اسٹال پر جو کتاب مجھے پسند آئی، وہ حضرت مولانا محمد سرفراز خان صفدرؒ کی کتاب ''ختم نبوت'' تھی۔ اس سے قبل بندہ اس نام سے واقف نہ تھا۔ بہرحال میرے لیے نیک فال تھی کہ سب سے پہلی کتاب جو میں نے خریدی، وہ ختم نبوت پر تھی اور حضرت شیخ رحمہ اللہ تعالیٰ کی لکھی ہوئی تھی۔ گویا یہ میری لائبریری کی ابتدا تھی۔

اس کتابی تعارف نے دل میں محبت پیدا کر دی۔ آہستہ آہستہ یہی نام عقیدت سے بڑھ کر آئیڈیل شخصیت کا روپ دھار گیا۔ محبت کب آرام سے بیٹھنے دیتی ہے۔ دل ملاقات اور آپ کی صورت وسیرت دیکھنے کے لیے بے تاب ہو گیا۔ اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں دعا کی کہ یا اللہ کوئی ایسی صورت پیدا فرما دے کہ ذوق وشوق کو تسکین ملے۔ ہمارے ایک دوست مولانا احمد حسن صاحب نے نصرۃ العلوم میں دورۂ حدیث کی جماعت میں داخلہ لیا۔ انہی دنوں میں ہمارے ایک دوسرے دوست اور کرم فرما حضرت مولانا محمد صابر صاحب مجھے اور حافظ احسان اللہ الحسینی کو گوجرانوالہ لے گئے۔ مدرسہ پہنچنے پر دل میں عجیب وغریب خوشی کے جذبات تھے کہ آج ہمارا مدعا پورا ہونے لگا ہے۔ ہم نے دیکھا کہ مسجد نور کے برآمدہ میں ایک باوقار اور پُرکشش شخصیت جلوہ افروز ہے۔ اردگرد طلبہ کا مجمع ہے۔ ایک طالب علم حدیث پڑھتا ہے، پھر حضرت اس کی تشریح فرماتے ہیں۔ تشریح کبھی مختصر ہوتی ہے اور کبھی کچھ دیر بولنے کا سلسلہ جاری رہتا ہے۔ ہمارے دوست نے بتایا کہ یہی حضرت شیخ ہیں۔ سبق کے اختتام پر جب آپ دوبارہ اپنی نشست پر آئے تو ہم نے مصافحہ کی سعادت حاصل کی۔ خوشی ومسرت کی وجہ سے جسم میں خوشی کی لہریں اٹھتی تھیں کہ کہاں ہم اور کہاں یہ نابغہ روزگار شخصیت، اکابر کے معتمد جن کی اللہ جل شانہ نے زیارت نصیب کرائی۔

گھر سے روانگی کے وقت خالہ نے فرمایا تھا کہ میرے لیے تعویذ لے کر آنا، کیونکہ گھر میں جھگڑا رہتا ہے۔ میں نے حضرت شیخ کی خدمت میں عرض کیا کہ خالہ کے گھر میں اکثر جھگڑا رہتا ہے، کوئی تعویذ دے دیں۔ بڑے ظریفانہ انداز میں فرمایا، بھئی بڑے اچھے لوگ ہیں کہ جھگڑا کرتے ہیں۔ حضرت کے پیارے پیارے الفاظ کی چاشنی آج بھی محسوس کرتا ہوں۔

آپ نے تعویذ دیا۔ تعویذ کو بند کرنے کا ایک مخصوص انداز تھا جو کسی دوسری جگہ میں نے نہیں دیکھا۔ اس تعویذ کو دوبارہ کھولنا ہر ایک کا کام نہ تھا۔ میں نے کھولنے کی کوشش کی تو تعویذ کے پھٹ جانے کا اندیشہ ہوا، لہٰذا اپنا ارادہ ترک کر دیا۔

دوسری مرتبہ بھی بندہ حضرت مولانا قاری محمد صابر صاحب کی معیت میں گکھڑ بغرض زیارت گیا۔ ان دنوں حضرت کے خادم ڈیرہ اسمٰعیل خان کے ایک ساتھی تھے جن کا اب نام یاد نہیں رہا۔ آپ کے کمرے میں بیٹھے، چائے اور مٹھائی پیش کی گئی۔ حال احوال ایسے پوچھتے تھے جیسے برسوں سے واقف ہوں۔ ماں باپ، بہن بھائی کا پوچھتے اور کام وغیرہ کے بارے میں تفصیلی حالات معلوم کرتے۔ ملاقات کے دوران میں مولانا قاری محمد صابر نے حضرت شیخؒ سے سوال کیا کہ حال ہی میں حضرت مولانا مفتی نظام الدین شامزئی صاحب نے فتویٰ دیا ہے، جو ضرب مؤمن میں شہ سرخی سے شائع ہوا تھا، کہ ہندوستان کے مسلمانوں پر جہاد فرض ہے۔ حضرتؒ نے فوراً فرمایا: ''مفتی صاحب کو اس فتویٰ سے رجوع کرنا چاہیے۔ ہندوستان میں بڑے بڑے علما موجود ہیں، وہ وہاں کے حالات کو زیادہ بہتر سمجھتے ہیں''۔

تیسری ملاقات کچھ عرصہ قبل تین چار ساتھیوں کے ہمراہ ہوئی۔ اس سفر کی غرض اجازت حدیث لینا اور اکابر کی زیارت تھی۔ لاہور میں جامعہ مدنیہ جدید میں جانا ہوا۔ ہم نے گوجرانوالہ کے سفر کا ارادہ ظاہر کیا تو ایک ساتھی نے بتایا کہ حضرت شیخ کے پوتے اور حضرت مولانا عبد الحق خان بشیر صاحب کے صاحبزادے یہاں زیر تعلیم ہیں۔ ان سے ملاقات کی۔ انہوں نے اپنا نام ممتاز الحسن خان بتایا اور کہا کہ حضرت نے مجھے ''حدائق الحنفیہ'' کے دو نسخے لانے کو کہا تھا۔ آپ جا رہے ہیں تو یہ ایک نسخہ میری طرف سے پیش کر دیں، دوسرا مل گیا تو وہ بھی حاضر خدمت کروں گا۔ آپ اس وقت آپ صاحب فراش تھے۔ ہم حیران تھے کہ اس حال میں بھی کتابی ذوق زندہ اور قائم ہے۔ سبحان اللہ! حضرت مولانا انور شاہ کشمیریؒ کی یاد تازہ کر دی۔ جب ان سے انتہائی بڑھاپے کی حالت میں تلامذہ نے عرض کیا کہ حضرت اب ایسا کون سا مسئلہ باقی ہے کہ جس کی تحقیق کرنا ہے؟ ہمارے ذمہ لگائیں، خود کیوں تکلیف اٹھاتے ہیں؟ تو فرمایا ''یہ ایک روگ ہے''۔ بہرحال ملاقات کے دوران ہم نے ممتاز الحسن خان صاحب کا ہدیہ پیش کیا تو بہت خوش ہوئے اور فرمایا ''میں نے تو دو نسخے کہے تھے''۔ مولانا احسان اللہ احسان نے عرض کی کہ حضرت دوسرا نسخہ مل جائے گا تو وہ بھی آپ کو بھیجیں گے۔ فی الحال ان کو ایک ہی نسخہ ملا ہے۔ ہم سب نے اپنے لیے دعا کرائی اور اجازت حدیث حاصل کی جو اس سفر کا بڑا مقصد تھا۔

کچھ عرصہ سے ہم پھر آپ کی زیارت کا پروگرام ترتیب دے رہے تھے کہ آپؒ کی وفات کی خبر آ گئی اور آناً فاناً پورے ملک میں پھیل گئی۔ پروانے شمع کے گرد جمع ہونے لگے۔ آپ کی وفات پر ہر انسان سوگوار تھا۔ ہر ایک انسان کی آواز گلوگیر تھی۔ جنازہ گاہ میں اشکوں کا سماں تھا۔ اس مجمع کو دیکھ کر مولانا ابو الکلام آزادؒ کی وفات پر شورش کشمیریؒ کے کہے ہوئے شعر زباں پر آنے لگے۔

یہ کون اٹھا کہ دیر و کعبہ شکستہ دل خستہ گام پہنچے
جھکا کے اپنے دلوں کے پرچم خواص پہنچے عوام پہنچے
تیری لحد پہ خدا کی رحمت تیری لحد کو سلام پہنچے
تری مرگ ناگہاں کا مجھے ابھی تک یقین نہیں ہے

حضرت مولانا ڈاکٹر خالد محمود نے جنازہ کے موقع پر اپنے کلمات میں فرمایا کہ وہ سرفراز تھے، اس شہر میں سرفراز آئے تھے اور سرفراز ہی گئے۔ اللہ تعالیٰ ان کی قبر پر کروڑوں رحمتیں نازل فرمائیں۔ بندہ اپنی ناقص رائے کے مطابق عرض کرتا ہے کہ جیسے شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد زکریاؒ اپنے بزرگوں کے لاڈلے تھے، ایسے ہی حضرت مولانا سرفراز خان صفدرؒ بھی اپنے اکابر کے لاڈلے تھے۔ اکابر کا جو اعتماد ان کے حصے میں آیا، ان کے معاصرین میں شاید اس کی مثال نہ ہو۔ انہوں نے بھی اکابر کے اس اعتماد کی لاج رکھی۔ فرماتے تھے کہ ''پچاس سال ہو گئے مجھے پڑھاتے ہوئے، مگر کبھی اجتہاد کا دعویٰ نہیں کیا''۔

مولانا محمد اسلم معاویہ

[ڈیرہ اسماعیل خان]

۱۰

میں نے دو سال مادر علمی جامعہ نصرۃ العلوم میں اپنے شیخ حضرت شیخ الحدیث والتفسیر نور اللہ مرقدہ کے قدموں میں بیٹھ کر شرف تلمذ حاصل کیا ہے۔ الحمد للہ اس دوران ہمیشہ یہی کوشش کرتا کہ استاد محترم نور اللہ مرقدہ کی جوتی مبارک کو سیدھا کرنے کا اور اٹھانے کی خدمت کا موقع مل جائے۔ استاد محترم کی گاڑی مدرسہ میں داخل ہوتی تو طلبہ اپنے شیخ اور استاد، اس دور کے قطب الاقطاب کی زیارت کی خاطر گاڑی کی طرف دیوانہ وار دیکھنے لگ جاتے۔ اس موقع پر استاد مکرم مولانا عبد القیوم ہزاروی مدظلہ کی والہانہ محبت دیدنی ہوتی تھی کہ حضرت شیخ کی آمد کے وقت مدرسہ کے صحن میں گھومتے رہتے تھے۔ جب حضرت شیخ مدرسہ میں تشریف لے آتے اور مولانا ہزاروی ان کی زیارت کر لیتے، تب ہی اپنے کمرے میں تشریف لے جاتے۔ استاد مکرم گاڑی سے اتر کر سیدھا مسجد کی طرف روانہ ہو جاتے۔ سب سے پہلے جو قدم مبارک مسجد میں آتا، وہ دایاں پاؤں ہوتا اور مسنون دعا پڑھ کر مسجد میں داخل ہو جاتے۔

ایک مرتبہ ۹ ذوالحجہ ۱۴۲۷ھ کو جامعہ سیدہ اسماء بنت ابی بکرؓ کی تقریب سنگ بنیاد کے موقع پر احقر نے استاد محترمؒ حضرت مولانا زاہد الراشدی مدظلہ اور فقیہ العصر مولانا مفتی محمد عیسیٰ خان گورمانی دامت برکاتہم اور مولانا محمد ایوب صفدر کو دعوت دی۔ ہم ان تمام حضرات کو گوجرانوالہ سے لے کر گوٹریالہ ضلع گجرات کے لیے روانہ ہوئے تو میں نے درخواست کی کہ حضرت شیخ الحدیث صاحب سے دعا بھی کروانی ہے اور مدرسہ کی سرپرستی فرمانے کی درخواست کرنی ہے۔ ہم گکھڑ میں حضرت امام اہل سنت کے گھر پہنچے، حضرت کی زیارت ہوئی اور استاد محترم مولانا زاہد الراشدی صاحب نے فرمایا کہ ہمارا گوٹریالہ میں مدرسہ کا سنگ بنیاد رکھنے کا پروگرام ہے، وہاں جا رہے ہیں، آپ دعا فرما دیں۔ آپ نے دعا فرمائی اور مدرسہ کی سرپرستی بھی قبول فرمائی۔ ملاقات کے بعد ہم روانہ ہوئے تو میرے دونوں ساتھی محترم بھائی شکیل احمد اور چودھری محمد بوستان آف گوٹریالہ نے کہا: آپ نے کیسی عظیم ہستی کی ہمیں زیارت کروائی ہے۔ ایک تو ہماری ساری تھکاوٹ دور ہو گئی ہے اور دوسرے حضرت امام اہل سنت کی زیارت کر کے ہماری زندگی بدل گئی ہے۔ چودھری محمد بوستان نے تو اسی وقت اپنے چہرے پر سنت رسول کو سجانے کا عزم مصمم کر لیا اور آج الحمد للہ ان کے چہرے پر سنت رسول سجی ہوئی ہے۔ یہ سب سیدی مرشدی میرے شیخ کا فیض ہے۔

استاد مکرم حضرت مولانا زاہد الراشدی تلونڈی بھنڈراں ضلع نارووال میں تشریف لائے تو میں ملاقات کی غرض سے خدمت میں حاضر ہوا۔ خیریت وعافیت پوچھنے کے بعد میں نے عرض کیا، استاذی حضرت شیخ کی طبیعت کیسی ہے؟ فرمایا:

استاذ محترم ٹھیک ہیں۔ پھر فرمایا کہ استاد محترم حضرت شیخ الحدیث نور اللہ مرقدہ گکھڑ میں پنجابی زبان میں درس قرآن دیا کرتے تھے۔ ان کو پنجابی سے اردو زبان مولانا محمد نواز بلوچ منتقل کرتے ہیں اور پھر میں اردو زبان چیک کرتا ہوں۔ جہاں پر کچھ غلطی کا احساس ہوتا ہے، اس پر نشان لگا دیتا ہوں، پھر حضرت شیخ کی خدمت میں پیش کر کے پوچھ لیتا ہوں۔ ایک مقام پر حضرت شیخ نے فرمایا کہ مکہ مکرمہ سے طائف کی مسافت تین میل ہے۔ میں استاد مکرم کی خدمت میں حاضر ہوا۔ میں نے عرض کی کہ آپ نے مکہ مکرمہ سے طائف کی مسافت تین میل بتائی ہے، لیکن یہ مسافت تین میل سے زیادہ ہے۔ حضرت شیخ نے فرمایا نہیں، تین میل ہے۔ فرمایا کہ جلالین شریف لاؤ۔ میں جلالین شریف اٹھا کر لایا تو فرمایا، فلاں صفحہ نکالو۔ میں نے وہ صفحہ نکالا تو فرمایا، فلاں حاشیہ دیکھو۔ میں نے جب مطلوبہ حاشیہ دیکھا تو اس میں لکھا تھا کہ مکہ مکرمہ سے طائف کی مسافت ثلاثۃ امیال ہے۔ ساتھ ہی مجھے فرمایا کہ میں نے پچاس سال قبل جلالین شریف کا مطالعہ کیا تھا۔ عمر کے اس حصے میں حافظ کا یہ حال کہ پچاس سال قبل دیکھی ہوئی کتاب کا صفحہ اور حاشیہ تک یاد ہے۔

احقر ایک مرتبہ جمعہ کے دن حضرت امام اہل سنت کی خدمت میں محض زیارت کی غرض سے حاضر ہوا۔ نماز عصر جامع مسجد امام اہل سنت میں ادا کی۔ نماز کے بعد اپنے شیخ کے مکان کی طرف روانہ ہوا۔ اس وقت کچھ احباب حضرت شیخ کی زیارت اور ملاقات کے لیے پہلے ہی موجود تھے۔ میں نے حضرت شیخ کے ساتھ مصافحہ کیا۔ استاد محترم نے فرمایا، مولانا آپ کون ہیں؟ میں نے عرض کی کہ آپ کا شاگرد بھی ہوں اور مرید بھی۔ فرمایا، کیا کرتے ہو؟ میں نے عرض کی کہ پہلے مسجد میں امام وخطیب تھا اور ساتھ حفظ قرآن مجید کی تعلیم بھی دیتا تھا۔ اب سرکاری نوکری کے لیے درخواست دی ہوئی ہے۔ پاس بیٹھے ہوئے ایک دوست نے کہا کہ استاد محترم سے کہیں کہ دعا فرمادیں۔ استاد محترم میری طرف متوجہ ہوئے اور فرمایا کہ میرے استاد تھے، حضرت مولانا عبد القدیر کیمبل پوریؒ۔ میں ان کی خدمت میں حاضر ہوا تو انھوں نے پوچھا کہ کیا کر رہے ہو؟ میں نے کہا کہ فاضل عربی کا کورس کر رہا ہوں۔ استاد محترم نے فرمایا: ہم نے تمہیں دین کی تعلیم اس لیے دی ہے کہ تم دین اسلام کی خدمت کرو گے، اور تم سرکار کے نوکر ہو رہے ہو! دو سال تک استاد محترم مولانا عبد القدیرؒ مجھ سے ناراض رہے۔ دو سال کے بعد میں استاد محترمؒ کی خدمت میں حاضر ہوا تو عرض کیا کہ استاذی! اب تو میں مدرسہ میں دین اسلام کی تعلیم دینے میں مصروف ہوں، اب تو آپ راضی ہو جائیں۔ تب استاد محترم راضی ہوئے۔ جونہی حضرت شیخ الحدیثؒ نے اپنے استاد محترم کا واقعہ مکمل کیا، میں ان کے مقصد کو سمجھ گیا۔ میں نے عرض کی کہ استاذی، آپ دعا فرمادیں۔ اب ان شاء اللہ دین ہی کا کام اور خدمت کروں گا۔

مورخہ ۷/ اپریل ۲۰۰۹ء کو احقر حضرت مولانا عبد الغفار تونسوی کے ساتھ حضرت شیخ الحدیثؒ کی ملاقات کی غرض سے حاضر ہوا۔ مولانا تونسوی نے مصافحہ کیا تو حسب عادت شریف فرمایا، مولانا آپ کون ہیں؟ تونسوی صاحب خاموش کھڑے رہے تو میں نے عرض کی کہ حضرت مولانا محمد عبد الغفار تونسوی۔ حضرت تونسوی دامت کاتہم کا نام نامی سنتے ہی فرمایا، مولانا کا کیا حال ہے؟ تو صاحبزادہ تونسوی صاحب نے فرمایا کہ ٹھیک ہیں۔ حضرت امام اہل سنت نے فرمایا کہ تونسوی صاحب مجھ سے بارہ سال چھوٹے ہیں۔ تھوڑی دیر کے بعد صاحبزادہ مولانا عزیز الرحمن صاحب شاہد کمرے میں داخل ہوئے تو حضرت شیخ الحدیث صاحب نے ان کو حضرت صاحبزادہ کا تعارف کروایا کہ یہ مولانا عبد الستار تونسوی کے بیٹے مولانا عبد الغفار تونسوی ہیں۔ پھر استاد محترم نے حضرت صاحبزادہ تونسوی کی طرف متوجہ ہو کر وہ قیمتی جملہ ارشاد فرمایا جس کی قدر صاحب

علم لوگ جانتے ہیں۔ فرمایا مولانا عبد الستار تونسوی علما کی ناک ہیں۔ اس کے بعد صاحب زادہ صاحب نے حضرت مولانا محمد عبد الستار تونسوی دامت برکاتہم کی طرف سے ہدیہ پیش کیا جس کو امام اہل سنتؒ نے نہایت ہی خوشی سے قبول فرمایا اور فرمایا کہ حضرت کو میرا اسلام کہنا۔ یہ میری استاد محترم حضرت امام اہل سنت کے ساتھ آخری ملاقات ثابت ہوئی۔

اللہ تعالیٰ حضرت امام اہل سنت نور اللہ مرقدہ کو کروٹ کروٹ جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام عطا فرمائے۔ آمین بحرمۃ النبی الامی الکریم صلی اللہ علیہ وسلم۔

مولانا عبد الرشید انور تونسوی

[گوٹریالہ، گجرات]

﴿ ۱۱ ﴾

حضرت امام اہل سنتؒ کی پہلی دفعہ زیارت اور آپ کا بیان سننے کی سعادت پندرہ سال قبل جامعہ فاروقیہ شیخوپورہ میں تکمیل مشکوۃ کے موقع پر حاصل ہوئی۔ یوں تو مدیر جامعہ فاروقیہ حضرت مولانا محمد عالم دامت برکاتہم کا حضرت امام اہل سنت کے ساتھ دیرینہ تعلق تھا جس کی بنا پر حضرتؒ کی طرف سے دیگر سینکڑوں اداروں اور تنظیموں کی طرح جامعہ فاروقیہ کی سرپرستی بھی ہمیشہ رہی۔ جامعہ فاروقیہ میں ۱۹۷۶ء میں جامعہ کی بنیاد رکھنے کے ساتھ ہی افتتاحی اسباق حضرت امام اہل سنتؒ نے پڑھائے جس کی برکت سے آج سینکڑوں طلبہ وطالبات اس چشمہ سے سیراب ہو چکے اور ہو رہے ہیں۔ علاوہ ازیں وقتاً فوقتاً امتحان کی غرض سے بھی حضرتؒ تشریف لاتے رہے۔

بندہ کو جس دور میں حضرتؒ کا پہلا خطاب سننے کی سعادت حاصل ہوئی، یہ بندہ کی تعلیم کا ابتدائی سال تھا۔ خیال تو یہ تھا کہ حضرت جو گفتگو فرمائیں گے، وہ ہم جیسے ابتدائی طلبہ کی سمجھ میں کہاں آئے گی، لیکن جب بیان شروع ہوا تو مجمع میں کوئی فرد، کسی طبقہ زندگی سے تعلق رکھنے والا شخص اس علم کے سمندر سے فیض یاب ہونے سے اپنی کم علمی کی وجہ سے محروم نہ تھا۔ حضرت نے مجمع اور افراد کی رعایت کرتے ہوئے دیگر علمی ابحاث کے ساتھ ساتھ روزمرہ پیش آنے والے ضروری مسائل انتہائی سادہ اور عام فہم طریقہ پر بیان فرمائے۔ کم علمی کے ساتھ اس وقت کم عمری کا زمانہ بھی تھا۔ چند باتیں پھر بھی ذہن پر نقش ہو کر رہ گئیں۔ آپ نے طہارت وصفائی کی اہمیت وضرورت پر درس دیتے ہوئے فرمایا کہ ناخنوں کو بڑھانا نہیں چاہیے، کیونکہ ان میں میل کچیل جمع ہو جاتی ہے۔ پھر آدمی انہیں میلے ہاتھوں سے کھانا کھائے یا اپنے رب کی دربار میں اسی میل کچیل کے ساتھ چلا آئے، یہ مسلمان کی شان کے لائق نہیں۔ دوسرا آپ نے عورتوں کے متعلق فرمایا کہ ناخن پالش لگا کر وضو کرتی ہیں، جبکہ ایسا وضو اور غسل درست نہیں۔ اس کے علاوہ باریک دوپٹے میں نماز پڑھنے سے منع فرمایا، کہ ستر پوشی کا حکم پورا نہ ہونے کی وجہ سے نماز ادا نہیں ہوتی۔

آپ کی ''انفع للناس'' کی شان آپ کے بیان سے واضح ہوتی ہے۔ اس کے علاوہ آپ کی ساری زندگی تدریس، تحریک جہاد، سیاست اور تحریر کے ذریعے حق کی طرف دعوت دیتے ہوئے انفعهم للناس کا نمونہ تھی۔ آپ نے جس سے بھی حق کے لیے اختلاف کیا تو طریق اختلاف پر بطور خاص توجہ دی کہ اختلافی دلائل جہاں مخاطب کے لیے مسکت ہوں، وہیں نفع بخش بھی ہوں۔ آپ نے مریض سے نفرت پھیلانے کی بجائے مرض کی خاتمہ کی طرف زیادہ توجہ فرمائی۔ آج ہمارے ہاں

آپ کی خدمات کا حوالہ دیتے ہوئے اور اظہار تصلب فی الدین والمسالک کا تذکرہ کرتے ہوئے مختلف مسالک پر آپ کے ردکو بطور سند پیش کیا جاتا ہے، مگر طریق اختلاف سے عموماً روگردانی کی جاتی ہے جس کے نتیجے میں اختلاف فساد تک پہنچ جاتا ہے جو بہر حال مذموم ہے۔

آپ نے جس طریق پر اختلاف کیا، اس کی ایک مثال ذکر کرنا چاہتا ہوں۔ مولانا اللہ وسایا مدظلہ بیان فرماتے ہیں کہ تحریک ختم نبوت کے زمانہ میں گوجرانوالہ میں ایک ایسا مکتب فکر جو اکابر علماے دیوبند کو کافر کہتا ہے، اس کے ایک راہنما مولانا زاہد الراشدی صاحب کی سیاسی ترکیب سے گوجرانوالہ میں ختم نبوت کے متحدہ پلیٹ فارم کے امیر بنادیے گئے۔ جب دیوبندی مکتب فکر سے متعلق لوگوں کو ان کے امیر بنائے جانے کا علم ہوا تو وہ حضرت مولانا سرفراز خان صفدرؒ کے پاس گئے اور عرض کی کہ کیا ہم اپنے اکابر کو کافر قرار دینے والوں کی زیر قیادت کام کریں؟ حضرت مولاناؒ نے جواب میں فرمایا کہ ہاں، انھی کے ساتھ کام کرو۔ جب وفد نے دوبارہ یہ عرض دہرائی تو ارشاد فرمایا کہ جاؤ، ان عالم کے ساتھ کام کرو۔ ہم نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی عزت کی خاطر اپنے اکابر کی عزت کو قربان کردیا۔

اختلاف کے باوجود وسعت قلبی کا جو راستہ آپ نے اپنایا، یہ اسی کا نتیجہ تھا کہ آپ کے جنازے میں اور جنازے کے بعد تعزیت کرنے والوں میں صرف آپ کے نقطہ نظر کے حامی ہی نہیں بلکہ بلاتفریق مسلک تمام مکاتب فکر کے نامور علما اور شخصیات شامل تھیں جس کی تفصیلات حضرت مولانا زاہد الراشدی نے روزنامہ اسلام لاہور میں شائع ہونے والے کالم میں بیان فرمائی ہیں۔ مقصد یہ ہے کہ اختلاف کے باوجود آپ نے مخاطب کو سمجھانے کی غرض اور اس کے نفع کو سامنے رکھا، چنانچہ فکری اختلاف کے باوجود ایسی وسعت قلبی کی جھلک آپ کے خاندان کے علما اور ''الشریعہ'' میں واضح طور پر دیکھی جاسکتی ہے۔

مولانا عبدالمالک طاہر

[مدرس جامعہ فاروقیہ شیخوپورہ]

﴿ ۱۲ ﴾

۵ رمئی ۲۰۰۹ء کو حضرت شیخ نور اللہ مرقدہ کی جدائی نے عالم اسلام کی سب سے بڑی علمی لائبریری گرادی۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ یادوں کی بستی میں شیخ صدیوں زندہ رہیں گے۔ حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی کی وفات پر حکیم الاسلام مولانا قاری محمد طیب صاحب نے ایک جملہ لکھا تھا کہ ''آج تو قاسم وامداد سب ہی مرتے ہیں''۔ حضرت شیخ رحمہ اللہ پر بھی یہی جملہ صادق آتا ہے۔

میری حضرت سے سب سے پہلی ملاقات ۱۹۸۰ء سے پہلے ہوئی۔ بندہ دارالعلوم حقانیہ میں مدرس تھا۔ ہم حضرت کے پاس گکھڑ گئے اور رات بھی شیخ کے گھر میں گزاری۔ صبح حضرت کی امامت میں نماز پڑھنے کی سعادت نصیب ہوئی۔ نماز کے بعد حضرت نے مسند احمد کا درس دیا۔ اس کے بعد ہم گکھڑ سے مدرسہ نصرۃ العلوم گوجرانوالہ تک حضرت کے ساتھ گئے۔ راستے میں حضرت نے پوچھا کہ کیا پشاور کے کسی کتب خانے سے ابن فورک کی کتاب ''مشکل الحدیث'' کا کوئی اچھا نسخہ مل جائے گا؟ ساتھ ہی فرمایا کہ یہ کتاب سب سے پہلے علامہ ابوالوفاء افغانی نے حیدر آباد دکن سے شائع کی تھی۔ ہم نے عرض کیا کہ یہ کتاب حال ہی میں اکوڑہ خٹک سے شائع ہوئی ہے۔ حضرت یہ سن کر بہت خوش ہوئے اور فرمایا کہ مجھے کب تک مل جائے گی؟ ایک

ساتھی نے کہا کہ آج ہی آپ کو مل جائے گی جس پر حضرت مزید خوش ہوئے۔ خوشی کی حالت میں ان کا چہرہ چمکنے لگتا تھا۔

شیخ کتابوں کے معاملے میں اپنے دور کے صاحب ''کشف الظنون'' تھے۔ صرف جمع کرنے کا شوق نہیں تھا، پڑھنے کے بھی شائق تھے۔ بغیر حوالے کے قدم نہیں اٹھاتے تھے۔ تحریر میں ہر مصنف کی سن پیدائش اور سن وفات کا ذکر نمایاں ہوتا ہے اور یہ التزام وہی شخص کرسکتا ہے جو تاریخ اور اسماء الرجال سے گہرا شغف رکھتا ہو۔

۱۹۹۶ء میں بنوں میں فقہی کانفرنس منعقد کرنے کا فیصلہ کیا گیا۔ حضرت کو دعوت دینے کے لیے کانفرنس کے بانی مولانا سید نصیب علی شاہ صاحب مرحوم کے ہمراہ میں بھی حاضر ہوا۔ حضرت بہت خوش ہوئے اور مجوزہ عنوانات پر ایک نظر ڈالی۔ پھر فقہی کانفرنس کے بارے میں جو تبصرہ فرمایا، وہ آب زر سے لکھنے کے قابل تھا، لیکن افسوس کہ اس وقت محفوظ نہ کیا جاسکا۔

اللہ تعالیٰ حضرت کی قبر کو منور فرمائیں اور ان کی علمی یادگار مدرسہ نصرۃ العلوم کو دن دگنی اور رات چگنی ترقی عطا فرمائے۔

مولانا قاری محمد عبد اللہ

[سینئر نائب امیر جمعیت علماے اسلام صوبہ سرحد]

﴿ ۱۳ ﴾

یہ ۱۹۷۷ء کا واقعہ ہے۔ تحریک نظام مصطفیٰ پورے ملک میں عروج پر تھی۔ ہر جگہ حکومت کے خلاف جلسے اور جلوس منعقد ہو رہے تھے۔ اسی سلسلے میں گوجرانوالہ میں گکھڑ منڈی کی جامع مسجد میں جمعے کی نماز کے بعد ایک بہت بڑا جلوس نکالا گیا جس کی قیادت شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد سرفراز خان صفدر فرما رہے تھے۔ میں بھی اس وقت گکھڑ میں ہی مقیم تھا اور اس جلوس میں شریک تھا۔ جلوس جی ٹی روڈ پر ایک مقام پر پہنچا تو پولیس نے روک لیا اور سڑک پر ایک سرخ لکیر کھینچ کر شرکاے جلوس کو دھمکی دی کہ جو بھی ریڈ لائن کو عبور کرے گا، اسے گولی مارنے کا حکم ہے۔ حضرت شیخ الحدیث رحمہ اللہ نے اپنے دست مبارک سے میری پیٹھ تھپکی اور اپنے مخصوص انداز میں فرمایا: ''سنگیا، اللہ داناں بلند کر''۔ میں نے نعرۂ تکبیر بلند کیا، شرکاے جلوس نے بیک آواز یہ نعرہ دہرایا اور جلوس حضرت کی قیادت میں ریڈ لائن عبور کر گیا۔ تھوڑا آگے چل کر پولیس نے پھر ایک جگہ ریڈ لائن لگادی۔ حضرت نے پھر میری پیٹھ تھپکی اور فرمایا کہ ''سنگیا، اللہ داناں بلند کر''۔ میں نے پھر نعرۂ تکبیر بلند کیا، اللہ اکبر کی صدا بلند ہوئی اور جلوس ریڈ لائن کراس کر گیا۔ تیسری دفعہ پھر یہی ہوا اور حضرت شیخ الحدیث کے حکم پر میں نے نعرۂ تکبیر بلند کیا اور جلوس ریڈ لائن توڑ کر آگے بڑھ گیا۔ اب پولیس نے لاٹھی چارج اور آنسو گیس کا استعمال کیا اور لوگوں کو گرفتار کرنا شروع کردیا۔ حضرت شیخ الحدیث سمیت کئی لوگ گرفتار کر لیے گئے۔

۱۹۷۸ء کی بات ہے۔ حضرت شیخ الحدیث کا معمول تھا کہ بوہڑ والی مسجد میں روزانہ صبح کی نماز کے بعد درس دیا کرتے تھے اور درس سے فارغ ہوتے ہی مدرسہ نصرۃ العلوم گوجرانوالہ کے لیے روانہ ہو جاتے تھے۔ میں ان دنوں محلہ پیر عبد اللہ شاہ کی مکی مسجد میں امامت کے فرائض انجام دے رہا تھا۔ ایک دن درس کے اختتام پر میں حضرت کو گوجرانوالہ کے لیے رخصت کرنے گیا۔ واپسی پر اپنی مسجد کی طرف جا رہا تھا کہ محلہ پیر عبد اللہ شاہ میں بریلویوں کی ایک مسجد میں بریلوی حضرات کے مناظر ضیاء اللہ قادری کو درس کے دوران حضرت شیخ کے متعلق نازیبا زبان استعمال کرتے ہوئے سنا۔ اس سے پچھلی رات بھی اسی مسجد میں جلسہ تھا جس میں بریلوی مقررین نے مسلک دیوبند اور خصوصاً حضرت شیخ الحدیث کے بارے میں نازیبا الفاظ

استعمال کیے تھے، لیکن رات کو ہی حضرت نے طلبہ کو منع فرمادیا تھا کہ کوئی طالب علم ان کے جلسے میں نہ جائے، کیونکہ یہ لوگ بے بنیاد باتیں کرتے ہیں اور طلبہ جذباتی ہوتے ہیں جس سے شراور فساد پیدا ہونے کا امکان ہے۔ بہرحال جب میں حضرت کو رخصت کر کے وہاں سے گزرا تو ضیاء اللہ قادری کی نازیبا زبان سن کر اپنے جذبات پر قابو نہ رکھ سکا اور سیدھا بریلویوں کی مسجد میں داخل ہو کر اسٹیج پر جا کر اسے گریبان سے پکڑ لیا اور وہاں اچھا خاصا ہنگامہ ہوگیا۔ آخر طے ہوا کہ ضیاء اللہ شاہ نے اپنے درس میں جو الزامات لگائے ہیں، ان پر مناظرہ کیا جائے گا۔ اس سے اگلے دن مناظرے کا وقت مقرر ہوا۔ جب حضرت شیخ الحدیث کو میری اس حرکت کا علم ہوا تو آپ نے فرمایا کہ اس کو ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا، لیکن اب وہ وہاں چلا گیا ہے تو پھر مناظرہ بھی کرنا چاہیے۔ حضرت نے اپنی مسجد کے صدر مدرس مولانا غلام علی صاحب کو فرمایا کہ آپ مناظرہ کے لیے جائیں، چنانچہ مولانا غلام علی صاحب مقام مناظرہ پر گئے لیکن ضیاء اللہ قادری اور بریلویوں کے دوسرے علما میدان سے فرار ہوگئے اور مناظرے کے لیے نہیں آئے۔

قاری فیض الدین

[بنہ، الائی۔ ضلع مانسہرہ]

﴿ ۱۴ ﴾

پانچ مئی بروز منگل نماز فجر کے بعد مجھے اپنے چھوٹے بھائی اور سینئر صحافی محمد عبداللہ خالد کے ذریعے، جو گکھڑ منڈی میں مقیم ہیں، اطلاع ملی کہ حضرت مولانا محمد سرفراز خان صفدر رحلت فرما گئے ہیں۔ اناللہ وانا الیہ راجعون۔ خبر سنتے ہی ایسا محسوس ہوا کہ جسم میں جان ہی نہیں رہی۔ دل ودماغ جسم کا ساتھ نہیں دے رہے تھے۔ سکتہ کی کیفیت لگ رہی تھی اور جب موت کی حقیقت آشکارا ہوئی تو آنکھوں سے آنسوؤں کا نہ رکنے والا سیلاب شروع ہوگیا۔ تقریباً ایک گھنٹہ اسی جگہ بیٹھے بیٹھے اپنے ماضی کے وہ دن یاد کرتا رہا جو اللہ تعالیٰ نے مولانا صاحب کی خدمت میں نصیب فرمائے تھے۔ یقیناً یہ میری خوش نصیبی تھی کہ جب تقسیم کے بعد والد صاحب گکھڑ منڈی میں آباد ہوئے تو ہمیں مولانا صاحب کی رفاقت نصیب ہوئی۔ والد صاحب جو کہ اسکول ٹیچر تھے، دین کی نسبت سے چند ہی دنوں میں حضرت کے بہت قریب آ گئے۔ یہ والد صاحب کا تقویٰ ہی تھا جس کی وجہ سے ان کو حضرت کی مسجد بوہڑ والی کی انجمن کا ناظم بنا دیا گیا۔ والد صاحب کے حضرت سے تعلقات کا اندازہ اسی بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ حضرت نے اپنی کتب میں والد محترم کا ذکر بڑی محبت سے کیا ہے۔

والد صاحب سے تعلقات اتنے قریبی ہوئے تو گھر کی خواتین، میری والدہ محترمہ اور خالہ جی (مولانا زاہد الراشدی کی والدہ) میں بھی آپس میں بہت پیار اور انس ہوگیا۔ مولانا زاہد الراشدی چونکہ اس وقت بہت چھوٹے تھے اور حضرت کی مصروفیات بہت زیادہ تھیں، اس لیے میرے والد محترم نے حضرت کی گھریلو خدمت کے لیے میری ڈیوٹی لگا دی۔ بازار سے کوئی چیز منگوانی ہوتی یا کوئی چھوٹا موٹا کام ہوتا تو حضرت اس بندہ ناچیز کو ہی یاد فرمایا کرتے تھے۔

حضرت کی رہائش اس وقت بٹ دری فیکٹری کی بالائی منزل پر ہوا کرتی تھی۔ اس فیکٹری کے مالک حاجی اللہ دتہ بٹ نہایت متقی اور مخلص انسان تھے۔ مجھے خدمت کی سعادت تیسری جماعت سے ساتویں جماعت تک رہی۔ بعد ازاں والد صاحب والد صاحب کا تبادلہ نت کلاں کے اسکول میں ہوگیا۔ حضرت کی شخصیت ایسی تھی کہ مجھے ان سے قلبی لگاؤ ہوگیا تھا اور یہ تعلق آج

تک نہ صرف میرے دل میں محسوس ہوتا ہے بلکہ ان کی محبت کے اثرات آج بھی اپنی روزمرہ زندگی میں محسوس کرتا ہوں۔

حضرت شیخ الحدیث کے اتنے قریب رہ کر جس چیز نے مجھے سب سے زیادہ متاثر کیا، وہ ان کی سادگی تھی۔ وقت کی پابندی کا اتنا خیال رکھتے تھے کہ لوگ ان کو دیکھ کر واقعی اپنی گھڑیاں درست کرتے تھے۔ حضرت جی جامع مسجد بوہڑ والی میں درس قرآن وحدیث دیا کرتے تھے۔ مجال ہے کہ کبھی ایک منٹ بھی آگے پیچھے ہوا ہو۔ اس کے علاوہ اسکول میں بھی بعد نماز عصر درس ہوا کرتا تھا اور وقت کی پابندی وہاں بھی قابل تقلید ہوا کرتی تھی۔

یقیناً جن لوگوں سے اللہ تعالیٰ نے کوئی بڑا کام لینا ہوتا ہے، ان میں ابتدائی زندگی سے ہی بلکہ بچپن ہی سے بزرگوں کے اوصاف نظر آنے لگتے ہیں۔ حضرت کے تقویٰ کا صرف ایک واقعہ لکھنا چاہوں گا۔ ایک دفعہ میں حضرت کے ساتھ تھا۔ جلدی میں ٹرین پر سوار ہوئے اور ٹکٹ نہ لے سکے۔ ہم گکھڑ منڈی سے گوجرانوالہ جا رہے تھے۔ گوجرانوالہ اتر کر حضرت نے فرمایا، بیٹے حفیظ الدین! یہ پیسے لو اور گوجرانوالہ سے گکھڑ کا ٹکٹ بنوا کر پھاڑ دینا تا کہ سرکاری خزانہ پر بوجھ نہ پڑے۔ ان کی تمام عادات صحابہ کرام جیسی تھیں۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی سنتوں کے سو فیصد پابند تھے۔

مجھے حضرت بچپن ہی سے بہت پیار کرتے تھے۔ جب بھی بلاتے، بیٹا حفیظ الدین کہہ کر بلاتے۔ دوران علالت جب بھی حاضری کی سعادت حاصل ہوئی، فرماتے میرا بیٹا حفیظ الدین آیا ہے۔ حال احوال پوچھتے، دعائیں دیتے اور نصیحت فرماتے۔

آج الحمدللہ انہی کی دعاؤں سے اللہ تعالیٰ نے دنیاوی پریشانیوں سے بچایا ہوا ہے۔ دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کی جدائی کے صدمہ کو سہنے کی توفیق ان کے تمام پس ماندگان اور مجھ خادم کو عطا فرمائے۔ آمین۔

صوفی حفیظ الدین

[میاں چنوں]

﴿ ۱۵ ﴾

اہل وفا کی ایک طویل فہرست ہے جو قیام انسانیت سے تادم حال اپنی قربانیوں کی لازوال تاریخ رقم کر گئے۔ انہی قلندرانہ، مجاہدانہ اور درویشانہ صفات وکمالات کے حامل امام اہل سنت مولانا سرفراز خان صفدر بھی اپنی لازوال قربانیوں کی بدولت اپنا نام اہل وفا کی فہرست میں شامل کروا چکے۔

تقریباً آخری آٹھ سال امام اہل سنت فالج کے دوبار شدید حملہ کی وجہ سے صاحب فراش ہوگئے۔ بیماری سے پہلے بھی اور بعد میں بھی آپؒ کے گھر پر اکثر مہمانوں کا رش رہتا۔ بہت سی شخصیات ملاقات اور زیارت کے لیے تشریف لاتیں۔ یقیناً آپ کی اولاد اور متعلقین میں سے ہر ایک نے اپنے وقت پر اور اپنے اپنے انداز میں ان کی خدمت کی مگر ان میں سے بعض نے تو آپ کی زندگی کے آخری اور معذوری کے دور میں خدمت کا حق ادا کر دیا۔ ان میں سے مفتی جمیل خان شہید، حاجی میر لقمان، ڈاکٹر فضل الرحمن، مولانا نواز بلوچ، قاری اسماعیل، مولانا مدثر اور خاص طور پر جگر گوشہ امام اہل سنت مولانا منہاج الحق خان راشد تو قابل رشک ہیں۔ برادرم راشد نے جونہی جوانی کے ایام میں قدم رکھا تو امام اہل سنتؒ بیماریوں کے حملے کی زد میں آ گئے۔ قربان جاؤں ایسے فرزند پر کہ جس نے اپنی جوانی کا ایک ایک پل اپنے عظیم والد کی خدمت میں اس انداز سے گزارا کہ

شاید اس کی مثال اس دور میں نہ مل سکے۔

آپ کو غسل دینا، کپڑے بدلنا، بستر بدلنا اور بہت سی دوسری خدمات میں راشد صاحب یکتا نظر آئے۔ میرا اکثر گکھڑ جانا ہوتا۔ جب سے حضرت صاحب فراش ہوئے، میں نے برادرم راشد کو رات کی نیند سے کوسوں دور دیکھا۔ جس طرح پورا دن خدمت میں گزرتا، اسی طریقے سے اپنی رات کی نیند بھی کئی سالوں تک اپنے عظیم والد کی خدمت میں قربان کی، بلکہ کبھی کبھی ایسا بھی دیکھا کہ برادرم راشد ہمارے گھر اچھڑیاں تشریف لاتے، لیکن جونہی پہنچتے اور ابھی پانی بھی نہ پیا ہوتا کہ گھر سے فون آ جاتا کہ ابا جان بلا رہے ہیں۔ فوراً سارا پروگرام تبدیل کر کے آپ کی خدمت میں حاضر ہو جاتے۔ اللہ رب العزت برادرم راشد صاحب کو بھرپور جزائے خیر عطا فرمائے۔ یقیناً یہ عظیم سانحہ آپ کی تمام اولاد اور متعلقین اور خصوصاً برادرم راشد صاحب کے لیے بہت بڑا سانحہ ہے۔ اللہ رب العزت ان سب کو صبر جمیل عطا فرمائے۔

حافظ سہیل امین سواتی

[اچھڑیاں، مانسہرہ]

۱۶

یہ ۱۹۵۹ء کی بات ہے۔ میں گورنمنٹ نارمل سکول گکھڑ کی ایس وی کلاس میں پڑھتا تھا۔ ایس وی کلاس میں تو میٹرک اور ایف اے تک کی تعلیم کے لڑکے تھے مگر ساتھ او ٹی کلاس بھی تھی جس میں عربی فاضل اور دینی مدارس کے فارغ التحصیل طلبہ بھی تھے۔ ہمارے پرنسپل جناب عبدالحمید مرحوم تھے جو بڑے نیک اور علم دوست انسان تھے۔ انھوں نے تمام طلبہ کے لیے لازم قرار دیا تھا کہ وہ پانچوں وقت کی نمازیں اسکول کی خوبصورت اور صاف ستھری مسجد میں باجماعت ادا کریں۔ جو لڑکا جماعت سے رہ جاتا تھا، اس کو سزا ملتی تھی۔ پرنسپل صاحب خود ہر نماز میں وقت سے پہلے مسجد میں پہنچ جاتے اور طلبہ کی حاضری چیک کرتے۔

عصر کی نماز کے بعد روزانہ درس قرآن ہوتا تھا جس کے لیے مولانا سرفراز خان صفدر گکھڑ شہر سے پیدل چل کر آتے تھے۔ ان کی رہائش اور اسکول کی مسجد کے درمیان ڈیڑھ دو کلومیٹر کا فاصلہ تھا۔ مولانا کی وقت کی پابندی حیران کن حد تک مثالی تھی۔ وہ عین وقت پر آ کر پہلے ہمیں نماز پڑھاتے اور پھر قرآن کا درس دیتے۔ جب نماز کی جماعت کھڑی ہونے میں دو تین منٹ باقی ہوتے تو وہ مسجد کے دروازے کے اندر داخل ہو رہے ہوتے تھے۔ یہ ان کا ہر روز کا معمول تھا۔ مجھے یاد نہیں کسی ایک دن بھی وہ تاخیر سے مسجد میں پہنچے ہوں۔ اگر کبھی ایسا ہوتا کہ نماز کا وقت ہو گیا اور مولانا مسجد میں نہیں پہنچے تو یقین تھا کہ اس دن وہ نہیں آ رہے اور درس کا ناغہ ہوگا۔ ہم نے ایک سال وہاں گزارا۔ مولانا نے اس دوران چھٹی تو کی مگر مسجد میں تاخیر سے کبھی نہیں پہنچے کہ ان کا انتظار کرنا پڑا ہو۔

آپ کا درس عالمانہ اور انداز حکیمانہ اور پرتاثیر ہوتا تھا۔ بات خوب ذہن نشین کر دیتے تھے۔ کبھی کوئی طالب علم سوال بھی کرتا جس کا تسلی بخش جواب دے کر مولانا سائل کو مطمئن کر دیتے۔ ایک دفعہ ایک طالب علم نے سورۃ المائدہ کی آیت ۱۵ 'قد جاء کم من اللہ نور و کتاب مبین' کے بارے میں پوچھا کہ یہاں نور سے مراد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔ آپ نے جواب میں فرمایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات کی نورانیت میں کوئی شبہ نہیں مگر یہاں نور اور کتاب دونوں

الفاظ قرآن کے لیے آئے ہیں۔ جب طالب علم نے جواب سے عدم اطمینان کا اظہار کیا اور مزید تفصیل پوچھی تو آپ نے فرمایا کہ آگے 'یہدی بہ' میں ضمیر واحد اس پر شاہد ہے کہ نور اور کتاب ایک ہی چیز ہے، دو چیزیں نہیں ورنہ ضمیر تثنیہ (بہما) آتی۔ آپ کا جواب سن کر سب طلبہ مطمئن ہو گئے۔

ہم نے گکھڑ میں قیام کے دوران مولانا صاحب سے خوب استفادہ کیا۔ اتنے بڑے عالم سے بعد ازاں زندگی بھر باقاعدہ درس لینے کا موقع نہ ملا۔ ایک دفعہ آپ سے پوچھا گیا کہ حضرت! سرفراز تو آپ کا نام ہے، صفدر کا اضافہ کیسا ہے؟ اس پر آپ نے بتایا کہ میں دیوبند سے فارغ التحصیل ہوا تو میری کامیابی امتیازی تھی۔ میرے اساتذہ مجھ پر خصوصی شفقت فرماتے تھے۔ تقسیم اسناد کی تقریب منعقد ہوئی۔ جب اسٹیج سے میرا نام پکارا گیا تو میں دور سے صفوں کو چیرتا ہوا آ رہا تھا۔ میرے محترم استاد نے مجھے اس طرح آتے دیکھا تو فرمایا، وہ سرفراز صفدر (صفوں کو چیرنے والا) آ رہا ہے۔ پس اسی دن سے میں سرفراز صفدر ہو گیا۔

اللہ تعالیٰ مرحوم کو جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام عطا فرمائے۔ اس قدر پایے کے عالم باعمل روز روز پیدا نہیں ہوتے۔

پروفیسر محمد یونس جنجوعہ

[قرآن اکیڈمی، ماڈل ٹاؤن، لاہور]

۱۷

حضرت امام اہل سنت علم و عرفان کا پیکر تھے۔ آپ کے علم کی بڑے بڑے جید علما حضرات تعریف کرتے اور آپ کے علم کی مثال دیتے تھے۔ ایک مرتبہ جامعۃ العلوم الاسلامیہ علامہ محمد یوسف بنوریؒ ٹاؤن کراچی کے سرپرست اعلیٰ حضرت مولانا عبدالرزاق سکندر مدظلہ نے بخاری شریف کا سبق پڑھاتے ہوئے آپ کے علم کے بارے میں فرمایا کہ اگر کسی نے حسین احمد مدنیؒ ثانی اور اس دور کا عظیم محدث اور محقق دیکھنا ہو تو وہ گکھڑ جا کر حضرت مولانا سرفراز خان صفدر کو دیکھ لے۔ یہ الفاظ احقر نے اپنے کانوں سے سنے اور میری کاپی پر یہ الفاظ منقوش ہیں۔

بندہ نصرۃ العلوم میں تین سال تک تعلیم حاصل کرتا رہا ہے۔ میرے مدرسہ میں داخل ہونے سے ایک سال قبل حضرتؒ نے شدید علالت کی وجہ سے مدرسہ آنا چھوڑ دیا تھا۔ اسی سال بندہ حضرتؒ کی زیارت کی غرض سے صبح سویرے مدرسے میں حاضر ہوا۔ ابھی امام اہل سنت تشریف نہیں لائے۔ تھوڑی دیر بعد حضرتؒ کی گاڑی گیٹ کے اندر داخل ہوئی۔ جونہی حضرت گاڑی سے باہر نکلے، حضرتؒ نے بآواز بلند سلام کے لیے صدا کی۔ پھر تھوڑا چل کر سیڑھیوں تک پہنچے اور قدم مبارک جوتے سے نکال کر مسجد میں داخل کیے ہی تھے کہ پھر سلام کی ایک صدا بلند کی۔ پھر تھوڑا سا آگے چلے تو طلبہ کو سلام کیا اور پھر جب تدریسی نشست کے قریب ہوئے اور بیٹھنے لگے تو پھر حضرت نے تھوڑا سا ہاتھ اٹھا کر تمام طلبہ کو سلام کیا۔ گویا تھوڑا سا فاصلہ طے کرتے ہوئے کم و بیش پانچ مرتبہ سلام کیا۔ ایک طالب علم سے جب میں نے سوال کیا تو اس نے بتایا کہ یہ حضرتؒ کا روزانہ کا معمول ہے۔ اس کے بعد حضرت تفسیر قرآن کا سبق پڑھانے لگے۔ اللہ اکبر! اس قدر عاجزی دیکھ کر میری آنکھیں نم ہو گئیں۔

عطاء الرحمن جالندھری

[گوجرانوالہ]

﴿ ۱۸ ﴾

حضرت مولانا محمد سرفراز خان صفدرؒ سے میری پہلی ملاقات آج سے تقریباً پچیس سال پہلے گکھڑ میں ان کی مسجد میں ہوئی۔ ملاقات کا بہانہ کچھ یوں بنا کہ میرے ایک دوست حافظ محمد اکرم کی چھوٹی بہن کو دورے پڑتے تھے۔ بیچاری بہت تکلیف میں تھی۔ عاملوں نے بتایا کہ ایک جن اس میں داخل ہوتا ہے تو اس کو دورہ ہوتا ہے۔ حافظ اکرم کو کسی شخص نے بتایا کہ مولانا محمد سرفراز خان صفدر سے بچی کو چیک کروائیں۔ حافظ محمد اکرم مجھے ساتھ لے گئے۔ ہم گکھڑ پہنچے تو اتفاق سے اس روز حضرت گھر پر نہیں تھے۔ بتایا گیا کہ آج حضرت راولپنڈی گئے ہیں۔ ہم دو دن کے بعد دوبارہ گئے مگر اس بار بہن ہمارے ساتھ نہیں تھی۔ ہم نے سوچا کہ پہلے وقت لے آتے ہیں، پھر بہن کو لے جائیں گے کیونکہ اس بات کا اندیشہ تھا کہ اسے اگر راستے میں دورے کی شکایت ہوگئی تو سنبھالنا بہت مشکل ہوگا۔ حضرتؒ سے ان کی مسجد میں نماز عصر کے بعد ملاقات ہوئی۔ ہم نے بچی کی تکلیف کا ذکر کیا اور پوچھا کہ اسے دم کرانے کے لیے کب لے کر آئیں۔ حضرتؒ نے فرمایا کہ بچی کو لانے کی ضرورت نہیں، بس ایک کام کرنا۔ ہم نے پوچھا، وہ کیا؟ فرمانے لگے کہ جب بچی میں جن صاحب وارد ہوں اور بچی کو دورہ پڑے تو بچی کے دونوں بازوؤں کو مضبوطی سے پکڑنا اور یہ کہنا کہ اے جن تم جو بھی ہو، سن لو کہ مولانا سرفراز خان صفدر کا پیغام ہے کہ بچی کا پیچھا چھوڑ دو، ورنہ مجھے تمہارا پیچھا کرنا پڑے گا۔ ہم واپس آگئے۔ چار پانچ گھنٹے کے بعد بچی کو دورے کی شکایت ہوئی۔ حافظ اکرم صاحب نے حضرتؒ کی ہدایت کے مطابق اپنی بہن کے دونوں بازو مضبوطی سے پکڑے اور حضرتؒ کا پیغام سنا دیا۔ اسی وقت بچی کی کیفیت بدل گئی اور اس کے چہرے پر اطمینان اور سکون کے آثار نظر آنے لگے۔ اس کے بعد وہ بچی ٹھیک ہوگئی۔ اب وہ بچی حافظ آباد میں رہتی ہے اور ماشاء اللہ دو بیٹوں اور دو بیٹیوں کی ماں ہے۔

ڈاکٹر عبدالماجد حمید المشرقی

[صدر انٹرنیشنل ایجوکیشن فورم پاکستان]

﴿ ۱۹ ﴾

جب ہم درجہ عالیہ میں تھیں تو ہمارے استاد محترم اکثر درس کے دوران مولانا نور اللہ مرقدہ کا تذکرہ فرمایا کرتے تھے۔ ایک دفعہ فرمانے لگے کہ بیٹیو! آپ میں صفت علم نہیں ہے، اس کی تحقیق کرو۔ اپنے اسلاف کو دیکھو، اور دیکھو کہ اگر آج دنیا میں کوئی بڑے شیخ الحدیث، شیخ التفسیر موجود ہیں تو وہ مولانا سرفراز خان صفدرؒ ہیں۔ جب بھی موقع ملے، ان کی زیارت کے لیے جاؤ اور ان ہستیوں کی قدر کرو۔ ان کی تصانیف دیکھو تو وہ علم کا شاہکار ہیں اور انہیں خود دیکھو تو عمل کا شاہکار و پیکر۔

پھر اللہ تعالیٰ نے ۲۰۰۵ء کے آخر میں مجھ پر اپنا کرم فرمایا اور میں نے حضرتؒ کی زیارت کی۔ ان کے چہرے سے نور جھلک رہا تھا اور سادگی کا پیکر تھے۔ مجھے ان کی بیعت سے مشرف ہونے کی سعادت حاصل ہوئی۔ میرے ساتھ میری والدہ اور میرا ایک کزن بھی بیعت سے مشرف ہوئے۔ میرے کزن کی ڈاڑھی نہیں تھی۔ میں نے بلکہ ہم سب نے دیکھا کہ ضعف وکمزوری کی وجہ سے حضرت بات بھی نہ کر سکتے تھے اور نہ اتنی طاقت تھی کہ بدن کو حرکت دے سکیں، لیکن سنت سے جو محبت تھی، وہ خود بخود ظاہر ہو رہی تھی اور بار بار آپ کے ہاتھ اسی سنت کی تبلیغ میں حرکت کر رہے تھے۔ جب میرے کزن نے سلام کیا تو انہوں نے بار بار ہاتھ سے ڈاڑھی کا اشارہ فرمایا۔ جب اس نے بیعت کے لیے کہا تو پھر یہی اشارہ فرمایا۔ وہ بار بار کہتا کہ ٹھیک ہے، میں ڈاڑھی رکھوں گا۔ پھر ہم تقریباً پانچ دس منٹ بیٹھے، اس دوران بھی وہ بار بار ڈاڑھی کی طرف اشارہ کرتے رہے۔ جب وہ اجازت کے لیے سلام لینے لگا تو پھر اشارہ فرمایا۔ ان کی طبیعت کی بے چینی اور سنت سے والہانہ محبت بتا رہی تھی کہ اگر ان کا بس چلتا تو اسی وقت اسے وہاں سے ڈاڑھی رکھوا کر اٹھنے دیتے۔ ان دس منٹوں میں سنت کی تکمیل اور تبلیغ کے لیے ان کی تڑپ سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ باقی زندگی کا لمحہ لمحہ انھوں نے کیسے اس کی تکمیل میں گزارا ہوگا۔

ہماری دعا ہے کہ اللہ ان کی قبر کو جنت کے باغوں میں سے ایک باغ بنائے اور روضہ مبارک کی کھڑکی ان کی قبر میں کھول دے، وہاں کی برکتوں اور رحمتوں کی بارش ان پر نازل فرمائے اور ہم سب کو ان کے لیے صدقہ جاریہ بنائے۔ اللہ کرے کہ ہماری طرف سے جو اعمال ان کو تحفہ ملیں، وہ ان کے لیے نافلہ ہوں اور قیامت کے روز اللہ انہیں عرش عظیم کے سایہ سے نوازے، آمین بجاہ سید الکونین صلی اللہ علیہ وسلم۔

اخت نوید

[کھاریاں، ضلع گجرات]

﴿ ۲۰ ﴾

قریباً تیس، پینتیس سال پرانی بات ہے کہ جمعۃ المبارک کے روز نماز جمعہ کی ادائیگی اور امام اہل سنت حضرت مولانا سرفراز خان صفدرؒ کی خدمت عالی میں حاضری اور دعا کی غرض سے جامع مسجد گکھڑ میں حاضر ہوا۔ نماز جمعہ کی ادائیگی کے بعد آپ کی خدمت عالی میں سلام عرض کرنے کے بعد گویا ہوا: ''حضرت! میں حویلیاں ضلع ایبٹ آباد سے حاضر ہوا ہوں، دار السعید کے نام سے حضرت مولانا قاضی محمد زاہد الحسینیؒ کی دعاؤں سے، اسلام کی بنیادی اور ضروری تعلیمات مقدسہ پر مشتمل چارٹس طبع کروا کر مساجد کے لیے تقسیم کیے جاتے ہیں۔'' یہ سن کر حضرت مسکرا کر خاموش ہوگئے۔ مسجد کے باہر مسجد کے صحن میں تشریف لائے۔ ایک آدمی جو مقامی معلوم ہوتا تھا، اپنے بارہ چودہ سالہ لڑکے کے ساتھ حضرت کے قریب ہوا۔ بڑی عقیدت کے ساتھ مصافحہ کرنے کے بعد بولا، حضرت! اس کے لیے دعا فرمائیں۔ یہ نماز نہیں پڑھتا۔ قدرے غصہ کے عالم میں اس سے کچھ اس طرح فرمایا کہ بچپن میں دین اور دین کے کاموں میں نہیں لگاتے، جب بگڑ جاتے ہیں تو پھر تعویذ کے لیے آجاتے ہیں۔ اس کو نماز پڑھنے کی تلقین فرمائی، دعا فرمائی اور پھر مسکراتے ہوئے اس سے پیار فرمایا۔ اس کے بعد میں نے عرض کیا، حضرت! اجازت ہے تو میری طرف دیکھ کر خاموش ہوگئے۔

جب مسجد کی سیڑھیوں سے اتر کر نیچے سڑک پر تشریف لائے تو میں نے پھر رخصت چاہی، لیکن حضرت خاموش رہے۔ سڑک کے کنارے فورڈ ویگن ان کے لیے کھڑی تھی۔ مجھے ویگن میں بیٹھنے کا حکم فرمایا اور خود بھی بیٹھ گئے۔ سڑک کی دوسری جانب حضرت کا مکان تھا۔ ویگن سے اتر کر مجھے بیٹھک میں بٹھایا اور خود گھر تشریف لے گئے۔ میں اکیلا بیٹھک میں بیٹھا سوچ رہا تھا کہ ہمارے اکابر کتنے عظیم ہیں۔ ان کو اللہ کریم اور اس کے دین سے محبت ہوتی ہے۔ پکے مکان بنانے کی فکر نہیں ہوتی، بلکہ اپنا اور دوسروں کا ایمان پکا بنانے کی فکر ہوتی ہے۔ اسی اثنا میں اللہ کے یہ ولی خود چائے بسکٹ لے کر تشریف لائے اور مجھے چائے پلائی۔ اس کے بعد میں نے دعا کی درخواست کی۔ دعا کے بعد مکان سے باہر مجھے الوداع کہنے کے لیے خود تشریف لائے۔

اپنی زندگی میں میری یہ حضرتؒ سے پہلی اور آخری ملاقات تھی۔ کتنے عظیم تھے، کتنے شفیق تھے ہمارے اکابر! اللہ تعالیٰ ان کی قبور پر رحمتوں کا نزول فرماتا ہی رہے۔

محمد سعید

[دارالسعید، حویلیاں شہر، ضلع ایبٹ آباد]

﴿ ۲۱ ﴾

یوں تو بندہ کو حضرت کی زیارت کا موقع بار بار ملا، مگر پہلی ملاقات کے لیے جب ہم گئے تو سارا رستہ ایک عجیب تصور دل ودماغ پر چھایا رہا۔ عرصے سے حضرت کے علمی وعملی کارنامے سنتے آرہے تھے اور حضرت کی شخصیت کا دبدبہ مرعوب کر رہا تھا۔ قلبی خوشی تھی کہ ملاقات کا وقت مل گیا۔ ہم حاضر ہوئے تو حضرت مصلے پر تشہد کی حالت میں سر جھکا کر عاجزی ومسکنت کے ساتھ تشریف فرما تھے۔ سلام ومصافحہ کے بعد تعارف ہوا اور کچھ مسائل اور حضرت کی بیماری وعوارض پر گفتگو ہوئی۔ بندہ کمرے کا جائزہ لیتا رہا۔ ہر طرف کتابوں کی الماریاں بھری ہوئی، چارپائیاں بھی کتابوں کے بوجھ سے جھکی ہوئی اور تپائیاں بھی کتابوں سے پر تھیں۔ حضرت نے اپنے بیٹے سے فرمایا کہ مہمان کو کھانا کھلائیں۔ وہاں موجود ایک محلہ دار نے کہا کہ حضرت! مہمان کو میں گھر لے جا کر کھانا کھلا دوں؟ حضرت نے فرمایا، کیوں؟ مہمان ہمارے ہیں، کھانا آپ کیوں کھلائیں؟ انھوں نے عرض کی کہ پھر کھانے کے بعد رات کا قیام اور ناشتہ میرے پاس ہو جائے۔ حضرت نے اس کی اجازت دے دی۔

رات ان صاحب کے ہاں قیام کیا۔ انہوں نے بہت اکرام کا معاملہ کیا اور بہت خدمت کی۔ مجھے حیرت ہوئی کہ پرائے مہمان کی اتنی خدمت کی کیا وجہ ہے۔ یہ سوال میں نے ان سے ہی پوچھ لیا کہ اتنے تکلف اور خدمت کی کیا ضرورت ہے۔ انہوں نے کہا کیوں نہ اتنی خدمت کروں، آپ میرے شیخ کے مہمان ہیں جن کی وجہ سے میری زندگی بدل گئی۔ میں نے پوچھا وہ کیسے؟ کہنے لگے کہ میں سعودیہ کام کے لیے گیا۔ وہاں خوب پیسہ کمایا۔ عیاشی کی زندگی تھی، نماز کی پروا تھی، بس دنیا میں مست اور آخرت سے غافل۔ گویا حیوانی زندگی تھی۔ میری والدہ اس پر پریشان تھیں۔ انھوں نے حضرت کے پاس حاضر ہو کر میرے بارے میں درخواست کی کہ اس کو خط لکھیں، شاید وہ سدھر جائے۔ حضرتؒ کا خط مجھے ملا، فکر آخرت سے لبریز، مختصر مگر جامع۔ میں نے خط پڑھا تو الفاظ اپنی گہرائی اور اخلاص کے ساتھ میرے دل ودماغ میں اترتے چلے گئے۔ ایسا پر اثر اور پر خلوص تھا کہ میری زندگی کی کایا ہی پلٹ گئی اور میری زندگی میں انقلاب آ گیا۔ اس کے بعد سے میں صوم وصلوٰۃ کا پابند ہو گیا، ڈاڑھی بھی رکھ لی اور شریعت کے مطابق زندگی بسر کرنا شروع کر دی۔

بندہ ان کی گفتگو سے سوچتا رہا کہ یہ ایک خط کی وجہ سے لوگوں کی زندگی بدل جاتی ہے، جن کتابوں کے تحریر کرنے میں حضرت نے اس قدر ان تھک محنت کی، ان سے کتنا انقلاب اور تبدیلی آئی ہوگی۔ ور واقعتاً ایسا ہی ہے۔ حضرت کی تصانیف سے بہت سوں کی زندگی بدلی۔ ہمارے ایک استاد جو آج کل وفاق المدارس کے بڑے عہدے پر فائز ہیں اور جن کی دعوت اور وعظ ونصیحت سے بہت سے لوگ متاثر ہو کر اپنی زندگیاں بدل رہے ہیں، انھوں نے اپنی آپ بیتی سنائی کہ میں بہت زیادہ شرک وبدعات میں مبتلا تھا، بلکہ گاؤں کے سارے لوگوں کو بھی بدعات میں مبتلا کیے ہوئے تھا۔ اثر ورسوخ کی وجہ سے کوئی روکتا بھی نہیں تھا۔ گاؤں کے ایک صاحب کراچی میں ملازمت کرتے تھے۔ انہوں نے ایک کتاب ''راہ سنت'' نامی خرید کر میرے لیے بھیجی۔ بس اس کتاب کا پڑھنا تھا کہ دل ودماغ کی صفائی ہو گئی۔ راستہ مل گیا اور پھر حق اور توحید کی محنت

شروع کی۔ آج وہی گاؤں توحید وتبلیغ کا مرکز ہے۔ الحمد للہ کئی حفاظ کرام اس گاؤں سے تیار ہو رہے ہیں۔ یہ حضرت کی محنت کی ہلکی سی جھلک ہے۔ کاش ہر مسلمان اپنی استعداد کے مطابق اخلاص سے دین کی محنت شروع کر دے۔

مولانا ضیغم بلال

[مدرسہ زید بن ثابتؓ، کمال آباد راولپنڈی]

﴿ ۲۲ ﴾

راقم الحروف نے حضرت شیخ سے دورۂ تفسیر قرآن میں استفادہ کیا ہے۔ درس کے آغاز پر قاری صاحب تلاوت فرماتے تھے اور طلبہ کرام وضو بنانے چلے جاتے۔ راقم الحروف حضرت شیخ صاحبؒ کے مبارک قدموں کو دباتا تھا۔ قاری صاحب نے سورۃ انفطار کی تلاوت یوں کی: ''وما ادریك ما یوم الدین ،ثم ما ادریك ما یوم الدین''۔ حضرت شیخ نے محبت بھرے لہجے میں فرمایا: قاری صاحب! رمضان المبارک کا مہینہ ہے، دورۂ تفسیر برکت کے لیے پڑھا رہے ہیں۔ آپ ٹھیک تلاوت کر رہے ہیں، مگر قراءت متواترہ سے پڑھیں۔ وماادرٰك مایوم الدین، ثم ما ادرٰك ما یوم الدین۔

راقم الحروف نے علمی وعملی ترقی کے لیے دعا اور خصوصی وظیفہ کی درخواست کی تو استاد محترم نے فرمایا کہ ہر فرض نماز کے بعد تین مرتبہ ''سنقرئك فلا تنسٰی'' پڑھا کرو۔ بندہ نے عرض کیا، ایک اور دعا چاہیے تو شفقت وپیار سے فرمایا، دائما (ہمیشہ) یہی پڑھ لیا کرو تو کافی ہے۔

حضرت شیخ فرماتے تھے: اکابر علماے دیوبند کی تصانیف اور تالیفات جو ورثہ میں ملی ہیں، ان میں جو رموز واسرار اور معارف ہیں اور مضبوط رہنمائی جو ان کی کتابوں میں ہے، یہ ہماری سمجھ میں آ جائے تو فضل الٰہی اور غنیمت ہے۔ ان کے خلاف کچھ لکھنا، بولنا ہمارے بس کی بات نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو حضرت شیخ کے پروگرام اور نصب العین کو آگے بڑھانے کی توفیق سے نوازیں اور ان کے تمام رفقا اور ابنا واقربا کو فلاح دارین سے نوازیں۔ آمین۔

مولانا عبدا لصبور

[جامعہ ابوہریرہ، خالق آباد، نوشہرہ]

﴿ ۲۳ ﴾

امام اہل سنت حضرت مولانا سرفراز صفدرؒ سے مجھے براہ شرف تلمذ حاصل نہیں، لیکن استاذ محترم محدث کشمیر حضرت مولانا محمد یوسف صاحب دامت برکاتہم اور مولانا سرفراز صاحب مرحوم ہم درس تھے۔ اس طرح میرا مولانا مرحوم سے تعلق ایک شاگرد کا رہا۔ مولانا کی باطل فرق کے خلاف کتب میرے زیر مطالعہ رہیں جن سے مولانا کے تبحر علمی کا اندازہ بخوبی ہوتا ہے۔

غالباً ۱۹۶۷ء کی ایک حسین ظہر تھی۔ میں مدرسہ انوار العلوم گوجرانوالہ میں طالب علم تھا۔ نماز ظہر کے بعد میں نے عجیب منظر دیکھا کہ مولانا سرفراز صاحب نے مولانا مفتی عبدالواحد مرحوم کا جوتا اٹھایا ہوا ہے، مولانا عبدالواحد صاحب نے قاضی شمس الدین مرحوم کا جوتا اٹھایا ہوا ہے اور مولانا سرفراز صاحب مرحوم کا جوتا صوفی رستم نے اٹھایا ہوا تھا۔ مولانا عبدالواحد صاحب، مولانا سرفراز صاحب مرحوم کے استاد تھے اور مولانا قاضی شمس الدین مرحوم مولانا عبدالواحد صاحب مرحوم کے استاد تھے۔ ان تینوں کو میں نے پیار ومحبت کی اس کیفیت میں دیکھا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب حیات النبی کا مسئلہ عروج پر تھا اور ان بزرگوں کی

کتابیں ایک دوسرے کے خلاف طبع ہو رہی تھیں، لیکن ان کا اختلاف صرف اور صرف علمی تھا۔ ہر ایک اپنی جگہ علم کا کوہ ہمالہ تھا۔

حضرت کی وفات کا غم صرف ان کے خاندان کا غم نہیں، ہم سب کا غم ہے۔ ہم میں سے ہر ایک تعزیت کے لائق ہے۔ خداوند قدوس حضرت مرحوم کو جنت الفردوس میں جگہ عطا فرمائے، ان کی آخرت کی تمام منازل آسان فرمائے اور ہم سب کو اس صدمہ جانکاہ کے سہنے کی توفیق عطا فرمائے۔

سردار ریاض احمد نعمانی
[ڈسٹرکٹ اینڈ سیشن جج، باغ]

﴿ ۲۴ ﴾

حضرت سے قلبی تعلق اور عقیدت شروع ہی سے تھی، لیکن ۲۰۰۵ء میں پہلی دفعہ ہم چار ساتھی برادرم نعمان ظہور، مولانا قیصر محمود، مولانا امیر حمزہ عاصم اور راقم شیخوپورہ سے گکھڑ حضرت کی زیارت کے لیے حاضر خدمت ہوئے۔ حضرت نے باری باری سب سے پوچھا کہ کہاں سے آئے ہو اور کیا کرتے ہو؟ ہم نے بتایا کہ ہم جامعہ فاروقیہ شیخوپورہ میں پڑھتے ہیں تو فرمایا کہ اس کی بنیاد میں نے ہی رکھی تھی۔ پھر حضرت مولانا محمد عالم صاحب کے بارے میں پوچھا تو ہم نے بتایا کہ الحمد للہ ٹھیک ہیں۔ پھر حضرت سے ڈھیروں دعاؤں کا ذخیرہ لے کر روانہ ہوئے۔

گزشتہ سال نصرۃ العلوم میں دورۂ حدیث میں داخلہ لیا تو ارادہ یہ تھا کہ گکھڑ قریب ہونے کی وجہ سے وقتاً فوقتاً زیارت کی سعادت ملتی رہے گی۔ بحمد اللہ حدیث کی تعلیم کے ساتھ ساتھ محدث وقت کی زیارت سے آنکھوں کو ٹھنڈک ملتی رہی۔

آخری بار حضرت کی زیارت ۲۵ رفروری ۲۰۰۹ء کو ہوئی جب وہ اپنے صاحبزادہ استاذ محترم مولانا عبد القدوس خان قارن کے گھر تشریف لائے۔ دورۂ حدیث کی جماعت کے ساتھیوں نے مولانا زاہد الراشدی اور مولانا عبد القدوس قارن سے خواہش ظاہر کی کہ ہم حضرت سے سبق پڑھنا اور حدیث کی اجازت لینا چاہتے ہیں۔ حضرت سے پوچھا گیا تو کمال شفقت سے اجازت مرحمت فرمائی، چنانچہ ہم سب ساتھی مولانا عبد القدوس قارن صاحب کے گھر گئے اور زیارت کے ان مقدس لمحات میں حضرت کے سامنے بخاری ثانی سے واقعہ افک کی عبارت پڑھی گئی۔ حضرت اس وقت شدید بیماری اور کمزوری کی وجہ سے نیم دراز تھے۔ عبارت سن کر نہایت گھمبیر لہجے میں فرمایا کہ میرے لیے اللہ تعالیٰ سے معافی کی دعا کرنا کہ میں حدیث کا ادب کما حقہ نہیں کر سکا، لیکن میں معذور ہوں۔ عبارت پڑھتے ہوئے خوشی اور غم کے ملے جلے جذبات کے ساتھ طلبہ حدیث اپنے اکابر کے ہاں ادب حدیث کے بارے میں فکرمندی کا مشاہدہ کر رہے تھے۔

دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ حضرت شیخ کو کروٹ کروٹ جنت نصیب فرمائے اور ہمیں ان کے نقش قدم پر چلنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین یا رب العالمین۔

حافظ محسن سعید ثاقب
[فاضل مدرسہ نصرۃ العلوم گوجرانوالہ]

﴿ ۲۵ ﴾

احقر تین سال حضرت امام اہل سنت کی خدمت میں گکھڑ رہا۔ تجوید وقراءت بھی وہاں پڑھی اور جامع مسجد میں مدرس بھی رہا۔ اس دوران کے چند واقعات درج کرتا ہوں۔

ایک مرتبہ حضرت مولانا غلام غوث ہزاروی گکھڑ تشریف لائے اور جامع مسجد میں خطاب فرمایا۔ حضرتؒ کے کپڑے کھدر کے تھے اور پھٹے ہوئے تھے۔ حضرت شیخ نے مجھے فرمایا کہ میں گھر جا رہا ہوں، تم مولانا سے کہنا کہ تھوڑی دیر انتظار فرمائیں، میں کپڑے بھیجتا ہوں، لیکن حضرت ہزارویؒ نے قومی اسمبلی کے اجلاس میں شرکت کے لیے جلدی جانا تھا، اور وہ روانہ ہو گئے۔ حضرت شیخ کو معلوم ہوا تو آپ نے اپنے صاحبزادہ قاری محمد اشرف خان ماجد مرحوم کو حضرت کے پیچھے وزیر آباد بھیجا کہ کپڑے وہاں پہنچا کر آؤ مگر گاڑی نکل چکی تھی۔ قاری صاحبؒ واپس آ گئے۔ اس وقت حضرت بہت غمگین ہوئے کیونکہ وہؒ حضرت ہزارویؒ کے شاگرد بھی تھے۔

ایک مرتبہ حضرت شیخ کے ایک صاحبزادے سے، جو میرے لیے انتہائی قابل قدر ہیں، میرا جھگڑا ہو گیا۔ اس وقت احقر جامع مسجد گکھڑ میں مدرس تھا۔ احقر بتلائے بغیر وہاں سے چلا گیا۔ کچھ عرصہ بعد حاضر خدمت ہوا اور دروازہ کھٹکھٹایا تو حضرت اقدسؒ مکان کی چھت پر کلہاڑے سے لکڑیاں پھاڑ رہے تھے۔ نیچے دیکھا تو فرمایا، بے وفا آ گیا ہے!

ایک مرتبہ ملاقات کے لیے حاضر ہوا تو واپسی پر اپنے ساتھ گوجرانوالہ لے آئے۔ راستے میں حضرت اقدسؒ درود شریف پڑھتے رہے اور احقر بھی ذکر میں مشغول ہو گیا۔

حضرت اقدسؒ بہت مہمان نواز تھے۔ ایک مرتبہ احقر کو اچھی طرح یاد ہے کہ حضرت اقدسؒ نے خود کھانے کے لیے میرے ہاتھ دھلوائے۔ اتنی عاجزی وانکساری تھی حالانکہ احقر نے کہا کہ میں خود ہاتھ دھو لیتا ہوں۔

روزانہ بلاناغہ درس قرآن وحدیث پابندی کے ساتھ ہوتا تھا۔ طلبہ پر پابندی تھی کہ درس قرآن میں ضرور شریک ہوں۔ باقاعدہ فجر کی نماز کی حاضری لگتی تھی اور یہ کام احقر کے سپرد تھا۔

ایک مرتبہ ایک مولوی صاحب ملاقات کے لیے حاضر ہوئے۔ احقر بھی موجود تھا۔ مولوی صاحب حضرتؒ سے فضول بحث کر رہے تھے جس پر حضرتؒ سخت ناراض ہوئے۔ بعد میں مولوی صاحب سے معذرت کی اور انھیں ایک سو روپیہ عطا فرمایا۔ یہ حضرتؒ کا بڑا پن تھا۔

ایک مرتبہ استاذ المحدثین حضرت مولانا قاضی شمس الدین گکھڑ سے گزر رہے تھے تو حضرت سے ملنے کے لیے تشریف لائے۔ حضرت اس وقت درس قرآن ارشاد فرما رہے تھے۔ حضرتؒ نے درس روک کر قاضی صاحبؒ کا استقبال کیا اور جب وہ تشریف لے گئے تو پھر درس قرآن شروع کیا۔

قاری محمد اشرف علی ناصر
[فیصل آ[illegible]

﴿ ۲۶ ﴾

ایک مرتبہ ۲۰۰۳ء میں راقم اپنے استاذ محترم حضرت مولانا محمد عمیر صاحب کے ساتھ حضرت شیخؒ [illegible] ملاقات کی غرض سے گکھڑ حاضر خدمت ہوا۔ استاذ محترم صاحب نے حضرتؒ سے اپنے تلامذہ میں [illegible] فرمانے کی درخواست کی۔ اسی وقت حضرتؒ نے کمال مہربانی اور شفقت سے حدیث شریف انما الاعمال بالنیات (بے شک اعمال کا دارومدار نیتوں پر ہے) پڑھائی۔ روانہ ہونے سے قبل بندہ نے درخواست کی کہ حضرت! علم وعمل کی پختگی کے لیے

کوئی دعا بتلا دیجیے۔ حضرت نے فرمایا کہ رب زدنی علما ہر نماز کے بعد گیارہ گیارہ بار پڑھا کرو۔ الحمد للہ، راقم اس وقت سے اب تک اس وظیفہ کو باقاعدگی کے ساتھ پڑھتا آ رہا ہے اور الحمد للہ پڑھنے کا مقصد بھی پورا ہو رہا ہے۔

۲۰۰۳ء میں ہی راقم ایک مرتبہ اپنے استادِ محترم مولانا محمد قاسم قاسمی خانپوری صاحب اور کچھ دوسرے دوست احباب کے ہمراہ حضرت شیخ کی زیارت وملاقات کے لیے حاضر ہوا۔ استاد محترم نے راستے میں کچھ پھل بھی خرید لیا کہ حضرت کی محفل میں بیٹھ کر کھانے کی سعادت نصیب ہوگی۔ حضرت شیخ کے لیے علیحدہ پھل غالباً انگور یا سیب وغیرہ خریدے گئے۔ جب ہم حاضر خدمت ہوئے تو ظہر اور عصر کا درمیانی وقت تھا۔ جونہی کمرے میں داخل ہوئے تو حضرت کی طرف دیکھ کر میرے دل پر عجیب سی کیفیت طاری ہوگئی۔ حضرت باوجود ضعف اور بیماری کے بازوؤں کی ورزش فرما رہے تھے۔ آپ نے گھنٹی بجائی، گھر سے خادم آیا جس نے ہم سب دوست احباب کو حسب معمول مشروب پلایا۔ حضرت کی یہ عادتِ شریفہ تھی کہ زیارت کے لیے آنے والے ہر شخص کا اکرام ضرور کرتے تھے۔ اس کے بعد ہم نے راستے سے جو پھل لیے تھے، وہ حضرت کے سامنے رکھ دیے گئے اور عرض کیا کہ ہم آپ کی زیارت وملاقات کے لیے حاضر ہوئے ہیں، اگر آپ یہ پھل اپنے مبارک ہاتھوں سے ہم میں تقسیم کر دیں تو یہ بہت بڑی سعادت ہوگی۔ حضرت شیخ صاحبؒ نے عاجزی وانکساری کو اپناتے ہوئے فرمایا کہ میں تو اپنے آپ کو اس لائق نہیں سمجھتا۔ پھر استاذ محترم اور ہم دوستوں کے اصرار پر حضرت شیخ صاحبؒ نے کمال شفقت فرماتے ہوئے وہ پھل ہمارے درمیان تقسیم فرمائے اور واپسی پر ہم سب کو خوب دعائیں دے کر رخصت فرمایا۔

حافظ لقمان احمد فاروقی

[جامعہ قاسمیہ، ضلع نارووال]

﴿ ۲۷ ﴾

امام اہل سنت حضرت مولانا محمد سرفراز خان صفدر شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد مدنیؒ کے حقیقی علمی وعملی جانشین تھے۔ امام اہل سنت نے ہر باطل فرقے کے تعاقب کو اپنا فرض منصبی سمجھا، خواہ وہ فرقہ کسی شکل میں ہی کیوں نہ ابھرا ہو۔ جب کسی موضوع پر قلم اٹھاتے تو یوں محسوس ہوتا کہ آپ سے بڑھ کر اس موضوع پر کوئی مہارت نہیں رکھتا۔ آپ کی کتابوں کے مطالعہ سے یہ حقیقت روز روشن کی طرح عیاں ہے۔

امام اہل سنتؒ کی وفات جہاں ان کے اعزہ واقارب کے لیے ایک جانکاہ صدمے کی حیثیت رکھتی ہے، وہاں یہ پورے عالم اسلام کے لیے بھی ایک سانحہ ہے، کیونکہ ان کی ہستی عالم اسلام کی ایک عظیم اور مایہ ناز ہستی تھی۔ آج اگرچہ امام اہل سنتؒ ہم میں موجود نہیں، لیکن ان کا مشن اور موقف الحمد للہ ہمارے پاس موجود ہے۔ وہ اگرچہ جسمانی طور پر ہمیں داغ مفارقت دے گئے ہیں، لیکن وہ اپنی خدمات اور کردار کے آئینے میں ہمیشہ زندہ رہیں گے۔

اللہ تبارک وتعالیٰ حضرت امام اہل سنت کو اعلیٰ علیین میں بلند مقام عطا فرمائے، ان کے مرقد پر کروڑ بار رحمتیں نازل فرمائے اور ہمیں حضرت امام اہل سنتؒ کے نقشِ قدم پر چلنے کی توفیق نصیب فرمائے۔ آمین ثم آمین۔

حافظ حفیظ اللہ

[بن مولانا اللہ وسایا قاسم مرحوم]

الدکتور عبد الرزاق اسکندر*

امام اهل السنة المحدث الكبير

محمد سرفراز خان صفدر رحمه الله

الحمد لله رب العالمين، والصلوة والسلام على اشرف الانبياء والمرسلين، وعلى آله وصحبه اجمعين۔ وبعد:

فقد ورد عن النبى صلى الله عليه وسلم انه قال :الناس كابل مائة، لا تكاد تجد فيها راحلة (صحيح البخارى: ۹٦/۲) لقد بين صلى الله عليه وسلم فى هذاالحديث ان الشخصيات البارزة قليلة فى كل شعب الحياة، وانها تتكون بعد مدة من الزمن۔ فالعلماء كثيرون ومتساوون فى اجسامهم ولباسهم وظواهرهم وحمل الشهادات، و لكن الراسخين فى العلم والمتفقهين فى الدين والعاملين به قليلون، كما ان مائة ابل فى ظواهرها، فى اجسامها والوانها واشكالها متساوية، ولكن الراحلة التى تتحمل متاعب السفر لا تكاد تجد فيها الاواحدة۔ فامامام السنة المحدث الكبير والمفسر والفقيه الكبيرفضيلة الشيخ العلامة سرفراز خان صفدرؒ كان من تلك الشخصيات الفذة التى تتكون بعد فترة طويلة، وتكون جامعة لصفات الكمال۔

فكان رحمه الله تعالى مفسرا، ومحدثا، وفقيها، وخطيبا ومصنفا وشجاعاً، كما انه تحلى بالخلق العظيم من التواضع واكرام الضيف وغيرها من الصفات۔ قضى اكثر من ۵۰ سنة من حياته خادما للكتاب والسنة والعلوم الاسلاميه فى الجامعة التى اسسها اخوه فضيلة الشيخ عبدالحميد السواتىؒ ،كما عاش اماما وخطيبا فى جامع بلده، يربى الشعب المسلم على الايمان وعلى الخلق والآداب الاسلامية الى ان تلقى ربه سبحانه وتعالى۔ واليك نبذة موجزة من حياته وترجمته:

اسمه ونسبه: اسمه سرفراز خان صفدربن نور احمدخان، وينتسب الى قبيلة مشهورة ذات منزلة فى هذه المنطقة، "يوسف زئى"۔

مولده ونشاته ودراسته: ولد سنة ۱۳۳۲ للهجرة الموافق ۱۹۱٤م فى قرية "دهكى

* رئيس جامعة العلوم الاسلامية، علامه بنورى تاؤن، كراتشى

جيران'' محافظة مانسهره اقليم الحدود۔ نشا فی اسرة دينية متمسكة بدينها وخلقها وآدابها، وهی اسرة اشتهرت بكرم الضيافة۔

بدا الدراسة الابتدائية الدينية والعصرية فی محافظته ثم رحل الی اقليم بنجاب ودرس الدراسة الثانوية الشرعية وما يساوی الكلية فی مدارسها، فی مدن مختلفة، ثم شد الرحال مع اخيه الشيخ صوفی عبدالحميد السواتی الی مركز العلم والعرفان" جامعة ديوبند الاسلامية" (ازهر الهند) والتحق بها فی الدراسات العليا سنة ١٩٣٩م، فدرس بها آنذاك علوم الكتاب والسنة والفقه الاسلامی علی كبار مشايخها امثال فضيلة الشيخ المحدث حسين احمدالمدنی شيخ العرب والعجم، وفضيلة الشيخ المحدث والمفسر شبير احمد العثمانی، اول شيخ الاسلام عند استقلال باكستان، فاستفاد منهم حق الاستفادة، وكان مرضيا عند مشايخه، ممتازا بين اقرانه، فتخرج من جامعة ديوبند الاسلامية سنة ١٩٤٠م ونال الشهادة العالمية۔

التدريس بجامعة نصرة العلوم: رجع مع اخيه الشيخ الصوفی عبد الحميد السواتی من ديوبند الی اقليم بنجاب، ونزل فی مدينة "غوجرانواله" واسس اخوه الجامعة الاسلامية "جامعة نصرة العلوم" وهی من اكبر الجامعات الاسلامية الاهلية فی باكستان، وهی عضو فی وفاق المدارس العربية۔ وبدا يدرس بها علوم الكتاب والسنة والفقه الاسلامی الی آخر حياته اكثر من ٥٠ سنة فصار مرجعا للعلماء والمدرسين، واتصف بصفات المعلم الناجح من كمال العلم، وفصاحة اللسان، والشفقة علی التلاميذ، والمواظبة علی اوقات التدريس، فقد جعل مقره فی بلدة "غكر مندی" القريبة من غوجرانواله، وياتی منها علی الحافلة يوميا، وكان رحمه الله مواظباً لا يتاخر فی الصيف والشتاء والمطر۔ فتخرج علی يديه فی هذه المدة الالآف من طلبة العلم من انحاء باكستان وخارج باكستان من بنجله ديش، وافغانستان، والهند، وبورما، وايران وهذه صدقه جارية لفضيلته الی يوم القيامة، ان شاء الله تعالی، مصداقا لقول النبی صلی الله عليه وسلم: اذا مات ابن آدم انقطع عنه عمله الا عن ثلاث: صدقة جارية او علم ينتفع به او ولد صالح يدعو له" (صحيح مسلم: ٤١/٢) وهذه الثلاثة حاصلة لفضيلته من: الجامعة، والتلاميذ العلماء، والاولاد الصالحين، والحمد لله۔

اهتمامه بالشعب المسلم: لم يكتف فضيلتهؒ بالتدريس واعداد العلماء، بل اهتم بامور المسلمين: الشعب المسلم، فقام بتوعيتهم توعية اسلامية، واختار لذلك المسجد مركزا للدعوة والارشاد، وذلك مسجد حارته فی "غكر مندی" وجعل نفسه فيه اماما وخطيبا، وبدا فيه العمل بغاية الصبر والحلم، لان جو البيئة كان غير موات له، فالبيئة ساودها الشرك والبدعات والخرافات، فبدا بالعمل بغاية الحكمة والصبر والتحمل، فبدا باصلاحهم عن

طريق "درس القرآن الكريم" بعد صلاة الصبح، وعن طريق خطبة الوعظ والارشاد باللغة المحلية قبل خطبة الجمعة باللغة العربيه۔

ملحوظة: ان علماء الهند وباكستان، جزاهم الله خيرا، حافظوا علی عربية خطبة الجمعة، ولما ان معظم المصلين لا يعرفون العربية، اختار العلماء لهم خطبة الوعظ والارشاد بلغة محلية، لكی يعرفوا دينهم ويكونوا علی بصيرة من احكام الشريعة، فيجلس الخطيب او ای عالم علی المنبر قبل خطبة الجمعة، ويختار موضوعا مناسبا للظروف، ويرشدهم الی دينهم۔ ونجد مثال هذا فی عهد الصحابة رضی الله عنهم، فقد كان سيدنا ابو هريرة رضی الله عنه يقف جنب المنبر قبل مجئ الخطيب، ويحدث الناس بحديث رسول الله صلی الله عليه وسلم، حتی اذا جاء الخطيب جلس۔

هكذا استمر فضيلة الشيخؒ مدة حياته يرشد الشعب المسلم ويقوم بتوعيتهم توعية دينية، حتی غير الجو، فصار اهل هذا البلد متمسكين بتعاليم الكتاب والسنة، محبين لفضيلة الشيخ رحمه الله تعالی، وظهر هذا الحب فی جنازته ٥/ مايو ٢٠٠٩م حيث حضرها مئات الالآف المصلون العلماء والشعب وودعوه ولسان حالهم يقول: العين تدمع، والقلب يحزن، وانا بفراقك يا شيخنا لمحزونون، ولا نقول الا بما يرضی به ربنا تبارك وتعالی۔

كيفية درس القرآن الكريم: ان من عادة العلماء الائمة والخطباء انهم يعقدون درسا للقرآن الكريم بعد صلاة الفجر فی مساجدهم ويجلس المصلون، المتعلمون منهم خاصة، ويفتحون امامهم المصاحف فيتلو العالم بضع آيات من القرآن الكريم بالتجويد، ثم ياخذ كلمة كلمة ويبين معناها باللغة المحلية ويبين هل هی اسم او فعل او حرف، ثم يترجم معنی الآية باللغة المحلية، ثم يفسرها۔ ويبدا بسورة الفاتحة حتی ينتهی الی سورة الناس، وهكذا دواليك۔ وفضيلته رحمه الله تعالی كان يقوم بهذا الدرس طوال حياته فی هذا المسجد، واضافة الی ذلك بدا يلقی درس التفسير فی مسجد الكلية الحكومية امام الاساتذة والطلاب واستمر الی آخر حياته، ومن المعلوم ان هذه الطبقة خلاصة الشعب المسلم۔

جهوده ضد الفرق الباطلة والمنحرفة، والدفاع عن الحق واهله: توجد فی الهند وباكستان الفرق الباطلة والجماعات المنحرفة عن جادة الحق، فقام رحمه الله تعالی يؤلف ضد هذه الفرق الباطلة والمنحرفة، وهو فی كتاباته يمتاز بالوقار وقوة الاستدلال والاعتدال وقد اعترف بذلك اكبر مخالفيه۔ ويعتبر مولفاته حجة فی الموضوع، وقد كتب فی المسائل الخلافية التی دارت فی الهند وباكستان واثبت فيها الحق بالحجة والبرهان، وكانت هذه المؤلفات سببا لهداية كثير من الشعب، وخاصة المتعلمين منهم۔

من الواضح كالشمس في رابعة النهار ان "جامعه ديوبند الاسلاميه" (ازهر الهند) ومشايخها هم الذين نشروا التوحيد وعلوم الكتاب والسنة في القارة الهندية، وكافحوا الشرك والبدعات والخرافات، وببركة هذه الجامعة انشئت آلاف المدارس والجامعات في الهند وباكستان. ولكن هذا لم يعجب بعض الطوائف حسدا من عند انفسهم فبداوا يكتبون ضد اهل الحق مشايخ الجامعة ويفترون عليهم ما لم يقولوه، وينقلون عباراتهم من كتبهم ويرتكبون الخيانة في نقلها۔ وبعضها لم تبلغها عقولهم وكم من عائب قولا صحيحا وآفته من الفهم السقيم، فقام رحمه الله تعالى بالرد على هذه الافتراء ات وكتب كتابا باسم ''عبارات اكابر'' كشف فيه عن جهلهم وخيانتهم في نقل العبارات۔

وكذلك كتب في موضوعات اخرى رد فيها على بعض الافكار الخاطئة، وهي باللغة الاردية لان عامة الشعب يعرف هذه اللغة، ومن اهمها:

١۔ المنهاج الواضح (راه سنت)

٢۔ تبريد النواظر

٣۔ ازالة الريب

٤۔ مسئله علم غيب وحاضر وناظر

٥۔ درود شريف پڑھنے کا شرعی طریقه (اى الطريقة الشرعية للصلوة على النبي صلى الله عليه وسلم) وقد هدى الله كثيرا من الشباب بعد قراء ة هذا الكتاب۔

٦۔ ارشاد الشيعة

فيه اجوبة عن الشبهات التي يقدمها الشيعة على الصحابة رضى الله عنهم، وعلى اهل السنة والجماعة لو قرا الشيعة من غير تعصب لكان له طريق الهداية۔

٧۔ احسن الكلام في ترك القراء ة خلف الامام

٨۔ ينابيع (مسئلة التراويح)

يوجد بعض الطوائف الذين يهتمون بالفروع الفقهية اكثر من المبادئ فيتسببون التنافر بين جماعة المسلمين فرد عليهم في هذين الكتابين۔

٩۔ عيسائيت کا پس منظر اى "خلفية المسيحية" كشف فيه عن حقيقة المسيحية واجاب من الوساوس التي يستعملها المنصرون لاضلال المسلمين۔

١٠۔ مقام ابى حنيفه، ذكر فيه من مناقب الامام ابى حنيفة رحمه الله تعالى ورد فيه على الشبهات التي يقدمها المخالفون۔

١١۔ انكار حديث کے نتائج (نتائج انكار الحديث)

١٢۔ شوق حديث (شوق الحديث) بين فيها حب الحديث وفضيلته واهميته، واسكت منكرى الحديث۔

١٣۔ صرف ايك اسلام (اسلام واحد فقط) رد فيه على منكرالحديث غلام جيلانى برق الذى كتب "دو اسلام" واورد فيه شبهات حول عدد من متون الاحاديث۔ ثم ان غلام جيلانى برق هداه الله فتاب عن انكارالحديث ودخل في اهل السنة والجماعة۔

١٤۔ تسكين الصدور

١٥۔ سماع الموتى

رد فيه على من ينكر سماع الموتى وحياة النبي صلى الله عليه وسلم في قبره الشريف ورد على الشبهات حول هذا الموضوع۔

جهوده الاجتماعية: كان رحمه الله تعالى مع اعماله التدريسية والاصلاحية يشارك الحركات الاسلامية التي كانت لصالح هذه الامة فشارك جمعية علماء الهند في حركتها ضد الاستعمار لتحرير الهند، كما شارك حركة تحكيم الشريعة الاسلامية في باكستان، وشارك حركات ختم النبوة التي كانت تطالب حكومة باكستان باصدار قانون باعتبار "القاديانية" اقلية غير مسلمة وعند مشاركته مع هذه الحركة سنة ١٩٥٣م وسنة ١٩٧٣م دخل السجن وبقى فيه شهوراً۔ وقد كتب ثلاثة كتب في رد القاديانية:

١۔ عقيدة ختم نبوت قرآن وسنت كى روشنى ميں (عقيدة ختم النبوة في ضوء الكتاب والسنة)

٢۔ توضيح المرام في نزول المسيح عليه السلام

٣۔ چراغ کی روشنی (ضوء السراج في تحقيق مسئلة المعراج)

ومما يدل على اهتمامه بقضية ختم النبوة انه ارسل رسالة لموتمر ختم النبوة في مسجد شاهى (المسجد الملكى) في لاهور، وقراها نجله الفاضل الشيخ عبدالقدوس قارن امام الملايين من الحاضرين وقال فيه:

"على جميع تلاميذى والمريدين والمتعلقين ان يتعاونوا مع "مجلس تحفظ ختم النبوة" لانها جماعة اسسها مشايخنا واننى انصح الجميع وآمرهم بهذا"

وهذه هى الرسالة التي اعلنها الشيخ عبدالحق خان بشير عند جنازته قبل الصلاة۔

تواضعه وشفقته على العلماء: كان فضيلةالشيخ رحمه الله تعالى مع غزارة علمه، وعظيم منزلته بين العلماء في غاية التواضع، يرى نفسه كاحد من الناس، فعند ما لقبه العلماء بلقب "امام اهل السنة" قال: نعم، انا امام اهل السنة بمعنى " انا امام في مسجد اهل السنة"۔

كـان رحـمه الله تعالى شفيقا على العلماء، يقابلهم بغاية البشاشة والرحمة، ويسالهم عن اعـمـالهـم، ويـرشـدهـم ويـدعو لهم۔ وقبل وفاته بايام كان هناك اجتماع مجلس الشورى لـمـجلس تحفظ ختم النبوة فى "كندياں شريف" تحت اشراف امير المجلس فضيلة الشيخ خـواجـه خان محمد دامت بركاتهم، وكان سفرنا عن طريق لاهور، واخبرنى الزملاء فضيلة الشيخ سـعـيـد احـمد جلال بورى وغيره من الاخوان اننا قررنا فى سفرنا هذا زيارة امام اهل السنة فـضيـلة الشيخ محمد سرفراز خان صفدر رحمه الله تعالى ففرحت جدا، وحضرنا فى بيتـه، وهـو على فراشه فى غاية الضعف، ومع ذلك رحب بنا، وفرح بهذه الزيارة، وبدا يسال عـن الاحـوال، وامر احد اولاده باكرام الضيوف وطلبنا منه الدعاء، فرفع يديه ودعا لنا جميعا ثم صافحناه وقبلنا يديه وودعناه وهو ينظر، ومن كا ن يد رى ان هذا آخر اللقاء؟

وقبـل هـذا فـى جمادى الاولى ١٤٢٤ھ الموافق يوليو سنة ٢٠٠٣م لما حضر رحمه الله تـعـالـى فى كراتشى فى بيت المفتى محمد جميل خان الشهيد، كنت ازوره ويزوره العلماء ويسـالـونـه عـن الـمسائل العلمية فيجيب، فتعجب احد الحاضرين من ذاكرته فى هذا العمر ومـع هـذا الـمرض والضعف، فقلت له: هذا ببركة دعاء النبى صلى الله عليه وسلم: "نضرالله امرءا سمع مقالتى فوعاها ثم اداها كما سمع" الحديث (سنن الترمذى: ٢/ ٩٠)

الدروس والعبر: فـى حيـاة امام اهل السنة الشيخ سرفراز خان صفدردروس وعبرللعلماء وطلاب العلم، من اهمها:

- الـجـهـدالـمـتـواصـل والـمـثـابـرة على طلب العلم، ثم الجهد المتواصل لنشر هذا العلم والمواظبة على المواعيد،
- الاهـتـمـام بتوعية الشعب المسلم على التوحيد وعلى التمسك بتعاليم الكتاب والسنة، والبعد عن الشرك والبدعات، بالحكمة والموعظة الحسنة،
- التخلق باخلاق الاسلام وآدابه،
- التمسك بطريق السلف الصالح۔

واخيرا عزاؤنا وعزاء اسرة الجامعة الى ابناء امام اهل السنة واسرته الروحية العلماء۔

الـعيـن تـدمـع والقلب يحزن وانا بفراقك يا شيخنا لمحزونون، ولانقول الا بما يرضى به ربنا تبارك وتعالى۔

الـلـهـم اغـفـرلـه وارحـمه واعف عنه، واكرم نزله، ووسع مدخله، اللهم ادخله الجنة بغير حساب، اللهم لاتحرمنا اجره، ولاتفتنا بعده، آمين۔

وصلى الله على سيدنا محمد وآله وصحبه اجمعين۔

الاستاذ محمد اکرم الندوی *

العلامة المحدث الفقيه الشيخ
محمد سرفراز خان صفدر رحمه الله

هـو شيـخـنـا الـمـجـيـز الـعلامة المحدث الفقيه الداعية امام اهل السنة والجماعة الشيخ ابوزاهـد مـحمد سرفراز خان صفدر بن نور احمد خان بن كل احمد خان بن المولوى كل خان، من قبيـلة خـوانين يوسف زئى، بقية الصالحين، وخاتمة الفقهاء المحدثين، وعلم من اكابر اعلام العصر الربانيين، وقدوة صالحة موهوبة، ومن اشهر العلماء الداعين المصلحين۔

مولده: ولـد سنة ثـلاث وثـلاثيـن واربـع مـائة والف فى قرية جيران دهكى، من مديرية مانسهره هزاره۔

طلبه: قـرا القرآن الكريم على ابن عمته الشيخ السيد فتح على شاه، واخذ مبادئ الاسلام، والـمـقـدمة الشهيـره فى النحو باللغة الفارسية "نحو مير" عن الشيخ غلا م غوث الهزاروى۔ واختـلف الـى الشيوخ والعلماء والمدارس المختلفة فى سبيل طلب العلم، واحتمل فى سبيل الـطـلـب مشـاق ومـصـاعـب تذكر بحياة سلفنا الصالح من المحدثين والفقهاء، واخذ علم التـصـريف، ونـورالايضاح فى الفقه الحنفى عن الشيخ سخى شاه، وشيئا من "نحو مير" عن الشيـخ احـمـد نبـى، ودرس كتبـا فى الصرف على الشيخ عبد العزيز فى خانبور، واشياء على الشيـخ عبـد الـواحـد الـمـعروف بالعرب، والمعلقات السبع، وشرح الملا جامى على كافية الـنحـو، والـرسـالة القطبية فى المنطق على الشيخ اسحاق الرحمانى، والميبذى على الشيخ ولـى الـلـه، ورسالة فى علم الفرائض على مؤلفها الشيخ عبدالعليم، ومسلم الثبوت ومختصر الـمـعـانـى وحـاشيتى عبد الغفور وحمدالله على الشيخين غلام محمد اللدهيانوى والشيخ عبدالخالق المظفر كرهى۔

والتـحـق بمدرسة انوار العلوم بكجرانواله، ودرس بها هداية الفقه للمرغينانى، والتوضيح والتلويح، وتفسير البيضاوى، والشمس البازغة، وشرح نخبة الفكر، ومشكاة المصابيح على الشيـخ عبـدالـقدير الكيملبورى، والمطول ورسالة السراجى فى الفرائض على الشيخ المفتى

*مركز اوكسفورد للدراسات الاسلامية، اوكسفور، بريطانيا

عبدالواحد۔

والتحق بدارالعلوم بديوبند سنة ١٩٤٠، وتخرج بها سنة ١٩٤١، فسمع بها صحيح البخارى، وجامع ابى عيسى على الشيخ الامام السيد حسين احمد المدنى، وصحيح مسلم على الشيخ محمد ابراهيم البليالوى، وسنن ابى داود والشمائل المحمدية لابى عيسى على الشيخ محمد اعزاز على، وسنن النسائي على الشيخ السيد عبد الحق نافع كل كاكا خيل، وسنن ابن ماجه على الشيخ المفتى رياض الدين والشيخ ابى الوفاء الشاهجهانفورى، والموطا رواية يحيى الليثى على الشيخ محمد ادريس الكاندهلوى، والموطا رواية محمد ابن الحسن الشيبانى على العلامة ظهور احمد الديوبندى، وشرح معانى الآثار لابى جعفر الطحاوى على الشيخ المفتى محمد شفيع الديو بندى۔ واجازه الشيخ الامام حسين احمد المدنى اجازة عامة سنة ١٩٤١، ولقبه "صفدر" وقابل بديوبند الشيخ عبيدالله السندهى واستمع الى بعض محاضراته۔ وحضر سنة ١٩٨٠ فى مهرجان دارالعلوم بديوبند على مرور مائة سنة من انشائها، ونال الاكرام۔

اخذه للطريقة: اخذ الطريقة من الشيخ حسين على بوان بجران، وصحبه واخذ عنه شيئا من تفسير القرآن الكريم، واجازه فى التفسير والحديث والطريقة النقشبندية۔ ان اجازته من الشيخ حسين على الراوى عن العلامة الامام رشيد احمد الكنكوهى اجازة عزيزة نادرة، فلا اعرف احدا من شيوخى يروى عن الشيخ حسين على، فهذه مفخرة كبيرة لشيخنا ابى زاهد يجب ان تذكر وتؤثر۔

حجه : حج بيت الله الحرام سنة ١٩٦٨، وزار فى الرحلة نفسها دمشق، ثم حج سنة ١٩٧٢۔ ثم فى سنة ١٩٩٠، واعتمر سنة ٢٠٠٢، ثم حج سنة ٢٠٠٣، ثم اعتمر سنة ٢٠٠٦م۔

رحلاته: رحل فى سبيل العلم و الدعوة الى ديو بند، وكلكتا، واجمير، ولاهور، ودهاكه، وكوئته، والحجاز، وبلاد الشام، والامارات العربية المتحدة، وافغانستان، وبريطانيا، وجنوب افريقيا، وغيرها من البلدان۔

التدريس والنشاط التعليمى: درس بمدرسة انوارالعلوم بكجرانواله سنة ١٩٤٢، وعين سنة ١٩٤٣م اماما فى جامع اهل السنة والجماعة ببوهر والى ككر، والقى محاضرات فى تفسير القرآن الكريم فى بعض المعاهد الحديثة الحكومية۔ وبدا التدريس فى مدرسة نصرة العلوم بكجرانواله فى شوال سنة ١٣٧٤ھ، وعمل عضوا فى وفاق المدارس العربية بباكستان، وعين سنة ١٩٥٨ رئيسا للمدرس وامينا للشؤون التعليمية فى مدرسة نصرة العلوم، وعين

شيخ الحديث بها سنة ١٩٦٠، ودرس بها صحيح البخارى، وجامع الترمذى، وتفسير القرآن الكريم۔

عرف بمواظبته على الدروس، والتزامه الشديد بالمواقيت، ولم يكن ياخذ اجازة من المدرسة، وكان يقول : مذهبى ان العطلة لا تجوز۔

تلامذته: تخرج عليه آلاف من العلماء فى باكستان وغيرها، واخذ عنه جماعة كبيرة، كما استجازه عدد كبير، منهم صاحبنا المسند محمد بن عبدالله الرشيد مؤلف (امدادالفتاح) وكاتب هذه السطور۔ ولعل اكبر تلامذته واشهرهم على الاطلاق نجله و خليفته شيخنا العلامة محمد زاهد الراشدى الذى فاق علماء عصره بالسعة والرسوخ فى العلم، ونفاذ البصيرة، واتقاد القريحة، والجمع بين العلوم الاسلامية ومطالب العصر، فهو رحمة من الله تعالى على امة نبيه صلى الله علية و سلم فى عصر تموج فيه الفتن وتتضارب فيه الآراء والافكار، وابتلى فيه كل ذى راى باعجاب رايه، فيا ليت علماء زماننا اتبعوه فى التيسير على الناس، واجتنبوا الخلاف والجدال فى الدين، اللهم متعنا بطول بقائه۔

وكذالك من اهم ورثة علومه وافكاره حفيده العلامة المحقق البحاثة الشاب عمار ناصر، فقد اطلعت على بعض كتاباته، فاعجبنى منهجه فى التحقيق، واسلوبه فى الكتابة، وارجو منه ان يعير عناية اكبر بالحديث النبوى الشريف، فانه كالمصباح فى الفتن، اللهم اجعلنا من متبعى الآثار، وجنبنا الاعجاب بالارآء والخلاف والجدال، آمين يا رب العالمين۔

كتاباته: دبج يراعه كتبا علمية قيمة مؤيدة بالادلة والبراهين، وحافلة بالتحقيقات النادرة والبحوث القيمة، وكتب مالا يحصى من المقالات فى عدد من مجلات باكستان من سنة ١٩٤٣ الى ١٩٩٠م۔

يقول ابنه شيخنا محمد زاهد الراشدى فى تعريفه بمؤلفاته : "قد انعم الله تعالى على ابينا شيخ الحديث محمد سرفراز خان صفدر بعناية خاصةً بالدراسة والتحقيق، والدفاع عن منهاج اهل الحق والصواب، تشهد مؤلفاته العلمية التى تربو على الثلاثين بتمكنة وشمول علمه وعمقه" (١)

النشاط السياسى : ظل عضوا نشيطا فى مجلس احرار الاسلام منذ سنة ١٩٣٥ الى سنة ١٩٤٥، وسافر سنة ١٩٤١ من ديوبند الى لاهور حيث حضر مؤتمر جمعية علماء الهند۔ ونشط فى حركة ختم النبوة، وقضى تسعة شهور فى معتقل ملتان حيث الف (صرف ايك اسلام بجواب دو اسلام) وقام فى السجن بتدريس الموطا، وحجة الله البالغة للامام ولى الله الدهلوى، و شرح نخبة الفكر، والهداية فى الفقه الحنفى۔

وعمل عضوا فی جمیعة علماء الهند ، ثم فی جمعیة علماء الاسلام سنة ۱۹۵۶، وظل الی فترة طویلة عضوا فی مجلسها الاستشاری المرکزی ، وامیرا لفرعها فی کجرانواله ، عضوا فی المجلس الاستشاری لجمعیة اشاعة التوحید والسنة ، ورئیسا لجمعیة اهل السنة بکجرانواله۔ واشترک فی نشاط فی حرکة اقامة نظام المصطفی صلی الله علیه و سلم، واعتقل وبقی فی السجن لمدة شهر۔

حیاته العائلیة: تزوج سنة ۱۹۴۵ من سکینة بنت الشیخ محمد اکبر راجبوت من کجرانواله، ولدت له منها سلمی وهی اکبر اولاده، ثم ولد له منها شیخنا العلامة المحقق الحافظ عبدالمتین خان زاهد الراشدی، وبه یکتنی، والشیخ المقری عبدالقدوس خان قارن، والعالمة الحافظة سعیدة، والشیخ الحافظ عبدالحق خان بشیر۔

وتزوج فی الثالث من رجب سنة ۱۳۷۱ من زبیدة بنت فیروز خان من مانسهره، وولد له منها الحافظ محمد اشرف خان، والحافظة طاهرة، والشیخ الحافظ المقری شرف الدین خان حامد المعروف بحماد الزهراوی، والشیخ الحافظ المقری رشید الحق خا ن عابد، والشیخ الحافظ المقری عزیز الرحمان خان شاهد، والحافظ المقری عنایة الوهاب خان ساجد، والشیخ الحافظ المقری منهاج الحق خان راشد۔ وعنی بتربیة اولاده تربیة دینیة، وتخریجهم علماء عاملین۔

وفاته: قضی شیخنا العلامة حیاة حافلة باعمال جلیلة فی مجال التعلیم والتالیف، والدعوة والاصلاح حتی وافاه اجل الله لیلة الثلاثاء تاسع جمادی الاولی سنة ۱۴۳۰ھ عن عمر یناهز ثمانیا وتسعین عاما ، وصلی علیه بوصیة منه ابنه الاکبر وخلیفته شیخنا العلامة محمد زاهد الراشدی، وشهد جنازته جمع کبیر من العلماء والمشایخ وعامة المسلمین، وعم الناس من الحزن والاسی ما الله به علیم ، وقال ابنه الشیخ محمد زاهدالراشدی وهو یبدی حزنه علیه: "لقد حرمت ابا کریما ، واستاذا جلیلا ، ودعوات شیخ کامل"۔

کانت وفاته فاجعة یالها من فاجعة عمت المسلمین علی اختلاف مذاهبهم وطبقاتهم، وبعد اقطارهم واوطانهم فی مشارق الارض ومغاربها، وصدمت السنة واهلها اجمعین۔

اخلاقه: عرف فی الناس بمکارم اخلاقه من الجود والسخاء ، والصدق والصفاء، والانبساط للناس، والتواضع، واکرام للضیوف، قال احد تلامذته الشیخ بیر محمد سلطان محمود :"لم اعهد فی حیاتی من یماثله فی المحبة والشفقة"۔

وقال ابنه محمد زاهد الراشدی :"قضی ابونا حیاته فی اتباع السنة ،واقتفاء مذهب سلفه"،

مکانته: کان من کبار علماء عصره، مضطلعا فی علم التفسیر، متمکنا فی علوم الحدیث واسماء الرجال، مقدما فی الفقه الحنفی، داعیا الی اقامة السنن، واماتة البدع، جامعا بین العلم والعمل، متصفا بالزهد والتقوی والورع، ومقیما للصلوات ،وشجاعا فی الجهر بکلمة الحق، لایخاف فی الله لومة لائم۔

کان یعتبر ترجمانا لمذهب اهل السنة والجماعة علی طریقة علماء دیوبند الاکابر ولقبه کبار علماء باکستان فی اجتماع کبیر سنة ۱۹۹۲م فی مدینة کراتشی بلقب (امام اهل السنة)۔

یقول حفیده الاستاذ محمد عمار خا ن ناصر : "کانت حیاة جدنا المکرم وشیخنا المبجل محمد سرفراز خان صفدر عبارة عن تدریس العلوم الدینیة، والاضطلاع من مصادر القرآن الکریم، والحدیث النبوی الشریف، والفقه، والتاریخ والسیرة، ویشهد بسعة نظره، واطلاعه علی دقائق العلوم الدینیة، ومعرفته لارآء العلماء الاعلام کل من سنحت له فرصة دراسة مؤلفاته حول المواضیع المختلفة"۔ (۲)

کان رحمه الله تعالیٰ فرید عصره، ونسیج وحده، کان مرجع الانام فی مشاکلهم، وموئل العلماء فی مهامهم، تشد الیه الرحال، بصیرا بدقائق کتاب الله، عارفا بمعانیه وتاویلاته، قائما بحقوقه، تالیا له آناء الیل وآناء النهار، متبعا لسنن المصطفیٰ صلی الله علیه وسلم، ومقتفیا لآثاره، وباحثا محققا، متین الدیانة، اسوة الصالحین، وقدوة العباد الزاهدین، وقد سارت بفضائله وعلو مه الرکبان، وانتشرت کتبه وتوالیفه فی الافاق۔ فلما مات ۔رحمه الله تعالیٰ ۔خسرنا علما کبیرا وقدوة عظیمة واسوة جلیلة ۔

سنده فی الحدیث الشریف: اخبرنا المحدث الفقیه الشیخ سرفراز خان صفدر ، اخبرنا الشیخ حسین علی ، وشیخ الاسلام السید حسین احمد المدنی ، الاول عن العلامة الامام رشید احمد الکنکوهی ، والثانی عن العلامة محمود حسن الدیوبندی ، والشیخ خلیل احمد السهارنفوری ، والشیخ حسب الله المکی الشافعی ، والشیخ عبدالجلیل برادة المدنی ، والشیخ عثمان عبدالسلام الداغستانی ، والسید احمد البرزنجی ، سبعتهم عن محدث المدینة المنورة عبدالغنی بن ابی سعید المجددی ، انا الامام اسحاق الدهلوی ، انا جدی لامی العلامة المحدث عبدالعزیز بن احمد بن عبدالرحیم الدهلوی ، انا والدی الامام احمد ابن عبد الرحیم الدهلوی،انا سالم بنعبدالله بن سالم البصری ، انا والدی عبدالله بن سالم البصری الحافظ ، انا محمد بن علاء الدین البابلی الحافظ ، انا الشمس محمد الرملی ، انا القاضی زکریا الانصاری م انا الحافظ ابن حجر العسقلانی ، انا البرهان ابو اسحاق ابراهیم

ابن احمد التنوخی ، انا ابو العباس احمد بن ابی طالب الحجار، انا ابو عبدالله الحسین بن المبارک الزبیدی ، انا ابو الوقت عبدالاول بن عیسی الهروی ،ثنا الامام ابو الحسن عبدالرحمن بن محمد بن المظفع الداوودی ، ثنا الحافظ ابو محمد عبدالله بن حمویه السرخسی ، ثنا ابو عبدالله محمد بن یوسف بن مطر الفربری ، قال : حدثنا الحفظ ابو عبدالله محمد اسماعیل الجعفی ، قال : حدثنا اسماعیل بن ابی اویس قال حدثنی مالک عن هشام بن عروة عن ابیه عن عبدالله بن عمرو بن العاص قال سمعت رسول الله صلی الله علیه وسلم یقول ان الله لا یقبض العلم انتزاعا ینتزعه من العباد ولکن یقبض العلم بقبض العلماء حتی اذا لم یبق عالما اتخذ الناس رؤوسا جهالا فسئلوا فافتوا بغیر علم فضلوا واضلوا۔ (۳)

قال الحافظ ابن حجر فی شرحه لهذا الحدیث :"وکان تحدیث النبی صلی الله علیه وسلم بذالک فی حجة الوداع کما رواه احمد والطبرانی من حدیث ابی امامة قال : لما کان فی حجة الوداع قال النبی صلی الله علیه وسلم :"خذو االعلم قبل ان یقبض او یرفع"، فقال اعرابی : کیف یرفع ؟ فقال : الا ان ذهاب العلم ذهاب حملته ، ثلاث مرات" (۴)

وقال الحافظ ابن حجر :"عند احمد عن ابن مسعود قال :"هل تدرون ما ذهاب العلم؟ ذهاب العلماء"، وافاد حدیث ابی امامة الذی اشرت الیه اولا وقت تحدیث النبی صلی الله علیه وسلم بهذا الحدیث ، وفی حدیث ابی امامة من الفائدة الزائدة ان بقاء الکتب بعد رفع العلم بموت العلماء لایغنی من لیس بعالم شیئا، فان فی بقیتل : فساله اعرابی فقال : یانبی الله کیف یرفع العلم منا وبین اظهرنا المصاحف ، وقد تعلمنا ما فیهاوعلمنا ها ابناء نا ونساء نا وخدمنا ، فرفع الیه راسه وهو مغضب ، فقال : وهذه الیهود والنصاری بین اظهرهم المصاحف ، لم یتعلقوا منها بحرف فیما جاء هم به انبیاؤهم ۔ (۵)

وبه قال ابو العباس : اخبرنا ابن اللتی ۔ انا ابو الوقت ، انا الداوودی ، السرخسی ، انا ابو عمران عیسی بن عمر السمرقندی . انا ابو محمد عبدالله بن عبد الرحمن السمرقندی ، قال: اخبرنا ابو عاصم . انا ثور بن یزید ، حدثنی خالد بن معدان عن عبدالرحمن ، عن عمرو ، عن عرباض بن سارية ، قال : صلی لنا رسول الله صلی الله علیه وسلم صلاة الفجر ثم وعظنا موعظة بلیغة ذرفت منها العیون ووجلت منها القلوب ۔فقال قائل یا رسول الله کانها موعظة مودع فاوصنا فقال :"اوصیکم بتقوی الله والسمع والطاعة وان کان عبدا حبشیا فانه من یعیش منکم بعدی فسیری اختلافا کثیرا فعلیکم بسنتی وسنة الخلفاء الراشدین المهدیین عضوا علیها بالنواجذ وایاکم والمحدثات فان کل محدثة بدعة ۔"

وبه قال ابو محمد: حدثنا سلیمان بن حرب وابو النعمان عن حماد بن زید ، عن ایوب، عن ابی قلابة ، قال : قال ابن مسعود: "علیکم بالعلم قبل ان یقبض ، وقبضه ان یذهب باصحابه، علیکم باالعلم ، فان احدکم لایدری متی یفتقر الیه او یفتقر الی ما عنده، انکم ستجدون اقواما یزعمون انهم یدعونکم الی کتاب الله وقد نبذوه وراء ظهورهم ، فعلیکم بالعلم، وایاکم والتبدع، وایاکم والتنطع، وایاکم والتعمق، وعلیکم بالعتیق۔"

المصادر

۱۔ مجله (الشریعه)الصادرة فی کجرانواله ، عدد اغسطس سنة ۲۰۰۸م ، ص۶

۲ ۔ المرجع السابق ،ص۸

۳۔ اخرجه البخاری فی صحیحه ،کتاب العلم، باب کیف یقبض العلم، وکتاب الاعتصام، باب ما یذکر فی ذم الرای وتکلف القیاس۔

ومسلم فی صحیحه ،کتاب العلم، باب رفع العلم وقبضه۔

وابوعیسی فی جامعه، کتاب العلم ، باب ما ذهاب العلم ۔ وابن ماجه فی سننه، فی المقدمة، باب اجتناب الرای والقیاس۔

۴۔ الحافظ ابن حجر: فتح الباری ۲۶۰/۱

۵۔ المرجع السابق ،۳۵۴/۱

الاستاذ محمد طارق جميل *

محدث العصر، الداعية الكبير

الشيخ محمد سرفراز صفدر رحمه الله

بسم الله الرحمن الرحيم۔ الحمد لله الذى كتب الآثار ونسخ الآجال، القلوب له مفضية والسر عنده علانية والحلال ما احل والحرام ما حرم والدين ما شرع والامر ما قضى والخلق خلقه والعبد عبده وهو الله الرء وف الرحيم وهو الذى رفع العلماء الى اشرف المناصب ونشر فى الاقاليم اعلامهم واجرى بالحكم اقلامهم وجعلهم فى الدنيا كالاعلام وهداة للانام۔

والصلوة والسلام على من خصه باجتبائه واصطفائه وسماه من اسمين من اسمائه رء وفا ورحيما فمن تمسك بشريعته نال فضلا جسيما وحاز فى الجنة نضرة ونعيما۔

وعلى آله وصحبه الذين انتقلوا ببركة رسالته ويمن سفارته الى حال الاولياء وسجايا العلماء فصاروا اعمق الناس علماً وابرهم قلوبا واقلهم تكفا واصدقهم لهجة وبعد:

فان قلمى بين انامل وانا معترف كل الاعتراف بقلة البضاعة العلمية بل بعدمها وكانى اسود بياض الصفحة واضيع وقت القارى بجزاف القول واشغله عن اكتساب المعروف وغرس المالوف بثرثراتى وهندساتى لاسيما اذا كان الكلام عن شخصية تنورت بعلمها البلاد واقرت بفضلها العباد وعن عالم دان لعلو كعبه فى المنقول والمعقول كل صديق وعدو وكل حاسد وغابط وكل دانٍ وقاصٍ ولقد كنت اعد هذاه الجراة والجسارة من الوقاحة وسوء الادب لو لم يامرنى بذالك السيد الكبير العالم النحرير من بكمال علمه وجمال عمله اعترف الثقلان وطار بذكر اعتداله الحدثان وفاح بنفحات لسانه كل مكان المدعو بالعلامة زاهد الراشدى وهو العالم لا اجتاز بيانه حد الاعتدال ولا سل قلمه عن غمد الاقتصاد والانصاف حتى نرى خصمه يقر بذالك ويلهج بنصفته فى تصنيفه وتاليفه ومهما يكن المجال من التحسين اوالتنقيح او الرد او النقد تجد قلمه منزها من درن الافراط

* مدير مدرسة الحسنين، فيصل آباد

والتفريط منقحا من رائحة السب والشتم مجانبا من مرتع الطعن والتشنيع سائرا على سواء السبيل ماضيا على النهج السليم۔

فارجع الحين الىٰ صلب المقال قائلا انه وطئت الهند اقدام الافرنج وهم فى ازياء التجار الشاطرين سنة ۱۶۰۰ للميلاد فصاروا فى امد قريب متنمرين ومتفرعنين بمؤامرتهم ودسائسهم وبغفلة اهل الهند و بتالب بعضهم على بعض وتكالب كل طامع وطالع على الحكومة فبدات الامارات الصغيرة تجثو امام الا فرنج وبحثوا عن الخائنين والغادرين فظفروا بما ارادوا، فتم لهم الامر والقبض فى بداية المطاف بسقوط بنغال وفى النهاية بفشل حرب الحرية (جنگ آزادی) ضد انكليز ۱۸۵۷ للميلاد فغربت شمس سياية المسلمين فجثم الليل الاليل من الظلم والجور ومن الضراوة والشقاوة ناشرا اجنحته السوداء على الهند باجمعها۔

فى مثل هذه الظروف الحالكة كان المسلمون فى شدة الحاجة الى بنيان مرصوص لسد هذا السيل الجارف الغربى من الكفر والزندقة والى من ينحى سفينة الاقدار الاسلامية من تيارات العواصف الاوربية وكان بصيص الرجاء يقطع حبله وشمعة الامل تلفظ انفاسها الاخيرة ولقد جرت سنة الاندلس لولابرهان ربنا...

انظروا ايها السادة فى هذه الخطوب الهائلة ... رجلان مدرس ودارس، معلم ومتعلم، محمود ومحمود، تحت شجرة الرمان وقد تعاهدا...وتعاقدا...وتوافقا...

ولم تلبث ان تطورت هذه المدرسة دارالعلوم بديو بند على قدم وساق ولما لم تتطور وقد غرسها وثقفها مولانا قاسم النانوتوى شيخ المعقولات والمنقولات ومن اليه انتهت رياسة العلوم والفنون آنذاك وكانت فرائض الهندوس وبطارقة النصارى ترتعش من اسمه وكيف لا وقد احتضنها مرجع التصوف والسلوك ابو حنيفة فى زمانه الشيخ رشيد احمد الكنكوهى۔

فها شجرة الامل شرعت تثمر وبركاتها تمطر وباتت هذه المدرسة فى صرف الغارات الغربية حصنا منيعا حديديا لا تزعزع بنيانه ولا تدحرج اركانه ودوحة عظيمة فى وجه صرصر عاتية اللادينية ولم يضن الافرنج بآخر عيدان تدبيرهم فى تحطيم كيانها ولكن "يريدون ان يطفئوا نورالله بافواههم والله متم نوره ولو كره الكافرون"

فى حجر دارالعلوم ترعرعت الابطال والامجاد ونشات فى كنفها الافاضل والسادات الذين قطعوا امانى العدو بسيف العلم والعمل ... ها هو الشيخ حكيم الامة اشرف على التهانوى على صعيد التزكية والتربية حتى بلغ بالامة ذراها وزكى نفوسها وطهر قلوبها،

هذا هو الشيخ عطاء الله الشاه البخارى قائم على رصيف ختم النبوة وحريمها والصاعقة

علی القادیانیة، وفی ناحیة اخری حامل لواء الجهاد فارس شاهر حسامه فی مطاردة انکلیز ویضرب اعناقهم ویقطع منهم کل بنان الشیخ حسین احمد المدنی، وفی مضمار الحدیث انور الشاه الکاشمیری الذی جدد ذکری المحدثین الاوائل وکان مکتبة ناطقة، وامیر موکب الدعوة والتبلیغ الداعیة الکبیر مولانا محمد الیاس الکاندهلوی، ادی الامانة وبلغ الرسالة المحمدیة، وورد موردها المفکر العظیم الداعی الی الاتحاد العالم الاسلامی ابو الحسن علی الندوی، وقد منح مفتاح الکعبة تقدیرا لمآثره العلمیة وتثمینا لبطولاته الاسلامیة العالمیة۔ کل لعب دوره الهام وحقا اقول : لو شرعت فی سرد قصصهم ومفاخرهم لطال الکلام ولضاق المقام فوالله انها لبحر زخار منه تستقی وتمتلئ سحاب العلم والعمل سحاب حاملات ثقال ثم لا تدع سهلا ولا حزنا الا وتهطل فیه مطرا غزیرا...

نعم وقد ارتفعت من هذا البحر العظیم من دارالعلوم سحابة ملیئة علما وفهما واتجهت قبل باکستان (قبل الانقسام) فسقت تربتها وروت غلیلها وشفت علیلها، الا وهو الشیخ المفسر المحدث الکبیر العالم المتبحر الناقد البصیر مولانا محمد سر فراز خان الصفدر رحمه الله رحمة واسعة۔

عاد هو ببقعة مسماة بغکر مندی ینبوعا لا ینضب ماؤه ولا یکدر صفوه وبستانا عدیم المثال وقدوة لبقیة الا جیال فورد هذا المعین العذب الوف بل مئات الالوف من عطاش العلوم فنهلوا منه وتعللوا۔

فان کنت تود ان تقتبس من حیاته لحیاتك فامعن النظر فیه وتعلم من طلبه للعلم۔ تجد انه یطوف فی الامصار ویجول فی الاقطار ویقطع الاسفار لفهم الاسفار ثلاث عشرة سنة متتالیة داخل باکستان (قبل الانقسام) ثم سافر وقطع الفیافی والقی عصا ترحاله بدارالعلوم دیوبند وبل صداه من العلوم العالیة بضع سنین ثم قفل عائدا الی وطنه وطفق یفیض نصف القرآن او اکثر بما تضلع من علوم وفنون،

وان کنت تبغی الاطلاع علی لباقته فانه قد اتخذ مکانا علیا فی عیون الاساتذة ولقبه استاذه شیخ العرب والعجم مولانا حسین احمد المدنی بصفدر یعنی المفرق بین الحق والباطل۔ وناهیك عن قوة ذاکرته ابنائه یحدثون اننا کلما اعیانا استشهاد لمسئلة واضنانا بحث فی مصدر سالناه فیسرد لنا المراجع مع تحدید اسماء الکتب ورقم الصفحة فنجد کماذکره۔ وانه والله فارس لحلبة التدریس والتعلیم، قضی جل حیاته فی تعلیم القرآن وتدریس الحدیث فحلی خلقا کثیرا برسوخ علمه واخلاص عمله۔

وان تعجب من السیف وهزته فانظر الی سیف القلم الذی قمع به اعداء الاسلام

وتصدی به المبتدعین والمنحرفین فالف مقالات لا باس بها وصنف اکثر من خمسین کتابا ضخما واستاصل بهذا السیف المسلول جذور البدعات والرسومات۔

مصنفاته شهب ثاقبه علی الفرق الباطلة والمبتدعة واللادینیة فاتحف العالم متاحف لاتبلی وکنوزا لاتفنی بکر الایام ومر الزمان، واحسن الکلام ووضح المرام واتم البرهان بذخیرة الجنان فی فهم القرآن فاسکن الصدور وافرح الخواطر بعبارات الاکابر۔

وکان یتبع الحق ویصدع به ویقول کلمة حق ولایخاف فیها لومة لائم وان اودته الی المنشور او اوصلته الی المحفور۔

وکما کان ابا رحیما لطلاب المدارس الدینیة، هکذا کان اخا شفیقا علی دارسی المدارس العصریة وقد تولی تدریس المعلمین فیها سنین طوالا۔

وکان آیة فی التواضع ومثلا فی المواظبة والمثابرة وصبورا علی الشدائد والنوازل حتی فی مرض الوفاة قد صحبه المرض ثمانی سنوات فاحسن صحبته من غیر جزع ولا فزع وقد تجاوز تسعین من عمره فنال به اجر وشرف الحدیث القدسی حیث یقول الله جل وعلا یبشر عباده: "اذا بلغ عبدی اربعین سنة عافیته من البلایا الثلاث : من الجنون والجذام والبرص، فاذا بلغ خمسین سنة حاسبته حسابا یسیرا، فاذا بلغ ستین سنة احببت الیه الانابة، فاذا بلغ سبعین سنة احبته الملائکة، فاذا بلغ ثمانین سنة کتبت حسناته والقیت سیئاته، فاذا بلغ تسعین سنة قالت الملائکة اسیر الله فی ارضه وغفرله ما تقدم من ذنبه وما تاخر وشفع فی اهله" (جا مع الاحادیث القدسیة وکذا نحوه فی مسند ابی یعلی الموصلی)

ثم لبی نداء ربه فی التاسع خلت من جمادی الاولی سنة ۱۴۳۰ للهجرة یوم الثلاثاء الموافق الخامس من مایو سنة ۲۰۰۹ للمیلاد۔ انا لله وانا الیه راجعون۔ تقبل الله حسناته وغفر سیئاته وتغمد الفقید بواسع رحمته واسکنه فسیح جناته والهم اهله وذویه الصبر والسلوان، وجزاه الله عنا وعن المسلمین خیرا وسیفتخر به دارالعلوم الی ابد الآبدین وتجنی من ثمراته هذه الامة الی دهر الداهرین۔

الدّكتور عبد الماجد نديم*

سماحة الشيخ سرفراز خان صفدر عليه الرّحمة

حياته وجهوده الدينية العلميّة

عند ذكر الصالحين تتنزّل الرحمة، ولِمَ لا؟ إنّ الصالحين تكون حياتهم حافلة بذكر اللّه سبحانه و تعالى: الذّكر باللسان و الذّكر بالقلب و الذّكر بالجوارح، و كلُّ عملٍ يقومون به يعبّر عن وحدانية اللّه، ولسان كلّ من رآهم أو صاحبَهم أوحدّث عنهم أو سمع عنهم ينطلق بـ كلمات سبحان اللّه، و الحمد للّه، ولا إله إلّا اللّه، واللّه أكبر وغيرها من التسبيحات والتحميدات، والتهليلات، والتكبيرات. وإنّ ذكر اللّه هو المنبع لجميع الرّحمات، وبالإضافة إلى ذلك شخصيات الأبرار توفّر لنا دروساً من حياتهم الذاكرة، ونحن نجد فيها أسوة نتأسّى بها، وقدوةً نقتدي بآثارها، فكلّما نذكرهم نذكر أسوتهم وحيثما نتحدّث عنهم تتجلّى لنا قدوتهم، والنفس تتأثر بأحوالهم، فيكون هذا الذكر تذكيراً لنا حتّى نزيّن بها حياتنا، فتعمّ الرّحمة، و كيف لا؟ وهم ذكروا الرّحمن والرّحمن موفياً بوعده يذكرهم فعند ذكرنا لهم نتمثّل بأمر الله وفعله فذاك سبب آخر لتنزّل الرّحمة.

أرجو من المولى الكريم أن تجلب هذه السطور الّتي قمتُ بكتابتها لي الرّحمة، وإنّ ظنّي بالشّيخ أبي الزاهد سرفراز خان صفدر أنّه من الّذين أدعو من اللّه عزّ وجلّ أن يدخلني الجنّة معهم، (اللهم أدخلنا الجنّة مع الأبرار) اللهمّ حقّق ظنّي فيه! فكيف لا أظنّ به هذا الظنّ ورأيت شيخي ومرشدي السيّد نفيس الحسيني رحمه اللّه يحترمه و يقدّره ويجلّله ويمجّده، ويقول فيه كلماتٍ مباركةً عظيمةً، وذلك لأنّ سماحة الشّيخ سرفراز خان قضى حياته كلّها تقيّة نقيّة، وكان ينشد إعلاء كلمة الحقّ، وسلك طريق العلم والدّين، وغُذّيَ بالرّوح الفاروقيّ ـ مُنِح من شيخه العظيم المعروف بشيخ العرب والعجم حسين أحمد المدني رحمة اللّه عليه، لقب "صفدر" يعني الفارق بين الحق والباطل حتّى جعله الشيخ سرفراز خان تخلّصاً له ـ وقام بإحقاق الحقّ وإبطال الباطل حيثما وعندما لاحت له لوائحه، وقاومَ

---

* الأستاذ المساعد بـ قسم اللغة العربية،الكليّة الشرقية، جامعة بنجاب، لاهور ـ باكستان

ضدّ المخاطر من البدع والرّسوم السّيئة واللاشرعية، بلسانه من خلال خُطبه وكلامه، وبقلمه من خلال تصنيفاته وتأليفاته، ولو اقتضى الأمر فخرج إلى الشّارع وتظاهر ضدّ الحُكّام وفساد أوامرهم، حتّى زار السّجن أكثر من مرّةٍ مرحّباً به ومعتنقاً بحياته المعسرة، غير خائفٍ ولا متردّدٍ. جزاه الله وأحسن الجزاءَ

فشيخنا المذكور أبو الزّاهد سرفراز خان صفدر بن نور أحمد خان بن گل أحمد خان من قبيلة مندراوى سواتي من يوسف زئى پٹهان، ولد فى سنة ١٩١٤م بـ "مانسهره هزاره" ونشأ فى بيئة أميّة وكانت المنطقة الّتى تولّد فيها سماحة الشّيخ قليلة العمران فقيدة العلم، فرعى الشيخ الغنم فى بداية حياته ولم يكن يتعلّم شيئاً حتّى جاءت سنة ١٩٢٥م عندما بلغ السنة الحادية عشرة من عمره۔

ولما أنّ أباه وأجداده كانوا متديّنين ولكنْ بسبب أحوالهم الجغرافية العسيرة الخاصّة لم يتمكّنوا من الحصول على العلمِ، فكان من تمنّيات أبيه الشديدة أن يكون من أبنائه من يتعلّم الدّين و ينشره، فقدر الله لابنيه الشّيخين: سرفراز خان صفدر، وعبد الحميد خان السّواتي أن يقوما بتحقيق تمنّياته وينشرا علم الدّين حتّى يُذكَر أبوهم في الكتب والمقالاتِ، وتسطر الأقلام وتحمل القراطيس اسمه كأبٍ للعَلَمين الجليلين الّذين أضاءا بعلمهما قلوب أهل شبه القارّة، الّذي لم يكنْ يقرأ شيئاً من القرآن إلا جزءاً منه ولكنّه قد أنجب ولدين نشرا القرآن ونشراه، ووقفا حياتهما على خدمة الدّين، وربّيا أولادهما على تربيةٍ حتّى لم يبق منهم إلا أن يخدموا الدّين والعلمَ ليلَ نهار.

و بدأ يتعلّم سرفراز خان الولد البالغ إحدى عشرة سنة على يدي ابن عمّته مولوي سيد فتح علي شاه رحمه اللّه القاعدة العربية و القرآن الكريم ببلده مانسهره۔والتحق في سنة ١٩٢٨م بـ مدرسة عصرية، حتّى وصل إلى الصفّ الثالث، وعندما أقام غلام غوث هزاروي عليه الرحمة مدرسة دينية فى مانسهره التحق بها في الصّفّ الثّالث وحفظ بها كتاب "تعليم الإسلام" للمفتي كفايت اللّه دهلوي رحمه اللّه، وتعلّم الخطابةَ، وتلمذ على مولانا غلام غوث هزارويؒ ودرس منه جزءاً من "نحو مير" بالإضافة إلى "تعليم الإسلام".

وفي السنة ١٩٢٨م أكرهه عطشه العلمي أن يخرج من بلده إلى بقاع الأرض حتّى يصل إلى مكانته المبتغاة الّتى كانت مقدّرة له، وصار الشيخ يرتحل من بلدٍ إلى بلدٍ فى شبه القارّة من كوئته إلى كلكتة يلتمس العلم، وكان يصاحبه في هذه الأسفار الطويلة أخوه العلّامة عبد الحميد خان سواتي رحمه اللّه، ومرّة واحدةً افترقا ولم يكن يعرف الشّيخ مكان وجود أخيه الصّغير فتجوّل في البلدان يطلب العلم و يسأل أهل مراكز العلم عن أخيه، حتّى أُخبر أنّه

سافر إلى ملتان، فعزم الشيخ على السفر إلى ملتان حتّى وصل إلى مدرسة الشيخ المفتي عبد العليم رحمه الله (۱۳۵۹هـ/ ۱۹۴۰م) ـ حفيد الشيخ خواجه عبيد الله الملتاني رحمه الله (توفّي ۱۳۰۵هـ/۱۸۸۸م)، و كانت مدرسة الشّيخ المفتي وشخصيّته ملتقى للعلم والعلماء وكان يدرس عنده أعلام المدارس المختلفة من المسلمين ـ مثل الشّيخين المذكورين و الشيخ عبد الله البهلوي رحمه الله، والشيخ علي محمد (دار العلوم كبيرواله) و الشيخ فخر الدين (دار العلوم ديوبند) ومولانا فيض الحسن شاه جمالي وأعلام من البريلوية، ورجالٌ من غير المقلّدين مثل المحدّث الملتانيّ الشيخ عبد التواب رحمه الله وغيرهم ـ، فالتقى بها الأخوان وتلمذا على يد الشيخ المفتي عبد العليم رحمه الله ودرسا كتيباً في علم الميراث، وهذا الكتيّب عبارة عن قصيدة كاملةٍ حول أحكام الميراث وشرحها، بعد إكمال هذا الكتيّب والورود بموارد أخرى من العلم، ارتحل الشيخ مع أخيه إلى كوجرانواله وذلك في سنة ۱۹۳۸م فالتحق بها بمدرسة "أنوار العلوم" وتعلّم على مولانا عبد القدير كيمل پوريؒ الهداية، والبيضاوي، و كتب الفنّ ومشكوة المصابيح وغيرها من الكتب. وهكذا تلمذ على يد المفتي عبد الواحدؒ ودرس "المطوّل" و "السّراجي".

وفي سنة ۱۹۴۰م التحق مع أخيه الصغير بأزهر الهند "دار العلوم ديوبند" وتلمذ بها على أكابر أساتذتها: مولانا حسين أحمد المدنيؒ، ومولانا محمد إبراهيم البلياويؒ، و مولانا إعزاز علي الديوبنديؒ. حتّى حصل على شهادة الفراغ وأجازه الشيخ حسين أحمد المدني رحمه الله إجازة خاصّة من عنده للحديث والكتب والفنون المتداولة.

وفي سنة ۱۹۴۱م بعد الفراغ من دار العلوم ديوبند تعلّم تفسير القرآن وحصل على شهادة التفسير والحديث والبيعة والخلافة من مولانا حسين علي بواں بچراں.

ومن سنة ۱۹۴۲م صار يدرّس الكتب الدينيّة في مدرسة "أنوار العلوم" و من سنة ۱۹۴۳م. عُيّنَ إماماً وخطيباً بالمسجد الجامع بـ بوهڑ والی گکھڑ وفي نفس السنة بدأ يدرّس ترجمة معاني القرآن ومفاهيمه أمام جمعٍ من الأساتذة والعاملين بـ المعهد الحكوميّ في گکھڑ. ومن سنة ۱۹۵۵م. صار يدرِّسُ بمدرسة نصرة العلوم.

وأمّا في مجال التّصنيف فبدأ الشيخ عليه الرحمة سلسلة التّأليف في سنة ۱۹۴۴م إذ ألّف أوّل كتاب له باسم "الكلام الحاوي في تحقيق عبارة الطحاوی"، وفي سنة ۱۹۴۷م صنّف كتابه المسمّى بـ "آئینہ محمدی". و بسنة ۱۹۴۹م "تبريد النواظر" و بسنة ۱۹۵۰م. "گلدستہ توحید" وفي سنة ۱۹۵۳م ألّف الكتاب "صرف ایک اسلام بجواب دو اسلام" ومن الجدير بالذّكر أن أغلب جزء لهذا الكتاب أُلّف أثناء أيّامه و كان مقيّداً في

سجن ملتان بسبب حركة ختم النبوّة، ومن خلال هذا القيد كان يدرِّسُ في السجن دروساً لموطّا الإمام مالك، و حجة الله البالغة، و نخبة الفكر، و الهداية. وفي سنة ۱۹۵۴م صنّف كتيباً باسم "چالیس دعائیں" وفي سنة ۱۹۵۵م ألّف كتابه الشهير "أحسن الكلام في ترك القراءة خلف الإمام" و"مسئلہ قربانی مع رسالہ سیف یزدانی". وفي سنة ۱۹۵۶م ترجم كتيّبَ سماحة الشيخ السيد حسين أحمد المدني "حلية المسلمين مع رسالة إعفاء اللحية" بالأردية. وفي سنة ۱۹۵۷م ألّف كتابه القيّم "المنهاج الواضح یعنی راہ سنت" وفي ۱۹۵۸م "راہ ہدایت" وفي سنة ۱۹۵۹م قدّم لـ "الفقه الأكبر" للإمام الأعظم أبي حنيفة رحمه الله تعالى تقديماً طويلاً. وصنف "إزالة الرّيب عن عقيدة علم الغيب" و "ضوء السراج في تحقيق المعراج چراغ کی روشنی" وفي ۱۹۶۰م "مسئلة مختار كل الموسوم دل کا سرور" و "انکار حدیث کے نتائج" وفي سنة ۱۹۶۲م "مقام أبي حنيفهؒ" و "طائفہ منصورہ" و "عیسائیت کا پس منظر" وفي سنة ۱۹۶۳م. "بانی دار العلوم دیوبند" وفي ۱۹۶۴م "تبلیغ اسلام" و "باب جنت بجواب راہ جنت" وفي ۱۹۶۵م. "تنقید متین بر تفسیر نعیم الدین" وفي ۱۹۶۶م. "مرزائی کا جنازہ اور مسلمان" و "درود شریف پڑھنے کا شرعی طریقہ" وفي ۱۹۶۷م. "حضرت ملا علي القاريؒ اور علم غیب و حاضر و ناظر" وفي ۱۹۶۸م "عمدة الأثاث في حكم الطلقات الثلاث" وفي ۱۹۷۰م "مودودی صاحب کا ایک غلط فتوی اور ان کے چند دیگر باطل نظریات" وفي السنة نفسها أكمل كتابه "شوق حديث". وفي ۱۹۷۱م "شوق جہاد" وفي ۱۹۷۲م "عبارات أكابر" وفي ۱۹۷۴م "حكم الذكر بالجهر" وفي ۱۹۷۵م "سماع الموتى الملقب بإثبات السماع والشعور لحملة أهل القبور" وفي ۱۹۷۶م تفريح الخواطر في رد تنوير الخواطر" وفي ۱۹۷۸م أكمل كتابه الحليل "تسكين الصدور في تحقيق أحوال الموتى في البرزخ والقبور" وفي ۱۸۸۱م "إتمام البرهان في ردّ توضيح البيان" و "إخفاء الذكر" وفي ۱۹۸۳م. "الشهاب المبين على من أنكر الحق الثابت بالأدلة والبراهين" وفي ۱۹۸۴م. "الكلام المفيد في إثبات التقليد" وفي ۱۹۸۵م. "إظهار العيب في كتاب إثبات علم الغيب" وفي ۱۹۸۶م كتب مقالةً حول "ختم نبوت کتاب وسنت کی روشنی میں" وألّف كتابه "المسلك المنصور في رد الكتاب المسطور" وفي ۱۹۸۸م "إحسان الباری لفهم البخاري" و في السنة نفسها كتب "مقدمة تدقيق الكلام" وألحقها في ختام كتابه "أحسن الكلام". وفي ۱۹۹۲م "خزائن السنن" وفي ۱۹۹۶م ألّف كتابه الأخير "توضيح المرام في نزول المسيح عليه السلام". ومن سنة ۲۰۰۲م. إلى ۲۰۰۸م طبعت دروسه القرآنية الّتي ألقاها على جمعٍ من عامّة النّاس في

گکھڑ بعد صلاة الفجر باللغة البنجابيّة فترجمت بالأرديّة فسمّاها سماحة الشيخ بالاسم "ذخيرة الجنان في فهم القرآن" وقد طبع منها ثمانية مجلّداتٍ حتى الآن. وفي ٢٠٠٧م. طبعت خطبه باسم "خطبات امام اهل سنّت" فی ثلاثة مجلّداتٍ، وبالإضافة إلى هذه الكتب كتب الشّيخ مقدّماتٍ لكتبٍ متعددة ومقالاتٍ لعدّة جرائد و مجلّاتٍ مختلفة.

لم تكن خدمات سماحة الشّيخ الدينية منحصرة فی مجال العلم بل قدّم خدمات جليلة أخرى فی الميادين العملية مثل السياسة وإرشاد النّاس والحكّام إلى الطريق المستقيم، وكان يحبّ الجهاد في سبيل اللّه ويتشوّق إليه فاشترى السيف من وظيفته الشهرية عندما عيّن إماماً في مسجد بمنطقة من مناطق مانسهره سنة ١٩٣٤م.، و من ١٩٣٥م إلى ١٩٤٥م لم يزل عضواً متحمّساً لمجلس الأحرار الإسلامي، واشتغل بأمور المسلمين ولم يمتنع من أيّة ممارسة ضدّ انتهاك حرمات المسلمين في عهد الإنجليز، واشترك في المؤتمرات الّتی عقدها المسلمون بوجوده و خُطبه، وبسبب حركة ختم النبوة بـ ١٩٥٣م قضى أكثر من تسعة أشهر في السجن بكوجرانواله و ملتان. وفي ١٩٥٦م التحق بـ "جمعية علماء الإسلام" الجماعة السياسيّة الدينيّة فی باكستان، ولم يزل لمدّة مديدة عضو مجلس الشورى المركزيّ للجمعيّة، و أميرها لفرع گوجرانواله. وترأّس غيرها من الجماعات الإسلامية الدّينية، وخدم الإسلام والمسلمين في مجالات خدميّة مختلفة.

ووافت هذه الحياة الحافلة بالعلم والخدمات الدينية أجلها بـ الخامس من مايو سنة ٢٠٠٩م.، الموافق بـ التاسع من جمادى الأولى سنة ١٤٣٠هـ. يوم الثلاثاء ليلاً. وترك سماحة الشّيخ سرفراز خان صفدر عليه الرحمة وراءه الصدقات الجارية في صورة كتبه، ومقالاته، وأولاده العلماء الأتقياء.

جزاه اللّه منّا ومن جميع المنتسبين إليه من الأولاد و المسترشدين والتلامذة والمحبّين أحسن جزاءٍ.

ـــ ٥ ـــ

منہاج فکر

معلومات اور اسلاف امت کی تحقیقات سے متعلق سوالات اور ان کے معقول ومدلل جوابات نے اہل السنت والجماعت کے اصول وعقائد کے بارے میں میرے اندر غیر متزلزل ذہنی پختگی پیدا کردی۔ حضرت شیخ کو بھی میری تمام تر علمی وعملی کمزوریوں، کوتاہیوں اور میرے طبعی لاابالی پن کے باوجود میری فکری واعتقادی پختگی کا پورا ادراک تھا۔ یہی وجہ ہے کہ علالت ونقاہت کے ایام میں ان کے پاس عقائد ونظریات پر مشتمل جو کتاب بھی تقریظ وتصدیق کے لیے آتی، وہ میرے پاس ارسال فرمادیتے۔ حضرت شیخ کے حکم پر حضرت شیخ کی جانب سے میں نے بحمد اللہ تعالیٰ نصف درجن سے زائد کتب پر تقاریظ لکھیں جو انہوں نے مکمل سماعت فرما کر ان پر اپنے دستخط ثبت فرمائے۔ خدا تعالیٰ مجھے اور حضرت شیخ کے دیگر متعلقین ومتوسلین کو حضرت شیخ کے علمی وتحقیقی فکر وفلسفہ پر تاحیات قائم وثابت رہنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین ثم آمین۔

حضرت شیخ کا اسلافؒ پر اعتماد اور جدید فتنوں سے نفرت

حضرت شیخ نور اللہ مرقدہ کو اپنے اسلاف پر کس قدر اعتماد تھا اور جدید وقدیم فتنوں سے کس قدر نفرت ان کے دل میں تھی، اس کا اندازہ وہی کرسکتا ہے جس نے ایمان ویقین کی روشنی اور عقل وشعور کے نور سے ان کے بیانات کو سنا اور ان کی تحریرات کو پڑھا ہے۔ ان گنت لوگوں کے سامنے بے شمار دفعہ انہوں نے فرمایا کہ:

''انسان جب اپنے علم وفہم اور عقل ودانش پر ہی مکمل بھروسہ کرتے ہوئے اپنے خود ساختہ اور خود تراشیدہ اصولوں کی بنیاد پر اور اپنے ذہن میں مخصوص ومتعین کیے ہوئے دلائل کی روشنی میں تحقیق کرتا ہے تو اس کے اندر تکبر وانانیت اور شہرت وخود پسندی کا خناس پیدا ہونے کا خطرہ ہوتا ہے جو اسے نہ صرف اکابر واسلاف کے فکر وفلسفہ سے دور لے جاتا ہے، بلکہ اکثر اوقات اسے الحاد وزندقہ کی پستیوں میں دھکیل دیتا ہے، جس کے نتیجہ میں اس کی جدت پسندانہ تحقیقات ایک نئے مکتب فکر اور جدید فرقہ کو جنم دیتی ہیں اور وہ اپنے پرستاروں، عقیدت مندوں اور حواریوں سمیت ضلالت وگمراہی کی دلدل میں دھنستا چلا جاتا ہے جہاں سے اس کی انانیت، خود رائی اور شہرت پسندی اس کی واپسی کے راستے اکثر وبیشتر بند کردیا کرتی ہے۔

اس کے برعکس اکابر واسلاف کے فراہم کردہ متواتر ومتوارث اصولوں کی بنیاد پر کی جانے والی تحقیقات سے انسان کے اندر نہ صرف عجز وانکساری اور تواضع پیدا ہوتی ہے، بلکہ اس کے ذریعہ اسلاف کی متواتر ومتوارث فکر سے علمی وروحانی نسبت ووابستگی بھی قائم رہتی ہے۔ اس تحقیق کے اندر روحانیت کا نور بھی پیدا ہوتا ہے اور قدرت کی طرف سے اس کے لیے خصوصی نصرت وحفاظت کا غیبی انتظام بھی کارفرما ہوتا ہے جو ان گنت لوگوں کی ہدایت وراستی کا ذریعہ بھی بنتا ہے اور بے شمار افراد کو گمراہی وبے راہ روی سے بچانے کا سبب بھی۔''

حضرت شیخ نے اپنے اسی فکر وفلسفہ کو زندہ رکھا اور اسی کو پروان چڑھایا، تقریری طور پر بھی اور تحریری انداز میں بھی۔ چنانچہ ایک مقام پر وہ عصر حاضر کی جدت پسندانہ ذہنیت کا نقشہ کھینچتے ہوئے فرماتے ہیں کہ:

''انسان کی فطرت کچھ اس طرح واقع ہوئی ہے کہ وہ ہر طرح سے آزاد رہنے کو پسند کرتا اور قید وبند کی زندگی کو اپنی خواہشات اور اہوا کے پورا کرنے میں مزاحم پاتا ہے۔ وہ ہر ایسی زندگی کی طرف لپک کر آگے بڑھتا ہے جو اس کو ہر قسم کی جسمانی وروحانی اور عقلی وذہنی آزادی کا پروانہ دیتی ہو اور ہر اس زندگی کے تسلیم کرنے میں تامل اور پس وپیش کرتا ہے جو اس کو ایک خاص دائرۂ عقائد واعمال اور اخلاق ومعاملات میں مقید کردینا چاہتی ہو۔ اس عمومی فطرت کے ساتھ ان وساوس وخطرات اور شکوک وشبہات کو بھی اگر ملا لیا جائے جو ہر وقت عدو مبین، ابلیس لعین القا کرتا رہتا ہے تو بدی کی گاڑی اور تیز ہو

جاتی ہے۔ اور اس نام نہاد دور تہذیب وتمدن میں عقائد واعمال اور اخلاق ومعاملات سے جو کھلی چھٹی ملی ہے، اس کی مثال قرون اولیٰ میں چراغ لے کر ڈھونڈنے سے بھی نہیں مل سکتی..... اور منکرین حدیث بھی اکثر حالات میں حدیث سے محض اس لیے انکار کرتے ہیں کہ وہ ان کے نفس کی آسودگی کے لیے ذرا بھی گنجائش نہیں چھوڑتی۔ یہ تو ان کے ضمیر، سیرت، کردار، اخلاق، نفس اور پوری زندگی کے لیے سخت آزمائش ہے۔ یہ گویا ان کے لیے پھولوں کی سیج نہیں، کانٹوں کا بستر ہے اور یہاں ہی سے آپ کو حق وباطل کی کش مکش اور اسلام وجاہلیت کی مستقل آویزش وپیکار نظر آجائے گی اور اللہ والے صرف یہ چاہتے ہیں کہ اسلام کے خزاں رسیدہ چمن میں پھر سے بہار آجائے۔'' (صرف ایک اسلام ص: ۲۱، ۲۲)

حضرت شیخ نے ماڈرن اسلام کی طرف تیزی سے پیش قدمی کرنے والے جدت پسند طبقات کی پوری ذہنیت اور مکمل نفسیات انسانی فطرت کے تقاضوں کی روشنی میں بیان کردی ہے اور ان کے ساتھ قدامت پسندوں کی محاذ آرائی کے اسباب بھی بیان کردیے ہیں۔ جدت پسند طبقات دین واسلام کا نیا نقشہ اپنی نفسیات کے مطابق تیار کرنا چاہتے ہیں جبکہ قدامت پسند طبقہ فکر وعمل کے حوالہ سے قرون اولیٰ سے ہی وابستہ رہنا چاہتا ہے اور عالم اسلام کے تمام مسلمانوں کو اسی سے وابستہ رکھنا چاہتا ہے، کیونکہ وہ اپنی دینی وایمانی حکمت وبصیرت کے ذریعہ دینی وفکری آزادی کا ہولناک انجام اور عبرتناک تباہی بخوبی دیکھ رہا ہے۔

اصحاب علم وتحقیق حضرت شیخ نور اللہ مرقدہ کے مذکورہ فرامین کی اہمیت وواقعیت اور اس کے استدلالی وزن سے بخوبی واقف وآگاہ ہوں گے اور خود حضرت شیخ کی تحقیقات وتصنیفات سے اس حقیقت کا پوری طرح ادراک ہوجاتا ہے کہ ان کے تحقیقی قلم کے پیچھے اگر دست قدرت کی خصوصی نصرت وحفاظت کارفرما نہ ہوتی اور رحمت الٰہیہ ان کے شامل حال نہ ہوتی تو نہ اسے علمی وعوامی حلقوں میں اتنی مقبولیت وپذیرائی حاصل ہوتی، نہ وہ لاکھوں افراد کی ہدایت کا ذریعہ بن پاتا، اور نہ وہ اکابر واسلاف کی بے پناہ تائید واعتماد کا مستحق قرار پاتا۔ گویا

بوئے گل، جان چمن، روح بہاراں ہم ہیں
کوئی کیا کہہ کے نکالے گا گلستاں سے ہمیں

صفدری فرقہ یا دیوبندی مکتبہ فکر؟

میں بسا اوقات سوچتا ہوں کہ اگر حضرت شیخ کے علم وتحقیق اور زبان وقلم پر رحمت الٰہیہ کی حفاظت کا خصوصی سائبان نہ ہوتا تو بہت حد تک ممکن تھا کہ وہ اپنی خداداد ذہانت، بے پناہ قوت حافظہ، تقریری وتحریری کی ادیبانہ وعالمانہ خوبیوں، تحقیق وتدریس کے بے مثال فنی کمالات اور قابل رشک وسعت مطالعہ کی بنا پر آزادی فکر کی گمراہ کن تاریکیوں میں کھو جاتے، اور ان کی نسبت سے ایک نیا مکتب فکر اور جدید مذہبی فرقہ معرض وجود میں آچکا ہوتا۔ آخر وہ کون سی علمی خوبی تھی جس سے پرویز وچکڑالوی بہرہ مند تھے اور شیخ صفدر محروم تھے؟ وہ کون سا فنی کمال تھا جو مودودی وغامدی کے حصہ میں آیا اور شیخ صفدر کو نہ مل سکا؟ وہ کون سی ادبی قابلیت تھی جس سے مشرقی ونیچری فیض یاب ہوئے اور شیخ صفدرؒ کے لیے وہ شجر ممنوعہ تھی؟ لیکن وہ کیا وجہ بن گئی کہ پرویزی، چکڑالوی، خاکساری، نیچری، مودودی اور غامدی فرقے تو معرض وجود میں آگئے لیکن صفدری فرقہ کا کہیں نام ونشان نہیں ملتا؟ حالانکہ علم وتحقیق سے وابستگی اور لگاؤ رکھنے والے اس حقیقت سے پوری طرح باخبر ہیں کہ قرآنی وحدیثی علوم

معلومات اور اسلاف امت کی تحقیقات سے متعلق سوالات اور ان کے معقول ومدلل جوابات نے اہل السنت والجماعت کے اصول وعقائد کے بارے میں میرے اندر غیر متزلزل ذہنی پختگی پیدا کردی۔ حضرت شیخ کو بھی میری تمام تر علمی وعملی کمزوریوں، کوتاہیوں اور میرے طبعی لاابالی پن کے باوجود میری فکری واعتقادی پختگی کا پورا ادراک تھا۔ یہی وجہ ہے کہ علالت ونقاہت کے ایام میں ان کے پاس عقائد ونظریات پر مشتمل جو کتاب بھی تقریظ وتصدیق کے لیے آتی، وہ میرے پاس ارسال فرمادیتے۔ حضرت شیخ کے حکم پر حضرت شیخ کی جانب سے میں نے بحمد اللہ تعالیٰ نصف درجن سے زائد کتب پر تقاریظ لکھیں جوانہوں نے مکمل سماعت فرما کر ان پر اپنے دستخط ثبت فرمائے۔ خدا تعالیٰ مجھے اور حضرت شیخ کے دیگر متعلقین ومتوسلین کو حضرت شیخ کے علمی وتحقیقی فکر وفلسفہ پر تاحیات قائم وثابت رہنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین ثم آمین۔

حضرت شیخ کا اسلافؒ پر اعتماد اور جدید فتنوں سے نفرت

حضرت شیخ نور اللہ مرقدہ کو اپنے اسلاف پر کس قدر اعتماد تھا اور جدید وقدیم فتنوں سے کس قدر نفرت ان کے دل میں تھی، اس کا اندازہ وہی کرسکتا ہے جس نے ایمان ویقین کی روشنی اور عقل وشعور کے نور سے ان کے بیانات کو سنا اور ان کی تحریرات کو پڑھا ہے۔ ان گنت لوگوں کے سامنے بے شمار دفعہ انہوں نے فرمایا کہ:

"انسان جب اپنے علم وفہم اور عقل ودانش پر ہی مکمل بھروسہ کرتے ہوئے اپنے خود ساختہ اور خود تراشیدہ اصولوں کی بنیاد پر اور اپنے ذہن میں مخصوص ومتعین کیے ہوئے دلائل کی روشنی میں تحقیق کرتا ہے تو اس کے اندر تکبر وانانیت اور شہرت وخود پسندی کا خناس پیدا ہونے کا خطرہ ہوتا ہے جو اسے نہ صرف اکابر واسلاف کے فکر وفلسفہ سے دور لے جاتا ہے، بلکہ اکثر اوقات اسے الحاد وزندقہ کی پستیوں میں دھکیل دیتا ہے جس کے نتیجہ میں اس کی جدت پسندانہ تحقیقات ایک نئے مکتب فکر اور جدید فرقہ کو جنم دیتی ہیں اور وہ اپنے پرستاروں، عقیدت مندوں اور حواریوں سمیت ضلالت وگمراہی کی دلدل میں دھنستا چلا جاتا ہے جہاں سے اس کی انانیت، خودرائی اور شہرت پسندی اس کی واپسی کے راستے اکثر وبیشتر بند کردیا کرتی ہے۔

اس کے برعکس اکابر واسلاف کے فراہم کردہ متواتر ومتوارث اصولوں کی بنیاد پر کی جانے والی تحقیقات سے انسان کے اندر نہ صرف عجز وانکساری اور تواضع پیدا ہوتی ہے، بلکہ اس کے ذریعہ اسلاف کی متواتر ومتوارث فکر سے علمی وروحانی نسبت ووابستگی بھی قائم رہتی ہے۔ اس تحقیق کے اندر روحانیت کا نور بھی پیدا ہوتا ہے اور قدرت کی طرف سے اس کے لیے خصوصی نصرت وحفاظت کا غیبی انتظام بھی کارفرما ہوتا ہے جو ان گنت لوگوں کی ہدایت وراستی کا ذریعہ بھی بنتا ہے اور بے شمار افراد کو گمراہی وبے راہ روی سے بچانے کا سبب بھی۔"

حضرت شیخ نے اپنے اسی فکر وفلسفہ کو زندہ رکھا اور اسی کو پروان چڑھایا، تقریری طور پر بھی اور تحریری انداز میں بھی۔ چنانچہ ایک مقام پر وہ عصر حاضر کی جدت پسندانہ ذہنیت کا نقشہ کھینچتے ہوئے فرماتے ہیں کہ:

"انسان کی فطرت کچھ اس طرح واقع ہوئی ہے کہ وہ ہر طرح سے آزاد رہنے کو پسند کرتا اور قید وبند کی زندگی کو اپنی خواہشات اور اہوا کے پورا کرنے میں مزاحم پاتا ہے۔ وہ ہر ایسی زندگی کی طرف لپک کر آگے بڑھتا ہے جو اس کو ہر قسم کی جسمانی وروحانی اور عقلی وذہنی آزادی کا پروانہ دیتی ہو اور ہر اس زندگی کے تسلیم کرنے میں تامل اور پس وپیش کرتا ہے جو اس کو ایک خاص دائرۂ عقائد واعمال اور اخلاق ومعاملات میں مقید کردینا چاہتی ہو۔ اس عمومی فطرت کے ساتھ ان وساوس وخطرات اور شکوک وشبہات کو بھی اگر ملا لیا جائے جو ہر وقت عدو مبین، ابلیس لعین القا کرتا رہتا ہے تو بدی کی گاڑی اور تیز ہو

جاتی ہے۔ اور اس نام نہاد دور تہذیب وتمدن میں عقائد واعمال اور اخلاق ومعاملات سے جو کھلی چھٹی ملی ہے، اس کی مثال قرون اولیٰ میں چراغ لے کر ڈھونڈنے سے بھی نہیں مل سکتی..... اور منکرین حدیث بھی اکثر حالات میں حدیث سے محض اس لیے انکار کرتے ہیں کہ وہ ان کے نفس کی آسودگی کے لیے ذرا بھی گنجائش نہیں چھوڑتی۔ یہ تو ان کے ضمیر، سیرت، کردار، اخلاق، نفس اور پوری زندگی کے لیے سخت آزمائش ہے۔ یہ گویا ان کے لیے پھولوں کی سیج نہیں، کانٹوں کا بستر ہے اور یہاں ہی سے آپ کو حق وباطل کی کش مکش اور اسلام وجاہلیت کی مستقل آویزش وپیکار نظر آجائے گی اور اللہ والے صرف یہ چاہتے ہیں کہ اسلام کے خزاں رسیدہ چمن میں پھر سے بہار آجائے۔" (صرف ایک اسلام ص: ۲۱، ۲۲)

حضرت شیخ نے ماڈرن اسلام کی طرف تیزی سے پیش قدمی کرنے والے جدت پسند طبقات کی پوری ذہنیت اور مکمل نفسیات انسانی فطرت کے تقاضوں کی روشنی میں بیان کردی ہے اور ان کے ساتھ قدامت پسندوں کی محاذ آرائی کے اسباب بھی بیان کردیے ہیں۔ جدت پسند طبقات دین واسلام کا نیا نقشہ اپنی نفسیات کے مطابق تیار کرنا چاہتے ہیں جبکہ قدامت پسند طبقہ فکر وعمل کے حوالہ سے قرون اولیٰ سے ہی وابستہ رہنا چاہتا ہے اور عالم اسلام کے تمام مسلمانوں کو اسی سے وابستہ رکھنا چاہتا ہے، کیونکہ وہ اپنی دینی وایمانی حکمت وبصیرت کے ذریعہ دینی وفکری آزادی کا ہولناک انجام اور عبرتناک تباہی بخوبی دیکھ رہا ہے۔

اصحاب علم وتحقیق حضرت شیخ نور اللہ مرقدہ کے مذکورہ فرامین کی اہمیت وواقعیت اور اس کے استدلالی وزن سے بخوبی واقف وآگاہ ہوں گے اور خود حضرت شیخ کی تحقیقات وتصنیفات سے اس حقیقت کا پوری طرح ادراک ہوجاتا ہے کہ ان کے تحقیقی قلم کے پیچھے اگر دست قدرت کی خصوصی نصرت وحفاظت کارفرما نہ ہوتی اور رحمت الٰہیہ ان کے شامل حال نہ ہوتی تو نہ اسے علمی وعوامی حلقوں میں اتنی مقبولیت وپذیرائی حاصل ہوتی، نہ وہ لاکھوں افراد کی ہدایت کا ذریعہ بن پاتا، اور نہ وہ اکابر واسلاف کی بے پناہ تائید واعتماد کا مستحق قرار پاتا۔ گویا۔

بوئے گل، جان چمن، روح بہاراں ہم ہیں
کوئی کیا کہہ کے نکالے گا گلستاں سے ہمیں

صفدری فرقہ یا دیوبندی مکتبہ فکر؟

میں بسا اوقات سوچتا ہوں کہ اگر حضرت شیخ کے علم وتحقیق اور زبان وقلم پر رحمت الٰہیہ کی حفاظت کا خصوصی سائبان نہ ہوتا تو بہت حد تک ممکن تھا کہ وہ اپنی خداداد ذہانت، بے پناہ قوت حافظہ، تقریر وتحریر کی ادیبانہ وعالمانہ خوبیوں، تحقیق وتدریس کے بے مثال فنی کمالات اور قابل رشک وسعت مطالعہ کی بنا پر آزادی فکر کی گمراہ کن تاریکیوں میں کھو جاتے، اور ان کی نسبت سے ایک نیا مکتب فکر اور جدید مذہبی فرقہ معرض وجود میں آچکا ہوتا۔ آخر وہ کون سی علمی خوبی تھی جس سے پرویز وچکڑالوی بہرہ مند تھے اور شیخ صفدر محروم تھے؟ وہ کون سا فنی کمال تھا جو مودودی وغامدی کے حصہ میں آیا اور شیخ صفدر کو نہ مل سکا؟ وہ کون سی ادبی قابلیت تھی جس سے مشرقی ونیچری فیض یاب ہوئے اور شیخ صفدرؒ کے لیے وہ شجر ممنوعہ تھی؟ لیکن وہ کیا وجہ بن گئی کہ پرویزی، چکڑالوی، خاکساری، نیچری، مودودی اور غامدی فرقے تو معرض وجود میں آگئے لیکن صفدری فرقہ کا کہیں نام ونشان نہیں ملتا؟ حالانکہ علم وتحقیق سے وابستگی اور لگاؤ رکھنے والے اس حقیقت سے پوری طرح باخبر ہیں کہ قرآنی وحدیثی علوم

کے کسی پہلو سے بھی مذکورہ اہل فکر کا شیخ صفدرؒ سے کوئی جوڑ نہیں اور ندی نالوں کی سمندر سے مناسبت ہو بھی کیا سکتی ہے؟

میں نے اس پہلو پر بھی بہت سوچا، بہت غور کیا اور مکمل غور و فکر کے بعد ایک ہی نتیجہ سامنے آیا کہ باقی تمام مفکرین نے اپنے خود ساختہ اصول بنائے یا ماضی کے گمراہ فرقوں کے اصولوں کو منہ مارا، لیکن شیخ صفدرؒ نے اکابرین اہل سنت اور اسلاف دیوبند کے اصول و فکر اور عقائد و نظریات سے اپنی غیر متزلزل وابستگی قائم رکھی جس کے نتیجے میں وہ اپنی تمام تر علمی و فنی خوبیوں کے باوجود کسی جدید مکتب فکر کے بانی و موجد بننے کی بجائے فکر اسلاف کے امین و ترجمان قرار پائے اور واقعی انسان کے لیے کسی نئی فکری تحریک کا بانی و سربراہ بننے کے بجائے اسلاف کی فکری تحریک کا وکیل و امین بننے میں ہی سعادت ہے۔ شیخ صفدرؒ اصول اہل سنت کے ترجمان اور فکر دیوبند کے امین تھے۔

امام اہل سنت کا خطاب

حضرت شیخ کی فکر اسلاف سے اسی غیر متزلزل وابستگی اور اسی کی اشاعت و ترجمانی کی بنا پر ملک بھر کے جملہ علمائے دیوبند نے انھیں بالاتفاق امام اہل سنت کے خطاب سے نوازا۔ اس تحریک کے اصل محرک حضرت مولانا مفتی احمد الرحمنؒ، مولانا ولی حسن ٹونکیؒ اور شہید اسلام مولانا محمد یوسف لدھیانویؒ تھے جنہوں نے ملک بھر کے اکابر علما کو اعتماد میں لے کر یہ فیصلہ کیا تھا، لیکن لسانی بنیادوں پر کراچی کے اندر ہونے والے واقعات و فسادات اور ان کی وجہ سے بگڑنے والے حالات اس تقریب کو تاخیر والتوا کی طرف دھکیلتے چلے گئے۔ بالآخر ۱۹۹۲ء میں حضرت مولانا مفتی نظام الدین شامزیؒ شہید، مفتی محمد جمیل خان شہید، مفتی محمد زرولی خان مدظلہ، مفتی محمد نعیم مدظلہ اور مولانا محمد اسلم شیخوپوری مدظلہ نے اس کام کا بیڑا اٹھایا اور انہی کی دعوت و تحریک پر کراچی کے اندر برنس روڈ پر ایک عظیم الشان امام اہل سنت کانفرنس کا انعقاد ہوا جس میں حضرت شیخ کو ”امام اہل سنت“ کا خطاب دیا گیا۔ اس موقع پر دیگر علمائے کرام کے علاوہ استاذی المکرم برادر محترم مولانا عبد القدوس خان قارن مدظلہ نے بھی خطاب فرمایا۔ برادر محترم مدظلہ کے بعد مولانا مفتی جمیل خان شہیدؒ نے مجھے مائیک پر طلب کیا اور حضرت شیخ کی تصنیفی و تحقیقی خدمات کے موضوع پر بیان کرنے کا حکم دیا گیا۔ حضرت شیخ کی موجودگی میں ان کے پہلو میں کھڑے ہو کر اظہار خیال کرنے کا یہ میرا پہلا موقع تھا۔ لڑکھڑاتی ٹانگوں، لرزتے وجود اور کپکپاتی آواز میں، میں نے عرض کیا کہ:

”عصر حاضر کے جدید مفکرین و محققین (سرسید احمد خان، مرزا غلام احمد قادیانی، عبد اللہ چکڑالوی، علامہ عنایت اللہ المشرقی، چودھری غلام احمد پرویز اور مودودی وغیرہ) اور حضرت شیخ کے طرز تحقیق میں یہ واضح و نمایاں فرق ہے کہ وہ تمام جدید مفکرین ماضی کے پورے علمی و تحقیقی اثاثہ کو کالعدم و ناقابل اعتماد قرار دیتے ہوئے اپنے خود ساختہ اصولوں کے ذریعہ اس بات کی تحقیق کرتے ہیں کہ اسلاف امت اور اکابرین اہل سنت کی اجماعی و اتفاقی تحقیقات صحیح تھیں یا غلط؟ اور پھر ھم رجال و نحن رجال کے [illegible] پرستانہ فلسفہ کی بنیاد پر اپنی خود ساختہ و بے بنیاد تحقیق کے حوالہ سے اسلاف امت کی متواتر و متوارث تعلیمات و تحقیقات کو غلط قرار دے کر ان کے مقابلہ میں ایک جدید فرقہ اور نیا مکتب فکر قائم کر لیتے ہیں۔ جبکہ ہمارے حضرت شیخ کی تمام عقائد و مسائل کے اندر تحقیقی بنیاد اسلاف اہل سنت اور اکابرین دیوبند کے فکر و فلسفہ اور اصول و قواعد سے غیر متزلزل وابستگی پر قائم ہے اور انہی کی تحقیقات کو اپنی ہر تحقیق کی بنیاد بناتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ یہ تمام جدید مفکرین اپنی تحقیق کے ذریعہ اسلاف امت کے افکار و نظریات پر تنقید کرتے ہیں، جبکہ ہمارے حضرت شیخ اپنی تحقیق

کے ذریعہ اکابرین اہل سنت کے عقائد و نظریات کا دفاع کرتے ہیں۔“

کانفرنس سے فارغ ہونے کے بعد جب ہم اپنی قیام گاہ (جامعہ بنوریہ ناظم آباد) پر پہنچے تو حضرت شیخ نے میرے اس بیان کو خوب سراہا اور شاباش دی۔ تحسین و آفرین کے ان انمول جملوں نے میرے اعتماد و حوصلہ کو مزید نکھار دیا۔ حضرت شیخ نے فرمایا کہ تم نے اپنی تقریر کے اندر جو کچھ بیان کیا، وہی حق اور حقیقت ہے۔ اپنی علمی زندگی کے اندر اس بات کو ہمیشہ کے لیے اپنا علمی و تحقیقی اصول بنالو کہ ہمارے لیے حق پر قائم رہنے اور ہر قسم کی گمراہیوں اور الحادی آلودگیوں سے بچنے کا واحد حفاظتی راستہ صرف اور صرف یہی ہے کہ ہم اپنے اکابر و اسلاف کے علم و فہم اور ان کی امانت و دیانت پر مکمل اعتماد رکھتے ہوئے ان کی متواتر تعلیمات و تحقیقات اور عقائد و نظریات سے پوری طرح وابستہ رہیں، کیونکہ اس راہ سے بھٹک کر ہم شرک و بدعت، کفر و نفاق اور الحاد و زندقہ کی کسی بھی تاریکی میں کھو سکتے ہیں۔ اس لیے ہمیشہ تمام عقائد و نظریات اور افکار و اعمال میں اپنے اسلاف و اکابر کا دامن تحقیق تھامے رکھنا، کسی جدید تحریک کے دل فریب افکار و تصورات کی طرف کبھی آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھنا، کیونکہ اسی میں ہماری دنیوی ہدایت پوشیدہ ہے اور اسی میں اخروی نجات مضمر ہے۔

اس کے بعد جب تک میں حضرت شیخ کا بدن اور ٹانگیں دباتا رہا، حضرت شیخ عہد جدید کے مختلف علیحدگی پسند مذہبی فتنوں کے نظریات اور ان کے طرز تحقیق پر تفصیلی و اجمالی روشنی ڈالتے رہے اور مجھے ان کے دینی و فکری نقصانات و رجحانات سے خبردار کرتے رہے۔ مجھے یوں محسوس ہو رہا تھا کہ بڑے غیر محسوس انداز میں اصلاح کی آڑ میں میرا امتحان لیا جا رہا تھا۔ غالباً یہ معلوم کرنے کی کوشش کی جا رہی تھی کہ تقریر میں جو کچھ کہا گیا، تحقیق کی بنیادوں پر کہا گیا یا صرف شنید کی بنیاد پر۔ منکرین حدیث اور منکرین حیات انبیا وغیرہ طبقات جدیدہ کی کتب و رسائل کے بارے میں دریافت کیا گیا کہ ان میں سے کون کون سی کتب مطالعہ میں آچکی ہیں جن کا میں نے بڑے مختصر انداز میں جواب دیا۔ میں نے بھی ذہن میں کافی عرصہ سے کھٹکنے والا ایک سوال داغ دیا، کیوں کہ موقع سے جائز فائدہ نہ اٹھانا بھی تو نعمت کی ناقدری ہے۔ میں نے پوچھا کہ جدت پسند طبقوں کی طرف سے کہا جاتا ہے کہ ہم پر اکابر و اسلاف کی توہین و تنقیص کا الزام سراسر غلط ہے، ہم تو صرف ان سے رائے کا اختلاف رکھتے ہیں اور اختلاف میں کوئی عیب نہیں۔ حضرت شیخ نے بڑے غصے اور جلالی انداز میں فرمایا، غلط کہتے ہیں، جھوٹ کہتے ہیں۔ اسلاف امت میں سے ایک ایک ہستی علم و فہم اور زہد و تقویٰ کے حوالے سے ایک منفرد اور بلند مقام رکھتی ہے۔ ہم تو ان میں سے کسی ایک کی رائے بھی اختلاف کی جسارت نہیں کر سکتے، چہ جائیکہ پوری امت کے اہل علم و تحقیق ایک رائے پر متفق ہوں اور اس رائے سے اختلاف کیا جائے۔ اپنے علم و فن کو پوری امت کے اہل علم و تحقیق کے مجموعی علم و فہم سے برتر جاننا یا کم از کم ان کی برابری کی سطح پر دیکھنا، اس سے بڑھ کر ان کی توہین و تنقیص کیا ہوگی؟ حضرت شیخ کے اس ایک جلالی جملہ نے ذہن صاف کر ڈالا اور ہر قسم کے شکوک و شبہات کے بادل چھٹ گئے اور بحمد اللہ آج تک پھر کوئی ایسا وسوسہ ذہن میں نہیں پھٹکا۔

تحقیق اسلاف کے مقابل اظہار رائے سے اجتناب

اسی سفر کے دوران (جو تقریباً ایک ہفتہ کا تھا) حضرت شیخ کراچی کے مختلف چھوٹے بڑے مدارس میں بھی تشریف لے گئے۔ جامعہ احسن العلوم گلشن آباد، جامعہ بنوریہ نارتھ ناظم آباد، جامعہ علوم اسلامیہ بنوری ٹاؤن، جامعہ یوسفیہ بنوری ٹاؤن، جامعہ فاروقیہ اور دار العلوم کراچی وغیرہ مدارس میں مختلف علمی و مسلکی عنوانات پر علما و طلبہ سے خطاب فرمایا۔ دار العلوم کراچی

کی مسجد میں حضرت شیخؒ کے بیان کا خصوصی اہتمام کیا گیا تھا جہاں اس وقت شیخ الحدیث مولانا سبحان محمودؒ، مفتی اعظم مفتی محمد رفیع عثمانی مدظلہ اور مولانا مفتی محمد تقی عثمانی مدظلہ بھی تشریف فرما تھے۔ مفتی اعظم نے حضرت شیخؒ کو خطاب کی دعوت دی۔ اس موقع پر حضرت شیخؒ نے اپنی تقریر میں فرمایا کہ:

"میں نے تقریباً پچاس سال تک مختلف فکری واعتقادی اور فقہی واجتہادی مسائل پر تحقیق کی اور تحقیق کے دوران بعض علمی وفقہی ایسے مسائل بھی میرے سامنے آئے جن کے بارہ میں ذاتی تحقیق ومطالعہ کی بنا پر میری ذہنی رائے اکابرین اہل سنت کی تحقیقی رائے سے مختلف رہی، لیکن میں نے تقریری وتحریری طور پر کبھی بھی پبلک کے سامنے اپنی ان ذہنی آرا کا اظہار نہیں کیا، اس لیے کہ خود کو اکابر واسلاف کی علمی وتحقیقی سطح کے برابر لانے کا تصور بھی دل میں پیدا نہیں ہوا۔ ہمیشہ یہی سوچا کہ میری اس ذہنی رائے کے پیچھے تحقیق میں کوئی نہ کوئی کمی موجود ہے۔ اسی سوچ وفکر کے تحت ہمیشہ اپنے اکابر واسلاف کی تحقیقی آرا کو ہی اصح سمجھا، انہی کو دل وجان سے قابل قبول جانا اور انہی کی اتباع وپیروی کو اپنے لیے باعث ہدایت ونجات سمجھا، بلکہ ان میں سے بعض مسائل ایسے بھی تھے جن کے بارے میں طویل مدت کے بعد تحقیقی طور پر بھی مجھ پر یہ منکشف ہوگیا کہ اس مسئلہ میں بھی اکابر کی تحقیق ورائے ہی مدلل ومحقق تھی۔ میں نے جن دلائل پر اپنی اپنی رائے قائم کی تھی، وہ تو ریت کا گھروندا تھے۔ اس لیے میں اپنے عزیز علماے کرام اور طلبہ سے درخواست کرتا ہوں، ان کو نصیحت کرتا ہوں کہ اپنے اکابر واسلاف کی اجماعی واتفاقی تحقیقات وتعلیمات سے کبھی انکار وانحراف نہ کرنا اور نہ ہی کبھی جمہور اہل سنت کا دامن چھوڑنا کیونکہ ہمارے علم وفن اور دیانت وامانت کی انتہا بھی ان کے علم وحکمت کی ابجد کو نہیں چھو سکتی۔ انہی پر اعتماد میں ہماری نجات ہے اور انہی میں ہمارے لیے خیر وبرکت ہے۔"

حضرت شیخؒ کے اس ناصحانہ وحکیمانہ بیان سے ان کا طرز تحقیق بہت حد تک کھل کر سامنے آجاتا ہے اور ان کے طرز تحقیق اور اصول تحقیق کو سمجھنے میں کسی قسم کا کوئی ابہام واشکال باقی نہیں رہتا۔ انہوں نے نہ صرف اسی طرز تحقیق کو تاحیات اختیار کیا بلکہ دوسروں کے لیے بھی اسی کو پسند کیا اور اسی کی ہمیشہ تلقین کی۔

عصر حاضر کا فکری المیہ

عصر حاضر کا سب سے بڑا فکری ونظریاتی المیہ یہ ہے کہ اس عہد جدید میں ایک طرف تو اسلام کے متواتر واجماعی عقائد کی حقیقت پسندانہ اور واقفیت پر مبنی تعبیر وتشریح کا پرچار کرنے اور اس ذریعہ سے دور حاضر کی امت مسلمہ کا فکری ونظریاتی رشتہ قرون اولیٰ سے جوڑنے والے اصحاب علم وفکر علما ودانشور تو قضا وقدر کے ہاتھوں مجبور ہو کر تیزی کے ساتھ یہ دنیا خالی کر رہے ہیں جس سے علم وفکر کی مسندیں ویران ہو رہی ہیں، جب کہ دوسری طرف ان کی جگہ پروفیسرز، ڈاکٹرز اور جدید تعلیم یافتہ نام نہاد دانشوروں کا وہ جدت پسند طبقہ پرنٹ اور الیکٹرانک میڈیا کے ذریعہ مفکرین اسلام اور مذہبی اسکالروں کی صورت میں سامنے آ رہا ہے یا ایک سوچی سمجھی سازش کے تحت سامنے لایا جا رہا ہے جو نئی روشن خیالی کے دلفریب وگمراہ کن عنوان سے اسلام کی وہ مسخ شدہ تصویر پیش کر رہا ہے جس کے خدوخال کا کوئی بھی پہلو قرون اولیٰ کے اعتقادی تصور اور اہل سنت والجماعت کے متواتر واجماعی فکر سے کسی قسم کی فکری ونظریاتی مطابقت نہیں رکھتا۔ جدید مفکرین کا یہ گروہ شعوری یا غیر شعوری طور پر اسلام دشمن قوتوں کے ہاتھ میں کٹھ پتلی بن کر رہ گیا ہے اور اپنے جدید فکر وفلسفہ اور اپنے خود ساختہ اصولوں کے ذریعہ امت مرحومہ کا فکری رشتہ

قرون اولیٰ اور اہل سنت کے متواتر واجماعی فکر سے کاٹ دینا چاہتا ہے۔ اگرچہ ایسے جدت پسند ہر دور میں پیدا ہوتے رہے ہیں، لیکن اس دور میں تو عالم اسلام میں بالعموم اور برصغیر میں بالخصوص برساتی مینڈکوں کی طرح برآمد ونمودار ہو رہے ہیں۔

ہمارے ملک کے اندر جدت پسند تحریکوں کی پشت پر اسلام دشمن مغربی قوتیں، اشتراکیت کی ہم نوا سیکولر لابیاں اور اس ملک کی پچانوے فی صد اکثریت اہل سنت والجماعت کو ان کے آئینی وقانونی حق سے محروم کر دینے کی سازش کرنے والے کچھ مذہبی طبقات موجود ہیں۔ ارباب فکر ودانش کے لیے اس پہلو پر غور وفکر اور توجہ کرنے کی شدید ضرورت ہے کہ وہ اس بات کا کھوج لگائیں کہ کون سا خفیہ ہاتھ، کن خفیہ مقاصد کے لیے ان جدت پسند الحادی تحریکوں کے الحادی نظریات کے فروغ اور ان کی اشاعت کے لیے کروڑوں ڈالر کا ماہانہ خرچہ برداشت کر رہا ہے؟ بے حیائی، فحاشی، عریانی اور اخلاقی تباہی کو فروغ دینے والے جن ٹی وی چینلز پر اہل حق علما کو اپنا موقف ونظریہ اور اپنا نقطہ نظر بیان کرنے کے لیے چند منٹ کا وقت حاصل کرنا بھی دشوار ہے اور انٹرویوز کے دوران بھی ان کے نقطہ نظر کا اصل حصہ وقفہ کی نذر کر دیا جاتا ہے، ان ٹی وی چینلز پر جدید مفکرین کی گھنٹوں گفتگو کا بل آخر کون ادا کرتا ہے اور کن مقاصد کے لیے؟

دور جدید کا سب سے بڑا قدامت پسند

عصر حاضر میں قدامت پسندی کا لفظ ہمارے پورے معاشرہ کے اندر ایک گالی بن کر رہ گیا ہے حالانکہ اسلامی عقائد ونظریات کا مکمل حقیقی ڈھانچہ قدامت پسندی ہی کی مضبوط بنیادوں پر کھڑا ہے۔ وہ اپنے اندر حالات کی تبدیلی کے ساتھ احکام وافکار کے تغیر وتبدل کا کوئی تصور نہیں رکھتا۔ وہ حالات اور اس کے تقاضوں کو اپنے ساتھ چلاتا ہے، خود کسی سوسائٹی، سماج اور تہذیب کے تابع ہو کر نہیں چلتا۔ اپنی اسی خوبی کی بنا پر وہ چودہ سو سال کے بعد بھی اپنی اصلی حالت میں موجود ہے، ورنہ دیگر مذاہب تو اپنی اصلی وحقیقی حالت ایک صدی تک بھی برقرار نہیں رکھ پائے۔ وہ تغیر وتبدل اور تحریف کے اتنے مراحل سے گزر چکے ہیں کہ ان میں سے ان کی حقیقی روح وتعلیم شاید خوردبین سے بھی نہ مل پائے اور اگر اسلام کے اندر بھی تغیر وتبدل کا وہی سلسلہ جاری رہتا تو وہ بھی اپنی حقیقی صورت کھو چکا ہوتا۔ اسلام اگر سنت نبوی اور سیرت صحابہ کا نام ہے (اور واقعی اسی کا نام ہے) تو اس سے ذہنی وعملی وابستگی کسی صورت بھی قدامت پسندی کے بغیر ممکن نہیں، اور پھر قرون اولیٰ کے بعد ہر دور کے قدامت پسندوں نے ہی اپنے اپنے دور کے جدت پسندوں کا مقابلہ کر کے اسلام کی اصلی وحقیقی تعلیمات کی حفاظت کی، ورنہ ہر عہد کی تعبیرات وتشریحات کی شکل قسط وار بگاڑی جا چکی ہے۔ اس اعتبار سے قدامت پسند طبقہ کا امت پر یہ احسان عظیم ہے کہ اس نے جدت پسند طبقہ کے ہاتھوں اسلام کی حقیقی شکل وصورت مسخ ہونے سے بچالی ہے۔

ہمارے شیخ مکرمؒ بھی قدامت پسندی کے اسی متواتر سلسلہ کی ایک مضبوط اور ناقابل تسخیر کڑی تھے جو اپنے اکابر واسلاف کی متواتر ومتوارث تعلیمات کے وارث وامین بھی تھے اور ان کے ترجمان ونگہبان بھی۔ وہ علم وتحقیق کے حوالے سے جتنی بڑی اور بلند شخصیت کے مالک تھے، فکر واعتقاد کے اعتبار سے اتنے ہی بڑے اور بلند قدامت پسند تھے اور ہمیشہ اپنی قدامت پسندی پر فخر وناز کرنے والے تھے۔ اگر وہ واقعی طور پر عصر حاضر میں عالم اسلام کی سب سے بڑی علمی شخصیت تھے تو پھر بلاشبہ وہ دور جدید کے سب سے بڑے قدامت پسند تھے۔ اس حوالے سے وہ زندگی کے کسی موڑ پر بھی قدامت پرستی، انتہا پسندی، بنیاد پرستی اور دقیانوسیت جیسے مغربی واشتراکی پروپیگنڈے سے نہ کبھی متاثر ہوئے اور نہ کبھی اس کے سامنے ذہنی مرعوبیت کا

مظاہرہ کیا۔ مغربی تہذیب وثقافت کی ''انا ولا غیری'' کی للکار ہو یا اشتراکیت کی فکری یلغار، یورپین فکر وکلچر سے مرعوب ودہشت زدہ مشرقی میڈیا کا پروپیگنڈا ہو یا فریب خوردہ جدت پسند طبقہ کا اسلامی تعلیمات پر حملہ، انہوں نے کبھی بھی کسی طرز کے فکر جدید کی تائید وتصویب نہیں کی اور نہ ہی اسے کبھی کسی رنگ میں پسند کیا۔ بیسیوں قسم کے فکری موضوعات ان کے زیر قلم آئے اور ہر موضوع پر بحمد اللہ تحقیق کا پورا پورا حق ادا کیا گیا، لیکن کسی بھی موضوع پر تحقیق کرنے کے لیے نہ انہیں کبھی جدید اصول وضع کرنے کی ضرورت محسوس ہوئی اور نہ اس کے لیے اسلاف امت کی متواتر واجماعی تحقیقات سے انکار وانحراف تک نوبت پہنچی۔ انہوں نے جو علوم وافکار جن تعبیرات وتشریحات کے ساتھ اپنے اکابر واسلاف اور اپنے اساتذہ وشیوخ سے حاصل کیے، وہ بغیر کسی تعبیری وتشریحی تغیر وتبدل کے اگلی نسل تک پہنچا دیے اور کسی مقام پر بھی کسی قسم کی فکری خیانت یا نظریاتی بد دیانتی کے مرتکب نہیں ہوئے۔

علما وطلبہ کو نصیحت

۱۹۹۸ء میں مدارس دینیہ کی سالانہ تعطیلات کے دوران مختلف مدارس کے اساتذہ وطلبہ کا کثیر تعداد پر مشتمل ایک وفد حضرت شیخؒ سے ملاقات وزیارت کے لیے گکھڑ حاضر ہوا اور دوران ملاقات حضرت شیخؒ سے نصیحت کی درخواست کی جس پر حضرت شیخؒ نے فرمایا کہ

> ''میرے عزیزو! ہم نے اپنے اسلاف واساتذہ سے جو علمی وفکری ورثہ پایا، اپنی تمام تر کمزوریوں کے باوجود وہ علمی وفکری امانت ووراثت بغیر کسی تغیر وتبدل کے آپ تک پہنچا دی۔ ہم نے قرآن وسنت کے وہی الفاظ آپ تک پہنچائے جو ہمیں متواتر سند کے ساتھ اپنے اساتذہ سے وراثت میں ملے اور ہم نے ان متواتر ومتوارث الفاظ کی وہی تعبیر وتشریح آپ تک پہنچائی جو ہمیں متواتر سند کے ساتھ اپنے اساتذہ سے وراثت میں ملی۔ نہ ہم نے ان متواتر الفاظ میں تغیر کیا اور نہ الفاظ کے متواتر مفہوم میں کوئی تبدیلی کی۔
>
> میں نے اپنی تمام کتابوں کے اندر اکابرین اہل سنت اور بزرگان دیوبند کے اجماعی واتفاقی مذہب ومسلک کے عین مطابق مختلف عقائد ونظریات پر مدلل وباحوالہ بحث کردی ہے۔ ان کا مطالعہ ضرور کرو۔ علامہ عبد الشکور لکھنویؒ کی تحریرات کو مطالعہ میں لاؤ اور ہمارے اس دور میں مولانا محمد یوسف لدھیانویؒ کی بڑی خدمات ہیں، ان کا وجود غنیمت سمجھو اور ان کی تحریروں کا بھی مطالعہ کرو۔ اب ہم نے متواتر علم وفکر اور متوارث عقائد ونظریات کی وہ امانت آپ کے سپرد کردی ہے۔ اس امانت کو اس کی اصلی وحقیقی صورت میں اگلی نسل تک پہنچانا آپ کی شرعی واخلاقی ذمہ داری ہے۔ اگر آپ نے اس ذمہ داری کو نبھانے میں کسی قسم کی غفلت وخیانت یا حرص وبزدلی کا مظاہرہ کیا تو آپ عند اللہ اپنے بڑوں کے بھی مجرم ہوں گے اور چھوٹوں کے بھی۔''

حضرت شیخؒ کی یہ انمول نصیحت ان روشن خیال حضرات کے لیے انتہائی قابل توجہ ہے جن پر ہر وقت تقلید کا جمود توڑنے اور اس کی بندشوں سے آزادی حاصل کرنے کا جنون طاری رہتا ہے اور آزاد خیالی کے اسی جنون کے تحت وہ کتابی علوم والفاظ کو تو متواتر ومتوارث مانتے ہیں، لیکن ان علوم والفاظ سے اخذ کیے جانے والے عقائد ونظریات کو متواتر ومتوارث تسلیم کرنے پر آمادہ نہیں۔ ان آزاد خیال جدت پسندوں کا یہ دعویٰ ہے کہ قرآن وحدیث کے الفاظ ونقوش اگرچہ تغیر وتبدل سے محفوظ ہیں، لیکن ان کے معانی ومطالب اور ان کی تعبیر وتشریح ہر دور کے تقاضوں کے مطابق بدلنی ضروری ہے۔ ان میں علمی وفکری تغیر

وتبدل کے دروازے ہر دور میں کھلے ہیں۔ اگر وہ دروازے بند کر دیے جائیں تو ذہن وشعور آلودہ ہو جائیں گے، علمی وفکری صلاحیتوں کی نشوونما رک جائے گی اور استعداد وصلاحیت بے کار ہو کر رہ جائے گی، اس لیے ان سب کو تواتر وتوارث کی قید سے آزاد ہونا چاہیے۔ ان کو سابقہ تعلیمات وتعبیرات کے قید خانہ میں بند رکھنے سے اسلامی ودینی تعلیمات اور قرآنی ونبوی مقاصد کی روح فنا ہو جائے گی۔ یہ روشن خیال وجدت پسند طبقہ اپنے اس فکر وفلسفہ کے ذریعہ جو مذموم مقاصد حاصل کرنا چاہتا ہے، وہ کسی بھی ہوش مند وباشعور مسلمان سے مخفی وپوشیدہ نہیں۔ وہ اس فکر وفلسفہ کے ذریعہ قرآنی ونبوی علوم وافکار کو اپنے خود ساختہ تحقیقی اصولوں کی بھٹی میں جھونکنا چاہتا ہے اور ان کو اپنے تحقیقی تجربات کے لیے تختہ مشق بنا کر نئے نئے افکار ونظریات منظر عام پر لانا چاہتا ہے تاکہ اس کے ذریعہ شہرت بھی حاصل ہو سکے اور ڈالر بھی، امت مسلمہ کی وحدت کو پارہ پارہ بھی کر سکے اور اس کا علمی وفکری رشتہ اس کے اسلاف سے بھی کاٹ سکے۔ خدا تعالیٰ ہر قسم کے روشن خیال جدت پسندوں کے شر وروفتن سے امت مسلمہ کی حفاظت فرمائے، آمین یا رب العالمین۔

امام اہل سنت کا تحقیقی فکر وفلسفہ

جدت پسند طبقہ کے تحقیقی فکر وفلسفہ کا سرسری جائزہ ہم لے چکے۔ اب حضرت شیخؒ کے عقائد ونظریات، ان کی تحقیقات اور ان کے اصول تحقیق پر تفصیلی بحث کرنے سے قبل ہم ان کے تحقیقی فکر وفلسفہ پر مختصر روشنی ڈالنا ضروری خیال کرتے ہیں تاکہ قارئین کرام کے سامنے وہ بنیادی نقطہ نظر واضح ہو جائے جو حضرت شیخؒ کی تحقیقات کی اصل اساس ہے۔

یہ ایک ناقابل انکار حقیقت ہے کہ حضرت شیخؒ اپنی تمام تالیفات وتحقیقات کے اندر قرآن حکیم کی تفسیر اور احادیث مبارکہ کی تشریح کے لیے الفاظ کے معانی ومطالب کی لغوی، اصطلاحی اور عرفی وضاحت ضرور کرتے ہیں۔ آیات قرآنیہ کے شان نزول کا باحوالہ تذکرہ بھی ہوتا ہے۔ کتب اسماء الرجال سے احادیث مبارکہ کی صحت وثقاہت یا ان کا ضعف واضح کرنے کے لیے احادیث کے راویوں پر مدلل ومفصل بحث بھی ہوتی ہے، لیکن اس کے باوجود فقط انہی امور کو اپنے موقف ونظریہ کے اثبات کی بنیاد نہیں بناتے، بلکہ امت کے تلقی بالقبول اور اسلاف امت کے علم وفہم اور ان کے علمی وتحقیقی نتائج کو ہی ہمیشہ انہوں نے اپنی تحقیق کی بنیاد بنایا اور مذکورہ امور کی مدد سے انہوں نے اسلاف امت کے افکار وعقائد کا دفاع کیا۔

قرآن وحدیث کے فہم صحیح اور ان سے تحقیقی استدلال کے لیے انہوں نے ہمیشہ سنت خلفاے راشدین، آثار صحابہ، تعامل تابعین واتباع تابعین اور اقوال وافکار ائمہ اہل سنت کو ہی اپنے لیے معیار واتھارٹی ٹھہرایا۔ وہ چونکہ افکار وعقائد اور علم وعمل کے اعتبار سے اول وآخر سنی اور صرف سنی تھے بلکہ سنی گر تھے، اس لیے ان کی ہر تحقیق، ہر فکر اور ہر عقیدہ کی بنیاد صرف اور صرف اصول اہل سنت پر تھی جن سے انہوں نے نہ خود کبھی سر مو انحراف کیا اور نہ کسی دوسرے کے لیے اس انحراف کو روا جانا، چنانچہ وہ اپنے تحقیقی فکر وفلسفہ کی وضاحت کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ:

> ''جوں جوں زمانہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور قرون مشہود لہا بالخیر سے دور ہوتا جا رہا ہے، دوں دوں امور دین اور سنت میں رخنے پڑتے جا رہے ہیں۔ ہر گروہ اور ہر شخص اپنے من مانے نظریات وافکار کو خالص دین بنانے پر تلا ہوا ہے اور اپنی تمام نفسانی خواہشات اور طبعی میلانات کو ایڑی چوٹی کا زور لگا کر دین اور سنت ثابت کرنے کا ادھار کھائے بیٹھا ہے، الا ماشاء اللہ۔ اور ایسی ایسی باتیں دین اور کار ثواب قرار دی جا رہی ہیں کہ سلف صالحین کے وہم وگمان میں بھی نہ ہوں گی،

حالانکہ دین صرف وہی ہے جو ان حضرات سے ثابت ہوا ہے اور انہی کے دامن تحقیق سے وابستہ رہنے میں نجات منحصر ہے۔'' (درود شریف پڑھنے کا شرعی طریقہ ص ۵۔۶)

حضرت شیخؒ کی مذکورہ وضاحت اور بالخصوص اس وضاحت کا آخری جملہ انتہائی قابل توجہ ہے۔ اسے بار بار ملاحظہ کیا جانا چاہیے، کیونکہ اس ایک جملہ کے اندر انہوں نے اپنا پورا تحقیقی فکر وفلسفہ واضح اور غیر مبہم الفاظ میں بیان کر دیا ہے۔ وہ صاف اور دوٹوک لفظوں میں اعلان فرما رہے ہیں کہ قرآنی وحدیثی تفسیرات وتشریحات اور سنت کی تعریف وتعیین کے حوالہ سے دین صرف اور صرف وہی ہے جو سلف صالحینؒ سے ثابت ہے۔ وہ کوئی لگی لپٹی رکھے بغیر واشگاف الفاظ میں سلف صالحینؒ کے دامن تحقیق سے وابستہ رہنے کو ہی مدارِ نجات قرار دیتے ہیں۔ اس کے باوجود اگر کسی کا یہ دعویٰ ہے کہ حضرت شیخؒ خود تو سلف صالحین کی تحقیقات سے وابستہ تھے، لیکن دیگر اہل علم کے لیے ان تحقیقات کے برعکس اپنی شخصی تحقیق پر عمل کرنے کی گنجائش باقی رکھتے تھے تو ہمارے خیال میں وہ پوری طرح حضرت شیخؒ کے اصول تحقیق اور طرزِ تحقیق سے واقف وباخبر نہیں ہے۔

حضرت شیخؒ نے سلف صالحین سے علمی وفکری وابستگی کا موقف درست صحیح ثابت کرنے کے لیے اس حدیث مبارکہ (مسلم ۱/۱۰ اور مشکوۃ ۱/۲۸) سے باقاعدہ استدلال کیا ہے کہ:

''آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ کچھ ایسے دجال وکذاب پیدا ہوں گے جو تمہارے سامنے ایسی حدیثیں اور باتیں پیش کریں گے، بما لم تسمعوا انتم و لا آباء کم، جو نہ تم نے سنی ہوں گی اور نہ تمہارے آباؤ اجداد نے۔ پس تم ان سے بچو اور ان کو اپنے قریب نہ آنے دو تا کہ وہ تمہیں نہ گمراہ کر سکیں اور نہ فتنہ میں ڈال سکیں۔'' (ایضاً ص ۶)

ظاہر بات ہے کہ اس حدیث مبارکہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا خطاب امت کے عام افراد سے نہیں بلکہ ان اہل علم سے ہے جو قرآن وحدیث کے علوم ومعارف سے بخوبی واقف ہیں، اور حدیث کے اندر آباؤ اجداد سے بھی نسلی ونسبی آباؤ اجداد مراد نہیں بلکہ علمی وفکری اور روحانی آباؤ اجداد مراد ہیں جو کہ اسلاف امت اور بزرگان دین ہیں۔ گویا قرآن وحدیث کے علوم ومعارف سے آگاہی رکھنے والے اہل علم سے کہا جا رہا ہے کہ تم نے بھی ایسی حدیثیں اور باتیں سماعت نہ کی ہوں گی اور تمہارے علمی وفکری آباؤ اجداد بھی ان باتوں سے لاعلم وبے خبر ہوں گے جو تمہارے سامنے دجال وکذاب لوگوں کی طرف سے پیش کی جا رہی ہیں۔ اس حدیث مبارکہ میں یا تو ان جعلی ووضعی حدیثوں کی طرف اشارہ ہے جو امت کے بعض بدبخت افراد وطبقات نے اپنے من گھڑت عقائد ونظریات اور اپنی خود تراشیدہ بدعات ورسومات کو ثابت کرنے کے لیے تراشیں، جنہیں نہ امت کا تلقی بالقبول حاصل ہوا اور نہ ان کے راوی صحت وثقاہت کے مسلمہ معیار پر پورا اتر سکے اور یا اس حدیث مبارکہ میں قرآن وحدیث کی تعبیرات جدیدہ کی طرف اشارہ ہے کہ قرآن وحدیث کی ایسی ایسی تعبیرات وتشریحات آخر زمانہ کے دجال وکذاب لوگوں کی طرف سے تمہارے سامنے آئیں گی جن سے اس دور کے اہل علم بھی ناواقف ہوں گے اور ان کے آباؤ اجداد کے بھی وہم وگمان میں نہ ہوں گی۔ گویا حق اور سچ کو پرکھنے اور اس تک رسائی حاصل کرنے کے لیے وقت کے اصحاب علم ومعرفت کے ساتھ ساتھ ماضی کے ارباب علم ومعرفت کو بھی معیار وکسوٹی قرار دیا گیا ہے۔ اس حدیث مبارکہ کی روشنی میں حضرت شیخؒ کا یہ موقف ونظریہ بہت حد تک نکھر کر سامنے آ جاتا ہے کہ ہماری ہدایت ونجات اپنے علمی وفکری آباؤ اجداد یعنی سلف صالحین کے دامن تحقیق سے وابستہ ہونے اور وابستہ رہنے میں ہی منحصر ہے۔

امام اہل سنتؒ کا کوئی نظریہ اجماع امت کے خلاف نہیں

سلف صالحین کے دامن تحقیق سے وابستگی حضرت شیخؒ کا ایسا طرہ امتیاز ہے جس کی بنا پر بلاخوف لومۃ لائم یہ دعویٰ کیا جا سکتا ہے کہ بحمد اللہ حضرت شیخؒ کا ایک بھی عقیدہ ونظریہ ایسا نہیں جو اسلاف امت کی اجماعی تحقیقات کے خلاف ہو۔ چند سال قبل (جب میرا بڑے سے چھوٹا بیٹا سرفراز حسن خان حمزہ سلمہ وہاں زیر تعلیم تھا) جامعہ فتاح العلوم سرگودھا کے ختم بخاری شریف کی تقریب میں حضرت مولانا مفتی طاہر مسعود مدظلہ مہتمم جامعہ فتاح العلوم کی شدید خواہش اور اصرار پر حضرت شیخؒ کو بھی لے جایا گیا جہاں ہمارے رائے پوری سلسلہ کے معروف بزرگ پیر طریقت مولانا عبد الجلیل مدظلہ آف ڈھڈیاں شریف، مولانا مفتی محمد تقی عثمانی مدظلہ اور مولانا زاہد الراشدی مدظلہ بھی موجود تھے۔ وقت کے ان شیوخ واکابر کی موجودگی میں ہم جیسے لوگوں کا کام صرف مجمع کو جوڑنا اور شیوخ کی آمد تک اسے مصروف رکھنا ہوتا ہے۔ چنانچہ اسی مقصد کے تحت مجھے بھی چند منٹ کے لیے مائیک پر کھڑا کر دیا گیا۔ میں نے بھی موقع غنیمت جانا اور اپنی اصلاح وتربیت کے لیے چند کلمات عرض کر دیے۔ میں نے اپنی تقریر میں کہا:

''ہم سب بحمد اللہ اسلاف اہل سنت اور بزرگان دیوبند کی اجماعی تحقیقات سے وابستہ ہیں اور آخری سانس تک انہی سے وابستہ رہنا چاہتے ہیں، کیونکہ اسی میں ہماری نجات ہے اور اسی کے ذریعہ ہم عصر حاضر کے فتنوں سے محفوظ رہ سکتے ہیں۔ اس وقت ہمارے پورے دیوبندی مکتب فکر کو علمی وتحقیقی حوالہ سے جس شخصیت پر سب سے زیادہ اعتماد ہے، وہ امام اہل سنت حضرت مولانا سرفراز خان صفدر کی شخصیت ہے جن کے تمام عقائد وافکار بحمد اللہ اکابرین علمائے دیوبند کے اجماعی سلوک کے عین مطابق ہیں۔ اگر بالفرض کسی وقت کسی مضبوط وپختہ دلیل سے یہ ثابت ہو جائے کہ امام اہل سنت کا فلاں عقیدہ اسلاف دیوبند کے فلاں اجماعی عقیدہ کے خلاف ہے تو میں پورے یقین واعتماد کے ساتھ اعلان کرتا ہوں کہ ہم حضرت شیخؒ کا نظریہ چھوڑ دیں گے، بزرگان دیوبند کی اجماعی تحقیق سے ہرگز دستبردار نہ ہوں گے۔''

حضرت شیخؒ اس وقت کمرے میں موجود تھے۔ میری خواہش تھی کہ حضرت شیخؒ نے میرا یہ بیان سن لیا ہو، تاکہ ان کا ردعمل جان سکوں، کیونکہ اسی ردعمل کا میری تربیت واصلاح کے ساتھ تعلق تھا۔ میں تقریر سے فارغ ہو کر خدمت میں حاضر ہوا تو کمرے سے باہر ہی خدمت پر مامور افراد سے خبر ملی کہ حضرت شیخؒ نے پورا بیان بڑی توجہ سے سنا اور حسب معمول ہاتھ اور سر ہلا کر خوشی کا اظہار فرمایا۔ میں خدمت میں حاضر ہوا تو بھی ان کی چمکتی آنکھیں اور دمکتا چہرہ ان کے ردعمل کو صاف ظاہر کر رہا تھا جو میرے لیے ایک بڑی سند تھی۔

صراط مستقیم معلوم کرنے کا آسان نسخہ

حضرت شیخؒ کی وفات سے تقریباً ڈیڑھ ماہ قبل ان کی خدمت میں معمول کی حاضری دی تو حسب عادت سوال پوچھ لیا کہ اس وقت ہمارے معاشرے میں مختلف مذہبی گروہ کام کر رہے ہیں اور ہر ایک خود کو صراط مستقیم پر قائم وگامزن قرار دیتا ہے، کیسے معلوم ہو کہ کون صراط مستقیم پر ہے؟ فرمایا کہ ''جو اپنی تحقیق پیش کرے، گمراہ ہے۔ جو بزرگوں کی تحقیق پیش کرے، صحیح ہے۔'' میرے لیے یہ حضرت شیخؒ کا آخری سبق ہے اور اگر اس پر غور کرتا ہوں تو پہلا سبق بھی یہی تھا، یعنی پہلے اور آخری سبق میں بال برابر بھی فرق نہ تھا۔ کاش یہ سبق میرے دل ودماغ کی ہر تختی پر نقش ہو جائے اور میں اسے زندگی کے کسی بھی

جو لنے نہ پاؤں ۔یہی میرے لیے میرے شیخ کا ورثہ ہے اور یہی وہ حصار ہے جس میں محصور رہ کر میں ہر فتنہ کی ضلالت و گمراہی سے محفوظ رہ سکتا ہوں ۔حضرت شیخ کے مذکورہ مختصر جملہ کی اگر کوئی تفصیل ملاحظہ کرنا چاہتا ہو تو وہ بھی ملاحظہ کرے۔

حضرت شیخ ''قرآن وحدیث سے استدلال کرنے کا ضابطہ'' کے زیر عنوان فرماتے ہیں:

''عوام الناس کو یہ بات پریشان کیے ہوئے ہے کہ جو بھی اسلامی یا منسوب بہ اسلام فرقہ اپنے مسلک کی طرف دعوت دیتا ہے تو وہ قرآن وحدیث ہی کا نام لیتا اور اپنے استدلال میں قرآن وحدیث ہی کو پیش کرتا ہے، اب ہم کس کو صحیح اور کس کو غلط، کس کو حق پر اور کس کو باطل پر سمجھیں؟ واقعی یہ شبہ اکثر لوگوں کے مغالطہ کے لیے کافی ہے، لیکن اگر انصاف، خدا خوفی اور دیانت کے ساتھ اس بات پر غور کر لیا جائے کہ آخر یہی قرآن وحدیث حضرات صحابہ کرامؓ، تابعین عظام اور ائمہ دین و بزرگان صالحین رحمہم اللہ کے سامنے بھی تھے، ان کا جو مطلب و معنی اور جو تفسیر و مراد انہوں نے سمجھی، وہی حق اور صواب ہے، باقی سب غلط اور باطل ہے۔ پس عوام کا یہ کام ہے کہ ہر باطل پرست اور خواہش زدہ سے یہ سوال کریں کہ فلاں آیت اور فلاں حدیث کی جو مراد تم بیان کر رہے ہو، آیا یہ سلف صالحین سے ثابت ہے؟ اگر ثابت ہے تو صحیح، صریح حوالہ بتاؤ۔ چشم ما روشن دل ما شاد، ورنہ یہ مراد جو تم بیان کرتے ہو، اس قابل ہے کہ اسے ع

اٹھا کر پھینک دو باہر گلی میں

عوام اس قاعدہ اور ضابطہ کے بغیر اور کسی طرف نہ جائیں ۔پھر دیکھیں کہ حق کس کے ساتھ ہے اور قرآن وحدیث کی مراد کون سی صحیح ہے؟ اگر وہ ایسا نہ کریں گے اور اس میں کوتاہی کریں گے تو ضروریات دین میں غلطی کی وجہ سے کبھی عند اللہ سرخرو نہیں ہو سکیں گے۔ اور اپنی طاقت اور وسعت صرف نہ کرنے کی وجہ سے جو گناہ قرآن وحدیث کی تحریف کرنے والوں کو ملے گا، اس میں ماننے والے بھی برابر کے شریک ہوں گے۔'' (تنقید متین بر تفسیر نعیم الدین ص ۱۸۰)

حضرت شیخ نے اپنے اس تفصیلی موقف کو ثابت کرنے کے لیے بھی پہلی صدی کے مجدد حضرت عمر بن عبد العزیزؒ کے قول (ابوداؤد ۲/۲۷۸) اور گیارہویں صدی کے مجدد حضرت مجدد الف ثانی شیخ احمد سرہندیؒ کے مکتوب (مکتوبات امام ربانی، مکتوب ۱۵۷) سے استدلال کیا ہے۔ حضرت شیخ کے اس موقف سے تین چیزیں پوری طرح واضح و آشکارا ہو جاتی ہیں:

۱۔ قرآن وحدیث کی جو تفسیر و تعبیر صحابہ کرامؓ اور ان کے بعد کے بزرگان دین اور ائمہ امت سے صحیح و صریح حوالہ جات کے ذریعہ ثابت ہوگی، وہی حق اور صواب ہے اور اسی پر چشم ما روشن دل ما شاد۔ اس کے علاوہ جو کچھ بھی ہے اور تعبیر و تشریح کا جو ذریعہ بھی ہے، وہ سب غلط اور باطل ہے، لہٰذا ع اٹھا کر پھینک دو باہر گلی میں۔

۲۔ عوام الناس کے لیے حق اور باطل کو پرکھنے اور صحیح و غلط کے درمیان تمیز و تفریق کرنے کی یہی ایک اتھارٹی ہے۔ اس کے علاوہ ان کے پاس کوئی ایسی کسوٹی نہیں جس کے ذریعہ وہ حق اور باطل کے درمیان فرق کر سکیں۔

۳۔ عوام کے جو افراد سلف صالحین کی وساطت سے قرآن وحدیث کی تعبیر و تشریح سمجھنے کی کوشش نہیں کرتے اور اس میں قصداً و عمداً غفلت و کوتاہی کرتے ہیں تو وہ اس گمراہی کے اندر گمراہی پیدا کرنے والے کے جرم میں برابر کے شریک ہوں گے جس کے ساتھ وابستہ ہوں گے۔

اس مقام پر یہ شبہ پیدا ہو سکتا ہے کہ حضرت شیخ نے یہ قواعد و ضوابط اور اصول صرف عوام الناس کے لیے بیان کیے ہیں، اہل علم کے لیے قواعد و ضوابط مختلف ہیں۔ تو ہم اس شبہ کے جواب میں دو چیزیں عرض کریں گے۔

۱۔ حضرت شیخ اپنی اس تحریر کے اندر اہل علم و تحقیق کو تحقیقات اسلاف کے دائرہ میں بند رہنے کا مشورہ دے رہے ہیں اور ان کے لیے یہی اصول بیان فرما رہے ہیں۔ اگر ان اہل علم کی تحقیق اس اصول کے دائرہ میں بند ہے تو حق و صواب ہے ورنہ باطل و مردود، تو گویا اس میں اہل علم کے لیے بھی اصول و قاعدہ موجود ہے۔

۲۔ لیکن اگر اہل علم بالفرض اس تحریر کے اندر اپنے لیے کوئی گنجائش پاتے ہیں تو پھر اس تحریر میں ان کو اپنی تحقیقات و افکار پبلک کے اندر لانے کی کوئی گنجائش نہیں ملے گی، کیونکہ عوام الناس کو حق و باطل کے درمیان فرق کرنے کا پیمانہ سمجھا دیا گیا ہے۔ لہٰذا وہ اہل علم اپنے خود ساختہ افکار و نظریات کو اپنے ذہن تک یا اپنے جیسوں تک ہی محدود رکھیں۔ کتابیں اور رسائل لکھ کر عوام الناس میں نہ لائیں۔ اسی میں ان کی بہتری ہے، اسی میں عوام کی بہتری ہے اور اسی میں دین کی بہتری ہے۔ گویا

میں وہ صاف صاف کہہ دوں جو ہے فرق مجھ میں تجھ میں
ترا درد درد تنہا مرا غم غم زمانہ

امام اہل سنتؒ کے اصول تحقیق

گزشتہ سطور میں ہم پوری طرح واضح کر چکے ہیں کہ حضرت شیخ اول و آخر سنی تھے۔ اصول و فروع میں سنی تھے اور سنت کے دائرہ سے کسی صورت باہر نکلنا پسند نہ کرتے تھے۔ اس اعتبار سے اصول اہل سنت ہی ان کے اصول تحقیق تھے، اور ان کی تمام تعلیمات و تحقیقات انہی اصولوں پر مبنی ہیں۔

حقانیت مذہب اہل السنۃ والجماعۃ

اصول اہل سنت سے قبل ہم اہل سنت پر مختصر بحث کرنا چاہیں گے۔ امت مسلمہ کے اندر مذہب اہل سنت و جماعت کی کیا حیثیت و اہمیت ہے اور حضرت شیخ سمیت تمام بزرگان دیوبند اس کو کس نظر سے دیکھتے تھے؟ اس کا مختصر تذکرہ ضروری ہے۔ احادیث صحیحہ اس حقیقت پر پوری طرح گواہ اور شاہد ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے امت کے اندر جس تفریق اور انتشار کی خبر دی، اس میں صرف ایک گروہ کو ہی ناجی اور قائم علی الحق قرار دیا۔ وہ ناجی گروہ کون سا ہے؟ اس کے بارے میں عم مکرم حضرت مولانا صوفی عبد الحمید خان سواتی فرماتے ہیں کہ

''حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میری امت کے تہتر فرقے بن جائیں گے۔ ایک فرقہ کے سوا باقی سب جہنم میں جائیں گے۔ عرض کیا وہ ناجی فرقہ کون سا ہوگا؟ فرمایا وہ جماعت ہوگی جسے اہل سنت و جماعت کہا جاتا ہے۔ یہ وہ لوگ ہوں جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرامؓ کے طریق پر چلیں گے۔ ان کا عقیدہ اور عمل حضور صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرامؓ کے عقیدہ اور عمل کے مطابق ہوگا۔ یہی لوگ ناجی ہیں۔'' (معالم العرفان ۴/۳۵۳)

ربیع الاول ۱۴۰۳ھ میں جماعت مبلغین اہل السنت والجماعت ضلع گوجرانوالہ کی طرف سے حضرت شیخ کی خدمت میں ایک مکتوب ارسال کیا گیا جس میں چند مسائل کی وضاحت دریافت کی گئی تھی۔ ان میں ایک سوال یہ بھی تھا کہ اہل السنت والجماعت کا مطلب کیا ہے اور یہ کون سا گروہ ہے؟ اس مکتوب کے جواب میں حضرت شیخ کی طرف سے جو مکتوب جاری کیا گیا، وہ جماعت مبلغین گوجرانوالہ نے ''اہل سنت کی پہچان'' کے نام سے شائع کیا۔ اس میں حضرت شیخ فرماتے ہیں کہ:

''اہل السنت والجماعت کا مطلب جیسا کہ سیدنا حضرت شیخ عبد القادر جیلانیؒ نے غنیۃ الطالبین میں اور امام حافظ ابن تیمیہ

نے منہاج السنۃ میں تصریح کی ہے، جو لوگ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت اور حضرات صحابہ کرام کی جماعت کی پیروی اور اتباع کریں، وہ اہل السنّت والجماعت ہیں۔ اور امت کے تہتر فرقوں میں سے یہی طبقہ اللہ تعالیٰ کے فضل وکرم سے اول وآخر تک دوزخ سے محفوظ رہے گا اور اس فرقہ کو الفرقۃ الناجیۃ سے تعبیر کیا جاتا ہے اور آنحضرت کی صحیح حدیث "ما انا علیہ واصحابی" کا مصداق یہی طبقہ ہے اور ما انا علیہ سے مراد سنت اور واصحابی سے مراد جماعت صحابہ کی پیروی کی طرف اشارہ ہے۔ علامہ عبدالکریم شہرستانی اپنی کتاب (الملل والنحل ۱/۱۳) میں یہ مرفوع حدیث نقل کرتے ہیں کہ:

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے خبر دی ہے کہ عنقریب امت تہتر فرقوں میں بٹ جائے گی۔ ایک فرقہ ان میں سے نجات پانے والا ہے اور باقی ہلاک ہونے والے ہیں۔ پوچھا گیا نجات پانے والا کون سا فرقہ ہے؟ تو آپ نے فرمایا کہ اہل السنّت والجماعت کا۔ پوچھا گیا کہ سنت اور جماعت سے کیا مراد ہے؟ تو آپ نے فرمایا کہ وہ طریقہ جس پر آج کے دن میں اور میرے صحابہؓ ہیں۔ اور واصحابی کے الفاظ حضرت عبداللہ بن عمرؓ کی مرفوع روایت میں بھی (جو مستدرک حاکم ۱/۱۲۹ اور تفسیر درمنثور ۲/۶۲ وغیرہ میں ہے) موجود ہیں۔ اس روایت کے مطابق ایک بات تو یہ معلوم ہوئی کہ فرقہ ناجیہ صرف اہل السنّت والجماعت کا گروہ ہے۔ اس کے بغیر باقی تمام فرقے ہلاکت کا شکار ہوں گے۔" (اہل سنت کی پہچان ص ۸)

اور پھر صفحہ ۱۳ پر درمنثور ۲/۶۳ تفسیر ابن کثیر ۱/۳۹۰ اور تفسیر مظہری ۲/۱۱۴ کے حوالہ سے حضرت عبداللہ بن عباسؓ اور حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے "یوم تبیض وجوہ وتسود وجوہ" کی تفسیر میں فرماتے ہیں کہ

"قیامت کے دن اہل السنّت والجماعت کے چہرے سفید ہوں گے اور اہل بدعت وضلالت اور اہل افتراق کے چہرے سیاہ ہوں گے۔" (ایضاً ص ۱۳)

اسی قسم کی ایک روایت تفسیر درمنثور ۲/۶۳ کے حوالہ سے حضرت ابوسعید خدریؓ سے بھی نقل کی گئی ہے جس میں اھل البدع والاھواء کے الفاظ ہیں، یعنی اہل بدعت اور خواہشات پرستوں کے چہرے قیامت کے دن سیاہ ہوں گے۔ امت کے اندر تہتر فرقوں کے معرض وجود میں آنے اور ناجی فرقہ کے لیے ما انا علیہ واصحابی کی روایت المنہاج الواضح یعنی راہ سنت میں بھی حضرت شیخؒ نے ترمذی ۲/۸۹ اور مشکوٰۃ ۱/۳۰ کے حوالہ سے نقل فرمائی ہے۔ اس کے بعد فرماتے ہیں کہ

"اور ایک دوسری روایت میں یہ الفاظ آئے ہیں: وھی الجماعۃ (ابوداؤد ۲/۲۷۵، مستدرک حاکم ۱/۱۲۸، ابن ماجہ ۲۹۶ اور مشکوٰۃ شریف ۱/۳۰) یعنی نجات حاصل کرنے والا صرف وہی فرقہ ہے جو اس جماعت صحابہ کرام کا ساتھ دینے والا ہے اور اسلام کی اس جماعت سے کٹ کر الگ نہ ہونے والا ہے۔" (راہ سنت ص ۳۷)

اور حکیم الہند حضرت شاہ ولی اللہؒ کی کتاب "حجۃ اللہ البالغۃ" ۱/۱۰۷ کے حوالہ سے فرماتے ہیں کہ

"اہل السنّت یعنی نجات پانے والا فرقہ وہ ہے جو عقیدہ اور عمل دونوں میں اس چیز کو لیتا ہو جو کتاب وسنت سے ظاہر ہو اور جمہور صحابہ کرامؓ اور تابعینؒ کا اس پر عمل ہو۔ اور غیر ناجی ہر وہ فرقہ ہے جس نے سلف (یعنی صحابہ کرامؓ وتابعینؒ) کے عقیدہ اور عمل کے خلاف کوئی عقیدہ اور عمل اپنا لیا ہو۔" (درود شریف پڑھنے کا شرعی طریقہ ۴۷)

اس مختصر مگر مدلل بحث سے یہ حقیقت پوری طرح واضح وآشکارا ہو چکی ہے کہ حضرت شیخؒ گروہ اہل السنّت والجماعت سے ہی اپنی فکری وعملی وابستگی کیوں قائم رکھنا چاہتے تھے اور ساری زندگی انہوں نے اسی کی اشاعت وترویج پر کیوں صرف کر دی؟ جب پیغمبر برحق صلی اللہ علیہ وسلم نے اختلاف امت کی نشاندہی بھی فرما دی، اس اختلاف میں ناجی فرقہ وگروہ کا نام بھی

بیان کر دیا اور اس کی علامت وپہچان بھی ظاہر کر دی تو پھر کسی باایمان مسلمان کے لیے اس سے انکار وانحراف یا اس سے اختلاف وروگردانی کی گنجائش کہاں باقی رہتی ہے؟

اصول اہل سنت یعنی دلائل شرعیہ

جب یہ بات پوری طرح واضح ہو چکی کہ امت کے متفرق گروہوں میں سے صرف اہل السنّت والجماعت کا گروہ ہی حق پر ہے تو پھر ضروری ہے کہ اس گروہ کے اصول ودلائل معلوم کیے جائیں۔ جب یہ گروہ قرون اولیٰ میں موجود تھا تو یقیناً اس کے اصول بھی قرون اولیٰ میں موجود تھے۔ اس حوالہ سے اس گروہ کے وہی اصول معتبر ہوں گے جو قرون اولیٰ میں وضع کیے گئے اور اس کے بعد ہر گروہ اور فرقہ کا مقابلہ انہی اصولوں کی بنیاد پر کیا گیا۔ یہ اصول چار ہیں: (۱) قرآن حکیم، (۲) سنت رسول صلی اللہ علیہ وسلم، (۳) اجماع امت، اور (۴) قیاس شرعی۔ یہی چار چیزیں اصول اہل سنت کہلاتی ہیں۔ یہی دلائل شرعیہ کے نام سے معروف ہیں اور انہی کو اصول فقہ تسلیم کیا گیا ہے۔

حضرت شیخؒ ان اصول اہل سنت اور دلائل شرعیہ کے بارے میں فرماتے ہیں کہ:

"تمام اہل اسلام اس امر پر کلیتاً اتفاق رکھتے ہیں کہ مسلمانوں کے لیے علم کے ذرائع میں سب سے پہلے قرآن کریم اور پھر حدیث شریف ہے، اور پھر اجماع امت کے بعد اظہار اسلام اور ان کے افہام وتفہیم کا ایک ذریعہ قیاس اور اجتہاد بالفاظ دیگر عقل وبصیرت بھی ہے۔ مگر طلوع اسلام (منکرین حدیث کا ترجمان) کے نزدیک نہ تو حدیث شریف علم کا ذریعہ ہے اور نہ امت مسلمہ کا اتحاد واتفاق۔" (انکار حدیث کے نتائج ص ۱۶۷)

یعنی علوم دینیہ حاصل کرنے کے چار ذرائع ہیں اور وہی اصول اہل سنت ودلائل شرعیہ ہیں۔ ان میں سے چوتھا اصول اور چوتھی دلیل قیاس واجتہاد کی ہے جسے عقل وبصیرت کا نام دیا گیا ہے۔ اس کے حدود وقیود پر ان شاء اللہ آگے حجیت قیاس کے تحت بحث آئے گی۔ بقیہ تین دلائل واصول کی حیثیت کیا ہے؟ ان کے بارہ میں حضرت شیخؒ کے چند اقتباسات ملاحظہ فرمائیے۔ فرماتے ہیں کہ:

"جملہ اہل اسلام اس امر پر متفق ہیں کہ دلائل وشواہد کی مد میں قطعی اور یقینی درجہ نمبر اول صرف قرآن کریم کو حاصل ہے، اس کے بعد حدیث متواتر، اور پھر اجماع قطعی کو۔" (انکار حدیث کے نتائج ص ۱۳۹)

"جملہ اہل اسلام کا اس امر پر اتفاق ہے کہ دلائل اور براہین کی مد میں جو درجہ اور مرتبہ قرآن کریم پھر حدیث شریف اور پھر اجماع امت کو حاصل ہے، وہ کسی اور دلیل وبرہان کو حاصل نہیں۔" (راہ ہدایت ۶۵)

"ہمارے اکابر عقیدہ کو قطعی دلائل سے پیش کرتے ہیں، اور قطعی دلائل یہ ہیں: (۱) قرآن کریم، (۲) خبر متواتر (عام اس سے کہ تواتر لفظی ہو یا تواتر طبقہ، تواتر قدر مشترک ہو یا تواتر توارث، ان میں سے ہر ایک کا انکار ہمارے اکابر کے نزدیک کفر ہے۔ البیان الازہر، از علامہ سید محمد انور شاہ کشمیریؒ ص ۱۰۳-۱۰۴) (۳) اور اجماع قطعی۔ کوئی عقیدہ ہمارا ان دلائل کے بغیر کسی اور چیز پر موقوف نہیں ہے۔" (راہ ہدایت ص ۱۶۲)

حضرت شیخؒ کی جملہ کتب میں ایسی عبارات بکثرت موجود ہیں۔ ہم نے ان کے موقف ونظریہ کی وضاحت کے لیے صرف تین عبارات پر اکتفا کیا ہے۔ ان عبارات سے پوری طرح واضح ہے کہ اہل سنت والجماعت کے نزدیک نصوص قطعیہ

تین ہیں: قرآن، سنت متواترہ اور اجماع قطعی، اور جملہ اکابر اہل سنت نے انہی نصوص قطعیہ سے عقائد کے اثبات کے لیے استدلال کیا ہے، اسی لیے ان کا کوئی عقیدہ ان نصوص کے علاوہ اور کسی دلیل پر موقوف نہیں۔ حضرت شیخ نے ان عبارات سے دو قسم کے گمراہ گروہوں کا رد کیا ہے:

پہلا وہ گروہ جو بزرگان امت کے شاذ ومتفرد اقوال پر عقیدہ کی بنیاد رکھتا ہے اور ان کے ذریعہ باطل نظریات وعقائد کی اشاعت کرتا ہے۔ بریلوی مکتب فکر کے جملہ عقائد ونظریات فاسدہ کی بنیاد اسی پر ہے۔ چنانچہ حضرت شیخ ان کے اس طرز عمل کی تردید کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ:

''اگر کسی بزرگ کا کوئی قول کسی جگہ مجمل ہے تو ان ہی کی عبارت میں دوسری جگہ اس کی تفصیل بھی عموماً موجود ہے۔ اگر بالفرض اس کی کوئی مناسب تاویل آپ کو نہیں مل سکتی تو قرآن کریم، احادیث اور اجماع امت کے مقابلہ میں ان کی وہ بات مردود ہوگی، نہ یہ کہ اس پر دین کی اور خصوصاً عقیدہ کی عمارت استوار ہو سکتی ہے۔'' (دل کا سرور ص ۲۱۹)

دوسرا وہ گروہ جو منصوص واجماعی مسائل وعقائد میں بھی صرف عقل سے کام لیتا ہے اور اس کا نقطہ نظر ہے کہ دین وشریعت کا فہم اور اس کی تعبیر وتشریح انسانی عقل کا وظیفہ ہے۔ ماضی وحال کے تقریباً تمام جدت پسندوں کی بنیاد اسی پر رہی ہے اور اسی کے ذریعہ انہوں نے نئے نئے عقائد ومسائل کو فروغ دینے کی کوشش کی، یعنی ان کے نزدیک سنت متواترہ اور اجماع امت کی بھی اس وقت تک کوئی حیثیت نہیں جب تک کہ وہ ہر انسانی عقل کے احاطہ میں نہ آ جائے اور ہر انسان کی عقل اس کو قبول نہ کرے۔ ظاہر ہے کہ جب دینی تعبیر وتشریح عقل کا وظیفہ ہے تو پھر یہ امتیاز وتفریق ناممکن ہے کہ کس انسان کی عقل معتبر ہے اور کس کی نامعتبر۔ گویا انسانی عقل بھی (باوجود اختلاف مراتب کے) اصول شرعیہ میں سے ایک اصل اور دلائل شرعیہ میں سے ایک دلیل ہے۔ قطع نظر اس سے کہ حقائق وواقعات کی دنیا میں ایسا ممکن بھی ہے یا نہیں، ہم فی الوقت صرف اس نکتہ پر اپنی بحث کو مرکوز رکھنا چاہتے ہیں کہ حضرت شیخ ان دونوں گروہوں کے نقطہ نظر کو مسترد کرتے ہیں۔ وہ نہ تو اجماع امت کے مقابلہ میں کسی بزرگ اور ولی کی مبہم، شاذ یا متفرد رائے کو بطور دلیل قبول کرتے ہیں اور نہ ہی اجماع امت کے مقابلہ میں کسی عقلی رائے کو درست اور صحیح تسلیم کرتے ہیں۔ اس کی تفصیلات آئندہ اوراق میں ملاحظہ فرمائیے۔

اب ہم اصول اہل سنت اور دلائل شرعیہ پر بالترتیب بحث کریں گے اور ہر اصول ودلیل پر حضرت شیخ کی عبارات وتحریرات لائیں گے تاکہ ان کی اہمیت وواقعیت پوری طرح واضح ہو جائے۔

پہلی دلیل شرعی: قرآن حکیم

اصول اہل سنت میں سے پہلا اصول اور دلائل شرعیہ میں سے پہلی دلیل قرآن حکیم ہے جو آخری آسمانی کتاب ہے۔ خدا کا کلام اور اس کی صفت ہے۔ تا قیامت ہر لفظی ومعنوی تحریف وتغیر وتبدل سے پاک ومحفوظ ہے۔ اس کے مخلوق یا غیر مخلوق اور حادث وغیر حادث ہونے کی بحثیں تو کسی دور میں چلتی رہی ہیں اور اس کے مکمل من جانب اللہ یا کلام اللہ ہونے یا نہ ہونے پر بھی بعض بدبختوں نے طبع آزمائی اور قلم گھسائی کی ہے، لیکن اسلام کی چودہ سو سالہ تاریخ کے اندر کوئی قابل ذکر فرقہ ایسا نہیں گزرا، سوائے روافض کے بعض گروہوں کے، جو قرآن کو حجیت شرعیہ تسلیم نہ کرتا ہو، اس لیے اس کے دلیل وحجت ہونے پر ہمارے خیال میں بحث کی ضرورت نہیں۔

دوسری شرعی دلیل: سنت رسول اللہ

اصول اہل سنت میں سے دوسرا اصول اور دلائل شرعیہ میں سے دوسری دلیل آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت مبارکہ ہے اور یہ ایک ایسی مظلوم دلیل ہے جو قرون اولیٰ سے آج تک ہر دور کے جدت پسندوں کے ہاتھوں تختہ مشق بنی رہی ہے۔ ہر جدت پسند فتنہ نے اپنے خود ساختہ ومن پسند افکار ونظریات کی اشاعت وترویج کے لیے مختلف انداز میں سنت رسول کی حجیت سے انکار وانحراف کیا ہے۔ چونکہ اس دلیل کی موجودگی میں کسی بھی بدبخت جدت پسند کے لیے قرآن کی من مانی تفسیر کرنا ممکن نہ تھا، اس لیے اس کو راستہ سے ہٹانا ہر جدت پسند کی ضرورت تھی، لہٰذا یا تو سنت کے حجت ہونے سے انکار کیا گیا یا اس کی تعریف میں پھڈے ڈالے گئے یا اس کی تعیین کی نئی بحثیں شروع کر دی گئیں اور سب کا مقصد ایک ہی تھا کہ کسی طرح اس دلیل سے جان چھوٹ جائے۔ العیاذ باللہ تعالیٰ۔

خوارج اسلام کا سب سے قدیم فرقہ ہے جو غالباً خلافت علوی میں پیدا ہوا اور اس فرقہ کی بنیاد ان الحکم الا للہ پر تھی، یعنی کتاب اللہ کے علاوہ ہر دلیل کی نفی۔ انہوں نے سنت رسول اور سنت خلفاے راشدین کو بطور دلیل قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ حضرت علیؓ نے جب حضرت عبد اللہ بن عباس کو ان سے مناظرہ کے لیے بھیجا تو انہیں تاکید کی کہ اے عبد اللہ! وہ قرآن قرآن کی رٹ لگائیں گے، انہیں سنت رسول کے ساتھ پکڑنا۔ حضرت علی کی اس تاکید ونصیحت سے معلوم ہوتا ہے کہ قرآن کی تشریح سنت رسول کے بغیر ممکن نہیں ہے۔ ظاہر ہے کہ اگر اس دور میں تفسیر قرآن کے لیے محض عقل وفہم کا استعمال اور سنت رسول کا ترک جائز نہیں تھا اور خلیفہ راشد نے اسے ناپسند کیا تو آج کے دور میں اس کی گنجایش کہاں ہوگی؟ بہرحال اس سے یہ بات پوری طرح واضح ہو چکی ہے کہ اسلام کے سب سے قدیم فتنہ کی بنیاد عقل پرستی اور ترک سنت پر تھی، لیکن خلیفہ راشدؓ سمیت تمام صحابہ کرام نے اسے مسترد کیا۔

عصر حاضر کے منکرین حدیث نے اہل قرآن کے نام سے اپنی جدوجہد کا آغاز کیا اور سنت وحدیث کے بارہ میں وہ بدگمانیاں پیدا کیں کہ الامان والحفیظ۔ کبھی احادیث رسول کو عجمی سازش قرار دیا اور کبھی انہیں امت کے اندر تفریق وانتشار کا ذریعہ قرار دے کر ان کا تمسخر اڑایا۔ حضرت شیخ کے حوالہ سے ان کی چند عبارات ملاحظہ فرمائیں:

''کتاب اللہ کے مقابلہ میں انبیا اور رسولوں کے اقوال وافعال، احادیث قولی وفعلی وتقریری پیش کرنے کا مرض ایک قدیم مرض ہے۔ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مقابل ومخاطب بھی قطعی اور یقینی طور پر اہل حدیث ہی تھے۔'' (ترجمۃ القرآن بآیات القرآن از مولوی عبد اللہ چکڑالوی ص ۹۷ بحوالہ انکار حدیث کے نتائج ص ۳۳)

''پس کتاب اللہ کے ساتھ شرک کرنے سے یہ مراد ہے کہ جس طرح کتاب اللہ کے احکام کو مانا جاتا ہے، اسی طرح کسی اور کتاب یا شخص کے قول وفعل کو دین اسلام میں مانا جاتا ہے، خواہ وہ فرضاً جملہ رسل وانبیا کا قول یا فعل بھی کیوں نہ ہو۔ جس طرح شرک موجب عذاب ہے، اس طرح ان الحکم الا للہ اور الا لہ الحکم والامر اور ولا یشرك فی حکمہ احدا کے شرک فی الحکم یعنی مسائل دین میں سوائے اللہ تعالیٰ کے اور کا حکم ماننا بھی اعمال کا باطل کرنے والا، باعث ابدی ودائمی عذاب ہے۔ افسوس شرک فی الحکم میں آج کل اکثر لوگ مبتلا ہیں۔'' (بلفظہ ترجمۃ القرآن ص ۹۸ بحوالہ انکار حدیث کے نتائج ص ۳۴)

''یہ سنت ہی تھی جس نے اسلام کے ابتدائی جمہوری مزاج میں بگاڑ پیدا کیا۔ یہ سنت ہی تھی جس نے مسلمانوں کو متعدد فرقوں میں ٹکڑے ٹکڑے کر کے ان کی وحدت کو پارہ پارہ کر دیا۔ یہ سنت ہی تھی جس نے بنوامیہ اور بنوعباس کے عہد میں مذہبی لوگوں کو غیر معمولی اہمیت دلوائی اور یہ سنت ہی تھی کہ جس نے دولت عثمانیہ کو ناقابل علاج مریضوں کی آماجگاہ بنایا۔'' (اخبار تسنیم ۹رفروری ۱۹۵۵ء بحوالہ انکار حدیث کے نتائج ص ۱۲)

''قرآن میں جہاں جہاں اللہ ورسول کی اطاعت کا حکم دیا گیا ہے، اس سے مراد امام وقت یعنی مرکز ملت کی اطاعت ہے۔ جب تک محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم امت میں موجود تھے، ان کی اطاعت اللہ ورسول کی اطاعت تھی اور آپ کے بعد آپ کے زندہ جانشینوں کی اطاعت اللہ ورسول کی اطاعت ہوگی، اور اطاعت عربی میں کہتے ہیں زندہ کی فرمانبرداری کو۔ رسول کی اطاعت یہ ہرگز نہیں ہے کہ ان کے بعد جو کوئی ان کے نام سے کچھ کہہ دے، ہم اس کی تعمیل کرنے لگیں۔'' (مقام حدیث ۱۵۵/۱، از حافظ محمد اسلم جیراج پوری بحوالہ انکار حدیث کے نتائج ص ۵۶)

یہ چند حوالہ جات عصر حاضر کے منکرین حدیث کی ذہنی نقاب کشائی کے لیے عرض کیے گئے ہیں۔ ان سے ان کے ذہن کی مکمل عکاسی ہو جاتی ہے۔ ان کے نزدیک قول وفعل پیغمبر حجت نہیں، حدیث رسول کی اطاعت شرک ہے، تمام انبیا ورسل کے مخاطب اہل حدیث تھے، اطاعت رسول کرنے والے ابدی ودائمی عذاب میں مبتلا ہوں گے، (حالانکہ منکرین حدیث کے نزدیک کافروں کے لیے دائمی وابدی عذاب کا تصور قرآن کے خلاف ہے) سنت رسول نے اسلام کے ابتدائی جمہوری مزاج کو بگاڑا۔ سنت رسول نے وحدت امت کو پارہ پارہ کیا۔ اللہ ورسول کی اطاعت سے مراد حاکم وقت اور مرکز ملت کی اطاعت ہے، کیونکہ اطاعت کا مطلب ہے زندہ کی فرمانبرداری۔ ہمارے خیال میں منکرین حدیث نے یہ نظریہ روافض سے لیا ہے، کیونکہ ان کے ہاں یہ اصول پایا جاتا ہے کہ اذا مات المفتی مات الفتوی۔ غرضیکہ منکرین حدیث نے سنت رسول کی اہمیت وافادیت ختم کرنے کے لیے اپنی طرف سے کوئی کسر نہیں چھوڑی اور ہر پہلو سے حملہ کر کے اس کی حجیت وحیثیت کو متاثر کرنے کی کوشش کی ہے۔

حضرت شیخ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت کی اہمیت اور اس کے حجت شرعیہ ہونے پر اپنی کتب کے اندر مختلف مقامات پر تفصیلی بحث کی ہے۔ چند حوالہ جات ملاحظہ فرمائیں:

قرآن حکیم کی متعدد آیات کریمہ پر بحث کرنے کے بعد فرماتے ہیں کہ

''جس طرح قرآن کریم میں آپ کی اطاعت اور اتباع کو امت کے لیے لازم قرار دیا گیا ہے اور تمام امت پر آپ کے عمدہ ترین اسوہ حسنہ کی پیروی ضروری بتائی گئی ہے، اسی طرح خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی عیاں الفاظ میں یہ ارشاد فرمایا ہے کہ تم میں سے کوئی شخص مومن نہیں ہو سکتا تاوقتیکہ اس کی خواہش میری خواہش کے تابع نہ ہو۔ (مشکوۃ شریف ۳۰/۱) یہ حدیث شرح السنۃ میں ہے اور امام نوویؒ اپنی اربعین میں فرماتے ہیں کہ ھذا حدیث صحیح۔ اور پروردگار عالم نے قسم اٹھا کر یہ حکم بیان کیا ہے کہ تیرے رب کی قسم یہ لوگ اس وقت تک مومن نہیں ہو سکتے تاوقتیکہ آپ کو ہر بات اور ہر معاملہ میں اپنا فیصل اور حکم تسلیم نہ کر لیں اور آپ کے حکم کے سامنے گردن تسلیم خم نہ کر لیں۔'' (انکار حدیث کے نتائج ص ۱۹، ۲۰)

''قرآن کریم، حدیث شریف اور امت مسلمہ کا اس پر اتفاق ہے کہ ہر رسول اور نبی اپنی امت کے لیے نمونہ اور اسوہ ہوتا ہے۔ اس کا قول وفعل (جو لغزش اور تخصیص کی مد میں نہ ہو) تمام امتیوں کے لیے لازم ہوتا ہے۔ اس کی اطاعت واتباع کے

بغیر نہ تو تقرب خداوندی حاصل ہوتا ہے اور نہ نجات اخروی ہی نصیب ہو سکتی ہے۔ وہ مطاع اور مقتدیٰ ہو کر آتا ہے اور امت مطیع ومقتدی کہلاتی ہے۔'' (ایضاً ص ۳۴)

''مذہبی لحاظ سے سطح ارضی پر اگرچہ بے شمار فتنے رونما ہو چکے ہیں، اب بھی موجود ہیں، اور تا قیامت باقی رہیں گے لیکن فتنہ انکار حدیث اپنی نوعیت کا واحد فتنہ ہے۔ باقی فتنوں سے تو شجرہ اسلام کے برگ وبار کو ہی نقصان پہنچتا ہے لیکن اس فتنہ سے شجرہ اسلام کی جڑیں کھوکھلی ہو جاتی ہیں اور اسلام کا کوئی بدیہی سے بدیہی مسئلہ بھی ثابت نہیں ہو سکتا۔ اس عظیم فتنہ کے دست برد سے عقائد واعمال، اخلاق ومعاملات، معیشت ومعاشرت اور دنیا وآخرت کا کوئی اہم مسئلہ بھی محفوظ نہیں رہ سکتا، حتیٰ کہ قرآن کریم کی تفسیر اور تشریح بھی کچھ کی کچھ ہو کر رہ گئی ہے اور اس فتنہ نے اسلام کی بساط کہن الٹ کر رکھ دی ہے۔'' (ایضاً ص ۲۹)

حضرت شیخ نے اپنی ان مذکورہ تحریرات میں کھل کر واضح کر دیا ہے کہ قرآنی ونبوی تعلیمات کے مطابق ہر مسلمان پر اطاعت رسول لازم ہے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی اتباع وپیروی ضروری ہے، اس وقت تک کوئی شخص مومن نہیں ہو سکتا جب تک وہ زندگی کے تمام امور میں آپ کے حکم کے سامنے سر تسلیم خم نہ کر دے، اس کے بغیر نہ تقرب خداوندی حاصل ہوتا ہے اور نہ نجات اخروی ملتی ہے، سنت رسول کے انکار سے اسلام کی جڑیں کھوکھلی ہو جاتی ہیں، اس کا کوئی قطعی وبدیہی مسئلہ بھی اس سے ثابت نہیں ہو سکتا، اس کی وجہ سے ہر قسم کے عقائد واعمال، اخلاقیات ومعاملات، معیشت ومعاشرت اور دنیا وآخرت غیر محفوظ ہو کر رہ جاتی ہے، اس کی وجہ سے قرآن کی تعبیر وتشریح بھی حقیقت وواقعیت سے دور ہو کر رہ جاتی ہے کیونکہ تفسیر قرآن کا اولین ماخذ ہی سنت رسول ہے۔

حضرت شیخ کی تحریرات سے اخذ کردہ مذکورہ تمام نتائج پر بار بار نظر ڈالنے سے یہ بات پوری طرح واضح ہو جاتی ہے کہ عقائد واعمال ہوں یا اخلاقیات ومعاملات، معیشت ومعاشرت ہوں یا دنیا وآخرت، ان تمام امور میں فہم قرآن اور اتباع شریعت کے حوالے سے سنت رسول بنیادی حیثیت رکھتی ہے اور اسے نظر انداز کرنے یا اس کی تعریف وتعیین کے نئے دروازے کھولنے سے اسلام وشریعت کا پورا ڈھانچہ شکست وریخت کا شکار ہو سکتا ہے۔

سنت کیا ہے؟

ائمہ اہل سنت میں ایک طبقہ وہ ہے جو حدیث وسنت کو مترادف وہم معنی قرار دیتا ہے جبکہ دوسرا طبقہ ان دونوں میں فرق کرتا ہے۔ ان کے نزدیک حدیث، سنت تک پہنچنے کا ذریعہ ضرور ہے، لیکن خود سنت نہیں کیونکہ سنت جاری عمل کا نام ہے، اور حدیث کا ایک بڑا ذخیرہ صحت وثقاہت کے باوجود امت کے جاری عمل میں داخل وشامل نہیں ہے۔ حضرت شیخ حافظ ابن رجب الحنبلی (جامع العلوم والحکم ۱۹۱/۱) کے حوالہ سے فرماتے ہیں کہ

''سنت اس راہ کا نام ہے جس راہ پر چلا جائے، اور یہ اس راہ کا تمسک ہے جس پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے خلفاے راشدین عامل تھے، عام اس سے کہ وہ اعتقادات ہوں یا اعمال واقوال، اور یہی سنت کاملہ ہے۔'' (راہ سنت ص ۳۱)

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ سنت کی اصل تلاش حدیث سے نہیں بلکہ خلفاے راشدین کے عمل سے ہوگی، اس لیے کہ سنت جاری عمل کا نام ہے اور جاری عمل صحابہ کرام کے تعامل سے ہی ہو سکتا ہے، چنانچہ سنت کی شرعی حیثیت پر بحث کرتے ہوئے حضرت شیخ فرماتے ہیں کہ:

"جس طرح علم خداوندی سے بے نیازی نہیں ہو سکتی، اس طرح اسوہ رسول اور سنت رسول اللہ سے بھی بے پروائی اختیار نہیں کی جا سکتی۔ سنت رسول اللہ کی اطاعت بھی ایسی ہی ضروری ہے جیسی کتاب اللہ کی، اس لیے کہ دونوں کی پیروی حکم الٰہی کی پیروی ہے اور اللہ تعالیٰ کی اطاعت اور رسول اللہ کی اطاعت دو مختلف چیزیں نہیں ہیں تو جس طرح قرآن مجید کی اطاعت خود اللہ تعالیٰ کی اطاعت ہے، اسی طرح جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت بھی خود اللہ تعالیٰ کی اطاعت ہے۔"
(راہ سنت ص ۲۲)

حضرت شیخ نے صاف لفظوں میں یہ وضاحت فرما دی ہے کہ سنت ایک مستقل دلیل ہے، کسی دوسری دلیل کی ثانوی حیثیت نہیں، جیسا کہ ہمارے ہاں کا جدت پسند طبقہ سمجھتا ہے۔ اس کے نزدیک جو سنت قرآن کے مطابق ہے، صرف وہی قابل قبول ہے اور جو سنت قرآن سے مطابقت نہیں رکھتی، وہ نا قابل قبول ہے۔ گویا سنت ان کے نزدیک مستقل دلیل نہیں اور پھر ظلم یہ ہے کہ کسی سنت کو قرآن کے مطابق یا مخالف قرار دینے کے لیے بھی وہ صرف اپنی عقل کو اتھارٹی قرار دیتے ہیں۔ اور یہ وہی طبقہ ہے جو قرآن وسنت کی تعبیر وتشریح کو عقل کا وظیفہ قرار دیتا ہے۔

تیسری دلیل شرعی: اجماع امت

اصول اہل سنت میں سے تیسرا اصول اور دلائل شرعیہ میں سے تیسری دلیل اجماع امت ہے۔ ترتیب ودرجہ کے اعتبار سے اگرچہ یہ تیسرے نمبر پر ہے، لیکن قوت ووزن کے اعتبار سے یہ سب سے فوقیت رکھتی ہے، اس لیے کہ قرآن وسنت کی تعبیر وتشریح کے لیے یہ سب سے بڑی اتھارٹی ہے۔ یہ ایک عالمگیر حقیقت ہے کہ اجتماعی مفادات وضروریات پر مشتمل کسی بھی قانون وضابطہ کی تشریح ووضاحت کے لیے اگر کوئی اتھارٹی متعین نہ کی جائے تو وہ قانون وضابطہ بازیچہ اطفال بن کر رہ جائے گا، اپنے بنیادی مقاصد اور اپنی اساسی حیثیت سے محروم ہو جائے گا، ہر خود غرض اس کی تعبیر وتشریح میں حصہ ڈالنا اپنا فرض منصبی جانے گا اور پھر ان گنت تعبیرات وتشریحات کے نیچے سسک سسک کر وہ قانون وضابطہ دم توڑ ڈالے گا۔

ہر ہوش مند تعلیم یافتہ شخص اس حقیقت سے پوری طرح باخبر ہے کہ دنیا کے ہر ملک کے اندر دو بڑے ادارے کام کرتے ہیں۔ ایک مقننہ جو قانون سازی کا فریضہ سرانجام دیتی ہے اور دوسری عدلیہ جو آئین ودستور کی تعبیر وتشریح اور اس کے عادلانہ ومنصفانہ نفاذ کا فریضہ سرانجام دیتی ہے۔ ہر باشعور شخص جانتا ہے کہ مقننہ، قانون سازی کا وہ ادارہ ہے جس کے بغیر قانون سازی کا اختیار کسی کے پاس نہیں ہوتا اور عدلیہ وہ اتھارٹی ہے جو قانون ساز ادارہ کے تیار کردہ آئین ودستور کی تعبیر وتشریح کا حق رکھتا ہے۔ اعلیٰ عدلیہ (سپریم کورٹ) کے سوا دستوری دفعات کی تعبیر وتشریح کا اختیار نہ صدر کے پاس ہوتا ہے اور نہ وزیر اعظم کے پاس، حتیٰ کہ اگر ان کے درمیان بھی اختیارات کا کوئی اختلاف پیدا ہو تو اس کے تصفیے کے لیے بھی سپریم کورٹ کی طرف رجوع ضروری ہے۔ اگر دستوری دفعات کی تعبیر وتشریح کی کوئی اتھارٹی متعین نہ کی جائے یا اسے بے وقعت وبے اثر کر دیا جائے تو ملک کے اندر جنگل کا قانون آ سکتا ہے۔

ہمارے ملک کے اندر اس کی واضح مثال موجود ہے، جہاں سیاسی لحاظ سے بھی جنگل کا قانون ہے اور مذہبی اعتبار سے بھی، کیونکہ ملک کا ہر سیاستدان ملکی دستور کی ہر دفعہ کی من پسند تعبیر وتشریح کرنا اپنا قومی فریضہ جانتا ہے، اور ملک کا ہر جدت پسند قرآن وسنت کی من پسند تشریح کرنا اپنا ملی واسلامی حق جانتا ہے۔ ہمارے شیخ کبھی کبھی فرمایا کرتے تھے کہ ہمارے ملک کی

گنگا الٹی بہتی ہے۔ دنیا کے ہر ملک کے اندر حق، حق والے کا ہوتا ہے، لیکن ہمارے ملک کے اندر حق، طاقت والے کا ہوتا ہے۔ جیسے روڈ ٹرالے والے کا، اسمبلی پیسے والوں کی، اور حکومت وردی والے کی۔ میں حضرت شیخ کے اس مقولہ پر اتنا ضرور اضافہ کروں گا کہ مذہب میڈیا والوں کا۔ اگر ملکی حالات کا گہری نظر سے جائزہ لیا جائے تو اس حقیقت کی پوری تصویر ہماری نظروں میں گھوم جائے گی اور واقعی یہ دونوں طبقے (سیاستدان اور جدت پسند) شتر بے مہار کی طرح نظر آئیں گے اور ان کے ہاتھوں دستور وشریعت کی دھجیاں بکھرتی ملیں گی۔

قرآن وسنت بھی ایک دستور ہے اور شریعت اسلامیہ کا سپریم لا ہے۔ کیا یہ اصول فطرت کے خلاف نہ ہوگا کہ اس دستور کو لاوارث چھوڑ دیا جائے؟ اس کی تعبیر وتشریح کے لیے کوئی اتھارٹی موجود نہ ہو اور جو انانیت پرست چاہے اس کی تعبیر وتشریح اپنے من پسند طریقہ سے کر کے اس کا حلیہ بگاڑتا رہے؟ یہ اصول فطرت کے بھی منافی ہے اور حکمت ومصلحت کے بھی۔ ہر شخص کو عقل وبصیرت کے نام پر اس دستور الٰہی کی آبرو سے کھیلنے کی اجازت نہیں دی جا سکتی اور اس کے لیے کوئی اتھارٹی بہر حال تسلیم کرنا ہوگی۔ قرآن وسنت کی دستوری دفعات کی تعبیر وتشریح کے لیے ہر دور میں اجماع امت کو اتھارٹی تسلیم کیا گیا ہے، اسی کی تعبیر وتشریح کو قبول کیا گیا ہے اور اسی کو افراط وتفریط اور بے اعتدالی سے بچنے کا ذریعہ قرار دیا گیا ہے۔ اگرچہ ہر دور کے جدت پسندوں نے اپنے خود ساختہ عقائد وافکار کی حفاظت واشاعت کے لیے اسی اتھارٹی پر سب سے زیادہ حملہ کیا ہے، اسی کو سب سے زیادہ مجروح کرنے کی کوشش کی ہے، اسی کو سب سے زیادہ نشانہ بنایا ہے، شاذ اور مرجوح اقوال کی بنیاد پر اس کی اہمیت وحیثیت کو ختم یا کمزور کرنے کی کوششیں کی ہیں، لیکن بحمد اللہ یہ آج بھی موجود ومحفوظ ہے اور جب تک قرآن وسنت باقی ہیں، یہ بھی موجود ومحفوظ رہے گا۔ کیسے ممکن ہے کہ دستور ومتن باقی رہیں اور ان کی تعبیر وتشریح گم اور ضائع ہو جائے؟

اجماع امت امام اہل سنت کی نظر میں

ہم گزشتہ سطور میں واضح کر چکے ہیں کہ حضرت شیخ اجماع امت کو انتہائی اہمیت دیتے تھے اور تمام اجماعی مسائل کا اثبات اجماع ہی کے ذریعہ کرتے تھے۔ اس کی تفصیل آئندہ سطور میں بھی آئے گی۔ چنانچہ حضرت شیخ فرماتے ہیں کہ

"کتاب وسنت کے بعد دلائل کی مد میں اجماع کا مرتبہ اور درجہ ہے۔ یہ بات ملحوظ خاطر رہے کہ آسانی کے لیے اجماع کا تجزیہ یوں کیا جا سکتا ہے: حضرات خلفاء راشدین کا اجماع، عام صحابہ کرام کا اجماع اور امت محمدیہ کا اجماع۔ ان میں سے ہر ایک اجماع اپنے اپنے مقام پر صحیح اور حجت ہے۔" (راہ سنت ص ۲۸)

حضرت شیخ نے اجماع امت کو حجت قرار دیتے ہوئے اسے تین حصوں میں تقسیم کیا ہے۔ ہم ضروری خیال کرتے ہیں کہ ان میں سے ہر ایک پر الگ الگ بحث کر لی جائے۔

پہلا درجہ: سنت خلفاء راشدینؓ: حضرت شیخ نے اجماع امت کے پہلے درجہ پر اجماع خلفاء راشدین کو رکھا ہے، یعنی وہ سنت خلفاء راشدین کو اجماع امت کا پہلا درجہ تسلیم کرتے ہیں۔ چنانچہ آیت استخلاف کے تحت فرماتے ہیں:

"لفظ استخلاف میں اشارہ ہے کہ وہ حضرات محض دنیوی سلاطین اور ملوک کی طرح نہ تھے، بلکہ وہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے جانشین ہو کر آسمانی بادشاہت کا اعلان کرنے والے اور دین حق کی بنیادیں جمانے والے تھے۔ یہ بات انصاف اور قیاس کے بالکل بعید ہے کہ اللہ تعالیٰ تو ان کو اپنے دین حق کی ترویج واشاعت کے لیے زمین کی خلافت ونیابت سپرد کر دے، اور وہ خدا

تعالیٰ اور اس کے رسول برحق کے اعتماد و اعتبار سے محروم رہیں۔'' (راہ سنت ص ۲۹)

اس کے بعد حضرت شیخ نے حدیث: "علیکم بسنتی و سنة الخلفاء الراشدین المهدیین" (بحوالہ ترمذی ۹۲/۲، ابن ماجہ ص ۵، ابوداود ۲۷۹/۲، مستدرک حاکم ۹۵/۱ قال الحاکم والذہبی صحیح) کے تحت حضرت ملا علی قاریؒ (بحوالہ مرقات علی المشکوٰۃ ۳۰/۱) کا یہ قول نقل کیا ہے کہ:

''حضرات خلفاے راشدین نے درحقیقت آپ ہی کی سنت پر عمل کیا ہے اور ان کی طرف سنت کی نسبت یا تو اس لیے ہوئی کہ انہوں نے اس پر عمل کیا اور یا اس لیے کہ انہوں نے خود قیاس و استنباط کر کے اس کو اختیار کیا۔'' (راہ سنت ص ۳۰)

غرضیکہ حضرت شیخ سنت خلفاے راشدین کو بھی حجت مانتے ہیں اور اس کی اتباع کو اہل سنت کی پہچان اور علامت قرا دیتے ہیں، چنانچہ اس کی وضاحت کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ:

''الحاصل حضرات خلفاے راشدین کی سنت حجت ہے اور امت کے لیے اس کی پیروی لازم اور ان کے عہد خلافت میں جن چیزوں پر حضرات صحابہ کرام کا اجماع ہوا، وہ بقول شیخ (عبدالقادر جیلانی) جماعت کا مفہوم ہے اور بغیر اس کے تسلیم کیے اہل السنۃ والجماعۃ کا مفہوم ہرگز پورا نہیں ہوتا۔'' (راہ سنت ص ۳۲)

ایک دوسرے مقام پر حدیث: "من یعش منکم بعدی فسیری اختلافاً کثیراً فعلیکم بسنتی و سنة الخلفاء الراشدین المهدیین تمسکوا بها و عضوا علیها بالنواجذ و ایاکم و محدثات الامور فان کل محدثة بدعة و کل بدعة ضلالة" (مذکورہ حوالہ جات) بیان کر کے فرماتے ہیں کہ امام حاکم فرماتے ہیں کہ اس حدیث کی سند بخاری و مسلم دونوں کی شرط پر صحیح ہے اور مجھے اس پر کوئی خرابی معلوم نہیں۔ (مستدرک ۹۶/۱) ناقد رجال علامہ ذہبیؒ فرماتے ہیں کہ اس حدیث میں کوئی علت موجود نہیں اور امام ترمذی فرماتے ہیں: هذا حدیث حسن صحیح (ترمذی ۹۲/۲)۔ اس کے بعد حضرت شیخ اس حدیث پر بایں الفاظ تبصرہ فرماتے ہیں کہ:

''آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے قواعد عربی کے لحاظ سے حضرات خلفاے راشدینؓ کی سنت کے وجوب اور لزوم اور اس کی مخالفت سے گریز و اجتناب کی جتنی ممکن تعبیریں ہو سکتی تھیں، اس حدیث میں صاف طور پر ارشاد فرما دی ہیں، مثلاً:

۱۔ علیکم بسنتی و سنة الخلفاء کے جملہ میں آپ نے ان کو خلفاء کے لفظ سے تعبیر فرمایا ہے اور ظاہر ہے کہ خلیفہ کا حکم اتنا ہی واجب الاتباع ہوتا ہے جتنا کہ اصل کا، ورنہ خلیفہ ہونے کا مطلب ہی کیا؟ یعنی اتباع اور پیروی کے لحاظ سے جو حکم اصل کا ہے، وہی خلیفہ اور نائب کا ہے۔

۲۔ آپ نے اس لزوم کو علیکم کے لفظ سے ادا فرمایا ہے اور یہ لفظ وضعاً لزوم کے لیے آتا ہے۔ گویا آپ نے خلفاے راشدین کی سنت کو بھی ویسا ہی لازم اور ضروری قرار دیا جیسا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت لازم اور ضروری ہے۔ (اس کے بعد حضرت شیخ نے علامہ ابن ہمام کی التحریر فی اصول الفقہ ص ۲۰۳، علامہ صدر الشریعہ کی التوضیح والتلویح ص ۲۶۶ اور مولانا ظفر احمد عثمانی کی اعلاء السنن ۴۵/۷ کے حوالہ سے ثابت کیا ہے کہ لفظ علی اور علیکم وجوب و لزوم پر دلالت کرتے ہیں۔)

۳۔ لفظ سنت کی الخلفاء کی طرف اضافت ایک الگ قرینہ اور دلیل ہے۔ خلفاء کی سنت لازم ہے کیونکہ حضرات صحابہ کرام کے باقی آحاد و افراد کی پیروی بھی تو ما انا علیه و اصحابی کے پیش نظر مامور اور مستحب ہے۔ اگر سنت خلفا کا بھی یہی مقام اور درجہ ہو تو تخصیص باقی نہیں رہتی اور خلیفہ کا امتیاز کچھ نظر نہیں آتا، حالانکہ یہ صحیح حدیث اپنے سیاق و سباق کے اعتبار سے فرق عیاں اور نمایاں کرتی ہے جس کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔

۴۔ اس حدیث میں آپ نے خلفاء کو راشدین فرمایا ہے۔ روشن بات ہے کہ درست و رشد امر کی اتباع لازم ہے اور اس کے مقابلہ میں جو عمل ہوگا، وہ غیر رشد ہوگا۔ اور جب وہ بھلائی اور رشد نہ رہا تو اس سے اجتناب لازم اور ضروری ہے۔

۵۔ راشدین کے بعد آپ نے مھدیین کا لفظ فرما کر اس بات کو اور مضبوط و موکد کر دیا کہ جب وہ حضرات ہدایت یافتہ ہیں تو ان کی پیروی لازم ہوگی کیوں کہ اگر مھدیین کی اتباع لازم نہ ہو تو کس کی اتباع لازم ہوگی؟ مہدی وہی ہو سکتا ہے جس کو ہدایت کے بلند و بالا مقام پر فائز کیا گیا ہو۔ گویا انہوں نے یہ مقام از خود حاصل نہیں کیا، بلکہ ان کو مرحمت ہوا ہے۔

۶۔ اس کے بعد تمسکوا بها فرمایا ہے، یعنی اپنے قصد اور اختیار سے تم حضرات خلفاے راشدین کی سنت کو مضبوطی سے پکڑو۔ کیونکہ لفظ تمسک باب تفعل سے ہے اور باب تفعل میں اکثر تکلف کا مفہوم ملحوظ ہوتا ہے جو عامل کے کسب و اختیار اور ارادہ پر دلالت کرتا ہے تو مطلب یہ ہوا کہ غیر ارادی اور غیر شعوری پر نہیں بلکہ اپنے کسب و ارادہ کے ساتھ میری سنت کی طرح میرے خلفاے راشدین کی سنت کو بھی مضبوطی سے پکڑو۔

۷۔ پھر مزید تاکید کرتے ہوئے عضوا علیها بالنواجذ فرمایا کہ میری سنت کی طرح میرے خلفا کی سنت کو بھی اپنی ڈاڑھوں کے ساتھ نہایت مضبوطی سے پکڑو۔ اور واضح امر ہے کہ جو چیز ڈاڑھوں سے پکڑی جائے گی، وہ بہ نسبت دوسرے دانتوں میں پکڑنے سے زیادہ مضبوط ہوگی۔ اور تمسکوا بها اور عضوا علیها بالنواجذ کے دونوں حکم آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت اور خلفا کی سنت کی طرف یکساں راجع ہیں۔ سو اگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت مسلمانوں پر لازم الاتباع ہے تو خلفاے راشدین کی سنت بھی لازم الاتباع ہوگی، کیونکہ جب دونوں کا حکم ایک ہی انداز سے بیان کیا گیا ہے تو پھر بلا قطعی دلیل کے ان میں فرق کرنا بے سود اور لایعنی ہے اور اصول کے اعتبار سے اس کا کوئی اعتبار نہیں۔ اور پہلے بیان ہو چکا ہے کہ معطوف اور معطوف علیہ کا حکم ایک ہوتا ہے۔

۸۔ اس حدیث میں آپ نے یہ بھی واضح فرمایا کہ جس آدمی کو طویل زندگی حاصل ہوگی اور مرور زمانہ کی وجہ سے دینی و مذہبی ماحول بدلتا جائے گا تو ایسے شخص کو بکثرت اختلاف نظر آئیں گے۔ اور فرمایا کہ ایسے مواقع پر ہر مسلمان کا اسلامی فریضہ یہ ہے کہ میری اور میرے خلفا کی سنت کو ہمیشہ پیش نظر رکھے اور اسی کی پیروی اور اتباع کرے۔ گویا اختلاف کے موقع پر اور اختلافی امور میں مسلمانوں پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے حضرات خلفاے راشدین کی سنت حجت اور معیار ہے۔

۹۔ اس حدیث میں آپ نے یہ بھی فرما دیا ہے کہ آپ اور آپ کے حضرات خلفاے راشدین کی سنت کے مقابلہ جو جو امور اور جو جو کام رونما ہوں گے، وہ خالص بدعت ہوں گے، اس لیے آپ نے ایاکم و محدثات الامور ارشاد فرما کر ایسے امور کے ارتکاب سے سختی سے نہی فرمائی ہے۔ اس سے یہ بات بھی بالکل آشکارا ہو گئی کہ سنت مذکورہ کے برخلاف جو بھی عمل ایجاد کیا جائے گا، گو وہ نیک نیتی سے ہی کیوں نہ ہو، وہ خالص بدعت ہوگا۔ کہیں کم اور کہیں زیادہ۔ ایسے فعل سے ہر مسلمان کا بچنا ضروری ہے۔

۱۰۔ پھر آپ نے محض لفظ بدعت پر اکتفا نہیں کیا تاکہ بدعت کے دل دادہ اور اس کے شیدائی اپنی مرضی سے بدعت کے ساتھ حسنہ کا پیوند لگا کر اس بدعت کی ترویج اور اشاعت پر کمربستہ ہو جائیں، بلکہ آپ نے ایک دوسری صحیح حدیث میں بدعت کے ساتھ لفظ ضلالة ارشاد فرما کر بدعت کا سیئة، ضلالة اور گمراہی ہونا متعین فرما دیا ہے تاکہ کسی طرح بھی کسی کو کوئی شبہ پیش نہ آئے اور نہ ہی اس کا موقع مل سکے۔ چنانچہ صحیح روایت سے ثابت ہے کہ عموماً آپ خطبہ میں شر الامور

محدثاتها و کل بدعة ضلالة (مسلم ۲۸۵/۱) کے الفاظ بھی فرمایا کرتے تھے یعنی برے کام وہ ہیں جو دین میں نئے نئے پیدا کیے جائیں اور ہر بدعت گمراہی ہے۔ اور نسائی ۱۷۹/۱ میں ہے کہ آپ نے فرمایا کہ: شر الامور محدثاتها و کل محدثة بدعة و کل بدعة ضلالة و کل ضلالة فی النار۔ یعنی نئے نئے کام جو دین میں گھڑے جائیں، وہ برے ہیں اور ہر نئی چیز جو دین میں نکالی جائے، وہ بدعت ہے اور ہر بدعت گمراہی ہے اور ہر گمراہی کرنے والا دوزخ میں ہے۔ اور کل ضلالة فی النار کے الفاظ کتاب الاسماء والصفات للبیہقی ص ۶۴ میں بھی آتے ہیں۔'' (رسالہ تراویح مع ترجمہ ینابیع ص ۱۴۔۱۹)

حضرت شیخ نے نہایت دل نشین اور علمی وتحقیقی انداز میں حدیث علیکم بسنتی و سنة الخلفاء الراشدین المهديين کی صحت وثقاہت اور اس میں سے نکات عشرہ بیان کر کے جدت پسندوں کے لیے تمام دروازے بند کر دیے۔ اب اس کے بعد اگر کوئی بدنصیب سنت خلفاے راشدین کی اہمیت کو نہ سمجھے اور اس کے مقابلے میں عقلی رائے قائم کرنے پر مصر رہے تو اس کی عقل پر ماتم کے سوا کیا کیا جا سکتا ہے؟

دوسرا درجہ: تعامل صحابہ کرامؓ: حضرت شیخ نے اجماع کا دوسرا درجہ تعامل صحابہ کرام کو قرار دیا ہے، یعنی سنت خلفاے راشدین کے بعد تعامل صحابہ کرام کا درجہ ہے۔ دراصل یہ دونوں چیزیں سنت رسول کی تعبیر وتشریح کا درجہ رکھتی ہیں۔ جس طرح کتاب اللہ کو سنت رسول اللہ کے بغیر سمجھنا ناممکن ہے، اسی طرح سنت رسول اللہ کو پانے اور سمجھنے کے لیے سنت خلفاے راشدین اور تعامل صحابہ کرام تک رسائی ضروری ہے۔ حضرت شیخ نے اسی لیے اجماع امت کے پہلے دو درجوں میں انہی کو رکھا ہے، چنانچہ ایک مقام پر بایں الفاظ سرخی قائم کرتے ہیں کہ ''حضرات صحابہ کرام بھی معیار حق ہیں اور ان کا اجماع حجت ہے''۔ (راہ سنت ص ۳۶) یعنی خلفاے راشدین کے ساتھ ساتھ صحابہ کرام بھی معیار حق وصداقت ہیں اور ان کا اجماع حجت ہے، چنانچہ اس کی وضاحت کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

''ترمذی جلد ۸۹/۲، مستدرک حاکم ۱۲۹/۱، اور مشکوٰۃ ۳۰/۱ میں ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ بنی اسرائیل بہتر فرقوں میں بٹ چکے تھے اور میری امت تہتر فرقوں میں تقسیم ہوگی۔ سب کے سب فرقے دوزخ میں جائیں گے مگر صرف ایک فرقہ۔ لوگوں نے آپ سے پوچھا کہ وہ کون سا فرقہ ہوگا؟ فرمایا وہ فرقہ ہے: ما انا علیه و اصحابی، جس نے وہ کام کیے جو میں نے اور میرے صحابہ نے کیے ہیں۔ اور ایک دوسری روایت (ابوداؤد ۲۷۵/۲، مستدرک حاکم ۱۲۸/۱) میں وهی الجماعة کے الفاظ آئے ہیں، یعنی نجات پانے والا صرف وہی فرقہ ہے جو اس جماعت صحابہ کرام کا ساتھ دینے والا ہو اور اسلام کی اس جماعت سے کٹ کر الگ نہ ہونے والا ہو۔ اس روایت سے معلوم ہوا کہ جیسے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرات خلفاے راشدین کی سنت ہمارے لیے مشعل راہ ہے، اسی طرح ما انا علیه و اصحابی کے ارشاد کے تحت حضرات صحابہ کرام کے اقوال واعمال بھی ہمارے لیے حق کا معیار اور پیمانہ ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ما انا علیه و اصحابی کا ارشاد فرما کر اپنی ذات بابرکات اور اپنے صحابہ کرام کی ذوات قدسیہ کو حق اور باطل کے پرکھنے کا مقیاس بتایا ہے کہ محض کالے کالے نقوش ہی (یعنی الفاظ) معیار نہیں بلکہ وہ ذوات بھی معیار حق ہیں جن میں یہ حروف ونقوش، اعمال واحوال بن کر رچ گئے ہیں اور اس طرح گھل مل گئے ہیں کہ اب ان کی ذوات کو دین سے الگ کر کے اور دین کو ان کی ذوات سے علیحدہ کر کے نہیں دیکھا جا سکتا۔ ما انا علیه و اصحابی کی حدیث سے

صرف حضرات صحابہ کرام کی منقبت اور فضیلت ہی ثابت نہیں ہوتی اور نیز ان کی محض مقتدائیت اور مقبولیت ہی ثابت نہیں ہوتی بلکہ امت کے حق وباطل کے لیے ان کی معیاری شان بھی ثابت ہوتی ہے کہ وہ محض حق پر نہیں بلکہ حق کے پرکھنے کی کسوٹی اور معیار بھی بن چکے ہیں جن سے دوسروں کا حق وباطل بھی کھل جاتا ہے۔ ان کا معیار حق وباطل ہونا صرف قیاسی نہیں، بلکہ ما انا علیه و اصحابی کے صریح ارشاد سے بطور نص ثابت ہے، نہ جیسا کہ باطل اور گمراہ فرقوں نے ان کو ہدف ملامت بنا کر درحقیقت کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ پر کلوخ اندازی کی اور اسلام کی بنیادی حقیقت کو کھوکھلا کرنے کی ناکام کوشش کی۔ حضرات صحابہ کرام کی ثقاہت اور عدالت، دیانت وامانت اور صداقت وللّٰہیت ایسے مسلم امور ہیں جن پر مدار اسلام ہے اور ان پر جرح وتعدیل کرنے والا دین کی عمارت کو گراتا ہے۔'' (راہ سنت ص ۳۷۔۳۸)

پھر حضرت شیخ نے حضرت ملا علی قاریؒ کی مرقاۃ ۵۱۷/۵ اور امام ابن اثیر الجزری کی اسد الغابہ فی معرفة الصحابہ ۲/۱ کے حوالہ سے یہ ثابت کیا ہے کہ صحابہ سب کے سب ثقہ وعادل ہیں اور ان پر جرح نہیں کی جا سکتی۔ اس کے بعد فرماتے ہیں کہ

''غرضیکہ حضرات صحابہ کرام امت کے لیے حق وباطل، خیر وشر، سنت وبدعت اور ثواب وعقاب وغیرہ امور کے پرکھنے کی کسوٹی اور معیار حق ہیں۔ جو کام انہوں نے کیا، وہ حق اور سنت اور باعث نجات ہے اور ان کا ہر قول وفعل ہمارے لیے ذریعہ فلاح اور وہی ہمارے لیے ترقی وسعادت کی راہ ہے، اور اس کی خلاف ورزی تباہی وبربادی پر منتج ہوگی اور بس۔'' (راہ سنت، ص ۳۸)

آگے مزید فرماتے ہیں کہ:

''اگر صحابہ کرام کا کسی بات پر اجماع واتفاق ہو جائے تو اس کے حجت اور قطعی ہونے میں شاید ہی کوئی بد بخت کلام کرتا ہو۔'' (راہ سنت ص ۳۹)

اس کے بعد شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ کی اقامة الدلیل ۱۳۰/۳ اور ابن حجر عسقلانیؒ کی فتح الباری ۲۶۶/۳ کے حوالہ سے ثابت کیا گیا ہے کہ اہل السنة والجماعة اس بات پر متفق ہیں کہ صحابہ کرام کا اجماع حجت ہے، واجب الاتباع ہے، قوی تر ہے اور دوسری غیر منصوص حجتوں پر مقدم ہے۔ (راہ سنت ص ۳۹)

اس تفصیلی بحث سے یہ بات روز روشن کی طرح واضح ہو چکی ہے کہ حضرت شیخ کے نزدیک تعامل صحابہ اور اجماع صحابہ بھی حجت شرعیہ ہے اور اس سے انکار وانحراف کی صورت میں ضلالت وگمراہی پروان چڑھتی ہے۔

تعامل خیر القرون: سنت خلفاے راشدین اور تعامل صحابہ کرام سے متصل ہونے کی بنا پر اجماع کے تیسرے درجہ میں تعامل خیر القرون سب سے زیادہ اہم ہے اور بعد کے اجماع امت سے مقدم ہے۔ چنانچہ حضرت شیخ فرماتے ہیں کہ:

''حضرات صحابہ کرام کے بعد تابعین اور اتباع تابعین کی اکثریت کا کسی کام کو بلانکیر کرنا یا چھوڑنا بھی ایک حجت شرعی ہے اور ہمیں ان کی بھی پیروی کرنا ضروری ہے۔'' (راہ سنت ص ۴۲)

''جب یہ بات ثابت ہو گئی کہ خیر القرون کے تین قرن ہیں اور ان قرون سے مراد حضرات صحابہ کرام اور تابعین اور اتباع تابعین کا قرن ہے تو طبقات رجال کی کتابوں میں اس کی تصریح ملتی ہے کہ تبع تابعین کا دور ۲۲۰ھ تک رہا ہے اور یہی وہ حضرات ہیں جن کے نقش قدم پر چل کر ہمیں کامیابی نصیب ہو سکتی ہے اور وہی امت مرحومہ کا بہترین گروہ ہے۔'' (راہ سنت ص ۴۵)

حضرت شیخ نے اپنے ان فرامین کے اندر خیر القرون کے تعامل کی حجیت اور اس کے اسباب کھل کر بیان کر دیے ہیں، اور یہ اجماع کے تیسرے درجہ کا پہلا مرحلہ ہے۔

تیسرا درجہ: اجماع امت: حضرت شیخ نے اجماع امت کا تیسرا درجہ عام امت کے اجماع کو قرار دیا ہے، یعنی خیر القرون کے بعد اصحاب علم وفضل کا اجماع۔ اس اعتبار سے ہمارے خیال میں تعامل خیر القرون (یعنی تابعین وتبع تابعین کا تعامل) برزخ یا حد فاصل کا درجہ رکھتا ہے جسے سنت خلفاے راشدین وتعامل صحابہ کا تتمہ بھی قرار دیا جا سکتا ہے اور بعد والے اہل علم وفضل کے اجماع کا مقدمہ بھی۔ تیسرے درجہ کے اجماع امت کے بارہ میں حضرت شیخ کے چند اقتباسات ملاحظہ فرمائیے:

۱۔ ''یہ امت کبھی ضلالت پر جمع نہ ہوگی'' کے عنوان کے تحت فرماتے ہیں کہ

''اگرچہ سینکڑوں ہی نہیں بلکہ ہزاروں مذہبی اور سیاسی مخلصانہ ومفسدانہ اور خود غرضانہ فتنے اس دھرتی پر ایسے برپا ہو چکے ہیں جن کا تصور کرتے ہوئے بھی جسم کانپ جاتا ہے، قلم میں لرزش پیدا ہو جاتی ہے، بدن کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں، اور زبان کو طاقت گفتار نہیں رہتی جن فتنوں میں کئی ایک بندگان حرص وہوئی اجماع امت کے جادۂ مستقیم کو چھوڑ کر ضالۃ الغنم بن چکے ہیں، مگر بحمد اللہ مجموعی طور پر اس امت مرحومہ کا کبھی ضلالت وگمراہی پر اجتماع نہیں ہوا اور بفضل اللہ تعالیٰ نہ تا قیامت ہوگا۔ اللہ تعالیٰ کا دست قدرت ونصرت ہمیشہ سے اس جماعت پر رہا ہے اور بمنہ قیامت تک رہے گا۔'' (تبلیغ اسلام ص ۳۲)

۲۔ پھر حضرت عبد اللہ بن عباسؓ کی روایت مستدرک حاکم ۱/۱۱۶ سے نقل فرماتے ہیں کہ:

''آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: لا یجمع اللہ امتی علی ضلالۃ ابدا وید اللہ علی الجماعۃ، اللہ تعالیٰ میری امت کو کبھی گمراہی پر جمع نہیں کرے گا اور اللہ کا ہاتھ جماعت پر رہے گا۔ اسی مضمون کی روایت حضرت عبد اللہ بن عمرؓ سے ترمذی ۲/۳۹ اور مستدرک ۱/۱۱۵ میں مروی ہے اور حضرت انس سے مستدرک ۱/۱۱۷ میں مروی ہے۔ غرضیکہ متعدد روایات اس پر پوری طرح روشنی ڈالتی ہیں کہ مجموعی لحاظ سے من حیث القوم یہ امت کبھی ضلالت پر جمع نہ ہوگی اور چودہ سو سال سے رب قدیر کے فضل وکرم سے ایسا ہی ہوتا رہا ہے کہ امت مرحومہ حق پر ڈٹی رہی ہے۔'' (تبلیغ اسلام ص ۳۲۔۳۳)

۳۔ ''حضرات خلفاے راشدین کی سنت اور حضرات صحابہ کرام کے اجماع کے بعد امت مرحومہ کے اجماع واتفاق کا درجہ ہے۔ (پھر آیت کنتم خیر امۃ اخرجت للناس (آل عمران) اور متفق علیہ حدیث: انتم شہداء اللہ فی الارض (مشکوٰۃ ۱/۱۴۵) تم اللہ کی طرف سے زمین پر گواہ ہو، کی وضاحت کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ) جس چیز کو یہ امت خیر کہے گی، وہ عند اللہ بھی خیر ہوگی اور جس چیز کو یہ شر کہے گی، وہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک بھی شر ہوگی۔ یہ امت سرکاری گواہ کی حیثیت رکھتی ہے اور یہی وجہ ہے کہ قیامت کے دن اسی امت کی شہادت پر تمام امتوں کی قسمت کا فیصلہ ہوگا اور اسی امت کی یہ بھی خصوصیت ہے کہ یہ کبھی گمراہی پر مجتمع نہ ہوگی۔'' (راہ سنت ص ۴۰)

۴۔ ''امام حاکم نے مستدرک ۱/۱۲۰ اور ذہبیؒ نے تلخیص مستدرک ۱/۱۲۰ میں حدیث انتم شہداء اللہ فی الارض سے اجماع امت کے حجت ہونے پر استدلال کیا ہے۔ حضرت ملا علی قاریؒ مرقات ۱/۳۰ میں حدیث: ان اللہ لا یجمع امتی علی الضلالۃ سے استدلال کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ امت کا اجماع حق اور صحیح ہے۔ علامہ بزدوی الحنفی اصول بزدوی ۳/۲۶۱ میں فرماتے ہیں کہ اجماع کی مثال ایسی ہے جیسے قرآن کریم کی آیت یا حدیث متواتر۔ جیسے یہ موجب علم وعمل ہیں،

اس طرح اجماع بھی۔ نتیجہ یہ ہوگا کہ نفس اجماع کا منکر کافر ہوگا۔ ابن تیمیہؒ الحجۃ ص ۶۲ اور معارج الاصول ص ۱۱ میں فرماتے ہیں کہ امت کا اجماع فی نفسہ حق اور حجت ہے۔ یہ امت کبھی کسی گمراہی پر جمع نہیں ہوگی۔'' (راہ سنت ص ۴۱)

۵۔ ''تواتر کی چار قسمیں ہیں: ۱) تواتر اسناد جس کو تواتر لفظی بھی کہتے ہیں۔ ۲) تواتر طبقہ، جیسا کہ قرآن کریم کا تواتر سے نقل ہوتے ہوئے چلا آنا کہ ہر پہلے طبقہ کے بعد اسے بعد کے آنے والے دوسرے طبقہ نے نقل کیا ہے۔ ۳) تواتر عمل وتوارث، جیسے نماز، روزہ، حج اور زکوٰۃ وغیرہ اسلام کے بنیادی احکام کا طبقۃً بعد طبقۃٍ امت کے عمل اور توارث سے ان کا ثبوت ہے۔ ۴) تواتر قدر مشترک جس کو تواتر معنوی بھی کہتے ہیں، جیسے معجزہ کا تواتر کہ مفردات اگرچہ اخبار آحاد سے ثابت ہیں، لیکن قدر مشترک قطعی طور پر متواتر ہے۔ اور حدیث متواتر کا منکر کافر ہے۔'' (احسان الباری ص ۳۲)

۶۔ ''خبر الواحد جو موید بالاجماع ہو، متواتر کے معنی میں ہے۔ اس کی مخالفت حرام ہے۔'' (ایضاً ص ۳۳)

۷۔ ''امام بزدویؒ کی اصول بزدوی ص ۲۴۷ کے حوالے سے فرماتے ہیں کہ: ومن انکر الاجماع فقد ابطل الدین کلہ لان مدار اصول الدین کلھا ومرجعھا الی اجماع المسلمین، یعنی جس نے اجماع کا انکار کیا، پس تحقیق اس نے پورے دین کو باطل کر دیا کیونکہ پورے اصول دین کا مدار اجماع المسلمین کی طرف ہے۔'' (احسان الباری ص ۳۴)

۸۔ ''شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ (مسوی ۲/۱۰۹) اور شاہ عبد العزیزؒ (فتاویٰ عزیزی ۲/۱۵۶) وغیرہ بزرگوں کے حوالوں سے یہ بات بالکل عیاں ہوگئی ہے کہ کتاب، سنت متواترہ اور اجماع امت سے جو چیز ثابت ہے، وہ قطعی اور ضروریات دین میں سے ہوتی ہے۔'' (ختم نبوت قرآن وسنت کی روشنی میں، ص ۳۵)

۹۔ علامہ محمد بن ابراہیم الوزیر یمانی، (ایثار الحق علی الخلق ص ۴۴۱، اتحاف ۲/۱۳) علامہ شمس الدین احمد بن موسیٰ الخیالی اور علامہ عبد الحکیم سیالکوٹی، (الخیالی مع حاشیۃ سیالکوٹی ص ۱۴۶) شاہ ولی اللہ دہلویؒ، (المسویٰ ۲/۱۰۹) ابن ہمامؒ، (مسایرہ ۲/۲۱۲) علامہ ابن عابدین شامیؒ، (رد المحتار ۱/۳۷۷) حضرت مجدد الف ثانیؒ، (مکتوبات ۳/۳۸) اور شاہ عبد العزیز دہلویؒ (فتاویٰ عزیزی ۲/۱۵۶) کے حوالہ سے ثابت کیا ہے کہ ضروریات دین میں تاویل کرنے والا کافر ہے۔ (ختم نبوت ص ۳۲)

۱۰۔ ''نصوص قطعیہ اور احادیث صحیحہ وصریحہ کے مقابلہ میں غیر معصوم شخصیتوں کی لغزشوں کا نام عین ایمان نہیں ہے۔ عین ایمان قرآن، احادیث متواترہ اور اجماع قطعی کا نام ہے۔ علماے دین کی غلطیاں اور لغزشیں عین ایمان ہرگز نہیں ہوا کرتیں۔'' (دل کا سرور ص ۱۸۱)

حضرت شیخ کی مختلف کتب سے مذکورہ دس حوالہ جات اجماع، اس کی اہمیت اور اس کے حکم سے متعلق ہم نے بیان کر دیے ہیں۔ ان حوالہ جات سے درج ذیل امور واضح ہو جاتے ہیں:

۱۔ امت مسلمہ من حیث الامۃ کسی گمراہی پر کبھی متفق نہ ہوگی۔ اس فرمان نبوی کی روشنی میں آج تک امت ہر قسم کی اجماعی گمراہی سے محفوظ ہے اور بحمد اللہ قیامت تک محفوظ رہے گی۔

۲۔ ماضی وحال میں بے شمار فتنے پیدا ہوئے جو اجماع امت کا راستہ چھوڑ کر جادہ مستقیم سے ہٹ گئے اور گمراہی وضلالت کا شکار ہو گئے۔

۳۔ اجماع امت کی پیروی اور اتباع میں وحدت فکر کے ساتھ امت کا جو نظام چل رہا ہے، وہی جماعت کا نظام ہے اور

خدا تعالیٰ کی نصرت واعانت کا ہاتھ جماعت پر ہوتا ہے۔

۴۔ امت مسلمہ کی حیثیت دیگر امتوں کے لیے شاہد وگواہ کی ہے اور گواہ کا عدالت پر قائم رہنا ضروری ہے۔ لہٰذا اس امت کی مجموعی حالت عدالت پر قائم ہے اور اس کے اجماعی فیصلے عدالت پر مبنی ہیں۔ جن چیزوں کو اس نے خیر سمجھا، وہ عنداللہ خیر ہے اور جن چیزوں کو اس نے شر سمجھا، وہ عنداللہ شر ہے۔

۵۔ امت کا اجماع حق اور حجت ہے اور نفس اجماع کا منکر کافر ہے، کیوں کہ اجماع کا انکار کرنے والا پورے دین کی عمارت گرانے والا اور اس کو باطل کرنے والا ہے، اس لیے تمام اصول دین کا مدار وانحصار اسی پر ہے۔

۶۔ متواتر کی چار قسمیں اپنے اپنے مقام پر درست اور صحیح ہیں۔ خبر واحد بھی جو موید بالاجماع ہو، متواتر کے حکم میں ہے۔ حدیث متواتر کی مخالفت حرام اور اس کا انکار کفر ہے۔

۷۔ قرآن، سنت متواترہ اور اجماع امت سے جو چیز ثابت ہو جائے، وہ قطعی اور ضروریات دین میں شامل ہوتی ہے اور ضروریات دین کا انکار یا ان میں تاویل کرنے والا کافر ہے۔

۸۔ قرآن، سنت متواترہ اور اجماع امت کے مقابلہ میں بزرگان دین کے متفرد اقوال ناقابل قبول ہیں اور ان پر عقیدہ وعمل کی بنیاد رکھنا غلط ہے۔

مندرجہ بالا امور کی روشنی میں اجماع امت کے بارے میں حضرت شیخ کا موقف ونظریہ غیر مبہم صورت میں ہمارے سامنے ہے اور بہت واضح طور پر یہ حقیقت حال ہمارے سامنے آ رہی ہے کہ حضرت شیخ اجماع امت کو حق اور حجت مانتے ہیں اور اس کے منکر کو کافر قرار دیتے ہیں۔ مذکورہ حوالہ جات سے یہ بات بھی کافی حد تک واضح ہو جاتی ہے کہ سنت متواترہ اور اجماع امت کے اندر لفظی اختلاف کے علاوہ کوئی اختلاف نہیں ہے، کیونکہ جب خبر واحد بھی متن کے اعتبار سے موید بالاجماع ہونے سے خبر متواتر قرار پاتی ہے تو اصل بنیاد اجماع ہی ٹھہری، لہٰذا اجماع کی حقیقت وواقعیت سے انکار صرف اور صرف خود فریبی ہی ہو سکتی ہے۔

حافظ محمد عمار خان ناصر کی علمی بے راہ روی

میرے انتہائی پیارے عزیز اور بھتیجے (برادر مکرم علامہ زاہد الراشدی مدظلہ کے فرزند) حافظ محمد عمار خان ناصر بچپن سے ہی خداداد ذہانت کے مالک ہیں۔ قدرت نے انہیں بے پناہ ذہانت سے نوازا ہے۔ وہ بلا کا حافظہ رکھتے ہیں اور بچپن سے مطالعہ کا بھی ذوق وجنون ہے، اور یہ فطرت کا قانون ہے کہ اگر کسی ذہین وفطین آدمی کو تربیتی سختیوں سے آزاد کر دیا جائے اور اسے نگرانی کے حصار میں نہ رکھا جائے تو اس کے بھٹکنے کا ہر وقت اندیشہ رہتا ہے اور اس کے فکری بے راہ روی کا شکار ہو جانے کا خطرہ ہوتا ہے۔ ماضی میں اس کی ان گنت مثالیں موجود ہیں۔ امام انقلاب مولانا عبید اللہ سندھیؒ کی ذہانت وفطانت ہی تھی جس نے ان کے مرشد وسرپرست حافظ محمد صدیق بھرچونڈویؒ کو پریشان کر دیا تھا اور انہوں نے مولانا سندھیؒ کو بغرض تعلیم رخصت کرتے وقت دعا کی تھی کہ یا اللہ! اس کا واسطہ کسی متبحر اور پختہ کار عالم سے پڑے، اور حضرت سندھیؒ خود فرماتے ہیں کہ میرے مرشد ومربی کی دعا مجھے حضرت شیخ الہندؒ کے قدموں تک لے آئی۔ غرضیکہ ذہین آدمی کی فکری تربیت کی نگرانی بہت ضروری ہوتی ہے اور اگر وہ مطالعہ کا ذوق وشوق بھی رکھتا ہو تو نگرانی میں شدت شامل کرنا بھی ضروری ہو جاتا ہے۔

مولانا ابوالکلام آزادؒ کی ذہانت وفطانت سے ہر صاحب علم ومطالعہ اچھی طرح واقف وباخبر ہے۔ تقریباً بارہ سال کی عمر میں وہ جملہ علوم وفنون کی تعلیم سے فارغ ہو چکے تھے۔ ان کی اسی ذہانت وفطانت کی بنا پر ان کے والد گرامی مولانا خیر الدینؒ کے بارے میں پریشان رہتے تھے اور ان کے بچپن میں اکثر فرمایا کرتے تھے کہ مجھے اپنے بیٹے کی ذہانت سے خوف آتا ہے۔ میں ڈرتا ہوں کہ کہیں اس کی ذہانت اسے کسی نئے رخ پر نہ لگا دے اور وہ نیا رخ اس کی اور اس کے ذریعہ دیگر لوگوں کی گمراہی کا باعث نہ بن جائے اور اسے اہل السنۃ والجماعۃ کے مسلک حقہ سے دور نہ کر دے۔ مولانا آزادؒ کے والد محترمؒ کی ماضی پر نظر تھی۔ وہ جانتے تھے کہ ماضی کے اندر ذہین وفطین لوگوں کے اٹھائے ہوئے فتنے ہزاروں لوگوں کے ایمان غارت کر چکے ہیں اور ہم اپنے شیخ ومرشدؒ کا قول بھی ان فتنوں کے بارے میں گزشتہ سطور میں بیان کر چکے ہیں۔ بعض حضرات کا خیال ہے کہ فکری اصلاح کے لیے دھونس سے کام نہیں لینا چاہیے، لیکن ہمیں اس سے ہرگز اتفاق نہیں، کیونکہ جب کوئی شخص اپنے آباؤ اجداد کے فکری اصولوں میں برملا طور پر دھاندلی سے کام لے رہا ہو تو اسے دھونس کے ذریعے راہ راست پر لانا اس کے سرپرستوں کی شرعی واخلاقی ذمہ داری ہے۔ قرون اولیٰ میں اس کی بے شمار مثالیں موجود ہیں اور خود ہمارے حضرت شیخؒ کا طرز تربیت اس بارے میں جو کچھ تھا، وہ کسی سے مخفی نہیں۔ اس کی تفصیلات ہم آگے چل کر عرض کریں گے۔

بہر حال مولانا خیر الدینؒ کا خدشہ وخطرہ بہت حد تک درست ثابت ہوا اور مولانا آزاد اپنے آزادانہ مطالعہ اور ذہانت کی بنا پر سرسید احمد خان کی نیچری تحریک سے متاثر ہوتے چلے گئے۔ بعد میں جب وہ حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن دیوبندیؒ کی سیاسی تحریک سے وابستہ ہوئے اور ان کی صحبت ومعیت نصیب ہوئی تو رفتہ رفتہ واپسی کا سفر اختیار کیا۔ اگرچہ اس کے بعد بھی ان کے بعض تفردات قائم رہے، لیکن کسی گمراہ اور گمراہ کن تحریک سے ان کی وابستگی ختم ہو گئی۔ وہ نیچری تحریک کے ساتھ وابستگی کے نتائج پر تبصرہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ:

> ’’والد مرحوم کہا کرتے تھے کہ گمراہی کی موجودہ ترتیب یوں ہے کہ پہلے وہابیت (یعنی ترک تقلید)، پھر نیچریت۔ نیچریت کے بعد تیسری قدرتی منزل جو الحاد قطعی کی ہے، اس کا ذکر نہیں کرتے تھے، اس لیے کہ وہ نیچریت کو ہی الحاد قطعی سمجھتے تھے، لیکن میں یہ تسلیم کرتے ہوئے اتنا اضافہ کرتا ہوں کہ تیسری منزل الحاد ہے اور ٹھیک ٹھیک مجھے یہی پیش آیا۔
>
> سرسید مرحوم کو بھی پہلی منزل وہابیت (ترک تقلید) کی ہی پیش آئی تھی۔ اصل یہ ہے کہ عقائد وفکر کے توسیع وتطور کے لیے پہلی چیز یہ ہے کہ تقلید کی بندشوں سے پاؤں آزاد ہوں۔ وہابیت اس زنجیر کو توڑتی ہے۔ اگر اس کے بعد آزادیٔ فکر، بے قیدی اور مطلق العنانی کی صورت اختیار کر لے تو بلاشبہ یہ نہایت مضر صورتیں بھی اختیار کر سکتی ہے۔ زندگی کے اس حصہ میری دماغی حالت حسب ذیل تھی:
>
> ۱۔ تقلید ورسوم کی بندشیں ٹوٹ چکی تھی۔
>
> ۲۔ تقلید آباؤ اجداد کے تمام نقوش اگر مٹ نہیں چکے تھے تو بہت مدھم پڑ چکے تھے۔
>
> ۳۔ لیکن آزادیٔ فکر نے ابھی کوئی مطمئن حالت حاصل نہیں کی تھی۔ شکوک وشبہات نئے نئے اٹھ رہے تھے۔ گردوپیش میں اس کے دفع کی قوت نہ تھی، بلکہ ضعف کی وجہ سے اور برانگیختگی ہو رہی تھی۔ اکثر حالتوں میں شکوک فتح مند رہتے تھے۔ مطالعہ کی وسعت انہیں اور بڑھا رہی تھی اور نئے نئے میدان بھی کھل رہے تھے۔
>
> ۴۔ طبیعت پوری طرح قدرتی طور پر کسی نئی حالت کے لیے تیار ومنتظر تھی۔‘‘ (آزاد کی کہانی خود ان کی زبانی، ص ۳۶۸)

مولانا آزادؒ کے اس فرمان میں یہ بات انتہائی قابل توجہ ہے کہ تقلید کی بندشوں سے آزادی کی ضرورت اسے محسوس ہوتی ہے جو اسلاف کے عقائد وافکار پر مطمئن نہیں ہوتا، بلکہ ان میں تبدیلی، ترقی یا ان کی تشکیل نو کا خواہش مند ہوتا ہے اور یہی چیز اسے تقلید کی بندشوں سے آزاد ہونے پر مجبور کرتی اور اسے آزادئ فکر، بے قیدی اور مطلق العنانی کی گمنام منزل کی طرف لے جاتی ہے۔ اس کے نتیجے میں مولانا آزادؒ جیسا ذہین وفطین آدمی اپنی ذہنی حالت جس انداز سے بیان کر رہا ہے، وہ آزادی فکر کے متلاشیوں کے لیے قابل عبرت ہے۔ کاش وہ اس سے عبرت حاصل کر سکیں۔ مولانا آزادؒ اپنی اس دور ضلالت کی ذہنی حالت وکیفیت پر مزید تبصرہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ:

''اب معاملہ تقلید وعدم تقلید اور وہابیت وحنفیت سے گزر چکا تھا، اور ایک ایسی بلندی پر اپنی جگہ محسوس ہو رہی تھی جہاں یہ تمام جماعتیں، یہ تمام عقائد وافکار اور یہ تمام جھگڑے بالکل حقیر دکھائی دیتے تھے۔ خواہ حنفی ہوں خواہ غیر مقلد، شیعہ ہوں یا سنی، ماتریدی ہوں یا اشعری، ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ان میں سے کوئی بھی اسلام کی اصلی حقیقت یا سرسید کی اصطلاح میں ٹھیٹھ اسلام سے آشنا نہیں۔ قرآن کے اصلی حقائق ومعارف اور مذہب کی اصلی تعلیمات تو وہ ہیں جن کے چہرے پر سے تیرہ سو برس بعد اس مجدد اعظم (جیسا کہ میری اس وقت کی بول چال تھی، یعنی سرسید) نے پردہ ہٹایا ہے۔'' (ایضاً ص ۳۷۰)

یہ تھا تقلید کی بندشوں سے آزادی کا انجام جو ابوالکلام آزادؒ جیسے عبقری انسان کے لیے زندگی کا سب سے بڑا پچھتاوا بن گیا اور ایک مدت اس کی تلافی میں گزری۔ ذہنی کیفیت میں تغیر کے ساتھ ساتھ عملی حالت میں جو تبدیلیاں پیدا ہوئیں، ان کا تذکرہ مولانا آزادؒ بایں الفاظ فرماتے ہیں کہ:

''جب اس بات کا استغراق بڑھ گیا کہ تمام واجبات وفرائض شرعیہ ان ان مصالح اور حکمتوں پر مبنی ہیں اور مقصود صرف ان فوائد کا حصول ہے تو پھر ظاہر ہے کہ طبیعت میں ادائے فرض کا کوئی جذبہ باقی نہیں رہتا۔ اہل مذاہب کے تشدد اور تاکیدات بالکل ایک طرح کی عدالتی تنبیہات معلوم ہونے لگتی ہیں۔'' (ایضاً ص ۳۹۴)

''جب نئی روشن خیالی کی ہوا لگی اور سرسید مرحوم کا رنگ چڑھا تو اس کا اثر صرف عقائد وافکار ہی کے دائرہ میں محدود نہ تھا، بلکہ اعمال پر بھی پڑتا تھا۔ اب صوم وصلوٰۃ کی حقیقت ہم وہ نہیں سمجھتے تھے جو عام لوگ سمجھتے تھے۔'' (ایضاً ص ۳۹۸)

''چند دنوں کی فکر وکشمکش کے بعد ایک دن شب کو آخری فیصلہ کر لیا اور صبح سے نماز ترک کر دی۔'' (ص ۴۰۰)

''اس کے بعد بالالتزام نماز ترک کر دی۔'' (ص ۴۰۱)

غور فرمائیے تقلید کی بندشوں سے آزادی کے جنون اور آزادانہ مطالعہ کی وسعت نے مولانا آزادؒ جیسے ذہین وفطین اور صاحب علم وبصیرت انسان کو کہاں سے کہاں پہنچا دیا؟ تیرہ سو سالہ امت مرحومہ کے فقہا ومحدثین اور مفسرین ومتکلمین کا ادب واحترام دل سے ختم ہوا، ان کی جملہ تعلیمات وتحقیقات عدم اعتماد کی نذر ہو گئیں، منصوص اور اجماعی عقائد وافکار متزلزل وبے یقینی کا شکار ہوئے، عبادات شرعیہ کی محبت واہمیت دل ودماغ سے رفو چکر ہو گئی، اعمال صالحہ میں شدید قسم کا ضعف پیدا ہوا، حتیٰ کہ روزہ جیسا اہم دینی فریضہ عملی زندگی سے نکل گیا، بچپن سے نماز کی مستقل عادت، محرومیت میں بدل گئی۔ اور یہ سب کچھ تحقیقات سلف پر عدم اعتمادی کا نتیجہ تھا، منصوص واجماعی مسائل سے انحراف وروگردانی کا رزلٹ آؤٹ ہو رہا تھا، آزادئ فکر اور روشن خیالی کا خوفناک جن بوتل سے باہر آ رہا تھا۔ اس لیے مولانا آزاد مرحوم نیچریت کے ذہنی شکنجہ سے نکلنے اور اعتماد کی طرف واپس پلٹنے کے بعد ترک تقلید کو گمراہی وضلالت کی اولین بنیاد اور الحاد وزندقہ کی پہلی سیڑھی قرار دیتے تھے اور اس

حقیقت کا برملا اعتراف کرتے تھے کہ نیچریت اور اس سے آگے الحاد تک میری رسائی اور گمراہی کا بنیادی سبب بھی ترک تقلید ہی تھی اور سرسید احمد خان کو بھی اپنی نیچری تحریک اٹھانے کے لیے پہلے ترک تقلید کی منزلیں ہی عبور کرنا پڑیں۔

تقلید کی بندشوں سے آزادی حاصل کر لینے والا شخص اجتہاد کے نام پر اپنے دائرۂ کار واختیار کو بڑھاتا چلا جاتا ہے۔ پھر اس کی کوشش ہوتی ہے کہ اجماعی واتفاقی مسائل کو بھی دائرۂ اجتہاد میں شامل کر لیا جائے، کیوں کہ اجتہاد ہی وہ واحد دروازہ ہے جس کے ذریعہ کسی بھی مسئلہ میں منہ مارا جا سکتا ہے۔ پھر نتیجہ ظاہر ہے۔ اور یہ خرابی عموماً انہی لوگوں میں پیدا ہوتی ہے جو ذہین اور وسیع المطالعہ ہونے کی بنا پر جنون اجتہاد میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ اگر ان لوگوں کو سرپرستانہ نگرانی اور تربیتی سختیوں سے آزاد کر دیا جائے تو ان کے اندر ذہنی آوارگی پیدا ہو جاتی ہے، کیونکہ بلا امتیاز حق وباطل اور ہدایت وضلالت کا دوطرفہ آزادانہ مطالعہ کسی نگرانی وراہنمائی کے بغیر ان گنت شکوک کا بیج بو دیتا ہے اور انسان از خود ہی اپنے ذہن کے اخذ کردہ نتائج وافکار کی طرف تیزی سے بڑھنے لگتا ہے۔ جس کے نتیجہ میں وہ اپنے اکابر واسلاف کے فکر وفلسفہ اور ان کے اصول وطرز تحقیق سے دور اور بہت دور ہوتا چلا جاتا ہے اور اسے گمراہی کی انتہائی منزل تک پہنچنے کے لیے، بہت سے ذہنی مراحل سے گزرنا پڑتا ہے۔

دعوتی اور تربیتی تقاضوں میں فرق

آج مکالمہ بین المذاہب کے عنوان سے بین الاقوامی پروپیگنڈے نے بعض حضرات کے دماغوں میں خرابی اور بعض کے ذہنوں میں شدید قسم کی غلط فہمی پیدا کر رکھی ہے کہ انسانی ذہن پر فکر وعقیدہ کی گرفت ڈھیلی رہنی چاہیے، کسی قسم کے مذہبی عقائد واعمال کے بارے میں سختی وتشدد کا دروازہ بند ہونا چاہیے، آدمی کو فکر وعمل کے حوالے سے آزاد چھوڑ دینا چاہیے، وہ اپنی سوچ وفکر کے ساتھ جو چاہے کرے۔ لیکن ہمارے دینی دانشور اس پہلو پر غور نہیں کر رہے کہ یہ پروپیگنڈا کرنے والی طاقت وہ ہے جس نے عالمی ذرائع ابلاغ اور انٹرنیشنل میڈیا کو مکمل طور پر اپنی گرفت میں لے رکھا ہے اور اس کے ذریعہ وہی فکر وفلسفہ پبلک کے سامنے لایا جا رہا ہے جس پر امریکی ویورپین دانشوروں کی مہر تصدیق ثبت ہوتی ہے۔ مکالمہ بین المذاہب کا یہ فلسفہ اور عدم تشدد کی یہ پالیسی قومی وعالمی تناظر میں دلائل وبراہین کے تبادلہ کے حوالہ سے ممکن ہے درست اور صحیح ہو، لیکن ہمارے ناقص خیال میں خوفناک اعتقادی فتنوں اور تباہ کن الحادی تحریکوں کے اس خطرناک ماحول میں اصلاح وتربیت کے حوالہ سے اس فلسفہ اور پالیسی کو کسی طور پر مناسب قرار نہیں دیا جا سکتا۔ اس پالیسی کو صرف دعوتی محاذ تک محدود رہنا چاہیے۔ اس کی بنیاد پر اپنی سرپرستانہ اور مربیانہ ذمہ داریوں سے صرف نظر کر لینا شاید دانش مندانہ طرز فکر نہ ہو۔ کیونکہ ہمارے مذہبی ماحول میں جدت پسندی اور روشن خیالی کا جو طرز تحقیق ماحولیات کے حوالے سے اپنے اندر ایک اثر وکشش رکھتا ہے، وہ ہماری سوسائٹی کے ضعیف الاعتقاد، توہم پرست، سہل پسند، شرعی پابندیوں سے نالاں، من پسندانہ دینی سہولتوں کے متلاشی اور اعمال صالحہ وعبادات شرعیہ سے چھٹکارا حاصل کر کے بھی پکے اور ٹھیٹھ مسلمان باقی رہنے کے خواہشمند نوجوانوں کے لیے انتہائی مہلک اور زہر قاتل ہے۔ عصر حاضر کے مسلمانوں کے ذہنوں پر سب سے پہلا حملہ عصری تقاضوں کے حوالہ سے ہوتا ہے۔ چونکہ دینی تعلیمات سے محروم مسلمان اپنے موجودہ تہذیبی وثقافتی ماحول سے ذہنی طور پر نکلنا پسند نہیں کرتا، اس لیے وہ اس حملہ کے اثرات قبول کیے بغیر نہیں رہ سکتا اور یہ خوفناک حملہ جدید تہذیب وتمدن سے مرعوب ومتاثر مسلمانوں کو اسلاف امت اور ان کی تحقیقات سے کاٹ کر رکھ دیتا ہے۔ ایسے حالات میں والدین، اساتذہ اور دیگر ایسے سرپرستوں کو اپنے زیر اثر

افراد واشخاص کی اصلاح وتربیت کی سرپرستانہ ذمہ داریوں سے بری الذمہ کیسے قرار دیا جاسکتا ہے؟

فرمان نبوی: الا کلکم راع و کلکم مسئول عن رعیتہ کی روشنی میں سرپرست ونگران کی حیثیت اپنے ماتحت وزیر اثر افراد کے لیے حکمران کی قرار دی گئی ہے اور اگر حکمران قانون کی بالادستی کے لیے اپنا اختیار استعمال نہ کرے تو نظام مملکت بگڑ سکتا ہے، رعایا میں بغاوت وسرکشی پیدا ہو سکتی ہے اور فکری وحدت پارہ پارہ ہو کر مملکت کو کمزور کر سکتی ہے۔ دعوتی محاذ پر اگرچہ اکراہ فی الدین سے منع کیا گیا ہے، لیکن دینی اصلاح وتربیت کے لیے سختی کا حکم بھی موجود ہے۔ چنانچہ حضرت شیخؒ فرماتے ہیں کہ:

"حدیث میں آتا ہے کہ جب بچے سات سال کی عمر کو پہنچ جائیں تو ان کو نماز کا حکم دو، اور جب دس سال تک پہنچ جائیں تو ان کو نماز ترک کرنے کی وجہ سے مارو پیٹو۔" (آئینہ محمدی ص ۱۵)

عقائد وافکار بہرحال فرائض واعمال سے زیادہ اہمیت رکھتے ہیں لہٰذا ان کی اصلاح کی طرف زیادہ توجہ کی ضرورت ہے۔ ہمارا اس پوری بحث سے یہ مقصد ومطلب ہرگز نہیں کہ اپنے ماتحت وزیر اثر اہل علم افراد کو جبر وتشدد کے ذریعہ تحقیق سے روکا جائے، البتہ ہمارے خیال میں یہ ضروری ہے کہ اس کو اپنا اختیار واثر استعمال کر کے تحقیقی اصولوں کے دائرے میں بند رکھا جائے اور مسلمہ اصولوں کے دائرہ میں اس کی تحقیقات کی نگرانی واصلاح کی جائے۔ مسلمہ اصولوں کی حدود پھلانگ کر کی جانے والی تحقیق کی بہرحال حوصلہ شکنی ضروری ہے۔

مرعوب ودہشت زدہ کون؟

جدت پسندی سے متاثر بعض حضرات قدامت پسندوں پر یہ طعن بھی کرتے ہیں کہ یہ حالات کا سامنا کرنے کا حوصلہ نہیں رکھتے، اس لیے فتویٰ کی زبان میں بات کرتے ہیں۔ جدت پسندوں کا یہ طنز وطعن اب ایک مستقل پروپیگنڈا اور تحریک کی صورت اختیار کر چکا ہے۔ جدید مفکرین کے افکار جدیدہ سے متاثر ومرعوب ایک ایسے ہی دوست سے عرصہ ہوا ملاقات ہوئی تو حیات مسیح ومعجزات انبیاے کرام وغیرہ متواتر واجماعی عقائد ونظریات سے انکاری تھا۔ دوران ملاقات اس نے مجھے گھسا پٹا طعنہ دیا کہ تم مولوی لوگ چونکہ عصر حاضر کی عقلی تحریکوں کے فکر وفلسفہ کا سامنا کرنے اور ان کا جواب دینے کا حوصلہ نہیں رکھتے اور ان سے ذہنی طور پر مرعوب ودہشت زدہ ہو، اس لیے تم ان کا عقلی حوالے سے مقابلہ کرنے کی بجائے اسلاف کے دامن تحقیق میں پناہیں تلاش کرتے ہو۔ میں نے اس سے کہا کہ تم لوگوں نے ان سے عقلی مقابلہ کی آڑ لے کر کون سا تیر چلایا ہے؟ فکری وعملی طور پر خود کو ان کے رنگ میں رنگ کر اور ان کے افکار ونظریات کو قبول کر کے آخر تم نے اسلام کی کون سی خدمت سرانجام دی ہے؟ ان عقلی وسائنسی تحریکوں نے جب یہ دعویٰ کیا کہ انسان کا کسی سائنسی ٹیکنالوجی کے بغیر فضاؤں میں بلند ہونا اور ہوا اور آتش کے کروں کو عبور کر لینا عقل کے منافی ہے تو تم نے ان کی اس بودی دلیل کے سامنے ہتھیار ڈال کر فوراً حضرت سیدنا عیسیٰ علیہ السلام کے رفع الی السماء اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے معراج جسمانی کا انکار کر دیا۔ ان عقلی تحریکوں نے اسباب ظاہرہ کے بغیر کسی کام کے وقوع وظہور کو خلاف عقل قرار دیا تو تم لوگ فوراً ہی معجزات انبیاے کرام سے منکر ومنحرف ہو گئے اور اس سے انکار وانحراف کے لیے تم لوگوں نے ایسی ایسی ناقص تاویلیں کیں کہ شیطان کی عقل بھی دنگ رہ گئی۔ تم نے اس مذموم مقصد کے لیے اجماع امت، احادیث صحیحہ اور آیات صریحہ تک کو پس پشت ڈال دیا۔ ان عقلی تحریکوں

نے دعویٰ کیا کہ انسانی حواس ومشاہدہ سے باہر کائنات کے اندر کسی چیز کا وجود تسلیم کرنا خلاف عقل ہے تو تم نے فوراً ملائکہ وجنات جیسی غیر محسوس مخلوقات کے عدم وجود کا فتویٰ دے دیا۔ ان عقلی تحریکوں نے اپنے کلچر وثقافت کے فروغ ودفاع کے لیے نام نہاد انسانی حقوق کا چارٹر تیار کیا تو تم پردہ جیسے حکم شرعی سے پیچھا چھڑانے کے بہانے تراشنے لگے، حدود اللہ کو ظالمانہ سزائیں قرار دے دیا اور ان بحثوں کا بازار گرم کر دیا کہ حدود اللہ کی سزائیں عام مجرموں کے لیے ہیں یا پیشہ ور مجرموں کے لیے۔ غرضیکہ تم علانیہ طور پر قرآن وسنت اور منصوص واجماعی مسائل واحکام سے منحرف ہوتے چلے گئے اور عقلی تحریکوں کا فکر وفلسفہ قبول کر لیا اور پھر بڑی ڈھٹائی کے ساتھ الزام ہمیں دیتے ہو کہ ان عقلی تحریکوں سے مرعوب ودہشت زدہ ہم ہیں۔ پسپائی تم نے اختیار کی، ہتھیار تم نے ڈالے، اپنی متواتر تعلیمات کا قلعہ تم نے منہدم کیا اور مرعوبیت کا طنز وطعن ہم پر ہے، حالانکہ ہم تو آج بھی بحمد اللہ اپنی بنیادوں پر قائم ہیں، اپنی تعلیمات وروایات سے پوری طرح وابستہ ہیں، اپنے اکابر واسلاف کی تحقیقات سے پوری طرح مطمئن ہیں اور آج بھی اپنی تمام تر متواتر واجماعی تعلیمات کو ثابت کرنے کا حوصلہ رکھتے ہیں۔ باقی رہا فتویٰ کی زبان میں بات کرنے کا مسئلہ تو فتویٰ ان لوگوں کے لیے ہوتا ہے جو دلائل کا موازنہ کرنے کی اہلیت وصلاحیت سے محروم ہوتے ہیں۔ انہیں گمراہ کن فتنوں کی گمراہی سے بچانے کے لیے فتویٰ کی ضرورت ہر دور میں محسوس کی گئی اور کی جاتی رہے گی۔

امام اہل سنت کا طرز تربیت

خاندان صفدریہ کا ہر وہ فرد جو حضرت شیخؒ کے ایام صحت وتندرستی کے معمولات سے باخبر ہے، وہ اس بات کی شہادت دے گا کہ حضرت شیخؒ اپنے بچوں کی اعتقادی واخلاقی تربیت واصلاح میں بہت سخت گیر تھے اور اس معاملہ میں ان کے اندر نرمی کا کوئی گوشہ نہ تھا۔ سب بچوں کی ڈاڑھیوں کو چیک کرنا، جس پر ڈاڑھی کٹانے کا شبہ ہو، اسے سخت سزا دینا، ہر جمعہ کو اپنے ہاتھوں سے سب کے ناخن کاٹنا، ناخن بڑھے ہوئے دیکھ کر سزا دینا، مہینہ میں کم از کم ایک بار سب کی حجامتیں اپنی نگرانی میں ہونا گویا ان کی ڈیوٹی کا حصہ تھا۔ ان کی تمام اولاد کے اندر مسلکی پختگی اور اسلاف کی تحقیقات پر غیر متزلزل یقین اور اعتماد ان کی اسی سخت نگرانی وشدت کا نتیجہ ہے۔

صحت کے دور میں سب بچوں کو اپنے ساتھ مسجد لے کر جانا، نماز کے بعد ان کو صفوں میں چیک کرنا، پہلی رکعت چھوڑنے کی صورت میں سزا دینا، نماز کے اندر سستی اور تعلیم واسباق کے اندر غفلت برتنے والوں کی پٹائی کرنا ان کا مستقل معمول تھا اور خاندان صفدریہ کا ہر فرد اس سے پوری طرح باخبر ہے۔ بچپن میں تمام بچوں پر دیوبندی کتب ورسائل کے علاوہ باقی مذاہب ومسالک اور فرقوں کی کتب اور رسائل کا مطالعہ کرنے پر سخت پابندی تھی۔ حضرت شیخؒ کے پاس قادیانی، روافض، منکرین حدیث، اہل حدیث اور بریلوی وغیرہ تمام مکتب فکر کے رسائل آتے تھے، لیکن سب بچوں کو ان میں سے دیوبندی مکتب فکر کے رسائل (بینات، البلاغ، الفرقان، الحق، ترجمان اسلام اور خدام الدین وغیرہ) کے علاوہ کوئی رسالہ پڑھنے کی کسی کو اجازت نہ تھی۔ یہ واردات اگر کسی نے کرنا ہوتی تو انتہائی خفیہ اور غیر محسوس طریقہ سے کرتا۔ متعدد بار اس معاملہ میں میری اور بھائی جان محمد اشرف خان ماجد مرحوم کی پٹائی بھی ہوئی۔ حضرت شیخؒ کی طرف سے اس پابندی وسختی کے خوش کن اور دور رس اثرات اس وقت بہت نمایاں ہو کر ہمارے سامنے آئے جب ہم نے فکری واعتقادی میدان میں عملی جدوجہد کے لیے قدم رکھا۔

صرف بچوں کی نہیں بلکہ مریدین وتلامذہ کی اصلاح وتربیت کے لیے بھی وہ کافی حد تک سختی سے کام لیتے تھے اور انہیں قدم

قدم پر اسلاف کی تحقیقات سے جڑے رہنے کی تلقین کرتے تھے۔ ایک بار ان کے ایک مرید نے، جو ہائی سکول میں ٹیچر تھے اور سیالکوٹ یا پسرور سے اکثر حضرت شیخؒ کی خدمت میں تشریف لایا کرتے تھے، چند غیر مسلکی کتابوں کے مطالعہ کی اجازت چاہی تو حضرت شیخؒ نے فرمایا کہ ”میرے نزدیک ایسے آدمی کے لیے جو اپنے مسلکی عقائد ونظریات اور ان کے دلائل سے پوری طرح واقف نہ ہو، کسی دوسرے مذہب ومسلک کی کتب ورسائل کا مطالعہ کرنا جائز نہیں، کیونکہ ان میں سے اکثر وہ ہیں جو اردو ادبیت کی چاشنی اور عقلی دلائل کی چکر بازیوں سے لبریز ہیں اور ان کی وجہ سے آدمی کا نقلی دلائل پر سے اعتماد ختم یا کمزور ہو جاتا ہے۔“ ماسٹر صاحب نے اپنی مسلکی پختگی کا پورا یقین دلاتے ہوئے اجازت پر اصرار کیا۔ میرے لیے یہ بات باعث حیرت تھی کہ وہ اجازت کیوں طلب کرتے ہیں اور پھر اجازت حاصل کرنے پر مصر کیوں ہیں؟ لیکن پوچھنے کا حوصلہ نہ کر سکا۔ انہوں نے سرسید احمد خان کی ”تفسیرات احمدیہ“ اور ”خطبات احمدیہ“ اور مولوی محمد علی لاہوری کی ”بیان القرآن“ پڑھنے کی اجازت مانگی تھی۔ ان کے شدید اصرار پر حضرت شیخؒ نے فرمایا کہ اگر ان کتب کا ضرور مطالعہ کرنا چاہتے ہو تو پھر ان سے پہلے مولانا عبدالحق حقانی دہلوی کی ”تفسیر حقانی“، مولانا محمد ادریس کاندھلویؒ کی تفسیر ”معارف القرآن“ اور مولانا سید سلیمان ندویؒ کی ”سیرت النبی“ جلد ۳، ۴ کا مطالعہ کریں۔ جب وہ حضرت شیخؒ سے ملاقات کے بعد واپسی کے لیے باہر نکلے تو میں نے ذہن کے اندر مچلنے والا سوال ان پر داغ دیا جس پر انہوں نے یہ عجیب انکشاف کیا کہ میرا گزشتہ پندرہ سال سے حضرت شیخؒ کے ساتھ تعلق ہے اور میں ہر قسم کی علمی وروحانی راہنمائی حاصل کرنے کے لیے حضرت شیخؒ کی خدمت میں حاضر ہوتا رہتا ہوں۔ جب بھی میرا کوئی دوست مجھے کوئی ایسی کتاب پڑھنے کے لیے دیتا ہے جو میرے مسلک کی نہ ہو تو میں حضرت شیخؒ کی خدمت میں حاضر ہو جاتا ہوں اور ان سے اس کتاب کے پڑھنے کی اجازت مانگتا ہوں۔ حضرت شیخؒ ہر بار یہی جملہ فرماتے ہیں کہ ایسی کتابوں کا مطالعہ جائز نہیں۔ میں ہر بار اصرار کرتا ہوں تو حضرت شیخؒ اجازت دے دیتے ہیں، لیکن ساتھ ہی اس کا توڑ بھی بتا دیتے ہیں۔ اس طرح زہر کے ساتھ تریاق بھی مل جاتا ہے۔ میں نے تعجب کے ساتھ ان سے کہا کہ آپ اپنے دوستوں سے ایسی کتابیں مطالعہ کے لیے لیتے کیوں ہیں؟ تو انہوں نے مسکرا کر فرمایا کہ میں بھی تو ان کو اپنے مسلک کی اور حضرت شیخؒ کی کتابیں پڑھنے کے لیے دیتا ہوں۔ اگر میں ان سے پڑھنے کے لیے کتاب نہ لوں (جو وہ دے رہے ہیں) تو وہ مجھ سے کتاب کیسے لیں گے؟ اور دوسرا فائدہ مجھے یہ ہو جاتا ہے کہ جو کتابیں میرے دوست مجھے دیتے ہیں، میں ان کو وہ کتابیں پڑھنے کے لیے دے دیتا ہوں جو حضرت شیخؒ مجھے ان کے توڑ کے لیے بتاتے ہیں۔ اس طرح اللہ تعالیٰ کے فضل وکرم اور حضرت شیخؒ کی خصوصی شفقت وتوجہ سے کئی ایسے دوستوں کو راہ راست پر لا چکا ہوں جو مختلف فتنوں کا شکار ہو چکے تھے۔

اس ایک واقعہ سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ حضرت شیخؒ کا انداز تربیت کیا تھا اور وہ کس انداز سے اپنے مریدین اور تلامذہ کو اسلافؒ کی تحقیقات سے جوڑے رکھتے تھے۔

قادیانی لٹریچر اور فکری اصلاح

فکری اصلاح وتربیت کے حوالے سے ایک واقعہ میری زندگی میں بڑی اہمیت کا حامل ہے (جس کی دلچسپ تفصیلات ان شاء اللہ اپنی یادداشتوں پر مشتمل ایک دوسرے مضمون میں ذکر کروں گا)۔ میں آٹھویں کلاس میں زیر تعلیم تھا جب میں نے خط لکھ کر ربوہ سے قادیانیوں سے مفت لٹریچر منگوایا جو حضرت شیخؒ نے خفیہ چھاپہ مار کر میرے بستہ سے برآمد کر لیا اور بحق سرکار

ضبط ہو گیا۔ تقریباً دس سال بعد جب میں درس نظامی سے رسمی فراغت حاصل کر چکا تھا ایک دن اچانک طلب کر لیا گیا۔ حاضر ہونے پر دریافت کیا گیا کہ تمہارے پاس قادیانیوں سے متعلق کون کون سی کتب موجود ہیں؟ میں عرض کیا کہ حضرت مولانا مفتی محمد شفیع دیوبندیؒ کی ”ختم نبوت کامل“، حضرت مولانا عبدالغنی پٹیالویؒ کی ”اسلام اور قادیانیت“، حضرت مولانا محمد رفیق دلاوریؒ کی ”رئیس قادیان“ اور پروفیسر محمد الیاس برنی مرحوم کی ”قادیانی مذہب کا علمی محاسبہ وغیرہ“ موجود ہیں۔ پوچھا گیا کہ ان کا مطالعہ کر چکے ہو؟ عرض کیا جی ہاں۔ فرمایا جاؤ المماری میں سے اپنی وہ کتابیں نکال لو اب تم ان کا مطالعہ کر سکتے ہو۔ میں نے وہ قادیانی لٹریچر نکالا اور چلا آیا۔ اپنے کمرہ میں بیٹھ کر جب وہ رسائل دیکھے تو ان میں سے بعض پر حضرت شیخؒ کے قلمی نوٹس موجود تھے جس سے اندازہ ہوا کہ وہ بھی ان کا مطالعہ کر چکے ہیں۔ اس ایک واقعہ کے اندر میری اصلاح وتربیت کے ہزاروں سامان موجود تھے اور حضرت شیخؒ کے اس انداز تربیت نے کم از کم مجھے ان گنت فتنوں سے محفوظ رکھا۔ خدا تعالیٰ ان پر کروڑ ہا رحمتیں نازل فرمائے اور ہمیں ان کی تعلیمات وتحقیقات کی حفاظت کی توفیق بخشے۔ آمین یا رب العالمین۔

اجماع کے بارہ میں عمار خان ناصر کی علمی ٹھوکر

عزیزم عمار خان ناصر سلمہ اللہ تعالیٰ کافی عرصہ سے ڈاکٹر جاوید احمد غامدی کی روشن خیال تحریک سے وابستہ ہیں اور اس وابستگی کے بعد ان کا تمام تر مطالعہ اسی فکر ونظر کے حوالہ سے ہوتا ہے۔ چنانچہ انہوں نے ایک کتاب ”حدود وتعزیرات: چند اہم مباحث“ کے نام سے لکھی جو غامدی صاحب کے ادارہ ”المورد“ سے شائع ہوئی۔ اس میں دیت اور زانی کی سزا کے بارے میں جو موقف اختیار کیا گیا ہے، وہ خالص غامدی نقطہ نظر ہے جسے کسی صورت بھی اہل السنۃ والجماعۃ کا موقف تسلیم نہیں کیا جا سکتا اور خود عزیزم عمار کو بھی اس پر اصرار نہیں کہ وہ جمہور اہل سنت کا موقف ہے۔ وہ بھی اسے جمہور کے خلاف اپنی ایک رائے قرار دیتے ہیں۔

مخدوم مکرم حضرت مولانا ڈاکٹر مفتی عبدالواحد صاحب مدظلہ (جامعہ مدنیہ لاہور) نے اس پر گرفت کی اور ”مقام عبرت“ کے نام سے ایک رسالہ تالیف فرمایا اور ہمیں اس بات کا اعتراف واعلان کرنے میں کوئی باک وعار نہیں ہے کہ ان کی گرفت جمہور اہل سنت والجماعت کے اصول ومسلک کے عین مطابق ہے اور حضرت امام اہل سنتؒ کے مسلک وطرز تحقیق سے بھی مکمل مطابقت رکھتی ہے اور ہم ان کی طرف سے اس عالمانہ وناصحانہ گرفت پر ان کے انتہائی ممنون وشکر گزار ہیں۔ عزیزم ناصر صاحب نے ان کے جواب میں ایک رسالہ ”مولانا مفتی عبدالواحد کی تنقیدات کا جائزہ“ تحریر کیا اور اس میں مفتی صاحب مدظلہ کی طرف سے اٹھائے گئے خالص علمی اعتراضات کا جواب دینے کی کوشش کی۔ ہمارے خیال میں اسے لفظی ہیر پھیر کا نام تو دیا جا سکتا ہے لیکن جواب تسلیم نہیں کیا جا سکتا۔ باقی ابحاث پر تو بحث فی الوقت ہم وقت کا ضیاع ہی سمجھتے ہیں کیونکہ جب تک کسی بنیادی اصول پر اتفاق ہی نہ ہو، ذیلی بحثوں کے چھیڑنے میں کوئی فائدہ نظر نہیں آتا۔ عزیزم عمار ان مسائل میں جو بہت بڑی علمی ٹھوکر کھا چکے ہیں اور کھا رہے ہیں ان کی بنیاد دراصل ان کا اجماع امت کے بارہ میں نقطہ نظر ہے۔ جب تک وہ اپنے اس نقطہ نظر پر نظر ثانی نہ کریں اس وقت تک ذیلی مسائل پر بحث بالکل فضول ہے۔ اجماع کے بارہ میں ان کا نقطہ نظر ملاحظہ فرمائیں۔ فرماتے ہیں کہ

”یہ اعتراض اس عام خیال کی ترجمانی کرتا ہے کہ کسی آیت یا حدیث کی تفسیر یا کسی فقہی مسئلے کے متعلق اگر سلف سے کوئی

اختلاف کتابوں میں منقول نہ ہو تو یہ اس بات کی دلیل ہے کہ صحابہ کے دور سے لے کر آج تک ہر دور کے تمام اہل علم اس رائے پر متفق رہے ہیں، اس لیے اس کی پابندی کرنا اور اس سے مختلف کوئی رائے اختیار نہ کرنا اہل سنت کا ایک علمی مسلمہ ہے جس کی خلاف ورزی ناجائز ہے۔ اس نقطہ نظر میں کسی رائے پر امت کے اہل علم کے کامل اتفاق کی جو صورت حال فرض کی گئی ہے، اگر وہ فی الواقع پائی جاتی ہو تو عقل و منطق سے قطع نظر کم از کم نفسیاتی طور پر یہ ایک بہت موثر استدلال ہے۔ تاہم واقعہ یہ ہے کہ یہ خیال جس قدر عام ہے اتنا ہی حقیقت واقعہ سے دور اور امت مسلمہ کی علمی روایت کے نہایت محدود، سطحی اور عامیانہ مطالعہ کا نتیجہ ہے۔ اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ اسلام کے بنیادی مآخذ یعنی قرآن وسنت اور دین وشریعت کے نہایت بنیادی تصورات اور احکام کی حد تک تو یہ بات یقیناً درست ہے کہ ان کو نسلاً بعد نسلٍ دین کی حیثیت سے نقل کرنے میں اس امت کے اہل علم اور عوام کا ایک عمومی عملی اتفاق ہے اور تاریخی معیار پر ہر دور میں اس اتفاق کو ثابت کرنا بھی پوری طرح ممکن ہے، لیکن جہاں تک نصوص اور احکام کی علمی تعبیر وتشریح کا تعلق ہے تو کسی بھی مخصوص مسئلہ میں امت کے تمام اہل علم یا کم سے کم وہ اہل علم جنھوں نے اس مسئلہ پر غور کیا اور اس پر باقاعدہ کوئی رائے قائم کی، ان سب کی آرا کو استقصا کے درجہ میں معلوم کرنا بدیہی طور پر انسانی بساط سے بالکل باہر ہے۔ چودہ سو سال میں ہر دور اور ہر علاقہ کے اہل علم کی آرا کو یقینی طور پر معلوم کرنے کا تو کیا سوال، تاریخ اسلام کے بالکل ابتدائی دور میں یعنی صحابہ اور تابعین کے عہد میں بھی اس کا کوئی عملی امکان نہیں پایا جاتا۔'' (تنقیدات کا جائزہ، ص ۶)

اور پھر حضرت امام شافعیؒ کی کتاب الام، حضرت امام ابن تیمیہؒ کے مجموع الفتاویٰ اور امام فخر الدین رازیؒ کی المحصول سے چند شاذ اقوال نقل کرنے کے بعد لکھتے ہیں کہ

''یہ حقیقت اپنی جگہ بالکل واضح ہے کہ علمی وفقہی تعبیرات کے دائرے میں اجماع کا تصور محض ایک علمی افسانہ ہے جس کا حقیقت کے ساتھ دور کا بھی کوئی تعلق نہیں''۔ (ایضاً ص ۱۳)

عزیزم عمار کے مذکورہ دونوں حوالہ جات ملاحظہ فرمایئے اور اندازہ کیجیے کہ وہ علمی وتحقیقی طور پر غلط رخ اختیار کرنے کی وجہ سے ذہنی تذبذب کا شکار ہو کر رہ گئے ہیں۔ ان کے مذکورہ حوالہ جات سے درج ذیل امور سامنے آتے ہیں:

۱۔ اجماع کا معروف تصور ایک مفروضہ اور علمی افسانہ ہے جس کا حقیقت سے کوئی تعلق نہیں۔

۲۔ اجماع عقل ومنطق کی دلیل نہیں بلکہ صرف ایک نفسیاتی دلیل ہے۔

۳۔ اجماع کا معروف تصور، علمی روایت کے نہایت محدود، سطحی اور عامیانہ مطالعہ کا نتیجہ ہے۔

۴۔ ہر دور اور ہر علاقہ کے اہل علم کی آرا کو یقینی طور پر معلوم کر لینا انسانی بساط سے باہر ہے۔

۵۔ قرآن وسنت اور دین وشریعت کے بنیادی تصورات واحکام کا تاریخی معیار پر ہر دور میں اجماع ثابت کرنا پوری طرح ممکن ہے۔

۶۔ نصوص واحکام کی کسی علمی تعبیر وتشریح پر اجماع ثابت کرنا عملی امکان سے باہر ہے۔

عزیزم عمار کی ذہنی کیفیت کا ایک دلچسپ پہلو اور بھی ہے، وہ بھی ملاحظہ فرمالیجیے۔ چنانچہ امام فخر الدین رازیؒ کی کتاب المحصول ۱۷۷/۳ کے حوالہ سے لکھتے ہیں کہ:

''پوری امت کے متفق ہونے کا علم اس کے بغیر ممکن نہیں کہ امت کے ہر ہر فرد کے بارہ میں معلوم ہو جو ایک ناممکن بات

ہے، کیوں کہ کون ہے جو مشرق ومغرب کے تمام انسانوں کو جانتا ہو؟ اور اس امکان کو کیسے رد کیا جا سکتا ہے کہ کسی مخفی مقام پر کوئی انسان موجود ہو جس کے بارے میں ہمیں علم نہ ہو؟ کیونکہ انصاف سے کام لیا جائے تو معلوم ہوگا کہ مشرق میں رہنے والوں کو مغرب کے کسی ایک عالم کی بھی خبر نہیں، چہ جائیکہ وہ ان سب کے بارہ میں اور ان کی آرا ومذاہب کے بارہ میں تفصیل سے جانتے ہوں۔ بلکہ یہاں ایک اور مقام بھی ہے۔ وہ یہ کہ اگر سارے اہل علم ایک جگہ جمع ہو جائیں اور اکٹھے آواز بلند کر کے یہ کہیں کہ ہم اس بات کا فتویٰ دیتے ہیں تو اس بات کے عملاً ناممکن ہونے کے علاوہ پھر بھی اس سے اجماع کا علم حاصل نہیں ہوتا۔ کیوں کہ ممکن ہے ان میں سے کوئی اس سے اختلاف رکھتا ہو، لیکن اتنے بڑے اجتماع کے سامنے اختلاف ظاہر کرنے سے ڈر گیا ہو۔ یا اس نے اس بادشاہ کے خوف سے، جس نے انہیں طلب کیا، اختلاف ظاہر نہ کیا ہو۔ یا اس نے اختلاف تو کیا ہو لیکن اس کی آواز ان سب کی آوازوں میں دب گئی ہو۔'' (ایضاً ص: ۹، ۱۰)

یہ ہے عزیزم عمار کی ''ٹامک ٹوئیاں'' مارتی ذہنی کیفیت۔ وہ اس مذکورہ حوالہ سے یہ ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ

۱۔ پوری امت کا اجماع قبول یا ثابت کرنا اس وقت تک ممکن نہیں جب تک کہ امت کے ہر ہر فرد کے بارے میں اس کی رائے معلوم نہ ہو جائے اور یہ ناممکن ہے۔

۲۔ اگر بالفرض امت کے سارے اہل علم ایک مقام پر جمع ہو جائیں اور بیک زبان ہو کر بآواز بلند ایک رائے پر اتفاق کریں تو بھی اسے اجماع قرار نہیں دیا جا سکتا، کیونکہ امکان ہے کہ کسی نے محض ڈر اور خوف سے ہاں میں ہاں ملا دی ہو یا اس نے اختلاف کیا ہو، لیکن شور میں اس کی آواز دب گئی ہو۔

نتیجہ ظاہر ہے کہ اجماع ممکن نہیں۔ اب عزیزم عمار کی ذہنی کیفیت اور ان کے طرز استدلال کو سامنے رکھ کر جائزہ لیجیے کہ وہ جس اجماع کے وقوع ووجود کا کسی بھی پہلو سے کوئی امکان تسلیم نہیں کرتے، اس کے بارے میں ''دو ذہنی'' کا شکار ہو کر رہ گئے ہیں۔ ایک طرف قرآن وسنت کے بنیادی تصورات واحکام میں اجماع کو ممکن مانتے ہیں اور دوسری طرف نصوص واحکام کی تعبیر وتشریح میں اجماع کو غیر ممکن قرار دیتے ہیں۔ ان کے مذکورہ مفروضات واستدلالات کی روشنی میں ایک پہلو ممکن اور دوسرا کیسے ناممکن ہے؟ یہ فلسفہ ہمارے فہم سے بالا ہے۔ اس کی وضاحت وہی کر سکتے ہیں۔ البتہ اس مقام پر ان کا یہ ''انکشاف'' نہایت افسوسناک ہے کہ جس اجماع کو آج تک پوری امت ایک ''شرعی دلیل'' کے طور پر پیش کرتی رہی ہے، اس اجماع کو وہ ''محض نفسیاتی دلیل'' قرار دے کر اس کا مذاق اڑا رہے ہیں اور پھر ستم بالائے ستم یہ کہ وہ اجماع کو ''علمی افسانہ'' ثابت کرنے کے شوق میں چودہ سو سالہ اسلاف امت کے تحقیق ومطالعہ کو محدود، سطحی اور عامیانہ قرار دے کر ''المورد'' کی علمی وفکری لامحدودیت اور برتری کو ثابت کرنے کے چکر میں ہیں۔ عزیزم عمار کو اس پہلو پر نہایت سنجیدگی سے اپنے طرز فکر کا جائزہ لینا چاہیے۔ ہمارے خیال میں عزیزم عمار نے جو اتنی بڑی علمی ٹھوکر کھائی ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ بعض اہم بنیادی حقائق کی طرف توجہ نہیں دے سکے۔ ہم ان حقائق کی طرف ان کی توجہ مبذول کرانا چاہتے ہیں۔ شاید اس طرح وہ اپنے افکار ونظریات پر ازسرنو نظر ثانی کر سکیں۔

۱) اجماع امت کا تصور اسلاف امت کا تخلیق کردہ نہیں کہ جس کے بارے میں مفروضات قائم کیے جائیں کہ یہ ممکن ہے یا ناممکن! اس کی بنیاد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اس فرمان پر ہے: ان اللہ لا یجمع امتی علی ضلالۃ (ترمذی ۳۹/۲، مستدرک حاکم ۱۱۶/۱) اب یہ فرمان آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے یا تو خبر ہے اور یا بشارت ہے۔ ان

دونوں صورتوں میں ذہن کے اندر یہ سوال اٹھتا ہے کہ کیا پیغمبر برحق صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے ایک ایسی چیز کی خبر یا بشارت دی جا رہی ہے جس کا وقوع وظہور ممکن ہی نہیں؟ ہمارے خیال میں کوئی ضعیف الاعتقاد مسلمان بھی یہ تصور نہیں کر سکتا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے دی گئی کوئی خبر یا بشارت محض مفروضہ یا علمی افسانہ ہو سکتی ہے۔ عزیزم عمار کو مسئلے کے اس پہلو پر محض تحقیقی نظر سے نہیں بلکہ ایمانی حوالہ سے بھی توجہ دینی چاہیے۔

۲) امت مسلمہ کی عظمت وفضیلت کے جو دلائل واسباب بیان کیے گئے ہیں، ان میں بھی ایک دلیل امت کے کسی گمراہی پر متفق نہ ہونے کی ہے اور گزشتہ اوراق میں حجیت اجماع کی بحث کے اندر حضرت شیخؒ کے حوالہ سے گزر چکا ہے کہ تمام امتوں پر شاہد وگواہ ہونے کی وجہ سے امت کی مجموعی عدالت قائم ہے اور وہ کسی گمراہی وضلالت پر متفق نہ ہوگی۔ اس امت نے جسے خیر سمجھا، وہ عند اللہ بھی خیر ہوگی اور جسے شر جانا، وہ عند اللہ بھی شر ہوگی۔ اس پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا امت کی عظمت وفضیلت کا جو سب سے بڑا وصف وکمال بیان کیا جا رہا ہے، وہ محض ایک ''مفروضہ'' اور ''علمی افسانہ'' ہے؟

۳) ہر صاحب علم وشعور اس حقیقت سے واقف وباخبر ہے کہ قرون اولیٰ سے اہل سنت والجماعت کے ہاں اجماع دلائل شرعیہ میں سے ایک مستقل دلیل تسلیم کیا گیا ہے اور چودہ سو سال سے اس دلیل کے ذریعے بے شمار افکار واحکام کا اثبات کیا گیا ہے۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا چودہ صدیوں سے جس دلیل کے ذریعہ ان گنت مسائل کے اثبات ونفی کا کام لیا گیا ہے، وہ محض ایک ''مفروضہ'' اور ''علمی افسانہ'' ہے؟ اور پھر عزیزم عمار کو یہ پہلو بھی سامنے رکھنا چاہیے کہ انھوں نے جن ائمہ کی عبارات سے استدلال کیا ہے، وہ خود ''اجماع'' کو دلیل مانتے ہیں اور چاروں ائمہ مجتہدین دو چیزوں پر اصولی اتفاق رکھتے ہیں۔ پہلی یہ کہ اصول اہل سنت، اصول فقہ اور دلائل شرعیہ چار ہی ہیں اور دوسری یہ کہ قرآن، سنت اور اجماع کے مقابلہ میں کسی مجتہد کو اجتہاد کا حق حاصل نہیں۔ آخر وہ کون سا اجماع ہے جس کے مقابلہ میں کسی بھی مجتہد کے لیے اجتہاد کے دروازے بند ہو جاتے ہیں اور جس کے منکر کو فقہائے کرام کافر یا اہل السنۃ والجماعۃ سے خارج قرار دیتے ہیں؟

۴) چودہ صدیوں سے اجماع کے بالمقابل کسی کی رائے کو قبول نہیں کیا گیا۔ اس کے مقابلہ میں رائے دو ہی قسم کی ہو سکتی تھی۔ یا بغاوت یا اجتہادی لغزشیں۔ بغاوت وسرکشی کو تو ہمیشہ گمراہی وضلالت قرار دیا گیا ہے، البتہ اجماع کے مقابلہ میں کسی مسلمہ بزرگ کی رائے کو تفرد قرار دیا گیا ہے یعنی یہ رائے تو بہر حال غلط ہے، لیکن اس کے پیچھے صاحب رائے کی بدنیتی ثابت نہیں ہو سکی، اس لیے اس پر اسے مطعون نہیں کیا جا سکتا۔ اگرچہ عزیزم عمار کو بھی اس پر شکوہ ہے کہ کسی کو رائے کو تفرد قرار دے کر اس کی حیثیت کمزور کرنا مناسب نہیں۔ چنانچہ لکھتے ہیں کہ:

''عام طور پر اہل علم کی ایسی آرا کو تفرد کہہ کر ان کی علمی اہمیت کو کم کرنے کی کوشش کی جاتی ہے، حالانکہ ان آرا کو جزوی اطلاق کے لحاظ سے تو تفرد کہا جا سکتا ہے، لیکن یہ کسی علمی بے اصولی یا حقیقی اور بنیادی مسلمات سے انحراف پر مبنی نہیں ہوتیں بلکہ مسلمات کے دائرہ میں معروف ومانوس علمی اصولوں ہی کے ایک نئے اطلاق سے وجود میں آتی ہیں۔ ظاہر یہ کہ یہ حتمی نہیں ہوتیں اور سابقہ آرا کی طرح ان سے بھی اتفاق یا اختلاف کی پوری گنجایش موجود ہوتی ہے، لیکن محض اچھوتا ہونے کی بنا پر انہیں علمی روایت سے انحراف قرار دینا کسی طرح درست نہیں۔'' (تنقیدات کا جائزہ، ص ۲۲)

عزیزم عمار کا یہ کہنا کہ اجماع کے مقابلہ میں کسی کی شخصی رائے سے اتفاق یا اختلاف کی اتنی ہی گنجایش ہوتی ہے جتنی کہ سابقہ یعنی اجماعی آرا سے اتفاق واختلاف کی، بہر حال محل نظر ہے۔ کیوں کہ ایک رائے پر (اگر بقول عزیزم عمار اجماع کی

معروف تعریف اس پر نہ بھی تسلیم کی جائے) کثیر اہل علم وتحقیق کا اتفاق ہے اور دوسری رائے فرد واحد کی ہو، دونوں سے اتفاق واختلاف کی مساویانہ گنجایش نا قابل فہم ہے۔ اور پھر شخصی رائے کو اجماع کے مقابلہ میں علمی بے اصولی یا حقیقی وبنیادی مسلمات سے انحراف تسلیم نہ کرنا بھی اسی وجہ سے ہے کہ عزیزم عمار اجماعی واتفاقی رائے تسلیم کرنے کی بجائے اسے صرف معروف ومانوس رائے قرار دیتے ہیں۔ بہر حال ہمارا نقطہ نظر یہ ہے کہ اجماعی رائے یا بقول عزیزم عمار معروف ومانوس رائے کے مقابلہ میں تفردات کو کبھی بھی قبول نہیں کیا گیا۔ چنانچہ برادر مکرم حضرت مولانا علامہ زاہد الراشدی مدظلہ فرماتے ہیں کہ

''آج کے نوجوان اہل علم جو اسلام کے چودہ سو سالہ ماضی اور جدید گلوبلائزیشن کے ثقافتی ماحول کے سنگم پر کھڑے ہیں، وہ نہ ماضی سے دستبردار ہونا چاہتے ہیں اور نہ مستقبل کے ناگزیر تقاضوں سے آنکھیں بند کرنے کے لیے تیار ہیں۔ وہ اس کوشش میں ہیں کہ ماضی کے علمی ورثہ کے ساتھ وابستگی برقرار رکھتے ہوئے قدیم وجدید میں تطبیق کی کوئی قابل قبول صورت نکل آئے مگر انہیں دونوں جانب سے حوصلہ شکنی کا سامنا ہے اور وہ بیک وقت قدامت پسندی اور تجدد پسندی کے طعنوں کا ہدف ہیں۔ مجھے ان نوجوان اہل علم سے ہمدردی ہے، میں ان کے دکھ اور مشکلات کو سمجھتا ہوں اور ان کی حوصلہ افزائی کو اپنی دینی ذمہ داری سمجھتا ہوں، صرف ایک شرط کے ساتھ کہ امت کے اجتماعی تعامل اور اہل سنت والجماعت کے علمی مسلمات کا دائرہ کراس نہ ہو، کیونکہ اس دائرے سے آگے بہر حال گمراہی کی سلطنت شروع ہو جاتی ہے۔'' (حدود وتعزیرات، ص ۱۳)

برادرم محترم علامہ راشدی مدظلہ کے مذکورہ ہمدردانہ ودرمندانہ موقف میں چند تحفظات کے باوجود ہمیں ان کی اس شرط سے کلی اتفاق ہے کہ امت کے اجماعی تعامل اور اہل سنت والجماعت کے علمی مسلمات کا دائرہ کراس کرنے والے ''تفردات'' کو نہ پہلے کبھی قبول کیا گیا ہے اور نہ اب اس کی کوئی گنجایش ہے، کیونکہ اس سے آگے گمراہی کی سلطنت شروع ہو جاتی ہے۔ اور تفردات گمراہی کب بنتے ہیں؟ جب انہیں اپنی ذات سے باہر لا کر ان کی اشاعت وترویج کا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے، چنانچہ علامہ زاہد الراشدی مدظلہ فرماتے ہیں کہ

''اور تفردات کے بارے میں ہمارا موقف یہ ہے کہ یہ ہر صاحب علم کا حق ہے جس کا احترام کیا جانا چاہیے، بشرطیکہ وہ ان کی ذات یا ان کے حلقہ تک محدود رہے۔ البتہ اگر کسی تفرد کو جمہور اہل علم کی رائے کے علی الرغم سوسائٹی پر مسلط کرنے کی کوشش کی جائے تو وہ فکری انتشار اور ایک نئے مکتب فکر کے قیام کا سبب بنتا ہے اور یہی وہ نکتہ اور مقام ہے جہاں ہمارے بہت سے قابل قدر اور لائق احترام مفکرین نے ٹھوکر کھائی ہے اور امت کے اجتماعی علمی دھارے سے کٹ کر جداگانہ فکری حلقوں کے قیام کا باعث بنے ہیں۔'' (ایک علمی وفکری مکالمہ، ص ۱۲)

یعنی تفردات کو جب پبلک کے اندر لانے کی کوشش کی جائے تو وہ ایک نیا مکتب فکر بن کر گمراہی کا باعث بنتے ہیں، لیکن اس مقام پر ہمیں برادر مکرم مدظلہ کے اس موقف سے شدید اختلاف ہے کہ ''تفردات ہر صاحب علم کا حق ہے۔'' ہمارے خیال میں تفردات قائم کرنا حق نہیں ہے، معذوری ہے، کیونکہ حق قرار دینے کا مطلب یہ ہے کہ اس کے دروازے ہمیشہ کے لیے ہر صاحب علم کے لیے کھلے ہیں۔ جب کہ ہمارا موقف یہ ہے کہ ماضی کے اہل علم کے تفردات کو ان کا حق تسلیم نہیں کیا گیا بلکہ ان کی معذوری قرار دیا گیا ہے اور خود برادر مکرم اس حقیقت کو تسلیم کرتے ہیں کہ امت کے اجماعی تعامل اور اہل سنت والجماعت کے علمی مسلمات کا دائرہ کراس کر کے آگے گمراہی کی سلطنت شروع ہو جاتی ہے اور ان مسلمات کے بالمقابل رائے وتفرد کو اگر سوسائٹی تک لے آیا جائے تو فکری انتشار کے ساتھ ایک نیا مکتب فکر جنم لیتا ہے۔ ہمارے فہم سے بالا ہے کہ

جب اجماعی تعامل اور مسلمات کے بالمقابل کسی رائے اور ''تفرد'' کی عملی زندگی کے اندر گنجایش ہی نہیں اور وہ سوسائٹی میں آ کر فکری انتشار پیدا کر سکتی ہے تو اس رائے یا تفرد کے لیے کسی کا حق کیسے تسلیم کیا جا سکتا ہے؟ ماضی کے تفردات کے ساتھ ہمارے اسلاف کا رویہ یہی ظاہر کرتا ہے کہ وہ اسے حق نہیں، معذوری تسلیم کرتے ہیں۔ بہر حال اس بحث سے ہمارا مقصود یہ ہے کہ بقول عزیزم عمار اگر اجماع کی معروف و مانوس صورت پر حقیقی اجماع کا اطلاق ہی نہیں ہوتا تو اس کے بالمقابل رائے کو گمراہی یا تفرد قرار دے کر مسترد کیوں کیا گیا ہے؟ اور پھر ماضی کے تفردات کو جب قبول نہیں کیا گیا اور مستقبل کے تفردات کو بھی امت کی طرف سے قبول کرنے کا کوئی چانس نہیں ہے تو پھر ان پر اپنی انرجی ضائع کر کے امت کے اندر فکری انتشار پیدا کرنے اور خود کو امت کے اجتماعی علمی و فکری دھارے سے کاٹنا آخر کہاں کی دانش مندی ہے؟

وہ وقفِ خزاں ہی سہی ہم نفس
چمن پھر چمن ہے قفس پھر قفس

چوتھی دلیل شرعی: قیاس واجتہاد

گزشتہ سطور میں گزر چکا ہے کہ حضرت شیخ قیاس واجتہاد کو عقل وبصیرت کا نام دیتے ہیں، اسے دلائل شرعیہ اور اصول اہل سنت میں تسلیم کرتے ہیں، اس کی حجیت کا اقرار کرتے ہیں، لیکن اس کی حدود وقیود کیا ہیں؟ ان کے بارہ میں حضرت شیخ کا موقف ملاحظہ فرمائیں:

۱۔ مولانا نواب صدیق حسن خان بھوپالیؒ کی الجنۃ ص ۱۱۲ اور افادۃ الشیوخ ص ۲۲ کے حوالہ سے فرماتے ہیں کہ

''جمہور حضرات صحابہ کرامؓ وتابعین، فقہا ومتکلمین اس طرف گئے ہیں کہ شرعی قیاس اصول شریعت میں سے ایک اصل ہے۔ احکام سمعی میں (جو محض عقلی نہ ہوں) جب کہ ان کے اثبات کے لیے نص اور اجماع نہ ہو تو قیاس شرعی سے استدلال کیا جا سکتا ہے۔'' (الکلام المفید ص ۱۱۳)

۲۔ ائمہ کے مختلف اقوال نقل کرنے کے بعد فرماتے ہیں کہ

''ان اقتباسات سے یہ ثابت ہوا کہ ایسی رائے قابل اعتبار نہیں جو کتاب وسنت سے متصادم ہو یا جس رائے کی بنیاد کتاب وسنت یا اجماع امت پر نہ رکھی گئی ہو۔ بخلاف اس کے وہ قیاس اور رائے محمود اور مقبول ہے جو ان تینوں میں سے کسی اصل پر مبنی ہو۔ (مقام ابی حنیفہ ص ۲۰۴)

۳۔ ''حضرت امام بیہقی کے اس واضح وصریح قول سے یہ ثابت ہو گیا کہ حضرت عمرؓ سے رائے کی مذمت کے الفاظ آئے ہوں یا کسی اور سے، اس سے مراد ہر وہ رائے ہے جو اصول ثلاثہ (قرآن، سنت اور اجماع امت) میں سے کسی اصل کے مشابہ اور اس پر متفرع نہ ہو، اور جہاں نص موجود نہ ہو، ایسے مقام پر رائے واجتہاد سے کام لینا اکثر امت سے ثابت ہے۔'' (مقام ابی حنیفہ ص ۲۰۷)

۴۔ ''جملہ اہل اسلام کا اس امر پر اتفاق ہے کہ فروعی مسائل میں خطائے اجتہادی (بشرطیکہ کسی مجتہد سے نیک نیتی کی وجہ سے واقع ہو) قابل مواخذہ نہیں ہے اور نہ صرف یہ کہ ایسا شخص معذور تصور ہوگا بلکہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے وہ ماجور بھی ہوگا، جیسا کہ اس پر صحیح اور صریح حدیث موجود ہے۔ (دیکھیے بخاری ۲/۱۰۹۲، مسلم ۲/۷۶) لیکن اصول دین، ضروریات دین اور عقائد کا معاملہ اس سے بالکل الگ ہے، کیونکہ ان میں دیانت کے ساتھ غلطی بھی قابل عفو نہیں ہے اور نہ اس باب

میں جہالت اور لاعلمی کی بنا پر کوئی شخص معذور سمجھا جا سکتا ہے۔ اور اسی طرح قرآن کریم، حدیث مشہور، اجماع اور قیاس جلی کا مخالف بھی معذور نہیں ہو سکتا، اگرچہ وہ شخص اپنے دعویٰ پر خبر غریب بھی پیش کرتا ہو۔'' (ازالۃ الریب ص ۴۲۴)

۵۔ التلویح ص ۶۷، حسامی ص ۱۵۷، شرح حموی ص ۲۶۷، شرح فقہ اکبر ص ۲۳۷، الیواقیت والجواہر للعلامہ عبد الوہاب شعرانی ۱/۲۱، تفہیمات الٰہیہ للشاہ ولی اللہ دہلویؒ ۱/۱۵۵ اور انباہ الاذکیاء للسیوطی ص ۱۰ کے حوالہ جات نقل کرنے کے بعد فرماتے ہیں کہ:

''ان اقتباسات سے یہ بات روشن ہو جاتی ہے کہ اصول دین اور عقائد میں اور اسی طرح قرآن کریم، حدیث مشہور، اجماع اور قیاس جلی کے مقابلہ میں اگرچہ خبر غریب بھی پیش کی جاتی ہو، تب بھی وہ باطل ومردود ہوگی اور اس باب میں مخالف یا مخطی ہرگز معذور نہیں ہو سکتا۔'' (ازالۃ الریب ص ۴۲۵)

۶۔ ''ہمارے ہاں تقلید کی تفصیل ہے۔ وہ یہ کہ قرآن وحدیث اور اجماع کے دلائل کی موجودگی میں یا ان کے مقابلہ میں تقلید حرام، ناجائز، مذموم اور بدعت ہے۔ اس کی جتنی بھی مذمت کی جائے، کم ہے۔ لیکن اگر کسی مسئلہ کی ان میں صراحت موجود نہ ہو تو ایسے موقع پر کسی مجتہد کی تقلید جائز ہے اور کسی ایک مجتہد کی تقلید سے بھی مکلف عہد برآ ہو جاتا ہے اور اسی کا نام تقلید شخصی ہے۔'' (الکلام المفید ص ۲۳)

۷۔ ''حضرات مقلدین تو بانگ دہل چلا چلا کر کہہ رہے ہیں کہ منصوص مسائل میں اور قرآن وحدیث واجماع کے خلاف کسی کی تقلید جائز نہیں ہے، تقلید صرف ان مسائل میں جائز ہے جو غیر منصوص ہوں۔'' (ایضاً ص ۵۷)

۸۔ ''اجتہاد ہر کس وناکس کا کام نہیں'' کے عنوان کے تحت فرماتے ہیں کہ:

''سابق عبارات اور حوالوں سے یہ بات تو بالکل آشکارا ہو گئی ہے کہ پیش آمدہ غیر منصوص مسائل میں قیاس اور اجتہاد تاقیامت جائز ہے اور اس سے کوئی مخلص اور چارہ نہیں، لیکن اجتہاد کرنا ہر کہ ومہ کا کام نہیں۔ اس کے لیے اصول فقہ کی کتابوں میں اہم اور ضروری شرائط بیان کی گئی ہیں۔'' (ایضاً ص ۶۵)

۹۔ امیر المومنین حضرت سیدنا علیؓ کی روایت کہ ''جس نے اجتہاد کیا اور خطا کی، وہ جہنمی ہے'' کی تشریح میں امام بیہقی کا قول بحوالہ السنن الکبریٰ ۱/۱۱۷ نقل کر کے لکھتے ہیں کہ:

''یہ حدیث اس شخص کے بارے میں آئی ہے جو اپنی رائے سے اجتہاد کرے، مگر اہل اجتہاد سے نہ ہو۔ اگر وہ اہل اجتہاد سے ہو اور ایسی چیز میں اجتہاد کرے جس میں اجتہاد کی گنجایش ہے تو اس سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم کے مطابق ان شاء اللہ خطا بالکل رفع ہو جائے گی۔'' (مقام ابی حنیفہ ص ۲۰۷)

۱۰۔ اہل ظاہر کے پیشوا ومقتدا امام داؤد بن علی الظاہریؒ پہلے شخص ہیں جنہوں نے قیاس کا رد کیا۔ اس بنا پر امام سبکی الشافعیؒ فرماتے ہیں کہ قیاس کی نفی کرنے والے اجتہاد کے درجہ کو نہیں پہنچ سکتے اور قضا کا عہدہ بھی ان کے سپرد کرنا جائز نہیں ہے اور اہل ظاہر علمائے شریعت میں سے نہیں ہیں۔ ہاں صرف ناقل ہیں، اگر ثقہ ہوں۔ (طبقات الشافعیہ الکبریٰ ۲/۵) اس پر تبصرہ کرتے ہوئے حضرت شیخ فرماتے ہیں کہ

''ممکن ہے بعض حضرات کو امام سبکیؒ کا یہ قول ناگوار گزرے کہ اہل ظاہر علمائے شریعت میں سے نہیں ہیں، لیکن ان کی بات بالکل صحیح ہے۔ اولاً اس لیے کہ جمہور اہل اسلام کا ساتھ چھوڑ کر اور ان کی مخالفت کر کے کوئی شخص علمائے شریعت کا فرد کیسے بن

سکتا ہے؟ وثانیاً اگر ایسا شخص قاضی بن جائے تو پیش آمدہ غیر منصوص مسائل اور سب جزئیات قرآن وحدیث میں صراحتاً تو مذکور نہیں ہیں، پھر قیاس سے مخلص کیا ہے؟ وثالثاً مسائل اور احکام کے اثبات کے لیے شریعت میں چار دلیلیں اور اصول ہیں۔ کتاب، سنت، اجماع اور قیاس۔ گو قیاس درحقیقت مظہر ہے، مثبت نہیں، لیکن اصول شریعت میں سے ایک اصل ہے تو اس اصل من اصول الشریعة کو نہ جاننے اور نہ ماننے والا اعلاے شریعت میں سے کیسے ہو سکتا ہے؟" (الکلام المفید ص ۱۱۲۔۱۱۳)

حضرت شیخ کے مذکورہ فرامین وحوالہ جات سے درج ذیل امور بڑی حد تک واضح ہو جاتے ہیں:

پہلا یہ کہ جمہور صحابہ کرامؓ اور اکثر امت کے نزدیک قیاس اصول شریعت میں سے ایک اصل اور دلائل شرعیہ میں سے ایک دلیل ہے جو احکام ومسائل کے لیے مظہر ہے نہ کہ مثبت۔ اس کے ذریعہ کوئی حکم ومسئلہ ثابت نہیں کیا جا سکتا، صرف نصوص (قرآن، حدیث، اجماع) میں سے ظاہر کیا جا سکتا ہے۔

دوسرا یہ کہ قیاس صرف غیر منصوص مسائل میں ہو سکتا ہے اور وہ قیاس محمود بھی ہوگا اور مقبول بھی جب کہ منصوص مسائل (یعنی قرآن وسنت اور اجماع سے ثابت شدہ) میں قیاس واجتہاد کی کوئی گنجایش نہیں اور ایسا ہر قیاس جو ان نصوص کے خلاف یا ان کے مقابلہ میں ہو، مردود ہے۔ اسی طرح قیاس جلی کے مقابلہ میں بھی قیاس مردود ہے۔

تیسرا یہ کہ قیاس کا منکر ومخالف چونکہ مسلمہ اصول اربعہ میں سے ایک اصول کا منکر ومخالف ہے، اس لیے نہ تو وہ علماے شریعت میں شامل ہے، اور نہ ہی وہ کسی عدالت شرعیہ کا قاضی بنایا جا سکتا ہے۔

چوتھا یہ کہ غیر منصوص مسائل میں بھی اجتہاد کرنا ہر کس وناکس کا حق نہیں اور نہ اس کی ہر ایک کو اجازت ہے، بلکہ یہ اجتہاد صرف وہی شخص کر سکتا ہے جو مجتہد ہو اور اس کے اندر اجتہاد کی تمام شرائط پائی جائیں جو اصول فقہ کی کتابوں میں مذکور ہیں۔

پانچواں یہ کہ مجتہد اگر اپنے قیاس واجتہاد میں خطا کر جائے تو وہ فرمان نبوی کے مطابق معذور بھی ہے اور عنداللہ ماجور بھی، جبکہ غیر مجتہد اگر اپنے اجتہاد میں خطا کرے تو فرمان نبوی کی روشنی میں وہ جہنمی ہے۔

چھٹا یہ کہ مجتہد کے لیے بھی اصول دین، ضروریات دین اور عقائد شرعیہ میں اجتہاد کرنا جائز نہیں۔ اگر ان میں اجتہاد کرے گا (خواہ جہالت ولاعلمی کی بنا پر ہو) تو وہ اجتہاد مردود ہوگا، کیوں کہ یہ اس کے دائرۂ اجتہاد سے باہر ہے۔

ساتواں یہ کہ تقلید کا انحصار چونکہ اجتہاد پر ہے، لہٰذا جن مسائل میں اجتہاد جائز ہے، ان میں کسی مسلمہ مجتہد کی تقلید بھی جائز ہے اور جن مسائل میں اجتہاد ناجائز ہے، ان میں تقلید بھی مذموم، حرام اور بدعت ہے۔

آٹھواں یہ کہ جمہور اہل اسلام کا ساتھ چھوڑ کر یا ان کی مخالفت کر کے علیحدگی کا راستہ اختیار کرنے والا بھی ہرگز علماے شریعت میں شامل وداخل نہیں۔

حضرت شیخ سے علمی وفکری نسبت رکھنے والے اصحاب علم وتحقیق کے لیے مندرجہ بالا امور کو اچھی طرح جاننا، سمجھنا اور ان پر گہری توجہ رکھنا نہایت ضروری ہے۔

طائفہ منصورہ

حضرت شیخ نے زندگی بھر یہی اصول رکھا ہے کہ حق تک رسائی حاصل کرنے اور حق پر قائم رہنے کے لیے اہل حق کے

ساتھ وابستگی ضروری ہے۔ اگرچہ بعض آزاد خیالوں کو اس سے بڑی چڑ ہے اور وہ اکثر یہ طعن کرتے رہتے ہیں کہ "بریلوی مقابر پرست ہیں اور دیوبندی اکابر پرست"، لیکن حضرت شیخ نے ایسے طعن وتشنیع کی بھی پروا نہیں کی اور ہمیشہ اپنے موقف ونظریہ کو اکابر کی تحقیقات کے حوالے سے ہی دیکھا اور بیان کیا اور انہی کے ساتھ علمی وفکری تعلق کا باعث سعادت جانا۔ چنانچہ "جماعتی زندگی کا مفہوم اور اس کی اہمیت" کے زیر عنوان فرماتے ہیں کہ:

"بلاشک وشبہ مذہب اسلام نے جماعتی زندگی پر بڑا زور دیا ہے اور جماعتی زندگی کے ترک کو اسلامی زندگی کے ترک سے تعبیر کیا ہے، جس کا نتیجہ سوائے خسران اور عذاب جہنم کے اور کیا ہو سکتا ہے؟ معاذ اللہ تعالیٰ۔ اور حدیث من شذ شذ فی النار (ترمذی ۳۹/۱، مشکوٰۃ ۳۰/۱) کا یہی مطلب ہے۔ اور دوسری حدیث میں واشگاف الفاظ میں رسول برحق صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ ارشاد فرمایا ہے کہ فانه ليس احد يفارق الجماعة شبرا فيموت الا مات ميتة جاهلية (متفق علیہ، مشکوٰۃ ۳۱۹/۲) جو شخص بھی جماعت سے ایک بالشت بھر الگ ہوا اور اسی حالت میں اس کی وفات ہو گئی تو اس کی موت جاہلیت کی موت ہوگی۔ اور ظاہر ہے کہ ایسی زندگی اسلامی زندگی کے سراسر مخالف ہے۔" (تبلیغ اسلام، ص ۳۳)

اس مقام پر جس جماعت کے ساتھ حضرت شیخ وابستگی کو ضروری قرار دے رہے ہیں، اس سے علیحدگی کو خسران اور عذاب جہنم کا ذریعہ قرار دے رہے ہیں اور اس پر موت کو جاہلیت کی موت قرار دے رہے ہیں، وہ جماعت آخر کون سی جماعت ہے؟ اس پر تبصرہ کرتے ہوئے حضرت شیخ فرماتے ہیں کہ:

۱۔ "اس دین قویم کی نصرت اور تجدید کے لیے اللہ تعالیٰ کا وعدہ ہے کہ وہ سخت سے سخت دور طغیان وفساد میں بھی صالحین امت کی ایک جماعت ضرور ایسی قائم رکھے گا جن کے نفوس وقلب خود اللہ تعالیٰ کی پناہ اور حفاظت میں ہوں گے اور وہ اللہ تعالیٰ کے بغیر کسی سے خوف نہیں کھائیں گے۔ ان کا دل صرف ایک ذات سے ڈرے گا جو ڈر کی خالق ہے۔" (تبلیغ اسلام ص ۲۹)

۲۔ بخاری ۱۴۴/۱ کے حوالہ سے حضرت امیر معاویہؓ اور مسلم ۸۷/۱ کے حوالے سے حضرت جابر بن عبد اللہؓ کی یہ روایت نقل کرتے ہیں کہ:

"آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: میری امت میں ایک گروہ ضرور ایسا رہے گا جو حق کو تھامے رکھے گا۔ اس کو وہ لوگ کوئی نقصان نہیں پہنچا سکیں گے جو اسے ذلیل ورسوا کرنے اور اس کی مخالفت کرنے پر تلے ہوں گے۔ وہ حق کی خاطر جہاد وقتال کرے گا، یہاں تک کہ حضرت سیدنا عیسیٰ علیہ السلام نازل ہو جائیں۔

یہ روایت مختلف الفاظ کے ساتھ دیگر متعدد صحابہ کرامؓ سے بھی مروی ہے۔ اس حدیث سے صاف طور پر یہ واضح ہو گیا کہ امت مسلمہ کا ایک حق گو اور حق خواہ طائفہ قیامت تک قائم ودائم رہے گا اور اس مبارک ٹولہ کی آخری کڑی حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے جڑ جائے گی جو آسمان سے نازل ہو کر حق کو باطل پر غالب ومنصور کرنے کے لیے شب وروز کوشاں وساعی ہوں گے اور ان کی زندگی ہی میں یہ شادمانی ان کو حاصل ہوگی کہ صرف دین حق باقی رہ جائے گا اور باقی تمام ادیان مٹ جائیں گے۔" (تبلیغ اسلام ص ۳۱)

۳۔ "چونکہ احادیث کو امت تک پہنچانے کا ذریعہ عالم اسباب میں صحابہ کرام وتابعین، محدثین وفقہاے عظام ہیں، اس لیے منکرین حدیث ان کی مسلمہ ثقاہت وعدالت، امانت ودیانت، ضبط واتقان، حفظ وکتابت کو بھی مجروح کرنے اور ان پر برسنے کو اپنی اس ناپاک تحریک کا کامیاب سبب سمجھتے ہیں اور ان کی تمام دینی خدمتوں اور قربانیوں کا وہ مذاق اڑاتے ہیں کہ

الامان والحفیظ، اور ان پر اس کڑی جرح کا مقصد بھی صرف یہ ہے کہ ''نہ رہے بانس نہ بجے بانسری'' کہ جب محدثین وفقہا ہی قابل اعتماد نہ رہے تو حدیث کیسے ثابت ہوگی؟ لیکن اس خواہش زدہ طبقہ نے مطلق غور نہ کیا کہ اگر درمیان کی یہ کڑی محدثین ہیں تو قرآن کریم ان کی دست برد سے کیونکر محفوظ رہا ہوگا؟ یا ان کا پیش کردہ قرآن حجت کیسے ہوسکتا ہے؟ بے شک اللہ جل مجدہ نے قرآن کریم کی حفاظت کا وعدہ فرمایا ہے، لیکن عالم اسباب میں یہی لوگ اس کی حفاظت کا وسیلہ اور ذریعہ ہیں۔ کسی نے الفاظ یاد کیے، کسی نے لغات یاد کیں تو کسی نے اسباب ونزول۔ حقیقت یہ ہے کہ درمیان کی اس کڑی کو تسلیم کیے بغیر دین کا کوئی ایک حکم بھی ثابت نہیں ہوسکتا۔'' (مسئلہ قربانی، ص ۱۰)

ان حوالہ جات سے ظاہر ہوتا ہے کہ حضرت شیخؒ اسی جماعت سے وابستہ رہنا اور دوسروں کو بھی اسی سے وابستہ رکھنا چاہتے ہیں جو جماعت عہد نبوی سے تواتر وتسلسل کے ساتھ چلی آرہی ہے، جس جماعت کے تسلسل کی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بشارت دی، اور ہر دور کے اندر اس کی موجودگی کی خوشخبری سنائی۔ اس جماعت کی آخری کڑی حضرت سیدنا عیسیٰ علیہ السلام ہوں گے۔ ظاہر بات ہے کہ جماعت نہ تو افراد کے ہجوم سے بنتی ہے اور نہ اشخاص کے ہڑبونگ سے، بلکہ جماعت فکری وحدت سے بنتی ہے۔ وہی فکری وحدت ایک جماعت سے دوسری جماعت کی طرف منتقل ہوتی چلی آرہی ہے۔ اسی فکری وحدت کو ختم یا کمزور کرنے کے لیے منکرین حدیث اور دیگر جدت پسند تمام درمیانی کڑیوں کو بائی پاس کر کے ڈائریکٹ قرآن وسنت تک پہنچنا چاہتے ہیں تاکہ قرآن وسنت کی من پسند تعبیر وتشریح کر کے ان کو اپنی تحقیق کا تختہ مشق بنایا جا سکے۔

یہاں یہ بات نہایت قابل غور ہے کہ اس فکری جماعت کا اولین مصداق اور سب سے پہلی کڑی جماعت صحابہؓ ہے۔ اس لیے خلفاے راشدین وصحابہ کرامؓ نے جن امور پر اتفاق کر لیا اور جن پر اجماع ہو چکا، اب فرمان نبوی کی روشنی میں ان سے اگلی جماعت یعنی تابعینؒ کے لیے لازم ہے کہ وہ پہلی جماعت کے اجماع کو کھڈے لائن نہ لگائیں بلکہ اسی اجماع کو آگے تیسری جماعت یعنی تبع تابعینؒ کی طرف منتقل کریں اور اسی طرح وہ سلسلہ جماعت در جماعت آگے بڑھتا رہے۔ اگر ان اجماعی فیصلوں کو ہر دور کے اندر وقتی تقاضوں کی آڑ میں تبدیل کرنے کی اجازت مل جاتی تو فکری وحدت کا تسلسل ممکن نہ تھا، کیونکہ یہ بات مسلمات میں سے ہے کہ علمی اعتبار سے اگرچہ مرکزی حیثیت دستور ومتن کو حاصل ہوتی ہے، لیکن عملی حوالہ سے بنیادی حیثیت اس دستور ومتن کی تفسیر وتوضیح کو حاصل ہوتی ہے۔ اب اگر کسی دستور ومتن کی تعبیر وتشریح کو ہر دور میں بدلنے کی اجازت دے دی جائے تو وہ بازیچہ اطفال بن کر رہ جائے، اسی لیے امت نے بالاتفاق عہد صحابہ وخلفاے راشدین کی اجماعی تعبیر وتشریح کی ہی کو بنیاد بنایا ہے اور وہ قرآن وسنت کی اصل تعبیر وتشریح تسلیم کی گئی ہے، اور بدقسمتی سے یہاں معاملہ صرف سنت کی تعبیر وتشریح کا نہیں بلکہ اس کی تعریف وتعیین کے لیے بھی پھڈا ڈال دیا گیا ہے۔ چنانچہ جدت پسندوں بالخصوص ڈاکٹر جاوید احمد غامدی کے اسی طرز عمل کا شکوہ کرتے ہوئے علامہ زاہد الراشدی مدظلہ فرماتے ہیں کہ

> ''سنت رسول سے مراد وہی ہے جو امت مسلمہ چودہ سو سال سے اس کا مفہوم سمجھتی آرہی ہے اور اس سے ہٹ کر سنت کا کوئی نیا مفہوم طے کرنا اور جمہور امت میں اب تک سنت کے متوارث طور پر چلے آنے والے مفہوم کو مسترد کر دینا بھی عملاً سنت کو اسلامی قانون سازی کا ماخذ تسلیم نہ کرنے کے مترادف ہے۔'' (حدود وتعزیرات، ص ۱۰)

بہرحال حضرت شیخؒ اسی متواتر جماعت اور اس کے متوارث فکر سے وابستہ رہنے ہی میں ہدایت ونجات جانتے تھے اور اسی جماعت کے بارے میں یہ فرمان نبوی نقل کرتے ہیں کہ اس جماعت سے کٹنے والا جہنمی ہے اور اگر جماعت سے علیحدگی

کی حالت میں ہی اس پر موت آجائے تو وہ جاہلیت کی موت مرے گا۔

علماے دیوبند

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے امت کے تہتر فرقوں میں سے صرف اہل سنت والجماعت کو ناجی وجنتی فرقہ قرار دیا ہے اور دوسرے فرمان میں ہر دور میں اہل حق کی موجودگی کی بشارت دی۔ گویا اہل سنت والجماعت کا گروہ ہی اہل حق ہے اور اسی کی بشارت دی گئی ہے اور اہل سنت والجماعت کا گروہ اپنے اصولوں (قرآن، سنت، اجماع اور قیاس) پر قائم ہے اور یہی اصول ہمیشہ اس کی شناخت رہے ہیں اور انہی اصولوں کی بنیاد پر اس نے تمام باطل وگمراہ فرقوں کا مقابلہ کیا ہے اور ان اصولوں کو ترک کرنے والے اہل سنت سے علیحدہ ہوتے رہے ہیں۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ عصر حاضر کے اندر جماعت حقہ کے اس متواتر سلسلہ کی کڑی کون سا گروہ ہے؟ حضرت شیخؒ پورے اعتماد ویقین کے ساتھ جماعت دیوبند کو اس کی کڑی قرار دیتے ہیں، چنانچہ فرماتے ہیں کہ:

> ''اکابر علماے دیوبند ہر مسئلہ میں اتباع سنت کے ساتھ سلف صالحینؒ کی تحقیق پر کامل اعتماد رکھتے ہیں۔ دیگر مسائل کی طرح وہ بدعت کی تعریف میں بھی سلف کی پیروی کرتے ہیں۔'' (راہ سنت، ص ۷۹)

> ''بحمد اللہ تعالیٰ علماے دیوبند اہل سنت والجماعت کے افراد ہیں اور اصول وفروع میں ان کا کوئی عقیدہ اور عمل اہل سنت والجماعت کے خلاف نہیں ہے، چہ جائیکہ ان کے عقیدہ اور عمل سے متصادم ہو۔ ہم نے اپنی متعدد کتب میں باحوالہ اس پر بحث کی ہے۔'' (اہل سنت کی پہچان، ص ۷)

حضرت شیخؒ اس دور میں (برصغیر پاک وہند کے اندر) جماعت دیوبند کو ہی قرآن وسنت کی موعودہ جماعت حقہ کی کڑی اور اہل السنۃ والجماعت کے اصول وعقائد کی ترجمان قرار دیتے تھے اور ان کا یہ دعویٰ ہر اعتبار سے مبنی برحقیقت ہے کہ جماعت دیوبند کا اصول وفروع میں کوئی عقیدہ اہل السنۃ والجماعت کے خلاف نہیں۔

اس پوری بحث سے یہ نتیجہ سامنے آتا ہے کہ حضرت شیخؒ فرمان نبوی کی روشنی میں اہل السنۃ والجماعت کو ناجی وہدایت یافتہ گروہ تسلیم کرتے تھے، اہل السنۃ والجماعت کے اصول ودلائل کی روشنی میں قرآن وسنت، سنت خلفاے راشدین، تعامل صحابہ وخیر القرون، اجماع امت اور قیاس شرعی کو حجت مانتے تھے، اس کے لیے وہ اہل السنۃ والجماعت کے متواتر ومتوارث گروہ سے فکری وابستگی کو ہی ہدایت ونجات کا ذریعہ سمجھتے تھے اور عصر حاضر میں جماعت دیوبند کو اسی سلسلہ کی کڑی تسلیم کرتے ہوئے اسی کے دامن تحقیق سے وابستہ تھے اور اپنے جملہ متعلقین کو بھی اسی سے وابستہ رکھنا چاہتے تھے۔ خدا تعالیٰ ہم سب کو اسی سے وابستہ رہنے کی توفیق بخشے۔ آمین

امام اہل سنت کا مسلک اعتدال اور عمار خان ناصر

عزیزم عمار خان ناصر کافی عرصہ سے ڈاکٹر جاوید احمد غامدی کی روشن خیال تحریک سے وابستہ ہیں اور اس وابستگی کے بعد ان کا تمام تر مطالعہ غالباً اسی فکر ونظر کے حوالہ سے ہوتا ہے۔ ایسے معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے حضرت شیخؒ کی کتب کا مطالعہ بھی اسی تناظر میں کیا ہے اور اس مطالعہ کے ذریعہ حضرت شیخؒ کے فکر وموقف کو سمجھنے کی بجائے غامدی صاحب کے جدت پسندانہ طرز فکر کے لیے دفاعی مواد تلاش کرنے اور اس کے لیے جواز کی صورتیں پیدا کرنے کی طرف خصوصی توجہ دی گئی ہے۔ یہی

وجہ ہے کہ حضرت شیخؒ کی کتب کا مطالعہ کرنے کے بعد عزیزم عمار کے قلم سے اس کا جو نتیجہ سامنے آیا ہے، اس میں حقیقت پسندانہ رنگ کہیں نظر نہیں آتا اور شعوری یا غیر شعوری طور پر وہ حقیقی و واقعی نتیجہ اخذ کرنے سے محروم و قاصر رہے ہیں۔ غالباً ان کی اس ساری کاوش کا محور غامدی صاحب کی علمی حیثیت کو مسلم کرانا ہے۔ حضرت شیخؒ کی وفات کے بعد ان کے کسی زیر تسوید مضمون کا ایک اقتباس ہفت روزہ ''وزارت'' لاہور کی ۱۰ تا ۲۳ رجون ۲۰۰۹ء کی اشاعت میں ''امام اہل سنتؒ کا مسلک اعتدال'' کے عنوان سے شائع ہوا ہے۔ جس میں فرماتے ہیں کہ:

''امام اہل سنت حضرت مولانا سرفراز خان صفدرؒ اپنی آرا و نظریات میں جمہور اہل علم کے موقف کی سختی کے ساتھ پابندی کرتے تھے۔ ان کا نقطہ نظر یہ تھا کہ کسی بھی علمی یا فقہی مسئلہ میں جمہور امت جس رائے کی تائید کریں، وہ اقرب الی الحق اور قرین صواب ہوتی ہے۔ انہوں نے اپنی تصانیف میں زیر بحث آنے والے کم وبیش تمام مسائل کی تحقیق میں اس زاویہ نگاہ کو ملحوظ رکھا ہے اور اپنے تلامذہ اور متعلقین کو بھی یہی ہدایت کرتے تھے کہ مختلف گمراہ کن نظریات کے اثرات سے بچنے کے لیے جمہور علمائے امت کی تحقیقات کا دامن تھامے رکھنا ہی محفوظ ترین اور محتاط ترین راستہ ہے۔ تاہم اس معاملے کا ایک دوسرا پہلو بھی ہے جسے وہ پورے اعتدال اور توازن کے ساتھ ملحوظ رکھتے تھے۔ وہ اس نکتہ کو بہت اچھی طرح سمجھتے تھے کہ بلند فکری اور ذہنی معیار رکھنے والے اہل علم اور محققین بسا اوقات کسی مسئلہ میں عام رائے پر اطمینان محسوس نہیں کرتے اور ان کا غور وفکر انہیں معروف و مانوس نقطہ نظر سے مختلف رجحان اختیار کرنے پر آمادہ کر سکتا ہے، چنانچہ وہ ایسے اہل علم کے لیے جن کی علمی حیثیت مسلم ہو، عام آرا سے اختلاف یا تفرد کا حق بھی پوری طرح تسلیم کرتے تھے، بشرطیکہ اس اختلاف کو علمی حدود میں رکھا جائے اور اس کی وجہ سے جمہور اہل علم پر طعن و تشنیع کا طریقہ اختیار نہ کیا جائے۔''

اس کے بعد عزیزم عمار نے حضرت شیخؒ کی بعض کتب سے چند اقتباسات و عبارات اور ان پر اپنے اخذ کردہ ذہنی تاثرات نقل کیے ہیں اور آخر میں اپنا حتمی ذہنی نتیجہ بایں الفاظ بیان کیا ہے کہ:

''مذکورہ امور کی روشنی میں میرے نزدیک امام اہل سنت کے موقف اور نظریہ کی درست تعبیر یہ بنتی ہے کہ وہ اصولی طور پر جمہور اہل علم کی آرا و تعبیرات کو ہی درست سمجھتے اور اپنے لیے اس کی پابندی کو بالعموم ضروری تصور کرتے تھے، تاہم اہل علم کے لیے دلائل کی روشنی میں انفرادی رجحانات کا حق بھی تسلیم کرتے تھے اور جمہور سے محض علمی اختلاف کو اہل سنت کے منہج سے انحراف یا گمراہی قرار نہیں دیتے تھے۔''

عزیزم عمار کے ذہن نے حضرت شیخؒ کی چند عبارات سے جو نتائج اخذ کیے، وہ ہم نے بے کم و کاست نقل کر دیے ہیں۔ ہم ان نتائج پر ذرا تفصیل سے روشنی ڈالنا چاہتے ہیں۔

نکتہ اولیٰ: اس مقام پر سب سے پہلا قابل توجہ نکتہ یہ ہے کہ عزیزم عمار بڑے واضح اور غیر مبہم الفاظ میں یہ تسلیم کر رہے ہیں کہ حضرت شیخؒ کا مختار، پسندیدہ اور تلقین کردہ مسلک و موقف اسلاف کی تحقیقات سے وابستہ رہنے اور دوسروں کو ان سے وابستہ رکھنے ہی کا ہے۔ اور حقیقت بھی یہی ہے کہ گمراہ کن نظریات اور ان کے تباہ کن اثرات سے بچنے اور دیگر مسلمانوں کو ان سے بچانے کے لیے حضرت شیخؒ کے نزدیک جمہور علمائے امت کی تحقیقات و تعلیمات سے وابستگی ہی محفوظ ترین اور محتاط ترین راستہ ہے۔ اور حضرت شیخؒ کا یہ موقف و نظریہ کسی وقتی و ہنگامی سوچ کا نتیجہ نہیں، بلکہ اس کے پیچھے ان کا ساٹھ سالہ تحقیق و مطالعہ اور غور وفکر کارفرما ہے۔ گویا یہ ان کے ساٹھ سالہ تحقیق و مطالعہ، غور وفکر اور تجربات و مشاہدات کا نچوڑ ہے۔ اس کے بعد

بھی اگر ان پر علمی اعتماد کرنے والا کوئی شخص تحقیقات اسلاف کا محفوظ و محتاط راستہ ترک کر کے کوئی غیر محفوظ و غیر محتاط راستہ تلاش کرے تو اسے کم سے کم درجہ میں اس کا غیر دانش مندانہ طرز ہی قرار دیا جا سکتا ہے۔

نکتہ ثانیہ: اس مقام پر دوسرا قابل توجہ نکتہ یہ ہے کہ حضرت شیخؒ کے نزدیک امت کے اجماعی مسلک اور جمہور امت کے مسلک میں بڑا واضح اور نمایاں فرق ہے۔ ان کے نزدیک اجماعی مسلک کا مطلب یہ ہے کہ اس موقف و نظریہ پر پوری امت متفق ہے اور اس میں پہلے سے کسی قسم کا کوئی اختلاف موجود نہیں۔ ایسے کسی اجماعی مسئلہ میں حضرت شیخؒ نہ صرف یہ کہ کسی کا حق اختلاف تسلیم نہیں کرتے، بلکہ اختلاف کرنے والے کو گمراہ اور اہل سنت سے خارج قرار دیتے ہیں۔ اور مسلک جمہور سے ان کا مطلب یہ ہے کہ کسی مسئلہ میں امت کے اہل علم و تحقیق کا اختلاف پایا گیا ہے اور اس اختلاف میں ایک طرف اہل علم کی اکثریت یعنی جمہور ہے اور دوسری طرف اہل علم کی ایک قلیل تعداد پائی گئی ہے۔ ایسے اختلافی مسائل میں حضرت شیخؒ خود بھی مسلک جمہور پر عمل کرتے ہیں اور دوسروں کو بھی مسلک جمہور پر عمل کرنے کی تلقین کرتے تھے، البتہ اگر کوئی اہل علم و تحقیق مسلک جمہور سے ہٹ کر کوئی دوسرا مسلک (جو پہلے موجود ہو) اختیار کر لے تو اسے گمراہ اور اہل سنت سے خارج قرار نہیں دیتے اور اسے مسلک جمہور اور جمہور ائمہ اہل سنت پر زبان طعن کھولنے کی بھی اجازت نہیں دیتے۔ عزیزم عمار نے سماع الموتی ص ۶۴ سے حضرت شیخؒ کا یہ موقف نقل کیا ہے کہ ''ہم جمہور کو شرع کی پانچویں دلیل نہیں مانتے۔ ادلہ شرعیہ چار ہی ہیں''۔ گویا جمہور کے مسلک پر عمل کرنا شرعی دلیل کے حوالے سے نہیں بلکہ شرعی احتیاط کے طور پر ہے، کیونکہ ہم کتنے ہی ذہین و فطین کیوں نہ ہوں، جمہور اہل علم کی رائے، علم و فہم اور امانت و دیانت کے اعتبار سے بہر حال ہماری رائے پر فائق و برتر ہے، اس لیے اسے قبول کر لینا ہی احتیاط کا تقاضا ہے اور ہمارے خیال میں اتبعوا السواد الاعظم کے فرمان نبوی میں بھی اسی طرف اشارہ ہے کہ اختلافی مسائل میں امت کے سواد اعظم یعنی جمہور کی اتباع کی جائے۔

نکتہ ثالثہ: اس مقام پر تیسرا قابل غور نکتہ یہ ہے کہ عزیزم عمار نے ایک جملہ اپنی عبارت میں ایسا لکھا ہے جس نے ہمیں چونکا دیا ہے اور اگر انہوں نے یہ جملہ شعوری طور پر لکھا ہے تو ہمارے نزدیک نہ صرف خطرناک ہے بلکہ گمراہ کن بھی ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ ''بلندی فکری و ذہنی معیار رکھنے والے اہل علم و تحقیق اگر معروف و مانوس موقف کے خلاف کوئی رائے قائم کر لیں''۔ اس جملہ سے معلوم ہوتا ہے کہ عزیزم عمار کے نزدیک جمہور امت کے معروف و مانوس مسلک پر عمل کرنے والے اہل علم نہ تو بلندئ فکر رکھتے ہیں اور نہ ہی ان کا ذہنی معیار ہے۔ کس قدر حیرت و تعجب کی بات ہے کہ اسلاف امت کے فکر تک رسائی حاصل کرنے والے تو بلندئ فکر اور ذہنی معیار سے محروم ہیں اور اپنی ناقص و نارسا عقل سے سر ٹکرانے والے بلند فکر بھی ہیں اور ذہنی معیار بھی رکھتے ہیں۔ العیاذ باللہ۔ ہم عزیزم عمار کی توجہ بار بار اس خطرناک جملہ کی طرف دلانا چاہیں گے جس کا نتیجہ بظاہر یہ سامنے آتا ہے کہ دادا تو بلندئ فکر اور ذہنی معیار دونوں سے محروم تھا، جب کہ پوتا بلندئ فکر کی دولت سے مالا مال ہے اور ذہنی معیار کی نعمت سے بھی۔ اور ایسا شاید اس لیے ہو گیا ہے کہ دادا کی نسبت فکری طور پر اسلاف امت اور بزرگان دیوبند کی طرف ہے اور پوتا ڈاکٹر جاوید احمد غامدی جیسے مفکر اعظم سے فکری نسبت رکھتا ہے اور ان دونوں کا بھلا جوڑ ہی کیا ہے؟

ہم لاکھ مہذب ہوں مگر تم ہی بتاؤ
جب ضبط کا پیمانہ چھلکتا ہی چلا جائے

نکتہ رابعہ: اس مقام پر چوتھا قابل توجہ نکتہ یہ ہے کہ حضرت شیخ کے نزدیک دینی مسائل میں ہر کس وناکس کو اپنی رائے قائم کرنے کا حق نہیں، بلکہ اس کے لیے علمی کمال اور فنی صلاحیت کی ضرورت ہے۔ چنانچہ ایک مقام پر فرماتے ہیں کہ

''بلاشبہ ہر صاحب الرائے اور صائب الرائے کو غیر منصوص اور غیر اجماعی مسائل میں اپنی رائے پر عمل کرنے کا حق ہے، لیکن سلف صالحین کا دامن چھوڑ کر اور خود رائے بن کر پانچواں سوار بننا بھی کسی طرح مستحسن نہیں۔'' (مودودی صاحب کا ایک غلط فتوی، ص ۴۶)

اور اپنے عظیم وشفیق استاد، جامع المعقول والمنقول حضرت مولانا عبدالقدیرؒ کی کتاب ''تدقیق الکلام'' کے مقدمہ میں فرماتے ہیں کہ

''مذہب اسلام کے مسائل دو حصوں میں منقسم ہیں: ایک اصول اور دوسرا فروع۔ اصول دین میں اختلاف انتہائی مذموم اور قبیح ہے اور اس اختلاف کی وجہ سے آدمی یا تو سرے سے دین ہی سے خارج ہو جاتا ہے اور یا اہل حق سے کٹ کر اور ہٹ کر اہل بدعت کے فرقوں میں شامل ہو جاتا ہے۔ اور فروع دین میں اختلاف اگر مجتہد سے رونما ہو تو وہ معذور بلکہ ماجور ہوگا اور اگر غیر مجتہد یہ کاروائی کرے اور اس میں تعصب مذہبی بھی شامل ہو تو وہ گنہگار ہوتا ہے۔ حضرات ائمہ دینؒ کے فروعی اختلاف سے، جو خالص دیانت اور خلوص نیت پر مبنی ہیں، کتب فقہ، شروح حدیث اور کتب تفسیر بھری پڑی ہیں۔ (تدقیق الکلام، ص ۹)

اور اپنے ایک مایہ ناز شاگرد حضرت مولانا حافظ حبیب اللہ ڈیرویؒ کی کتاب ''نور الصباح فی ترک رفع الیدین بعد الافتتاح'' کے پیش لفظ میں حضرت شیخ فرماتے ہیں کہ

''مذہبی اختلافات اصولاً دو قسم کے ہیں۔ ایک عقائد واصول کے، دوسرے اعمال وفروع کے۔ اول قسم کے اختلاف بہر حال وبہر کیف مذموم اور زہر قاتل ہیں۔ علم ودیانت کے ساتھ ہوں یا لاعلمی ونیک نیتی سے۔ زہر کو اگر کوئی شخص زہر سمجھ کر کھائے، تب بھی اس کا اثر مرتب ہوگا اور اگر بے خبری میں اسے کھانڈ یا چورن سمجھ کر استعمال کرے، عالم اسباب میں پھر بھی اس کا اثر ضرور مرتب ہوگا۔ اس لیے اصولی اور عقیدہ کے اختلاف میں علم ودیانت اور اجتہاد وقیاس کوئی چیز اس کی قباحت وشناعت میں کمی پیدا نہیں کرتی اور ایسے اصولی اختلاف جن میں ضروریات دین میں سے کسی امر کا انکار یا تاویل ہو، یقیناً کفر اور قطعاً باعث ملامت وگرفت ہے۔ رہے فروعی اختلاف تو ان میں خاصی تفصیل ہے جس کے لیے دفتر کے دفتر بھی ناکافی ہیں۔ ان کا نہایت ہی مختصر الفاظ میں خلاصہ یہ ہے کہ اگر فرعی اختلاف ناشی عن دلیل ہو اور اختلاف کرنے والا مجتہد ہو اور اس کی دیانت وعدالت وتقویٰ وورع مسلم ہو اور اختلاف میں بھی حظ نفس اور اپنی خواہش کی پیروی میں نہ ہو اور نہ تن آسانی کے لیے اپنے نفس کے لیے سہولت مطلوب ہو تو ایسا مجتہد خطا کی صورت میں بھی صرف معذور ہی نہیں بلکہ صحیح احادیث کی روشنی میں ماجور بھی ہوگا۔ اور اگر اختلاف کرنے والا اجتہاد وتفقہ کی کشتی کا پانچ ں سوار ہو اور اختلاف میں حظ نفس اور تن آسانی بھی ملحوظ ہو تو اس کے قبیح ومذموم ہونے میں رتی بھر شک نہیں ہے۔ اور جو احا یث ودلائل رائے اور قیاس کی مذمت میں وارد ہیں، وہ سب اسی صورت سے وابستہ اور متعلق ہیں۔ لاشک فیہ۔'' (نو. لصباح ص ۱۰)

مذکورہ تینوں عبارات میں حضرت شیخ نے تین چیزیں دوٹوک الفاظ میں واضح کر دی ہیں:

۱۔ پہلی یہ کہ اصول دین یعنی منصوص اجماعی مسائل کے اندر کسی کو اختلاف کا حق نہیں، خواہ وہ مجتہد ہی کیوں نہ ہو، خواہ وہ اختلاف امانت ودیانت پر ہی مبنی کیوں نہ ہو، کیوں کہ ان میں اختلاف زہر کی مانند مہلک وخطرناک ہے۔ ان میں اختلاف کرنے والا یا تو دین اسلام سے ہی خارج ہو جاتا ہے اور یا اہل سنت سے نکل کر اہل بدعت کے فرقوں میں شامل ہو جاتا ہے اور یہ اختلاف انتہائی مذموم وقبیح ہے۔

۲۔ دوسری یہ کہ فروع دین یعنی غیر منصوص وغیر اجماعی مسائل میں کوئی رائے قائم کرنا ہر شخص کا حق نہیں، صرف مجتہد یعنی صاحب الرائے اور صائب الرائے کا حق ہے۔ ایسا مجتہد جس کی عدالت ودیانت اور تقویٰ وورع مسلم ہو اور اس اختلاف کے پیچھے خواہش کی پیروی اور نفس کی سہولت بھی مطلوب نہ ہو، اگر ایسے مجتہد کی رائے غلط بھی ہوگی تو وہ معذور بھی ہوگا اور عند اللہ ماجور بھی۔ اس کے برعکس اگر اختلاف کرنے والا کشتی اجتہاد کا پانچواں سوار ہو تو اس کی غلط رائے اسے گنہگار بھی بنا سکتی ہے۔

۳۔ تیسری یہ کہ غیر منصوص وغیر اجماعی مسائل میں اگر سلف صالحین کی پہلے سے کوئی رائے موجود ہو تو اس کے مقابلہ میں صاحب رائے کے لیے بھی کوئی نئی رائے قائم کرنا مستحسن نہیں۔ البتہ اگر وہ کوئی نئی رائے قائم کر کے اس پر عمل کر گزرے تو اسے گمراہ بھی قرار نہیں دیا جائے گا۔

ان امور ثلاثہ پر اگر گہری توجہ دی جائے تو حضرت شیخ کا صرف موقف ونظریہ ہی نہیں بلکہ ان کا مکمل تحقیقی فکر وفلسفہ بہت واضح صورت میں نمایاں وآشکارا ہو جاتا ہے۔ عزیزم عمار نے بھی اپنے مضمون کے اندر اس حقیقت کو تسلیم کیا ہے کہ حق اختلاف صرف ان اہل علم کا ہے جن کی علمی حیثیت مسلم ہے۔

جدید مفکرین کی علمی حیثیت

مذکورہ امور ثلاثہ کی وضاحت کے بعد اب بحث کا یہ پہلو زیادہ توجہ طلب ہو جاتا ہے کہ کسی صاحب علم کی علمی حیثیت کو مسلمہ قرار دینے کے لیے آخر اتھارٹی کیا ہے؟ اور کسی کو صاحب الرائے اور صائب الرائے تسلیم کرنے کے لیے آخر کس پیمانہ کی ضرورت ہے؟ کیا اس کا دعویٰ اور اس کے چند حواریوں کا پروپیگنڈہ اس کی علمی حیثیت منوا سکتا ہے؟ کیا اس طرح واصل بن عطا اور ابو علی جبائی، ملا ابو الفضل، ملا فیضی اور سر سید احمد خان جیسے لوگوں کی علمی حیثیت مسلم ہو سکی؟ اگر عقل اور فطرت کے تقاضوں کی روشنی میں دیکھا، جانچا اور پرکھا جائے تو اس عقلی وفطری اصول سے کوئی بھی ذی ہوش انکار نہیں کر سکتا کہ جب تک سوسائٹی کے اندر معروف ومسلم اصحاب علم وفہم کی جماعت یا ان کی کثیر تعداد کسی کو علمی اعتبار سے مسلم اور صاحب رائے تسلیم نہ کرے، اس وقت تک اس کی علمی حیثیت مسلم نہیں ہو سکتی۔ کم از کم اگر کسی ایک مکتب فکر کے اصحاب علم بھی اس کی ضمانت دے دیں تو اس مکتب فکر کی حد تک اس کی علمی حیثیت مسلم تسلیم کی جا سکتی ہے۔ ہم فی الوقت صرف حضرت شیخ کے حوالہ سے دیکھنا چاہیں گے کہ وہ عصر حاضر کے جدید مفکرین میں سے کسی کی علمی حیثیت تسلیم کرتے ہیں یا نہیں؟

ہم گزشتہ اوراق میں مدلل وباحوالہ بحث کے ذریعے یہ ثابت کر چکے ہیں کہ حضرت شیخ اصول وفروع میں اول وآخر سنی ہیں، اس لیے انہوں نے عصر حاضر کی ہر علمی شخصیت کو صرف اور صرف اصول اہل سنت کی روشنی میں ہی دیکھا، اسی روشنی میں اس کو جانچا اور پرکھا۔ اگر علم وفہم کے ساتھ وہ اصول اہل سنت کی کسوٹی پر پورا اترا تو حضرت شیخ نے اس کی مسلمہ حیثیت کا برملا اعتراف کیا اور عرب وعجم کے ایسے بے شمار علما ہیں جن کی علمی حیثیت کا (ان کے بعض تفردات کے باوجود) حضرت شیخ نے اپنی کتب کے اندر تذکرہ کیا ہے، اس لیے کہ انہوں نے اصول اہل سنت کے دائرہ میں رہتے ہوئے صرف دلائل کی ترجیحات پر بعض مسائل میں اختلاف کیا۔ اس کے برعکس برصغیر پاک وہند کے متعدد ایسے جدید مفکرین جو عقل وادبیت کے حوالہ سے

ابھرے، جدید اصولوں اور نئی تحقیقات کا جال پھیلایا، لیکن حضرت شیخؒ نے اہل سنت کے اصولوں کے ساتھ ان کو جکڑا اور علمی وعوامی حلقوں میں ان کو بے نقاب کیا۔ چنانچہ ایک مقام پر فرماتے ہیں کہ

''جس طرح قرآن وحدیث اور دین اسلام کی باریکیوں کو حضرات ائمہ دینؒ سمجھتے ہیں، ایسا کوئی اور نہیں سمجھ سکتا اور ان میں سے بھی علی الخصوص حضرات ائمہ اربعہ جن کے مذاہب مشہور ومتداول اور امت مسلمہ میں قابل اعتماد ہیں اور آج کل کے مادر پدر آزاد دور میں ملاحدہ وزنادقہ کو جو اسلام کے مدعی تو ہیں، مگر اسلام کی سمجھ ہی ان کو نہیں اور نہ وہ اس کی روح سے واقف ہیں۔ وہ صرف اپنی نارسا عقل وخرد پر نازاں اور فرحاں ہیں اور اسی کو وہ حرف آخر سمجھتے ہیں اور حضرات سلفؒ پر طعن کرتے ہیں۔'' (ختم نبوت قرآن وسنت کی روشنی میں، ص ۴۲)

اور ایک دوسرے مقام پر فرماتے ہیں کہ:

''قرآن کریم کی صحیح فہم وبصیرت تو احادیث ومحدثین اور فقہا ومفسرینؒ پر اعتماد کرنے کے بعد ہی حاصل ہوتی ہے۔''
(انکار حدیث کے نتائج، ص ۸۷)

حضرت شیخؒ کے مذکورہ فرامین کی روشنی میں یہ فرق واضح ہو چکا ہے کہ مولوی عبد اللہ چکڑالوی، مولوی محمد علی لاہوری، چوہدری غلام احمد پرویز، حافظ محمد اسلم جیراج پوری، علامہ عنایت اللہ المشرقی، سید ابوالاعلیٰ مودودی جیسے جدید مفکرین (جنہوں نے جدید اصول وضع کر کے گمراہیاں پیدا کیں) کی علمی حیثیت کو حضرت شیخؒ قطعاً تسلیم نہیں کرتے، بلکہ انہیں ضال اور مضل قرار دیتے ہیں۔ اس اعتبار سے حضرت شیخؒ کے طرز تحقیق کی روشنی میں دیگر جدید مفکرین کو بھی جانچا اور پرکھا جا سکتا ہے۔ اگر ان کے اصول تحقیق اور ان کا طرز تحقیق اکابر اور اسلاف سے ملتا ہے تو ان کی علمی حیثیت تسلیم کی جا سکتی ہے، ورنہ وہ بقول حضرت شیخؒ پانچواں سوار ہے۔

حضرت شیخؒ اکثر وبیشتر اپنے دروس واسباق میں مودودی صاحب اور ان جیسے دیگر جدید مفکرین کو پانچواں سوار قرار دیتے تھے۔ اصول الشاشی کے سبق کے دوران ایک طالب علم کے سوال پر اس کی وضاحت اس طرح فرمائی کہ شاہی محل کے چار گھڑ سوار شاہی لباس میں ملبوس تیز رفتار گھوڑوں پر بڑی شان وشوکت کے ساتھ دہلی کی طرف رواں دواں تھے۔ ان کی شان وشوکت اور شاہی ٹھاٹھ باٹھ دیکھ کر راستہ میں ہر جگہ لوگ جمع ہو جاتے اور ان سے سوال کرتے کہ آپ کہاں جا رہے ہیں۔ وہ کہتے ہم دہلی جا رہے ہیں۔ ان کے پیچھے پیچھے ایک مفلوک الحال بوڑھا بوسیدہ لباس میں ملبوس، کمزور، لاغر اور مریل سے گدھے پر سوار چلا آ رہا تھا اور لوگوں کے پوچھے بغیر ہی شور مچا رہا تھا: میں بھی دہلی جا رہا ہوں، میں بھی دہلی جا رہا ہوں۔ وہ پانچواں سوار تھا۔

اس مثال سے حضرت شیخؒ کا مطلب یہ تھا کہ فقہا ومجتہدین اور علمائے امت تو علم وفہم کے برق رفتار گھوڑوں پر سوار ہیں، اصول اہل سنت کے شاہی لباس سے آراستہ ہیں، تقویٰ وقبولیت کی شان وشوکت سے مزین ہیں، اصحاب علم واہل ذوق کا ایک جم غفیر ان کی راہوں میں پلکیں بچھائے بیٹھا ہے، ان پر عقیدت ومحبت کے پھول نچھاور کر رہا ہے، ان کی تحقیقات وتعلیمات پر اعتماد کر رہا ہے اور ان کی تقلید واتباع کے ذریعے اپنے عقائد واعمال کی آبیاری کر رہا ہے، جبکہ جدت پسند مفکرین کا طبقہ علم سے محروم اور عقل سے پیدل ہے، ان کا دامن اہل علم کے اعتماد سے خالی ہے اور ان کے ارد گرد دین سے چھٹکارا حاصل کر کے فرائض میں چھوٹ اور معیشت ومعاشرت میں آزادی تلاش کرنے والے مغرب زدہ ماڈرن مسلمانوں کا

ہڑبونگ ہے اور ظاہر بات ہے کہ صرف مطالعہ کے زور پر اصولوں میں تبدیلی، افکار میں تغیر، اسلاف پر عدم اعتماد اور لفظوں کے ہیر پھیر کو علم وتحقیق کا نام تو نہیں دیا جا سکتا۔

پہلی غلطی: عزیزم عمار خان ناصر نے اپنے مضمون کے اندر جس پہلی غلطی کا ارتکاب کیا ہے، وہ جمہور اہل علم کے معروف ومانوس نقطہ نظر سے الگ راستہ نکالنے کے جواز کی حضرت شیخؒ کی طرف نسبت ہے اور اس کے لیے انہوں نے حضرت شیخؒ کی چند ادھوری ومجمل عبارات سے جو تعبیر اخذ کی ہے، ہمارے خیال میں وہ سراسر خلاف حقیقت ہے۔ ہم گزشتہ سطور میں واضح کر چکے ہیں کہ حضرت شیخؒ اجماعی موقف اور جمہور کے موقف میں فرق کرتے ہیں جبکہ عزیزم عمار ان دونوں میں کوئی فرق ملحوظ نہیں رکھتے، کیوں کہ وہ اجماع قطعی کا وجود ہی تسلیم نہیں کرتے، اس لیے وہ اجماعی موقف اور جمہور کے موقف کو ایک ہی قرار دیتے ہیں۔ اس کی بحث گزشتہ سطور میں ہو چکی ہے۔

حضرت شیخؒ اور عزیزم عمار کے موقف میں اس واضح اختلاف کے بعد مذکورہ جواز کی حضرت شیخؒ کی طرف نسبت بالکل بے وقعت ہو کر رہ جاتی ہے۔ اس سے یہ شبہ پیدا ہو سکتا ہے کہ عزیزم عمار نے غالباً غیر شعوری طور پر یہ شبہ پیدا کر دیا ہے کہ حضرت شیخؒ ان مسائل میں بھی اختلاف کو جائز تسلیم کرتے ہیں جو ان کے نزدیک اجماعی ہیں، حالانکہ یہ سراسر غلط ہے۔ اور عزیزم عمار نے بعض اکابر علما کے جمہور سے اختلاف کی جو مثالیں دی ہیں، وہ بھی ظاہر کرتی ہیں کہ اجماعی مسائل میں اختلاف کی گنجائش موجود ہے۔ لہٰذا جب تک یہ بات کنفرم نہ ہو جائے کہ عزیزم عمار اجماعی موقف اور جمہور کے موقف میں اسی طرح فرق کرتے ہیں جس طرح حضرت شیخؒ نے وہ فرق ملحوظ رکھا ہے، اس وقت تک مطلقاً جواز کی نسبت حضرت شیخؒ کی طرف ناقابل تسلیم ہے۔

دوسری غلطی: عزیزم عمار نے اپنے مضمون کے اندر جس دوسری بڑی غلطی کا ارتکاب کیا ہے، اس میں وہ دعویٰ کرتے ہیں کہ حضرت شیخؒ مسلم علمی حیثیت رکھنے والے اہل علم کا جمہور اہل علم کے موقف (بہ الفاظ دیگر اجماعی موقف) سے اختلاف کا حق تسلیم کرتے ہیں۔ ہم نہیں جانتے کہ انہوں نے حضرت شیخؒ کی کن عبارات سے یہ نتیجہ اخذ کیا ہے، کیونکہ حق تسلیم کرنے کا مطلب یہ ہے کہ یہ سلسلہ مستقبل میں بھی جاری رکھا جا سکتا ہے، حالانکہ یہ سراسر غلط ہے اور ہم اسے حضرت شیخؒ پر بہتان عظیم قرار دیتے ہیں۔ اس کے لیے انہوں نے ماضی کے بعض اکابر کے تفردات کا حوالہ دیا ہے کہ ان بزرگوں نے بعض اجماعی مسائل میں اختلاف کیا ہے، لیکن حضرت شیخؒ اس کے باوجود انہیں کافر یا اہل سنت سے خارج قرار نہیں دیتے۔ اس سے قطعاً یہ ثابت نہیں ہوتا کہ حضرت شیخؒ ان کو اختلاف کا حق دیتے ہیں یا ان کا حق تسلیم کرتے ہیں۔ اس کا مطلب تو فقط اتنا ہے کہ ان بزرگوں کی غلطی کو غلطی تسلیم کر کے ان کی مسلمہ علمی حیثیت کے پیش نظر انہیں اہل سنت سے خارج قرار نہ دیا جائے۔ اور ان دونوں باتوں میں بعد المشرقین پایا جاتا ہے۔ اگر حضرت شیخؒ ان کی غلطی کو غلطی ہی تسلیم نہیں کرتے، پھر تو کہا جا سکتا ہے کہ وہ ان کو اجماعی مسائل سے اختلاف کا حق دیتے ہیں، لیکن اگر وہ ان کی غلطی کو غلطی قرار دیتے ہیں، صرف ان کی بلند مقام شخصیت کی بنا پر ان کے خلاف فتویٰ نہیں دیتے تو کیونکر دعویٰ کیا جا سکتا ہے کہ حضرت شیخؒ ان کا حق اختلاف تسلیم کرتے ہیں؟ اور اس حقیقت سے عزیزم عمار بھی یقیناً واقف وباخبر ہوں گے کہ جب یہ کہا جاتا ہے کہ یہ فلاں بزرگ کا تفرد ہے تو اس کا مطلب ہی یہ ہوتا ہے کہ ہمارے لیے ناقابل تسلیم ہے۔ چنانچہ عزیزم عمار خود اپنے مضمون کے اندر حضرت شیخؒ کی

کتاب ''دل کا سرور'' کے ص ۲۱۹ کے حوالہ سے حضرت شیخؒ کا یہ قول نقل کیا ہے کہ

''اگر کسی بزرگ کا قول کسی جگہ مجمل ہے تو ان ہی کی عبارت میں دوسری جگہ اس کی تفصیل بھی عموماً موجود ہے۔ اگر بالفرض اس کی کوئی مناسب تاویل آپ کو نہیں مل سکتی تو قرآن کریم اور احادیث اور اجماع امت کے مقابلہ میں ان کی وہ بات مردود ہوگی، نہ یہ کہ اس پر دین کی اور خصوصاً عقیدہ کی عمارت استوار ہو سکتی ہے۔''

عزیزم عمار اپنے ہی نقل کردہ اس حوالہ پر بغور توجہ دیں کہ حضرت شیخؒ اجماع امت کے خلاف کسی موقف کو غلط و مردود قرار دے رہے ہیں یا اس موقف کو اختیار کرنے والوں کا حق اختلاف تسلیم کرتے ہیں؟

تیسری غلطی: عزیزم عمار نے اپنے مضمون کے اندر جس تیسری بڑی غلطی کا ارتکاب کیا ہے، اس میں یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ حضرت شیخؒ اجماعی مسائل میں علمی اختلاف کو اہل سنت کے منہج سے انحراف یا گمراہی قرار نہیں دیتے تھے۔ حضرت شیخؒ کی کتب و تصانیف اور تحقیقات سے گہری واقفیت رکھنے والے حضرات اچھی طرح جانتے ہیں کہ عزیزم عمار کا یہ موقف و دعویٰ بھی سراسر خلاف حقیقت ہے، کیونکہ عصر حاضر کے مختلف فتنوں کے غیر اجماعی نظریات اور اجماع امت کے خلاف ان کے افکار باطلہ کا رد حضرت شیخؒ نے اجماع امت کے حوالہ سے کیا ہے۔ سید عنایت اللہ شاہ بخاری نے جب مسئلہ حیات النبی اور سماع الموتی عند القبر سے اختلاف کیا اور امت کے اجماعی موقف کے خلاف الگ رائے قائم کی تو مفتی اعظم دار العلوم دیوبند مفتی سید مہدی حسنؒ نے ان کے خلاف فتویٰ دیا کہ:

''آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اپنے مزار مبارک میں بجسدہ موجود ہیں اور حیاتؐ ہیں۔ آپ کے مزار پر پاس کھڑے ہو کر جو سلام کرتا ہے اور درود پڑھتا ہے، آپ خود سنتے ہیں اور جواب دیتے ہیں۔ جو اس کے خلاف کہتا ہے، وہ غلط کہتا ہے، وہ بدعتی ہے۔ خارج اہل السنۃ والجماعۃ ہے، خراب عقیدہ والا ہے، اس کے پیچھے نماز مکروہ ہے۔''

اس فتویٰ پر حضرت مولانا مفتی جمیل احمد تھانویؒ (جامعہ اشرفیہ، لاہور) حضرت مولانا مفتی ضیاء الحق (جامعہ اشرفیہ) حضرت مولانا رسول خان ہزاروی (جامعہ اشرفیہ) کے علاوہ حضرت شیخؒ کے بھی دستخط موجود ہیں۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ حضرت شیخؒ پر یہ الزام سراسر غلط و بے بنیاد ہے کہ وہ اجماعی مسائل میں اختلاف کرنے والوں کو اہل سنت سے خارج و گمراہ قرار نہیں دیتے۔

چوتھی غلطی: عزیزم عمار نے اپنے مضمون کے اندر جس چوتھی بڑی غلطی کا ارتکاب کیا ہے، اس میں انہوں نے بعض ایسی بزرگ شخصیات کا تذکرہ کیا ہے جو بعض اجماعی نظریات سے اختلاف رکھتی ہیں، لیکن حضرت شیخؒ نے ان کا تذکرہ بڑے ادب اور احترام سے کیا ہے۔ ہمارے خیال میں عزیزم عمار اس مقام پر نہ تو مسئلہ کی حقیقی واقعیت کو سامنے رکھ سکے ہیں اور نہ حضرت شیخؒ کے تحقیقی مزاج کو۔ اس پر ہم مختلف پہلوؤں سے کچھ عرض کرنا چاہیں گے۔

۱۔ ائمہ اہل سنت اصطلاحات کے حوالہ سے تفرد اور ضلالت میں فرق کرتے ہیں، حالانکہ ظاہری طور پر ان دونوں کے پیچھے غلطی ایک ہی جیسی ہوتی ہے۔ دونوں کے پیچھے منصوص و اجماعی مسائل سے اختلاف پایا جاتا ہے، لیکن جس کی غلطی کو تفرد قرار دیا جاتا ہے، اس پر گمراہی کا فتویٰ لاگو نہیں ہوتا اور جس کی غلطی کو ضلالت قرار دیا جاتا ہے، اس پر گمراہی کا فتویٰ لاگو ہوتا ہے۔ صاحب تفرد کے پیچھے ذہنی طور پر بددیانتی کا عمل دخل نہیں ہوتا، جبکہ صاحب ضلالت کے پیچھے ذہنی بددیانتی ہی کار فرما ہوتی ہے۔ اگرچہ کسی کی ذہنی نیت کا معلوم کرنا آسان نہیں، لیکن ہمارے خیال میں دو طریقوں سے اس اندازہ و تخمینہ لگایا

جا سکتا ہے۔ پہلا یہ کہ اسلاف امت کے حوالہ سے دیکھا جائے کہ وہ غلطی کو تفرد اور اس کے مرتکب کو اہل سنت قرار دیتے ہیں یا وہ غلطی کو ضلالت اور اس کے مرتکب کو گمراہ قرار دیتے ہیں۔ ہمارے حضرت شیخؒ نے اسی پیمانہ کو اپنایا ہے، جیسا کہ خود عزیزم عمار نے راہ ہدایت ص ۱۲۱ کے حوالہ سے حضرت شیخؒ کا یہ قول نقل کیا ہے کہ

''اکثر اہل بدعت مشہور محدث حافظ ابن تیمیہؒ اور حافظ ابن القیمؒ کی رفیع شان میں بہت ہی گستاخی کرتے ہیں مگر ملا علی قاری الحنفیؒ ان دونوں بزرگوں کی تعریف ان الفاظ سے کرتے ہیں کہ یہ دونوں اہل السنت والجماعت کے اکابر ہیں اور اس امت کے اولیا میں تھے۔''

گویا حضرت شیخؒ بزرگان دین کی اغلاط کے بارے میں کوئی نظریہ قائم کرنے کے لیے بھی بزرگان دین ہی کی طرف رجوع کرتے تھے۔ یقیناً عزیزم عمار کی یہ غلط فہمی اب دور ہو گئی ہوگی کہ حضرت شیخؒ نے امام ابن تیمیہ، امام حافظ ابن قیم، علامہ عبد الرحمٰن بن خلدون، علامہ ابن حزم ظاہری وغیرہ بزرگان دین کا تذکرہ ان کے تفردات کے باوجود ادب و احترام کے ساتھ کیوں کیا ہے؟ دوسرا طریقہ یہ ہے کہ کسی اجماعی نظریہ کے خلاف رائے قائم کر کے غلطی کرنے والے کے طرز عمل کا جائزہ لیا جائے کہ اس نے اپنی اس غلط رائے کا اپنی تقریر یا تحریر میں صرف اظہار کیا ہے یا اس کی شاعت و ترویج کے لیے کوئی ادارہ یا جماعت بھی قائم کی ہے اور اپنی فکری و عملی صلاحیتیں اس کو فروغ دینے کے لیے صرف بھی کی ہیں۔ ہمارے خیال میں جس بزرگ نے صرف اپنی رائے کا اظہار کیا ہے اور اس کے فروغ و اشاعت کے لیے اپنی توانائیاں صرف نہیں کیں، ان کی اس رائے کو تفرد ہی قرار دیا گیا ہے اور ایسے کسی بزرگ کے حوالے سے ہمیں تاریخ کے اندر تفردات کے فروغ کے لیے کسی تحریک، کسی جماعت، کسی ادارہ اور کسی مستقل گروہ کا ثبوت نہیں ملتا۔ اس کے برعکس جن لوگوں نے اپنے نظریات کا صرف اظہار نہیں کیا بلکہ ان کے فروغ کے لیے جماعتیں، ادارے، گروہ اور تحریکیں پیدا کی ہیں، اپنی ہر قسم کی توانائیاں اس کی اشاعت کے لیے صرف کی ہیں اور اہل حق کے خلاف مناظرانہ اور مجادلانہ محاذ آرائی قائم کی ہے، اجماعی و جمہوری موقف کو غلط و باطل قرار دینے کی کوشش کی ہے، ان کی اغلاط کو ضلالت و گمراہی اور الحاد و زندقہ ہی قرار دیا گیا ہے۔ ماضی کی خوارج، معتزلہ، روافض، جبریہ، قدریہ، کرامیہ اور خلق قرآن وغیرہ تحریکیں اور حال کی اہل قرآن (منکرین حدیث) خاکسار، مودودی صاحب کی جماعت اسلامی، منکرین حیات انبیا وغیرہ تحریکیں اسی زمرہ میں شمار ہوتی ہیں۔ ڈاکٹر جاوید احمد غامدی (باوجود اس کے کہ ان کی علمی حیثیت کم از کم حضرت شیخؒ کے مسلک میں تو مسلم نہیں ہے) کے طرز عمل، ان کے ادارہ کے قیام اور مختلف ٹی وی چینلز پر ان کی طرف سے اپنے نظریات کی اشاعت و ترویج کے حوالے سے عزیزم عمار خود فیصلہ کریں کہ ان کی اغلاط اور اجماع امت کے خلاف ان کی آرا تفردات میں شمار ہوں گی یا ضلالت میں؟

۲۔ عصر حاضر کی بعض شخصیات علامہ شبلی نعمانی، مولانا امین احسن اصلاحی اور نواب صدیق حسن خانؒ وغیرہ کے بارہ میں حضرت شیخؒ کے تعریفی کلمات کا حوالہ دیتے ہوئے عزیزم عمار نے یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ حضرت شیخؒ اہل علم کے لیے حق اختلاف تسلیم کرتے تھے۔ یہ فلسفہ ہمارے لیے ناقابل فہم ہے کہ نواب صدیق حسن خانؒ کے تفردات کو تفردات تسلیم کرتے ہوئے ان کے حق اور صحیح موقف سے استدلال کرنے سے ان کا حق اختلاف کیسے ثابت ہوتا ہے؟ علامہ شبلی نعمانیؒ کے کلامی مسائل میں معتزلی ہونے سے ان کو مشہور و معتبر مورخ تسلیم کر لینا ان کے معتزلی مسائل و موقف کے جواز کا ثبوت کیسے بن جاتا ہے؟

اور مولانا امین احسن اصلاحی کو "حضرت مولانا" لکھ دینے سے ان کا جمہور واجماع سے حق اختلاف کیونکر ثابت ہو سکتا ہے۔

ہمارے خیال میں عزیزم عمار حضرت شیخ کے تحقیقی وتصنیفی مزاج سے اچھی طرح واقف نہیں ہیں، اس لیے ان کے قلم سے سامنے آنے والے چند تعریفی کلمات سے وہ غلط فہمی کا شکار ہو جاتے ہیں۔ مولانا شبلی نعمانیؒ کے افکار پر حضرت شیخ نے قلم نہیں اٹھایا۔ ان کے لیے علامہ کا لقب یا لفظ استعمال کیا تو عزیزم عمار نے فوراً ایک تعبیر اخذ کر لی، لیکن اگر وہ حضرت شیخ کی جملہ تصانیف کا گہری نظر سے مطالعہ کرتے تو انہیں معلوم ہو جاتا کہ حضرت شیخ نے علامہ عنایت اللہ المشرقی کے لیے بھی علامہ کا لقب استعمال کیا ہے، حالانکہ ان کے افکار ونظریات پر شدید ترین گرفت کرتے ہوئے وہ ان کو منکر حدیث قرار دیتے ہیں اور اس کی متعدد مزید مثالیں حضرت شیخ کی کتب میں موجود ہیں۔ مولانا، مولوی اور مفتی وغیرہ الفاظ تعظیم کی علامت ہیں، لیکن حضرت شیخ ان لوگوں کے لیے بھی انھیں استعمال کرتے ہیں جن پر اعتقادی گرفت کر رہے ہوتے ہیں۔

یہ طرز وفلسفہ عزیزم عمار کے بچگانہ اور ناتجربہ کارانہ ذہن کو شاید ایسے ہضم نہ ہو، ہم اس کی مثال دے کر انہیں سمجھانا چاہتے ہیں۔ ہم نے جب اپنی زندگی کی پہلی تصنیف "فتویٰ امام ربانی بر مرزا غلام احمد قادیانی" کا مسودہ اصلاح کے لیے حضرت شیخ کی خدمت میں بھیجا تو اس میں مرزا غلام احمد قادیانی کے بارے میں وہی طرز اختیار کیا گیا تھا جسے تحریری لفظی یا عملی انتہا پسندی قرار دیا جا سکتا ہے۔ جب مسودہ کی اصلاح ہو چکی تو ہمیں طلب کیا گیا اور اپنے سامنے ہی مسودہ چیک کرنے کا حکم دیا گیا۔ کاغذات الٹ پلٹ کر دیکھے تو ہر جگہ مرزا قادیانی کے بارے میں ہمارے لفظی جذبات مقطوع ہو چکے تھے اور ہر جگہ ایک ہی جملہ لکھا تھا: "مرزا صاحب نے یہ کہا" یا "مرزا صاحب نے یہ لکھا۔" جب تک ہم کاغذات کو الٹتے پلٹتے رہے، نگاہیں ہمارے چہرے پر مرکوز رہیں اور قلبی تاثرات کا چہرے سے جائزہ لیا جاتا رہا اور پھر سادہ سے انداز میں ایک نصیحت کی گئی: "تحریر کے اندر اپنے موقف ونظریہ کو بے لچک انداز میں پیش کرو، مگر مخاطب کی شخصی حیثیت کا ضرور لحاظ رکھو تا کہ تمہاری تحریر کو پڑھنے والا اسے ذاتی وشخصی عناد وبغض پر محمول نہ کر سکے۔" اس ایک بہت ہی سادہ اور جاندار جملہ سے عزیزم عمار حضرت شیخ کے تصنیفی وتالیفی مزاج سے یہ بات کافی حد تک سمجھ گئے ہوں گے کہ کسی شخصیت کے بارہ میں تعظیمی وتکریمی الفاظ استعمال کرنے سے حضرت شیخ کا یہ مقصد ہرگز نہیں ہوتا کہ کسی اجماعی موقف کے خلاف وہ اس کا حق اختلاف تسلیم کر رہے ہیں۔

۳۔ شیخ الصوفیاء محی الدین ابن عربیؒ کے نظریہ وحدت الوجود اور اس کے بارے میں حضرت شیخ کا موقف (کہ اس نظریہ کو کھینچ تان کر ہی قرآن وسنت کے مطابق بنایا جا سکتا ہے) نقل کرنے کے بعد عزیزم عمار لکھتے ہیں کہ ان کا تذکرہ بھی اپنی تصانیف کے اندر حضرت شیخ بے حد احترام کے ساتھ کرتے ہیں۔ اگر عزیزم عمار نے حضرت شیخ سے جو اسباق پڑھے ہیں، انہیں پوری توجہ سے سنا ہے تو انہیں معلوم ہوگا کہ حضرت شیخ صوفیاے کرام کی بعض اصطلاحات اور ان کی مبہم تعبیرات سے شدید اختلاف رکھتے ہوئے اکثر ایک جملہ فرمایا کرتے تھے: "قول صوفی حجت نیست"، یعنی وہ صوفیاے کرام کے ایسے اقوال وتعبیرات کو جو اجماع کے خلاف ہیں، حجت تسلیم نہیں کرتے البتہ ان کا ادب واحترام پوری طرح ملحوظ رکھتے ہیں۔ چنانچہ ایک مقام پر فرماتے ہیں کہ

"اور حضرت مجدد الف ثانیؒ (مکتوبات، دفتر اول ص ۳۳۵) میں لکھتے ہیں کہ عمل صوفیہ در حل وحرمت سند نیست، ہمیں بس است کہ ایشاں را معذور داریم وملامت نہ کنیم۔ جب حلال وحرام کے مسئلہ میں صوفیاے کرام کی بات حجت اور سند نہیں

تو عقائد میں ان کی گول مول اور مجمل باتیں کب قابل قبول ہوں گی؟ اور شیخ عبد الحق محدث دہلویؒ اخبار الاخیار ص ۹۳ میں لکھتے ہیں کہ "ومشرب پیر حجت نیست، دلیل از کتاب وسنت می باید"۔ جب پیر کی بات سرے سے حجت ہی نہیں، بلکہ کتاب وسنت سے استدلال کرنا ضروری ہے تو نہ معلوم ان کی بات سے عقائد کا اثبات اور پھر قرآن کریم کا مقابلہ کیونکر درست ہو سکتا ہے؟ اور حضرت شاہ ولی اللہ بھی "البلاغ المبین" المنسوب بشاہ ولی اللہؒ میں صاف طور پر اس کی تصریح کرتے ہیں کہ کسی پیر اور صوفی کی بات حجت نہیں ہو سکتی۔ قرآن کریم اور حضرات صحابہ کرام کی اتباع ہی ایمان ہے اور اسی میں سلامتی ہے۔ اب جو صاحب اس مسئلہ پر خامہ فرسائی کریں، ان کو یہ بات اچھی طرح مد نظر رکھنی چاہیے کہ ایسے اہم مسئلہ پر کسی بزرگ کا کوئی قول حجت نہیں، بلکہ خود خبر واحد صحیح بھی حجت نہیں، اور قرآن کریم (اور حدیث متواتر) کے مقابلہ میں اس کا پیش کرنا محض پرزہ بافی ہے۔" (آنکھوں کی ٹھنڈک، ص ۲۵-۲۶)

حضرت شیخ اس مقام پر تین ایسے بزرگوں کے حوالے نقل کر رہے ہیں جو ارباب شریعت بھی ہیں اور اصحاب طریقت بھی اور تینوں اس بات پر متفق ہیں کہ حلال وحرام اور عقائد وافکار میں پیر اور صوفی کی بات حجت نہیں، اور حضرت مجدد الف ثانیؒ ساتھ اس بات کی وضاحت بھی فرما رہے ہیں کہ صوفیاے کرام کی بات حجت وسند نہ ہونے کے باوجود ہم پر لازم ہے کہ ہم ان کو معذور سمجھیں اور انہیں ملامت نہ کریں۔ اس مختصر مگر مدلل بحث کے بعد ہمارے لیے یہ بات قطعی طور پر ناقابل فہم ہے کہ جو شخص برملا اور علانیہ طور پر "قول صوفی حجت نیست" کا فتویٰ دیتا ہو، اس فتویٰ پر اکابر واسلاف کے حوالہ جات ودلائل پیش کرتا ہو، اس پر یہ الزام کیونکر درست تسلیم کیا جا سکتا ہے کہ وہ اجماعی عقائد وافکار اور مسائل واحکام کے خلاف صوفیاے کرام کا حق اختلاف تسلیم کرتا ہوگا؟

یہ جو راہ تیری طویل ہے، تری گمرہی کی دلیل ہے
تری منزلیں ہیں وہیں کہیں ترا رخ جدھر نہیں ہو رہا

۴۔ امام انقلاب مولانا عبید اللہ سندھیؒ کے بارے میں حضرت شیخ کے ایک مکتوب (بنام مولانا مشتاق احمد چنیوٹی مدظلہ) کا حوالہ بھی عزیزم نے دیا ہے، جس میں حضرت شیخ نے فرمایا ہے کہ "مولانا سندھیؒ کے بعض نظریات سے اختلاف تو کیا جا سکتا ہے، لیکن ان پر کوئی فتویٰ نہیں لگتا۔"

اس مکتوب سے بھی عزیزم عمار نے اجماعی مسائل کے اندر اہل علم کا حق اختلاف ثابت کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس بارے میں پہلی بات تو یہ ہے کہ حضرت سندھیؒ کے افکار ونظریات پر ہم گزشتہ چھ سال سے مسلسل تحقیق کر رہے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ ان کے بارے میں مختلف اہل علم کی طرف سے یہ تو کہا گیا ہے کہ ان کے بعض نظریات درست نہیں تھے یا ان کے بعض نظریات سے اختلاف کیا جا سکتا ہے یا ان کی بعض آرا مرجوح وشاذ ہیں، لیکن وہ آرا ونظریات کس نوعیت کے ہیں؟ اس پر کوئی محقق بحث نہیں ملتی اور ہمیں تلاش بسیار کے باوجود ان کا کوئی ایسا نظریہ دستیاب نہیں ہو سکا جو عقیدہ سے متعلق ہو، اجماع امت کے خلاف ہو اور علم وتحقیق کے حوالے سے کسی مستند ومعتمد ذریعے سے ثابت ہو۔ محض املائی تقاریر وتفاسیر پر کس حد تک اعتماد کیا جا سکتا ہے، اصحاب علم وتحقیق اس سے اچھی طرح واقف ہیں۔

حضرت سندھیؒ کی شخصیت ونظریات کے بارے میں حضرت شیخ کے ساتھ ہماری تقریباً تین طویل نشستیں ہوئیں۔ حضرت شیخ کا موقف یہ تھا کہ ہمارے بعض اکابر علما حضرت سندھیؒ کے بعض نظریات سے اختلاف رکھتے تھے، لیکن حضرت سندھیؒ

کا کسی اجماعی عقیدہ سے اختلاف میرے علم میں نہیں۔ اس موضوع پر ہماری تفصیلی کتاب زیر ترتیب ہے جس میں ہم ان شاء اللہ اس موضوع پر مدلل بحث کریں گے۔ لیکن اگر بالفرض یہ تسلیم کر لیا جائے کہ حضرت سندھیؒ بعض اجماعی نظریات سے اختلاف رکھتے تھے تو بھی حضرت شیخ کے مکتوبہ جملہ سے صاف ظاہر ہو رہا ہے کہ وہ تفردات کے زمرہ میں شمار ہوتے ہیں۔ لہٰذا ان سے یہ نتیجہ اخذ کرنا کہ اس سے اہل علم کا اجماعی مسائل وعقائد میں حق اختلاف ثابت ہوتا ہے، سراسر خلاف حقیقت ہے۔

۵۔ مضمون کے اندر عزیزم عمار نے حضرت شیخ کے ساتھ اپنی ایک ملاقات کا تذکرہ بھی کیا ہے۔ وہ اس کی تفصیلات بایں الفاظ بیان کرتے ہیں کہ:

''وفات سے چند ماہ قبل کی بات ہے کہ میں ان کی خدمت میں حاضر ہوا۔ گفتگو کے دوران میں میں، نے کہا کہ آپ علمی مسائل میں جمہور کی رائے کی پابندی پر بہت اصرار کرتے ہیں، لیکن بہت سے اکابر اہل علم مثلاً امام ابن تیمیہؒ کے ہاں متعدد مسائل میں عام موقف سے ہٹ کر رائے پیش کرنے کی مثالیں بھی ملتی ہیں۔ (امام ابن تیمیہؒ کی ایسی آرا کی تعداد تین درجن کے قریب شمار کی گئی ہے) کیا یہ حضرات جمہور کی رائے کی اہمیت سے واقف نہیں تھے؟ اور کیا ان کو یہ حق حاصل تھا کہ وہ اپنی منفرد رائے قائم کریں؟ انہوں نے فرمایا، ہاں۔ میں نے پوچھا کہ کیا ایسا کرنے سے وہ گمراہی کا ارتکاب کرتے ہیں؟ انہوں نے کہا نہیں۔ میں نے کہا کہ کیا ایسا کرنے کے باوجود وہ اہل سنت کے دائرے ہی میں رہتے ہیں؟ انہوں نے کہا، ہاں۔''

ہم نے عزیزم عمار کے الفاظ میں وہ گفتگو بے کم وکاست نقل کر دی ہے۔ اس پوری گفتگو سے دو چیزیں واضح ہو رہی ہیں۔ پہلی یہ کہ حضرت شیخ جو کچھ فرما رہے ہیں، وہ امام ابن تیمیہ کی علمی حیثیت وشخصیت کے حوالہ سے فرما رہے ہیں۔ ان کی آڑ میں عصر حاضر کی کسی شخصیت کے لیے حق اختلاف کا جواز نکالنا درست نہ ہوگا۔ دوسری یہ کہ سوال کی روشنی میں حضرت شیخ کا یہ موقف صرف جمہور کے موقف سے حق اختلاف کا ہے، نہ کہ اجماعی موقف سے، کیونکہ اجماعی مسائل کے اندر حضرت شیخ نہ کسی بڑے کا حق اختلاف تسلیم کرتے ہیں نہ کسی چھوٹے کا، جیسا کہ اس کی کچھ بحث گزشتہ اوراق میں گزر چکی ہے۔

حاصل بحث

عزیزم عمار ناصر کے مضمون میں اٹھائے گئے جملہ امور سے حاصل بحث کے طور پر درج ذیل چیزیں واضح ہو جاتی ہیں:

۱۔ حضرت شیخ امت کے اجماعی موقف اور جمہور کے موقف میں فرق کرتے ہیں۔

۲۔ امت کے اجماعی موقف ونظریہ میں اختلاف کی کوئی گنجائش تسلیم نہیں کرتے، بلکہ اجماعی موقف سے اختلاف کرنے والے کو دین سے خارج یا اہل سنت سے خارج اور بدعتی قرار دیتے ہیں۔

۳۔ ماضی میں اگر کسی نے اجماعی موقف سے اختلاف کیا ہے اور اختلاف کرنے والے کے علم ودیانت کی اسلاف امت کے ہاں شہادت پائی گئی ہے تو اس کے اختلاف کو تفرد قرار دیتے ہیں اور اس کی علمی حیثیت وشخصیت کا پورا ادب واحترام ملحوظ رکھتے ہیں۔

۴۔ حضرت شیخ کا مختار، پسندیدہ اور تلقین کردہ مسلک یہی ہے کہ جمہور اہل علم کی تحقیقات وتعلیمات سے وابستہ رہیں اور دوسروں کو بھی اس سے وابستہ رکھیں۔

۵۔ اگر کوئی مسلم صاحب علم جمہور کے خلاف غیر جمہور کے موقف کو اپنائے یا اس کے خلاف اپنی تحقیق ورائے

پر عمل کرے تو اسے جائز قرار دیتے ہیں، لیکن غیر مستحسن۔

۶۔ غیر اجماعی مسائل میں جمہور اہل علم سے اختلاف کا حق ہر کس وناکس کو نہیں دیتے، بلکہ صرف ان اہل علم کو دیتے ہیں جو صاحب الرائے اور صائب الرائے ہیں اور ان کی علمی حیثیت مسلم ہے۔

۷۔ صاحب الرائے اور صائب الرائے کو رائے کی غلطی میں معذور وماجور مانتے ہیں، جبکہ غیر مجتہد کی رائے کی غلطی کو گناہ قرار دیتے ہیں۔

۸۔ عصر حاضر کے تمام جدید مفکرین غلام احمد پرویز، عنایت اللہ المشرقی، عبد اللہ چکڑالوی، ابوالاعلیٰ مودودی اور ان کے طرز کے دیگر جدت پسندوں کو نہ اہل علم تسلیم کرتے ہیں نہ صاحب الرائے اور نہ صائب الرائے بلکہ وہ ان سب کو پانچواں سوار قرار دیتے ہیں۔

افکار امام اہل سنت اجماع امت کی روشنی میں

اب ہم اس بحث کو آخری اور فیصلہ کن مرحلہ میں داخل کر رہے ہیں۔ ہم گزشتہ سطور میں پوری طرح واضح کر چکے ہیں کہ ہمارے حضرت شیخ نور اللہ مرقدہ اپنے جملہ افکار وعقائد کے لیے تمام شرعی دلائل سے استدلال کرتے ہیں، لیکن اپنے عقیدہ و فکر کو اجماع امت یا جمہور اہل سنت کے حوالہ سے ہی ثابت کرتے ہیں۔ گویا قرآنی وحدیثی افکار واحکام کی تعبیر وتشریح کے لیے بھی وہ اسلاف امت کی تحقیقات سے وابستہ رہنا ضروری خیال کرتے ہیں۔ اب ہم اسی حوالہ سے حضرت شیخ کے عقائد و افکار کا جائزہ لینے کی کوشش کریں گے۔ ملاحظہ فرمائیے:

۱۔ **وجوب قربانی:** موجودہ دور کے منکرین حدیث نے جب دیگر اسلامی احکام واعمال کے علاوہ قربانی جیسی متواتر عبادت پر بھی انکار وانحراف کا شب خون مارا اور اسے ایام حج اور حدود حرم تک مقید ومحدود کرنا چاہا تو حضرت شیخ نے فرمایا کہ

(۱) ''آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے صحابہ کرام علیہم الرضوان نے مدینہ طیبہ، فارس اور دیگر اسلامی ممالک میں باقاعدہ قربانی کی ہے اور تواتر کے ساتھ اس کا ثبوت ملتا ہے اور ایسے تواتر کا منکر دائرہ اسلام سے خارج ہو جاتا ہے۔'' (مسئلہ قربانی، ص:۱۵)

(۲) ''قربانی کے ثبوت پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے قولاً اور فعلاً متواتر درجہ کی حدیثیں موجود ہیں اور تمام امت کا اس پر اتفاق رہا ہے اور اس گئے گزرے دور میں بھی لوگ اس سنت کو کروڑوں کی تعداد میں ادا کرتے ہیں۔'' (انکار حدیث کے نتائج ص:۱۷۲)

۲۔ **ایام قربانی:** وجوب قربانی اگرچہ اجماعی مسئلہ ہے، لیکن ایام قربانی میں ائمہ اہل سنت کے اندر اختلاف موجود ہے۔ جمہور اہل سنت کے نزدیک قربانی کے ایام تین ہیں، حضرت امام شافعیؒ کے نزدیک چار ہیں۔ ہمارے ہاں کے غیر مقلدین بھی قربانی کے چار دن ہی مانتے ہیں۔ یہ ایک خالص اجتہادی مسئلہ ہے، لیکن غیر مقلدین حسب عادت اجتہادی مسائل میں بھی سخت ونا روا رویہ اختیار کر لیتے ہیں۔ ان کے رویہ پر تبصرہ کرتے ہوئے حضرت شیخ فرماتے ہیں کہ

''باوجودیکہ اس مسئلہ (قربانی) میں ائمہ ثلاثہ (حضرت امام اعظم ابوحنیفہؒ، حضرت امام مالکؒ، حضرت امام احمد بن حنبلؒ) کا مسلک صحیح حدیث پر مبنی ہے اور اکثر امت کا اسی پر عمل رہا ہے اور اب بھی ہے، مگر بایں ہمہ ہم فریق ثانی کے حق میں کم فہم،

متعصب، تنگ دل اور بد دیانت وغیرہ کے الفاظ کی نسبت کرنا انتہائی گستاخی اور بے ادبی سمجھتے ہیں۔ کس منہ سے ہم حضرت امام شافعی کو اور ان کے مقلدین کو یہ لفظ کہہ سکتے ہیں؟ یہ حوصلہ تو غیر مقلدین حضرات کو ہی حاصل ہے کہ وہ اپنے مخالفین کو سب کچھ کہہ سکتے ہیں۔'' (مسئلہ قربانی ص: ۳۷)

۳۔ تکوینی وتشریعی امور کا حاکم: جب ہمارے ہاں بعض طبقات نے انبیاے کرامؑ، ائمہ عظام اور اولیاء اللہ کو مختار کل قرار دے کر انہیں اوصاف الوہیت میں حصہ دار بنا دیا اور یہ ایک صریح شرک تھا، حضرت شیخؒ نے ان کے اس نظریہ کی تردید فرمائی اور ثابت کیا کہ تکوینی اور تشریعی دونوں قسم کے امور میں حاکم ومختار صرف اللہ تعالیٰ کی ذات ہے۔ چنانچہ فرماتے ہیں کہ

(۱) ''میرا اور میرے تمام اکابر بلکہ حضرات صحابہ کرامؓ، تابعینؒ، اتباع تابعین اور تمام ائمہ اہل السنّت والجماعت کا اتفاقی عقیدہ ہے کہ تکوینی اور تشریعی طور پر حاکم اور مختار صرف اللہ تعالیٰ ہی ہے۔ اس نے مافوق الاسباب اختیارات کسی کو نہیں دیے۔'' (دل کا سرور ص: ۱۳)

(۲) مکتوبات معصومیہ جلد ۳ ص ۸۳، غنیۃ الطالبین ص ۲۲۱، اور شرح مواقف ص ۷۵۴ کے حوالے نقل کرنے کے بعد فرماتے ہیں کہ

''الحاصل ائمہ اہل السنّت والجماعت اس بات پر متفق ہیں کہ جس فرقہ نے حضرت محمد صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم ودیگر ائمہ حضرات کو مختار کل تسلیم کیا ہے، وہ باطل اور گمراہ فرقہ ہے اور اہل السنّت واہل توحید سے اس کا کوئی تعلق نہیں ہے۔'' (ایضاً ص ۲۴)

تکوینی اور تشریعی امور کی وضاحت کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ

''تکوینی امور سے مراد زمین وآسمان، انسان وحیوان، چرند وپرند اور مختلف کیڑے مکوڑے، بیماری وتندرستی، فقر وغنا، اولاد دینا یا سلب کرنا، گدا سے بادشاہ بنانا اور بادشاہ کو گدا کرنا، بچے کو جوان اور جوان کو بوڑھا بنانا، رزق دینا یا نہ دینا، مینہ برسانا یا روک دینا وغیرہ امور کو پیدا کرنا اور ظاہر کرنا ہے۔۔۔۔ اور تشریعی امور سے مراد نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ ادا کرنا، سچ کہنا، جھوٹ سے بچنا، زنا اور چغلی سے اجتناب کرنا، گالی اور فحش گوئی سے گریز کرنا، صدقہ وخیرات کرنا، ماں باپ، بہن بھائی، بیوی وخاوند، استاد وشاگرد کے حقوق ادا کرنا، توحید پر قائم رہنا، شرک سے بچنا، غرضیکہ شریعت حقہ نے جن اوامر ونواہی کے بجالانے یا پرہیز کرنے کا مطالبہ مخلوق سے کیا ہے، خواہ وہ امور دنیا میں مفید ہوں یا آخرت میں، ان امور کو امور تشریعی سے تعبیر کیا جاتا ہے، اور اللہ تعالیٰ نے حضرات انبیاء عظام علیہم الصلوٰۃ والسلام کو ان ہی امور کی تشریح اور تفصیل کے لیے عملی نمونہ بنا کر بھیجا ہے تا کہ اللہ تعالیٰ کے بندے ان کے نقش قدم پر چل کر اللہ تعالیٰ کی رضا حاصل کر لیں اور اس کی ناراضگی سے بچ سکیں۔'' (دل کا سرور ص: ۴۵، ۴۶)

۴۔ فاتحہ خلف الامام: فاتحہ خلف الامام کا مسئلہ قرون اولیٰ سے اختلافی رہا ہے اور اسے فقہی واجتہادی حوالہ سے ہمیشہ اختلافی نظر سے ہی دیکھا گیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مذاہب اربعہ میں سے کسی مذہب کے مقلدین نے کبھی بھی دوسرے فقہی مذاہب کے مقلدین کی نماز کو باطل قرار نہیں دیا۔ بدقسمتی سے یہ طوفان بدتمیزی برصغیر کے اندر غیر مقلدین نے اٹھایا اور احناف کی نماز کو (بوجہ ترک قراءۃ خلف الامام) باطل قرار دینے کے فتوے جاری کر دیے جس کی وجہ سے احناف کو بھی دفاع میں قلم اٹھانا پڑا۔ چنانچہ حضرت شیخؒ نے بھی اس موضوع پر قلم اٹھایا اور ''احسن الکلام فی ترک القراءۃ خلف الامام'' کے نام سے دو جلدوں میں ایک ضخیم کتاب لکھی۔ اس میں فرماتے ہیں کہ

(۱) ''جمہور اسلام اور ان میں سے علی الخصوص احناف کثر اللہ سوادہم اس مسئلہ کو اختلافی مسئلہ سمجھتے ہیں اور صرف یہ فرماتے ہیں کہ امام کے پیچھے مقتدی کے لیے سورۃ فاتحہ سمیت کسی بھی قسم کی قراءت ممنوع اور مکروہ ہے۔ نہ تو وہ اس مسئلہ میں کسی کی تکفیر کرتے ہیں اور نہ کسی کی منکوحہ بیوی چھیننے کا فتویٰ دیتے ہیں اور نہ کسی کو اس مسئلہ کی وجہ سے فی النار والسقر تک پہنچاتے ہیں۔'' (احسن الکلام ۱/۳۷)

(۲) ''علمی وعملی اور فنی وتحقیقی لحاظ سے قراءۃ الفاتحہ خلف الامام کا مسئلہ اپنے مثبت اور منفی پہلو کے اعتبار سے قرن اول سے تاہنوز بحث وتمحیص اور تطبیق وترجیح کا محتاج رہا ہے۔ حضرات ائمہ دین ومحققین علما نے مختلف زمانوں اور متعدد زبانوں میں اس مسئلہ پر خامہ فرسائی کی ہے۔ محرم وقبیح اور راجح ومرجوح گوشہ کی تلاش اور جستجو میں انہوں نے انتہائی کوشش اور کاوش کی ہے اور سینکڑوں کتابیں اور رسالے اس پر لکھے گئے ہیں۔'' (ایضاً ص ۵۴)

(۳) ''ان اختلافی اور فروعی (اجتہادی) مسائل میں سے ایک مسئلہ قراءت یا ترک القراءۃ خلف الامام کا بھی ہے جو عہد نبوت سے تاہنوز اختلافی چلا آ رہا ہے اور ہر فریق اپنی علمی تحقیق پر عمل کرتا آ رہا ہے، کرتا ہے اور کرتا رہے گا۔ مگر غیر مقلدین حضرات نے اس میں بھی نہایت غلو اور تعصب کا مظاہرہ کیا ہے اور تمام دنیا کے احناف کثر اللہ سوادہم کو چیلنج کیا اور ان کی نماز کو باطل، بے کار اور کالعدم قرار دے کر ان کو فی النار والسقر تک کا حکم خسروانہ سنایا۔ (مقدمہ تدقیق الکلام، ص ۹)

(۴) احسن الکلام کی اشاعت کے بعد جب غیر مقلدین نے خیر الکلام ص ۳۳ اور توضیح الکلام ص ۴۵ وغیرہ کتب میں تسلیم کر لیا کہ فاتحہ خلف الامام کا مسئلہ فروعی، اختلافی ہونے کی بنا پر اجتہادی ہے، پس جو شخص جس تحقیق پر عمل کرے، اس کی نماز باطل نہیں ہوتی تو اس پر حضرت شیخؒ فرماتے ہیں کہ:

''کاش کہ یہ حضرات پہلے ہی سے اس حق گوئی سے کام لیتے اور اپنے غالی دوستوں کو چیلنج بازی اور احناف کی نماز کے باطل، بے کار اور کالعدم ہونے کے ناروا فتویٰ سے باز رکھتے تو ہمیں احسن الکلام لکھنے کی سرے سے ضرورت پیش نہ آتی۔ بفضلہ تعالیٰ یہ احسن الکلام کے ٹھوس اور محکم دلائل ہی کا نتیجہ ہے کہ ان حضرات نے ترک القراءۃ خلف الامام کرنے والوں کی نماز کے باطل نہ ہونے کا اقرار کیا۔'' (ایضاً ص ۹۔۱۰)

۵۔ عقیدہ ولادت مسیح علیہ السلام: عصر حاضر میں منکرین حدیث سر سید احمد خان، مرزا غلام احمد قادیانی، مولوی محمد علی لاہوری، مولوی عبد اللہ چکڑالوی اور چودھری غلام احمد پرویز وغیرہ نے حضرت سیدنا عیسیٰ علیہ السلام کی بغیر باپ ولادت کے قرآنی واقعہ سے انکار وانحراف کیا ہے، بلکہ ہمارے شہر گجرات کے اہل حدیث بزرگ مولوی عنایت اللہ اثری صاحب نے تو اس موضوع پر تقریباً پندرہ کتابیں (بحر قلزم، عیون زمزم وغیرہ) لکھ ماریں۔ حضرت شیخؒ ان کے جواب میں فرماتے ہیں کہ

(۱) ''قرآن کریم کی نصوص صریحہ اور احادیث صحیحہ اور تمام اہل اسلام کا اس پر اتفاق ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ نے اپنی قدرت کاملہ سے بغیر باپ کے پیدا کیا ہے اور یہ ایک ایسی کھلی حقیقت ہے کہ جس میں کبھی کسی مسلمان کو شک وشبہ نہیں ہوا۔'' (انکار حدیث کے نتائج، ص ۱۲۸)

(۲) ''نصوص قرآنیہ، احادیث صحیحہ اور امت مسلمہ کے اجماع واتفاق سے یہ ثابت ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو اللہ

تعالیٰ نے اپنی قدرت کاملہ سے بلا باپ کے پیدا کیا ہے اور حضرت مریم علیہا السلام کو بدون خاوند کے اللہ تعالیٰ نے بیٹا مرحمت فرمایا ہے۔'' (مودودی صاحب کا ایک غلط فتویٰ ص ۹)

۶۔ عقیدہ حیات ونزول مسیح علیہ السلام: عصر حاضر کے منکرین حدیث حضرت سیدنا عیسیٰ علیہ السلام کی حیات، ان کے رفع الی السماء اور ان کے نزول سے انکاری ہیں اور اس مسئلہ میں مرزا غلام احمد قادیانی کی ہم نوائی کرتے ہیں۔ حضرت شیخ نے اپنی متعدد کتب میں اس مسئلہ کی مدلل وضاحت فرمائی ہے۔ چند حوالہ جات ملاحظہ فرمائیں:

(۱) ''احادیث صحیحہ کے ذخیرہ سے یہ امر بالکل واضح اور آشکارا ہو جاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے زمین حق وصداقت کی آواز سے کبھی خالی نہ رہے گی تاآنکہ حضرت سیدنا عیسیٰ علیہ السلام آسمان سے نازل ہو کر تمام ادیان ومذاہب باطلہ کو باذن اللہ مٹا کر صرف ایک ہی دین اور ایک ہی مذہب کا سنہری پرچم نہ لہرائیں جس کا نام اسلام ہے۔ ان الدین عند اللہ الاسلام۔'' (تبلیغ اسلام، ص ۲۹)

(۲) ''علامہ محمد طاہر الحنفی (مجمع البحار، ۱/۲۸۶) میں اور علامہ ابوحیان اندلسی (بحوالہ امام ام عطیہ تفسیر بحر محیط ۲/۴۷۳ میں فرماتے ہیں کہ) امت کا متواتر احادیث کے پیش نظر اس بات پر مکمل اتفاق ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام آسمان پر زندہ ہیں اور قرب قیامت میں نازل ہوں گے۔ اور امام سیوطیؒ (الحاوی للفتاوی ص ۱۶۶ میں) فرماتے ہیں کہ اس کا انکار کفر ہے۔'' (چراغ کی روشنی ص ۹ حاشیہ)

(۳) ''علامہ سید محمد انور شاہ کشمیریؒ (اکفار الملحدین ص ۸) میں فرماتے ہیں کہ بلاشبہ تواتر سے یہ بات ثابت ہو چکی ہے اور اس پر اجماع بھی منعقد ہو چکا ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نازل ہوں گے، سو اس کی تاویل اور تحریف بھی کفر ہے۔'' (مودودی صاحب کا ایک غلط فتویٰ، ص ۲۱)

(۴) ''مرزا غلام احمد قادیانی کی تکفیر کے تین اصول: (۱) حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ختم نبوت کا انکار اور ختم نبوت کے مسلمہ معنی میں بے جا تاویل اور اپنی مصنوعی وخود ساختہ نبوت کے لیے چور دروازہ کی گنجائش، (۲) حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی حیات اور ان کے نزول کا انکار اور اس کی دور از کار اور لایعنی تاویلات، (۳) حضرات انبیاے کرام علیہم السلام کی توہین۔ یہ تین اصول ہیں جن کی وجہ سے علماے امت نے مرزا غلام احمد قادیانی اور ان کے پیروکاروں کی تکفیر کی ہے۔'' (مرزائی کا جنازہ اور مسلمان، ص ۶)

حضرت شیخ نے اپنی صحت وتندرستی کے آخری ایام میں ''توضیح المرام فی نزول المسیح علیہ السلام'' کے نام سے ایک مستقل اور مدلل رسالہ بھی تالیف فرمایا جس کے انتساب میں فرماتے ہیں کہ

''اگر راقم اثیم زندہ رہا تو ان شاء اللہ العزیز یہ حقیر سا تحفہ (توضیح المرام) خود حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی خدمت میں پیش کرنے کی سعی کرے گا اور سعادت حاصل کرے گا اور اگر ان کی آمد سے پہلے ہی اس حقیر کی وفات ہو گئی تو راقم اثیم کے اپنے متعلقین میں سے کوئی نیک بخت یہ تالیف حضرت کی خدمت اقدس میں پیش کر دے اور ساتھ ہی راقم اثیم کا نام لے کر عاجزانہ اور عقیدت مندانہ سلام مسنون بھی عرض کر دے۔ البقاء اللہ تعالیٰ وحدہ۔ (توضیح المرام ص ۷)

حضرت شیخ صاف اور واضح لفظوں میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی حیات اور نزول کے عقیدہ کو امت کا اجماعی عقیدہ قرار دیتے ہیں اور اس کے اندر تاویل اور تحریف کرنے والے کو کافر تسلیم کرتے ہیں۔

۷۔ حجیت حدیث: عصر حاضر کے منکرین حدیث نے جب حجیت حدیث کا انکار کیا اور یہ دعویٰ کر دیا کہ حدیث یقینی چیز نہیں، ظنی ہے اور کوئی ظن دین قرار نہیں دیا جا سکتا، حدیث کی حیثیت تاریخ کی سی ہے اور تاریخ تنقید سے بالاتر نہیں ہوتی تو حضرت شیخ نے اس فتنہ کا خوب رد فرمایا اور بڑے مدلل انداز میں حجیت حدیث کا اثبات فرمایا۔ چنانچہ فرماتے ہیں کہ

(۱) ''اہل اسلام کے کسی فقہی مکتب فکر کے نزدیک حدیث شریف کے بنیاد دین اور مدار اسلام ہونے میں قطعاً کوئی اختلاف نہیں ہے۔ الغرض اجماع امت سے بھی حجیت حدیث ثابت ہے۔'' (احسان الباری، ص ۲۱)

(۲) ''تمام اہل اسلام اس امر پر متفق ہیں کہ حضرات صحابہ کرام، تابعین اور اتباع تابعین نے پوری محنت اور مشقت، خالص دینی جذبہ اور ولولہ، کامل خلوص وللہیت سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث کو اپنے سینوں اور سفینوں میں محفوظ رکھا ہے اور بے حد جرات وبہادری سے انہوں نے یہ امانت عظمیٰ امت مرحومہ تک پہنچائی ہے۔'' (انکار حدیث کے نتائج ص ۱۴۸)

۸۔ حجیت سنت: عصر حاضر کے جدت پسندوں نے اول تو سرے سے حجیت سنت کا ہی انکار کر دیا اور بعض نے سنت کی جدید تعیین کر کے اس کے دائرہ کو محدود کر دیا۔ حضرت شیخ حجیت سنت پر بحث کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ

''قرآن کریم، حدیث شریف اور امت مسلمہ کا اس بات پر اتفاق ہے کہ ہر رسول اور نبی اپنی امت کے لیے نمونہ اور اسوہ ہوتا ہے اور اسی کا قول وفعل (جو لغزش اور تخصیص کی مد میں نہ ہو) تمام امتیوں کے لیے لازم ہوتا ہے اور اس کی اطاعت واتباع کے بغیر نہ تو تقرب خداوندی حاصل ہوتا ہے اور نہ نجات اخروی ہی نصیب ہوتی ہے۔ وہ مطاع اور مقتدی ہو کر آتا ہے اور امت مطیع ومقتدی کہلاتی ہے۔'' (انکار حدیث کے نتائج ص ۳۴)

۹۔ تفسیر قرآن بالحدیث: قرآن پاک کی تفسیر وتشریح کے لیے مختلف درجات ہیں۔ اول درجہ پر تفسیر قرآن بالقرآن ہے، یعنی قرآن کریم میں ایک جگہ پر ایک حکم ومسئلہ اجمالی طور پر بیان کیا گیا ہے اور دوسری جگہ تفصیلی طور پر تو تفصیلی مقام کے ذریعے اجمالی بیان کی تفسیر وتشریح کی جائے گی۔ اس کے بعد دوسرے درجات ہیں، لیکن قرآن کے باہر سے جس چیز کے ذریعے تفسیر قرآن کا پہلا درجہ ہے، وہ حدیث شریف ہے۔ چنانچہ حضرت شیخ اس بارہ میں فرماتے ہیں کہ

''تمام مسلمان اس کے قائل ہیں کہ قرآن کریم کی وہ تفسیر اول درجہ پر معتبر ہو گی جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہے، جو کتب حدیث کے ابواب التفسیر وغیرہ میں آئی ہے، مگر چونکہ ان کو صحیح تسلیم کر لینے کے بعد (چودھری غلام احمد) پرویز صاحب اپنی محض ذاتی واختراعی رائے سے تفسیر نہیں کر سکتے تھے، اس لیے انہوں نے ان احادیث کو وضعی قرار دیا ہے۔'' (انکار حدیث کے نتائج، ص ۱۴۷)

۱۰۔ عقیدۂ ختم نبوت: عقیدۂ ختم نبوت، توحید ورسالت کے بعد اسلام کا سب سے اہم اور بنیادی عقیدہ ہے۔ عہد نبوت کے آخر اور خلافت صدیقی کے آغاز میں سب سے پہلے اسی عقیدہ پر حملہ ہوا تھا اور جھوٹے مدعیان نبوت اور ان کے ہم نواؤں کے خلاف جہاد ولشکر کشی پر امت کا سب سے پہلا (خلافت صدیقی پر اجماع کے بعد) اجماع منعقد ہوا۔ اس عقیدہ کے بارہ میں حضرت شیخ فرماتے ہیں کہ

(۱) ''ختم نبوت کا عقیدہ قرآن کریم، احادیث صحیحہ متواترہ اور اجماع امت سے ثابت ہے۔'' (ختم نبوت قرآن وسنت کی روشنی میں ص ۹)

(۲)''قرآن کریم کی نصوص قطعیہ کے علاوہ احادیث متواترہ اوراجماع قطعی اس امر پردال ہیں کہ حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد جوشخص نبوت ورسالت کا دعویٰ کرے،اس کا دعویٰ یقیناً مردود ہے۔''(مرزائی کا جنازہ اور مسلمان ص۹)

۱۱۔مدعی نبوت کا کفر: آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد کسی مدعی نبوت اور رسالت کا صرف دعویٰ ہی بالاجماع مردودنہیں بلکہ اس کا کفر بھی بالاجماع ثابت ہے۔چنانچہ حضرت شیخ حضرت ملاعلی قاریؒ کی شرح فقہ اکبر ص ۲۰۱ کے حوالہ سے فرماتے ہیں کہ

''ہمارے نبی علیہ السلام کے بعد نبوت کا دعویٰ کرنا بالاجماع کفر ہے۔''(ختم نبوت قرآن وسنت کی روشنی میں ص ۱۹)

۱۲۔منکرین ختم نبوت: آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد اگر کوئی شخص کسی مدعی نبوت کو نبی مانتا تو نہیں،لیکن آپ کے بعد کسی نئے نبی کے آنے کا قائل ہو، وہ بھی کافر ہے۔چنانچہ حضرت شیخ علامہ ابن حزم ظاہر کی الملل والنحل ۱۳۹/۳ کے حوالے سے فرماتے ہیں کہ

''جوشخص آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بغیر کسی اور نبی کے آنے کا قائل ہوتو اس کے کفر میں دو مسلمانوں نے بھی شک نہیں کیا، کیونکہ ان میں سے ہر ایک امر پر تمام حجت قائم ہو چکی ہے۔''(ایضاً ص ۲۰)

یعنی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد کسی نئے نبی کے نہ آنے پر بھی حجت قائم ہو چکی ہے،اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے نزول وآمد پر بھی حجت قائم ہو چکی ہے، لہٰذا دونوں کا منکر ایسا کافر ہے کہ اس کے کفر میں دو مسلمانوں کو بھی شبہ نہیں۔گویا جوشک کرے، وہ مسلمان نہیں۔

۱۳۔منکرین ختم نبوت کا قتل: عقیدۂ ختم نبوت میں تامل کرنے والا بھی کافر ہے۔امام اعظم ابوحنیفہؒ تو آپ کے بعد کسی مدعی نبوت سے دلیل نبوت طلب کرنے کو بھی کفر قرار دیتے ہیں۔ایسا مدعی نبوت تو صرف کافر نہیں بلکہ واجب القتل بھی ہوتا ہے۔اسی طرح اس کے ماننے والے بھی۔چنانچہ حضرت شیخ فرماتے ہیں کہ

(۱)''نصوص قطعیہ، احادیث صحیحہ متواترہ اور اجماع امت سے مسئلہ ختم نبوت کا اتنا اور ایسا ثبوت ہے کہ اس میں تامل کرنے والا بھی کافر ہے۔''(ختم نبوت قرآن وسنت کی روشنی میں ص ۲۱)

(۲)''صحیح اور صریح احادیث کی رو سے مدعی نبوت اور اس کو نبی ماننے والا واجب القتل ہے، مگر یہ قتل صرف اسلامی حکومت کا کام ہے، نہ کہ رعایا اور افراد کا۔''(ایضاً ص ۲۱)

۱۴۔شیعہ امامیہ کی تکفیر: امت مسلمہ کے اندر اہل السنّت والجماعت کے بالمقابل قدیم ترین فرقہ روافض واہل تشیع کا ہے جو تحریف قرآن، نظریہ امامت اور سب صحابہ کی وجہ سے امت مسلمہ سے علیحدہ قرار دیا گیا ہے۔چنانچہ حضرت شیخ فرماتے ہیں کہ

''کسی بھی متدین مسلمان سے جسے علم دین کے ساتھ کوئی بھی مس ہو، یہ بات مخفی نہیں کہ نصوص قطعیہ، احادیث متواترہ، اجماع امت اور ضروریات دین کا انکار یا تاویل کفر ہے اور شیعہ امامیہ ان تمام امور کے مرتکب ہیں۔یہی وجہ ہے کہ جن حضرات پر شیعہ اور روافض کے عقائد ونظریات منکشف ہوئے،انہوں نے ان کی تکفیر میں کوئی تامل نہیں کیا۔حضرت مجدد الف ثانیؒ خاصی بحث کے بعد (رد رفض ص ۳۹ میں) اور (مکتوبات، دفتر اول، مکتوب ۴۵ میں) فرماتے ہیں کہ تمام بدعتی فرقوں میں بدترین فرقہ وہ ہے جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے حضرات صحابہ کرامؓ سے بغض رکھتا ہے۔اللہ تعالیٰ نے قرآن

کریم میں ان کو کفار فرمایا ہے: لیغیظ بھم الکفار۔(ارشادالشیعہ ص ۲۰۶)

اس کے بعد حضرت شیخ نے تفسیر ابن کثیر ۲۰۴/۴ اور روح المعانی ۱۲۸/۲۶ کے حوالہ سے لیغیظ بھم الکفار کی یہی تفسیر نقل کی ہے کہ صحابہ کرامؓ سے بغض رکھنے والا کافر ہے۔(ارشادالشیعہ ص ۲۰۷)

۱۵۔دعاوذکر کی شرعی حیثیت: دعا اور ذکر الٰہی ایک عبادت ہے اور احادیث صحیحہ میں دعا کو عبادت کا مغز بھی قرار دیا گیا ہے،لیکن بدقسمتی سے عصر حاضر کے منکرین حدیث نے ان دونوں کی اہمیت اور ان کی شرعی حیثیت سے انکار کیا ہے۔منکرین حدیث کے بالمقابل جملہ اہل اسلام کا موقف ونظریہ کیا ہے؟ اس کی وضاحت کرتے ہوئے حضرت شیخ فرماتے ہیں کہ

''جملہ اہل اسلام کے نزدیک یہ ایک طے شدہ حقیقت ہے کہ اللہ تعالیٰ کا ذکر، اس کی یاد اور اسی سے اپنی تمام ضروریات مانگنا اور طلب کرنا، نہ صرف یہ کہ اس کی محبت وتقرب اور تعظیم کا ذریعہ ہے بلکہ ایک بہت بڑی عبادت کا نچوڑ ہے۔قرآن کریم اور حدیث شریف میں ذکر اور دعا کی بہت بڑی فضیلت آئی ہے اور حضرات صحابہ کرامؓ سے لے کر یہ نظریہ آج تک چلا آرہا ہے اور امت مرحومہ کے علماء حقانی، شیوخ ربانی اور جملہ اہل اسلام ہمہ تن ذکر الٰہی میں مصروف چلے آرہے ہیں۔اور اب بھی بفضلہ تعالیٰ اس کے ذکر اور دعا کو دینی اور دنیوی کامیابیوں کا راز سمجھا جاتا ہے۔کوئی مسلمان اس میں ذرہ بھر تامل کرنے کے لیے آمادہ نہیں ہے اور ہر مسلمان اس کو نجات اخروی کا ذریعہ سمجھتا ہے اور نصوص قطعیہ کے پیش نظر ایسا سمجھنا بالکل صحیح ہے۔''(درود شریف پڑھنے کا شرعی طریقہ ص ۱۵)

۱۶۔حکم جزیہ: اسلامی امت کے اندر یا اسلامی حکومت کے ماتحت رہنے والے غیر مسلموں سے ان کے جان، مال، وکی حفاظت یا ملک کے دفاع کی خاطر ان سے جو ٹیکس وصول کیا جاتا ہے وہ جزیہ کہلاتا ہے۔حضرت شیخ اس کی وضاحت تے ہوئے فرماتے ہیں کہ

(۱)''اصطلاح شریعت میں جزیہ اس مال کو کہتے ہیں کہ جو صحت مند، جوان اور غیر معیوب کفار سے ملک کے دفاع کے لیے لیا جاتا ہے۔''(احسان الباری، ص ۱۱۲)

(۲)''یہ جزیہ خلافت راشدہ اور بعد کے ادوار میں ۴۸ درہم سالانہ امیر کبیر سے، ۲۴ درہم سالانہ متوسط الحال سے اور ۱۲ درہم سالانہ ادنیٰ حال جوان کفار سے لیا جاتا ہے۔بچے، بوڑھے، لنگڑے، نابینا، بیمار اور ان کے مذہبی پیشوا جزیہ سے مستثنیٰ ہیں۔''(ایضاً ۱۱۳)

(۳) فرماتے ہیں کہ ''جزیہ کے مسئلہ پر احادیث صحیحہ وصریحہ موجود ہیں۔'' پھر بخاری ۲۹۶/۱، ابوداؤد طیالسی ص ۳۳۵، اردالظمآن ص ۴۶۹ وغیرہ کے حوالہ سے بیان کیا ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام آکر جزیہ کو موقوف کریں گے۔(ایضاً ص ۱) اس پر جو اعتراض وارد ہوا کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام جب شریعت محمدیہ پر عامل ہوں گے اور اسی کے مطابق حکومت یں گے تو پھر جزیہ حکم شرعی موقوف کیسے کریں گے؟ تو خیالی کے حوالہ سے جواب دیتے ہیں کہ:

(۱) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے خود اس بات کی خبر دی کہ یہ نزول مسیح تک برقرار رہے گا۔اس کے بعد بذریعہ ضرت عیسیٰؑ یہ موقوف کر دیا جائے گا۔گویا اس کا نزول حضرت عیسیٰ تک مشروع ہونا بھی شریعت محمدیہ کا حکم ہے اور اس کے موقوف ہونا بھی شریعت محمدیہ کا ہی حکم ہے۔

(۲) جزیہ کفار سے وصول کیا جاتا ہے۔نزول مسیح کے بعد پوری سرزمین سے جب کفار ہی ختم ہو جائیں گے اور صرف

مسلمان باقی رہیں گے تو جزیہ خود بخود موقوف ہو جائے گا۔ (ایضاً ۱۱۶)

۱۷۔ حکم تعظیم وتوہین انبیاء: تعظیم انبیا ایمان کا حصہ ہے اور توہین انبیا کفر کا سبب۔ چنانچہ حضرت شیخ فرماتے ہیں کہ

(۱) ''حضرات انبیاے کرام کی تعظیم وتوقیر اور ان کا ادب واحترام ایمان کی بنیادی شرط ہے اور ان کی توہین وتحقیر اور بے ادبی خالص کفر ہے جس میں ذرہ برابر شک نہیں ہے۔ قرآن وحدیث اور اجماع امت کے واضح دلائل اس پر موجود ہیں۔'' (مرزائی کا جنازہ اور مسلمان ص ۱۹)

(۲) ''یہ بات خصوصیت سے قابل توجہ ہے کہ حضرات فقہاے کرام نے جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ادنیٰ توہین کو بھی موجب کفر قرار دیا ہے اور اس میں کسی قسم کی نرمی اور تساہل سے مطلقاً کام نہیں لیا۔'' (ازالۃ الریب ص ۴۳۸)

۱۸۔ گستاخ رسول واجب القتل: توہین وتحقیر نبوت کا مرتکب صرف کافر ہی نہیں ہوتا، بلکہ واجب القتل بھی ہوتا ہے۔ چنانچہ حضرت شیخ امام قاضی ابو یوسفؒ کی کتاب الخراج ص ۱۸۲، قاضی ابو الفضل عیاض اندلسیؒ کی کتاب الشفاء، ۲/ ۱۹۰، علامہ ملا علی قاریؒ کی شرح فقہ اکبر ص ۱۸۶، شیخ الاسلام ابن تیمیہ کی الصارم المسلول ص ۵۲۸ اور علامہ خفاجی کی شرح شفاء ۴/ ۴۲۱ کے حوالے سے نقل کرتے ہیں کہ

''ان تمام عبارات اور اقتباسات سے روز روشن کی طرح یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے بارہ میں ادنیٰ ترین توہین اور تنقیص بھی حضرات فقہاے کرامؒ کے نزدیک موجب کفر ہے اور یہ کہ اسلامی حکومت کا فریضہ ہے کہ اس شخص کو قتل کر دے اور یہ بھی بصراحت گزر چکا ہے کہ جو صفت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے ثابت نہیں ہے، اس کا آپ کے لیے اثبات یقیناً موجب توہین وتحقیر ہے۔'' (ازالۃ الریب ص ۴۴۱)

۱۹۔ مسئلہ شفاعت: مسلمانوں کے حق میں روز محشر مختلف شفاعتوں کا عقیدہ امت کے مشہور ومعروف عقائد میں سے ہے۔ مثلاً آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی شفاعت، قرآن پاک کی شفاعت، شہید کی شفاعت، حافظ قرآن کی شفاعت وغیرہ۔ قرآن پاک میں جہاں شفاعت کی نفی کی گئی ہے، وہ کفار کے لیے ہے۔ لیکن بد قسمتی سے منکرین حدیث کفار کے حق میں نفی شفاعت کی آڑ لے کر اہل ایمان کے حق بھی شفاعت کے منکر ہیں۔ منکرین حدیث کے پیشوا مولوی عبد اللہ چکڑالوی شفاعت کے بارہ میں اپنے ترجمۃ القرآن میں لکھتے ہیں کہ: ''جملہ انبیا ورسل اور ملائکہ مقربین اور ملا اعلیٰ کسی طرح ذرہ بھر سفارش نہ کر سکیں گے۔'' (ص ۲) ''شفاعت کا عقیدہ انبیا ورسل پر بہتان وافترا ہے۔'' (ص ۱۳۵) ''شفاعت کا عقیدہ عقلاً ونقلاً بے انصافی وظلم ہے۔'' (ص ۶) ''شفاعت کا عقیدہ اعلیٰ درجہ اور اول نمبر کی خباثت ونجاست ہے۔'' (ص ۱۲۵) حضرت شیخ منکرین حدیث کے اس موقف کی تردید کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ

''شفاعت کا مسئلہ ایسا اتفاقی اور اجماعی ہے جس کا کوئی بھی مسلمان آج تک انکار نہیں کر سکا۔ اور یہ مسئلہ اپنی شرائط کے ساتھ قرآن کریم کی نصوص سے ثابت ہے اور احادیث متواترہ میں شفاعت کبریٰ وصغریٰ کا صاف وصریح الفاظ میں ذکر آیا ہے۔ نیز انبیا وملائکہ اور صلحا کی شفاعت کا واضح الفاظ میں ثبوت ہے اور یہی مسلمانوں کا عقیدہ ہے۔'' (انکار حدیث کے نتائج ص ۳۷)

۲۰۔ افضل الانبیاء: پوری امت مسلمہ تمام انبیا ورسل کو برحق مانتی اور کسی ایک نبی کی نبوت سے بھی انکار کو کفر سمجھتی ہے، لیکن ان سب میں درجات ومراتب کے فرق کو (جو آیات قرآنیہ اور احادیث صحیحہ سے ثابت ہے) ملحوظ رکھتی ہے اور تمام

انبیا ورسل میں سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو امام المرسلین اور افضل الانبیاء تسلیم کرتی ہے۔ منکرین حدیث کو خدا معلوم اہل اسلام کا یہ عقیدہ کیوں گوارا نہیں اور اس عقیدے سے ان کو کیوں چڑ ہے؟ منکرین حدیث کے پیشوا مولوی عبد اللہ چکڑالوی حضرت مریم علیہا السلام اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا موازنہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ ''مریم علیہا السلام کو جنت کے میوے ملتے تھے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اپنے پیٹ پر تین تین دن پتھر بھوک کے مارے باندھے ہوئے پھرتے تھے۔ پھر بھی مسلمان طوطے کی طرح سید المرسلین اور فخر المرسلین وغیرہ وغیرہ اس قسم کے اور بہت سے خرافات ولغویات، خطابات بھی بکتے رہتے ہیں۔'' (ترجمۃ القرآن، ص ۱۴۷) اور دوسرے مقام پر لکھتے ہیں کہ ''پھر آپ نے ان کو نبیوں کا سردار بنا کر اور انبیا ورسل کی تحقیر وتذلیل کر کے لا نفرق بين احد من رسله کا کفر کیا یا نہیں؟ (اشاعۃ القرآن، ۱/ ۱۴) حضرت شیخ نے اس عقیدہ کو قرآن وحدیث اور اجماع سے ثابت کرتے ہوئے فرمایا ہے کہ

''قرآن کریم کی نصوص قطعیہ، احادیث متواترہ اور اجماع امت سے یہ عقیدہ ثابت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا رتبہ، مرتبہ اور شان نبیوں سے بڑھ کر ہے اور آپ خاتم النبیین اور سید المرسلین ہیں۔'' (انکار حدیث کے نتائج ص ۴۱)

۲۱۔ عذاب وثواب قبر: منکرین حدیث کے پیشوا مولوی عبد اللہ چکڑالوی نے عذاب وثواب قبر سے انکار کرتے ہوئے (ترجمۃ القرآن ص ۹۵ میں) لکھا ہے کہ انسان کے لیے مرنے کے بعد روز قیامت تک درمیانی زمانہ میں کوئی جزا وسزا نہیں ہے تو عذاب قبر کا غلط اور من گھڑت ہونا صاف ظاہر ہے۔ نیز یہ کہ عذاب قبر سوال منکر نکیر کی بنیاد جھوٹی حدیثوں پر ہے۔ اس کا جواب دیتے ہوئے حضرت شیخ نے فرمایا ہے کہ

(۱) ''دلائل قاطعہ اور براہین ساطعہ سے راحت وعذاب قبر وغیرہ کے مسائل ثابت ہیں اور متواتر احادیث کے علاوہ مما خطيئتهم اغرقوا فادخلوا نارا وغیرہ آیات اسی پر نص قطعی ہیں۔'' (انکار حدیث کے نتائج ص ۳۹)

(۲) ''جملہ اہل السنۃ والجماعت اس عقیدہ پر متفق ہیں کہ قبر وبرزخ میں اہل ایمان اور اصحاب طاعات کو لذت وسرور نصیب ہوتا ہے اور کفار ومنافقین اور گناہگاروں کو عذاب وتکلیف حاصل ہوتی ہے۔ اس میں کسی شک وشبہ کی کوئی گنجایش نہیں ہے۔ قرآن وسنت اور اجماع امت کے صریح دلائل کے پیش نظر یہ عقیدہ اتنا مضبوط ہے کہ حضرات فقہاے کرام کا ذمہ دار گروہ عذاب قبر کے منکر کو کافر کہتا ہے، حالانکہ وہ تکفیر کے مسئلہ میں بڑا ہی محتاط ہے۔'' (تسکین الصدور ص ۸۲)

۲۲۔ عذاب وثواب روح مع الجسد: منکرین حدیث کا ایک گروہ تو سرے سے عذاب وثواب قبر کا ہی قائل نہیں اور دوسرا گروہ عذاب وثواب قبر کو تو مانتا ہے، لیکن صرف روح کے لیے۔ جسم کو وہ اس سے بالکل دخل کر دیتا ہے۔ اس کے جواب میں حضرت شیخ فرماتے ہیں کہ

(۱) ''اہل سنت کا مسلک یہ ہے کہ میت جب قبر میں دفن کر دی جاتی ہے تو اس کی روح اس کے جسم کی طرف لوٹا دی جاتی ہے۔ یہ اعادہ بالجملہ (پورا) ہو، بایں طور کہ روح بکمالہ پورے جسم میں داخل ہو جائے جیسا کہ دنیا میں داخل تھی یا فی الجملہ یعنی اس قدر روح کا جسم سے اتصال اور تعلق ہو کہ جس سے راحت وتکلیف کا احساس ہو سکے، یہ اپنے مقام کی بحث ہے اور اس کے بارہ میں کچھ ضروری بحث آگے ہوگی، ان شاء اللہ۔ اس اعادہ کا ثبوت صحیح حدیث سے ہے۔'' (تسکین الصدور، ص ۱۰۷)

(۲) ''اس مفصل اور مدلل باحوالہ بحث سے بخوبی یہ معلوم کر چکے ہیں کہ قبر میں نکیرین کے سوال کے وقت اور اس طرح

قبر کی راحت وعذاب کے سلسلہ میں جمہور فقہا اور متکلمین کے نزدیک روح کا بدن مادی اور عنصری سے باقاعدہ تعلق اتصال اور ربط ہوتا ہے، اگرچہ اس کے اجزا ریزہ ریزہ اور ذرہ ذرہ ہو کر بکھر جائیں اور بقول علامہ آلوسیؒ کے ایک جز مشرق میں اور دوسرا مغرب میں چلا جائے۔ اور روح کا بدن سے یہ اتصال علم، ادراک اور شعور تک ہی محدود رہتا ہے جسم میں تدبیر اور جسم کے نشوونما سے اس کا تعلق نہیں ہوتا جیسا کہ دنیا میں ہوتا ہے۔ اور سابق پیش کردہ حوالے سے اس کا واضح اور بین ثبوت ہیں۔" (ایضاً ص ۱۰۶)

(۳) "ہم تسکین الصدور، سماع الموتی، الشہاب المبین کے علاوہ اس پیش نظر کتاب (المسلک المنصور) میں بھی باحوالہ عرض کر چکے ہیں کہ بعد از وفات، حیات اعادۃ الارواح الی الابدان العنصر یہ کے طریق سے حاصل ہے، گو وہ اہل دنیا کے شعور وادراک سے بالاتر ہے۔ یہی صحیح احادیث کا مفاد ہے اور یہی حضرت امام ابوحنیفہؒ کا ارشاد ہے اور اسی پر اہل سنت کا اتفاق ہے۔" (المسلک المنصور ص ۶۱)

۲۳۔ ایصال ثواب: کون سے اعمال کے ذریعے میت کو ایصال ثواب ہوتا ہے اور کون سے اعمال سے نہیں، اس اختلاف کے باوجود جملہ اہل اسلام میت کے لیے ایصال ثواب پر متفق ہیں، مگر منکرین حدیث اس سے انکاری ہیں۔ حضرت شیخ فرماتے ہیں کہ

"ایصال ثواب کا مسئلہ اہل اسلام کے ہاں ایک طے شدہ حقیقت ہے۔ ملائکہ مقربین کی مغفرت کی دعائیں، نماز جنازہ کی مشروعیت، نیز قرآن کریم کی متعدد دعائیں جو پہلے مسلمانوں کے حق میں کی جاتی ہیں، اس کا واضح ثبوت ہے۔" (انکار حدیث کے نتائج، ص ۴۰)

۲۴۔ نماز تراویح: نماز تراویح رمضان المبارک کی ایک مستقل عبادت ہے۔ سننت لکم قیامہ (ابن ماجہ ص ۹۵، نسائی، ۱/۱۳۹) اور من صام رمضان وقام رمضان ایماناً واحتساباً غفر له ما تقدم من ذنبه (بخاری ۱/۲۶۹، مسلم ۱/۲۵۹) وغیرہ فرامین پیغمبر اس حقیقت پر دال ہیں، لیکن روافض اور منکرین حیات نماز تراویح کی سنیت سے انکاری ہیں۔ حضرت شیخ فرماتے ہیں کہ

"نماز تراویح پر تمام اہل اسلام تاہنوز متفق چلے آرہے ہیں، لیکن مولوی عبد اللہ چکڑالوی یہ کہتے ہیں کہ نماز تراویح پڑھنا ضلالت ہے اور اس پر ایک مستقل رسالہ بھی انہوں نے "البیان الصریح لاثبات کراہۃ التراویح" کے نام سے لکھا ہے۔" (انکار حدیث کے نتائج ص ۴۰)

۲۵۔ رکعات تراویح: نماز تراویح کی طرح رکعات تراویح بھی امت کا ایک اجماعی مسئلہ ہے۔ پوری امت ۲۰ رکعت نماز تراویح پر متفق رہی ہے، لیکن بدقسمتی سے برصغیر پاک وہند کے اندر غیر مقلدین نے اس اجماعی مسئلہ کے اندر موجود امت کی وحدت کو پارہ پارہ کر دیا اور ۲۰ رکعت نماز تراویح پڑھنے والی پوری امت کو بدعتی قرار دے دیا۔ چنانچہ حضرت شیخ فرماتے ہیں کہ

"حضرت عمرؓ خلیفہ ہوئے تو ان کی خلافت میں تقریباً ۱۴ھ سے باقاعدہ جماعت کے ساتھ نماز تراویح شروع ہوئی اور آخر میں انہوں نے حضرات صحابہ کرام کی موجودگی میں مدینہ طیبہ میں مسجد نبوی کے اندر بیس رکعات کا حکم دیا اور ان کے حکم سے بیس رکعتیں ہوتی رہیں اور تقریباً تمام حضرات صحابہ کرام کا اس پر اتفاق واجماع ہو گیا، اور کسی نے اس کا انکار نہیں کیا۔

چنانچہ علامہ موفق الدین ابن قدامہؒ اور شمس الدین ابن قدامہؒ (مغنی ۱/۸۰۲) میں اس کاروائی کو کالاجماع سے تعبیر کرتے ہیں۔ اس وقت سے لے کر ۱۲۸۴ھ تک مختلف مکاتب فکر کے لوگ اسی پر عمل کرتے رہے اور کسی نے اس کے خلاف کرنے کی جرات نہ کی۔" (مقدمہ رسالہ تراویح مع ترجمہ ینابیع ص ۶ ۔ ۷)

۲۶۔ تعدد ازواج: تعدد ازواج جملہ آسمانی تعلیمات میں کبھی بھی متنازعہ نہیں رہا، لیکن یورپین اور اشترا کی اسلام دشمن قوتوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی عظمت وشخصیت کو داغدار کرنے کے لیے (العیاذ باللہ) ایک سے زائد شادی کو حرام وظلم قرار دینے کی مہم عرصہ دراز سے شروع کر رکھی ہے اور اس مہم میں وہ طبقہ زیادہ سرگرمی دکھا رہا ہے جو قرآن پاک کی تعبیر وتشریح کے معروف ومتواتر راستے بند کر کے تحقیق واجتہاد کے نام پر اسے تختہ مشق بنانا چاہتا ہے۔ چنانچہ منکرین حدیث کے پیشوا مولوی عبد اللہ چکڑالوی نے جب (اشاعۃ القرآن ۱/۱۸ میں) لکھا کہ تعدد ازواج بحوالہ قرآن زنا میں داخل ہے جس سے انبیاورسل سلام علیہم اور ان کی امت پاک ہے اور ان پر سراسر بہتان وافترا ہے تو حضرت شیخ نے فرمایا کہ

"قرآن کریم، سنت متواترہ اور تمام امت کے اتفاق سے یہ امر ثابت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے نکاح میں ایک سے زائد (بلکہ بیک وقت نو) منکوحہ بیویاں تھیں اور عام مسلمانوں کو بھی مخصوص شرائط کے تحت بیک وقت چار تک بیویاں رکھنے کی اجازت قرآن کریم اور حدیث صحیح میں مصرح ہے۔" (انکار حدیث کے نتائج، ص ۴۲)

بدقسمتی سے ہمارے پیشہ ور اور جدت پسند مفکرین ومحققین کی یہ عادت ہو گئی ہے کہ یورپین واشترا کی دانشور اسلام کے کسی واقعہ کو خلاف عقل قرار دے دیں تو وہ ایسے واقعات کا ہی سرے سے انکار کر دیتے ہیں اور اپنی اس ذہنی وفکری پسپائی کو وہ بڑے فخر سے مادیت پرستی اور اسلام دشمنی کا مقابلہ قرار دیتے ہیں۔ حیرت ہے کہ جس معاشرہ اور سوسائٹی کے اندر باپ کا نام دریافت کرنے کو بڑی گالی سمجھا جاتا ہو اور جہاں جنس پرستی حیوانیت کی سطح سے بھی کراس کر چکی ہو، وہاں کے کسی نام نہاد مفکر ومحقق کے اعتراض پر ہم اپنے اجماعی ومتواتر مسائل واحکام اور واقعات سے انکار وانحراف کو روشن خیال تحقیق کا نام دیتے ہیں۔

۲۷۔ معراج جسمانی: خدا تعالیٰ نے اپنی قدرت کاملہ سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو بحالت بیداری جسم عنصری کے ساتھ مسجد حرام سے مسجد اقصیٰ تک سیر کرائی اور وہاں سے سدرۃ المنتہیٰ سے اوپر تک معراج کرایا، لیکن مولوی عبد اللہ چکڑالوی، حافظ اسلم جیراج پوری اور پرویز جیسے منکرین حدیث اور مرزا غلام احمد قادیانی اس معراج جسمانی سے انکاری ہیں۔ ان کے نزدیک یہ صرف خواب کا واقعہ ہے۔ حضرت شیخ ان کے رد میں فرماتے ہیں کہ

(۱) "حضرات صحابہ کرام سے لے کر تاہنوز جملہ اہل اسلام اس عقیدہ پر متفق چلے آرہے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو ایک ہی رات میں جسد عنصری کے ساتھ بیداری کی حالت میں مسجد حرام سے مسجد اقصیٰ تک اور پھر وہاں سے ساتویں آسمان تک اور پھر سدرۃ المنتہیٰ تک سیر کرائی۔" (انکار حدیث کے نتائج ص ۴۹)

(۲) "اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ایک بہت بڑا حسی اور اہم معجزہ ذکر فرمایا ہے جس پر متواتر درجہ کی حدیثیں اور امت کا اجماع بھی موجود ہے اور وہ اسرا اور معراج کا معجزہ ہے۔" (راہ ہدایت، ص ۷۹)

اس کے علاوہ حضرت شیخ نے مرزا قادیانی کے انکار معراج پر "ضوء السراج فی تحقیق المعراج یعنی چراغ کی روشنی" کے نام سے ایک مستقل رسالہ بھی تالیف فرمایا ہے۔

۲۸۔ معجزات رسول: آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو دیگر انبیائے کرامؑ کی طرح بے شمار حسی معجزات عطا فرمائے گئے اور

احادیث وسیرت کی کتب میں ان کا بصراحت تذکرہ موجود ہے اور ان پر مستقل کتب بھی موجود ہیں، لیکن منکرین حدیث حافظ محمد اسلم جیراج پوری (مقام حدیث، ص ۱۷۹)، نیاز فتح پوری (من ویزداں ۱/۴۹۱)، غلام احمد پرویز (معارف القرآن، ۴/۷۲۹) میں لکھتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو کوئی حسی معجزہ نہیں دیا گیا۔ حضرت شیخ فرماتے ہیں کہ

(۱) ''قرآن کریم، متواتر احادیث اور تمام امت کا اسی پر اتفاق رہا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو علاوہ قرآن کے معجزہ کے اور بھی بے شمار ظاہری اور حسی معجزات عطا فرمائے تھے۔'' (انکار حدیث کے نتائج ص ۵۲)

(۲) ''کتب احادیث اور تاریخ میں صریح اور صحیح روایات سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بہت سے معجزات ثابت ہیں جن کا انکار کوئی نرا ملحد اور زندیق ہی کر سکتا ہے۔'' (ایضاً ص ۵۴)

۲۹۔ معجزہ شق القمر: انگلی کے اشارے سے چاند کا دو ٹکڑے ہونا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا بہت بڑا معجزہ ہے، لیکن منکرین حدیث اس سے بھی انکاری ہیں۔ حضرت شیخ اس معجزہ کے بارہ میں فرماتے ہیں کہ

(۱) ''جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا انشقاق قمر والا معجزہ قرآن کریم، صحیح احادیث اور اجماع امت سے ثابت ہے۔'' (راہ ہدایت ص ۸۳)

(۲) ''علمائے کرام اور مفسرین کرام کے نزدیک یہ ایک امر اتفاقی ہے کہ انشقاق القمر کا معجزہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں واقع ہو چکا ہے۔'' (انکار حدیث کے نتائج ص ۵۳، بحوالہ تفسیر ابن کثیر ۲/۲۶۴)

(۳) ''بعض حضرات نے اقترب الساعة وانشق القمر میں قرب قیامت کا انشقاق قمر مراد لیا ہے اور قبل از وقوع اس کی خبر دینے کو معجزہ پر حمل کیا ہے، لیکن یہ ان کی غلطی ہے، کیونکہ قرآن کریم میں لفظ انشـــق ہے جو ماضی کا صیغہ ہے اور متواتر درجہ کی حدیثیں اور امت کا اجماع اس مفہوم کو متعین کر دیتا ہے کہ اس سے قیامت کے وقت کا انشقاق مراد نہیں، بلکہ ایسا واقعہ ہے جو ماضی میں واقع ہو چکا ہے۔'' (ایضاً ص ۵۳)

۳۰۔ قرآن کریم کا مکمل من جانب اللہ ہونا: منکرین حدیث نے حدیث رسول کے انکار کے ساتھ ساتھ قرآن کریم کے بارہ میں بھی شکوک وشبہات پیدا کرنے شروع کر دیے۔ چنانچہ مشہور منکر حدیث نیاز فتح پوری لکھتے ہیں کہ ''تمام مسلمانوں اور مولویوں کا یہ عقیدہ کہ قرآن اپنے الفاظ اور اپنی ترتیب کے لحاظ سے بتمامہا پہلے لوح محفوظ میں منقوش موجود تھا اور فرشتہ جبرائیل یہی محفوظ ومنقوش کلام رسول اللہ کو آ کر سناتا تھا اور رسول اللہ انہی آسمانی الفاظ کو دہراتے تھے، حد درجہ مضحکہ خیز ہے۔ اگر قرآن کی زبان عربی نہ ہوتی بلکہ کوئی اور زبان ہوتی تو بھی خیر کچھ کہا جا سکتا تھا، لیکن جبکہ وہ اسی زبان میں نازل ہوا تھا جو عام طور پر عرب میں رائج تھی تو اس کے الفاظ کو کیونکر خدائی الفاظ کہا جا سکتا ہے؟ بہر حال قرآن کو خدا کا کلام اس حیثیت سے تسلیم کرنا کہ اس کا ایک ایک لفظ ایک ایک نقطہ خدا کا بنایا ہوا ہے اور خود رسول اللہ کے عقل ودماغ کو اس سے کوئی تعلق نہ تھا، خدا کو اس کے منصب سے گرا کر انسان کی حد تک کھینچ لاتا ہے اور رسول کو سطح انسانیت سے بھی نیچے گرا دیتا ہے۔'' (من ویزداں ۱/۵۵۲) اور دوسرے مقام پر لکھتے ہیں کہ ''کلام مجید کو نہ کلام خداوندی سمجھتا ہوں اور نہ الہام ربانی، بلکہ ایک انسان کا کلام جانتا ہوں۔'' (ایضاً ۲/۴۰۵) اس پر حضرت شیخ فرماتے ہیں کہ

''تمام اہل اسلام ہر زمانہ میں اس کے قائل رہے ہیں اور بفضلہ تعالیٰ اب بھی اسی کے قائل ہیں کہ قرآن کریم کی ایک ایک آیت، ایک ایک لفظ اور ایک ایک حرف ونقطہ خدا تعالیٰ ہی کی طرف سے بواسطہ جبرائیلؑ حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ

علیہ وسلم پر نازل ہوا۔'' (انکار حدیث کے نتائج ص ۶۶)

۳۱۔ جنت ودوزخ کا دوام: منکرین حدیث اول تو عذاب وراحت اور جنت ودوزخ کے ہی منکر ہیں جیسا کہ نیاز فتح پوری لکھتے ہیں کہ ''الغرض بقائے روح اور عذاب وثواب کا عقیدہ خدا کی بے نیازی اور علم وعقل کو دیکھتے ہوئے ضرورت ومصلحت اور قانون قدرت دونوں کے خلاف ہے اور اس کو تسلیم کرانے کے لیے نہ کوئی ربانی دلیل پیش کی جا سکتی ہے اور نہ اخلاقی وعلمی'' (من ویزداں ۱/۵۳۱) اور دوسرے مقام پر لکھتے ہیں کہ ''اس میں شک نہیں کہ کلام مجید میں دوزخ وجنت کا بیان اسی طرح کیا گیا ہے جیسے وہ کوئی مادی چیزیں ہوں، لیکن اس بیان کی حقیقت کو سمجھنا سخت غلطی ہے۔'' (ایضاً ۲/۱۶۷) لیکن بعض منکرین حدیث جیسے مولوی محمد علی لاہوری وغیرہ عذاب وثواب اور جنت ودوزخ کا وجود تو مانتے ہیں لیکن دوزخ کو دائمی وابدی نہیں مانتے۔ ان کے نزدیک دوزخ صرف اصلاح کا ایک مرکز ہے۔ جوں جوں دوزخیوں کی اصلاح ہوتی جائے گی، ان کو دوزخ سے نکالا جاتا رہے گا یہاں تک کہ دوزخ، دوزخیوں سے خالی ہو کر ختم ہو جائے گی۔ چنانچہ حضرت شیخ فرماتے ہیں کہ

''قرآن کریم، احادیث صحیحہ اور اجماع امت سے ثابت ہے کہ جس طرح جنت دائمی وابدی ہے، اسی طرح دوزخ بھی ابدی ہے اور دوزخ بھی کبھی فنا نہیں ہوگی اور کافروں کو ابدالآباد تک دوزخ میں رہنا ہوگا۔ لیکن مولوی محمد علی لاہوری کچھ بے سروپا آثار واقوال پر بنیاد رکھ کر یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ ایک وقت ایسا آئے گا جس میں دوزخ فنا ہو جائے گی اور اس سے سب کافر نکال لیے جائیں گے۔'' (مودودی صاحب کا غلط فتویٰ ص ۱۳)

۳۲۔ نصاب زکوٰۃ: قرآن کریم کے اندر چونکہ زکوٰۃ کا صرف حکم موجود ہے، اس کا نصاب ومقدار موجود نہیں، اس لیے منکرین حدیث نے زکوٰۃ کو بھی ایک ٹیکس قرار دے کر اس کے نصاب ومقدار کا اختیار حکومت وقت کو دے دیا۔ چنانچہ غلام احمد پرویز لکھتے ہیں کہ ''قرآن میں زکوٰۃ کا تعین نہیں، اس لیے ہر دور میں اسلامی حکومت خود متعین کرے گی کہ اسے کس قدر روپے کی ضرورت ہے اور اسی حساب سے وہ قوم سے ٹیکس وصول کرے گی۔'' (معارف القرآن، ۴/۴۶۹) ایک دوسرے مقام پر لکھتے ہیں کہ ''زکوٰۃ اس ٹیکس کے علاوہ اور کچھ نہیں جو اسلامی حکومت مسلمانوں پر عائد کرے۔ اس ٹیکس کی کوئی شرح معین نہیں کی گئی، اس لیے کہ شرح ٹیکس کا انحصار ضروریات ملی پر ہے حتیٰ کہ ہنگامی صورتوں میں حکومت وہ سب کچھ وصول کر سکتی ہے جو کسی کی ضرورت سے زائد ہو۔ لہٰذا جب کسی جگہ اسلامی حکومت نہ ہو تو پھر زکوٰۃ بھی باقی نہیں رہتی۔'' (ماہنامہ طلوع اسلام، جنوری ۱۹۴۹ء ص ۸۲) اس پر حضرت شیخ فرماتے ہیں کہ

(۱) ''تمام احادیث اور سو فیصدی مسلمان اس پر متفق چلے آ رہے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم خداوندی کے مطابق سونے، چاندی، نقد اور سامان تجارت میں سے چالیسواں حصہ مقرر کیا ہے۔'' (انکار حدیث کے نتائج ص ۱۲۲)

(۲) غور کیجیے کہ پرویز صاحب نے جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صحیح اور صریح احادیث اور امت کے اجماع واتفاق کے مقابل میں کس جرات سے متوازی شریعت اور دین کھڑا کر دیا ہے کہ زکوٰۃ کا کوئی تعین ہی نہیں ہے اور ہر دور کی اسلامی حکومت یہ خود متعین کرے گی کہ اسے کس قدر روپے کی ضرورت ہے۔'' (ایضاً ص ۱۲۲)

۳۳۔ سارق وزانی محصن کی شرعی سزا: چوری کرنے والے مرد اور چوری کرنے والی عورت کے لیے قطع ید کی سزا قرآن کریم میں بصراحت بیان کی گئی ہے اور زانی محصن کی سزا رجم (یعنی سنگسار کرنا) احادیث صحیحہ میں واضح طور پر مذکور ہے، لیکن منکرین حدیث ان دونوں سزاؤں کو شرعی سزا تسلیم نہیں کرتے۔ چنانچہ طلوع اسلام ۱۵/ اکتوبر ۱۹۵۵ء ص ۷ا پر مذکور ہے کہ

''السارق و السارقۃ فاقطعوا ایدیھما یعنی چور مرد اور چور عورت کی سزا یہ ہے کہ ان کے ہاتھ کاٹ دو۔ بعض نے یہ بھی کہا ہے کہ قطع ید کے معنی ہیں ایسے حالات پیدا کرنا جس سے ان کے ہاتھ چوری سے رک جائیں۔'' اور طلوع اسلام نومبر ۱۹۴۹ ص ۶ میں ہے کہ ''باقی رہا یہ کہ زنا کی سزا سنگساری میں کیا حرج ہے، سو حرج یہ ہے کہ جب خدا نے حکم دے دیا کہ اس کی سزا سو کوڑے ہے تو کس کی مجال ہے کہ اس حکم کو کسی دوسرے حکم سے بدل دے؟'' اس کے جواب میں حضرت شیخ فرماتے ہیں:

''طلوع اسلام سے اس کے اس بیان کے پیش نظر دریافت طلب امر یہ ہے کہ جب خدا نے یہ حکم دے دیا ہے کہ چور مرد اور چور عورت کی سزا قطع ید ہے تو اس کے اس حکم کو کسی دوسرے کے اس حکم سے کیسے تبدیل کیا جا سکتا ہے کہ اس کے لیے ایسے حالات پیدا کرنا ہے جس سے اس کے ہاتھ چوری سے رک جائیں؟'' (انکار حدیث کے نتائج ص ۱۷۰)

اور جہاں تک زانی محصن کی شرعی سزا کا تعلق ہے تو اس بارہ میں حضرت شیخ فرماتے ہیں کہ

''مسلمان اس امر پر تا ہنوز متفق رہے ہیں کہ زانی محصن کی سزا جو صحیح احادیث سے ثابت ہے، صرف رجم اور سنگساری ہی ہے۔'' (ایضاً ۱۶۹)

یعنی ان دونوں سزاؤں پر امت کا اجماع ہو چکا۔ قرآنی حوالہ سے سارق و سارقہ کے لیے قطع ید کی سزا بھی اجماعی مسئلہ ہے اور شادی شدہ مرد و زن کے لیے زنا کی سزا رجم وسنگساری پر بھی امت کا اجماع منعقد ہو چکا ہے، لہٰذا ان میں ترمیم و تغیر کی کوئی گنجائش باقی نہیں۔

۳۴۔ کتب سماویہ میں تحریف: قرآن وحدیث کے اندر کتب سماویہ (تورات، زبور، انجیل اور دیگر صحف) میں تحریف اور ان میں تغیر وتبدل کا واضح ثبوت موجود ہے، لیکن بعض طبقات یہودیت وعیسائیت کے ساتھ ذہنی یک جہتی کی خاطر اور ان پر اسلام کی بالادستی کا تصور ختم کرنے کے لیے اس تحریف سے صاف انکاری ہیں۔ حضرت شیخ فرماتے ہیں کہ:

''قرآن کریم کی نصوص قطعیہ، متواتر احادیث اور تمام مسلمانوں کا اس پر اتفاق ہے کہ یہود ونصاریٰ نے اپنی کتب میں تحریف کا ارتکاب کیا ہے اور یہ بھی منصوص ہے کہ اسلام کے بغیر کوئی مذہب اب خدا تعالیٰ کی رضا جوئی تک پہنچانے کا کفیل نہیں ہے۔'' (انکار حدیث کے نتائج ص ۷۹)

۳۵۔ مسئلہ تقدیر: مسئلہ تقدیر اسلام کے بنیادی عقائد میں سے ہے، لیکن بدقسمتی سے منکرین حدیث نے اس عقیدہ کی بھی نفی کر دی۔ حضرت شیخ اس عقیدہ کے بارہ میں فرماتے ہیں کہ

''قرآن کریم کی نصوص قطعیہ، متواتر درجہ کی احادیث اور امت مسلمہ کے اجماع سے یہ عقیدہ ثابت ہے کہ تقدیر پر ایمان لانا ضروری ہے اور بغیر اس پر ایمان لائے اگر کوئی احد پہاڑ کی مانند سونا بھی خدا تعالیٰ کی راہ میں صرف کر دے تو وہ ہرگز قبول نہ ہوگا۔'' (انکار حدیث کے نتائج ص ۱۷۵)

۳۶۔ ڈاڑھی کی شرعی حیثیت: ڈاڑھی کے سنت رسول ہونے میں کبھی کسی مسلمان کو شبہ نہیں رہا۔ ہر زمانہ کے مسلمانوں نے اسے سنت رسول ہی کی حیثیت سے اپنایا۔ حکیم الامت مولانا شاہ اشرف علی تھانویؒ کی بوادر النوادر ۲/۴۴۳ کے حوالہ سے حضرت شیخ فرماتے ہیں کہ

''اجماع امت یہ ہے کہ ایک قبضہ سے ڈاڑھی کم کرنا حرام ہے۔'' (حلیۃ المسلمین ص ۵)

مزید وضاحت کرتے ہوئے حضرت شیخ فرماتے ہیں کہ

(۱) ''حضرات صحابہ کرام، تابعین اور اتباع تابعین کے دور میں قبضہ (مٹھی بھر) سے کم ڈاڑھی کا کوئی ثبوت نہیں اور خلافت راشدہ میں بھی اس کی کوئی مثال موجود نہیں۔ اس مبارک دور میں تمام مسلمان از شرق تا غرب، از شمال تا جنوب جہاں بھی موجود تھے، ڈاڑھی کی پابندی کرتے تھے۔ البتہ یہود و مجوس اور نصاریٰ وبد باطن فرقوں کی بات جدا ہے۔ لیکن جس زمانہ میں خلافت راشدہ نہ تھی اور اسلام کے احکام بھی من وعن نافذ نہ تھے، اس زمانہ میں بھی بے ریش کو انتہائی حقارت کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا اور حسب مقدرت اس کو سزا دی جاتی تھی تاکہ دیکھنے والوں کے لیے عبرت ہو، چنانچہ مشہور مورخ ومفسر حافظ عماد الدین ابن کثیر الشافعی لکھتے ہیں کہ ۷۶۱ھ میں دمشق میں (ملنگوں کے) قلندریہ فرقہ کے کچھ لوگوں نے ڈاڑھیاں منڈوا دیں تو اس وقت کے بادشاہ سلطان حسن بن محمدؒ نے حکم دیا کہ ان کو ملک بدر کر دیا جائے اور اس وقت تک ان کو اسلامی شہروں میں داخل نہ ہونے دیا جائے جب تک کہ وہ کافرانہ شعار سے توبہ نہ کر لیں۔ حافظ موصوف (البدایہ والنہایہ ۱۴/۲۷۴ میں) لکھتے ہیں کہ یہ فعل باجماع امت حرام ہے۔'' (ایضاً ص ۴، ۵)

(۲) مشہور فقیہ حافظ ابن الہمام الحنفیؒ کی فتح القدیر ۲/۷۷ کے حوالے سے فرماتے ہیں:

''ڈاڑھی ترشوانا جب کہ ایک مٹھی سے کم ہو جیسا کہ بعض مغربی اور مخنث قسم کے مردوں کا فعل ہے تو اس کو کسی نے بھی مباح قرار نہیں دیا اور سب ڈاڑھی کا منڈوانا تو ہندوستان کے ہندوؤں اور عجم کے مجوسیوں کا طریقہ ہے۔'' (ایضاً ص ۵)

(۳) ''ان تصریحات کی موجودگی میں ڈاڑھی منڈوانے اور مٹھی سے کم ترشوانے کے حرام اور گناہ ہونے میں کیا شبہ رہ جاتا ہے؟ ایک طرف یہ ٹھوس حوالے ملاحظہ کریں اور دوسری طرف مودودی صاحب کا یہ خالص اختراعی نظریہ ملاحظہ فرمائیں۔ چنانچہ وہ لکھتے ہیں کہ..... ''آپ کا خیال کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم جتنی بڑی ڈاڑھی رکھتے تھے، اتنی بڑی ڈاڑھی رکھنی سنت رسول اور اسوہ رسول ہے، یہ معنی رکھتا ہے کہ آپ عادات رسول بعینہ وہ سنت سمجھتے ہیں جس کے جاری اور قائم رکھنے کے لیے نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور دوسرے انبیائے کرام مبعوث کیے جاتے رہے۔ مگر میرے نزدیک صرف یہی نہیں کہ یہ سنت کی صحیح تعریف نہیں بلکہ یہ عقیدہ رکھتا ہوں کہ اس قسم کی چیزوں کو سنت قرار دینا اور پھر ان کی اتباع پر اصرار کرنا ایک سخت قسم کی بدعت اور خطرناک تحریف دین ہے۔'' (رسائل ومسائل ص ۲۰۸) مودودی صاحبؒ کی بے باکی اور جرات ملاحظہ کیجیے کہ ڈاڑھی جیسی سنت صحیحہ کی اتباع اور پیروی کرنے کو سخت قسم کی بدعت اور خطرناک تحریف دین کہتے ہیں۔'' (ایضاً ص ۶)

مودودی صاحب ڈاڑھی کی سنت کو بدعت اور تحریف دین قرار دینے کے باوجود خود ڈاڑھی سے آراستہ تھے، لیکن اس وقت بعض ایسے جدت پسند بھی ان کے ہم نوا ہیں جن کے چہرے اس زینت سے محروم ہیں۔ ایسے معلوم ہوتا ہے کہ مودودی صاحب نے تو یہ فیصلہ اپنے فکر کو سامنے رکھتے ہوئے کیا ہے، لیکن دوسرے جدت پسند یہ فیصلہ اپنی شخصیت اور صورت کو سامنے رکھ کر کرتے ہیں کہ کون سی چیز سنت ہے اور کون سی سنت نہیں۔ جو چیز ان کی شخصیت میں موجود ہے، وہ سنت ہے، اور جو چیز ان کی شخصیت میں شامل وداخل نہیں، وہ سنت بھی نہیں۔

۳۷۔ وفات رسول: روضہ اقدس کے اندر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات مبارکہ کو بعض ناعاقبت اندیش لوگ نہایت غلط رنگ میں پیش کرتے ہوئے علمائے دیوبند پر یہ الزام عائد کرتے ہیں کہ وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے منکر ہیں۔ (العیاذ باللہ) حضرت شیخ اس الزام کا جواب دیتے ہوئے فرماتے ہیں کہ

''ان تمام آیات سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات بھی ایک قطعی اور حتمی امر ہے

جس کی ان آیات میں قبل از وقت خبر دی گئی اور کتب احادیث میں متعدد صحیح وصریح روایات اس پر دال ہیں کہ قبض النبی صلی اللہ علیہ وسلم اور توفی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت امام بخاریؒ نے باب وفاۃ النبی صلی اللہ علیہ وسلم قائم کرکے اس حقیقت کو الم نشرح کر دیا ہے۔ (بخاری ۲/۶۴۱) اور اسی وفات کے نتیجہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تجہیز وتکفین اور دفن وقبر وغیرہ کا انتظام ہوا اور حضرات صحابہ کرام نے اپنے ہاتھوں سے لحد مبارک میں آپ کو اتار کر دفن کیا اور اس کے بعد حضرت ابوبکر صدیقؓ کو خلیفۃ المسلمین منتخب کیا گیا اور وہی نماز اور خطبہ پڑھاتے اور فصل خصومات کرتے رہے اور اہم معاملات میں لوگ انہی کی طرف رجوع کرتے رہے اور اسی طرح ان کے بعد دیگر خلفا کے وقت بھی ایسا ہی ہوتا رہا۔ یہ تمام امور اپنے مقام پر ایک ثابت شدہ حقیقت ہے جو قرآن وحدیث اور امت مسلمہ کے اتفاق واجماع سے ثابت ہے جس کا کوئی شخص منکر نہیں۔'' (تسکین الصدور ص ۲۱۵)

عام طور پر حجۃ الاسلام مولانا قاسم نانوتویؒ کے نظریہ وفات پیغمبر سے غلط فہمیاں پیدا کی جاتی ہیں کہ وہ وفات پیغمبر کے منکر ہیں، حالانکہ یہ سراسر غلط ہے۔ وہ وفات پیغمبر کے منکر نہیں، بلکہ کیفیت وفات میں جمہور اہل سنت سے اختلاف رکھتے ہیں۔ جمہور اہل سنت انقطاع روح عن الجسد کی کیفیت سے وفات مانتے ہیں، جبکہ حضرت نانوتویؒ انقباض روح کی کیفیت سے وفات مانتے ہیں۔ گویا یہ اختلاف وفات کا نہیں، صرف کیفیت وفات کا ہے اور یہ حضرت نانوتویؒ کا تفرد ہے جسے دیگر علمائے دیوبند نے قبول نہیں کیا، چنانچہ حضرت شیخ فرماتے ہیں کہ

''الغرض حضرت نانوتویؒ نے کیسی صاف گوئی سے یہ واضح کر دیا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کا عقیدہ ضروری ہے اور علمی یا ذوقی طور پر بعض دیگر علما کی طرح موت کا جو معنی انہوں نے بیان فرمایا ہے، اس کو نہ تو وہ عقائد ضروریہ سے سمجھتے ہیں اور نہ عام لوگوں کو اس کی تعلیم وتبلیغ کرتے ہیں اور نہ علمائے کرام سے اس پر ہاتھا پائی کے لیے تیار ہیں۔ الحاصل حضرات انبیائے کرام علیہم السلام کی وفات ایک حتمی اور قطعی امر ہے اور اس کا اعتقاد ضروری ہے کیوں کہ یہ نصوص قطعیہ اور صریحہ سے ثابت ہے۔'' (ایضاً ص ۲۱۷)

۳۸۔ عقیدہ حیات النبی: وفات کے بعد عالم برزخ کے اندر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور دیگر انبیائے کرام کی برزخی حیات ایک اجماعی واتفاقی مسئلہ ہے، البتہ ہمارے ہاں ایک طبقہ ایسا موجود ہے جو قبر کو عالم برزخ کا حصہ ماننے کی بجائے اسے عالم دنیا کا حصہ قرار دیتا ہے، اسی لیے جب قبر کے اندر انبیائے کرام کی برزخی حیات کا تذکرہ کیا جاتا ہے تو وہ گروہ فوراً مشتعل اور جذباتی ہو جاتا ہے اور چیخ اٹھتا ہے کہ یہ دیوبندی قبر کے اندر نبی کی دنیوی حیات مانتے ہیں، حالانکہ اصل مسئلہ یہ ہے کہ وہ طبقہ عالم برزخ کے اندر نبی کے جسم وروح کا تعلق ماننے پر آمادہ نہیں۔ اس کا نظریہ ہے کہ نبی کی روح تو جنت کے اندر، البتہ جسم جنت سے باہر ہے۔ حضرت شیخ اس عقیدہ کی وضاحت کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ

(۱) ''تمام اہل السنت والجماعت اس بات پر متفق ہیں کہ حضرات انبیائے کرام، قبر اور برزخ میں زندہ ہیں اور ان کی زندگی حضرات شہدا کی زندگی سے بھی اعلیٰ وارفع ہے۔'' (تسکین الصدور، ص ۲۱۹)

(۲) ''یہاں تک جتنے حوالے پیش کیے گئے ہیں اور جتنی بحث بھی ہوئی ہے، اس کا حاصل یہ ہے کہ مختلف مکاتب فکر کے علما اس بات پر متفق ہیں کہ قبور میں حضرات انبیائے کرام کی حیات اور زندگی ایک طے شدہ حقیقت ہے۔ اس میں کسی کا کوئی اختلاف نہیں ہے۔ کافی تلاش اور خاصی کاوش کے باوجود سینکڑوں کتابوں کی ورق گردانی کے بعد اہل السنت والجماعت

میں ایک شخص بھی ایسا نہیں مل سکا جو یہ کہتا ہو کہ حضرات انبیائے کرام اور علی الخصوص حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم اپنی قبر مبارک میں زندہ نہیں اور آپ کی روح مبارکہ کا جسد اطہر سے کوئی اتصال وربط نہیں۔'' (ایضاً ص ۲۷۳)

۳۹۔ سماع النبی عند القبر: انبیائے کرام کی حیات فی القبور کے علاوہ ان کے سماع عند القبر سے بھی ناعاقبت اندیش لوگوں نے انکار کر رکھا ہے، حالانکہ یہ بھی ایک اجماعی مسئلہ ہے۔ چنانچہ حضرت شیخ فرماتے ہیں کہ

(۱) ''آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے عند القبر صلوٰۃ وسلام کے سماع کا نظریہ اتفاقی واجماعی ہے اور اس پر امت کا تعامل رہا ہے اور اب بھی ہے۔ حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ (فتاویٰ رشیدیہ، ۱/۱۰۰) میں فرماتے ہیں کہ انبیائے کرام کے سماع میں کسی کا اختلاف نہیں اور حضرت مولانا تھانویؒ (امداد الفتاویٰ ۵/۱۱۰) میں فرماتے ہیں کہ روضہ پاک پر درود شریف پڑھا جاتا ہے، وہ بالاتفاق بلاواسطہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر پیش ہوتا ہے اور آپ اس کو سنتے اور جواب دیتے ہیں۔'' (المسلک المنصور ص ۴۷)

(۲) ''جناب سید عنایت اللہ شاہ بخاری گجراتی سے قبل از شرق تا غرب از شمال تا جنوب پوری امت میں کوئی شخص ایسا نہیں گزرا جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے عند القبر صلوٰۃ وسلام کے سماع کا منکر ہو اور اس عقیدہ والا بدعتی بھی ہے، اہل السنت والجماعت سے خارج بھی ہے اور اس کے پیچھے نماز بھی مکروہ ہے۔ (المسلک المنصور ص ۴۹)

(۳) ''باقی رہا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی قبر مبارک کے پاس صلوٰۃ وسلام کے سماع کا مسئلہ تو اس میں فریقین کے درمیان قطعاً کوئی اختلاف نہ تھا۔ اس مسئلہ میں امت میں سب سے پہلے اختلاف ۱۳۷۴ھ کے بعد سید عنایت اللہ شاہ گجراتی نے پیدا کیا ہے۔ اور یہ کہنا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم عند القبر صلوٰۃ وسلام نہیں سنتے اور نہ جواب دیتے ہیں اور آپ کی روح مبارک کا جسد اطہر سے قبر شریف میں کوئی تعلق نہیں ہے، یہ امت میں نئی بدعت اور نیا فتنہ ہے۔ فالی اللہ المشتکی۔'' (خزائن السنن ۳/۵۵)

(۴) ''ان تمام اقتباسات سے یہ امر روشن ہو گیا ہے کہ اگر کوئی شخص آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی قبر مبارک کے پاس صلوٰۃ وسلام پڑھے تو اس کو آپ خود بنفس نفیس سنتے ہیں اور دور سے فرشتے پہنچاتے ہیں۔ اور حضرت گنگوہیؒ کی عبارت یہ بات واضح ہو گئی ہے کہ حضرات انبیائے کرامؑ کے سماع میں کسی کا کوئی اختلاف نہیں۔ جو شخص اس کا منکر ہو، وہ اجماع کا منکر ہے اور منکر اجماع کے لیے جو وعیدیں وارد ہوئی ہیں، وہ سب بلاشبہ اس شخص پر چسپاں ہیں۔'' (تسکین الصدور، ص ۳۴۶)

۴۰۔ مسئلہ سماع موتی: انبیائے کرام کے علاوہ باقی اموات کے سماع میں اہل السنت والجماعت کے درمیان اختلاف موجود ہے۔ اس اختلاف کی وجہ سے اس کے کسی ایک فریق پر بھی گمراہی اور ضلالت کا فتویٰ نہیں دیا جا سکتا، البتہ جمہور اہل سنت سماع موتی کے قائل ہیں۔ چنانچہ حضرت شیخ فرماتے ہیں کہ

(۱) ''عام اموات کے عند القبور سماع اور عدم سماع کا مسئلہ حضرات صحابہ کرام سے تاہنوز اختلافی رہا ہے۔ سماع کے قائلین بھی ہیں اور منکرین بھی۔ اکثر امت جن میں حضرات موالک، حضرات شوافع، حضرات حنابلہ تقریباً سبھی اور حضرات احناف بھی معتد بہ طبقہ اور جم غفیر سماع کا قائل ہے۔'' (خزائن السنن ۳/۵۵)

(۲) ''پوری امت بشمولیت جملہ اکابر علمائے دیوبند کثر اللہ سوادہم حضرات انبیائے کرام کے عند القبور سماع کو اتفاقی طور پر تسلیم کرتے ہیں، اور بقول حضرت گنگوہیؒ اس مسئلہ میں کسی کا اختلاف نہیں ہے۔ اور عام اموات کے سماع اور عدم سماع کو حضرات صحابہ کرام سے لے کر تاہنوز اختلافی مسئلہ تسلیم کرتے ہیں، قائلین اور منکرین دونوں کو اہل السنت

والجماعت ہی مانتے ہیں۔'' (الشہاب المبین ص ۱۱)

(۳) ''حضرات صحابہ کرام کے مبارک دور اور خیر القرون کے زمانہ سے لے کر اس وقت تک یہ مسئلہ اختلافی چلا آ رہا ہے کہ قبروں کے پاس اگر کوئی شخص اہل قبور کو سلام وغیرہ عرض کرے تو مردے سنتے ہیں یا نہیں؟ ایک گروہ سماع موتی کا قائل ہے جس میں حضرات صحابہ کرام کے علاوہ حضرات مالکیہ، شافعیہ اور حنابلہ کا جم غفیر اور حضرات احناف کا معتد بہ طبقہ اور اکابر علمائے دیوبند کی اکثریت شامل ہے۔ اس مسئلہ کے اختلافی ہونے کا انکار یا تو نرے جاہل اور ضدی سے سرزد ہوگا اور یا کسی مجذوب سے، ورنہ کوئی بھی حقیقت شناس، دیانت دار عالم اور خدا خوف مسلمان اس کا انکار نہیں کر سکتا۔'' (سماع الموتی ص ۷۸)

۴۱۔ مسئلہ توسل: آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور دیگر انبیائے کرام وصلحاؒ کے وسیلہ سے مانگنے کی شرعی حیثیت کیا ہے؟ یہ جائز ہے یا ناجائز؟ اس پر تبصرہ کرتے ہوئے حضرت شیخؒ فرماتے ہیں کہ

(۱) ''ہاں البتہ اس امر میں اختلاف ہے کہ دعا میں یہ کہا جا سکتا ہے یا نہیں کہ مثلاً اے پروردگار تو بوسیلہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم یا بطفیل حضرت ابوبکر صدیق یا بہ برکت حضرت امام ابوحنیفہؒ یا بحرمت سید عبد القادر جیلانیؒ یا بجاہ حضرت مجدد الف ثانیؒ میرا کام کر دے؟ یا اس قسم کا کوئی مفہوم ہو جس کو اپنی زبان، لغت اور عرف کے اعتبار سے ادا کرے تو آیا درست ہے یا نہیں؟ حافظ ابن تیمیہؒ اور ان کے اتباع اس کا انکار کرتے ہیں اور فرماتے ہیں کہ ایسا کہنا درست نہیں ہے۔ علامہ سبکیؒ (شفاء السقام ص ۱۲۰ میں) ابن تیمیہ کا رد کرتے ہیں کہ ان سے پہلے یہ بات کسی عالم نے نہیں کی۔..... اس سے صاف طور پر یہ بات معلوم ہو گئی کہ توسل کا انکار حافظ ابن تیمیہؒ سے قبل کسی عالم نے نہیں کیا اور اس مسئلہ کے پہلے منکر یہی حافظ ابن تیمیہ ہیں۔'' (تسکین الصدور، ص ۳۹۸)

(۲) ''الغرض توسل جمہور سلف وخلفؒ کے نزدیک درست ہے۔ حافظ ابن تیمیہ، ان کے تلامذہ اور اس لڑی کے بیشتر حضرات اور زمانہ حال کے اکثر غیر مقلدین حضرات اس کے منکر ہیں۔ بعض ان میں سے اس کے جواز کے قائل بھی ہیں جن کے حوالے عنقریب آ رہے ہیں اور ہمارے اکابر علمائے دیوبند تقریباً سبھی مشروع توسل کے جواز کے قائل ہیں۔ یہ یاد رہے کہ توسل کا مسئلہ صرف جواز کا درجہ رکھتا ہے، نہ ضروری ہے، نہ ناجائز اور گمراہی ہے جیسا کہ وہم کیا گیا ہے۔'' (ایضاً ص ۴۰۰)

۴۲۔ مسئلہ علم غیب وحاظر وناظر: قرآنی ونبوی تعلیمات کی روشنی میں امت مسلمہ اس بات پر متفق ہے کہ علم غیب خاصہ خداوندی ہے اور حاضر وناظر ہونا اسی کی صفت ہے، لیکن بدقسمتی سے ہمارے ہاں کے بعض طبقات انبیائے کرام اور اولیاء اللہ میں بھی یہ اوصاف ثابت کرنے پر مصر ہیں۔ حضرت شیخؒ اس مسئلہ پر متعدد حوالے پیش کرنے کے بعد فرماتے ہیں کہ

(۱) ''حضرات! آپ نے ملاحظہ کر لیا کہ حضرات فقہائے احناف کے نزدیک یہ مسئلہ اتنا واضح اور بے غبار ہے کہ وہ بغیر کسی خوف اور لومۃ لائم کے ایسے شخص کی تکفیر کرتے ہیں جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو ہر جگہ حاضر وناظر اور عالم الغیب تسلیم کرتا ہے۔ تمام ذمہ دار اور محقق علمائے احناف سو فیصدی اس پر متفق ہیں اور یہی اکابر علمائے دیوبند کا عقیدہ ہے۔'' (آنکھوں کی ٹھنڈک، ص ۲۷)

(۲) ''قارئین کرام! آپ نے ملاحظہ کیا کہ حضرات فقہائے احنافؒ کا محتاط، سنجیدہ اور متین گروہ کس بے باکی کے ساتھ لومۃ لائم کے بغیر اس شخص کی تکفیر صراحت کے ساتھ کرتا ہے جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے علم غیب ثابت کرتا یا آپ کو حاضر وناظر مانتا ہے۔ گویا حضرات فقہائے کرامؒ کے نزدیک یہ مسئلہ اصول دین سے بھی ہے اور ضروریات دین سے بھی اور اس کا ماخذ نصوص قطعیہ بھی ہیں اور امت کا اجماع قطعی بھی۔'' (ازالۃ الریب ص ۴۴۶)

۴۳۔ جواز واخفائے ذکر: ذکر الٰہی ایک اعلیٰ درجہ کی عبادت ہے، لیکن بدقسمتی سے اس عبادت کو بھی تفریق امت کا ذریعہ بنا لیا گیا ہے۔ ہمارے ہاں ایک طبقہ وہ ہے جو انکار حدیث کی بنا پر جواز ذکر کا ہی قائل نہیں اور دوسرا طبقہ وہ ہے جس نے ذکر کو اپنا مسلکی اور گروہی تشخص قائم کرنے کا ہتھیار بنا کر ذکر بالجہر کی خصوصی مجالس کا اہتمام کر رکھا ہے۔ حضرت شیخؒ دونوں کو راہ اعتدال کے خلاف قرار دیتے ہیں، چنانچہ فرماتے ہیں کہ

(۱) ''صحابہ کرام سے لے کر یہ نظریہ آج تک چلا آ رہا ہے اور امت مرحومہ کے علمائے حقانی، شیوخ ربانی اور اہل کلام ہمہ تن ذکر الٰہی میں مصروف چلے آ رہے ہیں اور اب بھی بفضلہ تعالیٰ اس کے ذکر اور دعا کو دینی اور دنیوی کامیابیوں کا راز سمجھا جاتا ہے۔'' (درود شریف پڑھنے کا شرعی طریقہ، ص ۱۵)

(۲) ''یہ ایک بین حقیقت ہے کہ اذان سے قبل یا اذان کے بعد بلند آواز سے درود شریف پڑھنے کا رواج نہ تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد مبارک میں تھا، نہ خلفائے راشدین اور صحابہ کرام کے دور میں تھا، نہ خیر القرون میں کوئی شخص اس بدعت سے واقف تھا اور نہ ائمہ اربعہ میں سے کسی بزرگ نے یہ کاروائی کی اور نہ اس کا فتویٰ دیا، بلکہ تقریباً ۷۹۰ھ تک کسی بھی مقام پر یہ بدعت رائج نہ تھی۔'' (ایضاً ص ۳۲)

(۳) ''تمام علما کا اس بات پر اتفاق ہے کہ آہستہ ذکر کرنا ہی بہتر ہے اور بلند آواز سے ذکر کرنا بدعت ہے، مگر ان مقامات پر جہاں جہر کی شرعی ضرورت پیش آئے مثلاً اذان، اقامت، تکبیرات تشریق، امام کے لیے رکوع وسجود کی طرف انتقال کی تکبیریں یا امام بھول جائے تو مقتدی کا سبحان اللہ کہنا، حج کے موقع پر لبیک کو بلند آواز سے پڑھنا وغیرہ۔'' (ایضاً ص ۲۶ بحوالہ تفسیر مظہری ۴۰۸/۳)

۴۴۔ تنسیخ متعہ: متعہ زمانہ جاہلیت کے نکاحوں میں سے نکاح کی ایک مروجہ صورت تھی۔ جس کو ابتدائے اسلام میں جائز اور روا رکھا گیا، جیسا کہ ترمذی ۱۳۳/۱ میں حضرت عبد اللہ بن عباس سے روایت ہے کہ ابتدائے اسلام میں جب کوئی شخص کسی شہر میں جاتا جہاں اس کی کوئی شناسائی نہ ہوتی تو وہ کسی عورت سے اتنے دنوں کے لیے جتنے دن اس نے قیام کرنا ہو توفیتزوج المراۃ، وہ اس عورت سے نکاح متعہ کر لیتا۔ وہ اس نکاح کی بنا پر اتنے دن اس کے سامان کی نگرانی کرتی اور اس کے لیے کھانا تیار کرتی، یہاں تک یہ آیت نازل ہوئی کہ بیویوں اور لونڈیوں کے علاوہ مردوں کو کسی پر اپنی شرمگاہیں ظاہر کرنا حرام ہے۔ حضرت ابن عباسؓ کی اس روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ متعہ نکاح کی ایک قسم تھی جو ابتدائے اسلام میں رائج تھی اور بعد میں من جانب اللہ اس پر پابندی عائد کر دی گئی۔ چنانچہ حضرت شیخؒ فرماتے ہیں کہ

(۱) ''خمینی صاحب کو ابتدائے اسلام میں جواز متعہ پر مسلمانوں کا اتفاق تو نظر آ گیا، لیکن اس کی نسخ اور نہی پر اجماع واتفاق نظر نہیں آیا۔'' (ارشاد الشیعہ، ص ۱۳۱)

(۲) ''اس کے بعد روافض کے علاوہ باقی تمام علمائے اسلام کا متعہ کے حرام ہونے پر اجماع ہو چکا ہے۔'' (ایضاً ص ۱۳۱ بحوالہ نووی شرح مسلم ۴۵۰/۱)

(۳) ''اس سے معلوم ہوا کہ تمام اہل اسلام کا متعہ کی حرمت پر اجماع ہے۔ ہاں روافض اس کے خلاف ہیں۔'' (ص ۱۳۲)

۴۵۔ عصمت انبیا: عصمت، انبیا کا خاصہ ہے، یعنی ہر نبی معصوم ہے اور کوئی غیر نبی معصوم نہیں۔ نبی ولادت سے وفات تک قبل از اعلان نبوت بھی اور بعد از اعلان نبوت بھی معصوم ہوتا ہے، چنانچہ حضرت شیخؒ فرماتے ہیں کہ

(۱) ''مسلمانوں کا عقیدہ ہے کہ انسانوں میں معصوم صرف حضرات انبیاے کرام ہی ہوتے ہیں۔ نہ تو ان سے صغائر سرزد ہوتے ہیں، نہ کبائر۔ خطاے اجتہادی اور زلت کا معاملہ جدا ہے، وہ گناہ کی مد میں شامل نہیں۔ اور یہ امر قرآن کریم، احادیث صحیحہ، متواترہ واضحہ اور اجماع امت سے ثابت ہے۔'' (ارشاد الشیعہ، ص ۸۴)

(۲) ''شیعہ کا یہ خیال ہے کہ پانچ حضرات (حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم، حضرت فاطمہ، حضرت علی، حضرت حسن اور حضرت حسینؓ) پاک ہیں اور ہم اہل السنت والجماعت یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ اگر پاک سے معصوم مراد ہے تو اس معنی میں صرف حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہی، (ان میں سے) پاک اور معصوم ہیں، کیونکہ معصوم صرف انبیاے کرام ہی ہوتے ہیں۔ انسانوں میں اور کوئی معصوم نہیں ہوتا۔ اور اگر پاک سے مراد متقی، پرہیزگار اور خدا رسیدہ ہے تو اس معنی میں بھی صحابہ کرام پاک ہیں جن کو رضی اللہ عنہم ورضوا عنہ کا پروانہ قرآن کریم میں من جانب اللہ مرحمت ہو چکا ہے۔'' (باب جنت ص ۲۶۴)

(۳) ''اللہ تعالیٰ نے جن برگزیدہ شخصیتوں کو لوگوں کی رشد وہدایت اور اصلاح وتزکیہ کے لیے انتخاب فرمایا ہے، ان کو ان تمام صفات حمیدہ سے متصف فرمایا ہے جو ان کے بلند اور رفیع مقام اور شان کے لائق ہیں اور ان سب رذائل اور آلایشوں سے محفوظ رکھا ہے جو ان کی جلالت شان کے منافی اور نامناسب ہیں۔ کفر وشرک، چوری وبدکاری، شراب نوشی اور زنا، جھوٹ اور مکر، فریب کاری اور دھوکہ وغیرہ، غرضیکہ تمام صغائر وکبائر سے اللہ تعالیٰ نے ان کو محفوظ ومصون رکھا ہے اور ہر طرح سے ان کی حفاظت فرما کر ان کو عصمت وعفت کا اونچا مقام مرحمت فرمایا ہے۔ تمام اہل اسلام انبیاے کرام کی عصمت کا عقیدہ رکھتے اور اس پر کامل یقین کرتے ہیں، ہاں اجتہادی لغزش اور غلطی انبیاے کرام سے بھی سرزد ہو سکتی ہے، لیکن نہ تو وہ صغیرہ کی مد میں ہوتی ہے اور نہ کبیرہ کی زد میں۔ وہ چیز ہی الگ ہے، اور ایسے ہی نسیان وخطا اور اجتہادی لغزشوں کے مقامات پر ان کے بلند اور ارفع مقام کے پیش نظر بمصداق حسنات الابرار سیآت المقربین اللہ تعالیٰ نے تشدیداً اس کو عصیان وغوایت، ظلم اور ذنب کے الفاظ سے تعبیر فرمایا ہے، حالانکہ درحقیقت نہ تو وہ صغائر ہیں اور نہ کبائر۔ کیونکہ گناہ کے لیے قصد اور ارادہ ضروری ہوتا ہے۔ مگر یہ افعال ان سے غیر ارادی اور غیر شعوری اور نسیان وغیرہ کے طریقہ سے سرزد ہوئے ہیں۔ اور جو قصد وارادہ سے سرزد ہوئے ہیں، وہ محض اجتہادی لغزش کا نتیجہ ہیں اور گناہ نہیں اور ان کی وجہ سے ان کی عصمت پر ہرگز کوئی اثر نہیں پڑتا۔'' (عیسائیت کا پس منظر ص ۶۱)

۴۶۔ ولادت انبیا کا فطری طریقہ: روافض نے اپنے بارے میں جو فاسد وباطل نظریات گھڑ رکھے ہیں، ان میں سے ایک یہ بھی ہے کہ وہ اپنے ائمہ کی ولادت معروف وفطری طریقہ سے نہیں مانتے، بلکہ ان کا عقیدہ یہ ہے کہ ائمہ اپنی ماؤں کی رانوں سے پیدا ہوتے ہیں۔ چنانچہ حضرت شیخ فرماتے ہیں کہ

''اہل اسلام کا یہ متفقہ نظریہ ہے کہ حضرات انبیاے کرام ماں اور باپ کے توسط سے اسی طرح پیدا ہوتے ہیں جیسے عام بچے پیدا ہوتے ہیں، ہاں مگر حضرت آدم اور حضرت عیسیٰ علیہما السلام کا قصہ جدا ہے کہ اول الذکر بزرگ ماں باپ کے توسط کے بغیر اور ثانی الذکر محترم بغیر باپ کے محض اللہ تعالیٰ کی قدرت سے صرف ماں سے پیدا ہوئے، اور یہ امر قرآن کریم، احادیث صحیحہ مرفوعہ، متواترہ واضحہ اور اجماع امت سے ثابت ہے، مگر شیعہ کا نظریہ (بحوالہ اصول کافی ص ۱۲۱) یہ ہے کہ امام بھی معصوم ہوتے ہیں اور وہ (بحوالہ حق الیقین ص ۱۲۶) اپنی ماؤں کی رانوں سے پیدا ہوتے ہیں۔'' (ارشاد الشیعہ ص ۸۴)

۴۷۔ قتل مرتد: اسلام کے اندر داخل ہونے کے بعد اگر کوئی شخص کسی ایک قطعی عقیدہ سے انکار یا تمام عقائد سے

انحراف کی بنا پر اسلام سے نکل جائے تو وہ مرتد کہلاتا ہے اور اس کی سزا قتل ہے، چنانچہ حضرت شیخ فرماتے ہیں کہ

''اسلام میں غیر مسلموں کے لیے تبلیغ وترغیب تو ہے لیکن لا اکراہ فی الدین کے قاعدہ کے مطابق جبراً کسی کو مسلمان نہیں بنایا جا سکتا، لیکن اگر کوئی مسلمان ہے اور وہ بدبخت اسلام سے پھر کر مرتد ہو جائے (العیاذ باللہ) تو وہ خدا تعالیٰ اور حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا باغی ہے۔ جب دنیا کی کسی حکومت میں باغی کسی رعایت کا مستحق نہیں، بلکہ تختہ دار پر لٹکائے جانے کے قابل سمجھا جاتا ہے تو اللہ تعالیٰ کے باغی کے لیے رعایت کی گنجایش کیسے؟ بلکہ قتل سے کوئی زیادہ سزا ہوتی تو وہ اس کا بھی مستحق ہے۔ مرتد کا قتل کرنا قرآن وحدیث اور اجماع امت سے ثابت ہے۔'' (ختم نبوت قرآن وسنت کی روشنی میں، ص ۳۶)

۴۸۔ امام عثمانؓ کی امام علیؓ پر فضیلت: امام اہل سنت مولانا عبد الشکور لکھنویؒ نے اپنی معروف کتاب ''خلفاء راشدین'' کے مقدمہ میں صراحت فرمائی ہے کہ خلفاے راشدین کا مرتبہ ان کی ترتیب خلافت سے نہیں، بلکہ ان کی خلافت ان کی ترتیب مراتب سے ہے، یعنی خلفاے راشدین کا مقام ان کی ترتیب سے ہے، جس ترتیب سے ان کی خلافت ہے۔ پہلا مرتبہ امام صدیق اکبرؓ کا تھا، ان کو پہلی خلافت ملی۔ دوسرا مقام امام فاروق اعظمؓ کا تھا، ان کو دوسری خلافت ملی۔ تیسرا مرتبہ امام عثمانؓ کا تھا، ان کو تیسری خلافت مل گئی۔ اور چوتھا مرتبہ امام علی مرتضیٰؓ کا تھا، ان کو چوتھی خلافت ملی۔ پھر ایک فرقہ امت کے اندر شیعان علی کے نام سے پیدا ہوا جس نے امام علیؓ کی امام عثمانؓ پر فضیلت کا نظریہ قائم کیا۔ ان کے بعد روافض پیدا ہوئے جنھوں نے خلفاے راشدین یعنی اصحاب ثلاثہ اور دیگر صحابہ کرام کی تکفیر اور ان پر سب وشتم کا نظریہ قائم کیا۔ چنانچہ متقدمین اہل سنت شیعہ اور رافضی میں فرق کرتے ہیں۔ حضرت شیخؒ، حافظ الدنیا امام فن رجال حافظ ابن حجر عسقلانی رحمۃ اللہ علیہ کی تہذیب التہذیب ج ا ص ۹۴ کے حوالے سے فرماتے ہیں کہ:

''متقدمین کے عرف واصطلاح میں تشیع کا مفہوم یہ ہے کہ حضرت علی کو صرف حضرت عثمانؓ پر فضیلت دی جائے اور یہ کہ حضرت علیؓ اپنی جنگوں میں حق بجانب تھے اور ان کے مخالف خطا پر تھے اور وہ حضرت ابوبکر اور حضرت عمرؓ کی تقدیم اور تفضیل کے قائل تھے۔ بہرحال متاخرین کے عرف واصطلاح میں تشیع کا مفہوم خالص رفض ہے۔ نہ تو غالی رافضی کی روایت قبول کی جا سکتی ہے اور نہ اس کی عزت کی جا سکتی ہے۔...... اس سے واضح طور پر معلوم ہوا کہ متقدمین کی اصطلاح میں شیعہ وہ تھے جو تمام اصول وفروع میں اہل السنت والجماعت سے متفق تھے۔ صرف حضرت علی کو حضرت عثمانؓ پر فضیلت دیتے تھے۔ جب کہ اہل سنت کے ہاں اتنا نظریہ بھی اجماع امت کے خلاف ہونے کی وجہ سے بدعت ہے اور وہ برملا تفضیل شیخینؓ کے قائل تھے اور حضرت علیؓ کے خلاف لڑنے والوں مثلاً حضرت امیر معاویہ وغیرہ کو مخطی کہتے تھے، نہ کہ کافر ومرتد۔ آج اس نظریہ کے شیعہ کہاں ہیں؟'' (ارشاد الشیعہ ص ۲۰)

۴۹۔ رد بدعات: حضرت شیخ نے رد بدعات پر جو کام کیا ہے، وہ کسی سے مخفی نہیں۔ ہمارے ہاں بدعات کے معاملہ میں سب سے مشکل مرحلہ ان کی تعیین اور بدعت کی تفریق کا ہے، کیونکہ ان کے بغیر ان کا رد کرنا مشکل ہے۔ حضرت شیخ نے اس مشکل مرحلہ کو بڑے آسان پیرایے میں حل فرمایا۔ چنانچہ فرماتے ہیں کہ

''جو چیز قرآن، حدیث، اجماع امت اور قیاس شرعی سے ثابت نہ ہو اور وہ کام جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت، اسوہ حسنہ اور نمونہ کے خلاف ہو، اور وہ کام جب دین کے اندر ایجاد کیا گیا تو یقیناً بدعت ہوگا۔'' (راہ سنت، ص ۷۵)

۵۰۔ رفع یدین: فروعی واجتہادی اختلافات میں سے ایک اختلافی مسئلہ رفع یدین کا بھی ہے۔ جس کے کسی ایک فریق

پر بھی ضلالت وگمراہی کا فتویٰ نہیں دیا جاسکتا۔ چنانچہ حضرت شیخ فرماتے ہیں کہ

(۱) ''ان فروعی اختلافات میں سے ایک مسئلہ رفع الیدین عند الرکوع وعند رفع الراس من الرکوع بھی ہے جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرات صحابہ کرام کے مبارک عہد سے تا ہنوز چلا آ رہا ہے اور دنیاے اسلام میں کہیں اس کے مثبت اور کہیں اس کے منفی پہلو پر عمل ہو رہا ہے۔ اگر اس اختلاف کو فرعی اختلاف کی حد تک ہی رہنے دیا جائے اور ہر فریق اپنی تحقیق ودانست کے مطابق جو اسے حق اور صحیح نظر آئے، اس پر عمل کرتے اور دوسرے فریق کے لیے بھی گنجایش چھوڑ دے تو کبھی نزاع اور جدال کی نوبت ہی نہیں آتی اور نہ آئے گی۔ مگر نہایت افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ زمانہ حال کے غیر مقلدین حضرات میں ایسے لوگوں کی کمی نہیں جو دیگر اختلافی مسائل کی طرح رفع یدین کے مسئلہ کو بھی حق وباطل کا معیار بنائے بیٹھے ہیں اور چند احادیث کے ظاہری الفاظ کو دیکھ کر یہ اٹل فیصلہ صادر کرتے ہیں کہ نماز صرف ہماری ہی ہے، اور احناف وغیرہ حضرات کی کوئی نماز نہیں اور اقل درجہ یہ ہے کہ سنت کے خلاف ہے۔'' (پیش لفظ از نور الصباح ص ۱۰)

(۲) ''مسئلہ ترک رفع یدین میں احناف تقلید نہیں کرتے، بلکہ اس میں احادیث صحیحہ اور صریحہ کی پیروی کرتے ہیں جن میں ایک حدیث صحیح ابوعوانہ ۲/۹۰ اور مسند حمیدی ۲/۲۷۷ میں متصل اور صحیح سند کے ساتھ حضرت ابن عمرؓ سے مروی ہے۔'' (الکلام المفید، ص ۲۱۲)

(۳) علامہ ابن حزم الظاہریؒ کی المحلیٰ ۳/۲۳۵ کے حوالے سے لکھتے ہیں:

''جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے صحیح طور پر ثابت ہے کہ آپ تکبیر افتتاح کے بعد سر جھکائے اور سر اٹھاتے وقت رفع یدین کرتے تھے اور یہ بھی ثابت ہے کہ نہیں بھی کرتے تھے تو یہ سب کچھ مباح ہے، فرض نہیں اور ہمیں حق حاصل ہے کہ ہم بھی اس طرح نماز پڑھیں۔ اگر ہم نے رفع یدین کر کے نماز پڑھی تو ویسی ہی نماز پڑھی جیسی کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے پڑھی تھی اور اگر ہم نے ترک رفع یدین کرتے ہوئے نماز پڑھی تو ویسی ہی پڑھی جیسی کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے پڑھی تھی۔'' (ایضاً ص ۲۱۴)

حاصل بحث

اس طویل بحث سے حضرت شیخ کی تحقیقات کا قارئین کرام نے بخوبی اندازہ کر لیا ہوگا کہ تمام اجماعی مسائل میں حضرت شیخ نے ہمیشہ اجماع امت کے استدلال ہی سے اپنا موقف ونظریہ ثابت کیا اور اسے اسی حوالہ سے قبول کیا اور اختلافی مسائل کے اندر جمہور اہل سنت کے موقف ونظریہ کو ہی قبول کیا اور اسی سے استدلال کیا، گویا کہ اجماع اور جمہور ہی حضرت شیخ کے نزدیک اصل اور بنیادی اہمیت رکھتے تھے۔ انہوں نے اس دائرہ کو نہ کبھی خود کراس کیا اور نہ کسی کے لیے اس دائرہ کو کراس کرنا پسند کیا۔ اسلافؒ کی تحقیقات سے وابستہ رہنے میں ہی انہوں نے اپنی نجات سمجھی اور اسی کو دوسروں کے لیے باعث نجات جانا۔ خدا کرے کہ حضرت شیخ کے جملہ متعلقین ومتوسلین صراط مستقیم کے انہی اصولوں پر گامزن رہیں، کیونکہ ان اصولوں کی پابندی سے اگر حضرت شیخ عند اللہ وعند الناس سرخرو ہو چکے ہیں اور ان شاء اللہ یقیناً سرخرو ہو چکے ہیں تو سرخروئی کا کوئی دوسرا راستہ تلاش کرنے کی آخر ضرورت ہی کیا ہے؟ خدا تعالیٰ جملہ اہل اسلام کو ہدایت وصراط مستقیم پر گامزن رہنے کی توفیق بخشے۔ آمین یا رب العالمین بجاہ النبی الکریم صلی اللہ علیہ وسلم۔

محمد عمار خان ناصر

حضرت شیخ الحدیث رحمہ اللہ کا منہج فکر

اور اس سے وابستگی کے معیارات اور حدود

گزشتہ صفحات میں قارئین نے عم مکرم جناب مولانا عبد الحق خان بشیر زید مجدہم کا مقالہ ملاحظہ فرمایا جس میں انھوں نے شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد سرفراز خان صفدرؒ کے اصول ونظریات کی وضاحت کرتے ہوئے والد گرامی مولانا زاہد الراشدی اور راقم کی بعض آرا کو بھی موضوع بحث بنایا اور ان پر ناقدانہ تبصرہ کیا ہے۔ یہ ایک علمی وتحقیقی موضوع ہے جس میں میرے یا والد گرامی کے نقطہ نظر سے اختلاف کرنا کسی بھی صاحب علم کا حق ہے اور قارئین جانتے ہیں کہ 'الشریعہ' کے صفحات پر اس نوعیت کی تنقیدات اور اختلافی بحثیں ایک معمول کی حیثیت رکھتی ہیں، البتہ عم محترم نے اپنے اس مقالے میں خاص طور پر میرے نقطہ نظر پر تنقید کرتے ہوئے حضرت شیخ الحدیثؒ کے موقف کے ساتھ تقابل کی فضا پیدا کرنے اور اسے اجاگر کرنے کی سعی کی ہے، حالانکہ میں نے بہت سے امور میں ذوق ورجحان اور رائے کے اختلاف کے باوجود بحث وتحقیق میں کبھی حضرت رحمہ اللہ کے موقف کے ساتھ تقابل کی صورت پیدا نہیں کی اور نہ کسی بھی رنگ میں اس کو پسند کرتا ہوں۔ خاص طور پر ایک ایسے موقع پر جب ہم 'الشریعہ' کی زیر نظر خصوصی اشاعت کی صورت میں حضرت رحمہ اللہ کی حیات وخدمات اور ان کی تحقیقات وافکار کا ایک عقیدت مندانہ مرقع قارئین کی خدمت میں پیش کر رہے ہیں، ہر لحاظ سے یہ مناسب تھا کہ عم محترم اس نزاکت کا لحاظ رکھتے، لیکن انھوں نے نہ صرف یہ کہ اسے ملحوظ نہیں رکھا بلکہ اس تقابل کو نمایاں کرنے اور اسے قبیح وشنیع صورت میں پیش کرنے کی کوشش میں بعض مقامات پر ''ستم ظریفی'' کی حد تک جانے سے بھی گریز نہیں کیا۔

میں نے حضرت رحمہ اللہ کے حوالے سے اپنے ایک مضمون میں، جو زیر نظر اشاعت میں شامل ہے، یہ عرض کیا ہے کہ حضرت رحمہ اللہ اپنی تحقیقات میں جمہور امت کے موقف کی پابندی کو ضروری تصور کرنے کے ساتھ ساتھ ''بلند فکری اور ذہنی معیار رکھنے والے اہل علم'' کے لیے عام آرا سے اختلاف کا حق بھی تسلیم کرتے تھے۔ عم محترم نے اس کو یہ مفہوم پہنایا ہے کہ ''دادا تو بلندیٔ فکر اور ذہنی معیار دونوں سے محروم تھا، جب کہ پوتا بلندیٔ فکر کی دولت سے مالا مال ہے اور ذہنی معیار کی نعمت سے بھی۔'' حالانکہ میری مذکورہ گزارش جمہور اہل علم یا حضرت رحمہ اللہ کے مقابلے میں اپنی علمی حیثیت جتلانے کے سیاق میں ہرگز نہیں کی گئی، بلکہ ان ائمہ اور اکابر کے حوالے سے کی گئی ہے جو حضرت رحمہ اللہ کی نظر میں اپنے علمی مقام ومرتبہ کی وجہ سے اس کی اہلیت رکھتے ہیں، چنانچہ ''بلند فکری اور ذہنی معیار رکھنے والے اہل علم'' کے جملے کا روئے سخن اسی تحریر میں آگے چل کر نقل کیے جانے اس اقتباس کی طرف ہے جس میں حضرت رحمہ اللہ نے فرمایا ہے کہ ''بلاشبہ ہمارے پیر ومرشد قدس اللہ تعالیٰ سرہ اور حضرت شاہ صاحبؒ اور شیخ الہندؒ اور حضرت نانوتویؒ وغیرہ حضرات نے اپنے علم وتحقیق کی بنا پر اپنے تفردات کو

بھی لیا ہے''۔ پھر عم محترم نے تفرد اختیار کرنے والے اہل علم کے اختلاف کی وجہ ان کے ''بلند فکری اور ذہنی معیار'' کو قرار دینے سے دوسرے اہل علم کو اس سے محروم سمجھنے کا جو مدعا مستنبط کیا ہے، اس کی مثال ایسے ہی ہے جیسے کوئی شخص حضرت رحمہ اللہ کے مذکورہ اقتباس سے یہ نتیجہ اخذ کرے کہ چونکہ انھوں نے حضرت مولانا حسین علی، علامہ سید انور شاہ کشمیری، حضرت شیخ الہند اور حضرت نانوتوی رحمہم اللہ کے، اپنے تفردات کو لینے کا باعث ان کے ''علم وتحقیق'' کو قرار دیا ہے، اس لیے اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ جمہور اہل علم کو علم وتحقیق سے عاری سمجھتے ہیں۔ سبحان اللہ!

بہرحال، یہ افتاد طبع کے مسائل ہیں جن میں زیادہ گلے شکوے کی گنجایش غالباً نہیں ہوتی۔ جہاں تک اہل علم کے لیے اجماعی آرا کی پابندی لازم ہونے یا اختلاف رائے کا حق حاصل ہونے کی بحث کا تعلق ہے تو چونکہ عم محترم نے اپنا نقطہ نظر حضرت رحمہ اللہ کے حوالے سے بیان کیا ہے جس کے جواب میں کسی باقاعدہ استدلالی مناقشے کو میں ادب واحترام کے منافی سمجھتا ہوں، اس لیے یہاں میں صرف اتنی بات واضح کرنے پر اکتفا کروں گا کہ ان کے اختیار کردہ موقف اور رجحان سے مختلف رجحان بھی امت کی مستند علمی روایت کا حصہ ہے اور اکابر اہل علم نے موقع بموقع اس رجحان کی نمائندگی فرمائی ہے۔ میں یہاں اس کے صرف چند پہلوؤں کی طرف اختصاراً اشارہ کروں گا:

الف۔ یہ بات محتاج وضاحت نہیں کہ علمی وفقہی تعبیرات میں جس چیز کو ''اجماع'' کہا جاتا ہے، وہ دراصل ''اجماع سکوتی'' ہوتا ہے جس میں ایک دور کے بعض اہل علم کی طرف سے اپنی رائے ظاہر کرنے اور باقی اہل علم کی طرف سے کوئی اختلاف سامنے نہ آنے کو ان کی طرف سے اتفاق اور تائید پر محمول کر لیا جاتا ہے۔ اصولیین کا ایک بڑا گروہ اجماع سکوتی کو یا تو سرے سے اجماع اور حجت ہی تسلیم نہیں کرتا اور یا اسے دلیل تو سمجھتا ہے لیکن قطعی حجت کے بجائے صرف ظنی دلیل کا درجہ دیتا ہے۔ ہمارے ہاں عام طور پر اجماع کے حوالے سے لکھی جانے والی تحریروں میں اس بنیادی اصولی بحث سے صرف نظر کر لیا جاتا ہے اور اسی وجہ سے عم محترم نے اس نقطہ نظر کی نمائندگی میں امام شافعی، ابن تیمیہ اور رازی رحمہم اللہ کی تصریحات کو اپنی معلومات کے مطابق ''شاذ اقوال'' کہہ کر نمٹا دیا ہے۔ تاہم جس شخص کو بھی اصول فقہ کی درسی کتابوں سے ہٹ کر اس فن کی امہات کا مطالعہ کرنے کا موقع ملا ہے، وہ اس ضمن میں اصولیین کے مختلف مسالک سے بخوبی واقف ہے۔ حال ہی میں ''اجماع اور اس کی شرعی حیثیت'' کے زیر عنوان جامعہ مدینۃ العلوم کراچی کے استاذ مولانا مفتی عبد الغفار ارکانی کی فاضلانہ تصنیف مولانا محمد تقی عثمانی زید مجدہم کی تقریظ کے ساتھ شائع ہوئی ہے جس میں مصنف نے بحث کے اس پہلو کو بھی تفصیل سے بیان کیا ہے۔ اردو خواں حضرات اس کتاب سے زیر بحث نقطہ نظر کا ایک اچھا تعارف حاصل کر سکتے ہیں۔

ب۔ امت کے کم وبیش تمام اکابر اہل علم کے ہاں معروف ومانوس آرا پر علمی اطمینان نہ ہونے کے تناظر میں نئی آرا اور تعبیرات پیش کرنے کی مثالیں کثرت کے ساتھ موجود ہیں اور کسی مبالغے کے بغیر اس طرز کو اہل علم کا ''متواتر ومتوارث'' طریقہ قرار دیا جا سکتا ہے۔ حضرت شیخ الحدیث رحمہ اللہ اس طرز سے اتفاق نہیں رکھتے، بلکہ ایسی تمام آرا کو کمزور اور مرجوح سمجھتے ہیں، لیکن تمام اکابر اہل علم کے ہاں اس کی مثالیں پائے جانے کو انھوں نے غیر مبہم الفاظ میں تسلیم کیا ہے، چنانچہ طلقات ثلاثہ کے مسئلے میں شاذ رائے پر فتوائے کفر کا ذکر کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ ''اگر یہی وتیرہ رہا تو ائمہ دین میں سے کسی کی خیر نہیں کیونکہ انھوں نے کسی نہ کسی اجتہادی خطا کا شکار ہو کر کہیں نہ کہیں مرجوح اور کمزور پہلو کو بھی اختیار کیا ہے۔'' (عمدۃ الاثاث ص ۴۶) خود اکابر علمائے دیوبند کے ہاں منفرد آرا کی صورت حال یہ ہے کہ والد گرامی مولانا زاہد الراشدی

کے بقول ''اگر کوئی صاحب صرف انھی کو جمع کرنے اور ان پر نقد کرنے میں لگ جائیں تو زندگی بھر کسی اور کام کے لیے انھیں فرصت نہیں ملے گی۔'' (عصر حاضر میں اجتہاد، ص ۳۲۸)

ج۔ اہل علم کا اجماعی آرا سے اختلاف کا یہ حق صرف انفرادی سطح پر رائے رکھنے تک محدود نہیں، بلکہ فقہائے احناف یہ تصریح کرتے ہیں کہ اگر اجتہادی صلاحیت رکھنے والا کوئی صاحب علم منصب قضا پر فائز ہو اور اپنے اجتہاد کی بنا پر فقہا کے کسی اجماعی موقف کے برخلاف فیصلہ کر دے تو محض اجماع کے خلاف ہونے کی بنا پر اس کے فیصلے کو کالعدم قرار نہیں دیا جائے گا، بلکہ یہ دیکھا جائے گا کہ نصوص میں علمی طور پر اس کی گنجایش موجود ہے یا نہیں۔ اگر گنجایش موجود ہو تو اس کا فیصلہ نافذ ہو جائے گا، حتیٰ کہ اگر وہی مقدمہ نظر ثانی کے لیے اس سے اوپر کسی دوسرے قاضی کے سامنے پیش کیا جائے تو وہ محض اس بنیاد پر اس کے فیصلے کو منسوخ کرنے کا حق نہیں رکھتا۔ (دیکھیے المحیط البرہانی ۴۸۵/۹)

د۔ خلافت عثمانیہ کے آخری دور میں مرتب کیے جانے والے ''مجلۃ الاحکام العدلیہ'' اور اسلامی جمہوریہ پاکستان میں حدود، قصاص ودیت اور شہادت سے متعلق وضع کیے جانے والے متعدد قوانین میں اجتہادی زاویہ نگاہ اختیار کرتے ہوئے نہ صرف فقہائے اربعہ کی متفقہ رائے اور امت کے عام تعامل کے برعکس بعض شاذ اور مرجوح فقہی اقوال کو قبول کیا گیا ہے، بلکہ بعض امور میں ماضی کی پوری فقہی روایت سے اختلاف کرتے ہوئے بالکل نیا موقف بھی اپنایا گیا ہے۔ (میں نے اس کی درجن بھر مثالیں 'الشریعہ' کے مئی/جون ۲۰۰۹ء کے شمارے میں شائع ہونے والے اپنے مضمون میں جمع کر دی ہیں۔) مثال کے طور پر دیت کی مقدار سے متعلق جس موقف کو ناقدین میری یا بعض اہل علم کی انفرادی رائے قرار دے رہے ہیں، وہ اس وقت پاکستان میں قانون کے طور پر رائج ہے اور اسلامائزیشن کے عمل سے وابستہ اہل علم اور مذہبی جماعتوں نے اسے ''اسلامی قانون'' کے طور پر قبول کر رکھا ہے۔

جہاں تک اس اشکال کا تعلق ہے کہ اگر علمی وفقہی تعبیرات کے دائرے میں ''اجماع'' کا تحقق یا ثبوت ناممکن ہے یا اس کی پابندی ہر حال میں ضروری نہیں تو پھر 'لا یجمع اللہ امتی علی ضلالۃ' اور اس مفہوم کی احادیث کا کیا محل ہے تو اس نوعیت کے تمام ارشادات کو ان کے درست سیاق وسباق میں دیکھنے سے واضح ہوتا ہے کہ ان میں ہر جگہ دین کے وہ اساسی تصورات واعمال زیر بحث ہیں جو اسلام کی معنوی حقیقت اور اس کے ظاہری قالب کو تشکیل دیتے ہیں اور جن میں کسی قسم کی کوئی تبدیلی دین کے بنیادی تصور کو مسخ کر دیتی ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم گزشتہ امتوں کے من حیث الجماعت گمراہی اور ضلالت کا شکار ہو جانے کے تناظر میں یہ فرما رہے ہیں کہ اس امت کو اللہ نے اس سے محفوظ رکھنے کا اہتمام فرمایا ہے اور کبھی ایسا نہیں ہوگا کہ پوری مسلمان قوم اصل دین سے منحرف ہو کر من حیث الامت کسی گمراہی پر مجتمع ہو جائے۔ جہاں تک نصوص کے فہم واستنباط اور علمی وفقہی اور فروعی نوعیت کے امور میں اہل علم کے اختلاف کا تعلق ہے تو وہ سرے سے ان ارشادات کا موضوع ہی نہیں اور نہ یہ کہنا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پیش نظر ہے کہ اگر ایک دور میں امت کے اہل علم کسی علمی یا فقہی مسئلے میں ایک نتیجہ اخذ کر لیں تو ان کے بعد آنے والوں کے لیے نصوص کے فہم اور تعبیر کے فطری اور مسلمہ اصولوں کے دائرے میں بھی ان سے اختلاف کی کوئی گنجایش باقی نہیں رہے گی۔ مثال کے طور پر نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے بدعات ومحدثات کے مقابلے میں اپنی سنت کے ساتھ 'سنۃ الخلفاء الراشدین' کی پیروی کرنے اور اس کو لازم پکڑنے کا حکم دیا ہے۔ بدیہی طور پر یہاں 'محدثات الامور' سے مراد وہی چیزیں ہیں جو شارع کے مقرر کردہ تصور دین اور اس کے

ظاہری ڈھانچے سے مختلف اور اس کو منہدم کر دینے والی ہوں۔ اس ارشاد کو علمی وفقہی امور سے متعلق قرار دے کر خلفائے راشدین کی آرا سے علمی اختلاف کو کسی مجتہد یا فقیہ نے ممنوع قرار نہیں دیا، چنانچہ نہ صرف صحابہ نے علمی مسائل میں خلفائے راشدین سے اختلاف کیا ہے بلکہ بعد کے فقہا نے بھی ایسے مسائل میں خلفائے راشدین کی آرا کی پابندی کو لازم نہیں سمجھا۔ خود فقہائے احناف کے ہاں بہت سے امور میں سیدنا عمر اور سیدنا علی رضی اللہ عنہما کی آرا کے مقابلے میں دوسرے فقہائے صحابہ کی آرا کو ترجیح دینے کی مثالیں موجود ہیں جنھیں امام شافعیؒ نے بڑے اہتمام سے اپنی کتاب ''الام'' میں جمع کر دیا ہے۔ جصاص اور دیگر محقق حنفی اصولیین یہ باقاعدہ موقف رکھتے ہیں کہ چاروں خلفائے راشدین اگر کسی مسئلے پر متفق ہوں تو بھی اسے ''اجماع'' کا درجہ نہیں دیا جا سکتا اور نہ صرف دوسرے صحابہ ان سے اختلاف کا حق رکھتے ہیں بلکہ بعد کے اہل علم کو بھی خلفائے راشدین کے مقابلے میں دوسرے فقہائے صحابہ کی آرا کو ترجیح دینے کا حق حاصل ہے۔ والد گرامی مولانا زاہد الراشدی نے اسی تناظر میں بجا طور پر یہ لکھا ہے کہ:

''اسلام جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد کسی کا یہ مقام تسلیم نہیں کرتا کہ اس کی بات حرف آخر ہے۔ وہ خلفائے راشدین کو بھی مجتہد کے درجے میں تسلیم کرتا ہے جن کی ہر بات میں خطا اور صواب دونوں کا احتمال موجود ہے اور ان کے کسی بھی فیصلے اور رائے سے اختلاف کی نہ صرف گنجائش موجود ہے، بلکہ بے شمار لوگوں نے ان کی بہت سی آرا سے عملاً اختلاف کیا ہے اور علمی اختلاف سے اسلامی کتب بھری پڑی ہیں۔'' (ماہنامہ الشریعہ، جولائی ۲۰۰۸، ص ۱۷)

اسی طرح نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے ایک ارشاد میں دین کے معاملے میں نت نئی باتیں پیش کرنے والوں کو دجال وکذاب قرار دیا ہے۔ ظاہر ہے کہ اس سے مراد بھی وہ باتیں ہیں جن سے دین کا بنیادی تصور مسخ ہوتا ہو (جیسے مثلاً تقدیر یا ختم نبوت یا معجزات وغیرہ کا انکار یا خلق قرآن وغیرہ جیسے نظریات کو بطور ایمان واعتقاد پیش کرنا) جبکہ علمی، فقہی اور فروعی نوعیت کے امور اس وعید کے دائرے میں ہرگز نہیں آتے۔ مثال کے طور پر حضرت شاہ ولی اللہؒ نے مصارف زکوٰۃ سے متعلق آیت کی تشریح اس انداز سے کی ہے کہ اس کے نتیجے میں مصارف زکوٰۃ آٹھ اقسام میں منحصر نہیں رہ جاتے، بلکہ ہر قسم کے مصرف پر زکوٰۃ خرچ کی جا سکتی ہے۔ مولانا اشرف علی تھانویؒ نے حدیث: 'لن یفلح قوم ولوا امرھم امراۃ' کی ایسی تاویل پیش کی ہے جس کے نتیجے میں خود حکم کی علت کی رو سے جمہوری طرز حکومت میں عورت کا حکمرانی کے منصب پر فائز ہونا جائز قرار پاتا ہے۔ علامہ انور شاہ کشمیریؒ نے سیدنا مسیح علیہ السلام کے نزول کے بعد اسلام کے غلبے کو پوری دنیا تک وسیع ماننے کے بجائے صرف شام کے علاقے تک محدود قرار دیا ہے۔ مولانا امین احسن اصلاحیؒ نے قرآن مجید کی آیت 'فاتباع بالمعروف' کی روشنی میں یہ رائے پیش کی ہے کہ دیت کی مقدار وغیرہ سے متعلق احکام اصلاً کسی بھی معاشرے کے عرف پر مبنی ہیں اور ہر معاشرہ اپنی ضروریات کے لحاظ سے مناسب قانون سازی کا اختیار رکھتا ہے۔ یہ تمام آرا ایسی ہیں جو ظاہری لحاظ سے اس سے پہلے ''نہ تم نے سنیں اور نہ تمہارے آبا واجداد نے'' کا مصداق ہیں، لیکن کوئی بھی ہوش مند شخص ان آرا پر مذکورہ وعید کو منطبق کر کے مذکورہ اہل علم کو 'دجالون کذابون' کے زمرے میں شمار کرنے کی جسارت نہیں کرے گا۔

مذکورہ امور کی روشنی میں، میں سمجھتا ہوں کہ علمی وفقہی تعبیرات کے دائرے میں ماضی کے اہل علم کے ظاہری اتفاق کو عمومی طور پر ایک علمی دلیل کے طور پر قبول کرنے کے باوجود اسے دین کی کوئی قطعی حجت نہ سمجھنے اور کسی علمی اشکال یا درپیش عملی ضرورت کی بنیاد پر نصوص کے براہ راست مطالعہ کی روشنی میں اس سے مختلف موقف اختیار کرنے کا طریقہ امت کی مستند علمی

روایت سے انحراف نہیں، بلکہ اسی روایت کا ایک تسلسل کے ساتھ چلا آنے والا حصہ ہے، اس لیے حضرت شیخ الحدیث رحمہ اللہ کا اختیار اور پسند کردہ طریقہ اپنے تمام تر استناد، علمی وزن اور ثقاہت کے باوصف امت کی علمی روایت کے مختلف رجحانات میں سے بہرحال ''ایک'' رجحان کی نمائندگی کرتا ہے اور اس کی قدر وقیمت کو متعین کرتے ہوئے یہ پہلو کسی حال میں نظروں سے اوجھل نہیں ہونا چاہیے۔

عم مکرم نے اپنے مقالے میں ایک نہایت خوب صورت بات یہ لکھی ہے کہ حضرت شیخ الحدیث رحمہ اللہ نے اپنے تمام تر علم وفضل اور عملی مواقع کے باوجود کبھی ''فرقہ صفدریہ'' کی بنیاد رکھنے کی کوشش نہیں کی۔ یہ بات بالکل درست ہے، لیکن اس کا یہ پہلو بھی سامنے رہنا چاہیے کہ اپنی ذات یا بعض مخصوص نتائج فکر کو عنوان بنا کر کوئی فرقہ قائم کرنے کا طریقہ اہل حق کے ائمہ اور اکابر کا نہیں، بلکہ اہل ہویٰ کا طریقہ ہے۔ جہاں تک اہل حق کا تعلق ہے تو کسی مخصوص شخصیت کے ساتھ عقیدت یا اس کے بعض مخصوص رجحانات اور نتائج فکر سے وابستگی کی بنیاد پر فرقہ تشکیل دینے کی خدمت عام طور پر اس کے معتقدین انجام دیا کرتے ہیں جس کی ایک قریبی مثال ہم کسی حد تک تبلیغی جماعت کی صورت میں دیکھ سکتے ہیں۔ بحمد اللہ حضرت رحمہ اللہ کے خاندان، تلامذہ اور حلقہ اثر میں اس رجحان کے آثار نہ ہونے کے برابر ہیں اور نہ صرف عمومی طور علمی اختلاف کی بلکہ حضرت رحمہ اللہ کے مطالعہ وتحقیق کے خصوصی دائرے میں بھی ان کے نتائج تحقیق سے اختلاف کی مثالیں خود ان کے نہایت قریبی حلقہ فکر میں موجود ہیں۔ مثال کے طور پر وہ اہل تشیع کی تکفیر کرتے تھے، جبکہ حضرت صوفی صاحب رحمہ اللہ اس سے متفق نہیں تھے۔ وہ نزول مسیح کو ایک اعتقادی مسئلہ قرار دے کر اس کا انکار کرنے والے کو کافر کہتے تھے، جبکہ حضرت صوفی صاحب کی رائے اس سے مختلف تھی۔ وہ 'المہند' میں درج تشریح کے مطابق حیات انبیاء علیہم السلام کے نظریے سے اختلاف رکھنے والے کو اہل سنت والجماعت سے خارج قرار دیتے تھے، جبکہ استاذ گرامی مولانا مفتی محمد عیسیٰ خان گورمانی کی رائے یہ ہے کہ یہ ایک فروعی مسئلہ ہے جسے علما کی اجتماعی رائے کے خلاف ہونے کی وجہ سے ناپسندیدہ تو کہا جا سکتا ہے، لیکن اس سے اہل سنت والجماعت سے خروج لازم نہیں آتا۔ حضرت رحمہ اللہ نے اپنی کتابوں میں امام زہری کا بھرپور دفاع کیا اور ان کے مناقب بیان کیے ہیں، جبکہ استاذ مکرم مولانا عبد القیوم ہزاروی مدظلہ ابن شہاب کی بیان کردہ بعض روایات کی روشنی میں انھیں اہل تشیع کا کارندہ سمجھتے اور درس حدیث کے دوران میں برملا اس کا اظہار کیا کرتے تھے۔ حضرت رحمہ اللہ بریلوی علما کو ان کے مخصوص عقائد کی بنیاد پر دائرۂ اسلام سے خارج سمجھتے تھے، لیکن والد گرامی مولانا زاہد الراشدی نے ان کا یہ موقف ان کی طرف سے قائل کرنے کی کوشش کے باوجود قبول نہیں کیا۔ متعدد امور کے بدعت ہونے یا نہ ہونے کے ضمن میں بھی ان کی رائے سے اختلاف کی مثالیں والد گرامی نے اپنے مضمون میں ذکر فرمائی ہیں۔

چند ماہ قبل والد گرامی نے ڈیجیٹل کیمرے کی تصویر اور ٹی وی وغیرہ کے جواز سے متعلق اپنے نقطہ نظر کا اظہار کیا تو انھیں ایک تحریری اعتراض موصول ہوا کہ ان کا یہ نقطہ نظر حضرت شیخ الحدیثؒ کے موقف کے برعکس ہے، جبکہ خود انھوں نے مدرسہ نصرۃ العلوم میں طلبہ سے خطاب کرتے ہوئے یہ کہا تھا کہ ہم حضرات شیخین کے نظریات کو ہی اپنا مشن بنا کر اس کے مطابق کام کریں گے۔ والد گرامی نے اس کے جواب میں لکھا کہ:

''مدرسہ نصرۃ العلوم کے اس سال کے افتتاحی سبق میں حضرات شیخین کے حوالے سے میں نے جو گفتگو کی تھی، اس کا مطلب یہ ہرگز نہیں ہے کہ فروعات وجزئیات میں بھی ہر ہر بات میں ہم ان کی رائے کے پابند ہوں گے۔ اگر ایسا ہے تو پھر

کسی مسئلہ پر نہ مطالعہ کی ضرورت ہے اور نہ ہی تحقیق کی کوئی گنجایش باقی رہ جاتی ہے۔ حضرات شیخین میں بھی بعض مسائل میں آپس میں رائے کا اختلاف رہا ہے اور اس کا اظہار بھی ہوتا رہا ہے، جبکہ فقہ حنفی کی تو بنیاد ہی باہمی بحث ومباحثہ، اختلاف رائے اور کھلے ماحول میں اپنی رائے کے اظہار پر ہے۔''

خود عم مکرم مولانا عبد الحق خان بشیر کی بعض گفتگوئیں اس بات کی شاہد ہیں کہ وہ عملی ضروریات کے تناظر میں نہ صرف اسلامی بینکاری بلکہ اسلامی ٹی وی چینل کے قیام سے متعلق بھی مولانا تقی عثمانی وغیرہ کے موقف کی طرف رجحان رکھتے ہیں۔

اس تناظر میں، میں یہ گزارش کرنا ضروری سمجھتا ہوں کہ جب اجماعی آرا کی حیثیت واہمیت کے ضمن میں حضرت رحمہ اللہ کے پسندیدہ رجحان سے مختلف ایک مستند علمی رجحان ہمیشہ سے اکابر اہل علم کے ہاں چلا آ رہا ہے تو اس کے ساتھ ذوقی اور فکری مناسبت رکھنے والے افراد کے لیے اختلاف رائے کا حق تسلیم نہ کرنا علمی واخلاقی حدود سے تجاوز کے ہم معنی ہے۔ اس حوالے سے یہ نکتہ بالخصوص پیش نظر رہنا چاہیے کہ حضرت شیخ الحدیث رحمہ اللہ جیسی وسیع المطالعہ اور بحث کے جملہ اطراف سے کما حقہ واقفیت رکھنے والی شخصیت اگر امت کی علمی روایت میں چلے آنے والے مختلف رجحانات میں سے کسی ایک رجحان کو اپنی تحقیق کی بنیاد پر اختیار کرتی اور اس سے مختلف رجحانات سے اختلاف بلکہ شدید اختلاف رکھتی ہے تو یہ ان کا مسلمہ علمی حق ہے، لیکن اگر ان کے دامن علم وتحقیق سے وابستہ حضرات امت کی وسیع تر علمی روایت، اس کے مختلف ومتنوع رجحانات اور گوناگوں اصولی علمی بحثوں سے براہ راست واقفیت بہم پہنچائے بغیر محض ان کے اختیار کردہ ذوق اور رجحان کی بنیاد پر کوئی کلی نوعیت کا معیار وضع کر کے چودہ سو سال کی پوری علمی روایت کو اس پر پرکھنا اور ماضی وحال کے اہل علم کو یہ سمجھانا شروع کر دیں کہ اس دائرے میں تو آپ کا حق رائے ہم تسلیم کرتے ہیں اور اس دائرے میں نہیں کرتے اور پھر اس سے آگے بڑھ کر اپنے ذہن کے لیے نامانوس کسی بھی علمی رجحان یا موقف کے بارے میں ''شاذ اقوال'' کے تحکمانہ فیصلے کرنے کا منصب بھی سنبھال لیں تو یقینی طور پر ایک مضحکہ خیز صورت حال پیدا ہو جاتی ہے۔ حیرت ہے کہ عم محترم کو، جمہور اہل علم کے ادب واحترام کو ملحوظ رکھتے ہوئے ان کی رائے سے علمی اختلاف کرنا تو ان کی توہین وتنقیص دکھائی دیتا ہے، لیکن وہ ماضی وحال کے تمام اکابر اہل علم کے مسلمہ اور ''متواتر ومتوارث'' طور پر برتے جانے والے حق اختلاف کی یہ کہہ کر نفی فرما دیتے ہیں کہ ''چونکہ ہم اور ہمارے شیخ اس رجحان کو درست نہیں سمجھتے، اس لیے ہم کسی صاحب علم کا یہ حق ہی سرے سے تسلیم نہیں کرتے'' اور اپنے اس طرز عمل میں انھیں ان تمام اہل علم کی توہین وتنقیص کا کوئی پہلو دکھائی نہیں دیتا۔ ع

جو چاہے آپ کا حسن کرشمہ ساز کرے

بہر حال یہ انھی کا حوصلہ ہے۔ ہم بحمد اللہ اس معاملے میں توازن اور اعتدال کو پوری طرح ملحوظ رکھتے اور اپنے دامن کو اس غلو سے بچائے رکھتے ہیں کہ امت کے اہل علم کے ہاں پائے جانے والے متنوع اور مختلف رجحانات کو کسی ایک شخصیت کے ذوق ورجحان کے کٹہرے میں لا کھڑا کیا جائے، چاہے اس شخصیت سے ہمارے قرابت، تلمذ واستفادہ، محبت وعقیدت اور احترام کے کتنے ہی رشتے کیوں نہ استوار ہوں۔ دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہمیں توازن اور اعتدال کے ساتھ امت کے تمام اہل علم اور خدام کا احترام کرنے، دین کے فہم اور اس کی تعبیر میں فطری طور پر اختلاف اور تنوع کی جو گنجایش خود شارع نے رکھی ہے، اسے قبول کرنے کا حوصلہ پیدا کرنے اور مستند علمی اصولوں کے دائرے میں رہتے ہوئے کسی تعصب اور امتیاز کے بغیر تمام اہل علم اور حلقہ ہائے فکر کی آرا اور تحقیقات سے استفادہ کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین

۔۔۔ ٦ ۔۔۔

افادات ومکاتیب

''حضرت مولانا محمد زکریا صاحب سہارنپوریؒ کا یہ معمول تھا کہ اگر سبق کے درمیان میں کوئی شخص آ جاتا اور اس کا تعلق سبق سے نہ ہوتا اور وہ کوئی بات پوچھتا تو حضرت گھڑی پر وقت دیکھتے اور اتنا وقت نوٹ کر لیتے۔ جب مہینہ گزرتا تو اتنے وقت کی تنخواہ کٹوا دیتے تھے کہ یہ وقت تعلیم کے دور میں خرچ نہیں ہوا۔ میں خود ذاتی طور پر کئی سال پریشان رہا، اس لحاظ سے کہ تعویذ اور دم والے بھی دور دراز سے آ جاتے ہیں، مرد بھی اور بیبیاں بھی۔ اگر دور سے آئے ہوں تو ان سے یہ کہنا کہ اس وقت ٹائم نہیں، چلے جاؤ تو اس کا برا اثر ہوگا۔ تو میں ان کو سبق کے درمیان تعویذ بنا دیتا اور دم کر دیتا۔ میں نے سوچا کہ اس سلسلے میں کیا کروں؟ تو ہمیں مدرسے کی طرف سے سالانہ پچیس چھٹیوں کی اجازت تھی۔ الحمد للہ میں نے حتی الوسع وہ پچیس چھٹیاں نہیں کیں۔ ایسے سال بھی گزرے ہیں کہ دو دو تین تین چار چار سال تک پورے سال میں ایک بھی چھٹی نہیں کی۔ وہ جو پچیس چھٹیاں ہماری مدرسے کی طرف سے تھیں، جو لوگ درمیان میں آ جاتے تھے، ان کے وقت کی کمی کو پورا کرنے کے لیے میں سالانہ پچیس چھٹیاں نہیں کرتا تھا اور الحمد اللہ میرا پلہ پھر بھی بھاری ہے۔ سبق کے دوران کسی سے گپ مارنا، غیر ضروری بات کرنا درست نہیں۔ ان چیزوں کو ملحوظ رکھیں۔''

ترتیب: محمد عمار خان ناصر

درس تفسیر

سورۂ بنی اسرائیل (آیات ۱ تا ۲۲)

اعوذ باللہ من الشیطان الرجیم۔ بسم اللہ الرحمن الرحیم

سُبْحَانَ الَّذِیْ أَسْرَی بِعَبْدِهِ لَيْلاً مِّنَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ إِلَى الْمَسْجِدِ الأَقْصَى
الَّذِیْ بَارَكْنَا حَوْلَهُ لِنُرِيَهُ مِنْ آيَاتِنَا إِنَّهُ هُوَ السَّمِيعُ البَصِيرُ (۱) وَآتَيْنَا مُوسَى
الْكِتَابَ وَجَعَلْنَاهُ هُدًى لِّبَنِي إِسْرَائِيلَ أَلاَّ تَتَّخِذُواْ مِن دُونِي وَكِيلاً (۲) ذُرِّيَّةَ مَنْ
حَمَلْنَا مَعَ نُوحٍ إِنَّهُ كَانَ عَبْداً شَكُوراً (۳) وَقَضَيْنَا إِلَى بَنِي إِسْرَائِيلَ فِي الْكِتَابِ
لَتُفْسِدُنَّ فِي الأَرْضِ مَرَّتَيْنِ وَلَتَعْلُنَّ عُلُوّاً كَبِيراً (۴) فَإِذَا جَاءَ وَعْدُ أُولاهُمَا بَعَثْنَا
عَلَيْكُمْ عِبَاداً لَّنَا أُوْلِي بَأْسٍ شَدِيدٍ فَجَاسُواْ خِلاَلَ الدِّيَارِ وَكَانَ وَعْداً مَّفْعُولاً (۵)
ثُمَّ رَدَدْنَا لَكُمُ الْكَرَّةَ عَلَيْهِمْ وَأَمْدَدْنَاكُم بِأَمْوَالٍ وَبَنِينَ وَجَعَلْنَاكُمْ أَكْثَرَ نَفِيراً (۶)
إِنْ أَحْسَنتُمْ أَحْسَنتُمْ لِأَنفُسِكُمْ وَإِنْ أَسَأْتُمْ فَلَهَا فَإِذَا جَاءَ وَعْدُ الآخِرَةِ لِيَسُوؤُواْ
وُجُوهَكُمْ وَلِيَدْخُلُواْ الْمَسْجِدَ كَمَا دَخَلُوهُ أَوَّلَ مَرَّةٍ وَلِيُتَبِّرُواْ مَا عَلَوْاْ تَتْبِيراً (۷)
عَسَى رَبُّكُمْ أَن يَرْحَمَكُمْ وَإِنْ عُدتُّمْ عُدْنَا وَجَعَلْنَا جَهَنَّمَ لِلْكَافِرِينَ حَصِيراً (۸)
إِنَّ هَـذَا الْقُرْآنَ يِهْدِي لِلَّتِي هِيَ أَقْوَمُ وَيُبَشِّرُ الْمُؤْمِنِينَ الَّذِينَ يَعْمَلُونَ الصَّالِحَاتِ
أَنَّ لَهُمْ أَجْراً كَبِيراً (۹) وأَنَّ الَّذِينَ لاَ يُؤْمِنُونَ بِالآخِرَةِ أَعْتَدْنَا لَهُمْ عَذَاباً أَلِيماً
(۱۰) وَيَدْعُ الإِنسَانُ بِالشَّرِّ دُعَاءَهُ بِالْخَيْرِ وَكَانَ الإِنسَانُ عَجُولاً (۱۱) وَجَعَلْنَا
اللَّيْلَ وَالنَّهَارَ آيَتَيْنِ فَمَحَوْنَا آيَةَ اللَّيْلِ وَجَعَلْنَا آيَةَ النَّهَارِ مُبْصِرَةً لِتَبْتَغُواْ فَضْلاً مِّن
رَّبِّكُمْ وَلِتَعْلَمُواْ عَدَدَ السِّنِينَ وَالْحِسَابَ وَكُلَّ شَيْءٍ فَصَّلْنَاهُ تَفْصِيلاً (۱۲) وَكُلَّ

إِنسَانٍ أَلْزَمْنَاهُ طَآئِرَهُ فِي عُنُقِهِ وَنُخْرِجُ لَهُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ كِتَاباً يَلْقَاهُ مَنشُوراً (١٣)
اقْرَأْ كَتَابَكَ كَفَى بِنَفْسِكَ الْيَوْمَ عَلَيْكَ حَسِيباً (١٤) مَّنِ اهْتَدَى فَإِنَّمَا يَهْتَدِي
لِنَفْسِهِ وَمَن ضَلَّ فَإِنَّمَا يَضِلُّ عَلَيْهَا وَلاَ تَزِرُ وَازِرَةٌ وِزْرَ أُخْرَى وَمَا كُنَّا مُعَذِّبِينَ حَتَّى
نَبْعَثَ رَسُولاً (١٥) وَإِذَا أَرَدْنَا أَن نُّهْلِكَ قَرْيَةً أَمَرْنَا مُتْرَفِيهَا فَفَسَقُوا فِيهَا فَحَقَّ
عَلَيْهَا الْقَوْلُ فَدَمَّرْنَاهَا تَدْمِيراً (١٦) وَكَمْ أَهْلَكْنَا مِنَ الْقُرُونِ مِن بَعْدِ نُوحٍ وَكَفَى
بِرَبِّكَ بِذُنُوبِ عِبَادِهِ خَبِيرَاً بَصِيراً (١٧) مَّن كَانَ يُرِيدُ الْعَاجِلَةَ عَجَّلْنَا لَهُ فِيهَا مَا
نَشَاءُ لِمَن نُّرِيدُ ثُمَّ جَعَلْنَا لَهُ جَهَنَّمَ يَصْلاَهَا مَذْمُوماً مَّدْحُوراً (١٨) وَمَنْ أَرَادَ
الآخِرَةَ وَسَعَى لَهَا سَعْيَهَا وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَأُولَئِكَ كَانَ سَعْيُهُم مَّشْكُوراً (١٩) كُلاًّ
نُّمِدُّ هَـؤُلاءِ وَهَـؤُلاءِ مِنْ عَطَاءِ رَبِّكَ وَمَا كَانَ عَطَاءُ رَبِّكَ مَحْظُوراً (٢٠) انظُرْ
كَيْفَ فَضَّلْنَا بَعْضَهُمْ عَلَى بَعْضٍ وَلَلآخِرَةُ أَكْبَرُ دَرَجَاتٍ وَأَكْبَرُ تَفْضِيلاً (٢١) لاَّ
تَجْعَل مَعَ اللّهِ إِلَـهاً آخَرَ فَتَقْعُدَ مَذْمُوماً مَّخْذُولاً (٢٢)

ترجمہ: ”پاک ہے وہ ذات جو لے گئی اپنے بندے کو رات میں مسجد حرام سے مسجد اقصیٰ تک، وہ کہ ہم نے برکت ڈالی اس کے آس پاس تا کہ ہم دکھائیں اس کو اپنی نشانیوں میں سے بعض۔ بے شک وہ سمیع ہے بصیر ہے۔ اور دی ہم نے موسیٰ علیہ السلام کو کتاب اور بنایا ہم نے اس کو ہدایت بنی اسرائیل کے لیے یہ کہ نہ بناؤ تم میرے سوا کارساز۔ اولاد ان کی جن کو ہم نے سوار کیا نوح علیہ السلام کے ساتھ، بے شک تھے وہ بندے شکرگزار۔

اور فیصلہ سنا دیا ہم نے بنی اسرائیل کو کتاب کے ذریعے کہ البتہ تم ضرور فساد کرو گے زمین میں دو مرتبہ اور البتہ تم سرکشی کرو گے سرکشی بڑی۔ پس جس وقت آیا ان میں سے پہلی دفعہ کا وعدہ، بھیجا ہم نے تم پر اپنے بندوں کو جو سخت گرفت والے تھے۔ پس گھس گئے وہ شہروں کے درمیان۔ اور تھا یہ وعدہ طے شدہ۔ پھر ہم نے لوٹائی تمہارے لیے باری ان پر اور مدد کی ہم نے تمہاری مالوں اور بیٹوں سے اور کیا ہم نے تمہیں نفری اور تعداد میں زیادہ۔ اگر نیکی کرو گے تو نیکی کرو گے اپنے نفوس کے لیے، اور اگر تم برائی کرو گے تو انھی نفوس کے لیے ہے۔ پس جس وقت آیا وعدہ دوسری مرتبہ کا تا کہ وہ اداس اور پریشان کر دیں تمہارے چہروں کو اور تا کہ وہ داخل ہوں مسجد میں جس طرح وہ داخل ہوئے اس میں پہلی مرتبہ، اور تا کہ وہ ہلاک کر دیں اس

چیز کو جس پر غالب آ جائیں ہلاک کرنا۔ قریب ہے کہ رب تمہارا تم پر رحم فرمائے، اور اگر تم لوٹو گے، ہم لوٹیں گے۔ اور بنائی ہم نے جہنم کافروں کے لیے قید خانہ۔ بے شک قرآن رہنمائی کرتا ہے اس طریقے کی جو درست ہے اور خوشخبری دیتا ہے مومنین کو وہ جو عمل کرتے ہیں اچھے کہ بے شک ان کے لیے اجر ہوگا بڑا۔ اور بے شک وہ لوگ جو نہیں ایمان لاتے آخرت پر، تیار کیا ہم نے ان کے لیے عذاب دردناک۔

اور مانگتا ہے انسان شر جیسے مانگتا ہے خیر اور ہے انسان جلد باز۔ اور بنائیں ہم نے رات اور دن دو نشانیاں۔ پس مٹائی ہم نے نشانی رات کی اور بنائی ہم نے نشانی دن کی روشن تا کہ تم تلاش کرو فضل اپنے رب کی طرف سے اور تا کہ تم جان لو گنتی سالوں کی اور حساب۔ اور ہر چیز کو ہم نے تفصیل سے بیان کیا تفصیل سے بیان کرنا۔

اور ہر انسان کو ہم نے لازم کر دیا ہے پروانہ اس کا اس کی گردن میں۔ اور نکالیں گے ہم اس کے لیے قیامت کے دن کتاب، ملے گا اس کو (اس حال میں کہ) کھلی ہوئی ہوگی۔ پڑھ اپنی کتاب کو۔ کافی ہے تیرا نفس آج کے دن تجھ پر حساب دان۔

جس نے ہدایت حاصل کی، پس پختہ بات ہے ہدایت حاصل کرے گا اپنے نفس کے لیے اور جس نے گمراہی اختیار کی، پس پختہ بات ہے اس کی گمراہی اس کے نفس پر پڑے گی۔ اور نہیں اٹھائے گا کوئی بوجھ اٹھانے والا دوسرے کے بوجھ کو۔ اور نہیں ہم سزا دینے والے یہاں تک کہ بھیجیں ہم پیغمبر۔

اور جس وقت ارادہ کرتے ہیں ہم اس کا کہ ہلاک کریں کسی بستی کو تو حکم دیتے ہیں وہاں کے آسودہ حال لوگوں کو، پس وہ نافرمانی کرتے ہیں اس بستی میں۔ پس لازم ہو جاتا ہے اس پر فیصلہ، پس ہلاک کرتے ہیں ہم اس کو ہلاک کرنا۔

اور کتنی ہلاک کیں ہم نے جماعتیں نوح علیہ السلام کے بعد۔ اور کافی ہے تیرا رب اپنے بندوں کے گناہوں سے خبردار بھی اور دیکھنے والا۔ جو شخص ارادہ کرتا ہے جلدی کے گھر کو، ہم اس کے لیے جلدی کر دیں گے اس میں جو ہم چاہیں، جس کے لیے چاہیں۔ پھر ہم بناتے ہیں اس کے لیے جہنم۔ داخل ہوگا اس میں مذمت کیا ہوا، پھٹکارا ہوا۔ اور جس نے ارادہ کیا آخرت کا، اور کوشش کی اس کے لیے کوشش کرنا اور ہے وہ مومن، پس وہ لوگ ہیں کہ ان کی کوشش کی قدر کی جائے گی۔ ہر ایک کو ہم امداد دیتے ہیں، ان کو بھی اور ان کو بھی، تیرے رب کے عطیے سے۔ اور نہیں ہے تیرے رب کا عطیہ روکا ہوا۔ دیکھ، کیسے ہم نے فضیلت دی ان میں سے بعض کو بعض پر، اور البتہ آخرت بڑی ہے از روئے درجوں کے اور بڑی ہے

ازروے فضیلت کے۔ نہ بنا الٰہ ساتھ اللہ تعالیٰ کے، تو بیٹھا رہے مذمت کیا ہوا رسوا کیا ہوا۔"

سُبْحَانَ الَّذِیْ أَسْرَی بِعَبْدِهِ لَيْلاً مِّنَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ إِلَى الْمَسْجِدِ الأَقْصَی

ربط: کل آپ نے پڑھا تھا: وَلَا تَكُ فِیْ ضَيْقٍ مِّمَّا يَمْكُرُوْنَ (النحل آیت ۱۲۷) کہ یہ کافر جو مکر کرتے ہیں، تدبیریں کرتے ہیں، آپ ان کی وجہ سے تنگ دل نہ ہوں۔ اسی تنگ دلی کے سلسلے میں یہ واقعہ پیش آیا کہ معراج سے آپ جب واپس تشریف لائے تو کافروں نے آپ کا امتحان لیا کہ مسجد اقصیٰ کے دائیں طرف، بائیں طرف اور آگے پیچھے کیا عمارت تھی۔ مسلم شریف کی روایت میں ہے کہ لم اثبته، میں ان چیزوں کی طرف توجہ نہیں کر سکا، نہ مجھے معلوم تھا۔ انھوں نے کہا کہ تو معاذ اللہ جھوٹ کہتا ہے۔ فکربت کربة لم اکرب مثله ۔ اتنا پریشان ہوا کہ مجھے اتنی پریشانی کبھی بھی نہیں ہوئی۔ اللہ تعالیٰ نے مسجد اقصیٰ میرے سامنے کردی۔ فطفقت اخبرهم، میں اس کو دیکھ کر ان کو بتاتا۔ تو ان تنگی کے مقامات میں ایک یہ واقعہ معراج کا بھی تھا جس کا ذکر آ رہا ہے۔

نام ہے اس کا سورۂ بنی اسرائیل۔ بنی اسرائیل کا ذکر اس میں ہے۔ معراج کے متعلق بحث تو بڑی طویل ہے۔ میں مختصر سی بات عرض کرتا ہوں۔ رجب کا مہینہ تھا اور مشہور روایات کے مطابق ۲۷ رجب تھی۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ام ہانی رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے گھر آرام فرما تھے۔ آپ کے ایک طرف حضرت حمزہ اور دوسری طرف حضرت عقیل تھے۔ درمیان میں آپ تھے۔ نیچے سوئے ہوئے تھے۔ فرشتے آئے۔ آپس میں انھوں نے گفتگو کی کہ ہمارا مطلوب کون سا ہے؟ کہنے لگے: اوسطهم وهو افضلهم ۔ یہ درمیان میں جو لیٹے ہوئے ہیں، یہ ہیں ہمارے مطلوب۔ مجھے اٹھایا گیا اور مکان کی چھت کو پھاڑا گیا۔ وہاں سے مجھے حجر اور حطیم میں بٹھایا گیا۔ حجر اور حطیم کعبے کا حصہ ہے۔ وہاں میرے سینے کو چاک کیا گیا اور سونے کی رکابی میں رکھ کر زم زم کے پانی سے دھویا گیا اور ملیئ حکمة و ایمانا، حکمت اور ایمان کی دولت اس میں بھر دی گئی۔ ایک جانور لایا گیا جو گدھے سے بھاری تھا اور خچر سے ذرا ہلکا تھا۔ اس کو براق کہتے ہیں۔ برق کے معنی بجلی کے ہیں۔ یہ بجلی انسانوں کی ایجاد ہے۔ سائنس دان کہتے ہیں کہ یہ جو بجلی ہے، یہ ایک منٹ میں زمین کے اردگرد پانچ سو مرتبہ چکر لگا سکتی ہے۔ یہ تو انسانوں کی ایجاد ہے تو جو رب کی برق ہے، اس کا کیا کہنا؟ آناً فاناً وہاں مسجد اقصیٰ پہنچا دیا گیا۔ حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ کی تحقیق یہ ہے کہ جاتے ہوئے آپ نے مسجد اقصیٰ میں تنہائی میں نماز تحیۃ المسجد پڑھی۔ پھر پہلے آسمان پر گئے۔ جبریل علیہ السلام نے دستک دی۔ پوچھا گیا کہ کون ہے؟ کہا، میں جبریل ہوں۔ ساتھ کون ہے؟ کہا محمد صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم۔ پوچھا گیا کہ ارسل الیه ؟کیا ان کی طرف پیغام گیا ہے؟ بلوائے گئے ہیں؟ فرمایا، ہاں۔ دروازہ کھولا تو سب نے مرحبا مرحبا کہی۔

پہلے آسمان کے اوپر دیکھا تو ایک باباجی تشریف فرما ہیں۔ ان کے دائیں طرف اسودة، کچھ نشانات سے ہیں۔ ان کو دیکھتے ہیں تو خوش ہوتے ہیں، ہنس پڑتے ہیں۔ بائیں طرف بھی کچھ نشانات ہیں۔ ان کو دیکھتے ہیں تو رو پڑتے ہیں۔ میں نے پوچھا کہ یہ باباجی کون ہیں؟ کہا گیا کہ آدم علیہ السلام ہیں۔ جا کر ان کو سلام کہیں۔ میں نے آدم علیہ السلام کو سلام کیا۔ انھوں نے کہا: مرحبا بالابن الصالح والنبی الصالح ۔ میں نے کہا کہ وہ دائیں طرف والی مخلوق کیا ہے اور بائیں طرف والی کیا ہے؟ تو کہا کہ یہ دائیں طرف اصحاب الیمین ہیں، ان کی مثالی شکلیں ہیں۔ بائیں طرف والے اصحاب الشمال ہیں۔ باپ ہونے کی وجہ سے شفقت ان پر بھی ہے، افسوس ان پر بھی ہے۔ پھر دوسرے آسمان، پھر تیسرے، پھر چوتھے،

پانچویں، چھٹے، ساتویں آسمان پر گئے۔ سدرۃ المنتہیٰ اور جنت دوزخ کی سیر کی گئی۔ یہ سارا کچھ جسم مبارک کے ساتھ بیداری میں ہوا۔ خواب کا واقعہ نہیں، کشف کا واقعہ نہیں اور کوئی الہامی بات نہیں، حقیقت ہے۔

پھر وہاں اللہ تعالیٰ نے تین تحفے دیے۔ ایک تو سورۂ بقرہ کا آخری حصہ آمن الرسول سے آخر تک بغیر جبریل علیہ السلام کی وساطت کے۔ دوسرا پچاس نمازیں۔ تیسرا تحفہ یہ کہ آپ کی امت میں جو میرے ساتھ کسی کو شریک نہیں ٹھہرائے گا، میں اس کو بخش دوں گا۔ نمازیں پچاس لے کر آپ آئے تو چھٹے آسمان پر موسیٰ علیہ السلام سے ملاقات ہوئی۔ انھوں نے کہا کہ کیا تحفے لائے؟ فرمایا، یہ تحفے ہیں۔ کہنے لگے حضرت! انی قد بلوت بنی اسرائیل ۔ میں نے بنی اسرائیل کا بڑا تجربہ کیا ہے، وہ تو دو نمازیں پوری نہیں پڑھ سکے دن رات میں۔ تو آپ کی امت میں کمزور لوگ بھی ہوں گے، پچاس نمازیں نہیں پڑھ سکیں گے۔ آپ میرے تجربے سے فائدہ اٹھائیں۔ ابھی اللہ تعالیٰ مہربان ہے۔ آپ جائیں، جا کر اللہ تعالیٰ سے درخواست کریں اور نمازوں میں تخفیف کرائیں۔ ابوعوانہ کی روایت میں ہے کہ ایک چکر میں نے لگایا۔ فحط عنی خمسا ۔ ایک چکر میں پانچ نمازیں معاف ہوگئیں۔ دوسرا چکر لگایا، پانچ مزید معاف ہوگئیں۔ نو چکر لگائے تو پینتالیس نمازیں معاف ہوگئیں، پانچ رہ گئیں۔ موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا کہ ایک چکر اور لگائیں تو بخاری کی روایت ہے، آپ نے فرمایا: استحییت من ربی، مجھے رب سے شرم اور حیا آتی ہے۔ کس بات کی شرم؟ کہ ہر چکر میں پانچ نمازیں معاف ہوتی رہیں۔ اب اگر ایک چکر اور لگائیں تو وہ پانچ بھی معاف ہو جائیں گی تو میں تحفہ کیا لے کر جاؤں گا؟ خالی ہاتھ تو جانا اچھی بات نہیں۔

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ کی تحقیق ہے جو اس مقام پر تفسیر ابن کثیر میں ہے اور البدایہ والنہایہ میں بھی ہے کہ واپسی پر فجر کی نماز آپ نے انبیاء علیہم السلام کو جماعت کے ساتھ پڑھائی تھی۔ وہاں سے آپ آئے تو اندھیرا ہی تھا۔ آپ غلس میں، اندھیرے میں ہی فجر کی نماز پڑھتے تھے۔ ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے فرمایا، حضرت دروازہ ویسے تو بند تھا۔ پیچھے سے کنڈی نہیں لگی ہوئی تھی اور میں نے دیکھا، فالتمستك علی فراشك فلم اجدك ۔ میں نے آپ کی چارپائی پر دیکھا تو آپ نہ تھے؟ کہاں تھے؟ فرمایا کہ مجھے اللہ معراج پر لے گیا تھا۔ ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے کہا آمنت و صدقت ۔ کفار نے نہیں مانا۔ یہ روایت بھی اس بات کی دلیل ہے کہ اگر یہ خواب کا واقعہ ہوتا تو بستر پر تو آپ کا وجود پڑا ہوتا۔ وہ کہتے ہیں: التمستك فلم اجدك ۔ میں نے تلاش کیا تو آپ بستر پر نہ تھے۔ حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ جب کوئی نرالی بات ہوتی ہے تو وہاں ہم بھی کہتے ہیں: سبحان الله ۔ جب رب تعالیٰ سبحان کے لفظ سے کوئی بات بیان کریں تو وہ بڑی نرالی چیز ہوگی۔ اگر خواب کا واقعہ ہوتا تو کوئی نرالا نہ ہوتا۔ یہ لفظ سبحان اس بات کی الگ دلیل اور قرینہ ہے کہ معراج جسم اور روح دونوں کے ساتھ ہوا۔ آگے فرماتے ہیں کہ بعبده میں لفظ عبد جسم اور روح دونوں کا نام ہے۔ باقی معراج کے متعلق عقلی و نقلی شبہات خاصے ہیں۔ اس پر ہماری ایک مستقل کتاب ہے "ضوء السراج فی تحقیق المعراج یعنی چراغ کی روشنی"۔ اس میں ہم نے وہ عقلی و نقلی شبہات جو ہمارے سامنے آئے ہیں، ان سب کے جوابات دیے ہیں۔

الْمَسْجِدِ الأَقْصَی الَّذِیْ بَارَكْنَا حَوْلَهُ ۔ وہ مسجد اقصیٰ جس کے اردگرد ہم نے برکت کی ہے۔ مسجد اقصیٰ کے اردگرد ظاہری برکت بھی ہے، باطنی برکت بھی ہے۔ ظاہری یہ کہ بڑا زرخیز علاقہ ہے، سرسبز علاقہ ہے، پانی کے چشمے ہیں، باغات ہیں۔ اور باطنی یہ کہ بے شمار پیغمبر یہاں آئے ہیں اور ان کی وہاں قبریں ہیں۔

لِنُرِيَهُ مِنُ آيَاتِنَا۔ تاکہ ہم دکھائیں اس کو اپنی نشانیوں میں سے بعض۔ من تبعیضیہ ہے۔

إِنَّهُ هُوَ السَّمِيعُ الْبَصِيرُ۔ جمہور مفسرین کرام تو فرماتے ہیں کہ انہ کی ضمیر اللہ کی طرف راجع ہے، یعنی وہ ذات سمیع اور بصیر ہے۔ روح البیان والے اسماعیل حقی رحمہ اللہ مفسر ہیں، رطب و یابس سب کچھ لکھ دیتے ہیں۔ انھوں نے انہ کی ضمیر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف لوٹائی ہے کہ بے شک وہ بندہ سمیع ہے بصیر ہے۔ اس کا یہ معنی نہیں ہے معاذ اللہ کہ جس معنی میں رب سمیع اور بصیر ہے، اسی میں آپ بھی ہیں۔ نہیں۔ جو آپ کے شان کے لائق سمیع ہے کہ وہاں جو باتیں ہوئیں، وہ بھی سنیں اور جو کچھ ہوا، وہ بھی دیکھا۔ وہ لوگ بڑے صاف عقیدے والے ہوتے تھے۔ ایسے لفظ بول کر وہ معانی نہیں لیتے تھے جو آج کل کے غالی مبتدعین اور مشرکین لیتے ہیں۔ تو اگرچہ یہ تفسیر مرجوح ہے، لیکن اس کا معنی بھی صحیح ہے کہ وہ بندہ سمیع ہے، اس نے سنا بھی ہے دیکھا بھی ہے۔

وَآتَيْنَا مُوسَى الْكِتَابَ وَجَعَلْنَاهُ هُدًى لِّبَنِي إِسْرَائِيلَ أَلَّا تَتَّخِذُوا مِن دُونِي وَكِيلاً

ربط: اوپر ذکر تھا مسجد اقصیٰ کا۔ اب اس پیغمبر کا ذکر آیا جو مسجد اقصیٰ میں رہنے والی مخلوق کی طرف بھیجے گئے۔ وہ حضرت موسیٰ علیہ السلام تھے۔ فرمایا ہم نے موسیٰ علیہ السلام کو تورات دی۔

وَجَعَلْنَاهُ هُدًى لِّبَنِي إِسْرَائِيلَ ۔ اور بنایا ہم نے اس کو ہدایت بنی اسرائیل کے لیے۔ بعض و جعلنہ کی ضمیر کتاب کی طرف لوٹاتے ہیں کہ کتاب ہدایت تھی بنی اسرائیل کے لیے۔ یہ بھی صحیح ہے۔ اور بعض اس ضمیر کو موسیٰ علیہ السلام کی طرف لوٹاتے تھے کہ وہ ہدایت تھے بنی اسرائیل کے لیے۔ أَلَّا تَتَّخِذُوا مِن دُونِي وَكِيلاً، یہ کہ میرے بغیر تم کسی کو کارساز نہ بناؤ۔ کارساز، کام بنانے والا صرف پروردگار ہے۔

ذُرِّيَّةَ مَنْ حَمَلْنَا مَعَ نُوحٍ إِنَّهُ كَانَ عَبْداً شَكُوراً

ذُرِّيَّةَ کا نصب ہے یا سے ہے جو محذوف ہے، ای یا ذریة ۔ اے اولاد ان کی جن کو ہم نے کشتی میں نوح علیہ السلام کے ساتھ سوار کیا۔ نوح علیہ السلام تو بڑے شکر گزار بندے تھے تو تم کیوں ناشکری پر کمربستہ ہو!

وَقَضَيْنَا إِلَى بَنِي إِسْرَائِيلَ فِي الْكِتَابِ لَتُفْسِدُنَّ فِي الأَرْضِ مَرَّتَيْنِ وَلَتَعْلُنَّ عُلُوّاً كَبِيراً۔

ربط: بنی اسرائیل کا ذکر تھا تو اب بنی اسرائیل کی شرارتوں کا ذکر ہے۔ ہم نے فیصلہ اپنا سنا دیا بنی اسرائیل کو کتاب کے ذریعے کہ تم زمین میں فساد مچاؤ گے دو مرتبہ اور سرکشی کرو گے تم سرکشی بڑی۔ تفسیر کبیر، ابن کثیر، خازن، معالم، وغیرہ تفسیروں میں یہاں بڑی بحث ہے، لیکن جتنی بسط سے بحث صاحب تفسیر حقانی نے کی ہے، شاید کسی اور نے نہیں کی۔ خلاصہ یہ ہے کہ دو دفعہ بنی اسرائیل کی شرارتوں کا بدلہ رب نے ان کو دیا۔ ایک دفعہ بخت نصر (بُخْتَ نَصَّرَ) ایرانی کے دور میں، جو ایران کا بادشاہ تھا اور بڑا جابر و ظالم تھا۔ اس کی فوجیں وہاں داخل ہوئیں اور لوگوں کو قتل کیا۔ مسجد اقصیٰ کی بے حرمتی کی اور اس سلسلے میں بڑا کچھ ہوا۔ تو پہلی دفعہ یہ ہے۔

فَإِذَا جَاءَ وَعْدُ أُولاهُمَا بَعَثْنَا عَلَيْكُمْ عِبَاداً لَّنَا أُولِي بَأْسٍ شَدِيدٍ فَجَاسُوا خِلاَلَ الدِّيَارِ۔ ان مرتین میں سے جب پہلی بار کا وعدہ آیا تو ہم نے اپنے بندے بھیجے، یعنی بخت نصر ایرانی اور اس کی فوجیں۔ وہ گھروں میں گھس گئے۔ وَكَانَ وَعْداً مَّفْعُولاً، اور یہ وعدہ طے شدہ تھا۔ ثُمَّ رَدَدْنَا لَكُمُ الْكَرَّةَ عَلَيْهِمْ، پھر ہم نے تمہارے لیے باری ان پر لوٹائی۔

لیے باری ان پر لوٹائی۔ وَأَمْدَدْنَاكُم بِأَمْوَالٍ وَبَنِينَ، اور ہم نے تمہاری مدد کی۔ مال بھی دیے، پیسے بھی دیے۔ وَجَعَلْنَاكُمْ أَكْثَرَ نَفِيراً، اور ہم نے تمہیں برادری کے لحاظ سے، نفری کے لحاظ سے، تعداد کے لحاظ سے زیادہ کر دیا۔ ہم نے کہہ دیا، إِنْ أَحْسَنتُمْ أَحْسَنتُمْ لِأَنفُسِكُمْ وَإِنْ أَسَأْتُمْ فَلَهَا۔ اگر نیکی کرو گے تو اپنے نفوس کے لیے کرو گے۔ برائی کرو گے تو وہ برائی تمہارے نفوس کے لیے مختص ہے۔

فَإِذَا جَاءَ وَعْدُ الآخِرَةِ ۔ اب دوسری دفعہ کا وعدہ آیا۔ دوسری دفعہ طیطس (طَيْطَس) رومی کا دور تھا۔ طیطس رومی بھی لکھ دیتے ہیں، طیطاؤس رومی بھی لکھتے ہیں۔ بعض نے کہا کہ یہ عیسائی تھا، بعض کہتے ہیں کہ نہیں، مشرک تھا۔ اس طیطس رومی کے دور میں پھر ارض مقدسہ پر، بیت المقدس پر حملہ ہوا اور بے پناہ لوگ قتل کیے گئے، مسجد کی بے حرمتی ہوئی۔ اس کا ذکر ہے کہ جب وعدہ دوسری مرتبہ کا آیا۔ لِيَسُوؤُوا وُجُوهَكُمْ۔ یہ لام عاقبت ہے۔ انجام یہ ہے کہ انھوں نے اداس کر دیے، پریشان کر دیے تمہارے چہرے، اور نتیجہ یہ ہوا کہ وہ مسجد میں داخل ہوئے جیسے پہلی مرتبہ داخل ہوئے تھے، اور نتیجہ یہ ہوا کہ وہ ہلاک کر دیں جس پر وہ غالب آئے ہیں ہلاک کرنا۔ ما علوا ای ما غلبوا۔

رب تعالیٰ نے فرمایا: عَسَى رَبُّكُمْ أَن يَرْحَمَكُمْ۔ قریب ہے کہ رب تم پر رحم فرمائے گا۔ وَإِنْ عُدتُّمْ عُدْنَا، اگر تم لوٹو گے شرارتوں کی طرف، فساد کی طرف، تو ہم لوٹیں گے سزا دینے کی طرف۔ تم شرارتیں کرو، ہم سزا دیں گے۔ یہ تو دنیا کی سزا ہے۔ آخرت کی سزا الگ ہے۔ وَجَعَلْنَا جَهَنَّمَ لِلْكَافِرِينَ حَصِيراً۔ ہم نے جہنم کو کافروں کے لیے قید خانہ بنا رکھا ہے۔ محاصرہ کا لفظ اسی سے بنا ہے۔

إِنَّ هَذَا الْقُرْآنَ يِهْدِي لِلَّتِي هِيَ أَقْوَمُ

ربط: پہلے تورات کا ذکر تھا۔ اب اس کتاب کی مناسبت سے قرآن پاک کا ذکر فرماتے ہیں کہ یہ قرآن کریم رہنمائی کرتا ہے۔ لِلَّتِي هِيَ أَقْوَمُ، بعض کہتے ہیں: للطریقه التی هی اقوم، یعنی طریقة کو موصوف نکالتے ہیں۔ بعض خصلة نکالتے ہیں، للخصلة التی هی اقوم ۔ اس خصلت کی طرف، اس طریقے کی طرف رہنمائی کرتا ہے جو درست ہے۔

وَيُبَشِّرُ الْمُؤْمِنِينَ الَّذِينَ يَعْمَلُونَ الصَّالِحَاتِ أَنَّ لَهُمْ أَجْراً كَبِيراً، اور مومنوں کو خوشخبری دیتا ہے جو نیک کام کرتے ہیں، اس بات کی کہ ان کے لیے اجر کبیر ہے۔ وأَنَّ الَّذِينَ لاَ يُؤْمِنُونَ بِالآخِرَةِ أَعْتَدْنَا لَهُمْ عَذَاباً أَلِيماً، اور جو آخرت پر ایمان نہیں لاتے، ان کے لیے ہم نے عذاب الیم تیار کیا ہے۔

وَيَدْعُ الإِنسَانُ بِالشَّرِّ دُعَاءهُ بِالْخَيْرِ وَكَانَ الإِنسَانُ عَجُولاً

ربط: اوپر ذکر تھا کہ ہم نے کافروں کے لیے جہنم بنائی۔ جو قیامت کے منکر تھے، وہ کہتے تھے کہ لاؤ نا وہ جہنم جو تم نے ہمارے لیے قید خانہ تیار کر رکھا ہے۔ کیوں نہیں لاتے؟ کاہے کی دیر ہے۔ رب تعالیٰ فرماتے ہیں کہ مانگتا ہے انسان شر کو جیسے مانگتا ہے خیر کو۔ یہیں نوٹ کر لینا۔ يَدْعُ جو ہے، یہ واؤ اس میں گر گیا۔ صرف تخفیف کے لیے۔ نہ کوئی ناصب ہے اور نہ کوئی جازم ہے۔ ایک یہ مقام ہے اور ایک آگے پچیسویں پارے میں آئے گا: وَيَمْحُ اللَّهُ الْبَاطِلَ (الشوریٰ، آیت ۲۴) وہاں یمحو سے واؤ گرا ہے، لیکن ناصب جازم کوئی نہیں۔ تیسرا سورۂ علق میں آئے گا: سَنَدْعُ الزَّبَانِيَةَ (العلق، آیت ۱۸)۔ وہاں بھی واؤ گرا ہے صرف تخفیف کے لیے، ناصب جازم وہاں بھی کوئی نہیں۔ روح المعانی وغیرہ میں اس کی تصریح ہے۔

دُعَاءَهُ بِالْخَیْرِ ۔ یہ جونصب ہے، نزع خافض کی وجہ سے ہے، ای کدعاء ہ بالخیر ۔ جیسے خیر کو مانگتا ہے، ویسے ہی عذاب کو بھی مانگتا ہے۔ وَکَانَ الإِنسَانُ عَجُولاً ، اور ہے انسان جلد باز۔

فرمایا: وَجَعَلْنَا اللَّیْلَ وَالنَّهَارَ آیَتَیْنِ فَمَحَوْنَا آیَةَ اللَّیْلِ وَجَعَلْنَا آیَةَ النَّهَارِ مُبْصِرَةً لِتَبْتَغُوا فَضْلاً مِّن رَّبِّکُمْ وَلِتَعْلَمُوا عَدَدَ السِّنِینَ وَالْحِسَابَ وَکُلَّ شَیْءٍ فَصَّلْنَاهُ تَفْصِیلاً ۔ اور ہم نے رات اور دن کی دو نشانیاں بنائی ہیں۔ رات کی نشانی ہم نے مٹائی اور دن کی نشانی کو ہم نے روشن کیا، تاکہ دن کو تم اللہ کا فضل تلاش کرو۔ مزدوری کرو، محنت کرو، کماؤ۔ اور رات اور دن کے ذریعے تم سالوں کی گنتی اور حساب جانتے ہو۔ ہر چیز کو ہم نے تفصیل کے ساتھ بیان کر دیا۔

وَکُلَّ إِنسَانٍ أَلْزَمْنَاهُ طَآئِرَهُ فِی عُنُقِهِ وَنُخْرِجُ لَهُ یَوْمَ الْقِیَامَةِ کِتَاباً یَلْقَاهُ مَنشُوراً

وَکُلَّ إِنسَانٍ ۔ کُلَّ کی نصب أَلْزَمْنَا کے ساتھ ہے۔ یہ نصب علیٰ شریطۃ التفسیر ہے، ای الزمنا کل انسان ۔ ہر انسان کو لازم کر دیا ہم نے پروانہ اس کا۔ قیامت کے دن جب نکلے گا تو ہر آدمی کا جو نامہ عمل ہوگا، اس کے گلے میں لٹکا ہوگا۔ تو ہر آدمی کا جو پروانہ ہے، وہ اس کی گردن میں ہے۔ آپ نے وہ قرآن کریم دیکھا ہوگا جو ایک ہی ورق پر لکھا ہوا ہے۔ گو کہ ہر آدمی پڑھ نہیں سکتا، یا حفاظ پڑھیں گے یا خوردبین کے ساتھ پڑھا جائے گا، لیکن ایک ہی کاغذ پر لکھا ہوا آپ نے دیکھا ہوگا۔ اسی طرح تمام نامہ عمل انسان کا کھلا ہوا اس کے سامنے ہوگا۔ اور دنیا میں کوئی پڑھا ہوا ہے یا ان پڑھ ہے، وہاں اللہ تعالیٰ ہر ایک کو اتنی بصیرت عطا فرمائیں گے کہ خود پڑھ لے گا۔ اقْرَأْ کَتَابَکَ ، خود پڑھ۔ کَفَی بِنَفْسِکَ الْیَوْمَ عَلَیْکَ حَسِیباً ، کافی ہے تیرا نفس آج کے دن تجھ پر حساب دان۔

اوپر ذکر ہے کہ ہم نے قرآن ہدایت کے لیے بھیجا یعنی نازل کیا۔ آگے فرماتے ہیں کہ جس طرح اس قرآن پاک کے ذریعے ہم نے ہدایت کی، پیغمبر بھیجنے سے پہلے ہم سزا نہیں دیتے۔ کیوں؟ اگر پیغمبروں کے آنے سے پہلے سزا ہوتی تو اس سلسلے میں لوگ کہہ سکتے تھے کہ ہم بے خبر ہیں۔ چھٹے پارے میں آپ پڑھ چکے ہیں: لِئَلاَّ یَکُونَ لِلنَّاسِ عَلَی اللّهِ حُجَّةٌ بَعْدَ الرُّسُلِ (النساء آیت ۱۶۵)

آگے فرماتے ہیں کہ: وَإِذَا أَرَدْنَا أَن نُّهْلِکَ قَرْیَةً أَمَرْنَا مُتْرَفِیهَا فَفَسَقُوا فِیهَا فَحَقَّ عَلَیْهَا الْقَوْلُ فَدَمَّرْنَاهَا تَدْمِیراً ۔ جب ہم کسی بستی کو ہلاک کرنے کا ارادہ کرتے ہیں تو وہاں کے آسودہ حال لوگوں کو حکم کرتے ہیں، پس وہ نافرمانی کرتے ہیں۔ پس ان پر بات لازم ہوتی ہے اور ہم انھیں ہلاک کر دیتے ہیں۔ یہاں أَمَرْنَا مُتْرَفِیهَا ، اس جملے کو اچھی طرح سمجھ لیں۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جب خود رب نافرمانی کا حکم دے تو ان کا گناہ کیا ہے کہ ان کو ہلاک کیا گیا۔ جب رب حکم دیتا ہے تو ان بے چاروں کا قصور کیا ہے؟ وہ رب سے زیادہ قوت والے تو نہیں کہ رب کے حکم کو ٹال سکیں۔ اس اشکال کے تین جواب ہیں:

ایک جواب بخاری کتاب التفسیر میں اور تمام تفسیروں میں حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے بیان ہوا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ امرنا کے معنی ہیں کثرنا، جب ہم کسی بستی کو ہلاک کرنے کا ارادہ کرتے ہیں تو زیادہ کر دیتے ہیں آسودہ حال لوگوں کو۔ جب وہ زیادہ ہوتے ہیں تو نافرمانی کرتے ہیں، کیونکہ دولت کا یہ خاصہ ہے کہ: وَلَوْ بَسَطَ اللَّهُ الرِّزْقَ لِعِبَادِهِ

لَبَغَوْا فِی الْأَرْضِ (الشوریٰ، آیت ۲۷)۔

دوسری تفسیر حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ سے ابن کثیر، ابن جریر، معالم التنزیل، درمنثور، روح المعانی وغیرہ میں مروی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ اس کا مطلب یہ ہے کہ امرنا مترفیها بالطاعة، ہم وہاں کے آسودہ حال لوگوں کو طاعت کا حکم دیتے ہیں، لیکن وہ نافرمانی کرتے ہیں جس کی وجہ سے ان پر عذاب لازم ہو جاتا ہے۔

تیسری تفسیر یہ ہے کہ امر سے امر ہی مراد ہے، لیکن امر تشریعی نہیں، بلکہ امر تکوینی۔ امر تشریعی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ یہ حکم کریں کہ بدی کرو۔ یہ مراد نہیں۔ امر تکوینی کا یہ معنی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہر ایک کو خیر اور شر کرنے کی قوت دی ہے۔ اگر کوئی شخص شر کی طرف چلتا ہے تو اللہ تعالیٰ کا قاعدہ یہ ہے کہ فَلَمَّا زَاغُوا أَزَاغَ اللَّهُ قُلُوبَهُمْ (الصف آیت ۵) اور نُوَلِّهِ مَا تَوَلَّی (النساء آیت ۱۱۵)۔ تو أَمَرْنَا مُتْرَفِیهَا سے مراد تکوینی امر ہے کہ اچھا اس راستے کو تم اختیار کرتے ہو تو کرو۔

آگے رب تعالیٰ فرماتے ہیں: مَّن کَانَ یُرِیدُ الْعَاجِلَةَ عَجَّلْنَا لَهُ فِیهَا مَا نَشَاءُ لِمَن نُّرِیدُ

العاجلة، یہ صفت ہے الدار کی۔ دار عربی میں مونث ہوتا ہے۔ جو شخص دار عاجلہ چاہتا ہے، جلدی والا گھر، یعنی دنیا تو ہم اس کے لیے جلدی کر دیتے ہیں، جو چاہیں جس کے لیے چاہیں۔ یہ نہیں کہ ہر ایک ہی چیز مل جاتی ہے، بلکہ جس کے لیے ہم چاہیں، اس کو دے دیتے ہیں۔ ثُمَّ جَعَلْنَا لَهُ جَهَنَّمَ یَصْلاهَا مَذْمُوماً مَّدْحُوراً ۔ پھر اس کے لیے جہنم ہے۔ اس میں داخل ہوگا مذمت کیا ہوا پھٹکارا ہوا۔

وَمَنْ أَرَادَ الآخِرَةَ ای الدار الآخرة ۔ اور آخرت کے گھر کا ارادہ کرے گا اور نرا ارادہ ہی نہیں، وَسَعَی لَهَا سَعْیَهَا ، اس آخرت کے لیے کوشش بھی کرے گا۔ نری کوشش ہی نہیں، وَهُوَ مُؤْمِنٌ ، ایمان کی صفت سے موصوف بھی ہو۔ مومن آخرت کی کوشش کرے تو اس کی کوشش کی قدر کی جائے گی۔ باقی رہا دنیا کا معاملہ تو کُلاًّ نُّمِدُّ هَؤُلاء وَهَؤُلاء مِنْ عَطَاءِ رَبِّکَ ۔ کُلاًّ میں تنوین عوض مضاف الیہ کے ہے، ای کل واحد منهما ۔ یہ جو طالب دنیا ہے اس کو بھی اور جو طالب آخرت ہے اس کو بھی، ہر ایک کو ہم مدد دیتے ہیں۔ تیرے رب کے عطیے سے دنیا میں ان کو بھی رزق ملتا ہے اور ان کو بھی۔ وَمَا کَانَ عَطَاءُ رَبِّکَ مَحْظُوراً ۔ تیرے رب کا عطیہ محظور نہیں۔ حظر یحظر کا معنی ہے روکنا۔ فقہ میں آپ نے الحظر والاباحۃ کا جو باب پڑھا ہے، وہ اسی سے ہے، یعنی ممانعت اور اباحت کا باب۔

انظُرْ کَیْفَ فَضَّلْنَا بَعْضَهُمْ عَلَی بَعْضٍ وَلَلآخِرَةُ أَکْبَرُ دَرَجَاتٍ وَأَکْبَرُ تَفْضِیلاً

اللہ نے انسانوں میں سے بعض کو بعض پر فضیلت دی ہے، شکل میں، قد میں، علم میں، مال میں، اولاد میں اور بہت سی چیزوں میں۔

لاَّ تَجْعَل مَعَ اللّهِ إِلَـهاً آخَرَ فَتَقْعُدَ مَذْمُوماً مَّخْذُولاً

ربط: اوپر ذکر تھا کہ آخرت کی کوشش کریں۔ اب آخرت کی کوشش میں سب سے بڑی چیز یہ ہے کہ لاَّ تَجْعَل مَعَ اللّهِ إِلَـهاً آخَرَ ۔ اگر بالفرض تم نے الہ بنایا تو تمہاری مذمت کی ہوگی اور رسوا اور ذلیل ہو کر بیٹھے رہو گے۔

ترتیب: مولانا حافظ محمد یوسف

خطبہ جمعۃ المبارک

[بمقام جامع مسجد نور مدرسہ نصرۃ العلوم گوجرانوالہ]

الحمد لله و كفى و سلام على عباده الذين اصطفى ، اما بعد! فاعوذ بالله من الشيطان الرجيم، بسم الله الرحمن الرحيم، اَلْمَالُ وَالْبَنُونَ زِيْنَةُ الْحَيَاةِ الدُّنْيَا وَالْبٰقِيٰتُ الصّٰلِحَاتُ خَيْرٌ عِنْدَ رَبِّكَ ثَوَاباً وَخَيْرٌ أَمَلاً (سورۃ الکہف، آیت ۴۶)۔

اللہ تبارک وتعالیٰ کی کتابوں میں جو درجہ، شان، رتبہ قرآن کریم کا ہے، اور کسی کتاب کا نہیں۔ ہمارا سب کتابوں پر ایمان ہے۔ ہمیں تفصیلاً اور قطعیت کے ساتھ معلوم نہیں کہ کتنی کتابیں نازل ہوئیں۔ ہمارے ایمان کے لیے اتنی بات کافی ہے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے جتنی کتابیں نازل فرمائی ہیں، ہم سب پر ایمان رکھتے ہیں۔ ان تمام میں آخری کتاب، محکم کتاب، مضبوط کتاب جو تغیر وتبدل سے محفوظ ہے، قرآن کریم ہے۔ قرآن کریم میں جس چیز کا ذکر آجائے، وہ قطعی اور یقینی ہو جاتی ہے۔

میں نے ایک آیت کریمہ پڑھی ہے جس کے دو حصے ہیں۔ پہلا حصہ ہے: اَلْمَالُ وَالْبَنُونَ زِيْنَةُ الْحَيَاةِ الدُّنْيَا۔ مال اور اولاد یہ دنیا کی زینت کا ذریعہ ہیں۔ نیک اولاد ہو، حلال مال ہو، اچھے مقصد میں صرف کیا جائے، عبادت ہی عبادت ہے۔ مال فی نفسہ برا نہیں۔ اگر فی نفسہ مال برا ہو تو اس پر ارکان اسلام موقوف نہ ہوں۔ ارکان اسلام میں ایک رکن ہے زکوٰۃ۔ اسلام کا رکن ہے، مال پر موقوف ہے۔ اگر مال فی نفسہ بری چیز ہوتی تو زکوٰۃ جیسا رکن مال پر موقوف نہ ہوتا۔ اور ان ارکان اسلام میں ایک حج بھی ہے جو مرکب من المال والبدن ہے۔ اگر فی نفسہ مال برا ہو تو اسلام کا رکن اس پر موقوف نہیں ہونا چاہیے۔ یہ باتیں خود واضح کرتی ہیں کہ فی نفسہ مال حلال اللہ کی نعمت ہے۔ اس پر عبادتیں موقوف ہیں۔ یہ تو دو رکن اسلام ہیں۔ فطرانہ وعشر وہ بھی عبادت ہیں، قربانی عبادت ہے۔ مال نہ ہو تو فطرانہ کیسے ادا کرے؟ پیداوار نہ ہو تو عشر کس چیز کا دے گا؟ نصاب نہ ہو تو قربانی کس چیز کی دے گا؟ تو جو لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ اسلام مال کی کلیتاً نفی کرتا ہے، غلط کہتے ہیں۔ حلال مال کمانا، یہ بھی عبادت ہے۔

الترغیب والترہیب حدیث کی کتاب ہے۔ اس میں حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ روایت کرتے ہیں۔ (حضرت عبد اللہ بن مسعود چھٹے نمبر کے مسلمان تھے، ان سے پہلے پانچ مسلمان ہوئے تھے۔ چھٹا نمبر اسلام میں ان کا ہے۔ السابقون الاولون میں ہیں اور دو خوبیاں ان کو اللہ تعالیٰ نے ایسی عطا فرمائی تھیں کہ امت میں اور کسی کو نہیں ملیں۔ ساری امت میں پہلے درجے کے مفسر قرآن اور ساری امت میں افقہ الامۃ، امت میں سب سے بڑے فقیہ۔ یہ دو خوبیاں اللہ تعالیٰ نے ان کو عطا فرمائی تھیں۔) تو حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ روایت کرتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم

نے فرمایا کو جو مسلمان، عقیدہ اس کا صحیح ہو، ہو مسلمان، نماز روزہ کا پابند ہو تو اپنے گھر سے حلال کمائی کے لیے قدم باہر رکھتا ہے، وہ قدم بھی فی سبیل اللہ کی مد میں ہے۔ علم طلب کرنے کے لیے قدم تو فی سبیل اللہ ہے ہی، اللہ کے راستے میں تبلیغ کے لیے قدم فی سبیل اللہ ہے، کفار کے مقابلے میں جہاد کے لیے قدم فی سبیل اللہ ہے، سفر حج کے لیے قدم فی سبیل اللہ ہے اور حلال کمائی کے لیے قدم اپنے گھر سے باہر رکھنا، وہ بھی فی سبیل اللہ کی مد میں ہے۔ ایک قدم کی سات سو نیکیاں۔

تو معلوم ہوا کہ مال فی نفسہ بری شے نہیں ہے۔ اگر فی نفسہ مال برا ہو تو اس پر زکوٰۃ، حج، قربانی، فطرانہ، عشر یہ موقوف نہ ہوں۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: اَلْمَالُ وَالْبَنُونَ زِيْنَةُ الْحَيَاةِ الدُّنْيَا۔ مال اور اولاد یہ دنیا کی زینت کا ایک ذریعہ ہیں۔ بخاری شریف میں روایت آتی ہے کہ حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی والدہ ام سلیم رضی اللہ عنہا نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے ایک موقع پر استدعا کی کہ حضرت! انس خادمکم، یہ انس آپ کے خادم ہیں رضی اللہ تعالیٰ عنہ، ان کے لیے دعا کریں۔ حضرت انس رضی اللہ عنہ کی عمر دس سال کی تھی جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم ہجرت کر کے مدینہ تشریف لائے۔ پورے دس سال آپ کی خدمت کی۔ خادم خاص تھے۔ بیس سال عمر تھی حضرت انس کی کہ آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم دنیا سے رخصت ہوئے۔ صحیح قول کی بنا پر حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی وفات ۹۳ ہجری میں ہوئی تھی۔ گویا اس لحاظ سے ایک سو تین سال ان کی عمر بنتی ہے۔ آخری دو تین سال بڑھاپے کی وجہ سے روزے نہیں رکھ سکے۔ نقاہت اور کمزوری اتنی زیادہ تھی کہ وہ فدیہ دیتے تھے اور روزہ نہیں رکھ سکتے تھے۔ تو حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی والدہ نے آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے کہا کہ حضرت! یہ آپ کے خادم ہیں، ان کے لیے دعا کریں۔ آپ نے دو جملے فرمائے: اللهم اكثر ماله وولده۔ پروردگار! اس کو مال بھی زیادہ دے اور اولاد بھی زیادہ دے۔ اگر مال کوئی بری شے ہوتی تو آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم حضرت انس رضی اللہ عنہ کے لیے یہ دعا نہ کرتے کہ اللهم اكثر ماله و والده۔ فرماتے ہیں کہ مدینہ طیبہ میں جو انصار ہیں، ان میں زیادہ مال دار میں تھا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی دعا کا اثر اور نتیجہ یہ تھا کہ انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا جو کھجوروں کا باغ تھا، سال میں دو دفعہ پھل دیتا، حالانکہ دنیا کی تاریخ میں نظیر موجود نہیں کہ کھجور کا درخت سال میں دو دفعہ پھل دے۔ اور اللہ تعالیٰ کی قدرت اور حکمت کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی دعا کا اثر اور نتیجہ تھا کہ پہلے جو درخت پھل دیتے تھے، اس سے کئی گنا زیادہ پھل دیتے۔ حضرت انس رضی اللہ عنہ کی بڑی بیٹی کا نام تھا قمینہ رحمہا اللہ تعالیٰ۔ تابعیہ تھیں۔ ۷۴ھ میں حضرت انس رضی اللہ عنہ نے فرمایا، بیٹی میں کمزور ہوں، بڑھاپے میں حافظہ بھی نہیں، تم ہی میری اولاد کا حساب کر کے بتاؤ کہ میری اولاد کتنی ہے۔ تو بخاری کی روایت میں آتا ہے، انھوں نے کہا کہ ابا جی، ایک سو بیس کے قریب تو آپ کے بچے فوت ہو گئے ہیں، اور مسلم کی روایت میں ہے کہ سو کے لگ بھگ زندہ چل پھر رہے ہیں۔

تو مال کثیر ہو، ہو حلال، اچھے مصرف میں صرف ہو، نعمت ہے۔ اولاد ہو، نیک ہو، وہ بھی نعمتوں میں سے ایک نعمت ہے۔ تو اللہ تبارک وتعالیٰ کا ارشاد ہے کہ اَلْمَالُ وَالْبَنُونَ زِيْنَةُ الْحَيَاةِ الدُّنْيَا۔ مال اور ولاد دنیا کی زینت کا ذریعہ ہیں، پر ہو نیک۔ یاد رکھنا، ایک مسئلہ نہ بھولنا۔ اگر کوئی شخص خود نمازی ہے اور اولاد اس کی نماز نہیں پڑھتی، تو اگر پنجابی میں جس کو کہتے ہیں "ٹل لگانا"، اس نے ان کے نمازی ہونے پر ٹل نہیں لگایا تو یہ بھی مجرم ہے کیونکہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے دو حکم قرآن کریم میں دیے ہیں۔ يَا أَيُّهَا الَّذِيْنَ آمَنُوا قُوا أَنْفُسَكُمْ وَأَهْلِيْكُمْ نَاراً۔ (التحریم آیت ۶) اے ایمان والو! اپنے آپ کو بھی

بچاؤ اور اہل وعیال کو بھی بچاؤ دوزخ کے عذاب سے۔تو خود دین پہ قائم رہے، ایک ڈیوٹی تو ادا کی۔دوسری ڈیوٹی و اھلیکم بھی تو ہے نا۔ہاں اگر اپنا ٹل لگالے تو پھر انسان کے بس میں نہیں۔خدائی اختیارات خدا کے پاس ہیں، مخلوق کے پاس نہیں۔

ابو البشر حضرت آدم علیہ السلام پیغمبر ہیں۔اپنے بیٹے قابیل پر انتہائی زور صرف کیا، لیکن نہیں مانا۔حضرت نوح علیہ السلام اولو العزم پیغمبروں میں سے ہیں۔اپنا پورا زور اپنے بیٹے سام ملقب بہ کنعان پر صرف کیا، نہیں مانا۔نوح علیہ السلام نے بیوی پر قوت صرف کی ہے، ایمان نہیں لائی۔لوط علیہ السلام نے اپنی بیوی پر پوراز ور صرف کیا ہے، نہیں مانی۔مقلب القلوب صرف پروردگار ہے۔پیغمبر ہادی ہیں، لیکن کس معنی میں؟ رہنمائی کرنے میں، راستہ حق کا بتانے میں۔دلوں میں تصرف کرنا صرف خدا کا کام ہے۔آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنا چچا عبد مناف کے بارے میں بڑی کوشش کی تھی۔اللہ تبارک وتعالیٰ نے قرآن کریم میں حکم نازل فرمایا: إِنَّكَ لَا تَهْدِىْ مَنْ أَحْبَبْتَ وَلَكِنَّ اللّٰهَ يَهْدِىْ مَن يَشَاءُ (القصص ۵۶)۔بے شک تو ہدایت نہیں دے سکتا جس کے ساتھ تیری محبت ہے۔ہدایت دینا رب کا کام ہے۔پیش کرنا پیغمبر کا کام ہے، ہدایت دینا رب کا کام ہے۔تو باپ کا بھی فرض ہے کہ اپنا پورا زور صرف کرے۔زور صرف کرنے کے بعد بھی کوئی نہیں مانتا تو لا یکلف الله نفسا الا وسعها۔

تو مال اور اولاد یہ دنیا کی زینت کا ذریعہ ہیں۔وَالْبٰقِيٰتُ الصّٰلِحَاتُ خَيْرٌ عِندَ رَبِّكَ ثَوَابًا وَّخَيْرٌ أَمَلًا۔ باقی رہنے والی چیزیں وہ تیرے رب کے ہاں بدلے کے لحاظ سے بھی بہتر ہیں اور امید کے لحاظ سے بھی بہتر ہیں۔باقیات صالحات میں کیا چیزیں شامل ہیں؟ تفسیروں میں بڑا کچھ ذکر ہے۔ایک تفسیر یہ ہے کہ باقیات صالحات میں نیک اولاد بھی ہے۔ان کی اولاد، ان کی اولاد، اولاد در اولاد تو باقیات صالحات میں سب داخل ہیں۔ایک تفسیر یہ ہے کہ باقیات صالحات میں دینی مدرسے، مسجدیں، یتیم خانے، جہاں پانی کی ضرورت ہے، وہاں پانی کا انتظام، جہاں سڑکیں خراب ہوں، وہاں سڑکیں بنا دینا، رفاہ عام کے کام جن سے لوگ فائدہ اٹھاتے ہیں، یہ ''باقیات صالحات'' ہیں۔جب تک وہ چیزیں رہیں گی، اس کو ثواب ملتا رہے گا۔حدیث میں آتا ہے کہ ''باقیات صالحات'' میں سبحان الله والحمد لله ولا اله الا الله والله اکبر ولا حول ولا قوة الا بالله العلی العظیم بھی ہے۔بعض سطحی ذہن کے لوگوں نے اعتراض کیا ہے کہ یہ کلمات سبحان اللہ جو پڑھے تو ختم ہو گئے۔یہ کہاں باقی رہے؟ الحمد للہ کہا تو ختم ہو گیا۔یاد رکھنا آپ ایک دفعہ سبحان اللہ کہیں گے تو دس نیکیاں بھی ملیں گی، ایک درجہ بلند ہوگا، ایک گناہ صغیرہ خود بخود مٹ جائے گا۔اسی طرح الحمد للہ اور اللہ اکبر کا سمجھ لیں۔تو وہ سطحی ذہن کے لوگ یہ کہتے ہیں کہ سبحان اللہ کہا، زبان سے ادا کیا تو وہ فضا میں اڑ گیا تو باقیات صالحات میں یہ کیسے ہوئے؟ مسجد تو سمجھ میں آسکتی ہے کہ باقیات صالحات میں ہے، مدرسہ سمجھ میں آسکتا ہے کہ باقیات صالحات میں ہے، نلکا، کنواں، سڑک یہ تو باقیات صالحات میں آسکتے ہیں۔اولاد در اولاد ان کا وجود ہے، وہ تو باقیات صالحات میں سمجھ آسکتے ہیں۔یہ کلمات سبحان الله والحمد لله ولا اله الا الله والله اکبر یہ کیسے باقیات صالحات ہیں؟

تو بات سمجھنا۔معراج کی رات آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی پیغمبروں سے ملاقات ہوئی۔میں اس وقت معراج کا مسئلہ نہیں بیان کرتا۔صرف یہ عرض کرتا ہوں کہ معراج آپ کو جسم مبارک کے ساتھ ہوئی، بیداری میں ہوئی، ایک رات میں ہوئی۔اس میں شک وشبہ کی کوئی گنجائش نہیں۔خواب کا قصہ نہیں، کشف نہیں، الہام نہیں۔تو معراج کی رات حضرت ابراہیم

علیہ السلام سے ملاقات بھی ہوئی۔شرح فقہ اکبر وغیرہ علم عقائد کی کتابوں میں لکھا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی ساری مخلوق میں پہلا درجہ ہے حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا، دوسرا نمبر ہے حضرت ابراہیم علیہ الصلاۃ والسلام کا، تیسرا نمبر ہے حضرت موسیٰ علیہ السلام کا۔تو حضرت ابراہیم علیہ الصلاۃ والسلام کی بڑی شخصیت ہے۔معراج کی رات آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے حضرت ابراہیم علیہ السلام کی ملاقات ہوئی تو انھوں نے دو پیغام دیے۔فرمایا، ایک پیغام میری طرف سے اپنی امت کو یہ دینا کہ ابراہیم علیہ السلام تمہیں سلام کہتے ہیں۔علیہ وعلیٰ نبینا وعلیٰ جمیع الانبیاء الصلوات والتسلیمات۔اللہ تعالیٰ کی مخلوق میں دوسرے نمبر کی شخصیت، اللہ تعالیٰ کی مخلوق میں پہلے نمبر کی شخصیت کے ذریعے سلام کہلواتی ہے۔معمولی بات نہیں ہے، بڑی بات ہے۔تو ایک پیغام میرا یہ دے دینا کہ ابراہیم علیہ السلام تمہیں سلام کہتے ہیں۔وعلیکم السلام۔اور دوسرا پیغام میرا یہ دے دینا کہ جنت کی زمین بڑی زرخیز ہے، لیکن ہے چٹیل۔اپنے لیے وہاں سے درخت اور باغات لے کر آنا۔ایک دفعہ کہیں گے سبحان اللہ تو دس نیکیاں بھی ملیں گی، ایک درجہ آپ کا نیکیوں میں بلند ہوگا اور ایک صغیرہ گناہ جھڑ جائے گا اور جنت میں ایک درخت لگ جائے گا۔ایک دفعہ الحمد لله کہے گا تو دس نیکیاں بھی ملیں گی، ایک درجہ بلند ہوگا، ایک صغیرہ گناہ جھڑ جائے گا اور جنت میں ایک درخت لگ جائے گا۔ایک دفعہ کہے لا اله الا الله تو دس نیکیاں بھی ملیں گی، ایک درجہ بھی بلند ہوگا، ایک گناہ بھی جھڑ جائے گا اور جنت میں درخت لگ جائے گا۔ایک دفعہ کہے الله اکبر، نیکیاں بھی دس ملیں گی، درجہ بھی بلند ہوگا، گناہ بھی صغیرہ جھڑ جائے گا اور جنت میں درخت بھی لگ جائے گا۔

تو یہاں اگرچہ یہ چیزیں بظاہر باقی نہیں رہتیں، لیکن سبحان اللہ کا نتیجہ جنت کے درختوں کی شکل میں باقی ہے۔باقیات صالحات میں ہی ہے۔اب تو ہمیں یہی نظر آتا ہے کہ سبحان الله کہا، زبان سے الفاظ ختم ہوئے اور فضا میں اڑ گئے، لیکن نہیں، یہ باقی ہیں۔یہ صحیح حدیث میں ہے جو ترمذی شریف میں عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے مروی ہے۔امام ترمذی رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: حدیث حسن صحیح۔اور ایک روایت مجمع الزوائد میں حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے آتی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے فرمایا کہ سبحان اللہ کہو گے تو جنت میں ایک پودا لگ جائے گا۔الحمد للہ کہو گے، پودا لگ جائے گا۔لا الہ الا اللہ کہو گے، ایک درخت لگ جائے گا۔اللہ اکبر کہو گے، درخت لگ جائے گا۔علامہ ہیثمی رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ: رجال موثقون۔سارے کے سارے ثقہ راوی ہیں۔تو اب اگرچہ ہمیں یہ الفاظ پڑھنے کے بعد نظر نہیں آتے لیکن ان کا نتیجہ باقی ہے۔تو باقیات صالحات میں یہ ساری چیزیں ہیں۔

اسی مناسبت سے ایک بات اور عرض کروں گا۔آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جوں جوں قیامت قریب آئے گی، فتنے زیادہ ہوں گے۔جو نیا سال آئے گا، اس میں کوئی نہ کوئی بدعت نئی گھڑلی جائے گی۔کراچی میں ایک نیا فرقہ پیدا ہوا ہے، اس کا یہ دعویٰ ہے کہ کوئی کسی کو ثواب پہنچائے، نہیں پہنچتا۔صدقہ وخیرات کرے، وہ اس کو ثواب نہیں پہنچتا اور اس پر انھوں نے دھڑا دھڑ رسالے لکھے ہیں۔یہ ان کی نادانی ہے۔قرآن کریم کی ایک آیت سے وہ دھوکہ کھاتے ہیں اور دیتے ہیں۔قرآن کریم میں آتا ہے: وَأَن لَّيْسَ لِلْإِنسَانِ إِلَّا مَا سَعَىٰ (النجم آیت ۳۹)۔یہ کہ انسان کے لیے نہیں مگر وہی کچھ جو انسان نے کوشش کی۔یہ ان کی دلیل ہے کہ انسان کو وہی کچھ ملے گا جو انسان نے کوشش کی۔تو اپنی کوشش ہی ملے گی، دوسرے کا ایصال ثواب ودعا کیا ملے گا؟ بہت مغالطے کا شکار ہیں۔میں تفصیل میں نہیں جانا چاہتا۔صرف دو باتیں عرض کرتا ہوں۔

عرض یہ ہے کہ اگر دعا دوسروں کی نہ پہنچتی تو قرآن کریم سے محکم کتاب تو کوئی بھی نہیں۔ حضرت نوح علیہ الصلوۃ والسلام کی دعا ہے، پروردگار، مجھے بھی بخش دے، وللمومنین۔ اور مومنین ومومنات کو بھی۔ اگر مومنین کو دعا نہیں پہنچی تو یہ مہمل کام خدا کے پیغمبر نے کیوں کیا؟ ابراہیم علیہ السلام کہتے ہیں: رَبَّنَا اغْفِرْ لِیْ وَلِوَالِدَیَّ وَلِلْمُؤْمِنِیْنَ یَوْمَ یَقُوْمُ الْحِسَابُ (ابراہیم آیت ۴۱)۔ اگر مومنوں کو دعا نہیں پہنچتی تو قرآن کریم میں معاذ اللہ ایسی مہمل دعاؤں کا کیا مقام؟ قرآن کریم میں مومنوں کی دعاؤں میں ذکر ہے: رَبَّنَا اغْفِرْ لَنَا وَلِإِخْوَانِنَا الَّذِیْنَ سَبَقُوْنَا بِالْإِیْمَانِ۔ (الحشر آیت ۱۰) پڑھتے ہو یا نہیں؟ اے رب ہمیں بھی بخش دے اور مومنین کو بھی جو ہم سے پہلے ایمان لائے۔ اگر دعائیں نہیں پہنچتیں تو قرآن کریم میں معاذ اللہ یہ مہمل اور بے کار طریقہ کیوں بتایا اور اگر دوسرے کی دعا نہیں پہنچتی تو جنازہ کیوں ہے؟ جنازہ میں بھی تو دوسرے کے لیے اللھم اغفر لحینا ومیتنا وشاھدنا وغائبنا پڑھا جاتا ہے۔ پھر تو جنازہ بھی چھوڑ دو، یہ بھی دوسرا دعا کرتا ہے۔ جو بات میں کہنا چاہتا ہوں، وہ یاد رکھنا۔ وان لیس للانسان الا ما سعی، ان کی دلیل نہیں، ہماری دلیل ہے۔ وہ غلطی سے اس کو اپنی دلیل سمجھتے ہیں۔ کیوں؟ ظاہری لفظ یہ ہے کہ انسان کے لیے وہی کچھ ہوگا جو اس نے کوشش کی۔ دیکھیے، انسان شادی کرتا ہے۔ شادی کے بعد اولاد پیدا ہوتی ہے، اولاد کی تربیت کرتا ہے۔ ان کو نماز روزہ دین کی باتیں سکھلاتا ہے۔ اب اگر باپ مر گیا اور اولاد اس کے لیے دعا کرتی ہے تو اس کی محنت کا نتیجہ ہی تو ہے۔ استاد نے شاگردوں کو پڑھایا، وہ مستفیض ہوئے۔ استاد مر گیا، انھوں نے اپنے استاد کے لیے مغفرت کی دعا کی تو استاد کی سعی کا نتیجہ ہی تو ہے نا۔ اچھے اخلاق سے برتاؤ کیا، لوگوں کے ساتھ رواداری کی، ہم دردی کی، خیر خواہی کی، دوست پیدا ہوئے، احباب پیدا ہوئے۔ جب یہ فوت ہوا، انھوں نے کہا کہ پروردگار، ہمارے ساتھی کو معاف کر دے تو اس کی اپنی اس کوشش کا نتیجہ ہی تو ہے۔ اسے ضرور ملنا چاہیے۔

أَنْ لَّیْسَ لِلْإِنْسَانِ إِلَّا مَا سَعَی یہ ان کی دلیل نہیں، ہماری دلیل ہے۔ انسان کو اس کی کوشش کا نتیجہ ضرور ملنا چاہیے۔ اولاد پر محنت اس نے کی۔ اب مرنے کے بعد وہ کہتے ہیں کہ اے پروردگار، ہمارے ابو کو بخش دے، ماں کو بخش دے تو یہ اس کا نتیجہ ہے۔ شاگرد استاد کے لیے دعا کرتے ہیں تو یہ اس کی محنت کا نتیجہ ہے۔ احباب دوست اس کے حسن اخلاق کی وجہ سے دعا کرتے ہیں تو اس کی محنت کا نتیجہ ہے تو اس کو اس کی محنت کا نتیجہ ضرور ملنا چاہیے۔ یہ لوگ غلط فہمی کا شکار ہیں۔ لیکن یاد رکھنا! ایام کی تعیین، وقت کی تعیین ایسی کوئی شے نہ ہو۔ جس وقت آپ چاہیں، بخشیں۔ ایک حدیث میں آتا ہے جو حدیث کی کتابوں میں بھی ہے اور الادب المفرد للبخاری میں بھی ہے کہ آدمی جب فوت ہو جاتا ہے تو کچھ دن وہ نچلی منزلوں میں ہوتا ہے، اللہ تعالیٰ کچھ دنوں کے بعد اس کو اوپر کی منزلیں دے دیتے ہیں۔ وہ کہتا ہے، پروردگار، میں جب آیا تھا تھرڈ کلاس میں تھا، اب میں انٹر میں اور سیکنڈ میں چلا گیا، اس کی وجہ؟ رب تعالیٰ فرماتے ہیں، تیری اولاد اور تیرے احباب کی دعاؤں کا نتیجہ یہ تجھے ملا ہے۔

الْمَالُ وَالْبَنُوْنَ زِیْنَةُ الْحَیَاةِ الدُّنْیَا ۔ مال اور اولاد دنیا کی زینت کا ذریعہ ہیں۔ وَالْبٰقِیٰتُ الصّٰلِحٰتُ خَیْرٌ عِنْدَ رَبِّکَ ثَوَاباً۔ باقی رہنے والی چیزیں تیرے رب کے ہاں بہتر ہیں بدلے کے لحاظ سے۔ وَخَیْرٌ أَمَلاً، اور بہتر ہے کہ امید رکھی جائے۔

اللہ تعالیٰ مجبور نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ کی رحمت بڑی وسیع ہے۔ اپنے فضل وکرم سے ہمیں اس نیکی کا صلہ ضرور دے گا۔ اللہ تعالیٰ سب کو سمجھنے کی عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔

ترتیب: مولانا حافظ محمد یوسف

حفظ قرآن اور دورۂ حدیث مکمل کرنے والے طلبہ سے امام اہل سنتؒ کا

ایک ایمان افروز تربیتی خطاب

[بمقام مدرسہ نصرۃ العلوم گوجرانوالہ]

نحمدہ ونصلی علیٰ رسولہ الکریم۔ اما بعد فاعوذ باللہ من الشیطان الرجیم بسم اللہ الرحمن الرحیم۔ ان اللہ یامرکم ان تؤدوا الامنت الی اھلھا۔

جن عزیزوں نے اللہ تعالیٰ کی توفیق سے حدیث شریف کے دورے میں کامیابی حاصل کی ہے اور تجوید میں کامیابی حاصل کی ہے اور جن برخورداروں نے قرآن کریم یاد کیا ہے، سب کو مبارک ہو۔ اللہ تعالیٰ کا انعام اور احسان ہے کہ جو چیز اللہ تعالیٰ کے نزدیک سب سے زیادہ محبوب ہے یعنی دین، اس کا علم حاصل کرنے کی آپ کو توفیق عطا فرمائی ہے۔ دین کی بنیاد ہے قرآن کریم اور اس کی تشریح اور تفصیل احادیث، فقہ اسلامی اور دیگر علوم میں ہے۔ قرآن پاک کا صحیح الفاظ کے ساتھ پڑھنا بھی اس کی توفیق ہے اور بہت بڑا انعام ہے۔ اس انعام کے مقابلے میں دنیا ومافیہا کی کوئی شے حقیقت نہیں رکھتی، لیکن اس سلسلے میں آپ پر بھی کچھ ذمہ داریاں ہیں۔ جو حضرات دورۂ حدیث شریف سے فارغ ہوئے ہیں، وہ اچھی طرح سنیں کہ آج تک آپ کی ذمہ داری آپ پر نہ تھی، مدرسے پر تھی۔ اب آئندہ آپ نے اس ذمہ داری کو خود نبھانا ہے اور جو امانت اساتذہ نے آپ کے سپرد کی ہے، اس کو کما حقہ آگے پہنچانے کی کوشش کرنی ہے۔

یہ خیال نہ کریں کہ آپ کو بنا بنایا مدرسہ مل جائے گا۔ ایسے بھی ہو سکتے ہیں کہ انھیں کسی مدرسے میں مدرس کی حیثیت سے کام کرنا ہوگا۔ ایسے بھی ہوں گے جن کو خود دینی مدرسہ قائم کرنا پڑے گا اور اس کے لیے بڑی محنت مشقت کی ضرورت ہے۔ بغیر محنت مشقت کے کچھ نہیں ہوتا۔ آپ نے جو پڑھا ہے، اس کے بارے میں یہ ہرگز خیال نہ کریں کہ جاتے ہی ہمارے سامنے بڑی بڑی جماعتیں بیٹھی ہوں۔ آپ کو پڑھانے کے لیے تھوڑے سے افراد بھی مل جائیں تو اس کو غنیمت سمجھیں۔ ہمارے اکابر کا جو طریقہ تھا، آپ نے پڑھا اور سنا ہوگا۔ سب سے پہلے جو دیوبند میں مدرسہ قائم ہوا چھتے والی مسجد میں، انار کے درخت کے نیچے، پڑھانے والے استاذ کا نام بھی محمود تھا اور پڑھنے والے شاگرد کا نام بھی محمود حسن تھا جو بعد میں شیخ الہندؒ قرار پائے۔ ایک استاذ ہے، ایک ہی شاگرد ہے۔ اگر وہ استاذ یہ خیال کرتے کہ میرے سامنے اچھی خاصی جماعت ہو، پھر میں کام کروں گا تو پھر تو کام کا آغاز ہی نہ ہوتا۔ اس لیے آپ تلامذہ کی قلت وکثرت کے چکر میں نہ پڑیں کہ زیادہ ہوں تو پڑھائے اور کم ہوں تو نہ پڑھائے۔ آپ یہ سمجھیں کہ ہمارا کام پڑھانا ہے۔

ہمارے استاذ محترم حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی مرادآباد جیل میں قید ہوگئے تو قاری محمد طیب صاحب، جو اس وقت دارالعلوم دیوبند کے مہتمم تھے، ان سے ملاقات کے لیے گئے۔ انھوں نے پوچھا کہ حضرت! آپ کا کیا مشغلہ ہے تو فرمایا کہ میں تعلیم الاسلام پڑھاتا ہوں۔ قاری محمد طیب صاحب نے دل لگی کے طور پر، ظرافت کے طور پر کہا کہ حضرت، خوب ترقی کی ہے کہ بخاری شریف اور ترمذی شریف پڑھانے کے بعد اب تعلیم الاسلام پڑھاتے ہیں۔ حضرت مدنی کا جواب یہ تھا کہ وہاں بخاری شریف اور ترمذی شریف پڑھنے والے تھے، یہاں تو قیدی ہیں، ان کو تعلیم الاسلام پڑھاتا ہوں۔ کام جو پڑھانا ہوا۔ تو پڑھانا آپ کا کام ہے۔ جس معیار پر، جس درجے کا طالب علم ملے، اس کو پڑھائیں۔ ابتدا میں یہ کوشش نہ کریں کہ ہمیں بڑی کتابیں ملیں۔ چھوٹی کتابیں بھی پڑھانے کا موقع ملے تو اس سے ہی آغاز کریں۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ پڑھنے پڑھانے کو نہ چھوڑیں اور اس کو اپنا مقصود بنائے رکھیں۔ یہ آپ کے سروں پر بھاری ذمہ داری ڈال دی گئی ہے۔ اس کو بھولنا نہیں۔ پڑھنا پڑھانا آپ کا شغل ہو۔ چھوٹی کتابیں ہوں، تھوڑے طالب علم ہوں، پس ماندہ علاقہ ہو، غریب علاقہ ہو، آپ ان چیزوں کو خاطر میں نہ لائیں۔ بس یہ سمجھیں کہ ہم نے پڑھانا ہے، خواہ تکلیفیں ہوں۔ ہر ایک کو ہر قسم کی سہولت ہر جگہ میسر نہیں ہوتی۔

دوسری بات یہ ہے کہ اپنے اکابر علماے دیوبند کثر اللہ تعالیٰ جماعتہم کا دامن نہ چھوڑنا۔ حقیقت یہ ہے کہ جس طرح دین کو ان حضرات نے سمجھا اور سمجھایا اور عمل کیا اور عملی زندگی کا نمونہ بن گئے، یقین جانیے اس وقت پوری دنیا میں اس کی نظیر نہیں ملتی۔ بے شک مصر میں جامعۃ الازہر آپ کو زبان سکھلائے، اسی طرح مدینہ یونی ورسٹی میں زبان اور جدید عربی آپ کو آجائے اور دیگر مدارس میں یہی قصہ ہے، لیکن دین کا یہ عمق اور گہرائی آپ کو ان شاء اللہ العزیز کہیں بھی نہیں ملے گی۔ ملے گی تو ان حضرات کے فیض یافتہ لوگوں سے جو حضرت شاہ ولی اللہؒ، ان کے تلامذہ، ان کے تلامذہ اور آگے ان کے شاگردوں کے ذریعے پاکستان، ہندوستان، بنگلہ دیش، افغانستان وغیرہ وغیرہ ملکوں میں ہیں۔ علم کی گہرائی آپ کو انھی کے پاس ملے گی۔ کبھی اپنی ذاتی رائے کو ذہن میں نہ جگہ دیں۔ اسی طرح کبھی اپنے اکابر سے ہٹ کر، کٹ کر جو شخص بظاہر کتنی ہی معقول باتیں کرے، معقول نہیں، دھوکہ ہے، فریب ہے۔ اپنے اکابر کے دامن کو ہر مسئلہ میں ان کی طرف رجوع کرنا، ان کی زندگی دیکھنا۔

تیسری بات یہ کہ بے شک مالی طور پر آپ کو پریشانیاں پیش آئیں گی، لیکن آپ نے یہ نہیں دیکھنا کہ فلاں مدرسے میں مجھے زیادہ تنخواہ ملتی ہے، فلاں میں کم ملتی ہے۔ زیادہ تنخواہ کی وجہ سے آپ ادھر مائل ہو جائیں، اس بات کو ذہن میں بھی نہ آنے دیں۔ یہ سوچنا ہے کہ جہاں کے لوگوں کو علم کی زیادہ ضرورت ہو، گو آپ تکلیف میں ہوں، اس جگہ کو ترجیح دینا۔ اگر آپ آسودگی کے درپے ہوں گے تو بہت سی مشکلات پیش آئیں گی۔ اسی طرح حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ نے فتاویٰ رشیدیہ میں لکھا ہے کہ یہ جو دینی مدارس ہیں، ان میں جو قواعد وضوابط ہوتے ہیں، چونکہ علما نے مرتب کیے ہوتے ہیں تو مدرسے کے ان قواعد وضوابط کی پابندی مدرس پر واجب ہے۔ جس وقت حاضری ہے، اس وقت حاضر ہوں۔ جو چھٹی کا وقت ہے، چھٹی ہو۔ اگر کہیں جانا ہو تو درخواست کے بغیر نہ جائیں۔ آزاد خیالی نہ کریں کہ جب چاہے اٹھے کھڑے ہوئے، جب چاہے بیٹھ گئے۔

حضرت مولانا محمد زکریا صاحب سہارنپوریؒ کا یہ معمول تھا کہ اگر سبق کے درمیان میں کوئی شخص آجاتا اور اس کا تعلق سبق سے نہ ہوتا اور وہ کوئی بات پوچھتا تو حضرت گھڑی پر وقت دیکھتے اور اتنا وقت نوٹ کر لیتے۔ جب مہینہ گزرتا تو اتنے وقت کی تنخواہ کٹوا دیتے تھے کہ یہ وقت تعلیم کے دور میں خرچ نہیں ہوا۔ میں خود ذاتی طور پر کئی سال پریشان رہا، اس لحاظ سے کہ تعویذ

اور دم والے بھی دور دراز سے آجاتے ہیں، مرد بھی اور بیبیاں بھی۔ اگر دور سے آئے ہوں تو ان سے یہ کہنا کہ اس وقت ٹائم نہیں، چلے جاؤ تو اس کا برا اثر ہوگا۔ تو میں ان کو سبق کے درمیان تعویذ بنا دیتا اور دم کر دیتا۔ میں نے سوچا کہ اس سلسلے میں کیا کروں؟ تو ہمیں مدرسے کی طرف سے سالانہ پچیس چھٹیوں کی اجازت تھی۔ الحمد للہ میں نے حتی الوسع وہ پچیس چھٹیاں نہیں کیں۔ ایسے سال بھی گزرے ہیں کہ دو دو تین تین چار چار سال تک پورے سال میں ایک بھی چھٹی نہیں کی۔ وہ جو پچیس چھٹیاں ہماری مدرسے کی طرف سے تھیں، جو لوگ درمیان میں آجاتے تھے، ان کے وقت کی کمی کو پورا کرنے کے لیے میں سالانہ پچیس چھٹیاں نہیں کرتا تھا اور الحمد للہ میرا پلہ پھر بھی بھاری ہے۔ سبق کے دوران کسی سے گپ مارنا، غیر ضروری بات کرنا درست نہیں۔ ان چیزوں کو ملحوظ رکھیں۔

حق تعالیٰ نے ہر طرح کی مخلوق پیدا کی ہے۔ ہر ایک کا ذہن ایک طرف ہے بلکہ ممکن ہے دوسرے اساتذہ کے ذہن کچھ اور ہوں۔ ہوں صحیح العقیدہ، لیکن ذہن میں تفاوت ہو۔ مہتمم صاحب سے ذہن نہ ملتا ہو، وہاں کے جو اراکین اور معاونین ہیں، ان سے ذہن نہ ملتا ہو۔ ان سلسلوں کو ملحوظ رکھنا۔ بدمزگی پیدا نہ ہو۔ سوچ سمجھ کر اگر کوئی معقول وجہ ہے تو ان کو بتائے کہ یہ بات ہے۔ میرے خیال میں معقول قسم کے اراکین ومعاونین کبھی اس میں قیل قال نہیں کریں گے، لیکن اپنی رائے کو دخل نہ دیں کہ میں یوں کروں گا، وہ کروں گا۔ ایسا سبق لے کر یہاں سے نہ جائیں۔

ادب کے ساتھ احترام کے ساتھ ایک دوسرے کی قدر کریں اور اپنے دیگر اساتذہ کی بھی۔ تلامذہ کے ساتھ نہایت نرمی سے پیش آئیں۔ آپ یہ سمجھیں کہ یہ ہماری نسبی اولاد ہے۔ جیسے ان کی بعض غلطیوں پر درگزر کرتے ہیں، ان کی غلطیوں سے بھی درگزر کریں۔ ہاں جو قابل گرفت ہے، اس میں اصلاح آپ کا فریضہ ہے۔ بعض دفعہ نرمی سے، بعض دفعہ گرمی سے اس کی اصلاح کریں لیکن ان کو اپنے بیٹے سمجھیں، اپنی اولاد سمجھیں۔ اس دور میں دین حاصل کرنے کے لیے دور دراز سے آئے ہیں تو اپنے ادارے کے ساتھ جہاں بھی ہوں اراکین جہاں بھی ہوں، ان کے ساتھ نہایت ہی سلوک سے رہیں۔ ایسا نہ ہو کہ وہ یہ کہیں کہ آپ یہ پڑھ کر آئے ہیں؟ یہ سبق ہمارا نہیں اور نہ یہ سبق مولوی کی شان کے لائق ہے۔ کوئی چیز مزاج کے خلاف ہوگی، طبیعت کے خلاف ہوگی، اس لیے سب چیزوں کو برداشت کرنا۔ آپس میں الفت محبت کے ساتھ رہنا۔

جو سبق پڑھانا ہو، بغیر مطالعہ کے ہرگز نہ پڑھائیں۔ میرے خیال میں چالیس سے زیادہ مرتبہ میں نے بخاری شریف پڑھائی ہے، لیکن آخری سبق تک میں نے بغیر مطالعہ کے نہیں پڑھائی۔ سبق بغیر مطالعہ کے نہ پڑھائیں۔ اس کے حواشی دیکھیں، شروح دیکھیں، طالب علموں کو اچھی طرح مطمئن کریں۔ یہ آپ کی ذمہ داری ہے۔ پھر سب سے بڑی بات یہ ہے کہ نماز کی پابندی کریں۔ جماعت کی پابندی کریں۔ آپ خود اگر نماز باجماعت کی پابندی نہیں کریں گے تو یقین جانیے آپ کے شاگردوں پر آپ کا کوئی اثر نہیں ہوگا۔

باقی جو قرا حضرات ہیں، وہ بھی سن لیں۔ بچے قراءت پڑھتے ہیں۔ کمزوری ہوتی ہے تو انھیں بے تحاشا پیٹتے ہیں۔ یہ بھی غلط ہے۔ اگر آپ نے سزا دینی ہے تو ایسا کریں کہ ان کو تھوڑی دیر کے لیے کھڑا کر دیں۔ ایسا نہ کہ بے چارے کو مار مار کر لہولہان کر دیں۔ ماں بھی دوڑتی ہوئی آئے، باپ بھی دوڑتا ہوا آئے کہ میں نے آپ کو بکرا ذبح کرنے کے لیے تو نہیں دیا تھا، پڑھنے کے لیے دیا تھا۔ میری باتیں نوٹ کرنا۔ زیادہ سختی کرنی ہو تو ان کو کھڑا کر دینا۔

جن بچوں نے قرآن کریم حفظ کیا ہے، ان سے گزارش ہے کہ بیٹو، قرآن پاک کا یاد کرنا بھی مشکل ہے۔ اگر آسان ہوتا تو ہر مسلمان مرد وعورت قرآن کے حافظ ہوتے ، لیکن اس کو آخر دم تک محفوظ رکھنا بہت مشکل ہے۔ بیٹو! قرآن کریم کو بھول نہ جانا۔ ابوداؤد شریف کی روایت ہے اور مسند احمد میں اور حدیث کی دوسری کتابوں میں بھی ہے کہ جس نے قرآن کریم کو یاد کیا اور پھر بھول گیا تو قیامت کے دون اس کو کوڑھی کر کے اٹھایا جائے گا، ہاتھ پاؤں گرے ہوئے ہوں گے۔ بیٹو! ایسا نہ ہو کہ قیامت کے دن آپ کوڑھی اٹھیں۔ اللہ کے فضل وکرم سے اچھی شکلیں صورتیں اور اعضا نصیب فرمائے ہیں۔

اور بیٹو! قرآن کریم کے بارے میں آتا ہے کہ حجة لك او عليك۔ یا تو تیرے حق میں گواہی دے گا یا تیرے خلاف گواہی دے گا۔ حدیث شریف میں آتا ہے کہ قرآن پاک کی زبان بھی ہوگی۔ جیسے اس وقت میں بولتا ہوں، آپ سمجھتے ہیں، اسی طرح قرآن بولے گا۔ اگر کسی نے قران پاک کو عمل میں لایا ہے تو قرآن کریم کہے گا کہ پروردگار، اگر اس سے غلطی ہوئی ہے تو درگزر فرما۔ میں سفارش کرتا ہوں۔ روزہ بھی سفارش کرے گا، اور قرآن کریم بھی اور حق تعالیٰ اس کی سفارش کو قبول فرمائے گا۔ اور اگر کسی نے قرآن کے خلاف زندگی بسر کی تو حجة عليك، یہ اس کے خلاف گواہی دے گا کہ اے پروردگار، یہ پڑھتا یوں تھا اور کرتا یوں تھا۔ امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ نے احیاء العلوم میں حضرت انس رضی اللہ کا موقوف اثر نقل کیا ہے۔ حضرت انس فرماتے ہیں کہ رب تال للقرآن والقرآن يلعنه ۔ بہت سے ایسے ہیں کہ قرآن پڑھتے ہیں اور قرآن ان پر لعنت بھیجتا ہے۔ مثلاً پڑھنے والا پڑھتا ہے: اقيموا الصلوة اور نماز کی پابندی نہیں کرتا۔ یہ آیت بزبان حال کہے گی کہ ملعون! پڑھتا کیا ہے اور کرتا کیا ہے؟ جب پڑھے گا، آتوا الزكوة اور اس پر زکوۃ آتی ہے لیکن نہیں دیتا تو یہ آیت بزبان حال اس پر لعنت بھیجے گی کہ آتوا الزكوة پڑھتے ہو لیکن زکوۃ دیتے نہیں۔ جب یہ پڑھے گا کہ لعنت الله على الكاذبين اور خود جھوٹ بولتا ہے تو یہ آیت لعنت بھیجے گی کہ اے ملعون، پڑھتا ہے لعنت الله على الكاذبين اور خود جھوٹ میں ڈوبا ہوا ہے۔ ایسے ہی پڑھتا ہے لا تقربوا الزنى ، زنا کے قریب نہ جاؤ اور خود اس میں آلودہ ہے تو یہی آیت بزبان حال اس پر لعنت کرے گی۔ اسی طرح جب پڑھے گا لا تقربوا مال اليتيم ، یتیم کے مال کے قریب نہ جاؤ اور خود یتیم کا مال کھا جاتا ہے تو بھی لعنت کا مستحق ہوگا۔

ایک بات اچھی طرح سمجھنا اور بھولنا نہیں۔ عام لوگوں میں جب کوئی فوت ہو جاتا ہے تو اس کا تیجا بھی ہوتا ہے، ساتواں بھی ہوتا ہے، دسواں بھی ہوتا ہے اور چالیسواں بھی ہوتا ہے۔ ایسے بھی مرنے والے ہوتے ہیں جن کی اولاد میں نابالغ بچے ہوتے ہیں۔ اب لوگ یہ کرتے ہیں کہ ابھی شرعی طور پر مال تقسیم نہیں کیا ہوتا اور مرنے والے کے متروکہ مال سے تیجا بھی کر دیتے ہیں، ساتواں بھی، دسواں بھی اور چالیسواں بھی کر دیتے ہیں اور حفاظ اور قرا کو بلا کر ان سے قرآن کریم پڑھواتے ہیں۔ ان دنوں کی تعیین کے ساتھ ایسے موقع پر قرآن پڑھ کر کچھ لینا اور کھانا حرام ہے اور پھر اس طرح مشترکہ کھاتے سے صدقہ خیرات کرنا بالاتفاق حرام ہے، اس میں کسی کا کوئی اختلاف نہیں۔ کوئی شخص مال تقسیم ہونے کے بعد اپنے مال سے، جس کا وہ مالک ہے، صدقہ خیرات کرے بغیر ایام کی تعیین کے تو وہ جائز ہے۔ مشترکہ کھاتے سے صدقہ خیرات سے بچو۔

اگر کسی نے مکان بنایا ہے اور وہ مکان کی خوشی میں حفاظ اور قرا کو لے جائے تو کھائیں اور اتنا کھائیں کہ ہفتہ بھر کے لیے پیٹ بھر جائے۔ اگر کوئی بیمار ہے، اس کی صحت کے لیے پڑھنا ہے تو پھر کھا سکتے ہیں کہ یہ خوشی کا مقام ہے۔ لیکن ایصال ثواب

کے لیے کوئی قرآن پڑھائے تو اس پر کوئی شے کھانا حرام ہے اور خاص طور پر مشترکہ کھاتے سے ہوگا تو حرام ہوگا۔ نابالغ کی اجازت شرعاً معتبر نہیں۔ اسی طرح غیر حاضر وارث ہو تو اس کی غیر موجودگی میں مشترکہ کھاتے سے صدقہ کرنا حرام ہے۔ عام لوگ شکوہ کرتے ہیں کہ مولوی صاحب، آپ بڑے سخت مسئلے بیان کرتے ہیں۔ وہ باہر سے لوگ آئے ہیں، وہ کہاں سے کھائیں؟ دور دراز سے بھی رشتہ دار آتے ہیں۔ اس کی صورت عموماً یہ ہوتی ہے کہ ایک دن دو دن تین دن میت کے گھر میں کھانا نہیں پکتا۔ اس کے عزیز رشتے دار، پڑوسی کھانا بھیج دیتے ہیں۔ یہ کھانا جائز ہے۔ حضرت جعفرؓ موتہ کے مقام پر شہید ہوئے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے اہل خانہ سے فرمایا کہ اصنعوا لآل جعفر طعاما فانهم اتاهم ما يشغلهم (ابن ماجہ، مسند احمد وغیرہ) تم ایسا کرو کہ چونکہ ان کو بڑا صدمہ ہے اور وہ پکا نہیں سکیں گے تو ان کو کھانا پکا دو۔ اگر وہ کھانا ہو تو کھا سکتے ہیں، لیکن اگر میت کے گھر میں مشترکہ کھاتے سے پکا ہوا ہو تو اس کے قریب نہ جانا۔ نہ مولوی کھائیں نہ پیر کھائیں۔ پھر عجیب لوگوں کا دھندا ہے کہ کہتے ہیں کہ یہ ایصال ثواب ہے۔ بھئی ایصال ثواب کا تو یہ مطلب ہوتا ہے کہ کسی غریب کو کھلائے۔ آپ تجربہ کر کے دیکھیں کہ ایسے موقع پر اگر کوئی غریب آ جائے تو لوگ دھکے دیتے ہیں۔ کھاتا کون ہے؟ دادا، ماموں، سسر، داماد، بہنوئی، یہ کھا جاتے ہیں۔ اگر اس کا نام ایصال ثواب ہے تو یہ روزانہ گھروں میں کھاتے ہیں، بھئی ان کا تو حق نہیں ہے۔ فتاویٰ رشیدیہ وغیرہ میں تصریح ہے کہ جو نفلی صدقہ ہوتا ہے، اس کا کھانا امیر کے لیے مکروہ ہے۔

اس لیے بیٹو! ایسا نہ ہو کہ قرآن کریم آپ کے خلاف ہو اور لعنت بھیجے۔ یہ میں نے مثال کے طور پر دو تین باتیں بیان کی ہیں، ورنہ سارا قرآن کریم اسی مد میں ہے کہ رب تال للقرآن والقرآن يلعنه۔ بہت سے ایسے قرآن کو پڑھنے والے ہیں کہ قرآن ان پر لعنت کرتا ہے۔ تو علما اور قرا حضرات اور حفاظ بھی میری باتوں کو ملحوظ رکھیں۔ اللہ پاک سب کو توفیق نصیب فرمائیں۔ آمین

فتح الباری وغیرہ تمام کتابوں میں یہ مسئلہ لکھا ہوا ہے اور اس پر علما اور محدثین کا اتفاق ہے کہ جہاد اگر فرض عین ہو تو پھر ماں باپ کی اجازت کے بغیر اس میں شریک ہو سکتا ہے۔ فرض عین اس وقت ہوتا ہے جس وقت ملک پر براہ راست حملہ ہو جائے اور اگر دوسرے علاقے میں جا کر لڑنا پڑے تو پھر ماں باپ کی اجازت کے بغیر جانا حرام ہے۔ ایسا آدمی اگر مرا تو شہید تو ہوگا لیکن فوراً جنت میں نہیں جا سکتا۔ کچھ عرصہ اس کو اعراف میں رہنا پڑے گا۔ بہت سے نوجوان جذبات میں آ کر ماں باپ کی کوئی قدر نہیں کرتے۔ آنکھیں بند ہونے کے بعد پتہ چلے گا کہ ماں باپ کا کیا حق ہے۔ آج کل ماں باپ کے سامنے بعض دفعہ اولاد ایسے باتیں کرتی ہے جیسے کوئی شخص اپنے دشمن کے ساتھ بات کر رہا ہو، حالانکہ قرآن پاک کا حکم ہے کہ ان کے سامنے اف بھی نہ کرو۔ رئیس التابعین حضرت سعید ابن مسیب فرماتے ہیں کہ ماں باپ کے سامنے اولاد کو ایسے بات کرنی چاہیے جیسے سخت مزاج آقا کے سامنے غلام بات کرتا ہے، لیکن آج اولاد اچھل اچھل کر حملہ کرتی ہے۔ تجربہ شاہد ہے۔ (ذخیرۃ الجنان ۷/ ۸۴)

تعلیم سے متعلق ایک سوال نامہ کا جواب

[ماہنامہ 'عزم نو' لاہور کی طرف ملک کے نظام تعلیم کے حوالے سے ایک سوال نامہ مشاہیر اہل علم کو بھیجا گیا اور ان کی طرف سے موصولہ جواب ماہنامہ 'عزم نو' کے تعلیم نمبر میں شائع کیے گئے۔ یہ سوال نامہ اور حضرت مولانا محمد سرفراز خان صفدر رحمہ اللہ کا تحریر کردہ جواب یہاں درج کیا جا رہا ہے۔]

سوال نامہ

۱۔ آپ کے نزدیک موجودہ تعلیمی پس ماندگی اور روز افزوں اخلاقی ترقی و معاشرتی انحطاط کے کیا اسباب ہیں؟

۲۔ آخر کیا وجہ ہے کہ آزادی حاصل کیے تیس برس گزر جانے کے باوجود ہم اپنا قومی و ملی تشخص اجاگر کرنے میں ناکام رہے ہیں؟

۳۔ موجودہ نظام تعلیم بدل کر اسلامی نظام تعلیم کیسے نافذ ہوگا؟ آپ کے نزدیک اس کا خاکہ کیا ہوگا، خصوصاً سائنسی اور فنی علوم کو کس طرح اسلامی قالب میں ڈھالا جائے گا؟

۴۔ کیا یہ صحیح نہیں کہ طلبہ کی ایک کثیر تعداد انگریزی زبان کی وجہ سے ناکام رہتی ہے۔ آخر انگریزی زبان کی بالادستی ختم ہو کر اردو کو کب اس کا صحیح مقام ملے گا؟

حضرت شیخ الحدیثؒ کا جواب

الیٰ محترم المقام جناب مہربان منظور احمد صاحب دام مجدہم

وعلیکم السلام ورحمۃ اللہ وبرکاتہ مزاج گرامی؟

آپ کا محبت نامہ تو کافی دنوں سے موصول ہو چکا ہے۔ آپ کی کرم فرمائی، حسن ظنی اور ذرہ نوازی کا صمیم قلب سے ہزار شکریہ، مگر عدیم الفرصت ہونے کی وجہ سے جواب نہ دیا جا سکا۔ پرسوں ۱۱؍رجب ۱۳۹۸ھ، ۱۸؍جون ۱۹۷۸ء کو بخاری شریف ختم ہوئی ہے۔ کل دور دراز سے آئے ہوئے مہمانوں کی وجہ سے مصروفیت رہی۔ آج خدا خدا کر کے کچھ تھوڑا سا وقت سرسری جواب دینے اور یوں سمجھیے کہ صرف آپ کے حکم کی تعمیل کے لیے بمشکل نکالا ہے۔ اس لیے آپ کے قائم کردہ سوالات کے نہایت ہی اختصار کے ساتھ جوابات بلکہ اشارات درج ذیل ہیں۔ واللہ الموفق۔

نمبر۱۔ راقم اثیم کے نزدیک موجودہ تعلیمی پس ماندگی کے کئی اسباب ہیں:

۱۔ خود اساتذہ کرام کی، بجائے محنت و مشقت اور دیانت کے ساتھ تعلیم و تدریس کے صرف تنخواہ اور ٹیوشن پر نظر۔

۲۔ طلبہ میں ٹھوس طریقہ سے تعلیم حاصل کرنے کے شوق و ذوق کا فقدان۔

۳۔ صرف اپنی نصابی تعلیم حاصل کرنے کی بجائے غیر ضروری سیاست میں حصہ لینا۔

۴۔ اور مادر پدر آزاد سوسائٹی اور مجلس کو اپنانا۔

۵۔ حب الدنیا کی وجہ سے اس کے درپے ہونا کہ تعلیم حاصل ہو یا نہ ہو، علمی استعداد و قابلیت اجاگر ہو یا نہ ہو، جلدی سے سند اور ڈپلوما حاصل ہو جائے، گو ناجائز طریقہ ہی سے کیوں نہ ہو تاکہ رقم بٹورنے کی سبیل بہت جلد سامنے آ جائے وغیرہ وغیرہ۔

اور معاشرتی و اخلاقی انحطاط کے اسباب بھی متعدد ہیں، مثلاً:

(۱) جنسی بے راہ روی کی فحش فلمیں، ٹی وی پروگرام، جذبات میں ہیجان پیدا کرنے والے ناول اور وہ اخباری مضامین جن کو لکھنے والے مزے لے لے کر لکھتے ہیں اور نوجوان طبقے کے اخلاق شعوری و غیر شعوری طور پر بگڑتے ہیں۔

(۲) کلب گھر، مینا بازار اور بین الاقوامی سطح پر ثقافت کے نام پر ناچوں اور ناچیوں کے تبادلے اور ان کی تشہیر۔

(۳) کالجوں میں مخلوط تعلیم جو جذبات کو برباد کرنے کا پہلا اور موثر قدم ہے۔

(۴) دینی تعلیم سے بے گانگی اور دوری بلکہ بعض کے نزدیک بڑی حد تک اس سے تنفر وغیرہ ایسے اسباب ہیں جن سے اخلاقی اور معاشرتی برائیاں قوم کی جڑوں تک پہنچ چکی ہیں جن سے عالم اسباب میں رستگاری مشکل ہے۔

نمبر۲۔ ہم نے جس مقصد کے لیے قربانیاں دی تھیں اور جس سنہرے مطلب کے لیے یہ ملک بنایا تھا کہ اس میں قرآن وسنت کی بطرز حضرات خلفاے راشدینؓ حکومت قائم کی جائے گی، آج تک حکومت کی سطح پر نیک نیتی سے اس کی طرف بالکل توجہ نہیں دی گئی۔ اگر اسلام کا عادلانہ نظام نافذ ہو جاتا اور اس کی برکات عوام دیکھ لیتے تو آج ہم اتنے ذلیل نہ ہوتے جتنے ہو گئے ہیں۔ ملک دو ٹکڑے ہو گیا ہے اور باطل پرستوں کو اپنے خالص کافرانہ اور ملحدانہ نظریات پھیلانے کا بڑا موقع مل گیا ہے جو پاکستان کے ہر محکمہ میں افراط کے ساتھ گھسے ہوئے ہیں اور دھیرے دھیرے اپنے جراثیم پھیلا رہے ہیں اور ان کے مقابلہ میں قوم کی اصلاح صرف چیونٹی کی چال چل رہی ہے اور وہ بھی صرف زبانی نہ کہ عملی۔ اندریں حالات قومی اور ملی تشخص کیونکر اور کیسے اجاگر ہو؟ بقول علامہ اقبال مرحوم ؎

خدا نے آج تک اس قوم کی حالت نہیں بدلی
نہ ہو جس کو خیال آپ اپنی حالت کے بدلنے کا

نمبر۳۔ موجودہ فرنگی نظام تعلیم کو، جو لارڈ میکالے کا ورثہ ہے، بدلنا ناممکن تو نہیں لیکن جب تک اس کی تعلیم کے پیدا کردہ کل پرزے موجود ہیں، مشکل ضرور ہے۔ اگر ملک کے اندر برسر اقتدار طبقہ سچے دل سے اسلامی نظام تعلیم نافذ کرنا چاہے اور اپنے غلط کار مشیروں کی رائے پر نہ چلے تو تھوڑے سے عرصے میں یہ نافذ ہو سکتا ہے۔ جب تک تعلیم کے تمام شعبوں پر تفصیلی طور پر نگاہ نہ ڈالی جائے اور ان کا مواد اکٹھا نہ کر لیا جائے، صرف چلتے چلتے خاکہ تیار نہیں ہو سکتا۔ یہ چیز ذرا محنت طلب ہے، لیکن یہ بات تو ممکن ہے کہ قرآن کریم کا ترجمہ، حدیث شریف کی بعض کتابیں، فقہ اسلامی کی بعض کتابیں اور حضرات صحابہ کرامؓ کے حالات پر مشتمل بعض ٹھوس تاریخی کتابیں نصاب کے طور پر سکولوں سے لے کر کالجوں تک درجہ بدرجہ حسب لیاقت

طلبہ لازم قرار دی جائیں۔ راقم اثیم کے نزدیک سائنس اور فنی علوم کسی اسلامی قاعدہ سے متصادم نہیں، جبکہ ان کا مصرف صحیح ہو۔ لہٰذا ان کو اسلامی قالب میں ڈھالنے کی ضرورت ہی نہیں ہے۔ ہاں، جب ان کا مصرف ہی غلط ہو کہ گانے بجانے اور فحش حرکات اور ڈراموں کو ہی مقصد زیست بنالیا جائے تو پھر معاملہ جدا ہے۔ ضرورت اپنے ڈھالنے کی ہے نہ کہ ان کو۔

نمبر۴۔ ناکامی کے اسباب صرف انگریزی زبان ہی نہیں، اور بھی کئی اسباب ہیں۔ ایک یہ غیر ملکی زبان بھی ہو تو اس میں کیا اشکال ہے؟ لیکن معاف رکھنا، جب تک لارڈ میکالے کی یہ روحانی نسل، جن کی گھٹی میں انگریزی زبان داخل ہے، ختم نہیں ہو جاتی، اس وقت تک یہ زبان بھی نہیں جائے گی۔ اردو کو اس کا صحیح مقام صرف اس وقت حاصل ہوگا جب خدا خوف قسم کا حکمران طبقہ جس کی زبان اور دل ایک ہو، اس کو صدق دل سے نافذ کرے، ورنہ ع

خواب تھا جو کچھ کہ دیکھا جو سنا افسانہ تھا

دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہمارے ملک کو صحیح معنی میں پاکستان بنائے اور اس میں عادلانہ نظام نافذ ہو اور ہم اپنی گنہگار آنکھوں سے اس کی برکات دیکھیں، مگر افسوس کہ ۔

مجھ کو منزل نصیب ہو نہ سکی
رہنماؤں سے میں نے پوچھا بھی

''عورت کے ذمہ جو حقوق ہیں، ان میں سے ایک یہ بھی ہے کہ شریعت نے اس کو حکم دیا ہے کہ وہ کسی غیر محرم کو خاوند کی اجازت کے بغیر گھر نہ آنے دے اور خاوند بھی کسی کو گھر آنے کی اجازت اس وقت دے جب وہ خود گھر میں موجود ہو۔ اپنی غیر حاضری میں کسی کو اجازت نہیں دے سکتا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے سوال کیا گیا کہ حضرت! دیور اور جیٹھ یعنی خاوند کے چھوٹے بڑے بھائی بھی ہوتے ہیں تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ان کا بھی تنہائی میں آنا نری موت ہے۔ ہاں اگر گھر میں ماں باپ بہن موجود ہیں یعنی گھر آباد ہے تو دیور جیٹھ آ سکتے ہیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جس عورت کے ساتھ غیر محرم ہوگا، تیسرا شیطان ہوگا۔ بہت کم لوگ ایسے ہیں جن میں خدا خوفی ہو اور ایسے اللہ تعالیٰ کے بندے بھی موجود ہیں، مگر شریعت نے عمومی ضابطہ بیان فرمایا ہے کہ کوئی غیر محرم کسی کے گھر میں نہیں آ سکتا، حتیٰ کہ سات دس سال کے نابالغ بچے جو پہلے گھروں میں آتے جاتے ہیں، بالغ ہو جانے کے بعد ان کو بھی منع کر دیا گیا کہ اب وہ گھر میں نہیں آ سکتے، جیسا کہ سورۂ نور کے اندر اس کا حکم موجود ہے۔ عورتیں یہ نہیں کہہ سکتیں کہ ہمارے پاس ہی پلے بڑھے ہیں اور انھی گھروں میں کھیلتے رہے ہیں، کیونکہ اس وقت نابالغ تھے اور اب بالغ ہو گئے ہیں۔ میں کہتا ہوں کہ شرعی اصولوں کی پابندی کی جائے تو ان شاء اللہ العزیز کوئی خرابی پیدا نہیں ہوگی۔ خرابی اس وقت پیدا ہوتی ہے جب انسانی شرعی حدود کو پھلانگتا ہے۔''

(ذخیرۃ الجنان ۴/۳۷، ۳۸)

امام اہل سنتؒ کی فارسی تحریر کا ایک نمونہ

[مولانا مفتی محمد عیسیٰ خان گورمانی کی تصنیف ''اعجاز الصرف'' پر تقریظ]

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نحمده و نصلى علىٰ رسوله الكريم اما بعد!

بندۂ ہیچ مدان محمد سرفراز بعالی خدمت کافہ اہل علم از علماء عظام وطلبہ کرام عرض می کند کہ فہم قرآن مجید وحدیث شریف کہ از افضل قربات است ونیز مہارت پیدا کردن در لغت عرب عرباء بر بعض علوم آلیہ موقوف است واز یں علوم وفنون کہ موقوف علیہا اند یکے علم تصریف است کہ بے حفظ وضبط کردن آں فہمیدن اعجاز نظم تنزیل در مفردات وصیغ واظہار وادغام وحذف واثبات ومعتل ومضاعف ومہموز وصحیح وغیرہ مصداق کوہ کندن وکاہ برآوردن است وبسیارے از علماء حق قدیماً وحدیثاً در ہر لغت وزبان کتب مبسوطہ ومطولہ دریں علم نوشتہ اند کہ بعض بر مسائل ومہمات ایں فن مقتصر ودر بعض دلائل وبراہین ہم ذکر کردہ اند وبا امثلہ وشواہد آنہا را ثابت کردہ خدمتے عظم واحسان عمیم کردہ اند، شکر الله سعيهم۔ ع ويرحم الله عبدا قال آمينا۔

واز یں جملہ در علم تصریف کتابے وجیز لیکن در نفع عظیم اعجاز الصرف است کہ محبنا فی اللہ وباللہ وللہ مولانا حافظ محمد عیسیٰ صاحب ڈیروی در رمضان مبارک ۱۳۷۹ھ در مطالعہ ایں حقیر پر تقصیر وبر گناہان خود نادم آوردند چنانچہ حصہ وافر ومعتد بہ از اں خود مطالعہ کردم وخیلے دیگر از مولانا موصوف شنیدم وبعدہ نظر وفکر حقیر برایں رسید کہ کتاب مذکور از بعض وجوہ بر اکثر کتب تصریف مزیت دارد زیرا کہ در و مسائل کثیرہ در صورت نظم جمع شدہ اند کہ حفظ آں آسان است وبرائے افہام آنہا تعبیر بسیار خوب ومختصر اختیار کردہ شدہ است کہ بعد از یاد گرفتن نظم مرد زیرک وفہیم زود نفع کثیرے گیرد واز شرح آں بر ضوابط وقوانین اطلاع مفصل یابد ودر بعض مواضع تعبیر قانون بر نہجے عجیب بیان شدہ است کہ آں قانون بلا تردد وبغیر افزودن مقدمات لاطائلہ در دیگر مماثل آں جاری وساری وبر جزئیات خود حاوی ومشتمل است، چنانچہ در یعدو، ہم چنیں در قال وغیرہ واقع شدہ است کہ در غایت اختصار وجامعیت بیان شدہ است کہ از یں تعبیر وحقیقت جملہ فروع وے نہ خارج ونہ منسلخ ومدار ایں بر ذوق واستقرا است ولکل مقام مقال۔ ع

وللناس فی ما یعشقون مذاھب۔

وصیغ مشکلہ ودقیقہ کہ درکتاب عزیز وبعض درکتب حدیث آمدہ اندکہ معقول المعنی ہستند واثرے دارند بخوبی بطور مشق وتمرین حل کردہ شدہ اند بخلاف صیغ مخترعہ وایجاد کردۂ ظریفاں محض برائے تمرین وامتحان مثلاً ”جو جو وسگ بچہ درہوا بغبغو“ ومانند آں کہ نزد بعض طلبہ مشہور ومتداول اند احتراز کردہ شدہ است کہ آنہا ہیچ اثرے وفائدہ ندارند، محض اختراع ورجم بالغیب اند۔ وصیغ واقعیہ نفس الامریہ رابحث شاقہ تلاش کردہ وحل آں بنمط متین بتعبیر حسین پیش کردہ شدہ است کہ بعد حفظ ووعی آں مبتدی را فائدہ عظیم حاصل می شود بمنہ وکرمہ۔

غرضیکہ راقم حقیراز بعض وجوہ ایں چنیں کتابے مختصر وجامع دریں فن تاہنوز ندیدہ است۔ اگرچہ در بعض مقامات درتعبیر ودر وضع قوانین ودلائل آنہا دیگراں رامجال سخن باقی است، مع ہذا فوائد آں بے شمار اند وعبارت آں مختصر وجامع تر۔ خداے بزرگ وبرتر مولانائے موصوف راہمت داد کہ بسعی کثیر ایں کتاب راجمع کردند وبرائے افادۂ طلبہ انتظام طباعت اونیز کردند فجزاہ اللہ عنا وعن سائر المسلمین وصلی اللہ تعالیٰ علیٰ خیر خلقہ محمد خاتم الانبیاء والمرسلین الذی لا نبی بعدہ ولا رسول وعلیٰ آلہ واصحابہ وازواجہ وجمیع امتہ الی یوم الدین، آمین۔

وانا العبد الاحقر ابوالزاہد محمد سرفراز

خطیب جامع گکھڑ ومدرس مدرسہ نصرۃ العلوم گوجرانوالہ

۲۳؍شوال ۱۳۷۹ھ / ۲۱؍اپریل ۱۹۶۰ء

فقہاء کرام رحمہم اللہ تعالیٰ نے یہ بیان فرمایا ہے کہ ”امرأۃ سبیت بالمشرق وجب علی اھل المغرب ان یخلصوھا“، اگر کوئی مسلمان عورت مشرق کے کونے میں کافروں کے ہاتھوں قید ہو جائے تو مغرب کی طرف تمام رہنے والوں پر واجب ہے کہ اس کی مدد کریں اور اس کو رہا کرائیں۔ آج ہمارے پڑوس کشمیر، افغانستان، بوسنیا، برما میں جو کچھ ہو رہا ہے، وہ سب کے سامنے ہے، مگر اس وقت مسلمانوں سے بڑا بے غیرت کوئی نہیں ہے۔ خصوصاً مسلمانوں کا حکمران طبقہ جہاں کہیں بھی ہے، بڑا بے غیرت ہے اور اتنے بے غیرت ہیں کہ آواز تک بلند کرنے کے لیے تیار نہیں ہیں۔ اپنا کوئی نقصان ہو تو چیختے چلاتے ہیں اور دوسرے مسلمانوں کے لیے اتنی آواز بھی نہیں نکال سکتے کہ اے ظالمو! ان مظلوموں پر ظلم نہ کرو۔ اس وقت برما میں بہت ظلم ہو رہا ہے، مگر کوئی ان کی خبر لینے والا نہیں ہے۔“

(ذخیرۃ الجنان ۳/۴۲۶، ۴۲۷)

امام اہل سنتؒ کے منتخب مکاتیب

بنام: حضرت مولانا سید محمد یوسف بنوریؒ (کراچی)

باسمہ سبحانہ

محترم المقام شیخ الحدیث جناب حضرت مولانا محمد یوسف صاحب بنوری دامت برکاتہم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ مزاج اقدس؟

غالباً ذوالقعدہ کی ابتدا میں حضرت مولانا محمد ادریس صاحب دام مجدہم کا ایک گرامی نامہ موصول ہوا تھا جس میں ماہ شعبان کے بینات کے ایک اہم مضمون کی طرف توجہ دلائی گئی تھی، مگر شومئی قسمت کہ کثرت مشاغل کی وجہ سے پڑھنے کا موقع نہ مل سکا۔ ایام اضحیٰ کی تعطیلات میں پڑھنے کا عزم تھا، مگر پے در پے تکالیف اور علالت کی وجہ سے پھر بھی پڑھنے کا وقت نہ نکال سکا۔ آج ہی اس کو پڑھا اور دل سے دعائیں نکلیں۔ راقم الحروف تو تقریباً بیس سال سے علماء کرام اور طلبہ عظام کی توجہ تصنیف وتالیف اور تحریر وانشا کی طرف مبذول کراتا رہا ہے مگر کاش کہ وہ اس کام کی تحسین ہی کرتے اور معذرت ودعا سے یاد فرما دیتے۔ باوجودیکہ میرا مستقل کام تو تدریس وخطابت ہے مگر اور بھی کئی کام گلے کا ہار بنے ہوئے ہیں، تاہم محض اللہ تعالیٰ کے فضل وکرم اور بزرگوں کی نیک دعاؤں کی برکت سے کافی عرصے سے بقدر ہمت وطاقت تالیف وتصنیف کا کام جاری ہے۔ آپ کے قلب مبارک پر اللہ تعالیٰ نے جو رائے القا فرمائی ہے، راقم کی عرصہ دراز سے یہ قلبی آرزو تھی مگر اپنے قریب کے حلقہ میں بھی راقم اس میدان میں تنہا وبے یار ومددگار تھا۔ اللہ تعالیٰ آنجناب کو جزائے خیر عطا فرمائے کہ آپ نے وقت کی اہم ضرورت کو شاندار اور وزن دار الفاظ میں واقعات کی روشنی میں علماء کرام کے سامنے پیش فرمایا ہے۔ امید ہے کہ آپ کو من سن سنۃ حسنۃ کے مطابق اس تحریک کا ثواب ضرور ملے گا اور بہت سے غافل اور بے خبر علماء کرام کو حقیقت حال سے آگاہی بخشی جو دور حاضر کی بے پناہ آندھیوں کی طرف دیکھنے اور سر اٹھانے کی سعی بھی نہیں کرتے بلکہ اس کی ضرورت ہی محسوس نہیں کرتے، جن آندھیوں کا ایک ایک جھونکا حدود اربعہ سے بزبان حال پکار پکار کر یہ کہہ رہا ہے کہ

ہواؤں کا رخ بتا رہا ہے، ضرور طوفان آ رہا ہے
نگاہ رکھنا سفینہ والو، اٹھی ہیں موجیں کدھر سے پہلے

اس کام کی راہ میں علماء کرام کی مالی پریشانیاں اس قدر زیادہ ہیں کہ اگر درس وتدریس کے مشغلوں سے نگاہ ہٹاتے ہیں تو پھر عالم اسباب میں ان کا کوئی دوسرا مشغلہ نہیں اور ہمارے مدارس میں بالعموم مدرسین حضرات کے سپرد اتنے اسباق ہوتے ہیں کہ وہ دوسرا کام کرنے سے قاصر ہوتے ہیں۔ ان کو مطالعہ اور تدریس ہی سے فرصت نہیں ہوتی۔ راقم الحروف کا اپنا یہ حال ہے کہ ”سکہ بند“ پاکستانی ہونے کے باوجود آج تک کراچی نہیں دیکھ سکا۔ بہر حال اس کار خیر کے محرک ہونے کی وجہ سے

آپ مبارک باد کے مستحق ہیں۔ اہم مسائل کی ایک فہرست بنا کر ارباب بصیرت علماء کرام کو جتنے بھی ممکن ہو سکیں، کسی مناسب جگہ اور موزوں موقع پر یکجا کرنے کی سعی فرمائیں اور اجتماعی صورت میں تبادلہ خیالات ہو اور پھر ان پر تحقیق ہو۔ مدارس عربیہ میں تحریر وانشا اور تصنیف وتالیف کی ضرورت کا احساس پیدا کرنے کا کام بھی کافی کاوش اور کوشش کے بعد ہی کامیاب ہو سکتا ہے۔

دعوات صالحہ میں یاد فرمائیں۔

والسلام

احقر ابوالزاہد محمد سرفراز

خطیب جامع مسجد گکھڑ

مدرس مدرسہ نصرۃ العلوم گوجرانوالہ

(ماہنامہ بینات کراچی ذوالحجہ ۱۳۸۴ھ)

بنام: حضرت مولانا عبد الحقؒ (اکوڑہ خٹک)

۱۴؍ اگست ۱۹۶۸ء

الی محترم المقام جناب حضرت مولانا صاحب دام مجدکم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

الحمد للہ کہ کتاب تسکین الصدور فی تحقیق احوال الموتی فی البرزخ والقبور طبع ہو چکی ہے۔ ایک نسخہ ہدیۃ بذریعہ رجسٹری پارسل ارسال خدمت ہے۔ اپنی زرّیں رائے مبارک اور قابل اصلاح مواضع کی اصلاح سے جلدی آگاہ فرمائیں تاکہ اور آرا کے ساتھ اس کی بھی جلدی طباعت ہو جائے اور تصدیقات کتاب کے ساتھ شامل کر دی جائیں۔ جتنی جلدی ہو سکے بہتر ہوگا۔ صحت ان دنوں بفضلہ تعالیٰ قدرے اچھی ہے۔ مزید دعا فرمائیں۔

والسلام

احقر محمد سرفراز گکھڑ گوجرانوالہ

بنام: مولانا مفتی محمد تقی عثمانی (کراچی)

باسمہ سبحانہ وتعالیٰ

منجانب ابی الزاہد

الی محترم المقام حضرت العلام مولانا.......... صاحب عثمانی دامت برکاتہم

وعلیکم السلام ورحمۃ اللہ وبرکاتہ   مزاج سامی؟

آپ کا گرامی نامہ تو کافی دنوں سے موصول ہو چکا ہے، مگر راقم اثیم اس انتظار میں رہا کہ قدرے فرصت ملے تو استاد محترم حضرت مفتی محمد شفیع صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ کے بارے ایک مقالہ تحریر کیا جائے کہ ایک طرف تو آنجناب کے وقیع حکم کی

تعمیل ہو جائے اور دوسری طرف حضرت رحمہ اللہ تعالیٰ سے اپنی عقیدت کا اظہار بھی ہو جائے، لیکن افسوس کہ فرصت نہ مل سکی۔ ع ما کل ما یتمنی المرء یدرکہ۔

بے حد مصروف ہونے کی وجہ سے قلم ہاتھ میں نہ پکڑ سکا۔ آج ہی خدا خدا کر کے تھوڑا سا وقت نکالا اور ناچار چند غیر مربوط جملے ارسال کیے جا رہے ہیں۔ فرصت ہوتی تو تسلی اور اطمینان سے کچھ عرض کیا جاتا، مگر مجبوری ہے اور ویسے بھی یہ حقیر کب اس قابل ہے کہ بزرگوں کی توصیف کے بارے میں کچھ لکھ اور عرض کر سکے۔ ولنعم ما قیل۔

نغمہ کجا و من کجا ساز سخن بہانہ ایست   سوے قطاری کشم ناقہ بے زمام را

اگر یہ غیر مربوط جملے رسالہ البلاغ میں درج ہونے کے قابل ہوں تو درج فرما دیں۔ ع

گر قبول افتد زہے عز وشرف

اور اگر حذف واضافہ اور ترمیم کے بعد یا ناقص جملے اندراج کے قابل ہوں، تب بھی آپ کو کلی اختیار ہے۔

رموز مملکت خویش خسرواں دانند

دعوات صالحات ومستجابات میں فراموش نہ فرمائیں۔ بفضلہ تعالیٰ راقم اثیم سراپا تقصیر بھی ہمہ وقت دعا جو ہونے کے ساتھ ساتھ دعا گو بھی رہتا ہے۔ حاضرین مجلس سے سلام مسنون ارشاد فرمائیں۔

والسلام

احقر ابوالزاہد محمد سرفراز از گکھڑ ضلع گوجرانوالہ

۱۸؍ جمادی الاولیٰ ۱۳۹۸ھ / ۲۷؍ اپریل ۱۹۷۸ء

بنام: مولانا سمیع الحق (اکوڑہ خٹک)

(۱)

۶؍ ربیع الاول ۱۳۹۵ھ بمطابق ۲۰؍ مارچ ۱۹۷۵ء

الی محترم المقام جناب برادرم حضرت مولانا سمیع الحق صاحب دام مجدہم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ   مزاج گرامی؟

عدیم الفرصت ہونے کی وجہ سے آپ کا مایہ ناز رسالہ ''الحق''، مستقل مطالعہ کرنے کا موقع نہیں مل سکتا۔ کبھی کبھار کوئی مضمون سامنے آجاتا ہے۔ الحمد للہ تعالیٰ بہت اچھے انداز سے آپ اسے مرتب فرماتے اور مضامین لکھتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ قبول فرمائے اور مزید سے مزید احقاق حق اور ابطال باطل کی توفیق بخشے، آمین ثم آمین۔ ع اللہ کرے زور قلم اور زیادہ۔

ماہ مارچ ۱۹۷۵ء کے شمارہ میں حضرت مولانا مفتی محمد فرید صاحب مدرس ومفتی دار العلوم حقانیہ کا دعا کے بارے میں ایک مضمون ہے جو صفحہ ۴۸ سے شروع ہوتا ہے اور صفحہ ۵۴ پر ختم ہوتا ہے۔ اس میں بعض اُمور اپنے اکابر کی تحقیق اور عمل کے سراسر خلاف ہیں اور پھر صوبہ سرحد میں بعض بلکہ اکثر علاقوں میں اس پر اصرار کرنے والوں کے لیے حقانیہ کے مفتی صاحب کا یہ فتویٰ سونے پر سہاگہ کا کام دے گا، اس لیے اکابر کی تحقیق کے پیش نظر خیر خواہی کے طور پر گزارش ہے کہ مفتی محمد فرید صاحب لکھتے ہیں ''علماء پر مخفی نہیں کہ خیر القرون میں ہیئت مروجہ سے (کہ امام اور قوم ہاتھ اٹھائیں) دعا کرنا معمول نہ تھا، نہ فرائض

کے بعد اور نہ سنن مؤکدہ ے بعد، نہ اللھم ا ے السلام پڑھنے کے وقت اور نہ دیگر ذکر و دعا کرنے کے وقت ۔ ومن ادعیٰ فعلیه الدلیل ولن یأتوا به ولو کان بعضهم لبعض ظهیرا " (الخ بلفظہ صفحہ ۵۲) نیز لکھتے ہیں "پس ہیئت اجتماعی کے ساتھ دعا کرنا فرائض کے بعد ہو یا رواتب کے بعد بدعت ہے جبکہ بطور التزام ہو اور بلا التزام جائز ہے، البتہ افضلیت میں اختلاف ہے۔" (صفحہ ۵۴) ایسا معلوم ہوتا ہے کہ حضرت مفتی صاحب سُنن اور نوافل کے بعد اجتماعی صورت میں دعا ثابت کرنے کے لیے پہلے تو فرائض کے بعد کی دعا کو کمزور کرتے ہیں، پھر فرائض اور رواتب کے بعد کی اجتماعی طور پر دعا کو (جو ان کا مقصد ہے) ایک سا درجہ دیتے ہیں اور پھر بلاوجہ چیلنج بازی پر اُتر آئے ہیں۔ مفتی ہند حضرت مولانا مفتی محمد کفایت اللہ صاحب رحمۃ اللہ تعالیٰ کا مشہور رسالہ نفائس مرغوبہ اسی مسئلہ کے مثبت اور منفی پہلو پر لکھا گیا ہے اور دیگر متعدد اکابر کی اس پر تصدیقات بھی ہیں، جس کا خلاصہ یہ ہے کہ فرائض کے بعد اجتماعی صورت میں دعا جائز اور ثابت ہے اور سنن و نوافل کے بعد اجتماعی صورت میں دعا بدعت اور مکروہ ہے۔ راقم اس پر حوالے اور عبارات نقل کرنا تطویل سمجھتا ہے۔ اسی رسالہ کا مطالعہ کر لیا جائے اور نور الایضاح وغیرہ کی مجمل عبارت پر بنیاد رکھ کر اس بدعت کو ہرگز تقویت نہ پہنچائی جائے۔ وماعلینا الا البلاغ۔

حضرت مولانا صاحب دامت برکاتہم کی خدمت میں سلام مسنون ارشاد فرمائیں اور دعوات صالحات کی التجاء پیش کریں۔ راقم اثیم بھی بفضلہٖ تعالیٰ دعا گو ہے۔ (حضرت مفتی محمد فرید صاحب نے بعض روایات کے ترجمہ میں بھی مطلب برآری سے کام لیا ہے، مگر ہمارا مقصد مناظرانہ موشگافیوں سے گریز کرتے ہوئے صرف اکابر کے مسلک کی حفاظت کرنا ہے۔ واللہ علیٰ مانقول وکیل)

والسلام

احقر ابوالزاہد محمد سرفراز از گکھڑ

(۲)

باسمہ سبحانہ

۲۶/جمادی الاخریٰ ۱۴۱۰ھ بمطابق ۲۴/جنوری ۱۹۹۰ء

من ابی الزاہد

الیٰ محترم المقام جناب حضرت العلام مولانا الحاج سمیع الحق صاحب دام مجدہم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکا۔

اُمید ہے کہ آپ خیر و عافیت سے ہوں گے۔ اللہ تعالیٰ عافیت ہی رکھے، آمین۔

محترم! جب آپ تشریف لائے تھے تو میں نے جمعیۃ کے دو دھڑوں میں مصالحت کی التجا کی تھی۔ آپ کے انداز و بیان میں خاص لچک تھی۔ اس کے بعد حضرت مولانا فضل الرحمٰن صاحب مدرسہ نصرۃ العلوم تعزیت کے سلسلہ میں حاضر ہوئے۔ چونکہ دن کا وقت تھا اور اخبارات میں بھی ان کی آمد کی اطلاع طبع ہو چکی تھی، بنابریں علمائے کرام اور عوام کی خاصی تعداد جمع ہو گئی۔ تعزیت اور طلبہ کو تعلیم پر توجہ کرنے کے بارے میں چند منٹ بیان بھی ہوا۔ راقم الحروف نے اُن سے مصالحت کے

بارے میں گفتگو کی۔ انہوں نے یہ تحریر لکھ کر مجمع کے سامنے پڑھی اور میرے حوالہ کی جس میں غیر مشروط طور پر شرکت کا اظہار کیا گیا ہے۔ جس پر حاضرین میں خوشی کی لہر دوڑ گئی۔ مجمع برخاست ہونے کے بعد ایک بزرگ نے جو مکہ مکرمہ سے آئے تھے، مجھے الگ کر کے یہ کہا کہ مولانا فضل الرحمٰن صاحب نے تو ایثار و قربانی کا ثبوت دے دیا ہے، مگر مولانا سمیع الحق صاحب آمادہ نہیں ہوں گے۔ میں نے تعجب کے طور پر کہا کیوں؟ انہوں نے کہا دیکھ لینا۔ پھر فیصل آباد کے ایک صاحب نے بھی ایسی ہی بات کہی جس سے راقم نے یہ اندازہ لگایا کہ اُن کا ذہن یہ بن چکا ہے یا بنا دیا گیا ہے کہ مصالحت میں رکاوٹ صرف مولانا سمیع الحق صاحب ہیں۔ راقم اثیم خود تو معذور ہے ورنہ اس اصلاح بین الناس کے کارِ خیر میں خود حاضر ہوتا، اس لیے اپنے لڑکے قاری محمد اشرف ماجد کو خدمت اقدس میں بھیجا جا رہا ہے اور راقم اثیم کو آپ سے اُس ایثار اور قربانی سے زیادہ کی توقع ہے جس کا اظہار مولانا فضل الرحمٰن صاحب نے کیا ہے۔ اگر ایسی پُر اُمید تحریر آپ عنایت فرما دیں تو پھر اگلا قدم اُٹھانے اور مصالحت میں کوئی دیر نہیں۔ بہت جلد یہ دینی قوت جمع ہو جائے گی اور اتفاق و اتحاد کی برکت سے دینی اور دُنیوی کامیابی حاصل ہو گی۔ وماذلك علی الله بعزیز۔

حاضرین مجلس سے سلام مسنون ارشاد فرمائیں اور نیک دعاؤں میں نہ بھولیں۔ بفضلہٖ تعالیٰ یہ عاصی و خاطی بھی داعی ہے۔

والسلام

احقر محمد سرفراز از گکھڑ

بنام: مولانا ابوعمار زاہد الراشدی (گوجرانوالہ)

(۱)

باسمہ سبحانہ

منجانب ابی الزاہد

عزیزم زاہد سلمہ اللہ تعالیٰ

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

امید ہے کہ میرے پہلے دونوں خطوط مل چکے ہوں گے۔ ہم بحمد اللہ تعالیٰ ۲۲/دسمبر بروز جمعہ المسجد الحرام پہنچ چکے ہیں۔ خلاف معمول سرد ہوائیں چل رہی ہیں۔ لوگوں نے اپنے گرم کپڑے سوئٹر اور کوٹ وغیرہ پہن رکھے ہیں، اوپر کمبل اوڑھ رہے ہیں، لیکن ایک میں ہوں اور ایک دو بنگالی نظر آئے ہیں کہ وہ بھی میری طرح احرام میں ہیں۔ احرام کی وجہ سے ہم سر بھی نہیں ڈھانپ سکتے اور مچھر بھی بے پناہ ہیں۔ کل ہی دس ریال کی ایک مچھر دانی خریدی ہے اور کئی راتوں کے بعد گزشتہ رات کچھ نیند پڑی ہے۔ گھر سے آنے کے بعد آج تک اطمینان سے نیند نہیں آ سکی۔ تین دن کی مسلسل محنت سے اور دوستوں کی بے[حد] کوشش سے شعب ابی طالب میں بہت ہی کم قیمت کا مکان ساڑھے چھ سو ریال پر ملا ہے، یعنی پاکستانی تقریباً دو ہزار روپیہ، مگر پانی دیگر کئی مکانوں کی طرح اس میں بھی نہیں ہے۔

اس سال اشیا کی اتنی گرانی ہے کہ بیان سے باہر ہے اور مکانوں کی اس قدر دقت ہے کہ الحفیظ والامان۔ راقم جب پہلی دفعہ آیا تھا تو ہمیں فی کس ۸۹۲ ریال، ایک من گندم اور دس سیر چاول ملے تھے مگر اب فی کس صرف ۶۳۵ ریال ملے ہیں۔

لوگ اپنے ساتھ خوب راشن لائے ہیں۔ جو راشن نہیں لا سکے تو وہ دیگر سامان اور کم از کم گھی فروخت کے لیے لائے ہیں۔

ہمارے محترم حاجی محمد صادق صاحب تقریباً ایک من گھی لائے ہیں، لیکن راقم صرف دس سیر چاول اور تقریباً ۵ سیر گھی اور تقریباً اڑھائی سیر کھانڈ لایا ہے اور بس۔ مکان کے کرایہ کے علاوہ مدینہ طیبہ کا کرایہ ۱۰۲ ریال، وہاں مکان کا کرایہ اور دیگر خرچہ، پھر عرفات اور منیٰ کا کرایہ ستر ریال، پھر جدہ کا کرایہ، پھر قربانی، یہی چیزیں اس رقم میں پوری نہیں ہو سکتیں۔ اس لیے راقم نے ایک وقت کی چائے بالکل چھوڑ دی ہے اور ایک وقت صرف قہوہ ہم پیتے ہیں اور کبھی کھانا بھی صرف ایک ہی وقت کھاتے ہیں۔ یہاں آٹا پاکستانی سکہ کے لحاظ سے ۸۵ روپے من ہے، آلو چار روپے سیر ہیں، پالک پانچ روپے سیر ہے، بھنڈی توری نو روپے سیر ہے۔ وعلیٰ ہذا القیاس یہی سلسلہ دیگر اشیا کا ہے۔ ہم کوشش کر رہے ہیں کہ ۷ر فروری کے جہاز سے واپسی ہو جائے۔ دعا کرنا اور اس وقت تک بھی ہمارا خرچہ پورا ہونا مشکل ہے۔ پچانوے فیصدی لوگوں نے ۳۳ سو روپیہ فی کس جمع کرایا تھا، ہمارا صرف ۲۹۸۲ ہے اور باقی وہ لوگ دیگر اشیا بھی ساتھ لائے ہیں۔ فروخت کر کے اپنا گزارا کر رہے ہیں اور ہر ایک کے پاس بڑا راشن ہے۔ آنے کے بعد یہ حقیقت کھلی ہے۔

راقم نے سب اہل خانہ، آپاں ایمنہ کے جملہ اہل خانہ، اور بٹ صاحب کے جملہ اہل خانہ، اور بے جی معراج صاحبہ کے جملہ اہل خانہ اور ماسی صاحبہ کے جملہ اہل خانہ اور ڈاکٹر صاحب کے جملہ اہل خانہ اور باقی تمام بزرگوں دوستوں اور عزیزوں کے لیے نام لے لے کر اور رو رو کر دعائیں کی ہیں، اللہ تعالیٰ قبول فرمائے۔ سب مل کر میرے حق میں دعا کرو کہ اللہ تعالیٰ اتمام حج کی توفیق بخشے۔ احرام لمبا ہے اور موسم نامناسب ہے۔ راقم کا نزلہ وزکام زوروں پر ہے۔

میری طرف سے محترم جناب بٹ صاحب اور خالہ صاحبہ، ملک صاحب، ماسٹر اللہ دین صاحب، ماسٹر بشیر احمد صاحب اور بھائی محمد علی صاحب غرضیکہ تمام نمازیوں کو نمازوں اور جمعہ کے موقع پر سلام مسنون عرض کرنا اور بچوں کی تعلیم اور نماز کا خوب خیال رکھنا۔ حضرت مولانا قاری عبدالحلیم صاحب اور مولانا غلام علی صاحب اور قاری محمد انور صاحب اور قاری علی احمد صاحب اور قاری محمد ہاشم صاحب و قاری محمد رفیق صاحب و قاری محمد اسحاق صاحب و قاری محمد بشیر صاحب اور قاری محمد یوسف صاحب اور قاری محمد داؤد صاحب اور تمام قاری کلاس کے طلبہ اور دیگر جملہ طلبہ کو اور رائیکا میدا والے بزرگ کو اور محترم محمد ایوب صاحب ڈار کو اور اپنے جملہ اہل خانہ اور ماسی صاحبہ اور آپاں ایمنہ کو جملہ اہل خانہ کو سلام مسنون عرض کرنا اور خصوصاً بے جی معراج صاحبہ کو۔ بچوں کو نماز اور سبق کی بڑی تاکید ہے۔ دونوں کو تاکید ہے کہ گھر کے نظام کو ملحوظ رکھیں اور کفایت شعاری سے کام لیں۔ سب بچوں کو پیار۔

والسلام

احقر ابوالزاہد محمد سرفراز از شعب ابی طالب

معرفت معلم سعید کامل، محلہ اجیاد مکہ مکرمہ

(۲)

باسمہ سبحانہ

منجانب ابی الزاہد

عزیزم زاہد سلمہ اللہ تعالیٰ

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

امید ہے کہ میرے تمام خطوط مل چکے ہوں گے اور ان سے حالات معلوم ہو چکے ہوں گے۔ اس دفعہ راقم کو خاصی تکلیف رہی ہے۔ ایک تو طوالت احرام کی وجہ سے۔ کبھی کبھی ایسی سرد ہوائیں چلتی ہیں کہ وطن میں جنوری میں چلنے والی ہواؤں کو بھی مات کر دیتی ہیں اور رات کو نیند نہیں آتی۔ سردی کی وجہ سے سر درد کرتا ہے اور حاجی صاحب اور دیگر ساتھی شاہی خراٹے مارتے ہیں۔ گکھڑ سے روانگی کے بعد آج تک ایک رات بھی اطمینان سے سونا نصیب نہیں ہوا۔ بہر حال سب دعا کرو کہ اللہ تعالیٰ حج مبرور کی توفیق عطا فرمائے اور میرے گناہوں کا کفارہ بنائے اور محترم جناب محمد شفیع صاحب ڈار مرحوم کا حج قبول فرمائے۔ آمین۔

ویسے میں کوشش کر رہا ہوں کہ فروری کی ابتدا میں جہاز کی تبدیلی ہو جائے۔ اگر خدانخواستہ اس میں کامیابی نہ ہو سکے تو پھر طلبہ کے اسباق وغیرہ کی وجہ سے سخت پریشانی ہے۔

جملہ اہل خانہ کو اور آپاں ایمنہ کے گھر میں اور تمام حاضرین اور سامعین کو سلام مسنون عرض کرنا اور ہمارے حق میں بھی دعا کرنا۔ ہم بھی اللہ تعالیٰ کے فضل وکرم سے دعا گو ہیں۔ یہ سن کر بڑی خوشی ہوئی کہ اللہ تعالیٰ نے عزیزہ زیب النساء کو بلال احمد عطا فرمایا ہے۔ دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کو صحیح معنی میں بلال بنائے، بغیر اس کے کہ وہ کالا ہو۔ لیکن تم نے یہ نہیں لکھا کہ زیب النساء گکھڑ میں ہے یا گوجرانوالہ میں ہے؟ تمام بچوں کو نماز اور تعلیم کی سخت تاکید ہے۔

محترم جناب قاری عبدالحلیم صاحب، مولانا غلام علی صاحب، قاری محمد انور صاحب اور باقی تمام قرا حضرات اور طلبہ اور نمازیوں کو جمعہ کے موقع پر سلام مسنون عرض کرنا۔ اخویم مولانا فتح علی شاہ صاحب کو بہت بہت سلام کہنا۔ قاری عبدالحلیم صاحب سے کہہ دینا کہ محترم جناب مرزا عبداللطیف صاحب ان کے خسر بھی آئے ہوئے ہیں اور ان سے ملاقات ہوئی ہے۔

احقر ابوالزاہد محمد سرفراز

معرفت معلم سعید کامل مدنی

محلہ جیاد، مکہ مکرمہ

۲ر ذوالحجہ ۱۳۹۲ھ / ۷ر جنوری ۱۹۷۲ء

(۳)

باسمہ سبحانہ

من ابی الزاہد

الیٰ عزیز القدر زاہد الراشدی سلمہ اللہ تعالیٰ من الحساد والآفات

وعلیکم السلام ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

تمہارا ارسال کردہ جمعیۃ علمائے اسلام کا برائے منظوری، منشور موصول ہوا۔ راقم اثیم ابتدا ہی سے جمعیۃ علماء اسلام سے وابستہ ہے اور دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ اسی پر تا زیست قائم رکھے۔ آمین ثم آمین۔ راقم کا ان دنوں دماغ مستحضر نہیں۔ علیل ہے۔ جمعیۃ علماء اسلام کا جو منشور ہے، وہ اپنی کوشش اور اخروی نجات کے لیے ضرور ہونا چاہیے، مگر اس میں بعض چیزیں تو محض شیخ

چلی کے پلاؤ کا مصداق ہیں۔ عملاً ان کا پتہ چلے گا، کاغذی کاروائی سے کیا معلوم ہو سکتا ہے؟ اقلیتی فرقوں میں بعض مرتد اور زندیق ہیں، ان کے لیے شرعاً ہم مسلک لوگوں کے لیے تعلیمی ادارے قائم کرنے کی گنجایش کہاں ہے؟ اور پاکستان میں آزاد و منصفانہ انتخابات کا تصور بھی نہیں ہو سکتا۔ اور اس میں اور بہت سی چیزیں ایسی ہیں جو قابل فہم اور قابل عمل نہیں ہیں اور ''۲۲ نکات کی روشنی میں ترامیم کی جائے گی'' کے جملہ کی بھی سمجھ نہیں آتی۔ گویا یہ اس کے رد کے مترادف ہے۔ بینکوں میں مضاربت، سرکاری اداروں کا تعلیم نصاب اور زکوٰۃ و عشر کے نظام پر نظر ثانی ایک چیستان ہے۔

بہرحال اخلاص کے ساتھ کوشش کرتے رہنا چاہیے تاکہ نجات اخروی کا سامان ہو۔ حاضرین مجلس سے سلام مسنون عرض کرنا۔

والسلام

احقر ابوالزاہد محمد سرفراز از گکھڑ

۲۰ر رجب ۱۴۰۸ھ / ۱۰ر مارچ ۱۹۸۸ء

(۴)

باسمہ سبحانہ

من ابی الزاہد

عزیزم زاہد سلمہ اللہ تعالیٰ

ہدیہ مسنونہ کے بعد عرض ہے کہ سنا ہے کہ دیوبندی بریلوی مصالحت ہوا چاہتی ہے۔ راقم کا وہ بیان جو جناب نیازی صاحب کے نکات کے جواب میں تھا، ابھی تک کیوں شائع نہیں ہوا؟ یہ بہت غیر ذمہ دارانہ حرکت ہے۔ چونکہ ان کے ''کنز الایمان''، ''خزائن العرفان'' اور مولویوں پر پابندی ہے، وہ اس بھنور سے اس حیلہ اور تدبیر سے اپنی راہ ہموار کرتے ہیں کہ ''فیصلہ ہفت مسئلہ'' کو سامنے رکھ کر اپنا کام ڈھیلے ڈھالے دیوبندیوں کے ذریعے نکالیں۔ اگر وہ اس پر فیصلہ چاہتے ہیں تو ہماری طرف سے یہ شرط ہوگی کہ وہ تحریر کر دیں کہ تمام علماے دیوبند مسلمان ہیں اور ہم ان کی تکفیر کرنے والوں کی تائید نہیں کرتے۔ اگر عبارات کا مسئلہ سامنے آئے تو ہماری طرف سے یہ شرط ہے کہ ان کے اکابر کی جو عبارات خلاف شرع اور قابل اعتراض ہیں، ان کی بھی وہ اصلاح کریں۔ اور اگر وہ یہ کہیں کہ ہمارے اکابر کی عبارات خلاف شرع اور قابل اعتراض نہیں ہیں تو ہمارا یہ مطالبہ ہے کہ اس کے لیے فریقین ثالث مقرر کر لیں جن میں علما کے علاوہ جج صاحبان بھی ہوں۔ جو فیصلہ وہ کریں، سب کو منظور ہو۔ اگر ہماری پیش کردہ شرائط وہ تسلیم نہیں کرتے تو ون وے ٹریفک اور ایک ہاتھ سے تالی بجانے کے ہم قائل نہیں ہیں۔ ہم اس کو کبھی برداشت نہیں کریں گے کہ وہ تو بدستور ہمارے اکابر کی تکفیر کرتے رہیں اور ہم بے غیرت ہو کر برداشت کرتے رہیں اور ان کا وقت پاس ہو جائے۔ ان مذکورہ شرائط کے خلاف صلح کرنے والے دیوبندیوں کی ہم علی الاعلان مخالفت کریں گے۔ ان شاء اللہ العزیز۔

والسلام

احقر ابوالزاہد محمد سرفراز

۱۵ر ربیع الثانی ۱۴۰۶ھ / ۲۸ر دسمبر ۱۹۸۵ء

بنام: جملہ فرزندان گرامی

باسمہ سبحانہ

من ابی الزاہد

الیٰ جملہ عزیزان سلمکم اللہ تعالیٰ

ہدیہ مسنونہ کے بعد، راقم اثیم اب قبر کے کنارے پر ہے۔ اللہ تعالیٰ خاتمہ علی الایمان کرے، آمین۔ راقم اثیم پریشان بھی ہے اور تم سب پر افسوس بھی ہے۔ وہ یہ کہ تم سے کم تنخواہ لینے والے اور تم سے بعد ملازم ہونے والے احباب نے اپنے سر چھپانے کے لیے مکانات بنا لیے ہیں اور تم لوگوں نے مساجد اور مدارس کے عارضی حجروں کو ہی پناہ گاہ بنا لیا ہے۔ موت ہر ایک کے لیے ہے اور ہر وقت ہے۔ البقاء للہ تعالیٰ وحدہ۔ آج اگر تم میں سے کسی کی وفات ہو جائے تو بمشکل ایک ماہ تک تمہارے بچوں کو اصحاب اختیار وہاں چھوڑیں گے۔ اس وقت بچوں کو جو پریشانی ہوگی، وہ بالکل عیاں ہے.... اور لوگ ظاہری قدر تم سب سے میری زیادہ کرتے ہیں، لیکن راقم اثیم گوجرانوالہ کی جیل میں دو ماہ پھر دس ماہ ملتان جیل میں رہا۔ گکھڑ کے کسی فرد نے میری خبر نہیں لی، اس لیے کہ چلتی کا نام گاڑی ہے۔ اللہ تعالیٰ جزاے خیر عطا فرمائے میاں جی مرحوم کو، دوسرے تیسرے ماہ ملتان جا کر میری خبر لے آتے تھے اور ضرورت کی اشیا دے آتے تھے۔ اس لیے اشد تاکید ہے کہ غیرت کرو اور جلدی اپنے مکان بناؤ اور منہ کے ذائقہ کو لگام دو اور جلدی اس طرف توجہ کرو۔ سرمایہ نہ ہو تو دفعۃً سارا مکان ایک دفعہ نہیں بنتا۔ تمہیں معلوم ہے کہ یہ رہایشی مکان تیس سال میں بنا ہے اور ابھی تک نامکمل ہے۔ غیرت کرو اور کاہلی ترک کر دو۔

والسلام

ابوالزاہد محمد سرفراز

۱۴ر شوال ۱۴۲۱ھ / ۱۰ر جنوری ۲۰۰۱ء

بنام: مولانا احسان اللہ احسان (ڈیرہ اسماعیل خان)

(۱)

باسمہ سبحانہ

من ابی الزاہد

الیٰ عزیز القدر جناب مولانا حافظ .... صاحب دام مجدہم

وعلیکم السلام ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

آپ کا محبت نامہ موصول ہوا۔ آپ کے اصرار و ذرہ نوازی کا شکریہ۔

عزیز القدر! ہمارا سلسلہ نقشبندی مجددی ہے اور ہمارے مرشد حضرت مولانا حسین علی صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ کے شاگرد اور حضرت خواجہ سراج الدین صاحب موسیٰ زئی شریف کے خلیفہ تھے۔ ہمارے ابتدائی

وظائف پانچ ہیں:

(۱) تیسرا کلمہ چوبیس گھنٹوں میں دو سو مرتبہ

(۲) سبحان اللہ وبحمدہ سبحان اللہ العظیم " " "

(۳) درود شریف نماز والا " " "

(۴) استغفر اللہ من کل ذنب واتوب الیہ " " "

(۵) قرآن کریم کی حسب توفیق تلاوت

اس کے علاوہ جو وظائف اور اذکار آپ کرتے یا کر سکتے ہیں، کوئی پابندی نہیں۔ وضو ہو تو نور علیٰ نور، نہ ہو تو پھر بھی وظائف کر سکتے ہیں۔

آپ کو تحریری طور پر بیعت میں شامل کر لیا گیا ہے۔ حاضرین سے سلام مسنون عرض کریں۔

والسلام

العبد الضعیف ابوالزاہد محمد سرفراز۔ از گکھڑ

۲۱ محرم الحرام ۱۴۲۴ھ / ۲۵ مارچ ۲۰۰۳ء

(۲)

باسمہ سبحانہ

من ابی الزاہد

الی عزیز القدر

وعلیکم السلام ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

آپ کا محبت نامہ موصول ہوا۔ یاد آوری کا تہہ دل [سے] ہزار شکریہ۔

عزیز القدر! اگر وہ صاحب اہل علم، صاحب عمل اور اہل حق میں سے ہیں اور جھکنے والوں نے ہاتھ چومنے کے لیے سر جھکائے ہیں تو کوئی حرج نہیں ہے، کیونکہ افراط وتفریط سے بچ کر ہاتھ چومنے جائز ہے اور ہاتھ چومنے کے لیے جھکنا ممنوع نہیں ہے۔ یہ ایک طبعی امر ہے۔ اور اگر اس کے سوا ایسی کاروائی ہوئی ہے تو اس میں کلام ہے۔ اللہ تعالیٰ محفوظ رکھے۔ آمین ثم آمین

دوستوں سے سلام مسنون عرض کریں اور راقم کے لیے خاتمہ علی الایمان کی دعا کریں۔

پیر ایک ہی ہوتا ہے۔ یکے گیر ومحکم گیر۔

والسلام

العبد الضعیف ابوالزاہد محمد سرفراز۔ از گکھڑ

۱۳ محرم الحرام ۱۴۲۴ھ / ۱۷ مارچ ۲۰۰۳ء

بنام: مجلس منتظمہ شاہ ولی اللہ یونیورسٹی گوجرانوالہ

باسمہ سبحانہ

من ابی الزاہد

الی اعضاء وارکین شاہ ولی اللہ رحمہ اللہ تعالیٰ یونیورسٹی دامت معالیکم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ مزاج سامی؟

آج ہی راقم اثیم کو ایک درخواست ملی ہے جس کو پڑھ کر انتہائی دکھ اور حیرت ہوئی ہے۔ ہم لوگ آپ کے اس دور میں دینی اور نیک جذبہ کی اور حصول مال کی تگ ودو کی تہہ دل سے قدر کرتے ہیں کہ آپ حضرات کی مساعی جمیلہ سے خاصی پیش رفت ہوئی ہے اور پہلے ہی دن سے آپ نے ہمارے نام برائے نام سرپرستوں میں رکھے ہیں۔ ہم آپ کی دیانت پر اعتماد کرتے ہوئے کبھی بھی دخیل نہیں ہوئے۔ ہمیں کوئی خبر نہیں ہوتی کہ یونیورسٹی میں کون رکھا جاتا ہے اور کون نکالا جاتا ہے اور کب رکھا جاتا ہے اور کب نکالا جاتا ہے؟ صرف ہم گنہگاروں کا نام ہی استعمال کیا جاتا ہے۔ اگر کسی ملازم میں کوئی کوتاہی ہو اور معصوم تو کوئی بھی نہیں ہوتا تو اولاً اس کو تنبیہ ہونی چاہیے اور ثانیاً اگر واقعی قصوروار ہو تو قاعدہ کے مطابق اس کو فارغ بھی کیا جا سکتا ہے مگر دفعۃً سب کو فارغ کر دینا شرعاً اخلاقاً عرفاً اور قانوناً ہرگز صحیح نہیں ہے۔ ان کے جملہ مطالبات کہ ہمیں بحال کیا جائے اور ضابطہ کے مطابق ہمارے ساتھ سلوک کیا جائے اور سالانہ ترقی کا خیال ملحوظ رکھا جائے، سب جائز اور صحیح ہیں۔

البتہ وزیر اعظم صاحب کے اعلان ریلیف فنڈ ۳۰۰ روپے ماہانہ کے نہ تو ہمارے غیر سرکاری ادارے پابند ہیں اور نہ اس پر بشمولیت نصرۃ العلوم کسی نے عمل کیا ہے۔ راقم اثیم کی ذاتی رائے یہ ہے کہ بلا کسی قیل وقال کے اس پر فوراً عمل کیا جائے اور اگر اس پر میٹنگ کی ضرورت ہو تو یکم جون ۱۹۹۷ء بروز اتوار آٹھ بجے صبح پابندیٔ وقت کے ساتھ مدرسہ نصرۃ العلوم میں رکھی جائے اور وقت کی خاص طور پر پابندی کی جائے۔ واللہ الموفق

والسلام

ابوالزاہد محمد سرفراز

۲۰ محرم ۱۴۱۸ھ / ۲۸ مئی ۱۹۹۷ء

بنام: حافظ محمد عمار خان ناصر

(۱)

باسمہ سبحانہ

من ابی الزاہد

الی عزیز القدر! عزیزی محمد عمار خان ناصر سلمہ اللہ تعالیٰ

ہدیہ مسنونہ کے بعد۔ راقم اثیم نے ''امام اعظم ابوحنیفہؒ اور عمل بالحدیث'' سرسری طور پر دیکھی ہے۔ نگاہ بھی نہیں ٹکتی اور حافظہ اور دماغ بھی ساتھ نہیں دیتا۔ چونکہ یہ تمہاری پہلی کتاب ہے اور نہایت ہی اہم مسئلہ پر ہے، اس کو موافق خوشی کی نگاہ سے اور مخالف سخت تنقیدی نگاہ سے دیکھیں گے اور جواب لکھنے والے ضرور جواب لکھیں گے، جلد یا بدیر، کیونکہ خاموشی اس فریق کی لغت میں نہیں ہے اور کسی ایسے اجہل اور منہ پھٹ کو جواب کے لیے آمادہ کریں گے جو رسالوں سے چن چن کر حضرت امام ابوحنیفہؒ پر قرآن کریم، احادیث اور حضرات صحابہ کرامؓ کے حوالوں کے خلاف حوالے نقل کر کے ایک طرف تو

خوب خوب دل کی بھڑاس نکالے گا اور دوسری طرف اپنی جماعت کے افراد کو تردیدی کتاب کا مژدہ سنا کر داد تحسین حاصل کرے گا اور وہ اسی کتاب سے چند کمزور حوالے نقل کر کے ساری دنیا میں تشہیر کریں گے، کیونکہ اس فرقہ کے پاس مالی وسائل اور پروپیگنڈا کے کرتبوں کی کمی نہیں۔ اس لیے روزانہ تھوڑا تھوڑا وقت نکال کر ایک تو کتابت کی عربی رسم الخطی کی غلطیاں درست کرو۔ ابن ابی شیبۃ اور ابن ماجۃ وغیرہ تا سے لکھو اور مؤطا میں ہمزہ لکھو اور دوسرے جس جس کتاب کا حوالہ دیا ہے، کسی کی نقل پر اعتماد نہ کرو، خود اصل کتابوں سے دیکھ کر تصحیح کرو اور اس سلسلہ میں جلد بازی نہ کرو۔ آرام آرام سے التزام کے ساتھ یہ کام کرو۔ اگر اس کتاب کی صحیح معنی میں تصحیح اور خدمت ہو جائے تو ایک بہت بڑا علمی کارنامہ ہوگا۔ ابھی کتاب میں کتابت کی اغلاط، حوالوں کی کمی اور اصل کتابوں کی طرف عدم مراجعت وغیرہ وغیرہ کی خامیاں اور امور کی خاصی کمی ہے۔ میری یہ کتاب اپنی رہنمائی کے لیے پاس رکھو اور مجھے اس کے عوض میں اور کتاب دے دو۔ صرف ابتدائی حوالے اس پر میری یادداشت کے لیے درج کردو۔

بحمد اللہ تعالیٰ وفضلہ تمہاری قیمت تو زیادہ ہے۔ میں یتیم ہوں، اس لیے صرف پانچ سو روپیہ تمہیں انعام دے رہا ہوں۔

والسلام

ابوالزاہد محمد سرفراز

۱۳/ربیع الاول ۱۴۱۷ھ/۳۰/جولائی ۱۹۹۶ء

(۲)

باسمہ سبحانہ

الیٰ عزیز القدر! عزیزم ناصر سلمہ اللہ تعالیٰ

ہدیہ مسنونہ کے بعد۔ راقم اثیم نے کتاب ''امام ابوحنیفہؒ اور عمل بالحدیث'' سرسری طور پر دیکھی۔ دماغ اور بصارت کی کمی سے پوری طرح تنقیدی نگاہ سے نہیں دیکھ سکا۔

(۱) بحمد اللہ تعالیٰ اردو بڑی سلیس اور عام فہم ہے اور بجز چند مقامات کے کسی مقام میں مطلب سمجھنے میں الجھن نہیں رہتی۔ وفقك الله تعالیٰ بازید من هذا بکرمه العمیم۔

(۲) بعض مقامات میں کتابت کی اغلاط رہ گئی ہیں۔ پوری لگن سے ان کی اصلاح کرو۔

(۳) امام ابن ابی شیبۃؒ یا دیگر بعض محدثین کے نام بغیر توصیفی الفاظ، امام، حافظ، محدث وغیرہ بعض مقامات پر مذکور ہیں۔ بعض توصیفی القاب کا ضرور خیال رہے اور آئندہ طبع میں اصلاح ہو جائے۔

(۴) امام ابن ابی شیبۃؒ کے اعتراض تو نقل کر دیے ہیں، مگر صفحات اور جلد کا حوالہ کہیں بھی درج نہیں۔ یہ کم فرصت لوگوں کے لیے تکلیف دہ چیز ہے، اس لیے ہر ہر اعتراض کی جلد اور صفحہ کا ضرور حوالہ ہونا چاہیے۔

(۵) جن کتابوں کے ج.... اور ص..... کر کے لکھا ہے، محنت کر کے حوالے درج کرو۔

(۶) ص ۱۱۰، ص ۱۱۱ اور ص ۱۱۲ میں عبارتیں آگے پیچھے اور صفحات میں گڑبڑی ہوگئی ہے۔ ان کی اصلاح درکار ہے۔

(۷) ص ۱۲۳ اور ص ۱۲۴ میں بات رہن کی ہو رہی ہے اور الفاظ بجائے راہن اور مرتہن کے خریدار اور بائع کے استعمال

کیے گئے ہیں۔

(۸) بعض مقامات میں جوابات میں کتابوں کے حوالے نہیں دیے گئے، حالانکہ کسی نہ کسی کتاب اور بزرگ کا حوالہ ضروری ہوتا ہے تاکہ دیکھنے والا کتاب کی طرف رجوع کر سکے۔ اور جن کتابوں سے جوابات نقل کیے گئے ہیں، ان کے صفحے اور جلدوں کا ضرور خیال رکھو۔ اس سے کتاب کی قدر بڑھ جاتی ہے۔

(۹) اکثر مقامات میں بخاری مع الفتح کا حوالہ دیا گیا ہے اور ظاہر امر ہے کہ فتح الباری آسانی سے نہیں ملتی اور بخاری شریف مل جاتی ہے۔ اس لیے آئندہ طبع میں بخاری کا حوالہ ہونا چاہیے۔

(۱۰) رسم الخطی کا اکثر جگہوں میں خیال نہیں رکھا گیا۔ مثلاً فقہاء کی جگہ فقہا اور علماء کی جگہ علما درج ہے اور ترضی اور ترحیم کے اشارہ کو بھی نظر انداز کیا گیا ہے، جبکہ صحابی کے نام کے ساتھ رضؓ اور ہر بزرگ کے نام کے ساتھ رحؒ کا اشارہ کم از کم ہونا چاہیے اور حضرات صحابہ کرامؓ کے نام کی ابتدا [میں] حضرت ضرور ہونا چاہیے۔

(۱۱) امام صاحبؒ پر کیے گئے اعتراضات میں ایسے بھی ہیں جن میں امام صاحبؒ متفرد نہیں بلکہ حضرات ائمہ اربعہؒ میں سے دوسرے بعض امام بھی ان کے ساتھ ہیں۔ مثلاً ص ۲۰۶ اور ص ۲۰۷ میں تیمم کا مسئلہ ہے کہ حضرت امام مالکؒ اور امام شافعیؒ بھی ان کے ساتھ ہیں۔ ان کی کتابوں سے ان کے حوالے درج کرنے سے مسئلہ کی پوزیشن مزید قوی ہو جائے گی۔ اور اسی طرح ہمت کر کے دیگر تمام اعتراضات میں حضرات ائمہ اربعہؒ اور دیگر حضرات فقہاء کرامؒ کے نام اور حوالے درج کرنے سے امام صاحبؒ کی رائے کا وزن خوب بڑھ جائے گا۔

(۱۲) ص ۲۰۶ [پر] نمبر ا میں حضرت جابرؓ کی روایت نقل کی ہے، حالانکہ یہ روایت حضرت ابن عمرؓ کی ہے۔ امام دارقطنیؒ اور امام بیہقیؒ اس کو موقوف قرار دیتے ہیں اور امام حاکمؒ اور ذہبیؒ اس کو شاہد کے طور پر پیش کرتے ہیں۔ (خزائن کو دیکھو)

(۱۳) اب چونکہ پوری دنیا میں دینی کتابیں بڑی فراوانی سے طبع ہوتی ہیں اور جلدوں اور صفحات کی تلاش میں پریشانی ہوتی ہے، اس لیے ہر کتاب کے مطبع کا حوالہ ہونا چاہیے۔ یہاں گکھڑ میں طحاوی کے دو نسخے الگ الگ مطبع کے ہیں مگر کسی کا حوالہ دوسرے نسخہ سے مطابقت نہیں رکھتا، اس لیے محنت اور لگن سے اس کا انتظام کرو۔

(۱۴) کیا تمہارے پاس دارقطنی کا کوئی نسخہ ہے جس کی تین جلدیں ہیں یا چار؟

بنام: مولانا عبدالقیوم حقانی (خالق آباد، نوشہرہ)

باسمہ سبحانہ

من ابی الزاہد

الیٰ محترم المقام حضرت العلام جناب مولانا............ صاحب دام مجدہم

وعلیکم السلام ورحمۃ اللہ وبرکاتہ مزاج سامی؟

آپ کا محبت نامہ تو کافی دنوں سے موصول ہو چکا ہے مگر مصروفیت، علالت اور کاہلی کی وجہ سے جواب میں تاخیر ہوئی۔ بار خاطر نہ ہو۔

محترم! علالت کی وجہ سے دماغ مستحضر نہیں رہتا۔ حسب ارشاد چند بے ربط جملے تحریر کر دیے ہیں۔ معیار کے مطابق

ہوں تو درج کر دیں ورنہ کوئی شکوہ نہیں ۔نو جوان طبقہ میں بفضلہ تعالیٰ آپ کی تحریر بڑی شستہ، مدلل اور معنی خیز ہوتی ہے ۔دعا ہے :اللھم زد فزد۔

اس وقت قلم کا فتنہ عروج پر ہے ۔بے دین پروفیسر اور صحافی دین کی بنیادی باتوں تک کا مذاق اڑاتے ہیں ۔ان باطل پرستوں کی علمی اور تحقیقی طور پر سرکوبی فریضہ وقت ہے ۔تقریباً نصف صدی تک راقم اثیم اپنی ناقص بساط کے مطابق باطل پرستوں کا تعاقب کرتا رہا ہے، مگر اب کبر سنی اور علالت کی وجہ سے رہ گیا ہے۔

اللہ تعالیٰ اپنے دین کا محافظ ہے ۔سرحد میں آپ کے لیے اور کراچی میں حضرت مولانا محمد یوسف صاحب لدھیانوی کے لیے خصوصیت سے دعائیں کرتا رہتا ہوں ۔اللہ تعالیٰ قبول فرمائے ۔اللہ تعالیٰ آپ حضرات کو مزید سے مزید احقاق حق اور ازالہ باطل کے لیے قوت، ہمت اور جرات بخشے ۔ویرحم اللہ عبدا قال آمینا۔

حاضرین مجلس سے سلام مسنون ارشاد فرمائیں اور مقبول دعاؤں میں فراموش نہ کریں ۔تین چار شدید بیماریوں کا شکار ہوں ۔عمر قمری لحاظ سے ۷۷ سال ہے ۔خاتمہ بر ایمان کے لیے خصوصی دعا کریں ۔بفضلہ تعالیٰ یہ عاصی بھی ہمہ وقت احباب و متعلقین کے لیے داعی رہتا ہے۔

والسلام

احقر ابوالزاہد محمد سرفراز از گکھڑ

۲۴/محرم ۱۴۰۹ھ/ ۷/ستمبر ۱۹۸۸ء

بنام: مولانا قاضی محمد اسرائیل گڑنگی (مانسہرہ)

باسمہ سبحانہ

من ابی الزاہد

محترم المقام حضرت العلام مولانا قاضی محمد اسرائیل گڑنگی صاحب دام مجدہم

وعلیکم السلام ورحمۃ اللہ وبرکاتہ   مزاج گرامی؟

آپ کا رقعہ اور قیمتی کتابوں کا ہدیہ سنیہ موصول ہوا ۔سب کا ایک ساتھ شکریہ ۔جزاکم اللہ تعالیٰ احسن الجزاء فی الدارین۔

محترم! گوناگوں علالتوں میں مبتلا ہوں ۔آنکھوں میں موتیا بھی اترا ہوا ہے اور بینائی بھی صحیح نہیں ہے ۔بڑی مشقت سے محض کتابوں کے کچھ صفحات پڑھے، دل باغ باغ ہو گیا کہ تقریری اور تحریری لحاظ سے ایک پس ماندہ خطہ میں اللہ تعالیٰ نے صاحب قلم پیدا کیا ہے جس نے عمدہ پیرایہ میں نہایت آسان لہجہ میں دینی عقائد، اعمال اور اخلاق وغیرہا کی صحیح تعبیر کی ہے۔ قلبی دعا ہے کہ

اللہ کرے زور قلم اور زیادہ

تالیف کے ساتھ درس وتدریس کا پڑھ کر اور خوشی ہوئی ۔اللہ تعالیٰ مزید سے مزید توفیق بخشے ۔آمین ثم آمین ۔اور دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ فرزند ارجمند کو حافظ، قاری، عالم اور مدرس ومقرر ومولف بنائے ۔وما ذالک علی اللہ بعزیز۔ جملہ حاضرین کو درجہ بدرجہ سلام مسنون عرض کریں اور مقبول دعاؤں میں نہ بھولیں اور خاتمہ علی الایمان کی دعا کریں ۔بفضلہ تعالیٰ

یہ خاطی وعاصی بھی داعی ہے۔

والسلام

ابوالزاہد محمد سرفراز گکھڑ

۱۸/جمادی الاولی ۱۴۱۸ھ/۲۱ستمبر ۱۹۹۷ء

بنام: مولانا نور محمد آصف (بھاؤ گھسیٹ پور، ضلع گجرات)

باسمہ سبحانہ

من ابی الزاہد

الی محترم المقام حضرت العلام مولانا......... صاحب دام مجدہم

وعلیکم السلام ورحمۃ اللہ وبرکاتہ   مزاج گرامی؟

آپ کا محبت نامہ موصول ہوا ۔یاد آوری، کرم فرمائی، حسن ظنی اور ذرہ نوازی کا تہ دل [سے] صد شکریہ، ورنہ من آنم کہ من دانم ۔کیا پدی اور کیا پدی کا شوربہ۔

محترم! آپ جس عمل پر ہیں، اس پر ڈٹ جائیں ۔اللہ تعالیٰ استقامت عطا فرمائے اور کسی کی حق کے مقابلہ میں پروانہ کریں۔

محترم! دو مصیبتوں والا معاملہ یہاں فٹ کرنا سخت نادانی ہے ۔معصیت اور ہے، مصیبت اور ہے ۔آپ نے گلستان میں ایک بزرگ کا واقعہ پڑھا ہوگا جنھوں نے کہا کہ الحمد للہ کہ بمصیبتے گرفتارم نہ بمعصیتے ۔سو گناہ ایک طرف ہو، ایک بدعت اس پر بھاری ہے کیونکہ گناہ سے دین کا نقشہ نہیں بدلتا اور بدعت سے نقشہ بدلتا ہے ۔ہمت سے کام لیں۔

صحت اچھی نہیں ۔گھر میں بھی بیماری ہے ۔دعا کریں ۔یہ خاطی بھی داعی ہے۔

والسلام

احقر ابوالزاہد محمد سرفراز از گکھڑ

۱۷/ذوالقعدہ ۱۴۰۹ھ/۲۲/جون ۱۹۸۹ء

بنام: مولانا مفتی شیر محمد (جامعہ اشرفیہ، لاہور)

باسمہ سبحانہ

من ابی الزاہد

الی محترم المقام حضرت العلام مولانا مفتی........... صاحب دام مجدہم

وعلیکم السلام ورحمۃ اللہ وبرکاتہ   مزاج سامی؟

آپ کا شفقت نامہ موصول ہوا ۔آپ سے قبل حضرت مولانا محمد عبد اللہ صاحب دام مجدہم کا احمد پور شرقیہ سے بھی اسی مضمون کا خط ملا تھا کہ تحفہ اثنا عشریہ حضرت شاہ عبد العزیز صاحبؒ ہی کی تالیف ہے ۔دہلی کے حالات کی ناسازگاری کی وجہ

سے حضرت نے توریہ سے کام لیا اور اپنے تاریخی نام پر کتاب شائع فرمائی۔ آپ دونوں بزرگوں کی رائے صحیح ہے اور اس غلطی پر آگاہ فرمانے کا صمیم قلب سے صد شکریہ۔ ان شاء اللہ العزیز آئندہ طبع میں اس کی اصلاح کر لی جائے گی اور کیا ہی اچھا ہو کہ آپ مزید اغلاط کی نشان دہی بھی فرمائیں تاکہ ان کی بھی اصلاح کر لی جائے۔

راقم اثیم کی صحت اچھی نہیں رہتی۔ گھر میں بھی بیماری اور پریشانی ہے۔ دعا فرمائیں اور حاضرین مجلس سے سلام مسنون ارشاد فرمائیں اور مقبول دعاؤں میں نہ بھولیں۔ بفضلہ تعالیٰ یہ آثم وعاصی بھی داعی ہے۔

والسلام

احقر ابوالزاہد محمد سرفراز از گکھڑ

۲۸ ربیع الاول ۱۴۰۹ھ / ۱۰ نومبر ۱۹۸۸ء

بنام: قائدین وکارکنان سپاہ صحابہؓ پاکستان

باسمہ سبحانہ وتعالیٰ

۱۷ رجب ۱۴۱۲ھ / ۲۳ جنوری ۱۹۹۱ء

من ابی الزاہد

الیٰ محترم المقام حضرت العلام جناب مولانا .... صاحب دام مجدہم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ   مزاج سامی؟

گزارش ہے کہ ''سپاہِ صحابہ رضی اللہ عنہم'' کے حضرات نے ایران کی طاغوتی طاقت کے بل بوتے اور شہ پر چلنے اور ناچنے والی رافضیت کا پاکستان میں جو دروازہ بند کیا ہے، وہ نہ صرف یہ کہ وقت کی اہم ضرورت ہے بلکہ دینی لحاظ سے بھی فرضِ کفایہ ہے۔ اللہ تعالیٰ آپ حضرات کی اس مبارک کوشش کو کامیاب کرے اور دن دوگنی رات چوگنی ترقی عطا فرمائے۔ آمین ثم آمین

اگر بارِ خاطر نہ ہو تو چند ضروری باتیں عرض کرنے کی جسارت کر رہا ہوں:

۱۔ جو ذہن آپ حضرات نے نوجوانوں کا بنایا ہے یا بنائیں گے، وہی وہ اپنائیں گے۔ کیونکہ اکثریت اُن کی علم دین بھی نہیں رکھتی اور اکابر کو بھی نہیں دیکھا۔ جو آپ اُن کو بتائیں گے، اُسی کو وہ حرفِ آخر سمجھیں گے اور تن من دھن کی بازی لگائیں گے۔ واللہ الموفق

۲۔ نوجوان جذباتی ہوتے ہیں اور جذبات میں بہت کچھ ''کر'' اور ''کہہ'' جاتے ہیں۔ شدت اور سختی سے کبھی مسائل حل نہیں ہوئے اور نہ قوت وطاقت سے کسی فرد یا نظریہ کو ختم کیا جا سکتا ہے۔ صدر صدام حسین کی ضد اور نادانی کی وجہ سے تیس سے زائد طاقتور حکومتیں بھی اُسے ختم نہ کر سکیں اور وہ ابھی تک جیتا جاگتا ہے۔ اس لیے گزارش ہے کہ نوجوانوں کو قولاً اور فعلاً شدت اختیار کرنے سے سختی کے ساتھ روکیں۔ رافضیوں کے کفر میں تو شک ہی نہیں مگر ''در و دیوار'' پر ''کافر، کافر'' لکھنے اور ''نعرہ بازی'' سے بجائے فائدہ کے نقصان ہوگا۔ ؎ عیاں را چہ بیاں

۳۔ ممکن ہے بعض جذباتی اور سطحی اذہان میری اس تحریر سے یہ اخذ کریں کہ میں ''بک'' گیا ہوں یا ''دب'' گیا ہوں تو یہ نظریہ درست نہ ہوگا۔ بفضلہ تعالیٰ یہ گناہگار انتہائی غربت اور جوانی کے زمانہ میں بھی نہ بکا ہے نہ دبا ہے، اب اسی (۸۰)

سال کی عمر میں قبر کے پاس پہنچ کر کیسے ''بک'' یا ''دب'' سکتا ہے؟

۴۔ کافی عرصہ ہوا ہے حضرت مولانا عطاء المنعم شاہ صاحب دام مجدہم نے حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کے سرکاری طور پر یوم منانے کی تحریک شروع کرنے کا ارادہ کیا تھا۔ میں نے اُن کو مفصل خط لکھا تھا کہ آپ کے والد محترم امیر شریعت رحمہ اللہ تو بدعات کو مٹانے کے لیے لٹھ لیے پھرتے تھے، آپ اس بدعت کو کیسے جاری کرتے ہیں۔ میرے خیال میں میرا عریضہ ضرور مؤثر ہوا اور اُس کے بعد اُن کا کوئی بیان اس بدعت کے ایجاد کرنے کا میرے علم میں نہیں۔

۵۔ آپ حضرات کی طرف سے زور وشور کے ساتھ حضرات خلفاء راشدینؓ کے ایام سرکاری طور پر منوانے کا مطالبہ آتا ہے۔ آپ جن اکابر کے دامن سے وابستہ ہیں، اُن کی تاریخ دیکھ لیجیے، کبھی ایسی بدعات کے ایجاد کا تصور بھی اُنہیں نہیں آیا۔ عوام تو نہیں جانتے مگر آپ تو علما ہیں، وسیع مطالعہ کے مالک ہیں، اس کاروائی کے بدعت ہونے کے بارے میں آپ حضرات کے سامنے کتابوں کے حوالہ پیش کرنا سورج کو چراغ دکھانے کے مترادف ہے۔ ولا ریب فیہ

۶۔ آپ حضرات کا مطالبہ صرف اور صرف ''خلافت راشدہ'' کا نظام قائم کرنے کا ہونا چاہیے جو حکمران اور سرمایہ دار طبقوں کے لیے پیام موت ہے۔ ایام منوانے کی بدعت کے پیچھے ہرگز نہ پڑیں۔ خلافت راشدہ کے نظام کے نافذ کرنے کے مطالبہ میں عند اللہ تعالیٰ بھی آپ سرخرو ہوں گے اور عوام کا تعاون بھی حاصل رہے گا۔

۷۔ اگر خدانخواستہ آپ کے ایام منانے کی کوئی شق منظور کر لی گئی تو حکمران طبقہ بھی اور عوام بھی یہ باور کریں گے کہ ''ان کو اَب خاموش رہنا چاہیے، ان کا مطالبہ پورا ہو گیا ہے''۔ اِس سے آپ کے اصل مقصد پر زد پڑے گی۔ بھٹو صاحب نے جمعہ کے دن کی چھٹی کرنے پر کہہ دیا تھا کہ ''لو! اب اسلام نافذ ہو گیا ہے اور کیا چاہتے ہو؟'' اور ہاں میں ہاں ملانے والے ہر دور میں رہتے ہیں، اب بھی کمی نہیں ہے۔

۸۔ زہریلے قسم کے اہل بدعت سخت پروپیگنڈا کر رہے ہیں۔ ماہ جنوری ۱۹۹۱ء کا ''رضائے مصطفیٰ'' ضرور بر ضرور دیکھیں۔ وما علینا الا البلاغ

والسلام

ابوالزاہد محمد سرفراز۔ از گکھڑ

(۲)

باسمہ سبحانہ وتعالیٰ

من ابی الزاہد

الیٰ محترم المقام جناب   صاحب دام مجدہم

وعلیکم السلام ورحمۃ اللہ وبرکاتہ   مزاج سامی؟

آپ کا مکتوب موصول ہوا۔ یاد آوری اور ذرہ نوازی کا تہ دل [سے] ہزار شکریہ، ورنہ من آنم کہ من دانم۔

محترم! میں نے واقعی انجمن سپاہ صحابہؓ اور جمعیۃ علماء اسلام کے بعض حضرات کو تحریر بھیجی ہے، نتیجہ کا مجھے علم نہیں۔

آپ کو معلوم ہے کہ راقم اثیم دیوبندی مکتب فکر سے تعلق رکھتا ہے اور اس مکتب فکر کے حضرات نے توحید وسنت کی نشر و

اشاعت اور شرک وبدعت کی علمی اور عملی لحاظ سے جس طرح تردید اور سرکوبی کی ہے، وہ اظہر من الشمس ہے اور خود راقم اثیم نے بھی ''راہ سنت'' وغیرہ کتب میں جو کچھ بیان کیا ہے، وہ آپ کے پیش نظر ہی ہوگا۔ عیاں راچہ بیاں۔

پورے ہفتہ کے دنوں میں جمعہ سید الایام ہے: ان یوم الجمعة سید الایام (ابن ماجہ ص ۷۷ ومشکوٰۃ ص ۱۲۰) اور لیلۃ الجمعۃ کی فضیلت کا کون مسلمان انکار کر سکتا ہے؟ مگر بایں ہمہ حضرت ابو ہریرہؓ آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں:

قال لا تختصوا لیلة الجمعة بقیام من بین اللیالی ولا تختصوا یوم الجمعة بصیام من بین الایام الا ان یکون فی صوم یصوم احدکم (مسلم ج ۱ ص ۳۶۱)

''آپ نے فرمایا کہ تم راتوں میں سے جمعہ کی رات کو قیام اور عبادت کے لیے مختص نہ کرو اور دنوں میں سے جمعہ کے دن کو روزہ کے لیے مخصوص نہ کرو، ہاں مگر جب جمعہ ان دنوں میں آ جائے جن میں تم روزہ رکھتے ہو (یعنی رمضان اور ایام بیض وغیرہ)۔''

کون مسلمان رات کی عبادت اور قیام کا انکار کر سکتا ہے؟ اور کون روزہ کی فضیلت کا منکر ہو سکتا ہے؟ مگر آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے امت کو یہ سبق دیا کہ تم اپنی طرف سے کسی نیکی کے لیے رات اور دن کے متعین کرنے کے مجاز نہیں۔ حضرات خلفائے راشدین تو کجا، ہم اس کے قائل ہیں کہ جس مجلس میں اللہ تعالیٰ کے کسی نیک بندے کا ذکر ہوا، وہاں خدا تعالیٰ کی رحمت نازل ہوتی ہے۔ ان حضرات کا ذکر تو دین ہی کا ایک پہلو اور شعبہ ہے، مگر غیر قوموں کی نقالی کر کے حضرات خلفائے راشدین کے پیش کردہ نظام کو نہ اپنانا اور صرف مخصوص دنوں میں ایام منا لینا ان سے مذاق کے مترادف ہے۔ ایام تو نکمی قومیں منایا کرتی ہیں جن کو صرف بزرگوں کے نام سے تعلق ہوتا ہے، کام سے نہیں۔ بزرگوں کی صحیح پیروی کرنے والی قومیں تو اپنے بزرگوں کے کام اور ان کے لائے ہوئے پروگرام پر عمل پیرا ہوتی ہیں۔ نری محبت اور دعوائے عقیدت سے کچھ نہیں بنتا۔ محض غیروں کی نقالی کہ وہ خاص دن مناتے ہیں، ہم بھی منائیں، اسلامی روح کے خلاف ہے۔

حضرت ابو واقد اللیثی (الحارث بن عوف المتوفی ۶۸ھ) سے روایت ہے:

ان رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم لما خرج الی حنین مر بشجرة للمشرکین یقال لها ذات انواط یعلقون علیها اسلحتهم فقالوا یا رسول اللہ! اجعل لنا ذات انواط کما لهم ذات انواط فقال النبی صلی اللہ علیہ وسلم سبحان اللہ! هذا کما قال قوم موسی اجعل لنا الها کما لهم آلهة والذی نفسی بیده لترکبن سنة من قبلکم ۔ هذا حدیث حسن صحیح (ترمذی ج ۲ ص ۴۱ ومسند احمد ج ۵ ص ۲۱۸)

''جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم حنین کی طرف نکلے تو ایک درخت کے قریب سے گزرے جو مشرکین کے ہاں متبرک تھا جس کو ذات انواط کہتے تھے اور (حصول تبرک کے لیے) وہ اس پر اپنے ہتھیار لٹکاتے تھے۔ (بعض) صحابہ نے کہا ہمارے لیے بھی ذات انواط مقرر کریں، جیسا کہ ان کا ہے۔ آپ نے فرمایا: سبحان اللہ، یہ تو ایسا ہے جیسا کہ موسیٰ علیہ السلام کی قوم نے کہا تھا کہ ہمارے لیے بھی ایک الٰہ بنائیں جیسا کہ ان (کنعانیوں) کا ہے۔ پھر

آپ نے فرمایا: اس ذات کی قسم ہے جس کے قبضہ میں میری جان ہے، تم ضرور ان لوگوں کے طریقے پر چلو گے جو تم سے پہلے ہوئے۔''

مشرکین کا عقیدہ تو ان کے ساتھ تھا، مگر حضرات صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم کے بارے میں، جو آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے فیض یافتہ اور آپ سے تربیت پانے والے تھے، یہ تصور نہیں کیا جا سکتا کہ وہ درخت کو الٰہ بنانے کے درپے تھے اور آپ سے اس کی اجازت چاہتے تھے کہ کسی درخت کو ان کا الٰہ بنایا جائے۔ معاذ اللہ تعالیٰ۔ یہی کہا جا سکتا ہے کہ انھوں نے محض تبرک کے لیے کسی درخت کی تعیین کا مطالبہ کیا تھا، لیکن آپ نے اس پر سخت ناراضگی کا اظہار کیا اور لفظ سبحان اللہ فرما کر ان کی تردید فرمائی اور پھر حضرت موسیٰ علیہ السلام کی قوم کا حوالہ دیا۔ اس سے ثابت ہوا کہ مسلمانوں کو غیروں کی نقالی نہیں کرنی چاہیے۔ عیسائیوں نے حضرت عیسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام کا دن منایا اور مناتے ہیں اور اس امت کے بعض لوگوں نے 'لترکبن سنة من کان قبلکم' پر عمل پیرا ہو کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت باسعادت کا دن بعنوان میلاد منانا شروع کر دیا جو شریعت کے لحاظ سے تو بدعت ہے ہی، عشق ومحبت کے اعتبار سے بھی بدعت ہے تو اپنے محبوب کی ہر دن اور ہر آن یاد کرنے کی بجائے ایک ہی دن مقرر کیا جائے اور اس میں خوشی کا اظہار کیا جائے، محبوب کی محبت کا تو یہ تقاضا ہرگز نہیں۔ محبوب کا ذکر تو پورے سال، ہر ماہ، ہر دن، ہر گھڑی، ہر آن مطلوب ہے۔ یہاں سال کی انتظار کا کیا معنی؟

قاصد پیام شوق کو اتنا نہ کر طویل
کہنا فقط یہ ان سے کہ آنکھیں ترس گئیں

معلوم نہیں کہ آپ کی عمر کیا ہے؟ راقم اثیم جوان تھا۔ ۱۹۲۹ء کے لگ بھگ جناب حاجی عنایت اللہ صاحب قادری، جو پہلے ہندو تھے، پھر مسلمان ہوئے۔ جب ہندو تھے تو رام لیلیٰ کا جلوس نکالتے تھے۔ مسلمان ہوئے تو انھوں نے میلاد النبی صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کا جلوس ایجاد کیا۔ اس کے موجد جناب قادری صاحب تاہنوز لاہور میں زندہ ہیں۔ ان کے اس کاروائی میں دست راست مولوی عبد المجید صاحب ساکن پٹی، جو ''ایمان'' رسالہ بھی نکالتے تھے اور دست چپ سابق میئر لاہور میاں شجاع الرحمٰن کے والد الحاج عبد القادر صاحب تھے جو دونوں بزرگ وفات پا چکے ہیں۔ بانی ابھی تک زندہ ہیں۔ عجیب بات ہے کہ یہ جلوس بریلوی مسلک کے علما، مشائخ اور مفتیوں کو حتیٰ کہ ان کے اعلیٰ حضرت کو بھی نہیں سوجھا، مگر ایک نومسلم ہندو کی یہ کاروائی اب عشق، محبت اور دین بن گئی ہے ورجلوس نہ نکالنے والوں پر آوازے کسے جاتے ہیں اور ان کو حقارت کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔ فالی اللہ تعالیٰ المشتکی۔ ان بے چاروں نے یہ کاروائی آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی محبت میں کی ہے، مگر دیکھنا یہ ہے کہ اس محبت کی شریعت میں کیا قدر ہے؟ اگر واقعی یہ محبت ہوتی تو حضرات خلفائے راشدین اور بقیہ حضرات صحابہ کرام، تابعین، تبع تابعین اور تاہنوز حضرات سلفؒ سے یہ ہرگز نہ چھوٹتی۔ حافظ ابن کثیرؒ (المتوفی ۷۷۴ھ) نے کیا خوب فرمایا ہے:

واما اهل السنة والجماعة فیقولون فی کل فعل وقول لم یثبت عن الصحابة رضی اللہ عنهم هو بدعة لانه لو کان خیرا لسبقونا الیه لانهم لم یترکوا خصلة من خصال الخیر الا وقد بادروا الیها (تفسیر ابن کثیر ج ۱ ص ۱۵۴)

''بہر حال اہل السنت والجماعت یہ کہتے ہیں کہ جو فعل اور قول حضرات صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم سے ثابت نہیں، وہ بدعت ہے کیونکہ اگر وہ فعل اور قول بہتر ہوتا تو وہ اس کی طرف سبقت کرتے، اس لیے کہ خیر کی کوئی خصلت ایسی نہیں جس کی طرف انھوں نے مبادرت نہ کی ہو۔''

سنت اور بدعت کو پرکھنے کے لیے یہ بہترین کسوٹی ہے، بشرطیکہ کوئی شخص ضد اور عناد کو نہ چھوڑنے کی قسم نہ کھا چکا ہو اور بدعت کی نحوست سے اس کی قلبی استعداد ختم نہ ہو چکی ہو۔ حدیث میں آتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہر بدعتی کے لیے توبہ کا دروازہ بند کر دیا ہے۔ حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے فرمایا:

ان اللہ حجب التوبۃ عن کل صاحب بدعۃ

(رواہ الطبرانی فی الاوسط ورجالہ رجال الصحیح غیر ہارون بن موسیٰ الفروی وھو ثقۃ: مجمع الزوائد ج ۱۰ ص ۱۸۹)

''بے شک اللہ تعالیٰ نے ہر بدعتی پر توبہ کا دروازہ بند کر دیا ہے۔''

ایک تو بدعت کی سیاہی اور نحوست سے حق کے قبول کرنے کی استعداد ہی ختم ہو جاتی ہے اور دوسرے جب بدعت کو آدمی کار ثواب سمجھے گا تو توبہ کیوں کرے گا؟ توبہ تو گناہ اور کار بد سے ہوتی ہے نہ کہ نیکی اور کار ثواب سے، مگر اس کے لیے حقیقت شناسی ضروری ہے۔ ہر نگاہ کام نہیں دیتی۔

اے اہل نظر ذوق نظر خوب ہے لیکن
جو شے کی حقیقت کو نہ دیکھے وہ نظر کیا

مومن کا شیوہ یہ ہے کہ اپنی ذاتی محبت اور اپنی پسند کو شریعت اور آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی محبت اور پسند پر قربان کر دے۔ حضرت انسؓ (المتوفی ۹۳ھ) کی روایت ہے کہ:

قال لم یکن شخص احب الیھم من رسول اللہ صلی اللہ تعالی علیہ وسلم قال وکانوا اذا راوہ لم یقوموا لما یعلمون من کراھیتہ لذلک (شمائل ترمذی ص ۲۴ و مسند احمد ج ۳ ص ۱۳۲)

''حضرات صحابہ کرام کے نزدیک آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے زیادہ محبوب کوئی اور نہ تھا اور فرماتے ہیں کہ صحابہ آپ کو دیکھتے تو کھڑے نہ ہوتے تھے، کیونکہ وہ جانتے تھے کہ آپ اس کو پسند نہیں کرتے۔''

یہ ہے اصلی اور صحیح محبت کہ حضرات صحابہ کرامؓ آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کو اللہ تعالیٰ کی مخلوق میں سب سے زیادہ محبوب سمجھتے ہوئے بھی آپ کے تشریف لانے پر احتراماً وتعظیماً نہیں کھڑے ہوتے تھے، حالانکہ شرعاً یہ جائز تھا اور ہے، مگر آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم چونکہ اس کاروائی کو پسند نہ فرماتے تھے، اس لیے حضرات صحابہ کرام اپنی پسند پر آپ کی پسند کو ترجیح دیتے تھے۔ اور مطیع وفرماں بردار مومن کا یہی کام ہے اور صرف یہی ہونا چاہیے۔

وہی بالا ہیں جو دنیا میں اپنا نیک وبد سمجھیں   یہ نکتہ وہ ہے جس کو اہل دل اہل خرد سمجھیں

اس ضروری تمہید کے بعد شق وار جوابات ملاحظہ فرمائیں:

۱) اثنا عشری فرقہ ہو یا کوئی اور باطل فرقہ، ان میں باہمی اتحاد، اپنے مسلک سے گہری وابستگی، مالی ایثار اور قربانی کا جو جذبہ ہے، وہ مجموعی لحاظ سے اہل حق میں مفقود ہے۔ ان کی اپنی اپنی تنظیمیں ہیں اور مشترک نقطہ پر بھی ان کا اتفاق مشکل

ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے افسر ہوں یا وزیر اپنے مسلک والوں کی رعایت ہم دردی اور ان کی ترقی برملا کرتے ہیں، جبکہ اپنے آپ کو سنی کہلانے والے برملا اپنے کو سنی کہنے کی ہمت اور جرات بھی نہیں کرتے اور رافضیوں کا تقیہ مفت میں ان کو الاٹ ہو گیا ہے اور عموماً اہل حق کے جلسوں اور محفلوں میں شریک ہونا اپنے لیے نقصان دہ سمجھتے ہیں۔ نتیجہ بالکل واضح ہے کہ فعال گروہ اور غیر فعال کبھی برابر نہیں ہو سکتا۔

۲) اہل السنت والجماعت میں اتفاق، اتحاد، یک جہتی اور مسلکی جذبہ نہ ہونے کی وجہ سے اثنا عشری ساری سرکار کو استعمال کرتے ہیں اور ان کی شنوائی ہوتی ہے، حالانکہ تقریباً تین فیصد ان کی آبادی ہے اور آپ حضرات ستانوے فی صد ہوتے ہوئے بھی اپنے مطالبات نہیں منوا سکتے۔ اتنا مطالبہ تو قانوناً آپ کا حق ہے کہ قومی خزانہ اور سرکاری گاڑیاں ایک فرقہ کے لیے کیوں استعمال ہوتی ہیں؟

۳) آپ کا یہ مطالبہ ہونا چاہیے کہ جس طرح محرم کے ابتدائی دنوں میں گانے بجانے کے پروگرام معطل ہوتے ہیں، اسی طرح بارہ مہینے یہ خرافات بند ہونی چاہییں کیونکہ اسلام اس کی اجازت نہیں دیتا۔

۴) اور جس طرح ریڈیو، ٹی وی وغیرہ سرکاری اداروں میں حضرات اہل بیت رضی اللہ تعالیٰ عنہم کے مناقب اور فضائل بیان کیے جاتے ہیں اور کھلی اجازت ملتی ہے، اسی طرح حضرات خلفائے راشدین اور دیگر حضرات صحابہ کرام حضرت امیر معاویہ اور حضرت ابوسفیان کے فضل وکمال کے بیان کی بھی کھلی اجازت ہو اور [ان کی توہین وتنقیص پر مشتمل] ایسا لٹریچر جو فارسی زبان میں ہو یا اردو وغیرہ میں، قدیم کتابوں میں ہو یا جدید میں، سب ضبط ہونا چاہیے۔

ہماری قلبی دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ آپ کو توفیق دے کہ ملک میں امن وامان کو برقرار رکھتے ہوئے اور قانون کی پابندی کرتے ہوئے اپنے مطالبات آپ منوا سکیں اور نوجوان طبقہ کی ذہنی تربیت اور ان کو جادۂ اعتدال میں رکھنے کی سعی کرتے ہیں۔ وما علینا الا البلاغ۔

احقر ابوالزاہد محمد سرفراز

۲۴ رجب ۱۴۱۲ھ / ۳۰ جنوری ۱۹۹۲ء

بنام: شبیر احمد خان میواتی (ندوۃ المعارف، لاہور)

باسمہ سبحانہ وتعالیٰ

من ابی الزاہد

الی محترم المقام جناب مولانا............ صاحب دام مجدہم

وعلیکم السلام ورحمۃ اللہ وبرکاتہ   مزاج سامی؟

آپ کا مکتوب گرامی ملا۔ یاد آوری کا تہ دل [سے] صد شکریہ۔

محترم! آپ نے تحریر فرمایا ہے کہ حضرت مولانا قاری عبد الرشید صاحب مرحوم کے بارے میں ان کی دینی خدمات پر مضمون درکار ہے۔ راقم علیل اور بے حد مصروف رہتا ہے۔ کچھ لکھنے کے لیے دماغ مستحضر نہیں ہے۔ اتنا ہی عرض کر سکتا ہے کہ مرحوم نوجوان علما میں بڑے مستعد، حساس اور صحیح عقیدہ کی اشاعت میں بڑے مخلص تھے۔ کئی مرتبہ میرے پاس آئے اور

آخری مرتبہ آئے اور یہ کہا کہ آپ ہمارے اکابر کی نشانی ہیں اور آپ کی بات موثر ہے۔ سپاہ صحابہؓ کے قائدین حضرات تو بڑے مصلح اور مبلغ لوگ ہیں، نوجوان طبقہ میں بعض جذباتی ہیں، ان کی اصلاح ہونی چاہیے ورنہ مسلک کو سخت نقصان پہنچے گا۔ ان کی تحریک پر راقم نے یہ خط لکھا اور متعدد ذمہ دار حضرات تک پہنچایا۔ جواب آیا تو اس کا جواب الجواب بھی لکھا ہے جو مطبوع ہے۔ اس کے محرک مرحوم ہی تھے۔

یہ خط بھی ارسال ہے۔ کلاً یا بعضاً اشاعت کی اجازت ہے۔ اس سے زیادہ کچھ لکھنا اب میرے بس میں نہیں ہے۔ حاضرین سے سلام مسنون ارشاد فرمائیں اور نیک دعاؤں میں نہ بھولیں۔ بفضلہ تعالیٰ یہ خاطی بھی داعی ہے۔

والسلام

ابوالزاہد محمد سرفراز

۲۰ر محرم ۱۴۱۴ھ / ۲۲ر جولائی ۱۹۹۲ء

بنام: مولانا مشتاق احمد چنیوٹی (جامعہ عربیہ، چنیوٹ)

باسمہ سبحانہ

من ابی الزاہد

الیٰ محترم المقام حضرت العلام مولانا .... صاحب دام مجدہم

وعلیکم السلام ورحمۃ اللہ وبرکاتہ   مزاج گرامی؟

آپ کا گرامی نامہ موصول ہوا۔ حسن عقیدت اور خوش اعتمادی کا شکریہ!

محترم!

(۱) راقم اثیم ایک اشد مجبوری کی وجہ سے انگلستان چلا گیا تھا۔ چند دن ہوئے کہ واپس آیا ہے۔ معلوم ہوا ہے کہ مولانا مفتی عبدالشکور صاحب چھٹی پر ہیں۔ ابھی تک آئے نہیں۔ اس لیے ان سے بات کیے بغیر کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ علاوہ ازیں گزارش ہے کہ آپ خود صاحب بصیرت ہیں۔ تحریر فرما دیں۔ اگر کوئی کمی ہوگی (اور کس مصنف کی کتاب میں نہیں ہوتی؟) تو ان شاء اللہ العزیز دوسرے ایڈیشن میں اصلاح ہو جائے گی۔ ہمت سے کام لیں۔ واللہ ینصرك۔

(۲) آپ آگے بھی اجازت دے سکتے ہیں، لیکن کسی ایسے لالچی آدمی کو نہ دیں جو لوگوں کی کھالیں اتارے اور ان کے پاس صرف ہڈیاں ہی رہنے دے۔ عمل کے لیے چلہ یہ ہے کہ تین نفلی روزے رکھے جائیں۔ پھر تعویذ موثر ہوگا۔ آپ کے والد ماجد صاحب دام مجدہم کو بھی اسی شرط کے ساتھ اجازت ہے جو پہلے آپ کو تحریر کی گئی ہے۔

(۳) (الف) راقم اثیم نے ایک قسم کا حلف اٹھایا ہوا ہے کہ خود حوالہ نہیں بتائے گا۔ جوئندہ یابندہ۔

(ب) راقم اثیم نے پہلے عرض کیا تھا کہ ہمارے پاس جو فتاویٰ عبدالحیؒ ہے، فارسی اور اردو کا مجموعہ ہے۔ اس کی تین ہی جلدیں ہیں۔ ممکن ہے مترجمین نے سہولت کے لیے اسے اردو کی چار جلدوں میں طبع کرا دیا ہو۔ واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب۔

(۴) ہمارا مدرسہ پہلے رجسٹرڈ بھی نہ تھا اور اس کا وفاق المدارس سے الحاق بھی نہ تھا، مگر چند مجبوریوں کی وجہ سے اب رجسٹرڈ بھی ہے اور ملحق بھی۔ آپ کا یہ خیال نظر انداز کرنے کے قابل نہیں کہ الحاق کے بعد فوج اور سکولوں میں چلے جائیں گے اور

ہمارا مشاہدہ ہے کہ ایسا ہوا ہے، لیکن اپنا پچاس سالہ تجربہ یہ ہے کہ فوج اور سکول میں وہی جاتے ہیں جو علمی طور پر کمزور ہوتے ہیں اور صرف سند کے سہارے جیتے ہیں اور وہ بخوبی جانتے ہیں کہ ہم عربی مدارس میں طلبہ کو مطمئن نہیں کر سکتے۔ راقم اثیم کا خیال ہے کہ ان کا وہاں جانا ہی بہتر ہے تاکہ وہاں بھی مسلک کا کچھ نہ کچھ بیان اور اثر ہو، ورنہ اہل بدعت وغیرہ وہاں چھا گئے تو پھر بہت نقصان ہوگا۔ اور نصرۃ العلوم کے کئی فارغ فوج اور سکولوں میں ڈٹ کر مسلک کا کام کرتے ہیں اور بڑی جرات کا مظاہرہ کر رہے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان کو مزید توفیق مرحمت فرمائے۔ آمین ثم آمین۔

باقی رہے وہ حضرات جو بخوبی کتابیں پڑھا سکتے ہیں، گو وہ تعداد میں بہت کم ہوتے ہیں، لیکن ماشاء اللہ ہر سال ضرور ہوتے ہیں۔ وہ آپ کی طرح طبعاً فوج اور سکول میں جانے سے نفرت کرتے ہیں۔ وہ مدارس ہی کا رخ کرتے ہیں اور درس نظامی پڑھانے میں مشغول ہو جاتے ہیں۔ اور وفاق المدارس سے فارغ شدہ حضرات کے لیے مدارس میں کھپت کی اتنی جگہ ہی نہیں ہوتی اور نہ طلبہ نئے مدرس پر پوری طرح مطمئن ہوتے ہیں۔ یہاں تو سالہا سال کے بعد کہیں پوزیشن قائم ہوتی ہے، الا من شاء اللہ تعالیٰ۔ دعا فرمائیں کہ اللہ تعالیٰ ہمیں بھی اور درس نظامی سے فارغ ہونے والوں، سب کو حسن نیت کی توفیق ارزاں فرمائے اور اس پر استقامت عطا فرمائے۔

حضرت والد صاحب دام مجدہم اور دیگر حاضرین مجلس سے سلام مسنون عرض کریں۔ مقبول دعاؤں میں نہ بھولیں۔ بفضلہ تعالیٰ طالب دعا بھی داعی بالخیر ہے۔

والسلام

احقر ابوالزاہد محمد سرفراز از گکھڑ

۲ر اکتوبر ۱۹۷۸ء

بنام: مولانا مفتی محمد اسلم حاصل پوری

باسمہ سبحانہ

من ابی الزاہد

الیٰ محترم المقام جناب مولانا .... صاحب دام مجدہم

وعلیکم وعلیٰ من لدیکم السلام ورحمۃ اللہ وبرکاتہ   مزاج سامی؟

آپ کا محبت نامہ موصول ہوا۔ یاد آوری کا تہ دل سے ہزار شکریہ!

محترم! تین نفلی روزے رکھیں اور بغیر طمع ولالچ کے مخلوق خدا کے فائدہ کی خاطر تعویذات لکھ دیں۔ اگر کوئی اپنی مرضی سے تھوڑی یا زیادہ خدمت کر دے تو بالکل حلال وطیب ہے، لا ریب فیہ۔ مگر طلب کرنا ہمارے اکابر کے طریقہ کے خلاف ہے۔ اسی شرط پر اوروں کو بھی اجازت دے سکتے ہیں، کیونکہ مخلوق خدا کو فائدہ پہنچانا عمدہ نیکی ہے۔ راقم اثیم کی قلبی دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ آپ کو علم وعمل اور نفع رسانی کی زندگی عطا فرمائے، وما ذالك علی الله بعزیز۔

استاد محترم حضرت العلام مولانا صاحب دام مجدہم اور دیگر حضرات سامعین واساتذہ کرام سے خصوصاً مولانا مشتاق احمد صاحب سے سلام مسنون عرض کریں۔ راقم اثیم خود بھی علیل ہے۔ گھر میں بھی علالت ہے۔ دعوات مستجابات میں نہ بھولیں۔

بفضلہ تعالیٰ یہ خاطی وعاصی بھی داعی ہے۔

والسلام

احقر ابوالزاہد محمد سرفراز از گکھڑ

۲۱رشوال ۱۴۱۰ھ/۱۷رمئی ۱۹۹۰ء

بنام: مولانا محمد عبدالمعبود (راول پنڈی)

(۱)

باسمہ سبحانہ

الیٰ محترم المقام جناب حضرت مولانا...... صاحب دام مجدکم

وعلیکم السلام ورحمۃ اللہ وبرکاتہ۔ مزاج گرامی؟

یادآوری کا تہ دل صد درصد شکریہ۔

آپ بہتر یہ ہے کہ تقویۃ الایمان مصنفہ حضرت شاہ اسمٰعیل شہید (المتوفی ۱۲۴۶ھ) کا مطالعہ کریں۔ آپ اہل علم ہیں اور اہل نظر بھی، آپ کے سامنے حقیقت بے نقاب ہو جائے گی۔ حضرت شاہ صاحبؒ نے اعبدوا ربکم واکرموا اخاکم (الحدیث) کے ترجمہ میں فائدہ بیان کرتے ہوئے یہ تحریر فرمایا ہے کہ عبادت تو صرف اللہ تعالیٰ ہی کی ہو سکتی ہے، اپنے بھائی کی یعنی میری عزت کرو۔ تم چھوٹے بھائی ہو، میں بڑا ہوں۔ (محصلہ) جس مقام پر انھوں نے لکھا ہے، ہرگز ہرگز وہاں توہین کا کوئی پہلو نہیں نکلتا۔ ناانصافی کا دنیا میں کوئی علاج نہیں ہے۔ تقویۃ الایمان راول پنڈی وغیرہ سے مل جائے گی۔ ضرور مطالعہ فرمائیں۔

اپنے احباب سے سلام مسنون عرض کریں اور میرے حق میں دعائے خیر کرتے رہیں۔

والسلام

احقر ابوالزاہد از گکھڑ

۲۱رشوال ۱۳۷۷ھ/۱۱رمئی ۱۹۹۸ء

(۲)

باسمہ سبحانہ وتعالیٰ

من ابی الزاہد

الیٰ محترم المقام حضرت العلام جناب مولانا........... صاحب دام مجدہم

وعلیکم السلام ورحمۃ اللہ وبرکاتہ مزاج سامی؟

آپ کا محبت نامہ ملا۔ یادآوری، کرم فرمائی، حسن ظنی اور ذرہ نوازی کا صمیم قلب سے ہزار شکریہ، ورنہ من آنم کہ من دانم۔ کیا پدی اور کیا پدی کا شوربا!

محترم! آپ کا گرامی نامہ تو کافی دنوں سے موصول ہو چکا ہے مگر مدرسہ نصرۃ العلوم میں نصاب کی تکمیل پھر سالانہ امتحان

کے سلسلے کی مصروفیت، فیصل آباد، سیالکوٹ اور شیخوپورہ وغیرہ کے تین چار پروگرام، پھر بروز جمعہ ساڑھے گیارہ [سال] عمر کے پوتے کا مسجد کی چھت سے گر کر فوت ہو جانا اور مہمانوں کی بکثرت آمد ایسے عوارضات پیش آئے کہ جلدی جواب نہ دیا جا سکا، لہٰذا تاخیر جواب بار خاطر نہ ہو۔

محترم! حضرت مولانا غلام غوث صاحب ہزاروی رحمہ اللہ تعالیٰ نے مانسہرہ میں مولوی غلام محمد صاحب بالاکوٹی عرضی ویس کے اہتمام میں انجمن اصلاح الرسوم کے عنوان سے ایک مدرسہ قائم کیا تھا جس میں راقم اثیم نے حضرت سے تعلیم اسلام کے چند اسباق پڑھے تھے۔ پھر حضرت کے مزاج کی تیزی کی وجہ سے بوجوہ وہ مدرسہ نہ چل سکا اور حضرت نے بفضلہ اپنا مطب قائم کر لیا۔ وہاں کوئی مدرسہ نہ تھا۔ راقم اثیم مسجد میں رہتا تھا اور ان کے مطب میں دوائیاں کوٹتا اور بناتا تھا۔ حضرت اکثر باہر دورے اور مریضوں کی دیکھ بھال پر رہتے تھے۔ وہاں مطب میں راقم اثیم نے حضرت سے نحو میر کے چند سباق پڑھے تھے اور پھر وہاں سے چلا گیا۔ حضرت کی وفات پر راقم اثیم کا ایک مضمون مرزا غلام نبی صاحب جانباز کے تبصرہ میں شائع ہوا تھا۔ اس کو مہیا کر کے ضرور ملاحظہ فرمائیں۔ امید ہے کہ تلاش پر کہیں سے مل جائے گا۔ جوئندہ یابندہ۔

حاضرین سے سلام مسنون ارشاد فرمائیں اور نیک دعاؤں میں نہ بھولیں۔ بفضلہ تعالیٰ یہ آثم وخاطی بھی داعی ہے۔

والسلام

احقر ابوالزاہد محمد سرفراز از گکھڑ

۲۳ررجب ۱۴۱۰ھ/۲۰رفروری ۱۹۹۰ء

بنام: مفتی ایاز احمد حقانی (شب قدر فورٹ، چارسدہ)

الیٰ محترم المقام حضرت العلام مولانا............ صاحب دام مجدہم

وعلیکم وعلیٰ من لدیکم السلام ورحمۃ اللہ وبرکاتہ مزاج گرامی؟

آپ کا نوازش نامہ تو کافی دنوں سے موصول ہو چکا تھا۔ یادآوری، کرم فرمائی، حسن ظنی اور ذرہ نوازی کا صمیم قلب سے صد شکریہ، ورنہ من آنم کہ من دانم۔ کیا پدی اور کیا پدی کا شوربہ!

محترم! راقم اثیم بے حد مصروف رہتا ہے۔ کبرسنی اور علالت اس پر مستزاد ہے۔ اور صوابی کی نسبت سے آپ کے شفقت نامہ کا جواب اور بھی ضروری تھا مگر سفر برطانیہ کی وجہ سے اسباق کے خاصے ناغے ہو گئے تھے اور بمشکل ۶ رجب تک تفسیر قرآن کریم، بخاری شریف، ترمذی شریف وغیرہ ختم ہوئے۔

گاڑی میں آتے آتے راقم اثیم نے ''النصیحۃ'' کے چند صفحات پڑھے، مگر عریضہ لکھنے میں تاخیر ہو گئی۔ معذرت خواہ ہوں۔

وللارض من کاس الکرام نصیب

دیگر مضامین بھی بحمد اللہ تعالیٰ خاصے مفید ہیں، لیکن غلام احمد قادیانی کے کفریہ عقائد کا مضمون بڑا مدلل، باحوالہ اور مفید ہے۔ صوبہ سرحد میں ایسے مضامین سے نوخیز مگر مادر پدر آزاد طبیعتوں پر اتمام حجت ہو گی، گو ماننا نہ ماننا اپنی مرضی کا ہے۔ بعض انگریزی خواں یہ سمجھتے ہیں کہ قادیانی فرقہ خادم (درحقیقت ہادم) دین ہے مگر مولوی ان کو تبلیغ نہیں کرنے دیتے، کیونکہ وہ غلام احمد قادیانی اور اس کے چیلوں کے واضح کفریات سے بالکل بے خبر ہوتے ہیں اور اس اختلاف کو حنفی، شافعی وغیرہ کے

اختلاف کا درجہ دیتے ہیں، جبکہ قادیانی بھی اپنے کفریہ عقائد پڑتے ہوئے ہیں اور معاذ اللہ تعالیٰ اسے اسلام کا رنگ دینے کی قسم اٹھائے ہوئے ہیں۔ ایسے موقع پر حق کو واضح کرنا اور بھی ضروری ہو جاتا ہے تاکہ نیک و بد میں پرکھ کرنے والے غلط فہمی کا شکار نہ ہوں۔

وہی بالا ہیں دنیا میں جو اپنا نیک و بد سمجھیں یہ نکتہ وہ ہے جس کو اہل دل اہل خرد سمجھیں
بہت ناکامیوں کے بعد بھی اصرار خود بینی اسے دانائی سمجھیں یا کہ نادانی کی حد سمجھیں

راقم اثیم کا تازہ رسالہ ''ختم نبوت کتاب وسنت کی روشنی میں'' ضرور مطالعہ وملاحظہ کریں جو اجلاس عالمی ختم نبوت کے اجتماع دار العلوم دیوبند کے لیے مقالہ کی شکل میں تیار کیا گیا تھا مگر ویزہ نہ مل سکنے کی وجہ سے وہاں نہ پہنچایا جا سکا۔ مکتبہ حنفیہ گوجرانوالہ نے طبع کر دیا ہے۔

ہماری دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ''النصیحۃ'' کو صحیح معنی میں مسلمانوں کے لیے نصیحت بنائے اور اسے مقبول خواص وعوام کرے۔ آمین ثم آمین۔ پروف دیکھنے کے لیے اور اغلاط کی درستگی کے لیے کوئی مستعد اور جفاکش آدمی مقرر کریں۔ بعض مقامات میں طباعت کی صفائی نہیں ہوتی۔ واللہ الموفق

حاضرین مجلس سے سلام مسنون ارشاد فرمائیں اور دعوات مستجابات میں نہ بھولیں۔ بفضلہ تعالیٰ یہ خاطی بھی داعی ہے۔

والسلام

احقر ابو الزاہد محمد سرفراز خان

صدر مدرس مدرسہ نصرت العلوم گوجرانوالہ

۸ رجب ۱۴۰۷ھ/۹ مارچ ۱۹۸۷ء

بنام: قاری جمیل الرحمٰن کشمیری (ریاض، سعودی عرب)

باسمہ سبحانہ

من ابی الزاہد

الی محترم المقام جناب قاری .... صاحب دام مجدہم

وعلیکم السلام ورحمۃ اللہ وبرکاتہ مزاج گرامی؟

آپ کا گرامی نامہ موصول ہوا۔ حسن عقیدت اور یاد آوری کا تہ دل [سے] ہزار شکریہ۔

محترم!

۱۔ پیر کا انتخاب اپنے اپنے مذاق اور صواب دید پر ہوتا ہے۔ اس میں کسی کا نام لینا بے کار ہے۔ آپ اس میں خود رائے قائم کریں۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کو سمجھ عطا فرمائی ہے اور جہاندیدہ ہیں۔

۲۔ دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ آپ کی اہلیہ محترمہ کو صحت کاملہ عاجلہ سے اور نرینہ اولاد سے نوازے۔ اللہ تعالیٰ کی رحمت سے مایوس ہونا گناہ ہے اور بڑے زمانہ کے بعد بھی رحمت خداوندی ہوتی رہتی ہے۔ یہ وظیفہ کثرت سے پڑھیں: وَيَهَبُ لِمَن يَشَاءُ الذُّكُورَ اور رَبِّ لَا تَذَرْنِي فَرْدًا وَأَنتَ خَيْرُ الْوَارِثِينَ۔ اول آخر میں تین تین مرتبہ نماز والا درود شریف

پڑھیں اور درمیان میں پانچ یا سات مرتبہ یہ پڑھیں۔ اللہ تعالیٰ خوشی عطا فرمائے، آمین۔

۳۔ یہ پڑھ کر خوشی ہوئی کہ اہلیہ محترمہ کو بھی حج کی سعادت نصیب ہو رہی ہے۔ اللہ تعالیٰ حج مبرور نصیب فرمائے۔

۴۔ عین طواف کے وقت کعبہ کی طرف رخ نہ کرنا۔ اس مسئلہ کو نہ بھولیں اور نہ کسی کی کاروائی سے متاثر ہونا۔ ہاں حجر اسود اور رکن یمانی کے سامنے چونکہ ٹھہراؤ کا وقت ہے، اس وقت کعبہ کی طرف منہ پھیرنا درست ہے۔

۵۔ روضہ اقدس پر راقم اثیم کا نام لے کر صلوٰۃ وسلام عرض کرنا۔ تاکید ہے۔

۶۔ ۱۵؍ جولائی کو عزیزم زاہد الراشدی، مولانا چنیوٹی، علامہ خالد محمود اور ضیاء القاسمی لندن روانہ ہو چکے ہیں اور وہاں سے ان شاء اللہ العزیز حج کے لیے روانہ ہوں گے۔

حاضرین مجلس سے سلام عرض کریں اور نیک دعاؤں میں نہ بھولیں۔

والسلام

احقر ابو الزاہد محمد سرفراز از گکھڑ

۲۶؍ شوال ۱۴۰۵ھ/۱۸؍ جولائی ۱۹۸۵ء

بنام: مولانا مفتی محمد شریف عابر (مسجد گنبد والی، جہلم)

(۱)

باسمہ سبحانہ

من ابی الزاہد

الی محترم المقام جناب مفتی .... صاحب دام مجدہم

وعلیکم السلام ورحمۃ اللہ وبرکاتہ مزاج سامی؟

آپ کا گرامی نامہ تو کافی دنوں سے موصول ہو چکا ہے، مگر دورۂ تفسیر میں بے حد مصروفیت اور رمضان مبارک کے دیگر مشاغل کی وجہ سے جواب میں تاخیر ہو گئی ہے۔

محترم! راقم اثیم اب عمر کے اس حصہ کو پہنچ گیا ہے کہ کتابوں کی ورق گردانی اور تحقیق مسائل پہاڑ نظر آتے ہیں۔ مشکل سے اپنی ڈیوٹیاں دیتا ہوں۔ اب میدان آپ لوگوں کے ہاتھ میں ہے۔ دوڑنا بھی آپ کا کام ہے۔

محترم! لا نکفر احدا بذنب کے حوالے اور اصول بالکل صحیح ہے۔ سب صحابہ کرامؓ کو (بغیر حضرات شیخینؓ وحضرت سیدہؓ عند البعض والبحث فی المرقات وغیرہ) گناہ کہتے ہیں، کفر نہیں کہتے۔ روافض کی تکفیر حضرات صحابہ کرامؓ کی تکفیر کی وجہ سے ہے (بقیہ وجوہ کے علاوہ) کیونکہ اس میں اولئک ھم المومنون حقا کی تکذیب اور انکار لازم آتا ہے جو بجائے خود کفر ہے۔ حضرت گنگوہیؒ سب کی وجہ سے تکفیر نہیں کرتے، دیگر وجوہ کی بنا پر کرتے ہیں جو ارشاد الشیعہ میں مفصل موجود ہیں۔ راقم کے پاس فتاویٰ رشیدیہ طبع جید برقی پریس دہلی ہے، مبوب نہیں ہے۔ یہ عبارت مجھے اپنے نسخہ میں نہیں مل سکی ''اور بندہ بھی ان کی تکفیر نہیں کرتا''۔ یہ آپ مہربانی کر کے اصل نسخہ میں تلاش کر کے لکھیں۔ راقم میں ہمت نہیں ہے۔

حاضرین مجلس سے سلام مسنون عرض کریں اور نیک دعاؤں میں نہ بھولیں۔ بفضلہ تعالیٰ یہ عاصی وخاطی بھی داعی ہے۔

آپ نے فتاویٰ رشیدیہ کی جس عبارت کی تاویل کی ہے، وہ درست نہیں ہے۔ غور فرمالیں۔

والسلام

احقر ابوالزاہد محمد سرفراز از گکھڑ

۲۵ر رمضان ۱۴۱۰ھ / ۲۱ر اپریل ۱۹۹۰ء

(۲)

حضرت العلام مولانا:......... صاحب دام مجدہم

وعلیکم السلام ورحمۃ اللہ وبرکاتہ مزاج؟

آپ کی جواب دہی کا صد شکریہ۔

محترم! فتاویٰ رشیدیہ طبع جدید برقی پریس دہلی حصہ دوم ص ۴۵ میں مجھے یہ عبارت نہیں مل سکی۔ غور فرمائیں۔ ص ۴۴ میں ناچ اور اسراف وغیرہ گناہوں کا ذکر ہے۔ ان گناہوں کی وجہ سے عدم تکفیر ہے۔ ص ۴۵ میں ''الجواب صحیح بندہ رشید احمد'' اور ص ۴۵ سطر ۸ میں رشوت کا مسئلہ ہے۔ غور فرما کر مجھے حقیقت حال سے آگاہ فرمائیں۔ شکریہ

والسلام

احقر ابوالزاہد محمد سرفراز

۳۰ر رمضان ۱۴۱۰ھ

(۳)

باسمہ سبحانہ

۹ر شوال ۱۴۱۰ھ / ۵ر مئی ۱۹۹۰ء

من ابی الزاہد

الی محترم المقام جناب حضرت مولانا مفتی........... صاحب دام مجدہم

وعلیکم السلام ورحمۃ اللہ وبرکاتہ مزاج گرامی؟

آپ کا گرامی نامہ ملا اور فوٹو اسٹیٹ کاپیاں بھی موصول ہوئیں۔ آپ کی اس تکلیف فرمائی کا تہ دل سے صد شکریہ، مگر محترم! مسئلہ ابھی تک حل نہیں ہوا۔ راقم کے پاس جو فتاویٰ رشیدیہ ہے، اس کے ٹائٹل اور جلد دوم ص ۴۵ کی فوٹو اسٹیٹ کاپیاں ارسال ہیں۔ مشین صاف نہ ہونے کی وجہ سے کاپیاں اگرچہ صاف نہیں لیکن مسئلہ حل ہو جاتا ہے۔ یہ فتویٰ بنام حکیم غلام احمد صاحب ہے اور بقلم مولانا محمد یحییٰ صاحب ہے اور جلد دوم بھی ہے اور صفحہ بھی ۴۵ ہے، مگر زمین وآسمان کا فرق ہے۔ غور فرمائیں کہ کہیں جعل سازوں نے فتاویٰ رشیدیہ کا حلیہ ہی نہ بگاڑ دیا ہو۔ خوب غور کریں۔

اگر یہ ثابت ہو جائے کہ یہ فتاویٰ رشیدیہ کی ہی عبارت ہے تو تطبیق یوں ہوگی کہ فتاویٰ رشیدیہ ج ۲ ص ۳۲ میں رافضی کو کافر کہا گیا ہے اور اس عبارت میں شیعہ کی تکفیر نہیں کی۔ شیعہ اور رافضی کا فرق ارشاد الشیعہ ص ۲۰ میں ملاحظہ کر لیں۔ علامہ ذہبیؒ میزان الاعتدال کے مقدمہ میں اور علامہ سیوطیؒ تدریب الراوی ص ۲۱۸ میں لکھتے ہیں، واللفظ لہ:

البدعة (ای فی الشیعة) علیٰ ضربین، صغری کالشیع بلا غلو او بغلو کمن تکلم فی حق من حارب علیا فهذا کثیر فی التابعین وتابعیهم مع الدین والورع والصدق فلو رد هولاء لذهب جملة من الآثار ثم بدعة کبریٰ کالرفض الکامل والغلو فیه والحط علیٰ ابی بکر وعمر والدعاء الی ذلك فهذا النوع لا یحتج بهم ولا کرامة اھ۔ شیعہ اور رافضی کا فرق کیا ہے۔

الغرض ارشاد الشیعہ ص ۲۰ کو غور سے پڑھیں گے تو ان شاء اللہ العزیز رافضی اور شیعہ کا فرق اور تکفیر وعدم تکفیر کی وجہ واضح ہو جائے گی اور فتاویٰ رشیدیہ کی دونوں عبارتوں میں تطبیق پیدا ہو جائے گی۔ مگر فتاویٰ رشیدیہ اصل کون سا ہے اور جعلی کون سا ہے، یہ اشکال تاہنوز باقی ہے۔ راقم کے پاس تو نسخہ پاکستان بننے سے پہلے کا ہے اور یہی صحیح ہے۔

نیک دعاؤں میں نہ بھولیں۔

والسلام

احقر ابوالزاہد محمد سرفراز از گکھڑ

(۴)

باسمہ سبحانہ

من ابی الزاہد

الی محترم المقام جناب حضرت مولانا............ صاحب دام مجدہم

وعلیکم السلام ورحمۃ اللہ وبرکاتہ مزاج گرامی؟

یاد آوری کا صمیم قلب سے صد شکریہ۔

محترم! راقم اثیم نے جب بھی کسی پر اعتماد کر کے حوالے درج کیے، وہیں علمی مار کھائی ہے۔ فیصل آباد سے ایک رسالہ نکلتا تھا، پاکستانی۔ یہ حوالہ اس سے لیا گیا تھا اور آپ سے پہلے بھی دو چار اہل علم مخلص ساتھیوں نے اس کی طرف توجہ دلائی ہے۔ ان شاء اللہ العزیز اس کو کتاب سے نکال دیا جائے گا۔ آپ کا بہت بہت شکریہ

حاضرین مجلس سے سلام مسنون عرض کریں اور نیک دعاؤں میں نہ بھولیں۔ بفضلہ تعالیٰ یہ خاطی بھی داعی ہے۔

والسلام

احقر ابوالزاہد محمد سرفراز از گکھڑ

۲ر جمادی الاولیٰ ۱۴۰۸ھ / ۲۴ر دسمبر ۱۹۸۷ء

بنام: مولانا شبیر احمد انور (رحیم یار خان)

(۱)

باسمہ سبحانہ

منجانب ا۔ ب۔ ز

الی محترم المقام جناب مولانا............ صاحب دام مجدہم

وعلیکم السلام ورحمۃ اللہ وبرکاتہ مزاج سامی؟

نوازش نامہ موصول ہوا۔ صد شکریہ

۱۔ کھڑے ہو کر قبر کی طرف منہ کر کے دعا کرنے کے بارے میں اختلاف ہے۔ بعض حضرات نے ایک صورت اور بعض نے دوسری صورت لے لی ہے۔ جس پر چاہے، عمل کرے۔

۲۔ فتاویٰ عبدالحیؒ میں دعا بعد از عید کا جواز ثابت ہے۔ اس مسئلہ میں بھی اختلاف ہے۔ شدت مناسب نہیں ہے۔ کبھی کر لے، کبھی ترک کر دے۔

۳۔ خاک شفا کا کھانا حرام ہے۔ ہاں بطور تبرک پھوڑے پھنسی پر مل اور لگا سکتا ہے۔

واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب

(۲)

باسمہ سبحانہ

منجانب ابی الزاہد

الیٰ محترم المقام جناب حضرت مولانا............ صاحب دام مجدہم

وعلیکم السلام ورحمۃ اللہ وبرکاتہ مزاج گرامی؟

آپ کا نوازش نامہ موصول ہوا۔ یاد آوری کا صد شکریہ

محترم! زیارت کسی قابل قدر اور بزرگ ہستی کی ہونی چاہیے۔ راقم جیسے اثیم تو ہر جگہ موجود ہیں۔ پھر ایسوں کی زیارت کا کیا مطلب؟

آپ کا کوئی عریضہ مسئلہ پر مشتمل جہاں تک راقم کو یاد ہے، مجھے نہیں ملا۔ اونچی ایڑی والی جوتی اگرچہ عورتوں کے لیے حرام تو نہیں، لیکن مکروہ ضرور ہے اور حدیث من تشبہ بقوم فھو منھم کی زد میں ہے۔ لہٰذا شریف اور دین دار عورتوں کو ہرگز یہ استعمال نہیں کرنی چاہیے۔ ہمارے گھروں میں بفضلہ تعالیٰ ایسی جوتیوں کا داخلہ ممنوع ہے۔

مدرسہ نصرۃ العلوم والوں کا گزشتہ دو سال کی طرح امسال بھی ارادہ ہے کہ یکم شعبان تا ۲۵ رمضان قرآن کریم کا تفسیری دورہ ہو۔ اللہ تعالیٰ توفیق مرحمت فرمائے۔

تمام بزرگوں اور دوستوں کو سلام مسنون عرض کریں اور ہمارے حق میں دعا کرتے رہیں۔ ہم بھی بفضلہ تعالیٰ دعا گو ہیں۔

والسلام

احقر ابوالزاہد محمد سرفراز از گکھڑ

۳۰ / جمادی الاخریٰ ۱۳۹۸ھ / ۷ / جون ۱۹۷۸ء

(۳)

باسمہ سبحانہ

منجانب ابی الزاہد

الیٰ محترم المقام جناب حضرت مولانا............ صاحب دام مجدہم

وعلیکم السلام ورحمۃ اللہ وبرکاتہ مزاج گرامی؟

آپ کا نوازش نامہ موصول ہوا۔ یاد آوری کا شکریہ

قریب کے زمانہ میں آپ کا کوئی گرامی نامہ راقم کو موصول نہیں ہوا۔

شادی کے موقع پر رنگ ڈالنا، یہ ہندوانہ رسم ہے۔ مسلمانوں کو اس سے پرہیز کرنی چاہیے۔ بخاری ج ۲ ص ۷۵۹ میں روایت ہے کہ حضرت عبدالرحمٰنؓ بن عوف نے شادی کی، وعلیہ صفرۃ الحدیث۔ اور مشکوٰۃ ج ۲ ص ۲۷۸ میں ہے، ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم رای علیٰ عبد الرحمنؓ بن عوف اثر صفرۃ فقال ما ھذا الحدیث۔ حدیث تو صحیح ہے لیکن اس سے رنگ ڈالنا ثابت نہیں ہوتا۔ چنانچہ علامہ طیبیؒ وغیرہ لکھتے ہیں، یحتمل الانکار فانہ کان ینھی عن التضمخ بالخلوق فاجاب بانہ لیس تضمخا بل شئ علق بہ من مخالطۃ العروس ای من غیر قصد او من غیر اطلاع اھ۔ ہامش مشکوٰۃ ج ۲ ص ۲۷۸

الغرض اس روایت سے یہ مسئلہ ثابت نہیں ہوتا بلکہ نفی ہوتی ہے۔

بحمد اللہ تعالیٰ مسجد نور محکمہ اوقاف نے واپس کر دی ہے۔ اسباق شروع ہیں۔ راقم کی صحت بھی فی الجملہ اچھی ہے۔ مزید دعا کرتے رہیں اور اپنے بزرگوں اور دوستوں سے سلام مسنون عرض کریں۔

والسلام

احقر ابوالزاہد محمد سرفراز از گکھڑ

۱۳ / ذوالقعدہ ۱۳۹۷ھ / ۲۷ / اکتوبر ۱۹۷۷ء

بنام: حافظ بشیر احمد چیمہ (دوبئی)

(۱)

باسمہ سبحانہ

من ابی الزاہد

الیٰ عزیز القدر مولانا حافظ بشیر احمد صاحب دام مجدہم

وعلیکم السلام ورحمۃ اللہ وبرکاتہ مزاج گرامی؟

آپ کا محبت نامہ مع ہدیہ کے موصول ہوا، جزاکم اللہ تعالیٰ فی الدارین خیرا۔

عزیز القدر! کراچی کا سفر میرے لیے گو تکلیف دہ تھا، مگر بحمد اللہ تعالیٰ جماعت اور مسلک کے لیے بہت ہی مفید رہا۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو استقامت علی الدین مرحمت فرمائے۔ اس کے خزانوں میں کوئی کمی نہیں، وہ قادر مطلق ہے۔

عزیز القدر! بخاری شریف کی تقریر کا حصہ اول جو عزیزم عابد نے مرتب کیا، احسان الباری لفہم البخاری طبع ہو گیا ہے اور ترمذی شریف کی تقریروں کا مجموعہ بھی عابد نے مرتب کیا ہے۔ تین جلدوں میں ہے، طبع ہو گیا ہے۔ وہ تینوں جلدیں اکٹھی کر دی گئیں۔ اس کا نام خزائن السنن ہے۔ ویسے بخاری اور ترمذی کی تقریروں کی کیسٹیں متعدد حضرات کے پاس ہیں۔ ایک

فوج کے بریگیڈیئر ہیں، مستنصر باللہ۔ انھوں نے بڑے اہتمام کے ساتھ لی ہیں۔ اس سال بھی اسباق میں کیسٹیں لگی ہوتی ہیں۔ غالباً قاری عبید اللہ عامر انتظام کر رہے ہیں۔ کوئی آنے والا ہو تو خزائن السنن اور احسان الباری آپ کو ہدیۃً بھیجی جا سکتی ہیں۔ ہمیں آنے جانے والے کا پتہ نہیں چلتا۔

تمام حضرات علمائے کرام اور احباب اور عزیزم رشید احمد کو سلام مسنون عرض کریں۔ طبیعت کمزور ہو گئی ہے۔

والسلام

ابوالزاہد محمد سرفراز۔ از گکھڑ

۹ر جمادی الاولی ۱۴۱۳ھ / ۵ر نومبر

(۲)

باسمہ سبحانہ وتعالیٰ

من ابی الزاہد

الی عزیز القدر محترم جناب حافظ بشیر احمد صاحب دام مجدہم

وعلیکم السلام ورحمۃ اللہ وبرکاتہ مزاج گرامی؟

آپ کا ارسال کردہ ہدیہ مبلغ ایک ہزار موصول ہو چکا ہے۔ یہ حقیر تحفہ نہیں، بلکہ کثیر وخطیر تحفہ ہے۔ جزاکم اللہ تعالیٰ فی الدارین احسن الجزاء کما یلیق بشانہ الاعلیٰ۔

عزیز القدر! ہمیں یہ فخر اور خوشی کیا کم ہے کہ آپ وہاں اہل حق کی نمائندگی کرتے ہیں اور دین کو علماً وعملاً اصلی شکل وصورت میں پیش کرتے ہیں اور مسلک حق کی اشاعت کرتے ہیں اور غلط نظریات واعمال کے سامنے دیوار ہیں۔ اللھم زد فزد۔

عزیز القدر! راقم کی طبیعت دن بدن کمزور ہوتی جا رہی ہے۔ گھر میں اہلیہ مزوجہ عابد و ماجد بھی علیل ہیں اور سبھی زیر علاج اور محتاج دعا ہیں۔ ماجد مع بیوی اور بچوں کے آب وہوا کی تبدیلی کے سلسلہ میں وطن گئے ہوئے ہیں۔ ساجد اور راشد بھی ساتھ ہے۔ عزیزم زاہد، شاہد اور ناصر افغانستان گئے ہیں۔ گرمی بڑی شدت کی ہے۔ بجلی، گیس اور اشیا کی قیمتیں بجٹ کے بعد خوب بڑھ گئی ہیں۔ ملک میں افراتفری ہے۔ امن وسکون مخدوش ہے۔ دعا کریں کہ اللہ تعالیٰ رحم فرمائے۔

عزیز رشید احمد اور جملہ باقی واقف کار علماء کرام اور ساتھیوں سے سلام مسنون عرض کریں اور نیک دعاؤں میں نہ بھولیں۔ بفضلہ تعالیٰ ہم بھی دعا گو ہیں۔ اہلیہ اور عزیزم حماد کی طرف سے بہت بہت سلام۔

والسلام

احقر ابوالزاہد محمد سرفراز از گکھڑ

۱۴ر ذوالحجہ ۱۴۰۹ھ / ۱۸ر جولائی ۱۹۸۹ء

بنام: مولانا محمد مفتی عیسیٰ خان گورمانی

(۱)

باسمہ سبحانہ

منجانب ابی الزاہد

الی محترم المقام جناب حضرت مولانا.......... صاحب دام مجدکم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ مزاج گرامی؟

آپ کا ارسال کردہ خط جس میں حوالے درج تھے، موصول ہوا۔ صد شکریہ!

اہل بدعت نے تبرید النواظر کی ایک عبارت پر اعتراض کیا ہے اور اس کو ایک سازش کے رنگ میں پاکستان بھر میں اچھالنا چاہتے ہیں۔ وہ عبارت یہ ہے:

''اور اس مسئلہ کو انھوں (حضرت ملا علی ن القاریؒ) نے شرح شفا میں پیش کیا ہے کہ لا لان روحہ حاضر فی بیوت المسلمین۔ ------ بعض نسخوں میں حرف لا چھوٹ گیا ہے جس سے بعض لوگوں کو یوں ہی بلاوجہ اشتباہ ہوا ہے۔ الخ'' (حاشیہ تبرید ص ۱۶۵)

اہل بدعت کا کہنا ہے کہ یہ افترا ہے۔ شرح شفا میں لا کا لفظ کوئی نہیں ہے۔ چونکہ تبرید النواظر کو لکھے کافی سال ہو چکے ہیں اور راقم کے پاس اس وقت شرح شفاء موجود نہیں ہے، اس لیے آپ تکلیف فرما کر شفاء میں اس عبارت: 'ان لم یکن فی البیت احد فقل السلام علیك ایھا النبی ورحمة الله وبرکاته' کی شرح میں شرح شفاء ملا علی ن القاریؒ کی یہ عبارت سیاق وسباق کے ساتھ مکمل لکھ کر جلدی ارسال فرمائیں۔ شکریہ۔ 'لان روحه روح النبی علیه السلام حاضر فی بیوت اهل الاسلام'۔

صحت اچھی نہیں رہتی۔ دعا فرمائیں۔ ان شاء اللہ حضرت مولانا سے ملاقات کی کوشش کروں گا۔

اگر شرح شفا کے دو تین مختلف مطبع کے نسخے دست یاب ہو جائیں تو بہتر رہیں گے۔

والسلام

احقر ابوالزاہد از گکھڑ

۱۵ر رمضان ۱۳۸۶ھ / ۲۸ر دسمبر ۱۹۶۶ء

(۲)

باسمہ سبحانہ

من ابی الزاہد

الی محترم المقام جناب مولانا مفتی محمد عیسیٰ صاحب دام مجدہم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ مزاج سامی؟

میرے پاس دار الافتاء دار العلوم کراچی کا ایک استفتا از دست عزیزم قارن سلمہ اللہ تعالیٰ پہنچا ہے جس پر آپ کے دستخط اور تصدیق بھی ہے۔ آپ بفضلہ تعالیٰ ذمہ دار، صاحب الرای اور افتا کے مجاز ہیں۔ اگر آپ کے نزدیک صحیح ہے تو راقم اثیم کوئی اعتراض نہیں ہے۔ آپ اپنے افتاء میں نہ صرف معذور بلکہ ماجور ہوں گے، لیکن راقم اثیم اپنے آپ کو تائید کرنے آمادہ نہیں پاتا جس کی کئی وجوہ ہیں:

(۱) یہ فتویٰ صرف سرکاری رؤیت ہلال کمیٹی کے دفاع کے لیے ہے۔ اس کے ارکان بھی باوجود علما ہونے کے انسان ہیں۔ نہ معصوم ہیں اور نہ مجتہد ہیں۔ ان سے غلطی کا امکان بلکہ وقوع ہوسکتا ہے اور اغلب یہی ہے۔

(۲) فقہی منقولہ جزئیات اور حوالے، خاص کر حضرت امام محمد رحمہ اللہ تعالیٰ کا فتویٰ صحیح اور حق ہے اور وہ وہاں رفع اختلاف کرسکتا ہے جہاں حنفی ہی حنفی ہوں۔ جہاں حضرات فقہاء کرامؒ کے باغی بھی موجود ہوں تو وہاں ان کا قول کیونکر رافع خلاف ہوگا یا ہوسکتا ہے؟

(۳) اگر غیر مقلدین آپ حضرات سے یہ سوال کریں کہ حضرت محمد صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کا ارشاد تو یہ ہے: صوموا لرؤیته وافطروا لرؤیته فان غم علیکم فاکملوا عدة شعبان ثلاثین (متفق علیہ، مشکوٰۃ ج، ص ۱۷۴) تو کیا تمہارے نزدیک حضرت محمد صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کا قول معمول بہ ہے یا حضرت امام محمدؒ کا؟

(۴) اس فتویٰ سے نئے اختلاف کا ایک وسیع دروازہ کھل جائے گا اور بے دین پروفیسر اور ترقی پسند صحافی اخبارات کے ذریعہ آپ کی عزت کی دھجیاں اڑائیں گے اور وہ اس کے لیے فارغ اور ایسے امور کے متلاشی ہوتے ہیں، جبکہ آپ حضرات دینی مشاغل میں مصروف اور قلم کے کمزور ہیں۔

(۵) راقم اثیم کی یہ ناقص رائے ہے کہ اس سلسلہ میں علماء کرام کو بالکل سکوت اختیار کر لینا چاہیے۔ اگر بدھ کو چاند نظر آ گیا (جس کا بظاہر امکان نہیں ہے) تو رؤیت ہلال کمیٹی کا فیصلہ درست ہو جائے گا اور اگر جمعرات کو نظر آ گیا اور اغلب یہی ہے کہ ان شاء اللہ العزیز نظر آ جائے گا تو بھی ان کی ساکھ برقرار رہ جائے گی اور اگر جمعرات کو بھی نظر نہ آیا تو وہی ہر طرف سے مورد طعن ہوں گے کما لا یخفیٰ، علماء کرام کی آبرو تو بچ جائے گی۔ یہ ٹانگ کیوں اڑاتے ہیں؟

(۶) ہاں یہ خدشہ قوی ہے کہ حکومت بجائے علماء پر اعتماد کرنے کے آئندہ نرے بے دین ماہرین فلکیات پر اعتماد کرے جو مسئلہ کی رو سے علما کے لیے قابل قبول نہ ہوگا تو اس کا ازالہ اس استفتا کی تائید ہی پر منحصر نہیں ہے۔ اس کے لیے جدا اور الگ کوشش درکار ہے۔ اس پر غور کر لیں۔

(۷) راقم اثیم دیانتاً یہ سمجھتا ہے کہ اس وقت علماء کرام کا اس فتویٰ کو نشر کرنا فرقہ واریت کو مزید تقویت پہنچائے گا اور تاثر میں رہنے والے اس کو خوب اچھالیں گے جس کا دفاع موثر نہیں ہوگا۔ دوسروں کو بچاتے بچاتے خود ہی نہ پھنس جائیں۔ بقول شخصے ع

تماشا خود نہ بن جانا تماشا دیکھنے والو!

(۸) پہلے بھی رمضان اور عید کے چاند کے بارے میں اختلاف ہوتے رہے ہیں۔ اب کی بار بھی دیکھ اور سن لیا جائے۔ فتویٰ جاری کر کے مزید خلیج کو وسیع نہ کیا جائے۔ هذا ما عندی والله تعالیٰ اعلم بالصواب والمآل۔

نیک اوقات میں دعاؤں میں نہ بھولیں۔ طبیعت قدرے ناساز ہے۔ یہ خاطی بھی داعی ہے۔

والسلام

احقر ابو الزاہد محمد سرفراز از گکھڑ

۲۲ رمضان ۱۴۰۷ھ / ۲۰ مئی ۱۹۸۷ء

بنام: مولانا قاری خبیب احمد عمر جہلمیؒ

باسمہ سبحانہ

منجانب ابی الزاہد

عزیزم خبیب احمد سلمہ اللہ تعالیٰ

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ مزاج گرامی؟

بوقت شام ہم نے عزیزم محمد ارشد سے اخبار کے حوالہ سے حادثہ کی خبر سنی تو بے حد پریشان ہوئے۔ کھانا پینا سب کو بھول گیا۔ پھر معلوم ہوا کہ عزیزم صوفی عبد الحمید نے عزیزم حامد کو جہلم بھیجا ہے۔ اس کی انتظار میں تھے کہ عزیزم قارن اور محمد شفیق آ گئے اور بعد از مغرب جہلم روانہ ہو گئے۔ فون پر رابطہ قائم کیا تو معلوم ہوا کہ لائن خراب ہے۔ رات سب نے سخت بے قراری کی گزاری، حتیٰ کہ عزیزم محمد شفیق ڈیڑھ بجے شب آیا اور اس وقت راقم اثیم جاگ رہا تھا۔ اس سے حقیقت حال معلوم ہوئی تو اطمینان ہوا۔ الحمد لله تعالیٰ علیٰ ذالك۔

حضرت مولانا غلام یحییٰ صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ کی موتِ شہادت کا بے حد صدمہ ہے۔ موصوف بہترین مدرس، مرنجاں مرنج اور من کل الوجوہ اپنے اکابر کے دامن سے وابستہ تھے، لیکن موت وحیات انسان کے بس کی نہیں ہے۔

لائی حیات آئے قضا لے چلی چلے
نہ اپنی خوشی سے آئے نہ اپنی خوشی چلے

لیکن ان کی عمر اتنی ہی ہوگی۔ قضائے مبرم ٹلتی نہیں۔ وہی ہوتا ہے جو منظور خدا ہو۔ دعا ہے کہ مرحوم کو رب العزت جنت الفردوس مرحمت فرمائے اور پس ماندگان کو صبر جمیل کی توفیق بخشے اور مدرسہ کو نعم البدل استاد عطا فرمائے۔ ہم اراکین مدرسہ اور مولانا مرحوم کے متوسلین کے غم میں برابر کے شریک ہیں اور میرا یہ عریضہ حضرت مفتی صاحب دام مجدہم اور دیگر حضرات کو سنا دینا اور نیک دعاؤں میں نہ بھولنا۔ ہم بھی ہمہ وقت دعا گو ہیں۔ جملہ اہل خانہ کو درجہ بدرجہ سلام مسنون عرض کریں اور دعوات عزیزوں کو پہنچا دیں۔

اگر راقم اثیم کا عریضہ پہنچنے تک عزیزم حامد نہ آیا ہو اور اس کی خاص ضرورت بھی نہ ہو تو بھیج دینا۔ اگر ضرورت ہو تو دو چار دن اور رہ جائے۔

والسلام

احقر ابو الزاہد محمد سرفراز از گکھڑ

۱۲ شوال ۱۴۰۱ھ / ۱۳ اگست ۱۹۸۱ء

بنام: اہلیہ قاری خبیب احمد عمر جہلمیؒ (دختر امام اہل سنتؒ)

باسمہ سبحانہ

من ابی الزاہد

الی عزیزۃ القدر! عزیزہ سعیدہ سلمہا اللہ تعالیٰ

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

جہلم کے سیلاب کی خبریں اخبارات میں پڑھ کر بہت ہی پریشانی تھی۔ کئی بار ٹیلی فون پر رابطہ قائم کرنے کی کوشش کی مگر کامیابی نہ ہوئی۔ اتنے میں ساجد آ گیا۔ اس نے کہا کہ میں رات جہلم میں تھا۔ جانیں بفضلہ تعالیٰ محفوظ ہیں، باقی بہت سا نقصان ہوا ہے۔ اجمالی طور پر کچھ تسلی ہوئی۔

مجھے کراچی والوں نے سخت مجبور کیا تھا۔ وعدہ کے مطابق میں اور عزیزم قارن ہوائی جہاز کے ذریعہ کراچی گئے۔ وہاں عزیزم عبدالحق بھی ملا۔ پانچ دن انتہائی مصروفیت کے رہے۔ پرسوں ہی ہم واپس آئے ہیں اور اپنے لیے ایک حکیم صاحب سے دوائی بھی لایا ہوں۔ دردوں کی تکلیف بہت زیادہ ہے۔ دعا کرنا۔

عزیزم زاہد کا خط لندن سے آیا ہے۔ وہ عارضی طور پر وہاں رک گیا ہے۔ عزیزم عابد کا کوئی پتہ نہیں کہ کہاں ہے! عزیزم شاہد سعودیہ چلا گیا ہے۔ باقی گھر میں فی الجملہ خیریت ہے۔ عزیزم حامد، عزیزہ میمونہ اور عالیہ بڑوں کو سلام اور بچوں کو دعوات عرض کرتے ہیں۔

حضرت مولانا صاحب دام مجدہم اگر آئے ہوں، عزیزم خبیب کو اور جملہ اہل خانہ کو درجہ بدرجہ میری طرف سے سلام مسنون عرض کرنا اور بچوں کو پیار۔

میں اپنی گرہ سے تمہارے اور بچوں کے لیے مبلغ دو ہزار روپے (۲۰۰۰) بھیج رہا ہوں۔

والسلام

ابوالزاہد محمد سرفراز ۔ از گکھڑ

۲۵ ربیع الاول ۱۴۱۳ھ / ۲۴ ستمبر ۱۹۹۲ء

بنام: حافظ نثار احمد الحسینی (حضرو، اٹک)

باسمہ سبحانہ

من ابی الزاہد

الیٰ محترم المقام حضرت العلام مولانا.......... صاحب زید مجدہم

وعلیکم السلام ورحمۃ اللہ وبرکاتہ مزاج گرامی.

آپ کا محبت نامہ موصول ہوا۔ یاد آوری، کرم فرمائی، حسن ظنی اور ذرہ نوازی کا صمیم قلب سے ہزار شکریہ، ورنہ من آنم کہ من دانم۔ کیا پدی اور کیا پدی کا شوربا!

محترم! راقم الحروف کو جو تھوڑی سی علمی شدبد ہے، وہ استاذنا المکرم حضرت مولانا عبدالقدیر صاحب دامت برکاتہم اور ان جیسی دیگر گراں قدر و بزرگ شخصیتوں کی برکت سے حاصل ہے، ورنہ ع نغمہ کجا و من کجا ساز سخن بہانہ ایست۔

محترم! راقم اثیم بے حد مصروف رہتا ہے۔ کبر سنی (عمر قمری لحاظ سے ۷۶ سال ہے) اور علالت اس پر مستزاد ہے۔ دعا کریں کہ اللہ تعالیٰ بقیہ کتب کی تکمیل کی توفیق بخشے، آمین۔

محترم! آپ نے بزم احناف کے عنوان سے جو جماعت تشکیل دی ہے، آپ حضرات صد مبارک کے مستحق ہیں، مگر

افسوس ہے بہت دیر سے کی ہے۔ اب لیٹ نکالنے کی مسلسل سعی کریں اور حضرت الاستاذ المحترم مولانا عبدالقدیر صاحب دامت برکاتہم کی کتاب خلف الامام کے بارے میں فوراً طبع کروائیں۔ بڑے قیمتی اور علمی مواد اس میں موجود ہیں۔

راقم اثیم ان دنوں علیل ہے۔ دعا فرمائیں اور حاضرین مجلس سے سلام مسنون عرض کریں۔ یہ خاطی بھی داعی ہے۔

والسلام

ابوالزاہد محمد سرفراز

۶ رجب ۱۴۰۸ھ / ۲۵ فروری ۱۹۸۸ء

بنام: مولانا سید لعل شاہ بخاریؒ (واہ کینٹ، ضلع راول پنڈی)

باسمہ سبحانہ

من جانب ابی الزاہد

الیٰ محترم المقام جناب حضرت مولانا سید.......... صاحب بخاری دام مجدکم

وعلیکم السلام ورحمۃ اللہ وبرکاتہ مزاج گرامی؟

محبت نامہ موصول ہوا۔ یاد آوری، کرم فرمائی اور ذرہ نوازی کا تہ دل سے صد شکریہ!

۱۔ ''راہ سنت'' اور دیگر کتابوں میں جو حوالے درج ہیں، تقریباً اٹھانوے فیصدی راقم نے خود کتابوں سے لیے ہیں۔ ایک دو فیصدی حوالے جن کی اصل کتابیں دست یاب نہیں ہو سکیں، وہ راقم نے اکابر کی کتابوں سے نقل کیے ہیں۔ ''محیط'' راقم کو نہیں مل سکی۔ جہاں تک مجھے یاد ہے، اس کا حوالہ حضرت مولانا مفتی کفایت اللہ صاحب رحمہ اللہ کی کتاب ''النفائس المرغوبہ'' یا ''دلیل الخیرات'' سے لیا گیا ہے۔ فالج کے بعد اب حافظہ بے حد کمزور ہے۔

۲۔ ''مجموعہ خانی'' کا حوالہ بھی انھی کی کتاب سے ماخوذ ہے اور اگر عبارت یہی ہو جو آپ نے نقل فرمائی ہے کہ ''بعد تکبیر چہارم سلام گوید و دعا نخواند وفتویٰ بریں قول است''، تب بھی ہمارا مدعا اس سے ثابت ہے۔ ہماری بحث سے یہ خارج نہیں ہو جاتی، کما لا یخفیٰ۔

پہلے قومی اور صوبائی الیکشن کے دھندے میں مبتلا رہے۔ وہاں سے ناکامی کے ساتھ فراغت ہوئی تو اب اسباق کے سلسلہ میں مصروف ہیں۔ عارضہ قلب، تبخیر، اعضا کا سن ہو جانا، بواسیر اور ناسور کئی ایک تکالیف شدت کے ساتھ درپیش ہیں۔ خاص اوقات میں دعا فرمائیں اور حاضرین مجلس سے سلام مسنون ارشاد فرمائیں۔

والسلام

ابوالزاہد از گکھڑ

یکم ذوالقعدہ ۱۳۹۰ھ / ۳۱ دسمبر ۱۹۷۰ء

بنام: مولانا مجیب الرحمٰن (ڈیرہ اسماعیل خان)

باسمہ سبحانہ

من ابی الزاہد

الی محترم المقام جناب مولانا .... صاحب دام مجدہم

وعلیکم السلام ورحمۃ اللہ وبرکاتہ مزاج؟

آپ کا محبت نامہ موصول ہوا۔ یاد آوری کا ہزار شکریہ!

محترم! نگاہ بھی کمزور ہوگئی ہے اور صحت بھی اچھی نہیں۔ خاتمہ علی الایمان کے لیے دعا کریں۔ مختصر جوابات عرض ہیں:

۱۔ کتابت کی غلطی کی وجہ سے بجائے فیھا کے جو ضمیر کتب سماویہ کی طرف راجع ہے، فیہ لکھا گیا ہے جو بظاہر قرآن کریم کی طرف راجع سمجھی جاتی ہے جو قطعاً غلط ہے۔ فیض الباری ج ۴ ص ۵۳۷ میں قال ابن عباس سے لے کر فکان التفسیر یختلط بالتوراۃ من ہذا الطریق تک عبارت دیکھیں، بات بخوبی واضح ہوجائے گی۔

۲۔ اس بے سند اور بے ثبوت قول سے قرآن کریم میں تحریف کیسے ثابت ہوگی؟

۳۔ بعضھم سے رافضی مراد ہیں اور وہ تو تحریف کے قائل ہیں۔ ان مردودوں کے قول سے قرآن کریم میں تحریف کیونکر ثابت ہوسکتی ہے؟ کلبی اور سدی دونوں رافضی، کذاب اور وضاع ہیں۔ ان کی نقل اہل حق کے لیے کیسے حجت ہوسکتی ہے؟

۴۔ کبریت احمر میرے پاس نہیں ہے اور آج کل میں مدرسہ نہیں جاتا۔ سیاق وسباق سے پتہ چلے گا کہ اس کا قائل کون ہے؟ تائید کرتا ہے یا تردید کرتا ہے؟ پھر ایک غیر معصوم کے غلط قول سے قرآن کریم میں تحریف کیسے تسلیم ہوسکتی ہے؟

۵۔ شیعہ واقعی تحریف کے قائل ہیں۔ راقم اثیم کی کتاب ''ارشاد الشیعہ'' میں اس کی مفصل باحوالہ بحث درج ہے۔ اس کو ضرور ملاحظہ کریں۔ مکتبہ صفدریہ، نزد مدرسہ نصرۃ العلوم گوجرانوالہ سے مل سکتی ہے۔

حاضرین سے سلام مسنون عرض کریں اور مقبول دعاؤں میں نہ بھولیں۔ بفضلہ تعالیٰ یہ عاصی وخاطی بھی داعی ہے۔

والسلام

ابوالزاہد محمد سرفراز۔ از گکھڑ

۱۵ ر رمضان ۱۴۱۵ھ / ۱۶ر فروری ۱۹۹۵ء

بنام: مولانا ڈاکٹر عبدالدیان کلیمؒ (پشاور یونیورسٹی، پشاور)

(۱)

باسمہ سبحانہ

من ابی الزاہد

الی محترم المقام حضرت العلام مولانا .... کلیم صاحب دام مجدہم

وعلیکم السلام ورحمۃ اللہ وبرکاتہ مزاج سامی؟

آپ کا شفقت نامہ موصول ہوا۔ صمیم قلب سے شکریہ!

محترم! راقم اثیم کس کھاتے میں ہے کہ آپ اسے علماء سرحد کی فہرست اور تاریخ میں شامل کرنا چاہتے ہیں؟ کیا پدی اور کیا پدی کا شوربا! ہاں اگر طلباء صوبہ سرحد میں درج کریں تو شاید مناسب حال ہو۔

ان دنوں دورۂ تفسیر شریف شروع ہے (یکم شعبان سے) جس میں مختلف ملکوں اور علاقوں کے تقریباً تین سو علما اور طلبا

شریک ہیں۔ اوسطاً پانچ گھنٹے مسلسل مجھے پڑھانا ہوتا ہے۔ ان دنوں کھانسنے اور سر کھجلانے کی فرصت بھی نہیں ملتی اور آخر رمضان شریف تک یہ سلسلہ ان شاء اللہ العزیز جاری رہے گا۔ تکمیل کے لیے خصوصی دعا فرمائیں، کیونکہ الدعاء بظہر الغیب مقبول ہوتی ہے۔

محترم! کچھ حالات قلم بند کیے تھے۔ محترم جناب خواص خان صاحب مرحوم آف ہیڑاں ڈاک خانہ بٹل ضلع مانسہرہ نے اپنی مطبوعہ کتاب ''علماء ہزارہ'' میں کچھ حالات درج کیے ہیں۔ نیز محترم جناب مولانا قاری فیوض الرحمن صاحب دام مجدہم نے، جو آج کل فوج میں شاید کرنل کے عہدہ پر ہیں، انھوں نے بھی کہیں لکھے ہیں اور غالباً عزیزم زاہد الراشدی نے ترجمان اسلام میں بھی لکھے تھے۔ ان دنوں مصروفیت کی وجہ سے اس سے ملاقات نہیں ہوسکی اور نہ مسودات کی تلاش کا وقت ملتا ہے۔ ان شاء اللہ العزیز رمضان شریف کے بعد آپ کو مختصراً مسودہ ارسال کر دیا جائے گا۔

عزیزوں اور حاضرین مجلس سے سلام مسنون ارشاد فرمائیں اور نیک دعاؤں میں نہ بھولیں۔ گھر میں بھی شوگر اور بلڈ پریشر کی تکلیف ہے اور راقم اثیم اور عزیزم صوفی کی طبیعت بھی ناساز ہے اور ہم عصاۃ بھی داعی ہیں۔

والسلام

ابوالزاہد محمد سرفراز۔ از گکھڑ

۲۵ رشعبان ۱۴۰۷ھ / ۲۴ راپریل ۱۹۸۷ء

(۲)

باسمہ سبحانہ

من ابی الزاہد

الی محترم المقام حضرت العلام مولانا .... صاحب دام مجدہم

وعلیکم السلام ورحمۃ اللہ وبرکاتہ مزاج گرامی؟

آپ کا پیارا گرامی نامہ موصول ہوا اور عزیزم حافظ شمس الرحمن سلمہ اللہ تعالیٰ کے رمضان مبارک میں قرآن کریم سنانے کی خوشی پر خوشی ہوئی۔ اللہ تعالیٰ مزید سے مزید ہمت بخشے، آمین۔ آپ نے خوشی سنائی ہے اور میں نہ سناؤں تو دنگل میں مقابلہ تو برابر نہ رہا۔ بحمد اللہ تعالیٰ ۱۹ رجون کو عزیزم عبدالحق سلمہ اللہ تعالیٰ کی شادی حضرت مولانا قاضی مظہر حسین صاحب کی صاحبزادی سے چکوال میں ہوچکی ہے۔ جو مٹھائی آپ پہلی خوشی پر ہمیں کھلانا چاہتے ہیں، وہی دور سے اس خوشی میں تناول فرمالیں کہ ہینگ لگے نہ پھٹکڑی۔ تلک بتلک۔ ان شاء اللہ العزیز بشرط زیست باقی وجدانی اور ذوقی باتیں بعد از ملاقات ہوں گی۔ آپ کے مفید مشوروں سے ان شاء اللہ العزیز ہم ضرور استفادہ کریں گے۔

آج ہی بحمد اللہ تعالیٰ مدرسہ نصرۃ العلوم میں اسباق شروع ہوچکے ہیں۔ اتمام کی دعا فرمائیں۔ حاضرین مجلس سے سلام مسنون ارشاد فرمائیں اور الدعاء بظہر الغیب کو فراموش نہ کریں۔ ہم بھی داعی ہیں۔

والسلام

ابوالزاہد محمد سرفراز۔ از گکھڑ

۲۰؍شوال ۱۴۰۶ھ/۲۸؍جون ۱۹۸۶ء

(۳)

باسمہ سبحانہ وتعالیٰ

من ابی الزاہد

الیٰ محترم المقام حضرت العلام مولانا............ صاحب دام مجدہم

وعلیکم السلام ورحمۃ اللہ وبرکاتہ مزاج گرامی؟

آپ کا بشارت نامہ موصول ہوا کہ عزیز کی شادی خانہ آبادی ہورہی ہے۔ بڑی خوشی ہوئی۔ خلوص دل سے دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ خیر وعافیت کے [ساتھ] خوشی کی تقریب دیکھنے اور طے کرنے کا موقع عطا فرمائے، آمین ثم آمین۔

محترم! آپ کو معلوم ہوگا کہ راقم طویل سفر سے معذور ہے۔ آٹھ سال ہو گئے ہیں کہ وطن نہیں جا سکا، حالانکہ اپنے کئی بزرگ اور قریبی رشتہ [دار] اور ماموں فوت ہو گئے ہیں۔ صرف تعزیت کے خطوط ہی لکھتا رہا ہے۔ دو تین بیماریاں ایسی ہیں کہ سفر سے مانع ہیں۔ گزشتہ سال علاج وغیرہ کے سلسلہ میں مجبوری کے تحت برطانیہ جانا ہوا، مگر ناکام ہو کر لوٹ آیا کیونکہ مصارف کی بھاری چٹان اٹھانے کے قابل نہیں تھا۔ بس یوں سمجھیے کہ کرایہ کے تاوان کے نیچے دب کے آ گیا۔ اس لیے حاضری سے معذوری ہے۔ دوبارہ اور سہ بارہ دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ کامیابی کے ساتھ یہ مرحلہ طے کرنے کی توفیق بخشے، آمین۔

حاضرین مجلس کو درجہ بدرجہ سلام مسنون ارشاد فرمائیں اور دعوات مستجابات میں نہ بھولیں۔ بحمد اللہ تعالیٰ یہ آثم بھی داعی ہے۔ (ان دنوں تکلیف زیادہ ہے)

والسلام

ابو الزاہد محمد سرفراز۔ از گکھڑ

۲۶؍صفر ۱۴۰۸ھ/۲۰؍اکتوبر ۱۹۸۷ء

بنام: مولانا مفتی محمد اسماعیل (احمد پور شرقیہ، بہاول پور)

(۱)

باسمہ سبحانہ

من ابی الزاہد

الیٰ محترم المقام جناب حضرت العلام مولانا............ صاحب دام مجدہم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ مزاج گرامی؟

حضرت مولانا ظفر احمد صاحب قاسم دام مجدہم جامعہ خالد بن الولید ٹھینگی ضلع وہاڑی (پاکستان) سے تشریف لائے تھے۔ انھوں نے راقم اثیم سے یہ کہا کہ آپ سفارش کریں کہ حضرت مولانا محمد اسماعیل صاحب بطور مدرس ہمارے پاس تشریف لے آئیں۔ چونکہ موصوف خود یہاں گکھڑ تشریف لائے تھے اور مجھ سے وعدہ لیا تھا، اس لیے عرض ہے کہ اگر آپ کا مدرسہ والوں سے کوئی معاہدہ نہ ہو اور حالات ٹھینگی جانے کی اجازت دیتے ہوں تو آپ مولانا موصوف سے رابطہ رکھیں۔

خوب غور وفکر کے بعد نفی یا اثبات کے فیصلہ سے راقم اثیم کو بھی آگاہ کر دیں۔

طبیعت اچھی نہیں رہتی۔ نیک دعاؤں میں نہ بھولیں۔ بفضلہ تعالیٰ یہ خاطی بھی داعی ہے۔ حاضرین مجلس سے سلام مسنون عرض کریں۔

میری اہلیہ کا انتقال ہو چکا ہے۔ اس کی مغفرت کی دعا بھی کریں۔

والسلام

احقر ابو الزاہد محمد سرفراز از گکھڑ

۱۷؍جمادی الاخریٰ ۱۴۰۹ھ/۲۶؍جنوری ۱۹۸۹ء

(۲)

باسمہ سبحانہ

من ابی الزاہد

الیٰ محترم المقام جناب حضرت مولانا............ صاحب دام مجدہم

وعلیکم السلام ورحمۃ اللہ وبرکاتہ مزاج سامی؟

آپ کا محبت نامہ ملا۔ یاد آوری کا تہ دل سے صد شکریہ!

محترم! میں نے حسب وعدہ آپ کو ایک پیغام پہنچایا تھا۔ نہ جبر ہے اور نہ کوئی کر سکتا ہے۔ صاحب البیت ادریٰ بما فیہ۔ آپ نے جو فیصلہ کیا ہے، ان شاء اللہ العزیز اسی میں آپ کی بھلائی اور ترقی ہوگی۔ مولانا کو خط لکھ دیں کہ میں اپنے حالات سے مجبور ہوں، گو سفارش بھی ہوئی تھی۔ ان کو اطلاع ضرور دے دیں۔

حاضرین مجلس سے سلام مسنون عرض کریں اور نیک دعاؤں میں نہ بھولیں۔ راقم علیل ہے اور یہ عاصی بھی داعی ہے۔

والسلام

احقر ابو الزاہد محمد سرفراز از گکھڑ

۱۶؍رجب ۱۴۰۹ھ/۲۳؍فروری ۱۹۸۹ء

بنام: مولانا ابو طاہر فتح خان اعوان (کٹاس)

باسمہ سبحانہ

من ابی الزاہد

الیٰ محترم المقام جناب مولانا............ صاحب دام مجدہم

وعلیکم السلام ورحمۃ اللہ وبرکاتہ مزاج سامی؟

آپ کا محبت نامہ موصول ہوا۔ یاد آوری کا ہزار شکریہ!

محترم! راقم اثیم کا وہی عقیدہ ہے جو المہند میں اور راقم اثیم کی کتابوں تسکین الصدور اور سماع الموتی وغیرہ میں درج ہے اور اسی پر قائم ہے۔ حضرت قاضی نور محمد صاحبؒ، حضرت قاضی شمس الدین صاحبؒ اور حضرت مولانا غلام اللہ خان صاحبؒ

وغیرہ حضرات کا عند القبر صلوٰۃ وسلام کے سماع کا وہی عقیدہ تھا جو راقم کا ہے۔ ہاں عام سماع موتی جو خود اختلافی مسئلہ ہے، اس میں وہ دوسری طرف تھے۔

۱۔ طے یہ ہوا تھا کہ [مولانا قاضی شمس الدینؒ کا] جنازہ قاضی عصمت اللہ صاحب پڑھائیں گے، مگر عین موقع پر [سید عنایت اللہ] شاہ صاحب آ گئے۔ کھڑے ہو گئے اور مجبوراً مجھے بھی کھڑا رہنا پڑا۔

۲۔ مولانا عبد الرحیم صاحب کا حیات الانبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام کے بارے وہی عقیدہ ہے جو راقم کا ہے۔ انھوں نے اپنے والد محترم ومرحوم کا رسالہ بھی طبع کرایا ہے جس میں اس مسئلہ کی تصریح ہے۔

۳۔ مسلک کے لحاظ سے میرا [منکرین حیات الانبیاء کے ساتھ] کوئی تعلق نہیں ہے۔

۴۔ بحمد اللہ تعالیٰ وہی ہے جو راقم کی کتابوں میں درج ہے اور پہلے سے زیادہ مضبوط ہے۔

۵و۶ میں راقم اثیم کا وہی جواب ہے جو دار العلوم دیوبند کے صدر مفتی حضرت مولانا سید مہدی حسن صاحب رحمۃ اللہ علیہ وغیرہ کا ہے جو تسکین الصدور کی ابتدا میں درج ہے۔

حاضرین سے سلام مسنون عرض کریں اور مقبول دعاؤں میں نہ بھولیں۔ بفضلہ تعالیٰ یہ عاصی وخاطی بھی داعی ہے۔

والسلام

ابو الزاہد محمد سرفراز

۳۰ ربیع الاول ۱۴۱۸ھ / ۶ اگست ۱۹۹۷ء

بنام: محمد یعقوب ہاشمی (سیکرٹری تعلیمات، حکومت جموں وکشمیر مظفر آباد)

باسمہ سبحانہ وتعالیٰ

منجانب ابی الزاہد

الی محترم المقام جناب ہاشمی صاحب دام مجدکم

وعلیکم السلام ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

آپ کا طویل نوازش نامہ موصول ہوا۔ یاد آوری، کرم فرمائی، حسن ظنی اور ذرہ نوازی کا تہ دل سے صد شکریہ!

آپ نے سات دن کے اندر اندر جناب شیخ محمود احمد صاحب کی ارسال کردہ تقریر کے بارے میں اور خصوصیت سے تین نکات: زکوٰۃ کی شرح، قطع ید کا مفہوم قرآن وسنت کی روشنی میں اور قرآنی احکامات کے مفہوم اور معانی میں تبدیلی کے امکانات کے متعلق قرآن وسنت کی روشنی میں رائے طلب کی ہے۔ ایک مصروف ترین آدمی کے لیے، جو روزانہ مختلف جگہوں میں تین ڈیوٹیاں باقاعدہ دیتا ہو اور علالت اس پر مستزاد ہو، یہ تو بہت مشکل ہے کہ وہ باحوالہ ذمہ داری سے کچھ لکھے اور پھر اس پر نظر ثانی کرے، اس کو صاف کرے اور اس کی نقل لے اور پھر اس کو ارسال کرے اور سات دن کے اندر وہ منزل مقصود تک پہنچ بھی جائے۔ جب ایک ہی نکتہ پر لکھنا شروع کیا تو کئی صفحات مرتب ہو گئے اور باقی دو امور پر ابھی لکھنا باقی ہے۔ اگر آج یا کل عریضہ نہ لکھا جائے تو آپ کو سات دن کے اندر اندر ملنا مشکل ہے، اس لیے مناسب سمجھا گیا کہ آپ کو فی الحال اپنی حتمی رائے اور آخری فیصلہ سے آگاہ کر دیا جائے۔ اگر آپ کو تفصیل کے ساتھ موصوف کی صریح غلطیوں پر آگاہی

درکار ہو تو جمعیۃ علمائے اسلام کے سرکاری ترجمان کی کسی قریبی اشاعت میں ملاحظہ فرمائیں۔

خلاصہ یہ ہے کہ جناب شیخ محمود احمد کے زکوٰۃ کی شرح، قطع ید اور قرآنی احکامات کے مفہوم اور معانی میں تبدیلی کے امکانات کے بارے میں جو کچھ بھی نظریات ہیں، وہ سراسر غیر اسلامی اور خالص ملحدانہ ہیں اور قرآن وسنت اور فقہ اسلامی کی روشنی میں بالکل مردود ہیں اور اس قابل ہیں کہ ان کو ع 'اٹھا کر پھینک دو باہر گلی میں'۔ حکومت آزاد کشمیر کا ایسے شخص کو ناظم تعلیمات کے عہدہ پر بایں ہمہ ہیجان برقرار رکھنا شرعاً بھی ناجائز ہے اور سیاسی طور پر بھی بالآخر اس کا وہی حشر ہوگا جو پاکستان میں ادارۂ تحقیقات اسلامیہ کے سربراہ ڈاکٹر فضل الرحمٰن صاحب جیسے ملحد کا ہو چکا ہے۔ اس لیے حکومت آزاد کشمیر غیور مسلمانوں کی اسلامی غیرت کو ہرگز چیلنج نہ کرے اور ان کو فوراً اس عہدہ سے الگ کر دے۔

من آنچہ شرط بلاغ است با تو می گفتم
تو از سخن من پند گیر وخواہ ملال

والسلام

احقر ابو الزاہد محمد سرفراز

خطیب جامع مسجد گکھڑ

۲۴ محرم ۱۳۹۱ھ / ۲۲ مارچ ۱۹۷۱ء

بنام: محمد یونس شامی

۴ جمادی الاخریٰ ۱۴۰۷ھ / ۳ فروری ۱۹۸۷ء

باسمہ سبحانہ

من ابی الزاہد

الی محترم المقام جناب محمد یونس شامی صاحب دام مجدہم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ   مزاج گرامی؟

گزارش ہے کہ آپ ہمارے دیرینہ اور مخلص ساتھی ہیں اور ان شاء اللہ العزیز توقع کی جا سکتی ہے کہ آئندہ بھی رہیں گے۔ اللہ تعالیٰ توفیق بخشے، آمین۔

محترم! آپ کے خلوص، سادگی اور علوم دینیہ پر عبور نہ رکھنے کی وجہ سے بعض دوست ناجائز فائدہ اٹھا رہے ہیں۔ الدین النصیحۃ کے طور پر چند باتیں عرض ہیں:

۱) خلیفۃ اللہ جن کا ذکر احادیث میں آتا ہے، وہ امام مہدی علیہ السلام ہی ہیں۔ مشکوٰۃ ج ۲ ص ۴۷۱ میں 'خلیفۃ اللہ المھدی' کے الفاظ حدیث میں موجود ہیں۔

۲) امام مہدی علیہ السلام کا نام محمد اور والد محترم کا نام عبد اللہ ہوگا اور حدیث میں ہے: 'المھدی من عترتی من ولد فاطمۃ' (ابوداؤد ج ۲ ص ۲۳۲)

۳) اور حدیث ہی میں ہے کہ وہ 'من اھل المدینۃ' ہوں گے۔ (ابوداؤد ج ۲ ص ۲۳۳)

۴) اور حدیث ہی میں ہے: 'یملك العرب رجل من اهل بیتی' (ابوداؤد ج ۲ ص ۲۳۲)

اس سے ثابت ہوا کہ وہ عرب کے بادشاہ ہوں گے اور صاحب اقتدار ہوں گے۔

۵) ان کی بیعت ابتداءً حجر اسود اور مقام ابراہیم کے درمیان کی جائے گی۔ (ابوداؤد ج ۲ ص ۲۳۳)

۶) اور وہ 'یملك سبع سنین' (ابوداؤد ج ۲ ص ۲۳۲) سات سال بادشاہی کریں گے۔

۷) اور اپنے دور اقتدار اور حکومت میں زمین کو عدل و انصاف سے بھر دیں گے اور ظلم و جور کو مٹا دیں گے۔ (ابوداؤد ج ۲ ص ۲۳۲) یعنی خداداد اقتدار سے نہ کہ وعظ سے۔

محترم! یہ اوصاف فاطمی النسل اور عربی کے ہیں جو اہل مدینہ سے ہوں گے۔ یہ اوصاف کسی اور میں اور خصوصاً کسی پاکستانی میں جبکہ اسے حکومت بھی حاصل نہ ہو، ہرگز نہیں پائے جاتے۔ اللہ تعالیٰ غلط فہمی دور فرمائے۔ آمین

والسلام

ابوالزاہد محمد سرفراز

خطیب جامع مسجد گکھڑ

بنام: مولانا ہارون مطیع اللہ (کراچی)

باسمہ سبحانہ

من ابی الزاہد

الیٰ عزیز القدر جناب مولانا.......... صاحب دام مجدہم

وعلیکم السلام ورحمۃ اللہ وبرکاتہ مزاج؟

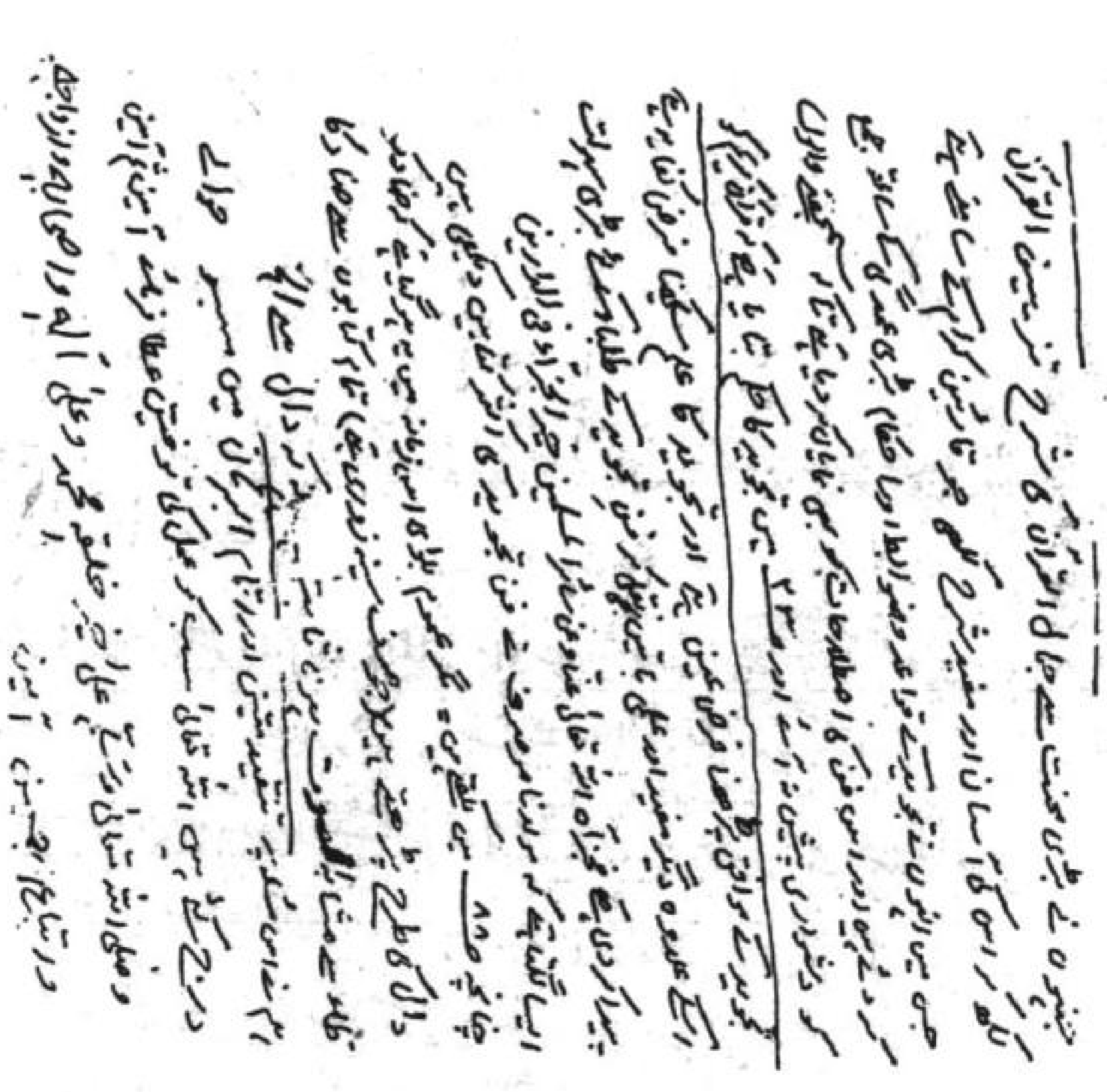
آپ کا خط ملا۔ حضرت مولانا عطاء اللہ صاحب مرحوم کی وفات کا سنا۔ سخت صدمہ ہوا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ مولانا مرحوم ہمارے دیرینہ ساتھی اور راقم اثیم کے شاگرد تھے۔ موطا امام مالکؒ انھوں نے کوہ مری میں مجھ سے پڑھا تھا۔ دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ مرحوم کو کروٹ کروٹ جنت الفردوس نصیب فرمائے اور جملہ پس ماندگان کو صبر جمیل کی توفیق بخشے۔ آمین ثم آمین

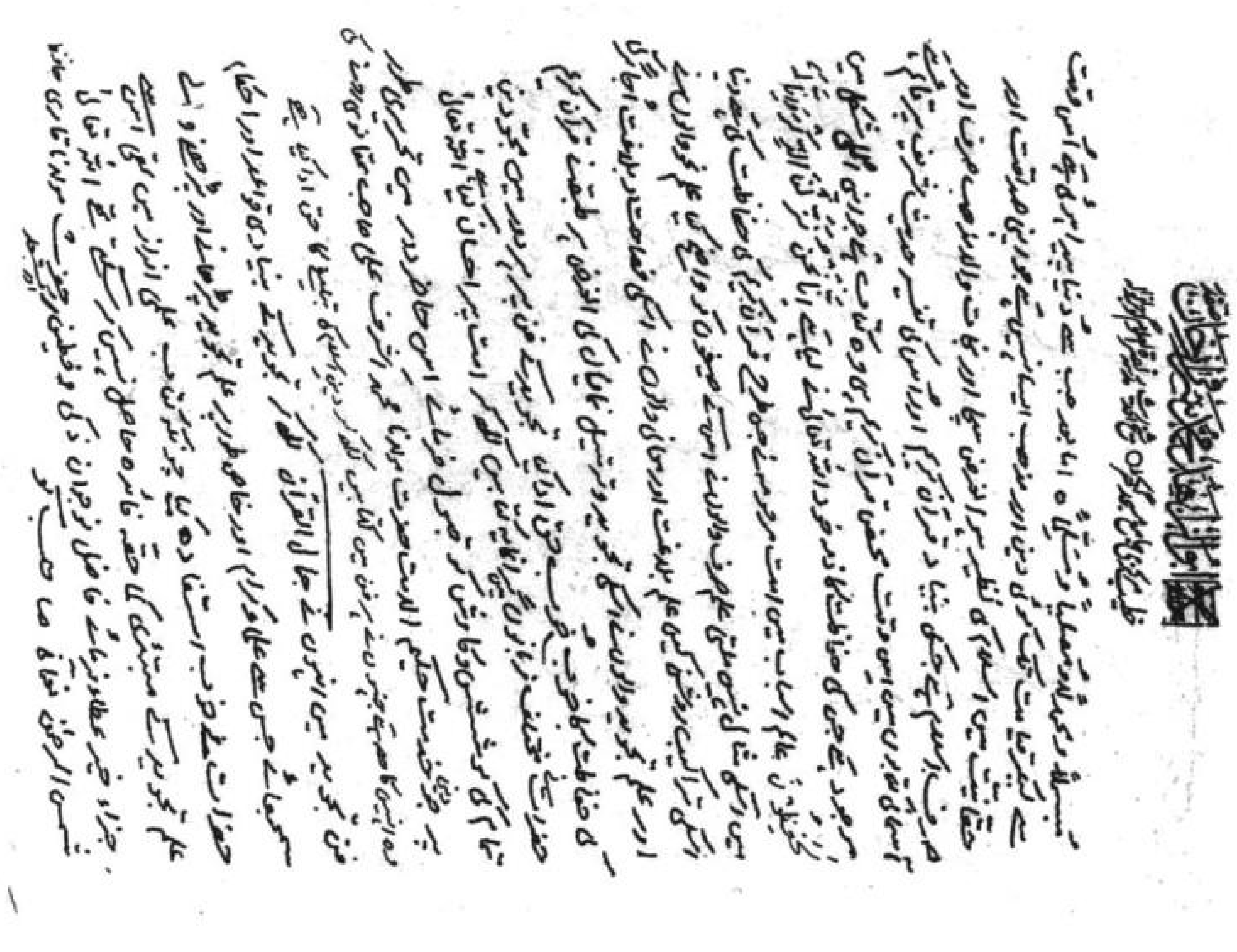
راقم بھی علیل ہے۔ خاتمہ علی الایمان کی دعا کریں۔

والسلام

ابوالزاہد محمد سرفراز

۱۴ محرم ۱۴۲۰ھ / یکم مئی ۱۹۹۹ء





باسمہ سبحانہٗ

من ابی الزاہد

الی عزیز القدر ! جناب مولانا صاحب دام مجدہم

وعلیکم السلام ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

مزاج ؟

آپ کا محبت نامہ موصول ہوا یاد آوری کا صمیم قلب سے ہزار شکریہ

ورنہ من آنم کہ من دانم

عزیز القدر ! راقم اثیم علیل ہے بیٹھکر نمازیں پڑھتا ہے اور آنکھوں میں موتیا آیا ہوا ہے اور پانی بہتا ہے خاتمہ علی الایمان کے لئے دعا کریں

خزائن السنن جلد دوم ص ۳۶ تا ص ۱۳۹ میں فرضوں کے بعد اجتماعی صورت میں برفع الایدی مبسوط باحوالہ بحث ہے آپ کے پاس ہوگی یا کسی ساتھی کے پاس ضرور ہوگی دیکھ لیں

تعویذ ارسال ہے حاضرین سے سلام مسنون عرض کریں

اور مقبول دعاؤں میں نہ بھولیں بفضلہ تعالیٰ

یہ عاجز و خاطی بھی داعی ہے مدرسہ نہیں جاسکتا تعطیلات ہوں گی بفضلہ تعالیٰ خیریت معلوم ہوتی رہتی ہے

والسلام

ابوالزاہد محمد سرفراز

۲۷ر رمضان ۱۴۲۱ھ

۲۴ر دسمبر ۲۰۰۰ء

باسمہ سبحانہٗ

۳۰ر جمادی الاولیٰ ۱۴۱۷ھ
۱۹۹۶ء

من ابی الزاہد

الی عزیز القدر ! عزیزی محمد عمار خان ناصر سلمہ اللہ تعالیٰ

ہدیہ مسنونہ کے بعد ۔ راقم اثیم نے امام اعظم ابوحنیفہؒ اور عمل بالحدیث سرسری طور پر دیکھی ہے نگاہ بھی نہیں ٹکتی اور حافظہ اور دماغ بھی ساتھ نہیں دیتا چونکہ یہ تمہاری پہلی کتاب ہے اور نہایت ہی اہم مسئلہ پر ہے اس کو موافق خوشی کی نگاہ سے اور مخالف سخت تنقیدی نگاہ سے دیکھیں گے اور جواب لکھنے والے ضرور جواب لکھیں گے جلد یا بدیر کیونکہ خاموشی اس فریق کی لغت میں نہیں ہے اور کئی ایسے اجہل اور منہ پھٹ کو جواب کے لئے آمادہ کریں گے جو رسالوں سے چن چن کر حضرت امام ابوحنیفہؒ پر قرآن کریم ۔ احادیث اور حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے حوالوں کے خلاف حوالے نقل کرکے ایک طرف تو خوب دل کی بھڑاس نکالیں گے اور دوسری طرف اپنی جماعت کے افراد کو تردیدی کتاب کا مژدہ سنا کر داد تحسین حاصل کریں گے اور وہ اس کتاب سے چند کمزور حوالے نقل کرکے ساری دنیا میں تشہیر کریں گے کیونکہ اس فرقہ کے پاس مالی وسائل اور پروپیگنڈا کے گر تمہاری کا کوئی کمی نہیں اسلئے روزانہ تھوڑا تھوڑا وقت نکال کر ایک تو کتابت کی عربی رسم الخط کی غلطیاں درست کرو اور دوسرے جس جس کتاب کا حوالہ دیا ہے کسی کی نقل پر اعتماد نہ کرو خود اصل کتابوں سے دیکھ کر تصحیح کرو اور اس سلسلہ میں جلد بازی نہ کرو آرام آرام سے التزام کے ساتھ یہ کام کرو اگر اس کتاب کی صحیح معنیٰ میں تصحیح اور خدمت ہو جائے تو ایک بہت بڑا علمی کارنامہ ہوگا الی کتاب میں کتابت کی اغلاط ۔ حوالوں کی کمی اور اصل کتابوں کی طرف عدم مراجعت وغیرہ وغیرہ کی خامیاں اور امور کی خامی کی ہے میری یہ کتاب اپنی رہنمائی کے لئے پاس رکھو اور مجھے اس کے عوض میں اور کتاب دیدو صرف ابتدائی حوالے اس پر میری یادداشت کے لئے درج کر دو

ابن ابی شیبۃ اور ابن ماجہ وغیرہ تاب ... لکھو

[illegible]

بحمداللہ تعالیٰ وفضلہٖ تمہاری قیمت تو زیادہ ہے [illegible] میں یتیم ہوں اسلئے صرف پچیس روپیہ تمہیں انعام دے رہا ہوں والسلام ابوالزاہد محمد سرفراز

مدرسہ نصرۃ العلوم (رجسٹرڈ)

محلہ فاروق گنج نزد گھنٹہ گھر گوجرانوالہ پاکستان فون ۲۴۲۷۱۱

باسمہ سبحانہ وتعالیٰ

من ابی الزاہد

الیٰ محترم المقام حضرت العلامہ الحاج مولانا فداء الرحمٰن صاحب ودیگر اراکین کمیٹی مصلح بین الفریقین دام مجدہم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

مزاج گرامی!

ملک اور بیرون ملک مخلص حضرات بے چینی سے تو آپ کے فیصلہ کی انتظار میں ہیں واللہ الموفق
مولانا فضل الرحمٰن صاحب تشریف لائے تھے میں نے ان سے عرض کیا تو انہوں نے تحریر لکھ دی (جو میرے پاس
گکھڑ میں موجود ہے یہ عریضہ میں فوری طور پر مدرسہ نصرۃ العلوم سے لکھ رہا ہوں) کہ غیر مشروط طور پر
میں مصالحت کے لئے تیار ہوں پھر میں نے حضرت مولانا سمیع الحق صاحب سے رابطہ کیا
ان کا بذریعہ ڈاک جواب ارسال ہے جس میں انہوں نے ساری ذمہ داری کمیٹی پر ڈالی ہے
اب آپ حضرات سے پرزور اپیل ہے کہ بہت جلد معاملہ کو پایۂ تکمیل تک پہنچا کر
قوم کے دلوں میں سرور پیدا کریں اور ثواب دارین حاصل کریں اور اس میں جس طرح
بھی ہو سکے جوڑنے کی ہی کوشش کریں قال اللہ تعالیٰ ان یریدا اصلاحا یوفق اللہ بینہما
حاضرین سے سلام مسنون ارشاد فرمائیں اور مقبول دعاؤں میں نہ بھولیں صحت اچھی نہیں رہتی
بفضلہ تعالیٰ یہ آثم وخاطی بھی داعی ہے

والسلام

ابو الزاہد محمد سرفراز از نصرۃ العلوم گوجرانوالہ

۱۷ رجب ۱۴۱۰ھ
۱۵ فروری ۱۹۹۰ء

ابو الزاہد محمد سرفراز خان صفدر

خطیب مرکزی جامع مسجد گکھڑ ○ شیخ الحدیث مدرسہ نصرۃ العلوم گوجرانوالہ

باسمہ سبحانہ وتعالیٰ

من ابی الزاہد

الیٰ علماء کرام وقافلہ اہل حق دامت برکاتہم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

مزاج عالی!

بڑے عرصہ کے بعد بعض مخلص ساتھیوں کی کوشش اور سعی
سے اپنے مسلک کے حضرات باوجود اپنی مذہبی اور سیاسی
جماعات کو برقرار رکھتے ہوئے مغربی اقوام کی اسلام دشمنی کے
خلاف اور بے دین لیڈروں کی عریانی اور فحاشی کی سرپرستی
کے مقابلہ میں جمع ہوئے جو بڑی خوشی کی بات ہے کہ اس طریقہ
سے مساجد اور دینی مدارس کی بقاء بھی ہوگی اور اہل حق کا اسلامی
فریضہ بھی ادا ہوگا اور اہل حق سے وابستہ حضرات کا اعتماد
بھی بحال ہوگا الحمد للہ تعالیٰ کہ توقع سے زیادہ اس میں ہر
جماعت نے اور قافلہ حضرت شیخ الہندؒ کے ہر فرد نے بڑھ چڑھ کر
حصہ لیا اور لے رہے ہیں اور چند اجتماعات بھی اسی مد کے مختلف
مقامات پر بڑی کامیابی سے منعقد ہوئے اور حضرات نے جوش
وخروش کا اظہار کیا اللّٰہم زد فزد فجزاہم اللہ تعالیٰ فی الدارین خیرا
راقم اثیم تقریباً پندرہ دن سے صاحب فراش اور آپ حضرات
کی طرف سے خاتمہ علی الایمان کی دعاء کا محتاج ہے درس وتدریس بالکل
معطل ہے جمعہ پڑھانا تو کجا پڑھ بھی نہیں سکتا اسلئے حاضری سے معذور ہے
سب حضرات کو مخلصانہ سلام مسنون عرض کریں

والسلام

ابو الزاہد محمد سرفراز

۳ صفر ۱۴۱۹ھ
۳۰ مئی ۱۹۹۸ء

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ۔ نحمدہ ونصلی علی رسولہ الکریم ۔ امابعد
کسی بھی وقت توحید وسنت کو نظر انداز نہ کرنا اور کسی بھی
وقت شرک وبدعت کی طرف رجحان نہ کرنا موت
اور آخرت کو ہر وقت پیش نظر رکھنا اور استغفر اللہ
الذی لا الٰہ الا ھو الحی القیوم ۔ بکثرت پڑھتے رہنا
اور زندگی کو صرف عارضی اور فانی سمجھنا اور یہ نہ بھولنا
کہ موت یوں پکار رہی ہے
غنیمت جان لو مل بیٹھنے کو ۔ جدائی کی گھڑی سر پر کھڑی ہے

۶ر جمادی الاخریٰ ۱۴۱۷ھ الاحقر ابو الزاہد محمد سرفراز خطیب جامع مسجد گکھڑ
۲ر اپریل ۱۹۹۶ء

باسمہ سبحانہ

راقم اثیم نے تقریباً پچپن سال سیاست میں بھرپور حصہ لیا ہے اور
تقریباً پینتالیس جمعیت علماء اسلام سے وابستہ رہا ہے اب علالت
اور کبر سنی اور مصروفیات کی وجہ سے میرا کسی سیاسی جماعت
سے کوئی تعلق نہیں جمعیت علماء اسلام کے مخلص اور اہل علم اکابر
اور علماء کی دل سے قدر کرتا ہے مگر میرا تعلق اب کسی فریق
سے نہیں ہے اگر کوئی فریق میرا نام استعمال کر کے
غلط فائدہ اٹھاتا ہے تو وہ اس کا ذمہ دار وہ ہے راقم نہیں ہے

ابو الزاہد محمد سرفراز
۲۶ر رجب ۱۴۱۱ھ
۱۲ر فروری ۱۹۹۱ء

—— ۷ ——

تعزیتی پیغامات وتاثرات

میں پانچویں جماعت کا طالب علم تھا اور اس وقت آزاد کشمیر کے ایک دور دراز گاؤں میں رہتا تھا۔ ہمارے قریب ہی ایک جامع مسجد تھی جس میں سنت وبدعت کے حوالے سے بحث چل پڑی۔ اس میں اتنی شدت آئی کہ معاملہ نزاع تک پہنچ گیا، جیسا کہ اس طرح کے مباحث میں بالعموم ہوتا ہے۔ میں کم عمر ہونے کے باوجود اس سے بہت متاثر بلکہ پریشان ہوا۔ انھی دنوں مجھے جستجو ہوئی کہ یہ جانوں کہ اصل حقیقت کیا ہے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے ایسی صورت پیدا فرما دی کہ مجھے حضرت مولانا کی تالیف ''راہ سنت'' کہیں سے مل گئی۔ میں نے کم سنی اور کم علمی کے باوجود اس کا مطالعہ کیا تو مجھے بہت فائدہ ہوا اور سنت وبدعت کا فرق بھی سمجھ میں آ گیا اور سب سے بڑی بات یہ کہ اللہ تعالیٰ نے اس تالیف کے سبب سنت پر عمل پیرا ہونے کی توفیق عطا فرمائی اور بدعت سے حتی الوسع اجتناب کا داعیہ پیدا کر دیا۔ اس موضوع پر بعد میں مزید کتب پڑھنے کا اتفاق ہوا، لیکن جو اثرات حضرت مولانا کی بے مثال تالیف کے مطالعہ سے دل ودماغ پر مرتب ہوئے، وہ آج بھی برقرار ہیں۔

تعزیتی پیغامات اور تاثرات

﴿ ۱ ﴾

باسمہ تعالیٰ

مخدومنا المکرم حضرت مولانا مرغوب الرحمٰن صاحب، دامت برکاتکم
حضرت مولانا سید ارشد مدنی صاحب، دامت برکاتکم
حضرت مولانا سعید احمد پالن پوری صاحب، دامت برکاتکم
ودیگر اکابر واساتذہ مادر علمی دار العلوم دیوبند

مزاج گرامی!

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

حضرت والد محترم مولانا محمد سرفراز خان صفدر نور اللہ مرقدہ کی وفات حسرت آیات کی المناک خبر آپ سب لوگوں تک پہنچ چکی ہوگی۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ وہ دار العلوم دیوبند کے فیض یافتہ اور اس مادر علمی کے فکر ومسلک کے ترجمان تھے جن کی علمی ودینی جدوجہد میں دیوبندی مسلک کا تعارف اور اس کا دفاع ہی ہمیشہ اولین ترجیح رہا ہے اور انہوں نے کم وبیش پون صدی تک مسلسل اس کے لیے خدمات سرانجام دی ہیں۔ اس لیے میں دار العلوم دیوبند کو اس کے ایک مایہ ناز سپوت کی وفات پر تعزیت کا حقدار سمجھتا ہوں اور حضرتؒ کے پورے خاندان کی طرف سے اس عریضہ کے ذریعہ دار العلوم دیوبند کے منتظمین، اساتذہ اور طلبہ سے تعزیت کی سعادت حاصل کر رہا ہوں۔ اللہ رب العزت انہیں جوار رحمت میں جگہ دیں اور ہم سب کو ان کی حسنات کا سلسلہ جاری رکھنے کی توفیق سے نوازیں۔ آمین یارب العالمین۔

ابو عمار زاہد الراشدی

خادم الحدیث مدرسہ نصرۃ العلوم گوجرانوالہ

﴿ ۲ ﴾

دیوبند، ۵ رمئی۔ پاکستان کے ممتاز عالم دین مولانا سرفراز خان صفدر کا آج مختصر علالت کے بعد گوجرانوالہ (پاکستان) میں انتقال ہوگیا۔ مولانا صفدر کا شمار برصغیر ہندوپاک کے جید علما میں ہوتا تھا۔ موصوف دار العلوم دیوبند کے فاضل تھے اور شیخ الاسلام حضرت مدنی کے تلامذہ میں سے تھے۔ مختلف موضوعات پر ان کی درجنوں تصانیف موجود ہیں۔ اسلام کے خلاف اٹھنے والے باطل فتنوں کے رد میں آپ کی کتابیں خاص وعام میں یکساں مقبول ہیں۔ مولانا کی ولادت ۱۹۱۴ء میں ہوئی۔

گوجرانوالہ (پاکستان) کے مدرسہ نصرۃ العلوم میں ایک طویل عرصہ تک بحیثیت شیخ الحدیث علم دین اور حدیث وفقہ کی خدمات انجام دیتے رہے۔ علم حدیث سے آپ کو کافی شغف تھا۔

جنازہ میں علما، فضلاے مدارس عربیہ کی بڑی تعداد موجود تھی۔ یہ اطلاع دیتے ہوئے دار العلوم دیوبند کے شعبہ کل ہند مجلس تحفظ ختم نبوت کے نائب ناظم مولانا شاہ عالم گورکھپوری نے بتایا کہ مولانا سرفراز خان صفدر کا انتقال ملت کا ناقابل تلافی نقصان ہے۔ ان کے انتقال سے جو خلا پیدا ہوا ہے، وہ پر ہونا مشکل ہے۔ کل ہند مجلس تحفظ ختم نبوت کے دفتر میں ان کے لیے ایصال ثواب کیا گیا۔

(ہفت روزہ الجمعیۃ، نئی دہلی)

﴿ ۳ ﴾

الحمد لله رب العالمين والصلوة والسلام على سيد المرسلين، وعلى آله واصحابه اجمعين۔

شیخ الحدیث والتفسیر امام اہل سنت حضرت مولانا سرفراز خان صفدرؒ تلمیذ رشید شیخ العرب والعجم حضرت مولانا سید حسین احمد مدنیؒ اور خلیفہ مجاز حضرت اقدس حضرت مولانا حسین علی صاحبؒ، قافلہ اہل حق کے سپہ سالار، عظیم محدث، عظیم مفسر، اس دنیاے فانی سے رخصت ہوگئے اور عزیمت واستقامت کے رہرو علماے کبار اور اولیاے ذی احترام کے پاس پہنچ گئے۔ دار العلوم دیوبند نے علم وعمل، زہد وورع، تقویٰ وتدین، فضل وکمال، اخلاص واتباع سنت کے حامل افراد کا جو قافلہ تیار کیا تھا، حضرت مولانا بھی اس قافلے کے ہم سفر تھے۔ فقیر کے ان کے ساتھ تعلقات تقریباً پون صدی پر محیط ہیں۔ ویسے تو ان کے ساتھ بہت ساری قدریں مشترک ہیں، لیکن دو قسم کے رشتے بڑے اہم ہیں۔ ایک یہ کہ ایشیا کی عظیم درس گاہ دار العلوم دیوبند اور دیوبند میں مرجع الخلائق شیخ العرب والعجم سید حسین احمد مدنیؒ سے اکتساب فیض اور ان کی پاکیزہ صحبت جو اللہ جل شانہ نے ہمیں نصیب فرمائی۔ اسی طرح ہمارے حضرت قدوۃ السالکین محبوب العارفین حضرت اعلیٰ خواجہ ابوالسعد احمد خان صاحبؒ کا تعلق خانقاہ موسیٰ زئی شریف سے تھا اور حضرت مولانا کے مرشد کامل حضرت مولانا حسین علیؒ کا تعلق بھی خانقاہ موسیٰ زئی شریف سے تھا۔ اس طرح اللہ تعالیٰ نے رشد وہدایت کے ان مراکز کے ساتھ ہمیں نسبت عطا فرمائی۔

ایں سعادت بزور بازو نیست
تا نہ بخشد خداے بخشندہ

حضرت مولانا کو اللہ تعالیٰ نے غیر معمولی صلاحیتوں سے نوازا تھا۔ گوناگوں صفات کے مالک تھے۔ ان کا سایہ بہت سے فتنوں کے لیے سد باب رہا۔ ان کا تبحر علمی بے مثال تھا۔ وہ علماے دیوبند کے علم وعمل کے وارث تھے۔ ان کی سب سے بڑی خوبی یہ تھی کہ انھوں نے جو کام بھی شروع کیا، مستقل مزاجی کے ساتھ کیا اور ہمیشہ عزیمت پر عمل کیا۔ اپنی پوری زندگی دین حق کی حفاظت میں صرف کی اور جب بھی کسی اہل باطل نے اسلام کے مسلمہ اصولوں میں کسی ایک اصول کے خلاف قلم اٹھایا تو حضرت مولانا نے بطریق احسن اس کا تعاقب کیا۔ وجادلهم بالتي هي احسن کا عملی نمونہ پیش کیا اور دلائل کے میدان میں ہمیشہ سرفراز ہی رہے، لیکن اس مشکل گھاٹی سے گزرتے ہوئے کبھی آپ نے اپنے اکابرین کی تحقیقات سے سرمو

انحراف نہیں کیا۔ نیز جس طرح آپ نے اپنے قلم کے ذریعے اسلام کی نظریاتی سرحدوں کا پہرا دیا، اسی طرح عملی تحریکات میں بھی شریک رہے۔ بالخصوص ۱۹۵۳ء کی تحریک ختم نبوت میں آپ نے نمایاں کردار ادا کیا اور ناموس رسالت صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے تقریباً ۱۰ ماہ جیل کاٹی۔ اللہ تعالیٰ ان کی مساعی جمیلہ کو قبول فرمائے۔ وہ دین کا روشن چراغ تھے جن سے بے شمار دینی مشعلیں روشن ہوئیں۔ ان کو ایک عالم حق اور باعمل بااخلاص ہونے کی وجہ سے ہمیشہ یاد رکھا جائے گا۔

خدا رحمت کند ایں عاشقان پاک طینت را

فقیر دعا گو ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کو اپنے جوار رحمت وغفران ورضوان میں جگہ عطا فرمائے اور امت میں ایسے افراد زہاد پیدا فرمائے جو اقامت دین کا فریضہ اسی طرح ادا کر سکیں۔ اللہ تعالیٰ ان کے اہل وعیال اور متعلقین کرام پر ہمیشہ اپنے فضل وکرم کا سایہ رکھے۔

آخر میں اپنے عزیزوں حضرت مولانا زاہد الراشدی، حضرت مولانا عبد القدوس قارن، حضرت مولانا عبد الحق خان بشیر ودیگر صاحب زادگان سے عرض کروں گا کہ وہ اپنے والد محترم کے نقش قدم پر چلتے ہوئے ہمت اور استقامت کے ساتھ دین حق پر سختی سے کاربند رہیں اور اپنی اولاد کو بھی اس پر کاربند رکھیں تاکہ یہ چراغ بجھنے نہ پائے۔

[مولانا] ابو الخلیل خان محمد

خانقاہ سراجیہ، کندیاں شریف

﴿ ۴ ﴾

برادران محترم جناب مولانا زاہد الراشدی صاحب زید مجدہ واخوانہ الکرام

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

استاذ محترم امام اہل سنت حضرت مولانا محمد سرفراز خان صفدر صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی وفات حسرت آیات پوری علمی دنیا کے لیے بہت بڑا سانحہ اور اکابر دیوبند کی اس نشانی کا رخصت ہو جانا بہت بڑا خسارہ ہے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

حضرت رحمۃ اللہ علیہ سے ناچیز کو تلمذ کا شرف اس طرح حاصل ہے کہ حضرت والا نے ناچیز کی درخواست پر روایت حدیث کی اجازت بھی خاص شفقت سے عطا فرمائی تھی جو ناچیز کے لیے بڑی سعادت ہے۔ ہر حاضری اور ملاقات کے موقع پر حضرت رحمۃ اللہ علیہ جس شفقت سے برتاؤ فرماتے تھے، اس کا دل پر گہرا نقش ہے۔

نماز جنازہ میں کوشش کی کہ ہم دونوں بھائیوں میں سے کوئی حاضر ہو جائے، لیکن وقت پر سیٹ نہ مل سکی۔ مجبوراً میں نے اپنے بھانجے مولوی ناظم اشرف، استاذ جامعہ اشرفیہ لاہور اور رفیق دار الافتاء جامعہ اشرفیہ لاہور مولانا محمد افتخار بیگ دونوں سے درخواست کی کہ وہ نماز جنازہ میں جا کر آپ حضرات کی خدمت میں میری طرف سے تعزیت بھی پیش کریں۔ الحمد للہ نماز جنازہ میں ان کی شرکت ہوگئی، مگر ٹریفک کے بے پناہ ہجوم کے باعث کئی گھنٹوں کی مسلسل کوشش کے باوجود آپ حضرات تک رسائی نہ ہو سکی۔

بلاشبہ یہ غم بہت صبر آزما ہے۔ اللہ تعالیٰ حضرت رحمۃ اللہ علیہ کی کامل مغفرت فرما کر درجات عالیہ سے نوازے اور آپ حضرات اور ہم سب پس ماندگان کو صبر جمیل عطا فرمائے اور حضرت رحمۃ اللہ علیہ کی برکات سے ہمیشہ مالا مال رکھے۔

براہ کرم ناچیز کی طرف سے سب بہن بھائیوں اور اہل خانہ کی خدمت میں تعزیت کے ساتھ سلام پہنچا دیا جائے۔

(مولانا مفتی) محمد رفیع عثمانی
صدر دارالعلوم کراچی

﴿ ۵ ﴾

محترم المقام مولانا زاہد الراشدی، مولانا عبد القدوس قارن،
مولانا عبد الحق خان بشیر، مولانا عزیز الرحمن و مولانا رشید الحق خان عابد
اور دیگر فرزندان وعزیز واقارب حضرت امام اہل سنتؒ
السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ
طالبین بخیر ہیں۔
شاعر نے کہا:

هيهات لا ياتي الزمان بمثله ان الزمان بمثله لبنخيل

گردش لیل ونہار میں بار بار یہ حقیقت مجسم شکل میں نظر آتی ہے: كل نفس ذائقة الموت یعنی

موت سے کس کو رستگاری ہے آج وہ، کل ہماری باری ہے

جو نفس بھی اس کائنات میں آیا، اسے واپس جانا ہی ہے، مگر ایسے نفوس معدودے چند ہوتے ہیں جو اپنی ذات میں انجمن، ایک محفل اور ایک ادارہ ہوتے ہیں، بلکہ اگر یہ کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا کہ ایسے نفوس اپنی ذات میں علم وعمل کا ایک جہان اور اخلاق وہدایت کی ایک دنیا بسائے ہوتے ہیں، اور ان کے اٹھ جانے سے ایک فرد کی ہی کمی نہیں ہوتی بلکہ پوری سبھا ہی اجڑ جاتی ہے۔ ایک عہد کا خاتمہ ہوتا ہے اور ایک قرن کا اختتام ہو جاتا ہے۔ ایسے افراد کا دنیا سے کوچ کر جانا سیکڑوں، ہزاروں بلکہ بعض اوقات لاکھوں انسانوں کے دنیا سے چلے جانے سے زیادہ باعث ضیاع وزیاں ہوتا ہے۔

علامہ ظفر احمد عثمانیؒ کی ہمہ جہت شخصیت کے سانحہ ارتحال پر محدث العصر علامہ محمد یوسف بنوریؒ نے فرمایا تھا:

''حضرت عثمانیؒ کی وفات سے مسند علم وتحقیق، مسند تصنیف وتالیف، مسند تعلیم وتدریس اور مسند بیعت وارشاد بیک وقت خالی ہو گئیں۔ اب ان کو پر کرنے والا کوئی نظر نہیں آتا''۔

حالانکہ حضرت عثمانیؒ کی وفات کے وقت جید اکابر علما کی ایک جماعت بقید حیات تھی، اس لیے یہ عبارت حضرت امام اہل سنتؒ کی ذات گرامی کے لیے زیادہ موزوں ہے۔ آپ کا مذاق ومزاج یقیناً تحقیق وتصنیف، تعلیم وتدریس اور اصلاح وارشاد کے تال میل سے بنا تھا۔

وما كان قيس هلكه هلك واحد ولكنه بنيان قوم تهدما

موجودہ دور کے تقریباً تمام فرق باطلہ وضالہ کے خلاف آپ کے خامہ عنبر شمامہ سے وہ متین تحریرات نکلیں کہ جن کا ٹھوس جواب اب تک مخالفین سے نہ بن پڑا۔ دبستان تنقید میں آپ نے جس اعتدال، میانہ روی اور ظرافت کی روش کو زندہ کیا، وہ ہر شخص کے بوتے کی بات نہیں۔ اسی ظرافت واعتدال نے آپ کی تحریرات کو ''از دل خیزد بر دل ریزد'' کا مصداق بنا دیا۔

آپ کی تحقیقات کا یہ قوس وقزحی مجموعہ تا قیامت اہل خبر ونظر کے مشام جان کو معطر کرتا رہے گا۔

حضرت اقدسؒ کی وفات حسرت آیات کے دن اساتذۂ جامعہ کا تعزیتی اجلاس ہوا جس میں حضرت مرحومؒ کے لیے ایصال ثواب اور دعائے مغفرت اور پس ماندگان ومتعلقین کے لیے صبر کی دعا کی گئی۔ جنازہ میں تقریباً اساتذہ اور طلبائے کرام کی بڑی تعداد نے شرکت کی۔ آہ!

داغ فراق صحبت شب کی جلی ہوئی اک شمع رہ گئی تھی سو وہ بھی خموش ہے

چمکتا آفتاب کسی ایک کی ملکیت نہیں ہوتا۔ ڈھلتے اور ڈوبتے سورج کا نقصان کسی ایک کا نقصان نہیں ہوتا۔ یہ نفوس قدسیہ پوری قوم کا سرمایہ، پوری کائنات کا اجتماعی اثاثہ اور پوری امت کی پونجی ہوتے ہیں۔ ہم سب لائق تعزیت ہیں کہ یہ نقصان ہم سب کا نقصان اور یہ دکھ ہم سب کا دکھ ہے۔ لیکن نسبی تعلق کی وجہ سے آپ حضرات زیادہ قابل تعزیت ہیں۔ ہماری دعا ہے کہ اللہ رب العزت حضرتؒ کو کروٹ کروٹ سکون وسرور نصیب فرمائے اور آپ اخلاف کو حضرتؒ کی سچی جانشینی کی توفیق نصیب فرمائے۔ آمین۔

آپ حضرت امام اہل سنتؒ کے دیرینہ ساتھی اور شاگرد حضرت شیخ الحدیث مولانا عبد القیوم ہزاروی صاحب مدظلہ العالی، حضرت مہتمم جامعہ مولانا ظہور احمد علوی صاحب مدظلہ العالی، جملہ اساتذہ جامعہ اور تمام طلبہ کرام کی طرف سے تعزیت قبول فرمائیں۔ حضرتؒ کے خاندان کے خورد وبزرگ کو بھی ہماری طرف سے تعزیت۔

جان کر من جملہ خاصان میخانہ مجھے مدتوں رویا کریں گے جام وپیمانہ مجھے

والسلام مع الاکرام۔ بہ احترامات فراواں
جملہ اساتذہ کرام وطلبہ جامعہ محمدیہ، F-6/4 اسلام آباد

﴿ ۶ ﴾

مکرمی ومحترمی مولانا زاہد الراشدی صاحب زادکم اللہ عزاً وشرفاً
السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

اعصابی تناؤ، درد اور اسہال کے عارضہ میں گھر میں لیٹا ہوا تھا کہ میرے بیٹے حافظ عبد الرحمن سلمہ اللہ نے فون پر اطلاع دی کہ حضرت مولانا شیخ الحدیث صاحبؒ کا انتقال ہو گیا ہے اور عصر کے بعد نماز جنازہ ہے۔ اس خبر نے طبیعت کو مزید بوجھل بنا دیا اور مسلسل ''انا للہ وانا الیہ راجعون'' پڑھتا رہا۔ حضرت کے انتقال کا صدمہ آپ کا اہل خانہ کا اور احباب ومتوسلین نصرۃ العلوم کا ہی نہیں بلکہ تمام اہل توحید کا صدمہ ہے۔ اللہ سبحانہ وتعالیٰ حضرت مرحوم کی دینی وعلمی خدمات کو قبول فرمائے اور بشری کمزوریوں کو اپنے عفو وکرم کی بنا پر معاف فرمائے۔ آپ اور آپ کے علاوہ ہزاروں ان کے تلامذہ یقیناً ان کے لیے صدقہ جاریہ ہیں اور اجر وثواب میں اور رفع درجات میں اضافے کا باعث ہیں۔ دل چاہتا تھا کہ حضرت مرحوم کے جنازہ میں شرکت کی سعادت حاصل کروں مگر صحت کی خرابی کے سبب اس سے محروم رہا۔ بس یہی دعا ہے کہ " اللهم اغفر له وارحمه وارفع درجته في المهديين والحقه بالنبيين والصديقين والشهداء والصالحين۔ آمين يا رب العالمين۔

محترم عمار صاحب کو بھی سلام عرض ہے۔

[مولانا] ارشاد الحق اثری

ادارۂ علوم اثریہ، فیصل آباد

﴿ ۷ ﴾

آج بروز شنبہ علی الصبح ہی آپ کے والد ماجد اور ملک کے مشہور عالم دین رحمۃ اللہ علیہ کے وصال پر ملال کی خبر سن کر بہت ہی ملال ہوا۔ اناللہ وانا الیہ راجعون۔ دلی دعا ہے کہ رب کریم ان کی قبر کو روضہ جنت بنا کر آپ کو دار قرار کی حقیقی مسرتوں سے نوازیں اور بالخصوص دینی تعلیمات کی برکات کا مشاہدہ کراتے رہیں۔ آمین آمین ویرحم الله عبدا قال آمینا

نجم المدارس میں قرآن مجید کے ختمات سے ایصال ثواب کی کوشش کی گئی، والقبول من الله الغفور الرحیم۔

آپ سب حضرات سے اپنے لیے حسن خاتمہ اور حفاظت عن المعاصی والمصائب کی دعا کی پرزور درخواست ہے اور یہ کہ نجم المدارس کو بھی اللہ تعالیٰ صالح طلبہ وصالح اساتذہ اور صالح معاونین سے آباد رکھے اور ہم جیسے برائے نام خدام کو بھی صالح بنادے۔ والله علی ما یشاء قدیر۔

بھائی قاضی عبد اللطیف صاحب جو کہ عرصہ سے بیمار ہیں اور بھائی قاضی محمد اکرم صاحب نیز برخورداران قاضی حافظ عبد الحلیم اور قاضی حافظ محمد نسیم سلمہم سب سلام مسنون اور حضرت مرحوم کے لیے آپ کو پیغام تعزیت عرض کرتے ہیں۔ یغفر الله لنا ولکم وهو ارحم الراحمین۔

[مولانا قاضی] عبد الکریم غفرله ولوالدیه

مدرسہ عربیہ نجم المدارس کلاچی

﴿ ۸ ﴾

سیدی وسندی حضرت والد ماجد قاضی عبد الکریم صاحب مدظلہ حضرت الشیخ کے سانحہ وفات سے بے حد متاثر ہیں۔ اس لیے تعزیت نامہ احقر کے سپرد کیا کہ اہتمام کے ساتھ روانہ کر دیا جائے۔ مکرر سہ کرر تعزیت کناں ہوں۔ احقر خود بیمار ہے اور بیماری بھی ایسی کہ سفر دشوار ہو گیا ہے، ورنہ خود حاضری کرتا اور نجم المدارس کلاچی کی نمائندگی ہو جاتی۔

ما کل ما یتمنی المرء یدرکه   تجری الریاح بما لا تشتهی السفن

کا قصہ ہے۔ بصد مجبوری تحریر پر اکتفا ہے۔

۷۰ء میں جبکہ بندہ دار العلوم حقانیہ اکوڑہ خٹک میں شریک دورۂ حدیث شریف تھا، جمعیۃ طلبا کے ایک اجلاس میں حقانیہ سے میں نے نمائندگی کی تھی۔ اسلوب قریشی کا دور تھا۔ سب سے پہلے حضرت کی زیارت اس موقع پر ہوئی تھی۔ حضرت کی نورانی صورت اور تقریر ابھی تک یاد ہے۔ قومی اتحاد کے جلسے جلوسوں کے موقع پر حضرت کی جلوس کی قیادت اور سرخ لکیر سے آگے جاتے ہوئے یہ جملہ کہ ''میں مسنون عمر پوری کر چکا ہوں'' حضرت کی جرات واستحضار آخرت کا ہم پس ماندگان کے لیے ایک عظیم درس حیات ہے۔ بہر حال حضرت کے سوانح حیات پر آپ تفصیل سے بہت جلد تحریر فرما دیں کہ بہتوں کا بھلا ہوگا۔ میرے جیسا نالائق تو بجز اس رونے کے اور کیا کر سکتا ہے۔ نجم المدارس کلاچی میں تمام اسباق میں حضرت کا ذکر

خیر چلتا رہا۔

اب انھیں ڈھونڈ چراغ رخ زیبا لے کر

[مولانا] قاضی عبد الحلیم

خادم التدریس والافتاء، مدرسہ عربیہ نجم المدارس کلاچی

﴿ ۹ ﴾

حضرت والا واقعی علم وتحقیق، تحریر وبیان، حق گوئی وبے باکی، عزم وہمت، جرات واستقلال میں اپنی نظیر نہیں رکھتے تھے۔ وہ سرمایہ ملت کے نگہبان اور اپنے اکابر واسلاف کی روایات کے امین تھے۔ انہوں نے پوری زندگی دین حنیف کی پاسبانی کا صحیح اور بھرپور فریضہ انجام دیا۔ اللہ تعالیٰ ان کو کروٹوں چین نصیب فرمائے، ان کو اپنے فضل وکرم سے غریق رحمت فرما کر جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام عطا فرمائے اور آپ بھی جملہ پس ماندگان ووابستگان کو صبر جمیل واجر جزیل عطا فرمائے۔

مولانا شبیر احمد

دار العلوم زکریا، جنوبی افریقہ

﴿ ۱۰ ﴾

اللہ تعالیٰ آپ کو جملہ خاندان سمیت صبر جمیل اور اجر جزیل عطا فرمائے۔ حضرت والا نور اللہ مرقدہ کو جنت الفردوس میں عالی مقامات عطا فرمائے۔ واقعی صدمہ بہت بڑا ہے اور سب کے لیے ہے۔ سب کے جذبات یہی ہیں۔ ان کا خلا اب کیسے پر ہوگا؟ کریم ہی کرم فرمائیں۔

ان دنوں احقر بھی جنوبی افریقہ کے سفر پر ہے۔ ۱۶ رمئی کو ایسٹ لنڈن شہر میں (جو جنوبی افریقہ کا خوبصورت ترین شہر ہے اور ساحل سمندر پر واقع ہے) میں نے بعد فجر ساحل سمندر پر ساتھیوں کے ساتھ مجلس ذکر اور نماز اشراق کے بعد میزبان کے گھر آرام کیا۔ اس دوران درج ذیل خواب دیکھا:

مجھے بتایا گیا کہ مرشدی شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا صاحب گھر تشریف لانے والے ہیں اور چند روز قیام فرمائیں گے۔ میں بہت خوش ہوا اور اسی غرض سے وضو کرنے کا ارادہ کیا۔ وضو کے لیے جانے لگا کہ حضرت اچانک خدام کی معیت میں تشریف لائے۔ میں ایک طرف سے وضو کے لیے گیا کہ بے وضو ملاقات نہ ہو، اتنے میں دیکھا کہ حضرت شیخ الحدیث مولانا سرفراز خان صفدر بھی کھڑے ہیں۔ اور بھی کچھ حضرات ہیں۔ حضرت شیخ نے حضرت کے والد گرامی کو دیکھا، بہت محبت سے ملاقات کی اور خیر وخیریت دریافت کر کے آگے ہمارے ہاں تشریف لے گئے۔ اتنے میں آنکھ کھل گئی۔ فرحمهم الله رحمة واسعة۔

[مولانا] محمد عزیز الرحمن

حال مقیم جوہانسبرگ، جنوبی افریقہ

﴿ ۱۱ ﴾

امیر اہل سنت سرفراز ملت حضرت مولانا سرفراز خان صفدرؒ کی وفات کی خبر سے انتہائی صدمہ پہنچا۔ بلوچستان کے دینی

حلقوں میں رنج وغم کی لہر دوڑ گئی۔ مدارس میں قرآن خوانی اور مساجد میں خصوصی دعائیں ہوئیں۔ تعزیتی اجتماعات میں علما نے ان کی دینی خدمات کو زبردست خراج عقیدت پیش کیا۔ وہ ملت اسلامیہ کی متاع تھے۔ اس دور میں ان کی دینی شخصیت پاکستان کے عوام کے لیے قیمتی اثاثہ تھی۔ اس نفسانفسی کے دور میں تمام اہل علم حضرات ان کا نام ادب واحترام سے لیتے تھے۔ وہ دینی یا دیوبندی سیاسی حلقوں میں غیر متنازعہ تھے۔ دینی مسائل میں سب ان پر اعتماد کرتے تھے۔

میں نے حضرت کا نام پہلی مرتبہ ۱۹۶۷ء میں سنا جب میرے والد صاحب ملک محمد حسین مرحوم نے مولانا سید شمس الدین شہیدؒ کے والد حضرت مولانا محمد زاہد مرحوم سے کہا کہ شمس الدین کو بہتر دینی تعلیم کے لیے گوجرانوالہ مولانا سرفراز خان صفدر صاحب کے مدرسہ میں بھیج دیں۔ والد صاحب نے ایک خط مولانا محمد اکرم مرحوم (اکرم فاؤنڈری) والوں کے نام تحریر کیا جس میں مولانا شمس الدین کے، مولانا محمد سرفراز خان صاحب کے مدرسہ میں واخلے کی درخواست کی تھی۔

میری حضرت سے پہلی ملاقات اس وقت ہوئی جب ۲۰۰۳ء میں، میں حج بیت اللہ کی سعادت کے لیے گیا تھا۔ جدہ ائیر پورٹ پر ہم ٹرمینل میں بسوں کے انتظار میں تھے کہ اتنے میں کراچی کے عالم دین جو بنوری ٹاؤن کے مدرس تھے، ان سے ملاقات ہوئی۔ علیک سلیک کے بعد انہوں نے بتایا کہ میرے ساتھ مفتی محمد جمیل خان، مولانا سعید احمد جلال پوری بھی تشریف لائے ہیں۔ میں جلدی جلدی حج ٹرمینل سے ائیر پورٹ کی طرف آیا تو حضرت مولانا مفتی محمد جمیل خان ایک وہیل چیئر کو دھکیل رہے تھے۔ میں نے مفتی صاحب کو سلام کیا اور یہ تصور کیا کہ کرسی پر مفتی صاحب کے کوئی بزرگ ہوں گے۔ مفتی صاحب نے بتایا کہ حضرت مولانا سرفراز خان صفدر ہیں تو ہم حیران ہو گئے۔ مفتی جمیل خان صاحب کا جو بت ہمارے ذہنوں میں تھا، وہ پاش پاش ہو گیا کہ ان سے بھی بڑی دینی ہستیاں اور شخصیات موجود ہیں۔ مجھے حضرت کی اعلیٰ شخصیت کا اندازہ ہو گیا کہ وہ اہل علم میں کتنا مقام رکھتے ہیں۔ منیٰ میں ہمارے خیمے مفتی محمد جمیل صاحب کے حج گروپ کے قریب ہی تھے۔ مانسہرہ کے کچھ ساتھی حضرت مولانا سرفراز خان صفدرؒ سے ملاقات کے لیے جا رہے تھے۔ میں بھی ہمراہ ہو گیا۔ علما ان کے اردگرد بیٹھے تھے اور علمی باتیں ہو رہی تھیں۔ ہم نے حضرت سے مصافحہ کیا اور ادب سے بیٹھ گئے اور جب رخصت ہونے لگے تو دعا کی درخواست کی۔ حضرت نے مجھے دیکھا اور فرمایا، نماز جماعت سے ادا کیا کرو اور ختم نبوت کا کام نہ چھوڑنا۔ میں گم سم ہو گیا۔ اس کے بعد اب کوشش ہوتی تھی کہ نماز باجماعت ادا کروں۔ ان دنوں بائی پاس کی وجہ سے بیٹھ کر نماز ادا کرتا ہوں۔ حضرت کا چہرہ اور فرمان میرے سامنے آ جاتا ہے اور سوچتا ہوں کہ حضرت کو میری کمزوری کا علم کیسے ہوا۔ مولانا عبدالقادر ڈیروی فرماتے ہیں کہ حضرت صاحب کشف تھے۔

یہ صرف آپ کا غم نہیں بلکہ پوری امت اسلامیہ کے لیے سانحہ ہے۔ اللہ تعالیٰ حضرت کے درجات بلند کرے۔ ہمیں ان کی تعلیمات پر عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔

فیاض حسن سجاد

ہفت روزہ اخبار جہاں کراچی

﴿ ۱۲ ﴾

اس میں شک نہیں کہ آپ کے والد محترم ایک عظیم انسان تھے جنہوں نے علمی میدان میں، تصنیف وتالیف میں، رد باطل

میں، حق بات کہنے اور لکھنے میں، اہل سنت دیوبند کے فرائض ترجمانی انجام دینے میں، باطل عقائد ونظریات کے حامل افراد وجماعت کے تعاقب میں، اور تدریسی خدمات سرانجام دینے میں وہ کارنامے انجام دیے جو رہتی دنیا اور نئی نسل کے لیے یقیناً مشعل راہ اور قابل تقلید نمونے ہیں۔ ایسی عظیم ہستیاں صدیوں میں پیدا ہوا کرتی ہیں۔ یہ بھی عجیب اور محیر العقول بات ہے کہ راقم الحروف نے آخری ملاقات میں دیکھا کہ حضرتؒ کے حواس بالکل صحیح وسالم ہیں۔ پلنگ پر لیٹے لیٹے ایسے ایسے علمی نکات اور اعتراضات فرما رہے تھے کہ عقل دنگ رہ جاتی ہے۔ اللہ تعالیٰ حضرتؒ کو اعلیٰ علیین میں جگہ دے، متعلقین ومنتسبین کو ان کے نقش قدم پر چلنے کی توفیق دے اور پس ماندگان کو صبر جمیل عطا فرمائے، آمین ثم آمین۔

مولانا محمد صدیق اراکانی

مدیر ماہنامہ حق نوائے احتشام کراچی

﴿ ۱۳ ﴾

دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت فرمائے، ان کے تمام گناہوں، خطاؤں اور کوتاہیوں سے درگزر فرمائے، تمام بھلائیوں، نیکیوں اور حسنات کو خوب بڑھا چڑھا کر قبول فرمائے، خاص اپنے سایہ رحمت میں جگہ عطا فرمائے اور ان کی قبر کو جنت کے باغوں میں تبدیل فرما دے۔ آمین۔

سچی بات تو یہ ہے کہ والدین کا کوئی بدل نہیں ہے۔ ان کا وجود ایک گھنے سایہ دار درخت کی مانند ہوتا ہے جس کے سائے تلے انسان اپنی ساری عمر گزار دیتا ہے اور اسے معلوم ہی نہیں ہوتا کہ وقت کیسے گزر گیا۔ لہٰذا اس نعمت سے محرومی بڑی محرومی ہے۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ جس طرح ایک ڈوبتا ہوا انسان مدد کے لیے پکارتا ہے اور تنکا بھی اس کا سہارا بن جاتا ہے، بعینہ اس طرح اس دنیا سے رخصت ہو جانے والا بھی مدد کا طالب ہوتا ہے اور دعائے مغفرت اس کا سہارا بن جاتی ہے۔ پس اب ساری عمر انہیں اپنی دعاؤں میں یاد رکھیں۔ یہ ان کا حق ہے اور آپ کا فرض۔ یوں بھی والدین کے لیے دعائے مغفرت اولاد کے لیے مفید ہے۔ ان کی خدمت اور اطاعت میں جو کمی، کسر رہ گئی ہو، اس طرح اس کا مداوا ہو جاتا ہے۔

حضرت مولانا نے دین کی ترویج واشاعت میں جو خدمات ایک طویل عرصہ انجام دی ہیں، لاکھوں افراد اس کے گواہ ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان کی مساعی جلیلہ کو قبول فرمائے اور ہم سب کو بھی بیش از بیش کی توفیق مرحمت فرمائے۔"

سید منور حسن

امیر جماعت اسلامی پاکستان

﴿ ۱۴ ﴾

آپ کے والدِ محترم کے انتقال کی افسوسناک اطلاع موصول ہوئی۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ میری دعا ہے کہ اللہ رب العزت آپ کے والد کی نیکیوں کو شرف قبولیت بخشے، سیئات سے درگزر فرمائے اور انہیں جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام عطا فرمائے۔ آمین

اس فانی دنیا میں رشتوں کی اہمیت بہت زیادہ ہے اور ان میں باپ کی شفقت ومحبت کا کوئی نعم البدل ملنا محال ہے۔ باپ اولاد کے لیے شجر سایہ دار ہوتا ہے اور اس کے جدا ہو جانے سے اس سایہ سے محرومی ہو جاتی ہے، لیکن اللہ تعالیٰ کے فیصلے پر

راضی رہنا تو ہمارے ایمان کا تقاضا ہے۔ اللہ تعالیٰ کی مشیت کے آگے انسان بے بس ہے اور اہل ایمان تو ہر حال میں راضی برضا رہتے ہیں۔ میری طرف سے تعزیت کے جذبات تمام گھر والوں کو پہنچا دیجیے۔ اللہ آپ کو اور دیگر اہل خانہ کو صبر جمیل اور اجر جزیل سے نوازے۔ آمین۔

لیاقت بلوچ

قیم جماعت اسلامی، پاکستان

﴿ ۱۵ ﴾

عظیم الشان علمی شخصیت کا اس دنیا سے اٹھ جانا یقیناً موت العالِم موت العالَم کے مصداق سبھی حلقوں اور طبقات کے لیے بڑے المیہ سے کم نہیں۔ انہوں نے تو اپنی پوری زندگی تدریس و تعلیم اور نشر و فروغ اسلام میں کھپا دی۔ انہوں نے نورانی کرنوں کو ہر سو بکھیرا اور بہت سے چراغ روشن کیے۔ اللہ تعالیٰ ان کی عظیم خدمات کو شرفِ قبولیت سے نوازیں، ان کے درجات بلند فرمائیں، انہیں اعلیٰ علیین میں جگہ عطا فرمائیں اور آپ کی شکل میں ان کے صدقہ جاریہ کو تادیر جاری و ساری رکھیں۔ علم و فضل کی شمعیں فروزاں رہیں اور امتِ مسلمہ آپ کی راستی فکر سے مستفید ہوتی رہے۔ ان لمحاتِ الم میں تعزیتی کلمات کو قبول فرمایئے اور بے خبری پر عرق ندامت بھی۔ اللہ تعالیٰ آپ کو صبر جمیل سے نوازیں اور مرحوم و مغفور پر ان کی سدا بہار رحمتیں سایہ فگن رہیں۔ آمین!۔

ڈاکٹر زاهد اشرف

مدیر ماہنامہ المنبر فیصل آباد

﴿ ۱۶ ﴾

حضرت مولانا محمد سرفراز خان صفدرؒ ہمارے اسلاف کی گرانقدر دینی و علمی نشانی تھے۔ وہ علم و فضل کے آفتاب و ماہتاب کی مانند مطلع پر جلوہ افروز رہے۔ اہل حق کی صحیح ترجمانی کا حق جس انداز میں انہوں نے ادا کیا ہے، وہ مسند خالی ہوگئی ہے۔ اب تو دور دور تک تاریکی ہی تاریکی نظر آ رہی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے انہیں جن اعلیٰ و ارفع صلاحیتوں سے نوازا تھا، اس سطح کی دینی و علمی اور محقق شخصیت نظر نہیں آ رہی۔ مادی اندھیرا تو کسی متبادل سے دور کیا جا سکتا ہے مگر یہ باطنی تاریکی دور کر کے انسانوں کا دل و دماغ منور کرنے والے مراکز انوار و برکات ختم ہو رہے ہیں۔ خانقاہیں اجڑ گئی ہیں، علمی و تحقیقی چشمے خشک ہو گئے ہیں اور تعلیم و تربیت گاہیں بانجھ ہو گئی ہیں۔ دور تک کوئی جگنو ہے نہ ستارہ روشن۔ ایسا گھٹا ٹوپ اندھیرا ہے کہ ڈر لگتا ہے والی حالت اور کیفیت پیدا ہے۔ اب تو اس صدمے کی صحیح نقشہ کشی کے لیے الفاظ بھی ختم ہیں۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

اللہ تعالیٰ حضرت مولانا محمد سرفراز خاں صفدرؒ کو اپنے خاص جوار رحمت میں مقام علیین پر سرفراز کرے اور آپ سب اہل خانہ کو صبر و استقامت کی توفیق کے ساتھ ان کے نقش قدم پر چلنے والا اور اعتدال و توازن کے ساتھ زندگی کے مراحل طے کرنے کی سعادت عطا فرمائے۔ آمین۔

مولانا مجاهد الحسینی

فیصل آباد

﴿ ۱۷ ﴾

شیخ الحدیث والتفسیر حضرت مولانا سرفراز خان صفدرؒ کی وفات کی وحشت انگیز اور المناک خبر سن کر نہایت ہی صدمہ اور افسوس ہوا۔ ان کی وفات پورے ملک کے لیے ایک زبردست سانحہ اور بہت بڑے حادثہ سے کم نہیں ہے۔ مرحوم بیک وقت بہت بڑے محدث، مفسر، مفکر، مصنف، مولف، مناظر، صاحب نسبت بزرگ، ادیب، خطیب، دلوں کے طبیب تھے۔ آپ علم و فضل اور زہد و تقویٰ کے پیکر اور اتحاد امت کے علمبردار تھے۔ آپ کی شخصیت ہمہ گیر تھی۔ آپ کی وفات سے ایک ایسا خلا پیدا ہو گیا ہے جس کا بظاہر صدیوں تک پورا ہونا مشکل ہے۔

آپ کے والد صاحب مرحوم اس اعتبار سے خوش قسمت ہیں کہ وہ اپنے پیچھے آپ جیسی نیک و صالح اولاد چھوڑ کر گئے ہیں جو بیک وقت عالم و فاضل بھی ہیں اور شیخ الحدیث بھی، جن کے قلم سے بیسیوں کتابیں نکل کر خراج تحسین وصول کر چکی ہیں، جن کو بین الاقوامی حالات پر مکمل عبور حاصل ہے اور اسی تناظر میں اخبارات اور رسائل میں آپ کے مضامین شائع ہوتے ہیں۔ آپ کے دیگر بھائی اور بہنیں بھی جو دینی خدمات سرانجام دے رہے ہیں، وہ ان کے لیے مستقل صدقہ جاریہ ہیں۔

اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ مرحوم کو جنت الفردوس کا اعلیٰ مقام نصیب فرمائے اور تمام افراد خانہ کو اس عظیم حادثہ کو برداشت کرنے کا عزم اور حوصلہ عطا فرمائے۔

حافظ مسعود قاسم قاسمی

مہتمم جامعہ قاسم العلوم فقیروالی

﴿ ۱۸ ﴾

حضرت امام اہل سنت نور اللہ مرقدہ کے سانحہ ارتحال کی خبر سنی تو دل مسوس کر رہ گیا اور زبان پر کلمہ استرجاع جاری ہو گیا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ ان للہ ما اخذ ولہ ما اعطی وکل شیء عندہ باجل مسمی۔ بروقت اطلاع ملنے کے باوجود بعض عوارض کی وجہ سے نماز جنازہ میں شرکت کی سعادت سے محروم رہا جس کا ہمیشہ قلق رہے گا۔ تاہم ہنگامی طور پر مسجد و مدرسہ میں تعزیتی و دعائیہ تقریب کا ضرور اہتمام کیا گیا۔

میں خود کو ہمیشہ حضرت کا ایک ادنیٰ عقیدت مند سمجھتا رہا ہوں جس کا آغاز زمانہ طالب علمی سے ہی ہو گیا تھا۔ ان کی گراں قدر تالیفات سے نہ صرف یہ کہ استفادہ کرتا رہا بلکہ ان کے ذریعے اہل باطل سے گاہے بگاہے ''مجادلہ'' بھی ہوتا رہا۔ ایک خاموش قاری اور ادنیٰ عقیدت مند کی حیثیت سے حضرتؒ کے بارے میں میرا تاثر یہ ہے کہ موصوف صحیحین کی اس حدیث کے کامل مصداق تھے جس میں صلحائے امت کے بارے میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے کہ ''ھم قوم لا یشقی جلیسھم ولا یخاب انیسھم''، جب کہ ان کی سیرت و کردار اور تصنیفات و تالیفات کے حوالہ سے یہی کہا جا سکتا ہے کہ ہماری جامعات بالخصوص ہزارہ یونیورسٹی اور پنجاب یونیورسٹی لاہور اس عنوان کو ایم فل اور پی ایچ ڈی کے تحقیقی مقالات میں شامل کرنے کا نوٹیفکیشن جاری کر دیں۔

۱۹۱۴ء میں ضلع مانسہرہ کے ایک غیر معروف گاؤں ''ڈھکی چیڑاں'' سے سفر زیست کا آغاز کرنے والے کے متعلق کون تصور کر سکتا تھا کہ وہ اپنے علم و عمل کی بدولت اتنا بلند مقام حاصل کر لے گا کہ ۵ رمئی ۲۰۰۹ء کو ایک دوسرے دور افتادہ مقام

''دگکھڑ'' میں اسے الوداع کہنے کے لیے ملک بھر سے ہزاروں علما وصلحا جمع ہو جائیں گے؟

میرا مولانا محمد منظور نعمانیؒ کے ساتھ بھی بڑا گہرا فکری تعلق رہا ہے۔ یہ دونوں حضرات ایک ہی نظریہ ومشن سے وابستہ تھے۔ ایک ہی مادر علمی کے فیض یافتہ تھے۔ دونوں کا مقصد زیست بھی ایک ہی یعنی اعلاے کلمۃ اللہ، غلبہ اسلام، نشر کتاب وسنت اور رد فرق باطلہ تھا۔ عمر میں اگرچہ حضرت نعمانیؒ (۱۹۰۵ـ۱۹۹۷ء) نو سال بڑے تھے مگر کام کی مقدار کے اعتبار سے حضرت شیخ سبقت لے گئے تھے، مگر یہ عجیب اتفاق ہے کہ دونوں حضرات ایک ہی تاریخ میں یعنی ۴ـ۵ رمئی کی درمیانی شب میں داغ مفارقت دے گئے۔

حضرتؒ کا داعی اجل کو لبیک کہنا ہم سب کے لیے ایک اجتماعی، ملی اور عظیم دینی صدمہ ہے مگر خود ان کے حق میں ایسی ترقی، ایسی رفعت وبلندی اور ایسی نعمت ہے کہ اگر اس دنیا میں اس کا مشاہدہ ہو جائے تو اس کے اشتیاق میں ایک ایک لمحہ کاٹنا مشکل ہو جائے اور یہاں جینے کی آرزو باقی نہ رہے۔ حضرت کے انتقال سے نہ صرف پاکستان بلکہ عالم اسلام ایک حق گو اور عالم باعمل سے محروم ہو گیا ہے۔ جو جانتے نہیں، انہیں تو بتانا کیا! اور جو نہیں جانتے، انہیں کیسے بتایا اور باور کرایا جائے کہ اس ایک ذات سے محروم ہو کر ہم کس نعمت سے محروم ہو گئے ہیں۔

آہ! وہ سلف صالحین کی چلتی پھرتی یادگار، وہ مجسمہ زہد وایثار، وہ پیکر تقدس اور وہ کوہ استقامت اب ہم کہاں دیکھ پائیں گے جسے دیکھ کر ایمان کے بجھے ہوئے ذرات میں چمک اور تازگی پیدا ہوتی تھی، جس کا قرب پا کر دلوں میں ذوق عمل اور تعلق باللہ کی امنگ بیدار ہو جاتی تھی، جس نے اس دور انحطاط میں ہر طرح کے مواقع کے باوجود زہد وایثار ہی کو اپنی اصلی دولت سمجھا، جس نے گوشہ خلوت میں بیٹھ کر نہیں بلکہ کارزار حیات کے ان میدانوں میں رہ کر اپنے دامن تقدس کو بے داغ رکھا۔

اس موقع پر بدوی کا ایک شعر پیش خدمت ہے جس سے زیادہ حضرت عبد اللہ بن عباس کو کسی کی تعزیت نے تسلی نہیں دی تھی۔

خیر من العباس اجرک بعدہ   واللہ خیر منک للعباس

باری تعالیٰ حضرتؒ کی مساعی جمیلہ کو شرف قبول بخشے، انہیں اپنی رحمت ومغفرت ورضوان سے نوازے اور جنت الفردوس نصیب فرمائے اور آپ کو مع جملہ متعلقین کو اجر جزیل اور صبر جمیل عطا فرمائے۔ آمین یا رب العالمین۔

قاضی محمد طاہر علی الہاشمی

مرکزی جامع مسجد حویلیاں، ہزارہ

۱۹

نہایت حزن وملال کے ساتھ یہ خبر سنی گئی کہ آپ کے والد گرامی ممتاز عالم دین مولانا سرفراز خان صفدر رحلت فرما گئے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ ان کی دینی، دعوتی، تعلیمی، تدریسی اور علمی خدمات ہمیشہ یاد رکھی جائیں گی۔ دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت فرمائے اور بشری لغزشوں کو معاف کر دے۔ آپ سمیت تمام لواحقین اور متعلقین کو صبر جمیل سے نوازے۔ آمین۔

[مولانا] محمد یاسین ظفر

پرنسپل جامعہ سلفیہ، فیصل آباد

۲۰

مولانا سرفراز خان صفدرؒ کا انتقال عالم اسلام کے لیے عموماً اور پاکستان اور دائرۂ علم وادب کے لیے خصوصاً بہت بڑا سانحہ ہے۔ یقیناً یہ ایک فرد اور ایک شخص کی موت نہیں ہے۔ یہ ایک عالم اور جہان کی موت ہے۔ اس غم میں عالمی رابطہ ادب اسلامی آپ کے ساتھ برابر کا شریک ہے۔ اس حوالے سے شعبے میں ایک تعزیتی اجلاس بھی منعقد ہوا جس کی روداد اخبارات میں چھپ چکی ہے۔ اللہ تعالیٰ مرحوم کو اعلیٰ علیین میں جگہ نصیب کرے اور آپ کو اور خاندان کے تمام لوگوں کو صبر جمیل عطا فرمائے۔ آمین۔

ڈاکٹر محمود الحسن عارف

نائب صدر عالمی رابطہ ادب اسلامی پاکستان

۲۱

مرحوم سب کے لیے اسلاف کی ایک نشانی تھے۔ ان کی وفات سے ایک بہت بڑا علمی خلا پیدا ہو گیا ہے۔ اللہ مرحوم کو اپنی جوار رحمت میں جگہ دے اور ان کے نسبی اور تعلیمی پسماندگان کو صبر جمیل عطا فرماوے۔ آمین۔ مجھے امید ہے کہ آپ کی علمی اور فکری سرگرمیوں کی وجہ سے مرحوم کے ساتھ لگاؤ رکھنے والے لاکھوں اہل علم کی ڈھارس بندھی رہے گی۔ اللہ تعالیٰ آپ اور ہم سب کا حامی وناصر ہو۔ آمین۔

ڈاکٹر قبلہ ایاز

چیئرمین شعبہ مطالعات سیرت

شیخ زاید اسلامک سنٹر، پشاور

۲۲

اللہ رب العزت خالق کائنات ہیں اور اس دار فانی میں خالق کائنات کا نظام ہے کہ روزانہ ہزاروں افراد آتے ہیں اور ہزاروں افراد کوچ کر جاتے ہیں کیوں کہ حکم ربانی ہے: "کل نفس ذائقۃ الموت" اور اس دار فانی میں کچھ چیزوں کا مثل مل جاتا ہے، مگر کچھ چیزیں ایسی گوہر نایاب ہوتی ہیں کہ ان کا مثل ملنا مشکل ہو جاتا ہے۔ ایسے ہی انسانوں میں کچھ افراد کا مثل تو مل جاتا ہے اور کچھ گوہر ہوتے ہیں جن کا مثل صدیوں میں کہیں پیدا ہوتا ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے: "انما الناس کالابل المائۃ لا تکاد تجد فیھا راحلۃ"۔ آپ نے جو تشبیہ دی ہے، وہ بالکل ٹھیک ہے، اس لیے کہ لوگ تو بہت ہوتے ہیں مگر ایسے لوگ کم ہوتے ہیں جن کا تعلق علما کے طبقہ سے ہے۔ پھر ان علما میں بھی جو گوہر نایاب ہوتے ہیں، جن کی لوگ اقتدا کرتے ہیں، جو باطل قوتوں کے لیے سیسہ پلائی دیوار ثابت ہوتے ہیں، ایسے افراد جو صدیوں میں پائے جاتے ہیں، اگر وہ ہمارے درمیان سے کوچ کر جائیں تو کہنا پڑتا ہے کہ موت العالم موت العالم۔ کیوں کہ علم کا انتزاع علما ہی کی صورت میں ہوتا ہے۔ انہی گوہر نایاب میں ایک شخصیت امام اہل سنت، قاطع شرک وبدعت، شیخ الحدیث حضرت مولانا سرفراز خان صفدرؒ کی تھی جو کہ تمام علما کے لیے اپنے وقت کے شمس الائمہ کی حیثیت رکھتے تھے، جنہوں نے پوری زندگی قرآن وحدیث کے لیے وقف کر رکھی تھی، جنہوں نے شرک وبدعت کی جڑیں کاٹ کر رکھ دیں اور آپ کی شخصیت ہمیشہ

باطل فرقوں کے خلاف مذہب احناف کی سیسہ پلائی ہوئی دیوار ثابت ہوئی۔

آج کل کے دور میں علمی شخصیت خصوصاً حضرت جیسی شخصیت کا مثل ملنا بہت ہی مشکل ہے۔ درحقیقت آپ کے جو علمی کارنامے ہیں، وہ ہمارے سامنے ہمیشہ آب وتاب کے ساتھ چمکتے اور دمکتے رہیں گے۔ ہم افسوس کا اظہار تو کر سکتے ہیں، مگر افسوس کے علاوہ اور کچھ نہیں کیونکہ آپ کے چلے جانے سے جو خلا آ گیا ہے، وہ تا قیامت شاید پورا نہ ہو سکے۔ اللہ تعالیٰ حضرت کے درجات بلند کرے اور جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام عطا کرے اور آپ کو اور ان کے تمام جسمانی اور روحانی لواحقین کو صبر جمیل عطا کرے۔ آمین۔

حضرت کی شخصیت پر چند اشعار ذہن میں آئے ہیں، جو درج ذیل ہیں:

وکنت سراج القوم بل نجم افقهم ۔۔۔ وبدرهم بل شمسهم حين تطفل
حسام لجمع المسلمين وسهمهم ۔۔۔ وسم زعاف للاعادى مثمل
وكنت لنا بحرا وكنز دقائق ۔۔۔ وغاية تحقيق اذا الامر يعضل
ومشكاة مصباح ومصباحها الذى ۔۔۔ اضاء لنا دهرا اذا الليل اليل

سید نجم الحسن امروہوی
جامعہ دار العلوم یاسین القرآن، کراچی

﴿ ۲۳ ﴾

پہلے مولانا خبیب احمد مرحوم کا اچانک سانحہ پیش آیا جن کے جنازہ میں یہ ناکارہ بھی شریک تھا۔ یہ بہت غم ناک واقعہ تھا جس میں آپ کے صدمہ کے ساتھ ہم جہلم کے لوگ بھی بہت متاثر ہوئے اور گہرے صدمہ سے دوچار ہوئے، کیونکہ ان کے وجود سے اپنے ملک میں کام کرنے کے لیے ہمیں بہت سہارا اور تعاون حاصل تھا۔ ہم لوگ اپنے علاقہ میں تنہا ہو کر رہ گئے ہیں۔ اور اس واقعہ کے فوراً بعد ہمارے اکابرین کا آخری سایہ بھی ہم سے اٹھ گیا جن کی جدائی ہمارے لیے ایک قسم کی جانکاہ اور جان لیوا ثابت ہوئی ہے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ ظاہر ہے آپ کو اپنے والد ماجد نور اللہ مرقدہ کی جدائی کا جو صدمہ پہنچا ہوگا، وہ ناقابل بیان ہی تصور ہوگا۔ اللہ پاک کے حضور میں ہم حضرت نور اللہ مرقدہ کی مغفرت اور بلندئ درجات کے لیے دعا ہی کر سکتے ہیں۔ اس کے سوا ہم پس ماندگان کر تو کچھ نہیں سکتے۔ اس ناکارہ کی دل کی گہرائی سے دعا ہے کہ اللہ رب العزت حضرت مولانا سرفراز خان کو جنت الفردوس میں مقام عالی عطا فرماویں اور آپ کو اپنے والد ماجد مرحوم کی جانشینی کا اعلیٰ استحقاق نصیب فرماویں اور یہ سلسلہ رشد وہدایت ودعوت مع عزیمت رہتی دنیا تک آپ کے خاندان میں جاری وساری رہے، آمین ثم آمین۔

بندہ محمد حسین
ڈیوزبری۔ یوکے

﴿ ۲۴ ﴾

جامع المعقول والمنقول حضرت مولانا محمد سرفراز خان صفدر صاحب رحمہ اللہ کی رحلت کی خبر پر بہت صدمہ ہوا ہے۔

انا للہ وانا الیہ راجعون۔ اس کٹھن دور میں ایسے بزرگوں کی جدائی ایک عظیم سانحہ سے کم نہیں۔ اللہ تعالیٰ ہمیں یہ سانحہ صبر واستقامت کے ساتھ برداشت کرنے کی توفیق ارزانی فرمائے۔ آمین۔ یوں تو حضرت شیخ رحمہ اللہ علما وطلبا کی ایک بڑی جماعت کے روحانی باپ ہیں، لیکن نسبی والد کا مقام ومرتبہ وضاحت کا محتاج نہیں۔ ان کی جدائی زندگی میں مشکلات ضرور پیدا کر دیتی ہے، تاہم صبر کے سوا چارہ نہیں ہے۔ صدر انجمن انجینئر مختار فاروقی، ماہنامہ حکمت بالغہ اور قرآن اکیڈمی جھنگ کے تمام اراکین اس غم میں آپ کے برابر کے شریک ہیں۔

مفتی عطاء الرحمن
قرآن اکیڈمی جھنگ

﴿ ۲۵ ﴾

آپ کے والد صاحبؒ کی خبر ہمارے حلقہ میں، خاص کر مہاجرین کے علاقہ میں آگ کی طرح پھیل گئی اور جمعیۃ اور معہد الفاروق الاسلامی کاکسی بازار میں قرآن خوانی اور دعائیں کرائی گئیں۔ آپ کی وفات ناقابل تلافی نقصان ہے۔ اللہ تعالیٰ مولانا محمد سرفراز صاحبؒ کی مغفرت فرما کر جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام عطا فرمائے۔ ان کے پس ماندگان کو صبر جمیل کی توفیق نصیب ہو اور ان کی وفات سے پیدا ہونے والے خلا کو پر فرمائے۔

الشیخ نور محمد عباس (نائب امیر مرکزی)
جمعیۃ خالد بن ولید الخیریہ، کاکسی بازار۔ بنگلہ دیش

﴿ ۲۶ ﴾

شیخ الحدیث علامہ مولانا جناب سرفراز خان صفدرؒ کے انتقال کی خبر نہ صرف ہمارے لیے بلکہ پورے عالم اسلام کے لیے ایک غم عظیم کا باعث تھی۔ مرحوم نے اپنی پوری زندگی اسلام کی بقا، دین مبین کے احیا اور امت مسلمہ کی سرفرازی کے لیے وقف کر رکھی تھی۔ آپ کا طرز بیان، انداز فکر، دل نشین گفتار اور سادگی طبع بلاشبہ فی زمانہ اپنی مثال آپ تھی۔ عالم اسلام کی ابتر حالت پر آپ کی تڑپ اور رنجیدگی نفس، مرحوم کی تقریر وتحریر سے بالکل عیاں تھی۔ ایسے عظیم انفاس کے نقوش کے لیے بے شک انسانیت کو ایک عرصہ طویل انتظار کی زحمت برداشت کرنا پڑتی ہے۔ اگرچہ دنیوی سامان عیش وتعیش آپ کے قدموں میں تھے، مگر مرحوم نے ان کو دھتکارتے اور خاطر میں نہ لاتے ہوئے فروغ علوم قرآن وحدیث کو اپنی حیات وآخرت کا اثاثہ جانا اور اسی مشغلہ صالح میں تمام عمر مشغول رہے۔ اللہ پاک مرحوم کے کار خیر کا اجر عظیم عطا فرمائیں اور ان کی نیک اور عظیم کاوشوں کو اپنی بارگاہ میں شرف قبولیت عطا فرمائیں۔ آمین۔ تحریک منہاج القرآن کے جملہ اراکین، رفقا اور وابستگان اس غم میں آپ کے ساتھ شریک ہیں اور دعا گو ہیں کہ اللہ پاک آپ کو صبر جمیل عطا فرمائیں اور آپ کو مرحوم کا اچھا نعم البدل ثابت ہونے کی توفیق عطا فرمائیں۔ آمین۔

عمران علی ایڈووکیٹ (ضلعی امیر)
محمد سرفراز حسین نیازی (ضلع ناظم)
تحریک منہاج القرآن ضلع گوجرانوالہ

﴿ ۲۷ ﴾

میں نے مرحوم کی کبھی زیارت نہیں کی۔ ان کی تصویر بھی آج پہلی بار اخبارات میں دیکھی ہے، لیکن مرحوم کا جب بھی ذکر آیا، اس پر محبت اور احترام کا جذبہ غالب تھا۔ میں ایک گناہگار شخص ہوں، لیکن اللہ تعالیٰ کی ایک مہربانی مجھ پر یہ بھی ہے کہ وہ اپنے نیک بندوں کی محبت میرے دل میں رکھ دیتا ہے۔ میں مرحوم کی مغفرت کے لیے دعا گو ہوں۔ اب انہیں جو سفر درپیش ہے، اس میں اللہ تعالیٰ آسانیاں فرمائیں۔ آپ کو اور آپ کے خاندان کو یہ صدمہ برداشت کرنے کی توفیق عطا فرمائیں۔ مجھے یقین ہے کہ آپ کے والد گرامی مرحوم آپ پر بہت خوش ہوں گے۔ ان کی خوشی آپ کے لیے دعا کا درجہ رکھتی ہے۔ ان کی دعاؤں کے سایے میں آپ ترقی وکامرانی کے منازل طے کریں گے۔ ان شاء اللہ

جاوید اختر بھٹی

ریلوے روڈ ملتان

﴿ ۲۸ ﴾

”آپ کے والد جناب مولانا سرفراز خان صفدرؒ کی وفات کی خبر ملی۔ اس خبر سے مجھے انتہائی دکھ اور صدمہ ہوا ہے۔ اذیت اور اندوہ کے ان لمحات میں میری ہمدردیاں آپ کے ساتھ ہیں۔ میری دعا ہے کہ مرحوم کو جنت میں بلند درجہ اور اعلیٰ مقام عطا فرمائے۔ آمین۔ میری دعا ہے کہ آپ کو اور آپ کے سوگوار خاندان کے سارے غمزدہ افراد کو حوصلہ کے ساتھ یہ صدمہ برداشت کرنے کے لیے صبر اور ہمت عطا فرمائے۔ آمین۔“

ضیا کھوکھر

میڈیا کنسلٹنٹ، پرائم منسٹر سیکرٹریٹ، اسلام آباد

﴿ ۲۹ ﴾

مجھے حضرتؒ کی زیارت کبھی نصیب نہیں ہوئی، مگر ان کے علم وفضل اور ان کے زہد وتقویٰ کی بابت بہت متاثر رہا ہوں، چنانچہ ان کی نماز جنازہ میں لاکھوں عقیدت مندوں کی شرکت بلا سبب نہیں تھی۔ مجھے اپنی اس محرومی پر ہمیشہ ملال رہے گا۔ تاہم آپ کے لیے یہ صدمہ ذاتی نوعیت کا ہی ہے۔ ہم سب ایک بہت بڑے عالم دین سے محروم ہو گئے ہیں، جب کہ آپ کے لیے یہ صدمہ دہرا ہے۔ اللہ تعالیٰ حضرتؒ کو اپنے جوار رحمت میں جگہ دے اور آپ کو اور دوسرے اہل خانہ کو ان کی جدائی کا صدمہ برداشت کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔

عطاء الحق قاسمی

کالم نگار روزنامہ جنگ لاہور

﴿ ۳۰ ﴾

مولانا محمد سرفراز خان صفدر دار فانی سے دار البقاء کی طرف رخصت ہو گئے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ اللہ تعالیٰ حضرت کو جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام عطا فرمائے اور آپ کو صبر جمیل عطا فرمائے۔ آمین یا رب العالمین۔

حضرت مولانا دور حاضر میں اسلاف کی ایک نشانی تھے۔ ان سے جو خیر پھیلا، اس کا ایک زمانہ گواہ ہے۔ انھوں نے دین

کی جس طرح خدمت کی، اس کا اجر اللہ تعالیٰ کے ہاں محفوظ ہو گیا۔ از روے حدیث نبوی صلی اللہ علیہ وسلم ”انسان کی موت کے بعد سارے اعمال منقطع ہو جاتے ہیں، سوائے تین کاموں کے، یعنی صدقہ جاریہ، علم نافع، اولاد صالح۔“ دو کام تو حضرت نے بھی ایسے کیے جو تا قیام قیامت ان کے نامہ اعمال میں خیر کے اضافے کا سبب بنتے رہیں گے۔ ایک علم دین جو ان کے ذریعے عام ہوا جس کا ثبوت سینکڑوں بلکہ ہزاروں طلبا ہیں جو دنیا کے کونے کونے میں پائے جاتے ہیں، اور دوسری اولاد صالح جس میں آپ جیسے پایے کے علمائے کرام اللہ تعالیٰ کے فضل وکرم سے موجود ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ صدقہ جاریہ کے خاص مفہوم میں بھی ان کی خدمات ہوں گی۔

مجھے اگرچہ براہ راست ان سے استفادہ کا موقع نہیں ملا، تاہم دو ایسے واقعات کا حضرت کے حوالے سے تذکرہ کروں گا جنھوں نے مجھے بہت متاثر کیا اور وہ حضرت کی ناقابل فراموش شخصیت کے گہرے نقوش میرے دل ودماغ پر چھوڑ گئے۔

ایک واقعہ کا تعلق آپ کی شاہکار تالیف ”راہ سنت“ سے ہے جس نے مجھے بہت متاثر کیا بلکہ میری کایا پلٹ دی۔ واقعہ اس طرح ہے کہ میں پانچویں جماعت کا طالب علم تھا اور اس وقت آزاد کشمیر کے ایک دور دراز گاؤں میں رہتا تھا۔ ہمارے قریب ہی ایک جامع مسجد تھی جس میں سنت وبدعت کے حوالے سے بحث چل پڑی۔ اس میں اتنی شدت آئی کہ معاملہ نزاع تک پہنچ گیا، جیسا کہ اس طرح کے مباحث میں بالعموم ہوتا ہے۔ میں کم عمر ہونے کے باوجود اس سے بہت متاثر بلکہ پریشان ہوا۔ انھی دنوں مجھے جستجو ہوئی کہ یہ جانوں کہ اصل حقیقت کیا ہے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے ایسی صورت پیدا فرما دی کہ مجھے حضرت مولانا کی تالیف ”راہ سنت“ کہیں سے مل گئی۔ میں نے کم سنی اور کم علمی کے باوجود اس کا مطالعہ کیا تو مجھے بہت فائدہ ہوا اور سنت وبدعت کا فرق بھی سمجھ میں آ گیا اور سب سے بڑی بات یہ کہ اللہ تعالیٰ نے اس تالیف کے سبب سنت پر عمل پیرا ہونے کی توفیق عطا فرمائی اور بدعت سے حتی الوسع اجتناب کا داعیہ پیدا کر دیا۔ اس موضوع پر بعد میں مزید کتب پڑھنے کا اتفاق ہوا، لیکن جو اثرات حضرت مولانا کی بے مثال تالیف کے مطالعہ سے دل ودماغ پر مرتب ہوئے، وہ آج بھی برقرار ہیں۔

دوسرا واقعہ آج سے تقریباً پندرہ سال پہلے کا ہے۔ اس وقت اخبارات کے ذریعہ معلوم ہوا کہ حضرت مولانا نے مسلک دیوبند سے متعلق علما کے مختلف دھڑوں کو متحد ویکجا کرنے کی کوشش کی جس میں وہ کامیاب نہ ہو سکے اور اس کا اعتراف انھوں نے کسی اخبار نویس کے استفسار پر کیا۔ پیرانہ سالی میں انھوں نے سفر اختیار کیا اور مفتی محمود مرحوم ومغفور اور مولانا عبد الحق مرحوم ومغفور کے جانشینوں سے ملاقاتیں کیں۔ ہم تصور کر سکتے ہیں کہ حضرت نے کس طرح ان حضرات کو سمجھایا ہوگا اور کیا امیدیں لے کر وہ ان کے پاس گئے ہوں گے اور پھر جب ان کی یہ کوشش بار آور ثابت نہ ہوئی تو ان پر کیا بیتی ہوگی!! آپ کی اس بے لوث کوشش اور عالی ظرفی کے ناقابل فراموش اثرات قلب وجگر میں ایسے نقش ہوئے کہ آج بھی ان کی تازگی محسوس ہوتی ہے۔

اس واقعہ کے نقل کرنے میں پیش نظر جہاں حضرت کی شخصی عظمت کو اجاگر کرنا ہے، وہاں پر یہ بتانا بھی مقصود ہے کہ اگر ان کی تشنہ تکمیل خواہش پر عمل کرتے ہوئے اب بھی مسلک دیوبند کے سارے دھڑے متحد ہو کر اللہ تعالیٰ کے دین کی سربلندی کے لیے کوشاں ہو جائیں تو حضرت کی روح کو یک گونہ تسکین حاصل ہوگی اور شاید کہ ملت اسلامیہ پاکستان اپنی منزل (نفاذ اسلام) کے حصول میں کامیاب ہو جائے۔ وما ذلك على الله بعزيز۔

ضمیر اختر خان (ونگ کمانڈر)

شعبہ مذہبی امور، ایئر ہیڈکوارٹرز پشاور

﴿ ۳۱ ﴾

حضرت مولانا محمد سرفراز خان صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ کی وفات حسرت آیات پر جامعہ قاسم العلوم گلگشت ملتان میں تعزیتی اجلاس منعقد ہوا۔ اجلاس میں تمام اساتذہ کرام نے شرکت کی۔ حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد اکبر خان صاحب نے مولانا کی زندگی کے مختلف کامیاب گوشے ذکر کیے اور طلبہ کو تلقین کی کہ ایسے گراں مایہ بزرگوں کے نقش قدم پر چل کر دارین کی سعادت حاصل کریں۔ دار التحفیظ میں قاری غلام یاسین صاحب کی زیر سرپرستی ایصال ثواب کے لیے قرآن خوانی ہوئی۔ بعد ازاں مدیر جامعہ جو مولانا سرفراز خان صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ کے ایک سال بحری جہاز میں سفر حج کے بھی رفیق تھے، انھوں نے مولانا مرحوم کی مغفرت اور بلندیٔ درجات کی دعا کرائی۔

اللہ تعالیٰ حضرت مولانا مرحوم ومغفور کی تمام دعائیں آپ کے حق میں اور آپ کی زیر نگرانی مختلف ادارے جو دینی خدمات انجام دے رہے ہیں، ان کے لیے قبول فرمائے۔ ہم ہمیشہ آپ کی کامرانیوں اور کامیابیوں کے لیے دعا گو رہیں گے۔

مولانا محمد یاسین (مدیر)

مولانا محمد اکبر (شیخ الحدیث)

جامعہ قاسم العلوم ملتان

﴿ ۳۲ ﴾

آپ کی ساری زندگی توحید ورسالت اور اسلام کی سربلندی کے لیے وقف تھی۔ اللہ تعالیٰ نے جب تک چاہا، ان سے کام لیا اور وقت مقرر پر اپنی امانت واپس لے لی۔ ان للہ ما اخذ ولہ ما اعطی و کل شئ عندہ باجل مسمی۔ اس چھٹی پر میں حضرت سے ملاقات کے لیے حاضر ہوا تو آپ نے سلام کا جواب دینے کے بعد پوچھا کہ کوئی پریشانی تو نہیں ہے یا سعودیہ جانے میں کوئی مشکل تو نہیں ہے؟ اس کے بعد میرے لیے خصوصی دعا فرمائی۔ اب ان دعاؤں کے لیے کان ترستے رہیں گے۔ اللہ تعالیٰ حضرت کو جنت الفردوس میں جگہ دے اور تمام اہل خانہ اور آپ کو اور ہم سب کو صبر کی توفیق دے۔ آمین ثم آمین۔

قاری عبد الرؤف بن قاری محمد بشیرؒ

گکھڑ منڈی (حال القطیف۔ سعودی عرب)

﴿ ۳۳ ﴾

یہ خبر سن کر انتہائی صدمہ ہوا کہ ولی کامل استاذ العلماء حضرت مولانا سرفراز خان صفدر رحمۃ اللہ علیہ دار فانی سے دار البقاء کی طرف مراجعت کر گئے اور آپ بلکہ ہم سب کو داغ مفارقت دے گئے۔ اللہ تعالیٰ حضرت استاذی المکرم کو رحمت خاصہ اور علیین میں اعلیٰ مقام عطا فرمائے اور پس ماندگان کو صبر جمیل کی توفیق دے۔ وہ تو بقول راجا بابا

بہ نور حقیقی منور بود   ز ظلمت مجازی مطہر بود

کیونکہ ان کی متاع قال اللہ وقال الرسول تھی:

بجز ہو ہو اللہ ندارد متاع   بجز نور رحمت ندارد شفاع

وہ تو سراپا اس شعر کے مصداق تھے:

بجز ذکر ہرگز ندارد متاع   بجز ذکر جاناں ندارد شفاع

ان کا ذکر جمیل اور علم کی حسین یادیں ہمیشہ تازہ رہیں گی اور وہ اور ان کا پھیلایا اور پڑھایا ہوا علم تا قیامت صدقہ جاریہ رہے گا، کیونکہ وہ ایک عظیم شخصیت تھے جن کے بارے میں راجا بابا کے یہ الفاظ بالکل صحیح لگتے ہیں کہ

کسے را کہ تکیہ بود بر خدا   کند بادشاہی بہ ہر دو سرا

ہم شیخ الحدیث والقرآن اور امام المفسرین کے لیے رفع درجات کی دعا کرتے اور اللہ تعالیٰ سے ان کے لیے دار البقاء میں ہمیشہ ہمیشہ کی نعمتوں اور سرفرازی کے خواست گار ہیں۔

پروفیسر عبد الماجد و دیگر رفقا

SIRST، مانسہرہ پاکستان

﴿ ۳۴ ﴾

من نالائق بندہ غلام حسین احرار نے تین مرتبہ شرف زیارت وملاقات کی سعادت حاصل کی۔ اپریل ۱۹۹۱ء میں حضرت ڈیرہ اسماعیل خان تشریف لائے۔ دو مرتبہ گوجرانوالہ دورۂ حدیث کے بعد شرف زیارت حاصل ہوا۔

آپ کے چچا مولانا عبد الحمید خان سواتیؒ سے چار بار ملاقات ہوئی۔ دروس القرآن کی جلدیں حاصل کرتا اور دعائیں لیتا۔ جس دن ان کی وفات ہوئی، لاہور میں جماعت احرار تحفظ ختم نبوت کا مرکزی انتخاب تھا۔ وفات کا سن کر بہت طبیعت میں رنج جاگزیں ہوا۔ مغرب کا وقت قریب تھا۔ حضرت پیر جی سید عطاء المہیمن شاہ بخاری مدظلہ کچھ ساتھیوں کے ہمراہ جنازہ میں شرکت کے لیے روانہ ہو چکے تھے۔

اللہ تعالیٰ مرحوم کو کروٹ کروٹ جنت الفردوس میں اعلیٰ مراتب نصیب فرمائے۔ تمام پسماندگان کو سانحہ عظیم پر صبر واستقامت عطا فرمائے۔ دینی چشمہ کو دن دگنی رات چوگنی ترقی دے۔

ڈاکٹر غلام حسین احرار بن مولانا قطب الدین

جامع مسجد مین بازار روڈ، ژوب شہر

﴿ ۳۵ ﴾

آپ کے والد ماجد حضرت مولانا محمد سرفراز خان صفدر رحمۃ اللہ علیہ کے انتقال کی افسوس ناک خبر بذریعہ اخبارات معلوم ہوئی۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ حضرت مولانا کی دینی خدمات اہل علم کے لیے بڑی حوصلہ افزا تھیں۔ انھوں نے ہر محاذ پر دین کی خدمت کرنے کو اپنی زندگی کا عظیم مقصد بنایا ہوا تھا اور پوری زندگی اس میں وقف کر دی۔

اللہ تبارک وتعالیٰ ان کی تمام دینی وعلمی خدمات قبول فرمائے، ان کے درجات بلند فرمائے اور ہم سب کو ان کی علمی میراث کی کما حقہ قدر کرنے کی توفیق نصیب فرمائے۔ آمین ثم آمین۔ ہم آپ کے ساتھ اور حضرت مولانا کے دیگر تمام پس

ماندگان کے ساتھ اس صدمہ میں شریک ہیں۔ اللہ تبارک وتعالیٰ آپ کو صبر جمیل عطا فرمائے۔

مولوی محمود حسن بن حافظ محمد اسماعیل

مہتمم مدرسہ عربیہ مظہر العلوم کھڈہ کراچی

﴿ ۳۶ ﴾

شیخ الحدیث مولانا محمد سرفراز خان صفدر برصغیر پاک وہند کے نامور شیوخ الحدیث کی صف میں شامل تھے۔ انھوں نے اپنی زندگی اسلام کی اشاعت کے لیے وقف کی ہوئی تھی۔ آپ نے جہاں مذاہب باطلہ کی تردید میں گراں قدر علمی وملی خدمات سرانجام دیں اور ان فتنوں کی بیخ کنی میں عملی تحریکوں میں قائدانہ کردار ادا کیا، وہاں فقہ حنفی کی ترویج وترقی اور دفاع میں غیر مقلدین کا علمی انداز میں تعاقب کیا۔ آپ کے ہزاروں تلامذہ وطن عزیز اور بیرون ملک میں تدریسی وتحریکی فرائض بخوبی سرانجام دے رہے ہیں جو یقیناً آپ کے لیے صدقہ جاریہ ہے۔

مفتاح العلوم سرگودھا میں تقریب ختم بخاری کے موقع پر آپ کی زیارت کرنے کا موقع ملا۔ اللہ تعالیٰ ان کو جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام دے اور آپ کو صبر جمیل سے نوازے۔ اللہ تعالیٰ آپ کو ان کے نقش قدم پر دین کی خدمت کرنے کی توفیق دے اور قومی وعالمی سطح پر علمی مسائل کو کتاب وسنت اور فقہ حنفی کے دائرہ کار میں رہ کر حل کرنے کی علمی استعداد میں اضافہ فرمائے۔

عطا محمد جنجوعہ

کوٹ بھائی خان، براستہ جھاوریاں، سرگودھا

﴿ ۳۷ ﴾

حضرت اقدس نور اللہ مرقدہ کا سانحہ ارتحال دیر سے گوش گزار ہوا۔ بنوں کے اخبارات میں یہ خبر شائع نہیں ہوئی۔ زبانی معلوم ہوا۔ اللہ سبحانہ وتعالیٰ مغفرت فرمائے اور جنت الفردوس نصیب فرمائے۔

عرصہ دراز سے بندہ حضرت اقدس سے ملاقات اور اجازت حدیث کی سند حاصل کرنے اور شرف تلمذ حاصل کرنے کا انتہائی خواہش مند تھا۔ کئی بار پروگرام بنایا، حتیٰ کہ ایک مرتبہ تو اپنے جملہ طلبہ حدیث اور مدرسہ کے شیخ الحدیث صاحب کے ساتھ اجتماعی ملاقات کا پروگرام طے ہوا، مگر کسی وجہ سے روبعمل نہ ہوسکا۔ ہر سال طلبہ دورۂ حدیث کو مرحوم کے بارے میں بتاتا کہ اسلاف کی آخری نشانی ہیں۔ جو آپ سے ملا اور سند حدیث حاصل کی، خوش قسمت ہوگا۔ بدقسمتی سے بندہ اس سعادت سے محروم رہ گیا اور آفتاب علم وعمل ہمیشہ کے لیے ہم سے جدا ہوگیا۔ اللہ جل جلالہ ہم سب کو آپ کے نقش قدم پر چلنے کی توفیق عطا فرمائے۔

[مولانا] حفیظ الرحمن المدنی

مہتمم جامعہ عربیہ معراج العلوم بنوں

﴿ ۳۸ ﴾

قبلہ حضرت مکرم شیخ الحدیث مولانا محمد سرفراز خان صفدر رحمہ اللہ کے انتقال پرملال کی خبر سن کر انتہائی صدمہ ہوا۔ ایک ولی آغوش رحمت میں چلا گیا۔ حضرت مرحوم کی وفات سے بلا مبالغہ ملت اسلامیہ کو ناقابل برداشت نقصان پہنچا ہے۔ آپ فرق

باطلہ کا قلع قمع کرنے کے لیے ساری عمر کوشاں رہے اور علمی وتدریسی فیوض سے ایک جہاں کو آباد کیا۔ آپ کی یہ علمی وتحقیقی خدمات جلیلہ ہمارے قلوب سے تا قیامت محو نہ ہوں گی۔ مسلمانان پاکستان کے لیے حضرت کا وجود مسعود ایک بڑی نعمت تھا۔

دار العلوم عزیزیہ میں ایصال ثواب اور مزید بلندئ درجات کے لیے ختم قرآن حکیم کا اہتمام کیا گیا اور جمعۃ المبارک کے موقع پر مرکزی جامع مسجد میں دعائے مغفرت کی گئی۔ اللہ رب کریم آپ کو اور جملہ متعلقین کو صبر واستقلال کی توفیق دے۔ آمین بجاہ النبی الکریم صلی اللہ علیہ وسلم۔

صاحبزادہ ابرار احمد بگوی

دار العلوم عزیزیہ، بھیرہ، ضلع سرگودھا

﴿ ۳۹ ﴾

اپنی کوتاہیوں اور بقول خود مصروفیتوں کی وجہ سے آپ کے والد محترم کی نماز جنازہ میں شامل نہ ہو کر جس سعادت سے محروم ہوا، اس ناقابل تلافی نقصان کا احساس مجھے ہمیشہ رہے گا۔ اللہ تبارک وتعالیٰ مرحوم کی آخرت کی منازل آسان فرماتے ہوئے انھیں جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام عطا فرمائے اور آپ کو اور آپ کے اہل خانہ کو صبر جمیل عطا فرمائے۔ مرحوم کی وفات سے مسلک کا جو نقصان ہوا ہے، اس کی تلافی فرمائے۔ آمین

سید مقبول حسین ایڈووکیٹ

اوکاڑہ

﴿ ۴۰ ﴾

استاد العلماء حضرت اقدس کے سانحہ ارتحال نے موت العالم موت العالم کا سکتہ طاری کر دیا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

فضلائے دیوبند اپنی ذات میں ایک انجمن، ایک ادارہ اور ایک تحریک کی ہمہ گیری لیے ہوتے ہیں۔ حضرت رحمہ اللہ نے فرق باطلہ کے تعاقب میں وہ کام کیا جو ایک مستقل ادارہ سے ہی ممکن ہوسکتا ہے۔ حضرت والا نے یہ تمام کام انفرادی طور پر بعون اللہ مکمل کیا اور وہ بھی اس طرح کہ ان کی ہر کتاب اپنے موضوع پر ایک ریفرنس بک بن گئی۔ حضرت رحمہ اللہ بیک وقت مفسر قرآن، محدث عظیم اور فقیہ دوران تھے۔ گلستان سعدی پڑھ کر ایک مستشرق نے کہا تھا کہ ایک شخص اتنے متنوع موضوعات پر نہیں لکھ سکتا۔ یہ کتاب ایک ادارے نے لکھی ہے۔ حضرت والا بھی اپنی ذات میں ایک ادارہ تھے۔

حضرت صوفی صاحب کے بعد حضرت الاستاذ مولانا محمد سرفراز خان صفدر کی وفات سے لگتا ہے کہ پاکستان میں علمائے دیوبند کے فیوضات وبرکات کا دروازہ بند ہونے لگا ہے۔ وہ علمی تبحر، وہ اخلاص وللّٰہیت، تقویٰ وطہارت کا وہ معیار اپنے اختتام کو پہنچ رہا ہے۔ آپ سے کیا تعزیت کریں۔ ایک جہان یتیم ہوگیا ہے۔ علمائے دیوبند کے فیوض وبرکات کا احاطہ نہیں کیا جاسکتا۔ دیوبند کے کتاب تعارف (وزٹنگ بک) پر ایک انگریز نے لکھا کہ ”یہ لوگ خود مجتہد ہیں، لیکن مقلد ہیں۔“ حضرت والا بھی اسی مقام کے حامل تھے۔

ادارۂ علم وادب آپ کے غم میں برابر کا شریک ہے۔ رب العالمین حضرت والا کو اعلیٰ علیین میں اپنا قرب نصیب فرمائے اور پس ماندگان کو صبر جمیل عطا فرمائے۔

حق نواز خلیل. اسماعیل گوہر

علی اکبر خان ایڈووکیٹ. اجمل خان

وممبران ادارۂ علم وادب ۔ بفہ

﴿ ۴۱ ﴾

آپ کے لیے والد کا سایہ سر سے اٹھ گیا مگر حقیقت یہ ہے کہ دین سے محبت رکھنے والے بے شمار لوگ یتیم ہو گئے ہیں کہ علم کا روشن چراغ بجھ گیا۔ اللہ رب العزت کا ان پر احسان ہے کہ وہ اپنی زندگی میں اپنے بیٹوں، پوتوں کو اپنی شعور سے اپنائی راہ کے راہی دیکھ گئے اور بیٹوں پوتوں کی خوش نصیبی کہ انھیں ایسا قابل قدر باپ اور دادا نصیب ہوا۔ یہ انعام الٰہی اور سعادت ہے۔ والد کسی عمر میں بھی بچھڑیں، جدائی کا کرب تو سہنا ہی پڑتا ہے۔ میں چونکہ اس کیفیت سے گزر چکا ہوں، اس لیے آپ کے غم کی گہرائی سے بخوبی آگاہ ہوں۔

اللہ تعالیٰ سے بصمیم قلب دعا ہے کہ وہ مولانا محترم کو اپنے جوار رحمت میں اعلیٰ مقام سے نوازے اور جملہ اہل خانہ کو ان کے لیے بہترین صدقہ جاریہ بنا دے۔ آمین یارب العالمین

عبد الرشید ارشد

جوہر آباد

﴿ ۴۲ ﴾

شیخ الحدیث والتفسیر امام اہل سنت رحمہ اللہ تعالیٰ کا سانحہ ارتحال پوری امت مسلمہ کے لیے قیامت سے کم نہیں۔ حضرت رحمہ اللہ کے انتقال کا غم صرف ان کے خاندان کا نہیں، بلکہ پوری امت مسلمہ کے لیے ہے۔ ہماری دعا ہے کہ حق تعالیٰ حضرت اقدس کو اپنے جوار رحمت میں جگہ عطا فرمائیں اور پس ماندگان کو صبر جمیل کی توفیق مرحمت فرمائیں۔

[مولانا] شاہ محمد

جامعہ قاسمیہ رحمٰن پورہ لاہور

﴿ ۴۳ ﴾

شیخ الحدیث مولانا سرفراز خان صفدر رحمۃ اللہ علیہ کی وفات سے از حد صدمہ ہوا۔ انھوں نے نہایت خلوص، بے غرضی اور کاوش سے تمام عمر دین کی خدمت میں بسر کی۔ ان کی وفات ایک عظیم سانحہ ہے اور یہ ایسا خلا ہے جو پورا نہ ہوگا۔ وہ اسلاف کی نشانی، اکابر کی یادگار اور سیرت وکردار کا اعلیٰ نمونہ تھے۔ دین کے ایسے سچے خادم ہم سے جدا ہو رہے ہیں۔ خدا کرے آپ لوگ ان کے مشن کو جاری رکھیں اور اسی خلوص، لگن، بے غرضی اور تن دہی سے دین اسلام کی خدمت انجام دیں۔

بشیر احمد

علامہ اقبال کالونی، راول پنڈی

﴿ ۴۴ ﴾

حضرت شیخ الحدیث رحمہ اللہ کا سانحہ ارتحال بلاشبہ امت مسلمہ کے لیے شدید صدمہ ہے۔ حضرت آثار خیر کی آخری

نشانیوں میں سے تھے۔ ان کے بعد فتنوں کے پھیلنے اور غلبے کی رفتار یقیناً بہت تیز ہو جائے گی۔ اللہ تعالیٰ ہی اس امت کی حفاظت فرمائیں اور حضرت شیخ الحدیث مرحوم ومغفور کے تلامذہ واولاد کو ان کی برکات وفیوض سے مالا مال فرمائیں۔

[مولانا] سراج الحق نعمانی

لال کرتی، نوشہرہ کینٹ

﴿ ۴۵ ﴾

حضرت کی رحلت کا صدمہ دیگر صدموں سے کہیں زیادہ بڑھ کر صدمہ ہے۔ پورے ایک سال کے بعد حضرت اپنے بھائی مولانا صوفی عبد الحمید سواتیؒ سے جا ملے۔ اکابر کا اس طرح یکے بعد دیگرے اس دار فانی سے چلے جانا، یہ قرب قیامت کی نشانی ہے۔ قحط الرجال کا زمانہ آ چکا ہے۔ ان جیسے اکابر علمائے کرام، بزرگان دین اور اللہ والوں کا سایہ ہمارے سروں سے اٹھ جانا علم کا ختم ہونا ہے۔ حضرت کی مفارقت سے پاکستان ایک عظیم اور عبقری شخصیت سے محروم ہو گیا۔

دعا ہے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ حضرت مرحوم کی دینی خدمات وحسنات کو قبول فرما کر اعلیٰ علیین میں جگہ نصیب فرمائے اور اپنے مقرب بندوں میں شامل فرمائے۔

حافظ محمد طیب لدھیانوی

جمشید روڈ، کراچی

﴿ ۴۶ ﴾

اخبارات سے یہ جانکاہ اطلاع ملی ہے کہ آپ کے والد گرامی قدر حضرت مولانا سرفراز خان صفدر صاحب کا وصال ہو گیا ہے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ شدید دکھ ہوا ہے اور اسی کے اظہار کے لیے یہ خط لکھ رہا ہوں۔ میری آپ سے کوئی واقفیت نہیں ہے اور نہ ہی آپ مجھے جانتے ہیں، لیکن حضرت مولانا مرحوم کے علمی مقام ومرتبے اور آپ کے طرز عمل نے مجھے یہ خط لکھنے پر مجبور کیا ہے۔ میں کبھی کبھار آپ کا ماہنامہ 'الشریعہ' پڑھتا ہوں۔ چونکہ آپ ایک متوازن فکر کی حامل شخصیت ہیں، اس لیے آپ کا دل کی گہرائیوں سے قدر دان ہوں اور ایک قلبی تعلق آپ سے قائم ہو چکا ہے۔ میری جانب سے دلی تعزیت قبول فرمائیں۔

موت العالم موت العالم والی بات مولانا سرفراز صفدرؒ پر بہر طور صادق آتی ہے۔ ان کے جانے سے ایک بہت بڑا خلا پیدا ہوا ہے۔ میں یہ تو نہیں کہتا کہ یہ خلا پر نہیں ہو سکے گا۔ یقیناً آپ میں یہ صلاحیت موجود ہے کہ آپ اپنے والد گرامی قدر کی راہ پر چلتے ہوئے خلا کو پر کریں گے، لیکن بہر حال ہمارے اوپر سے ایک شجر سایہ دار ہٹ گیا ہے۔

اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ حضرت مولانا سرفراز خان صفدر مرحوم کو جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام عطا فرمائے اور آپ کو ہی نہیں، ہم سب کو بھی صبر جمیل عطا فرمائے، اس لیے کہ ہم مولانا سرفراز صفدر مرحوم کی رحلت کو اپنا نقصان سمجھ رہے ہیں۔

میرا رونا نہیں، رونا ہے یہ سارے گلستاں کا

امید ہے کہ میرے نام سے آپ منفی تاثر نہ لیں گے اور اس خط کو میرے قلبی جذبات کا مظہر سمجھتے ہوئے قبول فرمائیں گے۔ دکھ ہوا ہے تو خط لکھا ہے۔

سید مزمل حسین جعفری

اسلام آباد

﴿ ۴۷ ﴾

آپ کے والد ماجد شیخ الحدیث کی وفات حسرت آیات کی خبر سن کر از حد صدمہ ہوا اور بے ساختہ زبان پر انا للہ وانا الیہ راجعون جاری ہوا۔ نہ معلوم کتنی دیر کلمہ استرجاع زبان پر رہا اور آنکھوں سے آنسوؤں کا سلسلہ جاری ہو گیا۔ گزرا ہوا دور مجھے یاد آ گیا۔ آپ میرے شیخ امام الموحدین رحمۃ اللہ علیہ سے تعلق رکھنے والے تھے۔ یہ ناچیز اس غم میں آپ کے ساتھ برابر کا شریک ہے۔ یہ صدمہ تنہا آپ کا نہیں، یہ ناچیز بھی اسی طرح قابل تعزیت ہے جیسے آپ ہیں۔ ناچیز ضعیف ہے، اس لیے آپ کی خدمت میں حاضر نہیں ہو سکا۔ امید ہے آپ میری ضعیفی کے عذر کو قبول فرمائیں گے۔

اللہ تعالیٰ شیخ الحدیثؒ کو اعلیٰ علیین میں اپنے جوار رحمت میں جگہ عطا فرمائے، آمین۔

[مولانا] نور حسین عبد اللہ بابا جی

ٹیکسلا، ضلع راول پنڈی

﴿ ۴۸ ﴾

آپ کے والد محترم شیخ الحدیث مولانا سرفراز خان صفدر کی وفات کا سن کر دلی صدمہ پہنچا۔ بے شک یہ اللہ تعالیٰ کا قائم کردہ نظام ہے۔ یہاں کسی کو ثبات نہیں۔ حضرت مرحوم ایک سچے اور عالم باعمل انسان تھے۔ مرحوم کی علمی اور مذہبی خدمات صدیوں قائم رہیں گی۔ یقیناً عالم اسلام ایک بڑے عالم، محقق اور برگزیدہ شخصیت سے محروم ہو چکا ہے۔ اللہ تعالیٰ مرحوم کے درجات بلند فرمائے اور آپ سب کو صبر جمیل عطا فرمائے۔ ادارہ آپ کے غم میں برابر کا شریک ہے۔ مرکزی شاہی مسجد میں مرحوم کے ایصال ثواب کے لیے خصوصی طور پر دعا کی گئی۔

صدر و اراکین انجمن اصلاح المسلمین

پنڈی بھٹیاں ضلع حافظ آباد

﴿ ۴۹ ﴾

امام اہل سنت حضرت اقدس مولانا سرفراز خان صاحب صفدر رحمۃ اللہ علیہ کی خبر وفات نے دل کو مجروح کیا۔ بلا شبہ وہ ایک نامور عالم دین اور مفسر قرآن تھے، لیکن سب سے بڑھ کر وہ علمائے حق کے موثر ترجمان تھے اور انھوں نے اپنی تصانیف میں اسلاف کے فکر و نظر کی جو ترجمانی فرمائی، ان شاء اللہ تعالیٰ وہ ان کے نامہ اعمال میں مستقل اضافے کا ذریعہ بنتی رہے گی۔

اللہ سبحانہ وتعالیٰ مرحوم کو اپنا قرب خاص عطا فرماویں اور ہم سب کو بالعموم اور ان کے اہل وعیال کو بالخصوص صبر جمیل سے نوازیں۔ بندہ بھی ان شاء اللہ تعالیٰ دعائیں اور ایصال ثواب کرتا رہے گا۔

[مولانا] عبد العزیز نقشبندی

کوئٹہ

﴿ ۵۰ ﴾

امام اہل السنۃ والجماعۃ، آیت السلف، محقق اعظم شیخ الحدیث والتفسیر حضرت مولانا سرفراز خان صفدر قدس سرہ کے سانحہ

ارتحال سے جہاں حضرت کی صلبی اولاد اور خاندان غم زدہ ہے، وہاں حضرت کی ہزاروں کی تعداد میں بکھری ہوئی روحانی اولاد احساس یتیمی کا شکار ہے۔ مفسر قرآن داعئ حق حضرت مولانا صوفی عبد الحمید سواتی رحمۃ اللہ علیہ کے تھوڑے عرصے بعد حضرت کی جدائی ملک وملت کے لیے عظیم سانحہ ہے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ ان للہ ما اعطی ولہ ما اخذ وکل شیء عندہ باجل مسمی۔

اللہ تعالیٰ نے ان دونوں حضرات سے امت کی صلاح وفلاح کا جو کام لیا، وہ یقیناً سنہرے حروف سے تاریخ میں محفوظ رہے گا اور ہر موقع پر ان کے اصلاحی کارناموں سے برابر استفادہ جاری رہے گا۔ حضرت شیخ رحمۃ اللہ علیہ نے بستر علالت پر رہ کر بھی جس خاموشی کے ساتھ دینی کاموں اور دینی تحریکات کی سرپرستی کی، وہ قابل رشک وقابل تقلید ہے۔ ان کی تصنیفی وتالیفی خدمات سے احقاق حق اور ابطال باطل کا جو فریضہ ادا ہوا، اس سے علمائے حق کا طبقہ ہمیشہ احسان مند رہے گا۔ ان کے فراق کے غم میں آپ تنہا نہیں، بلکہ ان کی روحانی اولاد اور عقیدت مندوں کی بڑی تعداد برابر کی شریک ہے۔ بجا طور پر کہا جا سکتا ہے کہ

حال ما در ہجر صفدر کم تر از یعقوب نیست
او پسر گم کردہ بود و ما پدر گم کردہ ایم

اللہ تعالیٰ حضرت شیخ رحمۃ اللہ علیہ کے مرقد پر باران رحمت نازل فرمائے، جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام سے نوازے اور لواحقین ومتعلقین کو صبر جمیل کی توفیق کے ساتھ جادۂ مستقیم پر قائم رکھے۔ آمین

[مولانا] ابو الظہیر ہدایت اللہ

جامعہ عربیہ مرکزیہ تجوید القرآن، سرکی روڈ کوئٹہ

﴿ ۵۱ ﴾

شیخ الحدیث حضرت مولانا سرفراز خان صفدر صاحب مرحوم ومغفور کی رحلت کی خبر سنی۔ دل کو سخت جھٹکا لگا۔ اللہ تعالیٰ مرحوم کو جنت میں اعلیٰ درجات نصیب فرمائے اور ان کی دینی خدمات کو اور آپ جیسے مخلص اور اہل علم اولاد کو ان کے لیے صدقہ جاریہ بنائے، آمین۔

حضرت والا کے دنیا سے رحلت فرمانے سے دینی حلقوں میں ایک بہت بڑا خلا پیدا ہوا ہے جس کا پورا ہونا مشکل ہے۔ دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ مرحوم کو اپنے ہاں جوار رحمت میں اعلیٰ مقام عطا فرمائیں اور سب پس ماندگان کو صبر جمیل سے نوازے۔ آمین

قاری محمد شریف

برطانیہ، لندن

﴿ ۵۲ ﴾

آپ کے والد گرامی اور ہم سب کے مرشد ومربی حضرت اقدس مولانا محمد سرفراز خان صاحب صفدر نور اللہ مرقدہ کی وفات عالم اسلام اور بالخصوص پاکستان کے لیے ناقابل تلافی نقصان ہے۔ حضرتؒ کی دینی وملی خدمات اظہر من الشمس ہیں۔ پوری زندگی باطل قوتوں کے خلاف برسرپیکار رہے۔ ان کی وفات سے جہاں آپ متاثر ہوئے ہیں، وہاں ان کے بلا مبالغہ ہزاروں

تلامذہ، معتقدین و متوسلین بھی مغموم ہیں لیکن اب سوائے صبر اور انا للہ وانا الیہ راجعون کہنے کے کوئی چارۂ کار نہیں۔

اللہ تعالیٰ آپ اور جملہ پس ماندگان کو یہ صدمہ جانکاہ برداشت کرنے کی ہمت عطا فرمائے اور ہم سب کو ان کا مشن جاری رکھنے کی توفیق بخشے اور حضرت مولانا کے درجات کو بلند فرمائے۔ آمین یا رب العالمین۔

[مولانا] گل احمد الاظہری
چکوٹھی۔ تحصیل ہٹیاں بالا۔ ضلع مظفر آباد

﴿ ۵۳ ﴾

امام المفسرین حضرت شیخ صفدرؒ کی رحلت ایک بہت بڑا سانحہ ہے اور حقیقتاً موت العالم موت العالم کا مصداق ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ان دونوں بھائیوں کو بہت کچھ دیا تھا۔ علم و عمل، زہد و تقویٰ کا پہاڑ تھے اور اللہ تعالیٰ نے ان سے خوب دین کا کام لیا۔ اکابرین دیوبند کی طرح ہر میدان میں، چاہے جس فتنے کے خلاف بھی ہو، کمر بستہ اور مستعد نظر آئے۔ تصنیف و تالیف میں بھی ان سے سابق کوئی نہ تھا۔ وعظ و تبلیغ میں بھی کسی سے پیچھے نہ تھے اور درس و تدریس میں تو بے مثال اور یکتا تھے۔ کون سی خوبی تھی جو ان سے دور تھی۔ ان کی زندگی بھی قابل رشک تھی اور موت بھی قابل رشک ہے۔ دور دراز سے سفر کر کے لاکھوں لوگوں کی جنازہ میں شرکت ان کے محبوب الی الناس اور مقبول عند اللہ ہونے کی واضح دلیل ہے۔ اللہ تعالیٰ نے دونوں بھائیوں کو اولاد بھی آنکھوں کی ٹھنڈک عطا فرمائی تھی۔ راقم کی بدقسمتی تھی کہ حضرت شیخ صفدرؒ کی زیارت سے محروم رہا، لیکن ان کی علمی شخصیت سے بہت ہی گہرا تعارف تھا۔ ان کی کتابوں سے خوب استفادہ کیا۔ واقعی ان کی وفات علامات قیامت میں سے ہے اور ان کی وفات کی خبر سن کر بہت دکھ پہنچا۔ اللہ تعالیٰ حضرت کو جوار رحمت میں جگہ عطا فرمائے اور ہم سب کو صبر جمیل عطا فرمائے۔

(مولانا) حفظ الرحمن
مدرسہ تجوید القرآن رحمانیہ، خانوخیل، ضلع ڈیرہ اسماعیل خان

﴿ ۵۴ ﴾

آنجناب کے والد گرامی قدر استاذ العلماء شیخ الحدیث حضرت اقدس مولانا محمد سرفراز خان صفدر رحمۃ اللہ علیہ کی وفات ایک خاندان کا نہیں بلکہ قومی سانحہ ہے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ حضرت اقدس [illegible] ات سے صرف اولاد ہی نہیں بلکہ اہل حق یتیم ہوئے ہیں۔ حضرت کی دینی خدمات ناقابل فراموش ہیں اور تاریخ کے دامن پر انمٹ نقوش کی طرح ہمیشہ ثبت رہیں گی۔ ان کی تحریر و تدریس کے ذریعے جس طرح انسان سازی کا کام ہوا ہے، وہ اب ہمیشہ کے لیے باطل قوتوں کے تابوت میں آخری کیل گاڑتے رہیں گے۔ حضرت کی وفات سے پیدا ہونے والا خلا پر ہونا مشکل ہے۔ یہی وہ شخصیت ہے جس کے بارے میں فرمایا گیا کہ موت العالم موت العالم۔

ہماری جماعت سپاہ صحابہ پاکستان اس غم میں برابر کی شریک ہے۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ آپ اور آپ کے خاندان سمیت متعلقین کو صبر جمیل کی توفیق بخشے اور حضرت اقدس کے درجات بلند فرمائے اور جوار رحمت میں جگہ عطا فرمائے۔ آمین۔

ڈاکٹر خادم حسین ڈھلوں
مرکزی سیکرٹری جنرل سپاہ صحابہ

﴿ ۵۵ ﴾

لکھوں تو کیا لکھوں! اس سانحہ فاجعہ کے بعد خود کو بھی قابل تعزیت تصور کرتا ہوں۔ میرا ذاتی تجزیہ اور احباب کا فیصلہ یہ ہے کہ حضرت نور اللہ مرقدہ کی وفات حسرت آیات سے ہم خود ایک عظیم سایے سے محروم ہو گئے ہیں۔ وہ جنھیں زندگی میں ایک دو بار حضرت رحمہ اللہ کی زیارت کا شرف حاصل ہوا، ان کا حال یہ ہے تو آپ تو پھر ان کے حقیقی فرزند اور مسند حدیث کے عظیم وارث ہیں۔ اللہ کریم ہم کو صبر جمیل نصیب فرمائے اور حضرت نور اللہ مرقدہ کی وفات سے جو خلا پیدا ہوا ہے، اپنی رحمت کی صورت میں پر فرمائے۔ آمین

[مولانا] محمد زبیر فهیم
جامعہ حنفیہ مدنیہ بصیر پور، اوکاڑہ

﴿ ۵۶ ﴾

روزنامہ اسلام میں یہ افسوس ناک خبر پڑھی کہ پاکستان کی مایہ ناز علمی و روحانی شخصیت استاذ العلماء حضرت مولانا محمد سرفراز خان صفدرؒ انتقال فرما گئے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ آپ کی وفات موت العالم موت العالم کا مصداق ہے۔ اللہ کریم آپ کو جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام سے نوازے۔ آپ کی وفات سے انتہائی صدمہ ہوا۔ حضرت کی وفات سے علمی دنیا میں ایک بہت بڑا خلا پیدا ہو گیا ہے۔ اللہ نے حضرت کو بہت سی خوبیوں سے نوازا تھا۔ بہت بڑے جید عالم، باعمل، محدث، مفسر، محقق، مصنف، معتدل، سادگی پسند اور اسلام کا بہترین نمونہ تھے۔ اللہ کریم ان کی یہ بہترین خدمات قبول فرمائے۔ آپ جیسے حضرات کو آپ کے لیے صدقہ جاریہ بنائے اور آپ تمام برادران کو ان کا صحیح خلف الرشید بنائے، آمین۔ اس عظیم صدمہ پر اللہ صبر جمیل کی توفیق بخشے۔

[مولانا] محمد امین ربانی
مدرسہ ربانیہ فیض العلوم، جوہر آباد

﴿ ۵۷ ﴾

ہمیں ہفت روزہ خدام الدین لاہور اور ماہنامہ شریعت (سندھی) سکھر سندھ کے ذریعے یہ ہوش ربا خبر پہنچی کہ آپ کے والد محترم فضیلۃ الشیخ مولانا سرفراز صفدر صاحب اس دنیائے فانی سے رخصت ہو کر عالم جاودانی کو سدھار گئے۔ آپ بہت بڑے محدث تھے، تفسیر قرآن پر بہت گہری نظر تھی، صاحب طرز ادیب تھے اور بلند پایہ خطیب تھے۔ ان کے پایے کے علما اس دور میں خال خال ہی نظر آتے ہیں۔ وہ صحیح معنوں میں ایک عبقری انسان تھے۔ انھوں نے ساری زندگی درس و تدریس، تصنیف و تالیف اور صحافت و خطابت کے ذریعے خدمت دین میں بسر کی۔ اللہ تعالیٰ کے حکم کے سامنے سوائے صبر کے اور چارہ نہیں۔ فصبر جمیل۔

اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ ہم کو اور آپ کو صبر کی توفیق بخشے اور مرحوم کے درجات بلند فرمائے۔ آمین

عبد الله بلوچ
عبداللہ بن مسعود لائبریری

ڈاک خانہ کھپرو، ضلع سانگھڑ

﴿ ۵۸ ﴾

آپ صاحبان کے حقیقی جبکہ ہمارے روحانی والد شیخ الحدیث حضرت مولانا سرفراز خان صفدر رحمہ اللہ کی وفات سے جو عظیم صدمہ، نقصان اور خلا پیدا ہوا، وہ شاید ہی پر ہو سکے۔ موت العالم موت العالم۔ آپ کے اٹھ جانے سے دینی حلقے واقعی یتیم ہو گئے اور علمی مجلسیں بے رونق ہو گئی ہیں۔ ظلمت، جہالت اور ضلالت میں آپ کی ذات مینار رشد و ہدایت تھی۔

امام اہل سنت کی اصاغر پروری، شفقت و محبت جو احقر کے ساتھ حاضری کے موقع پر کرتے تھے، اب بھی محسوس کر رہا ہوں۔ والد صاحب حضرت مولانا اظہار الحق مدظلہ ناظم جامعہ حقانیہ اور جملہ خاندان حقانی آپ کے ساتھ اس غم میں برابر کے شریک ہیں۔ نماز جنازہ میں عم محترم شیخ الحدیث مولانا سمیع الحق مدظلہ کے ہمراہ شرکت کی، لیکن رش کی وجہ سے ملاقات اور تعزیت نہ ہو سکی، اس لیے یہ کلمات تعزیت پیش ہیں۔

حافظ محمد عرفان الحق حقانی

دارالعلوم حقانیہ، اکوڑہ خٹک

﴿ ۵۹ ﴾

حضرت مولانا سرفراز خانؒ کی وفات پر مجھے اور اہل جامعہ کو بہت افسوس اور صدمہ ہوا۔ اللہ تعالیٰ ان کو اپنے جوار رحمت میں جگہ عطا فرمائے اور دین کے لیے جو قربانیاں انھوں نے دیں، انھیں اپنی بارگاہ میں قبول و منظور فرمائے اور ان کو ان کے لیے ذخیرۂ آخرت اور صدقہ جاریہ بنائے اور ان کے تمام لواحقین کو صبر جمیل اور اجر عظیم عطا فرمائے، آمین

مولانا محمد اسعد زکریا قاسمی

جامعہ اسلامیہ انوار العلوم، ایف بی ایریا، کراچی

﴿ ۶۰ ﴾

آپ کے والد گرامی اور ہم سب کے بزرگ اللہ تعالیٰ کے دربار میں حاضر ہو گئے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ تعزیت کے مستحق ہم سب ہیں۔ ہاں، آپ زیادہ ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان کی بال بال مغفرت فرما کر درجات بلند فرمائے اور آپ سب کو خدمت کا اجر اور صبر عطا فرمائے۔ آمین

ہماری عقیدت کئی وجوہ سے تھی۔ آپ کا تعلق، سلسلہ نقشبندیہ مجددیہ کا تعلق، علم و فضل کی ڈیڑھ سو برس پرانی روایت سے ہمارا ادنیٰ قلبی تعلق، یہ سب تعلق حضرت اقدس رحمہ اللہ کے ذکر سے تازہ ہو جاتے تھے۔ اللہ تعالیٰ ان سعادتوں میں سے ہمیں بھی کچھ عطا فرمائے جو اس نے حضرتؒ کو عطا فرمائی تھیں۔ فون پر حاضری اس لیے نہیں دی کہ کچھ کہہ نہ سکتا۔ قلم و قرطاس کا سہارا ایسے میں غنیمت معلوم ہوتا ہے۔

بھائی عمار صاحب کی خدمت میں بھی سلام اور جذبات تعزیت۔

ڈاکٹر سید عزیز الرحمن

اسسٹنٹ پروفیسر دعوہ ریجنل سنٹر، کراچی

﴿ ۶۱ ﴾

آپ کے والد محترم حضرت علام، فقیہ العصر حضرت شیخ الحدیث مولانا سرفراز خان صاحب کی وفات حسرت آیات کی خبر سن کر گہرا صدمہ و رنج ہوا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ حضرت مرحوم و مغفور کی علمی، فنی، تحقیقی خدمات اور کارناموں کو نہ صرف یاد رکھا جائے گا بلکہ علما، طلبا اور اہل فن بھی رہتی دنیا تک حضرت مرحوم و مغفور کے ممنون احسان رہیں گے۔

دعا ہے کہ اللہ کریم حضرت رحمۃ اللہ علیہ کے اس فیض کو تا قیامت جاری و ساری رکھیں کہ آپ جیسے بلند ہمت و حوصلہ صاحب علم و کمال اشخاص اس مبارک مشن کی ترقی کا سبب بنے رہیں۔ اللہ تعالیٰ حضرت کو اعلیٰ علیین میں مقام عطا فرمائے فرمائے اور ان کی لحد پر بے شمار رحمتیں نازل فرمائے۔

یہ ناکارہ آپ کے اس دکھ و غم میں برابر شریک ہے۔ اللہ تعالیٰ حضرت مرحوم و مغفور کے خانوادہ کی عزتوں اور وجاہتوں میں مزید اضافہ فرمائے اور اس سانحہ کو برداشت کرنے پر اجر جزیل عطا فرمائے۔ آمین

صاحبزادہ محمد سعید انصاری

بن حضرت مولانا محمد ادریس انصاری

خانقاہ نقشبندیہ غفوریہ، صادق آباد

﴿ ۶۲ ﴾

امام اہل السنت والجماعت، ابوحنیفہ وقت، ترجمان دیوبند، سیدی و مرشدی حضرت شیخ الحدیث نور اللہ مرقدہ کی وفات کی جانکاہ خبر ملی، انا للہ وانا الیہ راجعون۔ اس اطلاع کے ملتے ہی دل پر ایک چوٹ لگی اور حسرت ہوئی کہ کاش ہم اس عظیم ہستی سے محروم نہ ہوتے۔ حضرت شیخ مرحوم کی موت ایک عالم کی موت نہیں، بلکہ موت العالم موت العالم کا مصداق ہے۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ حضرت رحمۃ اللہ علیہ کو جنت الفردوس میں جگہ دے اور تمام پس ماندگان کو صبر جمیل کی توفیق دے۔ الحمد للہ حضرت والا نور اللہ مرقدہ نے اپنے پیچھے ایسی اولاد اور علمی ذخیرہ چھوڑا ہے جو ان کے لیے صدقہ جاریہ اور باقیات صالحات ہیں۔

اللہ اغفر لہ وارحمہ وادخلہ واسکنہ فی الجنۃ۔ آمین ثم آمین

حافظ خیر محمد

جامعہ خیر المدارس العربیہ۔ بلوچی قلعہ۔ کوئٹہ

﴿ ۶۳ ﴾

آپ کے والد محترم حضرت مولانا سرفراز خان صفدر صاحب کے انتقال کی خبر ملی جو مجھ پر ایک گہرے غم اور دکھ کا اثر چھوڑ گئی۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ بلاشبہ آپ کے والد محترم ایک عالم باعمل اور امام اہل سنت تھے۔ ان کی وفات عالم اسلام کے لیے ایک عظیم سانحہ ہے جس سے تمام دینی حلقوں کو بالعموم اور اہل سنت کو بالخصوص ناقابل تلافی نقصان پہنچا ہے۔ ہزاروں کی تعداد میں ان کے شاگرد اور معتقدین ان کے لیے تا قیامت صدقہ جاریہ ہیں، کیونکہ ان کی تعلیم و تدریس کا سلسلہ قائم رہے گا۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ دین کے لیے ان کی محنت کو قبول کر کے سفر آخرت کا بہترین سامان بنا دے اور ان کے درجات کو بلند کرے۔

ہم آپ کے غم میں برابر کے شریک ہیں۔ اللہ تعالیٰ آپ کو ان کا صحیح جانشین بنائے اور ان کے نقش قدم پر چلنے کی توفیق عطا فرمائے۔

الحاج محبوب احمد ملک
تحصیل نائب ناظم بھکر

﴿ ۶۴ ﴾

آپ کے والد محترم ہم سب ہی کی مشترکہ متاع عزیز تھی۔ ہم سب ہی تعزیت کے لائق ہیں، تاہم آپ کا خونی رشتہ تھا۔ آپ کو ان کی جدائی کا جس قدر صدمہ ہوا ہے، اس کا اندازہ دوسرے لوگ نہیں کر سکتے۔ اللہ تعالیٰ مولانا مرحوم کو اپنے جوار رحمت میں اعلیٰ مقام عطا فرمائے۔ اللہ تعالیٰ انھیں اپنے نیک مخلص بندوں میں شامل فرما کر ان کی دینی خدمات کو شرف قبولیت سے نوازے۔

برادر محترم حضرت حافظ ممتاز علی صاحب مرحوم کی دعوت پر مولانا مرحوم بھکر تشریف لائے اور اپنے مواعظ حسنہ سے عوام کو محظوظ فرمایا۔ ہمیں بفضلہ تعالیٰ للہ فی اللہ آپ کے علمی وعملی گھرانے سے محبت ہے۔ حضرت والا کا سانحہ ارتحال علمی وعملی دنیا میں بہت بڑا خلا ہے جس کو پر نہیں کیا جا سکتا۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو صبر جمیل اور اجر جزیل سے نوازے۔

حافظ اعجاز علی
برادر اصغر حافظ ممتاز علی صاحب مرحوم
جامعہ رشیدیہ بھکر

﴿ ۶۵ ﴾

حضرت والد گرامی کا سایہ اٹھنا یقیناً آپ تمام برادران اور لواحقین کے لیے بہت بڑا صدمہ ہے۔ اللہ کریم سب کو صبر عطا فرمائے، آمین۔ جامعہ فرقانیہ کے اساتذہ کرام، طلبہ ومنتظمین کے لیے بھی یہ صدمہ ہے، کیونکہ حضرت کی شفقت ہمیشہ ہمیں حاصل رہتی تھی اور جامعہ کے بانی مولانا عبد الحکیمؒ کے ساتھ بھی ان کا خاص تعلق تھا۔ ۲۰۰۰ تک جامعہ کے سیکڑوں طلبہ موقوف علیہ کے بعد دورۂ حدیث کی تکمیل کی سعادت حضرت ہی سے حاصل کرتے رہے ہیں۔

الحمد للہ حضرت کے جنازہ میں شریک ہونے کی سعادت حاصل ہوئی۔ جامعہ کے اساتذہ اور بعض طلبہ بھی شریک ہوئے۔ یہ تعزیتی کلمات پیش خدمت ہیں۔ قبول فرمائیں۔

ابو زبیر قاری محمد زرین
ناظم اعلیٰ جامعہ فرقانیہ راولپنڈی

حضرت شیخ الحدیثؒ کی وفات پر اظہار تعزیت کرنے والے

مذہبی وسیاسی راہ نماؤں کے اسمائے گرامی

[زیر نظر خصوصی اشاعت میں جن اصحاب قلم کی تحریریں اور تعزیتی پیغامات شامل ہیں، ان کے علاوہ بھی دنیا بھر سے مختلف حلقہ ہائے فکر سے وابستہ حضرات نے شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد سرفراز خان صفدر نور اللہ مرقدہ کی وفات کے موقع پر حضرت کے اہل خاندان سے اظہار تعزیت کیا۔ ان میں سے بعض نمایاں نام یہاں درج کیے جا رہے ہیں۔ (مدیر)]

- حضرت مولانا سلیم اللہ خان (جامعہ فاروقیہ کراچی)
- حضرت مولانا محمد تقی عثمانی (دار العلوم کراچی)
- حضرت مولانا سمیع الحق (اکوڑہ خٹک)
- حضرت مولانا ڈاکٹر شیر علی شاہ (اکوڑہ خٹک)
- حضرت مولانا عتیق الرحمٰن سنبھلی (برطانیہ)
- حضرت مولانا فضل الرحمٰن (ڈیرہ اسماعیل خان)
- مولانا نور الحسن راشد کاندھلوی (بھارت)
- مولانا حافظ حسین احمد (کوئٹہ)
- جناب جاوید احمد غامدی (لاہور)
- مولانا سعید احمد عنایت اللہ (مکہ مکرمہ)
- مولانا عبد الحفیظ مکی (مکہ مکرمہ)
- مولانا محمد مکی حجازی (مکہ مکرمہ)
- مولانا ڈاکٹر محمد عادل خان (جامعہ فاروقیہ کراچی)
- مولانا قاری محمد حنیف جالندھری (ملتان)
- مولانا محمد طلحہ (فرزند شیخ الحدیث مولانا محمد زکریاؒ)
- مولانا سید سلمان ندوی (لکھنو)
- مولانا محمد یحییٰ نعمانی (مدیر الفرقان، لکھنو)
- مولانا محمد طارق جمیل (فیصل آباد)
- صاحبزادہ مولانا سید امین الحسنات شاہ (بھیرہ)
- مولانا قاضی ظہور حسین (چکوال)
- مولانا مفتی محمد زرولی (کراچی)
- جناب چودھری پرویز الٰہی (گجرات)
- جناب قاضی حسین احمد (لاہور)
- جناب غلام دستگیر خان (گوجرانوالہ)
- جناب پروفیسر خورشید احمد (اسلام آباد)
- جناب خالد رحمٰن (اسلام آباد)
- جسٹس ڈاکٹر علامہ خالد محمود (لاہور)
- جناب جسٹس (ر) محمد رفیق تارڑ (لاہور)

-صاحبزادہ پیر عبدالرحیم نقشبندی (چکوال)
-جناب مجیب الرحمٰن شامی (لاہور)
-مولانا محمد سعید یوسف خان (آزاد کشمیر)
-مولانا سید اسد اللہ طارق گیلانی (آسٹریلیا)
-حافظ بشیر احمد چیمہ (دوبئی)
-مولانا قاری عبدالحلیم سواتی (بحرین)
-مولانا محمد طیب طاہری (پنج پیر)
-مولانا عطاء اللہ بندیالوی (سرگودھا)
-مولانا قاضی محمد یونس انور (لاہور)
-مولانا مشتاق احمد چیمہ (گوجرانوالہ)
-مولانا عبدالحمید ہزاروی (گوجرانوالہ)
-مولانا حافظ محمد عمران عریف (گوجرانوالہ)
-مولانا صاحبزادہ رفیق احمد مجددی (گوجرانوالہ)
-جناب خالد بھوترال (اسلام آباد)
-مولانا عبدالقہار (گجرات ضلع مردان)
-مولانا مفتی عبداللطیف (رحیم یار خان)
-مولانا محمد اسلم تھانوی (ملتان)
-مولانا محمد میاں (لودھراں)
-مولانا میاں عبدالرحمٰن (لاہور)
-جناب ڈاکٹر محمد امین (لاہور)

-مولانا میاں محمد اجمل قادری (لاہور)
-جناب افضال ریحان (لاہور)
-مولانا محمد بشیر سیالکوٹی (اسلام آباد)
-مولانا مفتی محمد ارشد (ہانگ کانگ)
-محمد فاروق شیخ (شارجہ)
-مولانا قاضی عصمت اللہ (قلعہ دیدار سنگھ)
-مولانا سید ضیاء اللہ شاہ بخاری (گجرات)
-مولانا قاضی عطاء اللہ (گوجرانوالہ)
-مولانا نصر اللہ راشد (گوجرانوالہ)
-مولانا محمد رفیق سلفی (گوجرانوالہ)
-مولانا محمد اعظم (گوجرانوالہ)
-مولانا خالد حسن مجددی (گوجرانوالہ)
-جناب میر احمد علی (احمد نگر، ضلع گوجرانوالہ)
-مولانا محمد یوسف کشمیری (کراچی)
-مولانا محمد عبداللہ اسعد (خیر پور ٹامیوالی)
-مولانا عبدالکریم ندیم (رحیم یار خان)
-علامہ عبدالحق مجاہد (ملتان)
-مولانا قاضی ارشد الحسینی (اٹک)
-سید حسان گیلانی (لاہور)
-جناب افتخار تبسم (کروڑ لعل عیسن)

مسئلہ حیات النبی صلی اللہ علیہ وسلم اور متوازن رویہ

[یہ تحریر فریقین کے سرکردہ علما کو بھیجی گئی]

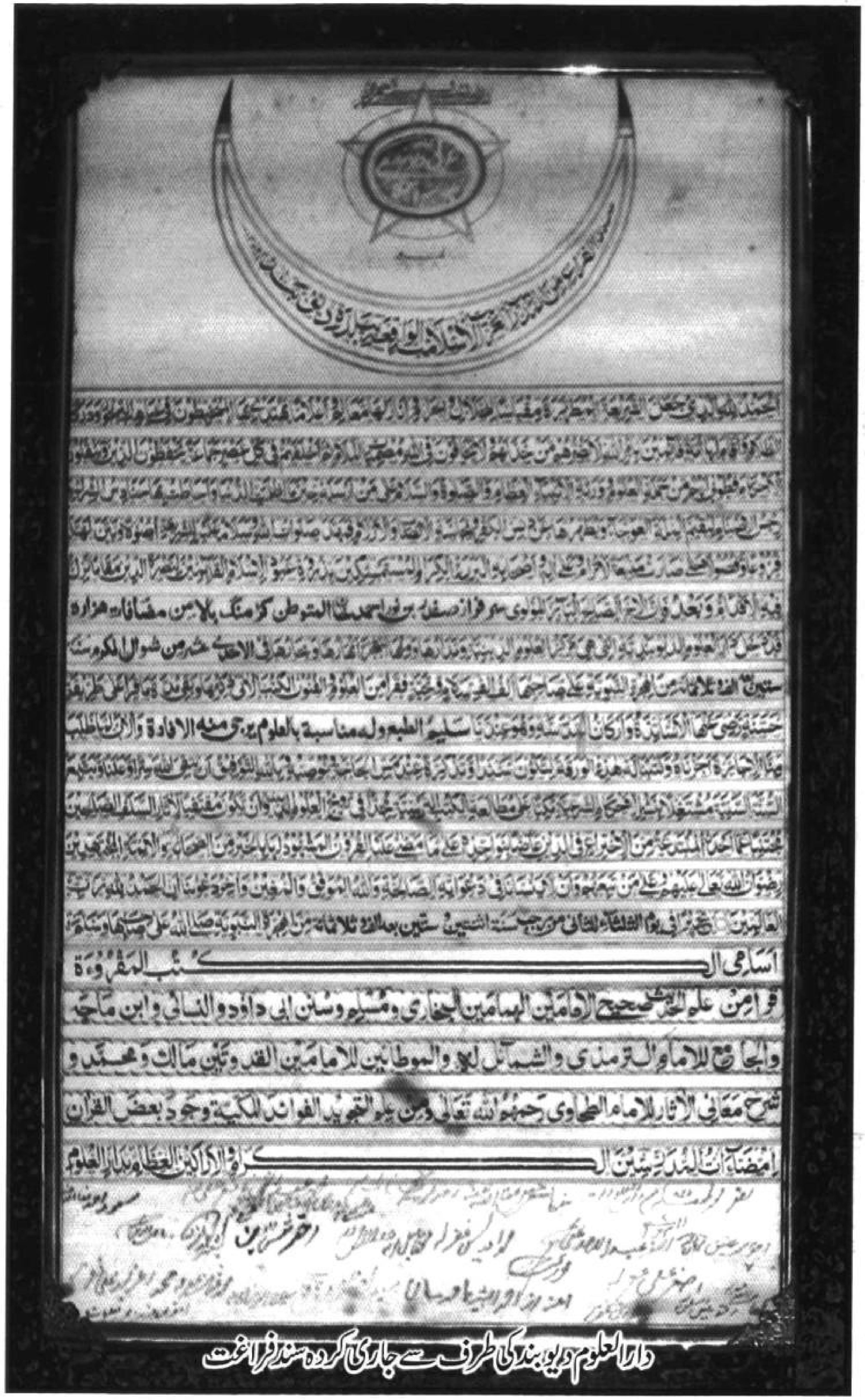
بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

جناب سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات فی القبر کے بارے میں گزشتہ نصف صدی سے بعض حلقوں میں اختلاف ونزاع کی جو کیفیت پائی جاتی ہے، اس میں میرا عقیدہ وہی ہے جو ''المہند علی المفند'' میں اکابر علماے دیوبند کے عقیدہ کے طور پر درج ہے، البتہ میں اسے پبلک اسٹیج کا مسئلہ نہیں سمجھتا اور عام اجتماعات میں اس مسئلے کا کسی بھی طرف سے شدت پسندانہ اظہار میرے نزدیک درست طرز عمل نہیں ہے۔ اسی وجہ سے والد محترم حضرت مولانا سرفراز خان صفدر نور اللہ مرقدہ کے جنازہ اور جامعہ نصرۃ العلوم گوجرانوالہ میں ان کی تعزیت کے لیے منعقد ہونے والے تعزیتی اجتماع کے موقع پر بعض مقررین کی طرف سے اس کا بے موقع ذکر اور خاص طور پر جمعیت اشاعت التوحید والسنۃ پاکستان کے بعض بزرگوں کا توہین آمیز انداز میں تذکرہ اچھا نہیں لگا، چنانچہ میں اپنی اخلاقی ذمہ داری سمجھتے ہوئے اس پر افسوس کا اظہار کرتا ہوں اور ان تمام حضرات سے معذرت خواہ ہوں جنہیں کسی بھی درجہ میں اس سے اذیت پہنچی ہے۔

اس کے ساتھ ہی میں فریقین سے یہ درخواست بھی ضروری سمجھتا ہوں کہ اجتماعی دینی تقاضوں اور ملک کی موجودہ سنگین صورت حال کو سامنے رکھتے ہوئے پبلک اجتماعات میں اس مسئلہ کو بلکہ اس جیسے دیگر مسائل کو بھی موضوع بحث بنانے سے گریز کریں اور خصوصی مجالس یا تحریروں میں ایسے مسائل پر اظہار خیال کرتے ہوئے اختلافات رائے کے علمی اور اخلاقی تقاضوں کا لحاظ رکھیں۔

امید ہے کہ تمام دوست میری اس دردمندانہ استدعا پر سنجیدگی سے غور فرمائیں گے۔

ابو عمار زاہد الراشدی
خطیب مرکزی جامع مسجد گوجرانوالہ


اسامی الکتب المقروءة

قرا من علوم الحدیث صحیح الامامین الهمامین البخاری و مسلم و سنن ابی داود و النسائی و ابن ماجه

والجامع للامام الترمذی والشمائل له والموطاین للامامین القدوتین مالک و محمد و

شرح معانی الآثار للامام الطحاوی رحمهم الله تعالی ومن علم التجوید الفوائد المکیة و جزء بعض القرآن

دارالعلوم دیوبند کی طرف سے جاری کردہ سند فراغت

امام اہل سنتؒ کے علمی مقام اور خدمات کے بارے میں

حضرت مولانا محمد حسین نیلویؒ کی رائے گرامی

[پنا کھہ ضلع گوجرانوالہ کے سید جعفر حسین شاہ صاحب نے ۵/ نومبر ۱۹۹۱ء کو ایک استفسار میں جمعیۃ اشاعۃ التوحید والسنۃ کے مرکزی راہ نما اور بزرگ عالم دین حضرت مولانا محمد حسین نیلویؒ سے دریافت کیا کہ شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد سرفراز خان صفدرؒ کے بارے میں بعض حضرات کی طرف سے شائع کیے جانے والے توہین آمیز اشتہارات کے متعلق ان کی کیا رائے ہے۔ اس کے جواب میں حضرت مولانا نیلوی مرحوم نے جو رائے تحریر فرمائی، اسے موقع کی مناسبت سے یہاں قارئین کی خدمت میں پیش کیا جا رہا ہے۔ اس تحریر کی نقل فراہم کرنے کے لیے ہم مولانا محمد ایوب صفدر (مہتمم مدرسہ فیضان سرفراز گوجرانوالہ) کے شکر گزار ہیں۔ (مدیر)]

الجواب بعون الملک الوہاب

جس شخص نے اس طرح کی کتاب لکھی ہے میں نے نہ دیکھی

نہ سنی مگر نام اور ادپر کے لکھے ہوئے مضمون سے میں

سمجھ رہا ہوں کہ یہ لکھنے والا عوام کا بھی یہ کام نہیں کہ اس طرح کے الفاظ نازیبا ایک جید محقق محدث عالم کے متعلق کہیں

چہ جائیکہ علماء و حق پرست۔ وہ تو کوسوں دور ایسے الفاظ سے بھاگتے ہیں۔ اس کا فرض ہے کہ اس کتاب کی اشاعت

ترک کر دے اور حضرت مولانا صاحب سے اپنے اس جرم کی ابھی ابھی معافی مانگ لے کہیں ایسا نہ ہو کہ بروز قیامت اللہ تعالیٰ

کے حضور دعویٰ دائر ہو جائے وہاں کیا بنے گا اللہم احفظنا من مثل هذه الاكاذيب والبهتان العظيم

محمد حسین عفی اللہ عنہ مدرسہ ضیاء الاسلام سرگودہا

بحمد اللہ تعالیٰ الشریعہ اکادمی کے زیر اہتمام امام اہل سنت رحمہ اللہ کی حیات و خدمات کے تذکرہ کے لیے

www.sarfrazsafdar.org

کے عنوان سے ایک مستقل ویب سائٹ قائم کر دی گئی ہے جس کی تشکیل و ترتیب ہمارے رفیق کار حافظ ناصر الدین خان عامر (فرزند حضرت مولانا زاہد الراشدی) کی شبانہ روز محنت کی مرہون منت ہے۔ 'الشریعہ' کی زیر نظر خصوصی اشاعت کے تمام مضامین اس ویب سائٹ پر ملاحظہ کیے جا سکتے ہیں۔ (ادارہ)